U9002


ایشیا

پُجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

حضرت ساغرؔ نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہمیں ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اسکی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغرؔ نظامی جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے سبب ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغرؔ نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرز وائس"

(۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات، حکومت صوبۂ متحدہ، حکومت بہار
حکومت سی پی اور حکومت صوبۂ پنجاب

مرتبہ

ساغر نظامی

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۸ر آنے

جملہ حقوق محفوظ
(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

ایشیا

جلد ۷	اگست سنہ ۱۹۴۲	نمبر ۷

فہرست مضامین

نئی صبح

اشارات

موجودہ مشکلوں سے بھری دُنیا میں اشیا کی قدریں خود ہی اہم اور بلند ہو گئی ہیں۔ "کاغذ و سیاہی" سونے چاندی کی قیمت رکھتے ہیں۔ اس گراں قدر زمانہ میں ہر ادارہ کو یہ محسوس کرنا چاہئے کہ محض کاغذ سیاہ کرنے کی جد وجہد وقت اور قوّت کا ضائع کرنا ہے اگر آج کوئی کتاب یا رسالہ اپنا معیار قائم نہیں رکھ سکتا تو اس کا فنا ہو جانا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ بدذوقی کی اشاعت میں کمی ہو جائے گی اور اس اعتبار سے بھی کہ اس کے حصّہ کا کاغذ دوسرے مستحقین کو مل سکے گا!

ایشیا کا جون و جولائی مشترک نمبر میری عدم موجودگی میں شائع ہوا۔ دکن میں میری نگاہ سے گزرا، پہلی نظر ہی میں میرے ضمیر نے مجھے حکم دیا۔ "تم دونوں میں سے ایک کی فنا فرض ہو گئی ہے"!؟ یہاں مجھے نہ ذمہ دار اراکین پر نکتہ چینی کرنی ہے، نہ کسی اور پر، مگر یہ ضرور اعتراف کرنا ہے کہ مجھے اپنی غیر ذمہ داریوں کا احساس ہوا، اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایشیا کا بند کر دینا پسند کروں گا مگر اس کی یہ حالت نہ ہونے دوں گا جو مشترک نمبر کی ہوئی۔ اس حالت کا واحد ذمہ دار صرف "ساغر" ہے، جسے آپ چاہیں معاف کر دیں مگر میں معاف نہیں کر سکتا۔!؟

تازہ نمبر صحتِ کتابت اور اپنے مقالات، مضامین، افسانوں، نظموں اور تنقیدی جزو کے اعتبار سے اپنے معیّنہ اور مقررہ معیار پر شائع کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ ممکن طور پر بلند ہوں، اور ایشیا جو کچھ پیش کرے اس کی حیثیت اِک آئیڈل کی حیثیت ہو، مگر بعض اوقات ایسی فروگزاشتیں ہو جاتی ہیں کہ ان کی تلافی ممکن نہیں ہوتی! ۱۰

ارشاد بیگ صاحب نے "آنے والی دُنیا کی جھلک" اس مرتبہ بھی دکھائی ہے، حیاتیاتی مسائل پر ڈارون ہربرٹ اسپینسر اور لزلی اسٹیفن نے ایک خاص مرکز تک غور و فکر کے بعد کچھ اخلاقی نظریہ مرتب کئے۔ اسپینسر اور اسٹیفن نے غور و فکر کی بنیاد ڈارون کے نظریات پر قائم کی۔ ارشاد بیگ نے اِن سب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسپینسر اور اسٹیفن سے بھی آگے جانا چاہتے ہیں! پہلے مقالہ کی بہت کچھ تصریح اِن کے تازہ مقالہ میں پائی جاتی ہے، تیسرے مقالہ میں وہ اپنے مطالب کو اور بھی واضح کریں گے!

"روسو کا نظریۂ مشیّتِ عامّہ"، مختصر مضمون ہے۔ اس میں اکرام قمر نے ایک بڑی بحث کو چھیڑ کر، جلد ختم کر دیا ہے، طامس ہوبز، لوک اور روسو کے مقابلہ میں ملوکیت پسند تھا وہ مشیّتِ عامّہ کا قائل نہیں تھا، فرد کی اطاعت اور شخصی جابریّت کو مانتا تھا۔ لوک نے ہوبز کے نظریوں میں ترمیمات کیں، اور انھیں عملی سیاسیات سے ہم دوش کیا۔ روسو نے لوک کی تعلیمات کی روشنی میں حاکمیّت اور آزادیٔ رعایا کے مابین ایک معاہدۂ سیاسی کا نظریہ پیش کیا!

روسو کے پیش کردہ ان مسائل اور نظریات پر بہت کچھ وضاحت سے لکھا جا سکتا ہے، تاہم اس مختصر مضمون میں ان تمام مسائل پر طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، جو افادیت سے خالی نہیں!

"اٹھارویں صدی کے دورِ ثانی کی صحافت اور اس کے چند نمونے" قاضی عبدالغفار کا مضمون ہے! جو یہ اندازہ کرنے کے لئے نہایت دلچسپ چیز ہے کہ اُردو کتنے چولے بدل کر ہم تک پہونچی ہے!

ساغر

ـــــــ ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

ارشاد بیگ

آنے والی دُنیا کی جھلک

غیر شعوری ارتقاء میں قباحتیں

غیر شعوری ارتقاء کے زمانہ میں نہ مرنا اچھا ہے نہ جینا کیونکہ زندگی میں تخریب و تباہی کے علاوہ تعمیر و تسکین کے پہلو مفقود ہیں۔ اصل میں اس وقت تک ہماری قوتِ حیات ترتیب و تشکیل اور اضافہ (ADDITION) و تغیّر (ALTERATION) کے عمل سے گزر رہی تھی۔ زندگی تو تھی ہی نہیں بلکہ قوتِ حیات کی شعوری منزل حاصل کرنے کے لئے محض ایک جد و جہد تھی۔ ادراک آگے بڑھتا تھا مگر ماحول اور سماجی نظام سابقہ معیار پر قائم رہتا تھا۔ اس طرح زندگی اور ماحول میں تطابق قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس عدم تطابق کا لازمی نتیجہ تباہی اور جمود کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اور ہمارے جذبات اور آرزوئیں تشنہ رہ جاتی تھیں۔ مگر اب ترتیب و تشکیل کا یہ کھیل ختم ہو رہا ہے۔ یہ تمام کھیل تو صرف اس لئے تھا کہ ہم ایک اعلیٰ شعوری ارتقاء کے مرتبہ پر پہنچ جائیں۔ اب قوتِ حیات شعوری حیثیت اختیار کرے گی اور ایک ایسا درجہ معرضِ شہود میں آجائے گا جہاں ذہن اور ماحول ایک ساتھ شعوری حیثیت میں ترقی کریں گے۔ زندگی شعوری سمت میں آگے بڑھے گی۔ شعوری درجہ قائم ہونے کے بعد زندگی کا صحیح نظام قائم ہو جائے گا۔ قوتِ حیات کی پامالی اور غیر شعوری رفتار کے بجائے ایسی زندگی وجود میں آئے گی جو ادراک کے شعوری خاکوں کا نتیجہ ہوگی۔ اور آئندہ تمام ارتقاء انہی شعوری خاکوں میں اضافہ کی صورت میں ہوگا۔ آئندہ زندگی میں "ریاست" "وطن" یا "مذہبی خدا اور سچائی" کے نام پر ہر فرد کو اپنی خواہشات اور مسرتوں کی قربانی نہیں کرنی پڑے گی نہ اعلیٰ صداقت اور اقتدار کے تصورات اور بلند آدرشوں کو کامیاب بنانے کے لئے جذبات و احساسات کی زندگی کو کچلنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ باتیں تو صرف اس لئے تھیں کہ دوسرے کم درجہ کے تصورات اور میلانات ہماری ذات کے نشوونما ارتقاء کو نہ روک سکیں۔ لیکن شعوری مرتبہ کے بعد ارتقاء میں غیر شعوری غلط اور کم درجہ کے میلانات کے حارج ہونے کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوگا۔ غیر شعوری ارتقاء کے زمانہ میں انسانوں کو گھر بار۔ بیوی بچے۔ مال و دولت۔ سماج جیسی ذہنیت محبّت اور اپنی دلچسپیوں وغیرہ کو اکثر قوتِ حیات کے ارتقاء کے لئے (سچائی۔ وطن۔ اخلاق یا فرض کے نام سے یا اعلیٰ مقصد بنا کر) کچل دینا پڑتا تھا۔ آئندہ زندگی میں خود یہ تمام جذبے انسان پر نچھاور ہوں گی یعنی انسانی زندگی میں تشنگی اور کرختگی کا نشان بھی باقی نہیں رہیگا۔

مُستقبل کی تاریخ

آئندہ تاریخ میں زوال کا کہیں ذکر نہ ہوگا۔ "زوال" اُس قوتِ حیات کے گرنے کا نام تھا جو آگے بڑھنے کی صلاحیت اور اپنا فائدہ زائل کر چکی تھی اور اس کے بجائے دوسری تازہ قوت اُبھرتی تھی۔ ایک کے زوال اور دوسرے کے عروج کی اصل وجہ یہ تھی کہ قوتِ حیات سب کو شیرازہ بند کر کے ایک (UNIT) کی طرح ترقی نہیں کرتی تھی۔ نوعِ انسان کی جدّ و جہد قوتِ حیات کی شیرازہ بند اور شعوری جدّ و جہد نہیں تھی۔ آئندہ تاریخ میں نوعِ انسان ایک ہی مرکز اور ایک ہی مقصد کیلئے شعوری جدوجہد کرے گی۔ اس لئے زوال کا مسئلہ پیدا نہیں ہوگا زوال اور عروج دو چیزوں کا وجود چاہتا ہے۔ یعنی ایک گرنے کے لئے موجود ہو اور دوسری اُبھرنے کے لئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کی قوتِ حیات دو سمتوں میں کام کرے آئندہ

تاریخ میں ایسا نہیں ہوگا۔ جنگ بھی ایک مشترکہ مقصد کی عدم موجودگی اور صحیح شعور سے دوری کا نتیجہ تھی۔ اور یہ ارتقار کی ایک گزر جانے والی حالت تھی۔ مختلف گروہ۔ مخالف جماعتیں رجعت پسند ادارے۔ مساجد۔ مندر۔ گرجے۔ محض قیاسی مسائل پر تحقیقات کرنے والی سوسائٹیاں۔ دماغی قوتوں کو زائل کرنے والی بیکار یونیورسٹیاں۔ ان سب کے ذکر سے نئی تاریخ کے اوراق آلودہ نہیں ہوں گے۔ آج کہیں پان ہندوازم ہے کہیں پان اسلام ازم۔ کہیں یورپین جمہوریتوں کے اتحاد کی تجاویز ہیں۔ کہیں ایشیائی نظام نو۔ کہیں نازیوں کا نیا نظام ہے۔ کہیں قادیانیوں اور بہائیوں کی نئی دُنیا ہے۔ "ہر ایک ہاتھ میں ایک جام ہے مگر خالی"۔ غرض اذہان دُنیا کے ہر گوشہ میں ایک دوسرے سے متضاد۔ باطل اور غیر حقیقی تصوّرات میں ضائع ہو رہے ہیں۔ آئندہ دُنیا میں ایک صحیح جانا بوجھا آئیڈیل ہوگا جس پر جد وجہد کی بُنیاد رکھنے کے بعد نوع انسان کا ذہن ضائع نہیں ہوگا۔ زندگی شانت اور مالا مال ہو جائے گی۔ پادری
مولوی۔ پنڈت۔ اور سیاہی سماج کے کارفرما عوامل میں سے
12 نہیں ہوں گے۔ آئندہ دنیا میں نقصان (.WASTE) کے امکانات بھی باقی نہیں رہیں گے۔

۱۔ نقصاناتِ جنگ کا ازالہ ہو جائے گا۔

۲۔ علَم برداران مذاہب کا کوئی مقام اور عمل باقی نہیں رہیگا پادری۔ مولوی۔ پنڈت۔ سماج پر بوجھ بن کر نہیں رہیں گے۔

۳۔ تبلیغی مراکز۔ قیاسی مسائل پر تحقیقات کرنے والی سوسائٹیاں۔ نوجوانوں کی زندگی کو بیکار کرنے والی یونیورسٹیاں یہ تمام ادارے معدوم ہو جائیں گے۔

۴۔ مخالف جماعتیں۔ غلط تصوّرات اور "ازم" وغیرہ میں ذہنوں کا ضائع ہونا ختم ہو جائے گا۔

۵۔ نسل اور مذہب کے تعصب کی وجہ سے پیدا شدہ تمام نقصانات کے امکانات مٹ جائیں گے۔

۶۔ جیل خانے نہیں رہیں گے۔

آ[illegible]ہ تاریخ میں قوموں کی غلامی اور نسل انسانی کی پامالی ک[illegible]تیں کالعدم ہو جائیں گی۔ کیونکہ ماحول اور نظام کی ہیئت یکسر مختلف ہوگی۔

حیاتیاتی طاقت کا طلوع

حیاتیات کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ عمرانیات کے مسائل کسی معاہدہ کی بنا پر طے و حل نہیں ہوتے بلکہ طاقت کی بنا پر فیصل ہوتے ہیں۔ عمرانی مسائل کو طے و حل کرنے کیلئے یہ طاقت قوتِ حیات سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ قوتِ حیات ازخود ذہن انسانی میں نہیں اُبھرتی تھی۔ بلکہ غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کی وجہ سے جو نئے طریقے اور ذرائع انسان معلوم کرتا تھا وہی طاقت کی بنیاد ثابت ہوتے تھے جس میں زیادہ جان ہوتی تھی وہی زیادہ نئے طریقے اور ذرائع معلوم کر سکتا تھا۔ اور اس طرح خود کو زیادہ قوی بناتا تھا میکانی ذرائع کے پس پشت دراصل ذہنی اور قوّتِ حیات کی صلاحیت ہی کام کرتی رہی ہے دوسرے الفاظ میں حیاتیاتی صلاحیت ہی میکانی صلاحیت کا سرچشمہ ہے آج وہی حیاتیاتی قوّتِ حیات ترقی پاکر نئی شکل میں اُبھر رہی ہے اس لئے اس کے سامنے میکانی طاقت بیکار ہو جائے گی کیونکہ میکانی طاقت اسی قوّتِ حیات کی غیر ترقی یافتہ صورت تھی۔ فرد میں قوتِ حیات کا ہونے والا نشو و ارتقا اجتماعیات پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کی حاکمی و محکومی کا مسئلہ کسی معاہدہ سے طے نہیں ہوا تھا۔ مغرب کا مشرق پر قبضہ اور غلبہ کسی معاہدہ کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ قوتِ حیات کے نشو و ارتقا نے جو اجتماعی اثر ڈالا اس کی بنا پر تاریخ نے یہ شکل اختیار کی۔ آئندہ نظام میں مسائل کسی معاہدہ کی بنا پر طے نہیں ہوں گے۔ بلکہ نئی حیاتیاتی قوتِ حیات ہی حَکَم بنکر مسائل کا فیصلہ کرے گی۔ اور چونکہ یہ نئی حیاتیاتی طاقت صحیح شعور کی حیثیت اختیار کرے گی اس لئے لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی پر مبنی نتائج ظہور پذیر نہیں ہونگے جیسے معاہدہ ورسیلز کے وقت ہوئے تھے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ نظام کی بنیاد حیاتیاتی حقائق پر ہوگی اور تاریخ میں شعوری ارتقار کا ایک نیا آغاز ہوگا۔

تاریخ کا حیاتیاتی نظریّہ

حیاتیاتی عناصر تاریخ انسان کی تشکیل میں جو اہم اور بنیادی پارٹ ادا کرتے ہیں اُن کا اندازہ ذیل کے مدارج سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ تاریخ کا ارتقا حیاتیاتی ارتقا ہے۔

۲۔ موجودہ بحران حیاتیاتی عمل کے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے تھے۔

۳۔ آنے والا انتظام اچانک صورت میں ظاہر ہوگا۔ کیونکہ حیاتیاتی ارتقا غیر مرئی ہوتا ہے۔

۴۔ تمام نوعِ انسان کے ادراک کو نئی قوتِ حیات مقید کرے گی۔ اور نظام عالم معطل حالت میں رک جائیگا۔

۵۔ حیاتیاتی قوتِ حیات میکانی قوت کی بجائے خود عمرانی مسائل کے حل کے لئے ایک قوت بن جائے گی۔

۶۔ شعوری ارتقار کا زمانہ شروع ہو جائیگا۔ نوع انسان کا ذہن آزادانہ ترقی کرے گا۔ غیر شعوری میلانات کی غلط مزاحمت اور ان دیکھی قوتوں کی مخالفت کا خدشہ نہیں رہیگا۔

۷۔ نوع انسان کی پامالی کا پہلو ختم ہو جائیگا۔ کیونکہ اب نوتِ حیات غیر شعوری اور اندھے ارتقا کے عمل سے گزر چکی ہوگی۔

عمرانی صلاحیت

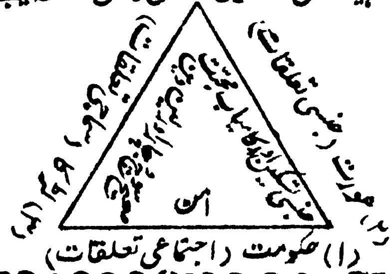
آئندہ زمانہ میں عمرانی صلاحیت منتشر اور اندھی حالت میں کام نہیں کریگی بلکہ ایک منضبط اور شعوری حیثیت اختیار کرے گی۔ یہی نہیں بلکہ ارتقار کی ایک اعلیٰ ہیئت بھی اختیار کرے گی۔

یہ یاد رکھئے کہ ارتقا قوتِ حیات میں رونما ہوتا ہے اور قوتِ حیات کی لطافت ہی انسان میں الوہیت کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ انسان میں ترقی اسی لطیف کیف وہیجان کی مرہونِ منت ہے۔ تخلیق اور نئے تر ین کا تعلق اسی لطیف قوتِ حیات سے ہے۔ خدا کا تعلق بھی عملی قوتِ محرکِ تخلیق اور عمرانی صلاحیت سے ہے۔ چونکہ خدا کا تعلق اس قوت سے ہے جو نوعِ انسان کی جدوجہد کی محرک اور رہنما ہے۔ اس لئے خدا زندگی پر قادر قرار پاتا ہے۔ لیکن آج مذہب کا خدا زندگی پر سے اپنا کنٹرول اور اقتدار کھو چکا ہے۔ اسے زندگی کی دھڑکن اور حرکت سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ قوتِ حیات حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے ہر انسان میں جاری وساری ہے اس لئے خدا مشترکہ خدا ہے اور چونکہ انسان ابھی تک ایسے مقام پر نہیں پہنچا ہے جہاں لطیف قوتِ حیات ہمارے ذہن پر منکشف ہو جائے۔ اس لئے خدا بھی ابھی تک ایک راز ہے۔ لیکن نئی ہیئت ذہنی میں خدا کا عرفان حاصل ہوگا۔ کیونکہ انسان حیوانی سطح سے بلند ہو جائے گا اور اس کے حواس و ذہن ایک اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جائیں گے۔ اتنا ہی نہیں ہوگا بلکہ دُنیاوی جدوجہد سے بھی بہیمیت اور حیوانیت کی بو نہیں آئے گی۔ خدا ایک حیاتیاتی قوت۔ علم اور تخلیق کا سرچشمہ ہے اور عملی جدوجہد سے انسلاک رکھتا ہے۔ مگر مذہب کا خدا اعتقاد کی حدود سے آگے نہیں بڑھتا۔

جب قوتِ حیات ایک اعلیٰ شکل میں ارتقا پذیر ہونا چاہتی ہے۔ اس کا تموّج انسان کے ذہن پر نہایت تیز پڑتا ہے اس تموّج کے پرتو سے خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں اگر انسان گفتگو کرنا چاہے تو الفاظ اس کے مُنہ سے ادا نہیں ہو سکتے کیونکہ گفتگو ادراک سے وابستہ ہے۔ یعنی بولنا ہماری سمجھ کا حیاتیاتی اظہار اور پرتو ہے۔ لیکن ادراک ایک خیرہ کن حیثیت میں ہونے کی وجہ سے اپنا حیاتیاتی اظہار کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ جب قوتِ حیات کے اس خیرہ کن تموّج کو ذہن
۱۴ برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے تو اس کے بعد شعوری ارتقار کے درجات شروع ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے ادراک ایک خیرگی میں اسیر ہوتا ہے۔ جب تک حواس قوتِ حیات کی اُبھرتی ہوئی لہروں کو تبدیل کرنے کے قابل نہ ہو جائیں قوتِ حیات مردہ حیثیت میں رہیگی۔ یعنی جب تک نوعِ انسان کے جسم میں قوتِ حیات کی لہر پُر ذی ہوش طریقے سے کام کرنے کے قابل نہیں ہوں گی ایک موت کی سی حالت نوعِ انسان کی حیات پر طاری رہے گی۔ آج ہر شخص پر موت طاری ہے۔ یعنی قوتِ حیات ایک ایسی اندھی گلی کے موڑ پہ آ گئی ہے کہ اس سے آگے قدم رکھنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ حواس قوتِ حیات کی اتنی اونچی لہروں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ذہن اپنا فعل جاری نہیں رکھ سکے گا۔ اس لئے ہر فرد کو اندھی گلی اور موت کی حالت سے بچنے کے لئے خود شعوری ہیئت ذہنی اور نئی قوتِ حیات کے سہارے چلنا ہوگا۔ یہی نوعِ انسان کے وجود کے باقی رہنے کا واحد حیاتیاتی طریقہ ہے۔

نئی قوتِ حیات کو مزید ارتقار حاصل کرنے کیلئے نہایت دشوار مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہلے ذہن کو کئی سال تک خموشی

کی حالت سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب دماغ اور احساسات اتنی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں کہ نئی قوت حیات کی لہروں کو جذب کر سکیں۔ تو تین مدارج اور طے کرنے ہوتے ہیں۔ یعنی غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کی ان تین نوعیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو وہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں اختیار کرتی ہے۔ پہلی نوعیت سیاسی قوت اور حکومت ہے دوسری نوعیت مسئلہ جنسی ہے۔ اور قوتِ حیات کی تیسری نوعیت اُنسِ بالمثل یعنی مرد کا مرد سے محبت کرنا ہے۔ جب تک نئے ارتقائی دعویدار قوتِ حیات' غیر ترقی یافتہ قوتِ حیات کی ان شکلوں کو کنٹرول نہ کرے۔ صحیح نظام شروع نہیں ہو سکتا کیونکہ قوتِ حیات کی یہ تین نوعیتیں غیر ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے حیوانی حیثیت سے اونچی نہیں اُٹھ سکتیں۔ یہ تین نوعیتیں حیوانی حیثیت میں (۱) قتل و خونریزی۔ حرص و آز۔ (۲) حرام و بیسوائیت اور (۳) آوارگی۔ کی فضا پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ اس لئے ان تین نوعیتوں کی جو قوتِ حیات کا ہیجان زندگی میں اختیار کرتا ہے حقیقی مدارجِ ارتقاء کے ذریعہ ہی کنٹرول کیا جا سکتا ہے محض مذہبی اپیل یا اخلاق یا وعظ سے دُنیا میں کبھی ان تین
نوعیتوں کو صحیح لڑی میں نہیں پرویا جا سکتا۔ جب ایک ایسی ۱۴
بلند حیاتیاتی سطح ذہنی دُنیا میں قائم ہو جائے گی جو ان تین غیر ترقی یافتہ نوعیتوں سے حیاتیاتی کشمکشوں کو طے کرنے کے بعد صحیح اور تکمیل یافتہ حیثیت میں ظہور پذیر ہوگی تو ان تین نوعیتوں کی حیوانی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ یہ نئی قوتِ حیات کے کنٹرول میں آجائیں گی۔ اور لوٹ کھسوٹ اور حیوانی طور و طریق کا مظاہرہ کرنے کے لئے آزاد نہیں ہوں گی۔ اس لئے جنگ اور غلامی بھی دم توڑ دے گی۔ امن تسکین اور آزادی کی راہیں کھل جائیں گی۔ جنسی تعلقات میں اوباشی جاتی رہیگی کیونکہ جنسی تعلقات کا صحیح نظم پیدا ہو جائے گا۔ اولاد کی سرکشی اور آوارگی بھی ختم ہو جائے گی اور اولاد کی ذہنیت غلط سمت میں پرواز نہیں کریگی۔ جب یہ سب کچھ ہوگا تو دُنیا کی جد و جہد میں انتشار باقی نہیں رہیگا۔ اس مثلث میں مسائل کا حل ملاحظہ کیجئے۔



پہلے مقالہ میں سرسری طور پر ان مسائل کا ذکر کر چکا ہوں۔ تا حال حکومت اور سیاسی و اجتماعی تعلقات خود غرضی۔ لوٹ کھسوٹ اور اسی قسم کے دوسرے عناصر سے پاک نہیں تھے۔ اس لئے دُنیا کی فضا بد امنی۔ تباہ حالی۔ ناانصافی اور خونریزی سے گھری ہوئی تھی لیکن خود شعوری پر مبنی نظام میں اجتماعی تعلقات صحیح بنیادوں پر قائم ہوں گے اور امن اس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔

اس وقت تک جنسی معاملات میں مرد ہمیشہ عورت کے در پر بھکاری ثابت ہوتا رہا ہے اور اس کی ساری توجہات عورت کی طرف راجع رہی ہیں۔ ہماری دُنیا میں ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ مرد ہر قسم کی عورت سے ملتفت ہوتا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ عورت بھی اسی طرح ہر قسم کے مردوں سے ملتفت ہوتی ہو۔ اس وقت تک عورت کی فطرت ایک مجہول محبوبیت کے دائرہ میں ڈانواڈول رہی ہے۔ جس کی وجہ سے نسل انسانی میں عمیق جنسی لگاؤ۔ تناسب اور گہری جنسی وابستگی نہیں پیدا ہو سکی۔ مرد کی بڑھتی ہوئی طالبیت کے قدم بقدم عورت نے بھی مقابلہ کی طالبیت نہیں دکھائی۔ اگر عورت بھی خود محبوبہ نہیں۔ عاشق بنتی تو سماج کے جنسی دھارے کا رُخ زیادہ صحت بخش ہوتا۔ مگر اب عورت مرد کی طرف رجوع ہوگی۔ اور مرد سے زیادہ دلچسپی اور لگاؤ کا اظہار کرے گی۔ نوعِ انسان میں صحیح شعور بھی پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے مرد بھی عورت سے ناانصافی پر مبنی اور غلط برتاؤ نہیں کرے گا۔ علاوہ ازیں آئندہ قوتِ حیات کے منتشر نہ ہونے اور ارتقاء کے بلند مقام پر پہنچنے کی وجہ سے مرد مطمئن ہو کر عورت کی جنسی تسکین کے سامان مہیا کر سکے گا۔

بچے ہی بڑھ کر آدمی بنتا ہے۔ لڑکے کے ذہن پر کنٹرول گویا مرد کے ذہن پر کنٹرول ہو جاتا ہے۔ اولاد نہ صرف یہ کہ فرمانبردار ہو گی بلکہ ہر لڑکا خود ایک صحیح باپ بھی ثابت ہوگا۔

قوتِ حیات کے یہ تین پہلو جب منضبط اور صحیح حالت میں اعلیٰ حیاتیاتی سطح ذہنی سے منسلک ہو جائیں گے تو زندگی کے لئے ایک نعمت' ایک عظمت اور ایک برکت ثابت ہوں گے ان کا انتشار ہی دُنیا کی پراگندہ فضا کا باعث ہے اور اس انتشار ہی کی وجہ سے عمرانی صلاحیت ضائع ہوتی ہے اور یہ ضائع ہونا ایک دوسرے کے لئے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ لیکن قوتِ حیات سے متعلق ان حقیقی اور عملی مسائل کو وہی نظام حل کر سکتا ہے جو

قوتِ حیات کے سائنٹفک حیاتیاتی مدارج سے گزر کر ایک اعلیٰ ہیئت اور بلند ارتقائی صورت میں خود کو دُنیا کے سامنے ظاہر کرے کوئی مذہبی دستور یا فزکس یا کیمسٹری کی قوتوں سے تعلق رکھنے والا نظام ان مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا۔

قوتِ حیات کی برتر ہیئت اُسی وقت ایک صحیح نظام کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے جب قوتِ حیات ان بکھری ہوئی حالتوں کو غیر مرئی طور پر کنٹرول کرے۔ غیر محسوس طور پر دُنیا اور نوعِ انسان اسی عمل سے گزر رہی ہے۔

جب دُنیا میں ایک حیاتیاتی خود شعوری سطح ذہنی قائم ہو جائے گی اور ایک نئے نظام کی صورت میں ظاہر ہو گی تو چونکہ ہمارے تمام افعال احساسات کے اشارے پر صادر ہوتے ہیں۔ .... اعلیٰ نمونہ کے انسان میں وہ جذبات و احساسات ایک کڑی ہوتے ہیں اعلیٰ بہ ذہن کے سوچ وچار اور خیالات کو صحیح سلسلۂ حیات اور عالم پر محیط روحِ مطلق سے ملانے میں ملتی ہیں اس طرح نئے نظام کا خاکہ صحیح ترین فطری خاکہ ہو جاتا ہے جس میں غلط شعور کا دخل نہیں ہو گا۔ دوسرے یہ کہ روح کی تمام دبی ہوئی طاقتیں اُبھر آئیں گی۔ اصل اور مرکزی چیز ایک برتر اور اعلیٰ سطح ذہنی ہے۔ اسی سے تمام حیاتیاتی تبدیلیوں اور ذہن کی نئی ہیئت اور نئے نظام کے قیام کے مسائل کا تعلق ہے۔ یہی بنیادی اور مرکزی نکتہ ہے جو نئے نظام کے خاکہ کو سنبھالے ہوئے ہے اور یہی تمام حیاتیاتی اور ذہنی ترقی و تبدیلیوں کا سرچشمہ ہے اس لئے ہمارا نصب العین اسی سے وابستہ ہے۔

ہمارے افعال کی باگ قوتِ حیات کا ہیجان ہی سنبھالے ہوئے ہے۔ ادراک اسی قوت حیات کا ذہنی فعل ہے۔ تخیّل اور ادراک کے فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ تخیّل کے پس پُشت قوتِ حیات کا تموّج نہیں ہوتا بلکہ تخیّل دماغ کی پرواز ہوتا ہے اس لئے اگر انسان تخیّل میں وہ کچھ بننا چاہے جس کا اس کی قوّتِ حیات کا ہیجان ادراک کی صورت میں خود کو اہل نہیں پاتا تو اسے ناکامی ہو گی۔ انسان کی قوتِ حیات کا ہیجان اس کے تخیّل کا ساتھ نہیں دیگا۔ انسان خود کو اور اپنے تخیّل کو کھوکھلا محسوس کرے گا۔ انسان کا ہیجان ہی اسے بتاتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ یہ ہیجان انسان کی قوتِ حیات کے تموّج ہی کا پرتو ہے۔ اس لئے انسان کی جد وجہد اس کی قوتِ حیات کی منّت کش ہے۔ انسان کا خارجی ماحول انسان کی قوتِ حیات کے ہیجان کو چھوتا ہوا چلتا ہے۔ قوتِ حیات کا یہ ہیجان انسان پر چھایا ہوا ہے وہ اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ بیشک یہ ہیجان اب تک منتشر حالت میں ہے۔ اور غیر شعوری رو میں بہہ رہا ہے لیکن انسان کو اس سے مفر کہاں؟ انسان کے مزاج اور نفسی کیفیات کو یہی ہیجان تبدیل کرتا ہے۔ انسان اس کے اشارے پر ہر کام سر انجام دیتا ہے۔ قوّتِ حیات کے اس ہیجان کے اصول محکم ہیں۔ یہ انسان میں ایسے تناؤ اور لہریں پیدا کرتا ہے کہ انسان کی جدّ وجہد ان کی پابند ہو کر سفر کرتی ہے۔ لیکن تاحال یہ تمام عمل غیر شعوری، منتشر اور بے ترتیب حالت میں ہے۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان خاموش ہو جاتا ہے تو انسان کا خیال باوجود کوشش کے خود کو جد وجہد پر آمادہ نہیں کر سکتا اور جب انسان میں یہ ہیجان پوری قوت سے کروٹیں لیتا ہے وہ ایک شدید جد وجہد کے لئے مستعد ہو جاتا ہے۔ خارجی جد وجہد انسان کی قوتِ حیات کے ہیجان کے خلاف نہیں جا سکتی۔ اس لئے موجودہ خارجی جد وجہد قوّتِ حیات کے ہیجان کے نئے ارتقاء اور اعلیٰ مقام کے لئے فضا پیدا کر رہی ہے اور دُنیا کو اسی سمت میں لے جا رہی ہے۔ کیونکہ خارجی جد وجہد قوتِ حیات کے ہیجان کے ارتقاء سے الگ کسی اور شئے کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ پس اب خارجی جد وجہد بھی مکمل طور پر ہمیں ایک تبدیلی کے ساحل پر پہنچا دیگی کیونکہ قوتِ حیات کا ہیجان اب مکمل طور پر ایک نئی ہیئت حاصل کر رہا ہے اور قوت کے نئی ہیئت میں آ جانے سے ہماری خارجی جد وجہد کا نقشہ بھی قطعی تبدیل ہو جائے گا۔

حیاتیاتی اصولِ اصلح

آج کی صحبت میں یہ سوال اہم ترین سوال ہے کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو انسان کو .... زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے قابل بناتی ہے۔ بدقسمتی سے اس سوال کا جواب آج تک صحیح نہیں دیا گیا اور اس مسئلہ پر جس قدر روشنی ڈالی گئی وہ نہایت غلط طور پر ڈالی گئی۔ میری کوشش ہو گی کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ قوتِ حیات کا ہیجان اور نفسی جولانگاہ ہی وہ چیز ہے جو حیات کے قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں حصّہ لیتی ہے۔ قوتِ حیات کا ہیجان اور تموّج ہمارے ذہنی اور جسمانی قویٰ میں

ایک روح پھونک دیتا ہے۔ دماغ کو نئے نئے طریقے معلوم ہو جاتے ہیں۔ نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں۔ یہی قوتِ حیات کا تموّج نئے نئے ذرائع کی صورت میں ہمیں ماحول پر قابو پانے کی قوت عطا کرتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس فرد میں قوتِ حیات کا ہیجان دب جاتا ہے وہ فرد جامد و ساکت اور بے دست و پا ہو جاتا ہے وہ تخریبی قوتوں پر جوابی وار نہیں کر سکتا۔ نہ اسے نئی نئی راہیں سوجھ سکتی ہیں اور نہ اسے اپنے وجود میں قوت محسوس ہوتی ہے۔ ایسے فرد میں بڑھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ فرد کے زندہ اور باصلاحیت ہونے کا معیار یہ ہے کہ اسکی نفسی جولانگاہ نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کے لئے متحرّک رہے۔ زندہ فرد میں ہیجان اور تموّج شدّت کے ساتھ پایا جائیگا اس کے برخلاف مردہ فرد میں سکون اور موت کی سی خاموشی ہوگی وہ عاجز نگاہوں سے انتہائی درد کے ساتھ خود کو مٹتا اور کچلتا ہوا دیکھتا رہیگا۔ لیکن اس کے وجود میں قوتِ حیات کا ہیجان کوئی طاقت بنکر نمودار نہیں ہوگا۔ وہ اپنے دماغ۔ اعضاء اور قویٰ کو استعمال کرنے کی راہیں نہیں پائے گا۔ بلکہ وہ ایسا محسوس کریگا کہ اس کے پر کاٹ دئے گئے ہیں۔ اس کی قوت سلب کر لی گئی ہے۔ ......(ADAPTABILITY) مطابقت کا لفظ نہایت ہی مہلک تصوّر پیدا کرتا ہے۔ پنپنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی قوتِ حیات کے ہیجان کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ اسے دبایا نہ جائے بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ بڑھتی ہوئی قوتِ حیات کے تموّج کو صحیح طور پر آشکارا کرنا ہی زندگی کی کنجی ہے۔ ماحول نتیجۃً مٹتا چلا جائے گا۔ ایک اہم چیز غور کے قابل یہ بھی ہے کہ عبوری دور میں کوئی ماحول نہیں ہوتا جس سے تطابق کیا جائے۔ بلکہ ایک تخریبی کیفیت ہوتی ہے۔ تخریبی حالتوں میں سے وہی آگے بڑھتے ہیں اور وہی نیا ماحول بناتے ہیں جو قوتِ حیات کے ہیجان کی رو کو معطل نہیں ہونے دیتے۔ ماحول سے تطابق کا اصول نہایت ہی مبہم اور بیکار سا ہے صحیح چیز قوتِ حیات کے ہیجان کو کامل قوتِ اظہار بخشنا ہے قوتِ حیات کے تموّج کو نہ روکنا اور ادراک کے اشارے پر آگے بڑھنا ہی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔

ایک اور بھی غلط اصول ہے۔ اعضاء کے استعمال اور عدم استعمال کا۔ یعنی یہ کہ جس عضو کو استعمال نہیں کیا جائے گا وہ بیکار ہو جائے گا۔ اور جس کو استعمال کیا جائیگا وہ نشو و نما پائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ قوتِ محرّکہ کونسی ہے جو ایک عضو کے استعمال اور دوسرے کے عدم استعمال کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اگر غور و فکر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو قوتِ حیات کا تموّج ہی ایک ہی عضو کے استعمال پر اُکساتا ہے اور دوسرے کے استعمال میں تساہل برتنے والا میلان پیدا کرتا ہے۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان اعضاء میں تھپیڑے مارنے لگتا ہے تو اعضا اپنے اندر ایک جوش محسوس کرتے ہیں۔ جو انھیں اپنے استعمال کی طرف راغب کرتا ہے اور اعضا نشو و نما پاتے ہیں۔ لیکن ان کی نشو و نما اسی حد تک ہوگی جس حد تک قوتِ حیات کا تموّج انھیں نشو و نما دے سکتا ہے۔ قوتِ حیات کے تموّج کی پشت پناہی کے بغیر محض استعمال نشو و نما کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اور نہ اس کے بغیر استعمال کرنے کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر قوتِ حیات کے ہیجان کے بغیر استعمال جاری رکھنے کی کوشش بھی کی جائے۔ تو یہ ایک ٹہنی کو درخت سے توڑ کر الگ نشو و نما دینے کے مترادف ہوگا۔ جب قوتِ حیات کا ہیجان اعضاء میں جاری نہیں ہوتا تو اعضا استعمال کی قوت سلب ہوتی ہوئی محسوس کرتے ہیں اور بالآخر ساکن و سامت ہو جاتے ہیں۔ فرد میں اس تموّج کے خاموش ہو جانے پر اگر ذہن کو استعمال کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو یہ ایسا ہے جیسے پانی کے بغیر درخت کا پروان چڑھانا۔ وہ خود بخود سوکھ جائے گا۔

اس کے علاوہ ایک چیز اور ہے جسے طبعی انتخاب (NATURAL SELECTION) کہا جاتا ہے طبعی انتخاب بھی دراصل قوتِ حیات کے ہیجان یا تموّج کے سلسلہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے لیکن اصلیت سے واقف نہ ہونے کی بنا پر اسے بھی ایک حد رجی اصول بنا کر پیش کیا گیا۔ ہوتا یہ ہے کہ جس نوع میں قوتِ حیات کا تموّج قوی اور شدید نہیں ہوتا وہ نوع خود کو قدرت کی خارجی طاقتوں سے بچانے کے طریقے اخذ نہیں کر سکتی اور ان کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی نفسی جولانگاہ ماحول کو نت نئے طریقوں اور قوتوں سے بھر دیتی ہے۔ جیسے سائنس کی ایجادیں۔ مشین۔ ذرائع آمد و رفت اور جدوجہد کے مختلف نفسی اور ذہنی طریقے۔ تو پھر وہ نوع جو ایسی نفسی جولانگاہ سے محروم ہوتی ہے کہ ایسے ہی طریقے خود بھی معلوم کر سکے۔ یا ان سے آگے بڑھ سکے وہ ان کا شکار بننا شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے

آجکل کی دُنیا آلاتِ جنگ کا شکار ہو رہی ہے۔ کیونکہ وہ ان کے علاوہ آگے ترقی کرنے اور ماحول پر قابو کرنے کے طریقوں سے نابلد ہے۔

آپس میں نوع کا مقابلہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص کا ذہن بندوق ایجاد کرتا ہے لیکن دوسرے کا ذہن اتنا اہل نہیں ہے اس کے پاس محض تلوار اور بھالہ ہی ہے تو قدرتی طور پر وہ بندوق والے کے مقابلہ میں دب جائے گا۔ مشرق مغرب سے اسی طرح ارتقاء میں پیچھے رہ گیا تھا . . . . بھی کام کرتا ہے لیکن طبعی انتخاب بھی قوتِ حیات کی صلاحیت اور اہلیت سے الگ کوئی قطعاً خارجی اصول نہیں ہے۔ آج نفسی جولانگاہ اور قوتِ حیات کا تموج ہمارے ذہن اور اعضا کو زیادہ اہل اور قوی بنا رہے ہیں۔ اور ان کی نشو و ارتقا نفسی جولانگاہ اور قوتِ حیات کے تموّج کی ہی مرہونِ منت ہے۔

حیاتیات اور موجودہ بحران کے اسباب

حیاتیات موجودہ بحران کے متعلق جو نقطۂ نظر قائم کرتے ہیں وہ زیادہ گہرا اور عملی حقائق سے نزدیک ہے۔ حیاتیات کے نزدیک یہ بحران اس لئے نہیں برپا ہے کہ انسان خدا سے دور ہو گیا ہے یا سرمایہ کی تقسیم غلط ہونے کی وجہ سے شدید حالتوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے بلکہ حیاتیاتی قوتیں ترتیب و تشکیل کے دور سے گزر رہی ہیں اور ایک نیا انسان ابھر رہا ہے۔ سرمایہ داری کی وجہ سے یہ بحران پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ خود اس بحران کا نتیجہ سرمایہ داری ہے۔ اصل میں بحران تعمیری اور مثبت قوتوں کے فقدان کا نام ہے۔ بحران کو دُور کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ اس تخریبی فضا اور ان ہی طریقوں کی بنا پر ایک معتدل حالت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ نئی حیاتیاتی قوتوں کو معلوم کیا جائے جو اس انتشار میں انضباط پیدا کر دیں۔ ہماری ترقی نے ایک مشینی ماحول قائم کیا۔ اسی مشینی ماحول نے بہت سے لوگوں کو بیکار کر دیا۔ یہ چیز نئی مصروفیتوں اور نئے مقاصد کی مقتضی بنکر سامنے آئی ہے۔ غلط تقسیم کے نتیجہ کے طور پر سامنے نہیں آئی زندگی کی ترقی کا اصول یہی ہے کہ اس خلا کو نئی قوتوں کے ذریعہ پُر کیا جائے نہ کہ اسے پیوند کرنے کی کوشش کی جائے یعنی بحران میں ہی تعمیری فضا پیدا کرنے کی سعی کو مقصد بنا لیا جائے۔

اصل میں سرمایہ داری اُن ذہنی قوتوں کے فقدان کی وجہ سے ہے جو نئے صنعتی نظام اور میکانی طریقوں پر قابو پا کر ایک موجودہ نظام سے بھی بلند سماجی نظام قائم کریں۔ اس طرح نوعِ انسان حیوانیت کے دور سے انسانیت کے دور میں ایک ارتقائی قدم بڑھا سکتی ہے۔ اور صحیح حیاتیاتی خاکوں کے ماتحت یہ بحرانی حالت جو چاروں طرف محیط ہے زیادہ مطمئن طور پر حل ہو جائے گی۔

ایک وقت تھا کہ ارتقائی قوتوں نے دُنیا میں نیا ماحول پیدا کیا۔ آج وہی ماحول صلاحیت و اصلح کے اصول پر نوعِ انسان پر حملہ کرنے لگا۔ اور نئی قوتوں اور نئے طریقوں کا اقتضا پیدا ہوا۔ آج آلاتِ حرب نوعِ انسان کو فنا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب نوعِ انسان اسی صورت میں خود کو زندہ رکھ سکتی ہے کہ ایسے طریقے معلوم ہوں اور ایسا نظام قائم ہو جو موجودہ ماحول اور آلاتِ حرب پر قابو پا سکے۔ یہ انتظام وہی نظام کر سکتا ہے جسے افعالِ انسانی پر پوری طرح قابو ہو اور انسان کا ارادہ و شعور اس کی گرفت سے گریز نہ کر سکیں۔ اس کے لئے نئی ہیئت ذہنی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نوعِ انسان اور معاشرہ کی زندگی تباہی اور عذاب کے جنگل سے نجات نہیں پا سکتی۔ موجودہ سوشلزم کا نظریہ اس بلند ارتقاء کا حامل نہیں ہے۔ موجودہ سوشلزم کا فلسفہ حیاتیات سے عدم واقفیت

17 پر مبنی ہے۔ بغیر تخلیقی قوتوں، صلاحیتوں کے اضافہ کے سرمایہ کی تقسیم بدلنے کی کوشش کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو کسی بلند ارتقائی نظام یا ذہنی سطح کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف سرمایہ کی تقسیم بدلنے سے ہی مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ اس طرح انسانیت کی توجہ ان نئی قوتوں۔ انکشافات اور راہوں سے ہٹ جاتی ہے جو اس کی سرزمین ذہن میں دبی ہوئی ہیں۔ سرمایہ کی تقسیم کو مقصد بنا نا خود کو اس تخلیقی ذریعہ سے غافل رکھنا ہے جو انسانی سماج کو صحیح بنیاد عطا کرنا یعنی خود شعوری ارتقار کا حصول۔ اور اس طرح نوعِ انسان کی زندگی کا معیار اس معیار سے کہیں زیادہ بلند ہو سکتا ہے جس کا سوشلزم وعدہ کرتا ہے کیونکہ خود شعوری ارتقار کے دور میں ہمارا ذہن آزادانہ ترقی کرے گا۔ آج کی طرح غلط تصوّرات اور مقاصد کا غلام نہ ہو گا بہت سے نقصانات مع جنگ کے دُنیا سے مٹ جائیں گے۔ اس بلند ارتقائی منزل کے بغیر اگر ہم مصنوعی تناسب یا خوشحالی پیدا کرنا چاہیں تو زندگی اتنی خوش آیند نہیں ہو سکے گی جتنی شعوری ارتقار کے دور میں ہو سکتی ہے۔ لہذا اوّلیں مسئلہ انقلاب کے حیاتیاتی عمل کی تکمیل اور شعوری ارتقا کا حصول ہے۔ موجودہ حالت میں سوشلزم قائم کرنا دُنیا کو عبوری حالت میں روک دینے کے مترادف

ہے۔ اور ہونے والا انقلاب کبھی روکا نہیں جا سکتا۔ میں پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ سرمایہ داری اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ عبوری مسئلہ ہے جو صحیح حیاتیاتی نظام قائم ہونے پر باقی نہیں رہیگا۔ غلط تقسیم تباہی اور جمود اور نوع انسان کے مصائب کی ذمہ دار نہیں بلکہ جمود کے قائم رہنے اور بلند ارتقا کے حاصل نہ ہو سکنے کا نتیجہ سرمایہ داری ہے۔ انسان کو ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو ذہن کے جدید شعور وارتقا پر مبنی ہو۔

آج مشین ایک قوت ہے۔ مزدور کو اس سے بڑھ کر ایسی تخلیقی اور انکشافاتی قوتیں پیدا کرنی چاہئیں جن کی وجہ سے وہ اپنے وجود کو معاشرہ کے لئے زیادہ سودمند ثابت کر سکے۔ اگر وہ زندگی میں ارتقائی قدم اٹھائے بغیر ماحول سے چمٹنا چاہے گا تو وہ سماج پر ایک مردہ بوجھ ہوگا اور یہ عمل ارتقا کے سراسر خلاف ہوگا۔ آج ماحول میں صحیح نظم پیدا کرتے اور زندگی کو خوش حال بنانے کے لئے نئی حیاتیاتی قوتوں کی ضرورت ہے جن سے کام لیکر رجعت پسند رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے۔ ہمارا ذہن اتنا بلند نہیں ہے جتنا ماحول کا تقاضا ہے۔ اور ہمیں اس خامی کو دور کرنا ہے

آج ماحول کے تقاضوں اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے انسان میں نئے حواس اور نئی ذہنی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔

موجودہ بحران ایسے بلند حیاتیاتی اور شوشل طریقوں اور ذہنی ترقیوں کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہے جو اس میکانی ماحول کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ حیاتیاتی عمل ہمیں اس طرف کھینچ رہا ہے ہمارا کام ایک بلند فطری اور طبعی نظام حاصل کرنا ہے جس میں سرمایہ داری اور دیگر مسائل کا حل زیادہ مطمئن کن اور حیاتیاتی سائنٹفک حقائق کی بنا پر موجود ہو۔ موجودہ تخریبی قوتوں کو ہی تعمیری نہیں بنایا جا سکتا بلکہ ان سے بلند تعمیری قوتوں کی ضرورت ہے۔

تعمیر

انسان کا عمل اور حرکت تحت الشعوری ذہن پر منحصر ہے
آج ہماری زندگی میں تحت الشعور ترقی کرتے کرتے بہت بلند درجہ پر کارفرما ہے لیکن ہم نہ پہنچے اور کام ہمارے وقت پرانے اور انتہائی کم درجہ کے شعور سے کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا شعور ہمارے عمل اور موجودہ ماحول پر قابو پانے سے عاجز رہتا ہے کیونکہ تحت الشعور بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ ہمارا عمل تحت الشعور کا نتیجہ ہے تحت الشعور کے آگے بڑھنے کی وجہ سے ہماری عملی قوتیں بہت آگے بڑھ چکی ہیں جو موجودہ تعمیر کو گرا رہی ہیں۔ ہمارا تحت الشعور اتنے بلند درجہ پر کام کر رہا ہے کہ پہلا شعور نہ اس پر قابو پا سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے کیونکہ شعور کی جدوجہد خیال پر مبنی ہوتی ہے اور عمل اور تعمیر تحت الشعوری احساسات پر۔ اکثر معلّم آئندہ زمانہ اور دنیا کا اندازہ لگاتے وقت پرانے شعور کے خیال سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے دنیا کو ان پر یہ اعتراض کرنے کا موقعہ ملتا ہے کہ یہ تعمیر سب خیالی ہے اور ابھی عمل کی دنیا سے دور ہے لیکن ان اوراق میں بیان کردہ مسائل کی بنیاد تحت الشعور پر قائم ہے اور تحت الشعوری احساسات کے عمل کا اندازہ پرانا شعور اپنے درجہ کے مطابق کرتا ہے۔ اس لئے مسئلہ الٹ کر یہ ہو جاتا ہے کہ اعتراض کرنے والوں کی بنیاد خیال پر اور ان مسائل کی بنیاد بلند اور حقیقی تحت الشعوری عمل پر ہے جس کا اندازہ پرانے شعور کی رکاوٹوں کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے

آج تحت الشعوری ارتقا کا خاکہ تبدیلی کی طرف مائل ہے۔ اور کل تحت الشعور شعور کا درجہ حاصل کرنے والا ہے پہلے ہمارا شعور تحت الشعور کا صرف نامکمل جزو تھا۔ اب شعور اور تحت الشعور دونوں ایک سطح پر آنے والے ہیں۔ اس طرح ارتقا کا مرکز قائم ہو جائیگا اور آنے والا ارتقا شعوری ارتقا ہوگا۔ یعنی آجتک کا ارتقا غیر شعوری تھا۔ آئندہ ہماری زندگی کو عبوری دور اور جمود سے واسطہ نہیں پڑیگا انسانی ترقی ایک ”لامتناہی اور حقیقی صبح“ کی گود میں بیدار ہو گی۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ تمام سائنس کا تعلق تحت الشعور سے ہے اور تمام سائنس کے انکشافات تحت الشعور سے کروٹیں لیکر اٹھتے ہیں۔ جن کو ماحول اور حواس کے ذریعہ پرکھنے سے درست پایا جاتا ہے۔ حواس اور تجربات کا کام پرکھنا اور تصدیق کرنا ہے۔ تمام اصول اور نظریات تحت الشعور کے منت کش ہیں۔

اسی طرح تمام کلچرل ترقی تحت الشعور سے ہی ہوتی ہے۔ روحانی اقتدار (روحانی سے مراد کلیسائی یا مذہبی اقتدار نہیں ہے) کا تعلق بھی تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر سے ہے۔ اس کے علاوہ اس بات میں ذرہ بھر شک نہیں ہے کہ اصل میں عملی قوت اور طاقت بھی تحت الشعور کے علاوہ کہیں اور نہیں۔

جب انسانیت ایک ایسے مقام پر آجائے گی جہاں دماغ کا تحت الشعوری حصہ ارتقا کے ذریعہ شعور کا درجہ حاصل کریگا اس

وقت تحت الشعور کے تمام پوشیدہ خزانے۔ بہترین کلچر۔ صحیح اور مکمل سائنس۔ صحیح روحانی اقدار۔ انسانیت کی آغوش میں آکر نوعِ انسان کو مالامال کر دیں گی۔ اور خیالی نہیں بلکہ تمام عملی قوتیں انسان کے ساتھ ہوں گی۔ اس طرح انسان کی امیری عملی پشت پناہی سے وابستہ ہوگی۔ یہ ایک واضح حقیقت ہوگی۔ کوئی خواب اور خیال کی دُنیا نہیں۔

انسان فطری طور پر انتہائی سائنٹفک۔ انتہائی مقدّس انتہائی افادہ طلب۔ اور انتہائی عملی ہے۔

جب تحت الشعور اور شعور ایک سطح پر آجائیں گے تو انسانیت کے حیوانی دور کے بجائے صحیح انسانی دور شروع ہو جائے گا۔ انسان کی فطرت جذبات و احساسات کی پیچیدگیوں اور نظام سے بنی ہے۔ نئے دور میں اس نفسی و جسمانی نظام میں ایک مکمل تبدیلی رُونما ہوگی۔ انسان کی کیفیت ہی دوسری ہو جائے گی۔ تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر کے ارتقا کی وجہ سے دماغی قوت میں اضافہ ہوگا اور چونکہ دماغ کے ساتھ تمام رگوں کا بھی تعلق ہے اس لئے انسان کی صحت بھی موجودہ صحت سے بہتر ہو جائے گی۔ انسانی اعضائے تناسل کا تعلق بھی دماغ سے ہے اس لئے دماغی ترقی اور نفسی ترقی کی وجہ سے انسان کی جنسی طاقتوں میں بھی ترقی ہوگی۔ نسلِ انسانی کو بہترین حظ حاصل ہوگا۔ مرد اور عورت کے تعلقات زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے۔ عورتوں کی اوباشی دُنیا سے مٹ جائے گی۔ انسان کا عمل تحت الشعوری ارتقار کے ماتحت ہونے کی وجہ سے شعوری گرفت سے آزاد رہا ہے اور نامکمل شعور اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنا چاہتا ہے۔ تحت الشعوری طاقت دوسری نوعیت سے کار فرما ہوتی ہے۔ اس لئے قدرت انسان کو ہمیشہ اپنے خلاف چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عبوری دور میں تو مکمل طور پر قدرت انسان کو اپنے خلاف ہی نظر آتی ہے۔ لیکن تحت الشعور کے تمام حصّوں کے شعور میں آجانے کی وجہ سے انسان کا خیال اندھیرے میں نہیں رہیگا وہ اپنے عمل کو سمجھ سکے گا۔ اس طرح تمام چیزیں اور واقعات حتیٰ کہ ہوا تک بھی انسان کے موافق چلے گی۔ کیونکہ انسانی مشینری کائنات اور دُنیا میں اس طرح فٹ ہے کہ قوانین کے مطابق صحیح نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ انسان کی زندگی سے اَسرار بالکل مٹ جائیں گے کیونکہ اسرار شعور کے اندھیرے میں رہنے اور عدمِ تکمیل کا نتیجہ ہیں۔ تحت الشعور اور شعور کے ایک سطح پر آجانے کے بعد اسرار کا وجود ختم ہو ہی جانا چاہیئے۔

غرض انسانی زندگی [illegible] ندترین۔ نعمتوں سے لبریز۔ انسانیت پر مبنی۔ اور جہل قوتوں سے محفوظ۔ عبوری دور اور خطرات سے پاک زیادہ صحت مند اور عورت مرد کے تعلقات کے لحاظ سے زیادہ پائیدار ہوگی۔

خدا کا تعلق تحت الشعور کے لطیف ترین عنصر سے ہے جس میں ارتقا ہوتا رہتا ہے اور جس کے ماتحت عمل بھی ہوتا ہے اس لطیف ترین تحت الشعوری عنصر کا شعور خدا کا عرفان ہے اس طرح خدا ایک اعتقاد نہیں بلکہ ایک ادراک۔ ایک قوّت اور ایک عملی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مشرق کا خدا تخیلی، ماورا اور بیکار ہے۔ لیکن آئندہ دُنیا میں انسان خدا کی تمیز کا شرف حاصل کر سکے گا۔

19 ”اہنسا“ کا فلسفہ ایک بیل اور مضحکہ انگیز چیز ہے جو عملی حیوانی قوتوں پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ حیوانی قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ لیکن آئندہ دُنیا میں تحت الشعور کی عملی قوّت جنگ کو ختم کر دے گی کیونکہ حیوانی ارتقار اور عبوری دور ختم ہو چکے ہوں گے اور انسانی ارتقا خود شعوری حیثیت اختیار کر لیگا۔

احساسات ہی ہمیں پرورش دیتے اور متحدّ رکھتے ہیں۔ مگر خود ترقی کر جاتے ہیں اور ماحول کو سلونیاتی و جامد چھوڑ جاتے ہیں اس کے بعد ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان ماحولات کو ہمارے احساسات۔ جذبات اور خواہشات کا کوئی پاس ہی نہیں ہے یہی حال ہمارے آج کے احساسات وجذبات کا ہے جو اس جامد وسکونیاتی نظام میں اپنے لئے کوئی جگہ نہیں پاتے یعنی ایک بلند نظام ہی میں ہماری آرزوؤں اور ماحول کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ اس طرح انسانی سوسائٹی پنپ سکتی ہے اور شیرازہ بند ہو سکتی ہے۔

اکرام قمر۔ ایم اے

روسو کا نظریۂ مشیتِ عامہ

یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت اور کلیسا کا نزاع اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ سلطنت کے حامی بادشاہ کو اور کلیسا کے موید اسقف اعظم کو کلی اختیارات تفویض کر رہے تھے، اور ہر ایک دوسرے پر فوقیت دے رہے تھے۔

اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی تحریک نے دین اور دنیا کو الگ الگ کر دیا۔ ریاست اور مذہب دو علیحدہ علیحدہ ادارے قرار دیے گئے۔ اب ملوکیت پرستوں نے ایک اور طرح ڈالی۔ اور بادشاہ کو خدا کا خلیفہ قرار دے کر اس کی اطاعت لازمی کر دی، ریاست کو خدا کی بنائی ہوئی کہا اور بادشاہ کو خدا کا نمائندہ ٹھیرایا۔ لیکن تمام ملوکیت پسند اشخاص بادشاہ کے نائب خدا ہونے کے نظریہ کو مکمل طور پر اپنا نہ سکے۔ ان میں طامس ۲
ہوبز (۱۵۸۸ء – ۱۶۷۹ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس وہ ریاست کی حاکمیت کا زبردست حامی، قانون موضوعہ کی قطعیت کا زبردست موید، اور رعایا کے حق بغاوت کا زبردست مخالف تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "عفریت" (لیوائتھن) میں سیاسی حاکمیت کے نظریہ پر زور دیا ہے۔ اس کے نزدیک ریاست کی بنیاد ایک ناقابل تنسیخ معاہدۂ عمرانی پر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ دور جاہلیت کے انسان اکٹھے ہو کر ایک ریاست بناتے ہیں۔ اس ریاست اور ریاست کے فرمانروا کی اطاعت لازمی اور غیر مشروط ہے اور فرمانروا کلی اختیارات کا مالک ہے۔ جان لوک (۱۶۳۲ء – ۱۷۰۴ء) نے اس کے نظریات میں چند ترمیم پیش کر کے انھیں عملی سیاست کے موافق بنانے کی کوشش کی۔

جان لوک ۱۶۸۸ء کے انقلاب انگلستان کا موید تھا۔ اس نے مشروط بادشاہت کا نظریہ پیش کیا۔ موخر الذکر نے ہوبز کے نظریہ میں اعتدال پیدا کیا اور حاکمیت کی سختیوں کو کم کیا۔ اس کا خیال ہے کہ ریاست کی حقیقی بنیاد دور جاہلیت کے افراد کے درمیان معاہدۂ عمرانی پر ہے اور اس معاہدہ کے بعد ایک قابل تنسیخ حکومتی معاہدہ ہوا ہے جس میں ایک فریق تو تمام قوم کی ہیئتِ اجتماعی ہے اور دوسرا فریق وہ فرمانروا ہے جسے قوم اپنا سردار چنتی ہے۔ لوک کہتا ہے کہ قوم اپنے تمام قدرتی حقوق اپنی بنا کردہ حکومت کے سپرد نہیں کرتی بلکہ صرف وہ حقوق اس کے سپرد کرتی ہے جو قومی وجود کے لئے لازمی ہیں اور ریاست کا مقصد وحید فرد کے بقیہ قدرتی حقوق بالخصوص زندگی، آزادی اور ملکیت کے قدرتی حقوق کا تحفظ ہے۔

لوک کی تعلیمات کے زیر اثر روسو (۱۷۱۲ء – ۱۷۷۸ء) معاشری و سیاسی انقلاب کے خواب دیکھنے لگا۔ اس نے شخصی آزادی کا جذبہ لوک سے بھی زیادہ ظاہر کیا۔ ریاستی حاکمیت اور آزادئ رعایا کو کس طرح اکٹھا کیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جسے حل کرنے کی روسو نے کوشش کی ہے۔ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یہ تصور کرتا ہے کہ دور جاہلیت کی آزادی کے مالک انسان رضاکارانہ طور پر ایک معاہدہ کرتے ہیں جس سے خود بخود ایک قوم وجود میں آ جاتی ہے جس میں فرد جو قوم کا ایک جزو ہے قوم کے بالکل مترادف ہے اور فرد کی شخصی رائے اور قوم کی مشیتِ عامہ (GENERAL WILL.) میں کوئی اختلاف و تضاد نہیں۔

روسو کے مشیت عامہ کے نظریہ کو علم سیاست میں ایک اہم جگہ حاصل ہے۔ سادہ الفاظ میں مشیت عامہ کا مطلب قوم کی رائے ہے بشرطیکہ اس میں سب کا فائدہ ہو۔ اس نظریہ کا مدعا و منشا حاکمیت کا جواز، اور ریاست اور شخصی آزادی کے درمیان ربط پیدا کرنا ہے۔

روسو کہتا ہے کہ ہر کوئی مشیت عامہ کی اطاعت کلی کر کے اپنی ہی رائے کی اطاعت کرتا ہے اور ظلم و استبداد سے اپنے آپ کو بچاتا ہے کیونکہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ سماجی شرائط کڑی ہوں اور مشیت عامہ کے ذریعہ انسان ہیئت اجتماعی کی اطاعت کرتا ہے، کسی فرد کی نہیں۔ جو حقوق وہ دوسرے کو دیتا ہے وہی وہ دوسرے سے حاصل بھی کر لیتا ہے۔ اس طرح کوئی شخص گھاٹے میں نہیں رہتا۔ جو کچھ وہ دیتا ہے وہ اسے مل بھی جاتا ہے، جو کچھ وہ کھوتا ہے، وہ پا لیتا ہے۔ اور اپنی ملکیتوں کے

بقا کے لئے اُسے زیادہ قوت حاصل ہو جاتی ہے۔

چونکہ سماج کی ہیئت حاکمہ کی تشکیل میں ہر فرد کی رائے کو دخل حاصل ہے اس لئے سماج کے فیصلوں کی مخالفت فرد کی طرف سے خود اپنی مخالفت ہے۔ لیکن آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہو۔ مگر مشیّت عامّہ کے نظریہ کی رو سے باغی خود اپنے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ روسو کا خیال ہے کہ ایسے مواقع پر آزادی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فرد اپنی اس رائے کی متابعت کرے جس میں مفاد عامّہ مضمر ہو۔ سماج کے قیام کا مقصد فرد کی بہبود ہے اور فرد نے سماج کے قیام میں حصہ لیا ہے اس لئے جب فرد اپنی اس رائے کی پیروی کرتا ہے جو سماجی احکام میں شامل ہے تو درحقیقت وہ کسی کی تابعداری نہیں کرتا، بلکہ آزاد ہوتا ہے۔ روسو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اگر ایک شخص سماج کی مشیّت عامّہ کی تعمیل سے انکار کر دے تو اسے اس تعمیل پر مجبور کر دینا چاہئے۔ بالفاظ دیگر اسے جبراً آزادی دیجائے۔

روسو مشیّتِ عامہ کے متعلق مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے:۔

"اوّل۔ چونکہ مشیّتِ عامہ مشترکہ مفاد کے لئے ہوتی ہے۔ اور اس کا تعلق کسی گروہ یا طبقہ کے مفاد سے نہیں ہوتا، اس لئے یہ ہمیشہ راستی پر اور ہمیشہ غیر جانبدار ہوا کرتی ہے۔ اس کا مآخذ سماج کے تمام افراد ہیں، اور یہ سب پر عائد ہوتی ہے۔ مشیّت جتنی عام ہوگی اتنی ہی منصفانہ ہوگی۔ درحقیقت آوازِ خلق نقارۂ خدا ہوا کرتی ہے۔

دوم۔ ہر مسئلہ کا ایک پہلو بہبود عامّہ سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور کسی گروہ یا فرد کے مفاد سے وابستہ نہیں ہوتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی شخص مشیّت عامّہ کی اطاعت نہ کرے لیکن یہ امر مشیّتِ عامہ کے عدم وجود پر دلالت نہیں کرتا۔ چنانچہ مشیت عامہ ہمیشہ مستقل، ناقابل تغیّر اور خالص ہوتی ہے۔

سوم۔ مشیّتِ عامّہ اور تمام کی رائے کی میں نمایاں امتیاز ہے۔ خواہ تمام متفق ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کی رائے خود غرضی اور ذاتی مقاصد پر مبنی ہوتی ہے، لیکن مشیّت عامہ کی بُنیاد مُشترکہ مفاد پر ہوتی ہے۔

چہارم۔ مشیّت عامّہ کا اظہار سماج کی رائے کی صورت میں ہوتا ہے۔ روسو کہتا ہے کہ ریاست ایک اخلاقی وجود اور ایک ایسی مشیّت رکھتی ہے جو ہمیشہ ہر جزو و کل کے مفاد و بقا پر مبنی ہوتی ہے اسی مشیت پر قانون کی بُنیاد ہے اور یہی مشیت حق و انصاف کا معیار ہے"

روسو کے ان خیالات کے سرسری مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس کے نزدیک فرد اور ریاست علیحدہ علیحدہ شخصیتیں ہیں، قوم کا اپنا ضمیر ہوتا ہے، اور قوم مشیت عامہ کی حامل ہے سیاسی ادارہ قوانین کے ذریعہ مشیّت عامّہ کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ چنانچہ قوانین آزادی عطا کرتے ہیں، کیونکہ یہ سب پر برابر عاید ہوتے ہیں اور مشترکہ مفاد کے لئے سب کی رضامندی پر استوار کئے جاتے ہیں۔

روسو یہ سوال کرتا ہے کہ اگر انسانی فطرت کی خودسری کے ماتحت فرد اپنی مخصوص رائے کا اظہار کرتا ہے جو مشیت عامہ سے برعکس یا مختلف ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ روسو کہتا ہے کہ اسے جبراً منایا جائے گا۔ مگر اس صورت میں فرد کی قدیم و غیر منفک آزادی کا کیا بنے گا؟ روسو لکھتا ہے کہ اس طرح آزادی میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ روسو کا خیال ہے کہ بعض اوقات فرد صداقت کو نہیں جان سکتا اس لئے قومی مفاد کا یہ تقاضا ہے کہ اسے کسی خاص فعل کے لئے مجبور کیا جائے۔ چونکہ اس قسم کے افعال مشیت عامہ پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے یہ لازمی ہے کہ اگر فرد کو حقیقت کا علم ہو تو وہ انہیں افعال کو از خود سرانجام دے۔ روسو کہتا ہے کہ انسان کی خودسری صرف یہ

ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی حقیقی رائے سے ناآشنا ہے۔ جبر اس کی حقیقی رائے کے مترادف ہے، قوم اس پر صرف اس لئے جبر کرتی ہے تاکہ اسے آزاد ہونے پر مجبور کر دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کو آزاد ہونے پر مجبور کرنا اسے اطاعت گزاری پر مجبور کرنا ہے اس طرح سے روسو کا مندرجۂ بالا سوال لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔

جب ہم روسو کے نظریۂ مشیت عامہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ چیز کھٹکتی ہے کہ یہ نظریہ روسو کے فلسفۂ خود غرضی سے ہم آہنگ نہیں۔ وہ انسان کو خودرائے اور خودغرض قرار دیتا ہے۔ اس لئے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہی انسان اپنی خودغرضی کو کس طرح بالائے طاق رکھ کر مشترکہ مفاد کے لئے رضامند ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ مشیّت عامّہ کا نظریہ خود روسو کے فلسفہ سے ٹکراتا ہے۔

مشیّت عامّہ کی سختی سے پابندی حکومتوں کے خلاف اکثر بغاوتوں پر منتج ہوگی۔ روسو ہمیں یہ غیر مبہم طور پر بتاتا ہے کہ اکثر حکومتوں کی بنیاد مشیّت عامّہ پر نہیں بلکہ مخصوص مفادات پر ہے، لیکن فرد پر مشیّت عامہ کی اطاعت فرض ہے۔ اس لئے اسے اکثر علم بغاوت

بلند کرنا ہوگا۔ اس طرح اس امن و نظم کی جڑیں کھوکھلی ہوجائیں گی جو سیاسی ادارہ کے قیام کا مقصد تھے۔

مشیّت عامہ کی تحقیق و دریافت نہیں ہوسکتی۔ یہ جاننا محال ہے کہ کون مشیّت عامہ کا ترجمان ہے اور کون سی چیز مشیت عامہ کے مطابق ہے۔ متفقہ فیصلہ کسی فیصلہ کی اچھائی کا ثبوت نہیں۔ روسو کہتا ہے کہ اگر انسان یہ جان جائے کہ اس کا ہر فیصلہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے تو ہر انسان مشترکہ بہبود کیلئے سوچنا شروع کردے گا۔ ہر فرد یہ کہے گا کہ "میرے نزدیک فلاں فعل مشترکہ فلاح پر منتج ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ دوسروں کی بھی یہی رائے ہے"۔

لیکن روسو کے اس سوال کے خلاف دو اعتراض ہیں:۔

(الف) اگر کوئی شخص کسی فعل کا قائل نہ ہو اور وہ اپنی رائے کا اظہار کرے، تو اس اظہار رائے کے لئے روسو کا نظریہ کوئی تحفظ پیش نہیں کرتا۔

(ب) تمام انسان شاذونادر ہی ایک سا سوچتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دو مختلف اشخاص کی رائیں آپس میں بالکل متضاد ہوں۔ ان حالات میں کوئی خدا کا فرستادہ قانون ساز ہی مشیّتِ عامہ کا ترجمان ہوسکتا ہے لیکن خدا کے اس فرستادہ کی بعثت کی کوئی اُمید نہیں۔ مجلس عامہ ہی مشیت عامہ کو ظاہر کرسکتی ہے۔ اس طرح روسو کا سرتیفک نظریہ جمہوریت محض ہو کر رہ جاتا ہے لیکن اب یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ اقلیت کیوں اکثریت کے فیصلوں کی پابندی کرے۔ روسو اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ اکثریت کو مشیت عامہ کی مظہر نہیں سمجھا جاسکتا۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اقلیت کی رائے مشترکہ بہبود کی حامل ہو۔ گویا کہ مشیت عامہ کی تلاش، بالکل بے سود ثابت ہوتی ہے۔ حکومت کے پاس کوئی ایسا واضح ادارہ نہیں جو مشیّتِ عامہ کو بیان کرے۔

اندریں حالات یہ امر ازحد حیران کن ہے کہ اس قسم کا اضداد سے لبریز نظریہ سیاسی فلسفہ میں اس قدر اہمیّت اختیار کرگیا ہے اور اس کا علمبردار روسو ایسا مفکر اعظم ہے۔ روسو اس نظریہ کی حمایت میں جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی اپنی مخصوص نفسیاتی حالت کا نتیجہ ہے اسے اپنے گناہوں کا احساس تھا اور وہ ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اخلاقی نجات کے لئے اس نے جو ذریعہ سوچا وہ نہ مذہب تھا اور نہ کلیسا۔ بلکہ اس نے سماج کی دنیوی طاقت کو نجات کا ذریعہ سمجھا: لوگوں میں مدنیت کا جذبہ موجود ہے جس کا نتیجہ عقلیت ہے۔ عقلیت مشترکہ بہبود اور متحدہ انسانوں کا مطالبہ و تقاضا کرتی ہے۔ مشیت عامہ ذریعہ اتحاد بھی ہے اور سماج کی اخلاقی ہیئت حاکمہ بھی جو سماج کے ارکان کی اخلاقی نجات کی اہلیت رکھتی ہے کیونکہ سماج کی مشیت فرد کی بھی رضا ہے۔ اور فرد سماج کی اطاعت سے اپنی ہی اخلاقی مشیت کی پیروی کرتا ہے۔ اور نجات حاصل کرلیتا ہے۔

اس نظریہ میں بعض بنیادی سچائیاں بھی موجود ہیں، اور یہ انسان، سماج اور ہیئت حاکمہ کے متعلق بعض صحیح خیالات پیش کرتا ہے۔

یہ نظریہ ہیئت حاکمہ اور قانون کی اطاعت کا جواز پیش کرتا ہے۔ ریاست قانون کے ذریعہ لوگوں کی رائے کو پیش کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر قانون "معقول مدنی الطبع قلب" (SOCIAL MIND RATIONAL) .... کا اظہار ہے۔ اس طرح یہ نظریہ قانون کی اطاعت کی ضرورت و جواز بتاتا ہے۔ قانون کے سامنے ہر شخص کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ فرد کو کسی قسم کی طبقاتی یا شخصی مراعات عطا نہیں کی جاتیں۔ ہر شخص قانون کی ایک سی اطاعت کرے گا۔ درحقیقت روسو کے جنون مساوات نے اس کے جنون آزادی کو تحریک دی ہے۔

یہ بالکل بجا ہے کہ ہر مسئلہ کا ایک پہلو راستی پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے اس پہلو کو سمجھنے اور عملی جامہ پہنانے کی کوشش لازمی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مجلس عامہ میں طبقاتی مفادات آپس میں ٹکرا کر مشیت عامہ کے لئے راستہ صاف کردینگے۔

روسو سے پہلے قوم کے ایجابی عمل کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ قوم کو آہستہ آہستہ اور غیر مرئی ترقی کرنے والی سمجھا جاتا تھا۔ قانون صرف قانون قدرت تھا۔ جو حالات کے مطابق ڈھال لیا جاتا تھا لیکن روسو یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ قوم مشیت عامہ کے ذریعہ ایجابی عمل کرتی ہے۔

المختصر مشیت عامہ قائم و دائم ہے، ہم سب میں موجود ہے، ہمیشہ حق پر ہوتی ہے اور اطاعت کی بنیاد ہے۔ لیکن کوئی ایسا واضح ادارہ موجود نہیں ہے جسے مشیت عامہ کا ترجمان سمجھا جاسکے۔

روسو نے بادشاہ کی بجائے قوم کو حاکمیت کا مالک قرار دیا۔ لیکن وہ قوم کے خلاف فرد کو کوئی تحفظ نہ دے سکا۔

اگرچہ روسو فرد اور قوم کے تعلق کے مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مگر اپنی بحث و نظر کے دوران میں اس نے علمِ سیاسیات میں مستقل اور گرانقدر اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر ہیرن شا اپنی کتاب "ارتقائے نظریاتِ سیاسی" کے باب "دورِ عقلیت" میں رقمطراز ہے:۔

"روسو کہتا ہے کہ سیاسی طاقت کی بنیاد عوام پر ہے۔ مشترکہ مفاد حکومت کا اصلی مقصد ہے۔ اس کے نزدیک ریاست ایک عمرانی تنظیم ہے اور ایک تنظیم ہونے کی حیثیت سے اس میں قومی احساس بھی ہے، اور مشیتِ عامہ کا وجود بھی۔ وہ اس جمہوری نظریہ کا حامی ہے کہ سیاسی ذیفہ کا حقیقی معیار رضامندی ہے۔ وہ آزادی اور حاکمیت کے اتحا کو ممکن قرار دیتا ہے........ اس کے نظریات انقلابِ فرانس میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ جس طرح مانطسقیو نے بوربونز کے سیاسی استبداد کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ اور والٹیئر نے رجعت پسند و بد اطوار کلیسائے گال کی طاقت کو کمزور کر دیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح روسو نے فرانس کے غیر منصفانہ معاشرتی نظام کی اخلاقی و ذہنی بنیادوں کو اکھیڑ کر رکھ دیا۔"

راحت سعید

قطعات

"خط کے جواب میں!"

تُو نہ مجھے بُھلا سکی اِس کا خیال ہے مجھے
میں نے تجھے بُھلا دیا اس کا ملال کچھ نہیں
جب بھی تری تلاش تھی، اَب بھی تری تلاش ہے
عشق کی صبح و شام میں ماضی و حال کچھ نہیں!

"یاد"

شام سے کچھ دیر پہلے دامنِ کہسار میں
سُن رہا تھا گوشِ دل سے نغمہ ہائے آبشار
اِس طرح آئی تھی تیری یاد رَہ رَہ کر مجھے
جس طرح سوتے میں کوئی گدگدائے بار بار!

"ماضی و حال"

یک بیک اِک نرم جھونکے سے ہَوا کے اِس طرح
ابر کے ٹکڑوں سے باہر آ گیا ہے ماہتاب
میری کیفِ شوق میں ڈوبی نگاہوں سے کبھی
دفعتًا جیسے ہُوا تھا تجھ کو احساسِ شباب!

عرش تیموری

سنگھائے میل!

نوشادی شدہ چاند!

تاریک سایوں میں ــــ اس طرح لرز رہا ہے جیسے کسی کے شدتِ جذبات میں ہونٹ! اور کوئی یہ سوچ رہا ہے کہ وہ نہ الم کا ہے نہ خوشی کا پرستار، ــــ جتنکبری زندگی، دورُخی زندگانی، یا پُر شور مگر بے ثمری تہذیب اس کے لئے کوئی دلبستگی نہیں رکھتی، ہرچند کہ اسی گردِ پیش میں گرفتار ہے لیکن یک رنگ زندگی، یک سو زندگانی یا حقیقی انسانی تہذیب کی جستجو اس کے دل کو پریشان بھی رکھتی ہے اور اسی دھن میں مست و سرشار بھی رہتا ہے۔

کوئی سوچتا ہے کہ جس ادیب کی نظر و فکر کی کاوشیں غرض و مقصد سے معرا ہوں وہ دو حال سے خالی نہیں، اگر مجنوں ہے تو مرفوع القلم ہے، اور اگر شاعر و ادیب ہے تو اسے کبھی کبھی اپنی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے! اپنی منزل کی مسافت کا اندازہ کرتے رہنا چاہیئے ــ!

کسی کی ادبی زندگی مختصر سہی، کسی کے ادبی کاموں کا حجم چھوٹا سہی، دیکھنا تو یہ ہے کہ گزشتہ تین چار برس میں کسی نوعمر ادیب کی سرگرمیوں میں کوئی ارتقا بھی ہوا ہے یا نہیں؟

اس سے پہلے کہ کسی کی ادبی زندگی سے چند اقتباسات پیش کئے جائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب کے بارے میں زاویۂ نظر بیان کر دیا جائے۔

اصلی ادب وہی ہے جو ایک شاہراہ کی مانند ہو۔ جس پر سے مختلف الحیثیت مخلوق معمولی حالات اور روزمرہ کے لباسوں میں بے تکلف گزر رہی ہو ــــ ایسا ادب عبرت انگیز بھی ہوتا ہے اور جنوں خیز بھی!

باوجودیکہ یہاں نہ تو رسیلے جذبات کی موجیں ہوتی ہیں نہ چشیلے خیالات کے طوفان، بلکہ بالکل سادہ زندگی اور اصلی زندگانی کی سچی تصویریں! ــــ تاہم ایسا ادب قوتِ تمیز کو اُبھارنے والی عبرت اور خلّاق عمل جنون پیدا کرتا ہے! ــــ یہی عقل اور عشق مل کر شخصی تہذیب اور قومی تعمیر کے لئے بنیاد کا کام دیتے ہیں!۔

زندگی میں نہ کوئی رس ہے نہ مزا۔ نہ چٹک ہے نہ مہک، وہ تو ایک بے طوفان سمندر، ایک بے نشیب و فراز میدان ہے۔ البتہ زندگانی حرکت و سکون کا چھلکتا ہوا کٹورا ہے۔ اسے چاہے طوفان کہہ لیا جائے اور چاہے نشیب و فراز!۔

ادیب یا شاعر کی نظر زندگی پر ہوتی ہے اس کا ادب زندگی کی لازوال ہمیشگی سے بھرپور ہوتا ہے زندگانی کے طوفان یا نشیب و فراز تو پڑھنے والوں کو سوجھتے ہیں۔

اداکار کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو درون پردہ ہوتی ہے دوسری وہ جو بیرون پردہ۔ ادیب و شاعر کی بھی ایسی ہی دو شخصیتیں ہوتی ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں اُلجھ کر ادیب گیٹے کے کردار "فاسٹ" کی طرح مسلسل کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی ایک ادا بن کر رہ جاتی ہے۔

کسی کی رائے میں ادیب و شاعر کو چاہیئے کہ وہ اپنی دونوں شخصیتوں کو ایک دوسری میں سمو دے اور اس طرح اپنے میں ایک تیسری شخصیت پیدا کرے جو متذکرہ صدر دونوں شخصیتوں سے بالاتر ہو۔ جو ان کی نگرانی بھی کرے اور نگہبانی بھی۔ یہی وہ تیسری شخصیت ہے جو ادیب و شاعر کو پیغمبرانہ اوصاف سے قریب کر دیتی ہے۔

کسی کے خیال میں ادیب و شاعر اپنے اصولِ نظر و فکر کو ایک چوک کے رُخ کھلتا ہوا دریچہ بنائے اور جو کچھ اس دریچہ میں سے دیکھے ہوبہو الفاظ و عبارات کا جامہ پہنا کر سلیقہ کے ساتھ پیش کر دے!

اگر کہیں ضرورتاً ع گفتہ آید در حدیث دیگراں

بھی واقع ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ پیش کرنے کا سلیقہ، خیالات کی ترتیب، بیان کی دلنشینی، ادیب و شاعر کی موجدانہ قابلیت پر منحصر ہے

اور یہی قابلیت ادب کو سحر و اعجاز کا مرتبہ بخشتی ہے۔

ادیب و شاعر کو چاہئے کہ تیر سے زیادہ ہدف کو اہمیت دے اور یہی جذبہ اس کے آرٹ کی ایک کشش سے نمایاں ہونا چاہئے۔

انسان کو آدمی سے مفر نہیں اور آدمی کو انسان کے بغیر چارہ نہیں، بالکل اسی طرح جیسے جسم کو سایہ سے گریز نہیں اور سایہ کو جسم کے بغیر وجود نہیں لیکن عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ جسم اور سایہ کو الگ الگ دو مستقل ہستیاں قرار دید یا جاتا ہے۔ یہ غیریت و دوئی کا نظریہ ہے اس سے آرٹ تباہ اور مختلف ہنگاموں میں گم ہو جاتا ہے۔

آجکل کے شعر و ادب میں کوئی نیا زاویۂ نظر نہیں پیدا کیا جا رہا ہے، انہی پرانے طریقہ ہائے نظر و فکر کی تشریح و توضیح کی جا رہی ہے اور سب سے زیادہ تنقید کے نام سے تمدید و تقبیح پر ہر ادیب قلم برداشتہ لکھتا جا رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادب و شعر فوج کی طرح قواعد کر رہا ہے ـــــ یعنی: جو وہ شعر و ادب نہ کوئی قدم حکم (مقررہ قواعد و ضوابط) کے خلاف اٹھا سکتا ہے نہ رکھ سکتا ہے۔

مختصراً ادیب کو نہ تو "ادب برائے ادب" کے اصول پہ کاربند ہونا چاہئے اور نہ "ادب برائے مقصد" کے اصول کا معتقد! یعنی نہ پروانہ کی طرح شعر و ادب میں فنا اور نہ بلبل کی طرح شعر و ادب کا وکیل یا دلاّل!

لہذا کوئی چاہتا ہے کہ ایک ادبی نمائش گاہ کھولے اور اپنی اپنی پسند کے نوادر انتخاب کرنے کی دعوت دے۔

نمائش گاہ تو بہت وقت، انتظام اور اہتمام چاہتی ہے بالفعل مشق و ربط (ریہرسل) کے طور پر چند نمونے پیش کئے جائیں۔

اقتباسات

حُسن و شباب:۔ "ہر عطر ایک خوشبودار تیل یا عرق پر کشید کیا جاتا ہے جسے زمین کہتے ہیں۔ حُسن کی زمین بھی شباب ہے جس طرح اچھا عطر اپنی زمین پر غالب رہتا ہے اسی طرح حُسن کامل بھی اپنے آگے شباب کو نمایاں نہیں ہونے دیتا۔"

حُسن کے قوی مظاہر:۔ "بعض حُسن نظر فریب ہوتے ہیں اور بعض سامعہ نواز۔ حُسن نظر فریب ہوش و حواس کے پرخچے اُڑا دیتا ہے اس لئے اس کا منکر ناپید ہے، لیکن حُسن سامعہ نواز ایک طویل داستان ہے جس کا آغاز ازل سے ہوا اور انجام ابد پر ہوگا۔ یہ داستان سوتوں کو گدگدا کر جگاتی اور جاگتوں کو تھپک تھپک کر سلاتی ہے۔ عالمِ امکان میں حُسن سامعہ نواز کے منکر بہت ہیں لیکن انکار خود اس کے ہونے کی دلیل ہے۔"

حُسن سے ہستی کی شناخت:۔ "ہستی کی تعریف فلسفی کے پاس کچھ نہیں۔ وہ اس کو حیات۔ علم اور ارادے کی دلیل سے پہچانتا ہے دراںحالیکہ حیات۔ علم اور ارادے سے بھی ویسی ہی ناواقف ہے۔ اسی طرح فلسفی اور اس کی ذرّیات ایک مجہول سے دوسرے مجہول کا قیاس کر لیتے ہیں۔ لیکن ادیب یا شاعر ہستی کو حُسن سے پہچانتا ہے۔ وہ صریحاً دیکھتا ہے کہ حُسن فریبندہ نے عقل کے قدم ڈگمگا دئے اور جنوں کا بول بالا کر دیا۔"

بُت پرست حُسن پرست ہے اور خدا پرست عین حُسن ہے، "تمام کائنات خدا پرست ہے۔ ایک آدم ہی بُت پرست ہے کہ اس نے انواع و اقسامِ حُسن کی پرستش کی دھن میں کروڑوں بُت بنا ڈالے لاکھوں صنم خانے تعمیر کر دئے، پھر بھی جی نہ بھرا تو مسجدوں میں غیر مرئی حُسن کی پرستش پر کمربستہ ہو گیا۔ یہاں سے بھی جی اکتا گیا تو خانقاہوں کے تاریک گوشوں میں دل کی گرمی کو پھونک پھونک کر روشن کیا اور اسی کو حُسن کا مظہر بنا کر پوجا پاٹ کرنے لگا۔"

دل اور حُسن:۔ "دل حُسن کا آئینہ اور حُسن تمام دلوں کا آئینہ خانہ ہے۔ لہذا عالمِ دل اور عالمِ حُسن دو آئینہ خانے ایک دوسرے کے مقابل ہیں ؎

دریائے فراواں خود اک آئینہ خانہ ہے
ہر قطرے کو اپنے میں دریا نظر آتا ہے

حُسن سیرت

آدمی:۔ "وہ گوشت کا لوتھڑا جو آدمی کی صورت لیکر دُنیا میں آتا ہے مدّت دراز تک اعلیٰ صفات انسانی سے محروم رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ سیرت کی تخلیق ہوتی ہے اور کوئی چابکدست نقّاش اس مرقع کی قلمکاری میں ہمہ تن منہمک رہتا ہے۔

آفاتِ ارضی و سماوی کے علاوہ ذاتی خواہشوں اور ترغیبوں کے فوارے اس مرقع کو تر دامن کرتے رہتے ہیں اور گرد و پیش کے شیاطین الانس والجن اس کے خد و خال کو بگاڑنے کی تاک میں لگے رہتے ہیں لیکن وہی نقّاش صیاد کی طرح اپنی کمین گاہ سے مرقع پر ٹکٹکی لگائے سیرت کی بہتر سے بہتر تجویز اور دلکش سے دلکش تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔"

صورت و سیرت: "حسن سیرت وہ خوش رنگ ٹھنڈی روشنی ہے جو صورت کے فانوس سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آتی ہے اور دور دور تک فضاؤں کو منور کر دیتی ہے۔"

حسن سیرت کا تفوق: "حسن سیرت بدصورتی کے تمام عیوب کو چھپا لیتا ہے۔ بری بھدے سے ناک نقشے حسن سیرت کی چمک دمک سے نظارگیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔"

آدم زاد اور دوام زندگی: "آدم زاد دوام زندگی کے لئے ہمیشہ سے ماہی بے آب کی طرح بے تاب ہے لیکن جنکی خواہشوں میں لذت کی طلب غالب ہوتی ہے وہ غارت کر دی جاتی ہیں غارتگر بھی آدمی ہی ہوتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ خدا کے ہاتھ اور ان کے دل و دماغ بے دردی یا ہمدردی کی بجائے عدل و انصاف کے تقاضوں سے بھرپور ہوتے ہیں ---- اور جن کی خواہشوں میں قربت و لدب غالب ہوتا ہے ان کے جسم بھی ڈوبتے ہیں مگر لطیف روحیں مرغابی کی طرح دنیا کے سمندر سے خشک نکلتی اور دوام زندگی کی مالک ہو جاتی ہیں۔"

زوال پذیر قومیں: "سنتے آئے ہیں کہ زوال پذیر قومیں

۲۶ بھی سیرتیں سنبھالتی ہیں اب سوچنا یہ ہے کہ ہمیں اپنی سیرتوں میں حسن پیدا کرنے کیلئے کیسی تربیت درکار ہے۔ کیونکہ ہمارا تقاضائے فطری زندگی دوام کا طالب ہے۔ (اقتباس۔ مضمون "حسن")

گفتگو سے دل کی شناخت: "باتیں بھی دل کا دھواں ہوتی ہیں ---- کسی دل میں عود دان روشن ہے اور کسی میں باورچی خانہ گرم ---- دھنواں دھنواں ایک ہے مگر اثر و کیفیت میں فرق ہے! ---- ابھی ہندوستان سونگھنے کی قوت سے محروم ہے! ---- خیر وقت آئے گا۔" (خیال آفریں دماغ)

گمراہ دل: "گمراہ دل غبی بچے کی طرح دماغ کا آموختہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ناکامی (غافلانہ عادتیں) رلائے دیتی ہیں۔" (تجزیاتی تمثیل ---- "بستر کی گداز بانہوں میں")

احساس اور شاعر: "ہر چیز کا تعلق احساسات سے ہے کسی ویران قبرستان میں گراموفون بجائیے تو آپ کو لطف نہ آئیگا اور اگر وہی گراموفون کسی رسیلی چاندنی رات میں جھیل ڈل میں چلتی ہوئی کشتی پر بجائیے تو آپ بےخود ہو جائیں گے ---- یہی حال شاعروں کا ہے کہ بہار ان میں حسن کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے خزاں کی کوئل کا نغمہ شاعروں کے نزدیک نغمہ نہیں۔ ان کیلئے تو بہار کی کوئل اور بہار کا نغمہ نغمہ ہے۔" (ٹیگور کے ساتھ دو سال ---- رسالہ ایشیا)

علم بیماری ہے: "دوست عزیز! علم و فضل کی طرف مطلق توجہ نہ دو۔ اس لئے کہ علم بیماریاں پیدا کر رہا ہے۔ دماغی بھی اور قلبی و روحانی بھی۔ لوگ جتنے ذی علم ہیں اتنے ہی زیادہ بیمار۔" (خیال آفریں دماغ)

زندگی حماقت آفریں ہے: "زندگی کے متعلق کیا پوچھتے ہو! ---- عمر کے مسافر کے گمراہانہ نقوش پا کے تسلسل سے ایک پگڈنڈی سی بن رہی ہے جس میں ہر قدم پر حماقتوں کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔" (خیال آفریں دماغ)

خدا کا بت: "یہ حمد! ---- یہ کیا ہے؟ سراسر توہین ہے! انسان نے الفاظ کا بت تیار کیا۔ اور لوگوں نے اس لفظی بت کی پرستش شروع کر دی، بعینہ اسی طرح جیسے کہ سامری نے سونے کا بچھڑا بنا ڈالا اور قوم بنی اسرائیل سربسجود ہو گئی!

ڈنلپ موٹر ٹائر کمپنی کے مالک کو خوب سوجھی کہ اس نے اپنے کارخانہ کے اشتہار میں ایک آدمی کی تصویر پر ٹائر ہی ٹائر پینٹ کرا دئے ---- باتونی اور پیٹ کے ہلکے آدمی نے خدا کے تصور کو لفظوں کے اس قدر لباس پہنائے کہ کثرتِ لباس اصل تصور کا مزار بن گئی۔ اور یہ اندھی مخلوق اسی مزار یا تصور یا لفظی بت کے آگے سربسجود ہے"!

انقلابی علمبردار اور ہندوستان: "انقلاب کے علمبردار! ---- یہ انقلاب کے علمبردار ادیب جو خیالات کے گھوڑے دوڑاتے ہیں میں ان سے خوب واقف ہوں! ...... میں پوچھنا چاہتا ہوں ---- ہاں! ان انقلابیوں سے! ...... تمہیں ایسی بے شرمی سے جینے کا کیا حق ہے؟ ---- تم نے ہندوستان کے آلام و مصائب کو مطبوعہ لفظوں اور عبارتوں سے جانا ہے! ...... اور انھیں کو الٹ پھیر کر تم نے پھر چھپوا دیا۔

تم نے ہندوستان کی بھوک! ---- جسمانی، دماغی اور قلبی بھوک کو کتابوں سے دریافت کیا...... تم نے ہندوستان کے دل کے متصل کھڑے ہو کر کبھی اس کی وحشیانہ اور تیز دھڑکن نہیں سنی! ---- اگر سنی ہوتی، اگر تم نے غریب زندگی دیکھی ہوتی تو اپنا قلم توڑ کر پھینک دیتے! جس طرح عالم نزع کے احساسات قلمبند نہیں کئے جا سکتے۔ اسی طرح ایک خزاں رسیدہ، ایک سسکتی ہوئی، ایک ٹھٹھری ہوئی زندگی کا عکس بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اس زندگی کی ہلکی سی جھلک دیکھی اور اس دن سے خاموش ہوں! ---- بالکل خاموش!!"

ڈاکخانہ لاوارث مہری لفافہ: "ارے دیوانے! اس سوچ بچار، اس فکر و تردد نے ہی تو تجھے کہیں کا نہ رکھا، تو دق کا مریض معلوم ہوتا ہے، تو نے کبھی آئینہ میں صورت بھی دیکھی؟ ..... بالکل ڈاکخانہ خطوطِ لاوارث (DEDD LETTER OFFICE) کا مُہری لفافہ۔"

آپس میں بے خبری: "یہ دُنیا جہاں ہم دل بہلانے کے لئے آتے ہیں، ایک سرائے ہے جس میں قطار در قطار بستر لگے ہیں، مگر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں!"

پامال گروہ: "بعض آدمی اور پامالی توام پیدا ہوتے ہیں بعضوں کو زبردستی پامالوں میں درج کر لیا جاتا ہے۔ اور بعض پامالی کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں۔"

زندگی اور میں: "آہ! میری زندگی کسی اُڑتے ہوئے پرندے کا سایہ ہے جو سطحِ زمین پر دوڑ رہا ہے! ـــــ نہ معلوم میں اس کے پیچھے دوڑ رہا ہوں یا وہ میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے؟"

کتابِ زندگی: "یہ زندگی ایک کتاب ہے ـــــ میری غفلت و بیداری کے حالات کی۔ میرے قول و فعل کے اثرات کی۔ میرے عیش و طیش کی کیفیات کی ـــــ کہیں کہیں صفحوں کے بیچ میں ترکیں لگی ہیں، یہ میری وہ یادیں ہیں جو ایک فراموش کار کی کتابِ زندگی میں بے ارادہ محفوظ رہ سکیں! ـــــ جب میں اپنی زندگی کی کتاب کو دُہراتا ہوں تو صرف یہ ترکوں والے صفحے ہی سامنے آتے ہیں۔"

دوگونہ زندگی: "انسان زندگی کا عجائب خانہ ہے۔ مگر حقیقی زندگی عقل و اخلاص کا کاشانہ۔"

میں اور بجلی کا تازیانہ: "کیا میں کسی مغلوب الجذبات شاعر کا وزن سے گرا ہوا مصرعہ ہوں جو عروض و قافیہ سے بالکل بے پروا ہے! ـــــ ہاں، ہاں ..... ایسا مصرعہ جو تڑپنے تڑپانے میں بجلی کا تازیانہ اور ایسا تازیانہ جسے تازیانہ ساز لچک بڑھانے اور آواز پیدا کرنے کے لئے جگہ جگہ سے توڑ مروڑ کر رکھ دیتا ہے۔ لہٰذا تازیانہ اپنی ذات سے شکستہ اور یہی شکستگی اس کا کمال ہے کیونکہ جس قدر شکستگی بڑھتی ہے اسی قدر لچک اور آواز میں اضافہ ہوتا ہے۔ ــ ۵

بُلبُل تری آواز کے ہر بول کے اندر
میں ایک تڑپتا ہوا دل دیکھ رہا ہوں

انسان اور آدمی: "بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان اپنی قسمت آپ بناتا ہے، ــــ آہ! دُنیا میں کوئی انسان ہی نہیں، سب آدمی ہیں۔"

ناموافق گرد و پیش: "غالب نے بھی کیا کیا شاہکار پیش کئے ہیں، ــــ میں بھی اپنا شاہکار پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب ارادہ کرتا ہوں تو ہونٹ ہلنے لگتے ہیں لیکن آواز نہیں نکلتی بعینہٖ اسی طرح جیسے کسی بھیانک خواب کے گرفتار کی گھگی بندھ جائے۔"

دماغ: "انسانیت کے سر پہ تاجِ شاہی ہے، نہیں نہیں یہی ساری دُنیا میں آباد ہے یعنی یہی حاکم اور یہی محکوم۔!"

فکر و نظر: "آنکھوں کی خاک کھاتے ہیں غم کی آندھیوں کے سوا کچھ نہیں۔ مگر دل خون کے آنسوؤں کا لبریز کٹورا ہے! یہ میری قمیص اسی خونِ دل کو جذب کرتی رہتی ہے جو کبھی کبھی کٹورہ سے چھلک جاتا ہے! ــــ کیا میرا خونِ دل فکر و نظر کا افشردہ ہے کہ بجلی کی طرح جسم سے پار ہو کر قمیص کو رنگین کر دیتا ہے؟ ــــ اگر اس قمیص کی رنگینیاں دُنیا کو دکھا دوں تو اسے رنگ آمیزی سمجھے گی!"

شاعر اور مداری: "آہ ہندوستان! ــــ ہندوستان کے بوالہوس شاعر اور مداری میں کیا فرق ہے؟ ..... ان کے حالات کے لئے دفتر کا دفتر ناکافی ہیں ــــ یعنی شاعر ڈھونگ مچا کر سوانگ بناتا ہے۔ سارے افیمی، شرابی، بھنگڑ، چرسیے تعریفوں کے پل باندھتے ہیں، مگر عقلمند آدمی دانتوں میں انگلی رکھتا اور مُنہ پھیر لیتا ہے۔"

معطر خار و خس اور پژمردہ پھول: "اگر خار و خس پر بھی عطر چھڑک دیا جائے تو لوگ دور ہی سے خوشبو سونگھ کر مست ہو جاتے ہیں لیکن بیچ بیچ کے پھول اگر دھوپ سے مرجھائیں یا ہاتھ لگنے سے کمھلائیں تو ان کی طرف کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا۔"

اُردو کی گالیاں: "اُف اُردو میں کس قدر گالیاں ہیں! لوگ کہتے ہیں کہ زبان قوم کے کردار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔"

زندگی اور قیامت: "جیون کیا ہے؟ قیامتوں کا سلسلۂ نامتناہی جو ادنیٰ قسم کی مسرتوں اور بیکار آرزوؤں کی شاہراہ پر کھنچتا لڑکھڑاتا چلا جا رہا ہے۔"

ہندوستانی شاعروں کا معشوق: "ہندوستان کے شاعروں نے چاند کو معشوق کے چہرے سے تشبیہ دی ہے لیکن طباق

سے چہرے میں تو کوئی حسن نہیں، ویسے بھی گول چہرے عوام کالانعام اور ایسے لوگوں کے ہوتے ہیں جن کے دماغ نازک خیالی سے معرّا، جن کی نگاہیں نکتہ رسی سے مبرّا اور جن کے دل قصائی کے کُندہ سے کچھ زیادہ باوقعت نہیں ہوتے۔"

آوارہ حُسن: "وہ آوارہ حُسن ہے! غرور کی لہروں پہ تیرتی ہوئی کشتی! ——— کاش میں اپنے آپ میں ڈوب کر ایک چیخ کھینچتا جو اس کے کانوں کے پردہ پھاڑ دیتی اور ترک غفلت کا آغاز ہوتا! ——— کاش میرے گرما گرم دل کی بھاپ اس سے سرگوشی کرتی۔ اور کہدیتی کہ اری نادان، تن کی سُندرتا، تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے! ہاں، اگر حُسن لازوال کی طالب ہے تو اپنے دماغ، من، آتما اور سیرت میں حُسن پیدا کر! ——— مگر وہ تو باغ عام ہے، اس کے چھوٹے سے دماغ میں فحش کے مسائل و تجربات کے سوا اور کسی چیز کے سمانے کی گنجائش ہی نہیں، اسی عینک کا رنگ جذباتی ہے۔"

ہندوستان کا فحش اور سماج: "جب ان کے ساغروں میں بال آیا تو وہ ایک جھنکار، ایک شعلہ بداماں شکست سے پسپا ہو کر اس مارکیٹ کی طرف دوڑ گئیں جہاں جوانیوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے، جہاں قوموں کی زندگی اپنا مزار تعمیر کرتی ہے۔ جہاں صبح کا ستارا کبھی نہیں نکلتا، ——— میں عزت کرتا ہوں میں اُن آوارہ عورتوں کے سامنے احترام کے ساتھ سر جھکاتا ہوں، کہ انھوں نے اپنی خودی کو پا لیا ——— اس عزم واستوار میں بڑے بڑے رہبروں اور سورماؤں سے بھی بڑھ گئیں۔"

ہندوستانی رہنما: "آہ، ہندوستان پر ایسے بڑے بڑے رہنما مینڈکوں کی طرح برس رہے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی سماج کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کرتا۔"

رونا اور ہنسنا: "سارا انانیت کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے جب میں اپنے اوپر ہنستا ہوں، ——— اور جب اپنے آپ پر ہنستا ہوں تو رونا آجاتا ہے۔" (اقتباس — خیال آفریں دماغ)

"دیوانے! سارے دُکھ اس لئے ہیں کہ لوگ اس پتھروں سے پٹی ہوئی سڑک پر کھڑاؤں پہنکر "کھٹ کھٹ" کرتے ہوئے چلنا چاہتے ہیں، جو دبے پاؤں گزر جاتے ہیں انھیں کوئی غم نہیں ہوتا۔" (اقتباس — "وقت گزر رہا ہے")

"پاس پست ناتواں میں ہوتا ہے! عیب میں ہوتا ہے! گل چیں نہیں! ——— یہ دُنیا دھوکے کی ٹٹی نہیں! یہ سرائے فانی نہیں، یہ ناٹک نہیں، یہاں فنا کا نام ونشان نہیں، یہاں حُسن ہی حُسن ہے۔"

"ہا! اس جگہ کو کون چھوڑے جہاں مائیں ہوں، غریب ہوں، بچے ہوں، گزشتہ زندگی کا پچھتاوا اور آئندہ زندگی کا اندیشہ ہو۔"

"ارے یہ گنگا جمنی زندگی بسر کرنے والے انسان، بند گلیاں ہیں! بند گلیاں!! ان میں نالیاں بہتی ہیں، کوڑے کے ڈھیر لگے رہتے ہیں، ابابیلیں گھونسلے بناتی ہیں، اور کبوتر "غٹرغوں" کرتے ہیں۔ انھیں ——— انھیں چھکبری زندگی بسر کرنے والوں کی کیا خبر! انھیں یہ بھی خبر نہیں کہ ان کی بستی میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو زندگی کے سرکش دنوں کو دھکیلتا ہے؟ یہ لڑھکتے ہوئے پتھر سب کچھ جانتے ہیں!" (اقتباس — "وقت گزر رہا ہے")

"کسی کا دل نہیں بھرا —— کوئی اپنے بستر میں پڑا ہوا سوچتا ہے کہ یہ پیالے ناکافی تھے —— مگر —— گمر زنوشادی شدہ چاند نافِ آسماں میں اس طرح لرز رہا ہے جیسے کسی کے شدتِ جذبات میں ہونٹ۔"

۲۸

قاضی عبدالغفار

اٹھارویں صدی کے دورِ ثانی کی صحافت اور اُسکے چند نمونے

گزشتہ سال میں نے اُردو صحافت کے ابتدائی زمانہ کے متعلق حیدرآباد کے ریڈیو اسٹیشن سے تین تقریریں کی تھیں یہ سلسلہ چند روز اور جاری رہنے والا تھا لیکن جنگ یورپ کا ہنگامہ اس قدر زیادہ گرم ہوگیا کہ علمی، ادبی یا فنی گفتگو کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ اور حالات حاضرہ پر میری تقریروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس وقت اُردو صحافت پر میری تقریروں کے سلسلہ کی چند کڑیاں باقی رہ گئی تھیں۔ اُن میں سے ایک آج پھر پیش کرتا ہوں ۱۸۵۰ء تک اُردو صحافت کی داستان بیان کرچکا ہوں لیکن اس دور کے بعض قدیم جرائد کی انشا پردازی کے چند نمونے بہت دلچسپی کے ساتھ سُنے جائیں گے۔ اس لئے اٹھارویں صدی کی اُردو صحافت کے دور آخر کا ذکر کرنے سے پہلے دور ثانی کی صحافت کے چند نمونے آپ کو سُنا دوں۔

مثلاً "دہلی اردو اخبار" اپنی ۲۳ مارچ ۱۸۵۱ء کی اشاعت میں سیاحت اور سفر حج کے متعلق اپنے ناظرین کو اُس زمانہ کا ایک آسان راستہ ان الفاظ میں بتاتا ہے:۔

"مشتاقان تفریح دیار و امصار اور سیاحان پختہ کار کو مژدہ ہو کہ بشرط شوق و ہمت اب عرب و عجم اور روس و شام و انگلستان کے جانے کیلئے بہت سہولت و آرام کا راستہ نکلا ہے یعنی فیروزپور یا لاہور سے کشتی پر سوار ہو کر بہ آرام تمام سندھ و بمبئی تک آدمی پہنچ سکتا ہے اور کچھ خوف چوری چکاری کا اثنائے راہ متصور نہیں ہے۔ اگر لاہور سے سوار ہو تو از راہ دریائے راوی بارہ دن میں ملتان پہنچ سکتا ہے" وغیرہ

یا مثلاً "دہلی اردو اخبار" اپنی ۱۹ نومبر ۱۸۵۴ء کی اشاعت میں اُستاد ذوق کے انتقال کی خبر اس طرح درج کرتا ہے:۔

"ظہیر درد اثر رحلتِ ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق اُستاد خاص حضور اقدس ظل سبحانی افسوس صد افسوس کہ شہنشاہ ملک سخنوری خسرو اقلیم معنی گستری ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم خاں ذوق استاد خاص حضور والا نے شب ۲۴ صفر شب آخری چہار شنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۸۵۴ء عالم فانی سے بسوئے عالم جاودانی رحلت کی۔ الحق یہ وہ مصیبت عظیم ہے کہ اگر صاحب زبان محاورہ فرس و ریختہ اردو بلکہ تمام اہل سخن ہند لباس ماتمی پہن لیں تو روا ہے۔ حضور والا کو جب اطلاع اس واقعہ جانکاہ کی ہوئی باوجود دیکہ دربار عام بتقریب آخری چہار شنبہ مہیا تھا اور سب اراکین سلطنت باریابی و مجرے کو حاضر تھے لیکن سب کو برخاست کردیا اور حکم دیا کہ شاہزادگان والا تبار معہ جمیع اہل دربار استاد مرحوم کی مشایعت جنازہ میں شریک ہوں۔"

یہ گویا تقریباً ایک صدی پہلے کی اردو زبان کا صحافتی انداز تحریر ہے لیکن یہ رنگ رفتہ رفتہ بدلتا گیا اور صحافتی زبان میں بالآخر جو سنجیدگی اور سلاست پیدا ہوئی اُس کے ایک داعی تو مرزا غالب تھے اور ان کے بعد سب سے بڑے داعی سر سید احمد خاں ہوئے جنھوں نے خود اپنے قلم سے مضامین نگاری کا ایک نیا نمونہ ملک کے سامنے پیش کیا چنانچہ تہذیب الاخلاق کے مسلک کی جتنی مخالفت اُس زمانہ میں ہوئی اس سے زیادہ اس کے طرز تحریر کی تقلید بھی شروع ہوگئی۔ اور اس بنیاد پر اُردو صحافت کے ارتقا کا ایک نیا دور شروع ہوا اس زمانہ میں اخبار "پنجابی" نے اپنے شمارہ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۸۷۳ء میں سر سید کے اسلوب تحریر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

" انگریز اس امر کو اپنے ادب کا کمال سمجھتے ہیں کہ اُس میں آئے دن نت نئے خیالات کا اضافہ ہوتا رہے

ہندوستانیوں کو ہرگز یقین نہ آئیگا اگر اُن سے کہا جائے کہ ان جدتوں میں فصاحت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی مگر ہندوستانی تو مسلسل تقلید کے قابل ہیں اور کسی اسلوب بیان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں اب یہ چاہیئے کہ تقلید ترک کردیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے خاص انداز تحریر کے مطابق لکھے"۔

علی گڑھ اخبار نے تو اُس زمانہ میں قدیم طرز تحریر کی مذمت کرتے ہوئے یہاں تک لکھا تھا کہ بعض اوقات ایسے مضامین کا مطالب سمجھنے کے لئے صحاح اور قاموس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے تقریباً ۱۸۶۸ء تک اُردو جرائد کا سیاسی رنگ بھی بہت پھیکا تھا مگر رفتہ رفتہ اُس میں بھی گرمی پیدا ہوگئی اور ان کے صفحات پر سیاسی مباحث جس قدر زیادہ اہمیت حاصل کرتے گئے اُسی قدر اُن کی طرز تحریر اور اُس کا اسلوب بیان بھی بدلتا گیا حتیٰ کہ اس دور کے آخری شعرا بھی اپنی نظموں میں یہ قومی رنگ اختیار کرنے لگے اور انیسویں صدی کے آخر میں اُردو صحافت اور ادب نے بالکل ہی اپنی کروٹ بدل لی۔

یہیں سے اُردو صحافت کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ اس
۴۰ دور کے پہلے سال یعنی ۱۸۸۹ء میں ۹۴ نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سے دو حیدرآباد کے تھے۔ ایک "جوہر سخن" جو کوچہ جلال سے شائع ہوتا تھا اور ایک "گلدستہ" جس کے مالک عبداللہ خان ضیغم داماد نواب شرف الامراء تھے۔ یہ پرچہ مطبع آصفی مجازی پُرانی حویلی میں چھپتا تھا اور اس کے سرپرست حسام الملک نواب خان خانان تھے۔ ۱۸۸۶ء میں ۹۵ نئے اخبار جاری ہوئے جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر "زمیندار" ہے۔ جو گوجرانوالہ سے پہلے ماہوار اور پھر ہفتہ وار منشی محبوب عالم نے جاری کیا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں حیدرآباد سے پانچ نئے پرچے جاری ہوئے جن میں سے چار "گلدستے" تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حیدرآباد میں شعر وسخن کا بہت چرچا تھا۔ ان چار میں سے ایک "گلزار سخن" تھا جس کے مالک نورالدین تھے اور یہ مطبع نور میں طبع ہوتا تھا اس گلدستہ کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

مزہ نہیں ہے خموشی کا خوش بیاں کیلئے
زباں سخن کیلئے ہے سخن زباں کے لئے

دوسرے گلدستہ کا نام "گل وبلبل" تھا۔ اس کے مالک الطاف حسین کسمبل تھے اس کے سرورق پر یہ شعر نمایاں تھا۔

وہ بہار آئی وہ غنچے ہنس کے شرمانے لگے
گوش گل تک نغمۂ بلبل بھی اب جانے لگے

تیسرا گلدستہ "خیال محبوب" تھا۔ اس کے مالک مولوی عبدالسلام عرش تھے اور وہ نظام پریس سے شائع ہوا کرتا تھا۔ چوتھا مزاحیہ گلدستہ "دکن پنچ" تھا جس کا دفتر بازار سدی عنبر گولیگوڑہ میں تھا۔ اس کے مالک کشن راؤ تھے مہتمم عبدالکریم ظریف اور ایڈیٹر غریب الدین۔

پانچواں اخبار جو اس زمانہ میں حیدرآباد سے جاری ہوا "افسر الاخبار" تھا جو قلعہ گولکنڈہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک مشتاق احمد تھے۔

اس سال کا ایک ممتاز پرچہ جو عورتوں کیلئے جاری کیا گیا تھا دہلی کا "اخبار النساء" تھا جس کے ایڈیٹر مولوی سیّد احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ تھے۔

اس سال کے آخری حصّہ میں لاہور سے "پیسہ اخبار" جاری ہوا جو آجتک مختلف صورتوں میں جاری ہے۔ اس اخبار کے مالک مولوی محبوب عالم کا نام شمالی ہندوستان بلکہ تمام ہندوستان کی صحافت میں ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ شاید سب سے پہلے تعلیم یافتہ پنجابی تھے جنھوں نے صحیح تجارتی اصولوں کو مدّنظر رکھ کر صحافت کا فن اختیار کیا۔ اور وہ اُردو صحافت کے اُن چند خوش قسمت اہل قلم میں تھے جنھوں نے اس پیشہ میں شہرت بھی حاصل کی اور دولت بھی۔

۱۸۸۸ء کے بعد اُردو صحافت کا ایک ایسا دور آیا جس میں نئے پرچوں کی تعداد سال بہ سال کم ہوتی رہی۔ اس سال کے ۲۱ نئے پرچوں میں زیادہ قابل ذکر لکھنؤ کا "وکیل قومی" ہے جس کو اُس زمانہ کے ایک مشہور واعظ مقرر اور صاحب قلم "عبداللہ حسرتی" نے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ پرچہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۸۸۹ء میں صرف ایک نیا ہفتہ وار "بھارت سدھار" لاہور سے جاری ہوا۔ یہ ہندو انتہا پسندوں کا پرچہ تھا۔ اس کا سیاسی رنگ بہت نمایاں تھا۔

۱۸۹۰ء میں صرف تین پرچے جاری ہوئے۔

۱۸۹۲ء میں صرف چار نئے پرچے جاری ہوئے جن میں پٹیالہ کا "مخبر صادق" کسی قدر مشہور ہوا۔ اس کے ایڈیٹر شیخ

ضیاء الحق تھے جو مختلف ریاستوں کے متعلق پمفلٹ شائع کرنے کے سلسلہ میں اچھی طرح جانے پہچانے گئے تھے۔

۱۸۹۴ء میں چار پرچے جاری ہوئے جن میں کوئی بھی قابلِ ذکر نہیں

۱۸۹۵ء میں لاہور سے "انتخاب لاجواب" جاری ہوا جو ابھی تک جاری ہے۔ یہ اپنی قسم کا پہلا پرچہ تھا جس کو انگلستان کے اخبار "ٹٹ بٹس" کے اصول پر جاری کیا گیا تھا۔ منشی محبوب عالم کے بھائی منشی عبدالعزیز اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ پرچہ ایک زمانہ میں بہت کامیاب ہوا۔ اور اب تک جاری ہے۔

۱۸۹۶ء، ۹۷ و ۹۸ء میں کوئی نیا پرچہ جاری نہیں ہوا۔ البتہ ۱۸۹۹ء میں لاہور سے صرف ایک پرچہ "پیشوا" جاری ہوا جس کو شیخ ضیاء الحق نے جاری کیا تھا۔ یہ پرچہ ایک طرف تو اُس زمانہ کی انتہا پسند سیاست کا ترجمان تھا۔ اور دوسری طرف ہندوستانی ریاستوں کے مسائل پر بہت زیادہ لکھتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں بیس نئے پرچے جاری ہوئے مگر اُن میں قابلِ ذکر ایک تو مرزا حیرت کا "کرزن گزٹ" تھا جس نے مذہبی مباحث میں اور خصوصاً حادثۂ کربلا کی اصلیت سے انکار کر کے بہت شہرت حاصل کی۔ اور دوسرا "شمشیر قلم" لاہور تھا جس کے ایڈیٹر اس زمانہ کے ایک مشہور صحیفہ نگار نثار علی شہرت تھے۔ اس سال مدراس سے مولوی عبداللطیف قادری کا جریدۂ "روزگار" شروع ہوا جو عرصہ تک جاری رہا۔ اور ایک زمانہ میں جنوبی ہند کا ایک ممتاز پرچہ سمجھا جاتا تھا۔

نصف صدی سے زیادہ کی ایک مختصر داستان ہے۔ جو بیان کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے بعد ہم اب اردو صحافت کے دورِ جدید کے دروازہ پر آ گئے ہیں۔ اور یہ وہ منزل ہے جہاں اردو صحافت نے ایک انقلاب انگیز کروٹ لی۔ گزشتہ نصف صدی میں عام طور پر اُردو زبان کے صحیفہ نگاروں کے قلم کی جولانی کا میدان سیاسی مسائل کی سرحد پر ختم ہو جاتا تھا۔ خبروں یا افسانوں یا غیر سیاسی مضامین کے ترجموں کے علاوہ اُس زمانہ تک اردو صحافت کا ایک بدنما پہلو ذاتیات کا وہ رجحان تھا جس نے بہت سے جراید کو استحصال بالجبر۔ تخویف مجرمانہ یا بھیک مانگنے اور بڑے آدمیوں کی قصیدہ خوانی کرنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اس زمانہ کے بیسیوں جراید کا سرمایہ تجارت بھی تھا کہ وہ رؤسا اور امراء سے کسی نہ کسی طرح روپیہ وصول کرلیں۔ ایسے اخباروں کی عام اشاعت محض برائے نام ہوتی تھی اور ان کا کوئی تعلق رائے عامہ سے نہ ہوتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۰۱ء کے بعد سے یہ رنگ بدل گیا اور ایسے صحیفہ نگاروں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ اُن کے بجائے اَب سیاسی ماحول نے ایسے اہلِ قلم پیدا کرنے شروع کئے جو "شجرِ ممنوعہ" کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے بنگال میں سب سے پہلے یہ حرارت پیدا ہوئی اور اس کے بعد پنجاب میں تقسیم بنگالہ کے ہنگامہ سے کچھ پہلے اور اُس کے بعد اُردو صحافت اپنے قدیم مسلک سے جدا ہوئی اور اُس نے مطالبہ حقوق اور سیاسی تنقید کے ایک ایسے میدان میں قدم رکھا جہاں نئی آوازوں سے اُس کے کان اور نئے الفاظ سے اُس کا قلم آشنا ہوا۔ اُس زمانہ کے بعض پرچے تو اس قدر گرم تھے کہ شاید آج بھی اُن کے الفاظ کو دُہرانا آسان نہیں مغاک سے یہ آگ پیدا ہوئی اور آگ سے وہ شعلے بھڑکے جنھوں نے ملک کے لاکھوں آدمیوں کی ذہنی فضا کو بدل دیا۔ اُن اعتدال پسند اور کمزور آباد اجداد کی یہ وہ نئی اور حجرۃ المزاج نسل ہے جو اس نئے دور میں اپنے بلوغ کی طرف قدم اُٹھاتی جا رہی ہے۔ اور کہتی جا رہی ہے۔ کہ

با من بیا وزا اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد

چند قابلِ دید کتابیں

سیرِ کائنات یہ کتاب انگلستان کے مشہور سائنسداں جی جینس کی آٹھ تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو موصوف نے رائل انسٹیٹیوٹ آف لندن میں زمین، ہوا، اور چاند ستاروں پر کی تھیں۔ قیمت مجلّد ۱۲؍

سلطنتِ خداداد میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اُس کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ۔ قیمت للعہ

۴۲

تاریخ جنوبی ہند جنوبی ہند کی مکمل تاریخ، بڑی چھان بین کی گئی ہے اور داخلی و خارجی ہر ممکن سند پیش کی گئی ہے۔ قیمت تین روپیہ (سے)

معلّم کی زندگی یہ مؤلف کی محض آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ۔ نیز اکیس سالہ تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ قیمت ہر دو حصص پانچ روپیہ (صہ)

محشرِ خیال سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعۂ مضامین کا دوسرا ایڈیشن۔ اس میں مرحوم کا ہنگامہ خیز ڈرامہ "روزِ جزا" بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ قیمت مجلّد تین روپیہ (سے) ۸؍ غیر مجلّد عہ

مبادی سیاسیات مصنفہ پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی۔ اس میں تفصیل سے علم سیاست کی ابتدائی معلومات اور عہدِ حاضر کی سیاسی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۴۰۰ صفحات قیمت مجلّد صہ

جگ بیتی پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب Glimpses of World History کا اُردو ترجمہ۔ قیمت جلد اوّل تین روپیہ (سے)

روحِ اقبال یہ کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب کے تین مقالوں اقبال اور آرٹ، اقبال کا فلسفۂ تمدّن، اقبال کے مذہبی اور مابعدالطبیعی تصوّرات پر مشتمل ہے۔ قیمت غیر مجلّد ہے۔

ذکرِ حسین ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب پرنسپل جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی "ذکرِ حسینی" پر معرکۃ الآراء تقریر جسے پبلک کے مطالبہ پر کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ قیمت تین آنہ (۳؍)

مکتبہ جامعہ دہلی

نئی دہلی ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی ۳

ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

نیا راگ

نیا راگ

اس نمبر کی نظموں میں کافی دوام و ثبات ہے۔ "رباب شکستہ" عندلیب شادانی کی گائی ہوئی غزل ہے۔ عندلیب لطیف نفسیاتِ محبت اور باریک محاکات نگاری میں مشاق ہے، رومان میں ڈوبی ہوئی سنجیدہ شوخی اس کی فطرت ہے۔ "آدمی" جوش کی تازہ فکر ہے، زندگی کے تضادوں کا آئینہ، سماجی اور قدرتی جبر و اختیار پر ایک ماہرانہ طنز، شاید اُردو زبان کے تمام شاعروں میں جوش ہی سب سے پہلا شاعر ہے جس نے طنزیات نگاری کو رومان کی آمیزش سے ایک خاص رنگ دیا، یہ رنگ اکبر کے رنگ کے مقابلے میں زیادہ گہرا اور ذی ثبات ہے۔ "قلوبطرہ کا جلوس" شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے "کلیوپیٹرا اور انطونی" کے ایک حصّہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ اور اس میں اوریجنل نظم کی سی روانی و تکمیل پائی جاتی ہے۔ اُردو ادب میں حفیؔ کی یہ کامیاب کوشش اس کے امیر ہونے کی دلیل ہے۔

شاہد کا 'ایک حسین منظر'، عندلیب کا 'ترانۂ تخریب'، خورشید الاسلام کی 'شکست' تینوں نظمیں، اپنی ایک سطح رکھتی ہیں۔ شاہد اجتماعی طور پر فکر کرنے کا عادی ہے۔ اس کی نظم کی ترتیب، روایت قدیم سے ذرا الگ ہے، مگر حسین منظر میں گم ہوگیا۔ عندلیب کی 'تخریب'، اک نغمۂ تعمیر ہے۔ اک گرج سی ترانہ کی جان ہے۔ 'شکست' میں نادر استعارے ہیں، اشیا کی تعبیر عام انداز کی نہیں، مگر نظم کے اختتام پر خورشید کا جذبہ ناتمامی کی نذر ہوگیا ہے۔

مخدوم محی الدین کے "ستارے" اور اختر الایمان کے "محلکے" دونوں قنوطیت کے دھوئیں میں اٹے ہوئے اس ہجوم میں نمایاں نظر ۳۴
آتے ہیں۔ اختر الایمان کا تصور ایک پیچ در پیچ قنوطی رومان میں پرواز کرنے کا عادی ہے۔ جس طرح مجبور اور مقیّد شباب کی خودرو اور خود زائیدہ تمنائیں، مگر جو کچھ ہے فطری ہے، اور ہمارے ماحول کا پرتو ہے، مخدوم کی نظم میں بھی یہی کیفیت ہے، مگر اختر کے مقابلے میں ایک دوسری قسم کی شگفت مخدوم کی خصوصیت ہے۔ اک دلنواز و جوان یاس انگیز مگر شوخ ترنم ان دونوں کی جان ہے۔

حسرت ترمذی اور جمیل الدین اپنے ترانے الگ گا رہے ہیں۔ راگ قدیم سہی، مگر اک رنگا رنگی کا ہجوم ہے، ترمذی کی غزل کی سطح کافی بلند ہے، عمومیت سے معرا اور جذباتی شوخی سے محفوظ۔ جمیل الدین، ترمذی کے مقابلے میں واضح طور پر زیادہ پُرشباب ہے۔ حسرت موہانی اپنی تازہ نوائی میں اک نئی تاریخ بنا رہے ہیں۔ غزل میں تلمیح نگاری بذاتِ خود ایک شعبہ تھا مگر حسرت نے اپنی ان ارتقائی غزلوں میں واقعیت نگاری سے نئی روح پھونک دی ہے۔ اور اپنے موضوع کو جو آج تک غیر مرئی نظر آتا تھا 'مرئی' کر دیا ہے۔

نظم کا یہ تمام حصّہ محض کسی رسالے کا رسمی حصّہ نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اپنی اہمیّت کے لحاظ سے مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ در وصفِ امینہ خانم اور قلوبطرہ کا جلوس، اس نمبر کو تاریخی مرتبہ بخش رہے ہیں۔

ساغر

عندلیب شادانی

ربابِ شکستہ

رشک ہے تجھ کو ہمنشیں، کچھ بھی اگر نہ تھا تو پھر
میری ہی سمت دیکھ کر، کیوں کوئی مُسکرا دیا

ترکِ وفا کے ساتھ ساتھ عذرِ جفا نہ کیجئے
بھولے ہوؤں کی یاد کیا، بھول گئے بھُلا دیا

یاد کرو وہ دن کہ تم بُت بھی نہ تھے خدا تو کیا
میری پرستشوں نے آج تم کو خُدا بنا دیا

تجھ کو خدا کا واسطہ، یوں مرا امتحاں نہ لے
مجھ کو نہ اس گماں میں ڈال تو نے مجھے بھُلا دیا

وقف ہیں کیوں مرے لئے آج یہ نامُرادیاں
پہلے ہی نوشِ لب کے ساتھ زہر نہ کیوں ملا دیا

ہاں وہیں جا رہا ہے چاند، مجھ کو بُلا رہا ہے چاند
ہائے اسے خبر نہیں اُس نے مجھے بھُلا دیا

مجھ کو بھی کچھ ملال تھا اُن کو بھی انفعال تھا
لب تو خموش ہی رہے دل نے حجاب اُٹھا دیا

ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

جوش ملیح آبادی

آدمی

خوشیاں منانے پر بھی ہے مجبور آدمی
آنسو بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اور مسکرانے پر بھی ہے مجبور آدمی
دنیا میں آنے پر بھی ہے مجبور آدمی
دنیا سے جانے پر بھی ہے مجبور آدمی

کیا آدمی کی بات کہوں تجھ سے ہمنشیں
اس ناتواں کے قبضۂ قدرت میں کچھ نہیں
رہتا ہے قصرِ حرمت و اعزاز میں مکیں
اور زندگی الٹتی ہے جس وقت آستیں
عزت گنوانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انسان کو ہوس ہے جئے صورتِ خضر
ایسا کوئی جتن ہو کہ بن جائے بس امر
تا روزِ حشر موت نہ بھٹکے ادھر ادھر
حالات جب بدلتے ہیں کروٹ کراہ کر
تو سر کٹانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انسان بہر صدق ہے سرچشمۂ صفا
انسان حق پرست ہے، حق جو، حق آشنا
انسان راست باز ہے مانند انبیا
پر اس کو آنے لگتا ہے جب جھوٹ میں مزا
ڈینگیں اڑانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انساں معاملت میں بھی رہتا ہے حق پناہ
ہر عذرِ لنگ اس کی شریعت میں ہے گناہ
رکھتا ہے خوش معاملگی ہی سے رسم و راہ
لیکن جب آ کے آنکھ دکھاتا ہے قرضخواہ
حیلے بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی

انساں ہے جود و بذل و غنا کی کائنات
لالچ کو اور ہوس کو سمجھتا ہے واہیات
قارون کے خزانے پہ بھی مارتا ہے لات
لیکن جب اس کے ساتھ بگڑتی ہے اس کی بات
جوتے چرانے پر بھی ہے مجبور آدمی

دل کو بہت ہے ہنسنے ہنسانے کی آرزو
ہر صبح شام جشن منانے کی آرزو
گانے کی اور ڈھول بجانے کی آرزو
پینے کی آرزو ہے پلانے کی آرزو
اور زہر کھانے پہ بھی ہے مجبور آدمی

ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

ہر دل میں ہے نشاط و محبّت کی تشنگی
دیکھو جسے وہ چیخ رہا ہے خوشی خوشی
اس کارگاہِ دہر میں لیکن کبھی کبھی
فرزندِ نوجوان و عروسِ جمیل کی
میّت اُٹھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

ہر دل کا حکم ہے کہ رفاقت کا دم بھرو
احباب کو ہنساؤ میاں آپ بھی ہنسو
چھوٹے نہ دوستوں کا تعلّق جو ہو سو ہو
لیکن ذرا سی بات میں یارانِ خاص کو
ٹھوکر لگانے پر بھی ہے مجبور آدمی

غصّہ سے ہلنے لگتا ہے مردانگی کا سر
مکّھی بھی بیٹھ جائے کبھی ناک پر اگر
عزّت پہ حرف آئے تو دیتا ہے بڑھ کے سر
ہر شب کو تازہ مرد کے آغوش میں مگر
جورو سُلانے پر بھی ہے مجبور آدمی

رہتا ہے عطر و عود میں کیا کیا بسا ہوا
پھرتا ہے رنگِ نرگس و نسرین سے کھیلتا
رکھتا ہے بوئے زلفِ دوتا سے معاملہ
پر مفلسی دہا تی ہے جب آن کر گلہ
کُوڑا اُٹھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

رفعت پسند ہے بہت انسان کا مزاج
پرچم اُڑا کے شان سے رکھتا ہے سر پہ تاج
گردوں پہ مہر و ماہ سے لیتا ہے گو خراج
لیکن ہر اک گلی میں بہ فرمانِ احتیاج
بندر نچانے پر بھی ہے مجبور آدمی

دل ہاتھ سے نکلتا ہے جس بُت کی چال سے
دم ہی نکلنے لگتا ہے جس کے ملال سے
موجیں لہو میں اُٹھتی ہیں جس کے خیال سے
یا رو کبھی کبھی اسی رنگیں جمال سے
آنکھیں چُرانے پر بھی ہے مجبور آدمی

۳۷ جب کوئی دیکھتا ہے کسی خوش خرام کو
جپتا ہے صبح و شام اُسی بُت کے نام کو
جی چاہتا ہے جائیے ہر شب سلام کو
آن بن جو ہو گئی تو اُسی لالہ فام کو
ٹھینگا دکھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

خود دار و خود شناس و خود آگاہ ہے بشر
سنجیدہ و متین و خوش آداب و حق نگر
پر دل میں احتیاج کا بجتا ہے جب گجر
تو سر ہلا ہلا کے طوائف کی پُشت پر
طبلہ بجانے پر بھی ہے مجبور آدمی

اخترالایمان

محلکے

تصوّرات کی شمعیں جلا کے دیکھ تو لوں
سیاہ خانۂ ہستی سجا کے دیکھ تو لوں
غمِ حیات پہ آنسو بہا کے دیکھ تو لوں
تری نظر سے ذرا دور جا کے دیکھ تو لوں

ابھی تو پی ہے مئے غم سنبھل نہیں سکتا
ابھی تو ہوش ہیں دو گام چل نہیں سکتا
ابھی تو زیست کا عنواں بدل نہیں سکتا
محبّتوں کو فسانہ بنا کے دیکھ تو لوں

یہ گھر بنا کے گرا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
دیئے جلا کے بجھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
یہ ساری بزم اُٹھا دوں گا اپنے ہاتھوں سے
خیال و خواب کی دُنیا بسا کے دیکھ تو لوں

سیاہ و سُرخ محلکوں[1] سے اس طرف کوئی
گھنی دبی ہوئی پلکوں سے اس طرف کوئی
پکارتا ہے دُھندلکوں سے اس طرف کوئی
یہ دو قدم ہیں انہیں بھی اُٹھا کے دیکھ تو لوں

غبارِ رہ کے اشارے سنبھال لیتے ہیں
افق کے دھندلے کنارے سنبھال لیتے ہیں
سُنا ہے ٹوٹتے تارے سنبھال لیتے ہیں
بس ایک بار سہی ڈگمگا کے دیکھ تو لوں

۳۸

---

[1] محل کا اسم تصغیر محلکہ۔ جمع محلکے۔

ایشیا۔ اگست ۱۹۴۲ء

م۔ش۔ حقی دہلوی

قلوپطرہ کا جلوس

ذیل کے اشعار شیکسپیئر کے ڈرامے "انطنی و قلوپطرہ" کا ایک منظوم اقتباس ہیں۔ انطنی کا مصاحب انوباربس اپنے رومی دوستوں کے سامنے قلوپطرہ کی شان و شوکت کا مرقع کھینچتا ہے۔ ڈرامے کا یہ ٹکڑا شیکسپیئر کی بہت مشہور اور دلآویز نگارشوں میں سے ہے۔

انوباربس:-

کیا پوچھتے ہو اُسکے سفینے کی تم بہار — رکھا تھا دوشِ موج پہ اک تختِ زرنگار
کیا اُسکی آب و تاب کا عالم کہے کوئی — دریا میں ایک آگ تھی گویا لگی ہوئی
کشتی نہیں سریرِ مطلّا تھا سربسر — اک شعلہ وسطِ آب بھڑکتا تھا سربسر
فردوسِ آرزو تھا عروسِ نظارہ تھا — آغوشِ رودِ نیل میں اک مہ پارہ تھا
وہ عطر میں بسے ہوئے خوش رنگ بادباں — رنگت پہ جن کی قوسِ قزح کا سا تھا گماں
اُن کی مہک پہ صدقے ہوئی جاتی تھی ہوا — ایک ایک بل پہ سینکڑوں بل کھاتی تھی ہوا
دُنبالہ تک دُھلے ہوئے سونے کا تھا تمام — کرتی شعاعِ مہر بھی جھک جھک کے تھی سلام
چپّو سڈول، نقرئی، زرکار و آبدار — گویا حسین آنکھوں پہ پلکوں کی تھی قطار
ہر دم غضب کی خوبی سے پڑتا تھا اُن کا ہاتھ — شہنائی کی سُریلی صداؤں کے ساتھ ساتھ
کچھ اس ادا سے کرتے تھے دریا کے دل پہ وار — اس ناز سے تھپکتے تھے موجوں کو بار بار
ہوتی تھی تیز پانی کی رفتار اور بھی — اور دوڑتا تھا پیچھے کہ اک بار اور بھی!
لیکن بیان محال ہے خود اُسکے حُسن کا — نطق اُس کے سامنے نظر آتا ہے بینوا
اک سر پہ شامیانہ تھا زرکار، مخملی — اور اُس میں وہ بہارِ تماشا دراز تھی
وینس کا وہ مرقع، تخیّل کا شاہکار[لہ] — صنعت سے جس کی ہوتی ہے فطرت بھی شرمسار
دیکھو تو یہ کہو وہ مرقع بھی کچھ نہیں — کچھ اس ادا سے جلوہ نما تھی وہ مہ جبیں
دو طفل خوبرو تھے دو طرفہ چنور لئے — تھے ٹھوڑیوں میں جن کی غضب کے بھنور پڑے
یوں دونوں مسکراتے تھے کیوپڈ کی شان سے — اُترے ہیں جیسے آکے ابھی آسمان سے!
طرفہ تھا کچھ چنور کے ہلانے کا طور بھی — دہکا رہے تھے شعلۂ عارض کو اور بھی

اگریپا:- واہ رے انطنی تری قسمت!

انوباربس:- اب سُنئے آپ اُسکی خواصوں کی آن بان — جل پریاں تھیں کہ اُس پہ فدا کر رہی تھیں جان

لہ یہ اشارہ ایک قدیم یونانی مصور کے مشہور شاہکار کی طرف ہے۔ وینس حسن کی دیوی کا یونانی نام ہے۔

یوں چل رہی تھیں اُسکے اشاروں پہ ناز سے — سو سو ادا نکلتی تھی اک اک نیاز سے
پتوار پر کھڑی تھی کوئی چل پری سی نار — تھی کوئی بنتِ بحر طنابوں کی نگہدار
وہ ہلکے ہلکے ہاتھ وہ نازک کلائیاں — انگڑائیاں سی لیتے تھے مستی میں بادباں!
کشتی میں تھی عجیب و غریب ایسی کچھ مہک — لپٹیں سی اُٹھ کے آتی تھیں دریا کے پار تک
اُس وقت انطنی کا بھلا کس کو ہوش تھا — دربارِ عام شہر میں سوتا ہی رہ گیا
خلقت تمام ٹوٹ پڑی اس نظارے پہ — سیٹی بجا رہے تھے ہوا میں خیال اُدھر
جاتی ہوا بھی سیر کو اُس دم عجب ہے کیا — فطرت میں یہ کہو کہ خلا ہی محال تھا

اگریپا :۔ کیا کہنا ملکۂ مصر کا!

اِنوباربس :۔ اُتری ہے جب کنارے تو یہ عرض کی گئی — کھانے پہ یاد شام کو کرتے ہیں انطنی
بولی کہ جاکے دو مری جانب سے یہ پیام — بہتر ہے آپ ہی مرے مہماں ہوں آج شام
اب کس طرح بھلا کریں انکار انطنی — عورت نے اُن سے "نا" تو سُنا ہی نہیں کبھی
جکڑے گئے خیال وہیں قصہ مختصر — دعوت میں پہنچے ملکۂ عالم کے محل پہ
اور نقدِ دل بدل میں ضیافت کے دیدیا — جس کا فقط نگاہ نے اُن کی مزا لیا

۴

اگریپا :۔ واہ رے میری ملکہ جان! [1]

اِنوباربس :۔ اک روز سیر کرنے جو بازار میں گئی — اٹھلا کے تھوڑی دور عجب ناز سے چلی
دم اس خرامِ شوخ سے کچھ پھول سا گیا — بولی تو جیسے بات کوئی بھول سا گیا!
بے حال ہونے میں بھی عجب حال اُس کا تھا — ناطاقتی میں اور سوا زور آ گیا!

میکناس :۔ پر اب تو چھوڑ دیں گے اُسے شاید انطنی؟

اِنوباربس :۔ جی اُن کی کیا مجال جو چھوڑیں اُسے کبھی!
کُمھلائے اُس کو گردشِ دوراں محال ہے — برگشتہ اُس سے ہو دلِ انساں محال ہے
جادو نہ جس پہ گردشِ دوراں کا چل سکے — افسوں سے اُسکے کیا کوئی انساں نکل سکے
ہر آن میں نئی ہے وہ ہر حال میں عجیب — یہ طرفگی و تازگی ہوگی کسے نصیب
وہ عورتیں جو جی سے اُتر جائیں اور ہیں — تسکین میں بھی یاں تو طلب ہی کے طور ہیں
کیا سیر اُس کے وصل سے ہوگا کسی کا جی — ظالم بجھا بجھا کے لگاتی ہے اور بھی!
بدمستیاں بھی اُس کی ہیں اس درجہ دلنشیں — کرتے ہیں زاہدانِ مقدس تک آفریں!

---

[1] Royal wench، اس جملے کے لئے اس سے زیادہ مناسب الفاظ نہیں ملے! (مترجم)

شاہد صدیقی اکبر آبادی

اک حسین منظر

فضائے دشت پہ شادابیاں سی چھائی ہوئی
درخت دھوئے ہوئے پتیاں نہائی ہوئی

لطیف و سرد ہوا، وادیوں میں گرم خرام
شبابِ عشق کی آبادیوں میں گرم خرام

ہوائے سرد میں شامل طیور کی آواز
کہ جیسے خواب میں آتی ہو دور کی آواز

فرازِ کوہ سے شفاف آبشار رواں
سوئے نشیب، تماشائی بہار رواں

افق پہ ابر کے ٹکڑے ہیں جھاڑیوں پہ دھواں
زمیں پہ سبزۂ تازہ، پہاڑیوں پہ دھواں

ہر ایک بوند سے پیدا ہے اک ترنم سا
کہ جیسے رقص میں آتی ہے گھنگروؤں کی صدا

۴۱

کہیں نشیب میں شاداب کھیت دھانوں کے
ہرے لباس میں کچھ حوصلے کسانوں کے

کہیں سکوت، کہیں طائروں کی آوازیں
خموش و صاحبِ دل شاعروں کی آوازیں

کسان مست ہیں، پھولے نہیں سماتے ہیں
بڑے غرور سے کھیتوں کی سمت جاتے ہیں

کسی نے پھینکے ہیں قطرے کچھ اس قرینے سے
کہ ہیں گلوں پہ چمکتے ہوئے نگینے سے

لچک رہی ہے زمیں، گنگنا رہی ہے بہار
عروسِ وقت کو جھولا جھلا رہی ہے بہار

ہوا میں ایک مہک سی ہے جس کا نام نہیں
یہی مہک تو کہیں حاصلِ مشام نہیں؟

بہارِ سادہ، طبیعت کو گمرہی کا پیام
دلِ خراب کو، ہر چیز بیخودی کا پیام

مری نگاہ سے فطرت کو اجتناب سا ہے
کہ ان حسیں مناظر پہ اک حجاب سا ہے

تاثرات کی حد سے گزر رہا ہوں میں
یہ بات ہے کہ تجھے یاد کر رہا ہوں میں

فضائے گُل میں بھٹکتا ہوں کھو نہ جاؤں کہیں
میں اس بہار میں تحلیل ہو نہ جاؤں کہیں

حسن یحییٰ عندلیب ایم۔ اے

تخریب کا ترانہ

ہر شے پہ جہاں کی طاری ہے اک خوف سا صبح و شام مرا
دیکھو گے جسے پاؤ گے اسیرِ خطرۂ زیرِ دام مرا
اک تہلکہ سا اک زلزلہ سا، ہوتا ہے ہر ہر گام مرا
مشرق میں قدم پہنچا تا ہے یہ مغرب تک پیغام مرا
بیدردی و خوں ریزی و تخریبِ جہاں ہے کام مرا

آہٹ سے مری مچ جاتی ہے، ہلچل محلوں، ایوانوں میں
شعلوں کے سمندر بہتے ہیں، صحراؤں میں، کاشانوں میں
شورش میری وحشت افزا حیوانوں میں، انسانوں میں
جو زور ہے میرا زور کہاں، وہ آندھی میں، طوفانوں میں
مست و بیخود ہو جاتے ہیں، جو پی لیتے ہیں جام مرا

آبادیوں میں، ویرانوں میں، دریا کی طرح میں بہتی ہوں
ملکوں کی سیاحت کرتی ہوں، قوموں کو مٹاتی رہتی ہوں
میں طعن و ملامت، ظلم و ستم، دنیا میں سبھی کچھ سہتی ہوں

خوابیدۂ غفلت قوموں سے، پر بات کھری میں کہتی ہوں
قوموں کو جگانے آتی ہوں، ہے گرچہ تباہی نام مرا

صدیوں کے خمار آلودہ بھی، ٹھوکر سے مری اٹھ جاتے ہیں
ہر چند مچلتے، روتے ہیں، گھبراتے ہیں، چلاتے ہیں
مسدود مگر راہیں سب، جب اپنے لئے وہ پاتے ہیں
میدانِ وغا میں تیغ بکف ناچار چلے ہی آتے ہیں
بازاروں میں گلیوں میں برپا ہر جا ہے کہرام مرا

مہمل ہیں سب حال و ماضی، رہتی ہے نظر مستقبل پر
رکھتا ہے سفینہ کب میرا کاشانۂ موجِ ساحل پر؟
سب جور و جفا سہہ جاتے ہیں، جو کچھ بھی گذرتی ہے دل پر
ڈھاتی ہیں شکستہ تعمیروں کو، جا لگتی ہوں منزل پر
پیغام نظامِ نو کا ہے تخریب کا یہ ابرام مرا

تاریک اندھیری راتوں کو، تنویرِ سحر میں دیتی ہوں
ہاں تشنہ لبِ اسکندر کو بھی، آبِ خضر میں دیتی ہوں
عصفور کے نازک سینے کو، شاہین کا جگر میں دیتی ہوں
یخ پاروں کو بادل کی گرج، بجلی کا اثر میں دیتی ہوں

آغاز مرا تخریب سہی، تعمیر ہے ترا انجام مرا

صیاد کے رخشاں خنجر سے اب، مرغِ بسمل پھڑکے کیوں؟
لو شمعِ بزمِ عشرت کی اب، خوفِ سحر سے بھڑکے کیوں؟
گلزارِ جہاں میں موجِ صبا سے، پتّہ کوئی کھڑکے کیوں؟
پیکانِ شعاعِ مہر سے آخر سینۂ شبنم دھڑکے کیوں؟
سایہ افگن سب پر یکساں ہوتا ہے لطفِ عام مرا

دیوانۂ راحت ڈرتا ہے، کلفت کے فسانے باقی ہیں
پنہاں ہے نظر سے آبِ بقا، ظلمت کے فسانے باقی ہیں
پر ہے یہ حقیقت میرے سبب، بہجت کے فسانے باقی ہیں
عشرت کے ترانے قائم ہیں، جرأت کے فسانے باقی ہیں
مخمورِ طرب کر دیتا ہے اک جامِ مئے آلام مرا

ہر قطرۂ اشکِ رنگیں میں، اک موجِ تبسم لرزاں ہے
ہر کرب و بلا کے دامن میں، اک روحِ مسرت خنداں ہے
ہر ضرب میں طبلِ جنگ کی مضمر نغمۂ سازِ شبستاں ہے
ہر سلسلۂ تخریب میں بس، تعمیر کا شعلہ رقصاں ہے
ہاں جوئے شیر بھی لاتا ہے، یہ تیشۂ خوں آشام مرا

تسکینِ قلوبِ مضطر ہوں، خونناب مری تصویر سہی
ہوں موجِ سحر، پروردۂ صد اظلام مری تنویر سہی
پیغامِ حیاتِ نو ہوں میں، آلودۂ خوں شمشیر سہی
چاؤش ہوں میں آزادی کی، آوردۂ صد زنجیر سہی
تحریرِ مسرت ہے نقشِ پائے فرخ فرجام مرا

مایوسیوں کو، محرومیوں کو امید سے ٹکر لینے دو
ضحاکِ فرومایہ کو بھی جمشید سے ٹکر لینے دو
مریخ اجل پیغام کو بھی ناہید سے ٹکر لینے دو
اب عہد ہے میرا ذرّہ کو خورشید سے ٹکر لینے دو
اک سیلِ کرم ہو جائے گا، غم پرور یہ ادغام مرا

حسرت موہانی

در وصفِ امینہ خانم

(مولانا حسرت موہانی کی جدید غزلیں)

(ایشیا پر مولانا حسرت کا یہ کرم ان کی شاعری کی طرح یادگار و جاودانی ہیگا۔ ساغر)

(جہاز رحمانی مورخہ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۱ء)

(جملہ حقوق محفوظ)

دل ہے نازاں کہ تری صورتِ زیبا دیکھی　　آنکھ حیران کہ اک حُسن کی دُنیا دیکھی
پہلے آنکھیں ہوئیں گرویدہ پہ آنکھوں کیطرح　　چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی
بدگماں مجھ سے بھی کیوں غیر کے مانند ہوئے　　مجھ کو دیکھا نہ مرے دل کی تمنا دیکھی
فطرتِ حسن ہے بیباک مگر ہم نے یہاں　　تیری شوخی میں بھی اک شانِ محابا دیکھی
زلفِ شب رنگ پہ گلنار لباسی کی بہار
آج حسرت نے رُخِ یار میں کیا کیا دیکھی

(۲)

(یکم فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

گر حسن دولتے است، نہ گنجش امینہ　　ور ناز خاتمے است، بہ زیبش نگینہ
شبہا بسے بہ عیش، بسر بُردی وہنوز　　مخمورِ آں خمارِ لطیف و شبینہ
حسرت بہ عرض شوق زکو شد کہ فی المثل
شایانِ سنگِ ہرزہ نہ آبگینہ

(۳)

(۲ر فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

عجب ہم کو آیا نظر ایک آج　　طرحدار معشوقِ عاشق مزاج
دل اس کا محبت کے غم سے قریں　　نظر اس کی سوزِ دروں کی امیں
توجہ کا لے جو تغافل سے کام　　کرم جس کی بے اعتنائی کا نام
بچے اُس سے کیونکر دلِ عاشقاں　　جسے خود ہو سودائے حُسنِ بُتاں
وہ حسرت نہ کیوں دل نوازی کرے　　جو چھپ چھپ کے خود عشق بازی کرے

ہر دم انہیں یاد ہے کسی کی　　چھپتی نہیں بات عاشقی کی
دل شاہدِ حُسن کا طرفدار　　آنکھیں غمِ آرزو سے خوں بار
شوق اس کا بری خود التجا سے　　بیگانہ ہے عرضِ مدعا سے
کردار ہیں ہیں سب اسکے مستور　　معشوقی و عاشقی کے دستور
حسرت ایسوں کی پائے بوسی
کچھ عیب نہیں قسم خدا کی

(۴ر فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

کس درجہ دلپذیر ہے پر نقش یہ خواب کی　　آئینہ دار آپ کے حسن و شباب کی
کرتی ہے دل کو اور بھی آمادۂ ہوس　　تیری یہ بے رُخی یہ ادا اجتناب کی
اہلِ نظر سے آپ کو لازم نہیں حذر　　ہوتی ہے اہلِ فسق سے حاجت حجاب کی
کچھ ان کو قدرِ شوق نہیں، ورنہ آرزو　　امیدوار بھی کرمِ بے حساب کی
حسرت وہ بے نیاز محبت ہیں کچھ انہیں
ابتک خبر نہیں ترے حالِ خراب کی

۴۴

(۴ر فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

پھر کہاں دل رہے کہاں نہ رہے　　جب تمہیں اُس پہ مہرباں نہ رہے
خود غرض عشق، رعبِ حُسن کو بھی　　چاہتا ہے کہ درمیاں نہ رہے
دل شکن کیوں بنو ہمارے لئے　　تم یہ مانا کہ دلستاں نہ رہے
یاس بہتر ہے، دیکھنا وے مہر　　آرزو کوئی نیم جاں نہ رہے
ہم بھی کہدینگے پیر حسرت کو
عشقِ حسرت اگر جواں نہ رہے

(۵ر فروری ۱۹۴۱ء جہاز رحمانی)

ہمنے ہر ہر بات اپنے حق میں جانی آپکی　　مہربانی ہو کہ نامہربانی آپ کی
ہے نرالی سبز کی بھی رنگِ روشن پر بہار　　اوڑھنی بہتر تھی لیکن ارغوانی آپ کی
خود غرض ہم کو بھی ٹھہرایا جو غیروں کی طرح　　دیکھئے اچھی نہیں یہ بدگمانی آپ کی
آپ کے معشوق ہو کر عاشقی کی داستاں　　کاش ہم بھی ایک دن سُنتے زبانی آپ کی
اس گلِ رعنا کا حسرت یوں ہی کیا عالم تھا جما
ہو گئی ہے طرہ جس پر خوش بیانی آپ کی

۶ر فروری ۱۹۴۱ء
نہ پوچھو خاطرِ بسمل میں کیا ہے
یہ خود سوچو تمہارے دل میں کیا ہے
بنائے جہدِ پیہم ہو تو خطرہ
فریبِ دوریِ منزل میں کیا ہے
سزا دو گے ہمیں کب تک کہاں تک
خدا جانے تمہارے دل میں کیا ہے
نظر مجرم ہے، پر لوثِ ہوس کے
تمہارے دعویٔ باطل میں کیا ہے
دعا کر وہ ملیں خود، ورنہ حسرت
تری اس سعیٔ بے حاصل میں کیا ہے

۹ر فروری ۱۹۴۱ء جہازِ رحمانی
ہر سمت مری چشمِ تمنا نگراں ہے
معلوم نہیں جلوۂ جانانہ کہاں ہے
شاید یہ وہی ہے جو مرے شوقِ نظر کے
باطن میں تو موجود ہے ظاہر میں نہاں ہے
۴۴ عاشق جسے کہتا ہے محبت کا قرینہ
بدعت کا اُسی چیز پہ زاہد کو گماں ہے
کونین کی راحت سے بھی زنہار جو بدلے
دل دردِ محبت کا ترے مرتبہ داں ہے
حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورتِ حق کا
گو اس کی نظر شیفتۂ حسنِ بتاں ہے

۱۹ر ستمبر ۱۹۴۱ء (کانپور)
جب سوا میرے نہ تھا کوئی نشانہ تیرا
یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ زمانہ تیرا
پاکے وہ گرمِ نظر مجھ کو سرِ عرشِ جہاز
کبھی چھپنا تو کبھی پھر نظر آنا تیرا
میرے اصرار پہ وہ ہاتھ چھڑا کر آخر
دستخط آپ سے اُردو میں بنانا تیرا
کج ادائی کے لئے شوق کو ٹھہرا نہ ہوس
مجھ سے کچھ خوب نہیں ہے یہ بہانہ تیرا
رامِ اخلاص نہو، جن کی مروّت حسرت
کیا قیامت ہے دل ایسوں سے لگانا تیرا

۲۲ر نومبر ۱۹۴۱ء (کانپور)
قیمت مے کہ یہ پیمانۂ جاں ہے ساقی
کون کہتا ہے کہ یہ نرخ گراں ہے ساقی
الحمد، کہ رندوں میں علی الرغمِ حسود
سکّۂ فیض ترا اب بھی رواں ہے ساقی
تشنہ کامانِ مے ناب ہیں، جاں برلبِ شوق
کرم اب بھی نہیں دشوار، کہاں ہے ساقی
تو نے رکھ دی تھی جہاں چھین کے ہم سے بوتل
روحِ مستی اُسی جانب نگراں ہے ساقی
دل ہے کس مے کا طلبگار خدا ہی جانے
کیا ہمیں سے ہے کہ بے نام و نشاں ہے ساقی
محتسب کی دشمنی ہے نہ سُنے گا حسرت
کہ وہ مے خوار ترا مرتبہ داں ہے ساقی

لہ Hasrat Mohani (جہاز رحمانی)

ساغر نظامی

انعکاسات

غرقابی تقدیر ہے جب، پھر دل کو ہراساں کون کرے
کشتی کشتی کون پکارے، طوفاں طوفاں کون کرے

وحشت میں اک وقفے کے اسرارِ نمایاں کون کرے
داماں ٹکڑے ٹکڑے کرکے داماں داماں کون کرے

کون جگائے کلیوں کو پھولوں کو پریشاں کون کرے
صبح سویرے گلشن میں توہینِ بہاراں کون کرے

الفت کی مجبوری کو اس درجہ ارزاں کون کرے
لے دے کر اک مشکل ہے اب اسکو آساں کون کرے

مشکل مشکل سب کہتے ہیں، جیسے اُن کی مشکل ہو
دیکھیں ان تن آسانوں میں مشکل آساں کون کرے

طوفاں ہے اور اس کا تکبر، دریا ہے اور اس کا غرور
سب کچھ بے اندازہ ہے، اندازۂ طوفاں کون کرے

چار گرہ کپڑے کی خاطر، سرِ وحشت کیوں کھولیں
چاک ہوا، سو چاک ہوا، اب ذکرِ گریباں کون کرے

پہلے زبان کہتی ہے اُن سے دل کی بپتا یا نظریں
دیکھیں اُن کی محفل میں یہ کارِ نمایاں کون کرے

جان سی پڑ جائیگی ابھی ان مردہ مردہ پھولوں میں
صبح سویرے نکہتِ گل پرّاں کو خراماں کون کرے

لے گیا کوئی چھین کے وہ شے جس سے تن من گاتے تھے
تو ہی بتا اے تلخیٔ غم، ساغر کو غزلخواں کون کرے

(اٹارسی سے حیدرآباد تک ریل میں۔ ۸ جون ۱۹۴۲ء)

۴۵

دو غزلیں

آخری آنسو

تم جو جاتے ہو تو حسرت کو مٹاتے جاؤ
خاک میں عہدِ تمنّا کو ملاتے جاؤ
روشنی یہ بھی رہے کیوں مرے غم خانے میں؟
شمعِ امید جو باقی ہے بجھاتے جاؤ
بھول جاؤ کہ کوئی عہد کیا تھا تم نے
اب مروّت کی ہر اک رسم اٹھاتے جاؤ
ہم بھی خود حال نہ اب دیکھ سکیں گے دل کا
جا رہے ہو تو ذرا شمع بجھاتے جاؤ
ہوش بھی ساتھ لئے جاؤ جو تم جاتے ہو
آج اک جام مجھے اور پلاتے جاؤ
تم نے جس نغمے سے بیدار کیا تھا غم کو
پھر وہی نغمۂ غم آج سناتے جاؤ
دل تڑپنے کا تو ساماں کئے جاتے ہو
دل کی تسکین کی صورت بھی بتاتے جاؤ
یہ بھی اک داغ رہے گا دلِ ویراں کیلئے
میری حالت پہ نہ تم اشک بہاتے جاؤ
جاؤ جاؤ کہ یہی تھا صلۂ عہدِ وفا
جاؤ جاؤ مجھے رو رو کے رلاتے جاؤ
جا کے آنے کا یہ وعدہ جو کیا ہے تم نے
جانِ حسرت کی قسم آج بھی کھاتے جاؤ

حسرت ترمذی۔ بی۔ اے۔ ایل ایل بی

فکرِ عالی

عطا جب اس نے مجھے دردِ ہجر فرمایا
الم نے رقص کیا عشق وجد میں آیا
ترے فراق میں ایسا بھی ایک وقت آیا
کہ دل نے بارِ مصائب پہ ناز فرمایا
ترا بذاتِ خود آنا تو اور ہی شے ہے
ترا خیال بھی آیا تو کیف بار آیا
ہمیں نے راہِ محبّت کو طے کیا ورنہ
قدم قدم پہ تمہارے کرم نے بہکایا
جہاں نہ قدرِ محبّت نہ احترامِ وفا
وفورِ شوق مجھے کس جہاں میں لے آیا
الٰہی خیر وہ ہے التفات پہ مائل
نشیب آئے تو آئے فراز بھی آیا
برا کیا کہ سُنی آپ نے نہ عرضِ عدو
کہاں کہاں سے تو الفاظ ڈھونڈ کر لایا
وہ تیرے غم کو بھلا کیسے جان لیں عالی
ابھی تک ان کو کوئی سانحہ بھی پیش آیا

جمیل الدّین احمد عالی

مخدوم محی الدین حیدرآبادی

ستارے

جاؤ جاؤ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ
رات رات بھر جاگ جاگ کر کس کو گیت سناتے ہو
چپ چپ رہ کر جھل مل جھل مل کس بھاشا میں گاتے ہو
جاؤ جاؤ ــــــــــــ

رات اندھیری کالی کالی، کس سج دھج سے آئی ہے
میرا کیا ہے، میں سودائی، تاروں کی رسوائی ہے
جاؤ جاؤ ــــــــــــ

ہم جس نگری میں رہتے ہیں، وہ نگری کیا دیکھو گے
ہم جس بستی میں بستے ہیں، وہ بستی کیا دیکھو گے
جاؤ جاؤ ــــــــــــ

آپ تن آسان راج دلارے، میں وحشی طوفان بدوش
میری دنیا، میلِ مسلسل، آپ کی دنیا سیلِ خموش
جاؤ جاؤ ـ چھپ جاؤ ستارو
جاؤ جاؤ تم چھپ جاؤ

ایشیا ـ اگست ۱۹۴۲ء

47

خورشید الاسلام بی - اے (علیگ)

شکست

شگوفے کھل رہے تھے، وقت بھی دم لیکے چلتا تھا   سپیدہ آسماں کی مہرِ پستاں سے اُبلتا تھا
ستارے سے رواں تھے، طائروں کی نغمہ کاری میں   چھپی بیٹھی تھی خوشبو لالۂ و گل کی عماری میں
فلک پر کچھ لجائی سی کہیں، ابرک کی نیّا تھی   کنول کے پھول میں بہتی ہوئی بزمِ ثریّا تھی
خیالوں میں مجھے یاقوت کی مینا نظر آئی   بہت کرنیں لئے تصویرِ آئینہ نظر آئی
شعاعِ اوّلیں نے بڑھ کے چوما عشقِ پیچاں کو   شراب رنگ لے کر بہ گئی تختِ سلیماں کو
مری تخئیل کی اک جست نے پرویں کو شرمایا   فضا نے بادۂ انگور ہو کر، کیف برسایا

عجب آئینہ خانہ تھا عجب جلوہ گری دیکھی   غبارِ گردشِ فانوس میں بھی ساحری دیکھی
جبیں میں ذوقِ سجدہ اس طرح جھوما بہار آئی   اُدھر اک زمزمہ اُٹّھا، ادھر صوتِ ہزار آئی

معاً، بلقیس کے رُخ سے نقابِ یاسمن اُٹھا   لئے فردوس پلکوں پر، ہر اک نقشِ چمن اُٹھا
یہ جی چاہا کہ میں بھی حُسن کے قدموں پہ جھک جاؤں   فلک کی آسیا بھی رُک گئی ہے میں بھی رُک جاؤں

ندا آئی کہ اے حُسنِ مجازی کے تمنّائی   نہ تجھ میں اُوس کی ٹھنڈک، نہ تجھ میں گُل کی رعنائی
تجھے ہے نقص کا احساس، یہاں ہر نقش آبی ہے   نہیں قربِ جمال اچھا کہ یہ عالم سرابی ہے

پشیماں ہوں میں، اپنے شوق کی پرواز سے اب بھی   لرز جاتا ہے دل گو حُسن کی آواز سے اب بھی

نئی کہانی

نئی کہانی

جذباتی کیڑے — سڑک — شام — بیگم

انسانی زندگی نفسیاتی الجھنوں کی ایک نہ بوجھی جانے والی پہیلی نہیں تو کیا ہے'-!؟ ورنہ فطرت کہیں تو محدود ہوتی'!؟ کیسی نیرنگیوں' اسرار اور تضادوں سے معمور ہے یہ ہماری دُنیا' اور اس دُنیا کے بسنے والے اور ان بسنے والوں کے گوشت و پوست کے اندر چھپا ہوا' اک لامتناہی جہان!! اس اسرار اور طلسم پر قابو پانے کیلئے انسانی عقل و خرد نے سر توڑ کوشش کی مگر اس کے معمولی سے بھید کو بھی نہ پا سکے؛

پُرانے داستان گو اپنی اپنی کہہ کر فسانہ ہو گئے' اب "نئی کہانی" کہنے والوں کی باری ہے' یہ کہانی سُنانا چاہتے ہیں' گزرے ہوؤں سے آزاد ہو کر' ان کے الفاظ میں اگلا سا شکوہ نہیں' طنطنہ نہیں' مگر سادگی ہے' صداقت ہے اور جستجو کی چنگاری ہے' بیباک چنگاری' جو سُننے والوں سے ٹکراتی اور روشنی بکھیرنے میں کوئی تکلف نہیں کرتی؛

۵۰ یہ زندگی کی اوڑھنی میں جواہر ٹانک کر اس کو وزنی اور تیرہ و تار نہیں کرتے' کھلی فضا اور نسیمی ماحول میں لا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کا بھید پا جانا چاہتے ہیں؛

سچ ہے' قدیم اطالوی بُت تراشوں کی طرح' ان نئے حسن کاروں کا مقصد بھی اک آزاد مشاہدہ ہے' یہ کائنات بھر کو پس منظر بنا کر دروپدی کے ہارنے اور عریاں ہونے کا منظر پیش کرنا چاہتے ہیں' مگر پانڈو کی طرح یہ بے حیا نیت نہیں کھلتے۔ آزاد اور متجسس فضا میں یہ زندگی کو اس کے حقیقی خدوخال میں دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں؛

کیسے نظر باز ہیں' یہ نئے لوگ'۔ ان نئی کہانی کہنے والوں میں سب ہی نئے ہیں' مدھوسودن' پرتھوی ناتھ شرما اور رام پرتاپ۔

ہر کہانی کہنے والا زندگی سے بہت قریب ہے' اتنا قریب کہ وہ اس کے چہرہ پر آتے جاتے ہوئے مختلف رنگ بھی دیکھ سکتا ہے اور اس کے دل کی دھڑکن بھی سُن سکتا ہے' مدھوسودن کی کہانی کا پلاٹ پریوں کی اَن دیکھی زمین سے لیا ہوا نہیں بلکہ ہمارے ہی روزمرہ کے افعال کا ایک پرتو ہے' اس کے کردار وہی چلتے پھرتے سائے ہیں جو صبح و شام ہمارے گرد گھومتے رہتے ہیں اور اس کا اسلوب بیان سادہ اور لوچدار ہے

مدھوسودن کی کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا نفسیاتی تجزیہ ہے وہ انسان کی نفسیات میں اتنا گہرا جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھاتیں اور جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اس پر مسکراتا ہوا ایک ہلکے سے طنز کے پردہ میں لپیٹ کر اپنے خیال کی دُنیا سے باہر پھینک دیتا ہے' کچھ دیکھنے والے اس پر کڑھتے ہیں' کچھ دانت پیستے ہیں اور کچھ محض دل مسوس کر رہ جاتے ہیں' ہمارے گرد اس سماج کے گندے تالاب میں اکثر جذباتی کیڑے کلبلاتے رہتے ہیں'۔ پرتھوی ناتھ شرما کی بول چال کنول کی طرح شگفتہ' خوشبو کی طرح فرحت زا اور شاخوں کی طرح لچکیلی ہے "سڑک" پر زندگی کی اتنی بڑی حقیقت بیان کرنے میں بیباک ہیں' جنسی بھوک مطلق بھوک سے مغلوب ہے' زندگی کی تھکان کو حسن و محبت کی لوری بھی نہیں اُتار سکتی' ترغیبات دل پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں مگر ہمارا سفر برابر جاری رہتا ہے۔

رام پرتاپ کی شام انوکھی ہوتی ہے' ان کی عادت ہے' ریت میں سے چاندی اور مٹی میں سے ہیرا نکالنے کی۔ زندگی کے عمومی مناظر میں سماجی و سیاسی مسائل اور مخصوص نفسی نتائج کی تخم ریزی کرتے ہیں' نفسیات کی رفتار' اور تاثرات کی پیہم دھڑکنوں میں ان کی کہانی کا نقطۂ عروج شروع ہوتا ہے اور یہیں سوچ وچار کی دُنیا میں تنہا چھوڑ کر دھندلا پڑ جاتا ہے' جا بجا طنز کے گہرے چھینٹے رنگ اور بھی گہرا کر دیتے ہیں'۔ ان کی شکنتلا جیتی کے آگے ہیچ ہے' شرما کی چھائی ہوئی تصوریت جیتی کی طالق ہے' وہ بلا خوف ایک جہاں سوز ہستی کو سرائے جیسی عام جگہ بھیج دیتے ہیں' جیتی کا مصنف شکنتلا کے مصنف کے مقابلہ میں زیادہ شاعر ہے' اور عجیب بات یہ ہے کہ زیادہ اخلاقی بھی ہے' اس کے مسافر کا شیشہ چٹان سے ٹکرا کر بھی شیشہ ہی رہتا ہے' لیکن اس کی زبان اور بیان کی نکھری ہوئی کامل افسانویت مشکل ہی سے ان باتوں کی طرف توجہ کرنے دیتی ہے؛

رام پرتاپ زندگی کی جزئیات میں اس قدر گم ہوتا ہے کہ وہ ہماری محسوس اور دیکھی ہوئی چیزوں کا ذکر جن میں ہمارے لئے کوئی رومانیت نہیں' مثلاً گاندھی جی جواہر لال' کانگریس' وغیرہ) ذکر ضرور کرتا ہے؛ اس کی کہانی میں' ایک سوچنے والا دماغ اور بہنے والا دل دھڑکتا ہے' رہی زبان' سو مجبوری ہے' ہندی کے افسانہ نگار اُردو کی بندش' ترتیب اور الفاظ کے جانے بوجھے محلات استعمال کو لکھتے ہی لکھتے لکھیں گے؛

جیتی اور شکنتلا کے ساتھ "بیگم" بھی کچھ کم نہیں' یہ چیخوف کی ایک مختصر کہانی ہے' جسے مسعود زاہدی نے ترجمہ کیا ہے؛

ساغر

مدھوسودن

جذباتی کیڑے

صبح جب وہ اٹھا تو دن چڑھ آیا تھا۔ اور دھوپ کی زرد کرنیں کھڑکی کے شیشوں سے آکر اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ پیپل کی نوزائیدہ ٹہنی کھڑکی پر جھکی ہوئی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہل رہی ہے اور شکنتلا نیچے جھکی ہوئی اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اچانک اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ اُدر اس نے اپنی آنکھیں کھولدیں۔ سردی آج پھر زیادہ تھی۔ برابر کے مکان میں رہنے والے پنڈت جی۔ جو پنڈت بھی تھے اور کلرک بھی اپنی پوجا ختم کر چکے تھے اور اَب وہ گھنٹی بجا بجا کر آرتی کر رہے تھے۔ اور اُن کا بڑا لڑکا غسل خانے میں "پیا ملن کو جانا" گا رہا تھا۔ اس کے اونچے اونچے بے ہنگم سُر پنڈت جی کی گھنٹی کی آواز کو مغلوب کئے جاتے تھے۔ اسے گانا بھی تو نہیں آتا۔ نریندر نے سوچا، لیکن یہ پنڈت جی پیا ملن کو جانا کیوں نہیں گاتے، کیا پنڈت جی ——— لیکن وہ آگے نہ سوچ سکا۔ پنڈت جی کی آرتی ختم ہو چکی تھی۔ اور اب وہ اپنے بیٹے پر برس رہے تھے ——— بدمعاش، آوارہ، پیا ملن کو جانے کا بچّہ، بے شرم، شرم نہیں آتی تجھے، ماں باپ، بہن، سب کے سامنے الاپنے لگتا ہے، بیہودہ، بدتمیز.....

پنڈت جی بہت دیر تک کچھ کچھ کہتے رہے اور نریندر کی سمجھ میں آگیا کہ پنڈت جی پیا ملن کو جانا کیوں نہیں گاتے۔ اس نے سوچا کہ شاید پنڈت جی گنگنانا نہیں چاہتے اور پیا ملن کو جانا اونچی آواز میں نہیں گایا جا سکتا کیونکہ محبوب سے ملنے تو چُھپ کر جایا جاتا ہے جیسے چوری کرتے ہوں اور چوری کے ارادہ کا اعلان اتنے زور سے تھوڑا ہی کیا جاتا ہے، اُس نے سوچا کہ پنڈت جی اپنے لڑکے کو ٹھیک ہی ڈانٹ رہے ہیں ورنہ خواہ مخواہ وہ کسی دن کسی پیا کے ساتھ پکڑا جائیگا اور پیا کے بھائی، رشتہ دار اور محلّہ والے جوتے مار مار کر اس کا بھُرکس نکال دیں گے لیکن پیا ملن کو جانا ——— اور اُسے پھر شکنتلا کا خیال آگیا۔

شکنتلا کو کل اُس نے اُس چوک کے اوپر کھڑکی میں دیکھا تھا یہ چوک ایک بہت بڑے مکان کا عقبی صحن تھا جس کی کھڑکیاں اِدھر کھلتی تھیں۔ ایک بڑے سے پیپل کے درخت نے اس صحن پر سایہ کر رکھا تھا اور اُس کی ایک شاخ کل اس کھڑکی پر جھکی ہوئی تھی۔ شکنتلا کل اسی کھڑکی میں اُسے نظر آئی تھی۔ یوں تو وہ شکنتلا کو مدّتوں سے دیکھتا چلا آیا تھا لیکن کل وہ اپنے چند ہم عمر دوستوں کے ساتھ جو اسی محلّہ کے باشندے تھے صحن میں کھڑا ہوا بچّوں کو کھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں جب اس نے اپنے ایک ساتھی کو کئی بار چھپی چھپی نظروں سے اوپر دیکھتے ہوئے دیکھا تو اس کی نظر آپ ہی آپ اوپر چلی گئی ——— پیپل کی نوزائیدہ شاخ کھڑکی پر جھکی ہوئی تھی۔ اب وہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہل رہی تھی۔ کھڑکی میں سے جھُکی ہوئی چند لڑکیاں نیچے جھانک رہی تھیں۔ اور اُن کے درمیان اُس نے شکنتلا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔

نریندر کو اُوپر دیکھتا ہوا دیکھ کر شکنتلا نے مُنہ پھیر لیا تھا لیکن اتنی سی بات نے کہ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی، اس کے جذبات میں ایک شدیدہ حرکت پیدا کر دی، خوشی، تجسُّس، اور ایک بے نام سے جذبہ کی عجیب سی لہر اور ایک اجنبی سا احساس برتری، غیر شعوری، غیر محسوس۔

جنسی فاقہ پرستی کرتے کرتے اُس کی حِس اب بہت نازک ہو گئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات اس کے جذبات کو بھڑکا دیتی تھی۔ کوئی عورت یونہی سرسری نظر سے بھی دیکھ لیتی تو اُسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ خصوصاً اس سے متوجہ ہے۔ وہ محبّت کرنا چاہتا تھا لیکن اُسے کسی ایسی لڑکی سے محبت نہ ہوتی تھی جو التفات نہ کرے۔ اس کا تخیل بار بار اُسے فریب دیتا تھا کسی بھی لڑکی کے ایک بار غور سے دیکھ لینے پر وہ سوچتا تھا کہ یہ مجھے پسند کرتی ہے اور صرف یہ احساس ہی اُس کے دل میں اس لڑکی کے لئے محبت پیدا کر دیتا۔ شدید جذباتی محبّت، لیکن لمحاتی۔ کیونکہ اس کے تخیل کا فریب زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہتا تھا۔ اور اُسے جلدی ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ اور وہ سوچتا کہ کیا لڑکیاں محبت کرنا نہیں چاہتیں۔

شکنتلا اس وقت اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس نے غیر شعوری طور پر اپنے ہاتھ پتلون کی جیب سے نکال کر اپنے سینہ سے باندھ لیئے اور واضح حرکتوں کے ساتھ بلند آواز میں اپنے دوستوں سے باتیں کرنے لگا اسے بات بات میں ہنسی آنے لگی اور اُس نے اپنے دوستوں کو چھیڑنا شروع کر دیا۔ اُس نے اُن پر بلند آواز میں فقرے بھی کسے تھے۔ شاید شکنتلا نے اُنھیں سُنا ہو۔ ان سب باتوں کے دوران میں اُسے صرف یہی احساس رہا کہ وہ میری باتوں کو سُن رہی ہے، مجھے دیکھ رہی ہے۔ کئی بار اُسے

خواہش ہوئی کہ اوپر دیکھے، لیکن ہر بار اُس نے اس خواہش کو اپنے سینہ میں دبا دیا تھا ایسا نہ ہو کہ اُسے اوپر دیکھتا ہوا دیکھ کر وہ پھر منہ نہ پھیر لے اس سے اچھا تو یہی ہے کہ وہ ہی اُسے دیکھتی رہے۔

اور رات وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا کہ آخر وہ اُسے کیوں دیکھ رہی تھی اور پھر اس کے اوپر دیکھ لینے پر اُس نے مُنہ کیوں پھیر لیا کئی بار اُسے خیال آیا بھی کہ شاید وہ مجھے نہ دیکھ رہی ہو لیکن اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ اور وہ سوچتا کہ وہ ضرور مجھے دیکھ رہی تھی ورنہ .. .. ورنہ وہ مُنہ کیوں پھیر لیتی۔ ضرور وہ میرے اچانک اوپر دیکھ لینے پر گھبرا گئی ہوگی، بچاری شکنتلا! اور اُس کی آنکھوں میں شکنتلا کا چہرہ پھر گیا اور اُسے یاد آیا کہ اُس کی آنکھیں نیلی ہیں، جن میں آسمان کی لامحدود نیلاہٹوں کی وسعت ہے اور سمندر کے وسیع پانیوں کی سی گہرائی شکنتلا اگر پھنس گئی تو ؟ آخر وہ اس کی طرف کیوں دیکھ رہی تھی۔ ضرور پھنس جائیگی اور اُس نے سوچا کہ کس طرح وہ سکول جاتے وقت اُس سے بات کرے گا لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟ اُس کے بھائی نے یا کسی اور محلّہ والے نے ...... لیکن پھر اُسے خیال آیا کہ اُس نے سکول جانا چھوڑ دیا ہے اور شاید وہ اب کے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے رہی ہے ما چھا تو وہ اُس سے اُس اندھیارے چھتے میں ہی بات کر لیگا۔ اگر اس کا سکول جانا چھڑا دیا گیا ہے تو کیا گھر سے باہر نکلنا بھی بند کر دیا گیا ہوگا لیکن بات کوئی ایک سیکنڈ میں تو ہو ہی نہیں جاتی، اس نے سوچا اور زیادہ دیر تک بات کرنے میں کیا پتہ کوئی دیکھ لے! اچھا تو وہ اُسے ایک محبت بھرا خط لکھ دیگا اور وہ خط وہ خود ہی اُسے دیگا۔ کیونکہ کسی دوسری طرح پہنچانے میں کیا معلوم کوئی پڑھ لے اور یہ بھید کھل جائے . . . یہ بھید! . . . . وہ بہت دیر تک یونہی سوچتا رہا تھا اور آنے والے عشق کی تفصیلات میں ڈوبا رہا تھا۔ نیند آتی ہی نہ تھی شکنتلا، شکنتلا، شکنتلا! وہ مختلف شکلوں میں اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی، بند آنکھوں کے آگے تیرتے ہوئے سُرخ، نیلے پیلے، دھارے بار بار شکنتلا کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ اور شکنتلا کی مبہم سی تصویروں میں اُس کی آنکھیں ہی واضح ہوتیں، نیلی آنکھیں ...... اور یہی سوچتے سوچتے خواب اور بیداری کی حدوں کے درمیان لیٹے ہوئے اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ شکنتلا سے محبت کرتا ہے!

وہ شکنتلا سے محبت کرنے لگا تھا کیونکہ شکنتلا کل اُسے دیکھ رہی تھی! لیکن آج کھڑکی سُنسان تھی۔ ہوا بند تھی اور پیپل کے پتے خاموش کھڑکی کو سُنسان دیکھ کر نریندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا دل اچانک دھڑکتے دھڑکتے رُک گیا ہے اور آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے لیکن اُس کی یہ اُمید کہ شکنتلا ہر وقت کھڑکی میں بیٹھی رہے محض ایک آرزوئے خام تھی۔ کیونکہ آخر وہ ایک شریف خاندان کی لڑکی تھی۔ اور اُسے گھر کے بہتیرے کام تھے، کبھی کبھی کھانا بنانا، اپنے چھوٹے بھائی کا سوئٹر بننا، شاید اپنے جہیز کے لئے کچھ سینا پرونا، کاڑھنا یوں ایک فضول سی بات کے لئے وہ آخر کب تک کھڑکی میں بیٹھی رہتی۔ چاہتی بھی جب بھی یہ ناممکن تھا۔ لیکن نریندر بچارا کیا کرتا، وہ ان تمام باتوں کو کیسے سوچتا، وہ تو مجبور تھا۔ بچارہ۔ خدا خدا کر کے تو ایک لڑکی نے نگاہ کرم کی تھی، وہ بھی دوسرے ہی دن سے یوں بے پرواہی برتنے لگے تو اس کے دل کو کیسے دھکّا نہ لگتا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس کا دل آہستہ آہستہ ڈوبتا جا رہا ہے۔ وہ وحشت جو کل تک اُس نے محسوس نہ کی تھی آج اس کھڑکی کو سنسان دیکھکر اس کی رُوح میں پھیل گئی تھی۔

بہت دیر تک وہ وہاں ٹہلتا رہا۔ اس کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ شاید وہ ذرا ٹھہر کر آجائے۔ وہ پانچ منٹ گذر گئے پھر دس منٹ اور اب اس طرح یہاں اکیلے ٹہلتا رہنا بظاہر بالکل بے معنی تھا اور اُس کے دل کے کسی نامعلوم گوشہ میں بیٹھا ہوا کوئی چور، بار بار اُس سے کہتا تھا کہ اس طرح یہاں دیکھکر ہر شخص یہی سوچیگا کہ تم آخر اس کھڑکی کے نیچے اکیلے کیوں ٹہل رہے ہو۔ اور کیا پتہ اسے اس بات کا شبہ ہو جائے۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اگر کسی کو معلوم ہوگیا تو اس بنائی متعلق شک بھی ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی کو معلوم ہوگیا تو بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔ کیا معلوم کوئی اس کی ہی شکایت کر دے یا اور اگر شکنتلا کے گھر کسی کو معلوم ہوگیا تو کیا جانے اُسے سخت سُست کہنے کے بعد اس کھڑکی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دئے جائیں۔ امید کی یہ جھلملاتی ہوئی کرن پھر اسے تاریکی میں کھو جائے!۔

اُسے بات بات میں اس راز کے فاش ہو جانے کا ڈر تھا۔!

وہ اس کے نتیجہ سے خوفزدہ تھا۔ جس ماحول میں وہ رہتا تھا وہاں محبت کو ہمیشہ ایک عیب خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں پنڈت جی اپنے لڑکے کو پیا ملن کی خواہش کے غیر شعوری اظہار پر بدمعاش اور آوارہ کہا کرتے تھے۔ یہ ایک کلرکوں کا محلّہ تھا یوں تو اس میں دو ایک تاجر بھی شامل تھے اور اسی قسم کے دوسرے لوگ بھی اور شکنتلا کے والد بزرگوار تو ایک وکیل تھے لیکن کلرکوں اور دوکانداروں وغیرہ کی طرح کچھ ایک سی ہوتی ہے، یہ سب اپنی عورتوں کو زمانے سے ڈھیں

سفر کراتے ہیں اور اپنی لڑکیوں کا تیرہ سال کی ہونے پر سکول جانا چھڑا دیتے ہیں۔ خود شکنتلا بھی اب میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دے رہی تھی اور اُسے کھڑکی میں سے اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر نریندر کو اُس سے محبت ہو گئی تھی۔ اس تمام ڈر کے باوجود کہ کوئی اس محبت کے بارے میں جان نہ لے وہ شکنتلا سے محبت کرنے سے باز نہ رہ سکا بلکہ اس ڈر کی وجہ سے اُسکی محبت شدید ہوتی گئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا اور وہ محبت اُسکے دل میں اُس آپ زہریلے دھوئیں کی طرح پھیلتی جا رہی تھی جسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اس زہر نے اُس کی خوشی کو تحلیل کر دیا لیکن اس محبت نے اُسے مضمحل کر دیا۔ ایک بوجھ سا ہر وقت اُسکے دل پر موجود رہتا اور اس بار کے زیر اثر اُس کا اونچی آواز میں بولنے کو بھی جی نہ چاہتا اُسکے دل میں ہر وقت ایک سنسنی سی رہتی جیسے اُسکی تمام رگیں ایک اداس اور بوجھل نغمے سے جھنجھنا رہی ہوں۔ لیکن جب وہ شکنتلا کو دیکھتا تو وہ نغمہ رک سا جاتا اور جب شکنتلا کے چہرے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ آتی اور وہ اپنا سر جھکا لیتی یا پیپل کے پتوں میں شور مچاتی ہوئی چڑیوں کو دیکھنے لگتی تو اُسے محسوس ہوتا کہ کھڑکی کی سلاخیں غائب ہو گئی ہیں اور شکنتلا اُسکے بہت قریب ہے اور وہ اُسے چھونے کیلئے بیتاب ہو جاتا لیکن یہ محض اُس کا وہم ہوتا۔ سلاخیں کھڑکی میں اُسی طرح جڑی ہوتیں اور اب شکنتلا ایک ٹک اُسکی طرف دیکھتی ہوتی۔ اُسکی آنکھوں میں ایک حسین سی چمک ہوتی جیسے نیلی جھیل پر صبح کاذب کا عکس۔

اور وہ سوچتا کہ ایسا کیوں ہے کہ شکنتلا کی جوان روح کو زنگ آلود سلاخوں میں بند کر دیا گیا ہے اور ایسا کیوں ہے کہ وہ اُس سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی زندگی میں ایک ایسا نسوانی پیکر چاہتا تھا جس میں ایک عورت کی روح ہو۔ جو اُسکے دل کی بے چین خلش کو مٹا دے اور اُسے سکون، شانتی اور مسکراتی زندگی بخش دے۔ شکنتلا میں اُسے امید کی ایک شعاع نظر آتی تھی جیسے تاریکی میں بھٹکے ہوئے مسافر کو ایک جھلملاتا ہوا چراغ۔ وہ اس چراغ کی طرف جا رہا تھا، چاہتا تھا کہ وہ چراغ اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ وہ اُس کھڑکی کے قریب رہنے کے بہانے ڈھونڈھتا، شکنتلا بازار جاتی تو وہ اُسکے انتظار میں دونوں راستوں کے سنگم پر کھڑا رہتا تاکہ وہ اُسے قریب سے صرف دیکھ ہی سکے۔ وہ شکنتلا سے بات تو نہ کر سکتا تھا۔ اُس سے کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا لیکن وہ ہر اُس جگہ موجود ہونے کی کوشش کرتا جہاں وہ شکنتلا کو اور شکنتلا اُسے دیکھ سکے۔ وہ ایک بیکار آدمی کی طرح ہر وقت شکنتلا ہی کو دیکھنا چاہتا تھا، لیکن یہ ناممکن تھا، شکنتلا اپنے "قید خانے" سے باہر بھی جاتی تو وہ اُس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتا تھا کہ راستے پر اُس کا انتظار کرتا ہے کیونکہ دوسری حالت میں لوگ سوچتے کہ آخر اس طرح ساتھ ساتھ گھومنے کا مطلب کیا ہے؟ آخر بات کیا۔ آ ـــــ ہے؟ اگر شکنتلا مندر جاتی مندر جاتی تب تو وہ وہاں جا سکتا تھا، کیونکہ مندر پرماتما کا گھر ہے۔ وہاں ہری جنوں کے علاوہ ہر شخص جا سکتا ہے، چاہے شکنتلا کو دیکھنے ہی کیوں نہ جائے لیکن شکنتلا مندر نہ جاتی تھی بلکہ وہ اپنی ماں کے ساتھ اور اُسکی ماں چند اور عورتوں کے ساتھ کبھی کبھی ایک مہاتما کی کٹیا میں جاتی تھی کیونکہ پرماتما سے زیادہ مہاتماؤں کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بے اولادوں کو اولاد اور سٹے بازوں کو کامیاب "ہندسے" دیتے ہیں۔

اُس روز مہاتما کی کٹیا میں کوئی خاص جشن تھا، اور نریندر کو معلوم تھا کہ آج وہ لوگ آئینگے اور وہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔

شام سے آسمان پر مٹیالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ستارے غائب تھے اور غلیظ بادلوں نے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔ وہ لوگ ابھی آئے نہ تھے۔ اب تو مہاتما کے چیلوں نے گھنٹے بھی بجانا شروع کر دئے تھے۔ شاید آرتی کر رہے تھے اور باغ کے وسیع سناٹے میں گھنٹوں اور شنکھوں کی آواز فصیل کی رنگین دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھی۔ آج کٹیا میں زیادہ آدمی موجود تھے آج مہاتما کے گھر ایک خاص جشن تھا لیکن وہ لوگ ابھی تک نہ آئے تھے۔ نریندر راستے کی طرف دیکھ رہا تھا مٹیالے بادل باغ کی جھاڑیوں والی دیوار سے پرے بورڈنگ ہاؤس پر جھکے ہوئے تھے اور بورڈنگ ہاؤس اندھیرے میں ایک پُر اسرار محل کی طرح نظر آ رہا تھا، سنسان، تاریک۔ جھاڑیوں کی دیوار کے درمیان سے سڑک کی اکا دکا مدھم بتیاں نظر آ جاتی تھیں، اداس خاموش کہرے میں پھنسی ہوئی۔ ٹہلتا ٹہلتا وہ کٹیا سے دور نکل آیا۔ شنکھوں کی آواز اب مدھم ہو گئی تھی۔ دور سے آ رہی تھی اور دور سے آتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی، جیسے وہ خود کوئی آواز نہ ہو، الگ گونج ہو۔ جو ختم ہونے میں نہ آتی ہو۔

وہ دیر تک گھاس پر ٹہلتا رہا۔ مہاتما کی کٹیا سے شکنتلا کے آنے کے راستے کی طرف ہوا میں گھاس اور نمی کی بو تھی۔ بورڈنگ ہاؤس کے طور پر ایک جگہ سے بادلوں کے کنارے روپہلی ہو گئے تھے، شاید چاند نکلنے کے قریب تھا۔ ایک ہلکی سی مبہم سفیدی باغ کے اندھیرے پر پھیل گئی تھی اور پیپل اور کھجور کے درخت واضح نظر آنے لگے تھے۔ اچانک اُس نے جھاڑیوں والی دیوار کے پیچھے عورتوں کے باتیں کرنے کی آواز سُنی، یہ شکنتلا ہی تھی، اور اُسکے دل کی حرکت جو

دیر سے مدھم ہو چکی تھی اچانک بڑھ گئی اور غیر محسوس خوشی کی ایک مضطرب لہر اُس کے دل میں اُتر کر سارے جسم میں پھیل گئی۔ جھاڑیوں کے پار بورڈنگ ہاؤس کے اوپر چاند آہستہ آہستہ نکل رہا تھا اور باغ کے اندھیرے پر روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ پھر وہ لوگ جھاڑیوں کے درمیان بنے ہوئے راستہ پر نمودار ہوئے اور جب وہ اُس کے قریب سے گزرے تو چاند پورا نکل آیا تھا۔ اور شکنتلا کا چہرہ چاند کی کرنوں میں روشن ہو اٹھا تھا۔ لیکن وہ قریب سے باتیں کرتی ہوئی گزر گئی۔ شاید اُس نے نریندر کو دیکھا نہیں یا شاید پہچان نہ سکی۔ اور شکنتلا کو آگے جاتا ہوا دیکھتے ہوئے اُس نے سوچا کہ اُس کا یہاں آنا بالکل بیکار رہا، فضول، بے سود، اور اُس نے محسوس کیا کہ چاندنی پھیکی پڑ گئی ہے اور پیپل اور کھجور کے درخت تھک کر سو گئے ہیں۔ گھنٹوں اور سنکھوں کی آوازیں بند ہو چکی تھیں، آرتی ختم ہو گئی تھی۔ دیر تک کُٹیا سے مبہم آوازیں آتی رہیں۔ جیسے سُنسان کھنڈروں میں بھوت بولتے ہوں۔ اور یہ احساس کہ شکنتلا وہاں موجود ہے اُسے کُٹیا کے قریب لے گیا۔ گیس کی روشنی میں جٹادھاری سادھو اپنے جسموں پر راکھ ملے بیٹھے تھے۔ اور ان میں سے ایک جس کی جٹائیں زیادہ گھنی تھیں کچھ کہہ رہا تھا۔ روشنی میں شکنتلا اُسے ایک دور دراز شے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ لوگ سب کے بعد آئے تھے اور سب سے پیچھے بیٹھے تھے۔ شکنتلا باہر دیکھ رہی تھی جیسے اُسے مہاتما کے وعظ سے دلچسپی نہ ہو۔ باہر ایک موہوم سی سفیدی پھیلی ہوئی تھی اور درختوں کے سائے گہرے گہرے سیاہ دھبے معلوم ہوتے تھے سردی بڑھ گئی تھی لیکن نریندر نے اسے محسوس نہیں کیا۔ وہ کُٹیا کے قریب ننگی گھاس پر ٹہلتا رہا۔ پھر اُس نے شکنتلا کو گیس کی روشنی میں جمائی لیتے دیکھا۔ جیسے وہ بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی ہو۔ پھر وہ اُٹھی، نریندر کا دل دھڑکا اور وہ باہر آ گئی۔ باہر وہی اندھیرا تھا، فصیل کے قریب، جھاڑیوں کے پار چماروں کی جھونپڑیاں تھیں لیکن ان میں جلتے ہوئے چراغ اندھیرے کو دور نہ کر سکے تھے۔ سر شام ہی سے سب جگہ اندھیرا چھا گیا تھا۔ چماروں کی جھونپڑیوں کے قریب کہیں کتے بھونکے، پیپل کے درخت پر کوئی پرند پھڑپھڑایا اور خاموشی چھا گئی۔ صرف اندر سے جٹادھاری سادھو کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور وہ پھر اندر چلی گئی۔

بہت دیر بعد مہاتما کا وعظ ختم ہوا اور لوگ اُٹھنے لگے۔ لوگوں کو اُٹھتا ہوا دیکھ کر نریندر چل پڑا۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ شکنتلا کے ساتھ والے لوگ اُسے باغ میں دیکھیں۔ وہ اُن سے پہلے ہی بازار میں آ جانا چاہتا تھا بازار میں تو ہزاروں آدمی چلتے ہیں، وہاں اگر وہ انھیں مل گیا تو کوئی بات نہ ہوگی۔ کسی کو شک بھی نہ ہوگا کہ یہ ہماری وجہ سے یہاں پھر رہا ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ بازار کے نکڑ پر کھڑا رہا۔ پان والے کی دوکان میں لگے ہوئے آئینہ میں اُسے اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اور وہ یہ دیکھ کر شرمندہ بھی ہوا اور متعجب بھی کہ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جیسے وہ ابھی ابھی کچھ چُرا کر بھاگا ہو یا چوری کرنا چاہتا ہو کچھ دیر بعد سامنے کی پگڈنڈی پر اُسے کچھ لوگ نظر آئے۔ شکنتلا سب سے آگے تھی۔ اس کے ساتھ اس کی کوئی سہیلی بھی تھی جسے وہ پہلی بار دیکھ نہ سکا تھا۔ شاید انھوں نے اب بھی اُسے نہیں دیکھا اور وہ جلدی جلدی چل کر چند گز آگے آ گیا اور دو آنے والے سنیما کے پاس پہنچ کر اُس پٹڑی پر ہو گیا جس پر وہ لوگ تھے۔ اور آہستہ آہستہ جیسے اُسے کچھ پتہ ہی نہیں، اُس طرف چلنے لگا جدھر سے وہ لوگ آ رہے تھے دُور سے اُس نے دیکھا کہ شکنتلا نے اُسے دیکھ لیا ہے۔ اُس نے اپنی سہیلی سے کچھ کہا اور پھر وہ دونوں ہنس پڑیں۔ اب وہ قریب آ گئی تھیں نریندر رُک گیا اور اُس نے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے رومال والے سے پوچھا ـــــ کیا بھاؤ ہے رومال کا؟ تین تین آنے ـــــ جب وہ شکنتلا کے قریب سے گزری، اُس کے ہاتھ اُٹھے اور ایک تانیے کے لیے درمیان میں رکتے ہوئے سر پر چلے گئے جیسے وہ بالوں کو ٹھیک کر رہی ہو۔ نریندر کو ایسا معلوم ہوا جیسے شکنتلا نے اُسے نمستے کی ہے!

اور وہ نمستے اُس کے دل میں ایک ہنگامہ بپا کر گئی جیسے آہستہ آہستہ بہتی ہوئی ندی میں تیز آندھی سے پُرشور روانی پیدا ہو جائے۔ جوں جوں وہ اُسے سوچتا رہا وہ نمستے اُس کے ذہن میں تیزی سے گردش کرنے لگی یہ گردش تیز ہوتی گئی۔ اور آہستہ آہستہ اس نمستے نے اُس کے ذہن میں آواز اختیار کر لی ــــ نمستے، نمستے، نمستے!

اور رات بستر پر لیٹتے ہوئے وہ جس طرف کروٹ لیتا وہ اُٹھے ہوئے ہاتھ اس کے سامنے آ جاتے ـــــ نمستے نمستے .... کروٹ بدلتا اور وہ نمستے پھر سامنے آ جاتی ہے۔ اس نے شکنتلا کے لئے ایک خط لکھا وہ خط جو اُس نے پہلے ہی دن جب شکنتلا اس کی طرف دیکھ رہی تھی تو اُس کے نام لکھنے کو تھا۔ ایک خط ہی شکنتلا سے کچھ کہنے کا اکلوتا ذریعہ تھا! خط لکھنے کے بعد وہ بار بار اُسے دینے کا ارادہ کرتا، لیکن ہمت نہ ہوتی تھی۔ اور اپنی اس کمزوری کے لئے وہ اپنے دل میں تاویلیں گھڑتا۔ کبھی خط دینے کا موقعہ کھو دینے کے بعد وہ سوچتا کہ اچھا ہی ہوا جو میں نے اس وقت کوشش نہ کی۔

دل کے بہلانے کو وہ تین دن تک ایسی ہی باتیں سوچتا رہا۔ آخر

تیسرے دن اُس نے وہ خط دے دیا۔ شاید وہ اُس وقت بھی نہ دیتا لیکن رات وہ بہت دیر تک یہی سوچتا رہا تھا۔ اُس نے بستر پر بار بار کروٹیں بدلتے ہوئے کئی بار خود کو ملامت کی تھی۔ اور اُس وقت گلی سنسان تھی۔ سناٹا سکوت۔ بچے سکول گئے ہوئے تھے اور عورتیں چھتوں پر دھوپ لے رہی تھیں۔ گلی میں سے گزر کر وہ اپنے گھر جا رہی تھی جب وہ چھتے میں پہنچی جہاں دن کے وقت بھی سرِ شام کا سا اندھیرا تھا تو نریندر نے جذبات اور گھبراہٹ سے بھاری آواز میں آہستہ سے پکارا ——— شکنتلا! شکنتلا نے گھوم کر دیکھا، اب وہ اُس کے قریب تھی، سناٹا گہرا ہو گیا تھا، اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، شکنتلا سہم گئی تھی، ایک لمحہ خاموش رہی، نریندر کچھ کہہ نہ سکا، اُس کی آواز حالات کی اجنبیت اور گھبراہٹ سے مغلوب ہو گئی۔ اُس نے وہ خط آگے بڑھا دیا۔ سہمی ہوئی آواز میں شکنتلا نے پوچھا ——— کس کا ہے؟ نریندر جواب نہ دے سکا، الفاظ اس کے دل میں گھوم کر رہ گئے۔ اُس کے سر پر کبوتر نے اپنے گھونسلے میں پر پھڑپھڑائے۔ اور اندھیرے چھتے سے باہر نکل کر پھر سے اُڑ گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ ایک طویل عرصہ کے بعد اُس نے ایک بھدا سا جواب دیا ——— پڑھ لینا! اور گھبراہٹ میں وہ باہر نکل آیا۔

جب دل کی دھڑکن اصلی حالت پر آئی تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کے اوپر سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا ہے لیکن یہ احساس صرف ایک لمحہ کیلئے تھا۔ دوسرے لمحہ اُس نے محسوس کیا کہ دل پر ایک فکر سا چھا گیا ہے ——— سہمی ہوئی آوازیں...... سناٹا...... دل کی تیز دھڑکن...... کس کا ہے...... کس کا ہے...... پڑھ لینا ——— اُس نے سوچا کہ پڑھنے کے بعد وہ کیا کرے گی اور اُس کے دل کی بے چینی بڑھ گئی، شاید وہ جواب دے، شاید وہ......

دن بھر اُسے بخار سا چڑھا رہا، رات نیند نہ آئی۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے اتنی جسارت کی تھی اور اب وہ بے چین تھا، دل آہستہ آہستہ گھبراتا تھا، وہ تصویریں، وہ الفاظ اُس کے احساس کے گرد گھومتے جا رہے تھے، گھومتے جا رہے تھے ——— شکنتلا...... سہمی ہوئی آنکھیں...... سہمی ہوئی آواز...... کس کا ہے...... کس کا ہے...... کس کا ہے

...... پڑھ لینا!......

ایک دن گزر گیا۔

دو دن

تین دن۔

تین دن تک شکنتلا کھڑکی میں نہ آئی۔ نریندر حیران تھا، حیران اور پریشان ——— چوتھے دن شکنتلا موجود تھی، لیکن نریندر کو دیکھ کر وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ کھڑکی پر جھکی ہوئی پیپل کی نوزائیدہ شاخ اب وہاں موجود نہ تھی۔ شاید تیز ہواؤں کے جھکڑ سے ٹوٹ گئی تھی، کھڑکی کی منڈیر پر ایک کبوتر پر پھیلائے ہوئے دھوپ لے رہا تھا، شکنتلا اُٹھ کر چلی گئی تھی اور آنے والے دنوں میں نریندر نے محسوس کیا کہ شکنتلا کا رویّہ بدل گیا ہے، اب وہ کھڑکی میں کم آتی تھی، ہوتی بھی تو نریندر کو دیکھ کر واپس چلی جاتی یا نیچے صحن میں دیکھنے کی بجائے مُنہ پھیر کر اندر کی طرف دیکھنے لگتی اور نریندر بچارا سوچتا کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس نے شکنتلا کو ناراض کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کے سامنے آنے سے بھی کتراتی ہے۔ اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو اسے جاننے کی خواہش اُس کے دل میں اور بڑھ جاتی۔ اور آخر ایک دن اُس نے اپنی نامکمل محبت کی داستان اپنے ایک دوست کو سُنا ڈالی۔ اور سُن کر اس کی آواز چہک اٹھی جیسے اس کی امیدوں پر پھر سے ملمع کر دیا گیا ہو، اُس نے کہا۔

"پہلے شکنتلا مجھ سے محبت کرتی تھی، پرکاش سے محبت کرتی تھی راجندر سے محبت کرتی تھی اور آجکل وہ پنڈت جی سے محبت کرتی ہے، ۵۵
تم نے بتایا نہیں کہ تم بھی اس حلقہ میں آ چکے ہو۔ اب تم باتیں چھپانے بہت لگے ہو۔ اس طرح تو نئی شادی شدہ لڑکیاں اپنے حمل کو بھی نہیں چھپاتیں۔"

"لیکن اب تو میں نے تمہیں بتا دیا، خدا کے لئے بتاؤ تو سہی تمہارے ساتھ کیا ہوا۔؟"

"ہوا کیا، کچھ بھی نہیں ہوا، دراصل کچھ ہونے سے پہلے ہی سب کچھ ہو گیا۔ تمہیں پچھلی ہولی کے دن یاد ہیں، ضرور ہوں گے، تم کہہ رہے تھے کہ پچھلی ہولی کو تم نے رجنی کے رخساروں کو ہاتھ لگایا تھا اور اس نے کچھ نہیں کہا تھا، ایسی باتیں تم بھول سکتے ہو بھلا، خیر تو اچھی طرح بھیگنے کے بعد میں اوپر دھوپ میں کپڑے سُکھا رہا تھا۔ نیچے صحن میں بہت شور و غل تھا، اوپر سورج بہت تنگ کر رہا تھا۔ بار بار چہرے کے سامنے آ جاتا تھا، جیسے میرے چہرہ کا نشانہ باندھ رہا ہو۔ بہت دیر بعد میری سمجھ میں آیا کہ یہ چمک سورج کی نہ تھی بلکہ شکنتلا اپنی چھت پر شیشے کو اس طرح چمکا رہی تھی کہ اس کا عکس بار بار میرے چہرے پر پڑتا تھا۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ بلکہ سروجنی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اور جب میں نے اُن کی طرف دیکھا تو وہ مُنہ پھیر کر ہنسنے لگیں۔ سمجھے میاں، میں تمہارے جیسا بدھو نہیں تھا کہ شکنتلا

کی شرارت کو نہ سمجھتا۔ اور پھر اُس کے بعد تو مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ شکنتلا ما بدولت پر عاشق ہو گئی ہے۔ اور کیا عاشق ہو گئی ہی سمجھو۔ میں ادم کے گھر جا کر آواز دیتا تو شکنتلا کھڑکی میں آجاتی اور جتنی دیر میں ادم کے کمرے میں بیٹھا رہتا وہ کھڑکی کے کواڑ کی آڑ میں کھڑی رہتی یا کھڑکی میں بیٹھ کر باتصویر رسالے پڑھتی، خود میں نے کئی بار اسے رسالے بھجوائے۔ اور جب وہ واپس آتے تو ان پر کئی کئی جگہ شکنتلا کا نام لکھا ہوتا۔ سمجھتے ہو میاں، کسی دوسرے کی کتاب پر اپنا نام لکھنا کیا معنے رکھتا ہے۔ خیر تو مطلب یہ کہ شکنتلا، شکنتلا ہو گئی تھی اور آخر ایک دن جیسا کہ تم نے کہا وہ گلی میں جا رہی تھی۔ تم تو بیوقوف ہو، میں نے تمہاری طرح عقب سے آواز نہیں دی، میرے تو وہ سامنے تھی، میں نے کہا شکنتلا —— بس میں اتنا ہی کہہ سکا۔ نہ جانے کہاں سے وکیل صاحب نکل آئے تھے انھیں دیکھ کر میں نے کہا —— شکنتلا سُنا ہے تمہارا تاریخ کا پرچہ آؤٹ ہو گیا ہے، کیا تمہیں معلوم ہے؟" شکنتلا نے جواب نہیں دیا۔ وہ تو بالکل سہم گئی تھی، وکیل صاحب بولے، اسے کیا معلوم ہو گا، تم سے کس نے کہا ہے، اور آجکل تو امتحان بھی نہیں ہو رہے۔ واقعی مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ آجکل امتحان نہیں ہو رہے لیکن شکنتلا اس وقت تک آگے جا چکی تھی اور اس کے بعد میں نے دن میں بیس بیس مرتبہ ادم کو جا کر آواز دی لیکن شکنتلا کھڑکی میں نہ آئی میں دن میں دس دس گھنٹہ ادم کے کمرہ میں بیٹھا رہا، شکنتلا اوّل تو آتی ہی نہ تھی اور اگر آتی بھی تو مجھے دیکھ کر واپس چلی جاتی تھی، جیسے غلطی سے ادھر آگئی ہو آخر میں نے صبر کر لیا اور سوچ لیا کہ لنگوٹی باندھوں گا، کھجوریں کھاؤں گا، بکری کا دودھ پیوں گا اور تکلی پھرایا کروں گا۔

ایسا ہی پرکاش کے ساتھ بھی ہوا، اُس بچارے نے بھی تمہاری طرح خط دیا تھا۔ یاد رکھو کبھی کسی کو اس طرح خط نہ دیا کرو، زبانی بات ہونی چاہئے، یہی زیادہ محفوظ ہے لیکن تم سب سے زیادہ ڈرپوک راجندر تھا بہت دن تک بچاری شکنتلا نیلی آنکھوں سے، چھپی چھپی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی، لیکن اس بیوقوف کا سر ہی نہ اُٹھا، وہ ہمیشہ عورتوں کی طرح شرماتا ہی رہا۔ پھر تم آگئے اور آجکل شکنتلا پنڈت جی سے محبت کرتی ہے۔"

"پنڈت جی کون، روپ چند؟"

"ہاں وہی سُفید چوہا، تم نے آجکل دیکھا ہو گا کہ پنڈت جی صحن میں بہت نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ دوپہر کو کالج سے آنے کے بعد جب پنڈت جی اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہوتے ہیں تو چھتے کے دروازہ میں آکر شکنتلا اپنی چھوٹی بہن کو آواز دیتی ہے —— کُسُم ! کُسُم !! اور کُسُم بیٹھک میں سے نکل آتی ہے، یعنی پنڈت جی اپنی بیٹھک کے دروازہ پر آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر شکنتلا کھڑی رہتی ہے پھر جب کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے تو واپس چلی جاتی ہے۔۔۔۔"

تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ کہنے لگا —— "عجیب عادت ہے یہ اس کی کہ پہلے تو شروعات کرتی ہے اور پھر جب بات کچھ بننے لگتی ہے تو الگ ہو جاتی ہے، کیا چاہتی ہے آخر یہ، عجیب عادت ہے —— شاید ——"

لیکن اس نے بات پوری نہ کی اور بہت دیر خاموش رہا۔ پارک کی فضا پر سناٹا چھا گیا تھا، چاند گورنمنٹ کلرکوں کے کوارٹروں کے پیچھے ڈوب رہا تھا اور سڑک کے ایک طرف کی بتیاں بُجھ گئی تھیں نرنیدر بہت دیر تک پچھلی باتوں کو سوچتا رہا اور اس کی آنکھوں میں پھر شکنتلا کا سلاخوں میں بند چہرہ پھرنے لگا، نیلی آنکھیں، سڈول بازو، حسین سینہ، شباب جاگا ہوا، سرکش۔

اچانک سناٹے میں حرکت پیدا ہو گئی۔ چارکول کی سخت اور سیاہ سڑک پر ایک تانگہ خاموشی پر ہتھوڑے مارتا ہوا گزر گیا، پھر نچلے طبقہ کے دو نوجوان "مچھلی پونچھ یا جائے" گاتے ہوئے گزر گئے اور ایک تلخ لہجے میں وہ کہنے لگا —— وہ خود کو محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی، وہ محبت کرنا چاہتی ہے مگر کر نہیں سکتی، اس میں ہمت نہیں، وہ ڈرتی ہے کہ بات بڑھ جانے پر کسی کو معلوم نہ ہو جائے ہم نہ محبّت کر سکتے ہیں نہ عیاشی اور وہ محبت کرنا چاہتی ہے، سُنتے ہو، وہ محبت کرنا چاہتی ہے اور کر نہیں سکتی ——"

لیکن نرنیدر نے شاید سُنا نہیں، کہنے لگا، "لیکن کبھی کبھی کھڑکی کو بند دیکھ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اب بھی اُس سے محبّت کرتا ہوں۔"

پرتھوی ناتھ شرما

سڑک

تھکا پیاسا۔ سوکھے ہونٹ، مرجھایا چہرہ۔ وہ چلتے چلتے ہار سا گیا۔ اُس کی دونوں پنڈلیاں درد کے مارے اکڑی جا رہی تھیں، وہ شیشم کے سایہ میں تھوڑی دیر سستانے رُکا۔ زمین سے اُٹھی ہوئی جڑ پر بیٹھ گیا۔ ستنے کو گھٹنوں تک سرکایا اور دونوں ہاتھ سے پنڈلیوں کو دابنے لگا۔ ملا۔ سہلایا لیکن درد ہر لمحہ، ہر ساعت فزوں ہونے لگا۔ آٹھ دس میل صرف آج وہ اتنا ہی فاصلہ طے کر پایا تھا اور اس کی پنڈلیاں جواب دیتی معلوم ہوتی تھیں جب پنڈلیوں کو دابنے، مسلنے اور ملنے سے کچھ درد کی شدت میں کمی نہ ہوئی تو اُسے بہت غصہ آیا، وہ مٹھی بنا کر بے تحاشہ اُن تھکی ہوئی پنڈلیوں پر مارنے لگا۔ ایک، دو، تین نہ معلوم کتنی، لیکن پھر بھی پنڈلیاں تھکاوٹ کا احساس سنبھالے معلوم ہوتی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف کچی پٹڑی تھی۔ پیلی پیلی ریت، اور کہیں کہیں کالی کالی مٹی کے ٹینس کے گیند کے برابر ڈھیلے، ہوا چلتی اور باریک ریت اُڑنے لگتی، بار بار مسافر نے اُن ریت کے باریک ذرات کو حملہ آور دیکھ کر اپنی آنکھ کو ڈھانپ ڈھانپ لیا، اور وہ ذرات اُس کی نیلی دھاری والی قمیض سے چپٹ چپٹ کر رہ جاتے یا کھلی ہوئی پنڈلیوں سے۔ پنڈلیوں کا درد، سڑک کی ویرانی اور تھکن سے مجبور ہو کر اس نے اپنی مختصر سی پوٹلی کو کھولا، اور گاڑھے کی چادر بچھا کر لیٹ رہا۔ اُسے امید تھی کہ شاید نیند کی آغوش میں تھکن اور پنڈلیوں کا درد کافور ہو جائیں گے۔ نیند، اُس نے کئی دفعہ سونے کی کوشش کی ہے مگر نہ سو سکا سڑک کے کنارے شیشم کے سایوں میں لطیف ہوا چلتی ہے، امن اور آشتی کی سلطنت ہے، بار بار سونے کا ارادہ کر کے لیٹتا تھا مگر نہ سو سکا، اور آج پھر وہ اُسی تجربہ کو دُہرا رہا تھا۔ آنکھ جھپکی۔ بند ہوئی۔ لطافت، پاکیزگی، خواب اور میٹھے میٹھے خیالات، تمنّائیں، آشائیں، اور زندگی کا غیر مرئی احساس بالکل لطیف احساس اور اُسے اُمید ہوئی کہ وہ ضرور سو سکیگا۔ آنکھ بند کئے لیٹا رہا۔ اُس نے کچھ قدموں کی چاپ سُنی، لیکن وہ ایک دم سُنائی دینی بند ہو گئی، بالکل ناممکن بات۔ راہگیر اتنی جلدی سڑک سے غائب تو نہ ہو جائیں گے۔ سونے کیلئے لیٹا تھا، پھر آنکھ ملتا اُٹھ کھڑا ہوا، سایہ میں دو آدمی بیٹھے سستا رہے تھے۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی؟"

"کہیں نہیں۔ ذرا سستانے کیلئے بیٹھ گئے۔ تم سوتے سوتے کیوں اُٹھ بیٹھے۔ نیند نہیں آتی؟"

"یوں ہی۔ مجھے دن میں بالکل نیند نہیں آتی۔ کوشش البتہ ضرور کر لیتا ہوں۔ آس پاس میں کوئی سرائے ہو تو بتاؤ۔ دس بارہ میل کا سفر اور طے کرنا تھا...... آٹھ دس میل پرے لاری مجھے چھوڑ گئی تھی۔ اس سڑک پر لاریاں نہیں چلتی اس لئے سوچا چلو پیدل ہی چلا چلوں۔ بیس میل کا سفر۔"

"اِکّا یا بیل گاڑی ہی کرایہ پر لے لیتے؟"

"لے تو لیتا۔ مگر میں آج پیدل سفر کرنے کے ارادہ سے چلا تھا بیس میل طے کرنے میں مشکل سے پانچ گھنٹہ لگتے ہیں لیکن اب پاؤں جواب دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ بچپن میں تو خیر نہیں لیکن سکول کے زمانہ میں اپنے گاؤں سے روزانہ چھ میل پرے پڑھنے جایا کرتا تھا اور واپس آتا تھا۔ پندرہ بیس میل کا سفر معمولی بات تھی۔"

نو واردوں نے تھوڑی دیر مسافر کی طرف دیکھا۔ ایک نے سر کھجایا دوسرے نے لُٹیا ڈور کی طرف دیکھا پھر اُن میں سے ایک بولا۔

"اس سڑک کے کنارے کنارے چلے جاؤ۔ ڈیڑھ کوس نہیں ایک کوس پرے ایک ٹوٹی پھوٹی سرائے ہے۔ بہت پُرانی سرائے ہے۔ اُس میں چلے جاؤ بھیّا۔"

"اچھا" مسافر کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا۔ اپنی پوٹلی کو سنبھالا۔ اور چلنا شروع کر دیا۔ اُس کی پنڈلیاں شاید بغاوت کر کر کے تنگ آ چکی تھیں۔ لہذا مسافر اپنے آپ کو بہت ہلکا سا سمجھنے لگا۔ بالکل ہلکا۔ وہ تھکن سب کافور ہو چلی تھی۔ سرائے میں قیام کرنے کے بعد رہی سہی تھکن بھی اُتر جائیگی۔ سرائے والا لیکا ہی کیا، ایک دو وقت کھانے کی اور ایک آنے چارپائی کا کرایہ۔ اور ساری رات آرام سے کٹ جائے گی اور صبح وہ پھر اپنے سفر کی تیاری میں مشغول ہو جائیگا۔ اس کے سامنے سڑک، پختہ سڑک کا ایک کوس لمبا فاصلہ تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ پنڈلیاں اتنے سفر کو طے کر سکیں گی۔ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ سڑک کے

دونوں طرف جوار باجرے کے کھیت تھے۔ جن کے اندر پکی ہوئی منٹھیاں تھیں۔ باجرے کی چھ چھ انچ لمبی پکی ہوئی بالیاں اور پودے دن ڈھلتے وقت چلنے والی مخمور ہوا میں جھکولے کھا رہے تھے۔ اور ذرا شدت کے جھونکے کے چلنے سے لچک سے جاتے تھے۔ بالکل کسی نازک بدن دوشیزہ کی لاغر کمر کی طرح۔ سایے بتدریج لمبے ہوتے جا رہے تھے اور دور زمین پر چھایا ہوا نیلا آسمان رنگ تبدیل کر رہا تھا۔ کچھ ہلکا سُرخ یا پھر ارغوانی یا پھر ایسا رنگ جو پیازی اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بن جایا کرتا ہے۔ اُس کی خواہش ہوئی وہ آنے والی شفق کے سایہ میں پناہ لے۔ کم از کم وہاں یہ سڑک، یہ پیلی ریت، اور ریاضت، زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے مشقت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ اور اسی ریاضت کے پیچھے اُس کو یہ بیس میل سفر طے کرنا تھا۔ اُسے سڑک کے بیچوں بیچ چلنے میں ایک گونہ مسرت محسوس ہوئی، کیونکہ سڑک کے بیچ میں سے وہ آنے والی شفق کی دُلہن کے استقبال کی تیاریاں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ پٹری پر درختوں کی آگے جُھکی ہوئی ٹہنیاں اس کی حدِّ نظر کو کاٹتی معلوم پڑتی تھیں۔ لہذا وہ سڑک کے سہارے سہارے جھومتے ہوئے کھیتوں، شام کو بسیرا کرنے کے لیے اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس ہونے والے پرندوں کی موسیقی اور شفق کے انتظار میں گم ہو کر جھومتا سا مخمور قدم رکھنے لگا لمبے آسان قدم، وہ ... کہ اس طرح سڑک کے بیچوں بیچ چلے جائے گا۔ ۵۸

... اور مسافر کو نہایت پسند تھی۔ آہستہ آہستہ ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہو نہ ہو یہ وہی سرائے ہے۔ جہاں وہ آرام کرنے کیلئے ٹھیرے گا۔ اور اس کے قدموں میں ایک دم تیزی آ گئی۔ وہ اُس ... عمارت کے سامنے رُکا۔ سوچنے لگا "کیا واقعی وہ سرائے کے سامنے کھڑا ہے۔ اجنبی کی بات کو سینکڑوں دل جوکھ ...

"باجرے کے کھیتوں میں سے یکایک دو تین لڑکیاں ایک دیہاتی گیت گاتی ہوئی نکلیں۔ اُن کے ہاتھوں میں باجرے کی بالیاں تھیں اور وہ اُن کو دربار نچا رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اُن باجرے کی بالیوں کو ایک دوسرے کے گلابی رخساروں سے مس کر دیتیں۔ ایک چوٹ کھائی ہوئی لڑکی بلبلا اُٹھی۔

"اونہہ۔ بڑی آئی ہے بن کے۔ پرماتما کرے تجھے کسی موٹے کالے آدمی کے ساتھ باندھ دیا جائے۔ وہ تجھے بالکل ٹھیک کر دیگا۔"

"تو ایسی کونسی خوبصورت ہے۔ کیا چہرہ ہے۔ نخرے۔ چل اُتی دن بھر تو کھیت میں مرتی ہے اور اب حور اور پری بنی جائے ہے......"

......" دانت نکالتے مُنہ مسکاتے دوسری لڑکی بولی۔

"رہنے دو بہنا۔ لڑتی کیوں ہو۔ اپنے اپنے بھاگ....." تیسری ذرا سنجیدہ معلوم ہوتی تھی۔

مسافر نے اُن کی پُر لطف گفتگو کو سُنا۔ آگے بڑھا۔

"دیکھنا"

"کیا کہتے ہو مسافر"

"سرائے دیکھ رہا ہوں"

"تو کھڑا کہاں ہے۔ یہ دس پک پرے سرائے ہے۔ اور کیا ہے"

پہلی نے دوسری کی طرف دیکھا، دوسری نے تیسری کی طرف اور پھر تینوں ہنسنے لگیں۔ اور مُنہ میں اپنی اپنی اوڑھنی کے آنچل کو دبا کر انہوں نے ہنسی کو بہت ضبط کیا مگر نہ کر سکیں۔ اور ایک نے دوسری اور دوسری نے تیسری کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بھاگنا شروع کر دیا۔ بے تحاشا، بے معنی

مسافر نے تعجب کی نگاہ سے دیکھا، اور پھر مُسکرا اُٹھا لیکن لڑکیاں بہت دور پہونچ چکی تھیں۔ جو اِس مسکراہٹ کا جواب دیتیں۔

آگے بڑھا۔ ٹوٹی پھوٹی مگر پکی عمارت کے دروازہ کو کھٹ کھٹایا اور پھر اُس عمارت کا معائنہ کرنے لگا۔ انیسوی صدی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

دروازہ کھُلا۔ ایک سولہ سالہ لڑکی نے باہر جھانکا۔

مسافر سکتہ میں رہ گیا۔ معاملہ کیا ہے۔ وہ گھبرا کیوں رہا ہے اُن لڑکیوں نے اس ہی عمارت کو تو سرائے بتایا تھا لیکن .....

"کہاں چلے مسافر"

"کہیں نہیں۔ سرائے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کدھر ہے؟"

"یہی تو ہے۔ آؤ"

"اچھا" اس وقت اس کی پنڈلیاں پھر دوبارہ درد کرنے لگی تھیں۔ ورنہ وہ چاندنی رات میں ہی اپنے سفر کو جاری رکھتا۔ اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی۔ مگر لڑکی برابر دروازہ پر ڈٹی رہی۔

"آ رہے ہو مسافر۔ یہ ہی سرائے ہے"

"اچھا آیا" ایک ایک قدم بھاری ہو رہا تھا۔ وہ چل نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک قدم کے بعد دوسرے کو گھسیٹ رہا تھا۔ ان وزنی قدموں کو کس طرح سنبھالے۔ خیر جوں توں کر کے دس بارہ قدم پورے کئے۔

"چلو مسافر"

"اس سرائے کی تم ہی مالکہ ہو" مسافر نے ہمّت کر کے پوچھا۔

"اونہہ ہوں۔ میرا باپ اس سرائے کا مالک ہے۔ وہ اندر صحن میں بیٹھا ہے۔ تم تھک گئے ہو مُسافر"

"ہاں جب ہی تو میں سرائے میں آیا۔ نہیں تو اپنا سفر جاری رکھتا"

وہ اُس پرشباب شوخ و شنگ لڑکی کے ساتھ اندر گھستا چلا گیا۔ کتنی خوبصورت، تمتماتے ہوئے رخسار، ٹیڑھی چتون، مسافر کو رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا کہ جنگل تو خیر نہیں مگر ویرانے میں بھی ایسا حُسن پھوٹتا ہے، پرورش پاتا ہے اور کھلی ہوئی فضا میں ہوا اور مینہ کے طوفان، زندگی کی کش مکش کے باوجود اُس کی ترو تازگی قائم رہتی ہے۔ وہ اُس حُسن سے کچھ مسحور ہو چلا تھا اور کھویا کھویا سا جا رہا تھا۔

"ابا مسافر کو کونسی کوٹھری میں ٹھیراؤں"۔

بوڑھے نے ناریل کے حقے کو گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"ادھر آؤ مسافر۔ تم تھک گئے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ سرائے میں کمروں کی کمی نہیں۔ جنّتی جا وہ سامنے والی کوٹھری ٹھیک کر دے"۔

"تمہاری سرائے میں مُسافر کبھی کبھی آتے ہیں نا۔ آج کوئی اور مُسافر نہیں ٹھیرا"۔

"بہت کم۔ پُرانی سرائے ہے۔ آجکل زمانہ میں لوگ سرائے میں کم ہی ٹھیرتے ہیں۔ مہینوں میں کبھی کوئی بھولا بھٹکا آجاتا ہے بزرگوں کی نشانی ہے۔ ویسے کھیتی باڑی کا کام کرتا ہوں"۔

"جنّتی! جنّی!"

"ابا۔ ابھی آئی"

لڑکی اپنے باپ کے پاس آئی۔

"ابا کوٹھری ٹھیک کر دی"

"میں لیٹنا چاہتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں"۔ اور بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مسافر سرائے کے بوڑھے مالک کے دُھندلے نقوش دیکھ رہا تھا، اور یا ناریل کے حقہ کی گڑگڑاہٹ کو سُن رہا تھا۔

"کھانا کب کھاؤ گے"

"یہی دو گھنٹہ کے بعد"

"اچھا"

لڑکی نے بیچ کی ہتھیلی میں سرسوں کے تیل کا دیا سنبھالا۔ اور کوٹھری کی طرف بڑھی۔ تھکا ماندہ مسافر پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لڑکی نے کوٹھری کے آلے میں دیا رکھ دیا۔ مدھم روشنی پھیل گئی۔ مُسافر نے دیکھا کہ کوٹھری کی دیواریں پختہ ضرور ہیں مگر جگہ جگہ سے چونے نے کھسکنا شروع کر دیا ہے۔ کڑیوں میں مکڑیوں کے لا انتہا جالے اور ایک سوندھا سوندھا سا تعفّن۔ معلوم ہوتا تھا کہ مدت سے کوٹھری کو کھولا نہیں گیا۔

جنّتی دیے کے سایے میں بیٹھ رہی۔

"تم کہاں جاؤ گے مسافر"

"بارہ میل پرے، وہاں مجھے جاکر کچھ کام کرنا ہے۔ دو تین مہینہ کے بعد پھر اپنے وطن کو واپس چلا جاؤں گا"۔

مسافر کھاٹ پر لیٹ گیا۔ جنّتی اُس دیے کے سایہ میں بیٹھی رہی دیے کی ہلکی پیلی روشنی میں جنّتی کے رخسار سیب ایسی رنگت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ دُنبالہ دار آنکھیں، اور نازک کونپل ایسے ہونٹ۔ وہ اپنی پلکیں برابر جھپکائے جا رہی تھی۔ مُسافر دزدیدہ نگاہوں سے اُس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ گدرایا ہوا حُسن، سادہ مگر پُر رُعب جو ہر انسان پر اپنا تسلّط جما دے، خاموش بالکل خاموش جنّتی بیٹھی بیٹھی تنکے سے کوٹھری کے فرش کو کریدنے لگی۔ اور اُس کی مرمریں کلائیاں مُسافر کے دل میں کھبی جا رہی تھیں۔

مسافر کا دل نیچے اوپر ہونے لگا۔ کیوں نہ وہ زندگی بھر اس سرائے میں قیام کرے۔ جہاں جنّتی ایسا زندگی کا اعلیٰ ترین نہیں خوبصورت ترین نمونہ پرورش پا رہا ہو۔ جنّتی برابر نگاہ جھکائے تنکے سے کوٹھری کے فرش کو کریدے جا رہی تھی۔ اور اُس کی چوڑیاں، پاس والے گاؤں کے منہیار کے ہاں تیار کی ہوئی کانچ کی چوڑیاں آپس میں ٹکرا کر ایک نہایت لطیف مگر سُریلی موسیقی بیدار کر رہی تھیں۔ جنّتی کی نگاہیں بتہ دیتی تھیں کہ وہ مسافر سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ مگر شاید اُس نے مُسافر کا تھکا ہوا چہرہ دیکھ کر صرف ایک ہی سوال پر اکتفا کیا۔

"جنّتی وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ مسافر کو آرام کر لینے دو۔ مسافر کو بھوکا مارنے کا ارادہ ہے کیا"۔

مُسافر کے پاس پوٹلی میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ مگر وہ سوچنے لگا کہ پھر کبھی کام آئے گا۔ کم از کم اس بہانے جنّتی پھر اُس کی کوٹھری میں آئیگی، جنّتی کو دیکھنے کی تمنّا نہ معلوم کیوں اس کے دماغ پر غلبہ پائے جا رہی تھی، اور شاید وہ اسی اُمید میں اُس کوٹھری میں لیٹا بھی رہا تھا۔ کیا مجال کوئی انسان وہاں ایک منٹ ٹھیر سکے۔ عجیب خوشبو سی کوٹھری کی فضا میں پھیلتی نظر آتی تھی۔ کچھ ابخرات جیسے اُٹھتے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس گھٹے گھٹے ماحول میں اُس نے سونا پسند کیا۔ اگر وہ جاتا تو صحن میں اپنی کھاٹ بچھا کر سو رہتا۔ مگر کس طرح وہ اور جنّتی سرائے کے مالک کی نگاہ سے بچ سکیں گے۔

گھنٹہ، دو گھنٹہ، نہ معلوم کتنے عرصہ تک مسافر سوتا رہا۔ کسی نے اُسے بُری طرح جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ وہ آنکھ ملتا ہوا اُٹھا۔ جنّتی کھانا لئے کھڑی تھی۔

"ارے! میں بہت تھک گیا تھا۔ اس لئے پڑ کر سو رہا۔ کھانا لائی ہو، رکھ دو"۔

مُسافر نے کھانا کھانا شروع کیا۔ جنّتی دیے کے سایے میں بیٹھ رہی

دو گھنٹہ پہلے شگفتہ کلی اب کھلتی جا رہی تھی۔ چنی کی جاذبیت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور دیے کی روشنی میں چنی کے چہرے پر اندھیرے اور اُجالے کے تاثرات ایک عجیب حُسن کی تشکیل کرتے معلوم دیتے تھے، قدیم یونان کی کسی خوبصورت دیوی کے نقوش وہ اُس وقت قطعی ایک پری بن گئی تھی۔ ایک تالاب میں کھلا ہوا کنول جس کو جتنی دیر دیکھا جائے اتنی اُسکی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا جائے۔ ایک خوبصورت چیز کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا پرکھا جائے اتنی ہی اس کی آب و تاب بڑھے۔ مسافر نے سرائے کے دروازہ پر چنی کو محض ایک لڑکی کے طور دیکھا۔ لیکن دروازہ والی وہ چنی اب حسین سے حسین تر ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ دیئے کے سایہ میں سُکڑی سُکڑائی، سمٹی سمٹائی، کچھ لجائی سی چنی مُسافر کے دل کے تاروں کو مضطرب کر رہی تھی۔ اور اُس کی نگاہ بار بار اُس حُسن ملیح کے جالے میں اٹک کر رہ جاتی۔

"مسافر اور کچھ چاہیئے"

"چاہیئے کیا۔ سب کچھ موجود ہے یہاں چُنی۔ مجھے بہت آرام ہے یہاں۔ اور بھلا کس چیز کی ضرورت"

"ضرورت تو ہے۔ مگر۔۔۔"

"مگر کیا؟"

"نہیں، مجھے سونے دو۔ میں بہت تھک گیا ہوں بہ ریا کھانی دبانی" مسافر نے کھاٹ پر پڑے پڑے اپنے آپ کو اینٹھا دیتے ہوئے کہا۔ اُسے چنی کو دیکھتے دیکھتے نزاکت کا احساس ہونے لگا تھا، نازک چیز کو دیکھ کر نازک بننا ہی پڑتا ہے۔

چنی چلی گئی۔ "ضرورت تو ہے"۔ مسافر سوچنے لگا۔ اُسے اور کس بات کی ضرورت ہے۔ کھاٹ ہے سونے کے لئے، مکان کا سایہ ہے۔ کھانا وہ کھا ہی چکا ہے۔ اور نیند وہ جلدی یا دیر میں اُس پر غلبہ پا جائیگی اُسے اطمینان ہے اور وہ فراغت کے عالم میں جلد ڈوب جائیگا۔ لیکن اُس نے دیکھ لیا متواتر جلے جا رہا ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے پتنگے اُس پر بے شمار تعداد میں قربان ہو رہے ہیں۔ ایک چھوٹے سے دیئے کے اتنے عاشق اور چنی وہ بھی ایک دیا ہے۔ اور اس کے پروانے۔ جانے دو۔ بے مطلب باتوں کے چکر میں پڑنا فضول ہے۔ رات خاموش سے خاموش تر ہو چلی۔ صحن میں بیٹھے ہوئے سرائے کے مالک نے حقہ گڑگڑانا بند کر دیا۔ صرف کبھی کبھی بہت دور شاید اُن جوار اور باجرے کے کھیتوں سے پپیہے کی مدھم مگر مست کن موسیقی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سُنائی دے جاتی تھی۔ مسافر کو دیئے کے سایہ میں چنی کی شبیہ بنکر پھر ڈھلتی نظر آتی تھی۔ چنی کے نقوش مسافر کی آنکھوں میں اس قدر معکوس ہو چلے تھے کہ دیئے کے سایہ میں اُس بیٹھی ہوئی چُنی اور اس کے دلکش چہرے کا احساس رہ رہ کر جاگ رہا تھا۔ اعضا درد کے مارے تڑپ رہے تھے۔ پنڈلیوں نے پھر درد کرنا شروع کر دیا۔ اور نیند، وہ جلد ہی مسافر کو اپنے مسکن کا باشندہ بنانا چاہتی تھی مُسافر سویا، اور نہایت فراخدلی کے ساتھ، صبح جب بیدار ہوا تو مہرِ عالمتاب کافی فیصلہ طے کر چکا تھا، مسافر کی معصوم نگاہیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ بالکل اس بات سے بے خبر ہے کہ چنی رات کو دوبارہ مسافر کی کوٹھری میں آئی تھی اور چلی گئی تھی۔ شاید چنی کے لئے مسافر میں کوئی کشش تھی۔

مسافر چارپائی کو چھوڑ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹھری کے دروازے پر چنی نمودار ہوئی۔

"سوچکے مسافر۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"سفر جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ ذرا پہر ڈھلے سے پہلے منزل پر پہنچ جاؤں گا"

"مسافر ایک دن تو اور ٹھیرتے۔ یہاں دیکھنے کیلئے بہت اچھی اچھی چیزیں ہیں" چنی کی نس نس مُسافر سے درخواست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

مسافر نے سوچا۔ اُسے جانے ہی کا کام تھوڑے مل جائیگا۔ وہ تو وقت مقررہ سے دو تین دن پہلے سے چلا یا تھا تاکہ مالک خوش ہو جائے سرائے کے آس پاس سرائے کے اندر قابل دید چیزیں بہت زیادہ تعداد میں تھیں اس میں شبہ ہی کیا ہے۔ سب سے زیادہ قابل دید چیز تو اُس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ مُسافر نے تھوڑی دیر سوچا۔ اور پھر۔

"اچھا کل چلے جائیں گے"

"تم بہت اچھے ہو مسافر" چنی نے اپنے چکیلے ہونٹوں کو نزاکت سے حرکت دیتے ہوئے کہا۔

سڑک کی اُس سمت، سرائے کے گرد و نواح میں دن بڑھنا شروع ہوا۔ مسافر سرائے کے مالک سے باتیں کرنے لگا چنی بار بار اِدھر سے اُدھر پھرتی پھراتی مسافر کی نگاہ کے سامنے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرائے کا بوڑھا مالک بڑا باتونی واقع ہوا تھا۔ وہ معنی بے معنی گفتگو کئے جا رہا تھا۔ اور سامنے رکھے ہوئے ناریل کے حقہ میں کبھی کبھی کش بھی لگا لیتا وہ کہتا تھا، میری بیوی ایسی خوبصورت تھی۔ آس پاس کے دیہات میں اُس جیسی حسین عورت چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی نہ مل سکتی تھی لیکن اُسے مرے ہوئے بارہ سال ہو گئے۔ اور چنی جب چار سال کا بچہ تھی۔ مُسافر ان باتوں کو

نہایت دلچسپی سے اور کان لگا کر سن رہا تھا لیکن بوڑھا آدمی کسی کام کے لئے سرائے سے باہر نکلا اور گفتگو خاتمہ پر آئی۔

مسافر سرائے سے باہر نکلا۔ اور جوار باجرے کے کھیتوں کے سہارے سہارے چہل قدمی کرنے لگا۔ جنّی ایک باجرے کے کھیت میں سے نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں باجرے کی پکّی ہوئی دو بالیاں تھیں۔

"مسافر۔ یہ ہمارا ہی کھیت ہے۔ آگے چلو"

کچّی منڈیر تھی۔ اور آس پاس باجرے اور جوار کے کھیت، پانچ پانچ چھ چھ فٹ قد آدم پودوں نے اُس منڈیر کو کھیتوں کے سہارے سہارے چلنے والے راہگیروں کی نگاہوں سے جنّی اور مسافر کو اوجھل کر دیا۔ جنّی نے باجرے کی بالیوں کو ادھر اُدھر لچکانا شروع کیا۔ اور پھر وہ اُس کچّی منڈیر پر بیٹھ رہی۔

"بیٹھ جاؤ مسافر"

"اچھا"

"مسافر"، جنّی نے ایک بالی سے دوسری بالی کو ٹکرایا۔ اور سر کا پلّہ نیچے آ رہا جنّی نے سر ڈھانپنے کی کوشش بھی نہ کی۔

"مسافر تم بہت اچھے ہو۔ دل چاہتا ہے کہ تم اسی سرائے میں ٹھہر جاؤ"

"کیوں؟"

"کیوں؟ مسافر تم کچھ نہیں سمجھتے۔ اتنے بڑے ہو چلے ..... اس ہوائے چلنے سے میرے سر میں درد ہو جاتا ہے مسافر"

ہوا میں ہرا بھرے ہرے نازک پودے لہرا رہے تھے۔ اور مسافر کے دیکھتے دیکھتے جنّی نے اپنے سر کو مسافر کے منڈیر کی ڈھلوان کے ساتھ ساتھ جھکی ہوئی ٹانگوں پر رکھ دیا۔

"کیا بات ہے جنّی"

"سر میں درد ہے۔ اُف" جنّی نے سر کو اوپر اٹھا لیا۔ اس نے مسافر کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ مسافر کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک نمایاں طور سے نظر آ رہی تھی۔

سرائے کے بوڑھے مالک نے پکارا "جنّی او جنّی۔ کدھر گئی"

"آئی ابا۔ مسافر تم آگے بڑھ کر اور کھیتوں کی سیر کر آؤ"

مسافر اُس منڈیر کے سہارے سہارے کھیتوں کی وسعت کو چیرنے لگا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر جنّی اُس سے کیا کہنا چاہتی تھی خیر اس الجھن میں پڑنے سے کیا حاصل۔ اب کی بار وہ اُس سے ٹھیک طور سے دریافت کر لیگا۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔

دوپہر کے وقت جنّی مسافر کی کوٹھری میں کھانا لائی۔ اور مسافر کے سامنے رکھ کر بیٹھ رہی۔ اُسی رات والے آلہ کے عین نیچے۔

خواہ مخواہ اس مرتبہ بھی جنّی کا پلّہ سر سے نیچے آ رہا۔ اور مسافر نے دیکھا کہ اس کی باریک کرتی کے پیچھے جنّی کا سینہ نیچے سے اوپر ہو رہا ہے۔ جنّی پھر زمین پر تنکے سے بے معنی لکیریں کھینچنے میں مشغول ہو گئی۔

مسافر تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگا۔ سرائے کی کوٹھری اُسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ جنّی اس قدر آگے بڑھ جائیگی۔

کھانا کھانے سے فراغت پا کر مسافر سرائے کے مالک کے پاس گیا پیسے چکائے اور کوٹھری میں آ کر اپنا سامان درست کرنے لگا۔

جنّی پھر کسی بہانے کوٹھری میں نمودار ہوئی۔ اُس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ کرتی کے بٹن ڈھیلے پڑ چلے تھے۔ دھوتی کا پلّہ کوٹھری کے دروازے کے اندر گھستے ہی سر سے آ رہا تھا۔ وہ مسافر کے عین نزدیک جا کر کھڑی ہو گئی مسافر کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ جنّی کے دل کی حرکت کی صدا تک کو سن رہا ہے۔ اور خاموش بت کی طرح کھڑی ہوئی جنّی اُس سے پھر کچھ التجا کرنی چاہتی ہے۔

"مسافر" جنّی نے پوٹلی کو ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔ "آج کی رات اور ٹھہر و مسافر" پوٹلی ہاتھ سے گر پڑی۔

اور مسافر نے دیکھا۔ کہ عین اُس کی نگاہ سے دو فٹ کی دوری پر جنّی کا سینہ دھڑک رہا ہے۔ اور اُس کی گوری گوری کلائیاں مایوسی اور ناامیدی کی ایک کشمکش میں ہیں۔

"چلدئے مسافر۔ پھر کبھی اس سرائے میں آؤ گے"

"کیا پتا۔ اس دُنیا کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ آج کیا ہونے والا ہے، کل کیا ہوگا۔ اور مجھے تو اکثر یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کل کیا ہوا تھا اچھا اب ہم چلدے"

"مسافر تم جیسا بھولا آدمی اب تک اس سرائے میں نہیں آیا" جنّی نے کچھ غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

مسافر کے سامنے اب وہی پکّی سڑک تھی۔ بارہ میل کا سفر طے کرنا تھا جتنے قدم آگے پڑتے تھے اتنے ہی قدم پیچھے سرائے بھاگی جا رہی تھی اور مسافر اُسے پیچھے چھوڑنا بھی چاہتا تھا۔ کبھی پڑی پر مٹی کے ڈھیلوں کو فٹ بال کے مانند لڑھکاتا، درختوں کی نیچے جھکی ہوئی ٹہنیوں کو توڑتا کچے۔ پتّوں کو خواہ مخواہ چباتا اور تھوکتا وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ چھ میل کا سفر طے کرنے کے بعد پھر اُسے تھکن کا احساس دم بدم کم ہمتی کی طرف

راغب کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا آیا وہ سستائے یا سفر کو جاری رکھے۔
ہرج ہی کیا ہے شیشم کے سایوں کی سڑک پر کمی نہیں۔ اور اپنی پوٹلی سے
چادر نکالی۔ اور زمین پر بچھا کر پھر لیٹ رہا۔

ایک آدمی کے سر پر صافہ، پاؤں میں دھوڑی استر کا جوتا! دوسرا
ننگے سر، ننگے پیر، اُسی شیشم کے سائے میں آکر بیٹھ گئے۔

"کدھر جا رہے ہو جی؟"

"چھ میل پرے قصبہ میں جانا ہے، رات کو سرائے میں ٹھیر گیا تھا
مگر سفر کی تھکن اب بھی نہیں اُتری۔"

سرائے کا نام سُنتے ہی نو واردوں کے چہروں کی رنگت بدلی۔
"وہ اُسی سرائے میں جہاں ایک بوڑھا آدمی رہتا ہے اور اُس کی
خوبصورت لڑکی۔"

"ہاں ہاں!" مسافر اُن دونوں آدمیوں کی طرف زیادہ
متوجہ ہو گیا۔

"لڑکی تو بہت خوبصورت ہے صاحب۔ مگر..."

"مگر کیا؟" مسافر نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی اگلے سال وہ ایک مسافر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ بوڑھے کو
پتہ لگا۔ اور اپنے واقف نمبردار کا گھوڑا لے وہ اپنی لڑکی کی تلاش میں
نکلا۔ پاس والے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ دن نکلنے میں دو گھنٹے کی دیر
ہوگی۔" پھر متکلم اپنے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔" اور پھر وہ
چنّی کو پکڑ کر لے آیا۔"

"اور مسافر کا کیا ہوا؟"

"ابھی اُس کا کیا قصور۔ وہ کہنے لگا کہ چنّی اپنی مرضی سے اُس کے
ساتھ آئی ہے۔ بوڑھے نے مسافر کو دو چار بات سُنا کر جانے دیا بھیا
جب اپنا پیسہ کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کا کیا قصور... چنّی سرائے
کے سامنے ڈرتی سی آکر کھڑی ہوگئی۔ سرائے کے بوڑھے مالک نے سڑک
پر شیشم کے درخت میں سے ایک بہت لچکیلی اور ہری ہری ڈنڈی کو
توڑا۔ اور چنّی کو اُس گُستی سُتانی ٹہنی سے پیٹنا شروع کیا۔ سارا گاؤں
کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔"

"سرائے کے مالک نے اس کی شادی کیوں نہ کردی؟"

مسافر کے اس سوال پر متکلم ہنسا۔

"بھیا شادی تو اس کی ہو چکی تھی مگر قسمت میں شادی کا سکھ
بھوگنا بھی ہو.... بوڑھے سے لوگوں نے کہا دوسری شادی کر دے
مگر وہ کہ دن بلا کر کہہ دیتا ہے کہ ہمارے خاندان میں بیوہ کی شادی
کبھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا ہم چلے۔ قصبہ چھ میل پرے ہے نا؟"

"ہاں۔ اتنی ہی دور ہوگا۔"

چنّی مسافر کے ساتھ بھی تو بھاگنا چاہتی تھی نہیں اُس نے کبھی
نہیں کہا۔ کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے چلے۔ مسافر کی خالی ہاتھ کی مٹھی غیر ارادی
طور سے بھینچی سی جاتی تھی۔ اُسے سرائے کے بوڑھے مالک پر غصہ آرہا تھا۔
اُسے چنّی کی شادی کر دینی چاہئے ورنہ پھر کسی دوسرے مسافر کے ساتھ
بھاگنے کی کوشش کریگی۔ وہ مجبور تھا۔ اپنے گاؤں میں بیوی بچوں کو
چھوڑ کر چلا تھا۔ جب وہ کمائی کر کے اپنے گھر واپس لوٹے گا تو بچے اُس
کو دیکھ کر پھولے نہ سمائیں گے۔ اور اُس کی بیوی اُس کی طرف دیکھے گی
تو وہ اُس سے کہدے گا کہ اُس نے اپنی بیوی کی امانت کو کسی کے
حوالہ نہیں کیا۔ اگر کر دیتا تو اچھا تھا۔ خیر شام بھی سر پر آرہی ہے سڑک
بتدریج سایوں کے لپیٹ میں آکر اپنی چمک کو کھوئے دے رہی ہے
وہ شفق کے نظارے کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس شوق نظارہ میں
وہ پھر کبھی کسی سرائے میں گم نہ ہو جائے۔ وہ سوچنے لگا کہ سڑک کیوں
اتنی خاموش رہتی ہے۔ یہ سڑک بھی عجیب ہے۔ اُس نے زندگی بھر
ایسی سڑک نہیں دیکھی۔ چوبیس گھنٹے متواتر مسلسل سوتی رہنے والی سڑک
سرائے گیارہ میل پرے رہ گئی، مسافر کو شام کے دھندلکے
میں قصبہ کی پکی عمارتوں کے کالے کالے مٹے مٹے نقوش دکھائی دینے
لگے۔ چھوٹا قصبہ ہے۔ اُسے مطلوبہ جگہ کا پتہ لگانے میں کچھ دیر نہیں
لگے گی۔

پچیس منٹ کے بعد وہ سڑک کے خاتمہ پر پہونچ گیا۔ ایک
دیہاتی نوجوان اپنی بیوی کے ساتھ قصبہ سے باہر نکلا۔ عورت نے ڈیڑھ گز
کا گھونگٹ نکال رکھا تھا۔ مسافر نے عورت کے سخت گورے ہاتھوں کی
طرف دیکھا جن میں سُرخ موٹی بھدی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔

کہیں وہ نوجوان اُس عورت کو بھگا کر تو نہیں لیجا رہا؟

مسافر نے عجیب انداز سے گردن کو ہلایا، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا
اور پھر سڑک کے عین خاتمہ پر پہونچ کر مسافر نے بہت مدھم آواز میں
اپنے آپ سے کہا۔

"کیا ہی اچھا ہو کہ چنّی کسی مسافر کے ساتھ بھاگنے میں کامیاب ہو جائے؟"

لیکن سڑک کے خاتمہ کے بعد قصبہ کی پتلی اور پیروں تلے دبی ہوئی
والی سڑک پر قدم رکھتے ہی، مسافر کے دماغ سے سرائے، چنّی، شیشم
کے سائے اور شفق کے نظارے کا خیال محو ہوتا چلا گیا۔

رام پرتاپ بہادر ایم، اے

شام

چھٹی کا دن مجھے کچھ یوں بھی پسند نہیں، اور پھر آج تو صبح ہی سے جی کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ دوپہر کو جب پچھم سے ہَوا دھول اُڑاتی ہوئی چلنے لگی تو میں ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اُس کے ساتھ میرا جی بھی اُڑ جائیگا۔ میں اس بات پر غور کرنے لگا کہ بسنت کے موسم میں جس کی تعریف میں شاعروں نے الفاظ کے پُل باندھ دئے ہیں ایسی تیز ہوا کیوں چلتی ہے جو دل اور قلب دونوں کو ایک ساتھ چیر جاتی ہے۔ تیز ہوا کے جھونکے میرے کمرے کی آمنے سامنے کی کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹوں میں سے سرسراتے ہوئے اور تیزی سے بجنے لگے، اور اس حالت میں بیٹھا بیٹھا میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بے رحم ہوا کے ساتھ میرے پھول جیسے دل کی پنکھڑیاں منتشر ہو کر ایک ایک کر کے اُڑ جائیں گی۔

سہ پہر کے بعد جیسے جیسے سورج پچھم کی جانب ڈھلنے لگا میرا دل بھی اس کے ساتھ ساتھ ڈوبنے لگا۔ شام ہونے ہوتے میں اتنا بے چین ہو گیا کہ اپنے کو اور موسم کو دونوں کو کوس کر بھی تسکین نہ پا سکا۔ فضا پر شام کی ہلکی ہلکی لکیریں دیکھ کر آتی ہوئی رات کا خیال آیا، اور پھر اس خیال سے کہ رات کی بے چین گھڑیاں کیسے کٹیں گی، میں بیقرار ہو گیا۔

کمرے سے باہر نکل کر کچھ دیر کھُلی چھت پر خالی الذہن ٹہلتا رہا لیکن جب وہاں بھی قلب کو سکون نہ ملا تو کمرے میں داخل ہوا اور ریڈیو چلا کر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈھیر سے ڈھیر سے خبریں آنے لگیں لیکن کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس خیال کے آتے ہی کہ دُنیا میں بھی کچھ نہیں ہو رہا ہے، اور ہر جگہ ایسی ہی کیفیت ہے شام اپنے سیاہ پنکھوں کے نیچے میرا دل دبانے لگی۔ جب میری بے چینی قوتِ برداشت سے بڑھ گئی تو یوں ہی غیر ارادی طور پر میں مکان سے باہر نکل پڑا۔

باہر فٹ پاتھ پر مکان کے سامنے ٹہلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سڑک کے دوسری طرف چوراہے کے پاس ایک آٹھ نو سال کا لڑکا ننگے بدن زمین پر بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بابوجی پیسہ" بھیک مانگنے والے لڑکے کے ہنس مکھ چہرہ سے جیسے میرے شعور کو دھچکا سا لگا۔ فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ آیا یہ لڑکا مجھے پہلے سے جانتا ہے، لیکن میں نے اُسے کبھی اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ پیٹ پھُلائے اپنی پتلی پتلی ٹانگیں سڑک کے کنارے کی دھول میں گاڑے ہوئے وہ خاک کی ڈھیر کے پاس بیخبر بیٹھا تھا۔ سامنے کچھ پھٹے پُرانے کپڑے اور چیتھڑے بھی پڑے تھے انھیں چیتھڑوں پر کچھ مونگ پھلیاں بھی پڑی تھیں۔ ناک اور مُنہ سے بہتے ہوئے نیٹے اور رال کو اُنھیں انگلیوں سے پونچھتا جاتا تھا جن سے مونگ پھلیاں چھیل رہا تھا۔ لگ بھگ اُسی کی عمر کے کئی لڑکے اُسے گھیرے کھڑے تھے جو اُسے چھیڑتے اور تنگ کرتے رہتے تھے۔

ٹہلتے ٹہلتے ایک بار پھر میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے اُسی طرح ہنستے ہوئے پیسہ مانگا۔ میں پریشان ہو کر سوچنے لگا، آخر اس بچہ میں کیا خرابی ہو سکتی ہے جو اس طرح سڑک پر پڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تیز چمک تھی۔ بدن گورا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس گندگی کے ڈھیر پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ میں پھر یہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ آخر یہ لڑکا کیوں بھیک مانگ رہا ہے۔ اتنے میں ایک شریر لڑکے نے اُس بیچارے کے سر پر ایک ٹیپ لگائی۔ بھیک مانگنے والا لڑکا رونے لگا۔ میری نظر اُس کی طرف گئی۔ اُس کی تیز چمکتی ہوئی آنکھیں آنسوؤں کی جھڑی کے پیچھے سے مجھے دیکھتے ہی مسکرائیں اور اُس نے ایک گندے چیتھڑے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اُسی برجستگی سے کہا، "بابوجی پیسہ"! کیا غضب کی شوخی اور شرارت تھی اُن آنکھوں میں! اُس کی طرف سے مُنہ پھیرنے ہوئے میں سوچنے لگا۔ کیا اسے ابھی بھیک مانگنا نہیں آتا؟ لیکن ایسا ہونہار لڑکا بھیک ہی کیوں مانگے؟ جیسے مجھے کسی نے چپت مار کر بتایا۔ لیکن کیا بھیک مانگنے کے لئے بھی کسی خاص خارجی علامت کی ضرورت ہے! جب میں ان گتھیوں کو سُلجھا نہ سکا اور وہاں ٹہلتے ہوئے اُس کی طرف بار بار دیکھنا بھی ناقابل برداشت ہو گیا، تو "فٹ پاتھ" چھوڑ کر میں سڑک پر چلنے لگا۔ جاتے جاتے ایک بار پھر میں نے اُس کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اُسی شوخ

انداز میں تیز آواز سے بھنبھنانے لگا۔ اب میں اپنے قدموں کو روک نہ سکا اور اس سے جان بچا کر تیزی سے سڑک پر بھاگا جا رہا تھا۔ لیکن اب کی بار میں نے جو خاص بات اُس بچّہ میں دیکھی وہ اُس کے بدن کے نیچے کے حصہ میں ایک غیر معمولی قسم کی حرکت تھی۔ کمر سے نیچے کا حصّہ اس تیزی اور مقررہ طریقہ سے حرکت کر رہا تھا کہ مجھے شبہ ہوا کہ اُسے اندر ہی اندر جیسے کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو گئی ہے۔

جب میں اپنے دوست کے مکان پر پہنچا تو وہ بھی کہیں جانے کے لئے تیار تھے، اُس کا نوکر تانگا لایا اور پھر ہم دونوں ساتھ ہی روانہ ہوئے۔ معلوم نہیں ہم دونوں کہاں جا رہے تھے۔ میرے دوست نے تانگہ والے سے صرف یہی کہا کہ سیدھی سڑک سے چلو۔ رات ہو چلی تھی، لیکن اس شب کی تاریکی میں بھی اُس لڑکے کی مسکراتی ہوئی چمکدار آنکھیں اور چہرہ ایک منٹ کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرف محلّوں میں سے ڈنکے کی آواز آ رہی تھی اور میں تانگہ پر چپ چاپ بیٹھا سوچ رہا تھا۔ محرم ہے۔ اگر ڈنکے اور تاشے اتنے زور سے نہ پیٹے جائیں تو کیسے معلوم ہو کہ محرم کیا چیز ہے۔ بیچ شہر میں سے ہو کر میرا تانگہ گزر رہا تھا۔ بجلی کی روشنی ہوتے ہوئے بھی ہر طرف دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ آسمان کا سارا دھنواں اور دھول ہوا نہ چلنے کی وجہ سے نیچے اتر آیا تھا۔ آنکھوں میں دھنواں بُری طرح بھرا جا رہا تھا۔ بار بار یہی خیال آتا کہ اس گھنی بستی میں رہنے والے کس طرح جیتے ہیں۔ کیا اس ہوا میں وہ خطرناک کیڑے نہیں موجود ہوں گے جو جیسا کہ ڈاکٹروں کا کہنا ہے صحت کے واسطے مضر ثابت ہوتے ہیں؟ تو پھر اس گندی ہوا میں ملا ہوا دھواں اور دھول پھانک کر ان سڑکوں کے کنارے بسنے والے کس طرح جیتے ہیں!

یک بیک تانگہ چوراہے پر رُک گیا۔ تانگہ والے نے کہا۔ "بابو جی تانگا آگے نہیں جا سکتا۔ اس طرف سے جلوس آنے والا ہے۔ بتائیے کہاں جانا ہے؟" میرے دوست نے جواب دیا۔ "مفتی گنج" اس نے وہیں سے تانگہ بائیں طرف کو موڑ لیا اور پھر اُسی تیز رفتار سے گھوڑا دوڑنے لگا۔ گھوڑے کے ساتھ میرے خیالات بھی دوڑنے لگے ——

کیا جلوس کے واسطے سڑک بند کر دینا ضروری ہے۔ رات کے وقت شہر کے بیچ سے جلوس نکالنے کی کیا ضرورت! ڈنکوں کی آواز سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اُنھیں مکانوں میں شاید کہیں کوئی بیمار ہوگا، کسی کے سر میں درد ہو رہا ہوگا، کوئی تپ دق میں مبتلا خون تھوکتا ہوگا اور کوئی اس دُنیا سے مُنہ موڑنے سے پہلے اپنی زندگی کا آخری پیغام ان ڈنکوں کی وجہ سے نہیں دے پا رہا ہوگا۔ زندگی اور موت کے درمیان یہ ڈنکے!

میرا تانگہ دوسرے چوراہے پر پہنچ چکا تھا۔ تانگہ والے نے گھوڑے کی راس کھینچتے ہوئے کہا۔ بابو جی ادھر سے بھی تانگہ نکالنا مشکل ہے۔ مفتی گنج میں کس طرف جانا ہے؟" میرے دوست نے جو تانگہ والے کی بغل ہی میں بیٹھے تھے کچھ کہا جو میں دھم دھڑا دھم کے شور و غل میں نہیں سُن سکا۔ میں اُس جلوس کو دیکھنے لگا تھا جو اس طرف سے گزر رہا تھا ایک کاغذ کے بنے ہوئے گھوڑے کو کالے رنگ کے کچھ مزدور اپنے کاندھوں پر لئے جا رہے تھے۔ اُس کے پیچھے سینکڑوں مختلف قسم کے عَلَم اور جھنڈے چل رہے تھے۔ سب سے پیچھے بہت سے جوان اور لونڈے ہاتھوں میں ڈنڈے اور لاٹھیاں لئے ایک دوسرے سے ٹھک ٹھک لڑاتے چل رہے تھے۔ میں یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ہندو مسلمان دنگوں کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ تانگے والے نے کہا۔ "یہ لٹھیا سالا رہیں۔ دُلدُل کے ساتھ نکلے ہیں۔" میں سوچنے لگا —— "دُلدُل" —— حضرت علی کا نامی گھوڑا۔ اُس کی آج ایک کاغذی تصویر بنا کر اس دھوم دھام سے لئے جا رہے ہیں۔ تانگہ والے نے اپنے گھوڑے کو دو چابک مارے۔ گھوڑا تیز دوڑنے لگا۔ مجھے اپنے تانگہ کا گھوڑا زیادہ اصلی معلوم ہوا۔!

لامحدود اُمیدوں اور بڑے بڑے منصوبوں کی فضا میں میں پلا ہوں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے دُنیا کی ہر چیز پسند آتی ہے۔ اس کے برخلاف مجھے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کمی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ میں فطرتاً رجائیت پسند رہا ہوں اس لئے دُنیا کی خرابیوں اور نا اُمیدیوں کے درمیان میری زندگی کا راستہ بند نہیں ہو جاتا۔ میں ہمیشہ اپنی دماغی دُنیا میں ہر چیز کی کمی کو دور کرتا رہتا ہوں۔ اور رکاوٹوں اور بندشوں کو توڑتا ہوا آگے بڑھنے کا طریقِ عمل ڈھونڈتا رہتا ہوں جس کسی چیز میں مجھے کمی نظر آتی ہے اُسے فوراً دماغی طور پر توڑ مروڑ کر مستقبل میں اُس کی جو شکل ہوگی اُس کی بنا پر اُس کا نیا خاکہ بنا لیتا ہوں۔ لیکن اُس 'دلدل'، 'علم'، ڈنڈوں اور لاٹھیوں کو دیکھ کر اور اُن بے شمار ڈنکوں پر چوبوں کی چوٹیں سُن کر میری عقل کو جیسے لقوہ مار گیا۔ میرے سامنے یہ سوال کہ آیا اِن سے بھی رہائی ہو سکتی ہے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بنکر کھڑا ہو گیا۔ کیا اپنے بدن کے کسی بیمار حصہ کی طرح اسے بھی ہم آسانی سے بذریعہ آپریشن اپنے نظام سے الگ کر سکتے ہیں؟ لیکن کچھ سوچ نہ سکا۔ ڈنکے سوچنے نہیں دیتے تھے۔ صرف دُلدُل اُٹھانے والے وہ کالے کالے آدمی آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ بقیہ سب اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ شہر کے اُس حصہ میں سڑک کے کنارے روشنی بھی نہیں تھی۔ دوڑتا ہوا گھوڑا اچانک رُک گیا۔ لیکن رُکتے رُکتے بھی گھوڑے

کے سامنے کے دونوں پہیے سڑک پر پڑے ہوئے بانس سے ٹکرا ہی گئے۔ تانگے والا تانگہ روک کر بولا "بابو جی اس سے آگے تانگہ نہیں جا سکتا۔ آگے سڑک کی مرمت ہو رہی ہے۔" مجبور ہو کر ہم لوگوں کو تانگہ پر سے اُترنا پڑا۔ میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر آج رکاوٹ کیوں ہے۔ ہم دونوں تانگہ چھوڑ کر کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ میرے سامنے دو عورتیں برقعہ پہنے آ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے ہم لوگوں کے راستہ ایک دوسرے سے رُک گئے۔ پھر لمبی عورت میری بغل سے راستہ بنا کر آگے بڑھی۔ اس کے ساتھ کی جوان لڑکی جو اپنے چہرے پر سے برقعہ ہٹائے ہوئے تھی میرے بالکل سامنے آ گئی اور مجھے دیکھ کر ذرا ٹھٹکی اور مُسکرا کر میرے کندھے سے کندھا رگڑتی ہوئی نکل گئی۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ اندھیری سڑک پر قدم سنبھال کر رکھتے ہوئے میں مُسلسل اُسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کے چیچک سے داغی چہرے کا مُسکرانا اور اُس کی ناک کی لمبی جھلنی کا اُس کے بُرقعہ سے ڈھکی ہوئی کمر کے ساتھ بل کھانا میں بھولا نہیں تھا۔ سڑک کے داہنی طرف ایک روشن برآمدے کے سامنے بہت سے لڑکے خوشی میں شور و غل مچا رہے تھے۔ برآمدے میں دیکھا ایک تعزیہ فرش پر رکھا تھا۔ اب جو اُس عورت کا خیال آیا تو سوچا محرم ہے!

اونچے کھابڑ ناہموار سڑک پر چلتے چلتے میں نے اپنے دوست سے پوچھا "کیوں بھائی کہاں تک چلنے کا ارادہ ہے؟" انھوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا "جہاں تم کہو" میں نے چُپ ہی رہنا مناسب سمجھا۔ پھر انھوں نے ہی کہا "سوچا آج تمہیں شرما جی کے وہاں لے چلوں"۔ یوں تو میں شرما جی کے نام سے واقف تھا لیکن اُن کا مکان کہاں ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اُن کی بیوی کی تعریف میرے دوست نے اکثر مجھ سے کی تھی لیکن مجھے خود اُن سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان کے بارے میں سوچ کر مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی تھی کہ وہ کیسی حسینہ ہے جو لوگوں کو یہاں وہاں سے کھینچ کر اپنے پاس بُلا لیتی ہے۔ لیکن اُس سے بھی زیادہ اُس کے مبارک شوہر یعنی شرما جی سے ملنے کی تمنا تھی۔ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ عجیب و غریب روزگار کرتے ہیں۔

میرے دوست نہایت ہی خوش مزاج آدمی ہیں۔ اور پھر ایسے مواقع پر اُن کا کیا کہنا! سوائے انگریزی کے اور دوسری زبان ایسے موقعوں پر بول ہی نہیں سکتے۔ اور پھر کس صفائی اور تیزی سے ایسے موضوع پر وہ پرائی زبان میں باتیں کر سکتے ہیں! اور ایسے موقعوں پر انھیں صدہا ہنسانے والی کہانیاں اور روایتیں یاد آنے لگتی ہیں وہ اُس اندھیری سڑک پر قصّہ سُناتے اور ہنستے ہنساتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان کی بغل میں خاموش گورووں کی طرح قدم سے قدم ملائے چلا جا رہا تھا۔ ظاہری طور پر اُن کی باتیں سُن کر ہاں میں ہاں ملاتا جاتا۔ لیکن خود میرے دماغ میں مختلف خیالوں کا ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کبھی اُس لڑکے کا ہنس مکھ چہرہ اور کبھی اس کی چمکتی آنکھیں بھیک مانگتی نظر آتیں۔ کبھی اُن ڈنکوں اور جلوسوں سے میرے خیالات کا بہاؤ رُک جاتا۔ پھر اُس خاموش اندھیری بستی کی طرف بھی میرا خیال جاتا جس میں سے ہو کر ہم لوگ گزر رہے، لیکن اُس وقت شرما جی ہی مجھے زیادہ آ رہے تھے۔ میں یہی بار بار سوچتا کہ شرما جی کو کیسے دیکھ سکوں گا۔

میرے دوست نے چلتے چلتے کہا "آپ ذرا دھیرے دھیرے چلو اُن کا مکان نزدیک ہے"۔ ایک دم میرے قدم رُک گئے۔ پھر وہ ایک طرف گلی میں مڑ گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے میں بھی ہو لیا۔ پتھر کی اندھیری گلی میں وہ اپنی ایڑیاں اُٹھا کر آہستہ آہستہ چل رہے تھے میں نے بھی اُن کی نقل کی۔ بائیں طرف وہ اونچا پختہ مکان کھڑا تھا۔ جس کی اونچائی اوپر اندھیرے دھندلے آسمان میں کھوئی جاتی تھی بائیں طرف کے پست قامت کچے مکان کی کھپریل میں ہاتھ اُٹھا کر چھو سکتا تھا۔ بیچ میں تنگ اندھیری پتھر کی گلی تھی جو اُن دو دُنیاؤں کو الگ کرتی تھی۔ ایک دُنیا وہ تھی جس کی ہزار دس روپیہ کی اونچی عالیشان عمارت کے ایک دس روپیہ کے کرایہ کے حصہ میں شرما جی اپنی منکوحہ کے ساتھ رہتے تھے۔ دوسری دُنیا اُن کچی دیواروں کے مکان کی تھی جس کی نامعلوم گرہستی سر شام ہی سے چراغ گل کر کے سو گئی تھی۔ ایک دُنیا میں متوسط طبقہ کی آتمائیں اُس پتھریلی سرمایہ داری کی چار دیواری کے درمیان پل کر اُوپر اُٹھنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ اور دوسری طرف کچے مکان میں درمیانی طبقہ کے رہنے والے نیچے اُتر کر نیچوں اور مظلوموں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے جا رہے تھے۔

گلی میں جو پہلا دروازہ ملا اُس سے ہم لوگ آگے بڑھ گئے دوسرے دروازہ پر میرے دوست ٹھیرے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اندر روشنی نہیں تھی۔ مجھے چونکہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے میں گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میرے دوست

مجھے وہیں رُکے رہنے کی ہدایت کر کے خود اندر داخل ہوئے اور دو چار سیڑھیاں اوپر چڑھ کر ایک اجنبی کی طرح پُکارنے لگے۔ کچھ دیر بعد جواب میں اوپر سے آواز آئی اور کہیں پر دروازہ بھی کھلا۔ اپنے دوست کو اوپر چڑھتے دیکھ کر میں بھی پیروں سے سیڑھیاں ٹٹولتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ زینہ کے اوپر موڑ پر سے کوئی لالٹین دکھا کر ہم لوگوں کا تاریک راستہ روشن کر رہا تھا۔ میرے دوست تو چونکہ اُس تاریک زینہ سے مانوس تھے اس لئے اُنھیں کچھ ایسی دقّت پیش نہ آئی۔ رہا میں سو میرے لئے اُس لالٹین کی روشنی بھی کافی ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ میرے اور اُس کے درمیان میرے دوست کا سایہ حائل تھا۔ خیر ساری دشواریوں کا سامنا کرتا ہوا جب میں اوپر زینہ کے آخری موڑ پر پہنچا اور میری نظر اُس چھوٹے کمرے میں پڑی جسے ڈیوڑھی بھی کہہ سکتے تھے۔ تو دروازہ کے ایک بے کھلے پٹے سے لگتی ہوئی مجھے جو پہلی چیز نظر آئی وہ کسی شخص کی کسی قدر غیر معمولی توند تھی۔ اس عجیب و غریب چیز کو اپنا استقبال کرتے دیکھ کر مجھے بے تحاشہ ہنسی آئی جسے میں نے جیب سے رومال نکال کر بمشکل تمام روکا۔ اُس چھوٹے سے مستطیل کمرے میں پہونچکر میرے دوست نے شرماجی سے میرا تعارف کرایا۔ میرے ہنسنے کا جذبہ چونکہ مجھ پر اب بھی غالب تھا اس لئے میں نے تو اپنی اور شاید شرماجی کی بھی آبرو رکھنے کیلئے کچھ بولنا چالنا غیر مناسب سمجھ کر خاموش بیٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اُن دو دوستوں اور خاص کر اس قسم کے دوستوں کی دیرینہ ملاقات کے باوجود ملنے پر آپس میں کوئی سرگرمی نہیں پیدا ہوئی۔

میرے دوست نے پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑیں لیکن میرے واسطے جو بات باعثِ پریشانی تھی وہ یہ کہ ہر بات کچھ آگے جاکر لنگڑانے لگی تھی۔ میں اپنی ہنسی اور قلبی پریشانی دونوں کو چھپانے کے لئے شرماجی کی طرف نہ دیکھ کر بقیہ ہر چیز پر نظریں دوڑانے لگا۔ چاروں طرف دیواروں پر تصویریں آویزاں تھیں۔ سب سے پہلے میری نظر پڑی گاندھی جی پر۔ ایک کیلنڈر کی تصویر میں وہ اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ماتھے پر تلک لگائے اپنی بوڑھی آنکھوں سے مسکرا رہے تھے۔ ننگے بدن کی ایک ایک ہڈی گنکر مجھے غصہ آنے لگا آخر ان کی یہاں کیا ضرورت تھی؟ دوسری طرف دیکھا تو اس ملک کا سب سے زیادہ خود دار آدمی نظر آیا ——— جواہر لعل! اُس تصویر میں وہ کھڑے ایک شیشہ ... ذرا ... ہنسی ہنس رہے تھے۔ مجھے اور بھی زیادہ جھنجھلاہٹ ہوئی ——— آخر یہاں ہر شخص کو ہنسنے کا کیا مذاق سوجھا ہے۔ بائیں طرف نظر گئی تو ایک تصویر میں لیلا ڈیسائی تاتھئی ناچتی ہوئی فخریہ انداز میں زمین پر لہنگا پھیلا کر اُکڑوں پیروں کے بل فرش پر بیٹھ گئی تھیں۔ اور خلا میں اُن کی خوبصورت سڈول ہاتھ کی اُنگلیوں میں رقص کی موسیقی تھرک رہی تھی۔ مجھے ذرا تسکین ہوئی ——— ہاں ’’یہ ایک چیز کسی قدر اپنی جگہ پر ہے!‘‘

اس اثنار میں میرے دوست شرماجی کو ہر طرح کی باتوں سے ٹٹول چکے تھے۔ پھر انھوں نے مصلحتاً اُس بڈھے کالے آدمی کے بارے میں انگریزی میں دریافت کیا جو زمین پر بیٹھا تھا۔ معلوم ہوا نوکر ہے پھر میرے دوست نے روزگار وغیرہ کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اب تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ اندر ہی اندر دم گھٹا جا رہا تھا میں نے اختلاج کے جھٹکوں کو دبانے کے لئے سگریٹ جلا کر جلدی جلدی دھوئیں کا ایک بادل اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا لیکن اس دوران میں یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ روزگار سے میرے دوست کا مطلب انشورنس تھا جو شرماجی کا اصلی پیشہ تھا۔ شرماجی نے خاکسارانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ’’معاف کیجئے گا اس وقت میرے پاس صرف بیڑی ہے‘‘۔ اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے میں نے اُنھیں ڈھارس بندھائی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن وہ رُکے نہیں ’’پہلے میں بھی سگریٹ ہی پیتا تھا لیکن بیڑی مجھے زیادہ پسند ہے‘‘۔ میرے دل نے بات جاری رکھی ’’ظاہر ہے سگریٹ پینا خود ہی کبھی کبھی بیڑی پینے کی تمہید ہوتی ہے‘‘۔ موقع پاکر میرے دوست نے اشارے میں شرماجی سے کچھ دریافت کیا۔ جواب میں شرماجی نے معافی چاہی اور مجبوری کا اظہار کیا۔

کچھ اور دیر ہم لوگ وہاں بیٹھے رہے۔ میرے دوست ایک عجب دماغی تردّد میں پھنسے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ وہاں اُس حالت میں ہم لوگوں کی بُری گت بن رہی تھی۔ مجھے مخاطب کر کے انھوں نے کہا ’’تو چلو بھائی کسی اور دن فرصت سے آئیں گے‘‘۔ وہ بات یوں ہی مصنوعی طریقہ پر کہی گئی تھی یا اس کے پیچھے کوئی مصلحت تھی۔ یہ سوچنے کے لئے میرے پاس وقت نہ تھا۔ میں جھٹ اُٹھا اور شرماجی سے نامناسب طریقہ سے الوداع کہے بغیر تیزی کے ساتھ زینہ سے اُترنے لگا۔ نیچے پہونچکر میں نے سانس لی۔ میرے دوست مجھ سے دو منٹ بعد آئے۔ ہم لوگ وہاں سے روانہ ہی ہو رہے تھے کہ اُسی وقت دو اور حضرات زینہ کے باہر دروازہ پر آ پہونچے۔ ان لوگوں نے شرماجی کو نامزد کر کے

پکارنا شروع کیا۔ اوپر سے شرماجی نے جواب دیا "شرماجی نہیں ہیں"
جب وہ لوگ کچھ دور چلے گئے تو میں نے اپنے دوست سے پوچھا "کیوں بھائی یہ کیا بات ہے؟" انھوں نے دبی ہوئی زبان میں جواب دیا "شرماجی نے بہت معافی مانگی ہے۔ اب انھوں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔" سامنے وہ حضرات سونی خاموش لمبی گلی میں قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے۔ پتھر کی تنگ گلی میں اوپر سے آنے والی دھیمی روشنی میں اُن کی سفید گاندھی ٹوپیاں چمکتی دیکھ کر مجھے بجد ہنسی آ رہی تھی شالوں اور چپلوں سے آراستہ وہ لوگ دیکھنے میں کانگریسی معلوم ہو رہے تھے۔ جناب شرماجی نے اپنا خیال بدل دیا تھا اور یہ لوگ ایسے لگ رہے تھے جیسے "وزارت" سے استعفیٰ دیکر واپس لوٹ رہے ہوں۔ اوپر سے جو منحوس روشنی آ رہی تھی اُس کی طرف میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر دُمدار ستارہ چمک رہا تھا۔ میں ایک دم کانپ اٹھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ہم لوگ چُپ چاپ پیدل ہی لوٹ رہے تھے جیسے لڑائی پر سے ہارے ہوئے سپاہی۔ میرے دوست تو حقیقت میں ہار ہی نہیں بلکہ زخمی ہو کر لوٹے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اب میں آگے آگے تھا اور وہ میرے پیچھے۔ داہنے ہاتھ اونچے پندھے پر ریل گاڑی بہت تیزی سے گزر رہی تھی۔ اندھیری دھنواں جیسی رات میں ٹرین کے روشن ڈبوں میں مسافر بھرے ہوئے تھے۔ فضا میں انجن اور ڈبوں نے ایک عجیب ہنگامہ اور شور برپا کر رکھا تھا۔ گاڑی میں مسافروں کا ہجوم دیکھ کر مجھے پھر درمیانی طبقہ کا خیال آیا اور اُسی کے ساتھ شرماجی کا خیال آیا۔ آخر شرماجی ایسا کرتے ہی کیوں تھے؟ تو کیا سچ مچ اُنھوں نے وہ گھر یلو روز گار بند کر دیا۔ میرے دوست نے کہا "ہرگز نہیں۔" شاید کوئی اور موٹی اور مستقل آسامی مل گئی ہے۔ میں سوچنے لگا۔ آخر اس کا فرائڈ کیا جواب دیتا؟ لیکن پھر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تو اقتصادیات کا مسئلہ ہے۔ ٹھیک ہی تو کسی نے کہا تھا کہ طبقاتی کشمکش میں متوسط طبقہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ ٹھیک یہی اس وقت اُن دونوں کچے پکے مکانوں میں ہو رہا تھا۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ سماجی کشمکش میں پڑ کر دونوں کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک رہی تھی۔ لیکن جہاں اُن میں سے ایک نے قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیکر تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ دوسرا اپنے برابر والوں سے بہتر ہونے کی غرض سے آخری کوشش کر رہا تھا۔ اوپر جانے کے لئے لیکن پھر مجھے اس بات سے جھنجھلاہٹ ہوئی کہ ایسی گندی اور بدصورت فضا میں خواہ مخواہ ایسے مشکل مسئلے کیوں دماغ میں چڑھ جاتے ہیں۔ پھر مجھے اُس آدمی کے سر داڑھی اور مونچھوں کے لمبے اُلجھے اور بگڑے ہوئے بالوں کو سوچکر ہنسی آنے لگی جو میرے دماغ میں اس ساری خرافات بھرنے کا ذمہ دار ہے۔ کچھ دور چل کر پھر ہم لوگ سڑک سے بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹے سے تاریک مکان میں گھس گئے۔

میں اندھیری ڈیوڑھی میں کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ اندر آنگن میں جا کر میرے دوست نے بڑھیا سے باتیں کیں پھر آکر مجھے بھی بُلا کر لیگئے۔ ہم دونوں کو بڑھیا نے ایک کمرے میں جہاں لالٹین کھڑکی پر رکھی جل رہی تھی لیجا کر بٹھا دیا اور بڑھیا خود کہیں باہر چلی گئی تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اُس چھوٹے سے کمرہ میں دھنوئیں کی کثرت سے میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ جب سے ہم دونوں وہاں آکر بیٹھے تھے سگریٹ ہی پیتے رہے تھے۔ کمرے کی پوری فضا ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی میں دھنواں دھنواں ہو رہی تھی اور ہم دونوں اس میں دو بے جان چیزوں کی طرح بیٹھے تھے۔

کچھ دیر بعد بڑھیا لوٹ آئی۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لیگئی۔ مجھ سے ایک چارپائی پر بیٹھنے کو کہہ کر اُس نے باہر سے دروازے بند کر دئیے۔ میں خاموش چارپائی پر بیٹھا، سگریٹ کے دھنوئیں سے دل کی تیز دھڑکن کو کم کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں آہستہ سے دروازہ کا ایک پٹ کھُلا۔ ایک چھوٹے قد اور گٹھیلے بدن کی تندرست لڑکی کمرے میں داخل ہو گئی۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں چونکہ میری آنکھیں جھُک گئیں اس لئے میں اُسے دیکھ نہ سکا۔ وہ میری چارپائی کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ طاق پر رکھی ہوئی ڈھبری اُس کی پیٹھ کی طرف پڑ رہی تھی، اس لئے اس کا لمبا چوڑا سایہ میرے اور کمرے پر چھا گیا کمرے میں جو رہی سہی روشنی تھی وہ اس گندے دھندلے ماحول میں کھو چکی تھی۔ سگریٹ کے بچے ہوئے ٹکڑے سے دھنوئیں کا آخری کش کھینچکر اُسے ایک طرف پھینکتے ہوئے لڑکی کا آنچل پکڑ کر میں نے اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ اس سے قبل کہ میں اُسے اپنی گود میں بٹھا تا اُس نے شرم سے اپنی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کر لیں۔ میں نے پیار سے اُس کے ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹا دئیے۔ چراغ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی میں نے اُسے دیکھا، اُس نے مجھے دیکھا۔ دونوں میں کس نے کس کو پہلے دیکھا معلوم نہیں۔ اُس کے اَدھ کھُلے ہونٹوں سے ایک چیخ نکل گئی

اور وہ بجلی کی طرح اچھل کر میری گود سے نکل کر کمرے کے باہر چلی گئی اُس کا چیخنا میرے دل اور کانوں کو ایک ساتھ چیر کر نکل گیا۔

میں تیزی سے کمرے سے نکلا۔ آنگن، ڈیوڑھی اور گلی میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آ نکلا۔ سڑک پر کچھ دور دوڑتا تو کچھ دور چلتا تھا، لیکن لگاتار بغیر کچھ سوچے سمجھے چلتا ہی جاتا تھا۔ سوچنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ لیکن بدستور چلتا جاتا تھا۔

میرے بالکل پیچھے آ کر تانگہ رُکا۔ گھوڑے کی ناک کی گرم سانس پیچھے میرے گلے سے مس ہوئی۔ میرے دوست تانگے سے اُتر کر میرے پاس آ چکے تھے۔ میرا کندھا پکڑ کر مجھے جنبش دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "کیوں، کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ آخر ہوا کیا؟ میرا انتظار تو کرتے۔ چلو، چلو تانگے پر بیٹھو!"

میں تانگے پر پیچھے کی طرف بیٹھا ہوا تھا اور وہ سامنے بیٹھے تھے۔ رات کافی جا چکی تھی، تیز ٹھنڈی ہوا دھیرے دھیرے مجھے جگا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے خیالوں کا سلسلہ پھر جاری ہوا۔ شکنتلا آج یہاں؟ اِس حالت میں؟؟ .... میں اس سے کبھی محبت کرتا تھا۔ اُس کے واسطے دیوانہ تھا۔ اُس کی شادی ہو گئی، اُسی نے مجھے لکھا تھا۔ "زندگی میں میرے اور تمہارے راستے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب ہم لوگوں کو مختلف سمتوں میں جانا ہے" لیکن آج پھر راستے ملے کیوں۔؟ اور یہاں ...... یہاں اس خرابے میں!

تانگہ ٹھیک میرے مکان کے سامنے رُکا۔ تانگے سے اُترتے ہوئے میں نے چوراہے کے اُس طرف دیکھا۔ جہاں شام کو لڑکا سڑک کے کنارے بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے کھسک کر چیتھڑے اپنی گود میں سمیٹے بجلی کے کھمبے کے نیچے سو گیا تھا۔ اُس نے مجھے اب کی بار دیکھ کر پیسہ نہیں مانگا۔ لیکن اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ چیتھڑوں کی گندگی میں سگریٹ کی ڈبیہ اور پتّی اکٹھا کر کے سماج کے گھورے پر پل کر پہنچنے والی انسانیت کا ایک دوسرا نمائندہ بجلی کے کھمبے کے نیچے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ بچے اور بوڑھے دونوں کندھے سے کندھا ملائے بجلی کے کھمبے سے لگ کر سو گئے تھے۔ اُن کے سروں پر بجلی کی روشنی سے مر کر گرنے والے پروانوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ بجلی اوپر جل رہی تھی۔ لیکن چراغ تلے اندھیرا تھا۔ شام رات میں کھو گئی تھی۔ دُنیا سوئی ہوئی تھی۔ صرف ایک اُلّو بجلی کے کھمبے پر بیٹھا چیخ رہا تھا۔!!

(صفحہ ۲۷ سے آگے)

اور وہ گیت بھی صادق نکلتا جنھیں وہ گایا کرتا تھا——

جوانی تو برباد ہو ہی گئی ہے
مگر عمر کے خواب باقی ہیں اب بھی
ابھی تو بہت دور ہے ایسی منزل
جہاں ٹھیر جائے گا، رومان کا پنچھی!

اور اسی کشمکش و پیچ میں اس نے پھر اپنے آپ سے سوالات کرنے شروع کیے۔ "یہ کیونکر ہو سکتا ہے، وہ ایک دیہاتی پادری کا لڑکا جس کی آزاد خیالی کے ساتھ پرورش ہوئی ہو ایک سیدھا سادھا اکھڑ اور بیباک آدمی ایک جھوٹی، آوارہ اور ذلیل مخلوق کے پنجہ میں پھنس کر رہ گیا، جو اس سے اتنی مختلف ہے، اتنی مختلف!"

جب گیارہ بجے کے قریب وہ کپڑے پہن کر ہسپتال جانے لگا تو نوکر آیا۔

"کیا ہے؟" اس نے کہا۔

"سرکار بیگم کہہ رہی ہیں کہ آپ نے جو ۲۵ روپئے کا وعدہ کیا تھا وہ دیدیجئے!"

چیخوف

مسعود زاہدی



"میں نے تم سے کتنی بار کہا کہ میری میز صاف مت کیا کرو۔" نکولی نے کہا۔

"جب بھی تم میز صاف کرتی ہو تو چیزیں اس طرح رکھ دیتی ہو کہ وقت پر نہیں ملتیں، وہ تار کہاں ہے؟ کہاں پھینک دیا اُسے؟ ڈھونڈو خدا کے لئے ڈھونڈو اُسے۔ قازان سے آیا ہوا ہے وہ اور کل کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔"

نوکرانی ـــــ ایک تیلی دُبلی زرد رُو اور بے نیاز سی لڑکی اس نے نیچے ٹوکری میں پڑے ہوئے تمام تار اکٹھے کر دئے۔ اور بغیر کچھ کہے سُنے ڈاکٹر کے ہاتھ میں دیدئے لیکن یہ تمام تار مریضوں کے تھے۔ تب اُس نے ڈرائنگ روم اور رادلکا کے کمرے میں بھی تلاش کیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ نکولی جانتا تھا کہ اسکی بیوی جلد واپس لوٹنے والی نہیں۔ کم از کم صبح کے پانچ بجے سے پہلے تو نہیں لوٹے گی۔ بیوی پر سے اس کا اعتبار اُٹھ گیا تھا، اور جب وہ بہت دیر تک باہر رہتی تھی تو وہ سو بھی نہیں سکتا تھا۔ پریشان ہو جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس سے نفرت بھی کرتا تھا۔

اسے اس کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی تھی، اس کے بستر، اس کے آئینہ، مٹھائیوں کی پیٹیاں اس کی خوشبو کی شیشیوں، یہاں تک کہ اُن نیلوفر کے پھولوں سے بھی جو اسے ہر روز کوئی نہ کوئی بھیجتا رہتا تھا۔ اور سیلی سیلی دوکان کی بیمار سی خوشبو سارے کمروں میں پھیلا دیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ زود رنج، بد مذاق، لڑاکا اور زود احساس ہو جایا کرتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس وقت اس تار کا ملنا بہت ضروری ہے، اشد ضروری۔ اگرچہ اس میں اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا کہ وہ اس کے بھائی نے بھیجا تھا۔ اور کرسمس کی مبارکباد دی تھی۔

اپنی بیوی کے کمرے میں میز کے نیچے سٹیشنری کے صندوق سے ڈھکا ہوا اُسے ایک تار ملا۔ اس نے اسے ایک اچٹتی سی نظر سے دیکھا۔ یہ تار اس کی خوشدامن کی معرفت اس کی بیوی کے نام تھا مانٹی کارلو کا پتہ تھا۔ اور نیچے مائیکل کے دستخط تھے۔ ڈاکٹر اس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔ یہ کسی غیر زبان میں تھا غالباً انگریزی میں ـــ

"یہ مائیکل کون ہے؟ مانٹی کارلو سے؟ اور پھر اس کی خوشدامن کی معرفت کیوں؟

شادی کے بعد کی سات سالہ زندگی میں وہ کافی شکی ہو گیا تھا۔ چیزوں کو کُرید کُرید کر اُن کی تہ میں پہنچنا اس کی عادت ہو گئی تھی اور اس دوران میں اسے کئی بار اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ اس شک نے اسے بہت اچھا سُراغرساں بنا دیا ہے وہ اٹھ کر اپنے مطالعہ کے کمرہ میں گیا اور سوچنے لگا، سوچتے سوچتے گزشتہ واقعات اس کے ذہن میں اُجاگر ہو گئے! ۴۹

تقریباً آج سے ڈیڑھ سال پہلے وہ اپنی بیوی کے ساتھ پیٹرزبرگ گیا تھا اور وہاں اپنے ایک پُرانے سکول کے ساتھی کے پاس ٹھہرا تھا جو سول انجنیئر تھا۔ واقعات اس کے ذہن میں اور صاف ہو گئے ـــ اسی انجنیئر نے اسے اور اس کی بیوی کو ایک اور شخص سے متعارف کرایا تھا جس کی عمر کوئی بائیس تئیس کے لگ بھگ تھی، اور اس کا نام ماہیکل یا مائیکل کچھ ایسا ہی تھا لیکن لوگ اسے یونہی ایک عجیب طریقہ پر مرسس کہنے لگے تھے۔

دو ہفتہ بعد ڈاکٹر نے اپنی بیوی کی تصویروں کے البم میں اُس شخص کی تصویر دیکھی جس پر فرانسیسی میں لکھا ہوا تھا۔

"حال کی یاد اور مستقبل کی اُمید میں"

اس کے بعد پھر اس کی ملاقات اس شخص سے اپنی خوشدامن کے یہاں ہوئی تھی۔ اور اسی وقت سے اس کی بیوی رات کو دیر سے گھر آنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اور بعض بعض مرتبہ تو رات رات بھر غائب رہتی تھی۔ اس کے بعد ہی سے وہ باہر جانے کیلئے ایک پاسپورٹ

کی فرمائش کرنے لگی تھی جسے وہ ابھی تک برابر انکار کرتا چلا آیا تھا جس کی وجہ سے گھر میں ایک اچھی خاصی جنگ شروع ہو گئی تھی، اس حد تک کہ وہ نوکروں کے سامنے آتا ہوا بھی شرماتا تھا۔

چھ مہینہ سے اس کے ساتھی اسے برابر مشورہ دے رہے تھے کہ اسے کہیں باہر چلا جانا چاہئے، اس کی صحت گر رہی ہے۔ تمام کام کو پسِ پشت ڈال کر اسے چاہئے کہ کریمیا چلا جائے۔ جب اس کی بیوی نے اس کے بارے میں سُنا تو اس کا پیار خاوند سے بڑھتا ہوا نظر آنے لگا۔ اور وہ اس سے برابر کہنے لگی کہ کریمیا میں سردی بہت ہو گی، اس سے بہتر یہ ہے کہ نائس چلا جائے تاکہ وہ بھی تیمارداری کی غرض سے اس کے ساتھ جا سکے۔ وہ وہاں اس کی نگہداشت رکھیگی۔ اور اسے ہر طرح آرام پہنچائے گی۔

اب اس کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا کہ اس کی بیوی کیوں نائس چلنے پر زور دے رہی تھی، اس لئے کہ مائیکل قریب ہی مانٹی کارلو میں تھا۔

وہ ایک انگریزی کی لغت لیکر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ لفظوں کا ترجمہ کرنے لگا۔

"میں اپنی محبوبہ کا جامِ صحت پیتا ہوں، اس کے ننھے پاؤں ۶۷
پہ ہزاروں بوسے قربان، میں اس کا بے چینی سے منتظر ہوں۔"

اُس نے اپنے اس مضحکہ خیز پارٹ کا تصور کیا جو اگر وہ نائس چلا جاتا تو اُسے ادا کرنا پڑتا۔ اسے اپنی حالت اتنی قابلِ رحم نظر آنے لگی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ بے چینی سے کمرے کے فرش پہ ٹہلنے لگا۔ اس کے مردانہ جذبات ابل کر بغاوت پہ آمادہ ہو گئے۔ غصہ میں اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور گالیاں خود بخود اس کے ہونٹوں پر لڑھکنے لگیں۔ اسے اپنے اوپر حیرت ہونے لگی کیونکر ممکن ہے یہ، کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک دیہاتی پادری کا لڑکا ایک مذہبی سکول کا تعلیم یافتہ، زندگی میں بیباکانہ کردار کا مالک، پیشہ کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر، وہ کیونکر ایک عورت کا غلام ہو کر رہ گیا، ایک کم حیثیت، کم مایہ، اور کمزور عورت کا غلام! "ننھے پاؤں" وہ بڑبڑانے لگا، تار اس کی چٹکیوں میں مسلا جا رہا تھا! "ننھے پاؤں"!

شادی کے بعد کے سات سال اور اس سے پہلے جب اسے اس سے محبت ہوئی تھی اور اس نے شادی کی تجویز پیش کی تھی، یہ سب اس کے ذہن میں محفوظ تھے اور اس تمام عرصہ میں اپنی بیوی کے لمبے معطر بالوں اور اس کے ننھے ننھے پاؤں کے سوا اسے کچھ بھی یاد نہ تھا، اور یقیناً اس کے پاؤں تھے بھی بہت چھوٹے چھوٹے نازک اور حسین، اور وہ انھیں ابھی تک چاہتا تھا، اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ اب بھی اس کی آغوش میں ہیں ــــ ان کے سوا کچھ بھی یاد نہ تھا اسے، کچھ بھی نہیں، وہ خانہ جنگی، ہسٹریا کی سی چیخیں، دھمکیاں، جھوٹ، خوفناک جھوٹ!

اسے اپنے باپ کا مکان جو دیہات میں تھا یاد آ گیا۔ کبھی کبھی ایک پرندہ کھلی ہوا میں سے اڑ کر کمرہ میں آ جایا کرتا تھا اور کھڑکی سے ٹکرا ٹکرا کر چیزوں کو بے ترتیب کر دیا کرتا تھا، اس طریقہ سے یہ عورت بالکل ایک مختلف جماعت سے اُڑ کر اس کی زندگی میں در آئی تھی، اُسے بالکل تتر بتر کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کے بہترین سال ایسے گزرے تھے جیسے جہنم میں گزر رہے ہوں، اس کی امیدیں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لئے ایک تماشا بن گئی تھیں، اس کی صحت گر گئی تھی اور اس کا گھر بھٹیار خانہ معلوم ہوتا تھا، اس تمام عرصہ میں اس دس ہزار کی آمدنی میں سے وہ کبھی دس روپیہ بچا کر بھی اپنی ماں کو نہ بھیج سکا تھا جو دیہات میں رہتی تھی، اور اس کا قرضہ، وہ الگ پندرہ ہزار تک پہنچ گیا تھا۔ اس وقت اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر اس کے گھر میں لٹیروں کا ایک گروہ بھی آ کر رہتا تب بھی یہ اتنی بری طرح برباد نہ ہوتا، جتنا اس عورت کی موجودگی سے ہو گیا تھا۔

وہ کھانسنے اور سانس کے لئے جدوجہد کرنے لگا، اسے اب تک اپنے بستر میں چلا جانا چاہئے تھا، مگر وہ نہیں جا سکا۔ اور برابر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی میز پہ بیٹھ جاتا اور قلم اٹھا کر یوں ہی گھسیٹنے لگتا۔

"نازک پاؤں .... ننھے پاؤں"

پانچ بجتے بجتے وہ بالکل کمزور ہو گیا، اور اسے سارا قصور اپنا ہی نظر آنے لگا، وہ سوچنے لگا کہ اگر اولگا کسی اور سے شادی کرتی جو اس پہ پوری طرح قدغن رکھتا ــــ کون کہہ سکتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے؟ وہ بہت اچھی اور گھر گر عورت ہوتی۔ وہ نفسیات میں بہت کمزور ہے اور عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔

.... "اب مجھے بہت عرصہ زندہ بھی نہیں رہنا"

اس نے سوچا میں بالکل مردہ ہوں، مجھے زندوں کے آڑے نہیں آنا چاہئے۔ دوسروں کا حق غصب کرنا بڑی زیادتی ہے۔ میں اس سے کنارہ کشی کروں گا۔ بہتر ہے کہ وہ اسی آدمی کے پاس چلی

جانے جس سے وہ محبت کرتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اُسے طلاق دیدونگا اور تمام ذمہ داری اپنے سر لے لوں گا۔"

آخر کار اورلنگا آگئی۔ وہ سیدھی مطالعہ کے کمرے میں گئی اور اُسی لباس میں جس میں وہ تھی، سفید لبادہ، ہیٹ اور فل بوٹ، وہ صوفے کی تہ میں ڈوب گئی "بدتمیز، موٹا" وہ سسکیاں لینے لگی، "بے ایمان، حرامخور، میں اسے برداشت نہیں کر سکتی، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"کیا بات ہے؟" نکولی نے اس کے پاس جاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ طالب علم، آز مدریکن مجھے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے راستہ میں کہیں میرا بٹوہ کھو دیا۔ اس میں پندرہ روپیہ تھے، میں نے وہ اماں سے اُدھار لئے تھے۔"

وہ ایک عجیب انداز میں رو رہی تھی، ایک بچی کی طرح اور نہ صرف اس کا رومال بلکہ اس کے دستانہ بھی آنسوؤں میں تر تھے۔

"اب اس کا کیا علاج" ڈاکٹر نے کہا، اگر اس نے کھو دئے تو کھو دئے، اب پریشان ہونے سے کیا فائدہ۔ خاموش رہو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں اتنی مالدار نہیں ہوں جو روپیہ یوں کھوتی پھروں۔ وہ کہتا ہے میں واپس کر دوں گا۔ مگر مجھے یقین نہیں، وہ بہت غریب ہے۔"

اس کا خاوند منتیں کرتا رہا کہ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ مگر وہ برابر طالب علم اور اپنے روپیہ کا ذکر کرتی رہی۔

"اچھا خاموش ہو جاؤ میں تمہیں کل پچیس روپیہ دیدوں گا اس نے غصہ سے کہا۔"

"اچھا میں کپڑے تبدیل کر آؤں" اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اپنے اس سمور میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتی، تم بھی کتنے عجیب معلوم ہو رہے ہو؟"

اس نے خود کپڑے اُتارنے میں اورلنگا کی مدد کی۔ سفید شراب کی بو جسے وہ بہت پسند کرتی تھی اس کے منہ سے آ رہی تھی، اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنے چہرہ پر پوڈر لگا کر واپس آگئی اگرچہ آنسو ابھی تک اس کی آنکھوں میں جھلک رہے تھے۔ اس کے خاوند کو روشنی میں لبادہ کی چمک اور اس کے بالوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں سلیپر پہنے ہوئے تھی۔

"کس سلسلہ میں باتیں کرنا چاہتے ہو" اس نے اپنے آپ کو ایک جھولے دار کرسی میں جھلاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ دیکھ چکا ہوں،" اس نے تار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

اُس نے اُسے پڑھا اور کندھے سکیڑ کر کہنے لگی۔

"پھر یہ تو نئے سال کی مبارکباد پر آیا تھا اس میں کوئی راز کی بات تو نہیں" وہ اور پہلے سے زیادہ زور زور سے جھولنے لگی۔

"تم مجھے انگریزی سے لاعلم ہونے کی وجہ سے اس طرح کہہ رہی ہو، ہاں مجھے انگریزی نہیں آتی، لیکن میرے پاس لغت ہے۔ یہ مرس کا تار ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کا جام صحت پیتا ہے، ہزاروں بوسے اس کے نازک پاؤں پر قربان کرتا ہے، خیر اسے چھوڑ دو" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا "میں کوئی اور نیا منظر نہیں پیدا کرنا چاہتا، بہتر یہ ہے کہ اب ہم اس چیز کو ختم ہی کر دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہی کچھ میں تم سے کہنا چاہتا تھا ــــــ تم اب آزاد ہو اور جہاں جی چاہے جا سکتی ہو"

اس پر خاموشی طاری ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ رونے لگی۔

"میں تمہیں اس لئے آزاد کرنا چاہتا ہوں کہ تم جھوٹ بولنے اور بہانے بنانے سے باز رہ سکو" نکولی نے اپنی بات جاری رکھی "اگر
ا۷ تم اس جوان آدمی سے محبت کرتی ہو تو کرو، اگر تم اس کے پاس وہاں جانا چاہتی تو جاؤ، تم جوان ہو، تندرست ہو، اور میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں، اور اب مجھے زیادہ دن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زندہ بھی نہیں رہنا، مختصراً یہ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم سمجھ گئیں نہ میرا مطلب۔

وہ مضطرب سا ہو گیا اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

اورلنگا روتی رہی جیسے وہ خود سے ہمدردی کر رہی ہو، اس نے یہ مان لیا کہ وہ مرس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے ساتھ شہر کے باہر بھی جایا کرتی تھی اور اکثر اس کے کمرے پر بھی اس سے ملاقات کے لئے جایا کرتی تھی، اور یہ کہ اس نے باہر بھی اس کے ساتھ جانا چاہا تھا۔

"تم دیکھتے ہو میں کوئی چیز تم سے چھپاتی نہیں۔"

اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "میری ساری زندگی تمہارے سامنے عریاں ہے۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے پاسپورٹ دلوا دو، دلوا دو پاسپورٹ!"

"میں پھر دہراتا ہوں کہ تم آزاد ہو۔"

وہ اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر آگئی، اور اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے لگی، اسے یقین نہ آیا اور وہ اس کا اصل مدعا سمجھنے کی کوشش کرنے لگی، وہ کبھی کسی کا اعتبار نہیں کرتی تھی، چاہے

دوسرے کی نیت کتنی ہی صاف کیوں نہ ہو۔ وہ سوچتی تھی کہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی خود غرضی کا شائبہ چھپا ہوا ہے۔ اور جب اولگا نے پھر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بلّی کی سی چمک تھی۔

"کب دلواؤ گے پاسپورٹ"؟ اس نے پوچھا۔

ڈاکٹر کا جی چاہا کہہ دے "کبھی نہیں"، لیکن اس نے ضبط کیا۔

"تم کب چاہتی ہو؟"

"میں صرف ایک مہینہ کے لئے جاؤں گی۔"

"تم ہمیشہ کے لئے مرس کے پاس جاؤ گی، میں تمہیں طلاق دیدوں گا، میں تمام ذمّہ داری اپنے سر لے رہا ہوں، تم سے شادی کرلینا۔"

"لیکن میں طلاق تو نہیں مانگتی۔" اولگا نے جلدی سے کہا میں تم سے طلاق کو تو نہیں کہہ رہی، میں تو صرف پاسپورٹ مانگ رہی ہوں۔"

"لیکن آخر تم طلاق چاہتی کیوں نہیں ہو؟" ڈاکٹر نے غصہ سے پوچھا۔ تم عجیب عورت ہو، کتنی عجیب، اگر تم واقعی اس کی دلدادہ ہو، اور وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے تو اس سے
۴۷ بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ تم اس سے شادی کرلو۔ کیا تم شادی اور حرام کاری میں بھی تمیز نہیں کرسکتیں!"

"میں سمجھ گئی تمہارا مطلب۔" وہ اس سے الگ ہٹکر کھڑی ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں کمینہ جذبات جھلکنے لگے "میں سمجھ گئی تمہارا مطلب، تم مجھ سے اُکتا گئے ہو، اور اس لئے مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو، یہ طلاق میرے سر منڈھ دینا چاہتے ہو، شکریہ! مگر میں اتنی بے وقوف نہیں جتنا تم سمجھتے ہو، نہ میں تمہیں چھوڑ دوں گی، اور نہ طلاق قبول کر دوں گی، نہیں، کبھی نہیں! مدعا یہ ہے کہ میں اپنا مرتبہ نہیں گرانا چاہتی، میں اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں میں حقیر نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ جیسے کوئی اسے بولنے سے روکنے والا ہے۔

"دوسری چیز یہ کہ میری عمر ستائیس سال ہے اور مرس کی عمر تیئیس سال، وہ ایک ہی سال میں مجھ سے اُکتا جائے گا۔ اور مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیگا اور اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو ایک وجہ یہ بھی ہے کہ......

بہت ممکن ہے...... بہت ممکن ہے میرے جذبات سرد پڑجائیں گے اور......... میں اُس سے اُکتا جاؤں یا نہیں میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"میں تمہیں دھکے دیکر گھر سے نکال دوں گا۔" نکولی نے چلّا کر کہا، اور زور سے زمین پر پاؤں مارا۔ "میں تمہیں گھر سے باہر نکال دوں گا، بدکار، چھنال!"

"دیکھا جائے گا" اس نے کہا اور باہر چلی گئی۔

باہر دن کی روشنی پھیل گئی تھی، لیکن ڈاکٹر ابھی تک اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا، اور اس کی پنسل خود بخود کاغذ پر چل رہی تھی۔

"میری جان......... ننھے پاؤں"

یا پھر وہ کمرے میں گھومنے لگتا تھا، اس تصویر کے سامنے جو آج سے سات سال پہلے اس کی شادی کے بعد لی گئی تھی اور اس کی طرف بہت عرصہ تک دیکھتا رہا۔ یہ پورے گھر بھر کی تصویر تھی۔ اس کے خسر، خوشدامن، اس کی بیوی اولگا جب وہ بیس سال کی تھی، اور وہ خود ایک خوش باش اور نوجوان خاوند کی شکل میں۔

اس کا خسر داڑھی مونچھ صاف، ایک بیمار سا پریوی کونسلر تھا، دوست کا بے انتہا بھوکا۔ اس کی خوشدامن ایک گٹھے ہوئے اور پتلے پتلے بھوکے سے نقوش کی عورت تھی کسی نیولے کی طرح۔ اپنی لڑکی سے بیحد محبّت کرتی تھی یہاں تک کہ اگر وہ اس کو کسی غیر مرد سے......... دیکھتی تو اپنے کرتے کے دامن سے پردہ پوشی کرتی۔ اولگا بھی نازک اور بھوکے سے نقوش کی لڑکی ہے، لیکن ماں سے زیادہ بیباک وہ نیولا نہیں بلکہ اس سے بھی بڑے قسم کی جانور ہے۔ اور نکولی خود تصویر میں ایک سیدھا سادھا، نرم فطرت اور صاف دل جوان نظر آتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک طالبعلم کی سی آزاد روی مُسکرا رہی ہے۔ اور اس آزاد روی میں اعتبار کی سی جھلک ہے، شاید یہ شکاری جانور جن کے پنجوں میں وہ گرفتار ہو گیا ہے اسے خوشی اور محبّت کی دوست دے سکیں۔ اور شاید اس کے وہ خواب پورے ہوسکیں جنھیں وہ طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا کرتا تھا

(بقیہ مضمون صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ کیجئے)

کسوٹی

کسوٹی

کیا گوری کیا سانولی

ایشیا کا یہ مسلک نہیں رہا ہے کہ وہ ماہانہ ہو کر ماہانہ رسائل سے اخذ و اقتباس کرے، کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ملک میں جو رسائل مقبول اور مشہور ہیں وہ اہلِ نظر کی نگاہوں سے گزرتے ہی ہیں، لیکن میراجی کا یہ مضمون اپنی حیثیت میں مفید و دلچسپ ہے اس لئے شائع کیا جاتا ہے۔

ساغر

پہلے انسان کو صرف عورت کی ضرورت تھی پھر زندگی پھیلتی گئی اور طبیعت رنگ بدلتی گئی، یہاں تک کہ آج عورت کی مختلف قسمیں ذہنِ انسانی کا مرکز ہیں۔ سرو قد، بوٹا سا قد، بھرے بھرے سڈول اعضا، چھریرا جسم، حُسن صبیح، حُسن ملیح۔ غرض جتنی آنکھیں ہیں اتنی باتیں ہیں اور اس میں کسی کا کیا بس، دل ہی تو ہے، — لیکن دل ڈانوا ڈول ہوتے رہنے کے باوجود ۴۷ کوئی نہ کوئی وجہ تو اپنے انتخاب کی رکھتا ہوگا۔ عظمت اللہ کہتے ہیں ؂

کیوں مجھے تیری چاہ ہے　　اس کو کیوں بوجھئے
جس کی بوجھن کچھ نہیں　　اُس کو کیوں بوجھئے

گویا دل کوئی سبب پیش نہیں کر سکتا تو آئیے ہم دماغ سے کام لینے کی کوشش کریں۔

ابتدا ہی سے اندھیرے اُجالے کا ساتھ رہا ہے لیکن انسان نے ہمیشہ اُجالے کو اندھیرے پر ترجیح دی ہے۔ ممکن ہے اس پسند کی علت تاریکی سے خوف ہو، وہ خوف جو مذہب کی ایجاد کا باعث بنا۔ اور یونہی کتب میں دیوی دیوتا اور فرشتے اور حوریں ہمیں گورے ہی دکھائی دیتے ہیں اور شیطان تاریکی کا بادشاہ۔ پھر بھی تہذیب و تمدن کی ترقی یافتہ منزلوں میں ہمیں چارلس باڈلیئر ایسے شعرا یہ کہتے سُنائی دیتے ہیں: —

"اسکی ہر بات کالے رنگ کی ہے، وہ تو روحِ شبانہ دکھائی دیتی ہے، روحِ تیرگی.... وہ ایک مہرِ آبنوسی ہے، ایک نجمِ سیاہ، اسکے باوجود نور و مسرت کی کرنیں۔ اُس میں سے پھوٹ رہی ہیں.... وہ سیمیں سیارہ نہیں جو لوگوں کے مطمئن خوابوں میں مسکراتا ہو، بلکہ ایک سانولی، غضبناک دیوی (ہے)"

گو یا رنگ کا مسئلہ ایک ایسا بھید ہے جسے ہم ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ یہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ رنگوں کا اثر نہ صرف جسمانی لحاظ سے ہم پر ہوتا ہے بلکہ ذہنی یا نفسی لحاظ سے بھی ہمارے احساسات اور خیالات ان سے تحریک پاتے ہیں اور ہر رنگ انسانی ذہن پر مختلف حسیاتی یا تخیلی تاثر پیدا کرتا ہے اور اس نسبت سے ہر جذبے یا خیال کا بھی مختلف رنگ ہے، مثلاً غصے کا سرخ، محبت کا گلابی، حسد کا سبز — وغیرہ۔ مشرق میں مغرب کی بہ نسبت رنگوں کی اس گہری اہمیت کا احساس زیادہ پرانا ہے جسکی ایک مثال راگ راگنیوں کے رنگ ہیں اور یہ سلسلہ صرف آواز تک ہی نہیں ختم ہو گیا بلکہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اس کا جال پھیلا ہوا ہے اور مختلف پہلو مختلف تشریحات کے حامل ہیں۔ سہاگن سُرخ جوڑا کیوں پہنتی ہے، سادھو سنت جوگیا لباس کیوں پسند کرتے ہیں، بیوہ سفید ساڑھی ہی لپیٹے رکھتی ہے۔ سیاہ کپڑا سوگ کا نشان ہے پھر کھلے اور رنگ برنگے کپڑے پہننے سے طبیعت میں ایک چلبلاپن، ایک اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے اور یونہی ایک سادہ طبیعت کے مقابلہ میں کوئی چُلبلا یا اُمنگوں بھرا دل بھڑکیلے اور رنگ برنگ کپڑوں کو پسند کرتا ہے۔

لیکن اس وقت ہمیں رنگوں کے انتہاء بھید کے گوناگوں پہلوؤں کی بجائے صرف گورے اور سانولے پہلو پر غور کرنا ہے اور اسکے ساتھ ہی سرسری طور پر دیکھنا ہے کہ ادب اور خصوصاً اُردو ادب میں اس لحاظ سے شعراء کا کیا مسلک رہا ہے نیز اسکی وجوہ کیا تھیں لیکن پہلے ہم انسان کے موجودہ علم کی روشنی میں جنسی انتخاب کے معیار کے اصولوں کو دیکھتے ہیں۔

ہیولاک ایلس کی تحقیق کے مطابق حُسن کا احساس کوئی اضطراری بات نہیں اس احساس اور انتخاب کی بُنیاد پانچ اصولوں پر ہے۔

اوّل ۔ جمالیاتی خصوصیات کی داخلی بُنیاد جس کی تمام متنوع صورتیں یک جا رہتی ہیں، اور جسکے ذریعے سے نسائی حُسن کے اس آدرش تک پہنچا جا سکتا ہے جو ابتک تمام نسلوں کے ذہین انسانوں کا خاصہ رہا ہے۔

دوم ۔ کسی نسل یا قوم کی معینہ اور امتیازی خصوصیات حُسن کے آدرش میں اختلاف پیدا کر دیتی ہیں کیونکہ اکثر حُسن نسلی یا قومی لحاظ سے جسمانی خصوصیات

کی انتہائی نشو و نما کا دوسرا نام ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قوم یا نسل کی جسمانی خصوصیات کی انتہائی نشو و نما اس قوم یا نسل کی صحت اور زور طبیعت کی انتہائی نشو و نما کا اظہار بھی کرتی ہے۔

سوم ۔ اکثر ممالک میں حُسن کا ایک اہم اور عموماً لازمی عنصر ثانوی جنسی خصوصیات بھی ہیں، مثلاً عورت میں سر کے بال، چھاتیاں، کولھے اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں۔

چہارم ۔ انفرادی ذوقِ سلیم، جس کی بُنیاد اور نشو و نما مخصوص نظامِ جسمانی اور ذاتی تجربات پر ہوتی ہے اور اکثر یہ انفرادی اجزاء اجتماعی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور یوں حُسن کے بدلتے ہوئے فیشن رائج ہوا کرتے ہیں کیونکہ ایک فرد کی شخصیت کا اثر کسی خاص بات کو بہت سے افراد کے ذہنوں پر طاری کر دیتا ہے۔

پنجم ۔ جب تہذیب و تمدن ترقی کی انتہائی منازل پر پہنچ جاتے ہیں تو بعض حسّاس اور اعصابی افراد حُسن کا ایک غیر معمولی آدرش قائم کر لیتے ہیں اور اسکی بجائے کہ وہ اپنی قوم یا نسل کے قریب تر حُسن سے متاثر ہوں انہیں ایسی صورتیں اور مورتیں پسند آنے لگتی ہیں جو اُن کیلئے مانوس نہ ہوں بلکہ اجنبی، اچھوتی اور دور کی چیز ہوں۔

بُنیادی طور پر جنسی انتخاب کے یہ پانچ اصول ہیں لیکن میرے خیال میں اسکے ساتھ ہی ہمیں محبت اور نفرت کے تعلق کو بھی نہ بھولنا چاہئے۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی خوبصورت یا گوری عورت سے محبت میں ناکامی ہوئی ہے تو نفسی عمل نے نفرت کا احساس پیدا کر کے دوسری بار اُسے پہلی سے بالکل مختلف قسم کی عورت کی طرف راغب کیا ہے۔ چنانچہ فرانسیسی شاعر چارلس باڈلیئر کی سیاہ پسندی اسکی بہترین مثال ہے۔ اپنی نسل کی عورت سے بوجہ محبت میں غیر مطمئن ہونے کے بعد اسکے احساسات ایک حبشن پر مرکوز ہو گئے لیکن ایسی مثالیں استثنا کا درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ انسانی رجحان زیادہ تر گورے رنگ کی طرف ہے اور اسی سلسلے میں جب ہم مختلف اقوامِ عالم کے معیارِ حسن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ذیل کی وضاحت ملتی ہے۔

پہلا گروہ خالص سفید اقوام کا جو فطرتاً سفید رنگ کو پسند کرتی ہیں۔

ایران :۔ سفید اور چہرے کا گلابی رنگ۔

یونان :۔ سفید رنگ۔

فرانس :۔ سفید اور گلگوں، دودھ سی سفید کھال۔

جرمنی :۔ سفید اور گلگوں۔

آئرلینڈ :۔ برف سے زیادہ سفید کھال۔

ترکی :۔ سفید رنگ۔

دوسرا گروہ غیر خالص سفید اقوام کا جو غیر خالص ہونیکے باوجود سفید رنگ کو پسند کرتی ہیں۔

جاپان :۔ سفید کھلا ہوا رنگ۔

شام :۔ انجیل میں لکھا ہے، تیری گردن ہاتھی دانت کا مینار ہے۔

عرب :۔ اسکا چہرہ پورے چاند کا سا تھا اور سفید (کالے) بالوں سے بالکل متضاد۔

اطالیہ :۔ مشہور شاعر پیٹرارش کی محبوبہ برف سی سفید ہے۔

تیسرا گروہ غیر خالص گندمی رنگ والا جو گورے رنگ کو پسند کرتا ہے۔

ہندوستان :۔ اور ہندوستان میں قدیم تصور کے لحاظ سے پدمنی کی مثال نمایاں ہے جس کا رنگ کنول کی طرح مانا گیا ہے لیکن انتہائی مثال کے طور پر راجپوتانے کے ایک گیت کا مصرعہ بھی دیکھئے:۔

گورے مکھ پہ سہائے کالی چونڈری

اُردو ادب کی طرف آنے سے پہلے ہندوستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہئے۔ پہلے ہندوستان میں صرف سیاہی مائل اقوام بستی تھیں چنانچہ نہ صرف وہ خود بلکہ اُن کے دیوی دیوتا بھی سیاہ اور وحشتناک تھے اور کالی اور کرشن مہاراج کے تصور کی بُنیاد بھی انہی کے تصورات پر ہے۔ بعد ازاں آریہ لوگ اپنے سفید رنگ کو ہندوستان میں لائے، پھر یونانی آئے اور اپنے رنگ کی آمیزش کی، پھر مغل آئے اور انہوں نے رنگ کی غزل کا نہ صرف مطلع بلکہ مقطع بھی عرض کیا اور یوں ہندوستان مختلف رنگوں کا ایک کھولتا ہوا سمندر بن گیا۔

۷۵

چونکہ ہمیں بُنیادی اقوام کا ادب حاصل نہیں ہے اس لئے ہم باہر سے آنے والوں ہی کے متعلق اندازہ لگاتے ہیں ظاہر ہے کہ آریہ رفتہ رفتہ یہاں کے لوگوں میں گھُلے مِلے ہوں گے۔ چنانچہ ابتدا میں انکے دیوی دیوتاؤں کے جتنے تصورات ہیں اُن میں گورے رنگ کو ہی فوقیت حاصل ہے۔ برہما گورے، بشنو گورے، پاربتی کا ایک نام ہی گوری، وشنو گورے، اُن کی لکشمی بھی گوری اور بہت بعد میں جا کر وشنو کے (غالباً) نویں اوتار کرشن مہاراج سانولے نظر آتے ہیں، لیکن رادھا پھر بھی گوری ہی رہتی ہیں۔ ادب میں پہلے زمانے کے لحاظ سے سنسکرت کے شاعر امرو کو دیکھئے جس کا زمانہ ۸۳۰ء قبل مسیح اور ۲۸۰ بعد مسیح کے درمیان ہے۔

"تمہارے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں،
اور وشم آدیت کا جنگل مصر اگیشی کے رنگین مندر کو اپنی گود کے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔"

ظاہر ہے کہ رنگین جگمگاتا ہوا مندر سیاہی مائل نہیں ہو سکتا۔ امرو ہی کی ایک اور نظم میں جو بدھ کی بیوہ کی پرارتھنا ہے، مرد کو چندر مکھ کہا گیا ہے اور اُس کی جلد گلاب کا ایک پھول ہے۔"

ایک اور مصرع دیکھئے:-
"میں تو اُڑ کر اُس جگہ پہنچنے کو ہوں جہاں وہ میری راہ دیکھ رہا ہے جو دن سے کہیں سُندر ہے"۔

ایک اور نظم میں عورت کہتی ہے:-
"جب وہ کالی جھیل میں سے نہا کر نکلتا ہے تو گویا چاند رات میں نمودار ہوتا ہے"۔

اور جو ذرا سانولے ہیں وہ گورا بننے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ سنگار کے سلسلے میں

"۔۔ بڑے بڑے کنول کے پھولوں سے برادہ لے کر اپنی چھاتیوں پر چھڑک لیا"۔

امرو کے بعد سنسکرت ادب کو چھوڑ کر ہم صوبائی رجحانات کی طرف آتے ہیں۔ بہار کے شاعر ودیاپتی نے سنسکرت ادب کی روایات کے سہارے پر اپنے ذہنی عقیدے کو ذاتی محبت کے چھپانے کا ذریعہ بنایا اور اس لئے اسکے گیتوں میں رادھا گوری ہے اگرچہ یوں بھی رادھا کو گوری کہا جاتا ہے۔ چنانچہ

چہرہ جیسے بجلی چمکے ۔۔ اور کاندھے پر بال گھٹا سے

ایک اور شعر

"چاند کنول کو گود میں لے کر ۔۔ ڈوب گیا مستی میں یکسر"

اس شعر میں چاند کرشن مہاراج ہیں اور یہاں ودیاپتی نے سانولے سلونے شام کی نسبت کا لحاظ بھی نہیں رکھا۔

اور سُنئے: ۔۔ رادھا چھپ کر ملنے جا رہی ہے ؎

انگ انگ رادھا کا ایسی سُندر جوت جگائے
چندر اُجالا جس کے اندر گھل مل کر کھو جائے
نین کسی کے دیکھ نہ پائیں دیکھیں تو کب جانیں
رادھا اور چندرماں ایک ہوں، کیسے مانیں؟

ممکن ہے کہ رادھا کا گورا تصور کرشن کے سانولے پن کے مقابل میں محض اضافی حیثیت رکھتا ہو لیکن گورے رنگ سے رغبت بہر حال ظاہر ہے۔

ودیاپتی کا ہمعصر چنڈی داس ہے جو بنگالی تھا اور بنگالیوں کے متعلق کچھ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں لیکن اسکے ہاں بھی رادھا اگرچہ اسکی اپنی محبوبہ رامی دھوبن کا ایک عکس ہے پھر بھی گوری ہی دکھائی دیتی ہے۔

اُردو شعرا گورے اور سانولے رنگ کے لحاظ سے عجیب ڈھلمل قسم کے رہے ہیں اور ان کے ہاں اکثر دونوں رنگوں کا ذکر دکھائی دیتا ہے بعض شعرا اس لحاظ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

ہندوستانی زندگی میں سانولے رنگ کی کثرت کے باوجود یہاں کے گیتوں اور ٹھمریوں میں بھی جہاں عموماً

"سانولی صورت، میرا من"

دکھائی دیتا ہے وہاں

"گورے مکھ پہ سہائے چوندڑی" بھی نظر آتا ہے اور یہ بھی راجپوتانے کے علاقے میں جہاں کے ریگستان میں پانی کو بھی شاید مل جائے صحیح معنوں میں گورا رنگ نادر معدوم ہی کا حکم رکھتا ہے کیونکہ پیلے رنگ کو گورا نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ شاید مختلف نسلوں کے رنگا رنگ اجتماع کا اثر ہے، غالباً قدیم ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے سفید رنگ مانوس ہونے کے باوجود کچھ خاص رغبت کا باعث نہ تھا۔

ولی دکنی گجرات کے سانولے حُسن کے گُن گاتا ہے۔ میر تقی کو فقر کا غم اس قدر مارے ڈالتا ہے کہ معشوق کا حُسن ان کے کلام میں ایک ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اسکے باوجود یہ شعر کہ

کیفیت اسکے لب کی کیا کہئے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

گورے ہی رنگ کی ترجمانی کرتا ہے۔

میر حسن کی مثنوی کے قریباً تمام کردار گورے ہیں۔ چنانچہ بدر منیر کے متعلق کہتے ہیں ؎

۱۔ وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
۲۔ وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے وہ نقشہ کہ تصویر حیرت کو آئے
۳۔ زبس مثلِ آئینہ تھا اُس کا تن کہے تو کہ تھی ناف عکسِ ذقن
۴۔ وہ ساقِ بلوریں وہ اندازِ پا بھرے ہے سحر چشم و دل میں صدا
۵۔ سماں اُس گھڑی کا کہوں کیا میں آہ ستاروں میں تھا جلوہ گر اک ماہ

نجم النساء کو دیکھئے:-

۱۔ بھبھوکا سا تن اور منھ کی دمک کہ جوں شعلہ آتش سے اُٹھے بھڑک
۲۔ نہانے سے نکلا عجب اس کا روپ نکل آئے بدلی سے جس طرح دھوپ
۳۔ وہ مہتاب سا چہرہ ہو زرد زرد سراپا ہوا شکل اندوہ و درد

عیش بائی رقاصہ بھی گوری ہی ہے

۱۔ فقط کان میں ایک بالا پڑا کہے تو کہ تھا مہ کے ہالا پڑا
۲۔ لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئی سر بسر کہ بدلی ہو جوں مہ کے اِدھر اُدھر

یہ سب تو بڑے کردار تھے لیکن بدر منیر کی ساتھنوں کو بھی دیکھئے:-

۱۔ کئی ہمدم اُس کی جو تھیں ماہرو بچھائے ہوئے کرسیاں سو بسو

اسکے مقابل میں سانولے رنگ کی حمایت میں ولی کے علاوہ داغ اور انشا کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ انشا صنائع بدائع رعایت لفظی کے زمانے

کا شاعر اور اس زمانے کے شعرا پر خلوصِ جذبات کے لحاظ سے اعتبار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اکثر ان کے کلام میں محبوب کا رنگ شعر کی فنی باتوں سے معین ہو جاتا ہے پھر بھی انشا پہلا اُردو شاعر ہے جو سید اور ترکی فارسی کا عالم ہونے کے باوجود اکثر سانولے رنگ کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ

ہے نام خدا، وا چھڑے کچھ زورِ تماشا ــــ یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب قہر بھبن اور جھمکڑا ــــ اللہ کی قدرت

اور اس رنگت کی وضاحت اگلے ہی شعر میں ہے ؎

میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشقِ شیدا ــــ اے کانِ ملاحت
فرمانے لگے ہنس کے سنو اور تماشا ــــ یہ شکل یہ صورت

اور دیکھیے ؎

یہ نمک، یہ چھب، یہ سج دھج، یہ ادا کو دیکھ تری
بتلاطمِ تحیر ہوئے غرق ہوشمنداں ــــ

ایک اور ؎

سانولے پن پہ غضب ہے دھج بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھیے جے اب کنہیا لال کی

غالب کے ہاں اگرچہ وہ داخلی ہوتے ہوئے بھی اپنی ہمہ گیری کی بنا پر غیر جانبدار شاعر ہے فطرتاً سفید رنگ ہی نمایاں ملتا ہے۔

مرزا رسوا عموماً ایک ناول نویس اور عالم کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن انکی شخصیت کے ساتھ اُن کی شاعری بھی دلچسپ اور قابلِ توجہ ہے۔ زندگی میں اُن کی محبوبہ ایک فرانسیسی عورت تھی لیکن جس طرح اپنے ناولوں میں انہوں نے آپ بیتی کے عنصر کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر پیش کیا ہے اسی طرح اپنی مثنوی امید و بیم کے ذریعے سے بھی اپنی محبوبہ کو

سانولا رنگ نشیلی آنکھیں ــ شوخ طرار رسیلی آنکھیں

کہکر بات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بحیثیت عمومی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو شعرا کے محبوب کا رنگ عموماً جغرافیائی، نسلی اور روائتی اثرات سے نمایاں ہونے کے باوجود امتیازی حیثیت نہیں رکھتا لیکن غالب کے بعد کے زمانے میں دو مثالیں مجھے نہایت درخشاں طور پر دکھائی دیتی ہیں یعنی عبدالرحمٰن بجنوری اور عظمت اللہ مرحوم۔ ان دونوں شاعروں کی ایک ایک نظم گورے اور سانولے حُسن کی تعریف میں ہے اور اپنی مختلف خوبیوں کی بنا پر میں یہ دونوں نظمیں پیش کرتا ہوں۔

پہلے بجنوری کو سُنئے

(۱) صنمِ فرنگ قمر جبیں، بتِ سیم رنگ، غضب حسیں
وہ عذار نازک و شرمگیں کہ رقیبِ ساغرِ آتشیں
وہ ہوا میں کاکلِ عصفریں کہ شہابِ ثاقبِ شب رواں

(۲) ورقاتِ غنچۂ گلاب گوں دو لبِ گداز پر از فسوں
مژۂ دراز و کج و نگوں میں نہاں وہ دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں

(۳) تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسلِ الم و بلا
مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں، تجھے کیا خبر گئی کسکی جاں

بجنوری کی نظم میں ایک گوری عورت کو جس چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے وہ ایک سانولے حُسن کے متوالے کو بھی للچا سکتا ہے اور یہی کیفیت عظمت اللہ کی نظم میں ہے سُنئے:۔

سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی
اندھر ویس کی سُندر پتری کالی کوئل سے کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور آدا ہٹ میں لالی

. . . .

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پُتلی بھنورا سی کالی
خمار اک مستانا چھایا
وہ من موہنی مقناطیسی ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو لُبھایا
اور سراپا گدرا گدرا، سانچے میں ڈھلا، لچکیلا
جوشِ جوانی، پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلا سا وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن
اک موج مچلتی مچلاتی چڑھتی اُترتی تھراتی
اور گردن کا نفیس ڈھلاؤ
سینے کا جوالا مکھ، کمر لچکتی، بل کھاتی
ہوش ربا اُتار چڑھاؤ
سُندر صورت سُندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی
فطرت نے جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے لئے حسن یہی ہے سج دھج گرمانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی

۷۷

مضمون تو ختم ہو گیا لیکن کوئی صاحب شاید یہ پوچھیں کہ عنوان پوری طرح چسپاں نہیں ہوتا لیکن میں کہوں گا کہ اپنے لئے سب برابر ہیں۔

کیا گوری، کیا سانولی

میراجی

نئی کتابیں

جگ بیتی

پنڈت جواہرلال نہرو کے ان خطوط کا ترجمہ ہے جو انہوں نے مختلف جیلوں سے اندرا کے نام لکھے ہیں۔ یہ تمام خطوط انگریزی میں ہیں۔ محمود علی خاں نے ان کا ترجمہ کیا ہے۔ کتاب مکتبۂ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی ہے قیمت تین روپے مجلد۔

یہ تمام خطوط تاریخ عالم کا ایک ہلکا سا خاکہ ہیں یا یوں کہئے کہ تاریخ کے جس قدر ضروری جزو ہیں اس کتاب میں پیش کر دئے گئے ہیں۔

آجتک جس قدر تاریخیں اُردو یا انگریزی میں لکھی گئیں ان تمام میں غلط واقعات کی اس قدر بھرمار ہے کہ ایک صحیح دل و دماغ کا آدمی انہیں پڑھتے پڑھتے اُکتا جاتا ہے اور غصہ سے کہیں کہیں خود بخود اس کی مٹھیاں بھنچنے لگتی ہیں۔ جہاں تک خیال کیا جا سکتا ہے ان تمام تاریخوں کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سب تعصب کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ خصوصاً وہاں سے جہاں ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے شروع ہوتے ہیں۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ اور ممالک

عربوں کے حملوں کو بربریت اور ظلم کی ایک داستان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن پنڈت جواہرلال کی یہ کاوش ایک صحیح اور سنجیدہ کاوش ہے انہوں نے چیزوں اور واقعات کو کہیں بھی غلط پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

پنڈت جی کی نگاہوں نے چیزوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھا ہے اس لئے ہمیشہ صحیح دیکھا ہے۔ اگر پُرانی تاریخوں میں کچھ واقعات درست بھی ہیں تو ان پر غلط بیانی کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے اور لکھنے والوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں جو اتحاد ہندو اور مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کا ذمہ دار ہے اور تمام تر منافرت پھیلائی گئی تاریخ کے ہی ذریعہ۔ جب ہم سکول کی بنچ پر تاریخ کی کتاب لے کر بیٹھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دراصل تاریخ نہیں بلکہ کچھ سوچنے سمجھنے والے جانوروں کی کہانیاں پڑھ رہے ہیں جو اکثر اپنی کمینگاہوں میں چھپے رہتے ہیں اور موقع ملنے پر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ غرضیکہ پُرانی تاریخوں کے کچھ اجزاء کے بارے میں بلاشک وشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غلط باتوں کی غلیظ پوٹ ہیں۔

پنڈت جی واقعات کو غلط بیانی کے رنگ میں نہیں رنگنا چاہتے اسکے علاوہ وہ ہندو مسلمانوں یا ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں منافرت پیدا کرنے کے بھی قائل نہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ دروغگوئی کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے واقعات کی غلط تاویلیں نہیں کر سکتے۔

ہم اس کتاب کو پڑھ کر ایک نشان لگا سکتے ہیں کہ یہاں سے تاریخیں اپنے صحیح رنگ میں پیش ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان کے مندروں پر حملے کئے لیکن اسکی وجہ تعصب نہیں بلکہ "مندروں کو تباہ کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پُرانے مندر عموماً قلعے اور گڑھ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتے تھے۔ جنوب کے بہت سے مندر آج بھی قلعوں سے مشابہ ہیں جہاں حملوں کی صورت میں لوگ پناہ لے سکتے ہیں۔"

غرضیکہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے خصوصاً وہ جو انگریزی سے واقف نہیں ان کیلئے یہ کتاب تاریخ تک پہنچنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔

ادب کثیف

مصنفہ حاجی لق لق، شائع کردہ مکتبۂ اردو لاہور
قیمت ایک روپیہ۔

حاجی لق لق کا خیال ہے کہ غالب نے درست ہی کہا تھا ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتا

حاجی لق لق کی یہ کتاب طنزیات کا ایک مجموعہ ہے جس میں وہ کہیں کہیں بے سوچا باتیں کرتے لگتے ہیں لیکن اکثر جگہ بڑے لطیف اور دلکش پیرایہ میں طنز کرتے ہیں۔ اُردو میں ہمیں شعراء میں تو ایک دو معروف وغیر معروف طنز نگار نظر آتے ہیں۔ لیکن نثر میں ابھی تک بہت کمی ہے۔ اگر کچھ ہیں بھی تو چند مزاحیہ نگار ہیں۔ یہ تمام دور جدید کی پیداوار ہیں۔ لیکن لق لق کے یہاں مزاح اور طنز کا ایک اچھا خاصا امتزاج نظر آتا ہے۔

لق لق کا اسلوب پُرامید ہے، وہ اسے جدت اور دلچسپی کی گہری شکل دے سکتے ہیں۔ لیکن جب وہ بے معنی باتیں کرنے لگتے ہیں تو ایک قسم کی کوفت سی ہونے لگتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر وہ طنز نگاری کو بھی ادب کی ایک باقاعدہ صنف سمجھیں اور اسے ایک فن کار کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً ان کے "جاپان مہد آفتاب" کے عنوان سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے نقالوں پر ایک اچھا طنز کرینگے لیکن نہیں کرتے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگتے ہیں ہاں ان کی "آسمانی حور"۔ "آؤ چلیں" وغیرہ قسم کی چیزیں اچھی ہیں۔

حیوانی دُنیا کے عجائبات

مصنفہ عبدالبصیر خاں، شعبۂ حیوانیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی قیمت عـہ

اب ہماری زبان مضامین کے لحاظ سے اتنی امیر ہوتی چلی جا رہی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اس میں ہر موضوع پر اچھی اور عمدہ کتابیں دستیاب ہو سکیں گی۔ چونکہ ہمارے ملک کی فضائیں اس وقت تک محض حسن و عشق گشت کر رہے تھے، جتنی کتابیں بھی تھیں وہ سب اس قسم کے خیالات سے پُر تھیں مگر اب بہت سے ٹھوس مضامین اور خیالات اس میں آتے چلے جا رہے ہیں اور یہ سب اس بہت مختصر وقت میں ہوا ہے بلا شبہ اس دور کو ہم نشاۃِ ثانیہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس کتاب میں عبدالبصیر خاں نے حیوانی دُنیا کے بہت سے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔ حیرت انگیز اس وجہ سے کہ ہماری توجہ کبھی جانوروں کی طرف مبذول نہیں ہوئی تھی۔ جب یہ چیزیں ہماری نظروں کے سامنے آتی ہیں تو ہم ایک قسم کی حیرانی کا اظہار کرتے ہیں۔

اب تک عام خیال یہ تھا کہ تمام جانور محض (INSTINCT) جبلّت کے تحت میں کام کرتے ہیں لیکن اب معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ جانور کچھ عقل بھی رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں جانوروں کا بڑا حصّہ اب بھی اپنی جبلّت کے بھروسے پر زندگی بسر کر رہا ہے لیکن وہ جانور جن کا دماغ بڑا ہوتا ہے اس میں (COMPLEXITY) اُلجھاؤ بھی ہوتا ہے اور یہی اُلجھاؤ ان کی عقل کی دلیل ہے۔ اس معاملہ میں آدمی کا دماغ بہت (COMPLEX) ہے اسی لئے انسان تمام جانوروں میں سب سے بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

جانوروں میں اخلاق بھی ہوتا ہے، چیزوں اور واقعات کو پہلے سے جان لینے کی قوّت بھی اور یہ کہ ان کا رنگ کہاں تک ان پر اثر انداز ہوتا ہے یہ تمام باتیں اس کتاب کی دلچسپی کا سبب ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو جانوروں سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اس علم سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اسکے علاوہ اگر یہ کتاب پڑھنے کی خاطر بھی خریدی جائے تو دلچسپی سے خالی نہیں اور معلوماتِ عامّہ کا سبب ہوگی۔

نغمۂ زندگی

یہ فضل احمد کریم صاحب فضلی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ملنے کا پتہ دفتر انجمن ترقی اُردو دہلی اور فضل برادران لمیٹڈ، کیننگ ہاؤس، مشن روڈ ایکسٹنشن، کلکتہ۔

فضلی پر "سادگی و پُرکاری" کا مقولہ بڑی حد تک صادق آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا اندازِ بیاں اچھوتا اور نرالا نہیں بلکہ تقلیدی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مقلّد تقلید میں کامیاب کہاں تک ہے۔ فضلی اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہے اسکے یہاں الفاظ اور تراکیب کے ساتھ ساتھ بیان کی سادگی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اس نے پرانوں کے اسالیب سے کافی استفادہ کیا ہے۔

جہاں تک فضلی کی نظموں کا تعلّق ہے وہ فن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں رکھتیں۔ نظم میں وہ اتنے کامیاب نہیں جس قدر غزل میں ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں محض غزل گوئی کیلئے پیدا کیا ہے۔ ہمارے شعراء میں ایک عام مرض یہ ہے کہ وہ ہر طرف پیر پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ مسلّمہ امر ہے کہ ہر آدمی صرف ایک ہی میدان میں تنوّع پیدا کر سکتا ہے اور مزاج کی رو کسی ایک ہی شعبہ میں کوئی نئی چیز خلق کر سکتی ہے۔ یوں دوڑنے کو آدمی ہر طرف دوڑ سکتا ہے مگر وہ بات نہیں پیدا ہوتی جو اس چیز میں ہوتی ہے جس سے طبیعت کو ایک فطری لگاؤ ہو۔

غزل کے اچھے اشعار کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ ایک یا دو مرتبہ سُننے کے بعد فوراً یاد ہو جاتے ہیں۔ فضلی کے اکثر اشعار میں یہ بات پائی جاتی ہے۔

آپ نے ہم سے بے وفائی کی
اب کسی بات کا یقیں نہیں رہا

آگ سا چہرہ پانی پانی
اف رے مرا شرمانے والا

ہمراز نہ تھا جب تک رہتی تھی گراں جانی
اب ہے یہ پریشانی ظالم نہ کہیں کہدے

پریشان ہونے سے اب فائدہ ؟
کہ جو بات ہونی تھی وہ ہو چکی

دیوان جوشش

مرتبہ قاضی عبدالودود صاحب، شائع کردہ انجمن ترقیٔ اُردو، دہلی۔ قیمت عـہ

جوشش عظیم آباد کے اُن شعراء میں سے ہے جو میر و مرزا کے زمانے میں زندہ تھے۔ اس کی زندگی کے کچھ زیادہ واقعات ہم تک نہیں پہنچتے۔ مثلاً یہ کہ بچپن اور جوانی کیونکر گذری۔ قاضی صاحب نے اس کتاب کی ترتیب میں بڑی کاوش کی ہے اور تقریباً ابتدا کے سو سے

زائد صفحات میں جوشش کے خاندانی حالات اور اسکی زندگی کے دوسرے واقعات معلوم کرکے حُسن کے ساتھ لکھے ہیں - جہانتک جوشش کی زبان کا تعلق ہے وہ وہی ہے جو اسکے ہمعصر شعرا کی زبان تھی لیکن اندازِ بیان میں کہیں کہیں میر کا انداز جھلکنے لگتا ہے -

جوشش کی طرح اور نمعلوم کتنے شعرا گذرے ہونگے جنہوں نے اُردو میں اچھے خیالات کا اضافہ کیا ہوگا مگر وہ منظر عام پر نہ آسکے انجمن ترقی اُردو کی کوششیں اس سلسلہ میں قابل تحسین ہیں کہ اس نے بہت سی ایسی کتابوں سے جو بہت اچھی تھیں مگر عوام ان سے واقف نہ تھے واقف کرایا -

جوشش کے رنگ اور زبان سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کرانے کے لئے نمونہ کے طور پر اُن کے چند شعر سُنئے :-

اس تغافل شعار کی باتیں — میں کوئی اعتبار کرتا ہوں
مرگیا ہوں پر اسکے آنے کا — اب تلک انتظار کرتا ہوں
زہر کے گھونٹ گھونٹ کرکے پیں — صبح و قع محار کرتا ہوں
کیوں نہ مجھ پر کرم کرے جوشش — جان اس پر نثار کرتا ہوں

تمہیدی خطبے

یہ گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبے ہیں جو وہ اُردو زبان پر ہر سال کے آغاز میں دیا کرتے تھے - انجمن ترقی اُردو دہلی سے شائع ہوئے ہیں - اس کتاب میں دتاسی کے صرف چھ خطبے شامل کئے گئے ہیں - قیمت درج نہیں -

گارساں دتاسی ایشیا کے ایک بہت بڑے مستشرق گزرے ہیں وہ اُردو کے بڑے ہی خواہ تھے - فرانس میں شعبۂ اُردو کے وہ پہلے پروفیسر تھے بلکہ شعبۂ اُردو کھلا ہی ان کی وجہ سے تھا - انہیں اُردو سے اتنا لگاؤ تھا کہ انہوں نے باغ و بہار، قصۂ گل بکاؤلی اور اسی قسم کی بہت سی کتابیں جو اس زمانہ میں شائع ہورہی تھیں ان کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا - اس کتاب میں ان کے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۵ء تک کے خطبے شامل ہیں -

دتاسی نے اپنی ساری زندگی مشرقی زبانوں خصوصاً اُردو کی تحصیل اور ترویج میں گزاری - وہ ہر سال اپنے لکچر شروع کرنے سے پہلے اپنے طالب علموں کو جو نئے ہوں یا پرانے ایک خطبہ دیا کرتے تھے جو اس ایک سال کی اُردو کی ترویج و ترقی پر ایک مکمل تبصرہ سا ہوتا تھا - انہیں میں سے چھ خطبوں کا ترجمہ اس کتاب میں ہے -

ہماری غذا

یہ رابرٹ میکرسن کی تصنیف ہے جسے سید مبارزالدین احمد رفعت نے ترجمہ کیا ہے اور انجمن ترقی اُردو دہلی نے شائع کیا ہے - قیمت عہ

ہمارے یہاں اس قسم کی کتابوں کی جن میں ٹھوس مضامین ہوں بہت کمی ہے - اس کتاب میں مصنف نے ہمیں بتایا ہے کہ غذا کا مقصد کیا ہے اور اس سے جسم کی تعمیر کیونکر ہوتی ہے - اسکے علاوہ انہوں نے بتایا ہے کہ پروٹین اور حیاتین کیا ہے اور ان کی کتنی قسمیں ہیں اور کس جانور میں اور کس سبزی میں یا دالوں میں ان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے یا کس میں کتنی ہوتی ہے - اس لحاظ سے ہمارے سامنے ایک ایسا گائڈ آجاتا ہے جو ہمیں ہماری خوراک اور اسکے اصول سے واقف کرادیتا ہے -

ہر قسم کی سبزی، گوشت اور دالوں کے بارے میں حیات سے متعلق اس میں ہدایات اور ان کا تذکرہ ہے -

وہ لوگ جو صحت کو ہزار نعمت سمجھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے -

تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ

شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی قیمت عمہ

ہمارے یہاں اُردو میں منظوم تاریخیں معدودے چند ہیں اور انہیں بھی عموماً وہ لوگ زیادہ دیکھتے ہیں جن میں تحقیق و تدقیق کا مادّہ ہوتا ہے ورنہ تاریخ کے اکثر طالب علم ان کی طرف سے بے نیاز ہیں -

کسی چیز کو نظم کرنے کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی دلچسپی بڑھ جائے تاریخ ان لوگوں کیلئے جنہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ایک خشک مضمون ہے اسے دلکش بنانے کا شعر ایک اچھا ذریعہ ہے اسکے علاوہ نثر کی نسبت نظم زیادہ مؤثر ہوتی ہے - تاریخ کی حیثیت سے شعر کا وجود ہے بھی نثر سے قدیم - شعر کا تعلق دماغ کی ان لطیف کیفیتوں سے ہے جہاں آدمی پرواز کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن جب شعر پر پابندی لگ جاتی ہے اس وقت وہ جذبۂ لطیف اتنا آزادی کے ساتھ کام نہیں کرتا جتنا آزادی کے ساتھ بغیر کسی پابندی کے کام کرتا ہے - لیکن اگر کوئی دماغ کسی قید کے باوجود بھی نہایت عمدگی اور سلیقہ کے ساتھ نظم کے اصل محاسن قائم رکھتے ہوئے شعری تخلیق کرے وہ یقیناً خلّاق اور قادر ہے - یہ تاریخ بھی ایک پابندی کے ساتھ نظم کی گئی ہے - تاریخ کو نظم کرنے سے پہلے شاعر نے موضوع کے مآخذ اور اپنے بارے میں مختصراً

بہت کچھ کہدیا ہے ؎

ہے تاریخ مطبوع جو اک اجری   وہ ہے نثر میں اور ہے فارسی
کیا نظم اُردو میں اس کو تمام   کہ ہوں مستفیض اس سے سب خاص و عام

ان اشعار سے معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر نے ابو الفتح ضیاء الدین محمد کی تاریخ دکن کا ایک باب جو سلطنت بہمنیہ سے متعلق ہے اس کا ترجمہ فارسی نثر سے اُردو نظم میں کیا ہے سہیل دکن کا اک شاعر ہے جس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں اسکے حالات زندگی کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں ملتا، ہاں اسکے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کام کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں شروع کیا ہے ؎

جوانی کا آتا ہے جس دم خیال   تو ہوتا ہے بس دل میں حزن و ملال
گئی عمر مانند آبِ رواں   ہوا باغ تن پائمال خزاں
کہاں وہ طبیعت کا جوش و خروش   فریں ہے کہ ہو شمع ہستی خموش
مگر رہ گیا میں پسِ کارواں'

شاعر تاسف جوانی پر کچھ رسمی اور روایتی معلوم ہوتا ہے لیکن ہماری واقفیت کے لئے بہت کافی ہے۔ سلاطین بہمنی کے بارے میں بھی تاریخ میں بہت ردوکد ہے۔ عام روایت ہے کہ حسن دہلی میں کسی منجم برہمن کا ملازم تھا۔ برہمن نے اسپر بہت مہربانی کی اور کچھ آراضی دہلی کے گرد و نواح میں کاشت کیلئے دے دی حسن کو ایک مرتبہ برہمن کے دئے ہوئے کھیت میں سے کچھ اشرفیاں ملیں تو وہ اس نے لیجا کر برہمن کی خدمت میں پیش کردیں۔ برہمن بہت خوش ہوا اور دربار میں جاکر حسن کی ایمانداری کی تعریف کی پھر اس کا زائچہ دیکھا اور بزرگی کے آثار دیکھ کر اس سے بولا ؎

ہو درجات عالی پہ تجھ کو صعود   سعادت ہے تیری جبیں سے نمود
بفضلِ الٰہی ہے تو خوش نصیب   ترا طالع چمکیگا اب عنقریب
مرے ساتھ یہ عہد و میثاق کر   ترقی پہ ہو جبکہ تو جلوہ گر
مرا نام ہو جزوِ اسم کرام   ترے ساتھ روشن ہو میرا بھی نام

اور اسی وجہ سے اس نے حسن گنگو بہمنی نام رکھا۔ لیکن اسکے علاوہ ایک اور بھی روایت ہے جسے سہیل نے یہاں نقل بھی کردیا ہے ؎

عجم کے جو مشہور ہیں تاجدار   کہ بہمن تھا ایک اور اسفندیار
ملقب ہوا بہمنی جو حسن   یہ تھا نسل بہمن میں بے ریب وظن
تھا عالی نسب اور عالی نہاد   حسن نام تھا اور کیانی نژاد

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن نے اپنے نسلی امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے یہ لقب اختیار کیا۔ چاہے کچھ بھی ہو جہانتک نظم کا تعلق ہے نہایت خوب ہے۔ پڑھتے وقت کہیں کہیں مثنوی سحر البیان کا لطف آنے لگتا ہے مگر چونکہ سحر البیان جیسی چیزوں کی تفصیل نہیں اس لئے فوراً وہ لطف جاتا رہتا ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ پوری کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قسم کی چیزیں بہت نایاب ہوتی ہیں۔ یہ انجمن ترقی اُردو کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہمیں ایسی نایاب چیزیں اُردو میں مل رہی ہیں۔ اہلِ ذوق کو چاہئے کہ اسے ضرور خریدیں۔

محمد رسول اللہ مترجمہ مولانا عبد الرحمٰن عاقل رحمانی، پبلشرس، کتابستان، پوسٹ بکس ۲۶۶ بمبئی نمبر ۳ - قیمت آٹھ آنے۔

یہ کتاب کارلائل کے ہیرو اور ہیرو ورشپ کے ایک جزو کا ترجمہ ہے جو بہت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے اور اصل مضمون کے محاسن اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ نہیں ہو جاتی کہ اسے ایک انگریز نے لکھا ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کارلائل اپنے دور کا ایک بہت بڑا فاضل اور بہت بڑے
٨١
دل و دماغ کا آدمی ہے اور اس کا قلم جس چیز پر بھی اُٹھے گا وہ بہت سوچ بچار کے بعد اُٹھے گا۔ اس تمام مضمون میں کارلائل ہمیں کہیں بھی جذباتی نظر نہیں آتا بلکہ نہایت ٹھوس دلائل کے ساتھ تمام مضمون میں رسولِ اکرم کی زندگی کو لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ شخص جسے مسلمانوں کی کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ جب اس قسم کا موضوع لے کر بحث کرے گا تو بالکل ایک غیر جانبدارانہ حیثیت سے کریگا۔ کارلائل کے قلم اور آواز کا بڑا وزن ہے اور اسے اپنے دور میں بڑے عالم کا درجہ حاصل ہے۔ رسول اکرم کی زندگی اس انداز سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کا دماغ کسی غلط چیز کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ اس کے کانوں میں رسولِ اکرم کے بارے میں جو کلمات پڑتے تھے اسے اس نے ایک عرصہ تک سوچا، رسول اکرم کی زندگی کا مطالعہ کیا، اسلام سے واقفیت بہم پہنچائی، اسکے اصولوں کو ناقدانہ نظر سے پرکھا، عرب کے پورے ماحول کو نظروں کے سامنے رکھا، تاریخ سے انحراف نہیں کیا اور تب کہیں جاکر صحیح انداز میں جو کچھ اس نے محسوس کیا وہ لکھ دیا۔

کتاب کسی خاص خوبصورت انداز میں نہیں چھپی ہوئی۔ کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ لیکن ہاں وہ موضوع جو کتاب کے اندر بند ہے بہت ضروری اور اہم ہے۔ بحث مباحثہ کے خیال سے اس کا مطالعہ کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن ہاں ایک صداقت کے متلاشی اور واقعات کو صحیح شکل میں دیکھنے والے کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے اس قسم کے لوگوں کیلئے گویا مذہب اسلام اور اسکی دعوت کے مطالعہ کیلئے ایک قدم ہے اور وہ لوگ جو محض انگریزی تحریر سے مرعوب ہو سکتے ہیں اسکے علاوہ کسی ہندی یا اعرابی کا قول ان کی نظر میں صادق نہیں ان لوگوں کے مرعوب کرنے کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے اس قسم کے لوگوں کیلئے کارلائل اور گوئٹے کا محمدؐ کو نبی مان لینا کافی دلیل ہے اس بات کی کہ وہ سچے اور برحق تھے۔

گورکی کی آپ بیتی

مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی

یہ گورکی آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے جس میں صرف اسکے بچپن کے واقعات ہیں۔ گورکی کا درجہ دورِ جدید کے افسانہ نویسوں اور ناول نویسوں کی فہرست میں بہت بڑا ہے لیکن اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوانح نگار کی حیثیت سے اس کا درجہ کسی سے کم نہیں۔ ٨١

ہمارے موجودہ ادیب بڑی حد تک اُسی تحریک سے متاثر ہیں اور ہم آجکل جو اکثر کہانیوں اور افسانوں میں تیسرے طبقے کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اس کا علمبردار بھی صحیح معنوں میں گورکی ہی ہے ڈاکٹر صاحب جب مقدمہ میں گورکی کے ماحول سے ہمیں واقف کراتے ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ گورکی سے پہلے کا طرزِ تحریر صرف اونچے طبقے کے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔

ٹالسٹائی خود ایک بہت بڑا جاگیردار تھا۔ ظاہر ہے کہ اسکی کہانیوں کے کرداراس اونچے طبقے کے لوگوں سے لئے گئے ہیں اسکے علاوہ چیخوف بھی اس گروہ سے متعلق ہے اور بقول اختر حسین کے کہ عوام ابھی تک ادب میں ایک...... محسوس کر رہے تھے۔ ایک اجنبیت اور کمی کا احساس ان کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ گورکی پہلا شخص ہے جس نے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف بڑی شدت کے ساتھ کھینچا اور پہلی بار لوگوں نے محسوس کیا کہ کوئی انہیں میں سے بول رہا ہے اور ان کے دلوں میں جھانک کر اس آواز کو جو ایک گوشہ میں دبی ہوئی تھی باہر پھینک رہا ہے۔ انقلاب روس میں گورکی کا بڑا ہاتھ ہے۔

جو گورکی کی زندگی ہے وہی اس کا ادب ہے۔ اس کے ناول اور افسانہ پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر جگہ ایک کردار خود گورکی ہے کسی نہ کسی رنگ میں اسکی زندگی اور اس کا عمل اس کا ادب بھی مختلف چیزیں ہیں۔ وہ زندگی سے بے انتہا قریب اور زندگی سے یہ قربت ہی اس کی شہرت اور تکلیفوں کا باعث ہوئی۔

اس کی آپ بیتی بجائے خود ایک کہانی ہے، ایک امر کہانی، گورکی کی نانی، نانا اور ماموں اب بھی ہمارے گرد پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسکے باپ جیسے متوالے اور بے فکر جوان اب بھی ہمارے گرد پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسکے باپ جیسے متوالے اور بے فکر جوان اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں لیکن ہر شخص کے ہاتھ میں گورکی کا قلم نہیں۔ پھر آدمی کے پاس گورکی کی آنکھیں نہیں اور ہر انسان اتنا زود حس اور چیزوں کا متلاشی نہیں۔ ہر آدمی کو اپنی زندگی ایک شہد کی مکھیوں کا چھتہ نہیں معلوم ہوتا جہاں جاہل اور سیدھے سادے لوگ اپنے تجربات لے کر آئیں اور انہیں مالا مال کر کے لوٹ جائیں۔

یہ واقعہ ہے اس ہندوستان میں بھی ہزاروں انسان ایسے ہیں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں جنکی زندگی اگر گورکی کی قسم سے لکھی جائے تو اس کی داستان کو بھی ماند کردے۔ مگر جیسا میں نے کہا ہر شخص گورکی نہیں۔ جب اس قسم کی گفتگو ہمارے نزدیک کی جاتی ہے جیسی گورکی کے ارد گرد ہوا کرتی تھی تو ہم گفتگو کرنیوالوں کو جھلا کر دھتکار دیتے ہیں۔ "کیا بکواس ہے، بیہودے وقت خراب کرتے ہیں، دماغ چاٹ لیا" لیکن گورکی کا دماغ اس قدر موم نہیں جو اتنی آسانی سے چاٹا جا سکے بلکہ ایک لچکدار پتھر ہے جس پہ یہ ساری چیزیں اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور تیس چالیس سال بعد بھی اتنی ہی تر و تازہ ہیں جتنی ابتدا میں تھیں۔

گورکی ایک لڑاکا، ضدی اور...... بچہ ہے۔ دن بھر دھما کے مچیں مگر وہ کاوہی۔ کوئی عجیب کردار نہیں۔ ہمارے عام بچوں سے مختلف ہیں۔ دن بھر ہمارے معمولی گھرانوں میں ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ ہر جاہل اور غریب گھر میں گورکی پلتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ وہ آخر میں جا کر گورکی ثابت نہیں ہوتے۔ وہی مزدور جو پیسے روز کمانے والا، ایک میلی کچیلی عورت کا خاوند بطنج کے بتجھیل کی

ایک قطار ساتھ لئے ہوئے، روتے، جھکتے، بھنبھناتے، اپنے ہی جیسے اور گورکی اپنے کثیف تعیش سے پیدا کرتا رہتا ہے۔

گورکی اپنے افسانوں کی طرح آپ بیتی میں بھی کردار کو پس منظر میں رکھ کر ماحول کو ابھارتا ہے۔ اس کا ماحول ہی انسانی کردار کا ذمہ دار ہے۔ اس کا قلم ایک مصوّر کا قلم بن کر ماحول کی نقشہ کشی کرتا ہے، ایک جگہ ایک منظر یوں بیان کرتا ہے۔

"اسٹول پر کھڑے ہوکر میں بالائی ہیرو کے سے کارخانے کے پھاٹک کو دیکھ سکتا تھا، جیسے کسی بوڑھے بھکاری کے کالے اور پوپلے منہ کی طرح ادھ جلی لالٹینیں آبالتی تھیں اور انسانوں کا گروہ اسکے اندر آجاتا تھا۔ دوپہر کو پھاٹک کا سیاہ دہانہ دوبارہ کھلتا اور کارخانہ ادھ جبا کے مزدوروں کو باہر اگل دیتا۔ یہ لوگ کالی نالی کی مانند سڑک پر بہتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ برفیلی ہوا کا جھونکا انہیں مکانوں کے اندر دھکیل دیتا۔"

یہ تمام واقعات اور ماحول وہ ہے جو چالیس سال بعد بھی گورکی کے دماغ میں روز اوّل کی طرح محفوظ ہے۔ یادداشت اور قوّتِ بیان ہی دو چیزیں گورکی کی میراث ہیں اور کہانیوں کے کردار، پلاٹ، کہانیاں گورکی کی زندگی ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین نے ترجمہ بھی نہایت برجستہ انداز میں کیا ہے اور زبان وہ استعمال کی ہے جسے صحیح معنوں میں ہندوستانی کہنا چاہئے۔ اختر حسین رائے پوری اور گورکی دونوں شخصیتیں ایسی ہیں جن کے تعارف کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اور یہی دونوں نام کتاب کی جاذبیت اور اچھا ہونے کی دلیل میں کافی ہیں۔

ٹراٹسکی کا بیان مترجمہ ایم۔ ایم۔ جوہر، شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، قیمت ۱۰؍

یہ مختصر سا مجموعہ ان بیانات کا ترجمہ ہے جو ٹراٹسکی نے اپنی بریت میں دئے تھے۔

حکومت نے ٹراٹسکی اور اسکے لڑکے پر چند الزامات لگائے تھے اس مقدمہ میں گولڈمین ٹراٹسکی کا وکیل تھا۔ ان بیانات میں ٹراٹسکی نے ہر چیز کو واضح طور پر بتایا ہے۔

جو الزامات ٹراٹسکی پر لگائے گئے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ سوویٹ یونین کے حکومتی طبقے کے سربرآوردہ لوگوں کے قتل کی سازشیں، خاص کر کرف کا قتل۔

۲۔ سوویٹ یونین میں کارخانوں، ریلوں کے تباہ کرنیکی عملی تدبیریں تاکہ اقتصادی نظام درہم برہم ہوجائے۔

۳۔ سوویٹ یونین کے نظام کو تباہ کرنے کے لئے ایک جماعت کی تنظیم جس کا مقصد یہ ہے کہ مزدوروں اور فوجیوں کو قتل کیا جائے تاکہ سوویٹ یونین کی فوجی طاقت کو صدمہ پہنچے۔

۴۔ جرمنی اور جاپان سے خفیہ سازباز۔ تاکہ یہ دونوں ملک سوویٹ یونین پر حملہ کریں اور یونین میں اندرونی بدنظمی پیدا کرنا تاکہ ٹراٹسکی خود سوویٹ یونین کا حاکم بن جائے۔

۵۔ سوویٹ یونین میں سوشلسٹ طریق پیداوار کا خاتمہ اور سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش،

ٹراٹسکی نے انہیں اعتراضات کا جواب اس کتاب میں دیا ہے۔

لینن کے بعد ٹراٹسکی اور سٹالن کے درمیان کچھ کشیدگی ہوگئی جس کی بنا پر دونوں میں ایک گہری خلیج حائل ہوگئی یہانتک کہ اسے روس سے نکال دیا گیا اور آخر میں میکسیکو میں اسے قتل کرا دیا گیا۔

سوویٹ یونین کی کارگزاریوں سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ کتاب بہت کافی مفید ہے۔

کتاب کے شروع میں مترجم نے سوویٹ یونین کی کارگزاریوں
کو شروع سے لیکر انہیں مختصراً بیان بھی کیا ہے جس سے ٹراٹسکی اور ۸۳
سٹالن کے جھگڑے اور بعد کی وجہ اور نوعیت معلوم ہوجاتی ہے"

"ٹراٹسکی لینن کے خاص ساتھیوں میں سے ایک ہے۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔ لینن کے ساتھ ٹراٹسکی کی زندگی اور اسکی کارگزاریوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔

شانِ خدا مؤلفہ مولانا عبید الرحمن عاقل رحمانی، پبلشرز:۔ کتابستان، پوسٹ بکس ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳ قیمت عہ

اس کتاب میں عاقل صاحب نے خدا کے وجود اور اسکی صفات کا تذکرہ کیا ہے۔

ہمارا یہ دور مادیت کا دور ہے۔ آج سے ایک عرصہ پہلے یورپ ایک نہایت ہی برے دور سے گزرا۔ اسکے بعد پھر وہ زمانہ شروع ہوا جسے احیاء علوم کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی زمانہ سے یونانی مفکرین کا سرمایہ منتقل ہوکر یورپ کے ممالک میں پھیلنے لگا۔ یورپ کی موجودہ ترقی اسی احیاء علوم کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ترقی ہر طرف دوڑنے لگی۔ یہانتک کہ مذہب کے بارے میں بھی لوگ آزاد خیال ہونے لگے۔ جہاں تک مذہبی تشکیک اور کی بیطرفی کا سوال تھا اس میں کوئی حرج نہیں۔ ضرورت تھی کہ پورا

یورپ مارٹن لوتھر ہو جاتا۔ لیکن یہ مادیت بڑھ کر اتنی ہوگئی کہ اسکے بعد کسی مذہب کی ضرورت باقی نہ رہی یا یوں کہئے کہ مذہب بھی تجارتی اصولوں پر رائج ہوگیا۔

اس تجارتی مذہب نے ایک عرصہ بعد مغرب میں کروٹ بدلی اور لوگ پھر روحانیت پر یقین رکھنے لگے لیکن ہندوستان ایک کثیر آبادی ہے نئے اور پرانے غلاموں کی۔ یہاں جو چیز بھی یورپ سے آئی مذہب بن گئی۔ بادشاہ کی زبان تو خیر رعیت کی زبان بننے ہی لگی۔ لیکن مذہب کے سلسلے میں بھی لوگ کئی قدم آگے بڑھنے لگے اور دہریت فیشن میں داخل ہوگئی۔

لیکن ان فیشن پرست لوگوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے دہریت کو صحیح معنیٰ میں سمجھا اور ہندوستان کی مشکلوں کا واحد حل قرار دیا۔ دراصل وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جسکے نیچے دُنیا کا ہر طبقہ پس رہا تھا ایک ساتھ ایسا جذبہ اُبھرا کہ آدمی کو ہر چیز سے بغاوت کرتے ہی بنی۔ یہ تحریک یورپ سے یورپ سے خصوصًا روس سے شروع ہوکر ہندوستان پہنچی اس سے بحث نہیں کہ تحریک کیسی ہے۔ اتنا ضرور ضرور کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں نے اس کی ضرورت محسوس کی اور نمایاں طور پر قدیم عناصر سے اپنی بیزاری کا اعلان کردیا۔

یہ تحریک ابھی تک اسی طرح جاری ہے لیکن ہمیں صرف یہاں خدا کے وجود سے بحث ہے۔ بحث ہم یہاں خود نہیں چھیڑ رہے بلکہ اس کتاب کا موضوع یہ ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہتے جو دہریت پر یقین رکھنے کے علاوہ اس پر مصر بھی ہیں اور اپنے پاس اس کے جواز میں دلائل بھی رکھتے ہیں اور جن کے پاس اپنی بریت میں دلائل نہیں ان کے لئے یہ کتاب یقینًا مفید ہوگی۔

عاقل صاحب نے کتاب کے کچھ حصے کئے ہیں اور حصے قائم کرکے بتدریج آگے بڑھے ہیں۔ پہلے حصہ میں خدا کے ہونے کے دلائل پیش کئے گئے ہیں اور قرآن کی آیتوں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے مفکرین عالم کے اقوال بھی نقل کئے ہیں۔ ان اقوال کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ مذہب ایک فطری چیز ہے۔ اور خدا کا وجود ہے۔ اس حصہ میں ان کی ان تھک کوشش بالکل صاف اور نمایاں ہے۔ اسکے علاوہ اس حصہ میں انہوں نے بڑے بڑے مفکروں کے اعتراضات نقل کرکے ان کے جوابات بھی دئے ہیں۔

دوسرے حصہ میں انہوں نے اس کے واحد و یکتا ہونے کو ثابت کیا ہے اور یہاں بھی کلام اللہ کی آیتوں کو پیش کیا ہے۔

تیسرے حصہ میں صفات الٰہی کا بیان ہے۔

ان دونوں حصوں میں بھی مشہور فلسفیوں کے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ غرضیکہ پوری کتاب خدا کے بارے میں کچھ جاننے والے کے لئے یا خدا کے جاننے کی خواہش رکھنے والے کیلئے نہایت مفید ہے۔ کتاب کے نام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری جماعت کے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن ایسا نہیں۔ کتاب نہایت فلسفیانہ، عاقلانہ اور عالمانہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔

نازیت شاہد حسین رزاقی ایم۔اے (عثمانیہ)
شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔ قیمت عہ

ہمارے زمانہ کی جنگ دو ہی ناموں سے تعبیر کی جارہی ہے مارکسزم اور نازی ازم۔ دراصل یہ جنگ ہے بھی دو ہی قوتوں کے درمیان۔ ایک مارکس قوت اور دوسری نازی قوت۔ اس کتاب میں مارکسی نہیں بلکہ نازی قوت سے بحث کی گئی ہے جرمنی کی ابتدائی قوت سے بحث کی گئی ہے اور جرمنی کی ابتدائی کشمکش سے شروع کرکے ہمارے موجودہ دور تک کے واقعات بیان کئے ہیں۔

دراصل ہماری وہ تمام تاریخ جب سے انسان نے موجودہ دُنیا کا شعور حاصل کیا ہے آمریت اور عمومیت کے ساتھ رہی ہے جوں جوں انسان بڑھتا جارہا ہے فرد کو ترجیح دیتا جارہا ہے اور یہ فرد کی بقا کا سوال اب اتنا اہم ہوگیا ہے کہ بڑی بڑی کتابیں اس پر لکھی جاچکی ہیں۔

فرد کے خیال کو اُجاگر کرنے والا تاریخ میں سب سے پیش پیش روسو ہے اور اسکے اس خیال نے انقلاب فرانس میں بڑی مدد دی تھی۔

اسی خیال کو لے کر جرمن قوم اٹھی تھی۔ قوم نہیں ہٹلر سے بہت پہلے ہونے والے جرمنی کے کرتا دھرتا فریڈرک اعظم اور بسمارک۔ آج کی تمام ذہنیت وہی ہے جو بسمارک کے تخیل سے نکل کر تھوڑی بہت نمایاں ہوئی تھی۔ جرمنی کو ایک متحدہ قوت بنانے کا خیال ایک عرصہ پہلے لوگوں کے ذہن میں جگہ پاچکا تھا۔ آج ہر

ہر ملک یہی کوشش کر رہا ہے کہ اسکے علاوہ تمام دُنیا چاہے ختم ہو جائے لیکن اسے زندہ رہنے کا حق مل جائے۔ یہ خوفناک جنگ اسی کا مظاہرہ ہے۔

اس کتاب میں شاہد صاحب نے جرمن قوم کے رجحانات، اس کا فلسفہ، اس میں کام کرنے والے اجزار کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے۔

جرمن قوم کے رجحانات کے علاوہ نتسی ازم کا مفہوم۔ اس کی وجہ تسمیہ اور اس کے آغاز کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے ہٹلر کس طرح اس حلقہ میں آیا۔ نانسی پارٹی کا آغاز کیونکر ہوا اور کس طرح ہٹلر کو اقتدار حاصل ہوا۔

اس میں شک نہیں جرمن قوم کا موجودہ رویّہ ایک زبردست دباؤ کے نیچے دبے رہنے کی بنا پر اس قسم کا ہو گیا ہے کہ وہ آج ساری دُنیا کو اپنے زیر نگیں اور اپنی نو آبادیات کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے لیکن یہ تمام خواہش خود غرضی کی بدترین مثال ہے۔

دورِ جدید کی تمام قومیں اس کشمکش میں مبتلا ہیں لیکن انفرادی آرار کا خیال رکھتے ہوئے کسی کو بھی دوسرے پر غلبہ پانے کا حق نہیں۔

ہٹلر کی شخصیت اور اسکے ساتھ ہی اس کی ذہنیت کو بنانے والی قوتوں کا تذکرہ اس کتاب میں نہایت عمدہ طریقہ سے کیا گیا ہے۔ قومی اشتراکی جماعت کا نصب العین جو بعد میں صرف نانسی جماعت کہلائی ابتدا میں کیا تھا۔ اس نے خود جرمنی میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے کس طرح جد و جہد کی، اسے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کس کس قسم کی چالاکیاں اور عیاریاں عمل میں لائی گئیں۔ کس طرح اس پارٹی نے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنایا اور کیونکر پورے ملک کی فضا کو بدل دیا۔ یہودیوں کے طرزِ عمل نے جرمنوں پر کیا اثر کیا۔

آخر میں شاہد صاحب نے فرد اور ــــــ ، عمومیت، قیادت، آمریت اور اہلیت اور مرکزیت پر اپنی رائے دی ہے اور اسکے ساتھ ہی پورے ماحول کی معاشری، معاشی اور اخلاقی حالت پر تبصرہ کیا ہے غرضیکہ پوری کتاب جرمنی، اس کی موجودہ زندگی، اُسکے آغاز اور کوششوں سے پُر ہے۔

ہندوستانی کھیل

مصنفہ خواجہ الطاف علی، شائع کردہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔ قیمت ۸عہ۔

اس قسم کی کتابیں جب ہم دیکھتے ہیں تو فوراً محسوس کر لیتے ہیں کہ اب ہم ذہنی طور پر کس طرف جا رہے ہیں۔ زمانہ کی ضروریات کیا ہیں اور اب ہمیں کون کون سے طریقے اپنے بچاؤ اور ترقی کے لئے اختیار کرنے چاہئیں۔

اُردو زبان میں بہت کم کتابیں ایسی ہیں جنہیں مفید کہا جا سکے خصوصاً بچّوں کے لئے۔ دراصل تربیت اطفال ہی وہ چیز ہے جو کسی قوم کی زندگی پر صحیح معنوں میں اثر انداز ہوتی ہے یہ چیز دوسرے ملکوں میں بہت نمایاں اور صاف ہے کہ وہاں بچّوں کی تربیت، صحت اور تعلیم کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بچّے تندرست اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اس تندرستی کا اثر آئندہ آنے والی نسل پر براہِ راست پڑتا ہے مگر ہمارے ملک میں ابھی تک بچّوں کی تربیت کا کوئی خاص خیال نہیں کیا جاتا۔

کھیل ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر بچّے کی تندرستی اور صحت پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ وہ بچّے جو تندرست اور صحت مند ہوتے ہیں اکثر ذہین ہوتے ہیں اور یہی تندرست
٨٥ بچّے آئندہ نسل کی صحت و قوّت کے ذمّہ دار ہوتے ہیں۔ چنانچہ کھیل بچّہ کے لئے نہایت ضروری شے ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ محض کھیل کے ذریعہ بچّہ اپنی ذہنیّت کا اظہار کرنے لگتا ہے اور بعض عقلمند والدین محض اُسے بہکتا ہوا دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ اس کا رجحان کس طرف ہے اور پھر اسی رجحان کے پیش نظر پوری کوشش کرتے ہیں کہ اس کی تربیت اور تعلیم کن ترتیبی بُنیادوں پر ہونی چاہیئے۔

مگر کچھ والدین ایسے بھی ہیں جو ابھی تک بچّوں کے کھیل کود کو لہو و لعب کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے ہماری بدلتی ہوئی دُنیا میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسی قسم کے لوگوں کی اولاد سوکھی ہوئی چڑچڑی۔ ڈرپوک اور بد ہیئت ہو کر گھروں سے نکلتی ہے۔

خواجہ الطاف نے ہندوستانی کھیلوں پر کتاب لکھ کر بڑی قومی خدمت کی ہے۔ مانا کہ ادبی اور تاریخی طور پر اس کی کوئی اہمیّت نہیں۔ لیکن یہ کتاب جس کی بچّوں کی دُنیا میں بڑی اہمیت ہے ان تمام چیزوں کے لئے ایک رہنما کی حیثیّت رکھتی ہے۔
اس کتاب میں خواجہ صاحب نے ہندوستان میں کھیلے

جانے والے مختلف کھیلوں کا ذکر کیا ہے اور اسکے ساتھ اُن کے کھیلنے کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔

لیکن کتاب کے آغاز میں "بچّہ اور اسکی ترکیب جسمانی" پر ایک اچھا طویل مضمون بھی درج ہے جسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کس حاجت غرض و غایت کے ماتحت لکھی گئی ہے اور اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آخر میں کتاب کے اندر چارٹ اور ہدایات درج ہیں تاکہ کھیلوں کے بعد بچّوں کی صحت کا اندازہ کیا جاسکے اور دیکھا جاسکے اس کا بچّوں پر کیا اثر پڑا۔

کتاب جتنی بچّوں کے لئے مفید ہے اس سے زیادہ ورزش کرانے والے اساتذہ کیلئے مفید ہے۔ جتنی انگریزی کی اصطلاحیں کھیلوں میں استعمال کی جاتی ہیں آخر میں ان سب کا اُردو ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے۔ کتاب بڑی مفید ہے اس سے زیادہ ورزش کرانے والے اساتذہ اور بچّوں کے لئے اس کا پاس رکھنا ایک رہنمائے تربیت کو ساتھ رکھنے کے مترادف ہے۔

(ادارہ)

ایشیا اگست ۱۹۴۲ء

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرما دی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں زندگی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور رگذری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں۔ ناول میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

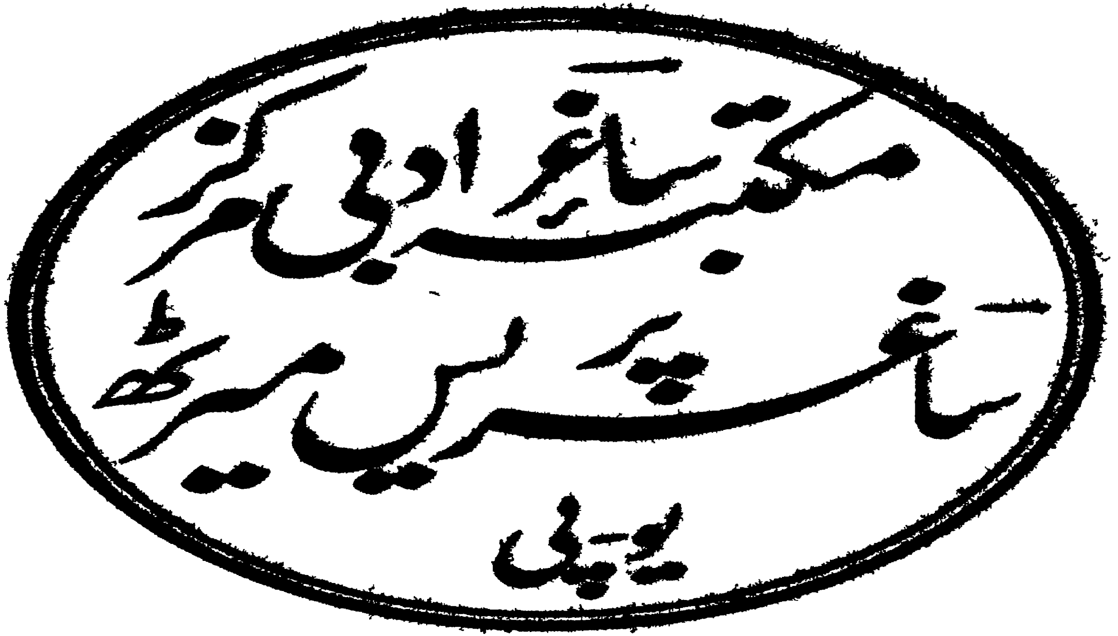
"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ منہ سے بول رہا ہے کہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے یہ بڑی تسکین دہ بات ہے کہ انداز بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھُلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا یہی نہیں "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر، تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھ کر دلی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشا آنکھوں میں کھینچ جاتا ہے۔ اسکے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادرِ محترم آنریبل مسٹر فخر الدین علی احمد سابق ریونیو منسٹر (آسام) کے نام معنون کیا ہے۔ شروع میں فخر الدین صاحب کی تصویر بھی شریکِ کتاب ہے۔ منیجر

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ساغر ادبی مرکز میں

"رسالہ ادیب" دہلی

Registered No. A-656



Published by

[illegible]



اس نمبر کے چند لکھنے والے

مرزا یگانہ چنگیزی

نواب جعفر علی خاں آثر بی۔ اے

حامد حسین قادری

رام پرتاپ بہادر ایم۔ اے

فراق گورکھپوری

عطاء اللہ

احمد ندیم قاسمی

اکرام قمر بی۔ اے

مدیر اعلیٰ

ساغر نظامی

رنگ محل

ساغر کی رومانی نظموں غزلوں اور گیتوں کا نیا مجموعہ

شعروادب کا دلکش مرکب، رومانیت وواقعیت کا مؤثر امتزاج جدید شاعری کے تمام تر تقاضوں کا حامل، رنگ محل کی ہر نظم انسانی ذہن وروح کیلئے فکر ونشاط کا شاید بالکل مختلف پیمانہ ہے۔ اس پیمانہ میں زندگی انوکھے انداز میں چھلکتی ہے رنگ محل کی نظموں کی رومانیت داخلی ہی نہیں ایک خارجی ماحول بھی بناتی ہے جس کے پس منظر میں زندگی کے آنسو بھی ہیں مسکراہٹ بھی محبت کا جنون بھی ہے اسکی بے بنیادی بھی، اکثر نظمیں "رنگ محل" سے نکل کر زندگی کے تپتے ہوئے میدانوں میں جاکر دم لیتی ہیں۔ گیتوں کی بنیاد قدرتی اور نفسیاتی حقائق پر قائم ہے ان میں دبا دبا دکھ ہے، پر یہ دکھ یوں ہی نہیں گنگناتے پڑھنے والے کے آنسو یہ بھید کہہ ہی دیتے ہیں، شاعر کی روح پر جو پہاڑ ٹوٹے ہیں کچھ ایسا ہی بوجھ میرے سینہ پر بھی ہے تمام نظموں میں شاعر کا اخلاص کارفرما ہے سماجی تصورات کی کھوکھلی نہیں مؤثر نمائندگی گئی ہے۔ ہر چبھتا ہوا شعر اپنی تاثیر کے لحاظ سے خود اس بات کی دلیل ہے کہ سیاسی تصورات ہوں یا سماجی، رومانی تاثرات ہوں یا احساسات، فکری عناصر ہوں یا روحانی شاعر نے ان تمام طوفانوں کو روایاتی نہیں حقیقی طور پر محسوس کیا ہے، دور سے نہیں قریب سے دیکھا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ساحل سے موجوں کا تماشائی نہیں بلکہ کیفیات و واردات کے طوفانوں میں تھپیڑے کھانے کا عادی ہے جدید مفکر و شاعر کی حیثیت سے اُردو شعروادب میں ساغر کی مسلمہ شخصیت کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں لیکن اس کی نئی تصنیف نے اسکے جوہر کو مخصوص طور پر نمایاں کر دیا ہے۔ ساغر کی نئی تصنیف حیات اور اسرار حیات کے متعلق نئی نسل کیلئے ایک جدید اشارہ ہے۔ قیمت عہ

ناشر

ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن

ملنے کا پتہ

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز۔ پونا

۱۹۳۵ء میں جاری ہوا

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومتِ صوبۂ متحدہ، حکومتِ بہار

حکومت سی۔پی اور حکومتِ صوبۂ پنجاب

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر آٹھ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ممالک سے)
(ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن)

فہرست

ماہنامہ ایشیا

دسمبر ۱۹۴۲ء

ناظم:- اسد یار خان اعظم

ادبی مرکز میرٹھ

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

جلد ۷ | دسمبر ۱۹۴۲ء | نمبر (۱۱)

ہمارے نقّاد

("نگار" کا ریاض نمبر)

نگار کا جنوری فروری ۱۹۴۳ء نمبر "ریاض نمبر" کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ انتساب، اعترافات، اور انتخابِ کلامِ ریاض، اڈیٹر کے قلم سے ہے اور باقی مضامین دوسرے مضامین نگار حضرات کے ہیں۔ سیّد عقیل احمد جعفری، ریاض مرحوم کے عزیز ہیں۔ اس لئے سوانح حیات، ریاض کی شوخیاں، مکاتیبِ ریاض، ریاض کے بعض انتقادی مباحث وغیرہ جیسے اہم اور ضروری عنوانات پر ان کے مضامین نہایت موزوں ہیں۔

اس نمبر پر تفصیلی نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ اک جائزہ تنقید کے اُس زاویۂ نگاہ کا لیا جائے جو ہمارے نام نہاد نقّادوں نے بنالیا ہے اور جس سے وہ اُردو شعر و ادب کی چھان بین کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں زیریں سطور بڑی حد تک بنیاد کا کام دے سکتی ہیں:-

"انتقاد کی ایک عام غلطی جس میں تقریباً ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے یہ ہے کہ نقّاد سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ لکھنے والے نے اسکے ذوق کی رعایت کس حد تک کی ہے اور اسکے نقطۂ خیال سے کون کون سا حصّہ ایک تصنیف کا مکمّل کہا جا سکتا ہے اور اسکے بعد وہ ایک قطعی حکم لگا دیتا ہے کہ فلاں جزو ایک کتاب کا اچھا اور فلاں خراب ہے، میرے نزدیک یہ اصولی غلطی ہے اگر ایک شخص کا دماغ زندگی کے مختلف شعبوں کارگاہِ حیات کے کثیر الانواع مناظر جذباتِ انسانی کے مختلف کوائف، تکمیلِ فن کی متعدد اشکال، اور فطرت کے بوقلموں مظاہر سے علیحدہ علیحدہ لطف اندوز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا تو اس کو انتقادی ذمّہ داریاں اپنے سر نہ لینا چاہیئے، کیونکہ اسکے لئے ایسے دماغ کی ضرورت ہے جو ہمہ گیر ہو اور ہر چیز کی جداگانہ حیثیت و امتیاز کو سمجھ کر اسکے نقائص و محاسن کا درک کر سکے لیکن چونکہ یہ صفت شاذ و نادر کسی میں پائی جاتی ہے، اس لئے حقیقی معنٰی میں نقّاد کا وجود بھی بہت کم نظر آتا ہے اور عام طور پر انتقادی مقالے تنقیصی جرح سے زیادہ کوئی اور حیثیت اختیار نہیں کر سکتے:

فرض کیجیے ایک نقّاد فطرت کی طرف سے یہ ذوق لے کر آیا ہے کہ جذباتِ سوز و گداز کو پسند کرتا ہے اور یہ پسندیدگی اس قدر غلو کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ کوئی اور جذبہ اس کو پسند ہی نہیں آتا تو اس کو یقیناً نقد کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، نقد وہی شخص کر سکتا ہے جو اگر ایک طرف میر کے اس شعر پر سر دُھن سکتا ہے ؎

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت

تو دوسری طرف داغ کا یہ شعر بھی اسے بےچین بنا دیتا ہو[۵]

یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے ہوا
چھپاتے ہیں جو وہ سینہ کمر نہیں چھپتی

الغرض نقاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کی طبیعت اپنی اپنی جگہ ہر رنگ کا لطف اُٹھا سکتی ہو، اور وہ ہر کتاب کا مطالعہ صرف اس کے موضوع اور مصنف کے میلانِ طبع کے لحاظ سے کرسکتا ہو“ (نگار ریاض نمبر)

ہر چند کہ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے، شبلی کا زاویۂ نگاہ نیاز کے الفاظ میں ہے، مگر یہ اُردو ادب کی ایک ایسی شخصیت کے الفاظ ہیں جو اپنی منکر فطرت کے لئے مشہور ہے۔ ہر چند کہ یہ شذرہ موقع کے لحاظ سے ایک اختیاری اصول کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن یہ اپنی جگہ بہت کچھ حقیقی ہے، غالباً اتنا حقیقی کہ خود نیاز کی رہبری کرسکتا ہے۔

آئیے ہم آپ کو ذرا وضاحت کے ساتھ یہ بتائیں کہ اُردو ادب میں انتقاد کے نام پر برسوں سے انفرادی رائے زنی کی محض ایک قیامت برپا ہے، صحیح تنقید کا تو ذکر ہی کیا، غلط تنقید کا بھی وجود نہیں، ملک میں گنتی کے چند محدود مطالعہ اور دقیانوسی رائے رکھنے والے ایک دو نثر نگار ہیں، جو اس وقت تک ذاتی پسندیدگی و ناپسندیدگی اور اپنے جانبدارانہ ادبی مصالح کی خاطر چند مخصوص شعراء کی نقابت کرتے آئے ہیں۔ خود نیاز فتحپوری جن کو شاید اپنے متعلق یہ دھوکہ ہے کہ وہ بھی اپنی جیب میں اک کسوٹی رکھتے ہیں، اور جوہر کو پرکھ سکتے ہیں بذاتِ خود اک فریب عظیم ہیں۔

یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ شعراء و ادباء، ان کے معائب و محاسن انکے شعر ادب اور اس کی اقدار، . . . .

. . . . ان کے ادبی فروغ کے امکان و عدم امکان پر اعلیٰ نقاد اور مفکر کی طرح غور کرنا نیاز کے بس کی بات ہی نہیں، . . . .

. . . .

. . . .

نیاز کی نقاد ہی میں نہیں، تمام اندازِ تحریر میں ایک سن رسیدہ بیگم کا سا عالمِ ناز تو پایا جاتا ہے مگر ایک مفکر اور وسیع النظر نقاد کی سی گہرائی مفقود ہے“ . . . .

. . . . ایک ادھیڑ عمر شعلہ جمال مہارانی جو جوانی ڈھل جانے کے باوجود ماضی کی تمام فتح مندیوں کے تصور، اور حاضر قوتوں کے سہارے نفرت و محبت میں انتہا پسند رہتی ہے اور اشیا و افراد کی اقدار قائم کرنے میں انفرادی قطعیت سے کام لیتی ہے، کچھ ایسا ہی عالم نیاز کے تنقیدی نقطۂ نگاہ کا ہے، یہ شخص عدل و جوہر شناسی اور ہدایت و رہبری سے قطعی عاجز ہے، لیکن جس زبان میں ”شعر العجم“ کے بعد ایک جامع انتقادی کتاب نہ لکھی جا سکی ہو، اُس زبان میں ہر کہ و مہ کا نمایاں ہو جانا تعجبات سے نہیں، نیاز کے اندازِ تحریر کی چمک ضرور دلوں کو لبھاتی ہے اور دور سے انگوٹھا دکھانا بھی دل چھین لے جاتا ہے، مگر محض طنزیاتی چھینٹوں اور نخروں سے تنقید جیسے اعلیٰ فریضہ کو کوئی تعلق نہیں، ایک اور بھی بات ہے، نیاز اک تو ظہور و ناقص جمالیاتی و رومانی عہد کی پیداوار ہے اُس نے اور اسکے معاصرین نے ادب میں رومانوی جمالیاتی ادب کے ارتقار کیلئے جو کوششیں کیں وہ اپنی جگہ مسلّم ہیں، لیکن یہ عہد ابھی مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُردو ادب میں تاریخ نے جست لگائی اور نئے نظریوں نے تبدیلی و تغیّر کی رفتار کو بالکل نئی سمتوں میں موڑ دیا۔ ادب کے نئے تقاضوں اور بدلتے ہوئے اسالیب و مقاصد کی بنیادوں کو نیاز نے نہ دوسری زبانوں کے ادب میں مطالعہ کیا اور نہ زمانہ کے بطن سے پیدا ہونے والے طوفان کو محسوس کیا اس لئے نئی چیزوں کا اندازہ تو وہ خود کر ہی نہیں سکتا تھا، لیکن قدیم شاعری خاص کر غزل کے متعلق بھی اس کا تنقیدی زاویۂ نگاہ قطعی ”ذوقی“ و ”انفرادی“ حیثیت رکھتا ہے“ مومن کو غالب پر ترجیح دینا، ابن یمین کو حافظ سے بڑھانا اور طرح طرح کی عجیب حرکتیں کرنا، یہ اصل میں ممتاز و ممیز ہونے کی تدابیر تھیں، ورنہ اس کی طرف سے کوئی تعمیری کوشش ظہور میں آنی چاہئے تھی جو شعر و ادب کی تعمیر میں مدد دیتی، اسکے یہاں تنقید محض تخریب و تردید کا دوسرا نام ہے، وہ اس عمل کو اپنی کامیابی و برتری سمجھتا ہے کہ اُسے بلور کا گلاس دیا جائے اور پوچھا جائے ”نیاز صاحب یہ گلاس کیسا ہے“ وہ اس گلاس کو ہاتھ میں لے اور زمین پر پٹک کر چور چور کر دے، پھر کہے، اچھا ہے مگر ٹوٹ جاتا ہے“

اکثر جگہ اسکی رائے ذاتی دشمنی و دوستی کے ماتحت بھی ہوتی ہے جیسے کہ جوش ملیح آبادی کے خلاف اس کا کمزور جہاد، یا سیماب اکبرآبادی کی تائید (جو بعض وقتی مصالح کے پیش نظر کی گئی تھی) یا اس تائید کے بعد پھر اُن کی شدید تردید، (یہ تردید بھی، دوسرے مخالف جذبہ کے ماتحت کی گئی تھی) یا ”اُردو شاعری نمبر“ اور اس سے تعلق رکھنے والا ”تنقیدی نمبر“ یا اب یہ ”ریاض نمبر“۔

جہاں تک ریاض خیرآبادی کا تعلق ہے، وہ بہر حال (بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۸۹)

نئی صبح

علیم اللہ صدیقی بی اے (جامعی)

حکومت کا دائرۂ عمل

ازمنۂ قدیم سے یہ مسئلہ مرکز بحث رہا ہے کہ حکومت کا دائرۂ عمل کیا ہو؟ عہد جدید میں بھی یہ مسئلہ مفکرین کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے اور ابتک ایسا کوئی حل نہ نکل سکا جس پر تمام ارباب فکر متفق ہو جائیں۔ میں نے اس مضمون میں سب سے پہلے یونانی، اسلامی، اور مسیحی نظریوں کا صرف ایک اجمالی خاکہ پیش کر دیا ہے اور ان پر تنقید وتبصرہ کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی کیونکہ ان نظریوں کا عملی شکل میں کہیں اس عہد میں وجود نہیں ہے، لیکن عہد جدید کے دو مشہور نظریوں، سوشلزم، اور اس کی مختلف قسموں، اور انفرادیت .... کے
٦ ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے اور ان کی اچھائیاں اور برائیاں سنجیدگی کے ساتھ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یونانی نظریہ

یونان میں فرد، جماعت یا فرد اور ریاست کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں خیال کیا جاتا تھا، ان کا باہمی تعلق نہایت گہرا تھا اور ہر کام ریاست کا کام سمجھا جاتا تھا، ان کا باہمی تعلق نہا۔۔ گہرا تھا اور ہر کام ریاست کا کام سمجھا جاتا تھا، یونانی مفکرین نے اس پر بھی غور و فکر کیا تھا کہ ایک مشترک مطبخ قائم کرنا چاہیئے اور شہریوں کیلئے ایک خاص پوشاک مقرر کی جائے افلاطون نے یہ بھی محسوس کیا کہ سیاست کی بنیاد اس وقت تک محکم نہ ہو گی جب تک اسے ایک متحدہ مذہب سے تقویت حاصل نہ ہو، اس نے اپنی کتاب "ریاست" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے "ریاست کے ارباب حل وعقد کو چاہیئے کہ ایک متحدہ مذہب کے قیام اور اسے عام طور سے مقبول بنانے کی کوشش کریں۔"

اسلامی نظریہ

ریاست کے دائرۂ عمل کا اسلامی نظریہ یونانی نظریہ سے کافی مشابہ ہے، یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کا مذہب ایک تھا اور یونانیوں کا کوئی مخصوص مذہب نہ تھا، اسلامی مفکرین ایک خاص مذہبی تعلیم اور خاص اخلاقی اصول کے پابند تھے اور یونانی نہیں، تھے، لیکن فرد، جماعت اور سیاسی تنظیم کو یونانی سیاست کی طرح اسلامی سیاست میں بھی ایک واحدہ ... . مانا گیا ہے، اتنا فرق ضرور ہے کہ اسلامی سیاست کی بنیاد مذہب پر قائم ہے اور اس کی وجہ سے ریاست پر بہت سی مذہبی اور اخلاقی قیود عائد ہیں، مثلاً "اسلامی ریاست کمزور بچوں کو پھینک نہیں سکتی ہے لیکن یونان کی بعض ریاستوں نے ایسا کیا تھا"، بیت المال کا تصور یونانیوں کے "عام مطبخ" کے تصور سے بہت قریب ہے، اگرچہ اسلامی سیاست میں اسکی بنیاد اخلاق اور مذہبی آئین پر قائم ہے!

مسیحی نظریہ

عیسائی مذہب، خصوصاً رومی کلیسا کی تعلیم یہ تھی کہ دین اور دُنیا یا دوسرے الفاظ میں مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں ہیں، اسی لئے ریاست کی حیثیت اتنی ہی پست تھی جتنی دین کے مقابلہ میں دُنیا کی۔ کیونکہ ریاست دُنیاوی اداروں میں شامل تھی، لیکن چونکہ سیاسی تنظیم کے بغیر عیسائی جماعت کا شیرازہ مجتمع نہیں کیا جا سکتا تھا، اسی بنا پر ۸۰۰ء میں مقدس رومی سلطنت کی تاسیس عمل میں آئی، اور ارباب کلیسا مذہبی معاملات میں پیشوا مانے گئے، دُنیاوی معاملات کا انتظام بادشاہوں کے حوالہ کر دیا گیا جن کا سردار اصولاً مقدس رومی شہنشاہ سمجھا جاتا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل تک اس نظام کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور اسی زمانہ میں "مارٹن لُتھر .... نے دین اور دُنیا کے ایک ہونے اور "صحیح دینی زندگی" ہونے کی تعلیم دی۔"

جدید نظریے!

جدید مذہبی تحریکوں کے ساتھ دُنیاوی زندگی کی جدید حیثیت اور تجارت اور سرمایہ داری نے بہت ترقی کی؛ ترقی کرنیوالے افراد یا جماعتیں اصولی طور سے عموماً ریاست کے وجود کو غیر ضروری خیال کرتی تھیں، ان اعتدال پسند طبقہ کا بھی یہ نظریہ تھا "کم سے کم ان کے معاملات میں ریاست دخل دے"۔ یہ طبقہ چونکہ مالدار تھا اس لئے ان کے اس نظریہ کی کافی شہرت ہوئی، اس نظریہ کی ابتدائی شکل .... "کرنے دو" فرانسیسی لفظ ہے) آزاد تجارت کا آئین اور انگلستان کے لبرلزم .... کو اس سے بہت قریبی تعلق ہے۔ مگر اس کا زیادہ قریبی تعلق (laissy faire free trade) اور (Leberalism) سے ہے، یہ نظریہ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے تاجروں میں عام طور سے مقبول تھا، انگلستان میں جو لبرل پارٹی بنی اور اس کا جو پروگرام بنا اس کی اساس اسی "آزاد تجارت کے آئین" پر قائم تھی ۱۸۱۵ء میں جب نپولین سے جنگ ختم ہوئی تو زمینداروں نے اس خیال سے کہ غلّہ کے دام گرنے نہ پائیں غلّہ کی درآمد پر بھاری محصول لگوا دیا، اس کی وجہ سے روٹی کی قیمت بہت بڑھ گئی، یہ بیان کرنا بے محل نہ ہو گا کہ ان زیادتیوں کے خلاف احتجاج کیا گیا خصوصاً (Corn Laws) کو منسوخ کرانے کیلئے بہت سی تحریکوں نے جنم لیا جو بعد میں (Leberalism) کی زبردست تحریکوں میں تبدیل ہو گئیں اور تیس برس کی متحدہ اور مسلسل کوشش کے بعد ۱۸۴۶ء میں (Corn Laws) منسوخ کرا کر دم لیا گیا۔

لبرلزم (Leberalism) کی تعلیم کا ایک معاشی پہلو تھا جس میں تجارت کی آزادی اور معاہدہ کی آزادی کا مفہوم یہ تھا کہ سرمایہ دار اور مزدور کو آزادانہ معاہدہ کرنے کا حق ہو، حکومت اس باہمی معاہدہ کو بروئے کار لانے میں ضرور امداد کرے لیکن اسے دخل دینے کا حق حاصل نہ ہو، لبرلزم .... کی تعلیم کا ایک دوسرا پہلو سیاسی بھی تھا۔ وہ انفرادیت کے حامی تھے اور ان کی خواہش تھی کہ افراد کو اپنی زندگی کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے اور ریاست صرف وہی کام اپنے ذمہ لے جن کے متعلق یقین ہو کہ افراد انہیں انجام نہ دے سکیں گے۔ مثلاً فوج رکھنا، پولیس کا انتظام کرنا، عدالتیں قائم کرنا وغیرہ، لبرل کا یہ نظریہ بھی اسی نقطۂ نظر کا رہین تھا کہ حکومت کو تعلیم کے بارے میں بھی دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں کی تعلیم اور اثر کی وجہ سے انگلستان میں ۱۸۷۰ء تک عام جبری تعلیم کا رواج نہ ہو سکا حالانکہ فرانس میں جبری تعلیم کا قانون ۱۸۴۰ء میں پاس ہو گیا تھا اور وہاں عام طور سے اس کا نفاذ تھا جس کی وجہ سے فرانس کی تعلیمی حالت پر خوش گوار اثر پڑا تھا۔

لبرلزم .... کی تعلیم انگلستان میں زیادہ مقبول ہوئی، وجہ یہ تھی کہ تجارت کی آزادی، معاہدہ کی آزادی اور انفرادیت کے اصول میں سرمایہ داروں اور متوسط طبقہ کے افراد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ تھا اور یہ طبقہ اپنے اثر و نفوذ اور سرمایہ کی وجہ سے چھایا ہوا تھا مگر باقی یورپ میں یہ تعلیم کبھی بھی صحیح تسلیم نہیں کی گئی۔ انگلستان میں بھی ۱۸۷۰ء کے بعد قانوناً نہیں تو عملاً لبرلزم کی تعلیم ترک کی جانے لگی اور بیسویں صدی میں تو اسکے اصول کو بالکل چھوڑ دیا گیا اور اس کی جگہ اجتماعیت (collectivism) کے رجحان نے لے لی، ریاست نے عام مفاد کیلئے ہر قسم کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور جماعت کا ہر کام گویا ریاست کا کام ہو گیا، یورپ کے دوسرے ممالک میں اجتماعیت کی طرف رجحان انگلستان سے بہت پہلے پایا جاتا تھا۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

اجمالی طور سے یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ انفرادی مسلک کے پیرو حکومت کے افراد کے حق میں دخل اندازی کو ناپسند کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ چونکہ انسانی معاشرہ نے ابھی تک اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ بغیر خارجی دباؤ کے انسان کی زندگی، جان و مال محفوظ رہ سکیں، اسی لئے وہ حکومت کو ناگزیر خیال کرتے ہیں تاکہ جس وقت ان عناصر زندگی میں سے کوئی بھی معرض خطر میں ہو اس وقت حکومت مداخلت کرکے نقصان رساں کو کیفر کردار کو پہنچائے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حکومت ایسے معاملات میں بے دخل

دے جو افراد کے دائرہ اقتدار میں ہوں، مثلاً تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ انفرادیت کے حامیوں کا خیال ہے کہ انہیں طے کرنے کا ہر شخص کو کلّی اختیار حاصل ہے اور وہ اپنے ان معاملات کو حکومت اور دوسرے لوگوں سے بہتر سمجھ سکتا ہے اور انہیں حل کر سکتا ہے اس لئے ان معاملات میں خارجی دخل اندازی سودمند ہونے کی جگہ مضر ثابت ہوگی۔

ان کے برعکس اجتماعیت کے حامی یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے مفاد سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتا اور اسکے اور ریاست کے اغراض و مقاصد میں بعض دفعہ جو منافات پائی جاتی ہے اسکے بُرے نتائج کے انسداد کیلئے حکومت کی دست اندازی ضروری ہے۔ ان کا خیال ہے "انفرادی معاشرہ میں اصولِ مقابلہ کی ترویج کے سبب انسان کی محنت اور سرمایہ کا بہت بڑا حصّہ ضائع ہو جاتا ہے، وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک ہی قسم کے کام کو بہت سے لوگ بیک وقت انجام دیتے ہیں، اس لئے کوئی امر بھی خاطر خواہ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ ان کے خیال میں بہترین ریاست وہی ہے جس میں اپنے پرائے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے، بلکہ سرمایہ و زمین دونوں ریاست کی ملکیت سمجھی جائیں اور "محنت" پر اسی کا پورا اختیار ہو، مکمّل اجتماعی یا اشتراکی ریاست وہی ہے جس میں اپنے پرائے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے بلکہ سرمایہ و زمین دونوں ریاست کی ملکیت سمجھی جائیں اور "محنت" پر اسی کا پورا اختیار ہو مکمل اجتماعی یا اشتراکی ریاست میں نہ زمینیں ہونگی نہ ملیں، نہ مدارس اور کارخانہ جات ہوں گے، بلکہ جس قدر بھی عاملین پیدائش ہیں سب حکومت کے دست نگر ہوں گے۔ ہر فرد گویا ریاست کی طرف سے کام کرے گا اور اسی کے مقرر کردہ معاوضہ پر اس کی قوت بسری ہوگی[سلہ]"

۸

انفرادیت کے حامیوں کے دلائل

انفرادیت کے حامیوں نے اپنے اصول پیش کر کے اپنے نقطۂ نظر کا استدلال کیا ہے، ان حامیوں میں آدم اسمتھ[ٹلہ] . . . . فون ہمبولٹ[ٹلہ] . . . . اور ہربرٹ اسپنسر[ٹلہ] . . . . کی شخصیتیں نمایاں طور سے نظر آتی ہیں، ان انفرادیت کے حامیوں کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی حرکات و سکنات کی اس وقت تک پوری آزادی ہونا چاہئے جب تک اسکا یقین نہ ہو جائے کہ اسکی آزادی سے کسی دوسرے فرد کو گزند پہنچتا ہے۔ انکا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانی معاشرہ کی بنیاد خودغرضی پر مبنی ہے، اس لئے ہر شخص اپنی غرض اور اپنے سود و زیاں کو دوسروں سے بہتر سمجھ سکتا ہے، اسی کے حصول کیلئے جتنی خارجی رکاوٹیں کم ہونگی، اسی قدر آسانی ہوگی، ان کا خیال یہ بھی ہے کہ ہر فرد کے حصولِ مقاصد ہی سے افراد کی اجتماعی فلاح و بہبود مدّنظر ہوتی ہے، اس لئے کہ افراد ہی تو معاشرہ کے اجزاءِ ترکیبی ہوتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد اپنی بہبودی کیلئے جدوجہد کریگا تو مختلف افراد کے درمیان مقابلہ کی کشمکش پیدا ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کی اعلیٰ صلاحیتیں اُبھر آئیں گی اور ان میں اپنی مدد آپ کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائیگی اور جو افراد فطرۃً ناقابل ہیں یا ماحول کے باعث ان کی فطری صلاحیت زائل ہو چکی ہے وہ ناقابلِ التفات ہو جائینگے یا فنا ہو جائینگے اس کا اثر معاشرہ پر خوشگوار پڑیگا، وجہ یہ ہوگی کہ اب صرف صالح اجزاء رہ جائینگے اور فاسد فنا ہو جائینگے۔ اس بحث و نظر سے انفرادیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حکومت کو چاہئے کہ افراد کے کاموں میں بےضرورت دخل نہ دے، اور صرف انہیں امور کی نگرانی رکھے جو ان کے جان و مال اور آزادی کے لئے ناگزیر ہیں۔

. . . .

. . . .

انفرادیت کے حامیوں کا سب سے پہلا اصول جو اس نظریہ کی جان ہے، یہ ہے کہ ہر فرد کو نہ صرف اپنی بہبودی مدّنظر ہوتی ہے اور اسکے لئے وہ جان توڑ کوشش کرتا ہے بلکہ وہی اس جدوجہد کا اہل بھی ہوتا ہے، اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقلِ انسانی مکمل نہیں ہے، "ممکن ہے ایک چیز کو ہم مفید خیال کرتے ہوں اور وہ درحقیقت ہمارے لئے مضر ہو۔ اسی طرح یہ بھی

سلہ اقتباس (کسی قدر تصرف کے ساتھ) از "اشتراکی تخیل اور تحریک رجحانات" باب ۸ و ۹ مؤلفہ الیاس احمد صاحب برنی ایم اے ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن ٹلہ ملاحظہ ہو "دولتِ اقوام" ۔۔۔

ٹلہ "خیالات متعلق تحدید دائرۂ حکومت"

ٹھ (Man versus State) "فرد بمقابلہ ریاست"

ایضاً۔ دسمبر ۱۹۴۲ء

ممکن ہے کہ ایک چیز کو ہم اپنے لئے مضر خیال کرتے ہوں اور در اصل وہ ہمارے لئے مفید ہو۔" یہ صرف دعویٰ نہیں ہے بلکہ روزمرّہ اس قسم کے صدہا واقعات پیش آتے رہتے ہیں جو اسکی تائید کرتے ہیں، اگر ہر فرد اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کے ذرائع سے کماحقہٗ واقف ہوتا تو ہم کسی فرد کو غربت اور ناکامی کی زندگی گزارتے ہوئے نہ دیکھتے۔ دوسرے بعض مرتبہ جب چیزیں بظاہر افراد کا مفاد نظر آتا ہے اس میں ان کی اجتماعی کیفیت کی بقا ضروری ہے (اور یہ مسلم ہے کہ ضروری ہے) تو پھر دونوں خیالات کو ایک دوسرے سے بالکل جُدا اور ممتاز رکھنا پڑیگا، اور ریاست کی ترقی اور اسکے مقاصد کے حصول کیلئے اسی طرح سہولتیں بہم پہنچانا پڑیں گی جس طرح خود افراد کی ترقی اور مقاصد کے حاصل کرنے میں آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تیسرے

. . . . یہ کہ انفرادیت کے حامی جس "آزادی" کی بقا کی کوشش کرتے ہیں اس کا تعین ریاست کی اثباتی مداخلت کے بغیر قریبًا ناممکن ہے اور فطری حقوق اور آزادی ریاست کی اثباتی مداخلت کے بغیر ایک سرور انگیز خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں، آخری دلیل انفرادیت کے حامیوں کی طرف سے جو پیش کی جاتی ہے وہ بقاء اصلح (اچھے عناصر کی بقاء) کا نقطۂ نظر ہے۔ اس دلیل کا سب سے بڑا مؤید ہربرٹ سپنسر . . . . ہے۔ وہ کہتا ہے "انسانی معاشرہ کی حقیقی فلاح و بہبودی مضمر ہے کہ بہترین افراد باہمی مقابلہ کے ذریعہ آگے بڑھیں اور بدترین فنا ہو جائیں"، سطحی نظر سے یہ خیال نہایت اچھا نظر آتا ہے کہ کوئی فرد بیکار نہ رہے جو بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دوسروں کا دست نگر ہو، لیکن اگر اسے عمیق نظر سے دیکھا جائے تو یہ بالکل بے بنیاد نظر آتا ہے، اسپنسر نے یہ نظریہ ان جانوروں سے اختراع کیا ہے جن میں اپنی اصلاح کی اہلیت نہیں ہے درانحالیکہ انسان ان جانوروں سے کہیں ممتاز ہے، اور ہر وقت وہ اپنی حالت بہتر بنانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں اب وہی اندھے، گونگے لولے، لنگڑے اور اپاہج جنہیں شاید اسپنسر سمندر میں ڈبو دیتا، معاشرہ کے بہترین عناصر بن گئے ہیں، جب یہ صورت حالات ہے تو جانوروں کی عادات سے استدلال کرنا اور بنی نوع انسانی کو گردن زدنی سمجھنا کہاں تک روا ہو سکتا ہے! دوسری غلط فہمی اسپنسر کو یہ ہے کہ باہمی مقابلہ سے بُرے افراد فنا ہو جاتے ہیں اور اچھے باقی رہتے ہیں، سچ پوچھئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مقابلہ کی وجہ سے بہت سے لوگ ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کو سخت معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، دوسرے جو فرد مقابلہ کی وجہ سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے۔ وہ اگرچہ اضافی حیثیت سے قابل تعریف مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ بہترین فرد بھی ہو، اس کے وسائل اور اس کا دائرۂ نظر عمومًا تنگ ہو جاتا ہے، اسکے برعکس اجتماعی انتظامات کی صورت میں دائرہ وسائل کی کثرت، مقاصد کی توسیع اور سرمایہ کی زیادتی کی وجہ سے وسیع تر ہو جائیگا!۔

انفرادیت کی ترمیم شدہ ہیئت

9 جنگ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء کے بعد انفرادیت کے نظریہ نے چولا بدلا ہے اور اس کی ہیئت میں بہت کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں دورانِ جنگ ۱۸-۱۹۱۴ء میں ہر ملک کے اندر دو قسم کی کیفیات ظاہر ہوئیں، ایک تو حکومت کی مداخلت دوسرے دیگر اداروں کے اثر میں توسیع۔ جنگ کے زمانہ میں اسکی ضرورت پیش آئی کہ مرکز سے منحرف قوتوں کا خاتمہ کر دیا جائے یا حکومت ان پر پوری طرح سے قابو پا لے۔ اس مقصد کے لئے نئے نئے ٹیکس آرڈیننس اور ڈیفنس لاز نافذ کئے گئے، اکثر جنگجو ملکوں میں جنگ کیلئے جبری بھرتی کی گئی، ذاتی کارخانوں میں، جن میں پہلے روزمرّہ کے استعمال کی اشیا بنتی تھیں، اب گولہ بارود اور دوسری جنگی ضرورتوں کا سامان طیار کیا جانے لگا، غرض ہر جگہ حکومت کی نگرانی ہونے لگی اور ہر موقع پر حکومت کے افسر نظر آنے لگے، اس کا ردعمل . . . . لازمی تھا۔ چنانچہ جنگ کے بعد لوگوں کو حکومت کی مداخلت اور دست برد سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی تھی اور بڑی قومی انجمنوں اور اداروں نے خود اپنے آئین اور ضوابط پر عمل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ترتیب و تنظیم حکومت کے جبر کے بغیر بھی ممکن ہے۔" انہیں معاشی کیفیات سے انفرادیت

له Man Versus State بمقابلہ ریاست
بحوالہ مساوی سیاسیات ۔

الشیا - دسمبر ۱۹۴۲ء

جدیدہ جنم لیتی ہے۔ "انفرادیت کی انتہائی شکل نراج ...... ہے۔ اس کا مفہوم "عدم حکومت" ہے۔ اسکے حامی چاہتے ہیں کہ انسان کے قوائے ذہنی اور جسمانی میں اتنی ترقی ہو جائے کہ افراد اور جماعتیں بغیر کسی قسم کے خارجی دباؤ کے تمام زندگی کے کاروبار انجام دے سکیں، ان کے خیال میں حکومت کے فقدان کے باوجود ترتیب و تنظیم اسی طرح باقی رہیگی، مگر جبر کا عنصر بالکل اُلٹ جائیگا ان کا سب سے بڑا گرو کرو پوٹکن .... کہتا ہے "اگر تم مجرریطہ سے ماسکو جاؤ تو تمہیں بیسیوں ریلوں میں سفر کرنا پڑیگا، جنہیں کروڑوں مزدوروں نے بنایا ہوگا، جن کی ہم آہنگی کے لئے کسی برسر اقتدار مرکزی حکومت یا ادارہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی"[1] ان کے نزدیک موجودہ حکومت بیکار ہے، ورنہ صرف تعلیم اور حفظان صحت بلکہ ملک کی حفاظت بھی اختیاری انجمنوں کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔ ان کا قول ہے کہ تاریخ انسانی میں اس قسم کی مثالیں نظر آتی ہیں کہ بیرونی حملہ آور کسی ملک کی منظم فوجوں پر تو کامیابی حاصل کر لیتے ہیں لیکن انہیں شہریوں کے ایسے مسلح گروہوں کے سامنے نیچا دیکھنا پڑتا ہے جو جگہ جگہ سے چھپ چھپ کر حملہ بول دیتے ہیں، ان کے نزدیک، فرد حقیقی معنی میں اسی وقت آزاد کہا جا سکتا ہے جب سیاسی بساط سے ریاست اور حکومت دونوں کا جنازہ اٹھ جائے اس وقت فرد کو ریاست اور سرمایہ دار دونوں کی محکومی سے آزادی نصیب ہو جائیگی اور ملکی امور ان کی بجائے اختیاری انجمنوں کے ذریعہ انجام پذیر ہوا کرینگے!

....

....

انفرادیت جدیدہ کے حامیوں کو یہ تسلیم ہے کہ انسان خودغرض ہے افراد اور جماعتوں کی باہمی اغراض میں تصادم ہوتا رہتا ہے کیا اس تصادم کے روکنے کیلئے اختیاری انجمنیں اور اختیاری ادارات کافی ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! اس کا نتیجہ یہ ہوگا جو زیادہ طاقتور ہوگی وہی موجودہ حکومت کی جگہ لے لیگی اور دوسری اختیاری اداروں کو اپنا مطیع بنا لے گی، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے انسان کی فطرت میں حاکم و محکوم ہونے کی صلاحیتیں اور احساسات پائے جاتے ہیں اور محض نظریہ اور انسانی تخیل سے انسانی فطرت بدلی نہیں جا سکتی۔

---

[1] نراج کا فلسفہ اور اسکا مطمح نظر، بحوالہ مبادئ سیاسیات۔

اس لئے اس نظریہ کا تعلق خیالی دُنیا سے عملی دُنیا کے اعتبار سے زیادہ ہے جو سودمند ہونے کے لئے بڑی دلیل ہے۔

اجتماعیت کا نظریہ

اس نظریہ کی ابتدائی شکل اشتراکیت ہے، اسکے بانی اور سب سے بڑے گرو کارل مارکس .... نے ۱۸۴۷ء میں جرمنی زبان میں ایک کتاب .... (اصل داری) کے نام سے شائع کی، اس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دُنیا کے جملہ آلام و مصائب کی جڑ ذاتی ملکیت ہے، دنیا کی مصیبتوں کا علاج صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی جگہ مشترکہ ملکیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اس عقلیہ کے تمام انتظامات ریاست کے ذمہ ڈال دئے جائیں۔ ریاست افراد کی فلاح و بہبودی سے خود افراد سے زیادہ واقف ہوتی ہے، مقاصد کے حصول کیلئے ریاست کو جملہ عاملین پیدائش پر خصوصی نگرانی لازمی طور پر کرنا چاہیئے۔ کارخانوں کا انتظام اس کا فرض ہے اور ہر شخص کے واسطے اسکے کام کے مناسب آرام و راحت کا انتظام کرنا بھی اسی کا فرض منصبی ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ اس طرح مقابلہ کا مضرت رساں جذبہ فنا ہو جائیگا اور افراد اپنے مفاد کیلئے نہیں ملک کے معاشری مفاد کیلئے کوشاں ہوں گے اور اسکی وجہ سے پوری ریاست کو طرح طرح کے مفاد حاصل ہوں گے!

اجتماعیت .... اشتراکیت کی ترمیم شدہ شکل ہے۔ پچھلے اسّی برس میں خصوصاً جنگ عظیم ۱۹۱۴-۱۸ء کے بعد اشتراکیت کے اصول میں کافی کمی زیادتی کی گئی ہے۔ اس کا دارومدار بھی کارل مارکس کے خیالات ہیں، اسکے حامی صرف یہ چاہتے ہیں کہ اشتراکی اصول کا اثر و نفوذ ہر ملک میں آہستہ آہستہ رواج پذیر ہو اور حکومت کی مشینری اشتراکیوں کے قبضہ میں آ جائے، اس مقصد کے حصول کیلئے مغربی یورپ میں ہر ملک کے اندر باقاعدہ اجتماعی سیاسی پارٹیوں کو منظم کیا گیا، ان میں سب سے پہلا گروہ جرمنی کے اندر "انجمن مزدوران" کی شکل میں نمودار ہوا، اس انجمن کو انیسویں صدی کے وسط میں فرونیند لاسال نے قائم کیا تھا، ۱۸۷۵ء میں جرمانی "دستوری اشتراکی" گروہ ظاہر ہوا اور اس نے اہمیت حاصل کر کے ۱۸۹۱ء میں اپنے پیش نامہ کا اعلان کر دیا یہ فریق حکومت میں اس وقت تک ارتقاء کا خواہشمند تھا جبتک ملک میں اشتراکی خیالات پورے طور سے سرایت نہ کر جائیں[1]

انگلستان میں اشتراکی خیالات کے روحِ رواں جارج برنارڈ شا اور فے بین سوسائٹی (جسکے کرتا دھرتا مسٹر سڈنی دیب تھے جو ۱۹۲۹ء کے وسط میں جب مزدور جماعت کی وزارت ترتیب دی گئی تھی تو یہ زیر نوآبادیات تھے) ان لوگوں کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ ایک طرف لامرکزیت کے اصول کی نشر و اشاعت کریں اور دوسری طرف جبری بیمہ، معمر لوگوں کے وظائف کے تقرر، کارخانہ داروں اور مزدوروں کی جبری پنچایت اور کارخانوں کی نگرانی کے اصول کی آڑ میں حکومت کے دائرۂ اثر کو وسیع کریں، یہی وہ حربے تھے جن کی وجہ سے ان اجتماعیوں کو عظیم الشان کامیابیاں حاصل ہوئیں، چنانچہ ایک طرف ۱۹۱۹ء میں جمہوریہ جرمنی کا سب سے پہلا صدر وہاں کے اشتراکی گروہ کا لیڈر فریڈرش ایبرٹ مقرر ہوتا ہے، دوسری جانب انگلستان میں ۱۹۲۴ء میں انگلستان کی مزدور پارٹی کا لیڈر ریمزے میکڈانلڈ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوتا ہے۔

کمیونزم کا نظریہ!

اشتمالیت .... بھی اشتراکیت کے اصول کو بروئے کار لانے کا ایک دوسرا طریق کار ہے۔ ضمناً معلوم ہو چکا کہ اجتماعیت کے حامیوں کا اشتراکی اصول اور قواعد کو عملی شکل دینے کا طریق کار یہ تھا کہ ارتقاء کے ذریعہ اشتراکی کیفیت کو ہمہ گیر کیا جائے، اشتمالیت یا کمیونزم کے حامیوں کا طریق کار یہ ہے کہ ان اصولوں کو انقلاب اور فرقہ وارانہ جنگ کے ذریعہ بروئے کار لایا جائے، ان کا خیال ہے کہ سرمایہ داروں نے اپنی بنیاد اتنی مستحکم کر رکھی ہے کہ وہ نرمی سے اپنی جگہ چھوڑنے کو آمادہ نہیں ہو سکتے ہیں، ابتدائی کمیونزم کے حامیوں میں مشہور جرجانی سیاسی فلسفی اینگلز سب میں ممتاز تھا[1]، لیکن اسے عملی شکل دینے والا لینن تھا جو ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۴ء تک روس کا ڈکٹیٹر رہا۔ لینن کہتا ہے[2] "یہ خیال خام ہے کہ جس طبقہ کے قبضہ میں صدیوں سے اقتدار رہا ہے وہ بغیر فیصلہ کن جنگ کے آسانی سے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائیگا"۔ ضرورت اس کی ہے کہ ملک کا مزدور اور محنتی طبقہ جبراً موجودہ سیاسی اختیارات اپنے قبضہ میں کر لے اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے انہیں کام میں لائے"۔ کمیونزم کے حامیوں کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کی بدامنی اور کشمکش کی وجہ صرف عدم مساوات ہے کامل مساوات کے بعد ایسی سیاسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں جبر و اکراہ کی حاجت نہ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کی حاجت بھی نہیں رہے گی، اس کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب مختلف طبقوں میں توازن قائم ہو

لیکن جب آبادی کے مختلف طبقوں میں مساوات کی بنا پر توازن قائم ہو جائیگا تو حکومت کی ضرورت باقی نہ رہے گی، اشتراکیوں اور انفرادیوں کے خیالات میں یوں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن دونوں کا مطمح نظر ایک ہے، یعنی دونوں کا مقصد یہ ہے کہ ایک زمانہ آجائے جس میں فرد کو کامل آزادی نصیب ہو اور کسی قسم کے خارجی دباؤ کی ضرورت باقی نہ رہے!

سوشلزم اور کمیونزم پر ایک تنقیدی نظر

یہ تحریکیں بھی حدِ اعتدال سے گزری ہوئی ہیں اور مغالطوں سے پُر ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان میں تین "عاملین پیدائش، زمین، محنت اور اصل میں سے محنت پر زیادہ زور دیا گیا ہے"۔ دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ "موجودہ انفرادی حالات میں قیمت، نوعیت و مقدار پیداوار تقسیم دولت اور دوسرے معاشی امور کا تعین خود بخود طلب و رسد کے قانون کے ذریعہ ہو جاتا ہے، لیکن جب مقابلہ ہی نہ رہے گا تو پھر ان کا تعین دشوار ہو جائیگا، تیسرے جہاں مقابلہ نہ ہونے سے رشوت ستانی اور سازشوں کا بازار گرم ہو جائیگا، وہاں جب ذاتی بہبود اور ذاتی منفعت کا خیال نہ رہیگا تو افراد بے پرواہ ہو جائینگے"۔ ارسطو کہتا ہے "جب انسان کسی کام کو خود اپنا تصور کرتا ہے تو وہ اس میں شرکت کے کام سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے"[1]

"خیالی دُنیا سے عملی دُنیا بہت مختلف ہے"[2]۔ خیالی اعتبار سے ایک طرف ہربرٹ سپنسر اور کروپوٹکن کے نظریے اور دوسری طرف کارل مارکس اور اینگلز کے خیالات بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو اعلان اشتمالین

[2] ملاحظہ ہو، لینن کی کتاب "انقلاب طبقۂ اسفل"

---

[1] ترجمہ انگریزی جوئٹ، ۲، ۳، ۴،

[2] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ام اے بی، ایچ، ڈی

لیکن جب انہیں عملی دُنیا میں لایا جاتا ہے تو ان پر عمل دشوار ہوتا ہے۔
چنانچہ جن ملکوں میں انفرادی نقطۂ نظر سے حکومت رائج ہے وہاں عام بہبودی اور زمانہ کی ضروریات نے انہیں مجبور کیا ہے کہ حکومت کے مختلف شعبوں میں اشتراکی اصول اختیار کریں اور وہاں حکومت کا دائرۂ اقتدار وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری جانب روس میں جو سنہ ۱۹۱۷ء سے کمیونزم کا مرکز ہے، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل طور سے کمیونزم کے اصول پر عمل کر کے ترقی کی "موجودہ منزل" بھی اس وقت تک طے نہیں کی جا سکتی ہے جب تک افراد کو تھوڑی بہت آزادی نہ دی جائے اور انفرادیت کے اصول پر ایک حد تک عمل نہ کیا جائے۔

اس بحث و نظر سے یہ چیز بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ اشتراکیت اور انفرادیت دونوں کے اصول میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے، اور ان کے حامی اعتدال پر قائم نہیں رہے ہیں، آزاد اور متمدن ملکوں میں "حکومت کا دائرۂ عمل" یہ ہے کہ ملک کی ترقی اور فلاح و بہبودی کے تمام شعبوں پر ان کی نگرانی ہوتی ہے اور نہ صرف رسل و رسائل اور معاشی پالیسی پر اس کا اقتدار ہوتا ہے بلکہ بڑی حد تک تعلیم اور حفظانِ صحت کے مسائل بھی اسکے ذمّہ ہوتے ہیں، حکومت کی طرف سے کارخانوں کی سرپرستی کی جاتی ہے، اور وقتاً فوقتاً صنعتی نمائشوں کے ذریعہ دُنیا کی توجہ ملکی پیداوار اور مصنوعات کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ ملکی صنعت و حرفت کو بیرونی مصنوعات پر طرح طرح کے محصول عائد کر کے، محفوظ کیا جاتا ہے، اکثر متمدن ممالک میں ریلوں کو یا تو حکومت براہِ راست چلاتی ہے ورنہ ان پر نگرانی ضرور رکھتی ہے،

غرض "حکومت کا دائرۂ عمل" ہر ملک کے حسب حال ہونا چاہیئے کوئی طریقۂ کار ہر جگہ یکساں طور سے مفید ثابت نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ "دائرۂ عمل" کا خاکہ بناتے وقت ہر ملک کے جغرافیائی، تہذیبی اور خصوصی حالات کا لحاظ رکھا جائے ورنہ کامیابی مشتبہ رہے گی، غور کرتے وقت یہ خیال ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ نظری اور عملی سیاست میں زمین، آسمان کا فرق ہے!

۱۲ ولی وارثی

غزل

گلشن میں ہر اک پھول زباں رکھتا ہے لیکن مبہوت سا ہے نغمۂ بلبل کے اثر سے
کچھ بادہ و ساغر کی حقیقت نہیں ساقی مے خانے کی رونق ہے فقط تیری نظر سے
اصغر[1] کی غزل کیا ہے غزل ہے کہ فسوں ہے
پوچھے یہ کوئی جا کے ولی اور جگر سے

[1] اصغر گونڈوی مرحوم

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۲ء

رئیس امروہوی

اخبار نویسوں کی قیمت!

یورپی اخبارات وجرائد کے متعلق عام طور پر یہ اعتماد ہے کہ وہ خارجی اثرات سے بلند تر ہو کر قوموں اور ملکوں کی خدمت کرتے ہیں، اور اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں کسی طاقت واقتدار سے مرعوب نہیں ہوتے —— مگر بعض مستثنیات کو چھوڑ کر یہ خیال صحیح نہیں۔ یورپی جرائد اکثر وبیشتر اپنا قلم، اپنا دماغ، اور اپنا ضمیر بہت آسانی سے فروخت کر دیتے ہیں گو یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ وہ معمولی داموں پر یہ سودا نہیں کرتے، ان کی جنبش قلم کو خریدنے کے لئے ہزاروں لاکھوں پونڈ کی ضرورت پڑتی ہے، یہ خصوصیت تو ہم ہندوستانی اخبار نویسوں کو ہی حاصل ہے کہ اگر کبھی بکتے بھی ہیں تو پورے دام نہیں اٹھتے —— اس مقالہ میں بتلایا گیا ہے کہ یورپ کے اخبارات کس طرح گنگا جمنی مصلحتوں اور سنہری روپہلی اغراض کے ماتحت غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں اور جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں —— اگر غور کیا جائے تو رائے عامہ کو جنگ کی طرف مائل کرنے میں سب سے اہم حصہ انھیں مسکین صحافیوں اور بُرامن اخبار نویسوں کا ہوتا ہے، آپ موجودہ لڑائی کے پس منظر میں بھی ایڈیٹر کے قلم اور صحافت کے دماغ کو پُر اسرار سازشوں میں مصروف دیکھ سکتے ہیں۔ (رئیس)

لندن کے مشہور اخبار نویس اور روزنامہ "ڈیلی میل" کے بانی مسٹر کینیڈی جونس (KENNEDY Jonce) نے صحافت کی تعریف مندرجۂ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

صحافت کیا ہے؟

وہ ایسا ادارہ ہے جس کا سب سے پہلا مقصد روپیہ کمانا ہے اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو پوری طرح اخبارات کی سرپرستی اور قدردانی پر آمادہ کیا جائے، عوام عجائب پسند ہوتے ہیں، وہ اپنی تفریح طبع اور دلبستگی کے لئے سنسنی دوڑا دینے والی خبریں چاہتے ہیں، سنسنی دوڑا دینے والی خبریں صرف جنگ مہیا کرتی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑائی کا زمانہ اخبارات وجرائد کی مقبولیت وہر دلعزیزی کا زمانہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر جزائر برطانیہ کے مشہور ترین روزنامہ "لنڈن ٹائمز" کو لیجئے، جنگ کریمیا نے ٹائمز کو ٹائمز بنا دیا، اور اس نے کثرت اشاعت کی بنا پر اس قدر دولت وخوشحالی پیدا کر لی کہ صرف ایک پینی روزانہ میں اتنا ضخیم پرچہ اپنے خریداروں کو دینے لگا۔ روزنامہ "اسٹینڈرڈ" کے لئے ہندوستان کا غدر ۱۸۵۷ء بھی ایسا ہی مبارک ثابت ہوا کہ اس نے ایک پیسہ روزانہ اپنی قیمت مقرر کر دی۔ فرانس اور پرشیا کی جنگ (۱۸۵۴ء) کے دوران میں "ڈیلی ٹیلی گراف" کی اشاعت پچاس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ پچاس ہزار ہو گئی۔ اور مصر وسوڈان کی جنگ کے وقت ڈھائی لاکھ تک جا پہنچی۔

جنوبی افریقہ کی جنگ (بوئر وار) کے دوران میں "ڈیلی میل" (لندن) نے اشاعت کا اک نیا معیار قائم کیا، اس نے اس لڑائی کے اخباری میدان میں اس عمدگی اور قابلیت سے قدم رکھا کہ اشاعت ۵ لاکھ کے بجائے دس لاکھ ہو گئی۔ لیکن پچھلی لڑائی کے دوران میں ٹائمز کی ساکھ گر گئی، اور وہ اپنی قیمت دو پنس کے بجائے تین پنس مقرر کرنے پر مجبور ہوا۔

ان مثالوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ جنگ اخباروں کیلئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتی ہے، اور وہ عموماً اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ صفحۂ ارض کے کسی گوشہ پر لڑائی کے شعلے بھڑکیں اور وہ عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنے لئے دولت واقتدار پیدا کریں، مگر یہ خیال قائم کر لینا بھی غلط ہے کہ وہ اپنے مذاد کے لئے

فقط یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات وہ جنگ کی مخالفت میں اپنا مفاد پاتے ہیں اور لڑائی کے خلاف دھواں دھار مقالات لکھنے شروع کر دیتے ہیں، اس کی ایک بہترین مثال "قضیہ تونس" پیش کرتا ہے۔ برلن کانگریس میں مختلف یورپی طاقتوں کے نمائندوں نے خفیہ طور پر ٹیونس (جس پر ۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو اتحادیوں نے حملہ شروع کیا ہے) فرانس کے حصہ میں دیدیا تھا مگر جب یہ معاہدہ منظر عام پر آیا تو لندن کے اخبارات میں آگ لگ گئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانی وزارت خارجہ نے پریس کو شہ دیدی تھی، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لندن ٹائمز نے لکھا کہ

"یہ ناممکن ہے کہ فرانس شمالی افریقہ کے ساحل پر اپنی نوآبادیاں قائم کرے کیونکہ اس کا نتیجہ فرانس و انگلستان کی جنگ کی شکل میں نکلے گا"

۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان طنجہ (الجزائر) کے مسئلہ پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان چل پڑی، اور برطانی حکومت نے لندن کے اخباروں کو فرانس کے پیچھے لگا دیا' اور انھوں نے اس مسئلہ پر خوب خوب زہر افشانیاں کیں۔"

یہ ہے برطانی پریس کا کمال ——— جو تمام یورپ میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور معقولیت پسند پریس خیال کیا جاتا ہے، لیکن جو ملک جذباتی اور انتہا پسند واقع ہوئے ہیں، ان کے پریس کی تلوّن مزاجی اور انتہا پسندی کا کیا کہنا ؟

اس سلسلہ میں سروی اور آسٹروی پریس کی مثال ہمارے ذہن میں آتی ہے، سرویا اور آسٹریا کے درمیان عملی لڑائی کا آغاز جولائی ۱۹۱۴ء (جنگ عظیم کی ابتدا) میں ہوا، لیکن مشہور سیاستدار، مجا ٹومچ راوی ہے کہ سرویا اور آسٹریا کے پریس کے درمیان ۱۹۰۴ء ہی سے ٹھن گئی تھی، وہ ایک دوسرے کے خلاف خوب خوب الزام لگاتے تھے اور یہی قلم کی لڑائی انجام کار ۱۹۱۴ء میں تلوار کی لڑائی میں تبدیل ہو گئی۔

اس چیز سے پریس کی طاقت کا ثبوت ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومتیں سماج اور رائے عامہ کے اس طاقتور آلہ کو اپنے اثر میں لینے کی کوششیں کرتی رہتی ہیں۔

برطانی حکومت زمانۂ امن میں صرف اس چیز پر اکتفا کرتی ہے کہ اخبارات کو سرکاری مراسلات اور بیانات نشر و اشاعت کی غرض سے بھیجتی رہے، لیکن بعض اوقات برسر اقتدار وزارت کا کوئی رکن کسی مشہور اخبار نویس سے گہرے تعلقات پیدا کر لیتا ہے، چنانچہ جنگ کریمیا کے دوران میں لارڈ پارسٹن اور مارننگ پوسٹ کے درمیان گہرے تعلقات پیدا ہو گئے تھے، البتہ بعض اوقات انگریزی صحافت نے غیر معمولی ذمہ داری اور قابل رشک آزادئ رائے کا ثبوت دیا ہے، جس کی بہترین مثال لندن ٹائمز کا وہ دلیرانہ رویّہ پیش کرتا ہے جو اس نے ۱۹۰۴ء میں شاہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے مقابل اختیار کیا، اس زمانہ میں لندن ٹائمز جرمنوں کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا تھا اور شاہنشاہ ایڈورڈ قیصر ولیم سے اتحاد کرنے کے حامی وساعی تھے، آخر انھوں نے ایک خفیہ قاصد لندن ٹائمز کے ایڈیٹر کے پاس روانہ کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے مخالف جرمن رویّہ کو بدل دے' آپ کو معلوم ہے کہ تاجدار برطانیہ کے اس پیغام کا جواب لندن ٹائمز کے اولوالعزم ایڈیٹر نے کیا دیا، اس بلند نظر اور حریّت پسند مدبّر نے شاہنشاہ ایڈورڈ کو جواب میں لکھا کہ

لندن ٹائمز ہز میجسٹی کی خواہشات کا احترام کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے، لیکن اس معاملہ میں . . . . صرف اسی معاملہ میں معذور ہے۔

ٹائمز کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ کہا جائے لیکن اس مقام پر تو وہ شاہی اثر سے بھی آزاد نظر آتا ہے ——— یہ یقیناً ایک عظیم الشان واقعہ ہے اور اس کا راوی بھی اتنا ہی عظیم الشان ہے یعنی خود قیصر ولیم اس شاندار روایت کے ناقل ہیں، پھر بھی یہ بات طے شدہ ہے کہ یورپ کی اکثر حکومتیں اخبارات و جرائد کو رشوت دینے کی عادی ہیں، بلکہ بعض موقعوں پر تو وہ مخالف پارٹی کے اخبارات کو بھی خرید لیتی ہیں ——— اسکی تعجب انگیز مثال فرانسیسی چیمبر میں دوہرائی گئی کہ دوران جنگ میں حکومت فرانس نے حزب الاختلاف کے اخبار "بونٹ راگ" کو خرید لیا تاکہ اس کی مخالفت سنجیدہ حدود تک محدود رکھی جائے۔

(مانچسٹر گارجین کی رپورٹ ۷ اردسمبر ۱۹۲۴ء)

یہ حکومتیں صرف ملکی اخبارات کے ضمیر و دماغ کو ہی نہیں خریدتیں بلکہ غیر ملکی صحافت پر بھی اثر ڈالتی ہیں، چنانچہ روسی غیر ازوسکی (۱۹۱۴ء) کا بیان ہے کہ

"ترکی الیات کے مسلّمہ افلاس کے باوجود ۱۹۱۳ء میں ترکی سفیر مقیم پیرس نے فرانسیسی اخبارات کو لاکھوں فرانک بطور

رشوت پیش کئے، اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس نے فرانسیسی نامہ نگاروں
اور صحافیوں سے تقریباً پچاس لاکھ کا وعدہ کیا تھا جس کا ½ حصّہ
زرِ نقد کی صورت میں ادا ہونا تھا، چنانچہ "لیبرے پیٹرول" نے
اس سلسلہ میں ایک لاکھ فرانک حاصل کئے۔"

بہت سی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپی حکومتیں اکثر اپنے غیر ملکی سفراء کے ذریعہ اخبارات کو روپیہ تقسیم کرتی ہیں اطالوی سفیر مقیم استانبول نے ۱۸۸۶ء میں سر چارلس ڈلکی کو لکھا کہ اطالوی پریس کا معتد بہ حصہ فرانسیسی حکومت نے خرید لیا ہے جیسے کہ اس سے پہلے "استیخانی ہیواس" ایجنسی نے خرید لیا تھا۔

۱۹۰۴ء میں ایک جرمن مدبّر نے واضح الفاظ میں اس لین دین کی طرف اشارہ کیا جو فرانسیسی حکومت اور اطالوی پریس کے درمیان ہوا تھا۔

اخبارات کو سب سے بڑا مالی فائدہ اُس سیاسی جمود کے درمیان میں پہنچا جو ۱۹۱۴ء سے پہلے سربیا اور آسٹریا کے متنازعہ مسائل کے سلسلہ میں یورپی سیاسیات پر طاری ہوگیا تھا، جرمن دستاویزات میں اس کی طرف صریحی اشارات پائے جاتے ہیں، چنانچہ کاؤنٹ جاگو اپنے جرمن سفیر (مقیم روم) سے بذریعہ تار دریافت کرتا ہے کہ

"آیا یور ایکسلنسی یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ اطالوی پریس کو متاثر کرنے کیلئے کتنے روپیہ کی ضرورت ہے؟"

۲۱ر جولائی ۱۹۱۴ء کو وہ اپنے سفیر (مقیم وائنا) کو ہدایت کرتا ہے کہ حکومت آسٹریا سے اس مقصد کیلئے رقم طلب کرو۔

۲۵ر جولائی ۱۹۱۴ء کو جرمن سفیر (روم) اپنی رپورٹ میں رقمطراز ہے کہ

"میرے آسٹروی معاصر نے اخبارات کو رشوت دینے کے لئے ۳ لاکھ فرانک خرچ کئے ہیں، کیا میں اس سلسلہ میں بیس ہزار سے چالیس ہزار مارکس تک پر اعتماد کر سکتا ہوں؟"

اب دوسری طرف روس پر نظر ڈالئے، پیرس کا روسی سفیر ازوسکی اپنی یادداشت میں رقمطراز ہے کہ

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ درۂ دانیال کا مسئلہ ہماری مرضی کے مطابق طے ہو تو ہمیں پیرس کے اخبارات کا اعتماد حاصل کرنا پڑیگا، لیکن بدقسمتی سے میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے، حالانکہ اطالوی سفیر (ٹٹونی) دل کھول کر صرف کر رہا ہے۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ چند روز کے بعد روسی سفیر (ازوسکی) کی یہ شکایت رفع ہوگئی، کیونکہ جولائی ۱۹۱۴ء میں اس نے پیرس کے اخبارات کو بڑی فیاضی اور دریا دلی سے روپیہ تقسیم کیا۔

اس سے دو برس قبل اکتوبر ۱۹۱۲ء میں موسیو سیزونوف (روسی وزیر خارجہ) نے اپنی ذمہ داری پر تین لاکھ فرانک کی گرانبہا رقم ازوسکی کو اس مقصد کیلئے دی تھی۔ اور لطف یہ ہے کہ روس کا یہ کثیر التعداد روپیہ فرانسیسی اخبارات پر موسیو پوائنکارے (وزیر اعظم فرانس) اور دیگر فرانسیسی مدبّرین کی زیر نگرانی تقسیم ہوا کیونکہ فرانسیسی حکومت خود ملکی رائے عامہ کو روس کی مدافعت میں منظم و مضبوط کرنا چاہتی تھی۔

اس کے بعد حکومت فرانس اور روس نے یورپی اخبار نویسوں کو خریدنے کا ایک مشترکہ پروگرام بنایا، اور ایک بین الاقوامی ایجنسی کے ذریعہ سونے چاندی کی یہ لوٹ شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ جرمن، آسٹریا اور ترکی کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا جائے، ہم ذیل میں صرف پیرس کے اخبارات کی فہرست پیش کرتے ہیں جن کو اس لوٹ مار میں حصّہ ملا، ان کے علاوہ دیگر اخبارات نے جو رشوتیں لیں ان کی فہرست طویل ہے، فرانس کے جو اخبارات خرید لئے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) لالمیٹرن .. .. .. ۴۰ ہزار فرانک
(۲) لاأوررور .. .. .. ۱۷ ہزار فرانک
(۳) ایل اونٹمینٹ .. .. ۱۱ ہزار فرانک
(۴) ایل ایکشن .. .. ۹ ہزار فرانک
(۵) ایل فرانس .. .. ۱۱ ہزار فرانک
(۶) لی ریپل .. .. .. ۷ ہزار فرانک
(۷) لی گل بلیس .. .. ۲ ہزار فرانک
(۸) پیرس جنرل .. .. ایک ہزار فرانک

(ازوسکی جلد سوم صفحہ ۳۵۱۔ سی۔ الف کازاڈ صفحہ ۲۷)

یہ کچھ عجیب بات ہے کہ فرانسیسی اخبارات سے غیر ملکی حکومتیں بہت جلد معاملہ طے کر لیتی ہیں، اور فرانسیسی اخبارات مدّت سے یہ منفعت بخش کاروبار کرتے آئے ہیں، چنانچہ ۱۷۷۹ء میں پیرس کا مشہور جریدہ "ای فرانس اینڈ دی ایسٹینٹ" روسیوں کا تنخواہ دار تھا۔

جن لوگوں نے گزشتہ جنگ عظیم کے ذہنی اسباب کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ان کا متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہے کہ پچھلی لڑائی ہرگز شروع نہ ہوتی اگر یورپی اخبارات لڑائی پر اُدھار کھائے نہ بیٹھے ہوتے۔

انھوں نے رائے عامّہ کو جنگ پر ابھارا، باہم منافرت پیدا کی، ایک دوسرے کے خلاف الزامات لگائے، طرح طرح کے بہتان تراشے، جھوٹ بولے، چند ہزار سکّوں کی خاطر لاکھوں بے گناہوں کے سر کٹوا دئے، اور دانستہ طور پر ان خون آشام سرمایہ داروں کے آلۂ کار بن گئے، جن کا پہلا اور آخری مقصد صرف جنگ ــــ عالمگیر جنگ تھا۔

اگر ہم موجودہ لڑائی کے ذہنی اور واقعاتی پس منظر کا تجزیہ کریں تو اس میں بھی ہمیں ان ضمیر فروش اخبار نویسوں کی خودغرضی اور غدّاری صاف طور پر جھلکتی نظر آسکتی ہے ڈاکٹر جوزف گوئیبلز نے دُنیا بھر کے اخباروں کو نازیوں کا ہمدرد بنانے میں جس قدر روپیہ خرچ کیا ہے اس کا اندازہ آسان نہیں، رائٹر ایجنسی تو مسلّمہ طور پر برطانی پروپیگنڈا آفس کی ایجنٹ ہے، اس کے علاوہ دُنیا کے بہت سے خبر رساں ادارے اور نامہ نگار برطانی وزارت اطلاعات عامّہ کے اشاروں پر کام کرتے ہیں، امریکہ، جاپان، ترکی اور دوسرے ملکوں کا بھی یہی حال ہے، ایک لاکھ اخبار نویسوں میں بمشکل ایک فرد ایسا ہوگا جس کا قلم کسی اجنبی اثر و اقتدار کے پاس رہن نہ ہو، اور اب تو یہ کاروبار پہلے کے مقابل عمومیت اختیار کر گیا ہے، سویٹ یونین کے علاوہ کسی ملک کا پریس سرمایہ داروں کی گرفت سے آزاد نہیں۔

بہرحال جنگ میں اخبارات کا حصہ دیکھ کر ہمیں پرنس بسمارک کا وہ قول یاد آجاتا ہے جو اس نے اخبارات کی ایسی (خفیہ) کارگزاری کے متعلق اپنے ایک دوست سے کہا تھا۔

"یاد رکھو! تلوار چلانے سے پہلے قلم حرکت میں لائے جاتے ہیں"

مرزا یگانہ چنگیزی علیہ السّلام

رُباعی

کیا بھانپتا ہے بھانپنے والے بازآ
حیران ہے کیوں ٹاپنے والے بازآ
کھنچتی جائے گی اور بھی دور سے دور
آفاق کی حد ناپنے والے بازآ

اکرام قمر۔ ایم اے

میکاولی کا سیاسی فلسفہ

جارج۔ ایچ۔ سیبائن اپنی کتاب "سیاسی نظریہ کی تاریخ" میں میکاولی پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے "میکاولی کا کردار اور اس کا فلسفہ موجودہ تاریخ کے لئے ایک معمہ بنا رہا ہے۔ کبھی تو اُسے ایک کٹر کلبی۔۔۔۔۔۔۔۔ ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ کبھی ایک گرم مزاج محبِ وطن بعض نے اُسے سرگرم قوم پرور گردانا اور بعض نے اُسے ایک سیاسی یسوعی سمجھا۔ کچھ لوگوں کی رائے میں وہ دل سے جمہوریت پسند تھا اور کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ وہ مطلق العنان فرماں رواؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بے باکی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔

پندرہویں صدی عیسوی میں سلطنت اور پاپائیت کا نزاع کم ہو چکا تھا۔ جاگیرداری نظام ختم ہو رہا تھا۔ بادشاہوں کی قوت قدرتی طور پر بڑھ رہی تھی۔ کلیسا اور ریاست دونوں میں ہی شخصی قوت کی طرف قدم بڑھائے جا رہے تھے۔ جاگیروں اور مجموعیوں (کارپوریشنوں) کے بجائے سیاسی طاقت ایک فردِ واحد ۔۔۔ بادشاہ ۔۔۔ کے ہاتھوں میں مرتکز ہو رہی تھی۔ انگلستان میں ہنری ہفتم۔ فرانس میں لوئی نہم اور ہسپانیہ میں فرڈی ننڈ طاقتور بادشاہ تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہر جگہ مضبوط آدمی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور طاقتور بادشاہ وقت کا سب سے بڑا تقاضہ تھا۔ قومی ریاست کا موجودہ نظریہ نشو و نما پا رہا تھا۔

اس تبدیلی کا تمام یورپی سماج پر اثر ہوا۔ وسائل کی کمیابی کی بنا پر تجارت مقامی ہو کر رہ گئی تھی اور شہر اقتصادی اکائیاں بن گئے تھے۔ ایک قسم کا وفاقی نظام ہی اس صورت کا صحیح حل تھا۔ پیداوار کا انتظام بلدیاتی گلڈوں (یعنی ہم پیشہ لوگوں کی بلدیاتی انجمنوں) کے ہاتھ میں تھا۔ اب اس طریق میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ تجارت بکھری بکھری تھی۔ تمام ملوکیتیں اپنے قومی وسائل کو استعمال میں لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں۔ سوداگر طبقہ اس دور میں پیدا ہو گیا۔ وہ امراء سے غیر مطمئن تھا اس لئے بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اس طرح ازمنۂ وسطیٰ کے تمام ادارے آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے اور بادشاہت کے پاؤں جمنے لگے۔ یہ نظریہ رائج ہو گیا کہ بہت سے ظالم امراء کی حکومت کی نسبت ایک ظالم بادشاہ کی حکومت بہتر ہے۔

سولہویں صدی کے آغاز ہی سے قومی ملوکیتیں زور پکڑنے لگیں ازمنۂ وسطیٰ کے ادارے، آئینی جاگیرداری، شہری ریاستیں، اور کمزور مگر دولتمند کلیسا دب کر رہ گئے۔ حکومتیں اب درمیانی طبقہ پر زیادہ انحصار کرنے لگیں۔

علوم کا احیا ہو رہا تھا۔ فلاسفر بھی اپنے بدلتے ہوئے ماحول سے متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ میکاولی (۱۴۶۹-۱۵۲۷ء) بھی حالات زمانہ سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے اداروں سے بھی واقف تھا اور قومیت کے جس نئے جذبہ پر نئے ادارے استوار کئے جا رہے تھے وہ اس سے بھی آگاہ تھا، اسے اس کا بھی احساس تھا کہ ان تبدیلیوں میں قوت و طاقت کا کیا حصہ ہے، وہ ایک خوشگوار سماجی زندگی کا خواہاں تھا، چونکہ اس نے بیدین تربیت پائی تھی اس لئے اس نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہ کی کہ مطلوبہ تبدیلی میں اخلاق و مذہب کا کتنا حصہ ہوگا۔

17 پروفیسر ہیرن شا اپنے کتابچہ "ارتقائے نظریاتِ سیاسی" میں میکاولی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"میکاولی فلورنس کی مختصر سی مگر عظیم الشان جمہوریت کا باشندہ تھا، وہ ایک اطالوی محبِ وطن تھا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا ملک تشتت و انتشار اور مفسدہ پردازیوں کی بنا پر طاقت کی دوڑ میں مغرب کی بڑی بڑی قومی ریاستوں سے پیچھے رہ گیا ہے اور وہ زمانہ کچھ دور نہیں جب اُسے فرانس یا ہسپانیہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں گے، یا یہ دونوں اس پر قبضہ کرنے کے لئے باہم جھگڑیں گے اور یہ تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ وہ کوئی ایسا طریقہ معلوم کرنے کے لئے بہت بیتاب تھا جس سے اطالیہ متحد ہو جائے، ہر قسم کے جارحانہ اقدام کا مقابلہ کر سکے، غیر ملکیوں کو باہر نکال سکے، نظم و قانون قائم کر سکے، اور فنون و تمدن کی ترقی کے لئے مناسب ماحول پیدا کر سکے۔ اسی مقصد کی خاطر اس نے تین بڑی بڑی کتابیں ۔۔۔۔ (۱) فن جنگ۔ (۲) لائیوی پر مکالمات ۔ اور (۳) بادشاہ ۔۔۔۔ لکھیں۔"

میکاولی صرف فلسفی ہی نہ تھا، وہ اپنے زمانہ کا ایک عملی انسان بھی تھا، وہ فلورنس میں ایک اہم سرکاری کمیٹی کا سکریٹری تھا۔ اُسے جلاوطنی اور قید کا سامنا بھی کرنا پڑا، رہائی کے بعد وطن واپس آ کر اس نے

باقی عمر تصنیف و مطالعہ میں صرف کی، اس نے فلورنس کی تاریخ بھی لکھی اس میں اس نے بادشاہوں کی بہت تعریف کی ہے ۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت بہت بلند ہے ۔

اطالیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے ۔ ہیجان و انتشار کا دَور دورہ تھا، شہروں پر جبر و استبداد کی حکومت تھی، فوجی تنخواہ دار اور پیشہ ور تھے، وطن پرور رضاکاروں کی کوئی فوج نہ تھی ۔ کئی مطلق العنان فرماں روا قابلیت کے مالک تھے اور کئی اس حیثیت سے صفر تھے، اندرونی بدحالی کے علاوہ بیرونی خطرہ بھی موجود تھا ۔ ہسپانیہ اور فرانس کی آنکھیں اطالیہ پر لگی ہوئی تھیں ۔

اطالیہ کے پانچ حصّے ہو چکے تھے، پاپائے اعظم نے اب اپنے لئے یہ حیثیت قبول کر لی تھی کہ وہ حاکموں کا حاکم نہیں بلکہ ان کے برابر ہے، اگرچہ وہ خود اطالیہ کو متحد کرنے کی تو قوّت نہ رکھتا تھا، مگر وہ اتحاد اطالیہ کی ہر کوشش کے راستہ میں روڑے اٹکا سکتا تھا، اور بیرونی حملہ آوروں کو حملہ کے لئے بلا سکتا تھا ۔ کلیسا کو امن کا علمبردار ہونا چاہئیے تھا لیکن وہ حکومت کا حریف بنا ہوا تھا ۔ پاپائے اعظم کی اپنی کلیسائی سلطنت تھی، پادری عوام کو بھی بھڑکا رہے تھے، اطالیہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بڑی مشکل کا سامنا تھا اس طرح اطالیہ کی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی، چنانچہ ہر طرف سے پاپائے اعظم کی مذمّت ہونے لگی، سیاسی انتشار کے علاوہ یہ دن اخلاقی اعتبار سے بھی بدترین تھے ۔ اخلاقی، مجلسی اور مذہبی غرضیکہ ہر اعتبار سے اطالیہ اضداد کا مجموعہ بنا ہوا تھا، اگرچہ لوگ مذہبی رسوم کو بڑی سختی سے ادا کرتے تھے، مگر مذہب کی حقیقی روح سے تغافل برت رہے تھے ۔

ذہنی آزادی تو موجود تھی مگر اداروں میں خراج قائم ہو چکا تھا، قوّت اور خود غرضی کا دور دورہ تھا، ارسطو کا قول سچّا ثابت ہو رہا تھا کہ "جب قانون اور انصاف باقی نہ رہیں تو انسان سب حیوانات سے بدتر ہو جاتا ہے" ۔

میکاولی بے قابو انسانوں کے دور کا سیاسی مفکّر تھا !

ملک کے انتشار اور بدنظمی سے وہ بہت متاثر ہوا تھا اور امن و نظم قائم کرنا چاہتا تھا ۔ وہ ایک صاحب بصیرت انسان تھا اور اطالیہ کو متحد دیکھنا چاہتا تھا، اور اس امر کے لئے کسی مضبوط شخص کی حکومت کی ضرورت تھی ۔ اس چیز پر میکاولی کے فلسفہ کی بنیاد ہے ۔

وہ امن پسند تھا اور انسانی فطرت کے متعلق کلبی نقطۂ نظر رکھتا تھا ۔ اس کے نزدیک سیاست کی بنیاد خود غرضی پر ہے، مقصد کے حصول کے لئے خواہ کوئی بھی راستہ اختیار کرنا پڑے، اختیار کرنا چاہئیے، یعنی حکومت ہمیشہ مضبوط ہونی چاہئیے، اس مسئلہ کو وہ صرف سیاسی ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہے، اس مسئلہ کو حل کرنے میں دو چیزوں نے اسکے لئے بہت سہولت پیدا کر دی ۔

(۱) اس کا اپنا مطالعہ ۔ اور (۲) اس کا اپنا تجربہ ۔

قوّتِ بازو اور دغا یہ سب اس مقصد (ریاست کی بقا) کے لئے استعمال کئے گئے تھے ۔ میکاولی کے نزدیک صرف "طاقتور بادشاہ" کا وجود ہی اس مقصد کے حصول کا ممکن العمل ذریعہ تھا ۔

تاریخ روما کے مطالعہ سے یہ بات اس پر واضح ہو چکی تھی کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے، اور ہمیشہ ایک دائرہ کی شکل میں چلتی رہتی ہے ۔ ارسطو نے جو دائرہ ـــــ بادشاہت، استبدادیت، عدیدیت، جمہوریت وغیرہ کا ـــــ پیش کیا تھا، میکاولی اس کا قائل تھا ۔

میکاولی سے پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان میں اور ایک صدی پہلے کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ مگر تاریخ روما کے مطالعہ نے اس پر یہ روشن کر دیا تھا کہ پہلے جمہوری نظام موجود تھا، پھر اس کی جگہ استبدادیت نے لی، اور جب لوگوں کی حالت اور گر جائے گی تو ایک مضبوط ملوکیت قائم ہو جائے گی ۔ اس کا خیال تھا کہ اطالیہ میں اس وقت مؤخر الذکر حالت موجود ہے ۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میکاولی جو دل سے تو جمہوریت پسند ہے "بادشاہ" میں اشراقی فلسفہ پیش کرتا ہے ۔ اپنی دوسری کتابوں میں وہ خالصتہً جمہوریت پسند ہے ۔ بعض لوگ تو اس تضاد کو حقیقی کے بجائے محض سطحی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنی کتاب "بادشاہ" میں بھی وہ دل سے جمہوریت پسند ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ کتاب لورنزو سے کیوں معنون کی گئی ہے اور اس کا ہیرو کیوں سیزر بورجیا ہے ؟ اس نے بحث کیوں اس طریق پر کی ہے جس سے ملوکیت کی صاف طور پر تائید ہوتی ہے ؟

میکاولی کو جمہوریت پسند کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اس کی کتاب "بادشاہ" ملوکیت کی علمبردار نہیں بلکہ ملوکیت کی پردہ دری کرتی ہے اور لوگوں کو استبدادیت سے خطرات آگاہ کرتی ہے لیکن یہ نظریہ درست معلوم نہیں ہوتا ۔ یہ کتاب نہ استبدادیت کے خلاف انتباہ کرتی ہے اور نہ اس کی پردہ دری کرتی ہے ۔ یہ منافیٔ اخلاق بنیادوں پر قائم شخصی حاکمیت کا جواز پیش کرتی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ میکاولی دل سے جمہوریت پسند تھا، لیکن وہ ایک ایسا آدرش وادی . . . . تھا جسے اندرونی اور بیرونی حالات نے بدل کر - اس امر کا قائل بنا دیا کہ چونکہ جمہوریت ناکام رہی ہے اس لئے یہ

ضرورتِ زمانہ کے مطابق نہیں ہے۔ وقت ایک مضبوط بادشاہ یا مستبد کا مطالبہ کر رہا تھا۔

اس کے سامنے سب سے اہم سوال ریاست کی بقا تھا اور یہ سوال عملی فلسفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور حالاتِ زمانہ کے مطابق اس سوال کا حل کیا معلوم کیا جاتا ہے۔ شریفانہ اور غیر شریفانہ طریقے ہر جگہ ہی اختیار کئے جاتے ہیں، اس کا خیال ہے کہ مقصد ہر قسم کے ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے۔ بادشاہ کو بُرے اور بھلے ہر قسم کے طریقوں سے آگاہی ہونی چاہئے پروفیسر ہیرن شا اپنی کتاب "ارتقائے نظریاتِ سیاسی" میں میکاولی کے اس نظریہ کا بدیں الفاظ ذکر کرتا ہے :-

"بادشاہ کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ـــــ یعنی اطالیہ کے اتحاد، ایک قومی فوج کے قیام، غیر ملکی حملہ آوروں کے اخراج اور امن و خوشحالی قائم کرنے کے لئے ـــــ کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں ؟ میکاولی کا خیال ہے کہ یہ مقصد اتنا عظیم ہے کہ ذرائع غیر اہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر بادشاہ اپنا مقصد اُن ذرائع سے حاصل کرے جنھیں اخلاقی سمجھا جاتا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے لیکن یہ اغلب ـــــ بلکہ تقریباً یقینی ـــــ ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا اس صورت میں اُسے بلا تامل وہ ذرائع اختیار کرنے چاہئیں ـــــ مثلاً بیرحمانہ جبر و تشدد، اور غیر محدود دغا و فریب ـــــ جنھیں عام طور پر منافیٔ اخلاق گردانا جاتا ہے، یہ میکاولیت کا لبِ لباب ہے۔ اس طرح سے سیاست کو اخلاقیات سے خارج کر دیا گیا۔ یہ نظریہ اس امر کا اعلان ہے کہ مقصد ہر قسم کے ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے"۔

وہ ریاستوں کے عروج و زوال کے اسباب کا تجزیہ کرتا ہے "بادشاہ" میں وہ بادشاہتوں پر اور "مکالمات" میں جمہوریتِ روما پر تبصرہ کرتا ہے۔ وہ منافیٔ اخلاق وسائل اور طاقت پر اعتقاد رکھتا تھا، لیکن جمہوریت کا دل سے حامی تھا۔ چونکہ اطالیہ میں اُس وقت جمہوریت کا قیام ناموزوں اور ناممکن تھا، اس لئے اس نے اپنے جمہوری اعتقادات کا کہیں بھی کھُل کر اظہار نہ کیا۔

میکاولی کا فلسفہ ایک مدبرانہ نظریہ ہے، جو حالاتِ زمانہ کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس کے نزدیک سیاست بذاتِ خود ایک منتہا ہے۔ وہ فنِ حکومت پر بحث کرتا ہے، اس کی تمام مساعی و توجہات صرف حکومتی قوت بڑھانے پر مرکوز ہیں۔ مذہب، اخلاق اور سماج کی اس کے نزدیک اُسی وقت اہمیت ہے جب وہ سیاست پر اثر انداز ہوں۔ وہ بد اخلاق نہیں، بلکہ اخلاق میں اعتقاد نہیں رکھتا وہ سیاست کو ہر قسم کے افکار ـــــ مذہبی، مجلسی، اخلاقی وغیرہ ـــــ سے علیحدہ کر دیتا ہے۔

اس کی تعلیمات ارسطو سے ملتی جلتی ہیں۔ اسے ریاستوں کی اچھائی یا بُرائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ پاپائیت کی مذمت میں وہ مارزیلیو کا ہم نوا ہے۔ وہ اسے اطالیہ کی پھوٹ کا باعث سمجھتا ہے لیکن مارزیلیو اور میکاولی میں ایک اہم فرق بھی موجود ہے، مارزیلیو عیسائی اخلاق کو عاقبت سے وابستہ کر کے انھیں آزادی دیتا ہے، مگر میکاولی ان اخلاق کا محض اس بنا پر مخالف ہے کہ یہ دوسرے جہان سے متعلق ہیں۔ وہ ایک دُنیا دار تھا، عیسائیت کی وہ مذمت کرتا ہے کیونکہ یہ انسان میں اطاعت گزاری اور انکساری کی عادات پیدا کرتی ہے۔ "مکالمات" میں وہ عیسائیت کا موازنہ پرانے مذاہب سے کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"ہمارے مذہب میں سب سے بڑی مسرت عجز، انکسار اور دُنیوی اشیاء سے نفرت میں مضمر ہے۔ مگر دوسرے مذاہب کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ روحانی رفعت، جسمانی قوت، اور انسانی توانائی کی تمام خصوصیات کو بہترین قرار دیتے ہیں...... میں سمجھتا ہوں 19
کہ عیسائیت کے ان ہی اصولوں نے انسانوں کو کمزور کر دیا ہے۔ بدنیت اشخاص انھیں آسانی کے ساتھ اپنا شکار بنا لیتے ہیں اور ان پر پوری طرح قابو پا لیتے ہیں۔ اور انسانوں کی اکثریت مظالم کا انتقام لینے کے بجائے انھیں خوشی کے ساتھ برداشت کرتی ہے، کیونکہ عیسائی تعلیمات میں یہی جنت کے حصول کا طریقہ ہے"۔

میکاولی کا خیال ہے کہ ہر بدطینت شخص عیسائی اصولوں کو آلۂ کار بنا سکتا ہے اور دوسری دُنیا کے انعامات کا لالچ دیکر عوام کو لوٹ سکتا ہے۔ وہ عوام کے مذہب و اخلاق کے سیاسی اور سماجی اثرات سے غافل نہ تھا۔ وہ حکام کو منافیٔ اخلاق وسائل کے استعمال کی اجازت تو دیتا ہے، مگر اسے اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عوام میں پھیلی ہوئی بد اخلاقی اچھی حکومت کا قیام ناممکن کر دیتی ہے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ریاست کی بنیاد عوام ہیں اور ان کے اخلاق و اطوار کی اہمیت سے بھی آگاہ تھا۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ حاکم اور محکوم کے لئے اخلاق کے دو جُدا جُدا ضابطے ہیں۔ حاکم کو اپنی قوت بقا میں کامیاب ہونا ہے اور محکوم کو اپنی روش سے سماج کو مضبوط کرنا ہے۔

میکاولی اخلاق سے جو بے اعتنائی برتتا ہے اُسے بعض اوقات علمی بے نیازی . . . . قرار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ خیال غلط ہے۔ اس کے سامنے صرف ایک ہی سوال تھا ــــ سیاسی قوت کا ــــ اور باقی تمام مقاصد و امور کی طرف وہ توجہ ہی نہیں کرتا۔ وہ کوئی علمی انسان بھی نہ تھا، اگرچہ وہ تجربات سے اپنے اصول وضع کرتا ہے لیکن اس کی تجربیت . . . . اس لئے نہیں کہ نظریات اور عمومی اصولوں کی صداقت کو جانچے۔ وہ واقعات سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ مگر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ میکاولی ایک "تاریخی" طریقہ کی پیروی کرتا ہے۔ جو مثالیں اپنے نظریات کی تائید میں وہ پیش کرتا ہے وہ پرانے زمانہ سے لی ہوئی ہوتی ہیں اپنے وضع کردہ اصولوں کو وہ تاریخ کی روشنی میں درست ثابت کرتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو وہ بہت غیر تاریخی تھا، وہ واضح طور پر یہ کہتا ہے کہ انسانی فطرت ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی رہی ہے چنانچہ جہاں کہیں سے بھی اُسے اپنی تائید میں مثالیں ملتی ہیں وہ انھیں اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی سمجھ بوجھ کو کام میں لاکر واقعات کا مشاہدہ و مطالعہ کرے۔ وہ مختلف واقعات پر تبصرے کرتا ہے لیکن کوئی فلسفیانہ اصول پیش نہیں کرتا۔

اس کے نزدیک انسان خود غرض ہے۔ اور طاقتور سے اپنے آپ کو ریاست کی امداد کے بغیر بچا نہیں سکتا۔ ملکیت اور زندگی کا تحفظ ضروری ہے اور یہ صرف حکومت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ (یہی نظریہ ہابز کے اصول کی بنیاد ہے) اطالیہ کی حالت بدترین ہو چکی تھی اور اب اُسے ایک مضبوط حکومت کی سخت ضرورت تھی۔ جب ضروری اور ناگزیر اچھائیاں باقی نہ رہیں تو صرف مضبوط حکومت ہی امن و نظم قائم رکھ سکتی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً لڑاکا ہے اور اس کی اس فطرت میں توازن پیدا کرنے کے لئے ایک مضبوط حکومت ضروری ہے۔ بالفاظِ دیگر سماج میں ایک مطلق العنان ریاست ہونی چاہئے جو سیاسی اور اقتصادی طاقتوں میں توازن قائم رکھے۔

اس کا خیال ہے کہ اخلاقی اور مدنی اچھائیاں قانون سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے زوال پذیر قوموں میں قانون ساز کی سخت ضرورت ہے۔ یہ قانون ساز سماج کی تعمیر کرتا ہے اور صرف ریاست کے انتظام و انصرام کی نگرانی نہیں کرتا بلکہ سماج کے تمام عناصر کو قابو میں لاتا ہے وہ ایک فوج بھی بنا سکتا ہے اور اقتصادی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی امور میں بھی دخل انداز ہو سکتا ہے۔

قانون اخلاق نافذ کر سکتا ہے اس لئے قانون ساز اخلاق سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے کاموں کو جانچنے کا معیار صرف کامیابی ہے۔ وہ تشدّد استعمال کر سکتا ہے۔ فلاح و بہبود کی تخریب کیلئے نہیں بلکہ ان کی تعمیر و تخلیق کے لئے۔ میکاولی کسی درمیانی راستہ کا قائل نہیں، وہ مطلق العنان ملوکیت کا حامی ہے۔

وہ صرف دو چیزوں کا مدّاح ہے ایک تو صاحب الرّائے و باتدبیر مطلق العنان فرماں روا کا۔ دوسرے خود مختار عوام کا۔ اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ یہ دونوں امور متضاد و متصادم ہیں۔

میکاولی کہتا ہے کہ جب تشدّد کے زور پر حکومت قائم کر لی جائے تو اس کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ عوام سیاسی طاقت میں حصّہ دار ہوں۔ ملکیت، زندگی اور رعایا کے جائز حقوق کا تحفظ ہو ایسی ریاستوں میں مطلق العنان فرماں روائی ہی صورتِ حال کا صحیح حل ہوتی ہے، مگر اس مطلق العنان فرماں روا کو بھی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

میکاولی اُس پابند قانون اور آزاد خیال حکومت کا بجا طور پر مدّاح ہے جس میں عوام بھی حکومت میں حصّہ دار ہوں، موروثی کے بجائے وہ منتخب حاکم کو ترجیح دیتا ہے۔ عمّال حکومت کو اپنی غلطیوں کی تلافی کا وہ قانوناً پابند کرتا ہے۔

امرا کو میکاولی اچھا نہیں جانتا وہ یہ امر اُجاگر کرتا ہے کہ نہ امرا اور بادشاہ کے مفادات میں کوئی یکسانی موجود ہے اور نہ درمیانی طبقہ اور امراء کے مفادات میں کوئی باہم آہنگی قائم ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ایک مطلق العنان فرماں روا میں اور کوئی خوبی نہ سہی کم از کم اس کا نقطۂ نظر امرا سے وسیع تو ہوتا ہے۔

وہ پیشہ ور فوجیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ فوجی اپنے ملکی بھائیوں پر تو جبر کر سکتے ہیں مگر غیر ملکی حملہ آوروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اور شاہی خزانہ کو خالی کرکے بادشاہ کو تباہ کر دیتے ہیں وہ قومی رضا کار فوج کا حامی ہے اور فرانس[1] کی سی شہری فوج کو

[1] سولھویں صدی کے آغاز میں فرانس میں ایک قومی محصول لگایا گیا جس سے قومی شہری فوج بنائی گئی جس نے انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ یہ محصول جاگیرداروں کے اختیارات میں کمی اور بادشاہ کی قوت میں اضافہ کا بھی باعث بنا۔ کیونکہ اس طرح طاقت بہت زیادہ مرتکز ہو گئی تھی اور جاگیردار اب محصول عائد کرنے کا اختیار ترک کر رہے تھے۔ اس طرح ان کی قوت میں کمی شروع ہو گئی۔

پسند کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سترہ سے لیکر چالیس برس کی عمر تک کے ہر شہری کو فوجی تربیت حاصل کرنی چاہیئے۔ اس طرح ان میں شاہ کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

وہ ملکی فرض کو ہر قسم کے تعلقات پر بھاری قرار دیتا ہے وہ کسی قومی ریاست کا تصور بھی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ رومائی قسم کی بڑھتی ہوئی شہری ریاست کا حامی تھا۔

وہ تجربات پر اپنے اصولوں کو وضع و استوار کرتا ہے۔ وہ سیاست 'فنِ حرب' اور فنِ حکومت میں دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے مشاہدات کو کسی عمومی اصول سے وابستہ نہیں کرتا۔ اقتصادی اور مجلسی مسائل سے اسے لگاؤ نہیں۔ وہ اتنا زیادہ عملی انسان ہے کہ فلسفہ کو چھوتا تک نہیں۔

ریاست کے موجودہ مروّجہ سیاسی معنی اسی کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ وہ ریاست کو انسانی زندگی میں سب سے اہم دخل دیتا ہے۔ سیاسی ارتقاء کے معنی سے وہ بخوبی آگاہ تھا۔

اس اعتبار سے میکاولی کا فلسفہ بالکل سطحی ہے کہ وہ قوموں کے عروج و زوال کو مطلق العنان فرماں رواکی اہلیت پر منحصر سمجھتا ہے۔

میکاولی کے زمانہ میں اطالیہ کے علاوہ باقی یورپ میں سیاست کو مذہب سے گہرا تعلق تھا، لیکن اپنی بحث و نظر کے دوران میں وہ مذہب کو پوری طرح مس بھی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کا فلسفہ صرف اس کے اپنے وطن اور زمانہ تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔

اصلاح مذہب کی تحریک کے بعد مذہب اطالیہ میں بھی اہم حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اور اگر اس تحریک کے بعد وہ اطالیہ میں بھی پیدا ہوتا تو یقیناً مذہب کو اس طرح نظر انداز نہ کرتا۔

افکار

عشق

عشق روحِ زندگی ہے عشق جانِ زندگی — ایک چنگاری سے روشن ہے جہانِ زندگی
عشق نے بخشی زمانے کو لسانِ آرزو
ورنہ تشنہ تھی جہاں میں داستانِ آرزو

غنچہ کی چٹک مرگِ گل و لالہ کا پیغام — آغازِ بہاراں ہی بہاراں کا ہے انجام
آغاز کی تقدیر ہے اِک لمحۂ امید — اُمید کا انجام ہے صد عبرتِ آلام
آئینہ ہے آئینہ یہ دورِ سحر و شام
اِک صبحِ درخشاں ہے ہر اِک رات کا انجام

محبّت

حاصل ہے اساطیرِ جہاں کا وہ کہانی — جو دل نے کہی اور نگاہوں نے سُنائی

ساغر

عطاء اللہ

چین میں امدادِ باہمی

چین ہمارا ہمسایہ ملک اصل میں اپنے آپ میں ایک دنیا ہے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے اس کی وسعت مسلّم ہے، لیکن اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے قدرت نے آس پاس کی دُنیا سے بالکل الگ تھلگ کر رکھا ہے، چین کے بڑے بڑے جنگل، سربلند پہاڑ، وسیع ریگستان اور بے پایاں سمندر اس کی ایسی ناقابلِ عبور سرحدیں ہیں کہ چین کا پیوند بیرونی دُنیا سے حقیقی معنوں میں آج بھی جدا ہے، چین خدا کی خدائی کی طرح وسیع ہے، اس میں اگر ایک طرف برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں موجود ہیں تو دوسری طرف جھلستے ہوئے صحراؤں کی بھی کمی نہیں، اگر ایک پہاڑ رنگ و بُو کا ایک چمنستان ہے تو دوسرا تپتا ہوا آتشدان، چین کے میدان اور ریگستان، چین کے ویرانے اور جنگلات، چین کے دریا، چین میں بارانِ رحمت کا جوش اور خشک سالی کا زور بھی ایک وقت میں ایک ہی جگہ جمع ہیں، آبادی کا یہ عالم ہے کہ آج تک باقاعدہ مردم شماری کی نوبت ہی نہیں آئی، موجودہ اندازوں میں حد درجہ اختلاف ہے، لیکن اس قدر پورے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ چین کی آبادی ۴۵ کروڑ سے زیادہ ہو تو ہو، کم کسی صورت میں نہیں۔

چین کی زندگی کو دیکھئے تو ملک کی وسعت کے لحاظ سے اس میں بعید رنگا رنگی پائی جاتی ہے، ان علاقوں میں جہاں مغربی اقوام کا اثر غالب آ رہا ہے موجودہ تمدن کے تمام لوازمات یعنی شاندار عمارات، بڑے بڑے بینک، یونیورسٹیاں اور کالج وغیرہ اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ موجود ہیں، ریل ہے، تار ہے، ڈاک ہے، ریڈیو ہے، اور سبھی کچھ ہے، لیکن ان اثرات سے دور چین میں دیہی مٹی کے جھونپڑے وہی ان کی پھوس کی چھت اور وہی بانس کی کھپچیوں کے در و دیوار ہیں، اور انسان زمین سے جنگ کر رہا ہے ایک مشہور مصنف کے قول کے مطابق چین میں انسانی زندگی کی جڑیں زمین کے اندر ہیں، چین کی تہذیب زراعتی تہذیب ہے"

کیونکہ زراعت ہی چینیوں کی زندگی کا سہارا اور ان کے تمدن اور معاشرت کی بنیاد ہے، اور چین کی زندگی اور ترقی اس کے شہروں کی نہیں دیہاتوں کی کیفیت کا نام ہے۔ آبادی کی تین چوتھائی سے بھی زیادہ کا انحصار براہ راست زراعت پر ہے، کسان کے کھیت چھوٹے چھوٹے، گھرانے بڑے بڑے، اور زراعت کے طریقے وہی دقیانوسی، چینی زبان میں ایک ضرب المثل ہے، زراعت پڑھی نہیں جاتی، ہمسایہ کے عمل سے سیکھی جاتی ہے، چین زراعتی پیداوار کی مقدار کے لحاظ سے ایک اول درجہ کا ملک ہے، پھر بھی خوراک کی خاص مقدار ہر سال درآمد کی جاتی ہے۔

زراعت ایک علم ہے، اور ایک فن، فنی تجربات سے علم بڑھتا ہے، اور علمی تجربات فن میں ایک انقلاب پیدا کرتے ہیں، جہاں کسان اَن پڑھ ہو، لکیر کا فقیر ہو، مفلس ہو، اچھے جانور اور عمدہ آلات اسے مہیا نہ آسکیں، اور جہاں کسان کو بارآور کاموں میں لگانے کے لئے معقول مقدار میں سرمایہ قابلِ قبول شرائط پر میسر نہ آسکے، وہاں زراعت مفلسی نہیں فاقہ مستی کا نام ہے مفلسی جسمانی، دماغی اور بڑی حد تک اخلاقی پستی اور ہر طرح کی ذلت کی بنیاد ہے، ہر ملک کی طرح قدرت کی ہر ہولناکی چین میں بھی پہلے کسان ہی کو تاکتی ہے، چین میں ایسے خطے عام ہیں جنھیں قدرت کی بے پروائیوں اور انسان کی غفلتوں اور ناداریوں نے قحط کی گھوڑ دوڑ بنا رکھا ہے، قحطوں کی کثرت اور ان کی لپیٹ میں آنے والے علاقوں کی وسعت، اور چینی کسان کی ناداری چین کی حکومت پر کسانوں کی امداد کا فرض عاید کرتی ہے، اور حکومت اپنی ہمت کے مطابق کسانوں کو تقاوی کی صورت میں امداد دیتی ہے۔

جنگ کی وجہ سے ایک اور مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ چین کے ساحلی علاقے کا وہ جفاکش کسان جس کی آبائی وراثت جاپان کے قبضہ میں آچکی ہے بھاگ بھاگ کر آزاد چین میں پہنچ رہا ہے، جہاں

اس کو آباد کرنے کے لئے ہر قسم کا انتظام و اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ وہ دوبارہ زمین سے سونا اگلوانا شروع کر سکے!

چین کے کسان کی ایک خوبی اور کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی سے قرض لینا اپنی شان خودداری کے خلاف اور اپنی بڑی ہی ذلت اور توہین سمجھتا ہے، اس سے اگر ایک طرف تو یہ فائدہ ہے کہ چین کا محنتی اور دیانتدار کسان ساہوکاروں اور مہاجنوں کے پنجے سے آزاد ہے تو دوسری طرف اس میں یہ عیب ہے کہ زراعت کی ترقی کے لئے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے وہ کسان کو میسر نہیں آتا' اور اور اسی طرح چینی کسان اور چینی زراعت دونوں ترقی سے محروم ہیں اسی لئے چینی کسان اور چینی زراعت کو امداد باہمی کی سخت ضرورت ہے۔

امداد باہمی انسان کے تمام تمدن اور اس کی پوری معاشرت کی بنیاد ہے، مختلف صورتوں میں آپس کی امداد کے بغیر موجودہ طرز کی زندگی اور اس کی تمام آسائشیں وہم و گمان بن کر رہ جاتی ہیں' اس لئے ہر ملک و قوم میں امداد باہمی کا جذبہ اپنے اپنے تمدن کی منزلوں کے مطابق مختلف صورتیں اختیار کرتا رہا ہے، چونکہ آج کل دنیا کا ہر کام روپیہ سے انجام پاتا ہے اور روپیہ ہی کا نہ ہونا سنو عیبوں کا ایک عیب ہے۔ چین میں بھی امداد باہمی کے موجودہ صورت میں رواج پانے سے پہلے آپس میں مل کر مقررہ ماہانہ قسطوں میں روپیہ جمع کرنے اور اسے ضرورت کے مطابق باری باری سے ہر امانتدار کو دیدینے کا طریقہ رائج تھا، ہمارے ملک میں بھی آجتک عورتوں میں باہم مل کر اسی طرح کمیٹیاں قائم کرنیکا رواج ہے، مغرب کے ایک مشہور مصنف اس طریقہ سے سخت بیزار ہیں، اور باوجود تفصیل و تشریح ان کی سمجھ میں یہ بات آہی نہیں سکی کہ امداد باہمی کی موجودہ صورت کی عدم موجودگی میں جبری بچت کا یہ چینی اور ہندوستانی طریقہ نہایت مفید اور امداد باہمی ہی کی ایک ابتدائی شکل ہے۔

امداد باہمی کی تحریک نے اپنی موجودہ صورت میں جرمنی میں جنم لیا، اور اب دنیا بھر میں یہ تحریک ایک زندہ اور زبردست تحریک ہے جس کی بدولت اگر یہ کہا جائے کہ قوموں اور ملکوں کی قسمتیں پلٹ گئیں ہیں تو ارباب بصیرت کے نزدیک مبالغہ نہ ہوگا، چین میں امداد باہمی کی اشاعت کا خیال سب سے پہلے سنہ ۱۹۱۹ء میں پروفیسر ہسائی . . . . کو پیدا ہوا جنھوں نے شنگھائی میں ایک امداد باہمی بینک قائم کیا اور ایک عرصہ تک اخبار "ینگمنگ" میں

زوردار پروپیگنڈا کرتے رہے، جس کا اثر قومی پارٹی پر اس قدر گہرا ہوا کہ آجتک یہ پارٹی امداد باہمی کے پیغام کو چین کے ہر شہر اور ہر گاوں میں پہنچانے کے لئے پوری گرمجوشی سے مصروف ہے اور ملکی خدمت اور ترقی کی اس تدبیر پر عمل کرنے والے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو امداد باہمی کے اصولوں اور طریقوں میں اپنی بساط اور بصیرت کے مطابق تعلیم و تربیت دینے میں مشغول ہے۔

چین میں قحط کا سلسلہ تو رہتا ہی ہے، شمالی چین میں ایک قحط اس قدر شدید اور وسیع واقع ہوا کہ ایک بین الاقوامی قحط کمیشن قحط زدوں کی امداد کے لئے مقرر ہوا، اس کمیشن میں چینی اور غیر چینی لوگ شامل تھے اور اس کا مقصد اس بڑی رقم سے جو امداد قحط کے طور پر جمع کی گئی تھی کسانوں کی بہترین طریق پر امداد کرنا تھا، اس کمیشن کا نام "چائنا انٹرنیشنل فیمن ریلیف کمیشن" تھا۔

اس کمیشن نے سنہ ۱۹۲۲ء میں امداد باہمی کی عملی امداد کے طور پر کسانوں کی انجمنیں قائم کیں، اور ان کو اپنے فنڈ سے روپیہ
۲۴ قرض دیا، اور اپنی ضمانت پر چینی بینکوں سے قرض دلوایا، صوبہ وار کانفرنسیں منعقد کرائیں، اور انجمنوں کے کام کی رہنمائی اور نگرانی کے لئے اپنے خرچ سے انسپکٹر مقرر کئے، بعض انجمنوں کو اپنے سرمایہ حصص اور ممبروں کی امانتوں کے سرمایہ سے کام شروع کر کے اپنی صلاحیت اور امداد حاصل کرنے کی لیاقت ثابت کرنے کی مہلت دی، اور اس طرح صوبہ ہوپی میں پندرہ سولہ برس کے عرصہ میں اچھی انجمنوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی، اور ان انجمنوں نے کسانوں کی معقول خدمت انجام دی۔

جب سنہ ۱۹۳۱ء کے ہولناک سیلاب نے یانگسی وادی کے کتنے ہی صوبوں میں تباہی و بربادی پھیلادی تو نیشنل فیمن ریلیف کمیشن اور چائنا انٹرنیشنل فیمن ریلیف کمیشن نے مل کر کسانوں کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے ایک تو غلہ اور روپیہ تقسیم کیا اور دوسرے ساتھ ہی ساتھ امداد باہمی کی ہزارہا انجمنیں قائم کردیں، پہلے تو یہ انجمنیں دس یا دس سے زیادہ کسان مل کر قائم کر سکتے تھے، جن کی ذمہ داری مشترک یا غیر محدود ہوتی تھی، اور انجمنیں غیر رجسٹری شدہ ہوتی تھیں، کمیشن ایسی انجمنوں کی معرفت کسانوں کو امداد کے لئے روپیہ دیتا تھا، اور اگرچہ کسان اپنے آپ کو دیوالیہ قرار

دیگر قرض کی واپسی سے بچ سکتے تھے، لیکن چینی کسان کی ایمانداری اور خود داری نے قرض کی واپسی کو ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے برابر سمجھا۔ یہ انجمنیں تھوڑے عرصہ کیلئے قائم ہوتی تھیں اور جب سب ممبروں کا قرضہ ادا ہو چکتا تھا تو انجمنیں بند کر دی جاتی تھیں، لیکن تھوڑی دیر بعد چائنا انٹرنیشنل فیمن ریلیف کمیشن نے ایسی انجمنوں کو مستقل بنا دیا ہے اور اب صوبہ آکنگ، ہونان، ہوپی اور کیانگسی میں ہزارہا انجمنیں قائم ہیں، اور کسان کی خدمت بجا لا رہی ہیں۔

چین کے مختلف صوبوں میں امداد باہمی کی طرز کی قرضہ انجمنوں کی تعداد آج سے پانچ چھ سال پہلے ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی تھی ۱۹۲۷ء میں ایک سرکاری زراعتی بینک قائم کیا گیا، اگرچہ وہ خالص امداد باہمی کی طرز کا بینک نہیں تاہم دوسرے تجارتی فرائض کے ساتھ ساتھ امداد باہمی کی قرضہ انجمنوں کو سرمایہ بھی بہم پہنچاتا ہے، اس فارمرز بینک کے علاوہ ایک نیشنل فارمرز بینک بھی قائم ہے جو انجمنوں کی معرفت کسانوں کی مالی ضروریات پورا کرنے میں مدد دیتا ہے، چین کی حکومت نے لیگ آف نیشنز سے زراعتی قرضہ اور مالیات کے ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور انھیں چینی کسان کی ضروریات سے واقفیت حاصل کرنے اور امداد باہمی کی ضرورت اور اس کے فروغ دینے کی تدابیر پر غور کرنے کا موقعہ بہم پہنچایا، ان ماہرین کی رائے سے دیہاتی قرضہ کی انجمنوں میں اضافہ ہوا، حکومت نے ذرائع آمد و رفت میں وسعت اور آسانیاں پیدا کیں، دیہات سُدھار کا دور دورہ شروع ہوا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حکومت نے تسلیم کر لیا کہ کاشتکار کی ترقی کے لئے صرف قرضہ انجمنیں ہی کافی نہیں، چینی کسان کو دوسرے ملکوں کے کسانوں کی طرح اپنی زندگی اور پیشہ کے ہر شعبہ میں امداد باہمی کی طرز کی انجمنوں کی ضرورت ہے، مثلاً انجمنوں کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ سے سرمایہ یا قرض حاصل کرنے میں اسے طرح طرح کا نقصان ہوتا ہے، اس لئے اُسے مناسب اور معقول شرائط پر سرمایہ بہم پہنچانے کے لئے قرضہ انجمنوں کی ضرورت ہے، اسے ضروریات زندگی اور اپنے پیشہ کے آلات اور سامان حاصل کرنے میں طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں، جو اس کے کھیتوں تو کیا اس کی زندگی تک کی شادابی کا خاتمہ کر دیتی ہیں، اسے اپنا خون پسینہ ایک کر کے پیدا کئے ہوئے اناج اور دوسرے سامان کی فروخت میں طرح طرح کا گھاٹا اور ٹوٹا اٹھانا پڑتا ہے، اس لئے انجمن قرضہ کے ساتھ امداد باہمی کی طرز کی انجمن ہائے خرید اور انجمن ہائے فروخت قائم کی گئیں، اور اس طرح کاشتکاروں کو اپنی ضرورت کے سامان کی خرید اور اپنی پیداوار کی فروخت میں آسانی پیدا ہو گئی ہے، خرید و فروخت کی انجمنوں کے زیر اہتمام کچھ پرچون کی دوکانیں بھی کھول لی گئیں،

زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے بکھرے ہوئے کھیتوں کو اشتمال اراضی یا چک بندی کی امداد باہمی کی طرز کی انجمنوں کے ذریعہ اکٹھا کر لیا گیا ہے، ہر گاؤں کا کسان اور زمیندار اس چک بندی کی انجمن کا ممبر ہوتا ہے اور زمین کی تقسیم نئے سرے سے کی جاتی ہے، اور کسان اپنا لگان زمیندار کے بجائے انجمن کو ادا کرتے ہیں، جہاں سے وہ رقم زمیندار کو دیدی جاتی ہے۔

شہروں، سکولوں اور کالجوں میں بھی کہیں کہیں اور چھوٹے پیمانہ پر خرید کی انجمنیں قائم ہیں۔

چین میں امداد باہمی کی تحریک ابھی نہایت ابتدائی حالت میں ہے، اس کی وسعت اور کارنامے ابھی قابل تذکرہ بھی نہیں اور نہ ہی اس کی گوناگونی پر کوئی اطمینان ظاہر کیا جا سکتا ہے، قرضہ کی چند ہزار دیہاتی انجمنیں، چند ہزار خرید و فروخت کی انجمنیں، دس پانچ بینک، وہ بھی خالص امداد باہمی کی طرز کے نہیں، ان انجمنوں کو چلانے کے لئے تحریک کے اصولوں سے پورے طور پر واقف لوگوں کا قحط، کارکنوں کو امداد باہمی کے علم و عمل میں تعلیم و تربیت دینے والوں کی کمی، کسان کی جہالت، عمدہ نگران اور لائق رہنماؤں کا فقدان، انجمنوں کا غیر رجسٹری شدہ رہنا، ابتدائی انجمنوں کا یونین کی صورت میں مرتب نہ ہونا مرکب انجمنوں کا قیام یعنی ایک انجمن کا مختلف بلکہ متضاد مقاصد کے لئے قائم ہونا وغیرہ وغیرہ کتنی ہی باتیں ہیں جن کی بنا پر چین میں امداد باہمی کی وسعت اور عمل کو کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہا جا سکتا۔ چین ان نقائص کو رفع کر رہا ہے، لیکن چین میں امداد باہمی کی سب سے بڑی ساکھ جذبۂ امداد باہمی کی ہمہ گیری، اسے سمجھنے کا ولولہ، اور اس پر عمل کرنے کی اُمنگ ہے، چین کو تھوڑی سی بیرونی رہنمائی اس تحریک کی بُنیادیں استوار کرنے کیلئے درکار ہوگی، ورنہ چین والوں کی فہم و فراست اور قوتِ تعمیر کا یہ حال ہے کہ انھوں نے پورے زور کے ساتھ یہ کہدیا ہے کہ چین کی صنعتی ترقی کو ہم مغربی زندگی اور صنعتی ترقی کے ناگوار

اثرات سے پاک رکھیں گے۔

چین کی سب سے بڑی دولت قدرت کے آغوش میں پرورش پانے والا جفاکش اور خوددار کسان ہے جس کی فطرت میں امداد باہمی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے، اور جسے چین کی ناقابلِ عبور سرحدوں نے موجودہ زمانہ کی خودغرضی اور حرص و ہوا کی لعنتوں سے محفوظ رکھتے ہوئے وطن کی محبّت سے سرشار کر رکھا ہے، ہر ملک کی ترقی کی بنیاد اس کے باشندے ہیں وہی ملکوں کے مقدّر اور قوموں کی قسمتوں کے پلٹنے۔ ایسے ہیں چین نے جس خودداری، بے جگری اور ایثار سے حفاظتِ وطن میں جانبازی اور سرفروشی کا ثبوت دیا ہے، اور جس طرح اس نے اپنے عزم و ہمّت سے جاپان کی ہلاکت بازیوں کا مقابلہ کیا ہے، وہ اس کی معاملہ فہمی، قوّتِ تنظیم اور اس کی بیداری اور فحتمندی کا ثبوت ہے۔

چین کا بہادر سپاہی برما میں ہندوستانی سپاہیوں کے دوش بدوش ہندوستان کی حفاظت کیلئے اپنا خون بہا رہا ہے، چین کا سب سے بڑا مدبّر سپہ سالار خود ہندوستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکا ہے، اب ہندوستان اور چین کی باہم امداد میں ہماری آزادی اور آبرو کا راز پوشیدہ ہے جب دونوں ملکوں کی اس امداد باہمی کی بدولت دُنیا کو ایک نیا، بہتر اور روشن مستقبل نصیب ہوگا تو چین کی معاشی امداد باہمی کی ترقی میں کیا دیر لگے گی۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

منتشر جذبے

برتری

تیری آنکھوں نے سکھادی رسم و راہِ برتری ہر اشارہ اِک خدائی، ہر نظر پیغمبری

آزادی

چہ مرگ و زیست، چہ دُنیا و دیں، چہ فکر و خیال تمام عالمِ امکاں غبارِ آزادی

ذوقِ احتجاج

پڑتی ہے روشنی مرے حالِ تباہ پر اے کاش بجلیوں کی چمک جاوداں رہے

خواب و بیداری

ترے خیال کے زانو پہ آنکھ لگتی ہے ترے تصوّرِ بیحد سے جاگتا ہوں میں

عطیہ

فطرت نے جو بخشی بھی تو وہ شے مجھے بخشی جس شے کی سمائی ہے نہ دُنیا میں نہ دیں میں

جوھر

ہوتا تو فضا نور سے بجلی نظر آتی جوہر ابھی موّاج نہیں میرے نگیں میں

ساغر

حامد حسن قادری

منشی جی

منشی دیانراین نگم سے میرے تعلقات تقریباً چالیس برس سے تھے۔ مختلف کاموں میں میرا اُنکا ساتھ رہا۔ انکا نام اور تذکرہ بار بار آتا تھا اور میں ان کو منشی جی کہا کرتا تھا۔ یہ ان کے نام کا مترادف ہو گیا تھا۔

منشی جی نے جب ۱۹۰۳ء میں بریلی سے زمانہ جاری کیا، میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ زمانہ کے چند پرچے نکل چکے تھے جب مجھے اسکے جاری ہونے کا علم ہوا۔ میں نے پہلی ششماہی کی جلد منگالی اور زمانہ اپنے نام جاری کرا لیا۔ پھر منشی جی سے ملاقات ہوئی، مراسم پیدا ہوئے۔ بے تکلفی بڑھی تو خریداری کا تکلف برطرف اور زمانہ میرے نام جاری رہا۔ بلکہ منشی جی مجھے مضمون نگاری کا معاوضہ دینے لگے۔ لیکن ایک دو مرتبہ کے بعد میں نے اس تکلف کو بھی اُٹھا دیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ میں تقریباً ۲۶
چالیس سال سے برابر زمانہ کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔

غالباً ۱۹۰۵ء جب زمانہ کانپور سے نکلنے لگا، میں نے اس میں مضامین اور نظمیں لکھنی شروع کیں۔ ۱۹۰۶ء میں منشی جی نے شہنشاہ اکبر اعظم کی سہ صد سالہ برسی کے موقع پر زمانہ کا اکبر نمبر شائع کیا۔ اس میں میری بھی ایک نظم (مقبرۂ اکبر) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ میں اس زمانے میں طالب علم تھا۔ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء میں بھی میرے مضامین اور رباعیاں زمانہ میں شائع ہوئیں۔

۱۹۰۹ء میں مجھے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں سے کانپور گیا کانپور کا سفر سیر و تفریح کیلئے نہ تھا۔

"ہوس سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو"

بلکہ صرف دو شخصوں کی زیارت کا اشتیاق کانپور لے گیا تھا۔ ایک منشی دیانراین نگم، دوسرے منشی رحمت اللہ رعد (مالک نامی پریس و بڑی جنتری) ایک روز منشی دیانراین صاحب سے دو بار ملا۔ دوسرے روز منشی رحمت اللہ رعد صاحب سے۔ اس ملاقات سے مجھے منشی دیانراین نگم کی ذات سے اک گرویدگی پیدا ہو گئی۔ منشی جی کو ادب سے زیادہ سیاست کا ذوق تھا۔ بعد کو تو ان کا شوقِ سیاست ذوقِ ادب پر بھی غالب و مؤثر ہو گیا تھا۔ لیکن اس رجحان کا اثر اس وقت بھی غیر محسوس نہ تھا۔ اب سے ۳۲، ۳۳ برس پہلے کی ہندی سیاست کچھ زیادہ پیچیدہ نہ تھی، تاہم سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ کا اثر باقی تھا۔ اور کانگریس اور کانفرنس کی رقابت جاری تھی۔ انہی موضوعات پر اس پہلی ملاقات میں میری اور منشی جی کی مختصر گفتگو رہی۔

۱۹۱۷ء میں میرا بسلسلۂ ملازمت کانپور جانا ہوا۔ اور مسلسل دس برس وہاں رہا۔ ۱۹۱۸ء میں میں نے بچوں کیلئے ایک پندرہ روزہ رسالہ سعید کانپور سے جاری کیا اور سات برس نکالتا رہا۔ منشی جی صحافت کے پہلے سے مرد میدان تھے اور میرے ان سے تعلقات۔ سعید کے زمانۂ اشاعت میں منشی جی نے جس طرح میری حوصلہ افزائی کی اس کا اثر آج تک میرے دل پر ہے۔ قیام کانپور کے زمانے میں زمانہ کی مضمون نگاری (جو عرصے سے چھوٹی ہوئی تھی) میں نے پھر شروع کر دی۔ بہت سے مقالے اور افسانے لکھے۔

۱۹۲۷ء میں میرے آگرہ آنے کے بعد جب آگرہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو منشی جی اُردو بورڈ کے ممبر ہو گئے اور آخر تک برابر ممبر رہے۔ میں ممبر بھی تھا اور کنوینر بھی۔ اس حیثیت سے منشی جی سے دوگونہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اور ہر سال ملاقات ہونے لگی۔ منشی جی (بجز ۱۹۴۱ء جب ان کے ایک صاحبزادے آگرہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور وہ انکے پاس ٹھہرے تھے) ہمیشہ دیال باغ میں قیام کیا کرتے تھے۔ میرے مکان اور دیال باغ میں بُعد المشرقین ہے۔ بلکہ صحیح تر بُعد الشمالین"۔ لیکن منشی جی اکثر بورڈ کے جلسے سے قبل یا بعد میرے مکان پر تشریف لایا کرتے تھے کہ بورڈ کی گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی ملاقات سے سیری نہیں ہوتی۔ یہ وضعداری منشی جی کی طبیعت کا خاصّہ تھی، اور کچھ میرے ہی ساتھ نہ تھی آگرہ میں لطیف الدین احمد صاحب (ل احمد) اکبر آبادی سے بھی ایسا ہی تعلق تھا۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ دور رہتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس بھی اکثر جایا کرتے تھے۔

مجھے منشی جی کی یہی ادائے قدامت پسندی و وضعداری سب سے زیادہ پسند تھی۔ اسکی ایک ذرا سی، لیکن بڑی دلچسپ مثال یہ ہے کہ ان کا رسالہ (زمانہ) جب بریلی سے نکلنا شروع ہوا تو ٹائٹل پیج پر "زمانہ" کا

نفظ نستعلیق میں لکھا جاتا تھا۔ پھر جب کانپور سے شائع ہونے لگا تو خطِ نسخ میں (زمانہ) لکھا جانے لگا۔ اسکے متعلق منشی جی فرماتے تھے کہ یہ خطِ گلزار کی مرصع اور نسخ کی شکل منشی رحمت اللہ رعد نے تجویز کی تھی۔ منشی جی نے وضع کی پابندی اور رعد مرحوم کی یادگار مرتے دم تک قائم رکھی۔ اس عرصے میں دوسرے اُردو رسالوں کے نئے نئے سرورق نظر آئے، خطِ نسخ سے عام دلچسپی نہ رہی، خطِ گلزار پُرانا پڑ گیا۔ لیکن منشی جی نے اپنی وضع نہ بدلی۔ درمیان میں ایک آدھ بار جدید وضع کا ٹائٹل پیج بھی بنا اور چھپا، لیکن اُن کو پسند نہ آیا اور انہوں نے پھر وہی وضع اختیار کر لی۔

ایک مرتبہ نئی تہذیب اور نوجوانوں کے اخلاق کا تذکرہ آ گیا منشی جی نے فرمایا، یہاں تو یہ حال ہے کہ جتنی عمر بڑھتی جاتی ہے "گھر" سے دلچسپی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

ایک سال اُردو بورڈ میں کسی کتاب کے بدلنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ ایک ممبر نے اس کتاب کی جگہ ایک جدید انشاپرداز کے افسانوں کا مجموعہ تجویز کیا۔ میں نے اس بنا پر اختلاف کیا کہ اس میں اکثر فسانے عُریاں قسم کے ہیں۔ کالجوں میں مخلوط تعلیم جاری ہے۔ پڑھنے والوں اور امتحان دینے والوں میں کثرت سے لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ منشی جی نے اپنے پُرانے پن کی وجہ سے اس رائے کو بہت پسند کیا اور وہ کتاب شاملِ نصاب نہ کی گئی۔

منشی جی پُرانے سماج اور قدیم معاشرت میں پل کر جوان ہوئے تھے، اور اس زمانے میں پختہ خیال ہو چکے تھے۔ جب نئی روشنی کچھ یوں ہی سی چمکی تھی، پھیلی اور چھائی نہ تھی، اسی کا فیضان تھا کہ انکے صاحبزادے اور اہلِ خاندان تہذیبِ مغربی اور تعلیمِ جدید سے متاثر ہو کر بھی اپنے اسلاف اور اپنے خاندان کی روایات کے حامل و عامل ہیں۔

منشی جی سیاسی آدمی تھے۔ لیکن سیاست میں اُن کی رفتار نہایت احتیاط اور مصلحت اندیشی کے ساتھ جاری رہی چونکہ یہ عادت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اس لئے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ان کا ادراک و احساس ان کو صحیح راستہ دکھا دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہندو نوجوان شاعر نے جو اُردو کے علاوہ فارسی شاعری کا بھی ذوق رکھتے ہیں، فارسی میں ایک قطعہ لکھ کر "زمانہ" میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ شاعر نے اس نظم میں ڈاکٹر اقبال سے خطاب کر کے کہا تھا کہ آپ طائرِ قدس ہیں۔ آپ کی پرواز ماورائے عرش تک ہے۔ پھر آپ جو ملک کی سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو یہ گویا رجعتِ قہقری ہے۔ آپ اپنے پر و بال ملکوتی کو گردِ سیاست میں کیوں آلودہ کرتے ہیں۔ منشی دیانرائن نگم نے اس قطعہ کو "زمانہ" میں محض اس خیال سے شائع نہیں کیا کہ ایک ہندو کی طرف سے ایک مسلمان لیڈر کو ترکِ سیاست کا مشورہ ایک طرف نازیبا اور خلافِ مصلحت ہے اور دوسری طرف اپنی کمزوری کا احساس و اظہار۔ حالانکہ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ شاعر کے پیشِ نظر اقبال کی روحانی عظمت اور ان کی شاعری کا ملکوتی پہلو تھا۔ سیاسی پیچ مقصود نہ تھا۔ لیکن منشی جی کی احتیاط اور دور اندیشی نے وہ پہلو نکال لیا۔

منشی جی "زمانہ" کے خاص نمبر اور سالنامے نکالنے کے قائل نہ تھے۔ لیکن مشاہیرِ علم و ادب کی یادگار میں انہوں نے متعدد نمبر بڑے شوق اور بڑی محنت سے شائع کئے۔ حالی نمبر اور پریم چند نمبر خاص چیزیں ہیں۔

منشی جی نے "زمانہ" میں التزام کر لیا تھا کہ تمام دُنیا کے عموماً اور ہندوستان کے خصوصاً مشاہیرِ ملک، اربابِ سیاست، اہلِ قلم، اصحابِ شعر و سخن کی وفات کے بعد ان کی تصویر اور ان کے حالات پر کم سے ایک مقالہ ضرور شائع کرتے تھے۔ انکے مجموعہ سے کتاب المشاہیر مرتب ہو سکتی ہے۔ میرے اندازے میں تقریباً سو مشہور لوگوں کے حالات "زمانہ" میں موجود ہونگے چار سو صفحوں کی کتاب بے تکلف بن سکتی ہے۔

۲۷

منشی دیانرائن نگم رائے بہادر، آنریری مجسٹریٹ، قومی اداروں کے سرپرست، سیاسی رہنما، سبھی کچھ تھے۔ لیکن میری نظر میں "زمانہ" کا اڈیٹر ہونا اور چالیس برس اُردو کی خدمت کرنا انکی بڑی فضیلت و عظمت ہے۔ منشی جی نے "زمانہ" کی صورت میں کم سے کم پچیس ہزار صفحے اُردو لٹریچر میں اضافہ کئے ہیں۔ جو علوم و فنون اور شعر و ادب کی انسائکلوپیڈیا کا حکم رکھتے ہیں۔

منشی جی کی وفات سے ان کا "فرزندِ معنوی" (زمانہ) معرضِ خطر میں ہے۔ خدا کرے کہ ان کے "فرزندانِ صوری" (اولادِ سعید) مسیحائی کر کے اس کو زندہ رکھ سکیں۔ پھر گویا منشی دیانرائن نگم خود زندہ رہیں گے۔

(صفحہ ۴۴ کا بقیہ مضمون)

بھینی بھینی خوشبو کی مالک ــــ مگر پھول بننے کے بعد ــ اور کبھی تو حالتِ ناشگفتگی ہی میں بھی ــ کچھ ہاروں میں گندھ کر سہروں میں چڑھ جاتی ہیں اور کچھ دُنیا کو دھوکا دینے کیلئے مرنے والے کی قبر پہ ڈال دی جاتی ہیں ــــ

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

..... آج چار دن سے اس کشمکش میں ہوں کہ یہ خط تم کو بھیجوں یا نہ بھیجوں ــــ لیکن ابھی تک یہ طے نہیں کر سکا کہ یہ خط ہے یا دماغی پراگندگی کا خاکہ ــ تم کو خط لکھنے بیٹھا تھا لیکن نہ معلوم دماغ کے کس اشارہ پہ قلم بہک کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ۔ اگر بھیجتا ہوں تو تم نہ معلوم میرے متعلق کیا رائے قائم کرو گی ــــ کاش وہی رائے قائم کرو جس کی مجھے خواہش ہے ــ مگر خواہش؟ کیا یہ کہ تم مجھ کو اپنا دوست سمجھو؟ نہیں ــ اسکے لئے بڑی ہمّت کی ضرورت ہے جو مجھ میں نہیں ــــ پھر؟ کیا یہ سب کچھ نہیں ؟ــ یہ کیسے کہوں؟ ــ پھر کیا کروں؟ اور نہیں بھیجتا ہوں تو؟ ــــ اسے کون پڑھے گا ــــ مگر کیا ضروری ہے کہ کوئی پڑھے؟ ــ کیوں نہ اس کو بھی انہیں اوراقِ پارینہ میں دفن کر دوں جن کا علم سوائے میرے اور میرے بکس کے چور خانے کے اور کسی کو نہیں ــ ضیا صاحب کو بھی نہیں ــ مگر پھر تم کو کیا لکھوں؟ــ اچھّا کل فیصلہ کروں گا کہ یہ خط تمہیں بھیجوں یا نہ بھیجوں؟

تمہارا ......

یادش بخیر! آج سے چند سال پہلے میرے ایک دوست ..... (نام مصلحتاً چھپا رہا ہوں) بورڈنگ میں میرے ہم کمرہ تھے ۔امتحان کے قریب وہ یکایک غائب ہو گئے اور ان کا ایک بکس میرے پاس رہ گیا ۔ یہ بکس ان کی کُل کائنات تھی ۔ بستر اور دوسری ضروریات کا سامان ان کے احباب کے پاس بہت کافی تھا اور جنہیں اگر وہ استعمال کرتے تھے تو یہ ہم لوگوں کے لئے باعثِ فخر ہوتا تھا ۔

گھر سے کھاتے پیتے تھے مگر ضرورت سے زیادہ خودداری نے ہمیشہ ٹیوشن پر بسر اوقات رکھی ۔ اور اس معاملہ میں کمال حاصل تھا ۔ جو کچھ ضروری اخراجات سے بچتا اسے دوستوں پر خرچ کر کے خود بیڑی اور چائے پر اکتفا کیا کرتے تھے ۔ محبّت کے نام سے چڑتے تھے مگر اشعار کے انتخاب نے اکثر رسوا کر دیا ۔ ہم لوگوں سے اگر کبھی اس مسئلے پر گفتگو آجاتی تو صنفِ نازک کی دھجیاں اس طرح اُڑاتے گویا ان سے اور حضرت حوّا کی بیٹیوں سے خاندانی بیر ہے مگر یہ ضرور دیکھا کہ وہ کسی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہوں اور سامنے کوئی مجسّم "پیمانہ و صہبا" لا کر رکھ دیا جائے تو پھر ان کی تقریر کی گل افشانی ساری فضا کو بہار و شباب سے معطّر کر دیا کرتی تھی ــ

بہرحال وہ ایک دن غائب ہو گئے اور انکے بکس میں کپڑوں کے اوپر ہی یہ خط رکھا ہوا ملا ۔ اس خیال سے کہ شاید وہ "مرحوم" نہ ہو گئے ہوں میں نے یہ خط پڑھا ۔ اور خود انہیں کی طرح میں بھی اب تک اس فکر میں ہوں کہ اس خط کو مکتوبات کی کس ضمن میں رکھا جائے ۔ ایک عرصہ سے ان کی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں ملی تھی ۔ مگر پرسوں اخبار "بین اسٹیٹسمین" کے "احمقوں کے گوشہ" میں ان کا نام دکھائی دیا اور معلوم ہوا کہ ایک بزرگ ...... نام کے ..... شہر سے ستیہ گرہ کر گئے ۔

یہ خط مکتوب الیہا (خط کی عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے) تک وہ نہ پہنچا سکے اور یہ خود مجھے بھی نہیں معلوم ۔ ممکن ہے عبارت اور اندازِ تحریر سے وہ محترمہ خود اندازہ لگا لیں اور پھر شاید دو سال کی قید کے بعد ..... صاحب کی مسرّت میں کوئی اضافہ یا ان کی زندگی میں کوئی چمک پیدا ہو سکے ۔

ساغر نظامی

آدرش[1]

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو، افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

وہ مرا خواب، وہ ایوانِ تخیّل کی اساس
وہ مرا خواب، وہ تصویرِ خیال و احساس
جس کے قدموں پہ سرافراز تصوّر کی جبیں
جس کے شہپر مری پروازِ تخیّل کے امیں
جس کے انوار سے روشن ہے شبستانِ وجود
ورنہ اک صفحۂ سادہ تھا گلستانِ وجود
وہ مرا خواب، وہ ہستی کا شبستانِ جمیل
میرا سپنا، مرے مقصود کا ایوانِ جمیل
وہ مرا خواب وہ اک محشرِ انوارِ رواں
وہ مرا خواب وہ افسونِ تلاطم کا جہاں
میرا آغاز، مرا نشو، وہ میری تکمیل
میرے جینے کا سہارا، مرے مرنے کا کفیل
جس میں اک عربدہ جو رقص کناں ہے پیہم
مثلِ خوں میرے دل و جاں میں رواں ہے پیہم
تم نہیں ہو مرے سپنے کے شبستانوں میں
ہے کوئی اور مرے خواب کے ایوانوں میں

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو، افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

نہ وہ قامت کہ جسے نشوِ تمنّا کہیئے
روحِ عظمت کا ابھرتا ہوا جذبہ کہیئے
سانپ کی طرح لچکتا ہوا پیکر بھی نہیں
بِس اور امرت سے چھلکتا ہوا ساغر بھی نہیں
نہ وہ آنکھیں ہیں کہ تاباں ہوں جواہر کی طرح
دل پہ زربار ہو دو ساغرِ گوہر کی طرح
نہ وہ ہاتھوں کا تناسب نہ وہ باہوں کا جمال
نہ وہ امواجِ تصوّر، نہ وہ گردابِ خیال
نہ وہ پھولوں کی مہک ہے، نہ وہ خوشبو کی لہک
نہ وہ پائل کی صدا ہے، نہ وہ گھونگرو کی دھمک
کھل کھلاہٹ نہ وہ برگِ گلِ تر کا نغمہ
مسکراہٹ نہ وہ آثارِ سحر کا نغمہ
اُس کا ہنسنا ہے نہ وہ سینۂ سیمیں کی ہے گونج
شورِ نغمہ ہے نہ وہ مطربِ رنگیں کی ہے گونج

[1] مطمحِ نظر

نہ وہ بازو کہ جو بیتاب ہوں گردن کیلئے
لعل و گوہر سے لدے، سانپ سے بل کھائے ہوئے

نہ وہ لچکی ہوئی شاخِ گلِ تر کا عالم
نہ وہ مچلی ہوئی ناگن سی کمر کا عالم

نہ وہ رفتار نہ ہر گام پہ رقصیدہ خرام
نہ قیامت کے وہ مجرے، نہ وہ آفت کے سلام

گفتگو بارشِ القا، نہ خموشی الہام
نہ وہ چُپ چاپ نظامِ ابدیّت سے کلام

نہ ملامت، نہ شکایت، نہ لطافت، نہ رضا
نہ تکلّم، نہ تبسّم، نہ ترنّم، نہ صدا

میری رگ رگ کو جکڑتی ہیں نگاہیں جس کی
باندھ لیتی ہیں مری زیست کو باہیں جسکی

مجھ میں محدود ہے پر روپ ہیں اُسکے بیحد
کبھی معبود، کبھی عبد، کبھی خود معبد

جھانک کر میرے تخیّل سے مسلسل گانا
اور پھر میرے تخیّل ہی میں حل ہو جانا

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

تم لرزتی ہو مرے جذبۂ صنعت گر سے
اُس نے مقصود چُرایا ہے دلِ آذر سے

تم بھڑکتی ہو مرے شعلۂ صنّاعی سے
اُسکی فطرت کو ہے اک لاگ صنم سازی سے

نہ وہ عصیاں کی تڑپ ہے نہ وہ ایماں کی جھلک
برسی پڑتی ہے نگاہوں سے رواجوں کی چمک

تم پہ ہر وقت روایات و عقائد کا عذاب
گرد ہے اس کی نگاہوں میں گنہ اور ثواب

نہ وہ مٹنے کی تمنّا، نہ سنورنے کا جنوں
نہ اُبھرنے کا سلیقہ، نہ بکھرنے کا جنوں

تمھیں پانی پہ بھی شک آتشِ سیّال کا ہے
زہر پر اُس کو یقیں بادۂ کم سال کا ہے

اُسکے ابرو میں، نگاہوں میں، اداؤں میں مدام
ہیں اُبلتے ہوئے ساغر تو چھلکتے ہوئے جام

اُس کی آنکھوں کی سیاہی میں جہانِ اشکال
لاکھ مبہم سے الم، لاکھ سسکتے سے خیال

ایک غمّاز خموشی اشک نما آنکھوں میں
لاکھ گردابِ وفا کھلتی ہوئی باہوں میں

یہ مری روح میں ہے قید یہ صد صبر تمام
اور تمھیں شوق کہ بنجائے مری روح غلام

تم سمجھتی ہو کہ افلاس میں رہتی نہیں لاج
اُس کے نزدیک محبّت کی یہی ہے معراج

تمھیں قیمت کی طلب، اُسکو محبّت کی طلب
تمھیں عشرت کی طلب، اُسکو مصیبت کی طلب

میرے مقصود کی تصویر نہیں ہو، افسوس
تم مرے خواب کی تعبیر نہیں ہو، افسوس

نواب جعفر علی خاں اثرؔ بی اے لکھنوی

ساقی

اک چھلکتا ہوا جام آنکھ ملا کر ساقی — جسکے ہر قطرے میں ہو صبح کا جوہر ساقی
زعفراں زار سے پھوٹے ہوئے چشمے کی طرح — موج سی آئے نظر جام کے اندر ساقی
رنگ بنجائے پری اور پری ہو رقصاں — اس قدر تیز چلے دَور میں ساغر ساقی
دیکھنا ہے مجھے مشاطگیٔ صبح بہار — جامِ بلّور میں دے بادۂ احمر ساقی
اپنی توڑی ہوئی انگڑائی کی ہے تجھ کو قسم — جام اسی کن سے ادھر ہاتھ بڑھا کر ساقی
کسی ترکیب سے حل کر دے تبسُّم اپنا — یوں نہیں.... ہونٹوں کے لیجا کے برابر ساقی
تجھ کو معلوم ہے میں پی کے بہکنے کا نہیں — بند مجھ پر تو نہ کر میکدے کا در ساقی
پھر پلٹ آئے زمانہ وہی بے فکری کا — آنکھ روتی نہ تھی جب دامنِ تر پر ساقی
پھوٹ آپس میں پڑی ہے کہ الٰہی توبہ — شکوہ آجائے نہ کیوں لب پہ مکرّر ساقی
دے وہ بادہ کہ غمِ دہر فسانہ ہو جائے — دِل کے مانند فضا بھی ہے مکدّر ساقی
رحم فرما کہ یہ ہے تیرہ شبی کا عالم — زندگی جو تھی عمل، خواب ہے یکسر ساقی
ان کی رسوائی میں ہے تیری بھی سُبکی مضمر — بھولے بھٹکوں کا پھر اکبار ہو رہبر ساقی

جب غلط کوش نہ تھے رند صفا کیش ترے
دیکھ لے پھر اثرؔ مست وہ منظر ساقی

— الیشیا - دسمبر ۱۹۴۲ء

احمد ندیم قاسمی

اِحساس کی چُٹکی

اُف مری رُوح پہ ماحول کا یہ بارِ گراں
اُف مری قوّتِ احساس کی واماندگیاں

اُف مِری فکر پہ کس بھوت نے پَر پھیلائے
چار جانب نظر آتے ہیں لرزتے سائے

اُف یہ کیا سحر ہے تہذیب کی عُریانی کا
زہرِ قاتل پہ بھی دھوکا ہے مجھے پانی کا

اُف یہ کس طُرفہ شکنجے میں گرفتار ہوں میں
اپنے اللّٰہ کی رحمت سے بھی بیزار ہوں میں

میری تحریر میں ہیں رنگ نگوں ساری کے
عکس۔ نغموں میں مرے۔ موت کی تیّاری کے

ہاتھ پھیلائے ہوئے آنکھ جھپکتی ہی نہیں
بجلیاں قلب میں غیرت کی چمکتی ہی نہیں

سوچتا ہوں تو سُجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
دیکھتا ہوں تو دِکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

عِفّتیں زر کے عوض بیچ کے بھی زندہ ہوں
اور غضب یہ۔ نہ پشیماں ہوں نہ شرمندہ ہوں

عشق کرتا ہوں تو دہکے ہوئے گالوں کیلئے
یاسمیں شانوں پہ بکھرے ہوئے بالوں کیلئے

قید و پابندیٔ مذہب سے ہوں باغی کب کا
اِک خدا روز بنا لیتا ہوں اپنے ڈھب کا

کانپ اُٹھتا ہوں جو توپوں کی گرج سُنتا ہوں
دُکھ بھرے گیت کی ہر تان پہ سر دُھنتا ہوں

گُھپ اندھیرے میں چڑیلیں نظر آتی ہیں مجھے
کچکچاتے ہوئے دانتوں سے ڈراتی ہیں مجھے

آج لیکن مرے سینے میں چمک کیسی ہے!
دِل کی دھڑکن میں یہ قدموں کی دھمک کیسی ہے!

میری ہر سانس سے جھڑتے ہیں شرارے کیسے!
دُھندلے ماحول میں اُبھرے ہیں ستارے کیسے!

کیسا بادل یہ اُفق پر سے کڑکتا اُٹھا
کیسا شعلہ یہ زمیں میں سے بھڑکتا اُٹھا

ہائے یہ کس نے بگاڑا ہے عناصر کا نظام
کِس نے گردوں سے پکارا مِرے اسلاف کا نام

جانے کیوں اور میں کس سمت اُڑا جاتا ہوں
خون یوں کھول رہا ہے کہ پُھنکا جاتا ہوں

ظفر تاباںؔ دہلوی

۲ غزلیں

اُسی کو اپنا سمجھ رہا ہوں وہی نگاہوں میں اجنبی ہے
ابھی تصوّر ہے نامکمل ابھی بصیرت میں کچھ کمی ہے

ارادہ آئینہ دارِ ہستی خیال معیارِ زندگی ہے
جو نا اُمیدی سے لڑ رہے ہیں کچھ اُن کے دل میں اُمید بھی ہے

علاجِ غمہائے زندگانی رہا نہ تھا اور کوئی یا رب
معاف فرمایہ دامنِ تر کہ سخت مجبور ہو کے پی ہے

تمھیں ہے کوتاہیِ بیاں کی شکایتیں عرضِ مدّعا پر
زباں سے اظہار کرنے والو کبھی نظر سے بھی بات کی ہے؟

حجاب حائل تھے درمیاں میں حیا کے پردے پڑے ہوئے تھے
ہزار کوشش کے بعد آخر تمہاری جانب نظر اُٹھی ہے

ہوا نہ مایوسیوں سے کچھ بھی علاج آشفتہ خاطری کا
جسے کبھی بھولنے لگا تھا اُسی کی پھر یاد آ رہی ہے

مری نگاہوں سے کوئی دیکھے شبِ جدائی کی دلفریبی
کسی کی زُلفِ سیاہ گویا دراز ہوتی چلی گئی ہے

فنا کے طوفاں سے ڈرنے والے مقامِ ہستی سے بیخبر ہیں
وہ جس سے پہلو بچا رہے ہیں وہی حقیقت میں زندگی ہے

وہی مکافاتِ معصیت کا فسانہ دُہرا رہی ہے دُنیا
وہ داستاں پھر سے سُن رہا ہوں جو داستاں بارہا سُنی ہے

سکوں کا آئے گا دَور آخر رہیگی طوفاں کی رَو بدل کر
خزاں سے مایوس ہونے والو ابھی اُمیدِ بہار بھی ہے

خیال کی عظمتوں سے تاباںؔ بدل رہا ہے نظامِ ہستی
اُنھیں خُدائی کی آرزو کیا جنھیں تمنّائے بندگی ہے

۳۱

فراقؔ گورکھپوری ایم۔اے

ہوش رہتے ہوئے پیالۂ دل بھر نہ سکیں
تجھے بے بھولے ہوئے یاد تری کر نہ سکیں

جینے والو کوئی جینے میں ہے یہ بھی جینا
کچھ بھی کر دھر نہ سکیں مٹ نہ سکیں مر نہ سکیں

جو محبّت بھی کریں اور نہ ہو جائیں خراب
وہ گُنہ کرتے ہی کیوں ہیں کہ جسے کر نہ سکیں

یہ نگاہِ غلط انداز ہے یا جادو ہے
انھیں آنکھوں کی قسم جی نہ سکیں مر نہ سکیں

یوں تو دُنیا کو چھکا دے تو مگر اے ساقی
تشنگیاں ایسی بھی کُچھ ہیں جو کبھی بھر نہ سکیں

ہو کے مجبورِ محبّت سے ہیں شاکی لیکن
اِتنے آزاد نہ ہو جائیں کہ کُچھ کر نہ سکیں

جیتے مردوں سے جیا بھی نہیں جاتا ہے فراقؔ
اور مرنے کو جو کہیئے تو کبھی مر نہ سکیں

الشیا - دسمبر ۱۹۴۲ء

ساغر نظامی

نئی موجِ طوفاں

آ کہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کر دیں

جگمگاتے ہوئے محلوں میں اندھیرا کر دیں ۔۔۔ تیرہ و تار خرابوں میں اُجالا کر دیں
ہر تباہی و تصادم کو گوارا کر دیں ۔۔۔ زلزلہ عالمِ محسوس میں پیدا کر دیں

اسی دُنیا کو اُلٹ کر نئی دُنیا کر دیں

یہ تضادوں کا جہاں، نفرت و اُلفت کا دیار ۔۔۔ طنز کرتی ہوئی بے روح محبت کا دیار
غم سے معمور خرابہ، یہ مسرّت کا دیار ۔۔۔ یہ روایات کا جنگل، یہ وراثت کا دیار

ہم جو چاہیں تو یہ سب کچھ تہ و بالا کر دیں

شکوے کب تک ہوں مشیّت کی تہی دستی کے ۔۔۔ معجزے کیوں نہ دکھائیں خرد و مستی کے
کیوں نہ ہم خود ہی بسیا ہوں نئی بستی کے ۔۔۔ اپنے عکسوں سے نئے جال بُنیں ہستی کے

اور ہستی کو حریفِ غمِ دُنیا کر دیں

اے مری جانِ سرور، اے مری جانانِ سرور ۔۔۔ حاصلِ ساغر و مینا و خُمستانِ سرور
رحمتِ میکدہ اے سروِ خرامانِ سرور ۔۔۔ گو نہیں میکدۂ زیست میں امکانِ سرور

پھر بھی اِک عمر تو نذرِ مے و مینا کر دیں

وہ جو اک روح کی عشرت ہے متاعِ آخر ۔۔۔ وہ جو اک جذبۂ وحشت ہے متاعِ آخر
وہ جو اک غم کی امانت ہے متاعِ آخر ۔۔۔ وہ جو اِک سوزِ محبت ہے متاعِ آخر

مُسکرا کر اُسے خورشیدِ تمنّا کر دیں

تیرے سپنوں کی مہکتی ہوئی خلدِ رقصاں ۔۔۔ میرے خوابوں کے پُراسرار کھنڈر مرثیہ خواں
یا ترے سینۂ موّاج کا بحرِ پنہاں ۔۔۔ میرا نا پُختہ تخیّل، ترا اِحساسِ جواں

جتنے پوشیدہ طلسمات ہیں پیدا کر دیں

چھنچھناتی ہوئی باہیں ہوں دھڑکتے ہوئے دل ۔۔۔ لڑکھڑاتی ہوئی سانسیں ہوں بہکتے ہوئے دل
کپکپاتے ہوئے پیکر ہوں پھڑکتے ہوئے دِل ۔۔۔ عطر ملتے ہوئے سینے ہوں مہکتے ہوئے دِل

اور یہ مِل جُل کے دو عالم تہ و بالا کر دیں

ہم سفر، راہنما، راہگذر ہو جائیں ۔۔۔ سفرِ زیست کا خود زادِ سفر ہو جائیں
عشق کی شام، محبت کی سحر ہو جائیں ۔۔۔ منتہا اپنے تجسّس کا اگر ہو جائیں

زندگانی کو بہر حال گوارا کر دیں

خود بھی سرشار ہوں، دُنیا کو بھی سرشار کریں ۔۔۔ ہو سکے تو اسی ویرانے کو گلزار کریں
فاش اس قدرتِ فرسودہ کے اسرار کریں ۔۔۔ موت کو دامِ محبت میں گرفتار کریں

اور بقا کو ابدیت کا اشارا کر دیں

۳۵

پرتوِ وقت ہے یا غنچۂ بشگفتہ کی بُو — موت کی گود میں مچلی ہوئی رفتارِ نمو
یا کوئی بادۂ سرجوش سے لبریز سبو — یہ جہانِ گزراں ہے کہ رمیدہ آہو
اس کو بھی کیوں نہ شکارِ غمِ فردا کردیں

عہد لیں زلزلوں سے آندھیوں سے ساز کریں — بحر کے قلب میں اک بابِ اثر باز کریں
آکہ رقصاں ہوں، بپا محشرِ آواز کریں — عینِ طوفاں میں نئی زیست کا آغاز کریں
کشتی کو موج کریں، موج کو دریا کردیں

ہے توہم رگ و پے میں وہی پیوست ابھی — آدمی نشۂ حکمت سے نہیں مست ابھی
فکرِ انساں کو بھرنی ہیں کئی جست ابھی — زندگی عشرت و آلام سے ہے پست ابھی
زیست کو عشرت و آلام سے بالا کردیں

نقص اِس کہنگئ فکر و عمل کے کب تک — تھرتھراتے ہوئے ذہنوں میں مچلکے کب تک
ہم رہیں عزمِ گراں بار سے ہلکے کب تک — اُفقِ زیست پہ قسمت کے دھندلکے کب تک
کوئی سورج اسی عالم سے ہویدا کردیں

حسِ اُلفت سے گزر، جذبۂ نفرت سے گزر — خبطِ دولت سے گزر، دامِ جلالت سے گزر
عشق کے نام پہ جذبوں کی تجارت سے گزر — سنگِ مدفن سے گزر، تختِ حکومت سے گزر
زندگانی کو روایات سے بالا کردیں

بےکس و بےبس و مظلومِ سراپا کا علاج — غم سے کچلی ہوئی مسلی ہوئی بیوا کا علاج
نقص اور جبر کی مدقوق مریضا کا علاج — دین سے ہو نہ سکا علتِ دُنیا کا علاج
آکہ دُنیا ہی کو دُنیا کا مداوا کردیں
آکہ ہستی کے اندھیروں میں اُجالا کردیں

۴۶

اقبال صفی پوری

غزل

دماغ و روح میں اک تازگی محسوس کرتا ہوں — ترے غم کو بجائے زندگی محسوس کرتا ہوں
مذاقِ زندگی میں تشنگی محسوس کرتا ہوں — اُنھیں پاکر بھی جیسے اک کمی محسوس کرتا ہوں
خوشی کا نام لینے میں خوشی محسوس کرتا ہوں — فریبِ زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں
یہ کیا سلسلے انتہائے بےخودی محسوس کرتا ہوں — وہ ملتے ہیں تو میں اپنی کمی محسوس کرتا ہوں
جہاں سے وہ مری ہستی میں شامل ہوتے جاتے ہیں — وہیں سے زندگی کو زندگی محسوس کرتا ہوں
نہیں محدود میرا ذوقِ غم اُن کی جفاؤں تک — کہ میں اس کے سوا کچھ اور بھی محسوس کرتا ہوں
گزر جاتا ہوں تنہا ظلمتوں سے جادۂ غم کی — حدِ منزل پہ آکر روشنی محسوس کرتا ہوں
تصوّر ہی تصوّر میں گزر جاتی ہے رات اپنی — وہ آئے اب وہ آئے میں یہی محسوس کرتا ہوں
یہیں سے غالباً اے دوست آغازِ محبت ہے — جگر میں درد۔ آنکھوں میں نمی محسوس کرتا ہوں
نہ ہے سوزِ تعلق ہو گئے دونوں جہاں روشن — جو اُن کے دل میں ہوتا ہے وہی محسوس کرتا ہوں
طبیعت ہو گئی اقبال کتنی خوگرِ وحشت
میں ہشیاری میں بھی دیوانگی محسوس کرتا ہوں

ایشیا۔ دسمبر ۱۹۴۲ء

نئی کہانی

رام پرتاپ بہادر ایم۔اے

اندر اور باہر

"موکو رام سے کوئی ملا دے" یہ مصرع رامائن میں تو نہیں لیکن جس بھگتی سے اُسے گایا جا رہا تھا، وہ درد اور خصوصیت بھرت جی کے گلے میں بھی شاید نہیں رہی ہوگی جب وہ رام چندر جی کی تلاش میں جنگلوں جنگلوں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ میں اپنے مکان کی دوسری منزل پر پاخانے میں تھا، نیچے پیچھے کی گلی سے یکایک ایک سُریلا راگ سماعت کو گھیرنے لگا، پاخانہ کی گلی میں کون مُدھر اور دلکش انداز سے گا سکتا ہے' میں یہی سوچ رہا تھا، پاخانہ کی چھوٹی کوٹھری جسے میں اپنے "بورژوا" دوستوں کے سامنے "باتھ روم" کے نام سے یاد کرتا ہوں' اسی کوٹھری بند میں چونک چونک کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، کہ آخر یہ موسیقی کس طرف سے پاخانے میں آ رہی ہے، مہتر نے پاخانہ کا گملہ گھسیٹتے ہوئے زور سے پکارا ــــ "بمبا کھولو" اب شک کی گنجائش نہیں رہی، گانا میرا مہتر ہی گا رہا تھا، اور اُسی نیچے کے سوراخ سے آواز آ رہی تھی، گملہ کو رکھتے ہوئے اپنی جوانی کی لَے میں پھر اُس نے الاپا ــــ "موکو رام سے کوئی ملا دے"

یوں تو مہتر لوگ گاتے اچھا ہیں، لیکن اُس کڑی میں کتنی تھرتھراہٹ تھی! موسیقی کا کوئی اُستاد بھی کیا اپنی لے کو اس طرح کنپا سکتا تھا!! اُس گندی اندھیری گلی میں سُریلی تان میں توڑ پیدا کرنے والی کپکپی میں سردی کا بھی کافی حصہ رہا ہو یہ دوسری بات ہے لیکن "رام" کا لفظ کس صفائی کے ساتھ پاخانہ کے گملہ میں گونج کر دیوار کے سہارے سوراخ میں ہو کر اوپر آ رہا تھا، ساتھ ہی ساتھ ایک ہندو کی خودی کو چاہے وہ کتنی ہی دبی ہوئی کیوں نہ ہو چوٹ لگی، میں سوچنے لگا۔ جیسا کہ بزرگوں کا خیال ہے شاید یہی وجہ تھی جو اچھوتوں اور نیچوں کو شروع ہی سے مقدس کتابوں سے دُور رکھا گیا۔

بالٹی کے پٹکنے کی تیز آواز سے میرے کانوں کو چوٹ لگی، اور میرے خیالات کی لڑی وہیں سے ٹوٹ گئی، کان لگا کر سُنا تو معلوم ہوا کہ مہترانی جھاڑو لگا رہی ہے، اُس کا گانا بند ہو چکا تھا، لیکن یہ عورت کی کیسی آواز! شاید مہترانی ہے، اُسے اس محلہ میں کون نہیں جانتا، اُس کے بھولے حسین چہرے پر نہ جانے کتنی بار میری نگاہیں اٹک کر رہ گئی تھیں، کس انداز سے وہ کپڑے سے کمر کس کر چلی کرتی تھی، اور ہاتھ میں جھاڑو اور بالٹی لئے سڑک پر حُسن اور بدبو کی ایک لہر پھیلاتی گزر جاتی ہے، اکثر اس کو دیکھ کر میں نے لوگوں کو کہتے سُنا ہے، بڑے شہروں کی مہترانیاں بھی خوبصورت ہوتی ہیں اس کی جوانی کی آنکھیں ہمیشہ کوئی گمنام راگ الاپنے میں مسرور رہتی تھیں، پچھلے سال اس کمبخت مہتر پر مجھے کتنا غصّہ آیا جب اُس نے اپنی بی بی کو بے قصور ہی گھر سے نکال دیا، لیکن کسی چیز کو چھوڑنا اور پھر اُسے اپنا لینا بھی ایسے طبقہ کے لوگوں کو آتا ہے، مہترانی مہتر سے کچھ کہہ رہی تھی، میں کان لگا کر سُننے لگا "کیوں آج گایا ہی جائیگا یا کھانے پینے کی بھی کچھ فکر ہے؟ کیوں رے آج تو بقرا عید ہے نا آج بھی تجھے وہی دھن لگی ہے، مُسلمان ججمانوں کے ہاں سے بکروں کے سرے اور پائے ملیں گے جم کر کھایا جائے گا" مہتر اپنے لاپرواہ لہجہ میں اور کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اس کی بات کٹ گئی "اور کب تلو دوسروں کی بھیک کے آسرے پر، چُپ کیوں ہوگئے؟ مُنہ میں پانی بھر آیا کیا؟ ......" مہترانی نہ معلوم کیا کیا بکتی رہی لیکن پاخانہ کی گلی میں مہتر کے مُنہ میں پانی بھر آنے کی بات سُنکر مجھے متلی آنے لگی، مہتر نے گھڑک کر کہا ــــ "میں نے کہہ تو دیا کسی کے ہاں سے کچھ ملے چاہے نہ ملے لیکن وہ اٹھنی خرچ نہیں ہوگی۔.... چاول چاول رٹ لگائے ہے...... اگر بابو جی نے دیر کر کے مہینہ نہ دیا ہوتا تو...... پیسے رکھے رہن دے شام کو کام پڑے گا" مہترانی نے مہتر کو جھڑک دیا ــــ "ہاں وہ تو ہم جانت ہیں نا۔ مُنوا حرامی کے ساتھ پیسے جوڑ کر آدھا جو مٹکا یا جائیگا ...... اچھا آج دیکھت ہوں منو کیسے میرے گھر پھٹکتے ہیں۔ ......" بڑبڑاتی ہوئی مہترانی گلی کے باہر نکل گئی۔

قریب ایک مہینہ سے لگاتار بدلی ہو رہی تھی، جاڑے کی بدلی ہوتی بھی ہے تکلیف دہ! اس سے کسی کو بھی تو مسرت حاصل نہیں ہوتی، پرندے جانور غریب دُکھیوں کے لئے تو اصل میں جاڑے

کا موسم ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا، اس موسم میں جمہوری مادّہ تو ہے ہی نہیں، اور پھر اس کی بدلی اور بوندا باندی تو ہڈیوں تک کو ہلا دیتی ہے غریب غربا تو الگ متموّل طبقہ والوں سے بھی اس کی اداسی سہی نہیں جاتی، نوجوانوں کیلئے تو یہ دو زخی ایذا کا باعث ہو جاتا ہے۔

ایسے موسم میں میرا دن اس طرح شروع ہوا، اور کرتا ہی کیا، چُپ چاپ کمرے میں آ کر بیٹھ گیا، بار بار وہی مصرع "موکو رام سے کوئی ملا دے" کانوں میں گونجنے لگتا تھا، مہتر صرف گانے کو ہی گا رہا تھا یا اُسے اُس سے کسی قسم کی روحانی مسرّت بھی حاصل تھی، آخر وہ التجا کس "رام" سے ملنے کی تھی؟ پاخانہ صاف کرتے وقت بھی کس جذبہ کے ماتحت وہ رام کی رٹ لگائے ہوئے تھا؟ کون "رام" اس کے "رام" ہو سکتے ہیں؟ وہ تو پیدائش سے موت کی آخری ہچکی تک غلاظت ہی صاف کرنے کیلئے بنا ہے، اُس کے آباؤ اجداد یہی کرتے آئے ہیں، اور آگے بھی اُسے پُشت در پُشت یہی کرنا ہوگا، یہ بھی نہیں کہ مہتر اس بات سے واقف نہیں، بلکہ وہ جس لاپرواہی سے زندگی کے مسائل کو برتتا ہے وہ اس کی جانکاری کا ثبوت ہے، وہ نہ کسی کا احسان مانتا ہے اور نہ کبھی بھولے سے بھی یہ سوچتا ہے کہ اُس کی روزی کوئی اُس سے چھین بھی سکتا ہے۔ جو کماتا ہے کھا پی ڈالتا ہے، مستی سے گھومتا ہے، لنگوٹا کستا اور کشتی لڑتا ہے، شراب پیتا اور شہنائی بجاتا ہے، جس سے چاہتا ہے شادی یا زنا کرتا ہے، پاخانے اور موریاں صاف کر کے زندگی گزار دیتا ہے بے روزگاری کا اُسے خطرہ نہیں، مشینیں اُس کی روزی چھین نہیں سکتیں، بلکہ اُس کا کام بڑھتے ہوئے شہروں اور قصبوں کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا ہے، غریبی کی اُسے پرواہ نہیں کیونکہ شاید وہ یہ سوچتا ہے کہ غریبی بھی اس سے زیادہ غریب نہیں ہو سکتی، بلکہ یوں کہئے کہ اُس کے خیال میں غریبی اُس کے لئے اور وہ غریبی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

جیسے میں آہستہ آہستہ اس کی زندگی سے رشک کرنے لگا ہوں، مہتر کی زندگی بھی آخر کتنی اطمینان اور بے فکری کی ہے دُنیا کی غلاظت صاف کرے گا، دوسروں کے ٹکڑے کھائے گا اور مر جائے گا ایک دن، یہ سوچتے سوچتے کہ اس کی زندگی کتنی کارآمد اور آئیڈیل ہے، میں اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں معلوم نہیں کب کھو گیا، معلوم نہیں پھر ذہن میں کیا کیا آیا اور میں سوچتا سوچتا کہاں سے کہاں پہونچ گیا، پھر دیکھتا ہوں کہ خلا میں ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے میں بالٹی لئے کھڑا ہوں، ایک دم چونک پڑا، گھبرا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا، کوئی اور تو نہیں مہتر کے تصوّر سے چھوٹنے کے لئے پھر میں نے کیا کیا کوشش نہیں کی، اُس سے کراہت سی ہونے لگی، اپنے چاروں طرف مجھے گندگی کا احساس پیدا ہو گیا، تو کیا اِن مہتروں کا بھلا ہو ہی نہیں سکتا، یہ ترقی کا زمانہ ہے ہر چیز آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہے، کیا یہ کمبخت مہتر ہی آگے نہیں بڑھ سکتا، پھر خیال آیا، آخر ان مہتروں، بھنگیوں، اور ڈوموں کے اُدّھار کی بھی تو بات چلی تھی، کافی شور و غل ہوا، بڑی بڑی باتیں ہوئیں، دھن والوں نے ان کی خاطر دھن کی تھیلیاں کھول دیں، ملک کے نیتاؤں اور سماج کے خادموں نے بڑے بڑے رونے روئے، جنکو کھانے کی کمی نہیں وہ انھیں کے واسطے فاقے کرنے پر آ گئے، زمانے کی سب سے بڑی شخصیت ان کی خاطر مر مٹنے کو تیار ہو گئی، ان کا ایک پاکیزہ نام بھی رکھا گیا، اِن "ہریجنوں" کو تسکین دینے کے لئے کہ ان کا پیشہ اتنا خراب نہیں بڑے بڑے لوگ جھاڑو اور ٹوکریاں لیکر سڑکوں پر نکل پڑے، آخر ان کنگالوں کی اندھیری بستیوں میں بھی اُمید کی ایک ہلکی شعاع نظر آئی، سماج نے انھیں ڈھارس بندھائی، وہ لوگ بھی ان کے ساتھ آئے جو دُنیا کا بھلا ہڑتالوں سے کرنا چاہتے ہیں، مہتروں نے بھی ہڑتالیں کیں، اپنے روزی رسانوں کو لال پیلی آنکھیں دکھا کر اکثر ان لوگوں نے اپنی مزدوری بھی بڑھالی، اور سب سے بڑا فائدہ جو ان کا ہوا وہ یہ تھا کہ ان پر پہلے پہل یہ راز فاش ہوا کہ چاہنے پر ایک دن سماج کو آگے بڑھنے سے وہ روک سکتے ہیں۔

میرے کانوں میں پھر وہی مصرع گونجنے لگا ——

"موکو رام سے کوئی ملا دے"۔ پھر پاخانہ کی گلی یاد آئی، وہی جھاڑو بالٹی اور گملہ۔ میں نے سوچنا چاہا، آخر ہوگا کیا؟ ان کا کیا کوئی مستقبل نہیں؟ کون ہیں اِن کے "رام" جن کے لئے مہتر بیتاب تھا؟ لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا، بلکہ تاریکی بڑھتی گئی، منحوس بدلی اور گہری ہو گئی تھی، ناقابل برداشت دماغی ہیجان کی حالت میں سوچتا رہا، کیا کسی طرح سے ان کے ہاتھ سے جھاڑو اور بالٹی نہیں چھینی جا سکتی! آج عید ہے! عید مسلمانوں کا تیوہار ہے، یہی ایک ایسا تیوہار ہے جبکہ میں ان کا پورے طور سے ساتھ دیتا ہوں، لیکن اس بدلی اور مہتر نے اس طرح

میرا دن بگاڑا کہ کچھ کہتے نہیں بنتا

کافی رات گئے میں دعوت سے لوٹا، محلّہ میں کچھ غیر معمولی سنّاٹا چھایا ہوا تھا، جیسے لوگ آج وقت سے پہلے ہی اپنے چراغ گل کر کے سو گئے، دیر سے لوٹنے پر بی بی ناراض نہ ہوں، اس خیال سے ڈرتا ڈرتا مکان میں داخل ہوا، پھٹکار تو نہیں پڑی بلکہ اُس کے عوض میں سب کی پریشانیاں مجھے دیکھ کر کم ہونے لگیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مہتر کے ہاں نارے پر کہرام مچا ہوا ہے، دن ڈوبتے ہی مہترانی مسلمان جھجانوں کے ہاں چلی گئی، گھر پر مہتر اور منوا محفل گرم کئے بیٹھے تھے، دو سروں اور کچھ بھنی ہوئی ہڈیوں پر شراب کا ادّھا ختم ہو کر زمین پر لڑھک گیا تھا، اب دوسری... بوتل سے دَور چل رہا تھا، نشہ خوب جمنے لگا تھا، اندھیرے برآمدے میں وہ اپنی محفل روشن کیے بیٹھے تھے۔

مہتر نے کُلّڑ خالی کرتے ہوئے کہا "مار ڈالا" اور منہ بگاڑ کر جھومتا ہوا بکرے کا سر اُٹھا کر دانتوں سے نوچنے لگا، منوا نے ہڈی چوستے ہوئے پوچھا "کس رے متیا سار تو رمیہریا کہاں گئی؟" "کہوں جھجانی گے ہوئی" منوا جھومنے لگا جیسے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا ہو "ہر وقت سسوری جھمنٹے میں رہت تھی۔ ہمار میہریا ہوت تو ہم ماری ڈالی" متیا نے ایک تلی توڑتے ہوئے کہا "ارے سرؤ نیک ہائے جو ناہیں ہائے، ناہیں تو تو نہکا تو یہاں بیٹھے ناہیں دیت" منوا کی آنکھوں میں شرارت تھی "ہمکا یہاں بیٹھے دیت چاہے نا دیت لیکن سرؤ تو نہکا تو یہاں بیٹھا کے بھیجوا کے یہاں گلچھرّا اُڑاوت تھی" متیا جیسے نیند سے جاگا "کس لیے کون بھیجوا؟ تنی پھر سے اُوکر نوّا لے تو" دوسرے بکرے کا سر منوا کے ہاتھ میں تھا "سرؤ تو ہو نکا کوئی مرد کہی۔ ہم تو روج اوکا بھیجوے کے گھر واں دیکھت ہیں" متیا نے ایک کُلّھڑ کس کے پی لیا، اور آنکھوں کی پُتلیاں اندھیرے میں گھما کر ذرا رازدارانہ لہجہ میں بولا "کس لیے بیج کہت ہے؟" اپنی بی بی کو بھدّی گالی دیکر "اچھا تنی چلا چل تو اتنی دکھت بھیجوا کا گھروا تو دکھا دے پھر اوکا ہم سمجھ لیب" یہ کہتے ہوئے وہ جھپٹ کر اندر گیا اور دو لاٹھیاں نکال لایا، ایک لاٹھی منوا کو ۴۳

پکڑا کر اپنی لنگی کا پھینٹ کستے ہوئے برآمدے سے نیچے لپکا اور پھر اندھیرے میں دونوں غائب ہو گئے۔

ادھیڑ عمر کے عزیز میاں آبکاری محکمہ کے معمولی ملازم تھے، بی بی اُن کی ایک زمانہ ہوا مر چکی تھیں، آج تیوہار کے دن دُھلا لنگا پاجامہ پہنکر ایک بوتل شراب کیساتھ وہ بھی اپنے طریقہ پر کی یاد تازہ کر رہے تھے، پیچھے گلی میں شور و غل سُنکر مہترانی کو تو انھوں نے باہر نکال دیا، خود نشہ کی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے دروازہ پر پہنچے، مہتر کو دیکھ کر اُن کا نشہ اور تیز ہو گیا، ہاتھ اُٹھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوری طاقت لگا کر وہ چلّا کر بولے "کیوں بے سالے تو یہاں کہاں؟ بھاگ جا ابھی یہاں سے" لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے متیا کے اوسان خطا کر گئے اُس کا نشہ جیسے اُترنے لگا۔ اتنے میں منوا گلی میں سے مہترانی کا ہاتھ پکڑے دوسرے ہاتھ میں لاٹھی لئے سامنے آ نکلا، عزیز میاں کی گالی سُنکر متیا تلملا کر رہ گیا تھا، مہترانی کو دیکھتے ہی پاگل ہو گیا، بڑھ کر جو اس نے لاٹھی ماری تو عزیز میاں زمین پر آ رہے، منوا نے بڑھ کر اسکی لاٹھی چھین لی، مہترانی رفو چکّر ہو چکی تھی۔

خبر کو پھیلتے دیر نہیں لگی، سارے محلّہ میں سنسنی پھیل گئی، ایک مسلمان کا ہندو کے ہاں مارا جانا یوں ہی کیا کم تھا! اور پھر بقرعید کے دن!! ذرا سی دیر میں آگ لگ گئی، ہندوؤں نے دروازے بند کر لئے، مسلمان پنشن یافتہ پیشکار صاحب کے دروازہ پر صلاح و مشورے کیواسطے اکٹھا ہو گئے، پولیس موقع پر پہنچ گئی، پولیس کا اب ایسا دبدبہ ہے کہ جو پہلے پولیس کو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے وہ بھی اب اس کے نام سے ڈرتے ہیں، بات بڑھنے نہیں پائی، بڑے بوڑھوں نے رائے دی کہ معاملہ عدالت پر ہی چھوڑ دیا جائے۔

صبح کو پولیس نے مہتر کے گھر کی تلاشی لی، بغیر لیبل کے شراب کی خالی بوتلیں ملیں، عزیز میاں کے گھر کی بھی تلاشی لینی پڑی، ایک وارنٹ کے ماتحت عزیز میاں گرفتار ہو گئے، متیا اور عزیز میاں کی غیر موجودگی میں محلّہ کی سنسنی ختم ہو گئی۔

آج جب میری نظر اپنے برآمدے میں نیم بورڈ پر پڑی، تو "اِن" اور "آؤٹ" پر آنکھیں ٹھہر گئیں، مہتر کا خیال آیا، میں نے اُس کا "آؤٹ" یعنی گلی میں صفائی کرنا اور "اِن" یعنی برآمدے میں بیٹھ کر شراب پینا دونوں دیکھا تھا۔ سوچنے لگا کیا ابتک کوئی ایسا نہ ہوا جو اُس کا "اِن" اور "آؤٹ" دونوں بیک وقت مٹا دے۔

م - ش - حقّی

آتش و آہن

(مختصر، مختصر سا افسانہ)

"یہ حُسن خداداد کے غاصب - یہ دولت کے سانپ - یہ مقدّر کے چہیتے!" وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ میں حسین عورتوں کے شوہروں کو دیکھ کر دانت پیسا کرتا تھا۔

"ثریا، اجمل - اجمل ثریا ـــــ اور میں؟ میں بھی تو اُسی لڑکی کو چاہتا ہوں؟" ان دونوں کی باہمی محبّت، پروانہ وار محبت کو دیکھ کر میں دل ہی دل میں خاکستر ہوتا - اجمل تو نہیں مگر ثریا میرے دل کی تپش سے واقف تھی - میں نے کئی دفعہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ لیا تھا، میں اکثر اُس سے شرارت کرتا تھا - جیسے کوئی لوہے کی لاٹھ کو پکڑ کر شغلاً ہلا کر دیکھے، اس یقین واثق کے ساتھ کہ یہ ہرگز جنبش نہ کرے گی۔ آہ کیسے معلوم کہ میں اسی آہنی صورت کا پُجاری تھا - مجھے اسکی صلابت کو بار بار محسوس کرکے دیکھنے میں لطف آتا تھا - میں اپنے دل کے اندرونی داغ پر یہ نشتر اکثر چبھویا کرتا تھا۔

ثریا رات گئے تک میرے پاس بیٹھی رہی - اجمل کی جُدائی میں وہ اکثر مجھ سے باتیں کرکے اپنا دل بہلاتی تھی اور میرے اوٹ پٹانگ فلسفے کو سُن سُن کر ہنسا کرتی تھی - اُس کی نظر میں شاید میں ایک معصوم آدمی تھا اور یقیناً کچھ وارفتہ بھی۔

"بیکار ہے یہ سب بیکار ہے" میں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "اس بگڑی ہوئی دُنیا میں ایک ہمیں کو درست رہنا لازم ہے؟ اس کج رفتار عالم میں کیا ہمارے ہی لئے راست روی رہ گئی ہے؟ اور بگڑنے دو اسے اور تباہ ہونے دو - یہ سماج ہرگز اس قابل نہیں کہ اسکے اصولوں کا احترام کیا جائے!" میں جانے کیا کیا بکتا رہا - وہ بیٹھی ہوئی مسکراتی رہی۔

"اُف یہ دروازہ تو کھلتا ہی نہیں" اُس نے امداد کے لئے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔

"تو اسے بند ہی رہنے دو ـــ کیا ضرورت ہے"

"لو اور سُنو! میں بھی کوئی ارواح ہوں کہ شیشے میں سے پار ہو جاؤں گی!"

میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کا لٹّو گھمایا - آج پہلی بار وہ مجھے شب بخیر کہنا بھول گئی۔

"اجمل کا خط ہفتہ بھر سے نہیں آیا - میرا دل سخت پریشان ہے" ثریا افسردہ سی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔

۱۳۱ "کلکتہ میں ہیں خدا جانے کس رنگ میں ہونگے" میں نے جواباً چُٹکی سی لی - اور پھر اپنا فلسفہ چھیڑ کر اُس کا دھیان بٹا دیا "انسان - فطرت - سماج - ظلم - بغاوت!"

وہ معمول سے زیادہ سنجیدہ بنی بیٹھی رہی - مگر آج میری بغاوت کی رگ بُری طرح پھڑک رہی تھی۔

وہ چلی - میں نے روکا - اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "دروازہ کھول دو"

"کیا دروازہ ضرور کھُلنا چاہیے" "یقیناً" اُس نے زور دیکر کہا۔ میری معصوم روح ایک عظیم الشّان بغاوت کے لئے بیتاب تھی مجھے سودا تھا لوہے کی دیوار سے سر ٹکرانے کا - آج میں اپنے حریف سے ٹکرا کر فنا ہو جانے کیلئے تیار تھا۔

"ثریا تم باعصمت ہو، باوفا ہو - شاید اجمل سے بھی زیادہ - آہ ثریا میں بے حد کم نصیب ہوں - میری محرومی پر ترس کھاؤ - اپنی اپنی عشرت آگیں زندگی میں سے چند لمحے مجھے چھین لینے دو گی تو تمہارے برّاق دامن پر کونسی کجلاہٹ آجائے گی ـــــ ثریّا!"

آنے والی مدافعت کا اندازہ کرکے میری تمام قوتیں مجتمع ہو گئی تھیں میں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

دیکھو دیکھو۔ میں بہت دن سے دیکھتی ہوں۔ ایسی باتیں زیبا نہیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے ـــــ میرے اللہ! مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ بھی دو"

میرے بازوؤں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ میرے ہونٹ اُس کے دہکتے ہوئے رخسار سے جا ملے۔ میرا کیفِ بغاوت اپنے شباب پر تھا۔

بالآخر وہ بولی۔ "اچھا ایک بات کی قسم کھاؤ" ۔

میرا دورانِ خون کئی درجے دھیما ہو گیا۔

"مرتے دم تک راز رکھو گے!"

میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میرا سر اُس کے رخسار کے برابر جُھک گیا۔ میری تمام مجتمع قوّت اپنے زور میں آپ پسپا ہو گئی۔ میں نے اُسے حسرت و مایوسی کے عالم میں چھوڑ دیا۔

وہ چلی گئی۔

سوچتا ہوں کیا واقعی میری نفسیاتی گہرائیوں سے واقف ہو گی ؟!

محمد صدیق ایم۔اے

ایک خط

...... خوش رہو۔

گو تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی اوّلین فرصت میں تم مجھے خط لکھو گی لیکن آج چھ دن ہو گئے اور میں ابتک چشم براہ ہوں۔ کیا بھول گئیں ؟

ابکی بار دہلی کا قیام میرے لئے ایک نیا باب ہے جس کی ابتدا تمہارے نام سے ہوتی ہے۔

...... یہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ میری فطرت کے وہ نازک اور کمزور پہلو تم لوگوں کے سامنے نہ آنے پائیں جنکی معمولی سی خراش بھی میرے دماغی سکون کو برباد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میں نے حُسن کی مسلسل تنقیص کو اپنا شعار بنایا اور ان محفلوں سے ہمیشہ احتراز کیا جہاں بات بنائے نہ بنے!

تم سے قبل ایک اور ناوک فگن نے مجھے اپنا شکار بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کی لیکن زمانہ کی ستم ظریفی کو کیا کہئے کہ ہر تدبیر اُلٹی ثابت ہوئی۔ اسے میں نے اپنی فطرت کے اتنے گھناؤنے پہلو دکھائے تھے کہ اگر معمولی دل و دماغ کا آدمی ہوتا تو نفرت کئے بغیر نہ رہتا۔ لیکن تم شاید سمجھ سکو کہ بعض اوقات زندہ رہنے کی یہ کوششیں خود کتنی مہلک نکلتی ہیں ـــــ طبیعت کی پراگندگی پر کہا گیا کہ "یہ ناتجربہ کاری ہے" ذاتی بداخلاقیوں کی طرف اشارہ کیا تو فرمایا کہ "خیر یہ تو سب ہی کرتے ہیں" کیرکٹر کی خرابیاں پیش کیں تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "اچھا اب زیادہ انکساری نہ کیجئے" اور پھر اسپر بھی جب اصرارِ اجتناب حد سے آگے بڑھا تو یہ کہکر کہ "اونہہ۔ ہوگا۔ آپ کو کیا! آپ بُرے ہیں تو غیروں کیلئے ہیں تو آپ کو اپنے لئے اچھا بنا لوں گی" مجھے ایک ایسی دماغی اُلجھن میں مبتلا کر دیا گیا کہ جس سے آج تین برس کے بعد بھی چھٹکارا نصیب نہیں۔

...... تمہیں بتاؤ کہ کیا یہ فطرت کا انتقام نہیں ؟ کیا میری ہی سپر سے تلوار کا کام نہیں لیا گیا ؟

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

میں نے دہلی کا قیام ترک کیا اور الہ آباد بھاگ آیا کہ شاید جگہ کی تبدیلی زندگی کو پھر پُرانے ڈھرّے پر لگا دے اور میں اسی اطمینان سے واقعات کی لہروں میں بہنے لگوں جس پر کبھی اپنے دوستوں کے سامنے میں فخر کیا کرتا تھا ـــــ مگر توبہ کیجئے۔ بھلا کھوئی ہوئی چیز اور کھوئی ہوئی بھی نہیں بلکہ چھینی ہوئی چیز کہیں واپس ملتی ہے؟

کتابیں اُلٹیں، مضمون لکھے، آگرہ، دہلی، کلکتہ، مدراس اور نہ معلوم کہاں کہاں کے سفر کئے، دوستوں سے مباحثے کئے، سیاست میں حصّہ لیا، جلسوں میں تقریریں کیں اور جو کچھ ہو سکتا تھا سب کیا مگر ہر جگہ اور ہر حالت میں یہ محسوس ہوا کہ جیسے

ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

چونکہ عمر کا بیشتر حصّہ بورڈنگ میں گزرا ہے، مختلف قسم کے احباب سے صحبت رہی ہے اور طبیعت کے فطری رُجحان کی بدولت بڑا وقت

اپنے اور دوسروں کے نفسیاتی مطالعہ میں گزار ہے۔ اس لئے اس کیفیت کو سمجھنے میں زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑی۔ اور ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ میں اپنے آپ کو ایک مسلسل دھوکا دے رہا ہوں ایک گہرا فریب ـــ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ہر مرتبہ یہ فریب کھل گیا اور میں چوروں کی طرح اپنی بے مائیگی پر افسوس کرتا ہوا پکڑا گیا۔

میں بیٹھا پڑھ رہا ہوں۔ کتاب بہت عمدہ ہے۔ مضمون کی سنجیدگی۔ اندازِ بیان کی لطافت توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ بارہ پندرہ صفحے ختم کر چکا ہوں کہ چند منٹ کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے بڑی دیر سے کسی نے دماغ کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ جو کچھ پڑھ رہا تھا وہ نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ نہ ہاتھ میں کتاب یاد رہی اور نہ کتاب پر سطریں دکھائی دیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہلکا ہلکا کہرہ بڑی دیر سے چھا رہا تھا لیکن ہم محسوس نہیں کر رہے تھے۔ جھنجھلا کر چند صفحے اُلٹے اور پھر سے پڑھنا شروع کیا۔

ایک سطر ـــ دو سطر ـــ تین سطر ـــ آج شریف صاحب کا اخبار نہیں آیا ـــ ڈاکیہ دکھائی تو دیا تھا ـــ کوئی خط بھی نہیں آیا۔ معلوم نہیں امی کیسی ہیں۔ ان کا خط تو کئی دن سے نہیں آیا ـــ یہ لوگ خط کیوں نہیں لکھتے ـــ چار ہفتے ہوئے ایک خط آیا تھا۔ اس میں الائچی کے دانے اور یہ جملہ کہ "آپ کو الائچی بہت پسند ہے نا؟ کھائیے"ـــ دو دانے کھائے اور باقی اسی لفافے میں رکھے ہیں ـــ لفافہ بکس کے اندرونی خانہ میں ہے ـــ دیکھوں؟ ـــ ٹھہرو ـــ اچھا پہلے کمرے کے دروازے بند کر لوں ـــ اوہو! اس میں اتنے خط جمع ہو گئے ـــ اور چوڑی کے ٹکڑے ـــ الائچی کے چند دانے ـــ دو نچے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے جن پر کچھ لکھا ہوا ـــ ایک خط بے القاب کا ـــ

"مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ اپنی مرضی سے ایسا کر رہے ہیں۔ اس میں میری بڑی بدنامی ہے۔ اگر چھوٹی نانی یا ممانی جان کوشش کرتیں تو کوئی بات نہ تھی لیکن اب آپ خدا کیلئے اپنے دل کو سنبھالئے۔ میں تو دیکھئے آپ سے زیادہ مجبور ہوں مگر پھر بھی اپنے دل کو کیسا تھامے ہوئے ہوں میں جانتی ہوں کہ اس خط سے آپ کو بڑی تکلیف ہو گی لیکن آپ کی محبت سے امید ہے کہ آپ مجھے درگزر کرینگے۔ آپ کو دُنیا میں بڑے بڑے کام کرنا ہیں۔ مجھ سے لاکھ درجہ بہتر آپ کو مل جائیں گی میں تو خیر! جیسے تیسے گزار لوں گی۔ آپ اپنی حالت کو درست کیجئے اور پڑھنے میں دل لگائیے۔ دوا خدا کیلئے پیتے رہئے گا۔ آپ گھر خط لکھ دیجئے جیسے آپ ٹال رہے ہیں اور ابھی نہیں کرنا چاہتے۔ میں نہ معلوم کتنی کوشش کے بعد آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ کیا کروں۔ زمانہ کے ہاتھوں سے مجبور ہوں۔"

چار دفعہ یہ خط پڑھنے کے بعد یہ شعر خود بخود زباں پر رواں ہو گیا۔

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

لاحول ولا قوۃ۔ میں تو بھول چکا تھا پھر یہ ہنگامہ کیوں؟ ارے توبہ میں رو رہا ہوں؟ یہ کیا مذاق ہے۔ اونہہ! یہ خطوط جلا کیوں نہ ڈالوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری! مگر جلانے سے کیا فائدہ۔ پڑا رہنے دوں کبھی یادگار ہی کے طور پر کام دینگے۔ ہٹاؤ بکس میں بند کئے دیتا ہوں اور اب نہیں کھولوں گا ـــ اور نہ دماغ میں ان کا خیال آنے دونگا۔ ـــ چلو گھوما جائے ـــ

"ضیا صاحب۔ ارے ضیا صاحب۔ آپ کو دُنیا میں سوائے پڑھنے کے اور بھی کوئی کام آتا ہے" میں نے ان کے کمرے کے دروازے زور سے جو کھولے تو شاید انہیں ناگوار ہوا۔ بہت خفا! فرمانے لگے "..... صاحب آپ کو تو امتحان دینا ہے نہیں پھر دوسروں کو کیوں پریشان کرتے ہیں"

"جی ہاں۔ مجھے بھی امتحان دینا ہے ـــ مگر ذرا دیکھئے چاندنی کیسی چھٹکی ہوئی ہے۔ آئیے گھوم آئیں ـــ چائے نہیں پیجئے گا؟ چلئے مُلّاجی کے ہاں آپ کو چائے پلا لائیں ـــ دروازہ میں تالا ڈال دیجئے ـــ

شام کا رنگیں سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
ہو نہیں سکتا تیری اس بد مذاقی کا جواب

ضیا صاحب بولے "حضرت یہ شام ہے کہ آدھی رات؟"
ہاں! ہاں! بھئی آدھی رات ہی سہی۔ مگر اب چلئے ـــ

چاندنی رات میں جب پھول کھلا کرتے ہیں
اور بڑھ جاتا ہے سودا تیرے سودائی کا

ضیا صاحب آج جگر کا ایک شعر بہت یاد آ رہا ہے۔ اگرچہ گاتے گاتے فرسودہ ہو چکا ہے مگر پھر بھی دوسرے مصرع کی فتنہ سامانی تو جاتی ہی نہیں۔

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی نہ - نا - نا - نا - نہ - نا
تا نہ نا - نا نہ نا ...... پاتا ہوں میں

جیسے ہر شے میں — ضیا صاحب کورس ختم کر لیا آپ نے؟

کیوں؟ آپ تو نہ معلوم کب سے کتابیں دبائے بیٹھے ہیں اور اب بھی کورس نہیں ختم ہوا؟ — میں نے بھی آج طے کر لیا ہے کہ امتحان کی تیاری باقاعدہ شروع کر دوں — نہیں مذاق نہیں واقعی اب پڑھنے کا ارادہ ہے۔ بھئی قصہ یہ ہے کہ امتحان کے معاملے میں میں ذرا فراخ دل واقع ہوا ہوں۔ جو کچھ دماغ میں سماتا ہے وہ یاد کر لیتا ہوں۔ اور جو رہ جاتا ہے وہ کاغذ کے ٹکڑوں پر اور دوات کے لیبل پر لکھ لیتا ہوں۔ یہ سب امتحان گاہ میں کام دیتا ہے۔ اور صاحب میرے نزدیک تو یہ سب جائز ہے — میرے ایک استاد کا قول ہے کہ "چوری ضرور کرو لیکن پکڑے نہ جاؤ۔" اور جناب ہے بھی یہی۔ امتحان نام ہے ممتحن کو بے وقوف بنانے کا — جو زیادہ سلیقے سے بیوقوف بنائیگا وہ زیادہ نمبر پائے گا — اب آپ دیکھئے کہ میں اپنے درجہ میں ہمیشہ اوّل آتا ہوں — کیوں؟ — بات یہ ہے کہ مجھے امتحان دینے کا راز معلوم ہے — مگر ضیا صاحب اس سال اگر میں پاس نہ ہوں تو کیسا رہے؟ ہر سال تو پاس ہو جاتا ہوں۔ اب کی مرتبہ فیل ہو کر بھی تو دیکھوں کہ کیا معلوم ہوتا ہے — اجی نہیں گھر پر کسی کو فکر بھی نہیں ہے کہ میں پاس ہوتا ہوں یا فیل — میری کامیابی ہی پر کس کو خوشی ہوتی ہے جو ناکامی پر کوئی افسوس کریگا — دُنیا تو ناکامیوں کا نام ہی ہے اور پھر میں تو یوں بھی حد درجہ بدقسمت واقع ہوا ہوں۔ اگر سونے میں ہاتھ لگا دوں تو مٹی ہو جائے — میں نے اسی لئے کبھی کسی سے محبّت نہیں کی۔ نہیں معلوم کیا افتاد اس غریب پر آن پڑے — زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا۔ ہا ہا ہا — ارے بھئی یہ ہنسی کی بات تو ہئی ہے — ضیا صاحب کبھی زاہد صاحب سے ملے ہیں آپ؟ آدمی بہت دلچسپ ہے۔ آج مجھ سے تجزیہ نفسیاتی پر گفتگو ہو رہی تھی کچھ محبّت کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ بہت مقدس انداز میں بولے کہ "عورت یا تو کسی سے محبّت کرتی نہیں اور اگر کرتی ہے تو صرف ایک مرتبہ! اور اس پر طرہ یہ کہ "مرد اسکی محبّت سے ہمیشہ ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے پہلے تو اُسے محبّت پر مجبور کرتا ہے اور پھر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتا ہے۔" میں نے کہا "میاں کیا حماقت کی بات کرتے ہو؟ عورت ہمیشہ مرد کو انگلیوں پر نچاتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ مرد اپنی طرف سے محبّت کا اظہار کرے۔ ابتدائے اعلان کا مرتکب وہ کبھی نہیں ہوتا۔ یہ تو کچھ عورت ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ قتل بھی کرتی ہے اور مسکراتی بھی جاتی ہے۔ ہمیشہ محبّت کا اظہار پہلے خود کرے گی۔ کبھی زبان سے اور کبھی آنکھوں سے — وہ روئیگی — تم پوچھو "کیوں روتی ہو؟" کہدیگی "کچھ نہیں"، بہت اصرار کرو تو نہایت سادگی سے نظریں جھکا کر بولے گی "میں کیا بتاؤں کیوں رو رہی ہوں — آپ میری جگہ ہوتے تو سمجھتے۔ بہرحال اچھا ہے نہ سمجھئے!"

اب جناب اگر آپ سمجھتے ہیں تو فی النّار اور نہیں سمجھتے تو فی السقر۔

اور ضیا صاحب یہی نہیں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ سے کچھ نہیں کہے گی — اپنی کتاب پر آپ کا نام لکھے گی اور پھر اسے یوں کاٹ دیگی کہ سوائے آپ کی نظروں کے اور کوئی نہ پڑھ سکے — آپ کو کبھی ضرورتاً خط لکھے گی — آخر میں اپنے نام سے پہلے لکھے گی "آپ کی ....." اور پھر صرف نام چھوڑ دیگی باقی الفاظ کاٹ دیگی — اب آپ ہی بتائیے کہ اس سے زیادہ صبر آزما طریقہ اظہارِ محبّت کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے جناب کہ عورت کی فطرت کا سمجھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں — اور اگر خدانخواستہ سمجھ میں آ جائے تو پھر سمجھ کا خدا حافظ!

دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن!!

خیر چھوڑئے اس قصّے کو — ہوگا — آج کون تاریخ ہے۔ چاند ڈوب رہا ہے۔ ستارے بھی کچھ دُھندلے دُھندلے سے ہو رہے ہیں جیسے کسی دوشیزہ کی قبر پر باسی پھول۔ کیوں صاحب کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ روشنی کتنی ہی مدّھم کیوں نہ ہو کسی نہ کسی مخرج کی مرہونِ منّت ہوتی ہے — مگر تاریکی کے اثرات کتنے ہولناک ہوتے ہیں! — میں اپنی زندگی کی تاریکیوں سے گھبرا گیا ہوں — میرا بچپن کتنا امید افزا تھا — جیسے انگور کی بڑھتی ہوئی بیل۔ میرے دماغ میں ترقی کی کتنی قوّتیں موجود تھیں — میرا ذہن! میرا حافظہ!! لیکن اب؟ — اب کیا! کچھ بھی نہیں — کلیاں سب ایک طرح کی ہوتی ہیں — خوش رنگ، خوبصورت،

(باقی مضمون دیکھو صفحہ ۴۸ پر)

کسوٹی

ساغر نظامی

کسوٹی

نئی کتابیں

جالب کے سو شعر

یہ مختصر سا مجموعہ محمد عادل مرزا صاحب جالب چغتائی مراد آبادی کے سو اشعار کا مجموعہ ہے جسے خود مصنف نے شائع کیا ہے۔ سو شعر جس حُسن کے ساتھ شائع ہونے چاہئیں، یہ مجموعہ اس جمالیاتی معیار کو پیش نہیں کرتا۔ لیکن اس کا حقیقی جمال خود وہ اشعار ہیں جو جالب کی گداز اور حسین روح کو پیش کرتے ہیں۔

اس چھوٹی سی کتاب میں ایک "بسیط" دیباچہ منظور حسین خاں مضطر ایم۔اے لکچرار فیض عام کالج میرٹھ نے تحریر فرمایا ہے، جسے اصولِ انتقاد سے کوئی تعلّق نہیں۔ نہ یہ دیباچہ اصل موضوع پر روشنی ڈالتا ہے "سو شعر کی غائتِ اشاعت پر" اس میں خیالات اور اظہار و بیان کا سخت بکھراؤ پایا جاتا ہے، وہی رومانوی عہد کا نظریاتی اُلجھاؤ۔ "وہی حُسنِ مطلق" "حُسنِ رازِ سربستہ" "حسنِ درد" اور "حُسنِ تپشِ دل"، تخیلاتِ رنگین وغیرہ کی تراکیب، نثر میں ایک نہیں، دو نہیں، تین تین اضافتیں، "حسنِ تپشِ دل" قسم کی۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ منظور صاحب اُس تبدیلی سے ناواقف محض ہیں، جو اُردو نثر نگاری کے اسالیب میں پچھلے چند برسوں میں عوامی ادب کے تقاضوں کی بنا پر ہوئی جس نے نیاز جیسے بر خود غلط انشا پرداز کو اپنے اسلوب کا احتساب کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں یہ خوب معلوم ہو گیا کہ چند عربی اور فارسی کے نامانوس اور غریب الفاظ لکھنا "ادب" نہیں ہے۔

نثر نگاری کے اسالیب ہی نہیں یہ دیباچہ چغلی کھاتا ہے کہ وہ اُردو غزل اور اسکے ارتقاء سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یا واقف ہیں تو اُسے ترتیب و تسلسل کے ساتھ بیان کر دینے پر قادر نہیں۔

یہی نہیں، شاعر کا جو تصوّر وہ پیش کرتے ہیں وہ بھی اوّل درجہ کا "دقیانوسی" ہے۔ جن موجودہ غزل گو شعراء پر بے نیازی کا دھوکہ ہو سکتا ہے اُن میں جگر، مرزا یگانہ، وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے، مگر سب جانتے ہیں کہ یہ بیچارے سوسائٹی سے بے نیاز ہونے پر مجبور ہیں۔

منظور صاحب فرماتے ہیں:۔

"جگر یا جالب — لیکن اپنے نغمات — جو آورد کا نتیجہ نہیں ہوتے تنہائی میں کسی کو سناتا ہوتا ہے، وہ بے نیاز ہوتا ہے اس امر سے کہ کوئی سُنے اور داد دے، وہ خود ہی قاری ہوتا ہے، اور خود ہی مستمع، خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق۔ میں غزل گو شاعر کو اسی معیار پر دیکھنا پسند کرتا ہوں، ہر چند قوم اور جماعت کے مفاد کا خون اس نظریّہ سے ہوتا ہے (آپ کی بلا سے ہوا کرے) لیکن کیا کیا جائے ایسا شاعر افراد کی سطح سے کہیں بالا ہوتا ہے اور تنقید کی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا لہذا اس کا دور رہنا ہی بہتر ہے"

جہاں تک ایسے شاعر کے خود ہی قاری اور خود ہی مستمع ہونے کا تعلق ہے قرینِ قیاس ہے، کیونکہ اگر یہ شاعر انسان ہے تو زبان و گوش ضرور رکھتا ہوگا، اپنی زبان سے اشعار "قرأت" کریگا اور اپنے کانوں سے "سمع" فرمائے گا، لیکن ایسے شاعر کی یہ تعریف کرنا کہ وہ "خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق" ہوتا ہے، محلِ نظر ہے۔ عاشق "اسم فاعل" ہے اور معشوق "اسم مفعول"۔ عاشق مرد کو قیاس کرینگے اور معشوق عورت کو، منظور صاحب کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ بہ یک وقت اسم فاعل، اسم مفعول اور چشم زدن میں مرد، عورت کیونکر ہو سکتا ہے!؟ یہ ممکن ہے کہ تغزّل کی انفعالیّت اُسے "درمیانی درجہ کی کوئی صنف" بنادے، ورنہ صاحب فاعل، فاعل ہے اور مفعول، مفعول۔ عاشق، عاشق ہے معشوق، معشوق!؟!

دیباچہ، پیش لفظ، اور تعارف، کا مقصد ناظرین کی نگاہوں میں شاعر یا ادیب کی ادبی اقدار قائم کرنا ہوتا ہے اور ادبی اقدار اُسی وقت قائم ہو سکتی ہیں، جب جنس کو نقد و نظر کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے ظاہر ہے کہ جالب صاحب کے سو اشعار کا دیباچہ اس لئے منظور صاحب

نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ شاعری میں جاؔلب صاحب کی شاعرانہ حیثیت کا تعارف کرائیں اور نقد و نظر کے بعد ان کی وہ قدر منوائیں جو قائم ہونی چاہئے۔ مگر تنقید کی مخالفت کر کے وہ خود اپنے دعویٰ کی تردید کر دیتے ہیں۔ دُنیا میں میرؔ جیسا مجنون، غاؔلب جیسا مدہوش، داؔغ جیسا رند اور اقبالؔ جیسا حکیم انتقاد کی ترازو سے نہ بچ سکا۔ سب کو سرِ بازار اور بازار کے ہر موڑ پر بالاعلان تولا گیا۔ منظورؔ صاحب کس دُنیا کی باتیں کر رہے ہیں! وہ شاعری کی اس تعریف سے پہلے ایک جگہ بالکل متضاد بات کہتے ہیں:

"لیکن اس دورِ ترقی میں جب شاعر کا دامن وسیع ہو چکا ہے
جس کو دیکھئے عاشقانہ اشعار جھوم جھوم کر پڑھ رہا ہے
. . . . بدیں وجہ دورِ حاضر کے تغزّل میں
اصلیت جدّت اور اثر نہیں رہا۔"

منظورؔ صاحب کے نزدیک جن غزل گو شعراء نے (ریڈیو اور ریکارڈ یعنی پروپگنڈے کے روحانیت سوز اثر رکھنے والے مقامات سے) شہرت حاصل کی ہے وہ ۹۰ فی صدی شہرت کے مستحق نہ تھے۔ حالانکہ منظورؔ صاحب یہ نہیں جانتے کہ ریڈیو اور ریکارڈنگ . . . . سے پہلے یہ غزل گو شعراء اپنی شہرت کا سکّہ اپنے جوہرِ شاعری کے ذریعہ جما چکے تھے۔ ریڈیو تک اگر کسی جوہر نے پہنچایا تو وہ ان کا حقیقی جوہر تھا جس کی سفارش ان کی شہرتوں نے کی۔

منظورؔ صاحب کا اصل مرض یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت دلؔ شاہ جہاں پوری کے شاگرد ہیں، اور اُن سے بیحد عقیدت رکھتے ہیں۔ (یہ عقیدت شاید جنون کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہے) دلؔ صاحب کو غیر مشہور اور غیر مقبول دیکھ کر انہیں روحانی صدمہ ہوتا ہے۔ اور یہ صدمہ ان کے عمل میں طرح طرح سے پھوٹتا ہے۔

آگے چل کر اک اُلجھی ہوئی بے معنی تمہید اُٹھا کر لکھتے ہیں:—

"ہندوستان میں اس قسم (اوپر ایک قسم قائم کی گئی ہے) کے ماتحت یوں تو حسرتؔ موہانی، جگرؔ مراد آبادی، سیمابؔ اکبر آبادی، یگانہؔ چنگیزی، اصغرؔ و فانیؔ وغیرہ باکمال حضرات کا کلام بلاغت نظام نہایت خلوص سے "رکھا" (؟) جا سکتا ہے لیکن میں ایک اور صرف ایک شاعر یعنی حضرت دلؔ شاہ جہاں پوری کے "نغمۂ دل" کو سب سے بہتر خیال کرتا ہوں۔"

مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے تمام اُردو دُنیا کو بے علم، بدذوق، کم نظر اور نابینا کیوں تصوّر کر لیا ہے۔ آخر اُردو ادب کے جوہریوں کی نگاہ اُس موتی پر کیوں نہیں پڑی، جس کی جوت نے منظورؔ صاحب کی نگاہوں کو خیرہ ہی نہیں کچھ اس سے زیادہ کر دیا ہے۔ دلؔ صاحب کے مشہور و مقبول نہ ہونے کے یہی اسباب نہیں کہ ان کو پروپگنڈے کے مواقع نصیب نہیں۔ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اُردو تغزّل کے بدلتے ہوئے رجحانات کو گرفت میں نہیں کر سکے۔ نہ صرف دلؔ صاحب بلکہ اس وقت نوحؔ، سائلؔ، اور باقیؔ ایسے تمام بزرگ جو قدیم محاورات نگاری اور معاملہ بندی کے شاعر تھے۔ اپنا کام ختم کر چکے ہیں، یہی نہیں ان کے بعد کے لوگ بھی کنارے پر پہنچ چکے ہیں۔

محمد عادل مرزا جاؔلب مراد آبادی کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس میں کوئی خصوصیت نہیں۔ جاؔلب صاحب کی شاعرانہ حیثیت کافی بلند ہے، جگرؔ کے بعد مراد آباد نے جاؔلب کو پیدا کیا، اور کوئی شک نہیں کہ ترقی یافتہ تغزّل کی تمام دل آویزیاں اور تاثر جاؔلب کی شاعری کی روحِ رواں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جاؔلب کے شعر میں اک دل دھڑکتا معلوم ہوتا ہے ؎

بہاریں بھی ہیں گلشن بھی ہے قصرِ ماہ و انجم بھی
مگر اس دل سے پوچھو جو کمی معلوم ہوتی ہے

قدیم تغزّل ہو کہ جدید، تاثیراتی عناصر ہر جگہ ایک ہی ہیں، گیت اور غزل میں "المناکی"، اور انفعالیت ہمیشہ سے "حسن" سمجھا گیا، شاید ایشیائی محبت کا منتہا ہی ناکامی اور بدنصیبی ہے، مشرقی زندگی میں چاروں طرف سے فرد کے ذہن پر جس قسم کے دباؤ پڑتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ وہ المناکی اور افسردگی ہے جو مشرقی شعراء کے کلام میں زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہے، رہی مستی اور رنگینی، وہ اس المناکی اور افسردگی کا ردِّ عمل ہے۔

جاؔلب کے کلام میں المناکی اور افسردگی کوئی ایسی بنیاد نہیں ہے جس پر اسکے تمام تر تفکّر اور تاثّر کی عمارت کھڑی ہوئی ہو اکثر جگہ نہایت دلنواز شگفتگی کلیوں کے کھلنے کا سا منظر پیشِ نظر کر دیتی ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ ؎

آتی ہے اس طرح سے چمن میں بہارِ نو
جیسے کہ سامنے سے چلے آ رہے ہو تم

علو اور رفعت، فکر اور جذبہ کی اصابت بعض جگہ اس طرح نمایاں ہوتی ہے کہ بے ساختہ اسکی شاعری کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ؎

محبت آج اس معیار پر پہنچی کہ عالم کو
مری وحشت بھی تیری ہی ادا معلوم ہوتی ہے

آنا ہی پڑ گیا مجھے دامِ خیال میں ہستی سے ہو سکا نہ گریزاں کسی طرح

بھر گیا ساغرِ کونین کو اک آن میں کون
میں نے دیکھا تھا دو عالم کو تہی جام ابھی

"سو شعر" کی اشاعت کا تخیل جامعہ ملیہ دہلی نے پیدا کیا۔ گو انتخاب میں وہ بھی کامیاب نہیں ہوئے، مگر نسبتاً مکتبۂ جامعہ نے جو انتخابات شائع کئے وہ معیار رکھتے ہیں۔ اسکے بعد جن لوگوں نے انتخابات شائع کئے وہ انتخاب کے مفہوم اور حسن کو قائم نہیں رکھ سکے۔ کسی شاعر کے سو دل گداز اشعار، سو سلطنتوں سے کم نہیں، مگر ہر مصنف نے روایتی طور پر انتخاب کیا اور شائع کر دیا، اس انتخاب کے معنی یہ ہیں، کہ وہ سو شعر جن پر اک عامی سے لیکر مخصوص فرد تک سر دھننے کیلئے مجبور ہو جائے اور جو انتخاب سے پہلے خود ہی سماعت اور شہرت نے چن لئے ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ جالب صاحب نے بھی اس زاویۂ نگاہ سے انتخاب نہیں کیا، ورنہ جو اشعار اس کتابچہ میں ہیں، ان کے کلام میں اس سے اچھے اشعار موجود ہیں۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۴)

اسکے حقدار تھے کہ ان کی یاد میں ایک نمبر شائع کیا جاتا، جو ان کے متعلق کامل معلومات پر مبنی ہوتا۔ گو نگار کا جنوری و فروری نمبر کوئی ایسی جامع حیثیت نہیں رکھتا، کہ اسے پڑھ کر ریاض کے متعلقات یا ان کی سیرۃ کے مختلف گوشے سامنے آجائیں، لیکن بہر حال نیاز کے ذوقِ خود پسندی کی تکمیل ہو گئی ہے۔

ریاض خیرآبادی کی یاد میں یہ نمبر اس لئے شائع نہیں کیا گیا کہ ریاض اسکے حق دار تھے، بلکہ اس لئے شائع کیا گیا ہے کہ "نیاز" ان کو پسند کرتے ہیں۔ ۴۸

حضرت ریاض مرحوم کی مدح سے قبل یہ ضروری تھا کہ ملک کے باقی تمام شعراء کو "جنسِ فرومایہ" کہا جاتا، چنانچہ "اعترافات" میں تین سطروں کے بعد ہی "انتقاد کا فرض" اس طرح ادا کیا جاتا ہے: ۔

"اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا شاعر، جیسا کہ اس سے قبل میں بارہا ظاہر کر چکا ہوں (لہجہ قابلِ غور ہے) بہ حیثیت انسان ہونے کے ایسی جنس فرومایہ ہے کہ مشکل ہی سے کسی کو اسکے پیش کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے (بدبختی سے ممدوحِ نیاز (ریاض) بھی شاعر ہیں اس لئے گریز بھی لازمی تھی تاکہ "جنسِ فرومایہ" کے انبار میں سے اپنے ہیرہ کو بہ حفاظت نکال لیا جائے) چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ۔

"لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر واقعی کوئی انسان اس گروہ میں نکل آیا تو پھر اس کا جواب عالمِ آب و گل "کیا معنی" "ملائکہ مقربین" اور "کرو بیانِ مقدسین" کی جماعت میں بھی نہیں مل سکتا۔"

میں نیاز کے بیان میں صرف اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کا شاعر ہی نہیں، بلکہ نقاد بھی ایسی جنس فرومایہ ہے کہ مشکل سے بھی اسکے پیش کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی، لیکن اسکے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ شعراء کے گروہ میں تو ایک آدھ انسان ایسا نکل بھی آتا ہے جس کا جواب عالمِ آب و گل "کیا معنی" "ملائکہ مقربین" اور "کرو بیانِ مقدسین" کی جماعت میں بھی نہیں مل سکتا۔ مگر ہندوستان کا بر خود غلط، خود پسند، بے اصول، کم نظر اور جاہل نقاد ایسی "جنسِ فرومایہ" ہے کہ اس میں کسی قسم کے استثنیٰ کی گنجائش نہیں۔

ریاض مرحوم کا تعارف کراتے ہوئے نیاز اس عہد کے سب سے بڑے جوہری تحریر فرماتے ہیں: ۔

"ریاض کیا چیز تھے؟ اگر میں تفصیل سے کام لوں تو اسکے لئے دفتر کے دفتر نا کافی ہیں لیکن اختصار و اجمال کے ساتھ اگر کوئی دریافت کرے تو میں اسکے جواب میں وہی کہہ سکتا ہوں جو یوسف کی خصوصیات معلوم کرنے کے بعد بعض زبانوں سے بے اختیار نکل گیا تھا: ۔

"ان ھٰذا الّا ملک کریم"

اور اسکے بعد بھی عرفی کا یہ مصرع پڑھونگا کہ: ۔

"مرغِ اوصافِ تو از اوجِ بیاں انداختہ"

کیونکہ یوسفؑ تو خیر پیغمبر پیدا ہوئے، پیغمبر زندہ رہے اور پیغمبر مرے، اور ان کے لئے "ملک کریم" ہو جانا کوئی امتیاز نہ تھا لیکن ریاض تو بقول شخصے اس تیرہ خاکدانِ ہند میں ایک گنہگار انسانی خاندان میں پیدا ہوئے، جوانی کا معصیت کوش زمانہ اس فضا میں بسر کیا جہاں "حسن" کا مفہوم "استغناء" نہ تھا اور ضعیفی ان حالات کے تحت گزاری جب "ممنوعات و محرکات" کا سوال شرعاً و قانوناً دونوں طرح اٹھ جاتا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے

کہ ریاض اپنی زندگی کی کسی منزل میں، اپنی حیات کے کسی مشغلہ میں اور اپنی عمر کے کسی موسم میں ایک لمحہ کیلئے بھی اُس جادۂ انسانیت و اخلاق سے ہٹتے ہوئے نظر آئے جو کبھی کبھی گنہگاروں کو تو مل جاتا ہے، لیکن "زاہدانِ مرتاض" کے حصہ میں کبھی نہیں آتا۔ اس لئے اگر ان کو ملک کریم کہنے کے بعد بھی عرفی کی طرح اعترافِ قصور کیا جائے تو غالباً نادرست نہ ہوگا۔ ریاض اُس عہد کی یادگار تھے جب اودھ و مضافاتِ اودھ سے اکثر مقامات میں زندگی کا مفہوم باوجود انتزاعِ سلطنت کے بدستور خندہ و قہقہہ چلا آرہا تھا اور ہر صحبت اسی احساس میں حسن و شباب کا مکمل نمونہ ہوتی تھی جسے شعر و موسیقی کا خلاق کہنا چاہئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہر اجتماع ہنگامۂ نائے و نوش تھا اور ہر منظر بساطِ گل فروش، بے فکریاں تھیں اور عیش کوشیاں، عیش کوشیاں تھیں اور ان اسباب کے ساتھ جب کہ ایک ادبی منظر صاحبِ رسائل طغرئی کی زبان میں "بہری بناگوش مطربانِ جلاجل نعل در آتش" کے تیور لئے ہوئے ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایسے مدہوش اور مدہوش کن زمانہ میں جوانی آئے اور شخص بھی کون؟ ریاض ایسا غیر معمولی طبع رنگین رکھنے والا، وہ جس قدر دادِ معصیت دیتا کم تھا۔ لیکن اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ یہ ساری عمر خمریات کی شاعری میں مبتلا ہو کر بسر کرنے والا شاعر، یہ زندگی کی تمام شگفتہ سامانیوں کے ساتھ حسن و شباب کے ہجوم میں بہترین ایامِ حیات گزارتے ہوئے جادۂ اخلاق سے کبھی ایک لمحہ کیلئے نہ ہٹنے والا شخص جس طرح ایک انسان پیدا ہوا تھا بدستور اسی طرح انسان رہا۔ اس زمانہ میں بھی جبکہ گناہ سے پہلے "عذرِ گناہ" پیدا کر لیا جاتا ہے ضعیفی کے وقت کا کیا ذکر کہ اس وقت تو ریاض حقیقی معنی میں صوفی تھے۔"

آگے چل کر اپنی اور ریاض مرحوم کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: —

"لیکن باوجود اسکے کہ زمانہ موافق نہ تھا، حالات نے سخت دلگیر بنا رکھا تھا، ہجومِ افکار نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا لیکن ریاض باوجود سراپا غم و الم ہونے کے دوسروں کے لئے یکسر بہار و شگفتگی تھے۔"

نیاز کے پاس اپنے اسلوب کے سوائے کچھ نہیں، دیکھئے کتنے محکم الفاظ میں وہ ریاض کے متعلق اپنی شیفتگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا ذہن اک شخصیت سے اس درجہ متاثر معلوم ہوتا ہے، کہ وہ جرح کے امکانات اور اندیشوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

یہ محاسن جو انہوں نے ریاض مرحوم کے گنوائے ان کی تردید مقصود نہیں لیکن یہ فطری طور پر نفسیات کے دقیق مسائل کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان سطور کے متعلق کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اڈیٹر نگار جنہیں حکیم اور مفکر نقاد اور نباضِ ادب ہونے کا دعویٰ ہے، میری تشفی کریں:

(۱) اخلاقِ انسانی کے متعلق خود ان کا قطعی نقطۂ نگاہ کیا ہے!؟

(۲) انسان کی کیا تعریف ہے!؟

(۳) شباب کی کیا تعریف ہے!؟

(۴) کیا انہوں نے اب "گناہ" کی دقیانوسی تعریف قبول کر لی ہے؟

(۵) شاعری کا فن انسانی فکر و عمل سے تعلق رکھتا ہے یا وہ محض ایک جامد آرٹ ہے!؟ آرٹسٹ کی روح اور احساسات کو اسکے آرٹ میں دخل ہے یا نہیں!؟

(۶) ہجومِ حسن و شباب میں "جادۂ اخلاق" پر چلنے والے اسی زمین کی مخلوق کہلاتے ہیں۔ یا آسمان کی۔ یا ذہن کی؟؟

اگر یہ واقعہ ہے کہ "خطابت" اور "سوانح نگاری" دو مختلف فرائض ہیں تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑیگا کہ اس قسم کا تعارف ریاض کے ساتھ، اسکی جوانی کے ساتھ، اسکی رومانیت اور اسکی غزل کے ساتھ شدید ظلم ہے۔

ریاض خیرآبادی کی شاعری کے متعلق کچھ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں، لٹتے ہوئے درباروں میں عیش و تفریح کی جو مٹی ہوئی یادگاریں باقی رہ گئی تھیں وہ ان کا دھندلا سا پرتو تھے۔ ان کے ذہن میں وہ ادائیں رس بس گئی تھیں جن سے امراء خوش ہوتے تھے؛ رفتہ رفتہ وہی باتیں ان کے اخلاق و اعمال کا ضمنی سانچہ بنا گئی تھیں، اور یہ سانچہ بالکل سطحی تھا۔ وہ شاعروں کی اُس نسل سے تھے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے تضادوں کا مجموعہ ہوتی تھی، ان کے فکر و عمل کے رشتے بالکل مختلف سمتوں میں جا کر جڑتے تھے، بادہ نوش نہیں،

لیکن شراب پر شعر کہہ رہے ہیں، شاہد باز نہیں لیکن رند بنے ہوئے ہیں، نہ کسی سے محبت ہے نہ نفرت، لیکن کلام میں سب کچھ موجود ہے؛ غرضکہ قافیہ نے جو کچھ کہا وہی بن گئے؛ ۳۰، ۴۰ برس کی مشق کے بعد یہ لوگ کچھ اچھے شعر بھی کہہ لیتے تھے۔

کوئی شک نہیں، ریاض بعض مسائل میں مستثنیٰ تھے؛ وہ بحیثیت انسان سینہ میں حساس دل رکھتے تھے لیکن ان کی شاعری اور اعمالِ اخلاق میں سخت قسم کا تضاد پایا جاتا ہے؛ اسی لئے ہم ان کی شاعری کو روایتی شاعری کہنے کیلئے مجبور ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کی شاعری کا اک معیار ہے اور ذہن و دماغ کی تفریح کرتی ہے؛ مگر شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ اسکے دل پر بھی بیتا ہے یا اس کو شراب سے واقعی ذوق رہا ہے؛ یہ ان کے کلام سے معلوم نہیں ہوتا۔

نیاز نے ریاض کا مقدمہ اُسی عجب انداز میں پیش کیا ہے جس میں تبختر، شان اور ریاض نمائی سے زیادہ خود نمائی کی ادا پائی جاتی ہے۔ یہ احساس مجہول (   ) نیاز کی مخصوص ترین کیفیت ہے۔ نیاز خوب جانتے ہیں، مجنوں اور فراق اور دسیوں نوجوان انکے مقابلے میں انگریزی ادب پر وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں اس لئے ان سے جب ملیں گے اک خودی کے ساتھ گویا   احساسِ مجہول کے ساتھ۔ ۵۰

تمام نمبر میں فراق، نیاز، اور دوسرے لکھنے والوں کی یہی سعی رہی ہے کہ وہ ریاض کی شاعری کا کوئی صحیح پس منظر بنائیں، مگر کامیابی نہیں ہوئی؛ فراق نے ذرا جرأت دکھائی ہے مگر مقصد ان کا بھی قصیدہ خوانی ہے، مُرکیاں اس لئے کھائیں ہیں کہ آپ کو گمان ہے، لوگ آپ کو بھی ترقی پسند خیال کرتے ہیں۔ دوسری طرف ترقی پسند دوستوں سے زیادہ اڈیٹر نگار کی خاطر منظور ہے۔ ریاض کی غزل کو فراق نے "اداکاری" سے تعبیر کیا ہے، جھوٹ کہا ہے، مگر اس "جھوٹ" کہنے کے لئے اسے خود بھی بہت بڑا جھوٹ بولنا پڑا ہے:۔

"ناسخ کا جھوٹ ریاض کا سچ بن گیا ہے" (فراق)

غلط کو صحیح، اور صحیح کو غلط، ثقاہت کو ابتذال اور ابتذال کو ثقاہت کر دکھانا نیاز فتحپوری کا کمال ہے، اگر انہیں ابتذال کی نمائندگی کرنی ہے تو وہ تمام عالمِ منطق، تمام دُنیائے طلاقت، کل امکاناتِ خطابت کو، جائز و ناجائز کے خیال سے آزاد ہوکر درہم و برہم کردیں گے؛ اور دُنیا سے تسلیم کرائیں گے کہ یہ ابتذال نہیں ثقاہت ہے۔

ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں ہوا کہ سماج میں شاعری کے ان رنگوں کے خلاف جذبہ پیدا ہوا جو دو رخے تمدن کا نتیجہ تھے۔ "دیوان خانہ" اور "حویلی" کی تہذیب نے جو دیواریں سماج میں کھڑی کردی تھیں، ظاہر ہے کہ داغ اور ریاض کی شاعری ان دیواروں کے سایہ میں پلی بڑھی ہے۔ اقبال سے پہلے اُردو شاعری اسی "چھندلے عنصر" کی بنا پر اس درجہ مردود اور مسترد ہو چکی تھی کہ بچوں اور عورتوں کے سامنے شعر پڑھنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ حالی نہ سہی مگر اقبال نے شاعری کو وہ گہرائی اور سنجیدگی بخشی کہ شعراء کی مٹی ہوئی عظمت سماج میں دوبارہ اس طرح اُبھر آئی جیسے کیچڑ کے اندر سے کنول کا پھول؛

شاعر کے اس ارتقاء اور نکھار کو نیاز "سنجیدہ سوختگی" اور "متین برشتگی" اور کھُل کھیلنے کی حالت میں بھی "جرأت رندانہ کے فقدان" سے تعبیر کرتے ہیں؛ ان کا خیال ہے کہ آج "شمعِ سخن" کے پروانوں کی خاک سرد پڑ گئی ہے۔

وہ اپنے حسرتناک بڑھاپے میں سٹھیا کر اُس چوک کو یاد کرتے ہیں، جہاں "تماشائے لبِ بام" کی رسم جاری تھی اور شام اودھ کے دھندلکے میں نغمہ و سرود کی گونج باقی؛

حالانکہ یہ وہ موقع تھا کہ وہ اس فرسودہ "ادبِ لطیف" کی نگارش سے پرہیز کرتے اور اس پسِ منظر کو پیش کرتے جو ہندوستانی سماج کے ابتذال کا ایک دردناک اور چھپا ہوا منظر تھا۔ یہ شعر؎

اس طرح گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
جب چھم سے چلیں گو دیں چپکے سے اٹھالے

نیاز کی نظر میں محض "ناواجب شوخی" کا آئینہ دار ہے، لیکن ریاض کے علاوہ داغ کے اس قسم کے اشعار کے متعلق یا غالب کے اس شعر پر کہ؎

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

وہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ابتذال کا چارج لگادیں گے۔ مگر ریاض کی وکالت کے زعم میں اس شعر کے متعلق وہ ادب کے مختارِ مطلق بن کر حکم صادر کرتے ہیں کہ "اسے مبتذل کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے؛" غالب کو وہ مفکر شاعر نہیں طنزیاتی شاعر تسلیم کرتے ہیں؛ حالانکہ ....

....

خود اُنکا طریق انتقاد، محض لفاظی اور طنز نگار کی سی ٹھٹول بازیوں کے علاوہ کچھ نہیں؛

ریاض نمبر میں سب سے بڑا مسئلہ دہلی اور لکھنؤ کا تمدنی، مجلسی نفسیاتی اور ذہنی تقابل کا ہے، جو بڑے مزہ سے چھیڑا گیا ہے، یہ عنصر فراق کے مضمون کی اساس ہے، بہ حیثیت نقاد فراق پر نظر ڈالتے ہوئے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی جائیگی۔ لیکن یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ میر و غالب کی صف میں ریاض کو نہیں بٹھایا جا سکتا۔ فراق نیاز سے زیادہ "باتونی" ہیں اور انہوں نے کافی طاقت ریاض کی شاعری کو اعلیٰ درجہ کی حقیقی شاعری ثابت کرنے پر کی ہے، لیکن اس وکالت سے زیادہ لوگ خود ریاض کی شاعری سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

زندگی کے دکھ سکھ کی وہ حقیقت جو الفاظ میں رچ کر شعر کو ابدیت عطا کرتی ہے، لکھنؤ والوں کے یہاں مفقود اور دہلی والوں کے یہاں نمایاں طور پر موجود ہے۔ میر کہتا ہے ؎

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

میراُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

عجلت میں یہ چند سطور تحریر کی گئی ہیں۔ لیکن "ہمارے نقاد" اور ان کی بے راہ روی متقاضی ہے کہ ان کے اعمال و افکار کے متعلق باقاعدہ ایک مبسوط سلسلہ لکھا جائے، چنانچہ ایشیا میں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آئندہ نمبر میں نیاز، مجنوں، فراق، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین زور۔ عبدالقادر سروری۔ مسعود الحسن، احتشام الدین، سجاد ظہیر، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور دوسرے اصحاب کے انتقادی نقطۂ خیال اور جملہ اعمال و افعال کو اصولِ انتقاد کی روشنی میں دیکھا جائیگا۔

اصل یہ ہمارے ادب میں انتقاد کی بڑی کمی ہے خاص کر موجودہ عہد کے اکثر شعراء نے اپنی نثر نگاری کی اہلیتوں کا تجزیہ و احتساب نہیں کیا، یہی نہیں انتقاد کے ذوق کی تکمیل سے بھی عاجز رہے، مگر اب وقت آگیا ہے کہ سونا خود اپنی کسوٹی کو پرکھے۔

ایک رات

(شالامار پکچرز کی پہلی تصویر)

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۶)

کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ راجہ کے مکان میں آنے کے بعد ننیا کو برج کی رانیوں کا لباس لہنگا شلوکا اور اوڑھنی پہنایا جاتا تو شاید مناسب ہوتا۔ میں جانتا ہوں ڈائرکٹر اس موقع پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ شلوار عام طور پر پہنی جاتی ہے اس لئے پہنائی جا سکتی ہے۔ ان دو مقامات کے علاوہ "ایک رات" کے تمام لباس اپنے اندر موزوں ترین انتخاب و صحت رکھتے ہیں۔

سوتیلی بہن کی پارٹی میں ننیا کو جو گیل اوور پہنایا گیا ہے، وہ اسے بالکل نہیں سجتا، دوسرے لباسوں کے مقابلے میں اس لباس میں اسکی عمر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کوئی شام کا لباس زیب کرانا تھا۔ گو یہ ضرور ہے کہ اس پارٹی میں اس کی سوتیلی بہن نے ننیا کو شریک نہیں کیا ہے، اور وہ یونہی بے تکلف علیحدہ بیٹھی ہوئی ہے۔

ترتیب و پلاٹ

کہانی دو معصوم صفت محبت کرنیوالے مرد و عورت سے شروع ہوتی ہے، جو ایک منزل پر آکر سماج کے اخلاقی بندھن کو توڑنا چاہتے ہیں، مگر ننیا کی معصومیت دونوں کو ناکام بنا دیتی ہے۔ اسکے بعد راجن اور ننیا کسی قسم کا باغیانہ اقدام نہیں کرتے، یہ مقام بڑا انتقادی اور نفسیاتی مقام ہے۔

سماج میں عورت کی پوزیشن باوجود ترقی آزادی اور روشنی کے ابھی تک رجعت غلامی اور تاریکی میں جکڑی ہوئی ہے، اس سے زیادہ خود عورت کا ذہن و روح ان پرانے سماجی ریتی رواج اور اعتقادات کے جال میں پھنسا ہوا ہے جو اُسے پرانے اور دقیانوسی ماحول سے وراثت میں ملے ہیں۔ اس لئے افسانہ نگار نے نئی ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے اپنا دامن بچایا ہے اور عافیت اسی میں سمجھی ہے کہ ننیا کی نفسیات اور قائم کردہ کردار راجہ کی سیرتی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر ایک قدرتی ترتیب کو جاری رکھے اور پھر رسمی مگر قیاسی پلاٹ کے ذریعہ کہانی کے انجامی مرکز تک

پہنچے۔ اس لحاظ سے کہانی میں کوئی نقص نہیں ہے اور وہ ترتیب و پلاٹ کے لحاظ سے درست ہے۔

تشکیل

میں یہ یقین کرتا ہوں کہ ایک رات کے ڈائرکٹر کا جمالیاتی ذوق عام ڈائرکٹروں سے بالکل مختلف اور بلند ہے کیونکہ اس تصویر میں تشکیل کی ادنیٰ سی غلطی نہیں پائی جاتی غالباً اس لئے کہ تصویر کی جو فضا اور ماحول ہے، شاید اس ماحول و فضا کے ایک ایک جزیہ کو اسکے ڈائرکٹر ذاتی طور پر مشاہدہ کر چکے ہیں۔

اداکاروں کی تعداد

ایک رات میں اداکاروں کی تعداد دو مناظر میں اجتماعی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ ایک چائے کی پارٹی میں، ایک عدالت میں۔ ایسے مواقع پر زیادہ تعداد کی وجہ سے مجبوراً ایسے چہروں والے افراد کو جمع کردینا پڑتا ہے کہ جو جمالیاتی اور رنگا رنگی کے نقطۂ نگاہ سے وہ توازن باقی نہیں رکھتے جس میں وقار اور کم تری حسن اور بدصورتی، اور مجموعی طور پر حقیقت بھی قائم رہ سکتی۔ چنانچہ چائے کی پارٹی میں نینا کی سوتیلی بہن کی جو سہیلیاں جمع ہوئی ہیں ان میں یہ تناسب باقی نہیں رہا، کوئی بھی اُن میں حسین لڑکی نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ڈائرکٹر کہہ سکتے ہیں کہ نینا کی سوتیلی بہن جیسی ہے ویسی ہی اسکی سہیلیاں ہیں، مگر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عوامی اور جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے ان کا جواب تسکین بخش نہیں ہوگا۔

البتہ عدالت کا منظر، اس لحاظ سے بالکل مکمل ہے، یہ ایک رسمی منظر ہے مگر تکمیل کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آتا ہے اور کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔

اداکاری

رہی اداکاری، سو، فلم انڈسٹری میں شاید کوئی سوشل تصویر ایسی نہیں ہے جس میں کسی ہیروئن نے نینا کی طرح حقیقت کا مجسمہ بن کر دکھایا ہو۔ نینا کی ہستی، نینا کی مکالمت، اندازِ گفتگو، اس کا طور و طریق، اسکی چلت پھرت، اسکی آنکھوں کی جنبش، اسکی حیا، اسکی بے باکی سب ایک گھریلو کنواری لڑکی کی حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی ہے، خاص کر اسکی آواز اور اندازِ گفتگو اتنا ہی دلربا اور اثر ریز، بے ساختہ اور پاکیزہ ہے جس قدر شمالی ہند کے ایک ایسے گھرانے کا ہوسکتا ہے جیسا کہ ایک رات میں دکھایا گیا ہے۔ اس لئے واقعیت اور فن اداکاری کے لحاظ سے اسکی کامیابی بہت بڑا درجہ رکھتی ہے، ایک رات کی تمام عمارت نینا کے تبسم پر قائم ہے۔

اوّل سے آخر تک نینا کا رول بغیر کسی نقص اور اکراہ کے بے ساختہ طور پر ادا ہوا ہے اور اسکی اداکاری میں حسن و تکمیل کی اتنی مقدار جمع ہوگئی ہے کہ وہ تقسیم ہوکر تمام باقی افراد کی اداکاری میں توازن قائم کردیتی ہے۔

راجن (ہیرو) یعنی پرتھوی راج پی لے کی اداکاری میں یہاں بھی انکی مخصوص خصوصیات نمایاں ہوئی ہیں۔ خاص قسم کی شرمیلی مردانگی، پُر وقار اندازِ مکالمت، شاندار وجود، مردانہ صبر و ضبط، شریفانہ تہذیب، صبر، مخصوص حرکات، چہرہ کے مختص خطوط، اپنی گھبراہٹ، اپنی مسکراہٹ، اپنی مسرت، اپنا غم، پرتھوی راج کی اداکاری اپنے اندر ایک شخصیت پوشیدہ رکھتی ہے۔ جب شخصیت کو سامنے لانا ہو تو پرتھوی راج کو چننا چاہیئے، وہ پُر وقار شریفانہ افراد کی نمائندگی کرنے میں مخصوص درجہ رکھتا ہے، میراں بائی میں راجہ کا کام اس کا وہ اختراعِ فائقہ ہے جو ایک بار ظاہر ہوکر پھر دوبارہ ظاہر نہ ہوسکا۔

مجھے یاد نہیں رہا، کے این سنگھ اور مبارک کا کیا رول ہے، مگر چتر لال اور راجہ نے حقیقی مصاحب اور حقیقی راجہ کو پیکر بخش دیا ہے، چتر لال نے اوّل سے آخر تک اپنے رول میں تکمیل و توازن کا کمال کامیابی سے باقی رکھا ہے نینا کے باپ کا اندازِ گفتگو قطعی بے روح ہے۔ اور نینا کی سوتیلی ماں نے اپنی شخصیت کو فراموش نہیں کیا۔ باقی ضمنی کرداروں میں راجہ کا ملازم اور نینا کی خادمہ نے بڑی کامیابی سے اپنا رول ادا کیا ہے۔ دیکھنے میں تو یہ ضمنی کردار ہیں لیکن اگر یہ جامد ہو جاتے تو ایک رات ٹھٹر کر رہ جاتی۔

عکّاسی

ایک رات کی عکّاسی، فنّی لحاظ سے موزوں ترین معیار رکھتی ہے۔ البتہ پارٹی میں نینا کے جو پوز دئے گئے ہیں وہ غلط ہیں اور منظر کو کم تر بنا دیتے ہیں۔ صرف یہی ایک ایسا مقام ہے ورنہ عکّاسی شروع سے آخر تک ایک معیار قائم رکھتی ہے۔

ہدایت کاری

رہی ہدایت کاری سو غور کرنے سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معمولی مسائل سے تعلق رکھنے والی کہانی میں جو اعلیٰ روح تناسب کام کر رہی ہے۔ اسکا کامل کریڈیٹ ایک رات کے ڈائرکٹر مسٹر ڈبلیو زیڈ احمد کو حاصل ہے، جو معمولی سے معمولی جزئیات کو اہمیت دیتے ہیں اور فنی طور پر جمالیات، اداکاری، تہذیب و تمدّن، کلچر، نفسیات اور جملہ باتوں کے متعلق علم و وقوف رکھتے ہیں، یہی نہیں ان کو عالم تصویر میں نمایاں کر سکتے ہیں۔ ایک رات کا ڈائرکشن کسی طرح اعلیٰ تصویروں کی ہدایت کاری سے کم نہیں۔ انہیں بنیادوں پر شمالی ہند میں یہ تصویر اعلیٰ تصویروں کا سا ریکارڈ قائم کر رہی ہے۔

میں تو حیران رہ گیا جب حیدرآباد میں میرے ایک جاگیردار دوست نے کہا کہ چلو، ایک رات دیکھو، میں اسے آج چودھویں بار دیکھنے ۔۔۔ جا رہا ہوں۔

ساغر

تصویر کدہ

ساغر نظامی

فلمی انتقاد

ایک رات

(شالامار پکچرز کی پہلی تصویر)

نثر و نظم، تحریر و تقریر، محض اظہار کا فرض ادا کر سکتی ہے لیکن صدیوں کے بعد انسانی ذہن نے فلم ہی ایک ایسا فن ایجاد کیا ہے جس میں اظہار کی قابلیتوں کے ساتھ ساتھ "ابلاغ" کی کامل اہلیت موجود ہے، فلم آرٹ، صناعت و ادب، اظہار و ابلاغ کا ایک ایسا نادر امتزاج ہے جسکی مثال انسانی تمدن و آرٹ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ابلاغ کی قطعی محسوس اور واضح قابلیتوں نے اس فن کو انسانی سماج کیلئے ایک ایسا ذریعہ قرار دیدیا ہے کہ لمحۂ پیدائش سے لیکر موت کی منزل تک جس قدر انسانی مسائل اور ضروریات ہیں ان سب کی تکمیل و ترویج، اصلاح و تبلیغ کے لئے اس ذریعہ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ 54

یورپ و امریکہ، جرمنی و جاپان نے اس حقیقت کو سمجھا اور برتا، ہندوستان غلام ملک ہے، یہاں نہ کوئی حقیقی منصف حکومت ہے نہ قومی حکومت، اس لئے فلم انڈسٹری سے بھی وہ کام نہیں لیا جا سکتا جو تعمیر حیات میں دوسرے آزاد ملکوں میں لیا جاتا ہے۔

پھر بھی ہزار مجبوریوں کے عالم میں صنعتِ فلم نے ہندوستان میں جس قدر ترقی کے مدارج طے کئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر اس ملک کو یورپ کے سے آزاد وسائل حاصل ہو جائیں اور اپنے ملک کی پیداوار اور نظم و نسق پر اختیار دیدیا جائے تو فلم انڈسٹری بہت جلد مرکزِ عروج تک پہنچ سکتی ہے۔

ابھی دس پندرہ سال بھی نہیں ہوئے کہ صنعتِ فلم بالپن کی گود میں ٹھنک رہی تھی، مگر اب اس نے آرٹ کا ایک معتدل معیار قائم کر لیا ہے اور اس کی آغوش میں نوجوانی مسکرانے لگی ہے، گو اپج اور رنگارنگی کی بڑی کمی ہے۔ تقلید اور مسابقت نے اس جوہر کو بہت دبا دیا ہے، ایک ہی قسم کی موسیقی، ایک قسم کی نیچرنگاری، ایک ہی قسم کی زندگی اور ایک ہی قسم کی کلچری خصوصیات میں فلمی جہان الجھا ہوا ہے، مگر بعض گوشوں میں ترقی و تجدد، مدعم اور معتدل تغیر کی کوششیں بھی کار فرما نظر آتی ہیں۔ انہیں کوششوں میں سے ایک ہلکی سی کوشش شالامار پکچرز بمبئی کی تازہ تصویر "ایک رات" بھی ہے۔

اس تصویر کا سماجی پس منظر کچھ دوسری تصویروں سے مختلف نہ سہی مگر پھر بھی زندگی کو بڑی حد تک قیاسی صورت میں پیش کیا گیا ہے شاید اسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اسکے ہیرو، اور ہیروئین اور دوسرے اداکار، حقیقت سے بیحد قریب ہو گئے ہیں۔

کہانی ایک رات کی کہانی اتنی سی ہے کہ ننیا ایک ہندو امیر گھرانے کی لڑکی ہے، اس کی ماں مر چکی ہے۔ سوتیلی ماں زندہ ہے اور ایک بہن۔

ننیا کی جوانی اپنی عمر کے خول سے اس طرح نمودار ہو رہی ہے جیسے صبحدم موجیں لیتی ہوئی جھیل میں سے کھلتی ہوئی کنول کی کلی، سوتیلی بہن کی جوانی جنگلی دھتورے کے پھول کے مانند ہے۔ لاڈ، غرور اور ضد، مگر اس کی ماں زندہ ہے اس لئے دنیا بھر کا چین و آرام اور نیک آرزوئیں اُسی کے لئے ہیں۔ ننیا کا باپ اسکی سوتیلی ماں کے دامِ اثر میں الجھا ہوا ہے سوتیلی ماں ننیا کے شگفتہ اور قدسی شکار حسن کو دیکھ کر جلتی ہے۔

اس گھرانے کے پڑوس میں دوسرا گھرانا ہے

اس میں راجن ایک نوجوان رہتا ہے اور ننیا اور راجن دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ننیا کی سوتیلی ماں اس بھید کو تاڑ جاتی ہے حد سے زیادہ جلتی ہے راجن اک فوجی ڈاکٹر، شکیل وجیہ اور مہذب نوجوان ہے، ننیا کی سوتیلی ماں اپنی بیٹی سے اس کا بیاہ رچانا چاہتی ہے۔ آخر وہ ایک دن ننیا کے بلوغ کی طرف اشارہ کر کے اپنے شوہر کو راضی کر لیتی ہے اور خود ننیا کے لئے بر تلاش کرنے کا وعدہ کرتی ہے اور کر بھی لیتی ہے۔

چترلال ایک آوارہ شخص کے ذریعہ وہ ایک عیاش و آوارہ راجہ کو ننیا کے ساتھ شادی کرنے کے لئے ساتھی ہے اور راجہ اس لئے تیار ہو جاتا ہے کہ لڑکی بھی خوبصورت ہے اور لڑکی کے باپ کا روپیہ بھی۔

اسی دوران میں راجن کو اپنی ملازمت پر جانا پڑتا ہے، اسکے جانے کے بعد ننیا کی شادی کے انتظامات ہوتے ہیں۔ راجن چھٹی لے کر واپس آتا ہے، تو اس سے ننیا کی سوتیلی ماں اپنی لڑکی کی شادی کے بارے میں بات چیت کرنے کیلئے مکان پر جاتی ہے۔ مگر راجن مسترد کر دیتا ہے۔ وہ ننیا کے باپ سے ملکر بھی متنبہ کرتا ہے کہ وہ راجہ سے ننیا کی شادی کر کے بہت بڑی غلطی کر رہا ہے، مگر وہ اسکی ایک نہیں سنتا، راجہ سے بھی کہتا ہے مگر وہ اور اسکا مصاحب چترلال بھی اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

آخر وہ ننیا سے ملتا ہے اور کہتا ہے آؤ ہم تم رات کو بھاگ چلیں، وہ جھجکتی ہے مگر پھر بھاگنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ وقت مقرر کر کے راجن اسکا انتظار پائین باغ میں کرتا ہے۔ مگر معصوم ننیا کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اسکی ماں یہ سب کچھ سمجھ رہی ہے اور بھاگنے کی ہر راہ بند کی جا چکی ہے۔ آخر راجن ناکام ہو کر واپس چلا جاتا ہے۔ ننیا کی شادی زبردستی راجہ کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔

ننیا کا ہونے والا شوہر - راجہ ایک عیاش شخص تھا

آوارہ اور عورت سے کھلونے کی طرح کھیلنے والا غیر معصوم شخص ہے۔ اسکی ایک داشتہ اس پر چھائی ہوئی ہے وہ اُسے یقین دلاتا ہے کہ یہ شادی میں نے محض روپیہ کیلئے حاصل کی ہے۔ چترلال کو اپنی زر اندوزی سے کام ہے وہ راجہ کی داشتہ، راجہ، اور ننیا ہر شخص کو بیوقوف بناتا ہے۔

شادی کے بعد راجہ کا جوش عیش پرستی اسے اُبھارتا ہے۔ وہ ننیا اپنی نئی بیوی سے ملنا چاہتا ہے، داشتہ تعاقب کرتی ہے اور ملنا ناممکن بنا دیتی ہے اسی طرح راجہ داشتہ سے بھی نفرت کرنے لگتا ہے اور چاہتا ہے راہ سے اس کانٹے کو نکال دے معصوم ننیا راجہ کا کلچر اور طور طریق دیکھ کر حیران و متنفر ہے چترلال راجہ کا مصاحب اُسے نئی راہوں پر ڈالتا ہے اور طرح طرح راجہ سے جبر و تعدی کرا کے ننیا کے باپ سے روپیہ اینٹھتا ہے۔

بالآخر ایک رات تنگ آ کر راجہ کی داشتہ شراب میں زہر ملا دیتی ہے، خود بھی مر جاتی ہے اور راجہ کو بھی مار دیتی ہے اور اس واقعہ کے متعلق یادگار میں اک تحریر چھوڑتی ہے۔

قمار خانہ میں نہ پہنچنے کی بنا پر چترلال راجہ کی کوٹھی میں آتا ہے، مگر دونوں کو مردہ پا کر حیران ہوتا ہے ننیا بھی گھر پر نہیں ہے وہ اس سے پہلے تنگ آ کر چلی جاتی ہے۔ راجن اپنے گھر پر آ د اس ہے نوکری چھوڑ چکا ہے۔

بہر حال اس قتل کے الزام میں چترلال راجن کو گرفتار کراتا ہے، مقدمہ ہوتا ہے۔ چترلال وہ تحریر جو راجہ کی داشتہ چھوڑ کر مری تھی ۲۰ ہزار میں ننیا کے باپ کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔ ننیا راجن کی محبت سے مغلوب ہو کر اسکی جان بچانے کی خاطر باپ سے چاہتی ہے کہ روپیہ دیدے، مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ ننیا اپنی ترکیب سے یہ تحریر چترلال سے چھین لیتی ہے۔ یہ تحریر کورٹ میں پیش ہوتی ہے۔ جرح کے وقت راجہ کی داشتہ کا شوہر نمودار ہو کر اسکی تصدیق کرتا ہے۔ بالآخر راجن اور ننیا کی محبت کامراں ہوتی ہے۔"

مقصد کہانی کی بُنیاد قطعی سماجی ہے، پس منظر میں سماج کے زہنی رواج سوتیلی ماں کا سلوک، ہندو سماج میں عورت کی بے وقعتی، دھن دے کر من خرید لینے کی رسم، اور بے من، تن سپرد کرد بینے کا طریق، روایتی شان و شوکت، بے جان عزت کا تخیل اور راجہ سوسائٹی کی ذلیل و قابلِ نفرت فضا کے خلاف "ایک رات" نہایت نازک احتجاج ہے۔

اس تمام انبوہ کی جان یہ حقیقت ہے کہ تن کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے من کی تسخیر ممکن نہیں، عورت کی نفرت و محبت اٹل ہے اور سچی محبت بالآخر کامیاب ہو کر رہتی ہے۔

نفسیاتی گہرائیاں کہانی کی بُنیاد سماجی مشکلات ہیں ہندو سماج میں عورت کی مجبور پوزیشن اور سوتیلی ماں کے گھر میں بن ماں کی بیٹی کی ہندوستان میں بدبختانہ بنتی ہے چنانچہ سوتیلی ماں راجن سے اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی ہے مگر نِنیا اور راجن کا معاہدہ ابدی ہو چکا ہے، شادی کے بعد بھی وہ راجہ (شوہر) سے محبت نہیں کرتی بلکہ نفرت کرتی ہے اور راجن کو سمجھاتی ہے جو اسکی طرف سے غیر یقینی عہد شکنی کا وہم رکھتا ہے۔

رنگ محل کا حیران کن اور پُر شکوہ ماحول، اور اک بد اعمال شخص کی معصیت کا جال، نِنیا کو بہک جانا چاہیئے تھا، مگر محبت انسان کو کتنی قوت بخش دیتی ہے، اس کا اندازہ نِنیا کے کردار سے ہوتا ہے۔ اس تمام سماجی اور نفسیاتی اُلجھاؤ کو مسٹر احمد کے ڈائرکشن نے اپنی تمام بلند اور فنی خصوصیات کے ساتھ نہایت تناسب اور فطری انداز میں ظاہر کیا ہے۔

مکالمات نِنیا کی شخصیت اور اسکی اداکاری تمام تصویر پہ ساون کی گھٹا کی طرح چھائی ہوئی ہے جس طرح ساون کی گھٹا انسانی نفسیات اور قوتِ احساس کو صرف اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ نِنیا کا کمال اداکاری دیکھنے والوں کو اپنی طرف ہی متوجہ رکھتا ہے ورنہ مکالمات بُرے نہیں، صلاح الدین احمد کے لکھے ہوئے ہیں، یہ ادبی دُنیا کے مدیر بھی ہیں اور خود اہلِ قلم ہیں، مکالمات میں کردار کے لحاظ سے بے ساختگی کے کیف و کم کو باقی رکھا گیا ہے اور جب کوئی کردار بولتا ہے تو معلوم ہوتا ہے یہ اُسی کی زبان اور اُسی کا دل ہے۔

یہی وہ معیار ہے جسے مکالمات میں ہر مکالمہ نگار کو قائم رکھنا چاہیئے۔

گیت بھی بُرے نہیں، مگر کسی تصویر کے گیتوں کی خصوصیت میرے نزدیک یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اسکرین سے اُچھلیں اور گلیوں میں گونجنے لگیں، جذبات کی شدت ان گیتوں میں نہیں ہے۔ یہ شدت خود ایک رات کے نغمہ نگار پنڈت اندرجیت شرما میں بنیادی اور طبعی طور پر نہیں ہے۔ پھر بھی گیت ایک سطح رکھتے ہیں۔ اس تصویر کی تہذیب و تناسب کا اندازہ صرف ایک بات سے کیا جاسکتا ہے کہ کسی بھی موڑ پر ہیرو مغنی کی حیثیت میں نمودار نہیں ہوتا۔ اگر احمد صاحب ایک آدھ بول پرتھوی راج صاحب سے گوا دیتے تو کم از کم یہ تاریخ تو بن جاتی کہ وہ بھی گنگنا لیتے ہیں!؟

خیر، مگر یہ حقیقت پرستی کا کمال ہے، کہ ایک رات کے ماہر ڈائرکٹر نے اس رسمی عنصر سے اپنی تصویر کو پاک رکھا ہے۔ ایسی مثالیں صرف انگریزی تصویروں ہی میں ملتی ہیں۔

موسیقی ایس۔ کے پال۔ فنِ موسیقی اور قدیم و جدید تقاضوں کے ماہر معلوم ہوتے ہیں، گو ایک رات کی موسیقی۔ نغموں، راگ، راگنیوں اور شوخ آوازوں کا انبار نہیں ہے، پھر بھی نغموں میں شدت کی کچھ مقدار تو ہونی ہی چاہیئے تھی، مگر جو کچھ ہے، وہ دلکش اور دلدوز ہے۔

پس منظر موسیقی کا جہاں تک تعلق ہے وہ نہایت دلنواز ہے تصویر میں رومانی اثر و فضا پیدا کرنا اصل میں پس منظر موسیقی کا کمال ہے۔ یہ ایک ماحول پیدا کرتی ہے اور انسانی روح کو غافل کر کے مسرت و توجہ کے اُس مرکز پر لے آتی ہے جو منظر کا اصل مرکز ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لحاظ سے ایس۔ کے پال بیحد کامیاب ہوئے ہیں۔

ایک رات کی پس منظر موسیقی نے تمام تصویر کے رومانی تعلقوں میں ایک تسلسل و تعلق پیدا کر دیا ہے، اور زندگی و سماج ایک رشتہ میں پروئی ہوئی آنکھوں کے سامنے پھرکنے لگتی ہیں۔

لباس میں راجن (فوجی ڈاکٹر) کے جسم پر فوجی وردی کے ساتھ تلوار کا پرتلہ لٹکانا حیرت کی بات ہے۔ فوجی ڈاکٹر کمرچ نہیں رکھتا، پھر یہ تعلقہ تو ۱۴ روپیہ پانے والے لڑاکا فوجی سپاہی کے لباس کا جزو ہے نہ کہ فوجی ڈاکٹر کا، نِینا کو ساری کے علاوہ زیادہ تر شلوار میں دکھانا سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ مکالموں کی زبان اور کُل تصویر کے کلچر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پنجاب نہیں، یو۔ پی کے کسی ماحول کی کہانی ہے۔ راجہ و مصاحب اور جملہ متعلقین کے جو لباس ہیں اُن سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ تصویر کا ماحول دو آبے کے (بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۱۸۶)

ساغر کی قدیم وجدید نظموں غزلوں اور گیتوں کا ناگری ایڈیشن

رس ساگر

جس کے سرورق کا ڈزائن مشرق کے سب سے بڑے مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی نے بطور خاص کیا ہے

ہندوستانی ادب میں یہ پہلی کامیاب کوشش ہے جس کی بنیاد میں لسانی اتحاد، قومی ملاپ اور ہندوستان ں ایک لنگوا فرینکا وضع کرنے کے خیال کی طرف پورے وثوق کے ساتھ قدم اُٹھایا گیا ہے۔ یہ کوئی ترجمہ نہیں بلکہ اغر کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" کی منتخب نظموں اور نئے کلام کو ناگری رسم الخط میں ایک مرتّب مجموعہ کی حیثیت میں شائع ا گیا ہے اور حواشی میں ان تمام الفاظ کے معنی آسان زبان میں دیدئے گئے ہیں جن کو ہندی جاننے والے سانی سے نہیں سمجھتے۔

کتاب کے لئے خاص طور پر بیلا اینٹک پیپر مل سے بنوایا گیا ہے اور چھپائی ہندوستان ٹائمز پریس دہلی میں ئی ہے۔ سبز رنگ کپڑے کی مضبوط جلد ہے اور ڈسٹ کور سات رنگوں میں چھاپا گیا ہے۔

غرض کہ "رس ساگر" مجموعی طور پر اُردو دُنیا کی طرف سے ہندی سنسار کیلئے اعلیٰ اور حسین ترین تحفہ ہے پ اپنے ہندی جاننے والے دوستوں کو نہایت فخر و مسرت کے ساتھ اس تحفہ کی نذر دے سکتے ہیں۔

ادبی مرکز پونا (صوبہ بمبئی)

Registered No. A 656

ایشیا



PUBLISHED BY —

The ADBI MARKAZ Sagar Press, (India)



اس نمبر کے چند لکھنے والے

جوش ملیح آبادی
محمد یحییٰ تنہا بی اے
نواب جعفر علی خاں اثر بی۔اے لکھنوی
رام پرتاپ بہادر
حسینیہ ایم۔اے
سلام مچھلی شہری
پہنک ناتھ مشرا ایم۔اے

مدیر
ساغر نظامی

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ نے جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرما دی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص قسم کا ناول ہے جس میں زندگی اور سماج کی کامل اور صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گزری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں۔ ناول میں متعلقہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ مُنہ سے بول رہا ہے کہ یہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے کہ اندازِ بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی۔ لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنیکے بعد کوئی ادھورا نہیں چھوڑ سکتا یہی نہیں "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر، تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اس کو پڑھ کر دلی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اسکے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادرِ محترم آنریبل مسٹر فخر الدین علی احمد سابق ریونیو منسٹر آسام کے نام معنون کیا ہے شروع میں فخر الدین صاحب کی تصویر بھی شریک کتاب ہے۔ قیمت عہ/۱۲ علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ :- **مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ**

سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی وادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ حکومت بہار

حکومت سی پی اور حکومت صوبۂ پنجاب

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

(نمونۂ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)

قیمت فی نمبر آٹھ آنہ

ناظم:- آسد یار خانِ اعظم

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ممالک سے)

(ایجنسیوں کو ۲۵ فیصدی کمیشن)

ادبی مرکز میرٹھ

فہرست

ماہنامہ ایشیا

نومبر سنہ ۱۹۴۲ء

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

جلد (۷) | نومبر سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر (۱۰)

۳

نئی زندگی

"ادبی مرکز" میرٹھ سے پونہ میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے !؟

میں تقدیر کا قائل نہیں، مگر حادثات اور اتفاقات کو مانتا ہوں، حادثے اندھا دھند ہوتے ہیں، اتفاقات یونہی، مگر تقدیر مستقل ایک مسئلہ ہے، اس مسئلہ کے ضمنی رشتہ دُور تک بکھرتے ہیں۔ زندگی میں پھیلی ہوئی حماقتوں، حیرتناک تضادوں، بدصورتی کی "قسمت" میں حُسن، اور حُسن سے عفونت کی وابستگی، دولت و حماقت کا ساتھ، سرمایہ داری و جہالت کی ہم آہنگی اور دنیا میں بکھری ہوئی بے اندازہ بھوک اور علالت، افلاس و گرسنگی، یہ تمام غیر متوازن کارخانہ ہے کہ چل رہا ہے اور انسان خیال کرتا ہے یہ اندھی مشینری کسی توازن اور شعور کے ماتحت کارفرما ہے !؟

عقل سوال کرتی ہے کہ شعور و توازن کا تقاضہ تو ترتیب و عدل ہونا چاہیئے نہ کہ محسوس ناانصافی اور دہاڑتا ہوا انتشار !؟

غور کرنے کو بھی جی چاہتا ہے، ہنسی بھی آتی ہے، کل تک چالیس میل سرکنے کی ہمت نہ تھی اور آج ہزار میل کی جست کرنے کی جرأت ہے۔ !!

ایک مہینہ ہی کی تو بات ہے ادبی مرکز میرٹھ سے دہلی منتقل نہ ہو سکا، مگر تازہ دلچسپ حادثہ یہ ہے کہ اس نمبر کے شائع ہونے کے بعد ادبی مرکز اپنے تمام متعلقات کے ساتھ "پونا"، منتقل ہو جائے گا!

اس کی جملہ ادبی جد و جہد بحالہ جاری رکھی جائے گی، مگر جولانگاہ میرٹھ نہیں پونا ہوگا!

دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء و جنوری سنہ ۱۹۴۳ء کے نمبر جنوری کے آخر میں پونہ سے شائع کئے جائیں گے نئے انتظامات کی وجہ سے اگر دیر ہو جائے تو آپ ادارہ کو معاف فرمائیں!

دُنیا کا تو یہ اصول ہے کہ پُرانی زندگی کے مقبرہ پر نئی زندگی کا رنگ محل چنتی ہے، مگر میں اپنے حقیقی فرض کو سمجھتا ہوں کہ میں نے نئی زندگی کی زرکار صبح پر پُرانی زندگی کی گھٹا ٹوپ رات کو قربان نہیں کیا!

پونہ منتقل ہونے کی اصل وجہ بھی کم دلچسپ نہیں، میرے قریبی نقاد اور دوست ہمیشہ مجھ سے کہتے رہے کہ تمہاری ادبی اہلیتیں اپنی گوناگوں نوعیتوں کے لحاظ سے متقاضی ہیں کہ میدانِ عمل فلمی دُنیا ہونی چاہیئے مجھے بھی اندازہ تھا کہ یہ حضرات کچھ درست ضرور کہتے ہیں، مگر اپنی فطرت، اپنے ارادوں، فلمی دُنیا کے خدوخال کے مزاج اور عملی کیفیتوں کا بھی قریب و دُور سے اندازہ تھا، میرا فیصلہ تھا اور آج بھی ہے کہ فلم انڈسٹری کی تباہی اور نقص کی اصلی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کی طرف زیادہ تر اہل قلم توجہ نہیں کرتے بلکہ یہ بھی ہے کہ فلم انڈسٹری جن افراد کے ہاتھ میں ہے وہ ترقی کے حقیقی تصوّر سے عاری ہیں، کسی آرٹ کی ترقی ایثار و قربانی کئے بغیر نہیں ہو سکتی، مجھے افسوس کیساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فلم انڈسٹری کو جو لوگ آگے لیجا سکتے ہیں وہ ایثار و قربانی کو خوف باطل سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک بھی "پیکر" ہی سب کچھ ہے "روح" کچھ نہیں، ان سب لوگوں نے تجارتی طور پر تصویروں کی کامیابی کو حقیقی کامیابی قرار دے رکھا ہے!

جس طرح "ادب" میں رجعت پسندی، اور جاری آرائے کی تائید و ترویج کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، اسی طرح فلم انڈسٹری بھی عوام کو پُرانی دار و ئے بیہوشی

دیتی ہے، اس کا یہ جادو کم نہیں کہ یہ ہر شام کو جاگنے والوں تک کو سُلا دیتی ہے! کسی تصویر میں میں نے نفسیاتی تصادم کی روح کار فرما نہیں دیکھی، وہی سادہ سودا، وہی ناچ، وہی شراب، وہی حُسن، وہی عشق، صدیوں کا تھکا ہوا دقیانوسی اور فرسودہ عشق، برسوں کا لٹا لٹایا بسورتا ہوا حُسن، اُن کا خیال ہے کہ دیسی فرقوں کے رجعت پسندوں نے جو راہ بنائی تھی اُسی پر آج بھی چلا جائے ؎

مگر اس جنگ کے بعد جو دُنیا بننے والی ہے اُس کے بعد فلم انڈسٹری کو چولا بدلنے میں بڑی دقّت ہو گی، زندگی کی موجودہ اقدار اپنا خول توڑ چکی ہیں، اخلاق و اعمال کے درخت میں نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں، اقتصادی اور سیاسی تقاضوں نے انسانی فطرت کو نہنگ بنا دیا ہے، اس رات کے بعد جو صبح ہو گی وہ اپنے ساتھ نئے مرد و عورت لائیگی، ان کے نفسیات جدا ہوں گے، سماجی اصول جدا ہوں گے، اخلاقی تقاضے جدا ہوں گے اور حُسن ہی نہیں عشق بھی نیا روپ دھارن کریگا۔

نئی زندگی کی نئی تکنیک پر فلم انڈسٹری کیونکر اپنی جنس تیار کر سکے گی، اس کے پاس سوچ وچار اور شاہراہِ عمل بنانے کیلئے اگر کوئی وقفۂ راحت ہے تو صرف یہی زمانہ جب زندگی آگ اور خون کے میدانوں میں سینہ بسینہ ہے، اس لئے اُسے چاہیئے کہ وہ نئے تقاضوں کو محسوس کرے، اور انسانی فطرت کے مطابق تصویریں بنائے ؎

یہ خیالات تھے، اور میں جانتا تھا کہ ان کا اظہار بھی فضول ہے، اس لئے جو دوست فلمی دُنیا میں کام کر رہے ہیں اُنھیں کو کام کرنے دینا چاہیئے بہرحال ان دوستوں نے بھی کم خدمت نہیں کی، گو یہ فلمی خداؤں کے شکنجے میں کسے ہوئے کام کرتے ہیں، مگر پھر بھی اپنے فرائض کو فراموش نہیں کرتے ؎

اس مرتبہ بنگلور و بمبئی کے سفر میں، اک موڑ پر یکا یک ایک سخت تصادم ہوا، اس کے بعد جو آنکھ کھُلی تو کیا دیکھتے ہیں ؎

شالامار پکچرز پونہ سے معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں، سامنے ایک نئی دُنیا ہے، نئی زندگی ہے، اور گوناگوں نئی مصروفیتیں ؎

"شالامار پکچرز" بمبئی نے جن معزز اور پُر وقار طریقوں سے میری اور حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی خدمات کو حاصل کیا اُس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ دوسروں سے قدرے مختلف ہے، اس کے ذمّہ دار افراد کے دل میں فلم انڈسٹری کی ترقی اور بہبودی کی بے تاب خواہش ہے، تجارتی مفادات کے ساتھ اس کے پروپرائٹر اور ڈائرکٹر صاحبان یہ آرزو رکھتے ہیں کہ آرٹ اور ادب کے لحاظ سے بھی فلم کا معیار بلند ہو ؎

آرٹ، ادب، اور فلم کے متعلق تبادلۂ خیالات کے دوران میں ہم نے بنیادی طور پر یہ اندازہ کیا کہ شالامار پکچرز کے ڈائرکٹر مسٹر احمد ادب و

۴ زندگی کو سمجھتے ہیں، اور .... وہ چاہتے ہیں کہ فلم کے ذریعہ ادب و زندگی کا ایک ایسا امتزاج پیش کیا جائے جو عوامی تقاضوں کو بھی پورا کرے اور جس کے ذریعہ سماج کے ارتقائی مقاصد کی بھی تکمیل ہو ؎

اس شعور کا یقین کرنے کے بعد میں نے ان کی پیشکش کو قبول کر لیا، جس کے قبول کرنے کے بعد میری زندگی کا رُخ قطعی طور پر تبدیل ہو رہا ہے مگر اس زندگی میں داخل ہونے کے یہ معنی ہرگز نہ لئے جائیں کہ آپ نے جو فرائض میرے سپرد کئے تھے میں اُن سے دست کش ہو رہا ہوں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ادب کے سلسلہ میں میرا جو فریضہ ہے اور جسے میں برسوں سے ادا کر رہا ہوں، وہ اسی توغّل اور شغف کے ساتھ ادا کیا جاتا رہے گا، اور تمام حلقوں سے وہی روابط قائم رہیں گے جو اس وقت تک قائم ہیں۔

خوبصورت، پُرسکون، شریف اور مسافر نواز "میرٹھ" میں میں نے اگست ۱۹۳۲ء میں رہنا سہنا شروع کیا۔ گیارہ برس اس کی محبتناک آغوش میں زندگی بسر کی، ادبی جدوجہد میں اس شہر نے حصّہ لیا یا نہیں لیا، اس تجزیہ کا موقع ہے نہ ضرورت، مگر یہ کچھ کم سلوک نہیں کہ اس کے ہندو اور مسلمان باشندوں، عوام و خواص اور اہل قلم و شعراء نے مجھے خاک پر نہیں اپنے دل میں سُلایا، میں کسی ایک فرد کا نام نہیں لے سکتا جو میری راہ میں حائل ہوا ہو! آج مسافر کارواں سے کٹ کر ایک دوسری طرف جا رہا ہے مگر اہلِ میرٹھ کی ابدی محبّت اس کے سینہ میں درخشاں ہے جو اسے ہمّت شکن تاریکیوں میں بھی راہ دکھاتی رہے گی ؎

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں ؎

ساغر نظامی
ادبی مرکز میرٹھ
۲۳ دسمبر ۱۹۴۲ء

پونہ کا پتہ :-
شالامار پکچرز اسٹیڈیو
پونہ

(صفحہ ۶۸ کا باقی مضمون)

شرم محسوس ہوتی تھی۔ اور اب ..... رانگا اور رنینا دونوں مجرموں کے مانند ونود کا پیچھا کر رہے تھے معصوم بچہ کی طرح ان کے چہروں پر خوف و ہراس اور آنے والے واقعات کی پرچھائیاں ان کو حیران و پریشان کئے دیتی تھیں ان کی حالت اس وقت اُن چڑیوں کے مانند تھی جو باز کی شکل دیکھتے ہی گھبرا سی جاتی ہیں اور آس پاس کی کسی جھاڑی میں چھپ نہیں سکتیں۔ دو مضبوط ہاتھ، دو مضبوط ہاتھ اُن کو پکڑ سکتے تھے اور .... راہگیر... کونسا راہگیر نہ ہوگا جو اُن کو بھاگنے کی اجازت دیدے۔

"کدھر ہے تمہارا گاؤں"

"سرکار۔ سرکار....."

"سرکار کے بچے۔ بتاؤ کدھر ہے تمہارا گاؤں...." تلیبٹی میں کتنے ہی راہگیر اپنے کندھے پر لٹھ رکھے جا رہے تھے۔ رانگا اور رنینا ڈر کے مارے گھبرا رہے تھے۔ گاؤں والوں کا انصاف۔ اُف کتنا سنگین ہوتا ہے اگر اُن لوگوں کو معلوم ہو گیا تو بلا تامل ان دونوں کی لاٹھیوں سے خبر لیں گے۔

"اِدھر سرکار"

"اچھا چلو" پھر تھوڑے توقف کے بعد، نینا کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے ونود نے کہا "لڑکی تجھے اُس سے محبت ہے۔ سچ بتانا۔ تو اس آدمی سے پیار کرتی ہے۔ کیوں۔ !؟"

"سرکار" نینا کے رخساروں میں شرم جھلک اُٹھی۔ اُن کا رنگ برسات کے موسم میں پکے ہوئے آم کے مانند شباب آور بن چلا۔ اودے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی نمودار ہوئی۔ سر جھک سا گیا۔ دونوں ٹانگوں کی کڑیاں آپس میں ٹکرا سی گئیں۔ اُن کی آواز ایک نغمہ میں گم ہو گئی۔ شاید وہ اُس محبت کا اعتراف کر رہی تھی جس کا رانگا اور نینا کی آنکھیں پتہ دیتی تھیں۔ "سرکار" کنول کی ڈنڈی پھر لچک سی گئی۔

ونود جھکا۔ ڈالی سے ایک جنگلی گلاب کا پھول توڑا، اور اپنے ہاتھ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان مسلنے لگا۔ "اچھا تجھ کو اس سے محبت ہے۔ خوب.... جنگلی پھول" تلیبٹی کے سہارے سہارے میدانی علاقہ میں جگہ جگہ گلابی پھول ہوا میں ایک ہلکی ہلکی خوشبو پھیلا رہے تھے۔ رانگا اور نینا دو پیتل کی مورتیوں کے مانند ونود کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ اندھیرا؟ اندھیرا تقریباً ہو سا چلا تھا۔ نئے چاند کی روشنی میں، اُن دو پیتل کی مورتیوں میں چمک اور زیادہ بڑھ چلی تھی۔ ونود نے پھر قدرے توقف کے بعد نینا سے کہا۔

"تو تجھ کو اس سے محبت ہے۔ ایں! ٹھیک .... اور تو اس بات کا اقرار کرتا ہے، تجھ کو اس لڑکی سے محبت ہے"

رانگا مسکرا سا اٹھا۔ پیتل کی مورتی نکھر رہی تھی۔ "ہاں! ہاں سرکار......"

"بہت خوب...... اور تم دونوں اتنے ڈرپوک ہو کہ جھوٹ بولنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اچھا! ...." شاعر کے سامنے ایک چٹان کھڑی تھی۔ نہایت مستحکم..... اور ایک کند پھاوڑہ.... وہ کس طرح اس چٹان کو توڑے۔ ونود سوچنے لگا۔ ان دو گاؤں کی ڈرپوک ہستیوں کے درمیان عجیب قسم کی محبت ہے۔ وہ ڈر کے مارے اپنے گاؤں تو واپس جانے سے رہے۔ اور دوسرے گاؤں میں جاتے ہچکچائیں گے۔ بزدل.... کیا اس میں اتنی بہادری نہیں جو اس محبت کی کو پروان چڑھنے دے شاید گاؤں کے باغی شہر میں ایک نئی لہر پیدا کر دیں.... محض ایک جذباتی چٹان..... بے عمل شاعر کا سپنا.... محبت، رومان، اور وہ خیالات کی چٹان کتنی مستحکم ہے۔ شہر محبت سے آشنا نہیں۔ اور گاؤں میں محبت پھوٹتی ہے، مگر نہایت بھونڈے طریقہ سے پرورش پاتی ہے۔ رانگا اور نینا نئے نکلے چاند کی روشنی میں نہایت خوبصورت نظر آتے ہیں شاعر کی چٹان..... ونود نے سوچا کتنی نرم پڑ چلی ہے۔ اُس نے اپنی عمر کے لمبے سایوں میں جذبات کے ٹیلوں کو پار کر کے رومان کے میدانوں میں ہنستے کھیلتے پھولوں کو ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے دیکھا تھا۔ شاعر۔ ایک تنہا ہستی ہے وہ ہر ایک جاندار کی روح میں پیوست ہو جانا چاہتا ہے اور اُس کا کند پھاوڑا اُس مستحکم چٹان کو توڑنے میں ہمیشہ کوشاں رہتا ہے جو ایک جذباتی اور خیالاتی سکون کی دُنیا کے قائم ہونے میں حائل ہے۔ رانگا اور نینا ڈرپوک لیکن محبت کے پروانے..... ونود جذبات کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ وہ ان دونوں روحوں کو ملانے کی کوشش کرے گا۔ اس آسمان تلے چاند کی پھیکی روشنی میں۔ اس کے دل میں ایک سمندر موجیں مار رہا تھا۔ جذبات کا سمندر....

"رانگا تجھے نینا سے پیار ہے۔ سچ بتانا...."

"ہاں!"

ونود کے ہاتھوں میں دو گلاب کے جنگلی پھول تھے جو اُس نے چلتے چلتے اُن پودوں کی ٹہنیوں سے جدا کر دئے تھے جو اُس تلیبٹی اور میدان میں پرورش پا رہے تھے۔

"دو جنگلی پھول" ونود نے دونوں گلاب کے جنگلی پھولوں کو یکجا کیا "دو جنگلی پھول....." تھوڑے توقف کے بعد.... "رانگا اور نینا دیہات نے تم کو ڈرپوک بنا دیا ہے نا..... ایں!"

پیتل کی مورتیاں ہنس دیں۔ پھیکے چاند کی روشنی میں کچھ آوازیں گونج گئیں۔ ونود چونکا۔ پیتل کی مورتیوں پر اُداسی چھا گئی۔ بہت سے آدمی ایک دم بھاگے آرہے تھے۔

"آجاؤ بھائی......" ایک دیہاتی جس کے کندھے پر لٹھ تھا للکارا۔ تین انسان سہم گئے۔ "آجاؤ چور پکڑا گیا!"

"اچھا!....." آوازیں گونج گئیں۔ تینوں کو ایک گھیرے میں لے لیا گیا۔ "بھاگ کر گئی تھی کلنکن!" "عشق کرنے چلی تھی سسری" ...."ہیر رانجھا......"

"کیوں بے رانگا" ایک آدمی نے رانگا کے ہاتھ کو پکڑا......

"کیوں بے چھوکری کو بھگا کر لایا"

"بھیا مجھے کیوں پکڑتے ہو ناحق..... بھلا میں کیسے گاؤں کی لڑکیوں کو بھگا کر لیجاتا۔ یہ بابو صاحب..... یہ بابو صاحب.... اور میں اِدھر ایک گاؤں سے آرہا تھا۔ نینا ان بابو صاحب کے ساتھ بھاگی جارہی تھی......"

"اچھا! چلئے بابو صاحب....." اُجڈ اور گنوار ہاتھوں نے ونود کی گردن ناپی۔

"سنبھل کر۔ بابو صاحب کو گاؤں لے چلو۔ پنچایت فیصلہ کریگی۔ چل ری چھوکری..... چل!" ٦

نینا رو رہی تھی۔ اُسے رانگا سے اتنی اُمید نہیں تھی۔ انسان مجرم کے بھیس میں کتنا بزدل بن جاتا ہے۔ رانگا..... نینا نے محسوس کیا رانگا کی بانسری ٹوٹ گئی ہے، وہ اسے اَب بجا نہیں سکتی۔ ایک زبردست اور خوفناک مستقبل نے رانگا کے خیالات کو تبدیل کر دیا۔ نینا روئے جارہی تھی۔ اُس نے ایک نئی دُنیا کا خواب بسایا تھا، برگد اور دیودار کے درختوں کے سایہ میں بسنے والی دُنیا کا خواب۔ رانگا کو اپنے زانوؤں کا سہارا دیکر تھکن دور کرنے کا خواب..... جنگلی پھول...... جنگلی پھول ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے۔

ونود چپ تھا۔ وہ ان اُجڈ گنوار لوگوں سے کیا کہہ سکتا تھا۔ اُس کی عقل اُن پر کس طرح غالب آسکتی تھی۔ ونود۔ رانگا۔ نینا۔ ..... عجب مجموعہ.....

گاؤں میں پنچایت لگی۔

صدر اپنی جائے نشست سے کھڑے ہوئے۔ "بابو صاحب کو پنچایت کے سامنے پیش کرو۔"

ونود سر جھکائے پیشی میں کھڑا ہو گیا۔

"اچھا!" صدر نے حقّہ کا ایک کش لگا کر فرمایا۔ "اچھا بابو صاحب! پہلے یہ بتاؤ کہ تم نینا کو کتنے دن سے جانتے ہو۔ سچ سچ بتانا۔ پرماتما کا انصاف سُنا ہے....."

"ہاں! میں نے پرماتما کا انصاف سُنا ہے پنچ مہاشے...... میں اس لڑکی سے تو کیا گاؤں تک سے واقف نہیں۔ رانگا نینا کو بھگا لے جا رہا تھا۔ اُس نے میرے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کیا۔ رانگا نینا سے محبت کرتا ہے۔ یہ تم خود اُن کے دل سے ہاتھ لگا کر پوچھ سکتے ہو..."

"بابو صاحب آئے..... چھوکری کو پیش کرو۔ کیوں ری! تو رانگا کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ ایں! گاؤں کی لاج اتنی سستی..... سچ بتا......"

پنچایت میں ہلکی سی آوازیں بیدار ہو گئیں۔ رانگا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"پنچ مہاشے..... صرف دو بات....."

"کہو"

"کاکا شہر کے آدمی بہت چالاک ہوتے ہیں۔ اور گاؤں کی لڑکی ان بیچاروں کے دھوکہ میں آجاتی ہے۔ نینا پاگلوں کی طرح بابو صاحب کے پیچھے جارہی تھی قطعی پاگلوں کی طرح..... میں نے بابو صاحب کو روکا اور گاؤں کی طرف ہی لا رہا تھا......" رانگا ہانپ سا گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہو گیا، اُس کو پوچھا......" ہاں! تو یہ نادان لڑکی، پگلی سی بابو صاحب کے ساتھ دیوانی سی بھاگی جارہی تھی۔"

نینا خاموش تھی۔ وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ اُس نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ساتھی پرندے نے اپنی محبوبہ کو تنہا پھڑپھڑانے کیلئے چھوڑ دیا ہے اور اُس پرندے کے پر ہوا کی تیزی سے کٹ سے گئے ہیں۔ اُف..... نیلا آسمان، رانگا، بانسری، اور ونود..... برگد اور دیودار کے درختوں کے سایوں میں ایک نئی دُنیا.... دماغ کے سامنے دھندلا دھندلا ماحول۔ چکر، دائرے.... نینا کو غش آگیا پنچایت میں کھلبلی سی مچ گئی.... لوگ نینا کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگے۔

"دیکھا پنچ مہاشے" رانگا نے کھڑے ہو کر کہا۔ "نینا کو اپنی غلطی کا کتنا غم ہے جنگلی پھول، بابو صاحب جنگلی پھول توڑ کر سونگھنا چاہتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں لڑکی کا دل موہ لیا۔ بے چاری گاؤں کی لڑکی......."

نینا ہوش میں آگئی تھی۔

"نینا سچ بتا کیا قصہ ہے۔ آدمی بعض دفعہ بہت چالاک بنجاتے ہیں۔"

"پنچ مہاشے..... پنچ مہاشے۔ پرماتما مجھ کو، تم کو سب کو دیکھ رہا ہے۔ گنگا جلی ہو تو میں قسم تک کھا سکتی ہوں۔ گنگا ماتا کی قسم بابو صاحب نردوش ہیں۔ نردوش..... رانکا" نینا کی بھویں پلکوں پر جھک گئیں اُس کے رخساروں میں شفق کا شہابی رنگ اُتر آیا۔ "میں رانکا کو چاہتی تھی اُس نے دریا پار بانسری بجائی اور میں اُس کے پیچھے پیچھے چلدی۔"

"غلط..... جھوٹی" رانکا نے غصہ کا اظہار کیا۔ "سفید جھوٹ کاکا بالکل سفید جھوٹ۔"

"لڑکی کو اپنا بیان جاری رکھنے دو۔ خاموش....."

"کاکا....." نینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "کاکا میں رانکا کو چاہتی تھی۔ وہ مجھ کو ایک نئی دُنیا میں لئے جا رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہم دونوں مل کر ایک نئی دُنیا بسائیں گے۔ برگد و دیودار کے سایوں تلے......."

آنسو، غم کے موتی۔ "بابو صاحب نردوش ہیں۔"

"اُونہہ" پنچ مہاشے نے اپنی ناک بھوں چڑھائی۔ "نئی دُنیا۔ لڑکی تو کوی بن گئی ہے۔ کتنی بھولی بن چلی ہے.... چل بیٹھ..... بابو صاحب صاف قصہ بتا دیجئے۔ گاؤں کا انصاف شہر کے انصاف سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہ ہم سب انسانوں کا انصاف ہے۔"

ونود کھڑا ہو گیا۔ ایک عظیم مورت، اس کی آنکھیں اداس تھیں وہ ایک عجیب گروہ میں پھنس گیا تھا۔ ایک عجیب ماحول، اُس گروہ کی آنکھوں میں روایتی شبہ تھا۔ دیہات والوں کی آنکھیں شہر والوں میں صرف عیاری جعلسازی، فریب اور دغا بازی کے اور کچھ دیکھ نہیں سکتی۔ ونود کا دل سسک رہا تھا۔ شاعر کا دل..... وہ اپنے جذبات کی دُنیا میں ایک نئی تصویر بیدار کرنا چاہتا تھا۔ ایکدم مختلف تصویر..... وہ پُرانے خداؤں کو نئے زمانہ میں نیا چولہ بدلوانا چاہتا تھا۔ اُس نے چٹان پر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھے بیٹھے، رانکا اور نینا کے لئے ایک نئی دُنیا کی تشکیل کے بارے میں سوچا تھا۔ خواہ وہ برگد اور دیودار کے سایہ تلے ہو یا اُس کے کنج عزلت میں۔ شاعر کا خیال، نئی دُنیا..... اور وہ کند کلہاڑے سے اُس چٹان کو توڑنا چاہتا تھا جو شاعر کو 'بے عمل' کے نام سے چڑاتی ہے۔ شاعر بے عمل۔ اُف..... ونود نے اپنی پیشانی پر تین اُنگلیوں کو پھیرا۔ پسینے کے قطرے زرد مٹی میں گر کر جذب ہو گئے۔ اُف! شاعر اور چٹان۔ اور اس کی ایک نئی دُنیا.... جو وہ رانکا اور نینا کے واسطے برگد اور دیودار کے درختوں کے سایہ میں یا اپنے کنج عزلت میں بسانا چاہتا تھا۔ بھورے بادل آسمان میں تیر رہے تھے۔ ہواؤں نے اُن بادلوں کا سارا رس چوس لیا تھا.....

"پنچ مہاشے۔ تمہاری آنکھ پتہ دے رہی ہے کہ تم کو شہری پر شک ہے ضرور اس بات سے انکار نہیں۔ میرا دل صاف ہے قطعی صاف ستھرا میں ایک چٹان پر جو کہ اُس ندیا سے جو تمہارے گاؤں کے نزدیک سے گزرتا ہے، شاید چھ یا سات میل دوری پر ہے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر رانکا آیا اور نینا کے ساتھ..... وہ دونوں ساتھ گاؤں سے بھاگ کر آئے تھے وہ دونوں ایک نئی دنیا بسانا چاہتے تھے..... پھر میں اُس چٹان سے اترا ان کو دھمکی دی۔ یہ گھبرا گئے۔ کچی پود ٹھہرے معصوم پروانے لیکن میں سمجھتا تھا کہ نینا اور رانکا دونوں کو چاہتے ہیں۔ ان دونوں میں راستہ میں اس بات کا اعتراف بھی کیا۔ اور پھر....." ونود کے چہرے پر ایک رومانی نور دوڑ گیا۔ بھورے بادل اَب بھی آسمان میں دوڑ رہے تھے۔ اور پھر...." اور پھر شاعر کا دل جاگ اُٹھا۔ اُس کے جذبات نے اس کے خیالات پر قابو پالیا۔ اور پھر میں نے سوچا یہ دونوں جہاں بھی جائینگے پکڑے جائیں گے، ان کا جرم.... نہیں ان کا جرم نہیں بلکہ گاؤں والوں کی نگاہوں میں ان کا جرم کھٹکے گا۔ اور گاؤں کا انصاف ان کو کہیں کا نہ رہنے دیگا۔ میں ان کے لئے وہ دُنیا مہیا کرنا چاہتا تھا جس کی ان دونوں کو ضرورت تھی۔ برگد اور دیودار کے درختوں کے سایہ تلے ایک نئی دُنیا......" ونود کا سانس اکھڑنے لگا۔ "بس پنچ مہاشے بس آگے کیا کہوں۔"

رانکا پھر کھڑا ہوا۔ "شہر والوں کی زبان کا اعتبار کیا۔ کاکا! کاکا سُنتے ہو۔ اُس گاؤں میں جہاں عزت کے نام پر نوجوان اپنی گردن تک کٹوا دیں بھلا ایسا کلکرم ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میرا اُٹھا ہاتھ سے چھوٹ کر گھاٹی میں کھو گیا نہیں تو میں اس آدمی وہیں ختم کر دیتا۔"

"ٹھیک ہے۔ رانکا ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ رانکا نے ٹھیک کہا ہے۔ نینا نے اپنے گاؤں کی لاج کھو دی ہے..... شسری..... شاعر کے ساتھ عشق کر رہی تھی۔ ایک نئی دُنیا بسانے۔ برگد اور دیودار کے درختوں تلے..... ہا ہا ہو ہو....."

"خاموش! بھائیو خاموش......"

نینا رو رہی تھی۔ اُس کے دل پر ایک چٹان ٹوٹ پڑی تھی۔ ونود بے بس تھا۔ اُس کے شعور کے ہاتھوں میں ایک کند کلہاڑا تھا جو اُس چٹان کو توڑ دینا چاہتا تھا جو انسانی ترقی کے ہر ایک کام میں حائل ہے۔ اُف کتنی سخت ہے وہ چٹان، وہ محض جذبات کے کند کلہاڑے سے نہیں بکھیری جا سکتی۔ اس کے ہاتھوں نے محسوس کیا کہ وہ دو جنگلی

پھول جن کو اُس نے آپس میں ملانے کی کوشش کی تھی کانٹا بنکر اس کی نازک ہتھیلیوں میں چُبھ رہے ہیں۔ اور وہ اس چٹان کو ہر گز نہیں توڑ سکتا وہ صدیوں سے قائم ہے اور قائم رہے گی۔ پُرانے خدا ایک دم مستقل ہیں۔ انھیں نئی بات بالکل نہیں بھاتی۔ شاعر کی دُنیا بے عمل انسان کی دُنیا ہے۔ اُس دور کا خیال جو صدیوں آگے ہے۔ صدیوں آگے۔۔ .... صدیوں بیتنے پر بھی شاید رانگا اور نینا برگد اور دیو دار کے سایوں میں ایک نئی دُنیا بسانے میں کامیاب نہیں ہوں گے ....

.....اور نینا وہ اس بھیڑ کی آنکھ بچا کر ایک درخت پر چڑھ رہی تھی۔ برگد کا درخت ....

پنچ مہاشے نے کہا ...... فیصلہ۔ پنچایت کا فیصلہ سُننے سے پہلے کچھ کہنا چاہتے ہیں بابو صاحب .....؟"

"کچھ نہیں۔"

"بابو صاحب کی کمر پر سو کوڑے لگائے جائیں۔ بس۔ اور پھر ان کو گاؤں کی طرف سے پیٹھ پھیر کر شہر کی طرف بھاگنے کی اجازت ......

"ہا ہا ہا ....." رانگا ہنس دیا۔ "ہا ہا ہا ......"

ایک! دو!! تین!!! ......

ایک شور۔ "بھاگنا۔ دوڑنا ..... غضب ہو گیا۔ ظلم ہو گیا۔ پرماتما! ....." ایک عجیب ابتری ......

"کیا ہوا"

"کیا ہوا" پنچ مہاشے نے پوچھا۔

"نینا نے درخت پر چڑھ اور پتھروں میں کود کر جان دیدی۔"

"عجیب ...... بابو صاحب کو بہت سزا مل چکی۔ جائیے ......"

ونود ہنس دیا۔ "خوب! ....."

گاؤں کے لوگ اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔ ایک غیر متوقع واقعہ نے ان کو سراسیمہ کر دیا تھا۔

ونود جلدی جلدی گاؤں سے باہر نکل کر بھاگا جا رہا تھا۔ پرانے خداؤں کے قہر سے دُور۔ اور وہ چٹان جس کو اس نے توڑنے کی کوشش کی تھی۔ اب کتنی مستحکم ہو گئی تھی۔

جاں نثار اختر

ایک التجا

ایسی پاگل نہ ہو محبّت میں — میری دیوانگی کو پیار نہ کر
ایک میرے سکونِ دل کے لئے — اس طرح خود کو بے قرار نہ کر
میرے ایّامِ غم کو رہنے دے — اپنی راتوں کو سوگوار نہ کر
دِل کسی اور ہی کا وحشی ہے — اپنے الطاف کا شکار نہ کر
یہ عنایت، یہ مرحمت، یہ کرم — اس قدر مجھ کو زیرِ بار نہ کر
اور کا غم اُٹھا رہا ہوں میں — تو مرے غم کو اختیار نہ کر
جو تجھے پیار کر نہ سکتا ہو — تو بھی اُس بے وفا کو پیار نہ کر

زندگی بے قرار ہے میری
تو اسے اور بے قرار نہ کر

ارشیا۔ نومبر ۱۹۴۲ء

صبح

ساغر نظامی

آزاد نظم

اس مقالہ کی حیثیت استفہامیہ ہے، مسائل کو سمجھانے سے زیادہ سمجھنا میرا مقصد ہے، اس زمانہ میں غیر منطقی اختلاف کی گنجائش کہاں؟ ہم سب ایک ہی مقصد کے لئے مختلف گوشوں میں جدّ و جہد کر رہے ہیں۔ نئے شعور اور ترقی یافتہ مزاج نے اخلاق و عمل دونوں کا سانچہ بڑی حد تک تبدیل کر دیا ہے، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ادبی تنقید اور اس کا لہجہ حیرتناک طور پر بدلا ہے۔ اس عہد کے کسی دو بڑے شاعروں میں غالب و قتیل کا سا مجادلہ نہیں ہوا، شرر و چکبست کی طرح اب مشہور انشا پردازوں کو آویزش کی فرصت کہاں؛ آج ادیبوں اور شعراء کو اٹھانے اور گرانے کے نئے طریقے تو ایجاد ہوئے ہیں، مگر وہ مغربی سیاست کی طرح دقیق ہیں، مشرقی سادگی کی طرح نمایاں نہیں؛

رہے ادیبوں کے گروہ، ان کے مفاد، پروپیگنڈہ، دوستانہ مدّاحیاں؛ اب پرانے ادیبوں میں بھی باقی نہیں، ایک دو تازہ دموں میں اس کی جھلک ہے، مگر صرف جھلک، کیونکہ وہ جانتے ہیں، یہ حربے اب کامیاب نہیں ہو سکتے؛

اب تنقید ذمہ دارانہ طور پر ادب کے اجتماعی فرائض اختیار کر چکی ہے، انفرادی خواہشوں کو فرائض پر ترجیح نہیں دی جا سکتی؛

میرا مطلب یہ ہے کہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اُسے نظم معرّیٰ کے دلدادہ محض میری استفادہ کوشی پر محمول کریں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں زندگی اور ادب کے کسی جزیہ میں رجعت پسند نہیں ہوں؛ سنہ ۲۳ء سے بلکہ سنہ ۱۹۴۲ء تک میری تمام کوششیں بتاتی رہی ہیں کہ میں اجتہاد اور جدّت ہی کا حامی ہوں اور اس پر عامل بھی، اس لئے اس مقالہ میں نظم معرّیٰ کی مخالفت محض اصولی مخالفت ہے، اور یہ محض ایک کوشش ہے اس فارم کو حقیقی طور پر سمجھنے سمجھانے کی؛

کوئی ۱۷ برس ہوئے، مارچ سنہ ۱۹۲۵ء کی ایک رات تھی، فیروزپور (پنجاب) کے ایک عام جلسہ میں سب سے پہلے میں نے نظم معرّیٰ کے دو نمونے تصدق حسین خالدؔ کی زبان سے سنے، اس وقت یہ مسائل کہاں تھے جو اب پیدا ہوئے، ۱۷ برس کا طویل و عریض خلا اس مشاعرہ کے درمیان حائل ہے؛

خالدؔ سے پہلے عظمت اللہ خاں دہلوی نے اسی قسم کے کئی تجربات کئے، عظمت اللہ خاں عروض اور موسیقی کے فن کو فنّی طور پر جانتے تھے۔ خیال و آہنگ کے باہمی ربط اور اس کے فلسفہ سے خوب واقف تھے۔ عظمت اللہ خاں سے پہلے اُردو میں عبدالحلیم شررؔ اور اسمٰعیل میرٹھی کی کوششوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان بزرگوں نے نظم غیر مقفّیٰ کا اک اسلوب جاری کیا۔ ان کے بعد موجودہ نئے فارم کا موجد تاریخی طور پر تصدق حسین خالدؔ ہے جس نے ۱۷ برس پہلے آزاد نظم کا موجودہ فارم شروع کیا؛ اصل میں خالدؔ کی ایجاد بھی بلینک ورس کی تقلید تھی، نہ جدید زاویہ ہائے فکر پیدا ہوئے تھے نہ ذہنی تسلسل، اور نہ نفسیاتی تحریک؛ آٹر بناتے تو کسے بناتے، لوگوں نے سُنا، زیرِ لب ہنسے، خالدؔ بھی سُنا سنو کر خاموش ہو گئے، مگر زندگی کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب کی پرورش کرتے رہے، رسائل میں اس کے نمونے چھپتے بھی رہے، لیکن خالدؔ کو کسی قسم کے دعویٰ کی جرأت نہیں ہوئی، اس کی شاید دو وجہیں تھیں؛

ایک تو وہ جو اوپر بیان کی گئی، دوسرے اُن کی پشت پناہی کے لئے کوئی ایسی پارٹی موجود نہیں تھی جو ہیرو سازی کا فریضہ ادا کرتی۔!؟

آج سے پہلے اگر عبدالحلیم شررؔ اور اسمٰعیل میرٹھی نے اس فارم کو ترک کر دیا تو اس کی کوئی اہم اور بنیادی وجوہ و اسباب ضرور ہوں گے، کیونکہ یہ اصحاب کسی چیز کو محض عوام کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی خاطر اختیار و ترک نہیں کرتے تھے ظاہر ہے کہ انھیں فکر و فن کے اصولوں ہی نے آگاہ کیا ہوگا کہ یہ اسلوب مقاصد کے اظہار و بیان کے لئے مناسب نہیں ہے، یقیناً انھیں یہ تجربہ ہوا ہوگا کہ نظم غیر مقفّیٰ اردو زبان میں خوش آہنگ معلوم نہیں ہوتی۔ اور

مطالب کامل جاذبیت و موزونیت کے ساتھ اس اسلوب میں ادا نہیں ہوتے، یعنی با قافیہ نظموں ہی میں تاثیر و آہنگ اور لوچ پیدا ہو سکتا ہے۔

قطع نظر عظمت اللہ خاں کے اُردو شاعری میں اجتہادی قدم اٹھانے والوں کا نظم غیر مقفیٰ سے یہ اجتناب اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ وہ با قافیہ نظموں کے مقابلہ میں بے قافیہ نظم کے اثرات کے قائل نہیں تھے۔

ہمارے عہد میں تقلید پرست مجددین اس باب میں کئی نوعیت سے متاثر ہوئے۔

(۱) میرا خیال ہے کہ جاپانی شاعری کے ترجموں نے انھیں ضرور متاثر کیا۔

(۲) بلینک ورس کی بنیاد پر ہونے والی کوششوں سے بھی ان حضرات نے اثر لیا۔

لیکن ان اسباب کے علاوہ ایک دلچسپ سبب اور بھی ہو سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی ابھی "ٹیگوری اُردو" اور "شعر منثور" کو نہ بھولا ہوگا جس کی ایجاد ۱۵ سال قبل چند خوش فکر رومانی انشاپردازوں نے کی تھی، اس بدعت کا کچھ مدت تک اردو ادب میں چرچا رہا۔ کیا عجب ہے کہ نظم معریٰ کا تخیل "شعر منثور" ہی سے پیدا ہوا ہو۔

اس پیرایۂ بیان کے اجزاء و عناصر شعریت افروز تھے، الفاظ کی ترتیب، تراش اور در و بست میں نظم کی سی عذوبت و رنگینی تھی یہ بھی نظم معریٰ کی طرح صرف پڑھی جا سکتی تھی، مگر اس کے مقابلہ میں شعر منثور کے اندر ایک خاص قسم کی دلکشی، قوت اور حسن پایا جاتا تھا،

میری رائے میں "شعر منثور" اُس زمانہ کے شعراء سے ذہن کا ایک غیر شعوری مطالبہ تھا کہ وہ روایتی غزل کو ترک کر کے نظم میں وہ رومانی عناصر جوش، شیرینی اور لوچ پیدا کریں جو "شعر منثور" میں پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ذہنی ارتقا نے اُردو شاعری میں ایک نیا رومانی دور شروع کیا، اظہار و بیان کے جدید طریقے ایجاد کیے گئے۔ اور شاعری پر رومانی اثرات چھا گئے۔

گو آپ بلینک ورس کی تاریخ سے واقف ہوں گے، لیکن شاید یہاں بھی اس کی طرف اشارہ نامناسب نہ ہوگا۔

کلاسیکی (یونانی اور رومی) شاعری میں بہت سی ایسی خصوصیات موجود تھیں جنھوں نے یورپ کے شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا، اطالوی شاعر ٹری سنو (Trissino) نے جو سولھویں صدی کے اوّلین نصف حصہ میں موجود تھا اپنی ٹریجڈی (المیہ) سوفونسبی اور رزمیہ نظم اٹیلیہ لبریٹا ڈے گوٹی (Italia Liberata dai Goti) کلاسیکی شعراء کی تقلید میں بلینک ورس میں لکھیں۔

ادھر انگریزی شاعر ارل آف سرے (Earl of Surrey) نے جس کا انتقال ۱۵۴۷ء میں ہوا۔ اس اطالوی شاعر کے اتباع میں ای نیڈ (Aeneid) کا دوسرا اور چوتھا حصہ غیر مقفیٰ نظم میں ترجمہ کیا جو ۱۵۵۷ء میں شائع ہوا۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ارل آف سرے نے انگریزی زبان میں نظم غیر مقفیٰ کو پہلی مرتبہ رواج دیا۔

اس کی اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ کاؤپر جیسے شعرائے مابعد نے ترجمہ کے لئے نظم غیر مقفیٰ ہی کو اختیار کیا، چنانچہ کاؤپر نے خود ہومر کا ترجمہ نظم کی اس جدید طرز میں کیا۔

ارل آف سرے کے کچھ روز بعد سیکول (Sackville) اور نارٹن (Norton) نے نظم غیر مقفیٰ کو درباری ڈرامہ نویسی کے لئے پسند کیا۔ اور اپنی ٹریجڈی گاربوڈک (Gorboduc) ۱۵۶۱ء میں تصنیف کی لیکن مارلو (Marlowe) نے اپنا مشہور ڈرامہ تیمور اعظم نظم غیر مقفیٰ میں لکھ کر عام ڈرامہ نگاری کے لئے اس طرز جدید کو مروّج کر دیا۔

سولھویں صدی کے اواخر سے نظم غیر مقفیٰ کا رواج ہو گیا اور شیکسپیئر نے اس کو مزید ترقی دی۔ اگرچہ یہ ترقی بتدریج ظہور میں آئی۔ کیونکہ شروع شروع میں اس نے اپنے ڈراموں کے بعض اشعار مثنوی کے انداز میں کہے یعنی اس کے اشعار مثنوی کے طرز پر جداگانہ قوافی رکھتے تھے۔ یا کبھی اس طرح پر کہ پہلے مصرعہ کا قافیہ تیسرے مصرعہ سے ملتا تھا اور دوسرے مصرعہ کا قافیہ چوتھے مصرعہ سے۔ لیکن بعد کے ڈراموں میں مقفےٰ اشعار کا طریقہ بالکل ترک کر دیا۔ چنانچہ ٹمپسٹ (Tempest) میں جو آخری عہد کا ڈرامہ ہے، ۱۴۵۸ مصرعہ غیر مقفیٰ ملتے ہیں اور محض دو مصرعہ مقفیٰ۔ اسی طرح رومیو اینڈ جولیٹ (Romeo and Juliet) میں جو (شروع کا ڈرامہ ہے) ۸۱ مصرع مقفیٰ ہیں اور ۲۴۹۰ مصرع غیر مقفےٰ۔ لیکن مقفےٰ مصرع لکھنے میں اکثر اوقات ڈرامہ کے مناظر،

اپنے کردار اور ان کی گفتگو کا بہت خیال رکھا ہے، چنانچہ جہاں جہاں اُسے غنائی شاعری سے اثر پیدا کرنا منظور تھا مثلاً (Romeo & Juliet) میں اُس نے ہمیشہ مقفّیٰ مصرع لکھے ہیں۔ یہی حال مڈسمر نائٹس ڈریم (Midsummer Nights Dream) کا ہے۔

سترہویں صدی میں ملٹن (Milton) نے اپنی رزمیہ نظم پیرڈائز لاسٹ اور پیرڈائز ریگینڈ بلینک ورس میں تصنیف کی، اٹھارہویں صدی میں ینگ (Young) اور ٹامسن (Thomson) اور دوسرے شعراء نے اخلاقی نظمیں بلینک ورس میں لکھنے کو رواج دیا، اور انیسویں صدی میں ہر قسم کی نظمیں اس صنف میں لکھی جانے لگیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام کوششوں میں بحر کا وجود ضرور باقی رہا۔ اس طرح قدیم انگریزی شاعری میں بلینک ورس اُردو کی نظم معرّیٰ سے بالکل مختلف تھی، اور اسے انگریزی شعراء نے
۱۲ منظوم ڈراموں میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اختیار کیا لیکن نظم معرّیٰ کے پیش نظر اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو اس کے سلسلہ میں بے قافیہ نظم کام آسکتی تھی، معرّیٰ نہیں۔

انگلستان کے علاوہ جہاں تک فرانس میں اس کا تعلق ہے یہ کامیاب ثابت نہ ہوسکی۔ اگر نظم معرّیٰ کا تعلق فنی اور فکری تبدیلیوں سے ہوتا تو فرانسیسی ادب کے لئے اس سے گریز ناممکن ہو جاتا۔ کیونکہ فرانس کی سرزمین نے موپاسان، فلابیئر، والٹیر اور روسو جیسی ہستیوں کی تمام فکری اور فنی کوششوں کو قبول کیا۔

فنونِ لطیفہ میں نظم وتناسب کا تخیل

آئیے اب ذرا اس مسئلہ کو اور گہری نظر سے دیکھیں اور جواز و عدم جواز کو تلاش کریں، آپ جانتے ہیں کہ زندگی میں نظم وتناسب کے اظہار کا دوسرا نام "تمدّن" ہے اور فنون لطیفہ اس نظم وتناسب کو عام کرنے کا ذریعہ، نسل انسانی نے کروڑوں برس میں حیوانی زندگی سے ترقی کرکے ایک تہذیبی تخیل کو مکمل کیا، تعمیرات، شاعری، مصوّری، نقاشی، سنگ تراشی، رقص اور موسیقی میں بتدریج ارتقائی شانیں پیدا ہوئیں۔ نینوا اور تاج محل کے طرز تعمیر کے درمیان قرنوں کا خلا ہے، اس خلا کو انسانی تمدّن کی پیہم کوششوں نے خون پانی ایک کرکے اس تعمیری وجمالیاتی آئیڈل کو نمود دی جس کا مجسمہ تاج محل ہے۔

انسان کی اس قسم کی کوششوں میں عظیم مقصد کی جھلک نظر آتی ہے، اس کا جمالیاتی احساس قرنوں سے حُسن کاری میں مصروف ہے، انسانی روح کے اولین مقاصد یہی معلوم ہوتے ہیں کہ زندگی میں حسن وتناسب کو فروغ ہو۔

اہرام مصری کے تصویری نقوش اور مغل آرٹ کے مابین نقّاشی نے جتنے منازل طے کئے وہ تناسب کے ارتقاء اور رواج کو پیش کرتے ہیں، زوال وترک کو سامنے نہیں لاتے۔

اسی طرح سنگ تراشی، رقص اور موسیقی میں تمدّنی زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ نظم وتناسب پیدا ہوا نہ کہ انتشار اور بے ٹھکاپن۔

انسانی زندگی خود تناسب پسند ہے، ہم ہر قدم پہ بکھراؤ کے نہیں نظم وتناسب کے آرزومند ہیں، اعلیٰ زندگی خود اک نظم کے ماتحت ہے۔

اگر کوئی عمارت نظم معرّیٰ کی تیکنک پر تعمیر کی جاتے تو میرے خیال سے لوگ شہری زندگی ہی سے دست بردار ہو جائیں۔

فنون لطیفہ میں "شاعری" کا ایک مخصوص درجہ ہے، پہلے انسان کو شعر کا احساس ہوا یا ترنّم کا، اول اول انسانی روح میں جذبات کا طوفان اُٹھا یا گنگناہٹ کا، بہرحال یہاں اس سے بحث نہیں، مجھے اس سے بھی بحث نہیں کہ سب سے پہلے دنیا کے اوّلین شاعر نے نظم معرّیٰ قسم کی شاعری کی یا باقافیہ غزل کی، لیکن بہرحال تمدّنی شعور کے بعد موسیقی کی بنیادوں پر فن عروض مدوّن ہوا۔

فن کی تاریخ دہرانا مقصود نہیں، مجھے یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ شاعری میں جو اصناف وضع ہوئیں ان کے فرائض، اثرات اور مقاصد کے لحاظ سے جدا جدا تھے، یہ اصناف سخن امراء القیس و ابو نواس سے لیکر ولی و جوش تک اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔

عربوں نے مقاصد کے لحاظ سے بحریں ایجاد کیں، رجزیہ بحور علیحدہ، بزمیہ الگ، حکیمانہ مسائل کو بیان کرنے کے لئے رباعی اور قطعات کی بحور جدا ہیں، غرضیکہ اظہار و بیان کے جتنے ذرائع انھیں درکار تھے اُن کے لحاظ سے فن کی ایک باقاعدہ تیکنک ہی پیش نہیں کی بلکہ اُسے مکمل بھی کردیا۔

اور اس فن کی بنیادوں پر عربی و فارسی کی وہ عظیم الشان شاعری پیدا ہوئی جس کا پرتو مغربی زبانوں پر بھی پڑا۔ گوئٹے جیسے شاعرِ اعظم نے خواجہ حافظ سے اثر لیا؛ طامس مور نے بھی اپنی مثنوی "لالہ رُخ" کی بنیاد اسی شاعری کے کلچر پر رکھی جس میں بحر بھی تھی اور قافیہ بھی؛

فارسی کے توسط سے اردو شاعری میں بھی عربی بحور و اوزان کو اختیار کیا گیا متقدمین چاہتے تو سنسکرت فن عروض کو بھی اختیار کر سکتے تھے، ماتراؤں سے بحریں بنانے کا طریقہ ہندی میں عربی طریقہ سے کہیں آسان ہے، لیکن عربی بحور کے اوزان موسیقی کے اصولوں پر قائم کئے گئے تھے اس لئے ان میں مقاصد کے اعتبار سے مخصوص جوش، اثر اور رس پیدا کرنے کی اہلیت زیادہ تھی؛

یہ تمام کوششیں متمدن انسانی سماج کو اور بھی آگے بڑھانے اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہوئیں یعنی شاعری اور انسانی معاشرہ میں مضبوط افادی روابط ہیں، خواہ وہ ماضی میں کسی دربار شاہی کے اندر قصیدہ خوانی سے تعلق رکھتے ہوں خواہ آج کسی سنیما میں نغمہ فشانی سے؛

شاہی دربار سے لیکر سنیما کے پردہ تک باقافیہ اور غیر مقفّٰی نظم نے ان افادی روابط کو باقی رکھا۔ اور سماج کے تقاضات کو پورا کیا؛

سوال یہ ہے کہ نظم معرّٰی کا کیا فن ہے؟ کیا فن کی تیکنک ہے؟؟ اور زندگی میں اس کی کیا افادی حیثیت ہے — !؟

اس وقت تک ہر زبان میں موسیقی اور شاعری کی ربط ہم آہنگی انسانی مقاصد کو مکمّل کرتی رہی، اصناف سخن میں مسدّس نے اخلاقی حِس کو بیدار کرنے کا فریضہ ادا کیا، مسدّس ملّی اور اجتماعی احساس کو جگانے والے جذبات کہنے کے لئے بہترین صنف ہے؛ مخمّس و مثلّث تفسیر و تشریح مطالب کے لئے موزوں ترین فارم ہے

ترجیع بند اور ترکیب بند مسلسل مسائل اور موضوعات کو بیان کرنے کے لئے خاص اصناف ہیں۔

رباعی خاص طور پر اجمال کے ساتھ حکیمانہ احساسات و جذبات کو نظم کرنے کے لئے بہترین ذریعہ ہے؛ اور غزل ہمارے صنفی جذبات کو چھیڑنے کے لئے دلدوز مضراب!

غزل کا اصل مقصد بذاتِ خود حُسن یا اس کے لوازمات نہیں؛ بلکہ اس کا فریضہ حسن سے تعلق رکھنے والے جذبات و کیفیات کا مطالعہ ہے مومنؔ سے لیکر حسرتؔ و جگرؔ تک غزل انسانی روح کی باطنی تڑپ کی آئینہ دار ہے؛

غزل کا تدریجی ارتقار یہ بھی بتاتا ہے کہ درجہ بدرجہ اظہار و بیان میں کس طرح شائستگی و ضبط پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور ماحول کے اثرات سے احساسات و جذبات نے نئے طریقہ ہائے اظہار کو کس طرح قبول کر لیا۔

حالیؔ نے اُردو شاعری میں اصلاحی و افادی عناصر کو جگہ دی، اور وہ اقبالؔ و جوشؔ تک اسی رنگ میں بڑھتی گئی یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے کہ وہ افادیت کی صحیح سمتیں اختیار کر سکی یا نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاعری میں زندگی کے نمایاں مسائل سیاست و مذہب کو جگہ دی گئی جو واردات حسن و عشق اور صنفی احساسات سے بالکل مختلف تھے، ان عناصر کی آمیزش نے یقیناً ایک نئی شاہراہ تیار کی جس پر اُردو شاعری مسلسل ترقی کا سفر کرتی رہی؛

مثنوی نے شاہنامہ سے لیکر "رموز و اسرار" تک انسانی
۱۳ تمدّن، کلچر اور تاریخ و تہذیب کی خدمت کی اور انسانی روح کے احساساتی اور جمالیاتی فرائض و مقاصد کو کامل طور پر پورا کیا۔

مثنوی کے ارتقار نے موجودہ نظم کی تخلیق کی، جدید ایرانی شاعری میں نئے وطنی اور قومی احساسات کی بنا پر نئے اسالیب اور طریقے ایجاد ہوئے، اقبال اور اُردو کے دوسرے شعراء نے انھیں اپنایا —— صرف اپنایا ہی نہیں بلکہ اپنی اپنی ذہانت سے کام لیکر خود بھی نئے فارم ایجاد کئے۔

ان سانچوں میں ہر قسم کے جذبات و احساسات ڈھال لینے کی کامل صلاحیت ہے؛ خاصکر مطلعانی نظم کا رواج سب سے زیادہ ہوا، اور بیانیہ شاعری کے لئے اسی اسلوب کو مخصوص کر دیا گیا۔

اردو شاعری سے قطع نظر ہندی کیا شاہیں دادرا، ٹھمری کجری، خیال، لاؤنی، ہر صنف کا ایک جداگانہ مصرف ہے اور وہ اُسے پورا کرتی ہے لیکن ان تمام اصناف کے مقابلہ میں نظم معرّٰی کے آئیڈل فارم کی اتنی بھی افادی حیثیت نہیں کہ کوئی اسکو جی ہی جی میں گنگنا بھی لے؛

تیکنک تو خیر کیا وضع ہوگی مگر واقعی یہ اہم سوال ہے کہ ہم اسے اگر گانا چاہیں تو کس طرح گائیں؛

بحری اور مقفے شاعری کا ئی جا سکتی ہے، موسیقی میں غزل کو ایک درجہ اب بھی نصیب ہے جو اسے گیتوں سے ممیّز کرتا ہے گیتوں میں جنسی محرّکات تو ہوتے ہیں اور ان کو سنکر صنفی احساس کی پیاس بھی بجھ جاتی ہے، لیکن کبھی کبھی روح ان مدارج سے آگے نکل جانا چاہتی ہے، یہاں اُسے غزل کے عناصر تسکین بخشتے ہیں؛

غزل میں اول تو جنسی محرّکات گیتوں کے مقابلہ میں بلند اور پاکیزہ شکل میں ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی اس میں وہ چیز بھی مل جاتی ہے جو انسانی روح کو صنفی احساس سے بلند کرتی ہے؛

دیہاتی گیت ہمارے جذبات واحساسات میں تلاطم پیدا کر سکتے ہیں، ہمیں سپنوں میں گم کر سکتے ہیں لیکن نظم معرّیٰ تو سوسائٹی کو اس قسم کی ثانوی مسرّت بھی نہیں دے سکتی۔ !؟

معاف کیجئے یہ تو ہماری حسِ موسیقی کو کچل دینے کا سامان بہم پہنچاتی ہے، میں یہ ادب جاننا چاہتا ہوں کہ آخر نظم معرّیٰ کا زندگی میں کیا فریضہ ہے —— !؟

اقبال کے بعد اُردو شاعری میں کچھ اور نئے مسائل کا اضافہ ہوا، اصل میں خود اس کے یہاں بھی ان مسائل کی ہلکی ہلکی علامتیں پائی جاتی ہیں۔

عالمگیر بحران، سیاسی نظریوں، سماجی تبدیلیوں اور سیاسی شعور و اقتصادی کشمکش نے انسانی ذہن و شعور کو اور بھی جگا دیا، زندگی کی قدریں بدلیں، محبّت کا نظریہ تبدیل ہوا، آدمی کا ذہن نئی استفہامی کیفیت سے دوچار ہوا، مزدور، سرمایہ، سرمایہ دار، ملکی غلامی، کلچرل مساوات کا مطالبہ، غیر طبقاتی نظامِ حکومت کا تصوّر، ایک آزاد اور ملے جُلے سماج کے ڈھانچے کا تخیّل، یعنی زندگی کو نئے روپ میں دیکھنے کا شوق انسان کو پیدا ہوا، اس سلسلہ میں گنگا اور جمنا کے ساحلوں سے شاعروں کی جو نوجوان نسل موج لیتی ہوئی اٹھی اُس کا ادب پر بڑا احسان ہے؛

اسرار الحق مجازؔ، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، سلامؔ مچھلی شہری، جذبیؔ، جاں نثار اخترؔ، شہابؔ، احسانؔ جمالؔ اور دوسرے شعراء نے اس نئی افادیت کا فریضہ ادا کیا جس کا مطالبہ اُردو شاعری سے وقت اور ماحول نے کیا تھا اس نئے تصوّر کو پروان چڑھانے میں ڈاکٹر اختر حسین کے "مقالۂ زندگی و ادب" اور ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کی کوششوں نے نہ صرف اپنے ماحول کو متاثر کیا بلکہ دکن اور پنجاب کو بھی؛

پنجاب میں احمد ندیم قاسمی اور چند شعراء، دکن میں مخدوم محی الدین اور بعض دوسرے شاعروں پر بھی اثر ڈالا، ان تمام اصحاب نے اپنی شاعری میں اُن عناصر کو کم و بیش قبول کیا جو ماحول کا تقاضہ تھے، اور جن کی طرف "نئے ادب" کی تحریک نے اشارہ کیا تھا، لیکن ان تمام شعراء نے با قافیہ شاعری کو اپنا میدان منتخب کیا اور اسی میں نئے فارم بھی ایجاد کئے، اس طرح نئی دنیا کی ترجمانی کے لئے شاعری کے نئے دروازے کھل گئے؛

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عشقیہ، اخلاقی، انقلابی، اور اشتراکی عناصر کے علاوہ اُردو شاعری میں وہ کون سے عناصر ہیں جو باقی رہ گئے، یعنی جدید نظم کے دائرہ سے باہر ایسے کون سے بنیادی تصوّرات یا فکری و تجرباتی احساسات کا وجود ثابت ہوتا ہے جن کے لئے سوائے نظم معرّیٰ کے چارۂ کار نہ ہو؛

کیا نظم معرّیٰ کے ماننے والوں کے پاس ایسا کوئی منفرد عنصر علیٰحدہ موجود ہے جیسا کہ غزل کے مقابلہ میں اصلاحی و قومی تخیّل کی صورت میں حالیؔ کے پاس موجود تھا —— !؟

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نظم معرّیٰ کا مقابلہ حالیؔ سے پہلے کی غزل یا نظم سے مقصود نہیں ہے، بلکہ جدید نظم سے ہے، جس میں بحور و قوافی کی پابندی کی جاتی ہے، اور با قافیہ نظم کہنے والے نئے شعراء ان تمام مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں خود ہی کوشاں ہیں،

نظم معرّیٰ محض ایک فارم ہے، اور فارم محض اک ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے، اصل شے احساسات و خیالات ہیں، اگر ان میں جدّت پیدا کر لی جائے، ان کے لئے نئے الفاظ اور جدید استعارات بھی وضع کر لئے جائیں، اور پھر ان تمام عناصر کو بحور و قوافی سے ہم آہنگ بھی کر لیا جائے تو میرے نزدیک یہ ایک اعلیٰ اور مکمّل اجتہاد ہوگا؛

عشقیہ شاعری، رزمیہ شاعری، مرثیہ، غزل، گیت، غرضیکہ تمام اصنافِ سخن اپنے اپنے موضوعات جدا گانہ رکھتی ہیں، سوال یہ ہے کہ نظم معرّیٰ کا کونسا متمیّز موضوع ہے؟! کیا صرف جنسیت !؟ یا صرف یاس پرستی !؟ اور کیا صرف منفیّت !؟!

ہم سے کہا جاتا ہے کہ:۔

"ہمارے اکثر اوضاعِ سخن اب بھی جدید خیالات کے سیلاب

کا ساتھ نہیں دے سکتے"۔

آئیے ان نئے خیالات کا سیلاب بھی دیکھ لیجئے جن کے لئے نظم معرّیٰ ایجاد کی گئی ہے:

اس کا چہرہ اُس کے خد وخال یاد آتے نہیں
اک شبستان یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پہ سیج
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
ان بتوں کی بے حسی پر خشمگیں
اُجلی اُجلی اونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ

فرش پر قالین، ایرانی اور ہندی تمدّن کی نشانی ضرور ہے، لیکن قالینوں پہ سیج !؟!

اس کا چہرہ، اس کے خد وخال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے

جدید خیالات کا تو ذکر ہی کیا' ان خیالات اور اعمال کا کوئی معیار نہیں معلوم ہوتا، مثبت اور تعمیری روح کا قطعی فقدان ہے ، یہ سطور معاف کیجئے روحِ انسانی کے ابتذال کی کچھ اچھی مثال نہیں، یہ مدنی زندگی سے بدوی خیالات کی طرف صریح رجعت ہے، کہ ساری قوم کے ظلم وستم کا انتقام ایک عورت سے لیا جائے ۔

اور اس سے زیادہ یہ کہ شاعر کا ادراک وایقان مشکوک ہو جاتا ہے کہ اپنی اس حرکت کو جو قطعی ذاتی وانفرادی ہو سکتی ہے اجتماعی اور اخلاقی حیثیت دیتا ہے۔ خودکشی، شرابی، بے کراں رات کے سناٹے میں، رقص، شاعرِ درماندہ، یہ سب نظمیں گریز، منفعیّت اور کھلی ہوئی جنسیت سے لبریز ہیں!

دوسرے اسی قسم کے شاعر صاحب کی نظم "امروز و فردا" کے عنوان سے سنیئے:

ایک صحرائے عظیم
جس کی بے اندازہ پہنائی کے آگے سرنگوں
آسمانوں کی بلندی اور شکوہ
تند اور وحشی بگولوں کا خروش
بادِ تابستان کے سمّی نفس
ہانپتا ہو جیسے اگنی دیوتا
خشک اور بے برگ پیڑ
یا بہار رنگ و بو کی نوحہ خوانی کے نقوش؟

(پہلا بند)

سوکھے سوکھے سخت "ٹھنٹھے"

شاید آپ ٹھنٹھے کو نہیں سمجھے (ٹھنی کا شوہر)
اس میں جدید خیال پوشیدہ ہے یعنی یہ نظم معرّیٰ کی "جدید اشاریت" ہے۔

۱۵ سوکھے سوکھے سخت ٹھنٹھے ـــــ ہاتھ پھیلائے ہوئے
جیسے عفریتوں کی آہیں منجمد
اور ان پر سرنگوں
اونگھتے سہمے ہوئے بیمار گدھ

لیکن اس کے بعد

(یعنی یہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے یہ ندّی کی طرف اشارہ تھا جس میں "ٹھنی" کے شوہر بہہ رہے تھے)

لیکن اس کے پار ـــــ افق کی سطح پر
جاگ اٹھا جیسے گلستانوں کے جوبن کا نکھار
ناچتی پھرتی ہے رنگوں کی بہار
جگمگاتی ہے شفق
یعنی مستقبل کی تابندہ اُمیدوں کی شفق

ذہنی تسلسل اور زندگی کا مربوط زاویۂ حیات

نظم معرّیٰ کے حامی کہتے ہیں کہ ہمارے یہاں نفسیاتی تحلیل اور جذباتی تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور ان دونوں کے ہم آہنگ ہونے سے ایک آزاد تسلسل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور شاعر نفسی تجزیہ اور جذباتی تسلسل کے بہاؤ میں ہم آہنگی

پیدا کر کے ذہن بد شعور میں سے آزاد تسلسل کو وجود میں لاتا ہے۔

لیکن شاعر اپنے شعری تخلیق کے عمل سے بھی ایک حد تک آگاہ رہتا ہے، خود نظم معرّیٰ والے یہ تسلیم کرتے ہیں، اس لئے جب تک یہ واقفیت صحیح حقائق سے رابطہ نہ رکھتی ہو، آزاد تسلسل اس قسم کے غلط تصوّرات پیدا کر دیتا ہے جیسے کہ راشد کی نظم انتقام، خودکشی، رقص گاہ، شرابی وغیرہ میں پائے جاتے ہیں، اور ان سے جذبات کے سبلی میشن کے لئے نئی راہیں پیدا ہونے کے بجائے ذہنی جنریشن اور گریز کی کیفیات اور بھی تیزی سے ابھر آتی ہیں۔

زندگی میں ہر طرف خوفناک کہانیاں ہیں، جذبات کا اُتار چڑھاؤ ہے، روایات کی تاریکیاں ہیں، گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے اگر شاعر صحیح نفسیاتی تجزیہ اور فکری حقائق سے آگاہ نہ ہوگا تو اسکی طرف سے طرح طرح کی بیماریوں کا اظہار ہوگا جو پورے سماج میں اپنا زہر پھیلا دیگا (جیسے کہ انتقام میں بدوی عہد کے جذبات کا اظہار ہے) ظاہر ہے کہ آزاد تسلسل نظم معرّیٰ کے ہاتھ میں زہر کی طرح ہے کیونکہ صحیح حقائق سے منسلک کر کے اسے صحت مند
16 صورت اور مربوط زاویۂ حیات کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکا

احتشام حسین کا خیال ہے کہ

ادب اور آرٹ کے اندر پیدا ہونے والی بیماریاں عام طور سے متعدل ہوتی ہیں، ان کا زہر بڑی تیزی سے پھیلتا ہے، ہوشیار ڈاکٹر سنکھیا دیتا ہے تو جانتا ہے کہ اس سے وہ کیا کام لینا چاہتا ہے، اور وہ زہر کو کس طرح تریاق بنا سکتا ہے لیکن ایک عطائی کے ہاتھ سے سنکھیا کھا لینے کا نتیجہ ظاہر ہے۔

جنسیت کوئی بیماری نہیں ہے، انسانی فطرت کا ایک صحت بخش فعل ہے لیکن راشد کے یہاں یہ بیماری کی صورت میں نظر آتا ہے، کسی مثبت حقائق کے بغیر آزاد تسلسل انسانی جذبات کے لئے ایک مہلک آلہ ہے، جیسے ہر کسی کو سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ جذباتی تسلسل کو مثبت آزاد تسلسل کی صورت میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، آج ذہن پر اس قدر وسیع گوناگوں اور تیز احساسات و جذبات کا عکس پڑ رہا ہے کہ ان کی وسعتیں تخیل کی دنیا کی حدوں سے جا ملی ہیں، اس لئے جب تک صحیح تشکیل و تخلیق کے لئے یکسر نئی اقدار کامل نہ ہو جائیں، اور ایک متوازن تشکیل یافتہ ذہن نمودار نہ ہو جائے آزاد تسلسل طوفان، دہشت اور شکست و ریخت کی لامتناہی فضائیں پیدا کرے گا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم معرّیٰ کی تیکنک میں آزاد تسلسل بالکل غلط رُخ سے پیش ہوا ہے، وقت کے تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں۔

اب میں آپ کو بتاؤں کہ آزاد تسلسل کی مثبت فضا پیدا ہونے کی وجہ سے کس قسم کے نتائج رونما ہوتے ہیں۔

اوّل تو تمام قوم کی "نجات" شاعر کو اسی میں نظر آئی کہ قومی غلامی کا بدلا، ایک یوروپین عورت سے لیا جا رہا ہے، ایک جگہ ساتویں منزل کے دریچے سے کود رہے ہیں، ایک جگہ رقص گاہ میں زندگی سے بھاگ کر رقص کے دامن میں پناہ لی جا رہی ہے۔

اگر آزاد تسلسل کے معنی یہی ہیں کہ جذبات کی لہروں کو یوں بے مہار چھوڑ دیا جائے تو زندگی میں اس کے نتائج ظاہر ہیں۔

دیسی اور دیہاتی زبانوں کے بازاری گیت جن میں دیہاتی عورتوں اور مرد شعراء نے اپنی دیسی جبلّت کی بنا پر جذبات کو بالکل بے مہار انداز میں ظاہر کیا ہے آزاد تسلسل کے بہترین نمونہ ہیں، ان میں رسیلا ترنم بھی ہے اور کلچرل خصوصیات بھی، اس لئے نظم معرّیٰ ان دلائل کے لحاظ سے بھی کوئی نئی چیز نہیں، البتہ وہ گیت زندگی میں ایک نشاط انگیزی ضرور پیدا کرتے ہیں لیکن نظم معرّیٰ یہ بھی نہیں کرتی۔

نظم معرّیٰ میں ملکی یا بین الاقوامی، قدیم یا جدید کوئی کلچر نہیں، بلکہ تقلیدی ٹکڑے ہیں جو ایک کامل ماحول نہیں بناتے۔

تمام جائزہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مجدّد بننے کے شوق نے نظم معرّیٰ کی تخلیق کی۔ حالانکہ ہر باقی رہنے والی افادی تجدید کا محرک محض شخصی شہرت کا جذبہ ہی نہیں ہو سکتا بلکہ ٹھوس اور بنیادی اسباب ہوا کرتے ہیں، جو از خود ماحول سے ابھرتے ہیں، لیکن نظم معرّیٰ ایک ایسی تقلید ہے جو نہ مشرق میں کھپ سکتی ہے نہ مغرب میں، اور اگر فارسی کے اثرات ہی سے بچنا تھا تو با قافیہ شاعری ہی میں تجدید کی راہیں کھل سکتی تھیں جیسی کہ کھل رہی ہیں! مغرب کے دروازہ پر جانے کی کیا ضرورت تھی، دریوزہ گری بہرحال دریوزہ گری ہے، خواہ وہ ایران کے دروازہ پر ہو یا انگلستان کے گیٹ پر۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ قافیہ سے پیدا شدہ ترنّم کا جواب نظم معرّیٰ نہیں دے سکتی، نظم معرّیٰ کے مقابلہ میں شعر منثور اور ادب لطیف کے ٹکڑوں میں کافی حیات اور تازگی ہے۔

آخر میں میری پُر خلوص آرزو ہے کہ نظم معرّیٰ کے حامی ٹھنڈے دل سے ان دلائل پر غور کریں گے اور ادبی طریقہ کے مشترکہ مقصد کے لئے اپنے زاویۂ نگاہ پر نظر ثانی کریں گے۔

آج کل ادبی رسائل میں بہتات کے ساتھ ایسی نظمیں شائع ہو رہی ہیں جن کا معنی اور بیان، زبان اور خیال کے لحاظ سے کوئی مفہوم نہیں۔

کیسی بدبختی ہے کہ اقبالؔ اور جوشؔ کے بعد اُردو شاعری اہمال اور تباہی کے غار میں اس طرح دھکیلی جا رہی ہے۔

مآلِ محبّت

مجھے مآلِ محبّت سے کیا ڈراتا ہے! — کہ مجھ پہ فاش ہے اے ہمنشیں یہ رازِ کہن!
سوادِ نجد دکھاتی ہے دِل کی تنہائی! — خرد ہو ساتھ تو کر سیرِ پیرس و لندن! 17

سِپاہی

(میرٹھ سے سندیلہ کے سفر میں)

شرعِ حرب و ضرب کا حافظ ہے سپاہی! — ملک و مدنیّت کا محافظ ہے سپاہی!
لشکر نہیں اک قافلۂ بے جگراں ہے — اقوام کی عزّت کا محافظ ہے سپاہی!
اپنوں میں جو ہو حربۂ تہذیب سے عاری — اُس فوج کی ہر جنگ میں قسمت ہے فراری!

عزمی۔ بی۔ اے (علیگ)

ایشیا۔ نومبر ۱۹۴۲ء

سیّدہ یحییٰ میرٹھی

جمہوریت کی ایک نئی قسم

اگر ہم اپنے اقتصادی نظام کو سرمایہ داری سے اشتراکیت میں تبدیل کر دیں تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنے سیاسی اداروں کو بھی بدلنا چاہیئے، کیونکہ موجودہ سیاسی ادارے ہمارے اقتصادی نظام کا جزو لاینفک ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اشتراکی اقتصادی نظام کا قائم کرنا جمہوریت کو ختم کرنا ہے؟ اس کا جواب اکثر اثبات میں دیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ سوشلزم یا کمیونزم کا نتیجہ (یہ الفاظ اس سلسلہ میں بغیر کسی امتیاز کے استعمال کئے جاتے ہیں) جمہوریت، ملکی اور مذہبی آزادی کی تباہی میں مرتب ہوگا اور یہ کہ کسی فرد یا افراد کے ایک گروہ کی غیر ذمہ دارانہ آمریت قائم ہو جائیگی۔ یہ بھی محسوس کیا جاتا ہے کہ خوشحالی اور تحفظ کے حصول کی خاطر بھی ایسی بڑی قیمت ادا کرنا بہت زیادہ ہے۔

اگر سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لئے یہ سیاسی حالات ضروری ہیں تو بلاشبہ خوشحالی کے حصول کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ لیکن دراصل یہ بات نہیں ہے، یہ ہرگز پیش نظر نہیں کہ ہم جمہوریت کو تباہ کر دیں، شہری اور مذہبی آزادی کو ختم کر دیں اور نہ یہ مقصد ہے کہ سوشلزم کے حصول کا کسی فرد یا افراد کی ایک جماعت کی غیر ذمہ دارانہ آمریت کو ذریعہ بنایا جائے۔ برخلاف اس کے پیش نظر یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول اور اس کی تعمیل کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر پھیلایا جائے۔

لیکن یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح یہ بات عمل میں لائی جائے۔ کیا برطانیہ اور امریکہ میں جمہوریت موجود نہیں ہے؟ اگر یہ تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ سیاسی نظام کو ختم کرنے کی تجویز ہے تو یہ کس طرح دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جمہوریت ختم نہیں ہوگی؟ لیکن اس وقت جو چیز ہمیں حاصل ہے وہ محض جمہوریت کی ایک خاص شکل ہے۔ ہمارے موجودہ سیاسی ادارے مخصوص قسم کی سرمایہ دارانہ جمہوریت پر مشتمل ہیں۔ ان کو ذرائع پیداوار کے موجودہ مالکوں کے آباؤ اجداد نے قائم کیا تھا۔ اور ان کو قائم کرنے کا یہ مقصد تھا کہ سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کے لئے ایک موزوں سیاسی ڈھانچہ مہیا ہو جائے۔ ابتدائی سوداگروں اور صنّاعوں کو ایک ایسا سیاسی نظام ملا تھا جس میں نفع رساں سرمایہ دارانہ پیداوار کی پوری ترقی ناممکن تھی، وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ انھیں ایسے قوانین سے بریّت حاصل ہونی چاہیئے جو ان کے تجارتی اور پیداوار کرنے والی جدّوجہد کی راہ میں روڑے اٹکانے والے ہوں انھوں نے اس اصول کو نافذ کرنے کی کوشش کی کہ سرمایہ دارانہ طبقہ گورنمنٹ کو منتخب کرے اور اسی طبقہ کو گورنمنٹ ذمہ دار ہو۔ گورنمنٹ پر اس قسم کا کنٹرول سرمایہ داروں کے لئے نہایت ضروری تھا تاکہ وہ اپنے تاریخی مشن کو پورا کرنے میں پوری توجّہ دے سکیں۔ وہ تاریخی مشن یہ تھا کہ قوم کے جملہ ذرائع پیداوار کو زیادہ سے زیادہ تیزی اور سُرعت کے ساتھ ترقی کی راہ پر لگایا جائے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ نفع رسانی کے لئے ان ذرائع کو استعمال کیا جا سکے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کرتے (اور ان لوگوں پر تلخ تجربہ نے یہ حقیقت واضح کر دی) تو غیر ذمہ دار بادشاہوں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکتے تھے جنھیں امراء اور دوسرے سست وکاہل خوشہ چینوں کے نفع کے لئے روپیہ کی ضرورت پڑتی تھی۔

لیکن سرمایہ داروں کو معلوم ہو گیا کہ وہ عوام کی اکثریت کے بغیر حصول اقتدار کی جدوجہد میں کامیاب نہ ہو سکیں گے وہ حمایت حاصل کرنے میں تو ضرور کامیاب ہو گئے۔ لیکن ایسا کرنے سے حکومت خود اختیاری کے لئے ان کی جدوجہد لازمی طور پر کسی حد تک ہر شخص کے لئے حکومت خود اختیاری کی جدوجہد میں تبدیل ہو گئی جمہوریت کے لئے سرمایہ داروں کا مطالبہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ وہ کل عوام کا جمہوریت کا مطالبہ بن گیا۔ آخر میں جمہوریت کے

بہت سے حقوق مثلاً حق رائے دہندگی صرف سرمایہ داروں ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ تمام جنتا کے لئے ہو گیا۔ ان حقوق کو حاصل کرنے کے لئے صرف سرمایہ داروں ہی نے کوشش نہیں کی بلکہ مزدور پیشہ اور بیچ کے طبقوں نے بھی جد و جہد کو جاری رکھا۔ یہ وہ طبقے تھے جنھیں خود سرمایہ دار پہلے حرکت میں لا چکے تھے۔ دراصل اگر دیکھا جائے تو آخیر مرحلوں میں اکثر جد و جہد خود سرمایہ دار جماعت کے خلاف کی گئی۔ مثال کے طور پر آزادیٔ پریس کا لبرل اصول برطانیہ میں کامیاب ہوا۔ اور اس کا سہرا اتنا سرمایہ داری کے لبرل نظریاتی لوگوں کے سر نہیں ہے جتنا کہ چارٹسٹ تحریک کے مزدور طبقہ کی دلیرانہ جد و جہد کے سر ہے۔ یہ اور دوسرے موجودہ جمہوری حقوق مزدور طبقہ کی طویل اور بہادرانہ جد و جہد کا نتیجہ ہیں۔

باوجودیکہ جمہوری حقوق کی توسیع بتدریج اور خلاف منشا ہوئی لیکن مؤثر سیاسی طاقت اب تک برطانیہ اور امریکہ جیسی سلطنتوں میں سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ جمہوریت کی موجودہ ہیئت کی بنیاد میں قائم کرنے میں اگر عوام بھی سرمایہ داروں کے ساتھ شامل تھے تو یہ انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اگرچہ تمام منافع کا $\frac{9}{15}$ حصہ سرمایہ داروں کے پاس رہا۔ نیز اس مشترکہ جد و جہد میں سرمایہ داروں نے گو کہ باقی لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی، تاہم جس قسم کی جمہوریتوں میں آجکل ہم لوگ رہتے ہیں اُن کے قیام کے لئے مزدور سرمایہ داروں کی امداد کرنے میں براہ راست پر تھے۔ کیونکہ جمہوریت کی موجودہ شکل اپنے مخصوص اداروں کے ساتھ جیسے (ذمہ دار حکومت، پریس کی براہِ راست حکومتی مداخلت سے آزادی، شخصی آزادی کے تحفظات، وقتاً فوقتاً عام انتخابات، پارلیمنٹیں یا کانگریسیں، اور قانونی بادشاہتیں یا قانونی جمہوریتیں) ایک ایسا سیاسی نظام ہے جو سرمایہ داری کے لئے موزوں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جاگیرداری نظام کی تدریجی شکست پر سرمایہ داری ہی وہ واحد ممکن اقتصادی نظام تھا جو قائم کیا جا سکتا تھا۔ پیداواری طاقتیں اور نسل انسانی کا بلوغ ترقی کی جس منزل تک پہونچ چکے تھے ان دونوں کے لحاظ سے یہی نظام مناسب تھا۔ اس کا کوئی اور بدل نہیں تھا۔ موجودہ جمہوریتوں کا تاریخی آغاز اور ان کی موجودہ نوعیت یہ ہے، لہذا ہم بھی اسکی تعریف قدرے مختلف نقطۂ نظر سے اس طرح کر سکتے ہیں کہ ایک خاص طریقہ جس کے ذریعہ برطانوی اور امریکن سرمایہ دار طبقوں نے ابتداءً سوسائٹی پر اقتدار حاصل کیا اور اب اس اقتدار کو تھامے ہوئے ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ سرمایہ داروں نے اپنے مفاد میں حکمرانی کی۔

لہذا انسانی تہذیب کی ترقی کے اس مخصوص مرحلے پر جس میں سے ہو کر ہم ابھی ابھی گزرے ہیں حکومت کی مناسب وضع پارلیمانی جمہوریت ہی تھی۔ بہرحال ہماری موجودہ ضروریات کے لئے موجودہ سرمایہ دارانہ قسم کی جمہوریت نہایت محدود اور غیر مکمل ہے۔ تنہا سرمایہ دار طبقہ کے لئے یہ حکومتی نظام جمہوریت سے قدرے زیادہ ہے، کیونکہ اس نظام میں آزادی کی وہ شرط اوّل یعنی ذرائع پیداوار تک بے روک ٹوک رسائی، بلا شرکت غیرے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ جبتک سماج کے زندہ رہنے کے ذرائع ہی محدود طبقہ کے قبضہ میں رہیں گے اُس وقت تک وہ حکومت کرتا رہیگا۔ اور دُنیا کا مکمل ترین جمہوری دستور بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ وہ اس محدود طبقہ کی آمریت پر نقاب ڈالے یا اس کی مطلق العنانی کو کچھ کم کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہمارے موجودہ سیاسی ادارے یک قلم منسوخ کر دئے جائیں اور ان کی جگہ ایسے دوسرے ادارے لائے جائیں جو جمہوریت کی زیادہ وسیع، زیادہ گہری، اور زیادہ اعلیٰ ترقی یافتہ شکل پیش کر سکیں۔

لیکن یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ نئے جمہوری ادارے کہاں سے آئیں گے؟ کیا یہ سیاسی علماء کے دماغوں میں مرتب ہونگے؟ اس کے برخلاف یہ ادارے محض ان مخصوص اور نئے ڈھنگ کے جمہوری اداروں سے اخذ کئے جا سکتے ہیں جن کی نشو و نما سرمایہ داری نظام میں ہوئی ہے۔ ان اداروں کو ترقی یافتہ بنا کر صف اوّل میں کھڑا کیا جا سکتا ہے تاکہ اقتصادی نظام تبدیل کر کے یہ ادارے نئی شکل اختیار کر لیں جن کے ماتحت ہم حکومت خود اختیاری کی تنظیم کریں۔

بعض مخصوص ادارے اب بھی سرمایہ داری میں ایسے موجود ہیں جن کو سوشلزم کے ماتحت برقرار رکھا جا سکتا ہے، ترقی دی جا سکتی ہے، اور ان کو ممتاز بنایا جا سکتا ہے۔ یہ ادارے سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کے مخصوص اداروں سے مختلف قسم کے ہیں، جیسے کہ پارلیمنٹیں، کانگریسیں، عام انتخابات اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔ ان اداروں کو نہ سرمایہ دار طبقہ نے قائم کیا تھا اور نہ اس طبقہ نے ان سے اُنسیت ہی کا اظہار کیا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ

معروف مثال ٹریڈ یونینیں (انجمن اتحادِ مزدوران) پیش کرتی ہیں۔

ایک طرف تو مکمل طور پر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں (ٹریڈ یونینس) انجمن اتحاد مزدوران موجود ہیں، اور دوسری طرف سرمایہ دارانہ علم السیاست نے یا تو بالکل ہی ان کے وجود کا اقرار نہیں کیا ہے اور اگر کیا ہے تو نہایت مجبوری کے عالم میں۔ اس کے علاوہ عدالتوں کی نظیروں اور مالکان کے اعمال سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں کا غالب طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ اس قسم کے اداروں کی موثر جدّوجہد کو روکنے کی کوشش کریں امریکہ میں بالخصوص کا غذ پر نہ سہی لیکن عملاً حق جماعت سازی کا مقابلہ امریکی سرمایہ داروں نے تشدّد اور طاقت کے ساتھ کیا ہے۔

ٹریڈ یونینس (انجمن اتحاد مزدوران) وہ جمہوری ادارے ہیں جن کا قیام سرمایہ دارانہ نظام میں ہوسکتا ہے اور ہے، لیکن ان کو سرمایہ دارانہ جمہوری اداروں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں سرمایہ داروں نے قائم نہیں کیا۔ ان کے وجود کے خلاف ابتک سرمایہ دار اکثر و بیشتر جھگڑتے رہتے ہیں۔

۲ ان مخصوص جمہوری اداروں میں ٹریڈ یونین وہ پہلی مثال ہے، جو اگرچہ آجکل سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت قائم ہے، لیکن جسے بحال رکھا جا سکتا ہے اور ایک نئے اقتصادی نظام کے ماتحت ترقی دی جا سکتی ہے۔ ٹریڈ یونینس سوشلسٹ سوسائٹی میں حکومت خود اختیاری کی تنظیم کے لئے کافی کام کر سکتے ہیں۔ اگر ان ٹریڈ یونینس کو کافی وسیع کیا جائے اور ترقی دیکر اس قابل بنا دیا جائے کہ ان میں واقعی طور پر تمام مزدور شامل ہو جائیں تو امریکہ اور برطانیہ میں پیداوار برائے استعمال کے نئے اقتصادی نظام کی تنظیم میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔

سوویٹ کے تجربوں سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ سوشلسٹ سوسائٹی میں ٹریڈ یونین اداروں کا کیا ہاتھ ہے، مگر بہت زیادہ جوشیلے منتظمین پیداوار کے خلاف، مزدوروں کے مفاد کا یہ ادارے تحفظ کرتے ہیں۔ ہر صنعت میں جو مزدوری دی جاتی ہے اور ہر کارخانہ میں جو اسامیاں کھولی جاتی ہیں ان کا تعیّن کرنے میں یہ ادارے سب سے زیادہ حصہ لیتے ہیں اور اقتصادی ترتیب و انصرام کا جو مجموعی کام ہے اس کا یہ ایک ضروری جزو ہے کیونکہ مزدوری کا نسبتی معیار ہی پیداوار کی ہر مخصوص شاخ میں مزدوروں کی سپلائی کا تعیّن اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، دوسرے ٹریڈ یونینس ہی وہ موزوں ادارے ہیں جو سوشل ملازمتوں کے سسٹم کا انتظام کر سکتے ہیں مثلاً بڑھاپے میں پنشن وغیرہ جن کا وجود سوشلسٹ نظام میں باقی رہیگا اگرچہ کمیونسٹ سوسائٹی میں ان کی ضرورت نہ ہوگی۔ تیسرے یہ کہ ٹریڈ یونین تمام آبادی کی مشترکہ زندگی کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہر کارخانہ نہ صرف ایک ایسی جگہ ہوگی جہاں پیداوار کا کام جاری رکھا جائے بلکہ اپنے اپنے کلب گھروں، تعلیمی اداروں ہوٹلوں اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے ہوتے ہوئے ہر کارخانہ متعدد باتوں کا مرکز بنجائیگا۔ جس میں اس کارخانہ کے جملہ اراکین (یعنی ملازمین کارخانہ) اچھّی زندگی بسر کریں گے۔

تاہم سوشلسٹ سوسائٹی میں متذکرہ بالا چیزوں کے علاوہ حکمرانی کا زیادہ حصّہ نہ ہوگا۔ مزدوروں کا ایک گروہ جنکو سنڈیکلیسٹ (syndicalist) کہا جاتا ہے اور جو اب معدوم ہے، بسا اوقات یہ تجویز کیا کرتا تھا کہ ٹریڈ یونینس ہی وہ ادارے ہونے چاہئیں جو ملکی حکومت سرمایہ داروں سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ نیز یہ کہ مزدوروں کو چاہیئے کہ وہ اسی طرح ٹریڈ یونینس کے ذریعہ حکمرانی کریں، جس طرح پارلیمنٹ اور کانگریس کے ذریعہ سرمایہ دار لوگ کرتے ہیں لیکن ٹریڈ یونینس اتنے کافی وسیع اور کل چیزوں پر حاوی نہ ہیں اور نہ بنائے جا سکتے ہیں کہ حکمرانی کے عظیم فرض کو پورے طور پر انجام دے جا سکیں۔ یہ تو ایک حد تک جماعتی تنظیمیں ہیں۔ ان میں مزدور بحیثیت بڑھئی، کان کھودنے والے، آمد و رفت کے مزدور یا انجنیر کی حیثیت سے نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ خالص مزدور کی حیثیت سے۔ لہذا مزدور طبقہ کی سیاسی حکمرانی کے عظیم فرض کو ادا کرنے کے لئے یہ ادارے موزوں نہیں ہیں۔ مزید برآں ٹریڈ یونینس آدھے سے زیادہ سرمایہ دارانہ ادارے ہیں۔ اگرچہ سرمایہ داروں کے لئے بسا اوقات مضر ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سرمایہ دارانہ نظام میں چلائے جا سکتے ہیں اور چل رہے ہیں چنانچہ اگر انھیں کبھی بھی اعتدال کیساتھ زندگی بسر کرنے کا موقعہ دیا جائے تو فی نفسہٖ وہ سرمایہ دارانہ طریقۂ پیداوار کے بنیادی مقدمات کو شکست دینے میں مزدوروں کی ضرورت کا کافی طور پہ اظہار نہیں کر سکتے۔

"ترجمہ"

اقبال حسین شوقی - بی اے

ٹیگور اور اُنکے کارہائے نمایاں

رابندرناتھ ٹیگور نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ شاعری اور موسیقیت سے معمور تھی۔ وہ جس خاندان کے چشم و چراغ تھے وہ دینی اور دُنیاوی امتیازات سے مالامال تھا۔ اس خاندان والے جہاں بڑی بڑی جائدادوں اور زمینوں کے مالک تھے وہاں مذہب، ادب شاعری، مصوری اور موسیقی میں بھی دخل رکھتے تھے۔ ٹیگور کے خاندان کا ہر فرد کسی نہ کسی خاص قابلیت کا مالک ہے۔ ٹیگور کے بڑے بھائی دوجندرا ناتھ بہت بڑے فلسفی ہیں، دوسرے بھائی جاتوتر بندرا ناتھ بہت بڑے آرٹسٹ ہیں، ان کے دو بھتیجے ابندرا ناتھ اور گگنندرا ناتھ بنگالی آرٹ کے ممتاز ماہر ہیں۔ تیسرے بھائی جوتندرا ناتھ موسیقی میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ ٹیگور کے والد مہارشی دیوندرا ناتھ ٹیگور ادب، فنون لطیفہ فلسفہ اور فطرت کے شیدائی، صوفی طینت اور اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔ فارسی میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ مثنوی مولانا روم اور کلام حافظ اکثر ورد زبان رہتا تھا۔ عرفان حقیقی کے لئے اُنھوں نے ایک عرصہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر حافظ کی غزلیں گا گا کر گزارا ہے۔ ٹیگور کی شخصیت اور کلام میں ان کے والد کی پاک اور بے لوث روحانی زندگی کی جھلک ہے۔

ٹیگور کی غیر معمولی ذہانت، شخصیت اور کارہائے نمایاں اس قدر ممتاز اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کا پورا پورا اندازہ کرنا سخت مشکل ہے ٹیگور بیک وقت شاعر، ادیب، فلسفی، مصور، انسانی ہمدرد، معلم الاخلاق، مصلح کل، صوفی طینت بزرگ، روشن ضمیر مفکر، سائنسدان اور ماہر تعلیم ہیں، ان کی شخصیت اور کارہائے نمایاں پر تفصیلی بحث اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے، میرا مقصد یہاں ان کی زندگی کے ہر پہلو پر مجملاً کچھ تحریر کرنا ہے۔

ٹیگور جس زمانہ میں پیدا ہوئے وہ بنگال میں نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ ۱۸۳۵ء میں انگریزی تعلیم عام ہوتے اور راجہ رام موہن کی برہمو سماج کی تحریک سے بنگال میں تخلیقی ادب کی بنیاد پڑ چکی تھی، تارو دت، میکائیل دت اور بنکم نے بنگالی نظم و نثر میں رومانیت کی روح پھونکی جس کی تکمیل رابندرناتھ نے کی۔ ٹیگور سے قبل بنگالی شاعری اُردو شاعری کی طرح دوسری زبان کے قواعد کی پابند تھی، اس کی عروض سنسکرت سے لی گئی تھی۔ سنسکرتی عروض کا اصول ہے کہ خفیف اور ثقیل ماتراؤں سے بحر و وزن کی ترتیب ہوتی ہے، بنگالی زبان میں سرے سے خفیف ماترائیں ہی موجود نہ تھیں۔ ہر حرف ثقیل ماترا کا ہموزن تھا۔ شاعر اس بنیادی اختلاف کو سنسکرت آمیز بنگالی میں شعر کہکر مٹاتے آئے تھے۔ ٹیگور نے اس سنسکرتی عروض کی زنگ خوردہ زنجیر کی کڑیوں کو کاٹا اور بنگالی ادب کو اس قید سے آزاد کیا جس میں مدتوں سے وہ جکڑا ہوا تھا۔

ٹیگور کی شاعری کی امتیازی خصوصیت سادگی اور بے ساختہ پن ہے وہ کسی مسئلہ یا حکیمانہ معمہ کو سلجھانے کے لئے شعر نہیں کہتے۔ بلکہ دل پر جو کچھ گزرتا ہے وہ شعر ہو کر ادا ہو جاتا ہے، یہ شعر کسی بنیادی حقیقت اور کائنات کے سربستہ راز کو فاش کر دینے کی وجہ سے زبان پر نہیں آتا، نہ اس کا مقصد کوئی علمی حقیقت یا مفید مطلب اخلاقی نصیحت بیان کرنا ہوتا ہے۔ ایک بے تاب آنسو یا بے اختیار مسکراہٹ کی طرح شعر دل کی کیفیت کی تصویر ہوتا ہے۔ وہ ہمارے سامنے ایک مختلف رنگوں کا پھول کھولتے ہیں، جس کی پتیاں طرح طرح کے رنگوں کی ہیں، تاہم وہ نہایت خوبصورت اور جاذب نظر پھول ہے، ان کا پیام فطری مختلف النوع، ہمہ گیر، روحانی، قدیمی، خوشگوار اور کڑوا بھی ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس قدر خوبصورت اور شیریں ہے کہ وہ مشرق و مغرب دونوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا جاسکتا ہے ان کی نظموں اور نثر کی سامع نواز موسیقیت ان کی داخلی اور ہمہ گیر ہم آہنگی کی صدائے بازگشت ہے "فضا کا گیت" جو کہ کائنات میں موجود ہے اور جسے سنتے سب ہیں لیکن سمجھتے کم ہیں اُسے ٹیگور

نے خود سُنا، سمجھا اور نغمۂ وصوت سے شعر وادب میں منتقل کر دیا ان کا کلام زندگی کی سُنہرے رنگوں سے بنائی ہوئی ایک ایسی تصویر ہے جس کی بوقلمونی میں جذبات کی مختلف النوعی، حیات کی مختلف منازل اور فطرت کی دلکشی و دلفریبی دیکھ کر انسان آئینہ کی طرح حیران رہ جاتا ہے۔

ٹیگور بہت ہی پُرگو شاعر اور زود نویس ادیب ہیں، ان کے صرف گیتوں ہی کی تعداد تین ہزار کے قریب ہے اور ان کا کل منظوم کلام پندرہ ضخیم جلدوں میں سماتا ہے، بنگالی نثر منظوم کلام سے کچھ کم ہے، اور انگریزی تصنیفات بنگالی نثر کے نصف کے قریب ہیں، ان کے بہت سے گیتوں اور نظموں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں نہیں ہوا ہے، اور جن کا ترجمہ ہو چکا ہے ان میں شاعر کے کلام کی ظاہری خوبیاں اشعار کی آمد اور سلاست، خلوص بیان سُروں کی دلنشیں آمیزش فنا ہو گئی ہے، اصل بنگالی میں ہر ایک گیت سادگی، تازگی، برجستگی، بے ساختہ پن، معانی کی نزاکت اور بلندی، بیان کی روانی، الفاظ کے حسنِ انتخاب، موزونیت، ترنم اور سُر تال کی ندرت اور دل کشی میں شاعری اور موسیقی کا لاجواب نمونہ ہے، ترجموں کو شاعر کے کلام کا خاکہ بھی نہیں کہا جا سکتا، ترجموں میں نہ وہ شعری محاسن ہیں، نہ وہ الفاظ کا ترنم، نہ وہ فصاحت و بلاغت، نہ وہ الہامی آمد و روانی، نہ ترکیبوں کی وہ حیرت انگیز برجستگی اور سادگی، جو کہ اصل زبان میں موجود ہے۔ اچھے سے اچھا ترجمہ شاعر کی شاعری کا صرف معنوی پنجر ہے، جس میں اصل زبان کا گوشت و پوست، زندگی، جوانی، اور حُسن کی کمی نمایاں طور پر معلوم ہوتی ہے۔

ٹیگور صرف شاعر ہی نہیں بلکہ موسیقی کے بھی بہت بڑے ماہر تھے، ان کی سماعت اس قدر حساس تھی کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دو دُنیاؤں میں رہتے تھے۔ ایک مرئی شکلوں اور رنگوں کی دُنیا، اور دوسری صوتی شکلوں اور رنگوں کی دُنیا۔ ان کی موسیقی میں غیر معمولی مہارت اور فطری مناسبت نے بڑے بڑے صاحبِ کمال موسیقاروں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ یہ صرف اُنکی لاتعداد مناجاتوں، وطنی نظموں اور گیتوں اور ان کے سروں کے متعلق جو انھوں نے خود بنائے ہیں، یا پُر جوش، سُریلے، دلنشیں اور وجد آفریں نغموں کے متعلق ہی (جو کہ انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف دوروں میں لکھے ہیں) نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کے متعلق بھی جو کچھ انھوں نے صرف موسیقی کے لئے کیا ہے، وہ صرف اپنے گیتوں کے معنی خیز اور وجدانی الفاظ کے ہی مصنّف نہیں ہیں، بلکہ ان گیتوں کے سُر و تال کے بھی مصنّف وہی ہیں۔

ٹیگور کی وطنی نظمیں امتیازی شان کی حامل ہیں وہ شائستہ اور منضبط ہیں۔ اور جھوٹی تعریف، نمائشی بہادری، خود ستائی اور دھمکیوں سے مبرّا ہیں، ان میں سے کچھ ہمارے دل کے ساز پر مضراب زنی کرتی ہیں، کچھ مادرِ وطن کو ہماری روحوں میں جانشیں کرتی ہیں، اور کچھ ہمارے مایوس دلوں کو ہمّت اور اولوالعزمی کے جذبے سے بھر دیتی ہیں، لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی دو مفادوں کی کشمکش، نسلوں کی باہمی جنگ یا پُرانی تاریخوں کی سی ناخوشگوار باہمی رنجشیں نہیں ہیں۔

اینڈریوز فلیچر (Andrews Fletcher) ایک اسکو چستانی محب وطن کے لئے یہ مشہور ہے کہ اس نے گیتوں کے متعلق کہا ہے کہ "اگر کسی انسان کو ہر قسم کے رزمیہ گیت بنانے کی اجازت ہو تو اس کو اس کی پرواکرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قومی قوانین کون بنائیگا"۔ کیونکہ گیتوں اور رزمیہ نظموں کا قوم کے بنانے میں بڑا حصّہ ہے۔ ٹیگور کے گیت اور رزمیہ نظمیں ایک حد تک بنگالیوں کے اخلاق و اطوار، عادات و خصائل (خواہ وہ تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل، خواہ شہری ہوں یا دیہاتی) ڈھال رہے ہیں، اور ان میں ایک نئی تہذیب اور کلچر کی بنا ڈال رہے ہیں، لیکن ٹیگور نے صرف گیت بنانے والے کی حیثیت سے ہی سودیشی تحریک میں حصّہ نہیں لیا، بلکہ ان کے سماجی سیاسی خطبات Social Philosophical addresses اور سالانہ میلے جو انھوں نے تجویز کئے یا جن کے انعقاد کا انتظام کیا۔ اس قومی خدمت کا جزو ہیں، انھوں نے نہایت تندہی کے ساتھ بننے اور دیگر فنون کے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے کام کیا۔ (خصوصًا دیہاتی صنعت و حرفت کے لئے) اور کوشش کی کہ ہندوستان میں تعلیم ہندوستانی ہو، اور حفظانِ صحت، تعمیر و تنظیم دیہات وغیرہ کے لئے نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کیا، محکمانہ رپورٹوں میں بھی ان کی بہت تعریف کی گئی ہے، اور زمینداروں میں (اپنی املاک میں اس قسم کی تدابیر اختیار کرنے کی وجہ سے) وہ بہترین زمیندار مانے گئے ہیں۔

ٹیگور کا کلام جس طرح عالمگیر ہے، اسی طرح وہ خود بھی عالمگیر

انسانی ہمدردی اور ہم آہنگی کے مالک ہیں وہ اس نظریۂ قومیت کے جس نے یورپ میں جنم لیا ہے سخت مخالف تھے انھوں نے اپنی کتاب قومیت (Nationalism) میں قومیت پر بہت زیادہ ملامت کی ہے، وہ قومیت کا مفہوم لوگوں کی ایک ایسی منظم جماعت سمجھتے تھے جو اپنی ذاتی ترقی اور مفاد کی خاطر دوسروں کا مفاد ہر جائز و ناجائز اور ظالمانہ طریقوں سے قربان کرتی ہے، اور چونکہ وہ خود دورِ حاضر میں بین الاقوامیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے، اس لئے ان کی مادر گیتی کی گہری اور عمیق محبت ہر سطحی طور پر دیکھنے والے پر آشکار نہیں ہوتی، لیکن وہ لوگ جو انھیں جانتے ہیں اور ان کے کلام کو سمجھتے ہیں، اور جنھوں نے ان کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا ہے، وہ یہ جانتے ہیں کہ ٹیگور اپنے وطن سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ (وہ خود فرماتے ہیں)

"افسانہ شدہ ماضی سے لائی ہوئی محبت کے ساتھ۔ اور ایسی محبت کے ساتھ جو عہد حاضر میں جاری و ساری ہے اور جسے استقبال میں تخیل کی مدد سے منتقل کر دیا گیا ہے (اپنی مادر وطن کی پرستش کرتا ہوں)"

تاریخ ہندوستان کے عمیق مطالعے نے ان کی محبت کو اور فروغ دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا نظریۂ بین الاقوامیت بھی محکم تر ہوتا گیا۔ بعض مرتبہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے بین الاقوامی اتحاد کے نظریہ کی بنا اس صدی کے پہلے دس سال ہیں، ان کے سودیشی اور عدم تقسیم بنگال کی (Anti partition movement) تحریکوں کے تلخ اور مایوس کن تجربوں سے ہوئی۔ اگرچہ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کل انسانیت کے مشغلوں کیساتھ محبت ان کی لڑکپن کی تصنیفات میں بھی موجود ہے، اور ان کی نظم پیرا ابیسی ([illegible]) میں جو کہ انھوں نے پختہ عمر میں لکھی ہے یہ حقیقت بدرجہ اتم موجود ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے، کہ "ان کا گھر ہر سرزمین میں موجود ہے، ان کا وطن تمام ملکوں میں ہے اور ان کے قریبی رشتہ دار تمام گھروں میں، اور یہ کہ وہ مصمم ارادہ کر چکے ہیں کہ وہ ایسا وطن، ایسا گھر اور ایسے قریبی رشتہ دار حاصل کر کے رہیں گے۔

ٹیگور کی حب الوطنی میں دوسرے ممالک کے لوگوں کی سی نہ تنگ نظری ہے، نہ جنگ جویانہ وطن پرستی، نہ نفرت ہے نہ حقارت ان کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے پاس دنیا میں پھیلانے کیلئے قدرت کا عطا کردہ تبلیغی درس ہے، اس کے ساتھ انھوں نے کبھی اس سے بھی انکار نہیں کیا کہ دوسرے ملکوں کے پاس بھی ان کے خاص پیام اور تبلیغی درس ہیں، وہ مغرب کو حقارت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کی سائنس، اس کی قوت، آزادی، عدل اور انسانی بہبود کی تلاش میں اپنے آپ کو قربان کر دینے کے جذبے کی قدر کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ مشرق مغرب سے حاصل کرے جو کچھ اسے حاصل کرنا چاہیے اور جو کچھ وہ حاصل کر سکتا ہے لیکن ایک فقیر کی طرح یا متبنیٰ کی طرح تعبیر وراثت کے نہیں بلکہ ایک تندرست و توانا انسان کی طرح وہ عمدہ خوراک ہر جگہ سے حاصل کرے، اور اسے اپنے اندر جذب کرے، یہ مشرق کا مغرب سے حصولِ علم، سیکھنے، مستعار لینے، یا نقل کرنے سے زیادہ قوتِ محرکہ حاصل کرنا ہے۔

مغرب بھی مشرق کے ساتھ اختلاط سے لوٹنے اور بیجا فائدہ اٹھانے کی بجائے حقیقی معنوں میں فائدہ اٹھا سکتا ہے، ان کا عقیدہ تھا کہ مشرق صرف اسی وقت مغرب کے پنجوں سے آزاد ہو سکتا ہے جبکہ مشرق اچھی طرح ہر چیز سے باخبر ہو جائے۔ خود کو جانے، خود پر قابو رکھے اور اپنی قدر کرے، اور اسے کوئی کام کرنے کے لئے کسی غیر شخص کے ہنٹر (تحریک) کی ضرورت نہ ہو، اور زندگی اور غور و فکر کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہو جو اس کے اپنے باشندوں سے بھرا ہوا نہ ہو۔

ٹیگور کے ہاتھ مغرب و مشرق بلکہ تمام انسانیت پر پھیلے ہوئے ہیں، رحم طلب کرنے کے لئے نہیں بلکہ مضبوطی سے پکڑنے اور سلامتی بھیجنے کے لئے، وہ نسلوں اور ملکوں میں اولین صلح کرانے اور اتحاد پیدا کرنے والوں میں سے تھے، انھوں نے ہندوستان کا تہذیبی رشتہ جاپان، چین، سیام، اور جزائر ہند سے ان ملکوں میں جا کر پھر سے قائم کر دیا۔ اور ہندوستان میں انگریزوں کے بیجا ظلم پر سختی سے ملامت کرنے کے باوجود انگریزوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں انھوں نے کبھی عدل اور بے تعصبی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ان کی سیاست قومی کاموں میں زبانی اظہار سے زیادہ سماج کو ڈھالنے اور کردار بنانے پر مبنی ہے، آزادی کو وہ دوسرے سیاستدانوں کی طرح بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں لیکن ان کا آزادی کا تصور زیادہ ہمہ گیر اور بنیادی ہے، ان کے لئے کاہلی، بزدلی، جہالت

خود غرضی، عشرت پسندی، توہمات اور بے جا رسموں کے بندھن مذہبی پیشواؤں کا اقتدار اور مذہبی کتابوں کی زنجیریں غیر ملکی حکومت سے زیادہ ہماری غلامی کا باعث ہیں، غیر ملکی حکومت صرف اُن چیزوں کا اثر اور نتیجہ ہے وہ غیر ملکی مداخلت کی عدم موجودگی کو نعمت سمجھتے ہیں اور اس کے خواہاں ہیں۔ لیکن صرف اسی پر ان کی آزادی کے تصور کا دارومدار نہیں ہے بلکہ ان کے خیال میں ایسی باطنی آزادی کا ہونا بھی ضروری ہے جو ایثار، روشن ضمیری تزکیۂ نفس اور انضباط سے پیدا ہوتی ہے، ان کے اس مطمح نظر کا ہندوستانی سیاست اور اس کے انجام دہی کے طریقوں پر بہت گہرا اثر ہوا ہے، وہ روح کو آزاد کر کے پرواز کے لئے پر دینا چاہتے ہیں تاکہ اس کا مشاہدہ وسیع ہو اور عمل کے لئے میدان لامحدود۔ ان کا دلی منشا ہے کہ خوف کو دل سے نکالدیا جائے، لہذا ان کی سیاست اور روحانی دستگیری ایک دوسرے میں ختم ہو جاتی ہے۔

ٹیگور کو پیری اور جسمانی ضعف نے لکیر کا فقیر اور دشمن تحقیق نہیں بنایا، ان کی روح ہمیشہ نئی روشنی کے استقبال کیلئے آمادہ رہی، وہ ترقی پسند مصلح سماج تھے، ان کی ذہنی قوتیں آخر عمر تک بہت بلند اور جوان رہیں، ان کی سب سے آخری شاعرانہ تخلیق ان کی بصیرت کے کسی طرح سے مدھم ہونے یا اس میں وجدان اور آمد کی کمی پر دلالت نہیں کرتی، اور نہ اس میں تکرار کی کوئی علامت پائی جاتی ہے، وہ اس عمر میں بھی ہم سے بہت زیادہ مستعد لکھنے والوں سے زیادہ لکھ سکتے تھے، ان کا یہ شوق تخلیق کی خوشی مافی الضمیر کو بیان کرنا اور برادرانہ پیشکش پر مبنی تھا، کیونکہ وہ اپنی نوع سے محبت کرتے تھے اور انسانی اختلاط و ارتباط ان کی روح کو بہت مرغوب تھا، ان کے مختلف النوع مضامین، لگاتار اور جامع مقالات بمعہ ان کے جو سائنس اور فنوں پر لکھے گئے اور ان کی بہت سے ملکوں کی سیاحت نے ان کو ہمیشہ نئے ذہنی اور روحانی ارتباط قائم کرنے اور معاصرانہ خیالات میں پہلو بہ پہلو ہونے اور انسانی ترقی اور غیر معلوم حکومت میں باخبر (آقا) شہنشاہ کا جھنڈا نسب کرنے کی کوشش میں ساتھ ساتھ قدم رکھنے میں مدد دی، کیونکہ وہ خود سب سے زیادہ زندہ دل اور بیخوف ذہنی اور روحانی باامید اور محققین میں سے تھے۔

لارڈ کرزن نے جب بنگال کے لوگوں کے احتجاج کے باوجود بنگال کو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ تو انھوں نے دل و جان کے ساتھ اس تحریک میں لوگوں کا حق منوانے اور ان کی شکایات کو ہر ممکن طریقہ سے عام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب جمہور کا غصہ اور ناامیدی تخریب پسندی کی حد تک پہنچ گئی تو وہ سب سے پہلے تنبیہ کرنے والے تھے کہ ہندوستانی قومیت کو تشدد پر عمل نہیں کرنا چاہیئے اور مایوس ہو کر اپنا مضحکہ نہیں اُڑوانا چاہیئے، اگرچہ ان کے لئے ہر حالت میں عدم تشدد مذہبی اصول نہیں تھا۔ وہ یکساں طور پر قوموں کے غارت گری کے جذبے اور کاموں پر ملامت کرتے تھے (خواہ وہ فوجی ہوں یا اقتصادی نوع کے) ان کا خیال تھا کہ جنگ رہزن قوموں کے معاہدات سے اُس وقت تک نہیں رک سکتی جب تک کہ وہ اپنے شر سے بھرے ہوئے طریقوں اور ان سے جو نقصان ہوتے ہیں ان پر پچھتائیں نہیں اور انھیں چھوڑ نہ دیں۔ (جنگ) اس کا علاج ان کے نزدیک طمع کو چھوڑ کر ہمسائیگی کے جذبات کو قوموں کے درمیان اس طرح ترقی دینا ہے جیسے کہ افراد کے درمیان ہوتے ہیں لہذا شاعر روشن ضمیر نے بار بار اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں اُپنشدوں کے ان احکام کو بیان کیا ہے:-

"اُن سب چیزوں میں جو کچھ کہ فطرت میں چلتی پھرتی ہیں، خدا جاگزیں ہے، تم اس سے لطف اٹھاؤ جو کچھ کہ اس کی طرف سے تمہیں دیا گیا ہے۔ کسی دوسرے کی دولت پر لالچ کی نظر مت ڈالو۔"

ٹیگور نے اس طرز خیال کی پیروی میں اگرچہ اپنے مافی الضمیر کو واضح طور پر روسی (نئی) حکومت کے تشدد کے استعمال کے خلاف ظاہر کیا ہے، اور اگرچہ ان کا ہمیشہ یہ یقین رہا کہ انفرادی ملکیت کے جائز استعمال پر انفرادی آزادی اور سماجی مفاد کے قیام اور ترقی کا دارومدار ہے، لیکن انھوں نے روسی نظریۂ اجتماعیت کو پرکھا اور اس کے فوائد بیان کئے، جیسا کہ ان کے مندرجۂ ذیل بجری تار سے ظاہر ہوتا ہے جو کہ انھوں نے وی۔ او۔ کے۔ ایس۔ ماسکو کے پروفیسر پیٹروک کے دریافت کرنے پر جواباً بھیجا تھا۔

"تمہاری کامیابی کا راز دولت کا رُخ انفرادیت سے اجتماعی انسانیت کی طرف پھیر دینے میں مضمر ہے۔" Your success is due to turning the tide of wealth from the individual to collective humanity

ٹیگور نے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے "وشوا بھارتی" کے تصور (IDEAL) میں تو ایک بین الاقوامی درسگاہ ہے، پتواؤں (جنگل میں رہنے والے ہندوستانی گرو) کے پرانے معیار کو قائم رکھا ہے، اس کی سادگی، عیش و عشرت سے کنارہ کشی، اسکی پاکیزگی و پاکدامنی پر اصرار، اس کی روحانیت، فطرت سے عملی ارتباط اور آزاد تحریک جو کہ جسمانی اور روحانی جوش و خروش پیدا کرتی ہے، اگرچہ ان سب چیزوں میں پرانی روح برقرار رکھی گئی ہے، لیکن اس کھلی ہوا کے مدرسہ (شانتی کمان) میں صرف رسم و رواج کی پابندی نہیں کی جاتی، خواہ وہ کتنے ہی پرانے کیوں نہ ہوں، شاعر کا ذہنی نظریہ عالمگیر ہے، وہ اپنے شاگردوں کے لئے ہر قسم کا علم اور تہذیب چاہتے ہیں ہر شعبہ کے لحاظ سے خواہ کچھ بھی اس کا ماخذ کیوں نہ ہو لہذا وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی دونوں جنسوں کے نوجوانوں کے دلنشیں ہندوستان کا ماضی کر دیں، اور ماضی سے ان کیلئے روحانی غذا حاصل کریں۔ اگرچہ وہ کلی طور پر ہندوستان کے بڑے بڑے مذاہب کے اصولوں کو جہاں تک اس درسگاہ کیلئے ممکن ہے ترقی دے رہے تھے۔ انھوں نے دوسرے مذاہب کے (بانیوں) پیشواؤں کو بھی دوستانہ دعوت دی، اور اس وجہ سے یہ ممکن ہو گیا کہ شانتی کنیان میں جو کوئی مذاہب کا مقابلۃً مطالعہ کرنا چاہے وہ آسانی سے کر سکتا ہے، وہ چاہتے تھے کہ نسلیت، قومیت اور رنگ و خون کا تعصب ان کے مدرسہ میں نہ پھیلے۔

وشوا بھارتی میں نہ صرف مذہبی تعلیم ہوتی تھی بلکہ مختلف پیشوں کے متعلق بھی۔ ٹیگور ذہنی نشوونما کے ساتھ ہی ساتھ دستکاری کی بھی تعلیم دینا چاہتے تھے، ان کا مقصد اپنے شاگردوں میں ذہنی، فنی اور جمالیاتی تعلیم عام کرنا تھا، وہ ایک ایسی شخصیت بنانا چاہتے تھے جو سماجی اور انفرادی دونوں طرح کی زندگی میں ممتاز ہو۔ شانتی کنیان میں ایک ابتدائی مدرسہ، ایک ہائی اسکول اور ایک کالج ہے، ایک کالج فارغ شدہ طلبار کے لئے تحقیق و تدقیق کرنے کے لئے ہے ایک مصوری، ڈھلائی اور صنعتی اسکول ہے، ایک موسیقی کا اسکول ایک زراعتی اور دیہاتی فلاح و بہبود کے کام کا اسکول، ایک کوآپریٹیو بینک مع شاخوں کے، اور ایک حفظان صحت کا ادارہ ہے۔

دونوں جنسوں کے طلبا مختلف کھیل کھیلتے ہیں، اور جسمانی ورزش کرتے ہیں، وہ جیوجسٹو ([illegible]) جو کہ ان کو بہت بڑے جاپانی ماہر نے سکھایا ہے اور دوسری قسم کی حفاظتی تدابیر بھی سیکھتے ہیں ٹیگور کا دیہات کا تصور (IDEAL) یہ ہے کہ اس میں تمام دیہاتی خوبصورتی اور دلکش خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ شہری خوشگواری جو کہ زندہ دلی اور کام کرنے کی اہمیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے ہونی چاہیئے ان میں سے چند چیزیں ان کے اسکول میں موجود ہیں، یہاں پر ہر درجہ میں مخلوط تعلیم ہے (Coeducation) یہ ٹیگور کی دلی تمنا ہے کہ طالبات کو یونیورسٹی میں مکمل تعلیم سائنس کے اصولوں پر دی جائے ان میں سے چند ان کی اپنی بصیرت اور پختہ کار تجربہ پر مبنی ہیں۔

ٹیگور کو وشوا بھارتی کا بانی صرف اس لئے نہیں کہا جاتا کہ انھوں نے اسے ایک مقامی مسکن، نام، عمارت، اور مالی امداد دی اور اس کا نصب العین قائم کیا، بیشک یہ چیزیں انھوں نے دیں، مالی امداد دینے کے لئے اسکول کے ابتدائی سالوں میں بعض اوقات انھیں کچھ اپنی کتابوں کا کاپی رائٹ (copyright) فروخت کرنا پڑا، اور بعض اوقات اپنی زوجہ کے کچھ جڑاؤ زیورات بھی عارضی طور پر گروی رکھنے یا فروخت کرنے پڑے، ادارے کے ابتدائی دور میں انھوں نے بہت سے مضامین خود ہی پڑھائے اور لڑکوں کے ساتھ ان کے کمروں میں رہے۔ اور ان کو شام کے وقت کہانیاں اور اپنے گیت سنا سنا کر ان کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا ۲۵
کیا۔ نئے نئے کھیل ایجاد کئے، اور ذہنی نشوونما اور تربیت کیلئے نئی نئی تدابیر اختیار کیں۔ اب بھی تقریباً دس بارہ سال پیشتر تک وہ کچھ کلاسیں خود پڑھاتے رہتے۔ اور مرتے دم تک ہمیشہ کسی نہ کسی طرح اس ادارے سے وابستہ رہے۔

ٹیگور ابتدائی عمر سے اخبار نویس تھے، انھوں نے اکثر نہایت ہی سچائی کے ساتھ لکھا ہے، رابندر ناتھ نے اوائل عمر میں نہایت کامیابی کے ساتھ مختلف ماہانہ رسالوں کی ادارت کی، اور آخری عمر تک بہت سے رسائل کو مضامین اور نظمیں بھیجتے رہے، انھوں نے بہت سے ہفتہ وار رسائل کیلئے بھی مضامین لکھے، بنگال میں صرف وہی ایک ایسے شخص تھے جو ایک رسالہ کو اول تا آخر ہر طرح کے عمدہ عمدہ مضامین اور نظموں سے بھر سکتے تھے۔ وہ رسائل میں باقاعدگی سے مضامین بھیجا کرتے تھے، مدیر کی حیثیت سے مضامین کی باقاعدگی سے اصلاح کر کے انھوں نے بہت سے مضمون نگار بنائے جو بعد میں بہت مشہور ہو گئے۔

ٹیگور کا خط بہت نفیس تھا، بنگال میں بہت سے لوگوں نے اس طرز کو اختیار کر لیا، لیکن تمام خوشخط لوگ مصور نہیں بن سکتے

اگرچہ رابندر ناتھ کی شہرت مصور کی حیثیت سے اس وقت ہوئی جبکہ ان کی عمر ستر برس کی تھی، اگرچہ خوشنویسی سے مصوری کا راستہ بہت کچھ فطری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں نہ میرا مقصد ہے اور نہ میں اپنے اندر اس قدر اہلیت پاتا ہوں کہ ان کی مصوری پر کچھ لکھ سکوں ان کی مصوری نہ ہندوستانی مصوری سے مشابہ ہے اور نہ کسی نئی یا پرانی مصوری کی نقل ہے۔ ایک بات جو شاید ان کے سمجھنے اور قابلِ داد ہونے میں یکساں ہے وہ یہ کہ ان سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا، کسی قصّہ کا پتہ نہیں چلتا اور کسی قسم کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتیں، وہ خطوط اور رنگوں میں وہ چیز ظاہر کرتی ہیں جو ٹیگور کے لامحدود الفاظ اور ادب میں مہارت بھی نہیں بیان کر سکتی۔ وہ نہ کبھی مصوری سیکھنے کسی اسکول میں گئے اور نہ کبھی گھر پر کسی سے سیکھی، اور نہ انھوں نے کسی کی نقل کرنا چاہی۔ لہٰذا وہ حقیقی معنی میں پیدائشی مصوّر تھے، اگر ان کی مصوری میں کسی اور مصوری کے اسکول کی مشابہت ہے تو وہ بالکل اتفاقیہ اور غیر دانستہ طور پر ہے۔

جب ان کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی اس وقت ان کی یہ تمنا تھی کہ وہ فنِ شکل تراشی (Plastic Art) شروع کریں، اور شاید انھوں نے شروع بھی کر دیا تھا، ایک بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ابندرا ناتھ ٹیگور جو کہ بہت مشہور مصوّر ہیں، بنگالی کے رسالہ "شانتینکیتان" میں لکھتے ہیں کہ کس طرح ان کے چچا رابندر ناتھ نے ان کو فطری مصوری میں اپنا طریقہ (Style) پیدا کرنا بتایا۔ مختصراً ابندرا ناتھ لکھتے ہیں۔

"بنگال کے شاعر نے مصوّری کے خط بنائے، بنگال کے مصوّر (خود ابندرا ناتھ) نے ایک عرصہ تک ان خطوط پر مشق کی۔"

ٹیگور رات کو بہت دیر میں سویا کرتے تھے اور صبح بہت جلد اُٹھ بیٹھتے تھے، دوپہر کے وقت بھی وہ اپنے کام میں مصروف رہتے اور تھوڑی سی دیر کے لئے بھی آرام نہیں کرتے تھے، سارے دن اور رات میں چند گھنٹے سونے، نہانے دھونے، اور کھانا کھانے میں صرف کرتے تھے، اور باقی تمام وقت کام میں صرف کرتے تھے گرمی کے زمانہ میں نہ وہ خود پنکھا جھلتے تھے اور نہ دوسروں کو جھلنے دیتے تھے۔

اگرچہ آخر عمر میں وہ بیماری کی وجہ سے بہت تھوڑا کام کرتے تھے تاہم آجکل کے بہت سے نوجوانوں سے زیادہ۔ وہ ایک سچّے گرو تھے لیکن جوگی نہ تھے، کیونکہ ان کا زندگی کا تصوّر بالکل مختلف تھا، ان کا قول تھا: "دُنیا سے علیحدہ رہکر نجات حاصل کرنا میرا اصول نہیں۔"

اس مضمون کو وضاحت کیساتھ وہ ایک اور نظم میں یوں بیان کرتے ہیں:

"خدا پر یقین رکھنے والوں کا عبادت (سادھنا) سے ایک مقصد یہ ہے کہ ان میں بھی کچھ خدائی صفات پیدا ہو جائیں، کیونکہ کل ممکناتِ خداوندی جو کہ اس کا (خدا کا) ملبوس بھی ہیں اور خود کو (خدا کو) ظاہر کرنے کا ذریعہ بھی، بے کیف صحرا نہیں ہیں، خدائی صفات کے حامل انسان کی زندگی اور ظاہر ایک صحرا کی سی نقل نہیں ہونے چاہئیں، اگرچہ اداس صحرا بھی خداوند تعالیٰ کی تخلیق کا ایک پہلو ہے، جوگیانہ زندگی بھی خدا کو تلاش کرنے اور خود کو پہچاننے کا ایک درجہ اور ایک پہلو ہو سکتی ہے، لیکن کل نہیں ہو سکتی، حقیقی جوگ خود شناسی، خدا شناسی اور انسانی فلاح و بہبود کیلئے قابلِ قدر ہے، لیکن یکساں بلکہ زیادہ قابلِ قدر عبادت ان لوگوں کی ہے جو اس سے بھی زیادہ مشکل راستہ اختیار کرتے ہیں، یعنی دُنیا میں رہتے ہوئے، دُنیا کے کاموں میں مشغول ہونے کے باوجود دُنیا ہی کے بنکر نہیں رہ جاتے۔"

ٹیگور ۶ مئی سنہ ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے اور ۱۲ اگست سنہ ۱۹۴۱ء کو اس دُنیا سے سدھار گئے۔ گویا اسّی برس سے کچھ زیادہ جئے۔ گو اسی برس کی طویل زندگی عام نہیں لیکن ایسی کمیاب بھی نہیں، دراصل درازیٔ عمر کوئی اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ اس کی اعلیٰ نوعیت اور وہ جس طریقہ پر گزاری جاتی ہے وہ اہم ہے، یوں تو بقول کسے۔

"پودے بھی زندہ رہتے ہیں اور چرند و پرند بھی (لیکن) دراصل زندہ تو وہ رہتا ہے، جس کا دماغ سوچتے ہوئے زندہ رہے۔"

ہم یہاں جوہن بوجر کے ہم آہنگ ہو کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اس کی تعلیم (دانشمندی) کے لئے کوئی زمانہ معیّن نہیں ہے، وہ اس قدر قدیم ہے جس قدر ہندوستان کے دریا، اور اس قدر نوعمر ہے جس قدر ایک کمسن بچہ، کیونکہ اس میں کسی فطری اور جبلی چیز کی جھلک نظر آتی ہے، جو کہ فرداً تک آشکار نہیں ہو سکتی، اس کی شاعری کسی اسکول سے تعلق نہیں رکھتی۔۔۔ بنگال کے پھول سورج کی شعاعوں اور بارش کی ننھی ننھی بوندوں سے پیدا ہوئے ہیں۔"

"اس کی ہمعصر انسانوں کیساتھ محبّت ساحری محبّت نہیں ہے (گمراہ کرنے والی) بلکہ کسی ایک گانے کی اور گانوں کے (Song of Songs) وہ جانتا ہے کہ جس طرح گھاس پر شبنم کا ایک قطرہ آسمان کا عکس دکھا سکتا ہے اسی طرح انسانی دماغ خدا کو منعکس کر سکتا ہے۔"

"اس کے مذہب میں نہ [illegible] وہ روحانی دُنیا کی خاموشی میں رہتا ہے جس کو سوائے انسانی دل کے کوئی چیز نہیں سمجھ سکتی۔"

تخیل

سید شفیق احمد

تخیل ان ہی لفظوں میں سے ہے جن کی یا تو تعریف ہی نہیں کی گئی، اور اگر ایسا ہوا بھی ہے تو بہت ہی مبہم الفاظ میں۔ جو تعریفیں اس کی ادبا نے کی ہیں وہ خود محتاج تعریف معلوم ہوتی ہیں یوں تو کسی مبہم تعریف کا ہونا اور اس کا فقدان دونوں ہی پریشان کن صورتیں ہیں، لیکن موخر الذکر زیادہ شدید قسم کی ہے، یہ ضرور ہے کہ کسی جامع اور مکمل تعریف کا پیش کرنا ذرا امکان سے باہر ہے، لیکن کسی تعریف کی کامل عدمیت تو اور زیادہ دشوار اس لئے ہو جاتی ہے کہ اس طریقہ سے تھوڑی بہت توجیہی گنجائش بھی باقی نہیں رہتی، کسی چیز کی تعریف کا بے لاگ ہونا تقریباً ناممکن ہے، اس لئے اس مقالہ میں تخیل کی جو تعریف بھی کی جائے گی اُسے لاگ اور جانبداری سے جو اکثر نظریات کو گھیرے رہتی ہے، آزاد نہیں کہی جا سکتی، اس مقالہ کا مقصد صرف یہ بتانا ہوگا کہ تخیل اور شاعری میں کیا واسطہ ہے یا وہ ایک دوسرے سے کیسے مربوط ہیں؟

لفظ تخیل کے فنی استعمال کی تاریخ پر اگر ہم نظر ڈالیں، تو سب سے پہلے ہمارے سامنے ورڈسورتھ اور کولرج کے نام آئیں گے ورڈسورتھ نے سب سے پہلے اس کا استعمال اپنے "دیباچہ" میں کیا ہے لیکن معنوی طریقہ سے اس کو تشنہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ کولرج کے یہاں یہ لفظ ہم کو اسکی (Biographia Literaria) میں ملتا ہے، کولرج اور ورڈسورتھ کا زمانہ ایک ایسا دور تھا جس میں ان شعرار کی طرف سے شاعری پر تنقید کا بازار گرم تھا، ان دونوں سے پہلے لفظ تخیل کسی خاص معنوں میں استعمال نہ ہوتا تھا اور نہ کوئی اس کی معنوی تحدید تھی، کولرج اور ورڈسورتھ نے نہ صرف اس کی معنوی حدود کی تعیین کی بلکہ اس پر بھی زور دیا کہ قوتِ متخیلہ اور قیاس (Fancy) میں تمایز ضروری ہے، قیاس اور تخیل کو باہم مخلوط کر دینے کی غلطیاں ہمیں اُن ادیبوں تک کے یہاں ملتی ہیں جنھوں نے زبان کی صحت کا بہت لحاظ رکھا ہے، ڈارون جیسا محتاط آدمی بھی اپنی کتاب "نسلِ انسانی" میں لکھتا ہے: "اس قوت کے ذریعہ سے آدمی غیر شعوری طور پر ان خیالات و تصورات کا امتزاج کر لیتا ہے جس سے نادر اور خوش آئند نتائج ظہور پذیر ہوں"۔ ڈارون کا پیش کردہ نظریہ ورڈسورتھ کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے، ڈارون کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تخیل کو ایک موہوم چیز سمجھتا ہے، اُس نے اس کا استعمال بالکل ایسے ہی کیا ہے جیسے ہم اکثر بغیر سوچے سمجھے سرسری طور پر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں بات میں تو تخیل کی رنگ آمیزی ہے، اس کی تعریف میں "خوش آئند نتائج" کی ترکیب ایسے استعمال ہوئی ہے کہ کسی خاص فیصلہ پر پہنچنا ناممکن ہے۔

اگر ہم تاریخی اعتبار سے اور زیادہ عتیق کی طرف قدم رکھیں جب ہر چیز کا سہرا یونان کے سر تھا تو ہم کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ یونانی مفکرین تخیل کو عقل کے مترادف جانتے تھے۔ پایرس پلومین (Piers Plowman) کے مصنف نے بھی اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ برنرس (Berners) نے بھی اپنی فرائیسوٹ (Froissart) میں اس کو اسی طرح جائز رکھا ہے، ڈانٹے بھی اس کے مروج استعمال سے منحرف نظر نہیں آتا۔ شاید شیکسپیئر کا مطالعہ ہمیں تخیل کے متعلق کچھ نئی باتیں بتا سکے، کیونکہ تمام انگریزی مصنفین کی صف میں وہی ایک واحد ہستی ہے جس کے لئے زبان ایک زندہ اور ذی حیات حقیقت ہے، حالانکہ شیکسپیئر کے کسی لفظ کے استعمال سے ہم کوئی تعریف اخذ نہیں کر سکیں گے، لیکن اُس سے اس لفظ کا نیا استعمال اور اُس کی وسعتوں کا اندازہ تو ہو جائیگا، اس نے اپنی (Midsummer Nights' Dream) میں ایک تقریر تھیسس کی زبان سے ادا کرائی ہے، ذیل میں اُس کا اقتباس درج ہے:—

اتنی عجیب اور صداقت سے اسقدر بعید کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہیں۔\
یہ کہنہ روایات اور یہ اساطیر قدیم\
عشاق اور دیوانے، ان کی وہ سرجوش عقل\
اور ان کے وہ تشکیلی توہمات جو اُن خیالات تک کیلئے آغوش وا کردہ ہیں

جن کو تنک مایہ دلائل بھی قبول نہیں کر سکتے ۔
دیوانے، عشاق اور شاعر
سب تخیل سے وابستہ ہیں۔
ایک کی فکر اتنے شیاطین تخلیق کر لیتی ہے جن پر دوزخ تنگ ہے ۔
یہ دیوانہ کا فکر ہے ۔ عشاق جو جنون سے بہرہ مند ہیں ،
حسن ہیلن کو مصری پیشانی میں تاباں دیکھ لیتے ہیں۔
اور شاعر کی آنکھ لطیف جنون کے حریری پردوں سے گزرتی ہوئی
زمین و آسمان پیمائی کرتی ہے
اُس کے تخیل کی تحریک سے وہ اشیا ظاہر ہوتی ہیں
جن کے خاکہ تک قابل ادراک نہیں ہوتے ۔ شاعر کا قلم
انھیں ان کی ہیئت بخشتا ہے لیکن جیسے بر دوش ہوا
ایک مانوس سا رنگ ، ایک مانوس سا نام
یہ تخیل کی کارگزاریاں ہیں
کہ اگر وہ خوشی سے دوچار ہو جائے
تو اُس کا بانی بھی تکوین کر لیتا ہے
یا اگر اس کی نظر سے کوئی ہول آفریں شے گزرتی ہے
تو وہ جھاڑی کو باآسانی ریچھ بنا دیتا ہے

اس اقتباس میں تھیسس نے محبت کے متعلق اظہار خیال کیا ہے جس کو وہ جنون اور سودائیت کہتا ہے' اُس کی نظر میں شاعری نیم عیاری اور نیم سودائیت ہے لیکن لطیف سودائیت، شاعر اس کے خیال میں سبعی اور لفظی جبلتوں کے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے، جس کا تخیل "جھاڑی" سے "ریچھ" کی تخلیق کرے ۔ یوں تو یہ بیان تھیسس کا ہے لیکن پس پردہ اسمیں شیکسپیئر بول رہا ہے تھیسس جسے "سرجوش عقل" کہتا ہے وہ خود آدمی کا نقص ہے جو اعلیٰ پیمانہ پر کامزن ہے ۔ وہ "تشکیلی توہمات" کا ذکر کرتا ہے، یہ تراکیب بہت ہی منتخب اور چیدہ ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ تخیل ایک تعمیری قوت ہے جس میں انسانی دماغ کی عمومی حالت کے خیالات کو وسعت دیکر اصلیت میں تبدیلی کر دینے کا ذکر ہوتا ہے اور جس کا کام نامعلوم کو معلوم کر دکھانا ہے ۔ شیکسپیئر کے یہاں ایسے پارے اکثر ملیں گے جو اس نظریہ کی تائید کریں کہ تخیل حقیقتاً ایک وسیع اور تعمیری چیز ہے تخیل کے لئے اُس نے (Tempest) میں "محکم تخیل" کی ترکیب استعمال کی ہے ۔ (Timon) میں اُس نے تخیل کو "تخیل عظیم" کہا ہے ۔ اسی طرح (Hamlet) میں اس کو "تشکیلیت" کہا ہے ہیملٹ میں ایک اور حوالہ بھی دیا ہے، ہیملٹ کہتا ہے کہ "تخیل خاک سکندر تک کا سُراغ لگا سکتا ہے" یہ کوئی اتفاقیہ امور نہیں ہیں ۔

تخیل پر ایک عقلی قوت کے نقطۂ نگاہ سے بعد میں بحث ہوگی، پہلے ورڈسورتھ اور کولرج کے زاویۂ نگاہ پر بھی غور کرنا ضروری ہے ۔

ورڈسورتھ اپنے "گیتوں" کے دیباچہ طبع دوم میں تخیل کے لفظ کو مروّجہ معنوں میں استعمال کرتا ہے ۔ لکھتا ہے

"میرا مقصد ان نظموں سے زندگی کے روزانہ واقعات و حالات سے جزئیات کا انتخاب ہے اور ان کا ایسا نظم کرنا ہے جس پر تخیل کی رنگ آمیزی ہو اور جس کے ذریعہ معمولی چیزیں دماغ کے سامنے غیر معمولی اطوار میں آئیں"

ورڈسورتھ کے جملہ کا آخری حصّہ بہت اہم ہے کیونکہ یہاں، تخیل سے مراد ایک ایسی شے لی گئی ہے جس کا کام رنگ آمیزی ہے یا جو کسی چیز کو ایسے سانچے میں پیش کرتی ہے جس سے اُس کی ہیئت میں فرق آجائے ۔ اب کولرج کے ریمارک پر بھی نظر ڈال لینی چاہیئے وہ اپنی (Biographia Literaria) میں ورڈسورتھ کی ایک نظم کی تحسین میں لکھتا ہے ۔

"ہمیں یہاں صداقت و اصلیت کا وہ توازن، تخئیلی قوت، کا مشاہدہ اور واقعات و حالات کا وہ رنگین انکشاف ملتا ہے جو ہماری علمی دُنیا پر محیط ہے"

یہاں رنگ آمیزی کی قوت کو تخئیلی قوت سے ممتاز کر دیا گیا ہے بلکہ تخیل کو صرف ترمیمی، تشکیلی اور اثراندازی کی قوت کہا گیا ہے ۔ ورڈسورتھ نے بھی اواخر ایام میں یہی کہنا شروع کر دیا تھا جس کو کولرج شروع میں کہہ چکا تھا ۔ ورڈسورتھ اسی نظریہ کو لیتے ہوئے ایک دیباچہ میں "تخلیق شعر" کے لوازم کو گنتا ہے مشاہدہ، احساس، تفکر، اجتہاد، محاکمہ وغیرہ کو تو وہ ضروری خیال کرتا ہی ہے لیکن سب سے زیادہ اہم وہ تخیل کو سمجھتا ہے جس کا کام اُس کے تئیں رنگ آمیزی، تخلیق، تلازم اور تشکیل ہے ۔ ان ہی ضروریات شعری کے ماتحت اُس نے اپنے کلام کو ترتیب دیا ہے تخیل اور قیاس کی بحث جہاں اُس نے چھیڑی ہے بڑے معقول اور دلچسپ نکات نکالے ہیں، لیکن قیاس اور تخیل کے مابین اُس نے اتنا باریک میکانکی تضاد رکھا ہے کہ ناظر کے لئے یہ طے کرنا

دشوار ہو جاتا ہے کہ کون سی نظم تخیّل کے عنوان میں رہیگی اور کونسی قیاس کے تحت میں۔ ویسے بھی ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے کیلئے کیا معیار ہو سکتا ہے، اگر ذوق رہبری کرے تو تخیّل اور قیاس کا فرق ممکن ہے ورنہ کوئی مقیاس ان کی تقسیم کیلئے ممکن نہیں۔ ورڈسورتھ کے مطالعہ کے وقت اس کا لحاظ ضروری ہے کہ ہم اس کی قافیہ آرائیوں سے بچتے رہیں، وہ عام ضوابط کے معاملہ میں بہت سیدھا اور صاف ہے لیکن ان کے اطلاق کے معاملہ میں وہ بہت ہی غیر پاک میں ہے اور انحنا سے کام لیتا ہے۔ حالانکہ وہ قیاس و تخیّل کو بالکل متضاد خیال کرتا ہے لیکن پھر وہ تخیل کے متعلق کہتا ہے "تخیّل اپنی ضروریات ہمیشہ قیاس کی کارگاہ سے پورا کرتا ہے" وہ قیاس کو بھی ایک اختراعی قوّت مانتا ہے لیکن پھر بھی کہتا ہے کہ جن قوتوں کے ماتحت قیاس کام کرتا ہے وہ خود تو ہم سے زیادہ کچھ نہیں جس کا اثر آنی اور غیر مستقل ہوتا ہے۔ اس سے دونوں میں تضاد پیدا ہونا ممکن ہے لیکن جب وہ کہتا ہے کہ "قیاس ہماری فطرت کے غیر مستقل اور آسانی سے بہل جانے والے حصّہ سے متعلق ہے اور تخیّل ہمیشہ دوامی اور لافانی کو برانگیختہ کرتا ہے" تو اُس وقت اس کا بیان کولرج سے زیادہ مشابہ ہو جاتا ہے۔ ورڈسورتھ نے اس جگہ لفظی اور جذباتی معنوی دھندلکے میں حقیقت کو گھمانا چاہا ہے اور اسی وجہ سے دیباچہ غیر متوقع طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ ورڈسورتھ نے تو اس فوری اختتام کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ناظرین اُس کی طوالت سے گھبرا نہ جائیں لیکن ہم جو کچھ اس سے اخذ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ورڈسورتھ کسی ایسے نتیجہ پر پہنچنے والا ہوگا جو کیفیت کے لحاظ سے کچھ نہ ہو اور محض کمیت ہی ہو۔ تخیّل کے متعلق وہ کہتا ہے "تخیّل سے میری مراد دماغ کا وہ تفاعل ہے جو اشیاء کے ظواہر سے زیادہ متعلق ہو یا وہ تخلیقی عمل مراد ہے جو مقررہ قوانین کا تابع ہو"۔ "تخیّلی عمل ہمیشہ دوسری خارجی اشیاء کو انعکاسی قوّت بخشنے یا ان سے اخذ کرنے پر متحرک ہوتا ہے" بہر صورت دماغ کی ایک نئی عملی شکل کیواسطے ظواہر کا انعکاس اور ان کا ردِّ عمل ضروری ہے۔

یہ دعویٰ کہ تخیّل کا کام تشکیل و تخلیق ہے بہت ہی اہم ہے کولرج کا ارادہ تھا کہ وہ اس دعوی کی مزید وضاحت کرے لیکن عدم طباعت کی وجہ سے ہم اپنا صریح نقصان محسوس کرتے ہیں قیاس اور تخیل کے باریک فرق کو مشرح کرکے اس نے ورڈسورتھ کی انتشاریت کا خاتمہ کر دیا اور ہر لفظ کی حدود مقرر کر دیں تحدید کی رُو سے اُس نے قیاس و تخیّل کو دو مختلف قوتیں ٹھیرایا ہے جو نہ تو ایک چیز سے مشتق ہیں اور نہ ایک دوسرے سے مربح قیاس حافظہ کی اُس وضع یا نہج کو کہا جا سکتا ہے جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر اپنا تمام مواد قانون تلازم سے حاصل کرتا ہے۔ گو تخیّل فی نفسہٖ "اختراع یا تخلیق کے دوامی فعل کی تکرار ہے جس کے مقررہ حدود دماغ سے باہر نہیں، جس کا فعل تجزیہ و تحلیل ہے تاکہ تخلیقی نتائج برآمد ہوں" گویا تخیّل کو کولرج نے ایسی قوت کہا ہے جس پر انسان مقتدر ہے اور جو اختراعی ہے جو اُس الوہی اختراعی طاقت کے مشابہ کہی جا سکتی ہے یا اس کی صدائے بازگشت جس کا فعل اس چیز کو مادی صورت بخشتا ہوتا ہے جو کسی ظاہری ہیئت سے عاری ہو یا تمام مواد کو ایک سانچہ میں تبدیل کر دینا چاہے، سانچے کی جدید تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ "وہ مکمل کا ایک عکس ہے جس کو کائنات کے کُہر سے مکشوف کر دیا گیا ہو"

کولرج زبان کی خوبیوں کا جہاں تک تعلق ہے اس قدر کھو جاتا
۲۹ ہے کہ اکثر حقیقت ایک بعید چیز معلوم ہونے لگتی ہے لیکن ذیل کے ایک پارہ میں جو اسکی (Biographia Literaria) میں سے نقل کیا گیا ہے وہ صاف اور مشرح ہے حالانکہ اس کے فوراً بعد وہ پھر زبان کی خوبیوں میں اُلجھکر تخیّل کو ایک مسحور کر دینے والی طاقت بتا دیتا ہے۔ تخیّل کا سحرکار ہونا ممکن ہے لیکن اگر کسی چیز کو سحرکار کہدینے کا مقصد یہ ہے کہ اُس پر عقلیت کے دروازے بند ہیں تو ہمیں اس سے اختلاف ہوگا (Dejection Ode) میں جو اس کی چھ سال کی بہترین نظموں میں سے ہے وہ تخیّل کی تعریف یوں کرتا ہے:-

ایک زمانہ تھا جب میرا جادہ ہموار نہ تھا
میری شادی رنج سے ہم آغوش تھی
جب غم و الم میرا سرمایہ تھا
جب میرا قیاس مجھے نشاط و عیش کے خواب دکھاتا تھا
لیکن اب میری امیدیں سرنگوں ہیں
مجھے یہ داہ نہیں اگر وہ میری طبعی راحت کو چھین لیں
لیکن آہ ہر نظارہ
بڑھ کر اُن فطری عطیات کو روک لیتا ہے جو مجھے پیدائش کیوقت عطا ہوئے تھے
آہ میری تخیّل کی تشکیلی قوّت!

اس بارہ میں تخیّل کو ایک محکم، قوی الاثر اور زبردست طاقت کہا گیا ہے، اُس آواز کی طرح جسنے "کن" کہا اور دنیا وجود میں آگئی، ایک "محکم نغمہ" جس کے ترنّم میں زندگی کے گزران نغمے چھپے ہوں، اور ایک تشکیلی طاقت جو خلا کو وجود بخشے اور غیر موجود میں تبدیل کردے، کولرج کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ تخیّل وہ اشیا پیدا کر لیتا ہے جن کو حقیقت کہا جا سکے، تخیّل پر زندگی کا انحصار ہے لیکن شادمانی اور تخیّل ایک ہی چیز ہیں، یعنی شادمانی کا ہی دوسرا نام تخیّل ہے۔ تخیّل جو شعرار کو زندگی کے مکمل خاکے بنانے پر مجبور کرتا ہے صرف شعرار کے لئے ہی محدود و مخصوص نہیں، بلکہ مقدار کے لحاظ سے ہر ناظر میں ہوتا ہے جس سے وہ کسی چیز کی تنقیص و تحسین کرتا ہے، اسی تخئیلی مقدار کی وجہ سے شاعری ہمیشہ زندہ رہتی ہے، نئی پیدا کی جاتی ہے اور نیا پن برقرار رکھتی ہے، تخیّل کو بھی اور دوسری جسمانی قوّتوں کی طرح بڑھایا جا سکتا ہے۔

ارسطو نے اپنی "شعریات" میں جو تعریف تخیّل کی کی ہے اس سے کچھ مختلف نہیں، ہر چند اُس نے زاویہ ہائے نگاہ کو مختلف جگہ نصب کیا ہے لیکن کوئی اضافی چیز برآمد نہ کر سکا، شاعری ارسطو کے خیال میں "ایک خاکہ یا ایک اقتدار ہے جس کا مادی ذریعہ اظہار زبان ہے"، جس کی دو خصوصیات ہیں یعنی یہ داخلی ہے اور انسانیت سے توام۔ دوسرے مسرّت و نشاط اس کا ایک فطری ذریعہ ہے۔ ارسطو انسانی سرگرمی اور عمل کو تین طریقوں پر تقسیم کرتا ہے (۱) فکر یا قوّتِ ذہنی (۲) عمل یا قوّتِ کردار و اعتقاد (۳) تخلیق یا قوّتِ اختراع۔ آخری قوّت کا پھر دوہرا عمل ہے جس کو منطق و حقیقت دونوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ آدمی اختراع کرتا ہے ظاہری ضروریات کی تشنگی دور کرنے کے لئے یہ اختراع فن ہے، اور فن جس کے اظہار کا ذریعہ زبان ہے زندگی کے لئے ضروری ہے، ان دونوں نظریات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاعری زندگی کی خارجی ضروریات کی تکمیل کرنے والی چیز نہیں بلکہ حیات کل کی مفسّر ہے جو زندگی کو اُس کی ماہیت و معنی سے روشناس کراتی ہے۔ شاعری زندگی کی تشکیل کرتی ہے اور تخیّل شاعری کی تشکیل کرتا ہے۔ گویا شاعری کی تخلیق میں مرکزی حیثیت تخیل کو حاصل ہے۔ ورڈسورتھ شاعری کی تخلیق کرنے والی قوّتوں میں مشاہدہ، عبور زبان، احساس، لطافت مشاہدہ، غور و فکر ایجاد و محاکمہ وغیرہ کو سمجھتا ہے، یقیناً محاکمہ کو وہ بڑی زبردست قوّت خیال کرتا ہے جو امتیاز کر کے نظم کرتی ہے لیکن ان سب سے بلند وہ تخیّل کو سمجھتا ہے جو ایک تشکیلی قوت ہے اور جس کے بغیر شاعری ناممکن ہے، مشاہدہ صحیح ہو سکتا ہے، مناظر اور اُن کا بیان درست ہو سکتا ہے، احساس کے لطیف ہونے کا امکان ہے، تجربوں کا صحیح غور و فکر عسیر الحصول ہے لیکن یہ سب وہاں تک رہبری کرتے ہیں جہاں سے شاعری اپنا آغاز کرتی ہے، یہ سب خارجی ہیں لیکن تخیّل جس کا کام ترمیمی، تشکیلی اور ایک گونہ رنگ آمیزی ہے ناگزیر ہے جو منظوم زبان میں زندگی کا خاکہ پیش کرتا ہے جس کو غور و فکر نے درست کیا ہے، جس کو جدّت مس کرتی ہے، جس کو صحیح احساس چھو کر گزرتا ہے، یقیناً شاعری کا جزو لاینفک ہے۔

شیدا۔ ایم اے

ادب کے مٹتے ہوئے رجحانات پر ایک نظر

پہلی جنگ عظیم کے بعد سے اب تک ادبی تنقید کے سلسلہ میں کس قدر خیال آرائیاں ہو چکی ہیں! جو نظریے پیش کئے گئے ہیں، اُن میں انتہا درجہ اصولی اور فردی اختلافات ہیں، اس عہد میں جبکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز ترقی ہونے سے اور سائنس کی عجیب و غریب معلومات و ایجادات کے سبب زمانی اور مکانی بعد بہت کم ہو گیا ہے، وقتوں اور قوموں کی تہذیبوں اور تمدنوں میں تصادم ناگزیر تھا۔ شروع شروع میں یہ اختلاف ہمت شکن ضرور محسوس ہو سکتا ہے لیکن بغور دیکھنے سے یہی تمدن اور ادب کے لئے شاندار مستقبل کا پیش خیمہ نظر آئے گا۔ میتھو آرنلڈ (Matthew Arnold) نے انیسویں صدی کے نصف ثانی میں کہا تھا کہ "ہماری دُنیا ایک نئے تمدن کی ولادت کا درد محسوس کر رہی ہے"! اگر اس زمانہ کے لئے یہ خیال صحیح تھا تو ہم آج بے خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ درمیانی زمانہ نے بیحد مصیبتیں برداشت کر کے اُس نوزائیدہ بچّہ کو پروان چڑھا دیا ہے —— یہاں تک کہ اب اس کے ذہنی ارتقا اور بلوغ کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔

ہماری دیکھتی آنکھوں بڑی تیزی کے ساتھ کچھ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں اور کچھ فنا۔ سماج کے مٹتے ہوئے رجحانات میں سب سے زیادہ اہم اقلیت کا تمدن ہے، پروہتی سامنتی اور مہاجنی کالوں میں مخصوص طبقوں کو رائے عامہ کے متاثر کرنے کا پورا پورا موقع رہا ہے۔ حکومت اور اخلاق کی مدد سے انھوں نے ہر ممکن مادی اور روحانی حربے کا استعمال کر کے عوام کو مغلوب اور اپنے مفاد کو محفوظ رکھا ہے، اصولی حیثیت سے افراد کو دولت، اور طاقت جمع کر کے، ضرورت مندوں کو دست نگر رکھنے کا حق رہا ہے سرمایہ کی تقسیم میں تناسب اور ہم آہنگی قائم رکھنے کیلئے بخشش اور مفلس نوازی کی تلقین ہوس پرستی کی راہ میں کسی وقت مفید عملی رکاوٹیں ثابت نہ ہو سکیں، ان افسانوں نے دُنیا کے سامنے کوئی بڑا کارنامہ پیش کیا بھی تو محض یہ کہ قسمت اور اتفاق کے خواب دیکھنے والی جنتا، اور وقتی خرابیوں سے فائدہ اُٹھانے والے برسرِ اقتدار طبقے کے معیارِ زندگی کے درمیان فرق بڑھتے بڑھتے ایسی خلا پیدا ہو گئی کہ ڈزرائلی (Disraeli) کے مرغوب تصوّر کے مطابق ہر ملک کی آبادی "دو مختلف قوموں" میں منقسم ہو گئی۔ اس سے معاشرتی گتھیاں زیادہ سے زیادہ اُلجھتی چلی گئیں!

طمع کیشی، عقلی ردِّ عمل اور بین الاقوامی معاملات اب منتہا پر پہنچ چکے ہیں، پیداوار میں حصّہ لینے والے عوام منظم ہو کر روز افزوں قوّت بنتے جا رہے ہیں جس سے غالب اقلیتوں کے پنجے ڈھیلے پڑ گئے دُنیا کی جنتا مصروفِ پیکار حکومتوں سے مقاصدِ جنگ کے صاف صاف اظہار کا مطالبہ کر رہی ہے، فردوں کے حقوق و فرائض متعیّن کرنے کے لئے طرح طرح سے رائے زنی کی جا رہی ہے، ویلس (H. G. Wells) کی مشہور کتابیں "انسان کے حقوق" (Rights of Man) اور "نیا نظامِ عالم" (The New World Order) اور اسٹریچی (J. Strachey) کی تصنیف "ترقی کیلئے ایک دستور العمل" (A Programme of Progress) ہندوستان کے انگریزی داں طبقہ سے بہت اچھی طرح روشناس ہیں۔

رائیوں کی اس کثرت، جانچ پڑتال اور قطع و برید کا مقصد بالکل صاف نظر آتا ہے، مجموعی حیثیت سے آج دُنیا مفلوک الحال انسانیت کے لئے، یا یوں کہئے کہ بیدار شدہ روحِ جمہور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ دیرپا امن کے وسائل سوچنے اور دستور العمل تیار کرنے میں مصروف ہے۔

موجودہ علم کی روشنی میں بے شمار ٹھوس سچائیاں بے مغز ثابت ہو چکیں۔ لہٰذا "حق و باطل" اور "خیر و شر" کے وہ تصوّرات اور

قدریں (Values) جو ایک زمانہ سے معیاری حیثیت رکھتی تھیں اس دور میں کس طرح اپنی پُرانی اہمیت کو برقرار نہیں رکھ سکتیں جن نظریوں کو "فطرتِ انسانی" کہکر ہمہ گیر حقیقتوں کے نام سے مروّج کیا جاتا تھا، وہ زیادہ تر یا تو صرف کمزور حسّیات (weak instincts) تھے، جنھوں نے تاریخ کے بنانے میں بہت کم حصہ لیا، اور یا مقامی رنگ سے آلودہ نفسیات (local psychology) اب جبکہ ادیب کی نظر زمانوں اور ملکوں کی حدود سے گزر کر زیادہ وسیع کینوس (Canvas) پر پڑتی ہے تو وہ انسانی محرکات کے بدلے ہوئے تصوّرات کو پیش کرنے پر مجبور ہے یا اُن ذہنیات (mentalities) کو حقیقت پارے (Part-Truths) شمار کرنے پر۔ عہدِ حاضر کے ادب پر یہ امر کئی طرح اثر ڈالتا ہے، ہم شدّت کے ساتھ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہماری روزانہ زندگی میں اقتصادی ضروریات کو نظرانداز کرنے سے مشکلات دور ہونا کسی طرح ممکن نہیں بلکہ ضرورت زیادہ صحیح توازن قائم کرنے کی ہے۔ "مادیت" کی یہ لہر جسے اخلاق کی روحِ رواں سمجھنا چاہیئے، سماج کی رگ و پے میں سرایت کرتی جارہی ہے۔ اس وقت انسان کے ذہن کو مابعدالطبیعی نکتہ آفرینیوں (metaphysical superficialities) کے لئے بہت کم فرصت ہے، وہ اس زمانہ میں دورازکار مصنوعوں پر "قیاس آرائیوں" میں کوئی خاص "انسانی مفاد" بھی نہیں دیکھتا یہی وجہ ہے کہ آج ادب سے ایسے مباحث اور معاشرتی تحریروں سے نقلی دلیلیں یک قلم خارج ہوچکی ہیں۔

اب ادب زندگی سے زیادہ قریب آنے کی کوشش کررہا ہے معمولی زندگی کے تجربات، رنج و راحت، اونچ نیچ، کمزوری اور مضبوطی اس کے دلچسپ موزوں ہیں، وہ حیات کی تلخ اصلیتوں کو "زلف و نظر" یا "ساقی و ساغر" کے رنگین افسانے کہکر بھلانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ان کی گہرائیوں میں جاکر حل تلاش کرنا چاہتا ہے، اُسے عجیب و غریب کرداروں اور نصب العین شخصیتوں میں اتنی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے کہ اوسط انسان قعرِ مذلّت میں افتادہ نظر آئے، ماحول کی چھوٹی چھوٹی حقیقتیں، جن کو صدیوں کی وہم پرستیوں اور تمدّنوں کی گوناگوں پیچیدگیوں نے نگاہوں سے اوجھل کررکھا ہے اور جو زندگی پر طرح طرح سے اثرانداز ہوتی ہیں، اس کی توجہ اور دلبستگی کے لئے کافی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ موجودہ ادب رومان اور مذاقِ تسلیم کے خلاف بدمزگی اور کورذوقی کی چٹانیں کھڑی کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس کے خلاف وہ ثقافت (Culture) کو عوام تک پہنچا کر اور جنتا کو رومان اور فن سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنا کر، ان گنت نسلوں کے بے بہا اندوختے پر بقا کی مہریں ثبت کرنا چاہتا ہے۔ البتہ تمدّن اور فن کے وہ امتیازات جن کی جڑیں سطحِ ماحول میں اُلجھ کر نشوونما (growth) کی صلاحیت کھو بیٹھیں ضرور اس "خطرے" سے خالی نہیں!

انفرادیت کا زمانہ ختم ہوچکا، اب انسانیت کو محکوم رکھنے اور کچلنے کے خواہشمند طبقے پوری طرح منظم و مسلح ہوچکے ہیں، اس لئے ان کے خلاف انفرادی حیثیت سے آواز بلند کرنا "صدا بصحرا" سے ہرگز زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، اجتماعیت اور تنظیم کا میلان ادب میں کئی طرح رونما ہورہا ہے، جس سے مظاہرۂ قوتِ مبارزہ (challenge) اور خطابیت کی اسپرٹ پیدا ہوتی ہے، خاص خاص ادارے اور اشاعت کے مراکز مخصوص مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے نشرواشاعت کے کام میں سرگرم ہیں، ہمارے تمام ادب کی رگوں میں کہیں نہ کہیں غرض (purpose) کے خون کی تیز رفتاری بہ آسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی نے ہم میں معاملاتی ذہنیت کو فروغ دیکر ہمارے ادب کے خمیر سے تفریحی عناصر (aesthetic elements) کم کردئے ہیں۔ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے بیشک سائنس نے اس تفریحیت کو فنا کردیا جس کا تخاطب بے بنیاد تصوّرات کی پیدا کردہ عارضی نفسیات سے تھا اور جن سے ہم اپنے مخصوص ذہنیات کے سبب خواہ مخواہ لُطف اندوز ہونے کے عادی ہوگئے تھے، سائنس نے جتنی تفریح فنا کی اُس سے کہیں زیادہ پیدا کردی ہے، شاید تفریحیت کے کم ہونے کی زیادہ سمجھ میں آنے والی وجہ بحرانی دَور (transitional age) کی بے اطمینانی اور وقت کی عارضی ہنگامی فضا ہے اور جس سے گزرنا شاید ان حالات میں ناگزیر بھی ہے، سکون کے ساتھ ساتھ ادب میں یہ عنصر بھی برابر بڑھتا رہے گا!

لگے ہاتھوں ادبی آماج (Range) کا ذکر کردینا بھی بے موقع نہ ہوگا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری اکثر قیمتی تصنیفات چند ہی سال میں اپنی ترو تازگی کھو بیٹھتی ہیں، یہ خیال اس لئے اور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے کہ گزرے ہوئے ادیب اپنی تصنیفات

(بقیہ مضمون دیکھیے صفحہ ۶۵ پر)

نیا راگ

جوش ملیح آبادی

اِک جانِ بہار کی سرکار میں

اے رُخ مصحفِ گلزار و چراغِ حرمِ غنچگی و آیۂ گلباری و قرآنِ بہار
اے بہ قد موجِ رواں، برقِ تپاں، سروِ سہی، شاخِ گُلِ تازہ و الہامِ خرامانِ بہار
پئے گلگشت ذرا، اس قدِ بالائے فلک تاب و چمن ساز کو دے اذنِ خرام
کہ ترے ہجر میں بے کیف ہے، بے روح ہے، بے تاب ہے، بے خواب ہے، لیلائے گلستانِ بہار
بزم کی بزم ہے پژمردہ و افسردہ و دل بستہ و خاموش و ملول و غم ناک
کھول دے کاکُلِ ژولیدہ و شب رنگ و جہاں صید و گہر بیز کہ ہے چشمۂ حیوانِ بہار
آ بھی جنبش میں کہ ہیں گوش برآواز دیبان و حریفان و گل و لالہ و سرو!
اے لبِ لعلِ فسوں بار و دل آویز و شکر ریز کہ ہے تجھ پہ فدا لرزشِ دامانِ بہار
بربط و عود و شراب و دف و افسانہ و افسون و شب و ماہ و رباب و ساغر
آ کہ مشتاق ہیں اے جانِ چمن، زہرہ جبیں، ہوش رُبا، ماہ لقا، شمعِ شبستانِ بہار
دہر ہے خفتہ و آشفتہ و آزردہ و غم دیدہ و ناشاد و زبوں حال و تباہ
ہاں اُٹھا، نرگسِ مخمور گہر تاب و جنوں خیز کہ ہے مجلسِ میخانہ و زندانِ بہار
آج ہے حافظِ شیرازی و خیام و نظیری و فغانی و ظہوری کا جواب
یہ ترا جوش کہ ہے مست و خراباتی و سر حلقۂ رندانِ جہاں قبلۂ خاصانِ بہار

۳۴

ایشیا۔ نومبر ۱۹۴۳ء

نواب جعفر علی خاں اثر بی اے لکھنوی

غزل

بے کس کی طرف غصّہ کی نظر، انسان کا دل تھا ٹوٹ گیا
جس ہاتھ میں دامن تھا، کانپا، اور ہاتھ سے دامن چھوٹ گیا

روداد محبّت کیا کہئے، اک درد بھرا افسانہ ہے
پہلو میں نہ تھا دل، چھالا تھا، اُبھرا، ٹپکا، پھوٹ گیا

دریا ہوں مگر ایسا دریا جو بحر کے نزدیک آ پہنچا
وہ جوش و روانی ختم ہوئی، ہر شغل و علاقہ چھوٹ گیا

الفت کی نرالی رسمیں ہیں، دل ایک نظر میں ان کا تھا
شکووں کے عوض تھا شکرِ جفا، کسوقت میں جی ہی چھوٹ گیا

چھاتی جو نہ کوٹو اس پر بھی یہ حال دھڑکتے دل کا ہے
محسوس یہ ہوتا ہے کہ اثر جیسے کوئی چھاتی کوٹ گیا

جمیل مظہری ایم اے

احساس و پیام

پھنکتا ہے صور قیامت کا اُٹھتی ہے میدر مانے کی
مغرب سے صدائیں آتی ہیں جنگی باجوں کے ترانے کی

باجوں کے شور میں دھرتی کی چیخیں بھی سُنائی دیتی ہیں
کرتوت پہ بیٹوں کی مائیں جس طرح دُہائی دیتی ہیں

تلواریں میان سے باہر ہیں فطرتِ انسان کی ننگی ہے
اک گونج میں سو آوازیں ہیں آوازیں ہم آہنگی ہے

بادل کی گرج بجلی کی چمک تلواروں کی جھنکاریں بھی
مجروحوں کی فریادیں بھی رن بیروں کی للکاریں بھی

دُکھیا ماؤں کے نالے بھی بھوکے بچّوں کا شیون بھی
ان ہنگاموں میں تیز ہے کچھ تہذیب کے دل کی دھڑکن بھی

اک آگ لگی ہے دُنیا میں گرد اُڑتی ہے لُو چلتی ہے
مغرب سے لیکر مشرق تک آدم کی کھیتی جلتی ہے

اب وقت نہیں ہے سونے کا اے غفلت کے پالے اُٹھو
اے ہند کے فرزندو اُٹھو، اے نیند کے متوالو اُٹھو

جس آگ کی لپٹوں نے بڑھ کر تہذیب کا دامن پکڑا ہے
اخلاق کے خرمن پھونکے ہیں فطرت کا کلیجہ جھلسا ہے

اُس آگ کے شعلے تھام چکے بھارت ماتا کے آنچل کو
امید کی نظریں ڈھونڈتی ہیں رحمت کے برستے بادل کو

اے مردِ بصیرت کھول آنکھیں سب جاگ چکے تو سوتا ہے
اُٹھ دیکھ تو تیری دُنیا میں کیا ہونا تھا کیا ہوتا ہے

یہ عالمِ کیف و کم یعنی یہ سود و زیاں کی آبادی
یوں ماتمِ دوش و فردا ہے جس طرح خزاں کی آبادی

سورج کا مُنہ کچھ اُترا ہے، فطرت کا دل کچھ بھاری ہے
اندر کی خدائی میں ہر سو فرمانِ سیاہی جاری ہے

کچھ بھیگی بھیگی رہتی ہیں پیچھے سے ہوائیں صحرا کی
رحمت کا فرشتہ روتا ہے قسمت پہ ہماری دُنیا کی

پھر شمعِ تمدّن نزع میں ہے بیمار کو ہچکی آتی ہے
یہ شمع نہیں انسانیّت کی روح پگھلتی جاتی ہے

اخلاقِ عمل کی تفسیریں افسونِ لبِ عیّاری سے
سو خواب کا عالم پیدا ہے ہنگامۂ یک بیداری سے

مُہرِ اللہ کی نعمت پر پہرے ذوقِ آزادی پر
شیطان حکومت کرتا ہے انسانوں کی آبادی پر

صد چاکِ ہوس کے ہاتھوں سے روحانیّت کا جامہ ہے
اک شورش ہے، اک ہلچل ہے، اک لوٹ ہے، اک ہنگامہ ہے

اس آگ کو گُل کرنے کیلئے رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم
رحمت کی گھٹا بن جاؤ تم، شاعر کی دُعا بن جاؤ تم

ایک ایسا عزم دکھانا ہے تہذیب کے اس گہوارے کو
جو موڑ دے اپنی طاقت سے سیلاب کے سرکش دھارے کو

وہ عزم مزاجِ آہن خود جسکے سانچوں میں ڈھلتا ہے
وہ عزم کہ جس کی گرمی سے تلوار کا لوہا گلتا ہے

سلام مچھلی شہری

"یہ ہوتا ہی رہیگا!"

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
دُنیا اک انگڑائی لے گی

چاند ستارے ٹوٹ پڑیں گے
آتش پارے ٹوٹ پڑیں گے!

انگاروں کی بزم سجے گی

جلتی سانسیں رقص کریں گی
مُردہ روحیں رنگ بھریں گی!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
نازک اور شرمیلی سڑکیں

زخمی، کوڑھی ہو جائیں گی
انسانوں سے گھبرائیں گی

ہم ان پر چلتے ہی رہیں گے

یہ گُل بوٹا بن جائیں گی
پھر اک شعلہ بن جائیں گی!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
پانی میں دوزخ گائے گا

لہریں ساز بداماں ہوں گی
عرش کی پریاں رقصاں ہونگی!

سُرخ سمندر ٹھنڈا ہو گا

لہریں مدھم ہو جائیں گی
زہرہ و پرویں سو جائیں گی!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہیگا!
اوپر طیّارے گرجیں گے

نیچے سُکھ کا گیت چھڑے گا
ہلکا ہلکا ساز بجے گا!

ساز کے تار بھی جل جائیں گے

گیت دھواں بن اُڑ جائے گا
ساز فضا میں تھرّائے گا

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا !
زرّیں کتبے اور مینارے
آگ کے شعلوں میں کانپیں گے
پاپ کے سائے میں ہانپیں گے!
پھر کچھ پرچم لہرائیں گے
پھر کوئی تاریخ لکھیں گے
اپنی اپنی طرح پڑھیں گے!

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!!
دُنیا اک انگڑائی لے گی
چاند ستارے ٹوٹ پڑیں گے
آتش پارے ٹوٹ پڑیں گے!
تم ان تاروں کے جُھرمٹ سے
میرا ساز اُٹھا لاؤ گی
کوشش کر کے کچھ گاؤ گی!
اپنے ہی گیتوں سے تمہاری
آنکھیں رنگین ہو جائیں گی
پھر کچھ غمگین ہو جائیں گی!
تم یہ کہو گی آج تو خوش ہوں
دل یہ کہے گا روتی کیوں ہو
اپنی خوشی میں کھوتی کیوں ہو!!؟

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!!
جبتک دُنیا تھک نہ چکے گی
چاند ستارے مر نہ چکیں گے
یہ نظارے مر نہ چُکیں گے!
دھندلی اور بے جان زمیں سے
جبتک ایک نیا سیارہ
پھر نہ حسیں بن کر اُبھرے گا

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!!
دُنیا اک انگڑائی لے گی!!!

ساغر نظامی

بے نام تقاضہ

میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

عید کے روز امیدوں کا جہاں ہے روشن — یہ جہاں ہاں یہ اندھیروں کا مکاں ہے روشن
جانے کس نور سے پنہاں و عیاں ہے روشن — آج کیوں میرا سیہ خانۂ جاں ہے روشن

مدّتوں سے یہ دیا میں نے جلایا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

آئی بے روح مسرّات میں لپٹی ہوئی عید — لاکھ فرسودہ حجابات میں لپٹی ہوئی عید
زیرِ لب نغمہ چکاں، رات میں لپٹی ہوئی عید — مُسکراتی ہے روایات میں لپٹی ہوئی عید

دین کیا آج تو اندازۂ دُنیا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

پھر بھی طوفان سا اُٹھتا ہے مرے سینے میں — کوئی رہ رہ کے مچلتا ہے مرے سینے میں
تُند شعلہ سا بھڑکتا ہے مرے سینے میں — ایک مُبہم سا تقاضہ ہے مرے سینے میں

اور یہ طوفان محبّت نے اُٹھایا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

زندگی مقتلِ آدم ہے، جہاں بجھے لہو[1] — شہر بکھرے ہیں اُجاڑ، اور چمن بے خوشبو
ارتقا شام و سحر خون سے کرتا ہے وضو — اسی عالم میں لنڈھاتا ہے کوئی جام و سبو

اور یہ ساقی کسی جانب نظر آتا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

پھر بھی کچھ نقش مرے ذہن میں ہیں مبہم سے — بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں کئی عالم سے
یوں میں انجان ہوں اس جذبۂ بیش و کم سے — جیسے مطرب سے رباب، اور زباں سرگم سے

[1] جب قوموں میں بین الاقوامی ازدواج ہو رہا ہے تو الفاظ کی دنیا میں اس رسم کو کیوں نہ رائج کیا جائے؟ میرے نزدیک صرف اس میں اسقدر التزام واحتیاط کی ضرورت ہے کہ ایسے دو الفاظ میں عطف و اضافت کو روا نہ رکھا جائے جس میں صوتی کراہت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ ساغر

یہ حقیقت بھی نہیں ہے کوئی دھوکا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

اس طرح بُنتے ہیں اک جال سا رومان و شباب — جیسے تخئیل کی اُٹھتی ہوئی موجوں کے حباب
جیسے تخلیق سی کرتی ہوئی دنیائے سراب — جس طرح ترکی و ایران کے شبستانوں کے خواب
ہجر ان کا مری آنکھوں کو گوارا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

دل ہے اِک مُبہم و ژولیدہ تصوّر کا شکار — روح ہے کشمکشِ جذبۂ پنہاں کا دیار
میرے نغمے ہیں کہ نابینا مغنّی کی پُکار — میرا احساس بصارت ہے جہانِ اسرار
لاکھ پردے ہیں، مگر نام کا پردہ بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

ساحروں کے سے عجب سحر جگاتا ہے کوئی — نشّے کے جال رگ و پے میں بچھاتا ہے کوئی
گِر جو جاتا ہوں تنفّس سے اُٹھاتا ہے کوئی — میکدہ سا مرے دل میں لئے آتا ہے کوئی
اور ابھی تک مجھے اندازۂ صہبا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

میری فطرت ہے توہّم مرا جینا ابہام — واہموں کو میں سُناتا ہوں حقیقت کے کلام
ڈھالتا ہوں میں تصوّر میں ہزاروں اصنام — دل ہی دل میں تمہیں دیتا ہوں کسی شے کے پیام
سوچتا ہوں کہ یہ عالم کوئی سپنا بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں گو تمہیں چاہا بھی نہیں

ایک بپھرا ہوا طوفان ہے حیاتِ آدم — آکہ بپھرے ہوئے طوفان میں کودیں باہم
جس طرح دورِ زمانہ ہے مسافر ہر دم — میرا جذبہ بھی ہے بہتا ہوا اک موجۂ یم
جانتا ہوں کہ قرار اس کا تقاضہ بھی نہیں
میں نے دیکھا بھی نہیں، گو تمہیں چاہا بھی نہیں

پھر بھی یہ نذرِ محقّر تمہیں منظور ہے کیا
دل کا چھلکا ہوا ساغر تمہیں منظور ہے کیا — جذبۂ وحشتِ یکسر تمہیں منظور ہے کیا
میرے نغموں کا گُلِ تر تمہیں منظور ہے کیا — شوق کا تحفۂ احقر تمہیں منظور ہے کیا!؟

نئی کہانی

اسٹیفن لِسکاک و مسعود چشتی

مستقبل کی ایک تمثیل

(اسٹیفن لِسکاک کا ایک Fantasia (خیالی منصوبہ)

یہ بات غیر مناسب معلوم ہوئی کہ بعض مصنف چار سو یا پانچ سو برس کی گہری نیند سوتے رہیں اور پھر مستقبل بعید میں اٹھ کر اُس وقت کے عجوبات کا مشاہدہ کریں۔ میں بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔

میں تمدنی مسائل کا بغور مطالعہ کرتا ہوں۔ جدید دُنیا مع اپنی شوریدہ مشینوں، مزدوروں کی ان تھک محنت اور ان کے روزانہ کے جھگڑوں، غربت اور مظالم کا جب میں غائر مطالعہ کرتا ہوں تو بیحد متاثر ہوتا ہوں۔ مجھے اُس زمانہ کے دیکھنے کا بیحد اشتیاق ہے جب انسان نیچر کو فتح کرے گا اور مصیبت زدہ تھکی ہوئی انسانی ہستیاں عدم کی دُنیا میں قدم رکھیں گی۔ پس میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔

میری خواہش یہ تھی کہ موجودہ فیشن کے مطابق میں کم سے کم تین یا چار سو برس کے لئے سو جاؤں اور پھر جاگنے پر مستقبل کی دُنیا کے عجائبات کو دیکھوں۔

میں نے سونے کی تیاری شروع کر دی

میں نے ہر قسم کے ظریفانہ و مصوّر رسالوں کو حاصل کیا اور انہیں اپنے ہوٹل کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اپنے ساتھ سور کا گوشت اور بہت سی کھانے کی چیزیں رکھ لی تھیں۔ گوشت اور دوسری چیزیں کھا لینے کے بعد بستر پر بیٹھ کر یکے بادیگرے رسالوں کا مطالعہ شروع کیا۔ ظریفانہ رسالوں کے پڑھنے کے دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے پر کچھ نہ کچھ کھا لیا کرتا۔ بالآخر جب میرے اوپر نیند کا بیحد غلبہ ہوا تو میں نے "لندن ٹائمز" کو ٹٹول کر اُٹھایا اور اسکے "اداریہ" کو اپنی نظر کے سامنے رکھا۔

ایک طریقے سے یہ خودکشی تھی لیکن پھر بھی میں باز نہ آیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے ہوش و حواس جواب دے رہے ہیں۔ ہمارے ہال کے سامنے والے کمرے میں ایک شخص سریلی آواز میں گا رہا تھا۔ اسکی آواز جو ابتداءً بہت تیز تھی، لمحہ بہ لمحہ میرے کانوں میں مدھم ہوتی گئی۔

آخر میں ایک گہری اور لامتناہی نیند کے آغوش میں تھا خارجی دُنیا سے بے تعلق، موہوم طریقہ پر دن، مہینے، سال گزرتے گئے، صدیاں گزر گئیں، جس کا ایک مبہم نقش میرے ذہن میں اب بھی ہے۔

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے بتدریج نہیں بلکہ یکایک میں اُٹھ بیٹھا اور چاروں طرف حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔

میں کہاں تھا؟ میں خود سے سوال کر رہا تھا،

میں نے اپنے کو ایک بڑے صوفے پر بیٹھا پایا۔ کمرہ نہایت وسیع، دُھندلا، تاریک اور بظاہر اُجاڑ نظر آتا تھا۔ جو شیشے کی الماریوں اور دیگر محفوظ رکھی ہوئی چیزوں سے عجائب خانہ معلوم ہوتا تھا۔

میری بغل میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اس کے چہرے پر بال مطلق نہ تھے وہ نہ تو بہت بوڑھا تھا نہ بالکل جوان۔

اُس نے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے جو پہلے کاغذ سے مشابہ تھے جیسے وہ جل کر کپڑے کی صورت میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہ شخص خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن اُسکے چہرے پر حیرت یا دلچسپی کے کوئی آثار نہ تھے۔

"میں نے فوراً بے چینی میں اُس سے پوچھا" "میں کہاں ہوں"؟ تم کون ہو؟ یہ کون سال ہے؟ کیا یہ تین ہزارواں

سال ہے؟ یا پھر آخر یہ کیا ہے؟

اس نے غصہ کی حالت میں ایک لمبا سانس لیا۔

"تمہاری گفتگو کا انداز کتنا عجیب اور مضحکہ خیز ہے" اُس نے جواب دیا۔

مجھے بتاؤ کہ یہ تین ہزار واں سال ہے؟ میں نے پھر کہا۔

"میں تمہارے مفہوم کو خوب سمجھ رہا ہوں" اُس نے کہا "لیکن فی الحقیقت مجھے خود کوئی اندازہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں ..... ۳ کے سو برس ادھر یا اُدھر ہو گا۔ چونکہ عرصہ دراز سے ہم لوگوں نے تاریخ اور سال کا شمار ترک کر دیا ہے اس لئے اب ان کا شمار ناممکن ہے۔"

"کیا واقعی تم لوگ ماہ و سال کا شمار اسی وجہ سے نہیں کرتے" میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"کسی زمانے میں ہم لوگ بھی ماہ و سال کا شمار رکھتے تھے" وہ شخص بولا "مجھے خوب یاد ہے کہ سو یا دو سو سال ہوئے اس وقت کچھ لوگ موجود تھے جو تاریخوں اور سالوں کو گنتے تھے لیکن ایک زمانہ گزرا کہ یہ اور اس قسم کی بہت سی فرسودہ چیزیں مفقود ہو گئیں" اُس نے اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "اور پھر اس کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ ہم لوگوں نے "موت" ہی کو ختم کر دیا"

"ہائیں! کیا تم نے موت کو ختم کر دیا؟ یا اللہ" میں حیرت و استعجاب میں سیدھا اُٹھ بیٹھا "تم نے کونسا لفظ ابھی ابھی استعمال کیا" اُس نے دریافت کیا۔

"یا خدا" میں نے دُہرایا۔

وہ شخص فوراً بولا "میں نے کبھی یہ فقرہ نہیں سُنا۔ ہاں میں کہہ رہا تھا کہ جب ہم لوگوں نے موت، غذا، اور تلون کو مفقود کر دیا پھر حالات و واقعات سے بھی یک قلم چھٹکارا مل گیا۔

میرا سر چکرا رہا تھا میں نے کہا "میرے سوالوں کا باری باری جواب دو" اُس نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا "اچھا! اب مجھے معلوم ہوا۔ تم شاید بہت دیر تک سوتے رہے ہو۔ ہاں اب تم سوالات کرو! لیکن کم سے کم سوالات کرو اور اس بات کی احتیاط رکھو کہ پریشانی یا مزید دلچسپی کے آثار تمہارے چہرے پر نمایاں نہ ہوں۔

اتفاق سے پہلا سوال جو میری زبان پر آیا وہ یہ تھا۔

یہ تمہارے کپڑے کس چیز کے بُنے ہیں۔

اُس نے جواب دیا "یہ سینکڑوں سال تک کام دیتے ہیں ہر شخص کے پاس ایک سوٹ رہتا ہے اور پھر ایسے کروڑوں جوڑے سوٹ استعمال کیلئے پڑے ہوتے ہیں۔

"شکریہ" میں نے کہا "ہاں یہ تو بتائیے میں کہاں ہوں؟"

"تم ایک عجائب گھر میں ہو۔ ان الماریوں میں تمہارے ہی جیسے چند نمونے رکھے ہوئے ہیں اگر تم اس وقت کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہو تو یہاں سے اُٹھو اور بڑی سڑک پر آ کر بینچ پر بیٹھ کر نظارہ کرو۔"

میں اُٹھ بیٹھا

میں اندھیری اور غبار آلود عمارت سے گزر رہا تھا اور الماریوں کے اندر جو مجسمے تھے اُن کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

ہاں! یہ شخص جو نیلی وردی پہنے ہوئے اور پیٹی لگائے ہوئے ہے ایک سپاہی ہے۔

میرا نیا ملاقاتی بول اُٹھا "کیا سپاہی اسی قسم کے ہوا کرتے تھے! وہ کس کام پر مامور ہوتے تھے؟

"مامور" میں نے سخت پریشان ہو کر کہا "یہ سڑک کے ایک کنارے پر کھڑے رہتے تھے"

"تاکہ وہاں سے آدمیوں کو گولی مار سکیں۔ میری لاعلمی کو معاف کرنا" اجنبی نے کہا "حصولِ تعلیم کے دوران میں میں نے تاریخ تمدن کے لئے ایک آپریشن لیا، لیکن آپریشن میں گھٹیا دوائیں استعمال کی گئیں"

میں اجنبی کی باتوں کو سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ لیکن اس وقت مزید سوالات کا موقع نہ تھا کیونکہ فوراً ہم لوگ ایک کشادہ سڑک پر آ نکلے۔ جہاں میں حیرت زدہ ہر چیز کو گھورتا رہا تھا۔ کشادہ سڑک! کیا ممکن تھا! حیرت انگیز تبدیلیاں! سڑکوں کی چہل پہل کے بجائے اب ہر طرف سنسان اور ویرانی ہے۔ فلک بوس محلات صدیوں ..... کے بعد ویران اور مسمار ہو گئے ہیں۔ دیواروں پر کائی کی موٹی تہیں جمی ہوئی ہیں۔ فضا بالکل خاموش تھی۔ سڑک سے ایک سواری بھی نہیں گزرتی تھی۔ سر کے اوپر تار بھی نہ تھے۔ زندگی، یا قدموں کی چاپ بھی نہ سُنائی دیتی تھی۔ صرف چند انسانی مجسمے الیسٹاس کے کپڑے زیب تن کئے ہوئے آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر ٹہلتے نظر آ رہے تھے۔ چہروں سے حیات جاودانی نمایاں تھی۔

یا اللہ! کیا فتح کا یہی دور ہے جس کا میں اس قدر مشتاق تھا! میرا یہ عقیدہ تھا کہ انسان ترقی کے منازل طے کرتا جا رہا ہے اور ایک دن وہ اسکی ضرور تکمیل کریگا۔ لیکن تہذیب کی اس بربادی کو دیکھ کر میں سکتہ میں رہ گیا۔

سڑک پر تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلہ پر بنچیں پڑی تھیں۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

"تہذیب میں کس قدر ترقی ہوگئی ہے" میرے اجنبی دوست نے کس قدر فخر کے ساتھ بیان کیا۔ میں نے بدقت تمام ایک سوال کیا۔

"موٹر اور کار کہاں ہیں؟" "او، وہ تو عرصہ ہوا نیست و نابود ہوگئیں۔ اس نے جواب دیا" اور یہ چیزیں کتنی تکلیف دہ تھیں، کس قدر تکلیف دہ تھیں، کس قدر شور آگیں!

"لیکن لوگ کیونکر ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے ہیں؟"

"آنا جانا بند" اس نے تیزی سے جواب دیا" اور پھر سفر کی ضرورت کیا ہے۔ یہاں رہنا ویسا ہی ہے جیسا دوسری جگہ۔"

اس وقت وہ تیز نظروں سے میرے چہرے کو گھور رہا تھا۔"

دماغ میں سیکڑوں طرح کے سوالات پیدا ہو رہے تھے لیکن میں نے ایک نہایت سادہ سوال کیا " لیکن لوگ اپنے کاموں پر کیسے آتے جاتے ہیں"؟

"کام" اس نے لرزتے ہوئے کہا " اب کوئی کام نہیں رہا۔ سب ختم ہوگیا۔ اور آخری کام تو شاید صدیوں گزرے ختم ہوگیا۔"

میرا منہ کھلا رہ گیا۔ میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر میری نظر یکایک ان افراد پر پڑی جو السبٹاس میں ملبوس سڑکوں پر چل پھر رہے تھے۔

میں نے اپنے حواس کو یکجا کیا۔ میں نے خیال کیا کہ اس مستقبل کی تفصیل کا مطالعہ بتدریج و مسلسل کرنا چاہئے۔

. . . .

"اب میں سمجھا" میں نے قدرے وقفے کے بعد کہا "ہمارے وقت سے عظیم الشان تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ تم مجھے چند سوالات کرنے کی اجازت دو، اور پھر باری باری تم مجھے اسکے جوابات دو، " ہاں اس سے کیا مراد کہ تمہارے پاس

اب کوئی کام نہیں ہے؟"

"کیوں" میرے ساتھی نے جواب دیا " کام خود بخود ختم ہوگیا۔ مشین نے اسے ختم کردیا۔ اگر میری یادداشت درست ہے تو شاید تمہارے وقت میں بھی کچھ مشینیں تھیں تم نے بھاپ اور بجلی سے بڑے بڑے کام لئے اگرچہ میرے خیال میں ریڈیائی قوت سے زیادہ کام نہیں لیا گیا۔"

میں نے سر ہلایا۔

"لیکن یہ تمہارے لئے مفید ثابت نہ ہوئی۔ جتنی زیادہ عمدہ مشینیں استعمال ہوتیں اتنا ہی زیادہ سخت جانفشانی سے کام کرنا ضروری ہوتا۔ چیزوں کی زیادتی سے تمہاری ضروریات بھی بڑھتی گئیں۔ زندگی کی رفتار تیز تر ہوتی گئی۔ تم چلایا کرتے لیکن رکنے کا نام نہ لیتی۔ تم سب اپنے مشینوں کے جنگل میں پھنس کر رہ گئے کسی نے انجام کو نہ سوچا۔"

"یہ بالکل درست ہے" میں نے کہا "تم نے یہ تمام باتیں کیونکر معلوم کیں"؟

"او" اس نے جواب دیا "میری تعلیم کے اس حصہ کا بہت کامیاب آپریشن ہوا تھا، اچھا! شاید تم میری ان باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ خیر میں تمہیں آگے چل کر یہ تمام باتیں بتاؤں گا۔ تمہارے دور کے دو سو برس کے بعد ایک نیا دور آیا۔ یعنی نیچر پر فتح کا زمانہ جس میں انسان نے قدرت اور مشین کے ذریعہ نیچر پر پوری قدرت حاصل کرلی۔"

"کیا واقعی انہوں نے قدرت کو زیر کرلیا؟" میں نے اپنے زمانے کے حالات کو سوچتے ہوئے پوچھا،

"فتح کرلیا" اس نے کہا " آخیر تک جنگ کرکے زیر کرلیا؟ کام بتدریج ہوتا ہے پھر جلد جلد حاصل ہونے لگتا ہے تقریباً سو برس میں سب کچھ ہوگیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب انسان نے اپنی قوت کو زیادہ کرنے کے بجائے کم کرنے میں صرف کیا تو تمام باتیں آسان ہوگئیں۔

پہلے کیمیائی غذا **chemical** اس کھانے میں کتنی سادگی ہے! تمہارے زمانے میں کروڑوں آدمی دن رات کھیتوں میں محنت کرتے۔ یہ صرف کھانے کے لئے۔ اسکے نمونے اب بھی عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ شاید انہیں کسان کہتے تھے۔ ایک کسان کا مجسمہ اب بھی عجائب گھر میں رکھا ہوا ہے

کیمیائی غذا ([illegible]) کے ایجاد ہونے کے بعد ہزاروں سال کیلئے ایک ہی سال میں کھانا تیار کرلیا۔ زراعت بالکل ختم ہوگئی۔ محنت مزدوری۔ گھر کا کام کاج سب کچھ اُٹھ گیا۔ آج کل صرف ایک گولی کھاتے ہیں جو سال بھر کیلئے کافی ہوتی ہے۔ غذا مہیا کرنے کے تمام آلات جو ہمارے زمانے میں تھے بہت بھدّے تھے جو عدم استعمال کے باعث مثل ہوائی بان کے غائب ہوگئے۔

مجھے مداخلت کی جرأت نہ ہوئی۔ پھر بھی میں بول اُٹھا "کیا تم لوگوں کے پاس پیٹ اور معدہ نہیں ہے"؟

اُس نے جواب دیا "ضرور ہم لوگوں کے پاس پیٹ و معدہ ہے۔ لیکن انہیں اب دوسرے امور کے لئے استعمال کرتے ہیں ہمارا پیٹ اس وقت صرف تعلیم سے پُر ہے۔ میں پھر بہک گیا میں جس طور سے بیان کررہا تھا۔ مجھے بیان کرنے دو۔ کیمیائی غذا .... کے ایجاد سے ایک تہائی کام ختم ہوگیا اور اُسکے بعد ایسبٹاس .... کے کپڑے ایجاد ہوئے اور یہ حیرت انگیز چیز تھی۔ ایک سال میں ہم لوگوں نے ابد تک کے لئے کپڑے تیار کرلئے ہیں۔ یہ ہرگز ممکن نہ تھا اگر عورتوں نے انقلاب کی آواز نہ بلند کی ہوتی اور فیشن کا خاتمہ نہ ہوگیا تھا۔

"کیا اب فیشن باقی نہیں رہ گیا" میں نے دریافت کیا۔ میں اپنے معمول کے فیشن کی بے ثباتی اور —— یہ گفتگو چھیڑنے ہی والا تھا کہ یکایک ایسبٹاس میں ملبوس کچھ متحرک شکلیں نظر آئیں۔ میں نے اس گفتگو کا ارادہ ترک کردیا۔

"سب مفقود ہوگیا" اجنبی نے جواب دیا۔ اور بعد ازاں ہم لوگوں نے تبدیلِ آب و ہوا کو بھی ختم کردیا۔ شاید تم یہ نہ سمجھتے ہوگے کہ تمہارے زمانے میں تبدیلِ آب و ہوا کی وجہ سے کس قدر کام بڑھ گئے تھے۔

میری مراد گوناگوں کپڑوں اور مکانوں سے تفریح گاہوں اور کام کے گھنے جنگلات سے ہے۔ تمہارے وقت میں کتنی تکلیف دہ اور خوفناک چیزیں تھیں۔ ہوا! طوفان! آسمان پر بڑے بڑے سپید ٹکڑے! بادل شاید ہوا میں اُڑتے تھے۔ سمندر میں نمک! بارش! اولے! کہرے!! کیا یہ چیزیں تمہارے وقت میں نہیں تھیں؟

کس قدر خوفناک!

"کبھی کبھی یہ نہایت حسین و دلکش مناظر پیش کرتے تھے"۔ میں نے کہا "لیکن تم نے ان تمام چیزوں کو بیک وقت کیونکر نیست و نابود کردیا؟"

اس نے کہا "تم نے موسم کو فنا کردیا۔ اس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ ایک طاقت کو دوسری طاقت سے بھڑادیا جس سے سمندر کے اجزاء کی ماہیت بالکل بدل گئی جس سے فضا بالکل شفاف ہوگئی۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں اسے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کرسکتا کیونکہ میں نے اسکول میں کبھی اس کا اپریشن ہی نہیں لیا لیکن ہاں آسمان بھورے رنگ کا ہوگیا اور سمندر گونددی رنگ کا ہوگیا۔ اور ہر جگہ موسم یکساں ہوگیا۔ اس سے ایندھن اور مکانات سب ختم ہوگئے"۔ وہ یہ کہکر کچھ دیر تک خاموش رہا۔ اور میں ان حیرت انگیز تبدیلیوں پر غور کررہا تھا۔

"گویا نیچر کو فتح کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کام کرنے کیلئے باقی نہیں رہ گیا" میں نے کہا۔

۴۵ اُس نے جواب دیا "بالکل یہی بات ہے۔ کوئی کام باقی نہیں رہا"۔

"کیا ہر شخص کے لئے وافر کھانا موجود ہے"۔

"بہت زیادہ" اس نے جواب دیا۔

"مکانات اور کپڑے"

اجنبی نے ہاتھ کے اشارہ سے بتایا "تمہیں جن چیزوں کی ضرورت ہو۔ وہاں رکھی ہوئی ہیں۔ تم وہاں سے انہیں لے سکتے ہو۔ یہ ضرور ہے کہ چیزیں اب تعداد میں کم ہوتی جاتی ہیں لیکن پھر بھی وہ ابھی صدیوں کام دینگی۔ ابھی اس کی طرف توجہ کی ضرورت نہیں ہے"۔

اُس وقت میں یہ غور کررہا تھا کہ اُس پرانی دُنیا میں زندگی کا کس قدر بیشتر حصہ طرح طرح کے لایعنی کاموں میں ختم ہوجاتا تھا۔ فوراً ہی میری نظریں اوپر اُٹھیں۔ ایک مسمار اور خستہ عمارت کے اوپر چند ٹوٹے پھوٹے تار لٹک رہے تھے جو بظاہر ٹیلیفون کے تار معلوم ہوتے تھے۔

"ٹیلیفون۔ ٹیلیگراف۔ اور دیگر رسل و رسائل کے ذرائع کیا ہوئے"؟ میں نے دریافت کیا۔

حیرت زدہ اجنبی چلا اُٹھا۔ "او! شاید وہ ٹیلیفون کہلاتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ یہ چیزیں تو سیکڑوں برس ہوئے ختم ہوگئیں۔ اور پھر ان کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"کیوں" میں جوش میں آکر بول اُٹھا۔ "ٹیلیفون کے ذریعہ ہر شخص سے بآسانی گفتگو کر سکتے ہیں۔"

اجنبی خوف زدہ ہوکر بولا "اور کوئی شخص تمہیں کسی وقت بلا سکتا تھا اور پھر بات چیت بھی کر سکتا تھا یہ کتنی فضول بات ہے! تمہارا دور یقیناً خوفناک تھا۔ اب ٹیلیفون۔ ٹیلیگراف اور سفر کرنے کے تمام ذریعے برباد کر دیئے گئے۔ سفر کرنا بڑی بیوقوفی کی علامت تھی۔ شاید تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ تمہارے بعد لوگ زیادہ عقلمند ہوگئے۔ ریل روڈ ہی کو لو۔ آخر اس سے کیا فائدہ تھا۔ . . . . شاید اس کی وجہ سے ایک شہر سے بہت سے لوگ دوسرے شہر میں گھس آتے تھے انہیں دوسرے شہر میں جانے کی ضرورت کیا تھی۔ جب کام اور تجارت ختم ہوگئی۔ کھانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اور موسم ہر جگہ یکساں ہے۔ ایسی حالت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر

کرنا صریحاً بیوقوفی ہوگی اس لئے سفر کے سب ذرائع ختم ہوگئے۔ بہرکیف یہ چیزیں بڑی خطرناک تھیں۔

"خطرناک"؟ میں نے کہا "خطرہ تو اب بھی ہے۔"

"ہاں کچھ حد تک اب بھی ہے اور وہ صرف منقطع ہونے کا خطرہ ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"تمہارا کیا مطلب" میں نے پوچھا۔

"یہ وہی ہے جسے تم موت کہتے ہو، اور ہاں کئی صدیوں سے کوئی موت واقع نہیں ہوئی ہے وہ بھی اب مفقود ہوگئی۔

بیماری اور موت صرف کیڑوں سے پیدا ہوتی تھی۔ یکے بعد دیگرے یہ چیزیں دریافت ہوتی گئیں۔ اور شاید تم لوگوں نے بھی اپنے زمانے میں کچھ معمولی بیماریوں کے علاج دریافت کر لئے تھے۔ تم نے شاید میعادی بخار۔ چیچک وغیرہ کے کیڑوں کو دریافت کر لیا تھا۔ لیکن اُسکے ایسے کیڑوں کو جنہیں تم دریافت کرتے اور سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔ ہم لوگوں نے دریافت کر کے ختم کر دیا۔ تعجب ہے کہ تم ابتک نہیں سمجھے کہ تمہارا پرانا دور بھی کیڑوں کے مشابہ تھا۔ یہ بالکل معمولی بات تھی لیکن تقسیم کار اس طرح تھی کہ تم اس کا خیال نہ کر سکتے تھے

"تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "کہ اب لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں" اجنبی دوست نے فوراً کہا "میں چاہتا تھا کہ تم خوف و ہراس اور حیرت و دلچسپی کا اظہار نہ کرتے۔ تم اس قدر متحیر ہو رہے ہو کہ شاید یہ تمام تبدیلیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ہاں ہم لوگ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں تاوقتیکہ کسی وجہ سے فنا نہ ہو جائیں۔ فنا ہو جانے کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے لیکن یہ بہت شاذ و نادر ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی چیز پر ہم زور سے گریں تو لکڑی کی طرح چور چور ہو جائیں۔ ہم میں ابھی تھوڑی نزاکت باقی ہے۔ اب صرف یہی تھوڑے سے پرانی بیماری کے کیڑے کی یادگار ہے جن سے اب بھی کچھ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ اس نے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تسلیم کرنے میں عار نہیں ہے کہ حادثات ہماری تہذیب پر بدنما دھبے تھے یہاں تک کہ ہم لوگوں نے کوشش کر کے حادثات کا خاتمہ کر دیا۔ تمہارے زمانے میں واردات کچل کے مرجانا ایک نہایت عام بات تھی لیکن اب سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ، موٹر ریل اور ہوائی جہاز سب ممنوعات قرار دیدئے گئے۔ تمہارے دور کے خطرات ان سے بہت وحشت انگیز تھے۔ اس وقت اس نے کپڑے میں لرزتے ہوئے کہا . . . . . . میں نے اپنی تہذیب کی یاد سے متاثر ہوکر فخریہ انداز میں جس کو میں نے پہلے محسوس نہیں کیا تھا کہا ہمارے خیال میں یہ جوا مردوں کے فرائض میں تھا۔"

"ہاں! ہاں!" اجنبی دوست نے بے صبری سے کہا "تم مزید پریشانی کو راہ نہ دو۔ میں تمہاری باتوں کو خوب سمجھتا ہوں یہ سراسر نادانی تھی۔"

عرصہ تک ہم لوگ خاموش بیٹھے رہے۔ میں منہدم عمارتوں ویران و سنسان سڑکوں اور آسمان اور فضا کی یکرنگی کو دیکھ رہا تھا۔ نیچر کو فتح کرنے کا یہ انجام تھا۔ کام۔ کھانا۔ بھوک سردی گرمی محنت سب کا اختتام، تبدیلی و موت کا زوال یعنی ابدی عیش و مسرت۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اس دور میں بھی ضرور نقص تھا۔ میں نے غور کیا پھر فوراً تیزی سے جوابات پر بغیر غور و فکر کے دو تین سوالات کئے۔

"اس وقت جنگ ہوتی ہے"۔

"سیکڑوں برس ہوئے ختم ہوگئی۔ طرح طرح کے بین الاقوامی

جھگڑوں کو طے کرنے کیلئے مشینوں سے شاید جنگ ہوا کرتی تھی لیکن اسکے بعد بین الاقوامی تعلّقات یک لخت ختم کردیے گئے۔ تجارت اور ایسے تعلّقات کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہر شخص غیر ملک کے باشندوں کو نفیر اور خوفناک تصوّر کرتا ہے۔"

"اخبارات شائع ہوتے ہیں یا نہیں؟"

"اخبار"! توبہ! نہیں اس کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟ اور اگر کسی کو پڑھنے کا شوق ہو تو ہزاروں پرانے اخبارات کے انبار لگے ہیں۔ اور پھر اُن میں ہے کیا؟ صرف اُن واقعات، واردات جنگ، اور موت کا ذکر ہے جس سے شاید تمہارے زمانے کو خصوصیت حاصل تھی۔ جب یہ سب چیزیں فنا ہوگئیں تو اخبارات بھی مفقود ہوگئے۔

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ سنو! باوجودیکہ تم شاید سوشل رفارمر (Social Reformers) تھے اس نئی زندگی کو تم تصوّر میں بھی نہ لاسکے۔ شاید تم اس بات کا پورے طور سے اندازہ نہیں کرسکتے کہ کتنا وزنی بوجھ ہمارے سر سے اُتر گیا۔ اس کو اس نظر سے دیکھو کہ تمہارے دور کا ابتدائی حصّہ کتنی جانفشانی میں ختم ہوجاتا تھا۔

"کیوں" میں نے کہا "صرف پندرہ برس حصولِ تعلیم کے لئے کافی تھا۔"

"بہت درست" اُس نے کہا "لیکن ذرا غور کرو کہ اب کتنی ترقّی ہوگئی ہے۔ اب تعلیم صرف آپریشن سے حاصل کی جاتی ہے مجھے حیرت ہے کہ تمہارے زمانے میں کسی نے یہ نہیں سمجھا کہ تعلیم صرف عملِ جرّاحی آپریشن (operation) ہے تمہیں اتنی عقل نہ تھی کہ تم یہ سمجھتے کہ فی الحقیقت تم جو کرتے تھے وہ دماغ کے اندرونی حصّہ کو نئی ساخت میں لاتا اور پیچ وخم و توڑ مروڑ کر کے تکلیف دہ طریقہ پر دماغی آپریشن کرتا تھا جو کچھ تم پڑھتے تھے وہ طبعی طور پر دماغی حالت کے مخالف ہوتا تھا۔ تم نے سمجھا۔ تمہارے زمانہ میں کسی کو انجام کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اسکے بعد حصولِ تعلیم بذریعہ آپریشن ایجاد ہوا۔ نہایت آسانی سے کھوپڑی کے ایک حصّے کو کھول کر اس میں ایک بنا بنایا مغز نصب کردیتے ہیں۔ پہلے شاید وہ مُردوں کے دماغ استعمال کرتے تھے مگر یہ بھیانک چیز تھی۔ یہ کہتے وقت وہ پتّوں کی طرح لرز رہا تھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ خود مغز بنانا سیکھ گئے۔ پھر تو یہ ایک بہت معمولی بات تھی اور چند منٹ کے آپریشن میں منظومات۔ تاریخ۔ جغرافیہ

ادب غرض انسان ہر چیز اپنے شوق کے مطابق حاصل کرسکتا ہے۔ اپنے سر کے بالوں کو ایک طرف کرتے ہوئے اس نے ایک داغ دکھایا اور پھر کلام کو جاری کیا "مثلاً اس جگہ میں نے ریاضیات کا آپریشن لیا تھا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ عمل تکلیف دہ تھا۔ لیکن انگریزی نظمیں اور تاریخ بغیر کسی تکلیف کے حاصل کرسکتے ہیں جب میں تمہارے دور کے تکلیف دہ اور وحشیانہ طریقے کو سوچتا ہوں جبکہ کانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کی جاتی تھی تو میں کانپ اُٹھتا ہوں۔ یہ بات تعجب انگیز ہے لیکن اب تو معلوم ہوگیا ہے کہ سیکڑوں امور کے لئے دماغ کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ فلسفہ اور منطق کو تو ہم لوگ معدہ میں رکھ لیتے ہیں۔ پھر اُس میں وہ چیزیں بھرتے ہیں اور وہ خوب سمو جاتی ہیں۔۔ وہ کچھ دیر تک خاموش تھا۔ پھر بولا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد تم کرتے کیا تھے"؟

"کیوں" میں نے کہا۔ تعلیم کے بعد کام کرنا ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وقت اور اس کا زیادہ حصّہ دوسری جنس کے ساتھ ختم ہوتا تھا رفیقِ حیات ڈھونڈھنے میں اور اسکے طلب کرنے میں، اجنبی سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے میں نے تم لوگوں کے عورتوں سے تعلّقات کے بارہ میں کچھ سُنا ہے لیکن یہ سب کچھ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے بتاؤ۔ کیا تم کسی ایک عورت کو منتخب کرلیتے تھے؟

"ہاں"

"اور کیا وہ عورت تمہاری بیوی ہوجاتی تھی۔"

"ہاں! وہ رفیقِ حیات ہوجاتی تھی" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔

"اور کیا تم اسکے لئے محنت مزدوری کرتے؟"

"ہاں" "اور وہ مطلق کام نہیں کرتی تھی؟"

"نہیں۔ مطلق نہیں" میں نے جواب دیا۔

"اور شاید تمہاری تمام جائداد اور دولت کے آدھے کی وہ شریک بھی ہوتی تھی؟"

اور ہاں۔ اسے تمہارے مکان ہی میں رہنے اور تمہاری چیزوں کو بھی استعمال کرنے کا حق حاصل تھا۔

"اور کیا" میں نے جواب دیا۔

"کیسی ڈراونی اور حیرت انگیز باتیں ہیں" وہ لرزتے ہوئے بولا۔

"سچ تو یہ ہے کہ میں تمہارے دور کے عجوبات اور تعلّقات سے پورے طور سے ابھی تک واقف نہیں ہوں" یہ کہہ کر وہ کانپتے ہوئے

بینچ پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔

یکایک مجھے خیال آیا کہ سڑک پر جتنے آدمی تھے سب یکساں تھے اُن کی صورت میں کوئی فرق نہ تھا۔

"مجھے بتاؤ" میں نے کہا۔ کیا اب عورتیں بھی نہیں ہیں؟ کیا وہ بھی ختم ہوگئیں۔

"نہیں۔ نہیں" اجنبی نے جواب دیا۔ "عورتیں اب بھی ہیں لیکن اُن میں اور مردوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ دیکھو بات یہ ہے کہ اب ہر چیز میں تغیر اور تبدیلیاں واقع ہوگئی ہیں۔ یہ اُن کی بغاوت کا نتیجہ تھا۔ اُن کو مرد بننے کا بڑا اشتیاق تھا۔ شاید یہ تمہارے ہی وقت میں شروع ہوگیا تھا۔

"ہاں کچھ کچھ" میں نے جواب دیا۔ انہوں نے ووٹ اور برابری کا مطالبہ شروع کردیا تھا۔ "ہاں ہاں میں سمجھا" میرے دوست نے کہا۔ مجھے الفاظ بھی نہیں ملتے لیکن میرے خیال میں تمہاری عورتیں خوفناک ہوتی ہونگی۔ کیا وہ طرح طرح کے پر اور کھال اور رنگین کپڑے جو مُردہ چیزوں سے بنتی تھیں استعمال کرتی تھیں۔ شاید وہ ہنستی بھی تھیں اور دانتوں کو ہر وقت باہر نکالے رہتی تھیں اور وہ تمہیں ایسے معابدوں میں قید کرلیتی تھیں۔ "اُف"! وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے غصہ میں اُسے مخاطب کیا۔ الیسٹاس (مجھے سوائے اسکے اس کا دوسرا نام معلوم نہیں تھا) "کیا یہ بھدی بھدی شکلیں جو بڑے بڑے لبادوں کو پہنے ہوئے سڑکوں پر رینگ رہی ہیں بیسویں صدی کی عورتوں کے مقابلہ میں آسکتی ہیں۔

یکایک میرے دماغ میں ایک دوسرا خیال آیا۔ "لڑکے" میں نے کہا لڑکے کہاں ہیں؟ کیا اب لڑکے نہیں ہوتے؟"

"لڑکے! وہ بول اُٹھا "کم سے کم سو سال سے میں نے لڑکوں کا نام بھی نہیں سُنا۔ لڑکے بھی عجیب و غریب چیز ہوتے ہونگے۔ بڑی بڑی شکلیں اور ہر وقت شور و غل، اور شاید وہ گھاس کی طرح بڑھتے بھی تھے میں سمجھتا ہوں وہ ہر سال سال گزشتہ سے زیادہ بڑھتے ہونگے۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

الیسٹاس! میں نے کہا "تو یہ تمہاری موجودہ تہذیب ہے، ابدی عیش و مسرت، زندگی کے ہر قسم کے کام اور بوجھ ختم ہونے کے بعد یہ دُنیا مُردہ سے بدتر ہے۔ اس کے ساتھ زندگی کی خوشیاں بھی ختم ہوگئیں۔ خطرات اور موت کے بجائے جاودانی عمر! مجھے پہلے زندگی واپس دو۔ خوفناک اور ڈراونی زندگی۔ زندگی کے تمام مصائب، خطرات ناامیدیاں واپس دو، مجھے اب اسکی قدر معلوم ہوئی۔ میں زور سے چلا اُٹھا "میں آرام نہیں چاہتا"۔ فوراً ایک مہیب آواز میرے کانوں میں آئی ہنگامہ

میری نیند ختم ہوچکی تھی۔ میں ہوٹل کے ایک کمرہ میں تھا۔ ایک شخص نیچے پکار رہا تھا۔ اور اسکے ساتھ زندگی کے تمام لوازمات اور میں بھی میں زینے سے نیچے اُتر آیا۔

رباعی

بلاوے پہ بلاوے لامکاں سے ہے!
یہاں فرصت نہیں ہے این و آں سے!
سنواروں انجمن یہ یا کہ وہ بزم؟
میں باز آیا نشاطِ دو جہاں سے!
ذرا جبریل! اتنا عرض کر دے
مجھے آزاد کر دیں دو جہاں سے!

عزمی۔ بی۔ اے (علیگ)

رام پرتاپ بہا - ایم - اے

ادھوری چٹھی

. . . . . .

آج صبح جب میں تھکا ہوا اُٹھا تو مجھے ہر چیز دھندلی لگنے لگی - چاروں طرف بادل سا چھایا معلوم ہو رہا تھا - دوا پیتے وقت ماں سے پوچھا ' آج ابھی سے اتنا اندھیرا کیوں ہو رہا ہے ؟' میں نے اُن کی اُداس آنکھوں کو خاموشی اختیار کرتے ہوئے دیکھا لیکن وہ دھندلاپن بڑھتا ہی جا رہا تھا - دھیرے دھیرے باہر کا دھندلاپن اپنے اندر بھی محسوس کرنے لگا - دوپہر کا کھانا سامنے لایا گیا، لیکن کچھ کھا نہ سکا - یوں ہی سو رہا - ابھی نیند کھلنے پر تکیے کے نیچے ہاتھ گیا تو تمہاری چٹھی ملی - تمہاری چٹھی! آنکھیں چمک اُٹھیں - دُنیا پھر سے روشن ہو گئی - کانپتی ہوئی اُنگلیوں سے لفافے کو چاک کیا - یہی خیال دماغ کو دُھن رہا تھا - میں نے تو سمجھا تھا کہانی ختم ہو چکی - ڈاکٹر کی رائے تمہیں بھی معلوم ہو گئی ہو گی - پھر تم نے مجھے خط کیوں لکھا! . . . .

خیر، خط کے واسطے شکریہ، اگر ایسے آدمی کا شکریہ بھی کوئی معنی رکھتا ہو تو - ہاں تو تم نے مجھے خط کا جواب دینے سے منع کیا ہے تمہاری خواہش ہے کہ میں تمہارا خط آخری خط سمجھوں - مجھے اس پر اعتراض نہیں - تمہاری خواہش مجھے منظور - لیکن . . . لیکن جس کا آغاز میں نے نہیں کیا تھا اُس کا آج انجام ہوتے ہوئے اندر ہی اندر ایک قسم کی دہشت سے کانپ اُٹھتا ہوں - خیر ایک ہی بات ہوئی - میرا خیال ہے میری آخری خواہش مان لینے میں تمہیں بھی زیادہ اعتراض نہیں ہو گا - آخری خط میں لکھ رہا ہوں -

تم نے لکھا ہے - تم نے میرے واسطے سب کچھ کرنے کی کوشش کی - مجھے خوش کرنے میں تم نے کچھ اُٹھا نہیں رکھا . . . میری ہو کر رہنے کی میری خواہش کو کامیاب بنانے کے لئے تم نے سب کچھ کیا لیکن دُنیا اور زندگی نے تمہیں کامیاب ہونے سے روکا - اس کا تمہیں دُکھ ہے . . . . . اب ہمارے تمہارے راستے الگ ہو چکے ہیں . . . . میں تمہیں بھول جاؤں اور معاف کر دوں

وقت ہی نے مجھے اور تمہیں ملایا تھا، اُسی نے الگ بھی کر دیا، تمہاری یہ رائے ہے کہ وقت کے سامنے سر جھکا کر ہمیں تمہیں اس کا فیصلہ خاموشی سے سُن لینا چاہئے - تم یہ بھی سوچتی ہو کہ اگر اس سے آگے تم میرے ساتھ اُس راستے پر چلنے کی کوشش کرتیں بھی تو وہ تمہاری ہماری خوشی اور سُکھ کا باعث نہ ہوتا -

لامحدود کمزوری کی حالت میں خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا - لیکن اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں - تم نے میرے لکھنے کے واسطے آخر چھوڑا ہی کیا ہے؟ جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ اتنا درست اور واجب ہے کہ بس جی یہی چاہتا ہے کہ تمہارے ہی لفظوں کو بار بار دوہرا کر خط تمام کر دوں - تم نے سب کچھ میرے واسطے کرنے کی کوشش کی' کوشش ہی کیا بلکہ سب کچھ تم نے کیا بھی - مجھے سُکھی بنانے میں تم نے کچھ بھی اُٹھا نہیں رکھا - وہ تمہاری مہربانی تھی - اس کے علاوہ اور میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

میں نے تو سمجھا تھا جیل کی زندگی نے میری کمر ہی توڑ دی - باہر نکلنے پر میں اپنے کو آدمی نہیں سمجھتا تھا - زندگی سے مجھے اور اُمیدیں نہیں رہ گئی تھیں - جیل میں آدمیوں نے مجھے آدمی سے حیوان بنا دیا تھا - تمہارے گھر بھی جانے کو جی نہیں چاہتا تھا - اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے گھر والوں کا خیال میرے واسطے کسی قدر بدل گیا ہو - اس کے برعکس تمہارے گھر کی ایک ایک چیز تمہاری بہن کی یاد میرے دماغ میں لاتی اور میں بے چین ہو جاتا - اُن بیچاری نے میرے ساتھ جو کچھ کیا یا کچھ بھی نہ کر سکی ہوں لیکن جہاں تک میرا سوال تھا میں یہ کیسے بھلا سکتا تھا کہ میرے بنانے یا بگاڑنے میں اُن کا کافی ہاتھ تھا - تمہیں تو سب معلوم ہی ہے -

وہ میری جوانی کی صبح تھی - میں ایک انجان بٹوہی کی طرح راستہ ہی ڈھونڈھنے میں مصروف تھا - دوسرے جب اُس صبح میری زندگی کے باغ میں پھولوں سے کھیلتے اور پھول توڑ رہے تھے میں نے اپنے

سر پر بہت بڑا بوجھ اُٹھا لیا۔ میں ایسے لوگوں کی صحبت میں پڑ گیا جو زندگی کا بھلا اور آخری مقصد دوسروں کا بھلا ہی کرنا سمجھتے ہیں اُن کے ساتھ میں شہر میں نہیں بلکہ شہر کے باہر باہر جیسے ایک جنون میں پھرا کرتا تھا۔ راتوں کو چھُپ چھُپ کر ایسی کتابیں پڑھتا جن سے دوسرے دن دہاڑے ڈرتے تھے میلوں چلتا اور دوڑتا تھا۔ اور اکثر گھر سے غائب رہتا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر شب کی تاریکی میں سائیکل چلاتا چلا جاتا۔ اُن باتوں کو سوچ کر آج تھکاوٹ معلوم ہو رہی ہے۔ جن اُنگلیوں میں آج قلم نہیں سنبھلتا اُنہیں میں ایک روز اُن لوگوں نے ریوالور پکڑا کر کہا "جاؤ اپنا کام کرو"

لیکن پھر بھی زندگی اتنی سخت اور دشوار ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی اُس کی سخت بندشوں سے بدن کے جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگتے تھے۔ اکثر ایسا محسوس کرتا کہ اپنی زندگی کی کوئی بُنیاد نہیں رہی حقیقت سے دُور ہٹ کر صرف جذباتی ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر چیز کو ایک خاص دماغی نظریہ سے دیکھتا اور غور کرتا جس راستے کو اپنی زندگی کا شاہراہ بنا لیا تھا اُس پر آفت مصیبت اور سختیاں جھیلتے ہوئے چلتا چلتا اکثر تھک جاتا۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا کہ اُس بھاری بوجھ کو سر سے اُٹھا کر پھینک دوں۔ راستے کے کنارے کی چھاؤں اور سبزہ زمین میں ذرا بیٹھ کر دم لینے کو بھی جی چاہتا، لیکن ایسا سوچتے وقت میں محسوس کرنے لگتا جیسے وہ ریوالور جو میری جیب میں تھا اُسے کسی نے میرے سر پر تان رکھا ہے۔ لاچار میں آگے کی طرف بڑھتا ہی جاتا جن فولادی زنجیروں میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اُنہیں کو توڑنے کے لئے!

اُسی وقت وہ لڑکی سڑک کے کنارے کھڑی ملی۔ اُسکی غریبی اور معصومیت نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح دیکھا کہ مجھے ذرا دیر ٹھہر کر اُس کا پیغام سُننا ہی پڑا۔ لیکن سر سے بوجھ اُتارا تھا کہ اُس کا جادو سر چڑھ گیا۔ اُسکی سادگی، معصومیت، غریبی اور پاک جوانی نے چھاپہ مار سپاہیوں کی طرح مجھے گھیر لیا۔

تمہاری بہن میرے واسطے "پل اوور" بُن رہی تھیں اُنگلی اور سلائی میں اُون کے پھندے ڈال کر میرا سینہ ناپتے آئیں اُنہیں میرے واسطے اتنا تکلیف اُٹھاتے دیکھ کر جب میں نے اعتراض کیا تو جواب میں اُنہوں نے مسکرا کر کہا۔ کیوں جاڑا پڑنا تو شروع بھی ہو گیا! آخر وہ تو بخش کر دے نہیں دے گی . . . . ؟" اُن کے مُنھ سے یہ سُن کر مجھے تعجب ہوا پھر پریشانی ہوئی اور آخر میں شرم سے آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔ وہ معمّا یعنی وہ بات اُنہیں کیسے معلوم ہوئی، میرے واسطے ایک علامت سوالیہ ہو کر رہ گیا۔ جب میں نے سوچا کہ آخر جاڑے سے میری حفاظت کرنے کی ذمّہ داری اُنہوں نے اپنے اوپر کیونکر لے لی۔

ابھی اُن پہیلیوں کو سُلجھا ہی رہا تھا کہ شام کو تم اُن کا خط لیکر آئیں۔ خط کے مضمون سے تو تم ناواقف تھیں لیکن اپنی کسی کا احساس تو تمہیں تھا ہی۔ آٹھ نو سال کی عمر میں ایک نہایت ہی ذمّہ داری کے کام کو جس غیر ذمّہ دارانہ انداز سے تم نے انجام دینے کی کوشش کی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کام کو وہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا وہ تمہارے اُس بے وقت مسکرا دینے کی وجہ سے آج بھی ہمارے تمہارے سر پر ایک بوجھ ہی ہو کر رہ گیا ہے۔

اُن سے جو کچھ مجھے ملا اُس کا ذکر آج مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ حُسن اور عشق کا تخیّل میرے دماغ سے بہت دور چھوٹ گیا ہے بیماری کے بستر پر صرف بدشکل اور تکلیف پہنچانے والی تصویریں میرے سامنے آتی ہیں۔ کسی چیز کی کمی اُسکی خوبی سے زیادہ ہوتی ہے یعنی کسی بھی چیز کی حدود اُس چیز سے زیادہ ہوتی ہیں یہ مجھے اُسی وقت معلوم ہوا۔ اُنہیں پانے پر چاہے مجھے ساری کائنات پا لینے کا احساس کیوں نہ ہوا ہو لیکن اس میں کیا شبہ کہ ایک سال سے کم ہی کی مدّت میں میں نے اُنہیں مٹی میں ملا کر کے دیا میری وجہ سے جو الم و اذیّت اُن کے حصّہ میں پڑی اُس کا اندازہ میں خود میں اپنی دماغی کوفت ہی سے لگا سکتا تھا۔ چھ مہینہ تک میں نے چین نہیں جانا۔ دن بھاگنے دوڑنے میں گزار دیتا، راتیں جاگتے جاگتے کٹ جاتیں۔ سر درد سے اور آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل رہتیں۔ اُن کے ساتھ میرا ایک ہی اور ساتھی تھا۔ یعنی خدا، اُن کا بھی ساتھ چھوٹ گیا یا چھوڑنا پڑا۔ میں نے شاید ٹھیک ہی سوچا کہ ایک کریم قادرِ مطلق کے ہوتے ہوئے دو بے گناہ روحوں کو اتنی ایذا کیسے پہنچ سکتی ہے۔

معلوم نہیں وہ خوشی یا افسوس کا موقع تھا۔ جب میں اُسے رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھے ڈرتا ڈرتا تمہارے گھر سے روانہ ہوا۔ دو میل سے زیادہ کا راستہ اُسی تیزی سے کاٹا جس سے کوئی بہت بڑا گناہ کا مرتکب کاٹتا ہے۔ ندی کے کنارے پہنچ کر اپنی چھ مہینے کی مُردہ نشانی کا مُنھ ایک بار دیکھنے کے جذبہ کو دبا کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڑھتے ہوئے دریا میں پھینک دی

لہروں کے سپرد کر دیا۔ میری زندگی کا وہ دوسرا خون تھا۔ پہلا خون میں نے اور انہوں نے مل کر کیا تھا۔ جب اُس دیہاتی لڑکی کا خط ہم لوگوں کے سامنے جلایا گیا جسے اُس نے معلوم نہیں کس قیمت پر کسی پڑھے لکھے آدمی سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ خیر اُسی کے چھ مہینے بعد تمہیں تو یاد ہی ہوگا، مجھے آخری خط لکھ کر وہ اپنے شاملِ حیات کے ساتھ چلی گئیں۔ تمہارا خط دیکھ کر اُن کے خط کی یاد بُری طرح مجھے ستا رہی ہے۔ اب لکھا نہیں جاتا۔ لیکن لکھنا ہی پڑیگا۔

اُسکے بعد کی سب باتیں تمہیں معلوم ہیں اور کیسے نہیں معلوم! اُس طوائف کی چھوکری سے مجھے ملاقات ہی ہوئے کتنے دن ہوئے تھے۔ لیکن کس سہولیت سے اُس نے مجھے چھ سال کیلئے پولیس کے حوالے کر دیا۔ معلوم نہیں دراصل اُس نے ریوالور دیکھا تھا یا نہیں۔ بہرحال میرے لئے تو وہ چیز اتنی پُرانی ہوگئی تھی کہ رکھی رکھی اب وہ زنگ بھی کھانے لگ گئی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اُس وقت میں سڑک کے بیچ سے ہٹکر سڑک کے بائیں طرف سے چلنے لگا تھا لیکن سوال تو یہ تھا کہ میں سڑک کے کسی طرف سے چلوں اُس سے کیا مطلب۔ اُس کی ہمدردی تو مجھ سے سینما ہال میں ہوئی تھی جیسا کہ اُس کا کہنا تھا وہ میرے ہی جیسے کی تلاش میں تھی جس کی آتما کی روشنی میں وہ بھی زندگی کی شاہراہ پر چل سکتی ہو ابھی ایسا ہی۔ مجھے بھی کسی ایسے کی تلاش تھی جو مجھے سمجھ سکتا اور میرے زخم پر مرہم لگاتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جس کی محبّت کا میں غلام ہو چکا تھا وہ دراصل کسی اور کی غلام تھی جس کی ترقی اور بہبودی کے واسطے کیا کچھ قربانی وہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو عدالت سے فیصلہ ہی میں چھ سال کی قید سخت کی سزا کے ساتھ ساتھ معلوم ہوا کہ چونکہ میرا سڑک کی بائیں پٹری پر چلنا اور بھی زیادہ خطرناک سرکار کی آنکھوں میں معلوم ہوا اس لئے طوائف کی چھوکری کو چاہنے والے سی، آئی، ڈی کے انسپکٹر نے مجھے سڑک کے بیچ میں چلنے کے پُرانے جرم میں گرفتار کر کے اپنی ترقی اور سرکار اور سماج کو فائدہ پہنچانا چاہا۔ جو بات طوائف کے گھر میں پولیس سے گھر کر گرفتار ہو کر بھی نہ جان سکا وہ عدالت میں سمجھ میں آئی لیکن عورت مرد سے کبھی محبّت کر سکتی ہے سو یہ بات آج تمہارا خط پا کر بھی نہیں جان سکا ـــــ

اُف! کھانسی آنی پھر شروع ہوگئی۔ شاید خط کو تمام نہ کر سکوں ـــــ

حالانکہ جیل کے پھاٹک سے جب میں رہا ہو کر نکلا اُس وقت میری عمر ۲۶ سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی لیکن میں ایسا محسوس کرنے لگا تھا جیسے میری زندگی کے کم سے کم ۵۶ سال تو گزر ہی چکے تھے۔ جس محور پر میری زندگی گھومتی تھی جیسے اب وہ محور ہی نہیں رہا تھا جس پر کمہار کا پہیّا گھومتا اور میری مٹی سے تخلیق ہوتا۔ خیر اُس قصّہ کو بھی چھوڑو اور اُس دن کو سوچو جب تمہیں مجھ سے ہمدردی ہوئی۔ یوں تو جیسا کہ تم کہتی رہی ہو تم نے پہلے پہل مجھ پر اُس وقت ترس کھایا جب تمہاری بہن مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو کر اپنے گھر چلی گئیں۔ یوں تو میری اور اُن کی باتیں تمہیں خط کے لانے لیجانے میں ہی معلوم ہوگئی تھیں لیکن دراصل مجھ سے محبّت یا ہمدردی (عورتوں کے سامنے محبّت پہلے ہمدردی کی شکل میں ایک وہم کا لباس پہن کر آتی ہے) تمہیں اُس وقت ہوئی جب میں جیل کی زندگی سے آزاد ہو کر نکلا۔ اب بڑے زور کی کھانسی آرہی ہے لکھنا کچھ دیر کیلئے ملتوی ہی کرنا ہوگا ادھر کچھ دنوں سے مُنہ سے خون آنا بند تھا سو وہ اب پھر آنے لگا ہے ـــــ

لیکن خط پورا ہی کرنا ہے۔ حالانکہ ماں آکر چارپائی پر لٹا گئیں اور خط نہ لکھنے کی تنبیہ کر گئیں لیکن چاہے بڑے سے بڑے کیوں نہ لکھنا پڑے لکھنا ہے۔ جیوں جیوں خط پورا ہو رہا ہے ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے اندر ہی اندر ساری قوّت ختم ہوئی جا رہی ہے یا جیسے کہیں کسی کونے میں وہ طاقت جذب ہوتی جاتی ہے۔ معلوم نہیں صرف سر ہی چکّر کھا رہا ہے یا کمرے کی دیواریں بھی۔ لیکن خط پورا کرنا ہے ـــــ یاد نہیں پڑتا کیا لکھ رہا تھا۔ ہاں وہ تمہاری بات ـــ تو جس وقت میں دُکھ درد کے لامحدود سمندر میں ڈوب رہا تھا اُس وقت تم نے میری زندگی کی پتوار کو سنبھالنے کی ذمّہ داری لی۔ اپنی بہن کی ادھوری کہانی کو پورا کرنے کیلئے تم نے قسم کھائی۔ لیکن میں تمہاری باتوں کا کوئی مطلب نہیں نکال پاتا تھا۔ تمہیں دیکھ کر جیسے اپنی آنکھوں کا یقین بھی نہ ہوا لیکن ایسا ضرور محسوس کرنے لگا جیسے اندھے کو کوئی راستہ بتانے کی کوشش کر رہا ہو۔ تمہیں اپنے ساتھ پا کر میری سوئی ہوئی آتما پھر سے جاگ اُٹھی۔ میں نے پھر ایک بار کمر سیدھی کر کے چلنے کی کوشش کی۔ میرے حوصلے پھر سے ایک بار لوٹ آئے میرے ارمان جاگ اُٹھے۔ اُمیدیں مسکرائیں۔ سڑک کی

بائیں طرف سے ہو کر میرے ساتھ کے چلنے والے چھوٹے اور نیچے زمین پر گر کر جیسے موت کی نیند سو گئے تھے۔ میں نے انہیں پھر سے جگایا، ہمت بڑھائی۔ مگر ابھی کچھ ہی دور چل سکا تھا کہ اس بیماری نے ——
—— انگلیاں کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ لکھا نہیں جاتا۔ آنکھوں کے نیچے کاغذ پر سطریں کانپ رہی ہیں۔ کھانسی لکھنے نہیں دیتی۔ لیکن یہ خط ——

آج جوانی قصے بن کر یاد آرہی ہے۔ جیسے کسی نے زندگی کا پتلا بنا کر جلا دیا ہو اور اب اُسکے جلے ہوئے ذرّے آنکھوں کے سامنے سیاہی کے بادل بن کر چھائے جارہے ہیں —— ہاں تو میں پھر چلنے لگا تھا۔ میرے پیچھے وہ انگنت بھوکے اور ننگے مظلوم انسانی پتلے تھے میرے آگے آگے تم چل رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے تم لگاتار کسی اونچی پہاڑی پر چڑھتی جارہی ہو۔ پہاڑ کی ٹھنڈی نرم ریشمی گھاس پر تمہارے پھول جیسے پیر برف کی گیندوں جیسے پڑتے تھے تمہاری سُرخ ایڑیوں کی جوت سے میری آنکھیں جلنے لگتیں۔ پتلیوں میں وہ جوت شعلے بن کر اوپر کی طرف اُٹھتی۔ میں ایسا محسوس کرتا جیسے میرے سامنے چتا جل رہی ہے۔ وہ شعلے مجھے اپنی اور بلاتے —— مجھے چتا بلا رہی ہے —— شاید یہ خط پورا نہ ہوسکے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے طاقت دو۔ میری آخری مانگ ہے۔ لیکن شاید تم نہ ——

ہم تم کیسے ایک ہوئے مجھے معلوم نہیں۔ ہمارے تمہارے زندگی کے راستے کس طرح آکر مل گئے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ تمہارا لکھنا کہ ہمارے تمہارے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ یوں بھی سچ ہو گیا تھا۔ جب ڈاکٹر کا مُنہ دیکھ کر میں نے اپنے مستقبل کا اندازہ لگا لیا۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ ہم تم ایک ہوئے ہی کب تھے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ابدیت کے دروازے سے برف کی گیند کی طرح ہم دونوں پھینک دئے گئے تھے۔ پہاڑی کے نشیب و فراز پر ڈھلکتے ڈھلکتے ہم دونوں ایک جگہ پر پہنچ کر ایک ہو گئے لیکن جب نیچی اونچی زمین پر سے ہو کر گزرنے لگے تو یہاں کی حرارت کی وجہ سے ٹوٹ کر الگ ہو گئے۔ شاید گل کر ہم کبھی ایک بھی ہو جائیں لیکن وہ میری آخری خواہش نہیں ہے۔ میں یہاں سے اپنی مٹھی میں باندھ کر کوئی امید نہیں لیجانا چاہتا۔ اتنا میں جانتا بھی ہوں کہ اگر ہم ملیں گے تو میں میں نہیں رہوں گا اور تم تم نہیں ——
یہ دیکھو پھر وہی اندھیرا چھا رہا ہے۔ پھر وہی سیاہ بادل گھرے آرہے ہیں۔ آنکھوں کے نیچے دھندلا پن پھیلا جاتا ہے۔ لیکن خط کو تو ختم ہونا ہی ہے۔

میں کیا نہیں کرسکتا تھا۔ کیا کیا میرے ارمان نہیں تھے۔ میری زندگی کا بھی کوئی مقصد تھا۔ لیکن افسوس! شروع ہی سے میری زندگی کے چراغ کی بتّی دونوں سروں پر جل رہی تھی۔ اُس وقت میں نے اُس کی پرواہ نہ کی۔ لیکن میں نے جو سب سے بڑی غلطی کی وہ یہ تھی کہ میں نے ہمیشہ کسی کے سہارے کو بنیاد بنا کر اپنی زندگی کو تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں اُس برگد یا پیپل کے پودے کی طرح ہو کر رہ گیا جو کسی درخت کے ٹھونٹھ میں اُگ کر پنپ ہی نہیں سکتا۔ زندگی خود ہی ایک بہت بڑی طاقت ہے اور اُسی طاقت سے مجھے شکست کھانی پڑی۔ ہر بُری چیز کو بگاڑنے اور اچھی کو بنانے کے منصوبے رکھتا تھا لیکن نہ کچھ بنا سکا اور نہ بگاڑ سکا۔ اسکے عوض میں اُن کے ہاتھوں لٹ گیا۔ جو میرا ہاتھ بٹانے آئے۔ اُف، اب تو بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ اب کیا لکھوں؟ اچھا ایک خوراک دوا پی کر دیکھوں۔ اس خط کو پورا کرنا ہے ——

لیکن یہ کڑوی دوا میں نے پی ہی کیوں جو زندگی بڑھانے کے بجائے گھٹا رہی ہے —— شاید اس زندگی کی کوئی صبح اور شام نہیں اسکی صبح ہی شام بھی ہوسکتی ہے۔ مگر میں یہ لکھ کیا رہا ہوں۔ تو کیا خط تمام نہ ہوسکے گا؟ ہوگا!

تم لال سیندور سے سہاگ رچا کر اپنی ایڑیاں رنگ کر کسی اور کے گھر جارہی ہو۔ یہی تمہاری بہن نے بھی لکھا۔ لیکن یہ کیا! میری آنکھوں میں پھر وہی سُرخ لپٹ!! چتا کے شعلے بلا رہے ہیں مجھے۔ خون! اس خط کو چھونا مت، اگر پڑھنا تو دور رکھ کر پڑھنا۔ لیکن میرا گلا سوکھ رہا ہے۔ اندر جیسے کوئی میرے پھیپھڑے دبا رہا ہے۔ اب مجھے جانا ہی چاہئے اگر میں تم چاروں کے کندھوں پر سوار ہو کر جاتا! لیکن تم تو جارہی ہو وہ کبھی کی جا چکی —— اور وہ کبھی آئی نہیں۔ اور اُسے آنے ہی نہیں دیا کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن یہ کیا ہو رہا ہے۔ دم گھٹا جاتا ہے میں دُنیا میں کیا نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن —— لیکن —— تو کیا یہ خط بھی پورا ....

ساغرِ نظامی

کرموں کا پھل

جنوبی ہندوستان کی ایک خوبصورت اور عظیم الشان ریاست میں ایک بڑا خاندان تھا جس کے مورثِ اعلیٰ کو "راجہ" کا خطاب تھا۔ یہ راجہ اپنے زمانے کا ایک فیاض، بہادر اور منتظم انسان تھا اپنی زندگی میں اُس نے وزارت کے فرائض نہایت کامیابی او۔ تدبّر کے ساتھ ادا کئے اور ایک طویل عمر پاکر دُنیا سے چل بسا، اسکے بعد اُس گھرانے میں راجہ کا مثیل کوئی پیدا نہ ہوسکا۔ اسکے رہنے کا محل او۔ اس محل کی مٹی ہوئی بہار اسکے بلند اور لطیف ذوق کی یادگار تھی۔

یہ محل یونانی طرزِ تعمیر کا ایک نہایت حسین نمونہ تھا، جسے ایک اونچے مقام پر چٹانوں کو ہموار کر کے تعمیر کیا گیا تھا۔ بڑے دروازے سے ایک وسیع احاطے میں داخل ہونا پڑتا تھا، اور ایک بیضاوی دائرے میں مرکزی چمن کو گھیر کر آنے جانے کیلئے چوڑا راستہ بنایا گیا تھا۔ دروازے کے بعد ۵۰ قدم کے فاصلے پر محل کا وہ حصّہ تھا جس میں راجہ خود رہتا تھا اور جس پر پہنچنے کے لئے ۳۰ سیڑھیاں طے کرنی پڑتی تھیں۔ اسکے سائے سے گزر کر سیدھے ہاتھ پر محل کا وہ دوسرا وسیع حصّہ تھا جس میں اس کی رانی اور خاندان رہتا تھا جس کا برآمدہ طویل یونانی ستونوں پر قائم تھا اور اسکے دونوں کناروں پر دو برج انداز گول کمرے تھے جن کی کھڑکیوں سے باہر کا تمام منظر اور چمن کے مرتفع صحن کا ایک ایک پھول مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔

گردشِ ایام نے ایک شاعر کو اس محل میں پہنچا دیا اور وہ اسکے مغربی گول کمرہ میں دو ہفتے مقیم رہا۔ کمرہ سے بالکل ملحق ستونوں کے بالکل نیچے، مہندی کی اونچی باڑ کی گود میں ایک چاندنی کا بڑا پودا تھا جو صبح و شام دوسرے پودوں سے زیادہ پھولوں سے لدھا ہوا نظر آتا اور رات کو چاندنی میں اسکی بہار دونی ہوکر چندر کو شرما دیتی تھی۔

(۲)

راجہ کے کمسن پڑپوتے جن کے ماتھوں سے خاندانی بڑائی ظاہر ہوتی تھی۔ آنکھوں سے ماضی کے احتشام کی چمک اور جن کے چہروں سے وجاہت اور حُسن برستا تھا، شاعر کے گیتوں سے مست ہوکر سو جاتے اور شاعر اس وسیع محل کی ویران و پُراسرار خاموشی کے گیت اور سرو کے درختوں کی ان سُنی گفتگو کو عبرت اور عبادت کے طور پر سُنتا رہتا، محل فضا کی گود میں اس طرح خاموش اور ساکت معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ویراگی شدید تپسیا میں مصروف و محو کھڑا ہو ہر طرف ایک سنّاٹا اور اس سنّاٹے میں باغ کی مرتب روشیں اور روشوں میں رنگارنگ پھول اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ایسا دھوکہ ہوتا تھا کہ کسی بیوہ کنیا کا سہاگ اپنے پریتم کا انتظار کر رہا ہے۔

اس تمام منظر سے جب شاعر کی نگاہیں سمٹ کر واپس آتیں تو چاندنی کے پھولوں پر دم لیتی تھیں جو ستونوں کے سائے میں ہنس ہنس کر آنسو بہاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے لیکن جب خلّاق اور ہزار داستاں رات تھک کر سو جاتی اور اوشا سورج کے رتھ پر سوار ہوکر اس سنسار میں دھرتی کو اپنی جوت سے جگمگا دیتی۔ شاعر کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ کمرہ اور برآمدہ کا تمام کوڑا چاندنی کے درخت پر پڑا ہوا ہے اس کے پھولوں کی کٹوریاں پاک شبنم کی بجائے گندے پانی اور تھوک کی بارش سے لت پت ہیں۔ سیاہ فام اور سفید چشم ملازم جس قدر ممکن غلاظت ڈال سکتے تھے، چاندنی کے پودے پر ڈالنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔

(۳)

اوتار ہوں یا دیوتا، شاعر ہوں یا پیغمبر، ان کی وہ آتما جو انہیں اوتار دیوتا، شاعر اور پیغمبر بناتی ہے ہر وقت ساتھ نہیں رہا کرتی، وہ نامحسوس طور پر کبھی تو محض ایک آدمی ہوتے ہیں۔ خصوصاً شاعر، اگر ہر دم شاعر رہے تو اس کا دم پیٹ سے نکل جائے پھر آدمی خود یہ نہیں چاہتے کہ شاعر ہر دم شاعر رہے، آدمی سے زیادہ شاعری جو شاعر کی روح میں کارفرما رہتی ہے۔ یہ موٹروں میں چلنے والے آسمانوں پر

اُڑنے والے، سڑکوں پر پھرنے والے، کوٹھیوں میں بسنے والے، تاش کھیلنے والے اور شب و روز بچے پیدا کرنے والے بزعمِ خود "آدمی" لوٹ لیتے ہیں۔

ایک دن شاعر انہیں آدمیوں کے ایک انبوہ سے واپس محل میں لوٹا اور پھول میں چاندنی کے پھولوں پر تھوکتا ہوا (کیونکہ اس وقت وہ شاعر نہیں آدمی تھا) تیزی سے گزر جانا چاہتا تھا کہ اُس نے ایک عورت کی چیخ سی سُنی اور اسکے ساتھ یہ الفاظ:۔

"تم سے تو یہ آشا نہ تھی ــــ اے کوی مہاراج"!

شاعر کی روح کو اس چیخ نے جو اپنی درد ناکی میں انجوہ تھی کپکپا دیا۔ اسکی تمام ہستی کانپ گئی۔ وہ یکایک آدمی سے شاعر ہو گیا اس نے برآمدے میں اوپر نیچے، ادھر اُدھر، دور و نزدیک چاروں طرف دیکھا، مگر وہاں کوئی عورت نظر نہ آئی۔ ہر طرف ایک سناٹا سا تھا، پُر اسرار سناٹا ــــ

تمہارے پان کی پیک میرے چمپا کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نازک لبوں اور کمل کی طرح بڑی بڑی سُندر آنکھوں ہی پر نہیں، میرے تلک تک پر پڑی ہے"!

شاعر نے محسوس کیا کہ آواز چاندنی کے درخت کی طرف سے آ رہی ہے، وہ آگے بڑھا، شاید کوئی دُکھیا برآمدے کے نیچے مہندی کی باڑ میں چاندنی کے درخت کے نیچے زخمی پڑی ہے، ہر طرف ایک افسانہ خواں سناٹا تھا اور فضا ساکت!

شاعر برآمدے سے اُترا، مہندی کی باڑ میں پہنچا، ادھر دیکھا اُدھر دیکھا مگر کوڑے کے انبار، پھٹے ہوئے کاغذ کے پرزوں اور پان کی پیکوں کے سوائے وہاں کچھ بھی نہ تھا، وہ گردن جھکائے برآمدے سے گزر کر کمرہ کی طرف بڑھا۔ مگر معلوم ہوا کہ کسی بے گوشت و پوست کے ہاتھ نے اس کا دامن پکڑ لیا:۔

"مہاراج اس بھرے سنسار میں کوئی نہیں ہے جو میری کہانی سُن سکے، اس اندھی دُنیا میں کوئی نہیں ہے جو دیکھ سکے، تم سُنتے جاؤ میری دُکھ بھری کہانی اے کوی مہاراج!!"

شاعر حیران ہو کر مڑا اور رُک گیا ــــ چاندنی کے درخت سے پھر صدا سی آئی:۔

"اے سنسار کی شوبھا اور فطرت کے حُسن کو جِلا دینے والے شاعر، سنو میری بپتا بھری کہانی میں بولتی ہوں "رانی چاندنی" میرا نام ہے میں دکن کے پُرانے راجاؤں کے خاندان سے ہوں۔ اُس

ہیروں کی جنم بھومی کا میں ایک ایسا انمول ہیرہ تھی جس کی جوت نے دکن ہی نہیں سارے آریہ ورت کو روشن کر دیا تھا۔ میرا باپ جو اُس زمانہ کا مہاراجہ تھا اپنی شکتی میں دھرتی پر اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ لاکھوں سورما اس کی چوکھٹ کو بوسہ دیتے تھے، ہزاروں ویر اسکی تلوار کا لوہا مانتے تھے۔ دھرتی سے لیکر آکاش تک اس کی عظمت کا ڈنکا بجتا تھا۔ تم جانو، مہاراج ایسی باپ کی اکلوتی سپتری کیا کچھ لاؤ لاڈ میں نہ پلی ہوگی!؟ اس زمانے کے مشہور اور مہاکوی میرے لئے لوریاں اور گیت لکھتے تھے، میں سرسوتی کے شالوں پر گیتوں کی پنکھا کی ہواؤں سے سوتی تھی اور مدھم اور لطیف راگنیوں کی ٹھیس سے جاگتی تھی، اور جب جاگتی تھی تو اوشا مجھے اپنی کرنوں کے جھولے میں جھولا جھلاتی تھی۔ یہ تھا میرا بال پن لیکن جونہی جوانی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا کہ دیوتا اور اوتار، انسان اور سنسار، تمام فطرت میرے پریم کے جال میں ہنس کی طرح پھنسی ہوئی پھڑپھڑا رہی ہے!؟

مہاراج! میں اپنے باپ کی اکلوتی راجکماری تھی۔ میرا کوئی بھائی نہ تھا۔ میرا باپ مجھ کنیا کو بیٹوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ میری تمیز بیت ایک راجکمار کی طرح کی گئی۔ باپ کے پریم اور ماں کی ممتا نے مجھے گھمنڈ کی پُتلی بنا دیا۔ مہاراج میرے غرور کی انتہا نہ تھی اور میری بہادری نے اس غرور کو صفت سے بدل کر پرجا کے دلوں پر میرا سکّہ بٹھا دیا تھا۔

تم جانتے ہو مہاراج، یہ سنسار، دُکھ، رنج اور موت سے بھرا ہوا ہے، تمام ذی روح جو پیدا ہوتے ہیں ٹک ٹک سب کے مکھ دیکھتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کیا دیکھتے ہیں اور کس کو دیکھتے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کیوں ہنستے ہیں، بچے پیدا ہوتے ہیں تو معصوم ہوتے ہیں، پھر مہاراج! اس سنسار میں سارے دُکھ، رنج اور موتیں کہاں سے آتی ہیں، موت کا باعث پیدائش ہے، اگر پیدائش نہ ہو تو کوئی مصیبت اور موت بھی نہ ہو۔

سو ایک دن ایسا آیا کہ میرا باپ جسکی شکتی سنسار سے اپنا خراج وصول کرتی تھی اور دھرتی و آکاش جس سے کانپتے تھے موت اسے اپنے پنجوں میں ایک بوڑھے پرند کی طرح دبا کر ایشور جانے کہاں لے گئی، اسکے بعد پرجا نے سارے راج پاٹ کا بوجھ میرے سپرد کر دیا۔ جبکہ روپ تتلیوں کا اور آتما عقابوں کی سی تھی شکتی کی اس بڑھوتی کے بعد میرے غرور کا سورج اتنا پھیل کر

چمکا کہ رحم کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو گئی۔ پریم پہاڑوں کی تاریک گپھاؤں میں مُنہ چھپانے لگا۔ اور محبت خوف زدہ ہو کر جنگلوں میں بھاگ گئی۔ سُندر اور ویر راجکماروں کے پریم کا جواب مجھ ابھاگی کے پاس صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ان کے سُندر چہرے ان کے شریروں سے جدا کر کے میرے سامنے چُننے جاتے۔ میں ان کے چہروں کو دیوانہ وار چومتی تھی اور پھر اُن کو مدھ میں ڈبو کر اس جگہ رکھوا دیا جاتا تھا جہاں رنگ محل کا کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا۔

میں کرموں کی ماری نہیں جانتی تھی کہ مصیبتیں اور رنج گناہوں سے پیدا ہوتے ہیں اور خوشی نیکی سے، میں اندھی نہیں سمجھتی تھی یہ قانون اٹل اور مقررہ قانون ہے کہ آم، ببول کے درخت سے نہیں آم ہی کے درخت سے پیدا ہوتے ہیں، میں گھمنڈ میں ڈوبی ہوئی ناری نہیں جانتی تھی۔ مہاراج کہ گیہوں سے بس گیہوں ہی پیدا ہوتا ہے چنا یا جو نہیں اور چنے کے پودے میں گنا نہیں چنا ہی پھوٹتا ہے۔ گو میں ان پڑھ نہیں تھی، ودیاوتی تھی پر میں اس وقت یہ سمجھنے کے قابل نہیں تھی کہ اسی طرح یہ بھی ایک قانون ہے کہ نیکی سے نیکی پیدا ہوتی ہے، نہ کہ بدی، اور بدی سے بدی پیدا ہوتی ہے نہ کہ نیکی، میں نہیں جانتی تھی مہاراج! کہ بُرے خیالوں اور بُرے کاموں سے مصیبت پیدا ہوتی ہے، اے ایشور! میں کب جانتی تھی کہ منش جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے اور سب اپنے کرموں کا پھل بھوگتے ہیں!!

مہاراج اب میں اپنی کہانی کے اس حصے پر آگئی ہوں، جہاں آکر مجھے خوف ہے کہ تم مجھے کہانی کہتے ہوئے چھوڑ جاؤ گے اور میں اس "پُنر جنم" کے چکر میں اُلجھی رہ جاؤں گی۔

(۴)

ایک دن کا ذکر ہے کہ میری داسیوں نے جن میں سے ہر ایک حُسن کی دیوی تھی آکر کہا، مہارانی جی! راج محل کے دروازے پر ایک نوجوان کوی آیا ہے اور وہ مہارانی کو اپنی کویتا سُنانا چاہتا ہے وہ گیروا رنگ کا ایک گوپی بانا پہنے ہوئے ہے۔ اس کا قد سرس کی طرح ہے، آنکھیں رسیلی اور جوانی کے مدھ سے بھری ہوئی ہیں۔ شانوں پر گھونگریالے بال ہیں، ماتھے پر شاندار تلک نے اس کو دیوتا بنا دیا ہے مہارانی جی! ہم نے تو یہ آن بان کسی راجکمار میں بھی نہیں دیکھی وہ کہتا ہے کہ میں نے مہارانی کی شکتی اور حُسن کا گیت ساری عمر کی محنت سے تیار کیا ہے، اُس میں جو لفظ استعمال کئے ہیں۔ وہ آج تک کسی کوی نے نہیں کئے۔ اس کی جو لے اس نے قائم کی ہے وہ کسی مغنّی کو نصیب نہیں ہو سکی۔ اسکے اک تارے کی آواز دُنیا کے کسی باجے میں نہیں پائی جاتی۔ اور سچ مچ مہارانی! اس نے ساری پرجا، کُل فوج، اور تمام درباریوں کو اپنے سنگیت سے سکتے میں ڈال دیا ہے، اس کی جیون کی پہلی اور آخری آرزو یہ ہے کہ مہارانی اسکی کویتا کو سُن لیں۔

مہاراج دیکھو چلے نہ جانا۔ پُنر جنم کے اس چکّر میں اُلجھا ہوا دیکھ کر مجھ پر دیا کرو۔ میں ایسی بات کہنے والی ہوں جو تمہاری آتما کو بیکل کر دے گی، مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہارا نازک دل میری سخت اور خوفناک بات سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے!؟ میرے کوی مہاراج! داسیوں کا یہ سندیش سُن کر میرے گندے اور پاپی دل میں یہ اُمنگ اُٹھی کہ ایسے سُندر اور باکمال شاعر کے مُنہ پر اگر میں تھوکوں گی تو میرے پاپی من کو چین نصیب ہو گا۔

مہاراج! تمہاری شاعری کا واسطہ، مجھ پاپن کو معاف کرو۔ پاپ کے آنکھ نہیں ہوتی، میں نے اس سُندر اور نوجوان کوی کو داسیوں اور اپنی سندر سہیلیوں کے بڑے مجمع میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

آہ! آج میں کہہ سکتی ہوں مہاراج! وہ کوی دیوتا کی طرح آیا، وہ کسی نشہ میں چور چور معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنا اک تارا چھیڑا، اور ایسا معلوم ہوا دھرتی و آکاش ناچنے لگے ہیں۔ ساری داسیوں اور سکھیوں کے جوڑے کھُل کھُل کر شانوں پر گر پڑے۔ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔ وہ بالکل بھول گئیں کہ میں ان کی مہارانی ہوں سب اس کوی کے گھونگریالے بالوں میں اُلجھ کر رہ گئیں، مگر کوی نے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور جیسے ہی اپنی کویتا ختم کی میرے چرنوں پر سر جھُکانے کے لئے بڑھا، میرے غرور نے ایک حقارت سے پاؤں سکیڑ لئے اور اسکے مُنہ پر تھوک دیا۔ وہ مجھے ہرنے کیلئے آیا تھا مگر میری یہ کٹھورتا دیکھ کر ایک حقارت کے ساتھ میری طرف دیکھے بغیر میرے غرور کو روندتا ہوا رنگ محل سے چلا گیا اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ میری شکتی اور میری تمام طاقت پر تھوک کر کہیں چھپ گیا۔

مہاراج! ——— وہ چلا گیا مگر اُس دن سے میں چین سے نہ رہی، در و دیوار، داس اور داسیاں، پرجا اور درباری، دھرتی اور آکاش، سورج اور چندر سب میرے مُنہ پر تھوکتے معلوم ہوتے تھے۔ تمام جوتشیوں کو اک اشارہ میں راج محل کے اندر بُلایا گیا اور پوچھا گیا کہ مہارانی کا پاگل پن کیونکر دور ہو سکتا ہے۔ سب نے جواب دیا کہ کوی کے سراپ کو کسی کوی کی کویتا ہی ختم کر سکتی ہے۔ دیوتا راضی

ہو سکتے ہیں مگر شاعر راضی نہیں ہو سکتا، مہارانی نے مہا پاپ کیا ہے
اور انہیں پُنر جنم کے چکر میں پڑ کر اپنے کرموں کا پھل بھوگنا پڑیگا۔ جوتش
گیان بتاتا ہے کہ آج سے ایک ہزار سال بعد جب مہارانی محض
اس رعایت کی بنا پر کہ وہ استری ہیں اور ان کا نام "رانی چاندنی"
ہے۔ چاندنی کے پودے کے روپ میں اس سنسار میں جیون گزار رہی
اور پھر ان پر عام لوگ کوڑا کرکٹ ڈالیں اور تھوکیں گے، اس وقت
پھر اک شاعر ان کے پاس سے گزرے گا جو اپنی شاعری سے انہیں
پُنر جنم کے چکر سے چھٹکارا دلائے گا۔"

مہاراج! یہ ہے میری کہانی! اگاؤ اپنی آتما کے اک تارہ پر اس
پاک اور اس چاندنی میں اک ایسی کوتا جو مجھے اس جال سے رہا کردے!
جب سے تم آئے ہو، میں سمجھ گئی ہوں کہ تم میرے پاپ کی دوا ہو۔

دوسرے دن صبح سویرے راجہ کے تمام خاندان نے دیکھا کہ شاعر
بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا ہے سب دوڑے، ضرور آج کوئی نظم نئی لکھی ہے، وہ
ادب سے شاعر کی خدمت میں پہنچے۔ سب کے ہاتھوں میں خوشبو، پھول،
صندل اور چندن تھا۔

(پھول دیتے ہوئے)

ایک، مہاراج! کیا رات بھر نہیں سوئے!؟

شاعر، رات سونے کے لئے کب ہے، نیند انسانی زندگی میں ایک
اضافی چیز ہے۔ اگر ہم جاگنے کی قوت کو پالیں تو ہم سو نہیں
سکتے۔ پیارو! سوجانا، بیداری سے ہار جانے کا نام ہے!

دوسرا، مہاراج! کیا آپ اپنا نیا "الہام" اپنے سیوکوں کو نہیں
سُنائینگے۔ دیکھئے سورج دیوتا افق سے مکھڑا نکالے ہوئے
سرگوش برآواز ہیں۔

شاعر نے سر اُٹھایا اور کہا:۔

"چاندنی رات میں، چاندنی کا پھول کاہی پتیوں سے
اس طرح جھانکتا ہے جس طرح پاپ کے سینے سے
نیکی کی آخری کرن! خالق کی عظمت اور پوجا میں
گم ہو جانے والے زبردست مہوس ہیں کہ اس کو
غیر محسوس حیثیت دے کر عظمت و بلندی کی آخری
حد قائم کرتے ہیں، اور اس حد کو اپنی پرستش کا مرکز
بنا کر اپنی بڑائی کا سامان کرنا چاہتے ہیں!؟ اس
خالق کی پوجا کرنا جو لانہایت اور بیحد ہے، ارفع
ترین ہے، دور و بعید ہے جس کو شعور و ادراک
نہیں چھو سکتے، کیا قریب، مسطح، محدود، محسوس
اور ذی شعور مخلوق کی پرستش کے مقابلے میں
انسان کی بھول نہیں!؟

چاند میری دسترس سے دور سہی، مگر یہ چاندنی کا
پھول جو رات کو سینکڑوں چاند اپنی گود میں روشن
کرتا ہے کیا اس قابل نہیں کہ میری روح اس کا طواف
کرے اور اسکے چاروں طرف بھونرا بن کر ناچے
اور ابد تک ناچتی رہے۔ یہ پھول جو فطرت کے گوشِ
نازک کا کرن پھول ہے!؟ یہ چاندنی کا پھول!

جس باغ کی باغبانی تیرے سپرد کی گئی تھی تو نے
اس کی بہار اور خزاں دونوں سے کیوں آنکھ بند
کرلی ہے؛ پھولوں کی توہین، مالی کی توہین ہے،
یہ چاندنی کا درخت اور اسکے پھول دھرتی کے سینے
سے تیری شوبھا بڑھانے کیلئے نہیں کھِلے ہیں۔ اگر
تو رات بھر جاگتا تو صبح سویرے تجھے اندازہ ہو جاتا
اے الھڑ راجکمار کہ یہ دُہ گل سے چمن کا تمام ماضی
جھانک رہا ہے!؟ تمام!

یہ چاندنی کا پھول رات بھر مجھ سے جو کچھ کہتا
رہا اسے زندگی کے باغ کے نورس غنچو، وہی سب
سے بڑا گیان ہے، پھولوں سے بے ادب رہوگے
تو زمانہ تمہارے حُسن سے باادب نہیں رہے گا۔ یہ
چاندنی کا پھول برسوں سے باغ میں اپنے کٹوروں
میں شبنم کی صبوحی لئے ہوئے صبح سویرے اپنے
ساقی کی نمائندگی کرتا ہے مگر تم نے دیکھا ہوگا جام!
اسکے جام میں کبھی سُرخ شراب نہیں دیکھی گئی۔ اسی
طرح کس سادہ لوح نے تم کو یقین دلادیا ہے، چاندنی
کا پھول، "گلاب" بن جائیگا۔ جو شخص تمہارے
چاندنی کے پھول جیسے چہروں پر دھول ڈالنے
کی گستاخی کریگا اس کا چہرہ کبھی اوراقِ گل سے
مس نہیں ہوگا۔"

کیا تم اس حقیقت کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ
"چاندنی کا پھول" دُنیا کے لئے صبح کی دیوی کا

بہترین تحفہ ہے، کیا تم اس سچائی سے انکار کر سکتے ہو کہ یہ شبنم کا سب سے زیادہ مضبوط اور دیرپا جھولا ہے، کیا تم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اُدھر، دور بہت دور، اس شبستان کے گوشہ میں جو "رات کی رانی" رات بھر اپنی مہک سے فضا کو جھوماتی رہی ہے یہ اسکی بڑی بہن ہے جسکے سپرد سورج کو نذرِ سحر کے طور پر چاندی کے تھال پیش کرنا ہے؟ اور کچھ تسلیم نہیں کر سکتے تو کیا اس سے بھی انکار کر دو گے کہ یہ شاعر کا دل ہے! یہ چاندنی کا پھول!"

راجہ کے پڑپوتے ادب سے آنکھوں میں آنسوؤں کے پھول لئے ہوئے اُٹھے۔ چاندنی کے درخت پر ایک دھبہ باقی نہیں رہا۔ اسکی شاخوں کے نیچے کی زمین ہیروں سے کچھ بڑھ چڑھ کر چمکدار ہو گئی۔

گردشِ ایام سے پھر کچھ دنوں کے بعد شاعر کا گزر اس محل میں ہوا، مگر اب یہ محل، محل نہیں تھا، مندر تھا، جہاں چاندنی کے پھول کی پوجا ہوتی تھی۔

(طبعزاد) (جملہ حقوق محفوظ) (سنہ ۱۹۳۷ء)

جالب مرادآبادی

سلام

تمہیں نسیمِ گلستاں سلام کہتی ہے
بہارِ حشر بداماں سلام کہتی ہے

گلوں کا سینۂ پرشوق چاک کر کے تمہیں
شمیمِ عطر بداماں سلام کہتی ہے

حسین تاروں کی بستی سے آن کر تم کو
غریبِ شبنمِ گریاں سلام کہتی ہے

حریمِ ناز میں جو باریاب ہو نہ سکی
وہی نگاہِ پریشاں سلام کہتی ہے

شفق کے روپ میں آ کے صبح و شام تمہیں
شعاعِ مہرِ درخشاں سلام کہتی ہے

نہ ہو سکی کبھی شبنم بھی جس کی محرمِ راز
وہ عصمتِ گلِ خنداں سلام کہتی ہے

حریمِ سینۂ پرشوق سے ہر اک لمحہ
ہنوز عظمتِ ایماں سلام کہتی ہے

صدائے قلبِ شکستہ نکل کے سینہ سے
بطرزِ مستِ غزلخواں سلام کہتی ہے

ہزار شوقِ فراواں سے آج گھبرا کر
ادب سے شامِ غریباں سلام کہتی ہے

مشتاق جلیلی حیدرآبادی

تاریک دائرے

پھر اُسے اگلی زندگی یاد آگئی اور وہ یاد نہ کرنے کی کوشش میں اُلجھا رہا پھر اسے اپنا چھوٹا سا جرمن ڈیزائن مکان یاد آگیا اور اسکے ساتھ ساتھ ہاسپٹل کے سب سے اوپر والی مریضوں کی قطار جنھیں وہ روز صبح دیکھتا تھا۔ پھر وارڈ نمبر ۳ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا وہ ریشمی بالوں والی ثریا اور بکھرے بالوں کی آغوش میں دمکتا ہوا چہرہ...... اور وہ تو محض ڈاکٹر تھا۔ اور ڈاکٹر کی ڈیوٹی تھی مریضوں کی دیکھ بھال، پھر اگر دن میں کئی بار اس کے قدم وارڈ نمبر ۳ کی طرف اُٹھ جاتے تو کوئی بات نہ تھی، کیونکہ یہ تو اس کا فرض تھا پھر وہ کیسے نہ جاتا؟ پھر یہ دوسری چیز تھی کہ اسے کچھ خوف ہو گیا اور وہ اُدھر جانے سے خود کو روکنا چاہتا، پھر وہ ایسا نہ کر سکا اور وہ برابر جاتا رہا.... پھر اس کے ہاتھ میں نازک نازک کلائی سمٹ سمٹ گئی اور وہ اس کی نبض کی رفتار کو اپنے دل کی دھڑکن سمجھا، پھر اس کی نظریں نرگسی آنکھوں کی گہرائیوں میں گھوم گئیں اور وہ شراب جیسے سرور میں بہہ گیا، اور بہتے ہوئے اُسے زندگی کی تلاش ہو گئی، پھر وہ فریبی تخیلی وادیوں میں بھٹکتا رہا اور اس کے قدم کانٹوں بھری راہوں کی سمت بڑھتے گئے، مگر وہ کانٹوں کی نوکوں پر چلتا رہا، پھر وہ سمجھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا اس کی سانس سینے میں رُکنے لگی، اور اس نے اس پُراسرار ماحول سے نکل کر بھاگنا چاہا، پھر اس نے کوشش بھی کی، وہ رخصت لے گیا پورے ایک ماہ کی رخصت، وہ اب ہاسپٹل جائیگا ہی نہیں اور ہاسپٹل نہیں جائیگا تو گویا وہ کہیں بھی نہ جا سکے گا، اور جاتا کیسے؟ وہ تو رخصت پر تھا —— پھر تین دن اس نے گھر پر گزار دئے اور جس انتشاری حالت میں گزارے یہ وہ خود بھی نہ جان سکا وہ تو سمجھا کہ وہ ہاسپٹل میں ہے، وہ وارڈ نمبر ۳ میں سانس لے رہا ہے، اور اس کی نگاہیں مرمریں لبوں سے مس ہو رہی ہیں لو وہ اٹھا وہ تھا گھر تک میں —— پھر تو اسے اپنے آپ پر بیحد غصہ آیا اور

اس نے "میتھالوجی" کی بڑی بڑی کتابیں اپنی نظروں کے سامنے کھولدیں، پھر اس کے کانوں میں چوڑیوں کی صدائیں شہنائی بنکر بجیں، وہ پڑھتا گیا، پھر اُسے سیمیں کلائیوں میں نبض کی رفتار یاد آگئی، وہ گھبرا اُٹھا اور اضطراب کے آغوش میں ٹہلنے لگا، پھر اُس نے سوچا، ان کتابوں میں کوئی جان نہیں، وہ شنکر کے یہاں سے نئی کتابیں کیوں نہ لائے؟ —— پھر وہ زینوں سے اترتا ہوا کار میں بیٹھ گیا اور وہ سڑکوں کے پیچ و خم پر دوڑ گئی، پھر کار رُکی، وہ اُتر پڑا، اور "شفنٹ" سے وہ بالائی حصہ پر پہنچ گیا، اور سامنے وارڈ نمبر ۳...... وہ بے اختیار اس سمت بڑھ گیا اور اس کی نظریں چارٹ سے ملنے لگیں، ان دنوں ٹمپریچر زیادہ رہا، پھر اس کے ہاتھ میں حسین کلائی کسمسائی، اور اس کی نظریں گھڑی کی چھوٹی سوئی پر جم گئیں، پھر اُسے خیال ہوا کئی منٹ گزر گئے اور اس نے گھبرا کر کلائی چھوڑ دی..... پھر اس سے شکایت کی گئی کہ تین دن سے کسی ڈاکٹر نے خبر نہ لی، وہ جھنجھلا اُٹھا، اور اس نے اپنی رخصت منسوخ کرالی۔

پھر ناتواں جسم اور ناتواں ہو گیا، کھانسی شدید ہو گئی آنکھوں میں کچھ ہلکے سیاہ دائرے پڑ گئے.... اور یہ اس سے نہ دیکھا گیا اور وہ دیکھتا بھی تو کیسے دیکھتا؟ پھر اس نے اس کے والدین کو بتایا کہ وہ یوں نہ جی سکے گی، میرج کے سنی ٹوریم کے ٹریٹمنٹ کا جواب نہیں، وہ وہاں ٹریننگ کے لئے بہت جلد جائیگا، اسے بھی وہیں بھیجدیا جائے —— پھر اسے بھیجدیا گیا، اور وہ سمجھا کہ اسے سچی خوشی حاصل ہو گئی..... پھر وہ اس کا تیماردار بن گیا اور اس نے کس کس طرح اس کی دلجوئی کی یہ وہ کیا جانے؟ کارڈس کی شعبدہ بازی، بیربل کے انتہائی دلچسپ لطائف، کوہ قاف کی پریوں کی کہانی، وہ گھنٹوں ان ہی لطیف مشغلوں میں اسے لئے رہتا، اور وہ ہنستی تو ہنستی ہی چلی جاتی، پھر وہ لبوں کی دلآویز

جنبشوں میں ڈوب کر اپنی ہستی کو بھول جاتا ــــــ اور دوسری طرف تمام ڈاکٹروں سے مشورے اور بڑے ڈاکٹر کے مکان کے دن بھر میں تین تین چکر کاٹنا، یہ تو اس کے روز کا معمول ہو گیا تھا ...... پھر ایسے ہی میں "فرینک" ہو گئی وہ بھی کامیاب فرینک ــــــ وہ گردن میں کئی دن تک درد محسوس کرتی رہی اور اس نے مسلسل کئی راتیں اس کے پاس بیٹھے بیٹھے گزار دیں پھر یہ اذیّتیں اس کے لئے لذّتیں بن گئیں، اور وہ دور افق کی گھاٹیوں پر زندگی کے خواب دیکھنے لگا ...... پھر یہاں اس نے اس کی فطرت کا عمیق عمیق نظروں سے مطالعہ کیا اور اس نے عجیب عجیب باتیں محسوس کیں، پھر اسے روحانی کوفت سے دوچار ہونا پڑا، اور اس کی چند حرکتیں اس کے لئے معمّہ بن کر رہ گئیں اور وہ معمّہ کیوں نہ بن جاتیں؟ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ وہ ہنستی ہنستی چپ ہو جاتی، اس کا چہرہ اُداس ہو جاتا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے، پھر وہ گھنٹوں خاموش رہتی ...... اور وہ گھبرا جاتا کہ ایسا کیوں ہو گیا؟ پھر یہ وحشت کن لمحات اس سے نہ دیکھے جاتے، اور وہ اپنی الجھنوں کو دور کرنے کے لئے کاٹج نمبر ۱۱ کی طرف بڑھ جاتا۔ اس میں نجمہ رہتی تھی اس کی دور کی ایک رشتہ دار، انتہائی سنجیدہ، انتہائی سادہ مزاج، پانچسو کیسوں میں وہ صرف اُسی کیس سے آشنا تھا، اور وہ گھنٹوں وہاں گزار دیتا، بھوتوں کی کہانیاں، مُردوں کے دلچسپ قِصّے، روحوں کے تازہ تازہ حالات، وہ سب کہے جاتا، اور وہ ہنستی ہنستی تھک جاتی، پھر وہ اپنی دلی اذیّتوں کو بھولنے میں کامیاب ہو جاتا، اور اس کے قدم اپنے کاٹج کی طرف اُٹھ جاتے، پھر اس کی نگاہیں اس کے متبسّم چہرہ سے مل جاتیں، اور وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا، پھر وہ ہفتوں کاٹج نمبر ۱۱ کی سمت نہ جاتا۔

ایسے ہی میں عید آ گئی اور اس نے "سانگلی" سے واپسی میں ایک انتہائی قیمتی مالا خریدی، اور وہ اپنے دل میں کچھ انوکھی انوکھی تمنّائیں لئے اس کے پاس آ گیا، پھر اس نے دور ہی سے مالا دکھائی، اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، پھر وہ مالا اس کے گلے میں عجیب سا معلوم ہوا، اور اس کے حُسن میں کتنا اضافہ کر دیا، یہ وہ کیا جانے؟ پھر وہ مُسکرائی اور مُسکراتی ہوئی نگاہیں اس کی نگاہوں میں ڈالدیں اور وہ لطیف بدوش بہاروں میں سمٹ سمٹ گیا ...... پھر وہ مُسکراتے ہوئے لب سُکڑ گئے اور کلیوں کی طرح شگفتہ چہرہ کُملا گیا، پھر نیلگوں آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ بھیگ گئیں .... پھر وہ اس معنی خیز تغیر کو دیکھتا رہا، اور اس کی عید کی ساری خوشی برباد ہو کر رہ گئی، پھر اس کے گلے میں سانس پھنس پھنس گئی، وہ گھبرایا ہوا اٹھا اور اس کے لرزیدہ قدم کاٹج نمبر ۱۱ کی طرف اُٹھ گئے۔

ایک تو اس کا مزاج شروع ہی سے چڑچڑا تھا اور بیماری نے اور بھی چڑچڑا بنا دیا، اور ان چیزوں کا اثر سیدھا اس کی غذا پر پڑتا تھا۔ کہدیا آج ٹماٹے کا عرق نہیں پیا جائیگا، اور دودھ انڈے سے تو جی اُکتا گیا، اور موسمبی کے نام پر تو اسے سچ مچ غصّہ آجاتا ــــــ پھر اس کی اسے کتنی خوشامدیں کرنی پڑتیں؟ اور اُسے ڈاکٹری کے لکچر دئے جاتے، اور خون کی پیداوار کے بارے میں سمجھایا جاتا کہ زندگی کا دوسرا نام غذا ہے پھر اس کی ضد اس کے لئے خطرناک ثابت ہوگی، اور وہ سوچے تو کہ اسے کتنی صحت ہو گئی، پھر اس کی یہ ذرا سی لغزشیں حاصل شدہ قوت کو ضائع کر دیں گی، اور اُسے ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے پھر یہ کوئی عقلمندی بھی تو نہیں کہ اپنے باپ کو تباہ کر دیا جائے، اور وہ سوچے تو اسے کتنی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا، کیسے کیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور وہ ان سب کا مقابلہ کرتی گئی، اور اسے یہی کرنا چاہئے تھا، پھر اس نے ایسا ہی کیا، مگر اب اسے اور قوی ارادوں سے کام لینا ہوگا، اور اس کی کٹھن گھڑیاں رہ ہی کتنی گئیں، یہی دو چار مہینہ، وہ برابر پہلے کی طرح مضبوط رہے گی ....

پھر اس کی ضد زیادہ دیر نہ رہ سکتی اور ٹماٹے کے رس کا گلاس اس کے ہاتھوں میں آجاتا، پھر روز کے پروگرام پر وہ عمل کرنے پر مجبور ہو جاتی، اور وہ محبّت پاش نظروں سے اُسے دیکھتا ہوا خوش ہو جاتا کہ وہ اس کے کچھ تو کام آسکا۔

اے بی کے کورس کو ختم ہونے میں صرف چھ مہینہ رہ گئے پھر اس کے وزن میں ہر ہفتہ دو پونڈ کا اضافہ ہوتا رہا، اور اس کے گالوں کی زردی شفق شام جیسی سُرخیوں میں تبدیل ہو گئی ــــ آنکھوں کے حلقے دُور ہو کر اُبھر گئے، پھر اس کا چہرہ جوانی کی نئی بہاروں سے تمتما اٹھا اور اس کے سارے جسم میں خون کی روانی تیزی سے دوڑ گئی، پھر اس کی آنکھیں آسمان کے تاروں جیسی چمک سے معمور ہو گئیں اور مقناطیسی ذرّات اس کی آنکھوں میں اور گھل مل گئے، پھر کلائیوں میں چوڑیاں پھنس پھنس گئیں اور

اسے دوسری چوڑیاں پہننی پڑیں، پھر اس کی باہیں گداز گداز باہیں بن گئیں، اور سُرخ دھاریاں یاقوتی ہونٹوں سے لپٹ لپٹ گئیں، اور اس کے ناتواں قدم قوی ہو گئے، پھر اسے اجازت مل گئی اور وہ سنی ٹوریم کی حدود میں گھومنے لگی، پھر وہ مریضہ کے بجائے حسینہ ہی حسینہ بنکر رہ گئی —— یہ سب کس کی محنتوں کا نتیجہ تھا؟ یہ وہ خوب جانتا تھا، پھر اودی اودی شلوار اور دھانی دھانی آنچل میں سموئے ہوئے غیر فانی حُسن کے بے پناہ جلووں میں وہ گم ہو گیا، اور نرم و ملائم زلفوں کی جھنڈ میں کھوتا ہوا نہ جانے وہ کہاں سے کہاں پہونچ گیا، پھر اُسے محسوس ہوا وہ ایک ایسی دُنیا میں سانس لے رہا ہے جہاں زندگی محبت کیلئے سجدہ ریز تھی، جہاں کا ذرّہ ذرّہ مسرتوں سے ہم آغوش تھا....

پھر وہ ان ہی خواب جیسی کیفیتوں میں ڈوبا رہا، اور گھنٹوں ڈوبا رہا، پھر اُسے دُنیا کی ہر چیز معمّہ معلوم ہوئی، اور وہ ہر معمّہ کو حل کرنے میں خود ایک معمّہ بن کر رہ گیا۔

ہوا مریضوں کے سانسوں کی طرح سر سرائی اور جھاڑیوں کے جھُنڈ میں سورج کی ناتواں کرنیں ڈوب گئیں..... وہ

٦٠ کاٹج نمبر ۱۱ کی طرف سے مُڑتا ہوا سنی ٹوریم کی حدود سے دُور ہو گیا اور وہ ناہموار سی زمین اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان دیر تک چلتا رہا، پھر وہ ایک بلند سی جگہ بیٹھ گیا —— اور دُور سے کاٹجوں کی قطاریں سیاہ لکیریں بن گئیں، پھر اُن میں کی مدھم روشنی قبروں پہ جلتے ہوئے چراغ کی طرح معلوم ہوئی، پھر وہ سوچا، یہ اس کا یہاں دوسرا سال شروع ہو گیا، مگر وہ اس طویل عرصہ میں کچھ بھی تو نہ کر سکا، دیکھا جائے تو اسے کیسے کیسے مواقع حاصل ہوئے اور اس نے ضائع کر دئے، اسے کہدینا چاہئے تھا مگر وہ کہتا تو کیا کہتا، آج تک اسے مناسب الفاظ ہی نہ ملے جن میں وہ اظہار تمنّا کرتا، اور یہ تو کہنے کی باتیں نہ تھیں، سمجھنے کی باتیں تھیں..... پھر اس نے تو اس کے لئے اپنی زندگی برباد کر دی نوکری چھوڑ دی، سارے دلچسپ مشغلے تباہ کر دئے، اور وہ ایسا کر کے بھی خوش تھا، کیونکہ اسے بے پناہ محبت تھی، اور وہ خود اس کا اندازہ مشکل سے کر سکتا تھا، پھر اس کی سمجھ میں گھنٹوں نہ آسکا کہ وہ کرے تو کیا کرے، وہ اتنی بھولی نہ تھی، نا سمجھ نہ تھی، پھر اسکی محبّت بھری نظروں کو نہ سمجھنا کیا معنی؟ آجتک اس کے ساتھ وہ سیر کو نہیں گئی، آخر کیوں؟ —— پھر اُسے خیال ہوا وہ بغیر اس کے جی تو نہ سکے گا، اور اگر اس کو اس کی محبت نہ حاصل ہو سکی تو گویا اس کی زندگی تاریک ہو گئی، مگر کیا اسکی ہمدردیوں کا اس کے دل پہ کوئی اثر نہ ہوگا؟ یہ کس طرح ممکن تھا——

پھر اسے اس میں ایک دم تغیّرات کے اکثر پیدا ہو جانے کا بُری طرح احساس ہوا، اور وہ سمجھا اس کی آڑ میں یقیناً کوئی راز ضرور مضمر ہوگا، مگر وہ اس راز کو حل کرے تو کیسے کرے یہ وہ کسی طرح نہ جان سکا —— پھر وہ جتنا سوچتا گیا اُتنا ہی اُلجھتا گیا، پھر وہ زندگی کے نشیب و فراز کے بھنور میں گھر گیا اور دیر تک گھرا رہا، پھر ایسے ہی میں اس نے تصفیہ کر لیا کہ وہ اپنی بزدلی کو چھوڑ دیگا، اور وہ اس سے زندگی کی بھیک مانگے گا اور برابر مانگے گا، پھر اس کی گھڑیاں روح پرسکونوں کی زد وں میں گزرنے لگیں گی، اور اس کے کانوں میں نغمۂ حیات کی دُھڑکنیں تانیں ٹکرائیں گی، پھر وہ محض شُبک شُبک سے شیریں کر رہ جائے گا —— پھر ہواؤں کی موجیں اس کی ریشمی قمیص کو کپکپاتی ہوئی گزر گئیں، اور اس کی نظر افقی وادیوں میں اُبھرتے ہوئے تاروں پر پڑی پھر اِن کی نوکوں سے ٹکراتی ہوئی تاریک دائروں میں دھند لاگئی، پھر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا....... دفعتاً کسی کی آہٹ کی صدا اس کے کانوں میں گونجی، اور اس نے ایک سمت نظریں گاڑ دیں، پھر تاریکی میں ایک دھبّہ بتدریج اس کے قریب ہوتا گیا، اور وہ بے اختیار پوچھ اُٹھا۔

”تم کہاں نجمہ؟“

”بس یوں ہی چلی آئی، اب تو مجھے تفریح کی اجازت مل گئی ہے“

وہ بولا ”اتنی دور چلے آنے کی کیا ضرورت تھی، چلو واپس چلیں“

”اب آگئی ہوں تو کچھ دم لیکر ہی چلوں گی۔“

وہ ایک پتھر پہ بیٹھتی ہوئی بولی، پھر اس کی تنفس کی موجیں تیز تیز ہوائیں ملتی گئیں، وہ کافی تھک گئی تھی، پھر گلابی رنگ کا پلّو بالوں کے گرد لپٹا ہوا چہرے کی رنگت کی طرح نکھر گیا تھا۔ اور آنکھوں میں برق جیسی قوتیں مچلی جا رہی تھیں ———

پھر وہ اس سے کہنے لگا ”یہ تم چھوٹے چھوٹے ناہموار سے ٹیلے جو دیکھ رہی ہو، یہ محض ٹیلے ہی نہیں، ان کے نیچے تو ایک دُنیا

آباد ہے، بالکل ہماری ہی طرح دُنیا، ہماری طرح مکانات، اور یہ بستی جنوں کی بستی کہلاتی ہے، ان میں بھی بادشاہ ہوتا ہے، ان میں بھی رعایا ہوتی ہے، مگر جیسے ہمارے یہاں جنگ ہوتی ہے وہاں نہیں ہوتی اور نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کسی کی کوئی آرزو ہی نہیں، پھر وہاں لڑائی کیا معنی؟ مگر ہاں اب تو سُنا ہے وہ ہوائی جہاز بھی بنانے لگے ہیں، کوئی تعجب کی بات نہیں وہ برابر بنا سکتے ہیں........ مگر اُن کی اصلی شکلیں خدا دشمن کو نہ دکھائے، یہ لانبے لانبے دانت، اور سر چار گز کا اوپر کی سمت، اور اسی کی مناسبت سے اتنے ہی دُگنے ہاتھ، اور اتنے دُگنے پیر، بالکل مُردوں کے ڈھانچوں کی طرح پتلے پتلے، اُف اس خیال سے میرے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے ہیں ——"

"بس بس تمہیں اِن بے پر کی باتوں کے سوا آتا ہی کیا ہے۔" وہ ہنستی ہوئی بولی "سنجیدہ گفتگو تم کیا جانو"——

—— وہ پھر مُسکراتے ہوئے اُٹھا اور دونوں کے قدم ایک ساتھ اُٹھتے گئے، پھر گرے ہوئے تاروں کے کمپونڈ سے وہ ملے ہوئے چلتے رہے —— پھر وہ خاموش دُنیا میں چلنے لگے،

—— ہر طرف مہیب سکوت بکھرا ہوا، اور اسی سکوت میں مریضوں کی ہزاروں سانسیں گھلی ہوئی، اور اسی کثیف خاموشی میں انسانوں کی نحیف اور کمزور کھانسی کی بھیانک صدائیں اور کبھی کبھی ایک دلدوز چیخ سینۂ سکوت کو توڑتی ہوئی چاروں سمت موت کا ڈراؤنا اور وسیع آغوش کھلا ہوا اور اس میں سہمی ہوئی نوجوانیاں، زندگی کی انتہائی وحشتناک تصویریں، بے بسی اور بے چارگی کی عجیب عبرت انگیز دُنیا، جہاں انسانوں کا وجود ہوتے ہوئے بھی ایک مستقل سناٹا وہ بھی گھبرایا ہوا، پھر وہی ایک ہی ڈیزائنوں کے تین کمروں والے مکانات اور بالکل ایک سمت مسہریوں کا رُخ اور ویسی ہی ساری مسہریاں، اور ان میں ایک ہی طرح لیٹے ہوئے مریض، پھر سامنے ویسی ہی چھوٹی سی ٹیبل، اور اس میں ویسے ہی رکھے ہوئے تام چینی کے ڈھکن دار اُگالدان، جیسے ایک ہی بیمار سارے کاٹیج میں سانس لے رہا ہو —— پھر ہوا کی لہروں میں پیروں کی چاپیں لرزتی گئیں اور وہ اس کے کاٹیج میں اسے چھوڑتا ہوا اپنے کاٹیج کی سمت بڑھ گیا، یہ تو طے تھا ہی کہ وہ آج سب کچھ کہہ دیگا، اور اسی خیال کے تحت اس کے قدم تیز ہو گئے

پھر جیسے ہی وہ کمرے کے اندر داخل ہوا، اُس نے کاغذ کے ایک پُرزے کو تیزی سے تکیہ کے نیچے چھُپا لیا، اور وہ کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا، اس کے چہرے پر آج ایک خاص رنگت دوڑی ہوئی تھی، اور وہ اُسے مصوّر کی ایک دلکش تصویر کی طرح نظر آئی، پھر وہ اس سے گھنٹوں باتیں کرتی رہی، اور وہ ہر سیکنڈ ارادہ کرتا رہا کہ وہ اب سب کچھ کہہ دیگا، پھر وہ سوچتا کا سوچتا رہ گیا........ پھر اس کی نگاہیں مرمریں جسم سے ٹکرائیں اور رنگین لبوں کے حسین زیر و بم کو روندتی ہوئی پھول جیسے چہرہ کے گرد جم گئیں، پھر مدہوش کن لمحوں نے اسے اپنے آغوش میں چھپا لیا اور وہ بھول گیا اسے کیا کہنا تھا؟

پھر ایسے ہی میں کرسمس آ گئی اور دُنیائے "سنی ٹوریم" رنگا رنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ ہو گیا، پھر دواخانہ کے ہر ملازم کو نئے نئے کپڑے تقسیم کئے گئے، اور نرسوں کا لباس آج بجائے سفید رنگ کے رنگ برنگ کے رنگوں میں نہا گیا، پھر ان کی ٹولیوں کی ٹولیاں چاروں طرف بکھر گئیں، پھر حدِ نظر تک خلافِ معمول زندگی دکھائی دینے لگی، اور ایک مسرت کی لہر تھی کہ ہر سمت دوڑی ہوئی تھی، پھر بینڈ کی ہلکی ہلکی تانوں ٦١
نے مریضوں کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی، اور ان کی نگاہیں دریچوں میں سے ہوتی ہوئی سامنے والے میدان کے چھوٹے سے مجمع پر جم گئیں، اور یہ دُنیا سے علیحدہ گوشہ بھی دُنیا کی شورشوں میں گم ہو گیا —— پھر ہوا کی نذ میں جھنڈیوں کی قطاریں لرزتی گئیں، اور شام کا دھندلکا پھیلتا گیا پھر مخصوص حصار میں گول دائرے کی طرح بجلی کے چھوٹے چھوٹے لال اودے بلب روشن ہو گئے، اور اس کے عین درمیان ایک بڑا ہال روشنیوں کے طوفان میں جگمگا اُٹھا، اور دور سے یہی منظر ایک حیات افروز منظر بن گیا —— پھر صبح کے گجر کے ساتھ ساتھ نغموں کی لطیف صدائیں ہوا کے دوش پر بہہ گئیں اور شعریت انگیز سکوت ہر سمت چھا گیا، پھر سارے سنی ٹوریم پر ایک مدہوشی سی چھا گئی...... پھر قریب ہی سے "کرسمس مبارک" کی صدا گونجی اور ایک نرس اس کی ٹیبل پر کچھ رکھ گئی، یہ بڈھے ڈاکٹر کی طرف سے کرسمس کا تحفہ تھا، پھر نازک نازک اُنگلیوں میں وہ "پیکٹ" گھومنے لگا، اور اس میں چاکلیٹ نظر آئے پھر قرص کی گولیاں اس میں سے نکلیں، اور ایک چھوٹا سا اسٹیچو،

پھر اس کے ساتھ ساتھ ایک ڈبیا، جس میں معمولی مگر انتہائی خوبصورت انگوٹھی، پھر اس نے ٹیبل پر اسٹیچو رکھتے ہوئے اپنی چھوٹی سی انگلی میں انگوٹھی پہن لی، اور دیر تک اسے دیکھتی رہی، پھر نہ جانے کیا جی میں آیا، اس نے وہ انگوٹھی اُتاری اور اس کی سمت بڑھا دی، اور وہ اپنی انگلی میں انگوٹھی پہنتے ہوئے ایک نامعلوم کیف میں ڈوب گیا، پھر اس کی نظر انگوٹھی کے کناروں سے مس ہوتی ہوئی اُس کی نگاہوں سے مل گئی اور اس کے لبوں سے نکلنے کے لئے چند جملے بے تابانہ تڑپ اُٹھے، پھر اس نے گھبرا کر اپنی نگاہیں ہوا سے لہلہاتی ہوئی جھنڈیوں پر گاڑ دیں۔

پھر صبح کی دھڑکنیں گوشۂ مشرق میں پھیل گئیں، اس کا دل نہ جانے کیوں گھبرا اٹھا، پھر وہ چمن کے پھولوں کی، نکہت پاش پھولوں کی فضاؤں میں سانس لیتا ہوا میرج کے شہر کی سمت بڑھ گیا، کچھ نہیں، صرف چند بڑی دوکانیں اور تنگ و تاریک گلیوں کے سوا کچھ نہ تھا، پھر اس کے قدم سرکاری ہاسپٹل کی طرف اُٹھ گئے اور اسے اپنا ہاسپٹل یاد آگیا، بالکل وہی مریضوں کی قطاریں اور وہی مسہری پر نمبر ۱ و نمبر ۲ کے نشانات، کسی کے کراہنے کی آواز اور کوئی موت سے ہم آغوش ——— پھر وہ ہر مریض کے چہرے کو بغور دیکھتا ہوا گزرنے لگا، پھر اس کا جی اکتا گیا، اور وہ لوکل کی طرف لپکا، پھر "سانگلی" میں وہ اُتر پڑا، اور اسٹیشن کی حدوں سے دُور ہو کر وہ ایک شاہراہ پر چلنے لگا، کشادہ کشادہ سڑکوں پر کبھی ایک آدھ موٹر گزر جاتی تو گزر جاتی، ورنہ وہی سائیکلوں کی بھیڑ ——— پھر اسے لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی نظر آئیں، کسی کے ہاتھ میں کتابیں کسی کے ہاتھ میں بستہ اور کسی کے ہاتھ خالی، ان میں سے بعض انتہائی حسین شکلیں نوشگفتہ کلی کی طرح نظر آئیں، اور اس کے ساتھ ساتھ چند ایسی صورتیں بھی نظر آئیں جنھوں نے اُن نوخیز بہاروں کو بھی پژمردہ بنا دیا، اور وہ سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر گیا پھر وہ ایک دوکان کی طرف بڑھا، اُسے ایک ٹانک اس کے لئے خریدنی تھی، اور وہ بوتل کو جیب میں رکھتا ہوا چل دیا ———

پھر وہ ایک سنیما کے بوڈ کے پاس رُک گیا، اور اُسے یاد آیا کہ "دشمن" اس کا دیکھا ہوا تھا، اور اس نے اس کھیل کو بے حد پسند کیا تھا، اور واقعی میں تھا بھی بڑا پاکیزہ فلم، مگر تھا دق کا، .... پھر وہ ان ہی الجھنوں میں آگے بڑھتا گیا، اور

اسی طرح اس نے کئی گلیاں اور طے کیں، پھر وہ راجہ صاحب کی پُرانی وضع کی کوٹھی پر سے گزرتا ہوا بہتے ہوئے کرشنا گھاٹ پر سانس لینے لگا، پھر ہوا کے پانی میں سوئے ہوئے جھونکوں نے اس کی ساری تھکن فوراً دور کر دی، پھر اس نے کوٹ کے بٹن کھول دئے اور پانی کی سطح کے قریب بیٹھ گیا ——— اور وہ کاندھوں پر گھڑے لئے سیڑھیوں سے بل کھاتی ہوئی دوشیزاؤں کی ٹکڑیاں اتریں، اور ساڑیوں کو سمیٹتی ہوئی پانی میں کچھ دور چلی گئیں، پھر جسمِ سیمیں کا عریاں حصّہ پانی میں چاند کی کرنوں کے عکس کی طرح معلوم ہوا، اور نازک نازک شانے گھڑوں کے بوجھ سے جھک جھک گئے، پھر ماتھے پر لال لال ٹیکا آسمان کی پیشانی پر تنہا تارے کی طرح نظر آیا، اور آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر قدم رکھتی ہوئی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں ——— پھر وہ پانی کی موجوں کو دیکھنے لگا، اور وہ سوچا، عجیب اضطراب ؟ سینۂ آب کو سکون ہی نہیں ؟ ہمیشہ لرزیدہ زندگی ؟ پھر اسے وہیں کہیں ایک کشتی دکھائی دی، اور اسے خیال ہوا کہ وہ اس کو ایک دن ضرور سیر کرائے گا، اور دونوں دور تک نکل جائیں گے، دریا کے بیچ و بیچ میں کشتی رینگتی چلی جائے گی، پھر اگر ایسے ہی میں طوفان آگیا اور کشتی ڈوب گئی تب ؟ پھر اس نے گھبرا کر آنکھیں موند لیں ——— پھر جھاڑ کی ٹہنیاں آپس میں ٹکرائیں، اور اسے احساس ہوا یہ اس کا تیسرا گھنٹہ گزرنے لگا، پھر بھی اس ماحول سے اس کا جی نہ بھرا، اور وہ چاہتا تھا وہ ایسے ہی بیٹھا رہے، پھر مغربی کناروں میں سورج سُرخ ہونے لگا، اور بڑے بڑے پہاڑوں کی چوٹیوں پہ زرد زرد کرنیں ناچتی ہوئی ڈوب گئیں، پھر اسے اِکبارگی محسوس ہوا کہ آج اس نے صبح سے نہیں دیکھا، اور اتنا وقت وہ کیونکر گزار سکا ؟ یہ اس کی سمجھ میں نہ آسکا...

.... پھر ہوا سرسرائی اور وہ اس کی آغوش میں چل دیا، پھر وہ ایک لاری میں سوار ہو گیا، اور لاری شہر کے ممتاز لوگوں کے مکانوں سے گزرتی ہوئی "سنی ٹوریم" کے پاس رُک گئی، پھر وہ دُنیا کے ایک علیحدہ گوشے میں چلنے لگا، اور اس کے قدم تیز ہوتے گئے، پھر اس کے کانوں میں "رضوی، رضوی" کی دو بار جیسے صدائیں گونج گئیں، مگر وہ رُکا نہیں چلتا گیا، پھر اس کی نظریں دور ہی سے اپنے کالج کی طرف اُٹھ گئیں، پھر اسے کوئی نئی شبیہ نظر آئی، اور وہ حیران حیران سا وہاں پہنچا، پھر اسے معلوم ہوا کہ

نووارد کا نام زیدی، اُس کا کوئی رشتہ دار، نوجوان سا، یہی بیس بائیس سال عمر ہوگی، سیدھے علی گڑھ سے یہاں آنا ہوا ـــــ پھر اس کی سہمی ہوئی نظر ارغوانی چہرے پر پڑی، اور اس کا چہرہ اسے پھول کی طرح شاداب نظر آیا، اور لبوں پر اک ہلکی ہوئی مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، پھر اُسے خیال ہوا وہ اتنی حسین اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئی، پھر ان دو تتوں کی نگاہوں کے ایک ہلکے سے تصادم نے اسے نجانے کیا بنا دیا، پھر اس کی آنکھوں میں ایک دم تاریکیاں سما گئیں ـــــ اور اس کے قدم کاٹج نمبر ۱۱ کی سمت تیزی سے اُٹھ گئے۔

پھر وہ چمن کی بنچ پر بیٹھا ہوا کچھ کھانسا، اور پسینہ کے قطرے اس کی پیشانی پر کچھ ناچنے لگے، پھر سستی سے اس نے اپنی بھیگی ہوئی پیشانی پونچھ لی، اور اس کی نگاہیں دُور دُور شام کے دھوئیں میں گھومتی ہوئی سامنے چھوٹے سے اسٹیشن پر جم گئیں، پھر سبز ساڑی کے آغوش میں گلابی گلابی چہرہ بالکل پتوں کی آڑ میں چھپے ہوئے پھول کی طرح معلوم ہوا، زلفیں سنوری ہوئی اور پلّو سر سے ڈھلکا ہوا........ پھر وہ بہکی ہوئی چال چلنے لگی اس کے بازو سے ایک بازو اور مل گیا، پھر دونوں دوش بدوش چلتے ہوئے صدر دروازے میں داخل ہوئے، اور وہ ہاتھوں میں ہاتھ ملائے ہوئے ایک سمت بڑھ گئے، پھر کچھ دور چل کر وہ اس کے شانے کا سہارا لئے چلتی رہی، اور دونوں کے قدم ایک ساتھ اُٹھتے گئے........ وہ اس طرف دیکھتا رہا اور دیکھتا گیا، پھر اس کی نظر دُھندلا گئی، اور پلکوں تلے کالی راتیں اُمنڈ اُمنڈ گئیں، پھر وہ تلخیوں کے تیز و تند دھارے پر بہنے لگا اور بجلی کی تیزی کی طرح بہنے لگا، پھر زندگی کے کئی المناک نقشے اُس کی آنکھوں کے سامنے کھنچ گئے، اور وہ ان نقشوں کی بھیانک لکیروں میں پس پس گیا، پھر اسے دُنیا کی تمام رعنائیاں حوادثات کے غضبناک طوفان میں گھرتی ہوئی نظر آئیں، اور آن کی آن میں برباد ہوکر رہ گئیں، پھر اُس نے دُنیا کی حدود سے ہٹ کر چلنا چاہا، مگر اسے معلوم ہوا تاریکی کے سوا کچھ نہیں، پھر اس کی نظریں ایک کملائے ہوئے پھول پر پڑیں، جس کی گلابی پتیاں زرد پڑ چکی تھیں اور وہ مارے ندامت کے ٹہنی سمیت زمین کی طرف جُھک گیا تھا، پھر وہ گھبرا کر اُٹھا، اور اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم بڑھ گئے، پھر اس نے اپنے آپ کو کاٹج نمبر ۱۱ میں سانس لیتے ہوئے محسوس کیا۔

پھر ہوا پتوں سے ٹکرائی اور رات ظلمتوں کے چشموں میں بہتی گئی، پھر بادلوں کے بھورے اور سیاہ تودے چاند تاروں کا آسمان بنے ہوئے دُور تک پھیل گئے، اور ہلکی سی گرج کیساتھ ہی بجلی تڑپ تڑپ گئی...... پھر وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، مگر نیند اس سے کوسوں دُور تھی، اور وہ کچھ نہ سوچنے کی کوشش میں سوچتا گیا، پھر اس نے سوچا کیا؟ یہ وہ خود نہ جان سکا ـــــ دفعتاً کچھ باتوں کی آوازیں سامنے والے کمرے سے آتی ہوئی سُنائی دیں، اور اس نے ساری توجہ سے اُس طرف کان لگا دئے، وہ بولی "تم کیا جانو؟ تمہارے بغیر اتنے دن میں نے کیسے گزار دئے، اگر یقین نہ آئے تو ڈاکٹر سے پوچھ لو ـــــ" پھر اس نے زور سے اپنے کانوں میں اُنگلی دھر لی، اور اس کی سانس لمحہ بھر کے لئے رُکی اور چلنے لگی، پھر اسے رات کے سینے میں بڑے بڑے گھاؤ پڑتے ہوئے نظر آئے جس میں موت کی بھیانک شکلیں اور بھیانک ہوگئیں اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس طرف دیکھا کیا، اور اس کے جسم کا رواں
۶۳ رواں کسی نامعلوم خوف کی لرزش میں کانپ کانپ گیا، پھر بجلیوں کی یورشوں میں اس کی جوانی کی بہاریں جُھلس جُھلس گئیں، اور وہ اپنی خوابیدہ تمنّاؤں کے جلے ہوتے ڈھیر کو دیکھ کر مُسکرا اُٹھا، پھر اسے محسوس ہوا، اسے تاریکیوں کے وسیع ترین غار میں دھکیل دیا گیا، اور وہ اس میں چل پڑا، پھر نکیلے پتھروں کی مسلسل رگڑ نے اس کے جسم کو چھلنی کر دیا، اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑا ـــــ ـــــ پھر ہوا کے تیز تیز جھونکے کھڑکیوں کے پٹوں سے ٹکرا کر وحشتناک آوازیں پیدا کرنے لگے، اور خاموشیوں میں تمام درختوں کی بیک وقت شورشیں آواز کی ایک دُنیا بن گئیں ـــــ ـــــ پھر اسے اس کے بائیں بازو کے ہلکے ہلکے درد کی آغوش میں دل کی ملبوس دھڑکنیں سُنائی دینے لگیں، اور وہ بے مائیگی اور بے چارگی میں لانبی لانبی سانس لینے لگا...... پھر اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے گئے، اور وہ سمجھا اس کے سارے جسم پر زہریلے جراثیم رینگنے لگے، پھر وہ پسینہ میں نہا اٹھا، اور اس کا تنفس تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔

پھر تاریکیاں چھٹیں، اور ۳۰ نومبر کی صبح بتدریج پھیلنے لگی، پھر اُسے یاد آیا، انجکشن لئے ہوئے پورا ایک مہینہ ہوگیا، پھر

آج اس کے انجکشن لگے گا۔ یہ توسنی ٹوریم کا قانون تھا کہ ہر بیمار کو ایک ایک مہینہ بعد یہ جاننے کے لئے انجکشن دیا جاتا کہ وہ متاثر تو نہیں ہوا؟ اور اسی اصول کے تحت آج اسے انجکشن لینا تھا، پھر اس نے اپنا نیا سوٹ نکالا اور آئینہ میں گھنٹوں ٹائی لگائی گئی، پھر اس کی نظر کسی متبسم لبوں کو چومتی ہوئی کسی سمت دوڑ گئی، پھر وہ وارڈوں کے گرد و پیش میں چلتا ہوا صدر ہال پہنچ گیا، پھر انجکشن سوئی اس کے سیدھے بازو میں لمحہ بھر کے لئے چبھی اور الگ ہوگئی، پھر سارے ڈاکٹروں کی نگاہیں اس کے بازو سے لپٹی رہیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بازو سوج گیا اور ڈاکٹر کرسچین چیخ اٹھا "اسے کاٹیج نمبر ۳ میں لٹا دو"۔۔ ـــ پھر اسے لٹا دیا گیا، مگر اس کے لبوں پر بدستور مسکراہٹ کھیل رہی تھی، یہ خبر بجلی کی طرح تمام میں دوڑ گئی، پھر وہ بھاگی بھاگی اس کے پاس آئی، اور آکر بولی۔

"یہ کیسا ہوگیا ڈاکٹر؟" وہ یہ کہکر دیر تک روتی رہی، پھر وہ آنچل میں آنسوؤں کو جذب کرتی ہوئی بولی۔ "میرے اچھے ہونے کی تمام خوشی برباد ہوگئی" وہ پھر رو پڑی ـــ ـــ اور وہ آنسوؤں کی ٹیڑھی ٹیڑھی لکیریں دیکھتا ہوا خوش ہوگیا کہ محبت کی انتہائی معراج اس سے زیادہ اور کیا ہوسکے گی؟

"میں جا رہی ہوں ڈاکٹر" اس کی رگوں میں زندگی کی لہریں دیکھ کر اس کے لبوں پر تبسم پھیل گیا، پھر اس نے لیٹے ہی لیٹے "اچھا" کہا ـــ پھر ہوا مریضوں کی اکھڑی ہوئی سانسوں کی طرح گزر رہی، اور پیپل کے درخت کے پیچھے سورج کی کرنیں لرزیں اور دم توڑ دیا۔۔۔۔۔۔۔ پھر اس کی کار کاٹیج نمبر ۱ کی طرف سے مڑتی ہوئی "سنی ٹوریم" کی حدوں سے دور ہوگئی ـــ اور وہ سوچتا رہ گیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا، پھر اس کا ذہن زندگی کے مختلف گوشوں میں دوڑ گیا، اور دیر تک دوڑتا رہا، پھر آنکھوں میں تاریکی کے مہیب پردے سما گئے اور وہ گم صم بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا، پھر اسے قلب و روح کی راہیں مسدود ہوتی ہوئی نظر آئیں اور وہ گھنٹوں ان ہی راہوں پر چلتا رہا۔۔۔۔۔۔ پھر ایسے ہی میں پانی کی تیز تیز بوندیں طوفانی ہواؤں کو چیرتی ہوئی برسنے لگیں، اور ساری کائنات ایک مسلسل شور میں نہا اٹھی، پھر اس کاٹیج سے اس کاٹیج کی نظر آنے والی روشنی مدھم ہوگئی اور ہر طرف ایک خوفناک سناٹا چھا گیا، پھر بجلیوں کی چشمک زنی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی ـــ پھر کھڑکی سے ہلکی ہلکی پھوار چھن چھن کر اس کے بستر کی شکنوں میں جذب ہوتی گئی، اور وہ اس طرف توجہ نہ کرتا ہوا کسی الجھن میں ڈوب گیا، پھر طرح طرح کے پریشان کن خیالات اس کے دل کی گہرائیوں میں بیدار ہوتے گئے، اور وہ اپنے وجود سے خوف زدہ ہوتا گیا، پھر سامنے دیوار پر کچھ نقوش بننے لگے، اور کسی کے لبوں کی حسین حرکتیں اسے یاد آگئیں، پھر ایک دلآویز چہرہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا، اور جیسے "میں جا رہی ہوں ڈاکٹر" کی دلدوز صدا اسے سنائی دینے لگی، اور اس کے ساتھ ہی کچھ قدموں کی آہٹ اس کے کانوں میں آئی، وہ پکار اٹھا "ثریا ثریا" ـــ مگر اس کی نظریں کسی اداس چہرے سے مل گئیں، اور وہ گھبرا کر پوچھ اٹھا "تم کہاں نجمہ!" اور وہ زبردستی لبوں پر مسکراہٹ پیدا کرتی ہوئی بولی "یوں ہی آگئی رضوی" پھر وہ وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی، وہ بری طرح تھک گئی تھی۔

"اتنی رات کو"

"ہاں ڈاکٹروں نے چلنے سے روک دیا ہے، چھپ کر آئی ہوں"

"پھر تم کیوں آگئی نجمہ، دیکھو تو سنبھل کر گر رہی ہو"

پھر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور نہ جانے وہ کیوں دیر تک روتی رہی، پھر اس کی سانس رکتی ہوئی چلی اور وہ اس کا بھیگا ہوا جسم سرد سرد جھونکوں سے کپکپا گیا۔ ـــ وہ اسے دیکھتا رہا مگر اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ ایسا کیوں، پھر وہ عالم محویت میں سانس لینے لگا، اور اس کے دل و دماغ کی ساری قوتیں سلب ہوکر رہ گئیں، پھر ایک نامعلوم بے ہوشی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ـــ پھر وہ چونکا، مگر وہ جا چکی تھی۔

پھر اس کی خواہش پر اسے کاٹیج نمبر ۵ میں منتقل کر دیا گیا، اور وہ وہاں چیخ کر اور بھی اداس کر دیا گیا، پھر اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ لیٹی ہوئی ہے، وہ بیٹھا ہوا ہے، اور ایسے میں اسے دنیا بھر کی باتیں یاد آگئیں، اور وہ شروع سے ایک ایک دن

یاد کرتا گیا ——— اور اس کی نبض کی رفتار سست پڑتی گئی۔

پھر ایک شب وہ سوچتا رہا کہ اس کے اتنے تار آئے مگر اس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا، اور یہ اس نے بُرا کیا، پھر اُس نے سوچا خیر کل وہ کئی تار ایک ساتھ بھیجدیگا، اور ابھی اس نے اچھی طرح تصفیہ بھی نہ کیا تھا کہ چھمن کی آواز اُسے سُنائی دی، پھر اُس نے سُنا، وہ کلّو کی ماں سے کہہ رہا تھا "کمار بابو نے رات سانس توڑ دی" ——— پھر اسے کھانسی کے ایک شدید دورے نے بے جان کر دیا، اور وہ بمشکل مسہری کے سہارے بیٹھ سکا، پھر اس کی نظریں کاٹج نمبر ۴ پر پڑیں .... وہ خاموشیوں کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔

پھر دن بھر کاٹج نمبر ۵ میں ڈاکٹروں کی بھیڑ لگی رہی، اور کرسچین ڈاکٹر کوئی دو دفعہ آیا، پھر پورا دواخانہ اس چھوٹی سی جگہ میں سمٹ سمٹ گیا، اور نرسیں گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر سے اُدھر دوڑتی رہیں، پھر بڑے بڑے آلات وہاں دکھائی دینے لگے، اور نلیوں کے ذریعہ "آکسیجن" پھیپھڑوں میں پہنچائی گئی، پھر دُور سے لمحہ بہ لمحہ انجکشنوں کی سوئی چمکتی ہوئی نظر آئی ——— مگر شام ہوتے ہوتے بھیڑ چھٹ گئی، اور سکوت چھا گیا۔

پھر نجمہ کے سیاہ حلقوں میں دو زرد زرد آنکھیں چمکیں، اور ان کی ناتواں نظریں کاٹج نمبر ۵ سے لپٹ لپٹ گئیں .... وہ تاریکیوں کا ڈھیر بن گیا تھا۔
.... پھر تیزی سے اس کا وزن گھٹ گیا۔

(صفحہ ۳۲ کا بقیہ مضمون)

کے سبب صدیوں تک نوکِ زباں رہے، اس میں ادب کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا وقت کا، ہمارا عہد بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے، اس لئے چیزوں کی قدروں میں بہت جلد فرق پیدا ہو جاتا ہے، اگر پہلے ادب کو بھی اس کی تاریخی اہمیت اور نسلوں کی پسندیدگی کے اثرات کو ذہن سے دور کر کے تحلیل کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کس قدر کم مواد ایسا ہے جس پر ہماری نسل بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔

قدیم جکڑ بندیوں اور رسمیات سے آزاد ہو کر جدید اسپرٹ کے کھل کھیلنے کی تمنّا اپنے لئے نئی نئی شاہراہیں بنا رہی ہے، یہاں تک کہ کبھی کبھی اپنے انقلابی نشے میں انتہا پسند (extremist) محسوس ہونے لگتی ہے، ادب میں اس کا اثر موضوعات سے گزر کر اصناف کی قطع و بُرید اور ترک و انتخاب پر پڑ رہا ہے، اب فارم (Form) کی اہمیت نالہ‌ہو گئی ہے اور اسے موضوع کا ہر صورت میں تابع رہنا پڑتا ہے ادیب، اگر کسی طرح بھی صنف اس کے راستہ میں حائل ہوتی ہے، تو اس کو ٹھکرا کر ایک جداگانہ روش اختیار کر لیتا ہے، اس رجحان سے لاتعداد نئی صنفیں ظہور پذیر ہو رہی ہیں جو رسمی پابندیوں سے قطعی بے پروا معلوم ہوتی ہیں۔

ابھی ادب کے ہر عنصر پر علیحدہ علیحدہ حکم لگانا قبل از وقت ہوگا، اس میں شک نہیں کہ موجودہ عہد کے ادب میں بھی کچھ چیزیں وقتی اور کچھ رطب و یابس ہوں گی، لیکن مجموعی طور پر اس کی افادیت سے انکار کرنا کفرانِ نعمت ہے، اسی طرح ہر عہد کے ادب اور خصوصاً ادبِ عالیہ (classical literature) میں یقیناً کچھ پودے ایسے ہیں، جن کی جڑیں رہتی دُنیا تک سوکھنی دشوار ہیں، مگر اس کے معنی یہ کسی طرح نہیں ہوتے کہ ہم حیات کی جدلیاتی (contradictions) حقیقت سے انکار کر دیں اور ترقی کرتے ہوئے سماج کے راستہ میں روڑا اٹکائیں

پرتھوی ناتھ شرما ایم اے

شاعر اور چٹان

کتنی مستحکم چٹان !

صدیوں کی بنیادوں پر کھڑی وہ چٹان ہر روز مستحکم سے مستحکم تر ہوئے جا رہی تھی۔ سنگ خارا والی چٹان، ونود نے ان پتھروں کو اپنے ہاتھوں سے مس کیا، کتنی سخت اور مضبوط چٹان .... اتنی سخت کہ ہزاروں ٹن وزنی ہتھوڑے بھاپ اور بجلی کی مدد سے اُسے نہ توڑ سکیں۔ ونود کا خیال، شاعر مسکرا دیا، اُس کے خیالات بھی اس چٹان کے مانند مستحکم بننا چاہتے ہیں۔ بننے کی کوشش کی ہے مگر...

..... ونود اُس چٹان کو محسوس کر رہا تھا، اتنی سخت چیز کا وہ خیال تک بھی نہیں کر سکتا۔ کتنی سخت، اُس کے خیالات سختی کا اندازہ لگانے کی خاطر مختلف شاہراہوں پر بکھر گئے۔ مگر وہ شاہراہیں پھیکی پڑ چکی تھیں، سختی کا خیال ونود کو تڑپانے لگا۔ آخر کتنی سخت۔ وہ چٹان کتنی مستحکم ہو سکتی ہے۔ شاعر کے عزم سے زیادہ مضبوط۔ ایں! ہرگز نہیں شاعر کا خیال چٹان سے زیادہ مستحکم ہے۔ نہایت ہی مستحکم..... ونود نے پھر چٹان کو محسوس کیا۔ ہرگز نہیں، چٹان کبھی مستحکم نہیں ہوتی خیال چٹان کو سخت تر بنا دیتا ہے۔ ہا ہا ہو ہو....... ونود ہنس دیا چٹان اس کے خیال میں گھلتے گھلتے بکھر سی گئی، ریزہ ریزہ..... ذرّات، گرد، مٹی ..... ہرگز نہیں! شاعر کا عزم چٹان سے زیادہ سخت ہے۔ ونود کے خیالات نے اُس کی پیشانی پر پسینہ کے موتیوں کو بیدار کر دیا۔

"اُف" ونود نے پیشانی سے پسینہ کی بوندوں کو پونچھا۔ "اُف" کبھی کبھی خیالات بھی ہمیں ایسی ایسی غلط شاہراہوں میں بھٹکنے دیتے ہیں کہ ہماری ان دو آنکھوں کے سامنے مایوسیوں کے سوتے پھوٹ اُٹھتے ہیں ان سوتوں کے سامنے عقلِ انسانی سوائے بے بسی کے ہاتھ پیر مارنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی۔

چٹان کا خیال ونود کو خیرباد کہہ رہا تھا، خیالات نے اُسے کتنا مضمحل کر دیا تھا، اور وہ زندگی کے اس پُر آشوب زمانے میں کچھ سہارا ڈھونڈنے اور تھکاوٹ رفع کرنے کے خیال سے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی تکان اتارنے کے خیال سے پیشانی کو ہاتھ کی ہتھیلی پہ سہارا اور گری ہوئی نگاہوں سے نیچے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس ابدی خاک کی طرف جس میں صدیوں کے طوفان کی نشانیاں ہیں جو بہر صورت قائم رہنے کی کوشش کرتی ہے خون کے دریا میں نہا نہا کر پھر سورج کی نکھری کرنوں اور نیلے آسمان کے احساس میں اپنی پُرانی خصوصیتوں کو حاصل کر لیتی ہے۔ ابدی خاک...

..... ونود کی پیشانی پر سلوٹیں سی نمودار ہوئیں وہ بھی تو اس میں پیدا ہوا ہے، اور اسی میں مل جانے کے لئے۔ اور ابدی خاک، وہ ہنستی رہتی ہے، دُنیا کی ہر ایک عجیب و غریب بات اُسے ہنسنے کے لئے مجبور کر دیتی ہے۔ وہ دو فقروں کے سوائے اور کچھ نہیں جانتی۔ "مجھ سے اٹھو" اور "مجھ میں ہی غائب ہو جاؤ" دُرست، درست، ابدی خاک ... تجھ سے اُٹھیں، اور تجھ میں غائب ہو جائیں۔ نہیں! شاعر کا خیال کہنے لگا۔ ہرگز نہیں۔ آخر کیوں؟ ابدی خاک سے اُٹھ کر پھر ابدی خاک میں مل جانا، عجیب حماقت ہے، جسم۔ ونود پھر مسکرایا۔ صرف جسم، اور شاعر کی روح ...... وہ کبھی خاک میں نہیں مل سکتی۔ وہ تاروں بھری راتوں میں آسمان پر گاتی پھرتی ہے، افق کا آنچل اُٹھا اُٹھا کر اُس کے شرمیلے مگر خوبصورت چہرے کی زیارت کرتی ہے، درختوں کی ٹہنیوں کے ساتھ ناچتی ہے، اور گم کردہ راہ مُسافر کی المناک نگاہوں میں جذب ہو کر اُس شاہراہ پر کھڑے ہو کر نسلِ آدم کو تلقین کرتی رہتی ہے۔ محض چند لمحے۔ خوشی کے چند لمحے، اور اُن لمحوں میں ہم المناک نگاہوں سے ہر کس و ناکس کے دل پر غم کی پرچھائیاں ڈالتے رہتے ہیں۔ اصل زندگی خوشی کا خیال ہے، محض خیال ......

"رانگا" کچھ شرمیلی سی آواز۔ کوئی چٹان تلے گلوٹے کی بیلوں کو چھیڑتا چلا جا رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ، اور ..... گلوٹے مسکرا اُٹھے .... "رانگا" ونود اُس آواز میں گم ہو گیا۔ شاید یہ اُس کے کھوئے ہوئے زمانہ کی صدائے بازگشت ہو۔ جو اُس کے کانوں میں بار بار گونج رہی تھی۔

"رانگا ٹھیرو" ونود جھکا۔ چٹان تلے رانگا اور اس کا ساتھی، اُس ساتھی کے چہرے پر گم شدہ خوشی کی پرچھائیاں، ایک عجیب دنیا کا نور جو برسات کے بعد نیلے آسمان کی طرح نکھرا ہوا تھا۔

"رانگا" دوشیزہ نے اپنے چمکیلے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے اور ...

پرخون دوڑاتے ہوئے کہا...... "رانگا تو پنیٹھ سے میرے لئے کوئی چیز نہیں لایا۔ یہ بات ٹھیک نہیں رانگا۔" وتو دچٹان کے پتھر کی آڑ میں یہ سب باتیں سُننے لگا۔

"کیا چیز۔ صرف بانسری کے لئے پیسے پاس تھے۔ لے آیا۔ دیکھ اور جب میں اسے بجاتا ہوں تو تو......" رانگا مُسکرایا۔ اُس نے بانسری کو مُنہ سے لگایا۔ "سُن نینا۔ سُن۔"

دو مورتیاں اُس چٹان تلے بیٹھ گئیں۔ رانگا نے بانسری بجانی شروع کردی۔ بانسری کا پھندنا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ رانگا کی نگاہ دُور اُفق کی لکیروں میں کسی چیز کو کھوج رہی تھی، اُن تاروں کو جو کبھی کبھی خود بجنے لگتے ہیں، اور جب اُن پر اُنگلیاں پھیری جاتی ہیں تو وہ خاموش رہتے ہیں۔

"رانگا" نینا نے رانگا کی طرف دیکھا۔ رانگا تیری بانسری بہت اچھی ہے۔

"ہاں!" رانگا نے گردن ہلائی۔ "یہ کبھی کبھی دل کی بات کہہ دیتی ہے نینا، جب چشموں کا پانی سوکھ جاتا ہے، برسات کا موسم ختم ہو جاتا ہے، اور جب یہ دُنیا بالکل خشک ہو جاتی ہے تو......"

"تو!"

"تو یہ بانسری ہی...... یہ بانسری ہی، نینا! ہمارے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔" رانگا پھر بانسری کے نغموں میں گم ہو گیا۔ وہ خشک دُنیا میں موسیقی کے دریا بہا دینا چاہتا تھا۔ دُنیا بالکل خشک ہے۔ سب دریا کے پانیوں کو پوجتے ہیں، سوتوں کو نہیں پوجتا۔ آخر پوجنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ غم کے سوتوں سے جو دریا اُبلتا ہے وہ مدّت دراز تک بہت سی غمگین روحوں کو خوشی کے پانیوں سے سرسبز و شاداب بناتا رہتا ہے، اور سرچشمہ، اس کی زندگی میں سوائے رونے کے کیا رکھا ہے؟ محض رونا ہی رونا، زندگی کی صبح سے موت کی شام تک......

مایوسیاں، المناک لمحے، گھٹی گھٹی تاریکیاں....

"رانگا" نینا نے اپنے سُرخ ہونٹوں کو بانسری سے چپکا دیا۔ "رانگا۔ مجھے بانسری بہت پیاری لگتی ہے۔ یہ میرے دل کی آواز کو باہر کھینچ لیتی ہے۔ رانگا،

بیں! میں! میں! بکری اور اُس کے بچّے، نرم ملائم ملائم کھال، نینا آگے بڑھی، اس نے ایک بکری کے بچّے کو گود میں اٹھایا اور پکارنے لگی، بکری مبہوت رانگا کی بانسری کو سُن رہی تھی۔ رانگا ازلی نغمہ چھیڑ رہا تھا ہستی کے راگ، وہ دریا پار سے نینا کو بھگا لایا تھا اُس نے پنیٹھ سے واپسی کے وقت چشمے پر کھڑے ہو کر بانسری کا راگ چھیڑ دیا تھا اور نینا نے اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر کھڑے ان راگوں کو سُنا۔ وہ بھاگی چلی آئی، لیکن دریا کا پانی، نینا کانپ اُٹھی دریا کا پانی...... رانگا کے چہرے پر کچھ کچھ صبر تھا، اُس نے چپکے چپکے نینا سے کہا۔

"مجھے ایک پُل معلوم ہے، وہاں دریا بہت کم گہرا ہے، اور ایک بڑ کا بہت بڑا درخت ایک سرے سے دوسرے سرے تک، آندھی اور طوفان سے گر کر پھیل گیا ہے، بس وہ ہی ہمارا پل ہے۔"

اور وہ دونوں اُس پُل کو پار کر بھاگم بھاگ یہاں تک آن پہنچے تھے۔ نینا نے رانگا سے تحفہ مانگا تھا، کہا تھا کہ پنیٹھ میں سے کچھ تحفہ لانا، لیکن رانگا کی جیب میں صرف ایک بانسری خریدنے کیلئے پیسے تھے اور وہ بانسری لے آیا، صرف ایک ذریعہ...... ایک آواز جس کے تار نینا کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں، اور نینا مصنوعی پُل کو پار کر کے رانگا کے ساتھ چٹان تلے بھاگ آئی تھی۔

دوپہر ڈھل رہی تھی، آسمان کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا، وادی کی آوازیں خاموش تھیں، چند ایک بکریاں اِدھر اُدھر کھونٹے کے بیلوں کے پاس، یا گوگل کے سایوں میں جھاڑیاں چبا رہی تھیں، دُور گہرائی میں تلیٹی کے سہارے گائے بھینس چر رہی تھیں، اور چرواہے آرام کی تان سو رہے تھے، درختوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر شکرے اور باز شام کے وقت ننھی ننھی چڑیوں کا شکار کرنے کی تاک میں چاروں طرف نگاہ ڈال رہے تھے، وادی میں دھوپ اور سایوں کے سبب سے ایک چوسری بن گئی تھی، خشکی کے موسم کے سبب جھرنوں میں سے پانی مرمر کر بہہ رہا تھا۔ چشمے تقریباً خشک کے برابر تھے۔ رانگا اپنی بانسری کو مُنہ سے لگائے نینا کے زانوؤں پر سو رہا تھا، شاید وہ بانسری اب بھی خاموش راگ الاپ رہی تھی، نینا کے ہونٹوں پر قناعت جاگ رہی تھی، اُس کی کچھ کچھ نیلی آنکھوں میں آسمان کا سایہ نکھر رہا تھا، پاس ہی جھاڑیوں کو چبانے والی بکریاں تھوتھڑیاں اوپر اُٹھا اٹھا کر رانگا اور نینا کی طرف دیکھ رہی تھیں، پھر نینا کے لب کھلے اور وہ بڑبڑانے لگی۔

"تو تھک گیا ہے رانگا۔ لیکن شام سے پہلے۔"

"بھاگ چلو نینا۔ چلو۔ گاؤں والے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ بھاگ چلو نینا۔" رانگا نیند میں بڑبڑا اُٹھا، اس کی آنکھ ایک دم کھل گئی اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

"کوئی نہیں رانگا۔ کچھ نہیں۔" نینا نے رانگا کی پیشانی سے پسینے کی بوندوں کو پونچھا۔ اس ذہنی کشمکش کے چند لمحوں میں جب رانگا کا خواب

بھی خیالات سے بھرپور تھا، رانگا گھبرا سا گیا۔ وہ نینا کو گاؤں سے دُور بھگا لایا تھا۔ ایک نئی دُنیا بسانے ...... برگد اور بڑ کے سایوں تلے ...... جب اس نے دریا کو پار کیا تھا تو وہ بہت خوش تھا، اُس نے نینا سے کہا تھا " نینا۔ بس اب ہم تم دُور کسی گاؤں میں جا کر دم لیں گے تو اور میں ! "

" ہوں " نینا مُسکرا دی تھی۔

" میں اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کروں گا۔ مزدوری..... اور پھر ہم دونوں اپنا گھر بسائیں گے " لیکن مجرم کا خیال رانگا کو خواب میں بھی پریشان کر رہا تھا۔ اُسے گاؤں کے آدمی سر پر لٹھ رکھے ہڈ بولتے دکھائی دے رہے تھے۔ مارو، پکڑو، دوڑیو، بھاگیو۔ اور جب وہ ہڑ بڑا کر اٹھا تو اُسے وہ خیال پھر ستانے لگا۔ بانسری الگ پڑی تھی۔ نینا کے اودے ہونٹوں پر مایوسی جھلک اُٹھی۔

" اب " نینا نے رانگا کی آنکھوں میں آنکھ ڈالتے ہوئے کہا " اب ! "

" اب " رانگا نے نینا کے بالوں میں اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھوں کو پھیرا۔ " اب " رانگا کپڑے جھاڑتا اُٹھا۔

" آ چلو آگے۔ چھ میل پرے گاؤں ہے اُس میں بسیرا مل جائے تو اچھا ..... کوئی پوچھیگا کہ میرے ساتھ کون ہے۔ تو کہہ دوں گا میری بیوی...... " رانگا نے نینا کے شہابی رخساروں پر اپنی اُنگلی کو نچایا۔

" میری ..... " دوپہر ڈھل رہی تھی شفق کا رنگ نینا کے رخساروں پر سُرخی ..... " اور " رانگا نے قدرے توقف کے بعد کہا " رات کے وقت ..... حفاظت ہو جاتی ہے۔ بھلا رات کو کون ہمیں دیکھ سکتا ہے "

..... اطمینان۔ اور وہ بھی قطعی غلط ..... ونود نا معلوم کتنی دیر سے ..... چٹان کی آڑ میں بیٹھا بیٹھا رانگا اور نینا کی باتیں سُن رہا تھا۔ رانگا کے دلاسہ دینے والی باتوں کو سُنکر ہنس دیا۔ ایک نہ ہم زبردستی ..... ہا ہا ہا ! ہو ہو ..... وہ پھرتی سے چٹان سے اُترا۔ رانگا اور ..... بھاگنے کی تیاریوں میں بھونچکے اِدھر اُدھر دیکھ .....

" ..... " ونود نے نہایت ملائم انداز میں اُن دونوں کی طرف مخاطب ..... ہوئے کہا۔

..... رانگا نے التماس بھرے الفاظ میں کہا " حضور یہ میرے ساتھ ..... آئی ہے۔ حضور میں پرماتما کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔ سرکار ..... "

" رانگا " نینا کے ہونٹ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ مجرم کتنا کمزور دل انسان ہوتا ہے۔ نینا کے چہرے پر خجالت کی سُرخی دوڑ رہی تھی، اور اس کے جسم کا نچلا حصّہ اُس مچھلی کی مانند لرز رہا تھا جو ابھی پانی سے نکال کر زمین پر ڈال دی گئی ہو۔

" حضور " رانگا نے پھر دوہرایا " حضور " اور رانگا نے ونود کے پاؤں پکڑ لئے۔

" حضور کے بچّے ..... الگ کھڑا ہو جا ——— " ونود ایک نئے ڈرامہ کا ایکٹر بننا چاہتا تھا۔ " اچھا صاحب ذرا چپ چاپ ادھر بیٹھ جائیے۔ پہلے لڑکی کو بھگا کر لایا اور اب اس سے منکر ہوتا ہے۔ ایں ! "

جرم ایک کمزور انسان کے سامنے کانپ رہا تھا۔ رانگا کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ اب کیا کرے۔ وہ ایک دم نڈھال سا ہو گیا۔ اس کی لاٹھی ہاتھ سے چھوٹ کر دُور گڑھے میں جا گری تھی۔ اور ایک نہتّا مجرم بہت ہی کمزور انسان بن جاتا ہے۔

" اور تو " ونود لڑکی کی طرف مخاطب ہوا " تو اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہے "

" نہیں سرکار۔ نہیں۔ پرماتما کی قسم ! سرکار ! پرماتما کی قسم۔ " نینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس کا آنچل آنسوؤں میں بھیگ گیا، ایک غیر متناہی آنسوؤں کا سلسلہ ..... اور ہر ایک آنسو نوحہ پڑھ رہا تھا " سرکار ! یہ مجھے زبردستی بھگا لایا ہے۔ زبردستی ..... "

" سچ کہتی ہے " ونود نے ذرا اور اکڑ کر کہا۔

" سرکار۔ بالکل سچ " نینا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی لڑیاں پرو رہے تھے۔ اُس کو غم تھا اس بات کا کہ رانگا کی محبت کتنی ناپائیدار ہے، پانی پر لکھے ہوئے حرفوں کی مانند، قطعی غیر مستحکم ..... اور اب اُسے ایک ڈر اور ستا رہا تھا۔ مجرم کا خیال۔ مجرم کتنا کمزور ہوتا ہے، اُسے ہر ایک اجنبی انسان انصاف کا ناخدا نظر آتا ہے رانگا کے ہاتھ شل سے پڑ گئے تھے۔ نینا کی نگاہ میں اس دریا کا پُل گھوم گیا جب کو وہ گرے ہوئے بڑ کے درخت کے ذریعہ پار کر کے آئے تھے جب وقت رانگا اُس کے زانو پر سر رکھ کر سو گیا تھا تو وہ رانگا کے کتنی قریب آ گئی تھی بالکل نزدیک جیسے کہ پھول اور اس کی پتیاں ..... اور اُس نے نہ معلوم کون سے جذبہ کے زیر اثر رانگا کے بالوں کو چوم لیا تھا، اُس وقت اُس کا چہرہ کیسا بھیگ سا گیا تھا شرم کے مارے۔ اسکی نگاہیں جھک سی گئی تھیں اور اُسے اس خلوت کی جگہ اوپر کی طرف مُنہ اُٹھانے تک میں

(بقیہ مضمون صفحہ ۵ پر ملاحظہ کیجئے)

کسوٹی

محمد یحییٰ تنہا بی۔اے

کسوٹی

نئی کتابیں

محشرِ خیال

اس نام کی ایک کتاب جناب الیاس احمد مجیبی نے قرول باغ نئی دہلی سے شائع کی ہے، جس کو پروفیسر خواجہ منظور حسین ایم۔اے (علیگ) بی۔اے (آکسن) نے ترتیب دیا ہے۔ سجّاد علی انصاری مرحوم بی۔اے ایل ایل۔بی (علیگ) کے مضامین اور اشعار کا یہ مجموعہ بہ اضافہ روزِ جزا (ڈرامہ) نہایت آب و تاب کے ساتھ دوسری بار زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا ہے، اور ناشر سے احمد منزل، کلاں محل دہلی کے پتہ پر دستیاب ہو سکتا ہے۔

سجّاد علی مرحوم کا یہ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا کہ خود آپ کے مضمون "حقیقت" کے الفاظ میں "احتیاطاً اس کی مقتضی (ہوئی) کہ اُسے کسی دوسری دُنیا میں بھیج دیا جائے"...... "تاکہ (اس) کی حوصلہ مندیاں وقارِ خداوندی کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں"۔ یہ ضعیف البنیان انسان اپنے خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں بہہ جاتا ہے۔ ۷۰ ع

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

کچھ بھی ہو آسکر وائلڈ کی تحریرات نے سجّاد علی مرحوم کو اپنی سحر طرازیوں سے مسخر کر لیا اور انھوں نے اپنے مضامین میں وہ شگوفہ کاری کی ہے کہ اُردو نثر میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، مختصر الفاظ میں وسیع معانی پنہاں ہیں اور ایک ایک لفظ ان کی مرصّع کاری پر شاہدِ عادل ہے۔ مثلاً (۱) "فرشتہ کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے"

(۲) "ایک حقیقت جب پلٹتی ہے دوسری حقیقت ہو جاتی ہے"

(۳) "ارتقارِ انسانی کی آخری منزل عورت ہے"

(۴) "یعنی انبساطِ شباب کا ایک مجسّمہ جس کی ہر کشش اپنے دامن میں کائنات کے لئے ہزاروں برکتیں رکھتی ہے"

(۵) "سنجیدہ فلسفہ چاہتا ہے کہ ہر واقعہ اور انسان کا ہر خیال عالمِ طلسم سے نکل کر واقعیت کی خشک فضا میں آجائے، اگر یہ ممکن ہوتا تو خدا کے اس جلوہ گاہ میں زندگی کا ایک ایک لمحہ ناقابلِ برداشت ہو جاتا، محبّت کی لطیف حماقتیں اور حُسن کا لطیف تر تلوّن، انھیں دونوں قوتوں نے زندگی کی مشکلات کو حل کر دیا ہے ورنہ اس عجیب دُنیا میں اگر صحیح معنوں میں دو ایک طلسم شکن فلسفی پیدا ہو جائیں انسان کی بے بسی تو مسلّمہ ہے خود فرشتوں کو بھی دُنیا میں آنا ناگوار ہو"

(۶) "مروّجہ تصوّف نے مذاقِ سلیم کو یہاں تک برباد کر دیا ہے، کہ خیالات کے ساتھ الفاظ بھی انتہائی غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں"

(۷) "مجاز و حقیقت صرف ایک دامِ فریب ہے جیسے تصوّف کی معصوم خیالی نے تیار کیا تھا، پیشہ ور صوفیوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا"

(۸) "گروہِ عشّاق اس قدر برخود غلط نہ ہوتا، اگر ذمّہ دار شعراء اُسے غلط فہمیوں میں نہ ڈال دیتے" وغیرہ وغیرہ

یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سجّاد علی مرحوم کے خیالات زیادہ تر صحیح یا متوازن ہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ کہا گیا ہے زوردار الفاظ میں کہا گیا ہے۔ انھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کی خوب نمائندگی کی ہے، اور قدامت کی مخالفت کو محض اس بنا پر کہ قدیم ہے اپنا شعار بنا لیا ہے۔ زُہد و پرہیزگاری بجائے خود بُری شے نہیں ہے لیکن جس میں ریاکاری شامل ہو وہ رندی و مستی سے بھی بدتر ہے۔ آخر الذکر کو بُرا کہنا رائے صواب ہے، لیکن اوّل الذکر کی مذمّت کرنا داخلِ ثواب نہیں ہے۔

سجّاد علی مرحوم نے رعنائیِ خیال کے ماتحت کفر و الحاد کی رنگینی سے لطف اندوز ہونے میں دریغ نہیں کیا اور اپنے لئے ایک نئی دُنیا بنا لی، جہاں ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

محشرِ خیال کے مضامین پڑھ کر واقعی یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ شیطنت

ملوکیت سے بڑھکر ہے، اور حسن پرستی و رنگینی تمام گناہوں کا کفارہ ہے، جس طرح آجکل شکست کی انتہا یہ ہے کہ فتح ہو جائے اور فتح کی انتہا یہ ہے کہ شکست ہو جائے۔ بچپن میں جب یہ سُنا تھا کہ قیامت آنے سے پہلے تمام دُنیا لامذہب ہو جائے گی اور خدا کا کوئی نام لیوا نہ رہیگا تو اپنے سے چھوٹے سے دماغ میں یہ بات نہیں سماتی تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہوگا لیکن آجکل کے نوجوانوں کی رفتار وگفتار اور وضع قطع نے ثابت کر دیا کہ وہ زمانہ کچھ دُور نہیں بلکہ شاید آگیا ہے۔"

سجاد صاحب کے فلسفۂ مذہب سے قطع نظر آپ کے بیش بہا خیالات دیگر عنوانات پر قابلِ غور ہیں۔

(۱) "حقیقی عورت ایک ناقابل فہم معمّہ ہے، وہ کبھی اپنی نسوانیت کو منکشف نہیں کرتی، اُس کا ہر انداز اُس کے حقائق کو پوشیدہ رکھتا ہے، وہ ایک طلسم ہے جسے اُس کا ظاہر اور بھی طلسم بنا دیتا ہے جس راز کو وہ دراصل افشا کرنا چاہتی ہے اُس کو بظاہر پوشیدہ رکھتی ہے، اور جس حقیقت کو وہ ہمیشہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے اُس کو کبھی کبھی افشا کر دینے میں بھی اُسے تامل نہیں ہوتا، غرضکہ اُس کا باطن وہ نہیں ہوتا جو پوشیدہ رہتا ہے اور نہ ظاہر وہ ہے جو افشا ہوتا رہتا ہے، اس طلسم سے اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرد اس کی فطرت کو نہ سمجھ سکے، کسی چیز سے متاثر رہنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ انسان اُس سے پورے طور پر باخبر نہ ہونے پائے، عورت یہ راز جانتی ہے اس لئے وہ اپنی ہستی کو کبھی کھلنے نہیں دیتی۔"

(۲) "احساساتِ عامّہ پر جس تحریک کا انحصار ہو اُس کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ فیصلہ اس کی صحت کی تصدیق کرے جس سے عوام کے احساسات وابستہ ہیں، مسلمانوں کی سیاست جس کی بنا حق و صداقت پر رکھی گئی ہے خاص طور پر اُس گروہ کی دست نگر ہے جو ایک طرف خدا اور اس کے احکام سے باخبر ہو اور دوسری انسان اور اس کے حقوق سے۔"

سیاسی جد و جہد کا ہر دور اُسی گروہ کی صحیح فہمیوں کا پابند رہا۔ اگر کبھی عوام نے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کیا، لیکن مذہبی گروہ نے اُس کی تائید سے انکار کر دیا، عوام کی جد و جہد قطعاً رائیگاں ہوگئی کوئی نتیجہ نکلا بھی تو یہ کہ طبقۂ جہلا اور طبقۂ علما میں وہ مخالفت پیدا ہوگئی جس کے اثرات کبھی مٹ نہیں سکتے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ طبقۂ علما نے آواز بلند کی، لیکن عوام نے صدا بصحرا سمجھ کر اُس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ غرض کبھی جہلا گمراہ ہوئے، کبھی علما۔ کوئی متفقہ قوت ایسی مجتمع نہ ہو سکی جو حق و صداقت کو کذب و باطل پر غالب کر سکتی۔"

(۳) اس سلسلہ میں ایک برگزیدہ شخصیت اور بھی ہے جو بظاہر گو دُنیا سے اُٹھ گئی لیکن حیاتِ جاوید نے اُسے ہمیشہ کیلئے نمایاں کر دیا ہے، قرونِ اولیٰ کا اسلام اگر کسی نے عملاً دُنیا کے سامنے اس صدی میں پیش کیا وہ محمود الحسن کی محترم ہستی تھی، آج جب کعبہ سے کفر کا دریا اُمنڈتا چلا آرہا ہے، دیارِ ہند کے ایک مسلمان نے خیر القرون کی یاد تازہ کر دی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے مولانا مرحوم نے علما کو نئے سر سے ہندوستان میں زندہ کر دیا، اور یہ انہیں کا فیض اور اُنہیں کی برکات تھیں کہ موجودہ کشمکش میں علما اور جہلا نے متحد ہو کر کذب و باطل کے مقابلے میں حق و صداقت کا علم بلند کیا گروہ علما، جو ایک زمانہ سے دورِ جدید کے مسلمانوں سے بیگانہ تھا، اُن سے آکر مل گیا، اور وہ خدا ناشناس مغرب پرست جو مذہب کو ناقابلِ برداشت اور شعائرِ اسلامی کو ناقابلِ عمل سمجھتے تھے خدا سے بھی مانوس ہو گئے، اور اُس کے قوانین سے بھی۔"

بیوی

(۴) "بعض ناعاقبت اندیش بیوی میں بھی غیر معمولی حُسن چاہتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ حُسن اُس وقت تک حُسن رہتا ہے جبتک وہ ایک لطیف معمّہ ہے، بیوی کی زندگی واقعات کی کشمکش میں اس طرح الجھتی ہے کہ حُسن کی افسانویت قطعاً فنا ہو جاتی ہے، اس لئے یہ تمنا کہ بیوی حسین ہو، درحقیقت حُسن کی توہین ہے، اس تمنا کا مفہوم دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ حُسن کی عظمت روزمرّہ کی زندگی سے ٹکرا کر برباد ہو جائے، حسین بیوی محض محبوب بنکر رہنا چاہتی ہے وہ زندگی کی کشمکش میں نیاز مندانہ شرکت نہیں کر سکتی، اُس کے حُسن کی رنگینیاں فرائضِ زوجیت کی قباحتوں سے بغاوت کرتی ہیں، یہ صورت ہر حیثیت سے خطرناک ہے۔"

وفا

(۵) "وفا شعاری، احساسِ حیات، اور جذبۂ حُسن پرستی کے اضمحلال کا نام ہے، البتہ اگر حُسن محبت نواز ہے، وفا جائز ہو سکتی ہے، لیکن محبوب کی بے نیازیوں اور بے پروائیوں پر اپنی زندگی کو قربان کر دینا خودکشی کرنی ہے، محبت کا سب سے بڑا جرم ارتکابِ وفا ہے۔ غالب نے اسی بنا پر "وفا کیسی، کہاں کا عشق ..." کہا تھا۔"

جھوٹ

(۶) "ایک لطیف جھوٹ حسنِ خیال اور لطافتِ اظہار پیدا کر دیتا ہے، لیکن وہ جھوٹ کبھی لطیف نہیں ہو سکتا جو ضرورتاً بولا جائے، راست گوئی گفتگو کو دلآویز نہیں بنا سکتی۔ اس لئے کہ ہر اخلاقی فرض دل فریبیوں کا دشمن ہوتا ہے، دروغ گوئی اس لئے اور بھی دلفریب ہوتی ہے کہ سچ کی طرح اُسے واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

دُعا

(۷) "سعیٔ ناکام دُعائے مقبول سے برگزیدہ تر ہے، کوششوں میں عظمتِ انسانی مضمر ہے، لیکن دُعا انسانیت کا اعلانِ شکست ہے، جس کے ذریعہ سے انسانی مجبوریوں کا راز اُن فرشتوں پر بھی منکشف ہو جاتا ہے جو کسی طرح اس انکشاف کے اہل نہیں، دستِ بدعا ہونا کارکنانِ قضا و قدر کے سامنے اپنی بے بسی اور ناچارگی کا اعتراف کرنا ہے۔"

محبّت

(۸) "محبت نام ہے چند احمقانہ اعتبار اور چند طفلانہ بے اعتباریوں کا۔" ۷۲

فلسفی اور شاعر

(۹) "فلسفی دُنیا کے ہر واقعہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے، یہی اُس کی ناکامیوں کا حقیقی راز ہے، وہ ہر ظاہر کا ایک باطن تلاش کرتا ہے، حالانکہ دُنیا میں ہزاروں پردے ایسے ہیں، جن کے اندر کوئی حقیقت پوشیدہ نہیں، فطرت کا یہ محض فریب ہے کہ انسان کو اُن رموز کا متلاشی بنا دے جن کا وجود ہی نہیں، جو سب سے زیادہ اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ فلسفی کہلاتا ہے، اور اُس کی متجسّسانہ حماقتیں، فلسفہ۔ صحیح فلسفہ وہ ہے جو انسان کو اپنی اُن افسوسناک حماقتوں کا معترف بنا دے۔"

"شاعر اس لطیف نکتہ سے واقف ہے کہ کائنات کی اگر کوئی حقیقت ہے، وہ محض پردہ کی رنگینیوں میں مضمر ہے، وہ انھیں دلفریبیوں میں محو ہو جاتا ہے، لیکن کبھی پردہ کو اُلٹنا نہیں چاہتا وہ جانتا ہے کہ نقاب خود ہی حُسنِ کائنات ہے، زیرِ نقاب کچھ نہیں۔"

آپ اُس کے خیالات سے خوش ہوں یا ناخوش، متفق ہوں یا مخالف، لیکن آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ اندازِ بیان میں وہ دلکشی ہے اور اسلوبِ نگارش میں وہ رعنائی ہے کہ یہ چند مضامین کا مجموعہ اپنے مصنف کا نام مدت تک فراموش نہ ہونے دیگا۔

مرزا غالب مرحوم نے اُردو لٹریچر میں سب سے پہلے جدّت طرازی کی، وہی ایک ساز تھا جو سب سے کانوں میں گونج رہا ہے، سرسیّد نے بھی مختلف پیرایۂ بیان اختیار کیئے، آزاد، نذیر احمد حالی، شبلی، شرر اور سرشار نے بھی، ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری اور مہدی الافادی نے بھی، چکبست نے بھی، سجاد حیدر نے بھی، لیکن سجاد علی انصاری جہاں اکثر الفاظ اور رعنائی خیال کیلئے مرزا غالب مرحوم کا منت کش ہے اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن کا متبع، وہاں اُس کا طرزِ تحریر اور جدّتِ خیال منفرد بھی ہے، مختصر اور جامع فقرات دونوں کے یہاں بکثرت ہیں، دونوں کے یہاں وہی شان اور آن ہے، رکاکت دونوں کے یہاں مفقود ہے، لیکن شدّت و غلو موجود ہے، عبد الرحمٰن اور سجاد علی انصاری دونوں ماں جائے بھائی معلوم ہوتے ہیں، فرق صرف وہی ہے جتنا حقیقی بھائیوں میں ہوتا ہے، مگر دونوں ابو الکلام آزاد کے "الہلال" سے متاثر ہیں۔

یہاں یہ کہنا بھی بے موقع نہ ہوگا کہ سجاد علی مرحوم کا اسلوبِ بیان جہاں ممتنع الجواب ہے وہاں اس میں یہ خرابی بھی ہے کہ یہ صرف مضامین نگاری کے کام آسکتا ہے، کتابیں اس طرز میں تصنیف و تالیف نہیں کی جا سکتیں، یا یہ طریقہ کتابوں کے لئے موزوں نہیں، کتاب نویسی کیلئے حالی، شبلی اور شرر ہی کے انداز کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا ورنہ سب کیا کرایا اکارت جائیگا، دیگر اصحاب جو طرزِ نو کے مالک ہیں اپنی شرر فشانی سے آنکھوں کو ضرور خیرہ کر دیتے ہیں لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ چراغ کی جگمگاہٹ ہی راستہ چلنے والوں کو نشانِ راہ کا پتہ دے سکتی ہے۔

سجاد علی مرحوم کے دماغ جدّت طراز سے کچھ اشعار نے بھی تراوش کی ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اگر مرحوم اور زندہ رہتے تو شاعری میں بھی ایک خاص درجہ حاصل کر لیتے۔ مثلاً

ہر پھول سے تراوشِ حسنِ بہار ہے
اے حسرتِ نگاہ فضائے چمن سے دُور

تم کھو گئے تو مجھ کو ملی منزلِ حیات
میں انتہائے یاس میں بھی کامیاب ہوں

دل ٹوٹتے ہی رازِ محبت بھی کھل گیا
اللہ رے بے ثباتیٔ پیمانِ آرزو

بہارِ حسن کو بیگانہ وار دیکھا تھا
نگہ نے چھیڑ دیا مسئلہ محبت کا

مضامین محمد علی حصۂ دوم

مرتبہ محمد سرور، استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ، ناشر مکتبۂ جامعہ۔ قیمت ۸/

مولانا محمد علی کو لوگ سیاسی رہنما ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن اصل میں وہ ایک شخصیت تھے جس میں مختلف عناصر نے ملکر جامعیت اور ہمہ گیری کا جوہر نمایاں کر دیا تھا، ادب و آرٹ، انشا پردازی سیاست، مذہب، صحافت، اور شاعری ان کی ذات میں مختلف مقدار کے ساتھ جمع ہو گئی تھی۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ سیاست ہی ان کا میدان عمل بنی اور باقی جوہر حاشیہ کے طور پر کارفرما رہے، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سیاست ایک سیاسی مدبر کی سی سیاست نہ تھی بلکہ ایک آئیڈیلسٹ کی سی سیاست تھی، گویا ان کی سیاست مذہبی شعور و بلوغ کی گود سے پیدا ہوئی، پروان چڑھی اور بالآخر اسی کی گود میں اس نے دم توڑ دیا۔

محمد علی جیسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں، ایک ماحول پیدا کرتی ہیں، ان کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں، یہ شخصیتیں جو شعور پیدا کرتی ہیں وہ ارتقا اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ مل کر ماحول کو تبدیل کر دیتا ہے مگر یہ تبدیل شدہ شخصیتیں نئے ماحول سے سمجھوتہ نہیں کر سکتیں۔

مولانا محمد علی کے ساتھ بھی یہی ہوا، ایک زمانہ ایسا آیا کہ وقت اور اس کے تقاضے اُن سے آگے نکل گئے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے خیال میں کامل اخلاص کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرنی چاہی، قوم سیاسی شعور سے جیسے آج عاری ہے، اُس وقت بھی عاری تھی، محمد علی جوہر محمد علی جناح نہیں تھا، اُس نے بساط پر اپنے وقار اور زندگی کی بازی لگائی اور قوم کو اس راستہ پر لانا چاہا جو اس کے فکر و تجربہ کا نتیجہ تھا، وہ دھارے کے ساتھ بہا نہیں، بلکہ دھارے کو چیر کر اُس نے ساحل پر پہنچنے کی سعی کی۔ تن آسانوں کو دھارے کے خلاف بہنے کی کیا ضرورت تھی، پھر اور بھی طوفان آئے، بالآخر فضا اندھیروں، آندھیوں، اور گمراہیوں سے معمور ہو گئی، مگر وہ آزادی کے لئے زندہ رہا اور آزادی کی راہ ہی میں اُس نے جان عزیز ختم کر دی۔

محمد علی نے ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کی، مگر سوائے چند تہمتوں کے کوئی نتیجہ نہ نکل سکا، بہرحال میری رائے ہے کہ محمد علی کے ساتھ مسلمانوں نے سب سے زیادہ غیر منصفانہ برتاؤ کیا۔

اس کتاب کے اکثر و بیشتر مضامین "ہمدرد" میں شائع ہو چکے ہیں، یہ محمد علی کے مضامین کی دوسری جلد ہے، مضامین کو عنوانات کے ماتحت دس حصوں کی صورت میں شائع کیا گیا ہے، دوسرے حصہ میں ہندو مسلم مناقشات کے متعلق مضامین ہیں، تیسرے حصہ میں ہندو مسلم اتحاد اور مسلم اقلیت کے تحفظ کی کشمکش کے متعلق اور چوتھے حصہ کے مضامین "ہندو مسلم سمجھوتہ" سے تعلق رکھتے ہیں۔

"روداد چمن" کے عنوان سے مولانا محمد علی کے مضامین ان کی سیاسی زندگی کے بعد کے گہرے تاثرات کا نتیجہ ہیں، ان مضامین میں کافی تلخی نظر آتی ہے، آخری حصہ میں مسئلہ حجاز، ہنگامۂ افغانستان، چین اور علامہ اقبال کے متعلق مضامین ہیں۔

ان مضامین کے مطالعہ کے بعد ان کی ساری زندگی ایک سیاسی و ذہنی کشمکش معلوم ہوتی ہے اور ان کے مضامین اس کشمکش کا آئینہ ہیں۔

کتاب کے آغاز میں وہ اتنے جانبدار نہیں جتنے کہ آخر میں، مولانا کی زندگی بتاتی ہے کہ انھوں نے غیر جانبداری کے مرکز سے "جانبداری" کی طرف رجعت کی، یہ رجعت کیوں کی گئی ان کے مضامین اس کا جواب پیش کرتے ہیں، وہ جذباتی انسان ضرور تھے، مگر ہر مخلص رہنما جذباتی ہوتا ہے، اصل میں وہ اخلاقی سیاستداں تھے، میکاولی کے شاگرد نہ تھے، اور اپنی رائے میں شدید تھے، اتنے شدید کہ ارتقا اور انقلاب کی اہمیت بھی ان کی نگاہ میں وہ نہ تھی جو ہونی چاہئے۔ ہوا یہ کہ جیسے جیسے سیاسی شعور ہندوستانیوں میں بڑھتا گیا، مذہبی قدریں کمزور ہوتی گئیں۔ اور سیاست کو سیاست کی نگاہ سے دیکھنے کا خیال جڑ پکڑتا چلا گیا! محمد علی کی نگاہ میں، وہ سیاست سیاست ہی نہ تھی جس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو، اور زمانہ اس عینک کو توڑ چکا تھا۔

بہرحال یہ مضامین ہر شخص کو پڑھنے چاہئیں، یہ صرف مسائل سیاسی کے متعلق ایک مخصوص شخصیت کی آراء ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے اندر محمد علی کا دل دھڑک رہا ہے۔

رفیق تنہائی

علی عباس حسینی، مکتبۂ اُردو، لاہور، قیمت دو روپیہ (عہ)

رفیق تنہائی علی عباس حسینی کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جو غالباً ان کی پہلی کوشش سے متعلق ہے۔ علی عباس دُنیائے ادب میں نئے نہیں اس لئے ان کے کسی مزید تعارف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جہاں تک اس کتاب کے افسانوں کا تعلق ہے اس میں اور موجودہ افسانوں کے معیار میں ایک بیّن فرق نظر آتا ہے۔ نہ صرف معیار میں فرق نظر آتا ہے بلکہ انداز بیان بھی کچھ دوسروں سے ممتاز ہے۔

اس دور کے اکثر افسانہ نگاروں کے یہاں زیادہ تر نفسیاتی تحلیل پائی جاتی ہے۔ جنسیات ایک خاص موضوع جس پر غیر ارادی طور پر لکھنے والا قلم اٹھاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی طرح جنسیات کی تہ میں اُتر جائے، اور اس طرح ان کی تحلیل کرے کہ جذبات پرستی کو کہیں دخل نہ ہو یا پھر جیمس جوئس بن جائے۔ اور اگر کچھ نہیں ہوتا تو ذرا کچھ ہٹ کر موپاساں بن جائے۔ غرضیکہ جنسیات نہ معلوم کیوں دماغوں پر سوار ہے اور کچھ اس جنسیاتی تحلیل نے سوار کر دی ہے۔

یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس قسم کی چیزیں پڑھنے سے نئی پود جلد

۴۷ جوان ہو جائے گی یا نہیں۔ لیکن اس قدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی جنسیاتی کہانیاں پڑھنے سے وہ خیالات اور احساسات جو تحت الشعور میں ہوتے ہیں شعوری کیفیتیں اختیار کر لیتے ہیں۔

عام افسانہ نگار اس راستے پر جا رہے ہیں لیکن علی عباس اپنے ان افسانوں میں انھیں خیالات کو لئے ہوئے ہیں جو اس مادی قسم کی نفسیات سے الگ ہیں۔ ان کی محبت بھی وہی ہے جو آج سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہی رومانی تخیل، ایک .... انھیں پُرانے قسم کے رکھ رکھاؤ کو پسند کرتی ہے۔ وہی شریف بہو بیٹیاں، بڑوں سے لجانے والی، غیروں سے شرمانے والی، بات بات پر جن کے رخساروں پر پسینہ آجاتا ہے اور ایک گلابی سی کھل جاتی ہے، انھیں پردہ کی بیٹھنے والی بہو بیٹیاں اچھی لگتی ہیں بہ نسبت اُن نوجوان لڑکیوں کے جو سڑکوں، شاہراہوں اور چوراہوں پر نظر آتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ان کے کچھ افسانوں پر فرسودگی کا اطلاق ہو لیکن صرف موضوع کے لحاظ سے، انداز بیان کے لحاظ سے نہیں، اس کے علاوہ ان کے ان افسانوں کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی عباس نے ان افسانوں کو خود جی سے نہیں لکھا بلکہ کسی نے ان سے لکھو لئے ہیں اور اس لئے ان میں محض خیال نظر آتا ہے، کوئی جذبہ یا روح کارفرما نہیں معلوم ہوتی۔ اس کتاب میں ان کے ایسے افسانے بھی ہیں جنھیں نفسیات سے بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ خیال کے طور پر ان کا "رفیق تنہائی" اور ایک حد تک "بھو کی ہنسی" بھی۔

اگر ان کے افسانے کہیں دورِ حاضر کے رجحان کی طرف آتے بھی ہیں تو چند قدم چل کر پھر پیچھے کو لوٹ جاتے ہیں۔

"سوبیگھے" میں بھی وہ کچھ پُرانی ہی چیز زندہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اس سے مقصد یہ نہیں کہ علی عباس پر فرسودگی کا الزام آسکے۔ جہاں ان کے اس قسم کے خیالات جھلکتے ہیں وہاں بغاوت اور سماج سے بیزاری کا عنصر بھی نمایاں ہے۔

غرضیکہ علی عباس کے افسانے ایک اچھا امتزاج ہے نئے اور پُرانے خیالات کا۔ موجودہ نفسیاتی تحلیل جہاں ایک طرف زندگی کو عریاں اور صحیح پیش کرتا ہے وہاں دوسری طرف اس سے ایک حد تک بیزار بھی کر دیتا ہے۔ کیونکہ عریاں حقیقت ہمیشہ بیزار کن ہوتی ہے غالباً اس خیال کو دیکھتے ہوئے علی عباس زندگی میں چونکہ نفاست کا قائل ہے اس وجہ سے اس بُت کو نہیں توڑنا چاہتا جو دور سے حسین معلوم ہوتا ہے اور حسن کے حسین اور اَمر با زو ازل سے ابد تک پھیلے ہوئے ہیں۔

میرے نغمے

یہ سلام مچھلی شہری کی نظموں کا مجموعہ ہے اُردو سوسائٹی نے لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

سلام نظم کے لحاظ سے جن چیزوں کے لئے جانا بوجھا جاتا ہے وہ شعر کی موزونیت نہیں بلکہ مضامین کی ندرت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "ادب برائے حیات" کوئی بُرا خیال نہیں لیکن حیات کو اگر عریاں لباس میں دیکھا جائے تو غالباً وہ اتنی دلچسپ نہ معلوم ہوگی جو اب ان گوناگوں پردوں میں معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح وہ ادب جو حیات کو اس طرح واضح کر دیتا ہے کہ زندگی ننگی ہو جاتی ہے اتنا دلکش نہیں ہوتا جس قدر وہ روپ جو زندگی کو پیش کرتا ہے مگر اس طرح کہ وہ ننگی نہ نظر آئے۔ لیکن اہل بینش کی نگاہوں سے اس کی حقیقت پوشیدہ بھی نہ رہے۔ زندگی کی ننگی اور بھیانک تصویر پیش کرنے سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کو زندگی سے متنفر کرنا چاہتے ہیں بلکہ یہ کہ اس کے دل میں ایک کسک پیدا ہو جائے اور وہ سوچنے لگے، وہ زندگی کی طرف بڑھے نہ کہ اس سے دامن چھڑا کر بھاگے۔

وہ چیز جو سلام کی اکثر نظموں میں پائی جاتی ہے ان نظموں میں وہ

اُپج اور اچھوتاپن نظر نہیں آتا محسوس ایسا ہوتا ہے کہ سلام نے اچھی نظموں کا مجموعہ شائع کرنے سے پہلے یہ کتاب محض اپنے تعارف یا مزید تعارف کیلئے شائع کی ہے۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ اس مجموعہ میں تمام نظمیں ہی بیکار ہیں۔ نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو ایک آدمی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ اگرچہ سلام کا یہ دعویٰ درست ہے کہ وہ کسی پابندی کا قائل نہیں اور یہ کہ وہ جو محسوس کرتا ہے اس کو نظم کی صورت میں پیش کرتا ہے، لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہا جائیگا کہ احساسات کے ساتھ اس کتاب میں طرزِ ادا کچھ معمولی سا ہے۔

نظمیں بری نہیں، موضوعات بد رنگ نہیں لیکن محسوس ایسا ہوتا ہے کہ سلام نے جتنی نظمیں مشق کے طور پر آجتک کہی تھیں وہ سب اس کتاب میں شائع کردی ہیں۔

بقول زرتشت

یہ فریڈرش نیتشے کی کتاب "بقول زرتشت" کا ترجمہ ہے جسے انجمن ترقی اُردو دہلی نے شائع کیا ہے۔ اور ڈاکٹر ابوالحسن منصور پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے جرمنی سے اُردو زبان میں ڈھالا ہے۔

جن خیالات کے زیر سایہ آج تمام جرمن قوم جی رہی ہے وہی نیتشے کا فلسفہ ہے۔ نیتشے صرف قوت کا قائل ہے، اس کے علاوہ اس کے ذہن میں اور کوئی چیز نہیں۔ قوت کے علاوہ اُسے ہر چیز بیکار اور بے مصرف نظر آتی ہے۔

"زرتشت کو تلاش ہے مل کر تخلیق کرنے والوں کی، زرتشت کو تلاش ہے مل کر فصل کاٹنے والوں کی، اور مل کر خوشی منانے والوں کی۔ اسے گلوں اور چرواہوں اور لاشوں سے کیا واسطہ"

"بے شمار تعداد اُن کی ہے جو زندہ رہتے ہیں اور بے حد دیر تک ان ہی شاخوں میں لٹکتے رہتے ہیں، کاش آندھی آئے اور ان تمام گلے سڑے اور کرم خوردہ سیبوں کو درخت سے جھاڑ دے"

"بڑی مہربانیاں شکر گزار نہیں بناتیں بلکہ کینہ پرور۔ اور اگر چھوٹی بھلائی فراموش نہ ہو جایا کرے تو وہ کرنے والا کیڑا بنجائے"

"لیکن بھیک منگوں کا قلع قمع کر دینا چاہیئے۔ واقعی ان کو دینا بھی تکلیف دہ ہے اور نہ دینا بھی تکلیف دہ۔"

یہ ہے نیتشے کا فلسفہ، اس کے نزدیک صرف اُن ہی چند افراد کو جینے کا حق ہے جو قوت ور ہوں، تنومند ہوں اور کمزور نہ ہوں، یا بقول نیتشے کے کہ محض لاشے نہ ہوں۔ اسے یہ چلتے پھرتے ہوئے لاشے پسند نہیں، وہ ان سے نفرت کرتا ہے، سوچتا ہے کوئی تیز ہوا چلے اور یہ سڑے گلے سیب گل کر نیچے آ پڑیں۔

انسان کی کمزوری اور بے بسی اس کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے آج یورپ کی زمین میں سے ایسے گلے سڑے سیبوں والے درخت اکھاڑے جا رہے ہیں، جو نیتشے نے کہا، نازی وہی کر رہے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس تند آندھی میں محض سڑے گلے پھل ہی گریں گے یا درخت بھی ساتھ ہی جڑ سے اکھڑ کر جا پڑیں گے۔

نیتشے کے نزدیک ہر وہ فعل جو آدمی کو جفاکش اور طاقتور بنائے مبارک ہے، اس کے نزدیک خود غرضی بھی بُری نہیں بلکہ خود غرضی کا دھارا اس کے نزدیک پھوٹتا ہی ایک بلند و برتر روح سے ہے اور بلند روح سے تعلق ہے طاقتور جسم کا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وہ ایسا کیوں کہتا ہے، کہتا ہے تو یہی کیوں کہ پورا ایک ملک اس کے اصولوں پر لبیک کہے۔ بہت ممکن ہے وہ اتنا حساس ہوگیا ہو کہ اُسے کبھی اپنی کمزوری پر غصہ آ گیا ہو یا انسانی نسل کی ذلت سے اس کا دل کڑھا ہو، اور واقعہ بھی یہی ہے اسے یہ رینگتے ہوئے کیڑے مکوڑے اچھے نہیں لگتے، وہ انسانی فطرت کی انتہائی گہرائیوں میں دبی ہوئی آواز کو اٹھا کر اوپر پھینکتا ہے، ۷۵
کمزوری گناہ ہے، جرم!

ہم میں سے ہر شخص یہی سوچتا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جتنے بھی حفاظت، ہمدردی اور محبت کے اصول مرتب کئے گئے ہیں وہ سب انسانی کمزوریوں کی آوازیں ہیں، وہ سب اک خوف کے تحت میں ترتیب دئے گئے ہیں۔

انسانی سماج، انسانی برادری، ہمدردی، علم و دانش، یہ سب چیزیں انسان کی کمزور آوازیں ہیں، اور سب سے زیادہ کمزور آواز ہے عدل و انصاف۔ نیتشے ان ہی کمزور آوازوں کے خلاف چیختا ہے، ان ہی آوازوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ اسے انسانی جسم میں بیکار اعضا پسند نہیں، اور یہی وہ دوسروں کو تلقین کرتا ہے کہ ان تمام اعضا کو کاٹ ڈالو، انکی کوئی ضرورت نہیں۔

نیتشے کی ذات ایسی نہیں جس کے لئے کسی مزید تعارف کی ضرورت ہو۔ یہ کتاب اُردو فلسفہ اور ادب میں ایک بہت بڑا اضافہ ہے۔





بہ نسخۂ کلاں

عرق مقوّی زعفرانی

(''میں نے اس عرق کی چند خوراکیں پیں، تیر بہدف قوت حاصل ہوئی، اور زیادہ دیر تک دماغی کاموں میں منہمک رہا مگر تکان نہیں ہوئی، معدہ کی ساری شکایات کالعدم ہوگئیں، اس تغیّر پر مجھے بڑی حیرت ہے۔'') ''شاعر''

یہ دُنیا کی تیر بہدف دوا عام طور سے مشہور و مقبول ہے جس کو ہندوستان کے باشندے موسم سرما میں بہت ہی شوق اور ایک خاص دلچسپی سے پیتے ہیں بلکہ تمام ممالک کے امیر طبقہ کے لوگ اس کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، یہ حقیقت میں موسم سرما کا ایک خاص تحفہ ہے اور ملک کے راجہ مہاراجہ اور نوّاب تو سوائے اس دوا کے کوئی دوسری چیز طاقت پیدا کرنے کیلئے پیتے ہی نہیں، کیونکہ اس دوا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے پینے کے بعد انسان کو کسی اور مقوّی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اس لئے کہ یہ جتنی مقدار میں پی جاتی ہے وہ تمام خون بنجاتی ہے، چنانچہ اسی قوت پر انسان کی ہر قوت باقی اور قائم رہتی ہے، یوں تو دُنیا میں بہت سی نئی نئی ایجادیں ہوتی رہتی ہیں مگر یہ دوا اطبّاء کی ایک محیّر العقول اور کثیر النفع ایجاد ہے، اس کے چند یوم پینے سے انسان کا خون کافی مقدار میں بڑھ جاتا ہے جس سے جسم کا وزن بڑھ کر دائمی قوّت اور طاقت پیدا ہوجاتی ہے، یہ بدیہی امر ہے کہ جب خون بڑھتا ہے تو سب طاقتیں بڑھتی ہیں، جسم میں بجلی سی کوندنے لگتی ہے، انگڑائیاں نہایت طاقت کیساتھ آتی ہیں چہرہ سُرخ مثل گلاب ہوجاتا ہے کمزوری جسم سے قطعاً مفقود ہو کر جسم سڈول اور خوبصورت ہوجاتا ہے، اور تمام قسم کے داغ دھبّے جلتے رہتے ہیں، خوشنمائی کا تمام جسم پر ایک عام دور ہوجاتا ہے، کتنا ہی کمزور وناتواں آدمی اس مقوی عرق کو پیئے اور دیکھیے کہ کیسی کیفیت طاری ہوتی ہے نہایت درجہ طاقت بخش مقوی باہ مولد خون ہے اصل میں قوائے ۷۶
ثلاثہ کو پُر جوش اور برانگیختہ کرنے کے واسطے یہ عرق سردی میں پیا جاتا ہے، ہر انسان اس کے جملہ اوصاف اور خوبیوں سے خوب واقف ہے، ہمیں اطبّاء اور حکماء کی اس جادو اثر دوا کی ایجاد کی دل سے داد دینی چاہیئے، اس کے سامنے سب طاقت کی ادویات ہیچ ثابت ہوئی ہیں، اس کے پینے سے بھوک بڑھتی ہے اور کھانا خوب ہضم ہوتا ہے۔ دل، دماغ، جگر یعنی اعضاء رئیسہ و شریفہ، معدہ، آنتیں، گردے غرضکہ تمام اعضا اس عرق کے پینے سے اپنی پوری پوری قوّت حاصل کرتے ہیں جس سے جسم کی ہر کمزوری دائمی طور پر دور ہوجاتی ہے اور کمزوریٔ باہ کی شکایات جیسے کثرت احتلام، جریان وغیرہ ہمیشہ کیلئے نیست و نابود ہوجاتی ہیں، لہٰذا اس موسم سرما کو ضائع نہ کیجیئے اور ایک مرتبہ ضرور پی کر دیکھئے کہ قدرت کاملہ نے اس دوا میں کیا خاصیت رکھی ہے، عورتوں، مردوں و نیز بوڑھوں وجوانوں کے لئے یکساں مفید اور کارآمد شے ہے، بچّے تھوڑی تھوڑی مقدار میں شوق سے پیتے ہیں، یہ دوا بڑھاپے کیلئے خاص ہے، اور عورتوں کی نسوانی بیماریوں کا ایک احد علاج ہے، ضروری بات ہے کہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے، مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں، میں بہت حیران ہوں کہ جب آپ صاحبان زندگی چاہتے ہیں تو پھر کیوں نہ زندگی کو ہر وقت ہر طرح درست رکھنے کی کوشش کریں، آخر اور بھی تو دُنیا کی ضروریات آپ لوگ اپنے اہل وعیال کیلئے پوری کرتے ہیں، کیا آپ کا یہ فرض نہیں ہے کہ سب سے مقدّم صحت کو سمجھیں، اور اس کے بعد پھر تو آپ دُنیا کی ہر جدّ و جہد میں حصّہ لینے کے قابل بن سکتے ہیں، صحت کی خرابی تمام آپ کے گھر کی خرابی کی وجہ ہے، ورنہ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں ناکام رہیں، مذہبًا، اصولًا انسانی فرض کو ادا کرتے ہوئے تندرستی کا ہمیشہ خیال رکھئے، یہ عرق ہمیشہ موسم سرما میں بہت سے بیش قیمت اجزاء سے تیار کیا جاتا ہے اس کی آمیزش میں سب قسم کے میوہ جات، دیگر طیور و قیمتی ادویات شامل ہیں۔ **قیمت** پانچ روپیہ چار آنہ (صہ) فی بوتل۔ ادھا تین روپیہ (سے) پوا ایک روپیہ نو آنہ (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔ **خوراک** پانچ تولہ بڑوں کیلئے۔ بچّوں کیلئے ایک تولہ مصری یا شہد ملا کر صبح کو استعمال کریں۔

المشتہر ڈاکٹر حکیم نعیم اللہ نعیم (مستند طبیہ کالج لاہور شاگرد رشید شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی بالقابہٗ)

(رجسٹرڈ اینڈ لیسنس میڈیکل پریکٹیشنر کلاس اے گورنمنٹ یو پی مالک مشہور عالم آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ دہلی والا جہانگیر آباد ضلع بلند شہر)

الیشیا۔ نومبر ۱۹۴۲ء

تصویرکدہ

ساغر نظامی

"لگن"

(فلمی تنقید)

نیو تھیٹرز ہندوستان کی تصویر ساز کمپنیوں میں اپنی چند اہم خصوصیات کے لئے خاص طور پر ممتاز تھی، چنانچہ یہ صرف نیو تھیٹرز ہی کا امتیاز تھا کہ اُس نے ہالیووڈ کے نئے تمثیلی رجحانات کو ہندوستان کے قدیم وجدانِ شعری کے ساتھ اس قدر کامیاب طریقہ پر ملایا۔ اب نئے فنی تقاضوں کی جھلک ہندوستان کے لطیف و دقیق جمالیاتی مطالباتِ میں نمایاں نظر آتی ہے۔ لگن انھیں دو متضاد میلانات کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش تھی۔ اس میں ایک موسیقی کالج کی ایک ترقی یافتہ طالبہ کی لگن اپنے شاعر پروفیسر کے ساتھ اور سماج کے تھوپے ہوئے شوہر کے لئے اُس طالبہ کی فرمانبرداری کے درمیان کشمکش کو دکھایا گیا ہے۔ اس طرح تصویر میں اُن گہرے اور پیچیدہ نفسیاتی دقائق (Subtilities Psychology) پر بحث کی گئی ہے جو محبت اور سماجی فرض کے حریفانہ تقابل کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں۔ گو انجام کے طور پر تصویر کے ڈائرکٹر نتن بوس نے سماجی فرض کو کامیاب ثابت کیا ہے جس سے ہم تصویر کو من حیث المجموع رجعت پسندانہ کہہ سکتے ہیں۔

افسانہ

لگن کی کہانی صرف اتنی ہے کہ کلکتہ کے ایک میوزک کالج کی طالبہ کسم (کانن بالا) اپنے کالج کے پروفیسر (سہگل) سے محبت کرنے لگتی ہے۔ پروفیسر شاعر ہے کسم اس کی شاعری سے متاثر ہے (اسی تاثیر کو "لگن" کہا گیا ہے) اسکول کی ایک تقریب میں حسین طالبہ کو کلکتہ کا ایک مشہور مالک اخبار دیکھ لیتا ہے۔ جوان و موثر کسم مالک اخبار کو متاثر کردیتی ہے۔ سرمایہ دار نے شادی کی خواہش کی جس کا منظور ہونا یقینی تھا۔ کسم مالک اخبار (نواب) کو بیاہ دی گئی ہے، شادی محبت پر فتح نہ پاسکی کسم کے دل میں شاعر کی یاد چٹکیاں لیتی رہی، شوہر نے اسکی دلجمعی کیلئے سینکڑوں جتن کئے مگر دل کی گہرائیوں میں اُترے ہوئے جذبہ کو وہ نہ نکال سکا۔ عاشق شوہر نے بیوی کو خوش کرنے کیلئے رقیب کو گھر بلالیا۔ مشاعرہ تازہ تھا کہ کسم اُس کا بے بس شکار ہے وہ جب چاہے گا سماج کے نمائندے (شوہر) سے اُسے چھین لے گا۔ بہادر شاعر نے کانن سے صاف کہدیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھ سے محبت کرتی ہو، میں بھی تمہیں چاہتا ہوں، میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔"

کہانی نے اچانک پلٹا کھایا، سوسائٹی کے مقدس قوانین آڑے گئے فرض نے فتح پائی، محبت ناکام ہوئی، اور شاعر کو شوہر کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی۔

اس طرح افسانہ کی بنیادی چیزیں وہ نفسیاتی دقائق ہیں جو محبت اور فرض کی باہمی پیچیدگیوں کے درمیان پیش آتے ہیں۔

مقصد

لیکن جہاں تک مقصد کا تعلق ہے لگن قطعی رجعت پسندانہ تصویر ہے، اس لئے کہ صرف شوہر پرستی کی اہمیت کو ثابت کرنا کسی طرح بھی قابل پسندیدگی نہیں۔

نفسیاتی ٹکڑے

جب شاعر کی دماغی محنتوں سے دوسرے فائدہ اُٹھائیں تو اس کے احساسات کس قدر مجروح ہوتے ہیں۔ جب بیوی اپنے شوہر کی فرمانبردار ہونے کے باوجود کسی دوسرے کی عزت کرتی ہو، اور جب شوہر اپنی بیوی کی محبت میں اُس کے اُستاد کو گھر بلاکر یہ محسوس کرے کہ وہ اس کا رقیب ہے۔ اور اپنی محبوبہ بیوی کی خواہش کے احترام میں خود اُسے چھوڑنے کیلئے تیار ہوجائے تو ان حالات میں کتنی دقیق اور لطیف نفسیاتی اُلجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں، اس کو لگن کے کامیاب ڈائرکٹر نتن بوس نے اپنے مخصوص طرز میں واضح کیا ہے اور یہی وہ مقامات ہیں جہاں "لگن" اور نتن بوس کی فنی بلندی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی نتن بوس شاعر اور اسکی نفسیات سے قطعی بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں۔ "لگن" میں شاعر کے کردار کو بیحد ذلیل انداز میں پیش کیا گیا ہے [illegible] انتہا اس مقام پر ہوتا ہے جب شاعر کسم کو اپنا لکھا ہوا اور اُدھ کھانے کیلئے بلاتا ہے۔
اس کا پلاٹ وہی ہے جو لگن میں ہو رہا ہے۔ شاعر نے ... سے استادی نہیں ہو سکتا۔

مکالمات

نیو تھیٹرز کی تمام تصویروں کے مکالمات عام طور پر ٹھیٹ ہندوستانی میں ہوتے ہیں لگن میں بھی اس کا پورا اہتمام رکھا گیا ہے، البتہ ایک جگہ زبان بالکل غلط استعمال کی گئی ہے،

جب کسم کے گھر پولیس آتی ہے تو اس کا باپ جگدیش اس قسم کا فقرہ تین بار ادا کرتا ہے ——— میں نے تو کہنا تھا ——— اس طرح "مجھے" مفعولی لفظ کی جگہ "میں نے" فاعلی لفظ استعمال کیا گیا ہے جو بلا شبہ ایک تکلیف دہ نحوی غلطی ہے۔

گیت

گیت ہندی طرز کے ہیں لیکن ان کی زبان چند ایک کو چھوڑ کر سخت اور ناقابل فہم ہے، بہتر ہوتا کہ گیت لکھتے وقت شمالی ہند کے مذاق کا اندازہ لگا لیا جاتا۔

موسیقی

عام طور پر پکے گانے سنیما بینوں کی اکثریت کو متاثر نہیں کرتے لیکن نیو تھیٹرز کے ماہر موسیقاروں کا یہ کمال تھا کہ وہ سخت اور بھر دری موسیقی کو عوامی ذوق سے اس قدر ملا دیتے تھے کہ عام گانے کی جاذبیت اس کے سامنے ماند پڑ جاتی تھی لگن میں بھی پکّی موسیقی کو استعمال کیا گیا ہے مگر لطیف مقدار کے ساتھ۔

پس منظر موسیقی

پس منظر موسیقی (Back-ground Music) موجودہ تمثیلی دُنیا میں بیحد اہمیت رکھتی ہے۔ پس منظر موسیقی ہی صرف اس ماحول کو پیدا کر سکتی ہے جس پر منظر۔ مکالمے۔ احساسات اور کردار کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے جب تک صحیح ماحول ہی تصویر کے منظر سے میل نہ کھائے اس کی تاثیر کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی۔ مگر تعجب ہے تمن بوس جیسا صاحب طرز ڈائرکٹر اسی کی طرف سے بے توجہ رہا۔ ڈائرکٹر کی غلطی اُس وقت اور بھی اجاگر ہو جاتی ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ لگن شروع سے آخیر تک پیچیدہ نفسیاتی مسائل سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس تصویر کے ہر ایک (Tragedian Comedian) طربی اور المی منظر میں ایک روکھا پن نمایاں ہے۔ جو رومانی جوڑوں (Touches) کو خشک فلسفیانہ رنگ دیدیتا ہے۔

لباس

لگن میں کلکتہ کی معاشرت کو پیش کیا گیا ہے لیکن تصویر میں اداکار جس معاشرت میں آتے ہیں وہ بنگالی ہونے کے باوجود شمالی ہند کے دوسرے علاقوں کی معاشرت سے بھی پوری طرح متناسب ہے جو کسٹیوم ڈائرکٹر (نگران لباس) کی سطحی ذہانت کی چغلی کھاتی ہے۔ ایڈیٹروں کا لباس اور وضع قطع کلکتہ کے مدیروں کی وضع سے بھی ملتی ہے اور دہلی و لاہور کے مدیروں کی وضع سے بھی یہ تضاد فضول ہے۔

ترتیب

چونکہ تصویر میں افسانوی پھیر اور اُلجھنیں نہیں ہیں اس لئے اس کی ترتیب کوئی فنی اہمیت نہیں رکھتی گو یہ اُمید کرنا بالکل حق بجانب تھا کہ اس آسانی کے ہوتے ہوئے ترتیب میں کوئی ندرت (Novelty) ہوگی۔ مگر اس ندرت کا کہیں پتہ نہیں۔

تشکیل

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نگران تشکیل (سٹینگ) نے بھی اپنی ذمہ داریاں باحسن اسلوب ادا نہیں کیں، میوزک کالج کے منیجر کے گھر اور کسم کی قیامگاہ میں گھر ستی کا ضروری سامان مہیا نہیں کیا گیا۔ البتہ نگران تشکیل کی مہارت فن کا اندازہ اُس منظر سے ضرور ہوتا ہے جس میں شاعر کے خالی گھر کو پیش کیا گیا ہے، اسے دیکھنے سے فوراً خیال ہوتا ہے کہ یہاں کوئی مقیم تھا جو اسے خالی کر کے چلا گیا ہے۔

اداکاروں کی تعداد

لگن میں بعض اداکار بالکل غیر ضروری ہیں۔ اگر انہیں ہٹا دیا جائے تو تصویر کی عام رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً مالک اخبار (نواب) کا سکریٹری جو دودھ کا گلاس پیش کرتا ہے۔ اس کی تصویر کیلئے ضرورت نہیں۔ اچھا ہوتا کہ چند ضروری مکالمے جو اس کی زبان سے ادا کرائے گئے ہیں کسی دوسرے کی زبان سے ادا کرا دئے جاتے۔

اداکاری

لگن میں فلمی دُنیا کے مشہور اداکار نواب، سہگل، جگدیش، نیمو اور بنگال کی مخصوص اداکار کانن بالا نے فرائض اداکاری انجام دئے ہیں۔

نواب درد و اثر کو ظاہر کرنے کے لئے بہترین اداکار ہے مگر چونکہ ان احساسات کا اظہار ہر مقام پر یکساں نہیں ہو سکتا، اس لئے حسّیات کی تبدیلی کے ساتھ اداکاری میں بھی تبدیلی ہونا چاہئے۔ لیکن نواب کے یہاں یہ تبدیلی ناپید ہے، اس لئے بعض مقامات پر تو وہ اس قدر ماہرانہ تصویر کشی کرتا ہے کہ دیکھنے والا مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے جبکہ ٹھیک ذرا سے بدلے ہوئے حالات میں اس کی مہارت کی صرف نمود ہی رہ جاتی ہے، صحیح میلانات کی تشریح مفقود ہو جاتی ہے۔

سہگل طنزیہ اداکاری (Satirical Action of) میں سہگل ایک خاص اور امتیازی فلسفیانہ طرز رکھتا ہے۔ وہ اس کا ہر جگہ کامیاب مظاہرہ کرتا ہے اور لگن کی اداکاری میں بھی اس خصوصیت کو اُس نے مضبوطی سے قائم رکھا ہے۔

نیمو:- سنجیدہ اداکاری (Semi Serious Action of) کے لئے نیمو سے بہتر ہندوستان میں شاید ہی کوئی اداکار ہو۔ وہ تمام اداکاری سنجیدہ احساسات کے اظہار کے لئے کرے گا لیکن ساتھ ہی اس قدر لطیف مزاح بھی شامل کرتا چلا جائے گا کہ شروع سے آخر تک

تمام ایکٹنگ ایک مستقل مزاج معلوم ہوگا۔ اس نے اپنی اس خصوصیت کا مظاہرہ لگن میں بھی نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے ۔

جگدیش:۔ نیم مزاحی اداکار (Semi-jocular Action of) میں جگدیش جتنا ممتاز ہے اس کو تمثیلی حلقے بخوبی جانتے ہیں لگن میں بھی اس کے کمالات اپنے قدیم طرز میں نمایاں ہیں۔

کانن بالا:۔ نواب اور کانن بالا کی اداکاری تمام تصویر میں سب سے زیادہ اہم، گہری اور فلسفیانہ ہے خصوصاً کانن کا ایکٹنگ حد درجہ مشکل ہے اُسے نفسیاتِ محبت کی مادّی اور غیر مادّی تشریح کرنا پڑی ہے، وہ بنانا چاہتی ہے کہ شاعر سے اس کی محبت خالص غیر مادّی، روحانی ہے۔ اور شوہر سے اس کا تعلق مادّی میلانات کی تسکین کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ کتنی دقیق منزل تھی اس کا صحیح اندازہ لگن کو دیکھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔ حقیقتاً لگن کے بعد کانن نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستانی صنعت تمثیل کی ایک قیمتی دولت ہے ۔

عکّاسی لگن کی عکّاسی کی نگرانی بھی نتن بوس نے کی ہے گمان تھا کہ عکاسی فنی نقطۂ نظر سے بہت کامل ہوگی، اور خوشی ہے کہ یہ گمان صحیح نکلا تصویر میں عکّاسی کا بلند نمونہ پیش کیا گیا ہے آؤٹ ڈور شوٹنگ (خارجی منظر کشی) زیادہ نہیں ہے اور ان ڈور شوٹنگ (داخلی منظر کشی) پر زیادہ زور دیا گیا ہے. تاہم اس سے تصویر کی منظری اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

ہدایت کاری لگن کی ڈائرکشن کا فرض ہندوستان کے لائق ترین ڈائرکٹر نتن بوس نے انجام دیا ہے اور پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ لگن کو ہدایت دیکر بوس نے اپنے آپ کو کافی بلند کر لیا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مسٹر بوس نے انتخاب اداکاران، فلسفیانہ نکات کی تشریح اور نفسیاتی ٹکڑوں کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ لگن کو ہندوستان کی اچھی تصویروں میں شمار کرنے میں ہمیں ذرا تامل نہیں ۔

ادا۔ بدایونی

اشکِ چکیدہ

۸۰

مٹی میں مل نہ جائے کہیں یہ بھی اے جنوں
ہنگامۂ بہار کا پیغامِ آخریں
یا اخترِ صبح ہے سپہرِ نیاز کا
اے نوک ہے نوازشِ پنہاں لئے ہوئے
رکھتی ہے بے قرار مجھے جس کی جستجو
اُجڑی ہوئی بہار کی ہیں رُخ پہ جھلکیاں
خوابیدہ تیری گود میں ماضی کی عشرتیں
پہلو میں تیرے آج بھی لیتی ہیں کروٹیں
اِس دُھندلے آئینہ میں ہیں پرتو فگن ابھی
تھرا رہی ہیں آج بھی تیری خموشیاں
غلطیدہ دھڑکنیں ہیں دلِ بے قرار کی
رقصاں وہ بجلیاں ہیں جو گرتی تھیں ہوش پہ
ویران ہو نہ جائے مری بزمِ آرزو

سرمایۂ حیات ہے بس ایک اشکِ خوں
مے خانۂ نشاط کا اِک جامِ آخریں
اِک آخری سرودِ محبّت کے ساز کا
حُسنِ فروغ شمع شبستاں لئے ہوئے
تجھ میں بسی ہوئی ہے وہ دُنیائے رنگ و بُو
تجھ میں رچی ہیں خونِ تمنّا کی سُرخیاں
وہ نازِ دِل نواز وہ رنگیں حکائیتیں
ترشے ہوئے لبوں کی حسیں مُسکراہٹیں
کچھ شوخ و شنگ صورتیں عہدِ نشاط کی
بیتے ہوئے زمانہ کی دل رس کہانیاں
مضمر ہے تجھ میں روحِ شبِ انتظار کی
ماضی کی زلفِ ناز پریشاں ہیں دوش پر
اے اشک! چشمِ تر سے کہیں گر نہ جائے تو

میں تلخئ شرابِ تغافل چشیدہ ہوں
چشمِ زمانہ ساز کا اشکِ چکیدہ ہوں

ایشیا۔ نومبر ۱۹۴۲ء

[illegible]

[illegible]

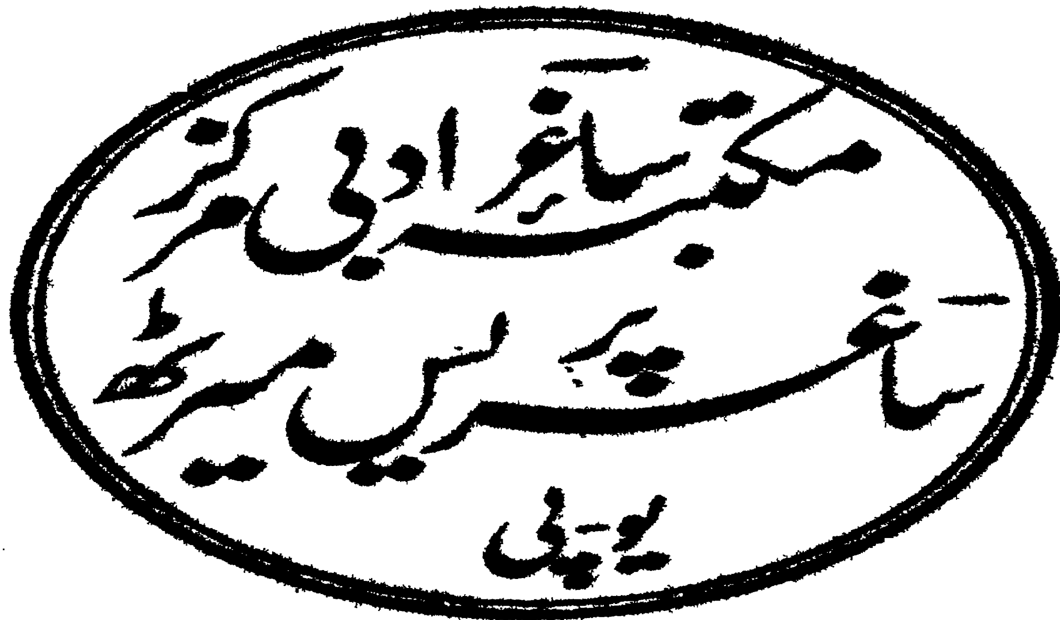
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

Registered No. A [illegible]





PUBLISHED BY :-

The [illegible] Sagar Press. (India)
MEERUT.

ایشیا

اس نمبر کے چند لکھنے والے

جوش ملیح آبادی
لطیف الدین احمد اکبر آبادی
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
رام پرتاپ بہادر ایم اے
ارشاد بیگ
جان نثار اختر
اختر الایمان
اکرام قمر ایم۔ اے
راحت سعید

مدیر اعلیٰ ساغر نظامی

سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ حکومت بہار

حکومت سی پی اور حکومت صوبۂ پنجاب

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۸ ر

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ممالک سے)
ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست

ماہنامہ ایشیا

ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء

ناظم:- اسد یار خان اعظم

ادبی مرکز میرٹھ

ادبی مرکز کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

جلد ۷	ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء	نمبر ۸ و ۹

(مسلسل)

تاثرات

(حیدر آباد کی علمی دنیا)

"حیدر آباد" علم و ادب کے قدیم و جدید جواہرات کا ایک مخزن ہے جس پر پرانے طریق اور ڈھتے ہوئے ماحول کا شدید دباؤ پڑ رہا ہے۔ ادبی تخلیق کا ایک سرچشمہ ہے جسے چاروں طرف سے کہنہ روایاتِ اخلاق و تمدن کا آہنی حصار گھیرے ہوئے ہے۔

لیکن وہ دن زیادہ دور نہیں، جب سرچشمہ سے اس کا اصلی جوہر اچھل کر اس آہنی حصار کو پار کرلیگا اور تمام دنیا اس سے فیض حاصل کریگی دکن میں اس سال میں نے ۵۷ دن گزارے، یہ مدت کسی مملکت کی سیاسی، تمدنی، اخلاقی اور خاص کر ادبی زندگی کے متعلق اندازے لگانے کے لئے کافی ہے۔ حیدر آباد کی عام زندگی بھی میرے سامنے آئی، اور ادبی و سیاسی زندگی بھی، ملک کے نظم و نسق کی خرابیاں بھی محسوس ہوئیں اور اسکی خصوصیتیں بھی، اور اُس دباؤ کا اندازہ بھی ہوا، جو حیدر آباد پر باہر سے پڑتا رہتا ہے، گویا غیر ارادی طور پر حیدر آباد کے سیاسی و ادبی ماحول سے اتنی ہی واقفیت ہوگئی جتنی کہ ہندوستان کے دوسرے گوشوں کے سیاسی و ادبی حالات سے تھی۔

حیدر آباد ہی ایسی جگہ ہے جہاں انسانی روح کی خفتہ ترین صلاحیتیں خفتہ نہیں رہ سکتیں؛ ذی حس دل میں محسوس کرنے کی افتادہ ترین اہلیت بھی احساس کے جھرو کے سے جھانکنے لگتی ہے ——— اک وسیع دنیا! ——— جہاں فطرت اور انسان، جاہلیت اور تمدن، دونوں کیفیتوں کے کارنامے بیک نگاہ سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں، کوئی کتنا ہی آنکھ بچائے یہاں زندگی اپنے پوشیدہ ترین تقادوں کو نامحسوس طور پر پیش کر دیتی ہے!

اگر کوئی آرٹسٹ اس ماحول سے ٹکرا کر چور چور ہو سکے تو ابدی زندگی اُسی کا حصّہ ہو سکتی ہے۔

حیدر آباد کے مشاہدے کے لئے روح کی تمام صلاحیتیں کام میں لانا پڑینگی، مشاہدہ ممکن بھی، مطالعہ آسان کام نہیں، اُن تمام انسانی جودتوں کو استعمال کرنا پڑیگا جنہیں ابھی تک انسان نے ارتقائی نقد و نظر کیلئے محفوظ رکھا ہے۔

حیدرآباد کی ایک اور دلچسپ حیثیت بھی ہے، یعنی اسکے پیمانہ میں پنجاب، بہار، مدراس اور مخصوص طور پر یو-پی کی شراب .... کے حقیقی رنگ وکیف اپنے مقدار کے اعتبار سے "دو آتشہ" ہی نہیں اکثر اوقات سہ آتشہ ہو کر نظر آتا ہے۔
اس کا نیلگوں آسمان، اسکے چاندستارے، اسکی سانولی چٹانوں سے پٹی ہوئی کیسری دھرتی، اسکے بجو بہ قصور، اس میں بسنے والی متمدن مخلوق، اس مخلوق کی تہذیب و نفاست، معیاری کلچر، ساحرانہ تبسم اور پھر انکا جمال وجلال !!

اسکے غلیظ اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے، ان میں پڑ رہنے والی دکھیاری جنتا، اس سیاہ و تابناک دکھیاروں کی اتفاقیہ کھل کھلاہٹ جیسے سوکھے درخت میں کلیاں کھل جائیں! یہ سب کچھ دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔
کبھی کبھی جب اونچی دیواروں کے سایہ میں یا سیمنٹ سے بنی ہوئی سڑکوں پر ان مزدور عورتوں پر نگاہ پڑی، تو میرے احساس و تصور کو ایسا محسوس ہوا کہ اجنتا کے غاروں کے بت صدیوں سے کھڑے کھڑے تھک گئے تھے آخر پہاڑیوں سے نئی دنیا کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ کون جانتا ہے اس دکھیا گروہ پر کتنے تمدنوں کا سیلاب گزر چکا ہے کتنی تہذیبیں اسے کھوند چکی ہیں۔ وہ تمدن اپنی دلدوزی میں کتنا فسوں ساز ہوگا جس تمدن کا مٹا ہوا پرتو یہ دکھیا گروہ ہے۔
صبح کے دھندلکے میں یہ آبنوسی مزدور لڑکیاں پُراسرار چٹانوں کی گود میں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے قدیم ترین سنگ تراشی کے نمونے چل پھر رہے ہوں، لیکن جیسے ہی اسرار سے لبریز یہ مناظر ختم ہوتے ہیں، حقیقت اپنا مکروہ نشان لے کر نمودار ہوتی ہے اور ناظر کو محسوس ہوتا ہے کہ دکن کے اسٹیڈیو میں یہ بت کم از کم ۴۰ فی صدی ہیں۔
یوں تو یہ ہماری ساری دنیا، اک نظام کے سبب حیرتناک پست وبلند اور آنکھیں کھول دینے والے تضادوں کی بستی ہے لیکن
۴ حیدرآباد میں یہ پست وبلند نمایاں نظر آتا ہے، اور زندگانی میں تضاد کے بڑے تیکھے اور شوخ رنگ پائے جاتے ہیں۔ اس پست وبلند اور گہرے تضادوں کی تفسیر و تشریح آسان کام نہیں، اور ہر کسی کا کام نہیں۔ فی الحال میرا ابھی یہ مقصد نہیں، سیاسی مسائل اپنے سینکڑوں گوشہ رکھتے ہیں، پیچ در پیچ مباحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ فرصت سے ان باتوں کا ذکر کیا جائیگا۔ لیکن بہر حال کسی کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ... اس دور کے اختتام پر یہ ہماری دنیا یونہی سجی سجائی باقی رہ جائیگی۔
ہزاروں تغیر فضا میں تھرتھرا رہے ہیں، حیدرآباد کی قسمت ہندوستان سے، اور ہندوستان کی قسمت بین الاقوامی سیاست سے بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی قوموں کی جو بھی آرزو ہو، لیکن جنگ کے بعد ارتقا کا دوسرا تقاضہ عالمگیر امن ہوگا۔ یہ ایک ایسے نظام کا مطالبہ کرے گا جو زندگی کی موجودہ اقدار کو یکسر مٹا کر حیات کے نئے خطوط بنائے گا۔ اس وقت زلزلہ کی سی کیفیت ہوگی، نہ ٹیلے ڈھنے سے محفوظ رہیں گے نہ آکاش کو چومنے والے پہاڑ، بلندیاں پستیاں بن جائینگی اور پستیاں آسمان، یہ پرانے نظام ہائے حکومت باقی نہیں رہینگے۔ اگر اتحادیوں کی فتح ہوئی (اور میرے خیال میں ان کی فتح ہونی چاہیئے) تو یقینی طور پر نیا نظام ان تجربوں کی بنیادوں پر قائم ہوگا جو خود سامراج کو ہوئے ہیں، اور سامراج کو سب سے بڑا تجربہ یہ ہوا ہے کہ اب وہ موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ قوموں کی آزادی اور اقتصادی ذرائع کی تنظیم اس طرح سے کی جائیگی کہ یہ امن عارضی ثابت ہونے کے بجائے مستقل بنیادوں پر قائم ہوسکے اور نسل انسانی کی بہتری و خوش حالی کی راہیں محفوظ ہو جائیں۔
ہیرلڈ لاسکی کا خیال ہے کہ جبتک سماجی نظام میں تبدیلیاں نہونگی ہم وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکیں گے، ڈکینس کا خیال ہے کہ اب مشترکہ انسان کا دور طلوع ہوگا۔
ہینسن امریکہ کے ماہر اقتصادیات کا خیال ہے کہ اگر سائنس کے موجودہ ذرائع کو تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے تو ایسا اعلیٰ معیار زندگی حاصل ہوگا جو تاریخ میں اس سے قبل نہیں ہوسکا تھا۔

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدر روزویلٹ کہتے ہیں کہ "نوع انسان اپنی تقدیری منزل کی طرف بڑھ رہی ہے اور وہ ہے روح انسان کی انتہائی آزادی"۔
آربھر مور نے کہا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کا حل اس مستقبل کے مسئلہ پر نظر رکھنے میں ہے جب رنگ، قوم، اور نسل کے تصورات سامراج اور لوٹ کھسوٹ کے مواقع قائم نہیں رہینگے ۔ وقت ہمیں اسی سمت لے جارہا ہے اور اسی نوعیت سے ہم ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مسئلہ کو سمجھ سکتے ہیں اور روئے زمین ہی کو اپنا وطن ماننے، انسانی اخوت قائم کرنے اور ایک مشترک نظام کے قیام ہی سے ہٹلر کو شکست دی جاسکتی ہے۔
نازی ازم کو اک سائنٹفک نظام کے درجہ تک پہنچا دیا گیا ہے، اس لئے اسے اک برتر اور جدید سائنٹفک نظام ہی سے جیتا جاسکتا ہے ۔ جرمن قوم میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ دراصل تعمیری حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتا بلکہ اس کی فتوحات اور جوش اس دباؤ کا ردّ عمل ہے جو سامراج کی گرفت کی وجہ سے جرمنی میں پیدا ہو گیا تھا، یہ اک کچلی ہوئی قوم کا غیض وغضب ہے اور جب تعمیر کا وقت آئے گا تو اُسے طبعی اور برتر تخلیقی جذبہ کی ضرورت درپیش ہو گی۔
تاریخ محوریوں اور اتحادیوں دونوں کو چیلنج دے رہی ہے، اور تعمیر کا خاکہ تخیلات کی سرحد سے جاملا ہے، بقول ہیرلڈ لاسکی ہم ایسے موڑ پر کھڑے ہیں جو انقلاب روس و فرانس کی طرح انقلابی موڑ ہے ۔ اس قسم کے موڑ اصل میں قوموں اور ملکوں کی نشاۃ ثانیہ ہوتے ہیں سال بھر ہوا (Belinne) کے عنوان سے ایک کتاب انگریزی میں شائع ہوئی تھی جس میں مشہور سائنسدانوں اور مفکرین نے موجودہ حالات کو مٹتی ہوئی تہذیب کی آخری نشانی قرار دیا تھا ۔ امریکہ میں Post war Recarslruetion کو اوّلین اہمیت دی جاری ہے ۔ سر رچرڈ گریگوری نے لندن میں سائنسدانوں کے بین الاقوامی اجتماع میں اس بات پر زور دیا تھا کہ نوع انسان کی ترقی اس بات میں مضمر ہے کہ خارجی اشیا کی چھان بین اور جو کچھ انسان ہے اس کی ماہیت معلوم کرنے کی مشترکہ سعی کی جائے ۔ ۵
کارڈل ہل، مسٹر ایڈن اور سر اسٹیفو، ڈکرپس بھی اپنی تقریروں میں طلوع ہونے والی تہذیب پر زور دیتے ہیں۔ واکیلس نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ یہ انقلاب گزشتہ ۱۵۰ سال سے ہمیں ایسے دروازے پر لے آیا ہے جو انسانی آزادی کا مشترکہ منتہائے نظر ہے" اور یہ انقلاب اس مقصد کو حاصل کرنے سے قبل ختم نہیں ہوسکتا ۔
گوئبلز خود اس وقت کیلئے پریشان ہے جب یہ جنگ ختم ہو کر قوموں کی حیثیات متعیّن کرنے کا وقت آئے گا ۔
یہ بھی کسی کا قول ہے کہ "بیدار ہوتے ہوئے سماجی اور سیاسی ذہن وشعور اور ارتقائی قوتوں کے تقاضات کو پورا کرنے کیلئے ہمیں مزید علم کی ضرورت ہے ۔
یہ ہیں وہ حقائق جو دنیا بھر کے مدبّرین کے دماغوں میں گردش کر رہے ہیں۔ اور ہندوستان ان کے اثرات سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ تو یقیناً حیدرآباد کو بھی مستثنیٰ نہیں کہا جاسکتا، ذرائع آمد و رفت نے تمام کرۂ ارض کو آج ایک ہی کڑی میں منسلک کر دیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ حیدرآباد ریاست، اور ریاست کے رہنما ان حقائق سے عہدہ برآ ہونے اور خود کو جدید سانچوں میں ڈھالنے کے لئے کیا سوچ رہے ہیں!؟
حیدرآباد کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ خود کو بین الاقوامی دائرہ ہی میں سمجھے اور اس دائرہ کے خطوط میں کسی قسم کے امتیازی نشانات اور حد بندیاں قائم نہ کرے ۔ اپنے امڈ آنے والے ارتقاء اور نئے حقائق کے قبول کرنے کی ممکن صلاحیت پیدا کرے، جو امن کشی میں عافیت نہیں، دامن کشی کے بجائے نئے حقائق سے وابستگی اس کے لئے بقا و استحکام کا باعث ہوسکتی ہے ۔ اگر اسکے ارباب حل و عقد اور دکنی رہنماؤں نے صحیح خطوط پر فکر و غور نہیں کیا تو اس بنیاد سے الگ انکی تمام کوششیں انہیں اپنے منتہائے نظر تک ہرگز نہیں پہنچا سکتیں، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ان کا منتہائے نظر مختلف تضادوں کا مجموعہ ہے ۔

ایشیا ۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

تاثرات تو تاثرات ہی ہیں، بے ارادہ سا اک طوفان، دماغ منطقی ربط کے ساتھ فکر نہیں کرتا، احساس ایک آئینہ خانہ ہے۔ جو چیز اسکے سامنے سے گزرے گی منعکس ہوگی، حساس دل اور آئینہ میں فرق بھی ہے، آئینہ میں اشیاء کا عکس قائم نہیں رہتا مگر دل کے پردے پر جتنے پرتو پڑتے ہیں، جم کر رہ جاتے ہیں۔

قدیم زمانے میں شعراء کو سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مزدور اور صنّاعوں کو بھی سوائے چپ چاپ کام کرنے اور اُجرت وصول کرنے کے کوئی رابطہ بادشاہوں سے نہ تھا، مگر اس وقت نہ ملیں تھیں، نہ کارخانے، نہ بین الاقوامی جلب منفعت، زندگی اجتماعی نہیں ہوئی تھی اور فرد کو اپنی صحیح حیثیت کا اندازہ نہیں تھا، مگر موجودہ نظام کے اثرات نے اسکے احساس و مشاہدہ کو بیدار کردیا ہے، زاویۂ نگاہ ہی بدل گیا، آرٹ پر بھی اس کا اثر پڑا، اب اعلیٰ تخلیقی شاعری کا پس منظر اس وقت تک تیار نہیں ہو سکتا جبتک کہ بین الاقوامی سیاست، سماجی نظام، اور انسان کے اندر اُٹھتی اور گرتی رہنے والی احساساتی رو کو گرفت میں نہ لیا جائے۔

سیاسی تاثرات کا ہجوم ایسی جگہ قدرتًا زیادہ ہوتا ہے جو بظاہر سیاسی زندگی سے علیحدگی ظاہر کرے مگر اسکے گوشہ گوشہ میں سیاسی ہنگامے دبے ہوئے ہوں۔ پھر عملی حیثیت سے تمدنی زندگی میں سیاست کو اولیت بھی حاصل ہے، بہرحال، دل پر پرتو بے اندازہ پڑے ہیں، مگر بیان کا یارا نہیں؛

ساری دُنیا کا جو حال ہے، حیدر آباد بھی اس سے محفوظ نہیں، اوّل تو "کلچر" خود فطرت اور سادگی کی موت کا دوسرا نام ہے، پھر وہ بھی روایاتی، لیکن بہرحال اسلامی تعلیمات نے انسانی زندگی میں یکسانیت و مساوات قائم رکھنے کیلئے اک نظام پیش کیا اگر وہ دُنیا میں باقی رہتا تو ایک "معیاری اسلامی معاشرہ" امن و راحت کا باعث ہوتا۔ کلچر غریبوں اور بھوکوں کی تو چیز ہی نہیں، اسی کو عام دیکھنے کیلئے ہر دل تڑپ رہا ہے درمیانی اور اعلیٰ طبقے کے دل و دماغ ایک مساواتی زندگی کا تصوّر تو رکھتے ہیں، اسلام کی فضیلت بھی جتاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ [illegible] ـت چھوٹے بڑے، امیر و غریب اور قوی و کمزور کے درمیان ہیبت ناک خلیجیں، کبھی کی مستحکم اور ابدی ہو چکیں مسلمان ہیں مگر "اسلامی سوسائٹی" کا وجود نہیں؛

یہ کلچرل اور طبقاتی دوری حیدر آباد میں، نظام ساگر کی طرح لمبی اور چوڑی ہے، لیکن جدا جدا حلقوں میں اگر دیکھا جائے تو اخلاق و اعمال کی رنگا رنگ اقسام نظر آتی ہیں، ماحول کے لحاظ سے امراء کا اخلاق جُدا ہے، متوسطین کا جدا، اور عہدہ داروں کا سب سے جُدا، اور غرض مندوں کا ان سے بھی جدا؛

امراء کے اخلاق پر قدرتی طور پر ان کی طاقت کا سایہ ہے، غرض مند اُن کے اخلاق پر نسلًا بعد نسلًا ایسے اثرات ڈالتے رہے ہیں کہ ان کی ہستی ہی مشکوک ہو جاتی ہے مگر ہر عہد کا ایک مزاج اور سانچہ ہوتا ہے، پُرانے امراء کے دماغ کا دوسرا سانچہ تھا، موجودہ عہد کے امراء نیا سانچہ اور جدید مزاج رکھتے ہیں، یہ وہی مزاج ہے جو کیف و کم کے ساتھ "جدید فرد" اور امراء میں مشترک ہے، زندگی جن دائروں تک پھیلی ہے اسکے لحاظ میں چھوٹے بڑے سب ہی آگئے ہیں؛ اس صورتِ حال نے شکوک کو دبایا اور نیا مزاج بنایا ہے، ماحول میں جیسے جیسے عوامی تقاضے جاگتے ہیں، یہ بھی جاگتے ہیں، مشینی عہد میں ان کے مفاد بھی جاگیردارانہ نہیں رہے، سرمایہ دارانہ عہد میں عوام سے نئی بنیادوں پر نئے رابطہ پیدا کرنا ناگزیر ہے؛

متوسطین کا اخلاق بھی متوسط ہوتا ہے، بُرائی بھی معتدل، بھلائی بھی معتدل، ان میں کبھی احتساب کی روح مُردہ نہیں ہوتی اعمال کو جانچنے کی اہلیت ہر دم تازہ رہتی ہے، پھر دُنیا بھر میں سب سے زیادہ اقتصادی بار اسی طبقے کی گردن پر ہے، سر اُٹھائے تو کیونکر!؟ مالی عدم توازن، ہمیشہ اسکے اخلاق میں توازن قائم رکھتا ہے اسکے افراد بہت اچھے نہیں ہو سکتے تو بہت بُرے بننے کی اہلیت بھی ان میں نہیں ہوتی؛

بے شمار مادی اور روحانی اُلجھنیں انہیں "اخلاقی تصوریت" سے ہر وقت قریب رکھتی ہیں، کلچر ہو یا تمدن، ادب ہو یا سیاست، زندگی کے ہر شعبہ کی ترقی کا راز صرف دُنیا کے اعصابی طبقے سے تعلق رکھتا ہے؛

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

عوام کا اخلاق اور ان کی زندگی ہی کیا، پھر بھی ہر چراغ میں ان کے دم سے روشنی ہے، بھوک ہو یا افلاس، دکھ ہو یا سکھ، عوام میں اخلاقی قدریں اپنا مقررہ معیار ترک نہیں کرتیں، وہ خاص اعتقاد اور مذہب کی صورت میں انکی روح کا جزو بن کر رہ جاتی ہیں۔

اس "نام نہاد کلچر" اور اخلاق سے انہیں کیا واسطہ جسکے پس منظر میں بے روح تبسم منہ چڑاتے رہتے ہیں۔ کلچر ان بیچاروں میں کہاں، کلچر تو بڑی خرچیلی چیز ہے، ہاں ان کے سینوں میں دل ہے، دل میں روشنی —— مگر دل اور روشنی کی ہماری دنیا میں کیا گنجائش!؟

رہے عہدہ دار تو ان کے اخلاق دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ، جب یہ وردی پہنے ہوئے ہوں، اور ایک وہ، جب یہ ذاتی لباس میں ہوں، کچھ ان سے زیادہ متعصب یا شدید معتقد ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو متوسطین ہی میں سے ہیں۔ ان کے اکثر افراد درمیانی طبقے ہی سے ترقی کر کے اعلیٰ مناصب پر پہنچتے ہیں، یہ محسوس کریں یا نہ کریں ان کے ماتحت الشعور . . . . . . میں درمیانی طبقے کے کرداری تقاضے تڑپتے رہتے ہیں۔ مقاصد اور ملنے جلنے میں یہ غلط بھی ہو سکتے ہیں اور صحیح بھی، ہاں انہیں یہ بتاتے رہنا چاہیئے کہ کلچر اور ترقی اور تہذیب و تمدن کوئی جامد اور محدود چیز نہیں، عوام سے متوسط، اور متوسط سے اعلیٰ کی طرف انسانی سماج نے پرواز کی اور یہ پرواز ارتقاء کے ساتھ ہمیشہ جاری رہیگی۔ ہمارے عہد میں تو یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ "کلچر" کسی مخصوص خاندان اور فرد کی جاگیر بن کر نہیں رہ سکتا۔

تعلیم انسان کو فکر کا عادی بناتی ہے، سوچنے والا دل خواہش سے ضرور دھڑکتا ہے، آرزو و ارادہ کو ضرور چھیڑتی ہے، ظاہر ہے کہ ہم ماحول میں بکھری ہوئی چیزوں (کلچر ترقی وغیرہ) ہی کی آرزو کرینگے، اس آرزو کا منتہا کیا ہوگا —— ؟ لامحدود ترقی! —— شاید عہدوں سے بھی آگے کی ترقی!!

اب رہے غرض مند اور ان کا اخلاق، یہ کوئی خاص طبقہ نہیں، ہر طبقہ اور اسکے افراد غرض مند ہیں۔ مجلسی زندگی میں اغراض پیدا ہوتیں اور ایک دوسرے سے متعلق کرتی ہیں، لیکن میری مراد غرض مندوں کے اس گروہ سے ہے جنہوں نے اغراض کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، ایسے افراد نے حیدرآباد کے اخلاق کو بیحد نقصان پہنچایا ہے اور وہاں کے لوگوں کو یقیناً اچھے برے میں تمیز کرنے میں دقت ہوتی ہوگی۔

پھر بھی حیدرآباد میں بسنے والے، معقولیت پسند، مہمان نواز اور شعر و ادب کی قدر و قیمت سے واقف ہیں جسے وہ جان لیں اسکی عزت کرتے ہیں اور جس سے وہ متاثر ہو جائیں اس سے محبت،

اعلیٰ طبقے میں شعر و ادب کا ذوق دکھاوے کے طور پر ہے، مگر اسکے اکثر افراد میں اعلیٰ ترین سخن سنج اور پایہ کے شعراء بھی موجود ہیں، عوام میں عام طور پر ذوق ہے مگر سینما دیکھنے سے کم، امراء اور اعلیٰ عہدہ داروں میں زندگی کی وہ بے ساختگی نہیں پائی جاتی جو شمالی ہند کی خصوصیت ہے۔

شمالی ہند ہو، یا جنوبی ہند ہر جگہ نظام تو ایک ہی ہے، سماج ایک ہی نظام پر قائم ہے، پھر بھی حیدرآباد اور دہلی میں کچھ امتیازی فرق ہیں، یہاں سیاسی تحریکوں کے اثر نے عوامی تخیل پیدا کیا ہے، لوگ جاگ اٹھے ہیں، باتوں کی کھوج کرتے ہیں، اپنے مفاد کو پہچانتے ہیں، ساری فضا چونکتی ہے، اعلیٰ طبقہ کا سوشل معیار اور اس معیار کی زنجیریں، ماحول کے دباؤ نے ڈھیلی کردی ہیں۔

کچھ "اردو" کے لئے لسانی کشمکش نے لوگوں کو ابھارا ہے، شمالی ہند میں شعراء اور انشا پردازوں کی نام نہاد مجلسی حیثیت بھی کچھ ہے، نئے شعراء نے سیاسی اور سماجی پھوڑوں پر نشتر لگا کر خود کو خطرناک ثابت کر دیا ہے، بات "مبارک سلامت" سے آگے جا چکی ہے۔

افسوس ہے حیدرآباد میں شعراء کیلئے یہ فضا تیار نہیں ہوئی، حالانکہ امکانات کے لحاظ سے اسباب ہوتے ہوئے بھی وہیں ایسا ہونا چاہیئے تھا، پھر بھی جب کوئی حسن کار اسکی آغوش میں آتا ہے تو بھاگ متی کی خوابگاہ اسے جھڑکتی نہیں جگہ دیتی ہے۔

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

عادت بُری سہی، مگر میں زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے کا جنون رکھتا ہوں، احساس بدقسمتی سے نازک ہے، پھر "تصوراتی حیوان" بھی ہوں، اس لئے بعض باتیں انتہا پسندانہ بھی ہو سکتی ہیں، لیکن وہ شخص جو یوں ہی آنے اور گزر جانے کا عادی ہے اس کے لئے حیدر آباد اک شاندار مشاہدہ ہے۔

مثلاً میرا تاثر ہے کہ اگر مجھے اُردو غزل سے اتنا عشق ہوتا جتنا پرنس نواب معظم جاہ بہادر کو ہے تو میں فانیؔ اور جگرؔ کو اپنے محل میں عمر بھر ساتھ رکھتا مگر ـــــــــــــــــــــــ !

جنرل والاشان نواب معظم بہادر شجیعؔ سے ملنے اور ان کا کلام سُننے کا بارہا اتفاق ہوا ہے حیرت ہے کہ جتنی بار میں اُن سے ملا، وہ مجھے شہزادے نہیں، جامع آرٹسٹ نظر آئے، ان کی غزل میں شہزادوں کا سا تصنّع نہیں، سوختہ سامانوں کا سا درد ہے، کلام میں اعلیٰ شاعری کی خصوصیات ہیں، ان کی شاعری، سادگی، تاثیر اور شوخی میں اٹھلاتے ہوئے ترنّم کا دلنواز امتزاج ہے۔

ولی سے لیکر حسرت تک کے جملہ شعری تقاضوں سے وہ ایک ماہر نقّاد کی طرح واقف ہیں، اُردو شاعری کے آغاز، ترویج و تکمیل، اور موجودہ اسالیب کے متعلق اپنی خاص رائے رکھتے ہیں، گفتگو نہایت دلکش انداز میں فرماتے ہیں، جدید نظم اور اسکے موضوعات سے انہیں دلچسپی نہیں (ہونی بھی نہیں چاہیئے) ہاں ترقی یافتہ غزل کو پسند کرتے ہیں اور خود بھی بہترین غزل کہتے ہیں۔

ان کا ذوقِ تنقید، ہر شاعر کے متعلق ان کی جامع رائے، متاخرین کے کلام کے متعلق آگہی، ترقی کرنے والے شاعروں کے بارے میں پیشین گوئیاں، یہ سب کچھ، ادب اور اسکی تمام تر رفتارِ ترقّی سے کامل واقفیّت کا ثبوت ہے۔

بعض اوقات میں نے محسوس کیا کہ "شہزادگی" اُن کی اعلیٰ شاعرانہ حیثیت کیلئے اک حجاب ہے، اگر وہ شہزادے نہ ہوتے تو تمام ملک میں مشہور و مقبول ہوتے، ان کے چند شعر سُنئے جو آدمی سے اس کا دلی سکون چھین لیتے ہیں ؎

جب تک نہ تڑپتا رہوں، راحت ہی نہیں ہے
شاید کہ سکونِ عشق کی فطرت ہی نہیں ہے
میں پُرسشِ مقصودِ محبت پہ کہوں کیا ؟
کوئی مرا مقصودِ محبت ہی نہیں ہے

خاموش بیٹھے ہم ضبط کا امکاں بھی نہیں تھا
مشکل نہ سہی غم، مگر آساں بھی نہیں تھا
جیسے ہی کیا ترکِ ستم عشق میں تم نے
ہم پر ستمِ گردشِ دوراں بھی نہیں تھا
ہم جب سے اسیری کے مزہ لوٹ رہے ہیں
کیا ذکر نشیمن کا گلستاں بھی نہیں تھا
وحشت ہمیں لے آئی کہاں راہِ طلب میں
جب آنکھ اُٹھائی تو بیاباں بھی نہیں تھا
تھا درد کی صورت میں خود احساسِ محبت
پنہاں جو نہیں تھا تو نمایاں بھی نہیں تھا

یہ پہلی قسط ہے دوسری قسط نومبر میں شائع ہو گی، میں یہاں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں صرف ان حضرات کا ذکر ہو گا جن سے میں حیدر آباد میں ملا، اور جنہیں مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ہوا۔

ساغر

نئی صبح

اشارات

اگست کا ایشیا شائع ہونے کے بعد ادبی مرکز کی زندگی میں نئی تبدیلی کے امکانات پیدا ہوئے، ان امکانات کے حاصل کرنے میں یہ تو ہوتا کہ میری زندگی
اور بھی مصروف ہو جاتی لیکن ادب کی نئی تشکیل کا جو فریضہ ہم سب کام کرنے والوں کے پیش نظر ہے اسکی ادائگی میں کچھ آسانیاں ضرور پیدا ہو جاتیں۔
میرٹھ سے منتقل ہونے کے کل سامان ہو گئے، نئی دنیا کی نیو ہی نہیں رکھ دی گئی کچھ دیواریں بھی چن دی گئیں، نئی بستی کا تخیل پرانی آبادی کی ابتری کا
سبب ہوتا ہی ہے اس لئے میرٹھ میں جو استحکامات تھے، ان سے دل بھی اچاٹ ہوا، اور ان میں کچھ توڑ پھوڑ بھی ہوئی، کیونکہ اب کھیل کا ڈراپ سین ہو چکا ہے
اس لئے مناظر کی تفصیل لاحاصل ہے۔ پھر آپ کی ذات سے مٹی ہوئی چیزوں کا کیا تعلق!؟ بہرحال ایک موڑ ایسا آیا جس سے آگے تخیل اور عمل کی گاڑی نہ
سرک سکی۔

ان واقعات کا نفسیاتی ردِ عمل کامل انہدام کی صورت میں رونما ہونا ہی چاہتا تھا کہ ٹوٹے ہوئے جوڑ جوڑ میں زندگی پھر کسمسائی، دل نے پھر کچھ سوچا
اور میں نے اپنی زندگی و مقصد کو بحالہ جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا ادھر کاغذ کے متعلق جب معلوم کیا گیا یہی جواب ملا، کراچی سے ابھی ویگن نہیں آئی ہیں۔ بازار سے سفید کاغذ خریدنے کی
جرأت کی، تو وہ نرخ سُنے کہ جرأت بھی اپنا سا منہ لیکر واپس آئی، کاغذ سونے چاندی کے بھاؤ بھی بڑے ایچ پیچ سے ملتا ہے۔ کاغذ کے اسٹاک کرنے کے
جو انتظامات کئے تھے وہ ابھی چند ماہ اور لینگے۔ بہرحال پورے ستمبر اور اکتوبر کے اوائل تک ایشیا کے شائع نہ ہونے کا اصلی سبب کاغذ کا نہ ملنا ہی تھا 10
جسے دوسری باتوں نے کچھ اور مضبوط کیا۔

آپ جانتے ہیں جو ادارے، آزاد خیالی یا ادب کے نئے آئیڈل کو سامنے رکھ کر کام کر رہے ہیں، ان کیلئے دقتیں ہی دقتیں ہیں۔ "مست قلندر"
اور "بیسویں صدی" کی سی آسانیاں ان غریبوں کو کہاں نصیب!؟ مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری حقیقی مصیبتوں کو محسوس کریں، اور ایشیا کی دیر سے
حاضری کو معاف کر دیں۔ ہمارا دور ایک شدید عبوری و بحرانی دور ہے اسکی فروگزاشتوں کو نظر انداز کرنا ہی پڑیگا۔ شاید سب سے بڑا معجزہ اس عہد میں
کسی شے کا قائم رہ جانا ہے۔

کبھی کبھی تو میں ایشیا کے جاری رہنے کو اپنی "حماقت" اور ذہانت دونوں کا کارنامہ یقین کرنے پر غور کیا کرتا ہوں!

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء سے ایشیا میں بعض اجزاء کی کمی اور بعض عناصر کا اضافہ پیش نظر ہے، ادب بحرانی اور عبوری دور سے گزر رہا ہے، ملک میں مختلف جماعتیں
اور افراد کام کر رہے ہیں، ان میں ذمہ دار جماعتیں بھی ہیں، غیر ذمہ دار افراد بھی۔ کچھ پارٹیاں ایسی بھی ہیں جو بیسویں صدی کے جمہوری تصور کے خلاف ابھی تک
"درباری ایچ پیچ" پر یقین رکھتی ہیں، ان پارٹیوں کے پڑھے لکھے افراد نے اپنا پیشہ بنا لیا ہے کہ تنقید کو مدح خوانی بنا دیں، اور اس مدح خوانی کو اپنے "گینگ"
تک محدود رکھیں، یعنی تنقیدی فرض کا الگ گلا گھونٹیں اور دوسروں کا حق بھی غصب کریں۔ اس طرح وہ تاریخ ادب میں غلط یادداشتیں محفوظ کر رہے
ہیں، ایشیا نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسی کسی جھوٹی تشہیری یادداشت کو تاریخ ادب میں فائل نہ ہونے دیا جائے، اور اگر ہونے دیا جائے تو اک اضافی نوٹ کے ساتھ
یہ ارادہ مصروفیتوں کو بڑھا ضرور دیگا۔ لیکن بہرحال ضروری فرض ہے، اسے تو ادا ہونا ہی چاہئے، اسکے علاوہ شعر و ادب میں نئے
فارم اور نئے اسالیب کے ماتحت جو سامان پیدا ہو رہا ہے اس کی چھان بین کرنا بھی ادبی اداروں کا اولین فرض ہے۔ کھلے دل
اچھائیوں کو سراہنا اور کمیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہئے۔ کسی عہد کے رسائل اس عہد کی نظم و نثر اور جملہ ادبی جد و جہد کی تاریخ ہوتے ہیں۔

ساغر

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۳ء

ارشاد بیگ

تیسرا مقالہ

آنے والی دُنیا کی جھلک

شعوری ارتقاء اور اس کے نتائج

حیاتیات کی نئی سائنس کیا ہے ؟ طبیعات و کیمسٹری کی طرح اس کے
بھی کئی گوشے ہیں جن پر سے ابھی تک پردے نہیں اُٹھے تھے تفصیل سے یہ سب
پھر آئندہ مقالہ میں بتایا جائے گا۔ لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس
طرح طبیعات اور علم کیمیا نے ہمارے بیرونی ماحول کو بدل کر رکھ دیا۔ اسی طرح
حیاتیات کے انکشافات اور اصول ہماری احساساتی اور شعوری کیفیات
اور عوامل کو بالکل بدل کر رکھ دیں گے۔ اور سائنس کی خارجی قوتوں پر قابو عطا کر کے
ہمیں ایک عظیم ترین دُنیا میں داخل کر دیں گے۔ حیاتیاتی سائنس کی کنجی جس
کے ہاتھ میں ہوگی آنے والی دُنیا پر وہی حکومت کرے گا۔ اور وہی ایک
نئے دور کا نقیب ہوگا۔ حیاتیات کا تعلق ہمارے تحت الشعور، ہمارے
نفسی قواعد و ضوابط اور ہمارے ذہن اور ذات کی قوتوں سے ہے۔

فرد اور جدید حیاتیات

حیاتیاتی ارتقار ہماری ذہنی صلاحیتوں، ہمارے زاویہ ہائے نگاہ
اور اعضائے جسمانی میں ایک غیر شعوری عمل کے ذریعے ایک خاص تغیر پیدا
کر رہا ہے۔ ہمارا رجحان اور خلقی میلان اور ہماری تمام تہ قوتیں ایک ایسے
مرکز کی طرف رجوع ہو رہی ہیں۔ جہاں وہ اپنا بہترین اطمینان اور راہ عمل پا سکیں
گی۔ فرد ایک بلند ترین اور اعلیٰ سطح ارتقاء سے منسلک کیا جا رہا ہے تاحال
فرد ایک غافل اور حیوانی رَو میں بہتا رہا ہے۔ فرد کے ذہن میں اَب تک
ایک ایسی کشاکش اور کشمکش طوفان اٹھاتی رہی۔ جس نے زندگی کو
ایک بے بسی۔ خوف۔ قربانی اور جبر میں قید رکھا ہے۔ فرد اور اجتماعی
تعلقات کے تصادم نے زندگی پر ہمیشہ ظلم کیا۔ اور انسان کے سامنے
صداقت یا توہم کی ترقی یا برتری کے لئے بہترین نظام کے نام سے قبل از
وقت اور تخیلی عناصر سے بھی نظام پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ ارتقائی عمل
غیر شعوری طور پر ہمیں ایک شعوری مکمل نظام کے لئے آگے بڑھا تا رہا ہے

غلط نظام میں پہلی بے چینی یہ ہوتی ہے کہ فرد کی ارتقائی صلاحیتیں نہ تو
اُس سے مطمئن ہوتی ہیں اور نہ اُس میں اپنے لئے جگہ پاتی ہیں۔ اس لئے
فرد میں اور زندگی میں ایک اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ فرد
کا فطری ذہن خود کو روایاتی یا نامکمل تصوّرات کا ہمنوا نہیں پاتا۔ نتیجہ
کے طور پر ذہن میں دو عملی پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی میں "بے بسی" شعور
کی ہار کا نام ہے۔ اور غلط شعور ہمیشہ ہارتا ہے۔ صحیح شعور ارتقائی قوتوں
کا نمائندہ ہوتا ہے۔ زندگی میں "خوف" شعور کے عدم تکمیل کا نتیجہ ہے۔
اور مجبوری اپنی قوتِ محرکہ کا صحیح ادراک حاصل نہ کر سکنے کو کہتے ہیں۔
قربانی کا جذبہ ارتقائی قوتوں کی عدم تنظیم اور عدم شناخت سے پیدا ہوا
ہے۔ انسان نے اپنی ذات کو سمجھنے کی بجائے اپنی ذات گھڑنے کی زیادہ 11
کوشش کی ہے۔ ارتقائی قوتوں سے گریز بے بسی پیدا کرتی ہے زندگی
قوت سے محروم ہو جاتی ہے۔ جب فرد کی ذات شعوری ارتقار کے ذریعے
منسلک ہو جائے گی۔ بے بسی۔ قربانی۔ خوف اور مجبوری زندگی سے خارج
ہو جائے گی۔ کیونکہ جب فردِ زندگی کی قوتِ محرکہ کے شعوری ارتقاء سے
ہم آہنگ ہوگا تو خوف کیا معنی ؟ خوف غلط شعوری تصوّرات اور حقیقی
قوتوں کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ آنے والی زندگی آزاد مکمل اور مطمئن
ہوگی۔ فرد کی قوتیں صحیح رُخ پر کام کریں گی۔ فرد کی قوتیں نقص یا عدم تکمیل
کے باعث پہلے کی طرح حیوانی کیفیات میں نہیں رہیں گی۔ بلکہ ایک صحیح
رشتہ سے وابستہ رہ کر کام کریں گی ۔

سیاسی خاکہ

حیاتی قوتیں ہمیں سائنس کی موجودہ قوتوں سے آگے بڑھا دیں گی
اس لئے آنے والا نظام سائنس کی طاقتوں پر قابو پا سکے گا۔ زمانہ کی
غیر شعوری قوتیں موجودہ تحریکوں اور حکومتوں کے قابو سے اب تک
باہر تھیں۔ اب یہ ایک ایسا طریقہ معلوم کرنے کی سعی کی گئی ہے جس کے
مکمل ہونے پر حملہ آور کی قوتِ ادراک کو بیکار کر دیا جائے۔ اس لئے

آنے والی دنیا میں مستقل امن قائم ہوگا۔ یہ ایک بے شک حیرت انگیز بات ہے۔ جس کا جواب طبیعات اور کیمسٹری کے پاس نہیں ہے۔ نہ منطق تمام نہاد روحانیت کے پاس ہے۔ آنے والے نظام میں ریاست کو قوتِ محرکہ اور شعور پر کامل کنٹرول حاصل ہوگا۔

دُنیا ایک حکومت کے ماتحت کام کرے گی۔ اور بلند ترین شعور (خود شعوری ہیئت ذہنی کا حامل) آنے والی دُنیا کا صدر رہیگا۔ ملکی حدود اور سلطنتیں ختم کر دی جائیں گی۔ وراثت اور جائداد کا تصفیہ ہو جائے گا۔ حاکم محض ایک چاکر حیثیت میں نئے ماحول میں اپنا کام کریگا۔ حکومت کسی کا ورثہ نہیں ہوگی۔ تمام دُنیا کی ایک شرحِ تبادلہ ہوگی اور کارفرما حکومتیں اندرونی معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ایک ہی ارتقائی طرزِ تمدن اور ایک ہی ارتقائی زبان جاری ہوگی۔ سسٹم کا طریقہ منسوخ کر دیا جائے گا۔

خیالی فردوس حیاتیات کی روشنی میں

اگر زندگی ایک شعوری ہیئت حاصل کرے۔ اور ہمارا نظام زندگی ایک ناقص نظام کے بجائے صحیح اور مکمل قوتوں کا نمائندہ ہو جس میں ہماری خواہشات احساسات اور ادراک کی لطیف ترین کیفیتیں صحیح میدان پا نہ چلی جائیں تو اس سے زیادہ مکمل خیالی فردوس کا مرئی نمونہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص کو اگر برابر پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اور ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرتا چلا جائے تو زندگی میں پھر لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ ختم ہو سکتا ہے۔ سوشلزم کا اوّلین مقصد انسانی لوٹ کھسوٹ ہی کو ختم کرنا ہے لیکن اس کو ختم کرنے کا طریقہ سائنس جس کی تعلیم مارکس نے دی ہے وہ تاریخ کا خام طریقہ ہے۔ جب نظام عالم ارتقائی عمل کے ذریعہ ایک نشاۃ ثانیہ حاصل کرے گا۔ اس وقت صنعتی پیداوار کے طریقوں پر حیاتیاتی قوتوں کے ارتقاء سے تشکیل یافتہ نظام سب خود بخود قابو ہو جائیگا۔ اور وہ طریقے زندگی کے لئے بجائے ایک جلب منفعت ثابت ہونے کے برکت ثابت ہوں گے۔ سرمایہ داری دوسرے لفظوں میں حیاتیاتی ارتقاء کا عبوری دور ہے۔ اس لئے سوشلزم کے مقابلہ میں حیاتیات کے پاس زیادہ صحیح طریقۂ علاج ہے۔ موجودہ سوشلزم حقائق سے اتنا ہی دور ہے جس قدر دوسرے مکتبِ خیال۔ کیونکہ سوشلزم تاریخ کے "حیاتیاتی تصور" سے ناواقف ہے۔ تاریخ کا ارتقا حیاتیاتی ارتقاء ہے۔ اور تاریخ کا عمل حیاتیاتی عمل ہے۔

جمہوریت کا صحیح مفہوم

اس حیاتیاتی ارتقاء کی رو سے جمہوریت کا صحیح مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب فرد کی صحیح ارتقائی قوتوں اور خواہشات کا لحاظ رکھا جائے۔ اس لئے اصلاحاً صحیح جمہوریت وہی ہے جو جمہوریت میں ہماری ارتقائی ذات کی صحیح نمائندگی ہوتی ہو۔ عوام پر ہمیشہ نامکمل اور روایاتی یا سکونیاتی یا یکطرفہ شعور چھایا رہتا ہے۔ عوام کو زندگی کا سرچشمہ بنانا زندگی کے ارتقاء کو روکنے اور ترقی و خوشحالی سے دور رکھنے کے مترادف ہے۔ نئے ارتقاء سے ہم آہنگ نظام عوام کے جذبات کی صحیح نمائندگی کرے گا بہ نسبت اس کے کہ عوام کا شعور کوئی نظام بنائے۔ اور موجودہ جمہوریت کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہیں کہ عوام کا شعور زندگی کی باگ تھامے۔ یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ سکونیاتی یا غیر ارتقائی شعور زندگی پر چھا جائے۔

آزادی کا پس منظر

موجودہ تحریکات قوموں کو بلند کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اور انہیں آزاد کرنے کی علمبردار ہیں۔ لیکن وہ انسانی تمدن کے ارتقائی تغیر کا جائزہ نہیں لیتیں۔ تاریخ ایک نئے دروازہ پر کھڑی ہے۔ نوعِ انسان کو ایک نئے اور بلند ترین ارتقائی طرزِ زندگی اور نئے طریق کی ضرورت ہے۔ اس لئے آزادی کا پس منظر ایک بلند ترین ارتقائی تمدن اور ماحول کو بنانا چاہئے موجودہ حالت میں بغیر ارتقائی قوتوں کو کام میں لئے اور کسی نئے ماحول کی تعمیر کے بغیر آزادی کا علمبردار بننا تاریخ کے حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔

ویلز کہتا ہے کہ دُنیا کو اس لئے تباہی سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل تھا کہ دُنیا یہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کسی چیز سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ نئی حیاتیات اس کا جواب دیتی ہے کہ ہمیں ایک غیر شعوری ہیئت سے زندگی کی ایک شعوری ہیئت میں داخل ہونا ہے۔ اور مسئلہ سیاسی یا مادّی یا مذہبی نہیں۔ بلکہ حیاتیاتی ارتقاء کا ہے۔ زندگی میں اب تک غیر شعوری ارتقا ہوتا رہا اب شعوری ارتقاء کا آغاز ہونے والا ہے اور ہمیں اس سے منسلک ہونا ہے۔

جنگ کے معنی

حیاتیات کے نزدیک جنگ ارتقائی قوتوں اور سکونیاتی تصورات

کا تصادم ہے۔ ایک جماعت دوسری جماعت سے اس لئے لڑتی ہے کہ وہ ارتقائی قوتوں کو قبول کرنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ اسکے نزدیک اسکے اپنے تصورات ہی زیادہ قیمت اور ترقی کا ذریعہ ہیں چونکہ تاریخ کا ارتقا غیر شعوری ارتقا ہے اس لئے یہ فیصلہ مشکل ہوجاتا ہے کہ کونسا حق پر ہے جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے اور جیت ارتقائی قوتوں ہی کی ہوتی ہے تاحال انسان کی تاریخ میں نہ تو ایک شعوری ہیئت حاصل ہوسکی تھی نہ قوتِ ارادی اور تصور کو کنٹرول کیا جاسکا تھا۔ شعوری ہیئت کی عدم موجودگی کی وجہ سے ارتقائی قوتوں کے بڑھنے کا نتیجہ کسی خاص طبقہ یا جماعت کی برتری کی صورت میں نکلتا تھا۔ نظامِ عالم کے سب پہلو ایک ضابطہ کے تحت میں نہیں آتے تھے اس لئے جنگ میں فتح کے بعد کوئی حقیقی غیر جانبدار نظام قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن آج انسان ایک شعوری نظم سے منسلک ہونے والا ہے اس لئے اب ارتقا کی سمت اور راہ آشکارا ہوجائے گی۔ اور غیر شعوری ارتقا کے خاتمہ کے ساتھ جنگ کا خاتمہ بھی ہوجائے گا۔

غلامی

غلامی کو اب تک لعنت سمجھا جاتا رہا ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن حیاتیاتی عمل کے لئے غلامی غیر شعوری ارتقا پر مبنی زندگی کے لئے ناگزیر تھی کیونکہ غلام رہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم ارتقائی قوتوں اور صلاحیتوں سے محروم ہے۔ اگر ارتقائی قوتوں سے محروم قوم کو آزاد کردیا جائے تو زندگی کی خوشحالی۔ ارتقا اور ترقی میں رکاوٹ ثابت ہوگی۔ اگرچہ بظاہر اور وقتی طور پر غلامی لعنت ہے لیکن غلامی کی عدم موجودگی زندگی کے ارتقائی عمل کے لئے مہلک ضرب ثابت ہوتی۔ اگر آزادی کے معنی سکوتیاتی تصورات کے ذریعہ ارتقائی قوتوں کا روک دینا ہوتا۔ ہمارے ملک کی کوششیں ایسی ہی ہیں

آزادی، حاصل کرنے کے لئے زمانہ کی نئی ارتقائی قوتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہئے اور زمانہ کی نئی ارتقائی قوتیں شعوری ارتقا کے نظام کو حاصل کرنے میں مضمر ہیں یعنی سائنس سے پیدا شدہ ماحول پر قابو جنگ کا اختتام زندگی کا صحیح نشو ونما۔ حیاتیات میں قوت کے معنی جسمانی قوت۔ موٹاپا یا درندگی کے نہیں ہیں۔ نہ حیاتیات میں قوت کثرتِ تعداد کو کہتے ہیں۔ حیاتیات میں قوت زندگی کی لطیف ترین ذہنی ترقی کا نام ہے جو اپنے پسِ پشت تموّج اور ہیجان رکھتی ہو۔ یہ ہی ذہنی قوت ہمیں نئے طریقے۔ نئے انکشافات اور نئی قوتوں کی ضرورت ہے جو تاریخ میں آج سے قبل ظہور پذیر نہیں ہوئی ہیں۔

جس طرح مغرب نے اپنی ایجادوں کے ذریعے مشرق کی جسمانی قوت کو بیکار کردیا۔ اسی طرح یہ حیاتیاتی قوتیں مغرب کے میکانی طریقوں کو بیکار کردینگی۔ وہ حیاتاتی قوتیں ایک ایسے شعور کے حصول سے منسلک ہیں۔ جہاں دماغ پر ہیجانی اور تموجاتی کیفیتیں مکمل طور پر منکشف ہوجائیں گی۔

نیا نظام غلامی کا ذریعہ یا آلہ ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ نظام ہماری ذات کے محض ہیجانات اور قوتوں کو ادراک کے ذریعے ایک صحیح تشکیل میں پیش کردے گا۔ غلامی کے معنی ایک مکمل نظام کی عدم موجودگی کے ہیں۔ لیکن موجودہ جنگ کا اختتام ہمیں ایسے نظام سے ہمکنار کردیگا۔ جہاں ہم اپنے ذہن کے نیچے چھپی ہوئی قوتوں کا شعوری طور پر جائزہ لے سکیں گے۔ اور اس طرح زندگی صحت۔ مسرت اور ترقی کا مخزن بن جائے گی۔

آئندہ زمانہ میں آزادی کا مفہوم

آزادی کے معنی کسی غیر قوم سے نجات حاصل کرنیکے ہی نہیں ہیں، بلکہ ارتقائی قوتوں کو حاصل کرنے کے ہیں۔ یعنی قوت کا حصول

آزادی کا ذریعہ ہے۔ اس لئے ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم نئے حقائق کا جائزہ لیں اور نئی قوتوں کا علم حاصل کریں۔

یورپ اور نوآبادیاں

یورپ کے سامنے نوآبادیات کا غلط تصور اس قدر مہلک ہے جو صحیح حالات کو سمجھنے میں رکاوٹ ثابت ہو رہا ہے۔ ترقی اور خوشحالی کا مفہوم نوآبادیات میں ہی مضمر سمجھا گیا ہے لیکن حال یہ ہے کہ نوآبادیات پر قابو رکھنے اور زمانہ کی رفتار کو روکنے کی قوت ارتقائی عمل نے زائل کردی ہے۔ نوآبادیات پر قبضہ ایک حیاتاتی وقفہ تھا جو گزر چکا۔ اب زندگی نئے ماحول اور حقائق اور تصورات میں پہلے سے زیادہ خوشحال ہوگی۔

زمانہ کی دو غلطیاں

اہم ترین غلطی آج کل یہ کی جاتی ہے کہ حالات کا جائزہ موجودہ طریقوں کی روشنی میں لیا جاتا ہے حالانکہ زندگی کے طریقوں میں ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ مگر ہمیں آنے والے امکانات کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ مسئلہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ حیاتیاتی تحقیقات کی روشنی میں

"حقیقت انسان" ایک ہی ہے یعنی نفسی قوتیں۔ قوتِ حیات نفسی قواعدُ ضوابط غرض زندگی کی ایک ہی حرکت اور ماہیت ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ کسی ایک ملک سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کا پس منظر عالمگیر ہے۔ اس لئے کوئی ایک ملک یا دو ملک آپس میں اس مسئلہ کو نہیں سُلجھا سکتے۔ جب تک کہ عالمگیر تخلیقی نظام نہ پیدا ہو باقی تمام کوششیں عبوری ہیں۔

سماجی نظام کا خاکہ

آنے والے نظام میں مخلوط ازدواج کا رواج ہوگا۔ قوم نسل مذہب۔ سب ختم ہو جائیں گے۔ سب کا ایک ارتقائی تمدّن ہوگا۔ مخلوط ازدواج سے دُنیا میں اولاد خوبصورت ہوگی۔ اور نسل آدم میں حُسنِ صحت کا اضافہ ہو جائے گا۔ دُنیا کو خدا کی تمیز ہوگی تصوّری خدا کے تخیّل میں دُنیا اسیر نہیں رہے گی۔ بلکہ ہماری زندگی کی رہنمائی کرنے والی لطیف ترین قوت ہی خدا کی نمائندہ ہوگی۔ اور خدا ایک زندہ قوّت اور حقیقت ہوگا۔ عبادتوں میں وقت ضائع نہیں ہوگا بلکہ زندگی کی حقیقی معرج اور روحانی لطیف ترین تڑپ انسان میں

14 پیش پیش ہوگی۔ بیکار رسموں۔ تہواروں۔ عرسوں میں قیمتی لمحات ضائع نہیں کئے جائیں گے۔

فوج بالکل باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ حیاتیاتی قوّت کی رُو سے ریاست کو تمام افراد کی قوتِ ارادی پر قابو ہوگا۔ دُنیا ایک کثیر نقصان سے بچ جائیگی اور جیل خانے توڑ دئے جائیں گے۔ موجودہ طریقۂ تعلیم باقی نہیں رہے گا۔ اور انسان عملی زندگی سے زیادہ قریب ہو جائیگا تقدیر اور تدبیر کا تصادم ختم ہو جائے گا۔ ہر شے انسان کے موافق حرکت کرے گی۔ حتیٰ کہ ہوا تک انسان کی ترقی میں مزاحم نہ ہوگی۔

ہمارا ماحول اور جدید ہیئتِ ذہنی

آنے والے نظام کے حیاتیاتی اثرات

(۱) دورِ امن۔ جنگ نوع انسان کے حیاتیاتی ارتقا میں ایک گزرنے والی شے ہے۔ اور اپنی افادیت زائل کر چکی ہے۔ کبھی یہ تاریخ کے غیر شعوری ارتقا میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور زندگی کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ تھی۔ اُس وقت انسان کے شعور میں قوّتِ حیات نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے جنگ ہی تاریخ کی روح رواں تھی۔ لیکن جب قوّتِ حیات مختلف مدارج کے بعد مکمل حیثیت سے ظہور پذیر ہوگی۔ تو تمام ارتقا، شعوری ارتقا ہوگا۔ اور نوعِ انسان کی قوّت شعوری قوت سے گریز نہیں کر سکے گی۔

(۲) **شعوری دور**۔ آنے والا زمانہ ایک شعوری دور ہوگا۔ یعنی اب تک ہم ایک اندھے عہد سے گزر رہے تھے جس میں ہمارے ذہن کو ٹکرا ٹکرا اور ٹٹول ٹٹول کر چلنا ہوتا تھا۔ ہمیں اپنا آغاز اور انجام کچھ معلوم نہیں تھا۔ اور ہم زندگی کی پُر اسرار حرکت اور قوّت کے اطراف اور اغراض سمجھنے سے قاصر تھے

(۳) **دورِ بقا**۔ اب تک قوّتِ حیات نے ہمارے جسم میں ایک قائم رہنے والی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ ابھی تک تربیت و تشکیل کے منازل طے ہو رہے تھے۔ یعنی قوتِ حیات باقی رہنے والی صورت میں ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آنے والے دور میں نشو و ارتقا کے لئے قوت حیات جسم میں شعوری حیثیت اختیار کرے گی۔ اس وقت تک قوّت حیات ...... کی جست کو دماغ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ قوّتِ ارتقا اس مرکز پر آ کر رک جاتی تھی اور ادراک کی گرفت سے باہر رہتی تھی۔ لازماً اُس کی نشو ونما کی تمام راہیں بند رہتی تھیں۔

(۴) **موت کا پردہ**۔ آنے والے نظام میں موت کا تاریک پردہ ادراک پر حائل نہیں رہے گا۔ موت تو ہوگی لیکن آئندہ نشو وارتقار کی راہیں منکشف ہو جائیں گی۔ یعنی موت ایک اسرار اور ایک قوّت نہیں رہے گی۔

(۵) **آزاد ذہن کا زمانہ**۔ آنے والے دَور میں ذہن آزاد ہوگا۔ تاریک اور غلط تصوّرات، اُلجھنیں اور رُکاوٹیں حائل نہیں ہوں گی۔ تمام تاریک پردوں اور بندشوں کی جکڑ بندیاں مٹ جائیں گی۔

خود شعوری ہیئت ذہنی اور غلط تصوّرات کا ازالہ

شعوری ہیئت ذہن کا طلوع تمام غلط تصوّرات اور خیالات کا ازالہ کرتا ہے۔

(۱) حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے خدا، سچّائی اور وحی کے تصوّرات بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت تک خدا ذہن انسانی میں ایک شعور ایک تمیز کی حیثیت میں نہیں تھا۔ اس لئے صحیح نظام اور صداقت دُنیا میں قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ حق کو قائم کرنے والی قوتِ حیات شعور میں مکمل حیثیت سے نہیں آئی تھی۔ اور وحی ایک لطیف پرواز

ادراک کے سوائے ایک صحیح اور قوتِ حیات کے مکمل نمائندہ کی حیثیت میں نہیں تھی اور نہ قربِ حق کا شعور ہی تھا اس لئے مذاہب کے سنہری دور اور حق کے پروگرام خیالی ثابت ہوئے۔ نامکمل ذہن کو خدا کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا۔ اور کوئی مذہب آنیوالے شعوری نظام کا حریف ثابت نہیں ہوسکتا۔ نہ کسی میں کوئی ایسی خلقی قوت ہی ہے۔

۲۔ **تحریکاتِ عالم**۔ سوشلزم۔ جمہوریت۔ فیسزم۔ نازی ازم اور سیاسی پروگرام نامکمل ثابت ہورہے ہیں۔ اور شعوری سطح ذہن پر قائم شدہ نظام سے نہایت پست ہیں۔

۳۔ **حق و ناحق کا فیصلہ** اب تک نہیں ہوسکا۔ اور یہ خامی صحیح اور کامل کسوٹی کے نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ لیکن شعوری سطح ذہن کا ظہور ہوتے ہی قوتِ حیات شعور میں نمایاں ہوجائے گی۔ اور کسی ثبوت عملی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ قوت خود ثبوتِ عملی بن کر پیش ہوگی۔

آنیوالے نظام اور دوسرے نظاموں میں فرق

۱۔ دوسرے نظام مثلاً مذاہب کے اپنے طریق کو عقل کی نگاہ میں مضحکہ انگیز طریق ہونے کے علاوہ کسی دوسری صورت میں ظاہر و ثابت نہیں کرسکتے تھے۔ مگر عقل ان سے بہتر پروگرام پیش کرتی رہی آنیوالے نظام میں بہترین عقلی عناصر کا اجتماع ہوگا۔

۲۔ مذاہب سچائی کا واسطہ دے دے کر دُنیا کو اپنی طرف بُلاتے ہیں۔ مگر زندگی میں عملی حیثیت اختیار کرنے کے لئے قوتِ حیات ان کی پشت پناہی نہیں کرتی کیونکہ وہ قوتِ حیات کے نمائندہ ہیں ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظام آج عملی زندگی سے خارج ہوچکے ہیں لیکن آنے والا نظام سچائی کا واسطہ دے کر نہیں بلکہ خود اس طرح بڑھے گا جیسے زمین بیج کو جگہ دیتی ہے۔

۳۔ دوسرے نظام شعوری سطح ذہن کے قبل از وقت ترجمان بنتے تھے۔ جبکہ ذہن نے حیاتیاتی طور پر ان مدارج کو طے ہی نہیں کیا تھا اس لئے ان میں بہت کافی خلا ہے اور وہ قوتِ حیات کے مسلمات شعوری و تکمیل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔

اجتماعی حقوق

(۱) نوعِ انسان کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ امن سے رہ سکے ایک اجتماعی نظام کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ نوعِ انسان کو پُر امن ماحول عطا کرے تاکہ دُنیا جنگ کے اندیشوں اور خطروں سے بے فکر ہوکر ترقی و تہذیب اور تمدن میں اپنی عام توجہ صرف کرسکے یعنی انسان کے اجتماعی نظام میں خلل واقع نہ ہو۔

(۲) نوعِ انسان کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ شائستہ اور انسانیت پر مبنی زندگی بسر کرے۔ خود فروشی۔ جُوا۔ بدمعاشیاں اور وہ تمام خرابیاں ایک انتشار پر مبنی نظام میں موجود ہوتی ہیں ختم ہوجانی چاہئیں۔ یعنی آنے والے نظام میں صحیح سماجی اور معاشرتی اطوار اور خاکے ہونے چاہئیں۔ حیوانیت کا دور ختم ہوکر انسانیت کے دور کا آغاز لازمی ہے۔ تمام خام کاریاں اور نقائص ختم ہوجانے چاہئیں۔

(۳) تمام نوعِ انسان کو یہ حق ہے۔ کہ وہ خدا کی تمیز حاصل کرے۔ اور اعلیٰ ترین اقدار سے ہمکنار ہو۔ اب ضرورت ہے کہ یہ نوع بغیر خدا کی تمیز کے حقائق اور سچائی میں نہ بھٹکتی رہے نئے نظام کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ دُنیا کو خدا کی تمیز کے مدارج طے کرائے۔

(۴) تمام دُنیا غیر شعوری جدوجہد اور کشاکشِ حیات میں ملفوف ہے۔ اُسے اپنے سفر کی منزل کا علم نہیں۔ نوعِ انسان کو حق ہے کہ وہ اپنی جدوجہد سے شعوری طور پر واقف ہو۔ اور یہ غفلت کا لامتناہی بہاؤ ختم ہوجانا چاہئے۔

(۵) تمام نوعِ انسان کو یہ حق ہے کہ وہ ابدی زندگی سے ہمکنار ہو۔ اور فنائیت سے محفوظ ہوجائے۔ حیاتاتی نقطۂ نگاہ سے ہماری قوتِ حیات کائنات میں فنا نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ ایک بہتر سے بہتر منزل کی طرف بڑھنی چاہئے۔ نئے نظام کے لئے لازمی ہے کہ وہ ہمیں آرزؤں کا اطمینان دلائے۔

(۶) نوعِ انسان کو حق ہے کہ ایک بلند معیارِ زندگی حاصل کرے۔ اور غربت دُنیا سے یکسر فنا ہوجائے۔ دُنیا میں صحت حُسن اور دولت کی فراوانی ہو۔ فوج۔ مخالف جماعتیں۔ اور غلط پروپیگنڈے پر طاقت کا بھی صرف ختم ہوجائے۔

(۷) نوعِ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ حوادث و سانحات کا شکار نہ ہو۔ اور بے ثباتی۔ بحران یا مخالف حالات کا اُسے سامنا نہ کرنا پڑے۔ مختصر یہ کہ آج سب سے اہم بات یہ ہے کہ نئی آنے والی دُنیا ہمیں اُس منزل تک لے جائے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

یورپ میں ایک ہندوستانی ادیب

آج سے کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ میں یورپ پہنچا۔ واپسی کو اب کچھ اوپر دو سال بیت گئے لیکن اگر آنکھیں بند کیجئے تو پچھلے جنم کی بات معلوم ہوتی ہے۔ پُرانا یورپ اور اسکے ساتھ پُرانی دُنیا ہمارے سامنے قتل ہو رہی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اسکے بعد سنسار کا رنگ روپ کیا ہوگا۔ آج کی صحبت بھی اس پُرانے یورپ کی ادبی زندگی کی یاد تازہ کرنا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی ادبی بحث چھیڑنا چاہتا ہوں۔ جن جانے پہچانے ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا اور جن آرٹسٹک اثرات سے میں دوچار ہوا انہیں کا تھوڑا سا ذکر مقصود ہے۔

میں نے اپنی تعلیم اور قیام کے لئے پیرس کا انتخاب کیا تھا۔

پیرس جو ہمیشہ ادب اور آرٹ کا گہوارہ رہا ہے اس وقت ہر قسم کی ۲۶
سیاسی اور کلچرل تحریک کا گھر تھا رنگ و نسل کی کوئی تمیز نہ تھی اور ہر اعتبار سے اسے آزادی کی راجدھانی کہا جاتا تھا کہ یہاں کی ہر رات میں دیوالی کی پھبن تھی۔ بلکہ اس لئے کہ یہاں انسانیت اور آزادی کی وہ مشعل روشن تھی جس نے صدیوں تک ساری دُنیا میں اُجالا کیا۔ پیرس گویا ایک روشن مینار تھا جس پر چڑھ کر ہر آنکھ والا یورپ کی کلچرل زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لے سکتا تھا۔

پیرس پہنچنے کے بعد مجھے سب سے پہلے ترکی کی مشہور ادیبہ خالدہ ادیب خانم سے ملنے کا موقع ملا۔ انہوں نے اپنے ہی محلّہ کے ایک فرانسیسی کنبہ میں میری رہائش کا انتظام کر دیا۔ سال ڈیڑھ سال میں اُن سے برابر ملتا رہا۔ اور خیالات کے بنیادی اختلاف کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ ایک مکمل انسان سے مل رہا ہوں اُن کی سادگی بہتے ہوئے پانی کی طرح نرمل تھی اور ان کے خلوص میں بلور کی طرح کبھی بال نہ آتا تھا۔ اُن میں بناوٹ نام کو نہ تھی اور یہ ایک عورت میں انوکھی سی بات ہے۔ اُن کی ذات سدا بہار پھول کی طرح ہے جو سرد و گرم میں ایک سا رہتا ہے، جس کی مہک میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ساتھ ہی ساتھ اُن میں ایک قسم کی مضبوطی تھی جو بادِ مخالف کے آگے جھکنا نہیں جانتی۔ خانم کی خودداری کی ایک مثال یاد آتی ہے جب انہوں نے اپنے شوہر عدنان بے کے ساتھ ترک کو چھوڑ کر غریب الوطنی اختیار کی تو اتاترک نے اُن کی قومی خدمات کے صلہ میں ایک معقول ماہانہ پنشن مقرر کر دی۔ لیکن دونوں نے یہ پنشن لینے سے انکار کر دیا۔

اب دستور یہ تھا کہ سالہا سال سے مہینہ کی ہر پہلی تاریخ کو بینک کا چیک اُن کے پاس آتا اور وہ اسے دیکھے بنا جوں کا توں لوٹا دیتے۔ اتاترک کے انتقال کے بعد ہی عصمت انونو نے انہیں ترکی بلا لیا۔ ہندوستان سے انہیں بڑی ہمدردی تھی اور اُن کا یہ جملہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے کہ: "ہندوستان کی تصویر میرے ذہن میں ایک بھکاری کی صورت میں محفوظ ہے جو تاریخ سے کسی چیز کی بھیک مانگ رہا ہے"۔

پیرس یونیورسٹی میں میرے شعبہ کی سیکریٹری ایک روسی خاتون تھیں اُن کا نام تھا مادام شوپاک۔ انقلاب کے بعد ان کا خاندان روس سے چلا آیا تھا۔ وہ نہایت شریف اور علم پرور خاتون تھیں اور اپنی برادری کے ادیبوں سے اُن کی جان پہچان تھی۔ جب مجھے فرانسیسی سمجھنے اور بولنے کا سلیقہ ہو گیا تو میں نے اُن سے درخواست کی کہ کچھ روسی ادیبوں سے ملائیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ انقلاب کے بعد روس سے زیادہ تر مشہور ادیب اپنا گھر تج کر فرانس چلے آئے تھے۔ ان میں ——
"KUPRIN - BUNIN - ROMESOF
MAREJKOVSKY" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔
BUNIN تنہا روسی ادیب ہے جسے نوبل پرائیز ملا۔
کیبرل کے ناول YAMA THE PIT کی ساری دُنیا میں دھوم ہے ROMESOF کی شہرت دوسرے ملکوں میں زیادہ نہیں۔ لیکن اپنی زبان کا وہ سب سے بڑا صاحب طرز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نئے روس میں بھی اُسکے قلم کا لوہا مانا جاتا ہے

"دیوتاؤں کی موت" کے نام ور مصنف (Marejkowsky.) کے کمال میں کوئی شک نہیں۔ لیکن عمر کے ساتھ اس پہ مذہب کا رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ مادام شوپاک کی عنایت سے میں (Merejkowsky) اور (Merejkowsky) دونوں سے ملا۔

سین ندی کے پاس کی ایک تنگ سی گلی کے کسی بوسیدہ مکان میں کیبرن رہتا تھا۔ دستک دیتے ہی دروازہ کھلا۔ اور ایک لڑکی نے سر نکال کر کہا۔

"چدراستویتے! ابّا آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن بیماری کی وجہ سے وہ پلنگ سے نہیں اٹھ سکتے۔ وہ آپ سے اپنی خواب گاہ میں ملیں گے۔"

بڑی بڑی مونچھوں والا ایک بوڑھا بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ یہی کیبرن ہے۔ وہ ادیب جس نے بدنصیب طوائفوں کی دُکھ بیتی لکھ کر دُنیا کو دہلا دیا۔ یہ اُس کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ دھیمی آواز میں وہ کہنے لگا۔ میں نے بھی بچ کے طور پہ ظلم کے خلاف احتجاج کیا ہے زندگی کی چھب کسی ایک رنگ سے نہیں بن سکتی۔ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ کسی رنگ کی کمی یا زیادتی سے اس کا روپ سنور یا بگڑ جائے گا۔ حقیقت اور مسرّت کی تلاش میں انسان بہت سے تجربے کرتا آیا ہے تو پھر روس کو بھی اس کی اجازت کیوں نہ دی جائے۔ کیونکہ میں اس تجربے کے ہر پہلو کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے راستہ سے ہٹ گیا۔ اسکی مخالفت نہ کی۔ جو بھی ہو، روس کی مٹّی میری روح میں بسی ہوئی ہے اور مرنے سے پہلے میں ایک بار اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس ملاقات کے چند ہفتہ بعد کیبرن کو روس جانیکی اجازت مل گئی۔ اور وہ وہاں جاکر کس مپرسی کی حالت میں مر گیا۔ باتوں باتوں میں وہ مجھ سے اپنے پرانے دوست مشہور آرٹسٹ نکولس رورک کے حالات پوچھنے لگا جو بہت دنوں سے ہمالیہ کے دامن میں کلو کی وادی میں رہنے لگے ہیں۔

(Marejkowski) رہن سہن اور شکل و صورت میں پُرانے زمانہ کے کسی ادیب سے ملتا جلتا تھا۔ کمرہ کے کونے میں مریم کا بُت رکھا ہے۔ اور اس کے آگے موم بتّی جل رہی ہے۔ ہاتھوں میں تسبیح ہے اور زبان پہ ایک رٹ ہے کہ دُنیا اس لئے ہلاک ہو رہی ہے کہ اُسے کسی شے پہ ایمان نہیں۔ ایک بار وہ کہنے لگا کہ اگر تم پُرانے روس کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہو تو کرسمس کی رات کو ایک محفل میں شریک ہو۔ یہ دعوت زار کے بھتیجے کے اعزاز میں ہوگی جو اس کا حقدار ہے۔ وہاں تم لٹے ہوئے روسی امراء کے طور طریقوں کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکتے ہو۔ ایسا موقع کب ملتا تھا۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ ایسا دلچسپ تماشہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔ ایک بہت بڑے کمرہ میں جھاڑ فانوس روشن ہیں۔ مردہ زاروں کی تصویریں دیواروں پہ لٹکی ہوئی ہیں۔ گرانڈ ڈیوک مائیکل ایک زرّیں کرسی پہ بیٹھا ہوا ہے۔ ہر آنے والا جو یا تو شوفر یا بھٹیارہ تھا۔ یہاں کاؤنٹ کے بھیس میں نظر آتا تھا۔ سب نے آکر اس نقلی زار کے ہاتھ کو چوما۔ ایک بھاری بھرکم پادری نے اس کے لئے برکت کی دُعا مانگی۔ پھر سب نے ہز مجیسٹی کا جام صحت پیا۔ دیر تک لوگ کیویار (comeen) کھاتے رہے، ووڈکا پیتے رہے۔ اور پولسکا یا والز ناچتے رہے۔ ہر ایک تقریر کا یہی موضوع تھا ——— جب ہم اپنی زمینداری میں رہتے تھے، جب ہم دربار میں پیش ہوئے میرے پاس جھک کاؤنٹس بیٹھی ہوئی تھیں کہنے لگیں ——— میں نے بھی سُنا ہے کہ ہندوستان خوبصورت شہر ہے۔ کیوں صاحب یہ ہے کس طرف۔ گویا قبرستان کے مُردے تھوڑی دیر کے لئے جاگ اُٹھے تھے اور بیتی ہوئی زندگی کا ناٹک دکھلا رہے تھے۔

فرانسیسی ادیبوں میں مجھے روماں رولاں کی شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ باہر اس کی جتنی عزت ہے اُتنی فرانس میں نہیں۔ عوام میں اس لئے نہیں کہ گزشتہ جنگ کے پہلے سے وہ فرانس کی عسکریت اور سرمایہ دارانہ تمدّن کی مخالفت کرتا آیا تھا۔ ادیبوں میں اس لئے نہیں کہ اس کی زبان زیادہ منجھی ہوئی نہیں ہوتی۔ اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے جو فرانس کے کسی لکھنے والے سے سرزد ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ کے فرانسیسی ادب کی مثال اس رنگیلے بوڑھے کی سی تھی جو دن رات آئینہ میں اپنی شکل دیکھ دیکھ کر کبھی ماضی کا ماتم کرتا ہو اور کبھی حال سے بیزاری کا اظہار زمانۂ حال سے بیزاری اور مستقبل سے نا امیدی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اس دور کے بہترین ناول نگار (Celline) اور Montherlant اسی رجحان کے ترجمان ہیں۔ André Malraux کے سوائی شنل کے کسی بڑے لکھنے والے میں انسانیت کا درد نہ تھا۔ یہی وہ بیزاری اور ٹنک پرستی کا زہر تھا جو گزشتہ جنگ کے بعد فرانس کے رگ و پے میں ساری ہو گیا۔ اور اس کی ہلاکت کا باعث ہوا۔

روماں رولاں ۳۸ء میں سوئٹزرلینڈ سے فرانس لوٹ آیا تھا۔ اور پیرس سے کوئی پچاس میل دور Vanilly نامی 17

گاؤں میں رہتا تھا۔ جیسے ہی مجھے یہ بات معلوم ہوئی دل بے اختیار چاہا کہ اس سے ملیئے۔

Soul Enchanted اور Jean Christophe. کے مصنف کو میں اس دور کا سب سے اچھا تو نہیں لیکن سب سے بڑا ناول نگار سمجھتا ہوں۔ اور گورکی کے ساتھ اس کی تحریروں نے مجھ پر بڑا اثر کیا ہے۔

میں نے خط لکھ کر اس سے ملنے کی اجازت چاہی۔ جواب آیا کہ ضرور آؤ۔ اور ایک ویک اینڈ کے لئے میرے مہمان رہو۔

یہ وہ دن ہمیشہ یاد رہیں گے۔ رومان رولاں کا آرٹ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے جو کبھی گرجتا ہے تو کبھی میٹھے سُروں میں گنگناتا ہے لیکن اس کا بہاؤ کبھی نہیں رُکتا۔ اور اس کی شخصیت پہاڑ کی طرح سربلند نہیں جس کے قریب جاکر آدمی کو اپنی کمتری کا احساس ہوتا ہے۔ بلکہ ایک پُر سکون سمندر کی طرح ہے جس میں تیر کر آدمی کو تازگی محسوس ہوتی ہے اس وقت یورپ پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے اور وہ اُداس تھا "انسان نے انسانیت کے تئیں اپنا فرض ادا نہیں کیا" —— وہ بولا۔ "کاش کہ لکھنے والے اپنے فرض کو سمجھتے۔ اور دُنیا کو نیند سے بیدار کر سکتے"۔

ایک چھوٹی سی تفریح کی مثال ریل کے سفر کی ہے جس میں آپ کھڑکی سے سر نکال کر باہر کے نظارہ پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈال سکتے ہیں اور بس۔

اب میں بہت سی باتوں کو چھوڑ کر ایسی صحبتوں کا ذکر کرتا ہوں جن کا اثر بہت سی ادبی محفلوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

پیرس کی کئی تفریح گاہیں اور کیفے صرف ادیبوں اور آرٹسٹوں کے لئے مخصوص ہیں۔ مون مارت کا ایک کیفے وکٹر ہیوگو سے منسوب ہے۔ سو سال سے یہاں شاعر اور ادیب بیٹھتے آئے ہیں وہی اُنیسویں صدی کا ماحول ہے۔ دیواروں پر شاعروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں اور مصوروں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے اسکیچ لٹک رہے ہیں۔ شراب کے دام نہ ہونے پر یہ کیفے کے مالک کو بیچ دئے جاتے تھے۔ کوئی اپنی نظم سُنا رہا ہے تو کوئی پیانو پر اپنا نیا گیت گا رہا ہے۔ کسی میز پر ادبی علمی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ تنگ تہ خانہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا ہے۔ عجیب عجیب لوگ جمع ہوتے ہیں یہاں کوئی نو سال سے دُنیا کی خاک چھانتے ہوئے ہر کس و ناکس سے پوچھتا پھرتا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ اور اُن کے جواب کو تیرہ موٹی موٹی جلدوں میں قلمبند کر چکا ہے ایک حاضر جواب کو یہ کمال حاصل ہے کہ آپ کا نام و پتہ پوچھ کر اُسی وقت آپ کی ذات گرامی پر ایک نظم تحریر کر کے الٹنی میں آپ کو بیچ دیگا۔ کسی نے وطن دولت سے مُنہ موڑ کر خانہ بدوشوں کا سنگ پکڑ لیا ہے۔

خانہ بدوشوں سے زیادہ کسی کی زندگی آرٹسٹک نہیں۔ خاص طور پر ہنگری کے جپسی۔ نہ اُن کا کوئی گھر بار ہے نہ خاندان نہ جائداد۔ جب تک جی چاہتا ہے رہتے ہیں۔ اور جی اُکتاتا ہے تو اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ انھیں مہذب کرنے کی سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اور جب اُنھیں ایک جگہ رہنے پر مجبور کیا گیا تو وہ دق میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ ہنگری کی سیر کرتے کرتے میں نے ایک دوست سے پوچھا۔ کہ کیا جپسیوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا جاسکتا ہے۔ بڈاپیسٹ سے کوئی سو میل دور بالاٹون کی جھیل کے کنارے ان کی زمینداری تھی۔ اور وہاں جپسیوں کے کارواں ٹھیرا کرتے تھے۔ ایک شام میں نے اُن کے ساتھ گزاری۔ اور یہ سینکڑوں مہذب صحبتوں سے زیادہ پُر لطف تھی۔ ہنگری کے جپسیوں کی موسیقی دُنیا میں انتخاب ہے۔ اور ان کے نغمہ و رقص کا جوش کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہ آوارگی اور سرمستی تہذیب کے بیماروں میں کہاں سے آنے لگی۔

بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ کن کن کا ذکر کیا جائے۔ تاریخ میں ایسے دَور بھی آتے ہیں۔ جب چند سالوں کا تجربہ صدیوں کے تجربے سے زیادہ بوجھل ہوتا ہے۔ اور اس بوجھ سے دب کر ایک پوری نسل بوڑھی ہو جاتی ہے۔

شاید ہم اس دور سے گزر رہے ہیں۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

اکرام قمر ایم، اے

ابتدائی مسیحی کلیسا کے سیاسی افکار

عہد نامۂ جدید کی سیاست

۳۱۳ء میں شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو مملکتِ روما کا ایک مذہب قانوناً تسلیم کر لیا۔ حضرت عیسیٰ کے وقت سے لیکر اس اہم ترین تاریخ تک تین صدیوں کے دوران میں عیسائی کلیسا کو عجیب دغریب انقلابات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانہ کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) یروشلم تا ۵۰ء (۲) انطاکیہ ۵۰ - ۱۵۰ء
(۳) اسکندریہ ۱۵۰ - ۲۵۰ء (۴) روما ۲۵۰ - ۳۱۳ء

پہلے دور — مسیح اور اس کے حواریوں کے دور — میں حضرت عیسیٰ اور اُن کے حواری سیاسیات سے دوسری تمام دُنیوی چیزوں کی طرح بے اعتنائی برتا کرتے تھے۔ انھیں حاضر اور ارضی چیزوں سے کچھ تعلق نہ تھا۔ بلکہ غائب اور ابدی چیزوں سے واسطہ تھا وہ دُنیا کی بے ثباتی کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ جلد ہی روزِ حساب آنے والا ہے جب کہ صرف روحانی اشیا ہی تسلیم کی جائیں گی۔ اور اس بات کو کچھ اہمیت نہیں دی جائے گی کہ اس دُنیا کی عارضی زندگی میں ایک شخص بادشاہ رہا ہے یا گدا۔ اشرافیت پسند رہا ہے یا جمہوریت پسند۔ جمہوریت پسند رہا ہے یا بادشاہت پسند۔ یہ چھوٹی سی عیسائی برادری ایک ریاست — سلطنت در سلطنت — کے مشابہ تھی۔ اگرچہ اس میں ارضی حکومت کے تمام لوازمات۔ مثلاً قطعۂ ارض، آمدنی، فوج اور پولیس موجود نہ تھے۔ مگر ان تمام سے محرومی کے باوجود یہ برادری بجائے ایک کلیسا کہلانے کے ایک سلطنت ہونے کی دعویدار تھی۔ مسیح اس کا شہنشاہ تھا، اس کے احکام کو یہ برادری تسلیم کرتی تھی۔ حتّٰی کہ انھیں مقدّس موسوی قوانین پر بھی فوقیت دیتی تھی۔ اس نے خود مختار ادارے قائم کئے۔ اس کے سیاسی (مذہبی کے برعکس) اسلوب کے عجیب و غریب نتائج نکلے

ایک طرف تو اس نے یہودیوں کو یہ یقین دلایا کہ مسیح کی "سلطنت" ایک ایسی تنظیم ہے جو مذموم رومی جوئے کے اُتار پھینکنے میں مدد دیگی۔ دوسری طرف اس نے حکومت روما کو خائف کر دیا۔ اور آپنے آقا کو صلیب پر لٹکوا دیا۔ کیونکہ "یہودیوں کا ہونے والا بادشاہ" تھا۔ مگر مسیح نے نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے ہوئے مشتعل یہودیوں اور پریشان خاطر رومیوں کو یہ بات صاف طور پر بتلا دی تھی۔ کہ وہ نہ تو ان کے سیاسی مسائل میں کسی قسم کی دلچسپی لیتا ہے۔ اور نہ وہ داؤد کی حکومت دوبارہ قائم کرنے کا یا قیصر کے اقتدار کو للکارنے کا خواہاں ہے۔ اس نے اپنی تعلیمات میں دو ایسے فقرے کہے ہیں جو سیاسی نظریات کی تاریخ میں اہم ترین حیثیت کے مالک ہیں پہلا فقرہ ہے کہ "میری سلطنت اس دُنیا کی نہیں ہے۔" دوسرا فقرہ ہے: "قیصر کی چیزیں قیصر کو اور خدا کی چیزیں خدا کو دو۔" ان جامع فقروں نے مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کر دیا۔ ان کے دائرہ عمل جدا جدا کر دئے۔ اور ان کی حد بندی کر دی۔ ان فقروں نے کلیسا کو ریاست سے علیحدہ کر دیا۔ اور یونانی و رومی شہری ریاست کے اس نظریّہ کو ختم کر دیا کہ خدا کی عبادت شہری انتظام کے ماتحت ہے۔

دنیوی اغراض سے علیحدگی کا طریق کار جو مسیح اور اس کے بارہ حواریوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ مسیح کو سولی لٹکانے کے بعد بہت عرصہ تک جاری نہ رہا۔ ایک طرف تو دُنیا کا متوقع خاتمہ نہ ہوا۔ کلیسائے یروشلم کی تمام دولت ختم ہو چکی تھی۔ اور اَب وہ پریشان کن افلاس کا شکار تھا۔ دوسری طرف انجیل کی تعلیم بنی اسرائیل سے باہر بھی پھیل گئی اور غیر یہودیوں نے بھی اسے قبول کر لیا۔ مشرقی مذاہب سے اس کے تعلقات پیدا ہو گئے جو اس پر بہت اثر انداز ہوئے۔ اس نے تجسیم مسیح (مسیح کا انسانی شکل اختیار کرنا) کفّارہ، دوسری زندگی اور بقائے دوام کی نئی تعلیم پیش کی جس نے اسے یہودیت سے فی الفور علیحدہ کر دیا۔ حالانکہ اس کی بنیاد یہودیت پر ہی تھی۔ اس نئی تعلیم

کا مبلغ سینٹ پال تھا۔ اور انطاکیہ (جہاں حواریوں کو سب سے پہلے عیسائی کا نام دیا گیا) نے جدید اناجیل اربعہ کی تعلیم کی نشر و اشاعت کی۔ یہ تعلیم ایشیائے کوچک، مقدونیہ اور یونان میں نہایت تیز رفتاری و کامیابی کے ساتھ پھیل گئی۔ حتیٰ کہ روما تک بھی پھیل گئی۔ غیر یہودیوں نے انبوہ در انبوہ ہر جگہ اس کا خیر مقدم کیا۔ مگر یہودیوں نے ہر جگہ اس کی مخالفت کی۔ سینٹ پال ایک رومی شہری تھا۔ اس نے اپنی شہریت کی تمام مراعات اور اختیارات کو اپنی حفاظت اور تبلیغ کیلئے مکمل طور پر استعمال کیا۔ اکثر اوقات اس نے مدنی حکام کے پاس درخواستیں گزرانیں جن سے وہ خود بھی تباہی و بربادی سے بچ جاتا اور اس کا ننھا سا کلیسا بھی محفوظ ہو جاتا۔ اس لئے روما کی شہنشاہی قوت کا وہ ممنونِ احسان اور شکر گزار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ روما کی حکومت قیام امن اور ضبط و قانون کے ذریعہ چھوٹے پیمانے پر وہی کام کر رہی ہے۔ جو کلیسا سر انجام دیتا ہے۔ اور لوگوں کو مسیح کی طرف بلا رہی ہے چنانچہ اس نے یہ تعلیم دی کہ دنیوی قوت خدا کی عطا کردہ ہے۔ اور کہا۔ "جو قوتیں اس دُنیا میں موجود ہیں وہ خدا کی مقرر کردہ ہیں"۔ اس نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ "بادشاہ اور ہر صاحب اقتدار کے لئے"
٢٠ دعا مانگا کریں۔ اس نے اطاعت پر زور دیتے ہوئے کہا: "ریاست اور طاقت کے مطیع رہو۔ حکام کا کہنا مانو اور ہر اچھے کام کیلئے تیار رہو" رومی شہریت کی اُس نے جتنی تعریف کی اور رومی بادشاہت کے ساتھ جتنی عقیدتمندی ظاہر کی اُتنا ہی اُس نے کلیسا اور ریاست اور برگزیدۂ حق اور دنیوی لوگوں کے فرق پر زور دیا جو مسیح کی تعلیم کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ خطا کار کارنتھیوں (یونان کے علاقہ کارنتھ کے باشندے) کو مخاطب کرتے ہوئے وہ نہایت غیظ و غضب کے ساتھ کہتا ہے "جب تم میں سے کسی ایک کو دوسرے کے خلاف شکایت ہو تو کیا اس میں یہ جرأت ہے کہ اسقفوں کے بجائے انصاف کش اشخاص کے سامنے اپنا مقدمہ لیکر جائے؟" اس سے یہ صاف طور پر عیاں ہے کہ کارنتھ کا کلیسا ایک خود مختار کلیسا تھا۔ اور عدل و انصاف کرنے کیلئے اس کے اپنے حکام اور اپنا مناسب طریق کار تھا۔

یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ سینٹ پال کی تحریروں اور رواقیوں کی تعلیمات میں نمایاں مشابہت ہے۔ مثلاً یہ نظریہ کہ قانون قدرت بلا امتیاز ملت و حالات ہر شخص کے دل اور ضمیر پر کندہ ہے۔ اور یہ خیال کہ ہر شخص بلا امتیاز دُنیوی مراتب کے خداوندی انعام و اکرام کا مساوی حقدار ہے۔

سینٹ پال کے نظریات کی تائید سینٹ پطرس کے مبینہ مکتوبِ اوّل میں پائی جاتی ہے جس میں یہ درج ہے کہ "انسان کے ہر حکم کے سامنے خدا کی خاطر سر تسلیم خم کر دو۔۔۔ خدا سے ڈرو۔۔۔ بادشاہ کی عزت کرو"۔

دَورِ جبر و تعذیب

عیسائی کلیسا اور سلطنت روما کا یہ خوشگوار اتحاد زیادہ عرصہ قائم نہیں رہا۔ ایک طرف تو اپنی تمام رواداری کے باوجود سلطنت اس بات پر زور دیتی تھی کہ بلا کسی استثنار کے رعایا قربانیاں اور خدمات کرے جو عیسائی تعلیم کے منافی تھیں۔ اور دوسری طرف کلیسا محض ایک ایسے مذہب کی حیثیت میں زندہ رہنے کو تیار نہ تھا جس کے ساتھ حکومت کی طرف سے صرف رواداری برتی جا رہی ہو۔ وہ اس بات پر قانع نہ تھا کہ اُسے فقط یہودیت کی ایک خاص شاخ یا مشرق کے کثیر مذاہب میں سے ایک مذہب سمجھا جائے۔ اس کا اعلان تھا کہ عیسائیت اور صرف عیسائیت ہی عالمگیر اور سچا مذہب ہے۔ جب پنتھیئن خداؤں (روما کے گول مندر کے دیوتاؤں) نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ مسیح کے محض پیشرو ہیں تو کلیسا نے ان سب کو شیاطین قرار دیا۔ یہ اعلان عامۃ الناس اور خصوصاً غیر اہل کتاب پجاریوں کے لئے اشتعال انگیز تھا اور شہنشاہ کو اس پر سب سے زیادہ طیش آیا۔ کیونکہ شہنشاہ ہونے کی وجہ سے وہ روما کے قدیم کے پجاریوں کی مجلس کا ایک رکن تھا۔ چنانچہ حکومت نے کلیسا کی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور عیسائیوں کو "غیر مدنی الطبع" اور "دشمنِ انسانیت" قرار دیا گیا۔ اس اعلان کی وجہ سے گاہے بگاہے ہنگامے اور جبر و تعذیب کے واقعات رونما ہوئے۔ عیسائیوں نے۔۔۔ جو جوش سے بھرے ہوئے۔ شہادت کے شائق اور اس طرح جنت کے حصول کو یقینی خیال کرتے تھے۔۔۔ مخالفانہ تعصب کو دُور کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ کلیسا کی ہستی کو تسلیم نہ کرنے سے علانیہ مخالفت شروع ہو گئی۔ یہ بڑھتی ہوئی مخالفت ابتدائی کلیسا کی تاریخ کے دَورِ اسکندریہ (٢٥٠-١٥٠ء) کی نمایاں خصوصیت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسکندریہ ہی میں غیر اہلِ کتاب فرقوں اور عیسائی رسوم کے معتقدوں کے درمیان اختلاف نے متشدد شورشوں کی شکل اختیار کر لی۔ اب سلطنت روما ننھے کلیسا کی محافظ و سرپرست نہ تھی بلکہ اس کی مخالف تھی اور اسے کچلنے کیلئے

گاہے بگاہے اس پر سختیاں بھی کرتی۔ اس روش کے جواب میں کلیسا نے بھی اپنا رویہ سلطنت کے بارے میں بدل لیا۔ کلیسا اب بادشاہت کو خدا کی طرف سے مقرر شدہ نقیب اناجیل، امن کا ضامن، اور لوگوں کو قانون کے ذریعے مسیح کی طرف لانے والا اُستاد نہیں سمجھتا تھا بلکہ اسے ناجی کے مقاصد کے لئے خطرناک اور دُنیا کی نجات کے لئے نقصان دہ شیطان سمجھتا تھا۔ اس نے مقدس سینٹ جان کے اس پیغمبرانہ الہام کو اپنایا جس میں روما کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "بابل ــــ سب سے بڑی فاحشہ ــــ طوائفوں اور ارضی خباثتوں کی ماں ہے۔" اور اسے "زاہدوں اور شہیدوں کے خون سے بدمست" قرار دیا گیا ہے۔

عیسائیت نے غیر مدنی روش اختیار کر لی تھی اور دُنیاوی طاقتوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ مگر دُنیاوی طاقتوں کے لئے اس سے زیادہ پائدار اور خطرناک چیز کلیسا کی بڑھتی ہوئی تعداد و تنظیم تھی۔ اپنے مہیمین صدقات، پادریوں، اسقفوں، اور بطریقوں کی وجہ سے کلیسا نے سلطنت کے اندر ایک اور منظم و مضبوط سلطنت کی حیثیت اختیار کر لی تھی جو اپنی تنظیم و ذرائع کی بنا پر بادشاہت کے قوت و اقتدار کی بھی رقیب بن گئی تھی۔ تیسری صدی کے وسط میں شہنشاہ ڈیشس نے یہ اعلان کیا کہ وہ ایک مخالفِ قیصر کی نسبت اسقفِ روما کو زیادہ خطرناک سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس نے خوفناک "تعذیب عام" کی ابتدا کر دی جو ۲۵۱ء سے ۳۱۱ء تک مختلف وقفوں کے ساتھ جاری رہی ان ساٹھ پُر خطر و ہولناک سالوں کے دوران میں چند قابل ترین و محب وطن بادشاہوں نے عیسائی کلیسا کے قلع قمع کے لئے پُر زور کوششیں کیں۔ مگر یہ کوششیں قطعی طور پر ناکام رہیں اور انھیں اپنی شکست کا علانیہ اعتراف کرنا پڑا۔ ۳۱۱ء میں تعذیبی فرامینِ حکومت منسوخ کر دیئے گئے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں اس سے دو سال بعد شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو سلطنت کے قانونی مذاہب میں جگہ دیدی۔ چونکہ غیر اہل کتاب اشخاص (Pagans) کے دماغ فرسودہ اور روح مردہ ہو چکی تھی۔ اس لئے اس اعتراف کا مطلب عیسائیت کا قیام تھا۔ اسّی سال تک ــــ جو جبر و تعذیب کی طویل صدیوں کے درمیان رواداری کا دلچسپ دَور ہے ــــ عیسائیت اور دوسرے فرقے شانہ بشانہ موجود رہے۔ ایک فرقہ سلطنت اور جمہور کی مقبولیت حاصل کر رہا تھا اور دوسرے فرقے زوال پذیر تھے۔ آخر کار ۳۹۲ء میں شہنشاہ تھیوڈوسئس اوّل نے منادر بند کر دئے۔ اور غیر اہل کتاب لوگوں کی قربانیاں ممنوع قرار دیں۔ صرف عیسائیت ہی اب تمام سلطنت میں قانونی مذہب کی حیثیت رکھتی تھی۔

(۳) قسطنطین سے آغستین تک

قسطنطین کی تبدیلیٔ مذہب ایک اہم واقعہ تھا جس کے دُور رس نتائج نکلے جس طرح اس سے پیشتر کے ناکام دورِ جبر و تعذیب کے اسباب سیاسی تھے اسی طرح اس واقعہ کے اسباب بھی سیاسی تھے قسطنطین اپنے پیشرو ڈیوکلیشئن کی طرح سلطنت کے شکستہ اتحاد کو دوبارہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ ڈیوکلیشئن کو یہ توقع تھی کہ اسقفوں کا خاتمہ کر کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیگا۔ مگر قسطنطین اس مقصد کیلئے انہی اسقفوں کو آلۂ کار بنانا چاہتا تھا۔ اسقفوں نے شاہی مشیروں میں تبدیلی کا خیر مقدم کیا۔ اسے اُنھوں نے خداوند کی طرف سے ایک خوشگوار تبدیلی سمجھا۔ اسکی وجہ سے انھیں بجائے اپنی جانوں کا ایندھن بنا کر تاپنے کے شاہی آگ کے سامنے ہاتھ تاپنے کا موقع مل گیا۔ انھیں اس بات پر مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ قسطنطین کو بجائے ایک نائب کے اپنا سرپرست اور بجائے ایک شاگرد کے اپنا اُستاد سمجھیں۔ اس تبدیلیٔ مذہب کے چوبیس سال بعد جب وہ بسترِ مرگ پر تھا تو اس نے بپتسمہ لیا۔ تا مین حیات وہ رومائے قدیم کے پجاریوں کی مجلس کا رُکن رہا۔ اور اپنے شاہی حقوق کی بنا پر وہ اپنی سلطنت کے عیسائی کلیسا کا سردارِ اعلیٰ بن گیا۔ اگرچہ اس نے ابھی تک بپتسمہ نہیں لیا تھا۔ مگر تمام مسیحی دُنیا کی پہلی مجلس نیکائی (قصبہ نیکیا میں عیسائیوں کی دو مجالس منعقد ہوئی تھیں۔ پہلی ۳۲۵ء میں اور دوسری ۷۸۷ء میں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس قضیئے کا تصفیہ کریں کہ حضرت مسیح جسمانی حیثیت سے عشائے ربّانی میں موجود ہوتے ہیں کہ نہیں اس کے علاوہ اس مسئلہ پر بھی غور کریں کہ عیسائیت میں بتوں کو رکھنے کی اجازت ہے یا نہیں) منعقدہ ۳۲۵ء کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی جو اس کے گرمائی محل میں منعقد ہوئی تھی اور جہاں اس کا "اسقفِ اعظم" کی حیثیت سے استقبال کیا گیا تھا۔

المختصر عیسائی کلیسا نے اب وہ حیثیت اختیار کر لی تھی جسے اِس نے پہلی صدی عیسوی میں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اب کلیسا ریاست کا ایک محکمہ بن چکا تھا اور اس کے اسقف حکومت کے عہدہ دار بن چکے تھے سیاست اور مذہب کی علیحدگی کو سرکاری طور پر دور کر دیا گیا تھا۔ غیر اہلِ کتاب حکومت کا یہ نظریہ کہ مذہب سلطنت کے ماتحت ہے دوبارہ زندہ ہو گیا۔ یہ تاکیدی حکم بے معنی ہو کر رہ گیا کہ "قیصر کی چیزیں قیصر کو اور خدا کی چیزیں خدا کو دو۔"

قیصر کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کی اطاعت کو ایک مذہبی فریضہ تصور کیا جانے لگا۔ اس لئے سلطنت کے قبول عیسائیت کو کلیسا کا ارتداد بھی کہا جا سکتا ہے۔

اس غیر کتابی (Pagan) سیاسی نظریہ کا احیاء جب قسطنطین نے مجلس نیکائی کو طلب کر کے اور اس کی صدارت کر کے کیا، تو مخلص عیسائیوں نے اس پر بہت اعتراض کیا۔ اور جو کلیسا کے اس دُنیاوی رنگ میں رنگے جانے سے خوفزدہ ہو چکے تھے سماجی زندگی کو ترک کے عزلت نشیں راہب بن گئے۔ جو عیسائی مذہب اور سیاست دونوں سے تعلق رکھتے تھے اور مذہبی طاقت نے بادشاہ کو جو مطلق العنانہ اختیارات دیدئے تھے اُن سے چوکنے ہو چکے تھے انھوں نے کھُلم کھُلا بغاوت کر دی جسے بدعات نے اور بھی تقویت پہنچائی۔ کاتھیا کی آریوسیت[1] (یہ نظریہ کہ عشائے ربانی میں حضرت عیسیٰ شراب اور روٹی کے ساتھ خود جسماً موجود نہیں ہوتے) افریقہ کی دوناتیت[2] (Donatism) آرمینیہ کی نسطوریت[3] (نسطور کا مسلک جو ۴۲۸ء میں قسطنطنیہ کا بطریق تھا) اور مصر و شام کی یوتیشیانیت (قسطنطنیہ کے پانچویں صدی کے بطریق یوتیشے کا مسلک کہ تجسیم کے بعد مسیح کی انسانی خصوصیات اس
۲۲ کی ربانی خصوصیات میں مدغم ہو گئیں۔ اور اب مسیح کی فطرت صرف الوہی ہو گئی تھی)۔ قیصریت و پاپائیت کے اتحاد کے خلاف پُر زور قومی تحریکات تھیں۔ اس اتحاد نے تمام قوت، عزت، اقتدار اور طاقت جملہ بنی نوع انسان میں سے صرف قسطنطنیہ میں رہنے والے بادشاہ کو تفویض کر دی تھی۔ اس بادشاہ کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس نے اپنی تمام دُنیوی و مذہبی ہیبتناک قوت اپنی رعایا سے نہیں بلکہ آسمانی بادشاہ سے حاصل کی ہے

مگر راہبوں کے خروج اور قومی بغاوت کے باوجود قیصریت و پاپائیت کا اتحاد (جس کی رو سے دنیوی و مذہبی حاکمیت بادشاہ کے ہاتھوں میں آگئی تھی) سلطنت روما کے مشرقی (یونانی اور ایشیائی) علاقوں میں قائم ہو گیا تھا۔ سینٹ کرائیسوسٹم کی طرح کے بطریقوں نے اس اتحاد کے خلاف احتجاج کیا۔ انھوں نے کلیسا کی آزادی کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر انھیں کچل دیا گیا۔ جو اپنے اسقفی عہدوں پر قائم رہنا چاہتے تھے اُنھیں یا تو مائلیوس کے اسقف آیٹیٹس کی طرح وفادارانہ رویہ اختیار کرنا پڑا جس کی رائے بادشاہ کے متعلق یہ تھی کہ "سوائے خدا کے اس سے کوئی ارفع و اعلیٰ نہیں"۔ یا انہیں آمبروسیاسٹر کی پیروی کرنی پڑی جس کا بادشاہ کے متعلق یہ قول تھا کہ "وہ خدا کا خلیفہ اور نمونہ ہے"۔

لیکن سلطنت کے مغربی (لاطینی اور یورپی) علاقوں میں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ قسطنطین کی موت کے بعد اطالیہ، افریقہ، ہسپانیہ اور گال کے بڑے بڑے اسقفوں نے دنیوی بادشاہوں کی مذہبی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بادشاہ اکثر بدکردار اور ان کے مذہبی اعتقاد بودے ہوتے تھے۔ چوتھی صدی کے اختتام سے پہلے میلان کے سینٹ آمبروز نے شہنشاہ والن طینئن سوئم (جس نے اُسے ایک آریوسی کو اسقف مقرر کرنے کا حکم دیا تھا) کو کہا "مذہبی معاملات میں اسقف بادشاہوں کی جانچ پڑتال کرتے ہیں، بادشاہ اسقفوں کی نہیں"۔ ایک صدی بعد (۴۹۴ء میں) پاپائے اعظم گیلاسئس نے شہنشاہ اناس طیسئس کو قسطنطنیہ میں ایک خط لکھا جس میں اس نے یورپی نظریہ نہایت غیر مبہم الفاظ میں بیان کیا کہ "اس دُنیا پر دو طاقتیں یا دو جلیل القدر شہنشاہ حکمراں ہیں ـــــ یعنی پادریوں کی مقدس طاقت اور شاہی قوت ـــــ آسمانی رموز و اسرار کو سمجھنے کیلئے تمہیں بجائے مذہبی افراد پر حکمرانی کرنیکے ان کی اطاعت کرنی چاہیئے"۔

یونانی اور لاطینی عیسائیت میں اختلاف کی جو ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی تھی اُس کی وجہ نظریات و رسومات کا کوئی خاص اختلاف نہ تھا بلکہ اس کا سبب یہی مسئلہ تھا کہ مذہبی معاملات میں کون سی فیصلہ کن اور قطعی طاقت ہے۔ بزنطینی قیصروں کے مردہ ہاتھوں تلے مشرق کے راسخ الاعتقاد کلیسا میں رجعت پسندانہ جمود پیدا ہو گیا تھا۔ مغرب میں پاپائے روم کی زیرِ سرکردگی کیتھولک کلیسا کی روحانی آزادی دوبارہ قائم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی یورپ میں ایک ہزار سال تک آزاد و خود مختار کلیسا اور دُنیوی طاقت کے تعلق کا سوال اہم سیاسی بحثوں کا مرکزی نقطہ بنا رہا۔

اس اہم بحث کا آغاز ہپّو کے سینٹ آغسطین (۳۵۴-۴۳۰ء) کی تصنیفات سے ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آغسطین نے اس مسئلہ کو براہِ راست نہیں چھوا تھا۔ اس کا مطمح نظر دوناتیوں کے سے معتزلیوں کو کچلنا،

---

[1] اسکندریہ کے آریوس (چوتھی صدی) کا مسلک۔ [2] چوتھی اور پانچویں صدی میں افریقہ میں عیسائیوں کا ایک ایسا فرقہ موجود تھا جو شہدا کی عزت و احترام میں معمولی کمی کا بھی روادار نہ تھا۔ مرتدوں سے بہت سخت سلوک کرتا اور کیتھولک عیسائیوں کو از سرِ نو بپتسمہ دیتا۔ اس فرقہ کے مسلک کو دوناتیت کہا جاتا ہے۔
[3] نسطور مسیح کی انسانیت و الوہیت دونوں کا قائل تھا لیکن وہ اس امر سے انکار کرتا تھا کہ یہ دونوں ایک خود آگاہ شخصیت میں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ اس کے نزدیک ان کا اجتماع محض اخلاقی تھا۔ گویا کہ اس نے مسیح کے دو وجود قرار دئے تھے۔ (مترجم)

پلاگیسیوں (چوتھی و پانچویں صدی کے راہب پلاگیئس کے پیرو۔ اس نے اس عقیدے سے انکار کیا تھا کہ گناہ آدم کی وجہ سے انسان کی سرشت میں بدی ہے) کی طرح کے بدعتیوں کو راہ راست پر لانا۔ اور وولوسیانس ([illegible]) کی قسم کے غیر اہل کتاب افراد کے خیالات کی تردید اور اُن کو قائل کرنا تھا۔ مگر آغسطین کو اس مسئلہ کا مسلسل سامنا کرنا پڑا۔ دوناتیوں کے خلاف اس نے جو رسالے لکھے ہیں اُن میں بالخصوص اور اپنی مشہور کتاب "مدینۃ اللہ" میں اُس نے اپنی روش کی مکمل وضاحت کی ہے۔ وہ شہنشاہ روما کو مانتا ہے۔ اس کی طاقت کو آسمانی سمجھتا ہے۔ سینٹ پال کے الفاظ میں رعایا پر شاہی احکام کی اطاعت لازمی قرار دیتا ہے۔ اور بادشاہ کی توجہ اس طرف منعطف کراتا ہے کہ وہ کلیسا کی حفاظت کرے، تشتت و افتراق کو دُور کرے اور بدعات کو کُچل کر رکھدے۔ لیکن وہ ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کہ بادشاہ مذہب کے مقدس دائرہ میں کوئی اختیار رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اعتقاد و اخلاق کے سوالات صرف کلیسائی مجالس کے مخصوص اسقف ہی حل کر سکتے ہیں۔ وہ پُرزور پیرایہ میں "مدینۃ اللہ" اور "مدینۃ الارض" کا فرق بیان کرتا ہے جسے قسطنطین کی تبدیلیٔ مذہب نے چھپا دیا تھا۔ قیصر کی چیزیں ایک دفعہ پھر خدا کی چیزوں سے علیحدہ کر دی گئیں۔

اس سوال کا جواب آسان نہیں کہ سینٹ آغسطین کا "مدینۃ اللہ" اور "مدینۃ الارض" سے کیا مطلب ہے۔ اس کا سرگرم حمایتی شروع میں یا تو عیسائی ہوتا یا غیر اہل کتاب۔ آغسطین یہ ثابت کرتا ہے کہ (۱) مغربی المانویوں (Visigotha) نے سنہ ۴۱۰ء میں روما کو جو تاخت و تاراج کیا اس کی ذمہ دار عیسائیت نہیں ہے۔ اور (۲) غیر کتابی مذہب نے اپنے عروج و اقتدار کے زمانہ میں روما کو شکست و ادبار سے نہیں بچایا۔

بعد ازاں وہ مرئی کلیسا اور اس کے سلسلۂ مراتب کو مدینۃ اللہ اور کلیسا سے باہر کی دُنیا کو مدینۃ الارض قرار دیتا ہے لیکن بالآخر و بالعموم معبدِ مقدس یا برگزیدگانِ حق کی مجلس ہی جس کا مکمل علم صرف خدا کو ہے مدینۃ الارض ہوتی ہے۔ اور اس کے متضاد مقام ناپاک یا راندۂ درگاہ کی مجلس مدینۃ الارض ہے۔ یہ راندۂ درگاہ دراصل فرشتہ تھا جو دُنیا کی پیدائش سے پہلے جنّت سے گر پڑا۔

اِن دو شہروں کی تعبیر خواہ کچھ بھی ہو یہ ایک امر نمایاں ہے کہ سینٹ آغسطین بھی دوسرے بہت سے عیسائی پاپایانِ اعظم کی طرح اس بات سے متاثر ہوا ہے اور اسے مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ سینیکا اور رواقیوں کی طرح اُسے بھی خیال اور حقیقت، خیر اور بد، کلیسا اور دُنیا، روحانی طاقت اور دنیوی طاقت، اور خدا اور رعایا کے ابدی و ناقابلِ عبور تضاد و اختلاف کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

(ترجمہ)

پنڈت جواہر لال نہرو

چین جمہوریت کی تیاریوں میں

امریکہ کی مشہور مصنفہ میڈم ایڈگرا سنو نم ویلز (Nym wales) اپنی کتاب China built for democracy ———— کا ایک ایڈیشن ہندوستان کے لئے شائع کرنے والی ہیں۔ اس کتاب کیلئے پنڈت جواہر لال نہرو نے ذیل کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔

۱۹۳۶ء کی گرمیوں کے آخر میں لندن میں ایک انگریز دوست کے یہاں اُن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی جو اسی زمانہ میں چین سے وہاں پہنچے تھے۔ ان میں انگریز بھی تھے اور چینی بھی۔ انھوں نے مجھے اس امداد باہمی کی تحریک کا حال بتایا، جس کا مقصد ایک طرف چین میں ان اشیاء کی پیداوار تھا جو وہاں کمیاب تھیں۔ اور دوسری طرف وہاں کے بازاروں میں جاپانی چیزوں کی بھرمار کی روک تھام۔ تحریک خوب تھی لیکن وہ اس کے بچپن کا زمانہ تھا اور مشکل ہی سے یہ تصور میں آ سکتا تھا کہ ترقی کرتے کرتے ۲۴ وہ اتنی بڑھ جائے گی کہ چین کے حالات پر نمایاں اثر ڈال سکے مجھے اس سے دلچسپی تھی۔

ہندوستان آنے کے بعد، ہانگ کانگ اور چنکیانگ سے کتابچے اور اشتہارات میرے پاس آتے رہے جن سے مجھے چین کے صنعتی امداد باہمی کے اداروں کی روز افزوں ترقی کا حال معلوم ہوتا رہا۔ اِن سے میری دلچسپی میں اضافہ ہوگیا، چین کے باعث نہیں، بلکہ ہندوستان میں گھریلو صنعتی تحریک کی خاطر۔ اگست ۱۹۳۹ء میں جب میں چین گیا۔ تو ان اداروں کے متعلق زیادہ واقفیت حاصل کرنے اور ممکن ہو تو بعض مراکز دیکھنے کی مجھے بیحد خواہش تھی۔ چنکیانگ میں میں نے کچھ زیادہ معلومات حاصل کیں۔ لیکن یورپ میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے مجھے اپنا دورہ مختصر کرنا پڑا۔ اور میں عجلت کے ساتھ وطن لوٹ آیا۔

کتابچوں اور اُن مضامین نے جو امریکہ کے رسائل میں شائع ہوئے مجھے اور زیادہ معلومات بہم پہنچائیں اور میری حیرت بڑھتی گئی۔ اپنی تقریروں اور اخبارات میں اپنے مضامین میں میں نے .... سے اُن اداروں کا حوالہ دیا۔ میرے پاس ایسے بہت سے خطوط آئے۔ جن میں ضروری تفصیلات طلب کی گئی تھیں۔ میں نے یہ تجویز کیا کہ گھریلو صنعتوں کے بعض ماہرین چین جاکر ضروری واقفیت حاصل کریں اور وہاں کے ماہرین کو ہندوستان آنے کی دعوت دی جائے۔ لیکن جنگ نے نئی مشکلات پیدا کردیں۔ اور ہماری تمام توجہ ان کی طرف مرکوز ہوگئی۔

میں جیل چلا گیا۔ ۱۹۴۱ء کی گرمیوں میں دہرہ دون جیل میں ایڈگر سنو کی کتاب ———— .... مجھ تک پہنچی میں نے اسے انتہائی شوق سے پڑھا لیکن اس کے کسی حصہ نے مجھے اپنی طرف نہیں کھینچا، جتنا اُن ابواب نے جن میں صنعتی اداروں کا ذکر تھا۔

دو تین مہینہ یوں ہی گزر گئے۔ پھر ہانگ کانگ سے مادام سن یاٹ سن کا بھیجا ہوا ایک تحفہ مجھے ملا۔ میری قید میں ان کا مجھے اس طرح یاد کرنا میرے لئے کافی خوشی کا باعث ہوا لیکن پیکیٹ کھولنے پر مجھے اور زیادہ مسرت ہوئی۔ اس میں نم ویلز کی کتاب نکلی۔ میں نے سوچا کہ مجھے جس کتاب کی ضرورت تھی آخر وہ مل گئی۔ اس سے مجھے اس دلکش تجربہ کا سب حال معلوم ہو جائے گا جو کافی کامیاب رہا تھا اور جس سے مستقبل کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔

دسمبر میں جب میں جیل سے باہر آیا تو کئی دوستوں سے اس کتاب کا ذکر کیا۔ ہر ایک نے چاہا کہ میں اس کو مستعار دیدوں۔ اس معاملہ میں زیادہ بخیل نہیں ہوں۔ لیکن اس قیمتی تحفہ کو جدا کرنے میں مجھے پس و پیش تھا لیکن اصرار حد سے بڑھ گیا اور وہ ایک سے دوسرے کے پاس منتقل ہوتی رہی۔ دو ماہ ہوئے کہ مجھے اس کی ایک اور جلد مل گئی، یہ اسی کتاب کا امریکن ایڈیشن تھا جو نم ویلز نے بھیجا تھا۔ اس کو بھی دوسروں نے چھین لیا تھا۔

ل کے امریکن ایڈیشن کا نام

—— ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

اور ابھی تک مجھے واپس نہیں ملا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس کتاب کی خاص مانگ ہے وجہ یہ ہے کہ ہمیں بھی ویسے ہی مسائل کا سامنا کرنا ہے جیسے کہ چین کو، ان میں کا ایک مسئلہ بڑی صنعت اور چھوٹی صنعت کے تعلق کا ہے جس پر ہندوستان کئی برس سے غور کر رہا ہے، کیا ان میں کوئی پُرانا جھگڑا ہے اور ایک کی بقا دوسرے کی فنا پر منحصر ہے؟ کہ ان دونوں کو کسی طرح ایک دوسرے سے منسلک نہیں کیا جا سکتا؟ مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب ہندوستان میں شائع ہو رہی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ بہتوں کی نظر سے گزریگی۔ چین کا تجربہ ہمارے لئے بے اندازہ قیمت رکھتا ہے اور میرا یقین ہے کہ ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

مدتوں سے میرا خیال ہے کہ ہندوستان کو صنعتی بنانا ضروری ہے تاکہ ہماری پیداوار اور ملکی دولت تیز رفتاری سے بڑھ سکے اور ہماری زندگی کا معیار اونچا ہو۔ اس کے بغیر اور بڑی صنعتوں کی ترقی نہ ہونے پر ہم مفلسی کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔ جو ملک صنعتی طور پر ترقی یافتہ نہ ہو وہ اقتصادی لحاظ سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

اس کے باوجود دیہاتی صنعتوں کی ترقی اور پھیلاؤ کے لئے میں نے کافی کوشش کی ہے، کسی سیاسی نظریہ کے ماتحت نہیں بلکہ ان میں ملکی مفاد کا یقین رکھتے ہوئے، میرے کئی دوستوں نے میری اس دو نظری کو پسند نہیں کیا، اور مجھ پر یہ الزام لگایا کہ میں ان میں سے یا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا یا اُس پر، اور اس کی کوشش کرتا ہوں کہ جہاں مصالحت ممکن نہیں وہاں صلح کرا دوں، لیکن وہ مجھے مطمئن نہیں کر سکے ہیں، اور اب تک میرا نظریہ ہے کہ ہندوستان میں ہمیں بڑی صنعتوں اور دیہاتی صنعتوں کو آگے بڑھانا، اور دونوں کو منسلک کرنا چاہیے۔ میں مانتا ہوں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ایسا آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظام ہی کو کیوں نہ بدل ڈالیں۔ حقیقت میں اس جنگ اور اس کے بعد کے اثرات میں وہ خود مٹ جائیگا اور (Planned Economy) اس کی جگہ لے لیگی۔

دیہی صنعت پر زور دیکر گاندھی جی نے میرے خیال میں ہندوستان کی بڑی خدمت کی ہے۔ ان کے ایسا کرنے سے قبل ہم میں سے سب اس سوال پر ناہمواری سے غور ہی نہیں کر رہے تھے بلکہ ہندوستان کے مخصوص حالات کو بھی نظر انداز کئے دے رہے تھے۔ چین کی طرح ہندوستان میں بھی مردوزن کی کافی آبادی ہے اور بہت زیادہ بیکاری۔ اس کا یورپ کے ممالک سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں جو اپنی چھوٹی مگر بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ صنعتی بن گئے ہیں۔ ہر ایسی اسکیم خراب ہے جو ہماری کام کی طاقت کو ضائع کرتی ہے یا لوگوں کو بیکاری کا شکار بناتی ہے۔ خالص اقتصادی نقطۂ نظر سے انسانی پہلو کا خیال کئے بغیر ہی کام کی طاقت کو (Labour Power.) جو مخصوص مشینری (مشینوں) کے مقابلہ میں زیادہ استعمال کرنا زیادہ فائدہ مند ہے۔ کم آمدنی پر زیادہ لوگوں کو معاش مہیا کرنا اس سے بہتر ہے کہ بیشتر تعداد کو بیکار کیا جائے اس کا بھی امکان ہے کہ گھریلو صنعتوں کی زیادتی سے کل دولت میں اضافہ ہو جائے۔ اس آمدنی کے مقابلہ میں جو چند کارخانوں سے اسی قسم کی چیزیں بنانے میں حاصل ہوتی ہے۔

ہم سب کو ایک مقصد کیلئے جد وجہد کرنا چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو، مساویانہ تقسیم اور بیکاری بالکل غائب۔ ہندوستان کی کثیر آبادی میں اس کو محض بڑی صنعتوں یا صرف گھریلو صنعتوں کے فروغ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اوّل الذکر بعض اشیاء کی پیداوار میں اضافہ کا باعث ہو سکے گی لیکن بیکاری اسی طرح باقی رہیگی اور مساویانہ تقسیم مشکل ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیداوار ہماری قوّتِ کار سے کم ہو کام کی طاقت کے ضائع ہونے کی وجہ سے گھریلو صنعتوں سے مساویانہ تقسیم آسان ہو جائیگی
٢٥ لیکن کل پیداوار کا پلڑا نیچا رہیگا اور اس طرح معیار اونچا نہ ہو سکیگا۔ البتّہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں ان کے پھیلاؤ سے موجودہ معیار کسی قدر اونچا ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی وہ نیچا ہی رہیگا۔ اس کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی ہیں جو کسی ملک کے گھریلو پر منحصر ہو جانے کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ موجودہ دور میں کوئی قوم بعض ضروری اشیاء کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی جو صرف بڑے کارخانوں میں بنائی جا سکتی ہیں ان کا پیدا نہ کرنا غیر ممالک کی برآمد پر منحصر ہو جاتا ہے، اس کا مطلب ہے اقتصادی پھندے میں پھنس جانا اور غالباً سیاسی غلامی۔

اس لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں دونوں قسم کی صنعتیں ہوں، بڑی اور گھریلو اور اس طرح ان کا انتظام کیا جائے کہ آپس میں ان کا نبھاؤ ہو سکے، بڑی صنعتوں کو امکانی تیزی سے قائم کیا جائے اور فروغ دیا جائے، لیکن ان کے انتخاب میں کافی غور و فکر کر لینا چاہئے اس کو ایسا ہونا چاہئے کہ اس پر قوم کی اقتصادی بنیادیں مضبوط ہو سکیں جن پر دوسری صنعتیں کھڑی ہو سکیں۔ بجلی کی ترویج صنعتی فروغ کی پہلی ضرورت ہے مشین، جہاز، کیمیاوی اجزاء، انجن اور موٹر کا بنانا اس کے بعد کی ضرورتیں ہیں، اور ان کی طرح کی دوسری صنعتیں دولت پیدا کرتی اور کام مہیا کرتی ہیں، ان سے بیکاری وجود میں نہیں آتی۔ ہلکی صنعتیں قابلِ اعتنا

نہیں، کیونکہ ابتدا میں ہمارا سرمایہ محدود ہے اور بھاری صنعتوں کیلئے اس کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ گھریلو صنعتوں کی راہ میں ان کی لکاوٹ بیکاری پھیلا سکتی ہے۔

بدقسمتی سے اس ملک کی صنعتی ترقی ہلکی صنعتوں تک محدود رہی ہماری صنعت کی ترویج کے لئے جو چند کوششیں ہمارے صناعوں نے کیں اُن کو برطانوی حکومت نے بری طرح کچل دیا۔ آنے والی نئی دُنیا کا خیال کرتے ہوئے برطانوی صنّاع مابعد جنگ کے ہندوستان میں اپنے اقتصادی تفوّق کے قیام کی فکر میں اتنے مشغول ہیں کہ ہندوستان میں بنیادی صنعتوں کی ترویج کی اجازت دیکر جنگ جیتنے کا خیال ان کے دماغ میں سما نہیں سکتا۔

ہندوستان میں صنعت کی باقاعدہ ترویج اور بڑی، درمیانی اور گھریلو صنعتوں کا ارتباط بغیر قومی طریق کار کے حاصل نہیں ہو سکتا اور سیاسی و اقتصادی آزادی کے بغیر یہ موثر نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ حکومت کی کافی نگرانی کے بغیر اس کا امکان نہیں۔ بنیادی صنعتیں اور رسل و رسائل کے ذرائع یا تو حکومت کے قبضہ میں ہوں یا ان پر اس کا کلی اختیار ہو، دوسری چیزوں پر کنٹرول کسی قدر کم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ حکومت کی پشت پناہی میں جو گھریلو صنعت فروغ پا رہی ۲۶
ہو اُس سے جو بڑی صنعت مقابلہ میں آئے اُس پر حکومت کو کلی اختیار ہونا چاہئے۔ اس سے آپس کے جھگڑے نہ ہوں گے اور نبھاؤ آسان ہو جائے گا۔

بجلی کے استعمال نے صنعتی دُنیا کو کافی بدل ڈالا ہے، اور بڑی صنعتوں کو (De Centralizing.) کرنا ممکن ہو گیا ہے،

یہ بات چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لئے بڑی مفید ہے۔

لیکن ان مسائل پر طبعی زمانہ میں ہی عمل ہو سکتا ہے۔ پھر بھی جنگ کے حالات نے چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی قدر بڑھا دی ہے، اور اس وقت چین کی مثال ہمارے لئے کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے حال میں اور حملہ آور سے مقابلہ کے لئے وہ بے حد موزوں ہے جس بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے وہ ان امداد باہمی کے صنعتی اداروں کی غیر معمولی پیداوار ہے۔ اصل جمع شدہ سرمایہ سے دُوگنی ان کی ماہانہ پیداوار کی قیمت ہے، ممکن ہے جنگ کے سبب ایسا ہو لیکن پھر بھی ہے تعجب خیز۔

ان اداروں کی جمہوری بنیاد، اور اس دنیا میں اس بنیاد پر ان کی ترویج، اپنے اندر دلچسپی کا سامان اور اہمیت رکھتی ہے، اسی بنیاد پر سیاسی جمہوریت زندہ رہ سکتی ہے۔ کسی دوسری بنیاد پر ایسا ہونے میں شک ہے۔

سرمایہ دارانہ صنعتی ترویج اب نہ ہندوستان میں ہو سکتی ہے نہ چین میں۔ اس کے باوجود ہمیں صنعتی لحاظ سے آگے بڑھنا ہے ورنہ ہماری زندگی ممکن نہیں۔ ہمیں خود ہی ایک راستہ نکالنا ہے اور اپنا توازن قائم رکھنا ہے۔ مستقبل، ممکن ہے ہمدردی اور دوسروں کی ایک متحدہ اشتراکیت باہمی کی طرف رہنمائی کرے، اور اگر دُنیا کو ان جنگوں اور انسانی کشت و خون کی موجودہ تلخیوں سے اُبھرنا ہے تو شاید اسی طرح کے کسی نظام پر اس کی از سرِ نو تنظیم ہو جائے۔!!

اخترالایمان

ادب اور ماحول

ہر ادب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے' یہ سب جانتے ہیں اور سب کہتے ہیں' اور پھر سب ادب پر بے سر و پا نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں' ہم روزانہ ادب' زندگی' اور ماحول کے متعلق بحث و تمحیص دیکھتے ہیں اور نگاہیں پھیر لیتے ہیں' اور پھر اسی قسم کی تنقید و بحث یا نئی راؤں کا انتظار کرتے ہیں' گویا یہ ایک مسلسل کھیل ہے لامتناہی ایک تماشا ہے جو یوں ہی ہوتا رہا اور جسے یوں ہی ہوتا رہنا چاہئے ۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہو' نہ انتہا' رہے کہنے والے سو ان کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں دبی زبان سے' ان کی رائے ابہام' شک اور خوف سے خالی نہیں۔

سب سے زیادہ مجھے جس پر تعجب ہے وہ ادب برائے ادب' اور ادب برائے زندگی کی بحث ہے' خوب لے دے ہو رہی ہے' جواز تلاش کئے جاتے ہیں' مثالیں پیش کی جاتی ہیں' لڑنے والے لڑتے ہیں' ہنسنے والے ہنستے ہیں' اور پھر دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن ہو کر کسی کیفے یا بار میں کوفت دور کرنے کیلئے چلے جاتے ہیں ۔ یہ بات سب ہی مانتے ہیں' کہ ادب' زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا عکس کش ضرور ہوتا ہے لیکن پھر بھی یہ بحث برابر جاری رہتی ہے' ادب برائے ادب کے ماننے والے آجتک اپنے اس مقولے کی کوئی صحیح تعریف نہ کر سکے کہ اگر وہ صرف حسن و عشق کے معاملات کی روایاتی تعبیر ہی کو ادب مانتے ہیں تو یہ چیز بھی زندگی کے جزئیات میں سے ہے' جنسی بھوک کے کچھ عناصر دب جانے کے بعد محبت مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے' لیکن اصل وہ اپنی جگہ قائم ہے' اسے کوئی بھی نہ بدل سکا۔

زندگی کے متعلق دنیا کی منضبط اور جاری آرائے انسانی ذہن پہ چھا چکی ہیں ۔ مارکسٹ نظریہ کے علاوہ کوئی رائے اور کوئی نظریہ نیا نہیں' ایسے بزرگ بھی موجود ہیں جو زندگی کا اصل اصول محض عیش و عشرت ہی کو سمجھتے ہیں' وہ گروہ بھی موجود ہے جو زندگی کو محض فریضہ سمجھتا ہے' اور فرض برائے فرض کا قائل ہے' ان کے علاوہ وہ گروہ بھی ہیں جن میں سے ایک زندگی کو دل اور ضمیر کی آواز کے تابع بھی سمجھتا ہے اور زندگی میں دلیل کو بڑی جگہ بھی دیتا ہے' دوسرا وہ جو اُسے شروع سے ایک تدریجی فعل سمجھ کر اُسے ایک مادّی شکل دیدیتا ہے ۔

اس آخری گروہ کیلئے انسان کی بقا کا مسئلہ ہی سب سے بڑی چیز ہے' غرضکہ اخلاق کا معیار اور انسانی قدریں آج سے بہت پہلے مقرر ہو چکی ہیں' اور ہمارا ادب ان ہی میں سے کسی نہ کسی کے تحت میں آجاتا ہے' ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک نظریہ رکھنے والا دوسرے نظریہ کے ادب اور زندگی سے کبھی متفق نہ ہوگا'

اکثرین کا خیال ہے کہ یہ دُنیا خردمندوں کی دُنیا ہے' لیکن تعجب یہ ہے کہ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک دوسرے سے کبھی متفق نہیں ہو سکتے برسرِ پیکار ہیں' اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ہم ماحول کو نظر انداز کر جاتے ہیں' میں اکثر افراد سے ملا ہوں جن کا نظریہ ادب برائے ادب ہے' گفتگو کے دوران میں مغربی ادیبوں میں انھوں نے قدیم و 27 جدید سب ہی کو سراہا' جب ہومر کا تذکرہ آتا ہے' مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے ہیں' اور ہومر کی خوبیوں میں محو ہو جاتے ہیں' اس کے بعد سیفو کو اور ساتھ ہی وہ پنڈار کو بھی سراہتے ہیں' حالانکہ پنڈار' سیفو اور ہومر دونوں سے مختلف ہے' اس کا موضوع وہی ہے جو اُس زمانہ کے شعراء کا خصوصاً کسانوں اور غریبوں سے متعلق' لیکن اگر کوئی آجکل اس معیار کی شاعری خلق کرنے لگے تو لوگ اُسے پسند نہیں کریں گے ۔ مغربی ہو یا مشرقی' پرانی شاعری کے لئے اب ماحول سازگار نہیں کس قدر دلچسپ بات ہے کہ ایک طرف وہ شاعری کو ماحول سے بالکل الگ قرار دیتے ہیں' اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ اب ماحول ایسی نظموں کی اجازت نہیں دیتا ۔ خود ہی وہ ایک چیز کی تائید کرتے ہیں اور خود ہی تردید۔

اس کے بعد ان کی نظر جاتی ہے بائرن' کیٹس اور شیلے پر' اسی زمرہ میں وہ ورڈز ورتھ اور کالیرج کو بھی شامل کر لیتے ہیں' کالیرج کی نظموں پر سر دھنتے ہیں' ورڈز ورتھ کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں' حالانکہ کالیرج اور ورڈز ورتھ' کیٹس اور شیلے سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے' ہر شخص ان میں سے ایک خاص زاویہ سے سوچنے کا عادی ہے اور ایک خاص لہجہ میں لکھنے کا' پھر بھی یہ سب کو سراہتے ہیں' سب میں فنی خوبیاں

دیکھتے ہیں' اور اپنی زبان میں اس قسم کا ادب پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ اس متضاد اور بے تکے طرزِ عمل کو دیکھ کر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان معترضین کے خیالات اپنے نہیں' دماغ اپنا نہیں' اور اعتراضات' بس ایک مشغلہ ہے' ایک ضد اور اس کے سوا کچھ نہیں' انھیں ملٹن جیسے مذہبی آدمی بھی پسند ہیں' ٹینی سن بھی' یہ بھی' اور وہ بھی' انھیں ساری دُنیا پسند ہے' لیکن اگر کوئی پسند نہیں تو موجودہ "ادب برائے زندگی" کا نظریّہ رکھنے والے' حالانکہ نئے ادب والوں کو افادیت کا ایک مفہوم حاصل ہے اور ان میں سے کوئی ماحول کے افادی تقاضوں کے خلاف نہیں۔

ادب ماحول کا پرتو اور زندگی کی ایک گہری تنقید ہے' یہ پرتو اور تنقید زندگی پر غیر محسوس افادی شان سے منعکس ہوتی ہے' ورنہ ادب کی اور کیا قیمت ہے' مانا کہ لطیف جذبات کی عکس کشی بھی ضروری ہے' پیریکلین کا ریتھنر بن سکتا ہے لیکن آخری دن کے لئے۔ کیا حسین مجسموں کو ہمیشہ دیکھا جا سکتا ہے' کیا ان سے ہمیشہ دل بہلایا جا سکتا ہے' اور اگر بہلایا بھی جا سکتا ہے تو یہ دل بہلاوہ اس طبقہ تک محدود ہے جو Holmes ..... کا قائل ہے' جن کا مقولہ زندگی میں محض عیش و عشرت کی تلاش ہے اور بس' اس کے بعد بھی کچھ طبقات ہیں اور ان طبقوں کی زندگی' ادب اک ہمہ گیری اور ابدیت ہے تو اسے کامل زندگی یعنی انسانی سماج اور ممکن طور پر قدرت کے پُراسرار حقائق کا نقاش اور آئینہ دار ہونا چاہئے۔ ہر نسل کو ادب محض اس لئے سونپا جاتا ہے کہ وہ اُس میں کچھ اضافہ کر سکے' لیکن اگر ہر شخص میر اور غالب ہی بننے کی کوشش کرے (حالانکہ یہ بھی ممکن نہ ہو سکا) تو ادب میں کیا اضافہ ہوگا اور پھر یہ بھی مشکل ہے' ہر شخص ان کی تقلید میں فانی نہیں ہو سکتا ان مجسموں کی تشکیل کا تبدیل کرنا بھی تو ضروری ہے' ہم اپنی شاعری کا نیا دور حالی اور آزاد سے شروع کرتے ہیں' لیکن یہ دونوں حسن و عشق سے نہیں کھیلتے' ان میں سے ایک کے دماغ پر بھی عورت سوار نہیں' یعنی ان بزرگوں کی "محبت" کو شاعری سے ماورا' ایک دوسری شے سمجھنا پڑے گا۔ کیا دلچسپ بات ہے کہ "ادب برائے ادب" کے حامی' آزاد اور حالی کو سراہتے ہیں!؟

مغربی تعلیم کی بدولت ہماری زندگی میں چند چیزوں کا اضافہ ہوا' جہاں معاشی اور سیاسی نظریّے بدلے وہاں جنسی نظریات میں بھی تغیّر ہوا یہ تغیّر برابر جاری ہے' اسی لئے جو شے آجکل سب سے زیادہ سطح اور عمق دونوں جگہ کار فرما نظر آ رہی ہے' وہ جنسی تعلیم اور مغربی ادب کے تاثرات ہیں' مخلوط طریقہ تعلیم ہندوستان میں نیا ہے اور مغربی ادب بھی' مغربی ادب کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ ایک زاویہ قائمہ بناتا ہے' کوئی چیز "..... جو زندگی سے متعلق ہے وہ ادب سے بچ کر نہیں رہتی' جوں کی توں ادب میں موجود ہے' ہمارے نئے ادیب اس نئی نوعیت سے متاثر ہیں' جنسی بھوک' ہم میں ہمیشہ سے موجود تھی' اور ہمیشہ موجود رہیگی' لیکن اب موجودہ دور میں بیرونی تاثرات نے اس بھوک کو بیدار کر دیا ہے جس قدر نوجوان اور نو تعمیر ماحول کے نئے تاثرات ہیں وہ براہ راست ادب پر پرتو فگن ہیں؛ اب انھیں کوئی روک نہیں سکتا۔ وہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں جو انھیں روکنے کی کوشش کرتے ہیں' ہونا یہ چاہئے کہ یا تو ان ضرورتوں کو پورا کیا جائے یا پھر طریقۂ زندگی بدلا جائے طوفان کہیں کچی دیواروں سے بھی رُکا ہے۔

اگرچہ شاعری میں ابھی زیادہ عریانی نہیں آئی' لیکن ہم دیکھ رہے ہیں' کہ افسانہ نگاری میں دن بدن عریانی بڑھتی چلی جا رہی ہے' ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے افسانے محض فیشن کے طور پر لکھ رہے ہوں' لیکن جو لوگ محض فیشن کے طور پر لکھ سکتے ہیں اُن کی دُنیائے ادب میں کوئی جگہ نہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اس میدان میں کامیاب سمجھے جاتے ہیں' ان کی دلی آواز ہے اُسے بُرائی پر محمول کرنا زیادتی ہے جدید شعور نے اخلاق کی قدروں کو تبدیل کر دیا ہے اور اب سماج و ماحول ایک نئی تبدیلی چاہتے ہیں' اب فرد وہ چیز چاہتا ہے جس کی اُسے ضرورت ہے' موجودہ نظام نے انسان کو ایک حد تک بے باک کر دیا ہے' فرد کے دل سے خوف تقریباً نکل چکا ہے' زندگی اپنے حقوق علی الاعلان مانگ رہی ہے' اسے لکھنے والوں کی زیادتی اور ماحول و نظام کی خرابی سمجھنا جان بوجھ کر واقعات سے آنکھیں بند کر لینا ہے' میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ صاحب جو کچھ نئے افسانہ نگار لکھ رہے ہیں وہ ہے تو درست لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اُسے منظرِ عام پر بھی لایا جائے' اور بہو بیٹیوں کو ان باتوں سے روشناس کرایا جائے جن سے اب تک وہ واقف نہیں ہیں' ان کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ نئے ادب میں پیش کیا جا رہا ہے وہ ماحول کے ان گوشوں کا پرتو ہے جن پر سے کبھی حجابات نہیں اُٹھے تھے' اگر اس کو غلاظت سے تعبیر کیا جائے تو یہ غلاظت کوئی نئے ادب کی پیداوار نہیں ہے' سماج کا اپنا پُرانا ملغوبہ ہے' موجودہ ادب صرف اتنا کرتا ہے کہ جو غلاظت اب تک نظروں سے اوجھل تھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسروں کو ترغیب دیتا ہے کہ اس کو صاف کرو' اب لوگ اُسے صاف کرنے کے بجائے شہرت دیتے پھریں تو یہ ان کا فعل ہے' اور وہ اپنے فعل کے مختار ہیں!؟

نئی تعلیم' نئے ادب' اور نئے طور طریق نے ہمارے لئے نیا ماحول

تیار کیا ہے، ہم اور ہمارے ادیب وہی پیش کر رہے ہیں جو اس ماحول سے تعلق رکھتا ہے، آج سے پہلے کبھی کسی نے اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا تھا ان احساسات اور جذبات کو نہیں چھُوا تھا، ان رجحانات کی نمائندگی نہیں کی تھی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پُرانے لوگ ان سے واقف تھے اور وہ جان بوجھ کر ان سے کنارہ کرتے تھے بلکہ یہ کہ وہ ان سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کی اہمیت سمجھتے تھے آج سے پہلے ہندوستان کو اپنی غلامی کا اتنا احساس نہ تھا جتنا اب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آج سے پہلے اس شے کے ذائقہ سے واقف نہ تھا، اسے آزادی کے لُطف اور غلامی کی تکلیف کا تقابل کرنا نہیں آیا تھا۔ اور نہ اس کے سامنے اس کی کوئی مثال تھی۔

میں یہاں کوئی سیاسی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا، مگر ہاں جنسی تعلیم کا مسئلہ میرے خیال میں اپنی جگہ نہایت اہم ہے، ہماری سوسائٹی اس مسئلہ سے کتنی ہی بیگانہ و غافل رہی ہو لیکن موجودہ ماحول میں جنسی تعلیم کی زندگی کے لئے اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اخلاقی تعلیم کی، اس جذبہ کا منبع اک نیا بنتا ہوا سماج ہے اور ماخذ بیرونی ادبیات جنھوں نے ہمارے ذہنوں کی ساخت و پرداخت اور رہبری میں کافی امداد کی ہے۔

ہندوستانی ادیب مغربی خیالات میں جن چیزوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے وہ موجودہ روسی نظریہ ہے، ہمارے اکثر افسانہ نگاروں کا طرزِ تحریر ٹالسٹائے، چیخوف یا تورگنیف کا سا نہیں، گورکی کا سا ہے، گورکی پہلا روسی مصنف ہے جس کے طرزِ تحریر میں بے باکی ہے، اسلوبِ بیان سیدھا سادھا ہونے کے علاوہ لوگ ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور موپاساں سے بھی بہت کچھ متاثر ہیں، خاصکر ملک میں "مخلوط تعلیم" کے بعد عورتوں کی بالکل دوسری فضا پیدا ہو گئی ہے، ایک پوری قوم نے جس نے زندگی میں دوش بدوش زندگی نہیں گزاری تھی، وقت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک نئی زندگی کی طرف قدم اٹھایا، مگر جھجک کے ساتھ، مخلوط تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ مرد اور عورت بے تکلف کلچرل تعلیم و تہذیب کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے ایک مرکز پر مجتمع ہوں، علاوہ جنسی احساسات کے وہ اجتماعی احساسات اور سیاسی ضروریات کو محسوس کر سکیں، ایک دوسرے کی نفسیات سے واقف ہو جائیں، لیکن اس کے برخلاف تجربہ ناقص طور پر کیا گیا یعنی لڑکیوں کو جدا جدا حلقوں میں رکھا گیا، ان پر شدید پابندیاں عائد کی گئیں، اور کسی نوعیت سے اتنی آزادی نہیں دی گئی جو انھیں مسکن کہہ کے جنسیات سے بلند کر دیتی، مخلوط تعلیم اک مخلوط زندگی کے استحکام اور تکمیل کے بعد کی چیز ہے، جن قوموں میں پردہ ہے اور زندگی پردہ کے پیچھے اُن کی عورتوں کو یا تو مخلوط تعلیم اختیار نہیں کرنی چاہئے یا پھر اس نسل میں پیدا ہونے والے تمام نتائج کو برداشت کرنا چاہئے اگر سماج ایسے نئے اخلاقی مفروضات فرض کرے جو ظاہر ہے کہ قدیم سوسائٹی کے اخلاقی نظریوں سے بالکل مختلف ہوں گے لیکن نئی زندگی کا ساتھ دے سکیں گے تو سماج امن و راحت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

انھیں اخلاقی نظریوں میں سے ایک "جنسی تعلیم" کا مسئلہ بھی ہے لڑکیوں کا تو ذکر ہی کیا، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی صاحبزادے بھی حیات کے ان "اسرار و رموز" سے اتنے ہی ناواقف ہیں جتنی کہ اس معصوم یا بالفاظ دیگر جاہل ملک کی لڑکیاں۔

اسی بنیادی نظریہ کی بنا پر ہمارے بعض نئے لکھنے والے، جنسی حقائق کے رُخ سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، دو تین سال کے اندر اندر جنسی مسائل کی بنیاد پر چند افسانے لکھے گئے، یہ ایک ناقص کوشش تھی، ان افسانوں میں تلذذ کا عنصر نمایاں ہے، نتیجہ خیزی کا جذبہ موجود نہیں، لیکن بہرحال ان ناقص کوششوں کے پس منظر میں نئے ارادے جھلکتے ہیں، میری رائے میں ان حضرات کو زیادہ غور و فکر کے بعد بجائے ایک وقتی نشاط و تلذذ کے نتیجہ خیزی کے عنصر کو ادب میں فروغ دینا چاہئے۔

یہ خام سماج جس کا کوئی حصہ مکمل اور پختہ نہیں ہے، ہر گوشہ میں ہر شخص سے اس کے حصہ کے مطابق تعمیری سامانوں کے لئے ندا دے رہا ہے، اس ندا کو سُننا اور سامان فراہم کرنا ہی تعمیری فریضہ کی تکمیل کرنا ہے، اور اس کے لئے سب سے زیادہ اس عہد کے ادیب ذمہ دار ہیں۔

ماہرینِ تعلیم اگر ایک طرف عقلمندی کا ثبوت دینا چاہتے تھے تو دوسری طرف انھوں نے انتہائی بیوقوفی کا ثبوت بھی دیا، مخلوط تعلیم کو ضروری سمجھا گیا اور اس کی ابتدا کر دی گئی، لیکن اس کے ابتدائی اثرات سے گھبرا کر انھوں نے چند پابندیاں عائد کرنی چاہیں جنھوں نے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو غلط راستوں پر ڈال دیا اور جس کے نتائج بڑھنے لگے، انھیں حادثات اور تعلقات کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑا، اب یہ اثر اتنا گہرا ہو چلا ہے کہ اگر ان چیزوں اور طریقوں کا رُخ نہ بدلا گیا تو وہ دن دور نہیں جب موجودہ نسل سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو جائیگی، اور یہ سارا ڈھونگ جو موجودہ دور کے نیتاؤں نے رچایا ہے خاک میں مل کر رہ جائے گا۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اب موجودہ دور کے شعراء کو یقین

ہو چلا ہے کہ صنفِ شعر کوئی محدود چیز سے وابستہ نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس کا زندگی سے تعلق ہے موضوعِ شعر بن سکتی ہے۔ اب شعراء کسانوں پر بھی نظم لکھتے ہیں اور کھیتوں پر بھی، جنسی احساسات پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں، جنسی خرابیوں پر بھی۔ جتنا انھیں ایک معشوق کے حنائی رخسار، سیاہ پُتلیاں، عرق آلود جبیں پسند ہے، اتنے ہی انھیں جنگلوں میں شبنم آلود شاخیں، قوس و قزح کی رنگینی اور شفق کے آثار چڑھاؤ پسند ہیں، اب ان کی شاعری کا میدان محدود نہیں رہا۔ ان کے لئے ساری دُنیا موضوعِ شعر بن سکتی ہے۔ زندگی ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اسی لئے شعر بھی ساری دُنیا کا احاطہ کرتا جا رہا ہے اور اسے کرنا چاہیئے۔

وہ لوگ جو زندگی اور ادب سے واقف ہونے پر بھی ادب برائے ادب کے قائل ہیں غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ لایعنی باتوں کو نظم کیا جائے۔ ایسی باتیں کی جائیں جو لطیف احساسات کو اس طرح ابھاریں کہ خود احساسات کو نہ معلوم ہو سکے کہ کیوں اُبھر رہے ہیں۔ ایسی باتیں کی جائیں جن پر خواہ مخواہ سر دُھنتے رہیں، اور یا پھر باؤلوں کی طرح ہنستے رہیں، ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کچھ ایسی لغو ترکیبیں ہیں کہ جن پر بحث کرنے والوں کو قانوناً سزا دینی چاہیئے، یا پھر ان لوگوں کو جو ادب برائے ادب
۳۰ کے نظریہ پر مصر ہیں انھیں چاہیئے کہ کچھ حدود قائم کریں کہ یہاں سے ادب برائے ادب شروع ہونا چاہیئے، اور اس کی واضح تشریح کریں۔ اپنے مفہوم کو خبط کرنے کے بجائے انھیں چاہیئے کہ واضح طور پر مفہوم کو بیان کریں اس نظریہ کے ماننے والے اتنے دلچسپ ہیں کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس نظریہ کی توضیح نہیں کرتے، دوسری طرف جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں اس میں وہی ترکیبیں وہی تشبیہیں، وہی استعارے، اور وہی بندشیں استعمال کرتے ہیں جو موجودہ ضرورت زندگی کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں، بالفاظ دیگر وہ بھی اسی خیال کے قائل ہیں جو آجکل محفوظ و وسیع ہو رہا ہے، لیکن چونکہ وہ اس سے انکار کر چکے ہیں، اب اسے کسی نہ کسی طرح نبھا رہے ہیں۔

کسی نقاد کا فرض یہ نہیں کہ وہ اصنافِ سخن کی تقسیم کرے، بلکہ یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے اُسے جانچے، دیکھے کہ کہنے والا جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس میں کہاں تک کامیاب ہے، ادب خوبصورت جلدیں بندھوا کر الماریوں میں رکھنے کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ براہِ راست زندگی سے متعلق ایک حقیقت ہے جو زندگی سے اثر لیتا بھی ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔

آج ہم روسو اور والٹیر کی تحریروں کو اس نظریہ سے نہیں دیکھتے کہ الماری میں رکھی ہوئی ان کی جلدیں کتنی حسین معلوم ہوتی ہیں، بلکہ اس نے پچھلے دور میں لوگوں کی ذہنیت پر کتنا اثر ڈالا ہے، انقلابِ فرانس اس کی بیّن دلیل ہے، وہ انقلاب جسے انقلاب فرانس سے تعبیر کیا جاتا ہے بڑی حد تک روسو اور والٹیر کی تحریروں کا مرہونِ منت تھا۔

جس چیز سے لوگ چڑتے ہیں وہ غالباً پروپیگنڈا ہے۔ بیشک ادب کو پروپیگنڈے کے رنگ میں پیش نہیں کرنا چاہیئے، بیشک اسے دیوار پر چسپاں کرنے والا اشتہار نہیں بنانا چاہیئے، لیکن مفہوم کے اعتبار سے وہ ہوگا ہر حال میں پروپیگنڈا ہی، جس طرح دُنیا میں اور دُنیاوی قسم کی چیزوں کی قسمیں ہیں، اسی طرح ادب کی بھی اقسام ہو سکتی ہیں، لیکن ان اقسام کو جدا جدا حد میں قائم کرنا تنقید نگار کے ذمہ نہیں، تنقید نگار انھیں ایک خاص عینک سے دیکھ کر اس کی کامیابی یا ناکامی کا اعلان کر سکتا ہے۔

فرض کیجئے ایک شخص شیشم کے درخت کی توصیف میں یا اس کے حُسن پر کچھ لکھتا ہے، اب نقاد کا فرض یہ نہیں کہ وہ لکھنے پر لے دے کرے، کہ اس نے اس درخت جیسی چیز پر کیوں قلم اُٹھایا جس کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں، یہ رویّہ غلط ہے، بلکہ ادب اور تنقید کے میدان میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ نقاد کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ دیکھے جو کچھ شیشم کے درخت کے بارے میں کہا گیا ہے وہ کہاں تک حقیقت کی کسوٹی پر صحیح اُترتا ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ لکھنے کے لئے درخت مخصوص کرے اور ان کا انتخاب کرے، بلکہ صرف لکھی ہوئی چیز کو جانچنا ہے، اگر لکھنے والا اپنے بیان میں ہر لحاظ سے کامیاب ہے تو اُسے اُس پر انگلی اٹھانے کا کوئی حق نہیں اور اگر کامیاب نہیں تو وہ اشارہ کر سکتا ہے کہ لکھنے والا فلاں جگہ ٹھوکر کھا گیا ہے۔

جن چیزوں کی بقا کی دُنیا کو ضرورت نہیں ہوتی چاہے انھیں فنا کیا جائے یا نہ کیا جائے وہ خود بخود فنا ہو جاتی ہیں اور جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ اسی طرح اس وقت تک برقرار رہتی ہیں جب تک ان کی ضرورت رہتی ہے۔ اگر ہم دورِ جدید کے مادّی نظریہ پر یقین رکھیں اور تنازع للبقا کے مسئلہ کو مانیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بہت سے جانور جن کے وجود کا ثبوت سائنسی دُنیا دیتی ہے، اب ہماری دُنیا میں موجود نہیں، عجیب الخلقت جانور، جسیم اور بے ڈھنگے جانور! میرا مقصد یہ ہے کہ فطرت ایک عظیم آرٹسٹ اور فن کار ہے، جس قدر بے ڈھنگے جانور ہو سکتے تھے انھیں ختم کر دیا گیا، یا فطرت کے تقاضہ سے خود بخود ختم ہو گئے۔ میں اپنے اس خیال کو کلیہ قرار دینا نہیں چاہتا، ہاں اتنا ضرور ہے فطرت کے زیرِ تحت اکثر چیزیں خواہ چرند ہوں یا پرند جو فطری زندگی بسر کرتے ہیں ان میں اکثر حسین ہیں، کچھ جانور اپنے افعال کے لحاظ سے بھیانک اور خوفناک ہو سکتے ہیں، لیکن ان کے حُسن میں کلام نہیں۔

اسی طرح ہماری دُنیا سے پہلے بھی دُنیا آباد تھی، اور ہم سے پہلے گزرنے والے انسانوں نے بھی اپنے آرام کے لئے کچھ چیزیں ایجاد کی تھیں ان میں بہت سی ایسی ہیں جن سے ہم واقف نہیں، اور اکثر ایسی ہیں، جو آجتک ہمارے استعمال میں آرہی ہیں، ہو سکتا ہے کوئی کہے کہ جو چیزیں اب استعمال نہیں وہ ایسی ہیں جو انسان کے قبضۂ قدرت سے باہر نکل گئی تھیں اور کچھ حادثات نے انھیں انسانوں کی نظر سے چھپایا جس سے رفتہ رفتہ وہ بے بہرہ اور ناواقف ہو گئے - یہ ایک حدتک درست ہو سکتا ہے اور وہ بھی اس حدتک کہ کچھ فطری حادثات نے انھیں انسان کی نظر سے چھپا دیا، لیکن ایسا کیوں ہے، انسان انھیں رفتہ رفتہ بھول گیا اور پھر کبھی استعمال میں نہ لاسکا، وجہ صاف اور بیّن ہے، حادثات سے بچے ہوئے انسانوں نے محض انھیں چیزوں کو استعمال کیا جو وقت کی ضرورت کے تحت میں آتی تھیں، اور باقی چیزوں کو محض فضولیات سمجھ کر انھیں فراموش کر دیا -

کسی قوم کے مہذب ہونے کے معنی آجتک اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان نے فضولیات میں کافی ترقی کرلی ہو، جہاں تک انسان کی ابتدائی اور بنیادی ضرورتوں کا تعلق ہے وہ ہر طرح پوری ہوتی رہی ہیں، آج سے ایک ہزار برس پہلے کے لوگ بھی اسی طرح زندہ تھے

لیکن وہ اتنے مہذب نہ تھے جتنے ہم ہیں، یعنی وہ ہماری طرح فضولیات میں نہیں پڑے تھے - ہماری تہذیب ہی تو ہے کہ ہم بیجا تکلفات میں اُلجھے ہوئے ہیں، اور انھیں روز بروز بڑھاتے چلے جا رہے ہیں، حاصل کلام یہ ہے کہ جن چیزوں کی وقعت اور دُنیا کو ضرورت نہیں ہوتی وہ خود بخود فنا ہو جاتی ہیں -

اُن خطوط اور طریقۂ تحریر ہی کو لیجئے جو کبھی کبھی مصر کی پُرانی عمارتوں چٹانوں، اور پُرانے پتھروں پر نظر آجاتی ہیں - آج ہیروگلیفی طرز تحریر کی کسے ضرورت ہے اور اس کے علاوہ وہ ذراسی بات کو تصویروں میں نمایاں کرنے اور تصویروں کے ذریعہ بات کرنے کا طریقہ بھی اب ہماری دُنیا میں رائج نہیں - وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اب ہمارے پاس اس سے سہل طریقۂ تحریر اظہار مطالب کے لئے آگیا ہے، یا پھر یوں کہئے کہ اب ہمیں ان طریقوں کی ضرورت نہیں رہی، ان تمام چیزوں کو ہم نے جان بوجھ کر نہیں چھوڑا بلکہ زمانے اور وقت نے ہم سے چھین لیا اور ہم مجبور ہو گئے کہ اسے خیرباد کہدیں، اور یہی چیز اور مقولہ ہماری اس دنیا میں درست ثابت ہو سکتا ہے اور ہمارے موجودہ رجحانات پر صادق آسکتا ہے جو ہمیں موجودہ اردو کے کھنڈرات اور ایلورا ایجنٹا کے غار ہمارے لئے اب اس سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ وہ ہماری پارینہ داستان کا ایک ورق ہے، اور یہی چیز ادب اور آرٹ سب کے لئے درست ہے، گزشتہ دور کا تمام ادب، تمام فن اور تمام صنائع اس سے زیادہ ہمیں کیا بتاتے ہیں کہ اس دور کے انسانوں کا مذاق زندگی یہ تھا -

غرضیکہ ہستی کا پورا تناسخ ہمیشہ اور ہر وقت اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اور اسی کے مطابق وجود میں آتا ہے، ہم نے اکثر پاگلوں کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی پیداوار نہ تھے یا یہ کہ وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئے تھے، اور اس واسطے زمانہ نے ان کی قدر نہ کی، نہ صرف بادشاہوں بلکہ شعراء کے بارے میں بھی یہ سُننے میں آیا ہے، غالب اور نظیر دونوں اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے اور اس واسطے ان کے دور کے لوگوں نے ان کی کوئی اہمیت نہ سمجھی، اور جس طرح ان کے ساتھ برتاؤ کرنا چاہئے تھا اس طرح نہیں کیا -

میتھیو آرنلڈ کے خیال کے مطابق ادب تنقید حیات ہے وہ ادب جو محض چند احساسات لطیفہ کو ابھار سکے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی مصرف نہ ہو، ماحول کی پیداوار نہیں ہو سکتا، اور پھر اگر ایک شخص اس قسم کا ادب پیش کرے تو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن اگر ہر شخص ایسی بے معنی باتیں کرنے لگے تو اسے کہاں تک برداشت کیا جاسکتا ہے -

دورِ جدید کے ادب سے ہماری مراد وہ ادب نہیں جو تفریحاً لکھا جا رہا ہے یا ایسا ادب جس کا تخریبی پہلو ہے لیکن بے معنی - اس میں شک نہیں کہ ہر وہ ادب جو کسی نئی دنیا کا پیغام لیکر آئے ایک حدتک یا ابتدا میں تخریبی ہوتا ہے لیکن اپنے مقاصد کے لحاظ سے ہمیشہ تعمیری ہوتا ہے، کچھ لوگ یا موجودہ ادب کے نمائندے محض تقلید میں ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں جن میں عریانی ہوتی ہے لیکن بے معنی عریانی جیسا کہ میں نے شروع میں کہا نئے ادب میں محض اس لئے آئی کہ ہم نے اپنے لکھنے والوں کے احساسات کو بیدار ضرور کیا لیکن انھیں خاطر خواہ طریقہ پر تسلی نہ دے سکے، ہم نے انسانی احساسات کو جگایا ضرور لیکن اس بات کا احساس نہیں کیا کہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں، اور یہی وجہ ہے اب ہم ایسی چیزیں پڑھ رہے اور دیکھ رہے ہیں جن کی ہمیں کبھی توقع نہ تھی -

ادب کے لئے کوئی عنوان مقرر کرنا، دراصل ادیب سے توقع رکھنا کہ اس کے علاوہ کسی اور موضوع کی طرف جا ہی نہیں سکتا صریحاً زیادتی،

شاعر اور ادیب دونوں کی نظر میں پوری کائنات ہے اور اس کائنات میں
انھیں پوری آزادی حاصل ہے کہ موضوع سخن کیلئے وہ جو چاہے جو شعبہ
چھانٹ لیں لیکن اتنے پر بھی یہ دونوں شخصیتیں عوام سے اپنا دامن نہیں
چھڑا سکتیں، شاعر اور ادیب دونوں عوام کی ملکیت ہوتی ہیں، اگر کلیتاً
نہیں تو ایک حد تک ضرور، اس لحاظ سے انھیں عوام کے مذاق کا خیال
بھی رکھنا پڑ گیا۔ عوام زندگی کی نفاست پر بھی غور کرتے ہیں، اس کے
علاوہ یہ کہ زندگی کی مشکلات کیا ہیں کوئی بھی منظر عام پر لا دینا پسند
نہیں کرے گا، یا کوئی بھی یہ نہیں چاہیگا کہ کہیں ایسی جگہ کھڑے ہو کر جہاں
سے سب دیکھ سکتے ہوں اور سن سکتے ہوں رقص عریاں شروع کر دے،
اس حالت میں اگر ادبی میدان میں آکر زندگی کی نفاست کو نظر انداز
کر دیا جائے تو یہ ایک زیادتی ہے جسے کوئی بھی برداشت نہیں کریگا۔
ادب کے متعلق جس نظریہ کا قائل ایک فہیم آدمی کو ہونا چاہیئے
وہ یہ ہے کہ جو بات بھی کہی جائے چاہے وہ زندگی کی کیسے رکیک
حرکت سے متعلق ہو وہ نہایت حسین اور دلکش پیرایہ میں ہو، بقول شخصے
اگر گالی بھی دیجائے تو وہ خوبصورت طریقے پر دی جائے۔
اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی نظریے کبھی ایک
مقام پر آکر متفق نہیں ہو سکتے، لیکن ہاں طریقہ کار ایسا اختیار کیا جا سکتا ۳۲
ہے جہاں یہ محسوس ہو کہ کسی کی دل آزاری نہیں ہو رہی، وہ لوگ جو
ادب برائے ادب کے شدت کے ساتھ قائل ہیں وہ بھی ایک منزل ایسی
آتی ہے جہاں حیات کے لئے کشمکش کرنے لگتے ہیں اور مجبور ہوتے ہیں
کہ اس کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکیں یا یہ کہ اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے آسکر وائلڈ
ایک ایسا شخص جو اعلانیہ ادب برائے ادب کا قائل تھا وہ بھی زندگی
کی حدود سے نکل کر نہیں جا سکا، اگر آسکر وائلڈ ہی کے نظریہ سے دیکھا
جائے اور اس کو مثال بنایا جائے تو ادب برائے ادب کے
(Dorian Gray) نظریہ ہوا، اس کا (Hedonist.)
کا ایک بہت بڑا کردار اگر کوئی تلقین کرتا ہے تو وہی کہ زندگی عیش و
عشرت ہی کا نام ہے، لیکن وائلڈ کا یہ نظریہ کچھ زیادہ مقبول نہ ہو سکا
اور اس کے (De Profundis.) پڑھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ وائلڈ اپنے اس نظریہ پر خود بھی نادم ہے، بہرکیف
جو کچھ بھی ہو ادب کے منہ میں ایک لگام ہونی چاہیئے، ادب کو اخلاق
کے معیار سے نہیں گرنا چاہیئے، یہاں تک کہ اگر وہ مذموم انسانی حرکتوں
کی تصویر کشی بھی کرتا ہے تو ایک خاص دائرہ کے اندر رہ کر، ایک
خاص انداز کے ساتھ کہ انسانی قباحتیں بھی حسن میں تبدیل ہو جائیں
اور انسان کے دل میں کچوکے دیں۔
ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ چیزیں جن کی انسان کو ضرورت نہیں
ہوتی خود بخود ختم ہو جاتی ہیں، ان پر وقت صرف کرنے کی اور انھیں مٹانے
کے لئے کوشش کرنے کی سر توڑ کوشش قطعاً بیکار ہے، زمانہ ان
چیزوں کو خود مٹا دیتا ہے۔
ہر زمانہ کا ادب اسی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن اپنے دور کی
یاد دلانے کے لئے اس کا ہونا ضروری ہے، آج کسی کو ضرورت محسوس
نہیں ہوتی کہ فردوسی کی طرح قلم لیکر بیٹھے اور ۳۵ سال صرف ایک
شاہنامہ پر صرف کر دے لیکن اتنے پر بھی نہ فردوسی کو موت آئی اور نہ
شاہنامہ کی اہمیت ختم ہوئی، اگرچہ اب کوئی اس کی تقلید نہیں کرتا،
نقاد کے قلم کو غیر جانبدار اور تعصب سے پاک ہونا چاہیئے اور
جس کا جتنا حصہ ہو اتنا اسے پہنچا دینا چاہیئے، ورنہ دنیا خود اس
کا حق اسے پہنچا دیگی۔

نیا راگ

تعداد میں کمی معیار میں اضافہ

ایشیا میں سیاسی عنصر پہلے سے کہیں اہمیت کے ساتھ ہوگا لیکن تنقیدی ادب اور سیاسی عنصر کی مقدار ہم وزن کردی جائیگی۔ شاعری لاکھ بیکار سہی، پھر بھی بیکار شے نہیں، اسکے اثرات ذہن ہی پر نہیں، روح پر بھی ہوتے ہیں، یہ انسان کی جمالیاتی حس کی مشاطہ ہے، اور تمدنی زندگی میں ترتیب و حسن کے احساس کو بیدار کرتی ہے، مگر مجھے ماننا پڑیگا کہ اُردو شاعری میں چند شعرا کو محفوظ کر کے کوئی بھی اعلیٰ تخلیق کا فریضہ ادا نہیں کرتا، فضا میں مجموعی ترقی تو محسوس ہوتی ہے یعنی مقدار کی کمی تو نہیں مگر اعلیٰ نوعیت مفقود ہے۔ "نظم معرّیٰ" ہی کو لیجئے اس کی تقلید میں جو بکواس شروع ہوئی ہے تو ہر رسالہ مہملات کی پوٹ معلوم ہوتا ہے کسی کو محنت تو کرنی نہیں پڑتی، جو جی چاہا بکا اور چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ادبی دُنیا جیسے معقول رسالے میں یہ مزخرافات ۷۵ فی صدی چھپنے لگے ہیں۔

شاید کسی زبان میں ادب ایسے عبوری دور سے نہ گذرا ہوگا! ایک طرف ادب کے حقیقی ترقی خواہوں کو رجعت پسند ادیبوں سے اُلجھنا پڑ رہا ہے۔ دوسری طرف نام نہاد ترقی پسندوں سے۔ موجودہ ادب میں "ترقی پسندی" کی ترکیب کی جو درگت ہوئی ہے کبھی اور کسی زبان میں نہوئی ہوگی

۳۴ ہر ابہام، ہر عریانی، ہر بے تکا پن، ترقی پسند ادب ہے۔ جسے دیکھئے وہ گورکی، بوئن گوبرین اور فرائڈ کا ہمسر ہے!

جس ناموزوں طبع کو دیکھئے ایک نظم معرّیٰ کہہ کر جوش و اقبال کو رجعت پسندی کی تہمت دیتا ہے اور خود کو میکفیلڈ وغیرہ کا اُستاد سمجھتا ہے، ان "اُستادوں" کی پونجی کیا ہے؟ صرف تین چار نظمیں جن کو پڑھنے کے بعد ذہن کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا!

ان کے علاوہ ایک گروہ اور بھی ہے جو ترقی پسندی کے مفہوم کو وسیع معنیٰ میں استعمال کرتا ہے، اسکی ضرور خواہش ہے کہ پیہم جد و جہد کے بعد نئے ادب کی تنقیحات قائم کی جائیں، تاکہ اُردو ادب کو ایک صاف راستہ مل جائے۔ یہ گروہ حقیقی تعمیر و تخلیق کے اعلیٰ اور صحیح خطوط بنانے کے لئے کوشاں ہے اس لئے اسے آج بھی ادب کے نئے اور پُرانے ماحولوں پر کنٹرول حاصل ہے اور کل مزید قابو حاصل ہو جائیگا۔

بہر حال جہاں تک نظم کا تعلق ہے، لوگوں کا خیال درست ہے، اسے کم ہونا چاہئیے، کم نظمیں چھپیں مگر وہ تخلیقی نمونے اور کلاسیکل ہوں، نہ مل سکیں تو نہ چھپیں، اس باب سے جو صفحات بچائے جائینگے وہ تنقید میں استعمال ہونگے!

موجودہ نمبر، ستمبر و اکتوبر نمبر ہے۔ اس میں کسی قسم کے حجم کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن نومبر اور دسمبر میں اسکی تلافی کی جائیگی۔

نومبر اور دسمبر دونوں نمبر اپنے مقررہ حجم سے زیادہ صفحات پر شائع کرنے کی سعی کی جائیگی۔ اگر محض ستمبر نمبر شائع کیا جاتا تو مسلسل تاخیر پیدا ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اب کم از کم نومبر نمبر اپنے وقت پر شائع ہوگا۔ امید ہے کہ آپ ہنگامی مجبوریوں کے پیش نظر اس فروگذاشت کو بھی معاف فرما دیں گے۔

ساغر

جوشؔ ملیح آبادی

حرفِ آخر کا ایک اور ورق

خدا - مشاطۂ بہشتی - اور حورانِ بہشتی

(حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے مشہور ڈرامے حرفِ آخر کا یہ وہ منظر ہے جس میں خدا کے سامنے مشاطۂ حورانِ بہشتی احتجاج کر رہی ہے اور پروردگارِ عالم اسے اطمینان دلا رہا ہے کہ حورانِ بہشتی گنہگار انسان کے سپرد نہیں کی جائینگی۔ اور ظالم انسانیت ان کا بال بیکا بھی نہ کرسکے گی۔ مشاطہ یہ سُن کر حوروں کو ساتھ لیکر چلی جاتی ہے۔ حوریں اپنے خیمہ میں پہنچکر نوحہ کرتی ہیں)

(خدا عرش کے حجرہ میں بیٹھا ہوا ہے کہ اتنے میں جبریل دبے پاؤں حاضر ہو کر عرض کرتے ہیں)

جبریل حاضر درِ دولت پہ ہیں حورانِ دل آرا

خدا آنے دو ـــــ اس انسان کے اعمال نے مارا

(کہ حوریں اپنی گھبرائی ہوئی مشاطہ کے پیچھے سہمی سمٹی اور سروں پر حریر کے پلّو ڈالے حاضر ہوتی ہیں اور خدا مشاطہ سے نرمی و ۳۵ متانت کے ساتھ دریافت کرتا ہے)

خدا کیوں ہے اتنی کشمکش کُھل کر ہوآئی ہو کیوں !؟ ان بناتِ کوثر و تسنیم کو لائی ہو کیوں ؟!

مشاطہ داورا کچھ عرض کرنا چاہتی ہے یہ کنیز

خدا یہ کہ کرنا چاہتی ہو حقّ و باطل میں تمیز !؟

(یہ کہتے ہی خدا سر جُھکا لیتا ہے چہرہ پر خود رحمی برسنے لگتی ہے اور پھر دبی زبان سے کہتا ہے)

خدا افسوس کہ انسان نے سب کھیل بگاڑا

(اور پھر مشاطہ کی طرف دیکھ کر)

جس بات کا ہے تم کو قلق مجھ سے بتاؤ ہاں صاف کہو، کُھل کے کہو، خوف نہ کھاؤ

(مشاطہ اس ہمّت افزائی کے بعد)

کیا یہ میری بیٹیاں انسان کو دی جائینگی یہ شرابیں خونیوں کے جام میں پی جائینگی
مَس کرینگے ان مری موجوں کو کیا وہ زشت خو کردگارا، جن کے مُنہ سے خون کی آتی ہے بو
خون میں لتھڑی ہوئی مٹّی کی قرباں گاہ پر کیا چڑھائے جائیں گے یہ خلد کے لعل و گہر
اے خدا، جنّت کو کیا دوزخ میں جھونکا جائے گا آگ کو تسنیم کے پانی سے داغا جائے گا

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر [illegible]

کیا ڈھکیلا جائے گا عصمت کو عصیاں کی طرف — گل ہنکائے جائیں گے خارِ مغیلاں کی طرف
کیا انہیں پتھر سے ٹکرانے کا ہے تجھ کو خیال — خندۂ گل سے بھی پڑجاتے ہیں جن شیشوں میں بال
کیا نگل لیں گی انہیں تاریکیاں انسان کی — جن کے مکھڑوں کی جھلک سے خلد میں ہے چاندنی
آئیں گی قبضہ میں کیا وہ قاتلانِ فرش کے — جوت سے جن کی دمکتے ہیں منارے عرش کے
سونپ دے گا نفس کو یہ دولتِ ماہِ تمام — یہ رموزِ سینۂ جنّت، یہ اسرارِ خیام
جن کے ہاتھوں لوٹیاں جو آکی ہیں گرم فغاں — ان کو دی جائیں گی یہ شبنم کی نازک بیٹیاں
ان کو انساں کے سفینے سے کریگا کیا نڈھال؟ — نرم رو کوثر کی جو لہریں ہیں اے ربِّ جمال؟
کیا تری رحمت یہ چاہے گی کہ اُڑ جائیں حواس — پھول جنّت کا بنے دوزخ کے کانٹوں کا لباس؟
آہنی تاروں میں کیا اے پاسبانِ تنظیم کے — گوندھے جائیں گے یہ موتی کوثر و تسنیم کے
اُن کے دل ہوں گے الٰہی قربِ انساں سے دونیم — چھو سکی ہے آج تک جن کو نہ جنّت کی نسیم
معدلت کی یہ ادائے حق پناہی ہائے ہائے — یہ سزائیں اور یہ جرم بےگناہی ہائے ہائے
ان کے رُخ کی چھوٹ کانپے اور فرشِ خاک پر — جن کی ضو ہو، شمسۂ ایوانِ ہفت افلاک پر
خونیوں کے پہلوؤں میں جذب ہو ان کا شباب — سانس سے جن کی فضائے خلد پیتی ہے شراب!
آدمی کی دھوپ کا کیونکر اُٹھا سکتی ہیں بار — چلتی پھرتی چاندنی راتیں ہیں یہ تو کردگار
دوزخی انسان اور یہ دولتِ خُلدِ بریں — اے خدائے حُسن و برنائی، نہیں، ہرگز نہیں
نوعِ انسانی کا جھولا الحفیظ و الاماں — ٹوٹ جائینگی یہ طوبیٰ کی لچکتی ڈالیاں
اف زمیں کے ذی نفس مرّیخ کی قہاریاں — اے خدا گھٹ گھٹ کے مرجائینگی میری کنواریاں

(تمام حوروں کے آہستہ آہستہ ہچکیاں لینے کی آوازوں سے الوہیت کا خلوت کدہ گونج اُٹھتا ہے اور خدا جلدی جلدی یہ ارشاد فرماتا ہوا چلا جاتا ہے)

خدا: — تڑپتی کیوں ہو، حق رسوا نہ ہوگا — کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا

(پردہ گرجاتا ہے)

نوحۂ حورانِ بہشتی

اپنے کو باغِ خلد میں رسوا کریگا کون — اب کُھل کے آدمی کی تمنا کریگا کون
اک بُت کے اشتیاق کو لاکر زبان پر — قہرِ خدائے پاک گوارا کریگا کون
اب حسبِ مدّعا و بقدرِ جنونِ شوق — اظہارِ آرزوئے تماشا کریگا کون

—— ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

مشّاطہ کے حضور سرِ فرش خوابِ ناز — اب ذکرِ نسلِ آدم و حوّا کرے گا کون

اب چشمِ شوق و جنبشِ مژگاں سے بے دریغ — اک جانِ آرزو کا تقاضہ کرے گا کون

امروز کے دریچۂ حسرت فروش سے — اب انتظارِ خندۂ فردا کرے گا کون

نا پختگانِ فرش پہ ہے عرش کا عتاب — اس آتشِ عتاب کو ٹھنڈا کرے گا کون

تھا کتنے دن سے مقدمِ جاناں کا غلغلہ — اب اس کا ساحلوں پہ اعادہ کریگا کون

کوثر پہ گھر کے آئینگی جب سُرخ بدلیاں — پیاسی زمین کی سمت اشارہ کریگا کون

چھلکی ہے یہ جو پھول سے مکھڑوں کی چاندنی — اس چاندنی کو آکے سہانا کرے گا کون

جس سے ہے خود ہی صاحبِ پیماں کو انحراف — ایسے فسردہ عہد کو ایفا کرے گا کون

"بیکا نہ ہوگا بال بھی" اللہ ری بے کسی — اب پائمالِ رنجشِ بیجا کرے گا کون

اس خیمۂ سکوت کو گلبانگِ کیف سے — رشکِ خروشِ گنبدِ مینا کرے گا کون

اب رہگذارِ جلوۂ و بازارِ حسن میں — نرخِ متاعِ ناز کو بالا کرے گا کون

درمانِ لاعلاج سے تنگ آچکا ہے دل — اب سازو برگِ درد مہیّا کرے گا کون

سُن ہوگیا ہے سینہ ہجومِ ثبات سے — اس جانِ زار کو تہ و بالا کرے گا کون

طوبیٰ کے زیرِ سایہ گھٹاؤں کی گونج میں — اب اہتمامِ ساغر و مینا کرے گا کون

(کہ اتنے میں مشّاطہ جو آڑ سے اس نوحہ کو سُن رہی تھی برافروختہ ہوکر یکایک سامنے آجاتی ہے اور تمام حوروں کو تلخی اور طنز کے ساتھ دیکھ کر کہنا شروع کرتی ہے)

مشّاطہ

افسوس اس خرابۂ عصمت کے سایہ میں — گلکاریاں گناہ کی پیدا کرے گا کون!؟

جنّت میں دیگا کون فرشتوں کو سولیاں — کوثر کو آکے خون کا دریا کریگا کون!؟

معزول کرکے دخترِ شرابِ طہور کو — اعلانِ تاجپوشیٔ دُنیا کرے گا کون!؟

(یہ سُن کر حوریانِ بہشتی اپنے خیمہ سے شرما کر بھاگ جاتی ہیں پردہ گرتا ہے)

جاں نثار اختر

ابھی نہیں

ابھی تو خود ہی سینۂ چمن میں آگ ہے نہاں — بہار ہے تو کیا حرام ہے نشاطِ گلستاں

یہ جشنِ گُل ابھی نہیں! یہ رنگ و بو ابھی نہیں

ابھی تو وقت کے لبوں پہ شعلہ بار راگ ہے — ابھی تو پرفشاں دلِ بشر میں غم کی آگ ہے

نوائے ساز و مطربانِ خوش گلو ابھی نہیں

ابھی تو بجلیوں کی زد پہ خرمنِ وجود ہے — ابھی تو چرخِ زندگی پہ ظلمتوں کا دود ہے

نظارہ سوز مہ وشوں کی آرزو ابھی نہیں

ابھی سفینۂ بشر ہے ظلمتوں کی موج پر — ابھی تلاطمِ حیات ہے کمالِ اوج پر

چراغِ ماہتاب و سیرِ آب جو ابھی نہیں

ابھی تو بحث گرم ہے مسائلِ حیات کی — ابھی تو غیر معتبر ہے شرح کائنات کی

نیاز و ناز کی لطیف گفتگو ابھی نہیں

ابھی تو جامِ ارض سے ہے ایک موجِ خوں بلند — ابھی تو دورِ نو ہے غرقِ شورِ ناوک و کمند

مئے کہن ابھی نہیں! خم و سبو ابھی نہیں

ہم اپنے ملک و قوم کو رکھیں گے کیا سدا غلام — جھکا وہ فرقِ آسماں اُٹھی وہ تیغ بے نیام

جوانیوں کا سر اس قدر لہو ابھی نہیں

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

ادا بدایونی

تعمیرِ نو

شرمندگیٔ کوششِ ناکام کہاں تک
محرومیٔ تقدیر کا الزام کہاں تک

دُنیا کو ضرورت ہے ترے عزمِ جواں کی
سرگشتہ رہیگا صفتِ جام کہاں تک

کب تک ترے ہونٹوں پہ حدیثِ رُخِ تاباں
سر میں ترے سودائے لبِ بام کہاں تک

گیسوئے سیہ تابِ رُخِ صاعقہ پرور
یہ مرگ و حیاتِ سحر و شام کہاں تک

لیلائے حقیقت سے بھی ہو جا کبھی دو چار
خوابوں کی حسیں چھاؤں میں آرام کہاں تک

رُخ گردشِ دوراں کا پلٹ سکتا ہے تو خود
ناداں! گلۂ گردشِ ایام کہاں تک

کب تک ترے سینہ میں خلش تیرِ مژہ کی
یادِ لبِ میگوں سحر و شام کہاں تک

اے ذرّۂ ناچیز! خجل مہر کو کر دے
افتادہ و تفتیدہ و گمنام کہاں تک

جز وہم نہیں قیدِ رہ و رسمِ زمانہ
اے طائرِ آزاد! تہِ دام کہاں تک

صفیہ شمیم ملیح آبادی

مرے لئے

آراستہ ہے صحنِ گلستاں مرے لئے — نغمہ سرا ہیں مرغِ خوش الحاں مرے لئے
روشن ہے میرے واسطے قندیلِ مہر و ماہ — تارے ہیں اوجِ چرخ پہ رقصاں مرے لئے
چلتی ہے سرد بادِ صبا میرے واسطے — آتا ہے روز ابرِ بہاراں مرے لئے
کھلتے ہیں میرے واسطے گلہائے نو بہ نو — شاداب ہے فضائے گلستاں مرے لئے
کھلتی ہے میرے واسطے شفّاف چاندنی — انوار بار ہے مہِ تاباں مرے لئے
رخسارِ گل پہ میرے لئے مضطرب ہے رنگ — روئے گہر پہ آب ہے غلطاں مرے لئے
آتی ہے میرے واسطے گلزار میں بہار — لاتا ہے ابر عیش کا ساماں مرے لئے
کرتی ہے نذر اوس کے موتی خموش رات — گلشن کا عطر بیز ہے داماں مرے لئے
ہر شاخِ گل ہے جام بکف میرے واسطے — ہر باغ ہے بہار بداماں مرے لئے
ہوتا ہے دن کا چہرہ مری خاطر آشکار — رہتی ہے شب کی زلف پریشاں مرے لئے
ساری ہے ایک روحِ بقا کائنات میں — جاری ہیں لاکھ چشمۂ حیواں مرے لئے

میرے لئے وجود میں آیا ہے کُل جہاں
پیدا ہے میرے واسطے پنہاں مرے لئے

سروش عسکری طباطبائی

نیا جہان

اُٹھ کہ پھر تاریکیِ شب سے سحر پیدا کریں — موت کے سینے سے ہستی کے شرر پیدا کریں

تلخیوں میں لذّتِ شہد و شکر پیدا کریں — زہر میں پھر آبِ حیواں کا اثر پیدا کریں

پھر خس و خاشاک سے گلہائے تر پیدا کریں — خاکِ بے مایہ سے پھر لعل و گہر پیدا کریں

طبعِ شاہان و مزاجِ مہوشاں کی کیا بساط — قلبِ یزداں میں در آئے وہ نظر پیدا کریں

جسکی ضو سے جگمگا اُٹھے شبِ تارِ حیات — وہ ہجومِ اخترِ تابندہ تر پیدا کریں

جو ہو بے تعیینِ منزل جو ہو بے قیدِ جہات — کارواں میں وہ نئی روحِ سفر پیدا کریں ۴۱

کوہ ٹکرا دیں جو حائل ہوں کشودِ کار میں — اس طلسمی گنبدِ بے در میں در پیدا کریں

نرم اور سنگین راہوں سے گزرنے کیلئے — آنکھ شبنم کی تو ہیرے کا جگر پیدا کریں

لوچ میں موجِ نسیم اور کاٹ میں تیغِ اصیل — مکتبِ نو سے وہ طفلِ باخبر پیدا کریں

دے سکے انساں کو انساں کی غلامی سے نجات — دُھن کی پکّی ایسی اک نوعِ بشر پیدا کریں

زندگانی کی مسلسل چلچلاتی دھوپ میں — نزہت و رنگینیِ موجِ گہر پیدا کریں

دم میں یہ سارا طلسمِ عہدِ حاضر ٹوٹ جائے — پنجۂ فولاد و ضربِ کارگر پیدا کریں

شکستہ بنیادوں کو ڈھا کر اس جہانِ خام کی
اک جہانِ دیگر و پائندہ تر پیدا کریں

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

راحت سعید

سمندر کی ریتی پہ اک روز میں نے!

سمندر کی ریتی پہ اک روز میں نے
یونہی بیٹھے بیٹھے لکھا نام اس کا
مگر چند موجوں نے ساحل پہ آکر
بہایا مری زندگی کا سہارا !
پھر اک بار ہمت سے کچھ کام لے کر
اسی طرح میں نے وہی نام لکھا
مگر اضطرابِ تموّج نے فوراً
مٹا ڈالا میری محبت کا ثمرا !

کہا اُس نے "ناکام کوشش سے حاصل
بھلا کس نے فانی کو باقی بنایا
مجھے خود عدم کو بسانا پڑے گا
میں چاہوں گی خود نام اپنا مٹانا" !

"بقا مادیّت کو ہے اس جہاں میں
ترا نام تو شہرہ آفاق ہوگا
میں اوراقِ ہفت آسماں پر لکھوں گا
ترے حُسنِ سیرت کا نادر قصیدا
کہیں جب قضا حکمرانی کرے گی
ہماری محبت ہی باقی رہے گی" !

(ای۔ اسپینسر)

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۳ء

اختر الایمان

تنہائی

میرے شانوں پہ ترا سر تھا نگاہیں نمناک
اب تو اک یاد سی باقی ہے تو وہ بھی کیا ہے!!
ذہن پر چھا گیا الجھی ہوئی آہوں کا غبار
سر ہتھیلی پہ دھرے سوچ رہا ہوں بیٹھا
کاش اس وقت کوئی پیر خمیدہ آکر
کسی آزردہ طبیعت کا فسانہ کہتا
کاش اس وقت کوئی مجھ کو سہارا دیتا!
اک دھندلکا سا ہے دم توڑ چکا ہے سورج
دن کے بستر پہ ہیں چھینٹے سے ریاکاری کے
اور مغرب کی فناگاہ میں پھیلا ہوا خون
دبتا جاتا ہے سیاہی کی تہوں کے نیچے
دور تالاب کے نزدیک وہ سوکھی سی ببول
چند ٹوٹے ہوئے ویران مکانوں سے پرے
ہاتھ پھیلائے برہنہ سی کھڑی ہے خاموش
جیسے غربت میں مسافر کو سہارا نہ ملے
اس کے پیچھے سے سسکتا ہوا اک گول سا چاند
ابھرا بے نور شعاعوں کے سفینے کو لئے

میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ اگر تو مل جائے
زندگی گو ہے گرانبار پہ اتنی نہ رہے
ایسے لاکھوں ہیں جو برگشتہ مقدر بھی نہیں
پھر بھی جینے کی تمنا میں مرے جاتے ہیں
میں اگر جی بھی رہا ہوں تو تعجب کیا ہے
مجھ سے لاکھوں ہیں جو بے سود جئے جاتے ہیں
کوئی مرکز ہی نہیں میرے تخیل کے لئے
اس سے کیا فائدہ جیتے رہے اور جی سکے
یوں تو ویران سے ڈھیروں کے سہارے اکثر
جن کا مونس کوئی آنسو ہے نہ بتی نہ دیا
جن کے ملتے ہیں آثارِ نفس، سنگِ مزار
جن کو اکتا کے یہاں جیسے کوئی چھوڑ گیا
پھول ہر رنگ میں کھلتے ہی رہا کرتے ہیں
ایسی بے کیف کشاکش سے مگر حاصل کیا
کون کرتا ہے حمائل انہیں باہوں کی جگہ
خود ہی گرتے ہیں، سنورتے ہیں بکھر جاتے ہیں
اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پہ مچلنے لگے بیتاب سا خوں
اور وہ میری محبت پہ کبھی ہنس نہ سکیں!
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ الجھتا ہوا تاریکی سے
بربریت کے کسی دور میں گم ہو جاؤں
یا کسی گوشۂ اہرام کے سناٹے میں
جا کے خوابیدہ فراعین سے اتنا پوچھوں
ہر زمانے میں کئی تھے کہ خدا ایک ہی تھا
اب تو اتنے ہیں کہ حیراں ہوں کس کو پوجوں
پھر کوئی تازہ کرے آ کے روایاتِ قدیم ۴۴
سو گئے مصر کے معبود خدا جانے کہاں

اب تو مغرب کی فناگاہ میں وہ لوگ نہیں
عکسِ تحریر ہے اک رات کا ہلکا ہلکا
اور پُرسوز دھندلکے سے وہی گول سا چاند
اپنی بے نور شعاعوں کا سفینہ کھیتا
ابھرا غمناک نگاہوں سے مجھے تکتا ہوا
جیسے گھل کر مرے آنسو میں بدل جائیگا
ہاتھ پھیلائے ادھر دیکھ رہی ہے، وہ ببول
سوچتی ہوگی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
آئینہ بن کے شب و روز تکا کرتا ہے
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا

یوں گزارے سے گزر جائینگے دن اپنے بھی
پر یہ حسرت ہی رہیگی کہ گزارے نہ گئے
خون پی پی کے پلا کرتی ہے انگور کی بیل
گر یہی رنگ تمنا ہے تو اب یوں ہی سہی
خون پیتی رہی بڑھتی رہی کونپل کونپل
چھاؤں تاروں کی شگوفوں کو نمو دیتی رہی

نرم شاخوں کو تھپکتے رہے ایام کے ہاتھ
شمعِ اوقات پگھلتی رہی لو دیتی رہی جلتی رہی

اب مگر یاد نہیں کیا تھا مآلِ امید
اس گزرگاہ پہ اب نقشِ کفِ پا بھی نہیں
ایک تحریر ہے ہلکی سی لہو کی باقی
خوشہ چیں ہاتھ بھیانک سی تنومند نظر
دھندلے اوراق پہ ماضی کے اگر کچھ ہے یہی
بیل پھیلتی ہے تو کانٹوں کو چھپا لیتی ہے
زندگی اپنی پریشاں تھی پریشاں ہی رہی

چاہتا یہ تھا مرے زخم کے انگور بندھیں
یہ نہ چاہا تھا مرا جام تہی رہ جائے
ہاتھ پھیلائے ادھر دیکھ رہی ہے، وہ ببول
سوچتی ہوگی کوئی مجھ سا ہے یہ بھی تنہا
ذہن پر چھا گیا الجھی ہوئی آہوں کا غبار
کیسا تالاب ہے جو اس کو ہرا کر نہ سکا
کاش اس وقت کوئی پیرِ خمیدہ آ کر
میرے شانوں کو تھپکتا غمِ تنہائی میں

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۳ء

مسلم ضیائی ایم۔اے

یاد

تمہارے مسکرانے سے زمانہ مسکراتا تھا — ہر اک ذرہ زمین و آسماں کا جھوم جاتا تھا
ہوا مستانہ چلتی تھی ستارے لڑکھڑاتے تھے — پرندے دیکھ کر ہم کو سریلے گیت گاتے تھے
فلک پر بجلیاں آپس میں تھیں سرگوشیاں کرتی — شفق کی چادرِ رنگیں میں تھیں اٹھکھیلیاں کرتی
ضیا بارِ مسرت ماہتاب عشق پرور تھا — مرا دل اک طلاطم خیز الفت کا سمندر تھا
یہ کیا معلوم تھا قسمت مری وہ دن بھی لائیگی — شکایت آپ کی میری زباں پر جبکہ آئے گی

ابھی بھولا نہ ہوگا تم نے جو افسانہ لکھا تھا — وہی افسانہ جس کا خاتمہ اس طرح ہونا تھا
مکمل ہو چکا افسانہ جی چاہے تو سن لیجے — گلِ افسردہ بکھرے ہیں جو جی چاہے تو چن لیجے
وہ صبحیں یاد آتی ہیں وہ شامیں یاد آتی ہیں — وہ جلسے یاد آتے ہیں وہ باتیں یاد آتی ہیں
وہ پُل پر بیٹھنا ندی میں جانا یاد آتا ہے — وہ پانی کھیلنا چھینٹیں اُڑانا یاد آتا ہے
وہ پروین اور احمد کا جھگڑنا یاد آتا ہے — تمہارے واسطے جگنو پکڑنا یاد آتا ہے
وہ خسرو باغ میں کشتی کا کھینا یاد آتا ہے — وہ اک ننھا سا رنگیں پھول دینا یاد آتا ہے
وہ ہنسنا کھیلنا اور مسکرانا یاد آتا ہے — جگر کے شعر گھنٹوں گنگنانا یاد آتا ہے

بھلاؤں کس طرح وہ نظم جو خود میں نے لکھی ہے
سناؤں کیسے وہ تصویر جو تم نے بنائی ہے

ساغر نظامی

عید

عید آئی ہے لیکن اے مطربِ اللہ بتا کس دُنیا میں!؟ یہ بادۂ کہنہ چھلکا ہے کس ساغر میں کس مینا میں
یہ موجِ مسرّت اُٹھی ہے کس ارمانوں کے دریا میں یہ روحِ لطافت دوڑی ہے کس گلشن میں کس صحرا میں
یہ نغمۂ عشرت گونجا ہے کس بربط میں کس دنیا میں!؟
عید آئی ہے لیکن اے مطربِ اللہ بتا کس دُنیا میں

انسانیت کے ماتھے سے فوّارۂ خونیں جاری ہے تہذیب کی نیّا ڈگمگ ہے غرقابی کی تیاری ہے ۴۶
رفتارِ تمدن مدّھم ہے تہذیب و عمل کی خواری ہے شیطان کا فسوں افسانہ ہوا آدم کے جنوں کی باری ہے
مجروح و مسافر دُنیا پر اب سانس بھی لینا بھاری ہے
عید آئی ہے لیکن اے مطربِ اللہ بتا کس دُنیا میں!؟

بستی لرزاں، جنگل لرزاں، فردوسِ بہاراں لرزاں ہے قلبِ مومن تھراتا ہے، احساسِ ایماں لرزاں ہے
مغرب لرزاں، مشرق لرزاں، ایران و قازان لرزاں ہے اک فتنۂ نو کی ہیبت سے کُل عالمِ انساں لرزاں ہے
انسانیّت کی چھاتی پہ اک گہرا زخم نمایاں ہے
عید آئی ہے لیکن اے مطربِ اللہ بتا کس دُنیا میں!؟

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

یاں آج بھی لاکھوں دیوانے تقدیر کا رونا روتے ہیں   یاں آج بھی لاکھوں اشکوں سے آنکھوں کا کاجل دھوتے ہیں
یاں آج بھی لاکھوں طاقت پر عزت کی دولت کھوتے ہیں   موہوم مسرت کی دھن میں امید کی کھیتی بوتے ہیں
یاں آج بھی پیاسے جاگے ہیں، یاں آج بھی بھوکے سوتے ہیں

عید آئی ہے لیکن اے مطرب اللہ بتا کس دنیا میں!؟

چہروں کی دمک پر چھائیں ہے آئینۂ چشم حیراں کی   مخمور نگاہوں کے پیچھے تاریخ ہے سوزِ پنہاں کی
رنگین لباسوں کے نیچے اک آگ دبی ہے حرماں کی   سینوں کے گدازوں کی تہ میں تربت ہے جہانِ ارماں کی
آلام کے شعلوں سے اب تک دوزخ ہے یہ جنت انساں کی

عید آئی ہے لیکن اے مطرب اللہ بتا کس دنیا میں!؟

۴۷

نغمے ہیں گراں اس بستی میں، مجبور کی آہیں ارزاں ہیں   اٹھنے کا امکان کم تر ہے، گرنے کی راہیں ارزاں ہیں
مسرور نگاہیں مہنگی ہیں مجبور نگاہیں ارزاں ہیں   مظلوم وطن سے باہر ہیں، ظالم کی پناہیں ارزاں ہیں
خوں ریز ابھی تک مقتل ہیں آباد ابھی تک زنداں ہیں

عید آئی ہے لیکن اے مطرب اللہ بتا کس دنیا میں!؟

اس دنیا میں جو مقتل ہے کمزوروں کا مقہوروں کا؟   اس دنیا میں جو دوزخ ہے معصوموں کا معذوروں کا
اس دنیا میں جو مسکن ہے ہل والوں کا مزدوروں کا   اس دنیا میں جو مرکز ہے بیواؤں کا مجبوروں کا
اس دنیا میں!؟ اس دنیا میں!! جو زنداں ہے مجبوروں کا!!!؟

عید آئی ہے لیکن اے مطرب اللہ بتا کس دنیا میں!؟

ایشیا۔ ستمبر تا اکتوبر ۱۹۴۷ء

مزدور کی کٹیا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو　　اُجڑی ہوئی دُنیا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو

دُنیائے تمنّا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو　　ہاں من کی نگریا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو

دکھیاری جنتا میں تو نہیں اس عید کے جلووں کا پرتو

عید آئی ہے لیکن اے مطرب للہ بتا کس دُنیا میں!؟

افلاس کی گہری تاریکی میں سڑنے والے سڑتے ہیں!　　دولت کی سنگین چوکھٹ پر صبح و شام رگڑتے ہیں

ہر موڑ پہ مدفن بنتا ہے، ہر گام پہ زندہ گڑتے ہیں　　طاقت کے نشے میں متوالے غم کے ماروں سے اکڑتے ہیں

سطوت کی جبیں پر نخوت کے بل اب بھی گہرے پڑتے ہیں

عید آئی ہے لیکن اے مطرب للہ بتا کس دُنیا میں؟

۴۸

جو جبر نے ہم پر طاری کی نفرت ہے، وہی غفلت ہے، وہی　　جو قہر نے ہم پر ساری کی دب جانے کی لعنت ہے، وہی

جو بار ہے انسانیت پہ انسانوں میں نفرت ہے وہی　　اس دُنیا میں نکبت ہے، وہی کلفت ہے، وہی غربت ہے، وہی

تقدیر وہی مزدور کی ہے، دہقانوں کی قسمت ہے وہی

عید آئی ہے لیکن اے مطرب للہ بتا کس دُنیا میں!؟

تاریک و مسلسل تنہائی غم خانے کی رکھوالی ہے　　امید کا فرقِ غمگیں ہے اور مرقدِ غم کی جالی ہے

نومیدی ہے بے رنگی ہے، بے کیفی ہے بے حالی ہے　　گلشن مرجھانے کو ہے مگر مالن ہے نہ کوئی مالی ہے

آغوش جو خالی تھا میرا وہ اور بھی خالی خالی ہے

عید آئی ہے لیکن اے مطرب للہ بتا کس دُنیا میں!؟

ایشیا ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

نئی کہانی

سیاست و ادب

اس وقت تک ایشیا میں زندگی کے جملہ عنوانات پر مضامین شائع ہوتے رہے، خاص کر پولیٹکل سائنس اور سیاست کی تاریخ پر اس نے ہمیشہ زور دیا، میرا خیال ہے کہ اب زندگی کا کوئی گوشہ سیاسی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، ہندوستان ہی کو لیجیے، ہندو قوم میں نیشلزم ابھی تک روایاتی قیدوں سے آزاد نہیں، نئے ہندوستان کا تخیل ہندو جنتا میں رام اور کرشن کے "بھارت ورش" کے ہم مفہوم ہے، مسلم عوام میں اس وقت تک رجعت پسند اور کھوکھلی تحریکیں محض فرسودگیوں اور جہالت ہی کی وجہ سے کامیاب ہوتی رہیں، مسلمانوں میں نام کو بھی سیاسی شعور نہیں، ایامِ جاہلیت کی طرح ان تحریکوں کو "کفر و اسلام" کے نام پر اعلیٰ طبقوں نے دکھاوے کیلئے کامیاب بنا کر ظاہر کیا، بے چارے مسلم عوام غافل اور جاہل تھے، رَو میں بہ گئے؛ جس طرح عام انتخابات کے موقع پر فرقہ پرستی، شیعہ سُنّی سیّد افغان، اور مختلف اغراض و مقاصد کا لاسہ دے کر ووٹروں کو احمق بنایا جاتا ہے کچھ ایسے ہی طریقے مسلم اعلیٰ طبقے نے سیاست کے میدان میں اختیار کئے نہ کوئی تنظیم ہے، نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی پروگرام ہے اور سب کچھ ہے۔

۵۰ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کیلئے بہت بڑے پیمانے کی ضرورت ہے آج کل اس کا امکان نہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے، اور دُنیا کے تمام سیاسی بحران سے عوام کو (عشرت پسند خواص کو بھی) آشنا کرنے کیلئے سیاسی ادب کی اشاعت ضروری ہے۔

"حیاتیات" پر مرزا ارشاد بیگ کے مقالوں کو علمی حلقوں میں بڑی اہمیت دی گئی ہے، کیوں نہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اپنے نقطۂ نگاہ سے بھی اظہارِ خیال کریں تاکہ ناظرین ہر پہلو سے آنے والی دُنیا کے خطوط کو زیادہ سمجھ سکیں۔ انگریزی میں ویلز ہی اس مسئلہ پر نہیں لکھتا، ہیرلڈ لاسکی اور دوسرے لوگ بھی لکھتے رہتے ہیں، غور کیا جائے تو یہ مسائل بہت اہم ہیں، اور راس بدلتی ہوئی ارتقاء پذیر دُنیا میں بڑی ضرورت ہے کہ علمی طور پر "آج"، و "کل" کا اندازہ کیا جائے۔

ساغر

ل۔احمد اکبرآبادی

ایک عاشق کے نفسیات

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے لکھنے والے سوویٹ روس کے ادب اور سماج کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یہ توجہ ہمارے ادب میں اضافے اور ترقی کا باعث ہوگی۔

سیاسی اسباب کی بنا پر سوویٹ روس کے خلاف جو پروپگنڈا ہوتا رہا اس نے دنیا کو یہ یقین دلایا کہ وہاں ادب حسب الحکم وجود میں آتا ہے اور سوویٹ لکھنے والے ایک وردی پہننے والی فوج سے زیادہ نہیں۔ اور اب اگرچہ سیاسی اسباب ہی نے سوویٹ روس کو دنیا کے سامنے اصلی رنگ روپ میں پیش کر دیا ہے، لیکن ادب صناعت کے باب میں اہلِ نظر اس پروپگنڈے سے کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ گورکی کے بعد شولاخوف وغیرہ کی تصانیف کو جھٹلایا نہ جا سکتا تھا۔

اس وقت جو "مختار" آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے یہ YURI OLYESHA کے ایک فسانہ (مطالعہ) سے لیا گیا ہے اور غرض یہ ہے کہ اس "مطالعہ" کو پڑھ کر ہم اندازہ کر سکیں کہ جس زبان کے دوسری اور تیسری صف کے لکھنے والے ایسا کچھ لکھ سکتے ہوں اس ادب کی عظمت و اہمیت کیا ہے!

میرے خیال میں یہ فسانہ تخئیلی ادب کا بہترین کارنامہ اور اس بات کی شہادت ہے کہ سوویٹ روس نے دنیا کو جو نیا کلچر دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی ادب کی عظمت و اہمیت کے تصور سے میں حقیقتاً کانپنے لگتا ہوں۔ یوری اولیشا کی عمر اس وقت بیالیس سال کی ہے۔ وہ کم لکھتا ہے لیکن ایک نہایت اچھوتے پرواز اور نرالے اندازِ بیان کا مالک ہے۔ (ل۔احمد)

جمالی، سائنس کی آخری ڈگری کا طالب علم، پارک میں شیریں کا انتظار کر رہا تھا۔ دن کافی چڑھ چکا تھا اور گرمی بھی ہو گئی تھی۔

ایک گرگٹ آیا اور پتھر کے اوپر چڑھ گیا۔ جمالی اسے دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ پتھر پر بیٹھا ہوا گرگٹ کتنا غیر محفوظ ہے۔ کتنی آسانی سے مارا جا سکتا ہے! پھر اسے گرگٹ کی غداری اور چوری کا خیال آیا پھر گرگٹ کو مار دینے سے ثواب ملنے کی طرف دھیان جانا ہی تھا۔

ان خیالات سے وہ کچھ جھنجھلا گیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے اندر کسی پر حملہ کر دینے کا جذبہ ابھر آیا تھا وہ خود ہی کہنے لگا:۔

"لاحول ولا قوۃ! گرگٹ کی غداری اور اسے مار ڈالنے سے ثواب کا خیال مجھے آیا ہی کیوں؟ گرگٹ بھی بہت سے بیکار کیڑوں کی طرح ایک ہے" اور میرے یہ خیالات ..... "

وہ بڑھ کر ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر جا بیٹھا۔ اس جگہ گھاس میں کیڑے مکوڑے بہت سے تھے جو جمالی کے پہنچنے سے اُٹھ کر پھدکنے لگے۔ ان کیڑوں کی اڑان سے جو خط اور لکیریں کھنچیں وہ جمالی کی نظر میں عمارتوں کے نقشے معلوم ہوئے۔ دروازے اور دیواریں، طاق اور محرابیں بنتی دکھائی دیں۔

پھر اسے خیال آیا کہ یہ کیڑے مکوڑے تو اسکے ذہن و خیال پر چھا گئے ہیں۔ وہ خود ہی کہنے لگا:۔

"میرے خیال کی فضا کیڑوں سے بھر گئی ہے۔ مگر یہ کیا چیز ہے جو کیڑوں سے بھر گئی ہے ــ مگر یہ کیا چیز ہے جو مجھ پر چھائے جا رہی ہے؟ میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جن کا وجود نہیں!"

شیریں ابھی تک نہ آئی تھی اور جمالی دیر ہونے کے سبب سے گھبرانے لگا تھا۔ وہ پھر ٹہلنے لگا۔ لیکن اتنی سی دیر میں اس کو کیڑوں کی کئی قسموں کا عین الیقین ہو گیا تھا! اس نے ایک کیڑے کو اُٹھا کر ہتھیلی پر رکھا تو اس کا چمکیلا ہٹ نظر آیا۔ جمالی سوچنے لگا:۔

"توبہ ہے ایسی حال رہا تو میں تھوڑی دیر کے اندر علم الحیات کا ماہر بن جاؤں گا" اس کا مزاج ابھی تک بگڑا ہوا تھا۔

پھر اسکی نظر گھاس کے فرش پر پڑی تو معلوم ہوا کہ گھاس کی بھی

قسمیں ہوتی ہیں۔ دوب کے علاوہ لانبی پتیوں والی اور چڑھتے چوبتی کی طرح بل کھائے ہوتی ہے۔ گھاس پر سے نظر ہٹی تو پھولوں کی نیرنگی نے حیران کر دیا۔ اُس نے سوچا :۔

"میں علوم فطرت کا ماہر بننا نہیں چاہتا، مجھے اس مشاہدے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!"

شیریں کا ہو رہا نہ تھا۔ انتظار میں مبتلا جمالی بے جانے تعداد وشمار میں مصروف ہوگیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پارک میں نکونی پتیوں والے درختوں کی تعداد زیادہ ہے۔ انتظار سے گھبرا کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ اچانک شیریں کے بدلے ایک اجنبی نمودار ہوگیا۔ یہ دیکھ کر جمالی کو بہت غصہ آیا۔

اجنبی سامنے والی بینچ پر بیٹھ گیا اور دونوں ہات گھٹنوں پہ رکھ لئے۔ وہ جوان تھا مگر نہایت خوش قسم کا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ "رنگندھا" (رنگ اندھا) تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں جمالی سے کہا :۔

"مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ تمہیں پیڑ پتے ہرے دکھائی دیتے ہیں — مجھے تو کیریاں بھی نیلی نظر آتی ہیں۔"

"کیریاں نیلی ہوتیں تو لوگ آم کھا ہی نہ سکتے۔" جمالی نے بے سوچے سمجھے کہا۔

"ہاں، پر میں تو اکثر نیلے ہی آم کھاتا ہوں!" اجنبی نے افسردہ لہجے میں بتایا۔

جمالی کے بدن میں ہمدردی کی پھریری دوڑ گئی۔ پھر اسنے پوچھا:۔

"یہ بتاؤ کہ ابابیلیں اُڑتی ہیں تو تمہیں مکان بنتا دکھائی دیتا ہے؟"

"نہیں مجھے ایسا تو کبھی محسوس نہیں ہوا!"

اُسکے جواب کی تشریح کے لئے جمالی نے ایک اور سوال کیا۔

"یعنی تمہیں ہر چیز ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی اور آدمیوں کو؟"

"ہاں، دو چار رنگوں کے سوا ہر چیز!" پھر اس نے جمالی کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "تمہیں کہیں محبت تو نہیں ہوگئی ہے؟"

"ہو تو گئی ہے!" جمالی کو قبولنا پڑا۔

"ہوں! مجھے بعض رنگ صحیح دکھائی نہیں دیتے باقی ہر چیز دوسرے آدمیوں کی طرح دیکھ سکتا ہوں۔"

آخری جملہ کہتے وقت اسکے چہرے پر بشاشت سی تھی۔

"لیکن نیلے آم کھاتا — اف!" جمالی نے مسکرا کر کہا۔

دور سے شیریں آتی دکھائی دی جمالی فوراً کھڑا ہوگیا، جیسے کہ اُچک پڑا ہو۔ رنگندھا اپنی ٹوپی اُٹھا کر چلنے لگا۔ جمالی نے خوشی کے لہجے میں کہا :۔

"تم بیلا بجا لیتے ہو؟"

"مگر اب بیلا وجود باطل ہے۔ اب نہ بیلا ہے نہ میں ہوں اور کوئی!"

"پر تمہارا ڈھنگ ہے تو بیلا نوازوں کا سا!"

رنگندھے نے جمالی کی بات کو نظر انداز کر کے کہا :۔

"ہوگا، مگر تمہارا راستہ ہے پُرخطر!"

شیریں تیز قدمی سے آرہی تھی۔ جمالی اس طرف کو بڑھا۔ نکونی پتیوں کے نقاب میں کلیاں ہلکی ہوا سے جھوم رہی تھیں اور رنگندھا سوچتا جا رہا تھا۔

"طوفانی موسم سر پر ہے!"

پھر اسکی نظر ایک درخت پر پڑی: دوسرے تمام پتوں کی طرح کا ایک پتا ہوا میں ہل رہا تھا — نیلے رنگ کا درخت ادھر سے اُدھر جھونکے کھا رہا تھا۔ لیکن جمالی کو ہر درخت ہرا دکھائی دے رہا تھا اور وہ پتوں کے متعلق مسلسل نظریئے بنا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا:۔

"ہرے بھرے درخت شیریں کا خیر مقدم کر رہے ہیں!"

رنگندھا یقیناً غلط خیالی میں مبتلا تھا مگر جمالی اس سے بڑی غلطی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ جمالی کو پھر کچھ خیال آیا اور آپ ہی آپ کہنے لگا :۔

"لاحول ولا قوۃ! میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جن کا وجود نہیں ہے!"

اتنے میں شیریں قریب آچکی تھی۔ اسکے ایک ہاتھ میں کاغذی تھیلے میں خوبانیاں تھیں۔ دوسرا ہاتھ جمالی کی طرف بڑھا کر بولی :۔

"منہ کیوں بنائے ہوئے ہو؟"

"میری نظر کچھ موٹی ہوگئی ہے!"

شیریں نے ایک خوبانی لی اور انگلیوں میں دبا کر اس کی گٹھلی نکالدی۔ گٹھلی ذرا فاصلے پر جا پڑی۔ جمالی اسے بڑے غور سے دیکھا کیا: جہاں گٹھلی گری تھی وہاں ایک درخت کھڑا ہوگیا — ایک نوخیز چمکیلا پودا، ایک خوبصورت سبز چھتری۔ پھر وہ شیریں سے کہنے لگا :۔

"کیا حماقت ہے — میں شکلوں میں سوچنے لگا ہوں! گویا میری فکر اور خیال کے لئے قدرت کے سب قانون ختم یا معطل ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پانچ سال میں اس جگہ خوبانی کا ایک درخت کھڑا ہو، یہ فطرت کا قانون ہوگا۔ لیکن اسکے خلاف مجھے وہ درخت

قدرتی نشوونما سے پہلے ہی نظر آرہا ہے۔ اسے تم حماقت نہ کہو گی تو کیا ہو گی! میں شاید ایک معلّمی، ایک آئیڈیالسٹ ہوا جارہا ہوں!"

خوبانی کا رس چوستے ہوئے شیریں نے جواب دیا :۔

"محبت کی جادوگری مشہور ہے!"

پردہ بدل جاتا ہے۔ شیریں پلنگ کے تکیوں پر بیٹھی جمالی کی منتظر تھی۔ جمالی کمرے میں داخل ہوا تو شیریں اس سے لپٹ گئی۔ دونوں کے چہرے سنہری ہالے پڑ رہے تھے۔ شبِ خوابی کے کپڑوں میں شیریں کتنی نازک اور کتنی لذیذ معلوم ہوتی تھی! ان کی پہلی ہم آغوشی ایک طوفان تھا! شیریں کے گلے کا لاکٹ اسکے بالوں میں جا اُلجھا۔ پھر جب وہ نرم تکیوں کے سہارے لیٹ گئی تو معلوم ہوتا تھا کہ دم توڑ رہی ہے! جمالی کا سر آہستہ آہستہ جھکنے لگا۔

"بتی گُل کردو" شیریں نے دھیمی آواز میں کہا۔

جمالی دروازے کے رُخ لیٹا ہوا تھا۔ دروازہ بڑھ کر جمالی کے قریب آگیا۔ وہ سوچنے لگا :۔

"پردے کے چھاپوں کے دو مختلف وجود ہیں لیکن اس بات کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ یہ چھاپے ہیں بھی معمولی قسم کے۔ مگر رات میں ان کی ہستی دوسری ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھید نیند آجانے کے دو چار ہی منٹ پہلے کھلتا ہے! غور سے دیکھئے یہ چھاپے اچانک بڑے بڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز اُبھر آتی اور پھر صورت بدلتی رہتی ہے!

جمالی کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور نیند کی اس حالت میں وہ اپنے بچپن کے بعض جوش انگیز واقعات کے دھیان میں کھو گیا۔ یہ واقعات بھی جن کے دھیان میں جمالی اُلجھا ہوا تھا، شکلیں بدلنے لگے اور اس حالت و کیفیت میں جمالی نے اگر کوئی چیخ نہ ماری تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ایک چیز جو شکل بھی اختیار کر رہی تھی، وہ بھی جانی پہچانی ضرور ہوتی تھی۔ گویا یہ تبدیلی کسی قطعی قانون کے تحت ہو رہی تھی! کیونکہ جو شکلیں سامنے آرہی تھیں وہ ایک دوسرے سے متعلق ہوتی تھیں۔ یا پھر اُسکے چیخ نہ مارنے کی وجہ یہ ہو گی کہ پردوں کے چھاپے جو ہاتھیوں کی شکل کے تھے بھیڑ بکریوں کی صورت اور کبھی کھانا پکانے والی ماما کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ اس تغیّر نے شاید اسے بالکل بھونچکا کر دیا ہو!

آنکھیں بند کئے ہوئے شیریں نے کروٹ لی اور باہیں جمالی کی گردن میں ڈالتی ہوئی بولی :۔

"تمہارے بیلے کا گز!"

اسکے جواب میں جمالی نے اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا اور نیند سے بھاری آواز میں کہنے لگا :۔

"اور یہ گرگٹ!"

بہت سویرے جب آنکھ کھلی اور جمالی نے ادھر اُدھر نظر ڈالی تو چیخ پڑا، یا یوں کہئے کہ اسکے گلے سے ایک زوردار الاپ جاری ہو گئی۔

جمالی اور شیریں کی ملاقات ہونے کے بعد سے دُنیا میں ایک تبدیلی آگئی تھی جو اُس رات کو مکمل ہو گئی۔ چنانچہ جمالی جاگا تو دُنیا ہی دوسری تھی۔ صبح کا سورج جگمگا رہا تھا۔ کھڑکی کی دہلیز پر جو گملا رکھا تھا اس میں رنگ رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

شیریں ابھی تک جمالی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے، پاؤں سکیڑے کمان بنی سو رہی تھی۔ جمالی کی نظر اسکی ریڑھ پر پڑی تو وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اُسے چھوٹی پوٹی کا گتا کہے یا ملاکا کا بید۔

اس بدلی ہوئی دُنیا کی ہر چیز جمالی کو اُکسائے دیتی تھی، ہر شے ایک جال اور پھندا بن گئی تھی۔ وہ اُٹھا، کپڑے پہنے مگر
۵۳ اسکے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ وہ زمین کی کشش کے اندر رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسکے اندر سے وہ بوجھ غائب ہے جس سے وہ زمین پر قائم رہ سکتا ہے اور چونکہ وہ اس بدلی ہوئی دُنیا کے قانون سمجھتا نہ تھا اس لئے اُسے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اگر ذرا بھی غلطی ہو گئی تو لو لو بولدیا جائیگا، تالی پٹ جائیگی! اسے خوف تھا کہ کسی چیز کو چھوا چھیڑا تو نہ معلوم کیا خطرہ سامنے آجائے! اسے ڈر تھا کہ کمرے میں شیر نہ گھس آئے اور وہ ایسے خیال کو دور کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

اچانک اسکی نظر دروازے کی طرف اُٹھ گئی اور ایک بھڑ لال پیلی لکیروں والی خونی بھڑ اندر آتی دکھائی دی۔ جمالی چیخ پڑا :۔

"شیریں، شیریں، شیر!"

شیریں چونک پڑی، گھبرا کر پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھڑ سنگار میز کے آئینے سے جا چمٹی تھی اور وہاں سے شیریں کی طرف لپکی۔ شیریں نے بدحواس ہو کر اسے جھاڑا۔ بھڑ اور شیریں کے مُندے بُندے فرش پر بکھر گئے۔ جمالی نے ایک مُندے کو اپنے جوتے سے دبا کر خوب زور سے کچل ڈالا۔ شیریں نے اصلی بھڑ کے اوپر تکیہ ڈالدیا۔

جب جمالی شیریں سے رخصت ہوا اور ایک نے دوسرے سے خدا حافظ کہا تو ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ لیکن جس عالم میں یہ بیٹھے وہ جھونکا طوفان کا مترادف تھا۔ ہوا سے باہر کا دروازہ کھل گیا اور اس سے جو آواز پیدا ہوئی وہ کچھ دھوبنوں کے گانے سے ملتی جلتی معلوم ہوئی کمرے کے اندر ہوا نے اس تکیے کو اُلٹ دیا جسکے نیچے شیریں نے بھڑ کو دبا دیا تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ میں ہنسی کا سا انداز محسوس ہوا اور شیریں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پھر ہوا سے شیریں کی ساری اُلٹ کر اس کے سر اور مُنہ سے لپٹ گئی۔

خدا حافظ پھر کہا اور سُنا گیا۔ جمالی زینے سے اُترا تو اتنا خوش و خرم کہ زینہ اُترنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ البتہ سڑک پر پہنچکر اسے خیال ہوا کہ یہ سب کچھ نظر یا حواس کا دھوکا نہ تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس وقت بھی ہوا میں اُڑ رہا ہے، محبت کے پروں سے اُڑ رہا ہے! ایک مکان کے اندر کوئی کہہ رہا تھا:۔

"وہ اُڑ رہا تھا اور اس کی کمیز پتنگ کی طرح چکر کھا رہی تھی۔ اسکے ہونٹوں پر بُخار کی پپڑی جمگئی تھی اور وہ ہر چیز کو حقیر دیکھ رہا تھا . . . ."

دوپہر ہوئی تو جمالی پھر پارک کے اندر ٹہل رہا تھا۔ شیریں کی محبت اور اس محبت کی مسرّت نے شاید اسے خستہ کر دیا تھا۔ جب وہ ایک بنیچ پر لیٹا تو نیند آگئی۔ دھوپ کی تیزی سے اسکے چہرے پر پسینہ نمودار ہوگیا مگر وہ سوتا ہی رہا۔

پھر جب آنکھ کھلی تو سامنے ایک اجنبی آتا دکھائی دیا۔ اسکا لباس پادریوں کا سا تھا۔ سر پر کالا ہیٹ تھا اور آنکھوں پر نیلا چشمہ گردن ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ وہ آیا اور سامنے والی بنیچ پر بیٹھ گیا اور پھر ذرا ٹھہر کر جمالی سے مخاطب ہوا:۔

"میرا نام آئزک نیوٹن ہے!" نیلے رنگ کی عینک میں سے دُنیا اسے نیلگوں دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی نیلگوں جیسی فوٹو کی تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ جمالی نے نیوٹن کا نام سُنتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا۔ ظاہر ہے کہ سلام انگریزی یعنی "گڈ مارننگ" تھا۔

مشہور سائنسداں اس طرح اُکھڑا اُکھڑا بیٹھا تھا جیسے کیلوں کے اوپر بیٹھا ہو۔ اسکی ساری توجہ جمالی پر صرف ہو رہی تھی اور رہ رہ کر اس کا کان بھی پھڑک رہا تھا۔ پھر وہ اُنگلی سے اس طرح اشارے کرنے لگا جیسے کسی فیبی بینڈ باجے کی ماسٹری کر رہا ہو۔ اس وقت فطرت بھی سانس روکے ہوئے محسوس ہوتی تھی اور معزز سائنسداں فطرت کی اس خموشی کو سُنتا معلوم ہوتا تھا۔ جمالی نے زمین کی طرف دیکھا تو اسے کنکروں میں سے باجے کی آواز سُنائی دی۔ نیوٹن نے اچانک کہا:۔

"وہ دیکھو ـــ کچھ سُن رہے ہو؟" پھر جمالی کی کمر میں ہاتھ ڈالدیا اور یہ دونوں گھاس کے فرش پر ٹہلنے لگے۔ نرم گھاس پر نیوٹن کے لانبے بوٹوں کے نشان بن رہے تھے۔ ان دونوں کے آگے آگے ایک گرگٹ دوڑا جا رہا تھا۔ جب وہ ایک کنج کے بیچ میں سے گزر کر نکلے تو نیوٹن کی عینک کے کناروں پر سارس کے پروں کا غبار جما دکھائی دیا۔ جمالی نے اس درخت کو پہچان لیا جسے اس نے پرسوں دیکھا تھا اور بیساختہ کہہ اُٹھا:۔

"خوبانی کا پیڑ!"

"نہیں، سیب کا!" نیوٹن نے سخت لہجے میں کہا۔ اور پھر کمر کو ہاتھ کا سہارا دیکر پیچھے کی طرف جُھکا تاکہ ریڑھ کو ذرا آرام ملے۔ اسکے ہاتھ میں ایک سیب تھا۔ وہ جمالی کو دکھا کر کہنے لگا "سمجھے اس کا مطلب کیا ہے؟"

جب جمالی نے کوئی جواب نہ دیا تو نیوٹن نے ٹھنڈی سانس بھری اور رغنا لہجے میں سوال کیا:۔

"بتا سکتے ہو کہ لوگ گر کیوں پڑتے ہیں ـــ ان کے گر جانے کا کیا سبب ہے؟"

جمالی چپ رہا اور نیوٹن کے ہاتھ میں اس سیب کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر انتظار کر کے نیوٹن نے پھر پوچھا:۔

"صاحبزادے، سُنا ہے آج تم اُڑ رہے تھے!" نیوٹن کی بھویں تن گئی تھیں "تم تو مارکس کے پیرو ہو؟ اور تم اُڑ رہے تھے!"

بھورے سے رنگ کا ایک بھونرا نیوٹن کی اُنگلی پر سے رینگتا ہوا سیب کے اوپر چڑھ گیا۔ نیوٹن کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ بھونرا اس کو نیلے رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر نیوٹن کی شکل ٹیڑھی دکھائی دینے لگی بھونرے نے پر کھول دئے جنہیں وہ دُم کے نیچے دبائے ہوئے تھا۔

"ہوں تو آج تم اُڑ رہے تھے!" نیوٹن نے پھر دوہرایا مگر جمالی پھر بھی چُپ رہا۔

"گدھا!" نیوٹن نے جھلّا کر کہا۔

جمالی کی آنکھ کھُل گئی۔

"گدھا!" شیریں کہہ رہی تھی اور بھونرے کے فولادی پیٹ کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"لاحول ولا قوۃ!" آنکھ کھُلتے ہی جمالی نے کہا "اوہو!

میں اُسے بس ایک بھونرا سمجھتا تھا! پھر کہنے لگا جب سے ہم ملے ہیں، میری نظر کو کچھ ہوگیا ہے ـــ آم نیلے دکھائی دیتے ہیں۔"

شیریں اس سے چمٹ جانا چاہتی تھی۔

"الگ ہا! چھوڑو! مجھے چھوڑ دو! میں تنگ آگیا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا جمالی وہاں سے اس طرح بھاگا جیسے اپنی پرچھائیں سے ڈر رہا ہو۔

جب سانس چڑھ گئی اور وہ رُکا تو شیریں کا دور دور پتا نہ تھا۔ اب اسے یہ احساس ہوا کہ جو دُنیا ہاتھ سے نکل گئی ہے سب کچھ دے کر بھی اسے حاصل کرے۔ مگر دل کہہ رہا تھا کہ وہ دُنیا اب نہ مل سکے گی۔ دل ہی میں اس نے شیریں کو "خدا حافظ" کہہ لیا۔ اور خستہ و مایوس ایک ڈھلوان جگہ پر بیٹھ گیا۔ دور تک کا منظر سامنے تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکان ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے نگینے جڑے ہوں۔ سڑک پر شربت فالودے والا ٹھیلہ لئے کھڑا تھا۔ بوتلوں کے لال پیلے اور ہرے رنگ جمالی کی حالت اور کیفیت سے مشابہ تھے۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا:۔

"میں جنّت میں جی رہا ہوں!"

اچانک پیچھے سے آواز آئی:۔

"کیا سچ مچ تم مارکس کے پیرو ہو؟"

یہ آواز اسی رنگندھے کی تھی۔ وہ آکر جمالی کے برابر بیٹھ گیا۔

"ہاں میں مارکسی ہوں!" جمالی نے جواب دیا۔

"ایک مارکسی اور جنّت!"

"وہ دُنیا ہی جنّت بن گئی ہے۔ اسکو کوئی کیا کریگا!"

رنگندھے نے سیٹی بجائی اور ہاتھ میں جو ٹہنی تھی اس سے کان کھجانے لگا۔

جمالی کہتا رہا:۔

جانتے ہو آج میں نے کیا کیا؟ میں آج اُڑتا رہا ہوں!"

ان کے سروں پہ ایک پتنگ سرسرانے لگی تھی۔ جمالی نے اسکی طرف اشارہ کرکے کہا:۔

"میں وہاں پہنچ سکتا ہوں ـــ دکھاؤں اپنا اُڑنا؟"

"شکریہ! مگر مجھے گوارا نہیں تم سے سنجیدہ آدمی کی لُولُو بولی جائے!"

جمالی نے کہا:۔

"سچ مچ؟"

"ہاں چند رنگوں کے سوا تمہاری دنیا میں ہر چیز مقرّر اور قائم ہے ـــ

پر تم جنّت کی زندگی سے بھی تو بے بہرہ ہو! دُنیا تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔ رہی میری حالت سو تم مجھے مادہ پرست سمجھتے ہی ہو۔ لیکن اکثر میری آنکھیں فطرت کے خلاف! سائنسی اصول کے خلاف، ایبنڈی بینڈی چیزیں دیکھنے لگتی ہیں!"

"بات تو اچھی نہیں ـــ مگر کیا کیا جائے تمہیں محبت ہوگئی ہے!"

جمالی نے جوش میں رنگندھے کا ہاتھ پکڑ کر خوب دبایا اور کہنے لگا:۔

"ہاں صحیح! لیکن سُنو۔ تم اپنی قرار واقعی دُنیا مجھے دیدو اور بدلے میں میری محبت لے لو!"

رنگندھا اُٹھ کہ چلنے لگا اور جاتے جاتے بولا:۔

۵۵ "مجھے افسوس ہے، مگر ایک ضروری کام یاد آگیا، خدا حافظ ـــ اپنی جنّت میں جیتے جاؤ!"

وہ ڈھال پر سے اُترنے لگا تو پاؤں پھسلا اور گر گیا گرنے میں اسکی ٹانگیں قینچی کے پھلوں کی طرح کھل گئیں۔ وہ اُٹھا اور پھر چلا۔ وہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی انگلیوں کو چوم کر وہ بوسہ جمالی کی طرف پھینکا اور کہنے لگا:۔

"اپنی جنّت سے میرا سلام کہنا!"

رنگندھے کے چلے جانے کے بعد جمالی نے باغ کا کونا کونا ڈھونڈ ڈالا کہ کہیں شیریں مل جائے۔ وہ علوم فطرت کا ماہر تو تھا نہیں کہ درختوں کی پہچان کرتا، وہ تو بس ان کے نیچے سے نکلتا پھر رہا تھا۔

شیریں اپنے کمرے میں سُرخ رنگ کے فرغل میں لپٹی سو رہی تھی۔ جمالی اس کی سانسوں کی آواز سُن رہا تھا۔ وہ بھی لیٹ گیا اور سر کو شیریں کے سینے پر رکھ دیا۔ پھر اسے شیریں کی سانسیں بھی سُنائی نہ دیں۔

اچانک ایک جھاڑی کے اندر سے رنگندھا نمودار ہوگیا اور جمالی سے بولا:۔

"وہ سُنتے ہوئے —"

"وہ نہیں، نہیں، یاں نہ آنا —— اُلّو کہیں کا!"

جمالی نے غصّے سے کہا۔

"سُنو تو! مجھے منظور ہے! میری ماڈی اور سٹڑی

ہوئی دُنیا تم لے لو اور اپنی محبّت مجھے دید و!"

"جاؤ، اور کہیں بیٹھ کر نیلے آم چوسو! آیا ہے کہیں سے!" جمالی نے جواب میں کہا۔

(مختار)

(بقیہ مضمون صفحہ ۷۲)

حفاظت ایک لازمی اور ازلی فرض ہے تو تم سے یہ چوک کیوں ہوتی؟

بیٹوں کی شدید چٹکی پر ماؤں کا ضمیر اُن سے کہہ رہا تھا اور مائیں اپنی اپنی جگہ ساکت تھیں، بیٹے نے پھر اپنے گھونگریالے بالوں کو ایک جھٹکا دیا اور بولا

ایک وہ دیویاں تھیں اور ——

"شانتی" ماؤں نے آگے بڑھ کر کہا۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ دیس کی محبّت اور اسکی چنگاری تمہارے سینے ہی کو پھونک رہی ہے۔ نوجوان بہادر اگر ایک لمحے کیلئے تم کو ماں بنا دیا جائے تو تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ جیسے کہ ہم تھے۔ لیکن اب ہم نے اپنی کمزوریوں پر فتح پالی ہے اور تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم راجپوتوں، افغانوں، عربوں اور مغلوں ہی کے پیٹ سے پیدا ہیں۔ پیارے جگر کے ٹکڑو! دھن باد ہو، رحمت ہو تم پر۔ موت تمہارے

۵۶ گھوڑوں کے سموں کے نیچے دبی ہوئی سسک رہی ہے اور زندگی تمہاری رکاب بردار ہے، دیکھو ہمارے جوڑے سنور گئے۔ دیکھو گزرے ہوئے زمانوں کی یاد نے ہمیں پھر جوان کر دیا۔

(۴)

تھوڑی دیر کے بعد مجاہدین کی بہنیں نوجوان بھائیوں کو سامانِ جنگ اُٹھا کر دے رہی تھیں۔ . . . .

. . . . . . ماؤں نے پُرجوش انداز میں کہا گھوڑوں کو تیار کرو ——

تیرے ابا کی تلوار کہاں ہے؟ میری کمر پر باندھ، تیرے چچا کا نیزہ کدھر ہے مجھے لا، خون رگوں سے اُچھلا پڑتا ہے۔ ہم اپنے باغ سے کسی کو پتّی بھی نہ لیجانے دینگے اور باغ پر ڈاکہ ڈالنے والے قزاقوں کو نکال کر دم لیں گے ہم خاموشی سے موت کی نیند سو جائینگے لیکن موجودہ زندگی کو گوارا نہیں کرینگے آہ اپنے چمن کی تباہی ہم سے نہ دیکھی جائیگی۔ ہاتھوں میں نظر نہ آنے والی ہتکڑیاں، پاؤں میں دکھائی نہ دینے والی بیڑیاں —— یہ ہم نہیں پہنیں گے —— مر جائینگے مگر نہیں پہنیں گے۔

جوشیلی ماؤں نے تلوار اور رائفل اُٹھا لیں اور دروازے کی طرف بڑھیں، نوجوان بیٹے بڑھے اور قدموں پر گر پڑے۔

اے مقدّس ماؤ! تم پر تمہارے بیٹوں کی جانیں نثار! یہاں در

کبھی اپنی ماؤں کو میدانِ جنگ میں آگے نہیں رکھتے۔ نیستی کے سمندر میں سب سے پہلے ہم کود دینگے۔ ہمارے گھوڑے بحرِ ہستی کی موجوں کو اپنے سینے کے جوان رگ پٹھوں کی تیلد قوت سے دھکا دینگے اور جب ہمارے آسودۂ ساحل ہونے کی خبر تم تک پہنچے تو ہنستی ہوئی تم آنا۔ میدان میں ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑتی ہوئی خاک دیکھ کر ہم سمجھ جائینگے کہ مجاہد مائیں آ رہی ہیں اور آنے کے بعد تو تم زخموں سے چور اجسام کو خود ہی دیکھ لوگی —— مگر ہوا! تم میرے چہرے کو خاک و خون میں آلودہ ہونے پر بھی پہچان لوگی؟ تم ہماری بے گور و کفن لاش کو بھی پہچان لوگی؟

مجاہدین نے ہنس کر کہا بس نعروں کو بلند کرو، اور رنگا رنگ جھنڈے کو لہرا دو۔ ماؤں نے بیٹوں کو کلیجے سے لگایا بہنوں نے ٹیکا دیا۔ اور کہا، خدا کے سپرد۔ جاؤ کھیتوں کی مینڈوں پر شاما الوداعی گیت گا رہی ہے۔ تلواریں میان سے نکال لو —— لڑکیو دروازہ بند کر لو۔

مجاہد بیٹوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور قلعہ سے باہر ہو گئے جھروکہ سے گردنیں نکال کر ماؤں نے کہا:۔

سُنو بیٹو! اس دروازے کا کُھلنا اس وقت تک ناممکن ہے جبتک باغ آزاد اور محفوظ نہ ہو جائے۔ شراب اور دودھ تم پر اس وقت تک حرام ہے جبتک ایک ایک پھول ظالم صیّاد کے ہاتھوں سے آزاد نہ ہو جائے۔ اگر راجپوتوں، افغانوں، عربوں اور مغلوں کے نام لیوا ہو تو زندہ واپس نہ آنا ورنہ یہاں سوائے راکھ کے تم کو کچھ نہیں ملے گا۔

مجاہد بیٹوں نے چمکتی ہوئی تلوار[illegible] بلند کیں اور "بغاوت کی جے" کا نعرہ لگاتے ہوئے [illegible] کے سلسلے میں غائب ہو گئے مائیں سینہ دبا کر بیٹھ [illegible]۔

آخری سلام قبول ہو چکا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑتی ہوئی خاک بھی شبنم نے دبا دی تھی۔

(کہکشاں)

رام پرتاب بہادر ایم۔ اے

کوڑھی کی موت

آدمی کی خوشی کی دو منزلیں ہوتی ہیں۔ پہلی منزل وہ جبکہ انسان اپنی خوشی کا موضوع پاکر کہیں بھی اور کسی بھی حالت میں خوش ہولے اُسکے بعد اُسے دُنیا کی مختلف پوشاکیں پہنا کر اُس سے خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

شادی ہونے کے بعد کچھ دنوں تک گویا میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کیا چاہیئے بلکہ یہ کہئے کہ میں اپنی خوشی سے اتنا خوش تھا اور اُس میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ دُنیا اور اُس کی نعمتوں کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا تھا۔ لیکن وہ اچھے دن کچھ ہی دنوں تک رہے۔

اُسکے بعد میں اپنی بیوی کے ہمراہ اکثر سینما دیکھنے جانے لگا۔ کبھی کبھی شہر کے باہر دور تک اُن کے ساتھ تفریح کی خاطر چلا جاتا۔ ایک دو بار دریا کی طرف بھی سیر کرنے گیا۔ غرضکہ اپنی خوشی کا "بینک بیلنس" تیزی کے ساتھ گھٹتا دیکھ کر ایسی نقلی چیزوں سے مدد لینے لگا جیسے گراموفون، ہارمونیم، آئس کریم وغیرہ وغیرہ دوستوں کی صحبت میں تاش کھیلنا ہنسی مذاق کرنا تو عام تفریح تھی مختصر یہ کہ ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے کیا کچھ میں نے نہیں کیا۔

لیکن وہ ایک ایسی عارضی خوشی تھی جو باوجود میری ساری کوششوں کے آئے دن دم توڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی تو مزاج بالکل اچٹ جاتا اور میں بے چین ہونے لگتا۔ گھر والے پہلے ہی گاؤں جانے کو کہہ رہے تھے۔ اب میں نے بھی اُن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے طبیعت بدلنے کے خیال سے گاؤں جانا طے کیا۔ چنانچہ ایک دو روز بعد شہر سے آرام اور آسائش کی چیزوں کا ایک انبار اکٹھا کرکے دیہات کے لئے ہم لوگ روانہ ہوئے۔ جبتک ریل گاڑی سوار رہے تب تک تو شہر سے کوئی ایسا تعلق نہیں ٹوٹا لیکن جب گاڑی سے اُترنے کے بعد میرا سارا شہری لاؤ لشکر گاؤں کیلئے بیل گاڑی پر لدنے لگا تو وہ منظر مجھے کسی قدر بے تکا سا نظر آیا۔ اور جب بیل گاڑیوں پر لدے پھندے ہم لوگ جنگل کے راستے سے ہوکر گزرنے لگے تو میرے اندر اک ناقابلِ برداشت ہنسنے کا جذبہ سا پیدا ہونے لگا۔ لیکن دراصل اپنی چھاؤنی کے مکان پر پہنچ کر میں نے مکمّل طور پر اپنے کو دیہات میں محسوس کیا۔ گراموفون بجتے بجتے جب خاموش ہوجاتا تو بیلوں بکریوں اور گنواروں کی آوازوں سے میرے کان بجنے لگتے۔

دوپہر کے وقت برآمدے میں میں اکیلا آرام کرسی پر پیر پھیلائے بیٹھا تھا۔ سامنے دروازے پر بائیں طرف غلّہ رکھنے والے مکان کے سامنے دو چار مزدور اپنی مزدوری لے رہے تھے۔ اُسی مکان کے برآمدے میں بڑے بھائی صاحب ننگے بدن کھرّی چارپائی پر بیٹھے مزدوروں کا حساب کرنے میں مشغول تھے۔ میرے داہنی طرف صحن کے مشرقی حصّے میں مویشیوں کے واسطے "چرن" بنی ہوئی تھی جہاں تقریباً ۲۰ پچیس بیل، گائیں اور بھینسیں کھڑی ناندوں میں سانی کھا رہی تھیں۔ اُن کے سانی کھانے سے فضا میں ایک عجیب بھدی قسم کی بھنبھناہٹ تیر رہی تھی جس میں جانوروں کے آس پاس اُڑنے والی مکھیوں کی آواز بھی شامل تھی۔ بیلوں کی کالی کالی لمبی پونچھوں کی مستقل حرکت کی وجہ سے مکھیاں بیلوں کے ناندوں سے سڑی ہوئی کھلی کی بدبو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہوا میں چکر کاٹ رہی تھیں۔ اینٹ کے چبوترے پر بڑھیا ہلواہن بیلوں کے نیچے سے گوبر ہٹا رہی تھی۔ بھوسا رکھنے کی لمبی کوٹھری اور بیلوں کے چرن کے درمیان کے تنگ اندھیرے برآمدے میں ہلواہا کسی کے ساتھ گانجے کا دم لگا رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا اور سامنے کھلیان کے اُس طرف کھیتوں کی لامحدود ہریالی کی خاموش دُنیا ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں سے زندگی کا رس کھینچ رہی تھی۔

ایک منگتا بھیک مانگتا ہوا دروازے پر آنکلا۔ مزدوروں

کے پاس اپنی جھولی اور ڈنڈا رکھ کر اُس نے بھائی صاحب کے اوپر دُعاؤں کی جھڑی لگادی اور پھر اُسی وقت خاموش ہوا جب اُسے تسلّی ہوگئی کہ اُسے بھیک ضرور مل جائیگی۔ جاڑے کا موسم عام طور سے دیہات میں لوگوں کے واسطے بیکاری کا وقت ہوتا ہے ۔ زیادہ تر لوگ زمینداروں کے ہاں مزدوری کرکے پیٹ پالتے ہیں جن کو یہ بھی نہیں میسّر ہوتا وہ لوگ کھیتوں سے ساگ پات نوچ کھسوٹ کر کھاتے اور جیتے ہیں لیکن ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایسی عجیب وغریب ترکیبوں سے روزی کماتے ہیں جو ہم متوسط طبقہ کے بیکاروں کو سوجھ ہی نہیں سکتیں بہت سے بھیک مانگنے کی غرض سے سادھو فقیر بن جاتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی زیادہ تعداد میں وہ ہوتے ہیں جو بھیک مانگنے کے لئے اپنی بھوک اور غریبی سے بہتر کوئی اور سند نہیں سمجھتے ۔

چنانچہ وہ ایک عجیب منظر ہوتا ہے جہاں ہم غریبوں کو اس قلّاش دُنیا میں بھیک مانگتے دیکھتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں موسیقی اور دوسرے فنون راج درباروں کی چیزیں ہوتی تھیں۔ فنون لطیفہ کے ماہر اُن دولت والوں کے سامنے اپنے ہُنر کی نمائش کرکے

۵۸ اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ لیکن آج ان بُرے دنوں میں، جبکہ نہ وہ دربار رہے اور نہ فنون لطیفہ کے وہ ماہر، اُن فنون اور کھیل تماشوں کی اگر کوئی نشانی باقی رہ گئی ہے تو دیہاتوں ہی میں اُس کی یاد تازہ ہوتی ہے ۔ بھیک مانگنے والے دیہاتیوں کی مفلسی کے دربار میں اپنا پیٹ پالنے کے لئے اُن فنون کی نمائش کرتے ہیں۔ وہ بھوکے پیاسے منگتے آخر کس محویت کے ساتھ موسیقی کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں! اور اُن سے بھی زیادہ اپنے کو بھُلا کر غریبی کے مارے دیہاتی اُن کے ہُنر کی داد دیتے ہیں اُن دیہاتی گویّوں کے مقابلے میں شہر میں رہنے والے علم موسیقی کے اُستاد مجھے ہمیشہ گٹھیا کے مریضوں جیسے لگتے ہیں۔ لیکن میں بار بار سوچتا ہوں کہ آخر ہمارے مٹتے ہوئے قدیم فنون کو بھی پناہ ان غریبی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں ہی کے نیچے ملی ۔

ابھی وہ بھیک مانگنے والا دروازے پر بیٹھا ہی تھا کہ بغل کی گلی سے ایک مداری ڈمرو بجاتا ہوا ایک بندر اور بندریا لئے آنکلا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ نہایت ہی سرگرمی سے اپنی پوری طاقت لگا کر زور زور سے ڈمرو بجانے لگا۔ ڈمرو کی تیز آواز فضا میں کچھ اس طرح گونجی کہ جیسے اُس کی گرگرک سے اغل بغل کے کچے مکانوں کی دیواریں کانپ رہی تھیں۔ غرضکہ پوری فضا ڈمرو کی آواز سے کانپ رہی تھی۔ میں بیٹھا بیٹھا ایسا محسوس کرنے لگا کہ جیسے قیامت آگئی۔ داڑھی والے شیوشنکر غصّے میں آکر ڈمرو بجا رہے تھے۔ سارے مویشی کان کھڑے کرکے چونک چونک کر مداری کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاؤں کے سارے بچے اکٹھے ہوگئے تھے۔ بوکھلائے ہوئے کُتّے بھونک بھونک کر آسمان پھاڑے ڈالتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے شیوشنکر کا محشر خیز ناچ شروع ہی ہونے کو ہے۔ پوری فضا بےچینی سے کانپ رہی تھی۔ اتنے میں بھائی صاحب کی کڑکتی ہوئی آواز مغربی برآمدے سے آئی۔ ڈمرو ایک دم خاموش ہوگیا۔

لیکن جب بچے اکٹھا ہو چکے تھے تو بندر کا ناچ ہو کر رہتا چنانچہ ناچ شروع ہوا۔ داڑھی والا مداری گاتا ہوا بندروں کو تماشہ کرنے کے لئے اشارہ کر رہا تھا۔ بندریا ایک طرف چُپ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سسرال جانے کو راضی نہیں تھی۔ اس وجہ سے کہ اُس کا شوہر اُس کی آرائش کے واسطے کچھ ساتھ کوئی چیز نہیں لایا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے خاوند سے ناراض تھی۔ لیکن جب مداری نے اس ناراضگی کی بات بندر کے کان میں ڈالدی تو بندر غصّہ سے بےاختیار ہوگیا۔ وہ ڈنڈا ہاتھ میں لیکر کھڑا ہوگیا اور اگر مداری نے بیچ بچاؤ نہ کردیا ہوتا تو بندریا پٹ کر رہتی۔ خیر پھر کسی صورت سے رخصتی ہوئی۔ آگے آگے بندر صاحب کندھے پر ڈنڈا لئے چلے اور پیچھے لہنگا پہنے اوڑھنی اوڑھے اُن کی منکوحہ چلیں۔ اُس بندریا کو دیکھ کر مجھے اپنے ملک کی عورتوں کا سسرال جانا یاد آیا۔ بالکل وہی پہناوا، وہی چال، وہی خوشی یا رنج اور وہی مجبوری! اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہی کہ بندریا چار پیروں سے چل رہی تھی ۔

لیکن دراصل اگر کسی بات پر مجھے حیرت ہو رہی تھی تو اس پر کہ آدمی نے جانور کو کچھ سکھایا بھی تو وہ بھی اپنی ہی تاہل زندگی! اور اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہو رہا تھا کہ آدمی عورتیں اور بچے کس خوشی سے اس تماشے کو دیکھ رہے تھے۔ وہی کام ہم ہر روز کرتے ہیں لیکن اُس دن بندروں کو اس طرح اپنی زندگی کی نقل کرتے دیکھ کر میں پریشان ہوگیا۔ زیادہ خیال مجھے آتا تھا اُن بندروں کا۔ وہ کیا سوچتے ہونگے؟ شاید وہ ایسا سوچتے ہوں کہ آدمی کو خوش کرنے کیلئے انھیں کی زندگی کی انہیں نقل کرنا پڑ رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں اور بھی زیادہ شرمندہ ہوا۔ بندروں

کے ہاتھوں اپنی زندگی کا مذاق اُڑتے دیکھ کر غصّہ بھی آ رہا تھا اور شرم بھی۔ لیکن اُسی وقت مجھے اُس بڑی سچائی یا حقیقت کا خیال آیا جس کے ماتحت ہم نے یہ جاننا سیکھا تھا کہ ہم بندروں سے ترقی کرکے آدمی ہوئے ہیں۔ اگر اُس سچائی کو قبول کرتے ہوئے مجھے کوئی دقت ہوتی تھی تو اس وجہ سے کہ اپنے اور بندروں کے درمیان تمدن کی ایک بہت لمبی چوڑی کھائی مجھے ہمیشہ نظر آتی تھی۔ لیکن آج اُن شائستہ بندروں کو اپنی انسانی تہذیب کی نقل اُتارتے دیکھ کر میں نے قطعی قبول کر لیا کہ وہ ضرور ہمارے پُرکھے رہے ہونگے۔

بندر کا ناچ ختم ہو چکا تھا لیکن اُس کا زیادہ اہم حصّہ اب شروع ہونے کو تھا۔ مداری کا پھٹا ہوا لنگوچھا زمین پر بچھ گیا ڈمرو پھر بجنے لگا۔ بچے اور عورتیں مختلف قسم کے اناج لا کر اُس پھیلے ہوئے کپڑے پر ڈال رہی تھیں۔ مداری للکار للکار کر بھیک مانگ رہا تھا۔ اور میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بیکاری دور کرنے کی یہ بھی ایک عجیب و غریب ترکیب ہے۔ چونکہ یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ تماشہ ہر کسی کو اچھا لگتا ہے اس لئے مداری دیہات کے غریبوں کے درمیان بھی بندر نچا کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔ دفعتہً عورتوں کو شرما کر بھاگتے اور بچوں کو تالیاں پیٹ کر ہنستے دیکھ کر میری نظر بندروں کی طرف گئی۔ میں نے دیکھا بندر اور بندرن یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ ہماری شادی سے تعلق رکھنے والی رسموں کے قائل نہیں۔ بندروں کو اُس حالت میں دیکھ کر میں نے اس کا اندازہ لگایا کہ ہمارے اجداد کی جنسی زندگی کس قسم کی رہی ہوگی۔

یوں تو سورج نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ابھی شام ہونے میں کافی دیر تھی۔ اصل میں جاڑے کی شام ایسی ہوتی ہی ہے میں اُسی کرسی پر پڑا کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ میری بی بی کے آجانے سے میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میری نظر صحن میں پڑے ہوئے گوبر پر سے اُٹھ کر اُن کے اوورکوٹ کے سمور پر گئی اپنا اوورکوٹ اُن کے ہاتھ میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اُن کا ارادہ ٹہلنے جانے کا تھا۔ میں برآمدے سے اُتر کر چلنے ہی کو تھا کہ گھر میں سے اور لڑکیاں اور بچے جاڑے کے کپڑے پہنے نکل پڑے۔ اُن سب کو ساتھ لیکر میں ٹہلنے چلا۔ کھلیان سے آگے نکل کر میں کھیتوں کی مینڈ پر ہوکر چلنے لگا۔ بچے آگے دوڑتے ہوئے چلے جا رہے تھے میری بی بی میرے پیچھے اور لڑکیوں کے ساتھ تھیں۔ میں ہریالی پر نظر دوڑاتا ہوا اِدھر اُدھر کی باتیں سوچتا چلا جا رہا تھا۔ سرسوں کے پیلے پیلے پھول آپس میں مل جل کر ایسے جھوم رہے تھے جیسے گیت گا رہے ہوں۔ مجھے اپنی بی بی کا صبح کو بھیرویں گانا یاد آیا مٹر کی کھیتی چھیموں کے گھمنڈ سے پھولی نہیں سماتی تھی۔ گیہوں اور جَو کے پودے اپنے تیز ٹونڈوں سے اپنی حفاظت کر رہے تھے۔

چلتا چلتا میں اپنے فارم پر پہنچا۔ گنّے کی اونچی فصل کھڑی تھی۔ اتنی اونچی کہ ہاتھی بھی اُس میں کھو جائے۔ لیکن بیچ بیچ کی کیاریوں سے ہوکر آدمی بہ آسانی آر پار آ جا سکتا تھا۔ بچے ہنستے اور شور و غل مچاتے ہوئے منع کرنے کے باوجود گنّے کے کھیت میں غائب ہو گئے۔ بچوں کا ساتھ دینے کی غرض سے ہمیں بھی اُنہیں گھنی کیاریوں سے ہوکر چلنا پڑا۔ بچے بھاگتے ہوئے دور آگے نکل گئے تھے۔ حالانکہ گنّے کی گھنی تیز پتیوں سے بچتے ہوئے جھک جھک کر میں چل رہا تھا لیکن بار بار جی یہی چاہتا تھا کہ بچوں کے ساتھ میں بھی بھاگ نکلوں۔ اگر بھاگنے سے کوئی روکتا تھا تو وہ میری بی بی کی موجودگی تھی جن کا شہری شائستگی میں گزرا ہوا ماضی اس قسم کی دوڑ دھوپ کی اجازت نہیں دے سکتا تھا لیکن شاداب قدرت کی گرفت میں آکر اُن کی بھی طبیعت کسی قدر ہری ہو گئی۔ تیز چلتی ہوئی مجھ سے پہلے ہی وہ بیچ فارم میں پہنچیں۔ بچے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ لیکن وہاں پہنچ کر اُن سب کو مایوسی ہوئی ..... فارم کی چھاؤنی بند ہو چکی تھی۔ کام کرنے والے مزدور اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ پتھر کی حوض میں پانی خاموش آسمان کو آئینہ دکھا رہا تھا۔ پانی کا انجن چپ چاپ انجن گھر میں آرام کر رہا تھا۔

پھر بچے آنکھ مچولی کھیلنے پر آمادہ ہو گئے۔ میری بی بی نے بھی کھیل میں حصّہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بچوں کی صحبت میں اُن کا سویا ہوا لڑکپن جاگ اُٹھا ہو۔ میرا جی تو کبھی سے دوڑنے بھاگنے کو چاہ رہا تھا لیکن جب بھی دوڑنا چاہتا تو ایسا محسوس کرتا جیسے ایک پیر سے لنگڑا ہو چکا ہوں دراصل اپنی شادی کے بعد میں ہمیشہ ایسا محسوس کرتا تھا جیسے میں ہمیشہ ایک پیر اپنی بی بی کے دوسرے پیر سے باندھ کر زندگی میں مستقل وہ دوڑ دوڑ رہا ہوں جو پڑھائی کے زمانے میں

بارہ دسمبر کے طیل کود کے دن بھی کسی لڑکے کے ساتھ اپنا ایک پیر رومال سے باندھ کر دوڑا تھا۔ لیکن آغوشِ قدرت میں اپنی بی بی کی روح کی کلی کو کھلتے دیکھ کر میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے دونوں پیر یک بیک آزاد ہو گئے ہوں۔ پھر بچّوں کے ساتھ کھیل میں ہم دونوں ایسے گھل مل گئے کہ بچے بھی ہمیں اپنے سے الگ نہیں سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت میں ہم دونوں بچّوں کے درمیان الگ ہی ایک کھیل کھیل رہے تھے جسے بچے ہرگز نہیں سمجھ سکتے تھے۔

اب روشنی بالکل باقی نہیں رہی تھی۔ شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا ہونے کو آیا۔ بچے تھکے ہوئے بھیڑوں بکریوں کے جھنڈ کی طرح شام ہو چکنے پر کچّی سڑک پکڑے لوٹ رہے تھے۔ سڑک چوڑی تھی لیکن برسات میں بیل گاڑیوں نے اسکی ایسی گت بنا دی تھی کہ اب سیر چلنا دشوار تھا۔ جگہ جگہ گڈھے تھے اور راستہ نہایت ہی ناہموار تھا۔ اس لئے ہم لوگ اصل سڑک چھوڑ کر کنارے کنارے کھیتوں کی مینڈ پکڑے لوٹ رہے تھے۔ حسب عادت بچے اب بھی آگے ہی آگے بھاگتے دوڑتے چل رہے تھے۔ ہم دونوں کچھ آپس کی بات چیت میں مشغول تھے کہ اتنے میں میں نے دیکھا۔ بچے میری طرف
۶۰ واپس لوٹے آ رہے ہیں۔ اُن میں سے ایک نے پہلے ہنچکر ہانپتے ہوئے سہمی آواز میں بتایا کہ آگے سڑک کے کنارے ایک جوڑی چپل پڑی ہے اور کوئی آدمی کھیت میں سویا ہوا ہے۔ لڑکے کی زبان سے یہ بات سنتے ہی میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس جاڑے کے موسم میں شام کے وقت کھیت میں کون سویا ہوا ہو سکتا ہے! بچّوں کے علاوہ اپنی بی بی کے واسطے مجھے زیادہ تشویش پیدا ہوئی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ نہایت کمزور دل کی عورت ہیں، اپنا سایہ دیکھ کر تو ڈرتی ہیں۔ آخر ان کے اوپر کیا بیتے گی! بچّوں کو اُنگلیاں پکڑائے سب کو ہمراہ لئے نظریں نیچی کئے میں دھیرے دھیرے سڑک پر چل رہا تھا۔

بچّوں سے نظر پوشی کرتے ہوئے آہستہ سے میں نے داہنے طرف دیکھا، موٹر کے ٹائر کے دو پھٹے پُرانے ٹکڑے پڑے تھے۔ چمڑے کی جگہ اُس میں پُرانی رسیاں لگی تھیں اور رسیوں میں چیتھڑے لپٹے تھے۔ کوڑھی کی چپل! میرا دماغ چیخ اُٹھا۔ اتنا زور زور سے میں سوچ رہا تھا کہ اپنی باتیں کانوں میں سُنائی پڑ رہی تھیں۔ دماغ سے گزرتے ہوئے خیالات کو اپنے کانوں سے سُن کر میں خود ڈرنے لگا۔ کھیت میں ایک آدمی سویا ہوا تھا۔ اُسکے سرہانے ایک پُرانا گھڑا پڑا تھا۔ خوابیدہ پاسبان اُس گھڑے کی کس نامعلوم ...... کی حفاظت کر رہا تھا؟ میں نے پھر اپنے دماغ کو سوچتے ہوئے سُنا۔ ہری فصل کھیت کے حاشیہ پر جہاں قلیل ہو جاتی تھی وہیں وہ راہی کچھ ننھے منھے پودوں کی سیج پر سو گیا تھا۔ لیکن کیا وہ آخری نیند تھی؟ اپنے دونوں بازوؤں پر رونگٹوں کو کھڑا ہوتے میں نے محسوس کیا۔ راہی موٹر کے ٹائر کی چپلوں پر چلتا چلتا آخر یہاں کیسے تھک کر سو گیا! ربڑ کا ٹائر تو ابھی نہیں گھسا تھا۔ مجھے خیال آیا فورڈ کمپنی کا جہاں وہ ٹائر بن کر تیار ہوا ہوگا۔ پھر مجھے وہ پُرانی سڑی گلی موٹر یاد آئی جو میرے محلے میں گندے پانی کے نالے کے کنارے ایک گڈھے میں ایک نامعلوم مدّت سے پڑی ہوئی ہے۔ اُس کے بعد مجھے اپنے اُس انجن کا خیال آیا جسے شام کو میں نے انجن گھر میں سوتا پایا تھا غرضکہ ذرا سی دیر میں میں ہر طرف فلا میں خاموش مشینیں دیکھنے لگا۔ ہر طرف مشینیں بگڑی پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ ربڑ کے ٹائر کی چپل بھی کیسی خاموش پڑی تھی! وہ ضرور کوئی کوڑھی ہوگا۔ لیکن پھر یہ سوچا کہ بدبخت کوڑھی کو دن دھاڑے کون اس طرح مار کر کھیت میں ڈال سکتا ہے۔ دیہاتی مثل ہے، 'بندر مارے ہاتھ کالے'، تو ضرور کوڑھی راہی زندگی کی شاہراہ پر ربڑ ٹائر کی چپل پر چلتا چلتا تھک کر ہمیشہ کیلئے اپنی زندگی کی شام دیکھ کر سو گیا ہے۔ مرنے اور جینے میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا لیکن مُردہ کو زندہ سے تمیز کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ جیتے جاگتے آدمی کو دیکھ کر آدمی کی ہمّت بڑھتی ہے۔ مرے آدمی سے ہمّت چھوٹ جاتی ہے۔

اندھیرے میں ڈرتے کانپتے ہم چلے جا رہے تھے۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ سوچتا رہا ہوگا لیکن ظاہرا سب خاموش تھے۔ اب سامنے والے ٹولے پر ہم لوگ پہنچ چکے تھے۔ اُس ٹولے کا مکھیا ہمیں راستہ ہی پر کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے پہچانتے ہی سلام کیا اور ہم لوگوں کو سلام کیا اور ہم لوگوں کو اُس وقت اُس حالت میں دیکھ کر اُسے تعجب ہوا۔ اُسی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ آدمی جنوب کی جانب سے آیا تھا۔ چینی کے مل سے ایک گھڑا چوٹا لیکر لوٹ رہا تھا۔ راستے میں بھر پیٹ چوٹا پی لینے کا نتیجہ تھا کہ زہریلے چوٹے نے اُسے چوٹے کا بوجھ ڈھونے سے نجات دلا کر ہمیشہ کیلئے زندگی ہی سے نجات دلا دی۔

یہ دردناک کہانی سُن کر دیہاتی زندگی کی پوری تصویر میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ جنوب میں گنّا اس وجہ سے نہیں بویا جاتا کہ اُس طرف ریلوے لائن نہونے سے چینی کی ملیں نہیں ہیں۔ جاڑے کے موسم میں

جب دکھن والے کھانے کی چیزوں کی . . . . . کمی کی وجہ سے بھوکوں مرنے لگتے ہیں تو اس طرف آکر چینی کی ملوں پہ سے گھڑوں چوٹا خرید کر لیجاتے ہیں۔ چینی کی مل میں سے بہکر گندے سڑے ہوئے چوبٹے کا ایک سوتا مل کی ساری گندگی اپنے ساتھ لئے ہوئے گندے پانی کے اُس بڑے تالاب میں جاتا ہے جس کی تیز بدبو سے چھوٹی لائن کی ٹرین پہ سفر کرتے ہوئے بڑے آدمیوں کو اکثر قے ہوگئی ہے۔ جب مل مالکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ مل کی وہ گندگی بھی آدمی کے کام آسکتی ہے تو انہوں نے اُس پر قیمت لگادی کُھلے دم ایک آنہ گھڑا وہ چوٹا اب بھی بکتا ہے اور دکھن سے آنے والے اب بھی وہ چوٹا خرید کر پیتے اور مرتے ہیں یا موت کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اُس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ میں تو کم لیکن میری بی بی زیادہ ڈر سے کانپتی رہیں۔ اُن کی نیند بار بار اُچٹ جانے سے مجھے تشویش ہوتی تھی کہ کہیں وہ بیمار نہ پڑ جائیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرکے اُنہیں میں بچوں کی طرح بہلا کر سُلانے کی کوشش کرتا تھا دور دور سے جنگل اور ارہر کے کھیتوں میں سے گیدڑوں اور لومڑیوں کے رونے کی آواز سُنائی پڑتی تھی۔ بار بار مجھے اُس مُردے کا خیال آتا تھا۔ یہی سوچتا کہ گیدڑ اور دوسرے جانور اکٹھا ہو کر اُس کی لاش کو نوچتے نہ ہوں۔ میری بی بی بار بار یہ کہتی تھیں کہ کوئی جانور اُس کی آنکھ نہ نکال لیجائے۔ کیوں نہیں گانوں والے اُس مُردے کو وہاں سے اُٹھا لاتے؟ لیکن بغیر تھانیدار صاحب کی اجازت کے وہاں سے لاش کیسے اُٹھ سکتی تھی! ان خیالات میں کھوئے ہوئے خوف زدہ ہم لوگ کبھی کبھی گھنٹوں خاموش پلنگ پر پڑے رہتے۔ جب میں اپنی بی بی کی طرف دیکھتا تو ایسا محسوس کرتا کہ جیسے ہم لوگ جنگل کے بیچ میں پڑے ہوں۔

رات کا جاگا ہوا آدمی صبح کو سو ہی جاتا ہے۔ ویسے اس طرح کے سونے کو بھی سونا ہی کہا جاتا ہے ورنہ اُس سونے میں میں جتنا جاگتا رہا اتنا زندگی میں کم جاگا ہوں۔ اُس نیند کی حالت میں کہاں کہاں گیا اور کیا کیا کیا، سب تو یاد نہیں۔ لیکن خواب کی حالت میں اُس اندھیری رات میں نامعلوم لاش کے پاس میں کتنی بار گیا۔ اُسکے بعد کی باتیں یاد ہیں۔ چاروں طرف مشینیں سرگرمی سے چل رہی تھیں، گرم انجنوں کے چمکتے ہوئے پُرزے تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ ہزاروں لاکھوں کوڑھی! بہت سے کوڑھی مر چکے تھے، اُن سے بھی زیادہ مر رہے تھے۔ مشینیں چل رہی تھیں اور کوڑھی مر رہے تھے۔

میں کانپ کر جاگ اُٹھا۔ آنکھ کھُلتے ہی دیکھا سویرا ہو چکا تھا۔ کمرے میں کافی روشنی آچکی تھی۔ میری بی بی پلنگ سے لپٹی پڑی تھیں۔ میں نے سوچا آج انہوں نے ہارمونیم پر بھیرویں نہیں گائی!!

برجستہ کسی کی ڈانٹ کی آواز باہر سے آئی۔ ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا دروازہ کھول کر دیکھا تو داروغہ صاحب بگڑ رہے تھے ٦١
دروازے پر تھانے کے سپاہی کچھ بیگار پکڑ لائے تھے۔ گنواروں کی مزدوری چھوڑ کر مجبوری کی حالت میں ہلکے ہاتھوں اپنے سر پر پگڑیاں باندھ رہے تھے۔ پوسٹ مارٹم، کے واسطے لاش شہر جانے والی تھی۔ بیگاروں کو دیکھ کر مجھے اسپین کے اُن بیچارے سیاسی قیدیوں کا خیال آیا جن سے قبریں کھُدوا کر اُنہیں اُنہیں قبروں میں گولی مار دی جاتی تھی۔

ایمان

جانم

اچھی خاصی گرمی تھی، مکھیاں لوٹ ٹوٹ پڑتی تھیں اور برابر تکلیف دے رہی تھیں۔ اس وقت شام کا تصوّر ہی بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ مشرقی افق پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور انکے ہمراہ ہوا میں ایک ہلکی سی نمی پھیل رہی تھی۔ اولنکا اپنے مکان کے بیرونی حصّہ میں بیٹھی ہوئی تھی اور اپنے خیالات میں کھوئی تھی۔ اس کا باپ ایک کالج کا مشیر تھا جواب اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔

کوکن، ایک کھلی چھت کے تھیٹر کا منیجر تھا جسے لوگ ٹیوولی کہتے تھے باغ کے بیچوں بیچ کھڑا ہوا آسمان کو دیکھ رہا تھا، وہ قریب ہی ایک معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔

"پھر..... بارش ہونے والی ہے! پھر بارش ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجھے ڈبو کر چھوڑے گی، مجھے خودکشی کرنی پڑے گی، نقصان، ہر روز نقصان، اف دیوالہ" اس نے نہایت پریشانی کے عالم میں کہا۔

"دیکھا آپ نے یہ ہے آپ کی زندگی مِس اولگا، آدمی روئے تو کیا کرے، آدمی کام کرتا ہے، اپنی انتہائی کوشش کرتا ہے۔ تھک کر چور چور ہو جاتا ہے، راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور بہتری کی صورت نکالنے کے لئے اپنا دماغ کھپاتا ہے اور پھر ہوتا کیا ہے؟

آپ نہیں سمجھیں گی! عوام ناواقف ہیں، جاہل ہیں، میں ان کیلئے بہترین اوپیرا کا انتظام کرتا ہوں، بہترین فن کار اُن کے سامنے پیش کرتا ہوں سرود و نغمہ ان کے لئے مہیا کرتا ہوں لیکن کیا آپ سمجھتی ہیں یہ سب کچھ آپ کے مذاق کے مطابق ہوتا ہے؟ وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں اسکی کوئی وقعت نہیں! انہیں تو چاہئیں مسخرے، بدتمیزی اور بیہودگی! اور پھر ادھر موسم کو دیکھئے ہر روز شام کو بارش ہو رہی ہے۔ دس مئی سے بارش ہونی شروع ہوئی تھی اور اب مئی اور جون دونوں گزر گئے۔ اُف! تماشائی نہیں آتے لیکن مجھے ہر چیز کا کرایہ اسی طرح ادا کرنا پڑ رہا ہے۔

کل پھر اسی طرح بادل چھا جائینگے اور کوکن ہسٹریا کے مریض کی طرح پھر چیخنے لگے گا "ہاں، برسو، برسو، اس باغ کو طوفان بن کر بہا لیجاؤ مجھے غرق کر دو، میری دین دُنیا دونوں کو غرق کر دو! اور آرٹسٹ انہیں بھی کہو کہ مجھے پکڑ لے جائیں۔ مجھے جیل بھیج دیں، سائبیریا بھجوا دیں! ہا ہا ہا!"

اور اگلے روز پھر وہی بارش!

اولنکا خاموشی سے کوکن کی باتیں سُنتی رہی۔ کبھی کبھی آنسو اسکی آنکھوں میں بھر آتے تھے۔ اس کی بدبختی سے اسے اتنی محبّت ہو گئی تھی کہ وہ اسے چاہنے لگی تھی۔ اسے اس پر رحم آنے لگا تھا۔ کوکن ایک پتلا دُبلا سا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور کنگھے سے پیدا کردہ زلفیں اس کی پیشانی پر پڑی رہتیں وہ بہت مہین اور نسوانی آواز میں گفتگو کیا کرتا تھا اور جب وہ بولتا تھا تو اس کا مُنہ ایک طرف ایک زاویہ سا بنا لیتا تھا۔ اسکے چہرے پر ہمیشہ ایک غم برستا رہتا تھا اور اسی چیز نے اولنکا کے دل میں اسکے لئے ہمدردی اور محبّت پیدا کر دی

اولنکا کی فطرت کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بغیر محبّت کے زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔

اپنے ابتدائی دنوں میں اسے اپنے باپ سے محبّت تھی جو اب ایک اندھیرے کمرے میں پڑا رہتا تھا اور مشکل سے سانس لے سکتا تھا۔ اسے اپنی خالہ سے محبّت تھی جو ہر دوسرے سال برنسک سے ملنے آیا کرتی تھی۔ اور اس سے پہلے جب وہ سکول میں تھی تو اسے اپنے فرانسیسی اُستاد سے محبّت تھی۔ وہ ایک نرم و نازک دُبلی پتلی لڑکی تھی جس کا دل کسی کے دُکھ پر پگھلنے کیلئے تیار رہتا تھا۔ اسکی آنکھیں سبک اور غلافی تھیں اور صحت قابلِ رشک۔ جب کوئی اسکے گلابی رخساروں اور ہاتھی دانت کی سی سفید گردن کو دیکھتا تھا۔ اس وقت جب وہ کسی بات پر یا کسی کی گفتگو پر مسکرا رہی ہو اور اسکے پتلے پتلے پھول سے ہونٹ ایک طرف کو خمیدہ ہوں تو اسکی زبان سے بیساختہ نکل جاتا تھا "بُری نہیں" اور ساتھ ہی مُسکرا بھی پڑتا تھا۔ اور لڑکیاں ..... لڑکیاں تو بات کرتے میں اس سے لپٹ جایا کرتی تھیں اور بات کرتے میں اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پیار سے کہا کرتی تھیں "جانم"۔

وہ مکان جس میں وہ اپنی پیدائش سے لیکر ابتک رہی تھی شہر کے ایک کونے پر تھا مگر ٹیسولی سے دور نہ تھا۔ شام کے وقت وہ تھیٹر کا بینڈ نہایت آسانی سے سُن سکتی تھی اور جب رات کو تماشے کے وقت پٹاخے چھوٹتے تھے اور آگ کی گرج پیدا ہوتی تھی تو اسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوکن اپنی تقدیر سے نبرد آزمائی کر رہا ہے۔ عوام کی بے توجہی سے لڑ رہا ہے اور دشمن ماحول کو زیر کر رہا ہے۔

اس وقت اسکے دل میں ایک میٹھا سا درد ہونے لگتا تھا، اسکے بدن میں ایک کیف انگیز جھرجھری سی پیدا ہوتی تھی اور سونے کی خواہش یک قلم مفقود ہو جاتی تھی اور جب دن نکلے وہ گھر لوٹتا تھا تو وہ اپنے بستر کے قریب والی کھڑکی کو ہولے سے کھٹکھٹاتی تھی اور اسے صرف اپنا چہرہ اور ایک شانہ دکھا کر پردہ کو جنبش دیتی تھی اسں کو دیکھتی تھی اور ایک دلکش تبسم اسکے ہونٹوں پر کھیل جاتا تھا۔

کوکن نے تجویز پیش کی اور ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ اور جب اس نے قریب سے اسکے شانوں کی دلکشی کو اچانک دیکھا تو "جانم"، کہہ کر ایک دم اسکے گلے میں ہاتھ ڈالدیئے۔

"جانم، تم کتنی پیاری ہو!"

وہ خوش تھا لیکن چونکہ اس کی شادی کے روز بھی بارش ہو رہی تھی اس لئے اسکے چہرے پر غم کے آثار تھے۔

وہ یونہی ہنسی خوشی دن بسر کرتے رہے۔ اولنکا دفتر میں بیٹھی رہتی تھی اور ٹیسولی میں چیزوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ آمد و خرچ لکھا کرتی تھی۔ حساب رکھتی تھی اور لوگوں کی تنخواہیں دیا کرتی تھی اسکے وہ گلابی رخسار اور دلکش اور سہانی مسکراہٹ ایک عجیب انداز لئے ہوئے تھی، ابھی دفتر میں ہے، ابھی تھیٹر میں پردوں کے پیچھے ہے اور ابھی کیفے میں۔ اب وہ اپنے جاننے پوچھنے والوں سے تھیٹر کا تذکرہ کیا کرتی تھی کہ تھیٹر زندگی کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔ اب وہ کہا کرتی تھی کہ تھیٹر ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ آدمی مہذب ہونے کے علاوہ دلچسپی بھی حاصل کر سکتا ہے انسانیت کی توسیع صرف تھیٹر ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

"لیکن کیا تمہارے خیال میں عوام اسے سمجھتے ہیں؟" وہ کہا کرتی تھی "وہ چاہتے ہیں مسخرے! کل ہم نے فاؤسٹ پیش کیا تھا اور تقریباً تمام بکس خالی تھے، لیکن اگر میں کوئی بیہودہ چیز پیش کرتی تو دیکھا ہوتا تمام بکس پُر ہوتے۔ کل میں اور ونیکا "جہنم میں رقص" پیش کر رہے ہیں، ضرور آنا۔"

اور جو کچھ کوکن تھیٹر اور ایکٹروں کے بارے میں اسی کو دُہرا دیتی تھی، اُسی کی طرح وہ عوام کی بے توجہی کی شکایت پر رونا روتی تھی کہ لوگ اس فن میں دلچسپی نہیں لیتے، وہ ریہرسل دیا کرتی تھی، ایکٹروں کو ہدایات دیتی تھی، اور سازندوں کے اخلاق و عادات پر گہری نگاہ رکھتی تھی، اور جب کبھی مقامی اخبار میں ان کے تھیٹر کے خلاف کچھ لکھا جاتا تھا تو وہ رونے لگتی تھی، اور خود جا کر معاملات ٹھیک کر لیتی تھی۔

ایکٹر اس کے دلدادہ تھے اور اسے "ونیکا اور مین" کے نام سے پکارا کرتے تھے، اور کبھی کبھی "جانم" بھی کہہ دیا کرتے تھے، وہ ان کی ہر تکلیف پر کڑھتی تھی، اور کبھی کبھی تھوڑے بہت پیسے بھی اُدھار دیدیا کرتی تھی، اور اگر وہ واپس نہیں کرتے تھے اور دھوکا دے جاتے تھے تو تنہائی میں دو چار آنسو بہا لیا کرتی تھی، مگر کبھی شوہر سے شکایت نہیں کرتی تھی۔

اس مرتبہ وہ سردیوں میں بھی بہت اچھی حالت میں رہے، انھوں نے پوری سردیوں کے لئے شہر میں ایک تھیٹر کرایہ پر لے لیا، اور کچھ تھوڑے بہت لین دین پر کبھی تو کسی روسی کمپنی کو دیدیتے تھے اور کبھی کسی مداری کو یا کبھی کسی ڈرامیٹک کلب کو، اولنکا کافی حیثیت و چالاک ہوتی گئی، اور اس کے چہرے پر اطمینان کی شعاعیں لہرانے لگیں، لیکن کوکن کمزور اور زرد ہوتا چلا گیا، اور ہمیشہ اپنے نقصانات کا تذکرہ کرنے لگا، اگرچہ ان سردیوں میں اس کی آمدنی کچھ بُری نہیں رہی تھی، وہ راتوں کو کھانستا رہتا تھا، اور وہ اُسے کبھی تو گرم رس بھری کی چائے دیتی تھی، اور کبھی چونے کے پانی سے غسل کراتی تھی، اور ایک گرم شال میں لپیٹ دیتی تھی۔

"تم کتنے اچھے ہو!" وہ ہمیشہ خلوص نیت کے ساتھ کہا کرتی تھی۔ "تم کتنے پیارے ہو!"

کچھ نئے آدمیوں کی تلاش میں کوکن کو ماسکو جانا پڑ گیا، اور وہ اس کی عدم موجودگی میں سو نہ سکی، اور تمام رات کھڑکی میں بیٹھی ہوئی ستاروں کو دیکھتی رہی، اور وہ اپنے آپ کو مرغیوں سے تشبیہ دینے لگی جو اگر ڈربہ میں مُرغا نہ ہو تو تمام رات جاگتی رہتی ہیں اور بے چین ہو جاتی ہیں، کوکن کو ماسکو میں روک لیا گیا، اور اس کا خط آیا کہ وہ ایسٹر سے پہلے نہ آسکے گا، اس کے علاوہ خط میں ٹیسولی کے بارے میں کچھ ہدایات لکھی تھیں، لیکن اتوار کے روز ایسٹر سے پہلے ہی دروازہ پر ایک خوفناک گرج سی پیدا ہوئی، اور کسی نے دستک دی، شام

ں، دھم ..... دھم ..... دھم !

باورچی اونگھتا ہوا ننگے پاؤں اُٹھکر بھاگا،

"مہربانی کر کے ذرا جلدی سے دروازہ کھولئے" کسی نے باہر سے کہا:" آپ کا تار آیا ہے":

اس سے پہلے بھی شوہر کا اسے ایک تار مل چکا تھا، لیکن اس مرتبہ نہ معلوم کیوں ایک خنک سا خوف اس پر غالب آ گیا، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے تار کھولا اور پڑھا :-

" پٹرووچ آج اچانک انتقال فرما گئے، تجہیز و تکفین کیلئے فوری ہدایات کا انتظار ہے :"

سٹیج منیجر نے تار پر دستخط کئے۔ اولنکا کی آنکھوں میں تاریکی سی ناچنے لگی:" وینیکا میرے پیارے، کیوں ملی میں تم سے! کیوں تم سے محبت کی! اب تمہاری دل شکستہ غریب اولنکا دُنیا میں تنہا رہ گئی ہے"

اور آنسو اس کی آنکھوں سے برساتی نالوں کی طرح بہنے لگے۔

منگل کے روز ماسکو میں کوکن کی تجہیز و تکفین ہوئی، اور بدھ کے روز اولنکا واپس لوٹ آئی، اور جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی بیدم ہو کر بستر پر گر پڑی، اور اتنے زور زور سے روئی کہ اس کی آواز ہمسائے ۲۱ کے علاوہ گلی تک میں سُنی جا سکتی تھی۔

"بے چاری جانم" ہمسایوں نے کہا جب وہ وہاں سے گزرے "اولنکا جانم، اب بیچاری کس طرح دن گزاریگی"

اس واقعہ کو تین مہینہ گزر گئے، اولنکا گرجا سے واپس لوٹ رہی تھی، اور ایک جانکاہ الم اس کے چہرے کا حلقہ کئے ہوئے معلوم ہوتا تھا، اتفاق ایسا ہوا کہ اس کا ایک ہمسایہ وسیلی بھی گرجا سے اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، وہ ایک شہتیر فروش کے یہاں منیجر تھا اس نے ایک تنکوں کی ٹوپی، سفید واسکٹ پہن رکھی تھی، اور واسکٹ کے اوپر سونے کی زنجیر لگا رکھی تھی، اور وہ اس لباس میں ایک بیوپاری کی نسبت ایک دیہاتی رئیس زیادہ جچ رہا تھا

"ہر بات جیسے لکھا ہوا ہے ویسے ہی ہوتی ہے اولنکا!" اس نے سنجیدگی سے کہا:" اگر ہمارا کوئی عزیز مرنے والا ہے تو اسے مر جانا چاہیئے کیونکہ یہ خدا کی مرضی ہے، ہمیں اُس کی رضا کے سامنے سر جُھکا دینا چاہیئے"

اس نے نہایت ہمدردانہ اور غم بھرے لہجہ میں کہا، اور اسے اس کے دروازہ تک چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ تمام دن وہ اسکی غم رُبا مردانہ آواز سنتی رہی، اور جب بھی اس نے آنکھیں بند کیں اس کی نگاہوں کے سامنے کالی داڑھی سے بھرا بھرا چہرہ پھر جاتا تھا۔ وہ اسے بہت زیادہ پسند کرنے لگی۔ اور اسی طرح اس نے بھی وسیلی پر اثرات چھوڑے تھے، کیونکہ تھوڑے ہی دنوں بعد ایک معمر خاتون جس کے ساتھ اس کی کچھ زیادہ جان پہچان نہ تھی، اس کے ساتھ چائے پینے آئی، اور جوں ہی وہ آن کر بیٹھی اور ذرا دم لیا تو وسیلی کے بارے میں باتیں کرنے لگی کہنے لگی وہ بہت ہی اچھا آدمی ہے، اور آمدنی کے لحاظ سے بھی آدمی اس پہ بھروسہ کر سکتا ہے، اور یہ کہ کوئی لڑکی بھی اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے گی۔ کوئی تیسرے روز وسیلی خود آیا، وہ کچھ زیادہ دیر نہیں ٹھہرا، کوئی دس منٹ کے بعد واپس چلا گیا، اور یہ کہ جتنی دیر وہ بیٹھا رہا اس نے کوئی خاص بات نہیں کی، لیکن اس کے بعد اولنکا نے محسوس کیا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے، اتنی شدید محبت کہ وہ رات کو سو بھی نہ سکی۔ اگلے روز اس نے اس معمر خاتون کو بلایا، بات طے ہو گئی اور اولنکا کی پھر شادی ہو گئی۔

وسیلی اور اولنکا شادی کے بعد بہت اچھی طرح رہنے لگے؛

عموماً کھانے کے وقت تک وہ دفتر میں بیٹھا کرتا تھا، اور کھانے کے بعد جب وہ کاروبار کے سلسلے میں باہر چلا جاتا تھا تو اولنکا آ جاتی تھی، اور شام تک دفتر میں بیٹھتی تھی اور بیٹھی بیٹھی آرڈر اور حساب ترتیب دیتی رہتی تھی۔

"ہر روز شہتیر مہنگے ہوتے جا رہے ہیں، قیمتیں بیس فیصدی تک بڑھ گئی ہیں"

وہ اپنے دوستوں اور خریداروں سے کہا کرتی تھی:" اب تک ہم مقامی شہتیر فروخت کیا کرتے تھے اور اب وسیلی کو ضلع موگیلو جانا پڑتا ہے، حالانکہ اس میں اتنا خطرہ ہے، خطرہ!" اور یہ کہکر وہ اپنے رخسار ملے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتی تھی۔

اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے ان شہتیروں کی تجارت میں لگی ہوئی ہے، اور یہ کہ زندگی میں سب سے زیادہ ضروری چیز صرف شہتیر ہی ہیں، اور اسے تختے، کڑیاں، لاٹھیاں، چھتیں، اور اسی قسم کی الفاظ میں، اور ان کی آواز میں ایک دلکشی سی محسوس ہوتی تھی۔

ایک رات جب وہ سو رہی تھی تو اس نے خواب میں بہت سے شہتیر، تختے اور لکڑیوں کی گاڑیاں دیکھی تھیں جو ان تمام چیزوں کو کھینچے لئے چلی جا رہی تھیں، وہ برابر خواب دیکھ رہی تھی کہ چھ انچ چوڑے اور

چالیس فیٹ لمبے برگوں کی ایک فوج اپنے آخری سروں پر کھڑی ہوئی ٹال کے صحن میں قواعد کررہی ہے اور یہ کہ ہزاروں تختے، برگے، کڑیاں ایک دوسرے کے اوپر دھائیں دھائیں گررہے ہیں، اُٹھ رہے ہیں اور پھر گررہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ڈر کر چونک پڑی اور وسیلی نے آنکھیں کھول کر کہا: "اولنکا، کیا بات ہے جانم، کیا بات ہے کروٹ بدلو!"

اس کے خاوند کے خیالات اسکے خیالات تھے۔ اگر وہ خیال کرتا تھا کہ کمرہ گرم ہے یا یہ کہ تجارت آج کل مندی ہے تو وہ بھی ایسا ہی محسوس کرتی تھی۔ اس کا خاوند تفریحات کو پسند نہیں کرتا تھا اور اتوار کی شام کو گھر ہی پڑ رہتا تھا۔ وہ بھی ایسا ہی کرتی تھی۔

"تم ہمیشہ یا تو گھر میں رہتی ہو یا دفتر میں" اسکے دوست اس سے کہا کرتے تھے۔

"کبھی کبھی تھیٹر یا سرکس چلی جایا کرو جانم"

"وسیلی کے اور میرے پاس تھیٹر جانے کے لئے وقت نہیں"۔

وہ جواب دیتی: "ہمارے پاس بیہودگیوں کیلئے وقت نہیں تھیٹر کی آخر زندگی میں ضرورت ہی کیا ہے"۔

ہفتہ کے روز وہ شام کو گرجا جایا کرتے تھے اور چھٹی کے روز صبح کے وقت۔ اور جب وہ برابر چلتے ہوئے گھر لوٹتے تھے تو انکے چہروں پر ایک قسم کی نرمی سی برسا کرتی تھی۔ ان دونوں کے گرد ایک خوشبو سی اُڑتی رہتی تھی اور اولنکا کا ریشمی لباس اسکے ملائم جسم پر لہراتا رہتا تھا۔ گھر آکر وہ چائے پیتے تھے۔ مکھن روٹی اور مربا اور اسکے علاوہ مختلف قسم کی چیزیں ان کی غذا ہوتی تھیں۔ اور سان تمام کے بعد چائے۔

بارہ بجے کے بعد اکثر ان کے صحن سے بطخ، مچھلی یا کسی اور گوشت کی ایسی خوشبو آیا کرتی تھی کہ راہ گیروں کو بھی بھوک محسوس ہونے لگتی تھی۔ دفتر میں بھی چولہا جلتا رہتا تھا اور خریداروں کی چائے وغیرہ سے تواضع کی جاتی تھی۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ نہانے کے لئے حمام جایا کرتے تھے اور جب نہا کر ساتھ لوٹا کرتے تھے تو ان کے چہروں پر ایک گلابی سی برسا کرتی تھی۔

"احسان ہے خداوند کریم کا ہمیں کسی چیز کی حاجت نہیں" وہ اپنے خریداروں سے کہا کرتی تھی "یہ میری دُعا ہے خدا سب کو ہمارے جیسی زندگی عطا فرمائے"۔

جب وسیلی خرید و فروخت کے سلسلہ میں کہیں باہر چلا جاتا تھا تو وہ اسکی کمی بُری طرح محسوس کیا کرتی تھی۔ تنہا لیٹی ہوئی جاگتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی شام کے وقت سمرنسن آجاتا تھا۔ وہ حیوانوں کے ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ جوان اور خوش وضع آدمی تھا اور اولنکا ہی کے مکانوں میں سے ایک میں رہتا تھا۔ وہ اسکے ساتھ آن کر تاش کھیلا کرتا تھا اور دلچسپ باتیں کیا کرتا تھا اور اپنے خاوند کی غیر موجودگی میں اس کی آمد سے اسکی کافی حد تک دلبستگی ہو جایا کرتی تھی، جب وہ اسے اپنی گھریلو زندگی کے بارہ میں بتایا کرتا تھا تو وہ کافی دلچسپی لیا کرتی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا، اور اس ایک لڑکا بھی تھا آجکل اس نے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی، کیونکہ اس کے خیال میں اس کی بیوی نے وفاداری کا ثبوت نہیں دیا تھا، اور اب وہ اس سے نفرت کرتا تھا، اور محض اپنے لڑکے کے اخراجات کے لئے چالیس روپیہ ماہوار بھیجا کرتا تھا، یہ سُنکر اولنکا گردن ہلا کر ٹھنڈی سانس لیا کرتی تھی، اسے اس سے بہت ہمدردی تھی،

"خدا تمہاری حفاظت کرے"

وہ اس سے کہا کرتی تھی جب وہ اس سے رخصت ہوا کرتا تھا، اور وہ اسے زینہ تک روشنی دکھانے آیا کرتی تھی۔

"مہربانی کا شکریہ" وہ کہا کرتا تھا "خدا تمہیں تندرستی عنایت فرمائے"۔

وہ یہ سب کچھ کہتے وقت بالکل اپنے شوہر کی نقل کیا کرتی تھی وہی انداز، وہی الفاظ کی نشست و برخاست، اور وہی بزرگانہ مشورہ اور جب ڈاکٹر بیرونی دروازہ کے نیچے غائب ہونے لگتا تو وہ کہا کرتی

"ڈاکٹر بہتر یہی ہے کہ تم اپنی بیوی سے مصالحت کرلو، اُسے معاف کردو، اپنے بچّہ کی خاطر ہی سہی، تمہیں ایسا کرلینا چاہیئے"۔

اور جب وسیلی واپس آیا تو اس نے اُسے نہایت نرم آواز میں ڈاکٹر اور اس کی خانگی زندگی کے بارے میں بتایا، دونوں کو اُس بیچارے پر رحم آنے لگا، اور سر ہلا ہلا کر اس کے لڑکے کے بارے میں باتیں کرنے لگے، یقیناً وہ اپنے باپ کی کمی محسوس کررہا ہوگا، اور پھر ایک عجیب و غریب جذبہ کے ماتحت وہ دونوں اُٹھکر مریم کی مورتی کے سامنے جُھک گئے، اور دعاء کرنے لگے کہ خدا انھیں بھی کوئی بچّہ عطا فرمائے۔

اور اس طرح وسیلی اور اولنکا چھ سال تک نہایت امن کی زندگی بسر کرتے رہے، لیکن ایک دن ...... ایک دن وسیلی سردیوں میں شام کی چائے کے بعد ننگے سر اُٹھکر ایک کام سے باہر

چلا گیا، اسے کچھ شہتیر کہیں بھجوانے تھے اور اس میں ذراسی بے احتیاطی سے اسے ٹھنڈ لگ گئی اور وہ بیمار ہو گیا۔ اگرچہ شہر کے بہترین ڈاکٹر اسکے علاج میں مصروف تھے لیکن اسکی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی اور چار مہینے کی طویل علالت کے بعد عازم ملک بقا ہوا۔ اور اولنکا ایک مرتبہ پھر بیوہ ہو گئی۔

"اب میرا کوئی بھی اس دُنیا میں نہیں میرے پیارے" وہ اپنے خاوند کی میّت پر سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی "میں اس دُکھ بھری دُنیا میں تمہارے بغیر کیونکر رہ سکتی ہوں؟ لوگو مجھ پر رحم کھاؤ میں اس وسیع دُنیا میں تنہا رہ گئی ہوں!"

اسکے بعد اس نے بیوگی کا لباس پہن لیا۔ آستینوں پر سیاہ لمبے گن چڑھا لئے اور ہیٹ اور دستانے ہمیشہ کیلئے پہننے چھوڑ دئے۔ اب وہ ایک نن کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ نہ کہیں آتی تھی نہ جاتی تھی ہاں کبھی کبھی یا تو گرجا چلی جاتی تھی یا اپنے خاوند کی قبر پر۔ چھ مہینے اسی طرح بیت گئے۔

اس نے اپنی سیاہ آستینیں اُتار دیں اور اتنے عرصہ کے بعد پہلی مرتبہ کھڑکیاں کھولیں۔ اب وہ اکثر صبح کے وقت باورچی کے ہمراہ بازار جاتی ہوئی دکھائی دے جاتی تھی۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کے لئے۔ لیکن گھر سے اب بھی ایک حد تک بے نیاز تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا تھا۔ ہر چیز ایک تاریکی میں تھی۔ ہاں شام کے وقت باغ میں ڈاکٹر کے ساتھ چائے پیتے ہوئے دیکھ کر لوگ کچھ اندازہ لگا لیتے تھے یا پھر اس بات سے جو اس نے ایک اور عورت سے ڈاکخانہ کے قریب کہی تھی۔

"شہر میں جانوروں کا ٹھیک طور پر کوئی معائنہ نہیں کرتا اور یہی وجہ ان متعدی بیماریوں کی ہے۔ روز شہر میں ایسی بیماریوں کی خبر اُڑتی رہتی ہے اور لوگوں کو گھوڑوں اور گایوں سے بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ جانوروں کی صحت کا خیال رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا انسانوں کی صحت کا"

جو حیوانوں کا ڈاکٹر کہتا تھا وہ انہیں باتوں کو دُہرا دیتی تھی اور ہر چیز کے بارے میں جو ڈاکٹر کی رائے تھی وہی اسکی رائے تھی۔ یہ چیز بالکل واضح تھی کسی سے بغیر کسی قسم کا لگاؤ رکھے ہوئے وہ ایک منٹ بھی نہیں جی سکتی تھی اور اسے خوشی میسّر نہیں آسکتی تھی اگر کوئی اور ہوتا تو ممکن ہے لوگ اُنگلیاں اُٹھاتے۔ لیکن اولنکا کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کرتی تھی وہ بالکل فطری تھا۔

اس نے یا ڈاکٹر نے کسی نے بھی اپنے نئے تعلّقات کے بارے میں کسی سے تذکرہ نہیں کیا تھا۔ دونوں اس چیز کو چھپاتے تھے۔ لیکن اولنکا جیسی فطرت کی عورت کبھی کوئی چیز راز بنا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ جب بھی کوئی اس سے ملنے آتا یا ڈاکٹر کی رجمنٹ کے آدمی اسکے پاس آتے تو وہ ان سے چائے پیش کرتے وقت، کھانا کھلاتے وقت، جانوروں میں پلیگ، پاؤں اور مُنہ کی بیماریوں اور بوچڑخانے کی بابت باتیں کرنے لگتے تھے۔ وہ اس پر بہت کڑھتا تھا اور جب سب مہمان چلے جاتے تھے تو وہ اسکی آستین پکڑ کر جھٹکتا تھا اور غصّہ میں چلّاتا تھا۔

"میں نے تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ جو چیز تمہاری سمجھ میں نہیں آتی اسکے بارے میں باتیں مت کیا کرو۔ جب دو ڈاکٹر باتیں کر رہے ہوں تو تم اپنی بات بیچ میں ٹھونس دیتی ہو، ایسا مت کیا کرو۔ مجھے ایسی باتوں پر غصّہ آتا ہے"

وہ اسکی طرف حیرانی سے دیکھتی تھی اور چوکنّا ہو کر کہتی تھی "تو پھر ڈاکٹر میں اور کیا باتیں کروں"

اور پھر اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ وہ اس سے لپٹ جاتی تھی اور التجا کیا کرتی تھی کہ ڈاکٹر تم غصّہ مت ہوا کرو اور پھر وہ دونوں خوش ہو جاتے تھے۔

لیکن یہ خوشی کچھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ ڈاکٹر چلا گیا ہمیشہ کیلئے، اسکی رجمنٹ کا تبادلہ ہو گیا، غالباً سائیبریا کی طرف اور وہ اس دُنیا میں پھر تنہا رہ گئی۔

اب وہ اس دُنیا میں بالکل اکیلی تھی۔ اس کا باپ عرصہ ہوا مر چکا تھا۔ ہاں اسکی ایک ٹانگ سے لنگڑی کُرسی ضرور برآمدہ میں پڑی تھی اور اس پر گرد جم گئی تھی۔ وہ دن بدن کمزور اور پیلی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ لوگ اب اسکی طرف اس طرح نہیں دیکھتے تھے جس طرح وہ پہلے دیکھا کرتے تھے بلکہ اب تو دیکھتے ہی نہ تھے، ان کی وہ پہلی مسکراہٹ نہ معلوم کہاں اُڑ گئی تھی۔ اولنکا کے بہترین دن اب گزر کر بہت دور نکل گئے تھے اور اب اسکی ایک نئی زندگی شروع ہو گئی تھی جس میں سوچنے کو کہیں دخل نہ تھا۔ شام کے وقت وہ مکان کے بیرونی حصّہ میں بیٹھا کرتی تھی اور ٹیوولی میں بجتے ہوئے بینڈ کی آواز اسکے کانوں میں آتی تھی۔ لیکن اب اس آواز میں اسکے لئے کوئی دلکشی نہ تھی۔ وہ اپنے صحن میں نہایت بے بسی کے ساتھ دیکھتی تھی اور اسکے ذہن میں کوئی خیال نہ آتا

۶۶

تھا۔ اب اسکی کوئی خواہش نہ تھی۔ رات ہو جاتی تھی اور وہ خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹ رہتی تھی اور اب اسکے خواب میں صرف ایک خالی صحن گھومتا تھا۔ وہ جی رہی تھی، کھا پی رہی تھی۔ یونہی، بے سبب یونہی!

اب اس کی کوئی رائے نہ تھی دُنیا کی کسی چیز کے بارے میں بھی وہ اپنے گرد چیزیں دیکھتی تھی اور جو دیکھتی تھی وہی سمجھتی تھی لیکن ان کے بارے میں اسکی کوئی رائے نہ تھی۔ اب وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا باتیں کرے۔ کس چیز کے متعلق باتیں کرے۔ اب اس کی کوئی رائے نہ تھی، کوئی رائے!

مثال کے طور پر آدمی بوتل دیکھتا ہے۔ بارش یا سڑک پر جاتے ہوئے دہقان کو دیکھتا ہے کہ گاڑی لئے ہوئے چلا جا رہا ہے لیکن ان تمام کے کیا معنی ہیں وہ نہیں سمجھتا۔ وہ نہیں جانتا یہ سب چیزیں کیوں ہیں! جب کوکن تھا، وسیلی یا حیوانوں کا ڈاکٹر تھا تو اس وقت وہ چیزوں کو سمجھتی تھی، ان کی وضاحت کر سکتی تھی ان کے بارے میں ایک رائے رکھتی تھی لیکن اب، اب تو ذہن اور دل دونوں اس طرح خالی تھے جس طرح مکان کا صحن خالی پڑا تھا۔ اب تو گویا اس کے منہ میں زبان بھی نہ تھی اور اگر تھی تو اسے کیڑا کھا گیا تھا۔

آہستہ آہستہ شہر چاروں طرف پھیلتا چلا گیا۔ پرانی سڑکیں گلیاں بن گئیں۔ جس جگہ ٹیپ دلی اور نال تھی اب وہاں نئے نئے موڑ اور مکانات بن گئے۔ کتنی تیزی سے گزرتا ہے وقت! اولنکا کا مکان بھی اب پرانا ہو گیا تھا۔ چھتیں زنگ آلود ہو گئی تھیں چھجے ایک طرف کو جھک گئے تھے اور صحن میں ہزاروں قسم کے خار و خس اُگ آئے تھے۔ اولنکا بھی اب معمر ہو چلی تھی۔ وہ اسی طرح اب بھی اپنے برآمدے میں بیٹھتی تھی لیکن اسکی روح اسی طرح خالی، خشک اور تلخ تھی۔ سردیوں میں وہ اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر برف کا منظر دیکھا کرتی تھی۔ جب بہار کے پھولوں کی خوشبو اس تک آتی، یا گرجا کی گھنٹیوں کی آواز اس تک پہنچتی اچانک کچھ پرانی یادداشتیں ان کے ذہن میں لوٹ آتیں۔ اسکے دل میں ایک درد سا پیدا ہوتا اور آنسو اسکی پلکوں پر لرزنے لگتے لیکن یہ سب کچھ صرف چند لمحوں کے لئے ہوتا تھا، صرف چند لمحوں کے لئے اور اسکے بعد پھر وہی خلا، وہی زندگی کی بدمزگی اور ویرانی! بلی کا سیاہ بچہ اسکی کمر سے کھیلنے لگتا۔ اس کی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑتا۔ لیکن اسکے لئے اس کھیل میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ اسے بلی کے بچے کی ضرورت نہ تھی اسے ایک انسان کی محبت چاہئے تھی جس میں وہ خود کو غرق کر دے، خود کو بھول جائے جس میں اسکی روح گھل مل جائے اور اسکے ذہن میں خیالات پیدا کر دے اور اسکے خون میں ایک قسم کی گرمی پیدا ہو جائے۔ وہ بلی کے بچے کو جھٹک دیتی۔

"بھاگ، مجھے تیری ضرورت نہیں!"

اور زندگی اسی طرح گزرتی رہی، لمحے، دن، سال، کوئی خوشی نہیں، کوئی تبدیلی نہیں، کوئی ذاتی رائے نہیں! جو کچھ باورچی کہہ دیتا وہ اسے مان لیتی، اس پر یقین کر لیتی۔

جولائی کی ایک شام کو، جب ڈھور ڈنگر چر کر واپس لوٹ رہے تھے اور تمام صحن گرد سے پُر تھا ایک دم کسی نے دروازہ پر دستک دی، وہ ایک دم اُٹھ کر کھولنے کے لئے گئی۔ ایک حیرانی سی اسکے تمام جسم پر طاری ہو گئی۔ شہری لباس میں ایک معمر آدمی، سفید سر، ڈاکٹر! وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور سر اسکے شانوں پر رکھ دیا۔ اس کیفیت میں اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کب اور کس طرح چل کر کمرے میں پہنچ گئے اور چائے پینے لگے۔

"کونسی موج ادھر بہا لائی ڈاکٹر" اس نے خوشی سے بھرپور لہجہ میں کہا۔

"میں اب ہمیشہ کے لئے یہیں رہنا چاہتا ہوں اولنکا" اس نے کہا "میں نے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا ہے اور جو کچھ میں نے اس وقت تک پس انداز کیا ہے اسی پر گزر کرنا چاہتا ہوں۔ اسکے علاوہ اب میرا بچہ بڑا ہو گیا ہے اور اسکے سکول جانے کے دن ہیں۔ اب میں نے بیوی سے مصالحت کر لی ہے۔"

"کہاں ہے وہ" اولنکا نے پوچھا۔

"وہ لڑکے سمیت ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے اور میں مکان کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔"

"مکان کی تلاش میں کیوں پھر رہے ہو میرا مکان کس لئے ہے مجھے چاہئے ہی کیا، صرف ایک کمرہ، میں تم سے کوئی کرایہ نہ لوں گی تم ضرور آجاؤ۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

اگلے روز سے مکان کی مرمت شروع ہو گئی چھتیں درست ہونے لگیں، دیواروں پر سفیدی ہو گئی۔ اولنکا ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہدایتیں دیتی ہوئی چاروں طرف پھر رہی تھی۔ اسکے چہرے پر خوشی کندن کی طرح چمک رہی تھی اور وہ اسی طرح تمام رات جاگتی رہی۔ ڈاکٹر کی بیوی آ گئی۔ پتلی دُبلی ایک سادہ سی عورت تھی جس کے چھوٹے چھوٹے بال تھے، بٹیر کی سی آنکھیں۔ اسکے ساتھ ساشا تھا، ایک دس سال کا بچہ، نیلی آنکھوں والا چھوٹا سا بچہ۔ بات

۶۸

کرتے تو اسکے گالوں میں حلقے پڑ جاتے تھے۔ ابھی اسے آئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ بلی کے پیچھے بھاگنے دوڑنے لگا اور اسکی خوشی اور معصومیت سے بھری ہوئی کلکاریاں مکان میں گونجنے لگیں۔

"خالہ اماں یہ تمہاری پوسی ہے" اس نے اولنکا سے پوچھا۔ "جب یہ بچے دے تو ایک بچہ ہمیں ضرور دینا اماں چوہوں سے بہت ڈرتی ہیں۔"

اولنکا نے اس سے بہت سی باتیں کیں، اسے چائے پلائی، اسکے جسم میں ایک عجیب قسم کی مسرت لہریں لینے لگی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ساشا اس کا بچہ ہے۔ اور جب شام کے وقت وہ اپنا سبق یاد کرنے کے لئے بیٹھا تو وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی اور خود بخود کہنے لگی:

"میری جان!.... میرے خزانے..... تم کتنے اچھے ہو..... کتنے شریر ہو۔"

"جزیرہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو چاروں طرف پانی سے گھرا ہو" وہ زور زور سے پڑھ رہا تھا۔

"جزیرہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے جو چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا ہو" وہ زور زور سے پڑھ رہا تھا۔

"جزیرہ زمین کا وہ ٹکڑا ہے" وہ دہرانے لگی اور ایک طویل عرصہ کے بعد یہ اسکی پہلی رائے تھی جو اسکے ذہن کی مردہ زمین سے ابھر رہی تھی۔

اب اسکی اپنی ایک رائے ہو گئی تھی۔ شام کے کھانے پر وہ ساشا کے والدین سے باتیں کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ بچوں کے لئے اسباق کا انتخاب بہت مشکل رکھا ہے لیکن پھر بھی ہائی سکول تجارتی سکول سے بہتر ہے اس لائن میں آدمی آگے چل کر ڈاکٹر بھی بن سکتا ہے اور انجینئر بھی، اب یہ اس کی مرضی پر ہے کہ جا ہے جو پیشہ اختیار کرے۔

ساشا نے ہائی سکول جانا شروع کر دیا۔ اس کی ماں وہاں سے اٹھ کر اپنی بہن کے یہاں خارکوف جا رہی اور واپس نہیں آئی اسکے باپ کو روز جانوروں کی دیکھ بھال کیلئے جانا پڑتا تھا اور کبھی تو گھر سے تین تین روز غائب رہتا تھا۔ اولنکا کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ دونوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے اسکی اب گھر والوں کو کوئی ضرورت نہیں محسوس ہوتی اور یہ کہ وہ وہاں بھوکا بھی مرتا ہے اس لئے وہ اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے گھر لے آئی اور ایک کمرہ اسکے رہنے کے لئے دیدیا۔

چھ مہینے سے ساشا اسکے ساتھ تھا۔ ہر روز صبح کو اولنکا اس کے کمرے میں جاتی اور دیکھتی کہ وہ اپنے رخساروں کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے خاموشی سے سو رہا ہے۔ جب وہ اسے جگانے کا ارادہ کرتی تو اسے تکلیف محسوس ہوتی۔

"ساشنکا" وہ دردبھری آواز میں کہتی۔ "اٹھ بیٹھو جانم سکول کا وقت ہو گیا ہے۔"

وہ اٹھ بیٹھتا، نہا کر کپڑے بدلتا اور صبح کی دعا مانگنے کے بعد ناشتہ کرنے کیلئے بیٹھ جاتا۔ ایک دو توس، ایک کریم اور تین پیالیاں چائے کی پیکر وہ تیار ہو جاتا۔ لیکن اس تمام عرصہ میں نیند کی سستی اس پر سے دور نہ ہوتی، ایک چڑچڑا پن سا اس پر برستا رہتا۔

"تمہیں اپنی کہانی بھی یاد نہیں ساشنکا" اولنکا اس سے کہتی اور اسکی طرف ایسے دیکھتی جیسے کسی بڑے سفر پر روانہ ہونیوالا ہے "تمہارے ساتھ کتنی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اپنا سبق یاد کر لیا کرو اور اپنے استادوں کا کہنا مانا کرو جانم۔"

"آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے" ساشا اس سے تنگ آکر کہتا اور پھر وہ سکول کی طرف روانہ ہو جاتا، ایک ننھی سی جان بڑی سی ٹوپی پہنے ہوئے ایک بھاری سا بستہ کندھے پر رکھے ہوئے۔ اولنکا دبے پاؤں اسکے پیچھے پیچھے ہو لیتی۔

"ساشنکا" وہ اسے پیچھے سے آواز دیتی اور اس کے ہاتھ میں کھجور یا ایسی ہی کوئی کھانے کی چیز دیدیتی۔ جب وہ سکول کے دروازہ پر پہنچتا تو اسے شرم سی آنے لگتی کہ ایک طویل طویل اور مضبوط عورت اسے چھوڑنے کے لئے سکول آرہی ہے۔ وہ پیچھے کی طرف مڑتا اور کہتا۔

"خالہ اماں اب آپ جائیے اب میں اکیلا چلا جاؤں گا۔"

وہ یہ سن کر خاموش کھڑی رہ جاتی اور وہ اسکول کے دروازہ میں غائب ہو جاتا۔

آہ اسے اس سے کتنی محبت تھی، کتنا لگاؤ تھا اسے اس بچے سے آج تک کسی چیز نے اسکی روح کا اس درجہ گھیرا احاطہ نہ کیا تھا اس کی مادرانہ جبلتیں ابھر ابھر کر منظر شہود پر آگئی تھیں۔ اسے کتنی مسرت ملتی تھی اس ننھی سی جان کو دیکھ کر جس کے رخساروں میں بات

کرتے وقت حلقے پڑجاتے تھے۔ وہ اسکے لئے اب اپنی زندگی وقف کرسکتی تھی۔ وہ اپنی مسرت اور آنسو بھری آنکھوں کے اظہار پر مجبور تھی۔ لیکن ایسا کیوں تھا، کیوں؟ یہ کون بتا سکتا تھا کہ ایسا ہے کیوں؟

وہ ساشا کو سکول کے دروازے کے پیچھے غائب ہوتا ہوا دیکھ کر گھر کی طرف لوٹ پڑتی تھی، مطمئن اور خاموش اسکا دل محبت سے لبریز ہوتا تھا اور اس کا چہرہ ان چھ مہینوں کے اندر ہی اندر پھر جوان ہو چلا تھا۔ اسکے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ہوتی تھی اور چہرے پر ایک قسم کی روشنی سی۔ لوگ اسے راستہ میں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

"تسلیم اولگا جانم۔ کیسی ہو جانم"؟

"آجکل سکولوں میں سبق بڑے مشکل دئے جاتے ہیں" وہ منڈی کے قریب کھڑی ہو کر اظہارِ خیال کرتی۔ "پہلی ہی جماعت میں اتنا مشکل سبق، کل انہوں نے اسے مُنہ زبانی ایک کہانی یاد کرنے کے لئے دے دی تھی۔ ایک لاطینی کا ترجمہ اور ایک شکل حل کرنے کے لئے۔ تم جانتے ہو ایک ننھی سی جان کے لئے کتنی مشکل چیزیں ہیں یہ"

اور وہ اُستادوں، اسباق، سکول اور کتابوں کے بارے میں اسی طرح باتیں کرنے لگتی جس طرح ساشا بیان کرتا۔

شام کو تین بجے کے قریب وہ دونوں اکٹھے کھانا کھاتے شام کو رات گئے وہ دونوں اکٹھے سبق یاد کرتے اور دونوں مل کر چلاتے۔ اور جب رات کو وہ اسے بستر میں لٹاتی تو بہت دیر تک اسے دیکھتی رہتی اور پھر اسکے لمبا سا صلیب کا نشان بنا کر کچھ پڑھنے لگتی اور پھر اپنے بستر میں لیٹ کر اپنے دُھندلے مستقبل کے خواب دیکھنے لگتی۔ جب ساشا پڑھ لکھ کر فارغ ہو جائے گا اور کہیں انجنیر یا ڈاکٹر ہو جائے گا۔ اس کا ایک بہت بڑا امکان گھوڑا اور گاڑی ہونگے۔ شادی ہو گی اور بہت سے بچے ہونگے ...... وہ انہیں خوابوں کی گود میں سو جاتی، آنسو اسکی آنکھوں سے بہتے رہتے، اسکے رخسار تر ہو جاتے اور بلی اسکے قریب لیٹی ہوئی خرخر کرتی رہتی۔

اچانک دروازہ پر دھم دھم ہوتی۔ اولگا گھبرا کر اور بے دم ہو کر آنکھیں کھول دیتی، دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگتا۔ آدھ منٹ بعد پھر وہی دھم دھم ہوتی۔

"کیا خبر ہارکو سے تار آیا ہو" وہ سوچنے لگتی کہ وہ دُنیا میں سب سے زیادہ بدقسمت عورت ہے اور ایک منٹ گزر جاتا اور دروازہ پر ایک دھیمی سی آواز گونجتی اور آخر میں وہ ڈاکٹر کی آواز ثابت ہوتی، معلوم ہوتا کہ کلب سے لوٹا ہے۔

"شکر ہے خدا کا لاکھ لاکھ" وہ سوچتی۔

رفتہ رفتہ اس کے دل کا بوجھ اُتر جاتا اور اسے پھر ایک سکون سا مل جاتا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں ساشا کے متعلق

سوچتی ہوئی چلی جاتی جو برابر کے کمرے میں لیٹا ہوا گہری نیند سو رہا تھا اور خواب میں بڑبڑا رہا تھا۔

"یہ میں تمہیں دے دونگا ....
دور ہو جاؤ .... بکو مت!"

(چیخوف)

ساغر نظامی

ماؤں کو آخری سلام

غفلت کا انجام دیکھو، آخر ہمارے سرسبز و شاداب باغ میں وہ منحوس گھڑی آگئی جس کا خدشہ تھا ——— نو شگفتہ پھولوں کی گود بلبلوں کے خون سے اس طرح لبریز ہوگئی جیسے پیالے سرخ شراب سے، جیسے آنکھیں خون کے آنسوؤں سے، نونہالانِ چمن کے خون سے چمن کا ذرہ ذرہ رنگین ہوگیا، گویا ہر طرف گلاب کی خشک پتیاں بکھری ہوئی پڑی ہیں معصوم اور اچھوتی کلیوں کے نازک اور کیفِ شباب سے جھک پڑنے والے گچھوں میں صیاد کے تیروں نے آشیانے بنالئے باغ کی ایک ایک ٹہنی اور ایک ایک پتی پر صیاد کی ظالم فوج نے اپنا قبضہ جمالیا، وہ پھول جن کی نزاکت نظارہ کا بھی بوجھ نہ اُٹھا سکتی تھی ....

.... اور وہ پھول جن کی نکہت اپنی نازک خرامی کی وجہ سے
۷۰ شامہ تک سفر کرنے میں تکلف نظر آتی تھی مسل کر پھینک دئے گئے۔ اِدھر اُدھر پھینک دئے گئے۔

باغ کے وہ نوجوان جو اپنی عمر کی بہاریں لوٹنے میں مست ہو سکتے تھے چمن کے وہ بانکے جن کی کجکلاہی چاند اور سورج کو نیچا دکھاتی تھی زخمی پڑے ہیں، وہ کنواریاں جو باغ کا نور اور بہاروں کی جان تھیں۔ اُن عفت و عصمت کی دیویوں پر صیاد و باغباں اور ان کے حواریوں نے وہ ناقابلِ بیان ظلم ڈھائے جن کا بیان کرنا ہمارے مقدس باغ کی چار دیواری میں "پاپ" سمجھا جاتا تھا، پاپ! اے ماؤ پاپ! نہ بیان ہو سکنے والا پاپ ——— ایسی حالت میں تم ہمیں میدانِ جنگ کی طرف جانے سے روکتی ہو۔ اُس میدانِ جنگ کی طرف جہاں ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ اے سپید سر بوڑھیو! یہ وقت رونے دھونے کا نہیں ہے ہمیں اپنے وطن پیارے وطن پر قربان ہوجانے کیلئے رخصت کردو۔ اے مفلوک اور مفلس باغ کی غریب اور مصیبت زدہ غلام فطرت ماؤ ہمیں زیادہ دیر تک بزدل، بیکار، بے غیرت اور بے حیا نہ بناؤ۔ اس وقت سارے باغوں پر غلامی کے عفریت نے اپنے پروں سے سایہ کرلیا ہے اور وہ اپنی مقدس بنسی کی لَے پر ابدی غیرت کے میٹھے اور مدھر گیت نہیں گا سکتے۔

اے ماتا! ہم صبح سویرے ماحول کے گرم و تند گیتوں کا شور سن کر بیدار ہوئے ہیں ہماری رگوں میں سویا ہوا خون جاگ پڑا ہے، وہ خون جو ہمارے آباؤ اجداد سے ہمیں زندگی کے تحفہ کے طور پر ورثہ میں ملا ہے۔

یہ ورثہ ہم سے اپنے استعمال کا مطالبہ کرتا ہے۔ قرضخواہ اپنا قرض طلب کر رہا ہے، اے ماتا! ہمیں جانے دے۔ جانے دے، ہم اب وہ حالت برداشت نہیں کر سکتے جس کا برداشت کرنا سب سے بڑی ذلت ہے۔

صبح کی سپیدی دکھیا کنواری کی مضمحل و غم زدہ آنکھوں کی طرح بے نور ہے اور چڑیوں کے چہچہے مدھم پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی فاختہ نے اپنی پرارتھنا ختم بھی نہ کی تھی کہ صیاد نے اس کو ایک ہی تیر میں خون اور پروں کی گیند بنا کر کانٹوں کی جھاڑی پر گرادیا اور وہ ایک شاخ پر اٹک کر رہ گئی ———

اے ماں! آ ہم تجھے ظلم کا یہ پرچم دکھائیں ——— جانے دے، جانے دے پیاری اماں! ہمیں جانے دے انتقام کی تیز آگ ہماری رگ و پے میں بھڑک کر ہمیں آتشکدہ بنا چکی ہے۔ یہ آتشکدہ تیرے آنسوؤں سے ٹھنڈا نہیں پڑ سکتا۔ اس کو تو دشمن کے گرم خون کی بارش ہی سرد کر سکتی ہے۔

اے ماں! تو کیا سوچتی ہے۔ ہم تیرے وہ ہی پوت ہیں جو شب و روز شراب اور گیت سے کھیلتے تھے اور رقاصہ لڑکیوں کے گھونگروؤں کی آواز پر ناچتے ہوئے اپنی راتیں گنواتے تھے مگر آج ہم موت کے فرشتوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر اُس میدان کی طرف جارہے ہیں جہاں توپوں اور ٹینکوں سے ہم کو کھیلنا ہے۔ ہم نے شراب کے مٹکوں کو اپنی جنگی چپلوں سے اوندھا دیا ہے۔ پیالوں کو میخانے کے فرش پر چکنا چور کردیا ہے چھاگلیں سڑکوں پر پھینک دی ہیں۔ دیواروں پر چھائی ہوئی انگوروں کی شاداب بیلوں اور نیم تیار خوشہ ہائے تاک کو ریزہ ریزہ کردیا ہے۔ ہم نے رقاصہ لڑکیوں کو ہاتھ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ ان کی سرخ چوڑیاں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر زمین پر گر گئیں۔ ان کے آنسو آج ہم کو متاثر نہیں کر سکے اور کیوں کر سکتے تھے آخر تو ہم ارجن و بھیم کی اولاد میں سے ہیں۔ ہم نے ان کے وداعی گیت، درد انگیز اور غمناک گیت نہیں سُنے اور کیوں سُن سکتے تھے! ہمارے کانوں میں معصوم مظلوموں کے بین و بکا کی آوازیں سمائی ہوئی تھیں ہمارے کان اُس مہیب نغمے

ایشیا ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

شور پہ لگے ہوئے تھے "جو وقت کے" خوفناک مغنی کے لبوں سے بلند ہو رہا تھا۔
ماتا! اے ماتا! ہم نے اپنی منگیتر کنواریوں کو بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا
...رکیوں دیکھتے جبکہ ہماری نیت اور ہمارا ارادہ اپنے وطن پر قربان ہو جانے
...ہے۔ اے اماں! ہم اس وقت تم سے دودھ بخشوانے کیلئے آئے ہیں۔
———— آخری بار صورت دکھانے کیلئے آئے ہیں۔
اے ماں! اس قدر نہ چیخ، خدا کی قسم ہماری روح اپنے فرض کو بھول
...ئے گی، خدا کی قسم اس طرح نہ رو ہم صبح سویرے "کافر" ہو جائینگے۔ خدا
...لیئے سر کو اس قدر نہ پیٹ کہ تیرے سفید بالوں کا ریشم بالکل بکھر جائے اور ہماری
...گوں میں جوش مارنے والے خون کے بجائے آنسو دوڑنے لگیں۔
اماں! اماں! بوا! بوا! دامن نہ پکڑو ورنہ گریبان چاک کر دینگے
...یہ بزدلی، یہ کمزوری، دھرم سے یہ غداری اصول سے یہ بغاوت فرض سے یہ
...بد عہدی، اے ماؤ یہ تلواریں پڑی ہیں گلے کاٹ دو مگر ہمیں لا مذہب نہ بناؤ،

. . . .

. . . .

. . . . ہمارا دامن نہ پکڑو، تمام دنیا
اس وقت اپنے باغوں کی عزت اور عزت کی حفاظت کیلئے سینہ سپر ہے
... ہمارے شاداب میوہ دار باغ میں ایک مدت سے آندھیاں چل
...رہی ہیں، خزاں اور صیاد کے ظلم اپنے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں،
ہر درخت کی جڑ کھوکلی ہے، ہر نخل مرجھایا ہوا ہے۔ ہر پھول پژمردہ ہے۔ خوش
رنگ چڑیاں پیاس سے بے تاب ہو کر شاخوں پر اپنی چونچیں کھولے ہوئے
آسمان کی طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ لو کے گرم تھپیڑے خشک
پتوں کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے، ذرہ ذرہ قوت سے مغلوب ہے، قطرہ
قطرہ آلام کے سمندر کی فلک بوس موجوں سے تھر تھرا رہا ہے۔ آسمان
ہمارے نہیں رہے۔ زمین ہماری نہیں رہی در و دیوار ہم سے خفا ہیں کائنات
ہم سے ناراض ہے۔ تمام لالہ زاروں کے محافظ ہمیں ذلت کی نگاہ سے
دیکھتے ہیں، اے ماؤ ہم نے اس خفگی کے راز کو معلوم کر لیا ہے، ہم اپنی
بے مائگی کے بھید کو تاڑ گئے ہیں ہم نے اپنے فرض کو بھلا دیا تھا، وہ
مقدس فرض، آج تیرے پوتوں کے سوئے ہوئے دلوں میں ایک بہادر
کی طرح انگڑائی لیکر جاگ اٹھا ہے۔ ہماری آنکھوں میں میدانِ جنگ کا نقشہ
گردش کر رہا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سموں کے نیچے غنیم کی روح
سسکتی نظر آتی ہے۔ ہماری تلواریں ہمارے رائفل ہمارے خنجر سب
اپنی اپنی جگہ چمک رہے ہیں۔ ہم بہادر ہیں ہم اپنے باغ کے پھولوں کی
حفاظت کیلئے خوفناک جہاد کیلئے تیار ہوئے ہیں۔ اے ماؤ ————

چھوڑ دو ہمارے گھوڑوں کی باگیں، ———— !

(۲)

نوجوان مجاہد اتنا ہی کہہ سکے تھے کہ کمسن کنواریاں اپنے اپنے
چھپر کھٹوں پر جاگ اٹھیں۔ ایک نے حیرت سے دیکھا ————
دوسری نے کچھ کہنا چاہا ———— تیسری رو پڑی، بھیا! کہاں
چلے؟ بیرن! کدھر جاتے ہو، کیا شکار کیلئے تیر و کمان سنبھالی ہے؟
ہاں شکار کو جاتے ہیں! مجاہدین نے جواب دیا ظالم اور غاصب
کے شکار کو جس نے ہمارے باغ کی زندگی کو شکار کرنے کی ٹھانی ہے۔
بہنوں نے اٹھ کر دیکھا ———— اور بولیں: —
دوش پر نیزے اور کمروں میں تلواریں، جسموں پر زرہ بکتر۔ گھوڑے
جنگی سامان سے آراستہ! بھیا اب کاہے کو لوٹ کر آؤ گے۔ بیرن! اب کیوں اپنی
بہنوں کو مکھڑا دکھاؤ گے! بھیا! یہ عمر تو مرنے کی نہیں ہے، سہرا بندھنے کی ہے۔
"خاموش!" ———— مجاہدین نے تھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔
غیرت مند وطن پرست اپنے مقدس چہروں پہ پھولوں اور کلیوں کے
سہرے نہیں باندھا کرتے خون کے سرخ موتیوں کا سہرا ان کے رخ پہ
بندھتا ہے، بہنیں ان کے ماتھے پر ٹیکا نہیں لگاتیں، بلکہ حیاتِ جاوید
١٧ ان کی جبیں پر خود اپنے ہاتھ سے کبھی نہ مٹنے والا قشقہ لگاتی ہے جو
سورج بن کر ابد الآباد تک چمکتا رہتا ہے ———— "خاموش!" اے راجپوت
بہن! چپ ہو۔ اے بابر کی نسل کو بدنام کرنیوالی لڑکی!
کنواریوں نے پھر رونا شروع کیا، بھائیوں کے دامن پکڑ کر
بیٹھ گئیں اور بولیں: —
بھیا مت جاؤ! اور جاتے ہو تو ہم کو بھی ساتھ لے چلو! اماں! اب
کاہے کو لوٹ کر آئینگے، ماؤں نے سنا اور دہاڑیں مار کر رونے پیٹنے لگیں۔
کاہے کو آئینگے، جا کر کون آتا ہے، پریمی کی گرمی پہ تھوڑے
ہی جا رہے ہیں جو ہنس بول اور تماکو پی کر چلے آئینگے۔ آگ اور خون
کے میدانوں میں جا رہے ہیں، موت کی کوٹھری کی کنڈی کھٹکھٹاتے
ہوئے ہمارے پیارے جانے کہاں گم ہو جائینگے!! یہ
ہمارے لاڈلے، یہ جوان جوان پوت، یہ مونگے کے دانے، یہ ہیرے کے ٹکڑے
ہے پرماتما! یہ یوں ہی چلے جائینگے۔ اے خدا ہمیں باغ کی پروا نہیں،
کوئی اس میں آگ لگائے تو لگا دے، کوئی اسے لوٹے تو لوٹ لے،
کوئی اس پر قبضہ جمائے تو جما لے، مگر اپنے بچوں کو نہ جانے دینگے پھل
نہ آئے باغ نہ پھولے۔ ہمارے پھول سدا بہار پھول یوں ہی شاداب
رہیں۔ سندری دوڑ ———— کنڈی تو لگا ———— کوئی ہماری اجازت

کے بغیر جا سکتا ہے ؟ ——— جاؤ گے ؟ ——— جاؤ گے ؟؟
ماؤں نے اپنی ماتما سے متاثر ہو کر غضبناک دیوانگی کے ساتھ کہا۔ مجاہد بیٹوں نے سر جھکا لیا۔

اے بچو! اے ناتجربہ کار جوشیلے نوجوانو! ہماری اجازت کے بغیر جا سکتے ہو، ماتما کو خود دروی کی درانتی سے ذبح کرو گے، پریم کا گلا جوانی کے تیز چاقو سے کاٹو گے؟ محبت کا گلا گھونٹو گے؟ کدھر ہیں تمہاری تلواریں؟ ——— کہاں ہیں تمہارے تیر؟ ——— کمانیں بازوؤں سے گرادو، گھوڑوں کی پیٹھوں کی زین اُتار دو۔ جنگی لباس کے ٹھیک ٹکھ لدو؟ ——— بڑے آئے باغ کے رکھوالی ——— بڑے بہادر۔ بڑے سورما۔ شراب کے پیالے توڑ آئے ناچ نہیں دیکھا، مہارشی! ماؤں کے حکم کے بغیر تم کچھ کرسکتے ہو، مگر آہ ہمارا پیارا دیس جسکی زمین پر تمہاری طرح رونی ہوئی ہم بھی پیدا ہوئی ہیں۔ یہ بچپن کا جھولا، یہ جوانی کی جولانگاہ!!

(۳)

ہاں وہی دیس، وہی دیس، آج ایسی مشکل میں ہے جس میں خدا کسی کو نہ ڈالے، وہی باغ آج اسی میں ظلم اور تشدد، سختی اور جبر کی وہ آندھی
۷۴
چل رہی ہے جو ایک ہری شاخ اور ایک پھول کی پتی بھی باقی نہ چھوڑیگی جائینگے ہم اپنے پیارے دیس کو بچانے کیلئے اُسکی عزت پر مر مٹنے اور کٹ مرنے کے لئے ہم اپنی جان کی بھینٹ دیس کے اُس مندر پر چڑھائینگے جس کا سنہری کلس عرش الٰہی کو بوسہ دیتا ہے۔

چھوڑ دے اماں! ہمارے گھوڑوں کی باگیں اور ہمیں جانے دے،

"نہیں" ماتما نے بہ آواز بلند بے تاب ہوکر کہا اور اسکے بعد ماؤں کے ہاتھ جن میں چوڑیاں وداعی گیت گا رہی تھیں مجاہدین کی گردنوں میں حمائل ہو گئے۔ گئو ماتا خواب سے بیدار ہو گئی۔ طوطے نے چہچہانا شروع کیا، مویشیوں کے گلے میں گھنٹیاں بجنے لگیں، بیٹوں نے ماؤں کے حکم سے تلواریں زمین پر ٹیک دیں کمانیں بازوؤں سے اُتار دیں ترکش ایک طرف رکھ دئے، چہرے سُرخ تھے، آنکھیں نکلی پڑتی تھیں، سینے تنے جاتے تھے، اسی حال میں مجاہدین نے کہا:۔

ہم تمہارے بغیر کچھ نہیں کر سکتے، پانی بھی نہیں پی سکتے، تنکا بھی نہیں اُٹھا سکتے ——— مگر ——— اے ماؤ، کیا صدیوں کی غلامی نے تمہارے خون کو سرد کر دیا ہے تم اپنی قومی روایات کو بھول گئیں، اگر آج سے ہزاروں برس پہلے پتا بائی کے بجائے (جس نے وفاداری کی خاطر اپنے بیٹے کو کٹا دیا تھا) تم پیدا ہوئی ہوتیں تو کیونکر کام چلتا ———

ہم نہیں جائینگے دیس کی سیوا کرنے کیلئے مگر اے ماں! اس حقیقت سے انکار کر دے کہ تو راجپوتوں کی اس قوم سے نہیں ہے جس نے جواہر بائی جیسی بہادر عورت پیدا کی جس نے میدان جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر سے بہادروں کے دل ہلا دئے۔ اے ماؤ! ماتما میں ڈوبی ہوئی ماؤ! کرم دیوی بھی تمہاری ہی طرح ایک عورت تھی مگر وہ سچی "راجپوتنی" تھی جس نے اپنے دیس کی سیوا کیلئے تلوار اُٹھائی اور دشمن کو مار بھگایا۔

اے ماں! گو امتداد نے ہماری خصوصیتوں کو برباد کر ڈالا مگر ابھی زمانہ نورجہاں، کلاوتی اور ساوتری کو فراموش نہیں کرسکا ہے جو تمہاری ہی طرح بیٹوں کی مائیں تھیں۔ کلاوتی اور ساوتری ——— وہی ساوتری جسنے شیواجی کے چھکے چھڑا دئے۔ کلاوتی ——— وہی کلاوتی جس نے علاؤ الدین سے خوفناک جنگ کی اور زخم خوردہ شوہر کے زخم کا زہر چوس کر وفا کی راہ میں قربان ہوگئی۔

اے ماؤ! ہم دیس کی سیوا کیلئے تیار نہیں ہیں اگر تم یہ کہدو کہ "ماتما سچ مچ دُنیا میں بدترین جذبہ ہے اور تم اُس مہارانی کی نسل سے نہیں ہو جس نے اپنے شوہر جسونت سنگھ راٹھور کے ناکام واپس ہونے پر قلعہ کے دروازے بند کر لئے تھے اور کہا تھا کہ بہادر راجپوت یا فاتح کی حیثیت میں لوٹتا ہے یا شہید کے روپ میں۔ یہ کون میرے دروازے پر واپس آیا ہے کہہ دو کہ میں اسکی بیوی نہیں ہوں جو میدان جنگ سے ناکام ہوکر زندہ واپس آجائے۔

ماؤ! کہو۔ کہو۔ کیا تم اُسی قوم سے ہو جسکی عورتیں اپنی کوکھ سے رام اور بیدمشٹر، پرشرام اور بھیشم، درونا چاریہ اور ارجن پیدا کرتی تھیں جو غیور تھیں، خوددار تھیں، بہادر تھیں، مستقل مزاج تھیں، آزادی پسند تھیں اور جنہوں نے آریہ ورت کے ذرے ذرے کو اپنا کلمہ پڑھنے کیلئے مجبور کر دیا تھا۔

اگر ابھمن کی ماں زندہ ہوتی تو میں اُس سے کہتا کہ سچے بہادر کی بہادر ماں تیری آتما پر رحمت ہو کیونکہ تو نے بزدل اور آشو تشتھامان کی گھمسان فوج میں شاندار رتھ کو چکر لگانے سے روکا نہیں، لیکن میری ماں! مجھے میرے دیس کی سیوا کرنے سے روکتی ہے اور وہ پھر بھی سمجھتی ہے کہ "راجپوت" کی راجپوت بیٹی ہے۔

بوڑھی مائیں شدت تاثر سے چیخ اُٹھیں۔ انکی آنکھوں سے عظمت و جلال کی کرنیں پھوٹ کر مجاہدین کی نگاہوں کو خیرہ کئے دیتی تھیں۔ انکے تنے ہوئے ابروؤں میں رام دھنش کھنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان کی نگاہوں سے تیغ امام چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی انکی آنکھوں کی سرخی میں چتائیں تیار تھیں ان میں بھسم ہو جانا چاہتی تھیں طعنوں کی بیل بوچھار! اتنی بڑی گالی اپنے خون کی ارتقائی شکل کی طرف سے شرم کرو۔ اے ماؤ اگر تم جلد یہ جان لیتیں کہ دیس کی سیوا اور اپنے باغ کی

(بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۸۵ پر)

کسوٹی

کسوٹی

نئی کتابیں

نئے ادبی رجحانات

اسرار کریمی پریس الہ آباد سے حال ہی میں ایک کتاب "نئے ادبی رجحانات" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف سید اعجاز حسین الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر اور اُردو ادب کی مشہور شخصیت ہیں۔ نظم و نثر پر علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کیلئے کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ نظم کا آغاز دکن کی اُردو شاعری، ولی اور اس کے معاصرین سے کیا گیا ہے۔ اُردو شاعری کی ابتدا تصوف آمیز عشق سے ہوئی۔ اور غالب تک اسی پرانے ڈھرے پر چلتی رہی کچھ تو ہندوستان

کی سرزمین ہی اتنی مہربان واقع ہوئی ہے کہ انسان کو بھوکا نہیں مرنے دیتی اور کچھ ایرانی کلچر اور فارسی شاعری کے پرتو ہندوستانی زندگی پر گہرے پڑتے رہے۔ ہندو قوم اور اس کے کلچر میں خود کوئی جان باقی نہ تھی۔ ان کی زندگی ویدانت، بدھ مت کے تیاگی اصولوں، کرشن بھگتی، رام پریم، اور ایسے ہی مختلف نشوں کے بعد غضب کا رچاؤ پیدا کر چکی تھی۔ فارسی تغزل کے گہرے اثرات نے اس دور کے ہندوستانی کو سخت عاشق مزاج بنا دیا، غزل خود بھی اسی قسم کے سامانوں کو چاہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کی کوئی ایسی مضبوط بنیاد نہ پڑ سکی جس میں نشو و نما کی خاص قوت ہوتی۔

لیکن دوسرے ملکوں خاصکر انگریزی شاعری ہی کو لیجئے چاسر کے بعد اب تک بتدریج ترقی کرتی نظر آئے گی۔ ہر آنے والے نے اپنے حصّہ کے دو چار قدم اُٹھائے اور دوسرے کے لئے راستہ بناتا چلا گیا۔ مگر لکیر کے فقیر ہندوستانیت کا ہل نشان میں کبھی کسی کو قدم اُٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ جو بھی آیا اُس نے بزرگوں کے اثاثہ کو سینہ سے لگایا اور اسی پر فخر کرتے کرتے دم توڑ دیا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے لوگ مرتے چلے آئے اور اپنے پیچھے مردہ شاعری کا ایک قبرستان بھی چھوڑتے چلے گئے۔

کتاب کے پہلے باب میں ولی سے لیکر سودا اور درد کے موضوعات شاعری کے متعلق اشارے کئے گئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ان موضوعات کو جو غیر شعوری طور پر قلم سے نکل گئے ہوں گے باقاعدہ اپنا لیا جاتا تو ہمارے دور کی بہت پہلے ابتدا ہو گئی ہوتی۔ اور شاعری نہ معلوم اب تک کتنے قدم اُٹھا چکی ہوتی۔

بہر کیف پہلے باب میں غزل کی ابتدا و ارتقا کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ دور امیر مینائی اور داغ پر ختم ہو جاتا ہے جسے اعجاز صاحب نے ان الفاظ میں ختم کیا ہے:۔

> "ادبی دور کی تقسیم کے لحاظ سے اب قلم کا مسافر اس مقام پر آگیا ہے جو قدیم و جدید اُردو شاعری کا سنگم ہے، جہاں پرانی شاعری کے سربرآوردہ شعرا نئی شاعری کے علمبرداروں سے مل رہے ہیں۔ آزاد و حالی امیر و داغ کا احترام کرتے ہوئے اپنی عمارتوں کے نقشے مرتب کر رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ ہم کسی طرح آپ کی منقصت گوارا نہیں کر سکتے۔ آپ کے کارنامے کبھی بھلا نہیں سکتے۔ صرف زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے اُردو شاعری کا دائرہ وسیع کرنا چاہیئے حسن و عشق کی منزلیں طے ہو چکی ہوں۔ یا ابھی باقی ہوں اب ادب کو وطن کی بیداری کے لئے صور بنانے دیجیئے۔"

اس طرح انھوں نے پرانے دور کا خاتمہ کیا ہے۔ اس دور کے ساتھ تقریباً وہ تمام پرانی بدعتیں بھی ختم ہو گئیں جو استادی و شاگردی سے تعلق رکھتیں اور شعر کو بنئے کی طرح ترازو میں تولنے کا انداز بھی باقی نہ رہا نئے دور کا آغاز حالی اور آزاد سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

> "مغربی تہذیب و تمدّن کا اثر یہ بھی تھا کہ اب ہندوستانیوں کو صاف نظر آنے لگا کہ دُنیا بدل گئی ہے، پُرانے طرز زندگی سے کام نہ چلے گا۔ نئے اصول مرتب کرنے پڑیں گے، وضع قطع، ادب، سب کو تبدیل کرنا پڑے گا۔"

چنانچہ اُردو شاعری نے وضع قطع تبدیل کرنی شروع کی۔ آزاد نے نئے رجحانات کی تشکیل کی، حالی و آسمٰعیل نے بڑھ کر ہاتھ بٹایا۔ غرضکہ مغربی تمدن اور خیالات نے اردو شاعری پر یہ اثر ڈالا کہ آزاد حالی اور اسمٰعیل نے نئے رجحانات کے ماتحت نظمیں لکھنی شروع کر دیں حالانکہ ماحول سازگار نہ تھا۔ اس لئے کہ ابھی پُرانے دور کا خمار اور ہلکی سی غنودگی دماغوں میں رچی ہوئی تھی۔

اگر ہم ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ابھی معلوم ہو جائے کہ انشاؔ، جراَتؔ اور مصحفیؔ سب کے سب ایک مسخرے پن میں مشغول ہیں۔ رامس و رنگ، حسن و عشق، اور شیخ کی دستار، میخانہ و پیمانہ موضوع شاعری بنے ہوئے ہیں۔ اصل میں لُٹے ہوئے جاگیردارانہ ماحول کے اثرات باقی تھے، مسلمانوں میں تعیش کی لہر دوڑی ہوئی تھی، غزل نے محاورات نگاری معاملہ بندی اور عشق و محبت کے پست جذبات کے لحاظ سے ترقی کی، وہی پُرانا ڈھچر، اِدھر کے الفاظ اُدھر، اُدھر کے فقرے اِدھر کر دئے اور شاعری کا فریضہ ادا ہو گیا۔ چنانچہ ہم میرؔ۔ غالبؔ اور مومنؔ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ غزل میں کسی کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے، سب اسی ڈھرّے پر چلتے رہے اور انہیں الفاظ و خیالات کا اعادہ کرتے رہے الفاظ کی توڑ جوڑ اور زبان کی چسکاریاں ان لوگوں کے نزدیک معراجِ کمال تھی۔

ہمارے موجودہ دور کے رجحانات کی بنیاد حالیؔ، آزادؔ، اسمٰعیلؔ ہی کے ہاتھوں پڑ چکی تھی۔ ان موضوعات کو جو غزل میں کبھی کبھی اپنی جھلک دکھاتے تھے، باقاعدہ شاعری کا موضوع بنایا گیا، اور شاعری نے اپنا دقیانوسی چولا تبدیل کر ڈالا۔ جدید شاعری کی داغ بیل ڈالنے والوں کا ذکر مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"جدید شاعری نے ابتدا ہی سے اپنے رجحانات کی فہرست میں عملی پہلو کو سب سے اہم جگہ دی، اخلاقیات تمثیلات کے پردے میں ہندوستان کو عملی جد و جہد کی طرف نہ صرف توجہ دلاتی رہی بلکہ ان سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ آزاد، حالی اور اسمٰعیل متعدد نظمیں اسی نقطۂ نگاہ سے لکھتے رہے۔"

نظم معرّیٰ جسے ہمارے شعرا آج رواج دینا چاہتے ہیں آج سے بہت عرصہ پہلے جدید شاعری کے بانیوں کے ہاتھوں اس کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح اُس وقت دماغ اس اسلوب نظم سے واقف نہیں تھے، آج بھی نہیں، اور اگر ہیں بھی تو شاذ و نادر ہی، مگر یہ انداز بھی نظر آتے ہیں کہ شاید ہوتے ہوتے خوگر ہو ہی جائیں گے۔

کتاب میں شاعری کے ذیل میں جس مسئلہ پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ شاعری میں پیدا ہونے والے مختلف قسم کے رجحانات ہیں ساری کتاب سیاسی، معاشی، معاشرتی، سماجی اور تعلیمی تبدیلیوں اور تقاضوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہے۔ اور اس طرح شعراء اُن کے اسالیب کلام اور ان کی خصوصیاتِ شاعرانہ کو پس منظر میں دبا دیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قوم کا ادب اس کی ذہنی کشمکش کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب مغربی نیشنلزم سے متاثر ہو کر اور انگریزی تعلیم کے نتائج کے طور پر ہندوستانی اپنے پر پُرزے نکال رہے تھے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ادب تھا وہ بہت دور رس تھے وقت کی ضرورت کو سمجھتے تھے، اور اچھی طرح جانتے تھے کہ یہی وہ دور ہے جب مسلک کے قدیم ذہنی سانچے کو توڑ کر نئے سانچوں میں جدید رجحانات کو ڈھالنا ہوگا۔ چنانچہ کوششیں شروع ہوئیں اور برابر جاری رہیں۔

ان رجحانات میں جو سب سے زیادہ نمایاں رجحان ہے وہ سیاسی تقاضات ہیں ہندو مسلمان دونوں کوشش رہے تھے کہ کسی طرح ملک متحد ہو۔ اس کوشش کے سلسلہ میں قومی و وطنی ادب کی پیداوار بہت اعلیٰ

درجہ کی نہ سہی مگر متوسط معیار کی ضرور تھی۔ اقبالؔ کی متعدد نظمیں اس سلسلہ میں بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے بعد چکبستؔ تو اس مشن میں پیش پیش تھا۔ اس زمانہ میں ہوم رول اور سیلف گورنمنٹ کے مطالبہ ہو رہے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے ذہنوں میں سے ابھی اپنی گزشتہ "حاکمیت" کا تصور نہیں نکلا تھا، مغرب کی تحریکوں نے انہیں اور جھنجھلا دیا، سیاسی تحریکوں کے لیڈر ایسے جلنے بوجھے لوگ تھے جن پر ہر شخص کا ایمان تھا۔ تحریک خلافت ترک موالات کی تحریک سول نافرمانی، اور عام طور پر ایک قوم پرستی کی روح ملک کے گوشہ گوشہ میں دوڑ گئی۔ ہر بار ہر تحریک کو حکومت کی طرف سے کچلا گیا لیکن ملک میں وطن پرستی کا جذبہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ مغربی تعلیم کے اثرات، دوسرے ممالک کی سیاحی کا پرتو، یورپین اقوام اور ممالک کے طور طریقے اور ان کا انعکاس، ذہین ہندوستانی بےچین ہو گئے کہ کسی طرح ملک کو آزاد کرا ہی دیں۔ موجودہ نظام سے باغی بھی تھے اور متاثر بھی، اس لئے چاہتے تھے کہ کسی طرح سہی، خواہ تعاون کر کے خواہ ٹکرا کر بہرحال ہندوستان کے لئے کچھ کر گزریں۔

ان تمام طوفانوں کے ساتھ جو چیز سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی وہ مارکسی خیالات کی رو تھی، دُنیا کا ایک ملک اس کا تجربہ کر رہا تھا۔ انقلابات ظہور اور وجود میں آ رہے تھے۔ مگر یہ تمام خیالات صرف تعلیم یافتہ

اور دماغی طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ عوام ابھی اُسی طرح اونگھ رہے تھے ہندوستان کی اسّی نوّے فیصدی دیہی آبادی میں اس دور کا احساس بھی نہ تھا۔

دماغی طبقوں ہی سے ادب کا تعلق ہے، چنانچہ نثر و نظم پر مارکسی خیالات اور سوشلزم کے مجموعی اثرات کا عکس پڑا۔ مختصر کہانی پریم چند تک تو طالسطائی کی اخلاقیاتی کیفیات چھائی ہوئی تھیں۔ مگر اب نئے موضوعات سرمایہ، سرمایہ دار، مزدور، کسان، غریبی، امیری اور اسی قسم کے دوسرے مضامین پر اظہار خیال شروع ہوا۔ کہانی کے پس منظر میں ایک نئی دُنیا جھلکنے لگی۔

شاعری کے رجحانات قومی بھی بدلنے شروع ہوئے، حالی کی مرثیہ خوانی، اقبال کی بین الاسلامیت، چکبست کی وطن پرستی، اور پرانی دنیا کو واپس لانے کے تمام نعرے بیکار اور دقیانوسی قرار دئے گئے جس مرکز پر حالی اور آزاد وغیرہ نے شاعری کو چھوڑا تھا، صرف یہ کہ اس مرکز سے شاعری نے حیرتناک ترقی کی بلکہ منزلوں آگے نکل گئی۔ تمام شعراء نوجوان تھے، مارکسی خیالات کے دلدادہ، پیکار کیلئے ہر وقت تیار۔ شاعری ان کا ذریعہ معاش نہ تھی، یہ بھی اک چیز تھی جو زندگی کے اور شعبوں
67 کی طرح زندگی میں شامل تھی، یہ اپنے بزرگوں کے مقابلہ میں من چلے اور آزاد تھے، ان سے اور دربار والوں کے آسروں سے کیا تعلق؟ یہ اس گروہ میں سے نہیں تھے جو امراء کے سہارے دن تیر کرنے کی فکر میں ہی زندگی گزارتا تھا۔

ان شعراء اور ادیبوں کے نزدیک قومی حکومت کے ماتحت آزادی ملنا ہی کافی نہ تھا، بلکہ وہ اپنے ادب میں سامراج کی مخالفت کرکے اک نئی اشتراکی دُنیا کی مبادیات کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، اب بھی ملک کی قومی تحریکوں سے انکا اتحاد عمل سہی، مگر محض ملک کی داخلی آزادی یا سامراجی نظام کے ماتحت کامل آزادی بھی انکا مقصد نہیں۔ اسی طرح وطن پرستی کے جذبہ میں زیادہ وسعت، گہرائی اور زور پیدا ہو گیا۔ ان تمام سیاسی رجحانات کے متعلق مصنف نے جگہ جگہ اس طرح اشارے کئے ہیں:۔

"جنگ عظیم کے زمانہ ہی میں غلہ، کپڑا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی گرانی نے لوگوں کی اقتصادی حالت ابتر کر دی تھی اس کے بعد بھی کم و بیش اب تک وہی عالم تھا، صنعت و حرفت کی حالت یہ تھی کہ کارخانے زیادہ تر (۸۷ فیصدی) انگریزی سرمایہ سے چل رہے تھے، دوران جنگ برطانوی جہازات، افواج اور اسلحہ جات پہنچانے میں مصروف تھے اور تمام مالک کام کے حاجتمند تھے۔"

"۱۹۱۸ء میں انفلوانزا کی بیماری ہندوستان کیلئے ایسی مہلک اور عالمگیر ثابت ہوئی کہ کوئی آٹھ لاکھ آدمی مر گئے مزدور طبقہ میں اس وبا کا حملہ کچھ زیادہ نہیں رہا، اتنے مرے کہ کارخانوں میں ہر طرف مزدوروں کی مانگ ہونے لگی، مزدوروں نے موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر کارخانے والوں کے سامنے اور مطالبات پیش کئے۔"

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے حالات، تحریکات، مزدوروں اور نچلے طبقہ کے لوگوں کی جدوجہد اور مارکسی خیالات نے نوجوانوں پر کافی اثر ڈالا، ان کی روحوں میں جو آگ دبی ہوئی تھی وہ ان کی زبانوں سے پھوٹ پڑی، وہ ایک نئی دُنیا کا خواب دیکھنے لگے۔

ان تمام حالات و خیالات کو مصنف نے کامل طور پر واضح کیا ہے، آغاز سے لیکر موجودہ وقت تک کا پورا خاکہ نگاہوں کے سامنے پیش ہو جاتا ہے۔

اس خاکہ کو دیکھنے کے بعد کوئی تعجب نہیں اگر ہمارا موجودہ ادب ظہور میں آیا۔ کیونکہ نوجوانوں نے سیاسی رجحانات سے بھی فائدہ اُٹھایا اور غیر ملکی ترقی یافتہ ادب سے استفادہ بھی کیا۔ اوّل اوّل اشتراکی ادب کو حکومت نے روکنا چاہا، لیکن نوجوان بڑھتا ہی چلا گیا، اور رفتہ رفتہ تمام ملک مشتعل ہو گیا۔ لوگ جیلوں میں بند کئے گئے، مگر وہ اثر جسے ذہن و دماغ قبول کر چکے تھے، اُسے یہ کوشش بھی نہیں مٹایا جا سکا۔

اصل میں یہ کتاب موجودہ ادب کا ایک سرسری پس منظر ہے ادب اور ادیب، شعر اور شاعر سے کچھ زیادہ بحث اس میں نہیں کی گئی ہے۔ تمام کتاب محض رجحانات سے پُر ہے، باوجود اس کے مصنف نے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ محض آزاد اور اس کے ہم عصر ہیں، جب وہ موجودہ شعراء کا تذکرہ کرنے پر آتے ہیں تو ان کا قلم سُست پڑ جاتا ہے، اور وہ محض ان کے نام گنا کر رہ جاتے ہیں، کہیں کہیں موجودہ شعراء کے کلام کے نمونے بھی انھوں نے دئے ہیں، مگر اس سے وہ تشنگی دور نہیں ہوتی جو محسوس ہوتی ہے

وہ شعراء جنھوں نے اوّلین ترقی پسندانہ شاعری کی ابتدا کی، یقیناً قابل ستائش ہیں، لیکن اب اُردو شاعری اُن کے کارناموں سے بہت آگے نکل گئی ہے، کتاب میں بار بار اُن لوگوں کا ذکر ہے اور موجودہ دور کے کہنے والوں کا محض نام لیکر چھوڑ دیا گیا ہے۔

حالیہ شعراء کے کلام پر باقاعدہ مبسوط تبصرہ کی ضرورت تھی، اُنکی

توانائیوں اور کمزوریوں کا ذکر کیا جاتا یا اگر یہ نامناسب تھا تو پھر محض "رجحانات" کا تذکرہ کر کے کتاب کو ختم کر دیا جاتا۔ کچھ لوگ اس سختی سے سراہے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کتاب انھیں ممدوحین کی خاطر لکھی گئی ہے اور کچھ غریبوں کے متعلق اس سطحیت سے لکھا گیا ہے گویا یہ بھی اعجاز صاحب کے ممدوحین کا پرتو ہیں۔

مصنف کی اس دقت کا ہمیں اندازہ ہے، اوّل اول ان کے ذہن میں محض رجحانات نگاری کا تصور تھا، جیسے ہی انھوں نے قلم اٹھایا رجحانات پیدا کرنے والوں کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتے گئے۔ ان کے تذکرہ سے آگے مضمون شیطان کی آنت معلوم ہونے لگا۔ خوفِ طوالت سے اختصار سے کام لینا چاہا، بار بار پرانے ناموں کو دہرایا، اور جہاں نئے نام آئے ان کا محض ذکر کر کے فرض سے عہدہ برآ ہو گئے۔

سید اعجاز حسین نے شعر کی ہر صنف کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جہاں جس کی ضرورت تھی، اُسے تشنہ نہیں چھوڑا گیا، مگر بالآخر طوالت کے خیال سے تھک کر وہ ایک جگہ پہنچ کر اکتا گئے، ان کا ہاتھ اور دماغ دونوں ستانے پر مجبور کرنے لگے، پھر بھی انھوں نے موجودہ دور کی شاعری کی خصوصیت کو ...... کہیں نظر انداز نہیں کیا، موجودہ شاعری جو آزاد و حالی کے بعد وجود میں آئی اس کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس قسم کی شاعری میں ایک خاص اعتماد کا عنصر ہے، انسانی قدرت کی وسعتوں پر کافی توجہ کی ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں کو بزدلی، اور احساس کمتری کے شدید جذبہ سے الگ کرنا ہے۔"

ایک دوسری خصوصیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"کارل مارکس کے نظریہ کے مطابق اس کے اقتصادی مفاد کی کسوٹی پر جانچا گیا، وجدان و جذباتی خصوصیات کو زیادہ جگہ نہیں دی، اگر اس قسم کی چیزیں حیاتِ انسانی کے اس پہلو کو تقویت پہنچاتی ہیں جن کا تعلق معاش سے ہے تو قائم رکھے جانے کے قابل ہیں۔"

ایک تیسری خصوصیت کا یوں ذکر کرتے ہیں:۔

"اُردو شاعری کے اس سیاسی رجحان کی ایک خصوصیت یہ بھی قابل دید ہے کہ جوش و خروش کی حالت میں اشتراکی شعراء اپنے کو اُس اوصاف سے متصف کرتے ہیں جو رومانی شعراء کو معشوقوں میں نظر آتے تھے، مگر یہ صفتیں لب و لہجہ و انداز بیان کی تبدیلی سے بالکل نئی خصوصیات اختیار کر لیتی ہیں، نزاکت یا انسانیت کے بجائے ان میں مردانگی و جانبازی کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں اور یہ بدلی ہوئی ہیئت ایسی فضا پیدا کر دیتی ہے جو اپنی ندرت و لطافت کی وجہ سے دلوں پر بیباکانہ انداز میں قبضہ کر لیتی ہے۔"

ان تمام خوبیوں کے باوجود جدید شعراء کے مزید تعارف کی کمی کی وجہ ایک پیاس سی باقی رہ گئی، پھر بھی جہاں تک کتاب کے نام کا تعلق ہے کتاب اس سے پورا پورا انصاف کرتی ہے۔

مگر فرائض کی اس تمام تکمیل کے بعد بھی، وہ آزاد نظم کا ذکر کچھ دبے ہوئے انداز میں کرتے ہیں،

ورنہ ان کے ارادوں میں وہ تساہل پیدا نہ ہوتا جو ختم کرتے کرتے پیدا ہو گیا ہے، ان کی انصاف پسندی اور وسعت نظر تو اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حصۂ نثر میں جہاں تک تدریجی ترقیوں اور تبدیلیوں کا تعلق ہے اس کے بیان میں انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، یہاں تک کہ مختلف زمانوں میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل اور جتنی چیزیں اُردو ادب کے ارتقاء کا سبب ہوئیں ان سب کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے۔

قدیم نثر کا تذکرہ کرنے کے بعد اعجاز صاحب نے جدید نثر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس کی اشاعت و ترقی میں بھی انھیں ہستیوں کا ہاتھ ہے جو نظم میں کارفرما تھیں۔ ہاں ایک دو ناموں کا اضافہ یہاں ضرور ہو جاتا ہے۔ سر سید احمد خاں اور شبلی نعمانی جس طرح نظم پر مغربی جذبات و خیالات کا اثر ہوا، اسی طرح نثر پر بھی ہوا، مضمون نویسی کا آغاز بھی اس دور سے ہوا، سیرۃ نگاری اور تاریخ کو بھی اُردو میں ایک مقام حاصل ہوا، اس طرح متعدد قابل قدر کتابوں کا اضافہ اُردو ادب میں ہو گیا۔

ہر چند کہ ابھی تک تنقید کا کوئی نکھرا ہوا تخیل اُردو میں نہیں آیا، لیکن بہر حال اُردو میں تنقید کے یہ اسالیب جو آجکل جاری ہیں مفقود تھے، دیوانوں پر نہایت بیہودہ قسم کی رائے زنی ہوا کرتی تھی، اس رائے زنی کا نہ کوئی مفہوم ہوتا تھا نہ کوئی مقصد، بہر حال یہ طریقہ یکلخت ختم ہو گیا۔

ڈاکٹر لی بان جیسے شخص کی اعلیٰ ترین کتاب "تمدن عرب" کا اُردو میں ترجمہ کر لیا گیا، یہ اُردو کی نہایت عظیم الشان کامیابی تھی۔ ناول، ڈرامہ، مقالہ، رفتہ رفتہ سبھی کچھ اُردو میں ایک ارتقائی

شکل اختیار کرتا چلا گیا، سب سے زیادہ ترقی مختصر کہانی نے کی، مختصر کہانی لکھنے والوں کا ذکر کرتے وقت بھی مصنف کی رفتار سست پڑ جاتی ہے، موجودہ دور کے لوگوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کا موضوع صرف نئے رجحانات ہیں۔

انھوں نے اس دور کے تقریباً تمام ادبی اداروں کا ذکر کیا ہے ان کی کوششوں کو بھی سراہا ہے، اس دور کی چیزیں اُردو کے پروپیگنڈے سے متعلق ہیں، مثلاً سنیما، ریڈیو اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، ان کا بھی ذکر اور ایک دو نقادوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن اس ضمن میں جو چیز سب سے زیادہ حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ ایک دو ایسے مصنفوں کا ذکر کر گئے جن کے لئے اُردو ادب میں کوئی جگہ نہیں، اور دو ایک ایسے آدمیوں کو چھوڑ گئے جن کے بغیر مضمون نامکمل معلوم ہوتا ہے۔ صادق الخیری کا کام مختصر افسانہ نویسی میں ایسا نہیں جسے بھلایا جا سکے لیکن ندیم صہبائی ایسی چیز نہیں جن کا تذکرہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ پروفیسر مرزا احمد سعید ایسی شخصیت نہیں جسے اُردو ادب ایسی آسانی سے نظر انداز کر دے۔ تعجب ہے کہ اعجاز صاحب اتنی بڑی غلطی کیونکر کر گئے اور انھیں کیونکر اس کا احساس نہ ہوا۔

۷۸ جیسا کہ ہم نے کہیں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے جہاں تک متقدمین کا تعلق ہے انھیں بہت غور سے پڑھا ہے اور اُن تمام تحریکوں کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اس پچھلے دور میں ہندوستانیوں پر اثر انداز رہی ہیں، لیکن جہاں تک موجودہ دور کے لکھنے والوں کا تعلق ہے وہ ان سے اور ان کے کام سے لاپرواہ معلوم ہوتے ہیں متاخرین میں یا اس دور میں ابھی تک زندہ شعرا اور ادیب ایسی بے ماکی سے تو بھلائے جانے کے قابل نہیں اور پروفیسر مرزا احمد سعید ایسے کمسن بھی نہیں جن کا کام کسی نے نہ دیکھا ہو اور ان سے کوئی واقف بھی نہ ہو۔

ان تمام اعتراضات کے باوجود بھی کتاب ایک بڑی کمی کو پورا کر رہی ہے اور اس میں وہ تمام رجحانات جو اُردو نظم و نثر پر اثر انداز رہے ہیں ان کا بڑی خوبی سے تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کیلئے ادبی دُنیا کو اعجاز صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے۔

جمال کشمیر

مصنفہ منشی بابو رام ایڈووکیٹ۔ فرخ آباد یو۔پی

قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

اس کتاب میں منشی بابو رام نے مناظر کشمیر کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے، جہاں تک موضوع کا تعلق ہے کوئی نئی بات نہیں اکثر لوگوں نے کشمیر اور مناظر کشمیر پر قلم اٹھایا ہے لیکن لوگوں کی کوشش اور منشی جی کی کوشش میں فرق اتنا ہے کہ اوروں نے محض کشمیر ہی پہ اکتفا کی ہے لیکن منشی جی نے شروع سے لیکر جہاں سے کشمیر کی حدود کا آغاز ہوتا ہے انھیں نظم کرنا شروع کیا ہے اور جتنی بھی دیکھنے کی جگہیں، تفریح کے مقامات اور عجیب روزگار چیزیں وہاں ہو سکتی ہیں چاہے وہ عمارتیں ہوں یا چشمے، دریا ہوں یا آبشار، یہاں تک کہ راستہ کی خوبصورتی تک کو نظم کیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ ہر سیلانی کو یہ نظم ایک گائڈ کا کام دے سکتی ہے جہاں تک نظم کی خوبیوں اور شاعرانہ کوشش کا تعلق ہے اس میں کوئی کوتاہی نہیں معلوم ہوتی۔ نظم کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنے قلم، خیالات اور زبان پر پورا پورا اقتدار ہے، اور یہی سب سے بڑی خوبی کی بات ہے۔

کیا فسوں ساز تھا وہ لہجۂ طنزِ دلدار
بن گیا چشمِ زدن میں وہ چمنِ شالامار
وسط گلشن میں وہ تعمیر ہوا قصر نگار
سنگِ موسیٰ کے ستوں کرتے ہیں اتنگ گفتار
اس کے پہلو میں جہانگیر کا دل ہے پنہاں
جس سے آتی ہے صدا "نور جہاں، نور جہاں"

ایک جگہ اور دیکھئے۔

اہلِ کشمیر ہُنر مند ہیں مشہور جہاں
کار ابریشم و پشمینہ میں یکتائے جہاں
بے زری سے ہے مگر جامۂ تن گردنشاں
اشک کہسار اسی غم میں ہے چشموں سے رواں
شدّتِ سوز سے پتھر بھی گھلا جاتا ہے
پانی بن بن کے دلِ کوہ بہا جاتا ہے

غرضیکہ ساری نظم نہایت خوبصورت، دلآویز اور عمدہ ہے۔

قومیت اور بین الاقوامیت

اس کتاب کو محمد قاسم حسن نے لکھا ہے اور مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

سیاسی رجحان کے تحت یہ مسئلہ آجکل ایک اہم صورت اختیار کر گیا ہے، قومیت کا تصور آج لوگوں کے دلوں میں اتنا راسخ ہو گیا ہے کہ اس کا مٹانا ایک مشکل امر...... ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس کا مفہوم بھی ٹھیک طریقہ پر نہیں سمجھتے ان کے تحت الشعور میں قومیت کا

تصوّر جاگزیں ہے، اگرچہ اب اس کے ساتھ ایک لفظ اور بڑھا دیا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ ابھی تک واہمہ ہی ہے۔

ہم اگر ایک ہلکی سی نظر ڈال کر دیکھیں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ لفظ "بین الاقوامیت" ابھی تک وہیں ہے جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا، یورپ کے صنعتی انقلاب نے لوگوں کو کچھ اس درجہ لالچی بنا دیا ہے کہ اگرچہ وہ اس قومیت کے گورکھ دھندے سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن نہیں نکل سکتے غیر شعوری طور پر پورا یورپ ہوس ہو گیا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر دوسرے کو اپنے سے کمتر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے، اور اسی جذبہ کا نتیجہ ہے یورپ کا موجودہ انتشار۔

اگرچہ ہر شخص اب جذبۂ قومیت سے اکتایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامیت اُسے اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہے لیکن وہ اسی خیال میں صبح سے شام کر دیتا ہے، اور گاڑی چل رہی ہے، قاسم صاحب نے اپنی اس کتاب میں قومیت اور بین الاقوامیت ہر دو کی ابتدا اور اس کے خیال کی تدریج بتائی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے قومیت کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ لفظ قومیت کو کن کن معنوں میں لیا جاتا ہے اور کیونکر یہ لفظ ظہور میں آیا اور اس کے عناصر کیا ہیں

کتاب کے تیسرے باب میں انھوں نے قومیت کے تخیّل کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے کہ کیونکر یہ چیز مختلف خطوں میں پہنچی، کیونکر لوگوں نے اس خیال کو اہمیت دی۔ اس باب میں انھوں نے یورپ میں قومیت کے لفظ کو واضح کیا، ترکستان، پولینڈ، اسپین، سوئٹزرلینڈ اور روس نے کیونکر اپنے آپ کو قوموں کے رابطہ میں منسلک کیا، اور پھر کیونکر یورپ میں اقلیتوں کے مسئلہ کی طرف توجہ دی گئی۔

اس کے بعد انھوں نے اس جذبۂ قومیت کے ارتقا کو مشرقی ممالک میں واضح کیا ہے، یہاں سے بڑھ کر وہ جدید قومیت پر آئے ہیں کہ موجودہ یورپ اور دورِ حاضر قومیت کو کن معنی میں استعمال کرتا ہے، اس کے بعد وہ آفاقیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بین الاقوامیت پر آتے ہیں۔

بین الاقوامیت اور اس کا ارتقار اس کی تنظیم، کوششیں اور قوانین، اس کے بعد انجمن اقوام، امن عالم، اس تخیّل کی ابتدا غیر شعوری طور پر قومیت سے بیزاری، یہ سب کچھ انھوں نے اپنی آخر کے ابواب میں بیان کیا ہے۔

بہرکیف کتاب عمدہ ہے، اور وہ لوگ جو ان سیاسی ہنگاموں اور ان کے اتار چڑھاؤ سے واقفیت بہم پہنچانا چاہتے ہیں اُن کیلئے نہایت مفید اور دلچسپ ثابت ہوگی۔

افادی ادب

یہ مختصر سی کتاب اختر انصاری کی تصنیف ہے، جسے نیا سنسار، کتاب گھر نے شائع کیا ہے۔

"ادب حیات انسانی کی تفسیر ہے" اس خیال کو لیکر اختر صاحب نے ادب کی وضاحت کی ہے، اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ یہ فقرہ جوں کا توں درست ہے۔ اس نظریہ کو انھوں نے مختلف جگہوں پر مثالیں دیکر ثابت کیا ہے، کہ خواہ زمانہ کوئی ہو، ماحول کیسا ہی ہو ادیب یا شاعر اس سے ہر حالت میں متاثر ہوتا ہے، اور جو کچھ وہ کہتا ہے یا لکھتا ہے وہ تمام اس کے خارجی اثرات کا پرتو ہوتا ہے۔

اختر صاحب نے اس نظریہ کی اس کتاب میں تردید کی ہے جس کا خیال ہے کہ ادب کو اپنے ماحول اور اثرات سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ لوگ جن کے خیال کے مطابق ادب لاہوت و ناسوت سے بھی کہیں آگے کی چیز ہے اختر صاحب کی رائے میں دیوانہ کے مترادف ہیں، ادب کی تعریف کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک ادب میں دو خصوصیتیں لازمی طور پر پائی جانی چاہئیں:۔

79 اول تو یہ کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئی ہو"

ان دو چیزوں کو بنیاد بنا کر اپنے خیالات کو آگے بڑھایا ہے، اور ہر دو خیالات کی تشریح کی ہے۔ تشریح کرتے کرتے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"جذبۂ عشق کی ترجمانی میر بھی کرتا ہے اور ہندی کی شاعرہ میرا بھی۔ سعدی و حافظ بھی، اور ایران کا جدید شاعر بہار بھی، شاعر اطالوی ڈانٹے بھی اور قدیم یونان کی شاعرہ سیفو بھی، لیکن ان میں سے ہر ایک کی شاعری دوسروں کی شاعری سے بنیادی طور پر مختلف ہے، اس لئے کہ ہر ایک کا جذبۂ عشق ایک مخصوص اور جداگانہ سیاسی و معاشی ماحول کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اب اس کے بعد یہ کہنا کہ فلاں ادیب ان جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں، اور اس لئے اس کا ادب کسی خاص وقت اور خاص مقام سے وابستہ نہیں ہے، اور اس کے برعکس فلاں ادیب کے موضوعات محض وقتی اور ہنگامی ہیں، ایک فضول اور بے معنی سی بات ہے۔"

ایشیا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

اس خیال کو بڑھاتے بڑھاتے وہ ایک جگہ اور لکھتے ہیں :-

"شعرگوئی، افسانہ نگاری، اور ڈرامہ نویسی کوئی پاگلوں کی مجنونانہ حرکتیں تو ہیں نہیں کہ معانی اور مفہوم سے عاری اور غرض وغایت سے بے نیاز ہوں، وہ ہوشمند انسانوں کے ہوشمندانہ مشاغل ہیں، اور یقیناً ایک خاص مقصد رکھتے ہیں۔"

اور اس کے باب کے اختتام پر وہ اسے یوں ختم کرتے ہیں :-

"کسی ادبی کارنامہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ ادبی کارنامہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا ہے یا نہیں، اور یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئی یا نہیں، اگر اس میں یہ دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تو وہ صحیح و صالح ادب کا ایک نمونہ ہے ورنہ نہیں۔"

غرضیکہ انھوں نے ادب کے افادی پہلو کو نہایت کاوش کے ساتھ واضح کیا ہے، اور اس کے نمونے دئے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مولانا محمد علی رحؒ کے یورپ کے سفر

اس کتاب میں محمد علی مرحوم کے کچھ خطوط اور چند مضامین شامل ہیں، ان تمام خطوط اور مضامین کو محمد سرور صاحب نے ترتیب دیا ہے، اور کتاب خانۂ پنجاب، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱۸)

سرسید اور آزاد کے بعد اردو نثر نگاری نے جس طرح اور جس طرف رخ کیا وہ کوئی ایسی گمنام چیز نہیں جس کا تذکرہ بالتفصیل کیا جائے ہاں مختصراً اتنا ہے کہ اردو مضمون نگاری نے رخ افسانہ نگاری کی طرف بدل دیا، اور طبیعت کا رجحان روسی اور فرانسیسی ادب کے زیر اثر [illegible] کی طرف ہو گیا۔

اس کہنے سے یہ مراد نہیں کہ اردو نثر میں مضمون نگاری قطعاً مفقود ہو گئی بلکہ یہ کہ نسبتاً کم ہو گئی۔ محمد علی مرحوم اسی پرانی زنجیر کی ایک کڑی ہیں جس کے حلقے آزاد، سرسید اور حالی ہیں اور ان کے مضامین اور خطوط کی زبان میں وہی رنگ جھلکتا ہے لیکن ہم یہاں جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کی ادبی حیثیت نہیں بلکہ ایک قسم کی کرداری حیثیت ہے، اس تمام کتاب میں زیادہ تر مولانا کے خطوط ہیں، اور یہ چیز اب بالکل صاف ہو گئی ہے کہ خطوط انسان کے کردار کی بڑی حد تک تصویر کشی کرتے ہیں۔

ہم یہاں خطوط کی اہمیت پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالنا چاہتے ہر وہ انسان جسے علم اور مطالعہ سے تھوڑا سا بھی واسطہ ہے خطوط کی اہمیت پر آج سے بہت پہلے کچھ دیکھ چکا ہوگا جب اردو میں پہلے پہل خطوط کی اہمیت سمجھی گئی تھی۔ اس کتاب میں جس قدر خطوط درج ہیں ان میں دو قسم کے خطوط زیادہ تعداد میں ہیں۔ پہلی قسم کے خطوط وہ ہیں جو سیاسی معاملات کی بنا پر یورپ کے سفر سے متعلق ہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں جو سفر یورپ کے دوران میں لکھے گئے۔ لیکن یہ سفر صرف علالت کی بنا پر بغرض علاج کرنا پڑا تھا۔ بہرحال ہمیں خطوط کی نوعیت کی تفصیل میں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہاں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے سفر ان کی زندگی کی جد و جہد، ان کی کامیابی یا ناکامی، اور یورپ کی معاشی اور اقتصادی زندگی سمجھنے کیلئے ان خطوط کا مطالعہ ضروری ہے۔ ایک جگہ مولانا اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں :-

"یہ سب کچھ تو ہوا اگر سوال پیسہ کا ہے، یہاں صرف کھانے وغیرہ اور نرسنگ کے روزانہ ۲۵ مارک یعنی ۱۷ روپیہ دینا پڑینگے اور دوا دارو اور پروفیسر صاحب کی فیس علاوہ۔

ہندوستان کے افلاس کے متعلق میں نے انگریزوں کی اس بار بار کی بکواس کے بارہ میں کہ (But living is cheaper in India - (وہاں کی زندگی تو سستی ہے) جل کر عرض کیا تھا کہ Yes and dying is only just a little cheaper —— (بالکل صحیح فرمایا، اور مرجانا زندگی سے کچھ ہی زیادہ سستا ہے)

یہاں کے مصارف کے خوف سے کہنا پڑتا ہے کہ Living is dear in Europe and in the whole dying is much cheaper.

زندگی یورپ میں سخت گراں ہے، اور سب چیزوں کا لحاظ کیا جائے تو مرجانا ہی بہت سستا ہے۔"

مولانا کے تمام خطوط میں اسی قسم کی جھلکیاں ہیں جن میں ہندوستان اور یورپ سیاسی اور معاشی لباس پہنے موقع موقع سے جھانکتا رہتا ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے بڑی حد تک محمد علی مرحوم کا کردار آئینہ ہو جائے گا۔ اور ہم بڑی حد تک انھیں سمجھ سکیں گے۔

پجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰

حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

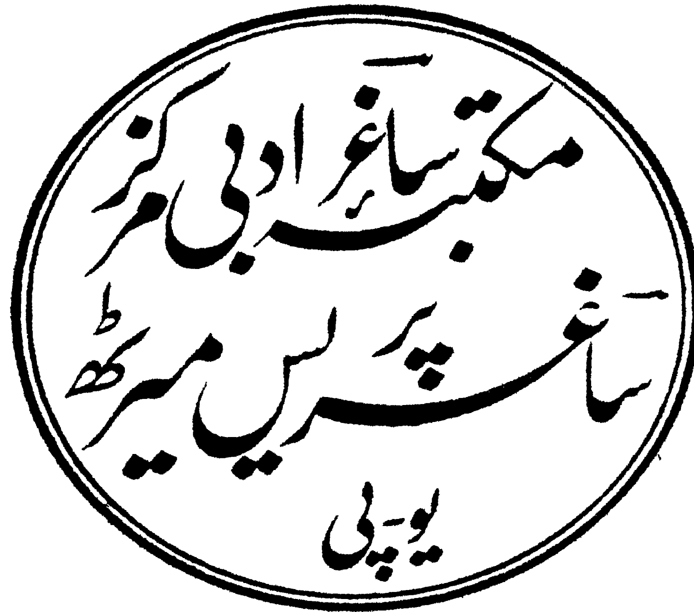
ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہمیں بالکل انوکھی چیز پیش کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اسکی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی جو اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے سبب ہندوستان کے شعرا میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب نظم کو سنتے ہی رہیں واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرس وائس"

Registered No. A 656

ایشیا



Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.


ایشیا

پجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہم ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنیکا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے سبب ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرس وائس"

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات، حکومت صوبۂ متحدہ،

حکومتِ بہار، حکومتِ سی پی اور حکومتِ صوبۂ پنجاب

مرتبہ

ساغر نظامی

ناشر

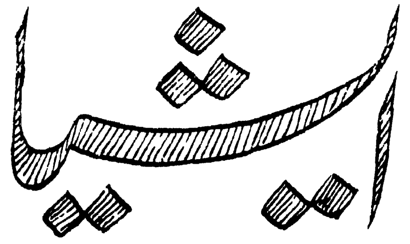
مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۸ آنے

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست مضامین ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء



جلد ۶ | جون و جولائی ۱۹۴۲ء | نمبر ۱۱ و ۱۲

سخنہائے گفتنی!

آج کل کسی پرچہ کا زندہ رہنا اگر معجزہ نہیں تو کم از کم ایسی ہی کوئی چیز ضرور ہے۔ اس مشکل کو کچھ وہی زیادہ جانتا ہے جو اس سے متعلق ہے۔ اور ہر وقت اس سے دوچار رہتا ہے ۔ ان الفاظ سے مدعا یہ نہیں کہ ہم نے آپ کی شکایات کو نظر انداز کرنا چاہا بلکہ یہ کہ ہماری مشکل آپ کی شکایت سے زیادہ ہے ۔

اس مرتبہ جون اور جولائی کا مشترکہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے اور یہ بھی محض کاغذ کی دقت کی بنا پر نکالا گیا ہے۔ جب پرچہ آپ کے پاس پہنچے گا تو آپ اندازہ لگائینگے کہ سائز کے لحاظ سے پرچہ میں ایک ہلکی سی تبدیلی ہے۔ اور شاید وجہ ہم سے پوچھنے کے بجائے آپ خود ہی جان لیں اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ اگست نمبر کا سائز عام پرچوں کا سا کرنا پڑے ۔

کاغذ کے سلسلہ میں دقتیں اٹھانی پڑ رہی ہیں ان سب کا تذکرہ اگر آپ سے کرنا شروع کیا جائے تو کہا نہیں جا سکتا آپ مستقل مزاجی سے سن سکیں گے یا نہیں اور تذکرہ ہم کرنا بھی نہیں چاہتے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کی طبیعت بھی ہم ہی جیسی مشکل پسند ہو لیکن اب اس سے کیا حاصل۔ مختصراً یہ کہ پرچہ کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچا دیا اور آئندہ بھی پہنچاتے رہینگے۔ اس لئے کہ ہمارے پائے استقلال کو ابھی تک کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

یوں تو ساری زندگی ہی دکھ اور پریشانیوں سے معمور ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ زندگی ذمہ داری کی زندگی ہے ایک طرف جنگ ہے کہ کسی صورت مفاہمت یا فیصلہ کی صورت اختیار نہیں کرتی۔ نہ معلوم وہ انسانیت، تہذیب اور تمدن کے علمبردار آج اپنا علم کہاں رکھ کر بھول گئے۔ نہ معلوم انہیں کبھی اپنے پرانے دعووں کا خیال بھی آتا ہے یا نہیں۔ آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تمام تہذیب اور تمدن ایک حسین بلی کی مانند جس کی نرم و نازک پوستین کے نیچے بہت تیز ناخن چھپے ہوئے ہیں اور جنہیں وہ آہستہ آہستہ نکالتی جا رہی ہے ۳۰ اس چند سالہ جنگ اور اس کی خاص کر ہولناکیاں دیکھ کر مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آنے لگتا ہے۔ ان توپوں، ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کی خونخوار آوازیں سے ایک بھی امید کی شعاع پھوٹتی نظر نہیں آتی۔ انسانی زندگی ایک عجیب کشمکش میں ہے جس کا کوئی تدارک سمجھ میں نہیں آتا۔

اس شمارہ کے مضامین

اس شمارہ کے مضامین پر اگر فرداً فرداً تبصرہ کیا گیا تو یقیناً بہت طویل ہو جائیگا اور آج کل ویسے بھی فرصت کم ہی میسر آتی ہے۔ مرزا ارشاد بیگ کا مضمون "آنے والی دنیا کی ایک جھلک" گرمین کے نظریہ کی انسانی شکل ہے۔ اردو میں ایسے ٹھوس اور سائنسی مضامین کی بڑی کمی ہے اسکے علاوہ اکرام قمر، اکرام حسین، سید مظفر حسین برنی اور سراج الدین آذر کے مضامین اپنی اپنی کاوش اور پہنچ کے لحاظ سے اپنے لئے ایک خاص جگہ کے مالک ہیں۔

علی اطہر کے تراجم آپ اس سے پہلے بھی ایشیا میں دیکھ چکے ہیں۔

آپ کو تراجم میں ایک خاص ملکہ ہے اور ترجمہ برجستہ ہوتا ہے۔ قاضی عبدالغفار کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ "بیش لفظ" کو نہ افسانہ کہا جا سکتا ہے نہ مضمون۔ میری رائے میں پیش لفظ زندگی کی ایک تعریف ہے یا بذات خود زندگی کا ایک جزو۔ "عجیب بات" گالزوردی کے ایک اچھے افسانہ کا ترجمہ ہے۔ یوسف ظفر ہماری بزم میں پہلی دفعہ شامل ہوئے ہیں ایک اچھی چیز کے ساتھ۔

نیا راگ جوش کے بارے میں اظہار خیال کرنا اپنے پڑھنے والوں کو جاہل سمجھنے کے مترادف ہے۔ اختر ہوشیارپوری ایک عرصہ کے بعد ایشیا میں درشن دے رہے ہیں۔ "شکست" کا شاعر بھی اس مجلس میں پہلی ہی مرتبہ آرہا ہے اور اسکے علاوہ اچھی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جو اپنے مضامین، اسلوبِ بیان، الفاظ کے دروبست اور خیالات کے لحاظ سے اچھوتی ہیں۔ (ادارہ)

بریلی، بدایوں اور ایٹہ کے دوستوں سے

انسانی ارادہ کتنا بےبُنیاد اور غیر یقینی فعل ہے، تین ماہ سے خیال تھا کہ پھر فقیر کا پھیرا آپ کی نگری تک ہوگا، مگر بجائے یو۔پی کے دورے کے دورے کے، دکن کی جست کامیاب ہوئی۔ آپ تک پہنچنا، یا دوسروں تک پہنچنا، یہ جست، یا وہ جست، غرض باوجود بے پروبالی کے یہ تمام تر اُڑان محض زبان و ادب کے اُس مقصد کے لئے جو بظاہر بُنیادی اور ضروری معلوم نہیں ہوتا، لیکن انسانی معاشرہ میں اسکی حیثیت قطعی بُنیادی ہے۔

میرا آپ تک پہنچنا اور پہنچکر آپ کو متوجہ کرنا یعنی "ہم بیکار ہیں اور کیلئے" کا حادثہ ہونا تعلق کے مثبت ہونے کی دلیل ضرور ہے، مگر میں غالب کا مذاق نہیں رکھتا۔ یعنی ؎

اب نازِ عاشقی کو ہے اُس دن کا انتظار
تم آؤ میرے در پہ تمنّا لئے ہوئے ——— !؟

غیرت تو کچھ اور چاہتی ہے، یعنی مقصد لے کر انسان، انسان سے ملنا چھوڑ دے، فرد خود اجتماعی فرائض کو محسوس کرے، میں تو چاہتا تھا کہ آپ اس وقت تک خود ہی ایشیا کی تجدید خریداری فرما دینگے، مگر میعادِ خریداری ختم ہونے کے بعد اس نمبر تک ۶ نمبر آپ کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں اور آپ کے استغنا نے کروٹ نہیں لی —— !؟

مجھے بہت کچھ حق ہے، لیکن باوجود کلّی استحقاق اور ضرورت کے ایشیا کی خریداری کو "مجبوری کا سودا" بنانا چاہتا۔ ہاں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ ۶ پرچے پہنچنے کے بعد اب ہر دوست کو زرِ سالانہ خود ہی بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دینا چاہیئے۔ لیکن جو اصحاب سال بھر کیلئے خریدار نہیں رہنا چاہتے۔ انہیں محض ۶ ماہ کی قیمت تین روپے (سے ؁) جو واجب قیمت ہے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مرکز کو ممنون فرمانا چاہیئے۔ دھڑکتے ہوئے زمانے اور اس لرزتے ہوئے وقت کا تقاضہ ہے کہ تمام احباب نازک صورتِ حال کو محسوس کریں اور اپنا فرض بجا لائیں۔

ساغر نظامی

اسلام ہاؤس حیدرآباد دکن

۲۵ جون ۱۹۴۲ء

نئی صبح

آنے والی دُنیا کی اِک جھلک

حیاتیاتی اور نفسیاتی تحقیق کا اک سلسلہ

آنے والی دُنیا کی اک جھلک

نئے تمدّن کی خصوصیات

مرزا ارشاد بیگ جنکے مضامین اکثر ایشیا میں شائع ہوتے رہتے ہیں، زندگی اور اسکے تعلقات پر گہری نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ ہو گیا یا جو کچھ ہو چکا اسکی انہیں اتنی فکر نہیں جتنی اسکی فکر ہے کہ آئندہ کیا ہوگا اور علمی طور پر اسکی کیا تعبیرات ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ موجودہ دُنیا اک عجیب و غریب بحران میں غوطہ زن ہے۔ لوگ تبدیلی اور انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، مگر اسکی تعبیر نہیں کر سکتے، شاید اس لئے کہ وہ سائنٹفک طور پر حالات کے تجزیہ سے قاصر ہیں، سیاست داں شعراء اور انقلابی ہیر و طوفان کی علامتیں ظاہر کرتے ہیں، مگر ان علامتوں کی بُنیادوں کو نہیں بتاتے، شاید ان کا یہ فریضہ بھی نہیں ہے۔

ارشاد بیگ نے ان فلسفیانہ مسائل پر سات مقالے لکھے ہیں، جن میں مسائلِ حیات کی حیاتیاتی اور نفسیاتی تحقیق کی گئی ہے۔

(۱) آنے والے تمدّن کی خصوصیات
(۲) غیر شعوری ارتقاء میں قباحتیں
(۳) حیاتیاتی اصول اسلح
(۴) موجودہ ماحول اور نئی ہیئت ذہنی
(۵) مغربی فلسفہ اور نئی حیاتیات
(۶) قوت کا نیا مفہوم اور استعداد برائے نظامِ نو
(۷) متوازن ذہن عالم

۶

اس سے پہلے دنیا کے مفکرین نے نئی دُنیا کے متعلق اشارے کئے ہیں، ہمارے شعراء نے نئے زمانہ اور نئے نظام کے گیت بھی گائے ہیں، یعنی ہمیں امید اور رجائیت کے گہوارے میں ہلکورے دینے کی مسلسل کوششیں کی گئی ہیں، مگر یہ تمام کوششیں بڑی حد تک مبہم اور تیرہ و تار حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی ہیں، اصل میں جب تک ان حقائق اور قوتوں کو نہ بتایا جائیگا جو نئی دُنیا بسانے کی ذمہ دار ہو سکتی ہیں، محض خیالوں میں ایک نئے زمانے کے راگ گانا، کھوکھلی قسم کی رجائیت ہے موجودہ دباؤ ڈالنے والی دُنیا میں نسل انسانی کے رجائی بننے کے امکانات بھی ہیں یا نہیں، وہ معہود اور مقصود رجائیت، جو زندگی کی کشتی کو کھے سکے کس حقیقت میں پوشیدہ ہے!؟ اور اس فردوس کو نوع انسان کس طرح پا سکتی ہے۔ ان مقالات میں ارشاد بیگ نے یہ کوشش کی ہے کہ اس فردوس کا پتہ لگایا جائے، کامیابی اور ناکامی کا سوال نہیں، مگر نوع انسانی کے ذہن اور قوت حیات کے ان تقاضوں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں جو "رجائیت" کو خواب کے بجائے حقیقت اور ابہام کے بجائے وضاحت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

دُنیا کے تمام مفکرین اور سیاست داں کہہ رہے ہیں کہ انسانی ذہن اور تحت الشعور میں ایک عظیم تبدیلی کی ضرورت ہے، موجودہ منزل نوعِ انسانی کے ارتقاء کی آخری منزل نہیں ہے۔ نیا ارتقاء اور زندگی کی نئی ہیئت کیا ہوگی؟ یہ تجزیہ کرنا وقت کی اوّلین ضرورت ہے۔ جبتک موجودہ مفکر یہ معلوم نہیں کریگا کہ ذہنی ارتقاء ماحول پر کس طرح نظر انداز ہوتا ہے، کونسی ذہنی تبدیلیاں موجودہ تباہی کی ذمہ دار ہیں، ذہن میں نئے ماحول کی تعمیر کے لئے کتنی اور کیسی صلاحیتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اور وہ صلاحیتیں دُنیا کے مسائل کو کس طرح حل کر سکیں گی، وہ قوت جو ماحول پر قابو حاصل کر سکتی ہے، اُس کی واقعی صورت کیا ہے؟ اور وہ کس کے دستِ قدرت تک ہے۔ ان بھیدوں کو جبتک معلوم نہ کر لیا جائے ہماری تمام ترجد و جہد لاحاصل ہے۔

ارشاد بیگ کے ان مقالات میں انہیں مسائل کی چھان بین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، موجودہ بحران اور انسانی ذہن کی خود شعوری ارتقائی سطح کے تعلق کو اُجاگر کیا گیا ہے مجھے امید ہے کہ موجودہ غلط اور سطحی ذہنیت، انقلاب اور فضول اعتراضات کے استیصال میں ان مقالوں سے مدد ملیگی جن میں زندگی کے موجودہ بکھراؤ، جنگ اور دُنیا کی جدو جہد کو حیاتیاتی حقائق کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے، اُردو پڑھنے والے ان مضامین سے موجودہ صورتِ حال پر اک نئے زاویۂ نگاہ سے نظر ڈال سکیں گے ——— کوئی فیصلہ کن دعویٰ نہیں لیکن تاریخ کی نئی رفتار کے تعین میں یہ صفحات غور و فکر کی ترغیب ضرور ہیں، یہ کوئی تصوری خاکہ یا اعتقادی بحث نہیں ہے "حیاتیات" کے اصولوں پر ان مقالات کی بُنیاد ہے اس لئے مجھے علم نواز حلقوں میں ان کی کامیابی کا یقین ہے۔

اشاعت جون جولائی ۱۹۴۳ء

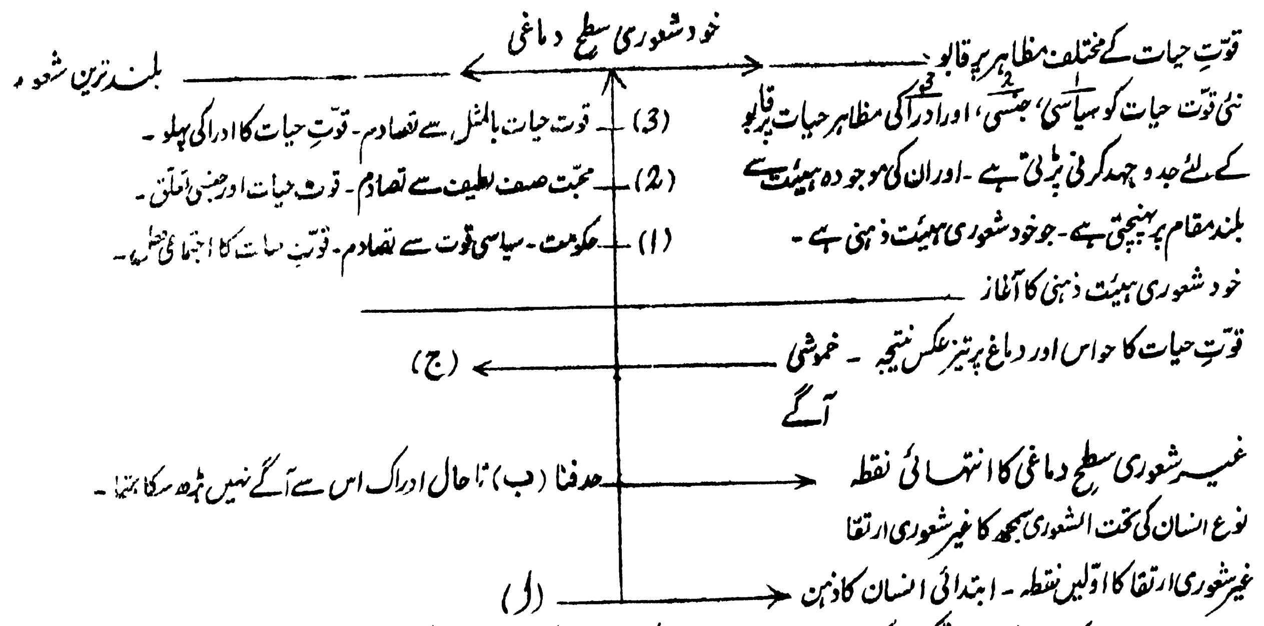
مصنف کا کہنا ہے کہ انہوں نے حیاتیاتی تحقیق کرنے میں کافی وقت صرف کیا ہے اور ان مقالوں کی اساس حیاتیاتی سائنس کی نئی تحقیقیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نئے حقائق قطعی Original ہیں اور تحقیقی حیثیت رکھتے ہیں
قوتِ حیات اور ذہن کا تعلق قوت کا جدید مفہوم نظریۂ علم، مسئلہ جبر و اختیار، صحیح نظام کے ارتقائی اصول یہ اور اس قسم کے مسائل کو از سرِ نو حل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ وہی حقائق اور خیالات ہیں جن کی بنیاد پر آئندہ دنیا کی تعمیر ہو گی۔

بہرحال اس موضوع کے ماہرین ان کے اس خیال کی تائید یا تردید کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ان مقالات پر تنقیدی مضامین آئے تو ایشیا ان مضامین کو بھی شائع کریگا۔
موجودہ اشاعت میں "آنے والے تمدن کی خصوصیات" کے عنوان سے پہلا مقالہ شائع کیا جاتا ہے۔

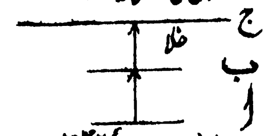
ساغر

یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تاریخ پر دوسرے عناصر کی بجائے حیاتیاتی عناصر غالب آگئے ہیں۔ اس لئے بننے والی تاریخ حیاتیاتی عمل کی داستان ہو گی۔ نوعِ انسان کا ادراک اور اس کا ذہن ایک خاص حیاتیاتی دور سے گزر رہا ہے۔ ایک نئی شکل اختیار کر رہا ہے۔ آئندہ تمدن خود شعوری ہیئتِ ذہن کا نتیجہ ہو گا۔ آج سے قبل تاریخ میں کبھی ذہن انسانی نے خود شعوری کے دور میں داخل ہونے کا شرف نہیں حاصل کیا تھا۔ ہمارے حواس قوتِ حیات تموّج یا ہیجان اور ذہن نے وہ ارتقائی منازل طے نہیں کی تھیں جن کے طے کرنے کے بعد زندگی میں خود شعوری حاصل ہوتی ہے۔

ذہن اور قوتِ حیات کے حیاتیاتی ارتقائی مدارج



ذہن انسانی کی حیاتیاتی ترتیب و تکمیل کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ا سے ب تک تاحال تاریخ کی جد و جہد غیر شعوری جد و جہد تھی۔ ہم قوتِ حیات کی رو میں بہتے تو تھے لیکن اس کا جائزہ نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ ہمارے ذہن نے شعوری درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لئے ادراک میں تخیلی عنصر کا دخل رہا تھا۔ کیونکہ عقل ہمیشہ تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ اور تمام پہلو ابھی ادراک کے پردہ پر نہیں آئے تھے۔ حیاتیاتی ارتقا ہمارے ذہن کو آہستہ آہستہ اس طرح تکمیل و ترتیب دے رہا تھا کہ بالآخر شعوری درجے تک پہنچ جائے۔ جبتک شعوری درجہ حاصل نہیں ہوتا عقل کی تمام پرواز نامکمل رہتی ہے اور تخیلی عنصر کے دخل سے آزاد نہیں ہوسکتی۔ اس لئے مسائل عالم کا حل اور حقیقت کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ جبتک قوتِ حیات خود انسان کے ذہن میں ظہور پذیر نہو جائے۔ اس سے متعلق مسائل کو صرف تخیل اور نامکمل حقائق کی بنا پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتک جسے عقل کہا گیا ہے وہ نامکمل اور غیر شعوری قوتِ حیات کے ادراک کا پھیلاؤ ہے یعنی قوتِ حیات کی عدم تکمیل سے جو خلا ذہن میں رہ جاتا ہے اسے تخیل کے ذریعہ پر کیا جاتا ہے۔



قوتِ حیات نے "ب" تک ذہن میں ارتقائی سطح طے کی ہے۔ اور اسکی وجہ سے "ب" تک نئے حقوق معلوم ہوگئے ہیں۔ "ب" سے "ج" تک کے نئے حقائق ابھی ادراک سے پوشیدہ ہیں۔ لیکن عقل "ب" تک کے ارتقائی عمل کو "کل" کی طرح برتتی ہے۔ یعنی "ج" تک سوچتی ہے لیکن زندگی کے تمام مناظر کو "ب" کی آنکھ سے ہی دیکھ سکتی ہے۔ "ب" خود نامکمل ہے اور ذہن کی ارتقائی سطح کا ایک تدریجی نقطہ ہے۔ جبتک "ج" کے درجہ تک قوتِ حیات نہ پہنچے۔ قوتِ حیات کو ذہن میں شعوری درجہ حاصل نہ ہوگا۔ اور "ب" اور "ج" میں خلا رہیگا۔ اس خلا کو جبتک قوتِ حیات کا ارتقا پورا نہ کرلے۔ صرف نامکمل عقل کے ذریعہ تخیل کی مدد سے مسئلہ حیات کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ گویا عقل ابھی نامکمل ہے اور تخیل کے عنصر سے خالی نہیں ہے۔

قوتِ حیات نے چونکہ ہمارے ذہنی قویٰ میں تکمیل کے مدارج طے نہیں کئے تھے۔ اس لئے عدم تکمیل کا لازمی نتیجہ نقص۔ حیوانیت۔ تخیل پرستی۔ بیکار دلیل بازی کے سوائے کیا ہوسکتا تھا۔ کیونکہ بغیر خود شعوری ذہن کے حقیقت۔ حق۔ اور صحیح نظامِ حیات کا فیصلہ کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن آنے والے تمدن میں روح وقوتِ حیات کی شعوری سطح کے بعد اس کا وجود پوشیدہ یا مخفی نہیں رہے گا۔ اور یہی قوتِ حیات کا عملی ثبوت ہوگا۔ حیاتیات کے جدید اصولوں نے (Vitalism) اور (Mechanism) کے مسئلہ کو بالکل حل کرلیا ہے۔ آنیوالے تمدن میں ذہنِ انسانی کو بے سروپا اور تخیلی مسائل میں اُلجھنا نہیں پڑیگا۔ اور اس طرح غلط سوالات اور مسائل میں ہماری ذہنی قوتیں ضائع نہیں ہونگی۔ آنے والے نظام کے حل کو قوتِ حیات پر مکمل قابو ہوگا۔ اور یہ حیرت انگیز حقیقت طبعی سائنس کے بھاپ اور بجلی پر قابو پانے سے زیادہ تعجب خیز اور ہماری زندگی کو مالامال کردینے والی ثابت ہوگی۔

دوسری حقیقت یہ کہ موت کا حجاب اُٹھا دیا جائیگا اور انسان دائمی بقا کے دور میں داخل ہوجائیگا۔ موت تو ہوگی۔ لیکن حجاب باقی نہ رہے گا اور انسان موت کو ایک معمولی عمل خیال کریگا۔

تقدیر۔ اور اسرار۔ اور حجابات کی گتھی وا ہوجائے گی۔ حوادث وخطرات زندگی سے تقریباً مفقود ہوجائیں گے۔ حیوانی جبلیں اور طریقے مٹ جائینگے

۸ آنیوالے نظام میں ہماری قوتِ حیات تکمیل کی صورت میں ظہور پذیر ہوگی۔ اس لئے ہماری خواہشات کچل نہیں جائیں گی۔ بلکہ صحیح طور پر تسکین حاصل کریں گی۔ انسان کے تمام جذبات اور آرزوئیں ایسی مطمئن اور مخمور رہیں گی۔ گویا ہر تار مضراب کی زد سے صحیح سُر چھیڑ کر ایک مکمل نغمہ سے ہم آہنگ ہوگا۔ اور صحیح معنی میں انسانیت کے دور کا آغاز ہوگا۔

لنگڑے لولے اور اندھوں کی پیدائش بند ہوجائیگی۔ کیونکہ آنیوالے دور میں حیاتیاتی ارتقا صحیح ارتقا صحیح نظم اختیار کرلیگا۔ تمام حیاتیاتی نقائص دور ہوجائینگے۔

آنیوالا انظام ایک حیاتیاتی انقلاب ہے۔ جلد ہی نوع انسان کو حیاتیات کے ایک نئے دور میں داخل ہونا ہے۔ اس وقت تمام دُنیا کے سامنے یہی مسئلہ ہے کہ آج نوعِ انسان شعوری طریقہ حیات حاصل کرلے۔ قومیت۔ نسل۔ مذہب۔ برتری اور ترقی کے تمام غلط تصورات تبدیل ہوجائینگے۔ کیونکہ دُنیا کا تمام نظام اور تمام ذہنیت اور ماحول یکسر بدل جائے گا۔ اس لئے ہر قوم کو اپنا مستقبل اور اپنی پوزیشن آنے والے نقشے میں دیکھنی چاہیئے۔ اس وقت تک کا تمام نظام۔ تمام جدوجہد۔ قوم۔ مذہب اور ملک کے تصورات۔ نوآبادیات کا حصول۔ یہ سب قوتِ حیات کے ارتقائی مدارج کا عبوری نتیجہ تھا۔ وہی قوتِ حیات اب ہمیں پُرامن شانت اور شائستہ اور عالمگیر نظام کے دروازے پر لے آتی ہے۔ جہاں جنگ نہیں ہوگی۔ حیوانی زندگی۔ کچلی ہوئی آرزوئیں۔ اور جذبات اور بےچین ذہن نہیں ہوگا۔ نامعلوم اور اوجھل قوتوں کا خطرہ۔ موت کی تیرگی اور تاریکی۔ اسرار کا خوف، زندگی سے ناپید ہوجائینگے۔ مغرب میں نوآبادیات کا لالچ اور مشرق میں تصوری تقدس اور جنت کا فریب قوتِ حیات کی لازوال اور مدہوش کن مسرات کا بدل ثابت نہیں ہوسکینگے۔ اور نہ ہی نوآبادیات اور مذہب کے تمام تصورات آنے والے نظام کی قوت کو پسپا کرسکتے ہیں۔ حقیقت تخیل اور افسانہ سے زیادہ شاندار اور باعظمت ہوتی ہے۔ حقیقی نئے نظام میں مادی خوشیاں اور فرد کی ذات کا حقیقی کیف اپنے صحیح وفطری ادب میں افسانوی تصورات اور گمراہ طریقوں اور غلط نظریات پر مبنی نظام کی نام نہاد خوشیوں سے زیادہ مطمئن کرنیوالی حیثیات اختیار کرینگے۔

حیاتیاتی ارتقا اور نظامِ عالم

حیاتیاتی ارتقا کے مختلف مدارج کا جائزہ ہمیں زندگی اور نظامِ عالم کی اُن صورتوں سے واقف کردیگا جو اس کرۂ ارض پر اسے اختیار کرنی پڑیں گی حیاتیاتی

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

ارتقا نے نئی سطح حاصل کرنے کے لئے اوّلین عملِ انقلاب آج مکمل کیا ہے اور زندگی اب ایک شعوری سطح حاصل کرنے والی ہے۔ بے سروپا تحقیقات اور بیکار تعلیم کا زمانہ مستقبل کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ اسکے بعد زندگی میں حیاتیاتی نشوونما کی ایسی سطح اُبھرے گی کہ طریقۂ حکومت روئے زمین سے ختم ہو جائے گا اور ہر شخص اپنے معاش کا خود مالک اور کنٹرول کرنے والا ہوگا۔ تیسرا حیاتیاتی انقلاب زندگی کی بیماریوں سے کلی نجات دلا دیگا۔ اور بالآخر زندگی لافانی ہو جائے گی۔ پیدائش اور موت کا چکر کرۂ ارض پر بند ہو جائے گا۔ یہ قوّتِ حیات کی معراج اور انتہائی ارتقا کا قیام ہوگا۔

نظامِ عالم سے متعلق قوّتِ حیات کی مختلف ارتقائی صورتیں

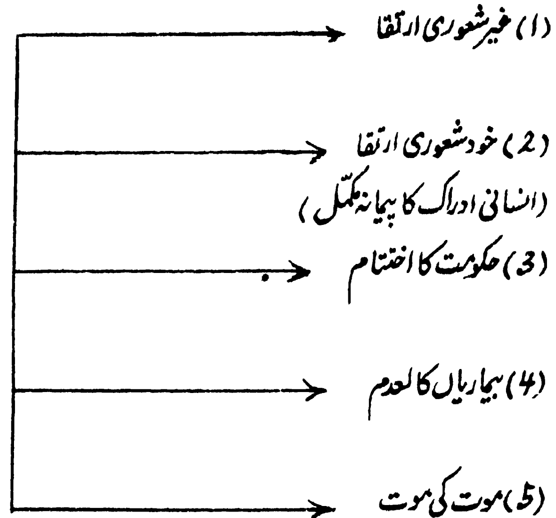
(۱) قوّتِ حیات کا غیر شعوری ارتقا۔ کشمکشِ حیات۔ قوّتِ حیات کی عدم تکمیل ذہن سے متعلق۔ قوّتِ حیات اور شعور میں بعد۔ قیاسی تحقیقات و علم۔ اور نظامات و تحریکیں۔

(2) خود شعوری ارتقا۔ قوّتِ حیات کا ذہن میں شعوری ظہور۔ انسانی ادراک کے پیمانہ کی تکمیل، قیاسی علم اور تصوّرات کے زمانہ کا اختتام۔ صحیح نشوونما اور ترقی و انکشافات کا آغاز۔

(3) حکومت کا اختتام۔ قوّتِ حیات ایسے ارتقائی مدارج طے کر چکی ہوگی۔ کہ اس درجہ پر آکر زندگی کے مزید ارتقا اور اجتماعی تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

(4) بیماریاں کالعدم۔ قوّتِ حیات کا نشوونما ایسی تشکیل اختیار کر لیگا کہ بیماریاں جاتی رہیں گی۔ بیماریاں قوّتِ حیات کے انتشار اور جسم کی اسے سہارنے کی عدم صلاحیت کا نتیجہ ہیں۔

(5) موت کی موت۔ قوّتِ حیات اور ہمارا جسم ایک سطح پر آ جائینگے اور جسم لافانی ہو جائے گا۔ جسم میں قوّتِ مدافعت اور صلاحیت اپنے انتہائی مدارج پر ہوگی۔



پہلے درجہ سے دوسرے درجہ تک غیر شعوری ارتقا کا عمل ہے اور باقی تمام درجات کا عمل شعوری ارتقا سے متعلق ہے۔ گویا خود شعوری ارتقا سے تاریخ کی رفتار شروع ہوگی۔ وہ نوعِ انسان کے جسم میں قوّتِ حیات کا ارتقا جو مدارج اختیار کرے گا اُن کا اثر سماجی نظام۔ سیاسی خاکوں اور زندگی کے دوسرے طریقوں پر بھی پڑے گا۔

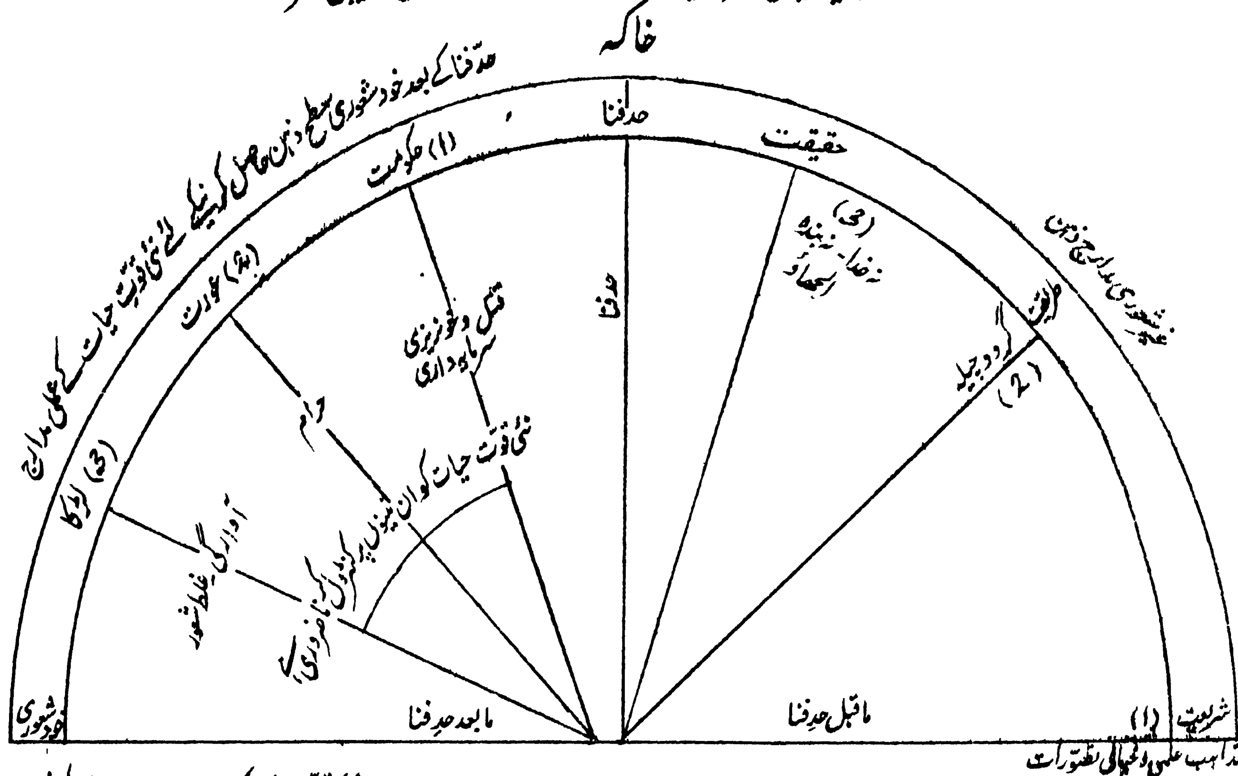
موجودہ بحران۔ اور قوموں اور دُنیا کے نظاموں کا حیاتیاتی جائزہ

موجودہ دُنیا بے شعوری کی دُنیا ہے۔ یعنی قوّتِ حیات شعوری حیثیت میں کارفرما نہیں ہے۔ موجودہ نظام کو قوّتِ حیات پر قابو نہیں ہے۔ بس چل رہا ہے۔

جس کی وجہ سے قتل و خونریزی حرص و آز دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ مذاہب نے قوّتِ حیات کی شعوری تمیز کے بغیر اعتقادی خیالات میں دنیا کو اُلجھا دیا۔ اسکے علاوہ جو آزاد خیال افراد ہیں وہ بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ کیونکہ قوّتِ حیات کی انہیں تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔ بدیں وجہ موجودہ نظام زندگی کیلئے ایک عذاب بنا ہوا ہے۔ قوّتِ حیات کا ارتقائی عمل جسے خود شعوری کی سطح حاصل کرنی ہے۔ قوّتِ حیات کو کنٹرول کر رہا ہے۔

انسان کی حیاتیاتی قوّتِ حیات کا مختلف مدارج اور اصولوں سے تدریجی سفر

خاکہ



نئی قوّتِ حیات کا ← سطحِ ذہن

اطلاق خود شعوری سطحِ ذہنی کے ساتھ

نتیجہ غیر شعوری اور عدم تکمیل پر مبنی قوّتِ حیات پر کنٹرول

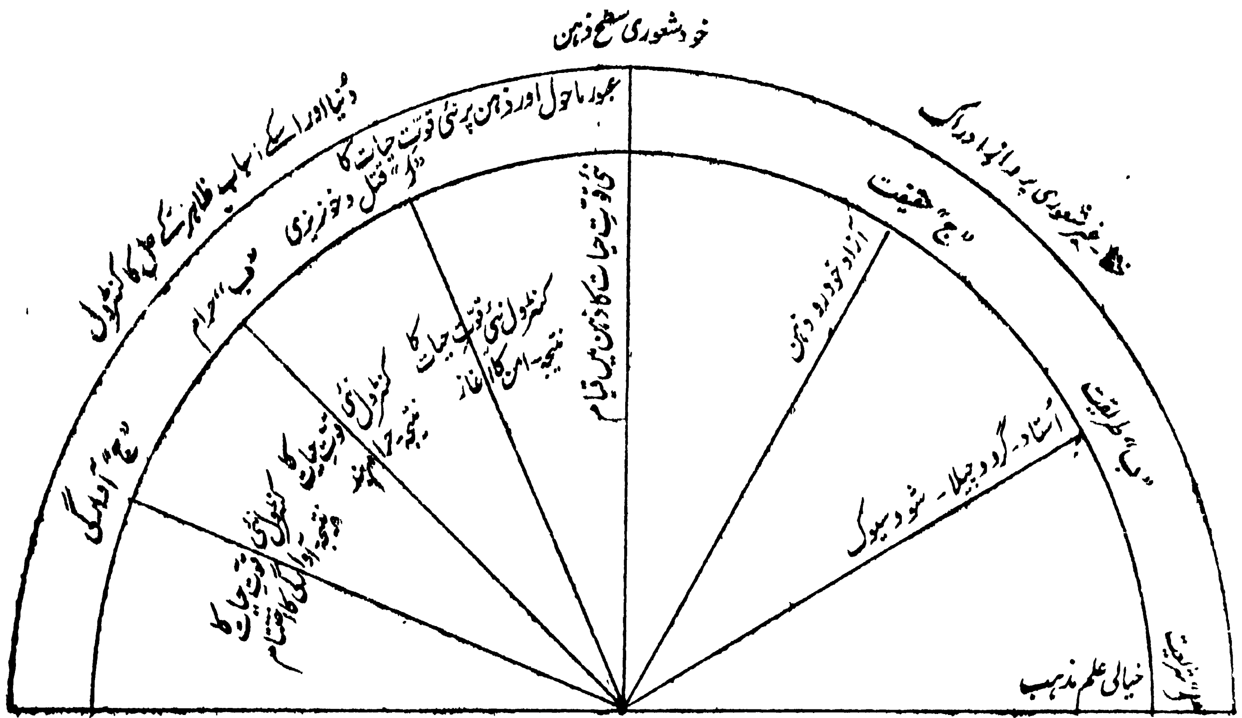
خاکے میں دُنیا کے موجودہ مسئلہ کو حیاتیات کی روشنی میں بنایا گیا ہے۔ نقطۂ فنا سے قبل انسانی سمجھ تین ارتقائی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ یا تو وہ کسی ظنی نظام کے سامنے سر ڈال دیتی ہے اور مذہب کی شریعت سے خود کو وابستہ کر دیتی ہے اور اس طرح زندگی کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہے۔ یا اس سے آگے بڑھ کر گرو یا مرشد کے سامنے انسان کا ذہن جھک جاتا ہے۔ اور حق کی تلاش اسکے اتباع کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے یا اس سے بھی آگے بڑھنے پر سمجھ خود زندگی کے مسئلہ پہ آزادانہ نظر ڈالتی ہے اور خود کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ یہاں آکر انسان اپنی ذات کو سب کچھ سمجھتا ہے حتیٰ کہ خود کو خدا تک سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ قوّتِ حیات کا شعور حاصل نہیں ہوتا اس لئے ذہن خود دروبن جاتا ہے اور کوئی راہ نہیں ملتی۔ غیر شعوری سطح ذہن کی بلندی کا انتہائی نقطہ حدِ فنا تک ہے۔ اب تک نوع انسان کی جد و جہد اور ارتقا حدِ فنا سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ یہ انسان کا ذہن اور ادراک نقطۂ فنا سے پست ہے۔ نقطۂ فنا پر آکر حواس قوّتِ حیات کے تیز عکس کی وجہ سے اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہ گویا ادراک کی حدِ موت ہے۔ نقطۂ فنا پر آتے ہی ذہن کو نشو و نما کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ اس سے آگے ارتقا حاصل کرنے کے لئے ادراک کو حدِ فنا عبور کرنی پڑتی ہے۔ گویا غیر شعوری اور خود شعوری ارتقا کے بیچ میں حدِ موت حائل ہے۔ جہاں حواس قوّتِ حیات کی مدافعت میں جواب دیدیتے ہیں۔ جب اس میں قوّتِ حیات کا ہیجان تیزی سے ابھرتا ہے تو انسان حواس کا توازن کھو دیتا ہے۔ لیکن آج انسان کا ذہن زیادہ صلاحیت کا حامل ہے۔ اس لئے وہ توازن تو نہیں

آہنگ جولائی ۱۹۴۹ء

کھوئے گا لیکن اوّل حواس پر خاموشی طاری ہونی لازمی ہے۔ کیونکہ سمجھ اُبھار حاصل کرتے وقت حواس پر زیادہ دباؤ ڈالتی ہے۔ خاموشی کے بعد خود شعوری ارتقا کے مدارج شروع ہوتے ہیں۔ یہاں پہنچکر نئی قوّتِ حیات کو تکمیل حاصل کرنے کے لئے غیر ترقّی یافتہ قوّتِ حیات کی تین عملی صُورتوں کو قابو کرنا ضروری ہے۔ ورنہ نئی قوّتِ حیات صحیح نظام قائم کرنے سے قاصر رہے گی۔ خود شعوری حاصل کرنے والے ذہن کو عورت کی محبت سے تصادم پذیر ہوکر آگے ارتقائی طور پر بڑھنا ہوگا۔ اور اگر نئی قوّتِ حیات عورت کی جنسی تسکین نہ کر سکے۔ تو زندگی کے نظام میں نقائص اور خامیاں رہ جائیں گی۔ اسکے بعد نئی قوّت حیات بالمثل سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ اور یہ چیلنج کی فعل نہایت ہی مشکل اور دشوار ہے۔ کیونکہ اس عمل میں دونوں کی جنس ایک ہوتی ہے۔ یہاں جنسی میلان کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ نئی قوّتِ حیات جنسی تسکین کے ذریعہ اسے مفتوح کر سکے۔ اس لئے قوّتِ حیات کو نہایت ہی ضبط کے ساتھ آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اگر نئی قوّتِ حیات پسپا ہو جائے تو زندگی کے نظام میں نوع انسان کی سمجھ اور شعور اور ارادہ پر نئی قوّتِ حیات کا کنٹرول نہ ہو سکے گا۔ جب نئی قوّتِ حیات اس سے بھی آگے بڑھنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے نوع انسان کی اس قوّتِ حیات پر پورا قابو حاصل ہو جائے گا جو ابھی خود شعوری کی منازل سے نیچے ہے۔ اور نقطۂ فنا پر کھڑی ہے۔ آج تمام نوع انسان نقطۂ فنا پر کھڑی ہوئی فنائیت کی زد میں ہے۔ وہ اپنے مزید ارتقا اور نشوونما کیلئے جبتک خود شعوری سطح ذہن کا اتباع نہیں کرلے گی۔ اس حالت سے نہیں نکل سکے گی۔ نئی قوّتِ حیات جب قوّتِ حیات بالمثل کو رجوع کر چکتی ہے تو حکومتوں کا نظام بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حکومتیں افراد کے اجتماعی شعور کا ہی نتیجہ ہیں۔ اس لئے نئی قوّتِ حیات کو سیاسی قوّت بھی حاصل ہو تی جائے گی۔ جب نئی قوّتِ حیات کو حدِّ فنا سے گزرنے کے بعد دُنیا میں پھیلی ہوئی قوّتِ حیات کی ان تین صورتوں پر کنٹرول حاصل ہو جائے گا تو نظامِ عالم سے قتل و خونریزی، جلبِ منفعت، اور فرد کی قربانی بند ہو جائیگی۔ حرام۔ اغلاط۔ عورتوں کی بدچلنی۔ اور لڑکوں کی آوارگی و غلط روی ختم ہو جائیگی۔ کیونکہ انسان کی قوّتِ حیات نئی قوّتِ حیات کی گرفت سے گریز نہیں کر سکے گی۔ قوّتِ حیات کے غلط انتشار کا نتیجہ یہ نقائص تھے۔ نئی قوّتِ حیات خود ان درجوں سے آگے بڑھ کر مکمّل ہو جائیگی۔ اور یہ صحت و نظم کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوگی۔ زندگی ایک فردوس ہوگی۔ ابتک کے تمام نظام میں زبردست قباحت اور نقص تھا۔ کسی نظام نے ان حیاتیاتی مدارج کو آج تک طے نہیں کیا۔ جو آنے والا نظام طے کر چکے گا۔

11 مختلف مذاہب نے عالمِ ارواح۔ جنّت کی زندگی کے تصوّرات ہمارے سامنے پیش کئے۔ نقطہ فنا سے قبل کا ذہن اگر نقطۂ فنا کے بعد کے مسائل کو گرفت میں لینا چاہے تو سوائے تخیلی تک ودو اور ناکامی کے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مذاہب کا خدا تصوّری خدا ہے۔ اور مذہب کو زندگی پر قابو نہیں ہے لیکن نئے نظام میں حیاتیاتی ارتقا کے ذریعہ نقطۂ فنا سے گزر کر نوع انسان کی قوّتِ حیات کو عملی مدارج کے ذریعہ گرفت میں لیا جائیگا۔ اس لئے آنے والے نظام کو زندگی پر قابو حاصل ہوگا۔ یہ نظام محض اپیل نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی عملی حقیقت ہے۔ حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے خدا ایک تصوّر یا زبان سے ادا کرنے کا لفظ ہی نہیں بلکہ ایک قوّت ہے۔ اور اخلاق ایک وعظ نہیں۔ بلکہ قوّتِ حیات کے نظم و صحت کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ محض آرزوؤں کی قربانی اور ترک نہیں بلکہ تسکین اور خواہشات کی تکمیل میں ممد و معاون ہوگا۔ بیش از بیش گزشتہ نظاموں نے اُس حیات کا جو قوّتِ حیات کو خود شعوری سطح ذہن حاصل کرنے کے بعد ملے گی۔ تصوّراتی بہشت اور خیالی فردوس کے ذریعہ ایک نعم البدل پیش کیا۔ نقطۂ فنا سے قبل کے ادراکِ انسانی پر مبنی نظاموں نے دُنیا کی جدوجہد اور نوع انسان کی قوّتِ حیات پر کنٹرول نہیں کیا۔ بلکہ خام اور نامکمل پروگرام پیش کئے۔ اسی لئے آج نوع انسان کو تباہی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس سے بچنے کیلئے تکمیل یافتہ قوّتِ حیات سے مخالفت کرنا لازمی ہے۔

آنے والا نظام قوّتِ حیات کے مزید نشوونما ارتقا کے لئے راہ مہیّا کرے گا۔ اور اس کے لئے عملی مدارج کے ذریعہ اور آگے بڑھنے کے مواقع پیدا ہوں گے۔ کیونکہ نیا حیاتیاتی نظام خود عملی مدارج ارتقا کے بعد قائم ہوگا۔ تخیّل یا عدم تکمیل پر مبنی قوّتِ حیات کی بنیاد پر نہیں۔



ادراک کا غیر شعوری ارتقا اور مدارج اور دُنیا کے مسائل یہ سب خودشعوری سطح ذہن پر آکر حل ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف مسائل زندگی پر بصورت اعتقادی مذاہب نے نظر ڈالی۔ اور اعتقادی طور پر ارتقائی منازل کے حل کو تخیلی اعتقادات کے ذریعہ پورا کرنا چاہا۔ جب زندگی کو خودشعوری حاصل ہو جائے گی تو نئی قوّتِ حیات کی رو میں معتقدات خود بہ جائینگے۔ دوسری طرف ادراک نے حیاتیاتی منازل عبور کئے بغیر آزاد ہو دوڑنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوا۔ لیکن حیاتیاتی نظام دُنیا کے مسئلہ کو عملی اور ارتقائی منازل سے گزرنے کے بعد اس وقت گرفت میں لینا شروع کرتا ہے۔ جب اسے خودشعوری حاصل ہو جاتی ہے۔ خودشعوری کے حصول میں کامیاب ہونے کے بعد ہر ذہنی روح پر نئی قوّتِ حیات کی گرفت قائم ہو جائے گی۔ یعنی نئی طاقتوں کا کنٹرول شروع ہو جائے گا۔ یہ کنٹرول آج دنیا کی موجودہ جدوجہد پر شروع ہو گیا ہے۔ اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ حیاتیات کا اٹل قانون ہے۔ ۱۴

قوموں کی نفسیاتی قباحتیں

مذاہب کو خدا کی تمیز نہیں ہے۔ مذاہب کا خدا تصوّراتی خدا ہے۔ حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ذہن سب سے زیادہ حقیقت سے دور ہے۔ اس قوم نے حقیقت کے قصّے گھڑ لئے۔ ترتیبُ ارتقائے نفس کا غلط راستہ اختیار کیا۔ ہندوؤں نے صحیح راستہ اختیار کرنا تو چاہا۔ لیکن خودشعوری تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے کوئی راہ نہ پا سکے۔ یورپین قومیں خود ردبلا کنٹرول قتل و خونریزی میں اُلجھ گئیں۔ مسلمانوں کا مولوی۔ عیسائیوں کا بادشاہ اور ہندوؤں کا یوگی زندگی کے عملی اور خودشعوری ارتقائی دائرہ میں بیکار ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ اُن میں قوّتِ حیات نے خودشعوری سطح ذہن تو حاصل کی ہی نہیں تھی۔ اس سے اُن کو دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے تمام مسلمانوں کے مولوی یورپ کے سیاستداں اور ہندوؤں کے مفکر حیاتیاتی نظام کی گرفت میں لئے جا رہے ہیں۔ ہر قوم کی ترقی کی راہ یہی ہے کہ وہ اپنے ارتقائے نفس کیلئے نئی اُبھرتی ہوئی طاقتوں کا اتباع کرلے۔ مسلمانوں کا ظنّی علم۔ یورپ کی میکانی قوّت اور ہندوؤں کا تخیل خودشعوری سے منسلک طاقتوں کے سامنے بیکار ہے۔

"نفسی اور جسمانی نظام میں تغیّر"

ارتقائی نظام کی طرف یعنی خودشعوری ہیئت ذہنی کی طرف اشارہ کرنے والی حقیقت نفسی اور جسمانی نظام میں تغیّر ہے۔ نئی قوّتیں ہیں آگے کی طرف

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

دھکیلتی ہیں اور ہماری ذہنی بلندی موجودہ نظام اور اقدار کو زیادہ صحیح اور جدید خطوط پر دیکھنا چاہتی ہے۔ جب ادراک میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو اس سے کم درجہ کی چیزیں مضحکہ انگیز سی معلوم ہونے لگتی ہیں علاوہ ازیں ہمارے احساسات اور ذہن کو غلط تصورات سے اطمینان بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ زندگی کی عملی کیفیتیں ایک الگ ذہنیت پیدا کرتی ہیں۔ انسانی تصورات اور زندگی کے عملی حقائق کے اس تصادم سے عجیب عجیب الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ذہن کیلئے بیحد تکلیف دہ اور جاں گسل ثابت ہوتی ہیں۔ انسان کو زندگی میں معقولیت۔ امید۔ نجات۔ سچائی۔ نظم اور اپنی ذات کی نشوونما کی راہیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ پرانا شعور اور طریقے زندگی میں کارگر ثابت نہیں ہوتے۔ انسان خود کو تنہا۔ مایوس اور تباہ حال پاتا ہے اور مختلف تاویلیں اس صورتِ حال کی کر کے خود کو مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن سوائے مایوسی کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیونکہ امید معقولیت۔ اور ذات کی نشوونما کے ذرائع تو نیا شعور ہی پیش کر سکتا ہے اس لئے نفس اور ذہنی نظام اس وقت تک منتشر رہتا ہے جبتک اسے صحیح ارتقائی نظام حاصل نہ ہو۔

انقلاب کے سابقہ عبوری ادوار اور موجودہ عبوری دور

آج سے قبل جتنے عبوری ادوار تاریخ میں آئے وہ قوّتِ حیات کی غیر شعوری ہیئت اور اسکے نامکمل پہلوؤں کی ارتقائی منازل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان عبوری دوروں کی وجہ سے قوّتِ حیات کوئی بالکل نئی شکل و ہیئت اختیار نہیں کرتی تھی یعنی ایک ہی نوعیت کے سادہ اور مسلسل ارتقا کا سلسلہ تھا اور زندگی کوئی نیا حیاتیاتی پلٹا نہیں کھاتی تھی۔ مثلاً نباتات جبتک نباتاتی ہیئت میں ارتقائی منازل طے کریں ان کا ارتقا ایک ہی نوعیت کا کہلائے گا۔ اور اگر وہ نباتات سے حیوانات کی ارتقائی ہیئت اختیار کر لیں تو یہ ایک نیا حیاتیاتی پلٹا کہلائے گا۔ انسان کی زندگی جبلّتوں اور ہیجانات کے بہاؤ کے زور پر حیوانی ارتقائی ہیئت میں ہی چل رہی تھی ایک اعلیٰ ارتقائی ہستی اختیار نہ کی تھی لیکن موجودہ عبوری دور ہمیں یعنی ہماری قوّتِ حیات کو انسانیت کی ایک اعلیٰ ہستی میں منتقل کر رہا ہے۔

غیر شعوری سطحِ ذہن کی انتہا جسکے بعد .... "م" .... "ی" تک نہ پہنچنے سے قبل ادراک کے پیمانہ میں خلائیں باقی تھیں۔ ان خلاؤں کے پُر ہونے کے بعد قوّتِ حیات ایک نئی سطح اختیار کرتی ہے۔ آج ذہن "ی" تک پہنچ چکا ہے اور وہ نئی ہیئت کا منتظر ہے۔

۱۳

ذہن نئی ہیئت اختیار کرتا ہے۔

سابقہ عبوری ادوار ذہن انسانی کو "ی" تک پہنچانے کا ایک ذریعہ تھے۔

غیر شعوری ارتقا

خلائیں جو ارتقا پُر کرے گا۔

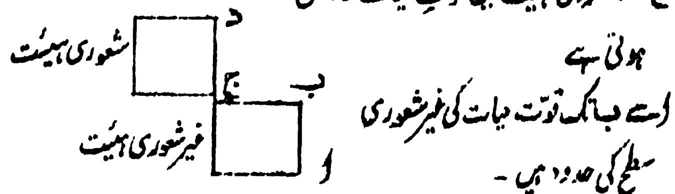
4

3

2

1

آجتک قوّتِ حیات غیر شعوری منزلوں ہی میں درجہ بدرجہ ترقی پا رہی تھی۔ لیکن موجودہ دور میں قوّتِ حیات غیر شعوری منازل طے کرنے کے بعد شعوری منزلوں میں داخل ہو چکی ہے۔



اوّل اوّل پانی سو درجے تک گرم ہوتا ہے اسکے بعد وہ بھاپ بنتا ہے۔ یہی حال قوّتِ حیات کا ہے۔ اوّل اوّل وہ غیر شعوری سطح کی ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور پھر ایک شعوری ہیئت میں داخل ہوتی ہے۔ موجودہ عبوری دور اسے سابقہ ہیئت میں ہی آگے بڑھانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اب تو تمام قوّتِ حیات

خودشعوری کی نئی ہیئت اختیار کر رہی ہے۔ اس لئے قوّتِ حیات کے تمام گوشے پوری طرح کھول رہے ہیں۔ ظاہر ہے موجودہ عبوری دور اور سابقہ عبوری دوروں میں زبردست فرق ہے۔ کیونکہ تمام قوّتِ حیات اب نشو و ارتقا کی ایک نئی دُنیا میں داخل ہو رہی ہے۔ اگر یہ نئی شکل سے گریز کرنا چاہے تو ساری کی ساری فنا کی زد میں آجاتی ہے۔ قوّتِ حیات کا کوئی ایک جزو منزلِ تعمیر میں نہیں ہے۔ بلکہ تمام کی تمام تعمیرِ منزل میں ہے۔ غیر ترقی یافتہ ادراک انسانی نئی ہیئت کو اگر قبول نہ کرے تو چونکہ غالب جمعیت بلند ہوتی ہے۔ اس لئے پست ادراک اس سے ٹکرا کر واپس لوٹتا ہے۔ اور اپنی ہی ذات پر حملہ کرتا ہے۔ اس عمل سے انسان کی قوّتیں خود کو بے بس محسوس کرتی ہیں اور زندگی میں ایک نشیب کی سی حالت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا ادراک نئی ارتقائی حدود سے نہ پیچھے جاسکتا ہے۔ نہ نئی ہیئت کو پھاند کر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اور ایک جمود کی حالت موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک جانکنی۔ ایک انتشار، ایک نہ رُکنے والا اضطراب، زندگی پر ٹوٹ پڑتا ہے اور نئی ہیئت سے تطابق لازمی اور لابدی بن جاتا ہے۔ پہلے عبوری دوروں میں چونکہ قوّتِ حیات کوئی ہیئت اختیار نہ کرتی تھی۔ بلکہ ایک بڑھتی ہوئی رو کی شکل میں چلتی تھی۔ اس لئے غیر ترقی یافتہ ادراک کی کسی ہیئت اور نئی سطح سے ٹکرانے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور غیر ترقی یافتہ ادراک پر کنٹرول بھی ہو سکتا تھا۔ سابقہ عبوری دوروں میں انتشار پھیل جاتا تھا۔ لیکن ادراک اور قوّتِ حیات کو اس طرح مقید نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ غیر ترقی یافتہ قوّتِ حیات کو محیط تو ایک نئی سطح اور ہیئت قوّتِ حیات ہی کر سکتی ہے۔ آج نوعِ انسان پہلی دفعہ اس عمل سے گزر رہی ہے۔ اگر انسان مذہب کی طرف یعنی سچائی اور حقیقت کے ظنّی تصوّرات کی طرف توجہ کرے۔ اور ان میں گم ہونا چاہے۔ تو احساسِ گناہ ادراک پر مستقلاً طاری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ادراک عملی طور پر آگے بڑھنے کی راہ تو پا نہیں سکتا۔ وہ مستقلاً ایک تعطّل کی حالت میں قائم ہے۔ یعنی ادراک کو گریز کے لئے بھی کوئی راہ نہیں ہے۔ اور مذہب نیک و بد اور گناہ و ثواب کے معیار کو ادراک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ زندگی خود لغزشوں اور خامیوں کی رہگزر ہے جبتک صحیح حیاتیاتی نظم قائم نہ ہو۔ احساسِ گناہ کی صورت میں مسلسل ایک عذاب کی سی کیفیت کے سوائے ادراک کو کوئی حل نہ ملے گا۔ یہ بھی ایک حیاتیاتی قانون ہے۔ یعنی جب ادراک مقید ہو اور کسی غلط مکتبِ خیال کا خودساختہ معیار ہی ہماری ذات کو رد کرتا ہے۔ کیونکہ وہ مکتبِ خیال ادراک کو حیاتیاتی نشو و ارتقا کی راہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ (حیاتیاتی نشو و ارتقا کی راہ تو نیا حیاتیاتی شعور ہی دے سکتا ہے) یعنی جب ادراک اسیر رہتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ نشو و ارتقا بھی اسیر ہے۔ اور یہ قید و بند کا احساس اس خیال میں تبدیل ہو جاتا ہے 14
کہ فرضی مکتبِ خیال کو اچھی طرح نہ نباہنے کا نتیجہ یہ قید و بند ہے۔ اس خیال و احساس کی بنا پر ایک تکلیف دہ کیفیت اور جانکنی ذہن پر چھا جاتی ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ ایک آزاد خیال شخص بھی بغیر خود شعوری حیاتیاتی اور ارتقائی راہوں کے بے بس ہو کر رہ جائے گا۔ اور خود کو پسپا ہوتا ہوا پائے گا۔ یہ حال آج کل تمام تحریکوں کا ہے۔ جنہیں کوئی راہ نہیں ملتی ہے۔ حکومتیں بھی کوئی راہ نہ پاتے ہوئے شکست خوردہ شخص کی طرح ہاتھ پیر ماریں گی اور خود کو کچل ڈالیں گی غرض یہ کہ جبتک ادراک نئی منزل اور نئے خود شعوری ذہن سے تطابق نہ کرلے۔ نشو و ارتقا کی کوئی راہ نہیں مل سکتی۔ آج تمام نوعِ انسان کو نئی ہیئت ذہنی سے تطابق کرنے کی ضرورت ہے۔

زندگی اور موجودہ نظامِ عالم کے درمیان ایک علیحدگی پیدا ہوگئی۔ یعنی موجودہ نظامِ عالم میں ہمارے جذبات اور قوّتوں کا کوئی پاس نہیں ہے۔ ہماری زندگی موجودہ محدود نظامِ عالم کے چوکھٹے میں فٹ نہیں ہے۔ وہ قوّت جو ہمیں متحد اور شیرازہ بند رکھتی ہے خود عبوری حالت میں ہے اور یہ عبوری حالت نوعِ انسان کی تاریخ میں ایک خاص نوعیت رکھتی ہے۔ پہلا مسئلہ ایک ایسا ماحول اور نظام قائم کرنا ہے۔ جو ہماری زندگی کی نئی ارتقائی قوّتوں کو راہ دے سکے اور وہ نظام خودشعوری ہیئت ذہنی کی مدد سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ موجودہ انسان کا ذہن اور ماحول اسی کا مقتضی ہے۔

ارتقائی زندگی نئے ماحول اور فضا کی مقتضی ہے۔ موجودہ نظام غیر شعوری سطحِ ذہن کی انتہا کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے نیا ماحول لازمی نئی خودشعوری ہیئت کے علاوہ قائم نہیں ہو سکتا۔

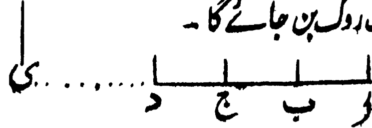
موجودہ نظامِ عالم

پُرانی زندگی کے لئے کافی تھا۔ اور پُرانی قوّتوں کی بنا پر قائم ہوا تھا۔

ایشیا جون جولائی ۱۹۶۷ء

موجودہ نظام عالم جن قوتوں کی بنا پر قائم ہوا تھا - وہ غیر شعوری سطحِ ذہن کے انتہائی نقطۂ ارتقا کا نتیجہ تھیں - اب ارتقا آگے بڑھ چکا ہے وہ غیر شعوری سطح ذہن کا کوئی نقطہ تو ہو نہیں سکتا - کیونکہ غیر شعوری سطح ذہن کے انتہائی نقطہ کی بنا پر تو وہ نظام ہی قائم تھا - جو اب ٹوٹ رہا ہے - اس لئے اب خود شعوری ارتقا کے دور میں زندگی داخل ہو رہی ہے - اور موجودہ نظام خود شعوری ارتقا سے متعلق قوتوں کو نہ جذب کر سکتا ہے اور نہ اپنی کوئی راہ دے سکتا ہے - اور نہ روک سکتا ہے -

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تمام غیر ترقی یافتہ ادراک نئی قوتِ حیات اور خود شعوری ہیئت ذہنی کے جنگل میں مقید ہو گئی ہے - یہ ایسا ہی ہے جیسے چراغ کو پشت کی طرف رکھا جائے تو سایہ آنکھوں کے آگے ہی پڑے گا - اسی طرح حیاتیاتی اصول ہے - جبتک نئی ہیئت ذہنی کو رہبر نہ بنایا جائے گا - غیر ترقی یافتہ ادراک پر اس کا سایہ پڑ کر ایک روک بن جائے گا -



نقطہ ی شعوری ہیئت ذہنی کا نمائندہ ہے - جبتک ی کی بنیاد پر نظام عالم قائم نہ ہوگا ا ب ج د کے لئے ی ایک روک بنا رہیگا اور ا - ب - ج - د کی قوتیں ی کے بلند درجۂ ذہنی کے سایہ کی وجہ سے مقید رہیں گی -

پرانے شعور اور ارتقائی قوتوں میں آج ایک زبردست کشمکش بپا ہے - پرانا شعور نئی قوتوں کو قابو کرنے میں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے - اس لئے انسان کا پرانا ادراک بے بسی میں گرفتار ہو جاتا ہے - علاوہ ازیں پرانا نظام زندگی کے نئے جذبات اور ہیجانات کی تسکین نہیں کر سکتا - اس لئے زندگی بے کسی میں مبتلا ہو جاتی ہے - زندگی کی بے بسی اور بے کسی کا علاج نئی قوتوں کی بنا پر ماحول اور ادراک کو بلند کرنا ہے - اگر نئے ارتقا سے ہم آہنگ نہ ہوا جائے - تو انسان تباہ حال اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے - جبتک صحیح نظم قائم نہ کیا جائے - پرانے شعور اور ارتقائی قوتوں میں اندر ہی اندر ایک کشمکش جاری رہے گی اور زندگی بے چینی اور اضطراب سے نجات نہ پا سکے گی -

۱۵

پرانا شعور ← نتیجہ بے بسی ← نئے شعور کی ضرورت

پرانا نظام ← نتیجہ تباہ حالی اور بے کسی ← نئے ماحول کی ضرورت

قوتِ حیات کی نئی شعوری ہیئت کی وجہ سے جسمانی - ذہنی اور بیرونی نظم میں تبدیلیاں

خود شعوری ہیئت ذہنی

(جسم)

جسم کی قوتِ مدافعت میں اضافہ - ادراک کا پیمانہ مکمل ہو جائے گا - قوتِ حیات منتشر حالت میں نہ رہے گی - اس لئے صحت میں اضافہ ہوگا جنون اور مجذوبیت کا خاتمہ ہو جائیگا - عمر میں اضافہ لازمی نتیجہ ہوگا - ذہن کی صلاحیت بڑھ جائیگی - ناقص اعضا والوں - بہروں - اندھوں - لولے لنگڑوں کی پیدائش بند ہو جائے گی -

اعضائے جنسی

جنسی خواہشات کی صحیح تسکین ہوگی - اعضائے جنسی میں نقص نہ رہے گا - قوت حیات کے نشوونما سے اعضائے جنسی کی صحت کا زبردست تعلق ہے - صحیح نشوونما یافتہ قوتِ حیات اعضائے جنسی کو بھی صحت اور قوت عطا کرتی ہے اور اس طرح جنسی تعلقات کی شکایات کو دفع کرنے میں مدد و معاون بنتی ہے

قوّتِ حیات آزاد اور شعوری حیثیت میں ترقی کرے گی۔ اس لئے ذہن آزاد **(ذہن)**
ذہن آزاد ذہن ہو گا۔ اسرار ختم ہو جائے گا۔ حوادث اور خطرات کا استیصال ہو جائیگا۔ موت کا پردہ ذہن پر وَا ہو جائے گا

بیوی۔ اولاد اور معاشی ذرائع کی طرف سے کلی اطمینان حاصل ہوگا۔ خود شعوری ترقی **(خاندانی زندگی)**
کی وجہ سے بیوی اور شوہر میں تصادم اور اولاد کی سرکشی وقوع میں نہ آئے گی۔ صحیح نظام کی وجہ سے معاشی کاوشیں بھی دور ہو جائینگی۔

مذاہب کا وجود باقی نہ رہے گا۔ عبادت ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ سب **(سچائی اور اقرار)**
خدا تک پہنچنے کا ذریعہ تھے۔ جب خود شعوری حاصل ہو جائے گی۔ تو دُنیا کے لئے خدا ایک راز نہ رہے گا۔ دُنیا کو خدا کی تمیز کی منزل پر پہنچنے کے بعد عبادت کی کیا ضرورت رہتی ہے۔

قوّتِ حیات کی نئی حیاتیاتی ہیئت قائم ہونے پر مکانی سائنس پر **(سائنس (طبعیات اور کیمسٹری))**
ذہن کو قابو ہو جائے گا اور یہ زندگی کی بہتری کے لئے کام کرے گی۔ حیاتیاتی سائنس میں حیرت انگیز انکشافات اور طریقے معلوم ہو جائینگے اور نوعِ انسان کی قوّتِ حیات پر قابو ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہ سائنس کو غلط سمت میں استعمال نہ کر سکے گی۔

تمام نوعِ انسان کے رہن سہن کا ایک ہی فطری ارتقائی طریقۂ زندگی ہوگا۔ نسل اور **(تمدّن)**
قوم کے تصوّرات ختم ہو جائینگے۔ یہ جغرافیائی حدبندیوں کے پیدا کردہ تھے۔ مخلوط شادیاں ہوں گی اور ایک ہی زبان تمام دُنیا میں عام ہو گی۔

تمام دُنیا پر ایک صدر کی حکومت ہو گی۔ جو خود شعوری ارتقا کا نمایندہ اور **(حکومت)** 16
حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے صحیح شعور کا حامل ہو گا۔ اور زندگی کی صحیح رہنمائی کر سکے گا۔ وراثت کا رواج ختم کر دیا جائے گا۔ اجارہ داری اور جلبِ منفعت کے مواقع مسدود کر دئے جائینگے۔

عالمگیر تبادلہ کا قیام۔ کسٹم ڈیوٹی کی تنسیخ۔ فوج کا اختتام۔ جیلوں کو توڑ دیا **(سیاسی نظام)**
جائے گا۔ ادراک پر کنٹرول ہونے کے بعد ان کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ نہ فوج کی۔ مستقل امن قائم ہو جائیگا۔

غلط مسائل اور کتابی علم اور ذہنی تکان کے بجائے آزاد ذہن زندگی کی جدوجہد **(تعلیم)**
میں صحیح طور پر نشوونما کر سکے گا اور ترقی و انکشافات کی راہیں وا ہوں گی۔



خود شعوری ہیئت ذہنی کے نتائج

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۳ء

اکرام حسین بی۔اے

(مسلسل)

جدید بنگالی شاعری

"ٹیگور انسانوں میں ہمہ گیر انسان ہے۔ شاعری میں بے نظیر شاعر۔ اور ہمارا یہ عہد ٹیگور کا عہد ہے"۔ جدید بنگالی شاعری رابندر ناتھ ٹیگور کی ہمہ گیر خلاقانہ، اور ندرت پسند شعری کاوشوں اور کاہشوں کی منت کش تعبیر ہے۔ ٹیگور کی شاعری سے قطع نظر اُسکی شخصیت کا شعوری اور غیر شعوری اثر تمام شاعروں پر پڑا۔ یہ اثر گزشتہ یوروپی جنگ تک کافی گہرے نقوش اُبھار چکا تھا جس نے تمام عالم کے مروجہ سماجی نظام کو بدل دیا۔

ہماری قومیت کا تمدنی سانچہ بنگال میں تیار ہوا جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں تغیرّاتی نقطۂ نگاہ پیدا کر دیا۔ مغربی علوم و فنون کا چرچہ پہلے پہل بنگال ہی میں شروع ہوا۔ سیاسی و سماجی اصلاح کی صدا بھی وہیں سے بلند ہوئی۔ انہیں تبدیلیوں کی بنا پر سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ادبی، تمام نظریات نئے معیار اور "جدید" کا نٹے پر تولے جانے لگے۔

بنگال ہمیشہ سے مغربی تحریکات کو جذب کرنے اور اپنے تمدنی معیار اور قومی ضروریات کے مطابق اُن سے استفادہ کرنے کے معاملے میں پیش پیش رہا ہے۔ یورپ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں تغیرّ و تبدّل رونما ہوا جس نے نونیاز بنگال کی وسعتِ فکر و خیال کو چمکا دیا۔ نئے زمانے اور نئے نظریاتی تغیرات کے ساتھ ساتھ، آمد و شد کے نئے ذرائع۔ نشریاتِ لاسلکی نئے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" نے کسی قدر طاقت عوام کے ہاتھوں میں پہنچا دی۔ دو مختلف قوموں کے درمیان شادی بیاہ کے معاملے میں جو دیوار ایسا حائل تھیں اُسے ترقی پسند سماجی نظام کے حامل گروہ نے کچل دیا۔ تعلیم کی بڑھتی ہوئی رو اور کتابوں کی طباعت اور اشاعت کی وجہ سے ملک میں تحقیق و تدقیق کا مادّہ پرورش پاتا جا رہا تھا۔ صنعتِ فلم سازی مغربی تحریکات کو ہند کی سرزمین اور پھر ترقی پسند دماغوں تک لانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی تھی۔ اکثر بڑے شہروں میں مخلوط تعلیم کی وجہ سے جنسی نظریات و تخیّلات بدل رہے تھے۔ قومی حکومت کا تقاضا تھا، روس، جرمنی اور جاپان میں ہندوستانی پناہ گزینوں کے ذریعہ نئے سیاسی عقائد کی اشاعت۔ خصوصاً اوّل الذکر دو ممالک میں ملوکیت کے بُت پاش پاش ہو جانے پر نئے رجحانات کی نشر و اشاعت نے زاویۂ فکر بدل دیا۔ "اچھوت ادھار" کے مسئلہ نے بھی ایک حد تک سماجی زندگی کے بکھرے ہوئے مروجہ نظام میں تبدیلی کی ایک لہر دوڑا دی۔

ٹیگور صرف ایک باکمال شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک ہوشیار نبّاض بھی۔ اُس نے نہ صرف بنگال کی روح کو جلا دی بلکہ وہ اُس کی روح گویا تھا۔ اُسکی نظریں زندگی کے اس اُلجھاؤ سے نکل کر اُن کے حل تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ اُسکے مذہبی مقالات معاشرتی تحریرات ہیں، ادبی مضامین ڈراموں اور ناولوں میں ہم ایسی سماجی ہیجان کو حیرت انگیز طور پر نغمہ سرا پاتے ہیں لیکن اُسکی شاعری کے قالب سے قطع نظر، اگر ہم ٹیگور کے نفسِ مضمون پر آتے ہیں تو یہاں بھی وہی جمود اور بے حرکتی دیکھتے ہیں جو گوتم بدھ اور مہاتما گاندھی سے منسوب ہے۔ ٹیگور اور اُسکے زمانے کے شاعروں کا امتیازی فرق موضوعات نہیں بلکہ شاعری کا تصوّر و تخیّل ہے۔ ٹیگور کے خیال کے مطابق شاعری ذہنی شعور، علمیّت اور ادراک کی لطیف روح، نزہت زا خوشبو اور رعنائی پرور انگڑائی ہے —— اور یہی ایک ایسا زینہ ہے جسکی مدد سے ہم زندگی کی ابدی سچائی اور حقیقتوں تک پہنچ سکتے ہیں اُسکے نزدیک ایک بے تاب آنسو یا ایک بے اختیار مسکراہٹ کی طرح شعر دل کی کیفیّت کی تصویر ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے نوجوان بنگالی شاعروں کیلئے شاعری محض حکایتِ زبان و بیان ہے۔ اُن کے نزدیک ہمارے اخلاقی شعور کو بیدار کرنا ہی شاعری کا مقصد نہیں جیسا کہ (Words worth) کا ایمان تھا۔ یا زندگی کے ابدی مسائل کی تفسیر جیسا کہ (Browning) کا شاعرانہ

نصب العین تھا۔ وہ اپنے موقلم سے نقاشی اور پُرکاری نہیں کرتے جیسا ٹیگور نے اپنے شاہپاروں میں ہر جگہ کیا ہے۔ وہ ایک سائنسداں کی طرح انسانی زندگی کے اُن جذبات و احساسات کا تجزیہ نہیں کرتے جو ہومر (Homer) کے زمانے سے آجتک جاری و ساری ہے نہ اُنہیں وہ پرشوکت و پرعظمت ہستی ہی نظر آتی ہے جو ٹیگور کی شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔

کولرج (Coleridge.) اپنی مشہور تصنیف (Biographia Literaria) میں شعری فطانت کے یہ لوازم قرار دیتا ہے ''حسِ لطیف شعری فطانت کا جسم ہے۔ تصورات اُس کا حریری لبادہ۔ ایک کپکپی، ایک حیات بخش تھرتھراہٹ اُسکی زندگی اور تخئیل اُسکی روح ہے جو ہر جگہ اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے''۔ شعری فطانت کے یہ لوازم کتنے ہی ضروری ہوں، نئے شاعروں میں کم و کیف ان کا فقدان ہے۔ وہ تجزیۂ نفس تحت الشعور میں حکمت تامہ رکھتے ہیں۔ وہ صوتی نغمات (Evocative rhythm) اور عکسی ترتیب (Image Sequence) پر سر دُھنتے ہیں۔ اُن کے نزدیک نظم کی ظاہری شان و شوکت، ''دقیق الفاظ، رنگین تراکیب، بعید از قیاس استعارے، دور از کار تشبیہات'' — اُسے زندہ رکھتی ہیں — (Word Worth) کا خیال ہے کہ تمام اچھی نظمیں ''شدت جذبات کے از خود چھلکنے'' سے وجود میں آتی ہیں مگر ہمارے نئے شاعر اس خیال کے حامی نہیں۔ وہ فن تنقید کے اصولوں سے آزاد اپنی دھن میں مست ہوکر لکھتے ہیں۔ انکے نزدیک ''کوئی تم سے اکم واکم'' (شاعری الفاظ کے ترنم کا نام ہے) یہی سب کچھ ہے۔ [illegible] (MALLARme) فرانسیسی شاعری کی رمز مثالی تحریک (Symbolist movement) کے مخالف کے خیال کے مطابق بھی ''شعر کی تخلیق خیال سے نہیں، الفاظ سے ہوتی ہے''۔ ان نئے رومانی شاعروں نے مغربی شعری شعور کو اپنایا اور تصوّراتی (Imagist) اور (Surrealist) شاعر — (David Gascoyne) کا اتباع کیا۔ وہ انگریزی، امریکی اور غیر ملکی شعراء کی خوشہ چینی کرتے ہیں۔ جن میں سے چند نام حسب ذیل ہیں:- Masefield Blunden Spender, Davies, Edith Sitwell, Walter De La Mare, Eliot, Pound, Poe Mallarme, Rimbaud......

۱۸

....

اور بعض اوقات روسی کمیونسٹ شعراء کے اتباع سے بھی دامن نہیں بچاتے۔ لیکن ان شعراء کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ مغربی شعراء کے اتباع کے باوجود اُن کی ملکی روایات میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں یہ تو مشکل ہے کہ تمام شعراء کے ذاتی رجحانات اور تحریکات شعری کا تجزیہ کیا جائے۔ لیکن جدید شاعری کی رفتار اور اس کی تدریجی ترقی کے اظہار کیلئے یہ ضروری ہے کہ چند مخصوص صاحب اسلوب اور مختلف الخیال اسکول کے شعراء کے کلام پر روشنی ڈالی جائے۔

ٹیگور کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیت اس کا بیساختہ پن ہے اصل بنگالی میں ان گیتوں میں سے ہر ایک اپنی سادگی، تازگی، برجستہ پن، معانی کی نزاکت اور بلندی، بیان کی روانی، الفاظ کے حُسن انتخاب، موزونیت، ترنم اور سُرتال کی ندرت اور دلکشی میں شاعری اور موسیقی کا لاجواب نمونہ ہے۔

ٹیگور انسانی آزادی کا علمبردار ہے۔ غلامی اور جہل و حقارت کی گود میں پلی ہوئی موجودہ تہذیب و تمدن کی دُنیا میں وہ آزادیٔ فکر و عمل اور باہمی صلح و محبت کا پیامبر ہے۔ ٹیگور کی زندگی فرسودہ بے معنی رسم و رواج اور مُردہ و بوسیدہ مذہبی توہمات کے کٹھن بندھنوں کو کاٹتے کٹی ہے۔

''مجھے معلوم نہیں عبادت کسے کہتے ہیں!
جبھی تیرے دروازے کی خاک پر بیٹھا صرف رویا کیا ہوں!
میں بے سمجھ تھا، اور جس طرح میرے دل میں آیا میں چلا آیا!
میں اندھیرے میں تجھ سے ڈرا نہیں!
لیکن یہ عارف تیرے،
مجھے سخت طعنہ دیتے ہیں۔
کہتے ہیں'' تو یہاں آنے کی مناسب راہ سے نہیں آیا، لوٹ جا!''
میرے لوٹنے کا راستہ تو تم نے بند کر رکھا ہے!
اور وہ بیکار پکار رہے ہیں'' لوٹ جا، لوٹ جا!''
(ا۔گیت۔ بنجاشیکا)

اور:-

دروبان چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوشبو بنا کر اُڑا دے!
خوشبو چاہتی ہے کہ لوبان کو اپنے سینہ میں چھپائے رکھے!
نغمہ چاہتا ہے کہ سُرتال کا پابند رہے،
سُر چاہتا ہے کہ نغمہ کو لے کر اُڑ جائے!
خیال چاہتا ہے کہ مجسم صورت میں جلوہ گر ہو،

اور صورت کی آرزو ہے کہ عالمِ خیال میں آزاد رہے !
گرہ کا کھلنے کی فکر میں ہنا،
آزادی کا زنجیروں کی آرزو کرنا،
یہ عالمِ ہست و نیست میں کسکی خوشی ہے جو کارفرما ہے !"

(۲-گیت -انتسنگ)

"میرا اندھیرا ہی بھلا ہے !
اپنے آپ کو روشنی کے حوالہ تو کر سکے گا !
روشنی کا حریص دیکھو، نور کو کس طرح سے سمیٹتا ہے -
بس یہی طمع کا دھندلکا تباہ کن ہے !
بچہ ماں کی گود میں اطمینان سے دودھ پیتا ہے،
لیکن مغرور عقلمند تیری بارگاہ کے دروازے پر روک دیا جاتا ہے !
تیری راہ اپنا دروازہ خود دکھاتی ہے !
پروردگار! میں تیری اس راہ پر سیدھا چلوں گا !
اور وہ جو راستہ بتانے کے لئے آ جمع ہوئے ہیں —
وہ تیری راہ میں سنگِ راہ ہیں !"

(۳-گیت -پوربا ہی نی)

ٹیگور نے مروّجہ تعلیم کے خلاف جہاد کیا - اور "وشوا بھارتی" کا سنگِ بنیاد رکھ کے یہ ثابت کر دیا کہ مصنوعی قید و بند سے آزاد ہو کر نام نہاد حدود کو توڑ کر ہی حقیقی اور سچی تعلیم کی روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ٹیگور نے انسان میں انسانیت کے خدا کو دیکھا ہے اور اسی لئے اُسکی توہین وہ کسی رنگ میں برداشت نہیں کر سکتا -

ٹیگور کی عظمت کا سنگِ بنیاد، اُسکی لاثانی شخصیت کا مدار وہ نغمہ ہے جو اُس نے اس حسین دُنیا کے تن میں حُسن و سرور کی روح پھونکنے والے "شاعرِ کائنات" محض حُسن، محض سرور، کی مدح و ثنا میں گایا ہے: —

"خوف نہ کھاؤ کہ پیغام بر ایمان لکھتے ہوئے،
بیٹھے بادبانوں میں سینے کو تان کر،
میں اپنی کشتی کو کھیتا اُس پار لیجاتا ہوں !
میرا رہنما وہی ہے —
جو مجھے ہر حال میں دیکھ رہا ہے !
میرے دل میں کھٹکا نہیں —
میں کشتی کو منجدھار میں چھوڑتا ہوں،
مجھے اُس پر بھروسہ ہے !
دن ڈھلے پر مجھے یقین ہے کہ کشتی تیرے سہارے پار لگے گی !
وہاں میں اپنے دردِ دل کے سُرخ پھول کو —
تیری رحمت کے قدموں میں رکھ دونگا !"

(۴-گیت -مکت دھارا)

"آہ میری راتیں اس طرح کیوں برباد ہو رہی ہیں ؟
آہ، کیوں ہمیشہ میں اسکے مشاہدے سے محروم رہتا ہوں —
جس کے تنفس کا اثر میں اپنے خوابوں پر محسوس کر رہا ہوں"

(نغمہ ۲۶-گیتانجلی)

"میں تجھے اپنے خدا کی حیثیت سے جانتا ہوں اور تجھ سے علیحدہ ہوں میں تجھے اس ہستی کی حیثیت سے نہیں جانتا جو میری ہو، اور تجھ سے قریب تر نہیں ہوتی - میں تجھے اپنے باپ کی حیثیت سے جانتا ہوں اور تیرے قدموں میں سربسجدہ ہوں - میں تیرا ہاتھ اپنے دوست کا ہاتھ سمجھ کر نہیں پکڑتا"

(نغمہ ۲۷-گیتانجلی)

ٹیگور نے وہ گیت سُنے ہیں جو مُغنّیِ فطرت اپنے قدرتی مظاہر میں ہمیشہ گائے جا رہا ہے اُس کا دل و دماغ انہی قدرتی گیتوں کے لاجواب سُروں سے گونج رہا ہے اور وہ خود مجسم سرور و نغمہ ہو کر گاتا ہے - ٹیگور کا معبود اور معشوق وہ شاعر اور مصوّر ہے جو اُس کی زندگی میں لطف اور سرور [illegible] اور اندوہ کی سحر پھونک رہا ہے، اُس کی زندگی میں عجیب و غریب کیفیات کے رنگ بھر رہا ہے - شاعر اُسکے عشق میں، اور اُسکے حُسن کو قدرت میں دیکھ کر اُس کی تعریف میں نغمہ سرا ہے -

ایشیا کا عرفان، اُپنشدوں کا گیان، جو رشیوں کی خصوصیت تھا وہ ہمارے دور کی آزادی اور جدید علمی تحقیقات اور فلسفیانہ حقائق کی روشنی سے مل کر ایک حیرت انگیز لافانی موزونیت کی صورت میں ہم ٹیگور میں موجود پاتے ہیں - ٹیگور اپنی شاعری کے عالم کا آپ ہی خالق ہے - اُس سے قبل کی بنگالی شاعری کی وہی حالت تھی جو اردو کی [illegible] مرزا غالب سے

سے پہلے اُس نے اپنے مذاق کے مطابق عروض کے قواعد، الفاظ کے استعمال اور اظہارِ خیال کے میدان میں بھی اصلاحیں کیں۔ وہ خود کہتا ہے:۔

"دل کی خوشی کے چڑھتے ہوئے سیلاب کے ریلے کے سامنے
بندھی بندھائی عروض کی بحریں اور وزن اپنی جڑیں زمین
میں سنبھال کر نہ رکھ سکے۔ اور جس طرح ندی سیدھی راہ نہیں بہتی
اپنی ترنگ میں گھومتی، چکر کاٹتی چلی جاتی ہے، میرے اشعار
کے بہاؤ میں بھی خود سری تھی۔"

قاضی نذرالاسلام۔ اسکے بعد نذرالاسلام کی ہستی ہے، ٹیگور نے خود بارہا نذرالاسلام کی شاعرانہ عظمتوں کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ہم ٹیگور کے بعد بنگالی کا سب سے بڑا شاعر نذرالاسلام ہی کو مانتے ہیں۔ نذرالاسلام کی شہرت کی بُنیاد اُسکی "باغیانہ نظموں پر قائم ہے۔ کون اُسکی نظم "باغی" اور "طوائف" سے انکار کرسکتا ہے۔ اُسکی نظموں میں مضمون کی مناسبت سے کچھ اس قسم کے الفاظ ہوتے ہیں کہ اُن میں ایک انقلاب انگیز گرج اور ولولہ انگیز شور پیدا ہوجاتا ہے۔

نذرل موجودہ ملکی نظام، سرمایہ داری، بیواؤں کی زبوں حالی، مزدور کی کس مپرسی، اور سماجی بدحالی کے خلاف ہے۔ وہ کھُلے ہوئے پیرایہ میں (Socialism) اشتراکیت کا پرچار کرتا ہے۔ اُسکے نزدیک مُلکی بدحالی کو دور کرنے کا ایک یہی واحد علاج ہے۔ چونکہ وہ خود سپاہی رہ چکا ہے اس لئے اُسکی نظموں کا جوش، اُسکے ذہنی نشو و نما کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔

وہ ایک باغی شاعر ہے اُس کی زیادہ تر نظمیں حکومت اور اُسکی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکے بیشتر مجموعے ضبط ہو جاتے ہیں۔

اُس کی قومی اور انقلابی نظموں کا نئے شاعروں پر گہرا اثر پڑا۔ اور یہی دیکھتے دیکھتے، اب وہ خموش ہوگیا ہے۔ (ٹیگور کے شرادھ کے موقع پر میں نے اُس سے مل کر یہی رائے قائم کی ہے) اب اس نے اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر محبت اور نیچر کو اپنا موضوعِ شاعری بنالیا ہے۔ نذرل اس معاملہ میں جوش کے بالکل برعکس ہے۔ نذرل نے پہلے بغاوت کی آگ اُچھالی اور پھر "محبت" اور "نیچر" کے گیسو سنوارے۔ مگر جوش پہلے ایک نشاطی و رومانی شاعر رہا بعد کو انقلاب اور اشتراکیت کے گیت گانے لگا۔

اب نذرالاسلام رومانی شاعر ہے اور اُس کی اکثر رومانی نظمیں شعری لطافت کے لحاظ سے انتہائی مقبول ہوئی ہیں۔ بہت دنوں سے وہ چھوٹے چھوٹے گیت لکھ رہا ہے جو فارسی کی غزلوں کی طرح نرم و شیریں ہوتے ہیں۔

نذرالاسلام ایک غریب گھر کا چشم و چراغ تھا۔ بردوان کے ایک گاؤں میں وہ آج سے ۴۵ سال قبل پیدا ہوا۔ قدرت کی آغوش میں پروان چڑھا۔ اسکول اور کالج کی تعلیم سے بے نیاز رہا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوکر عراق چلا گیا۔ جنگ کا میدان اسکے لئے سب سے بڑی درسگاہ ثابت ہوا۔ جب لڑائی کے میدان سے ہندوستان لوٹا تو چند نظموں کے مسودے اسکے ساتھ تھے۔ اُن کا مجموعہ "اگنی دُنیا" (آگ کی بانسری) کے نام سے شائع ہوا۔ یہ آٹھ یا نو نظموں پر مشتمل ہے جس میں سے دو کو چھوڑ کر باقی سب عراق میں لکھی گئیں۔ ان سب میں اسلامی روایاتی زندگی کی دھڑکن پائی جاتی ہے۔ اور اُن میں ہم ایک مسلمان انقلابی، ایک اسلامی مجاہد کی جھلک دیکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو اس زمانے میں اُسے آزادی کی لگن اور ظلم سے نفرت تھی۔

"کسان تو وہ ابتدا ہی سے تھا۔ لیکن عراق کی جنگ نے اُسے سپاہی بھی بنا دیا۔ کسان سپاہی میں انقلاب گری کے بڑے بڑے امکانات پنہاں ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا ساتھ مزدور سے ہوجائے۔ کسان، مزدور اور سپاہی ـــ ان تینوں کا اتحاد دُنیا کی تمام جابر سلطنتوں کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ زار کا زوال اس حقیقت کا ثبوت ہے۔"

"مسلمان کی گرم گفتاری، کسان کی حقیقت پسندی اور سپاہی کا جوش یہ تینوں چیزیں نذرالاسلام کو ودیعت کی گئی تھیں۔ مزدور کی انقلابی سرشت کی کمی تھی، سو وہ بھی بعد میں پوری ہوگئی۔"

عراق سے واپسی پر اُسے اپنے خیالات کی تہذیب اور تعلیم کا موقع ملا۔ اسی زمانہ میں اُس نے وہ نظم "ودروھی" (باغی) لکھی جس نے اُسے ادبی انقلاب کا پیشوا بنا دیا۔ پروفیسر سرکار اپنی کتاب "ایشیا کا مستقبل" Future of Asia میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"جب میں نے نذرالاسلام کی نظم "باغی" کو پڑھا تو مجھے محسوس

ہوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے
متوقع تھے آج اُس کا آغاز ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے
ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا لہریں مارنے لگا۔ مسلمانوں
نے ابتک اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی نہیں کی تھی جتنی اُن پر
عائد ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ بنگال کی سوئی ہوئی روح
کو بیدار کرنیکا سہرا شاید ان ہی کے سر بندھنے والا تھا۔"

"باغی" بنگلہ ادب میں اپنی نوعیت کی اچھوتی چیز ہے۔ وکٹر ہیو گو
(طوفان) سوئن برن (ہرتھا) اور لارڈ بائرن (تخریب) جیسے باکمال شعرا
نے اس موضوع پر نظمیں لکھی ہیں اور پشکن کا ترانہ "آزادی" روسی انقلابیوں کے
دلوں میں اُتر چکا ہے۔ لیکن "باغی" کی عظمت اور بلندی ان سب سے بڑھ کر ہے
یہ "باغی" یونان کا رستم ہرکلس نہیں جس کی ٹانگیں آہنی ستونوں سے زیادہ موٹی
تھیں۔ بلکہ ہومر کا شکیل و جمیل ہیرو "ایکلیس" ہے جس کی تلوار میں اتنی ہی کاٹ
تھی جتنی کہ اس کے مکر بھری آنکھوں میں۔"

اگرچہ بغاوت کا ایسا خاکہ مشکل سے کہیں ملے گا۔ لیکن پھر بھی اُسکے
خیالات میں اس وقت تک پختگی اور صفائی نہیں آئی تھی اور نہ اُس کا نظریۂ زندگی
ہی واضح ہوا تھا جس کی مثال "نعرۂ انقلاب" میں ملتی ہے۔

"اگنی" (آمد) اور "وددرودھی" (باغی) نظموں نے بنگال کے ادبی
حلقوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ قدامت پسندوں نے ان پر سخت شور مچایا۔
ان کی نرالی سج دھج ایک نئے دور کا اعلان کر رہی تھی۔ ٹیگور اسکول کے مقلدین
کو یاد نہیں رہا کہ انہوں نے بھی بنکم چندرا اور ڈی۔ ایل۔ رائے کی روایات
کو توڑ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ بنایا تھا۔ اس ادبی جہاد سے جوان اور بوڑھے
دو گروہ میں بٹ گئے اور اُن کے تنازعہ کی بنا نذر الاسلام کی شاعری قرار پائی۔

نذر الاسلام کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت وہ پیغام ہے
جو وہ اپنے وطن کے نام لایا تھا۔ یہ اُن سرفروشوں کا پیغام تھا جو انسانیت
کی نجات کی خاطر دیس پر دیس ہر سولیوں پر چڑھ رہے تھے۔ لیکن اس پیغام سے
قطع نظر اُس نے جس اسلوب میں اس پیام کو دنیا کے سامنے پیش کیا وہ بھی کچھ
کم اہم نہ تھا۔" شاعری یا ادب کے ہر شعبے میں طرز یا اسلوب کو سب سے بڑا مرتبہ
حاصل ہے۔ اور اچھے سے اچھا مضمون اسلوب کے نقص کی وجہ سے
بے اثر اور بے جان رہ جاتا ہے۔" نذر الاسلام اس حقیقت سے اچھی طرح
واقف تھا اور اسی لئے اُس نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کیلئے
ایک ایسے اسلوب کی بنا ڈالی جو اُس کے پیام کا حامل ہو سکے۔

ٹیگور کے بنائے ہوئے سانچے غنائی نظموں کیلئے انتہائی موزوں
تھے۔ لیکن رزمیہ شاعری کی آنچ پڑتے ہی وہ ٹوٹ جاتے تھے۔ چنانچہ نذر الاسلام
نے فارسی اُردو کے سبک الفاظ کے رچاؤ سے اپنی نظموں میں خاطر خواہ زور و
اثر پیدا کیا۔ نذر الاسلام کی اس جدت نے بنگال کے ادبی پاکبازوں
(Puritans) میں ایک آگ سی لگا دی۔ ہر طرف سے اس پر اعتراضات
کی بوچھار شروع ہو گئی۔ اور اکثر Literary Philistines
نے اسے فرقہ پرست اور رجعت پسند قرار دے دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس
نئے رجحان کی خوبیوں کو سمجھ گئے اور آج اسلوب بنگلہ میں کافی مقبول ہو گیا۔
اب تو اسکے تتبع میں غزل نگاری بنگلہ شاعری کی خاص صنف بن گئی ہے
اور اس صنف کا محرک بھی نذر الاسلام ہی ہے۔

نذر الاسلام کو چونکہ بچپن ہی سے گانے بجانے کا شوق تھا۔ لڑکپن
میں اس نے اس فن کو حاصل بھی کیا تھا۔ موجودہ عہد میں وہ موسیقی کا اُستاد اور
مجتہد مانا جاتا ہے۔ اس لئے اُس کی نظموں میں ایک رزمیہ موسیقی پیدا ۳۱
ہو گئی ہے جو اُس کی دوسری خوبی ہے اور جو اُس کے پیام کو پُر اثر بنانے کیلئے
ناگزیر تھی۔

"پیغام کی نوعیت، زبان و بیان کی جدت اور طرز کلام کی قوت۔
یہ وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے بہت کم عمری میں نذر الاسلام کو بنگال کا سب سے
عظیم مقبول شاعر بنا دیا۔"

نذر الاسلام نے حولداری کی وردی چھن جانے پر حکومت کے
عتاب اور قدامت پرستوں کی مخالفت کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ اُسکے عزائم
اور نصب العین میں بھی کچھ فرق نہ آیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۴ء کے عرصہ میں
اس نے دو ہفتہ وار "کلول" اور "نوروز" جاری کئے لیکن سیاسی ہنگاموں
کے ختم ہونے پر ہندو مسلم فساد کی وجہ سے انہیں بند کرنا پڑا۔ لیکن "کلول" کا
اثر غیر شعوری طور پر بنگالی دماغ پر چھایا رہا۔ اور کلول اسکول کے ادیب
یورپ کے رومانی ادیبوں کی طرح اپنے لئے ایک خاص مقام بنا گئے۔ انہوں
نے مولویوں اور پنڈتوں کی زندگی کو بے نقاب کر کے اُن کے حجرہ و کُنج ماتم کدہ
بنا دیا۔ ان ادیبوں میں سے کچھ نے نذر الاسلام کے ساتھ ہو کر سماجی انقلاب

کو اپنا اصلی مقصد بنا لیا۔ اور کچھ "جیمس جوئس" اور "فرائڈ" سے متاثر ہو کر جنسی اصلاح میں کھو گئے۔

۱۹۲۶ء نذر الاسلام کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اُس کے مربی سی۔ آر۔ داس کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی اُس کی پُشت پناہی پر نہیں رہا تھا۔ مخالفت کا ایک شور بلند ہوا۔ اپنے اس شور میں اُسکی آواز کو جذب کر لینے کے لئے۔ ہندو مسلم فساد کی وجہ سے ملک کی جو حالت تھی اُس کی وجہ سے وہ فرقہ پرست کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ اسی دوران میں اُس نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی۔ پھر کیا تھا۔ فرقہ پرست اسکی جان کے دشمن ہو گئے اور ہر طرف سے اعتراضات کی آگ اُچھالی جانے لگی۔ حکومت کی چیرہ دستیوں، مولویوں کا غصّہ اور اب ہندو جماعت کے ستم کو وہ اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کرتا ہے: ۔

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔
کوئی کہتا ہے اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔
کوئی کہتا ہے شاعر کو قید و بند سے کیا واسطہ۔
کوئی کہتا ہے دوبارہ جیل جا کر وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔
مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پاکر
مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتا ہے۔
ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہے،
لہذا یقیناً فرقہ پرست ہے۔
گاندھی جی مجھ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔
عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست
بتاتے ہیں۔
غرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔
لوگو! مجھے اسکی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔
تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں،
میری خونچکاں تحریر ان کے لئے پیامِ موت ثابت ہو۔"

افلاس اور غربت، گرسنگی اور بیچارگی نے اس کی بغاوت گری کا گلا مسوس دیا اور مجبور ہو کر اُسے وہ گیت لکھنے پڑے جو آج بنگال کے بچّہ بچّہ کی زبان پر ہیں۔ جن میں ادب سے زیادہ موسیقی کو دخل ہے

اور یہی رنگ اب اُسکی شاعری پر غالب آ چکا ہے۔ اُس کی انقلابی شاعری ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۵ء تک سرد ہو گئی۔

نذر الاسلام کی شاعری کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

ابتدائی دور تحریکِ خلافت کے ساتھ شروع ہوا۔ اس زمانے میں "انور پاشا" اور "مصطفےٰ کمال" پر دو چھوٹے چھوٹے رزمیہ منظوم مکالمے لکھے۔ معرکۂ کربلا پر بھی چند نظمیں ہیں۔

دوسرا دور "باغی" کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں بم بنائے اور پھینکے جا رہے تھے۔ نوجوانوں کے دلوں میں جوش اور امنگ کا دریا لہریں مار رہا تھا اور Terrorist. پارٹی زور پکڑ رہی تھی۔

تیسرا دور ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ یہ نذر الاسلام کا اشتراکی دور کہلاتا ہے۔ اب وہ زندگی کے فلسفہ کو پا گیا۔ مزدور کی گرد سے اٹی ہوئی پیشانی، طوائف کے آنسوؤں کی رنگین عورت کا درجہ، فلسفہ "حاکم و محکوم"۔ "درگاہ" کی چاشنی، سچائی کے زہر کے ساتھ ساتھ، بنگال کی سرزمین کا قدرتی رومان اُسے متاثر کر رہی گیا۔ "وہاں کے اودے اودے بادلوں گھنے پیڑوں اور ڈبڈبائی ہوئی ندیوں کے پیچھے رومان مسکراتا ہے۔"

نذر الاسلام پر بھی یہ جادو چل گیا۔ اس کا ہلکا سا پرتو "یادِ ایام"، "دریا کا گیت"، "مجھے یاد کرو گی"۔ نظموں میں نظر آتا ہے۔

نذر الاسلام پہلا بنگالی شاعر ہے جس نے اپنے زمانے اور اسکی مروجہ روایات کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ وہ ایک آفتابِ تازہ کی تلاش میں تھا جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو کچل کر قوم و مذہب، رنگ و نسل کی حدوں کو توڑ کر دنیا کو مساوات اور آزادی کا درس دیتا ہے اور اس نئے دور کا وہ یوں اعلان کرتا ہے: ۔

"وہ مبارک ساعت آ پہنچی۔
ہتھوڑی اور کدالی سے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے،
راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں،
تمہاری خدمت کیلئے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے،
تمہارا بارِ گراں اٹھانے کے لئے جو ہمیشہ خاک آلودہ رہتا ہے
وہی۔۔ صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اُسی کے

گیت گاتا ہوں۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دُنیا کی
تعمیر کرے گا۔
آج مظلوموں اور بیکسوں کے خون سے رنگ کر مشرق کی
سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔
آج دُنیا کے بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان
دورِ بیداری کا آغاز ہو رہا ہے۔ جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے
اور شیطان خوف سے لرزتا ہے۔"

نذر الاسلام کے نظریہ کے مطابق "زندگی دائم و قائم ہے اور انسان لاشریک لہٗ اس کا کارساز ہے۔ وہ شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدامت کا حریف اور جدید کا علمبردار ہے۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں جنگ کی دیبی بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان سب سے افضل اور اکمل ہے۔

"میں اپنی خودی کے علاوہ کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔
میں اس بوسیدہ سماج کا دشمن اور اسکے لئے خطرۂ عظیم ہوں۔
میں خدا ہوں! میں حقیقی معنوں میں مکمل ترین انسان ہوں۔"

نذر الاسلام کی شاعری امید اور اُمنگ کا پیغام ہے۔ چونکہ ابھی تک [illegible] شاعر زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا رونا روتے آئے [illegible]۔ اس لئے اُس کی شاعری نے بنگال کو ایک نیا زاویۂ فکر اور ایک جدید خیال دیا جس نے نا امیدی کو امید، یاس کو اُمنگ اور قنوطیت کو رجائیت میں بدل دیا جس نے شاعری کی مُردہ رگوں میں زندگی کا [illegible] دوڑا دیا۔ اُس سے پہلے کے شاعروں کا خیال تھا کہ [illegible] موت کے بعد مل سکتی ہے۔ لیکن کبیر داس کے بعد نذر الاسلام ہی نے اس بات کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ جو شے زندگی میں نہیں مل سکی وہ موت کے بعد کیونکر مل سکتی ہے۔ اُس نے "اطنی شاعری" [illegible] کے تار و پود کو جلا کر اُس کی گرمی اور حدت سے انقلابی شراب تیار کی جس سے آج میخانے جھوم رہے ہیں۔

نذر الاسلام نے کبھی دوئی کا پردہ اُٹھانے کی کوشش نہ کی وہ اسے سعیٔ لاحاصل، بیکار مشغلہ، اور فلسفہ دانی تک ہی محدود خیال کرتا ہے اسکے مقابلے میں زندگی کے حقائق کو سلجھانا اور سمجھنا اس کا محبوب ترین شغل ہے۔ اسی لئے اُس نے صرف دُنیوی زندگی اور اسکے مسائل سمجھنے سمجھانے میں اپنی تمام تر کوشش صرف کی۔

زندگی اور اُس کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے
۲۴۷ یہی دیکھا کہ ایک طرف انسانوں کی اکثریت جہالت اور افلاس میں گھٹ رہی ہے اور دوسری طرف اُس کی محنت کا پھل چند آرام طلب ہضم کر رہے ہیں۔ ایک طرف جنت بوس محل کھڑے کئے جا رہے ہیں دوسری طرف ہزاروں جھونپڑیوں کے اندر اپنی بھوک کی آنتیں مسوسے پڑے ہیں۔ نذر الاسلام ست یہ زبوں حالی اور نا انصافی نہ دیکھی گئی۔ اور "باغی" انہیں خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

اکرام قمر۔ بی۔ اے

روما کے سیاسی افکار

(۱) یونان کی بجائے روما

افلاطون اور ارسطو سے زیادہ متضاد و متباین دو بلند پایہ مفکر تلاش کرنا محال ہے ۔ ایک فلسفی اور استنباطی (کسی کلیہ سے جزئی نتیجہ اخذ کرنے والا) تھا، دوسرا سائنسی اور استقرائی (جزئی مثالوں سے کلی نتیجہ اخذ کرنے والا) ۔ ایک ترکیبی (متفرق خیالات کے ربط اور ترتیب سے کوئی نظریہ قائم کرنے والا یا متعدد نظریوں کو ربط دیکر نظام فلسفہ بنانے والا) تھا، دوسرا تحلیلی (کسی چیز کا تجزیہ کرکے اُسکے عام اصول معلوم کرنے والا) ایک داخلی (اشیا اور خیالات کو اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ صناع کے نقطۂ نظر اور ذاتی رجحانات کے مطابق پیش کرنیوالا) تھا، دوسرا خارجی (اشیا اور خیالات کو اصلی و حقیقی رنگ میں دیکھنے اور بیان کرنیوالا)۔ ایک

۲۴

خیال پرست تھا، دوسرا حقیقت پسند۔ ایک کے نزدیک عقل زندگی کی بلند ترین رہبر ہے، دوسرا جبلّت کا قائل ہے ۔ ایک کا خیال ہے کہ فلسفیوں کے ہاتھوں سے سماج اور ریاست میں اعتدال و ترمیم کی جا سکتی ہے ۔ دوسرا رواج، عادات اور روایات کو مستقل اور ناقابلِ تغیر سمجھتا ہے ۔ مگر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یونانی شہری ریاست ایک معیاری طرزِ حکومت ہے ۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے وقت کی یونانی شہری ریاست ایک معیاری طرزِ حکومت ہے ۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے وقت کی یونانی شہری ریاست کے بہت سے بیرونی اور اندرونی طاقتور دشمن ہیں ۔ دونوں کا یہ اعتقاد ہے کہ تعلیم سے ـــ ایسی تعلیم شہریت سے جو علم اور راستبازی میں اضافہ کرے ـــ شہری ریاست کی اصلاح اور تحفظ ہو سکتا ہے ۔

لیکن ان کا یونانی شہری ریاست کا نظریہ غلط تھا ۔ اس کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ بین الاقوامی شہنشاہیت نے لے لی تھی ۔ ارسطو نے خود ان لوگوں کی تربیت میں مدد کی تھی جن کے ہاتھوں بعد میں یونانی آزادی کا خاتمہ ہوا ۔ اور مغرب میں پہلی عالمگیر حکومت کا قیام عمل میں آیا

یونانی شہری ریاست کے زوال کی فوری وجوہات مندرجہ ذیل تھیں:۔

(۱) اندرونی سخت بدعملی ۔ اسکی ارسطو فینز نے اپنی طربیات میں انتہائی مذمت کی ہے ۔

(۲) بڑی ریاستوں نے چھوٹی ریاستوں پر وحشیانہ مظالم کئے اس سلسلہ میں وہ جبر و استبداد خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو ایتھنز والوں نے ایگیئن شہروں پر کیا اور سپارٹا نے پیلو پونیشین شہروں کے ساتھ اور تھیبز کی حکومت نے بیوشین شہروں کے ساتھ روا رکھا ۔

(۳) بڑی بڑی ریاستوں کا باہمی جنگ و جدل ۔ خصوصاً ایتھنز اور سپارٹا (۴۳۱-۴۰۴ ق۔م) کی پیلو پونیشین جنگ ۔ اور

(۴) مقدونوی حملہ اور فتح جو ۳۳۸ ق۔م کی جنگ کیرونیا میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے ۔

مگر زوال کی ان فوری وجوہات کے علاوہ یونانی شہری ریاست کی ساخت ہی میں بہت سے عیوب موجود تھے جنہوں نے یہ بات ناممکن و ناپسندیدہ بنادی تھی کہ اس ریاست کو انسانی تنظیم کی آخری صورت سمجھتے ہوئے زندہ رہنے دیا جائے ۔ یونانی شہری ریاست بہت ہی چھوٹی، بہت ہی الگ تھلگ، بہت ہی خود غرض، بہت ہی جھگڑالو، بہت ہی مستبد، فرقہ بندیوں میں بہت ہی بُری طرح جکڑی ہوئی، بہت ہی غیر مستحکم، اور غلامی کے ادارے کے ساتھ بہت ہی بُری طرح جکڑی ہوئی تھی ۔ اس لئے بقائے دوام کے خداوندی انعام کی یہ مستحق نہ تھی ۔

یہ جگہ اُس مشہور کہانی کے بیان کے لئے موزوں نہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ فلپ شاہِ مقدونیہ نے کس طرح یونانیوں کو تاخت و تاراج کیا اور اسکے بیٹے اسکندر اعظم نے (۳۳۶-۳۲۳ ق م) کس طرح مقدونوی شہنشاہی قائم کی ۔ صرف یہی بتلا دینا کافی ہے کہ تیرہ سال کی مسلسل و محیر العقول جنگوں کے بعد اسکندر اعظم ایک ایسی حکومت کے قیام میں کامیاب ہو گیا جو ایڈریاٹک سے لیکر جزائر شرق الہند تک دُنیا

ایشیا جون جولائی ۱۹۶۳ء

کے مشرق و مغرب کو محیط تھی۔ جہاں تک یونانیوں کا تعلق ہے اس حکومت کے قیام کی دو وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ یونانی شہری ریاستوں کی آزادی سلب ہو چکی تھی اور وہ ایک وسیع فوجی شہنشاہی کی بلدیات بن گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یونانی تہذیب دُنیا کے اُن دور دراز خطوں تک پہنچ چکی تھی جہاں کسی یونانی کے ابھی تک قدم بھی نہ گئے تھے۔ یونانی اور بربری کا غیر منصفانہ فرق ختم ہو چکا تھا۔ مشرق نے یونانی تہذیب کو اپنا لیا تھا اور یونان نے ایک عالمگیر صورت اختیار کر لی تھی۔

اندریں حالات آزاد شہری ریاست کا یونانی سیاسی نظریہ متروک اور بے محل ہو گیا۔ شہر میں سے بہتر زندگی مفقود ہو گئی۔ شہری کے لئے سیاسی زندگی میں کچھ جاذبیت باقی نہ رہی۔ ریاست اور فرد کی ہم آہنگی جاتی رہی۔ غیر ملکی اور دُور دراز کی ایک شہنشاہیت نے غلام دُنیا کی زندگیاں اور قسمتیں ناقابلِ تعرض طریقہ پر ختم کر ڈالیں۔ ریاست کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا۔ مگر شخصی دائرہ مختصر اور محدود ہو گیا آزادی اور خود مختاری جاتی رہی اور زندگی میں سیاسیات کیساتھ زیادہ دلچسپی باقی نہ رہی۔

یونانی سیاسی نظریہ نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کس طرح تبدیلیاں اختیار کیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ایسے سیاسی مفکر تھے جنہیں یا تو یہ تبدیلیاں دکھائی ہی نہ دیتی تھیں اور یا وہ انہیں دیکھنے سے انکار کرتے تھے۔ وہ یہی لکھ رہے تھے کہ شہری ریاست کو اسکندر کے جانشینوں کے عہدِ حکومت میں بھی وہی آزادی حاصل ہے۔ جو ایرانی جنگوں کے زمانہ میں موجود تھی۔ ہرقلیدس اور پونٹیکس کی قسم کے فلاطونیوں اور طیوفرسطس کے سے ارسطاطالیسیوں کے درمیان ابھی تک ریاست اور فرد، اشتمالیت (مال کو قوم کی مشترکہ ملک بنانے کا اصول جس کی رو سے ہر فرد کو حسب قابلیت اور حسب ضرورت حصّہ دیا جائے) اور شخصی ملکیت، اور اشرافیت و جمہوریت کی قسم کے مسائل پر بحث جاری تھی۔ ان فرسودہ فلسفیوں کی قدامت پسندی کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ یہ حقائق کے مقابلہ کے لئے تیار نہ تھے۔ یونان کے علم السیاسیات صرف فلسفۂ ریاست ہی پر مشتمل نہ تھا۔ یونانیوں کے نزدیک ریاست، سماج فرد اور دیوتا ایک دوسرے سے وابستہ اور متشابہ تھے۔ چنانچہ ان کا علم سیاست موجودہ علم سیاست سے زیادہ وسیع تھا اور فلسفۂ حیات، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور دینیات کو محیط تھا۔ یونانیوں کا کوئی مندر ریاست سے جُدا نہ تھا اور ان کا کوئی بھی مذہب سیاسیات سے علیحدہ نہ تھا۔ اس لئے ان کی تمام تر سماجی، اخلاقی اور مذہبی سرگرمیوں کے لئے جنہیں آج کل سیاسیات سے علیحدہ ادارے سمجھا جاتا ہے شہری ریاست ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ شہری ریاست کا نظریہ صدیوں سے رائج تھا اور اس کا اثر بڑی مشکلوں کے بعد زائل ہوا۔

شب گرفتہ اور ظلمت پسند فلاطونیوں اور ارسطالیسیوں کے علاوہ چند اشخاص ایسے بھی تھے جو حقائق کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور سیاسی فلسفہ کو اسکندری عہد سے بعد کے واقعات کے مطابق ڈھالنے کے خواہشمند تھے۔ ان میں سے اپیکیوریسی (یونانی حکیم اپیکیورس سنہ ۳۰۶ ق م کے پیرو۔ اس حکیم نے انسانی افعال کا منتہائے مقصود حصولِ لذت قرار دیا تھا) اور رواقی (رواقیت[1] کا فلسفہ زنیو نے سنہ ۳۰۰ ق م میں ایتھنز میں قائم کیا تھا۔ اس میں صرف نیکی زندگی کا مقصد قرار دی گئی تھی اور جذبات کو ضبط کرنے اور لذت والم کے احساس سے آزاد ہو جانے کی تعلیم دی جاتی تھی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں مگر اس سے پہلے ہم یہ بتلا دینا چاہتے ہیں کہ اسکندر اعظم نے جو شہنشاہی قائم کی تھی چونکہ وہ اسے مستحکم و مضبوط نہ کر سکا تھا اس لئے اسکی موت کے جلد ہی بعد اس کے حصّے بخرے ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک اس سلطنت کے تین بڑے بڑے حصوں۔ مقدونیہ، شام اور مصر نے اپنا ایک کمزور مگر علیحدہ وجود قائم رکھا۔ لیکن آخرکار یہ سب۔ مقدونیہ ۱۴۶ ق م میں، شام ۶۴ ق م میں، اور مصر ۳۰ ق م میں رومی حکومت کے ماتحت آگئے۔ یونان بھی مقدونیہ کے ساتھ ہی روما نے فتح کر لیا۔ درحقیقت روما ہی اسکندر کا صحیح جانشین اور اس کی حکمت عملی کا صحیح پیرو تھا۔ روما بھی مقدونیہ کی طرح یونانی اثر قبول کر چکا تھا اسکی تہذیب یونانی تھی۔ اسکی تہذیب یونانی تھی۔ اسکی زبان، اس کا ادب اور قانون، اسکے فنونِ لطیفہ اور سیاسی نظریات ——— سب کے سب اُسی تمدن سے متاثر ہوئے تھے۔ جس کا منبع ایتھنز اور مبلغ اسکندریہ تھا۔

(۲) اپیکیوریسی اور رواقی

اپیکیوریسیوں اور رواقیوں کو اس امر کا اعتراف تھا کہ کسی وقت آزاد شہری ریاست کا نظریہ کامیاب تھا۔ لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ وہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے اور سیاسی زندگی میں ہر اچھے شہری کے لئے کشش نہیں رہی۔ ان کا خیال ہے کہ ریاست اور فرد کی ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے اور دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک اچھی زندگی کا مطلب سیاسی مسائل سے گریز و اجتناب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خیالات کا اقرار اپیکیوریس (سنہ ۳۴۰-۲۷ ق م) اور رواقی مکتبِ خیال کے بانی زینو (سنہ ۳۴۰-۲۶ ق م) دونوں کے لئے آسان تھا کیونکہ ایتھنز کو اگرچہ انہوں نے وطن بنا لیا تھا اور دونوں یہیں تعلیم دیتے تھے مگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی شہری ریاست کا باشندہ نہ تھا۔ اپیکیوریس جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ اُنیس سال کی عمر میں ایتھنز چلا آیا۔ اور فلاطونی مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ اُس وقت افلاطون کی وفات کو چھبیس سال ہو چکے تھے اور سکندر کے درخشاں مگر عارضی عہدِ حکومت کے المناک خاتمہ کو ایک سال گزر چکا تھا۔ زینو اس سے بھی زیادہ دور دراز علاقہ

۴۶ کا تھا۔ اسکے باپ کا نام نونیشئین اور اس کا وطن سائپرس تھا۔ اسکے ذریعے یونانی فلسفہ میں ایک خاصہ مشرقی عنصر داخل ہو گیا۔ اپنی سیاسی تحقیق کے دوران میں اس نے شہری ریاست کو چھوا تک نہیں۔

اپیکیوریس نے افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو ترک کر کے انفرادیت (اس نظریہ کی رو سے فرد کو ہر طرح کی آزادی ہونی چاہیے) کو قبول کیا۔ اور سوفسطائیوں کے مذہبِ لذتیت (یہ عقیدہ کہ انسان کا مقصدِ زندگی حصولِ لذت ہے) اور فلسفۂ افادیت (یہ اصول کہ جو کام اپنے لئے مفید ہو وہی اچھا ہے) کی طرف رجوع کیا۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ صرف فرد کی شخصیت ہی اہمیت رکھتی ہے، مسرتِ زندگی کا منتہا ہے اور ریاست اس مسرت کے حصول کا صرف ایک ذریعہ ہے ریاست ایک مصنوعی چیز ہے جس کی بنا معاہدۂ عمرانی یا رسم و رواج پر ہے۔ قانون کا مقصد محض افادی ہے۔ انصاف کی کوئی خارجی زندگی نہیں۔ مذہب صرف ایک من گھڑت افسانہ ہے جو انسانیت پر زبردستی ٹھونسا گیا ہے۔ اگر حکومتیں اتنی مضبوط اور مستحکم ہوں کہ وہ امن و امان قائم کر کے ایک فرد کو حصولِ مسرت کے لئے کوشاں ہونے کے قابل بنا سکیں تو ان کی اقسام ناقابلِ توجہ ہیں۔ اپیکیوریسی معاملاتِ عامہ میں بالکل دخل نہیں دیتا اور اس کا رجحانِ طبع صرف اپنی ذات کیلئے راحت و آرام حاصل کرنے کی طرف ہے۔ اُس کے مسلک کو بالکل بُرا نہیں کہا جا سکتا استکمالِ نفس، نفس پرستی کے مترادف نہیں۔ مگر اپیکیوریسیت کا عملی نتیجہ عموماً بدترین بداخلاقی اور سماجی فرائض سے مکمل انکار ہوا ہے۔ چنانچہ اپیکیوریسیت رومیوں کیلئے چنداں جاذبِ نظر ثابت نہیں ہوئی کیونکہ ان کی روایات کی وجہ سے سماجی فرائض کا احساس انکی گھٹی میں پڑا تھا۔ مگر لیوکریشیس کی مشہور نظم اور ہوریس کے مختلف اشعار ہی لاطینی علم ادب میں اپیکیوریسی فلسفہ کی تائید کرتے ہیں۔

رواقیت نے روما میں بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی ـــ جتنی مقبولیت اس نے یونان میں حاصل کی تھی اُس سے بھی زیادہ ـــ یہ ایک عمدہ، بلند اور سخت گیر مسلک تھا۔ اس نے سینیکا اور مارکس آریلیئس کے سے سلطنتِ روما کے بلند دماغوں کو بھی اپنا سرگرم حامی بنا لیا تھا۔ یہ مسلک عیسائیت سے بہت ملتا جلتا تھا اور اس نے سینٹ پال کی تبلیغ کیلئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ رواقیوں نے حصولِ مسرت کی بجائے فرض کی ادائگی کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا۔ وہ تسکین و امن کے متلاشی تھے مگر اپنی تمام تر خواہشات کی تکمیل کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی خواہشات کو کم کر کے ان کے نزدیک زندگی نفس کشی اور ریاضت کا نام ہے اور خارجی معاملات چنداں اہم نہیں کسی شخص کا غلام یا مطلق العنان شہنشاہ ہونا ان کے لئے کچھ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ یہ مسلک نہ تو انفرادیت پسند تھا، نہ قومی اور نہ بین الاقوامی۔ بلکہ ایک صلح کل مشرب تھا۔ اسکے خیال کے مطابق تمام انسان ایک واحد اور ناقابلِ تقسیم اکائی ہیں۔ رواقی ایک آدمی کو شہروں کی مخلوق نہیں سمجھتا بلکہ ایک ہم نسل قوم کا رکن سمجھتا ہے۔ وہ مساوات کا قائل ہے اور ریاست کو صرف اسی وقت قدرتی سمجھتا ہے جب یہ عالمگیر ہو ـــ جیسا کہ سلطنتِ روما کی آرزو تھی۔ اگر ریاست محدود اور قطعہ واری ہو تو وہ ریاست اسکے نزدیک محض بناوٹی اور رسمی ہے۔ وہ قانونِ قدرت کا قائل ہے جو مستقل اور اٹل ہے اور جس کے احکام تمام دنیوی قوانین سے

فوقیت رکھتے ہیں۔ وہ انصاف کو قانونِ قدرت کا ایک حکم سمجھتے ہوئے اُس کی تعظیم کرتا ہے اور اُسے خارجی، دائمی، غیر متغیر اور عالمگیر سمجھتا ہے۔ اُسکے نزدیک مذہب کا مطلب نفسِ ناطقہ کی اطاعت اور ہر اُس فرض کی کماحقہٗ آدائگی ہے جسے ضمیر لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قدرت اور قوانینِ قدرت کی تہہ میں نفسِ ناطقہ ہی کارفرما ہے۔ دیوتاؤں کا وجود یا عدم وجود اسکے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر ان کا کوئی وجود نہیں ہے تو وہ ان کے بغیر بھی گزارہ کرسکتا ہے۔ اگر ان کا کوئی وجود ہے تو وہ جو سزا اُسے دیں وہ بھگتنے کیلئے تیار ہے۔

جن لاطینی رواقیوں نے سیاسی تحقیق و مطالعہ کیا ہے اُن میں سینیکا (۳ ق م ۔ ۶۵ سنہ ء) کو عظیم ترین اور ناقابلِ انکار حیثیت حاصل ہے۔ پیشتر ازیں کہ ہم اس کا اور اسکے بعد آنے والے اہم رومی فقہا کا جو تقریباً سب کے سب رواقی ہیں ذکر کریں اُن دو مفکروں کے سیاسی نظریات کا مطالعہ لازمی ہے جو اُس سے پہلے ہوگزرے ہیں۔ یعنی پولیبیئس (۲۰۴-۱۲۲ ق م) اور سسرو (۱۰۶-۴۳ ق م) موخر الذکر کچھ حد تک رواقی فلسفہ کے زیر اثر تھا۔

(۳) روما کے سیاسی مفکرین

روما کا پہلا سیاسی مفکر پولیبیئس تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ بھی یونانی تھا۔ وہ سولہ سال تک (۱۶۷-۱۵۱ ق م) روما میں ایکیائی جمعیتہ (......) (ACHALAN LEAGNE) کے یرغمال کے طور پر رہا۔ اس قیام کے دوران میں وہ رومی طرزِ حکومت کا مدّاح اور رومی عروج کا راز معلوم کرنے کا مشتاق ہوگیا (یہ یاد رہے کہ روما ایک زمانہ میں شہری ریاست تھی جسے ایتھنز یا سپارٹا پر کچھ فوقیت حاصل نہ تھی) کیونکہ اسکے برعکس یونان کی شہری ریاستیں بہت بُری طرح ناکام ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے تاریخ روما کا غائرانہ اور مفصل مطالعہ کیا۔ اسکے بعد اس نے ایک گراں بہا اور یادگار کتاب لکھی جس میں اُس نے کارتھیجی جنگوں کے آغاز سے لیکر اپنے زمانہ تک کے تعجب انگیز طور پر بڑھتے ہوئے رومی وسعت و اقتدار کے مختلف مدارج بیان کئے اپنی اس تاریخ کے ایک باب (کتاب ششم) میں اُس نے اُن اصولوں کے فلسفیانہ تجزیہ کی کوشش کی ہے جنہوں نے رومی آئین کو عدیم النظیر طریقہ پر مستحکم اور مضبوط کردیا تھا۔ ارسطو نے ریاست کو بادشاہت اشرافیت اور جمہوریت میں تقسیم کیا ہے۔ اس تقسیم سے پولیبیئس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان ہر سہ اقسام کا اختلاف اندرونی اور اصولی نہیں بلکہ بیرونی اور ادارہ کا ہے اور یہ اختلاف متضاد قوتوں کی بنا پر ہے متضاد اصولوں کی بنا پر نہیں۔ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان تینوں میں سے کسی کی بھی اصلی حالت مستقل طور پر قائم نہیں رہتی وہ یہ دکھاتا ہے کہ یونان میں ریاست کی شکل و صورت میں ایک انقلابی تغیر و تبدل باقاعدگی اور تیز رفتاری کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔ اس تغیر و تبدل نے مندرجہ ذیل دائرہ کی صورت اختیار کر لی ہے:۔

بادشاہت ۔ استبدادیت ۔ اشرافیت ۔ عدیدیت ۔ جمہوریت اور حکومت انبوہ ۔ اس کے بعد پھر بادشاہت وجود میں آتی ہے اور یہی دائرہ پھر بنتا ہے ۔

اسکے نزدیک رومی قوت و استحکام کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آئین میں ریاست کی تینوں قسمیں متوازن طور پر باہم مخلوط ہوگئی ہیں ۔ قنصل بادشاہت کے اصول کے مظہر ہیں۔ ایوانِ اعلیٰ اشرافیت اور ایوانِ زیریں جمہوریت کے اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ آئینی نظام میں اس نے سب سے ۲۷
پہلے مزاحمت و توازن کا نظریہ شامل کیا۔ اسکے نزدیک ریاست ایک نامیاتی نظام (یعنی ریاست کسی طبیعی حرکت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس نے مختلف ذریعوں سے نشوونما پائی ہے) نہیں ہے بلکہ ایک میکانکی اختراع (یعنی ریاست محض طبیعی حرکت کا نتیجہ ہے اور بغیر کسی شعوری ارادے کے خود بخود نمودار ہوگئی ہے) اور متضاد قوتوں کی ترتیب و انضباط ہے ۔

پولیبیئس روما کے جس استحکام و توازن کا ثناخواں تھا اس کی زندگی ہی میں اُس کی جگہ جھگڑوں اور ہنگاموں نے لے لی تھی۔ گراچی (۱۳۳ ق م) کی شورشوں نے اشرافیت اور جمہوریت کے درمیان جس صد سالہ جنگ کا آغاز کیا تھا اس کا نتیجہ جمہوریت کا زوال اور شہنشاہیت کا قیام ہوا۔ سسرو کی تصانیف پولیبیئس سے ایک صدی بعد کی ہیں اس زمانہ میں جولیئس سیزر اپنی فاتح فوج کی مدد سے روما میں ایک شہنشاہی آمریت قائم کررہا تھا۔ سسرو ایک سرگرم جمہوریت پسند تھا اور سیزر

سے متنفر و خائف تھا۔ وہ ایوانِ اعلیٰ کی عزت اور مجسٹریٹوں کی قوت کے دوبارہ قیام کا خواہاں تھا۔ اپنی کتابوں "جمہوریت" اور "قوانین" میں اس نے ان وجوہات کا جائزہ لیا ہے جو پولیبئس کے خوش اقبال زمانہ کے بعد ہی سے جمہوریت کے المناک زوال کے لئے کوشاں ہو گئی تھیں۔ پولیبئس توازن کو استحکام کی بُنیاد قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت سسرو نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسکے وقت کی شورشیں اور مصیبتیں اس وجہ سے ہیں کہ جمہوری عنصر کو بہت زیادہ قوت دیدی گئی ہے۔ ایک ایسی قوت جس کا ماریس اور سیزر کے سے مقرروں نے ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے۔ سسرو رومی جمہوریت اور اس کے آئین کی خوبیوں کی تعریف میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتا ہے۔ عملی مقاصد کیلئے وہ رومی قانون ـــ جو انصاف و معدلت کے اصولوں کے لحاظ سے مضبوط ہے ـــ کو رواقی قانونِ قدرت کے مترادف قرار دیتا ہے یہ امر واقعہ ہے کہ علمِ سیاست پر یہ اس کا اہم ترین احسان ہے، کیونکہ یہ نظریہ قانونِ قدرت کو آسمانوں پر سے زمین پر لے آتا ہے اور اسکے آزادی، مساوات اور اخوت کے اصولوں کو بنی نوعِ انسان میں پہلی

۲۸ دفعہ رائج کرتا ہے۔

ایک ادبی شخص کیلئے ایک ریاست کا بچانا ناممکن ہے چنانچہ سسرو نے سیزر اور اسکے بھتیجے آغسطس کی مخالفت کرکے اپنے ہی قتل و بربادی کا سامان پیدا کیا۔ رومی جمہوریت کی جگہ ایک شہنشاہیت نے لے لی تھی۔ اسکے اوّلین اور بدترین بادشاہوں میں ایک نیرو نامی بھی ہوا ہے۔ آٹھ برس تک (سنہ ۵۴-۶۲ ق م) اسکا اتالیق سینیکا اس کا وزیر رہا۔

نیرو کی وزارت کا عہدہ رواقی دبستان (SCHOOL THONG)[HT] کے سخت ترین پابند فلسفی کیلئے ایک سخت آزمائش تھی۔ تخیّل اور حقیقت میں بُعدالمشرقین کی وجہ سے یکجہتی ناممکن تھی۔ ایک طرف تو رواقی فلسفہ کی تعلیم تھی کہ دورِ جاہلیہ کا غیر ترقی یافتہ اور جاہل انسان بھی معصوم اور مسرور تھا، اس دور میں قانونِ قدرت ہر شخص کی گھُٹّی میں پڑا ہوا تھا ہر شخص اسکی اطاعت کرتا تھا اور قانونِ قدرت نے اس دور میں کافی ضبط و نظم قائم کر رکھا تھا، نہ شخصی ملکیت تھی، نہ غلامی اور نہ کوئی حکومت، بلکہ آزادی، مساوات اور اخوت کا دور دورہ تھا۔ دوسری طرف نیرو کی شہنشاہیت تھی جس میں غیر معمولی بدعملی، عظیم ترین جرائم، وسیع مصائب جبر و تشدد، عدمِ مساوات، کثیر ترین غلامی اور خوفناک عداوتیں خانہ جنگی کا باعث ہو رہی تھیں۔ اگرچہ یہ بادشاہت بُری تھی، مگر اُس نراجی ابتری سے اچھی تھی جو اس حکومت کے خاتمہ پر یقینی تھی۔ اس لئے سینیکا اور اسکے سے دوسرے اشخاص اس شہنشاہیت کے حامی و معاون تھے انہیں اس امر کا احساس تھا کہ انہیں دو بُرائیوں میں سے ایک بُرائی منتخب کرنا ہے ـــ استبدادیت یا فوضویت (فوضویت کو نراج بھی کہا جاتا ہے ـــ اس نظام میں کوئی حکومت نہیں ہوتی اور ہر شخص بذاتِ خود اپنے لئے قانون ہوتا ہے۔ انارکزم اسی کا نام ہے) ـــ اور وہ اوّل الذّکر کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ استبدادیت میں ضبط و نظم قائم رکھا جا سکتا تھا اور یہ پایانِ کار مزاج سے کم جابر تھی لیکن زمانہ کے حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور ان میں کسی قسم کی اصلاح کی امید نہ تھی۔ اس لئے اس رواقی (سینیکا) نے عزلت نشینی اختیار کر لی اور موت کا انتظار کرنے لگا کہ وہ آکر اسے ان جھمیلوں سے خلاصی دلائے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رواقیوں کے نزدیک اُس معیاری طرزِ حکومت میں جو دورِ جاہلیت میں قائم تھی (اگر انسان اچھے بن جائیں تو یہ نظامِ حکومت دوبارہ بھی قائم ہو سکتا ہے) اور عملی طرزِ حکومت میں (جو انسانی کمزوریوں اور غلطیوں کا لازمی نتیجہ ہے) جو اختلاف ہے وہ عیسائی اسقفوں کیلئے اس وقت بہت مفید ثابت ہوا۔ جب انہیں احکامِ اناجیل کو نئے عیسائی شدہ متذبذب بزنطینی شہنشاہوں کے اعمال و افعال کے مطابق ڈھالنا پڑا۔

سینیکا کے ہمعصر فقیہوں اور اسکے بعد قسطنطین (سنہ ۳۰۶-۳۳۷ء) کے زمانہ تک کے متعدد فقیہوں نے ـــ جو تقریباً سب کے سب رواقی تھے ـــ فلسفہ کے اصولوں کو رومی قوانین پر عائد کیا۔ انہوں نے قانونِ قدرت کے رواقی نظریہ کو ـــ یہ قانونِ قدرت دراصل تعلیم یافتہ ضمیر اور عقلِ سلیم کے احکام پر مشتمل ہے ـــ روما کے شہری قانون کو بلند و مطہّر اور بین الاقوامی قانونِ جنگ کو وسیع کرنے کیلئے استعمال کیا۔ قانونِ قدرت کے اصولوں نے غلامی کی سختیوں اور پابندیوں میں تخفیف اور نرمی کر دی جیسا کہ البین نے... کہا ہے:۔ قانونِ قدرت کے مطابق ہر انسان ایک دوسرے کے برابر ہے۔" قانونِ قدرت نے جنگی دشمنوں کو کم، خانگی زندگی کو بلند اور ملکیت کو عام کیا اور یہ اہم اصول پیش کیا کہ شہنشاہی قوت کا منبع جمہور ہیں۔ (زیدہ...

سید مظفر برنی

اردو شاعری کے نئے میلانات

زمانہ اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب زمانہ سے متاثر ہوتا ہے اور زمانہ ادب سے اثر قبول کرتا ہے۔ ادب زمانہ کا آئینہ ہے۔ تو زمانہ ادب کا پرتو ہوتا ہے۔ ادب زمانہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اور زمانہ ادب کا دامن نہیں جھٹک سکتا۔ اسی لئے کسی زمانہ کے ادب کا جائزہ لینے کے لئے اس وقت کے مخصوص حالات اور رجحانات پر نظرِ غائر ڈالنا ضروری ہے۔

آج بیسویں صدی میں دو زبردست رجحانات کرۂ ارض پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک اشتراکیت دوسرا جمہوریت۔ اول الذکر انیسویں صدی کے صنعتی دور اور اسکے نتیجے سرمایہ دارانہ نظام کے ردعمل کا نتیجہ ہے اور مؤخر الذکر بنی نوعِ انسان کے خواب آزادی کی مبہم سی تعبیر ہے۔ ان دونوں رجحانات کا اثر عالمگیر ہے۔ اشتراکیت اور جمہوریت کی انتہا پسند صورت یہ ہے کہ یہ دونو "قدیم" کے خلاف "جدید" کی حامی ہیں۔ گویا رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی مکمل ضد ہیں۔ یہاں تک کہ ہر وہ اچھی یا بری چیز جو کسی صورت سے بھی زمانۂ ماضی سے منسوب ہے زمانۂ حال کی ان تحریکوں کی زد میں آجاتی ہے۔ جنگِ عظیم نے ان تحریکوں کو ایک نیا جوش، ایک نئی سرگرمی اور ایک نئی زندگی بخشی لیکن ہر تحریک ایک ایسے دور سے گزرتی ہے جب ترقی پسند قوتیں ... (REVOLUTIONARY FORCES.) رجعت پسند قوتوں (REACTIONARY) سے برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ دونو ایک دوسرے کی ٹکر کی ہوتی ہیں۔ اس لئے جلد ایک دوسرے پر غالب نہیں آسکتیں۔ اس وقت بنی نوع انسان ایک تذبذب کے عالم میں ہوتے ہیں۔ چونکہ کوئی فریق کامران و کامیاب نہیں ہوتا اس لئے وہ آگ پانی کی سی مخالف فریقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے کبھی وہ مُڑ کر اسی راستے کو دیکھتے ہیں۔ جس سے یہاں تک آئے ہیں۔ اور کبھی ایک امید افزا شوق اور ایک شوق افزا امید کے ساتھ نئے راستے پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے زمانہ کی ہو بہو ایسی ہی کیفیت ہے۔ آمریت جو ملوکیت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جمہوریت سے برسرِ پیکار ہے۔ سرمایہ داری اشتراکیت سے دست و گریباں ہے ایک عام بے اطمینانی اور بے چینی کا عالم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بے تحاشہ دوڑتے ہوئے تھک گئی ہے۔ اور پھر کبھی حالتِ جمود سے اُکتا کر دوڑنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک ہیجان ایک اضطراب ہے بے تحاشہ دوڑنے پر اکساتا ہے۔ لیکن پھر ایک قسم کی افسردگی اور دل برداشتگی ہمارے قدم پکڑ لیتی ہے۔ تاریکی دور ہوتی جاتی ہے۔ دور بہت دور افق پر ایک نئی صبح کے انوار نمایاں ہیں۔ خدا جانے یہ صبح کاذب ہے یا صبح صادق۔ آنکھوں پر سے غفلت کے پردے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اعتقاد عقل کے سامنے سر جھکا رہا ہے۔ مسلمہ باتیں تنقید کی کسوٹی پر پرکھی جا رہی ہیں۔ حتیٰ کہ خدا کا عدم یا وجود بھی معرض بحث میں پڑ گیا ہے۔ غرضیکہ یہ "دورِ طلسم شکنی" (DISILLVSION MENT.) ہے۔

جب ہم اُردو کی جدید شاعری پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شعر و ادب بھی رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہا ہے اگرچہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ تمام جدید شاعری کا ماحصل یہ ہے کہ یہ زندگی اور فطرت سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اُردو شاعری الفاظ سے کھیلتی تھی۔ پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ جذبات و احساسات سے بھی کھیلنے لگی۔ لیکن اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہماری شاعری زندگی اور فطرت دونو سے کھیلتی ہے۔ زندگی اور فطرت جو خود ایک کھیل ہیں۔ پہلے شاعری زندگی کا ایک کھیل سمجھی جاتی تھی۔ اب زندگی شاعری کا کھیل بن گئی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہماری زندگی انفرادی تھی۔

لیکن بیسویں صدی میں ہماری زندگی انفرادی کی بجائے اجتماعی ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی شاعری کا داخلی پہلو (SUBJECTIVE)

ب ھا اور جدید شاعری دا ں

پہلو خارجی پہلو سے ہم آہنگ ہے - بلکہ جدید شاعری داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین سنگم ہے - ہماری انفرادی زندگی صرف جذبات و احساسات کا نام ہے لیکن اجتماعی زندگی سیاست، اقتصادیات اور معاشرت وغیرہ سے عبارت ہے - اسی لئے آج حریم سخن میں سیاست، معاشرت، مدنیت وغیرہ بھی باریاب ہیں -

وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تصوّرات بھی بدل گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری میں زندگی کے نئے تصوّرات، سیاست کے نئے عقدے تمدّن کے نئے مسائل، قوم و ملک کی بہبودی کے نئے نظریے دعوتِ فکر دے رہے ہیں - میں اُردو شاعری کے اس دور کو "انقلابی دور" کہونگا - نہ صرف زبان و بیان بلکہ موضوعات و مضامین میں ایک زبردست انقلاب ہو گیا ہے ہماری شاعری پُرانی مسموم فضا چھوڑ کر ایک نئی کُھلی فضا میں سانس لے رہی ہے - غرض یہ ہے کہ شاعری کا نہج بدل کر رہ گیا ہے - اس ڈرامائی تغیر و تبدّل کا اندازہ مندرجہ ذیل شعروں سے ہوگا - غالب کا ایک شعر ہے ؎

۴۰

نے تیر کماں میں ہے نے صیّاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ شعر نہ صرف اس وقت کی عام ذہنیت کا آئینہ دار ہے بلکہ روحِ عصر کا بھی ترجمان ہے - آج زمانہ اور ماحول بدلنے سے یہی مضمون اس سانچہ میں ڈھل گیا ہے ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں تاک میں نہ ہو صیّاد (اقبالؒ)

زندگی کی مردانہ جدوجہد جو ہمارے زمانہ کا مسلک ہے - اس شعر سے نمایاں ہے - دیکھئے ہماری شاعری اجتماعی زندگی سے کتنی قریب آچکی ہے اور زمانہ کے اثرات کہاں تک قبول کر رہی ہے ؎

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے آشیاں اپنا[1]
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے (اصغر گونڈوی)

[1] اصغر صاحب جدید شعراء میں سے تو نہیں ہیں - !؟ وہ صوفی شاعر ہیں اور قدیم دقیانوسی متلوّنانہ خیالات ان کی شاعری کی جان ہیں - ادارہ

وہی قفس وہی آشیاں وہی چمن لیکن الفاظ کے اس روایتی ڈھانچے کے اندر آزادی کی وہ روح دوڑادی ہے کہ یہ شعر ہماری قومی ذہنیت کی صحیح اور سچی تصویر بن گیا ہے -

جدید شاعری کا اوّلین رجحان انقلاب کی جانب ہے - جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی مطلع پر کبھی دھواں دھار ابر چھایا کبھی طوفان خیز آندھیاں چڑھیں - کبھی جھکّڑ آئے - کبھی بگولے اُٹھے - غرض ایک عام بے چینی اور حرکت و حرارت پیدا ہو گئی - روحِ جمہور موجودہ سماج اور حکومت سے بیزار ہو گئی - انقلاب کی ایک لہر تمام ملک میں دوڑ گئی - اسی تغیر و تبدّل کا اثر ہمارے شاعروں پر بھی پڑا ؎

جو ایک ایسا آئینہ ہیں شاہراہِ وقت پر
چہرۂ ہستی کے خال و خد ہیں جس میں جلوہ گر
اُڑ رہے ہیں جن کے پرچم آب و گل کے قصر پر
جن کی بیتا اُنگلیاں رہتی ہیں نبضِ عصر پر (جوشؔ ملیح آبادی)

ہمارے شاعر جو اب تک کوچۂ یار کو اپنی دُنیا سمجھتے تھے جو میخانہ کو جنّت جانتے تھے جو "جامِ آتشیں" کو حاصلِ کونین مانتے تھے - جو دربان کے قدموں میں سر بسجود رہنا عبادت خیال کرتے تھے - جو مقتل کو تفریح گاہ گردانتے تھے - جو محبوب کے تصوّر سے سر اُٹھانا گناہ خیال کرتے تھے جو حریمِ ناز میں باریابی کو معراج سمجھتے تھے - جن کی قیمتی زندگی کا مصرف صرف یہ تھا - ع

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

جن کے زنانہ پن کی حد یہ تھی کہ نازک اندام محبوب کے ہاتھ میں خنجرِ آبدار و تیغِ جوہر دار دیکر اپنی سخت جانی اور ان ہتھیاروں کی "بے نسوانیت" کا مظاہرہ کریں جو تیغ و کفن باندھنا صرف اس لئے ضروری خیال کرتے تھے کہ - عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا - جن کی آواز زیرِ لب آہوں اور زبان دلسوز نالوں کیلئے وقف تھی - وہ بھی آج زمانہ اور ماحول کے اثرات سے بیگانہ نہیں - وہ بھی موجودہ تمدّن سے بیزار ہیں - وہ بھی تہذیبِ حاضر سے متنفر ہیں - وہ بھی ظالم و جابر حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں - وہ اس دُنیا کو نیست و نابود کر کے ایک نئی دُنیا - اپنے خوابوں کی دُنیا بنانا چاہتے

ہیں۔ وہ موجودہ فرسودہ نظام کو مسمار کر کے اس کی بُنیادوں پر ایک نیا نظام بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اب وہ فردوس گوش نغمات کے متحمل نہیں۔ انہیں تلواروں کی جھنکاروں میں موسیقی کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اب طبلِ جنگ کی صدا پر ان کی روحیں رقص کرنے لگتی ہیں اب وہ مقتل میں خونِ بسمل کے رقص کی دعوتِ تماشا نہیں دیتے۔ بلکہ انقلاب کے وقت خون کی ندیاں بہانا چاہتے ہیں۔ اب ان کے لب نَے نوازی میں مست نہیں بلکہ صور پھونکنے کے لئے وقف ہیں اب ان کی آنکھوں میں شراب کا خمار نہیں بلکہ غیض و غضب کے شعلے دہک رہے ہیں۔ اب ان کی آواز روحِ انسانی میں انبساط کی لہر نہیں دوڑاتی بلکہ اضطراب کے مد و جزر پیدا کرتی ہے۔ سماج سے بغاوت، حکومت سے بغاوت، مسلمہ امور سے بغاوت، موجودہ حالات سے بغاوت غرض بغاوت ان کی شاعری کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہماری موجودہ شاعری کی تہ میں انقلاب کی روح کار فرما ہے۔ ایک ایک شعر کسی نامعلوم جذبہ بغاوت، کسی مبہم تمنائے تغیر، کسی اندرونی درد و کرب سے کپکپا رہا ہے۔ آج ہر شاعر جوشؔ سے ہم آہنگ ہو کر یہ نعرہ لگا رہا ہے[1] ؎

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب (جوشؔ)

علامہ اقبالؒ نے بھی جو قطعاً جدید شعرا (URTRA MODERN POETS) کے تحت میں نہیں آتے اس انقلاب کی کار فرما قوت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب
انقلاب اے انقلاب

جوشؔ کی "بغاوت"۔ مجازؔ کی "آوارہ"۔ علی سردار جعفری کی "حال و مستقبل"۔ شہاب ملیح آبادی کی "انقلاب کی پکار"۔ احسان کی "باغی کا خواب" اور اسی قسم کی دوسری نظمیں ایک ناگزیر انقلاب کی خبر دے رہی تھیں۔ مجازؔ کی نظم "آوارہ" کے چند بند سنئے۔ معلوم ہوتا ہے موجودہ سماج کی بدعنوانیاں۔ سرمایہ داری کی سفاکیاں، امرا کی عیاشیاں۔ غربا کی مجبوریاں شاعر کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا کر رہی ہیں۔ وہ سماج کی زنجیروں کو توڑنا چاہتا ہے وہ نام نہاد اخلاقی قوانین سے مُنہ موڑتا ہے کہ ان ہی کے پردے میں اخلاق سوز بدکاریاں روا رکھی جاتی ہیں۔ وہ حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتا ہے کہ یہی تمام بُرائیوں کی جڑ ہے ؎

رات ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ میخانہ میں چل
پھر کسی شہ نازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے بیوہ کی جوانی جیسے مفلس کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

سماج سے بیزاری، حکومت سے نفرت، موجودہ حالات سے بے اطمینانی کبھی بغاوت کا رجائی جذبہ اور کبھی روگردانی کا متشائم جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جاں نثار اختر مجازؔ کی طرح مقابلہ کی تاب نہیں لاتا۔ وہ اس کشمکش سے تھک کر اس کو بھول جانا چاہتا ہے اور بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے۔ ع دوست اب سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اس وقت فطرت کے روح پرور نظارے بھی حزن و افسردگی کے مرقع نظر آتے ہیں ؎

---

[1] جوشؔ کے نہیں وقت سے ہم آہنگ ہو کر۔

یہ ستارے یہ کفن کے سرد پھول
آسماں جیسے جلی لاشوں کی دھول
چاند گویا ایک میلے امت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

انقلاب کا اثر یہاں تک نمایاں ہے کہ ایک رومانی شاعر بھی ساقی سے خطاب کرکے کہتا ہے ؎

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج میخانے کا دروازہ
ہر ایک مے کش بیک بے پیے برہم اٹھا ساقی
یہ کیسا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز سے اک نغمۂ ماتم اٹھا ساقی
بغاوت کی ہوائیں چل اٹھیں شاید گلستاں سے
یہ پیمانے الٹ ساقی یہ جامِ جسم اٹھا ساقی
جو ممکن ہو تو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی
(جاں نثار اختر)

۳۲ زمانے کے تغیرات دیکھیئے کہ ساقی جو کبھی نزاکت و لطافت کا پیکر "ایمان و آگہی" کا دشمن خیال کیا جاتا تھا۔ جس کا کام مے پلانا اور مست کرنا تھا۔ آج اس سے "لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم" اٹھانے کی درخواست کی جاتی ہے۔ آج جبکہ ہر کس و ناکس کے دل میں انقلاب کے جذبے ابھر رہے ہیں۔ بغاوت کے ولولے نشو و نما پا رہے ہیں تو شاعر جو عام سطح سے بلند جو عوام الناس سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا ہے کہیں یہ طوفان "باغی کے خواب" دکھاتا ہے۔ کہیں یہ حرمان زدگی و بیچارگی کا احساس پیدا کرتا ہے جیسا کہ مجاز اور اختر کے محولہ بالا اشعار سے نمایاں ہے۔

لیکن موجودہ انقلابی شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمارے شعرا صرف تخریب چاہتے ہیں۔ تعمیر کا کوئی تصور پیش نہیں کرتے نہ غالبًا مدنظر ہے۔ اختر اور نیوی کا جوش ملیح آبادی پر اعتراض اس نوع کی تمام شاعری پر اعتراض ہے۔ "جوش اتنا سمجھتا ہے کہ اس دور کے بعد بھی حیات و تہذیب کے مظاہر قائم ہوں گے۔ لیکن ان کی شکل و صورت سے اسے کوئی بحث نہیں وہ صرف پہاڑوں کو ڈھانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد جوئے شیر لانا نہیں"۔ یہ صحیح ہے کہ ہماری انقلابی شاعری میں آئندہ نظام کا کوئی معقول نظریہ پیش نہیں کیا جاتا۔ لیکن انقلاب کو دماغ کی نسبت دل زیادہ ابھارتا ہے۔ ظاہر ہے جہاں جذبات (SENTIMENTS) کا دور دورہ ہو گا وہاں (SCIENCE) کا گزر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے ادب میں کوئی گہرائی کوئی دعوتِ تفکر کوئی نظریاتی (IDEALOGICAL.) عنصر نہیں ملتا۔

جدید شاعری بنی نوع انسان سے محبت و ہمدردی کی آئینہ دار ہے ہمارا شاعر تنگ و تار کوچوں، عفونت بیز گلیوں۔ ٹوٹے پھوٹے مکانوں جھلسی ہوئی جھونپڑیوں حتیٰ کہ جسم فروشی کی مکروہ دکانوں کا گہری ہمدردی اور سچے احساس سے مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ پیٹ کے بل رینگنے والے محتاجوں، سڑک پر گھسٹنے والے بھک منگوں، روٹی کے ایک سوکھے ٹکڑے پر لڑنے والے انسانی درندوں کا نقشہ کھینچ کر ہمارے دلوں کو احساس کی آگ سے پگھلاتا ہے۔ وہ دن بھر خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں، پتھر کوٹنے والی "شہزادیوں" قحط زدہ کسانوں، بھوکے ننگے کارخانہ داروں کی عکاسی ایسے خلوص ایسی ہمدردی اور ایسی صداقت سے بیان کرتا ہے۔ کہ ہم اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ وہ اس فاقہ مستی اور تہیدستی کے ذمہ دار بڑے پیٹ چھوٹے سر اور دل کی جگہ سنگ پارہ رکھنے والے سرمایہ داروں کو ٹھہراتا ہے۔ وہ ان کی ہڈیاں چچوڑنے کے لئے بپھرا ہوا ہے۔ وہ ان دولت کے پجاریوں کو ڈسنے کیلئے سم آمیز پھنکارے مار رہا ہے۔ وہ صنعت و تجارت کے اجارہ داروں کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اب ہماری شاعری امارت کے در پر ناصیہ فرسا نہیں اس میں انسانی مصائب و ابتلا کا گزر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے دروازے مظلوم فاقہ کش بے بس غریب انسانوں کے لئے بند نہیں ؎

اے نباری کے سر انگور اہل عز و جاہ — آدمی پر رحم کرنے کو سمجھتے ہو گناہ
اغنیا بے حس خدا غافل حکومت بے عمل — بن پڑے تجھ سے تو ان تینوں کے پھندوں سے نکل

بے حس مظلوموں اور بر سر اقتدار ظالموں کے ہجوم میں اپنے آپ کو بے بس

پاتا ہے۔ وہ ایک ایسی دُھن ہے جس میں مجبوری غضبناکی سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ کہہ اُٹھتا ہے ؎

پڑ نہیں جاتے الٰہی سینۂ دولت میں داغ ۔۔۔ بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ
اپنی تابِ تیر سے لے سرمایہ داروں ہوشیار ۔۔۔ اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدارو ہوشیار
غنچۂ یاقوت سے شعلے بھڑک اُٹھنے کو ہیں ۔۔۔ سُرخ دینارِ لعل میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں
فرشِ گل والوں زمیں پر لوگ محوِ خواب ہیں ۔۔۔ خرمنوں کے پاسبانوں بجلیاں بیتاب ہیں

یہ اس کی باطنی پکار ہے۔ یہ اس کا مستحکم یقین ہے۔ اس کی مبصرانہ پیش گوئی ہے۔

جوشؔ کی "ضعیفہ"، "دو بیوہ کا ہندوستان"، "حسن اور مزدوری"۔ ساغرؔ کی "بھکارن"، احسانؔ کی "بھیک"، "مزدور کی موت" وغیرہ نظمیں ہماری شاعری نے اس جدید میلان کی ترجمان ہیں۔ جوشؔ کی نظم "ایک تقابل" کے چند شعر سنئے ؎

ریل کا وہ درجہ جس میں ریل کے مزدور تھے ۔۔۔ آگے ٹھہرا دوسرے درجے کے بالکل سامنے
اس طرف سامانِ دل تنگی تھا جو ملنے کا دھوا ۔۔۔ اس طرف چہروں پہ تھی ٹھنڈی ہوا کی سُرخیاں
اس طرف موجِ نفس ایک نالۂ بیتاب تھی ۔۔۔ اس طرف تارِ سکوں پر ذہن کی مضراب تھی
آہ ان دونوں میں ایک شے مشترک جو ہر نہ تھی ۔۔۔ ان کے جوتوں پر چمک تھی انکے چہروں پر نہ تھی
آہ اللہ اس قدر عدل و تناسب کی کمی ۔۔۔ اس طرف بھی آدمی تھے اس طرف بھی آدمی
لیکن اس منزل سے بے ماتم گزر سکتا ہے کون ۔۔۔ جز خدا اس ظلم کو برداشت کر سکتا ہے کون

احسانؔ مستقل طور پر شاعرِ مزدور کہلاتا ہے۔ اس کی شاعری کا منتہائی مزدوروں کی شرمناک غربت و بیکسی کی عکاسی کرتا ہے۔ جوشؔ کی شاعری میں یہ جذبہ اس طرح محدود نہیں بلکہ عالمگیر وسعت رکھتا ہے۔ "مظلوم بچہ" بھی جو جنگ کا میدان میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا اسکے حریمِ سخن میں باریاب ہے۔ وہ اسکی نفسیاتی عکس ریزی کیلئے وہ پہلو منتخب کرتا ہے جو ہماری روح میں تیر بن کر اُتر جاتا ہے ؎

دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رخِ طفلی پہ اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے

وہ "چادر کی بھیک" کے بھی خدا سے ملتمس ہے ؎

فقط ہلکی سی اس بڑھیا کو چادر
خدایا! داورا! پروردگارا!

اس کی تمام شاعری میں یہ جذبہ مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے ایک شب کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس میں بھی خونِ افلاس سے رنگ بھرتا ہے ؎

سو رہے ہیں مُرق یا جھونکے ہوائے سرد کے ۔۔۔ مفلسی کی تلخ فریادوں کو دامن میں لئے
بن چُکی ہے سینۂ رحمت میں اک ہلکی سی آہ ۔۔۔ منعموں کی چین پیشانی غریبوں کی نگاہ

موضوعاتِ نظم میں یہاں تک تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ کہ ہمارا شاعر صرف حسن و دلکشی کا جویا نہیں۔ اسکی نظریں حیات کے صرف خوبصورت پہلوؤں پر نہیں پڑیں۔ بلکہ وہ بدصورتی میں بھی حُسن دیکھ لیتا ہے۔ وہ صحرا میں بھی نخلستاں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ صرف شیریں و زلیخا کے حُسن کے گیت نہیں گاتا۔ بلکہ مہترانی کو بھی دیکھ کر لااُبالیانہ انداز سے الاپنے لگتا ہے ؎

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور
کچھ بھی ہو جائے جوانی گنگنائے گی ضرور (جوشؔ)

ہر وہ چیز جو اسکے جذبات کو گُدگُداتی ہے اور اس کے احساس کو اکساتی ہے۔ عنوانِ نظم بن سکتی ہے وہ "ٹوٹی ہوئی بوتل" سی حقیر شے سے بھی جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہے متاثر ہو جاتا ہے اور کہتا ہے

ع السلام اے جنتِ بے موجِ کوثر السلام

مجازؔ کی "ریل گاڑی"۔ اختر بریلوی کی "ٹھیلا" وغیرہ نظمیں اس نئے میلان کی حدِ امکان کی شاہد ہیں۔ ۳۴۷

دورِ حاضر کی شاعری میں بے باکی (جو بعض دفعہ عریانی کی حد تک پہنچ جاتی ہے) نہایت درجہ نمایاں ہے۔ اب جذبات کا گلا نہیں گھونٹا جاتا۔ احساسات پر پردے نہیں ڈالے جاتے۔ عشق و محبت کا اظہار استعاروں میں نہیں کیا جاتا۔ مذکر ضمائر کے استعمال اور طرزِ ادا کے پیچ و خم سے صداقتِ احساس اور خلوصِ بیان کا خون نہیں کیا جاتا۔ عہدِ حاضر کا شاعر نہ صرف بالواسطہ تخاطب پر عمل پیرا ہے بلکہ زبان و بیان میں اس حد تک تبدیلی کر دی ہے۔ کہ ضمائر کے تانیثی استعمال کے علاوہ محبوبہ کا فرضی یا اصلی نام بھی پیش کرنے سے نہیں جھجکتا ایامِ جاہلیت میں جبکہ عربوں کی شاعری معراجِ کمال پر تھی عرب شعراء اپنی محبوبہ کو نام بنام مخاطب کرتے تھے۔ اور یہی عین فطرت تھا۔

اختر شیرانی کی "سلمیٰ" اور "ریحانہ"۔ جاں نثار اختر کی "انجم" ان کی شاعری کی منتہا ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جذبات فطری احساسات شدید اور

طرزِ بیان صد درجہ پُرخلوص ہوگیا۔ علاوہ ازیں ان کی شاعری میں کردار کی استواری بھی پیدا ہوگئی ہے۔ چونکہ ایک ہی محبوب ہستی ہر نظم میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لئے جذبات میں باطنی ہم آہنگی۔ اخلاقی بلندی اور روحانی یگانگت کا پرتو نظر آتا ہے۔ حقیقت پرستی کے اس دور میں محبوبہ کی ہستی فرضی یا تخیلی نہیں رہ سکتی۔ کسی خیالی پیکر میں مستعار جذبات اور مصنوعی الفاظ کی مسیحا نفسی سے جان نہیں ڈالی جا سکتی۔ اب تو محبوبہ ایک جیتی جاگتی انسانی ہستی ہونی چاہیئے۔ جس کے کردار کا خاکہ قارئین کے ذہن پر مرتسم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "سلمیٰ" یا "انجم" گوشت پوست کی ہستیاں ہونے کے باعث ہم سے نہایت قریب نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں نزاکتِ احساس اور حُسنِ ادا سے جان پڑ جاتی ہے۔

قدیم تہذیب کا تقاضہ تھا۔ کہ جنسیت (SEX) کی دیوار آہنی ہوں۔ لیکن عہدِ حاضر میں صنفِ نازک صنفِ کرخت کے دوش بدوش ہے۔ قدامت پرستی جنسی جذبے کو ایک گناہ گردانتی ہے۔ لیکن آج بیسویں صدی میں یہ جذبہ دوسرے جذبوں کی طرح طبعی خیال کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ رجحان ہماری صحت مندانہ نفس پرستی کا بھی شاہد ہے اور "مذاق عجمی" کے ردِّ عمل کا نتیجہ ہے۔ فرائیڈ کے نفسیاتی تجزیہ اور ODEPUS- ۳۴۳
COMPLEX-) کے نظریے نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے۔ کہ ہم ان جذبے کو بخوبی عکس ریز کر سکیں۔ ہماری تمام رومانی شاعری جذبۂ جنسی کے محور پر گھوم رہی ہے۔

جدید شاعروں کا پہلا مسلک وسعتِ زبان ہے۔ فارسی اور عربی کے مستعمل الفاظ کے علاوہ بھاشا کے میٹھے میٹھے شبد بھی گھُلا ملا کر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ جوش کی نظم "یہ کون اُٹھا ہے شرماتا" سے چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

رُخ پہ سُرخی آنکھ میں جادو	بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون سمٹے ابرو	نیچی نظریں بکھرے گیسو
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی	جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا مسکی ساری	ہلکی مہندی دھندلی بندی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

ل۔ احمد صاحب اکبر آبادی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں اُردو زبان کی اصلی صورت ان بندوں میں جھلکتی ہے اور اس وقت جو رجحان نظر آرہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پچاس برس گزرنے سے پہلے یہی زبان مقبولِ عام ہوگی"۔ اس باب میں ساغر نظامی کی ان تھک کوششیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی مشہور نظم "ناگ" کا ایک بند سُنیئے۔

سینہ تانے پھن پھیلائے جُھوم رہے ہو ایسے
جیسے کوئی دکنی کنواری مد میں اپنی کر جھومے
اندھیاری درپن ہے تمہارا نور تمہارا کالا
رات کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے مالا
ٹھہرو اک تصویر بنا لوں اے پاتال کے واسی
آؤ تمہیں تن من میں بسا لوں اے پاتال کے واسی

وہ الفاظ و محاورات جو ابتک حریمِ سخن میں باریاب نہ تھے۔ اس عام پسندی (عوام پسندی نہیں) کے دور میں مختلف طریقوں سے روشناس کئے جارہے ہیں۔ متروک لیکن جامع الفاظ نئے دور کی ٹکسال میں پسندیدگی کا ٹھپّہ لگا کر رائج کئے جارہے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جمہوریت کی روح الفاظ و محاورات میں سرایت کر گئی ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جمہور انہیں سمجھ سکے۔ اور ان سے حظ و نشاط حاصل کر سکے۔ آج کل ہر شاعر[1] کا مطمح نظر یہی ہے کہ زبان ایسی ہو جسے ہر خاص و عام سمجھ سکے۔ اور طرزِ ادا نہایت صاف روشن سیدھا سادھا اور موثر ہو۔ استعاروں کی پیچیدگی، تشبیہوں کی کھینچ تان اور تلمیحات کے ہیر پھیر اب محاسنِ شعری میں داخل نہیں۔ اب تو استعارات اور تشبیہات عام مشاہدے سے اخذ کی جاتی ہیں۔ مثلاً

جھُریوں سے کھُر درا اپنا چہرہ بے آب میں
جیسے کھُل جاتی ہیں درزیں سوکھ کر تالاب میں	(احسان)
سبزے کے دامن پہ یوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کاجل آنکھ سے بہ کر رخساروں کو گھیرے	(ساغر)
حوض میں مستانہ بطخ کے تیرنے سے جس طرح	کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار

[1] ہر شاعر نہیں کم از کم جوش کی الفاظ نگاری کا معیار اتنا سخت ہے کہ اُسے عوام تو عوام وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے جو شاعری سے بنیادی ذوق نہیں رکھتے۔ (ادارہ)

حافظ پر یونہی اک بیدار کن گہری خراشش
ڈال دیتی ہے شبِ غم میں پپیہے کی پکار (جوش)

سیدھی سادھی مادی تشبیہوں سے مبہم نفسی کیفیتوں کی عکاسی کی جاتی ہے ؎

آئی جوانی کی یاد تو آتی چلی گئی — ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
ویرانۂ حیات کے ایک ایک گوشے میں — جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی
(جگر)

کیسی دلکش تشبیہوں کے تصورات سے محبوب کی رفتار کی تصویر کھینچی گئی ہے

کوئی خوابوں سے بنائی ہوئی شے ہے گویا — جامِ سرشار سے چھلکی ہوئی مے ہے گویا
بھری برسات کی راتوں میں جیسے گاتے ہیں — تیری رفتار اسی گیت کی لے ہے گویا
(اختر انصاری)

جدید شاعر بحور و اوزان کے استعمال میں بھی بڑی حد تک آزاد و خود پسند واقع ہوا ہے۔ حفیظ جالندھری کی نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" کا ایک اقتباس پیش ہے۔ یہ نظم کسی مقررہ صنفِ سخن کے تحت میں نہیں آتی ؎

عبادتوں کا ذکر ہے — نجات کی بھی فکر ہے
خیال ہے عذاب کا — جنون ہے ثواب کا
مگر سنو تو شیخ جی — عجیب شے ہیں آپ بھی
بھلا شباب و عاشقی — الگ ہوئے بھی ہیں کبھی
حسین جلوہ ریز ہوں — ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں — تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگار ہائے فتنہ گر — کوئی ادھر کوئی ادھر
ابھارتے ہوں عیش پر — تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر — تمہارا نقطۂ نظر
درست ہو تو ہو مگر
ابھی تو میں جوان ہوں

بحور و اوزان کے انتخاب میں زیادہ تر ذوقِ ترنم کو رہبر بنایا جاتا ہے۔ قوافی و ردیف کی بے جا پابندیوں کے خلاف یہاں تک علمِ بغاوت بلند کیا گیا ہے۔ کہ ردیف قافیہ اور بحر سے آزاد نظموں کا رواج چلا ہے۔ "میراجی" خالد، ن۔م راشد، فیض احمد فیض اسی رنگ کو رائج کرنے میں پیش پیش ہیں۔ یہ صرف جذبات کی ادائگی اور نفسی لہروں (PSYCHIC WAVES.) کی عکاسی پر زور دیتے ہیں۔ ن۔م راشد کی ایک نظم "خودکشی" کا ایک بند سنئے ؎

کر چکا ہوں آج عزمِ آخریں
میرا عزمِ آخریں یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پا لیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و درخشاں لہو

گیت اور دوہے بھی مقبول ہو رہے ہیں۔ گیت ہندوستان کی روحِ شعری کی پہلی انگڑائی ہے۔ یہ عوام الناس کی زندگی کا جزو لاینفک ہے ہر ملک میں (FOLK SONGS.) مقبول رہے ہیں۔ اب کہیں جاکر ہمارے شاعروں نے بھی اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے۔ ساغر اور حفیظ کے گیت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ حفیظ الفاظ کی موسیقی کا زیادہ خیال کرتا ہے اور ساغر الفاظ کی موسیقی کے ساتھ روح کی موسیقی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ حفیظ کے گیتوں میں کبیر کی سی پند و نصیحت پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ساغر پریم کے گیت الاپتا ہے۔ ان میں پند و نصیحت کے چٹیل پن کے برخلاف کنواری کنیا کی سی لچک اور جھجک نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کا انسان اپنے آباؤ اجداد کی نسبت زیادہ مصروف اور کثیر المشاغل ہے۔ اسکی زندگی ایک بے تحاشہ دوڑ کے مشابہ ہے جس میں "آگے بڑھ جینگے دم لیکر" کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بہت سی ایسی تحریکیں آئے دن وجود میں آتی رہتی ہیں جن کا منشا وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار اور زندگی کی غیر فطری سرعت کا انسداد کرنا ہے اور بنی نوع انسان کے لئے آرام اور فرصت کا وقت نکالنا ہے۔ فرصت کے لمحات کے اختصار کا ادب پر یہ اثر پڑا کہ آج مختصر افسانے، ایک ایکٹ کی تمثیلیں اور چھوٹی چھوٹی نظمیں رائج ہو رہی ہیں۔ اُردو اس سے مستثنیٰ نہیں۔ "سحر البیان" کی سی شیطان کی آنت

آتنت مثنویاں ناپید ہیں۔ یہ بھی کسی قدر پرانے زمانے کا قصہ ہے لیکن جدید اور قدیم جدید ادب میں بھی زمین اور آسمان کا فرق نظر آرہا ہے۔ آج "شمع" اور "شاعر" کی سی طویل نظمیں بھی مفقود ہیں۔ نظموں کے اختصار کی حد یہ ہے۔ کہ اب قطعہ اور رباعیات قبولیت عامہ حاصل کر رہی ہیں۔ نہ صرف اصنافِ سخن کی طوالت اختصار میں تبدیل ہو رہی ہے بلکہ نفس مضمون بھی اس سے متاثر ہو رہا ہے ہمارے زمانہ کا انسان ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے۔ ایک ہی بات سوچ سکتا ہے۔ اور ایک ہی بات قبول کر سکتا ہے۔ اس لئے تمام اصناف سخن میں وحدتِ تاثر اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ غزل بھی جو گوناگوں احساسات اور بوقلموں جذبات بلکہ بعض دفعہ متضاد جذبات کا آئینہ ہوتی تھی جس کا ایک شعر وصل کی لذت دوسرا شعر ہجر کی اذیت تیسرا محبوب کے تغافل چوتھے اس کے التفاتِ بے پایاں کا ترجمان ہوتا تھا۔ آج "وحدت تاثر" پر مبنی ہے۔ مسلسل غزلوں کو چھوڑ کر عام غزلوں کی تہ میں بھی ایک ہی تاثر ایک ہی جذبہ ایک ہی نفسی رو کار فرما نظر آتی ہے مثلاً جگر کی ایک غزل ہے ؎

بیتاب ہے بیخواب ہے معلوم نہیں کیوں؟ دل ماہی بے آب ہے معلوم نہیں کیوں؟
بے کیف مے ناب ہے معلوم نہیں کیوں؟ پھیکی شب ماہتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
بے نام سی ایک یاد ہے کیا جانئے کس کی؟ ہو جو تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن کشتی سی تہ آب ہے معلوم نہیں کیوں؟
دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا ابتک اثر خواب ہے معلوم نہیں کیوں؟
معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟

قطعات مبہم جذبات اور دھندلے احسات کے اچھوتے مرقع ہیں اکثر قطعات ایک نظم کی سی جامعیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے احساسات اس درجہ نازک اور ہمارے جذبات اس حد تک ذکی الحس ہو گئے ہیں کہ تفصیل کی بجائے اختصار اور صریح بیان کی بجائے کنایوں سے کام لیا جا سکتا ہے اسی لئے عموماً قطعات میں اشاروں اور کنایوں سے وہ بات کہہ دی جاتی ہے کہ شاعر کے حسن بیان اور حسن احساس سے کیف و سرور کی ایک موج دل و دماغ کو چھو کر نکل جاتی ہے ؎

جو کوئی پوچھتا ہے سرخ کیوں ہیں آج آنکھیں تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں آج سو نہ سکا
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا

(اختر انصاری)

انسانی نفسیات اور جذبات صدیوں سے شعر کا جامہ پہنتے رہے ہیں لیکن آج بھی انہی احساسات اور جذبات پر ایسے مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں کہ ایک نیا لطف، ایک نامحسوس حظ حاصل ہوتا ہے۔

دورِ حاضر کا ہر شاعر اپنا کلام ترنم سے پڑھتا ہے۔ ریڈیو کے مشاعروں نے قارئین کے ساتھ سامعین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے۔ اس کا کلام پر یہ اثر پڑا۔ کہ ہر شاعر ایسے الفاظ اور تراکیب انتخاب کرتا ہے جو مل جل کر ایک نوع کی روانی اور ایک قسم کی موسیقی پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ مترنم الفاظ موسیقیت نواز تراکیب، متوازن ٹکڑے استعمال کر کے حسن تناسب میں ایک ایسا آہنگ پیدا کر دیتا ہے کہ غزل یا نظم سے بہتے ہوئے دریا کی سی روانی اور ستاروں کی سی راگنی سے مملو نظر آتی ہے۔ گویا شاعری "غنائیت" سے قریب تر ہو گئی ہے۔ بعض اوقات الفاظ کی کثرت استعمال اور گیتوں کی مقبولیت سے خیال ہوتا ہے کہ وہ زمانہ دور نہیں جب ہر نظم بجائے خود ایک نغمہ ہو گی۔ نغمہ بھی شعر کی طرح اظہارِ جذبات کا ایک ذریعہ ہے۔ جذبات کے تنوع کے ساتھ نغمات بھی متنوع ہوتے ہیں۔ "نوحۂ غم" "نغمۂ شادی" سے مختلف ہوتا ہے رجز اور ساون کے گیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میدانِ کارزار کی موسیقی اور شبستان کی موسیقی میں بین امتیاز پایا جاتا ہے۔ شاعری اور موسیقی توام فنون لطیفہ ہیں۔ اکثر شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری بن جاتی ہے۔ جدید شاعری بھی موسیقی سے ہم آغوش ہوتی جا رہی ہے۔ آج شاعر کے خلوص بیان کی حدود فطرت کی حدود سے ملتی جا رہی ہیں۔ اسی لئے اس کے جذبات نغمات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں "یہ کون اٹھا ہے شرماتا" کی موسیقی اور "بغاوت" کا رجز نفس مضمون سے ہم آہنگ ہے۔

ہماری جدید شاعری کا ایک رجحان فطرت پرستی کی طرف بھی ہے۔ گو ابھی پرستار فطرت ورڈزورتھ کی سی نظمیں مفقود ہیں۔ اُردو کی اس تہی دامانی کا ماتم کرتے ہوئے صاحبِ تاریخ ادب اُردو اس طرح رقمطراز ہیں "دیہاتی اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے اُردو شاعری کا دائرہ محدود ہے۔ قدرتی مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب اُمنگیں پیدا کرتے ہیں ہمارے اُردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ مولانا الیاس برنی بھی مناظر قدرت" کی تمہید میں لکھتے ہیں۔ قدرت کو لیجئے اسکے بیشمار عجائبات آنکھوں

کے سامنے ہیں۔ لیکن ہمارے شعراء نے کہیں اب جا کر نقاشی شروع کی ہے اور ابھی وہ زمانہ دور ہے کہ نیچر کی تصاویر منہ سے بولنے لگیں"۔ فطرت کی تصاویر اکثر نظموں کے پسِ منظر کے طور پر تو پیش کر دی جاتی ہیں۔ لیکن محض فطرت کی پرستاری بالذّات مقصود نہیں۔ جوش نے اکثر نظمیں فطرت کے معصوم مناظر سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ لیکن جوش میں ورڈز ورتھ کی سی والہانہ شیفتگی اور روحانیت کا پرتو نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش فطرت سے مانوس نہیں۔ وہ صرف فطرت کا تماشائی ہے تمنائی نہیں وہ فطرت کے مناظر میں کھو نہیں جاتا۔ بلکہ بیدار احساس اور بینا آنکھ سے اسکے حُسن کا جائزہ لیتا ہے ؎

خامشی دشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے
عمر بھر جو نہ سُنی ہو وہ صدا آتی ہے
دشنہ رکھ دیتا ہے گھبرا کے رگِ جاں پہ کوئی
جب کلی خاک پہ دم توڑ کے گر جاتی ہے
مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹا میں بجلی
آنکھ سی کوہ و بیاباں کی جھپک جاتی ہے
جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے
دلِ شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سائے باتیں
ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے
جب ہری دوب کے مڑ جاتے ہیں نازک ریشے
شیشۂ قلب میں اک ٹھیس سی لگ جاتی ہے
ان مناظر کو میں بے جان سمجھ لوں کیونکر
جوشؔ کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے

(از "ذی حیات مناظر" بہ تصرف)

قلبِ صحرا میں جھٹپٹے کے وقت دل میں غلطاں ہے ایک طرفہ امنگ
مجھ سے کہتا ہے کیا خدا جانے دھان کے کھیت پر شفق کا رنگ

اس کا تو عقیدہ ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کیلئے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اس باب میں جوش بجنوری مرحوم کی اصطلاح کے مطابق "رب النوع"
کہلانے کا مستحق ہے اسکی اکثر نظمیں مثلاً "شام کا رومان" "بہار کی ایک دوپہر" "روحِ شام" "جذباتِ فطرت" وغیرہ ہماری شبابی شاعری کی زینت بنی رہینگی۔ عام روش سے ہٹ کر ایک نئی ڈگر نکالنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آئندہ آنے والے شاعر اس راہ پر گامزن ہونگے۔ جو ممکن ہے ہماری شاعری کی ایک شاہراہ بن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے شاعروں کو دُنیا کے تلخ حقائق کی چل چلاتی دھوپ سے فطرت کے سکون پرور سائے میں دم لینے کی فرصت ہی نہیں اور یہی ان کیلئے اچھا بھی ہے۔ زمانہ آئیگا کہ وہ فطرت کے آغوش میں سکون کے متلاشی ہونگے۔

آج دُنیا ایک عجب بدنظمی، انتشار، ابتری اور ہلچل کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ سماجی افراتفری اور دماغی افلاس کے باعث مذہب جو سکون اور شانتی کا پیغام تھا۔ پس پُشت ڈال دیا گیا۔ آج تنقید کا دور دورہ ہے۔ تلقین کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اعتقاد کی جڑیں تشکیک نے ہلا کر رکھ دی ہیں۔ سائنس کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ غرض اس دورِ عقلیت میں تصوّف اور روحانیت کی دال نہیں گل سکتی۔ مذہب کا سکّہ نہیں چل سکتا۔ حتّٰی کہ وجودِ خداوندی بھی معرضِ شک میں پڑ گیا ہے۔ ہندوستان میں دہریت ایک اور وجہ سے بھی ۳۷
فروغ پا رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب مظلوم و مجبور انسانوں پر اس حد تک ظلم و ستم روا رکھے جاتے ہیں۔ کہ وہ دبے سانپ کی طرح کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں وہ ہر ظالم و جابر ہستی سے باغی ہو جاتے ہیں خواہ وہ انسانی ہو یا مافوق الانسانی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے اکثر شاعر اشتراکیت کے زیر اثر تصوّف، روحانیت اور مذہب سے منحرف ہونے کے بعد خدا سے بھی باغی ہو گئے ہیں۔ وہ کسی ایسے "شخصی" خدا کے قائل نہیں جو قہار و جبار ہو ؎

اللہ کو قہار بتانے والو اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ سماج کے بیجا بندھنوں، تقسیم دولت کی بدعنوانیوں، سیاسی عیاریوں اور شیطانی بدکاریوں کو آسمانی خدا نہیں، ارضی انسانی جابروں سے منسوب کرتے ہیں اور بعض دفعہ اس روح فرسا کشمکش سے مجبور ہو کر کہہ اُٹھتا ہے ؎

تیرا اک بندہ تجھ کو روتا ہے اے خدا مر گیا کہ سوتا ہے (مجذوبؔ قریشی)

وہ ایک ایسے خدا کو تو ضرور مانتے ہیں ؎

"جس کے قبضے میں زماں ہے جس کے قدموں پہ زمیں"
آج تک پہنچی نہیں جس اوج تک چشمِ خیال
ایک نامعلوم قوّت ایک نا دیدہ جلال
"داغِ شخصیت" سے ہے ناآشنا جس کی جبیں
نوعِ انساں کے تعاون کی جسے حاجت نہیں
جس کا ہر تارہ ہے مصحف جس کا ہر ذرّہ کتاب
جس کے دفتر کی ہے زرّیں مہر قرصِ آفتاب
وہ خدا وہ طاقتِ مخفی وہ دارائے حیات
جس کی ایک ادنیٰ سی جنبش کا لقب ہے کائنات

علاوہ ازیں دنیا کو رنگ و نسل کے امتیازات، صنعت و تجارت کی مقابلہ بازی، کمزور اقوام کی پائمالی اور آئے دن کی خونریزیوں سے نجات دلانے کی آس صرف بین الاقوامیت سے بندھتی ہے۔ ہمارا شاعر بھی آبائی مذہب سے کنارہ کش ہوکر صرف بین الاقوامیت کو اپنا مذہب اپنا دین، اپنا ایمان قرار دیتا ہے ؎

۳۸ اُٹھ کھڑے ہو آؤ تکمیل عبادت کے لئے | اک نیا نقشہ بنائیں آدمیت کیلئے
آؤ محفل میں جلائیں بھی بصد شان فراغ | نوعِ انسانی کی مجموعی اخوت کا چراغ
اور کچھ حاجت نہیں ہے دوستی کیواسطے | آدمی ہوتا ہے کافی آدمی واسطے
آؤ وہ صورت نکالیں جس کے اندر جان ہو | آدمیت دین ہو انسانیت ایمان ہو

(جوشؔ)

ہمارے ملک کی موجودہ تباہ ناک حالت سماجی افراتفری، دماغی افلاس اور روحانی جمود کا تقاضہ تھا کہ ہمارے ادب میں قنوطیت کی روح سرایت کرجائے لیکن اسکے برخلاف ہماری شاعری رجائیت کے جذبے سے مملو نظر آتی ہے۔ یہ ایک نیک شگون ہے۔ لیکن یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ہماری قنوطیت حد کو پہنچ چکی تھی۔ چونکہ قنوطیت کی تیرہ و تار شب ہی رجائیت کی صبح تابناک کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مزید برآں ہماری شاعری جو محض حسن و عشق اور شراب و کباب کا مجموعہ کہی جاتی ہے۔ ملک و قوم میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے اور پھر سیاسی و سماجی انقلاب کی ابتدا ذہنی انقلاب سے ہوتی ہے۔

اگر مندرجہ بالا تمام رجحانات یکجا دیکھنے ہوں تو ساغرؔ کی نظم "ناگ" پڑھئے۔ شاعر سماج سے باغی ہے۔ سرمایہ داری سے بیزار ہے۔ موجودہ نظام سے اُکتا گیا ہے۔ اسکی نظر "ناگ" پر پڑتی ہے "ناگ" جس سے ہر شخص ڈر کر بھاگتا ہے جس کے پاس کوئی نہیں پھٹکتا۔ باغی شاعر سے بھی کوئی محبت و ہمدردی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوانہ ہے جس سے سب ڈر کر بھاگتے ہیں۔ اسے دیکھ کر سرمایہ دار تیوری پر بل ڈال لیتے ہیں "پنڈت، ملّا، لالے" نفرت سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ دونو دُنیا کے ظلم و ستم کے زخم خوردہ ہیں۔ دونو نفرت و کراہیت کا تختۂ مشق ہیں باغی شاعر فوراً "ناگ" کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور مسرّت کا ایک بے اختیار نعرہ لگاتا ہے جیسے کسی اجنبی کو اپنا ہموطن نظر آجاتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے۔ ع

آؤ تمہیں تن من میں بسالوں اے باہنی کے واسی

وہ ناگ کے حسن کے گیت الاپنے لگتا ہے۔

باغی شاعر اور ناگ میں ایک اور بھی مماثلت ہے۔ کہ شاعر تخریب کا حامی ہے۔ تخریب کی تصویر ناگ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ وہ بھی فطرت کی تخریبی طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے۔ شاعر ناگ بن کر سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کو ڈس لینا چاہتا ہے۔ وہ ناگ کا مقابلہ اور دوسرے ہزاروں انسانی ناگوں سے کرتا ہے اور آخر یہ نتیجہ نکالتا ہے ؎

بس ہے تمہارا بوند برابر ان کا زہر سمندر
ڈنک تمہارا ویرانوں تک ان کا ڈسنا گھر گھر
تیرا کاٹا اک دن زندہ ان کا کاٹا پل بھر
سحر تمہارا سر پر بولے ان کا جادو من پہ
دل سے ان کا زہر ہٹالوں اے باہنی کے باسی
آؤ تمہیں تن من میں بسالوں اے باہنی کے باسی

یہ نظم نہ صرف انقلاب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے بلکہ اس میں ہماری جدید شاعری کی دوسری خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ اس کی زبان عام فہم۔ الفاظ میٹھے اور شریلے ہیں۔ یہ اُردو ہندی ملاپ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں بہتے ہوئے پانی کی سی روانی اور موسیقی پائی جاتی ہے تشبیہات عام مشاہدے سے ماخوذ ہیں اور ایک ندرت اور جدّت لئے ہوئے۔ ؎

سبزے کے دامن پر ہو یوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کاجل آنکھ سے بہ کر رخساروں کو گھیرے
سورج کی کرنوں سے ایسے چمک رہا ہے مکھڑا
جھل مل جھل مل جیسے جھومر کرے کسی دلہن کا

سینہ تانے پھن پھیلائے جھوم رہے ہو ایسے
جیسے کوئی دکھنی کنواری مدھرا پی کر جھومے
اندھیاری درپن ہے تمہارا نور تمہارا ہالا
رات کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے بالا

عہدِ حاضر کا ہر شاعر اپنی بقا کا راز انفرادیت میں پاتا ہے۔ اور اسی لئے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ساغر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے گیتوں میں ہندو علم الاصنام (MYTHOLOCY، کا پیوند لگا کر ان کا دامن ہند کے عہدِ عتیق کی تہذیب و تمدن سے باندھ دیتا ہے۔ یونانی علم الاصنام ابتک انگریزی شاعری کی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا مخزن بنا ہوا ہے۔ ساغر ناگ کو موت کی گردن کی ہیکل، شنکر کا جوشن، اور کالی کی جھانجن کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔
اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نظم گیت کی شکل میں ہے۔ گیت ہماری حیات کا ایک جزو ہے۔ اس لئے عوام النّاس کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ گیت نصیحت (IMCTRUSTION) کی بجائے اشارت (INSINDATWN،) پر مبنی ہے جو کسی ملک کے اعلیٰ ترین ادب کا طغرائے امتیاز ہے۔

ساغر کی چند جدید نظمیں اردو شاعری میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کر رہی ہیں۔ "اتنی فرصت کہاں" ماحول اور زمانہ کی تمام بے چینیوں اور انکے ردّ عمل کا آئینہ ہے، شاعر کی حساس روح، بیرونی اثرات کو ایک اندرونی کیفیت سے ترتیب دے کر عجب چیز بنا دیتی ہے۔ دورِ حاضر کی طلسم شکنی کہ شاعر یا عاشق یا محبوب، محبت کو ٹھکرا رہا ہے۔ پچھلی صدی کا شاعر ایسے عاشق کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ترقی اور بلندی کا نصب العین جس کے حصول کیلئے نئی زمانہ انسان کو سچے معنوں میں مشین بن جانا پڑتا ہے علو مقصد اور اسکے مقابلے میں وقت کی رفتار، یہ سب باتیں الفاظ کے ایسے تانے بانے میں بنی ہوئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، ساغر کی نظموں کی

جھلملیوں میں سے حیات کے تاریک پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے بعض دفعہ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مادرِ گیتی یا روحِ عصر اپنے اندرونی درد و کرب کی آہوں کو اسکے شعروں سے متشکل بنا رہی ہے۔
اگرچہ جنگ کے شعلے ہمارے ملک سے دور ہیں لیکن ان کی آنچ ہمارا شاعر اپنے قلب پر محسوس کرتا ہے اور اپنے ہم وطنوں کے احساسِ وطنیت، جذبۂ مدافعت اور ولولۂ آزادی کو بیدار کرنے کیلئے ایک جنگی ترانہ چھیڑتا ہے ؎

پھر امن کی رنگیں وادی سے ہنگامہ گیر و دار اٹھا
دنیائے سکوں کے پہلو میں ایک فتنہ حشر آثار اٹھا
ہستی کے بہاریں مطلع پر ایک ابرِ شرارہ بار اٹھا
بیکار ہیں چنگ و تار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثارِ آزادی جاں میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ ظالم چھین نہ لیں ملت کا لوائے آزادی
وہ غلغلۂ یلغار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

۳۲۹ ناموسِ وطن کو غیروں کے پنجوں سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس انکی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں
لا برقِ فنا آثار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پھر حشیم براہ جرأت ہے لیلائے شہادت میداں میں
شاداب ہوا کرتی ہے صدا ہر قوم کی عظمت میداں میں
تلواروں کے خونیں آنچل سے کھل جاتی ہے جنت میداں میں
گلہائے طرب کا بار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

(اختر شیرانی)

موجودہ جنگ نے دنیا کو جو کچھ بھی نقصان پہنچایا ہے لیکن اردو ادب میں ایک لافانی رزمیہ نظم کا اضافہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آجتک ان ممالک میں بھی جہاں لوگ اپنی آزادی برقرار رکھنے کیلئے جانوں کی بازی لگا رہے ہیں ایسا جوشیلا جنگی ترانہ نہیں سنا گیا۔ وہ حضرات آئیں جو اردو شاعری کو "دقیانوس" کہکر ہماری ترقی کو ترقی معکوس بتلا رہے ہیں اور دیکھیں کہ ہماری شاعری کس طرح رفتارِ

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

سراج الدین آذر

فارسی اور ہندوستانی تہذیب

کسی ملک کی تہذیب۔ اس کا کلچر۔ اسکی زبان۔ اس کا ادب ایسی چیزیں ہیں جو صدیوں میں تشکیل پاتی ہیں۔ زمانہ کا بہاؤ۔ حکومت کے انقلاب۔ باشندوں کی مزاجی تبدیلیاں اور بیرونی ممالک اور اقوام سے اثر و تاثر۔ ادب۔ زبان وغیرہ کو نئے سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں زبان بالخصوص اتنے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اسکی عہد بعہد ترقیوں کا جائزہ لینا دلچسپیوں سے پُر ہے۔

ترکوں کا ہندوستان کو فتح کرنا ایک اہم واقعہ ہے جس کے بے پناہ اثرات سے ہندوستانی تہذیب اور کلچر پر ایک کاری ضرب لگی۔ اور وہ چوٹ کھا کر جوابی طور پر فاتحین کے خیالات و تصورات پر حملہ آور ہوا گرد و پیش کے حالات جس شدت کے ساتھ کسی قوم کے دل و دماغ۔ انکے خیالات۔ عادات و اطوار حرکات و سکنات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسکی
۴۰ مثال اس سے بہتر شاید نہ مل سکے۔ ترک اور مغل جب ہندوستان میں آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اور ہندوستانیوں کے کلچر میں کوئی مشترکہ اوصاف ہی نہیں ہیں۔ مغل اور ہندوستانی۔ بول چال۔ رنگ ڈھنگ آداب و اخلاق بہت سے پہلوؤں سے مختلف بلکہ متضاد تھے۔ اس اجنبیت کے باوجود ان دو تہذیبوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکنا قوموں کے باہمی مدنی انحصار کی ایک ایسی دلیل ہے جسے آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

مغل اور ہندوستانی کلچر میں پہلے تصادم ہوا۔ پھر گریزاں سی آشنائی۔ پھر کچھ باہمی ربط۔ آخری شکل جو اس باہمی تعلق نے اختیار کی وہ حاکم و محکوم کا رشتہ تھا۔ ترک اور مغل ہندوستان میں فاتح بن کر آئے تھے اور ان کی زبان کچھ مدت کے بعد فارسی ہو گئی تھی۔ عربی کا مقولہ ہے "النّاس علیٰ دین ملوکھم" یعنی رعایا بادشاہ کے دین کے تابع ہوتی ہے۔ زبان بھی علم و فن۔ صنعت و صناعی اور اخلاق و اطوار کی طرح سلطنت کے اثر کی مغلوب ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سلطنت کا مذاق ہر چیز میں سرائت کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی بہت جلد ہر دلعزیز ہو گئی اور ہندوستانیوں نے بلا تفریق مذہب و ملت اس میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کی۔ زبان میں بدلتے ہوئے حالات اور بگڑتے یا بنتے ہوئے کلچر کا عکس آنا لازمی تھا۔

فارسی اور ہندی الفاظ کا رد و بدل اور لین دین غزنوی دور سے ہی شروع ہو گیا تھا چنانچہ اس عہد کے شعراء اور مورخین۔ فردوسی۔ عنصری۔ فرخی۔ اسدی۔ سنائی اور بیہقی کے ہاں ذیل کے ہندی الفاظ ملتے ہیں:۔

بت۔ دشمن۔ شارہ کت بمعنی تخت۔ کوتوال۔ نو بہار (عبادتگاہ) بیلک۔ لگھن۔ شل۔ کتارہ۔ چندن اور پانی۔

ابو الفرج رونی۔ جو شاہ ابراہیم اور اسکے بیٹے مسعود ثالث کے عہد کا شاعر ہے۔ اسکے کلام میں دند۔ جوہر اور جبت ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

بشکل پیل یک دندش نظر کن

بقول صاحب فرہنگ رشیدی دند ہندی لفظ ہے۔ فرہنگ آنندراج میں لکھا ہے۔

"گویا ایں مفرس دنت باشد کہ لغت ہندی است"

لیکن میرے فاضل دوست پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ چونکہ ابو الفرج رونی لاہوری ہے۔ دند اس نے پنجابی زبان سے لیا ہے پیل یک دند سے شاعر کا مقصد ایک دنتا ہاتھی ہے۔ جبت بھی اصل میں پنجابی لفظ جٹ ہے جسے اُردو میں جاٹ کہتے ہیں۔

جوہر سے مقصد راجپوتوں کی معروف رسم ہے۔ یعنی غالب دشمنوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے مال و اسباب کو جلا کر اور اہل و عیال کو قتل کر کے آ ڈٹتے تھے اور جبتک ایک ایک کر کے ہلاک نہ ہو جاتے مُنہ نہ موڑتے۔

ایشیا جون جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

مسعود سعد سلیمان نے کت (بمعنی تخت) ۔ مار امار (آپس کی مار پیٹ) اور برشکال یعنی برش کال بمعنی (برسات کا موسم) ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں ۔

حکیم سنائی غزنوی المتوفی ۵۴۵ھ کے کلام میں ہندی لفظ پائی اور کوتوال (کوٹ والا بمعنی مالک حصار) پائے جاتے ہیں ۔

اسی طرح تاج الدین ریزہ کے ہاں سیر اور من (۴۰ سیر کے معنوں میں) ملتے ہیں ۔

طبقات ناصری از منہاج سراج جو ۶۵۸ھ کی تصنیف ہے اس میں یہ ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں ۔

سیل (بھیڑ) ۔ لک (لاکھ) ۔ نوبہار (یعنی نو وہار بمعنی عبادتگاہ) ۔

دقیقی شاعر نے بھی نوبہار لہراسپ نامہ میں استعمال کیا ہے[۹]

بلخ گزیں شد بداں نوبہار — کہ یزداں پرستاں آں روزگار
مرآں خانہ را داشتندے چناں — کہ مرمکہ را تازیاں ایں زماں

امیر خسرو کے یہاں کثرت سے ہندی الفاظ اور محاورے پائے پائے جاتے ہیں ۔ طوالت کے خوف سے میں ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر کرونگا :-

ساغر (ساگر بمعنی حوض و تالاب) ۔ راوت (راجپوت) ۔ پایک (پیادہ) ۔ (پگڑی) ۔ بیڑہ ۔ تنبول ۔ دھانک (تیرانداز) ۔ بسیٹھ (ایلچی و سفیر) بیل ۔ سیوتی ۔ کیوزہ ۔ مولسری ۔

تاریخ فیروز شاہی ۔ میں جو ۷۵۸ھ کی تصنیف ہے کم از کم ۸۰ ہندی لفظ آئے ہیں ۔ ان میں سے بھی چند ایک سن لیجیے ۔ ٹکنی (ایک قسم کی شراب) منڈہ (منڈی) ۔ سوندھار (بمعنی اُدھار) ۔ لادی (بمعنی باربردار) ۔ مار مار (بمعنی سعی بیہم) ۔ سکھ آسن (پالکی) ۔ ڈانگ (کٹھ) ۔ منڈل (جلسہ و جماعت)

سیر الاولیا میں کئی لفظ ہندی کے آئے ہیں ۔ مثلاً لینگھن بمعنی روزہ ۔ بھاگسی بمعنی قید خانہ ۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اس فہرست الفاظ سے جنکی نیرنگیاں ایک ماہر لسانیات کے لئے صد سامان صد ہزار نمکداں لئے ہوئے ہیں ،،

آپ اُکتا گئے ہونگے ۔ اس لئے میں مفرح القلوب میں سے صرف چند ہندی کے لفظ پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں ۔

جوگی ۔ کھبڑ (پیالہ رکابی) ، مراتبہ (مرتبہ) ۔ لنگوٹی ۔ چھتر ۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نویں صدی ہجری تک فارسی زبان ہندوستان میں ہمہ گیری صورت اختیار کر چکی تھی ۔ فارسی جاننے والوں کی تعداد اس وقت تک بہت کم تھی لیکن ماحول کے گوناگوں اثرات سے فارسی زبان متاثر ہو رہی تھی ۔ اور مجھے یہی دکھانا مقصود تھا ۔

جس طرح ہندی الفاظ فارسی میں داخل ہو گئے ۔ فارسی عربی الفاظ ہندی کتابوں میں دخل پا گئے ۔ نرپتی نلہ ایک ان پڑھ شاعر تھا ۱۱۵۵ء میں اس نے ایک کتاب "بیل دیو راسو" نظم میں لکھی ۔ اس میں اور اس وقت کی دیگر ہندی کتابوں میں متعدد لفظ عربی فارسی کے ملتے ہیں ۔ نمونے کیلئے دیکھئے ۔

مہل (محل) ۔ ہجرت (حضرت) کھدا (خدا) ۔ سرتان (سلطان) ۔ سایہب (صاحب) ۔ پھرمان (فرمان) ۔ کھلک (خلق) ۔ کلا (کلاہ) ۔ کبائے (قبا) ۔ پائگا (پائے گاہ) باجا باجا (بعض بعض)

۱۴۱ دلچسپ بات اس میں یہ ہے کہ فارسی الفاظ کو ہندی نے انکی اصلی حالت میں قبول نہیں کیا ۔ بلکہ اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق انہیں ڈھال لیا ہے ۔ خلق کی خ کو ادا کرنے اور ق کا ڈول حلق سے نکالنے کی تاب ہندوستانی سہل انگاری کب لا سکتی تھی لہذا کھلک بنا دیا گیا ۔ عین کو بھی ہندی کی نازکی کا شکار ہونا پڑا ۔ اور بعض بعض کا باجا باجا بن گیا ۔ ص ۔ س ۔ ث ۔ کو ہندی نے ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ۔ اور حائے حطی اور ہائے ہوز بھی ہندی میں ایک دوسرے کو پہچاننا بھول گئیں ۔ ض ۔ ظ ۔ ز وغیرہ ایک جیم میں منجمد ہو گئے ۔ قاعدہ ہے کہ غیر الفاظ قبول کرنے سے پہلے زبان سُنار کی طرح انہیں اپنے مزاج اور میلان کی آگ میں ڈالتی ہے ۔ پگھلنے کے بعد یہ الفاظ مختلف سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں ۔ ج ۔ اہل عرب کو نہیں بھاتی تو عمل زر گر سے چاوش ساوش بن جاتا ہے ۔ ڑ فارسی ایسی گوش نواز زبان میں نہیں کھپ سکتی ۔ لہذا کاڑہ نے کنارہ کی صورت اختیار کی ۔ درحقیقت ہر زبان کسی خاص ماحول میں پرورش پا کر ایک انفرادی

موج یا ترنگ اپنے میں ادا کر لیتی ہے۔ اور کسی دوسری زبان کے الفاظ کی دسترس اس تک اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ اسکے من کی موجو ل کا خیال رکھے۔ نارنگی اچھا خاصا لفظ ہے۔ لیکن فارسی زبان کو پسند نہیں۔ یہ خوش مزاج چاہتی ہے کہ نارنج ہو۔ اہل فارس جن کی اپنی طبیعت کا عکس فارسی زبان میں ہے۔ نارنج کیوں نہ کہیں گے۔ آپ دیکھیے نارنگی ہو کہ نارنج بات ایک ہے لیکن زبان کا مزہ مختلف ہے۔

ان تمام انقلابات کو بنظر غور ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے فلسفہ اور تصور پرستی کا ایک مسلسل عکس جو مدتوں ہندی پر پڑا تھا۔ اس سے زبان میں ایک میدانی سُست رو دریا کا پھیلاؤ آگیا تھا۔ ہندی زبان نہایت سیدھی سادھی اور صاف زبان تھی لیکن کم مایہ۔ اسکے الفاظ میں رس تھا۔ اس کے تصنع سے پاک جملوں میں گھُلاوٹ موجود تھی۔ لیکن اس میں اس وسعتِ بیان کا فقدان تھا جو فارسی کا طرۂ امتیاز ہے۔ فارسی کے اچھوتے لفظوں۔ تخیل میں رچی ہوئی ترکیبوں اور "جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں" اشعار و مطالب نے ہندی مصنفوں کے دل موہ لئے۔ اس لئے یہ کہنا کہ فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبان پر قطعی حاکم و محکوم کے رشتہ کا مرہونِ منت ہے قدرے سطحی نظریہ ہے۔ جھروکہ درشن ایسی ترکیب یقیناً سلطان کی خوشنودی کیلئے نہیں بنی۔ بلکہ ہندی اور فارسی الفاظ کے رسیلے اُلجھاؤ سے ایک بُنیادی احساس اور ضرورت کی ترجمانی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ۴۴

نویں صدی تک کی فارسی تصانیف میں ہندی الفاظ کے دخل کی رام کہانی میں مختصراً عرض کر چکا ہوں۔ اب ملک الشعرائے شاہجہانی ابو طالب کلیم کی ایک مثنوی کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ تاکہ وہ سلسلہ مغلیہ دور سے مربوط ہو جائے۔ دیکھیے کس بے تکلفی سے ہندی لفظ استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔

منہ بر وعدۂ تنبولیاں دل — کہ حرز جون خُردن آز و نیست حاصل
زحسن شستہ دھوبی چہ گویم — ازاں بے پردہ محبوبے چہ گویم
بتانِ راجپوت و شیخ زادہ — شکیب عاشقاں برباد دادہ
چہ جنبر شعلۂ شمع ست بے دود — کہ آتش می زند بر خرمنِ عود
زموروناں نظر در پوزہ دارم — کہ وصفِ مولسری را بر نگارم

مفردات سے قطع نظر مرکبات کی داستان سنئیے جو اس سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ ان محاوروں کو ملاحظہ فرمائیے اور پھر اندازہ کیجئے کہ کس حد تک فارسی زبان ہندوستانی ماحول سے متاثر ہو چکی تھی۔

زمین خفتن یعنی "زمین پر سونا" اس ہندوستانی رسم کا پتہ دیتا ہے جس سے سلاطین و شہزادگان کی وفات کے وقت ماتم داری کے ایام میں لوگ زمین پر سوتے تھے۔ چنانچہ امیر خسرو کہتا ہے۔

"وز زمین خفتن ہمہ آفاق شد پہلو کبود"

بیڑہ تنبول گرفتن۔ "بیڑہ اُٹھانا" اس محاورہ کے جو معنی غیاث اللغات میں لکھے ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ محاورہ بھی ایک خاص ہندوستانی رسم کی خبر دیتا ہے۔ صاحب غیاث کے الفاظ میں "درزمانِ سابق در سلاطین ہند رسم بود کہ پیش امرا برائے انصرام رسانیدن مہم بیڑہ پان می افتند۔ کسیکہ آنرا برداشتے انصرام آں مہم بذمہ او واجب شدے"

ان کے علاوہ سینکڑوں ہندوستانی محاورے فارسی میں داخل ہو گئے اور مستند مصنفین کے ہاں ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آواز کردن (آواز دینا)۔ گفتار گفتن (بات کہنا)۔ مالا کلام کردن (کسی سودے کا انقطاع کرنا)۔ نیشکر با پیل خوردن (ہاتھی سے گنا کھانا)۔ ع نشاید نیشکر با پیل خوردن (خسرو)۔ دندان در شکم بودن (پیٹ میں داڑھی یا دانت ہونا)۔ ع چوں خربزہ دندانش درون شکم است (خسرو)۔ بیک چوب ہمہ را راندن (سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا)۔ ے

خسرو زبان تست گوہر ہمہ را — پیدا ز نہاں تست جوہر ہمہ را
شد رانده سنانُ تیغ و تیر از کلکت — زینگونہ بیک چوب مراں ہر ہمہ را

دست بگوش نہادن (کانوں پہ ہاتھ رکھنا)۔

جان بہ بینی رسیدن (ناک میں دم آنا)۔ ع

جان مردم رسید در بینی (خسرو)

چراغ برکردہ طلب کردن (چراغ لیکر ڈھونڈنا)۔

پگ از سر فرود آوردن (پگڑی اُتارنا۔ بے عزتی کرنا)۔ چونی پگ از سر فرود

اورد شد چہ حرمت ماند (شمس سراج)۔
افیون فرود آوردن (افیون اُترجانا)۔
دوران آمدن (چکّر آنا)

خالہ کا گھر۔ ایک ہندوستانی محاورہ ہے۔ ضیا برنی یہی محاورہ استعمال کرتا ہے "چنانکہ خوردگان نازنیں درخانہ خالگاں مہاں روند" ان کی خوشی اسی میں ہے۔ خوشی ایشاں بریں است (مفرح القلوب)
اپنی گرہ سے خرچ کرنا۔ خرچ و اخراجات از گرہ خود کردن (شمس سراج عفیف)۔

جان ہے تو جہان ہے۔ اول جان بعدہ جہان۔ (مفرح القلوب)
آدھی کو چھوڑ ساری کے پیچھے دوڑنا۔ نیم نان گزاشتہ برائے تمام نان میرود۔
مجھ سے کیا لیگا۔ ازمن چہ خواہد گرفت۔ (مفرح القلوب)
اگر اپنی خیریت چاہتے ہو۔ اگر خیریت خود میخواہی۔
ان تلوں میں تیل نہیں۔ خالے برخش دیدم وگفتم کہ تل است۔
گفتا کہ بروئیست دریں تل تیلے (خسرو)

بعض الفاظ کے معنی میں ہندوستانی ماحول نے نئے مفہوم پیدا کردئے۔ جن سے اہلِ زبان کے کان ناآشنا رہے۔ مثلاً
متحرک۔ بمعنی چالباز۔ یہی حال لفظ حرکت کا ہے۔
کاہل۔ بمعنی ڈرپوک۔
خوش۔ بمعنی شاد و خرم۔ ایرانی فارسی میں بمعنی مرغوب آتا ہے
روشنائی۔ بمعنی مرکب یعنی سیاہی۔
سرکار۔ بمعنی خزانہ۔

چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے۔
"اگر حکم شود کہ تریاک مجرب کہ در خطامی باشد و بالفعل ازاں در سرکار موجود است بیاوریم"۔
غصہ بمعنی خشم و طیش۔ ایرانی فارسی میں بمعنی اندوہ گلوگیر استعمال ہوتا ہے۔

شد اندر غصہ شادی نمان و الا
مدد جست از پناہِ حق تعالیٰ (خسرو)

فارسی اور ہندی کی اس باہمی کشاکش اور کیمیاگری کی تصویر مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال میں کھینچی ہوئی ہے۔ مغل جب ہندوستان میں آئے تو شان و شوکت کے دلدادہ اور جوش و خروش کی زندہ مثال تھے۔ آہستہ آہستہ ہندوستانی مزاج کے خمیر نے ان پر اثر کیا۔ ان کی شاعری جو اس وقت رزمیہ تشبیہوں اور استعاروں سے مملو تھی۔ اب بزم طرب اور محفل عشرت کے کیا بات میں کھو گئی۔ قصیدوں میں جنگ و جدال کی رمزیں کم نظر آنے لگیں۔ حتیٰ کہ محمد شاہ رنگیلے اور بہادر شاہ کے زمانے میں استعاروں اور تشبیہوں کی ہیئت بالکل ہی بدل گئی اور کیوں نہ بدلتی۔ اولوالعزمی اور رجبیدہ کی جگہ سہل انگاری اور عیش و عشرت نے لے لی تھی۔ درباری شاعر اپنے سرپرست کے بغیر زندہ ہی کس طرح رہ سکتا ہے۔ اس نے وہی کچھ بیان کیا جو اسے نظر آیا۔ فارسی کے اُبلتے ہوئے چشمے اب نہر رود ریاں چھلکے سکے۔ پہلے زلف کو کمند و چوگان۔ ابرو کو خنجر مژگاں کو تیر اور آنکھوں کو قاتل و سفاک باندھا جاتا تھا۔ اب بنفشہ و سنبل
۴۳ یاسمن اور نرگس وغیرہ کو کامل استعاروں کا رتبہ حاصل ہوا۔ قصیدہ کی جگہ غزل نے لے لی۔ بلکہ غزل کی آمد شروع ہو گئی۔ تصوّف کو عروج ہوا۔ ہندوستان کی فضا اسکے لئے موزوں تھی۔ اسلامی تصوّف میں "گرو چیلہ" اور بھگتی مسلک کے پیرو ٹھیٹھ میں "پیر و مرید" کے الفاظ اپنائے گئے۔ اس امتزاج سے دونوں زبانوں اور قوموں میں یگانگت پیدا ہونے لگی۔ مسلمان اور ہندوستانی آرٹ اور کلچر نے ایک دوسرے کے قریب آنا چاہا۔ اردو زبان ان دونوں کے اثر و تاثر سے ہی سنوری۔ لیکن اس کا ذکر میری تقریر کی حدود سے باہر ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

یوسف ظفر

خود فریب

ترے حریمِ محبت میں آؤں گا امشب
جواں ستاروں کی کرنوں پہ گاتا آؤں گا
صدائے ماہ سے جب جھلملائینگے کوکب
چراغِ ساغر و مینا جلاتا آؤں گا

بہار تیرے لئے میرے دل کے داغ سہی
میرے لئے ترے عارض چمن بدامن ہیں
یہ میری آنکھوں کے آنسو ترے چراغ سہی
تری نگاہ سے میرے چراغ روشن ہیں

یہ سامنے کے دریچے میں دیکھ رازِ حیات!
کہیں زباں پہ نگاہیں ہیں، آنکھ میں باتیں
کہیں دھندلکے ہیں دن اور نور ہیں برسات
کہیں نہ دن ہے نہ بہتی ہوئی سیہ راتیں

مگر نہیں — تری محفل میں آج آؤں گا
ہزار اشک ہوں آنکھوں میں مسکراؤں گا

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

دُکھ سُکھ

علی اطہر اور چیخوف
(مسلسل)

(ڈراما)

آیوانوف

روسی مشہور افسانہ نگار چیخوف کا ایک شاہکار

(چوتھا ایکٹ)

ریوانوف کے مطالعہ کا کمرہ۔ ایک لکھنے کی میز جس پر کاغذات، کتابیں سرکاری لفافے، کھلونے اور ریوالور بے ترتیبی سے پڑے ہیں کاغذات کے قریب ایک لیمپ، دودھ کا قراب ایک رکابی میں مچھلی، کچھ روٹی، اور لکڑی کے ٹکڑے، دیواروں پر نقشے، تصویریں، بندوق، پستول، درانتی اور کوڑے لٹکے ہوئے ہیں، دوپہر کا وقت ہے۔

شیبلسکی، لبیڈیو، بورکن اور پیوتر۔ شیبلسکی اور لبیڈیو لکھنے کی میز کے قریب بیٹھے ہیں، بورکن اسٹیج کے بیچ میں کرسی پر پیر پھیلائے بیٹھا ہے، پیوتر دروازے پر کھڑا ہے۔

لبیڈیو:۔ فرانس کی پالیسی واضح اور متعین ہے ۔۔۔۔ فرانسیسی جانتے ہیں کہ انھیں کس چیز کی ضرورت ہے وہ چاہتے ہیں کہ سموسے کھانیوالوں کی کھالیں اور جرمنی کا قصہ بالکل مختلف ہے۔ جرمنی کے آنکھوں کے خار فرانس کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں ۔۔۔۔۔۔

شیبلسکی: مہمل ۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ جرمن قوم بزدل ہے اور فرانسیسی بھی بزدل ہیں وہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ زبان درازی کرسکتے ہیں۔ یقین جانو کہ معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھیگا۔ وہ جنگ کبھی نہیں کریں گے۔

بورکن:۔ اور میرا خیال ہے کہ جنگ کی ضرورت بھی نہیں۔ آخر اتمام اسلحہ بندی کانگریسوں اور اخراجات کا فائدہ کیا ہے؟ میں تمہیں بتاؤں کہ ایسی ہیں میں کیا کرتا۔ تمام ملک کے کتوں کو جمع کرکے ان کے جسم میں نشتر کے ذریعہ ایک مہلک مادہ پھیلا کر اور ان کو دشمن کے ملک میں چھوڑ دیتا ایک مہینہ کے اندر اندر تمام دشمن کتے کے کاٹے سے دیوانے ہوجاتے

لبیڈیو۔ (ہنستا ہے) اس کا سر دیکھنے میں چھوٹا ہے لیکن اس میں شاندار خیالات کی شدت ہے۔ جتنی سمندر میں مچھلیوں کی۔

شیبلسکی:۔ یہ ان معاملات کا تو ماہر ہے۔

لبیڈیو۔ خدا بھلا کرے تمہارا مائیکل ماسلوچ تم دل خوش کردیتے ہو (ہنسنا بند کردیتا ہے) ہم لوگ بک بک کئے جارہے ہیں لیکن واڈکا کا کیا ہوگا۔ ایک دور اور (تین گلاس شراب بھرتا ہے) ہم لوگوں کی بہترین صحت کیلئے (سب پیتے ہیں اور کچھ کھاتے ہیں) ہماری پرانی سرخ ہیرنگ مچھلی بہترین ناشتہ ہے

شیبلسکی:۔ نہیں ککڑی زیادہ اچھی ہوتی ہے ۔۔۔۔۔ دنیا کی پیدائش سے لیکر اب تک بڑے بڑے علما سوچ سوچ کر تھک گئے۔ لیکن نمک اور ککڑی سے بہتر کوئی چیز ابتک نہیں سوچ سکے (پیوتر سے) پیوتر جاؤ کچھ ککڑی لے آؤ اور باورچی سے کہو کہ ہمارے لئے چار پیاز کے سموسے تل دے اور گرم گرم بھیجے۔ (پیوتر باہر چلا جاتا ہے)

لبیڈیو:۔ واڈکا کے ساتھ کیویئر مچھلی بھی بری نہیں ہوتی لیکن اسکو استعمال ذرا سلیقہ سے کرنا چاہئے۔ ایک چھٹانک لہوڑے کو دو۔ پرانی پیاز اور ذرا سے زیتون کے تیل میں ملالو ۔۔۔۔۔ اور دو تین قطرے لیموں کا عرق ڈال کر کھاؤ ۔۔۔۔۔ نہایت ہی لذیذ ہوتا ہے اور اس کی تو خوشبو حیرت انگیز ہوتی ہے

بورکن:۔ تلی ہوئی گجن مچھلی بھی واڈکا کے بعد بہت مزیدار ہوتی ہے لیکن اسے تلنے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے۔ صاف کرکے پاؤڈر دی

کے گوادے میں ملاکر اتنا تلنا چاہئے کہ سوکھ جائے اور چبانے میں
کرکر کرنے لگے۔۔۔۔ کر۔۔۔ کر۔۔ کر۔۔ کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شیبلسکی:۔ کل مادام بیاکن کے یہاں ایک بڑی اچھی چیز کھانے میں آئی۔۔۔
۔۔۔۔ساگ

لیبیڈیو:۔ میں کہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شیبلسکی:۔ لیکن خاص طریقہ سے پکائی ہوئی۔ یوں سمجھو کہ پیاز، کنول کی پتیاں اور کئی طرح کے مصالحہ کے ساتھ ملاکر۔ جیسے ہی ڈھکن اٹھایا گیا ایک بھاپ نکلی اور خوشبو۔۔۔۔۔۔ نہایت لذیذ

لیبیڈیو:۔ کیوں دوستو کیا خیال ہے، رہے ایک دو اور (سب پیتے ہیں) ہماری بہترین صحت کیلئے (گھڑی دیکھتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ میں نکولائی کا انتظار نہیں کرسکتا۔ اب چلنے کا وقت ہوگیا ہے تم کہتے ہو کہ تم نے مادام بیاکن کے یہاں ساگ کھایا اور ہم نے ابھی تک ساگ دیکھا بھی نہیں۔ او ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم مارخاں کے یہاں کیوں گھسے رہتے ہو؟

شیبلسکی:۔ (بورکن کی طرف اشارہ کرتا ہے) کیوں! آپ ان سے میری شادی کرانا چاہتے ہیں

لیبیڈیو:۔ شادی! اے بھئی تمہاری عمر کیا ہے؟

شیبلسکی:۔ باسٹھ برس

لیبیڈیو:۔ شادی کرنیکی بہترین عمر! اور مارفا سے تمہارا جوڑا بہت خوب ہوگا۔

بورکن:۔ سوال مارفا کا نہیں اسکے آدمیوں کا ہے۔

لیبیڈیو:۔ اور بھی کچھ فرمائیے۔ مارفا کے روپئے اسکے بعد   کرنے کا حوصلہ کیجئے گا۔

بورکن:۔ جب انکی شادی ہوجائے گی اور جیب روپیوں سے لد جائیگی۔ تب کہے گا کہ   کرنے کا حوصلہ ہے کہ نہیں۔ انکی قسمت پر آپکو رشک آئے گا۔

شیبلسکی۔ اور جانتے ہو آپ اس معاملے میں بڑے خلوص کا اظہار فرماتے ہیں ان علامہ زمان کو یقین ہے کہ میں وہی کروں گا۔ جو یہ فرماتے ہیں۔ اس سے شادی بھی کروں گا۔

بورکن:۔ کیوں نہیں۔ یقینی۔ کیا تم کو بھی اس کا یقین نہیں؟

شیبلسکی:۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔۔۔۔ مجھے کب اس کا یقین ہوا تھا

بورکن:۔ شکریہ۔۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔ تو آپ مجھے بیوقوف بنانا چاہتے ہیں۔ پہلے تو کہا کہ شادی کروں گا اور اب فرماتے ہیں کہ نہیں کرونگا ۔۔۔۔ کون بیہودہ آپ کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اور میں زبان دے چکا ہوں۔ تو تم اس سے شادی نہیں کروگے؟

شیبلسکی:۔ (کندھے ہلاتے ہوئے) تم اسے سچ سمجھ بیٹھے۔ عجیب آدمی ہو

بورکن:۔ (غصہ میں) اگر یہ بات تھی تو ایک شریف خاتون کو پریشان کرنے سے تمہارا کیا مطلب تھا؟ وہ تو کاؤنٹس ہونے کے پیچھے پاگل ہوئی ہے، نہ سوسکتی ہے۔ نہ کھا سکتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ اور آپ اسکو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ یہ شرافت ہے؟

شیبلسکی:۔ (انگلی اٹھاتے ہوئے) خیر اگر میں یہ حرکت کر ہی بیٹھوں تو میرا کیا ہوگا! صرف شرارت کیلئے میں جاکر شادی کر ہی لیتا ہوں۔ واللہ۔۔۔ بڑا تماشا ہوگا۔

(لووو داخل ہوتا ہے)

لیبیڈیو:۔ ڈاکٹر صاحب تسلیمات عرض ہے (لووو کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور رگاتا ہے) ڈاکٹر صاحب خدا کیلئے مجھے بچائیے۔ جناب مجھ پر موت کی ہیبت طاری ہے۔ ۴۷

لووو:۔ کیا ابھی تک نکولائی ایلکزیوچ نہیں آئے؟

لیبیڈیو:۔ جی نہیں۔ میں ایک گھنٹہ سے ان کا انتظار کر رہا ہوں (لووو یہ   میں اسٹیج پر ٹہلتا ہے) کیوں بھائی اناپیٹرونا کیسی ہے

لووو:۔ بہت بیمار ہے۔

لیبیڈیو:۔ (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) کیا میں جاکر عیادت کرسکتا ہوں؟

لووو:۔ نہیں مہربانی کرکے نہ جائے! میرا خیال ہے وہ سو رہی ہے۔۔۔۔
۔۔۔۔ (وقفہ)

لیبیڈیو:۔ وہ بہت   نیک عورت ہے (ٹھنڈی سانس لیتا ہے)۔ ساشا کی سالگرہ میں جب وہ میرے یہاں بیہوش ہوئی تو میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ بیچاری زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہیگی۔ معلوم نہیں اسکو کیا ہوگیا تھا۔ جب میں دوڑ کر اسکے پاس گیا تو دیکھا وہ لیٹی تھی اور موت کی زردی اسکے

چہرہ پر چھائی ہوئی تھی۔ اسکے پاس نکولائی گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا۔ اور
اتنا ہی زرد ہو رہا تھا جتنی وہ اور ساشا رو رہی تھی ایک ہفتہ تک
میری اور ساشا کی یہ حالت رہی گو یا ہم لوگ چندھیا گئے ہیں۔

شیبلسکی:۔ (لوو وسے) سائنس کے معزز علمبردار ذرا یہ تو بتائیے کہ وہ کون
عاقلِ دوران تھا جس نے یہ پتہ چلایا کہ جن عورتوں کے سینے کمزور
ہوتے ہیں انھیں نوجوان کی زیادہ آمد و رفت سے فائدہ ہوتا ہے
یہ بڑی عظیم الشان تحقیق ہے یہ کس کا کارنامہ ہے! ایلوپیتھک کا
یا ہومیو پیتھک کا؟

(لوو وجواب دیتے دیتے رک جاتا ہے اور ایک نفرت آمیز نظر
ڈال کر چلا جاتا ہے)

شیبلسکی:۔ کیسی خشک کر دینے والی نظر تھی . . . .

لیبیڈیو:۔ معلوم نہیں کس شیطانی جذبہ میں تمہاری زبان اس طرح
چلنے لگی ہے۔ اسکی توہین کیوں کی تمنے؟

شیبلسکی:۔ (چڑاونے انداز میں) تو وہ جھوٹ کیوں بولتا ہے۔
یہ سب جھوٹ ہے میں اسے برداشت نہیں کرسکتا

۱۴ لیبیڈیو:۔ آپ کیسے جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟

شیبلسکی:۔ (اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) میں یہ خیال برداشت نہیں کرسکتا کہ
ایک زندہ مخلوق بلا کسی وجہ کے مرجائے۔ چھوڑو اس موضوع کو
(کوشم داخل ہوتا ہے)

کوشم:۔ (ہانپتا داخل ہوتا ہے) کیا نکولائی الیکزیوچ گھر پر نہیں؟
اداب عرض ہے (جلدی جلدی سبھوں سے ہاتھ ملاتا ہے) کیا وہ
گھر پر نہیں؟

بورکن:۔ نہیں وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔

کوشم:۔ (بیٹھتا ہے اور پھر جھٹکے کے ساتھ اٹھتا ہے) اگر ایسی بات ہے
تو خدا حافظ (ایک گلاس شراب پیتا ہے اور پھر جلدی جلدی کچھ
کھاتا ہے) میں جاتا ہوں . . . . . . بہت مصروف ہوں . . .
. . . تھک کر چور ہو گیا ہوں . . . کھڑا ہونا بھی مشکل ہو رہا ہے . . .

لیبیڈیو:۔ تم نازل کہاں سے ہو گئے؟

کوشم۔ بار بانو کے یہاں سے . . . . . . ہم لوگ رات بھر ونٹ کھیلتے
رہے۔ ابھی ابھی ختم کیا ہے . . . . میں تو پٹ گیا . . . . . .
وہ باربانو چمار کی طرح کھیلتا ہے! (رونی آواز میں) ذرا سنو۔
میں برابر پان کھیل رہا ہوں . . . . (بورکن کو مخاطب کرتا ہے
وہ کھسک جاتا ہے) وہ ٹھکری چل پڑا لیکن میں پھر پان کھیلا، وہ
پھر ٹھکری چل پڑا . . . . . نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہاتھ بھی نہیں بنا سکا۔
(لیبیڈیو سے) ہم لوگ چار چڑیا بولے۔ میرے ہاتھ میں ایکہ بیوی
اور پانچ اور چڑیا کے پتّے اور حکم کا ایکہ دہلا دو اور پتّے تھی . . .

لیبیڈیو:۔ (کانوں میں انگلیاں دیتے ہوئے) رحم کیجئے، خدا کیلئے مجھے
بخشئے۔

کوشم:۔ (کاؤنٹ سے) دیکھتے ہیں جناب، ایکہ، بیوی، چڑیا کے
پانچ اور پتّے ایکہ اور دہلا دو اور حکم . . . .

شیبلسکی:۔ (اس کو ہٹاتے ہوئے) چلے جاؤ میں تمہاری بات نہیں سننا چاہتا

کوشم:۔ اور لیکا یک ایسی بدقسمتی کے حکم کے ایکہ پر پہلے ہی ہاتھ میں ٹرمپ
ہو گیا۔

شیبلسکی: (میز پر سے ایک ریوالور اٹھاتے ہوئے) چلے جاؤ نہیں تو میں
تمہیں گولی مار دوں گا۔

کوشم:۔ (ہاتھ ہلاتا ہے) برا ہو اس کا . . . کیا ایک بھی ایسا آدمی نہیں
جس سے میں کچھ باتیں کرسکوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں آسٹریلیا
میں پہونچ گیا ہوں، نہ کوئی مشترک دلچسپی ہے نہ ایک دوسرے
سے ہمدردی . . . . سب کے سب اپنے آپ میں مگن ہیں . . .
. . . خیر مجھے چلنا چاہئے . . . . . دیر ہو گئی۔ (اپنی ٹوپی جھپٹ کر
اٹھا لیتا ہے) وقت قیمتی ہے (لیبیڈیو سے ہاتھ ملاتا ہے) پاس
(قہقہہ) (کوشم چلا جاتا ہے اور دروازہ میں اودوتیا نزاروونا
سے ٹکر کھاتا ہے)

اودوتیا:۔ (چیختی ہے) خدا غارت کرے مجھے دھکا دیتے ہو۔

سب لوگ:۔ آ۔ آہ۔ یہ تو ہر جگہ موجود رہتی ہے۔

اودوتیا:۔ تو تم سب لوگ یہاں ہو اور میں نے گھر بھر ڈھونڈھ ڈالا۔
گڈ مارننگ۔ میرے چمکتے ہوئے فاختو۔ کھانے کا مزہ لے رہے ہو؟
(سبھوں کو خوش باش کہتی ہے)

لیبیڈیو:- آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں؟

اودوتیا:- کام ہے جناب والا (کاونٹ سے) ایسا کام جس کا تعلق آپ سے ہے حضور عالی۔ (جھکتی ہے) مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو سلام کہوں اور خیریت دریافت کروں ...... میری خوبصورت گڑیا نے مجھے تم سے یہ کہنے کا حکم دیا ہے کہ اگر آج شام تم آکر اس سے ملاقات نہیں کروگے تو وہ رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالے گی اس نے کہا، مائیڈیر اس کو الگ لیجاکر کان میں رازدارانہ طریقہ پر کہنا۔ لیکن رازداری کی کیا ضرورت ہے، یہاں پر ہم سب ایک دوسرے کے پرانے دوست ہیں۔ اسکے علاوہ کچھ گناہ تو کرنہیں رہے ہیں۔ ہم تو فریقین کی رضامندی اور محبت کے ساتھ جائز طریقہ پر شادی کرانا چاہتے ہیں۔ یوں تو میں ایک گنہگار عورت ہوں لیکن ابتک شراب کا ایک قطرہ بھی چکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ مگر اس موقع پر ایک گلاس پیوں گی۔

لیبیڈیو:- اور میں بھی ایک گلاس پیوں گا۔ (گلاس بھرتا ہے) اور بڑھی کبوتری تم پر تو سن وسال کا کوئی اثر بھی نہیں معلوم ہوتا تم اس وقت بھی کافی بوڑھی تھیں جب تیس سال قبل میں تم سے پہلے پہل ملا تھا۔

اودوتیا:- اب تو میں سالوں کا شمار بھی بھول گئی۔ ... دو شوہروں کو دفنا چکی ہوں۔ تیسرے سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن جہیز کے بغیر کوئی مجھے قبول ہی نہیں کرنا چاہتا۔ آٹھ لڑکے ہوئے ...... (گلاس اٹھاتی ہے) خیر خدا کرے کہ ہم لوگوں نے یہ نیک کام جو شروع کیا ہے اسکی مہربانی سے انجام کو پہونچ جائے۔ یہ دونوں زندہ رہیں گے۔ پھلے پھولیں گے اور ہم لوگ ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اللہ کرے، دونوں میں محبت اور یگانگت ہو (پیتی ہے) یہ تو کڑ وی دودکا ہے

شیبلسکی:- (ہنستے ہوئے لیبیڈو سے) لیکن جانتے ہو بڑا طرفہ یہ ہے کہ لوگ واقعی سمجھتے ہیں کہ میں .... حیرت انگیز بات ہے (اٹھ جاتا ہے) کیا خیال ہے تمہارا پادشا ما واقعی میں یہ حرکت تبیح کر ہی ڈالوں صرف شرارت کے لئے .. .. بڈھا کُتا ہڈیاں کیوں نہ چبائے پاشا این؟

(باقی)

قاضی عبدالغفار

پیش لفظ

کسی دلدوز نغمہ پر   اظہار ستایش کرنا، کہ ارباب محفل نقادِ فن سمجھ کر داد کی داد یں۔ کھلی ہوئی بازاریت ہے "پیش لفظ" پڑھ کر جو طوفان اٹھے ان کے بیان پر نہ قدرت ہے نہ اظہار ستایش کی ہمت۔ کہنا صرف یہ ہے کہ یہ شاہکار ایک تصنیف کا نامکمل دیباچہ ہے جو قاضی عبدالغفار صاحب نے بیگم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے اصرار سے "جہاں نما" کے لئے عنایت کیا، اور بیگم صاحبہ نے ایشا کو عطا فرمادیا۔

(ساغر)

روحوں میں طوفان اٹھتے ہیں جس طرح سمندروں میں ـــــ ایک ایسے ہی طوفان میں کسی کشتی کے غرق ہونے کا یہ قصہ ہے۔ اگر آپ سمجھنا بھی چاہیں تو سن لیجئے اور اگر سمجھنے میں کچھ زحمت ہو تو شکایت نہ کیجئے۔ کہنے والا اس بات کا ضامن نہیں کہ آپ سمجھ بھی جائیں گے!۔

اس سمندر کا داستان گو نہ جانے کب سے اپنی داستان بیان کر رہا ہے اور نہ جانے کب تک بیان کرتا رہیگا۔ لیکن اس داستان کا انجام نہ وہ بیان کرسکا اور نہ کوئی سننے والا اس کا تصور کرسکتا ہے طوفان کی ایک موج یہ داستان بھی ہے لیکن پھر کیا ہوگا اگر اس موج کو اسکے سمندر سے جدا کردیں؟ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ یعنی موج سے شناسائی اور سمندر سے بیگانگی!۔

ان طوفانوں میں جتنی ان گنت موجیں ہیں اتنی ہی لاتعداد کشتیاں ہیں۔ ہر موج کو جو اٹھتی ہیں آپ شمار کیجئے اور ہر کشتی کو جو غرق ہوتی یا چٹان سے ٹکراتی ہے یا موجوں کے تھپیڑے کھا کر کسی ویران ساحل پر الٹ جاتی ہے آپ گن لیجئے، ان کشتیوں میں بہت سی ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو موجوں نے کسی پتھریلے ساحل پر پٹک دیا اور پھر کسی دن سمیٹ کر لے گئیں ان ٹوٹی ہوئی کشتیوں کو بھی موج کے آغوش میں جگہ ملتی ہے۔ وہ بار بار پھینکی جاتی ہیں اور بار بار اسی آغوش میں سمیٹ لی جاتی ہیں! جب تک ان کا ایک تختہ بھی باقی ہے ان کے اور موج کے درمیان یہ لگن باقی رہتی ہے ـــــ تم اسے فلسفہ کہوگے میں اسے کیفِ حیات کہتا ہوں!۔

یہ ایک چھوٹی سی پُرانی کشتی تھی ـــــ کوئی بڑا جہاز نہ تھا ـــــ جس کا حال تمہیں سناتا ہوں۔ اس کشتی کے بادبان پارہ پارہ ہوچکے تھے اور اسکے پتوار ٹوٹ چکے تھے اور ملاح کی نوازشوں سے وہ محروم ہوچکی تھی۔ پھر بھی وہ تھی ایک کشتی۔ کتنی ہی سخت اور پھسلواں چٹانوں پر وہ پٹخی گئی۔ کتنے ہی ساحلوں پر اوس نے تنہائی کے دن اور کس میرسی کی راتیں بسر کیں۔ لیکن جن موجوں نے اسکو پٹخا تھا وہی اسکو اٹھا کر لے گئیں ـــــ پروردگان آغوش موج کی یہ داستان کوئی نئی تو نہیں ہے!۔

کسی ملاح نے موج اور کشتی کے اس لگاؤ کو اپنی ایک مثنوی میں بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ!۔

"موج اور کشتی الگ الگ دو نام ہیں لیکن حقیقت
ایک ہے حقیقت میں یہ دو موجود ہیں۔ کشتی کے بغیر
موج کی نمود کیا ہے؟ سوائے اسکے کہ وہ سمندر کی
ایک ٹھوکر ہے اور بغیر موج کے کشتی کیا ہے؟ سوائے
چند تختوں کے جن کو بڑھئی نے اپنی آری سے کاٹا
تھا اور اپنے ہتوڑوں سے کوٹا تھا"

شاعر کے ان تصورات کو تم جب زندگی کے سانچے میں ڈھالکر دیکھوگے تب تم کو یہ خبر ملے گی کہ جس طرح سمندر بغیر موج کے بیجان ہے اسی طرح موج بغیر کشتی کے اپنی قوت پر مغرور اور سربلند نہیں ہوسکتی ہے

میں موج کا رقص اور موج کے رقص میں کشتی کی گردش ـــــ نقطۂ تکمیل یہ ہے اور شاید اس کو انسانوں کی اصطلاح میں جوانی کہتے ہیں ۔

مجھے معلوم نہیں کہ کشتی کتنے چشموں اور دریاؤں سے گزرتی ہوئی کتنے ساحلوں کو چھوتی ہوئی کتنے سمندروں کے سینہ پر اچھلتی ہوئی کتنے بادلوں کی کڑک اور کتنی بجلیوں کی تڑپ سے آشنا ہوتی ہوئی ۔ اس بظاہر آخری طوفان کے دامن تک پہونچی تھی جس سے میری داستان کا آغاز ہوتا ہے ۔ بہر حال میں نے اُسکو ایک ویران جزیرہ کے پتھریلے ساحل پر بہت شکستہ حالت میں پایا ۔ وہ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح سے اون قافلوں کا خروش سُن رہی تھی جو سمندر کے طوفان میں گزر رہے تھے لیکن اُن تک پہونچ نہیں سکتی تھی ـــــ اسکی خستگی اور درماندگی سراپا انتظار تھی ـــ اُسکی تھکن میں بھی آغوشِ موج کے ہنگاموں کی تمنائیں بیدار تھیں ۔

جاڑوں کی یہ رُت تھی ۔ ویران جزیرہ کے ساحل پر وہ آخری منظر میں نے دیکھا تھا ، جب پرخروش اور غضبناک سمندر کی بے پروا موجوں نے اس کشتی کو اتنے چکر دئیے تھے ۔ اتنی دفعہ اچھالا اور گرایا تھا کہ اس کے رقص کی ہر لرزش سے ایک ایسی تھکن مترشح ہونے لگی تھی جسکو دنیا کے لوگ بڑھاپے کے نام سے یاد کرتے ہیں ! لیکن کیا طوفان کی موجوں کے جھکولوں سے جدا ہو کر ساحل کی چٹانوں پر بکھر جانا کوئی ایسی انتہا ہے جو پھر کبھی اپنے آغاز کی طرف رجوع نہ ہوگی ؟ یا اگر یہ امکان باقی ہے کہ کسی دن پھر کوئی موج اس اوندھی کشتی کو یا اسکے ٹوٹے ہوئے تختوں کو اپنی دامن میں لپیٹ کر بہا لے جائیگی اور سمندر کے سینہ پر بکھیر دیگی تو پھر کیا ان ٹوٹے ہوئے تختوں کی یہ انتہا بھی انکے آغاز ہی کا دوسرا نام نہیں ہے ؟ اور نہیں تو پھر کیا ہے ؟ ۔

موسم سرما کی اندھیری رات تھی جس کی ظلمت کے سینہ میں ایک بے اختیار آرزو کی طرح ، ایک بے محابا تمنا کی صورت ، بجلی چمک رہی تھی کہ گویا غضبناک دیوتاؤں کی فوجیں مصروف پیکار ہیں ۔ ان دیوتاؤں کے سمندر کا نیلا پانی رات کی سیاہی سے اتنا سیاہ فام تھا کہ اگر چٹانوں کی سختی موجوں کے منہ میں کف پیدا نہ کرتی جس کے دھبے بجلی کی چمک کے ساتھ نظر آرہے تھے تو آسمان و زمین کی وسعتوں میں ایک زہرہ گداز خروش کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا ہوتا ۔ موجوں کے سینہ کو کشتیوں کے تپوار شیر کے پنجہ کی طرح چیر رہے تھے ۔ ہوا کا وہ فراٹا ۔ بادل کی گرج اور چٹانوں پر موجوں کے تھپیڑوں کی آواز ـــ ارض و سما کی درمیانی وسعت میں یہ سارا خروش بقا سے فنا اور فنا سے بقا کی منزلوں کا ایک پھیلاؤ تھا جس میں اس مضطرب کشتی کی جوانی نے ہزار دفعہ بوڑھاپے کی منزلیں طے کیں اور ہزار دفعہ اپنے بوڑھاپے سے جوانی کی طرف عود کیا ! ۔ یہ ہر آن اور ہر لحظہ کی ایک مسلسل داستان ہے برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی کی پرخروش موجوں کے عریاں شانوں اور مضبوط بازووں پر برف کے گالے اس طرح گر رہے تھے کہ اگر تاریکی نہ ہوتی تو سارا عالم سفید ہی سفید نظر آتا

ہر نئی موج کے تھپیڑے میں اس کشتی کے شکستہ تپواروں کی چڑ چڑانے کی آواز آنیوالے بوڑھاپے اور جانیوالی جوانی کی کشمکش کا ایک کرب ناتمام تھا ۔ جس میں موج کے بازو کی قوت ایک طرف اور کشتی کا زندہ رہنے پر اصرار دوسری طرف اپنے ارادوں کو آزما رہا تھا ۔ ہر تھپیڑے کے بعد یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی (شاید) آخری ضرب ہے لیکن مضطرب سمندر کی کھلی ہوئی گود میں کشتی کے تختوں کی مسکراتی ہوئی دراز ہر موج سے یہ کہتی سنائی دیتی تھی کہ

" میں کیونکر فنا ہو سکوں جب تک کہ تو باقی رہے "

ویران جزیرے کے ساحل پر شاعر کی چشم نگراں اس کشمکش کو دیکھ رہی تھی اور فلسفی حیران تھا کہ اگر اس طوفان زندگی کا کوئی آخری مقام بھی ہے تو وہ کہاں ہے ۔ کہاں ہے کوئی ایسا سکون مطلق جسکی خاموش وادیوں میں سمندر سو جائے اور موج بے خروش ہو جائے ۔

ابھی مشرق کی حد نظر پر ایک سُرخ پردہ کی جھالر کو سمندر کی موجیں اپنے دامن سے دھو رہی تھیں اور رات کی تھکی ہوئی کشتی نے ساحل کے

سامنے دم لینا چاہا تھا کہ یکایک کسی زیادہ شوخ موج نے اسکے نیچے کا ندھا مارا اور پہلے اس سے کہ یہ سفینۂ صبح کے سکوں میں موج کی اس شوخی کے خلاف کوئی احتجاج کرے۔ صرف ایک ہی جھکولے میں وہ ساحل کی چٹان پر پھینک دیگئی۔ زندگی میں بہت سے دن ایسے ہوتے ہیں جب سورج نکلتا ہے مگر صبح نہیں ہوتی یا جب صبح ہوجاتی ہے مگر سورج نہیں نکلتا ! لیکن زندگی کی بہت سی وحدتیں جو صبح کا انتظار کرتی ہیں یا سورج کو دیکھنے کی تمنا رکھتی ہیں۔ غلطی یہ کرتی ہیں کہ شاعر سے مشورہ کئے بغیر مایوس ہوجاتی ہیں ! ان بدنصیبوں کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ کسی دن ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح اور سورج دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ سورج کی کرنیں صبح زندگی کے دامن سے لپٹی ہوئی آتی ہیں۔ یہ صبح بہت روشن ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رات بھر کے طوفان کے بعد ہی وہ آتی ہیں !۔

غضبناک سمندر نے آخری جھکولے سے کشتی کے تختوں پر کیلوں کی گرفت بہت ڈھیلی کر دی تھی اور ساحل کی ناہموار سطح پر دور سے یہ ایک دھبہ سا نظر آتا تھا جس پر موجیں اپنے جھاگ اڑا رہی تھیں ــــــ اس طرح جیسے برات کے دولہا کی سواری پر یا کسی تابوت پر پھول برسائے جاتے ہوں !۔ دولہا کی سواری اور جنازہ کا درمیانی فاصلہ اتنا کم ہے کہ شاعر یا فلسفی جب جنازہ سے برات تک اور برات سے جنازہ تک منزلیں شمار کرتا ہے تو موت وحیات کے اس محور پر کچھ بھی نہیں پاتا سوائے ایک "عزم حیات" کے۔ اس کی نظر میں کشتی کا ٹوٹا ہوا ہر تختہ بجائے خود ایک کشتی ہے ! . . . .

شام

صاحبزادہ محمد علی خاں میکش
حیدر آبادی

چھین لے، اس ظلمت وانوار کی دُنیا سے شام
جستجوئیں نامکمل، آرزوئیں نا تمام
اپنے دامانِ شفق کو کر بھی لے رنگین تر
نوجوانی دے رہی ہے، لے تجھے خونِ جگر

آسماں پر نور و ظلمت کا یہ ہلکا اتصال
جیسے دُلہن کے دھڑکتے دل میں دُھندلے سے خیال
ٹہنیوں پر یہ تھکے ماندے پرندوں کی پُکار
جیسے پھولوں کی ہنسی میں چند لمحوں کی بہار
ڈوبتے خورشید کی یہ نیم جاں پرچھائیاں
نیند سے پہلے کی جیسے مضمحل انگڑائیاں

چھا رہا ہے پھر اندھیرا، جل رہی ہیں پھر چراغ
ناامیدی میں چمک دکھلا رہے ہیں دل کے داغ
ایک گہری فکر میں کھویا ہوا ہے پھر شباب
بن رہے ہیں "آج" کی آنکھوں میں شاید "کل" کے خواب
رقصِ انجم کے لئے بزمِ فلک کا اہتمام
لے رہا ہے پھر مرے اشکوں سے اندازِ خرام
ہو رہی ہے زندگی پھر ایک خاموشی میں گم
اک فریبِ مرگ میں، اک خود فراموشی میں گم

تُو جو آئی، غم کو حُسنِ جاودانی مل گیا
آخری سانسوں کو ذوقِ زندگانی مل گیا

عبدالرشید عرفان

رکشا والا

"دیوی جی! آپ روزانہ کوٹھی جاتی ہیں نا؟"

"ہوں ——— کیوں؟"

"یونہی ——— اگر ——— قریب ہی کے رکشا پر" ——— یہ کہہ کر رکشا والا ملتجی نگاہوں سے تکنے لگا۔

"اُف! بہت گرمی ہے ذرا تیز چلو" ——— ایک مرتبہ رکشا نے ذرا زور سے ہچکولا کھایا، تھوڑی دور چلنے پر رفتار پھر دھیمی ہو گئی جیسے رکشا والے کی بھدی پنڈلیوں کے اُبھری ہوئی رگوں میں خون جم کے رہ گیا ہو، اس نے انگوچھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"سچ مچ بہت گرمی ہے، تھوڑی ہی دور میں جان نکل گئی ——— ہاں تو روزانہ اسی وقت آپ کوٹھی جاتی ہوں گی ———!؟"

"نہیں اس سے کچھ سویرے ہی، آج کچھ دیر ہو گئی ہے ——— بس بس آہستہ سامنے والی کوٹھی ہیں۔

"بہت اچھا سرکار"

"کے پیسے ہوئے تمہارے؟" ———

"ہونہہ! بھلا آپ نہیں جانتی ہیں ——— ہیں ہیں" ——— رکشا والے نے ایک کثیف ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا، "روز کا آنا جانا رہا ہوگا، آپ سے کیا چھپا ہے سرکار؟" ———

"اچھا یہ لو اور دیکھو کل ساڑھے آٹھ بجے ہی ہم کو فرصت ہو جائیگی، کل سنیچر ہے اور ہاں سنو! پرسوں اتوار ہے، تم جانتے ہو نا کہ اتوار کو چھٹی رہتی ہے؟" ———

"جانتے ہیں دیوی جی! ——— ہم بھی جب ———!!" جیسے رکشا والے کے سامنے اس کے طالب العلمی کے زمانہ کا سارا اتوار ناچ گیا ہو

"کیا تم بھی جب ———؟"

"کچھ نہیں ——— یہی کہ ہم بھی جب پڑھتے تھے تو ———!"

"اچھا! تم بھی کبھی پڑھتے تھے ———؟ ——— تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے رکشا والے؟"

"یہی معمولی سی چند کلاسیں سرکار" ———

"آخر کہاں تک تم نے پڑھا ہے؟" ———

"کیا کیجئے گا پوچھکر سرکار؟ ——— کل ٹھیک وقت پر ہم ضرور پہونچ جائیں گے، دیکھئے دوسرا رکشا نہ کر لیجئے گا ———"

اُس نے پیسوں کو انٹی میں رکھا۔ اور پاس والے نیم کی چھاؤں میں جاکر پسینہ سے تر گنجی کو اُتار کر ہوا دینے لگا، جب ذرا جان میں جان آئی تو پائپ پر جاکر مُنہ ہاتھ دھویا، پانی پیا اور پھر بڑ بڑانا شروع کیا۔

"کتنی شریف ہیں یہ؟ آج کل کون غریب پر نظر کرتا ہے، کرایہ بھی تو بیجا نہیں دیا، دو پیسے زائد ہی دیدیئے، کل کہدوں گا، سرکار ۲ پیسے بیشی آپ نے دیئے ہیں ——— لیکن ——— شاید برا مانیں، بڑوں سے زیادہ بولنا بھی تو ٹھیک نہیں، مگر کل یہ ضرور پوچھوں گا اُس طرف سے کس کے رکشا پر آتی ہیں، شاید میرے ہی رکشا پر!"

——— کشور نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آسمان تو کسی کے دن ہمیشہ یکساں نہیں رہنے دیتا ——— گاؤں میں جو ہیضہ کی وبا پھیلی تو خاندان کا خاندان اجڑ گیا، ایک ایک مکان سے بہ یک وقت پانچ پانچ، چھ چھ لاشیں نکلتی تھیں، کوئی جنازہ اٹھانے تک کو نہیں تھا ——— بُرا ہو لڑائی کا، شاید کہیں سے "کالرا فیچ"، شیشیوں میں بند ٹرین سے جا رہے تھے ان میں سے کچھ شیشیاں کسی طرح ٹوٹ گئیں اور پورے گاؤں میں ہیضہ پھیل گیا ——— جگت پور جو آج کل ایک ویران اُداس اور سُنسان بستی ہے کچھ دنوں پہلے پھلا پھولا، صدا بہار گاؤں تھا، نہ جانے کشور نے اُس جہنم میں کون سا ارادہ کیا تھا یا کمزور مزدور اور غریب

کسانوں پر اس کے آبا و اجداد کے بے جا ظلم و تشدد کا ثمرہ تھا یہ کہ جسکی سزا وہ رکشا والا ہوکر بھگت رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، بہت ٹھیک کہتے ہیں لوگ، کشور آخر کرتا کیا، اس نے تعلیم بھی تو زیادہ نہیں پائی تھی، دسویں جماعت تک وہ بھی حقیر سے قصبے کے اسکول میں ——— آج کل تو کتنے بی، اے مارے مارے پھرتے ہیں۔ افلاس کی شدت اور بھوک نے سینکڑوں کو ادنی جگہوں کی خانہ پُری کیلئے آمادہ کر دیا ہے۔ کشور تو انکے مقابلہ میں کم پڑھا لکھا اور اجڈ دیہاتی تھا ——— پھر بھی ایک تعلیم یافتہ سے زیادہ پاک طینت ا——— مگر پاک طینتی پیٹ نہیں بھر سکتی۔ اسے اپنا پیٹ پالنا تھا ——— گاؤں کے کسی بھلے مانس نے رائے دی ہوگی۔ بھیّا! تم ابھی بھگوان کی دیا سے جوان مضبوط، اور تندرست ہو۔ پڑھے لکھے ہو شہر کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہاں کسی کے لڑکے کو پڑھانا اور کچھ نہیں تو کم از کم بھر پیٹ کھانے کو تو مل ہی جائیگا! مصیبت کے وقت ذراسی دلجوئی بھی انسان کے لئے بڑا سہارا ہوتی ہے، فلک زدہ کشور کے سامنے ایک دھندلا سا پُرامید مستقبل ناچ گیا، اُس کے خیال میں ایک لہر سی دوڑ گئی، اسی روز پو پھٹتے ہی اُس نے باپ دادا کی نگری کو خیرباد کہنے کی ٹھان لی۔ شہر جاتے وقت اُسکے قدم من من بھر کے ہوگئے تھے۔ وہ چلا جارہا تھا اور مڑ مڑ کر اپنی جنم بھومی کو تکتا جاتا تھا ——— وہ جارہا تھا، پُربہار باغوں ہرے بھرے کھیتوں، پُل اور اپنے کنوئیں کی منڈیروں کو چھوڑ کر جہاں گاؤں کی حسین و الّھڑ کنواریاں پانی بھرنے آتی تھیں ——— وہ چلا جارہا تھا۔ بھوک کا مارا ہوا، اُن حسین اور رسیلے نغموں کو چھوڑ کر جو برکھا کی سہانی رات میں دیہاتی سندر کنواریاں مست ہو ہو کر چھیڑا کرتی تھیں ——— اسے بچپن کے خوشگوار دن رہ رہ کر یاد آرہے تھے وہ درختوں کو یاس میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے آلودہ نگاہوں سے دیکھتا تھا، درختوں کی ڈالیوں کو تو عالم وارفتگی میں بے تحاشا پکڑ پکڑ کر چومتا جاتا تھا ——— لیکن وہ آگے ہی بڑھتا جاتا تھا کیونکہ اسے آگے ہی بڑھنا تھا ——— وہ زمانہ بیتے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے جب یہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ دن دن بھر انہیں شاخوں پر "ڈول پتا" کھیلتا تھا، اسکی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، لیکن اس کے قدم آگے ہی اُٹھتے جاتے تھے، کوئی اجنبی طاقت اسے روکتی تھی لیکن کوئی نامعلوم جذبہ اسے اپنی طرف کھینچتا تھا ——— دن چڑھے وہ شہر میں پہنچ گیا در در کی خاک چھان ماری لیکن ہر جگہ ناکامی و محرومی، یہاں تک کہ فاقوں کی نوبت پہنچی کیونکہ ایک دیہاتی اگر تلاش معاش میں شہر آکر کم از کم ایک دو وقت فاقہ نہ کرلے تو وہ دیہاتی کیسے کہلا سکتا ہے ———

——— پر پیٹ کی مار بڑی ہی بری ہوتی ہے، مرتا کیا نہ کرتا مجبوراً اُسے رکشا کھینچکر پیٹ کا جہنم بھرنا پڑا، وہ جوان تھا، تندرست اور پھر گاؤں کا رہنے والا کچھ ہی دنوں میں اُسے رکشا کھینچنے کی عادت سی ہوگئی۔ یا یوں سمجھئے کہ غربت، مجبوری اور وقت کے تقاضوں نے مجبوراً سب کچھ سکھلا دیا۔ اپنے پیٹ بھرنے کیلئے روزانہ پیسے کما لیتا اُسے زیادہ کمانے کی فکر نہ تھی۔ اس کا تھا ہی کون؟ کس کیلئے یہ کماتا؟ مالک کا بھاڑا اور اپنی خوراک کے لئے روزانہ پیدا کر لیتا تھا ———

مگر اس کا دل اس زندگی سے غیر مطمئن تھا، درد و کرب کی لہریں اُسکے دل میں اس طرح اُٹھتیں جیسے سمندر میں طوفان، وہ رہ رہ کر اس تکلیف دہ خیال کو دل سے نکال دینے کی اکثر کوشش کرتا ——— ناکام کوشش! کیونکہ بعض وقت بلکہ اکثر گھر، گاؤں اپنے بیگانے کی یاد اسکے دل میں بے طرح چٹکیاں لینے لگتیں، وہ ہمیشہ کھویا کھویا، چپ چپ سا رہتا۔ اوروں کی طرح اپنے درد دکھ کی کہانی لوگوں کو سنا کر وقتی طور پر اسے اپنا غم ہلکا کرنا بھی نہ آتا تھا، مزدور تھا مگر غیرت اسکی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس مفلسی کی حالت میں بھی اسکی خودداری اچھوتی تھی، انھیں تفکرات میں کبھی کبھی اسکی طبیعت بری طرح بگڑ جاتی اور اس وقت اسکو اپنی چھوٹی بہن پربھا یاد آجاتی جو گھنٹوں اُس کا سر دبایا کرتی تھی۔ اُٹھکر اپنے نازک ہاتھوں سے پانی پلاتی تھی ——— اس کا دل تڑپ کر رہ جاتا۔ وہ کسی دن تو کچھ کماتا ہی نہیں تھا، اس سے جب لوگ پوچھتے وہ کماتا کیوں نہیں؟ تو صاف جواب دیتا کس کیلئے کمائیں زیادہ کما کر کیا ہوگا؟ ——— بات آئی گئی ہوتی۔

——— آج بھی وہ ملول تھا، کوئی بات یاد آگئی ہوگی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا، یہ سوچ رہا تھا کہ روزانہ اور رکشا والوں کی طرح مجھے بھی چند مقررہ سواریاں ملجاتیں اور مہینے پر حساب ہوا کرتا تو اس طرح

گلیوں کوچوں میں مارے مارے پھرنے سے نجات ملجاتی، اس فکر میں ڈوبا غیر ارادی طور پر رکشا لئے ہوئے گرل اسکول کے سامنے جانکلا ایک نازک اور سریلی آواز آئی "اے رکشا! چورنگی تک چلوگے؟"
—— کشور نے گھوم کر دیکھا، کچھ بڑھا اور جھجکا، جھجکا اور بڑھا —— ہاں حضور! رکشا حاضر ہے!" —— آج تک اس نے کسی دوشیزہ کو رکشا پر نہیں بٹھایا تھا، اسے شرم معلوم ہوتی تھی کہ عورت کو بٹھا کر کھینچے، کتنی بار تو اس نے بہت سی لڑکیوں کو یوں ہی کہہ کر ٹال دیا تھا کہ رکشا خالی نہیں ہے! —— لیکن آج پرمیلا کی آواز نے خلاف معمول نہ جانے کیوں اسے انکار نہ کرنے دیا۔ شاید یہ وجہ ہو کہ آج صبح سے اس نے ایک پیسہ بھی نہیں کمایا تھا —— اس نے گدی جھاڑ دی، دھوپ سے بچاؤ کیلئے چھتری اٹھادی۔ ان انتظامات میں، اُسے ایک حظ محسوس ہو رہا تھا، اس نے آج تک کسی خاتون سے اتنا گھل ملکر باتیں بھی نہیں کی تھیں ——

اس دن کے بعد وہ روزانہ وقت سے پہلے ہی اپنا رکشا لئے گرلس اسکول کے بڑے پھاٹک پر کھڑا رہتا، جب پرمیلا رکشا پر چڑھ جاتی یہ اسے کبھی بہت تیز، کبھی بالکل آہستہ، کبھی ذرا دھیمی رفتار سے لیجاتا اور راہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور چھیڑتا۔ گفتگو کے مختلف پہلو نکالتا کچھ نہیں تو کم از کم یہی کہتا کہ سرکار آپ بڑی اچھی ہیں! زیادہ کما کر کیا ہوگا حضور، بس آپکو روز لیجاتا ہوں، دو تین سواری شام کو سنیما اور نیما کی ملجاتی ہیں۔ بس دال روٹی بھر پیٹ کھانے کو ہوجاتا ہے —— پرمیلا اسکی باتوں پر ہوں ہاں کر دیتی اور جب کچھ جواب نہ دیتی تو کشور گھوم کر تکتا پھر آپ ہی آپ ہنس کر کہنے لگتا "سرکار بہت پڑھتی ہیں، رکشا تک پر سرکار پڑھتی ہی رہتی ہیں! ——"

"تمہارا کیا نام ہے رکشا والے" ایک روز پرمیلا نے یونہی پوچھ لیا۔ میرا نام؟ —— میرا نام کشور ہے سرکار" ——
"اچھا کشور تم رہتے کہاں ہو؟" —— کشور سوچنے لگا کیا جواب دے۔ نہ اس کا گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ وہ تو فٹ پاتھ ہی پر اپنا وقت بتاتا ہے ——

—— پرمیلا کو کشور کی عجیب و غریب، بھولی بھالی، بہکی بہکی اوٹ پٹانگ باتوں سے کچھ دلچسپی سی ہوگئی تھی، اس کا راستہ مزے سے کٹ جاتا تھا —— آج شہر میں پہلی مرتبہ کسی نے اتنی مدت بعد کشور کو کشور کہہ کر پکارا تھا، کشور کا دل بھر آیا، اس کی آواز بیٹھنے لگی اسے اس وقت اپنا گھر بری طرح یاد آرہا تھا —— وہ ویرانی اور تباہی! —— پر اس نے چونک کر فوراً جواب دیا، "رہیں گے کہاں سرکار، جہاں رات ہوگئی وہیں رہ گئے۔ کشور نے بڑی مشکل سے ان الفاظ کو ادا کیا۔ اسکی آواز تھرتھرا رہی تھی اور ہونٹ بری طرح کانپ رہے تھے، پرمیلا نے متعجب ہو کر پوچھا "کیوں کشور؟ کیا بات ہوئی؟ شاید تم ——"

"نہیں کچھ نہیں کہاں کچھ ہوا سرکار —— آہ! کبھی کبھی گھر بری طرح یاد آجاتا ہے۔ آج بیکار آپ نے میرا نام پوچھا —— —— میں تو اپنا نام جیسے بھول ہی گیا تھا۔ میرے کان برسوں سے اپنا نام سننے کو ترس رہے تھے، دیوی جی! میں نے تو یقین کر لیا تھا کہ میرا نام رکشا والا ہو گیا ہے" ——

"تو کشور! یہاں تمہارا کوئی بھی اپنا نہیں ہے کیا؟"

"آپ کیا غیر ہیں سرکار؟ —— آپ بھی تو اپنی ہی جیسی ہیں —— جب سے میں آپ سے ملا ہوں میرا بہت کچھ دکھ درد ہلکا ہوگیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہت دن بعد کوئی اپنا ملا ہے جس نے مجھے کشور کہہ کر پکارا ——"

"ہوں" —— پرمیلا خاموش ہوگئی، کشور لرز گیا اس سے کوئی گستاخی تو نہیں ہوگئی —— ایسا ہی ایک دن اِدھر اُدھر کی گپ کرتے ہوئے کہا "سرکار!" پھر وہ عجیب سراسیمگی کی حالت میں پرمیلا کو تکنے لگا، اس کے پاس الفاظ نہیں تھے پوچھنے کیلئے —— لیکن پرمیلا کی مہربان نگاہوں نے بتلا دیا تھا کہ وہ خفا نہ ہوگی۔ جن الفاظ میں چاہے وہ باتیں کر سکتا ہے ——

"ہاں! تم کیا کہنا چاہتے تھے کشور؟" پرمیلا نے جو اسکے دکھ درد کی کہانی سن کر اس پر ترس کھانے لگی تھی پوچھا ——

"حضور کا نام؟" کشور نے دبی زبان سے کہا، پرمیلا ہنس دی اور ہنستے ہوئے اس نے جواب دیا "میرا نام پوچھکر تم کیا کرو گے؟"

کشور چپ ہوگیا، اُس نے سوچا سچ تو ہے، نام پوچھکر میں کیا کروں گا؟ ——— وہ بہت پشیماں ہوا، خود پر لعنت ملامت کرنے لگا اُس سے ایسی غلطیاں کیوں ہو جایا کرتی ہیں ——— پرمیلا نے محسوس کیا کشور اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہے، اس نے کہا "مجھے پرمیلا دیوی کہتے ہیں، تمہیں یہ نام پسند ہے؟" ———

"بہت پسند ہے سرکار ——— ہاں ایک بات بہت دنوں سے سوچ رہا تھا، یاد نہیں پڑتا تھا ——— کوٹھی سے آپ کسی کے رکشا ہی پر تو آتی ہوں گی ———!؟"

"کوٹھی سے تو میں بابو جی کی کار میں آتی ہوں، لیکن پھر وہی کار بابو جی کو لیکر ہائی کورٹ چلی جاتی ہے، اسی لئے اس طرف سے ہمیں رکشا پر جانا ہوتا ہے ——— اگر تم کل سویرے پو پھٹتے ہی کوٹھی پر پہونچ جاؤ تو ہم بابو جی سے کہہ کر تمہیں کو ٹھیک کر لیں۔ اکثر مجھے دیر ہو جایا کرتی ہے اور بابو جی کا کام حرج ہوتا ہے ———"

کشور نے خوش ہو کر کہا "سرکار آپ جس وقت بھی بلائیے ہم ہر وقت حاضر ہیں، اگر وقت پر نہ آویں تو ایک پیسہ نہ دیجئے گا سرکار! آپ بڑی دیالو ہیں ———"

"کشور! تم بہت بڑھ گئے ہو"، کشور کانپ گیا کہ پھر کوئی چوک تو نہیں ہوئی اس سے ——— لیکن پرمیلا کھلکھلا کر ہنس پڑی جیسے ہوا کے لطیف جھونکوں سے "کنول" اپنی پنکھڑیاں بکھرا دیں، اس نے کہا "دیکھو کشور! ہم امیر ہیں، روپئے والے ہیں تو اس سے کیا ہوا، تم غریب ہو لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم شریف ہو ——— تم مجھے میرے نام سے پکار سکتے ہو، یہ سرکار ورکار تو ——— آخر تم نے میرا نام پوچھا ہے کس لئے ——— تم کو میرا نام لیکر پکارنا ہی ہوگا ——— زیادہ بڑے بڑے الفاظ سننے سے انسان مغرور سا ہو جاتا ہے۔ سمجھے؟" ———

"نہیں شریمتی جی! آخر غریب اور امیر میں کچھ فرق بھی تو ہونا چاہئے، میری ہمت نہیں پڑتی کہ میں اور آپ کا نام لے سکوں!! اور نام تو صرف یونہی میں نے پوچھ لیا تھا ———"

"تو تم گویا میری بات کاٹ رہے ہو؟"

"لیکن ——— آپ ———"

"نہیں ——— آپ نہیں بلکہ تم" ——— فرطِ مسرت سے کشور نے ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے اور اس نے اثبات میں اپنی گردن کو جنبش دی یعنی وہ بھی پرمیلا کو ایسا ہی تصور کیا کرتا تھا کہ وہ امیر و غریب کی کوئی تفریق نہیں کرنا چاہتی اور اس کی وقعت کشور کے دل میں اور بڑھتی گئی ——— پرمیلا ہی کی ضد کی بنا پر اگر وہ اس کا نام بھی لیتا تھا تو بڑے احترام سے ——— اسے پرمیلا کے یہاں دس روپے ماہوار مقرر ہو گئے تھے۔ اب اسے مالک کا بھاڑا پورا کرنے کے لئے صرف تھوڑی سی محنت اور کرنی پڑتی تھی ——— لیکن کشور کا پہلا زخم ابھی اچھی طرح بھرا بھی نہیں تھا کہ پرمیلا کے ان الفاظ نے اُسے پھر سے ہرا کر دیا "سنتے ہو کشور! کل سے ہمیں اسکول نہیں آنا ہوگا"

"کیوں؟ ——— کیا بات ہوئی پرمیلا دیوی؟" ———

"کچھ نہیں ——— کل سے ہمیں کالج کبھی نہیں آنا ہوگا ——— اچھا تم کل آؤ گے نا؟" ——— کشور ہکا بکا رہ گیا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا، لیکن اس نے پرمیلا کے آخری الفاظ کو سنا۔ اور اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہاں ہاں، ہم کل کیوں نہیں آئیں گے، ہم ضرور آئیں گے، ہم تو آتے ہی ہیں، پرمیلا دیوی ہم سے کسی روز دیر تو نہیں ہوئی، آپ ہم سے خفا کیوں ہو گئیں؟ ——— اگر آپ ہی غصہ ہو جائیں تو پھر ———"

"سنو! کل پھر تم آجانا"

"کل کے بعد پھر پرمیلا دیوی؟"

"پھر کیا ———؟" ایسا معلوم ہوا جیسے کشور کے آنگن میں چندرمان پھوٹ پڑا ہے، اس نے رات نہایت اضطراب میں کاٹی لسے ہر چیز اداس، سونی سونی، اور روٹھی روٹھی سی معلوم ہوتی تھی سوچ رہا تھا "آج پرمیلا دیوی اتنی اداس روئی روئی سی کیوں تھیں ——— ؟" پو پھٹتے ہی کشور چورنگی پہنچ گیا، دربان نے پرمیلا دیوی کو جا کر خبر کی "آپ کا رکشا والا آگیا ہے چھوٹی سرکار"

پرمیلا دیوی نے سنا اور خاموش ہو رہی، دل ہی دل میں اس نے کہا ہوگا "دربان بھی کیسا احمق ہے، میرا رکشا والا!!"

پرمیلا باہر نہیں آئی بلکہ اس کے پتا جی آئے اور انھوں نے پوچھا "تمہارا کتنا حساب ہوا رکشا والا؟" ——

"خیر تو ہے سرکار، ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی، پھر ایسا کیوں؟" —— پرمیلا کے پتا نے جواب دیا کہ "نہیں کشور! پرمیلا نے کالج چھوڑ دیا ہے، تم اپنا حساب لے لو،" —— کشور نے کچھ جواب نہیں دیا، سکتہ میں رہ گیا، اس کا دماغ بری طرح گھوم رہا تھا اس نے بڑی ہمت سے کام لیکر پوچھا "کیوں سرکار! پرمیلا دیوی اب نہیں پڑھیں گی؟" —— سورلیش بابو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں کشور! پرمیلا کا بیاہ ہے نا، تمہیں بھی کچھ کام کاج کرنے کو کل سے آنا ہوگا، مطمئن رہو تمہیں پوری مزدوری ملجایا کرے گی،" ——

کشور نے ایک کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا "بڑی اچھی بات ہوئی! بڑی اچھی بات!! ہم بہت خوش ہیں سرکار —— کل سے ہم ضرور آئیں گے،" —— !!!

—— کشور —— نڈھال اس گھوڑے کی مانند جسے چابک سوار نے بے قصور سینکڑوں کوڑے لگا کر اس کے جسم کو گھائل کر دیا ہو، ڈگمگاتا ہوا چلا، اس کا دماغ ان باتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جو پرمیلا نے اس سے کہی تھیں "ہم امیر ہیں، روپئے والے ہیں تو اس سے کیا ہوا، تم کو مجھے پرمیلا ہی کہنا ہوگا،" —— وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کشور کہہ کر کون پکارے گا اور کس سے وہ باتیں کرے گا، اور کس کو پرمیلا دیوی کہے گا۔

کشور انہیں خیالوں سے الجھتا ہوا بڑھتا گیا، اسکے رکشا پر آج پرمیلا دیوی نہیں تھی، سب سے پہلے صبح ہوتے ہی اسکے رکشا پر پرمیلا رہتی تھی، یہ روز اپنی دیوی کا درشن کیا کرتا تھا، آج اس کا رکشا خالی تھا، جیسے اس کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہو —— وہ گرلس اسکول کی طرف آنکلا، بالکل غیر ارادی طور پر —— اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بی، ان، آر، ٹریننگ کالج کا بڑا پھاٹک ایک مہیب دیو ہے اور اسے پکڑنے کیلئے بڑھا آرہا ہے —— وہ فوراً پلٹا —— اس نے کہا "جب پرمیلا ہی نہیں چڑھیں گی تو پھر کس کا منہ ہے میرے رکشا پر چڑھنے کا، اس نے رکشا لیجا کر مالک کے حوالہ کر دیا —— ایک مرتبہ وہ پرمیلا کو دیکھنا چاہتا تھا، وہ سوچتا تھا پرمیلا نے اسے بتلا کیوں نہیں دیا کہ اس کی شادی ہونیوالی ہے، اس میں اس کا کیا بگڑ جاتا —— پھر یہ بھی سوچتا کہ آخر وہ بتلاتی ہی کیوں —— ؟ میں ہوتا ہی کون ہوں بھلا؟ —— کشور کا دل بھر آیا، خیال میں کھویا ہوا، وہ پرمیلا کی کوٹھی پر پہنچا سورلیش بابو نے کہا "کشور! آج یہ بیٹھک صاف کر دو اور کل پرمیلا کا کمرہ صاف کر دینا،" —— پرمیلا کا نام سن کر اور آخری بار اپنی مقدس دیوی کی خدمت کرنے کا موقع پا کر کشور کے پژمردہ آنکھوں میں ایک ہلکی سی مسرت کی چمک جاگ اٹھی —— اس نے بڑی تندہی سے کام کیا اور کام ختم کرنے کے بعد بازار آیا۔ پہلے تو اسے پیسوں کی بالکل ضرورت نہیں رہتی تھی لیکن اب تو نہ معلوم کیوں اسے صرف پیسوں کے حاصل کرنے ہی کی فکر رہتی. سوائے پیسوں کے اسے اور کچھ نہیں بھاتا، اس نے بوجھ ڈھونا شروع کر دیا. وہ مزدوری کرتا اور صرف تھوڑا بہت رُوکھا پھیکا کھا کر تمام پیسوں کو بچا کر رکھ لیتا۔ —— لوگ اسے دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ شاید اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔ اتنا اچھا جوان گھل کر کانٹا ہوگیا، اس پر کونسی مصیبت آن پڑی ہے —— ہر صبح کشور سورلیش بابو کے یہاں جاتا اور کام ختم کرنے کے بعد مزدوری کرنے کیلئے بازار چلا جاتا، ایک روز سورلیش بابو نے کہا "کشور! سنتے ہو، پرسوں پرمیلا کی بارات آنیوالی ہے، تم سویرے ہی سے چلے آنا، باراتیوں کا سامان وغیرہ تمہیں کو اتارنا ہوگا۔"

"بارات! پرمیلا دیوی کی بارات!! —— پرسوں ہیں ؟ —— اُف بھگوان —— !!؟"

کشور پھر بازار چلا آیا، پاگلوں کی طرح یہ ہر آنیوالے جانیوالے سے پوچھتا "بوجھا ہے سرکار؟ سستا ہی پہنچا دوں گا،" لوگ اس کا منہ تکتے ہوئے بڑھ جاتے اور وہ مایوس ہو جاتا —— سبھوں کو یقین سا ہو چلا تھا کہ کشور پاگل ہو گیا ہے۔ بعض لوگ جو اس کے گزشتہ دکھ درد کی کہانی جانتے تھے دوسروں سے دوہراتے اور ہمدردانہ انداز میں کہتے۔ "جس پر اتنی مصیبتیں پڑی ہوں، جو اتنے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو، پڑھا لکھا ہو، جس پر اچانک مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو

پاگل نہ ہو گا تو کیا ہو گا، جب تک بدن میں خوب کس بل ہے ہار کشا کھینچا، لیکن اتنی کڑی دھوپ میں تپتی ہوئی سڑک پر رکشا کھینچنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، دماغ گرم تو یقینی ہو گا ـــــ!،، کشور پریشان حال آبادی سے دور ایک ویران مقام پر چلا گیا، کمر سے ایک میلا کچیلا جالی دار بٹوا نکالا، پیسوں، دھیلوں، اکنیوں سبھوں کو گننا شروع کیا "تیرہ روپے ساڑھے چار آنے!،، ایک دھندلی سی خوشی اُسکے چہرہ کو مس کر گئی۔ وہ پھر بازار آیا، ایک سنار کی دکان پر پہنچا، سب پیسوں کو جو اسکی زندگی بھر کی کائنات تھی بکھیر دیا اور کہا "بابو جی! اسے گن لیجئے اور مجھے ایک بڑھیا سونے کی انگوٹھی دیجئے اگر کچھ گھٹے گا تو ہم کما کر آپ کا چکا دیں گے بابو جی، ہم یہیں پر تو رہتے ہیں، آپ مطمئن رہئے سرکار ـــــ!،، کشور کی سراسیمگی، اسکی اتنی شستہ زبان اور یہ زبوں حالی سنار کو متعجب کرنے کیلئے بہت کافی تھی، بہرحال اُس نے ایک انگوٹھی نکال کر دیدی۔ کشور نے انگوٹھی کو بڑی احتیاط سے کمر میں بٹوے کے اندر رکھا ـــــ صبح ہوتے ہی پرمیلا کی کوٹھی پر پہنچا۔ پرمیلا ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی، اس کا چہرہ خزاں کے سفید گلاب کی طرح اترا ہوا تھا ـــــ کشور کی باچھیں کھل گئیں ـــــ پرمیلا نے بھی کشور کو دیکھا اور ٹھٹھک گئی، کشور نے پژمردہ لب و لہجہ میں کہا ـــــ۔

۵۸ "ابھی بہت سویرا ہے نا پرمیلا دیوی؟ بابو جی نے سویرے ہی بلایا تھا، آج تمام کمروں کو صاف کرنا ہے،، پرمیلا کشور کو تکتی رہی، چپ چپ سی پھر اس نے کہا، "تم اب رکشا نہیں چلاتے کشور؟،، کشور خاموش رہا، دو موٹے موٹے آنسو اسکی پلکوں میں بھر کے اور ڈھلک گئے، نہ معلوم کیوں پرمیلا کی بھی پلکیں کچھ بوجھل تھیں۔ کشور نے کہا پرمیلا دیوی اگر" پھر یہ ہو گیا، پرمیلا اسکے بالکل قریب ہو گئی، ہمدردانہ و سرگوشیانہ انداز میں اُس نے پوچھا "کیا ہے کشور؟ تم کہنا کیا چاہتے تھے؟ ـــــ،،

پرمیلا دیوی تم سچ مچ کی دیوی ہو، ایک بات جو مان لو اپنے غریب اور پرانے خدمت گزار کی ـــــ!،،

"بولتے کیوں نہیں کشور؟ آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟،، ـــــ

"غریب کا آپ سے کیا مطلب دیوی جی؟ صرف یہ نشانی ـــــ اگر قبول کر لیں اسے تو میں سمجھوں گا ـــــ نہیں میں بہت ہی خوش ہوں گا سرکار،، ـــــ پرمیلا کشور کو اچھی طرح سمجھانا چاہتی تھی لیکن وہ جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ اس نے صرف اتنا کہا "کشور! تم نے روپیہ فضول برباد کیا ـــــ تم غریب ہو اور غریب کی نشانی ہی کیا؟ غریب تو خوش رہنے کیلئے نہیں پیدا کیا گیا ـــــ اور پھر آجکل تو تم رکشا بھی نہیں کھینچتے،، ـــــ یہ کہتے کہتے وہ بہت زور زور سے سسکیاں لیتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی آئی، اتنے میں سورلش بابو بھی آ گئے، انہوں نے کشور کو دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا "واہ کشور! خوب تم آ گئے! جاؤ پرمیلا اپنے کمرہ میں ہے، آج اسی کا کمرہ تمہیں صاف کرنا ہے،، ـــــ

کشور کمرہ میں چلا تو آیا لیکن ایک بے جان، بے حس مجسمہ کی مانند کھڑا رہا وہ انگوٹھی اپنی مٹھی میں بھینچے ہوئے تھا، پرمیلا نے مڑ کر اس پر ایک نگاہ ڈالی اور بولی "ہاں تو تم میرا کمرہ صاف کرنے آئے ہو نا؟ اچھا دیکھو یہ بستر باہر کر دو اور یہ گھڑی میز کے اندر رکھ دو۔ اور ہاں دیکھو اسے مت چھونا یہ بجلی کا تار ہے، لیک کرتا ہے، بابو جی نے کہا ہے مستری بلوا کر اسے ٹھیک کرانا ہو گا!،، ـــــ پرمیلا چلی گئی، کشور جلدی جلدی کمرہ صاف کرنے لگا، وہ کمرہ صاف کرتا تھا اور سوچتا تھا "ہم امیر ہوئے، روپے والے ہوئے تو کیا ہوا؟ تمہیں مجھے پرمیلا کہنا ہی ہو گا،، پھر اس کے دماغ نے ایک پلٹا اور کھایا اور وہ سوچنے لگا "تم غریب ہو اور غریب کی نشانی ہی کیا؟ صرف یہ انگوٹھی!،، اس کے دماغ نے ایک پلٹا اور کھایا "اسے مت چھونا یہ بجلی کا تار ہے،، ـــــ کشور پاگلوں کی طرح زور سے ہنسا اور جھپٹ کر اس نے تار کو پکڑ لیا ایک ہلکی نحیف چیخ کمرہ میں گونج کر رہ گئی۔

ـــــ پرمیلا کے پائیں باغ میں ایک حقیر بیل ناشپاتی کے درخت کا سہارا پا کر بہت دور تک چڑھ گئی تھی ـــــ شدنی! ہوا کے ایک تیز جھٹکے نے آج اسے پھر زمین پر گرا دیا ـــــ سامنے سے ایک بکری آئی اور اسے چر گئی ـــــ

کشور کی جو کہانی ناتمام حرفوں میں لکھی نظر آتی تھی وہ بھی اسکی زندگی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

گالزوردی

عجیب بات

چند روز ہوئے، اپنے ایک مغربی حصہ کے قیام کے دوران میں، کیونکہ میں کبھی آج تک اس طرف نہ آیا تھا وہیں سیر کے لئے نکل گیا ——— مارچ کی ٹھنڈی صبح تھی!

میں ایک ایسے خلجان میں تھا جو اکثر ادیبوں کو ہوا کرتا ہے خالی الذہن، خود اعتمادی مفقود، ہزاروں قسم کی الجھنیں گھیرے ہوئے کتنی تکلیف دہ ہے قلم کے سہارے جینے والوں کی زندگی بھی۔ ایک جدوجہد ایک کوشش اور بقول میرے ایک دوست کے ایک مردانہ وار کوشش!

ہاں تو میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔ ہوا کی نرم لہریں رگ و پے میں ایک زندگی پھونک رہی تھیں، ایک چمکدار سورج نیلگوں آسمان کی سطح پر تیر رہا تھا مگر میرا ذہن ابھی تک اسی طرح بیکار تھا روشنی کی ایک شعاع بھی میرے دماغ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ نہ معلوم وہ ہلکے رنگ کے تیرتے ہوئے قرمزی سائے جو دماغوں کو کام کرنے پر ابھارتے ہیں اس وقت کہاں غائب ہو گئے تھے۔ نہ معلوم وہ غیر مرئی قوتیں جو روح میں احساس اور گرمی پیدا کر دیتی ہیں اس وقت کہاں سو گئی تھیں اور میں اُکتا کر اپنے پیشہ کو گالیاں دینے لگا۔

میری نگاہیں پہاڑی سلسلہ کے نشیب و فراز میں بھٹک رہی تھیں، یہ جنگل، یہ وادیاں، یہ حسین چٹانیں اور یہ ایک قوس و قزح کا سا حلقہ مجھے بے چین کر رہا تھا کہ میں اس حسن، اس خوبصورتی اور اس دلکشی کو اپنے الفاظ میں محصور نہیں کر سکتا۔ اونچی نیچی بل کھاتی ہوئی روشوں کو تراش کر ہموار کر دیا گیا تھا اور ان کے پیچھے ہر چیز نہایت صاف نظر آ رہی تھی۔ یکایک میری نگاہوں کے سامنے کچھ بلبلے سے ناچنے لگے۔ کچھ سیاہ و سپید چیزیں ہوا میں متحرک معلوم ہوئیں، ایک، دو تین، تلیئروں کا ایک جھلڑ ہوا میں اڑتا ہوا جا رہا تھا حسین پرندے اپنے طویل طویل سفر پر گنگناتے ہوئے روانہ ہو رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں وادیوں اور جنگلوں کو پار کر کے ان کے پیچھے غائب ہو گئے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے پیچھے کچھ چھوڑ گئے ہیں۔

خیالات کروٹیں سی لگے تھے، مایوسی میں دبی ہوئی ایک امید پھر اُبھر آئی تھی اور اس وقت یہ جی چاہا کہ اپنے آپ کو انہی وادیوں کی رنگینیوں کے حوالہ کر دوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دوسری پگڈنڈی کے موڑ پر سے گرجا کی گھنٹیوں کی جھوجھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوئی تین سو قدم کے فاصلہ پر ایک بستی نظر آ رہی تھی۔ آدمیوں کے گروہ خوبصورت لباس پہنے ہوئے اور عورتیں نرم و نازک لباسوں میں ملبوس آپس میں باتیں کر رہے تھے اور گرجا کے مربع صحن کے اوپر ایک چمکدار کلس مسکرا رہا تھا۔

"کیا بات ہے" میں نے سوچا۔ آج اتوار بھی نہیں، کسی امیر لڑکے کی سالگرہ بھی نہیں معلوم ہوتی اور کسی پیر کا عرس بھی نہیں اور عرس ان علاقوں میں اس طرح منائے بھی نہیں جاتے، پھر کیا بات ہے، یقیناً کسی کی شادی ہے۔ اور میں دیکھنے کیلئے اس منتظر گروہ میں سے گزرتا اور الجھتا ہوا اندر تک پہنچ گیا۔ وہاں بھی لوگوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور سب دروازہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بھیڑوں کے چھتہ کی طرح بھن بھن ہو رہی تھی۔ گرجا اسی طرح جس طرح وہ آج سے برسوں پہلے سے کھڑا تھا خاموش اور ساکت تھا، اس کی دیواریں اور بھاری بھاری پتھر دیہاتی عبادت گذاروں کا تماشا دیکھ رہے تھے لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ آج یہاں معمولی سے زیادہ رونق تھی اور ہوا میں لوگوں کے کپڑوں کی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔

گھنٹیاں جو ابتک ایک مترنم آواز میں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں

اور ایک خاص قسم کا کیف و سرور پیدا کر رہی تھیں اب زور زور سے بجنے لگیں۔ ان کی اس وقت کی بے ہنگم چیخ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دلہن بہت قریب آگئی ہے اور بس یہاں پہونچنے ہی والی ہے میری نگاہوں کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا جو ابھی ابھی لڑکپن کی حدوں سے نکل رہا تھا۔ ان کے گرد لوگوں کے حلقہ دستانے چڑھے ہوئے ہاتھوں اور اس کے کھیلتے ہوئے چہرے پر ایک خاص قسم کی ہنسی سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہی دولہا ہے۔ مجھے وہ اس وقت نہایت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہی معمولی دیہاتی تراش خراش، فطرت میں ایک بیباکی اور آزادی اور نگاہوں میں ایک امنگ لیکن کوئی خاص طور پر اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ سب لوگ دلہن کا انتظار کر رہے تھے۔ اور سب لوگوں کے ساتھ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی۔ کیسی ہوگی وہ؟ ایک معمولی قسم کی دیہاتی لڑکی۔ بھرے بھرے گال، کھردرا سا نقاب، بھورا سا رنگ اور خرگوش کی سی آنکھیں یا پھر کچھ......... کچھ اس لڑکی جیسی جسے میں نے ایک مرتبہ ویلز میں دیکھا تھا اور اس کے بعد سے آجتک اس جیسی نظر سے نہ گذری

میں نے ذرا آگے کو جھککر ایک عورت سے جس کا چہرہ سیب کیطرح گول اور پکا ہوا تھا پوچھا، "کیا آپ بتا سکتی ہیں ان میں دلہن کونسی ہے؟"

اس نے مجھے اپنی گول گول، بھوری اور اجنبی نگاہوں سے گھورتے ہوئے جواب دیا "کیوں! تم نہیں جانتے، یہ ماٹا ہے، اس علاقہ میں سب سے خوبصورت لڑکی،" اور پھر اس نے اپنا انگوٹھا نچاتے ہوئے دولہا کی طرف اشارہ کرکے جسے سب نے نظرانداز کر رکھا تھا کہا "بڑا خوش قسمت ہے یہ جو اسے ایسی حسین لڑکی اور اچھی لڑکی ملی"، مگر اس کی اس تشریح سے میری کچھ تسلی نہ ہوئی۔

ایک شور، ایک حرکت، ایک بے چینی!

اور لوگوں کی طرح میں بھی بلا تکلف گھوم گیا۔ وہ ایک درشت سے خانہ بدوش نما آدمی کے سہارے سہارے اپنے بہترین دیہاتی لباس میں آرہی تھی۔

میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس مٹیالے گرجا کے صحن اور ان سیاہ پوش آدمیوں کے درمیان وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی سورج کی کرن ناچ رہی ہو۔ میں نے اتنا مسرت انگیز سہانا اور دلکش چہرہ آجتک نہیں دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اسکے لبوں پر کھیل رہی تھی، ایک شوخی اس کی نگاہوں میں رقص کر رہی تھی اور وہ اپنے ماحول کی دلچسپیوں میں جذب ہوئی جا رہی تھی، اس کے سرکش اور سنہرے بال موٹے سے نقاب میں مچل رہے تھے، اس کی پتلیاں مست بھونروں کی طرح رقصاں تھیں۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نوعمر سیب کے پھولوں پر سورج کی کرنیں ناچ رہی ہیں مچل رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک خاص چمک تھی جو انسان کی نیک فطرت کی انتہائیوں سے ابھرتی ہیں۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر اور یہ معلوم کرکے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں جا رہی ہے ایک سکون سا ہوگیا۔

گرجا کے صحن میں نرگس کے پھول اُگے ہوئے تھے جو اس لڑکی کی شادی پر عین موزوں تحفہ تھا۔ جب وہ باہر نکلتی تو ان پھولوں میں لدی ہوئی تی اور ایک ایسا تکلیف دہ اعتراف جس کے بغیر معصوم سے معصوم روح بھی خوشی کی حدوں کو نہیں پہنچ سکتی اسکے چہرے سے نمایاں تھا۔ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں دیکھ کر آدمی ایک گونہ اطمینان محسوس کرتا ہے، سورج کی روشنی، پھول، کھیلتے ہوئے تندرست بچے، خوش الحان پرندے، بادل پہاڑ، نیلگوں آسمان، رقص اور نوجوان لڑکی کا چہرہ اور اس وقت مجھے بھی یہی احساس ہوا کہ سب لوگ اسکے چہرے کو دیکھ کر ایک گونہ خوشی محسوس کر رہے تھے!

وہ جا چکی تھی اور ایک خاموشی، سکون اور تنہائی اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ میرے آگے آگے ایک لنگڑا بوڑھا اپنے رخساروں پر اگی ہوئی گھنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتا ہوا "مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ میرے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر اس نے کہا۔ "کیا ستم ظریفی ہے! جب ایسی لڑکیاں بھی شادی کے بعد چلی جاتی ہیں تو روح لرز جاتی ہے،" میرے سر ہلانے پر اس نے پھر کہا "یہ سورج کی نرم اور بے باک کرنیں اب یہاں کبھی نہیں آئیں گی، جھوٹ نہیں، اب یہاں ایسی لڑکی نہیں مل سکتی!!"

میں گفتگو کیلئے کوئی موضوع تلاش کرنا چاہتا تھا، میں نے کہا،،

"کیا وہ اس کا باپ تھا،،

اس نے تیز تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے زور سے گردن جھٹکی، نہ اس کی ماں ہے نہ باپ۔ یہاں مارا کا کیا کہتے ہیں اُسے چچا رہتا ہے، ماں باپ نہیں اسکے، اس نے فقرہ کو دہرایا۔ اسکی آواز کے ٹھہراؤ میں ایک تکلیف کا احساس تھا، ایک ٹھہراپن جیسے وہ کچھ جانتا ہے اور بتانا نہیں چاہتا۔

کیونکہ اب انتظار کے قابل کوئی چیز نہیں رہی تھی اس لئے میں اوپر کی پگڈنڈی پر ایک چھوٹی سی سرائے میں چلا گیا اور روٹی اور پنیر لانے کیلئے کہا۔ اندر کے کمروں میں بہت سے آدمی کھانے پینے اور شور کرنے میں مصروف تھے اس لئے میں ایک اجنبی کی حیثیت سے باہر برآمدہ ہی میں بیٹھ گیا اور وہیں مارچ کے سورج کی نرم شعاعوں میں اپنا معمولی سا ناشتہ ختم کیا، پیسے دیئے اور چلدیا۔ میرے سامنے تین چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے نشیب و فراز کو دیکھ کر یہیں یوں ہی بے جانے بوجھے ایک پر ہو لیا، در اصل یہاں تو کی تفریح یہی ہے کہ بلا جانے بوجھے کہیں سے روانہ ہو گئے اور کہیں جا نکلے۔ اس پگڈنڈی پر کل دو چیزیں نظر آئیں ایک جھونپڑی نما گاؤں اور ایک کھیت چڑھان پر اور تمام راستہ میں کچھ نہ تھا۔ بہار بھی ان علاقوں میں اچھی طرح اجاگر نہ ہوئی تھی۔ کہیں کہیں درختوں پر کلیاں نظر آجاتی تھیں اور کبھی کبھی سورج کی روشنی میں ہوا کے کندھوں پر برف کے ٹکڑے اڑتے ہوئے دکھائی دے جاتے تھے۔

دوسری طرف دیوار کے ایک کنج کے پاس پگڈنڈی ایک مکان کے صحن میں ڈوبتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جہاں تین چھکڑے کھڑے تھے جن کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ پگڈنڈی پر نرگس کے پھول بکھرے پڑے تھے اور مکان سے شور بلند ہو رہا تھا۔ لوگوں کی آرجار اور بھنبھناہٹ سے مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں اتفاق سے دلہن کے مکان پر پہونچ گیا ہوں۔

میں نے اپنی حیرانی کو دباتے ہوئے خشک پتھریلی زمین، کبوتروں، مرغیوں اور کتوں کے شور اور پرانے ڈھیر نما مکان کی بوالعجبی پر ایک نظر ڈالی اور ایک دائیں ہاتھ کی پگڈنڈی پر جو ایک ندی کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی مڑ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر ایک بہت بڑا پُرا درخت کھڑا تھا اور بائیں ہاتھ پر ایک اجاڑ سا میدان پڑا تھا جس میں بہت سے درخت اُگے ہوئے تھے پگڈنڈی نیچے ایک مکان کے دروازہ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی جہاں پتھروں کی ایک چٹان سی بنی ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے کھیت خزاں کی یاد دلاتے تھے اور کھیتوں کی باڑیں بے ترتیبی کے ساتھ اکھڑی پڑی تھیں۔ لہو کی آمیزش لئے ہوئے چھوٹے چھوٹے شرارے اور نیلا دھواں زرد زرد نیم وا کلیاں، سورج کی کرنیں اور کچھ اڑتے ہوئے برف کے ٹکڑے ہوا میں ایک عجیب قسم کی رنگت پھیلا رہے تھے میں وہاں پہونچکر رکا اور سوچنے لگا آیا مجھے نیچے جانا چاہئے یا نہیں؟

آخر کار میں نے ارادہ کر لیا کہ ضرور نیچے جاؤں گا اور اس خیال سے دروازہ کو دھکیلنا شروع کیا۔ اچانک میری نظر ایک عورت پر پڑی جو درخت سے ورے دیوار کے سایہ میں ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر رکھا تھا، اسکی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے بدن کو آگے پیچھے جھلا رہی تھی اس نے ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا، نیلی سرج کا لباس اس کے بدن پر تھا، ہیٹ اسکے قریب زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال رخساروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ چہرہ جس پر کرنیں سی منڈلا رہی تھیں ایک دم بھیانک۔ اور حماقت انگیز معلوم ہونے لگا، جو چہرہ کبھی حسین رہ چکا تھا اب زندگی اور تیز احساسات کے ہاتھوں کھردرا اور منورم ہو گیا تھا۔ اب اسکی طرف دیکھنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ اس کا لباس، اس کا ہیٹ اور جس طریقہ پر اسکے بال بنے ہوئے تھے ان میں شہری تہذیب کی جھلک تھی۔ اس میں ایک ایسی بے نام سی چیز جھلک رہی تھی جو صرف ان عورتوں میں ہوتی ہے جن کا کام مردوں کو لبھانا ہے، لیکن اتنے پر بھی اسکی نظروں میں ایک حیرانی تھی جیسے وہ شہر میں بہت کم رہی ہو۔

بے حس ماحول، ایک عورت، آزردہ خاطر اور اپنی پریشانیوں پر قابو پانے کے نا قابل۔ کون ہے جو اس منظر کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگا

میں وہیں ٹھہر گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ وہ اسی طرح اپنے بدن کو آگے پیچھے جھلا رہی تھی۔ اور اس کے لبوں سے ایک مدھم سی کراہنے کی آواز نکل رہی تھی۔ پھر اچانک اس کا سر اسکی گود میں جھک گیا اور اسکے بازو بے جان ہو کر اِدھر اُدھر جا پڑے جیسے وہ بیہوش ہو گئی ہے۔ اسے اس حالت میں چھوڑ کر کیونکر جایا جا سکتا ہے؟ لیکن اس سے کہا بھی کیا جائے سکوئی جسمانی بیماری بھی معلوم نہیں ہوتی؟

میں اسی تذبذب میں کھڑا ہوا اُسے دیکھتا رہا۔ یہ کونہ ہوا سے محفوظ تھا۔ سورج گرم ہو چلا تھا اور ہواؤں پہ ایک جمود سا طاری ہو گیا تھا۔ کامل تین منٹ تک اس نے انگلی تک نہ ہلائی یہاں تک کہ میں سوچنے لگا کہیں وہ بیہوش تو نہیں ہو گئی؟ میں اس کے قریب گیا اسکے بدن سے گرم غازہ آلود بھبکا آرہا تھا، چہرہ پر ہلکا ہلکا ورم تھا اور ٹوٹی ہوئی سانسوں میں غنودگی اور مدہوشی تھی۔

میں نے ہمت کر کے اسکے بازوؤں کو چھوا، اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک حسین زمانے کی یادگار صرف آنکھیں اس کے پاس رہ گئی تھیں جو کبھی بہت حسین ہوں گی۔ اب خون میں بجھی ہوئیں اجنبی
62 اور حیران قدرے جری اور بیباک جو ایک خاص طبقہ کی عورتوں کی خصوصیت ہے۔ وہ بولی نہیں میں نے ہچکچاتے ہوئے پورٹ کا ایک جام جو سفر کے دوران میں ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا نکالا اور اس سے کہا

"معاف کیجئے... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں..... اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ..." اور میں نے جام اسکی طرف بڑھا دیا کچھ دیر تک وہ ایک خلا میں گھورتی رہی اور پھر میرے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے کہا "بڑی تکلیف کی آپ نے، میں بھی اسکی ضرورت محسوس کر رہی تھی" اور وہ جام ہونٹوں سے لگا کر اس کا آخری قطرہ تک پی گئی اور جام واپس کرتے وقت ایک نامانوس مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر آ گئی۔

"غالباً آپ مجھے یہاں بیٹھا ہوا دیکھ کر ہنسے ہوں گے"

"جی نہیں میرا خیال تھا آپ بیمار ہیں"
ایک کھوکھلی ہنسی اسکے گلے میں گونجنے لگی۔

"مجھے جانا چاہئے تھا، کیوں؟ لیکن اسکی بھی ایک وجہ ہے۔ وہی پرانی جگہ، کئی سال کے ایک طویل سلسلہ کے بعد"

اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا جنہیں شراب نے اور بھی جگا دیا تھا۔ غالباً وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ آیا اس نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہے یا نہیں یا پھر یہ کہ میں کس قماش کا آدمی ہوں اور پھر اُس نے کہا

"میں یہیں پیدا ہوئی تھی کیا تم بھی یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں میں یہاں کا رہنے والا نہیں" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
وہ پھر ہنسی اور ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی

"میں ایک شادی میں آئی تھی —— پیدائش کے بعد سے میں نے آج اسے پہلی دفعہ دیکھا ہے"

میں ایک اندرونی جذبہ کے ماتحت خاموش رہا۔

"میں اپنی لڑکی کی شادی میں آئی تھی لیکن کوئی مجھے جانتا نہیں، کوئی بھی نہیں جانتا"

میں وہیں دیوار کے سائے تلے اسکے مقابل ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ان الفاظ پر ایک گہری دلچسپی کے ساتھ اسکی طرف دیکھنے لگا۔ یہ اکھڑ، آوارہ، غازہ آلود شہری عورت اس پُر نازک سورج کی کرن جیسی لڑکی کی ماں تھی جس کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی؟

میری خاموشی پر وہ پھر مسکرائی۔

"لڑکی کیا میرا بھائی تک مجھے نہیں پہچانتا، اور پھر وہ جان بھی کیسے سکتی ہے جب وہ بچہ ہی تھی کہ میں اس سے الگ ہو گئی تھی اور اسکے بعد سے آج تک اس نے مجھے نہیں دیکھا اس وقت وہ محض ایک جاندار مضحکہ خیز سا گوشت کا لوتھڑا تھی" اور میرے چہرے پر نظر ڈال کر وہ پھر ایک خلا میں گھورنے لگی جیسے اپنے گذرے ہوئے اوقات کا جائزہ لے رہی ہو۔

"اسے وجود میں لانے کیلئے ہم غالباً یہیں ہنس بول رہے تھے ہاں بالکل اسی جگہ تھے ایک گرمیوں کی رات میں۔ اس رات میرے سر پر ایک جنوں سوار تھا، ایک سودا" اور پھر اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "ہر لڑکی کی تقدیر یہی ہے۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وقت! اب میری عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہے اب تو میں اپنی آخری منزل سے بہت قریب آ گئی ہوں اور اب اس سے زیادہ توقع

بھی کیا کیجا سکتی ہے؟ میری زندگی کا مقولہ "خوش باش دیے رہا ہے مگر اب تو میں اپنے حصہ کا سب کچھ ختم کر چکی ہوں اور اس کا باپ .... اس کا باپ بھی مر چکا ہے!"

"تمہارا مطلب ہے کہ محض اس لڑکی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا"

"چاہو تو یوں بھی کہہ سکتے ہو۔ اس لڑکی نے مجھے اور اسے ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ مجھسے کہا گیا کہ میں سپر دعویٰ دائر کر دوں۔ وہ روپیہ ادا نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ چلا گیا۔ اور دو سال بعد جنگ ہوئی تو وہ مارا گیا اور میں، میں بھی! لیکن وہ ابھی تک ایک دلکش خیال کی طرح حسین اور زندہ ہے۔ کتنی عجیب بات ہے، کیوں؟" اور پھر وہ اسی طرح خلا میں گھورنے لگی۔

مجھے بھی کچھ کہنے کیلئے الفاظ نہ ملے اور میں سوچنے لگا، سورج کی ایک حسین اور رقصاں کرن جس کا وجود یہاں والوں کیلئے ایک رحمت تھا۔ جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں "اب ایسی لڑکی یہاں نہیں مل سکتی،" اس کے وجود نے دو ہستیوں کو تباہ کر دیا، ان دو ہستیوں کو جنہوں نے اسے جنم دیا تھا۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا "یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ مجھے کیونکر معلوم ہوا اس کی شادی ہونیوالی ہے —— ایک کسان نے مجھے بتایا تھا۔ وہ جب بھی شہر آتا ہے میرے پاس ضرور آیا کرتا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ میرے پرانے مکان کے پاس رہا کرتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں جانتا حالانکہ وہ میرے سامنے سکول جایا کرتا تھا۔ میں نے بھی اسے کبھی نہیں بتایا۔ اس روز جب اس نے مجھے شادی کے بارے میں بتایا میرے اوپر عجیب مضحکہ انگیز قسم کے جذبات طاری تھے۔ اس نے ایک عجیب انداز میں سر ہلایا "میں نے اپنی زندگی کے حالات کبھی کسی کو نہیں بتائے مگر معلوم نہیں میں نے نہیں کیوں بتا دیئے آج میں اپنے حواس میں نہیں ہوں،" اس کے اس فقرہ پر میں نے جلدی سے کہا "کوئی ہرج نہیں میں یہاں کسی ایک آدمی سے بھی واقف نہیں"

اس نے ایک آہ بھری "... بڑی تکلیف کی آپ نے۔ میرا بھی کبھی کبھی کسی سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ہاں تو اس کسان کے چلے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ ایک دن کی چھٹی مناؤں اور اپنی لڑکی کی شادی ہوتی ہوئی دیکھوں،" وہ ہنسنے لگی "... میری رنگینیاں سب کی سب اس رات کو ختم ہو گئی تھیں جس رات مجھ پر وہ جنون سوار ہوا تھا۔ آہ!

میرا باپ بہت سخت گیر آدمی تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میرے باپ نے مجھے شادی نہ کرنے دی۔ سوتیلی ماں کے پاس رہ کر میری زندگی میں رونا داخل ہو گیا۔ میں بہت نرم دل تھی سوتے سوتے بھی میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے، وہ ہمیشہ بھیگی ہی رہیں، ایک نوجوان لڑکی اور آنسو! میرے باپ نے مجھے شادی نہ کرنے دی!"

"تو کیا تم بھاگ گئیں اس کے بعد؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"سب سے بڑی جرأت کا کام جو میں نے ساری زندگی میں کیا۔ جی کو چھوڑتے وقت میرا جی کٹتا تھا۔ لیکن اس کے سوا دوسرا علاج خودکشی تھا۔ میں ایک نوجوان جلدساز کے ساتھ بھاگ گئی جو میرے لئے دیوانہ تھا مگر اس نے بھی مجھ سے شادی نہ کی! ..." وہ پھر ہنسنے لگی اور جلتی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کرکے کہا "جب میں چھوٹی سی تھی تو اس کی گھاس جلانے میں مدد کیا کرتی تھی ..." اور وہ پھر رونے لگی مگر اس مرتبہ یہ اتنا تکلیف دہ نہ تھا

گاڑیوں کے راستہ سے ہٹ کر ایک پرانا جوتا پڑا تھا میں اسے دیکھنے لگا۔ پتھروں کے درمیان ایک سیاہ سا دھبہ اور جنگلی بوٹی اس دلکش دن سے اتنے ہی نامانوس تھے جتنا اس عورت کا ماضی اُسکے حال سے جسے وہ آج تلاش کر رہی تھی اور میرے ذہن میں اس رات کا خیال گھومنے لگا جب بقول اُسکے "اسکے سر پر جنون سوار تھا،" اور ساتھ ہی ساتھ وہ نوجوان جوڑہ بھی جو اس گرم اور تاریک تنہائی میں جذبات پہ قابو نہ پا کر ان سے مغلوب ہو گیا تھا۔ برف کے چھوٹے چھوٹے گالے دھوئیں اور شعلوں پر سے اڑتے ہوئے اسکے بالوں پہ گرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ ان سے اٹ گئے اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے بچوں کی طرح انہیں پکڑنا شروع کر دیا۔

"میری لڑکی کی شادی کیلئے یہ بڑا عجیب دن ہے،" اس نے کہا اور پھر ایکدم گھبرا کر بولی "نہیں نہیں وہ اپنی ماں کو نہ جان سکے گی، وہ بہت آرام سے ہے،" اور زمین سے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے وہ کھڑی

ہوگئی ،، اب مجھے واپس جانا چاہئے ورنہ گاڑی سے رہ جاؤں گی اور گاڑی سے رہ جانیکے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے عہدہ پر نہ پہونچ سکوں گی ،،

ہیٹ اوڑھ لینے کے بعد اس نے اپنے چہرہ پر ہاتھ پھیرے اور گرد آلود لباس کو جھاڑتے ہوئے وہ جلتی ہوئی آگ کی طرف دیکھنے لگی اس کی بےبسی اور بیچارگی دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس سڑک پہ پڑے ہوئے ردی جوتے کے مانند ہے ۔ اپنے ماحول سے بیگانہ اور نامانوس !

،، میں نے یہاں آکر غلطی کی ،، اس نے کہا ،، مجھے سوائے تکلیف کے اور کیا ملا اور اب تو تم بھی بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے ہو گے ، جو خدا حافظ ، آپ کے جام کا شکریہ ! ،،

اور اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جنہیں بازاری پن نہ تھا بلکہ خالص انسانی نگاہیں ، الجھی ہوئیں اور پریشان ۔ دوسری مرتبہ ایک لمحہ کے بعد پھر اُس کے ہونٹ کپکپائے ۔

،، خدا حافظ ! ،،

اور وہ دروازے میں سے گزر کر نیچے پگڈنڈی کی تہ میں ڈوب گئی ۔

اس کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک میں وہیں برف اور دھوپ میں بیٹھا رہا ۔ تب اُٹھ کر جلتی ہوئی گھاس کی طرف دیکھا لہراتے ہوئے شعلے اور نیلا دھواں ، خوبصورت اور زندگی بخش معلوم ہو رہا تھا ۔ لیکن اپنے پیچھے وہ جلتی ہوئی شاخوں کے ڈھانچ چھوڑ رہے تھے ۔

ایک یا دو ہفتہ بعد ان کی جگہ ہری اور ننھی ننھی گھاس کی کونپلیں پھوٹ آئیں گی اور سورج کی روشنی میں لہرانے لگیں گی ۔

یوں ہی چلتی رہتی ہے یہ دنیا !

تعمیر اور تخریب ، تخریب و تعمیر کتنی عجیب بات ہے !



۶۴ نیساں اکبرآبادی

خودداریاں

یہ کیوں کہوں کہ نہ تڑپا نگاہِ یار مجھے
مگر قرار تو لے کر کے بے قرار مجھے

دیا فریب طبیعت کو آج پھر میں نے
پھر آچلا ترے وعدوں پہ اعتبار مجھے

وہ ایک تم کہ نظامِ حیات ہے تم سے
وہ ایک میں کہ نہیں کچھ بھی اختیار مجھے

مری نگاہِ تصور نے ان کو دیکھ لیا
جب آچلا تھا ذرا لطفِ انتظار مجھے

فسردگیِ دلِ وحشت زدہ کی اے توبہ
ہنسی کی بات بھی ہوتی ہے ناگوار مجھے

جب اپنے آپکو دھوکے دئیے ہیں خود میں نے
پھر اور کس کا ہو دنیا میں اعتبار مجھے

مری نظر میں ہے جب سے بہار کا انجام
مثالِ خار کھٹکتی ہے یہ بہار مجھے

نہ مجھ کو دل پہ ہے قابو نہ انکو نظروں پر
نہ اختیار انھیں ہے نہ اختیار مجھے

بہت عزیز ہیں خودداریاں بھی اے نیساں
شکستِ حسن بھی ہوتی ہے ناگوار مجھے

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

نیا راگ

جوشؔ ملیح آبادی

(منظوم ڈراما)

حرفِ آخر کا ایک ورق

(خدا دریچۂ عرش وا کرکے دنیا کے مناظر دیکھ رہا ہے ان مناظر میں سے ابلیس کا دربار بھی اک منظر ہے)

ابلیس

اے وباؤ، دہشتو، تاریکیو، بیماریو
آؤ اے میرے رفیقو اے مرے درباریو

ہاں مرے اس قصر پہ لہرا بصد جاہ و حشم
اے گناہوں کے پھریرے اے بغاوت کے علم

حاضری دینے کو اپنی اپنی قبروں سے اُٹھو
اے ٹھگو، اے قاتلو، اے ڈاکوؤ لے خونیو

نکلو اے بوسیدہ لاشو تربتوں کو توڑ کر
آؤ اور اس بام پر منڈلاؤ بازو جوڑ کر

اے گِدھو، چیلو، بھیانک الّوؤ جنبش میں آؤ
اپنی آنکھوں کو نکالو اپنے بازو پھڑپھڑاؤ

بازوؤں کو پھڑپھڑاؤ، ظلمتوں کو تھرتھراؤ
ہاں لگاؤ دین کے بھیجے پہ ہاں ٹھونگیں لگاؤ

ظلمتو ہر سمت سے اُمڈو، تجلّی سے لڑو
تیرہ شب کا روز روشن ہے اُڑو چمگادڑو

پرفشاں ہو جلد انسانوں کے اعمال سیاہ
جلوہ گر ہو آدم و حوّا کے فیضانِ گناہ

ہاں پیو اے ساحرو، آ آ کے بید و حساب
تیلیوں کے کاسہ ہائے سر میں چانول کی شراب

ہاں میرے چاروں طرف اے بھتنیو دل کھول کر
آؤ اور لڑھکاؤ ہزاروں مُردہ خنزیروں کے سر

ہاں جگاؤ اپنے اپنے بیر اے جادوگرو
اژدہو، ناگو، سنپولو، آؤ مجھ کو گھیر لو

آؤ اے بھوتو چڑیلو برق رفتاری سے آؤ
آؤ چیخو، غُل مچاؤ، بھنبھناؤ، منمناؤ

اے ریاکاری کی روحو بدلیاں بن بن کے آؤ
آؤ اُس اُبھرے ہوئے گنبد پہ گرجو، گھڑگھڑاؤ

آؤ اس میدان میں دوڑو، بڑھو، رینگو، چلو — کیکڑو، گھونسو، مکوڑو، کنکھجورو، بچھوؤ
ہاں دکھا دے ظلمتوں کو اے مرے سینے کے داغ — اے کثافت بڑھ کے گل کر دے لطافت کے چراغ

(کہ یکایک زبردست دھماکہ کی آواز پیدا ہوتی ہے، تاریکیوں کے دامن درازتر ہو جاتے ہیں۔ زمین لرزنے اور ہوا چیخنے لگتی ہے، اور دفعۃً ابلیس کا لشکر حاضر ہو کر شور و غل اور ہلچل مچانے میں مشغول ہو جاتا ہے اور ابلیس اپنی بیگم کے دوش بدوش تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور بیٹھتے ہی اپنے درباریوں کو حکم دیتا ہے)

شاہزادی کل ہوئی ہے دفن جو اس باغ میں — نورِ عصیاں کا ہے ابتک جس کے دل کے داغ میں
ہاں چرا لاؤ چڑیلو، اس کی زلفِ عنبریں — اس کی آنکھیں، اس کی گردن، اسکے لب، اسکی جبیں
اسکے اعضا کا تناسب، اسکے رخساروں کا نور — لاؤ کشتی میں لگا کر میری بیگم کے حضور

(کہ طرفۃ العین میں مری ہوئی شاہزادی کا جمال ابلیس بیگم کے چہرہ پر دمکنے لگتا ہے۔ تمام درباری مسرت سے تالیاں بجانے لگتے ہیں اور شیطان دوبارہ حکم دیتا ہے)

پیرزن کی چشمِ تر تاریک موتی رول دے — شاہدِ عالم فریبی زلفِ شب گوں کھول دے
ہاں بجا اے کاوشِ عصیاں فواحش کا ستار — ہاں دکھا دے دفترِ انگورِ سینہ کا ابھار
اے پیمانہ تمناؤ، چلو کرتب دکھاؤ — بھیڑیوں کی ہڈیوں سے اپنے ناخن سجاؤ
اے چغل خوری کی دیوی جلد شر کا راگ گا — اے دغا کے دیوتا خونیں معبروں کو جگا
جلد سارنگی اٹھا اے جھوٹ دانائی کے ساتھ — ہاں نرت کر بدظنی کی روح برنائی کے ساتھ
گونج اٹھو چاروں طرف اے فحش لفظو گونج اٹھو — تال دو جادو کے نعرو گالیوں کو تال دو
ہاں کمر لچکا شرارت، کا کلیں چھٹکا عناد — رقص کر کولھوں پہ رکھ کر ہاتھ اے روحِ فساد
ڈائنو ہاں اپنے اپنے منہ پہ مل کر خاک آؤ — چاہتی کیوں نکر ہو بچے بھاؤ کر کے یہ بتاؤ
حکم دیتا ہوں کہ ہل جا خانۂ عصمت کی نیو — ہاں برہنہ ہو کے گردن کو ہلا اے کام دیو
اے سیہ کاری کے ارمانو بدی کے ولولو — پیشوازوں کو پہن لو، گھونگروؤں کو باندھ لو

(کہ یکایک خبیث ارواح کا رقص و سرود شروع ہو جاتا ہے)۔

("طوفان کی جے شیطان کی جے" کے عنوان سے یہاں اک ترانہ ہے)

(اس ترانہ پر ابلیس فرطِ مسرّت سے کہنا شروع کرتا ہے)

شکر ہے ابلیس پر واجب خدائے پاک کا
آگ کے قدموں پہ سر رکھا ہوا ہے خاک کا

جس کے جتنوں مجھ سے بگڑا تھا الٰہ العالمین
آج اس آدم کے بچے ہیں میرے زیرِ نگیں

اس زمیں پر ہاں علی الزعم خدائے آسماں
آج میرے ہاتھ میں ہے نوعِ انساں کی عناں

اور یہ جو ہیں صحیفے طاق میں رکھے ہوئے
ہو چکے ہیں یہ تو کب کے ضبط میرے حکم سے

کر چکا ہوں میں نرالا انتظام ان کے لئے
حلق سے نیچے اُترنا ہے حرام ان کے لئے

دیدنی ہے میری تفسیروں کا عالم آج کل
کثرتِ معنیٰ سے ہر آیت ہے مبہم آج کل

میرے حلقہ میں ہے داخل ہر فقیہ ذی حشم
حکم سے چلتا ہے میرے ہر محدّث کا قلم

کی گئی ہے موشگافی اس قدر آیات میں
بہ رہا ہے ہر سفینہ سیلِ تاویلات میں

حکم جس کا رات کو کرتا ہو دن اور دن کو رات
اس سے سجدے کیلئے کہتا تھا ربّ کائنات

"خاک پر سرکش فرشتے خاک پر رکھ دے جبیں"
تاب اس توہین کی "سرکش فرشتے" کو نہیں

کامرانی ہو چکی ہے مجھ کو اپنے کام میں
ہر پیمبر کی نشانی ہے مرے گودام میں

گوپیوں کی تابِ رُخ، بلقیس کا رنگِ جبیں
شیام کی نے، نوح کی کشتی، سلیماں کا نگیں

....

خاتمِ دستِ سلیمان و عصائے موسیٰ
الغرض ہر شے جو تھی وابستۂ پیغمبری

کر لیا ہے قرق اِن سب کو مرے خدّام نے
جس کو جھٹلانے کی قوّت ہو وہ آئے سامنے

(اسکے بعد خدا ناراض ہو کر دریچۂ عرش بند کرنے کا حکم دیتا ہے، اور انبیا سے جواب طلب کرتا ہے)۔

مولانا حسرت موہانی

نغمۂ آہستہ خرام

معجزہ دیکھا سرِ شام آپ کا — مطلع خورشید ہے بام آپ کا

یاد ہے اب تک وہ از راہِ کرم — وعدہ پہ آنا سرِ شام آپ کا

ہار ہوئی آخرِ کار آپ کی — بازی گیا جیت غلام آپ کا

میرا وہ اصرارِ نشیدِ غزل — عذر میں وہ نرم کلام آپ کا

رات کی تنہائی میں آخر وہ خود — نغمۂ آہستہ خرام آپ کا

مٹ کے رہے دونوں بتقریبِ وصل — دردِ مرے دل کا زکام آپ کا

دعوائے میخواریٔ حسرت غلط
آپ کی بوتل ہے نہ جام آپ کا

ساغر نظامی

خاکستر

اُلجھی سُلجھی سانسوں سے اب زیست کا ساماں کیا ہو گا
جینا تو مر مر کے ہوا تھا، مرنا آساں کیا ہو گا

ہو گا کیا جینے کا سہارا زیست کا ساماں کیا ہو گا
لاگ نہیں اب تجھ سے بھی دل کو اے غمِ پنہاں کیا ہو گا

آنسو بن کر ٹپکا بھی تو کارِ نمایاں کیا ہو گا
اے غمِ پنہاں! اے غمِ پنہاں! اے غمِ پنہاں کیا ہو گا

غرق ہوئے تو ہو جائیں گے، کارِ نمایاں کیا ہو گا
موج کے اُٹھنے گرنے سے نقصانِ طوفاں کیا ہو گا

اُلٹے سیدھے شکووں پر وہ کافر حیراں کیا ہو گا
عشق ہی آنکھیں نیچی کر لے، حُسن پشیماں کیا ہو گا

حُسنِ بہاراں، کیفِ بہاراں، جوشِ بہاراں کیا ہو گا
دیوانے گلشن میں نہیں مرکز یہ گلستاں کیا ہو گا

طوفان طوفان بہتے پھرنا، رسوائی ہے کشتی کی
بچ نکلے تو دُنیا کو اندازۂ طوفاں کیا ہو گا

کشتی نذرِ موجِ بلا ہے، موجِ بلا کا کیا کہنا
ساحل تک پہنچا بھی دیا تو ہم پر احساں کیا ہو گا

ان کی مرضی، جبرِ مسلسل، ہستی سراپا مجبوری
اپنے بس میں کچھ بھی نہیں تا حدّ امکاں کیا ہو گا

قیدِ حیات و جبرِ مشیّت، اُس پہ فریبِ مختاری
تجھ سے بڑھ کر اے غمِ ہستی کوئی زنداں کیا ہو گا

ہوش گریزاں، شکوے لرزاں، گویائی کی تاب نہیں
شوق کے ان طوفانوں میں وہ شوخ پشیماں کیا ہو گا

روتی ہوئی آنکھوں کی جگہ کچھ اشک ہیں رنگیں رنگیں سے
اس سے زیادہ سوزِ محبت اور نمایاں کیا ہو گا

ان کا قصّہ بھید نہیں کچھ، دل کا فسانہ راز نہیں
میرے دو اک اشکوں سے یہ اور نمایاں کیا ہو گا

کعبۂ دل آثارِ شکستہ، ان کی نگاہیں کفرِ تمام
شیخ و برہمن کچھ تو کہو، انجامِ ایماں کیا ہو گا

موسمِ گُل میں ٹکڑے ہونا اور ہوا میں اُڑ جانا
اس سے بڑھ کر اے غمِ وحشت مصرفِ داماں کیا ہو گا

کوئل ہو یا بُلبُل ہو یا جھرنے ہوں کہساروں کے
کوئی بھلا ساغر کی طرح مستی میں غزل خواں کیا ہو گا

(یہ غزل ادبی بیان درستی معین الدین صاحب کے نسخۂ خاص سے) (۷، جون ۱۹۴۲ء)

۷۰

اخترالایمان

شکست

تم سے بیرنگیٔ ہستی کا گلا کرنا تھا!

دل پہ انبار ہے خوں گشتہ تمناؤں کا — آج ٹوٹے ہوئے تاروں کا خیال آیا ہے
ایک میلہ سا ہے مفلوج سی امیدوں کا — چند پژمردہ بہاروں کا خیال آیا ہے
پاؤں تھک تھک کے رہے جاتے ہیں مایوسی میں — پُرمحن راہ گزاروں کا خیال آیا ہے

ساقیٔ و بادہ نہیں جام و لب جو بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

روز دہقان دُھندلکے میں ہوس بوتا ہے — رنگ بھرتا ہے شب و روز کے افسانے میں
روز چشموں سے اُبلتا ہے پہاڑوں کا لہو — خشک ہو جاتا ہے جا کر کسی ویرانے میں
لالہ زاروں میں اُگا کرتا ہے بازار کا روپ — ترشے جاتے ہیں صنم روز صنم خانے میں!

کرم شہتوت کے پتّوں سے بھی محروم ہیں جو
ریشم و اطلس و کمخواب بنا کرتے ہیں!

میرے پندار کی زنجیر گلی جاتی ہے — اس خرابے میں کہیں کوئی قدح خوار نہیں!
وہی فرسودہ عقائد نئے پیراہن میں — آج دیرینہ ہوس کار ہوس کار نہیں!
سرگریباں ہوں مرا زعم نظر ٹوٹ گیا — اب مرے گرد کوئی آہنی دیوار نہیں

اب اسی حال میں رہنا ہے ستم سہنا ہے!
اب مجھے کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں کہنا ہے!

اختر ہوشیارپوری

عزم

ہوگئی صبح ہوئے جاتے ہیں افسردہ چراغ

چاندنی نیم کے سائے تلے اب سو بھی گئی
چور ہے تھک کے جوانی کے ہر اک نغمے کی لے
دل کی آواز فضاؤں میں کہیں کھو بھی گئی

دوشِ احساس پہ اب بار ہیں مینا و ایاغ

آہ وہ بیتے ہوئے لمحے محبت کے امیں

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں جو سستانے
ہانپتے آئے تھے تپتے ہوئے صحراؤں سے
رس بھرے ہونٹوں سے بے نام سی لذت پانے

رہ گئے تیرگیٔ غم کے تلے دب کے کہیں

اب ترے ہاں نہیں آؤں گا، نہیں آؤں گا

منزلیں لاکھوں ہیں ٹھکرا کے جنہیں آیا تھا
رہ میں تارے بھی ہیں، میخانے بھی، گل بھی جن سے
اپنی معصوم جوانی کو بچا لایا تھا،

اب کہیں بند کئے آنکھ چلا جاؤں گا

ہوگئی صبح، ہوئے جاتے ہیں افسردہ چراغ

ایشیا۔ جون جولائی ۱۹۴۲ء

ظفر تاباں دہلوی

غزل

وہ بیخودی ہے کہ اب بیخودی نہ جائے گی
میری شراب کی مستی کبھی نہ جائے گی

نہ جائے گی خلش عاشقی نہ جائے گی
جگر کا درد نظر کی نمی نہ جائے گی

حریمِ خلوتِ جاناں ہے وہ مقامِ ادب
نگاہ سے بھی جہاں بات کی نہ جائے گی

ہزار حُسن میں شیوے ہوں بے حجابی کے
مگر نگاہ کی شرمندگی نہ جائے گی

ہزار بار کرے حُسن اہتمامِ سکوں
دماغِ عشق کی آشفتگی نہ جائے گی

ہزار عشق کو ہو ناز آشنائی پر
مگر وہ حُسن کی بیگانگی نہ جائے گی

اُسی نظر میں نہاں رازِ عاشقی ہوگا
وہ اک نظر جو تری سمت کی نہ جائے گی

یہی رہی خلشِ عاشقی اگر تاباں
تو بے قرارئ دل ضبط کی نہ جائے گی

نواب جعفر علی خاں اثر بی-اے

غزل

عرق آلود کسی کا رُخِ تاباں ہونا
اپنے ہی نور میں خورشید کا پنہاں ہونا

زیرِ لب کہکے کچھ، انگشت بدنداں ہونا
یہ ہے دیوانہ بنانا کہ پشیماں ہونا؟

کچھ نہیں اسکے سوا جوشِ گُل و موسمِ گُل
ایک ہنگامہ پے چاک گریباں ہونا

عشق پر ختم ہے یہ طرزِ گرفتاریٔ دل
آپ ہی اپنی تمنّاؤں کا زنداں ہونا

خشک آنکھوں میں پھر اک اشکوں کا طوفاں اُمڈا
سیکھ لے تم سے کوئی حال کا پرساں ہونا

عشقِ شوریدہ کو سودا ہے اُسی منزل کا
راز بنتا ہے جہاں راز کا عرفاں ہونا

عشق ہے بزمِ تماشا بھی، تماشائی بھی
آپ ہی دیکھنا اور آپ ہی حیراں ہونا

یاد اُس عہد کی جب کان سُنا کرتے تھے
گُل کی آغوش میں نکہت کا غزلخواں ہونا

ہے اثر دل کے دھڑکنے میں بھی نغمہ، لیکن
پہلے درکار ہے دو روحوں میں پیماں ہونا

شورؔ (علیگ)

طیّارہ

موت کا اک قہقہہ غارت گری کی اک ہنسی
ایک آشفتہ تباہی ایک برہم نیستی

بربریت کی قسم پیمانِ تخریبِ حیات
ایک ایسی صبح جس کی گود میں تاریک رات

سینۂ ایجاد کا اک زخم خونابہ فشاں
ترکشِ غارتگری کا اک خدنگ بے اماں

اک پریشاں سی قیامت ایک آوارہ عذاب
ایک رم خوردہ تغیّر ایک بھٹکا انقلاب

ایک ظلمت ریز بادل ایک آندھی تند و تیز
اک ہلاکت خیز طوفاں شعلہ بیز و شعلہ ریز

نیستی کی چیخ کربِ زندگی کی اک پکار
اک تلاطم خیز ساحل اک خزاں پرور بہار

چرخ پیما ایک آوارہ بگولا موت کا
جنبشیں کھاتا ہوا سا ایک جھولا موت کا

ایک بہتا سا جزیرہ ایک اُڑتا سا غبار
اضطرابِ روحِ فطرت فتنۂ گیتی شکار

ایک کوہِ آتش افشاں ایک کھائی موت کی
ایک "انگڑائی" فنا کی اک "جمائی" موت کی

ایک معلّق زلزلہ انگڑائیاں لیتا ہوا
زندگی کو اک پیغامِ فنا دیتا ہوا

ہم نشیں وہ آسماں پر دیکھ طیّارہ اُڑا
آگ کے طوفاں کو لیکر دیکھ انگارا اُڑا

بادلوں کو چیرتا کہرے ہیں درّانے لگا
ابر کے ٹکڑوں میں چھپ چھپ کے نظر آنے لگا

اب فنا کے ہاتھ ہوگا زیست کا برہم نظام
موت اس صورت سے لیگی زندگی سے انتقام

آسماں میں اب یہ طیّارے اُڑائے جائیں گے
اب اسی صورت سے قصر و بام ڈھائے جائینگے

اب فضا میں آتشیں طوفاں اُٹھائے جائیں گے
اب بساطِ خاک پر شعلے بچھائے جائینگے

مسندوں میں آگ، محلوں میں شبستانوں میں آگ
دامنوں میں آگ بھڑکے گی گریبانوں میں آگ

کوچہ و بازار میں شعلے، طرب خانوں میں آگ
معبدوں میں آگ لگ جائے گی ایوانوں میں آگ

جنگلوں میں آگ بھڑکے گی گلستانوں میں آگ
کشتیوں میں آگ ہوگی اور طوفانوں میں آگ

آگ کے شعلے گرائے جائینگے افلاک سے
آگ کے طوفاں اُٹھائے جائینگے اب خاک سے

خرمنِ تہذیب سے اُٹھتا رہے گا اک دھواں
اب یوں ہی گزرے گا ہستی سے فنا کا کارواں

یہ جو اُڑتا جارہا ہے آسماں پر ہم نشیں
ہاں "سکونِ روحِ آدم" ہے یہ طیّارہ نہیں

خمار بارہ بنکوی

غزل

نہیں ہوتا مداوائے غمِ پنہاں نہیں ہوتا
بظاہر ہنس لیا جاتا ہے دل خنداں نہیں ہوتا

پریشانی میں ہنس دینا جسے آساں نہیں ہوتا
وہ کم ہمت سزاوارِ غمِ جاناں نہیں ہوتا

محبت نے مجھے پہنچا دیا ہے اس بلندی پر
کہ اب اُن سے بھی میرے درد کا درماں نہیں ہوتا

طوافِ کعبہ برحق۔ بندگی واجب مگر زاہد
بغیر مے پرستی آدمی انساں نہیں ہوتا

حفاظت چاہیئے دلکی حفاظت چھوڑو گلشن کی
اُجڑ جاتا ہے دل گلشن کبھی ویراں نہیں ہوتا

جہاں بھی جی میں آئے سر جھکا دے بے نیازانہ
مذاقِ سجدہ پابندِ درِ جاناں نہیں ہوتا

نشیمن کیا چمن سے ربط ہونا چاہیئے دل کو
نشیمن کے اُجڑنے سے چمن ویراں نہیں ہوتا

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

سبھی کچھ ہو رہا ہے اس ترقی کے زمانے میں
مگر یہ کیا غضب ہے آدمی انساں نہیں ہوتا

فراقِ یار میں مرنا خمار آساں ہوتا ہے
فراقِ یار میں جینا خمار آساں نہیں ہوتا

سلیمان ادیب

بنتِ عم سے!

تم سے اک بات ہے کہنے کی بڑی اچھی بات
سن کے تم ہنس ہی پڑو گی وہ ہے کچھ ایسی بات
یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں تم نہ خفا ہو جاؤ
یہ بھی ممکن ہے کہ اک سوچ میں تم کھو جاؤ
تم سے کہنے کا بہت دن سے ارادہ تھا مرا
اے خوشا! طالع بیدار کہ وقت آ ہی گیا

دیکھتی ہو وہ شفق پھول رہی ہے کیسی
شاید اس مہندی لگے ہاتھ کی سرخی ہو گی
طائر اڑ اڑ کے بسیرے کو چلے آتے ہیں
نرم ہے موج ہوا پھول کھلے جاتے ہیں
چاند کے روپ میں اتنی تو نہ تھی رنگینی
دیکھوں! ٹوٹی تو نہیں کوئی تمہاری چوڑی!؟

ہاں مگر یاد رہے یاد رہے راز ہے یہ
دل میں دو اس کو جگہ دل ہی کی آواز ہے یہ
لو سنو کان ادھر لاؤ مرے منھ کے قریب
اے لو شرماتی ہو تم، تم بھی ہو کس درجہ عجیب؟
یہ کہا "جلد کہو" خیر تو پھر سن لینا
کام ہے تم کو کسی اور کو یہ جل دینا
کیوں جھجکتی ہو کوئی چیز لئے لیتا ہوں؟
کیوں بگڑتی ہو ادھر آؤ کہے دیتا ہوں
کچھ نہیں جانتیں؟ انجان بنی جاتی ہو
کونسی نظم ہے وہ تم جو کبھی گاتی ہو
"کونسی نظم؟" وہی نظم جو پیاری ہے بہت
ہاں وہی نظم جو تم کو بھی تو بھاتی ہے بہت
جس میں شاعر نے کہا ہے کہ "محبت ہے مجھے
بنتِ عم تیرے تصور ہی میں راحت ہے مجھے"

چاہتا ہوں میں تمہیں بس یہی کہنا تھا مجھے
کیا کہا، اب نہیں بولو گی کبھی تم مجھ سے؟

کسوٹی

تازہ رسائل

برہان۔ جون۔

فلسفہ۔

فلسفہ کا وجود انسان کے شکوک کی بنیاد پر ہے۔ ہر سوچنے والا انسان جب ان سنی سنائی باتوں یا ایک عام روش سے اکتا جاتا ہے تو اسکے خیالات اسکے گرد حلقہ کر لیتے ہیں۔ وہ کیوں۔ کس طرح؟ اور کیونکر؟ کے ایک جال میں گھر جاتا ہے، اس کا دماغ اُسے بار بار اکساتا ہے اگر یہ یوں ہی ہے تو یوں ہی کیوں ہو۔ کسی اور طرح کیوں نہیں اور خیالات کی یہی رو دماغ کو فکر کی دعوت دیتی ہے۔ انسانیت اور ماورائے انسانیت کا تخیّل آدمی کو گھیر لیتا ہے طبعیات اور مابعد الطبعیات اخلاقیات اور مدنیات، خیر و شر، حسن و قبح، رحم و انصاف اور اسی قسم کی تمام چیزیں جن سے زندگی کا ایک گہرا تعلق ہے آدمی انکو بار بار سوچتا ہے اور یہی سوچنا زندگی کی ان منزلوں میں آدمی کو گھسیٹ کر لے آتا ہے جہاں سے انسان کی سطحی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ذہن میں بار بار یہ خیال پیدا ہو کر کہ زندگی محض خوردن، نوشیدن اور مردن نہیں اور ایک نئی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔

اس طریقہ سے ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرتی اصولوں نے جنم لیا۔ اور ہر شخص نے اپنی حیثیت اور فکر کے مطابق اصول مرتب کئے۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا جو زندگی کا مفہوم اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ ؎

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہو گیا جن کا خیال تھا کہ زندگی کو ضمیر کی آواز پر چھوڑ دینا چاہیئے چونکہ ضمیر ہی ایک ایسی چیز ہے جو بلا واسطہ خدا کی آواز کو سن سکتا ہے اور سنتا ہے۔ ایسے گروہ کے کچھ لوگوں نے زندگی کو محض ایک فریضہ تصور کیا اور انکی زندگی ایک سپاہی کی زندگی بنکر رہ گئی "فرض برائے فرض" کے علاوہ انکی زندگی میں ذاتیات کو کہیں دخل نہیں۔

تیسرے گروہ کے لوگوں کے نزدیک زندگی تنازع للبقا کے سوا کچھ بھی نہ رہی۔ اسی حیوانی کشمکش سے ان کے خیال کے مطابق ہم نکل آئے تھے اور اس زندگی میں بھی ہم کو وہی کشمکش جاری رکھنی چاہیئے۔ جس طرح اکثر جانور گروہوں میں رہتے ہیں۔ محض اپنی حفاظت کی غرض سے اسی طرح ہم بھی گروہوں میں رہتے ہیں اور ہمیں اس جماعتی نظام کے ساتھ ساتھ افراد کا بھی خیال رکھنا چاہیئے

چوتھا گروہ انہی تین قسم کے سوچنے والوں کے بین بین پیدا ہو گیا اور انھوں نے ان تینوں قسم کے سوچنے والوں کے بہترین اصول لیکر یکجا کر دیئے۔

ڈاکٹر ولی الدین کے متذکرہ بالا مضمون سے جو انھوں نے پچھلے ماہ کے برہان میں لکھا ہے۔ ہم یہاں کچھ پیش کرتے ہیں۔

"موجودہ زمانہ میں ہمارا نقطۂ نظر زیادہ تر انفرادی واقع ہوا ہے ہم دنیا پر ہیئتی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشرتی، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اسکی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ قدمائے یونان کو ثبات و تغیر عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا لیکن تغیر سے انکی مراد مادی تغیر تھا یعنی مادی ذرات یا اجزاء کی حرکت یا نشو و نما، زوال و فنا کے مظاہر۔ چنانچہ زینو کا خیال تھا کہ قدرت کے کارخانہ میں تغیر محال ہے۔ اسکو بظاہر جو تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب والتباس ہے، لیکن ہرقلیتوس کو یقین تھا کہ ثبات و سکون کائنات کی کسی شے میں نہیں۔ دنیا سر تا پا تغیر، تجدّد، تنوّع ہے، یہ اور اسی قسم کے مسائل اس میں شک نہیں ابتک لاجواب ہیں لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کئی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہو گئی ہے، ہم معاشرتی رسوم، سیاسی علائق، اخلاق و آداب مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادی کی تغیرات والی دنیا۔ لہٰذا فلسفہ کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفۂ حیات، اسکی قدر و قیمت، اسکی بدایت و نہایت، اور غرض و غایت کی توجیہ کرتا ہے اس لئے ارتقاء، ترقی، ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کیلئے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

شاید قارئین میں سے بہت کم ایسے ہونگے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے سوالات کو نہ اٹھایا ہوگا۔ کیا خدا کا وجود ممکن ہے، یا سوائے مادہ اور انرجی کے کوئی شئے نہیں؟ مادہ کا مایۂ خمیر کیا ہے؟ کیا درد سے زیادہ کوئی چیز حقیقی ہو سکتی ہے؟ اگر جلوہ فرمائی صرف مادہ کی ہے تو درد کیا چیز ہے کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا؟ تو کیا ذہن مادے سے جدا نہیں؟ اور غور وفکر کرنا، درد والم سہنا، کیا صرف مادی ہی جسم سے تعلق رکھتا ہے، مادی

جسم ہی کا وظیفہ ہے یا اس سے جدا شئے ہے؟ میں زندہ ہوں؟ حیات کیا ہے؟ وہ مے کیا ہے جو بقول اقبال "تلخ تر و نیکو تر ست"؟ ایک روز مجھے موت آئیگی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابوالعتاہیہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا۔

اَلْمَوْتُ بَابٌ وَ کُلُّ النَّاسِ یَدْخُلُہٗ　　یَا لَیْتَ شِعْرِیْ بعد الباب مَا الدَّارُ؟

ہم کٹھ پتلی نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا ع

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی!

حافظ کا خیال تھا کہ ع

پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند!

واقعہ کیا ہے! مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض اُن میں کے صائب ہیں اور بعض خطا پذیر، صواب و خطا کے کیا معنی ہیں؟ انکے معیار کیا؟ ہم میں سے بعض تلاش زر میں سرگرداں ہیں بعض شہرت کے خواہاں اور بعض لذت کے دلدادہ اور

"خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است"

کے پیرو۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قسمیں ہیں؟ ان سے اعلیٰ و ارفع نصب العین موجود ہیں؟ مثلاً رواقیہ نے "طمانیت نفس" کو خیر و برتر قرار دیا تھا، دنیا کی کوئی مصیبت دنیا کی کوئی خوشی، اطمینان خاطر کو صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ بی ہتیوس نے روما کے جیل خانہ میں فلسفے کے تسلی بخش لذات پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ کیا اس طرح تلاش حق، فنون لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قسمیں نہیں قرار دیجا سکتیں؟ ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے؟ علم انسانی کی حدود کیا ہیں اس کی اڑان کتنی ہے؟ علاوہ ازیں فطرت و صنعت میں خوبصورت اشیاء میرا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ اکثر بدصورت بھی ہیں، حسن کیا ہے؟ ایک خوبصورت عمارت میں، ایک حسین چہرے میں، موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہوتے ہیں؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں۔ ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت لباس حسن میں ملبوس ہوتی! یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں۔ ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، ان پر غور کرنا، حکیمانہ طور پر، تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا۔ ان کے جواب فراہم کرنیکی سعی کرنا گویہ لاحاصل سہی فلسفہ ہے، یا جیسے فلسفہ کے شیدائی ولیم جیمس نے کہا ہے "فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے"، یہ کام دیوتاؤں کا نہیں، جانوروں کا نہیں، انسان کا ہے، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پروفیسر ہو یا تاریخ کا!"

گل کر دو پھینک دو پہلے ہی سے یہ زرد چراغ

آج بھی عیش کے لمحات فسردہ کیوں ہوں

جگمگاتے ہوئے ریشم کا پرانا ملبوس

جسم افسردہ کی زردی کو چھپا ہی لے گا

رات کے وقت بہر حال یہ نیلا فانوس

تم سمجھتی ہو کہ خلوت کو سجا ہی لے گا

کل یہی ساز، یہی گیت، یہی جام شراب

جھلملاتی ہوئی دیوار پہ تھرّاتے تھے

رات یہ شمع، یہ تارے، یہ سنہرا مہتاب

خلوت عیش میں کچھ سرد ہوئے جاتے تھے

دھندلے دھندلے سے انہی ریشمی پردوں کے ادھر

حسن غربت کے نظارے بھی یہاں کیوں کھیلیں

جنکے چہروں سے مجھے اپنے گناہ آئیں نظر

ایسے وہ چاند ستارے بھی یہاں کیوں کھیلیں

ہاں ہٹا دو مری نظروں سے یہ پُر درد چراغ

مرے گاتے ہوئے جذبات فسردہ کیوں ہوں

ساقی جون۔ (سلام مچھلی شہری)

نظم پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کا شاعر اپنے گرد و پیش سے کچھ بیزار سا ہے۔ محفل عیش میں داخل ہونے سے پہلے اسکی نظر اس زرد چراغ پر جاتی ہے جو اس انجمن نشاط کیلئے ایک بر اشگون ہے۔ اگرچہ اشعار

کے ساتھ ساتھ ذرا سا ذہن پر زور دیکر کچھ سوچیں تو ہمیں اسکے پس منظر میں ایک ایسے انسان کی تصویر نظر آئیگی جس کے چہرہ پر ایک حزن و ملال اور آنکھوں سے بیزاری ٹپکتی ہوہے۔ اسکی نگاہوں کے سامنے محفلِ عیش و نشاط کا باب وا ہے، اور وہ اپنے آپکو اس میں غرق کر دینا چاہتا ہے۔

اسکی آمد اس محفل نشاط میں آج پہلی بار نہیں بلکہ وہ اکثر آتا ہے۔ اور جس طرح اس سے پہلے اسکے وقتی تعیش میں کوئی فرق نہیں آیا اسی طرح وہ آج بھی نہیں چاہتا کہ اسمیں کوئی فرق آئے لیکن صرف شمع ہی کے الگ کر دینے سے ہی تو عیش کے لمحات فسردہ ایک امنگ میں نہیں بدل جائینگے اسکے لئے وہ کہتا ہے کہ جہاں اور چیزوں کا تعلق ہے انہیں یہ ریشمی غلاف ڈ پر لئے ملبوس ڈھاپ لیں گے۔ جہاں تک زندگی کی بے بسی کا تعلق ہے وہ وہ ایک تاریکی میں مدغم ہو کر رہ جائیں گے۔

نظم میں کہیں بھی نمایاں طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر یہ تمام کچھ کہہ کیسے رہا ہے لیکن اس پس منظر پر نظر ڈالنے سے اس انسان کے سامنے ایک نسوانی پیکر نظر آئیگا۔ بہت دھندلا اور مبہم سا جو پرانے ریشمی ملبوس اتار دینے کے بعد زندگی کی ایک بھیانک تصویر ہے۔ غربت کا ایک مستقل نظارہ ابھرا اس تصور کے ساتھ ہی اس ماحول میں سینکڑوں نسوانی پیکر عریاں، زرد بے بس۔ انسانی گناہوں کی ایک تصویر، چاروں طرف منڈلاتے ہوئے نظر آئیں گے،

یہ نظم فن کاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے سلام جو کچھ پس منظر میں رکھنا چاہتا ہے وہ وہیں رہتا ہے اور جس انداز سے نظم کا آغاز کرتا ہے وہ انداز آخر تک اسی طرح قائم رہتا ہے۔ اس کا منتہا اس محفلِ عیش میں آنے سے صرف یہ ہے کہ وہ ایک لمحہ کیلئے ان انسانی آلائشوں سے منہ موڑ لینا چاہتا ہے۔ جیسے دیکھتے دیکھتے وہ اکتا گیا ہے اور نہیں چاہتا کہ اب دیکھے تاوقتیکہ اس کا یہ خمار اور یہ ایک وقتی لطف ختم نہ ہو جائے۔ اسکے علاوہ ایک چیز یہ بھی ہے کہ اگر وہ اس زرد شمع کی روشنی میں ان پرانے ریشمی ملبوس اور زرد اجسام کو دیکھے گا تو اسے اپنے گزشتہ واقعات کا خیال آئیگا۔ اس محفلِ عیش کا جس کی داد وہ اکثر دیتا رہا ہے اور وہ اپنے گناہوں سے پشیمان ہوگا۔ اس کا لطف ایک مستقل تکلیف بن کر اسکے دل میں ایک کسک پیدا کر دیگا۔ اور نہیں چاہتا کہ اس کے گاتے ہوئے جذبات فسردہ ہو جائیں

وہ انہیں اجاگر کر کے لایا ہے۔

وہ نظم میں ابتدا ہی سے ایک تاثیر پیدا کرنا چاہتا ہے ایک ہی سلسلہ خیال کو لیکر چلنا چاہتا اور اسے آخر تک قائم رکھتا ہو نظم کے شروع میں خیال ہوتا ہے کہ کہیں وہ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر جو محفل عیش میں اس کے سامنے آنیوالی ہیں لڑکھڑا نہ جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ وہ ایک ہی وقت میں تعیش کوش بھی ہے، نقاد بھی، اور ایک فن کار بھی۔ لیکن اس کا یہ پہلو جس میں وہ ایک نکتہ چیں کی حیثیت سے نسوانی زندگی اور محفل عیش کو دیکھتا ہے اتنا دبا ہوا ہے کہ وہ آخر میں ایک فن کار ہی ثابت ہوتا ہے سلام کی اکثر نظمیں وہ ایک فن کار کی تراش خراش کا اچھا نمونہ ہیں۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں لغزش بھی ہو جاتی ہے۔

ہمارا دور بیداری کا ایک احساس ہے، ایک انسانی ہمدردی کی رو، ایک خلفشار اور خلجان میں نہ صرف ایک آدمی بلکہ ہر شخص گرفتار ہے۔ ہر ذی حس اور سوچنے والا دماغ۔ اس خلفشار میں نہ صرف سلام ہے۔ بلکہ یوسف ظفر بھی۔

چور پکڑا گیا —— پکڑا ہی گیا آخر کار
رات کے ٹوٹتے تاروں کا سنبھالا لیکر
چپکے چپکے وہ دبے پاؤں ہوا تھا داخل
بھوک اک خنجرِ بیباک تھی اس کے دل میں
دل کی دھڑکن —— وہ تو چہرے پہ نکھر آئی تھی
کئی راتوں کی تھکن اس کی نظر کے بل پر
آنکھ کے پردۂ سیمیں پہ اتر آئی تھی
اسکی پژمردہ جوانی کا وہ ڈھانچا تو نہ تھا
ایک احساس کا پتھرایا ہوا لاشا تھا

سامنے کمرے میں کیا کچھ نہ تھا —— سب کچھ ہی تو تھا
وہ زر و سیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا
اپنے خود کاشتہ اصنام کا انبارِ عظیم
عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں
مسکراتی ہوئی تصویریں بنی جاتی تھیں
وہ بھوک مٹ سکتی تھی —— مٹ سکتی تھی —— مٹ سکتی تھی۔ (یوسف ظفر)

ادب لطیف۔ جون۔ زندگی کی جس ضرورت کیلئے سلام زرد اجسام ریشمی ملبوس میں پوشیدہ کر رہا ہے اسی ضرورت کو ظفر ایک دوسرے طریقہ سے پیش کر رہا ہے۔ ایک فنکار کی تعریف یہ ہے کہ وہ کوئی بھی موضوع ہو اسے اس طرح پیش کرے کہ کانوں کو گراں اور حسن لطیف پہ بار نہ گزرے اس موضوع پر جس پر ظفر اظہار خیال کر رہا ہے پہلے بھی نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن انھیں پڑھنے سے وہی لطف آتا ہے جو ایک فوجی بینڈ کو سنکر آسکتا ہے۔ لیکن ظفر صرف

چور پکڑا گیا۔ پکڑا ہی گیا آخرکار

کہہ کر دماغ کو ایک روحانوی اور مضطرب ماحول کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد جذبات ایکدم ایک لاوے کیطرح ابل نہیں پڑتے بلکہ ایک کسک بنکر بے چین کر دیتے ہیں۔

رات کے ٹوٹتے تاروں کا سنبھالا ایک آرٹسٹ ہی کے قلم سے نکل سکتے ہیں اور پھر اس کے پیچھے جو گداز اور سوز چھپا ہوا ہے اسکی کیفیت کچھ وہی شخص زیادہ سمجھ سکتا ہے جس کو ایک امید و بیم کی گھڑی در پیش آئی ہو۔ نظم حقیقت در و ماں کے ملے جلے تاثرات لئے ہوئے آخر تک ایک لطیف طنز بن کر رہ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی طبیعت میں ایک ہلکا۔ نفرت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

وہ زر و سیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا
اپنے خود کاشتہ انصاف کا انبار عظیم
عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں

یہ سطریں جہاں ہمارے سامنے ایک مشاق نقاش کو پیش کرتی ہیں۔ وہاں ایک تبسم زیر لب کبھی مجبور کرتی ہیں جنہیں کڑواہٹ اور تلخی بدرجۂ اتم ہے اور جب ہم سنتے ہیں کہ۔

اسکی بڑھ مردہ جوانی کا وہ ڈھانچا تو نہ تھا
ایک احسان کا پتھرایا ہوا لاشا تھا

اس وقت اسکے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا کہ رفتہ رفتہ ان چیزوں کی بیخ کنی کیجائے۔ اس طرح کہ۔

عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں مدھم پڑ جائیں

اگر اس طرف سلام اور ظفر روزگار کے شاکی ہیں۔ تو دوسری طرف جذبی اور روش غم دل کے شاکی ہیں۔ اور ان دونوں سے کہیں نجات نہیں۔

اپنے بھیگے ہوئے رخسار دوں کا آہ کے ساتھ — مرے جلتے ہوئے ہونٹوں پہ رکھیگا کوئی
اپ نگہیں کی خموشی پہ نہ میں بگڑوں گا — مری بیباک نوائی پہ نہ روٹھیگا کوئی
دل نازک کے دھڑکنے کی سنوں گا نہ صدا — مری گھٹتی ہوئی آہوں پہ نہ چونکیگا کوئی
مری آہٹ پہ لجاتے ہوئے میری جانب — ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے نہ آئیگا کوئی
انکے ماتھے پہ پڑیگی نہ بناوٹ کی شکن — انکے کھنچتے ہوئے ہاتھوں کو نہ چومے گا کوئی
مری وحشت کے تماشے بھی نہیں ہونگے نصیب — انکے الجھے ہوئے بالوں سے نہ الجھے گا کوئی

دل ناشاد تری چپ سے مگر کیا ہوگا
نری فریاد کو سمجھا ہے نہ سمجھے گا کوئی

ادب لطیف جون۔ (جذبی)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبی ایک تذبذب اور کشمکش کے عالم میں سر جھکائے زندگی کے گذرے ہوئے لمحات پر غور کر رہا ہے۔ خیالات کا ایک سلسلہ ہے جو بندھا ہوا ہے۔ ذہن گذشتہ واقعات کو دہرا رہا ہے اور ایک چھیڑ چھاڑ اور لطیف رمز و کنایات جو دو جذبات سے بھرے ہوئے دلوں میں ہوا کرتے ہیں ان کا تصور بندھا ہوا ہے۔ کبھی انھیں حنا آلود کھنچے کھنچے ہاتھوں کا خیال آتا ہے جنہیں وہ چومنے کیلئے بیقرار رہا کرتا تھا۔ اور کبھی اس التہاب شوق کا۔ جب کوئی اسکے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے رخسار رکھدیا کرتا تھا اسے وہ منظر یاد آجاتا ہے۔ جب کوئی اسکی آہٹ پر اپنے آنچل کو نرم و نازک انگلیوں سے ہٹاتا ہوا لجاتے ہوئے اسکی طرف آیا کرتا تھا اور کبھی جب اسکی انگلیاں کسی کے الجھے ہوئے بالوں سے کھیلا کرتی تھیں۔

81

اسے ان لطیف احساسات کا تصور بے چین کر دیتا ہے اور وہ جس طرح خیالات اس کے ذہن میں آتے تھے اور جس طرح واقعات ہو چکے ہیں بعینہٖ اسی طرح انہیں اٹھا کر اپنے قلم کی ایک جنبش سے کاغذ پر لے آتا ہے۔ جس طرح اس نے اپنے ذہن میں دیکھا اسی طرح ہم نے اسے کاغذ پر دیکھا اور اپنے تخیل میں ایک تصویر بنالی اور بقول شخصے بہترین شاعری فن کے لحاظ سے وہ ہے جسکی تصویر بن سکے اور ہم بلا شک و شبہ جذبی کی اس نظم کو پڑھ کر ایک تصویر مکمل کر سکتے ہیں۔

ایشیا جون، جولائی ۱۹۳۳ء

رات بھر نکہتِ بیدار گل افشاں ہی رہے
صبح تک خلوتِ شب بزمِ چراغاں ہی رہے
گرم رو قافلۂ شوق فراواں ہی رہے
جذب پنہاں کو یوں ہی راہ نما رہنے دے

کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ
عالمِ شوق کو غافل نہ کہیں پائیں وہ
دلِ ناداں کہیں آکر نہ چلے جائیں وہ
بربطِ غم کو یوں ہی نغمہ سرا رہنے دے

بے اثر ہو غمِ الفت یہ نہیں ہو سکتا
حاصل عشق ہو فرقت یہ نہیں ہوسکتا
ان کو لائے نہ محبت یہ نہیں ہو سکتا
اس پہ سب فلسفۂ یاس فزا رہنے دے

دلِ ناداں نہیں معلوم وہ کب آجائیں
در کاشانۂ اُمید کھلا رہنے دے

(روشن صدیقی)

۸۲ ادیب جون -

جذبی اور روشن کے فلسفۂ محبت میں بہت بڑا فرق یہاں آن کر پڑجاتا ہے جہاں جذبی کہتا ہے

پیار تری بات کو سمجھا ہے نہ سمجھو گا کوئی

اور روشن کے خیال میں

اب یہ سب فلسفۂ یاس فزا رہنے دے

روشن مایوسی کو گناہ خیال کرتا ہے اور اسی لئے اسکے یہاں حزن و ملال نہیں یا یہ کہ اسکی نگاہیں ایسے مناظر سے دوچار ہونیکی قوت نہیں رکھتیں۔ اپنے آپ کو امید کی آخری منزلوں پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کو اپنے جذبۂ عشق پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ یہ کہہ اٹھتا ہے۔

بے اثر ہو غمِ الفت یہ نہیں ہو سکتا۔

وہ یاس کا قائل نہیں ہاں ایک مسلسل کوشش کا ضرور قائل ہے۔ اسکے یہاں شک کا شائبہ ضرور ہے۔

"کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ" میں اگرچہ ظاہرا طور پر ایک امید کی جھلک ہے لیکن اسکے پس پردہ ایک ابہامی کیفیت پنہاں ہے۔ یہ بھی بہت ممکن ہے وہ نہ بھی آئیں۔ کوئی وقت کا تعین نہیں، کوئی خاص وقت نہیں لیکن ہاں ایک رو تحت الشعور میں ضرور دوڑ رہی ہے، جو بار بار کہتی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ ضرور آئیں گے۔

ممکن ہے زندگی میں آگے چلکر ایسے مقامات آجاتے ہوں جہاں مایوسی امید میں بدل جاتی ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ روشن ان مقامات کو طے کر چکا ہو۔ ورنہ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ

روز امید بدل جاتی ہے مایوسی میں۔

ادارہ

نئی کتابیں

انجمن ترقی اردو کی کہانی:۔ مولوی غلام ربانی صاحب سررشتۂ آثار قدیمہ کی لکھی ہوئی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت چار آنے

یہ کتاب انجمن کی ابتدائی حالت سے لیکر اسوقت تک کی جدوجہد اور کاوش کی ایک مختصر کہانی ہے۔ زبان نہایت عمدہ اور برجستہ ہے اور بہت مؤثر انداز میں لکھی گئی ہے۔ ہماری اکثر انجمنوں کی کیفیت یہ ہے کہ پیدا ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور بعض بعض تو اس خوبصورتی کے ساتھ پیدا ہوتی اور ختم ہو جاتی ہیں کہ لوگوں کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوتی بالکل اسی طرح سے جس طرح اسلام نے خیرات کا طریقہ بتایا ہے کہ اس طرح ہونی چاہئے کہ دائیں ہاتھ کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

در اصل اس قسم کے تمام کاموں کی بنیاد کارکنان کے ذمہ دارانہ یا غیر ذمہ دارانہ رویہ پر ہوتی ہے۔ ہم لوگوں میں خلوص، ایثار، جانفشانی اور نیک نیتی سے کام کرنیوالے لوگ بہت کم ہیں۔ اکثر لوگ کسی انجمن یا اسی قسم کی کسی اور تحریک کی ذمہ داری محض اس وجہ سے قبول فرما لیتے ہیں کہ انکی نظر تحریک سے ہٹ کر ذاتی شہرت یا کسی ذاتی مفاد پر ہوتی ہے ممکن ہے تحریک کی کامیابی بھی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کامیابی ہو کیونکر۔ ذاتی مفاد تلاش کرنیوالے لوگ خود کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

کسی تحریک میں کام کرنیوالے عموماً تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں، پہلے وہ جو روپیہ صرف کرسکتے ہیں کام نہیں کرسکتے ایسے لوگوں کے پیش نظر محض شہرت اور ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو کام کرسکتے ہیں روپیہ نہیں صرف کرسکتے۔ ایسے لوگ ضرورت سے زیادہ جوشیلے ہوتے ہیں اور تیسرے وہ جو روپیہ بھی صرف کرسکتے ہیں اور کام کرنیکی اہلیت بھی رکھتے ہیں لیکن یہ قسم عموماً نایاب ہے اور اگر ملتی ہے تو بہت مشکل سے۔ بعض اوقات اول الذکر قسم کے لوگوں کی نیت بھی درست ہوتی ہے مگر اتفاق سے جو کام انکے سپرد کیا جاتا ہے اس سے انکی طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ کام بے دلی سے شروع ہوتا ہے نتیجہ یہ کہ سب کچھ صفر ہوکر رہ جاتا ہے جس کی قیمت دائیں یا بائیں کسی طرف لگانے سے بھی نہیں بڑھتی۔

یہ انجمن ترقی اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا جو روپیہ بھی صرف کرسکتا ہے اور محنت بھی جان توڑ کر کرسکتا ہے یہ ہی اور کلی انجمن کی ترقی کا راز ہے۔ اس میں بڑا دخل نیک نیتی، خلوص اور ایثار کو ہے۔

مولوی غلام ربانی صاحب نے یہ رسالہ مولوی عبدالحق صاحب کی ۲۵ سالہ معتمدی انجمن ترقی اردو کی یادگار کے طور پر خود اپنے شوق سے تحریر کیا ہے اور جن جن مشکلات کا مولوی صاحب اور انجمن کو مقابلہ کرنا پڑا اسے نہایت اچھے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ کتاب کا آغاز انجمن کے ابتدائی دور سے کیا ہے کہ کیونکر مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمن شروانی کے ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی انجمن مولوی عبدالحق صاحب تک پہنچی۔ اسوقت انجمن کا کل سرمایہ مصنف کے الفاظ یہ تھا۔

ایک پرانا صندوق جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا، ایک رجسٹر اور چند پرانے اور غیر مرتب مسودات۔ ایک قلم دوات اور باقی اللہ کا نام،، اگر ہم آجکل کسی کو ایک لوہے کا گز۔ ایک گز گاڑھا اور ایک کاغذ کے پرزے پر شہر کے محلوں اور گلیوں کے نام لکھکر دیدیں اور کہیں کہ جاکر بڑے پیمانے پر تجارت کرو۔ تو سوائے اسکے کہ وہ شخص یا تو مسکرا کر خاموش ہو جائے یا پھر گالیاں دے اور کیا کرسکتا ہے مگر مولوی صاحب نے ایسا نہیں کیا ممکن ہے اس ذمہ داری کو قبول کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک تبسم آگیا ہو مگر اس کے معنی بھی یہی تھے کہ اچھا۔

گر یہی رنگ تمنا ہے تو اب یونہی سہی

اس کے بعد انجمن کا کام شروع ہوا۔ اورنگ آباد دکن۔ ترقی اردو کی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور وہ رقمیں جنہیں حقیر خیال کیا جاتا ہے جمع ہونی شروع ہوئیں جد وجہد ہوئی، دوڑ دھوپ کے ساتھ ساتھ خلوص کام کرنے لگا۔ چندہ اکٹھا کرنا بے انتہا مشکل کام ہے۔ مگر مولوی صاحب نے سب سے پہلے یہی کام کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بغیر روپے کے ہر سکیم چاہے وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو نا کام ہوکر رہ جاتی ہے۔ مختلف رسائل میں اسکی موافقت میں مضامین نکلنے شروع ہوئے۔ کیونکہ یہ دنیا پروپیگنڈے کی ہے اور اسکے بغیر کسی کام کو بڑے پیمانہ پر چلانا ذرا مشکل ہے۔ اب اس تمام جد وجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ انجمن اب وہاں ہے۔ جہاں گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہ کبھی پہنچ سکے گی۔

ہماری زبان کا سرمایہ اب تک محض قصہ کہانیوں تک محدود تھا۔ اسے کسی صورت میں بھی علمی زبان نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک علمی اور ادبی زبان ہے۔ آجتک کوئی کتاب علم سائنس اور فلسفہ جیسے خشک مضامین سے متعلق ہماری زبان میں نہ تھی اور یوں بھی ہم لوگوں کے دماغ فطرتاً تعیش پسند ہیں۔ ہمارا ہر ادنی آدمی اس دور کے خواب دیکھتا ہے جب اس کا رنگین تخیل حقیقت میں بدل جائیگا اور بقول شخصے اسکے لئے۔

دن عید اور رات شب برات ہوگی۔

لیکن انجمن ترقی اردو کی کوششوں سے تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی طرف قدم اٹھایا گیا اور آج اس زبان میں بہت سی کتابیں فلسفہ، تاریخ اور سائنس سے متعلق مل سکتی ہیں یہاں تک کہ ابتدائی جماعتوں کی درسی کتابیں بھی جن کا اس وقت تک قحط تھا

اس وقت انجمن سے دو ٹھوس رسالے، اردو، اور سائنس نکل رہے ہیں اور انکی اہمیت کسی بھی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔

غرضیکہ تمام کتاب انجمن اور مولوی صاحب کی کاوشوں اور مشکلوں کے ساتھ ساتھ اسکی ترقیوں کی بھی ایک مختصر روداد ہے، اخیر میں انجمن کی چند مفید کتابیں مثلاً میکسم گورگی کی خود نوشت سوانح عمری، قاضی نذرالاسلام کی بنگالی نظموں کا ترجمہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران اور نطشے کی تصنیف بقول زرتشت کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ

کی فہرست درج ہے۔ انجمن اور اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایک اچھی چیز ہے۔ چاہئیے کہ لوگ اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید لیں۔

انشائے داغ۔ مرتبہ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ قیمت ایک روپیہ چھ آنے

یہ مرزا داغ دہلوی کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں پہلی فصل میں والیانِ ریاست، حکام، عمال اور امراء کے نام خطوط ہیں۔ دوسری فصل میں مخصوص اعزہ واحباب اور تلامذہ کے نام خطوط ہیں۔ تیسری فصل میں بسلسلۂ شاعری شاگردوں کے نام خطوط ہیں۔ مقدمہ سے پہلے احسن مرحوم کی بہت عمدہ تصویر ہے اور مقدمہ کے بعد مرزا داغ کی تصویر ہے داغ صاحب اس تصویر میں شاعر اور خوش زبان معلوم ہوتے ہیں بہرحال خیالات واحساسات کی تنظیم بھی عسکری تنظیم سے کچھ کم نہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ لوگوں کو ہندوستان میں اپنے مشاہیر کے خطوط سے دلچسپی ہوگئی ہے در اصل خطوط ہی ایسی چیز ہیں جن سے کسی شخص کی انفرادیت اور اخلاقِ زندگی کی عکس کشی ہوتی ہے۔ کسی بھی زبان میں کیوں نہ ہوں خطوط کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادبی شخصیتیں دماغی خلجان اور خلفشار میں مبتلا رہی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہتے ہوں۔ اور اس ذہنی کشمکش نے انہیں بارہا مجبور کیا کہ اپنی ان تلخیوں اور مجبوریوں کی داستان کسی کو سنائیں تاکہ کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔

ہر شخص کی زندگی کے عموماً دو رُخ ہوا کرتے ہیں ایک وہ جو عوام کے سامنے پیش ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کبھی عوام کے سامنے نہیں آتا۔ اس دنیا میں ہر شخص اپنے منہ پر ایک نقاب ڈالے پھرتا ہے۔ ہمارے گرد و پیش جس قدر بھی چہرے ہیں ان میں بہت کم اپنے اصلی روپ میں ہوتے ہیں بلکہ اپنے اصلی روپ میں کبھی ہوتے ہی نہیں۔ ہماری اس دنیا کا رویہ کاروباری قسم کا ہے اور ہر ایک کاروبار کے لئے کچھ خاص قسم کی عادتوں اور مہارتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ہم میں سے جو لوگ وہ مہارتیں حاصل کر لیتے ہیں وہ لوگ کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جو وہ عادتیں اور مہارتیں جن کی قدم قدم پر ضرورت ہے حاصل نہیں کر سکتے وہ اس زندگی کی دوڑ میں کچلے جاتے ہیں۔ اگرچہ ایک عرصہ سے جب سے انسان کی شعوری کیفیتیں اجاگر ہوئی ہیں اخلاقیات کے اصول مرتب ہو چکے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ آجتک اصولوں ہی کی حد تک ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔

کسی انسان کو جبتک وہ اپنے منہ پر سے نقاب نہ اتارے پہچاننا بہت مشکل کام ہے اور بہت مشکل ہے کہ آدمی منظرِ عام پر آکر اپنے چہرے سے وہ نقاب الٹ دے جس نے اسے عزت یا ذلت جو کچھ بھی دی ہو، لیکن ایسا ہوتا ضرور ہے کہ آدمی اپنے چہرے سے نقاب الٹتا ہے اور وہ صرف تنہائی ہے جس میں آدمی بالکل بے نقاب ہوتا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ہر آدمی کا کوئی محرمِ راز ہو۔ آدمی اس محرمِ راز کے سامنے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اپنے چہرے سے نقاب الٹ کر پھینک دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو بالکل عریاں ہو جاتا ہے اس عریانی کا پتہ لگانے کا بھی کوئی طریقہ اس وقت معلوم نہ تھا۔ مگر اب معلوم ہوگیا ہے۔ اور وہ کسی انسان کے خطوط ہیں جو اس نے کسی محرمِ راز کو لکھے ہوں۔

خطوط انسان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ غالباً اگر نپولین کے خطوط جو اس نے مختلف عورتوں سے عشق کے دوران میں لکھے نہ ملتے تو کوئی بھی اسکی اخلاقی زندگی کا پتہ نہ لگا سکتا۔ اس طرح اگر کوئی جج اپنے روزانہ کے انصاف کی حقیقت اپنے کسی محبوب کو لکھ کر بھیجنا شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کی زندگی کے آئینہ دار ہوں گے کوئی بھی اس خیال سے خطوط نہیں لکھتا کہ یہ کبھی منظرِ عام پر آئیں گے اس میں وہ جو چاہتا ہے نہیں بلکہ جو اسکی زندگی ہوتی ہے وہ خطوط میں نمایاں کر دیتا ہے جس طرح ایک مصور تصویر کھینچتے وقت اپنے سامنے رکھی ہوئی چیز کے غیر نمایاں حصہ تک نہیں چھوڑتا۔ اس لئے لکھنے والا اپنی زندگی کے غیر نمایاں پہلو خط میں لکھے بغیر باز نہیں رہ سکتا۔

بہرکیف کتاب میں اس کے سوا کوئی جاذبیت نہیں کہ داغ کے خطوط ہیں اور ایسی چیزیں اگر پاس رہیں تو کوئی برائی نہیں۔ تاکہ اپنے مشاہیر کی اخلاقی زندگی کا بھی علم ہو جائے۔

(ادارہ)

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرما دی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں زندگی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گذری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں ناول میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

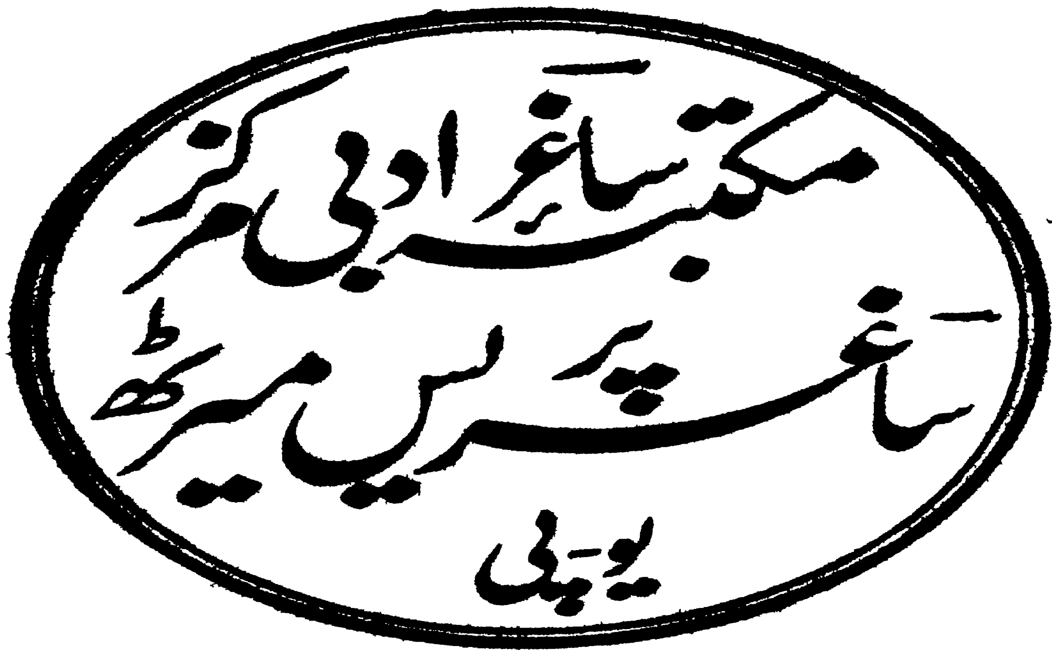
"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ مُنھ سے بول رہا ہے کہ یہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دے دی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے کہ انداز بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی۔ لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھُلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی نہیں "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر، تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھ کر دلّی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اسکے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلّی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادر محترم آنریبل مسٹر فخرالدین علی احمد سابق ریونیو منسٹر (آسام) کے نام معنون کیا ہے۔ شروع میں فخرالدین صاحب کی تصویر بھی شریک کتاب ہے۔ ــ مینجر

ملنے کا پتہ :۔ **مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ**

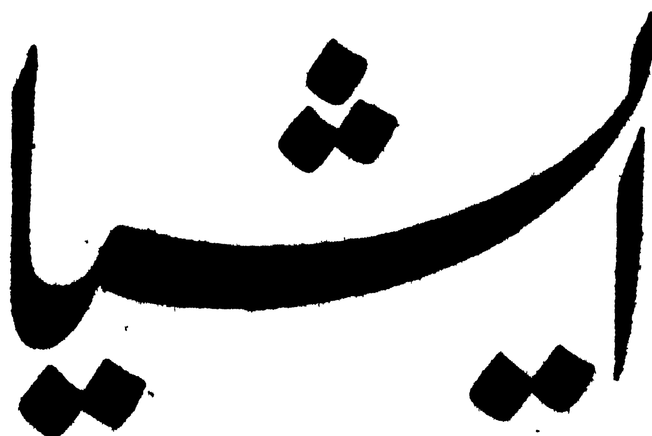
"رسالہ ادیب" دہلی

Registered No. A. 656



Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.


ایشیا

پجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہمیں ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنیکا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی ترنم جاذبیت کے سبب ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی ہوئی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوتی جاتی ہے اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات، حکومت صوبۂ متحدہ،

حکومتِ بہار، حکومتِ سی پی اور حکومتِ صوبۂ پنجاب

مرتبہ

ساغر نظامی

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۸ آنے

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست مضامین ایشیا جون و جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

ایشیا

جلد ۶ | جون و جولائی ۱۹۴۲ء | نمبر ۱۱ و ۱۲

سخنہائے گفتنی!

آج کل کسی پرچہ کا زندہ رہنا اگر معجزہ نہیں تو کم از کم ایسی ہی کوئی چیز ضرور ہے۔ اس مشکل کو کچھ وہی زیادہ جانتا ہے جو اس سے متعلق ہے۔ اور ہر وقت اس سے دوچار رہتا ہے۔ ان الفاظ سے مدعا یہ نہیں کہ ہم نے آپ کی شکایات کو نظر انداز کرنا چاہا بلکہ یہ کہ ہماری مشکل آپ کی شکایت سے زیادہ ہے۔

اس مرتبہ جون اور جولائی کا مشترکہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے اور یہ بھی محض کاغذ کی دقت کی بنا پر نکالا گیا ہے۔ جب پرچہ آپ کے پاس پہنچے گا تو آپ اندازہ لگائیں گے کہ سائز کے لحاظ سے پرچہ میں ایک ہلکی سی تبدیلی ہے۔ اور شاید وجہ ہم سے پوچھنے کے بجائے آپ خود ہی جان لیں اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ اگست نمبر کا سائز عام پرچوں کا سا کرنا پڑے۔

کاغذ کے سلسلہ میں دقتیں اُٹھانی پڑ رہی ہیں ان سب کا تذکرہ اگر آپ سے کرنا شروع کیا جائے تو کہا نہیں جا سکتا آپ مستقل مزاجی سے سُن سکیں گے یا نہیں اور تذکرہ ہم کرنا بھی نہیں چاہتے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کی طبیعت بھی ہم ہی جیسی مشکل پسند ہو لیکن اب اس سے کیا حاصل۔ مختصراً یہ کہ پرچہ کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچا دیا اور آئندہ بھی پہنچاتے رہیں گے۔ اس لئے کہ ہمارے پائے استقلال کو ابھی تک کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

یوں تو ساری زندگی ہی دُکھ اور پریشانیوں سے معمور ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ زندگی ذمہ داری کی زندگی ہے

ایک طرف جنگ ہے کہ کسی صورت مفاہمت یا فیصلہ کی صورت اختیار نہیں کرتی۔ نہ معلوم وہ انسانیت، تہذیب اور تمدن کے علمبردار آج اپنا علم کہاں رکھ کر بھول گئے۔ نہ معلوم انہیں کبھی اپنے پرانے دعووں کا خیال بھی آتا ہے یا نہیں۔ آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تمام تہذیب اور تمدن ایک حسین بلی کی مانند جس کی نرم و نازک پوستین کے نیچے بہت تیز ناخن چھپے ہوئے ہوں جنہیں وہ آہستہ آہستہ نکالتی جا رہی ہے اس چند سالہ جنگ اور اس کی خاص کر ہولناکیاں دیکھ کر مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آنے لگتا ہے۔ ان توپوں۔ ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کی خونخوار آوازوں میں سے ایک بھی امید کی شعاع پھوٹتی نظر نہیں آتی۔ انسانی زندگی ایک عجیب کشمکش میں ہے جس کا کوئی تدارک سمجھ میں نہیں آتا۔

اس شمارہ کے مضامین

اس شمارہ کے مضامین پر اگر فرداً فرداً تبصرہ کیا گیا تو یقیناً بہت طویل ہو جائیگا اور آج کل ویسے بھی فرصت کم ہی میسر آتی ہے۔ مرزا ارشاد بیگ کا مضمون "آنے والی دنیا کی ایک جھلک" گرمین کے نظریہ کی اضافی شکل ہے۔ اُردو میں ایسے ٹھوس اور سائنسی مضامین کی بڑی کمی ہے اسکے علاوہ اکرام قمر، اکرام حسین، سید مظفر حسین برنی اور سراج الدین آذر کے مضامین اپنی اپنی کاوش اور پہنچ کے لحاظ سے اپنے لئے ایک خاص جگہ کے مالک ہیں۔

علی اطہر کے تراجم آپ اس سے پہلے بھی ایشیا میں دیکھ چکے ہیں۔

آپ کو تراجم میں ایک خاص ملکہ ہے اور ترجمہ برجستہ ہوتا ہے ۔ قاضی عبدالغفار کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ "پیش لفظ" کو نہ افسانہ کہا جاسکتا ہے نہ مضمون ۔ میری رائے میں پیش لفظ زندگی کی ایک تعریف ہے یا بذات خود زندگی کا ایک جزو ۔ "عجیب بات" گالزوردی کے ایک اچھے افسانہ کا ترجمہ ہے ۔ یوسف ظفر ہماری بزم میں پہلی دفعہ شامل ہوئے ہیں ایک اچھی چیز کے ساتھ ۔

نیا راگ جوش کے بارے میں اظہار خیال کرنا اپنے پڑھنے والوں کو جاہل سمجھنے کے مترادف ہے ۔ اختر ہوشیارپوری ایک عرصہ کے بعد ایشیا میں درشن دے رہے ہیں ۔ "شکست" کا شاعر بھی اس مجلس میں پہلی ہی مرتبہ آرہا ہے اور اسکے علاوہ اچھی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جو اپنے مضامین، اسلوب بیان، الفاظ کے دروبست اور خیالات کے لحاظ سے اچھوتی ہیں ۔ (ادارہ)

بریلی، بدایوں اور ایٹہ کے دوستوں سے

انسانی ارادہ کتنا بے بنیاد اور غیر یقینی فعل ہے، تین ماہ سے خیال تھا کہ پھر فقیر کا پھیرا آپ کی نگری تک ہوگا، مگر بجائے یو۔ پی کے دورے کے دورے کے، دکن کی جست کامیاب ہوئی ۔ آپ تک پہنچنا، یا دوسروں تک پہنچنا، یہ جست، یا وہ جست، غرض باوجود بے پروبالی کے یہ تمام تر اُڑان محض زبان و ادب کے اُس مقصد کے لئے جو بظاہر بنیادی اور ضروری معلوم نہیں ہوتا، لیکن انسانی معاشرہ میں اسکی حیثیت قطعی بنیادی ہے ۔

میرا آپ تک پہنچنا اور پہنچکر آپ کو متوجہ کرنا یعنی "ہم پکاریں اور کیلئے" کا حادثہ ہونا تعلق کے مثبت ہونے کی دلیل ضرور ہے، مگر میں غالب کا مذاق نہیں رکھتا ۔ یعنی ؎

اب نازِ عاشقی کو ہے اُس دن کا انتظار
تم آؤ میرے در پہ تمنّا لئے ہوئے ——— !؟

غیرت تو کچھ اور چاہتی ہے، یعنی مقصد لے کر انسان، انسان سے ملنا چھوڑ دے، فرد خود اجتماعی فرائض کو محسوس کرے، میں تو چاہتا تھا کہ آپ اس وقت تک خود ہی ایشیا کی تجدید خریداری فرمادینگے، مگر میعادِ خریداری ختم ہونے کے بعد اس نمبر تک ۶ نمبر آپ کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں اور آپ کے استغنا نے کروٹ نہیں لی ——— !؟

مجھے بہت کچھ حق ہے، لیکن باوجود کلّی استحقاق اور ضرورت کے آیشیا کی خریداری کو "مجبوری کا سودا" بنانا چاہتا ۔ ہاں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ ۶ پرچے پہنچنے کے بعد اب ہر دوست کو زر سالانہ خود ہی بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دینا چاہئے ۔ لیکن جو اصحاب سال بھر کیلئے خریدار نہیں رہنا چاہتے ۔ انہیں محض ۶ ماہ کی قیمت تین روپے (سے) جو واجب قیمت ہے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرماکر مرکز کو ممنون فرمانا چاہئے ۔ دھڑکتے ہوئے زمانے اور اس لرزتے ہوئے وقت کا تقاضہ ہے کہ تمام احباب نازک صورتِ حال کو محسوس کریں اور اپنا فرض بجالائیں ۔

ساغر نظامی

اسلام ہاؤس   حیدرآباد دکن

۲۵ر جون ۱۹۴۲ء

نئی صبح

آنے والی دُنیا کی اِک جھلک

حیاتیاتی اور نفسیاتی تحقیق کا اک سلسلہ

ارشاد بیگ

مقالہ نمبر ۱

آنے والی دُنیا کی اک جھلک

نئے تمدّن کی خصوصیات

مرزا ارشاد بیگ جنکے مضامین اکثر ایشیا میں شائع ہوتے رہے ہیں، زندگی اور اسکے تعلقات پر گہری نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ ہو گیا یا جو کچھ ہو چکا اسکی انہیں اتنی فکر نہیں جتنی اسکی فکر ہے کہ آئندہ کیا ہو گا اور علمی طور پر اسکی کیا تعبیرات ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ موجودہ دُنیا اک عجیب و غریب بحران میں غوطہ زن ہے۔ لوگ تبدیلی اور انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر اسکی تعبیر نہیں کر سکتے، شاید اس لئے کہ وہ سائنٹفک طور پر حالات کے تجزیہ سے قاصر ہیں، سیاست داں شعراء اور انقلابی ہیرو طوفان کی علامتیں ظاہر کرتے ہیں، مگر ان علامتوں کی مُنبعوں کو نہیں بتاتے، شاید ان کا یہ فریضہ بھی نہیں ہے۔

ارشاد بیگ نے ان فلسفیانہ مسائل پر سات مقالے لکھے ہیں جن میں مسائل حیات کی حیاتیاتی اور نفسیاتی تحقیق کی گئی ہے۔

(۱) آنے والے تمدّن کی خصوصیات (۲) غیر شعوری ارتقاء میں قباحتیں (۳) حیاتیاتی اصول اسلح

(۴) موجودہ ماحول اور نئی ہیئت ذہنی (۵) مغربی فلسفہ اور نئی حیاتیات (۶) قوت کا نیا مفہوم اور استعداد برائے نظام نو

(۷) متوازن ذہن عالم

اس سے پہلے دنیا کے مفکرین نے نئی دُنیا کے متعلق اشارے کئے ہیں، ہمارے شعراء نے نئے زمانہ اور نئے نظام کے گیت بھی گائے ہیں، یعنی ہمیں امید اور رجائیت کے گہوارے میں ہلکورے دینے کی مسلسل کوششیں کی گئی ہیں، مگر یہ تمام کوششیں بڑی حد تک مبہم اور تیرہ و تار حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی ہیں، اصل میں جب تک ان حقائق اور قوتوں کو نہ بتایا جائیگا جو نئی دُنیا بسانے کی ذمہ دار ہو سکتی ہیں، محض خیالوں میں ایک نئے زمانے کے راگ گانا، کھوکھلی قسم کی رجائیت ہے موجودہ دباؤ ڈالنے والی دُنیا میں نسل انسانی کے رجائی بننے کے امکانات بھی ہیں یا نہیں، وہ معہود اور مقصود رجائیت، جو زندگی کی کشتی کو کھے سکے کس حقیقت میں پوشیدہ ہے! ؟ اور اس فردوس کو نوع انسان کس طرح پا سکتی ہے۔ ان مقالات میں ارشاد بیگ نے یہ کوشش کی ہے کہ اس فردوس کا پتہ لگایا جائے، کامیابی اور ناکامی کا سوال نہیں، مگر نوع انسانی کے ذہن اور قوت حیات کے ان تقاضوں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں جو "رجائیت" کو خواب کے بجائے حقیقت اور ابہام کے بجائے وضاحت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

دُنیا کے تمام مفکرین اور سیاست داں کہہ رہے ہیں کہ انسانی ذہن اور تحت الشعور میں ایک عظیم تبدیلی کی ضرورت ہے، موجودہ منزل نوع انسانی کے ارتقاء کی آخری منزل نہیں ہے۔ نیا ارتقاء اور زندگی کی نئی ہیئت کیا ہو گی؟ یہ تجزیہ کرنا وقت کی اوّلین ضرورت ہے۔ جبتک موجودہ مفکر یہ معلوم نہیں کریگا کہ ذہنی ارتقاء ماحول پر کس طرح نظر انداز ہوتا ہے، کونسی ذہنی تبدیلیاں موجودہ تباہی کی ذمہ دار ہیں، ذہن میں نئے ماحول کی تعمیر کے لئے کتنی اور کیسی صلاحیتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اور وہ صلاحیتیں دُنیا کے مسائل کو کس طرح حل کر سکیں گی، وہ قوت جو ماحول پر قابو حاصل کر سکتی ہے، اُس کی واقعی صورت کیا ہے؟ اور وہ کس کے دستِ قدرت میں ہے۔ ان بھیدوں کو جبتک معلوم نہ کر لیا جائے ہماری تمام ترجد و جہد لاحاصل ہے۔

ارشاد بیگ کے ان مقالات میں انہیں مسائل کی چھان بین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، موجودہ بحران اور انسانی ذہن کی خود شعوری ارتقائی سطح کے تعلق کو اجاگر کیا گیا ہے مجھے امید ہے کہ موجودہ غلط اور سطحی ذہنیت، انقلاب اور فضول اعتراضات کے استیصال پر، ان مقالوں سے مدد ملیگی جن میں زندگی کے موجودہ بکھراؤ، جنگ اور دُنیا کی جدو جہد کو حیاتیاتی حقائق کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے، اُردو پڑھنے والے ان مضامین سے موجودہ صورتِ حال پر اک نئے زاویۂ نگاہ سے نظر ڈال سکیں گے —— کوئی فیصلہ کن دعویٰ نہیں لیکن تاریخ کی نئی رفتار کے تعین میں یہ صفحات، غور و فکر کی ترغیب ضرور ہیں، یہ کوئی تصوری خاکہ یا اعتقادی بحث نہیں ہے "حیاتیات" کے اصولوں پر ان مقالات کی بُنیاد ہے اس لئے مجھے علم نواز حلقوں میں ان کی کامیابی کا یقین ہے۔

الشاعر جولائی ۱۹۴۳ء

۶
۱

مصنف کا کہنا ہے کہ انہوں نے حیاتیاتِ تمام پر تحقیق کرنے میں کافی وقت صرف کیا ہے اور ان مقالوں کی اساس حیاتیاتی سائنس کی نئی تحقیقیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ حقائق قطعی Original ہیں اور تحقیقی حیثیت رکھتے ہیں۔ قوّتِ حیات اور ذہن کا تعلق، قوّت کا جدید مفہوم، نظریۂ علم، مسئلہ جبر و اختیار، صحیح نظام کے ارتقائی اصول یہ اور اس قسم کے مسائل کو ازسرِ نو حل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ وہی حقائق اور خیالات ہیں جن کی بنیاد پر آئندہ دُنیا کی تعمیر ہو گی۔

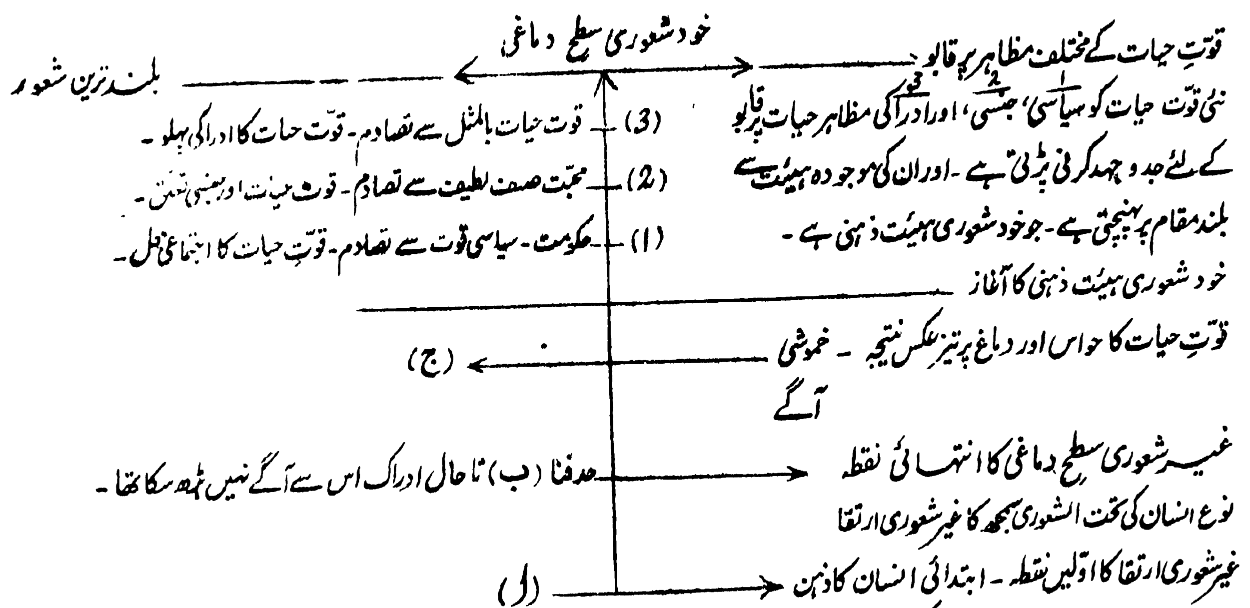
بہرحال اس موضوع کے ماہرین ان کے اس خیال کی تائید یا تردید کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ان مقالات پر تنقیدی مضامین آئے تو ایشیا ان مضامین کو بھی شائع کریگا۔

موجودہ اشاعت میں "آنے والے تمدّن کی خصوصیات" کے عنوان سے پہلا مقالہ شائع کیا جاتا ہے۔

ساغر

یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تاریخ پر دوسرے عناصر کی بجائے حیاتیاتی عناصر غالب آ گئے ہیں۔ اس لئے بننے والی تاریخ حیاتیاتی عمل کی داستان ہو گی۔ نوعِ انسان کا اوراک اور اس کا ذہن ایک خاص حیاتیاتی دور سے گزر رہا ہے۔ ایک نئی شکل اختیار کر رہا ہے۔ آنیوالا تمدن، خود شعوری ہیئتِ ذہن کا نتیجہ ہو گا۔ آج سے قبل تاریخ میں کبھی ذہنِ انسانی نے خود شعوری کے دور میں داخل ہونے کا شرف نہیں حاصل کیا تھا۔ ہمارے حواس، قوّتِ حیات تموّج یا ہیجان اور ذہن نے وہ ارتقائی منازل طے نہیں کی تھیں جن کے طے کرنے کے بعد زندگی میں خود شعوری حاصل ہوتی ہے۔

ذہن اور قوّتِ حیات کے حیاتیاتی ارتقائی مدارج



ذہنِ انسانی کی حیاتیاتی ترتیب و تکمیل کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ ا سے ب تک تا حال تاریخ کی جدوجہد غیر شعوری جدوجہد تھی۔ ہم قوّتِ حیات کی رو میں بہتے تو تھے لیکن اس کا جائزہ نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ ہمارے ذہن نے شعوری درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لئے ادراک میں تخیلی عنصر کا دخل رہتا تھا۔ کیونکہ عقل ہمیشہ تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ اور تمام پہلو ابھی ادراک کے پردہ پر نہیں آئے تھے۔ حیاتیاتی ارتقا ہمارے ذہن کو آہستہ آہستہ اس طرح تکمیل و ترتیب دے رہا تھا کہ بالآخر شعوری درجے تک پہنچ جاتے۔ جبتک شعوری درجہ حاصل نہیں ہوتا عقل کی تمام پرواز نامکمل رہتی ہے اور تخیلی عنصر کے دخل سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسائلِ عالم کا حل اور حقیقت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جبتک قوّتِ حیات خود انسان کے ذہن میں ظہور پذیر نہ ہو جائے۔ اس سے متعلق مسائل کو صرف تخیل اور نامکمل حقائق کی بنا پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ سمجھا جا سکتا ہے ابتک جسے عقل کہا گیا ہے وہ نامکمل اور غیر شعوری قوّتِ حیات کے ادراک کا پھیلاؤ ہے یعنی قوّتِ حیات کی عدم تکمیل سے جو خلا ذہن میں رہ جاتا ہے اسے تخیل کے ذریعہ پُر کیا جاتا ہے۔

ذہن کی صلاحیت

ج

خلا

ب

ا

قوتِ حیات نے "ب" تک ذہن میں ارتقائی سطح طے کی ہے۔ اور اسکی وجہ سے "ب" تک نئے حقوق معلوم ہو گئے ہیں۔ "ب" سے "ج" تک کے نئے حقائق ابھی ادراک سے پوشیدہ ہیں۔ لیکن عقل "ب" تک کے ارتقائی عمل کو "کل" کی طرح برتتی ہے۔ یعنی "ج" تک سوچتی ہے لیکن زندگی کے تمام مناظر کو "ب" کی آنکھ سے ہی دیکھ سکتی ہے۔ "ب" خود نامکمل ہے اور ذہن کی ارتقائی سطح کا ایک تدریجی نقطہ ہے۔ جبتک "ج" کے درجہ تک قوتِ حیات نہ پہنچے۔ قوتِ حیات کو ذہن میں شعوری درجہ حاصل نہ ہوگا۔ اور "ب" اور "ج" میں خلا رہیگا۔ اس خلا کو جبتک قوتِ حیات کا ارتقا پورا نہ کرلے۔ صرف نامکمل عقل کے ذریعہ تخیل کی مدد سے مسئلہ حیات کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ گویا عقل ابھی نامکمل ہے اور تخیل کے عنصر سے خالی نہیں ہے۔

قوتِ حیات نے چونکہ ہمارے ذہنی قوی میں تکمیل کے مدارج طے نہیں کئے تھے۔ اس لئے عدم تکمیل کا لازمی نتیجہ نقص۔ حیوانیت۔ تخیل پرستی۔ بیکار دلیل بازی کے سوائے کیا ہوسکتا تھا۔ کیونکہ بغیر خود شعوری ذہن کے حقیقت۔ حق۔ اور صحیح نظامِ حیات کا فیصلہ کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن آنے والے تمدن میں روح و قوتِ حیات کی شعوری سطح کے بعد اس کا وجود پوشیدہ یا مخفی نہیں رہے گا۔ اور یہی قوتِ حیات کا عملی ثبوت ہوگا۔ حیاتیات کے جدید اصولوں نے (Vitalism) اور (Mechanism) کے مسئلہ کو بالکل حل کرلیا ہے۔ آنیوالے تمدن میں ذہن انسانی کو بے سروپا اور تخیلی مسائل میں الجھنا نہیں پڑیگا۔ اور اس طرح غلط سوالات اور مسائل میں ہماری ذہنی قوتیں ضائع نہیں ہونگی۔ آنے والے نظام کے حل کو قوتِ حیات پر مکمل قابو ہوگا۔ اور یہ حیرت انگیز حقیقت طبعی سائنس کے بھاپ اور بجلی پر قابو پانے سے زیادہ تعجب خیز اور ہماری زندگی کو مالامال کردینے والی ثابت ہوگی۔

دوسری حقیقت یہ کہ موت کا حجاب اٹھا دیا جائیگا اور انسان دائمی بقا کے دور میں داخل ہو جائیگا۔ موت تو ہوگی۔ لیکن حجاب باقی نہ رہے گا اور انسان موت کو ایک معمولی عمل خیال کریگا۔

تقدیر۔ اور اسرار۔ اور حجابات کی گتھی وا ہو جائے گی۔ حوادث و خطرات زندگی سے تقریباً مفقود ہو جائیں گے۔ حیوانی جبلیں اور طریقے مٹ جائینگے آنیوالے نظام میں ہماری قوتِ حیات تکمیل کی صورت میں ظہور پذیر ہوگی۔ اس لئے ہماری خواہشات کچل نہیں جائیں گی۔ بلکہ صحیح طور پر تسکین حاصل کریں گی۔ انسان ۸
کے تمام جذبات اور آرزوئیں ایسی مطمئن اور مخمور رہوں گی۔ گویا ہر تار مضراب کی زد سے صحیح سُر چھیڑ کر ایک مکمل نغمہ سے ہم آہنگ ہوگا۔ اور صحیح معنی میں انسانیت کے دور کا آغاز ہوگا۔

لنگڑے لولے اور اندھوں کی پیدائش بند ہو جائیگی۔ کیونکہ آنیوالے دور میں حیاتیاتی ارتقا صحیح ارتقا صحیح نظم اختیار کرلیگا۔ تمام حیاتیاتی نقائص دور ہو جائینگے۔ آنیوالا نظام ایک حیاتیاتی انقلاب ہے۔ جلد ہی نوع انسان کو حیاتیات کے ایک نئے دور میں داخل ہونا ہے۔ اس وقت تمام دنیا کے سامنے یہی مسئلہ ہے کہ آج نوع انسان شعوری طریقہ حیات حاصل کرلے۔ قومیت۔ نسل۔ مذہب۔ برتری اور ترقی کے تمام غلط تصورات تبدیل ہو جائینگے۔ کیونکہ دنیا کا تمام نظام اور تمام ذہنیت اور ماحول یکسر بدل جائے گا۔ اس لئے ہر قوم کو اپنا مستقبل اور اپنی پوزیشن آنے والے نقشے میں دیکھنی چاہئیے۔ اس وقت تک کا تمام نظام۔ تمام جدوجہد۔ قوم۔ مذہب اور ملک کے تصورات۔ نوآبادیات کا حصول یہ سب قوتِ حیات کے ارتقائی مدارج کا عبوری نتیجہ تھا۔ وہی قوتِ حیات اب ہمیں پرامن شانت اور شائستہ اور عالمگیر نظام کے دروازے پر لے آتی ہے۔ جہاں جنگ نہیں ہوگی۔ حیوانی زندگی۔ کچلی ہوئی آرزوئیں۔ اور جذبات اور بے چین ذہن نہیں ہوگا۔ نامعلوم اور اوجھل قوتوں کا خطرہ۔ موت کی تیرگی اور تاریکی۔ اسرار کا خوف، زندگی سے ناپید ہو جائینگے۔ مغرب میں نوآبادیات کا لالچ اور مشرق میں تصوری تقدس اور جنت کا فریب قوتِ حیات کی لازوال اور مدہوش کن مسرات کا بدل ثابت نہیں ہو سکینگے۔ اور نہ ہی نوآبادیات اور مذہب کے تمام تصورات آنے والے نظام کی قوت کو پسپا کرسکتے ہیں۔ حقیقت تخیل اور افسانہ سے زیادہ شاندار اور باعظمت ہوتی ہے۔ حقیقی نئے نظام میں مادی خوشیاں اور فرد کی ذات کا حقیقی کیف اپنے صحیح و فطری لباس میں افسانوی تصورات اور گمراہ طریقوں اور غلط نظریات پر مبنی نظام کی نام نہاد خوشیوں سے زیادہ مطمئن کرنیوالی حیثیات اختیار کرینگے۔

حیاتیاتی ارتقا اور نظامِ عالم

حیاتیاتی ارتقا کے مختلف مدارج کا جائزہ ہمیں زندگی اور نظامِ عالم کی اُن صورتوں سے واقف کردیگا جو اس کرۂ ارض پر اسے اختیار کرنی پڑیں گی حیاتیاتی

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۶ء

ارتقا نے نئی سطح حاصل کرنے کے لئے اوّلین عمل انقلاب آج مکمل کیا ہے اور زندگی اب ایک شعوری سطح حاصل کرنے والی ہے۔ بےسروپا تحقیقات اور بیکار تعلیم کا زمانہ مستقبل کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ اسکے بعد زندگی میں حیاتیاتی نشوونما کی ایسی سطح اُبھرے گی کہ طریقۂ حکومت روئے زمین سے ختم ہو جائے گا اور ہر شخص اپنے معاش کا خود مالک اور کنٹرول کرنے والا ہوگا۔ تیسرا حیاتیاتی انقلاب زندگی کی بیماریوں سے کلی نجات دلا دیگا۔ اور بالآخر زندگی لافانی ہو جائے گی۔ بید الفناء موت کا چکّر کرۂ ارض پر بند ہو جائے گا۔ یہ قوّتِ حیات کی معراج اور انتہائی ارتقا کا قیام ہوگا۔

نظامِ عالم سے متعلّق قوّتِ حیات کی مختلف ارتقائی صورتیں

(۱) قوّتِ حیات کا غیر شعوری ارتقا۔ کشمکشِ حیات۔ قوّتِ حیات کی عدم تکمیل ذہن سے متعلّق۔ قوّتِ حیات اور شعور میں بعد۔ قیاسی تحقیقات و علم۔ اور نظامات و تحریکیں۔

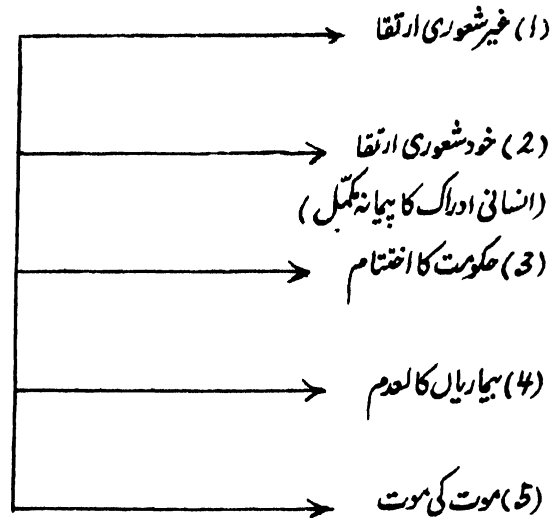
(2) خود شعوری ارتقا۔ قوّتِ حیات کا ذہن میں شعوری ظہور۔ انسانی ادراک کے پیمانہ کی تکمیل، قیاسی علم اور تصوّرات کے زمانہ کا اختتام۔ صحیح نشو و ارتقا اور ترقی و انکشافات کا آغاز۔

(۳) حکومت کا اختتام۔ قوّتِ حیات ایسے ارتقائی مدارج طے کر چکی ہوگی۔ کہ اس درجہ پر آکر زندگی کے مزید ارتقا اور اجتماعی تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

(4) بیماریاں کالعدم۔ قوّتِ حیات کا نشوونما ایسی تشکیل اختیار کرلیگا کہ بیماریاں جاتی رہیں گی۔ بیماریاں قوّتِ حیات کے انتشار اور جسم کی اسے سہارنے کی عدم صلاحیت کا نتیجہ ہیں۔

(۵) موت کی موت۔ قوّتِ حیات اور ہمارا جسم ایک سطح پر آجائینگے اور جسم لافانی ہو جائے گا۔ جسم میں قوّتِ مدافعت اور صلاحیت اپنے انتہائی مدارج پر ہوگی۔

٩



پہلے درجہ سے دوسرے درجہ تک غیر شعوری ارتقا کا عمل ہے اور باقی تمام درجات کا عمل شعوری ارتقا سے متعلّق ہے۔ گویا خود شعوری ارتقا جو تاریخ کی رفتار شروع ہوگی۔ وہ نوعِ انسان کے جسم میں قوّتِ حیات کا ارتقا جو مدارج اختیار کرے گا اُن کا اثر سماجی نظام۔ سیاسی خاکوں اور زندگی کے دوسرے طریقوں پر بھی پڑے گا۔

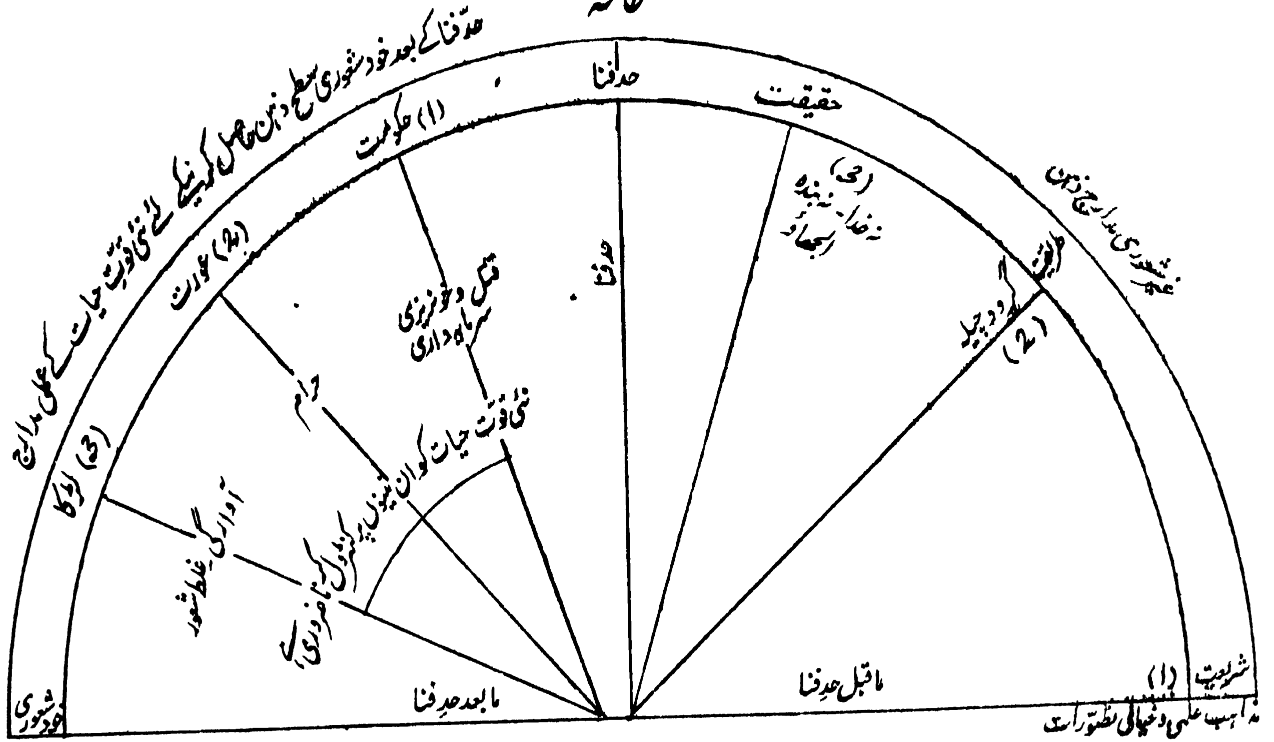
موجودہ بُحران۔ اور قوموں اور دُنیا کے نظاموں کا حیاتیاتی جائزہ

موجودہ دُنیا بے شعوری کی دُنیا ہے۔ یعنی قوّتِ حیات شعوری حیثیت میں کارفرما نہیں ہے۔ موجودہ نظام کو قوّتِ حیات پر قابو نہیں ہے بس چل رہا ہے۔

جس کی وجہ سے قتل و خونریزی حرص و آز دُنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ مذاہب نے قوّتِ حیات کی شعوری تمیز کے بغیر اعتقادی خیالات میں دُنیا کو اُلجھا دیا۔ اسکے علاوہ جو آزاد خیال افراد ہیں وہ بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ کیونکہ قوّتِ حیات کی انہیں تمیز نہیں ہوتی۔ اسی لئے مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔ بدیں وجہ موجودہ نظام زندگی کیلئے ایک عذاب بنا ہوا ہے۔ قوّتِ حیات کا ارتقائی عمل جسے خود شعوری کی سطح حاصل کرنی ہے۔ قوّتِ حیات کو کنٹرول کر رہا ہے۔

انسان کی حیاتیاتی قوّتِ حیات کا مختلف مدارج اور اصولوں سے تدریجی سفر

خاکہ



نئی قوّتِ حیات کا ← سطح ذہن

اطلاق خود شعوری سطح ذہنی کے ساتھ

نتیجہ غیر شعوری اور عدم تکمیل پر مبنی قوّتِ حیات پر کنٹرول

خاکے میں دُنیا کے موجودہ مسئلہ کو حیاتیات کی روشنی میں بتایا گیا ہے۔ نقطۂ فنا سے قبل انسانی سمجھ تین ارتقائی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ یا تو وہ کسی ظنی نظام کے سلسلے میں سر ڈال دیتی ہے اور مذہب کی شریعت سے خود کو وابستہ کر دیتی ہے اور اس طرح زندگی کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہے۔ یا اس سے آگے بڑھ کر گرو یا مرشد کے سامنے انسان کا ذہن جھک جاتا ہے۔ اور حق کی تلاش اسکے اتباع کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے یا اس سے بھی آگے بڑھنے پر سمجھ خود زندگی کے مسئلہ پر آزادانہ نظر ڈالتی ہے اور خود کو جبلت الٰہیت دیتی ہے۔ یہاں آ کر انسان اپنی ذات کو سب کچھ سمجھتا ہے حتیٰ کہ خود کو خدا تک سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ قوّتِ حیات کا شعور حاصل نہیں ہوتا اس لئے ذہن خود دروبین جاتا ہے اور کوئی راہ نہیں ملتی۔ غیر شعوری سطح ذہن کی بلندی کا انتہائی نقطہ حدِ فنا تک ہے۔ اب تک نوع انسان کی جدوجہد اور ارتقا حدِ فنا سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ہر انسان کا ذہن اور ادراک نقطۂ فنا سے پست ہے۔ نقطۂ فنا پر آ کر حواس قوّتِ حیات کے تیز عکس کی وجہ سے اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہ گویا ادراک کی حدِ موت ہے۔ نقطۂ فنا پر آتے ہی ذہن کو نشو و نما کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ اس سے آگے ارتقا حاصل کرنے کے لئے ادراک کو حدِ فنا عبور کرنی پڑتی ہے۔ گویا غیر شعوری اور خود شعوری ارتقا کے بیچ میں حدِ موت حائل ہے۔ جہاں حواس قوّتِ حیات کی مدافعت سے جواب دیدیتے ہیں۔ جب اس میں قوّتِ حیات کا ہیجان تیزی سے ابھرتا ہے تو انسان حواس کا توازن کھو دیتا ہے۔ لیکن آج انسان کا ذہن زیادہ صلاحیت کا حامل ہے۔ اس لئے وہ توازن تو نہیں

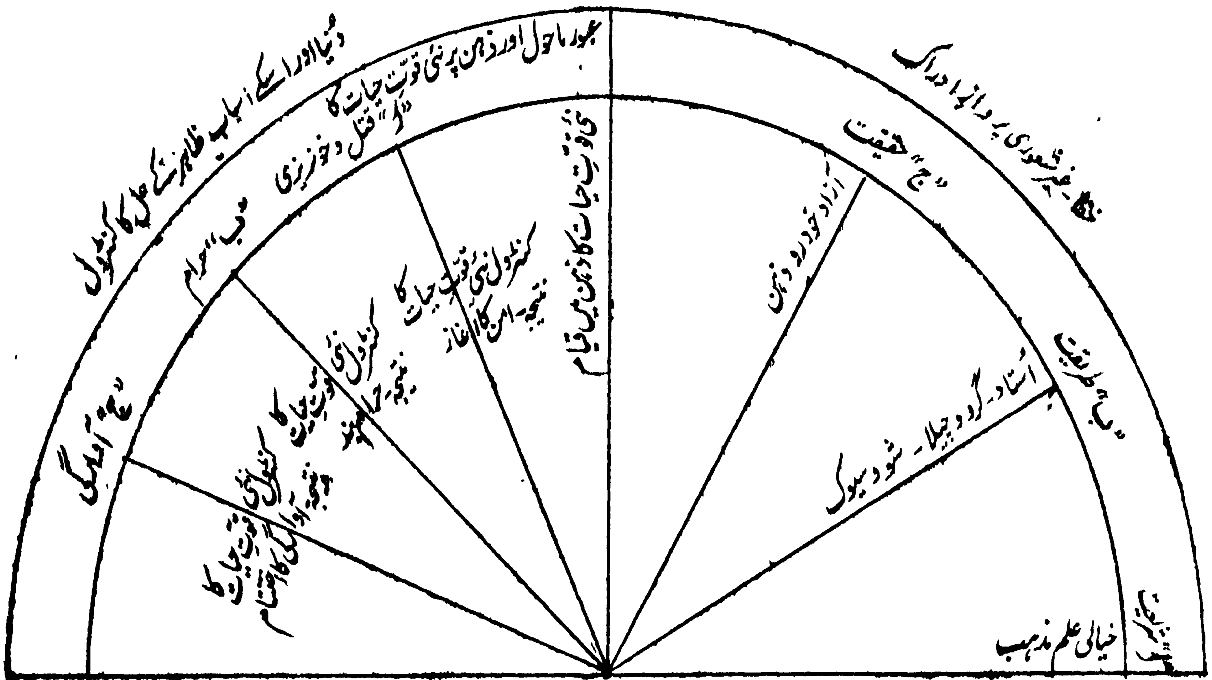
آئینہ جمال جولائی ۱۹۷۶ء

کھوئے گا لیکن اوّل حواس پر خاموشی طاری ہونی لازمی ہے۔ کیونکہ سمجھ اُبھار حاصل کرتے وقت حواس پر زیادہ دباؤ ڈالتی ہے۔ خاموشی کے بعد خود شعوری ارتقا کے مدارج شروع ہوتے ہیں۔ یہاں پہنچکر نئی قوّتِ حیات کو تکمیل حاصل کرنے کے لئے غیر ترقّی یافتہ قوّتِ حیات کی تین عملی صورتوں کو قابو کرنا ضروری ہے۔ ورنہ نئی قوّتِ حیات صحیح نظام قائم کرنے سے قاصر رہے گی۔ خود شعوری حاصل کرنے والے ذہن کو عورت کی محبت سے تصادم پذیر ہو کر آگے ارتقائی طور پر بڑھنا ہوگا۔ اور اگر نئی قوّتِ حیات عورت کی جنسی تسکین نہ کر سکے۔ تو زندگی کے نظام میں نقائص اور خامیاں رہ جائیں گی۔ اسکے بعد نئی قوّت حیات بالمثل سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ اور یہ حیلیاتی فعل نہایت ہی مشکل اور دشوار ہے۔ کیونکہ اس عمل میں دونوں کی جنس ایک ہوتی ہے۔ یہاں جنسی میلان کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ نئی قوّتِ حیات جنسی تسکین کے ذریعہ اسے مفتوح کر سکے۔ اس لئے قوّتِ حیات کو نہایت ہی ضبط کے ساتھ آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اگر نئی قوّتِ حیات پسپا ہو جائے تو زندگی کے نظام میں نوع انسان کی سمجھ اور اسکے شعور اور ارادہ پر نئی قوّتِ حیات کا کنٹرول نہ ہو سکے گا۔ جب نئی قوّتِ حیات اس سے بھی آگے بڑھنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے نوع انسان کی اس قوّتِ حیات پر پورا قابو حاصل ہو جائے گا جو ابھی خود شعوری کی منازل سے نیچے ہے۔ اور نقطۂ فنا پر کھڑی ہے۔ آج تمام نوع انسان نقطۂ فنا پر کھڑی ہوئی فنائیت کی زد میں ہے۔ وہ اپنے مزید ارتقا اور نشو و نما کیلئے جبتک خود شعوری سطحِ ذہن کا اتباع نہیں کرے گی۔ اس حالت سے نہیں نکل سکے گی۔ نئی قوّتِ حیات جب قوّتِ حیات بالمثل کو رجوع کر چکتی ہے تو حکومتوں کا نظام بھی متزلزل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حکومتیں افراد کے اجتماعی شعور کا ہی نتیجہ ہیں۔ اس لئے نئی قوّتِ حیات کو سیاسی قوّت بھی حاصل ہو تی جائے گی۔ جب نئی قوّتِ حیات کو حدِّ فنا سے گزرنے کے بعد دُنیا میں پھیلی ہوئی قوّتِ حیات کی ان تین صورتوں پر کنٹرول حاصل ہو جائے گا تو نظامِ عالم سے قتل و خونریزی۔ جلبِ منفعت۔ اور فرد کی قربانی بند ہو جائیگی۔ حرام۔ اغلاط۔ عورتوں کی بدچلنی۔ اور لڑکوں کی آوارگی و غلط روی ختم ہو جائیگی۔ کیونکہ انسان کی قوّتِ حیات نئی قوّتِ حیات کی گرفت سے گریز نہیں کر سکے گی۔ قوّتِ حیات کے غلط انتشار کا نتیجہ یہ نقائص تھے۔ نئی قوّتِ حیات خود ان درجوں سے آگے بڑھ کر مکمل ہو جائیگی۔ اور یہ صحت و نظم کا اعلیٰ ترین نمونہ ہو گی۔ زندگی ایک فردوس ہو گی۔ ابتک کے تمام نظام میں زبردست قباحت اور نقص تھا۔ کسی نظام نے ان حیاتیاتی مدارج کو آج تک طے نہیں کیا۔ جو آنے والا نظام طے کر چکے گا۔

11

مختلف مذاہب نے عالمِ ارواح۔ جنّت کی زندگی کے تصوّرات ہمارے سامنے پیش کئے۔ نقطہ فنا سے قبل کا ذہن اگر نقطۂ فنا کے بعد کے مسائل کو گرفت میں لینا چاہے تو سوائے تخیلی تگ و پو اور ناکامی کے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ مذاہب کا خدا تصوّری خدا ہے۔ اور مذہب کو زندگی پر قابو نہیں ہے لیکن نئے نظام میں حیاتیاتی ارتقا کے ذریعہ نقطۂ فنا سے گزر کر نوع انسان کی قوّتِ حیات کو عملی مدارج کے ذریعہ گرفت میں لیا جائیگا۔ اس لئے آنے والے نظام کو زندگی پر قابو حاصل ہوگا۔ یہ نظام محض اپیل نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی عملی حقیقت ہے۔ حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے خدا ایک تصوّر یا زبان سے ادا کرنے کا لفظ ہی نہیں بلکہ ایک قوّت ہے۔ اور اخلاق ایک وعظ نہیں۔ بلکہ قوتِ حیات کے نظم و صحت کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ محض آرزوؤں کی قربانی اور ترک نہیں بلکہ تسکین اور خواہشات کی تکمیل میں ممد و معاون ہوگا۔ پیش از پیش گزشتہ نظاموں نے اُس حیات کا جو قوّت حیات کو خود شعوری سطحِ ذہن حاصل کرنے کے بعد ملے گی۔ تصوّراتی بہشت اور خیالی فردوس کے ذریعہ ایک نعم البدل پیش کیا۔ نقطۂ فنا سے قبل کے ادراکِ انسانی پر مبنی نظاموں نے دُنیا کی جدوجہد اور نوعِ انسان کی قوّتِ حیات پر کنٹرول نہیں کیا۔ بلکہ خام اور نامکمل پروگرام پیش کئے۔ اسی لئے آج نوع انسان کو تباہی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس سے بچنے کیلئے تکمیل یافتہ قوّتِ حیات سے مخالفت کرنا لازمی ہے۔

آنے والا نظام قوّتِ حیات کے مزید نشو و ارتقا کے لئے راہ مہیّا کرے گا۔ اور اس کے لئے عملی مدارج کے ذریعہ اور آگے بڑھنے کے مواقع پیدا ہوں گے۔ کیونکہ نیا حیاتیاتی نظام خود عملی مدارج ارتقا کے بعد قائم ہوگا۔ تخیّل یا عدمِ تکمیل پر مبنی قوّتِ حیات کی بُنیاد پر نہیں۔



ادراک کا غیر شعوری ارتقا اور مدارج اور دنیا کے مسائل یہ سب خود شعوری سطح ذہن پر آ کر حل ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف مسائل زندگی پر بصورت اعتقادی مذاہب نے
نظر ڈالی۔ اور اعتقادی طور پر ارتقائی منازل کے حل کو تخیلی اعتقادات کے ذریعہ پورا کرنا چاہا۔ جب زندگی کو خود شعوری حاصل ہو جائے گی تو نئی قوتِ حیات کی رو میں معتقدات ۱۴
خود بہ جائینگے۔ دوسری طرف ادراک نے حیاتیاتی منازل عبور کئے بغیر آزاد ہو دوڑنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوا۔ لیکن حیاتیاتی نظام دنیا کے مسئلہ کو عملی اور
ارتقائی منازل سے گزرنے کے بعد اس وقت گرفت میں لینا شروع کرتا ہے۔ جب اسے خود شعوری حاصل ہو جاتی ہے۔ خود شعوری کے حصول میں کامیاب ہونے کے بعد
ہر دمی روح پر نئی قوتِ حیات کی گرفت قائم ہو جائے گی۔ یعنی نئی طاقتوں کا کنٹرول شروع ہو جائے گا۔ یہ کنٹرول آج دنیا کی موجودہ جدوجہد پر شروع ہو گیا ہے۔ اور روز
بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ حیاتیات کا اٹل قانون ہے۔

قوموں کی نفسیاتی قباحتیں

مذاہب کو خدا کی تمیز نہیں ہے۔ مذاہب کا خدا تصوراتی خدا ہے۔ حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ذہن سب سے زیادہ حقیقت سے دور ہے۔ اس قوم نے حقیقت کے قصے گھڑ لئے۔ ترتیبِ ارتقائے نفس کا غلط راستہ اختیار کیا۔ ہندوؤں نے صحیح راستہ اختیار کرنا تو چاہا۔ لیکن خود شعوری تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے کوئی راہ نہ پا سکے۔ یورپین قومیں خود رو بلا کنٹرول قتل و خونریزی میں الجھ گئیں۔ مسلمانوں کا مولوی۔ عیسائیوں کا بادشاہ اور ہندوؤں کا یوگی زندگی کے عملی اور خود شعوری ارتقائی دائرہ میں بیکار ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ اُن میں قوّتِ حیات نے خود شعوری سطح ذہن تو حاصل کی ہی نہیں تھی۔ اس سے اُن کو دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے تمام مسلمانوں کے مولوی یورپ کے سیاستداں اور ہندوؤں کے مفکر حیاتیاتی نظام کی گرفت میں لئے جا رہے ہیں۔ ہر قوم کی ترقی کی راہ یہی ہے کہ وہ اپنے ارتقائے نفس کیلئے نئی اُبھرتی ہوئی طاقتوں کا اتباع کرے۔ مسلمانوں کا ظنی علم۔ یورپ کی میکانی قوّت اور ہندوؤں کا تخیل خود شعوری سے منسلک طاقتوں کے سامنے بیکار ہے۔

"نفسی اور جسمانی نظام میں تغیّر"

ارتقائی نظام کی طرف یعنی خود شعوری ہیئت ذہنی کی طرف اشارہ کرنے والی حقیقت نفسی اور جسمانی نظام میں تغیّر ہے۔ نئی قوتیں ہیں آگے کی طرف

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

دھکیلتی ہیں اور ہماری ذہنی بلندی موجودہ نظام اور اقدار کو زیادہ صحیح اور جدید خطوط پر دیکھنا چاہتی ہے۔ جب ادراک میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو اس سے کم درجہ کی چیزیں مضحکہ انگیز سی معلوم ہونے لگتی ہیں علاوہ ازیں ہمارے احساسات اور ذہن کو غلط تصورات سے اطمینان بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ زندگی کی عملی کیفیتیں ایک الگ ذہنیت پیدا کرتی ہیں۔ انسانی تصورات اور زندگی کے عملی حقائق کے اس تصادم سے عجیب عجیب اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ذہن کیلئے بیحد تکلیف دہ اور جانگسل ثابت ہوتی ہیں۔ انسان کو زندگی میں معقولیت۔ امید۔ نجات۔ سچائی۔ نظم اور اپنی ذات کی نشوونما کی راہیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ پُرانا شعور اور طریقے زندگی میں کارگر ثابت نہیں ہوتے۔

انسان خود کو تنہا۔ مایوس اور تباہ حال پاتا ہے اور مختلف تاویلیں اس صورتِ حال کی کر کے خود کو مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن سوائے مایوسی کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیونکہ امید، معقولیت۔ اور ذات کی نشوونما کے ذرائع تو نیا شعور ہی پیش کر سکتا ہے اس لئے نفس اور ذہنی نظام اس وقت تک منتشر رہتا ہے جبتک اسے صحیح ارتقائی نظام حاصل نہ ہو۔

انقلاب کے سابقہ عبوری ادوار اور موجودہ عبوری دور

آج سے قبل جتنے عبوری ادوار تاریخ میں آئے وہ قوّتِ حیات کی غیر شعوری ہیئت اور اسکے نامکمل پہلوؤں کی ارتقائی منازل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان عبوری دوروں کی وجہ سے قوّتِ حیات کوئی بالکل نئی شکل و ہیئت اختیار نہیں کرتی تھی یعنی ایک ہی نوعیّت کے سادہ اور مسلسل ارتقا کا سلسلہ تھا اور زندگی کوئی نیا حیاتیاتی پلٹا نہیں کھاتی تھی۔ مثلاً نباتات جبتک نباتاتی ہیئت میں ارتقائی منازل طے کریں ان کا ارتقا ایک ہی نوعیّت کا کہلائے گا۔ اور اگر وہ نباتات سے حیوانات کی ارتقائی ہیئت اختیار کر لیں تو یہ ایک نیا حیاتیاتی پلٹا کہلائے گا۔ انسان کی زندگی جبلّتوں اور ہیجانات کے بہاؤ کے زور پر حیوانی ارتقائی ہیئت میں ہی چل رہی تھی ایک اعلیٰ ارتقائی ہستی اختیار نہ کی تھی لیکن موجودہ عبوری دور ہمیں یعنی ہماری قوّتِ حیات کو انسانیت کی ایک اعلیٰ ہستی میں منتقل کر رہا ہے۔

غیر شعوری سطح ذہن کی انتہا جسکے بعد .... "ی" .... "ی" تک نہ پہنچنے سے قبل ادراک کے پیمانہ میں خلائیں باقی تھیں۔ ان خلاؤں کے پُر ہونے کے بعد قوّت حیات ایک نئی سطح اختیار کرتی ہے۔ آج ذہن "ی" تک پہنچ چکا ہے اور وہ نئی ہیئت کا منتظر ہے۔

ذہن نئی ہیئت اختیار کرتا ہے۔

سابقہ عبوری ادوار ذہن انسانی کو "ی" تک پہنچانے کا ایک ذریعہ تھے۔

غیر شعوری ارتقا

خلائیں جو ارتقا پُر کرے گا۔

4

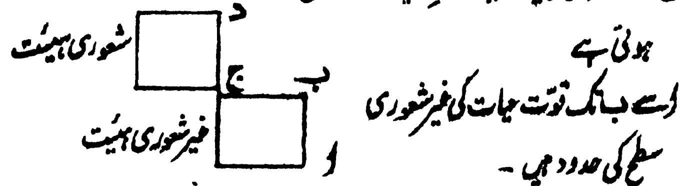
3

2

1

۱۲۷

آجتک قوّتِ حیات غیر شعوری منزلوں ہی میں درجہ بدرجہ ترقّی پا رہی تھی۔ لیکن موجودہ دور میں قوّتِ حیات غیر شعوری منازل طے کرنے کے بعد شعوری منزلوں میں داخل ہو چکی ہے۔



ج سے شعوری ہیئت میں قوّتِ حیات داخل ہوتی ہے

ا سے ب تک قوّت حیات کی غیر شعوری سطح کی حدود ہیں۔

اوّل اوّل پانی سو درجے تک گرم ہوتا ہے اسکے بعد وہ بھاپ بنتا ہے۔ یہی حال قوّتِ حیات کا ہے۔ اوّل اوّل وہ غیر شعوری سطح کی ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور پھر ایک شعوری ہیئت میں داخل ہوتی ہے۔ موجودہ عبوری دور اسے سابقہ ہیئت میں ہی آگے بڑھانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اب تو تمام قوّتِ حیات

خود شعوری کی نئی ہیئت اختیار کر رہی ہے ۔ اس لئے قوّتِ حیات کے تمام گوشے پوری طرح کھول رہے ہیں۔ ظاہر ہے موجودہ عبوری دور اور سابقہ عبوری دوروں میں زبردست فرق ہے۔ کیونکہ تمام قوّتِ حیات اب نشوو ارتقا کی ایک نئی دُنیا میں داخل ہو رہی ہے۔ اگر یہ نئی شکل سے گریز کرنا چاہے تو ساری کی ساری فنا کی زد میں آجاتی ہے۔ قوّتِ حیات کا کوئی ایک جزو منزلِ تعمیر میں نہیں ہے۔ بلکہ تمام کی تمام تعمیرِ منزل میں ہے۔ غیر ترقی یافتہ ادراک انسانی نئی ہیئت کو اگر قبول نہ کرے تو چونکہ غالمیت بلند ہوتی ہے۔ اس لئے پست ادراک اس سے ٹکرا کر واپس لوٹتا ہے۔ اور اپنی ہی ذات پر حملہ کرتا ہے۔ اس عمل سے انسان کی قوّتیں خود کو بے بس محسوس کرتی ہیں اور زندگی میں ایک نشیب کی سی حالت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا ادراک نئی ارتقائی حدود سے نہ پیچھے جا سکتا ہے۔ نہ نئی ہیئت کو پھاند کر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اور ایک جمود کی حالت موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک جانکنی۔ ایک انتشار، ایک نہ رُکنے والا اضطراب، زندگی پر ٹوٹ پڑتا ہے اور نئی ہیئت سے تطابق لازمی اور لابدی بن جاتا ہے۔ پہلے عبوری دوروں میں چونکہ قوّتِ حیات کوئی ہیئت اختیار نہ کرتی تھی۔ بلکہ ایک بڑھتی ہوئی رو کی شکل میں چلتی تھی۔ اس لئے غیر ترقی یافتہ ادراک کی کسی ہیئت اور نئی سطح سے ٹکرانے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور غیر ترقی یافتہ ادراک پر کنٹرول بھی ہو سکتا تھا۔ سابقہ عبوری دوروں میں انتشار پھیل جاتا تھا۔ لیکن ادراک اور قوّتِ حیات کو اس طرح مقید نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ غیر ترقی یافتہ قوّتِ حیات کو محیط تو ایک نئی سطح اور ہیئت قوّتِ حیات ہی کر سکتی ہے۔ آج نوعِ انسان پہلی دفعہ اس عمل سے گزر رہی ہے۔ اگر انسان مذہب کی طرف یعنی سچائی اور حقیقت کے ظنّی تصوّرات کی طرف توجّہ کرے۔ اور ان میں گم ہونا چاہے۔ تو احساسِ گناہ ادراک پر مستقلاً طاری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ادراک عملی طور پر آگے بڑھنے کی راہ تو پا نہیں سکتا۔ وہ مستقلاً ایک تعطّل کی حالت میں قائم ہے۔ یعنی ادراک کو گریز کے لئے بھی کوئی راہ نہیں ہے۔ اور مذہب نیک و بد اور گناہ و ثواب کے معیار کو ادراک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ زندگی خود لغزشوں اور خامیوں کی رہ گزر ہے جب تک صحیح حیاتیاتی نظم قائم نہ ہو۔ احساسِ گناہ کی صورت میں مسلسل ایک عذاب کی سی کیفیت کے سوائے ادراک کو کوئی حل نہ ملے گا۔ یہ بھی ایک حیاتیاتی قانون ہے۔ یعنی جب ادراک مقید ہو اور کسی غلط مکتبِ خیال کا خود ساختہ معیار ہی ہماری ذات کو رد کرتا ہے۔ کیونکہ وہ مکتبِ خیال ادراک کو حیاتیاتی نشوو ارتقا کی راہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ (حیاتیاتی نشوو ارتقا کی راہ تو نیا حیاتیاتی شعور ہی دے سکتا ہے) یعنی جب ادراک اسیر رہتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ نشوو ارتقا بھی اسیر ہے۔ اور یہ قید و بند کا احساس اس خیال میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ فرضی مکتبِ خیال کو اچھی طرح نہ نباہنے کا نتیجہ یہ قید و بند ہے۔ اس خیال و احساس کی بنا پر ایک تکلیف دہ کیفیت اور جانکنی ذہن پر چھا جاتی ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ ایک آزاد خیال شخص بھی بغیر خود شعوری حیاتیاتی اور ارتقائی راہوں کے بے بس ہو کر رہ جائے گا۔ اور خود کو پسپا ہوتا ہوا پائے گا۔ یہ حال آج کل تمام تحریکوں کا ہے۔ جنہیں کوئی راہ نہیں ملتی ہے۔ حکومتیں بھی کوئی راہ نہ پاتے ہوئے شکست خوردہ شخص کی طرح ہاتھ پیر ماریں گی اور خود کو کچل ڈالیں گی غرض یہ کہ جب تک ادراک نئی منزل اور نئے خود شعوری ذہن سے تطابق نہ کرلے۔ نشوو ارتقا کی کوئی راہ نہیں مل سکتی۔ آج تمام نوعِ انسان کو نئی ہیئت ذہنی سے تطابق کرنے کی ضرورت ہے ۔ ۱۴

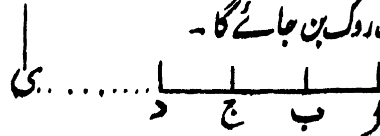
زندگی اور موجودہ نظامِ عالم کے درمیان ایک علیحدگی پیدا ہو گئی۔ یعنی موجودہ نظامِ عالم میں ہمارے جذبات اور قوّتوں کا کوئی پاس نہیں ہے۔ ہماری زندگی موجودہ محدود نظامِ عالم کے چوکھٹے میں فٹ نہیں ہے۔ وہ قوّت جو ہمیں متحد اور شیرازہ بند رکھتی ہے خود عبوری حالت میں ہے اور یہ عبوری حالت نوعِ انسان کی تاریخ میں ایک خاص نوعیت رکھتی ہے۔ پہلا مسئلہ ایک ایسا ماحول اور نظام قائم کرنا ہے۔ جو ہماری زندگی کی نئی ارتقائی قوّتوں کو راہ دے سکے اور وہ نظامِ خود شعوری ہیئت ذہنی کی مدد سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ موجودہ انسان کا ذہن اور ماحول اسی کا مقتضی ہے ۔

ارتقائی زندگی نئے ماحول اور فضا کی مقتضی ہے۔ موجودہ نظام غیر شعوری سطحِ ذہن کی انتہا کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے نیا ماحول لازمی نئی خود شعوری ہیئت کے علاوہ قائم نہیں ہو سکتا۔

پرانی زندگی کے لئے کافی تھا۔ اور پرانی قوّتوں کی بنا پر قائم ہوا تھا۔ ← موجودہ نظامِ عالم

موجودہ نظامِ عالم جن قوتوں کی بنا پر قائم ہوا تھا۔ وہ غیر شعوری سطحِ ذہن کے انتہائی نقطۂ ارتقا کا نتیجہ تھیں۔ اب ارتقا آگے بڑھ چکا ہے وہ غیر شعوری سطحِ ذہن کا کوئی نقطہ تو ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ غیر شعوری سطحِ ذہن کے انتہائی نقطہ کی بنا پر تو وہ نظام ہی قائم تھا۔ جو اب ٹوٹ رہا ہے۔ اس لئے اب خود شعوری ارتقا کے دور میں زندگی داخل ہو رہی ہے۔ اور موجودہ نظام خود شعوری ارتقا سے متعلق قوتوں کو نہ جذب کر سکتا ہے اور نہ اپنی کوئی راہ دے سکتا ہے۔ اور نہ روک سکتا ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تمام غیر ترقی یافتہ ادراک نئی قوتِ حیات اور خود شعوری ہیئت ذہنی کے جنگل میں مقید ہو گئی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے چراغ کو پُشت کی طرف رکھا جائے تو سایہ آنکھوں کے آگے ہی پڑے گا۔ اسی طرح حیاتیاتی اصول ہے۔ جب تک نئی ہیئت ذہنی کو رہبر نہ بنایا جائے گا۔ غیر ترقی یافتہ ادراک پر اس کا سایہ پڑ کر ایک روک بن جائے گا۔



نقطہ ی شعوری ہیئت ذہنی کا نمائندہ ہے۔ جب تک ی کی بنیاد پر نظامِ عالم قائم نہ ہوگا ا ب ج د کے لئے ی ایک روک بنا رہیگا اور ا۔ ب۔ ج۔ د کی قوتیں ی کے بلند درجۂ ذہنی کے سایہ کی وجہ سے مقید رہیں گی۔

پُرانے شعور اور ارتقائی قوتوں میں آج ایک زبردست کشمکش بپا ہے۔ پُرانا شعور نئی قوتوں کو قابو کرنے میں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے انسان کا پُرانا ادراک بے بسی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پُرانا نظامِ زندگی کے نئے جذبات اور ہیجانات کی تسکین نہیں کر سکتا۔ اس لئے زندگی بے کسی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ زندگی کی بے بسی اور بے کسی کا علاج نئی قوتوں کی بنا پر ماحول اور ادراک کو بلند کرتا ہے۔ اگر نئے ارتقا سے ہم آہنگ نہ ہوا جائے۔ تو انسان تباہ حال اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب تک صحیح نظم قائم نہ کیا جائے۔ پُرانے شعور اور ارتقائی قوتوں میں اندر ہی اندر ایک کشمکش جاری رہے گی اور زندگی بے چینی اور اضطراب سے نجات نہ پا سکے گی۔

15

پُرانا شعور ← نتیجہ بے بسی ← نئے شعور کی ضرورت

پُرانا نظام ← نتیجہ تباہ حالی اور بے کسی ← نئے ماحول کی ضرورت

قوتِ حیات کی نئی شعوری ہیئت کی وجہ سے جسمانی۔ ذہنی اور بیرونی نظم میں تبدیلیاں

خود شعوری ہیئت ذہنی

(جسم)

جسم کی قوتِ مدافعت میں اضافہ۔

ادراک کا پیمانہ مکمل ہو جائے گا۔ قوتِ حیات منتشر حالت میں نہ رہے گی۔ اس لئے صحت میں اضافہ ہوگا جنون اور مجذوبیت کا خاتمہ ہو جائیگا عمر میں اضافہ لازمی نتیجہ ہوگا۔ ذہن کی صلاحیت بڑھ جائیگی۔ ناقص اعضا والوں۔ بہروں۔ اندھوں۔ لولے لنگڑوں کی پیدائش بند ہو جائے گی۔

اعضائے جنسی

جنسی خواہشات کی صحیح تسکین ہو گی۔ اعضائے جنسی میں نقص نہ رہے گا۔ قوت حیات کے نشوونما سے اعضائے جنسی کی صحت کا زبردست تعلق ہے۔ صحیح نشوونما یافتہ قوتِ حیات اعضائے جنسی کو بھی صحت اور قوت عطا کرتی ہے اور اس طرح جنسی تعلقات کی شکایات کو دفع کرنے میں ممد و معاون بنتی ہے

ایشیا۔ جون جولائی ۱۹۶۶ء

(ذہن) ————

قوت حیات آزاد اور شعوری حیثیت میں ترقی کرے گی۔ اس لئے ذہن آزاد ذہن آزاد ذہن ہوگا۔ اسرار ختم ہو جائے گا۔ حوادث اور خطرات کا استیصال ہو جائیگا۔ موت کا پردہ ذہن پر وا ہو جائے گا

(خاندانی زندگی) ————

بیوی۔ اولاد اور معاشی ذرائع کی طرف سے کلی اطمینان حاصل ہوگا۔ خود شعوری ترقی کی وجہ سے بیوی اور شوہر میں تصادم اور اولاد کی سرکشی وقوع میں نہ آئے گی صحیح نظام کی وجہ سے معاشی کاوشیں بھی دور ہو جائینگی

(سچائی اور اقرار) ————

مذاہب کا وجود باقی نہ رہے گا۔ عبادت ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ سب خدا تک پہنچنے کا ذریعہ تھے۔ جب خود شعوری حاصل ہو جائے گی۔ تو دُنیا کے لئے خدا ایک راز نہ رہے گا۔ دُنیا کو خدا کی تمیز کی منزل پر پہنچنے کے بعد عبادت کی کیا ضرورت رہتی ہے۔

(سائنس (طبیعات اور کیمسٹری)) ————

قوتِ حیات کی نئی حیاتیاتی ہیئت قائم ہونے پر مکانی سائنس پر ذہن کو قابو ہو جائے گا اور یہ زندگی کی بہتری کے لئے کام کرے گی۔ حیاتیاتی سائنس میں حیرت انگیز انکشافات اور طریقے معلوم ہو جائینگے اور نوع انسان کی قوتِ حیات پر قابو ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہ سائنس کو غلط سمت میں استعمال نہ کر سکے گی۔

(تمدن) ————

تمام نوع انسان کے رہن سہن کا ایک ہی فطری ارتقائی طریقۂ زندگی ہوگا۔ نسل اور قوم کے تصوّرات ختم ہو جائینگے۔ یہ جغرافیائی حد بندیوں کے پیدا کردہ تھے۔ مخلوط شادیاں ہوں گی اور ایک ہی زبان تمام دُنیا میں عام ہوگی۔

(حکومت) ————

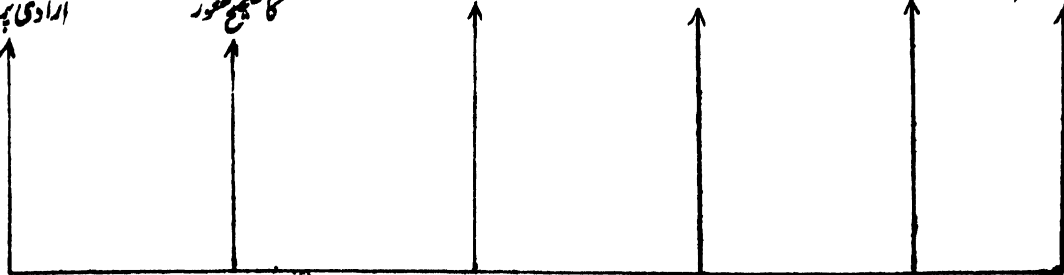
تمام دُنیا پر ایک صدر کی حکومت ہوگی۔ جو خود شعوری ارتقا کا نمائندہ اور ۱۷
حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے صحیح شعور کا حامل ہوگا۔ اور زندگی کی صحیح رہنمائی کر سکے گا۔ وراثت کا رواج ختم کر دیا جائے گا۔ اجارہ داری اور جلب منفعت کے مواقع مسدود کر دئے جائینگے۔

(سیاسی نظام) ————

عالمگیر تبادلہ کا قیام۔ کسٹم ڈیوٹی کی تنسیخ۔ فوج کا اختتام۔ جیلوں کو توڑ دیا جائے گا۔ ادراک پر کنٹرول ہونے کے بعد ان کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ نہ فوج کی۔ مستقل امن قائم ہو جائیگا۔

(تعلیم) ————

غلط مسائل اور کتابی علم اور ذہنی تکان کے بجائے آزاد ذہن زندگی کی جدوجہد میں صحیح طور پر نشو و نما کر سکے گا اور ترقی و انکشافات کی راہیں وا ہوں گی۔



خود شعوری ہیئت ذہنی کے نتائج

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۳ء

اکرام حسین بی-اے
(مسلسل)

جدید بنگالی شاعری

"ٹیگور انسانوں میں ہمہ گیر انسان ہے۔ شاعری میں بے نظیر شاعر۔ اور ہمارا یہ عہد ٹیگور کا عہد ہے۔" جدید بنگالی شاعری رابندر ناتھ ٹیگور کی ہمہ گیر خلاقانہ، اور ندرت پسند شعری کاوشوں اور کاہشوں کی منت کش تعبیر ہے۔ ٹیگور کی شاعری سے قطع نظر اُسکی شخصیت کا شعوری اور غیر شعوری اثر تمام شاعروں پر پڑا۔ یہ اثر گزشتہ یوروپی جنگ تک کافی گہرے نقوش اُبھار چکا تھا۔ جس نے تمام عالم کے مروجہ سماجی نظام کو بدل دیا۔

ہماری قومیت کا تمدنی سانچہ بنگال میں تیار ہوا جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں تغیراتی نقطۂ نگاہ پیدا کر دیا۔ مغربی علوم و فنون کا چرچا پہلے پہل بنگال ہی میں شروع ہوا۔ سیاسی و سماجی اصلاح کی صدا بھی وہیں سے بلند ہوئی۔ انہیں تبدیلیوں کی بنا پر سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ادبی، تمام نظریات نئے معیار اور جدید "کانٹے" پر تولے جانے لگے۔

بنگال ہمیشہ سے مغربی تحریکات کو جذب کرنے اور اپنے تمدنی معیار اور قومی ضروریات کے مطابق اُن سے استفادہ کرنے کے معاملے میں پیش پیش رہا ہے۔ یورپ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں تغیر و تبدل رونما ہوا جس نے نونیاز بنگال کی وسعتِ فکر و خیال کو چمکا دیا۔ نئے زمانے اور نئے نظریاتی تغیرات کے ساتھ ساتھ، آمد و شد کے نئے ذرائع۔ نشریاتِ لاسلکی نئے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" نے کسی قدر طاقت عوام کے ہاتھوں میں پہنچا دی۔ دو مختلف قوموں کے درمیان شادی بیاہ کے معاملے میں جو دیواریں حائل تھیں اُسے ترقی پسند سماجی نظام کے حامل گروہ نے کچل دیا۔ تعلیم کی بڑھتی ہوئی رو اور کتابوں کی طباعت اور اشاعت کی وجہ سے ملک میں تحقیق و تدقیق کا مادہ پرورش پاتا جا رہا تھا۔ صنعتِ فلم سازی مغربی تحریکات کو ہند کی سرزمین اور پھر ترقی پسند دماغوں تک لانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی تھی۔ اکثر بڑے شہروں میں مخلوط تعلیم کی وجہ سے جنسی نظریات و تخیلات بدل رہے تھے۔ قومی حکومت کا تقاضا تھا، روس جرمنی اور جاپان میں ہندوستانی پناہ گزینوں کے ذریعہ نئے سیاسی عقائد کی اشاعت ہے، خصوصاً اول الذکر دو ممالک میں ملوکیت کے بُت پاش پاش ہو جانے پر نئے رجحانات کی نشر و اشاعت نے زاویۂ فکر بدل دیا۔ "اچھوت ادھار" کے مسئلے نے بھی ایک حد تک سماجی زندگی کے بکھرے ہوئے مروجہ نظام میں تبدیلی کی ایک لہر دوڑا دی۔

ٹیگور صرف ایک باکمال شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک ہوشیار نباض بھی۔ اُس نے نہ صرف بنگال کی روح کو جلا دی بلکہ وہ اُس کی روح کو پا گیا۔ اُسکی نظریں زندگی کے اس اُلجھاؤ سے نکل کر اُن کے حل تک پہنچنا چاہتی ۱۷
تھیں۔ اُسکے مذہبی مقالات معاشرتی تحریرات میں، ادبی مضامین ڈراموں اور ناولوں میں ہم ایسی سماجی ہیجان کو حیرت انگیز طور پر نغمہ سرا پاتے ہیں لیکن اُسکی شاعری کے قالب سے قطع نظر اگر ہم بنگلہ کے نفسِ مضمون پر آتے ہیں تو یہاں بھی وہی جمود اور بے حرکتی دیکھتے ہیں جو کہ تم بدھ اور رامائن سے منسوب ہے۔ ٹیگور اور اُسکے زمانے کے شاعروں کا امتیازی فرق موضوعات نہیں بلکہ شاعری کا تصور و تخیل ہے۔ ٹیگور کے خیال کے مطابق شاعری ذہنی شعور، علمیت اور ادراک کی لطیف روح، نزہت زا خوشبو اور رعنائی پرور انگڑائی ہے ـــــ اور یہی ایک ایسا زینہ ہے جسکی مدد سے ہم زندگی کی ابدی سچائی اور حقیقتوں تک پہنچ سکتے ہیں اُسکے نزدیک ایک بے تاب آنسو یا ایک بے اختیار مسکراہٹ کی طرح شعر دل کی کیفیت کی تصویر ہوتا ہے لیکن ہمارے نوجوان بنگالی شاعروں کیلئے شاعری محض حکایتِ زبان و بیان ہے۔ اُن کے نزدیک ہمارے اخلاقی شعور کو بیدار کرنا ہی شاعری کا مقصد نہیں جیسا کہ (Words worth) کا ایمان تھا۔ یا زندگی کے ابدی مسائل کی تفسیر جیسا کہ (Browning) کا شاعرانہ

نصب العین تھا ۔ وہ اپنے موقلم سے نقاشی اور پُرکاری نہیں کرتے جیسا کہ ٹیگور نے اپنے شاہپاروں میں ہر جگہ کیا ہے ۔ وہ ایک سائنسداں کی طرح انسانی زندگی کے اُن جذبات و احساسات کا تجزیہ نہیں کرتے جو ہومر (Homer) کے زمانے سے آجتک جاری و ساری ہے نہ اُنہیں وہ پرشوکت و پرعظمت ہستی ہی نظر آتی ہے جو ٹیگور کی شاعری پر چھائی ہوئی ہے ۔

کولرج (Coleridge.) اپنی مشہور تصنیف (Biographia Literaria) میں شعری فطانت کے یہ لوازم قرار دیتا ہے " حِسِ لطیف شعری فطانت کا جسم ہے ۔ تصوّر اس کا حریری لبادہ ۔ ایک کپکپی، ایک حیات بخش تھرتھراہٹ اُسکی زندگی اور تخئیل اُسکی روح ہے جو ہر جگہ اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے "۔ شعری فطانت کے یہ لوازم کتنے ہی ضروری ہوں، نئے شاعروں میں کم و کیف انکا فقدان ہے ۔ وہ تجزیۂ نفس تحت الشعور میں حکمت تامّہ رکھتے ہیں ۔ وہ صوتی نغمات (Evocative rhythm) اور عکسی ترتیب (Image sequence) پر سر دُھنتے ہیں ۔ اُن کے نزدیک نظم کی ظاہری شان و شوکت ، ـــــ دقیق الفاظ ، رنگین تراکیب، بعید از قیاس استعارے ، دور از کار تشبیہات ـــــ اُسے زندہ رکھتی ہیں ـــــ (Word worth) کا خیال ہے کہ تمام اچھی نظمیں " شدت جذبات کے از خود چھلکنے " سے وجود میں آتی ہیں مگر ہمارے نئے شاعر اس خیال کے حامی نہیں ۔ وہ فن تنقید کے اصولوں سے آزاد اپنی دھن میں مست ہو کر لکھتے ہیں ۔ اُنکے نزدیک " کوئی قریب الفہم ... " (شاعری الفاظ کے ترنم کا نام ہے) یہی سب کچھ ہے ۔ (MALLARme) فرانسیسی شاعری کی مم مثالی تحریک (Symbolist movement) کے مخالف کے خیال کے مطابق بھی " شعر کی تخلیق خیال سے نہیں ، الفاظ سے ہوتی ہے "۔ ان نئے رومانی شاعروں نے مغربی شعری شعور کو اپنا یا اور تصوّرائیت (Imagists) اور (Surrealist) شاعر (David gascoyne ـــــ) کا اتباع کیا ۔ وہ انگریزی ، امریکی اور غیر ملکی شعراء کی خوشا چینی کرتے ہیں ۔ جن میں سے چند نام حسب ذیل ہیں : ـــ

Masefield Blun-den Spender, Davies, Edith Sitwell, Walter De la Mare, Eliot, Pound, Poe Mallarme, Rimbaud.....

. . . .

اور بعض اوقات روسی کمیونسٹ شعراء کے اتباع سے بھی دامن نہیں بچاتے ۔ لیکن ان شعراء کی ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ مغربی شعراء کے اتباع کے باوجود وہ اُن کی ملکی روایات میں کوئی فرق نہیں آتا ہے ۔

اس مختصر سے مضمون میں یہ تو مشکل ہے کہ تمام شعراء کے ذاتی رجحانات اور تحریکات شعری کا تجزیہ کیا جائے ۔ لیکن جدید شاعری کی رفتار اور اس کی تدریجی ترقی کے اظہار کیلئے یہ ضروری ہے کہ چند مخصوص صاحب اسلوب اور مختلف الخیال اسکول کے شعراء کے کلام پر روشنی ڈالی جائے ۔

ٹیگور کی شاعری کی ما بہ الامتیاز خصوصیت اس کا بیساختہ پن ہے اصل بنگالی میں ان گیتوں میں سے ہر ایک اپنی سادگی ، تازگی ، برجستہ پن ، معانی کی نزاکت اور بلندی ، بیان کی روانی ، الفاظ کے حُسن انتخاب ، موزونیت ، ترنم اور سُر تال کی ندرت اور دلکشی میں شاعری اور موسیقی کا لاجواب نمونہ ہے ۔

ٹیگور انسانی آزادی کا علمبردار ہے ۔ غلامی اور جہل و حقارت کی گود میں پلی ہوئی موجودہ تہذیب و تمدن کی دُنیا میں وہ آزادئ فکر و عمل اور باہمی صلح و محبت کا پیامبر ہے ۔ ٹیگور کی زندگی فرسودہ بے معنی رسم و رواج اور مُردہ و بوسیدہ مذہبی توہمات کے کٹھن بندھنوں کو کاٹتے کٹی ہے ۔

" مجھے معلوم نہیں عبادت کسے کہتے ہیں !
جبھی تیرے دروازے کی خاک پر بیٹھا صرف رویا کیا ہوں !
میں بے سمجھ تھا ، اور جس طرح میرے دل میں آیا میں چلا آیا !
میں اندھیرے میں تجھ سے ڈرا نہیں !
لیکن یہ عارف تیرے ،
مجھے سخت طعنہ دیتے ہیں ۔
کہتے ہیں " تو یہاں آنے کی مناسب راہ سے نہیں آیا ، لوٹ جا !
میرے لوٹنے کا راستہ تو تُنے بند کر رکھا ہے !
اور وہ بیکار پکار رہے ہیں " لوٹ جا ، لوٹ جا ! "
(ایک گیت ۔ بنجاشیکا)

اور : ـــ

" دلوبان چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوشبو بنا کر اُڑا دے !
خوشبو چاہتی ہے کہ لوبان کو اپنے سینہ میں چھپائے رکھے !
نغمہ چاہتا ہے کہ سُر تال کا پابند رہے ،
سُر چاہتا ہے کہ نغمہ کو لے کر اُڑ جائے !
خیال چاہتا ہے کہ مجسم صورت میں جلوہ گر ہو ،

اور صورت کی آرزو ہے کہ عالمِ خیال میں آزاد رہے !
گرہ کا کھلنے کی فکر میں رہنا،
آزادی کا زنجیروں کی ارزو کرنا،
یہ عالمِ ہست و نیست میں کسکی خوشی ہے جو کارفرما ہے !"

(۲-گیت - اتسنگ)

"میرا اندھیرا ہی بھلا ہے !
اپنے آپ کو روشنی کے حوالہ تو کر سکے گا !
روشنی کا حریص دیکھو، نور کو کس طمع سے سمیٹتا ہے -
بس یہی طمع کا دھندلکا تباہ کن ہے !
بچّہ ماں کی گود میں اطمینان سے دودھ پیتا ہے،
لیکن مغرور عقلمند تیری بارگاہ کے دروازے پر روک دیا جاتا ہے !
تیری راہ اپنا دروازہ خود دکھاتی ہے !
پروردگار ! میں تیری اس راہ پر سیدھا چلوں گا !
اور وہ جو راستہ ہٹانے کے لئے آ جمع ہوئے ہیں ـــ
وہ تیری راہ میں سنگِ راہ ہیں !"

(۳-گیت - پروباہی نی)

ٹیگور نے مروّجہ تعلیم کے خلاف جہاد کیا - اور "وشوابھارتی" کا سنگِ بُنیاد رکھ کے یہ ثابت کر دیا کہ مصنوعی قید و بند سے آزاد ہو کر نام نہاد حدود کو توڑ کر بھی حقیقی اور سچّی تعلیم کی روشنی حاصل کی جا سکتی ہے - ٹیگور نے انسان میں انسانیّت کے خدا کو دیکھا ہے اور اسی لئے اُسکی توہین وہ کسی رنگ میں برداشت نہیں کر سکتا -

ٹیگور کی عظمت کا سنگِ بُنیاد، اُسکی لاثانی شخصیت کا مدار وہ نغمہ ہے جو اُس نے اس حسین دُنیا کے تن میں حُسن و سرور کی روح پھونکنے والے "شاعرِ کائنات" محض حُسن، محض سرور، کی مدح و ثنا میں گایا ہے : ؎

"خوف نہ کھاؤ کہ پیغام پریشان رکھتے ہوئے،
پھٹے بادبانوں میں سینے کو تان کر،
میں اپنی کشتی کو کھیتا اُس پار لیجاتا ہوں !
میرا رہنما وہی ہے ـــ
جو نہتے ہر حال میں دیکھ رہا ہے !
میرے دل میں کھٹکا نہیں ـــ
میں کشتی کو منجدھار میں چھوڑتا ہوں،
مجھے اُس پر بھروسہ ہے !
دن ڈھلے پر مجھے یقین ہے کہ کشتی تیرے سہارے پار لگے گی !
وہاں میں اپنے دردِ دل کے سُرخ پھول کو ـــ
تیری رحمت کے قدموں میں رکھ دونگا !"

(۴-گیت - مکت دھارا)

"آہ میری راتیں اس طرح کیوں برباد ہو رہی ہیں ؟
آہ، کیوں ہمیشہ میں اسکے مشاہدے سے محروم رہتا ہوں ـــ
جس کے تنفس کا اثر میں اپنے خوابوں پر محسوس کر رہا ہوں"

(نغمہ ۲۶ - گیتانجلی)

"میں تجھے اپنے خدا کی حیثیت سے جانتا ہوں اور تجھ سے علیحدہ ہوں
میں تجھے اس ہستی کی حیثیت سے نہیں جانتا جو میری ہو، اور تجھ سے
قریب تر نہیں ہوتی - میں تجھے اپنے باپ کی حیثیت سے جانتا ہوں
اور تیرے قدموں میں سر بسجدہ ہوں - میں تیرا ہاتھ اپنے دوست
کا ہاتھ سمجھ کر نہیں پکڑتا"

(نغمہ ۷۷ - گیتانجلی)

ٹیگور نے وہ گیت سُنے ہیں جو مُغنّیٔ فطرت اپنے قدرتی مظاہر میں ہمیشہ گائے جا رہا ہے اُس کا دل و دماغ انہی قدرتی گیتوں کے لاجواب سروں سے گونج رہا ہے اور وہ خود مجسّم سرور و نغمہ ہو کر گاتا ہے - ٹیگور کا معبود اور معشوق وہ شاعر اور مصوّر ہے جو اُس کی زندگی میں لطف اور سرور، غم اور اندوہ کی سُریں پھونک رہا ہے، اُس کی زندگی میں عجیب و غریب کیفیّات کے رنگ بھر رہا ہے - شاعر اُسکے عشق میں پیا اور اُسکے حُسن کو قدرت میں دیکھ کر اُس کی تعریف میں نغمہ سرا ہے -

ایشیا کا عرفان، اُپنشدوں کا گیان، جو رشیوں کی خصوصیت تھا وہ ہمارے دور کی آزادی اور جدید علمی تحقیقات اور فلسفیانہ حقائق کی روشنی سے مل کر ایک حیرت انگیز لافانی موزونیّت کی صورت میں ہم ٹیگور میں موجود پاتے ہیں - ٹیگور اپنی شاعری کے عالم کا آپ ہی خالق ہے - اُس سے قبل کی بنگالی شاعری کی وہی حالت تھی جو اُردو کی میر اور مرزا غالب سے

سے پہلے اُس نے اپنے مذاق کے مطابق عروض کے قواعد الفاظ کے استعمال اور اظہار خیال کے میدان میں بھی اصلاحیں کیں۔ وہ خود کہتا ہے :۔

" دل کی خوشی کے چڑھتے ہوئے سیلاب کے ریلے کے سامنے
بندھی بندھائی عروض کی بحریں اور وزن اپنی جڑیں زمین
میں سنبھال کر نہ رکھ سکے۔ اور جس طرح ندی سیدھی راہ نہیں بہتی
اپنی ترنگ میں گھومتی، چکر کاٹتی چلی جاتی ہے، میرے اشعار
کے بہاؤ میں بھی خود سری تھی۔"

قاضی نذرالاسلام۔ اسکے بعد نذرالاسلام کی ہستی ہے، ٹیگور نے خود بار ہا نذرالاسلام کی شاعرانہ عظمتوں کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ہم ٹیگور کے بعد بنگالی کا سب سے بڑا شاعر نذرالاسلام ہی کو مانتے ہیں۔ نذرالاسلام کی شہرت کی بنیاد اُسکی "باغیانہ نظموں پر قائم ہے۔ کون اُسکی نظم "باغی" اور "طوائف" سے انکار کرسکتا ہے۔ اُسکی نظموں میں مضمون کی مناسبت سے کچھ اس قسم کے الفاظ ہوتے ہیں کہ اُن میں ایک انقلاب انگیز گرج اور ولولہ انگیز شور پیدا ہو جاتا ہے۔

نذرل موجودہ ملکی نظام، سرمایہ داری، بیواؤں کی زبوں حالی، مزدور کی کس مپرسی، اور سماجی بدحالی کے خلاف ہے۔ وہ کھلے ہوئے پیرایہ میں (Socialism) اشتراکیت کا پرچار کرتا ہے۔ اُسکے نزدیک مُلکی بدحالی کو دور کرنے کا ایک یہی واحد علاج ہے۔ چونکہ وہ خود سپاہی رہ چکا ہے اس لئے اُسکی نظموں کا جوش، اُسکے ذہنی نشوونما کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔

وہ ایک باغی شاعر ہے اُس کی زیادہ تر نظمیں حکومت اور اُسکی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکے بیشتر مجموعے ضبط ہو جاتے ہیں۔

اُس کی قومی اور انقلابی نظموں کا نئے شاعروں پر گہرا اثر پڑا۔ اور یہی دیکھتے دیکھتے، اب وہ خموش ہو گیا ہے۔ (ٹیگور کے شرادھ کے موقع پر میں نے اُس سے مل کر یہی رائے قائم کی ہے) اب اس نے اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر محبت اور نیچر کو اپنا موضوع شاعری بنالیا ہے۔ نذرل اس معاملہ میں جوش کے بالکل برعکس ہے۔ نذرل نے پہلے بغاوت کی آگ اچھالی اور پھر "محبت" اور "نیچر" کے گیسو سنوارے۔ اگر جوش پہلے ایک نشاطی و رومانی شاعر رہا بعد کو انقلاب اور اشتراکیت کے گیت گانے لگا۔

اب نذرالاسلام رومانی شاعر ہے اور اُس کی اکثر رومانی نظمیں شعری لطافت کے لحاظ سے انتہائی مقبول ہوئی ہیں۔ بہت دنوں سے وہ چھوٹے چھوٹے گیت لکھ رہا ہے جو فارسی کی غزلوں کی طرح نرم و شیریں ہوتے ہیں۔

نذرالاسلام ایک غریب گھر کا چشم و چراغ تھا۔ بردوان کے ایک گاؤں میں وہ آج سے ۴۵ سال قبل پیدا ہوا۔ قدرت کی آغوش میں پروان چڑھا۔ اسکول اور کالج کی تعلیم سے بے نیاز رہا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو کر عراق چلا گیا۔ جنگ کا میدان اسکے لئے سب سے بڑی درسگاہ ثابت ہوا۔ جب لڑائی کے میدان سے ہندوستان لوٹا تو چند نظموں کے مسودے اسکے ساتھ تھے۔ اُن کا مجموعہ "اگنی وینا" (آگ کی بانسری) کے نام سے شائع ہوا۔ یہ آٹھ یا نو نظموں پر مشتمل ہے جس میں سے دو کو چھوڑ کر باقی سب عراق میں لکھی گئیں۔ ان سب میں اسلامی روایاتی زندگی کی دھڑکن پائی جاتی ہے۔ اور اُن میں ہم ایک مسلمان انقلابی، ایک اسلامی مجاہد کی جھلک دیکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو اس زمانے میں اُسے آزادی کی لگن اور ظلم سے نفرت تھی۔

کسان تو وہ ابتدا ہی سے تھا۔ لیکن عراق کی جنگ نے اُسے سپاہی بھی بنا دیا۔ "کسان سپاہی میں انقلاب گری کے بڑے بڑے امکانات پنہاں ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا ساتھ مزدور سے ہو جائے۔ کسان، مزدور اور سپاہی ــــ ان تینوں کا اتحاد دُنیا کی تمام جابر سلطنتوں کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ زار کا زوال اس حقیقت کا ثبوت ہے۔"

" مسلمان کی گرم گفتاری، کسان کی حقیقت پسندی اور سپاہی کا جوش یہ تینوں چیزیں نذرالاسلام کو ودیعت کی گئی تھیں۔ مزدور کی انقلابی سرشت کی کمی تھی، سو وہ بھی بعد میں پوری ہو گئی۔"

عراق سے واپسی پر اُسے اپنے خیالات کی تہذیب اور تعلیم کا موقع ملا اسی زمانہ میں اُس نے وہ نظم "ودروھی" (باغی) لکھی جس نے اُسے ادبی انقلاب کا پیشوا بنا دیا۔ پروفیسر سرکار اپنی کتاب "ایشیا کا مستقبل" Futurism of Asia میں اس طرح لکھتے ہیں :۔

" جب میں نے نذرالاسلام کی نظم "باغی" کو پڑھا تو مجھے محسوس

ہوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے آج اُس کا آغاز ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا لہریں مارنے لگا مسلمانوں نے ابتک اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی نہیں کی تھی جتنی انپر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کریگا سہرا شاید ان ہی کے سر بند ھنے والا تھا۔"

"باغی" بنگلہ ادب میں اپنی نوعیت کی اچھوتی چیز ہے۔ وکٹر ہیوگو (طوفان) سوئن برن (ہرسیتھا) اور لارڈ بائرن (تخریب) جیسے باکمال شعراء نے اس موضوع پر نظمیں لکھی ہیں اور پشکن کا ترانہ "آزادی" روسی انقلابیوں کے دلوں میں اُتر چکا ہے لیکن "باغی" کی عظمت اور بلندی ان سب سے بڑھ کر ہے یہ "باغی" یونان کا رستم ہرکلس نہیں جس کی ٹانگیں آہنی ستونوں سے زیادہ موٹی تھیں۔ بلکہ ہومر کا تشکیل و تجمیل ہیرو "ایکیلس" ہے جس کی تلوار میں اتنی ہی کاٹ تھی جتنی کہ اس کے مکر بھری آنکھوں میں۔"

اگرچہ بغاوت کا ایسا خاکہ مشکل سے کہیں ملے گا۔ لیکن پھر بھی اُسکے خیالات میں اس وقت تک پختگی اور صفائی نہیں آئی تھی اور نہ اس کا نظریۂ زندگی ہی واضح ہوا تھا جس کی مثال "نعرۂ انقلاب" میں ملتی ہے۔

"آگمنی" (آمد) اور "ودروھی" (باغی) نظموں نے بنگال کے ادبی حلقوں میں ایک ہیجان پیدا کردیا۔ قدامت پسندوں نے ان پر سخت شور مچایا۔ ان کی نرالی سج دھج ایک نئے دور کا اعلان کررہی تھی۔ ٹیگور اسکول کے مقلدین کو یاد نہیں رہا کہ انہوں نے بھی بنکم چندرا اور ڈی۔ ایل۔ رائے کی روایات کو توڑکر اپنے لئے ایک نیا راستہ بنایا تھا۔ اس ادبی جہاد سے جوان اور بوڑھے دو گروہ میں بٹ گئے اور اُن کے تنازعہ کی بنا نذرالاسلام کی شاعری قرار پائی۔

نذرالاسلام کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت وہ پیغام ہے جو وہ اپنے وطن کے نام لایا تھا۔ یہ اُن سرفروشوں کا پیغام تھا جو انسانیت کی نجات کی خاطر دیس پردیس میں سولیوں پر چڑھ رہے تھے۔ لیکن اس پیغام سے قطع نظر اُس نے جس اسلوب میں اس پیام کو دُنیا کے سامنے پیش کیا وہ بھی کچھ کم اہم نہ تھا۔ "شاعری یا ادب کے ہر شعبے میں طرز یا اسلوب کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ اور اچھے سے اچھا مضمون اسلوب کے نقص کی وجہ سے بے اثر اور بے جان رہ جاتا ہے۔" نذرالاسلام اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا اور اسی لئے اُس نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کیلئے ایک ایسے اسلوب کی بنا ڈالی جو اُسکے پیغام کا حامل ہوسکے۔

ٹیگور کے بنائے ہوئے سانچے غنائی نظموں کیلئے انتہائی موزوں تھے لیکن رزمیہ شاعری کی آنچ پڑتے ہی وہ تڑخ جاتے تھے۔ چنانچہ نذرالاسلام نے فارسی اُردو کے سبک الفاظ کے رچاؤ سے اپنی نظموں میں خاطر خواہ زور و اثر پیدا کیا۔ نذرالاسلام کی اس جدت نے بنگال کے ادبی پاکبازوں (Puritans [illegible]) میں ایک آگ سی لگا دی۔ ہر طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہوگئی۔ اور اکثر [illegible] Literary Philistines نے اسے فرقہ پرست اور رجعت پسند قرار دے دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس نئے رجحان کی خوبیوں کو سمجھ گئے اور نیا اسلوب بنگلہ میں کافی مقبول ہوگیا۔ اب تو اسکے تتبع میں غزل نگاری بنگلہ شاعری کی خاص صنف بن گئی ہے اور اس صنف کا محرک بھی نذرالاسلام ہی ہے۔

نذرالاسلام کو چونکہ بچپن ہی سے گانے بجانے کا شوق تھا۔ لڑکپن میں اس نے اس فن کو حاصل بھی کیا تھا۔ موجودہ عہد میں وہ موسیقی کا اُستاد اور مجتہد مانا جاتا ہے۔ اس لئے اُس کی نظموں میں ایک رزمیہ موسیقی پیدا ہوگئی ہے جو اُس کی دوسری خوبی ہے اور جو اُس کے پیام کو پُر اثر بنانے کیلئے ناگزیر تھی۔

"پیغام کی نوعیت، زبان و بیان کی جدت اور طرزِ کلام کی قوت۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے بہت کم عمری میں نذرالاسلام کو بنگال کا سب سے عظیم مقبول شاعر بنا دیا۔"

نذرالاسلام نے حولداری کی وردی چھن جانے پر، حکومت کے عتاب اور قدامت پرستوں کی مخالفت کی ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ اُسکے عزائم اور نصب العین میں بھی کچھ فرق نہ آیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۴ء کے عرصہ میں اس نے دو ہفتہ وار "کلّول" اور "نوردز" جاری کئے لیکن سیاسی ہنگاموں کے ختم ہونے پر ہندو مسلم فساد کی وجہ سے انہیں بند کرنا پڑا۔ لیکن "کلّول" کا اثر غیر شعوری طور پر بنگالی دماغ پر چھایا رہا۔ اور "کلّول اسکول" کے ادیب یورپ کے رومانی ادیبوں کی طرح اپنے لئے ایک خاص مقام بنا گئے۔ انہوں نے مولویوں اور پنڈتوں کی زندگی کو بے نقاب کرکے اُن کے حجروں کو ماتم کدہ بنا دیا۔ ان ادیبوں میں سے کچھ نے نذرالاسلام کے ساتھ ہوکر سماجی انقلاب

کو اپنا اصلی مقصد بنا لیا۔ اور کچھ "جیمس جوئس" اور "فرائڈ" سے متاثر ہوکر جنسی اصلاح میں کھو گئے۔

۱۹۲۶ء نذرالاسلام کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اُس کے مربی سی۔ آر۔ داس کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی اُس کی پُشت پناہی پر نہیں رہا تھا۔ مخالفت کا ایک شور بلند ہوا۔ اپنے اس شور میں اُسکی آواز کو جذب کر لینے کے لئے۔ ہندو مسلم فساد کی وجہ سے ملک کی جو حالت تھی اُس کی وجہ سے وہ فرقہ پرست کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ اسی دوران میں اُس نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کرلی۔ پھر کیا تھا۔ فرقہ پرست اسکی جان کے دشمن ہوگئے اور ہر طرف سے اعتراضات کی آگ اُچھالی جانے لگی۔ حکومت کی چیرہ دستیوں، مولویوں کا غصہ اور اب ہندو جماعت کے ستم کو وہ اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کرتا ہے: ۔

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔
کوئی کہتا ہے اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔
کوئی کہتا ہے شاعر کو قید و بند سے کیا واسطہ۔
کوئی کہتا ہے دوبارہ جیل جاکر وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔
مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پاکر
مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتا ہے۔
ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کرلی ہے،
لہٰذا یقیناً فرقہ پرست ہے۔
گاندھی جی مجھ پر "تشدد پسندی" کا الزام لگاتے ہیں۔
عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست
بناتے ہیں۔
غرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔
لوگو! مجھے اسکی پرواہ نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔
تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں،
میری خونچکاں تحریریں ان کے لئے پیامِ موت ثابت ہوں"

افلاس اور غربت، گرسنگی اور بیچارگی نے اس کی بغاوت گری کا گلا مسوس دیا اور مجبور ہوکر اُسے وہ گیت لکھنے پڑے جو آج بنگال کے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ جن میں ادب سے زیادہ موسیقی کو دخل ہے اور یہی رنگ اب اُسکی شاعری پر غالب آچکا ہے۔ اُس کی انقلابی شاعری ۱۹۲۰ء سے شروع ہوکر ۱۹۳۵ء تک سرد ہو گئی۔

نذرالاسلام کی شاعری کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ابتدائی دور تحریک خلافت کے ساتھ شروع ہوا۔ اس زمانے میں "انور پاشا" اور "مصطفیٰ کمال" پر دو چھوٹے چھوٹے رزمیہ منظوم مکالمے لکھے۔ معرکۂ کربلا پر بھی چند نظمیں ہیں۔

دوسرا دور "باغی" کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں بم بنائے اور پھینکے جا رہے تھے۔ نوجوانوں کے دلوں میں جوش اور امنگ کا دریا لہریں مار رہا تھا اور [redacted] پارٹی زور پکڑ رہی تھی۔

تیسرا دور ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ یہ نذرالاسلام کا اشتراکی دور کہلاتا ہے۔ اب وہ زندگی کے فلسفہ کو پا گیا۔ مزدور کی گرد سے اٹی ہوئی پیشانی، طوائف کے آنسوؤں کی رنگین عورت کا درجہ، فلسفۂ "حاکم و محکوم"۔ "دو بگاہ" کی چاشنی، سچائی کے زہر کے ساتھ ساتھ، بنگال کی سرزمین کا قدرتی رومان اُس پر اثر کر رہی گیا۔ "وہاں کے اودے اودے بادلوں، گھنے پیڑوں اور ڈبڈبائی ہوئی ندیوں کے پیچھے رومان مسکراتا ہے۔"

نذرالاسلام پر بھی یہ جادو چل گیا۔ اس کا ہلکا سایہ تو "یادِ ایام"، "دریا کا گیت"، "مجھے یاد کروگی"۔ نظموں میں نظر آتا ہے۔

نذرالاسلام پہلا بنگالی شاعر ہے جس نے اپنے زمانے اور اسکی مروجہ روایات کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ وہ ایک آفتابِ تازہ کی تلاش میں تھا جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو کچل کر قوم و مذہب، رنگ و نسل کی حدوں کو توڑ کر دُنیا کو مساوات اور آزادی کا درس دیتا ہے اور اس نئے دور کا وہ یوں اعلان کرتا ہے: ۔

" وہ مبارک ساعت آپہنچی۔
ہتوڑی اور کدال سے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے،
راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں،
تمہاری خدمت کیلئے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے،
تمہارا بارِ گناہ اُٹھانے کے لئے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے،
وہی ۔۔۔ صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اُسی کے

۴۲

گیت گاتا ہوں۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دُنیا کی
تعمیر کرے گا۔
آج مظلوموں اور بیکسوں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی
سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔
آج دُنیا کے بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان
دورِ بیداری کا آغاز ہو رہا ہے۔ جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے
اور شیطان خوف سے لرزتا ہے۔"

نذر الاسلام کے نظریّہ کے مطابق "زندگی دائم و قائم ہے اور انسان لاشریک لہٗ اس کا کارساز ہے۔ وہ شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ تغیّر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدامت کا حریف اور جدید کا علمبردار ہے۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان سب سے افضل اور اکمل ہے۔

"میں اپنی خودی کے علاوہ کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔
میں اس بوسیدہ سماج کا دشمن اور اسکے لئے خطرۂ عظیم ہوں۔
میں خدا ہوں! ہر حقیقی معنوں میں مکمّل ترین انسان ہوں۔"

نذر الاسلام کی شاعری امید اور اُمنگ کا پیغام ہے۔ چونکہ ابھی تک بنگلہ شاعر زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا رونا روتے آئے تھے۔ اس لئے اُس کی شاعری نے بنگال کو ایک نیا زاویۂ فکر اور ایک جدید خیال دیا جس نے ناامیدی کو امید، یاس کو اُمنگ اور قنوطیت کو تفاؤل میں بدل دیا جس نے شاعری کی مُردہ رگوں میں زندگی کا خونِ گرم دوڑا دیا اُس سے پہلے کے شاعروں کا خیال تھا کہ حقیقت صرف موت کے بعد مل سکتی ہے۔ لیکن کبیر داس کے بعد نذر الاسلام ہی نے اس بات کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ جو شے زندگی میں نہیں مل سکی وہ موت کے بعد کیونکر مل سکتی ہے۔ اُس نے "اطنی شاعری" Mystic Poetry کے تار و پود کو جلا کر اُس کی گرمی اور حدّت سے انقلابی شراب تیار کی جس سے آج میخانے جھوم رہے ہیں۔

نذر الاسلام نے کبھی دوئی کا پردہ اُٹھانے کی کوشش نہ کی۔ وہ اسے سعیٔ لاحاصل، بیکار مشغلہ، اور فضول سی تگ و دو خیال کرتا ہے اسکے مقابلے میں زندگی کے حقائق کو سُلجھانا اور سمجھنا اس کا محبوب ترین شغل ہے۔ اسی لئے اُس نے صرف دُنیوی زندگی اور اُسکے مسائل سمجھنے سمجھانے میں اپنی تمام تر کوشش صرف کی۔

زندگی اور اُس کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے یہی دیکھا کہ ایک طرف انسانوں کی اکثریت جہالت اور افلاس میں گھٹ رہی ہے اور دوسری طرف اُس کی محنت کا پھل چند آرام طلب ہضم کر رہے ہیں ایک طرف جنّت بوس محل کھڑے کئے جا رہے ہیں دوسری طرف ہزاروں جھونپڑیوں کے اندر اپنی بھوک کی آنتیں مسوسے پڑے ہیں۔ نذر الاسلام سے یہ زبوں حالی اور ناانصافی نہ دیکھی گئی۔ اور "باغی" انہیں خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اکرام قمر۔ بی۔ اے

روما کے سیاسی افکار

(۱) یونان کی بجائے روما

افلاطون اور ارسطو سے زیادہ متضاد و متباین دو بلند پایہ مفکر تلاش کرنا محال ہے۔ ایک فلسفی اور استنباطی (کسی کلیہ سے جزئی نتیجہ اخذ کرنے والا) تھا، دوسرا سائنسی اور استقرائی (جزئی مثالوں سے کلی نتیجہ اخذ کرنے والا)۔ ایک ترکیبی (متفرق خیالات کے ربط اور ترتیب سے کوئی نظریہ قائم کرنے والا یا متعدد نظریوں کو ربط دیکر نظامِ فلسفہ بنانے والا) تھا، دوسرا تحلیلی (کسی چیز کا تجزیہ کرکے اُسکے عام اصول معلوم کرنے والا) ایک داخلی (اشیا اور خیالات کو اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ صناع کے نقطۂ نظر اور ذاتی رجحانات کے مطابق پیش کرنیوالا) تھا، دوسرا خارجی (اشیا اور خیالات کو اصلی و حقیقی رنگ میں دیکھنے اور بیان کرنیوالا)۔ ایک
۲۴ خیال پرست تھا، دوسرا حقیقت پسند۔ ایک کے نزدیک عقل زندگی کی بلند ترین رہبر ہے، دوسرا جبلّت کا قائل ہے۔ ایک کا خیال ہے کہ فلسفیوں کے ہاتھوں سے سماج اور ریاست میں اعتدال و ترمیم کی جا سکتی ہے۔ دوسرا رواج، عادات اور روایات کو مستقل اور ناقابلِ تغیر سمجھتا ہے۔ مگر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یونانی شہری ریاست ایک معیاری طرزِ حکومت ہے۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے وقت کی یونانی شہری ریاست ایک معیاری طرزِ حکومت ہے۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے وقت کی یونانی شہری ریاست کے بہت سے بیرونی اور اندرونی طاقتور دشمن ہیں۔ دونوں کا یہ اعتقاد ہے کہ تعلیم سے ـــ ایسی تعلیم شہریت سے جو علم اور راستبازی میں اضافہ کرے ـــ شہری ریاست کی اصلاح اور تحفظ ہو سکتا ہے۔

لیکن ان کا یونانی شہری ریاست کا نظریہ غلط تھا۔ اس کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ بین الاقوامی شہنشاہیت نے لے لی تھی۔ ارسطو نے خود ان لوگوں کی تربیت میں مدد کی تھی جن کے ہاتھوں بعد میں یونانی آزادی کا خاتمہ ہوا۔ اور مغرب میں پہلی عالمگیر حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

یونانی شہری ریاست کے زوال کی فوری وجوہات مندرجہ ذیل تھیں:۔

(۱) اندرونی سخت بدعملی۔ اسکی ارسطو فینیز نے اپنی طربیات میں انتہائی مذمت کی ہے۔

(۲) بڑی ریاستوں نے چھوٹی ریاستوں پر وحشیانہ مظالم کئے اس سلسلہ میں وہ جبر و استبداد خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو ایتھنز والوں نے ایگین شہروں پر کیا اور سپارٹا نے پیلوپونیشین شہروں کے ساتھ اور تھیبز کی حکومت نے بوشین شہروں کے ساتھ روا رکھا۔

(۳) بڑی بڑی ریاستوں کا باہمی جنگ و جدل۔ خصوصاً ایتھنز اور سپارٹا (سنہ ۴۳۱-۴۰۴ ق۔م) کی پیلوپونیشین جنگ۔ اور

(۴) مقدونوی حملہ اور فتح جو ۳۳۸ ق۔م کی جنگ کیرونیا میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔

مگر زوال کی ان فوری وجوہات کے علاوہ یونانی شہری ریاست کی ساخت ہی میں بہت سے عیوب موجود تھے جنہوں نے یہ بات ناممکن و ناپسندیدہ بنا دی تھی کہ اس ریاست کو انسانی تنظیم کی آخری صورت سمجھتے ہوئے زندہ رہنے دیا جائے۔ یونانی شہری ریاست بہت ہی چھوٹی بہت ہی الگ تھلگ، بہت ہی خود غرض، بہت ہی جھگڑالو، بہت ہی مستبد، فرقہ بندیوں میں بہت ہی بُری طرح جکڑی ہوئی، بہت ہی غیر مستحکم، اور غلامی کے ادارے کے ساتھ بہت ہی بُری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ اس لئے بقائے دوام کے خداوندی انعام کی یہ مستحق نہ تھی۔

یہ جگہ اُس مشہور کہانی کے بیان کے لئے موزوں نہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ فلپ شاہِ مقدونیہ نے کس طرح یونانیوں کو تاخت و تاراج کیا اور اسکے بیٹے اسکندر اعظم نے (سنہ ۳۳۶-۳۲۳ ق م) کس طرح مقدونوی شہنشاہی قائم کی۔ صرف یہی بتلا دینا کافی ہے کہ تیرہ سال کی مسلسل و محیر العقول جنگوں کے بعد اسکندر اعظم ایک ایسی حکومت کے قیام میں کامیاب ہو گیا جو ایڈریاٹک سے لیکر جزائر شرق الہند تک دنیا

کے مشرق و مغرب کو محیط تھی۔ جہاں تک یونانیوں کا تعلق ہے اس حکومت کے قیام کی دو وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ یونانی شہری ریاستوں کی آزادی سلب ہو چکی تھی اور وہ ایک وسیع فوجی شہنشاہی کی بلدیات بن گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یونانی تہذیب دُنیا کے اُن دور دراز خطوں تک پہنچ چکی تھی جہاں کسی یونانی کے ابھی تک قدم بھی نہ گئے تھے۔ یونانی اور بربری کا غیر منصفانہ فرق ختم ہو چکا تھا۔ مشرق نے یونانی تہذیب کو اپنا لیا تھا اور یونان نے ایک عالمگیر صورت اختیار کر لی تھی۔

اندریں حالات آزاد شہری ریاست کا یونانی سیاسی نظریہ متروک اور بے عمل ہو گیا۔ شہر میں سے بہتر زندگی مفقود ہو گئی۔ شہری کے لئے سیاسی زندگی میں کچھ جاذبیت باقی نہ رہی۔ ریاست اور فرد کی ہم آہنگی جاتی رہی۔ غیر ملکی اور دُور دراز کی ایک شہنشاہیت نے غلام دُنیا کی زندگیاں اور قسمتیں ناقابل تعرض طریقہ پر ختم کر ڈالیں۔ ریاست کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا۔ مگر شخصی دائرہ مختصر اور محدود ہو گیا آزادی اور خود مختاری جاتی رہی اور زندگی میں سیاسیات کیساتھ زیادہ دلچسپی باقی نہ رہی

یونانی سیاسی نظریے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کس طرح تبدیلیاں اختیار کیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ایسے سیاسی مفکر تھے جنہیں یا تو یہ تبدیلیاں دکھائی ہی نہ دیتی تھیں اور یا وہ انہیں دیکھنے سے انکار کرتے تھے۔ وہ یہی لکھ رہے تھے کہ شہری ریاست کو اسکندر کے جانشینوں کے عہدِ حکومت میں بھی وہی آزادی حاصل ہے۔ جو ایرانی جنگوں کے زمانہ میں موجود تھی۔ ہرقلیدس اور پونٹیکس کی قسم کے فلاطونیوں اور طیوفریسٹس کے سے ارسطاطالیسیوں کے درمیان ابھی تک ریاست اور فرد، اشتمالیت (مال کو قوم کی مشترکہ ملک بنانے کا اصول جس کی رو سے ہر فرد کو حسب قابلیت اور حسب ضرورت حصہ دیا جائے) اور شخصی ملکیت، اور اشرافیت و جمہوریت کی قسم کے مسائل پر بحث جاری تھی۔ ان فرسودہ فلسفیوں کی قدامت پسندی کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ یہ حقائق کے مقابلہ کے لئے تیار نہ تھے۔ یونان کے علم "سیاسیات" صرف فلسفۂ ریاست ہی پر مشتمل نہ تھا۔ یونانیوں کے نزدیک ریاست، سماج فرد اور دیوتا ایک دوسرے سے وابستہ اور متشابہ تھے۔ چنانچہ ان کا علم سیاست موجودہ علم سیاست سے زیادہ وسیع تھا اور فلسفۂ حیات، اخلاقیات، مابعدالطبیعیات اور دینیات کو محیط تھا۔ یونانیوں کا کوئی مندر ریاست سے جُدا نہ تھا اور ان کا کوئی بھی مذہب سیاسیات سے علیحدہ نہ تھا۔ اس لئے ان کی تمام تر سماجی، اخلاقی، اور مذہبی سرگرمیوں کے لئے جنہیں آج کل سیاسیات سے علیحدہ ادارے سمجھا جاتا ہے شہری ریاست ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ شہری ریاست کا نظریہ صدیوں سے رائج تھا اور اس کا اثر بڑی مشکلوں کے بعد زائل ہوا۔

شب گرفتہ اور ظلمت پسند فلاطونیوں اور ارسطالیسیوں کے علاوہ چند اشخاص ایسے بھی تھے جو حقائق کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور سیاسی فلسفہ کو اسکندری عہد سے بعد کے واقعات کے مطابق ڈھالنے کے خواہشمند تھے۔ ان میں سے ایپکیوریس (یونانی حکیم ایپکیوریس ۳۴۱ ق م کے پیرو۔ اس حکیم نے انسانی افعال کا منتہائے مقصود حصول لذت قرار دیا تھا) اور رواقی (رواقیت کا فلسفہ زینو نے ۳۰۰ ق م میں ایتھنز میں قائم کیا تھا۔ اس میں صرف نیکی زندگی کا مقصد قرار دی گئی تھی اور جذبات کو ضبط کرنے اور لذت و الم کے احساس سے آزاد ہو جانے کی تعلیم دی جاتی تھی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں مگر اس سے پہلے ہم یہ بتلا دینا چاہتے ہیں کہ اسکندر اعظم نے جو شہنشاہی قائم کی تھی چونکہ وہ اسے مستحکم و مضبوط نہ کر سکا تھا اس لئے اسکی موت کے جلد ہی بعد اس کے حصے بخرے ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک اس سلطنت کے تین بڑے بڑے حصوں - مقدونیہ، شام اور مصر نے اپنا ایک کمزور مگر علیحدہ وجود قائم رکھا۔ لیکن آخر کار یہ سب۔ مقدونیہ ۱۴۹ ق م میں، شام ۶۴ ق م میں، اور مصر ۳۰ ق م میں رومی حکومت کے ماتحت آگئے۔ یونان بھی مقدونیہ کے ساتھ ہی روما نے فتح کر لیا۔ درحقیقت روما ہی اسکندر کا صحیح جانشین اور اس کی حکمت عملی کا صحیح پیرو تھا۔ روما بھی مقدونیہ کی طرح یونانی اثر قبول کر چکا تھا اسکی تہذیب یونانی تھی۔ اسکی تہذیب یونانی تھی۔ اسکی زبان، اس کا ادب اور قانون، اسکے فنون لطیفہ اور سیاسی نظریات ——— سب کے سب اُسی تمدن سے متاثر ہوئے تھے۔ جس کا منبع ایتھنز اور مبلغ اسکندر تھا۔

(۲) اپیکیورسی اور رواقی

اپیکیورسیوں اور رواقیوں کو اس امر کا اعتراف تھا کہ کسی وقت آزاد شہری ریاست کا نظریہ کامیاب تھا۔ لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ وہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے اور سیاسی زندگی میں ہر اچھے شہری کے لئے کشش نہیں رہی۔ ان کا خیال ہے کہ ریاست اور فرد کی ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے اور دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک اچھی زندگی کا مطلب سیاسی مسائل سے گریز و اجتناب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خیالات کا اقرار اپیکیورس (۳۴۱-۲۷۰ ق م) اور رواقی مکتب خیال کے بانی زینو (۳۳۶-۲۶۴ ق م) دونوں کے لئے آسان تھا کیونکہ ایتھنز کو اگرچہ انہوں نے وطن بنا لیا تھا اور دونوں یہیں تعلیم دیتے تھے مگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی شہری ریاست کا باشندہ نہ تھا۔ اپیکیورس جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ اُنیس سال کی عمر میں ایتھنز چلا آیا۔ اور افلاطونی مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ اُس وقت افلاطون کی وفات کو پچیس سال ہو چکے تھے اور سکندر کے درخشاں مگر عارضی عہد حکومت کے المناک خاتمہ کو ایک سال گزر چکا تھا۔ زینو اس سے بھی زیادہ دور دراز علاقہ کا تھا۔ اسکے باپ کا نام فونیقیہ اور اس کا وطن سائپرس تھا۔ اسکے ذریعے یونانی فلسفہ میں ایک خاصہ مشرقی عنصر داخل ہو گیا۔ اپنی سیاسی تحقیق کے دوران میں اس نے شہری ریاست کو چھوا تک نہیں۔

اپیکیورس نے افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو ترک کر کے انفرادیت (اس نظریہ کی رو سے فرد کو ہر طرح کی آزادی ہونی چاہئے) کو قبول کیا۔ اور سوفسطائیوں کے مذہب لذتیت (یہ عقیدہ کہ انسان کا مقصد زندگی حصول لذت ہے) اور فلسفۂ افادیت (یہ اصول کہ جو کام اپنے لئے مفید ہو وہی اچھا ہے) کی طرف رجوع کیا۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ صرف فرد کی شخصیت ہی اہمیت رکھتی ہے۔ مسرت زندگی کا منتہا ہے اور ریاست اس مسرت کے حصول کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ ریاست ایک مصنوعی چیز ہے جس کی بنا معاہدۂ عمرانی یا رسم و رواج پر ہے۔ قانون کا مقصد محض افادی ہے۔ انصاف کی کوئی خارجی زندگی نہیں۔ مذہب صرف ایک من گھڑت افسانہ ہے جو انسانیت پر زبردستی ٹھونسا گیا ہے۔ اگر حکومتیں اتنی مضبوط اور مستحکم ہوں کہ وہ امن و امان قائم کر کے ایک فرد کو حصول مسرت کے لئے کوشاں ہونے کے قابل بنا سکیں تو ان کی اقسام ناقابل توجہ ہیں۔ اپیکیورسی معاملات عامہ میں بالکل دخل نہیں دیتا اور اس کا رجحان طبع صرف اپنی ذات کیلئے راحت و آرام حاصل کرنے کی طرف ہے۔ اُس کے مسلک کو بالکل برا نہیں کہا جا سکتا استکمال نفس، نفس پرستی کے مترادف نہیں۔ مگر اپیکیوریسیت کا عملی نتیجہ عموماً بدترین بداخلاقی اور سماجی فرائض سے مکمل انکار ہوا ہے۔ چنانچہ اپیکیوریسیت رومیوں کیلئے چنداں جاذب نظر ثابت نہیں ہوئی کیونکہ ان کی روایات کی وجہ سے سماجی فرائض کا احساس انکی گھٹی میں پڑا تھا۔ گو لکریشیس کی مشہور نظم اور ہوریس کے مختلف اشعار ہی لاطینی علم ادب میں اپیکیورسی فلسفہ کی تائید کرتے ہیں۔

رواقیت نے روما میں بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی — جتنی مقبولیت اس نے یونان میں حاصل کی تھی اُس سے بھی زیادہ — یہ ایک عمدہ، بلند اور سخت گیر مسلک تھا۔ اس نے سینیکا اور مارکس آرلیئس کے سے سلطنت روما کے بلند دماغوں کو بھی اپنا سرگرم حامی بنا لیا تھا۔ یہ مسلک عیسائیت سے بہت ملتا جلتا تھا اور اس نے سینٹ پال کی تبلیغ کیلئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ رواقیوں نے حصول مسرت کی بجائے فرض کی ادائگی کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔ وہ تسکین و امن کے متلاشی تھے مگر اپنی تمام تر خواہشات کی تکمیل کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی خواہشات کو کم کر کے ان کے نزدیک زندگی نفس کشی اور ریاضت کا نام ہے اور خارجی معاملات چنداں اہم نہیں۔ کسی شخص کا غلام یا مطلق العنان شہنشاہ ہونا ان کے لئے کچھ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ یہ مسلک نہ تو انفرادیت پسند تھا، نہ قومی اور نہ بین الاقوامی۔ بلکہ ایک صلح کل مشرب تھا۔ اسکے خیال کے مطابق تمام انسان ایک واحد اور ناقابل تقسیم اکائی ہیں۔ رواقی ایک آدمی کو شہروں کی مخلوق نہیں سمجھتا بلکہ ایک ہم نسل قوم کا رکن سمجھتا ہے۔ وہ مساوات کا قائل ہے اور ریاست کو صرف اسی وقت قدرتی سمجھتا ہے جب یہ عالمگیر ہو — جیسا کہ سلطنت روما کی آرزو تھی۔ اگر ریاست محدود اور قطعہ داری ہو تو وہ ریاست اسکے نزدیک محض بناوٹی اور رسمی ہے۔ وہ قانون قدرت کا قائل ہے جو متقبل اور دائمی ہے اور جس کے احکام تمام دنیوی قوانین کے

فوقیت رکھتے ہیں۔ وہ انصاف کو قانونِ قدرت کا ایک حکم سمجھتے ہوئے اُس کی تعظیم کرتا ہے اور اُسے خارجی، دائمی، غیر متغیر اور عالمگیر سمجھتا ہے، اُسکے نزدیک مذہب کا مطلب نفسِ ناطقہ کی اطاعت اور ہر اُس فرض کی کما حقہٗ آدائگی ہے جسے ضمیر لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قدرت اور قوانینِ قدرت کی تہ میں نفسِ ناطقہ ہی کارفرما ہے۔ دیوتاؤں کا وجود یا عدم وجود اسکے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر ان کا کوئی وجود نہیں ہے تو وہ ان کے بغیر بھی گزارہ کرسکتا ہے۔ اگر ان کا کوئی وجود ہے تو وہ جو سزا اُسے دیں وہ بھگتنے کیلئے تیار ہے۔

جن لاطینی رواقیوں نے سیاسی تحقیق و مطالعہ کیا ہے اُن میں سینیکا (۳ ق م ۔ ۶۵ء) کو عظیم ترین اور ناقابلِ انکار حیثیت حاصل ہے۔ پیشتر ازیں کہ ہم اس کا اور اسکے بعد آنے والے اہم رومی فقہا کا جو تقریباً سب کے سب رواقی ہی ذکر کریں اُن دو مفکروں کے سیاسی نظریات کا مطالعہ لازمی ہے جو اُس سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ یعنی پولیبیئس (۲۰۴-۱۲۲ ق م) اور سسرو (۱۰۶-۴۳ ق م) موخرالذکر کچھ حد تک رواقی فلسفہ کے زیر اثر تھا۔

(۳) روما کے سیاسی مفکرین

روما کا پہلا سیاسی مفکر پولیبیئس تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ بھی یونانی تھا۔ وہ سولہ سال تک (۱۶۷-۱۵۱ ق م) روما میں ایکیائی جمعیتہ ...... (ACHALAN LEAGNE) کے یرغمال کے طور پر رہا۔ اس قیام کے دوران میں وہ رومی طرزِ حکومت کا مداح اور رومی عروج کا راز معلوم کرنے کا مشتاق ہوگیا (یہ یاد رہے کہ روما ایک زمانہ میں شہری ریاست تھی جیسے ایتھنز یا سپارٹا پر کچھ فوقیت حاصل تھی) کیونکہ اسکے برعکس یونان کی شہری ریاستیں بہت بُری طرح ناکام ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے تاریخ روما کا غائرانہ اور مفصل مطالعہ کیا۔ اسکے بعد اس نے ایک گراں بہا اور یادگار کتاب لکھی جس میں اُس نے کارتھیجی جنگوں کے آغاز سے لیکر اپنے زمانہ تک کے تعجب انگیز طور پر بڑھتے ہوئے رومی وسعت و اقتدار کے مختلف مدارج بیان کئے اپنی اس تاریخ کے ایک باب (کتاب ششم) میں اُس نے اُن اصولوں کے فلسفیانہ تجزیہ کی کوشش کی ہے جنہوں نے رومی آئین کو عدیم النظیر طریقہ پر مستحکم اور مضبوط کردیا تھا۔ ارسطو نے ریاست کو بادشاہت اشرافیت اور جمہوریت میں تقسیم کیا ہے۔ اس تقسیم سے پولیبیئس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان ہر سہ اقسام کا اختلاف اندرونی اور اصولی نہیں بلکہ بیرونی اور ادارہ کا ہے اور یہ اختلاف متضاد قوتوں کی بنا پر ہے متضاد اصولوں کی بنا پر نہیں۔ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان تینوں میں سے کسی کی بھی اصلی حالت مستقل طور پر قائم نہیں رہتی وہ یہ دکھاتا ہے کہ یونان میں ریاست کی شکل و صورت میں ایک انقلابی تغیّر و تبدّل باقاعدگی اور تیز رفتاری کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔ اس تغیّر و تبدّل نے مندرجہ ذیل دائرہ کی صورت اختیار کرلی ہے:-

بادشاہت ۔ استبدادیت ۔ اشرافیت ۔ مذبذبیت ۔ جمہوریت اور حکومت انبوہ ۔ اس کے بعد پھر بادشاہت وجود میں آتی ہے اور یہی دائرہ پھر بنتا ہے ۔

اسکے نزدیک رومی قوت و استحکام کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آئین میں ریاست کی تینوں قسمیں متوازن طور پر باہم مخلوط ہوگئی ہیں ۔ قنصل بادشاہت کے اصول کے مظہر ہیں ۔ ایوانِ اعلیٰ اشرافیت اور ایوانِ زیریں جمہوریت کے اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ آئینی نظام میں اس نے سب سے ۲۷
پہلے مزاحمت و توازن کا نظریہ شامل کیا۔ اسکے نزدیک ریاست ایک نامیاتی نظام (یعنی ریاست کسی طبعی حرکت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس نے مختلف ذریعوں سے نشو و نما پائی ہے) نہیں ہے بلکہ ایک میکانکی اختراع (یعنی ریاست محض طبعی حرکت کا نتیجہ ہے اور بغیر کسی شعوری ارادے کے خود بخود نمودار ہوگئی ہے) اور متضاد قوتوں کی ترتیب و انضباط ہے

پولیبیئس روما کے جس استحکام و توازن کا ثنا خواں تھا اس کی زندگی ہی میں اُس کی جگہ جھگڑوں اور ہنگاموں نے لے لی تھی۔ گراکی (۱۳۳ ق م) کی شورشوں نے اشرافیت اور جمہوریت کے درمیان جس صد سالہ جنگ کا آغاز کیا تھا اس کا نتیجہ جمہوریت کا زوال اور شہنشاہیت کا قیام ہوا۔ سسرو کی تصانیف پولیبیئس سے ایک صدی بعد کی ہیں اس زمانہ میں جولیئس سیزر اپنی فاتح فوج کی مدد سے روما میں ایک شہنشاہی آمریت قائم کر رہا تھا۔ سسرو ایک سرگرم جمہوریت پسند تھا اور سیزر

سے متنفر و مخالف تھا۔ وہ ایوانِ اعلیٰ کی عزت اور مجسٹریٹوں کی قوت کے دوبارہ قیام کا خواہاں تھا۔ اپنی کتابوں "جمہوریت" اور "قوانین" میں اس نے ان وجوہات کا جائزہ لیا ہے جو پولیبیس کے خوش اقبال زمانہ کے بعد ہی سے جمہوریت کے المناک زوال کے لئے کوشاں ہو گئی تھیں۔ پولیبیس توازن کو استحکام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت سسرو نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسکے وقت کی شورشیں اور مصیبتیں اس وجہ سے ہیں کہ جمہوری عنصر کو بہت زیادہ قوت دیدی گئی ہے۔ ایک ایسی قوت جس کا ماریس اور سیزر کے سے مقرروں نے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ سسرو رومی جمہوریت اور اس کے آئین کی خوبیوں کی تعریف میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتا ہے۔ عملی مقاصد کیلئے وہ رومی قانون — جو انصاف و معدلت کے اصولوں کے لحاظ سے مضبوط ہے — کو رواقی قانونِ قدرت کے مترادف قرار دیتا ہے یہ امرِ واقعہ ہے کہ علمِ سیاست پر یہ اس کا اہم ترین احسان ہے، کیونکہ یہ نظریہ قانونِ قدرت کو آسمانوں پر سے زمین پر لے آتا ہے اور اسکے آزادی، مساوات اور اخوت کے اصولوں کو بنی نوعِ انسان میں پہلی دفعہ رائج کرتا ہے۔

ایک ادبی شخص کیلئے ایک ریاست کا بچانا ناممکن ہے چنانچہ سسرو نے سیزر اور اسکے بھتیجے آغسطس کی مخالفت کر کے اپنے ہی قتل و بربادی کا سامان پیدا کیا۔ رومی جمہوریت کی جگہ ایک شہنشاہیت نے لے لی تھی۔ اسکے اولین اور بدترین بادشاہوں میں ایک نیرو نامی بھی ہوا ہے۔ آٹھ برس تک (سنہ ۵۴-۶۲ ق م) اس کا اتالیق سینیکا اس کا وزیر رہا۔

نیرو کی وزارت کا عہدہ رواقی دبستان (SCHOOL THONG)[HT] کے سخت ترین پابند فلسفی کیلئے ایک سخت آزمائش تھی۔ تخیل اور حقیقت میں بُعد المشرقین کی وجہ سے یک جہتی ناممکن تھی۔ ایک طرف تو رواقی فلسفہ کی تعلیم تھی کہ دورِ جاہلیہ کا غیر ترقی یافتہ اور جاہل انسان بھی معصوم اور مسرور تھا، اس دور میں قانون قدرت ہر شخص کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا ہر شخص اسکی اطاعت کرتا تھا اور قانونِ قدرت نے اس دور میں کافی ضبط و نظم قائم کر رکھا تھا، نہ شخصی ملکیت تھی، نہ غلامی اور نہ کوئی حکومت، بلکہ

آزادی، مساوات اور اخوت کا دور دورہ تھا۔ دوسری طرف نیرو کی شہنشاہیت تھی جس میں غیر معمولی بدعملی، عظیم ترین جرائم، وسیع مصائب جبر و تشدد، عدمِ مساوات، کثیر ترین غلامی اور خوفناک عداوتیں خانہ جنگی کا باعث ہو رہی تھیں۔ اگرچہ یہ بادشاہت بُری تھی۔ مگر اُس نراجی ابتری سے اچھی تھی جو اس حکومت کے خاتمہ پر یقینی تھی۔ اس لئے سینیکا اور اسکے سے دوسرے اشخاص اس شہنشاہیت کے حامی و معاون تھے انہیں اس امر کا احساس تھا کہ انہیں دو برائیوں میں سے ایک برائی منتخب کرنا ہے — استبدادیت یا فوضویت (فوضویت کو نراج بھی کہا جاتا ہے — اس نظام میں کوئی حکومت نہیں ہوتی اور ہر شخص بذاتِ خود اپنے لئے قانون ہوتا ہے۔ انارکزم اسی کا نام ہے) — اور وہ اوّل الذکر کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ استبدادیت میں ضبط و نظم قائم رکھا جا سکتا تھا اور یہ پایانِ کار مزاج سے کم جابر تھی لیکن زمانہ کے حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور ان میں کسی قسم کی اصلاح کی امید نہ تھی۔ اس لئے اس رواقی (سینیکا) نے عزلت نشینی اختیار کر لی اور موت کا انتظار کرنے لگا کہ وہ آ کر اسے ان جھمیلوں سے خلاصی دلائے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رواقیوں کے نزدیک اُس معیاری طرزِ حکومت میں جو دورِ جاہلیت میں قائم تھی (اگر انسان اچھے بن جائیں تو یہ نظامِ حکومت دوبارہ بھی قائم ہو سکتا ہے) اور عملی طرزِ حکومت میں (جو انسانی کمزوریوں اور غلطیوں کا لازمی نتیجہ ہے) جو اختلاف ہے وہ عیسائی اسقفوں کیلئے اس وقت بہت مفید ثابت ہوا۔ جب انہیں احکامِ اناجیل کو نئے عیسائی شدہ متذبذب بزنطینی شہنشاہوں کے اعمال و افعال کے مطابق ڈھالنا پڑا۔

سینیکا کے ہمعصر فقیہوں اور اسکے بعد قسطنطین (سنہ ۳۰۶-۳۳۷ء) کے زمانہ تک کے متعدد فقیہوں نے — جو تقریباً سب کے سب رواقی تھے — فلسفہ کے اصولوں کو رومی قوانین پر عائد کیا۔ انہوں نے قانونِ قدرت کے رواقی نظریہ کو — یہ قانون قدرت دراصل تعلیم یافتہ ضمیر اور عقلِ سلیم کے احکام پر مشتمل ہے — روما کے شہری قانون کو بلند و مطہر اور بین الاقوامی قانونِ جنگ کو وسیع کرنے کیلئے استعمال کیا۔ قانونِ قدرت کے اصولوں نے غلامی کی سختیوں اور پابندیوں میں تخفیف اور نرمی کر دی جیسا کہ البیئن نے کہا ہے: "قانونِ قدرت کے مطابق ہر انسان ایک دوسرے کے برابر ہے"۔ قانونِ قدرت نے جنگی وحشتوں کو کم، خانگی زندگی کو بلند اور ملکیت کو عام کیا اور یہ اہم تبدیلی پیش کیا کہ شہنشاہی قوت کا منبع جمہور ہیں۔ (پروفیسر

سیّد مظفر برنی

اُردو شاعری کے نئے میلانات

زمانہ اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب زمانہ سے متاثر ہوتا ہے اور زمانہ ادب سے اثر قبول کرتا ہے۔ ادب زمانہ کا آئینہ ہے۔ تو زمانہ ادب کا پرتو ہوتا ہے۔ ادب زمانہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور زمانہ ادب کا دامن نہیں جھٹک سکتا۔ اسی لئے کسی زمانہ کے ادب کا جائزہ لینے کے لئے اس وقت کے مخصوص حالات اور رجحانات پر نظرِ غائر ڈالنا ضروری ہے۔

آج بیسویں صدی میں دو زبردست رجحانات کرۂ ارض پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک اشتراکیت دوسرا جمہوریت۔ اول الذکر انیسویں صدی کے صنعتی دور اور اسکے نتیجے سرمایہ دارانہ نظام کے ردعمل کا نتیجہ ہے اور مؤخر الذکر بنی نوع انسان کے خواب آزادی کی مبہم سی تعبیر ہے۔ ان دونوں رجحانات کا اثر عالمگیر ہے۔ اشتراکیت اور جمہوریت کی انتہا پسند صورت یہ ہے کہ یہ دونو "قدیم" کے خلاف "جدید" کی حامی ہیں۔ گویا رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی مکمل ضد ہیں۔ یہاں تک کہ ہر وہ اچھی یا بُری چیز جو کسی صورت سے بھی زمانۂ ماضی سے منسوب ہے زمانۂ حال کی ان تحریکوں کی زد میں آجاتی ہے۔ جنگِ عظیم نے ان تحریکوں کو ایک نیا جوش، ایک نئی سرگرمی اور ایک نئی زندگی بخشی لیکن ہر تحریک ایک ایسے دور سے گزرتی ہے جب ترقی پسند قوتیں۔ ۔ ۔ ۔

(REVOLUTIONARY FORCES.) رجعت پسند قوتوں (REACTIONARY) سے برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ دونو ایک دوسرے کی ٹکر کی ہوتی ہیں۔ اس لئے جلد ایک دوسرے پر غالب نہیں آسکتیں۔ اس وقت بنی نوع انسان ایک تذبذب کے عالم میں ہوتے ہیں۔ چونکہ کوئی فریق کامراں و کامیاب نہیں ہوتا اس لئے وہ آگ پانی کی سی مخالف فریقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے کبھی وہ مُڑ کر اسی راستے کو دیکھتے ہیں۔ جس سے یہاں تک آئے ہیں۔ اور کبھی ایک امید افزا شوق اور ایک شوق افزا امید کے ساتھ نئے راستے پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے زمانہ کی ہو بہو ایسی ہی کیفیت ہے۔ آمریت جو ملوکیت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جمہوریت سے برسرِ پیکار ہے۔ سرمایہ داری اشتراکیت سے دست و گریباں ہے ایک عام بے اطمینانی اور بے چینی کا عالم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بے تحاشہ دوڑتے ہوئے تھک گئی ہے۔ اور پھر کبھی حالتِ جمود سے اُکتا کر دوڑنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک ہیجان ایک اضطراب اسے بے تحاشہ دوڑنے پر اکساتا ہے۔ لیکن پھر ایک قسم کی افسردگی اور دل برداشتگی ہمارے قدم پکڑ لیتی ہے۔ تاریکی دور ہوتی جاتی ہے۔ دور بہت دور افق پر ایک نئی صبح کے انوار نمایاں ہیں۔ خدا جانے یہ صبح کاذب ہے یا صبح صادق۔ آنکھوں پر سے غفلت کے پردے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اعتقاد عقل کے سامنے سر جھکا رہا ہے۔ مسلمہ باتیں تنقید کی کسوٹی پر پرکھی جا رہی

29 ہیں۔ حتیٰ کہ خدا کا عدم یا وجود بھی معرضِ بحث میں پڑ گیا ہے۔ غرضیکہ یہ "دورِ طلسم شکنی" (DISILLVSION MENT.) ہے۔

جب ہم اُردو کی جدید شاعری پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شعر و ادب بھی رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہا ہے اگرچہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ تمام جدید شاعری کا ماحصل یہ ہے کہ یہ زندگی اور فطرت سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اُردو شاعری الفاظ سے کھیلتی تھی۔ پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ جذبات و احساسات سے بھی کھیلنے لگی۔ لیکن اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہماری شاعری زندگی اور فطرت دونو سے کھیلتی ہے۔ زندگی اور فطرت جو خود ایک کھیل ہیں۔ پہلے شاعری زندگی کا ایک کھیل سمجھی جاتی تھی۔ اب زندگی شاعری کا کھیل بن گئی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہماری زندگی انفرادی تھی۔

لیکن بیسویں صدی میں ہماری زندگی انفرادی کی بجائے اجتماعی ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی شاعری کا داخلی پہلو (SUBJECTIVE)

خارجی پہلو (OBJECTIVE.) پر غالب تھا اور جدید شاعری کا داخلی پہلو خارجی پہلو سے ہم آہنگ ہے۔ بلکہ جدید شاعری داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین سنگم ہے۔ ہماری انفرادی زندگی صرف جذبات و احساسات کا نام ہے لیکن اجتماعی زندگی سیاست، اقتصادیات اور معاشرت وغیرہ سے عبارت ہے۔ اسی لئے آج حریم سخن میں سیاست، معاشرت، مدنیت وغیرہ بھی باریاب ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تصوّرات بھی بدل گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری میں زندگی کے نئے تصوّرات، سیاست کے نئے عقدے، تمدّن کے نئے مسائل، قوم و ملک کی بہبودی کے نئے نظریے دعوتِ فکر دے رہے ہیں۔ میں اُردو شاعری کے اس دور کو "انقلابی دور" کہونگا۔ نہ صرف زبان و بیان بلکہ موضوعات و مضامین میں ایک زبردست انقلاب ہو گیا ہے ہماری شاعری پرانی مسموم فضا چھوڑ کر ایک نئی کھلی فضا میں سانس لے رہی ہے۔ غرض یہ ہے کہ شاعری کا نہج بدل کر رہ گیا ہے۔ اس ڈرامائی تغیّر و تبدّل کا اندازہ مندرجہ ذیل شعروں سے ہوگا۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

۳۰ نے تیر کماں میں ہے نے صیّاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ شعر نہ صرف اس وقت کی عام ذہنیت کا آئینہ دار ہے بلکہ روحِ عصر کا بھی ترجمان ہے۔ آج زمانہ اور ماحول بدلنے سے یہی مضمون اس سانچہ میں ڈھل گیا ہے ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں تاک میں نہ ہو صیّاد (اقبالؒ)

زندگی کی مردانہ جدوجہد جو ہمارے زمانہ کا مسلک ہے۔ اس شعر سے نمایاں ہے۔ دیکھئے ہماری شاعری اجتماعی زندگی سے کتنی قریب آ گئی ہے اور زمانہ کے اثرات کہاں تک قبول کر رہی ہے ؎

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے آشیاں اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے (اصغر گونڈوی)[1]

وہی قفس وہی آشیاں وہی چمن لیکن الفاظ کے اس روایتی ڈھانچے کے اندر آزادی کی وہ روح دوڑا دی ہے کہ یہ شعر ہماری قومی ذہنیت کی صحیح اور سچی تصویر بن گیا ہے۔

جدید شاعری کا اوّلین رجحان انقلاب کی جانب ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی مطلع پر کبھی دھواں دھار ابر چھایا کبھی طوفان خیز آندھیاں چڑھیں۔ کبھی جھکڑ آئے۔ کبھی بگولے اُٹھے۔ غرض ایک عام بے چینی اور حرکت و حرارت پیدا ہو گئی۔ روحِ جمہور موجودہ سماج اور حکومت سے بیزار ہو گئی۔ انقلاب کی ایک لہر تمام ملک میں دوڑ گئی۔ اسی تغیّر و تبدّل کا اثر ہمارے شاعروں پر بھی پڑا ؎

جو ایک ایسا آئینہ ہیں شاہراہِ وقت پر
چہرۂ ہستی کے خال و خد ہیں جس میں جلوہ گر
اُڑ رہے ہیں جن کے پرچم آب و گل کے قصر پر
جن کی بیتاب اُنگلیاں رہتی ہیں نبضِ عصر پر (جوش ملیح آبادی)

ہمارے شاعر جو ابتک کوچۂ یار کو اپنی دُنیا سمجھتے تھے جو میخانہ کو جنّت جانتے تھے جو "جامِ آتشیں" کو حاصلِ کونین مانتے تھے۔ جو دربان کے قدموں میں سر بسجود رہنا عبادت خیال کرتے تھے۔ جو مقتل کو تفریح گاہ گردانتے تھے۔ جو محبوب کے تصوّر سے سر اُٹھانا گناہ خیال کرتے تھے جو حریمِ ناز میں باریابی کو معراج سمجھتے تھے۔ جن کی قیمتی زندگی کا مصرف صرف یہ تھا۔ ع

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

جن کے زنانہ پن کی حد یہ تھی کہ نازک اندام محبوب کے ہاتھ میں خنجرِ آبدار و تیغِ جوہر دار دیکر اپنی سخت جانی اور ان ہتھیاروں کی "نسوانیت" کا مظاہرہ کریں جو تیغ و کفن باندھنا صرف اس لئے ضروری خیال کرتے تھے کہ۔ عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا۔ جن کی آواز زیرِ لب آہوں اور زبان دلسوز نالوں کیلئے وقف تھی۔ وہ بھی آج زمانہ اور ماحول کے اثرات سے بیگانہ نہیں۔ وہ بھی موجودہ تمدّن سے بیزار ہیں۔ وہ بھی تہذیبِ حاضر سے متنفر ہیں۔ وہ بھی ظالم و جابر حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ اس دُنیا کو نیست و نابود کر کے ایک نئی دُنیا۔ اپنے خوابوں کی دُنیا بنانا چاہتے

[1] اصغر صاحب جدید شعراء میں سے تو نہیں ہیں۔ وہ صوفی شاعر ہیں اور قدیم و کہنہ نوسی متلوّنانہ خیالات ان کی شاعری کی جان ہیں۔ ادارہ

ہیں۔ وہ موجودہ فرسودہ نظام کو مسمار کر کے اس کی بنیادوں پر ایک نیا نظام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب وہ فردوس گوش نغمات کے متحمل نہیں۔ انہیں تلواروں کی جھنکاروں میں موسیقی کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اب طبلِ جنگ کی صدا پر ان کی روحیں رقص کرنے لگتی ہیں اب وہ مقتل میں خونِ بسمل کے رقص کی دعوتِ تماشا نہیں دیتے۔ بلکہ انقلاب کے وقت خون کی ندیاں بہانا چاہتے ہیں۔ اب ان کے لب نَے نوازی میں مست نہیں بلکہ صور پھونکنے کے لئے وقف ہیں۔ اب ان کی آنکھوں میں شراب کا خمار نہیں بلکہ غیض و غضب کے شعلے دہک رہے ہیں۔ اب ان کی آواز روحِ انسانی میں انبساط کی لہر نہیں دوڑاتی بلکہ اضطراب کے مد و جزر پیدا کرتی ہے۔ سماج سے بغاوت، حکومت سے بغاوت، مسلمہ امور سے بغاوت، موجودہ حالات سے بغاوت غرض بغاوت ان کی شاعری کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہماری موجودہ شاعری کی تہ میں، انقلاب کی روح کارفرما ہے۔ ایک ایک شعر کسی نامعلوم جذبہ بغاوت، کسی مبہم تمنائے تغیر، کسی اندرونی درد و کرب سے کپکپا رہا ہے۔ آج ہر شاعر جوش سے ہم آہنگ ہو کر یہ نعرہ لگا رہا ہے[1] ؎

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب (جوش)

علامہ اقبال نے بھی جو قطعاً جدید شعرا (URTRA MODERN POETS) کے تحت نہیں آتے اس انقلاب کی کارفرما قوت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب
انقلاب اے انقلاب

جوش کی "بغاوت"، مجاز کی "آوارہ"، علی سردار جعفری کی "حال و مستقبل"، شہاب ملیح آبادی کی "انقلاب کی پکار"، احسان کی "باغی کا خواب" اور اسی قسم کی دوسری نظمیں ایک ناگزیر انقلاب کی خبر دے رہی ہیں۔ مجاز کی نظم "آوارہ" کے چند بند سنئے۔ معلوم ہوتا ہے موجودہ سماج کی بدعنوانیاں۔ سرمایہ داری کی سفاکیاں، امرا کی عیاشیاں۔ غربا کی مجبوریاں شاعر کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا کر رہی ہیں۔ وہ سماج کی زنجیروں کو توڑنا چاہتا ہے وہ نام نہاد اخلاقی قوانین سے منہ موڑتا ہے کہ ان ہی کے پردے میں اخلاق سوز بدکاریاں روا رکھی جاتی ہیں۔ وہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے کہ یہی تمام برائیوں کی جڑ ہے ؎

رات ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ میخانہ میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے بیوہ کی جوانی جیسے مفلس کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

سماج سے بیزاری، حکومت سے نفرت، موجودہ حالات سے بے اطمینانی کبھی بغاوت کا رجائی جذبہ اور کبھی روگردانی کا متشائم جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جاں نثار اختر مجاز کی طرح مقابلہ کی تاب نہیں لاتا۔ وہ اس کشمکش سے تھک کر اس کو بھول جانا چاہتا ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔ ع دوست اب سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اس وقت فطرت کے روح پرور نظارے بھی حزن و افسردگی کے مرقع نظر آتے ہیں ؎

[1] جوش سے نہیں وقت سے ہم آہنگ ہو کر۔

یہ ستارے یہ کفن کے سرد پھول
آسماں جیسے جلی لاشوں کی دھول
چاند گویا ایک بے امت رسول

دوست سب کچھ بھول جانے دے۔ مجھے

انقلاب کا اثر یہاں تک نمایاں ہے کہ ایک رومانی شاعر بھی ساقی سے خطاب کرکے کہتا ہے ؎

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج میخانے کا دروازہ
ہر ایک مے کش بیک یک بے پیے برہم اٹھا ساقی
یہ کیسا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز سے اک نغمۂ ماتم اٹھا ساقی
بغاوت کی ہوائیں چل اٹھیں شاید گلستاں سے
یہ پیمانے الٹ ساقی یہ جام جم اٹھا ساقی
جو ممکن ہو تو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی
(جاں نثار اختر)

زمانے کے تغیرات دیکھیے کہ ساقی جو کبھی نزاکت و لطافت کا پیکر "ایمان و آگہی" کا دشمن خیال کیا جاتا تھا۔ جس کا کام مے پلانا اور مست کرنا تھا۔ آج اس سے "لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم" اٹھانے کی درخواست کی جاتی ہے۔ آج جبکہ ہر کس و ناکس کے دل میں انقلاب کے جذبے ابھر رہے ہیں۔ بغاوت کے ولولے نشو و نما پا رہے ہیں تو شاعر جو عام سطح سے بلند جو عوام الناس سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا ہے کہیں یہ طوفان "باغی کے خواب" دکھاتا ہے۔ کہیں یہ حرمان زدگی و بیچارگی کا احساس پیدا کرتا ہے جیسا کہ مجاز اور اختر کے محولہ بالا اشعار سے نمایاں ہے۔

لیکن موجودہ انقلابی شاعر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمارے شعراء صرف تخریب چاہتے ہیں۔ تعمیر کا کوئی تصور پیش نہیں کرتے نہ غالباً مدنظر ہے۔ اختر اورینوی کا جوش ملیح آبادی پر اعتراض اس نوع کی تمام شاعری پر اعتراض ہے۔ "جوش اتنا سمجھتا ہے کہ اس دور کے بعد بھی حیات و تہذیب کے مظاہر قائم ہوں گے۔ لیکن ان کی شکل و صورت سے اسے کوئی بحث نہیں وہ صرف پہاڑوں کو ڈھانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد جوئے شیر لانا نہیں۔" یہ صحیح ہے کہ ہماری انقلابی شاعری میں آئندہ نظام کا کوئی معقول نظریہ پیش نہیں کیا جاتا۔ لیکن انقلاب کو دماغ کی نسبت دل زیادہ ابھارتا ہے۔ ظاہر ہے جہاں جذبات (SENTIMENTS) کا دور دورہ ہوگا وہاں سائنس (SCIENCE) کا گزر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے ادب میں کوئی گہرائی کوئی دعوت تفکر کوئی نظریاتی (IDEALOGICAL.) عنصر نہیں ملتا۔

جدید شاعری بنی نوع انسان سے محبت و ہمدردی کی آئینہ دار ہے ہمارا شاعر تنگ و تار کوچوں، عفونت بیز گلیوں۔ ٹوٹے پھوٹے مکانوں جھلسی ہوئی جھونپڑیوں حتیٰ کہ جسم فروشی کی مکروہ دکانوں کا گہری ہمدردی اور سچے احساس سے مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ پیٹ کے بل رینگنے والے محتاجوں، سڑک پر گھسٹنے والے بھک منگوں، روٹی کے ایک سوکھے ٹکڑے پر لڑنے والے انسانی درندوں کا نقشہ کھینچ کر ہمارے دلوں کو احساس کی آگ سے پگھلاتا ہے۔ وہ دن بھر خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں، پتھر کوٹنے والی "شہزادیوں" قحط زدہ کسانوں، بھوکے ننگے کارخانہ داروں کی عکاسی ایسے خلوص ایسی ہمدردی اور ایسی صداقت سے بیان کرتا ہے۔ کہ ہم اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ وہ اس فاقہ مستی اور تہیدستی کے ذمہ دار بڑے پیٹ چھوٹے سر اور دل کی جگہ سنگ پارہ رکھنے والے سرمایہ داروں کو ٹھہراتا ہے۔ وہ ان کی ہڈیاں چچوڑنے کے لئے بپھرا ہوا ہے۔ وہ ان دولت کے پجاریوں کو ڈسنے کیلئے سم آمیز پھنکارے مار رہا ہے۔ وہ صنعت و تجارت کے اجارہ داروں کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اب ہماری شاعری امارت کے در پر ناصیہ فرسا نہیں اس میں انسانی مصائب و ابتلا کا گزر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے دروازے مظلوم فاقہ کش بے بس غریب انسانوں کے لئے بند نہیں ؎

اے ثباری کے سر کے انگور اہل عز و جاہ — آدمی پر رحم کرنے کو سمجھتے ہو گناہ
اغنیا بے حس خدا غافل حکومت بے عمل — بن پڑے تجھ سے تو ان تینوں کے پھندوں سے نکل

بے حس مظلوموں اور بر سر اقتدار ظالموں کے ہجوم میں اپنے آپ کو بے بس

پاتا ہے۔ وہ ایک ایسی دُھن میں جس میں مجبوری غضبناکی سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ کہہ اُٹھتا ہے ؎

بڑھ نہیں جاتے الٰہی سینۂ دولت میں داغ — بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ
اپنی تابِ زر سے لے سرمایہ داروں ہوشیار — اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدارو ہوشیار
نیلم و یاقوت سے شعلے بھڑک اُٹھنے کو ہیں — سُرخ دیناروں میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں
فرشِ گُل والوں زمیں پر لوگ محوِ خواب ہیں — خرمنوں کے پاسبانوں بجلیاں بیتاب ہیں

یہ اس کی باطنی آواز ہے۔ یہ اس کا مستحکم یقین ہے۔ اس کی مبصرانہ پیش گوئی ہے۔

جوش کی "ضعیفہ"۔ "دو بیود کا ہندوستان"۔ "حسن اور مزدوری"۔ ساغر کی "بھکارن"۔ احسان کی "بھیک"۔ "مزدور کی موت" وغیرہ نظمیں ہماری شاعری نے اس جدید میلان کی ترجمان ہیں۔ جوش کی نظم "ایک تقابل" کے چند شعر سنیئے ؎

مال کا وہ درجہ جس میں ریل کے مزدور تھے — آگے ٹھہرا دوسرے درجے کے بالکل سامنے
اس طرف سامانِ دل تنگی تھا جو ملبے کا ڈھوا — اس طرف چہروں پہ تھی ٹھنڈی ہوا کی سُرخیاں
اس طرف موجِ نفس اک نالۂ بیتاب تھی — اس طرف تارِ سکوں پر ذہن کی مضراب تھی
آہ ان دونوں میں ایک شے مشترک جو تھی سو تھی — ان کے جوتوں پر چمک تھی ان کے چہروں پر نہ تھی
آہ اللہ اس قدر عدل و تناسب کی کمی — اس طرف بھی آدمی تھے اس طرف بھی آدمی
لیکن اس منزل سے بے ماتم گزر سکتا ہے کون — جز خدا اس ظلم کو برداشت کر سکتا ہے کون

احسان مستقل طور پر شاعرِ مزدور کہلاتا ہے۔ اس کی شاعری کا منتہا ہی مزدوروں کی شرمناک عزت و بیکسی کی عکاسی کرتا ہے۔ جوش کی شاعری میں یہ جذبہ اس طرح محدود نہیں بلکہ عالمگیر وسعت رکھتا ہے۔ "مظلوم بچہ" بھی جو ننھا منا سا میدان میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا اسکے حریمِ سخن میں باریاب ہے۔ وہ اسکی نفسیاتی عکس ریزی کیلئے وہ پہلو منتخب کرتا ہے جو ہماری روح میں تیر بن کر اُتر جاتا ہے ؎

دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رُخِ طفلی پہ اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے

وہ "چادر کی بھیک" کے بھی خدا سے ملتمس ہے ؎

فقط ہلکی سی اس بڑھیا کو چادر
خدایا! داورا! پروردگارا!

اس کی تمام شاعری میں یہ جذبہ مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے ایک شب کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس میں بھی خونِ افلاس سے رنگ بھرتا ہے ؎

سو رہے ہیں منہ ق یا جو ٹیکے ہوئے سر دکھے — مفلسی کی تلخ فریادوں کو دامن میں لئے
بن چکی ہے سینۂ رحمت میں اک ہلکی سی آہ — منعموں کی جبیں میشانی غریبوں کی نگاہ

موضوعاتِ نظم میں یہاں تک تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ کہ ہمارا شاعر صرف حسن و دلکشی کا جویا نہیں۔ اسکی نظریں حیات کے صرف خوبصورت پہلوؤں پر نہیں پڑیں۔ بلکہ وہ بدصورتی میں بھی حُسن دیکھ لیتا ہے۔ وہ صحرا میں بھی نخلستاں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ صرف شیریں و زلیخا کے حُسن کے گیت نہیں گاتا۔ بلکہ مہترانی کو بھی دیکھ کر لاابالیانہ انداز سے الاپنے لگتا ہے ؎

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور
کچھ بھی ہو جائے جوانی گنگنائے گی ضرور (جوش)

ہر وہ چیز جو اسکے جذبات کو گُدگُداتی ہے اور اس کے احساس کو اکساتی ہے۔ عنوانِ نظم بن سکتی ہے وہ "ٹوٹی ہوئی بوتل" سی حقیر شے سے بھی جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہے متاثر ہو جاتا ہے اور کہتا ہے

ع السّلام اے جنّتِ بے موج کوثر السّلام

مجاز کی "ریل گاڑی"۔ اختر بریلوی کی "ٹھیلا" وغیرہ نظمیں اس نئے ۴۳۴
میلان کی حدامکان کی شاہد ہیں۔

دورِ حاضر کی شاعری میں بے باکی (جو بعض دفعہ عریانی کی حد تک پہنچ جاتی ہے) نہایت درجہ نمایاں ہے۔ اب جذبات کا گلا نہیں گھونٹا جاتا۔ احساسات پر پردے نہیں ڈالے جاتے۔ عشق و محبت کا اظہار استعاروں میں نہیں کیا جاتا۔ مذکر ضمیر کے استعمال اور طرزِ ادا کے پیچ و خم سے صداقتِ احساس اور خلوصِ بیان کا خون نہیں کیا جاتا۔ عہدِ حاضر کا شاعر نہ صرف بالواسطہ تخاطب پر عمل پیرا ہے بلکہ زبان و بیان میں اس حد تک تبدیلی کر دی ہے۔ کہ ضمائر کے تانیثی استعمال کے علاوہ محبوبہ کا فرضی یا اصلی نام بھی پیش کرنے سے نہیں جھجکتا ایامِ جاہلیت میں جبکہ عربوں کی شاعری معراجِ کمال پر تھی عرب شعراء اپنی محبوبہ کو نام بنام مخاطب کرتے تھے۔ اور یہی عین فطرت تھا۔ اختر شیرانی کی "سلمیٰ" اور "ریحانہ"۔ جاں نثار اختر کی "انجم" ان کی شاعری کی منتہا ہیں نتیجہ یہ ہے کہ جذبات فطری احساسات مشد[illegible]

طرزِ بیان صدر درجہ پُرخلوص ہوگیا۔ علاوہ ازیں ان کی شاعری میں کردار کی استواری بھی پیدا ہوگئی ہے۔ چونکہ ایک ہی محبوب ہستی ہر نظم میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لئے جذبات میں باطنی ہم آہنگی۔ اخلاقی بلندی اور روحانی یگانگت کا پرتو نظر آتا ہے۔ حقیقت پرستی کے اس دور میں محبوب کی ہستی فرضی یا تخیلی نہیں رہ سکتی کسی خیالی پیکر میں مستعار جذبات اور مصنوعی الفاظ کی مسیحا نفسی سے جان نہیں ڈالی جاسکتی۔ اب تو محبوبہ ایک جیتی جاگتی انسانی ہستی ہونی چاہیئے۔ جس کے کردار کا خاکہ قارئین کے ذہن پر مرتسم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "سلمیٰ" یا "انجم" "گوشت پوست کی ہستیاں" ہونے کے باعث ہم سے نہایت قریب نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں نزاکتِ احساس اور حُسنِ ادا سے جان پڑ جاتی ہے۔

قدیم تہذیب کا تقاضہ تھا۔ کہ جنسیت (SEX) کی دیواریں آہنی ہوں۔ لیکن عہدِ حاضر میں صنفِ نازک صنفِ کرخت کے دوش بدوش ہے۔ قدامت پرستی جنسی جذبے کو ایک گناہ گردانتی ہے۔ لیکن آج بیسویں صدی میں یہ جذبہ دوسرے جذبوں کی طرح طبعی خیال کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ رجحان ہماری صحت مندانہ نفس پرستی کا بھی شاہد ہے اور "مذاق عجمی" کے ردّ عمل کا نتیجہ ہے۔ ۴۳
فرائیڈ کے نفسیاتی تجزیہ [illegible] (OEDIPUS COMPLEX) کے نظریے نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے۔ کہ ہم اس جذبے کو بخوبی عکس پذیر کرسکیں۔ ہماری تمام رومانی شاعری جذبۂ جنسی کے محور پر گھوم رہی ہے۔

جدید شاعروں کا پہلا مسلک وسعتِ زبان ہے۔ فارسی اور عربی کے مستعمل الفاظ کے علاوہ بھاشا کے میٹھے میٹھے شبد بھی گھلا ملا کر استعمال کئے جارہے ہیں۔ جوش کی نظم "یہ کون اُٹھا ہے شرماتا" سے چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

رُخ پہ شرمگیں آنکھ میں جادو — بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون میٹھے ابرو — نیچی نظریں بکھرے گیسو
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی — جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا مسکی ساری — ہلکی مہندی دھندلی بندی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں اُردو زبان کی اصلی صورت ان بندوں میں جھلکتی ہے اور اس وقت جو رجحان نظر آرہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ پچاس برس گزرنے سے پہلے یہی زبان مقبولِ عام ہوگی۔" اس باب میں ساغر نظامی کی ان تھک کوششیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی مشہور نظم "ناگ" کا ایک بند سنیئے۔

سینہ تانے پھن پھیلائے جھوم رہے ہو ایسے
جیسے کوئی دکھنی کنواری مدھرا پی کر جھومے
اندھیاری درپن ہے تمہارا نور تمہارا ہالا
رات کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے بالا
ٹھہرو اک تصویر بنالوں اے بانبی کے واسی
آؤ تمہیں تن من میں بسالوں اے بانبی کے واسی

وہ الفاظ و محاورات جو ابتک حریمِ سخن میں باریاب نہ تھے۔ اس عام پسندی (عوام پسندی نہیں) کے دور میں مختلف طریقوں سے روشناس کئے جارہے ہیں۔ متروک لیکن جامع الفاظ نئے دور کی ٹکسال میں پسندیدگی کا ٹھپہ لگا کر رائج کئے جارہے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جمہوریت کی روح الفاظ و محاورات میں سرایت کرگئی ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جمہور انہیں سمجھ سکے۔ اور ان سے حظ و نشاط حاصل کرسکے۔ آج کل ہر شاعر[1] کا مطمعِ نظر یہی ہے کہ زبان ایسی ہو جسے ہر خاص و عام سمجھ سکے۔ اور طرزِ ادا نہایت صاف روشن سیدھا سادھا اور موثر ہو۔ استعاروں کی پیچیدگی، تشبیہوں کی کھینچ تان اور تلمیحات کے ہیر پھیر اب محاسنِ شعری میں داخل نہیں۔ اب تو استعارات اور تشبیہات عام مشاہدے سے اخذ کی جاتی ہیں۔ مثلاً

جھریوں سے گھردرا پن چہرۂ بے آب میں
جیسے کھل جاتی ہیں درزیں سوکھ کر تالاب میں (احسان)
سبزے کے دامن پہ جیسے یوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کاجل آنکھ سے بہ کر رخساروں کو گھیرے (ساغر)
حوض میں مستانہ بطخ کے تیرنے سے جس طرح — کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار

ل۔ ہر شاعر کا نہیں تو کم از کم جوش کی الفاظ نگاری کا معیار اتنا سخت ہے کہ اُسے عوام تو عوام وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے جو شاعری سے بُنیادی ذوق نہیں رکھتے۔ (ادارہ)

حافظہ پر یونہی اک بیدار کن گہری خراشس
ڈال دیتی ہے شبِ غم میں پپیہے کی پکار (جوش)

یہیں سادہی مادی تشبیہوں سے مبہم نفسی کیفیتوں کی عکاسی کی جاتی ہے ؎

آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
ویرانہ حیات کے ایک ایک گوشے میں جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی
(جگر)

کیسی دلکش تشبیہوں کے تصورات سے محبوب کی رفتار کی تصویر کھینچی گئی ہے

کوئی خوابوں سے بنائی ہوئی شے ہے گویا جامِ سرشار سے چھلکی ہوئی مے ہے گویا
بھری برسات کی راتوں میں جیسے گاتے ہیں تیری رفتار اسی گیت کی لے ہے گویا
(اختر انصاری)

جدید شاعر بحور و اوزان کے استعمال میں بھی بڑی حد تک آزاد و خود پسند واقع ہوا ہے۔ حفیظ جالندھری کی نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" کا ایک اقتباس پیش ہے۔ یہ نظم کسی مقررہ صنفِ سخن کے تحت میں نہیں آتی ؎

عبادتوں کا ذکر ہے نجات کی بھی فکر ہے
خیال ہے عذاب کا جنون ہے ثواب کا
مگر سنو تو شیخ جی عجیب شے ہیں آپ بھی
بھلا شباب و عاشقی الگ ہوئے بھی ہیں کبھی
حسین جلوہ ریز ہوں ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگارہائے فتنہ گر کوئی ادھر کوئی ادھر
ابھارتے ہوں عیش پر تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر تمہارا نقطۂ نظر
درست ہو تو ہو مگر
ابھی تو میں جوان ہوں

بحور و اوزان کے انتخاب میں زیادہ تر ذوقِ ترنم کو رہبر بنایا جاتا ہے۔ قوافی و ردیف کی بے جا پابندیوں کے خلاف یہاں تک علمِ بغاوت بلند کیا گیا ہے۔ کہ ردیف قافیہ اور بحر سے آزاد نظموں کا رواج ہو چلا ہے۔ "میراجی" خالد، ن۔ م راشد، فیض احمد فیض اسی رنگ کو رائج کرنے میں پیش پیش ہیں۔ یہ صرف جذبات کی ادائگی اور نفسی لہروں کی (PSYCHIC WAVES) عکاسی پر زور دیتے ہیں۔ ن م راشد کی ایک نظم "خودکشی" کا ایک بند سنیے ؎

کر چکا ہوں آج عزم آخریں
میرا عزم آخریں یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و درخشاں لہو

گیت اور دوہے بھی مقبول ہو رہے ہیں۔ گیت ہندوستان کی روحِ شعر کی پہلی انگڑائی ہے۔ یہ عوام الناس کی زندگی کا جزو لاینفک ہے ہر ملک میں (FOLK SONGS) مقبول رہے ہیں۔ اب کہیں جاکر ہمارے شاعروں نے بھی اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے۔ ساغر اور حفیظ کے گیت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حفیظ الفاظ کی موسیقی کا زیادہ خیال کرتا ہے اور ساغر الفاظ کی موسیقی کے ساتھ روح کی موسیقی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ حفیظ کے گیتوں میں کبیر کی سی پند و نصیحت پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ساغر پریم کے گیت الاپتا ہے۔ ان میں پند و نصیحت کے چٹیل پن کے برخلاف کنواری کنیا کی سی لچک اور جھجک نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کا انسان اپنے آباؤ اجداد کی نسبت زیادہ مصروف اور کثیر المشاغل ہے۔ اسکی زندگی ایک بے تحاشہ دوڑ کے مشابہ ہے جس میں "آگے بڑھیں گے دم لیکر" کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی رفتار بڑھتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بہت سی ایسی تحریکیں آئے دن وجود میں آتی رہتی ہیں جن کا منشا وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار اور زندگی کی غیر فطری سرعت کا انسداد کرنا ہے اور بنی نوع انسان کے لئے آرام اور فرصت کا وقت نکالنا ہے۔ فرصت کے لمحات کے اختصار کا ادب پر یہ اثر پڑا کہ آج مختصر افسانے، ایک ایکٹ کی تمثیلیں اور چھوٹی چھوٹی نظمیں رائج ہو رہی ہیں۔ اُردو اس سے مستثنیٰ نہیں۔ "سحر البیان" کی سی شیطان کی آنت

آنت مثنویاں ناپید ہیں - یہ بھی کسی قدر پُرانے زمانے کا قصہ ہے لیکن جدید اور قدیم جدید ادب میں بھی زمین اور آسمان کا فرق نظر آرہا ہے - آج "شمع" اور "شاعر" کی سی طویل نظمیں بھی مفقود ہیں - نظموں کے اختصار کی حد یہ ہے - کہ اب قطعہ اور رباعیات قبولیت عامہ حاصل کررہی ہیں - نہ صرف اصنافِ سخن کی طوالت اختصار میں تبدیل ہورہی ہے بلکہ نفس مضمون بھی اس سے متاثر ہورہا ہے ہمارے زمانہ کا انسان ایک وقت میں ایک ہی کام کرسکتا ہے - ایک ہی بات سوچ سکتا ہے - اور ایک ہی بات قبول کرسکتا ہے - اس لئے تمام اصنافِ سخن میں وحدتِ تاثر اساسی حیثیت رکھتا ہے - حتّٰی کہ غزل بھی جو گوناگوں احساسات اور بوقلموں جذبات بلکہ بعض دفعہ متضاد جذبات کا آئینہ ہوتی تھی جس کا ایک شعر وصل کی لذت دوسرا شعر ہجر کی اذیت تیسرا محبوب کے تغافل چوتھے اس کے التفاتِ بے پایاں کا ترجمان ہوتا تھا - آج "وحدتِ تاثر" پر مبنی ہے - مسلسل غزلوں کو چھوڑکر عام غزلوں کی تہ میں بھی ایک ہی تاثر ایک ہی جذبہ ایک ہی نفسی رو کارفرما نظر آتی ہے مثلاً جگر کی ایک غزل ہے ؎

بیتاب ہے بےخواب ہے معلوم نہیں کیوں؟ دل ماہی بے آب ہے معلوم نہیں کیوں؟
بےکیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں؟ پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
بےنام سی ایک یاد ہے کیا جانئے کس کی؟ بےوجہ تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟ ۳۶۰
دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن کشتی ہی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں؟
دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا ابتک اثرِ خواب ہے معلوم نہیں کیوں؟
معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟

قطعات مبہم جذبات اور دُھندلے احساسات کے اچھوتے مرقع ہیں اکثر قطعات ایک نظم کی سی جامعیت رکھتے ہیں - علاوہ ازیں ہمارے احساسات اس درجہ نازک اور ہمارے جذبات اس حد تک ذکی الحس ہو گئے ہیں کہ تفصیل کی بجائے اختصار اور صریح بیان کی بجائے کنایوں سے کام لیا جاسکتا ہے اسی لئے عموماً قطعات میں اشاروں اور کنایوں سے وہ بات کہہ دی جاتی ہے کہ شاعر کے حُسنِ بیان اور حُسنِ احساس سے کیف و سرور کی ایک موج دل و دماغ کو چھوکر نکل جاتی ہے ؎

جو کوئی پوچھتا ہے سُرخ کیوں ہیں آج آنکھیں تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں آج سو نہ سکا
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا

(اختر انصاری)

انسانی نفسیات اور جذبات صدیوں سے شعر کا جامہ پہنتے رہے ہیں لیکن آج بھی انہی احساسات اور جذبات پر ایسے مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں کہ ایک نیا لطف، ایک نامحسوس حظ حاصل ہوتا ہے -

دورِ حاضر کا ہر شاعر اپنا کلام ترنّم سے پڑھتا ہے - ریڈیو کے مشاعروں نے قارئین کے ساتھ سامعین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر کردیا ہے - اس کا کلام پر یہ اثر پڑا - کہ ہر شاعر ایسے الفاظ اور تراکیب انتخاب کرتا ہے جو مل جُل کر ایک نوع کی روانی اور ایک قسم کی موسیقی پیدا کردیتی ہیں - وہ مترنم الفاظ موسوقیت نواز تراکیب، متوازن ٹکڑے استعمال کرکے حُسنِ تناسب میں ایک ایسا آہنگ پیدا کردیتا ہے کہ غزل یا نظم سے بہتے ہوئے دریا کی سی روانی اور ستاروں کی سی راگنی سے مملو نظر آتی ہے - گویا شاعری "غنائیت" سے قریب تر ہوگئی ہے - بھاشا کے الفاظ کی کثرتِ استعمال اور گیتوں کی مقبولیت سے خیال ہوتا ہے کہ وہ زمانہ دور نہیں جب ہر نظم بجائے خود ایک نغمہ ہوگی - نغمہ بھی شعر کی طرح اظہارِ جذبات کا ایک ذریعہ ہے - جذبات کے تنوع کے ساتھ نغمات بھی متنوع ہوتے ہیں - "نوحۂ غم" "نغمۂ شادی" سے مختلف ہوتا ہے رجز اور ساون کے گیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے - میدانِ کارزار کی موسیقی اور شبستان کی موسیقی میں بیّن امتیاز پایا جاتا ہے - شاعری اور موسیقی توام فنونِ لطیفہ ہیں - اکثر شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری بن جاتی ہے - جدید شاعری بھی موسیقی سے ہم آغوش ہوتی جارہی ہے - آج شاعر کے خلوصِ بیان کی حدود فطرت کی حدود سے ملتی جارہی ہیں - اسی لئے اسکے جذبات نغمات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں "یہ کون اُٹھا ہے شرماتا" کی موسیقی اور "بغاوت" کا رجز نفسِ مضمون سے ہم آہنگ ہے -

ہماری جدید شاعری کا ایک رجحان فطرت پرستی کی طرف بھی ہے - گو ابھی پرستارِ فطرت ورڈز ورتھ کی سی نظمیں مفقود ہیں - اُردو کی اس تہی دامانی کا ماتم کرتے ہوئے صاحبِ تاریخ ادب اُردو اس طرح رقمطراز ہیں "دیہاتی اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے اُردو شاعری کا دائرہ محدود ہے - قدرتی مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب اُمنگیں پیدا کرتے ہیں ہمارے اُردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے - مولانا الیاس برنی بھی "مناظرِ قدرت" کی تمہید میں لکھتے ہیں - قدرت کو لیجئے اسکے بیشمار عجائبات آنکھوں

کے سامنے ہیں۔ لیکن ہمارے شعراء نے کہیں اب جا کر نقاشی شروع کی ہے اور ابھی وہ زمانہ دور ہے کہ نیچر کی تصاویر مُنہ سے بولنے لگیں۔" فطرت کی تصاویر اکثر نظموں کے پسِ منظر کے طور پر تو پیش کر دی جاتی ہیں۔ لیکن محض فطرت کی پرستاری بالذات مقصود نہیں۔ جوشؔ نے اکثر نظمیں فطرت کے معصوم مناظر سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ لیکن جوشؔ میں ورڈز ورتھ کی سی والہانہ شیفتگی اور روحانیت کا پرتو نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوشؔ فطرت سے مانوس نہیں۔ وہ صرف فطرت کا تماشائی ہے تمنائی نہیں وہ فطرت کے مناظر میں کھو نہیں جاتا۔ بلکہ بیدار احساس اور بینا آنکھ سے اسکے حُسن کا جائزہ لیتا ہے ؎

خامشی دشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے
عمر بھر جو نہ سُنی ہو وہ صدا آتی ہے
دشنہ رکھ دیتا ہے گھبرا کے رگِ جاں پہ کوئی
جب کلی خاک پہ دم توڑ کے گر جاتی ہے
مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹا میں بجلی
آنکھ سی کوہ و بیاباں کی جھپک جاتی ہے
جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے
دلِ شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سائے باتیں
ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے
جب ہری دوب کے مُرجھاتے ہیں نازک ریشے
شیشۂ قلب میں اک ٹھیس سی لگ جاتی ہے
ان مناظر کو میں بے جان سمجھ لوں کیونکر
جوشؔ کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے

(از "ذی حیات مناظر" بہ تصرف)

قلبِ صحرا میں جھٹپٹے کے وقت — دل میں غلطاں ہے ایک طرف امنگ
مجھ سے کہتا ہے کیا خدا جانے — دھان کے کھیت پر شفق کا رنگ

اس کا تو عقیدہ ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کیلئے — اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اس باب میں جوشؔ بجنوری مرحوم کی اصطلاح کے مطابق "ربّ النوع" کہلانے کا مستحق ہے اسکی اکثر نظمیں مثلاً "شام کا رومان" "بہار کی ایک دوپہر" "روحِ شام" "جذباتِ فطرت" وغیرہ ہماری شبانی شاعری کی زینت بنی رہینگی۔ عام روش سے ہٹ کر ایک نئی ڈگر نکالنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آئندہ آنے والے شاعر اس راہ پر گامزن ہونگے۔ جو ممکن ہے ہماری شاعری کی ایک شاہراہ بن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے شاعروں کو دُنیا کے تلخ حقائق کی جل جلاتی دھوپ سے فطرت کے سکون پرور سائے میں دم لینے کی فرصت ہی نہیں اور یہی ان کیلئے اچھا بھی ہے۔ زمانہ آئیگا کہ وہ فطرت کے آغوش میں سکون کے متلاشی ہونگے۔

آج دُنیا ایک عجب بدنظمی، انتشار، ابتری اور ریل پیل کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ سماجی افراتفری اور دماغی افلاس کے باعث مذہب جو سکون اور شانتی کا پیغام تھا۔ پسِ پُشت ڈال دیا گیا۔ آج تنقید کا دور دورہ ہے۔ تلقین کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اعتقاد کی جڑیں تشکیک نے ہلا کر رکھ دی ہیں۔ سائنس کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ غرض اس دورِ عقلیت میں تصوّف اور روحانیت کی دال نہیں گل سکتی۔ مذہب کا سکّہ نہیں چل سکتا۔ حتّٰی کہ وجودِ خداوندی بھی معرضِ شک میں پڑ گیا ہے۔ ہندوستان میں دہریت ایک اور وجہ سے بھی فروغ پا رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب مظلوم و مجبور انسانوں پر اس حد تک ظلم و ستم روا رکھے جاتے ہیں۔ کہ وہ دبے سانپ کی طرح کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں وہ ہر ظالم و جابر ہستی سے باغی ہو جاتے ہیں خواہ وہ انسانی ہو یا مافوق الانسانی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے اکثر شاعر اشتراکیت کے زیرِ اثر تصوّف، روحانیت اور مذہب سے منحرف ہونے کے بعد خدا سے بھی باغی ہو گئے ہیں۔ وہ کسی ایسے "شخصی" خدا کے قائل نہیں جو قہار و جبار ہو ؎

اللہ کو قہار بتانے والو — اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ سماج کے بیجا بندھنوں، تقسیمِ دولت کی بدعنوانیوں، سیاسی عیاریوں اور شیطانی بدکاریوں کو آسمانی خدا نہیں، ارضی انسانی جابروں سے منسوب کرتے ہیں اور بعض دفعہ اس روح فرسا کشمکش سے مجبور ہو کر کہہ اُٹھتا ہے ؎

تیرا اک بندہ تجھ کو روتا ہے — اے خدا مر گیا کہ سوتا ہے (مجاذب قریشی)

وہ ایک ایسے خدا کو تو ضرور مانتے ہیں ؎

"جس کے قبضے میں زماں ہے جس کے قدموں پہ زمیں"

آج تک پہنچی نہیں جس اوج تک چشمِ خیال

ایک نامعلوم قوت ایک نا دیدہ جلال

"داغِ شخصیت" سے ہے ناآشنا جس کی جبیں

نوعِ انساں کے تعاون کی جسے حاجت نہیں

جس کا ہر تارہ ہے مصحف جس کا ہر ذرہ کتاب

جس کے دفتر کی ہے زریں مہر قرصِ آفتاب

وہ خدا وہ طاقتِ مخفی وہ دارائے حیات

جس کی ایک ادنیٰ سی جنبش کا لقب ہے کائنات

علاوہ ازیں دنیا کو رنگ و نسل کے امتیازات، صنعت و تجارت کی مقابلہ بازی، کمزور اقوام کی پائمالی اور آئے دن کی خونریزیوں سے نجات دلانے کی آس صرف بین الاقوامیت سے بندھتی ہے۔ ہمارا شاعر بھی آبائی مذہب سے کنارہ کش ہو کر صرف بین الاقوامیت کو اپنا مذہب، اپنا دین، اپنا ایمان قرار دیتا ہے ؎

۴۲۸ اُٹھ کھڑے ہو آؤ تکمیل عبادت کے لئے اک نیا نقشہ بنائیں آدمیت کیلئے

آؤ محفل میں جلائیں بھی بصد شان فراغ نوعِ انسانی کی مجموعی اخوت کا چراغ

اور کچھ حاجت نہیں ہے دوستی کیواسطے آدمی ہوتا ہے کافی آدمی واسطے

آؤ وہ صورت نکالیں جس کے اندر جان ہو آدمیت دین ہو انسانیت ایمان ہو

(جوش)

ہمارے ملک کی موجودہ تباہ ناک حالت سماجی افراتفری، دماغی افلاس اور روحانی جمود کا تقاضہ تھا کہ ہمارے ادب میں قنوطیت کی روح سرایت کر جائے لیکن اسکے برخلاف ہماری شاعری رجائیت کے جذبے سے مملو نظر آتی ہے۔ یہ ایک نیک شگون ہے۔ لیکن یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ہماری قنوطیت حد کو پہنچ چکی تھی۔ چونکہ قنوطیت کی تیرہ و تار شب ہی رجائیت کی صبحِ تابناک کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مزید برآں ہماری شاعری جو محض حسن و عشق یا شراب و کباب کا مجموعہ کہی جاتی ہے۔ ملک و قوم میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے اور پھر سیاسی و سماجی انقلاب کی ابتدا ذہنی انقلاب سے ہوتی ہے۔

اگر مندرجہ بالا تمام رجحانات یکجا دیکھنے ہوں تو ساغر کی نظم "ناگ" پڑھئے۔ شاعر سماج سے باغی ہے۔ سرمایہ داری سے بیزار ہے۔ موجودہ نظام سے اُکتا گیا ہے۔ اسکی نظر "ناگ" پر پڑتی ہے "ناگ" جس سے ہر شخص ڈر کر بھاگتا ہے جس کے پاس کوئی نہیں پھٹکتا۔ باغی شاعر سے بھی کوئی محبت و ہمدردی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوانہ ہے جس سے سب ڈر کر بھاگتے ہیں۔ اسے دیکھ کر سرمایہ دار تیوری پر بل ڈال لیتے ہیں "پنڈت، ملا، لالے" نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ دونو دُنیا کے ظلم و ستم کے زخم خوردہ ہیں۔ دونو نفرت و کراہیت کا تختہ مشق ہیں باغی شاعر فوراً "ناگ" کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور مسرت کا ایک بے اختیار نعرہ لگاتا ہے جیسے کسی اجنبی کو اپنا ہموطن نظر آجاتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے۔ ع

آؤ تمہیں تن من میں بسالوں اے بانبی کے واسی

وہ ناگ کے حسن کے گیت الاپنے لگتا ہے۔

باغی شاعر اور ناگ میں ایک اور بھی مماثلت ہے۔ کہ شاعر تخریب کا حامی ہے۔ تخریب کی تصویر ناگ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ وہ بھی فطرت کی تخریبی طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے۔ شاعر ناگ بن کر سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کو ڈس لینا چاہتا ہے۔ وہ ناگ کا مقابلہ اور دوسرے ہزاروں انسانی ناگوں سے کرتا ہے اور آخر یہ نتیجہ نکالتا ہے ؎

بس ہے تمہارا بوند برابر ان کا زہر سمندر

ڈنک تمہارا ویرانوں تک ان کا ڈستا گھر گھر

تیرا کاٹا اک دن زندہ ان کا کاٹا پل بھر

سحر تمہارا سر پہ بولے ان کا جادو من پہ

دل سے ان کا زہر ہٹالوں لے بانبی کے باسی

آؤ تمہیں تن من میں بسالوں اے بانبی کے باسی

یہ نظم نہ صرف انقلاب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے بلکہ اس میں ہماری جدید شاعری کی دوسری خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ اس کی زبان عام فہم۔ الفاظ میٹھے اور شریلے ہیں۔ یہ اُردو ہندی ملاپ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں بہتے ہوئے پانی کی سی روانی اور موسیقی پائی جاتی ہے تشبیہات عام مشاہدے سے ماخوذ ہیں اور ایک ندرت اور جدت لئے ہوئے ہیں۔ ؎

سبزے کے دامن پر ہو یوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کاجل آنکھ سے بہ کر رخساروں کو گھیرے
سورج کی کرنوں سے ایسے چمک رہا ہے ٹکڑا
جھل مل جھل مل جیسے جھومر کرے کسی دلہن کا

سینہ تانے پھن پھیلائے جھوم رہے ہو ایسے
جیسے کوئی دکھنی کنواری مدھرا پی کر جھومے
اندھیاری درپن ہے تمہارا نور تمہارا ہالا
رات کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے بالا

عہدِ حاضر کا ہر شاعر اپنی بقا کا راز انفرادیت میں پاتا ہے۔ اور اسی لئے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ساغر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے گیتوں میں ہندو علم الاصنام (MYTHOLOGY, کا پیوند لگا کر ان کا دامن ہند کے عہدِ عتیق کی تہذیب و تمدّن سے باندھ دیتا ہے۔ یونانی علم الاصنام ابتک انگریزی شاعری کی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا مخزن بنا ہوا ہے۔ ساغر ناگ کو موت کی گردن کی ہیکل، شنکر کا جوشن، اور کالی کی جھانجن کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔

اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نظم گیت کی شکل میں ہے۔ گیت ہماری حیات کا ایک جزو ہے۔ اس لئے عوام الناس کے دلوں کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ گیت نصیحت (INSTRUCTION) کی بجائے اشارت (INSINUATION,) پر مبنی ہے جو کسی ملک کے اعلیٰ ترین ادب کا طغرائے امتیاز ہے۔

ساغر کی چند جدید نظمیں اُردو شاعری میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کر رہی ہیں۔ "اتنی فرصت کہاں" ماحول اور زمانہ کی تمام بے چینیوں اور انکے ردّ عمل کا آئینہ ہے، شاعر کی حساس روح، بیرونی اثرات کو ایک اندرونی کیفیت سے ترتیب دے کر عجب چیز بنا دیتی ہے۔ دورِ حاضر کی طلسم شکنی کہ شاعر یا عاشق یا محبوب، محبّت کو ٹھکرا رہا ہے۔ پچھلی صدی کا شاعر ایسے عاشق کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ترقی اور بلندی کا نصب العین جس کے حصول کیلئے فی زمانہ انسان کو سچّے معنوں میں مشین بن جانا پڑتا ہے علو مقصد اور اسکے مقابلے میں وقت کی رفتار، یہ سب باتیں الفاظ کے ایسے تانے بانے میں بُنی ہوئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، ساغر کی نظموں کی جھلملیوں میں سے حیات کے تاریک پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے بعض دفعہ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مادرِ گیتی یا روحِ عصر اپنے اندرونی درد و کرب کی آہوں کو اسکے شعروں سے متکلم بنا رہی ہے۔

اگرچہ جنگ کے شعلے ہمارے ملک سے دور ہیں لیکن ان کی آنچ ہمارا شاعر اپنے قلب پر محسوس کرتا ہے اور اپنے ہم وطنوں کے احساسِ وطنیت، جذبۂ مدافعت اور ولولۂ آزادی کو بیدار کرنے کیلئے ایک جنگی ترانہ چھیڑتا ہے ؎

پھر امن کی رنگیں وادی سے ہنگامہ گیر و دار اُٹھا
دُنیائے سکوں کے پہلو میں ایک فتنۂ حشر آثار اُٹھا
ہستی کے بہاریں مطلع پر ایک ابرِ شرارہ بار اُٹھا
بیکار ہیں چنگ و تار اُٹھا اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثارِ آزادی جاں میری فدائے آزادی
اُٹھ جلد کہ ظالم چھین نہ لیں ملت کا لوائے آزادی
وہ غلغلۂ یلغار اُٹھا اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

۴۹ ناموسِ وطن کو غیروں کے پنجوں سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس انکی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں
لا برقِ فنا آثار اُٹھا اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

پھر جسم براہ جرأت ہے لیلائے شہادت میداں میں
شاداب ہوا کرتی ہے صدا ہر قوم کی عظمت میداں میں
تلواروں کے خونیں آنچل سے کھل جاتی ہے جنت میداں میں
گلہائے طرب کا بار اُٹھا اُٹھ ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا

(اختر شیرانی)

موجودہ جنگ نے دُنیا کو جو کچھ بھی نقصان پہنچایا ہے لیکن اُردو ادب میں ایک لافانی رزمیہ نظم کا اضافہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آجتک ان ممالک میں بھی جہاں لوگ اپنی آزادی برقرار رکھنے کیلئے جانوں کی بازی لگا رہے ہیں ایسا جوشیلا جنگی ترانہ نہیں سُنا گیا۔ وہ حضرات آئیں جو اُردو شاعری کو "ڈگر پرست" کہکر ہماری تہذیب کو ترقیِ معکوس بتلا رہے ہیں اور دیکھیں کہ ہماری شاعری کس طرح رفتارِ زمانے کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

سراج الدین آذر

فارسی اور ہندوستانی تہذیب

کسی ملک کی تہذیب۔ اس کا کلچر۔ اسکی زبان۔ اس کا ادب ایسی چیزیں ہیں جو صدیوں میں تشکیل پاتی ہیں۔ زمانہ کا بہاؤ۔ حکومت کے انقلاب۔ باشندوں کی مزاجی تبدیلیاں اور بیرونی ممالک اور اقوام سے اثر و تاثر۔ ادب۔ زبان وغیرہ کو نئے سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں زبان بالخصوص اتنے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اسکی عہد بعہد ترقیوں کا جائزہ لینا دلچسپیوں سے پُر ہے۔

ترکوں کا ہندوستان کو فتح کرنا ایک اہم واقعہ ہے جس کے بے پناہ اثرات سے ہندوستانی تہذیب اور کلچر پر ایک کاری ضرب لگی۔ اور وہ چوٹ کھا کر جوابی طور پر فاتحین کے خیالات و تصورات پر حملہ آور ہوا گرد و پیش کے حالات جس شدت کے ساتھ کسی قوم کے دل و دماغ۔ انکے خیالات۔ عادات و اطوار حرکات و سکنات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسکی مثال اس سے بہتر شاید نہ مل سکے۔ ترک اور مغل جب ہندوستان میں آئے ۴۰
تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اور ہندوستانیوں کے کلچر میں کوئی مشترکہ اوصاف ہی نہیں ہیں۔ مغل اور ہندوستانی۔ بول چال۔ رنگ ڈھنگ آداب و اخلاق بہت سے پہلوؤں سے مختلف بلکہ متضاد دیکھے۔ اس اجنبیت کے باوجود ان دو تہذیبوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکنا قوموں کے باہمی مدنی انحصار کی ایک ایسی دلیل ہے جسے آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

مغل اور ہندوستانی کلچر میں پہلے تصادم ہوا۔ پھر گریزاں سی آشنائی۔ پھر کچھ رسمی ربط۔ آخری شکل جو اس باہمی تعلق نے اختیار کی وہ حاکم و محکوم کا رشتہ تھا۔ ترک اور مغل ہندوستان میں فاتح بن کر آئے تھے اور ان کی زبان کچھ مدت کے بعد فارسی ہو گئی تھی ۔ عربی کا مقولہ ہے "الناس علی دین ملوکھم" یعنی رعایا بادشاہ کے دین کے تابع ہوتی ہے۔ زبان بھی علم و فن۔ صنعت و صناعی اور اخلاق و اطوار کی طرح سلطنت کے اثر کی مغلوب ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سلطنت کا مذاق ہر چیز میں سرائت کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی بہت جلد ہر دلعزیز ہو گئی اور ہندوستانیوں نے بلا تفریق مذہب و ملت اس میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کی۔ زبان میں بدلتے ہوئے حالات اور بگڑتے یا بنتے ہوئے کلچر کا عکس آنا لازمی تھا۔

فارسی اور ہندی الفاظ کا رد و بدل اور لین دین غزنوی دور سے ہی شروع ہو گیا تھا چنانچہ اس عہد کے شعراء اور مورخین۔ فردوسی۔ عنصری۔ فرخی۔ اسدی۔ سنائی اور بیہقی کے ہاں ذیل کے ہندی الفاظ ملتے ہیں :۔

بت۔ دشمن۔ شارہ کت بمعنی تخت۔ کوتوال ۔ نو بہار (عبادتگاہ) بیلک۔ لگہن۔ شل۔ کتارہ۔ چندن اور پانی ۔

ابو الفرج رونی۔ جو شاہ ابراہیم اور اسکے بیٹے مسعود ثالث کے عہد کا شاعر ہے۔ اسکے کلام میں دند۔ جوہر اور جت ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

بشکل پیل یک دندش نظر کن

بقول صاحب فرہنگ رشیدی دند ہندی لفظ ہے۔ فرہنگ آنندراج میں لکھا ہے ۔

"گویا این مفرس دنت باشد کہ لغت ہندی است"

لیکن میرے فاضل دوست پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ چونکہ ابو الفرج رونی لاہوری ہے۔ دند اس نے پنجابی زبان سے لیا ہے پیل یک دند سے شاعر کا مقصد ایک دنتا ہاتھی ہے۔ جت بھی اصل میں پنجابی لفظ جٹ ہے جسے اُردو میں جاٹ کہتے ہیں ۔

جوہر سے مقصد راجپوتوں کی معروف رسم ہے۔ یعنی غالب دشمنوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے مال و اسباب کو جلا کر اور اہل و عیال کو قتل کر کے آ ڈٹتے تھے اور جبتک ایک ایک کر کے ہلاک نہ ہو جاتے مُنہ نہ موڑتے ۔

— ایشیا جون جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

مسعود سعد سلیمان نے کت (بمعنی تخت) - مارا مار (آپس کی مار پیٹ) اور برشکال یعنی برش کال بمعنی (برسات کا موسم) ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں -

حکیم سنائی غزنوی المتوفی ۵۴۵ھ کے کلام میں ہندی لفظ پائی اور کوتوال (کوٹ والا بمعنی مالک حصار) پائے جاتے ہیں -

اسی طرح تاج الدین ریزہ کے ہاں سیر اور من (۴۰ سیر کے معنوں میں) ملتے ہیں -

طبقات ناصری از منہاج سراج جو ۶۵۸ھ کی تصنیف ہے اس میں یہ ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں -

سیل (بھیڑ) - لک (لاکھ) - نو بہار (یعنی نو وہار بمعنی عبادتگاہ) -

دقیقی شاعر نے بھی نو بہار لہراسپ نامہ میں استعمال کیا ہے؎

بلخ گزیں شد بداں نو بہار   کہ یزداں پرستاں آں روزگار
مرآں خانہ را داشتندے چناں   کہ مرمکہ را تازیاں ایں زماں

امیر خسرو کے یہاں کثرت سے ہندی الفاظ اور محاورے پائے پائے جاتے ہیں - طوالت کے خوف سے میں ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر کرونگا :-

ساغر (ساگر بمعنی حوض و تالاب) - راوت (راجپوت) - پایک (پیادہ) - (پگڑی) - بیڑہ - تنبول - دھانک (تیر انداز) - بسیٹھ (ایلچی و سفیر) - بیل - سیوتی - کیورہ - مولسری -

تاریخ فیروز شاہی میں جو ۷۵۸ھ کی تصنیف ہے کم از کم ۸۰ ہندی لفظ آئے ہیں - ان میں سے بھی چند ایک سن لیجئے - کگنی (ایک قسم کی شراب) منڈہ (منڈی) - سوندھا - (بمعنی اُدھار) - ادی (بمعنی باربردار) - مار مار (بمعنی سعی بیہم) - سکھ آسن (پالکی) - ڈانگ (کٹھ) - منڈل (جلسہ و جماعت)

سیر الاولیا میں کئی لفظ ہندی کے آئے ہیں - مثلاً لینگھن بمعنی روزہ - بھاگسی بمعنی قید خانہ -

مجھے اندیشہ ہے کہ اس فہرست الفاظ سے جنکی نیرنگیاں ایک ماہر لسانیات کے لئے "سامان صد ہزار نمکداں لئے ہوئے ہیں" آپ اُکتا گئے ہونگے - اس لئے میں مفتاح القلوب میں سے صرف چند ہندی کے لفظ پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں -

جوگی - کھپر (پیالہ رکابی) - مراتبہ (مرتبہ) - لنگوٹی - چھپر -

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نویں صدی ہجری تک فارسی زبان ہندوستان میں ہمہ گیری صورت اختیار کر چکی تھی - فارسی جاننے والوں کی تعداد اس وقت تک بہت کم تھی لیکن ماحول کے گوناگوں اثرات سے فارسی زبان متاثر ہو رہی تھی - اور مجھے یہی دکھانا مقصود تھا -

جس طرح ہندی الفاظ فارسی میں داخل ہو گئے - فارسی عربی الفاظ ہندی کتابوں میں دخل پا گئے - نرپتی نلہ ایک ان پڑھ شاعر تھا ۱۱۵۵ء میں اس نے ایک کتاب "بیل دیو راسو" نظم میں لکھی - اس میں اور اس وقت کی دیگر ہندی کتابوں میں متعدد لفظ عربی فارسی کے ملتے ہیں نمونے کیلئے دیکھئے -

مہل (محل) - ہجرت (حضرت) کھدا (خدا) - سرتان (سلطان) - سایہب (صاحب) - پھرمان (فرمان) - کھلک (خلق) - کلا (کلاہ) - کباۓ (قبا) - پائگا (پائے گاہ) باجا باجا (بعض بعض) -

۱۴۱ دلچسپ بات اس میں یہ ہے کہ فارسی الفاظ کو ہندی نے انکی اصلی حالت میں قبول نہیں کیا - بلکہ اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق انہیں ڈھال لیا ہے - خلق کی خ کو ادا کرنے اور ق کا ڈول حلق سے نکالنے کی تاب ہندوستانی سہل انگاری کب لاسکتی تھی - لہذا کھلک بنا دیا گیا - عین کو بھی ہندی کی نازکی کا شکار ہونا پڑا - اور بعض بعض کا باجا باجا بن گیا - ص - س - ث - کو ہندی نے ایک ہی لاٹھی سے ہانکا - اور حائے حطی اور ہائے ہوز بھی ہندی میں ایک دوسرے کو پہچاننا بھول گئیں - ض - ظ - ز وغیرہ ایک جیم میں منجمد ہو گئے - قاعدہ ہے کہ غیر الفاظ قبول کرنے سے پہلے زبان سُنار کی طرح انہیں اپنے مزاج اور میلان کی آگ میں ڈالتی ہے - پگھلنے کے بعد یہ الفاظ مختلف سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں - چ - اہل عرب کو نہیں بھاتی تو عمل زر گر سے چاوش ساؤش بن جاتا ہے - ڑ فارسی ایسی گوش نواز زبان میں نہیں کھپ سکتی - لہذا کنارہ نے کنارہ کی صورت اختیار کی - درحقیقت ہر زبان کسی خاص ماحول میں پرورش پا کر ایک انفرادی

موج یا ترنگ اپنے میں ادا کرلیتی ہے۔ اور کسی دوسری زبان کے الفاظ کی دسترس اس تک اسی وقت ہوسکتی ہے۔ جبکہ وہ اسکے من کی موج کا خیال رکھے۔ نارنگی اچھا خاصا لفظ ہے۔ لیکن فارسی زبان کو پسند نہیں۔ یہ خوش مزاج چاہتی ہے کہ نارنج ہو۔ اہل فارس جن کی اپنی طبیعت کا عکس فارسی زبان میں ہے۔ نارنج کیوں نہ کہیں گے۔ آپ دیکھئے نارنگی ہو کہ نارنج بات ایک ہے لیکن زبان کا مزہ مختلف ہے۔

ان تمام انقلابات کو بنظرِ غور ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے فلسفہ اور تصوّر پرستی کا ایک مسلسل عکس جو مدّتوں ہندی پر پڑا تھا۔ اس سے زبان میں ایک میدانی سست رو دریا کا پھیلاؤ آگیا تھا۔ ہندی زبان نہایت سیدھی سادھی اور صاف زبان تھی لیکن کم مایہ۔ اسکے الفاظ میں رس تھا۔ اس کے تصنّع سے پاک جملوں میں گھلاوٹ موجود تھی۔ لیکن اس میں اس وسعتِ بیان کا فقدان تھا جو فارسی کا طرۂ امتیاز ہے۔ فارسی کے اچھوتے لفظوں۔ تخیّل میں رچی ہوئی ترکیبوں اور "جاوداں پیہم رواں ہردم جواں" اشعار و مطالب نے ہندی مصنّفوں کے دل موہ لئے۔ اس لئے یہ کہنا کہ فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبان پر قطعی حاکم و محکوم کے رشتہ کا مرہونِ ۴۳
منت ہے قدرے سطحی نظریہ ہے۔ جھروکۂ درشن ایسی ترکیب یقیناً سلطان کی خوشنودی کیلئے نہیں بنی۔ بلکہ ہندی اور فارسی الفاظ کے رسیلے اُلجھاؤ سے ایک بُنیادی احساس اور ضرورت کی ترجمانی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

نویں صدی تک کی فارسی تصانیف میں ہندی الفاظ کے دخل کی رام کہانی میں مختصراً عرض کرچکا ہوں۔ اب ملک الشعرائے شاہجہانی ابو طالب کلیم کی ایک مثنوی کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ تاکہ وہ سلسلہ مغلیہ دور سے مربوط ہوجائے۔ دیکھئے کس بے تکلّفی سے ہندی لفظ استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔

منہ بر وعدۂ تنبولیاں دل — کہ جز خون خوردن از وے نیست حاصل
زحسنِ شستہ دھوبی چہ گویم — ازاں بے پردہ محبوبے چہ گویم
بتانِ راجپوت و شیخ زادہ — شکیب عاشقاں بر باد دادہ
چہ جنبر شعلۂ شمع ست بے دود — کہ آتش می زند بر خرمنِ عود

زمور و ناں نظر دریوزہ دارم — کہ وصفِ موسہری را بر نگارم

مفردات سے قطع نظر مرکبات کی داستان سُنئیے جو اس سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ ان محاوروں کو ملاحظہ فرمائیے اور پھر اندازہ کیجئے کہ کس حد تک فارسی زبان ہندوستانی ماحول سے متاثر ہوچکی تھی

زمین خفتن۔ معنی "زمین پر سونا" اس ہندوستانی رسم کا پتہ دیتا ہے جس سے سلاطین و شہزادگان کی وفات کے وقت ماتم داری کے ایام میں لوگ زمین پر سوتے تھے۔ چنانچہ امیر خسرو کہتا ہے۔

"وز زمیں خفتن ہمہ آفاق شد پہلو کبود"

بیڑہ تنبول گرفتن۔ "بیڑہ اُٹھانا" اس محاورہ کے جو معنی غیاث اللغات میں لکھے ہیں۔ ان سے معلوم ہوجائے گا کہ یہ محاورہ بھی ایک خاص ہندوستانی رسم کی خبر دیتا ہے۔ صاحب غیاث کے الفاظ ہیں "درزمانِ سابق در سلاطین ہند رسم بود کہ پیش امرا برائے انصرام رسانیدن مہم بیڑہ پان می انداختند۔ کسیکہ آنرا برداشتے انصرام آں مہم بذمّہ او واجب شدے"۔

ان کے علاوہ سینکڑوں ہندوستانی محاورے فارسی میں داخل ہوگئے اور مستند مصنفین کے ہاں ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آواز کردن (آواز دینا)۔ گفتار گفتن (بات کہنا)۔ مالا کلام کردن (کسی سودے کا انقطاع کرنا)۔ نیشکر با پیل خوردن (ہاتھی سے گنا کھانا)۔ ع نشاید نیشکر با پیل خوردن (خسرو)۔ دندان در شکم بودن (پیٹ میں داڑھی یا دانت ہونا)۔ ع چوں خربزہ دندانش درون شکم است (خسرو)۔ بیک چوب ہمہ را راندن (سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا)۔ ے

خسو زبان تست کو ہر ہمہ را — پیدا نہاں تست جو ہر ہمہ را
شد راندہ سنانِ تیغ و تیر از کلکت — زیں گو نہ بیک چوب مراں ہر ہمہ را

دست بگوش نہادن (کانوں پر ہاتھ رکھنا)۔
جان بہ بینی رسیدن (ناک میں دم آنا)۔ ع

جان مردم رسید در بینی (خسرو)

چراغ بر کردہ طلب کردن (چراغ لیکر ڈھونڈنا)۔
پگ از سر فرود آوردن (پگڑی اُتارنا۔ بےعزتی کرنا)۔ چونی پگ از سر فرود

آوردندچہ حرمت ماند (شمس سراج) ۔

افیون فرود آوردن (افیون اُترجانا) ۔

دوران آمدن (چکّر آنا)

خالہ کا گھر ۔ ایک ہندوستانی محاورہ ہے ۔ ضیا برنی یہی محاورہ استعمال کرتا ہے " چنانکہ خوردگان نازنیں درخانہ خالگاں مہماں روند "

ان کی خوشی اسی میں ہے ۔ خوشی ایشاں بریں است (مفرّح القلوب)

اپنی گرہ سے خرچ کرنا ۔ خرچ واخراجات ازگرہ خود کردن (شمس سراج عفیف) ۔

جان ہے تو جہان ہے ۔ اول جان بعدہ جہان ۔ (مفرّح القلوب)

آدھی کو چھوڑ ساری کے پیچھے دوڑنا ۔ نیم نان گزاشتہ برائے تمام نان مرود ۔

مجھ سے کیا لیگا ۔ ازمن چہ خواہد گرفت ۔ (مفرّح القلوب)

اگر اپنی خیریت چاہتے ہو ۔ اگر خیریت خود میخواہی ۔

ان تلوں میں تیل نہیں ۔ خالے برخش دیدم وگفتم کہ تل است ۔

گفتا کہ برونیست دریں تل تیلے (خسرو)

بعض الفاظ کے معنی میں ہندوستانی ماحول نے نئے مفہوم پیدا کردئے ۔ جن سے اہلِ زبان کے کان ناآشنا رہے ۔ مثلاً

متحرک ۔ بمعنی چالباز ۔ یہی حال لفظ حرکت کا ہے ۔

کاہل ۔ بمعنی ڈرپوک ۔

خوش ۔ بمعنی شادوخرم ۔ ایرانی فارسی میں بمعنی مرغوب آتا ہے

روشنائی ۔ بمعنی مرکب یعنی سیاہی ۔

سرکار ۔ بمعنی خزانہ ۔

چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے ۔

" اگر حکم شود کہ تریاک مجرّب کہ درخطامی باشد و بالفعل ازاں درسرکار موجود است بیاوریم "

غصّہ بمعنی خشم وطیش ۔ ایرانی فارسی میں بمعنی اندوہ گلوگیر استعمال ہوتا ہے ؎

شد اندر غصّہ شادی نمان والا

مدد جست از پناہِ حق تعالیٰ (خسرو)

فارسی اور ہندی کی اس باہمی کشاکش اور کیمیاگری کی تصویر مغلیہ سلطنت کے عروج وزوال میں کھنچی ہوئی ہے ۔ مغل جب ہندوستان میں آئے تو شان وشوکت کے دلدادہ اور جوش وخروش کی زندہ مثال تھے ۔ آہستہ آہستہ ہندوستانی مزاج کے ضمیر نے ان پر اثر کیا ۔ ان کی شاعری جو اس وقت رزمیہ تشبیہوں اور استعاروں سے مملو تھی ۔ اب بزم طرب اور محفل عشرت کے کنایات میں کھو گئی ۔ قصیدوں میں جنگ وجدال کی رمزیں کم نظر آنے لگیں ۔ حتیٰ کہ محمد شاہ رنگیلے اور بہادر شاہ کے زمانے میں استعاروں اور تشبیہوں کی ماہیت بالکل ہی بدل گئی ۔ اور کیوں نہ بدلتی ۔ اُلوالعزمی اور حب جاہ کی جگہ سہل انگاری اور عیش وعشرت نے لے لی تھی ۔ درباری شاعر اپنے سرپرست کے بغیر زندہ ہی کس طرح رہ سکتا ہے ۔ اس نے وہی کچھ بیان کیا جو اسے نظر آیا ۔ فارسی کے اُبلتے ہوئے چشمے اب نرم رو دریا بن چکے تھے ۔ پہلے زلف کو کمند وچوگاں ۔ ابرو کو خنجر ۔ مژگاں کو تیر اور آنکھوں کو قاتل وسفّاک باندھا جاتا تھا ۔ اب بنفشہ وسنبل

۴۳ یاسمن اور نرگس وغیرہ کو کامل استعاروں کا رتبہ حاصل ہوا ۔ قصیدہ کی جگہ غزل نے لے لی ۔ بلکہ ہزل کی آمد شروع ہو گئی ۔ تصوّف کو عروج ہوا ۔ ہندوستان کی فضا اسکے لئے موزوں تھی ۔ اسلامی تصوّف میں " گرو چیلہ " اور بھگتی مسلک کے پیرو طبقے میں " پیرومرید " کے الفاظ اپنائے گئے ۔ اس اتصال سے دونوں زبانوں اور قوموں میں یگانگت پیدا ہونے لگی ۔ مغل اور ہندوستانی آرٹ اور کلچر نے ایک دوسرے کے قریب آنا چاہا ۔ اُردو زبان ان دونوں کے اثر وتاثر سے بنی سنوری ۔ لیکن اس کا ذکر میری تقریر کی حدود سے باہر ہے ۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

یوسف ظفر

خودفریب

ترے حریمِ محبت میں آؤں گا امشب
جواں ستاروں کی کرنوں پہ گاتا آؤں گا
صدائے ماہ سے جب جھلملائینگے کوکب
چراغِ ساغر و مینا جلاتا آؤں گا

بہار تیرے لئے میرے دل کے داغ سہی
میرے لئے ترے عارض چمن بداماں ہیں
یہ میری آنکھوں کے آنسو ترے چراغ سہی
تری نگاہ سے میرے چراغ روشن ہیں

یہ سامنے کے دریچے میں دیکھ رازِ حیات!
کہیں زباں پہ نگاہیں ہیں، آنکھ میں باتیں
کہیں دھندلکے ہیں دن اور نور میں برسات
کہیں نہ دن ہے نہ بہتی ہوئی سیہ راتیں

مگر نہیں — تری محفل میں آج آؤں گا
ہزار اشک ہوں آنکھوں میں مسکراؤں گا

ایشیا جون جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

دُکھ سُکھ

علی اطہر اور چیخوف

(مسلسل)

(ڈراما)

آیوانوف

روسی مشہور افسانہ نگار چیخوف کا ایک شاہکار

(چوتھا ایکٹ)

ریوانوو کے مطالعہ کا کمرہ - ایک لکھنے کی میز جس پر کاغذات، کتابیں سرکاری لفافے، کھلونے اور ریوالور بے ترتیبی سے پڑے ہیں کاغذات کے قریب ایک لیمپ، دودھ کا قراب ایک رکابی میں مچھلی، کچھ روٹی، اور لکڑی کے ٹکڑے، دیواروں پر نقشے، تصویریں، بندوق، پستول درانتی اور کوڑے لٹکے ہوئے ہیں، دوپہر کا وقت ہے -

شیبلسکی، لبیڈیو، بورکن اور پیوتر شیبلسکی اور لبیڈیو لکھنے کی میز کے قریب بیٹھے ہیں، بورکن اسٹیج کے بیچ میں کرسی پر پیر پھیلائے بیٹھا ہے، پیوتر دروازے پر کھڑا ہے -

لبیڈیو:- فرانس کی پالیسی واضح اور متعین ہے .... فرانسیسی جانتے ہیں کہ انھیں کس چیز کی ضرورت ہے - وہ چاہتے ہیں کہ سموسے کھانیوالوں کی کھالیں اور جرمنی کا قصہ بالکل مختلف ہے - جرمنی کے آنکھوں کے خار فرانس کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں ......

شیبلسکی:- مہمل .... میں سمجھتا ہوں کہ جرمن قوم بزدل ہے اور فرانسیسی بھی بزدل ہیں وہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ زبان درازی کرتے ہیں - یقین جانو کہ معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھیگا - وہ جنگ کبھی نہیں کریں گے -

بورکن:- اور میرا خیال ہے کہ جنگ کی ضرورت بھی نہیں - آخر اتمام اسلحہ بندی کانگریسوں اور اخراجات کا فائدہ کیا ہے؟ میں تمہیں بتاؤں کہ ایسی میں میں کیا کرتا - تمام ملک کے کتوں کو جمع کرکے ان کے جسم میں نشتر کے ذریعہ ایک مہلک مادہ پھیلا کر دان کو دشمن کے ملک میں چھوڑ دیتا - ایک مہینہ کے اندر اندر تمام دشمن کتے کے کاٹے سے دیوانے ہو جاتے

لبیڈیو:- (ہنستا ہے) اس کا سر دیکھنے میں چھوٹا ہے لیکن اس میں شاندار خیالات کی شدت ہے - جتنی سمندر میں مچھلیوں کی -

شیبلسکی:- یہ ان معاملات کا تو ماہر ہے -

لبیڈیو:- خدا بھلا کرے تمہارا مائیکل مالسوچ تم دل خوش کر دیتے ہو (ہنسنا بند کر دیتا ہے) ہم لوگ بک بک کئے جا رہے ہیں لیکن وادکا کا کیا ہوگا - ایک دور اور (تین گلاس شراب بھرتا ہے) ہم لوگوں کی بہترین صحت کیلئے (سب پیتے ہیں اور کچھ کھاتے ہیں) ہماری پرانی سرخ ہیرنگ مچھلی بہترین ناشتہ ہے

شیبلسکی:- نہیں ککڑی زیادہ اچھی ہوتی ہے ..... دنیا کی پیدائش سے لیکر اب تک بڑے بڑے علما سوچ سوچ کر تھک گئے - لیکن نمک اور ککڑی سے بہتر کوئی چیز اب تک نہیں سوچ سکے (پیوتر سے) پیوتر جاؤ کچھ ککڑی لے آؤ اور باورچی سے کہو کہ ہمارے لئے چار پیاز کے سموسے تل دے اور گرم گرم بھیجے - (پیوتر باہر چلا جاتا ہے)

لبیڈیو:- وادکا کے ساتھ کیویئر مچھلی بھی بری نہیں ہوتی لیکن اسکو استعمال ذرا سلیقہ سے کرنا چاہئے - ایک چھٹانک لیوتڑے کو دو - پرانی پیاز اور ذرا سے زیتون کے تیل میں ملالو - . . . . اور دو تین قطرے لیموں کا عرق ڈال کر کھاؤ . . . . . نہایت ہی لذیذ ہوتا ہے اور اس کی تو خوشبو حیرت انگیز ہوتی ہے

بورکن:- تلی ہوئی گجن مچھلی بھی وادکا کے بعد بہت مزیدار ہوتی ہے لیکن اسے تلنے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے - صاف کرکے پاؤ ز دنی

کے گوارے میں ملا کر اتنا تلنا چاہئے کہ سوکھ جائے اور چبانے میں
کرکر کرنے لگے۔۔۔۔۔ کر۔۔۔۔ کر۔۔۔ کر۔۔۔۔۔۔۔۔۔
شیبلسکی:۔ کل مادام بیاکن کے یہاں ایک بڑی اچھی چیز کھانے میں آئی۔۔۔
۔۔۔۔ ساگ
لیبیدیو:۔ میں کہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
شیبلسکی:۔ لیکن خاص طریقہ سے پکائی ہوئی۔ یوں سمجھو کہ پیاز، کنول کی
پتیاں اور کئی طرح کے مصالحہ کے ساتھ ملاکر جیسے ہی ڈھکن اٹھایا گیا
ایک بھاپ نکلی اور خوشبو۔۔۔۔۔۔ نہایت لذیذ
لیبیڈیو:۔ کیوں دوستو کیا خیال ہے، رہے ایک دو اور (سب پیتے ہیں)
ہماری بہترین صحت کیلئے (گھڑی دیکھتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ میں
نکولائی کا انتظار نہیں کرسکتا۔ اب چلنے کا وقت ہوگیا ہے تم کہتے ہو
کہ تم نے مادام بیاکن کے یہاں ساگ کھایا اور ہم نے ابھی تک ساگ
دیکھا بھی نہیں۔ او ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم مارخال کے یہاں کیوں گھسے
رہتے ہو؟
شیبلسکی:۔ (بورکن کی طرف اشارہ کرتا ہے) کیوں! آپ ان سے میری شادی
کرانا چاہتے ہیں
لیبیڈیو:۔ شادی! ائے بھئی تمہاری عمر کیا ہے؟
شیبلسکی:۔ باسٹھ برس
لیبیڈیو:۔ شادی کرنیکی بہترین عمر! اور مارفا سے تمہارا جوڑا بہت خوب ہوگا۔
بورکن:۔ سوال مارفا کا نہیں اسکے آدمیوں کا ہے۔
لیبیڈیو:۔ اور بھی کچھ فرمائیے۔ مارفا کے روپئے اسکے بعد کرنے کا
حوصلہ کیجئے گا۔
بورکن:۔ جب انکی شادی ہوجائے گی اور جیب روپئوں سے لدجائیگی۔
تب کہے گا کہ کرنے کا حوصلہ ہے کہ نہیں۔ انکی قسمت پر آپکو
رشک آئے گا۔
شیبلسکی:۔ اور جانتے ہو آپ اس معاملے میں بڑے خلوص کا اظہار فرماتے
ہیں ان علامہ زمان کو یقین ہے کہ میں وہی کروں گا۔ جو یہ فرماتے
ہیں۔ اس سے شادی بھی کروں گا۔
بورکن:۔ کیوں نہیں۔ یقینی۔ کیا تم کو بھی اس کا یقین نہیں؟

شیبلسکی:۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے کب اس کا یقین ہوا تھا
بورکن:۔ شکریہ۔۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔ تو آپ مجھے بیوقوف بنانا چاہتے
ہیں۔ پہلے تو کہا کہ شادی کروں گا اور اب فرماتے ہیں کہ نہیں کرونگا
۔۔۔۔۔ کون بیہودہ آپ کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اور میں زبان
دے چکا ہوں۔ تو تم اس سے شادی نہیں کروگے؟
شیبلسکی:۔ (کندھے ہلاتے ہوئے) تم اسے سچ سمجھ بیٹھے۔ عجیب آدمی ہو
بورکن:۔ (غصہ میں) اگر یہ بات تھی تو ایک شریف خاتون کو پریشان کرنے سے
تمہارا کیا مطلب تھا؟ وہ تو کاؤنٹس ہونے کے پیچھے پاگل ہو رہی
ہے، نہ سوسکتی ہے۔ نہ کھا سکتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور آپ اسکو
مذاق سمجھ رہے ہیں۔ یہ شرافت ہے؟
شیبلسکی:۔ (انگلی اٹھاتے ہوئے) خیر اگر میں یہ حرکت کر ہی بیٹھوں تو میرا
کیا ہوگا! صرف شرارت کیلئے میں جاکر شادی کر ہی لیتا ہوں۔
واللہ۔۔۔۔ بڑا تماشا ہوگا۔
(لووو داخل ہوتا ہے)
لیبیڈیو:۔ ڈاکٹر صاحب تسلیمات عرض ہے (لووو کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے
اور رگاتا ہے) ڈاکٹر صاحب خدا کیلئے مجھے بچائیے۔ جناب مجھ پر ۴۷
موت کی ہیبت طاری ہے۔
لووو:۔ کیا ابھی تک نکولائی الیکزیوچ نہیں آئے؟
لیبیڈیو:۔ جی نہیں۔ میں ایک گھنٹہ سے ان کا انتظار کررہا ہوں (لووو
بے میں اسٹیج پر ٹہلتا ہے) کیوں بھائی انا پیٹرونا کیسی ہے
لووو:۔ بہت بیمار ہے۔
لیبیڈیو:۔ (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) کیا میں جاکر عیادت کرسکتا ہوں؟
لووو:۔ نہیں مہربانی کرکے نہ جائیے! میرا خیال ہے وہ سو رہی ہے۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ (وقفہ)
لیبیڈیو:۔ وہ بہت نیک عورت ہے (ٹھنڈی سانس لیتا ہے)
ساشا کی سالگرہ میں جب وہ میرے یہاں بیہوش ہوئی تو میں نے
اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ بیچاری زیادہ عرصہ
تک زندہ نہیں رہیگی۔ معلوم نہیں اسکو کیا ہوگیا تھا۔ جب میں
دوڑ کر اسکے پاس گیا تو دیکھا وہ لیٹی تھی اور موت کی زردی اسکے

چہرہ پر چھائی ہوئی تھی۔ اسکے پاس نکولائی گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا۔ اور
اتنا ہی زرد ہو رہا تھا جتنی وہ اور ساشا رو رہی تھی ایک ہفتہ تک
میری اور ساشا کی یہ حالت رہی گو یا ہم لوگ چندھیا گئے ہیں۔
شیبلسکی:۔ (لووو سے) سائنس کے معزز علمبردار ذرا یہ تو بتایئے کہ وہ کون
عاقل دوران تھا جس نے یہ پتہ چلایا کہ جن عورتوں کے سینے کمزور
ہوتے ہیں انھیں نوجوان کی زیادہ آمد و رفت سے فائدہ ہوتا ہے
یہ بڑی عظیم الشان تحقیق ہے یہ کس کا کارنامہ ہے! ایلوپیتھک کا
یا ہومیوپیتھک کا؟
(لووو جواب دیتے دیتے رک جاتا ہے اور ایک نفرت آمیز نظر
ڈال کر چلا جاتا ہے)
شیبلسکی:۔ کیسی خشک کر دینے والی نظر تھی . . . .
لیبیڈیو:۔ معلوم نہیں کس شیطانی جذبہ میں تمہاری زبان اس طرح
چلنے لگتی ہے۔ اسکی توہین کیوں کی تمنے؟
شیبلسکی:۔ (چڑاونے انداز میں) تو وہ جھوٹ کیوں بولتا ہے۔
یہ سب جھوٹ ہے میں اسے برداشت نہیں کرسکتا
۴۷۸ لیبیڈیو:۔ آپ کیسے جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟
شیبلسکی:۔ (اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) میں یہ خیال برداشت نہیں کرسکتا کہ
ایک زندہ مخلوق بلاکسی وجہ کے مرجائے۔ چھوڑو اس موضوع کو
(کوشم داخل ہوتا ہے)
کوشم:۔ (ہانپتا داخل ہوتا ہے) کیا نکولائی الیکزیوچ گھر پر نہیں؟
اداب عرض ہے (جلدی جلدی سبھوں سے ہاتھ ملاتا ہے) کیا وہ
گھر پر نہیں؟
بورکن:۔ نہیں وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔
کوشم:۔ (بیٹھتا ہے اور پھر جھٹکے کے ساتھ اٹھتا ہے) اگر ایسی بات ہے
تو خدا حافظ (ایک گلاس شراب پیتا ہے اور پھر جلدی جلدی کچھ
کھاتا ہے) میں جاتا ہوں . . . . . . بہت مصروف ہوں . . .
. . . تھک کر چور ہو گیا ہوں . . . کھڑا ہونا بھی مشکل ہو رہا ہے . . .
لیبیڈیو:۔ تم نازل کہاں سے ہو گئے؟
کوشم۔ باربانو کے یہاں سے . . . . . . ہم لوگ رات بھر ونٹ کھیلتے
رہے۔ ابھی ابھی ختم کیا ہے . . . . میں تو پٹ گیا . . . . . .
وہ باربانو چمار کی طرح کھیلتا ہے! (رونی آواز میں) ذرا سنو۔
میں برابر پان کھیل رہا ہوں . . . . (بورکن کو مخاطب کرتا ہے
وہ کھسک جاتا ہے) وہ ٹھکری چل پڑا لیکن میں پھر پان کھیلا، وہ
پھر ٹھکری چل پڑا . . . . نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہاتھ بھی نہیں بنا سکا۔
(لیبیڈیو سے) ہم لوگ چار چڑیا بولے۔ میرے ہاتھ میں ایکہ بیوی
اور پانچ اور چڑیا کے پتے اور حکم کا ایکہ دہلا دو اور پتے تھی . . .
لیبیڈیو۔ (کانوں میں انگلیاں دیتے ہوئے) رحم کیجئے، خدا کیلئے مجھے
بخشئے۔
کوشم:۔ (کاؤنٹ سے) دیکھتے ہیں جناب، ایکہ، بیوی، چڑیا کے
پانچ اور پتے ایکہ اور دہلا دو اور حکم . . . .
شیبلسکی:۔ (اس کو ہٹاتے ہوئے) چلے جاؤ میں تمہاری بات نہیں سنا چاہتا
کوشم:۔ اور یکایک ایسی بدقسمتی کے حکم کے ایکہ پر پہلے ہی ہاتھ میں ٹرمپ
ہو گیا۔
شیبلسکی:۔ (میز پر سے ایک ریوالور اٹھاتے ہوئے) چلے جاؤ نہیں تو میں
تمہیں گولی مار دوں گا
کوشم:۔ (ہاتھ ہلاتا ہے) برا ہو اس کا . . . . کیا ایک بھی ایسا آدمی نہیں
جس سے میں کچھ باتیں کرسکوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں آسٹریلیا
میں پہونچ گیا ہوں، نہ کوئی مشترک دلچسپی ہے نہ ایک دوسرے
سے ہمدردی . . . . سب کے سب اپنے آپ میں مگن ہیں . . .
. . . خیر مجھے چلنا چاہئے . . . . . دیر ہو گئی۔ (اپنی ٹوپی جھپٹ کر
اٹھالیتا ہے) وقت قیمتی ہے (لیبیڈیو سے ہاتھ ملاتا ہے) پاس
(قہقہہ) (کوشم چلا جاتا ہے اور دروازہ میں اودوتیا نداروونا
سے ٹکر کھاتا ہے)
اودوتیا:۔ (چینختی ہے) خدا غارت کرے مجھے دھکا دیتے ہو۔
سب لوگ:۔ آ۔ آہ۔ یہ تو ہر جگہ موجود رہتی ہے۔
اودوتیا:۔ تو تم سب لوگ یہاں ہو اور میں نے گھر بھر ڈھونڈھ ڈالا۔
گڈ مارننگ۔ میرے چمکتے ہوئے فاختو۔ کھانے کا مزہ لے رہے ہو؟
(سبھوں کو خوش باش کہتی ہے)

لیبیڈیو:۔ آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں؟

اودوتیا:۔ کام ہے جناب والا (کاونٹ سے) ایسا کام جس کا تعلق۔ آپ سے ہے حضور عالی۔ (جھکتی ہے) مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو سلام کہوں اور خیریت دریافت کروں ...... میری خوبصورت گڑیا نے مجھے تم سے یہ کہنے کا حکم دیا ہے کہ اگر آج شام تم آکر اس سے ملاقات نہیں کروگے تو وہ رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالے گی اس نے کہا، مائیڈیر اس کو الگ لیجاکر کان میں رازدارانہ طریقہ پر کہنا۔ لیکن رازداری کی کیا ضرورت ہے، یہاں پر ہم سب ایک دوسرے کے پرانے دوست ہیں۔ اسکے علاوہ کچھ گناہ تو کر نہیں رہے ہیں۔ ہم تو فریقین کی رضامندی اور محبت کے ساتھ جائز طریقہ پر شادی کرانا چاہتے ہیں۔ یوں تو میں ایک گنہگار عورت ہوں لیکن ابتک شراب کا ایک قطرہ بھی چکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ مگر اس موقع پر ایک گلاس پیوں گی۔

لیبیڈیو:۔ اور میں بھی ایک گلاس پیوں گا۔ (گلاس بھرتا ہے) اور بڑھی کبوتری تم پر تو سن و سال کا کوئی اثر بھی نہیں معلوم ہوتا۔ تم اس وقت بھی کافی بوڑھی تھیں جب تیس سال قبل میں تم سے پہلے پہل ملا تھا۔

اودوتیا:۔ اب تو میں سالوں کا شمار بھی بھول گئی ... دو شوہروں کو دفنا چکی ہوں۔ تیسرے سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن جہیز کے بغیر کوئی مجھے قبول ہی نہیں کرنا چاہتا۔ آٹھ لڑکے ہوئے ...... (گلاس اٹھاتی ہے) خیر خدا کرے کہ ہم لوگوں نے یہ نیک کام جو شروع کیا ہے اسکی مہربانی سے انجام کو پہونچ جائے۔ یہ دونوں زندہ رہیں گے۔ پھلے پھولیں گے اور ہم لوگ ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اللہ کرے، دونوں میں محبت اور یگانگت ہو (پیتی ہے) یہ تو کڑ وی وودکا ہے۔

شیبلسکی:۔ (ہنستے ہوئے لیبیڈو سے) لیکن جانتے ہو بڑا طرفہ یہ ہے کہ لوگ واقعی سمجھتے ہیں کہ میں .... حیرت انگیز بات ہے (اٹھ جاتا ہے) کیا خیال ہے تمہارا پادشاما واقعی میں یہ حرکت تبسیح کر ہی ڈالوں۔ صرف شرارت کے لئے ... بڈھا کتا ہڈیاں کیوں نہ چبائے پاشا این!

(باقی)

قاضی عبدالغفار

پیش لفظ

کسی دلدوز نغمہ پر اظہارِ ستائش کرنا، کہ ارباب محفل نقادِ فن سمجھ کر داد کی داد دیں، کھلی ہوئی بازاریت ہے، "پیش لفظ" پڑھ کر جو طوفان اٹھے ان کے بیان پر نہ قدرت ہے نہ اظہار ستائش کی ہمت۔ کہنا صرف یہ ہے کہ یہ شاہکار ایک تصنیف کا نامکمل دیباچہ ہے جو قاضی عبدالغفار صاحب نے بیگم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے اصرار سے "جہاں نما" کے لئے عنایت کیا، اور بیگم صاحبہ نے ایشیا کو عطا فرما دیا۔

(ساغر)

روحوں میں طوفان اٹھتے ہیں جس طرح سمندروں میں — ایک ایسے ہی طوفان میں کسی کشتی کے غرق ہونے کا یہ قصہ ہے۔ اگر آپ سمجھنا بھی چاہیں تو سُن لیجئے اور اگر سمجھنے میں کچھ زحمت ہو تو شکایت نہ کیجئے۔ کہنے والا اس بات کا ضامن نہیں کہ آپ سمجھ بھی جائیں گے!۔

اس سمندر کا داستان گو نہ جانے کب سے اپنی داستان بیان کر رہا ہے اور نہ جانے کب تک بیان کرتا رہیگا۔ لیکن اس داستان کا انجام نہ وہ بیان کر سکا اور نہ کوئی سننے والا اس کا تصور کر سکتا ہے طوفان کی ایک موج یہ داستان بھی ہے لیکن پھر کیا ہوگا اگر اس موج کو اسکے سمندر سے جدا کر دیں؟ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ یعنی موج سے شناسائی اور سمندر سے بیگانگی!۔

ان طوفانوں میں جتنی ان گنت موجیں ہیں اتنی ہی لاتعداد کشتیاں ہیں۔ ہر موج کو جو اٹھتی ہیں آپ شمار کیجئے اور ہر کشتی کو جو غرق ہوتی یا چٹان سے ٹکراتی ہے یا موجوں کے تھپیڑے کھا کر کسی ویران ساحل پر الٹ جاتی ہے آپ گن لیجئے۔ ان کشتیوں میں بہت سی ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو موجوں نے کسی پتھریلے ساحل پر پٹک دیا اور پھر کسی دن سمیٹ کر لے گئیں۔ ان ٹوٹی ہوئی کشتیوں کو بھی موج کے آغوش میں جگہ ملتی ہے۔ وہ بار بار پٹکی جاتی ہیں اور بار بار اسی آغوش میں سمیٹ لی جاتی ہیں! جب تک ان کا ایک تختہ بھی باقی ہے ان کے اور موج کے درمیان یہ لگن باقی رہتی ہے — تم اسے فلسفہ کہو گے میں اسے کیفِ حیات کہتا ہوں!۔

یہ ایک چھوٹی سی پُورانی کشتی تھی — کوئی بڑا جہاز نہ تھا — جس کا حال تمہیں سناتا ہوں۔ اس کشتی کے بادبان پارہ پارہ ہو چکے تھے اور اسکے پتوار ٹوٹ چکے تھے اور ملاح کی نوازشوں سے وہ محروم ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ تھی ایک کشتی۔ کتنی ہی سخت اور پھسلواں چٹانوں پر وہ پٹخی گئی۔ کتنے ہی ساحلوں پر اوس نے تنہائی کے دن اور کس مپرسی کی راتیں بسر کیں۔ لیکن جن موجوں نے اسکو پٹخا تھا وہی اسکو اٹھا کر لے گئیں — پروردگان آغوش موج کی یہ داستان کوئی نئی تو نہیں ہے!۔

کسی ملاح نے موج اور کشتی کے اس لگاؤ کو اپنی ایک مثنوی میں بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ:۔

"موج اور کشتی الگ الگ دو نام ہیں لیکن حقیقت
ایک ہے حقیقت میں یہ دو موجود ہیں۔ کشتی کے بغیر
موج کی نمود کیا ہے؟ سوائے اسکے کہ وہ سمندر کی
ایک ٹھوکر ہے اور بغیر موج کے کشتی کیا ہے؟ سوائے
چند تختوں کے جن کو بڑھئی نے اپنی آری سے کاٹا
تھا اور اپنے ہتوڑوں سے کوٹا تھا"

شاعر کے ان تصورات کو تم جب زندگی کے سانچے میں ڈھالکر دیکھو گے تب تم کو یہ خبر ملے گی کہ جس طرح سمندر بغیر موج کے بیجان ہے اسی طرح موج بغیر کشتی کے اپنی قوت پر مغرور اور سربلند نہیں ہو سکتی۔ سمندر

ایشیا جون، جولائی ۱۹۶۲ء

میں موج کا رقص اور موج کے رقص میں کشتی کی گردش ـــــ نقطۂ تکمیل یہ ہے اور شاید اس کو انسانوں کی اصطلاح میں جوانی کہتے ہیں ۔

مجھے معلوم نہیں کہ کشتی کتنے چشموں اور دریاؤں سے گزرتی ہوئی کتنے ساحلوں کو چھوتی ہوئی کتنے سمندروں کے سینہ پر اچھلتی ہوئی کتنے بادلوں کی کڑک اور کتنی بجلیوں کی تڑپ سے آشنا ہوتی ہوئی۔ اس بظاہر آخری طوفان کے دامن تک پہونچی تھی جس سے میری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اُسکو ایک ویران جزیرہ کے پتھریلے ساحل پر بہت شکستہ حالت میں پایا۔ وہ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح سے اون قافلوں کا خروش سُن رہی تھی جو سمندر کے طوفان میں گزر رہے تھے لیکن اُن تک پہونچ نہیں سکتی تھی ـــــ اسکی خستگی اور درماندگی سراپا انتظار تھی ـــ اُسکی تھکن میں بھی آغوشِ موج کے ہنگاموں کی تمنائیں بیدار تھیں ۔

جاڑوں کی یہ رُت تھی۔ ویران جزیرہ کے ساحل پر وہ آخری منظر میں نے دیکھا تھا جب پرخروش اور غضبناک سمندر کی بے پروا موجوں نے اس کشتی کو اتنے چکر دئے تھے۔ اتنی دفعہ اچھالا اور گرایا تھا کہ اس کے رقص کی ہر لرزش سے ایک ایسی تھکن مترشح ہونے لگی تھی جسکو دنیا کے لوگ بڑھاپے کے نام سے یاد کرتے ہیں ! لیکن کیا طوفان کی موجوں کے جھکولوں سے جدا ہو کر ساحل کی چٹانوں پر رکھ جانا کوئی ایسی انتہا ہے جو پھر کبھی اپنے آغاز کی طرف رجوع نہ ہوگی ؟ یا اگر یہ امکان باقی ہے کہ کسی دن پھر کوئی موج اس اندھی کشتی کو یا اسکے ٹوٹے ہوئے تختوں کو اپنی دامن میں لپیٹ کر لیجائیگی اور سمندر کے سینہ پر رکھدیگی تو پھر کیا ان ٹوٹے ہوئے تختوں کی یہ انتہا بھی انکے آغاز ہی کا دوسرا نام نہیں ہے ؟ اور نہیں تو پھر کیا ہے ؟ ۔

موسم سرما کی اندھیری رات تھی جس کی ظلمت کے سینہ میں ایک بے اختیار آرزو کی طرح ، ایک بے محابا تمنا کی صورت ۔ بجلی چمک رہی تھی کہ گویا غضبناک دیوتاؤں کی فوجیں مصروف پیکار ہیں ۔ ان دیوتاؤں کے سمندر کا نیلا پانی رات کی سیاہی سے اتنا سیاہ فام تھا کہ اگر چٹانوں کی سخت موجوں کے منہ میں کف پیدا نہ کرتی جس کے دھبے بجلی کی چمک کے ساتھ نظر آرہے تھے تو آسمان و زمین کی وسعتوں میں ایک زہرہ گداز خروش کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا ہوتا۔ موجوں کے سینہ کو کشتیوں کی پتوار شیر کے پنجہ کی طرح چیر رہے تھے ۔ ہوا کا وہ فراٹا ۔ بادل کی گرج اور چٹانوں پر موجوں کے تھپیڑوں کی آواز ـــ ارض و سما کی درمیانی وسعت میں یہ سارا خروش بقا سے فنا اور فنا سے بقا کی منزلوں کا ایک پھیلاؤ تھا جس میں اس مضطرب کشتی کی جوانی نے ہزار دفعہ بوڑھاپے کی منزلیں طے کیں اور ہزار دفعہ اپنے بوڑھاپے سے جوانی کی طرف عود کیا ! یہ ہر آن اور ہر لمحہ کی ایک مسلسل داستان ہے برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی کی پرخروش موجوں کے عریاں شانوں اور مضبوط بازوؤں پر برف کے گالے اس طرح گر رہے تھے کہ اگر تاریکی نہ ہوتی تو سارا عالم سفید ہی سفید نظر آتا

ہر نئی موج کے تھپیڑے میں اس کشتی کے شکستہ پتواروں کی چڑچڑاہٹ کی آواز آنیوالے بوڑھاپے اور جانیوالی جوانی کی کشمکش کا ایک کرب ناتمام تھا جس میں موج کے بازو کی قوت ایک طرف اور کشتی کا زندہ رہنے پر اصرار دوسری طرف اپنے ارادوں کو آزما رہا تھا۔ ہر تھپیڑے کے بعد یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی تھی آخری ضرب ہے لیکن مضطرب سمندر کی کھلی ہوئی گود میں کشتی کے تختوں کی مسکراتی ہوئی دراز ہر موج سے یہ کہتی سنائی دیتی تھی کہ

"میں کیونکر فنا ہو سکوں جب تک کہ تو باقی رہے"

ویران جزیرے کے ساحل پر شاعر کی چشم نگراں اس کشمکش کو دیکھ رہی تھی اور فلسفی حیران تھا کہ اگر اس طوفان زندگی کا کوئی آخری مقام بھی ہے تو وہ کہاں ہے ۔ کہاں ہے کوئی ایسا سکون مطلق جسکی خاموش وادیوں میں سمندر سو جائے اور موج بے خروش ہو جائے ۔

ابھی مشرق کی حد نظر پر ایک سرخ پردہ کی جھالر کو سمندر کی موجیں اپنے دامن سے دھو رہی تھیں اور رات کی تھکی ہوئی کشتی نے ساحل کے

سامنے دم لینا چاہا تھا کہ یکایک کسی زیادہ شوخ موج نے اسکے نیچے کا ندھا مارا اور پہلے اس سے کہ یہ سفینۂ صبح کے سکوں میں موج کی اس شوخی کے خلاف کوئی احتجاج کرے۔ صرف ایک ہی جھکولے میں وہ ساحل کی چٹان پر پھینک دیگئی۔ زندگی میں بہت سے دن ایسے ہوتے ہیں جب سورج نکلتا ہے مگر صبح نہیں ہوتی یا جب صبح ہو جاتی ہے مگر سورج نہیں نکلتا! لیکن زندگی کی بہت سی وحدتیں جو صبح کا انتظار کرتی ہیں یا سورج کو دیکھنے کی تمنا رکھتی ہیں۔ غلطی یہ کرتی ہیں کہ شاعر سے مشورہ کئے بغیر مایوس ہو جاتی ہیں! ان بدنصیبوں کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ کسی دن ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح اور سورج دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ سورج کی کرنیں صبح زندگی کے دامن سے لپٹی ہوئی آتی ہیں۔ یہ صبح بہت روشن ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رات بھر کے طوفان کے بعد ہی وہ آتی ہیں!۔

غضبناک سمندر نے آخری جھکولے سے کشتی کے تختوں پر کیلیوں کی گرفت بہت ڈھیلی کر دی تھی اور ساحل کی ناہموار سطح پر دور سے یہ ایک دھبہ سا نظر آتا تھا جس پر موجیں اپنے جھاگ اڑا رہی تھیں ـــــ اس طرح جیسے برات کے دولہا کی سواری پر یا کسی تابوت پر پھول برسائے جاتے ہوں!۔ دولہا کی سواری اور جنازہ کا درمیانی فاصلہ اتنا کم ہے کہ شاعر یا فلسفی جب جنازہ سے برات تک اور برات سے جنازہ تک منزلیں شمار کرتا ہے تو موت وحیات کے اس محور پر کچھ بھی نہیں پاتا سوائے ایک ”عزم حیات“ کے۔ اس کی نظر میں کشتی کا ٹوٹا ہوا ہر تختہ بجائے خود ایک کشتی ہے! . . . .

صاحبزادہ محمد علی خاں میکش
حیدرآبادی

شام

چھین لے، اس ظلمت وانوار کی دُنیا سے شام
جستجوئیں نامکمل، آرزوئیں ناتمام
اپنے دامانِ شفق کو کر بھی لے رنگین تر
نوجوانی دے رہی ہے، لے تجھے خونِ جگر

آسماں پر نور و ظلمت کا یہ ہلکا اتصال
جیسے دُلہن کے دھڑکتے دل میں دُھندلے سے خیال
ٹہنیوں پر یہ تھکے ماندے پرندوں کی پُکار
جیسے پھولوں کی ہنسی میں چند لمحوں کی بہار
ڈوبتے خورشید کی یہ نیم جاں پرچھائیاں
نیند سے پہلے کی جیسے مضمحل انگڑائیاں

چھا رہا ہے پھر اندھیرا، جل رہے ہیں پھر چراغ
نااُمیدی میں چمک دکھلا رہے ہیں دل کے داغ
ایک گہری فکر میں کھویا ہوا ہے پھر شباب
بن رہے ہیں ”آج“ کی آنکھوں میں ”شاید کل“ کے خواب
رقصِ انجم کے لئے بزمِ فلک کا اہتمام
لے رہا ہے پھر مرے اشکوں سے اندازِ خرام
ہو رہی ہے زندگی پھر ایک خاموشی میں گم
اک فریبِ مرگ میں، اک خود فراموشی میں گم

تُو جو آئی، غم کو حُسنِ جاودانی مل گیا
آخری سانسوں کو ذوقِ زندگانی مل گیا

عبدالرشید عرفاں

رکشا والا

"دیوی جی! آپ روزانہ کوٹھی جاتی ہیں نا ؟"

"ہوں ——— کیوں ؟"

"یونہی ——— اگر ——— قریب ہی کے رکشا پر" ——— یہ کہہ کر رکشا والا ملتجی نگاہوں سے تکنے لگا۔

"اُف! بہت گرمی ہے ذرا تیز چلو" ——— ایک مرتبہ رکشا نے ذرا زور سے ہچکولا کھایا، تھوڑی دور چلنے پر رفتار پھر دھیمی ہوگئی جیسے رکشا والے کی بھدی پنڈلیوں کے اُبھری ہوئی رگوں میں خون جم کے رہ گیا ہو، اس نے انگوچھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"سچ مچ بہت گرمی ہے، تھوڑی ہی دور میں جان نکل گئی ——— ہاں تو روزانہ اسی وقت آپ کوٹھی جاتی ہوں گی ———!؟"

"نہیں اس سے کچھ سویرے ہی، آج کچھ دیر ہوگئی ہے ——— بس بس آہستہ سامنے والی کوٹھی ہیں۔

"بہت اچھا سرکار"

"کے پیسے ہوئے تمہارے ؟" ———

"ہونہہ! بھلا آپ نہیں جانتی ہیں ——— ہیں ہیں" ——— رکشا والے نے ایک کثیف ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا" روز کا آنا جانا رہا ہوگا، آپ سے کیا چھپا ہے سرکار ؟" ———

"اچھا یہ لو اور دیکھو کل ساڑھے آٹھ بجے ہی ہم کو فرصت ہو جائیگی، کل سنیچر ہے اور ہاں سنو! پرسوں اتوار ہے، تم جانتے ہو نا کہ اتوار کو چھٹی رہتی ہے ؟" ———

"جانتے ہیں دیوی جی! ——— ہم بھی جب ———!!"
جیسے رکشا والے کے سامنے اس کے طالب العلمی کے زمانہ کا سارا اتوار ناچ گیا ہو

"کیا تم بھی جب ——— ؟"

"کچھ نہیں ——— یہی کہ ہم بھی جب پڑھتے تھے تو ——— !"

"اچھا! تم بھی کبھی پڑھتے تھے ——— ؟ ——— تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے رکشا والے ؟"

"یہی معمولی سی چند کلاسیں سرکار" ———

"آخر کہاں تک تم نے پڑھا ہے ؟" ———

"کیا کیجئے گا پوچھکر سرکار ؟ ——— کل ٹھیک وقت پر ہم ضرور پہونچ جائیں گے، دیکھئے دوسرا رکشا نہ کر لیجئے گا ———"

——— اُس نے پیسوں کو انٹی میں رکھا۔ اور پاس والے نیم کی چھاؤں میں جاکر پسینہ سے تر گنجی کو اُتار کر ہوا دینے لگا، جب ذرا جان میں جان آئی تو پائپ پر جاکر مُنہ ہاتھ دھویا، پانی پیا اور پھر بڑبڑانا شروع کیا۔

"کتنی شریف ہیں یہ؟ آج کل کون غریب پر نظر کرتا ہے، کرایہ بھی تو بیجا نہیں دیا، دو پیسے زائد ہی دیدیئے، کل کہدوں گا، سرکار ۲ پیسے بیشی آپ نے دیئے ہیں ——— لیکن ——— شاید برا مانیں، بڑوں سے زیادہ بولنا بھی تو ٹھیک نہیں، مگر کل یہ ضرور پوچھوں گا اُس طرف سے کس کے رکشا پر آتی ہیں، شاید میرے ہی رکشا پر!"

——— کشور نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آسمان تو کسی کے دن ہمیشہ یکساں نہیں رہنے دیتا ——— گاؤں میں جو ہیضہ کی وبا پھیلی تو خاندان کا خاندان اجڑ گیا، ایک ایک مکان سے بہ یک وقت پانچ پانچ، چھ چھ لاشیں نکلتی تھیں، کوئی جنازہ اٹھانے تک کو نہیں تھا ——— بُرا ہو لڑائی کا۔ شاید کہیں سے "کالرا فیج" شیشیوں میں بند ٹرین سے جارہے تھے ان میں سے کچھ شیشیاں کسی طرح ٹوٹ گئیں اور پورے گاؤں میں ہیضہ پھیل گیا ——— جگت پور جو آج کل ایک ویران اُداس اور سُنسان بستی ہے کچھ دنوں پہلے پھلا پھولا، صدا بہار گاؤں تھا، نہ جانے کشور نے اُس جہنم میں کون سا ارادہ کیا تھا یا کمزور مزدور اور غریب

کسانوں پر اس کے آبا و اجداد کے بے جا ظلم و تشدد کا ثمرہ تھا یہ کہ جسکی سزا وہ رکشا والا ہو کر بھگت رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، بہت ٹھیک کہتے ہیں لوگ۔ کشور آخر کرتا کیا، اس نے تعلیم بھی تو زیادہ نہیں پائی تھی، دسویں جماعت تک وہ بھی حقیر سے قصبے کے اسکول میں ــــ آج کل تو کتنے بی، اے مارے مارے پھرتے ہیں۔ افلاس کی شدت اور بھوک نے سینکڑوں کو ادنیٰ جگہوں کی خانہ پُری کیلئے آمادہ کر دیا ہے۔ کشور تو انکے مقابلہ میں کم پڑھا لکھا اور اجڈ دیہاتی تھا ــــ پھر بھی ایک تعلیم یافتہ سے زیادہ پاک طینت ــــ مگر پاک طینتی پیٹ نہیں بھر سکتی۔ اسے اپنا پیٹ پالنا تھا ــــ گاؤں کے کسی بھلے مانس نے رائے دی ہوگی۔ بھیّا! تم ابھی بھگوان کی دیا سے جوان، مضبوط، اور تندرست ہو۔ پڑھے لکھے ہو شہر کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہاں کسی کے لڑکے کو پڑھانا اور کچھ نہیں تو کم از کم بھر پیٹ کھانے کو تو مل ہی جائیگا! مصیبت کے وقت ذرا سی دلجوئی بھی انسان کے لیے بڑا سہارا ہوتی ہے، فلاکت زدہ کشور کے سامنے ایک دھندلا سا پُر امید مستقبل ناچ گیا، اُس کے خیال میں ایک لہر سی دوڑ گئی، اسی روز پو پھٹتے

ہی اُس نے باپ دادا کی نگری کو خیر باد کہنے کی ٹھان لی۔ شہر جاتے وقت اُسکے قدم من من بھر کے ہوگئے تھے۔ وہ چلا جا رہا تھا اور مڑ مڑ کر اپنی جنم بھومی کو تکتا جاتا تھا ــــ وہ جا رہا تھا، پُر بہار باغوں ہرے بھرے کھیتوں، پُل اور اپنے کنوئیں کی منڈیروں کو چھوڑ کر جہاں گاؤں کی حسین و اُلھڑ کنواریاں پانی بھرنے آتی تھیں ــــ وہ چلا جا رہا تھا۔ بھوک کا مارا ہوا، اُن حسین اور رسیلے نغموں کو چھوڑ کر جو برکھا کی سہانی رات میں دیہاتی سندر کنواریاں مست ہو ہو کر چھیڑا کرتی تھیں ــــ اسے بچپن کے خوشگوار دن رہ رہ کر یاد آ رہے تھے وہ درختوں کو یاس میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے آلودہ نگاہوں سے دیکھتا تھا، درختوں کی ڈالیوں کو تو عالم وارفتگی میں بے تحاشا پکڑ پکڑ کر چومتا جاتا تھا ــــ لیکن وہ آگے ہی بڑھتا جاتا تھا کیونکہ اسے آگے ہی بڑھنا تھا ــــ وہ زمانہ بیتے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے جب یہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ دن دن بھر انہیں شاخوں پر ڈول پتا، کھیلتا تھا، اسکی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، لیکن اس کے قدم آگے ہی

اُٹھتے جاتے تھے، کوئی اجنبی طاقت اسے روکتی تھی لیکن کوئی نامعلوم جذبہ اسے اپنی طرف کھینچتا تھا ــــ دن چڑھے وہ شہر میں پہنچ گیا در در کی خاک چھان ماری لیکن ہر جگہ ناکامی و محرومی، یہاں تک کہ فاقوں کی نوبت پہنچی کیونکہ ایک دیہاتی اگر تلاش معاش میں شہر آکر کم از کم ایک دو وقت فاقہ نہ کرے تو وہ دیہاتی کیسے کہلا سکتا ہے ــــ

ــــ پر پیٹ کی مار بڑی ہی بری ہوتی ہے، مرتا کیا نہ کرتا مجبوراً اُسے رکشا کھینچکر پیٹ کا جہنم بھرنا پڑا، وہ جوان تھا، تندرست اور پھر گاؤں کا رہنے والا کچھ ہی دنوں میں اُسے رکشا کھینچنے کی عادت سی ہوگئی۔ یا یوں سمجھئے کہ غربت، مجبوری اور وقت کے تقاضوں نے مجبوراً سب کچھ سکھلا دیا۔ اپنے پیٹ بھرنے کیلئے روزانہ پیسے کما لیتا اُسے زیادہ کمانے کی فکر نہ تھی۔ اس کا تھا ہی کون؟ کس کیلئے یہ کماتا؟ مالک کا بھاڑا اور اپنی خوراک کے لئے روزانہ پیدا کر لیتا تھا ــــ مگر اس کا دل اس زندگی سے غیر مطمئن تھا، درد و کرب کی لہریں اُسکے دل میں اس طرح اُٹھتیں جیسے سمندر میں طوفان، وہ رہ رہ کر اس تکلیف دہ خیال کو دل سے نکال دینے کی اکثر کوشش کرتا ــــ ناکام کوشش! کیونکہ بعض وقت بلکہ اکثر گھر، گاؤں، اپنے بیگانے کی یاد اسکے دل میں بے طرح چٹکیاں لینے لگتیں، وہ ہمیشہ کھویا کھویا، چپ چپ سا رہتا، اوروں کی طرح اپنے درد دکھ کی کہانی لوگوں کو سنا کر وقتی طور پر اسے اپنا غم ہلکا کرنا بھی نہ آتا تھا، مزدور تھا مگر غیرت اسکی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس مفلسی کی حالت میں بھی اسکی خودداری اچھوتی تھی، انھیں تفکرات میں کبھی کبھی اسکی طبیعت بری طرح بگڑ جاتی اور اس وقت اسکو اپنی چھوٹی بہن پربھا یاد آجاتی جو گھنٹوں اُس کا سر دابا کرتی تھی۔ اُٹھکر اپنے نازک ہاتھوں سے پانی پلاتی تھی ــــ اس کا دل تڑپ کر رہ جاتا۔ وہ کسی دن تو کچھ کماتا بھی نہیں تھا، اس سے جب لوگ پوچھتے وہ کماتا کیوں نہیں؟ تو صاف جواب دیتا کس کیلئے کمائیں زیادہ کما کر کیا ہوگا؟ ــــ بات آئی گئی ہوئی۔

ــــ آج بھی وہ ملول تھا، کوئی بات یاد آ گئی ہوگی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا، یہ سوچ رہا تھا کہ روزانہ اور رکشا والوں کی طرح مجھے بھی چند مقررہ سواریاں ملجاتیں اور مہینے پر حساب ہوا کرتا تو اس طرح

گلیوں کوچوں میں مارے مارے پھرنے سے نجات ملجاتی، اس فکر میں ڈوبا غیر ارادی طور پر رکشا لئے ہوئے گرلز اسکول کے سامنے جانکلا ایک نازک اور سریلی آواز آئی "اے رکشا! چورنگی تک چلوگے؟"

—— کشور نے گھوم کر دیکھا، کچھ بڑھا اور جھجکا، جھجکا اور بڑھا—

ہاں حضور! رکشا حاضر ہے!"—— آج تک اس نے کسی دوشیزہ کو رکشا پر نہیں بٹھایا تھا، اسے شرم معلوم ہوتی تھی کہ عورت کو بٹھا کر کھینچے، کتنی بار تو اس نے بہت سی لڑکیوں کو یوں ہی کہہ کر ٹال دیا تھا کہ رکشا خالی نہیں ہے!—— لیکن آج پرمیلا کی آواز نے خلاف معمول نہ جانے کیوں اسے انکار نہ کرنے دیا۔ شاید یہ وجہ ہو کہ آج صبح سے اس نے ایک پیسہ بھی نہیں کمایا تھا—— اُس نے گدی جھاڑ دی، دھوپ سے بچاؤ کیلئے چھتری اٹھا دی۔ ان انتظامات میں اُسے ایک حظ محسوس ہو رہا تھا، اس نے آج تک کسی خاتون سے اتنا گھل ملکر باتیں بھی نہیں کی تھیں——

اس دن کے بعد وہ روزانہ وقت سے پہلے ہی اپنا رکشا لئے گرلز اسکول کے بڑے پھاٹک پر کھڑا رہتا، جب پرمیلا رکشا پر چڑھ جاتی یہ اسے کبھی بہت تیز، کبھی بالکل آہستہ، کبھی ذرا دھیمی رفتار سے لیجاتا اور راہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور چھیڑتا، گفتگو کے مختلف پہلو نکالتا کچھ نہیں تو کم از کم یہی کہتا کہ سرکار آپ بڑی اچھی ہیں! زیادہ کما کر کیا ہوگا حضور، بس آپکو روز لیجاتا ہوں، دو تین سواری شام کو سینما والوں کی ملجاتی ہیں۔ بس دال روٹی بھر پیٹ کھانے کو ہو جاتا ہے

—— پرمیلا اسکی باتوں پر ہوں ہاں کر دیتی اور جب کچھ جواب نہ دیتی تو کشور گھوم کر تکتا پھر آپ ہی آپ ہنس کر کہنے لگتا "سرکار بہت پڑھتی ہیں، رکشا تک پر سرکار پڑھتی ہی رہتی ہیں!——"

"تمہارا کیا نام ہے رکشا والے" ایک روز پرمیلا نے یونہی پوچھ لیا۔ میرا نام؟—— میرا نام کشور ہے سرکار"——

"اچھا کشور تم رہتے کہاں ہو؟"—— کشور سوچنے لگا کیا جواب دے۔ نہ اس کا گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ وہ تو فٹ پاتھ ہی پر اپنا وقت بتاتا ہے——

—— پرمیلا کو کشور کی عجیب و غریب، بھولی بھالی، بہکی بہکی اوٹ پٹانگ باتوں سے کچھ دلچسپی سی ہوگئی تھی، اس کا راستہ مزے سے کٹ جاتا تھا—— آج شہر میں پہلی مرتبہ کسی نے اتنی مدت بعد کشور کو کشور کہہ کر پکارا تھا، کشور کا دل بھر آیا، اس کی آواز بیٹھنے لگی اسے اس وقت اپنا گھر بری طرح یاد آرہا تھا—— وہ ویرانی اور تباہی!—— پر اس نے چونک کر فوراً جواب دیا، "رہیں گے کہاں سرکار، جہاں رات ہوگئی وہیں رہ گئے۔ کشور نے بڑی مشکل سے ان الفاظ کو ادا کیا۔ اسکی آواز تھرتھرا رہی تھی اور ہونٹ بری طرح کانپ رہے تھے، پرمیلا نے متعجب ہو کر پوچھا "کیوں کشور؟ کیا بات ہوئی؟ شاید تم——"

"نہیں کچھ نہیں کہاں کچھ ہوا سرکار—— آہ! کبھی کبھی مگر بری طرح یاد آجاتا ہے۔ آج بیکار آپ نے میرا نام پوچھا—— میں تو اپنا نام جیسے بھول ہی گیا تھا۔ میرے کان برسوں سے اپنا نام سننے کو ترس رہے تھے، دیوی جی! میں نے تو یقین کر لیا تھا کہ میرا نام رکشا والا ہو گیا ہے"——

"تو کشور! یہاں تمہارا کوئی بھی اپنا نہیں ہے کیا؟"

"آپ کیا غیر ہیں سرکار؟—— آپ بھی تو اپنی ہی جیسی ہیں—— جب سے میں آپ سے ملا ہوں میرا بہت کچھ دکھ درد ہلکا ہو گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہت دن بعد کوئی اپنا ملا ہے جس نے مجھے کشور کہہ کر پکارا——"

"ہوں"—— پرمیلا خاموش ہوگئی، کشور لرز گیا اس سے کوئی گستاخی تو نہیں ہوگئی—— ایسا ہی ایک دن اِدھر اُدھر کی گپ کرتے ہوئے کہا "سرکار!" پھر وہ عجیب سراسیمگی کی حالت میں پرمیلا کو تکنے لگا، اس کے پاس الفاظ نہیں تھے پوچھنے کیلئے—— لیکن پرمیلا کی مہربان نگاہوں نے بتلا دیا تھا کہ وہ خفا نہ ہوگی۔ جن الفاظ میں چاہے وہ باتیں کر سکتا ہے——

"ہاں! تم کیا کہنا چاہتے تھے کشور؟" پرمیلا نے جو اسکے دکھ درد کی کہانی سُن کر اس پر ترس کھانے لگی تھی پوچھا——۔

"حضور کا نام؟"، کشور نے دبی زبان سے کہا، پرمیلا ہنس دی اور ہنستے ہوئے اس نے جواب دیا "میرا نام پوچھکر تم کیا کروگے؟"

کشور چپ ہوگیا، اُس نے سوچا سچ تو ہے، نام پوچھکر میں کیا کروں گا؟
——— وہ بہت پشیماں ہوا، خود پر لعنت ملامت کرنے لگا اس سے
ایسی غلطیاں کیوں ہوجایا کرتی ہیں ——— پرمیلا نے محسوس کیا
کشور اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہے، اس نے کہا "مجھے پرمیلا دیوی
کہتے ہیں، تمہیں یہ نام پسند ہے؟" ———

"بہت پسند ہے سرکار ——— ہاں ایک بات بہت دنوں
سے سوچ رہا تھا، یاد نہیں پڑتا تھا ——— کوٹھی سے آپ کسی کے
رکشا ہی پر تو آتی ہوں گی ———!؟"

"کوٹھی سے تو میں بابوجی کی کار میں آتی ہوں، لیکن پھر وہی
کار بابوجی کو لیکر ہائی کورٹ چلی جاتی ہے، اسی لئے اس طرف سے
ہمیں رکشا پر جانا ہوتا ہے ——— اگر تم کل سویرے پو پھٹتے ہی
کوٹھی پر پہونچ جاؤ تو ہم بابوجی سے کہہ کر تمہیں کو ٹھیک کرلیں. اکثر
مجھے دیر ہوجایا کرتی ہے اور بابوجی کا کام حرج ہوتا ہے ———"

کشور نے خوش ہوکر کہا "سرکار آپ جس وقت بھی بلایئے
ہم ہر وقت حاضر ہیں، اگر وقت پر نہ آویں تو ایک پیسہ نہ دیجئے گا
۵۷ سرکار! آپ بڑی دیالو ہیں ———"

"کشور! تم بہت بڑھ گئے ہو"، کشور کانپ گیا کہ پھر کوئی چوک
تو نہیں ہوئی اس سے ——— لیکن پرمیلا کھلکھلا کر ہنس پڑی جیسے
ہوا کے لطیف جھونکوں سے "کنول" اپنی پنکھڑیاں بکھرا دیں، اس نے
کہا "دیکھو کشور، ہم امیر ہیں، روپئے والے ہیں تو اس سے کیا ہوا،
تم غریب ہو لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم شریف ہو ——— تم مجھے میرے
نام سے پکار سکتے ہو، یہ سرکار ورکار تو ——— آخر تم نے میرا نام
پوچھا ہے، کس لئے ——— تم کو میرا نام لیکر پکارنا ہی ہوگا ———
زیادہ بڑے بڑے الفاظ سننے سے انسان مغرور سا ہوجاتا ہے.
سمجھے؟" ———

"نہیں شریمتی جی! آخر غریب اور امیر میں کچھ فرق بھی تو ہونا
چاہئے، میری ہمت نہیں پڑتی کہ میں اور آپ کا نام لے سکوں !!
اور نام تو صرف یونہی میں نے پوچھ لیا تھا ———"

"تو تم گویا میری بات کاٹ رہے ہو؟"

"لیکن ——— آپ ———"

"نہیں ——— آپ نہیں بلکہ تم" ——— فرطِ مسرت سے کشور کے
ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے اور اس نے اثبات میں اپنی گردن کو جنبش دی
یعنی وہ بھی پرمیلا کو ایسا ہی تصور کیا کرتا تھا کہ وہ امیر و غریب کی
کوئی تفریق نہیں کرنا چاہتی اور اس کی وقعت کشور کے دل میں اور
بڑھتی گئی ——— پرمیلا ہی کی ضد کی بنا پر اگر یہ اس کا نام بھی لیتا تھا
تو بڑے احترام سے ——— اسے پرمیلا کے یہاں دس روپے
ماہوار مقرر ہوگئے تھے. اب اسے مالک کا بھاڑا پورا کرنے کے لئے
صرف تھوڑی سی محنت اور کرنی پڑتی تھی ——— لیکن کشور کا پہلا
زخم ابھی اچھی طرح بھرا بھی نہیں تھا کہ پرمیلا کے ان الفاظ نے اُسے
پھر سے ہرا کردیا "سنتے ہو کشور! کل سے ہمیں اسکول نہیں آنا ہوگا"

"کیوں؟ ——— کیا بات ہوئی پرمیلا دیوی؟" ———

"کچھ نہیں ——— کل سے ہمیں کالج کبھی نہیں آنا ہوگا ———
اچھا تم کل آؤ گے نا؟" ——— کشور ہکا بکا رہ گیا. اسکی سمجھ میں
کچھ نہ آیا، لیکن اس نے پرمیلا کے آخری الفاظ کو سنا. اور اپنے
جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہاں ہاں، ہم کل
کیوں نہیں آئیں گے، ہم ضرور آئیں گے، ہم تو آتے ہی ہیں، پرمیلا
دیوی ہم سے کسی روز دیر تو نہیں ہوئی، آپ ہم سے خفا کیوں ہوگئیں؟
——— اگر آپ ہی غصہ ہوجائیں تو پھر ———"

"سنو! کل پھر تم آجانا"

"کل کے بعد پھر پرمیلا دیوی؟"

"پھر کیا ———؟" ایسا معلوم ہوا جیسے کشور کے آنگن میں
چندرمان پھٹ پڑا ہے، اس نے رات نہایت اضطراب میں کاٹی اسے
ہر چیز اداس، سونی سونی، اور روٹھی روٹھی سی معلوم ہوتی تھی سوچ
رہا تھا "آج پرمیلا دیوی اتنی اداس روئی روئی سی کیوں تھیں ———
———؟" ——— پو پھٹتے ہی کشور چورنگی پہونچ گیا، دربان نے پرمیلا دیوی
کو جاکر خبر کی "آپ کا رکشا والا آگیا ہے. چھوٹی سرکار"
پرمیلا دیوی نے سنا اور خاموش ہورہی، دل ہی دل میں اس نے کہا ہوگا
"دربان بھی کیسا احمق ہے، میرا رکشا والا!!"

پرمیلا باہر نہیں آئی بلکہ اس کے پتا جی آئے اور انھوں نے پوچھا، "تمہارا کتنا حساب ہوا رکشا والا؟"ـــــ

"خیر تو ہے سرکار، ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی، پھر ایسا کیوں؟" ـــــ پرمیلا کے پتا نے جواب دیا کہ "نہیں کشورا پرمیلا نے کالج چھوڑ دیا ہے، تم اپنا حساب لے لو"ـــــ کشورا نے کچھ جواب نہیں دیا، سکتہ میں رہ گیا، اس کا دماغ بری طرح گھوم رہا تھا اس نے بڑی ہمت سے کام لیکر پوچھا "کیوں سرکار! پرمیلا دیوی اب نہیں پڑھیں گی؟" ـــــ سورلیش بابو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں کشورا! پرمیلا کا بیاہ ہے نا، تمہیں بھی کچھ کام کاج کرنے کو کل سے آنا ہوگا، مطمئن رہو تمہیں پوری مزدوری ملجایا کرے گی"ـــــ

کشورا نے ایک کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا "بڑی اچھی بات ہوئی! بڑی اچھی بات!! ہم بہت خوش ہیں سرکار ـــــ کل سے ہم ضرور آئیں گے"ـــــ!!!

ـــــ کشورا ـــــ نڈھال اس گھوڑے کی مانند جسے چابک سوار نے بے قصور سینکڑوں کوڑے لگا کر اس کے جسم کو گھائل کر دیا ہو، ڈگمگاتا ہوا چلا، اس کا دماغ ان باتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جو پرمیلا نے اس سے کہی تھیں "ہم امیر ہیں، روپیے والے ہیں تو اس سے کیا ہوا، تم کو مجھے پرمیلا ہی کہنا ہوگا"ـــــ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کشورا کہہ کر کون پکارے گا اور کس سے وہ باتیں کرے گا، اور کس کو پرمیلا دیوی کہے گا۔

کشورا نہیں خیالوں سے الجھتا ہوا بڑھتا گیا، اسکے رکشا پر آج پرمیلا دیوی نہیں تھی، سب سے پہلے صبح ہوتے ہی اسکے رکشا پر پرمیلا رہتی تھی، یہ روز اپنی دیوی کا درشن کیا کرتا تھا، آج اس کا رکشا خالی تھا، جیسے اس کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہو ـــــ وہ گرلس اسکول کی طرف آنکلا، بالکل غیر ارادی طور پر ـــــ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بی، ان، آر، ٹریننگ کالج کا بڑا پھاٹک ایک مہیب دیو ہے اور اسے پکڑنے کیلئے بڑھتا آرہا ہے ـــــ وہ فوراً پلٹا ـــ اس نے کہا "جب پرمیلا ہی نہیں چڑھیں گی تو پھر کس کا منہ ہے میرے رکشا پر چڑھنے کا"، اس نے رکشا لیجا کر مالک کے حوالہ کر دیا ـــ ایک مرتبہ

وہ پرمیلا کو دیکھنا چاہتا تھا، وہ سوچتا تھا پرمیلا نے اسے بتلایا کیوں نہیں دیا کہ اس کی شادی ہونیوالی ہے، اس میں اس کا کیا بگڑ جاتا ـــ پھر یہ بھی سوچتا کہ آخر وہ بتلاتی ہی کیوں ـــ؟ میں ہوتا ہی کون ہوں گا؟

ـــ کشورا کا دل بھر آیا، خیال میں کھویا ہوا، وہ پرمیلا کی کوٹھی پر پہنچا سورلیش بابو نے کہا "کشورا! آج یہ بیٹھک صاف کر دو اور کل پرمیلا کا کمرہ صاف کر دینا"ـــــ پرمیلا کا نام سن کر اور آخری بار اپنی مقدس دیوی کی خدمت کرنے کا موقع پا کر کشور کے پژمردہ آنکھوں میں ایک ہلکی سی مسرت کی چمک جاگ اٹھی ـــــ اس نے بڑی تندہی سے کام کیا اور کام ختم کرنے کے بعد بازار آیا۔ پہلے تو اسے پیسوں کی بالکل ضرورت نہیں رہتی تھی لیکن اب تو نہ معلوم کیوں اسے صرف پیسوں کے حاصل کرنے ہی کی فکر رہتی۔ سوائے پیسوں کے اسے اور کچھ نہیں بھاتا، اس نے بوجھ ڈھونا شروع کر دیا۔ وہ مزدوری کرتا اور صرف تھوڑا بہت روکھا پھیکا کھا کر تمام پیسوں کو بچا کر رکھ لیتا۔

ـــــ لوگ اسے دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ شاید اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔ اتنا اچھا جوان گھل گھل کر کانٹا ہو گیا، اس پر کونسی مصیبت آن پڑی ہے ـــــ ہر صبح کشورا سورلیش بابو کے یہاں جاتا اور کام ختم کرنے کے بعد مزدوری کرنے کیلئے بازار چلا جاتا، ایک روز سورلیش بابو نے کہا "کشورا سنتے ہو، پرسوں پرمیلا کی بارات آنیوالی ہے، تم سویرے ہی سے چلے آنا، باراتیوں کا سامان وغیرہ تمہیں کو اتارنا ہوگا"

"بارات! پرمیلا دیوی کی بارات!! ـــــ پرسوں ہیں؟

ـــــ اُف بھگوان ـــــ!!؟"

کشورا پھر بازار چلا آیا، پاگلوں کی طرح یہ ہر آنیوالے جانیوالے سے پوچھتا "بوجھا ہے سرکار؟ سستا ہی پہنچا دوں گا"، لوگ اس کا منہ تکتے ہوئے بڑھ جاتے اور وہ مایوس ہو جاتا ـــــ سبھوں کو یقین سا ہو چلا تھا کہ کشورا پاگل ہو گیا ہے۔ بعض لوگ جو اس کے گزشتہ دکھ درد کی کہانی جانتے تھے دوسروں سے دوہراتے اور ہمدردانہ انداز میں کہتے۔ "جس پر اتنی مصیبتیں پڑی ہوں، جو اتنے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو، پڑھا لکھا ہو، جس پر اچانک مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا وہ

پاگل نہوگا تو کیا ہوگا، جبتک بدن میں خوب کس بل ہا رکشا کھینچا، لیکن آتنی کڑی دھوپ
میں تپتی ہوئی سڑک پر رکشا کھینچنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، دماغ گرم تو یقینی
ہوگا ــــــ ! "۔ کشور پریشان حال آبادی سے دور ایک ویران مقام پر چلا گیا،
کمر سے ایک میلا کچیلا جالی دار بٹوا نکالا، پیسوں، دھیلوں، اکنیوں سبھوں کو
گن شروع کیا " تیرہ روپے ساڑھے چار آنے! "۔ ایک دھندلی سی خوشی اُسکے
چہرہ کو مس کر گئی۔ وہ پھر بازار آیا، ایک سنار کی دکان پر پہنچا، سب پیسوں کو
جو اسکی زندگی بھر کی کائنات تھی بکھیر دیا اور کہا " بابوجی! اسے گن لیجئے اور مجھے
ایک بڑھیا سونے کی انگوٹھی دیجئے اگر کچھ گھٹے گا تو ہم کما کر آپ کا چکا دیں گے
بابوجی، ہم یہیں پر تو رہتے ہیں، آپ مطمئن رہئے سرکار ــــــ ! "۔ کشور
کی سراسیمگی، اسکی اتنی شستہ زبان اور یہ زبوں حالی سُنار کو متعجب کرنے
کیلئے بہت کافی تھی، بہرحال اُس نے ایک انگوٹھی نکال کر دیدی۔ کشور
نے انگوٹھی کو بڑی احتیاط سے کمر میں بٹوئے کے اندر رکھا ــــــ صبح ہوتے ہی
پرمیلا کی کوٹھی پر پہنچا۔ پرمیلا ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی، اس کا چہرہ خزاں کے
سفید گلاب کی طرح اترا ہوا تھا ــــــ کشور کی باچھیں کھل گئیں ــــــ پرمیلا
نے بھی کشور کو دیکھا اور ٹھٹھک گئی، کشور نے پُرخم دہ لب و لہجہ میں کہا ــــــ ۔
۵۸ " ابھی بہت سویرا ہے نا پرمیلا دیوی؟ بابوجی نے سویرے ہی بلایا تھا،
آج تمام کمروں کو صاف کرنا ہے "، پرمیلا کشور کو تکتی رہی، چپ چپ سی
پھر اس نے کہا، " تم اب رکشا نہیں چلاتے کشور؟ "۔ کشور خاموش رہا،
دو موٹے موٹے آنسو اسکی پلکوں میں بھر کے اور ڈھلک گئے، نہ معلوم
کیوں پرمیلا کی بھی پلکیں کچھ بوجھل تھیں۔ کشور نے کہا پرمیلا دیوی اگر
پھر یہ ہو گیا، پرمیلا اسکے بالکل قریب ہو گئی، ہمدردانہ وسرگوشیانہ انداز
میں اُس نے پوچھا " کیا ہے کشور؟ تم کہنا کیا چاہتے تھے؟ ــــــ "
پرمیلا دیوی تم سچ مچ کی دیوی ہو، ایک بات جو مانو تو اپنے
غریب اور پرانے خدمت گزار کی ــــــ ! "
" بولتے کیوں نہیں کشور؟ آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟ " ــــــ
" غریب کا آپ سے کیا مطلب دیوی جی؟ صرف یہ نشانی ــــــ
اگر قبول کرلیں اسے تو میں سمجھوں گا ــــــ نہیں میں بہت ہی خوش
ہوں گا سرکار، ــــــ پرمیلا کشور کو اچھی طرح سمجھانا چاہتی تھی
لیکن وہ جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ اس نے صرف اتنا کہا " کشور! یا تم نے
روپیہ فضول برباد کیا ــــــ تم غریب ہو اور غریب کی نشانی ہی کیا؟
غریب تو خوش رہنے کیلئے نہیں پیدا کیا گیا ــــــ اور پھر آجکل تو تم رکشا
بھی نہیں کھینچتے " ــــــ یہ کہتے کہتے وہ بہت زور زور سے سسکیاں
لیتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی آئی، اتنے میں سورلیش بابو بھی آگئے۔ انہوں
نے کشور کو دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا " واہ کشور! خوب تم آ گئے! جاؤ
پرمیلا اپنے کمرہ میں ہے، آج اسی کا کمرہ تمہیں صاف کرنا ہے " ــــــ
کشور کمرہ میں چلا تو آیا لیکن ایک بے جان، بے حس مجسمہ کی مانند کھڑا رہا
وہ انگوٹھی اپنی مٹھی میں بھینچے ہوئے تھا، پرمیلا نے مڑ کر اس پر ایک
نگاہ ڈالی اور بولی " ہاں تو تم میرا کمرہ صاف کرنے آئے ہو نا؟ اچھا
دیکھو یہ بستر باہر کر دو اور یہ گھڑی میز کے اندر رکھ دو۔ اور ہاں دیکھو
اسے مت چھونا یہ بجلی کا تار ہے، لیک کرتا ہے، بابوجی نے کہا ہے
مستری بلوا کر اسے ٹھیک کرانا ہوگا! " ــــــ پرمیلا چلی گئی،
کشور جلدی جلدی کمرہ صاف کرنے لگا، وہ کمرہ صاف کرتا تھا اور
سوچتا تھا " ہم امیر ہوئے، روپے والے ہوئے تو کیا ہوا؟
تمہیں مجھے پرمیلا کہنا ہی ہوگا "، پھر اس کے دماغ نے ایک پلٹا
اور کھایا اور وہ سوچنے لگا " تم غریب ہو اور غریب کی نشانی
ہی کیا؟ صرف یہ انگوٹھی! "، اس کے دماغ نے ایک پلٹا اور کھایا
" اسے مت چھونا یہ بجلی کا تار ہے " ــــــ کشور پاگلوں
کی طرح زور سے ہنسا اور جھپٹ کر اس نے تار کو پکڑ لیا
ایک ہلکی نحیف چیخ کمرہ میں گونج کر رہ گئی۔

ــــــ پرمیلا کے پائیں باغ میں ایک حقیر
بیل ناشپاتی کے درخت کا سہارا پاکر بہت دور تک چڑھ گئی
تھی ــــــ شدنی! ہوا کے ایک تیز جھٹکے نے
آج اسے پھر زمین پر گرا دیا ــــــ سامنے سے
ایک بکری آئی اور اسے چر گئی ــــــ
کشور کی جو کہانی نباتاتی حرفوں میں لکھی نظر آتی تھی وہ بھی اسکی
زندگی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

گالزوردی

عجیب بات

چند روز ہوئے، اپنے ایک مغربی حصہ کے قیام کے دوران میں، کیونکہ میں کبھی آجتک اس طرف نہ آیا تھا میں سیر کے لئے نکل گیا ——— مارچ کی ٹھنڈی صبح تھی!

میں ایک ایسے خلجان میں تھا جو اکثر ادیبوں کو ہوا کرتا ہے خالی الذہن، خود اعتمادی مفقود، ہزاروں قسم کی الجھنیں گھیرے ہوئے کتنی تکلیف دہ ہے قلم کے سہارے جینے والوں کی زندگی بھی۔ ایک جہد و ایک کوشش اور بقول میرے ایک دوست کے ایک مردانہ وار کوشش!

ہاں تو میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔ ہوا کی نرم لہریں رگ و پے میں ایک زندگی پھونک رہی تھیں، ایک چمکدار سورج نیلگوں آسمان کی سطح پر تیر رہا تھا مگر میرا ذہن ابھی تک اسی طرح بیکار تھا روشنی کی ایک شعاع بھی میرے دماغ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ نہ معلوم وہ ہلکے رنگ کے تیرتے ہوئے قرمزی سائے جو دماغوں کو کام کرنے پر ابھارتے ہیں اس وقت کہاں غائب ہو گئے تھے۔ نہ معلوم وہ غیر مرئی قوتیں جو روح میں احساس اور گرمی پیدا کر دیتی ہیں اس وقت کہاں سو گئی تھیں اور میں اکتا کر اپنے پیشہ کو گالیاں دینے لگا۔

میری نگاہیں پہاڑی سلسلہ کے نشیب و فراز میں بھٹک رہی تھیں، یہ جنگل، یہ وادیاں، یہ حسین چٹانیں اور یہ ایک قوس و قزح کا سا حلقہ مجھے بے چین کر رہا تھا کہ میں اس حسن، اس خوبصورتی اور اس دلکشی کو اپنے الفاظ میں محصور نہیں کر سکتا۔ اونچی نیچی بل کھاتی ہوئی روشوں کو تراش کر ہموار کر دیا گیا تھا اور ان کے پیچھے ہر چیز نہایت صاف نظر آ رہی تھی۔ یکایک میری نگاہوں کے سامنے کچھ بلبلے سے ناچنے لگے۔ کچھ سیاہ و سپید چیزیں ہوا میں متحرک معلوم ہوئیں، ایک، دو تین، تیلیتر کوں کا ایک جھنڈ ہوا میں اڑتا ہوا جا رہا تھا حسین پرندے اپنے طول طویل سفر پر گنگناتے ہوئے روانہ ہو رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں وادیوں اور جنگلوں کو پار کر کے ان کے پیچھے غائب ہو گئے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے پیچھے کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ خیالات کروٹیں سی لگے تھے، مایوسی میں دبی ہوئی ایک امید پھر ابھر آئی تھی اور اس وقت یہ جی چاہا کہ اپنے آپ کو انہی وادیوں کی رنگینیوں کے حوالہ کر دوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دوسری پگڈنڈی کے موڑ پر سے گرجا کی گھنٹیوں کی جھوجھری آواز میں سنائی دینے لگیں۔ کوئی تین سو قدم کے فاصلہ پر ایک بستی نظر آ رہی تھی۔ آدمیوں کے گروہ خوبصورت لباس پہنے ہوئے اور عورتیں نرم و نازک لباسوں میں ملبوس آپس میں باتیں کر رہے تھے اور گرجا کے مربع صحن کے اوپر ایک چمکدار کلس مسکرا رہا تھا۔

"کیا بات ہے،" میں نے سوچا۔ آج اتوار بھی نہیں، کسی امیرزادے کی سالگرہ بھی نہیں معلوم ہوتی اور کسی پیر کا عرس بھی نہیں اور عرس ان علاقوں میں اس طرح منائے بھی نہیں جاتے۔ پھر کیا بات ہے، یقیناً کسی کی شادی ہے۔ اور میں دیکھنے کیلئے اس منتظر گروہ میں سے گزرتا اور الجھتا ہوا اندر تک پہنچ گیا۔ وہاں بھی لوگوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور سب دروازہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بھڑوں کے چھتہ کی طرح بھن بھن ہو رہی تھی۔ گرجا اسی طرح جس طرح وہ آج سے برسوں پہلے کھڑا تھا خاموش اور ساکت تھا، اس کی دیواریں اور بھاری بھاری پتھر دیہاتی عبادت گذاروں کا تماشا دیکھ رہے تھے لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ آج یہاں معمولی سے زیادہ رونق تھی اور ہوا میں لوگوں کے کپڑوں کی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔

گھنٹیاں جو اب تک ایک مترنم آواز میں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں

اور ایک خاص قسم کا کیف و سرور پیدا کر رہی تھیں اب زور زور سے بجنے لگیں۔ ان کی اس وقت کی بے ہنگم چیخ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دلہن بہت قریب آگئی ہے اور بس یہاں پہونچنے ہی والی ہے میری نگاہوں کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا جو ابھی ابھی لڑکپن کی حدوں سے نکل رہا تھا۔ ان کے گرد لوگوں کے حلقہ دستانے چڑھے ہوئے ہاتھوں اور اس کے کھیلتے ہوئے چہرے پر ایک خاص قسم کی ہنسی سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہی دولہا ہے۔ مجھے وہ اس وقت نہایت بھلا معلوم رہا تھا۔ وہی معمولی دیہاتی تراش خراش۔ فطرت میں ایک بیباکی اور آزادی اور نگاہوں میں ایک امنگ لیکن کوئی خاص طور پر اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ سب لوگ دلہن کا انتظار کر رہے تھے۔ اور سب لوگوں کے ساتھ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی۔ کیسی ہوگی وہ؟ ایک معمولی قسم کی دیہاتی لڑکی۔ بھرے بھرے گلے، کھردرا سا نقاب، بھورا سا رنگ اور خرگوش کی سی آنکھیں یا پھر کچھ۔۔۔۔۔۔ کچھ اس لڑکی جیسی جسے میں نے ایک مرتبہ ویلز میں دیکھا تھا اور اس کے بعد سے آجتک اس جیسی نظر سے نہ گذری

٦٠ میں نے ذرا آگے کو جھک کر ایک عورت سے جس کا چہرہ سیب کی طرح گول اور پکا ہوا تھا پوچھا، "کیا آپ بتا سکتی ہیں ان میں دلہن کونسی ہے؟"

اس نے مجھے اپنی گول گول، بھوری اور اجنبی نگاہوں سے گھورتے ہوئے جواب دیا "کیوں! تم نہیں جانتے، یہ نادیا ہے۔ اس علاقہ میں سب سے خوبصورت لڑکی" اور پھر اس نے اپنا انگوٹھا نچاتے ہوئے دولہا کی طرف اشارہ کر کے جسے سب نے نظر انداز کر رکھا تھا کہا "بڑا خوش قسمت ہے یہ جو اسے ایسی حسین لڑکی اور اچھی لڑکی ملی"۔ مگر اس کی اس تشریح سے میری کچھ تسلی نہ ہوئی۔

ایک شور، ایک حرکت، ایک بے چینی!

اور لوگوں کی طرح میں بھی بلا تکلف گھوم گیا۔ وہ ایک دہشت سے خانہ بدوش نما آدمی کے سہارے سہارے اپنے بہترین دیہاتی لباس میں آ رہی تھی۔

میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس مٹیالے گرجا کے صحن اور ان سیاہ پوش آدمیوں کے درمیان وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی سورج کی کرن ناچ رہی ہو۔ میں نے اتنا مسرت انگیز سہانا اور دلکش چہرہ آجتک نہیں دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اسکے لبوں پر کھیل رہی تھی، ایک شوخی اس کی نگاہوں میں رقص کر رہی تھی اور وہ اپنے ماحول کی دلچسپیوں میں جذب ہوئی جا رہی تھی، اس کے سرکش اور سنہرے بال موٹے سے نقاب میں مچل رہے تھے، اس کی پتلیاں مست بھونروں کی طرح رقصاں تھیں۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نوعمر سیب کے پھولوں پر سورج کی کرنیں ناچ رہی ہیں۔ مچل رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک خاص چمک تھی جو انسان کی نیک فطرت کی انتہائیوں سے ابھرتی ہیں۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں جا رہی ہے ایک سکون سا ہو گیا۔

گرجا کے صحن میں نرگس کے پھول اُگے ہوئے تھے جو اس لڑکی کی شادی پر عین موزوں تحفہ تھا۔ جب وہ باہر نکلتی تو ان پھولوں میں لدی ہوئی تی اور ایک ایسا تکلیف دہ اعتراف جس کے بغیر معصوم سے معصوم روح بھی خوشی کی حدوں کو نہیں پہنچ سکتی اسکے چہرے سے نمایاں تھا۔ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں دیکھ کر آدمی ایک گونہ اطمینان محسوس کرتا ہے، سورج کی روشنی، پھول، کھیلتے ہوئے تندرست بچے، خوش الحان پرندے، بادل پہاڑ، نیلگوں آسمان، رقص اور نوجوان لڑکی کا چہرہ اور اس وقت مجھے بھی یہی احساس ہوا کہ سب لوگ اسکے چہرے کو دیکھ کر ایک گونہ خوشی محسوس کر رہے تھے!

وہ جا چکی تھی اور ایک خاموشی، سکون اور تنہائی اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ میرے آگے آگے ایک لنگڑا بوڑھا اپنے رخساروں پر اگی ہوئی گھنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتا ہوا مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ میرے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر اس نے کہا۔ "کیا ستم ظریفی ہے! جب ایسی لڑکیاں بھی شادی کے بعد چلی جاتی ہیں تو روح لرز جاتی ہے" میرے سر ہلانے پر اس نے پھر کہا "یہ سورج کی نرم اور بے باک کرنیں اب یہاں کبھی نہیں آئیں گی، جھوٹ نہیں، اب یہاں ایسی لڑکی نہیں مل سکتی!!

ایشیا جون۔ جولائی ۱۹۴۲ء

میں گفتگو کیلئے کوئی موضوع تلاش کرنا چاہتا تھا، میں نے کہا،

"کیا وہ اس کا باپ تھا،"

اس نے تیز تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے زور سے
گردن جھٹکی، "نہ اس کی ماں ہے نہ باپ، یہاں ماما کا کیا کہتے ہیں
اُسے چچا رہتا ہے، ماں باپ نہیں اسکے، اس نے فقرہ کو دہرایا۔ اسکی
آواز کے ٹھہراؤ میں ایک تکلیف کا احساس تھا۔ ایک کھرکھراپن جیسے
وہ کچھ جانتا ہے اور بتاتا نہیں چاہتا۔

کیونکہ اب انتظار کے قابل کوئی چیز نہیں رہی تھی اس لئے میں
اوپر کی پگڈنڈی پر ایک چھوٹی سی سرائے میں چلا گیا اور روٹی اور پنیر
لانے کیلئے کہا۔ اندر کے کمروں میں بہت سے آدمی کھانے پینے اور
شور کرنے میں مصروف تھے اس لئے میں ایک اجنبی کی حیثیت سے باہر
برآمدہ ہی میں بیٹھ گیا اور وہیں مارچ کے سورج کی نرم شعاعوں
میں اپنا معمولی سا ناشتہ ختم کیا۔ پیسے دیئے اور چلدیا۔ میرے
سامنے تین چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے نشیب و فراز
کو دیکھ کر میں یوں ہی بے جانے بوجھے ایک پر ہولیا، در اصل یہاں تو
کی تفریح یہی ہے کہ بلا جانے بوجھے کہیں سے روانہ ہوگئے اور کہیں
جا نکلے۔ اس پگڈنڈی پر کل دو چیزیں نظر آئیں ایک جھونپڑی آتا ؤ
اور ایک کھیت چڑھان پر اور تمام راستہ میں کچھ نہ تھا۔ بہار
ابھی ان علاقوں میں اچھی طرح اجاگر نہ ہوئی تھی۔ کہیں کہیں درختوں
پر کلیاں نظر آجاتی تھیں اور کبھی کبھی سورج کی روشنی میں ہوا کے
کندھوں پر برف کے ٹکڑے اڑتے ہوئے دکھائی دے جاتے تھے۔
دوسری طرف دیوار کے ایک کنج کے پاس پگڈنڈی ایک مکان کے
صحن میں ڈوبتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جہاں تین چھکڑے کھڑے
تھے جن کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ پگڈنڈی پر نرگس کے پھول بکھرے
پڑے تھے اور مکان سے شور بلند ہو رہا تھا۔ لوگوں کی آرجار اور
بھنبھناہٹ سے مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں اتفاق سے دلہن کے
مکان پر پہونچ گیا ہوں۔

میں نے اپنی حیرانی کو دباتے ہوئے خشک پتھریلی زمین،
ٹٹروں، مرغیوں اور کتوں کے شور اور پرانے ڈھیر نما مکان کی بوالعجبی پر ایک نظر ڈالی اور ایک دائیں ہاتھ کی پگڈنڈی پر جو ایک ندی کے پاس سے ہوکر گزرتی تھی مڑ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر ایک بہت بڑا پرانا درخت کھڑا تھا اور بائیں ہاتھ پر ایک اجاڑ سا میدان پڑا تھا جس میں بہت سے درخت اُگے ہوئے تھے پگڈنڈی نیچے ایک مکان کے دروازہ پر جاکر ختم ہو جاتی تھی جہاں پتھروں کی ایک چٹان سی بنی ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے کھیت خزاں کی یاد دلاتے تھے اور کھیتوں کی باڑ میں بے ترتیبی کے ساتھ لکڑی پڑی تھیں۔ لہو کی آمیزش لئے ہوئے چھوٹے چھوٹے شرارے اور نیلا دھواں زرد زرد نیم وا کلیاں، سورج کی کرنیں اور کچھ اڑتے ہوئے برف کے ٹکڑے ہوا میں ایک عجیب قسم کی رنگت پھیلا رہے تھے۔ میں وہاں پہونچکر رکا اور سوچنے لگا آیا مجھے نیچے جانا چاہئے یا نہیں؟

آخر کار میں نے ارادہ کرلیا کہ ضرور نیچے جاؤں گا اور اس خیال سے دروازہ کو دھکیلنا شروع کیا۔ اچانک میری نظر ایک عورت پر پڑی جو درخت سے ورے دیوار کے سایہ میں ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا رکھا تھا، اسکی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے بدن کو آگے پیچھے جھلا رہی تھی اس نے ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا، نیلی سرج کا لباس اس کے بدن پر تھا، ہیٹ اسکے قریب زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال رخساروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ چہرہ جس پر کرنیں سی منڈلا رہی تھیں ایک دم بھیانک اور حماقت انگیز معلوم ہونے لگا، جو چہرہ کبھی حسین رہ چکا تھا اب زندگی اور تیز احساسات کے ہاتھوں کھردرا اور متورم ہوگیا تھا۔ اب اسکی طرف دیکھنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ اس کا لباس، اس کا ہیٹ اور جس طریقہ پر اسکے بال بنے ہوئے تھے ان میں شہری تہذیب کی جھلک تھی۔ اس میں ایک ایسی بے نام سی چیز جھلک رہی تھی جو صرف ان عورتوں میں ہوتی ہے جن کا کام مردوں کو لبھانا ہے۔ لیکن اتنے پر بھی اسکی نظروں میں ایک حیرانی تھی جیسے وہ شہر میں بہت کم رہی ہو۔

بے حس ماحول۔ ایک عورت، آزردہ خاطر اور اپنی پریشانیوں پر قابو پانے کے ناقابل۔ کون ہے جو اس منظر کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگا

میں وہیں ٹھہر گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ وہ اسی طرح اپنے بدن کو آگے پیچھے جھلا رہی تھی۔ اور اس کے لبوں سے ایک مدھم سی کراہنے کی آواز نکل رہی تھی۔ پھر اچانک اس کا سر اسکی گود میں جھک گیا اور اسکے بازو بے جان ہو کر اِدھر اُدھر جا پڑے جیسے وہ بیہوش ہو گئی ہے اسے اس حالت میں چھوڑ کر کیونکر جایا جا سکتا ہے؟ لیکن اس سے کہا بھی کیا جائے شاید کوئی جسمانی بیماری بھی معلوم نہیں ہوتی؟

میں اسی تذبذب میں کھڑا ہوا اُسے دیکھتا رہا۔ یہ کونہ ہولے سے محفوظ تھا۔ سورج گرم ہو چلا تھا اور ہواؤں پر ایک جمود سا طاری ہو گیا تھا۔ کامل تین منٹ تک اس نے انگلی تک نہ ہلائی یہاں تک کہ میں سوچنے لگا کہیں وہ بیہوش تو نہیں ہو گئی؟ میں اس کے قریب گیا اسکے بدن سے گرم غازہ آلود بھبکا آرہا تھا، چہرہ پر ہلکا ہلکا ورم تھا اور ٹوٹی ہوئی سانسوں میں غنودگی اور مدہوشی تھی۔

میں نے ہمت کر کے اسکے بازوؤں کو چھوا، اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک حسین زمانے کی یادگار صرف آنکھیں اس کے پاس رہ گئی تھیں جو کبھی بہت حسین ہوں گی۔ اب خون میں بجھی ہوئیں اجنبی
۶۲ اور حیران قدرے جری اور بیباک جو ایک خاص طبقہ کی عورتوں کی خصوصیت ہے۔ وہ بولی نہیں میں نے ہچکچاتے ہوئے پورٹ کا ایک جام جو سفر کے دوران میں ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا نکالا اور اس سے کہا۔

"معاف کیجئے۔۔۔۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ"، اور میں نے جام اسکی طرف بڑھا دیا کچھ دیر تک وہ ایک خلا میں گھورتی رہی اور پھر میرے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے کہا "بڑی تکلیف کی آپ نے، میں بھی اسکی ضرورت محسوس کر رہی تھی"، اور وہ جام ہونٹوں سے لگا کر اس کا آخری قطرہ تک پی گئی اور جام واپس کرتے وقت ایک نامانوس مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر آ گئی۔

"غالباً آپ مجھے یہاں بیٹھا ہوا دیکھ کر ہنسے ہوں گے"،

"جی نہیں میرا خیال تھا آپ بیمار ہیں"،

ایک کھوکھلی ہنسی اسکے گلے میں گونجنے لگی۔

"مجھے جانا چاہئے تھا، کیوں؟ لیکن اسکی بھی ایک وجہ ہے۔ وہی پرانی جگہ، کئی سال کے ایک طویل سلسلہ کے بعد"،

اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا جنہیں شراب نے اور بھی جگا دیا تھا۔ غالباً وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ آیا اس نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہے یا نہیں یا پھر یہ کہ میں کس قماش کا آدمی ہوں اور پھر اُس نے کہا

"میں یہیں پیدا ہوئی تھی کیا تم بھی یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں میں یہاں کا رہنے والا نہیں"، میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ پھر ہنسی اور ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی

"میں ایک شادی میں آئی تھی ــــ پیدائش کے بعد سے میں نے آج اسے پہلی دفعہ دیکھا ہے"،

میں ایک اندرونی جذبہ کے ماتحت خاموش رہا۔

"میں اپنی لڑکی کی شادی میں آئی تھی لیکن کوئی مجھے جانتا نہیں، کوئی بھی نہیں جانتا"،

میں وہیں دیوار کے سائے تلے اسکے مقابل ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ان الفاظ پر ایک گہری دلچسپی کے ساتھ اسکی طرف دیکھنے لگا۔ یہ ــ اکھڑ، آوارہ، غازہ آلود شہری عورت ایک نرم نازک سورج کی کرن جیسی لڑکی کی ماں تھی جس کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی؟

میری خاموشی پر وہ پھر مسکرائی۔

"لڑکی کیا میرا بھائی تک مجھے نہیں پہچانتا، اور پھر وہ جان بھی کیسے سکتی ہے جب وہ بچہ ہی تھی کہ میں اس سے الگ ہو گئی تھی اور اسکے بعد سے آج تک اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اسوقت وہ محض ایک جاندار مضحکہ خیز سا گوشت کا لوتھڑا تھی"، اور میرے چہرے پر نظر ڈال کر وہ پھر ایک خلا میں گھورنے لگی جیسے اپنے گذرے ہوئے اوقات کا جائزہ لے رہی ہو۔

"اسے وجود میں لانے کیلئے ہم غالباً یہیں ہنس بول رہے تھے ہاں بالکل اسی جگہ تھے ایک گرمیوں کی رات میں۔ اس رات میرے سر پر ایک جنوں سوار تھا، ایک سودا"، اور پھر اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "ہر لڑکی کی تقدیر یہی ہے۔ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی وقت! اب میری عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہے اب تو میں اپنی آخری منزل سے بہت قریب آ گئی ہوں اور اب اس سے زیادہ توقع

بھی کیا کہی جا سکتی ہے؟ میری زندگی کا مقولہ "خوش باش دے رہا ہے مگر اب تو میں اپنے حصہ کا سب کچھ ختم کر چکی ہوں اور اس کا باپ.... اس کا باپ بھی مر چکا ہے!"

"تمہارا مطلب ہے کہ محض اس لڑکی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا"

"چاہو تو یوں بھی کہہ سکتے ہو۔ اس لڑکی نے مجھے اور اسے ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں سپرد دعویٰ دائر کر دوں۔ وہ روپیہ ادا نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ چلا گیا۔ اور دو سال بعد جنگ بوئر میں مارا گیا اور میں، میں بھی! لیکن وہ ابھی تک ایک دلکش خیال کی طرح حسین اور زندہ ہے۔ کتنی عجیب بات ہے، کیوں؟ اور پھر وہ اسی طرح خلا میں گھورنے لگی۔

مجھے بھی کچھ کہنے کیلئے الفاظ نہ ملے اور میں سوچنے لگا، سورج کی ایک حسین اور رقصاں کرن جس کا وجود یہاں والوں کیلئے ایک رحمت تھا۔ جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں "اب ایسی لڑکی یہاں نہیں مل سکتی"، اس کے وجود نے دو ہستیوں کو تباہ کر دیا، ان دو ہستیوں کو جنہوں نے اسے جنم دیا تھا۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا "یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ مجھے کیونکر معلوم ہوا اس کی شادی ہونیوالی ہے —— ایک کسان نے مجھے بتایا تھا۔ وہ جب بھی شہر آتا ہے میرے پاس ضرور آیا کرتا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ میرے پرانے مکان کے پاس ہل چلایا کرتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں جانتا حالانکہ وہ میرے سامنے سکول جایا کرتا تھا۔ میں نے بھی اسے کبھی نہیں بتایا۔ اس روز جب اس نے مجھے شادی کے بارے میں بتایا میرے اوپر عجیب مضحکہ انگیز قسم کے جذبات طاری تھے، اس نے ایک عجیب انداز میں سر ہلایا "میں نے اپنی زندگی کے حالات کبھی کسی کو نہیں بتائے مگر معلوم نہیں میں نے تمہیں کیوں بتا دیئے آج میں اپنے حواس میں نہیں ہوں"، اس کے اس فقرہ پر میں نے جلدی سے کہا "کوئی ہرج نہیں میں یہاں کسی ایک آدمی سے بھی واقف نہیں"

اس نے ایک آہ بھری، "بڑی تکلیف کی آپ نے، میرا بھی کبھی کبھی کسی سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے "ہاں تو اس کسان کے چلے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ ایک دن کی چھٹی مناؤں اور اپنی لڑکی کی شادی ہوتی ہوئی دیکھوں"، وہ ہنسنے لگی۔ "میری رنگینیاں سب کی سب اس رات کو ختم ہو گئی تھیں جس رات مجھ پر وہ جنون سوار ہوا تھا۔ آہ!

میرا باپ بہت سخت گیر آدمی تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میرے باپ نے مجھے شادی نہ کرنے دی۔ سوتیلی ماں کے پاس رہ کر میری زندگی میں رونا داخل ہو گیا۔ میں بہت نرم دل تھی۔ سوتے سوتے بھی میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے، وہ ہمیشہ بھیگی ہی رہیں، ایک نوجوان لڑکی اور آنسو! میرے باپ نے مجھے شادی نہ کرنے دی"!

"تو کیا تم بھاگ گئیں اس کے بعد؟ میں نے آہستہ سے کہا۔

"سب سے بڑی جرأت کا کام جو میں نے ساری زندگی میں کیا۔ بچی کو چھوڑتے وقت میرا جی کٹتا تھا۔ لیکن اس کے سوا دوسرا علاج خودکشی تھا۔ میں ایک نوجوان جلدساز کے ساتھ بھاگ گئی جو میرے لئے دیوانہ تھا مگر اس نے بھی مجھ سے شادی نہ کی!"۔ وہ پھر ہنسنے لگی اور جلتی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کر کے کہا "جب میں چھوٹی سی تھی تو اس کی گھاس جلانے میں مدد کیا کرتی تھی"۔ اور وہ پھر رونے لگی مگر اس مرتبہ یہ اتنا تکلیف دہ نہ تھا ۶۳

گاڑیوں کے راستہ سے ہٹ کر ایک پرانا جوتا پڑا تھا میں اسے دیکھنے لگا۔ پتھروں کے درمیان ایک سیاہ سا دھبہ اور جنگلی پودے اس دلکش دن سے اتنے ہی نامانوس تھے جتنا اس عورت کا ماضی اسکے حال سے جسے وہ آج تلاش کر رہی تھی اور میرے ذہن میں اس رات کا خیال گھومنے لگا جب بقول اسکے "اسکے سر پر جنون سوار تھا"، اور ساتھ ہی ساتھ وہ نوجوان جوڑہ بھی جو اس گرم اور تاریک تنہائی میں جذبات پہ قابو نہ پا کر ان سے مغلوب ہو گیا تھا۔ برف کے چھوٹے چھوٹے گالے دھوئیں اور شعلوں پر سے اڑتے ہوئے اسکے بالوں پر گرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ ان سے اٹ گئے اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے بچوں کی طرح انہیں پکڑنا شروع کر دیا۔

"میری لڑکی کی شادی کیلئے یہ بڑا عجیب دن ہے"، اس نے کہا اور پھر ایکدم گھبرا کر بولی "نہیں نہیں وہ اپنی ماں کو نہ جان سکے گی، وہ بہت آرام سے ہے"، اور زمین سے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے وہ کھڑی

ہو گئی،، اب مجھے واپس جانا چاہئے ورنہ گاڑی سے رہ جاؤں گی اور گاڑی سے رہ جانے کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے وعدہ پر نہ پہونچ سکوں گی،،

ہیٹ اوڑھ لینے کے بعد اس نے اپنے چہرہ پر ہاتھ پھیرے اور گرد آلود لباس کو جھاڑتے ہوئے وہ جلتی ہوئی آگ کی طرف دیکھنے لگی اس کی بے بسی اور بیچارگی دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس سڑک پر پڑے ہوئے ردی جوتے کے مانند ہے، اپنے ماحول سے بیگانہ اور نامانوس!

"میں نے یہاں آکر غلطی کی،، اس نے کہا "مجھے سوائے تکلیف کے اور کیا ملا اور اب تو تم بھی بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہوگے۔ اچھا خدا حافظ، آپ کے جام کا شکریہ!،،

اور اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جنہیں بازاری پن نہ تھا بلکہ خالص انسانی نگاہیں، الجھی ہوئیں اور پریشان۔ دوسری مرتبہ ایک لمحہ کے بعد پھر اس کے ہونٹ کپکپائے۔

"خدا حافظ!،،

اور وہ دروازے میں سے گزر کر نیچے پگڈنڈی کی تہ میں ڈوب گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک میں وہیں برف اور دھوپ میں بیٹھا رہا۔ تب اٹھ کر جلتی ہوئی گھاس کی طرف دیکھا لہراتے ہوئے شعلے اور نیلا دھواں، خوبصورت اور زندگی بخش معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اپنے پیچھے وہ جلتی ہوئی شاخوں کے ڈھانچ چھوڑ رہے تھے۔

ایک یا دو ہفتہ بعد ان کی جگہ ہری اور ننھی ننھی گھاس کی کونپلیں پھوٹ آئیں گی اور سورج کی روشنی میں لہرانے لگیں گی۔

یوں ہی چلتی رہتی ہے یہ دنیا!

تعمیر اور تخریب، تخریب و تعمیر کتنی عجیب بات ہے!



نیساں اکبرآبادی

خودداریاں

یہ کیوں کہوں کہ نہ تڑپا نگاہِ یار مجھے — مگر قرار تو لے کرکے بے قرار مجھے
دیا فریب طبیعت کو آج پھر میں نے — پھر آچلا ترے وعدوں پہ اعتبار مجھے
وہ ایک تم کہ نظامِ حیات ہے تم سے — وہ ایک میں کہ نہیں کچھ بھی اختیار مجھے
مری نگاہِ تصور نے ان کو دیکھ لیا — جب آچلا تھا ذرا لطفِ انتظار مجھے
فسردگیِ دلِ وحشت زدہ کی اے توبہ — ہنسی کی بات بھی ہوتی ہے ناگوار مجھے
جب اپنے آپکو دھوکے دئیے ہیں خود میں نے — پھر اور کس کا ہو دنیا میں اعتبار مجھے
مری نظر میں ہی جب ہے بہار کا انجام — مثالِ خار کھٹکتی ہے یہ بہار مجھے
نہ مجھ کو دل پہ ہے قابو نہ انکو نظروں پر — نہ اختیار انہیں ہے نہ اختیار مجھے

بہت عزیز ہیں خودداریاں بھی اے نیساں
شکستِ حسن بھی ہوتی ہے ناگوار مجھے

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

ناگن

جوشؔ ملیح آبادی

(منظوم ڈراما)

حرفِ آخر کا ایک ورق

(خدا دریچۂ عرش وا کر کے دنیا کے مناظر دیکھ رہا ہے ان مناظر میں سے ابلیس کا دربار بھی اک منظر ہے)

ابلیس

اے وباؤ، دہشتو، تاریکیو، بیماریو — آؤ اے میرے رفیقو اے مرے درباریو
ہاں مرے اس قصر پہ لہرا بصد جاہ و حشم — اے گناہوں کے پھریرے اے بغاوت کے علم
حاضری دینے کو اپنی اپنی قبروں سے اٹھو — اے ٹھگو، اے قاتلو، اے ڈاکوؤ اے خونیو
نکلو اے بوسیدہ لاشو تربتوں کو توڑ کر — آؤ اور اس بام پر منڈلاؤ بازو جوڑ کر
اے گِدھو، چیلو، بھیانک الّوؤ جنبش میں آؤ — اپنی آنکھوں کو نکالو اپنے بازو پھڑپھڑاؤ
بازوؤں کو پھڑپھڑاؤ، ظلمتوں کو تھرتھراؤ — ہاں لگاؤ دین کے بھیجے پہ ہاں ٹھونگیں لگاؤ
ظلمتو ہر سمت سے اُمڈو، تجلّی سے لڑو — تیرہ شب کا روز روشن ہے اُڑو چمگادڑو
پر فشاں ہو جلد انسانوں کے اعمالِ سیاہ — جلوہ گر ہو آدم و حوّا کے فیضانِ گناہ
ہاں پیو اے ساحرو، آ آ کے بیحد و حساب — تیلیوں کے کاسہ ہائے سر میں چانول کی شراب
ہاں میرے چاروں طرف اے بھتنیو دل کھول کر — آؤ اور لڑھکاؤ ہزاروں مُردہ خنزیروں کے سر
ہاں جگاؤ اپنے اپنے بیر اے جادوگرو — اژدہو، ناگو، سنپولو، آؤ مجھ کو گھیر لو
آؤ اے بھوتو چڑیلو برق رفتاری سے آؤ — آؤ چیخو، غُل مچاؤ، بھنبھناؤ، منمناؤ
اے ریاکاری کی روحو بدلیاں بن بن کے آؤ — آؤ اس اُبھرے ہوئے گنبد پہ گرجو، گھڑگھڑاؤ

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

آؤ اس میدان میں دوڑو، بڑھو، رینگو، چلو — کیکڑو، گھونسو، مکوڑو، کنکھجورو، بچھوؤ
ہاں دکھا دے ظلمتوں کو اے مرے سینے کے داغ — اے کثافت بڑھ کے گُل کر دے لطافت کے چراغ

(کہ یکایک زبردست دھماکہ کی آواز پیدا ہوتی ہے، تاریکیوں کے دامن درازتر ہو جاتے ہیں۔ زمین لرزنے اور ہوا چیخنے لگتی ہے، اور دفعتہً ابلیس کا لشکر حاضر ہو کر شور و غل اور ہلچل مچانے میں مشغول ہو جاتا ہے اور ابلیس اپنی بیگم کے دوش بدوش تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور بیٹھتے ہی اپنے درباریوں کو حکم دیتا ہے)

شاہزادی کل ہوئی ہے دفن جو اس باغ میں — نورِ عصیاں کا ہے اب تک جس کے دل کے داغ میں
ہاں چُرا لاؤ چڑیلو، اس کی زلفِ عنبریں — اس کی آنکھیں، اس کی گردن، اسکے لب، اسکی جبیں
اسکے اعضا کا تناسب، اسکے رخساروں کا نور — لاؤ کشتی میں لگا کر میری بیگم کے حضور

(کہ طرفۃ العین میں مری ہوئی شاہزادی کا جمال ابلیس بیگم کے چہرہ پر دمکنے لگتا ہے۔ تمام درباری مسرّت سے تالیاں بجانے لگتے ہیں اور شیطان دوبارہ حکم دیتا ہے)

پیرزن کی چشمِ تر تاریک موتی رول دے — شاہدِ عالم فریبی زلفِ شب گوں کھول دے ۶۷
ہاں بجا اے کاوشِ عصیاں فواحش کا ستار — ہاں دکھا دے دفترِ انگور سینے کا ابھار
اے بہیمانہ تمناؤ، چلو کرتب دکھاؤ — بھیڑیوں کی ہڈیوں سے اپنے ناخن تیز کر لو
اے چُغل خوری کی دیوی جلد شر کا راگ گا — اے دغا کے دیوتا خونیں عبیر اڑا کے ناچ
جلد سارنگی اٹھا اے جھوٹ دانائی کے ساتھ — ہاں نرت کر بدظنی کی روح برنائی کے ساتھ
گونج اٹھو چاروں طرف اے وحش لفظو گونج اٹھو — تال دو جادو کے نعرو گالیوں کو تال دو
ہاں کمر لچکا شرارت، کاکلیں جھٹکا عناد — رقص کر کولھوں پہ رکھ کر ہاتھ اے روحِ فساد
ڈائنو ہاں اپنے اپنے منہ پہ مل کر خاک آؤ — چاہتی کیوں کر ہو بچے بھاؤ کر کے یہ بتاؤ
حکم دیتا ہوں کہ ہل جا خانۂ عصمت کی نیو — ہاں برہنہ ہو کے گردن کو ہلا اے کام دیو
اے سیہ کاری کے ارمانو بدی کے ولولو — پیشوازوں کو پہن لو، گھونگروؤں کو باندھ لو

(کہ یکایک خبیث ارواح کا رقص و سرود شروع ہو جاتا ہے) ۔

("طوفان کی جے شیطان کی جے" کے عنوان سے یہاں اک ترانہ ہے)

(اس ترانہ پر ابلیس فرطِ مسرت سے کہنا شروع کرتا ہے)

شکر ہے ابلیس پر واجب خدائے پاک کا
آگ کے قدموں پہ سر رکھا ہوا ہے خاک کا

جس کے جتنوں مجھ سے بگڑا تھا الٰہ العالمین
آج اس آدم کے بچے ہیں میرے زیرِ نگیں

اس زمیں پر ہاں علی الزعم خدائے آسماں
آج میرے ہاتھ میں ہے نوعِ انساں کی عناں

اور یہ جو ہیں صحیفے طاق میں رکھے ہوئے
ہو چکے ہیں یہ تو کب کے ضبط میرے حکم سے

کر چکا ہوں میں نرالا انتظام ان کے لئے
حلق سے نیچے اترنا ہے حرام ان کے لئے

دیدنی ہے میری تفسیروں کا عالم آج کل
کثرتِ معنیٰ سے ہر آیت ہے مبہم آج کل

میرے حلقہ میں ہے داخل ہر فقیہ ذی حشم
حکم سے چلتا ہے میرے ہر محدث کا قلم

کی گئی ہے موشگافی اس قدر آیات میں
بہ رہا ہے ہر سفینہ سیلِ تاویلات میں

حکم جس کا رات کو کرتا ہو دن اور دن کو رات
اس سے سجدے کیلئے کہتا تھا ربِ کائنات

"خاک پر سرکش فرشتے خاک پر رکھ دے جبیں"
تاب اس توہین کی "سرکش فرشتے" کو نہیں

کامرانی ہو چکی ہے مجھ کو اپنے کام میں
ہر پیمبر کی نشانی ہے مرے گودام میں

گو پیوں کی تابِ رخ، بلقیس کا رنگِ جبیں
شیام کی نَے، نوح کی کشتی، سلیماں کا نگیں

....

خاتمِ دستِ سلیماں و عصائے موسوی
الغرض ہر شے جو تھی وابستۂ پیغمبری

کر لیا ہے قرق اِن سب کو مرے خدام نے
جس کو جھٹلانے کی قوت ہو وہ آئے سامنے

(اسکے بعد خدا ناراض ہو کر دریچۂ عرش بند کرنے کا حکم دیتا ہے، اور انبیا سے جواب طلب کرتا ہے) ۔

مولانا حسرت موہانی

نغمۂ آہستہ خرام

معجزہ دیکھا سرِ شام آپ کا   مطلع خورشید ہے بام آپ کا

یاد ہے ابتک وہ زراہِ کرم   وعدہ پہ آنا سرِ شام آپ کا

ہار ہوئی آخر کار آپ کی   بازی گیا جیت غلام آپ کا

میرا وہ اصرارِ نشیدِ غزل   عذر ہیں وہ نرم کلام آپ کا

رات کی تنہائی میں آخر وہ خود   نغمۂ آہستہ خرام آپ کا

مٹ کے رہے دونوں بہ تقریبِ وصل   درد مرے دل کا زکام آپ کا

دعوائے میخواری حسرت غلط
آپ کی بوتل ہے نہ جام آپ کا

ساغر نظامی

خاکستر

اُلجھی سُلجھی سانسوں سے اب، زیست کا ساماں کیا ہوگا — جینا تو مر مر کے ہوا تھا، مرنا آساں کیا ہوگا

ہوگا کیا جینے کا سہارا زیست کا ساماں کیا ہوگا — لاگ نہیں اب تجھ سے بھی دل کو اے غمِ پنہاں کیا ہوگا

آنسو بن کر ٹپکا بھی تو کارِ نمایاں کیا ہوگا — اے غمِ پنہاں! اے غمِ پنہاں! اے غمِ پنہاں کیا ہوگا

غرق ہوئے تو ہو جائینگے، کارِ نمایاں کیا ہوگا — موج کے اُٹھنے گرنے سے نقصانِ طوفاں کیا ہوگا

اُلٹے سیدھے شکووں پہ وہ کافر حیراں کیا ہوگا — عشق ہی آنکھیں نیچی کر لے، حُسن پشیماں کیا ہوگا

حُسنِ بہاراں، کیفِ بہاراں، جوشِ بہاراں کیا ہوگا — دیوانے گلشن میں نہیں مرکز یہ گلستاں کیا ہوگا

طوفان طوفان بہتے پھرنا، رسوائی ہے کشتی کی — بچ نکلے تو دُنیا کو اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

کشتی نذرِ موجِ بلا ہے، موجِ بلا کا کیا کہنا — ساحل تک پہنچا بھی دیا تو ہم پر احساں کیا ہوگا

ان کی مرضی، جبرِ مسلسل، ہستی سراپا مجبوری — اپنے بس میں کچھ بھی نہیں تا حدِّ امکاں کیا ہوگا

قیدِ حیات و جبرِ مشیّت، اُس پہ فریبِ مختاری — تجھ سے بڑھ کر اے غمِ ہستی کوئی زنداں کیا ہوگا

ہوش گریزاں، شکوے لرزاں، گویائی کی تاب نہیں — شوق کے ان طوفانوں میں وہ شوخ پشیماں کیا ہوگا

روتی ہوئی آنکھوں کی جگہ کچھ اشک ہیں نگیں رنگیں سے — اس سے زیادہ سوزِ محبّت اور نمایاں کیا ہوگا

ان کا قصّہ بھید نہیں کچھ، دل کا فسانہ راز نہیں — میرے دو اک اشکوں سے یہ اور نمایاں کیا ہوگا

کعبۂ دل آثارِ شکستہ، ان کی نگاہیں کفرِ تمام — شیخ و برہمن کچھ تو کہو، انجامِ ایماں کیا ہوگا

موسمِ گُل میں ٹکڑے ہونا اور ہوا میں اُڑ جانا — اس سے بڑھ کر اے غمِ وحشت مصرفِ داماں کیا ہوگا

کوئل ہو یا بُلبُل ہو یا جھرنے ہوں کہساروں کے — کوئی بھلا ساغر کی طرح مستی میں غزل خواں کیا ہوگا

(یہ گھاری میں فتانِ بہار رشید عین الدین صاحب کے غریب خانے پر) (۶/جون ۱۹۴۲ء)

اختر الایمان

شکست

تم سے بیرنگیٔ ہستی کا گلا کرنا تھا!

دل پہ انبار ہے خوں گشتہ تمناؤں کا — آج ٹوٹے ہوئے تاروں کا خیال آیا ہے
ایک میلہ سا ہے مفلوج سی امیدوں کا — چند پژمردہ بہاروں کا خیال آیا ہے
پاؤں تھک تھک کے رہے جاتے ہیں مایوسی میں — پُرمحن راہ گزاروں کا خیال آیا ہے

ساقیٔ و بادہ نہیں جام و لب جو بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

روز دہقان دھندلکے میں ہوس بوتا ہے — رنگ بھرتا ہے شب و روز کے افسانے میں
روز چشموں سے اُبلتا ہے پہاڑوں کا لہو — خشک ہو جاتا ہے جا کر کسی ویرانے میں
لالہ زاروں میں اُگا کرتا ہے بازار کا روپ — ترشے جاتے ہیں صنم روز صنم خانے میں!

کرم شہتوت کے پتوں سے بھی محروم ہیں جو
ریشم و اطلس و کمخواب بنا کرتے ہیں!

میرے پندار کی زنجیر گلی جاتی ہے — اس خرابے میں کہیں کوئی قدح خوار نہیں!
وہی فرسودہ عقائد نئے پیراہن میں — آج دیرینہ ہوس کار ہوس کار نہیں!
سرگریباں ہوں مرا زعمِ نظر ٹوٹ گیا — اب مرے گرد کوئی آہنی دیوار نہیں

اب اسی حال میں رہنا ہے ستم سہنا ہے!
اب مجھے کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں کہنا ہے!

اختر ہوشیارپوری

عزم

ہوگئی صبح ہوئے جاتے ہیں افسردہ چراغ

چاندنی نیم کے سائے تلے اب سو بھی گئی
چور ہے تھک کے جوانی کے ہر اک نغمے کی لے
دل کی آواز فضاؤں میں کہیں کھو بھی گئی

دوشِ احساس پہ اب بار ہیں مینا و ایاغ

آہ وہ بیتے ہوئے لمحے محبت کے امیں

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں جو سستانے
ہانپتے آئے تھے تپتے ہوئے صحراؤں سے
رس بھرے ہونٹوں سے بے نام سی لذت پانے

رہ گئے تیرگیٔ غم کے تلے دب کے کہیں

اب ترے ہاں نہیں آؤں گا، نہیں آؤں گا

منزلیں لاکھوں ہیں ٹھکرا کے جنہیں آیا تھا
رہ میں تارے بھی ہیں، میخانے بھی، گل بھی جن سے
اپنی معصوم جوانی کو بچا لایا تھا،

اب کہیں بند کئے آنکھ چلا جاؤں گا

ہوگئی صبح، ہوئے جاتے ہیں افسردہ چراغ

ایشیا۔ جون جولائی ۱۹۴۲ء

ظفر تاباں دہلوی

غزل

وہ بیخودی ہے کہ اب بیخودی نہ جائے گی
مری شراب کی مستی کبھی نہ جائے گی

نہ جائے گی خلش عاشقی نہ جائے گی
جگر کا درد نظر کی نمی نہ جائے گی

حریم خلوتِ جاناں ہے وہ مقامِ ادب
نگاہ سے بھی جہاں بات کی نہ جائے گی

ہزار حسن میں شیوے ہوں بے حجابی کے
مگر نگاہ کی شرمندگی نہ جائے گی

ہزار بار کرے حسن اہتمامِ سکوں
دماغِ عشق کی آشفتگی نہ جائے گی

ہزار عشق کو ہو ناز آشنائی پر
مگر وہ حسن کی بیگانگی نہ جائے گی

اُسی نظر میں نہاں رازِ عاشقی ہوگا
وہ اک نظر جو تری سمت کی نہ جائے گی

یہی رہی خلشِ عاشقی اگر تاباںؔ
تو بے قراریِ دل ضبط کی نہ جائے گی

نواب جعفر علی خاں اثر بی-اے

غزل

عرق آلودگی کا رُخِ تاباں ہونا
اپنے ہی نور میں خورشید کا پنہاں ہونا

زیرِ لب کہکے کچھ، انگشت بدنداں ہونا
یہ ہے دیوانہ بنانا کہ پشیماں ہونا؟

کچھ نہیں اسکے سوا جوشِ گل و موسمِ گل
ایک ہنگامہ پے چاک گریباں ہونا

عشق پر ختم ہے یہ طرزِ گرفتاریٔ دل
آپ ہی اپنی تمناؤں کا زنداں ہونا

خشک آنکھوں میں بھی اک اشکوں کا طوفاں اُمڈا
سیکھ لے تم سے کوئی حال کا پرساں ہونا

عشقِ شوریدہ کو سودا ہے اُسی منزل کا
راز بنتا ہے جہاں راز کا عرفاں ہونا

عشق ہے بزمِ تماشا بھی، تماشائی بھی
آپ ہی دیکھنا اور آپ ہی حیراں ہونا

یا اُس عہد کی جب کان سُنا کرتے تھے
گُل کی آغوش میں نکہت کا غزلخواں ہونا

ہے اثرؔ دل کے دھڑکنے میں بھی نغمہ، لیکن
پہلے درکار ہے دو روحوں میں پیماں ہونا

شورؔ (علیگ)

طیّارہ

موت کا اک قہقہہ غارت گری کی اک ہنسی
ایک آشفتہ تباہی ایک برہم نیستی
بربریت کی قسم پیمانِ تخریبِ حیات
ایک ایسی صبح جس کی گود میں تاریک رات
سینۂ ایجاد کا اک زخم خونا بہ فشاں
ترکشِ غارتگری کا اک خدنگ بے اماں
اک پریشاں سی قیامت ایک آوارہ عذاب -
ایک رم خوردہ تغیّر ایک بھٹکا انقلاب
ایک ظلمت ریز بادل ایک آندھی تند و تیز
اک ہلاکت خیز طوفاں شعلہ بیز وشعلہ ریز
نیستی کی چیخ کربِ زندگی کی اک پکار
اک تلاطم خیز ساحل اک خزاں پرور بہار
چرخ پیما ایک آوارہ بگولا موت کا
جنبشیں کھاتا ہوا سا ایک جھولا موت کا
ایک بہتا سا جزیرہ ایک اڑتا سا غبار
اضطرابِ روحِ فطرت فتنۂ گیتی شکار
ایک کوہِ آتش افشاں ایک "کھائی موت" کی
ایک "انگڑائی" فنا کی اک "جمائی" موت کی
ایک معلّق زلزلہ انگڑائیاں لیتا ہوا
زندگی کو اک پیغامِ فنا دیتا ہوا
ہم نشیں دہ آسماں پر دیکھ طیّارہ اڑا
آگ کے طوفاں کو لیکر دیکھ انگارا اڑا
بادلوں کو چیرتا کہرے میں درّ آنے لگا
ابر کے ٹکڑوں میں چھپ چھپ کے نظر آنے لگا

اب فنا کے ہاتھ ہوگا زیست کا برہم نظام
موت اس صورت سے لیگی زندگی سے انتقام

آسماں میں اب یہ طیّارے اڑائے جائیں گے
اب اسی صورت سے قصر و بام ڈھائے جائینگے
اب فضا میں آتشیں طوفاں اٹھائے جائیں گے
اب بساطِ خاک پر شعلے بچھائے جائینگے
مسندوں میں آگ، محلوں میں شبستانوں میں آگ
دامنوں میں آگ بھڑکے گی گریبانوں میں آگ
کوچہ و بازار میں شعلے، طرب خانوں میں آگ
معبدوں میں آگ لگ جائے گی ایوانوں میں آگ
جنگلوں میں آگ بھڑکے گی گلستانوں میں آگ
کشتیوں میں آگ ہوگی اور طوفانوں میں آگ
آگ کے شعلے گرائے جائینگے افلاک سے
آگ کے طوفاں اٹھائے جائینگے اب خاک سے
خرمنِ تہذیب سے اٹھتا رہے گا اک دھواں
اب یوں ہی گزرے گا ہستی سے فنا کا کارواں

یہ جو اڑتا جا رہا ہے آسماں پر ہم نشیں
ہاں "سکونِ روحِ آدم" ہے یہ طیّارہ نہیں

خمار بارہ بنکوی

غزل

نہیں ہوتا مداوائے غمِ پنہاں نہیں ہوتا
بظاہر ہنس لیا جاتا ہے دل خنداں نہیں ہوتا

پریشانی میں ہنس دینا جسے آساں نہیں ہوتا
وہ کم ہمت سزاوارِ غمِ جاناں نہیں ہوتا

محبت نے مجھے پہنچا دیا ہے اس بلندی پہ
کہ اب اُن سے بھی میرے درد کا درماں نہیں ہوتا

طوافِ کعبہ برحق۔ بندگی واجب مگر زاہد
بغیر مے پرستی آدمی انساں نہیں ہوتا

حفاظت چاہیئے دل کی حفاظت چھوڑ گلشن کی
اُجڑ جاتا ہے دل گلشن کبھی ویراں نہیں ہوتا

جہاں بھی جی میں آئے سر جھکا دے بے نیازانہ
مذاقِ سجدہ پابندِ درِ جاناں نہیں ہوتا

نشیمن کیا چمن سے ربط ہونا چاہیئے دل کو
نشیمن کے اُجڑنے سے چمن ویراں نہیں ہوتا

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

سبھی کچھ ہو رہا ہے اس ترقی کے زمانے میں
مگر یہ کیا غضب ہے آدمی انساں نہیں ہوتا

فراقِ یار میں مرنا خمار آساں ہوتا ہے
فراقِ یار میں جینا خمار آساں نہیں ہوتا

سلیمان ادیب

بنتِ عم سے!

تم سے اک بات ہے کہنے کی بڑی اچھی بات — سُن کے تم ہنس ہی پڑو گی وہ ہے کچھ ایسی بات
یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں تم نہ خفا ہو جاؤ — یہ بھی ممکن ہے کہ اک سوچ میں تم کھو جاؤ
تم سے کہنے کا بہت دن سے ارادہ تھا مرا — اے خوشا! طالعِ بیدار کہ وقت آ ہی گیا

دیکھتی ہو وہ شفق پھول رہی ہے کیسی — شاید اس مہندی لگے ہاتھ کی سُرخی ہو گی
طائر اُڑ اُڑ کے بسیرے کو چلے آتے ہیں — نرم ہے موجِ ہوا پھول کھلے جاتے ہیں
چاند کے روپ میں اتنی تو نہ تھی رنگینی — دیکھوں! ٹوٹی تو نہیں کوئی تمہاری چوڑی!؟

ہاں مگر یاد رہے یاد رہے راز ہے یہ — دل ہیں دو اس کو جگہ دل ہی کی آواز ہے یہ
لو سنو کان ادھر لاؤ مرے مُنھ کے قریب — اے لو شرماتی ہو تم، تم بھی ہو کس درجہ عجیب؟
یہ کہا "جلد کہو" خیر تو پھر سُن لینا، — کام ہے تم کو کسی اور کو یہ جُل دینا
کیوں جھجکتی ہو کوئی چیز لئے لیتا ہوں؟ — کیوں بگڑتی ہو ادھر آؤ کہے دیتا ہوں
کچھ نہیں جانتیں؟ انجان بنی جاتی ہو — کونسی نظم ہے وہ تم جو کبھی گاتی ہو
"کونسی نظم؟" وہی نظم جو پیاری ہے بہت — ہاں وہی نظم جو تم کو بھی تو بھاتی ہے بہت
جس میں شاعر نے کہا ہے کہ "محبت ہے مجھے — بنتِ عم تیرے تصوّر ہی میں راحت ہے مجھے"

چاہتا ہوں میں تمہیں بس یہی کہنا تھا مجھے
کیا کہا، اب نہیں بولو گی کبھی تم مجھ سے؟

ایشیا۔ جون جولائی ۱۹۴۲ء

کسوٹی

تازہ رسائل

برہان۔جون۔

فلسفہ۔

فلسفہ کا وجود انسان کے شکوک کی بنیاد پر ہے۔ ہر سوچنے والا انسان جب ان سنی سنائی باتوں یا ایک عام روش سے اکتا جاتا ہے تو ائکے خیالات اسکے گرد حلقہ کرلیتے ہیں۔ وہ کیوں۔ کس طرح؟ اور کیونکر؟ کے ایک جال میں گھر جاتا ہے اس کا دماغ اُسے بار بار اُکساتا ہے اگر یہ یوں ہی ہے تو یوں ہی کیوں ہو کسی اور طرح کیوں نہیں اور خیالات کی یہی رو دماغ کو فکر کی دعوت دیتی ہے۔ انسانیت اور ورائے انسانیت کا تخیل آدمی کو گھیر لیتا ہے طبعیات اور مابعد الطبعیات اخلاقیات اور مدنیات، خیر و شر، حسن و قبح، رحم و انصاف اور اسی قسم کی تمام چیزیں جن سے زندگی کا ایک گہرا تعلق ہے آدمی انکو بار بار سوچتا ہے اور یہی سوچنا زندگی کی ان منزلوں میں آدمی کو گھسیٹ کرلے آتا ہے جہاں سے انسان کی سطحی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ذہن میں بار بار یہ خیال پیدا ہو کر کہ زندگی محض خوردن، نوشیدن اور مردن نہیں اور ایک نئی راہ پر ڈالدیتے ہیں۔

اس طریقہ سے ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرتی اصولوں نے جنم لیا۔ اور ہر شخص نے اپنی حیثیت اور فکر کے مطابق اصول مرتب کئے۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا جو زندگی کا مفہوم اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ ؎

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہو گیا جن کا خیال تھا کہ زندگی کو ضمیر کی آواز پر چھوڑ دینا چاہئے چونکہ ضمیر ہی ایک ایسی چیز ہے جو بلاواسطہ خدا کی آواز کو سن سکتا ہے اور سنتا ہے۔ ایسے گروہ کے کچھ لوگوں نے زندگی کو محض ایک فریضہ تصور کیا اور انکی زندگی ایک سپاہی کی زندگی بنکر رہ گئی "فرض برائے فرض" کے علاوہ انکی زندگی میں ذاتیات کو کہیں دخل نہیں۔

تیسرے گروہ کے لوگوں کے نزدیک زندگی تنازع للبقا کے سوا کچھ بھی نہ رہی۔ اسی حیوانی کشمکش سے ان کے خیال کے مطابق ہم نکلکر آئے ہیں اور اس زندگی میں بھی ہم کو وہی کشمکش جاری رکھنی چاہیئے۔ جس طرح اکثر جانور گروہوں میں رہتے ہیں۔ محض اپنی حفاظت کی غرض سے اسی طرح ہم بھی گروہوں میں رہتے ہیں اور ہمیں اس جماعتی نظام کے ساتھ ساتھ افراد کا بھی خیال رکھنا چاہئے

چوتھا گروہ انہی تین قسم کے سوچنے والوں کے بین بین پیدا ہو گیا اور انھوں نے ان تینوں قسم کے سوچنے والوں کے بہترین اصول لیکر یکجا کر دیئے۔

ڈاکٹر ولی الدین کے متذکرہ بالا مضمون سے جو انھوں نے پچھلی ماہ کے برہان میں لکھا ہے۔ ہم یہاں کچھ پیش کرتے ہیں:۔

"موجودہ زمانہ میں ہمارا نقطۂ نظر زیادہ تر انفرادی واقع ہوا ہے ہم دنیا پر ہئیتی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشرتی، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اسکی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ قدماء یونان کو ثبات و تغیر عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا لیکن تغیر سے انکی مراد مادی تغیر تھا یعنی مادی ذرات یا اجزا کی حرکت یا نشو و نما، زوال و فنا کے مظاہر۔ چنانچہ زینو کا خیال تھا کہ قدرت کے کارخانہ میں تغیر محال ہے۔ اسکو بظاہر جو تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب والتباس ہے، لیکن ہرقلیتوس کو یقین تھا کہ ثبات و سکون کائنات کی کسی شئے میں نہیں۔ دنیا سرتاپا تغیر، تجدد، تنوع ہے، یہ اور اسی قسم کے مسائل اہم ہیں شک نہیں ابتک لاجواب ہیں لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کئی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہو گئی ہے، ہم معاشری رسوم، سیاسی علائق، اخلاق و آداب مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں لیکن امر، قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادی کی تغیرات والی دنیا۔ لہذا فلسفہ کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفۂ حیات، اسکی قدر و قیمت، اسکی بدایت و نہایت، اور غرض و غایت کی توجیہ کرتا ہے اس لئے ارتقاء ترقی، ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کیلئے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شاید قارئین میں سے بہت کم ایسے ہونگے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے سوالات کو نہ اٹھایا ہوگا۔ کیا خدا کا وجود ممکن ہے، یا سوائے مادہ اور انرجی کے کوئی شئے نہیں؟ مادہ کا مایۂ خمیر کیا ہے؟ کیا درد سے زیادہ کوئی چیز حقیقی ہو سکتی ہے؟ اگر جلوہ فرمائی صرف مادہ کی ہے تو درد کیا چیز ہے؟ کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا؟ تو کیا ذہن مادے سے جدا نہیں امیر غور و فکر کرنا، درد و الم سہنا، کیا صرف مادی ہی جسم سے تعلق رکھتا ہے، مادی

جسم کا وظیفہ ہے یا اس سے جدا شئے ہے؟ میں زندہ ہوں؟ حیات کیا ہے؟ وہ مے کیا ہے جو بقول اقبال "تلخ تر و نیکو تر ست"؟ ایک روز مجھے موت آئیگی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابوالعتاہیہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا۔

اَلْمَوْتُ بَابٌ وَکُلُّ النَّاسِ یَدْخُلُہٗ   یَا لَیْتَ شِعْرِیْ بعد الباب مَا الدَّارُ

ہم آزاد نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا ع

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی!

حافظ کا خیال تھا کہ ع

پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند!

واقعہ کیا ہے! مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض اُن میں کے صائب ہیں اور بعض دغا پذیر، صواب و خطا کے کیا معنی ہیں؟ انکے معیار کیا؟ ہم میں سے بعض تلاش زر میں سرگردان ہیں بعض شہرت کے خواہاں اور بعض لذت کے دلدادہ اور

"خوش باش دمے کہ زندگانی این است"

کے پیرو۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قسمیں ہیں؟ ان سے اعلیٰ وارفع نصب العین موجود ہیں؟ مثلاً سواقیہ نے "طمانیت نفس" کو خیر و برتر قرار دیا تھا، دنیا کی کوئی مصیبت دنیا کی کوئی خوشی، اطمینان خاطر کو صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ بی ہتیئوس نے روما کے جیل خانہ میں فلسفے کے تسلی بخش لذات پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ کیا اس طرح تلاش حق، فنون لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قسمیں نہیں قرار دیجا سکتیں؟ ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے؟ علم انسانی کی حدود کیا ہیں اس کی اڑان کتنی ہے؟ علاوہ ازیں فطرت و صنعت میں خوبصورت اشیاء میرا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ اکثر بدصورت بھی ہیں، حسن کیا ہے؟ ایک خوبصورت عمارت میں، ایک حسین چہرے ..... میں، موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہوتے ہیں؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں۔ ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت لباس حسن میں ملبوس ہوتی! یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں۔ ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، ان پر غور کرنا، حکیمانہ طور پر، تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا۔ ان کے جواب فراہم کرنیکی سعی کرنا گویا لاحاصل سہی فلسفہ ہے، یا جیسے فلسفہ کے شیدائی ولیم جیمس نے کہا ہے، "فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے"، یہ کام دیوتاؤں کا نہیں، جانوروں کا نہیں، انسان کا ہے، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پروفیسر ہو یا تاریخ کا!"

گل کر دیجئیے وہ پہلے ہی سے یہ زرد چراغ
آج بھی عیش کے لمحات فسردہ کیوں ہوں

جگمگاتے ہوئے ریشم کا پرانا ملبوس
جسم افسردہ کی زردی کو چھپا ہی لے گا
رات کے وقت بہر حال یہ نیلا فانوس
تم سمجھتی ہو کہ خلوت کو سجا ہی لے گا

کل یہی ساز، یہی گیت، یہی جام شراب
جھلملاتی ہوئی دیوار پہ تھراتے تھے
رات یہ شمع، یہ تارے، یہ سنہرا مہتاب
خلوت عیش میں کچھ سرد ہوئے جاتے تھے

دھندلے دھندلے سے انہی ریشمی پردوں کے ادھر
حسن غربت کے نظارے بھی یہاں کیوں کھولں
جنکے چہروں سے مجھے اپنے گناہ آئیں نظر
ایسے وہ چاند ستارے بھی یہاں کیوں کھولں

ہاں ہٹا دو مری نظروں سے یہ پُردرد چراغ
مرے گاتے ہوئے جذبات فسردہ کیوں ہوں

ساقی جون۔ (سلام مچھلی شہری)

نظم پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کا شاعر اپنے گرد و پیش سے کچھ بیزار سا ہے۔ محفل عیش میں داخل ہونے سے پہلے اسکی نظر اس زرد چراغ پر جاتی ہے جو اس انجمن نشاط کیلئے ایک برا شگون ہے۔ اگرچہ اشعار

کے ساتھ ساتھ ذرا سا ذہن پر زور دیکر کچھ سوچیں تو ہمیں اسکے پس منظر میں ایک ایسے انسان کی تصویر نظر آئیگی جس کے چہرہ پر ایک حزن وملال اور آنکھوں سے بیزاری ٹپکتی ہو ہے۔ اسکی نگاہوں کے سامنے محفل عیش ونشاط کا باب وا ہے، اور وہ اپنے آپکو اس میں غرق کر دینا چاہتا ہے، اسکی آمد اس محفل نشاط میں آج پہلی بار نہیں بلکہ وہ اکثر آتا ہے، اور جس طرح اس سے پہلے اسکے وقتی تعیش میں کوئی فرق نہیں آیا اسی طرح وہ آج بھی نہیں چاہتا کہ اسمیں کوئی فرق آئے لیکن صرف شمع ہی کے الگ کر دینے سے ہی تو عیش کے لمحات فسردہ ایک امنگ میں نہیں بدل جائیں گے اسکے لئے وہ کہتا ہے کہ جہاں اور چیزوں کا تعلق ہے انہیں یہ ریشمی غلاف ڈ پرانے ملبوس ڈھاپ لیں گے۔ جہاں تک زندگی کی بے بسی کا تعلق ہے وہ وہ ایک تاریکی میں مدغم ہو کر رہ جائیں گے۔

نظم میں کہیں بھی نمایاں طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر یہ تمام کچھ کہہ کیسے رہا ہے لیکن اس پس منظر پر نظر ڈالنے سے اس انسان کے سامنے ایک نسوانی پیکر نظر آئیگا۔ بہت دھندلا اور بہم سا جو پرانے ریشمی ملبوس اتارنیکے بعد زندگی کی ایک بھیانک تصویر ہے۔ غربت کا ایک مستقل نظارہ اور اس تصور کے ساتھ ہی اس ماحول میں سینکڑوں نسوانی پیکر عریاں، زرد بے بس۔ انسانی گناہوں کی ایک تصویر، چاروں طرف منڈلاتے ہوئے نظر آئیں گے،

یہ نظم فن کاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے سلام جو کچھ پس منظر میں رکھنا چاہتا ہے وہ وہیں رہتا ہے اور جس انداز سے نظم کا آغاز کرتا ہے وہ انداز آخر تک اسی طرح قائم رہتا ہے۔ اس کا منتہا اس محفلِ عیش میں آنے سے صرف یہ ہے کہ وہ ایک لمحہ کیلئے ان انسانی آلائشوں سے منہ موڑ لینا چاہتا ہے۔ جسے دیکھتے دیکھتے وہ اکتا گیا ہے اور نہیں چاہتا کہ اب دیکھے تاوقتیکہ اس کا یہ خمار اور یہ ایک وقتی لطف ختم نہو جائے۔ اسکے علاوہ ایک چیز یہ بھی ہے کہ اگر وہ اس زرد شمع کی روشنی میں ان پرانے ریشمی ملبوس اور زرد اجسام کو دیکھے گا تو اسے اپنے گذشتہ واقعات کا خیال آئیگا۔ اس محفلِ عیش کا جس کی داد وہ اکثر دیتا رہا ہے اور وہ اپنے گناہوں سے پشیمان ہوگا۔ اس کا لطف ایک مستقل تکلیف بن کر اسکے دل میں ایک کسک پیدا کر دیگا۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کے گاتے ہوئے جذبات فسردہ ہو جائیں

وہ انہیں اجاگر کر کے لایا ہے۔

وہ نظم میں ابتدا ہی سے ایک تاثیر پیدا کرنا چاہتا ہے ایک ہی سلسلہ خیال کو لیکر چلنا چاہتا اور اسے آخر تک قائم رکھتا ہے نظم کے شروع میں خیال ہوتا ہے کہ کہیں وہ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر جو محفل عیش میں اس کے سامنے آنیوالی ہیں لڑکھڑا نہ جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا وہ ایک ہی وقت میں تعیش کوش بھی ہے، نقاد بھی، اور ایک فن کار بھی۔ لیکن اس کا یہ پہلو جس میں وہ ایک نکتہ چیں کی حیثیت سے نسوانی زندگی اور محفل عیش کو دیکھتا ہے اتنا دبا ہوا ہے کہ وہ آخر میں ایک فن کار ہی ثابت ہوتا ہے سلام کی اکثر نظمیں وہ ایک فن کار کی تراش خراش کا اچھا نمونہ ہیں۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں لغزش بھی ہو جاتی ہے۔

ہمارا دور بیداری کا ایک احساس ہے، ایک انسانی ہمدردی کی رو، ایک خلفشار اور خلجان میں نہ صرف ایک آدمی بلکہ ہر شخص گرفتار ہے۔ ہر ذی حس اور سوچنے والا دماغ۔ اس خلفشار میں نہ صرف سلام ہے۔ بلکہ یوسف ظفر بھی

چور پکڑا گیا ــــ پکڑا ہی گیا آخر کار
رات کے ٹوٹتے تاروں کا سنبھالا لیکر
چپکے چپکے وہ دبے پاؤں ہوا تھا داخل
بھوک اک خنجرِ بیباک تھی اس کے دل میں
دل کی دھڑکن ــــ وہ تو چہرے پہ نکھر آئی تھی
کئی راتوں کی تھکن اس کی نظر کے بل پر
آنکھ کے پردۂ سیمیں پہ اتر آئی تھی
اسکی پژمردہ جوانی کا وہ ڈھانچا تو نہ تھا
ایک احساس کا پتھرایا ہوا لاشا تھا

سامنے کمرے میں کیا کچھ نہ تھا ــــ سب کچھ ہی تو تھا
وہ زر و سیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا
اپنے خود کاشتہ اصنام کا انبارِ عظیم
عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں
مسکراتی ہوئی تصویریں بنی جاتی تھیں
ہر طرف [illegible] تھی ــ [illegible] تھی ــ سسکتی تھی ــ
(یوسف ظفر)

ادب لطیف۔ جون۔ زندگی کی جس ضرورت کیلئے سلام زرد اجسام ریشمی ملبوس میں پوشیدہ کر رہا ہے اسی ضرورت کو ظفر ایک دوسرے طریقہ سے پیش کر رہا ہے۔ ایک فنکار کی تعریف یہ ہے کہ وہ کوئی بھی موضوع ہو اسے اس طرح پیش کرے کہ کانوں کو گراں اور حسن لطیف پر بار نہ گزرے اس موضوع پر جس پر ظفر اظہار خیال کر رہا ہے پہلے بھی نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن انھیں پڑھنے سے وہی لطف آتا ہے جو ایک فوجی بینڈ کو سُنکر آسکتا ہے۔ لیکن ظفر صرف

چور پکڑا گیا ۔۔ پکڑا ہی گیا آخر کار

کہہ کر دماغ کو ایک روحانوی اور مضطرب ماحول کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد جذبات ایکدم ایک لاوے کیطرح ابل نہیں پڑتے بلکہ ایک کسک بنکر بے چین کر دیتے ہیں۔

رات کے ٹوٹتے تاروں کا سنبھالا ایک آرٹسٹ ہی کے قلم سے نکل سکتے ہیں اور پھر اس کے پیچھے جو گداز اور سوز چھپا ہوا ہے اسکی کیفیت کچھ وہی شخص زیادہ سمجھ سکتا ہے جس کو ایک امید و بیم کی گھڑی در پیش آئی ہو۔ نظم حقیقت ورومان کے ملے جلے تاثرات لئے ہوئے آخر تک ایک لطیف طنز بن کر رہ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی طبیعت میں ایک ہلکا۔ نفرت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

وہ زر و سیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا
اپنے خود کاشتہ انصاف کا انبار عظیم
عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں

یہ سطریں جہاں ہمارے سامنے ایک مشاق نقاش کو پیش کرتی ہیں وہاں ایک تبسم زیر لب کبھی مجبور کرتی ہیں جنہیں کڑواہٹ اور تلخی بدرجۂ اتم ہے اور جب ہم سنتے ہیں کہ۔

اسکی پژمردہ جوانی کا وہ ڈھانچا تو نہ تھا
ایک احسان کا پتھرایا ہوا لاشا تھا

اس وقت اسکے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا کہ رفتہ رفتہ ان چیزوں کی بیخ کنی کیجائے۔ اس طرح کہ۔

عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں دھندلی پڑ جائیں

اگر اس طرف سلام اور ظفر روزگار کے شاکی ہیں۔ تو دوسری طرف جذبی اور روشِ غمِ دل کے شاکی ہیں۔ اور ان دونوں سے کہیں نجات نہیں۔

اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھوں گا آہ کے ساتھ — مرے جلتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ رکھیگا کوئی
رہِ نگہیں کی خموشی پہ نہیں بگڑوں گا — مری بیباک نوائی پہ نہ روٹھیگا کوئی
دلِ نازک کے دھڑکنے کی سنوں گا نہ صدا — مری گھٹتی ہوئی آہوں پہ نہ چونکیگا کوئی
مری آہٹ پہ لجاتے ہوئے میری جانب — ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے نہ آئیگا کوئی
انکے ماتھے پہ پڑیگی نہ بناوٹ کی شکن — انکے کھینچے ہوئے ہاتھوں کو نہ چومے گا کوئی
مری وحشت کے تماشے بھی نہیں ہونگے نصیب — انکے الجھے ہوئے بالوں سے نہ الجھے گا کوئی

دلِ ناشاد تری چپ سے مگر کیا ہوگا
تری فریاد کو سمجھا ہے نہ سمجھے گا کوئی

ادب لطیف جون۔ (جذبی)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبی ایک تذبذب اور کشمکش کے عالم میں سر جھکائے زندگی کے گذرے ہوئے لمحات پر غور کر رہا ہے۔ خیالات کا ایک سلسلہ ہے جو بندھا ہوا ہے۔ ذہن گذشتہ واقعات کو دہرا رہا ہے اور ایک چھیڑ چھاڑ اور لطیف رمز و کنایات جو دو جذبات سے بھرے ہوئے دلوں میں ہوا کرتے ہیں ان کا تصور بندھا ہوا ہے۔ کبھی انھیں حنا آلود کھنچے کھنچے ہاتھوں کا خیال آتا ہے جنہیں وہ چومنے کیلئے بیقرار رہا کرتا تھا۔ اور کبھی اس التہابِ شوق کا۔ جب کوئی اسکے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے رخسار رکھدیا کرتا تھا اسے وہ منظر یاد آجاتا ہے۔ جب کوئی اسکی آہٹ پر اپنے آنچل کو نرم و نازک انگلیوں سے ہٹاتا ہوا لجاتے ہوئے اسکی طرف آیا کرتا تھا اور کبھی جب اسکی انگلیاں کسی کے الجھے ہوئے بالوں سے کھیلا کرتی تھیں۔

اسے ان لطیف احساسات کا تصور بے چین کر دیتا ہے اور وہ جس طرح خیالات اس کے ذہن میں آتے تھے اور جس طرح واقعات ہو چکے ہیں بعینہ اسی طرح انہیں اٹھا کر اپنے قلم کی ایک جنبش کاغذ پر لے آتا ہے جس طرح اس نے اپنے ذہن میں دیکھا اسی طرح ہم نے اسے کاغذ پر دیکھا اور اپنے تخیل میں ایک تصویر بنالی اور بقول شخصے بہترین شاعری فن کے لحاظ سے وہ ہے جسکی تصویر بن سکے اور ہم بلا شک وشبہ جذبی کی اس نظم کو پڑھ کر ایک تصویر مکمل کر سکتے ہیں۔

رات بھر نکہتِ بیدار گل افشاں ہی رہے
صبح تک خلوتِ شب بزمِ چراغاں ہی رہے
گرم رو قافلۂ شوق فراواں ہی رہے
جذب پنہاں کو یوں ہی راہ نما رہنے دے

کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ
عالمِ شوق کو غافل نہ کہیں پائیں وہ
دلِ ناداں کہیں آ کر نہ چلے جائیں وہ
بربطِ غم کو یوں ہی نغمہ سرا رہنے دے

بے اثر ہو غمِ الفت یہ نہیں ہو سکتا
حاصل عشق ہو فرقت یہ نہیں ہو سکتا
ان کو لائے نہ محبت یہ نہیں ہو سکتا
اس پہ سب فلسفۂ یاس فرا رہنے دے

دلِ ناداں نہیں معلوم وہ کب آ جائیں
در کاشانۂ اُمید کھلا رہنے دے

(روشن صدیقی)

۸۲ ادیب جون۔

جذبی اور روشن کے فلسفۂ محبت میں بہت بڑا فرق یہاں آن کر پڑ جاتا ہے جہاں جذبی کہتا ہے

پیار تری بات کو سمجھا ہے نہ سمجھو گا کوئی

اور روشن کے خیال میں

اب یہ سب فلسفۂ یاس فرا رہنے دے

روشن مایوسی کو گناہ خیال کرتا ہے اور اسی لئے اسکے یہاں حزن و ملال نہیں یا یہ کہ اسکی نگاہیں ایسے مناظر سے دوچار ہونیکی قوت نہیں رکھتیں۔ اپنے آپ کو امید کی آخری منزلوں پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کو اپنے جذبۂ عشق پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ یہ کہہ اٹھتا ہے۔

بے اثر ہو غمِ الفت یہ نہیں ہو سکتا۔

وہ یاس کا قائل نہیں ہاں ایک مسلسل کوشش کا ضرور قائل ہے۔ اسکے یہاں شک کا شائبہ ضرور ہے۔

"کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ" میں اگرچہ ظاہرا طور پر ایک امید کی جھلک ہے لیکن اسکے پس پردہ ایک ابہامی کیفیت پنہاں ہے۔ یہ بھی بہت ممکن ہے وہ نہ بھی آئیں۔ کوئی وقت کا تعین نہیں، کوئی خاص وقت نہیں لیکن ہاں ایک رو تحت الشعور میں ضرور دوڑ رہی ہے، جو بار بار کہتی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور آئیں گے۔

ممکن ہے زندگی میں آگے چلکر ایسے مقامات آجاتے ہوں جہاں مایوسی امید میں بدل جاتی ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ روشن ان مقامات کو طے کر چکا ہو۔ ورنہ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ

روز امید بدل جاتی ہے مایوسی میں۔

ادارہ

نئی کتابیں

انجمن ترقی اردو کی کہانی:- مولوی غلام ربانی صاحب سررشتۂ آثار قدیمہ کی لکھی ہوئی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت چار آنے

یہ کتاب انجمن کی ابتدائی حالت سے لیکر اسوقت تک کی جدوجہد اور کاوش کی ایک مختصر کہانی ہے۔ زبان نہایت عمدہ اور برجستہ ہے اور بہت مؤثر انداز میں لکھی گئی ہے۔ ہماری اکثر انجمنوں کی یہ کیفیت ہے کہ پیدا ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور بعض بعض تو اس خوبصورتی کے ساتھ پیدا ہوتی اور ختم ہو جاتی ہیں کہ لوگوں کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوتی بالکل اسی طرح سے جس طرح اسلام نے خیرات کا طریقہ بتایا ہے کہ اس طرح ہونی چاہئے کہ دائیں ہاتھ کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

دراصل اس قسم کے تمام کاموں کی بنیاد کارکنان کے ذمہ دارانہ یا غیر ذمہ دارانہ رویہ پر ہوتی ہے۔ ہم لوگوں میں خلوص، ایثار، جانفشانی اور نیک نیتی سے کام کرنیوالے لوگ بہت کم ہیں۔ اکثر لوگ کسی انجمن یا اسی قسم کی کسی اور تحریک کی ذمہ داری محض اس وجہ سے قبول فرما لیتے ہیں کہ انکی نظر تحریک سے ہٹ کر ذاتی شہرت یا کسی ذاتی مفاد پر ہوتی ہے۔ ممکن ہے تحریک کی کامیابی بھی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کامیابی ہو کیونکہ ذاتی مفاد تلاش کرنیوالے لوگ خود کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

کسی تحریک میں کام کرنیوالے عموماً تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ پہلے وہ جو روپیہ صرف کرسکتے ہیں کام نہیں کرسکتے ایسے لوگوں کے پیش نظر محض شہرت اور ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو کام کرسکتے ہیں روپیہ نہیں صرف کرسکتے۔ ایسے لوگ ضرورت سے زیادہ جوشیلے ہوتے ہیں اور تیسرے وہ جو روپیہ بھی صرف کرسکتے ہیں اور کام کرنیکی اہلیت بھی رکھتے ہیں لیکن یہ قسم عموماً نایاب ہے اور اگر ملتی ہے تو بہت مشکل سے۔ بعض اوقات اول الذکر قسم کے لوگوں کی نیت بھی درست ہوتی ہے مگر اتفاق سے جو کام انکے سپرد کیا جاتا ہے اس سے انکی طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ کام بے دلی سے شروع ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے سب کچھ صفر ہوکر رہ جاتا ہے جس کی قیمت دائیں یا بائیں کسی طرف لگانے سے بھی نہیں بڑھتی۔

یہ انجمن ترقی اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا جو روپیہ بھی صرف کرسکتا ہے اور محنت بھی جان توڑ کر کرسکتا ہے یہ ہی اور انجمن کی ترقی کا راز ہے۔ اس میں بڑا دخل نیک نیتی، خلوص اور ایثار کو ہے۔

مولوی غلام ربانی صاحب نے یہ رسالہ مولوی عبدالحق صاحب کی ۲۵ سالہ معتمدی انجمن ترقی اردو کی یادگار کے طور پر خود اپنے شوق سے تحریر کیا ہے اور جن جن مشکلات کا مولوی صاحب اور انجمن کو مقابلہ کرنا پڑا اسے نہایت اچھے پیرایہ میں بیان کیا ہے، کتاب کا آغاز انجمن کے ابتدائی دور سے کیا ہے کہ کیونکر مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمن شروانی کے ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی انجمن مولوی عبدالحق صاحب تک پہنچی۔ اسوقت انجمن کا کل سرمایہ مصنف کے الفاظ یہ تھا۔

ایک پرانا صندوق جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا، ایک رجسٹر اور چند پرانے اور غیر مرتب مسودات۔ ایک قلم دوات اور باقی اللہ کا نام،، اگر ہم آجکل کسی کو ایک لوہے کا گز۔ ایک گز گاڑھا اور ایک کاغذ کے پرزے پر شہر کے محلوں اور گلیوں کے نام لکھکر دیدیں اور کہیں کہ جاکر بڑے پیمانے پر تجارت کرو۔ تو سوائے اسکے کہ وہ شخص یا تو مسکرا کر خاموش ہوجائے یا پھر گالیاں دے اور کیا کرسکتا ہے مگر مولوی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ ممکن ہے اس ذمہ داری کو قبول کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک تبسم آگیا ہو مگر اس کے معنی بھی یہی تھے کہ اچھا۔

گر یہی رنگ تمنا ہے تو اب یونہی سہی

اس کے بعد انجمن کا کام شروع ہوا۔ اورنگ آباد دکن۔ ترقی اردو کی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور وہ رقمیں جنہیں حقیر خیال کیا جاتا ہے جمع ہونی شروع ہوئیں جد وجہد ہوئی، دوڑ دھوپ کے ساتھ ساتھ خلوص کام کرنے لگا۔ چندہ اکٹھا کرنا بے انتہا مشکل کام ہے۔ مگر مولوی صاحب نے سب سے پہلے یہی کام کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بغیر روپے کے ہر سکیم چاہے وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو ناکام ہوکر رہ جاتی ہے۔ مختلف رسائل میں اسکی موافقت میں مضامین نکلنے شروع ہوئے۔ کیونکہ یہ دنیا پروپیگنڈے کی ہے اور اسکے بغیر کسی کام کو بڑے پیمانہ پر چلانا ذرا مشکل ہے۔ اب اس تمام جد وجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ انجمن اب وہاں ہے۔ جہاں گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہ کبھی یہ ہو بھی سکے گی۔

ہماری زبان کا سرمایہ ابتک محض قصہ کہانیوں تک محدود تھا۔ اسے کسی صورت میں بھی علمی زبان نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک علمی اور ادبی زبان ہے۔ آجتک کوئی کتاب علم سائنس اور فلسفہ جیسے خشک مضامین سے متعلق ہماری زبان میں نہ تھی اور یوں بھی ہم لوگوں کے دماغ
۸۳ فطرتاً تعیش پسند ہیں۔ ہمارا ہر ادنی آدمی اس دور کے خواب دیکھتا ہے جب اس کا رنگین تخیل حقیقت میں بدل جائیگا اور بقول شخصے اسکے لئے۔

دن عید اور رات شب برات ہوگی۔

لیکن انجمن ترقی اردو کی کوششوں سے تصنیف وتالیف اور ترجمہ کی طرف قدم اٹھایا گیا اور آج اس زبان میں بہت سی کتابیں فلسفہ، تاریخ اور سائنس سے متعلق مل سکتی ہیں یہاں تک کہ ابتدائی جماعتوں کی درسی کتابیں بھی جن کا اس وقت تک قحط تھا

اس وقت انجمن سے دو ٹھوس رسالے، اردو، اور سائنس نکل رہے ہیں اور انکی اہمیت کسی بھی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔

غرضیکہ تمام کتاب انجمن اور مولوی صاحب کی کاوشوں اور مشکلوں کے ساتھ ساتھ اسکی ترقیوں کی بھی ایک مختصر روداد ہے، اخیر میں انجمن کی چند مفید کتابیں مثلاً میکسم گورگی کی خود نوشت سوانح عمری قاضی نذرالاسلام کی بنگالی نظموں کا ترجمہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران اور نطشے کی تصنیف بقول زرتشت کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ

کی فہرست درج ہے۔ انجمن اور اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایک اچھی چیز ہے۔ چاہئیے کہ لوگ اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدلیں۔

انشائے داغ۔ مرتبہ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ قیمت ایک روپیہ چھ آنے

یہ مرزا داغ دہلوی کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں پہلی فصل میں والیانِ ریاست، حکام، عمال اور امراء کے نام خطوط ہیں۔ دوسری فصل میں مخصوص اعزہ و احباب اور تلامذہ کے نام خطوط ہیں۔ تیسری فصل میں بسلسلۂ شاعری شاگردوں کے نام خطوط ہیں۔ مقدمہ سے پہلے احسن مرحوم کی بہت عمدہ تصویر ہے اور مقدمہ کے بعد مرزا داغ کی تصویر ہے داغ صاحب اس تصویر میں شاعر اور خوجی زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال خیالات و احساسات کی تنظیم بھی عسکری تنظیم سے کچھ کم نہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ لوگوں کو ہندوستان میں اپنے مشاہیر کے خطوط سے دلچسپی ہوگئی ہے در اصل خطوط ہی ایسی چیز ہیں جن سے کسی شخص کی انفرادیت اور اخلاق زندگی کی عکس کشی ہوتی ہے۔ کسی بھی زبان میں کیوں نہ ہوں خطوط کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادبی شخصیتیں دماغی خلجان اور خلفشار میں مبتلا رہی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہتے ہوں۔ اور اس ذہنی کشمکش نے انہیں بارہا مجبور کیا کہ اپنی ان تلخیوں اور مجبوریوں کی داستان کسی کو سنائیں تاکہ کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔

ہر شخص کی زندگی کے عموماً دو رخ ہوا کرتے ہیں ایک وہ جو عوام کے سامنے پیش ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کبھی عوام کے سامنے نہیں آتا۔ اس دنیا میں ہر شخص اپنے منہ پر ایک نقاب ڈالے پھرتا ہے۔ ہمارے گرد و پیش جس قدر بھی چہرے ہیں ان میں بہت کم اپنے اصلی روپ میں ہوتے ہیں بلکہ اپنے اصلی روپ میں کبھی ہوتے ہی نہیں۔ ہماری اس دنیا کا رویہ کاروباری قسم کا رہا ہے اور ہر ایک کاروبار کے لئے کچھ خاص قسم کی عادتوں اور مہارتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ہم میں سے جو لوگ وہ مہارتیں حاصل کر لیتے ہیں وہ لوگ کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جو وہ عادتیں اور مہارتیں جن کی قدم قدم پر ضرورت ہے حاصل نہیں کر سکتے وہ اس زندگی کی دوڑ میں کچلے جاتے ہیں۔ اگرچہ ایک عرصہ سے جب سے انسان کی شعوری کیفتیں اجاگر ہوئی ہیں اخلاقیات کے اصول مرتب ہو چکے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ آجتک اصولوں ہی کی حد تک ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔

کسی انسان کو جبتک وہ اپنے منہ پر سے نقاب نہ اتارے پہچاننا بہت مشکل کام ہے اور بہت مشکل ہے کہ آدمی منظر عام پر آکر اپنے چہرے سے وہ نقاب الٹ دے جس نے اسے عزت یا ذلت جو کچھ بھی دی ہو، لیکن ایسا ہوتا ضرور ہے کہ آدمی اپنے چہرے سے نقاب الٹتا ہے اور وہ صرف تنہائی ہے جس میں آدمی بالکل بے نقاب ہوتا ہے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر آدمی کا کوئی محرم راز ہو۔ آدمی اپنے محرم راز کے سامنے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اپنے چہرے سے نقاب الٹ کر پھینک دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو بالکل عریاں ہو جاتا ہے اس عریانی کا پتہ لگانے کا بھی کوئی طریقہ اس وقت معلوم نہ تھا۔ مگر اب معلوم ہو گیا ہے۔ اور وہ کسی انسان کے خطوط ہیں جو اس نے کسی محرم راز کو لکھے ہوں۔

خطوط انسان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ غالباً اگر نپولین کے خطوط جو اس نے مختلف عورتوں سے عشق کے دوران میں لکھے نہ ملتے تو کوئی بھی اسکی اخلاقی زندگی کا پتہ نہ لگا سکتا۔ اس طرح اگر کوئی جج اپنے روزانہ کے انصاف کی حقیقت اپنے کسی محبوب کو لکھ کر بھیجنا شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کی زندگی کے آئینہ دار ہوں گے کوئی بھی اس خیال سے خطوط نہیں لکھتا کہ یہ کبھی منظر عام پر آئیں گے اس میں وہ جو چاہتا ہے نہیں بلکہ جو اسکی زندگی ہوتی ہے وہ خطوط میں نمایاں کر دیتا ہے جس طرح ایک مصور تصویر کھینچتے وقت اپنے سامنے رکھی ہوئی چیز کے غیر نمایاں حصہ تک نہیں چھوڑتا۔ اس لئے لکھنے والا اپنی زندگی کے غیر نمایاں پہلو خط میں لکھے بغیر باز نہیں رہ سکتا۔

بہرکیف کتاب میں اس کے سوا کوئی جاذبیت نہیں کہ داغ کے خطوط ہیں اور ایسی چیزیں اگر پاس رہیں تو کوئی برائی نہیں۔ تاکہ اپنے مشاہیر کی اخلاقی زندگی کا بھی علم ہو جائے۔

(ادارہ)

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرمادی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں ندگی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گذری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں ں میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

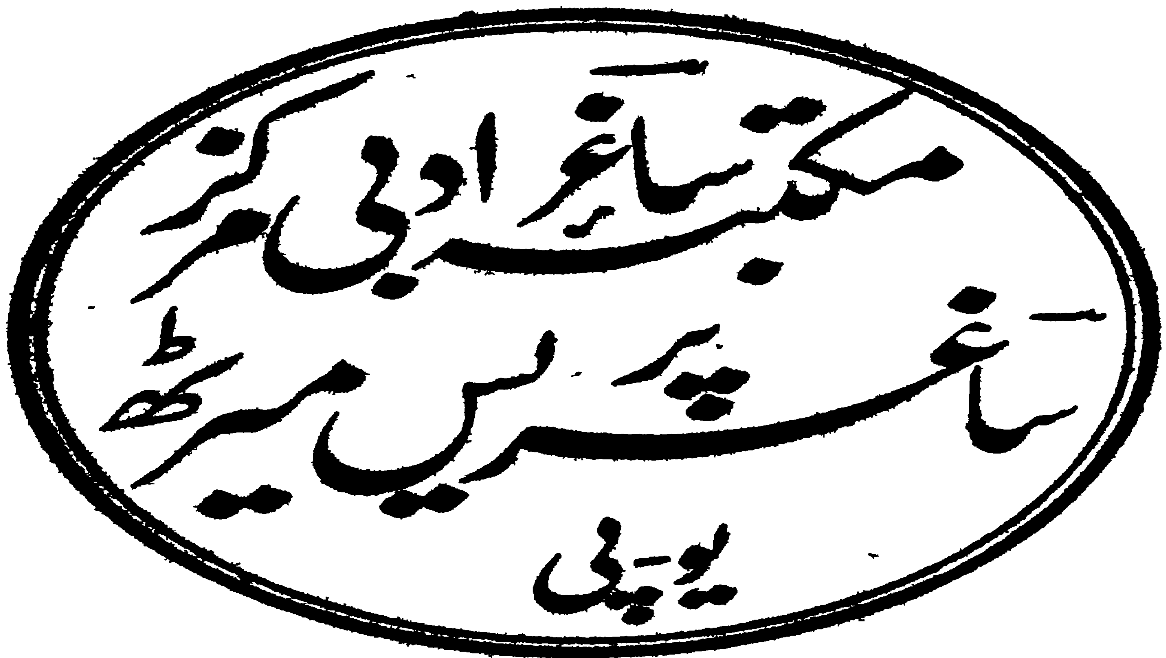
"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ منہ سے بول رہا ہے کہ یہ ایک لوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے انداز بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی۔ لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی نہیں وت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر، تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھ کر دلّی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ۔ اسکے مطالعے سے دسیوں محاورے جو دلّی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادر محترم آنریبل مسٹر فخر الدین علی احمد سابق ریونیو منسٹر (آسام) کے نام معنون کیا ہے۔ ع میں فخر الدین صاحب کی تصویر بھی شریک کتاب ہے۔ مینجر

ملنے کا پتہ :۔ **مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ**

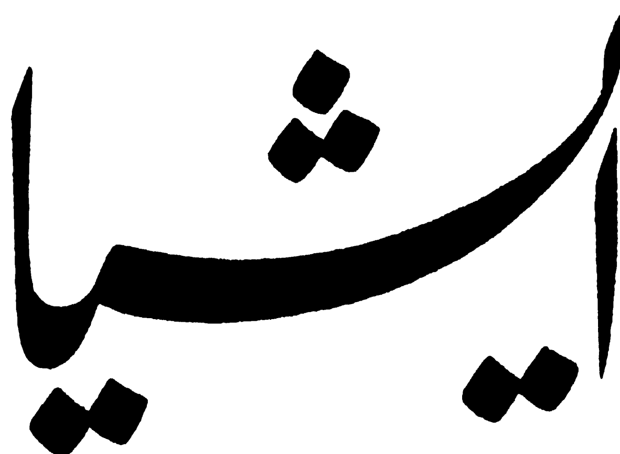
"رسالہ ادیب" دہلی

Registered No. A. 656



Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.


ایشیا

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ نے جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں ۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرمادی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں زندگی اور سماج کی کامل وصحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گذری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں ناول میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ مُنہ سے بول رہا ہے کہ یہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے کہ اندازِ بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی۔ لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی نہیں "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر، تہذیب اور تمدّن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھکر دلّی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلّی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادرِ محترم آنریبل مسٹر فخر الدّین علی احمد سابق ریونیو منسٹر (آسام) کے نام معنون کیا ہے شروع میں فخر الدّین صاحب کی تصویر بھی شریک کتاب ہے۔ —منیجر

ملنے کا پتہ :- **مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ**

"رسالہ ادیب" ۔ دہلی

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

حکومت صوبۂ بہار اور حکومت صوبۂ سی۔ پی (برار)

زیر سرپرستی

ڈاکٹر سیّد محمود

ایڈیٹر ———— ساغر

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)

(قیمت فی نمبر ۸ آنے)

قیمت سالانہ آٹھ روپے (دوسرے ملکوں سے)

(ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن)

فہرست مضامین الیشیا مئی سنہ ۱۹۴۲ء

ایشیا

جلد ۷ | مئی ۱۹۴۲ء | نمبر ۴

فاشیزم اور ادب

موجودہ زمانہ کی کشمکش — فرد اور سماج کے تنازعہ کی تفسیر ہے یہ کشمکش کسی نہ کسی شکل میں تاریخ کے ہر دور میں جاری تھی۔ فرد کی یہ تمنا کہ ہر ممکن طریقہ سے اپنی خواہشات کی تکمیل کرے اور سماج کی یہ سعی کہ انفرادی جد و جہد کو جائز حدود تک محدود کر دے — ان دونوں نظریوں میں کھینچ تان کیونکر پیدا ہو، ہر مذہب اور فلسفہ کی بنیاد یہیں شروع ہوتی ہے، جائز حدود کا تعین کون کریگا، یہ حکمراں طبقہ کا کام قرار پایا اور یہ کام حکومت کے آلہ سے لیا جانے لگا۔

فوج، پولیس، قانون — یہ سب فرد کو جائز حدود کے اندر رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

غرض یہ کشمکش بہت عرصہ تک جاری رہی۔ سماج کے نام حکمران طبقہ مزد پر طرح طرح کے بندھن لگاتا گیا ان میں سب سے بڑا بندھن روح کا تھا اور روح کا چوکیدار کلیسا تھا۔ کامیاب اور وسیع پیمانہ پر اس روحانی تجدید کے خلاف یورپ میں تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کا نام نشاۃ ثانیہ (Renaissance) ہے۔

نشاۃ ثانیہ کا دور قدیم و جدید زمانے کے درمیان ایک سنگِ راہ ہے۔ تاریخ میں پہلی بار بیچارے فرد کو کسی نہ کسی حد تک اپنی قسمت کے فیصلے کا حق ملا۔ گو یہ حق بہت محدود تھا تاہم وہ سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا جس پہ انقلابِ فرانس کی عمارت کھڑی ہوئی۔

انقلابِ فرانس سے لے کر گذشتہ جنگ تک کا دور انفرادی آزادی کا دور کہا جا سکتا ہے — عملی طور پر نہیں تو نظریاتی طور پر۔ امریکہ اور یورپ میں ہر طرف انسانیت پروری اور لبرلزم کی ہوائیں چلنے لگیں۔ سماجی جبر کے ردِ عمل کے طور پر اب سب کا عقیدہ یہ ہو چلا کہ اگر ہر فرد کو اپنی صلاحیت اور مرضی کے مطابق زندہ رہنے دیا جائے تو ساری دنیا میں مسرت کی فراوانی ہو جائے گی۔ لیکن عملی طور پر یہ آزادی محض نام نہاد تھی جب تک سماج کے اقتصادی ڈھانچہ میں استحصال کا عنصر موجود تھا سیاسی اور معاشی خود مختاری کی بھلا کیا قیمت تھی۔ جب کسی کو تعلیم کی برکت میسر نہ ہوئی ہو تو وہ ووٹ کا پرچہ لے کر کیا کرے۔ اور خیر کلچر کوئی ایسی سستی شے تو نہیں کہ دن رات محنت کرنے والا مزدور اس سے فیض مند ہو سکے۔ لیکن لبرلوں نے یہ کہہ کر تکیہ کر لیا کہ اگر آپ امیر ہیں تو آپ کو اپنی امارت بڑھانے کی آزادی ہے اور کوئی غریب تو اسے فاقہ کرنے کی آزادی ہے۔ اس نام نہاد آزادی نے فرد اور سماج کی کشمکش کو اور بھی بھڑکایا۔ سماج کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اور ہر شخص محسوس کرنے لگا کہ اس فرسودہ نظام کو بدل کر ایک ایسی دنیا تعمیر کی جائے جس میں آزادی اور پابندی کا تخیل فرد اور جماعت دونوں کے لئے بھلائی کا باعث ہو۔

مختصراً یہ ہے پس منظر اس جد و جہد کا جس نے سوویٹ روس کی اشتراکیت اور درمیانی یورپ کے فاشیزم کو جنم دیا۔ ان دونوں میں یہ امر مشترک ہے کہ وہ فرد کے حقوق پر جماعت کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کیونکہ

حکومت جماعت کی نگہبان ہے لہٰذا فرد حکومت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن دونوں نظاموں کے مقاصد میں مشرقین کا فرق ہے۔ سوویٹ نظام فرد پر جو پابندیاں لگاتا ہے اُن کا انداز اصلاحی ہے اور مقصد یہ ہے کہ فرد سرمایہ دارانہ ذہنیت کی کدورت کو دھو کر انفرادیت کی معراج کو پہونچ سکے۔ یہ ویسی ہی پابندی ہے جو طبیب بیمار پر لگایا کرتا ہے لیکن فاشیزم فرد کو ہمیشہ کے لئے جماعت یعنی حکومت یعنی حکمراں طبقہ یعنی سرمایہ دار کا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور اس غرض سے اُس کے ذہن و احساس کو بھی فنا کر دینا چاہتا ہے۔

ہم کلچر اور ادب کے خادم ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جب یہ سارے سیٹھ ساہوکار مر جائیں گے تو مفلس شاعروں کے گیت اور نادار مصنفوں کے افسانے زندہ رہیں گے۔ اس لحاظ سے ہم صرف اس نظام کے حامی ہیں جو انفرادیت کو اس طرح فروغ دینا چاہتا ہے کہ وہ حسن و حقیقت دونوں کی خدمت کر سکے اور یہی شعر و ادب کی جان ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ فاشیزم ان سب اقدار کو یکسر مٹا دینا چاہتا ہے جنسے اعلیٰ قسم کا آرٹ پیدا ہوتا ہے۔ جب جرمنی کے قید خانوں سے دنیا کے بڑے بڑے آرٹسٹوں کی کراہ سنائی دیتی ہے۔ جب دنیا کے تمام پرانے اور نئے آرٹسٹ وہاں مردود قرار دئے جاتے ہیں ــــ تو ہم نازیزم اور فاشیزم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اگر ہمارا قلم اس کارزار کے موقع پر ان لعنتوں کی مخالفت میں مصروف نہ ہو تو ہم کلچر اور آرٹ سے غداری کریں گے۔

۴۴

یہ وہ جذبات تھے جنھیں لے کر ہم دہلی کی آل رائٹرس کانفرنس میں گئے۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے اینٹی فاسٹ مصنفوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں۔ ان کا کوئی متحدہ محاذ قائم کریں۔ یہ کام کرنے کا تھا اور گو کہ یہ کانفرنس ــ کانفرنس کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نہ رہی بہرحال داغ بیل تو پڑ گئی۔ ہم خیال لوگوں میں جاگ تو پڑ گئی۔ اچھا ہوتا اگر کانفرنس کے منتظم جلدی نہ کرتے۔ لوگوں کو مہلت دیتے۔ بحث طلب مسائل کو گشتی چٹھی کی صورت میں تقسیم کرتے۔ لیکن کانفرنس کرنے میں اتنی جلدی کی گئی کہ باہر کے بہت لوگوں کو جواب دینے کا بھی موقع نہ ملا۔ علاوہ بریں اتنی اہم کانفرنس کی تشکیل نہایت باقاعدگی سے ہونا چاہئے تھے۔

بہرحال غنیمت ہے کہ ادیبوں نے کروٹ تو لی، کچھ تو ہو،

ہم کانفرنس کے منتظموں کو اب بھی یہ صائب مشورہ دیں گے کہ زیادہ وسیع النظری سے کام لیں۔ مقاصد کی بلندی کے اعتبار سے دل و نگاہ کو بھی بلند رکھا جائے تو کیا اچھا ہو۔ ایک تو یہ کہ کانفرنس کسی لحاظ سے نمائندہ نہ تھی باہر تو باہر خود دہلی کے بہت سے ہمدرد مصنف شامل نہ تھے۔ وجہ جو بھی اس سے بحث نہیں۔ لیکن اگر آگے کام چلانا ہے تو کیا اُن کے تعاون کی ضرورت نہیں اگر ہے تو پھر (   ) کو صرف حاضرین سے یہی کیوں پر کر دیا گیا اور ان حاضرین میں صرف "انجمن ترقی پسند مصنفین" اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ہی حضرات کیوں تھے۔ یہ حلقہ زیادہ وسیع کیوں نہ کیا جائے؟

یہ چند نکات برادرانہ مشورہ کے طور ہیں کسی کو ہماری نیک نیتی پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایشیا کسی لیبل کی تمنا کئے بغیر ترقی پسند تحریکوں کی حمایت اور فاشیزم کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے۔

ہماری خواہش صرف یہ ہے کہ کیونکہ مختلف زبانوں اور اسکولوں کے مصنفوں کے ملنے کے ٹھکانے کم ہیں اس لئے جب کبھی اس قسم کی کوئی تحریک شروع ہو تو اسے زندہ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

دنیا اور ہندوستان کی نجات اسی میں ہے کہ فاشیزم اور اس کے تمام عناصر فنا ہو جائیں۔ ہم سب کو اس جنگ میں حصہ لینا ہے، فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے اور نہ کوئی فصیل پر بیٹھ سکتا ہے۔

ادارہ

نئی صبح

۹

اپریل - مئی [illegible]

پنڈت جواہر لال نہرو کی شہرۂ آفاق کتاب

جگ بیتی

دُنیا کی تاریخ سنین و سلاطین کی فہرست کا نام نہیں ہے نہ مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال اور تاج و تخت کے لئے زور آزمائی کرنے والوں کی باہمی کشمکش کو تاریخ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل تاریخ نام ہے افراد کے ذہنی ارتقار کا۔ جماعتی نظام کی تنظیم کا۔ تہذیب و تمدن کے اصولوں کی تدوین کا اور علوم و فنون کی ترویج کا۔ پھر تاریخ کا دائرہ کسی ایک ملک یا قوم کے حالات تک محدود نہیں ہوتا۔ اسکے پیش نظر تمام ممالک اور تمام اقوام ایک سلسلے میں منسلک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور متاثر کرتے ہیں۔

جگ بیتی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے انہی اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے اور تمام مختلف زمانوں میں تمام ممالک اور تمام اقوام کے خاکے پیش کر کے دُنیا کی ایک یکجائی تصویر کھینچی ہے۔ اس لئے ان کی یہ کتاب ہندوستان کے تاریخی ادب میں ایک جدت ہے ایک تنوع ہے جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔

سیاسی مصروفیتوں کے باوجود پنڈت جی کا وسیع مطالعہ اور غیر معمولی غور و فکر کی عادت اس کی متقاضی تھی کہ جگ بیتی جیسی تصنیف منظر عام پر آئے۔ چنانچہ ان خطوط کی شکل میں جو پنڈت جی نے جیل سے اپنی لڑکی کے نام لکھے۔ یہ کتاب اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچے گی۔ اب مکتبۂ جامعہ نے محمود علی خاں جامعی سے سلیس اُردو میں ترجمہ کرا کے پیش کرنے کا فخر حاصل کیا ہے۔ قیمت جلد اول ۳؍

مکتبۂ جامعہ دہلی قرولباغ

شاخیں:۔ دہلی ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی ۳

(ادبی مرکز میرٹھ سے بھی مل سکتی ہے)

(۱) جوش ملیح آبادی

(۲) ساغر نظامی

مشاہیر شعرائے اُردو کا فلسفۂ حیات

ہوسکتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ملک کو مختلف قسم کی شکایتیں ہوں، لیکن کچھ عرصہ سے اس نے اپنی تقریروں کے معیار کو کافی بلند کیا ہے، دلّی سے آج کل ادبی، علمی اور حکیمانہ مسائل پر جو تقریریں ہو رہی ہیں، وہ اپنی رنگا رنگی، افادیت، زبان اور ادب کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو دہلی نے جو.............................. اور اُردو کے مشاہیر شعرا کو دعوت دی کہ وہ دُنیا کو بتائیں، زندگی ان کی نظر میں کیا ہے؟ وہ حیات کے متعلق منفی نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں یا اثباتی!؟ یا محض یونہی، چنانچہ اس سلسلے کی کچھ تقریریں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے جوش ملیح آبادی و ساغر نظامی کی تقریریں اس نمبر میں شائع کی جاتی ہیں۔

"ادارہ"

(۱) جوش ملیح آبادی

میرا فلسفۂ حیات

یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ پندرہ منٹ کی سی بے حقیقت مدت کے اندر سمیٹا نہیں جا سکتا۔ بہرحال کوشش کروں گا کہ مجمل طور سے اپنے مفہوم پر کسی قدر روشنی ڈالوں۔

انسانی ذرائع اور انسانی ذہن دونوں ابتک اس درجہ تشنہ محدود ہیں کہ بیسویں صدی کے اس نسبتاً ترقی یافتہ دور میں بھی زندگی ایک دردناک عذاب بنی ہوئی ہے۔ کیا داخلی اور کیا خارجی دونوں حیثیتوں سے انسان ابتک افسردہ و بیمار ہے۔ ہم مسرتوں کے حاصل کرنے کے واسطے دوڑتے ہیں۔ لیکن اس تمام دوڑ دھوپ اور عرق ریزی کے بعد آخرکار جس شے کے پانے میں ہمیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ وہ غم اور صرف غم ہے۔ امیدیں ہر صبح ہم کو جگاتی اور ناامیدیاں ہر رات کو ہمیں سُلاتی ہیں۔

تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سلاتی ہے — نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی
لڑکپن ضد میں روتا تھا جوانی دل کو روتی ہے — نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی

ہماری اس ناکامی و نامرادی کا سبب ایک طرف تو یہ ہے کہ جیسا میں بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے ذرائع اور ذہن دونوں ابتک محدود ہیں۔ اور دوسری طرف چونکہ ہم ابتک انسانیت کے مجموعی تقاضوں کی جانب اعتناء کرنے کے خوگر نہیں ہوئے ہیں اور صرف اپنے انفرادی حاجات و مقتضیات

ہماری نظر محدود ہے۔ اس لئے ہمیں اس زندگی میں دُکھ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاید اپنے انفرادی حاجات و مقتضیات سے ہم کبھی آزاد نہیں ہو سکینگے لیکن انسانی نفسیات پر نظر رکھنے والے اس خیال کے قائم کرنے میں قطعی حق بجانب ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد ہماری انفرادیت اس قدر وسیع ہو جائے گی کہ عالمِ انسانیت کے مجموعی تقاضے عین ہمارے انفرادی تقاضے بن جائینگے۔

لیکن اس وقت تک تو انسانی دُنیا کی حالت نہایت خستہ و خراب ہے اور اس وقت ہماری زبوں حالیاں اور بھی شدید ہو جاتی ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے غموں ہی کا مآل غم نہیں ہوتا۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا۔ تو شاید ہم کچھ نہ کچھ اپنے کو تسلی دے لیتے۔ لیکن بڑی بے پایاں درد مندی تو یہ ہے کہ ہماری مسرتوں کی تان بھی غم ہی پر ٹوٹتی ہے۔ اور ہماری وقتی مسرت جس قدر شیریں ہوتی ہے اس کا پیدا کردہ غم اتنا ہی دیرپا اور تلخ ہوا کرتا ہے۔

ہمیں کبھی کبھی یہ زندگی تھوڑی دیر کے واسطے فرشِ گل پر چلنے کا موقع دیتی ہے۔ اور وہ صرف اس لئے کہ ہمیں فرشِ گل کا خوگر بنانے کے بعد کانٹوں پر چلائے۔ اور اس وقت ایک طرف تو کانٹوں کی تکلیف ہمیں زیادہ محسوس ہو اور دوسری طرف پھولوں کی یاد میں ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ یعنی ایک طرف تو ہمارا جسم فگار ہو اور دوسری طرف ہمارے دل کے ٹکڑے اُڑ جائیں۔

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کیلئے
طالبانِ عیش سے کہہ دوں تو اُڑ جائیں حواس کس قدر رویا ہوں میں اک مسکرانے کیلئے

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ابتک تو اس زندگی میں اگر کوئی ٹھوس حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ غم اور صرف غم ہے۔ رباعی کہتے ہو کہ مُنہ آنسوؤں سے تر نہ کروں
غم ٹھوس حقیقت ہے یہ باور نہیں کروں۔ بیکار ہے ہائے ہائے کرنا لیکن۔ انسان ہوں
ہائے ہائے کیوں نہ کروں۔ بیشک اس وقت تک انسانیت پر مسرت کا صحیفہ نازل نہیں ہوا ہے۔ اور اب تک جس شے کو مسرت کہا جاتا ہے وہ صرف ایک وقفۂ غم کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب ہم پر غم کا ناقابلِ برداشت حملہ رُک جاتا ہے تو اس وقفۂ مختصر کو ہم خوشی کے نام سے پکارنے لگتے ہیں حالانکہ وہ صرف ایک گونہ تسکین اور ایک وقتی سرشاری ہوتی ہے۔ جسے خوشی کا لقب نہیں دیا جاسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اس دردناک حقیقت کا جو افراد مطالعہ کرتے ہیں وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو حیات کی اس دردمندی کو دیکھ کر سپر انداختہ ہو جاتا ہے۔ مایوسی اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اسکے ہاتھ پاؤں ڈھیلے دل زخمی اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور یہی وہ گروہ ہے جسے ہم قنوطی' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور دوسرا گروہ ان دردمندیوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن سپر انداختہ نہیں ہوتا۔ ہر چند یہ گروہ بھی سمجھتا یہی ہے کہ ہم اس دردمندی پر فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ اس سے مغلوب ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔ اور اپنے کو فریبِ مسرت میں مبتلا کر دینے کی خاطر ایسے رنگین مشاغل میں خود کو غرق کر دیتا ہے۔ کہ ضرباتِ غم سے نسبتاً بہت کچھ محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس گروہ کو ہم 'رجائی' کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ رجائیوں کے مقابلہ میں 'قنوطی' گھاٹے میں رہتا ہے۔ 'رجائی' اس دو روزہ حیات کے کچھ نہ کچھ مزے تو اُڑا لیتا ہے۔ لیکن بیچارے 'قنوطی' کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

لیکن جہانتک زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کا تعلق ہے قنوطی ہوں کہ رجائی دونوں گروہ اس شرفِ عظیم اور اس سعادتِ کبریٰ سے قطعی محروم رہتے ہیں۔

میں نے زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کو سعادتِ کبریٰ کہا ہے، ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ آپ جسے سعادتِ کبریٰ کہتے ہیں سعادتِ کبریٰ تو بڑی چیز ہے۔ میں اُسے ایک مہمل خود آرائی سے زیادہ کوئی مرتبہ نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ زندگی جبکہ آلام سے بھری ہوئی ہے۔ جبکہ غم ہی کی نہیں خوشی کی تان بھی غم ہی پر ٹوٹتی ہے اور جبکہ ہر عمل کا خواہ وہ کتنا ہی شائستہ کیوں نہ ہو۔ ایک دردناک ردِ عمل ہوا کرتا ہے۔ تو کیا ہم اتنے دیوانے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں حصہ لیکر اپنا وقت برباد اور اپنی قوت کو تباہ کریں۔ اور کیا یہ عاقلانہ روش نہیں ہے کہ یا تو ایک آہ سرد بھر کر ہم زندگی سے مایوس ہو جائیں یا ساز اُٹھا کر اس طرح الاپیں کہ تمام غموں کو بھول جائیں۔

لیکن جو شخص بھی خواہ وہ کتنی وجاہت رکھتا ہو۔ ایسے کم ہمتی کے کلمات زبان سے نکالے گا۔ ہم بجا طور سے اُسکے متعلق یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جائینگے کہ وہ دُنیا کے مزاج، انسانی فطرت اور انسانی عزائم کی وسعت اور اقتدار

کے قانون سے قطعی طور پر بیگانہ ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تک انسانیت دردمند ہے اور ہم مسرّت کے حصول کی جد و جہد میں بالآخر غم ہی سے دوچار ہو رہے ہیں لیکن اسکے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ صورتِ حال اٹل اور ابدی ہے اور ایسی کہ اس سے رُستگاری حاصل کی ہی نہیں جا سکتی ہے ۔

غور کرنا چاہئے کہ اس کرۂ خاکی پر حیات کو رونما ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور اس منزل پر ہم غموں کو کیونکر فتح کر سکتے ہیں جب کہ انسانیت ہنوز طفلی کے عالم میں ہے اور اُس کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہیں ہے ۔

لیکن یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ روز بروز ہم غم سے دور اور خوشی سے قریب ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہماری یہ فطری اور مسلسل رفتار اس بات کا یقین کرنے پر ہمیں مجبور کرتی ہے ۔ کہ ایک نہ ایک دن ہم تمام مکروہات و آلام سے نجات حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ مسرّت کی زندگی بسر کرینگے ۔ اور یہ مسرّت کی زندگی ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں حالتوں کا احاطہ کر لے گی ۔

یہ وہ منزل ہوگی جبکہ ایک طرف تو ہمارے مزاج اور عادات و اطوار بدل جائینگے اور اشیائے مادّی و ذہنی کی معروف قدریں تبدیل ہو جائینگی ۔ اور دوسری طرف اس عالم کے تمام قوائے کارفرما کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر انہیں ہم اشاروں پر نچانے لگیں گے ۔

اور جبکہ ہمارا مستقبل اس قدر شاندار اور یقینی طور سے شاندار ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم انسانیّت کی اس جنگِ عظیم اور ارتقاء کے اس جہادِ اکبر سے بزدلوں کی طرح بھاگ کر کسی گوشۂ خلوت یا محفلِ عشرت میں جا کر چھپ جائیں ۔

اس کے علاوہ جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آج جو یہ مادّی و ذہنی نعمتیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ہمیں حاصل ہیں وہ تمام کی تمام ہمارے بزرگوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہیں ۔ جنہیں وہ ہمارے واسطے ایک مبارک وراثت کے طور پر چھوڑ گئے ہیں اور اسکے صاف و صریح یہ معنی ہیں کہ ہم اپنے خاموشی کے ساتھ احسان کرنیوالے بزرگوں کے مقروض ہیں ۔ اور اسقدر کہ ہمارا بال بال قرض سے گندھا ہوا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ ہر اچھے شہری اور ہر بھلے آدمی کا یہ ایک شریفانہ کارنامہ ہے کہ وہ اپنا قرض پائی پائی ادا کر دے ۔ اور وہ قرض صرف اس واحد شکل سے ادا کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے ہمیں آگے بڑھایا ہے اسی طرح ہم بھی اپنی آئندہ نسلوں کو کچھ آگے بڑھا کر مریں ۔

اور اگر ہم اس مقدّس فریضے کے ادا کرنے میں کوتاہی کرینگے تو ہماری موت ایک بد دیانت مقروض کی موت ہوگی ۔ اور کیا کوئی شریف اور خوددار انسان ایک بد دیانت مقروض کی موت کا ننگ گوارا کر سکتا ہے ؟ ۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک ہوا ہی کیا ہے ۔ ابھی تو ہمیں بہت کچھ کرنا ہے ۔ ابھی تک تو ہم اپنے چھوٹے چھوٹے غموں اور معمولی عناصر یہاں تک کہ خاک کے ایک بظاہر حقیر ذرّے تک پر قبضہ نہیں کر سکے ہیں ۔ حالانکہ ہمارا پروگرام بہت ہی بڑا اور نہایت ہی پیچیدہ ہے ۔ ہمیں ہر فرد کو اسکی اطلاع دے دینا چاہئے ۔ کہ ابھی ہمیں بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں ۔ بڑے بڑے ہفت خواں طے کرنا ہیں ۔ صدیوں اور قرنوں تک پسینہ بہانا اور جانیں کھپانا ہے ۔ جھوٹے رسم و رواج سے لڑنا ہے ۔ عقائد و اوہام کو مٹانا ہے ۔ تندرست خیالات اور بلند افکار کی تخم ریزی کرنا ہے ۔ دہشت انگیز بوں ۱۴۰
اور خون ریزیوں کا سدِّ باب کرنا ہے ۔ بیماریوں اور وباؤں کو فنا کر کے شباب کو قائم کرنا ہے ۔ اور شباب کو قائم کر کے ہیبت ناک موت کو موت کے گھاٹ اُتارنا ہے اور پھر اُلوہیت کے تاج کو پیشانی پر کج کر کے اس سرکش ستارے اور دوسرے کُرّوں پر اپنا پرچم لہرانا ہے ۔

ممکن ہے، اور ہندوستان میں تو ممکن ہی نہیں ۔ گمان غالب ہے کہ لوگ میرے ان بلند عزائم اور درخشاں امیدوں پر مسکرائیں اور ارشاد فرمائیں کہ یہ شاعر تو شیخ چلّی کی سی باتیں کرنے لگا ہے ۔ کہاں ضعیف انسان اور کہاں تسخیرِ کون و مکاں ۔ میں ایسے تمام حضرات کی خدمت میں صرف اسی قدر مشورہ دونگا کہ وہ براہِ معارف نوازی ۔ اپنے مطالعے اور مشاہدے کو بڑھائیں ۔ نظر کو وسیع اور تفکر کو عمیق بنائیں ۔ انسان کی فطرت اور انسان کے عزائم تیز ارتقاء کی رفتار اور زمانے کے قرائن و آثار پر نگاہ ڈالیں ۔ اگر وہ میرے مشورے پر عمل کرینگے ۔ سو فی صدی میرے ہم خیال و ہم نوا ہو جائینگے ۔ ورنہ میرے پاس ان کے تمسخر و تبسّم کے مرض کا کوئی علاج نہیں ہے ۔

ہاں تو ہمارے سامنے اس قدر وسیع اور اسکے ساتھ ساتھ اس قدر دشوار

کام ہے کہ ہم نہ تو نکھٹوؤں کی طرح رونے میں وقت ضائع کر سکتے ہیں اور نہ رجائیوں کی مانند ہر وقت کے رامش و رنگ ہی کیلئے وقت نکال سکتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں گروہوں کے بین بین زندگی بسر کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ابھی ہمیں بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں۔ لیکن اس حکیمانہ نکتے کو بھی پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ہمیں اپنے کو اس قدر تھکانا بھی نہیں ہے کہ چار دن کام کرنے کے بعد ہمارے قوائے عمل و ذہن اور ہماری صحت برباد ہو جائے۔ ہمیں بیشک کام کرنا اور ایک جانباز سپاہی کی طرح پوری کاوش اور سرگرمی سے کام کرنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر روز چند گھنٹے رجائیوں کی سی زندگی بھی بسر کرنا ہے۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ہر صبح کو ہم تازہ ہمت اور بلند تر ولولوں کے ساتھ دن کی محنت کے واسطے تیار ہو جائیں۔ کام کرنا مستعدی اور سنجیدگی سے انسانیت کو آگے بڑھانا۔ کوئی شک نہیں ہمارا تنہا فریضہ ہے لیکن ہر وقت کام کرنا اور ہر آن سنجیدہ رہنا اپنی ذات کے ساتھ ایک خطرناک مسخرگی ہے۔ اس لئے ہمیں زیادہ کام کر سکنے کی خاطر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم اپنی ذات کے ساتھ خطرناک قسم کا مسخراپن نہیں کرینگے۔ دن کے وقت ہم ایڑی چوٹی کا پسینہ بہائینگے۔ اور رات کو جب تاریکیوں کے دامن دراز ہو جائینگے اور ستاروں کی خنک روشنی ہمارا احاطہ کریگی تو ہم بچوں کی طرح خوشیاں منائیں اور فراغت و مسرت کے دریا بہائینگے۔ اور

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

پر عمل کر کے اس شریر ستارے کو جسے کرۂ ارض کہتے ہیں۔ اپنے قدموں پر جھکا کر نعرہ لگائینگے۔ کہ

میں اور ڈروں صولتِ دُنیائے دُنی سے
خود لرزہ براندام ہے دُنیا مرے آگے

دن کو اگر کوئی ہم سے رنگ رلیوں کی باتیں کریگا تو ہم اسے انسانیت کا دشمن یا کم سے کم جاہل سمجھ کر اس کی طرف سے مُنہ پھیر لینگے لیکن اگر رات کو کوئی ہم سے محنت یا سنجیدگی کا مطالبہ کریگا تو اسکی کم بینی اور خفتِ عقل پر قہقہے مارینگے

آپ آرائش بھی کرتے ہیں مناسب وقت کی
دن کو مُنہ دھویا گیا زلفیں سنواریں رات کو

11

ساغر نظامی (۲)

زندگی میری نظر میں

زندگی اور میں اچانک صبح سے پہلے بیدار ہو گئے۔ مجھے اور اسے ابھی دن چڑھے تک سونا تھا۔ مگر کچی نیند میں ہم دونوں الم کم سن خانہ بدوشوں کی طرح جاگنے کیلئے مجبور ہو گئے جن کی حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی۔ کون رہرو ہے اور کون رہبر یہ بھی ہوش نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وجود کے مبہم دُھندلکے میں چست و چالاک دو سایہ کائنات کے بام و در پر چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

امید اور ناامیدی۔ روشنی اور تاریکی۔ خیر و شر۔ دھوپ اور چاندنی۔ کفر و ایمان۔ ہار اور جیت۔ یعنی ہر وہ منزل جو انسان لاکھوں سہارے لیکر طے کرتا ہے۔ میں نے براہِ راست زندگی کے سہارے طے کی۔ دُنیا کے طویل سفر میں زندگی ہی میرا سفر تھی۔ اور زندگی ہی ہمسفر رہزنی اور رہبری۔ آبادی و بربادی کے جتنے تجربے تھے زندگی ہی ان کا معمول تھی۔ اور زندگی ہی ان کی عامل۔

ہمارے علم کی تمام تر اساس تجربات پر مبنی ہے۔ آپ کو اصرار ہے تو ہو۔ میرے خیال میں فطری تصوّرات۔ تجربات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے اس لئے جتنے اصول اور کلیے ہیں وہ تمام تر تجربات کی پیداوار ہیں۔ میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں زندگی اندھیری رات ہے اور تجربہ نورِ سحر۔ ذہن تاریک کو ٹھری ہے اور مشاہدات و تجربات شعاعِ نور۔

مشاہدے اور تجربے سے پہلے انسانی ذہن ہر قسم کے نقوش اور تصوّرات سے اسی طرح محروم ہوتا ہے جس طرح بیج ڈالنے سے پہلے بنجر زمین کچھ محرکات انسان کے احساس و شعور پر خارج سے پڑتے ہیں اور اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ تصوّرات ہیں جو ذہنی افعال کے نتیجوں کی صورت میں مترتب ہوتے ہیں۔ اصل میں وہ محرکات بھی جو ہمارے احساس و خیال پر اثر ڈالتے ہیں ہمارے تصوّرات ہی کا عکس ہیں۔

جس وقت میں نے آنکھ کھولی۔ زندگی اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ تہذیب و تمدن۔ قدیم و جدید نظریے۔ اصول اور فلسفے۔ علوم و فنون ترقی اور تکمیل کا بڑا حصہ زندگی کو مل چکا تھا۔ غرضیکہ کائنات سجی سجائی۔ ہزاروں سال کی روائتوں کی امانت لئے منتظر تھی۔ میں دُنیا کے غم سے واقف تھا نہ مسرّت سے۔ ناکامی کو جانتا تھا نہ کامیابی کو۔ عشق کو پہچانتا تھا نہ ہوس کو۔ جنگ کو سمجھ سکتا تھا نہ صلح کو۔ ہار سے واقف تھا نہ جیت سے۔ زندگی کے کارزار میں میرا داخلہ اس غیر مسلح نوجوان کی طرح ہوا جو میدانِ جنگ میں کسی ریلے کے ساتھ اتفاقیہ داخل ہو جائے۔

میدانِ جنگ کی پہلی ضرورت نہ شاعری ہے نہ حکمت۔ نہ بیم ہے نہ رجا۔ یاس ہے نہ اُمید۔ نہ زندگی کا تاریک رُخ ہے نہ روشن پہلو۔ اسکی پہلی اور آخری ضرورت صرف اپنا بچاؤ ہے اور اپنا بچاؤ والہانہ خود اعتمادی کے بغیر ممکن نہیں۔ ٹکراؤ کی جنون انگیز قوّت۔ تصادم کی بے پناہ طاقت۔ یہ ہیں وہ جوہر جو خودی کے روپ میں انسانی فطرت کی رہنمائی کرتے ہیں۔

زندگی میں سب سے پہلے مجھے اپنے انہیں اچھوتے تصوّرات سے واسطہ پڑا۔ خاص کر مقابلے اور تصادم کی رَو سے۔ یہ رَو "مشیّت" کے مقابلے میں مجبور سہی۔ مگر زندگی کا پہلا اور آخری بھید ہے۔ مقابلے کی بڑھتی ہوئی قوّت۔ پنپنے کی مچلتی ہوئی آرزو۔ اور آگے بڑھنے کی سیلابی خواہش۔ انسان کو فریب۔ جوش اور جنون میں اُلجھا دیتی ہے۔ مجھ پر بھی اس نے اپنا جال پھینکا۔ اور مدّتوں پھسلاتی رہی "تو سب سے بلند ہے تو کامل آزاد ہے"۔ مجھے بلندی کا یقین ہو گیا۔ میں نے خود کو آزاد جان لیا۔ یہ احساسات شباب پر تھے۔ شرمیلے تصوّرات دل سے دور لرزتے رہے افسردگی اور جوانی کا ساتھ ہے۔ کبھی کبھی غمگین جذبات دل میں جاگتے۔ مگر وہ "ناامیدی" ابتدائی زندگی کے جسم کا گھن۔ یہ گھن مجھے کبھی نہیں لگا۔

جب یہ ناگن میری طرف بڑھی۔ خودی کے نامحسوس جذبے نے اس کا سر کچل دیا۔

میں ایک ایسا جہاز تھا جو ساحل سے لنگر اُٹھاتے ہی طوفان میں گھر جائے۔ ابر و باد کی یورش میں ملّاح بڑے بڑے نظریوں اور فلسفوں پر غور نہیں کرتے۔ مقابلہ کی قوّت کو استوار کرتے ہیں۔ جاتے ہوئے حوصلوں کو مضبوط بناتے ہیں۔ زندگی اور موت سے بلند ہو کر وہ اس مقصد کیلئے اپنی ہستی سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔ جس مقصد کو لے کر وہ ساحل سے روانہ ہوئے تھے۔

یہی ہے زندگی کا وہ محور جس پر زندگی کے چلنے اور رُک جانے کا دارومدار ہے۔ یہ محور جو امید اور مقصد کی بُنیاد پر زندگی کو گردش دیتا ہے دائروں کو بڑھاتا چلا گیا۔ آس پر یاس خندہ زن ہوئی۔ مقصد کے سامنے نتیجوں کی آرزو نے ہاتھ پھیلائے۔ ناکامیوں نے کامیابیوں کا راستہ گھیرا۔ نئے واسطے ہوئے اور انوکھے رابطے۔ لیکن کامیابی اور ناکامی مقصد سے افضل ہیں۔

خود یہ اُلجھ کے رہ گئی میرے جنوں کے دام میں ١٥
میرا جنوں نہ دب سکا گردشِ روزگار سے

مجھے "اندھی مشیّت" کا علم نہیں تھا۔ "زندگی" اندھی مشیّت کی انجان حرکت ہے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ مگر آدم کی مجبور و مقہور نسل کے لئے جو نسخہ المانوی حکیم شوپنہار نے تجویز کیا تھا۔ وہ میری گھٹی میں گھولا ہوا تھا۔ میں اپنے انفرادی ارادوں کو مٹا کر مشیّت کو ہرانے کی کوشش میں کیوں جان گنواتا۔ میں کائنات اور انسان کے حُسن پر مٹنے کیلئے کسی حکیم کا محتاج نہیں تھا۔ میں تو حُسن کے لہریں مارتے سمندر ہی میں پیدا ہوا۔ مجھے کیف خود اپنے میکدہ سے ملا۔ دُکھ سُکھ کی قیدوں سے آزاد اک سرور۔ کامیابی و ناکامی۔ رنج و راحت۔ ہار جیت۔ مجھے ان سپنوں کو یاد رکھنے کا ہوش ہی کب تھا۔ کیونکہ میرے جینے کے لئے یہ فریب کافی تھا "میں سب کچھ ہوں" اور "میں سب کچھ کر سکتا ہوں"۔ لیکن زندگی اپنے محور پر اور تیزی سے گھومی۔ نقاب چہرے سے گرنے لگے۔ مسکراتی ہوئی تازہ و شاداب لڑکی کا مکھڑا بھیانک ہو گیا۔

مشاہدہ کی یہ منزل۔ نئی منزل تھی۔ مضبوط اور سرکش حواس کے گلے میں تلخ حقیقتوں نے اپنی گنجلی باہیں ڈال دیں۔ دُکھ سُکھ کی سچّی قدریں معلوم ہوئیں۔

پہلی مرتبہ زندگی میں تلخی اور کمزوری کا احساس ہوا۔ انسانی روح کی بے بسی اور نفسیاتی مجبوری سوئیاں چبھونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے ایک تاریک و دبیز دیوار آکھڑی ہوئی۔ پہلی بار تمام تر جسمانی و روحانی قوتیں جی چھوڑتی ہوئی دکھائی دیں۔ زندگی مصیبتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ نظر آنے لگی۔ احساس و خیال آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ شاید یہ سچ بھی ہے کہ دُنیا کی تعمیر ہی اس انداز سے ہوئی ہے۔ ہر انسان اپنی تمام آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ناکامی اٹل ہے تو دُکھ بھی اٹل ہے۔

زندگی بھی اصول و قوانین کی ایک معین حد تک پابند ہے لیکن نفسیاتی و اخلاقی خاص کر معاشی و سیاسی ضابطوں اور قاعدوں کی مقید نہیں

کسی ارادے و قصد کے بغیر ناکامی و کامیابی اور دُکھ سکھ کی آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ اس پر انسانی فکر و ارادہ کا ذرا قابو نہیں۔ یہاں تک کچھ بھی ہو پھر بھی یہ مجال کس کو ہے کہ مسرّت کا تنہا مدّعی بن بیٹھے۔ مسرّت کی تمناؤں سے کھیلنا ہرگز دانشمندی نہیں۔ حیات کی پہلی اور آخری تمنّا خوشی سہی۔ مگر خوشی ہے کیا؟ محض ایک موج۔ صرف ایک حرکت۔ فقط ایک مسلسل مطالبہ۔

۱۷ اور "الم"۔ الم مسرّت کے مقابلہ میں ذی مقدار بھی ہے اور پائدار بھی۔ مسرّت کی تھاہ ہے مگر غم کی تھاہ نہیں۔ لامحدود شے محدود سے بہرحال افضل ہے۔ مگر ان جذبوں کا مرکز خود "انسان" ہے انسان الم اور مسرّت دونوں سے افضل ہے۔ رنج اور خوشی محض دو مرحلے ہیں اور ان سے گزر جانا ہی آدمی کی بڑائی ہے ؎

غم بھی کوئی منزل ہے رہِ عشق و جنوں میں
آلام کے موّاج سمندر سے گزر جا

وہ انسان جسے مقصد کا جنوں نہیں۔ زندگی سے نہیں جیت سکتا ایسے انسان کا سینہ مشرق کی مانند ہے۔ جہاں ہر گھڑی اک نئے طلوع اور جدید آغاز کی بھیڑ رہتی ہے۔

غم کے تبسّم نے زندگی میں نئی شگفتگی پیدا کی۔ انانیت کی سیلابی روح ایک سانچے میں ڈھلنے لگی۔ کامیابی اور فتح کی نئی تعبیریں بننے لگیں۔ سربند شراب شیشے سے اُبلنے لگی۔ ماحول اور قدرت کے جبر نے انفرادی ارادوں کو اجتماعی شکل بخشی۔ شعور نے سنبھالا لیا۔ مگر ذہن لاشعور اندر ہی اندر گریز و فرار کی خواہش تڑپنے لگی۔

گریز و فرار کی یہ خواہش کبھی آنسو بنی۔ کبھی تبسّم۔ کبھی ترک و رہبانیت کا احساس بنکر ساکت ہوئی۔ کبھی تخریب کا سرکش شعلہ بن کر لپکی کبھی کامل نیکی کی شکل میں نمودار ہوئی۔ کبھی مکمل شر کی صورت میں۔ مرحلہ سخت تھا۔ مگر ہر وہ انسان جسے کوئی لگن ہو۔ اس مرحلے سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔

بیرونی محرکات اور میرے تصورات نے گھل مل کر ایک نیا سانچہ بنایا۔ اور میں اس سانچے میں ڈھل کر رہ گیا۔ تیاگ اور رہبانیت روحانیت کے نام پر زندگی سے گریز ہے۔ کھلی ہوئی ہار۔ وجود کے ہنگامے اور مشیت کے آہنی پنجے سے ابدی نجات حاصل کرنے کے لئے رندانہ محویّت محض فرار ہے۔ اس گریز اور فرار کی داستان اور بھی سنگین ہو جاتی ہے جب ہم اس کے اجتماعی ردّ عمل پر غور کرتے ہیں۔

ایسے تمام فلسفے جو اس قسم کے مسئلوں کے مقابلے میں انسانی زندگی کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ میرے نزدیک دُنیا کے لئے مہلک اور انسانی ترقّی میں سدّ راہ ہیں۔

انسانی زندگی دو پاٹوں کے درمیان دبی ہے۔ ایک پاٹ مشیت ہے۔ ایک پاٹ انسانی سماج۔ چکّی میں پڑے ہوئے دانوں پر اوپری پاٹ کا دباؤ نچلے پاٹ کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ مگر زندگی وہ چکّی ہے جس کے دونوں پاٹ برابر کا دباؤ رکھتے ہیں۔ یہ نظام جس میں انسان نے اپنی جنس کو پیس رکھا ہے۔ ابھی تک اجتماعی تصوّر سے عاری ہے۔ ابھی تک یہ عوام کے لئے جہنّم ہے محض مشیّت پر جبر کا الزام انسانی سماج کے ناقص اور غیر منصفانہ نظام سے چشم پوشی کرنا ہے۔ مشیّت نے حسن کو محدود نہیں کیا تخلیق کو نہیں روکا۔ ارتقا پر بندشیں نہیں کیں۔ مگر انسان نے اپنی جنس پر مسرّت، راحت اور آزادی کا ہر دروازہ بند رکھا۔ انسان کے تمام ارادی اعمال و افعال کی اساس انفرادی و اجتماعی مسرّت کا حاصل کرنا ہے۔ ہر ایک کی کوشش ہے، سکھ ملے۔ زندگی کو سجائے۔ سنوارے۔ تمام انسانی تاریخ مسرت و راحت کے حصول کی ناکام کوشش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ مگر یہ لامتناہ سلسلہ آدم کے خونخوار بیٹوں نے انتہائی خود غرضی کے ساتھ جاری رکھا۔ کسی نے کامل طور پر زندگی اور اسکی

مسرّتوں کو برابر بانٹنے کا نظام پیدا نہیں کیا ۔

زندگی جہنّم تھی ۔ اور ہے ۔ یہ جہنّم آج بھی فردوس بن سکتا ہے لیکن پُرانی دُنیا کو ڈھا دینے کے بعد ۔ جو ایک مجموعی سماج بنانے سے قاصر رہی ۔

دُکھ سُکھ اور محض جبر و اختیار کے جنجال میں انسانی ذہن کو مقید کر کے جو بزرگ زندگی سے گریز کی تعلیم دیتے رہے ۔ وہ انسانی ترقی اور حیات کی پرواز کے دُشمن تھے ۔ اگر یہ دُنیا لاکھوں قیامتوں اور تباہیوں کے بعد بھی چلتی رہی ہے ۔ تو ہو سکتا ہے کچھ اور چلتی رہے ۔ شاید آنیوالا ارتقا کوئی ایسا نظام ریاست پیدا کر دے جو زمین کی مصیبتوں کو ختم کر کے انسانوں کو سماجی و اقتصادی مسرّتوں کی دولت بخش دے ۔ عمریں مختصر ہو جائیں اور مسرّتیں طویل ۔ پُر آلام زندگی کے مقابلے میں مسرّت کی ایک گھڑی ابدی زندگی سے کم نہیں ۔

پھر بھی میرے نزدیک مسرّت والم جبر و اختیار اور اس قسم کے حکیمانہ مسائل سے افضل ۔ انسانی زندگی اور اس کی تہذیب و تکمیل ہے ۔ ارتقا کی معجز نمائی کا فریضہ ہے ۔ شاید ایک ایسا سماج بن سکے جس میں امیر و غریب برابر کا آرام حاصل کر لیں ۔ بھوک کی اُلجھنیں ختم ہوں ۔ انسان انسانیت کے لئے زندہ رہیں اور انسانیت کے لئے قربان ہوں ۔

میں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک نورانی مستقبل کا تصوّر رکھتا ہوں ۔ ظاہر ہے یہ زندگی کا منفی پہلو نہیں اثباتی ہے ۔ سوچئے تو تیاگ اور رہبانیت نے انسانوں کو ہزاروں سال غلام رکھا ۔ رندی و سرشاری نے نسلیں برباد کر دیں ۔ شرمیلے اور رسیلے تصوّرات نے توازن کو مفلوج کر دیا شاعرانہ محویت اگر محض ظالم مشیت کے ہاتھوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ہے ۔ تو میرے نزدیک وقت کی تباہی ہے ۔ ہاں اگر یہ انسانی زندگی میں تہذیبی مساوات اور انصاف پیدا کرنے کے کام آئے جس کا نتیجہ انسانی نشاط و راحت ہو ۔ تو دُنیا کی تمام عبادتوں سے بڑھ کر ہے ۔ شاید یہی جوہر شاعری کا حاصل ہے ۔ اور یہی تو زندگی کی حکمت ۔

نیساں اکبر آبادی

نازک بیانیاں

جلوۂ حُسن وہ دکھاتے ہیں — نقش حیرت بنائے جاتے ہیں
پھول تو پھول ان کے ہنسنے پر — آج کانٹے بھی مُسکراتے ہیں
ہم انہیں دیکھتے ہیں پیشِ نظر — یا فریبِ نگاہ کھاتے ہیں
بیخودی میری بڑھتی جاتی ہے — جس قدر آپ یاد آتے ہیں
سوچتے ہیں کریں گے اُن سے گلہ — جب وہ ملتے ہیں بھول جاتے ہیں
آپ سمجھے بھی یا نہیں اب تک — اشکِ خوں داستاں سُناتے ہیں
آرزوئیں ہماری ختم ہوئیں — اک سکون دل میں آج پاتے ہیں
ضبطِ غم مری بات رکھ لینا — آج وہ مجھ کو آزماتے ہیں

یہ ہمارا ہی کام ہے نیساں
درد میں بھی جو مُسکراتے ہیں

قاضی عبدالغفار

غیر جنبہ داری

۱۹۱۴ء کی جنگ تک بلکہ اُسکے بعد بھی کچھ عرصہ تک "غیر جنبہ داری" ایک ایسی سیاسی اصطلاح تھی جس کے مفہوم کو عوام اور اخبار پڑھنے والے لوگ تھوڑا بہت سمجھ لیتے تھے۔ لیکن جرمن آمریت کے ارتقار نے اس لفظ کی معنوی اہمیت کو اس قدر مسخ کر دیا کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اُنیسویں صدی میں جب یورپین دول کی سامراجی سیاست نے ساری دُنیا میں جدید سیاسی تصوّرات پیدا کرنے شروع کئے تو اُس کے ساتھ جنگ اور صلح کے جدید بین الاقوامی قواعد و ضوابط میں ملکوں کے ایک ایسی سیاسی حیثیت کا بھی تعین کیا گیا جو بطور ایک اصطلاح کے "غیر جنبہ داری" کہلائی۔ اس تصوّر کو اختیار کرنے کیلئے اُس کا اعلان ضروری سمجھا گیا اور بین الاقوامی قانون میں اُسکی تعریف بھی مقرر کر دی گئی اور بعض ایسی شرائط کا بھی تعین کر دیا گیا جو "غیر جنبہ دار" حکومت پر عاید ہوتی تھیں۔ ۱۸

حکومتوں نے اس بین الاقوامی اصول کی تفصیلات کو مقامی قواعد و ضوابط کے تحت اپنے اپنے دستور العمل میں معین کر لیا۔ امریکہ نے ۱۸۱۸ء میں اپنے لئے ایک "قانون غیر جنبہ داری" مرتب کر لیا۔ اور ۱۸۷۰ء میں برطانیہ نے بھی اسی قسم کا ایک قانون بنا کر اپنے کو اُس کا پابند کر لیا۔ دوسرے ممالک نے بھی ان دو قوانین کی تقلید کی اور بین الاقوامی سیاست میں یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ غیر جنبہ دار حکومت وہ ہے جو کسی جنگ میں نہ تو فریقین میں سے کسی کا ساتھ دے اور نہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کسی فریق کو امورِ جنگ میں امداد حاصل ہوتی ہو۔ ۱۹۲۴ء تک غیر جنبہ داری کے یہ تصوّرات باقی رہے اور جنگ عظیم کے بعد بھی مجلسِ اقوام کے قوانین میں ان تصوّرات کو زیادہ مؤثر صورت میں قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔

لیکن نازیوں اور فاشیوں نے جنگ کے تمام قدیم نظریات کو بدل دیا اور اُن ہی کے ساتھ صلح اور امن اور غیر جنبہ داری کے تمام قدیم نظریات بھی بدلنے لگے۔ محوری نظریات کے تحت جنگ کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ ہر قسم کی غیر جنبہ داری اُس کی زد میں آگئی۔ قدیم زمانہ میں جنگ شروع کرنے کے لئے اعلانِ جنگ ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن محوری "فوجیت" نے اعلانِ جنگ کے بغیر ہی حملے کرنے شروع کر دئے اس لئے اعلان غیر جنبہ داری بھی بیکار ہو گیا۔ جس طرح اصول جنگ کی تمام اخلاقی حدود شکست ہو گئیں اسی طرح اور لازماً غیر جنبہ داری کے اخلاقیات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ جنگ کسی بین الاقوامی قانون کی پابند رہی ہے اور نہ غیر جنبہ داری کا کوئی اصول باقی رہا ہے۔

اس وقت تمام یورپ میں بلکہ دُنیا کے (۳/۴) حصہ میں اگر کسی ملک کو غیر جنبہ دار کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف سوئزرلینڈ ہے لیکن اُسکی غیر جنبہ داری ایک مسلح جنبہ داری ہے یعنی وہ اپنی غیر جنبہ داری کی حفاظت کرنے کے لئے اپنی فوجی قوّت کو تیار رکھتا ہے۔ پھر بھی باوجود اسکے کہ تمام دول نے ایک بین الاقوامی معاہدہ کے تحت ۱۶۴۸ء میں سوئزرلینڈ کی دوامی غیر جنبہ داری کو تسلیم کر لیا تھا اور ۱۸۱۵ء کی وینا کانفرنس میں اس معاہدہ کی مزید توثیق بھی کی گئی تھی لیکن یورپ میں واقعات کی جو رفتار ہے اُس کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ غیر جنبہ داری کسی دشمن کے حملہ سے کے دن محفوظ رہ سکے گی۔ وہ زمانہ گزر گیا جب ۱۸۷۱ء میں فرانس کی بھاگی ہوئی ۸۰ ہزار فوج کے اسلحہ جو ملک میں گھس آئی تھی سوئزرلینڈ نے اپنی غیر جنبہ داری کی بنا پر رکھوا لئے تھے اور اُسکو نظر بند کر دیا تھا۔ ۱۸۲۱ء میں جب مجلسِ اقوام نے اپنی بین الاقوامی فوجی پولیس کے گزر جانے کے لئے سوئزرلینڈ سے راستہ مانگا تھا تب بھی اُس نے

اس درخواست کو منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لیکن آج جبکہ محور کے فلسفۂ جنگ نے تمام بین الاقوامی قوانین اور جنگ کے اخلاقی اصولوں کو ٹھکرا دیا ہے اور ہر غیر جنبہ دار ملک کا یہ حال ہے کہ اُس میں ہزارہا جرمن فوجی سیاحوں کے بھیس میں پھیلے ہوئے ہیں۔ غیر جنبہ داری کی قیمت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔

بہرحال یورپ میں مسلحہ "غیر جنبہ داری" کی صرف ایک مثال ہے۔ لیکن وہ بھی

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

غیر جنبہ داری کی ایک اور وسیع تر اصطلاح دوستانہ غیر جنبہ داری ہے اس غیر جنبہ داری کا رجحان کسی ایک فریق یا دونوں فریقین کی طرف ہو سکتا ہے ۱۹۳۶ء کی جنگ کے بعد اس دوستانہ غیر جنبہ داری کی پہلی مثال وہ تھی جب کہ اسپین کی خانہ جنگی میں اٹلی اور جرمنی نے کوئی فوجی مداخلت تو نہیں کی لیکن جنرل فرانکو کو ہر قسم کی اخلاقی اور مادّی امداد دیتے رہے۔ محور کی کتاب کا یہی ورق اب امریکہ نے اُڑا لیا ہے اور "دوستانہ غیر جنبہ داری" کی تمام منطقی انتہاؤں تک اب امریکہ جمہوریتوں کی امداد کر رہا ہے۔

اس قسم کی غیر جنبہ داری کی حدود اب اس قدر وسیع ہو چکی ہیں کہ میدانِ جنگ میں فوج بھیجنے کے علاوہ ہر قسم کی عملی ہمدردی اور امداد غیر جنبہ داری کے منافی نہیں سمجھی جاتی۔ یہ نتیجہ بھی براہ راست ہٹلر کے اس طرزِ عمل کا ہے اُس نے جنگ کے اخلاقیات کے تمام حدود کو توڑ دیا۔ درحقیقت اب اس قسم کی غیر جنبہ داری ایک مشروط غیر جنبہ داری ہے بین الاقوامی قوانین کے اکثر ماہرین اس قسم کی غیر جنبہ داری کو قانوناً ناقص سمجھتے ہیں لیکن خود بین الاقوامی قوانین کی تمام بُنیادیں اس درجہ مسمار ہو چکی تھیں کہ اب اُس کو کسی عمل کے جواز و عدم جواز کا معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ ہیگ کنونشن نے اس قسم کی جنبہ داری کو ناقص قرار دیا تھا اور ایسے غیر جنبہ دار کا شرکاءِ جنگ میں شمار کیا جانا جائز قرار دیا تھا۔

لیکن قانون کی انتہائی تباہی کا نام ہی جنگ ہے اور ۱۹۱۴ء سے آج تک ہم دیکھ رہے ہیں کہ "قوت" کا فلسفہ روز بروز تمام قوانین اور اصولوں پر بالادست ہوتا جا رہا ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں یونان عرصہ تک غیر جنبہ دار رہا لیکن اُس نے اپنے علاقہ میں اتحادی فوجوں کے داخل ہونے کی اجازت دیدی تھی۔ خود اٹلی اور جرمنی کے تعلقات اُس جنگ میں بہت عرصہ تک اصطلاحاً ایک دوسرے کے مقابلہ میں غیر جنبہ داری اور صلح جوئی کا اعلان کرتے رہے۔ کچھ دن تک مشرق بعید کے ایک گوشہ میں وہی صورت پیدا رہی یعنی جاپان بظاہر غیر جنبہ دار رہا لیکن بباطن شریکِ جنگ تھا اور دوسرے محوری شرکاءِ جنگ کی مصلحتوں کا پابند۔ (بالآخر اب وہ لڑنے والوں میں سے ایک ہے)۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

 . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

اگر بین الاقوامی اخلاقیات اور قوانین و روایات کو گزشتہ ۲۰ سال میں محوری طاقتوں نے اس قدر برباد نہ کیا ہوتا تو یہ دوستانہ یا غیر مشروط جنبہ داری کی اصطلاح پیدا ہی نہ ہوتی۔



ڈاکٹر تاراچند

اُردو اور ہندی

(ڈاکٹر تاراچند صاحب نے پروفیسر امرناتھ جھا کے چند اعتراضات کا جواب انگریزی اخبار لیڈر (الہ آباد) کے نام ایک خط میں دیا ہے یہ خط ایک مستقل مضمون ہے جس میں اُردو ہندی اور ہندستانی کے موجودہ مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ہم ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ (ادارہ)

سہرو سنگھ (مظفرپور) کے ایک جلسے میں پنڈت امرناتھ جھا نے جو تقریر کی تھی اسکے کچھ ٹکڑے لیڈر مورخہ ۲۳ مارچ ۴۲ء میں شائع ہوئے تھے جن سے ہندوستان کی قومی زبان کے سوال پر انکے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے اخبار میں ان باتوں کے لئے بھی کچھ جگہ نکال سکیں گے جو ان خیالات سے مختلف ہیں جو مظفرپور میں ظاہر کئے گئے تاکہ مسئلے کے تمام پہلو لوگوں کے سامنے آجائیں۔ میں اس تقریر میں پیش کئے ہوئے دلائل پر سلسلہ وار بحث کرونگا۔ ۲۰

پروفیسر جھا کہتے ہیں کہ "صرف ہندی ہی ہندوستان کی قومی زبان ہوسکتی ہے اور یہ رتبہ صرف اسی کو مل سکتا ہے کیونکہ یہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ اس کو فیضان اسی ملک سے ملتا ہے، ملک کے تمدن و تہذیب کی حامل ہے اور ملک کی بڑی بڑی زبانوں سے اس کا میل ہے" ــــــ اس بیان میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ ہندی سنسکرت سے نکلی ہے؛ یہ بیان دونوں طرح سے غلط ہے اس لئے کہ اس میں جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ ہندی ــــ یعنی وہ جدید ہندی جس کو آج کل کے بہت سے ہندی شاعر استعمال کرتے ہیں ــــ جس کو بقول پروفیسر امرناتھ جھا، ہندوستان کی قومی زبان ہونی چاہیئے ــــ ہرگز سنسکرت سے نہیں نکلی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ ہندوستانی قومی زبانوں میں سے کوئی زبان بھی سنسکرت سے مشتق نہیں ہے کیونکہ سنسکرت ایک معین ادبی زبان ہے جس کو زبان کی قواعد بنانے والوں نے اس کی کبھی اجازت ہی نہ دی کہ وہ بڑھے اور پھیلے اور اس سے نئی نئی شاخیں نکلیں۔ انڈو آرین لسانیات کی کسی کتاب کو بھی پڑھ کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ہندی دراصل سورسینی پراکرت کی اپ بھرنشا سے نکلی ہے اور یہ بولی مدھ دیس میں کئی صدیوں سے بولی جاتی تھی۔ سورسینی پراکرت خود ان پرانی انڈو آرین بولیوں کی پیداوار ہے جو بدھ کے زمانے سے قبل شمالی ہندوستان میں بولی جاتی تھیں۔ پرانی انڈو آرین پراکرت میں کئی بولیاں شامل تھیں جن میں سے ایک کو ادبی ضرورتوں کیلئے استعمال کیا جانے لگا۔ سب سے پہلی ادبی صورت چھندوں میں پائی جاتی ہے جو ویدوں میں استعمال کئے گئے۔ بعد کو ایک بولی نے ادبی حیثیت اختیار کرلی اور اسکو سنسکرت کہا جانے لگا۔ پانینی اور دوسرے قواعد دانوں نے اسکی قواعد بنائی اور اس نے ایک ایسی جامد صورت اختیار کرلی کہ اس میں پھیلنے اور بڑھنے کی قوت باقی نہ رہی۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ ہندی سنسکرت سے نکلی ہے، بالکل غلط ہے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ اُردو ان انڈو آرین زبانوں سے نہیں نکلی ہے جن سے ہندی نکلی ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان اسی اپ بھرنشا، اسی پرانی سورسینی پراکرت کی پیداوار ہے جس پر جدید ہندی کی بنیاد ہے گویا جہاں تک ابتدا کا سوال ہے دونوں زبانوں کی بنیاد ایک ہی ہے اور دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے برتری کا دعویٰ نہیں کرسکتی

اب رہا یہ کہنا کہ ہندی کو فیضان اسی ملک میں ملا اور ملک کی تہذیب اور تمدن کی وہ آئینہ دار ہے اور اُردو کو یہ حیثیت حاصل نہیں ــــ تو یہ بیان یک طرفہ اور مبالغہ آمیز ہے۔ یاد رہے کہ اُردو ہندوستان سے باہر کسی ملک کی زبان نہیں جو ہندوستانی باہر جاکر آباد ہوگئے ہیں؛ وہی اُردو بولتے ہیں اور انہوں نے البتہ اپنے نئے ہموطنوں کو اُردو سکھا دی ہے ورنہ اُردو ہندوستان کیلئے ویسی ہی "دیسی" اور "ملکی" ہے جیسی کہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی یا تامل! اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستانیوں ہی کے ہاتھوں اسکی پرورش ہوئی جن میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں۔ اسکی بنیادی ساخت اور اسکا صوتیاتی اور صوریاتی نظام ہندوستانی ہے اور اسکی بالائی ساخت میں تو ہندی سے کہیں زیادہ فراخدلی پائی جاتی ہے کیونکہ اسکے ذخیرے میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے تہذیبی ماحول میں استعمال ہوتے رہے ہیں ہندی کے مقابلے میں اُردو کی بنیاد کہیں زیادہ وسیع ہے اور اسکے مقابلے میں اُردو کا مشرب زیادہ آزاد اور فراخ ہے اور یہ سب اس لئے کہ اُردو نے دونوں فرقوں کے تمدن سے فیضان حاصل

کیا ہے اور دونوں کی روایات پر حاوی ہے ۔

لوگ اُردو کے متعلق کچھ کہتے وقت (عموماً یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوانی زندگی کا شاید ہی کوئی رُخ اور پہلو ایسا ہو جسے اُردو زبان میں نہ پیش کیا گیا ہو ۔ اُردو میں اُپنشدوں کے ترجمے موجود ہیں ۔ بھاگوت گیتا کا ترجمہ ہو چکا ہے، سمرتیوں، رامائن، مہابھارت اور بہت سے پُرانوں کے ترجمے بھی اُردو میں مل سکتے ہیں ۔ ہندو مذہبیات اور فلسفۂ مذہب پر اُردو میں بڑی بڑی تصنیفیں موجود ہیں جن میں ہندو دیومالا، ہندوؤں کی عبادتوں اور جاتراؤں وغیرہ سے بحث کی گئی ہے ۔ ان کے علاوہ ہندو آرٹ اور خصوصاً موسیقی پر کثرت سے اُردو کتابیں موجود ہیں ۔ سنسکرت کے بہت سے ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں اُردو ادب میں جگہ پا چکی ہیں ۔ ہندوؤں کے علوم ریاضی، ہیئت و کیمیا وغیرہ کے تذکرے اُردو کتابوں میں ہیں ۔ اور یہ سب کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک بہت سے ہندو اُردو کو خاص اپنی زبان مانتے تھے ۔ ہندو شعراء اور نثر لکھنے والے اُردو کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے تھے اور شمالی ہند کے بہتیرے پڑھے لکھے ہندو نہ صرف معلومات بڑھانے کی خاطر بلکہ ذوقِ سلیم کے تقاضے سے اُردو کتابیں پڑھتے تھے ۔ اس زمانے میں البتہ ہندو لوگ احیائی اور فرقہ وارانہ تحریکوں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ اُردو کو چھوڑ رہے ہیں ۔ ایسی کتابوں کی مانگ کم ہو گئی ہے اور کتابوں کے تاجروں کو اس قسم کی کتابیں شائع کرنے میں نفع نظر نہیں آتا اسکے باوجود اگر گورنمنٹ گزٹ پر نظر ڈالی جائے جو صوبجاتی حکومتوں کی طرف سے شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ ایسی کتابیں اب بھی شائع ضرور ہوتی ہیں ۔

اُردو نے ہندوؤں کی خدمت کی اور ان کی ضروریات پوری کیں اور ساتھ ہی ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کی ضروریات کو زیادہ تر پورا کیا ۔ جہاں تک تخلیقی ادب کا تعلق ہے اُردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر فخر ہے ۔ بے شمار ہندو اہلِ قلم نے ——— شاہجہاں کے زمانے کے ولی رام ولی سے لیکر اب تک اُردو کو اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ۔ مسلمان تذکرہ نویسوں کی کوتاہ بینی کی بدولت ان کا اعتراف پورا پورا نہ ہو سکا مگر اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر ہندوؤں کی زیادہ تعداد اُردو کی طرف نہیں آئی تو اس میں کچھ خطا خود مسلمانوں کی بھی ہے ۔ بہت سے مسلمان شاعروں نے ہندو اساتذہ کے قدموں کے پاس بیٹھ کے پڑھنا لکھنا سیکھا مگر خبطِ برتری پھر بھی نہ گیا اور اسی وجہ سے بہت سے ایسے (ہندو) اساتذہ کی خودداری مجروح ہوئی جو ادبی شہرت کے متمنّی تھے ۔ اور پھر اب تو احیائی اور فرقہ وارانہ تحریکوں کا زہر دونوں کی رگوں میں ایسا سرایت کر گیا ہے کہ دونوں کے مناقشات اور زیادہ بڑھ گئے ۔ مسلمان اگرچہ قرونِ وسطیٰ میں سیاسی قوّت کے اجارہ دار تھے مگر انہوں نے برج بھاشا، اودھی اور دوسری دیسی زبانیں سیکھنا ہرگز کسرِ شان نہ سمجھا ۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ان زبانوں کے ایسے ایسے شاعر پیدا کئے جن کے نام اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک یہ زبانیں سیکھی اور پڑھی جاتی رہیں گی مگر حالیہ دور میں وہ اپنے ہموطن ہندوؤں کے تمدّن کا مطالعہ کرنے کا رجحان برابر کم کرتے چلے جاتے ہیں ۔

بہرحال اور کچھ بھی ہو مگر یہ الزام کہ اُردو ادب میں باہر کی بو باس زیادہ ہے، محض مبالغہ ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سا اُردو ادب مسلمان فرقے کی روایات سے رنگا ہوا ہے لیکن مسلمان فرقہ بھی تو ہندوستانی ہے اور یہ تو فطری بات ہے کہ اسکے افراد جو ادب پیش کرینگے اس میں کسی حد تک انکی آرزوؤں، اُن کے خیالات اور ان کی روایات کا ذکر ضرور ہوگا ۔ ایسا نہ ہونا غیر فطری تھا ۔ ہندوستان کے وہ فرقے جو ایسے مذہبوں کے پیرو ہیں جن کی ابتدا ہندوستان سے باہر ہوئی یعنی پارسی، عیسائی اور مسلمان ——— ان کو محض اس ایک وجہ کی بنا پر اجنبی یا پردیسی نہیں خیال کیا جا سکتا کہ ان کے مذہب دیسی نہیں ہیں ۔ جو لوگ اسکے خلاف رائے رکھتے ہیں وہ دراصل ہندوستان کو تقسیم کرنے والی اسکیموں کی تائید کرتے ہیں ۔

پھر یہ کہ جو لوگ اُردو ادب سے پوری طرح واقف ہیں اور ان کی معلومات ادھوری نہیں ہیں ان کو معلوم ہے کہ اجنبی یا بدیسی ہونے کا یہ الزام کتنا ظالمانہ اور غلط ہے ۔ دکن کے اُردو شعراء کا کلام پڑھیے ۔ خصوصاً ان کی مثنویاں اور مرثیے ۔ سودا اور میر کا کلام پڑھیے ۔ ان کی مثنویاں، قصیدے اور مرثیے پڑھیے یا میر حسن کی مثنوی سحر البیان یا دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم اور میر انیس کے مرثیے یا نظیر اکبر آبادی کی نظمیں ۔ یا حال کے شعراء مثلاً آزاد، حالی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی، چکبست اور بہت سے موجودہ شعراء کی بڑی بڑی نظمیں پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اُردو ادب کے ماحول کو بیگانہ یا بدیسی نہیں کہا جا سکتا ۔ ایسی جگہوں پر بھی جہاں ہیرو کے نام اور مقامات بدیسی ہیں جیسے کہ مرثیوں میں، وہاں بھی جذبات خیالات اور معاشرت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے بالکل ہندوستانی ہے ۔

اب اگر نثر پر نظر ڈالی جائے جیسے نذیر احمد کی اخلاقی ناولیں یا سرشار کا شاہکار فسانۂ آزاد یا پریم چند کے افسانے اور کہانیاں، تو یہ رائے ہرگز قائم نہیں رہ سکتی

کہ اُردو ادب میں ہندوستانی زندگی کی نمائندگی نہیں ہے یا اُردو ادب ہندوستان کے مختلف تمدنی ماحول کو پیش کرنے سے عاری ہے۔ پھر جب شکسپیر کے ڈرامے، ہیملٹ۔ جولیس سیزر۔ اینٹونی اینڈ کلیوپیٹرا، مرچنٹ آف وینس، رومیو اینڈ جولیٹ، اوتھیلو، ٹرائلس اینڈ کریسیڈا اور ٹائمن آف ایتھنز نیز ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ اور سیمپسن اگونسٹس، بائرن کی نظم پرزنر آف شلان، اسکاٹ کی ناولیں ۔ کوئنٹن ڈروَرڈ اور ٹلیسمین، لٹن کی ناول رنزی، جارج ایلیٹ کی ناول رمولا نیز وہ بہت سے ترجمے جو عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، لاطینی، پرتگالی، جرمن، روسی اور چینی زبانوں سے انگریزی میں کئے گئے انگریزی ادب کیلئے بدیسی نہیں خیال کئے جاتے تو ان ترجموں پر جو عربی یا فارسی زبانوں سے اُردو میں کئے گئے ہیں یہ الزام کیوں عاید کیا جاتا ہے کہ ان میں بدیسی پن ہے۔ انگریزی ادب میں یونانی، رومی اور یہودی روایات اور تاریخی واقعات اور تاریخی اور اصنامی ہستیوں کے بیشمار اشارے اور تلمیحیں ہیں لیکن اسکے باوجود انگریزی ادب کے کٹر سے کٹر شیدائیوں نے بھی کبھی ان تلمیحوں یا اشاروں کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ پھر یہ کون سی سمجھ ہے کہ اگر ہندوستانیوں کا ایک طبقہ کہ جس کی مذہبی نسبتیں
۴ ہندوستان کے حدود تک محدود نہیں ہیں۔ ہندوستان سے باہر کی تلمیحیں استعمال کرتا ہے تو اُردو کو اسکے لئے موردِ الزام قرار دیا جائے۔

یہ کہا گیا ہے کہ "ہندی کو ہندوستان کی تمام بڑی بڑی زبانوں سے نسلی تعلق ہے"۔ میں اس بحث کو زیادہ طول نہ دونگا۔ لیکن یہ بیان ظاہر ہے بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ پھر دراوڑی زبانوں کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ کیا اُردو کا پنجابی سے ویسا ہی تعلق نہیں جیسا ہندی کا پنجابی سے ہے؟

ہندی پر اُردو کو ترجیح دینے کیلئے پروفیسر جھا نے جو دلیلیں پیش کی تھیں ان پر بحث کرنے کے بعد اب میں "ہندوستانی" پر ان کی رائے زنی سے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستانی" کو بُرا بھلا کہنے میں ان کو خاص لطف آتا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے "ہندوستانی" کو دوغلا جانور (Hybrid Monster) کہا تھا۔ اب وہ اس کو ایک "مضحکہ خیز زبان" کہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ان کے ذہن میں یہ ہے کیا۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ دُنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جو مخلوط نہ ہو۔ انگریزی زبان نے تو نہایت بے باکی کے ساتھ دُنیا کی تقریباً ہر زبان سے استفادہ کیا ہے، اس طرح "دوغلوں" کی فہرست میں انگریزی کا نام تو سب سے پہلے آنا چاہئیے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا سنسکرت خالص زبان ہے۔ اگر ایسا ہے تو اُن دراوڑی اور منڈا الفاظ کے متعلق کیا رائے ہے جو ایک بڑی تعداد میں سنسکرت میں داخل ہو چکے ہیں۔ ویبر نے تو سنسکرت ادب کی تاریخ میں بتایا ہے کہ ہیئت کی بہت سی عربی اصطلاحیں سنسکرت کی ان کتابوں میں ہیں جو ہندوستانی ہیئت کی خاص کتابیں کہلائی جاتی ہیں۔ کیا اُردو مخلوط زبان نہیں ہے جس میں افعال تو انڈو آرین ہیں اور اسم فارسی! اور ہندی کیا ہے ـــــ کیا تلسی داس، بہاری لال، کیشو اور دوسروں نے عربی اور فارسی لفظ نہیں استعمال کئے ہیں اور کیا نئی ہندی میں انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ دراوڑی، منڈا اور چینی زبان کے لفظ استعمال نہیں کئے جاتے ہیں۔ دکھنی اُردو پر غور کیا جائے جو تقریباً چار سو برس تک ادبی زبان بنی رہی اور اسکے پڑھنے لکھنے والوں نے پراکرت اور فارسی لفظوں کے میل جول کو کبھی مضحکہ خیز نہیں سمجھا۔ یہ سب بالکل ویسا ہی ہے کہ بعض لوگوں کو پیاز کا شوق ہوتا ہے اور بعض کو لہسن کا۔ اور بعض لوگ پیاز اور لہسن کے آمیزے کو پسند کرتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو جو پیاز کے شائق ہوں یہ حق ہو سکتا ہے کہ ان کو بُرا بھلا کہیں جو لہسن اور پیاز کے آمیزے کو پسند کرتے ہیں۔

پروفیسر جھا کو یہ یقین نہ کر لینا چاہئیے کہ ملک میں اس سنسکرت ملی ہندی کے ہمدرد بہت ہیں۔ اُن صوبوں میں جہاں اُردو یا ہندی مادری زبان کی طرح نہیں بولی جاتی ہیں۔ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سارے ہندوستان کیلئے ایک لنگوا فرانکا ہو۔ ان کو یقین ہے کہ اُس زبان کی کوئی شکل جو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں بولی جاتی ہے یہ مقصد پورا کر سکے گی۔ لیکن ان کو یہ یقین نہیں ہے کہ کون سی شکل اختیار کی جائے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر ایس کے چٹرجی مشہور ماہر لسانیات نے "ایک ایسی ہندی یا ہندوستانی کے رواج کے لئے کوشش کی تھی جو تمام نحوی مشکلوں مثلاً افعال کی تذکیر و تانیث وغیرہ سے بری ہو۔ مسٹر ستیا نراین نے جو جنوبی ہند میں ہندی پرچار کے بہت پُرجوش حامی اور نہ تھکنے والے کارکن ہیں ہندی پرچار سماچار میں جو دکھنی بھارت ہندی پرچار سبھا کا خاص اخبار ہے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے جو ہندی کو سنسکرت لفظوں سے بھر دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ لکھا ہے اور ان کو متنبہ کیا ہے کہ

"اگر ہم کو ایک ایسی ہی زبان قبول کرنا ہے جو سنسکرت سے بھری ہوئی ہو یا جس میں بڑا حصہ سنسکرت کا ہو تو ہمیں شمال کی زبانوں ہی پر نظر جمانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ

بنگال، مہاراشٹر اور دکن وغیرہ کی زبانیں ایسی غریب نہیں کہ
اس لین دین میں ان کا دیوالہ نکل جائے (سنسکرت ملانے کی)
اس دلیل میں اتنا فائدہ نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے بلکہ
اسکے برعکس نقصان کا زیادہ امکان ہے۔"

کچھ روز ہوئے جب ان صوبوں کے باشندوں نے جہاں ہندی نہیں بولی جاتی یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندی میں کچھ ادل بدل کیا جائے تو ڈاکٹر دھریندر ورما نے اس مطالبے پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا :-

"واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان بننے کی عزت کے
خیال اور اس لالچ نے ہندی والوں کو اس وقت ایک
ایسی خود فریبی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ یا تو اپنی زبان کے
اصلی مسائل کو بھلائے دے رہے ہیں اور یا پھر انکی صحیح
نقطۂ نظر سے دیکھنے کی قوت ہی جواب دے گئی ہے۔" (ونیا)

پروفیسر جھا ان چند لوگوں کو خوش کرنے کے خیال سے جو ہندی کو اس لئے پڑھیں گے کہ وہ انگریزی کی جگہ لیکر بین صوبائی زبان بنے گی اس میں سنسکرت ملانے کی زبردست حمایت کر رہے ہیں لیکن وہ یہ نہیں محسوس کرتے کہ اس طرح سے وہ لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں جو ہندوؤں کے ہمسائے کے طور پر دریائے سندھ سے دریائے کوسی تک اور ہمالیہ سے ست پڑا تک پھیلے ہوئے ہیں دشمنی اور نفرت کا جذبہ پیدا کئے دے رہے ہیں۔

اب میں ان اعتراضوں کا تجزیہ کروں گا جو اُردو پر کئے گئے ہیں پروفیسر جھا فرماتے ہیں :-

"اُردو ادب کا سارا ماحول غیر ہندوستانی ہے مشکل
ہی سے کوئی دیسی بحر اُردو میں مستعمل ہے۔"

یہاں پر مجھے وہ سب دہرانے کی ضرورت نہیں جو اُردو کے ہندوستانی ہونے کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں لیکن بحر (Metre) کے متعلق اتنا ضرور کہونگا کہ اوّل تو کوئی بحر (Metre.) کسی زبان سے مخصوص نہیں ہوتی اس لئے کہ زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ بحریں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ کیفیت اس قدر عام ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن انگریزی اور بنگالی ادب پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انگریزی میں ــــ جیسا کہ انگریزی ادب کا ہر متعلم جانتا ہے کہ ہر نئے عہد کے شعراء نظم کی مختلف طرز کے تجربے کرنا اپنا شیوہ بناتے رہے۔ اس رجحان کا سب سے تازہ مظاہرہ (Sprung Verse.) ہے جس کو جیرارڈ ہاپکنس نے پچھلی جنگِ عظیم کے دوران میں ایجاد کیا تھا اور جو اب ہارڈی اور برجیز کی ارکانی (Syllabic.) نظم کی جگہ عام ہو رہی ہے بنگالی میں پرانے ماترِتیا اور اکشرِ وِیتا کے علاوہ ایک تیسری بحر سوررِتیا ہے۔ پہلی بحریں تو شمالی ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی ہیں لیکن تیسری بحر جسکی بنیاد غالباً تان (Stress.) پر ہے بنگالی کیلئے مخصوص ہے۔ بعض ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ یہ غیر آرین چیز ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر، اب مجھے یہ بتانا ہے کہ با قافیہ نظم کے لحاظ سے اُردو اور ہندی یکساں ہیں اور سنسکرت ان دونوں سے مختلف ہے، اس لئے کہ سنسکرت میں با قافیہ نظموں کا وجود ہی نہیں۔ اسکے علاوہ اُردو میں گیتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے کہ ان کے راگ ہندی گیتوں کے راگ جیسے ہیں اور راگوں کی اس یکسانی کی وجہ سے اُردو گیتوں اور ہندی گیتوں میں پہچان نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت اگرچہ اُردو نظم اور ہندی نظم پر کوئی بڑی علمیاتی بحث نہیں کی جا سکی ہے لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کی حد تک اُردو ہندی سے بالکل مختلف نہیں ہے۔ جو بھی اس کی تصدیق کرنا چاہے۔ ہندی "چوپائی" اور اُردو "بحرِ متقارب" ۲۳
کا موازنہ کرے۔

اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کہ اُردو کا ماحول بالکل غیر ہندوستانی ہے پروفیسر جھا نے ان لفظوں کا ذکر کیا ہے جو مشہور لغت فرہنگ آصفیہ میں دئے گئے ہیں۔ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ذکر جس پیرائے میں کیا گیا ہے وہ بہت گمراہ کن ہے۔ پروفیسر جھا نے اس کا تذکرہ ہی نہیں کیا کہ اس لغت (فرہنگ آصفیہ) میں ۵۴ ہزار سے زیادہ لفظ دئے گئے ہیں جن میں سے صرف ساڑھے تیرہ ہزار لفظ فارسی اور عربی کے ہیں گویا بدیسی لفظوں کی تعداد کل لفظوں کی چوتھائی ہے۔ اس تناسب کی بنیاد پر کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو غیر ہندوستانی زبان ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں ثابت کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن، مسٹر سمپورنانند اور ساہتیہ سمیلن کے دوسرے ادیب آجکل یہ بھول گئے کہ اس واقعہ کی تردید ہی ممکن نہیں کہ اُردو اور ہندی دراصل ایک ہی بولی جانے والی زبان کی دو مختلف شکلیں یا صورتیں ہیں۔ اسی طرح چھوٹے موٹے مضمون نگار کچھ بھی کہتے پھریں مگر لسانیات کی کسی کتاب سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہو سکتی کہ برج بھاشا،

اودھی اور نئی ہندی ایک ہی ہیں! زبانوں کی یکسانی کا دارو مدار ظاہری مشابہت پر نہیں ہوا کرتا۔

اگر اس وقت ہندی اور اُردو کے لکھنے والوں میں ایسے شدت پسندوں کی اکثریت ہے جو اپنے طرزِ تحریر کو نمایاں اور مؤثر بنانے کے شوق میں دقیق اور غیر مانوس عبارت کے عادی ہیں تو اسکے یہ معنی تو ہرگز نہیں ہو سکتے کہ یہ اکثریت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اُردو کے ادیبوں نے ایک زمانے میں صوتیاتی اور لسانی خالصیت کے اصولوں پر غلط طریقے سے کاربند ہو کر عام استعمال کے بہت سے اچھے، سادے اور مؤثر لفظوں کو ادب سے نکال پھینکا تھا اور اُردو الفاظ کی کانٹ چھانٹ کیلئے ایسے قاعدے بنا دئے تھے جن میں اس رواج کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا۔ یہ انہوں نے بڑی سخت غلطی کی تھی۔ آج ہندی کے حق میں اس سے بھی بڑھ کر غلطی بہت سے ہندی کے ادیب کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تو "ہندوستانیت سے مراد کیا ہے" اسکے متعلق نہایت غلط عقیدہ رکھتے ہیں اور بعض علانیہ فرقہ واری تعصب سے متاثر ہیں۔ ہندی والے یہ غلطی چار طرح سے کر رہے ہیں۔

۲۶ (۱) بدیسی زبانوں کے وہ لفظ نکالے جا رہے ہیں جو نہایت سہل، سادے اور عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) عام تدبھو کی جگہ سنسکرت تت سم رکھے جا رہے ہیں۔

(۳) مشتقات کیلئے سنسکرت کی قواعد استعمال کی جا رہی ہے جو پراکرتی فطری ترقی کے مخالف ہے۔ اور ہندی کے صوتیاتی نظام پر بوجھ ہے۔

(۴) سنسکرت کے ذخیرۂ الفاظ سے موزوں اور ناموزوں ہر قسم کے لفظ بلا امتیاز لئے جا رہے ہیں۔

اُردو اور ہندی کے متعلق صرف یہی درست نہیں کہ اُردو میں ہندی کے معمولی لفظوں کی جگہ بدیسی لفظ استعمال کئے جانے لگے بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ نئی ہندی بنی ہی اس طرح کہ اُردو میں سے فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دئے گئے اور نئی ہندی تیار ہو گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندی کے مقابلے میں اُردو ایک بہت شاندار قدامت کی حامل ہے اور اُردو والوں کو یہی اصلی شکایت ہے کہ ہندی والے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ایک ہندوستانی زبان کو مٹا کر دوسری نئی گھڑی ہوئی زبان چالو کر دیں۔

یہ کہنا کہ اس طرح اُردو اور ہندی دونوں فطری ترقی کے راستے الگ الگ طے کر رہی ہیں، واقعات کی بہت غلط تاویل ہے اس لئے کہ یہ کسے نہیں معلوم کہ یہ رجحانات زبردستی اور ایک خاص مقصد سے پیدا کئے جا رہے ہیں۔ اُردو اور ہندی کے درمیان خلیج کو بڑھانا دراصل ادبی زندگی میں اس فرقہ واریت کا مظاہرہ ہے جو ہماری معاشری اور سیاسی زندگی میں اس قدر سرایت کر گئی ہے میری مخالفت ضرور ہوگی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سنسکرت ملی ہندی کا پروپیگنڈا کوئی صحت پرور قومی تحریک نہیں ہے کیونکہ اس سے علیحدگی کی پالیسی میں مدد ملتی ہے۔ ہندوستان ایک مرکب ملک ہے۔ یہاں کئی نسلیں، کئی مذہب، کئی تمدن اور کئی زبانیں ہیں۔ ہندوستان کی قوم انگلستان، فرانس، اٹلی، یا جرمنی کی قوموں کی طرح ایک وحدانی ہم جنس ادارے کی شکل نہیں اختیار کر سکتی۔ ہندوستان کی مشترکہ لنگوا فرینکا میں ہندوستانی قومیت کے تمام اجزا کی نمائندگی ہونی چاہئے اور اسی لئے ہر وہ کوشش ناکام رہے گی اور تفرقہ برپا کرے گی جو ایسی زبان کو ملک کی قومی زبان بنانے کے لئے کی جائیگی جس کی بنیاد کسی ایک مخصوص تمدن کی روایات پر ہو۔

انہی مشکلات کا اعتراف کر کے انڈین نیشنل کانگرس نے ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان کے طور پر اختیار کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے دقتوں کو صاف صاف محسوس کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"مجھے اب ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندی اور اُردو کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب آجانا چاہئے اور چاہے انکی ظاہری شکل مختلف ہو مگر وہ لازمی طور سے ایک ہی زبان ہو جائیں گی"

دونوں فرقوں کی باہمی بیگانگی دور کرنے کی خواہش نے ابھی حال میں مہاتما گاندھی کو یہ کہنے پر مجبور کیا:۔

"میں ایک ایسی انجمن بنانا چاہتا ہوں جس کا مقصد یہ ہو کہ اسکے اراکین دونوں بولیاں اور دونوں رسم خط سیکھیں اور اس کا پروپیگنڈہ بھی کریں اور یہ سب اس اُمید پر کہ بالآخر دونوں مل کر "ہندوستانی" کے نام سے ایک بین صوبائی زبان بن جائے اور پھر مساوات یہ نہ ہوگی کہ ہندی + اُردو = ہندوستانی، بلکہ مساوات یہ ہوگی۔ ہندوستانی۔ ہندی = اُردو"

مجھے امید ہے کہ تمام ذی فہم لوگ اس مسئلہ کی طرف دل سے توجہ کرینگے اور اپنی حد تک تو میری بڑی خواہش ہے کہ مہاتما گاندھی کی تجویز کامیاب ہو جائے۔ (ہماری زبان)

سیّد محمد آصف علی

کرپس مشن

(وہ مٹا ہوا کرپس مسوّدہ جسپر لکھ کر پھر مٹایا گیا)

برطانوی حکومت کا مسوّدہ اعلان واپس ہو گیا۔ جس شخص کو حالات کی انتہائی نزاکت کا ٹھیک ٹھیک خیال ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ جن سب کا اس سے تعلق ہے ان کے لئے کتنے بُرے نتیجے آغوشِ مستقبل میں ہیں، وہ موجودہ حالت کو نہایت تشویش کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ معاملوں کو اس جگہ چھوڑ دینا، جہاں وہ جمودی حالت پیدا کر دیں، تو اوّل درجہ کی مصیبت کو دعوت دینا ہے، ہندوستان کی حفاظت کا مسئلہ داخلی طور پر متضاد حالات کا یرغمال ہے، حکومت غیر ملکی ہاتھوں میں ہے اگرچہ اس مشینری کے پہیوں کے بیشتر کاگ ہندوستانی ہیں، جو لوگ عوام کے نظریہ اور اسپرٹ کو بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ صرف وہی لوگ ہیں جو اس وقت لڑائی سے خارج ہیں، حکومت کی روح تاریک بدشگونیوں سے پُر ہے اور وہ اس طرح کے موج بچار میں ہے جیسے وہ کوئی عمل کرنا چاہتی ہو اور کر سکتی ہو، اسکے مستقبل پر غم، مصیبت اور بے یقینی کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بیرونی کیفیت یہ ہے کہ اسکے سمندری راستوں میں زبردست حملہ آور گھوم رہے ہیں، جنہوں نے اسے گھیر لیا ہے، امریکہ کی سپلائی نہ صرف ہندوستان کیلئے بلکہ چین اور یورپ کیلئے بھی گو مگو کی صورت میں ہے، محوری طاقتوں کے موسم گرما کا مسئلہ خوفناکی کے ساتھ فضا میں گھوم رہا ہے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان ایک باعزت سمجھوتہ اور اتحادی قوموں کے ہاتھوں اسکی آزادی کے تسلیم کر لئے جانے سے راتوں رات تمام پوزیشن میں انقلاب ہو جاتا، اور اتحاد شکنی اور کامیابی کے طوفانی دروازے کھل جاتے۔

پھر کرپس مشن کا خاتمہ اس بے ڈھنگے پن سے کیوں ہوا؟ اسکی بہت سی وضاحتیں ہیں جن میں سے ایک خود مسٹر اسٹیفورڈ کرپس کی پیش کی ہوئی ہے جو سرسری طور پر حقیقی واقعات سے اتنی غیر مطابق ہے کہ صرف وہی لوگ اسے جائزہ لینے کے قابل سمجھ سکتے ہیں جو اس بات کیلئے بیتاب تھے کہ آخری وقت تک کسی طرح معاملہ لٹک سکے، اس سے نہ تو ہندوستان والے دھوکے میں آسکتے ہیں اور نہ غیر جانبدار غیر ملکی مبصر ہی کسی فریب میں آسکتے ہیں۔

ایک وضاحت ان لوگوں کی ہے جو عملاً اس گفت و شنید میں شریک تھے وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ دہلی یا لندن سے ایسے موقعہ پر یکایک "ہالٹ" (ٹھہرو) کا حکم صادر کیا گیا، جبکہ حکومت برطانیہ یا حکومتِ ہند کے نزدیک وہ منزل آ چکی تھی جو امریکہ چین وغیرہ میں ان کے نزدیک پروپیگنڈہ کیلئے کافی تھی لیکن صدر کانگریس کے آخری خط نے تو اس بہانہ کو بالکل ہی بے نقاب کر دیا کہ کانگریس نے برطانی پیٹھ پر آخری تنکا رکھ دیا۔ (ایک انگریزی محاورہ ہے کہ آخری تنکا اونٹ کی پیٹھ توڑ دیتا ہے) آخری بار سر اسٹیفورڈ کرپس صدر کانگریس اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان جو زبانی بات چیت ہوئی اس سے ان کے دلوں میں ذرا بھی شبہ نہیں رہا کہ مسودۂ اعلان کے فقرے ای میں جو پیش کش کی گئی ہے وہ صرف ایک نمکین جال ہے۔ اگست سنہ ۱۹۴۰ء میں تو اسے بالکل ہی گیا گزرا قرار دیدیا گیا تھا، لیکن اس بار شروع کی گفتگو میں ایسا نمک مرچ لگایا گیا کہ ۲۵ مارچ سے ۱۰ اپریل تک کی بات چیت میں یہ اُمید زندہ رہی کہ حقیقت میں اس کا نتیجہ ایک آزاد حکومت ہوگی، اور جنگ کو کامیابی سے چلانے کیلئے جو اختیارات ضروری ہیں وہ ایک سابقہ معاہدہ کے ذریعہ وزیر جنگ کو دیدیئے جائینگے مجبورًا یہ خیال کرنا پڑتا ہے کہ شروع میں جو یاددہانی کی گئی تھی وہ محض ایک دل لُبھانے والا فریب تھا، یہ نتیجہ اس وقت مجبورًا ہمارے ضمیر کو قبول کرنا پڑتا ہے، جب ہم مجوّزہ ہندوستانی کیبنٹ کی تمام رنگا رنگ چمکتی ہوئی تصویر کو اپنے ذہن میں لے آتے ہیں، جو شروع میں پیش کی گئی تھی۔

پہلی نظر میں یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دفعہ الف اس اعلان کی جان ہے لیکن چونکہ ڈیفنس کا محکمہ بالکل ریزرو رکھا گیا، اس لئے اس میں خوشنما "نفی" ہی تھی۔ صدر کانگریس اسی نتیجہ پر پہنچے، چنانچہ پہلی ملاقات میں مستقبل کے متعلق چند چبھتے ہوئے باریک جملوں کے بعد انہوں نے دفعہ ب پر

توجہ مرکوز کی۔ سرسٹیفورڈ اس یقین سے کیے جاتے تھے کہ اصل مقصد یہ ہے کہ بس ایک استثنائے تمام اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کئے جا رہے ہیں، اور وہ استثنا کمانڈر انچیف کے اختیارات کے متعلق ہے۔ یہ بھی امکان تھا کہ ایک ڈیفنس منسٹر مقرر ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ لفظوں پر نہ جائیے، عملاً ایک نیشنل کیبنٹ ہوگا، اور وائسرائے اور اس کیبنٹ کے درمیان ویسے ہی تعلقات ہوں گے جیسے بادشاہ اور ہمارے کیبنٹ کے درمیان ہیں۔ بہرحال وائسرائے ملک معظم کا نمائندہ ہے اور وہ بادشاہ سے زیادہ اختیارات استعمال نہ کر سکے گا۔ بعد کی گفتگو میں انہوں نے اس خیال کو اور بھی واضح کر دیا اور موجودہ آئین کے پیش نظر انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ وائسرائے کی پوزیشن ایک چیئرمین اور ایک وزیراعظم کے درمیان ہوگی۔ لیکن آخری خط میں دفعہ "سی" کی وضاحت کا تمام لب ولہجہ ایک مطلق العنانہ حکومت میں تبدیل ہو کر رہ گیا اور اقلیتوں کے اعتراض کا بالکل نیا مضمون اسی میں پیوست کر دیا گیا۔

شروع میں سرسٹیفورڈ کرپس نے یہ بات بالکل صاف کر دی تھی کہ اگر کبھی وزارت بننے کا اسٹیج آیا تو میں ہندوستان میں اور زیادہ ٹھہر جاؤں گا
اور یہ دیکھوں گا کہ اس سلسلہ میں آخری تدبیریں اختیار کر لی گئیں، اپنے آخری ۴۶
خط میں صدر کانگریس نے یہ بات نکتہ چینی اور شبہ سے بالاتر انداز میں ظاہر کر دی کہ اگر وہ منزل آجاتی تو اطمینان بخش حل بھی نکل آتا، کیا سر اسٹیفورڈ کرپس کیلئے یہ جواب دینا غیر ممکن تھا کہ مزید گفتگو میری موجودگی میں وائسرائے اور متعلقہ پارٹیوں کے درمیان ہوتے دیکھئے۔ لیکن سر اسٹیفورڈ کرپس جو مٹے ہوئے حروف پر لکھے ہوئے حروف کا مسودہ لائے تھے اس کی عبارت بھی یکایک جھیل دی گئی۔ کیا اسکی وجہ یہ تھی کہ اطمینان بخش حل پیش نظر تھا۔ کیا یہ اس لئے تھا کہ یہ خوف تھا کہ ملک کے عوام کی نمائندگی کرنے والی مختلف پارٹیوں کی مشترکہ مرکزی حکومت کے لئے طاقت کا نہیں بلکہ کمزوری کا باعث ثابت ہوگی۔ ہندوستانی عوام کی بے اعتمادی بہت قوی ثابت ہوئی۔ سب پارٹیاں اس بات پر تیار تھیں کہ مستقبل کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور جنگ کو کامیابی سے چلانے کے لئے موجودہ حالت پر ہی توجہ مرکوز کی جائے۔ تمام پارٹیاں اس بات پر ہاتھ ملانے کے لئے تیار تھیں کہ مشترکہ کوشش سے حصول مقصد اور قربانی کیلئے ملک کے جوش کو اعلیٰ ترین منزل تک پہنچایا جائے۔ لیکن قسمت انسانی خواہش سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

ایشیا - مئی ۱۹۴۲ء

بے عملی کے پوسٹ مارٹم کی کارروائی ایک ایسے وقت میں جبکہ خوفناک مقدرات اپنا سایہ ہم پر ڈال رہے ہیں مصیبت کم نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ اسکی مدد سے ہمیں اس اندھیری گلی سے باہر راستہ دیکھنے میں مدد نہ ملے، باہمی اتہام طرازی تو صریحاً خطرناک ہے، کیونکہ اسکی بدولت بدمزاجی پیدا ہوتی ہے اور اس سے بے لوث فیصلوں پر اثر پڑتا ہے، آخر وہ چیز کیا تھی جس کا مطالبہ کانگریس نہ صرف اپنے لئے بلکہ تمام ہندوستان کیلئے کر رہی تھی، سب سے پہلی چیز یہ ذہنی تبدیلی ہے کہ قسمت پرستانہ بے بسی اور مخالفانہ بے رُخی کی جگہ ایک نئی شان پیدا ہو اور وہ پُرجوش حبّ وطن ہو۔

کسی ملک کی جنگی قوّت کا بہت بڑا حصّہ عوام کا جوش ہوتا ہے اسکے بعد اسکے مادّی وسائل ہوتے ہیں، ہندوستان کے پیشہ ور فوجی بھی بہادر سپاہی ہیں، لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نیا جوش بھر جانے سے ان میں سے ہر ایک اٹل سورما بن جائیگا، جبکہ کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں اپنے خون سے ملک کی آزادی پر مُہر لگانے کی جوت جل رہی ہوگی۔ ہر سپاہی اپنے اعلیٰ ترین حد تک پہنچ جائیگا اور ہر ہندوستانی دل و جان سے متحدہ قوموں کی کوششِ جنگ میں شریک ہو جائیگا یہ تو تسلیم کر لیا گیا تھا، اور یہ حق دے بھی دیا گیا تھا کہ اعلیٰ فوجی تدبیروں کا یہ تقاضہ ہے کہ کمانڈر انچیف ہندوستان کا وزیر جنگ ہو اور اسے مسلح فوجوں پر پورا کنٹرول ہو، کسی تحریر کی رو سے نہیں بلکہ بے لکھے قانون یا ایسے رسمی ضابطہ کی رو سے جو گورنر جنرل اور حکومت کے ممبروں کے درمیان طے ہو، یہ پیش کیا گیا تھا کہ اگر کوئی ہی کیبنٹ کی حیثیت سے عمل کرے اور ممبر مشترکہ طور پر اپنے عمل کے لئے حکومت کے روبرو ذمہ دار ہوں اسکے معنی لیجسلیچر کے سامنے ذمہ داری کے نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے سامنے ذمّہ دار ہونے کے ہیں تاکہ حکومت کے ہر صیغہ میں قریب تر تعاون رہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ لڑائی چلانے کے لئے وار منسٹر (وزیر جنگ) کی خاص ذمّہ داریوں پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ اس میں اقلیتوں کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ پورے جی جان سے تعاون کا قابل اطمینان فارمولا حاصل کئے بغیر کوئی کیبنٹ بن ہی نہیں سکتی۔ ایسی حکومت کوئی جنگ چلا نہیں سکتی جہاں لوگ پر مشتمل ہو جو اس تاک میں ہوں کہ ہم اپنے اختیارات سے مزید طاقتیں چھین لیں اسی لئے استعفیٰ کی دھمکی سے وزیر جنگ کے اختیارات پر غلبہ حاصل کرنے کا سوال تو سرسری طور پر ہی خارج کر دیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ وزیر جنگ

(بقیہ مضمون صفحہ ۶۳ پر دیکھو)

عبدالسلام رامپوری

اسلام سے قبل کے بعض مشہور کتاب خانے

اب سے ہزاروں سال پہلے جبکہ فطرت سرتا پا راز تھی، مظاہرِ قدرت انسان کے لئے باعثِ تحیّر تھے، ماضی کے تجربات سے اُسکا حافظہ سادہ تھا مستقبل کے متعلق امید اور نا امیدی دونوں کی دونوں بے معنی تھیں اُس کا کام صرف مشاہدہ تھا۔ اُس سے قوی اور اُس سے کمزور دونوں کی مخلوق اُس کے سامنے تھی، وہ مختلف جذبات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ روزانہ نئی نئی چیزوں کا احساس ہوتا جاتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ اب وہ قوّت اور ضعف کو سمجھے۔ مضرت اور منفعت اب اُس کے لئے غیر مانوس تصوّر نہیں رہے رفتہ رفتہ واقعات کا ساتھ ساتھ ہونا اور یکے بعد دیگرے ہونا اُنکا مختلف اور متحد ہونا انسانی دماغ کو متوجّہ کرنے لگا۔ مبہوتی اور تحیّر کا دور ختم ہوگیا۔ اُسکے دماغ میں اسباب و علل کی کرید شروع ہوگئی۔ اُس کے ذہن میں کون؟ کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟ کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ واقعات کی توجیہ کیلئے اُس کو قدرۃً اپنے آپ سے قوی تر مظاہر کی طرف متوجّہ ہونا پڑا۔ اُنکی قوّت سے اُس کا ذہن خواہ نخواہ اُنکی برتری کی طرف منتقل ہوگیا۔ عقلی قویٰ کی کوتاہی نے اس تصوّرِ برتری کے تحت اپنے جیسے جذبات و عواطف، حسّیات و اعمال کو ممکن حدتک بڑی مقدار میں اُن کے لئے بھی ثابت کر دیا۔ کہتری کے جذبہ نے خود بخود اُن کو دیوتا اور دیوی کا مقدّس لباس پہنا دیا۔ کثرت سے وحدت کی طرف اس ابتدائی حالت میں نہ عقل متوجّہ ہوسکتی تھی نہ ہوئی۔ چنانچہ مختلف اعمال وافعال کیلئے مختلف دیوتا اور دیوی منتخب ہوئے۔ ہر قوم نے اپنے مذاق کا خدا تلاش کرلیا۔ بنی نوع پر تفوّق حاصل کرنے کے جذبے نے عقیدۂ طوطمیت کو رواج دیا۔ انسانی نسب دیوتاؤں سے ملا دئے گئے۔ دیوتاؤں کی غیر معمولی طاقت کے اظہار کے لئے محیّر العقول واقعات گھڑے گئے۔ واقعات کی خصوصیات اور دیوتاؤں کی شخصیت کے تصوّر نے مندر اور ہیکل کی تعمیر میں نقشے کا کام دیا۔ مندر کے خادم مذہب کے امین کہلائے۔ بادشاہ اور امرا دیوتاؤں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اُن کے مظاہر بلکہ خود دیوتا مان لئے گئے۔

کتابت عام سرسبزی اور خوشحالی کیلئے دیوتاؤں کو بھجن گا گا کر خوش کیا گیا اُن کا تفوّق ثابت کرنے کے لئے اُن کے کارنامے بیان کئے جانے لگے۔ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے یا اُن پر فتح پانے کے لئے، قحط و وبا اور دوسری مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے دُعائیں کی جانے لگیں
۲۷ کامیاب اتفاقی نتائج نے الفاظ اور طرز کی خصوصیت کو اہمیّت دیدی اور قوّتِ ارادی کی تاثیر نے اس وہمی اہمیّت کو ایک واقعیت بنا دیا۔ چیزیں برابر بڑھتی جارہی تھیں۔ انسانی حافظہ کب تک امداد دیتا۔ ادھر انسانی عقل میں مسلسل نشو و نما ہوتا رہا ذہنی طاقتیں منجھتی رہیں۔ مذہبی عقلاء نے اُن چیزوں کو آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ رکھنے کی تدبیر پر غور کیا۔ چنانچہ مختلف قوموں نے اس سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لئے مختلف طریقے ایجاد کئے۔ اشوری اور کلدانی قوموں نے مختلف آوازوں کے لئے مختلف علامتیں بنائیں جن کو میخوں اور پیکانوں سے مشابہ ہونے کی وجہ سے خطِ میخی یا خطِ پیکانی کہتے ہیں۔ قدیم مصری قوموں نے واقعات کو تصاویر سے ظاہر کیا۔ اہلِ فنیقیہ نے انہیں تصاویر سے بائیس مختصر شکلیں انتخاب کیں اور وہ حروفِ تہجّی تسلیم کرلی گئیں۔ دُنیا کی مہذّب قوموں نے بھی اُن کو شرفِ قبول بخشا۔ عربی، عبرانی، لاطینی، یونانی بلکہ بعض علما کی رائے کے مطابق سنسکرت، جرمنی اور ناروے کے مقدس خطوط کا سرچشمہ بھی یہی فنیقی حروف قرار دئے گئے۔[1]

ایشیا ھی - ۱۹۴۲ء

[1] تاریخ تمدّن قدیمہ از سینوبس صفحہ ۲۷۲-۲۷۴، تاریخ بابل و نینوا صفحہ ۱۹

کتابیں | جب خط کی کسی نہ کسی حیثیت میں ایجاد ہوگئی تو سب سے پہلے مذہبی دُعائیں۔ دیوتاؤں کی تعریفیں اور جھاڑ پھونک کے منتر لکھے گئے۔ ادویّہ اور علاج کے طریقے قلمبند ہوئے۔ زمانہ ترقی کرتا گیا نئے مشاہدے انسانی علم میں آتے گئے ضرورتیں وسیع ہوتی گئیں اور اُس تناسب سے تحریروں میں تنوّع پیدا ہوتا گیا۔ حروف کی شکلوں اور اُن کے لکھنے کے طرز میں ترمیمیں ہوئیں مکتوبات میں وسعت ہوئی۔ تجارتی دستاویزیں، عدالتی کارروائیاں، نظری طب، پند و مواعظ، فلکی مشاہدات، موسمی تغیّرات، ہندسی نظریے اور لسانی قواعد غرض یہ ہے کہ اُس وقت تک کے علوم کل کے کل قلمبند ہونا شروع ہو گئے اور کتابت ایک مستقل اور باقاعدہ فن بن گیا۔

کتاب خانے | کتابت کی ترقی سے کتابوں کے ذخیروں میں اضافہ لازمی تھا جن کے رکھنے کے لئے کسی نہ کسی جگہ کا تعیّن ناگزیر ہے۔ یہیں سے کتاب خانہ کا تصوّر پیدا ہوا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے کہ کتابت کی ایجاد کا بڑا سبب مذہب ہے تو یہ قیاس بھی بیجا نہیں کہ مخطوطات کا سب سے پہلا مخزن بھی کوئی مندر ہی ہو سکتا ہے۔ ایسے مخزن کا محافظ کسی پُرانے مندر کا بوڑھا کاہن یا پوجاری
۲۸ ہی ہوگا۔

رفتہ رفتہ مخطوطات جمع کرنیکا شوق عام ہوتا گیا۔ مندر اور ہیکل سے نکل کر علماء کے کاشانے اور بادشاہوں کے ایوان قدیم اور جدید مخطوطات سے آراستہ کئے جانے لگے۔ بادشاہوں سے یہ شوق امرا میں آیا اور علم کی اشاعت و ترقی کے لئے کتابوں کے فائدے کو زیادہ عام کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی حتّٰی کہ خصوصی کتاب خانوں سے عمومی کتاب خانے بن گئے۔ اب کتاب خانے صرف مذہبی کتابوں کے ہی مخزن نہ تھے بلکہ اُن میں وقت کے تمام مروّجہ علوم و فنون کے زر پارے بڑی کوشش سے جمع کئے جاتے تھے۔

چونکہ تہذیبی اور تمدّنی ارتقا تمام قوموں میں یکساں نہیں ہوا ہے بعض قومیں اب سے ہزارہا سال پہلے سے تہذیبی اور تمدّنی درجے پر آچکی تھیں درآں حالیکہ بعض قومیں آج بھی اپنی بدوی حالت پر قائم ہیں۔ مزید براں بعض قومیں خاص خاص اسباب عروج و زوال کے تحت تہذیب و تمدّن سے پھر بدوی حیات کی طرف لوٹ گئیں یا اپنی قومی اور اجتماعی حیثیت میں دُنیا سے ہی معدوم ہوگئیں اور اس طرح اُن کے ساتھ ہی اُن کے متعلق ہر قسم کے ذرائع علم بھی ختم ہو گئے۔ لہذا کتاب خانوں کا سلسلۂ وجود بھی جو تہذیب و تمدّن کی پیداوار ہے دُنیا کی ہر قوم میں نہ ہو سکتا تھا اور نہ آج ہے۔ اور نہ آج اُن تمام قوموں کا احصار ممکن ہے جن میں کسی نہ کسی حیثیت میں کتاب خانے تھے۔ ہمارے تحریری ذخیرے اور اثری انکشافات نے جن قوموں میں کتاب خانوں کے وجود کا سراغ لگایا ہے ظاہر ہے کہ اُن کو حقیقت سے کمیّت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔ میں نے اس مضمون میں اسلام سے پہلے کے بعض مشہور کتاب خانوں کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب خانے مختلف اقوام اور مختلف ممالک سے متعلق ہیں جو قدیم دُنیا کے تینوں برّاعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ سے وابستہ ہیں۔

مصر

دُنیا کی قدیم تاریخ میں مصر کی عظمت ناقابلِ انکار حقیقت ہے جب تقریبًا ساری دُنیا پر وحشت و بربریت کی گھٹاٹوپ اندھیاری چھائی ہوئی تھی مصر اپنی تہذیب اور تمدّن کے اعتبار سے اُس معراجِ کمال پر تھا جس پر دوسری قوموں کو پہنچنے کے لئے ہزاروں سال انتظار کرنا پڑا۔ اُس کے علوم و معارف، اُس کی صنعت، اُس کا نظامِ سلطنت اُس کے قوانین دُنیا کیلئے نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ جن کتاب خانوں سے ہم ابتک واقف ہوئے ہیں اُن میں سے سب سے قدیم کتاب خانے کا سُراغ مصر ہی میں ملتا ہے۔

دُنیا کا قدیم ترین کتاب خانہ | مقام جیزہ میں اہرام کے قریب کھُدائی کے دوران میں ایک قبر برآمد ہوئی ہے اُس قبر کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہانِ مصر کے دوسرے خاندان کے کسی بادشاہ کے کتاب خانے کے ناظر کی یہ قبر ہے۔ اس کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب خانے میں طب۔ ہندسہ۔ فلسفہ۔ فلکیّات۔ تاریخ۔ ادب وغیرہ کا اچھا خاصا ذخیرہ محفوظ تھا[1] مصر کے حکمرانوں کے دوسرے خاندان کا زمانۂ حکومت ۴۷۵۱ق م سے ۴۴۴۹ق م ہے[2] اس کے معنی یہ ہیں کہ اب سے کم از کم چھ ہزار سال پہلے مصر قدیم کے کتاب خانے اس حد تک ترقی کر چکے تھے کہ اُنہوں نے ایک خصوصی شعبے کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اُن کے لئے خاص عہدے کے تحت ایک خصوصی نگراں کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ مزید براں اس کتبے کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علمی حیثیت میں اُس نے کتنی

---

[1] الکافی فی تاریخ مصر الحدیث والقدیم الجزو الاوّل ص ۱۶۹

[2] ایضًا ص ۲۹۲۷۔

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۳ء

ترقی کر لی تھی اور کتنے اہم فنون اُس وقت تک اپنی مستقل حیثیت میں وُجود میں آ چکے تھے۔

اَمَن مُحعت کا کتاب خانہ | اَمَن مُحعت دوسرے خاندان کا سب سے پہلا بادشاہ ہے سنہ ۴۷۵ ق م میں مصر کے قدیم پایۂ تخت منفس میں تخت نشیں ہوا۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اُس نے ایک نہایت اعلیٰ کتاب خانے کی بُنیاد رکھی ہزاروں سال تک یہ کتاب خانہ عروج و زوال کی مختلف منزلیں طے کرتا رہا۔ چنانچہ اس کتاب خانے کی کتابیں مصر پر یونان کے حملے تک یعنی تقریباً تین صدی قبل مسیح تک موجود تھیں[1] گو ہمارے پاس شواہد و آثار موجود نہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ مذکورۂ بالا کتاب خانہ یہی اَمَن مُحعت کا کتاب خانہ ہو اور جیزہ والی قبر اسی کے ناظروں میں سے کسی ناظر کی قبر ہو۔

اُمیڈیاس کا کتاب خانہ | امیڈیاس مصرِ قدیم کا ایک نامور اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے عہدِ حکومت میں بہت تلاش اور جستجو سے قدیم کتابوں کو مہیّا کیا اور ایک عظیم الشّان کتاب خانے کی بُنیاد ڈالی۔ یہ کتاب خانہ اپنے زمانے میں خاص شہرت اور اہمیت رکھتا تھا۔

کتاب خانہ شفاخانۂ رُوح | رَیمِس اوّل نے جب مصر کی حکومت کی زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے امیڈیاس کے مذکورہ بالا کتاب خانے کی ترقی میں مزید کوشش کی اور مختلف مقامات سے کتابیں حاصل کر کے اُس میں شامل کیں اور اُس کو شفاخانۂ رُوح کے نام سے موسوم کر کے اس نام کا کتبہ کتاب خانے کے دروازے پر نصب کرا دیا[2]

اسکندریہ | تقریباً تین سو سال قبل مسیح یونان اپنی ترقی اور عروج کی آخری منزل پر تھا۔ اُس وقت کی معلومہ دُنیا کو زیرِ نگیں کرنے کے لئے اسکندرِ اعظم اپنی آخری کوششیں کر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر اپنی قدیم روایتی طاقت اور رونق کھو چُکا تھا۔ مصر کی قومی حکومت کمزور ہوتے ہوتے تقریباً سنہ ۵۰۰ ق م ایرانیوں کے ہاتھوں سے آخر ختم ہو گئی۔ جاہ و جلال والے فراعنہ جو اپنی قوّت و شوکت کے گھمنڈ میں خدائی کے دعوے سے بھی نہیں چوکتے تھے اپنے مدفنوں میں ہمیشہ کیلئے سو چکے تھے کہ سکندر کی زیرِ قیادت یونان نے حملہ کر دیا اور مصر پر اہلِ یونان کا تسلط ہو گیا۔

سکندر کی فتح کا مشہور سالار بطلیموس سوطر سنہ ۳۲۵ ق م میں مصر کا حکمراں ہوا[3] بحرِ روم کے ساحل پر اُس نے سکندر کے نام پر اسکندریہ آباد کیا اور اُسی کو دار الحکومت بنالیا۔

اسکندریہ کا کتاب خانہ | سکندر کے خاص مصاحب اور یونانی فلسفے کے ہیرو ارسطاطالیس کے مشورے سے بطلیموس نے اسکندریہ کے مشہور عجائب خانے کی بنا ڈالی[4] یہ عجائب خانہ شہر کے ایک مشہور حصّے بروشین میں واقع تھا۔ دوسری شاہی عمارتیں بھی اس جگہ واقع تھیں۔ عجائب خانے کی عمارت سنگِ مرمر کی تھی چہل قدمی کیلئے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے تھے۔ اس عمارت میں دُنیا کا مشہور کتاب خانہ، کتاب خانۂ اسکندریہ قائم کیا گیا[5] دُنیا کے مشہور علمی مرکزوں میں ایجنٹ بھیجے گئے اور کتابیں منگوا کر اس کتاب خانے میں جمع کی گئیں۔ ایران کا وہ علمی ذخیرہ جس کو سکندر نے فتح ایران کے بعد مصر بھیجا تھا[6] غالبًا اسی خزانے میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔

29 کتاب خانے کے مہتمم کو حکم تھا کہ جہاں کہیں سے کتابیں دستیاب ہوں سرکاری خرچ سے خرید لی جائیں۔ اسکے ساتھ ساتھ کتاب خانے کے متعلق کاتبوں کا پورا عملہ تھا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی کتاب فروخت کرنا نہ چاہتا تو اُس کی نقل کرا کر مالک کو دے دی جاتی اور اصل نسخہ کتاب خانے میں داخل ہو جاتا۔ کتاب خانے کی طرف سے اکثر بیش قرار قیمتیں معاوضے یا تاوان کے طور پر اصل مالکوں کو دی جاتی تھیں[7]

یوسیفوس کی روایت کے مطابق بطلیموس نے بیت المقدس کے ستر منتخب علما کو اسکندریہ آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنی مذہبی کتابوں کی ایک نہایت صحیح نقل کر دیں۔ اور اُس کو کتاب خانے میں داخل کر دیا جائے۔ چنانچہ فرمائش کے مطابق جب یہ علما نقلیں پوری کر چکے اور مقابلہ ختم ہو گیا تو بادشاہ کی طرف سے اُن کو بہت سا انعام دیا گیا اور نہایت اعزاز

---

[1] الکافی فی تاریخ مصر الحدیث و القدیم الجزو الاوّل ص ۱۶۷

[2] چیمبرز انسائکلوپیڈیا برٹانیکا طبع سنہ ۱۸۹۱ء جلد ششم ص ۶۰۸

[3] ناٹل انسائکلوپیڈیا ص ۵۲۴

[4] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد شانزدہم ص ۸۶۶

[5] معرکۂ مذہب و سائنس ا۔ ڈریپر ص ۲۵، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۶۶

[6] تاریخ سنی ملوک الارض و الانبیاء از حمزہ بن الحسن الاصفہانی ص ۳۲، طبری جلد دوم ص ۹

[7] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۶ .

سے اُن کو رخصت کیا گیا[۱] بائبل عہد قدیم کا سبعینیہ نسخہ یہی کہلاتا ہے۔

بطلیموس سوٹر کے بعد اُس کا بیٹا بطلیموس فلاڈیلفوس ۲۸۵ق م میں تخت نشین ہوا[۲] فلاڈیلفوس بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست تھا کتاب خانے سے اُس کو خاص دلچسپی تھی چنانچہ اُسکے عہدِ حکومت میں اسکندریہ کے کتاب خانے نے خوب ترقی کی۔ مشہور مصری مؤرخ مانیتون نے یونانی زبان میں قدیم مصر کی تاریخ اس کی فرمائش سے لکھی تھی۔ اس تاریخ کو دفتری کاغذات سرکاری دستاویزوں اور مختلف کتابوں اور نوشتوں کی مدد سے جو پرانے مندروں اور ہیکلوں میں محفوظ تھے جمع کیا گیا تھا[۳]

کتاب خانہ اگرچہ بطلیموس سوٹر کے زمانے میں ہی کافی ترقی کر چکا تھا لیکن اُسکے عہدِ حکومت میں اُس کی کوئی فہرست مرتب نہیں ہو سکی تھی۔ فلاڈیلفوس نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ اُس کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کرائی[۴] فلاڈیلفوس کے بعد بھی ہر بادشاہ نے اپنے زمانۂ سلطنت میں اس کتاب خانے کی سرپرستی کی۔ چنانچہ اس کی کتابوں کی تعداد چار لاکھ نسخوں تک پہنچ گئی۔ اور کتاب خانے کی عمارت اس سے زیادہ کتابوں کی گنجائش نہ رکھتی تھی۔ لہذا اس عمارت میں کتابوں کا مزید داخلہ روک دینا پڑا۔

سراپیم کا کتاب خانہ | اسکندریہ کے عجائب خانے کی وہ عمارت جو کتابوں کے لئے مخصوص تھی مزید تعداد کی متحمل نہ ہو سکی تو سراپیم کے مشہور مندر میں ایک دوسرے کتاب خانے کا افتتاح کیا گیا۔ اس کتاب خانے کی حیثیت عجائب خانے کے پرانے کتاب خانے کے اعتبار سے ایک شعبے کی تھی۔ چنانچہ سراپیم کا کتاب خانہ پہلے کتاب خانہ کا ایک تتمہ تھا۔ حکومت کے علمی ذوق اور اُس کی غیر معمولی توجہ سے اس شعبے نے بھی تھوڑی مدت میں کافی ترقی کر لی اور اس میں بھی تین لاکھ کے قریب کتابیں جمع ہو گئیں[۵]

اسکندریہ کے کتاب خانوں میں آتشزدگی | اسکندریہ کے یہ دونوں کتاب خانے بروکشین کا کتاب خانہ اور سراپیم کا کتاب خانہ جو پہلے کا ایک شعبہ تھا مسیح علیہ السلام سے تقریباً نصف صدی پیشتر تک موجود تھے۔ مصر کی ایک اندرونی نزاع کے سلسلے میں رومی شاہنشاہ جولیس سیزر مصر کی مشہور ملکہ کلوپیٹرا کی حمایت کیلئے آیا ہوا تھا۔ مصریوں نے ارکلاس کی زیر قیادت بروکشین میں سیزر کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ سیزر کا بیڑا مصریوں کے قبضے میں آجائے بیڑے کو مصریوں سے بچانے کی ایک ہی تدبیر تھی کہ بیڑے میں آگ لگا کر اُس کو تباہ کر دیا جائے۔ سیزر نے مجبوراً بیڑے میں آگ لگانے کا حکم دیدیا اتفاق سے یہ آگ زیادہ پھیل گئی اور بروکشین تک پہنچکر شاہی کتاب خانے میں لگ گئی اور پورے کتاب خانے کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا[۶]

جب یہ کتاب خانہ اس طرح برباد ہو گیا تو مارک اینٹونی نے تلافی نقصان کے طور پر پرگیماس کا کتاب خانہ جس میں دو لاکھ کے قریب کتابیں تھیں اور جو اب روم کے تحت تھا ملکہ کلوپیٹرا کے حوالے کر دیا کلوپیٹرا کے حکم سے یہ ذخیرہ سراپیم کے کتاب خانے میں منتقل کر دیا گیا[۷]

بروکشین کے کتاب خانے کے جل چکنے کے بعد اب اسکندریہ میں صرف ایک ہی کتاب خانہ موجود تھا[۸] ۳۸۹ء میں اسکندریہ کے بشپ تھیافیلس نے رومی بادشاہ تھیاڈوشیش کے حکم سے مصر کے اس قدیم علمی ذخیرے کو بھی برباد کر دیا[۹] اس طرح اسکندریہ کے یہی دونوں کتاب خانے برباد نہیں ہوئے بلکہ پرگیماس کا علمی ذخیرہ بھی جو کلوپیٹرا کے عہدِ حکومت میں مصر آچکا تھا برباد ہو گیا۔

اسکندریہ کے کتاب خانے کے جلانے کا حضرت عمرؓ پر اتہام | اسکندریہ کے یہی کتاب خانے ہیں جن کو جلانے کا الزام ساتویں صدی ہجری کے دو مؤرخ عبداللطیف بغدادی اور علی بن یوسف قفطی کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کی بنیاد پر فاروق اعظم پر لگایا جاتا ہے جس کی حقیقت مشہور مؤرخ گبن کے

---

[۱] تاریخ یوسیفوس فصل اوّل ترجمہ عربی ص ۴۹-۵۰
[۲] نائل انسائکلوپیڈیا ص ۵۲۴
[۳] الکافی الجزو الاوّل ص ۲۰۹
[۴] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۶۶
[۵] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۵

[۶] الکافی الجزو الاول ص ۲۳۳، معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸
[۷] سوانح عمری اینٹونی از پلوٹارک بحوالہ حاشیہ ذیلی معارف جلد نہم نمبر ششم ص ۴۴۶، معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸
[۸] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸
[۹] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۷، انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۶۶

اقرار کے مطابق صرف اتنی ہے کہ "پڑھو اور تعجب کرو"[1] خصوصاً ایسی صورت میں کہ احماق کے افسانے کا اصل ہیرو یحیٰ نحوی (یوحنا عبرانی میں، جان انگریزی میں، ژان فرانسیسی میں یوہن جرمنی میں، اس لفظ کی مختلف شکلیں ہیں) جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے مصر کے عامل حضرت عمرو ابن عاص سے یہ کتاب خانہ مانگا تھا۔ انہوں نے حضرت عمر سے استصواب کیا۔ حضرت عمر نے لکھا کہ اگر یہ کتابیں کتاب اللہ کے موافق ہیں تو ان کی ضرورت نہیں۔ کتاب اللہ کافی ہے اور مخالف ہیں تو مضر ہیں۔ بہر حال ان کو جلا دیا جائے چنانچہ ان کے حکم سے یہ کتاب خانہ نذرِ آتش کر دیا گیا، مسلمانوں کے اسکندریہ کو فتح کرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا[2]۔

اس بے بنیاد الزام کا ڈھنڈورا متعصب عیسائی مورخین ایک زمانے تک پیٹتے رہے ہیں۔ اس طرح کہ ساری دنیا اس کی بازگشت سے گونج اٹھی لیکن کب تک یہ کاٹھ کی ہانڈی چڑھی رہتی۔ آخر حقیقت بے نقاب ہو کر رہی۔ بجز سر پھروں کے ہر پڑھا لکھا اس الزام کو دہرانے میں اپنی علمی توہین سمجھتا ہے۔ لیکن جہاں تک تدلیس اور تغلیط کا تعلق ہے اب بھی لوگ باز نہیں آتے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انگلستان کا نہایت فاضل اور مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن جو اس الزام کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے حضرت عمر کے سلسلے میں اسکی طرف نفیاً اور اثباتاً کسی قسم کا اشارہ نہیں کرتا۔ اندلس کی عربی ادبیات کے بیان میں اس واقعہ کی طرف ضمناً اشارہ کرتا ہے مگر اس طرح کہ ہر پڑھنے والا یہ سمجھے کہ یہ الزام بالکل صحیح ہے اور ساتھ ساتھ اپنے علمی وقار کو بھی ٹھیس نہ لگے۔ "تاریخ ادبیات عرب" میں اندلس میں مسلمانوں کے ہشت صد سالہ علمی ذخیرے کی بربادی پر ماتم کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اگرچہ یہ مشتبہ ہے کہ حضرت عمر نے اسکندریہ کے کتاب خانے کو جلوا دیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ پادری زمینیر کے تعصب نے مسلمانوں کے اس علمی ذخیرے کو نذرِ آتش کر دیا"۔ حالانکہ نکلسن کو معلوم ہے کہ یہ الزام اب مشتبہ نہیں رہا ہے بلکہ اس کے غلط اور جھوٹے ہونے پر نہایت قوی اور واضح دلائل موجود ہیں۔ وہ صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا ہے بلکہ اس پر ذیلی حاشیہ لکھا ہے کہ "اگرچہ مصر کے جرجی زیدان نے اس الزام کی صحت کو دلائل سے ثابت کیا ہے"۔ ان دونوں عبارتوں کو ملا کر پڑھنے سے ایک عام پڑھنے والے پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے جہاں تک جرجی زیدان کے دلائل کا تعلق ہے محققین نے اسکے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں۔

عراق اور اس کے اطراف

دجلہ اور فرات کے درمیان کا علاقہ آرمینیا کے کوہستانی سلسلے تک قدیم اقوام کی مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کے اختلاط اور تصادم کا آماجگاہ رہا ہے چنانچہ اسکی تاریخ بھی مصر قدیم کی تاریخ کے تقریباً پہلو بہ پہلو ہی رہی ہے۔ اکادی سومیری اشوری کلدانی قوموں کے عروج و زوال، جنگ و صلح اور فتح و شکست کا گہوارہ اس دوآبے کے ہی مختلف مقامات ہیں۔ تہذیب و تمدن اور کتاب خانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہٰذا اس درمیانی علاقے میں کتاب خانوں کا وجود بھی نہایت قدیم زمانے سے ہے جن کی تفصیلات قدامت کی تاریکی میں چھپی ہوئی ہیں۔

سارگن اول کا کتاب خانہ | سارگن اول ۳۸۰۰ ق م میں کلدہ کا ایک سامی فرمانروا تھا۔ اپنے عہدِ حکومت میں اس نے ایک عظیم الشان کتاب خانے کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ کتاب خانہ کلدہ کے مشہور شہر ارک میں واقع تھا۔ اسی
۱۳۱ مناسبت سے اس شہر کو "کتابوں کا شہر" کہا جاتا تھا۔ اس کتاب خانے میں نجوم، تاریخ، قواعد وغیرہ بہت سے فنون پر ہر قسم کی قدیم اور جدید کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ اس کتاب خانے کے انتظام سے اس عہد کی عام تہذیبی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے تک خود کتاب خانوں نے کتنی حیرتناک ترقی کر لی تھی۔ چنانچہ اس کتاب خانے کی تمام کتابوں پر نمبر شمار درج تھے۔ پورے کتاب خانے کی ایک باقاعدہ فہرست موجود تھی۔ مطالعہ کے شائقین فہرست سے کتاب کا انتخاب کر لیتے تھے اور مطلوبہ کتاب کا نمبر کتاب خانے کے ناظم کو بتا دیتے تھے۔ اور مطلوبہ کتاب لاکر حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اس کتاب خانے کی کتابوں پر اس کے ناظم کی مہر ثبت ہوتی تھی۔ کتاب خانے کے ناظم کا نام "ابن سرو" تھا۔ غالباً قدیم سے قدیم ناظم کتاب خانے کا نام جس کا اب تک علم ہو چکا ہے یہی نام ہے[3]۔

---

[1] ڈکلاین اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر از گبن جلد پنجم صفحہ ۵۳۴

[2] دی عرب کانکوئسٹ آف ایجپٹ از بٹلر بحوالہ المعارف جلد نہم نمبر ششم صفحہ ۴۴۲

[3] تاریخ ملل قدیم صفحہ ۱۰۱، انٹرنیشنل سائکلوپیڈیا جلد دوم صفحہ ۹۱-۹۲، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم صفحہ ۶۰۸

اشور نصرپال کا عام کتاب خانہ | اس زمانے میں بہت سے کتاب خانے مختلف شہروں میں موجود تھے جن میں اشور اور نینوا کے کتاب خانے خاص اہمیت اور شہرت رکھتے تھے۔ اشور کا سب سے آخری اور سب سے اہم کتاب خانہ اشور کے بادشاہ اشور نصرپال کا تھا جو ۶۸۰ ق م میں موجود تھا یہ کتاب خانہ تمام رعایا کیلئے عام تھا اور پبلک لائبریری کی حیثیت تھی جس میں عام فائدے کے لئے ہر قسم کی کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ یہ کتاب خانہ ۶۰۶ ق م تک موجود تھا آخر بنو چند نصر کے ہاتھوں سے برباد ہو گیا۔ اس زمانہ میں یہی ایک کتاب خانہ نہ تھا بلکہ اشور نصرپال کے عہد میں اور اُس کے بعد بھی ہر بڑے شہر میں کوئی نہ کوئی عام کتاب خانہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔[1]

یونان

یونان کی علمی ترقی اور فلسفے اور حکمت کے مختلف شعبوں میں اُس کے کارنامے دُنیا کے تاریخی حافظے پر اس طرح ثبت ہیں کہ اُن کو کوشش کر کے بھی نہیں مٹایا جاسکتا۔ لیکن جہاں تک کتاب خانوں کا تعلق ہے ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُن میں باضابطہ کتاب خانوں کا وجود زیادہ قدیم نہ ہو لیکن خود علماء کے پاس ذاتی طور پر کتابیں نہ ہوں بہت زیادہ مستبعد ہے۔ ۳۲

ارسطاطالیس کا کتاب خانہ | اسٹرابو کے بیان کے مطابق مشہور یونانی فلسفی اور سکندر اعظم کا خاص مصاحب ارسطو (۳۲۲ - ۳۸۵ ق م) پہلا یونانی ہے جس نے کتاب خانہ جمع کیا۔ ارسطو کی علمی حیثیت کا اور اُن سہولتوں کا لحاظ کرتے ہوئے جو اُس کو کتابیں جمع کرنے میں حاصل تھیں یہ قرینِ قیاس ہے کہ اُس کا کتاب خانہ کتابوں کی تعداد اور اُن کی اہمیت دونوں کے اعتبار سے خاص حیثیت رکھتا ہوگا۔ ارسطو کا جمع کیا ہوا یہ کتاب خانہ اُس کی موت کے بعد اُس کے شاگرد نیلیئس کے قبضے میں آیا۔[2] نیلیئس اُس کو سیپسس لے گیا۔ اس زمانے میں برگیماس کے بادشاہ خاص طور سے کتابوں کی جستجو اور تلاش میں رہتے تھے۔ نیلیس اُنہیں کتابیں دینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اُن کی دستبرد سے بچانے کے لئے بعض مورخین کے خیال کے مطابق اُس نے اس بیش بہا کتاب خانے کو زمین میں دفن کردیا۔ اسٹرابو بیان کرتا ہے کہ اس کتاب خانے

[1] تاریخ ملل قدیمہ ص۱۰۱، انٹرنیشنل انسائکلوپیڈیا جلد دوم ص۱۹۰۹، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم ص۶۰۔ [2] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص۵۷۶، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم ص۵۰۶

کو اپلیکس نے خرید لیا اور انھیں لے آیا۔ اپلیکن کے مرنے کے بعد یہ کتاب خانہ روم آگیا۔ انہی نیوس کا بیان ہے کہ بطلیموس نے اس کتاب خانے کو خرید لیا تھا اور وہ اسکندریہ کے کتاب خانے میں شامل کر دیا گیا۔

بیس ٹریٹس کا کتاب خانہ | بیس ٹریٹس اُن یونانیوں میں جو کتابیں جمع کرنے کے شائق تھے خاص شہرت رکھتا تھا۔ اُس کا کتاب خانہ کتابوں کی تعداد اور اہمیت دونوں کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتا تھا۔

پالکریٹس اقلیدس نیکا کریٹس یوریپڈیس قبل مسیح صدیوں کے اُن علماء میں سے ہیں جن کے کتاب خانے خاص طور پر شہرت اور اہمیت رکھتے تھے۔

برگیماس کا کتاب خانہ | برگیماس ایشیا کوچک کا ایک شہر تھا اور اس نام کے صوبے کا پایہ تخت جس کی تقریباً تیسری صدی قبل مسیح میں بُنیاد رکھی گئی۔ یہ یونانی مہاجرین کی ایک نوآبادی تھی۔ یہ صوبہ ابتداءً مقدونیہ کے تحت تھا اُس کے بعد آزاد ہو گیا اور ۱۳۳ ق م میں رومی حکومت کے تحت آگیا۔[1]

جس زمانے میں اسکندریہ کا کتاب خانہ ترقی کر رہا تھا شاہان برگیماس نے اسکندریہ کے کتاب خانے کی مسابقت میں برگیماس میں اس کتاب خانے کی بُنیاد رکھی اور اس کو ترقی دیکر اسکندریہ کے کتاب خانے سے بڑھا دینے کی ہر طرح کوشش کی۔ مختلف مقامات میں ایجنٹ بھیجے گئے تاکہ جس طرح ممکن ہو کتابیں لائی جائیں۔ گو یہ حقیقت ہے کہ برگیماس کا یہ کتاب خانہ اسکندریہ کے کتاب خانے سے سبقت تو کیا اُسکے مساوی بھی نہ ہو سکا۔ لیکن ان کوششوں کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ دُنیا میں اسکندریہ کے بعد دوسرے درجے پر یہی کتاب خانہ تھا تقریباً نصف صدی قبل مسیح تک اس میں دو لاکھ کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ آخر اسی زمانے میں مارک اینٹونی کے حکم سے ملکۂ کلوپیٹرا کے حوالے کر دیا گیا اور سراپیم کے کتاب خانے میں داخل ہو گیا۔[2]

روم

روم کو اپنے عہدِ عروج میں ایک زمانے تک کتابوں اور کتاب خانوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی چنانچہ ۱۴۶ ق م میں روم کے بادشاہ سیونے کارتھیج کو فتح کیا اور سامانِ غنیمت کے طور پر ایک کتاب خانہ بھی لایا تو اُس کو اپنی طبعی غیر دلچسپی کی بنا پر سوائے چند زراعتی تصانیف کے اور کوئی کتاب پسند نہ آئی اور

[1] نائٹل انسائکلوپیڈیا ص۴۹۴

[2] معرکۂ مذہب و سائنس ص۲۸۲، سوانح عمری اینٹونی بحوالہ المعارف

اُس کو روم میں رکھنے کے بجائے افریقی حکومتوں کو بخش دیا۔ اسکے بعد بھی مختلف شاہانِ روم نے بہت سے کتاب خانے مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کئے ۸۶ھ ق م میں سولا ایتھنس سے اپیلیکیس کا کتاب خانہ لایا لیکن اُس سے کوئی دلچسپی نہوئی۔ لیکن اسکے بعد سے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا اور اُن کو جمع کرنیکا جذبہ پیدا ہوگیا۔

لوکولس کا کتاب خانہ | لوکولس کا کتاب خانہ اس حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اُس نے دوسرے لوگوں کیلئے نمونے کا کام دیا اور اُس کے بعد سے لوگوں میں عام علمی شوق نے نشو ونما پانا شروع کر دیا۔ اس کتاب خانے کی بُنیاد ۶۷ھ ق م میں اس طرح پڑی کہ لوکولس اپنی مشرقی فتوحات کے سلسلے میں مالِ غنیمت میں کتابوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ساتھ لایا اور اُس کو اپنے احباب اور دوسرے اہلِ علم کے مطالعہ کیلئے عام کر دیا۔

سسیرو اور اٹیکس کے کتاب خانے خاص اہمیت رکھتے تھے ان کے مالک سسیرو اور اٹیکس دونوں زیادہ سے زیادہ کتابیں جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح بہت کافی ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔

نجی کتاب خانوں کا شوق بھی روز بروز بڑھتا جارہا تھا جن میں بعض کتاب خانے کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے کافی عظمت رکھتے تھے چنانچہ ٹیرانین کا کتاب خانہ تقریباً تیس ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ سیمونکیس نے اپنے شاگرد گورڈین کے لئے باسٹھ ہزار سے بھی زیادہ کتابیں چھوڑی تھیں۔

روم کا سب سے پہلا عام کتاب خانہ | آود کے قول کے مطابق اس زمانے میں جی اسینیوس پولیو نے سب سے پہلا عام کتاب خانہ قائم کیا یہ کتاب خانہ ایٹریوم کا لیبر ٹیٹس میں قائم کیا گیا تھا۔

اکٹیوین کا عام کتاب خانہ | جی اسینیوس پولیو کے کتاب خانے کے بعد دوسرا شاہی عام کتاب خانہ قیصر اگسٹس نے ۳۳ھ ق م میں اکٹیوین کے نام سے قائم کیا۔ یہ پورٹیکس اکسٹیوئے میں قائم کیا گیا۔ یہ کتاب خانہ تقریباً ایک صدی تک رہا آخر ٹیٹس (سنہ ۴۰-۸۱ء) کے زمانے میں جل کر تباہ ہوگیا۔

پلاٹین کا عام کتاب خانہ | یہ کتاب خانہ بھی قیصر اگسٹس نے قائم کیا تھا۔ اسکی کوئی مستقل عمارت نہ تھی بلکہ اپالو کے مندر میں پلاٹین پہاڑی پر قائم کیا گیا تھا اور اس پہاڑی کے نام پر اُس کا نام بھی پلاٹین کا کتاب خانہ ہوگیا۔ اس میں یونانی اور لاطینی دونوں زبانوں کی کتابیں موجود تھیں۔ یہ کتاب خانہ ایک زمانے تک رہا۔ آخر چھٹی صدی ہجری میں پوپ گری گوری کے حکم سے نذرِ آتش کر دیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ دوسرے اتفاقی حادثے میں جل کر تباہ ہوا۔[1]

ایران

یونان و روم بلکہ مصر کی طرح ایران بھی دُنیائے قدیم کی تہذیب اور تمدّن کے بڑے نمائندوں میں سے ایک ہے۔ اس لئے ایران کے علوم و معارف سے انکار کرنا حقیقۃً اُسکی پُرانی تہذیب اور اُس کے قدیم تمدّن سے آنکھیں بند کرلینا ہے واقعہ یہ ہے کہ ایران پر سکندر کی سرکردگی میں یونانیوں کے حملے نے جہاں اُنکی قومیت کو عظیم الشان صدمہ پہنچایا وہاں اُن کو اُن کے قدیم علوم و فنون سے اور اُسکے بیش بہا علمی خزانوں سے بھی محروم کر دیا اور وہ علمی حیثیت سے تقریباً برباد ہوگئے۔ جو کچھ رہ گیا وہ بالکل مخلوط غیر منظم اور پارہ پارہ، اس قومی حادثے کے بعد سے اُن کی فطری ذہانت اور دماغی صلاحیت کو پھر اُبھرنے کیلئے تقریباً ہزار سال انتظار کرنا پڑا اور اسلام کے بعد وہ اپنی علمی عظمت کو واپس لا سکے۔ یہی اُنکی علمی بربادی تھی کہ اُن کی کتابوں کے پُرانے ذخیرے یا کتاب خانے سکندر کے حملے کے بعد سے ختم ہوگئے۔ چنانچہ اُنکے کتاب خانوں کی تاریخ سکندر کے حملے پر ایک حد تک ختم ہو جاتی ہے۔

ایران کا سب سے پہلا کتاب خانہ | ایران کی اپنی قدیم روایت کی بنا پر سب سے پہلا کتاب خانہ طہمورث بن ہوشنگ بن سیامک بن کیومرث نے قائم کیا تھا۔ ایران کے تجربہ کاروں اور ماہرین کے مشورہ اور رائے سے اصفہان میں مقام سارویہ میں اس کتاب خانے کی بنیاد رکھی گئی اور اُس زمانے میں جن جن علوم پر کتابیں موجود تھیں۔ اُن کو بڑی کوشش سے جمع کیا گیا اور اُن کو اس خیال سے کہ آئندہ حوادث سے تباہ و برباد نہ ہو جائیں محفوظ کر دیا گیا۔ مشہور منجم ابو معشر جعفر بن محمد بن عمر البلخی (متوفی ۲۷۲ھ) نے اصفہان میں ایک مقام کی کھدائی کے اثناء میں کتابوں کے ایک ذخیرے کو دیکھا تھا جس کے متعلق اُس وقت بھی خیال کیا گیا کہ یہ یہی کتاب خانہ ہے۔[2]

دژ نبشت | یہ کتاب خانہ قدیم پرسی پالس یا اصطخر میں واقع تھا اس میں طب، فلسفہ نجوم، زراعت اور بہت سے دوسرے فنون پر کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ یہ کتاب خانہ سکندر کے حملے تک موجود تھا۔ سکندر نے اسکی کتابوں میں سے بہت سی اہم کتابوں کا ترجمہ اور نقلیں کرائیں اور اُن کو یہاں کی بہت سی کتابوں سمیت لے گیا اور بقیہ کو برباد کرا دیا۔

گنج بشیگان | گنج بشیگان کے نام سے سمرقند میں کسی جگہ یہ کتاب خانہ قائم کیا تھا سکندر

۱؎ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۶۶، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم ص ۶۰۵، فاٹل انسائکلوپیڈیا ص ۶۵۲

۲؎ کشف الظنون، فہرست ابن ندیم ص ۳۲۵

ایشیا - مئی ۱۹۴۲ء

کے حملے تک یہ بھی موجود تھا لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ اس حملے میں دوسرے علمی ذخیروں کی طرح یہ بھی برباد ہوگیا یا کسی دوسرے اتفاقی حادثے کے تحت ختم ہوا۔

اس کتاب خانے کے بعد سے ایران میں باقاعدہ کتاب خانوں کے متعلق عام روایتیں خاموش ہیں۔ اتنا یقینی ہے کہ ایران میں کتابیں موجود تھیں خصوصاً تاریخ اور اخلاقیات پر کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود تھا چنانچہ عہد اسلام میں جب تراجم کا دور شروع ہوا ہے تو ان میں سے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا تھا۔[۱]

چین

بر اعظم ایشیا میں چین کی اپنی تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے وہی حیثیت ہے جو افریقہ میں مصر کی ہے لیکن چونکہ چین کے تعلقات دوسرے ممالک سے عام نہیں ہوسکے اس لئے اُسکے متعلق دوسرے ممالک کی تاریخیں خاموش رہیں اور آج اس دورِ تہذیب میں بھی چین کے متعلق عام لوگ اُس سے بہت کم جانتے ہیں جتنا کہ وہ دوسرے ممالک کے متعلق جانتے ہیں۔ اور چونکہ چین کے تعلقات عام نہیں ہوئے اور دوسرے ممالک سے خیالات و نظریات کا تبادل عمومیت کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس لئے اُس کی تہذیب و تمدن، علوم و صنائع میں دوسرے

۳۴ ممالک کا بہت ہی کم حصہ ہوسکتا ہے۔ اُس نے بلا شرکت غیر اپنی تہذیب اور اپنے علوم اور اپنی صنعتیں خود ہی پیدا کیں اور خود ہی نشو و نما دیتا رہا۔ بہرحال چین کی قدامت ایک مسلمہ حقیقت ہے علم و تہذیب میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کتاب خانوں کا وجود ناگزیر ضرورت ہے چنانچہ چین میں کتاب خانوں کا وجود بھی بہت پرانے زمانے سے ہے۔

جہاں تک میرے ذرائع علم کا تعلق ہے اُسکی بنا پر چین کے کتابخانوں کے متعلق تفصیلی اطلاعات بہم نہیں پہنچائی جاسکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۲۱۲ ق م سے بہت پہلے چین میں ہر قسم کے کتاب خانے کثرت سے تھے جن میں ایک شاہی کتاب خانہ بھی تھا۔ چین خاندان کے چوتھے فرمانروا جی وانگ ٹی متوفی ۲۱۰ ق م نے قانون اور ملکی نظام میں کچھ جدید اصلاحات جاری کرنی چاہی تھیں۔ یہ اصلاحات قدیم رسوم و رواج اور پرانی کتابوں کے خلاف تھیں۔ لوگوں نے پرانے رسوم و رواج اور قدیم کتابوں کی بنیاد پر ان اصلاحات کے خلاف آواز اُٹھانی شروع کردی۔ جی وانگ ٹی نے اپنے وزیر لی شی کے مشورے سے پورے شاہی کتاب خانے کو آگ لگوادی اور لوگوں کی ذاتی کتابیں بھی ضبط کرلی گئیں اور اُن کو جلوا دیا گیا۔ جن لوگوں نے کتابیں دینے سے انکار کیا اُن کو قتل کردیا گیا۔ جیمز کارکون کے قول کے مطابق ایسے مقتولین کی تعداد چار سو ساٹھ تک پہنچ گئی تھی۔

غالباً یہ تاریخ میں سب سے پہلا واقعہ تھا کہ کسی قوم کی ادبیات کو ملکی و سیاسی وجوہ کی بنا پر برباد کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً ایک صدی قبل مسیح سے پھر از سرِ نو کتابوں کے جمع کرنے کی کوشش شروع کردی گئی اور جو کتابیں بالکل ضائع ہوگئی تھیں اُن کو حافظے کی مدد سے پھر لکھوانے کی کوشش کی گئی۔ شاہی کتاب خانہ پھر دوسری بار قائم کیا گیا۔[۲]

ہندوستان

ہندوستان اپنی تاریخی روایتوں کی نگہداشت میں کمزور رہا ہے چنانچہ خود اہم تاریخی روایات کی شہادتیں نہیں چہ جائیکہ خفیف جزئیات کی۔ اور جو موجود ہیں اُن میں سے حقائق کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ مستند ذرائع کے فقدان کی وجہ سے اور اگر ہوں بھی تو دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے میں ہندوستان کے کتاب خانوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں بہم پہنچا سکا۔

بہرحال قدیم ہندوستان میں بُدھ سے پہلے کسی کتاب خانے کے وجود کا ثبوت نہیں۔ ہاں بدھ کے بعد سے پیروانِ بُدھ کے مندروں اور مدرسوں میں کتاب خانوں کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ چینی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں مدرسوں کے سلسلے میں اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ نالند کے کتاب خانے ساتویں صدی عیسوی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ نالند کے متعلق بعض سیاحوں کے تاثرات کی تلخیص "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کی تہذیب" کے فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں کی ہے[۳] جس میں اُس کے کتاب خانوں کا بھی ضمناً تذکرہ کیا ہے۔

ان سب کے ساتھ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قدیم ہندوستان اپنے علوم و فنون خصوصاً فلسفہ اور ریاضیات میں قدیم دُنیا کی علمی نمائندگی کا فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہا تھا۔

---

[۱] فہرست ابن ندیم صفحہ ۳۳۳، تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء صفحہ ۳۲، طبری جلد دوم صفحہ ۹، معارف نمبر ۱ جلد دوم صفحہ ۳۲ — [۲] تاریخ مملکت چین از جیمز کارکرن جلد دوم صفحہ ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، چائنا از رابرٹ ڈگلس صفحہ ۱۵، ۱۷ — [۳] "قرون وسطیٰ میں ہندوستان کی تہذیب" از گوری شنکر ہیرا چند اوجھا صفحہ ۱۷۵ ہیونسانگ کے بیان کی تلخیص

۳۵

دُکھ

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۲ء

پجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰

حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہم ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنیکا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلپذیر جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں۔ سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرس وائس"

علی اطہر اور چیخوف

(ڈراما)

آیوانوف

(روسی افسانہ نگار چیخوف کا ایک شاہکار)

(دوسرا اور تیسرا ایکٹ)

[لیبیڈیو کے مکان کا ڈرائنگ روم۔ اسٹیج کے مقابل باغ میں جانے کا دروازہ۔ دائیں اور بائیں بھی دروازے ہیں۔ پرانی وضع کے قیمتی فرنیچر۔ جھاڑ۔ فانوس اور تصویریں۔ سب ڈھکے ہوئے۔)

زنیدہ سوشنا۔ کوسیخ۔ اودوتیا نذارووِنا۔ یگورشکا۔ گیورل۔ ایک ماما۔ بڈھی مہمان عورتیں۔ کچھ نوجوان اور مادام بباکن۔

زنیدہ سوشنا صوفے پر بیٹھی ہیں اُن کے ایک جانب آرام کرسیوں پر بوڑھی عورتیں اور دوسری جانب معمولی کرسیوں پر کچھ نوجوان بیٹھے ہیں۔ پس منظر میں باغ کے دروازے کے قریب کچھ لوگ تاش کھیل رہے ہیں۔ کھیلنے والوں میں۔ کوسیخ۔ اودوتیا نذارووِنا اور یگورشکا ہیں۔ گیورل دائیں جانب دروازے کے قریب کھڑا ہے۔ ایک ماما مٹھائیوں کا تھال سبھوں کے پاس باری باری لیجاتی ہے پورے ایکٹ میں مہمان باغ سے دائیں دروازے کی جانب اور پھر واپس آتے جاتے رہتے ہیں۔ مادام بباکن دائیں دروازے سے اندر داخل ہوتی ہیں۔ اور زنیدہ سوشنا کے پاس جاتی ہیں]

زنیدہ:۔ (خوشی میں) پیاری مارفا یگورووِنا!

مادام بباکن:۔ کیسا مزاج ہے زنیدہ سوشنا؟ بیٹی کی سالگرہ پر میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں (ایک دوسرے کا بوسہ لیتی ہیں) خدا کرے کہ.......

زنیدہ:۔ شکریہ۔ ڈارلنگ۔ میں بہت خوش ہوں........ ہاں اور تم کیسی ہو؟

مادام بباکن:۔ بہت بہت شکریہ (اُن کی بغل میں صوفہ پر بیٹھ جاتی ہیں) اور کہو نوجوانو تم لوگ کیسے ہو۔

(مہمان اُٹھتے ہیں اور سر جھکاتے ہیں)

پہلا نوجوان:۔ (ہنستا ہے) نوجوانو!...... تو آپ کیا بوڑھی ہو گئیں۔

مادام بباکن:۔ (آہ بھر کر) اور کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جوان ہونے کا

دعویٰ نہیں کر سکتی

پہلا مہمان :۔ (ادب کے ساتھ ہنستے ہوئے) اور بھی کچھ کہئے گا!؟

چہرے سے تو آپ بیوہ نہیں معلوم ہوتیں بلکہ جوان چھوکریوں کو بھی مات کر سکتی ہیں۔ (گیورل مادام بباکن کو چائے دیتا ہے)۔

زنیدہ :۔ (گیورل سے) اس طرح کیوں لائے ہو؟ تھوڑا سا جام بھی لاؤ کرونڈے کا یا اور کسی چیز کا۔

مادام بباکن :۔ بہن تکلف مت کرو۔ شکریہ ...... (مختصر وقفہ)

پہلا مہمان :۔ مار فایگرو ونا کیا آپ مشکنون کی راہ سے آئی ہیں۔

مادام بباکن :۔ نہیں۔ زمشتنشے کی طرف سے۔ ادھر کی سڑک اچھی ہے۔

پہلا مہمان :۔ ضرور

کوسیج :۔ دو کالا پان

یگورشکا :۔ پاس

اودوتیا :۔ پاس

دوسرا مہمان :۔ پاس

۳۸ مادام بباکن :۔ لاٹری کے ٹکٹ کی قیمت تو حیرت انگیز طریقے پر چڑھ گئی ہے پیاری زنیدہ اتنی زیادہ قیمت کبھی سُنی بھی نہیں ہے۔ پہلے قرعہ میں دو سو ستر ہے اور دوسرے میں دو سو پچاس۔ پہلے کبھی اتنی قیمت نہیں ہوئی تھی۔

زنیدہ :۔ (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) جن کے پاس زیادہ ہے ان کیلئے اچھی چیز ہے

مادام بباکن :۔ یہ نہ کہو ڈارلنگ قیمت تو اتنی زیادہ ہے لیکن اس میں روپیہ لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صرف بیمہ ہی آدمی کو پاگل بنا دینے کو کافی ہے۔

زنیدہ :۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن پیاری اس میں پھر بھی امید تو رہتی ہے ..... (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) خدا رحیم ہے۔

تیسرا مہمان :۔ میرا خیال تو یہ ہے خواتین کہ آج کل سرمایہ رکھنے والوں کو کوئی نفع نہیں۔ تجارت میں روپیہ لگانے سے منافع تو تھوڑا ملتا ہے لیکن خطرے بہت زیادہ ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں جس کے پاس سرمایہ ہے اُس کی حالت زیادہ اندیشناک ہے بہ نسبت اس شخص کے جو ....

مادام بباکن :۔ یہ سچ ہے۔

(پہلا مہمان جمائی لیتا ہے)

مادام بباکن :۔ خواتین کے مجمع میں یہی تہذیب برتی جاتی ہے!؟

پہلا مہمان :۔ معاف کیجئے خاتون یہ محض اتفاق تھا۔

(زنیدہ سوشنا اُٹھتی ہے اور دائیں دروازے کی طرف جاتی ہے۔

(طویل خاموشی)

یگورشکا :۔ دو ٹھکری

اودوتیا :۔ پاس

دوسرا مہمان :۔ پاس

کوسیج :۔ پاس

مادام بباکن :۔ (علیحدہ) یا اللہ کتنی موت کی سی اُداسی ہے۔

(زنیدہ سوشنا اور لیبیڈیو داخل ہوتے ہیں)

زنیدہ :۔ (لیبیڈیو کے ساتھ دائیں دروازے سے خاموشی سے آتے ہوئے) تم وہاں اکیلے چپکے رہنا کیوں چاہتے ہو۔ جیسے تم بہت بڑے آدمی ہو۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھو

(جہاں پہلے بیٹھی تھی بیٹھ جاتی ہے)

لیبیڈیو :۔ اوّہ۔ اوّہ (مادام بباکن کو دیکھ کر) واللہ یہاں تو رسگلا بیٹھی ہوئی ہیں۔ (ہاتھ ملاتا ہے) آپکا قیمتی مزاج کیسا ہے۔

مادام بباکن :۔ بالکل ٹھیک بہت شکریہ۔

لیبیڈیو :۔ خیر خدا کا شکر ہے (بیٹھ جاتا ہے) ہاں۔ہاں .... گیورل (گیورل ایک گلاس شراب اور پانی کا جگ لاتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے اور پھر پانی)

پہلا مہمان :۔ آپ کی بہترین صحت کے لئے۔

لیبیڈیو :۔ بہترین صحت۔ ضرور .... مجھے مشکور ہونا چاہئے کہ میں نے اپنی صحت بالکل تباہ نہ کر لی (اپنی بیوی سے) زیورشکا آج کی ملکہ کہاں ہے۔

کوسیج :۔ (غمگین آواز میں) میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ کیوں ہم لوگوں نے آج ایک بازی بھی نہیں جیتی (اُچک پڑتا ہے) کیوں ہم تمام بازیاں ہار گئے خدا مجھے غارت کرے۔

اودوتیا:۔ (کودتی ہے اور غصہ میں کہتی ہے) کیوں؟ جب تم کو کھیلنا نہیں
آتا تو اچھا ہے کہ ایک بازی بھی نہ جیتو۔ آپ کو وہ پتہ چلنے کی
کونسی ضرورت پڑی تھی جو فریق کے پاس زیادہ تھا۔ اسی وجہ سے
آپ کا یکہ رکھا کا رکھا رہ گیا۔ (دونوں میز سے آگے کی طرف
دوڑ کر جاتے ہیں)

کوسیج:۔ (رونی آواز میں) سُنئیے ذرا ...... میرے پاس اکا۔ بادشاہ
بیوی۔ آٹھ اور ٹھکری کے پتے۔ حکم کا اکّا اور ایک چھوٹا پان تھا
اور یہ چھوٹا سلام نہ بول سکیں۔ شیطان جانے کیوں۔ میں نو
ٹرمپ بولا تھا۔

اودوتیا:۔ میں نو ٹرمپ بولی تھی۔ تم دو بولے اور نو ٹرمپ ......

کوسیج:۔ یہ سخت تکلیف دہ ہے ...... معاف کیجئے ......
تمہارے پاس ...... میرے پاس ...... تمہارے
پاس ...... (لیبیڈیو سے) خیال کرو یا ڈول کر پنج ....
میرے پاس۔ اکا۔ بادشاہ۔ بیوی اور آٹھ اور ٹھکریاں تھیں

لیبیڈیو:۔ (اپنی انگلی اُس کے کان میں ڈالتے ہوئے) بُرا نہ مانئے تو
مجھے بخش ہی دیجئے۔

اودوتیا:۔ (چلاتی ہے) میں نو ٹرمپ بولی تھی۔

کوسیج:۔ (خوفناک آواز میں) میں ذلیل اور کمینہ ہونگا اگر پھر کبھی اس بڈھی
چڑی کے ساتھ کھیلوں۔ (جلدی سے باغ میں چلا جاتا ہے
دوسرا مہمان اُسکے پیچھے جاتا ہے میز پر صرف یگورشکا رہ جاتا ہے)

اودوتیا:۔ اخ۔ میں سر سے پیر تک گرم ہو رہی ہوں ...... چڑی؟
...... چڑی وہ خود ہے۔

مادام بباکن:۔ تم جلد باز بھی ہو دادی۔

اودوتیا:۔ (مادام بباکن کو دیکھ کر تیزی سے ہاتھ ملاتی ہے) میری جان
میری مورت۔ تم یہاں ہو اور میں اتنی اندھی ہوں کہ تمہیں دیکھ
بھی نہ سکی ...... میری پیاری ...... (اُسکے کندھے کو
پیار کرتی ہے اور اُس کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے) کتنی خوشی ہوئی
آؤ تمہیں جی بھر کے ذرا دیکھ تو لوں۔ میری سفید بط! ......

لیبیڈیو:۔ اب تو تمہیں فرصت ہے ...... بہتر ہوتا کہ تم ان کیلئے
ایک دولھا ڈھونڈھ دیتیں ......

اودوتیا:۔ ضرور، ضرور، میری پُرانی گناہ گار ہڈیاں اس وقت تک قبر میں
نہ جائینگی جب تک کہ میں ان کے لئے دولھا نہ ڈھونڈھ دوں اور ساشا کے
لئے بھی ..... کبھی نہیں! .... (ٹھنڈی سانس لے کر) لیکن آج کل
دولھے ملتے کہاں ہیں؟ آج کل کے نوجوان بیٹھے پر پھڑپھڑاتے رہتے ہیں
جیسے برسات میں مرغ کرتے ہیں۔

تیسرا مہمان:۔ تشبیہ نہایت مہمل ہے۔ میرے خیال میں محترمہ اگر اس
زمانے میں نوجوان کنوارا رہنا پسند کرتے ہیں تو اس کی وجہ آج کل
کی معاشرتی حالت ہے یعنی ......

لیبیڈیو:۔ اچھا، اچھا، وعظ کی ضرورت نہیں! .... میں اسکی
پروا نہیں کرتا .....

(ساشا آتی ہے)

ساشا:۔ (اپنے باپ کے نزدیک جاتی ہے) اتنا بہترین موسم اور آپ
لوگ اس بند کمرے میں بیٹھے ہیں۔

زنیدہ:۔ ساشا کیا دیکھتی نہیں کہ مارفا یگوروونا آئی ہیں؟

۳۹

ساشا:۔ میں نادم ہوں (مادام بباکن کے پاس جاکر ہاتھ ملاتی ہے)

مادام بباکن:۔ تم کچھ مغرور ہو گئی ہو ساشا۔ ایک مرتبہ بھی مجھ سے ملنے
نہیں آئیں (اس کو پیار کرتی ہے) میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں ڈارلنگ

ساشا:۔ شکریہ۔ (اپنے باپ کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے)

لیبیڈیو:۔ ہاں اودوتیا نذاروونا، آج کل کے نوجوان کچھ عجیب طرح کے
ہوتے ہیں۔ دولھا تو کیا شادی وادی کے موقع پر کوئی اچھا
شہ بالا بھی اس زمانے میں نہیں ملتا۔ آج کل کے نوجوان (میرا
اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں) نہایت پھیکے اور ڈھیلے ہوتے
ہیں۔ خدا ان کی مدد کرے .... نہ تو گفتگو کا سلیقہ
جانتے ہیں نہ رقص کرنا اور نہ شراب ہی پینا

اودوتیا:۔ ارے نہیں شراب پینے میں تو سب اُستاد ہیں اگر موقع مل جائے

لیبیڈیو:۔ شراب پینا کوئی مشکل آرٹ تو ہے نہیں۔ گدھا بھی پی سکتا ہے
...... مطلب یہ ہے کہ تہذیب کے ساتھ پینا۔ ہم لوگ جوان تھے
تو دن بھر لیکچروں کے ساتھ سر مغزی کرتے رہتے تھے لیکن جیسے ہی

شام ہوئی سب کسی طرف نکل جاتے اور پھر صبح تک لٹو کی طرح چکر لگاتے رہتے
اس درمیان میں کچھ دیر رقص میں حصہ لیتے، کچھ دیر لڑکیوں کا جی بہلاتے اور جی
بھر کے پیتے بھی۔ مہمل بکواس کرتے یا فلسفہ چھانٹتے یہاں تک کہ زبانیں تھک
جاتیں ...... لیکن آج کل کے نوجوان ...... (شانہ ہلاتا ہے) انکا تو کچھ
سر پیر ہی سمجھ میں نہیں آتا ۔ .... نہ خدا کے اور نہ شیطان کے۔ ضلع
بھر میں صرف ایک سمجھدار نوجوان ہے اور اسکی شادی ہو چکی ہے (ٹھنڈی
سانس لیتا ہے) اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا دماغ بھی اپنی جگہ سے کھسکنے
لگا ہے۔ ....

مادام بباکن:۔ وہ کون ہے ؟

لیبیڈیو: نکولاشا آیوانوف ۔

مادام بباکن:۔ ہاں آدمی تو اچھا ہے (منہ بنا کر) لیکن کچھ بدقسمت ہے .....

زنیدہ:۔ تو خوش قسمت کیسے ہوتا بہن؟ (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) بیچارے
سے کیسی بھاری غلطی ہوئی! غریب نے یہودن سے شادی کی
اس امید میں کہ ساس سسر بیٹی کے جہیز میں سونے کا پہاڑ دیدینگے
لیکن ہوا بالکل الٹا .... جب سے انّا نے مذہب بدلا۔ ماں
باپ نے اس کو ٹھکرا دیا۔ بد دعائیں دینے لگے .... اسی لئے
اس بیچارے کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ اب پچھتاتا ہے لیکن
تیر کمان سے چھوٹ چکا ہے .....

ساشا:۔ امّاں یہ صحیح نہیں ہے ۔

مادام بباکن:۔ (بگڑ کر) کیا کہا ساشا، صحیح نہیں ہے؟ ساری دنیا یہ بات جانتی
ہے۔ اگر روپیہ کی غرض نہ ہوتی تو وہ ایک یہودن سے شادی ہی
کیوں کرتا؟ سینکڑوں روسی لڑکیاں موجود تھیں یا نہیں؟ بات
یہی ہے ڈارلنگ کہ اس سے چوک ہوئی، سخت چوک .....
(ذرا جوش کے ساتھ) اور میں کہتی ہوں کہ انّا کے ساتھ اسکا سلوک
کیسا ہے! نہایت ہی پرلطف۔ جیسے ہی وہ گھر پہنچتا ہے بیوی پر
برس پڑتا ہے: "تمہارے ماں باپ نے مجھے دھوکا دیا نکل جاؤ
میرے گھر سے" وہ بیچاری بھلا جائے کہاں؟ ماں باپ اسکو
اپنے گھر میں قدم نہیں رکھنے دینگے، ماما گیری کر سکتی ہے لیکن
اس کو کام کاج سے کبھی واسطہ نہیں رہا ...... اسی طرح
اسکو ستاتا رہتا ہے۔ یہانتک کہ کاؤنٹ غریب کو اسکی حمایت
کرنی پڑتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ کاؤنٹ نہ ہوتا تو وہ ایسے سلوک
سے کب کی مر چکی ہوتی ....

آودوتیا:۔ اور کبھی کبھی تو وہ اس کو تہ خانہ میں بند کر دیتا ہے اور شلجم
کھانے پر مجبور کرتا ہے ...... وہ بیچاری کھاتی ہے اور
کھاتے کھاتے بیمار پڑ جاتی ہے (قہقہہ)

ساشا:۔ ابّا جان یہ بالکل جھوٹ ہے آپ تو جانتے ہیں!

لیبیڈیو:۔ تو میں کیا کروں؟ بکنے دو ان لوگوں کو ...... (پکارتا
ہے) گیورل!

(گیورل اس کو شراب اور پانی بڑھاتا ہے)

زنیدہ:۔ یہ ہے داستان اسکی تباہی کی۔ بیچارہ! اس کی حالت خراب
ہو رہی ہے بہن .... اگر بورکن اسکی جائداد کی دیکھ بھال
نہ کرتا تو وہ اور اسکی یہودن فاقہ کرتے (ٹھنڈی سانس لیتی ہے)
اور اسکی وجہ سے ہم لوگوں کو کتنا نقصان اٹھانا پڑا .....
خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی وجہ سے کتنا گھاٹا ہوا! تم یقین
نہیں کروگی بہن گزشتہ تین سال سے ہمارے نو ہزار روپے
اس پر واجب ہیں!

مادام بباکن:۔ (چونک کر) نو ہزار روپے؟

زنیدہ:۔ ہاں .... یہ میرے رحم دل پشنکا کی رائے تھی کہ اس کو قرض
دینا چاہئے۔ یہ تو بالکل جانتے ہی نہیں کہ قرض کس کو دینا چاہئے
اور کس کو نہیں۔ اصل تو الگ ہی رہا۔ اس کی فکر ہی بیکار ہے
لیکن سود تو کم از کم پابندی سے ادا کرنا چاہئے تھا

ساشا:۔ (غصہ میں) امّاں آپ ہزاروں مرتبہ اس کا تذکرہ کر چکی ہیں

زنیدہ:۔ تو تمہارا اس میں کیا بگڑتا ہے؟ تم کیوں اسکی وکالت کر رہی ہو؟

ساشا:۔ لیکن آپ کیسے اس طریقے سے ایک ایسے شخص کے بارے میں
اس قسم کی گفتگو کر سکتی ہیں جس نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا؟
آخر انہوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے

تیسرا مہمان:۔ الیکزنڈر یولونا، میری بھی دو باتیں سن لیجئے، میرے دل
میں نکولائی الیکزیوچ کی بڑی عزت ہے اور اس پر ہمیشہ فخر کرتا رہا

...... لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ میرے خیال میں وہ ایک موقعہ باز آدمی ہے ۔

ساشا: ۔ بہت خوب! میں آپ کو آپ کے اس خیال پر مبارکباد دیتی ہوں!

تیسرا مہمان: ۔ اور اسکے ثبوت میں ایک واقعہ سن لیجئے جو مجھ سے اسکے دُم چھلّا یار از دار بورکن نے بیان کیا تھا۔ دو سال ہوئے کہ مویشیوں میں پلیگ پھیل گیا تھا، اس نے مویشیان خرید کر ان کا بیمہ کرا لیا......

زنیدہ: ۔ ہاں ہاں ہاں۔ مجھے وہ واقعہ یاد ہے مجھ سے بھی کسی نے ذکر کیا تھا۔

تیسرا مہمان: ۔ جی ہاں تو اس نے بیمہ کرا لیا۔ اسے یاد رکھئے گا۔ اسکے بعد مویشیوں میں پلیگ کے جراثیم کو مصنوعی طریقے سے پھیلایا اور اس طرح بیمہ کا روپیہ مار لیا۔

ساشا: ۔ اخ۔ یہ سب نہایت بیہودہ بکواس ہے۔ نہ تو کسی نے مویشی خریدے اور نہ پلیگ پھیلایا۔ یہ سب بورکن کے دماغ کی تخلیق تھی اور وہ اس اسکیم کا فخریہ ذکر کرتا پھرتا تھا، جب آیوانوف نے سُنا تو اسکے سامنے ہفتوں پیشانی رگڑی تب معافی ملی۔ آیوانوف کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ کمزور ہے اور اتنی ہمّت نہیں رکھتا کہ اس بورکن نمک حرام کو نکال باہر کردے۔ اور وہ صرف اس لئے ملامت کا مستحق ہے کہ وہ لوگوں پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ ہر طرح سے لوگوں نے اس کو لوٹا اور تباہ کیا ہے۔ اس کی فیاضانہ اسکیموں کی بدولت جس جس سے ہو سکا اس نے روپیہ بنایا۔

لیبیڈیو: ۔ ساشا تم بہت تیز زبان ہو۔ چُپ رہو!

ساشا: ۔ تو کیوں یہ لوگ اس قسم کی مہمل بکواس کرتے ہیں! یہ بہت تکلیف دہ اور اُکتا دینے والی حرکت ہے! آیوانوف، آیوانوف، ہر وقت آیوانوف، اور کوئی دوسرا تذکرہ ہی نہیں۔ (دروازہ کی طرف جا کر پلٹ پڑتی ہے) مجھے حیرت ہے (نوجوانوں کو مخاطب کرکے) مجھے حیرت ہے آپ حضرات کے صبر پر! کیا اس طرح چُپ چاپ بیٹھے بیٹھے تھک نہیں جاتے؟ یہاں کی تو ہوا میں بھی اُکتاہٹ ہے۔ کچھ بولئے، لڑکیوں کی خاطر کیجئے، اِدھر اُدھر چلئے پھرئے۔ اگر آپ کے پاس گفتگو کیلئے آیوانوف کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع نہیں تو آئیے سب مل کر ہنسیں، گائیں، ناچیں یا کچھ ....

لیبیڈیو: ۔ (ہنستے ہوئے) ہاں ہاں خوب خبر لو ان لوگوں کی۔

ساشا: ۔ آئیے میں کہتی ہوں میری ہی خاطر کچھ کیجئے۔ اگر آپ ہنسنا، ناچنا یا گانا نہیں چاہتے۔ اگر ان باتوں سے طبیعت گھبراتی ہے تو میں درخواست کرتی ہوں، التجا کرتی ہوں۔ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ تو۔ محض عجوبہ کے طور پر کچھ ایسا کیجئے کہ ہم لوگ متحیر ہو جائیں یا ہمارا دل بہل جائے۔ کوشش تو کیجئے۔ سب ملکر شاندار پُر لطف بات سوچئے۔ کچھ بات ہی کیجئے بلا سے بازاری ہی کیوں نہ ہو لیکن دل خوش کن اور نئی ہونی چاہئے ایا سب مل کر کچھ ایسا کام کیجئے، چھوٹا ہی سا سہی، کہ یہ نوجوان لڑکیاں زندگی میں ایک مرتبہ تو آپ کو دیکھ کر (واہ) چلّا اُٹھیں۔ آپ آپ ہم لوگوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں، چاہتے ہیں یا نہیں؟ تو کیوں خوش کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ لیکن بات یہ ہے کہ آپ لوگ کسی کام کے نہیں۔ آپ میں سے کوئی بھی کسی کام کا نہیں ...... اس فضا میں تو مکھیاں بھی مارے اکتاہٹ کے مر جائیں اور آپ کو دیکھ کر شمع سے بھی دھواں اُٹھنے لگے ...... آپ لوگ بالکل کسی مصرف کے نہیں، کوئی بھی نہیں ...... میں پہلے بھی ہزاروں مرتبہ آپ سے کہہ چکی ہوں اور ہمیشہ کہتی رہوں گی۔

(آیوانوف اور شیبلسکی داخل ہوتے ہیں)

شیبلسکی: ۔ (آیوانوف کے ساتھ داہنے دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے) یہاں وعظ کون صاحب فرما رہے تھے؟ تم تھیں ساشا؟ (ہنستا ہے اور اس سے ہاتھ ملاتا ہے) خوش رہو خوش رہو میری فرشتہ۔ خدا کرے تم عمر خضر پاؤ اور مر کر پھر نہ پیدا ہو......

زنیدہ: ۔ (خوش ہو کر) نکولائی الیگزیوچ! اکاؤنٹ!

لیبیڈیو: ۔ ارے، یہ میں کس کو دیکھ رہا ہوں ...... کاؤنٹ (اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھتا ہے)۔

شیبلسکی: ۔ (زنیدہ سوشنا اور ما دام بباکن کو دیکھ کر ان کی طرف ہاتھ

بڑھاتا ہے) ایک صوفے پر دو سونے کی چڑیا . . . .
کتنا مسرت بخش منظر ہے (ہاتھ ملاتا ہے، پھر زنیدہ سوشنا کو مخاطب کرتا ہے) تم کیسی ہو زیوشکا ؟ . . . . (مادام مباکن سے) اور تم کیسی ہو پیٹرا ؟

زنیدہ :۔ بڑی خوشی ہوئی کاؤنٹ تم تو بالکل عید کے چاند ہو (چلّا کر کہتی ہے) گیورل چار لاؤ ! آپ لوگ تشریف رکھیں (اُٹھتی ہے، داہنے دروازہ سے باہر جاتی ہے پھر فوراً لوٹ آتی ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے کسی سوچ میں ہے، ساشا جہاں پہلے بیٹھی تھی وہیں پھر بیٹھ جاتی ہے۔ آیوانوف خاموشی کے ساتھ سبھوں سے ملتا ہے)

لیبیڈیو :۔ یہ تم کہاں سے نازل ہو گئے ؟ کیسے کیسے راستہ بھول گئے ؟ میں تو حیرت میں پڑ گیا ! (اس کو بوسہ دیتا ہے) کاؤنٹ تم نہایت ہی شریر ہو شریفوں کا یہی رویّہ ہوتا ہے ؟ (ہاتھ پکڑ کر اس کو روشنی کے پاس لے جاتا ہے) تم ہمارے یہاں آتے کیوں نہیں ؟ کچھ خفا ہو یا کیا بات ہے ؟

۴ شیبلسکی :۔ میں کیسے آسکتا ہوں ؟ کیا چھڑی پر سوار ہو کر آؤں ؟ میرے پاس اپنی کوئی سواری نہیں اور نکولائی مجھے اپنے ساتھ لانا نہیں چاہتا، وہ کہتا ہے کہ میں سارہ کے پاس رہا کروں تاکہ وہ تنہائی محسوس کرے اپنے گھوڑے بھیج دیا کرو تو آجایا کرونگا . . . .

لیبیڈیو :۔ (ہاتھ ہلا کر) ارے بھئی، میں گھوڑوں کو ہاتھ بھی لگاؤں تو زیوشکا مجھ پر برس پڑے گی۔ میرے پیارے دوست ڈارلنگ تم جانتے ہو کہ تم میرے عزیز ترین اور قریب ترین دوست ہو، پرانے لوگوں میں صرف ہم اور تم بچ گئے ہیں، تمہیں دیکھ کر میں اپنے ماضی کے آلام سے محبّت کرنے لگتا ہوں اور مجھے اپنی خوبصورت جوانی یاد آجاتی ہے جسے میں نے بے پروائی سے لٹا دیا . . . .
مذاق نہیں کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ خوب روؤں (کاؤنٹ کو پیار کرتا ہے)

شیبلسکی :۔ چھوڑو، چھوڑو، تم شراب کی الماری کی طرح مہک رہے ہو . . . . .

لیبیڈیو :۔ میرے بھائی۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں اپنے پرانے دوستوں کو کتنا یاد کرتا ہوں۔ میں تو اتنا پریشان ہوں جی چاہتا ہے پھانسی لگا لوں (دھیمی آواز میں) زیوشکا نے روپیہ بٹورنے کے جنون میں تمام اچھے لوگوں کو بھڑکا دیا ہے، دیکھ لو سوائے زولو کے کوئی بھی دلچسپ آدمی نہیں رہا . . . . . بس صرف ڈڈکن بڈکن رہ گئے ہیں . . . . . آؤ چار پیو۔
(گیورل شیبلسکی کے لئے چار لاتا ہے)

زنیدہ :۔ (بے چین انداز میں گیورل سے) تم کیا کر رہے ہو ؟ جام لے آؤ یا اور کوئی چیز . . . . . .

شیبلسکی :۔ (ہنس کر آیوانوف سے) دیکھو میں نے تم سے کہا تھا نہ ؟ (لیبیڈیو سے) میں نے راستہ میں شرط کی تھی کہ جیسے ہی ہم یہاں پہنچینگے، زیوشکا جام سے ہم لوگوں کی خاطر کریگی۔

زنیدہ :۔ کاؤنٹ ابھی تک تمہاری مذاق کی عادت نہ گئی (بیٹھ جاتی ہے)

لیبیڈیو :۔ انہوں نے دو درجن جام بنوائے ہیں، آخر اسکی کھپت کیسے ہو ؟

شیبلسکی :۔ (میز کے قریب بیٹھتے ہوئے) تم خوب روپیہ جمع کر رہی ہو زیوشکا کیوں ؟ میرا خیال ہے اب تک لکھ پتی ہو چکی ہو گی۔ ہے نا ؟

زنیدہ :۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) ہاں، باہر والے یہی سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ روپیہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ آخر روپیہ ہم لوگوں کے پاس آیا کہاں سے ؟ یہ سب صرف گپ ہے . . .

شیبلسکی :۔ رہنے بھی دو، ہم لوگ سب جانتے ہیں . . . . . خوب جانتے ہیں کہ یہ کھیل تم کتنی خوبی سے کھیلتی ہو۔ (لیبیڈیو سے) پاشا تم سچ بتاؤ، دس لاکھ جمع کر لئے ہیں یا نہیں ؟

لیبیڈیو :۔ مجھے کچھ نہیں معلوم، زیوشکا سے پوچھو . . . . . .

شیبلسکی :۔ (مادام بباکن سے) اور ہماری چھوٹی موٹی بیٹرہ کے پاس بھی جلد ہی دس لاکھ جمع ہو جائینگے۔ اس کا جسم تو روز بروز کیا ہر ہر گھنٹہ گداز اور خوبصورت ہوتا جا رہا ہے، یہ خاص دولتمندی کی علامت ہے . . . . .

مادام بباکن :۔ میں جناب والا کی نہایت ہی ممنون ہوں لیکن مجھے اس کا شوق نہیں کہ میرا مذاق اُڑایا جائے۔

شیبلسکی :۔ میری پیاری سونے کی گڑیا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارا مذاق اُڑا رہا ہوں۔ یہ تو میرے دل کی آواز تھی، دل کی سیری ہی سے زبان کھلتی ہے . . . . . تم سے اور زیوشکا سے مجھے جتنی

محبّت ہے اس کی کوئی انتہا نہیں (پر سرور لہجے میں) تم میں سے
کسی کو دیکھتا ہوں تو ایک بے پناہ مسرت، ایک خاص انبساط
محسوس کرتا ہوں۔ دل ایک خاص کیفیت سے متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہتا۔

زنیدہ: ۔ ابھی تک تم بالکل پہلے ہی جیسے ہو۔ (گیورشکا سے) گیورشکا روشنی
بجھا دو۔ کھیل نہیں ہو رہا ہے؟ (گیورشکا اُٹھ کر روشنی بجھاتا ہے
اور پھر بیٹھ جاتا ہے (آیوانوف کو مخاطب کر کے) نکولائی الیکزیوچ
تمہاری بیوی کیسی ہیں؟

آیوانوف: ۔ بہت بیمار ہیں، آج ڈاکٹر نے کہدیا کہ ان کو یقینی تپ دق ہے

زنیدہ: ۔ واقعی؟ بڑا افسوس ہے۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) ہم سب انہیں بہت
چاہتے ہیں۔

شیبلسکی: مہمل، مہمل، بالکل مہمل ..... اس کو دق وق کچھ بھی نہیں
یہ سب نیم حکیمی ہے۔ ڈاکٹروں کی چال ہے۔ یہ حضرت اس مکان
کا چکر لگاتے رہنا چاہتے ہیں اس لئے دق تشخیص کی ہے۔ خوش
قسمتی سے شوہر صاحب میں رقابت نہیں (آیوانوف ایسی حرکت
کرتا ہے جس سے بے صبری ظاہر ہوتی ہے) اور جہاں تک
سارہ کا تعلق ہے میں اس کی کسی بات، کسی بات پر بھروسہ نہیں
کرتا، میں نے زندگی میں کبھی ڈاکٹروں، وکیلوں اور عورتوں کا
اعتبار نہیں کیا، یہ سب مہمل ہے، نیم حکیمی اور چالبازی

لیبیڈیو: ۔ (شیبلسکی سے) تم عجیب آدمی ہو ماتوئی ..... تم نے دُنیا جہان
سے نفرت کرنے کا بناوٹی طریقہ اختیار کیا ہے اور اس کی اس طرح
نمائش کرتے ہو جیسے ایک احمق نئی ٹوپی کی۔ تم بھی دوسروں کی
طرح ایک انسان ہو لیکن باتوں میں ایسے چڑچڑے ہو جیسے تمہاری زبان
میں کوئی آبلہ ہو، یا تمہیں بدہضمی کی شکایت ہو گئی ہو

شیبلسکی: ۔ کیوں کیا تم چاہتے ہو کہ میں لچّوں اور بدمعاشوں کو پیار کرتا
پھروں یا کیا؟

لیبیڈیو: ۔ تم نے لچّے اور بدمعاش کہاں دیکھے؟

شیبلسکی: ۔ یہاں جو لوگ موجود ہیں ان کی طرف میرا اشارہ نہیں ہے
مگر .....

لیبیڈیو: ۔ پھر تم نے اگر مگر شروع کیا ..... یہ سب مکاری ہے۔

شیبلسکی: ۔ مکاری؟ ..... بہت اچھا ہے کہ تمہاری زندگی کا کوئی اصول نہیں

لیبیڈیو: ۔ میری زندگی کا اصول کیا ہو سکتا ہے۔ بیٹھا ہوا ہر لمحہ پیمانۂ حیات کے
لبریز ہونے کا انتظار کیا کرتا ہوں۔ یہی میری زندگی کا اصول ہے
بڑے میاں ہمارے اور تمہارے لئے زندگی کے اصول کا تذکرہ
کرنے کا وقت نہیں، وہ زمانہ گزر چکا۔ جی ہاں (چلّا کر پکارتا
ہے) گیورل!

شیبلسکی: ۔ کیا بار بار گیورل کو پکارتے ہو .... ابھی سے تمہاری ناک
چقندر کی جڑ کی طرح سُرخ ہو رہی ہے۔

لیبیڈیو: ۔ (پیتا ہے) کچھ پرواہ نہیں، پیارے دوست ..... آج کچھ
میرا بیاہ تو ہے نہیں

زنیدہ: ۔ بہت دنوں سے ڈاکٹر لوو ہم لوگوں سے ملنے نہیں آئے
انہوں نے ہم لوگوں کو بالکل چھوڑ دیا۔

ساشا: ۔ مجھے للّٰہی بغض ہے اس شخص سے۔ ایمانداری کا چلتا پھرتا مجسمہ
وہ ایک گلاس پانی یا ایک سگریٹ بھی اپنی غیر معمولی ایمانداری کی
نمائش کئے بغیر نہیں پی سکتا۔ جب وہ چلتا ہے باتیں کرتا ہے تو بھی
اسکے چہرے پر لیبل لگا رہتا ہے کہ "میں ایماندار آدمی ہوں" مجھے
سخت کوفت ہوتی ہے۔

شیبلسکی: ۔ وہ بڑا ضدی اور تنگ نظر آدمی ہے (نقل کرتے ہوئے) ایمانداری
کی محنت کیلئے راستہ خالی کر دو۔ کوّے کی طرح ہر قدم پر چلّاتا ہے
اور سمجھتا ہے کہ وہ ڈوبرکیوبو ثانی ہے۔ اسکے خیالات بھی
حیرت انگیز ہیں۔ اگر کوئی کسان ذرا خوش حال ہے اور آدمی
کی طرح رہتا ہے تو بس وہ بدمعاش اور خون چوسنے والا ہو گیا
میں نے کسی دن مخمل کا جیکٹ پہن لیا اور نوکر نے مجھے کپڑے
پہنا دئے بس میں بدمعاش اور غلام رکھنے والا ہو گیا۔ وہ مارے
ایمانداری کے پھٹا پڑتا ہے۔ آپ کے معیار پر کوئی چیز پوری نہیں
اُترتی۔ مجھے تو واقعی اس سے ڈر لگتا ہے ..... ہاں ہاں
نہیں معلوم کس وقت ایک طمانچہ لگا دے۔ یا احساس فرض میں
گالی دے بیٹھے

۴۳

آیوانوف: ۔میں بھی اس سے بہت تنگ رہتا ہوں لیکن ساتھ ہی میں اسے پسند بھی کرتا ہوں۔آدمی نہایت مخلص ہے ۔

شیبلسکی: ۔جی ہاں ۔کیا اخلاص ہے! کل میرے پاس آیا اور بلا وجہ کہنے لگا "کاؤنٹ تم مجھے بہت مکروہ معلوم ہوتے ہو" بڑا احسان فرمایا جناب نے ۔ اور یہ سب حرکتیں کچھ یونہی نہیں کرتا بلکہ اصول کی خاطر۔ اسکی آواز میں لرزش ہوتی ہے ۔آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور سر سے پیر تک کانپنے لگتا ہے...... خدا غارت کرے ایسے خشک اخلاص مجھ سے نفرت کرتا ہے کرے۔ کوفت ہوتی ہے ہو۔ یہ قدرتی بات ہے میں اسے سمجھ سکتا ہوں لیکن رو در رو مجھ سے ایسا کہنے کی کیا ضرورت ہے ۔میں ایک تباہ حال انسان ہوں۔ پھر بھی میرے بال سفید ہو چکے ہیں...... یہ ایمانداری کیا ہے حماقت اور بیرحمی ہے!

لیبیڈیو: ۔جانے دو بھئی جانے دو ...... تم بھی کبھی جوان تھے اور نوجوانوں کی حماقتوں کو در گذر کر سکتے ہو

شیبلسکی: ۔ہاں میں بھی جوان اور احمق رہ چکا ہوں میں بھی اپنے دنوں میں شاتسکی بنا پھرتا تھا۔میں نے بھی بدمعاشوں اور لچوں کو برا بھلا کہا ہے لیکن زندگی میں کبھی کسی چور کو اسکے منہ پر چور نہیں کہا ہے نہ پھانسی پائے ہوئے شخص کے مکان میں کبھی پھانسی کے تختے کا ذکر کیا۔میری تربیت اچھی ہوئی تھی۔لیکن آپ کے کوڑھ مغز ڈاکٹر صاحب تو ایسے ہیں کہ اگر قسمت سے ان کو اپنے اصول اور انسانیت کے مقاصدِ اعلیٰ کی خاطر سر بازار میرے منہ پر ایک چانٹا یا پیٹ میں ایک گھونسہ مارنے کا موقع مل جائے تو خوشی کے مارے ساتویں آسمان پر پہنچ جائینگے اور سمجھینگے کہ اپنی زندگی کا مشن پورا کر رہے ہیں

لیبیڈیو: ۔نوجوان ہمیشہ اپنی قابلیت جتاتے ہیں ۔میرے ایک چچا تھے ہیگل کے ہیرو...... وہ اپنے ہاں ایک جمِ غفیر کی دعوت کرتے۔انکے ساتھ شراب پیتے اور پھر کرسی پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کرتے "تم لوگ جاہل ہو، تاریکی کے ستون ہو، نئی زندگی کی کرنیں پھوٹنے والی ہیں وغیرہ وغیرہ..... اس طرح بکے جاتے ۔

ساشا: ۔اور مہمان کیا کرتے تھے ؟

لیبیڈیو: ۔اوہ کچھ نہیں ...... بیٹھے سنتے رہتے اور شراب پیتے۔ البتہ میں نے ایک مرتبہ ان کو ڈوئیل لڑنے کا چیلنج دیا..... اپنے چچا کو۔ جھگڑا بیکن کے بارے میں تھا۔جہانتک مجھے یاد ہے میں ماتوی کی جگہ پر بیٹھا تھا اور چچا اور گراش نیلیچ گویا اسی جگہ کھڑے تھے جہاں اس وقت نکولائی ہے........ گراش نیلیچ نے ایک سوال کیا......

(بورکن بھڑکیلا لباس پہنے ہاتھ میں ایک پارسل لئے دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے گنگناتا اور پھسلتا جاتا ہے ...... خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے)

نوجوان خواتین: ۔ مائیبل مائیسلیچ ۔

لیبیڈیو: ۔مائیبل مائیسلیچ! میرے کان کہتے ہیں.....

شیبلسکی: ۔مجمع کی روح ۔

بورکن: ۔میں حاضر ہوں! (دوڑ کر ساشا کی طرف جاتا ہے) محترم خاتون! میں کائنات کو آپ کے جیسے شاندار پھول کی پیدائش پر مبارکباد دینے کی جرأت کرتا ہوں۔خدا کرے کہ وہ تاریک رات کو اسی طرح روشن کر دیں جس طرح آپ تاریکی کی سلطنت کو روشن کر رہی ہیں۔

(ڈرامائی طور پر جھکتا ہے)

ساشا: ۔ شکریہ.......

لیبیڈیو: ۔ (آیوانوف) تم اس یہودن سے اپنا پیچھا کیوں نہیں چھڑاتے؟

بورکن: ۔ (لیبیڈیو سے) پاویل کبریلیچ کی خدمت میں تسلیمات! (آیوانوف سے) اپنے سرپرست کی خدمت میں بھی! (گاتا ہے اور مجمع کے چاروں طرف چکر لگاتا ہے) معزز ترین زنیدہ سوشنا کی خدمت میں بھی! فرشتہ خصلت مارفا یگوروونا...... قدیم ترین ہستی اودوتیا نذروونا...... مقتدر کاؤنٹ.......

شیبلسکی: ۔ (ہنستا ہے) مجمع کی روح...... جہاں کہیں پہنچتا ہے فضا ہلکی ہو جاتی ہے ۔تم نے غور کیا ہے ؟

بورکن: ۔اف میں تھک گیا...... میں سمجھتا ہوں میں تمام لوگوں کی خدمت میں تسلیمات عرض کر چکا ہوں۔ اچھا تو کیا چیز ہے خواتین و حضرات؟ ہماری طبیعتوں کو ابھارنے والی کوئی خاص بات نہیں؟ (تیزی کے ساتھ زنیدہ سوشنا کو مخاطب کرتا ہے) سنیئے تو ماما..... آتے ہوئے

راستہ میں..... (گیورل سے) جائیے لاؤ گیورل لیکن کوئے کا جام نہ لانا۔ (زنیدہ سے) ہاں تو آتے ہوئے راستہ میں میں نے کچھ کسانوں کو دریا پہ آپ کے سرکنڈہ کی چھڑیاں توڑتے ہوئے دیکھا اسے بیچ کیوں نہیں دیتیں؟

لیبیڈیو: ۔ آیوانوف سے) کیوں نہیں تم اس بیودن سے نجات حاصل کرتے؟

زنیدہ: ۔ (بھونچکی ہوکر) ٹھیک تو مجھے ضرور یہی کرنا چاہئے کبھی خیال ہی نہیں کیا

بورکن: ۔ (بازوؤں کی ورزش کرتا ہے) ورزش کے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔ ..... ماما میں کونسا کام کروں جو غیر معمولی ہو؟ مارفا یگور وونا میں آج ہوں ذرا سرور میں۔ جوش سے بے قابو (گاتا ہے)

پھر ترے سامنے میں حاضر ہوں ......

زنیدہ: ۔ کچھ کرو کیونکہ ہم سب اداس ہیں۔

بورکن: ۔ واقعی؟ کیوں آپ لوگ اتنے دل برداشتہ کیوں ہیں؟ اس طرح بیٹھے ہیں جس طرح اراکین جوری...... چلئے کچھ کیا جائے۔ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ تاش۔ کبڈی۔ آنکھ مچولی۔ رقص یا آتشبازی؟

نوجوان خواتین: ۔ (تالیاں بجاکر) آتشبازی، آتشبازی (دوڑ کر باغ میں جاتی ہیں)۔

ساشا: ۔ (آیوانوف سے) اس وقت آپ اتنے سست کیوں ہیں؟

آیوانوف: ۔ سر میں درد ہے ساشا اور کوفت ہو رہی ہے

ساشا: ۔ ملاقات کے کمرے میں آئیے۔ (وہ دونوں دائیں دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ دوسرے تمام لوگ باغ میں چلے جاتے ہیں سوائے زنیدہ سوشنا اور لیبیڈیو کے)

زنیدہ: ۔ ہاں یہ ہے ایک نوجوان۔ آئے ہوئے ایک منٹ بھی نہ گزرا کہ سبھوں کو خوش کر دیا (بڑا لیمپ بجھا دیتی ہے) سب لوگ باغ میں چلے گئے تو بیکار موم بتیاں ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ (بتیاں بجھا دیتی ہے)۔

لیبیڈیو: ۔ (اسکے پیچھے پیچھے) زیوشکا مہمانوں کے لئے کھانے کا کچھ انتظام کرنا چاہئے.......

زنیدہ: ۔ کاؤنٹ نے پورا گلاس پیا بھی نہیں بیکار چینی ضائع گئی (بائیں

دروازہ کی طرف جاتی ہے)۔

لیبیڈیو: ۔ خود (باغ میں چلا جاتا ہے)

(آیوانوف اور ساشا داخل ہوتے ہیں)

ساشا: ۔ (دائیں دروازہ سے آیوانوف کے ساتھ آتی ہے) سب لوگ باغ میں چلے گئے۔

آیوانوف: ۔ تو ساشا یہی میرا حال ہے۔ پہلے میں بہت کام کرتا تھا۔ خوب سوچتا تھا اور کبھی نہیں تھکتا تھا۔ اب نہ کوئی کام کرتا ہوں نہ سوچتا ہوں۔ پھر بھی جسم اور روح دونوں تھکے رہتے ہیں میرے ضمیر میں دن رات ایک چبھن سی رہتی ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ قصور سراسر میرا ہی ہے لیکن یہ قصور ہے کیا یہ نہیں جانتا اسپر بیوی کی بیماری، روپیہ پیسہ کی تنگی۔ ہمیشہ کی ڈانٹ ڈپٹ اور طرح طرح کی افواہ، غیر ضروری باتیں۔ وہ بیوقوف بورکن...... گھر کاٹے کھاتا ہے اور وہاں رہنا ایک مصیبت ہے میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میری بیوی مجھ سے محبت کرتی ہے پھر بھی اسکے ساتھ رہنا ناقابل برداشت ہے۔ تم ایک زمانہ سے میری دوست ہو سچ بات کہنے سے خفا نہ ہوگی تمہارے پاس اس خیال سے آیا تھا کہ شاید کچھ سکون میسر ہو۔ لیکن یہاں بھی کوفت ہو رہی ہے اور اب گھر جانے کے لئے بے چین ہوں معاف کرنا چپکے سے نکل جاتا ہوں۔ ۴۵

ساشا: ۔ نکولائی الیکیوچ میں تمہارے دل کی کیفیت اچھی طرح سمجھتی ہوں تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم بالکل تنہا ہو۔ تمہارے ساتھ ایک ایسا آدمی ہونا چاہئے جس سے تم محبت کرتے ہو اور جو تمہیں سمجھے محبت کے علاوہ تمہارا دوسرا علاج نہیں

آیوانوف: ۔ اور بھی کچھ کہہ لو ساشا۔ میرے جیسے پریشان خستہ حال انسان کیلئے نئے سرے سے عشق و محبت شاید دوسرے جنم میں ہو تو ہو۔ خدا مجھے اس عذاب سے بچائے۔ نہیں میری چھوٹی سی عقلمند دوست میری اس حالت کا محبت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایمان سے کہتا ہوں کہ میں ہر چیز برداشت کرسکتا ہوں۔ مصیبت، کمزوری، دیوانگی، بیوی کی جدائی، قبل از وقت بڑھاپا، تنہائی سب کچھ، لیکن اپنے آپ سے

ایشیا، مئی ۱۹۴۲ء

نفرت، یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس خیال سے مارے شرم کے مرجانا چاہتا ہوں کہ میرے جیسا مضبوط اور صحت مند آدمی ایک قسم کے ہیملٹ یا مانفرڈ! ایک فضول سا آدمی اور نہ معلوم کیا۔۔۔۔ ہوکر رہ جائے۔ بہت سے قابلِ رحم لوگ ایسے بھی ہیں جو ہیملٹ یا فضول آدمی کے خطاب پر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن میں اسے ذلیل سمجھتا ہوں۔ میری خودداری کو اس سے ٹھیس لگتی ہے۔ شرم سے پس جاتا ہوں اور بےچین ہو جاتا ہوں۔

ساشا: (آنسوؤں کے درمیان مذاق کرتے ہوئے) آؤ نکولائی ہم لوگ امریکہ بھاگ چلیں۔۔۔۔۔

آیوانوف: میں اس دروازے تک بھی جانے میں کاہلی محسوس کرتا ہوں اور تم امریکہ کی بات کرتی ہو (دونوں باغ کے دروازے تک جاتے ہیں) یہ ٹھیک ہے ساشا کہ تم بھی یہاں عافیت سے نہیں رہتی ہو۔ تم جن لوگوں میں گھری رہتی ہو انہیں دیکھ کر میں اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ ان میں کون ایسا ہے جس سے تم شادی کر سکو۔ صرف یہ امید ہوتی ہے کہ شاید کبھی ادھر سے کوئی فوجی افسر یا طالب علم گزرے اور تم کو بیاہ لے جائے۔۔۔۔۔ (زنیدہ بائیں دروازے سے جام کا برتن لئے آتی ہے)

آیوانوف: معاف کرنا ساشا میں ابھی آتا ہوں۔۔۔۔۔

(ساشا باغ میں چلی جاتی ہے)

آیوانوف: زنیدہ سوشنا میں ایک عنایت کی درخواست کرنے آیا ہوں۔

زنیدہ: کیا بات ہے نکولائی الیکزیوچ؟

آیوانوف: (ہچکچاتا ہے) بات یہ ہے کہ پرسوں آپ کا سود ادا کرنے کا دن ہے۔ بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ تھوڑی مہلت دیدیں یا اجازت دیں کہ سود کو اصل کے ساتھ ملا دوں۔ اس وقت روپیہ بالکل نہیں ہے۔۔۔۔۔

زنیدہ: (خوف زدہ ہوکر) نکولائی الیکزیوچ۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ معاملہ کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ نہیں ایسا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ خدا کے لئے مجھے پریشان نہ کرو، مجھے یوں ہی کافی پریشانیاں ہیں۔۔۔۔۔

آیوانوف: مجھے بڑی ندامت ہے۔ (باغ میں چلا جاتا ہے)

زنیدہ: اُف اس نے مجھے گھبرا دیا۔ میں کانپ رہی ہوں۔ سر سے پیر تک کانپ رہی ہوں۔۔۔۔۔

(دائیں دروازے کی طرف چلی جاتی ہے) (کوسیخ داخل ہوتا ہے)

کوسیخ: (دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے اور اسٹیج کے دوسری طرف جاتا ہے) میرے پاس ایکہ، بادشاہ، بیوی، آٹھ اور ٹھکریاں، حکم کا ایکہ اور صرف ایک۔۔۔۔۔ ایک چھوٹا سا پان تھا اور اس نے چھوٹا سلام بھی نہیں کیا۔ خدا غارت کرے۔۔۔۔۔ (دائیں طرف کے دروازے کی طرف جاتا ہے)

(اودوتیا، نذاروونا، اور پہلا مہمان داخل ہوتے ہیں)

اودوتیا: (باغ کی طرف سے پہلے مہمان کے ساتھ آتے ہوئے) میں چاہتی ہوں اسکے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دوں۔ یہ بھی کوئی مذاق ہے۔ پانچ بجے سے میں یہاں بیٹھی ہوں اور اس نے ایک باسی مچھلی بھی نہیں کھلائی۔۔۔۔۔ یہ بھی کوئی آدمی کا گھر ہے۔۔۔۔۔ یہ کوئی انتظام کا طریقہ ہے۔

پہلا مہمان: مجھے اتنی کوفت ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے جا کر دیوار پر سر دے ماروں۔ یہ بھی عجیب لوگ ہیں۔ خدا ہم لوگوں پر رحم کرے اتنا بھوکا ہوں اور اتنی کوفت ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے بھیڑیے کی طرح چلاؤں اور لوگوں کا منہ نوچنا شروع کر دوں۔

اودوتیا: میں گنہگار تو ہوں ہی۔ بس اسکی بوٹیاں نوچ لوں گی۔

پہلا مہمان: میں تو بڑی بی کچھ پیوں گا اور گھر چلا جاؤں گا۔ مجھے آپ کی ان مہذب نوجوان خواتین کی ضرورت نہیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اب تک جس نے ایک گلاس شراب نہ پی ہو اس کو عشق و محبت کہاں سوجھ سکتا ہے۔

اودوتیا: چلو چل کر کچھ ڈھونڈیں۔۔۔۔۔

پہلا مہمان: شا شا۔ چپکے چپکے۔ میرا خیال ہے کھانے کے کمرے میں جو الماری ہے اس میں ووڈکا ہے، یگورشکا کو پکڑ لائیں۔۔

شا۔شا (دونوں بائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

(اناپیٹروونا اور لوو دائیں دروازے سے آتے ہیں)

اناپیٹروونا: ٹھیک ہے، یہ لوگ ہمیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ ایں یہاں تو

کوئی بھی نہیں۔ ضرور سب باغ میں ہیں۔
تودو: ۔ مجھے حیرت ہے کہ تم مجھے گدھوں کے اس گھونسلے میں کیوں لائیں؟
یہ جگہ میرے اور تمہارے لئے نہیں ہے۔ ایمانداروں کو اس فضا
سے الگ تھلگ رہنا چاہئے

انا پیٹرو ونا: ۔ سنئے جناب ایماندار صاحب۔ یہ کوئی تہذیب نہیں ہے کہ
آپ ایک خاتون کو اپنے ساتھ لائیں اور راستہ بھر ایمانداری کے
علاوہ کوئی دوسری بات نہ کریں۔ ممکن ہے ایمانداری کا طریقہ یہی
ہو لیکن کم از کم بہت اُکتا دینے والا ہے۔ عورتوں سے اپنی
خوبیوں کا کبھی آپ کو تذکرہ نہ کرنا چاہئے۔ وہ خود دیکھ لیں گی
جب میرا نکولائی تمہاری عمر کا تھا تو عورتوں کی صحبت میں سوائے
گانے اور قصہ کہنے کے کوئی دوسرا کام نہ کرتا۔ پھر بھی سب جانتے
تھے کہ وہ کن خوبیوں کا مالک ہے

تودو: ۔ آہ مجھ سے اپنے نکولائی کا تذکرہ مت کرو۔ اس کو میں اچھی طرح
سمجھتا ہوں۔

انا پیٹرو ونا: ۔ تم آدمی تو اچھے ہو لیکن سمجھتے خاک بھی نہیں۔ چلو باغ میں چلیں
نکولائی نے کبھی ایسے جملے نہیں کہے کہ "میں ایماندار آدمی ہوں
اس فضا میں میرا دم گھٹتا ہے۔ گدھے۔ اُلّو کا گھونسلا، مگرمچھ"
وہ چڑیا خانہ کو ہمیشہ الگ ہی رکھتا۔ غصہ میں بھی میں نے اس کو
یہی کہتے سُنا "آہ آج میں نے کتنی ناانصافی کی" یا "مجھے
اس شخص پر افسوس آرہا ہے" وہ اس قسم کا آدمی تھا اور تم
..... (دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

(اودوتیا نذاروونا اور پہلا مہمان داخل ہوتے ہیں)

پہلا مہمان: ۔ (بائیں دروازے سے اندر آتے ہوئے) کھانے کے کمرے
میں تو نہیں ہے گوشت والی الماری میں کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوگا
یگورشکا کو لانا چاہئے۔ چلو ملاقات کے کمرے میں ہو کر چلیں۔

اودوتیا: ۔ جی چاہتا ہے اسکے ٹکڑے اُڑا دوں۔ (دائیں دروازے سے
باہر چلے جاتے ہیں)۔

(مادام بباکن اور بورکن باغ سے بھاگ آتے ہیں شیبلسکی ان کے
پیچھے پیچھے آتا ہے ہنستا اور ہاتھ ملتا ہوا)

مادام بباکن: ۔ کتنی اُداس فضا ہے (ہنستی ہے) بہت اُداسی ہے۔ یہ
اس طرح بیٹھتے اور چلتے پھرتے ہیں جیسے میخیں نگل لی ہیں۔ اکتاہٹ
سے گھٹ گئی ہوں (ادھر اُدھر پھسلتی ہے) ذرا پیر پھیلاؤں
(بورکن اسکی کمر میں ہاتھ دیکر گالوں کو پیار کرتا ہے)

شیبلسکی: ۔ (ہنستا اور اُنگلی دکھاتا ہے) ستیاناس ہو۔ (کھکارتا ہے)
آخر ....

مادام بباکن: ۔ چھوڑو۔ بے شرم اپنے ہاتھ ہٹاؤ۔ خدا جانے کاؤنٹ کیا
خیال کرے گا۔ ہٹ جاؤ.......

بورکن: ۔ میری روح کی حسرت، میرے دل کی راحت.... (پیار کرتا ہے)
پیاری تین سو روپے مجھے قرض دیدو.....

مادام بباکن: ۔ نہ نہ نہیں۔ نہ نہ نہیں..... جو جی چاہے کہو۔ لیکن
روپیہ کا ذکر نہ کرو۔ نہیں شکریہ نہیں نہیں نہیں۔ وہ ہاتھ ہٹاؤ

شیبلسکی: ۔ (ان کے ارد گرد ٹہلتا پھرتا ہے) چھوٹی سی بیٹو ......
اس میں ایک دلکشی ہے......

بورکن: ۔ (سنجیدگی سے) خیر بہت ہوا آؤ مطلب کی بات کریں یہیں معاملات ۴۷
کو کاروباری آدمی کی طرح سیدھی سیدھی طرح طے کرنا چاہئے
بغیر حیلہ حوالہ کئے مجھ کو ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ ہاں یا نہیں۔
سنو (کاؤنٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے) اُن کو روپیوں کی
ضرورت ہے کم سے کم تین ہزار روپے ہر سال۔ تم کو شوہر کی
ضرورت ہے تم کاؤنٹس ہونا پسند کرو گی؟

شیبلسکی: ۔ عجیب سنکی آدمی ہے.....

بورکن: ۔ تم کاؤنٹس ہونا پسند کرو گی۔ ہاں یا نہیں۔

مادام بباکن: ۔ (اضطراب میں) سوچو تو تم کیا کہہ رہے ہو۔ مشا۔ واہ اور
ایسے معاملے اس طرح ہنسی مذاق میں طے نہیں کئے جاتے...
اگر کاؤنٹ کی خواہش ہے تو وہ خود...... اور میں واقعی
نہیں سمجھتی کہ کیسے ایک لمحہ میں......

بورکن: ۔ رہنے بھی دو بہت ہوا باندھ چکیں، یہ تو معاملہ کی بات ہے...
ہاں یا نہیں۔

شیبلسکی: ۔ (ہنستے اور ہاتھ ملتے ہوئے) ہاں۔ واقعی کیوں؟ ستیاناس ہو

کیوں نہ ایک جرأت رندانہ کروں؟ کیوں! پیٹرہ (مادام بباکن کے
گال پر پیار کرتا ہے) موہنی - دل کی ملکہ

مادام بباکن:۔ ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو ...... تم نے مجھے پریشان کر دیا...
جاؤ چلے جاؤ۔ نہیں نہیں مت جاؤ ......

بورکن:۔ جلدی کرو۔ ہاں یا نہیں۔ ہمارے پاس وقت ضائع کرنے کیلئے
نہیں......

مادام بباکن:۔ کاؤنٹ میری ایک تجویز ہے۔ تم اگر دو تین دن میرے ساتھ
رہو۔ دلچسپی رہے گی۔ میرا گھر اس گھر کی طرح نہیں ہے۔ کل آؤ
..... (بورکن سے) نہیں تم مذاق کر رہے ہو۔ کیوں؟

بورکن:۔ (خفگی میں) گویا ایسے معاملہ میں بھی مذاق کیا جاسکتا ہے!

مادام بباکن:۔ ایک منٹ ٹھہرو ایک منٹ ..... آہ میں بیہوش ہو رہی
ہوں۔ میں بیہوش ہو رہی ہوں۔ کاؤنٹس ..... میں بیہوش
ہو رہی ہوں۔ کاؤنٹس ..... میں بیہوش ہو رہی ہوں....
میں گر پڑوں گی۔ (بورکن اور شپیلسکی ہنستے ہوئے اسکے بازو
۱۴ پکڑ لیتے ہیں اور گال پر پیار کرتے ہوئے دائیں دروازے
سے باہر لیجاتے ہیں)۔

(آیوانوف اور ساشا باغ سے دوڑتے ہوئے اندر آتے ہیں)

آیوانوف:۔ (اپنا سر گھبراہٹ میں پکڑتے ہوئے) یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں
ساشا یہ مت کرو ..... اف مت کرو۔

ساشا:۔ (بے قابو ہو کر) میں تمہاری محبت میں پاگل ہو رہی ہوں....
تمہارے بغیر میری زندگی بے معنی ہے۔ تمہارے بغیر میرے
لئے کوئی خوشی نہیں۔ کوئی مسرت نہیں۔ میرے لئے تم ہی
سب کچھ ہو......

آیوانوف:۔ کیا فائدہ۔ یا خدا .... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ساشا
ایسا مت کرو......

ساشا:۔ بچپن میں میرے دل کی مسرت تم ہی تھے۔ میں تم سے تمہاری روح
سے اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح اپنے سے...... لیکن
اب .... مجھے تم سے عشق ہے نکولائی الیکزیوچ ....
میں تمہارے ساتھ دوسری دنیا میں چلی جاؤں گی۔ تم چاہو گے
تو قبر میں بھی ساتھ چلی جاؤں گی لیکن خدا کے لئے جلدی طے کرو
نہیں تو میرا دم گھٹ جائیگا.....

آیوانوف:۔ (خوشی کا قہقہہ لگاتا ہے) یہ کیا ہوا! تو نئے سرے سے
زندگی شروع کروں ساشا۔ ہاں؟ .... میرے دل کی راحت
(اسکو اپنی طرف کھینچتا ہے) میری جوانی .... میری تازگی ....
(انا پیٹروونا باغ کی طرف سے آتی ہے اور اپنے شوہر اور ساشا
کو دیکھ کر اسکے قدم زمین پر گڑ جاتے ہیں)

آیوانوف:۔ تو ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ ہاں! پھر کام شروع کرنا ہے
(ایک بوسہ۔ بوسہ کے بعد آیوانوف اور ساشا ادھر ادھر نظر
دوڑاتے ہیں اور انا کو دیکھتے ہیں)

آیوانوف:۔ (خوفزدہ ہو کر) سارہ!

پردہ گرتا ہے

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۲ء

رام پرتاب بہادر ایم۔ اے

زرینہ

زرینہ! جس کا یہ نام ہو وہ سوائے خوبصورت ہونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ میرا یہ کامل یقین ہے، صرف نام یاد کرنے سے ایک آدھ کھلی کلی کی خوشبو اور حسن سنگیت بنکر میرے دماغ میں گونجنے لگتا ہے، زرینہ!! پھر مجھے گلے اور رخساروں سے کھیلتے ہوئے اسکے چمکتے ہوئے بُندے یاد آئے، کانوں اور گالوں کے اوپر سے گزرتا ہوا سفید ساڑی کا مخملی کالا چوڑی دار کنارہ اسکے چہرہ کی لامحدود خوبصورتی کو محدود کرتا ہوا میرے شاعرانہ دل و دماغ کو وجد میں لے آتا تھا۔ میں نے وہی ایک چہرہ دیکھا جس میں ناک اوپر سے دھری ہوئی چیز نہیں معلوم ہوئی فقط دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھوٹی ناک اسکے حسن کا ایک نازک تر حصہ تھی اور اس میں وہ ننھی سی شربتی رنگ کی کیل! اب بھی جب میں سوچتا ہوں تو وہ شیشہ کا ٹکڑا میری آنکھوں میں چبھنے لگتا ہے اسکے لب ایسے ملے ہوئے تھے جیسے آپس میں مل جُل کر خاموش باتیں کر رہے ہوں ان ہونٹوں کو کبھی میں نے بناوٹی رنگ کا محتاج نہیں پایا۔ سیاہ چنچل آنکھوں کا اسکے گورے مکھڑے پر ازلی رقص میری سوتی جاگتی روح کو ابدی تماشائی بنائے رہتا تھا۔ زرینہ!!! ہمیشہ مجھے اس لفظ سے کسی کی پتلی نازک کمر کی یاد آتی ہے۔ اور پھر وہ کمر جس پر اس کی غیر محسوس جوانی اٹھکیلیاں کرتی چلتی تھی اسکی لمبی سڈول بانہوں کو دیکھ کر میرے خودغرض دل نے کتنی بار نہیں چاہا کہ بیل کی طرح وہ مجھے لپیٹ لیں۔ زرینہ!!!! اس لفظ سے مجھے ہمیشہ ادھورے افسانے یا ادھورے شعر کا خیال آتا ہے۔

لیکن تھی وہ طوائف، میں اسے طوائف ہی کہونگا کیونکہ اس لفظ میں مجھے واجد علی شاہی شان کی جھلک ملتی ہے۔ قالین کا فرش، مسند، پاندان اور اگالدان۔۔ بیسوا میں اُسے نہیں کہہ سکتا کیونکہ اسے بیسوا کہتے وقت میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میں اسکے ساتھ بے انصافی کر رہا ہوں، اس لفظ میں جو زہر ہے جو آلودگی ہے، جو بدصورتی ہے جو مفلسی ہے وہ زرینہ میں نہیں تھی، زرینہ وکیل چھاپ کی کالی سلیپر پہنتی تھی، وہ بیسواؤں کی طرح چپلیں نہیں پہنتی تھی چپلوں کا خیال کر کے مجھے گاندھی جی کی یاد آتی ہے اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے بیسوائیں اس ملک کی غربت پیروں میں پہنکر چل رہی ہیں، کالی سلیپر کے ساتھ چلی ہوئی وکالت کا خیال آتا ہے، اس طرح کی سلیپر طوائفیں اور کامیاب وکیل پہنتے ہیں۔ زرینہ سر سے پاؤں تک سادگی اور خوبصورتی کا مجسمہ تھی، وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جسے ہر کوئی پڑھ سکتا تھا، زرینہ بکتی تھی اپنے کو بیچتی نہیں تھی۔ بیسوا کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے نفرت ہوتی ہے، زرینہ کو دیکھکر عزت کرنے کی خواہش ہوتی تھی، محبت بڑھتی تھی۔ کیا سُلجھی ہوئی پہیلی تھی وہ جس میں میں اُلجھ گیا!

(۲)

میری اس کی جب پہلی بار ملاقات ہوئی وہ مجھ سے کچھ کم عمر کی تھی، میں بھی زندگی سے انجان تھا۔ یوں بھی طالب علمی کی زندگی میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ دُنیا کے غیر معمولی عیش و مسرت کا حصہ دار ہو سکے۔ لکھنے پڑھنے کی عمر میں جب کبھی ہلکے قسم کے جذبات و خواہشات سر اُٹھاتے ہیں تو انہیں خیالوں اور خوابوں سے سینچکر سُکھا دینا پڑتا ہے وہ ایسی عمر ہوتی ہے جبکہ خاص طور سے کچھ کرنے کو نہ ہوتے ہوئے بھی ہم ضرورت سے زیادہ مصروف رہتے ہیں دُنیا اس وقت تک زندگی کو کھیلنے کے لئے کوئی خاص کھلونے نہیں دیتی جس کے ساتھ ہم مصروف ہو کر کھیلیں، پھر بھی ہم اپنے بچپن کے کھیلوں میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ آغاز شباب چیزوں کے سمجھنے کا وقت ہوتا ہے ہر شخص جو مجھ سے ایک دن پہلے بھی اس دُنیا میں آیا ہو وہ مجھے راستہ بتانے کا حقدار بن جاتا ہے۔ ہر طرف سے ہم پر نصیحتوں کی بارش ہونے لگتی ہے، اگر بچہ سب نصیحتوں کو مان لے تو بوڑھا ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ہر چیز کو اس طرح نہیں سمجھ لیتے جس طرح ہمیں بتایا جاتا ہے۔ مگر دُنیا میں آنکھ کھولتے ہی ہر شخص ہمارے سامنے ہمہ داں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے دُنیا کو ہم ایک عجائب خانہ یا نمائش کی شکل میں پاتے ہیں۔ ہماری پہچان کیلئے

ہر چیز پر کوئی نہ کوئی مہر لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ عام طور سے کٹھل کی مُہر املی پر، مہوے کی آم پر ہے۔ دُنیا ہمیں نصیحتوں کی خُردبین دیتی ہے جسکی مدد سے ہم ہر چیز دیکھ سکیں، ہر شخص میرے لئے زندگی کے راستے پر خطروں سے آگاہ کرنے والا راہنما بن جاتا ہے، اس چیز کو مت چھوؤ، اس سے مت بولو۔ اس سے مت اُلجھو اس سے مت ملو ...... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دُنیا خرابیوں اور بُرائیوں کا ایک ڈھیر سا بنکر رہ جاتی ہے، راستے ہم کو کم ملتے ہیں اور رُکاوٹیں زیادہ روڑوں اور رُکاوٹوں کے سامنے ہم سے سر جھکانے کو کہا جاتا ہے۔

اس طرح جوانی کی صبح کو میں نے دیکھا ہر چیز میرا راستہ روکے کھڑی ہے مگر میرے اندر ایک طاقت تھی جو مجھے آگے بڑھاتی تھی۔ میں خود کو روکنے لگا ایک زبردست کشمکش ہوئی، زندگی جسے میں ایک بہتے ہوئے چشمے کی طرح سادہ اور سہل سمجھتا تھا وہ میرے واسطے ہر قدم پر بندھن ثابت ہونے لگی، لیکن میں اندرونی طاقت سے مغلوب ہوگیا اور ساری رُکاوٹوں، بندھنوں کو توڑ کر زندگی میں گھُس پڑا۔

(۳)

۵۰ اس سے پہلے میں نے سرون کمار، اور سُور داس، ایسے ڈرامے دیکھے تھے اور اسٹیج پر رنگ برنگ کے پردوں کے سامنے مختلف قسم کے مناظر قدرت کے درمیان سُنہری تتلیوں جیسی پریوں کو ناچتے تھرکتے دیکھا تھا اور اپنی عمر کے لحاظ سے اس سے لطف اندوز ہوا تھا، کبھی کبھی اسکول سے لوٹتے وقت تھیٹر کے شامیانے کے باہر کھڑا ہو کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ انگریزی بینڈ کو بجتے سن کر اپنا جی بہلا لیا کرتا تھا، لیکن آج ناٹک دیکھتے وقت کچھ اور ہی قسم کا احساس اور تجربہ ہو رہا تھا۔ اسٹیج پر خوبصورت ہیروئن کو عشق کے طوفان میں گھر کر جو کچھ سہنا اور برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس سے میری پوری ہمدردی ہیروئن کے ساتھ تھی۔ ہمدردی ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی میرا نوجوان دل تو ایسا مست ہو جاتا کہ جی چاہتا تھا ہیروئن کی دُکھ درد کی کہانی ختم کرنے کیلئے خود اپنے کو نثار کر دوں اور اس طرح ہیرو اور ہیروئن کی تمام مشکلات ختم کر دوں۔

میں جس درجہ میں بیٹھا تھا اسی قطار میں دو بہنیں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ناٹک دیکھ رہی تھیں۔ دیکھنے سے وہ بنگالی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی بہن تو عورت زیادہ تھی اور لڑکی کم جس کی وجہ سے وہ میری جوانی کے سپنوں کے نزدیک بھی نہیں آسکتی تھی لیکن اس کے اور اس کی ماں کے درمیان وہ پندرہ سولہ سال کی لڑکی وہ لڑکی تھی جسے دیکھتے ہی میرے بدن میں ایک طرح کی سنسنی دوڑ گئی۔ اُسے ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنا ہی میرا کام رہ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس ہال میں میرے واسطے دو ناٹک ہونے لگے تھے۔ ایک اسٹیج پر اور دوسرا اس لڑکی کے ارد گرد۔ اسے دیکھتے ہی میرے دماغ میں بہت سے سوال اُٹھ کھڑے ہوئے اس کو جاننے اور سمجھنے کیلئے میرے جسم کا ایک ایک تار بے چین ہوگیا — اس چھوٹے سے شہر میں وہ کس بنگالی گھرانے کی ہوسکتی ہے؟ وہ میرے لئے اتنی بیش قیمت ہوگئی تھی کہ میری نظر میں اس شہر میں کوئی ایسا خوش قسمت نہیں ہوسکتا تھا جس کی وہ ہوسکتی تھی۔

یہ معلوم نہیں کہ شہد کی مکھی پہلے پھول پر بیٹھتی ہے یا کانٹے پر لیکن جب سے میں اس سے دلچسپی لینے لگا تھا اسی وقت سے میری آنکھیں اس سے تعلق رکھنے والوں کی جانچ پڑتال کرنے لگی تھیں۔ ہر شخص کو میں شبہے کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس تھوڑے وقت میں اس کے سادہ حُسن کے کنج میں میری معصوم محبت نے جو آشیانہ بنا لیا تھا اس میں میں ایک غریب پرند کی طرح بیٹھا چاروں طرف آنکھیں گھما گھما کر یہی دیکھ رہا تھا کہ خوبصورتی اور محبت کے دو تنکوں کے بنے ہوئے آشیانہ کے بگاڑنے والے وہاں کون کون تھے۔ جب پردہ گرتا تو اُسکے آس پاس مجھے دو غنڈے گلاس میں شربت یا ہاتھ میں پان لئے نظر آتے معلوم نہیں وہ غنڈے تھے یا کیا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میرا دل اس سے واسطہ رکھنے والوں کے بارے میں اچھا نہیں سوچ سکتا تھا۔ میرے واسطے زیادہ پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اُس بے چین فضا میں مجھے ہر کوئی اسی کی طرف دیکھتا ہوا نظر آتا تھا یہاں تک کہ بجلی کا "ٹیبل فین" بھی جو اس کی قطار کے سامنے ہوا دینے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے داہنے بائیں گھومتے ہوئے اس کے سامنے آکر رُکنے لگتا تھا اور مجبوراً وہاں سے ہٹتا تھا۔ جس چیز کی طرف میں اپنے سُکھ اور شانتی کیلئے کھنچ گیا تھا وہ میرے واسطے لامحدود تکلیف اور پریشانی کا سبب بن گئی تھی جسے میں اچھی طرح دیکھ یا جان بھی نہ پایا تھا، وہ یکلخت میری ہوگئی تھی۔ اپنا بنانے کیلئے تو میں کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن اسے دوسروں کے چُنگل سے چُھڑانے کیلئے میری ساری قوت اندر ہی اندر ختم ہوئی جا رہی تھی، اُس اتھاہ سمندر میں امید اور ناامیدی کے اُٹھتے ہوئے جوار بھاٹے میں میرا کمزور دل ڈوبتا اور اُبھرتا رہا۔

ناٹک ختم ہوتے ہی باہر نکلا، برآمدے میں کئی سوکینڈل پاور ( ) کی روشنی میں اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے۔ اسکی آنکھوں سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مجھے غیرارادی طور پر اپنی طرف بُلا رہی ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر میں اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بھیڑ سے نکل کر سونی سڑک پر چلتا ہوا بھی میں اپنے چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا جب بجلی کی روشنی کا کھمبا قریب آتا تو میں ذرا پیچھے رہ جاتا، روشنی میں پہنچ کر وہ مُڑ کر میری طرف دیکھتی تھی، رات کو دو بجے ہونگے، ناٹک نہ دیکھنے والی شہری دُنیا سو گئی تھی، سڑک سونی پڑی تھی۔ وہ پیدل اپنے گھر والوں کے ساتھ چلی جارہی تھی، اسکے ساتھ وہی پان شربت والے آدمی تھے، انہیں دیکھ کر کبھی کبھی میرے دل میں ڈر پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ ارادہ کرکے بھی کہ اگلی گلی سے مُڑ کر گھر چلا جاؤں گا۔ میں اسکے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے اندھیرے راستے میں روشنی دکھا رہی ہے۔ اندھیری گلیوں میں پھر کیسے جاتا ـــــ

چلتے چلتے میں اس محلے میں پہنچ گیا جہاں دن میں جانے کا مجھے خیال تک نہ آسکتا تھا۔ اسکے گھر کے سامنے پہنچ کر میں نے اُسے پہچانا، اب میرے دل میں مطلق شبہ نہیں رہا، اُسے گھر تک پہنچا کر وہ شُہدے لوٹ پڑے انہیں آتے دیکھ کر میری جان نکل گئی، طے نہیں کر پایا کہ کس طرف جاؤں، پریشانی کی حالت میں پاؤں بڑھتے گئے، سیدھا اندھیری گلی میں میں چلتا گیا لیکن آگے جا کر وہ گلی بند ملی، مجبور ہو کر لوٹنا پڑا، اسکے مکان کے سامنے اندھیرا تھا وہ برآمدہ میں کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر اندر چلی گئی۔

اب میں اکیلا تھا۔ اور سوائے ان اندھیری گلیوں کے اور کوئی میرا ساتھی نہیں تھا۔ جدھر سے گیا تھا اسی طرف سے لوٹ رہا تھا کبھی ڈر لگتا تو کبھی اپنے ڈرنے پر غصہ آتا۔ اپنی زبوں حالی پر زبردست دماغی چبھن اور شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں کہاں چلا آیا تھا؟ یہ مجھے ہو کیا گیا تھا؟ مجھے اپنی ذات سے سخت نفرت ہو رہی تھی، ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بڑا بھاری گناہ کرکے لوٹ رہا ہوں، اتنی رات گئے سڑکوں پر صرف میلے کی گاڑیاں چل رہی تھیں۔ ان کے پہیوں کی آواز دور سے کھنچتی ہوئی آتی تھی۔ میں چلتا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے میں ایسا محسوس کرنے لگا جیسے میں خود میلا گاڑی کی طرح سڑک پر ہر طرف بدبو پھیلاتا جا رہا ہوں، کسی طرف سے ایک کُتا دوڑا آیا اور مجھے گھیر گھیر کر بھونکنے لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ مجھے پھٹکار رہا ہے، میں اور شرمندہ ہوا، کُتّے سے جان چھوٹی تو گھر کا خیال ستانے لگا۔ معلوم نہیں نوکر نے بچھونا نکالا ہوگا یا نہیں، امّاں شاید بیٹھی انتظار کر رہی ہوں۔ پھر خیال آیا کہ محلّہ کے کسی آدمی نے مجھے دیکھا تو نہیں، انہیں خیالوں کی بھیڑ میں ڈرتا کانپتا اور افسوس کرتا میں گھر پہنچا، سب سو گئے تھے، دروازہ پر میری چارپائی بچھی تھی، کوٹ اُتار کر سرہانے رکھا۔ صُراحی سے ایک گلاس پانی اُنڈیل کر پیا۔ پھر چارپائی پر بیٹھ کر مُنہ ہاتھ پاؤں دھوئے۔ مسہری گرا کر میں نے اپنے دونوں کان پکڑ کر قسم کھائی، اب ایسی بھول کبھی نہ ہوگی اور گائتری منتر پڑھتا پڑھتا سو گیا۔

(۴)

"مگر میری غریبی کا خیال نہ کرو، زرینہ! میں تمہیں پیار کرتا ہوں" میں نے اسکے ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا، اس نے مسکرا کر اپنی اُنگلیاں چھُڑاتے ہوئے جواب دیا ـــ "لیکن تم نہیں جانتے میں کون ہوں" اس کی بات کاٹتے ہوئے دُکھی آواز میں میں نے کہا ـــ "جانتا ہوں، لیکن مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہو؟ ..... تم میری سب کچھ ہو" یہ کہتے ۵۱
کہتے میرا گلا بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے میں نے اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ایک لمحہ مجھے وہ چُپ چاپ اُداس آنکھوں سے دیکھتی رہی ـــ "تم مجھے بالکل نہیں جانتے، میں محبت کرنے کے لئے نہیں ہوں۔ یہ کہتے ہوئے ناک کی نتھ چھو کر وہ بولی ـــ اسے دیکھتے ہو اس کی قیمت ہے ۵.سو روپے، اب مجھے چھوڑ دو، مجھے جانا ہے" وہ اپنا ہاتھ چھُڑانے لگی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کے نیچے سڑک چل رہی تھی، میں گھٹنوں کے بل زمین پر اسکے پاؤں کے پاس جھُکا ہوا تھا، اسکے دونوں ہاتھ پکڑے حسرت بھری آنکھوں سے دیکھتا ہوا کہنے لگا "میں دونگا ..... سب کچھ دونگا ..... میں سو ہزار روپے دونگا ......" یہ کہتے کہتے میری زبان لڑکھڑائی، اسکے چکنے چکنے پاؤں میرے ہاتھوں میں آگئے تھے، وہ مُسکرانے لگی، اپنے پاؤں چھُڑا کر کھمبے کے پاس کے پُل کی پتھریلی دیوار پر بیٹھ گئی، مجھے بھی اپنے پہلو میں بٹھالیا، تھوڑی دیر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔ "تم کیا کرتے ہو؟" میں نے بتایا "میں پڑھتا ہوں" پھر اس نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگی،

ایک کتّا اسکے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اُسے میں نے زور سے ایک لات مار کر بھگا دیا، اُس کی کمر میں میں نے اپنا بایاں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کا داہنا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پاگل کی طرح بیٹھا سوچ رہا تھا — اس کی کمر زیادہ پتلی ہے یا اس کا ہاتھ زیادہ ملائم ہے، اتنے میں ایک یکّے والا کوئی غزل گاتا ایکہ تیز دوڑاتا ہوا گزرا، ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا، وہ مسرور ہو کر میٹھے راگ میں گنگنانے لگی ——

. . . .

پھر اس نے میرے گالوں کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے مجھے پیار سے چوم لیا، ہونٹ سے ہونٹ ملتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں اس نے مجھے اپنی لمبی لمبی باہوں میں کس لیا۔ میں نے اُس کی کمر زور سے پکڑلی، معلوم نہیں ہم دونوں کب تک اس حالت میں چپ چاپ بیٹھے رہے پھر اسے نیند آنے لگی، میں نے اسے اپنی گود میں اُٹھا کر پُل کی دیوار کے پاس زمین پر سُلا دیا، اسکی خوبصورتی کتنی سُبک تھی! ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر سڑک کے کنارے سو گئے۔

۵۲ زور سے مرغ نے میرے سرہانے بانگ دی، میری آنکھیں کھُل گئیں۔ گھبرا کر میں اُٹھ بیٹھا، میں کہاں ہوں! مسہری سے مُنہ نکالتے ہی دیکھا سُرخ مُرغا ایک مُرغی کو دوڑا رہا تھا۔ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ کیا وہ خواب تھا؟ میں سوچنے لگا۔ جلدی سے چارپائی سے اُٹھ پڑا، سب لوگ جاگ گئے تھے نوکر برآمدہ میں جھاڑو دے رہا تھا، سرہانے اخبار رکھا تھا۔ اُٹھا کر پڑھنے لگا۔

(۵)

سوائے بُڑھیا ماں کے دُنیا میں میرا اور کوئی نہیں تھا۔ پتاجی اپنی کمائی ہوئی دولت چھوڑ کر جوانی ہی میں اپنی حسرتوں کا بوجھ لئے اس دُنیا سے چل بسے تھے، میں ہی اپنی ماں کی بوڑھی آنکھوں کی روشنی تھا۔ ماں ہی کی وجہ سے بچپن میں میں نے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی۔ میری طرف سے بھی ماں کو کبھی دلشکنی نہیں ہوئی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی میں کبھی بُرا نہیں رہا امتحان میں پاس ہونا ہی ماں کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ میری کسی خواہش کو پورا کرنے میں انھوں نے کبھی کچھ اُٹھا نہیں رکھا، انہیں مجھ پر پورا یقین تھا۔ سوائے ان کی محبت کے میری زندگی میں اور کوئی رکاوٹ یا بندش نہیں تھی —

لیکن وہ دن کتنی پریشانی میں کٹ رہے تھے، پاگلوں کی سی میری حالت ہوگئی تھی، کھانا کھاتے وقت وہ مجھ سے اور کھانے کا اصرار کرتے کرتے اُداس ہو جاتیں۔ لیکن میں ان سے ہر طرح محبت کرتے ہوئے بھی انہیں خوش نہیں کرسکتا تھا۔ وجہ یہ تھی میں خود اپنی خوشی کھو بیٹھا تھا۔

دھیرے دھیرے میرا سب ملنا جلنا بھی چھوٹ گیا، گرمی کے دنوں میں زیادہ وقت کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے گزر جاتے۔ کبھی کمرہ کے گرم ماحول سے پریشان ہو اُٹھتا۔

شام ہوئی نہیں کہ میں ندی کی سمت چلا، ندی کے کنارے جی بہلانے کو جاتا اور زیادہ تر اس خیال سے کہ لوٹتے وقت اُس محلّے کی طرف سے آنے کا بہانہ مل جائیگا۔ عموماً سورج ڈوب جانے کے بعد میرا اس کے دروازہ کے سامنے سے گزر ہوتا۔ مکان کے سامنے ہمیشہ کوئی نہ کوئی سواری موٹر یا تانگہ کھڑا ہوتا، روشن کمرہ میں محفل جمی ہوتی جس کے بیچ میں وہ حُسن کی دیوی بنی صدارت کرتی ہوتی، مسند سے لگے ہوئے دوچار اور بڑے آدمی نظر آتے، پان سگریٹ کا دور چل رہا ہوتا۔ کبھی گانے بجانے کی محفل جمی ملتی، میں نالے کے کنارے دیوار سے لگا دیر تک کھڑا رہتا۔ اتنے میں کسی کے مست قہقہے کی آواز آتی اور میں وہاں سے بے چین ہوکر چلنے لگتا۔ اور وہ مجھے اپنی خاموش نگاہوں سے اس طرف آتے دیکھتی۔ مجھے اپنے اوپر جھنجھلاہٹ ہوتی، غصّہ آتا اور نفرت ہوتی، میں تہیّہ کرتا قسم کھاتا کہ اب پھر یہاں نہیں آؤں گا۔

لیکن گھر پہنچنے کے بعد پھر اسکی یاد ستانے لگتی، میں سوچتا وہ مجھے ضرور چاہتی ہے، مجھے کن آنکھوں سے دیکھتی ہے! لیکن اپنی ماں سے مجبور ہے، وہ بُڑھیا چوکھٹ ہی پر پاندان لئے بیٹھی رہتی ہے۔ آخر وہ کرے تو کیا کرے، لیکن وہ مجھے ضرور چاہتی ہے، آخر میرے خواب میں آئی تھی! اسکی باہیں، اُسکی کمر، اسکی اُنگلیاں، اسکے ہونٹ، اس کا گداز و ملائم جسم!! اس نے کس طرح مجھے چوم لیا تھا!!! اور میں طے کر لیتا —— وہ میری ہے۔ چاہے جو ہو میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اسکے جسم کے ہر حصّہ کو کتنے نزدیک سے میں نے دیکھا ہے، چھوا ہے، اُف کیسی پھول سی بنی ہے وہ، میں ان خیالوں سے پاگل ہو جاتا۔ اسے چھونے کیلئے میری

انگلیاں پھر ایک بار رینگنے لگتیں، کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ میرے بازو ٹوٹنے لگتے، جیسے میرے بدن کے کوئی ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتیں، بند کمرہ میں میری روح چیخ اُٹھتی ـــ میں اسکے پاس جاؤں گا! ضرور جاؤں گا!!

(۶)

دوپہر کا وقت تھا۔ جیٹھ تپ رہا تھا۔ لو چل رہی تھی، ننگے سر میں اسکے مکان کے سامنے سے گزرا، دروازے بند ملے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن ذرا اور غور کر کے سُنا تو طبلے اور گانے کی آواز ساتھ ساتھ کہیں سے آرہی تھی۔ بے چین ہوکر جلدی جلدی چلنے لگا۔ اتنے میں میرے کندھے پر کسی نے زور سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں چونک گیا۔ مُڑ کر دیکھا۔ روشن لال! اس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے ہنسکر پوچھا "کہئے جناب! آپ یہاں کہاں؟ بڑے چھپے رستم نکلے"۔ میرے تو ہوش اُڑ چکے تھے، گھبراہٹ میں معلوم نہیں کیا جواب دیا۔ پھر ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اُس چوڑی گلی سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف اونچے اونچے کوٹھے، دھول لئے ہوئے لُو زور سے چل رہی تھی۔ اتنے میں روشن لال ایک دم بے تحاشا بھاگا، ہوا کے ساتھ دھول کا بگولا اُڑتا دیکھ کر میں بھی اُسی طرف بھاگا، جتنا تیز میں بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا، اِدھر اُدھر کے مکانوں کی دیواروں کو دیکھتا جاتا۔ زمین مکانوں کو لئے ہوئے نیچے اوپر ہو رہی تھی، روشن ایک گلی میں گھس گیا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ روشن کھڑا زور زور سے ہانپ رہا تھا، میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا ـــ "بڑے اُلو ہو جی! بھاگے کیوں؟" روشن لال نے دم لیکر ہنستے ہوئے جواب دیا ـــ "ارے یار بال بال بچ گئے، ادھر کی گلی سے میرے خسر آرہے تھے"۔ مجھے بھی ہنسی آگئی ـــ "لیکن تم بھاگے کیوں؟" اس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا ـــ "تمہارا دماغ پھر گیا ہے کیا۔ جانتے نہیں یہ کون محلہ ہے، اگر انہوں نے دیکھ لیا ہوتا تو جوتے پڑتے"۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے میں بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے پوچھا ـــ "اور تم کیوں بھاگے؟" میں نے جواب دیا ـــ بھئی میں نے سمجھا زلزلہ آگیا"۔ روشن تالیاں بجاکر زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں نے بیانِ صفائی دیتے ہوئے کہا "تمہیں ہنسی آرہی ہے۔ یاد نہیں جو زلزلہ میں نہیں بھاگ سکے وہ دیواروں کے نیچے پس گئے"۔ پھر ہم دونوں خوب ہنسے۔ وہ میرے زلزلہ سے ڈر کر بھاگنے پر اور میں اس کے خسر کو اس محلّے میں سوچکر۔

(۷)

میں اچھے یا بُرے راستہ پر چل رہا تھا۔ یہ میں نہیں سوچ سکتا تھا لیکن اپنے کو ہزاروں مرتبہ اس راستہ پر چلنے سے روکا، کس کس کا خیال میرے دماغ میں نہیں آیا۔ شرم نفرت اور ڈر مجھے چوکنے سپاہیوں کی طرح ہمیشہ گھیرے رہتے تھے۔ جس طرف بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھتا مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر چیز مجھ پر ہنس رہی ہے ـــ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ راستہ میں جو بھی مجھے ملتا او رہنسکر میرا خیر مقدم کرتا۔ اسپر مجھے شبہ ہوتا۔ ہو نہ ہو وہ نفرت سے مجھ پر ہنس رہا ہے۔ ہر شخص مجھے اپنا دشمن معلوم ہوتا۔ چنانچہ میں سب سے بچنے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی تو سڑک پر چلتا ہوا میں ایسا محسوس کرنے لگتا جیسے پولیس والا ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے میری گردن پکڑ لینا چاہتا ہے، اپنے کو ہمیشہ مجرم سمجھنے کی میری عادت ہوگئی تھی۔ کبھی یکایک میں اس خیال سے کانپ اُٹھتا۔ دھیرے دھیرے مجھے ہر چیز سے نفرت ہوتی جارہی تھی۔ ہر چیز پر غصہ آتا تھا۔ خیالی دُنیا میں کھویا ہوا میں ہمیشہ اپنے ہی کو خلا میں پاتا ـــ پوری طاقت لگا کر پھاوڑے سے کسی بڑے ستون کو یا کبھی کسی بھاری دیوار کو توڑ

توڑ کر گرا رہا ہوں۔ جب کبھی سوچنے کی کوشش کرتا تو اپنے کو ایک زبردست باغی اور دہشت انگیز کی شکل میں پاتا تھا۔ میری حالت بگڑتی گئی اور میری بوڑھی ماں کی حالت اور بھی پریشان کن ہوتی گئی۔ وہ میری وجہ سے بہت متفکر رہتی تھیں میں کسی حالت میں بھی اپنے بھلے کے واسطے ان کا بُرا نہیں سوچ سکتا تھا لیکن میں کرتا کیا! میں اُن کی خوشی کے لئے اپنا سُکھ اور اطمینان قربان کرسکتا تھا۔ لیکن زرینہ تو میری زندگی میں سُکھ نہیں بلکہ دُکھ کا پیغام لیکر آئی تھی ـــ میں کتنا مجبور تھا! میں اکثر اسے تیاگ دینے کا تہیہ کر لیتا اور کبھی اس سے نجات حاصل کرنے کی قسم کھاتا۔ لیکن میں کیسے تیاگ دیتا اور کس طرح تیاگ دیتا؟ زرینہ میرے واسطے تھی ہی کیا یا اس کے لئے میں کیا تھا۔ میں ان خیالات سے پریشان ہو اُٹھتا، کبھی سوچنے لگتا ـــ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پڑ گیا، لیکن مکھی کی طرح گڑ میں پھنس گیا تھا۔ جتنا زور نکلنے کیلئے لگاتا اتنا ہی پھنستا جاتا۔ کنول کی طرح اس کا سادہ حُسن، اس کی پتلی کمر، اس کی سڈول ملائم بانہیں، پتلی نرم انگلیاں!!! اس نے کن آنکھوں سے مجھے دیکھ کر میرے ہونٹوں کو چوم لیا تھا!! یہ سب سوچتا ہوا، اسے اپنی

گو دیں محسوس کرکے میں پاگل ہو جاتا، کیا یہ سب خواب تھا؟ کیا زرینہ صرف ایک خواب ہے میں پھر سوچنے لگتا۔ لیکن کتنا پُرمعنی خواب! پوری کوشش کرکے میں خواب کو خواب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ خواب نہیں جادو تھا۔ پھر میں سوچنے لگتا ——— وہ میرے بارے میں ضرور سوچتی ہوگی، ورنہ میرے خواب میں کیوں آتی۔ یہ سوچتا ہوا میں اُٹھا اور اسکے مکان کی طرف اُسی حالت میں چل دیا۔

(۸)

اندھیرے میں مکان کی منڈیر کے نیچے کھڑا ہو گیا، بجلی کے پنکھے سے اسکے کمرے کی روشنی کانپ رہی تھی۔ اُستاد کے مست ہاتھوں کے نیچے طبلے کھڑک رہے تھے۔ جوڑی کی کِھن کِھن کِھن جیسے مجھے چڑھا رہی ہو، ایک سارنگی تھی جو میرے دل کے ساتھ رو رہی تھی۔ اور وہ گا رہی تھی،

نا برسو نا برسو،

نا برسو نا برسو،

ساون کے بادرا کارے

میری سوئی ہوئی آتما جاگ اُٹھی۔ جوڑ جوڑ پھڑکنے لگا، آنکھیں اُٹھا کر میں نے آسمان کی سمت دیکھا ——— کہیں بادل نہیں تھے۔ لیکن اسکی آواز میں
کتنی التجا ہے ان سروں کا التماس سُن کر میگھ دوت مان ہی نہیں بلکہ وہ جائینگے۔ اتنے میں اس نے ذرا نیچی آواز میں انترا اُٹھایا،

آئے ہونگے آج ساجن ہمارے

پریت کے مارے تلوارے

سُنتے سُنتے میں بوکھلا اُٹھا۔ کیا تخت پر مسند لگا کر بیٹھے ہوئے موٹے موٹے بدمعاش اسکے ساجن ہیں! میرے دل نے کہا ——— ہرگز نہیں ایک دم جی میں آیا کہ کمرہ میں داخل ہوں اور ان بدمعاشوں کو پیٹ کر وہاں سے نکال دوں اور زرینہ کو لیکر کہیں بھاگ جاؤں۔ میرے قدم بڑھے، برآمدہ کی سیڑھی کے پاس سے کتراتا ہوا میں صحیح راستہ پر پڑ گیا۔

لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہو کر رہے گی، گھر پہنچ کر سیدھا اپنے کمرہ میں گیا۔ پیچھے کمر پر ہاتھ باندھے کچھ دیر کمرہ میں ٹہلتا رہا نوکر کو تیز آواز سے پانی لانے کو کہا۔ پھر ٹہلنے لگا، گلاس میں پانی لئے ماں کمرہ میں داخل ہوئیں، پانی مجھے دیتے ہوئے ایک کرب انگیز نگاہ سے میری طرف دیکھا، ماں کو دیکھ کر میں بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہیں خوش کرنے کے لئے میں نے ہنس کر کہا ——— "اماں، کئی دنوں سے میں تم سے کہنے کو سوچ رہا تھا"۔ ماں نے مجھے تسلّی دیتے ہوئے کہا "کہو بیٹا! کہو، کیا بات ہے؟ آخر کہو گے نہیں تو معلوم کیسے ہوگا"۔ میں بالکل بچّہ بن گیا۔ سر جھکائے ہوئے رو ٹھ کر میں نے کہا "ماں، میں ایک سونے کی گھڑی لوں گا۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے"۔ "اچھّا بیٹا، اچھّا۔ اچھّا۔ اتنی ہی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں کہا؟ میں نے تمہیں کب روکا ہے؟" میں نے دوسری طرف مُنہ پھیر کر کہا ——— میں نے ایک گھڑی دیکھی ہے ——— وہ مجھے پسند ہے۔ گھڑی والا دو سو روپے اس کے مانگتا ہے"۔ ماں حیرت سے تکتی رہ گئیں ——— "بیٹا اتنے دام کی گھڑی لیکر کیا کرو گے؟ کوئی ہلکے ———" مجھے چُپ دیکھ کر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکیں۔ جب میں کچھ نہیں بولا تو انہوں نے اندر جاتے ہوئے کہا:۔ اچھّا اس میں کیا ہے، میں روپے دیتی ہوں، میں نے تمہاری کون سی بات نہیں رکھی"۔ اور وہ نہیں معلوم کیا کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

(۹)

ہائے جوانی دِوانی، تو کیا کچھ نہ کرا لے۔ جیب میں دو سو روپے نقد لئے اور جیب کو ہاتھ سے دابے زرینہ کے مکان کے سامنے گندے نالے کے پُل پر میں اندھیرے میں کھڑا تھا، ہر آدمی کو دیکھ کر چور اُچکّے کا شک ہوتا تھا، کوئی جیب نہ کاٹ لے۔ میں جس کی جوانی خریدنے کے لئے وہاں کھڑا تھا اس کا دروازہ آج بند مِلا۔ برآمدہ اور دروازہ پر خاموشی کا عالم تھا اور اس تاریکی میں سے مایوسی کی لہریں نکل رہی تھیں جو مجھے ٹکرا کر لوٹ جاتیں، لیکن سیلاب کی طرح ہر لہر میرے جسم کے زیادہ حصّہ کو ڈبو دیتی تھی، دھیرے دھیرے پانی میرے گلے تک پہنچ رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کی روح کی طرح میری روح پھڑپھڑانے لگی۔ اتنے میں سامنے کے دروازے کا ایک کواڑ کھلا اور میں امید کے خوف سے بھیگے ہوئے آدمی کی طرح کھڑا کھڑا کانپنے لگا۔ وہ آکر برآمدہ میں کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر ساکت کھڑی رہنے کے بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اندر جاتے ہوئے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک غیر ارادی سکوت سے جس طرح مجرم پھانسی کے تختہ کی طرف بڑھ رہا ہو میں اس کا اشارہ پاکر اسکی طرف جا رہا تھا۔

کمرہ میں داخل ہوتے ہی اس نے چٹخنی چڑھالی، پھر وہ بیچ کے کمرہ سے ہو کر بغل کے کمرہ میں گئی اور بڑے کمرہ میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی، سامنے

کی کرسی پر اُس کا اشارہ پاکر میں بیٹھ گیا۔ اسے سنجیدہ دیکھ کر میری زبان بند ہوگئی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آخرکار کمرہ کی دردناک خاموشی اسی نے توڑی "آپ کیوں روز یہاں تشریف لاتے ہیں؟" یہ سوال سُنتے ہی میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ ہچکچاتے اور ڈرتے ہوئے میں نے کچھ کہنا چاہا، میں نے کچھ کہنا چاہا، "میں آپ کو —" لیکن میری بات اس کی ہلکی ہنسی سے کٹ گئی۔ سر اُٹھا کر وہ سامنے دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں تصویر پر جمی تھیں۔ سر جھکائے میں آنکھیں چرا کر اُسکے گلے تک کا حصّہ دیکھ رہا تھا۔ اس سے کہنے کیلئے میں کتنے رومانی مضامین اپنے دل میں نہیں لکھ لایا تھا لیکن اس وقت زبان کھولے نہ کھلتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کمرہ کی خاموشی سے میں گھبرانے لگا۔ یہاں سے نکالا نہ جاؤں۔ آخر اس طرح وہ کب تک میری خاموشی برداشت کرے گی۔ میں یہی بیٹھا سوچ رہا تھا۔ جب مجھے کچھ کرتے نہ بنا تو میں نے جیب سے گٹھری نکال کر رکھ دی۔ اس نے پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں مجھ سے برابر سوال کر رہی تھیں، آخر یہ کیا ہے، میں نے اس کی ناک کی نتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا "اس کی قیمت دو سو روپے"۔ یہ کہتے ہوئے میرا دل زور سے دھڑکنے لگا اور میں آگے کچھ اور نہ کہہ سکا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گٹھری کھولی، روپے دیکھ کر اُس نے ہنستے ہوئے کہا —

"آپ کو نوٹ نہیں ملے؟" میں بے حد شرمندہ ہوا اور اپنی اُس چھوٹی سمجھ کو کوسنے لگا جس نے زرینہ کو خریدنے کے لئے چاندی کے روپیوں کو کاغذ کے نوٹوں سے زیادہ کارگر سمجھا تھا۔ زرینہ نے شرارت سے میری جیب کی طرف اشارہ کرکے کہا "آپ کے پاس کچھ اور ہے؟" میں نے مجرمانہ انداز سے جیب میں ہاتھ ڈالے کچھ پیسے تھے۔ وہ بھی نکال کر میں نے اسکے سامنے رکھ دئے۔ زرینہ روپے اور پیسے سب ہاتھ میں لیکر بچّوں کی طرح بجانے لگی۔ میں اُسکے سامنے اُلّو بنا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے ساری مایا میری جیب میں ڈال دی اور ریشمی رومال جس میں وہ کائنات بندھی تھی جھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا، اس رومال میں وہ اپنی اُنگلیاں ڈال کر کھیلنے لگی۔ "رومال میرا ہے، روپے میں نے اپنی طرف سے آپ کو مٹھائی کھانے کے لئے دئے۔" اس نے کہا۔

میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے ہوا میں کرسی لگائے بیٹھا ہوں — میں سوچ رہا تھا اب کیا کروں؟ لیکن کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ جی میں آیا اپنی پوری کہانی ایک دم [illegible]ہوں — "لیکن میں آپ سے محبت کرتا ہوں — جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے اپنی خوشی کھو بیٹھا ہوں — اگر آپ مجھے اپنا نہیں بنالینگی تو میں کہیں کا نہیں ہونگا۔"

اسکے ہونٹوں کی سُرخی مُسکرائی اور اسکے بیچین چہرہ پر ہنسی کی ایک لکیر ناچ گئی۔ وہ پھر ایک تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ میں اسکی اوپر اُٹھی پتلیوں کی سفیدی کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسکی آنکھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ میں بھی تصویروں کی طرف دیکھنے لگا۔ دیوار کی لٹکی ہوئی تصویر میں ہوائی جہاز اُڑ رہا تھا سامنے کی سیٹ پر زرینہ پائلٹ کی ٹوپی اور چشمہ لگائے بیٹھی تھی اسکی پیچھے کی سیٹ پر راجسی ٹھاٹھ کے کوئی راجا صاحب بیٹھے تھے، اور ان کے پیچھے دُبلے پتلے سے کوئی صاحب انگریزی لباس میں سجے ہوئے بیٹھے تھے۔

اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "راجہ صاحب اور انکم ٹیکس کے افسر۔ انہوں نے پچھلے تین سال میں مجھے کوئی دس ہزار روپے دئے ہیں۔ میں ان کی مہربانیوں کے ہاتھ بک چکی ہوں، انہیں لوگوں نے میری نتھ اُتاری
۵۵ تھی۔" اچنبھے میں اسکی نتھ کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے شبہ میں کہا "لیکن آپ تو اب بھی —" زرینہ نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ماں کا حکم ہے"۔ ماں کا حکم ہے اور ان لوگوں کو بھی یہ حسین فریب پسند ہے۔" کچھ لمحے ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخرکار میری پریشانی دیکھ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اپنے حُسن کا بوجھ ہتھیلی پر رکھے جانگھ پر جُھکی ہوئی مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا، لیکن میں نے حوصلہ سے جواب دیا "میں آپ سے محبت کرتا ہوں"۔ ناک پر اُنگلی لیجا کر اس نے ہنسکر کہا "تو آپ بھی اسے اُتارنا چاہتے ہیں؟" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ میرے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی۔

میں چُپ چاپ بیٹھا کمرہ کی ہر چیز کو غور سے دیکھتا رہا کس قرینے سے ہر چیز اپنی جگہ سجی ہوئی تھی۔ کتنا ملائم بچھونا تھا اور کتنا بڑا پلنگ اور پلنگ کے سامنے دو گدّے دار کرسیاں رکھی تھیں۔ پھر اسکے بعد تخت تھا جس پر قالین بچھا تھا۔ تخت پر پڑے ہوئے دو مسند آپس میں کچھ مشورہ کر رہے تھے اسی قالین پر ایک طرف اُگالدان بھی رکھا تھا۔ دروازوں پر موتیوں کا جھلملی دار پردہ

پڑا تھا اور دیواروں پر چاروں طرف بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں ۔ پھر میری نظر اس مخصوص تصویر پر پڑی جس میں زرینہ ہوائی جہاز چلا رہی تھی۔ زرینہ کے پیچھے ان دو شریف آدمیوں کو دیکھ کر پہلے مجھے ایک عجیب اُلجھن ہوئی اور پھر ترس آیا۔ پلنگ میں سرہانے کی طرف ایک آئینہ جڑا ہوا تھا۔ ذرا پیچھے کھسک کر آئینہ میں اپنا منہ دیکھنا چاہا۔ آئینہ میں میرا چہرہ چوروں کا سا لگا۔ ایک دم میں نے منہ ہٹا لیا جیسے کوئی میرے کانوں میں گا رہا ہو "کھڑ ملکیا دیکھت درپن میں"۔

زرینہ واپس آکر پھر میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس کی طرف میں نے دیکھا ناک میں نتھ کی بجائے شربتی رنگ کی نگ جڑی ایک کیل تھی۔ زرینہ کا حُسن اس کیل کے جڑاؤ سے کوئی مدھر راگنی الاپ رہا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں پیوست کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "آپ یہی چاہتے تھے نا! لیجئے اب آپ والی ہو گئی۔" یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ اپنی چھوٹی ہتھیلیوں میں لیکر سنجیدگی سے بولی۔ "تو آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں! لیکن میں محبت کے لئے نہیں بنی ہوں آپ پڑھنے لکھنے والے بھلے گھر کے لڑکے ہیں ——— آج تو خیر اماں نہیں ہیں ——— لیکن آپ میرا کہا مانئے ———" میں ایک عجیب ہیجان میں یکبارگی بول اُٹھا۔ "یہ ناممکن ہے، زرینہ یہ مجھ سے نہ ہو گا۔" میرے منہ سے وہ اپنا نام اس بیباکی سے سن کر مسکرائی۔ "یہ ناممکن ہے! اور اگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں؟" میرا سر جھک گیا۔ "اگر آپ کی اسی میں خوشی ہے تو میں آپ کو پیار کرتی ہوں۔ لیکن میں پھر آپ سے کہتی ہوں کہ میں محبت کیلئے نہیں بنی ہوں میں یہاں بکتی ہوں۔" میری نظریں سیدھی اس جہاز پر پڑ گئیں۔ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ "یہاں ہر چیز ایک فریب ہے، ایک جھوٹ ہے، وہ نقلی ہوائی جہاز کی تصویر ہے جس میں میری اور میرے چاہنے والوں کی تصویریں بعد میں شامل کر دی گئی ہیں، ان لوگوں نے سب سے زیادہ میری قیمت دی ہے، میں ان کی ملازم ہوں۔" اس کی باتیں سنتے سنتے میں ایک نامعلوم تشویش میں پڑ گیا۔ میرا چہرہ کمھلا گیا اور اندر زبان سوکھ جانے سے دم گھٹنے لگا۔

"میں نے اُس دن آپ کو تھیٹر کے باہر دیکھا تھا اور اس دن سے لگاتار ادھر آتے جاتے دیکھ رہی ہوں، آپ مجھے چاہتے ہیں لیکن یہاں کی ہر چیز دھوکا ہے، فریب ہے، ہر شخص جو یہاں آتا ہے وہ یہ جانتا ہوا آتا ہے لیکن تم کچھ نہیں جانتے۔" اسکے منہ سے "تم" سن کر میرا دل کھل گیا۔ اسکے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "لیکن اگر اس طرح تم یہاں آتے ہو تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے برباد نہ ہونے دوں گی۔ میں میری کامیابی بغیر تمہاری مدد کے نہیں ہو سکتی۔" اسکی طرف ایک ٹک دیکھتا ہوا میں اسکی باتیں سُنتا رہا۔ "تم جانتے ہو تم نے میرے اندر ایک طوفان اُٹھا دیا ہے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے وہ نہ چاہو گے جس کے لئے دوسرے یہاں آتے ہیں۔ اسکے بدلے میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تم سے وہ سلوک نہ رکھوں گی جس کے لئے میں یہاں دروازہ کھولے بیٹھی ہوں۔ میں تم سے امید کرتی ہوں کہ تم مجھے وہ نہ سمجھو گے جو سمجھ کر دوسرے یہاں آتے ہیں۔ تم سے مجھے جو زندگی کی ایک نئی جھلک ملی ہے اسے قائم رکھنے میں تم میری مدد کرو اور مجھے امید ہے کہ تم مجھ میں وہی پاؤ گے جس کی تصویر دل میں لیکر تم یہاں آئے تھے۔"

میرا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ پلنگ پر اسکے ساتھ لیٹا ہوا میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بادلوں کی سیج پر سوئے ہوئے ہم دونوں آسمان میں اُڑ رہے ہوں۔ میں شروع سے آخر تک اسی کو دیکھ رہا تھا اور وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اتنے میں کوئی باہر سے دروازہ پیٹنے لگا۔ اس نے میری ہمت بندھائی وہ آگے چلی اور میں اسکے پیچھے ہو لیا۔ ڈیوڑھی کی تاریکی میں پہنچ کر اس نے مجھے اپنی باہوں میں کس کر میرے ہونٹھ چوم لئے۔ جس وقت وہ بڑے کمرے کا دروازہ کھول رہی تھی ڈیوڑھی کا ایک پٹ کھول کر میں باہر نکل گیا۔ کوئی صاحب باہر انگریزی کپڑے پہنے سر پر نائٹ کیپ رکھے پتلون میں سے قمیص کا دامن کھینچ کر جلدی جلدی ہوا کر رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے سے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا اس بیچارے کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے وہ دن یاد آیا جب مجھ کو بھی ایک بار اس دروازہ پر پسینہ آنے لگا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا۔ روپیوں کو بکس کی تہ میں رکھا۔ پھر ڈھیرے سے وہ پانچ روپے کی سونے کی گھڑی نکالی۔ اس نقلی گھڑی میں مجھے وقت دیکھتے ہوئے ہنسی آئی۔ گھڑی لیکر اندر گیا۔ ماں کی ضعیف آنکھیں لالٹین کی روشنی میں اصلی سونا دیکھ کر چمکنے لگیں۔ ماں نے کہا۔ "بیٹا اب تو تم نے خرید ہی لی۔ اگر کہو تو میں اسے اپنے پاس رکھ لوں۔ شاید تم سے کھو جائے۔" میں نے اپنی رضامندی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ اور کوئی نہ جاننے پائے ہم نے سونے کی گھڑی خریدی ہے۔ ماں کو میری بات پسند آئی۔ اور ان کو خوش دیکھ کر میں اُداس ہو گیا۔

(۱۰)

انگریزی کی عادت ہے "کسی خواہش کو دبانا نہیں چاہئے"۔ لیکن میرا

تجربہ یہ ہوا کہ اپنی خواہش کے سامنے ایک بار سر جُھکا دینے سے معاملہ حل نہ ہوا۔ میری روح کی یہ پیاس بار بار بُجھ کر بھی نہ بُجھ سکی۔ زرینہ کی تنبیہ پر بھی اسکے یہاں بار بار جانے کو جی کرتا تھا جس طرح شرابی کو جب شراب نہیں میسّر ہوتی تو وہ بھٹی کے دروازے پر جاکر وہاں کی ہوا پی کر مسرور ہو آتا ہے۔ اسی طرح میں زرینہ کے مکان کے گرد چکّر لگا کر اپنا جی بہلا آتا تھا۔

لیکن اس دن پھر دل نے میرے اوپر قابو پالیا۔ شام کا وقت تھا بیچ کے بڑے کمرے میں روشنی نہیں جل رہی تھی۔ میں چُپکے سے اندر جاکر کونے میں کُرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بغل کے کمرہ میں، تخت پر کوئی آدمی ایک موٹے تکیہ پر مُنہ کے بل پڑا ہوا تھا۔ اسکے سامنے ایک گلاس میں شراب رکھی تھی جس میں سوڈے کے بُلبُلے اُٹھ رہے تھے، شراب کی بوتل اور دو سوڈے کی بوتلیں سامنے تھیں۔ گلاس میں برف کا ٹکڑا گل کر چھوٹا ہو گیا تھا۔ اُگالدان کے اوپر پان کی بھدّی پیک پڑی تھی۔ اس آدمی کے بال ماتھے پر بکھرے تھے، مُنہ لال ہو گیا تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ گلاس پر ہاتھ رکھے وہ مُنہ کے بل تکیے پر پڑا تھا۔ میں نے ذرا جُھک کر دیکھا، موتیوں کی جھلملی کے پیچھے زرینہ پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ اسکے ہاتھ میں بھی گلاس تھا اور آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں وہ ٹکٹکی لگائے شرابی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں اپنی آنکھوں سے یہ کیا دیکھ رہا ہوں! زرینہ شرابی!! وہی زرینہ جو میری سیدھی سادی زندگی کی اکیلی رہبر ہے!!! میں بیٹھا سوچتا رہا اور جب سوچ نہ سکا تو صرف دیکھتا رہا۔ شرابی نے خمار سے جاگ کر آنکھیں اُٹھا کر زرینہ کی طرف دیکھا، میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ نہ راجہ صاحب نہ انکم ٹیکس کے افسر۔ پھر آخر یہ تیسرا آدمی کون؟ کیا بہت سے ایسے بدمعاشوں کی گزر زرینہ کے یہاں ہے؟ میں نے پھر سوچنے کی کوشش کی۔ اتنے میں زرینہ اُس کی آنکھوں کا اشارہ پاکر اُٹھی اور بوتل سے شراب اس کے گلاس میں اُنڈیلنے لگی، اسکے ضد کرنے پر تھوڑی شراب اپنے گلاس میں بھی ڈال لی اور پھر اپنی جگہ جاکر بیٹھ گئی۔ شرابی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ زرینہ کو اس نے اپنے پاس بیٹھنے کی دعوت دی اور پھر اپنے گلاس کی شراب زرینہ کے اوپر پھینکنے کے لئے گلاس اُٹھایا، زرینہ ہنستی ہوئی اسکے سرہانے پاس جاکر بیٹھ گئی۔

اب میں صرف زرینہ کو دیکھ سکتا تھا۔ شرابی زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسکی اُنگلیاں توڑ رہا تھا۔ زرینہ ہنستی ہوئی اُنگلیاں چھڑا کر اسکے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی

اتنی ہمدردی شرابی کے ساتھ! اتنی مہربانی اسکے اوپر! میرا احساس زور زور سے میرے کانوں میں چیخ رہا تھا۔ پھٹے ہوئے موٹے گلے سے شرابی بڑبڑا رہا تھا۔

پیئے جا اور پیئے جا

زرینہ نے اس کو اپنے گلے سے گانا بنا دیا۔

بوتل اُٹھا، کاگ اُڑا

شرابی نے گانے کو جاری رکھا،

جتنا پی سکتا ہے پی لے   ارے زندگی میں اور دو دن جی لے

زرینہ نے ایک گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کر دیا اور جھوم جھوم کر گانے لگی

عاقبت کی باتیں جانے کوئی کیا   خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا

شرابی نے ٹٹول کر اپنا بایاں ہاتھ زرینہ کی جانگ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے گلاس خالی کر دیا۔ زرینہ نے جتنی شراب بچ رہی تھی شرابی کے گلاس میں اُنڈیل دی اور جُھک کر خالی بوتلیں تخت کے نیچے رکھنے لگی۔ شرابی نے اسکی جانگھ میں اُنگلیاں گڑاتے ہوئے دوسرے گلاس کو بھی خالی کر کے اُسے تخت پر اُلٹ دیا۔ میں نیم بیہوشی میں شرابی کو اُنگلیاں زرینہ کی جانگھ میں گڑاتے دیکھ رہا تھا۔ میری گرم آہ بول اُٹھی۔ وہی جانگھیں! ۵۷

معلوم نہیں اس حالت میں کب تک پڑا رہا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور اس کا احساس نہیں ہے میں سویا جاگ رہا تھا۔ یکا یک کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور میری آنکھیں کُھل گئیں۔ میرے سامنے زرینہ کھڑی تھی۔ شرابی مُنہ کے بل تخت پر پڑا پڑا سو گیا تھا۔ اور اسکے مُنہ سے سُرخ رال ٹپک کر تکیہ پر بہہ رہی تھی۔ زرینہ کے اشارہ پر میں اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ مجھے کوٹھے پر اپنے کمرہ میں لے گئی۔ وہ اپنی چارپائی پر پڑ گئی۔ تھکا اور اُکسایا میں بھی اسکی بغل میں لیٹا رہا۔ کچھ دیر چُپ چاپ ہم دونوں اسی حالت میں پڑے رہے۔ پھر کوئی کمرہ میں داخل ہوا۔ زرینہ چونک کر اُٹھ بیٹھی، میں نے سر اُٹھا کر دیکھا زرینہ کی بڑی بہن تھی۔ اُلٹے پاؤں کمرہ سے باہر جا رہی تھی۔ زرینہ کچھ سوچتی ہوئی پلنگ پر کچھ دیر پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ میں اپنی جگہ پڑا رہا۔ اتنے میں زرینہ کی ماں کی آواز کمرہ کے باہر سُنائی دی "کیوں زرینہ یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس سوال کے بعد اس کی آواز اور سخت ہو گئی "تیری جیسی کئی زرینہ میں پیدا کر کے بیٹھی ہوں — چلی ہے عشق کرنے! سارے شہر کے لونڈوں کا کیا یہ کوئی ٹھکانا ہے!" زرینہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور میں دھیرے دھیرے کھسک کر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرینہ کی ماں

کی آواز اندر کے برآمدہ میں غائب ہوگئی۔ میری خودی کو بڑی زبردست ٹھیس لگی تھی زرینہ کی آنکھوں کے آگے میری سخت بے عزّتی ہوئی۔ زرینہ کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرہ کے باہر نکلا، نیچے برآمدہ میں پہنچکر اس نے دھیرے سے کہا " جاؤ میں لکھوں گی۔" اور میں چور کی طرح وہاں سے بھاگتا ہوا گھر آرہا تھا۔

(۱۱)

سکنڈ کلاس ڈبّہ میں ہم بیٹھے تھے۔ ان کے اور میرے سوا ڈبّے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میرے ہی برتھ پر وہ دوسری طرف بیٹھی تھیں لیکن داہنے رُخ پر ساری کا پلّہ اس طرح پڑ رہا تھا کہ میں انہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی چلنے پر میرے دل میں جو پہلی خواہش پیدا ہوئی وہ تھی ان کو دیکھنے کی۔ ویسے تو انکی خوبصورتی کی تعریف دُوسروں کے مُنہ سے میں نے بہت کچھ سُنی تھی لیکن آج تو میں اپنی ہی آنکھوں کا اعتبار کرسکتا تھا۔ مجھے اس کا بھی خیال تھا کہ گھر سے جُدا ہونے کا انہیں بڑا رنج ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی ہیں اس لئے ان کا رنج دور کرنے اور اپنے دل کی پیاس بجھانے کی غرض سے میں نے ان کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ رکھنا چاہا۔ حالانکہ سماج نے قانون
58 کی زنجیروں میں باندھ کر انہیں میرے حوالہ کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک انجان عورت پر جس کی صورت سے بھی میں آشنا نہ تھا ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے ڈر لگا۔
ایک مرتبہ ان کو چھونا چاہا لیکن ہاتھ کانپ کر رہ گیا۔ دوبارہ ہمّت کر کے میں نے مُسکراتے ہوئے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ ہی دیا۔ وہ ڈر اور لجّا سے میرے غیر مانوس ہاتھ کے بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا، میں نے انہیں اپنے پاس کھینچنا چاہا۔ لیکن جب کامیابی نہیں ہوئی تو میں نے جُھک کر ان کی ٹھوڑی پکڑ کر شرارت سے کہا۔ " مجھ سے بھی کیا شرم! تم تو اب میری ہو۔" یہ کہتے وقت میں نے اپنی بھوکی اور امیدوں سے بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا! زرینہ! وہی آنکھیں، وہی صورت وہی معصوم ادائیں لیکن زرینہ کی وہ مسکراہٹ نہ تھی! نہیں زرینہ نہیں، یہ میری دھرم پتنی ہیں۔ میرے ضمیر کی آواز آئی۔" میں اپنے شاعر دل کو کوسنے لگا۔ جو ہر پیکر حُسن میں زرینہ کو ڈھونڈھتا تھا۔ میں نے سوچا یہ تو میری بیوی ہے، ہندو گھر کی نئی دُلہن ہے۔ پتی کے سامنے کیسے مسکرا سکتی ہے۔ وہ نیچی نگاہوں سے کسی دوسری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ حسین چہرہ، وہ رنگ کا نکھار، ماتھے کا سیندور، کانوں اور گلے میں جھومتے جھلکتے سونے اور نگوں کے جڑاؤ گہنے! باریک ریشمی ساری میں سے ان کا حُسن جھانک رہا تھا۔ ایسی حسین معصومیّت بھی میں نے کم دیکھی۔

میں پلنگ پر لیٹا ہوا خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے ہوا میں محل بنا رہا تھا اور اس محل میں اپنی نئی بیوی کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن ہر بار اس میں زرینہ ہی نظر آتی، اور میں جھنجھلا کر دھوئیں کے محل کو ہاتھ سے مار کر بار بار بگاڑ دیتا۔ اتنے میں میں نے محسوس کیا میرے سرہانے کوئی کھڑا ہے پلٹ کر میں نے دیکھا۔ میری بیوی چاندی کی طشتری میں پان الائچی لئے کھڑی ہیں میں نے اپنے تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اپنی بھابی کی تاکید کے مطابق گنّی نکالکر طشتری میں رکھ دی۔ زرینہ پھر مجھے یاد آئی۔ جب میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑی ہے تو میں نے دو گلوریاں خود لیکر کھالیں۔ اچانک مجھے اس مسافر کا خیال آیا جسے میں نے ایک بار تھک کر کہیں کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں دباتے دیکھا تھا لیکن میری بیوی کے چہرہ کا رنگ نہیں بدلا۔ انہوں نے طشتری اُٹھا کر میز پر رکھ دی۔ طشتری میں گنّی دیکھ کر کمبخت زرینہ کا خیال مجھے بُری طرح ستانے لگا۔

صبح کے آفتاب کی نرم اور رنگین کرنیں جنگلے سے گزر کر میرے پلنگ پر پڑ رہی تھیں۔ میں چپکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا، سورج کی لمبی لمبی کرنوں کی روشنی میں میری بیوی کی کلائی۔ گلے اور کان کے گہنے دمک رہے تھے۔ وہ ابتک سوئی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ گہنوں اور ساڑی سے لیکر ان کی پیشانی تک کی ہر چیز مجھے زرد دکھائی دے رہی تھی۔ میری آخری شاعرانہ اُمنگیں اصلیت کی دُنیا میں پیلے سونے اور رپہلی صورت سے مس ہو کر خودکشی کر رہی تھیں۔ انکی سانس کی حرکت سے ہار کی کمانی دار تتلیاں کانپ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی کرنوں نے تتلیوں میں جان ڈال دی تھی اور وہ ابھی رنگین کرنوں کے بل کھاتی ہوئی اُڑ جائینگی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کمرہ میں آرہی تھی جس سے میری بیوی کے رخسار پر بکھرے ہوئے بال ہلکے ہلکے اُڑ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا جس تتلی کے کمانی دار پنکھ رات ٹوٹ گئے تھے وہی تتلی بے حس پڑی تھی۔

لیکن میرے لئے شادی بھی اپنے ساتھ راحت نہ لائی۔ میرے دل میں زرینہ کی طرف سے نفرت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی مگر اس کا خیال دل سے نہ جاتا تھا۔ اسکی یاد آتے ہی میرا غصّہ بڑھ جاتا اور میری بیوی جو اب مجھ سے دھیرے دھیرے ہل مل گئی تھیں میرے منٹ منٹ پر احساس کے تغیرات سے ایک قدم آگے بڑھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔

اسی سلسلے میں ایک روز ڈاک کے ذریعہ ایک قیمتی ساری میری بیوی کے واسطے شادی کے تحفہ میں آئی۔ پارسل پر بھیجنے والے کا نام نہیں تھا۔ صرف یہی لکھا تھا "ایک دوست کی طرف سے" میں نے پیسے والوں کو گمنام خیرات کرتے سُنا تھا لیکن یہ گمنام تحفے بھیجنے کا طریقہ اپنی جگہ پر ایک ہی تھا اور مجھے بہت پسند آیا۔ اگرچہ حیرت ہوئی تو اس بات سے کہ وہ گمنام طریقہ سے میری زندگی میں پھر کیوں داخل ہوئی۔

باغوں میں جب پھول کھلنے لگتے ہیں تو بسنت کا چھپ کر آنا بھی سب پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا راز اوروں کو بھی معلوم تھا میں اپنی لاعلمی میں اپنی شادی کو صرف ایک اتفاق یا سانحہ سمجھتا تھا۔ ایک دن صبح کو ٹہل کر واپس ہوا تو دیکھا کہ میز کے پاس کپڑا جلا پڑا ہے، پوچھنے پر بیوی نے غصہ میں بتایا، خود انہوں نے وہ ساری جلادی تھی۔ دو سو روپے کے تحفے کی جلی ہوئی سیاہی نے میری آنکھوں میں جلن پیدا کر دی، ولائتی کپڑے جلائے جانے کے دنوں کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میں سوچنے لگا یہ بھی بائیکاٹ کا کیا قیمتی طریقہ ہے۔ لیکن زرینہ کی بات ان سے کہی کس نے؟ اپنی بھابی کا خیال آیا، میرا دماغ چکرانے لگا۔ ایک دم جی چاہا کہ سامنے جو عورت کھڑی تھی اس کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن وہ میری بیوی تھیں۔

(۱۲)

شہر سے دو میل کی دوری پر اک پارک ہے۔ جب سے دُنیا کے جنجال سے دور جا کر وقت گزارنے کی میری عادت پڑی اسی وقت سے میں اس پارک سے مانوس ہوں، شہر کی بھیڑ بھاڑ اور گندگی سے بہت دور سول لائنس کی امیری کی بو سے ذرا بچکر، دریا سے تھوڑی دور یہ پارک کئی میل کی لمبائی چوڑائی میں پھیلا ہوا تھا۔ میں نے یہی ایک پارک پایا جس میں آدمی عام طور پر بہت کم ملتے تھے۔ اس سے پہلے میں یہاں صبح کے وقت آیا ہوں، شام کو آیا ہوں اور رات کو بھی۔ لیکن اس رات کو نو بجے وہاں ہونا مجھے عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ ہلکی چاندنی پارک کی ہری گھاس اور پھولوں پر سوگئی تھی۔ بڑے بڑے درخت اپنی مبہم خاموشی میں چپ چاپ کھڑے تھے۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، میں راستہ کے کنارے بڑی بڑی گھاس میں جو لوہے کی کرسی رکھی تھی اس پر قریب آدھ گھنٹہ سے چپ چاپ بیٹھا تھا میرے سر کے اوپر سیمر کا ایک بڑا پیڑ کھڑا تھا، ہر دم اسکے بڑے لال لال پھول زمین پر پٹ پٹ گرتے تھے۔ جب کوئی پھول گرتا تو میری نظر اسکی طرف جاتی تھی آسمان سے زمین پر گر کر وہ اپنے زوال کی سُرخ کہانی سُناتا ہی ہوتا کہ اتنے میں دوسرا پھول پٹ سے زمین پر گر پڑتا۔ ہر پھول کے گرنے میں کم سے کم دو آوازیں ہوتیں۔ ایک کسی ڈال سے ٹکرانے کی اور دوسری زمین پر گرنے کی۔ سیمر کے بھاری پھولوں کے گرنے کی منحوس آوازوں میں گھرا ہوا کرسی پر بیٹھا تھا۔

کرسی پر بیٹھا بیٹھا جب میں اپنے خیالوں میں کھو جاتا تو کوئی سیمر کا پھول زمین پر گر کر مجھے جگا دیتا۔ میں سمجھتا زرینہ آگئی۔ کتنی ہی بار اسی جگہ زرینہ مجھ سے ملی تھی۔ جب سے میں نے اسکے گھر جانا چھوڑا تھا وہ مجھ سے یہیں ملتی تھی، آج مجھے اسکی آخری ملاقات یاد آرہی تھی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اُداسی سے مسکرا کر مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس وقت میری شادی کی بات چیت گھر پر ہو رہی تھی۔ اس سے میرے اندر ایک نئی خواہش پیدا ہو گئی تھی، میں اسکے تصوّر سے ناچ اُٹھا۔

زرینہ میری ہو جائیگی۔ میں خوشی سے پھولا ہوا زرینہ سے یہاں ملنے آیا زرینہ کو شام کو کہیں گانے کیلئے جانا تھا۔ وہ اکثر ایسے موقعوں پر مجھ سے یہاں ملنے کا ارادہ کر لیتی تھی۔ زرینہ مجھ سے دور ہی تھی کہ اس کی زری کی ساری کا عکس میری آنکھوں کی پُتلیوں میں جھلکنے لگا۔ زرینہ آکر تھکی ہوئی میری بغل میں اسی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ مجھے باسی پھول جیسا لگا، شادی کی بات سُن کر وہ اُداس ہنسی ہنسنے لگی۔ میں اس بات کو لاکھ طرح سے اُٹھاتا اور ہر طرح سے التجا کرتا تھا لیکن وہ میری بات ٹالتی ہی گئی۔ جب مجھے غصہ آنے لگا تو اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا "شادی کرلو میں بھی بہو دیکھنے آؤں گی۔"

میرا غصہ بڑھنے لگا۔ کرسی سے اُٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر ٹہلنے لگا۔ میں بار بار یہی سوچ رہا تھا۔ اسی نے میری شادی کرائی اور میری .... زندگی برباد کی۔ میرا ماتھا گرم ہو گیا تھا۔ اندر سے بغاوت کا ایک طوفان اُمڈ آرہا تھا۔ ایک بھاری پھول پٹ سے زمین پر گرا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ پھول نہیں تھا۔ زرینہ آرہی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے نزدیک آکر کہا "میں نے کہا آداب عرض"۔ میں نے جواب دیا "آداب عرض"۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا "کہئے خیریت تو ہے، بہت دنوں بعد ملے۔" "آپ کی مہربانی"۔ "کیوں خیریت تو ہے

کچھ روٹھے سے لگ رہے ہو۔ ہو نے کچھ کہا تو نہیں؟" ——— "سب آپ کی مہربانی ہے" ——— "کیوں کیا بات ہے کچھ کہو تو سہی ——— جب سے شادی ہوئی تم ملنے بھی نہیں، خود سوچا چلو آج مل آؤں" ———

"اچھا سوچا میں بھی ملنے ہی والا تھا" ——— "لیکن کچھ کہو تو کیوں ایسی روکھی روکھی باتیں کر رہے ہو؟ میرا جی گھبرا رہا ہے، میں تو خوشی خوشی ملنے آئی سوچا بہت دنوں بعد تم سے ملاقات ہوگی۔ تم سے باتیں کر کے جی بہلاؤں گی اور ایک تم ہو کہ روٹھے بیٹھے ہو" ——— "زرینہ! جو کچھ تم نے کہا میں نے کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں کہیں کا نہ رہا۔ میں ناراض نہیں ہوں، میرا اپنا کون ہے جس سے میں ناراض ہونگا" ——— "کیا ہو سے" ———؟

"ہو ہو مت کرو، اگر تم چاہتی ہو کہ میں یہاں بیٹھا رہوں۔ جب سے ساری جلائی گئی میں نے اس کی شکل . . . ." ——— "ساری جلائی گئی" ——— "جی ہاں۔ وہ ساری جو تم نے بھیجی تھی جل کر خاک ہو چکی۔ لیکن اسے چھوڑو، اس وقت میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے میں خود جلا جا رہا ہوں اور اگر تم مجھ کو اس آگ سے نکالنا چاہتی تو میری مدد کرو"

پریشانی کے عالم میں زرینہ کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے، سر اوپر اٹھائے میری طرف دیکھ رہی تھی" ——— "نہیں تو مجھے تم سے رخصت ہونا پڑیگا"۔ یہ کہکر میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ٹہلنے لگا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی اور کچھ عرصہ تک ہم لوگ خاموش رہے، صرف پھولوں کے گرنے کی آواز ہو رہی تھی۔

زرینہ نے سنجیدگی سے کہا ——— "بیٹھ جاؤ۔ مجھ سے بھول ہوئی جو میں نے تم سے شادی کرنے کے لئے کہا ——— میری بھول تھی کہ اس رات کو تم کو اندھیری سڑک پر سے اپنے مکان میں بلایا اور یہ بھی بھول تھی کہ انہوں نے وہ ساری جلا دی۔ لیکن سب سے بڑی بھول یہ ہے تمہاری جو ان کی شکایت لیکر تم میرے پاس آئے ہو۔ میں کیا کر سکتی ہوں، اگر میں معافی بھی مانگ لوں تو معاملہ حل نہ ہو جائیگا۔ میں نے تمہارے راستہ میں آکر غلطی کی" ——— "یہ مجھے سمجھنے کے لئے چھوڑ دو" ——— "نہیں مجھی کو سمجھنا چاہیئے" ——— "مجھے کیا حق تھا کہ اپنی اچھی یا بری زندگی سے نکل کر تمہاری زندگی کی ہریالی پر تفریح کرنے آئی۔ خوش تھی میں اپنی زندگی میں" ——— "زرینہ! جھوٹ مت بولو۔ تم خوش نہیں تھیں" ——— "یہ تمہیں کیسے معلوم، میں آج سے زیادہ خوش تھی" ——— "اُن شرابیوں اور بدمعاشوں کے ساتھ" ——— "ہاں! لیکن آج دو انسانوں کے رنج کی وجہ بنکر خوش نہیں ہوں، میں گندگی میں رہتی تھی اور وہی میری خوشی تھی۔ بگڑے ہوئے میرے پاس آتے تھے، میں اور بگاڑتی یا بناتی تھی، اسی لئے وہ میرے پاس آتے تھے۔ وہی میری زندگی کی تفریح تھی۔ اسی کیلئے سماج نے ہم کو شہر کے کنارے اس محلے میں بٹھا دیا تھا۔ جن کو دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں کر سکتا، وہ مجھ میں راحت ڈھونڈنے آتے تھے جنکا سنسار میں کوئی نہیں ہوتا وہ مجھے اپنا پاتے۔ میں اس آتی جاتی اور بنتی بگڑتی دنیا میں رہ کر خوش تھی، سُکھی تھی" ——— "شراب پی کر؟" ——— "ہاں شراب پی کر۔ وہی شراب جس سے تمہیں نفرت ہے، وہی شراب جو تم کو میں نے نہیں پلائی، شراب پینا اور اس زندگی میں رہنا مجھے پسند تھا۔ لیکن میرے دل میں ایک ایسا کونا تھا جس کو میں جیت نہ پائی۔ اپنے من کے اسی جھروکے سے میں نے تمہیں دیکھا۔ میں تم پر فریفتہ ہو گئی" ——— "اور میری شادی کرا دی" ——— "وہ میری ہار تھی اور تمہارا شادی کر لینا میری جیت ہے، اپنے آنسوؤں کا ہار تمہارے گلے میں ڈال کر میں نے کہا جاؤ شادی کر لو۔ میرے آنسو ہی میری محبت کی یادگار تھے اپنی خود غرضی پر میں نے تم کو قربان نہیں کیا۔ لیکن تم مجھ سے بہت امیدیں کرنے لگے جس کا نتیجہ ہے کہ آج تم اس طرح مجھے ملامت کر رہے ہو"۔

اس کی باتیں سنتے سنتے میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا "تم سے اپنی زندگی کو سُکھی بنانے کی کوشش کرنا میری بھول تھی۔ میں نہیں سوچ سکتی تھی کہ اس دنیا میں کسی کا سُکھ کم کر کے ہی ہم سُکھی ہو سکتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو"

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "یہ سوچ رہا تھا بہت دیر ہو رہی ہے"

زرینہ ایک دم رُک کر بولی "ہاں چلو چلتی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی تھی اس لئے میں نے تمہارا بُرا نہیں چاہا (پارک کے کسی کونے سے لومڑی کے رونے کی آواز آنے لگی) مجھے امید ہے تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گے (لومڑی زور زور سے رو رہی تھی) ایک شخص دو انسانوں کو آج سُکھی نہیں بنا سکتا وہ چاہے میں ہوں یا تم۔ مجھے امید ہے تم مجھے غلط نہیں سمجھو گے" (ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لومڑی روتی ہوئی میری طرف بڑھتی آرہی تھی) میں چلتے چلتے رُک گیا اور مُڑ کر اس سے کہا "زرینہ! ——— (وہ لومڑی بالکل میرے پیچھے آکر رونے لگی) ——— اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بھول جاؤ جو کچھ ہوا"۔

(۱۳)

سات سال بعد ــــــ

اب میں دو بچوں کا باپ ہوں، کھاتا پیتا آدمی ہوں، اپنے بچوں کو پیار اور بیوی کی عزت کرتا ہوں کسی چیز کی کمی نہیں محسوس کرتا۔ ویسے تو موجودہ زندگی ایسی ہے کہ آج کی دُنیا میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسکے پاس سب کچھ ہے۔

کسی چیز کے بارے میں اُسے الگ کر کے نہیں سوچا جا سکتا ہے۔ ہر چیز دوسری چیزوں کے مقابلہ میں ہم کو چھوٹی یا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ میں اپنے بارے میں بھی اپنے سے بڑوں اور چھوٹوں کو دماغ میں رکھے بغیر کیسے سوچ سکتا ہوں۔ اور اس زمانہ میں تو ہر آدمی کو یہ شکایت ہے کہ اسے زندگی سے اتنا نہیں ملا جتنا وہ سمجھتا ہے اسے ملنا چاہئے تھا اور میں تو خود اسی اعتقاد کے بل پر جیتا ہوں اور مشقت کرتا ہوں کہ کل کی دُنیا میرا احسان مانے گی ــ

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

یہی میرا نظریہ ہے اور یہی میرا فلسفہ۔ یہ دوسری بات ہوئی کہ آئے دن ہماری خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ ہر ایک آج کو منوّر اور کل کی روشنی میں دیکھ کر خود کو تسکین دیتا ہوں۔ اگر دُنیا ہم کو ایسی نہیں ملتی جس طرح کہ ہم نے ایک خیالی تصویر بنا رکھی ہے تو اسکی یہ وجہ ہے کہ شروع ہی سے ہم دو دُنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک وہ دُنیا جس کو میں نے کتابوں میں پڑھا اور جس کی بنا پر دماغ میں ایک نئی دُنیا کے نقش بنائے۔ وہ دُنیا میرے دماغ کی ہے اور دوسری دُنیا میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، لیکن میں اس سے ہراساں نہیں ہوتا کیونکہ میں سوچتا ہوں کہ اسی فرق کی بنا پر انسان کی مسلسل ترقی کا مدار ہے۔

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ نسبتاً میں اپنے کو سُکھی سمجھتا ہوں۔ چھوٹے پیمانے پر میری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، میری ازدواجی زندگی سُکھی ہے اپنے بال بچوں میں اپنے آپ کو خوش پاتا ہوں، اسکے علاوہ مجھ میں اوروں کے مقابلہ میں ایک طرح کی برتری کا احساس بھی ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری جڑیں آم، املی، پیپل یا برگد کے درختوں کی طرح زندگی میں نیچے تک گئی ہیں۔ دوسرے مجھے گملوں میں لگے ہوئے پودوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس ایک دھکا لگا اور وہ اپنے گملوں سمیت زمین پر ڈھلک جائیں گے۔

میں شام کو اپنے برآمدہ میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ سامنے سڑک پر کوئی تانگہ رُکا۔ ایک ادھیڑ عمر کی تندرست بھرے بدن کی عورت سفید ساڑی پہنے تانگہ سے اُترنے لگی۔ اسکے ماتھے پر گھونگھریالے بالوں کے دو گُچھے دونوں طرف لٹکے ہوئے اس عورت کے بیتے ہوئے حُسن کی کہانی سُنا رہے تھے۔ اس نئے محلے میں ہر آدمی راستہ بھولا ہوا آتا ہے۔ میں سوچنے لگا ضرور شریمتی جی کسی کا مکان پوچھنا چاہتی ہیں۔ وہ میرے برآمدہ میں آگئیں حالانکہ میں ان سے واقف نہیں تھا۔ لیکن ان کی نسوانیت کے احترام میں مجھے کرسی چھوڑ کر اُٹھ جانا پڑا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کیا، میں نے بھی غیر ارادی طور پر جواب میں ہاتھ جوڑے۔ وہ مسکرا اٹھیں۔ میرا دل چیخ اُٹھا، یہ کیا! زرینہ!! میں نے اسے پہچانا اور گھبرایا ہوا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے اُنکے ساتھ بڑے کمرے میں آیا۔ فوراً بیوی کا خیال ہوا۔ لیکن وہ ان دنوں اپنے گھر گئی ہوئی تھیں، وہاں بھی مجھے چین نہ ملا۔ ان کے ساتھ ساتھ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میں ایسی قیمتی چیز پا گیا تھا کہ اسے چھپانے کی کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی، جیسے کُتا روٹی کا ٹکڑا پا کر کوئی کونا تاک کر بھاگتا ہے۔

۲۱ اوپر کے کمرہ میں آکر میں نے ان سے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ ریڈیو دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ میں نے پوچھا "آپ ہنسیں کیوں؟"۔ زرینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یوں ہی"۔ میں نے پوچھا "کہیئے آپ مزے میں ہیں"۔ "آپ کی مہربانی" ــــ "اِدھر کیسے آنا ہوا" ــــ "بنارس تک ایک بیڑے کے سلسلے میں آئی تھی۔ سوچا آپ سے بھی مل لوں"۔ میں نے تعجب سے پوچھا ــــ "لیکن میرا پتہ؟" انہوں نے ریڈیو کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولیں۔ "میں نے ریڈیو سُنا تھا"۔ میں تعجب سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ذرا سوچنے پر خیال آیا۔ شرم سے میرا سر جُھک گیا۔ بہت دن ہوئے ریڈیو والوں کو میں نے خط لکھا تھا۔ ریڈیو پروگرام کے بارے میں زرینہ کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے میں نے صلاح دی تھی کہ انہیں اکثر گانے کے واسطے بلایا جائے" ــــ "لیکن وہ چٹھی آپ کو کیسے ملی؟" ــــ چٹھی کا جواب میں نے سُنا تھا" "اچھا میں نے نہیں سُنا" ــــ "جی ہاں، آپ نے بڑی مہربانی کی۔ میرا کئی بار لکھنؤ جانا ہوا، بڑی مدد آپ نے میری ......" میں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا ــــ "جی ہاں میں نے اپنے کچھ ساتھیوں سے ویسے خط لکھنے کو کہہ دیا تھا" زرینہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "مجھے آپ بھولے نہیں، یہی میرے لئے کیا کم ہے"۔

میں نے ہنستے ہوئے نوکر کو آواز دی اور اُسے چائے لانے کو کہا — "جی نہیں تکلّف نہ کیجئے! میں نے اسٹیشن پر چائے پی لی ہے۔" میں نے اس بات سے ذرا نامطمئن ہو کر کہا۔ "آپ میرے وہاں آ رہی تھیں تو —" انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا — "جی نہیں، یہ بات نہیں، میں نے سوچا آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "رہنے دیجئے بہت ہو چکا اب، پان میں تو اعتراض نہیں ہے" میں نے نوکر سے پان لانے کو کہا۔"...................

.... اس وقفہ میں ان کی نظر کمرہ کے کونہ کی میز پر رکھے ہوئے فوٹو اسٹینڈ پر پڑی، زرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا "یہی ایک لڑکی ہے؟" میں نے تصویر میں دیکھا۔ میری دھرم پتنی میرے پہلو میں بیٹھی تھیں اور ہمارے سامنے ہماری لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے کہا "جی نہیں ایک بچّہ گود میں ہے۔" تصویر پر آنکھ جمائے ہوئے انہوں نے پوچھا "آپ کی بیوی تو مزے میں ہیں۔" تصویر میں میں اپنی بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ شرماتے ہوئے میں نے کہا "جی ہاں مزے میں ہیں۔"

نوکر نے پان لا کر دیا۔ پان کھاتے ہوئے سنجیدگی سے زرینہ نے کہا

٦٢ "میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔ میرے پاس وقت زیادہ نہیں ہے، اسی گاڑی سے لکھنؤ جانا ہے۔" میں نے بات کاٹ کر کہا "لیکن آپ نے تو کہا تھا بنارس۔" زرینہ بیچ میں بول اُٹھی "جی نہیں۔ کل لکھنؤ سے پروگرام ہے۔" سامنے پڑا ہوا لسنر (Listener) میں اُلٹنے لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی "میرا اس طرح آنا یہاں، معاف کیجئے گا۔ کچھ دنوں سے برابر آنے کو سوچ رہی تھی۔ آنا ضروری تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنا منی بیگ کھولنے لگی، میں تعجب سے منی بیگ کی طرف دیکھ رہا تھا — "آپ کو یاد ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سونے کی ایک چھوٹی سی دو موتیوں کی نتھ نکالی — "آپ تو اسے پہچانتے ہوں گے — یہ اس وقت اُتر چکی تھی، اسکے اُتارے جانے میں میری ماں کا ہاتھ تھا، وہ میری رسم نہ تھی۔ لیکن میں ایسے آدمی کی تلاش میں تھی جسے میں اس کو نذر کر سکتی۔ جو عورت کو پہچانتا ہو اور اس کی قیمت سمجھتا ہو........ اس دن ریڈیو پر آپ کا خط سُنکر میں نے طے کیا کہ آپ عورت کی اس عزت کا بوجھ اُٹھا سکینگے۔" نتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر وہ کرسی سے اُٹھنے لگی، میں نے پریشان آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے شک کی حالت میں اُس سے پوچھا "لیکن میں اس کا کیا کروں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ آپ کی چیز ہے، اس میں عورت کی لاج اور عزت دونوں ہیں — یہ امانت آپ کے پاس رہنی چاہئیے۔" یہ کہکر وہ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ میں نے بےچین ہو کر کہا "لیکن اتنی جلدی کیا ہے، آج رہ جائیے۔ کل صبح بھی لکھنؤ جا سکتی ہیں۔" اس نے کمرہ کے چاروں طرف دیکھ کر پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "یہ میرے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھی سے اُترنے لگی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "پھر کب ملاقات ہوگی؟" اس نے مڑ کر میری آنکھوں میں دیکھا "زندگی کا کیا ٹھکانا۔" یہ کہتے کہتے وہ ساڑی کا کونہ اُٹھا کر اپنی آنکھوں تک لے گئی۔ میں دروازہ پر کھڑا تھا اس کا تانگہ چلا جا رہا تھا وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا زرینہ کتنی بدل گئی ہے۔ اسکی عمر کس تیزی سے ڈھلتی جا رہی ہے۔ اس کا کہنا یاد ہو آیا۔ "زندگی کا کیا ٹھکانا۔" اور میں یکبارگی کانپ گیا۔

خیالوں میں ڈوبا ہوا اپنے کمرہ میں واپس آیا۔ چھوٹی میز پر سونے کی امانت پڑی تھی، کہاں رکھوں اسے؟ یہی سوال بار بار میرے دل میں اُٹھتا تھا، وہ چھوٹی سی چیز مجھے کتنی بھاری معلوم ہو رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے میرے گلے میں پتھر کی بھاری چکّی ڈال دی ہے۔ کچھ دیر اسے ہاتھ میں لئے اِدھر اُدھر گھومتے رہنے کے بعد اپنا بکس کھولا اور اسکی تہ میں نتھ رکھ دی۔ پھر کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد پھر میں بےچین ہو گیا، جا کر بکس کھولا نتھ کو ڈھونڈتے ہی سونے کی ایک گھڑی ملی۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ اتنی دیر میں اس نے اپنا ایک ساتھی بھی ڈھونڈھ لیا، اب میں دونوں چیزوں کو ہاتھ میں لئے کمرہ میں گھومنے لگا۔ پھر الماری کھولی، الماری کے اندر بیچ کے خانہ میں دیوار پر ایک تصویر دو کیلوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

تیئیس سال ہوئے آسمان میں اُتر کی طرف ایک بڑا تارہ چمکا تھا جس کی سُرخ روشنی دُنیا کے پانچویں حصہ پر آج بھی چمک رہی ہے۔ یہ اُسی لال ستارہ کی تصویر ہے۔ چکنا سر، چمکتی ہوئی گہری آنکھیں، بھدّی ناک، مضبوط جبڑے اور چھوٹی سی ڈاڑھی! — دیکھنے میں وہ آدمی چوروں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ دراصل چوروں اور نیچوں سے زندگی میں اس کا گہرا تعلق رہا۔ اس تصویر کو دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا، تصویر دو کیلوں پر ٹھہری تھی، ایک کیل پر وہ نتھ اور دوسری پر وہ گھڑی میں نے لٹکا دی۔

سونے کی نقلی گھڑی میں میرا ماضی چھپا ہوا تھا اور اصلی سونے کی نتھ میں میرے مستقبل کا بوجھ! ایک کے بغیر دوسرا ممکن نہیں، نتھ کا بوجھ میں اکیلے نہیں اُٹھا سکتا تھا، اس لئے اس تصویر کو ساتھی بنایا۔

بقیہ مضمون صفحہ ۲۶

اور وزیر بچاؤ کے اختیارات کے حدود کی صاف صاف وضاحت کردی جائے یہ تمام باتیں بہترین نیک نیتی سے کی گئیں، اور خاص مقصد یہ تھا کہ زور شور سے کام شروع ہوجائے۔ یہ ظاہر تھا کہ بغیر اسکے ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی۔

موجودہ حکومت یہ یقین کرسکتی ہے کہ وہ عوام کے جذبات و احساسات کا علم رکھتی ہے، لیکن خلیج بہت بڑی ہے اور عوام کے لیڈر ہی اسے پاٹ سکتے ہیں اور عوام کے لیڈر بھی اُسی وقت کامیاب ہوسکتے ہیں جب وہ عوام کی امیدوں کے قدم بقدم رہیں۔ نظر بہ حالات کانگریس کی ورکنگ کمیٹی سمجھوتہ کی صادق اور پُرجوش خواہش کی وجہ سے اس انتہا تک پہنچ گئی کہ عوام کے جذبات انتہا درجہ تک چھیل چھال کر کم کردے گئے، کمیٹی کو اس بات کا پوری طرح علم تھا کہ آسٹریلیا اور ہندوستان کی پوزیشن میں جو فرق ہے وہ ہندوستان کے بچاؤ کے کنٹرول اور رہنمائی کی نسبت سے عوام کو سمجھانا مشکل ہوگا۔ لیکن اس امید کا پورا بھروسہ تھا کہ ایک بار جہاں سمجھوتہ ہوا تمام پارٹیوں کی مشترکہ کوشش ایک دم سے فضا کو بدل دے گی، اور ہندوستان میں ہر شہر اور گاؤں میں پُرجوش والنٹیروں کی چہل پہل نظر آئے گی، صرف یہ کہنے کا موقع ملنا چاہیئے تھا کہ ہندوستان عملاً آزاد ہے، اور برطانی اور امریکن آپ کے دوستوں اور ساتھیوں کی حیثیت سے یہاں ہیں، تاکہ آپ کو اپنی آزادی قائم کرنے اور بچانے میں مدد دیں، اس میں کسی ایک فرقہ کے دوسرے پر چھا جانے یا کسی اقلیت پر اکثریت کی جابرانہ حکومت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

سر اسٹیفورڈ کرپس کے آخری خط اور ان کی براڈکاسٹ تقریر نے تو اور بھی زیادہ گنجلک پیدا کردی اور بعد کو انہوں نے کراچی کے اخبار والوں کو جو انٹرویو دیا، اس سے تو اس انتشار میں جو رہی سہی کسر تھی وہ بھی پوری ہوگئی انہوں نے قدرتی طور پر یہ کوشش کی کہ حالات کے سیاسی جائزہ میں شخصی نوازن داخل کرکے صریحی درشتیوں کو نرم کردیں، اس . . . .

سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر مُنہ بدذائقہ ہوگیا۔ ہندوستان ہکا بکا ہے اور پہلے سے زیادہ غیر یقینی حالت میں ہے اور یہ محسوس کیا جاتا ہے (جس کے لئے بہت کچھ جواز موجود ہے) کہ سر اسٹیفورڈ کرپس کی آخری اداکاری خاص اس مقصد سے تھی کہ وہ دہلی اور لندن میں اپنے آدمیوں میں اپنی ناکامی کو ایک قسم کی کامیابی ظاہر کریں، ایک ایسے رجعت پسند کی کامیابی جو وقتی طور پر سامراج کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہو۔

شائد مسٹر جناح سے آخری انٹرویو کے دوران میں مسٹر اسٹیفورڈ کرپس نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کانگریس مشترکہ ذمہ داری کے کنونشن سے لیجسلیچر کے روبرو ذمہ داری چاہتی ہے۔ ورنہ مسٹر جناح اتنے تجربہ کار پارلیمنٹیرین ہیں کہ وہ اپنے اخباری بیان میں وہ خیال نہ ظاہر کرتے جو انہوں نے سر اسٹیفورڈ کرپس کی روانگی کے بعد ظاہر کیا۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو سر اسٹیفورڈ کرپس نے مختلف آدمیوں سے مختلف مقصدوں سے مختلف باتیں کہیں، اس سے پہلے پنڈت جواہرلال نہرو اور کانگریس کے صدر سے انٹرویو کے دوران میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے ہی ہمت کرکے یہ کہا تھا کہ چونکہ اگزیکٹو کے ممبر لیجسلیچر کے سامنے ذمہ دار نہیں ہوسکتے، وہ ایک طرح پان پارٹیوں کے سامنے ذمہ دار ہوں گے جن میں سے وہ آئے ہوں گے۔

۶۳ بہرحال کیبنٹ کی تشکیل پر تو اس لئے بحث نہیں ہوئی کہ وہ منزل آئی ہی نہیں، لیکن یہ ظاہر تھا کہ اس مشترکہ کیبنٹ سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ مشترکہ ذمہ داری احساس کے ساتھ ایک ٹیم کی سی اجتماعی اسپرٹ سے کام کریگی اگزیکیٹو اور گورنر جنرل کے رابطہ کا جہانتک سوال تھا اسکا تعلق کیبنٹ کی مشترکہ ذمہ داری اور گورنر جنرل سے تھا، کیبنٹ کے اندر فرقہ واری کی بنیاد پر پالیسی اور لائن پر اکثریت اور اقلیت کا سوال تو کبھی زیر بحث آیا ہی نہیں۔ اگر بحث کیلئے یہ مان بھی لیا جائے کہ مجوزہ کیبنٹ کی تشکیل ایسی ہوتی ہے کہ رائے دہی کے معاملہ میں اقلیتوں کے نمائندے گھاٹے میں رہتے، لیکن انتہائی دھندلی نظر والی اکثریت ہی خانہ بر انداز ظالمانہ کھیل کھیل سکتی ہے۔ اپنے تجربہ کی بنا پر میں اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ پارٹی کیبنٹ میں بھی اقلیتیں اپنی تعداد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وزن رکھتی ہیں۔ وقتی مسئلے جن پر اہم نتیجوں کا انحصار ہوتا ہے دوٹوں سے نہیں بلکہ عام اتفاق رائے سے طے ہوتے ہیں لیکن اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

مجموعی حیثیت سے ہندوستان میں کرپس مشن کا نتیجہ یہ ہے کہ مصیبت کی گھٹائیں اور زیادہ گھر آئیں۔

حسرت ترمذی بی-اے

محبّت کی وادیاں

یہ عہدِ محبّت کی آبادیاں   سلامت رہیں دل کی بربادیاں
نشیمن کی وہ آرزو کیا کرے   سمجھتا ہو جو خانہ بربادیاں
محبّت کی رسمیں ہی اب اور ہیں   نہ فرہاد ہیں اور نہ فرہادیاں
کہاں فکر کی اُلجھنوں سے نجات   کہاں زندگانی میں آزادیاں ۶۱
کوئی کیا کسی کی شکایت کرے   چمن میں لُٹیں خود چمن زادیاں
نگاہوں میں شوخی لبوں پر ہنسی   کوئی سیکھ لے تم سے صیّادیاں
تمہاری اداؤں کے سب کھیل ہیں   نہ آبادیاں ہیں نہ بربادیاں
کہاں تک یہ ہم سے تری غفلتیں   کہاں تک یہ ہر لحظہ بربادیاں
محبّت کے جلووں سے آباد ہیں   یہ صحرا، یہ گلزار، یہ وادیاں

قفس کے لئے دل تڑپتا رہے
ملیں ہم کو حسرت جو آزادیاں

نیا راگ

عورت کی زندگی (تریاقِ نسواں)

اس حیثیت سے کہ عورت زندگی میں خلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ دُنیا اور سماج کی تمام تر صحت کی ذمہ وار ہے، یہی نہیں، آنے والی نسلوں کی صحت کا دار و مدار خود آج کی عورت کی تندرستی پر ہے، مگر افسوس مرد غافل اور خود عورت دور رس نہیں۔ اس کی حیا، اور مرد کی غفلت دُنیا کو مریض مستقبل کی طرف لئے جا رہی ہے۔

عورتوں کی معمولی بیماری ہی کو لیجئے، عام جسمانی کمزوری و نقاہت، بعض اوقات زچگی کے امراض اور کبھی رحم کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے سفید رطوبات خارج ہونے لگتی ہیں، جس کی وجہ سے زندگی مضمحل نظر آنے لگتی ہے۔ قبل از وقت بُڑھاپا چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اولاد ہونا بھی بند ہو جاتا ہے، ان تمام شکایتوں کے لئے تریاقِ نسواں نہایت ذی تاثیر دوا ہے۔ پہلی ہی خوراک اثر کرتی ہے۔ اس دوا نے صنفِ نازک کے طبقے میں بڑی قبولیت حاصل کی ہے، اصل میں یہ اکسیر ہمارے دواخانے کی شہرت اور کامیابی کا باعث ہوئی ہے۔ تریاقِ نسواں ۳ ماشہ صبح اور ۳ ماشہ شام گائے کے تازہ دودھ کے ساتھ استعمال کیجئے۔ ترش اشیاء اور گڑ وغیرہ سے پرہیز لازمی ہے۔ قیمت برائے ایک ماہ فی ڈبہ ۱۲؍ علاوہ محصولڈاک۔

نوٹ:۔ یہ تریاقِ حکیم نعیم اللہ صاحب سند یافتہ طبیہ کالج لاہور رجسٹرڈ انڈیجنس میڈیکل پریکٹیشنر کلاس اے گورنمنٹ یوپی کی شہرۂ آفاق دو اہیں (ادارۂ ایشیا میرٹھ)

منیجر مشہور عالم آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ

جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر یوپی)

ساغر نظامی

سماج

کِھل کِھلاتے ہوئے چہرں پہ نہ جا، جانِ بہار	اے مری جانِ بہار

خندہ، جُز شورشِ آغازِ بلا کچھ بھی نہیں
نغمہ، جُز ماتمِ تابوتِ صدا کچھ بھی نہیں
ہر روشِ صحنِ گلستاں کی مزارِ بُو ہے
گو دہیں موجِ تبسّم کے فقط آنسو ہے
جگنوؤں کا یہ چراغاں ہے شراروں کا فریب
لالہ و گُل کا تبسّم ہے بہاروں کا فریب

کِھل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا، جانِ بہار	اے مری جانِ بہار
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا، جانِ سخن	اے مری جانِ سخن

جھوٹ نے مستیِ گفتار میں بدلا ہے لباس
غیبت و کذب کی رنگین و تراشیدہ اساس
بحرِ تکذیب کے ٹھہرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ
یا جہنّم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
سچ کو اک آن میں الہام بنا دیتے ہیں

چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا، جانِ سخن	اے مری جانِ سخن

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر، کیفِ نظر — اے مرے کیفِ نظر

یوں تو شیریں ہیں بظاہر یہ مئے زیست کے جام
لیکن احساس ہیں یہ جام ہیں زہرابِ تمام
تلخیاں جھانک رہی ہیں کوئی جیتا تو نہیں
بادۂ عیشِ جہاں میں کوئی پیتا تو نہیں
میٹھی میٹھی یہ نگاہیں، یہ تبسّم یہ نیاز
سب کے پردے میں ہے اک تلخ حقیقت غمّاز

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر، کیفِ نظر — اے مرے کیفِ نظر
گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا، سازِ خیال — اے مرے سازِ خیال

استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستون چاہیئے اس بیل کو زردوزی کا
حلقہ کرتی ہیں یہ زرّیں کمرو گردن کا
عکس پڑتا ہے بہاروں ہی پہ اس گلشن کا
فن ہو یا حُسن، جوانی ہو کہ پیغامبری
ہار پڑتا نہیں مفلس کے گلے میں یہ کبھی

گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا، سازِ خیال — اے مرے سازِ خیال
عطر آلود لباسوں پہ نہ جا، روحِ گلاب — اے مری روحِ گلاب

اُس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائیگا دنگ
عہدِ تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ دھڑنگ
ہے یہی مرکزِ بو، اور یہی مخزنِ رنگ
جسمِ عریاں پہ مگر جامۂ انفاس ہے تنگ
توشہ خانے سے غریبوں کے اُڑے ہیں یہ لباس
خونِ مزدور کی خوشبو میں بسے ہیں یہ لباس

عطر آلود لباسوں پہ نہ جا، روحِ گلاب — اے مری روحِ گلاب

ایشیا مئی ۱۹۴۲ء

اِن خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ، حسنِ نظر — اے مرے حسنِ نظر
چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جو تہذیب کے بُت
ترشے ترشائے ہوئے آذرِ تادیب کے بُت
ان کے دل سنگ ہیں، جان سرد ہے، سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب، ان کے سفینے تاریک
کوئی دَر ان پہ سیہ کاریوں کا بند نہیں
جانِ ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں
اِن خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ، حسنِ نظر — اے مرے حسنِ نظر
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا، کشتِ حیات — اے مری کشتِ حیات
کبھی مجبور پہ ہو بارشِ الطافِ امیر؟
ایک ہو جائے کبھی قسمتِ صیّاد و اسیر!
زہر خود شہد بنے، آب ہو خود موجۂ شیر
اپنی ہر کاٹ سے پیدا کرے امرت شمشیر
جذبۂ جبر کے ہونٹوں پہ تبسّم ہو، محال
ظلم کی روح کو احساسِ ترحّم ہو محال
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا، کشتِ حیات — اے مری کشتِ حیات
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا، حسنِ نظر — اے مرے حسنِ نظر
یہ کرم اور یہ اخلاق، یہ مجرے، یہ سلام
یہ تواضع، یہ تکلّف، یہ تبسّم، یہ کلام
ہر نفس گدگدے صوفوں پہ قعود اور قیام
ہر ادا قاتل و صیّاد، نظر دانہ و دام
پر یہ سب ذوقِ نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
اس کی تہ میں صداقت بخدا کچھ بھی نہیں
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا، حسنِ نظر — اے مرے حسنِ نظر

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۲ء

ساغر نظامی

انقلاب

کیوں لطف تم کو شام و سحر میں نہیں رہا — کیا میرا اعتبار نظر میں نہیں رہا
ساکت ہے کائنات تو جامد ہیں شش جہات — جیسے کہ دورِ شمس و قمر میں نہیں رہا
جس میں فروغِ لالہ و گل دیکھتا تھا مُنہ — وہ آئینہ حریمِ سحر میں نہیں رہا
آئینہ ہی نہیں ہے تحیّر سے چور چور — جوہر مزاجِ آئینہ گر میں نہیں رہا
ہر شے کو دیکھتا ہوں، مگر دیکھتا نہیں — احساسِ دید چشم و نظر میں نہیں رہا
دل اختیار میں ہے نہ قابو ہے روح پر — میرا وجود میرے اثر میں نہیں رہا
تھی گردشِ حیات بھی جس عزم سے خجل — وہ عزم میرے ذوقِ سفر میں نہیں رہا
جو چومتا تھا اُڑ کے تخیّل کی چوٹیاں — وہ اشتیاق بازو و پر میں نہیں رہا
جو میرے آشیاں کو بناتا تھا آشیاں — وہ اضطراب برق و شرر میں نہیں رہا
کشتی مری امید کی اب کون لے چلے — طوفان کوئی دیدۂ تر میں نہیں رہا
جس نے تجھے تراش کے معبود کر دیا — وہ بُت تراش قلب و نظر میں نہیں رہا
جس میکدہ کا مست خرامی تھا ایک نام — وہ میکدہ بھی راہ گزر میں نہیں رہا
آتا تھا جس سے تیرے خرامِ حسیں میں لوچ — اب وہ ہجوم راہ گزر میں نہیں رہا
مَلتا ہوں ہاتھ آہ کہ جب لگ رہی تھی آگ — کیوں اس گھڑی میں بھول کے گھر میں نہیں رہا
ہر دم نوازشیں ہیں نہ پیہم ستائشیں — اب کوئی لُطف عرضِ ہنر میں نہیں رہا
عکّاس تھا جو تیرے جمال و جلال کا — وہ سوزِ حُسن شام و سحر میں نہیں رہا
مبہم سا اک فریبِ اجابت تھا جس کا نام — وہ ربط بھی دُعا و اثر میں نہیں رہا
پرتو سے جس کے آرزوئے دل جوان تھی — وہ التفات تیری نظر میں نہیں رہا

شائد یہ کائنات بکھرتی نہ کچھ دنوں
کچھ اور کیوں میں تیری نظر میں نہیں رہا

ساغر نظامی

آنکھیں

نسیم و نکہت و رنگ و شراب ہیں آنکھیں   شگفتگی ہیں، کنول ہیں، گلاب ہیں آنکھیں
جزیرہ ہائے مہ و آفتاب ہیں آنکھیں   پہیلیوں کی طلسمی کتاب ہیں آنکھیں

نظر اُٹھا کے خود اپنا جواب ہیں آنکھیں

سجودِ صبح کے پاکیزہ تر اثر کی قسم   شب گنہ کی دھڑکتی ہوئی سحر کی قسم
کسی عفیف کی بہکی ہوئی نظر کی قسم   تمام عالمِ اسرارِ خیر و شر کی قسم

پیامِ کفر و گناہ و ثواب ہیں آنکھیں

مچل رہی ہیں کبھی مسکرا رہی ہیں کبھی   سنبھل رہی ہیں کبھی لڑکھڑا رہی ہیں کبھی
فریبِ کیف میں سب کچھ لٹا رہی ہیں کبھی   چھلک رہی ہیں کبھی اور پلا رہی ہیں کبھی

شراب ہیں کبھی جامِ شراب ہیں آنکھیں

تڑپ رہی ہے غمِ گفتگو کی بیتابی   جھلک رہی ہے خفی جستجو کی بیتابی
شگفتگی کو ہے پروازِ بو کی بیتابی   چھلک رہی ہے مئے آرزو کی بیتابی

لطیف دو قدحِ اضطراب ہیں آنکھیں

سلام ہوتے ہیں پیہم پیام آتے ہیں — کلام ہوتے ہیں باہم سلام آتے ہیں
ابد نشاط تمنا کے جام آتے ہیں — عجیب ان کو طریقِ کلام آتے ہیں
کہ چُپ ہیں بزم میں اور کامیاب ہیں آنکھیں

تصدق ان پہ ہیں، شام و پگاہ کے بھونرے — طواف کیلئے بیکل ہیں آہ کے بھونرے
تڑپ رہے ہیں مری تشنہ چاہ کے بھونرے — بنے ہیں نغمۂ رقصاں نگاہ کے بھونرے
کنول کی شاخ ہو تم اور گلاب ہیں آنکھیں

دلوں میں سوئے ہوئے کاروان جگاتی ہیں — عجیب خواہشوں کی مثنوی سُناتی ہیں
سپردگی کے عجب راگ گنگناتی ہیں — بغیر مس ہی سازِ کرم بجاتی ہیں
نگاہِ شوق ہے مطرب، رباب ہیں آنکھیں

بیان پھر ہوں فسانے حسین آنکھوں سے — بلند پھر ہوں ترانے حسین آنکھوں سے
کچھ اور مست نشانے حسین آنکھوں سے — بدل گئے ہیں زمانے حسین آنکھوں سے
نویدِ شورشِ صد انقلاب ہیں آنکھیں

جوش ملیح آبادی

"حرفِ آخر" کا ایک ورق

حوّا کا احساسِ شباب

(ایک کنج کے سبزہ زار پر حوا بیٹھی ہوئی ہے، آدم اسکے زانو پر سر رکھے سو رہا ہے کہ دبے پاؤں اک سرخ پوش چہرہ پر گہری سیاہ نقاب ڈالے حوا کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، اسکے احساسِ شباب کو بیدار کرنے کی خاطر آہستہ سے کہتا ہے)

اس آبِ تبسم میں نہ آئے گی روانی — اس حرف سے جھلکے ہیں نہ جھلکیں گے معانی
اس حسن سے ہو گی نہ کبھی شعلہ فشانی — برسے گا نہ اک بوند بھی اس ابر سے پانی
نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس سلسلۂ شرم سے بل جائیگا جس وقت — رگ رگ میں جوان خون ابل جائیگا جس وقت
سانچے میں نئی آگ کے ڈھل جائیگا جس وقت — کانٹا ترے سینہ کا نکل جائے گا جس وقت
کھل جائیں گے تخلیق کے اسرارِ نہانی
نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس شرم سے اس ضبط سے اس بیم و رجا سے — اس جذبۂ ناموس سے اس خوفِ خدا سے
اس شدتِ آداب سے اس فرطِ حیا سے — اس خفتِ مغرولئ انداز و ادا سے
شامیں ہی سلونی ہیں نہ صبحیں ہیں سہانی
نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

ہاں جھوم، کہ انگارہ جوانی کا دمک جائے — کوندا سا لپکنے لگے بجلی سی چمک جائے
یوں پی مئے عشرت کہ ترا جسم چھلک جائے — اور اتنی کہ انگڑائی جو لے جلد مسک جائے
اٹھ رقص میں آ رقص میں بھرپور جوانی

ایشیا - مئی ۱۹۴۴ء

(یہ کہتے ہی سُرخ پوش نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حوّا پر بیداریٔ شباب کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ اپنی کلائی کو بلند کرکے دیکھتی ہے۔ ایک عجیب لذت و کرب کے عالم میں دل ہی دل میں کہنے لگتی ہے)

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں
یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں دواں

بیداریوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے
کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کئے ہوئے

آنکھوں سے ایک بھاپ سی اُٹھتی ہے گرم و سرد
پنڈے کے پھیکے پن میں ہے کیسے مزہ کا درد

تڑپا رہا ہے کون دلِ دردمند کو
اینٹھن سی کھائے جاتی ہے ہر جوڑ بند کو

رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں
رُخ سے سکون کے چھوتے ہی اُٹھتا ہے اک دھواں

کوئی ہمک رہا ہے یہ اندازِ دل نشیں
سینے میں ہے کہ گود میں مجھ کو خبر نہیں

کانوں سے لو نکلتی ہے اور آگ ہے جبیں
چھاتی اُبل رہی ہے نہ ہو جائے شق کہیں

زانو پہ سونے والے ہی سے کیوں نہ پوچھ لوں
یہ بیخودی سی مجھ میں پھٹی پڑ رہی ہے کیوں

دھومیں مچی ہوئی ہیں وہ دل ہیں کہ الاماں
اینٹھی سی جا رہی ہیں نگوڑی کلائیاں

اک لو سی پھٹ رہی ہے الجھتی نجوم سے
کیا صبح ہو رہی ہے رگ و پے میں دھوم سے

ہوتی ہے کیوں لچک سی کمر میں یہ بار بار
کیسا یہ اُف ہے دھوم مچاتا ہوا اُبھار

پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بُری
پہلو سے زلف مس ہو تو آتی ہے جُھرجُھری

تیزی سے بن رہی ہوں میں اک زندہ پھول بن
ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے پھبکا ہوا بدن

ہر رونگٹے کی جاگ اُٹھی پیاس الاماں
احساس اور جسم کا احساس الاماں

شیریں و تلخ زہر رگ و پے میں بھر دیا
کس نے یہ مجھ کو جسم سے آگاہ کر دیا

لگتا ہے تیر بن کے چھلکنا ہزار کا
در آیا ہے بدن میں زمانہ بہار کا

سیال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن
معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن

اے کاش مجھ پہ رحم نہ کوئی ذرا کرے
مجھ کو نڈھال کر دے مجھے ادھ موا کرے

دشمن کی طرح بھینچ کے رگ رگ کو توڑ دے
اور توڑنے کے بعد سسکتا ہی چھوڑ دے

(کہ حوّا کے جسم کی برقی لہروں سے آدم بیدار ہو جاتا ہے اور ایک سیاہ لکۂ ابر دونوں کو چھپا لیتا ہے)

ایشیا [illegible]

۵۷

کسوٹی

ایشیا - مئی سنہ ۱۹۳۶ء

اکسیر برص (سفید داغ)

حسن، انسانی زندگی اور جد و جہد کا اعلیٰ ترین مقصود ہے، سوسائٹی اور زندگی میں خوبصورتی کبھی ناکام نہیں ہوئی، مگر سفید داغ (برص) انسان کی انتہائی بدقسمتی ہے، نفرت و حقارت کا موجب ہیں، سوسائٹی میں برص زدہ انسان سے کوئی حقارت کا اظہار نہ کرے، مگر اسکے منظر کا اثر انسانی دل و دماغ پر ضرور ہوتا ہے موذی ترین مرض ہے، اور انسانی حسن کا شدید دشمن، مگر اس شدید دشمن کا علاج صرف اکسیر برص ہے جس کے استعمال سے یہ جلدی مرض جڑ سے جاتا رہتا ہے۔

صبح و شام، اکسیر برص ۶، ۶ ماشہ تیز گرم پانی میں بھگو رکھیں اور کچھ دیر بعد نتھار کر پی لیں، بچے ہوئے فضلہ کو پیس کر اور سرکہ میں ملا کر داغوں پر لیپ کر لیں۔ سوتے وقت ضماد برص نیم گرم داغوں پر لگائیں اور اسکے بعد دیکھیں کہ کس طرح یہ اپنا کام کرتا ہے۔ قیمت ایک ماہ کیلئے صہ، علاوہ محصول۔

نوٹ:- یہ اکسیر حکیم نعیم اللہ صاحب سند یافتہ طبیہ کالج لاہور رجسٹرڈ انڈیجنس میڈیکل پریکٹیشنر گورنمنٹ یو۔پی کی مجرّب اور کارگر ادویات میں سے ہے۔ (ادارۂ ایشیا میرٹھ)

منیجر مشہور عالم آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ
جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر۔ یو۔پی)

کسوٹی

نئی کتابیں اور رسالے

روح غالب :- مرتبۂ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور،
سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو شمارہ (۲۱)
قیمت ؎ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن

مرزا غالب کی نظم و نثر اور اُن کی زندگی کے متعلق کافی لٹریچر پیدا ہو چکا ہے مگر شکسپیر کے برابر نہیں۔ غلام، بدذوق اور جاہل قوم میں جو کچھ ہو گیا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ مایوس کن نہیں۔ روح غالب کے نام سے ڈاکٹر زور (حیدرآباد کے) مرزا غالب کے متعلق ایک نئی کتاب ترتیب دی ہے۔ اس تالیف و ترتیب کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے اس شاہکار سے صرف ایسے شہ پارے چن لئے جائیں جو زبان اور اسلوب کے لحاظ سے دلچسپ ہوں اور اُن علمی و فنی بحثوں کو علیحدہ کر دیا جائے جو تحقیق و تفتیش کرنے والوں کے لئے کارآمد ہیں نہ کہ غالب کے اسلوبِ خاص سے لطف اندوز ہونے اور اردو نثر کے پاکیزہ نمونوں سے واقف ہونے کے لئے۔

جن ادب پاروں کو ڈاکٹر صاحب نے منتخب کیا ہے اُن کی حیثیت ادبی ہے۔ نثر کے جو انتخابات شامل کئے گئے ہیں وہ اُن کے اردو مکاتیب کا نچوڑ ہیں ان خطوط سے غالب کی روحانی کیفیتیں پھوٹی پڑتی ہیں۔ غالب کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔

اصل میں یہ کتاب اک تالیفی نمونہ ہے، مغربی اصول ترتیب کا، دوسری کتابوں کے سقوط کے لئے اسے ترتیب نہیں دیا گیا۔ بلکہ جماعت کے لئے رنگا رنگ مزاج و ذوق کے مطالبہ کی ضمنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس تالیف میں لاعلمی و فنی باتوں کے علاوہ اس مجموعہ کے خطوط سے ان عبارتوں کو بھی علیحدہ کر دیا گیا ہے جن میں غالب نے حوائج ضروری اور دیگر ایسے امور کا ذکر کیا ہے جو مطالعہ کے لطف میں بدمزگی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتے تھے۔

یہ ہیں وہ التزامات جن کی بنا پر اسے روح غالب کہا جا سکتا ہے۔

خطوط کے سمجھنے کے لئے مرزا غالب کے حالاتِ زندگی، تصنیفات تالیفات خاص عزیزوں اور دوستوں کے متعلق معلومات بھی ایک باب میں درج ہیں۔

کتاب کے پہلے باب "غالب کے متعلق ادب" میں ابتدائی کوششوں کی داستان، سوانح عمریاں، اور غالب کے سوانح نگاروں اور ناقدوں حالی آزاد حیدر یار جنگ طباطبائی۔ دوسری نثر میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام۔ سالک رام اور مہیش پرشاد کا ذکر ہے۔

[* تیسرے باب "غالب کے ادبی کارنامے" میں فارسی نظم، فارسی نثر، اردو نظم، اردو نثر کا ذکر ہے۔ چوتھے باب "غالب کے اعزہ و احباب" میں اعزہ و احباب اور تلامذہ کا ذکر کیا گیا ہے۔]

تیسرے باب میں حیاتِ غالب میں الف خاندان، تعلیم و تربیت، شادی اور سکونتِ دہلی، صحبت کا اثر، مالی پریشانیاں، کلکتہ میں، بدنامی، قید، قلعہ کی ملازمت عروج و زوال، رام پور سے تعلق، انگریزوں کی خفگی، رام پور کا دوسرا سفر، وفات ب آزادہ روی و رندمشربی، اسراف، خوشامد، مروّت و فراخ حوصلگی، مذہبی بے تعلقی و رواداری اور ظرافت کا ذکر کیا گیا ہے۔ *

۴ پانچویں باب "خطوطِ غالب کے دلچسپ ادبی حصے" میں غالب کے خطوط کی خصوصیت، خطوطِ غالب کی فہرست، اور غالب کے خطوط درج کر دیئے گئے ہیں۔

اس کا پیش لفظ آنریبل مولوی سید مہدی حسین صاحب بلگرامی نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے (کیمبرج) صدرالمہام تعلیمات ممالک محروسہ و معین میر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے تحریر فرمایا ہے۔ اس پیش لفظ کا یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ غالب کو مغربی معیار و نقطۂ نگاہ سے نہیں مشرقی زاویۂ نگاہ ہی سے دیکھنا چاہئے۔ یہ انتباہ ان حضرات کے لئے ہے جو مغربی اصولِ تنقید کی روشنی میں غالب کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ گو یہ پیش لفظ مختصر ہے مگر اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت ہی خوب ہے۔

دیباچہ مرتب نے لکھا ہے۔ غالب اور ڈاکٹر زور صاحب کے دو عکسی فوٹو ہیں۔ غالب کی کوئی نئی تصویر نہیں ہے۔

۷۷

ایشیا مئی ۱۹۴۲ء

کتاب تنوع کے طور پر نہایت خوب ہے اور شعرا کے متعلق اس قسم کی نئی تالیفات اور بھی آئیں تو اردو زبان کی یہ بہت بڑی خدمت ہے۔ ضرورت ہے کہ اب ڈاکٹر زور قبرستانوں سے رخ پھیر کر زندگی کی طرف رجوع ہوں اور عصرِ حاضر کے زندہ جدید شعرا کی چھان بین کی طرف رجوع کریں اگر یہ پوری نسل کی نسل خود رو طور پر پروان چڑھنے کے لئے چھوڑ دی گئی تو اس کی ذمہ داری ان افراد پر ہوگی جو خود کو نقاد کہتے ہیں اور اس وقت تک زیرِ زمین دفن شدہ دنیا ہی سے تعلق رہا ہے۔

اُردو میں نیا سیاسی ادب

+ کسی زبان میں رومانی ادب کی زیادتی ذہنی انفعال کی دلیل ہے۔ اردو میں صدیوں ایک خاص قسم کے ادب کی ترقی ہوتی رہی۔ سیاسی ادب نام کو بھی نہ تھا۔ آزاد نے تو تاریخ کا لہجہ بھی افسانوی کر دیا۔ آخر دوسری زبانوں نے اردو ادب پر اپنا پرتو ڈالا۔ یہاں کی سیاسی جدوجہد نے بھی اردو ادب کو کافی متاثر کیا۔ چنانچہ اب وقتی ضروریات سے ہم آہنگ سیاسی ادب پیدا ہو رہا ہے اور یہ مستقل افادی حیثیت رکھتا ہے۔ "الہلال" اور "نگار"
۷۸ نے بڑی حد تک عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ پڑھنے والوں کو کچھ عادت سی ہو گئی کہ نظم و افسانہ کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی سیاسی جدوجہد سے بھی واقف ہوں اس باب میں مکتبۂ جامعہ دہلی کی کوششیں بھی کم اہم نہیں۔ مکتبہ نے سیاسیات کی مبادیات و تاریخ کے متعلق اس وقت تک متعدد سیاسی کتابیں شائع کی ہیں حال ہی میں اسی قسم کی کتابوں کا ایک سیٹ چھاپا ہے جو لڑائی کی جغرافیائی و سیاسی حیثیت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اس سلسلے کی چار کتابیں بحر الکاہل کی سیاست اور بین الاقوامیت، ممالک اسلامیہ کی سیاست اور نازیت پیشِ نظر ہیں۔ اس وقت میں صرف "بحر الکاہل کی سیاست" پر اظہارِ رائے کر سکوں گا۔

بحر الکاہل کی سیاست ——— محوریوں اور اتحادیوں کی موجودہ جنگ میں بحرِ الکاہل (پیسفک) کی ہستی ایک نئے باب کے انجام و آغاز کی کنجی ہے۔ پرسکون پانی کی یہ وسیع دنیا کرۂ ارض کے کروڑوں انسانوں کے اقتصادی قومی اور ملکی مسئلوں کا مجموعہ ہے۔ اس سمندر کی اہمیت دنیا کے باقی سمندروں کے مقابلے میں دوسرے درجہ پر ہے۔ بحر الکاہل کی موجوں نے مغرب کی ہوسِ ملک رانی اور سینکڑوں تاجرانہ آرزوؤں کے قافلے کو اپنے سینے سے گذارا ہے۔ جاپان کی بیداری کے بعد بحر الکاہل کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جاپان نے مغربی اثر سے آزاد کر کے ایشیا کو خود اپنے اثر میں لینے کا جو خواب دیکھا ہے وہ شرمندۂ تعبیر ہوگا یا نہیں، اس سے بحث نہیں لیکن بحر الکاہل کی موجوں میں اس وقت تک طوفان اٹھتا رہے گا جب تک ایشیائی اقوام کو اقتصادی اور سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔

یہ چھوٹی سی کتاب بحر الکاہل کی سیاسیات پر جامع ترین کتاب ہے جغرافیائی حالات، ساحلی ممالک، بحر الکاہل کے جزیرے، خود بحر الکاہل کی اہمیت اور بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس کا تقابل ان تمام جغرافیائی حقیقتوں کو روشن کرتا ہے جو اس سمندر سے تعلق رکھتی ہیں۔

بحر الکاہل کی سیاسی اہمیت کا رشتہ دنیا کے مستقبل سے نہایت گہرا ہے، دنیا کی تمام تر تجارت کا رخ بھی بحر الکاہل ہی کی طرف ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ بحر الکاہل دنیا کی تجارت کا مرکز ہوگا۔ اس چھوٹی سی کتاب میں ان تمام سیاسی و اقتصادی حالات سے بحث کی گئی ہے جو بحر الکاہل کی اقتصادی اہمیت کو بڑھاتے ہیں جس قدر موجودہ سیاسی کشمکش ہے اس کے پس منظر میں بھی بڑھتی ہوئی اقتصادیات کارفرما ہیں جو بحر الکاہل کے ذریعہ ہونے والی تجارت کو دنیا میں متاثر کر رہی ہیں۔

چین اور دورِ حاضر کے عنوان سے ۱۸۹۶ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کے وہ تمام سیاسی انقلابات اور سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے جس کی آماجگاہ چین کی سرزمین اب تک بنی رہی۔ ان انقلابات کے پیچھے جاپان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یورپی طاقتوں کے سیاسی و تجارتی مفادات کام کر رہے تھے۔ ٹیلپنگ کی بغاوت، باکسر کی جنگ، چین اور جنگِ عظیم، چین کا دوسرا انقلاب، چین اور بیرونی ممالک اور اس کے بعد موجودہ دور تک کی تمام سیاسی جدوجہد آئینہ بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ چین اور جاپان کی سیاسیات کا ہر پہلو بھی اس کے اوراق میں روشن ہو جاتا ہے۔ جاپان مشرق میں اپنی طاقت کے قیام و استحکام کے لئے مغرب سے ٹکرا رہا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ "ایشیا، ایشیا والوں کے لئے ہے" بظاہر یہ نعرہ ایک لغو مشرقی تحریک کا اجتماعی نشان معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح مغربی طاقتیں اور امریکہ جلبِ منفعت کے جذبہ سے مغلوب رہا جاپان بھی ایشیا کی شکارگاہ پر بلا شرکتِ غیرے اپنا قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جاپان کا مفاد بحر الکاہل اور اس کے ممالک سے وابستہ ہے اس سمندر کی لہروں پر وہ اتنے ہی ہاتھ پیر مارنا چاہتا ہے جتنے دوسرے پیراک اس وقت اپنی غواصی کے کارنامے دکھاتے رہے۔

لیکن مغربی امپیریلزم اور جاپانی امپیریلزم میں مفاد اور نظام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ اس کتاب میں نہایت وضاحت کے ساتھ ان مسائل اور حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

برطانیہ اور بحرالکاہل کی سیاست ایک مکمل باب ہے جس میں برطانوی مفاد کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی سیاسیات کے متعلق لکھا گیا ہے اسی طرح ایک باب ریاست ہائے متحدہ اور بحرالکاہل کے عنوان سے ہے جس میں امریکہ کے مفاد، اصول غیر جانب داری .... جزائر فلپائن اور جزائر ہوائی کے متعلق واضح معلومات درج ہیں۔ تیسرا باب روس اور بحر الکاہل کی سیاست کے متعلق ہے۔ ان مخصوص ابواب کے بعد یہ ابواب ہیں :-

(۱) بحر الکاہل میں ہالینڈ کے مقبوضات اور اس کی سیاسی پالیسی۔
(۲) جاپان اور برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ۔
(۳) بحر الکاہل کے ممالک میں نقل وطن اور نسلی امتیاز۔
(۴) بحر الکاہل میں ہوائی راستے۔

ان ابواب میں بحر الکاہل کے متعلق سیاسی معلومات کا اک سمندر بند ہے۔ آخر میں چند نقشے ہیں جو اپنی مباحث کے متعلق ہیں اور مسائل سمجھنے میں بڑی امداد کرتے ہیں۔

میرے خیال میں جاپان، امریکہ اور برطانیہ کی جنگ کا پس منظر سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

(باقی)

ساغر

مجبورِ معذرت

موجودہ خلفشار میں زندگی کے اہم ترین معمولات الٹ پلٹ ہو رہے ہیں۔ الیشیا کی اشاعت کا فریضہ تو عام حالات میں، جمود اور پریشانی سے آزاد نہیں رہ سکا۔ آجکل کاغذ کی گرانی و کمیابی اور دوسری پریشانیوں کا حملہ اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ ۶ ماہ کے لئے حکومت کی طرف سے کاغذ کی سپلائی کا انتظام ہوا تھا وہ میعاد ختم ہوئی۔ اب نئے انتظامات پیش نظر ہیں کچھ اس لئے کچھ دوسری وجوہ سے اس نمبر میں تاخیر واقع ہوئی۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے

منیجر

یوپی میں خوبصورت، باشوکت صحیح اور بہترین طباعت کا واحد مرکز

ساغر پریس میرٹھ

شعبۂ طباعت ادبی مرکز میرٹھ

معیاری طباعت کو پسند کرنے والے اصحاب کو نوید

ساغر نظامی کے زیرِ انتظام و نگرانی میرٹھ میں ساغر پریس نے جو کارہائے نمایاں کیئے اُن کا بہترین نمونہ بادۂ مشرق ہے، جس کی طباعت کے متعلق متفقہ طور پر ہندوستان کی یہ رائے ہے کہ اُردو تو کجا انگریزی زبان میں بھی اس شان کی کتاب نہیں دیکھی گئی۔ اگر آپ اپنی تصنیف یا کوئی کام بغیر کسی دقّت و پریشانی کے اپنے مرکز پر مقیم رہ کر چھپوانا چاہتے ہیں تو منیجر ساغر پریس کو مطلع فرمایئے حسبِ وعدہ و دلخواہ باصحت تیار کرکے پہونچا دیا جائیگا۔ نہ آپ کو کاپیاں دیکھنے کی ضرورت ہوگی نہ پروف ملاحظہ کرنے کی۔ خود ساغر نظامی کی نگرانی میں ہر کام پایۂ تکمیل کو پہونچایا جائیگا

پتہ

احمد یار خاں منیجر ساغر پریس۔ سی، پٹ بازار میرٹھ

مفرح یاقوتی محمد شاہی

جواہرات گرانمایہ، ورقِ طلاو نقرہ، مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ طب کیمیاوی کی اعجاز نما کرشمہ بوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی بے ضرر شہنشاہی مفرح

خادم خلق اللہ

محمد عبدالمغنی انصاری مع برادران نبیرۂ لقمان الملک علامہ حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی منیجر انصاری دواخانہ زیر نگرانی حکیم محمد عبدالغنی انصاری خسرو شاہ نظامی

(واقع شاہ گنج حیدرآباد دکن)

یاقوتی محمد شاہی

معروف و مشہور مغل شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمال کی دوا جس کا نسخہ قطعی راز میں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے خاندان عالیہ انصاریہ میں (جو عہد سلطنت مغلیہ میں علاوہ منصب طبابت شہنشاہی کے عہدۂ جلیلہ ملکی ہفت ہزاری تک پر متفخر رہ چکا ہے) چلا آرہا ہے یہ نسخہ صرف والیان ملک و سارو امراء کیلئے مخصوص طور سے بنایا جاتا رہا۔ اگر اس کو ہر اعتبار سے علاوہ قطعی بے ضرر ہونیکے سرتاج و شہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار شاہدات کی بے لاگ کسوٹی پر ہر گز بیجا نہ ہوگا۔ یوں تو یاقوتی اور مفرحات سے طب یونانی کی قرابادینیں پٹی پڑی ہیں اور بعض تجارتی دواخانے مفرحات میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کرکے بدنام کنندۂ نکو نامے چند کے مصداق ہو رہے ہیں مگر یہ شہنشاہ پسند مفرح یاقوتی جسکو ایک جماعت اطباء و حکماء و فضلاء عصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا۔ اسکے اجزاء ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گراں مایہ کا مجموعہ ہیں اس کو مجدد طب علامہ لقمان الملک حکیم نابینا صاحب نے اپنے جدید طب کیمیاوی کے طریقہ سے اب اس درجہ مکمل فرما دیا ہے کہ یہ مفرح بغایت معتدل ہوگئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں کرتی ورق طلاو نقرہ۔ مروارید ناسفتہ لعل بدخشانی۔ یاقوت رومانی و یاقوت اصفر و کہربا زمرد تابناک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول اور بعید الطف بنا کر اس میں شامل کیا جاتا ہے اسی وجہ سے قلب و دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو حد درجہ تقویت پہنچاتی ہے اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو ہمہ صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے تھے کہ تقویت ہو اور باہ بھی بڑھے جسم و روح اور اعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اس درجہ تفریح اور ایسی ہیجان فرحت کمال کا حال پیدا کرتی ہے کہ باید و شاید۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے عجیب و غریب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب و غریب صفت ہے کہ بیمثل جوہر الجواہر یا جواہر مُہرہ کے پرانی سے پرانی عادت منشیات کو ترک کرا دیتی ہے۔ اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شرابی شوقینوں نے شراب ترک کر دی افیونیوں نے افیون ترک کر دیا اور دوسرے منشیات کے استعمال کرنیوالوں نے اس یاقوتی کو حرز جاں بنایا۔ یہ مفرح یاقوتی جسم کی تمام ارواح کو کمال درجہ تقویت بخشتی نشاط پیدا کرتی عمدہ اغذیہ کو جزو بدن بناتی ہے وہ لوگ جو گرم مقویات کھا کر پریشان ہوتے ہیں اور نہ جنکو سرد دوا موافق آتی ہو ان کے لئے یہ مفرح یاقوتی واقعی آب حیات سے کم نہیں ہے۔ بلا کسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کیلئے بہترین مقوی ہے بہرحال یہ یاقوتی ہر اعتبار سے ہمہ صفت موصوف ہے مگر صرف ایک صفت اس میں نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ حد درجہ بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اور روح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی ایک شاہی دوا ہے جو حضرات نمونتاً بھی اسکی چند خوراکیں نوش جاں فرما لیتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے اسکے والہ و شیفتہ ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گویا روح ادویہ ہے اس لئے اسکی مقدار خوراک حد درجہ قلیل ہے جو چاہے اس کا تجربہ یعنی عمل انالائزر کے بہت اچھی طرح جانچ سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مضر ادویہ ہر قسم کی سمیات مکاسات کشتہ جات سے قطعی پاک ہے۔

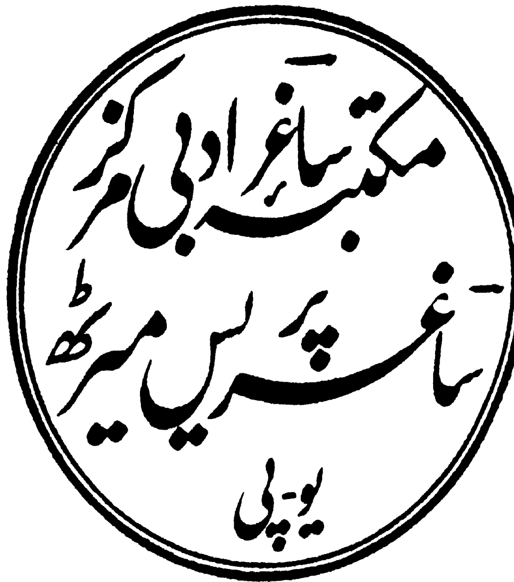
مقدار خوراک ۲ رتی سے ۸ رتی تک ہے۔ ۸ رتی سے زیادہ شاید ہی کوئی ذی آدمی برداشت کر سکے۔ قیمت فی شیشی جس میں ۲ ماشہ یہ شہنشاہی یاقوتی ہے (ﷲ) پانچ روپیہ۔

بدرقہ۔ کچا دودھ ۱۰ تولہ۔ گرم پانی ۱۰ تولہ قدرے شیرینی ملا کر۔

المعلن:۔ عبدالغنی انصاری منیجر انصاری دواخانہ نبیرۂ علامہ لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی

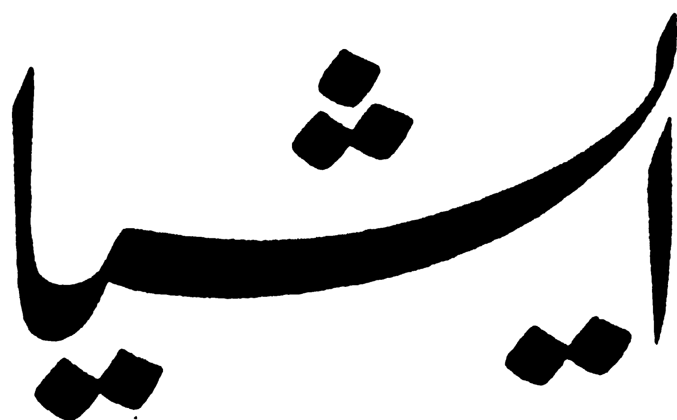
Asia Meerut

Registered No. A. 656



Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.


ایشیا

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ نے جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرما دی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں زندگی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گذری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں ناول میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ منہ سے بول رہا ہے کہ یہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے کہ انداز بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی۔ لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھُلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی نہیں "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر، تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھکر دلی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادر محترم آنریبل مسٹر فخر الدین علی احمد سابق ریونیو منسٹر (آسام) کے نام معنون کیا ہے شروع میں فخر الدین صاحب کی تصویر بھی شریک کتاب ہے۔ مینیجر

ملنے کا پتہ :- مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

"رسالۂ ادیب"۔ دہلی

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

حکومت صوبۂ بہار اور حکومت صوبۂ سی۔ پی (برار)

زیر سرپرستی

ڈاکٹر سیّد محمود

ایڈیٹر ——— ساغر

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)

(قیمت فی نمبر ۸ آنے)

قیمت سالانہ آٹھ روپے (دوسرے ملکوں سے)

(ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن)

فہرست مضامین الشیائی سنہ ۱۹۴۲ء

۲

ایشیا

نمبر۴	مئی ۱۹۴۲ء	جلد۷

فاشیزم اور ادب

موجودہ زمانہ کی کشمکش ——— فرد اور سماج کے تنازعہ کی تفسیر ہے یہ کشمکش کسی نہ کسی شکل میں تاریخ کے ہر دور میں جاری تھی۔ فرد کی یہ تمنا کہ ہر ممکن طریقہ سے اپنی خواہشات کی تکمیل کرے اور سماج کی یہ سعی کہ انفرادی جدوجہد کو جائز حدود تک محدود کر دے ——— ان دونوں نظریوں میں کشمکش یہیں سے پیدا ہوئی ہر مذہب اور فلسفہ کی بنیاد یہیں شروع ہوتی ہے جائز حدود کا تعین کون کریگا، یہ حکمراں طبقہ کا کام قرار پایا اور یہ کام حکومت کے آلہ سے لیا جانے لگا۔

فوج، پولیس، قانون ——— یہ سب فرد کو جائز حدود کے اندر رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

غرض یہ کشمکش بہت عرصہ تک جاری رہی۔ سماج کے نام حکمراں طبقہ فرد پر طرح طرح کے بندھن لگاتا گیا ان میں سب سے بڑا بندھن روح کا تھا اور روح کا چوکیدار کلیسا تھا۔ کامیاب اور وسیع پیمانہ پر اس روحانی تجدید کے خلاف یورپ میں تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کا نام نشاۃ ثانیہ (Renaissance) ہے۔

نشاۃ ثانیہ کا دور قدیم و جدید زمانے کے درمیان ایک سنگ راہ ہے۔ تاریخ میں پہلی بار بیچارے فرد کو کسی نہ کسی حد تک اپنی قسمت کے فیصلے کا حق ملا۔ گو یہ حق بہت محدود تھا تاہم وہ سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا جس پہ انقلابِ فرانس کی عمارت کھڑی ہوئی۔

انقلابِ فرانس سے لے کر گذشتہ جنگ تک کا دور انفرادی آزادی کا دور کہا جا سکتا ہے ——— عملی طور پر نہیں تو نظریاتی طور پر۔ امریکہ اور یورپ میں ہر طرف انسانیت پروری اور لبرلزم کی ہوائیں چلنے لگیں۔ سماجی جبر کے ردِ عمل کے طور پر اب سب کا عقیدہ یہ ہو چلا کہ اگر ہر فرد کو اپنی صلاحیت اور مرضی کے مطابق زندہ رہنے دیا جائے تو ساری دنیا میں مسرت کی فراوانی ہو جائے گی۔ لیکن عملی طور پر یہ آزادی محض نام نہاد تھی۔ جب تک سماج ۴۴ کے اقتصادی ڈھانچہ میں استحصال کا عنصر موجود تھا سیاسی اور معاشی خود مختاری کی بھلا کیا قیمت تھی۔ جب کسی کو تعلیم کی برکت میسر نہ ہوئی ہو تو وہ ووٹ کا پرچہ لے کر کیا کرے۔ اور خیر کلچر کوئی ایسی سستی شے تو نہیں کہ دن رات محنت کرنے والا مزدور اس سے فیض مند ہو سکے۔ لیکن لبرلوں نے یہ کہہ کر تکیہ کر لیا کہ اگر آپ امیر ہیں تو آپ کو اپنی امارت بڑھانے کی آزادی ہے اور کوئی غریب تو اسے فاقہ کرنے کی آزادی ہے۔ اس نام نہاد آزادی نے فرد اور سماج کی کشمکش کو اور بھی بھڑکایا۔ سماج کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اور ہر شخص محسوس کرنے لگا کہ اس فرسودہ نظام کو بدل کر ایک ایسی دنیا تعمیر کی جائے جس میں آزادی اور پابندی کا تخیل فرد اور جماعت دونوں کے لئے بھلائی کا باعث ہو۔

مختصراً یہ ہے پس منظر اس جدوجہد کا جس نے سوویٹ روس کی اشتراکیت اور درمیانی یورپ کے فاشیزم کو جنم دیا۔ ان دونوں میں یہ امر مشترک ہے کہ وہ فرد کے حقوق پر جماعت کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور کیونکہ

حکومت جماعت کی نگہبان ہے لہٰذا فرد حکومت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن دونوں نظاموں کے مقاصد میں مشرقین کا فرق ہے۔ سوویٹ نظام فرد پر جو پابندیاں لگاتا ہے اُن کا انداز اصلاحی ہے اور مقصد یہ ہے کہ فرد سرمایہ دارانہ ذہنیت کی کدورت کو دھوکر انفرادیت کی معراج کو پہونچ سکے۔ یہ ویسی ہی پابندی ہے جو طبیب بیمار پر لگایا کرتا ہے۔

لیکن فاشیزم فرد کو ہمیشہ کے لئے جماعت یعنی حکومت یعنی حکمراں طبقہ یعنی سرمایہ دار کا غلام بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور اس غرض سے اُس کے ذہن و احساس کو بھی فنا کر دینا چاہتا ہے۔

ہم کلچر اور ادب کے خادم ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جب یہ سارے سیٹھ ساہوکار مر جائیں گے تو مفلس شاعروں کے گیت اور نادار مصنفوں کے افسانے زندہ رہیں گے۔ اس لحاظ سے ہم صرف اس نظام کے حامی ہیں جو انفرادیت کو اس طرح فروغ دینا چاہتا ہے کہ وہ حُسن و حقیقت دونوں کی خدمت کر سکے اور یہی شعر و ادب کی جان ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ فاشیزم ان سب اقدار کو یکسر مٹا دینا چاہتا ہے جن سے اعلیٰ قسم کا آرٹ پیدا ہوتا ہے۔ جب جرمنی کے قید خانوں سے دنیا کے بڑے بڑے آرٹسٹوں کی کراہ سُنائی دیتی ہے۔ جب دنیا کے تمام پُرانے اور نئے آرٹسٹ وہاں مردود قرار دئے جاتے ہیں — تو ہم نازیزم اور فاشیزم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اگر ہمارا قلم اس کارزار کے موقع پر ان لعنتوں کی مخالفت میں مصروف نہ ہو تو ہم کلچر اور آرٹ سے غداری کریں گے۔

یہ وہ جذبات تھے جنھیں لے کر ہم دہلی کی آل رائٹرس کانفرنس میں گئے۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے اینٹی فاسسٹ مصنفوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں۔ اِن کا کوئی متحدہ محاذ قائم کریں۔ یہ کام کرنے کا تھا اور گو کہ یہ کانفرنس — کانفرنس کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نہ رہی بہرحال داغ بیل تو پڑ گئی۔ ہم خیال لوگوں میں جاگ تو پڑ گئی۔ اچھا ہوتا اگر کانفرنس کے منتظم جلدی نہ کرتے۔ لوگوں کو مہلت دیتے۔ بحث طلب مسائل کو گشتی چٹھی کی صورت میں تقسیم کرتے۔ لیکن کانفرنس کرنے میں اتنی جلدی کی گئی کہ باہر کے بہت لوگوں کو جواب دینے کا بھی موقع نہ ملا۔ علاوہ بریں اتنی اہم کانفرنس کی تشکیل نہایت باقاعدگی سے ہونا چاہئے تھی۔

بہرحال غنیمت ہے کہ ادیبوں نے کروٹ تو لی، کچھ تو ہو،

ہم کانفرنس کے منتظموں کو اب بھی یہ صائب مشورہ دیں گے کہ زیادہ وسیع النظری سے کام لیں۔ مقاصد کی بلندی کے اعتبار سے دل و نگاہ کو بھی بلند رکھا جائے تو کیا اچھا ہو۔ ایک تو یہ کہ کانفرنس کسی لحاظ سے نمائندہ نہ تھی باہر تو باہر خود دہلی کے بہت سے ہمدرد مصنف شامل نہ تھے۔ وجہ جو بھی اس سے بحث نہیں۔ لیکن اگر آگے کام چلانا ہے تو کیا اُن کے تعاون کی ضرورت نہیں اگر ہے تو پھر ( ) کو صرف حاضرین سے یہی کیوں پُر کر دیا گیا اور ان حاضرین میں صرف "انجمن ترقی پسند مصنفین" اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ہی حضرات کیوں تھے۔ یہ حلقہ زیادہ وسیع کیوں نہ کیا جائے؟

یہ چند نکات برادرانہ مشورہ کے طور پر ہیں کسی کو ہماری نیک نیتی پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایشیا کسی بیل کی تمنا کئے بغیر ترقی پسند تحریکوں کی حمایت اور فاشیزم کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے۔

ہماری خواہش صرف یہ ہے کہ کیونکہ مختلف زبانوں اور اسکولوں کے مصنفوں کے ملنے کے ٹھکانے کم ہیں اس لئے جب کبھی اس قسم کی کوئی تحریک شروع ہو تو اسے زندہ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

دنیا اور ہندوستان کی نجات اسی میں ہے کہ فاشیزم اور اس کے تمام عناصر فنا ہو جائیں۔ ہم سب کو اس جنگ میں حصّہ لینا ہے، فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے اور نہ کوئی فصیل پر بیٹھ سکتا ہے۔

ادارہ

نئی صبح

پنڈت جواہرلال نہرو کی شہرۂ آفاق کتاب

جگ بیتی

دُنیا کی تاریخ سنین وسلاطین کی فہرست کا نام نہیں ہے نہ مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج وزوال اور تاج وتخت کے لئے زورآزمائی کرنے والوں کی باہمی کشمکش کو تاریخ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دراصل تاریخ نام ہے افراد کے ذہنی ارتقاء کا۔ جماعتی نظام کی تنظیم کا۔ تہذیب وتمدّن کے اصولوں کی تدوین کا اور علوم وفنون کی ترویج کا۔ پھر تاریخ کا دائرہ کسی ایک ملک یا قوم کے حالات تک محدود نہیں ہوتا۔ اسکے پیش نظر تمام ممالک اور تمام اقوام ایک سلسلے میں منسلک ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور متاثر کرتے ہیں۔

جگ بیتی میں پنڈت جواہرلال نہرو نے انھی اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے اور تمام مختلف زمانوں میں تمام ممالک اور تمام اقوام کے خاکے پیش کرکے دُنیا کی ایک یکجائی تصویر کھینچی ہے۔ اس لئے ان کی یہ کتاب ہندوستان کے تاریخی ادب میں ایک جدّت ہے ایک تنوع ہے جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔ ۱۰

سیاسی مصروفیتوں کے باوجود پنڈت جی کا وسیع مطالعہ اور غیرمعمولی غور وفکر کی عادت اس کی متقاضی تھی کہ جگ بیتی جیسی تصنیف منظرِعام پر آئے۔ چنانچہ ان خطوط کی شکل میں جو پنڈت جی نے جیل سے اپنی لڑکی کے نام لکھے۔ یہ کتاب اہل ذوق کے ہاتھوں میں پہنچی گی۔ اب مکتبۂ جامعہ نے محمود علی خاں جامعی سے سلیس اُردو میں ترجمہ کراکے پیش کرنے کا فخر حاصل کیا ہے۔ قیمتِ جلد اوّل ۳ سے،

مکتبۂ جامعہ دہلی۔ قرولباغ

شاخیں:۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

(ادبی مرکز میرٹھ سے بھی مل سکتی ہے)

(۱) جوش ملیح آبادی

(۲) ساغر نظامی

مشاہیر شعرائے اُردو کا فلسفۂ حیات

ہو سکتا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ملک کو مختلف قسم کی شکایتیں ہوں، لیکن کچھ عرصہ سے اس نے اپنی تقریروں کے معیار کو کافی بلند کیا ہے، دلّی سے آج کل ادبی، علمی اور حکیمانہ مسائل پر جو تقریریں ہو رہی ہیں، وہ اپنی رنگا رنگی، افادیت، زبان اور ادب کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو دہلی نے جو .... اور اُردو کے مشاہیر شعرا کو دعوت دی کہ وہ دُنیا کو بتائیں، زندگی ان کی نظر میں کیا ہے؟ وہ حیات کے متعلّق منفی نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں یا اثباتی!؟ یا محض یونہی، چنانچہ اس سلسلے کی کچھ تقریریں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے جوش ملیح آبادی و ساغر نظامی کی تقریریں اس نمبر میں شائع کی جاتی ہیں۔

"ادارہ"

11

(۱) جوش ملیح آبادی

میرا فلسفۂ حیات

یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ پندرہ منٹ کی سی بے حقیقت مدت کے اندر سمیٹا نہیں جا سکتا۔ بہر حال کوشش کروں گا کہ مجمل طور سے اپنے مفہوم پر کسی قدر روشنی ڈالوں۔

انسانی ذرائع اور انسانی ذہن دونوں ابتک اس درجہ تشنہ و محدود ہیں کہ بیسویں صدی کے اس نسبتاً ترقی یافتہ دور میں بھی زندگی ایک دردناک عذاب بنی ہوئی ہے۔ کیا داخلی اور کیا خارجی دونوں حیثیتوں سے انسان ابتک افسردہ و بیمار ہے۔ ہم مسرتوں کے حاصل کرنے کے واسطے دوڑتے ہیں۔ لیکن اس تمام دوڑ دھوپ اور عرق ریزی کے بعد آخر کار جس شے کے پانے میں ہمیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ وہ غم اور صرف غم ہے۔ امیدیں ہر صبح ہم کو جگاتی اور ناامیدیاں ہر رات کو ہمیں سُلاتی ہیں۔

تمنائیں جگاتی ہیں تو ناکامی سلاتی ہے — نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی
لڑکپن صدمۂ بیتاب تھا جوانی دل کو روتی ہے — نہ جب آرام تھا ساقی نہ اب آرام ہے ساقی

ہماری اس ناکامی و نامرادی کا سبب ایک طرف تو یہ ہے جیسا میں بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے ذرائع اور ذہن دونوں ابتک محدود ہیں۔ اور دوسری طرف چونکہ ہم ابتک انسانیت کے مجموعی تقاضوں کی جانب اعتناء کرنے کے خوگر نہیں ہوئے ہیں اور صرف اپنے انفرادی حاجات و مقتضیات تک

ہماری نظر محدود ہے۔ اس لئے ہمیں اس زندگی میں دُکھ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاید اپنے انفرادی حاجات و مقتضیات سے ہم کبھی آزاد نہیں ہو سکینگے لیکن انسانی نفسیات پر نظر رکھنے والے اس خیال کے قائم کرنے میں قطعی حق بجانب ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد ہماری انفرادیت اس قدر وسیع ہو جائے گی کہ عالمِ انسانیت کے مجموعی تقاضے عین ہمارے انفرادی تقاضے بن جائینگے۔

لیکن اس وقت تک تو انسانی دُنیا کی حالت نہایت خستہ و خراب ہے اور اس وقت ہماری زبوں حالیاں اور بھی شدید ہو جاتی ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے غموں ہی کا مآل غم نہیں ہوتا۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا۔ تو شاید ہم کچھ نہ کچھ اپنے کو تسلّی دے لیتے۔ لیکن بڑی بے پایاں دردمندی تو یہ ہے کہ ہماری مسرّتوں کی تان بھی غم ہی پر ٹوٹتی ہے۔ اور ہماری وقتی مسرّت جس قدر شیریں ہوتی ہے اس کا پیدا کردہ غم اتنا ہی دیرپا اور تلخ ہوا کرتا ہے۔

ہمیں کبھی کبھی یہ زندگی تھوڑی دیر کے واسطے فرشِ گل پر چلنے کا موقع دیتی ہے۔ اور وہ صرف اس لئے کہ ہمیں فرشِ گل کا خوگر بنانے کے بعد کانٹوں پر چلائے۔ اور اس وقت ایک طرف تو کانٹوں کی تکلیف ہمیں زیادہ محسوس ہو اور دوسری طرف پھولوں کی یاد میں ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ یعنی ایک طرف تو ہمارا جسم فگار ہو اور دوسری طرف ہمارے دل کے ٹکڑے اُڑ جائیں۔

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کیلئے
طالبانِ عیش سے کہدوں تو اُڑ جائیں حواس کس قدر رویا ہوں میں اک مسکرانے کیلئے

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ابتک تو اس زندگی میں اگر کوئی ٹھوس حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ غم اور صرف غم ہے۔ رباعی

کہتے ہو کہ مُنہ آنسوؤں سے تر نہ کروں
غم ٹھوس حقیقت ہے یہ باور نہیں کروں
بیکار ہے ہائے ہائے کرنا لیکن
انسان ہوں ہائے ہائے کیوں نہ کروں

بیشک اس وقت تک انسانیت پر مسرّت کا صحیفہ نازل نہیں ہوا ہے۔ اور اب تک جس شے کو مسرّت کہا جاتا ہے وہ صرف ایک وقفۂ غم کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب ہم پر غم کا ناقابلِ برداشت حملہ رُک جاتا ہے تو اس وقفۂ مختصر کو ہم خوشی کے نام سے پکارنے لگتے ہیں حالانکہ وہ صرف ایک گونہ تسکین اور ایک وقتی رُستگاری ہوتی ہے۔ جسے خوشی کا لقب نہیں دیا جاسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اس دردناک حقیقت کا جو افراد مطالعہ کرتے ہیں وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو حیات کی اس دردمندی کو دیکھ کر سپر انداختہ ہو جاتا ہے۔ مایوسی اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اسکے ہات پاؤں ڈھیلے دل زخمی اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں اور یہی وہ گروہ ہے جسے ہم 'قنوطی' کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور دوسرا گروہ ان دردمندیوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن سپر انداختہ نہیں ہوتا۔ ہر چند یہ گروہ بھی سمجھتا یہی ہے کہ ہم اس دردمندی پر فتح حاصل نہیں کرسکتے۔ لیکن وہ اس سے مغلوب ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔ اور اپنے کو فریب مسرّت میں مبتلا کر دینے کی خاطر ایسے رنگین مشاغل میں خود کو غرق کر دیتا ہے۔ کہ ضرباتِ غم سے نسبتاً بہت کچھ محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس گروہ کو ہم 'رجائی' کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ رجائیوں کے مقابلہ میں 'قنوطی' گھاٹے میں رہتا ہے 'رجائی' اس دورو زہ حیات کے کچھ نہ کچھ مزے تو اُڑا لیتا ہے۔ لیکن بیچارے 'قنوطی' کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔

لیکن جہانتک زندگی کی دوڑ میں حصّہ لینے کا تعلق ہے قنوطی ہوں کہ رجائی دونوں گروہ اس شرفِ عظیم اور اس سعادتِ کبریٰ سے قطعی محروم رہتے ہیں۔

میں نے زندگی کی دوڑ میں حصّہ لینے کو سعادتِ کبریٰ کہا ہے، ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ آپ جسے سعادتِ کبریٰ کہتے ہیں سعادتِ کبریٰ تو بڑی چیز ہے۔ میں اُسے ایک مہمل خود آرائی سے زیادہ کوئی مرتبہ نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ زندگی جبکہ آلام سے بھری ہوئی ہے۔ جبکہ غم ہی کی نہیں خوشی کی تان بھی غم ہی پر ٹوٹتی ہے اور جبکہ ہر عمل کا خواہ وہ کتنا ہی شائستہ کیوں نہ ہو۔ ایک دردناک ردِّ عمل ہوا کرتا ہے۔ تو کیا ہم اتنے دیوانے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں حصّہ لیکر اپنا وقت برباد اور اپنی قوّت کو تباہ کریں۔ اور کیا یہ عاقلانہ روش نہیں ہے کہ یا تو ایک آہ سرد بھر کر ہم زندگی سے مایوس ہو جائیں یا ساز اُٹھا کر اس طرح الاپیں کہ تمام غموں کو بھول جائیں۔

لیکن جو شخص بھی خواہ وہ کتنی وجاہت رکھتا ہو۔ ایسے کم بینی کے کلمات زبان سے نکالے گا۔ ہم بجا طور سے اُسکے متعلق یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جائینگے کہ وہ دُنیا کے مزاج، انسانی فطرت اور انسانی عزائم کی وسعت اور ارتقاء

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۲ء

کے قانون سے قطعی طور پر بیگانہ ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تک انسانیت دردمند ہے اور ہم مسرّت کے حصول کی جد و جہد میں بالآخر غم ہی سے دوچار ہو رہے ہیں لیکن اسکے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ صورتِ حال ازلی اور ابدی ہے اور ایسی کہ اس سے رُستگاری حاصل کی ہی نہیں جاسکتی ہے ۔

غور کرنا چاہئے کہ اس کرۂ خاکی پر حیات کو رونما ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور اس منزل پر ہم غموں کو کیونکر فتح کر سکتے ہیں جب کہ انسانیت ہنوز طفلی کے عالم میں ہے اور اُس کی عمر نو دس برس سے زیادہ نہیں ہے ۔

لیکن یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ روز بروز ہم غم سے دور اور خوشی سے قریب ہوتے چلے جارہے ہیں اور ہماری یہ فطری اور مسلسل رفتار اس بات کا یقین کرنے پر ہمیں مجبور کرتی ہے ۔ کہ ایک نہ ایک دن ہم تمام مکروہات و آلام سے نجات حاصل کرکے زیادہ سے زیادہ مسرّت کی زندگی بسر کرینگے ۔ اور یہ مسرّت کی زندگی ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں حالتوں کا احاطہ کرے گی ۔

یہ وہ منزل ہوگی جبکہ ایک طرف تو ہمارے مزاج اور عادات و اطوار بدل جائینگے اور اشیائے مادّی و ذہنی کی معروف قدریں تبدیل ہوجائینگی ۔ اور دوسری طرف اس عالم کے تمام قوائے کارفرما کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر انہیں ہم اشاروں پر نچانے لگیں گے ...

اور جبکہ ہمارا مستقبل اس قدر شاندار اور یقینی طور سے شاندار ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم انسانیت کی اس جنگِ عظیم اور ارتقاء کے اس جہادِ اکبر سے بزدلوں کی طرح بھاگ کر کسی گوشۂ خلوت یا محفلِ عشرت میں جاکر چھپ جائیں ۔

اس کے علاوہ جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آج جو یہ مادّی و ذہنی نعمتیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ہمیں حاصل ہیں وہ تمام کی تمام ہمارے بزرگوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہیں ۔ جنہیں وہ ہمارے واسطے ایک مبارک وراثت کے طور پر چھوڑ گئے ہیں اور اسکے صاف و صریح یہ معنی ہیں کہ ہم اپنے خاموشی کے ساتھ احسان کرنیوالے بزرگوں کے مقروض ہیں ۔ اور اسقدر کہ ہمارا بال بال قرض سے گندھا ہوا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ ہر اچھے شہری اور ہر بھلے آدمی کا یہ ایک شریفانہ کارنامہ ہے کہ وہ اپنا قرض پائی پائی ادا کردے ۔ اور وہ قرض صرف اس واحد شکل سے ادا کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے ہمیں آگے بڑھایا ہے اسی طرح ہم بھی اپنی آئندہ نسلوں کو کچھ آگے بڑھا کر مریں ——

اور اگر ہم اس مقدّس فریضے کے ادا کرنے میں کوتاہی کرینگے تو ہماری موت ایک بد دیانت مقروض کی موت ہوگی ۔ اور کیا کوئی شریف اور خوددار انسان ایک بد دیانت مقروض کی موت کا ننگ گوارا کرسکتا ہے ؟ ۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ابھی تک ہوا ہی کیا ہے ۔ ابھی تو ہمیں بہت کچھ کرنا ہے ۔ ابھی تک تو ہم اپنے چھوٹے چھوٹے غموں اور معمولی عناصر یہاں تک کہ خاک کے ایک بظاہر حقیر ذرّے تک پر قبضہ نہیں کرسکے ہیں ۔ حالانکہ ہمارا پروگرام بہت ہی بڑا اور نہایت ہی پیچیدہ ہے ۔ ہمیں ہر فرد کو اسکی اطلاع دے دینا چاہئے ۔ کہ ابھی ہمیں بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں ۔ بڑے بڑے ہفت خواں طے کرنا ہیں ۔ صدیوں اور قرنوں تک پسینہ بہانا اور جانیں کھپانا ہے ۔ جھوٹے رسم و رواج سے لڑنا ہے ۔ عقائد و اوہام کو مٹانا ہے ۔ تندرست خیالات اور بلند افکار کی تخم ریزی کرنا ہے ۔ دہشت انگیز بوں ۱۲۳
اور خون ریزیوں کا سدّباب کرنا ہے ۔ بیماریوں اور وباؤں کو فنا کرکے شباب کو قائم کرنا ہے ۔ اور شباب کو قائم کرکے ہیبت ناک موت کو موت کے گھاٹ اُتارنا ہے اور پھر اُلوہیت کے تاج کو پیشانی پر کج کرکے اس سرکش ستارے اور دوسرے کُروں پر اپنا پرچم لہرانا ہے ۔

ممکن ہے ، اور ہندوستان میں تو ممکن ہی نہیں ۔ گمان غالب ہے کہ لوگ میرے ان بلند عزائم اور درخشاں امیدوں پر مسکرائیں اور ارشاد فرمائیں کہ یہ شاعر تو شیخ چلی کی سی باتیں کرنے لگا ہے ۔ کہاں ضعیف انسان اور کہاں تسخیرِ کون و مکاں ۔ میں ایسے تمام حضرات کی خدمت میں صرف اسی قدر مشورہ دونگا کہ وہ براہِ معارف نوازی ۔ اپنے مطالعے اور مشاہدے کو بڑھائیں ۔ نظر کو وسیع اور تفکر کو عمیق بنائیں ۔ انسان کی فطرت اور انسان کے عزائم تیز ارتقاء کی رفتار اور زمانے کے قرائن و آثار پر نگاہ ڈالیں ۔ اگر وہ میرے مشورے پر عمل کرینگے ۔ سو فی صدی میرے ہم خیال و ہم نوا ہوجائینگے ۔ ورنہ میرے پاس ان کے تمسخر و تبسم کے مرض کا کوئی علاج نہیں ہے ۔

ہاں تو ہمارے سامنے اس قدر وسیع اور اسکے ساتھ ساتھ اس قدر دشوار

کام ہے کہ ہم نہ تو قنوطیوں کی طرح رونے میں وقت ضائع کر سکتے ہیں اور نہ رجائیوں کی مانند ہر وقت کے رامش و رنگ ہی کیلئے وقت نکال سکتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں گروہوں کے بین بین زندگی بسر کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ابھی ہمیں بڑے بڑے معرکے سر کرنا ہیں۔ لیکن اس حکیمانہ نکتے کو بھی پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ہمیں اپنے کو اس قدر تھکانا بھی نہیں ہے کہ چار دن کام کرنے کے بعد ہمارے قوائے عمل و ذہن اور ہماری صحت برباد ہو جائے۔ ہمیں بیشک کام کرنا اور ایک جاں باز سپاہی کی طرح پوری کاوش اور سرگرمی سے کام کرنا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہر روز چند گھنٹے رجائیوں کی سی زندگی بھی بسر کرنا ہے۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ ہر صبح کو ہم تازہ ہمت اور بلند تر ولولوں کے ساتھ دن کی محنت کے واسطے تیار ہو جائیں۔ کام کرنا مستعدی اور سنجیدگی سے انسانیت کو آگے بڑھانا۔ کوئی شک نہیں ہمارا تنہا فریضہ ہے لیکن ہر وقت کام کرنا اور ہر آن سنجیدہ رہنا اپنی ذات کے ساتھ ایک خطرناک مسخرگی ہے۔ اس لئے ہمیں زیادہ کام کر سکنے کی خاطر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم اپنی ذات کے ساتھ خطرناک قسم کا مسخراپن نہیں کرینگے۔ دن کے وقت ہم ایڑی چوٹی کا پسینہ بہائینگے۔ اور رات کو جب تاریکیوں کے دامن دراز ہو جائینگے اور ستاروں کی خنک روشنی ہمارا احاطہ کریگی تو ہم بچوں کی طرح خوشیاں منائیں اور فراغت و مسرت کے دریا بہائینگے۔ اور

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

پر عمل کر کے اس شریر ستارے کو جسے کرۂ ارض کہتے ہیں۔ اپنے قدموں پر جھکا کر نعرہ لگائینگے۔ کہ ؎

میں اور ڈروں صولتِ دُنیائے دُنی سے
خود لرزہ بر اندام ہے دُنیا مرے آگے

دن کو اگر کوئی ہم سے رنگ رلیوں کی باتیں کریگا تو ہم اسے انسانیت کا دشمن یا کم سے کم جاہل سمجھ کر اس کی طرف سے مُنہ پھیر لینگے لیکن اگر رات کو کوئی ہم سے محنت یا سنجیدگی کا مطالبہ کریگا تو اسکی کم بینی اور خفتِ عقل پر قہقہے مارینگے ؎

آپ آرائش بھی کرتے ہیں مناسب وقت کی
دن کو مُنہ دھویا گیا زلفیں سنواریں رات کو

ساغر نظامی (۲)

زندگی میری نظر میں

زندگی اور میں اچانک صبح سے پہلے بیدار ہو گئے۔ مجھے اور اسے ابھی دن چڑھے تک سونا تھا۔ مگر کچی نیند میں ہم دونوں ان کم سن خانہ بدوشوں کی طرح جاگنے کیلئے مجبور ہو گئے جن کی حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی۔ کون رہرو ہے اور کون رہبر یہ بھی ہوش نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وجود کے مُبہم دُھندلکے میں چست و چالاک دو سایہ کائنات کے بام و در پر چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

امید اور ناامیدی۔ روشنی اور تاریکی۔ خیر و شر۔ دھوپ اور چاندنی۔ کفر و ایمان۔ ہار اور جیت۔ یعنی ہر وہ منزل جو انسان لاکھوں سہارے لیکر طے کرتا ہے۔ میں نے براہِ راست زندگی کے سہارے طے کی۔ دُنیا کے طویل سفر میں زندگی ہی میرا سفر تھی۔ اور زندگی ہی ہمسفر۔ رہزنی اور رہبری۔ آبادی و بربادی کے جتنے تجربے تھے زندگی ہی ان کا معمول تھی۔ اور زندگی ہی ان کی عامل۔

ہمارے علم کی تمام تر اساس تجربات پر مبنی ہے۔ آپ کو اصرار ہے تو ہو۔ میرے خیال میں فطری تصورات۔ تجربات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے اس لئے جتنے اصول اور کُلیے ہیں وہ تمام تر تجربات کی پیداوار ہیں۔ میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں زندگی اندھیری رات ہے اور تجربہ نورِ سحر۔ ذہن تاریک کوٹھڑی ہے اور مشاہدات و تجربات شعاع نور۔

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۲ء

مشاہدے اور تجربے سے پہلے انسانی ذہن ہر قسم کے نقوش اور تصوّرات سے اسی طرح محروم ہوتا ہے جس طرح بیج ڈالنے سے پہلے بنجر زمین کچھ محرّکات انسان کے احساس و شعور پر خارج سے پڑتے ہیں اور اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ تصوّرات ہیں جو ذہنی افعال کے نتیجوں کی صورت میں مترتب ہوتے ہیں۔ اصل میں وہ محرّکات بھی جو ہمارے احساس و خیال پر اثر ڈالتے ہیں ہمارے تصوّرات ہی کا عکس ہیں۔

جس وقت میں نے آنکھ کھولی۔ زندگی اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ تہذیب و تمدّن۔ قدیم و جدید نظریے۔ اصول اور فلسفے علوم و فنون ترقی اور تکمیل کا بڑا حصہ زندگی کو مل چکا تھا۔ غرضیکہ کائنات سجی سجائی۔ ہزاروں سال کی روائتوں کی امانت لئے منتظر تھی۔ میں دُنیا کے غم سے واقف تھا نہ مسرّت سے۔ ناکامی کو جانتا تھا نہ کامیابی کو۔ عشق کو پہچانتا تھا نہ ہوس کو۔ جنگ کو سمجھ سکتا تھا نہ صلح کو۔ ہار سے واقف تھا نہ جیت سے۔ زندگی کے کارزار میں میرا داخلہ اس غیر مسلح نوجوان کی طرح ہوا جو میدانِ جنگ میں کسی ریلے کے ساتھ اتفاقیہ داخل ہو جائے۔

میدانِ جنگ کی پہلی ضرورت نہ شاعری ہے نہ حکمت۔ نہ بیم ہے نہ رجا۔ یاس ہے نہ اُمید۔ نہ زندگی کا تاریک رُخ ہے نہ روشن پہلو۔ اسکی پہلی اور آخری ضرورت صرف اپنا بچاؤ ہے اور اپنا بچاؤ والہانہ خود اعتمادی کے بغیر ممکن نہیں۔ ٹکراؤ کی جنون انگیز قوّت۔ تصادم کی بے پناہ طاقت۔ یہ ہیں وہ جوہر جو خودی کے روپ میں انسانی فطرت کی رہنمائی کرتے ہیں۔

زندگی میں سب سے پہلے مجھے اپنے انہیں اچھوتے تصوّرات سے واسطہ پڑا۔ خاص کر مقابلے اور تصادم کی رَو سے۔ یہ رَو "مشیّت" کے مقابلے میں مجبور سہی۔ مگر زندگی کا پہلا اور آخری بھید ہے۔ مقابلے کی بڑھتی ہوئی قوّت۔ پنپنے کی مچلتی ہوئی آرزو۔ اور آگے بڑھنے کی سیلابی خواہش۔ انسان کو فریب۔ جوش اور جنون میں اُلجھا دیتی ہے۔ مجھ پر بھی اس نے اپنا جال پھینکا۔ اور مدّتوں پھُسلاتی رہی "تو سب سے بلند ہے تو کامل آزاد ہے۔" مجھے بلندی کا یقین ہو گیا۔ میں نے خود کو آزاد جان لیا۔ یہ احساسات شباب پر پہنچے۔ سنہرے پیلے تصوّرات دل سے دور لرزتے رہے افسردگی اور جوانی کا ساتھ ہے۔ کبھی کبھی غمگین جذبات دل میں جاگتے۔ مگر "نا اُمیدی" انسانی زندگی کے جسم کا گھن۔ یہ گھن مجھے کبھی نہیں لگا۔ جب یہ ناگن میری طرف بڑھی۔ خودی کے نامحسوس جذبے نے اس کا سر کچل دیا۔

میں ایک ایسا جہاز تھا جو ساحل سے لنگر اُٹھاتے ہی طوفان میں گھر جائے۔ ابر و باد کی یورش میں ملاّح بڑے بڑے نظریوں اور فلسفوں پر غور نہیں کرتے۔ مقابلہ کی قوّت کو استوار کرتے ہیں۔ جاتے ہوئے حوصلوں کو مضبوط بناتے ہیں۔ زندگی اور موت سے بلند ہو کر وہ اس مقصد کیلئے اپنی ہستی سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔ جس مقصد کو لئے کر وہ ساحل سے روانہ ہوئے تھے۔

یہی ہے زندگی کا وہ محور جس پر زندگی کے چلنے اور رُک جانے کا دارومدار ہے۔ یہ محور جو امید اور مقصد کی بُنیاد پر زندگی کو گردش دیتا ہے دائروں کو بڑھاتا چلا گیا۔ آس پر یاس خندہ زن ہوئی۔ مقصد کے سامنے نتیجوں کی آرزوئیں ہاتھ پھیلائے۔ ناکامیوں نے کامیابیوں کا راستہ گھیرا۔ نئے واسطے ہوئے اور انوکھے رابطے۔ لیکن کامیابی اور ناکامی مقصد سے افضل ہیں۔

خود یہ اُلجھ کے رہ گئی میرے جنوں کے دام میں ۱۵
میرا جنوں نہ دب سکا گردشِ روزگار سے

مجھے "اندھی مشیّت" کا علم نہیں تھا۔ "زندگی" اندھی مشیّت کی انجان حرکت ہے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ مگر آدم کی مجبور و مقہور نسل کے لئے جو نسخہ المانوی حکیم شوپنہار نے تجویز کیا تھا۔ وہ میری گھٹی میں گھولا ہوا تھا۔ میں اپنے انفرادی ارادوں کو مٹا کر مشیّت کو ہرانے کی کوشش میں کیوں جان گنواتا۔ میں کائنات اور انسان کے حُسن پر مٹنے کیلئے کسی حکیم کا محتاج نہیں تھا۔ میں تو حُسن کے لہریاتے سمندر ہی میں پیدا ہوا۔ مجھے کیف خود اپنے میکدہ سے ملا۔ دُکھ سُکھ کی قیدوں سے آزاد اک سرور۔ کامیابی و ناکامی۔ رنج و راحت۔ ہار جیت۔ مجھے ان سپنوں کو یاد رکھنے کا ہوش ہی کب تھا۔ کیونکہ میرے جینے کے لئے یہ فریب کافی تھا۔ "میں سب کچھ ہوں" اور "سب کچھ کر سکتا ہوں۔" لیکن زندگی اپنے محور پر اور تیزی سے گھومی۔ نقاب چہرہ سے گرنے لگے۔ مُسکراتی ہوئی تازہ و شاداب لڑکی کا مکھڑا بھیانک ہو گیا۔

مشاہدہ کی یہ منزل۔ نئی منزل تھی۔ مضبوط اور سرکش حواس کے قلعے ہل گئے حقیقتوں نے اپنی گج گجی باہیں ڈالدیں۔ دُکھ سُکھ کی سچی قدریں معلوم ہوئیں

پہلی مرتبہ زندگی میں تلخی اور کمزوری کا احساس ہوا۔ انسانی روح کی بے بسی اور نفسیاتی مجبوری سوئیاں چبھونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے ایک تاریک و دبیز دیوار آکھڑی ہوئی۔ پہلی بار تمام تر جسمانی و روحانی قوتیں جی چھوڑتی ہوئی دکھائی دیں۔ زندگی مصیبتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ نظر آنے لگی۔ احساس وخیال آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ شاید یہ سچ بھی ہے کہ دُنیا کی تعمیر ہی اس انداز سے ہوئی ہے۔ ہر انسان اپنی تمام آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ناکامی اٹل ہے تو دُکھ بھی اٹل ہے۔

زندگی بھی اصول و قوانین کی ایک معین حد تک پابند ہے لیکن نفسیاتی و اخلاقی خاص کر معاشی و سیاسی ضابطوں اور قاعدوں کی مقید نہیں کسی ارادے و قصد کے بغیر ناکامی و کامیابی اور دُکھ سکھ کی آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ اس پر انسانی فکر و ارادہ کا ذرا قابو نہیں۔ اسباب و علل کچھ بھی ہوں پھر بھی یہ مجال کس کو ہے کہ مسرّت کا تنہا مدّعی بن بیٹھے۔ مسرّت کی تمنّاؤں سے کھیلنا ہرگز دانشمندی نہیں۔ حیات کی پہلی اور آخری تمنّا خوشی ہی۔ مگر خوشی ہے کیا؟ محض ایک موج۔ صرف ایک حرکت۔ فقط ایک مسلسل مطالبہ۔

اور "الم"۔ الم مسرّت کے مقابلہ میں ذی مقدار بھی ہے اور پائدار بھی۔ مسرّت کی تھاہ ہے مگر غم کی تھاہ نہیں۔ لامحدود شے محدود سے بہرحال افضل ہے۔ مگر ان جذبوں کا مرکز خود "انسان" ہے انسان الم اور مسرّت دونوں سے افضل ہے۔ رنج اور خوشی محض دو مرحلے ہیں اور ان سے گزر جانا ہی آدمی کی بڑائی ہے ؎

غم بھی کوئی منزل ہے رہِ عشق و جنوں میں
آلام کے موّاج سمندر سے گزر جا

وہ انسان جسے مقصد کا جنوں نہیں۔ زندگی سے نہیں جیت سکتا ایسے انسان کا سینہ مشرق کی مانند ہے۔ جہاں ہر گھڑی اک نئے طلوع اور جدید آغاز کی بھیڑ رہتی ہے۔

غم کے تبسّم نے زندگی میں نئی شگفتگی پیدا کی۔ انانیت کی سیمابی روح ایک سانچے میں ڈھلنے لگی۔ کامیابی اور فتح کی نئی تعبیریں ہونے لگیں سربند شراب شیشے سے اُبلنے لگی۔ ماحول اور قدرت کے جبر نے انفرادی ارادوں کو اجتماعی شکل بخشی۔ شعور نے سنبھالا لیا۔ مگر (ذہن لاشعور) اندر ہی اندر گریز و فرار کی خواہش تڑپنے لگی۔

گریز و فرار کی یہ خواہش کبھی آنسو بنی۔ کبھی تبسّم۔ کبھی ترک و رہبانیت کا احساس بنکر ساکت ہوئی۔ کبھی تخریب کا سرکش شعلہ بن کر لپکی۔ کبھی کامل نیکی کی شکل میں نمودار ہوئی۔ کبھی مکمل شر کی صورت میں۔ مرحلہ سخت تھا۔ مگر ہر وہ انسان جسے کوئی لگن ہو۔ اس مرحلے سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔

بیرونی محرکات اور میرے تصوّرات نے گھل مل کر ایک نیا سانچہ بنایا۔ اور میں اس سانچے میں ڈھل کر رہ گیا۔ تیاگ اور رہبانیت روحانیت کے نام پر زندگی سے گریز ہے۔ کھلی ہوئی ہار۔ وجود کے ہنگامے اور مشیّت کے آہنی پنجے سے ابدی نجات حاصل کرنے کے لئے رندانہ محویّت محض فرار ہے۔ اس گریز اور فرار کی داستان اور بھی سنگین ہو جاتی ہے جب ہم اس کے اجتماعی ردّ عمل پر غور کرتے ہیں۔

ایسے تمام فلسفے جو اس قسم کے مسئلوں کے مقابلے میں انسانی زندگی کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ میرے نزدیک دُنیا کے لئے مہلک اور انسانی ترقّی میں سدّ راہ ہیں۔

انسانی زندگی دو پاٹوں کے درمیان دبی ہے۔ ایک پاٹ مشیّت ہے۔ ایک پاٹ انسانی سماج۔ چکّی میں پڑے ہوئے دانوں پر اوپری پاٹ کا دباؤ نچلے پاٹ کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ مگر زندگی وہ چکّی ہے جس کے دونوں پاٹ برابر کا دباؤ رکھتے ہیں۔ یہ نظام جس میں انسان نے اپنی جنس کو پیس رکھا ہے۔ ابھی تک اجتماعی تصوّر سے عاری ہے۔ ابھی تک یہ عوام کے لئے جہنّم ہے محض مشیّت پر جبر کا الزام انسانی سماج کے ناقص اور غیر منصفانہ نظام سے چشم پوشی کرنا ہے۔ مشیّت نے حسن کو محدود نہیں کیا تخلیق کو نہیں روکا۔ ارتقا پر بندشیں نہیں کیں۔ مگر انسان نے اپنی جنس پر مسرّت راحت اور آزادی کا ہر دروازہ بند رکھا۔ انسان کے تمام ارادی اعمال و افعال کی اساس انفرادی و اجتماعی مسرّت کا حاصل کرنا ہے۔ ہر ایک کی کوشش ہے، سُکھ ملے۔ زندگی کو سجائے۔ سنوارے۔ تمام انسانی تاریخ مسرّت و راحت کے حصول کی ناکام کوشش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ مگر یہ اتھاہ سلسلہ آدم کے خونخوار بیٹوں نے انتہائی خود غرضی کے ساتھ جاری رکھا۔ کسی نے کامل طور پر زندگی اور اسکی

مسرتوں کو برابر بانٹنے کا نظام پیدا نہیں کیا۔

زندگی جہنم تھی۔ اور ہے۔ یہ جہنم آج بھی فردوس بن سکتا ہے لیکن پرانی دُنیا کو ڈھا دینے کے بعد۔ جو ایک مجموعی سماج بنانے سے قاصر رہی۔

دُکھ سُکھ اور محض جبر و اختیار کے جنجال میں انسانی ذہن کو مقید کر کے جو بزرگ زندگی سے گریز کی تعلیم دیتے رہے۔ وہ انسانی ترقی اور حیات کی پرواز کے دشمن تھے۔ اگر یہ دُنیا لاکھوں قیامتوں اور تباہیوں کے بعد بھی چلتی رہی ہے۔ تو ہو سکتا ہے کچھ اور چلتی رہے۔ شاید آنیوالا ارتقا کوئی ایسا نظامِ ریاست پیدا کر دے جو زمین کی مصیبتوں کو ختم کر کے انسان کو سماجی و اقتصادی مسرتوں کی دولت بخش دے۔ عمریں مختصر ہو جائیں اور مسرتیں طویل۔ پُر آلام زندگی کے مقابلے میں مسرت کی ایک گھڑی ابدی زندگی سے کم نہیں۔

پھر بھی میرے نزدیک مسرت و الم جبر و اختیار اور اس قسم کے حکیمانہ مسائل سے افضل۔ انسانی زندگی اور اس کی تہذیب و تکمیل ہے۔ ارتقا کی معجز نمائی کا فریضہ ہے۔ شاید ایک ایسا سماج بن سکے جس میں امیر و غریب برابر کا آرام حاصل کر لیں۔ بھوک کی اُلجھنیں ختم ہوں۔ انسان انسانیت کے لئے زندہ رہیں اور انسانیت کے لئے قربان ہوں۔

میں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک نورانی مستقبل کا تصور رکھتا ہوں۔ ظاہر ہے یہ زندگی کا منفی پہلو نہیں اثباتی ہے۔ سوچئے تو تیاگ اور رہبانیت نے انسانوں کو ہزاروں سال غلام رکھا۔ رندی و سرشاری نے نسلیں برباد کر دیں۔ شرمیلے اور رسیلے تصورات نے توازن کو مفلوج کر دیا۔ شاعرانہ محویت اگر محض ظالم مشیت کے ہاتھوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ہے۔ تو میرے نزدیک وقت کی تباہی ہے۔ ہاں اگر یہ انسانی زندگی میں تہذیبی مساوات اور انصاف پیدا کرنے کے کام آئے۔ جس کا نتیجہ انسانی نشاط و راحت ہو۔ تو دُنیا کی تمام عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ شاید یہی جوہر شاعری کا حاصل ہے۔ اور یہی زندگی کی حکمت۔

نیساں اکبرآبادی

نازک بیانیاں

جلوۂ حُسن وہ دکھاتے ہیں
نقشِ حیرت بنائے جاتے ہیں

پھُول تو پھُول ان کے ہنسنے پر
آج کانٹے بھی مُسکراتے ہیں

ہم انہیں دیکھتے ہیں بیشِ نظر
یا فریبِ نگاہ کھاتے ہیں

بیخودی میری بڑھتی جاتی ہے
جس قدر آپ یاد آتے ہیں

سوچتے ہیں کریں گے اُن سے گلہ
جب وہ ملتے ہیں بھول جاتے ہیں

آپ سمجھے بھی یا نہیں اب تک
اشکِ خوں داستاں سُناتے ہیں

آرزوئیں ہماری ختم ہوئیں
اک سکون دل میں آج پاتے ہیں

ضبطِ غم مری بات رکھ لینا
آج وہ مجھ کو آزماتے ہیں

یہ ہمارا ہی کام ہے نیساںؔ
درد میں بھی جو مُسکراتے ہیں

قاضی عبدالغفار

غیر جنبہ داری

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ تک بلکہ اُسکے بعد بھی کچھ عرصہ تک "غیر جنبہ داری" ایک ایسی سیاسی اصطلاح تھی جس کے مفہوم کو عوام اور اخبار پڑھنے والے لوگ تھوڑا بہت سمجھ لیتے تھے۔ لیکن جرمن آمریت کے ارتقاء نے اس لفظ کی معنوی اہمیت کو اس قدر مسخ کر دیا کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اُنیسویں صدی میں جب یورپین دول کی سامراجی سیاست نے ساری دُنیا میں جدید سیاسی تصوّرات پیدا کرنے شروع کئے تو اُس کے ساتھ جنگ اور صلح کے جدید بین الاقوامی قواعد و ضوابط میں ملکوں کے ایک ایسی سیاسی حیثیت کا بھی تعیّن کیا گیا جو بطور ایک اصطلاح کے "غیر جنبہ داری" کہلائی۔ اس تصوّر کو اختیار کرنے کیلئے اُس کا اعلان ضروری سمجھا گیا اور بین الاقوامی قانون میں اُسکی تعریف بھی مقرر کر دی گئی اور بعض ایسی شرائط کا بھی تعیّن کر دیا گیا جو "غیر جنبہ دار" حکومت پر عاید ہوتی تھیں۔

حکومتوں نے اس بین الاقوامی اصول کی تفصیلات کو مقامی قواعد و ضوابط کے تحت اپنے اپنے دستور العمل میں معیّن کر لیا۔ امریکہ نے سنہ ۱۸۱۸ء میں اپنے لئے ایک "قانون غیر جنبہ داری" مرتب کر لیا۔ اور سنہ ۱۸۷۰ء میں برطانیہ نے بھی اسی قسم کا ایک قانون بنا کر اپنے کو اُس کا پابند کر لیا۔ دوسرے ممالک نے بھی ان دو قوانین کی تقلید کی اور بین الاقوامی سیاست میں یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ غیر جنبہ دار حکومت وہ ہے جو کسی جنگ میں نہ تو فریقین میں سے کسی کا ساتھ دے اور نہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کسی فریق کو امورِ جنگ میں امداد حاصل ہوتی ہو۔ سنہ ۲۴ء تک غیر جنبہ داری کے یہ تصوّرات باقی رہے اور جنگ عظیم کے بعد بھی مجلس اقوام کے قوانین میں ان تصوّرات کو زیادہ موثر صورت میں قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔

لیکن نازیوں اور فاشیوں نے جنگ کے تمام قدیم نظریات کو بدل دیا اور اُن ہی کے ساتھ صلح اور امن اور غیر جنبہ داری کے تمام قدیم نظریات بھی بدلنے لگے۔ محوری نظریات کے تحت جنگ کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا کہ ہر قسم کی غیر جنبہ داری اُس کی زد میں آگئی۔ قدیم زمانہ میں جنگ شروع کرنے کے لئے اعلانِ جنگ ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن محوری "نوجیت" نے اعلانِ جنگ کے بغیر ہی حملے کرنے شروع کر دئے اس لئے اعلان غیر جنبہ داری بھی بیکار ہو گیا۔ جس طرح اصول جنگ کی تمام اخلاقی حدود شکست ہو گئیں اسی طرح اور لازماً غیر جنبہ داری کے اخلاقیات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ جنگ کسی بین الاقوامی قانون کی پابند رہی ہے اور نہ غیر جنبہ داری کا کوئی اصول باقی رہا ہے۔

اس وقت تمام یورپ میں بلکہ دُنیا کے (۳/۴) حصہ میں اگر کسی ملک کو غیر جنبہ دار کہا جا سکتا ہے تو وہ صرف سوئزرلینڈ ہے لیکن اُسکی غیر جنبہ داری ایک مسلّح جنبہ داری ہے یعنی وہ اپنی غیر جنبہ داری کی حفاظت کرنے کے لئے اپنی فوجی قوّت کو تیار رکھتا ہے۔ پھر بھی باوجود اسکے کہ تمام دول نے ایک بین الاقوامی معاہدہ کے تحت سنہ ۱۶۴۸ء میں سوئزرلینڈ کی دوامی غیر جنبہ داری کو تسلیم کر لیا تھا اور سنہ ۱۸۱۵ء کی ویانا کانفرنس میں اس معاہدہ کی مزید توثیق بھی کی گئی تھی لیکن یورپ میں واقعات کی جو رفتار ہے اُس کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ غیر جنبہ داری کسی دشمن کے حملہ سے کے دن محفوظ رہ سکے گی۔ وہ زمانہ گزر گیا جب سنہ ۱۸۷۱ء میں فرانس کی بھاگی ہوئی ۸۰ ہزار فوج کے اسلحہ جو ملک میں گھس آئی تھی سوئزرلینڈ نے اپنی غیر جنبہ داری کی بناء پر رکھوائے تھے اور اُسکو نظر بند کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں جب مجلس اقوام نے اپنی بین الاقوامی فوجی پولیس کے گزر جانے کے لئے سوئزرلینڈ سے راستہ مانگا تھا تب بھی اس نے

اس درخواست کو منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لیکن آج جبکہ محور کے فلسفۂ جنگ نے تمام بین الاقوامی قوانین اور جنگ کے اخلاقی اصولوں کو ٹھکرا دیا ہے اور ہر غیر جنبہ دار ملک کا یہ حال ہے کہ اُس میں ہزارہا جرمن فوجی سیاحوں کے بھیس میں پھیلے ہوئے ہیں۔ غیر جنبہ داری کی قیمت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔

بہرحال یورپ میں مسلمۂ "غیر جنبہ داری" کی صرف ایک مثال ہے۔ لیکن وہ بھی

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمی ماند

غیر جنبہ داری کی ایک اور وسیع تر اصطلاح دوستانہ غیر جنبہ داری ہے اس غیر جنبہ داری کا رجحان کسی ایک فریق یا دونوں فریقین کی طرف ہو سکتا ہے ۱۹۳۶ء کی جنگ کے بعد اس دوستانہ غیر جنبہ داری کی پہلی مثال وہ تھی جب کہ اسپین کی خانہ جنگی میں اٹلی اور جرمنی نے کوئی فوجی مداخلت تو نہیں کی لیکن جنرل فرانکو کو ہر قسم کی اخلاقی اور مادّی امداد دیتے رہے۔ محور کی کتاب کا یہی ورق اب امریکہ نے اُڑا لیا ہے اور "دوستانہ غیر جنبہ داری" کی تمام منطقی انتہاؤں تک اب امریکہ جمہوریتوں کی امداد کر رہا ہے۔

اس قسم کی غیر جنبہ داری کی حدود اب اس قدر وسیع ہو چکی ہیں کہ میدانِ جنگ میں فوج بھیجنے کے علاوہ ہر قسم کی عملی ہمدردی اور امداد غیر جنبہ داری کے منافی نہیں سمجھی جاتی۔ یہ نتیجہ بھی براہ راست ہٹلر کے اس طرزِ عمل کا ہے اُس نے جنگ کے اخلاقیات کے تمام حدود کو توڑ دیا۔ درحقیقت اب اس قسم کی غیر جنبہ داری ایک مشروط غیر جنبہ داری ہے بین الاقوامی قوانین کے اکثر ماہرین اس قسم کی غیر جنبہ داری کو قانوناً ناقص سمجھتے ہیں لیکن خود بین الاقوامی قوانین کی تمام بنیادیں اس درجہ مسمار ہو چکی تھیں کہ اب اُس کو کسی عمل کے جواز و عدم جواز کا معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ ہیگ کنونشن نے اس قسم کی جنبہ داری کو ناقص قرار دیا تھا اور ایسے غیر جنبہ دار کا شرکاءِ جنگ میں شمار کیا جانا جائز قرار دیا تھا۔

لیکن قانون کی انتہائی تباہی کا نام ہی جنگ ہے اور ۱۹۱۴ء سے آج تک ہم دیکھ رہے ہیں کہ "قوت" کا فلسفہ روز بروز تمام قوانین اور اصولوں پہ بالادست ہوتا جا رہا ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں یونان عرصہ تک غیر جنبہ دار رہا لیکن اُس نے اپنے علاقہ میں اتحادی فوجوں کے داخل ہونے کی اجازت دیدی تھی۔ خود اٹلی اور جرمنی کے تعلقات اُس جنگ میں بہت عرصہ تک اصطلاحاً ایک دوسرے کے مقابلہ میں غیر جنبہ داری اور صلح جوئی کا اعلان کرتے رہے۔ کچھ دن تک مشرقِ بعید کے ایک گوشہ میں وہی صورت پیدا رہی یعنی جاپان بظاہر غیر جنبہ دار رہا لیکن بباطن شریکِ جنگ تھا اور درپردہ محوری شرکارِ جنگ کی مصلحتوں کا پابند۔ (بالآخر اب وہ لڑنے والوں میں سے ایک ہے)۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

اگر بین الاقوامی اخلاقیات اور قوانین و روایات کو گزشتہ ... سال میں محوری طاقتوں نے اس قدر برباد نہ کیا ہوتا تو یہ دوستانہ یا غیر مشروط جنبہ داری کی اصطلاح پیدا ہی نہ ہوتی۔



ڈاکٹر تاراچند

اُردو اور ہندی

(ڈاکٹر تاراچند صاحب نے پروفیسر امرناتھ جھا کے چند اعتراضات کا جواب انگریزی اخبار لیڈر (الہ آباد) کے نام ایک خط میں دیا ہے یہ خط ایک مستقل مضمون ہے جس میں اردو ہندی اور ہندستانی کے موجودہ مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ہم ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ (ادارہ)

سہروسنگھ (مظفر پور) کے ایک جلسے میں پنڈت امرناتھ جھا نے جو تقریر کی تھی اسکے کچھ ٹکڑے لیڈر مورخہ ۲۳ مارچ ۴۲ء میں شائع ہوئے تھے جن سے ہندوستان کی قومی زبان کے سوال پر انکے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنے اخبار میں ان باتوں کے لئے بھی کچھ جگہ نکال سکیں گے جو ان خیالات سے مختلف ہیں جو مظفر پور میں ظاہر کئے گئے تاکہ مسئلے کے تمام پہلو لوگوں کے سامنے آجائیں۔ میں اس تقریر میں پیش کئے ہوئے دلائل پر سلسلہ وار بحث کرونگا۔

پروفیسر جھا کہتے ہیں کہ "صرف ہندی ہی ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے اور یہ رتبہ صرف اسی کو مل سکتا ہے کیونکہ یہ سنسکرت سے نکلی ہے۔ اس کو فیضان اسی ملک سے ملتا ہے، ملک کے تمدن و تہذیب کی حامل ہے اور ملک کی بڑی بڑی زبانوں سے اس کا میل ہے" ــــ اس بیان میں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ ہندی سنسکرت سے نکلی ہے۔ یہ بیان دونوں طرح سے غلط ہے اس لئے کہ اس میں جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ ہندی ــــ یعنی وہ جدید ہندی جس کو آج کل کے بہت سے ہندی شعراء استعمال کرتے ہیں ــــ جس کو بقول پروفیسر امرناتھ جھا، ہندوستان کی قومی زبان ہونی چاہیئے۔ ــــ ہرگز سنسکرت سے نہیں نکلی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ ہندوستانی قومی زبانوں میں سے کوئی زبان بھی سنسکرت سے مشتق نہیں ہے کیونکہ سنسکرت ایک معین ادبی زبان ہے جس کو زبان کی قواعد بنانے والوں نے اس کی کبھی اجازت ہی نہ دی کہ وہ بڑھے اور پھیلے اور اس سے نئی نئی شاخیں نکلیں۔ انڈو آرین لسانیات کی کسی کتاب کو بھی پڑھ کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ہندی دراصل سورسینی پراکرت کی اپ بھرشما سے نکلی ہے اور یہ بولی مدھ دیس میں کئی صدیوں سے بولی جاتی تھی۔ سورسینی پراکرت خود ان پرانی انڈو آرین بولیوں کی پیداوار ہے جو بدھ کے زمانے سے قبل شمالی ہندوستان میں بولی جاتی تھیں۔ پرانی انڈو آرین پراکرت میں کئی بولیاں شامل تھیں جن میں سے ایک کو ادبی ضرورتوں کیلئے استعمال کیا جانے لگا۔ سب سے پہلی ادبی صورت چھندوں میں پائی جاتی ہے جو ویدوں میں استعمال کئے گئے۔ بعد کو ایک بولی نے ادبی حیثیت اختیار کر لی اور اسکو سنسکرت کہا جانے لگا۔ پاننی اور دوسرے قواعد دانوں نے اسکی قواعد بنائی اور اس نے ایک ایسی جامد صورت اختیار کر لی کہ اس میں پھیلنے اور بڑھنے کی قوت باقی نہ رہی۔ ان حالات میں یہ کہنا کہ ہندی سنسکرت سے نکلی ہے، بالکل غلط ہے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ اُردو ان انڈو آرین زبانوں سے نہیں نکلی ہے جن سے ہندی نکلی ہے۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان اسی اپ بھرشما، اسی پرانی سورسینی پراکرت کی پیداوار ہے جس پر جدید ہندی کی بنیاد ہے گویا جہاں تک ابتدا کا سوال ہے دونوں زبانوں کی بنیاد ایک ہی ہے اور دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے برتری کا دعویٰ نہیں کر سکتی

اب رہا یہ کہنا کہ ہندی کو فیضان اسی ملک میں ملا اور ملک کی تہذیب اور تمدن کی وہ آئینہ دار ہے اور اُردو کو یہ حیثیت حاصل نہیں ــــ تو یہ بیان یک طرفہ اور مبالغہ آمیز ہے۔ یاد رہے کہ اُردو ہندوستان سے باہر کسی ملک کی زبان نہیں جو ہندوستانی باہر جا کر آباد ہو گئے ہیں وہی اُردو بولتے ہیں اور انہوں نے البتہ اپنے نئے ہموطنوں کو اُردو سکھا دی ہے ورنہ اُردو ہندوستان کیلئے ویسی ہی "دیسی" اور "ملکی" ہے جیسی کہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی یا تامل! اُردو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستانیوں ہی کے ہاتھوں اسکی پرورش ہوئی جن میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں۔ اسکی بنیادی ساخت اور اسکا صوتیاتی اور صوریاتی نظام ہندوستانی ہے اور اسکی بالائی ساخت میں تو ہندی سے کہیں زیادہ فراخدلی پائی جاتی ہے کیونکہ اسکے ذخیرے میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے تہذیبی ماحول میں استعمال ہوتے رہے ہیں ہندی کے مقابلے میں اُردو کی بنیاد کہیں زیادہ وسیع ہے اور اسکے مقابلے میں اُردو کا مشرب زیادہ آزاد اور فراخ ہے اور یہ سب اس لئے کہ اُردو نے دونوں فرقوں کے تمدن سے فیضان حاصل

کیا ہے اور دونوں کی روایات پر حاوی ہے ۔

لوگ اُردو کے متعلق کچھ کہتے وقت (عموماً) یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوانی زندگی کا شاید ہی کوئی رُخ اور پہلو ایسا ہو جسے اُردو زبان میں نہ پیش کیا گیا ہو ۔ اُردو میں اُپنشدوں کے ترجمے موجود ہیں ۔ بھاگوت گیتا کا ترجمہ ہو چکا ہے، ہمارے یہاں رامائن، مہابھارت اور بہت سے پرانوں کے ترجمے بھی اُردو میں مل سکتے ہیں ۔ ہندو مذہبیات اور فلسفۂ مذہب پر اُردو میں بڑی بڑی تصنیفیں موجود ہیں جن میں ہندو دیو مالا، ہندوؤں کی عبادتوں اور جاتراؤں وغیرہ سے بحث کی گئی ہے ۔ ان کے علاوہ ہندو آرٹ اور خصوصاً موسیقی پر کثرت سے اُردو کتابیں موجود ہیں ۔ سنسکرت کے بہت سے ڈرامے، کہانیاں اور نظمیں اُردو ادب میں جگہ پا چکی ہیں ۔ ہندوؤں کے علوم ریاضی، ہیئت و کیمیا وغیرہ کے تذکرے اُردو کتابوں میں ہیں ۔ اور یہ سب کوئی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک بہت سے ہندو اُردو کو خاص اپنی زبان مانتے تھے ۔ ہندو شعراء اور نثر لکھنے والے اُردو کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے تھے اور شمالی ہند کے بہتیرے پڑھے لکھے ہندو نہ صرف معلومات بڑھانے کی خاطر بلکہ ذوقِ سلیم کے تقاضے سے اُردو کتابیں پڑھتے تھے ۔ اس زمانے میں البتہ ہندو لوگ احیائی اور فرقہ وارانہ تحریکوں سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ اُردو کو چھوڑ رہے ہیں ۔ ایسی کتابوں کی مانگ کم ہو گئی ہے اور کتابوں کے تاجروں کو اس قسم کی کتابیں شائع کرنے میں نفع نظر نہیں آتا ۔ اسکے باوجود اگر گورنمنٹ گزٹ پر نظر ڈالی جائے جو صوبجاتی حکومتوں کی طرف سے شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ ایسی کتابیں اب بھی شائع ضرور ہوتی ہیں ۔

اُردو نے ہندوؤں کی خدمت کی اور ان کی ضروریات پوری کیں اور ساتھ ہی ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کی ضروریات کو زیادہ تر پورا کیا ۔ جہاں تک تخلیقی ادب کا تعلق ہے اُردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر فخر ہے ۔ بے شمار ہندو اہلِ قلم نے ——— شاہجہاں کے زمانے کے ولی رام ولی سے لیکر اب تک اُردو کو اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ۔ مسلمان تذکرہ نویسوں کی کوتاہ بینی کی بدولت ان کا اعتراف پورا پورا نہ ہو سکا مگر اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر ہندوؤں کی زیادہ تعداد اُردو کی طرف نہیں آئی تو اس میں کچھ خطا خود مسلمانوں کی بھی ہے ۔ بہت سے مسلمان شاعروں نے ہندو اساتذہ کے قدموں کے پاس بیٹھ کے پڑھنا لکھنا سیکھا مگر خبطِ برتری پھر بھی نہ گیا اور اسی وجہ سے بہت سے ایسے (ہندو) اساتذہ کی خودداری مجروح ہوئی جو ادبی شہرت کے متمنی تھے ۔ اور پھر اب تو احیائی اور فرقہ وارانہ تحریکوں کا زہر دونوں کی رگوں میں ایسا سرایت کر گیا ہے کہ دونوں کے مناقشات اور زیادہ بڑھ گئے ۔ مسلمان اگرچہ قرونِ وسطیٰ میں سیاسی قوت کے اجارہ دار تھے مگر انہوں نے برج بھاشا اودھی اور دوسری دیسی زبانیں سیکھنا ہرگز کسرِ شان نہ سمجھا ۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ انہوں نے ان زبانوں کے ایسے ایسے شاعر پیدا کئے جن کے نام اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک یہ زبانیں سیکھی اور پڑھی جاتی رہیں گی مگر حالیہ دور میں وہ اپنے ہموطن ہندوؤں کے تمدن کا مطالعہ کرنے کا رجحان برابر کم کرتے چلے جاتے ہیں ۔

بہرحال اور کچھ بھی ہو مگر یہ الزام کہ اُردو ادب میں باہر کی بو باس زیادہ ہے، محض مبالغہ ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سا اُردو ادب مسلمان فرقے کی روایات سے رنگا ہوا ہے لیکن مسلمان فرقہ بھی تو ہندوستانی ہے اور یہ تو فطری بات ہے کہ اسکے افراد جو ادب پیش کرینگے اس میں کسی حد تک انکی آرزوؤں، اُن کے خیالات ان کی روایات کا ذکر ضرور ہوگا ۔ ایسا نہ ہونا غیر فطری تھا ۔ ہندوستان کے وہ فرقے جو ایسے مذہبوں کے پیرو ہیں جن کی ابتدا ہندوستان سے باہر ہوئی یعنی پارسی، عیسائی اور مسلمان ——— ان کو محض اس ایک وجہ کی بنا پر اجنبی یا پردیسی نہیں خیال کیا جا سکتا کہ ان کے مذہب دیسی نہیں ہیں ۔ جو لوگ اسکے خلاف رائے رکھتے ہیں وہ در اصل ہندوستان کو تقسیم کرنے والی اسکیموں کی تائید کر رہے ہیں ۔

پھر یہ کہ جو لوگ اُردو ادب سے پوری طرح واقف ہیں اور ان کی معلومات ادھوری نہیں ہیں ان کو معلوم ہے کہ اجنبی یا بدیسی ہونے کا یہ الزام کتنا ظالمانہ اور غلط ہے ۔ دکن کے اُردو شعراء کا کلام پڑھیے ۔ خصوصاً ان کی مثنویاں اور مرثیے ۔ سودا اور میر کا کلام پڑھیے ۔ ان کی مثنویاں، قصیدے اور مرثیے پڑھیے یا میر حسن کی مثنوی سحر البیان یا دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِ نسیم اور میر انیس کے مرثیے یا نظیر اکبرآبادی کی نظمیں ۔ یا حال کے شعراء مثلاً آزاد، حالی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی، چکبست اور بہت سے موجودہ شعراء کی بڑی بڑی نظمیں پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اُردو ادب کے ماحول کو بیگانہ یا بدیسی نہیں کہا جا سکتا ۔ ایسی جگہوں پر بھی جہاں ہیرو کے نام اور مقامات بدیسی ہیں جیسے کہ مرثیوں میں، وہاں بھی جذبات خیالات اور معاشرت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے بالکل ہندوستانی ہے ۔

اب اگر نثر پر نظر ڈالی جائے جیسے نذیر احمد کی اخلاقی ناولیں یا سرشار کا شاہکار فسانۂ آزاد یا پریم چند کے افسانے اور کہانیاں، تو یہ رائے ہرگز قائم نہیں رہ سکتی

کہ اُردو ادب میں ہندوستانی زندگی کی نمائندگی نہیں ہے یا اُردو ادب ہندوستان کے مختلف تمدنی ماحول کو پیش کرنے سے عاری ہے۔ پھر جب شکسپیر کے ڈرامے، ہیملٹ۔ جولیس سیزر۔ اینٹونی اینڈ کلیوپیٹرا، مرچنٹ آف وینس، رومیو اینڈ جولیٹ، اوتھیلو، ٹرائلس اینڈ کریسیڈا اور ٹائمن آف ایتھنز، نیز ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ اور سیمپسن ایگونسٹس، بائرن کی نظم پرزنر آف شلان، اسکاٹ کی ناولیں ۔ کونٹن ڈرورڈ اور ٹیلسمین، لٹن کی ناول رنزی، جارج ایلیٹ کی ناول رمولا نیز وہ بہت سے ترجمے جو عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، لاطینی، پرتگالی، جرمن، روسی، اور چینی زبانوں سے انگریزی میں کئے گئے انگریزی ادب کیلئے بدیسی نہیں خیال کئے جاتے تو ان ترجموں پر جو عربی یا فارسی زبانوں سے اُردو میں کئے گئے ہیں یہ الزام کیوں عاید کیا جاتا ہے کہ ان میں بدیسی پن ہے۔ انگریزی ادب میں یونانی، رومی اور یہودی روایات اور تاریخی واقعات اور تاریخی اور اصنامی ہستیوں کے بیشمار اشارے اور تلمیحیں ہیں لیکن اسکے باوجود انگریزی ادب کے کٹر سے کٹر شیدائیوں نے بھی کبھی ان تلمیحوں یا اشاروں کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔ پھر یہ کونسی سمجھ ہے کہ اگر ہندوستانیوں کا ایک طبقہ کہ جس کی مذہبی نسبتیں

۳۱ ہندوستان کے حدود تک محدود نہیں ہیں۔ ہندوستان سے باہر کی تلمیحیں استعمال کرتا ہے تو اُردو کو اسکے لئے مورد الزام قرار دیا جائے۔

یہ کہا گیا ہے کہ "ہندی کو ہندوستان کی تمام بڑی بڑی زبانوں سے نسلی تعلق ہے۔" میں اس بحث کو زیادہ طول نہ دونگا۔ لیکن یہ بیان ظاہر ہے بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ پھر دراوڑی زبانوں کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ کیا اُردو کا پنجابی سے ویسا ہی تعلق نہیں جیسا ہندی کا پنجابی سے ہے؟

ہندی پر اُردو کو ترجیح دینے کیلئے پروفیسر جھا نے جو دلیلیں پیش کی تھیں ان پر بحث کرنے کے بعد اب میں "ہندوستانی" پر ان کی رائے زنی سے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستانی" کو بُرا بھلا کہنے میں ان کو خاص لطف آتا ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے "ہندوستانی" کو دوغلا جانور (Hybrid Monster) کہا تھا۔ اب وہ اس کو ایک "مضحکہ خیز زبان" کہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ان کے ذہن میں ہے کیا۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ دُنیا کی کوئی ایسی زبان نہیں جو مخلوط نہ ہو۔ انگریزی زبان نے تو نہایت بے بلکی کے ساتھ دُنیا کی تقریباً ہر زبان سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح "دوغلوں" کی فہرست میں انگریزی کا نام تو سب سے پہلے آنا چاہئے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا سنسکرت خالص زبان ہے۔ اگر ایسا ہے تو اُن دراوڑی اور منڈا الفاظ کے متعلق کیا کہا جائے ہے جو ایک بڑی تعداد میں سنسکرت میں داخل ہو چکے ہیں۔ ویبر نے تو سنسکرت ادب کی تاریخ میں بتایا ہے کہ ہیئت کی بہت سی عربی اصطلاحیں سنسکرت کی ان کتابوں میں ہیں جو ہندوستانی ہیئت کی خاص کتابیں کہلائی جاتی ہیں۔ کیا اُردو مخلوط زبان نہیں ہے جس میں افعال تو انڈو آرین ہیں اور اسم فارسی! اور ہندی کیا ہے —— کیا تلسی داس، بہاری لال، کیشو اور دوسروں نے عربی اور فارسی لفظ نہیں استعمال کئے ہیں اور کیا نئی ہندی میں انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی، عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ دراوڑی، منڈا اور چینی زبان کے لفظ استعمال نہیں کئے جاتے ہیں۔ دکھنی اُردو پر غور کیا جائے جو تقریباً چار سو برس تک ادبی زبان بنی رہی اور اسکے پڑھنے لکھنے والوں نے پراکرت اور فارسی لفظوں کے میل جول کو کبھی مضحکہ خیز نہیں سمجھا۔ یہ سب بالکل ویسا ہی ہے کہ بعض لوگوں کو پیاز کا شوق ہوتا ہے اور بعض کو لہسن کا۔ اور بعض لوگ پیاز اور لہسن کے آمیزے کو پسند کرتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو جو پیاز کے شائق ہوں یہ حق ہو سکتا ہے کہ ان کو بُرا بھلا کہیں جو لہسن اور پیاز کے آمیزے کو پسند کرتے ہیں۔

پروفیسر جھا کو یہ یقین نہ کر لینا چاہئے کہ ملک میں اس سنسکرت ملی ہندی کے ہمدرد بہت ہیں۔ اُن صوبوں میں جہاں اُردو یا ہندی مادری زبان کی طرح نہیں بولی جاتی ہیں۔ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سارے ہندوستان کیلئے ایک لنگوا فرانکا ہو۔ ان کو یقین ہے کہ اُس زبان کی کوئی شکل جو شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں بولی جاتی ہے یہ مقصد پورا کر سکے گی۔ لیکن ان کو یہ یقین نہیں ہے کہ کونسی شکل انتخاب کی جائے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر ایس کے چٹرجی مشہور ماہر لسانیات نے ایک ایسی ہندی یا ہندوستانی کے رواج کے لئے کوشش کی تھی جو تمام نحوی مشکلوں مثلاً افعال کی تذکیر و تانیث وغیرہ سے بری ہو۔ مسٹر ستیا نراین نے جو جنوبی ہند میں ہندی پرچار کے بہت پُر جوش حامی اور نہ جھکنے والے کارکن ہیں، ہندی پرچار سماچار میں جو دکھنی بھارت ہندی پرچار سبھا کا خاص اخبار ہے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے جو ہندی کو سنسکرت لفظوں سے بھر دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ لکھا ہے اور ان کو متنبہ کیا ہے کہ

"اگر ہم کو ایک ایسی ہی زبان قبول کرنا ہے جو سنسکرت سے بھری ہوئی ہو یا جس میں بڑا حصہ سنسکرت کا ہو تو ہمیں شمال کی زبانوں ہی پر نظر جمانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ

بنگال، مہاراشٹر اور دکن وغیرہ کی زبانیں ایسی غریب نہیں کہ
اس لین دین میں ان کا دیوالہ نکل جائے (سنسکرت ملانے کی
اس دلیل میں اتنا فائدہ نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے بلکہ
اسکے برعکس نقصان کا زیادہ امکان ہے۔"

کچھ روز ہوئے جب ان صوبوں کے باشندوں نے جہاں ہندی نہیں بولی جاتی یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندی میں کچھ ادلی بدل کیا جائے تو ڈاکٹر دھرینددر ورما نے اس مطالبے پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا۔

"واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان بننے کی عزت کے
خیال اور اس لالچ نے ہندی والوں کو اس وقت ایک
ایسی خود فریبی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ یا تو اپنی زبان کے
اصلی مسائل کو بھلائے دے رہے ہیں اور یا پھر انکی صحیح
نقطۂ نظر سے دیکھنے کی قوت ہی جواب دے گئی ہے۔" (ایضاً)

پروفیسر جھا ان چند لوگوں کو خوش کرنے کے خیال سے جو ہندی کو اس لئے پڑھیں گے کہ وہ انگریزی کی جگہ لیکر بین صوبائی زبان بنے گی اس میں سنسکرت ملانے کی زبردست حمایت کر رہے ہیں لیکن وہ یہ نہیں محسوس کرتے کہ اس طرح سے وہ لاکھوں مسلمانوں کے دلوں میں جو ہندوؤں کے ہمسائے کے طور پر دریائے سندھ سے دریائے کوسی تک اور ہمالیہ سے ست پڑا تک پھیلے ہوئے ہیں دشمنی اور نفرت کا جذبہ پیدا کئے دے رہے ہیں۔

اب میں ان اعتراضوں کا تجزیہ کروں گا جو اُردو پر کئے گئے ہیں پروفیسر جھا فرماتے ہیں :۔

"اُردو ادب کا سارا ماحول غیر ہندوستانی ہے مشکل
ہی سے کوئی دیسی بحر اُردو میں مستعمل ہے۔"

یہاں پر مجھے وہ سب دہرانے کی ضرورت نہیں جو اُردو کے ہندوستانی ہونے کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں لیکن بحر (Matre) کے متعلق اتنا ضرور کہوں گا کہ اوّل تو کوئی بحر (Matre.) کسی زبان سے مخصوص نہیں ہوتی اس لئے کہ زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ بحریں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ کیفیت اس قدر عام ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن انگریزی اور بنگالی ادب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزی میں — جیسا کہ انگریزی ادب کا ہر متعلم جانتا ہے کہ ہر نئے عہد کے شعراء نظم کی مختلف طرز کے تجربے کرنا اپنا شیوہ بناتے ہیں۔ اس رجحان کا سب سے تازہ مظاہرہ (Sprung Verse.) ہے جس کو جیرارڈ ہاپکنس نے پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں ایجاد کیا تھا اور جو اب ہارڈی اور برجیز کی ارکانی (Syllabic.) نظم کی جگہ عام ہو رہی ہے بنگالی میں پرانے ماترِیتا اور اکشرِیتا کے علاوہ ایک تیسری بحر سورِیتا ہے۔ پہلی بحریں تو شمالی ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی ہیں لیکن تیسری بحر جسکی بنیاد غالباً تان (Stress.) پر ہے بنگالی کیلئے مخصوص ہے۔ بعض ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ یہ غیر آرین چیز ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر، اب مجھے یہ بتانا ہے کہ باقافیہ نظم کے لحاظ سے اُردو اور ہندی یکساں ہیں اور سنسکرت ان دونوں سے مختلف ہے اس لئے کہ سنسکرت میں باقافیہ نظموں کا وجود ہی نہیں۔ اسکے علاوہ اُردو میں گیتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے کہ ان کے راگ ہندی گیتوں کے راگ جیسے ہیں اور راگوں کی اس یکسانی کی وجہ سے اُردو گیتوں اور ہندی گیتوں میں پہچان نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت اگرچہ اُردو نظم اور ہندی نظم پر کوئی بڑی علمیاتی بحث نہیں کی جا سکی ہے لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاعری کی حد تک اُردو ہندی سے بالکل مختلف نہیں ہے۔ جو بھی اس کی تصدیق کرنا چاہے۔ ہندی "چوپائی" اور اُردو "بحرِ متقارب" کا موازنہ کرے۔ ۳۴۳

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ اُردو کا ماحول بالکل غیر ہندوستانی ہے پروفیسر جھا نے ان لفظوں کا ذکر کیا ہے جو مشہور لغت فرہنگ کے صفحہ پر دئیے گئے ہیں۔ مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ذکر جس پیرائے میں کیا گیا ہے وہ بہت گمراہ کن ہے۔ پروفیسر جھا نے اس کا تذکرہ ہی نہیں کیا کہ اس لغت (فرہنگ) کے صفحہ ۵۴ ہزار سے زیادہ لفظ دئے گئے ہیں جن میں سے صرف ساڑھے تیرہ ہزار لفظ فارسی اور عربی کے ہیں گویا بدیسی لفظوں کی تعداد کُل لفظوں کی چوتھائی ہے۔ اس تناسب کی بنیاد پر کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو غیر ہندوستانی زبان ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں ثابت کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن، مسٹر سمپورنانند اور ساہتیہ سمیلن کے دوسرے ادیب آجکل میں یہ بھول گئے کہ اس واقعہ کی تردید ہی ممکن نہیں کہ اُردو اور ہندی در اصل ایک ہی بولی جانے والی زبان کی دو مختلف شکلیں یا صورتیں ہیں۔ اسی طرح چھوٹے موٹے مضمون نگار کچھ بھی لکھتے پھریں مگر لسانیات کی کسی کتاب سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہو سکتی کہ برج بھاشا،

توجہ مرکوز کی۔ سر سٹیفورڈ اس یقین سے کہے جاتے تھے کہ اصل مقصد یہ ہے کہ بس ایک استثنائے سے تمام اختیارات ہندوستانیوں کو منتقل کئے جا رہے ہیں، اور وہ استثنا کمانڈر انچیف کے اختیارات کے متعلق ہے۔ یہ بھی امکان تھا کہ ایک ڈیفنس منسٹر مقرر ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ لفظوں پر نہ جائیے، عملاً ایک نیشنل کیبنٹ ہوگا، اور وائسرائے اور اس کیبنٹ کے درمیان ویسے ہی تعلقات ہوں گے جیسے بادشاہ اور ہمارے کیبنٹ کے درمیان ہیں۔ بہرحال وائسرائے ملک معظم کا نمائندہ ہے اور وہ بادشاہ سے زیادہ اختیارات استعمال نہ کر سکے گا بعد کی گفتگو میں انہوں نے اس خیال کو اور بھی واضح کر دیا اور موجودہ آئین کے پیش نظر انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ وائسرائے کی پوزیشن ایک چیئرمین اور ایک وزیر اعظم کے درمیان ہوگی۔ لیکن آخری خط میں دفعہ "ر" کی وضاحت کا تمام لب ولہجہ ایک مطلق العنانہ حکومت میں تبدیل ہو کر رہ گیا اور اقلیتوں کے اعتراض کا بالکل نیا مضمون اسی میں پیوست کر دیا گیا۔

شروع میں سر سٹیفورڈ کرپس نے یہ بات بالکل صاف کر دی تھی کہ اگر کبھی وزارت بننے کا اسٹیج آیا تو میں ہندوستان میں اور زیادہ ٹھہر جاؤں گا
۲ اور یہ دیکھوں گا کہ اس سلسلہ میں آخری تدبیریں اختیار کر لی گئیں، اپنے آخری خط میں صدر کانگریس نے یہ بات نکتہ چینی اور شبہ سے بالاتر انداز میں ظاہر کر دی کہ اگر وہ منزل آجاتی تو اطمینان بخش حل بھی نکل آتا، کیا سر اسٹیفورڈ کرپس کیلئے یہ جواب دینا غیر ممکن تھا کہ مزید گفتگو میری موجودگی میں وائسرائے اور متعلقہ پارٹیوں کے درمیان ہونے دیجئے۔ لیکن سر اسٹیفورڈ کرپس جو مٹے ہوئے حروف لکھے ہوئے حروف کا مسودہ لائے تھے اس کی عبارت بھی یکایک چھیل دی گئی۔ کیا اسکی وجہ یہ تھی کہ اطمینان بخش حل پیش نظر تھا۔ کیا یہ اس لئے تھا کہ یہ خوف تھا کہ ملک کے عوام کی نمائندگی کرنے والی مختلف پارٹیوں کی مشترکہ مرضی ملک کے لئے طاقت کا نہیں بلکہ کمزوری کا باعث ثابت ہوگی۔ ہندوستانی عوام کی بے اعتمادی بہت قوی ثابت ہوئی۔ سب پارٹیاں اس بات پر تیار تھیں کہ مستقبل کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور جنگ کو کامیابی سے چلانے کے لئے موجودہ حالت پر ہی توجہ مرکوز کی جائے۔ تمام پارٹیاں اس بات پر ہاتھ ملانے کے لئے تیار تھیں کہ مشترکہ کوشش سے حصولِ مقصد اور قربانی کیلئے ملک کے جوش کو اعلیٰ ترین منزل تک پہنچایا جائے۔ لیکن قسمت انسانی خواہش سے زیادہ طاقتور رہوتی ہے۔

بے عملی کے پوسٹ مارٹم کی کارروائی ایک ایسے وقت میں جبکہ خوفناک مقدرات اپنا سایہ ہم پر ڈال رہے ہیں مصیبت کم نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ اسکی مدد سے ہمیں اس اندھیری گلی سے باہر راستہ دیکھنے میں مدد نہ ملے، باہمی الزام طرازی تو صریحاً خطرناک ہے، کیونکہ اسکی بدولت بدمزاجی پیدا ہوتی ہے اور اس سے بے لوث فیصلوں پر اثر پڑتا ہے، آخر وہ چیز کیا تھی جس کا مطالبہ کانگریس نہ صرف اپنے لئے بلکہ تمام ہندوستان کیلئے کر رہی تھی؟ سب سے پہلی چیز یہ ذہنی تبدیلی ہے کہ قسمت پرستانہ بے بسی اور مخالفانہ بے رخی کی جگہ ایک نئی شان پیدا ہو اور وہ پُرجوش حبِ وطن ہو۔

کسی ملک کی جنگی قوت کا بہت بڑا حصہ عوام کا جوش ہوتا ہے اسکے بعد اسکے مادی وسائل ہوتے ہیں، ہندوستان کے پیشہ ور فوجی بھی بہادر سپاہی ہیں، لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ نیا جوش بھر جانے سے ان میں سے ہر ایک اٹل سورما بن جائیگا، جبکہ کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں اپنے خون سے ملک کی آزادی پر مُہر لگانے کی جوت جل رہی ہوگی۔ ہر سپاہی اپنے اعلیٰ ترین حد تک پہنچ جائیگا اور ہر ہندوستانی دل و جان سے متحدہ قوموں کی کوشش جنگ میں شریک ہو جائیگا یہ تو تسلیم کر لیا گیا تھا، اور یہ حق دے بھی دیا گیا تھا کہ اعلیٰ فوجی تدبیروں کا یہ تقاضہ ہے کہ کمانڈر انچیف ہندوستان کا وزیر جنگ ہو اور اسے مسلح فوجوں پر پورا کنٹرول ہو، کسی تحریر کی رو سے نہیں بلکہ بے لکھے قانون یا ایسے رسمی ضابطہ کی رو سے جو گورنر جنرل اور حکومت کے ممبروں کے درمیان طے ہو، یہ پیش کیا گیا تھا کہ اگر کوئی کیبنٹ کی حیثیت سے عمل کرے اور ممبر مشترک طور پر اپنے عمل کے لئے حکومت کے روبرو ذمہ دار ہو اسکے معنی لیجسلیچر کے سامنے ذمہ داری کے نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے سامنے ذمہ دار ہونے کے بھی، تاکہ حکومت کے ہر صیغہ میں قریب تر تعاون رہے لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ لڑائی چلانے کے لئے وار منسٹر (وزیر جنگ) کی خاص ذمہ داریوں پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ اس میں اقلیتوں کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ پورے جی جان سے تعاون کا قابلِ اطمینان فارمولا حاصل کئے بغیر کوئی کیبنٹ بن ہی نہیں سکتی۔ ایسی حکومت کوئی جنگ چلا نہیں سکتی جہاں لوگ پر مشتمل ہو جو اس تاک میں ہوں کہ ہم اپنے اختیارات سے مزید طاقتیں چھین لیں اسی لئے استعفیٰ کی دھمکی سے وزیر جنگ کے اختیارات پر غلبہ حاصل کرنے کا سوال تو سرسری طور پر ہی خارج کر دیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ وزیر جنگ

(بقیہ مضمون صفحہ ۶۳ پر دیکھو)

عبدالسلام رامپوری

اسلام سے قبل کے بعض مشہور کتاب خانے

اب سے ہزاروں سال پہلے جبکہ فطرت سرتاپا راز تھی، مظاہرِ قدرت انسان کے لئے باعثِ تحیّر تھے، ماضی کے تجربات سے اُسکا حافظہ سادہ تھا مستقبل کے متعلق امید اور نا امیدی دونوں کی دونوں بے معنی تھیں اُس کا کام صرف مشاہدہ تھا۔ اُس سے قوی اور اُس سے کمزور دونوں کی مخلوق اُس کے سامنے تھی، وہ مختلف جذبات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ روزانہ نئی نئی چیزوں کا احساس ہوتا جاتا تھا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ اب وہ قوّت اور ضعف کو سمجھے۔ مضرت اور منفعت اب اُس کے لئے غیر مانوس تصوّر نہیں ہے رفتہ رفتہ واقعات کا ساتھ ساتھ ہونا اور یکے بعد دیگرے ہونا اُنکا مختلف اور متحد ہونا انسانی دماغ کو متوجّہ کرنے لگا۔ مبہوتی اور تحیّر کا دور ختم ہوگیا۔ اُسکے دماغ میں اسباب و علل کی کرید شروع ہوگئی۔ اُس کے ذہن میں کون؟ کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟ کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ واقعات کی توجیہ کیلئے اُس کو قدرۃً اپنے آپ سے قوی تر مظاہر کی طرف متوجّہ ہونا پڑا۔ اُنکی قوّت سے اُس کا ذہن خواہ نخواہ اُنکی برتری کی طرف منتقل ہوگیا۔ عقلی قویٰ کی کوتاہی نے اس تصوّرِ برتری کے تحت اپنے جیسے جذبات و عواطف، حسیات و اعمال کو ممکن حد تک بڑی مقدار میں اُن کے لئے بھی ثابت کردیا۔ کہتری کے جذبہ نے خود بخود اُن کو دیوتا اور دیوی کا مقدّس لباس پہنا دیا۔ کثرت سے وحدت کی طرف اس ابتدائی حالت میں نہ عقل متوجّہ ہوسکتی تھی نہ ہوئی۔ چنانچہ مختلف اعمال و افعال کیلئے مختلف دیوتا اور دیوی منتخب ہوئے۔ ہر قوم نے اپنے مذاق کا خدا تلاش کرلیا۔ بنی نوع پر تفوّق حاصل کرنے کے جذبے نے عقیدۂ طوطمیت کو رواج دیا۔ انسانی نسب دیوتاؤں سے ملا دئے گئے۔ دیوتاؤں کی غیر معمولی طاقت کے اظہار کے لئے محیّر العقول واقعات گھڑے گئے۔ واقعات کی خصوصیات اور دیوتاؤں کی شخصیت کے تصوّر نے مندر اور ہیکل کی تعمیر میں نقشے کا کام دیا۔ مندر کے خادم مذہب کے امین کہلائے۔ بادشاہ اور امرا دیوتاؤں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اُن کے مظاہر بلکہ خود دیوتا مان لئے گئے۔

کتابت عام سرسبزی اور خوشحالی کیلئے دیوتاؤں کو بھجن گا گا کر خوش کیا گیا اُن کا تفوّق ثابت کرنے کے لئے اُن کے کارنامے بیان کئے جانے لگے۔ دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے یا اُن پر فتح پانے کے لئے، قحط و وبا

27 اور دوسری مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے دعائیں کی جانے لگیں کامیاب اتفاقی نتائج نے الفاظ اور طرز کی خصوصیت کو اہمیّت دیدی اور قوّتِ ارادی کی تاثیر نے اس وہمی اہمیّت کو ایک واقعیت بنا دیا۔ چیزیں برابر بڑھتی جارہی تھیں۔ انسانی حافظہ کب تک امداد دیتا۔ ادھر انسانی عقل میں مسلسل نشو و نما ہوتا رہا ذہنی طاقتیں منجھتی رہیں۔ مذہبی عقلائ نے اُن چیزوں کو آئندہ نسلوں کیلئے محفوظ رکھنے کی تدبیر پر غور کیا۔ چنانچہ مختلف قوموں نے اس سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لئے مختلف طریقے ایجاد کئے۔ اشوری اور کلدانی قوموں نے مختلف آوازوں کے لئے مختلف علامتیں بنائیں جن کو میخوں اور پیکانوں سے مشابہ ہونے کی وجہ سے خطِ میخی یا خطِ پیکانی کہتے ہیں۔ قدیم مصری قوموں نے واقعات کو تصاویر سے ظاہر کیا۔ اہلِ فنیقیہ نے انہیں تصاویر سے بائیس مختصر شکلیں انتخاب کیں اور وہ حروفِ تہجّی تسلیم کرلی گئیں۔ دُنیا کی مہذب قوموں نے بھی اُن کو شرف قبول بخشا۔ عربی، عبرانی، لاطینی، یونانی بلکہ بعض علما کی رائے کے مطابق سنسکرت، جرمنی اور ناروے کے مقدس خطوط کا سرچشمہ بھی یہی فنیقی حرف قرار دئے گئے۔[1]

ایشیا بھی - ۱۹۴۲ء

[1] تاریخ تمدّن قدیمہ از سینوبس ص ۲۷۲-۲۷۴، تاریخ بابل و نینوا ص ۱۹

کتابیں جب خط کی کسی نہ کسی حیثیت میں ایجاد ہوگئی تو سب سے پہلے مذہبی دُعائیں۔ دیوتاؤں کی تعریفیں اور جھاڑ پھونک کے منتر لکھے گئے۔ ادویّہ اور علاج کے طریقے قلمبند ہوئے۔ زمانہ ترقی کرتا گیا نئے مشاہدے انسانی علم میں آتے گئے ضرورتیں وسیع ہوتی گئیں اور اُس تناسب سے تحریروں میں تنوّع پیدا ہوتا گیا۔ حروف کی شکلوں اور اُن کے لکھنے کے طرز میں ترمیمیں ہوئیں مکتوبات میں وسعت ہوئی۔ تجارتی دستاویزیں، عدالتی کارروائیاں، نظری طب، پند و مواعظ، فلکی مشاہدات، موسمی تغیّرات، ہندسی نظریے اور لسانی قواعد غرض یہ ہے کہ اُس وقت تک کے علوم کل کے کل قلمبند ہونا شروع ہوگئے اور کتابت ایک مستقل اور باقاعدہ فن بن گیا۔

کتاب خانے کتابت کی ترقی سے کتابوں کے ذخیروں میں اضافہ لازمی تھا جن کے رکھنے کے لئے کسی نہ کسی جگہ کا تعیّن ناگزیر ہے۔ یہیں سے کتاب خانہ کا تصوّر پیدا ہوا۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے کہ کتابت کی ایجاد کا بڑا سبب مذہب ہے تو یہ قیاس بھی بیجا نہیں کہ مخطوطات کا سب سے پہلا مخزن بھی کوئی مندر ہی ہوسکتا ہے۔ ایسے مخزن کا محافظ کسی پُرانے مندر کا بوڑھا کاہن یا پوجاری ہی ہوگا۔

رفتہ رفتہ مخطوطات جمع کرنیکا شوق عام ہوتا گیا۔ مندر اور ہیکل سے نکل کر علماء کے کاشانے اور بادشاہوں کے ایوان قدیم اور جدید مخطوطات سے آراستہ کئے جانے لگے۔ بادشاہوں سے یہ شوق امرا میں آیا اور علم کی اشاعت و ترقی کے لئے کتابوں کے فائدے کو زیادہ عام کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی حتّٰی کہ خصوصی کتاب خانوں سے عمومی کتاب خانے بن گئے۔ اب کتاب خانے صرف مذہبی کتابوں کے ہی مخزن نہ تھے بلکہ اُن میں وقت کے تمام مروّجہ علوم و فنون کے زرپارے بڑی کوشش سے جمع کئے جاتے تھے۔

چونکہ تہذیبی اور تمدّنی ارتقا تمام قوموں میں یکساں نہیں ہوا ہے بعض قومیں اب سے ہزارہا سال پہلے سے تہذیبی اور تمدّنی درجے پر آچکی تھیں درآں حالیکہ بعض قومیں آج بھی اپنی بدوی حالت پر قائم ہیں۔ مزید براں بعض قومیں خاص خاص اسباب عروج و زوال کے تحت تہذیب و تمدّن سے پھر بدوی حیات کی طرف لوٹ گئیں یا اپنی قومی اور اجتماعی حیثیت میں دُنیا سے ہی معدوم ہوگئیں اور اس طرح اُن کے ساتھ ہی اُن کے متعلق ہر قسم کے ذرائع علم بھی ختم ہوگئے۔ لہٰذا کتاب خانوں کا سلسلۂ وجود بھی جو تہذیب و تمدّن کی پیداوار ہے دُنیا کی ہر قوم میں نہ ہوسکتا تھا اور نہ آج ہے۔ اور نہ آج اُن تمام قوموں کا احصار ممکن ہے جن میں کسی نہ کسی حیثیت میں کتاب خانے تھے۔ ہمارے تحریری ذخیرے اور اثری انکشافات نے جن قوموں میں کتاب خانوں کے وجود کا سراغ لگایا ہے ظاہر ہے کہ اُن کو حقیقت سے کمیّت اور کیفیت دونوں کے اعتبار سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔ میں نے اس مضمون میں اسلام سے پہلے کے بعض مشہور کتاب خانوں کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب خانے مختلف اقوام اور مختلف ممالک سے متعلق ہیں جو قدیم دُنیا کے تینوں برّاعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ سے وابستہ ہیں۔

مصر

دُنیا کی قدیم تاریخ میں مصر کی عظمت ناقابلِ انکار حقیقت ہے جب تقریبًا ساری دُنیا پر وحشت و بربریت کی گھٹاٹوپ اندھیاری چھائی ہوئی تھی مصر اپنی تہذیب اور تمدّن کے اعتبار سے اُس معراجِ کمال پر تھا جس پر دوسری قوموں کو پہنچنے کے لئے ہزاروں سال انتظار کرنا پڑا۔ اُس کے علوم و معارف، اُس کی صنعت، اُس کا نظامِ سلطنت اُس کے قوانین دُنیا کیلئے نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ جن کتاب خانوں سے ہم ابتک واقف ہوئے ہیں اُن میں سے سب سے قدیم کتاب خانے کا سُراغ مصر میں ہی ملتا ہے۔

دُنیا کا قدیم ترین کتاب خانہ مقام جیزہ میں اہرام کے قریب کھدائی کے دوران میں ایک قبر برآمد ہوئی ہے اُس قبر کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہانِ مصر کے دوسرے خاندان کے کسی بادشاہ کے کتاب خانے کے ناظر کی یہ قبر ہے۔ اس کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب خانے میں طب۔ ہندسہ۔ فلسفہ۔ فلکیّات۔ تاریخ۔ ادب وغیرہ کا اچھا خاصا ذخیرہ محفوظ تھا[1]۔ مصر کے حکمرانوں کے دوسرے خاندان کا زمانۂ حکومت سنہ ۴۷۵۱ ق م سے سنہ ۴۴۴۹ ق م ہے[2]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب سے کم از کم چھ ہزار سال پہلے مصر قدیم کے کتاب خانے اس حد تک ترقی کر چکے تھے کہ اُنھوں نے ایک خصوصی شعبے کی حیثیت اختیار کرلی تھی اور اُن کے لئے خاص عہدے کے تحت ایک خصوصی نگراں کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ مزید براں اس کتبے کی روشنی میں یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ علمی حیثیت میں اُس نے کتنی

---

[1] الکافی فی تاریخ مصر الحدیث والقدیم الجزء الاوّل ص ۱۶۹۔

[2] ایضًا ص ۲۹۲۷۔

نقی کرلی تھی اور کتنے اہم فنون اُس وقت تک اپنی مستقل حیثیت میں وُجود
یں آ چکے تھے۔

مُن مُحنت کا کتاب خانہ امُن مُحنت دوسرے خاندان کا سب سے پہلا بادشاہ
ہے ۲۷۵۰ ق م میں مصر کے قدیم پایۂ تخت منفس میں تخت نشین ہوا۔ اپنی تخت
نشینی کے بعد اُس نے ایک نہایت اعلیٰ کتاب خانے کی بُنیاد رکھی۔ ہزاروں
سال تک یہ کتاب خانہ عروج و زوال کی مختلف منزلیں طے کرتا رہا۔ چنانچہ
س کتاب خانے کی کتابیں مصر پر یونان کے حملے تک یعنی تقریباً تین صدی
بل مسیح تک موجود تھیں[1] گو ہمارے پاس شواہد و آثار موجود نہیں لیکن
ہوسکتا ہے کہ مذکورۂ بالا کتاب خانہ یہی امُن مُحنت کا کتاب خانہ ہو اور جیزہ
الی قبر اسی کے ناظروں میں سے کسی ناظر کی قبر ہو۔

رَمیڈیاس کا کتاب خانہ امیڈیاس مصرِ قدیم کا ایک نامور اور علم دوست
دشاہ تھا۔ اُس نے اپنے عہدِ حکومت میں بہت تلاش اور جستجو سے قدیم
تابوں کو مہیّا کیا اور ایک عظیم الشّان کتاب خانے کی بُنیاد ڈالی۔ یہ کتاب خانہ
پنے زمانے میں خاص شہرت اور اہمیت رکھتا تھا۔

کتاب خانہ شفا خانۂ روح رِعمیس اوّل نے جب مصر کی حکومت کی زمامِ اختیار
پنے ہاتھ میں لی تو اس نے امیڈیاس کے مذکورہ بالا کتاب خانے کی ترقی
یں مزید کوشش کی اور مختلف مقامات سے کتابیں حاصل کر کے اُس میں
شامل کیں اور اُس کو شفا خانۂ روح کے نام سے موسوم کر کے اس نام کا کتبہ
کتاب خانے کے دروازے پر نصب کرا دیا[2]

اسکندریہ تقریباً تین سو سال قبل مسیحؑ یونان اپنی ترقّی اور عروج کی آخری
منزل پر تھا۔ اُس وقت کی معلومہ دُنیا کو زیرِ نگیں کرنے کے لئے اسکندرِ اعظم
اپنی آخری کوششیں کر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر اپنی قدیم روایتی طاقت
اور رونق کھو چکا تھا۔ مصر کی قومی حکومت کمزور ہوتے ہوتے تقریباً ۵۰۰ ق م
ایرانیوں کے ہاتھوں سے آخر ختم ہوگئی۔ جاہ و جلال والے فراعنہ جو اپنی
قوت و شوکت کے گھمنڈ میں خدائی کے دعوے سے بھی نہیں چوکتے تھے
اپنے مدفنوں میں ہمیشہ کیلئے سو چکے تھے کہ سکندر کی زیرِ قیادت یونان نے

حملہ کر دیا اور مصر پر اہلِ یونان کا تسلط ہوگیا۔

سکندر کی فوج کا مشہور سالار بطلیموس سوٹر ۳۲۳ ق م میں مصر کا
حکمراں ہوا[4] بحرِ روم کے ساحل پر اُس نے سکندر کے نام پر اسکندریہ
آباد کیا اور اُسی کو دار الحکومت بنالیا۔

اسکندریہ کا کتاب خانہ سکندر کے خاص مصاحب اور یونانی فلسفے کے
ہیرو ارسطا طالیس کے مشورے سے بطلیموس نے اسکندریہ کے مشہور
عجائب خانے کی بنا ڈالی[4] یہ عجائب خانہ شہر کے ایک مشہور حصّے بروشین
میں واقع تھا۔ دوسری شاہی عمارتیں بھی اس جگہ واقع تھیں۔ عجائب خانے
کی عمارت سنگِ مرمر کی تھی چہل قدمی کیلئے چاروں طرف برآمدے بنے
ہوئے تھے۔ اس عمارت میں دُنیا کا مشہور کتاب خانہ، کتاب خانۂ اسکندریہ
قائم کیا گیا[5] دُنیا کے مشہور علمی مرکزوں میں ایجنٹ بھیجے گئے اور کتابیں
منگوا کر اس کتاب خانے میں جمع کی گئیں۔ ایران کا وہ علمی ذخیرہ جس کو
سکندر نے فتح ایران کے بعد مصر بھیجا تھا[6] غالبًا اسی خزانے میں محفوظ
کر دیا گیا تھا۔

۲۹ کتاب خانے کے مہتمم کو حکم تھا کہ جہاں کہیں سے کتابیں دستیاب
ہوں سرکاری خرچ سے خرید لی جائیں۔ اسکے ساتھ ساتھ کتاب خانے کے
متعلق کاتبوں کا پورا عملہ تھا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی کتاب فروخت کرنا
نہ چاہتا تو اُس کی نقل کرا کر مالک کو دے دی جاتی اور اصل نسخہ کتاب خانے
میں داخل ہو جاتا۔ کتاب خانے کی طرف سے اکثر بیش قرار قیمتیں معاوضے
یا تاوان کے طور پر اصل مالکوں کو دی جاتی تھیں[3]

یوسیفوس کی روایت کے مطابق بطلیموس نے بیت المقدس کے
ستّر منتخب علما کو اسکندریہ آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اپنی مذہبی کتابوں
کی ایک نہایت صحیح نقل کر دیں۔ اور اُس کو کتاب خانے میں داخل کر دیا
جائے۔ چنانچہ فرمائش کے مطابق جب یہ علما نقلیں پوری کر چکے اور مقابلہ
ختم ہوگیا تو بادشاہ کی طرف سے اُن کو بہت سا انعام دیا گیا اور نہایت اعزاز

---

[1] الکافی فی تاریخ مصر الحدیث والقدیم الجزو الاوّل ص ۱۶۷
[2] چیمبرس انسائکلو پیڈیا برٹانیکا طبع ۱۹۵۰ء جلد ششم ص ۲۰۸
[3] نائل انسائکلو پیڈیا ص ۲۴۵

[4] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد شانزدہم ص ۸۶۶
[5] معرکۂ مذہب و سائنس ا۔ ڈریپر ص ۲۵، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۶۶
[6] تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء از حمزہ بن الحسن اصفہانی ص ۳۳، طبری جلد دوم ص ۹
[7] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۶ ۔

سے اُن کو رخصت کیا گیا[1]۔ بائبل عہد قدیم کا سبعینیہ نسخہ یہی کہلاتا ہے۔

بطلیموس سوٹر کے بعد اُس کا بیٹا بطلیموس فلاڈیلفوس ۲۸۵ ق م میں تخت نشین ہوا[2]۔ فلاڈیلفوس بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست تھا کتاب خانے سے اُس کو خاص دلچسپی تھی چنانچہ اُسکے عہدِ حکومت میں اسکندریہ کے کتاب خانے نے خوب ترقی کی۔ مشہور مصری مورخ مانیتون نے یونانی زبان میں قدیم مصر کی تاریخ اس کی فرمائش سے لکھی تھی۔ اس تاریخ کو دفتری کاغذات، سرکاری دستاویزوں اور مختلف کتابوں اور نوشتوں کی مدد سے جو پرانے مندروں اور ہیکلوں میں محفوظ تھے جمع کیا گیا تھا[3]۔

کتاب خانہ اگرچہ بطلیموس سوٹر کے زمانے میں ہی کافی ترقی کر چکا تھا لیکن اُسکے عہدِ حکومت میں اُس کی کوئی فہرست مرتب نہیں ہو سکی تھی۔ فلاڈیلفوس نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ اُس کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کرائی[4]۔ فلاڈیلفوس کے بعد بھی ہر بادشاہ نے اپنے زمانۂ سلطنت میں اس کتاب خانے کی سرپرستی کی۔ چنانچہ اس کی کتابوں کی تعداد چار لاکھ نسخوں تک پہنچ گئی۔ اور کتاب خانے کی عمارت اس سے زیادہ کتابوں کی گنجائش نہ رکھتی تھی۔ لہذا اس عمارت میں کتابوں کا مزید داخلہ روک دینا پڑا۔

سراپیم کا کتاب خانہ | اسکندریہ کے عجائب خانے کی وہ عمارت جو کتابوں کے لئے مخصوص تھی مزید تعداد کی متحمل نہ ہو سکی تو سراپیم کے مشہور مندر میں ایک دوسرے کتاب خانے کا افتتاح کیا گیا۔ اس کتاب خانے کی حیثیت عجائب خانے کے پرانے کتاب خانے کے اعتبار سے ایک شعبے کی تھی۔ چنانچہ سراپیم کا کتاب خانہ پہلے کتاب خانہ کا ایک تتمہ تھا۔ حکومت کے علمی ذوق اور اُس کی غیر معمولی توجہ سے اس شعبے نے بھی تھوڑی مدت میں کافی ترقی کر لی اور اس میں بھی تین لاکھ کے قریب کتابیں جمع ہو گئیں[5]۔

اسکندریہ کے کتاب خانوں میں آتش زدگی | اسکندریہ کے یہ دونوں کتاب خانے بروکشین کا کتاب خانہ اور سراپیم کا کتاب خانہ جو پہلے کا ایک شعبہ تھا مسیح علیہ السلام سے تقریباً نصف صدی پیشتر تک موجود تھے۔ مصر کی ایک اندرونی نزاع کے سلسلے میں رومی شاہنشاہ جولیس سیزر مصر کی مشہور ملکہ کلوپیٹرا کی حمایت کیلئے آیا ہوا تھا۔ مصریوں نے ارکلاس کی زیر قیادت بروکشین میں سیزر کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ سیزر کا بیڑا مصریوں کے قبضے میں آ جائے بیڑے کو مصریوں سے بچانے کی ایک ہی تدبیر تھی کہ بیڑے میں آگ لگا کر اُس کو تباہ کر دیا جائے۔ سیزر نے مجبوراً بیڑے میں آگ لگانے کا حکم دیدیا۔ اتفاق سے یہ آگ زیادہ پھیل گئی اور بروکشین تک پہنچکر شاہی کتاب خانے میں لگ گئی اور پورے کتاب خانے کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا[6]۔

جب یہ کتاب خانہ اس طرح برباد ہو گیا تو مارک اینٹونی نے تلافیٔ نقصان کے طور پر پرگیماس کا کتاب خانہ جس میں دو لاکھ کے قریب کتابیں تھیں اور جو اب روم کے تحت تھا ملکہ کلوپیٹرا کے حوالے کر دیا کلوپیٹرا کے حکم سے یہ ذخیرہ سراپیم کے کتاب خانے میں منتقل کر دیا گیا[7]۔

بروکشین کے کتاب خانے کے جل چکنے کے بعد اب اسکندریہ میں صرف ایک ہی کتاب خانہ موجود تھا[8]۔ ۳۸۹ء میں اسکندریہ کے بشپ تھیا فیلس نے رومی بادشاہ تھیا ڈوشش کے حکم سے مصر کے اس قدیم علمی ذخیرے کو بھی برباد کر دیا[9]۔ اس طرح اسکندریہ کے ہی یہ دونوں کتاب خانے برباد نہیں ہوئے بلکہ پرگیماس کا علمی ذخیرہ بھی جو کلوپیٹرا کے عہدِ حکومت میں مصر آ چکا تھا برباد ہو گیا۔

اسکندریہ کے کتاب خانے کے جلانے کا حضرت عمر پر اتہام | اسکندریہ کے یہی کتاب خانے ہیں جن کو جلانے کا الزام ساتویں صدی ہجری کے دو مورخ عبداللطیف بغدادی اور علی بن یوسف قفطی کے غیر ذمہ دارانہ بیانات کی بنیاد پر فاروق اعظم پر لگایا جاتا ہے جس کی حقیقت مشہور مورخ گبن کے

۱۔ تاریخ یوسیفوس فصل اول ترجمہ عربی ص ۴۹-۵۰

۲۔ نائل انسائکلوپیڈیا ص ۵۲

۳۔ الکافی الجزو الاول ص ۲۰۹

۴۔ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدھم ص ۵۶۹

۵۔ معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۵

۶۔ الکافی الجزو الاول ص ۳۳۳، معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸

۷۔ سوانح عمری اینٹونی از پلوٹارک بحوالہ حاشیہ ذیلی معارف جلد نہم نمبر ششم ص ۴۴۶، معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸

۸۔ معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸

۹۔ معرکۂ مذہب سائنس ص ۲۵، انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدھم ص ۵۶۶

اقرار کے مطابق صرف اتنی ہے کہ "پڑھو اور تعجب کرو"[1] خصوصاً ایسی صورت میں کہ احراق کے افسانے کا اصل ہیرو یحییٰ نحوی (یوحنا عبرانی میں، جان انگریزی میں، ژان فرانسیسی میں یوہن جرمنی میں، اس لفظ کی مختلف شکلیں ہیں) جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے مصر کے عامل حضرت عمرو ابن عاص سے یہ کتاب خانہ مانگا تھا۔ اُنہوں نے حضرت عمرؓ سے استصواب کیا۔ حضرت عمرؓ نے لکھا کہ اگر یہ کتابیں کتاب اللہ کے موافق ہیں تو ان کی ضرورت نہیں۔ کتاب اللہ کافی ہے اور مخالف ہیں تو مضر ہیں۔ بہر حال اُن کو جلا دیا جائے چنانچہ اُن کے حکم سے یہ کتاب خانہ نذرِ آتش کر دیا گیا، مسلمانوں کے اسکندریہ کو فتح کرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔[2]

اس بے بُنیاد الزام کا ڈھنڈورا متعصب عیسائی مورخین ایک زمانے تک پیٹتے رہے ہیں۔ اس طرح کہ ساری دُنیا اس کی بازگشت سے گونج اُٹھی لیکن کب تک یہ کاٹھ کی ہانڈی چڑھی رہتی۔ آخر حقیقت بے نقاب ہوکر رہی۔ بجز سر پھروں کے ہر پڑھا لکھا اس الزام کو دُہرانے میں اپنی علمی توہین سمجھتا ہے۔ لیکن جہاں تک تدلیس اور تغلیط کا تعلق ہے اب بھی لوگ باز نہیں آتے۔ حیرت ہوتی ہے کہ انگلستان کا نہایت فاضل اور مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن جو اس الزام کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے حضرت عمرؓ کے سلسلے میں اسکی طرف نفیاً اور اثباتاً کسی قسم کا اشارہ نہیں کرتا۔ اُندلس کی عربی ادبیات کے بیان میں اس واقعہ کی طرف ضمناً اشارہ کرتا ہے مگر اس طرح کہ ہر پڑھنے والا یہ سمجھے کہ یہ الزام بالکل صحیح ہے اور ساتھ اپنے علمی وقار کو بھی ٹھیس نہ لگے "تاریخ ادبیات عرب" میں اُندلس میں مسلمانوں کے ہشت صد سالہ علمی ذخیرے کی بربادی پر ماتم کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اگرچہ یہ مشتبہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسکندریہ کے کتاب خانے کو جلوا دیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ پادری زمینیر کے تعصب نے مسلمانوں کے اس علمی ذخیرے کو نذرِ آتش کر دیا۔" حالانکہ نکلسن کو معلوم ہے کہ یہ الزام اب مشتبہ نہیں رہا ہے بلکہ اس کے غلط اور جھوٹے ہونے پر نہایت قوی اور واضح دلائل موجود ہیں۔ وہ صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا ہے بلکہ اُس پر ذیلی حاشیہ لکھا ہے کہ "اگرچہ مصر کے جرجی زیدان نے اس الزام کی صحت کو دلائل سے ثابت کیا ہے"۔ ان دونوں عبارتوں کو ملا کر پڑھنے سے ایک عام پڑھنے والے پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے جہاں تک جرجی زیدان کے دلائل کا تعلق ہے محققین نے اُسکے تار و پود بکھیر کر رکھ دئے ہیں۔

عراق اور اُس کے اطراف

دجلہ اور فرات کے درمیان کا علاقہ آرمینیا کے کوہستانی سلسلے تک قدیم اقوام کی مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کے اختلاط اور تصادم کا آماجگاہ رہا ہے چنانچہ اسکی تاریخ بھی مصر قدیم کی تاریخ کے تقریباً پہلو بہ پہلو ہی رہی ہے۔ اکادی سومیری اشوری کلدانی قوموں کے عروج و زوال، جنگ و صلح اور فتح و شکست کا گہوارہ اس دوآبے کے ہی مختلف مقامات ہیں۔ تہذیب و تمدن اور کتابخانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لہذا اس درمیانی علاقے میں کتاب خانوں کا وجود بھی نہایت قدیم زمانے سے ہے جن کی تفصیلات قدامت کی تاریکی میں چھپی ہوئی ہیں۔

سارگن اوّل کا کتاب خانہ سارگن اوّل ۲۸۰۰ق م میں کلدہ کا ایک سامی فرمانروا تھا اپنے عہدِ حکومت میں اُس نے ایک عظیم الشان کتاب خانے کی بُنیاد رکھی تھی۔ یہ کتاب خانہ کلدہ کے مشہور شہر اورک میں واقع تھا۔ اسی ۱۴۱
مناسبت سے اس شہر کو "کتابوں کا شہر" کہا جاتا تھا۔ اس کتاب خانے میں نجوم، تاریخ، قواعد وغیرہ بہت سے فنون پر ہر قسم کی قدیم اور جدید کتابیں جمع کی گئیں تھیں۔ اس کتاب خانے کے انتظام سے اُس عہد کی عام تہذیبی اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے تک خود کتاب خانوں نے کتنی حیرتناک ترقی کر لی تھی۔ چنانچہ اس کتاب خانے کی تمام کتابوں پر نمبر شمار درج تھے۔ پورے کتاب خانے کی ایک باقاعدہ فہرست موجود تھی۔ مطالعہ کے شائقین فہرست سے کتاب کا انتخاب کر لیتے تھے اور مطلوبہ کتاب کا نمبر کتاب۔ خانے کے ناظم کو بتا دیتے تھے۔ اور وہ مطلوبہ کتاب لاکر حوالے کر دیتا تھا۔ اس کتاب خانے کی کتابوں پر اُسکے ناظم کی مہر ثبت ہوتی تھی۔ کتاب خانے کے ناظم کا نام "ابن سرو" تھا۔ غالباً قدیم سے قدیم ناظمِ کتاب خانے کا نام جس کا ابتک علم ہو چکا ہے یہی نام ہے۔[1]

---

[1] ڈکلاین اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر از گبن جلد پنجم صفحہ ۵۳۴

[2] دی عرب کانکوئسٹ آف ایجپٹ از بٹلر بحوالہ معارف جلد نہم نمبر ششم صفحہ ۴۴۲

[1] تاریخ ملل قدیم صفحہ ۱۰۱، انٹرنیشنل سائکلوپیڈیا جلد دوم صفحہ ۹۱-۹۲، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم صفحہ ۶۰۸

اشور نصر پال کا عام کتاب خانہ | اس زمانے میں بہت سے کتاب خانے مختلف شہروں میں موجود تھے جن میں اشورا اور نینوا کے کتاب خانے خاص اہمیت اور شہرت رکھتے تھے۔ اشور کا سب سے آخری اور سب سے اہم کتاب خانہ اشور کے بادشاہ اشور نصر پال کا تھا جو ۶۸۰ ق م میں موجود تھا یہ کتاب خانہ تمام رعایا کیلئے عام تھا اور پبلک لائبریری کی حیثیت تھی جس میں عام فائدے کے لئے ہر قسم کی کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ یہ کتاب خانہ ۶۰۶ ق م تک موجود تھا آخر بخت نصر کے ہاتھوں سے برباد ہو گیا۔ اس زمانہ میں یہی ایک کتاب خانہ نہ تھا بلکہ اشور نصر پال کے عہد میں اور اُس کے بعد بھی ہر بڑے شہر میں کوئی نہ کوئی عام کتاب خانہ ضروری سمجھا جاتا تھا۔[1]

یونان

یونان کی علمی ترقی اور فلسفے اور حکمت کے مختلف شعبوں میں اُس کے کارنامے دُنیا کے تاریخی حافظے پر اس طرح ثبت ہیں کہ اُن کو کوشش کر کے بھی نہیں مٹایا جا سکتا۔ لیکن جہانتک کتاب خانوں کا تعلق ہے ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُن میں باضابطہ کتاب خانوں کا وجود زیادہ قدیم نہ ہو لیکن خود علماء کے پاس ذاتی طور پر کتابیں نہ ہوں بہت زیادہ مستبعد ہے۔ ۳۳

ارسطاطالیس کا کتاب خانہ | اسٹرابو کے بیان کے مطابق مشہور یونانی فلسفی اور سکندر اعظم کا خاص مصاحب ارسطو (۳۲۲ - ۳۸۵ ق م) پہلا یونانی ہے جسنے کتاب خانہ جمع کیا۔ ارسطو کی علمی حیثیت کا اور اُن سہولتوں کا لحاظ کرتے ہوئے جو اُس کو کتابیں جمع کرنے میں حاصل تھیں یہ قرینِ قیاس ہے کہ اُس کا کتاب خانہ کتابوں کی تعداد اور اُن کی اہمیت دونوں کے اعتبار سے خاص حیثیت رکھتا ہوگا۔ ارسطو کا جمع کیا ہوا یہ کتاب خانہ اُس کی موت کے بعد اُسکے شاگرد نیلیُس کے قبضے میں آیا۔[2] نیلیُس اُس کو سیپسس لے گیا۔ اس زمانے میں پرگیماس کے بادشاہ خاص طور سے کتابوں کی جستجو اور تلاش میں رہتے تھے۔ نیلیس اُنہیں کتابیں دینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ اُن کی دستبرد سے بچانے کے لئے بعض مورخین کے خیال کے مطابق اُس نے اس بیش بہا کتاب خانے کو زمین میں دفن کر دیا۔ اسٹرابو بیان کرتا ہے کہ اس کتاب خانے کو اپیلیکُس نے خرید لیا اور اتھینس لے آیا۔ اپیلیکس کے مرنے کے بعد یہ کتاب خانہ روم آگیا۔ انہی نیوس کا بیان ہے کہ بطلیموس نے اس کتاب خانے کو خرید لیا تھا اور وہ اسکندریہ کے کتاب خانے میں شامل کر دیا گیا۔

بیسس ٹریٹس کا کتاب خانہ | بیسس ٹریٹس اُن یونانیوں میں جو کتابیں جمع کرنے کے شائق تھے خاص شہرت رکھتا تھا۔ اُس کا کتاب خانہ کتابوں کی تعداد اور اہمیت دونوں کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتا تھا۔

پالکریٹس اقلیدس نیکا کریٹس یوری پیڈیس قبل مسیح صدیوں کے اُن علماء میں سے ہیں جن کے کتاب خانے خاص طور پر شہرت اور اہمیت رکھتے تھے

پرگیماس کا کتاب خانہ | پرگیماس ایشیائے کوچک کا ایک شہر تھا اور اس نام کے صوبے کا پایہ تخت جس کی تقریباً تیسری صدی قبل مسیح میں بُنیاد رکھی گئی۔ یہ یونانی مہاجرین کی ایک نو آبادی تھی۔ یہ صوبہ ابتداءً مقدونیہ کے تحت تھا اُس کے بعد آزاد ہو گیا اور ۱۳۳ ق م میں رومی حکومت کے تحت آگیا۔[1]

جس زمانے میں اسکندریہ کا کتاب خانہ ترقی کر رہا تھا شاہان پرگیماس نے اسکندریہ کے کتاب خانے کی مسابقت میں پرگیماس میں اس کتاب خانے کی بُنیاد رکھی اور اس کو ترقی دیکر اسکندریہ کے کتاب خانے سے بڑھا دینے کی ہر طرح کوشش کی۔ مختلف مقامات میں ایجنٹ بھیجے گئے تا کہ جس طرح ممکن ہو کتابیں لائی جائیں۔ گو یہ حقیقت ہے کہ پرگیماس کا یہ کتاب خانہ اسکندریہ کے کتاب خانے سے سبقت تو کیا اُسکے مساوی بھی نہ ہو سکا۔ لیکن ان کوششوں کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ دُنیا میں اسکندریہ کے بعد دوسرے درجے پر یہی کتاب خانہ تھا تقریباً نصف صدی قبل مسیح تک اس میں دو لاکھ کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ آخر اسی زمانے میں مارک انیٹونی کے حکم سے ملکۂ کلوپیٹرا کے حوالے کر دیا گیا اور سراپیم کے کتاب خانے میں داخل ہو گیا۔[2]

روم

روم کو اپنے عہدِ عروج میں ایک زمانے تک کتابوں اور کتاب خانوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی چنانچہ ۱۴۶ ق م میں روم کے بادشاہ سیپو نے کارتھیج کو فتح کیا اور سامان غنیمت کے طور پر ایک کتاب خانہ بھی لایا تو اُس کو اپنی طبعی غیر دلچسپی کی بنا پر سوائے چند زراعتی تصانیف کے اور کوئی کتاب پسند نہ آئی اور

---

[1] تاریخ ملل قدیمہ ص ۱۰۸، انٹرنیشنل انسائکلوپیڈیا جلد دوم ص ۹۱۲، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم ص ۶۰۔ [2] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا جلد شانزدہم ص ۵۲۶، چیمبرس انسائکلوپیڈیا جلد ششم ص ۵۰۶

[1] نائل انسائکلوپیڈیا ص ۴۹۴

[2] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۲۸۲، سوانح عمری انیٹونی بحوالہ معارف

ایشیا۔ مئی ۱۹۳۲ء

اُس کو روم میں رکھنے کے بجائے افریقی حکومتوں کو بخش دیا۔ اسکے بعد بھی مختلف شاہانِ روم نے بہت سے کتاب خانے مالِ غنیمت کے طور پر حاصل کئے ٦٨ق م میں سولا ایتھنس سے اپلیکیس کا کتاب خانہ لایا لیکن اُس سے کوئی دلچسپی نہوئی۔ لیکن اسکے بعد سے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا اور اُن کو جمع کرنیکا جذبہ پیدا ہوگیا۔

لوکولس کا کتاب خانہ | لوکولس کا کتاب خانہ اس حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اُس نے دوسرے لوگوں کیلئے نمونے کا کام دیا اور اُس کے بعد سے لوگوں میں عام علمی شوق نے نشو و نما پانا شروع کر دیا۔ اس کتاب خانے کی بنیاد ٧٠ ق م میں اس طرح پڑی کہ لوکولس اپنی مشرقی فتوحات کے سلسلے میں مالِ غنیمت میں کتابوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ساتھ لایا اور اُس کو اپنے احباب اور دوسرے اہلِ علم کے مطالعہ کیلئے عام کر دیا۔

سسیرو اور اپٹیکس کے کتاب خانے خاص اہمیت رکھتے تھے ان کے مالک سسیرو اور اپٹیکس دونوں زیادہ سے زیادہ کتابیں جمع کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس طرح بہت کافی ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔

نجی کتاب خانوں کا شوق بھی روز بروز بڑھتا جارہا تھا جن میں بعض کتاب خانے کتابوں کی تعداد کے اعتبار سے کافی عظمت رکھتے تھے چنانچہ ٹیرانین کا کتاب خانہ تقریبًا تیس ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ سیمونیکس نے اپنے شاگرد گورڈین کے لئے باسٹھ ہزار سے بھی زیادہ کتابیں چھوڑی تھیں۔

روم کا سب سے پہلا عام کتاب خانہ | آود کے قول کے مطابق اس زمانے میں جی ایسینیوس پولیو نے سب سے پہلا عام کتاب خانہ قائم کیا یہ کتاب خانہ ایٹریوم کا لیبر ٹیٹس میں قائم کیا گیا تھا۔

اکٹیوین کا عام کتاب خانہ | جی ایسینیوس پولیو کے کتاب خانے کے بعد دوسرا شاہی عام کتاب خانہ قیصر اگسٹس نے ۳۳ ق م میں اکٹیوین کے نام سے قائم کیا۔ یہ پورٹیکس اکسٹیوئے میں قائم کیا گیا۔ یہ کتاب خانہ تقریبًا ایک صدی تک رہا آخر ٹیٹس (٤٠–٨١ء) کے زمانے میں جل کر تباہ ہوگیا۔

پلاٹین کا عام کتاب خانہ | یہ کتاب خانہ بھی قیصر اگسٹس نے قائم کیا تھا۔ اسکی کوئی مستقل عمارت نہ تھی بلکہ اپالو کے مندر میں پلاٹین پہاڑی پر قائم کیا گیا تھا اور اس پہاڑی کے نام پر اُس کا نام بھی پلاٹین کا کتاب خانہ ہوگیا۔ اس میں یونانی اور لاطینی دونوں زبانوں کی کتابیں موجود تھیں۔ یہ کتاب خانہ ایک زمانے تک رہا۔ آخر چھٹی صدی ہجری میں پوپ گری گوری کے حکم سے نذرِ آتش کر دیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ دوسرے اتفاقی حادثے میں جل کر تباہ ہوا[1]

ایران

یونان و روم بلکہ مصر کی طرح ایران بھی دُنیا، قدیم کی تہذیب اور تمدّن کے بڑے نمائندوں میں سے ایک ہے۔ اس لئے ایران کے علوم و معارف سے انکار کرنا حقیقۃً اُسکی پُرانی تہذیب اور اُس کے قدیم تمدّن سے آنکھیں بند کر لینا ہے واقعہ یہ ہے کہ ایران پر سکندر کی سرکردگی میں یونانیوں کے حملے نے جہاں اُنکی قومیت کو عظیم الشّان صدمہ پہنچایا وہاں اُن کو اُن کے قدیم علوم و فنون سے اور اُسکے بیش بہا علمی خزانوں سے بھی محروم کر دیا اور وہ علمی حیثیت سے تقریبًا برباد ہوگئے۔ جو کچھ رہ گیا وہ بالکل مخلوط غیر منظم اور پارہ پارہ، اس قومی حادثے کے بعد سے اُن کی فطری ذہانت اور دماغی صلاحیت کو پھر اُبھرنے کیلئے تقریبًا ہزار سال انتظار کرنا پڑا اور اسلام کے بعد وہ اپنی علمی عظمت کو واپس لا سکے۔ یہی اُنکی علمی بربادی تھی کہ اُن کی کتابوں کے پُرانے ذخیرے یا کتاب خانے سکندر کے حملے کے بعد سے ختم ہوگئے۔ چنانچہ اُنکے کتاب خانوں کی تاریخ سکندر کے حملے پر ایک حد تک ختم ہوجاتی ہے۔ ۳۲۲

ایران کا سب سے پہلا کتاب خانہ | ایران کی اپنی قدیم روایت کی بنا پر سب سے پہلا کتاب خانہ طہمورث بن ہوشنگ بن سیامک بن کیومرث نے قائم کیا تھا۔ ایران کے تجربہ کاروں اور ماہرین مشورہ اور رائے سے اصفہان میں مقام سارویہ میں اس کتاب خانے کی بنیاد رکھی گئی اور اُس زمانے میں جن جن علوم پر کتابیں موجود تھیں۔ اُن کو بڑی کوشش سے جمع کیا گیا اور اُن کو اس خیال سے کہ آئندہ حوادث سے تباہ و برباد نہ ہوجائیں محفوظ کر دیا گیا۔ مشہور منجم ابو معشر جعفر بن محمد بن عمر البلخی (متوفی ۲۷۲ھ) نے اصفہان میں ایک مقام کی کھدائی کے اثناء میں کتابوں کے ایک ذخیرے کو دیکھا تھا جس کے متعلق اُس وقت یہی خیال کیا گیا کہ یہ یہی کتاب خانہ ہے[2]

دژنبشت | یہ کتاب خانہ قدیم پرسی پالس یا اصطخر میں واقع تھا اس میں طب، فلسفہ، نجوم، زراعت اور بہت سے دوسرے فنون پر کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ یہ کتاب خانہ سکندر کے حملے تک موجود تھا۔ سکندر نے اسکی کتابوں میں سے بہت سی اہم کتابوں کا ترجمہ اور نقلیں کرائیں اور اُن کو یہاں کی بہت سی کتابوں سمیت لے گیا اور بقیہ کو برباد کرا دیا۔

گنج پشیگان | گنج پشیگان کے نام سے سمرقند میں کسی جگہ یہ کتاب خانہ قائم کیا تھا سکندر

[1] [illegible] ص ۱۵۲
[2] کشف الظنون و فہرست ابن ندیم ص ۳۲۵، [illegible] ص ۵۲۶، [illegible] ص ۶۰۵، [illegible] ایشیا - مئی ۱۹۴۳ء

کے حملے تک یہ بھی موجود تھا لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ اس حملے میں دوسرے علمی ذخیروں کی طرح یہ بھی برباد ہوگیا یا کسی دوسرے اتفاقی حادثے کے تحت ختم ہوا۔

اس کتاب خانے کے بعد سے ایران میں باقاعدہ کتاب خانوں کے متعلق عام روایتیں خاموش ہیں۔ اتنا یقینی ہے کہ ایران میں کتابیں موجود تھیں خصوصاً تاریخ اور اخلاقیات پر کتابوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود تھا چنانچہ عہدِ اسلام میں جب تراجم کا دور شروع ہوا ہے تو ان میں سے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا تھا[1]

چین

برِّ اعظم ایشیا میں چین کی اپنی تہذیب اور تمدّن کے اعتبار سے وہی حیثیت ہے جو افریقہ میں مصر کی ہے لیکن چونکہ چین کے تعلقات دوسرے ممالک سے عام نہیں ہوسکے اس لئے اُسکے متعلق دوسرے ممالک کی تاریخیں خاموش رہیں اور آج اس دورِ تہذیب میں بھی چین کے متعلق عام لوگ اُس سے بہت کم جانتے ہیں جتنا کہ وہ دوسرے ممالک کے متعلق جانتے ہیں۔ اور چونکہ چین کے تعلقات عام نہیں ہوئے اور دوسرے ممالک سے خیالات و نظریات کا تبادل عمومیت کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس لئے اُس کی تہذیب و تمدّن، علوم و صنائع میں دوسرے ممالک کا بہت ہی کم حصّہ ہوسکتا ہے۔ اُس نے بلا شرکت غیر اپنی تہذیب اور اپنے علوم اور اپنی صنعتیں خود ہی پیدا کیں اور خود ہی نشو و نما دیتا رہا۔ بہرحال چین کی قدامت ایک مسلّمہ حقیقت ہے علم و تہذیب میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ کتاب خانوں کا وجود ناگزیر ضرورت ہے چنانچہ چین میں کتاب خانوں کا وجود بھی بہت پُرانے زمانے سے ہے۔

جہاں تک میرے ذرائع علم کا تعلق ہے اُسکی بنا پر چین کے کتابخانوں کے متعلق تفصیلی اطلاعات بہم نہیں پہنچائی جا سکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۲۱۳ ق م سے بہت پہلے چین میں ہر قسم کے کتاب خانے کثرت سے تھے جن میں ایک شاہی کتاب خانہ بھی تھا۔ چین خاندان کے چوتھے فرمانروا جی وانگ ٹی متوفی سنہ ۲۱۰ ق م نے قانون اور مُلکی نظام میں کچھ جدید اصلاحات جاری کرنی چاہی تھیں۔ یہ اصلاحات قدیم رسوم و رواج اور پُرانی کتابوں کے خلاف تھیں۔ لوگوں نے پُرانے رسوم و رواج اور قدیم کتابوں کی بُنیاد پر ان اصلاحات کے خلاف آواز اُٹھانی شروع کردی۔ جی وانگ ٹی نے اپنے وزیر لی شی کے مشورے سے پورے شاہی کتاب خانے کو آگ لگوادی اور لوگوں کی ذاتی کتابیں بھی ضبط کرلی گئیں اور اُن کو جلوا دیا گیا۔ جن لوگوں نے کتابیں دینے سے انکار کیا اُن کو قتل کر دیا گیا۔ جیمز کارکون کے قول کے مطابق ایسے مقتولین کی تعداد چار سو ساٹھ تک پہنچ گئی تھی۔

غالبًا یہ تاریخ میں سب سے پہلا واقعہ تھا کہ کسی قوم کی ادبیات کو ملکی و سیاسی وجوہ کی بنا پر برباد کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد تقریبًا ایک صدی قبل مسیح سے پھر از سرِ نو کتابوں کے جمع کرنے کی کوشش شروع کردی گئی اور جو کتابیں بالکل ضائع ہوگئی تھیں اُن کو حافظے کی مدد سے پھر لکھوانے کی کوشش کی گئی۔ شاہی کتاب خانہ پھر دوسری بار قائم کیا گیا[2]

ہندوستان

ہندوستان اپنی تاریخی روایتوں کی نگہداشت میں کمزور رہا ہے چنانچہ خود اہم تاریخی روایات کی شہادتیں نہیں چہ جائیکہ خفیف جُزئیات کی۔ اور جو موجود ہیں اُن میں سے حقائق کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ مستند ذرائع کے فقدان کی وجہ سے اور اگر ہوں بھی تو دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے میں ہندوستان کے کتاب خانوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں بہم پہنچا سکا۔

بہرحال قدیم ہندوستان میں بُدھ سے پہلے کسی کتاب خانے کے وجود کا ثبوت نہیں۔ ہاں بدھ کے بعد سے پیروانِ بُدھ کے مندروں اور مدرسوں میں کتاب خانوں کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ چینی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں مدرسوں کے سلسلے میں اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ نالندہ کے کتاب خانے ساتویں صدی عیسوی میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ نالندہ کے متعلق بعض سیاحوں کے تاثرات کی تلخیص "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کی تہذیب" کے فاضل مصنّف نے اپنی کتاب میں کی ہے[3] جس میں اُس کے کتاب خانوں کا بھی ضمنًا تذکرہ کیا ہے۔

ان سب کے ساتھ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم ہندوستان اپنے علوم و فنون خصوصًا فلسفہ اور ریاضیات میں قدیم دُنیا کی علمی نمائندگی کا فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہا تھا۔

---

[1] فہرست ابن ندیم ص۳۳۳، تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء ص۳۲، طبری جلد دوم ص۹، معارف نمبر ۱ جلد دوم ص۳۲ — [2] تاریخ مملکت چین از جیمز کارکرن جلد دوم صفحہ ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، چائنا از رابرٹ ڈگلس ص۱۵، ۱۷ — [3] "قرون وسطیٰ میں ہندوستان کی تہذیب" از گوری شنکر ہیرا چند اوجھا ص۱۷۵ ہیونسانگ کے بیان کی تلخیص

دُکھ

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۲ء

پُجارن

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہم ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنیکا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلپذیر جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیل کی بلندی، الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں۔ سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرس وائس"

علی اطہر اور چیخوف

(ڈراما)

آیوانوف

(روسی افسانہ نگار چیخوف کا ایک شاہکار)

۳۷

(دوسرا اور تیسرا ایکٹ)

[لیبیڈیو کے مکان کا ڈرائنگ روم۔ اسٹیج کے مقابل باغ میں جانے کا دروازہ۔ دائیں اور بائیں بھی دروازے ہیں۔ پرانی وضع کے قیمتی فرنیچر۔ جھاڑ۔ فانوس اور تصویریں۔ سب ڈھکے ہوئے۔)

زنیدہ سوشنا کوسیخ۔ اودوتیا نذار وونا۔ یگور شکا۔ گیورل۔ ایک ماما۔ بڈھی مہمان عورتیں۔ کچھ نوجوان اور مادام بباکن۔

زنیدہ سوشنا صوفے پر بیٹھی ہیں اُن کے ایک جانب آرام کرسیوں پر بوڑھی عورتیں اور دوسری جانب معمولی کرسیوں پر کچھ نوجوان بیٹھے ہیں۔ پس منظر میں باغ کے دروازے کے قریب کچھ لوگ تاش کھیل رہے ہیں۔ کھیلنے والوں میں۔ کوسیخ۔ اودوتیا نذار وونا اور یگور شکا ہیں۔ گیورل دائیں جانب دروازے کے قریب کھڑا ہے۔ ایک ماما مٹھائیوں کا تھال سبھوں کے پاس باری باری لیجاتی ہے پورے ایکٹ میں مہمان باغ سے دائیں دروازے کی جانب اور پھر واپس آتے جاتے رہتے ہیں۔ مادام بباکن دائیں دروازے سے اندر داخل ہوتی ہیں۔ اور زنیدہ سوشنا کے پاس جاتی ہیں]

زنیدہ:۔ (خوشی میں) پیاری مارفا گیورونا!

مادام بباکن: کیسا مزاج ہے زنیدہ سوشنا؟ بیٹی کی سالگرہ پر میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں (ایک دوسرے کا بوسہ لیتی ہیں) خدا کرے کہ ......

زنیدہ:۔ شکریہ۔ ڈارلنگ۔ میں بہت خوش ہوں .... ہاں اور تم کیسی ہو؟

مادام بباکن:۔ بہت بہت شکریہ (اُن کی بغل میں صوفہ پر بیٹھ جاتی ہیں) اور کہو نوجوانو تم لوگ کیسے ہو۔

(مہمان اُٹھتے ہیں اور سر جھکاتے ہیں)

پہلا نوجوان:۔ (ہنستا ہے) نوجوانو! ...... تو آپ کیا بوڑھی ہوگئیں۔

مادام بباکن:۔ (آہ بھر کر) اور کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جوان ہونے کا

دعویٰ نہیں کرسکتی
پہلا مہمان :۔(ادب کے ساتھ ہنستے ہوئے) اور بھی کچھ کہئے گا!؟
چہرے سے تو آپ بیوہ نہیں معلوم ہوتیں بلکہ جوان چھوکریوں کو
بھی مات کرسکتی ہیں۔ (گیورل مادام بہاکن کو چائے دیتا ہے)۔
زنیدہ :۔(گیورل سے) اس طرح کیوں لائے ہو؟ تھوڑا سا جام بھی لاؤ
کرونڈے کا یا اور کسی چیز کا
مادام بہاکن :۔بہت تکلف مت کرو۔ شکریہ .... (مختصر وقفہ)
پہلا مہمان :۔ مارفا ایگروونا کیا آپ مشکنون کی راہ سے آئی ہیں۔
مادام بہاکن :۔نہیں۔ زمشتنشے کی طرف سے۔ ادھر کی سڑک اچھی ہے۔
پہلا مہمان :۔ضرور
کوسیخ :۔ دو کالا پان
یگورشکا :۔ پاس
اودوتیا :۔ پاس
دوسرا مہمان :۔ پاس
۴۸ مادام بہاکن :۔ لاٹری کے ٹکٹ کی قیمت تو حیرت انگیز طریقے پر چڑھ گئی ہے
پیاری زنیدہ اتنی زیادہ قیمت کبھی سنی بھی نہیں ہے۔ پہلے قرعہ میں
دو سو ستر ہے اور دوسرے میں دو سو پچاس ۔ پہلے کبھی اتنی قیمت
نہیں ہوئی تھی۔
زنیدہ :۔ (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) جن کے پاس زیادہ ہے ان کیلئے اچھی چیز ہے
مادام بہاکن :۔ یہ نہ کہو ڈارلنگ قیمت تو اتنی زیادہ ہے لیکن اس میں روپیہ لگانے
سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ صرف بیمہ ہی آدمی کو پاگل بنا دینے کو
کافی ہے۔
زنیدہ :۔ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن پیاری اس میں پھر بھی امید تو رہتی
ہے ...... (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) خدا رحیم ہے۔
تیسرا مہمان :۔ میرا خیال تو یہ ہے خواتین کہ آج کل سرمایہ رکھنے والوں کو
کوئی نفع نہیں۔ تجارت میں روپیہ لگانے سے منافع تو تھوڑا ملتا ہے
لیکن خطرے بہت زیادہ ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمانے
میں جس کے پاس سرمایہ ہے اُس کی حالت زیادہ اندیشناک ہے
بہ نسبت اس شخص کے جو ....

مادام بہاکن :۔ یہ سچ ہے۔
(پہلا مہمان جمائی لیتا ہے)
مادام بہاکن :۔خواتین کے مجمع میں یہی تہذیب برتی جاتی ہے!؟
پہلا مہمان :۔معاف کیجئے خاتون یہ محض اتفاق تھا۔
(زنیدہ سوشنا اُٹھتی ہے اور دائیں دروازے کی طرف جاتی ہے۔
(طویل خاموشی)
یگورشکا :۔ دو ٹھکری
اودوتیا :۔ پاس
دوسرا مہمان :۔ پاس
کوسیخ :۔ پاس
مادام بہاکن :۔(علیحدہ) یا اللہ کتنی موت کی سی اُداسی ہے۔
(زنیدہ سوشنا اور لیبیڈیو داخل ہوتے ہیں)
زنیدہ :۔(لیبیڈیو کے ساتھ دائیں دروازے سے خاموشی سے آتے ہوئے)
تم وہاں اکیلے چپکے رہنا کیوں چاہتے ہو۔ جیسے تم بہت بڑے آدمی
ہو۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ بیٹھو
(جہاں پہلے بیٹھی تھی بیٹھ جاتی ہے)
لیبیڈیو :۔اوہ۔ اوہ (مادام بہاکن کو دیکھ کر) واللہ یہاں تو رسگلا
بیٹھی ہوئی ہیں۔(ہاتھ ملاتا ہے) آپکا قیمتی مزاج کیسا ہے۔
مادام بہاکن :۔بالکل ٹھیک بہت شکریہ۔
لیبیڈیو :۔ خیر خدا کا شکر ہے (بیٹھ جاتا ہے) ہاں۔ ہاں ...... گیورل
(گیورل ایک گلاس شراب اور پانی کا جگ لاتا ہے۔ وہ شراب
پیتا ہے اور پھر پانی)
پہلا مہمان :۔ آپ کی بہترین صحت کے لئے۔
لیبیڈیو :۔بہترین صحت۔ ضرور .... مجھے مشکور ہونا چاہئے کہ میں
نے اپنی صحت بالکل تباہ نہ کرلی (اپنی بیوی سے) زیورشکا آج کی
ملکہ کہاں ہے۔
کوسیخ :۔ (غمگین آواز میں) میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ کیوں ہم لوگوں نے آج ایک
بازی بھی نہیں جیتی (اُچک پڑتا ہے) کیوں ہم تمام بازیاں ہار گئے
خدا مجھے غارت کرے۔

اودوتیا: - (کودتی ہے اور غصّہ میں کہتی ہے) کیوں ؟ جب تم کو کھیلنا نہیں
آتا تو اچھا ہے کہ ایک بازی بھی نہ جیتو - آپ کو وہ پتہ چلنے کی
کونسی ضرورت پڑی تھی جو فریق کے پاس زیادہ تھا - اسی وجہ سے
آپ کا یکہ رکھا کا رکھا رہ گیا - (دونوں میز سے آگے کی طرف
دوڑ کر جاتے ہیں)

کوسیچ: - (رونی آواز میں) سُنیئے ذرا ...... میرے پاس اکا - بادشاہ
بیوی - آٹھ اور ٹھکری کے پتے - حکم کا اکا اور ایک چھوٹا پان تھا
اور یہ چھوٹا سلام نہ بول سکیں - شیطان جانے کیوں - میں نو
ٹرمپ بولا تھا -

اودوتیا: - میں نو ٹرمپ بولی تھی - تم دو بولے اور نو ٹرمپ ......

کوسیچ: - یہ سخت تکلیف دہ ہے ...... معاف کیجئے ......
تمہارے پاس ...... میرے پاس ...... تمہارے
پاس ...... (لیبیڈیو سے) خیال کرو پاؤل کریلچ ....
میرے پاس - اکا - بادشاہ - بیوی اور آٹھ اور ٹھکریاں تھیں

لیبیڈیو: - (اپنی انگلی اُس کے کان میں ڈالتے ہوئے) بُرا نہ مانئے تو
مجھے بخش ہی دیجئے -

اودوتیا: - (چلاتی ہے) میں نو ٹرمپ بولی تھی -

کوسیچ: - (خوفناک آواز میں) میں ذلیل اور کمینہ ہونگا اگر پھر کبھی اُس بڈھی
چڑی کے ساتھ کھیلوں - (جلدی سے باغ میں چلا جاتا ہے
دوسرا مہمان اُسکے پیچھے جاتا ہے میز پر صرف یگورشکا رہ جاتا ہے)

اودوتیا: - اخ - میں سر سے پیر تک گرم ہو رہی ہوں ...... چڑی ؟
...... چڑی وہ خود ہے -

مادام بباکن: - تم جلد باز بھی ہو دادی -

اودوتیا: - (مادام بباکن کو دیکھ کر تیزی سے ہاتھ ملاتی ہے) میری جان
میری مورت - تم یہاں ہو اور میں اتنی اندھی ہوں کہ تمہیں دیکھ
بھی نہ سکی ...... میری پیاری ...... (اُسکے کندھے کو
پیار کرتی ہے اور اُس کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے) کتنی خوشی ہوئی
آؤ تمہیں جی بھر کے ذرا دیکھ تو لوں - میری سفید بط ! ......

لیبیڈیو: - اب تو تمہیں فرصت ہے ...... بہتر ہوتا کہ تم ان کیلئے
ایک دولھا ڈھونڈھ دیتیں ......

اودوتیا: - ضرور، ضرور، میری بُرانی گناہ گار ہڈیاں اس وقت تک قبر میں
نہ جائینگی جب تک کہ میں ان کے لئے دولھا نہ ڈھونڈھ دوں اور ساشا کے
لئے بھی ..... کبھی نہیں ! .... (ٹھنڈی سانس لے کر) لیکن آج کل
دولھے ملتے کہاں ہیں ؟ آج کل کے نوجوان بیٹھے پر پھڑپھڑاتے رہتے ہیں
جیسے برسات میں مرغے کرتے ہیں -

تیسرا مہمان: - تشبیہ نہایت مہمل ہے - میرے خیال میں محترمہ اگر اس
زمانے میں نوجوان کنوارا رہنا پسند کرتے ہیں تو اس کی وجہ آج کل
کی معاشرتی حالت ہے یعنی ......

لیبیڈیو: - اچھا، اچھا، وعظ کی ضرورت نہیں ! .... میں اسکی
پروا نہیں کرتا .....

(ساشا آتی ہے)

ساشا: - (اپنے باپ کے نزدیک جاتی ہے) اتنا بہترین موسم اور آپ
لوگ اس بند کمرے میں بیٹھے ہیں -

زنیدہ: - ساشا کیا دیکھتی نہیں کہ مارفا یگورونا آئی ہیں ؟

ساشا: - میں نادم ہوں (مادام بباکن کے پاس جاکر ہاتھ ملاتی ہے)

مادام بباکن: - تم کچھ مغرور ہوگئی ہو ساشا - ایک مرتبہ بھی مجھ سے ملنے
نہیں آئیں (اس کو پیار کرتی ہے) میں تم کو مبارکباد دیتی ہوں ڈارلنگ -

ساشا: - شکریہ - (اپنے باپ کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے)

لیبیڈیو: - ہاں اودوتیا نذارو ونا، آج کل کے نوجوان کچھ عجیب طرح کے
ہوتے ہیں - دولھا تو کیا شادی وادی کے موقع پر کوئی اچھا
شہ بالا بھی اس زمانے میں نہیں ملتا - آج کل کے نوجوان (میرا
اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں) نہایت پھکیلے اور ڈھیلے ہوتے
ہیں - خدا ان کی مدد کرے ...... نہ تو گفتگو کا سلیقہ
جانتے ہیں نہ رقص کرنا اور نہ شراب ہی پینا

اودوتیا: - ارے نہیں شراب پینے میں تو سب اُستاد ہیں اگر موقع ملجائے

لیبیڈیو: - شراب پینا کوئی مشکل آرٹ تو ہے نہیں - گدھا بھی پی سکتا ہے
.... مطلب یہ ہے کہ تہذیب کے ساتھ پینا - ہم لوگ جوان تھے
تو دن بھر لکچروں کے ساتھ سر مغزی کرتے رہتے تھے لیکن جیسے ہی

شام ہوئی سب کسی طرف نکل جاتے اور پھر صبح تک لٹو کی طرح چکر لگاتے رہتے
اس درمیان میں کچھ دیر رقص میں حصہ لیتے، کچھ دیر لڑکیوں کا جی بہلاتے اور جی
بھر کے پیتے بھی۔ مہمل بکواس کرتے یا فلسفہ چھانٹتے یہاں تک کہ زبانیں تھک
جاتیں...... لیکن آج کل کے نوجوان ...... (شانہ ہلاتا ہے) انکا تو کچھ
سر پیر ہی سمجھ میں نہیں آتا ۔ .... نہ خدا کے اور نہ شیطان کے۔ ضلع
بھر میں صرف ایک سمجھدار نوجوان ہے اور اسکی شادی ہو چکی ہے (ٹھنڈی
سانس لیتا ہے) اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا دماغ بھی اپنی جگہ سے کھسکنے
لگا ہے ۔......

مادام بباکن: ۔ وہ کون ہے؟

لیبیڈیو: نکولا ستا آیوانوف ۔

مادام بباکن: ۔ ہاں آدمی تو اچھا ہے (منہ بنا کر) لیکن کچھ بدقسمت ہے.....

زنیدہ: ۔ تو خوش قسمت کیسے ہوتا بہن؟ (ٹھنڈی سانس لیتی ہے) بیچارے
سے کیسی بھاری غلطی ہوئی! غریب نے یہودن سے شادی کی
اس امید میں کہ ساس سسر بیٹی کے جہیز میں سونے کا پہاڑ دیدینگے
لیکن ہوا بالکل الٹا..... جب سے انا نے مذہب بدلا۔ ماں
باپ نے اس کو ٹھکرا دیا۔ بد دعائیں دینے لگے ... اسی لئے
اس بیچارے کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ اب پچھتاتا ہے لیکن
تیر کمان سے چھوٹ چکا ہے ......

ساشا: ۔ اماں یہ صحیح نہیں ہے ۔

مادام بباکن: ۔ (بگڑ کر) کیا کہا ساشا، صحیح نہیں ہے؟ ساری دنیا یہ بات جانتی
ہے ۔ اگر روپیہ کی غرض نہ ہوتی تو وہ ایک یہودن سے شادی ہی
کیوں کرتا؟ سینکڑوں روسی لڑکیاں موجود تھیں یا نہیں؟ بات
یہی ہے ڈارلنگ کہ اس سے چوک ہوئی، سخت چوک.....
(ذرا جوش کے ساتھ) اور میں کہتی ہوں کہ انا کے ساتھ اس کا سلوک
کیسا ہے! نہایت ہی پرلطف ۔ جیسے ہی وہ گھر پہنچتا ہے بیوی پر
برس پڑتا ہے: "تمہارے ماں باپ نے مجھے دھوکا دیا نکل جاؤ
میرے گھر سے" وہ بیچاری بھلا جائے کہاں؟ ماں باپ اس کو
اپنے گھر میں قدم نہیں رکھنے دینگے، ماماگیری کر سکتی ہے لیکن
اس کو کام کاج سے کبھی واسطہ نہیں رہا...... اسی طرح
اسکو ستاتا رہتا ہے ۔ یہاں تک کہ کاؤنٹ غریب کو اسکی حمایت
کرنی پڑتی ہے، سچ تو یہ ہے کہ کاؤنٹ نہ ہوتا تو وہ ایسے سلوک
سے کب کی مر چکی ہوتی.......

اودوتیا: ۔ اور کبھی کبھی تو وہ اس کو تہ خانہ میں بند کر دیتا ہے اور شلجم
کھانے پر مجبور کرتا ہے...... وہ بیچاری کھاتی ہے اور
کھاتے کھاتے بیمار پڑ جاتی ہے (قہقہہ)

ساشا: ۔ ابا جان یہ بالکل جھوٹ ہے آپ تو جانتے ہیں!

لیبیڈیو: ۔ تو میں کیا کروں؟ بکنے دو ان لوگوں کو ...... (پکارتا
ہے) گیورل!

(گیورل اس کو شراب اور پانی بڑھاتا ہے)

زنیدہ: ۔ یہ ہے داستان اسکی تباہی کی۔ بیچارہ! اس کی حالت خراب
ہو رہی ہے بہن ...... اگر بورکن اسکی جائداد کی دیکھ بھال
نہ کرتا تو وہ اور اسکی یہودن فاقہ کرتے (ٹھنڈی سانس لیتی ہے)
اور اسکی وجہ سے ہم لوگوں کو کتنا نقصان اٹھانا پڑا......
خدا ہی جانتا ہے کہ اس کی وجہ سے کتنا گھاٹا ہوا! تم یقین
نہیں کرو گی بہن گزشتہ تین سال سے ہمارے نو ہزار روپے
اس پر واجب ہیں!

مادام بباکن: ۔ (چونک کر) نو ہزار روپے؟

زنیدہ: ۔ ہاں ..... یہ میرے رحم دل پشنکا کی رائے تھی کہ اس کو قرض
دینا چاہیئے۔ یہ تو بالکل جانتے ہی نہیں کہ قرض کس کو دینا چاہیئے
اور کس کو نہیں۔ اصل تو الگ ہی رہا۔ اس کی فکر ہی بیکار ہے
لیکن سود تو کم از کم پابندی سے ادا کرنا چاہیئے تھا

ساشا: ۔ (غصہ میں) اماں آپ ہزاروں مرتبہ اس کا تذکرہ کر چکی ہیں

زنیدہ: ۔ تو تمہارا اس میں کیا بگڑتا ہے؟ تم کیوں اسکی وکالت کر رہی ہو؟

ساشا: ۔ لیکن آپ کیسے اس طریقے سے ایک ایسے شخص کے بارے میں
اس قسم کی گفتگو کر سکتی ہیں جس نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا؟
آخر انہوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے

تیسرا مہمان: ۔ الیکزنڈر یولونا، میری بھی دو باتیں سن لیجئے، میرے دل
میں نکولائی الیکزیوچ کی بڑی عزت ہے اور اس پر ہمیشہ فخر کرتا رہا

...... لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ میرے خیال میں وہ ایک موقعہ باز آدمی ہے۔

ساشا: بہت خوب! میں آپ کو آپ کے اس خیال پر مبارکباد دیتی ہوں!

تیسرا مہمان: اور اسکے ثبوت میں ایک واقعہ سن لیجئے جو مجھ سے اسکے دُم چھلّا یار از دار بورکن نے بیان کیا تھا۔ دو سال ہوئے کہ مویشیوں میں پلیگ پھیل گیا تھا، اس نے مویشیاں خرید کر ان کا بیمہ کرالیا......

زنیدہ: ہاں ہاں۔ مجھے وہ واقعہ یاد ہے مجھ سے بھی کسی نے ذکر کیا تھا۔

تیسرا مہمان: جی ہاں تو اس نے بیمہ کرالیا۔ اسے یاد رکھئے گا۔ اسکے بعد مویشیوں میں پلیگ کے جراثیم کو مصنوعی طریقے سے پھیلایا اور اس طرح بیمہ کا روپیہ مار لیا۔

ساشا: اخ۔ یہ سب نہایت بیہودہ بکواس ہے۔ نہ تو کسی نے مویشی خریدے اور نہ پلیگ پھیلایا۔ یہ سب بورکن کے دماغ کی تخلیق تھی اور وہ اس اسکیم کا فخریہ ذکر کرتا پھرتا تھا۔ جب آیوانوف نے سنا تو اسکے سامنے ہفتوں پیشانی رگڑی تب معافی ملی۔ آیوانوف کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ کمزور ہے اور اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ اس بورکن نمک حرام کو نکال باہر کردے۔ اور وہ صرف اس لئے ملامت کا مستحق ہے کہ وہ لوگوں پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ ہر طرح سے لوگوں نے اس کو لوٹا اور تباہ کیا ہے۔ اس کی فیاضانہ اسکیموں کی بدولت جس جس سے ہو سکا اس نے روپیہ بنایا۔

لیبیڈیو: ساشا تم بہت تیز زبان ہو۔ چپ رہو!

ساشا: تو کیوں یہ لوگ اس قسم کی مہمل بکواس کرتے ہیں! یہ بہت تکلیف دہ اور اُکتا دینے والی حرکت ہے! آیوانوف، آیوانوف، ہر وقت آیوانوف، اور کوئی دوسرا تذکرہ ہی نہیں۔ (دروازہ کی طرف جاکر پلٹ پڑتی ہے) مجھے حیرت ہے (نوجوانوں کو مخاطب کرکے) مجھے حیرت ہے آپ حضرات کے صبر پر! کیا اس طرح چپ چاپ بیٹھے بیٹھے تھک نہیں جاتے؟ یہاں کی تو ہوا میں بھی اُکتاہٹ ہے۔ کچھ بولئے، لڑکیوں کی خاطر کیجئے، اِدھر اُدھر چلئے پھرئے۔ اگر آپ کے پاس گفتگو کیلئے آیوانوف کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع نہیں تو آئیے سب مل کر ہنسیں، گائیں، ناچیں یا کچھ ....

لیبیڈیو: (ہنستے ہوئے) ہاں ہاں خوب خبر لو ان لوگوں کی۔

ساشا: آئیے میں کہتی ہوں میری ہی خاطر کچھ کیجئے۔ اگر آپ ہنسنا، ناچنا یا گانا نہیں چاہتے۔ اگر ان باتوں سے طبیعت گھبراتی ہے تو میں درخواست کرتی ہوں، التجا کرتی ہوں۔ اپنی زندگی میں ایک مرتبہ تو۔ محض عجوبہ کے طور پر کچھ ایسا کیجئے کہ ہم لوگ متحیر ہو جائیں یا ہمارا دل بہل جائے۔ کوشش تو کیجئے۔ سب ملکر شاندار پُر لطف بات سوچئے۔ کچھ بات ہی کیجئے بلا سے بازاری ہی کیوں نہ ہو لیکن دل خوش کن اور نئی ہونی چاہئے! یا سب مل کر کچھ ایسا کام کیجئے، چھوٹا ہی سا سہی، کہ یہ نوجوان لڑکیاں زندگی میں ایک مرتبہ تو آپ کو دیکھ کر (واہ) چلّا اُٹھیں۔ آپ آپ ہم لوگوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں، چاہتے ہیں یا نہیں؟ تو کیوں خوش کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ لیکن بات یہ ہے
۴۱ کہ آپ لوگ کسی کام کے نہیں۔ آپ میں سے کوئی بھی کسی کام کا نہیں ..... اس فضا میں تو مکھیاں بھی مارے اُکتاہٹ کے مرجائیں اور آپ کو دیکھ کر شمع سے بھی دھواں اُٹھنے لگے .... آپ لوگ بالکل کسی مصرف کے نہیں، کوئی بھی نہیں ... ... میں پہلے بھی ہزار،وں مرتبہ آپ سے کہہ چکی ہوں اور ہمیشہ کہتی رہوں گی۔

(آیوانوف اور شیبلسکی داخل ہوتے ہیں)

شیبلسکی: (آیوانوف کے ساتھ داہنے دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے) یہاں وعظ کون صاحب فرما رہے تھے؟ تم تھیں ساشا؟ (ہنستا ہے اور اس سے ہاتھ ملاتا ہے) خوش رہو خوش رہو میری فرشتہ۔ خدا کرے تم عمرِ خضر پاؤ اور مر کر پھر نہ پیدا ہو......

زنیدہ: (خوش ہوکر) نکولائی الیکزیوچ! کاؤنٹ!

لیبیڈیو: ارے، یہ میں کس کو دیکھ رہا ہوں ... ... کاؤنٹ (اس سے ملنے کے لئے آگے بڑھتا ہے)۔

شیبلسکی: (زنیدہ سوشنا اور مادام بابکن کو دیکھ کر ان کی طرف ہاتھ

بڑھاتا ہے) ایک صوفے پر دو سونے کی چڑیا . . . .
کتنا مسرت بخش منظر ہے (ہاتھ ملاتا ہے، پھر زنیدہ سوشنا کو
مخاطب کرتا ہے) تم کیسی ہو زیوشکا؟ . . . . (مادام مہاکن سے)
اور تم کیسی ہو پیٹرا؟

زنیدہ:۔ بڑی خوشی ہوئی کاؤنٹ تم تو بالکل عید کے چاند ہو (چلا کر کہتی ہے)
گیورل چاء لاؤ! آپ لوگ تشریف رکھیں (اٹھتی ہے، داہنے
دروازہ سے باہر جاتی ہے پھر فوراً لوٹ آتی ہے۔ چہرے سے
معلوم ہوتا ہے کسی سوچ میں ہے، ساشا جہاں پہلے بیٹھی تھی وہیں
پھر بیٹھ جاتی ہے۔ آیوانوف خاموشی کے ساتھ سب سے ملتا ہے)

لیبیڈیو:۔ یہ تم کہاں سے نازل ہو گئے؟ کیسے کیسے راستہ بھول گئے؟ میں تو
حیرت میں پڑ گیا! (اس کو بوسہ دیتا ہے) کاؤنٹ تم نہایت ہی شریر ہو
شریفوں کا یہی رویہ ہوتا ہے؟ (ہاتھ پکڑ کر اس کو روشنی کے پاس
لے جاتا ہے) تم ہمارے یہاں آتے کیوں نہیں؟ کچھ خفا ہو یا
کیا بات ہے؟

شبیلسکی:۔ میں کیسے آسکتا ہوں؟ کیا چھڑی پر سوار ہو کر آؤں؟ میرے
پاس اپنی کوئی سواری نہیں اور نکولائی مجھے اپنے ساتھ لانا نہیں
چاہتا، وہ کہتا ہے کہ میں سارہ کے پاس رہا کروں تاکہ
وہ تنہائی محسوس کرے اپنے گھوڑے بھیج دیا کرو تو آجایا کرونگا....

لیبیڈیو:۔ (ہاتھ ہلا کر) ارے بھئی، میں گھوڑوں کو ہاتھ بھی لگاؤں تو
زیوشکا مجھ پر برس پڑے گی۔ میرے پیارے دوست ڈارلنگ
تم جانتے ہو کہ تم میرے عزیز ترین اور قریب ترین دوست ہو،
پرانے لوگوں میں صرف ہم اور تم بچ گئے ہیں، تمہیں دیکھ کر میں اپنے
ماضی کے آلام سے محبت کرنے لگتا ہوں اور مجھے اپنی خوبصورت
جوانی یاد آجاتی ہے جسے میں نے بے پروائی سے لٹا دیا . . . .
مذاق نہیں کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ خوب روؤں (کاؤنٹ کو پیار کرتا ہے)

شبیلسکی:۔ چھوڑو، چھوڑو، تم شراب کی الماری کی طرح مہک رہے ہو . . . . .

لیبیڈیو:۔ میرے بھائی۔ تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں اپنے پرانے دوستوں کو
کتنا یاد کرتا ہوں۔ میں تو اتنا پریشان ہوں جی چاہتا ہے پھانسی
لگالوں (دھیمی آواز میں) زیوشکا نے روپیہ بٹورنے کے جنون میں
تمام اچھے لوگوں کو بھگا دیا ہے، دیکھ لو سوائے زولو کے کوئی بھی
دلچسپ آدمی نہیں رہا . . . . . بس صرف ڈڈ کن بڈکن رہ گئے
ہیں . . . . . آؤ چاء پیو۔
(گیورل شبیلسکی کے لئے چاء لاتا ہے)

زنیدہ:۔ (بے چین انداز میں گیورل سے) تم کیا کر رہے ہو؟ جام لے
آؤ یا اور کوئی چیز . . . . . .

شبیلسکی:۔ (ہنس کر آیوانوف سے) دیکھو میں نے تم سے کہا تھا نہ؟
(لیبیڈیو سے) میں نے راستہ میں شرط لگی تھی کہ جیسے ہی ہم یہاں
پہنچینگے، زیوشکا جام سے ہم لوگوں کی خاطر کرینگی۔

زنیدہ:۔ کاؤنٹ ابھی تک تمہاری مذاق کی عادت نہ گئی (بیٹھ جاتی ہے)

لیبیڈیو:۔ انہوں نے دو دیگچے جام بنوائے ہیں، آخر اسکی کھپت کیسے ہو؟

شبیلسکی:۔ (میز کے قریب بیٹھتے ہوئے) تم خوب روپیہ جمع کر رہی ہو زیوشکا
کیوں؟ میرا خیال ہے اب تک لکھ پتی ہو چکی ہوگی۔ ہے نا؟

زنیدہ:۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) ہاں، باہر والے یہی سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کے
مقابلہ میں زیادہ روپیہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ آخر
روپیہ ہم لوگوں کے پاس آیا کہاں سے؟ یہ سب صرف گپ ہے . . .

شبیلسکی:۔ رہنے بھی دو، ہم لوگ سب جانتے ہیں . . . . . خوب
جانتے ہیں کہ یہ کھیل تم کتنی خوبی سے کھیلتی ہو۔ (لیبیڈیو سے)
پاشا تم سچ بتاؤ، دس لاکھ جمع کر لئے ہیں یا نہیں؟

لیبیڈیو:۔ مجھے کچھ نہیں معلوم، زیوشکا سے پوچھو . . . . . .

شبیلسکی:۔ (مادام بیاکن سے) اور ہماری چھوٹی موٹی بیٹرہ کے پاس
بھی جلد ہی دس لاکھ جمع ہو جائینگے۔ اس کا جسم تو روز بروز
کیا ہر ہر گھنٹہ گداز اور خوبصورت ہوتا جا رہا ہے، یہ خاص
دولتمندی کی علامت ہے . . . . .

مادام بیاکن:۔ میں جناب والا کی نہایت ہی ممنون ہوں لیکن مجھے اس کا
شوق نہیں کہ میرا مذاق اڑایا جائے۔

شبیلسکی:۔ میری پیاری سونے کی گڑیا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارا مذاق
اڑا رہا ہوں۔ یہ تو میرے دل کی آواز تھی، دل کی سیری ہی سے
زبان کھلتی ہے . . . . . تم سے اور زیوشکا سے مجھے جتنی

محبت ہے اس کی کوئی انتہا نہیں (پرسرور لہجے میں) تم میں سے
کسی کو دیکھتا ہوں تو ایک بے پناہ مسرت، ایک خاص انبساط
محسوس کرتا ہوں۔ دل ایک خاص کیفیت سے متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہتا۔

زنیدہ: ۔ ابھی تک تم بالکل پہلے ہی جیسے ہو۔ (یگورشکا سے) یگورشکا روشنی
بجھا دو۔ کھیل نہیں ہو رہا ہے؟ (یگورشکا اُٹھ کر روشنی بجھاتا ہے
اور پھر بیٹھ جاتا ہے (آیوانوف کو مخاطب کرکے) نکولائی الیکزیوچ
تمہاری بیوی کیسی ہیں؟

آیوانوف: ۔ بہت بیمار ہیں، آج ڈاکٹر نے کہدیا کہ ان کو یقینی تپ دق ہے

زنیدہ: ۔ واقعی؟ بڑا افسوس ہے۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) ہم سب انہیں بہت
چاہتے ہیں۔

شیبلسکی: ۔ مہمل، مہمل، بالکل مہمل..... اس کو دق وق کچھ بھی نہیں
یہ سب نیم حکیمی ہے۔ ڈاکٹروں کی چال ہے۔ یہ حضرت اس مکان
کا چکر لگاتے رہنا چاہتے ہیں اس لئے دق تشخیص کی ہے۔ خوش
قسمتی سے شوہر صاحب میں رقابت نہیں (آیوانوف ایسی حرکت
کرتا ہے جس سے بے صبری ظاہر ہوتی ہے) اور جہاں تک
سارہ کا تعلق ہے میں اس کی کسی بات، کسی بات پر بھروسہ نہیں
کرتا، میں نے زندگی میں کبھی ڈاکٹروں، وکیلوں اور عورتوں کا
اعتبار نہیں کیا، یہ سب مہمل ہے، نیم حکیمی اور چالبازی

لیبیڈیو: ۔ (شیبلسکی سے) تم عجیب آدمی ہو باتونی..... تم نے دنیا جہان
سے نفرت کرنے کا بناوٹی طریقہ اختیار کیا ہے اور اس کی اس طرح
نمائش کرتے ہو جیسے ایک احمق نئی ٹوپی کی۔ تم بھی دوسروں کی
طرح ایک انسان ہو لیکن باتوں میں ایسے چڑی ہو جیسے تمہاری زبان
میں کوئی آبلہ ہو یا تمہیں بدہضمی کی شکایت ہو گئی ہو

شیبلسکی: ۔ کیوں کیا تم چاہتے ہو کہ میں لچّوں اور بدمعاشوں کو پیار کرتا
پھروں یا کیا؟

لیبیڈیو: ۔ تم نے لچّے اور بدمعاش کہاں دیکھے؟

شیبلسکی: ۔ یہاں جو لوگ موجود ہیں ان کی طرف میرا اشارہ نہیں ہے
مگر.....

لیبیڈیو: ۔ پھر تم نے اگر مگر شروع کیا..... یہ سب مکاری ہے۔

شیبلسکی: ۔ مکاری؟..... بہت اچھا ہے کہ تمہاری زندگی کا کوئی اصول نہیں

لیبیڈیو: ۔ میری زندگی کا اصول کیا ہو سکتا ہے۔ بیٹھا ہوا ہر لمحہ پیمانۂ حیات کے
لبریز ہونیکا انتظار کیا کرتا ہوں۔ یہی میری زندگی کا اصول ہے
بڑے میاں ہمارے اور تمہارے لئے زندگی کے اصول کا تذکرہ
کرنے کا وقت نہیں، وہ زمانہ گزر چکا۔ جی ہاں (چلّا کر پکارتا
ہے) گیورل!

شیبلسکی: ۔ کیا بار بار گیورل کو پکارتے ہو..... ابھی سے تمہاری ناک
چقندر کی جڑ کی طرح سُرخ ہو رہی ہے۔

لیبیڈیو: ۔ (پیتا ہے) کچھ پرواہ نہیں، پیارے دوست..... آج کچھ
میرا بیاہ تو ہے نہیں

زنیدہ: ۔ بہت دنوں سے ڈاکٹر لووو ہم لوگوں سے ملنے نہیں آئے
انہوں نے ہم لوگوں کو بالکل چھوڑ دیا۔

ساشا: ۔ مجھے للّٰہی بغض ہے اس شخص سے۔ ایمانداری کا چلتا پھرتا مجسمہ
وہ ایک گلاس پانی یا ایک سگریٹ بھی اپنی غیر معمولی ایمانداری کی ۴۳
نمائش کئے بغیر نہیں پی سکتا۔ جب وہ چلتا ہے باتیں کرتا ہے تو بھی
اسکے چہرے پر لیبل لگا رہتا ہے کہ "میں ایماندار آدمی ہوں" مجھے
سخت کوفت ہوتی ہے۔

شیبلسکی: ۔ وہ بڑا ضدّی اور تنگ نظر آدمی ہے (نقل کرتے ہوئے) ایمانداری
کی محنت کیلئے راستہ خالی کر دو۔ کوّے کی طرف ہر قدم پر چلّاتا ہے
اور سمجھتا ہے کہ وہ ڈوبرلیوبود ثانی ہے۔ اسکے خیالات بھی
حیرت انگیز ہیں۔ اگر کوئی کسان ذرا خوش حال ہے اور آدمی
کی طرح رہتا ہے تو بس وہ بدمعاش اور خون چوسنے والا ہو گیا
میں نے کسی دن مخمل کا جیکٹ پہن لیا اور نوکر نے مجھے کپڑے
پہنا دئے بس میں بدمعاش اور غلام رکھنے والا ہو گیا۔ وہ مارے
ایمانداری کے پھٹا پڑتا ہے۔ آپ کے معیار پر کوئی چیز پوری نہیں
اُترتی۔ مجھے تو واقعی اس سے ڈر لگتا ہے..... ہاں ہاں
نہیں معلوم کس وقت ایک طمانچہ لگا دے۔ یا احساس فرض میں
گالی دے بیٹھے

آئیوانوف: ۔میں بھی اس سے بہت تنگ رہتا ہوں لیکن ساتھ ہی میں اسے پسند بھی کرتا ہوں۔ آدمی نہایت مخلص ہے۔

شیبلسکی: ۔جی ہاں۔ کیا اخلاص ہے! کل میرے پاس آیا اور بلا وجہ کہنے لگا "کاؤنٹ تم مجھے بہت مکروہ معلوم ہوتے ہو" بڑا احسان فرمایا جناب نے۔ اور یہ سب حرکتیں کچھ یونہی نہیں کرتا بلکہ اصول کی خاطر۔ اسکی آواز میں لرزش ہوتی ہے۔ آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور سر سے پیر تک کانپنے لگتا ہے..... خدا غارت کرے ایسے خشک اخلاص مجھ سے نفرت کرتا ہے کرے۔ کوفت ہوتی ہے ہو۔ یہ قدرتی بات ہے میں اسے سمجھ سکتا ہوں لیکن رو در رو مجھ سے ایسا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ایک تباہ حال انسان ہوں۔ پھر بھی میرے بال سفید ہو چکے ہیں..... یہ ایمانداری کیا ہے حماقت اور بیرحمی ہے!

لیبیڈیو: ۔جانے دو بھئی جانے دو.... تم بھی کبھی جوان تھے اور نوجوانوں کی حماقتوں کو درگذر کر سکتے ہو

شیبلسکی: ۔ہاں میں بھی جوان اور احمق رہ چکا ہوں۔ میں بھی اپنے دنوں میں شاتسکی بنا پھرتا تھا۔ میں نے بھی بد معاشوں اور لچوں کو برا بھلا کہا ہے لیکن زندگی میں کبھی کسی چور کو اسکے منہ پر چور نہیں کہا ہے نہ پھانسی پائے ہوئے شخص کے مکان میں کبھی پھانسی کے تختے کا ذکر کیا۔ میری تربیت اچھی ہوئی تھی۔ لیکن آپ کے کرخت مغز ڈاکٹر صاحب تو ایسے ہیں کہ اگر قسمت سے ان کو اپنے اصول اور انسانیت کے مقاصدِ اعلیٰ کی خاطر سر بازار میرے منہ پر ایک چانٹا یا پیٹ میں ایک گھونسہ مارنے کا موقع مل جائے تو خوشی کے مارے ساتویں آسمان پر پہنچ جائینگے اور سمجھینگے کہ اپنی زندگی کا مشن پورا کر رہے ہیں

لیبیڈیو: ۔نوجوان ہمیشہ اپنی قابلیت جتاتے ہیں۔ میرے ایک چچا تھے ہیگل کے پیرو..... وہ اپنے ہاں ایک جمِ غفیر کی دعوت کرتے۔ انکے ساتھ شراب پیتے اور پھر کرسی پر کھڑے ہو کر تقریر شروع کرتے "تم لوگ جاہل ہو، تاریکی کے ستون ہو، نئی زندگی کی کرنیں پھوٹنے والی ہیں" وغیرہ وغیرہ..... اس طرح بکے جاتے۔

ساشا: ۔اور مہمان کیا کرتے تھے؟

لیبیڈیو: ۔اوہ کچھ نہیں..... بیٹھے سنتے رہتے اور شراب پیتے۔ البتہ — میں نے ایک مرتبہ ان کو ڈوئیل لڑنے کا چیلنج دیا.... اپنے چچا کو۔ جھگڑا بیکن کے بارے میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں ماتوی کی جگہ پر بیٹھا تھا اور چچا اور گراش نیلیچ گویا اسی جگہ کھڑے تھے جہاں اس وقت نکولائی ہے........ گراش نیلیچ نے ایک سوال کیا.......

(بورکن بھڑکیلا لباس پہنے ہاتھ میں ایک پارسل لئے دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے گنگناتا اور پھسلتا جاتا ہے.... خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے)

نوجوان خواتین: ۔مائیکل مائیکلچ۔

لیبیڈیو: ۔مائیکل مائیکلچ! میرے کان کہتے ہیں.....

شیبلسکی: ۔مجمع کی روح۔

بورکن: ۔میں حاضر ہوں! (دوڑ کر ساشا کی طرف جاتا ہے) محترم خاتون! میں کائنات کو آپ کے جیسے شاندار پھول کی پیدائش پر مبارکباد دینے کی جرأت کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ وہ تاریک رات کو اسی طرح روشن کر دیں جس طرح آپ تاریکی کی سلطنت کو روشن کر رہی ہیں۔ (ڈرامائی طور پر جھکتا ہے)

ساشا: ۔شکریہ......

لیبیڈیو: ۔(آئیوانوف) تم اس یہودن سے اپنا پیچھا کیوں نہیں چھڑاتے؟

بورکن: ۔(لیبیڈیو سے) پاویل کبریلیچ کی خدمت میں تسلیمات! (آئیوانوف سے) اور اپنے سرپرست کی خدمت میں بھی! (گاتا ہے اور مجمع کے چاروں طرف چکر لگاتا ہے) معزز ترین زنیدہ سوشنا کی خدمت میں بھی! فرشتہ خصلت مارفا یگوروونا...... قدیم ترین ہستی اوو قتیاندروونا...... مقتدر کاؤنٹ......

شیبلسکی: ۔(ہنستا ہے) مجمع کی روح...... جہاں کہیں پہنچتا ہے فضا ہلکی ہو جاتی ہے۔ تم نے غور کیا ہے؟

بورکن: ۔اف میں تھک گیا...... میں سمجھتا ہوں میں تمام لوگوں کی خدمت میں تسلیمات عرض کر چکا ہوں۔ اچھا تو کیا چیز ہے خواتین وحضرات؟ ہماری طبیعتوں کو ابھارنے والی کوئی خاص بات نہیں؟ (تیزی کے ساتھ زنیدہ سوشنا کو مخاطب کرتا ہے) سنئے تو ماما... آتے ہوئے

راستے میں..... (گیورل سے) جائیے لاؤ گیورل لیکن کوئے کا جام
نہ لانا۔ (زنیدہ سے) ہاں تو آج صبح راستہ میں میں نے کچھ کسانوں
کو دریا پر آپ کے سرکنڈہ کی چھڑیاں توڑتے ہوئے دیکھا اسے بیچ
کیوں نہیں دیتیں ؟

لیبیڈیو:- (آیوانوف سے) کیوں نہیں تم اس بیہودن سے نجات حاصل کرتے ؟

زنیدہ:- (بھونچکی ہو کر) ٹھیک تو مجھے ضرور یہی کرنا چاہئے کبھی خیال ہی نہیں کیا

بورکن:- (بازوؤں کی ورزش کرتا ہے) ورزش کے بغیر میں رہ نہیں سکتا۔
..... ماما میں کونسا کام کروں جو غیر معمولی ہو؟ مارفا یگورونا
میں آج ہوں ذرا سرور میں۔ جوش سے بے قابو (گاتا ہے)
پھر ترے سامنے میں حاضر ہوں......

زنیدہ:- کچھ کرو کیونکہ ہم سب اداس ہیں۔

بورکن:- واقعی؟ کیوں آپ لوگ اتنے دل برداشتہ کیوں ہیں؟ اس طرح
بیٹھے ہیں جس طرح اراکین جوری..... چلئے کچھ کیا جائے۔ آپ
لوگ کیا چاہتے ہیں۔ تاش۔ کبڈی۔ آنکھ مچولی۔ رقص یا
آتشبازی ؟

نوجوان خواتین:- (تالیاں بجا کر) آتشبازی، آتشبازی (دوڑ کر باغ میں
جاتی ہیں)۔

ساشا:- (آیوانوف سے) اس وقت آپ اتنے سست کیوں ہیں؟

آیوانوف:- سر میں درد ہے ساشا اور کوفت ہو رہی ہے

ساشا:- ملاقات کے کمرے میں آئیے۔ (وہ دونوں دائیں دروازے کی
طرف جاتے ہیں۔ دوسرے تمام لوگ باغ میں چلے جاتے ہیں سوائے
زنیدہ سوشنا اور لیبیڈیو کے)

زنیدہ:- ہاں یہ ہے ایک نوجوان۔ آئے ہوئے ایک منٹ بھی نہ گزرا کہ
سبھوں کو خوش کر دیا (بڑا لیمپ بجھا دیتی ہے) سب لوگ باغ میں
چلے گئے تو بیکار موم بتیاں ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔ (بتیاں
بجھا دیتی ہے)۔

لیبیڈیو:- (اسکے پیچھے پیچھے) زیونشکا مہمانوں کے لئے کھانے کا کچھ انتظام
کرنا چاہئے......

زنیدہ:- کاؤنٹ نے پورا گلاس پیا بھی نہیں بیکار چینی ضائع گئی (بائیں
دروازہ کی طرف جاتی ہے)۔

لیبیڈیو:- خود (باغ میں چلا جاتا ہے)

(آیوانوف اور ساشا داخل ہوتے ہیں)

ساشا:- (دائیں دروازہ سے آیوانوف کے ساتھ آتی ہے) سب لوگ
باغ میں چلے گئے۔

آیوانوف:- تو ساشا یہی میرا حال ہے۔ پہلے میں بہت کام کرتا تھا۔
خوب سوچتا تھا اور کبھی نہیں تھکتا تھا۔ اب نہ کوئی کام کرتا ہوں
نہ سوچتا ہوں۔ پھر بھی جسم اور روح دونوں تھکے رہتے ہیں
میرے ضمیر میں دن رات ایک چبھن سی رہتی ہے میں محسوس کرتا
ہوں کہ قصور سراسر میرا ہی ہے لیکن یہ قصور ہے کیا یہ نہیں جانتا
اسپر بیوی کی بیماری، روپیہ پیسہ کی تنگی۔ ہمیشہ کی ڈانٹ ڈپٹ
اور طرح طرح کی افواہ، غیر ضروری باتیں۔ وہ بیوقوف بورکن
...... گھر کاٹے کھاتا ہے اور وہاں رہنا ایک مصیبت ہے
میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میری بیوی مجھ سے محبت
کرتی ہے پھر بھی اسکے ساتھ رہنا ناقابل برداشت ہے۔ تم
ایک زمانہ سے میری دوست ہو سچ بات کہنے سے خفا نہ ہوگی تمہارے
پاس اس خیال سے آیا تھا کہ شاید کچھ سکون میسر ہو۔ لیکن یہاں
بھی کوفت ہو رہی ہے اور اب گھر جانے کے لئے بے چین ہوں
معاف کرنا چپکے سے نکل جاتا ہوں۔

ساشا:- نکولائی الیکسیوچ میں تمہارے دل کی کیفیت اچھی طرح سمجھتی ہوں
تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم بالکل تنہا ہو۔ تمہارے ساتھ ایک ایسا
آدمی ہونا چاہئے جس سے تم محبت کرتے ہو اور جو تمہیں سمجھے محبت
کے علاوہ تمہارا دوسرا علاج نہیں

آیوانوف:- اور بھی کچھ کہہ لو ساشا۔ میرے جیسے پریشان خستہ حال انسان
کیلئے نئے سرے سے عشق و محبت شاید دوسرے جنم میں ہو تو ہو۔ خدا
مجھے اس عذاب سے بچائے۔ نہیں میری چھوٹی سی عقلمند دوست
میری اس حالت کا محبت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایمان سے کہتا ہوں
کہ میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں۔ مصیبت، کمزوری، دیوانگی، بیوی
کی جدائی، قبل از وقت بڑھاپا، تنہائی سب کچھ، لیکن اپنے آپ سے

نفرت، یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس خیال سے مارے شرم کے مرجانا چاہتا ہوں کہ میرے جیسا مضبوط اور صحت مند آدمی ایک قسم کے ہیملٹ یا مانفرڈ! ایک فضول سا آدمی اور نہ معلوم کیا..... ہو کر رہ جائے۔ بہت سے قابلِ رحم لوگ ایسے بھی ہیں جو ہیملٹ یا فضول آدمی کے خطاب پر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن میں اسے ذلیل سمجھتا ہوں۔ میری خودداری کو اس سے ٹھیس لگتی ہے۔ شرم سے پس جاتا ہوں اور بےچین ہو جاتا ہوں۔

ساشا:۔ (آنسوؤں کے درمیان مذاق کرتے ہوئے) آؤ نکولائی ہم لوگ امریکہ بھاگ چلیں.......

آیوانوف:۔ میں اس دروازے تک بھی جانے میں کاہلی محسوس کرتا ہوں اور تم امریکہ کی بات کرتی ہو (دونوں باغ کے دروازے تک جاتے ہیں) یہ ٹھیک ہے ساشا کہ تم بھی یہاں عافیت سے نہیں رہتی ہو۔ تم جن لوگوں میں گھری رہتی ہو انہیں دیکھ کر میں اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ ان میں کون ایسا ہے جس سے تم شادی کر سکو۔ صرف یہ امید ہوتی ہے کہ شاید کبھی ادھر سے کوئی فوجی افسر یا طالب علم گزرے اور تم کو بیاہ لے جائے........ (زنیدہ بائیں دروازے سے جام کا برتن لئے آتی ہے)

۴۶

آیوانوف:۔ معاف کرنا ساشا میں ابھی آتا ہوں......

(ساشا باغ میں چلی جاتی ہے)

آیوانوف:۔ زنیدہ سوشنا میں ایک عنایت کی درخواست کرنے آیا ہوں۔

زنیدہ:۔ کیا بات ہے نکولائی الیکزیوچ؟

آیوانوف:۔ (ہچکچاتا ہے) بات یہ ہے کہ پرسوں آپ کا سود ادا کرنے کا دن ہے۔ بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ تھوڑی مہلت دیدیں یا اجازت دیں کہ سود کو اصل کے ساتھ ملا دوں۔ اس وقت روپیہ بالکل نہیں ہے........

زنیدہ:۔ (خوف زدہ ہو کر) نکولائی الیکزیوچ۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ معاملہ کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ نہیں ایسا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ خدا کے لئے مجھے پریشان نہ کرو، مجھے یوں ہی کافی پریشانیاں ہیں.......

آیوانوف:۔ مجھے بڑی ندامت ہے۔ (باغ میں چلا جاتا ہے)

زنیدہ:۔ اُف اس نے مجھے گھبرا دیا۔ میں کانپ رہی ہوں۔ سر سے پیر تک کانپ رہی ہوں......

(دائیں دروازے کی طرف چلی جاتی ہے) (کوسیخ داخل ہوتا ہے)

کوسیخ:۔ (دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے اور اسٹیج کے دوسری طرف جاتا ہے) میرے پاس اکیہ، بادشاہ، بیوی، آٹھ اور ٹکریاں، حکم کا اکیہ اور صرف ایک...... ایک چھوٹا سا پان تھا اور اس نے چھوٹا سلام بھی نہیں کیا۔ خدا غارت کرے....... (دائیں طرف کے دروازے کی طرف جاتا ہے)

(اودوتیا، نذآرودنا، اور پہلا مہمان داخل ہوتے ہیں)

اودوتیا:۔ (باغ کی طرف سے پہلے مہمان کے ساتھ آتے ہوئے) میں چاہتی ہوں اسکے ٹکڑے اُڑا دوں۔ یہ بھی کوئی مذاق ہے۔ پانچ بجے سے میں یہاں بیٹھی ہوں اور اس نے ایک باسی مچھلی بھی نہیں کھلائی...... یہ بھی کوئی آدمی کا گھر ہے......۔ یہ کوئی انتظام کا طریقہ ہے۔

پہلا مہمان:۔ مجھے اتنی کوفت ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے جا کر دیوار پر سر دے ماروں۔ یہ بھی عجیب لوگ ہیں۔ خدا ہم لوگوں پر رحم کرے اتنا بھوکا ہوں اور اتنی کوفت ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے بھیڑیے کی طرح چلاؤں اور لوگوں کا منہ نوچنا شروع کر دوں۔

اودوتیا:۔ میں گنہگار تو ہوں ہی۔ بس اسکی بوٹیاں نوچ لوں گی۔

پہلا مہمان:۔ میں تو تھوڑی بہت کچھ پیوں گا اور گھر چلا جاؤں گا۔ مجھے آپ کی ان مہذب نوجوان خواتین کی ضرورت نہیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ابتک جس نے ایک گلاس شراب نہ پی ہو اس کو عشق و محبت کہاں سوجھ سکتا ہے۔

اودوتیا:۔ چلو چل کر کچھ ڈھونڈیں.......

پہلا مہمان:۔ شا شا۔ چپکے چپکے۔ میرا خیال ہے کھانے کے کمرے میں جو الماری ہے اس میں ووڈکا ہے، یگورشکا کو پکڑ لائیں...

شا۔ شا (دونوں بائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)

(اناپیتروونا اور لوودو دائیں دروازے سے آتے ہیں)

اناپیتروونا:۔ ٹھیک ہے، یہ لوگ ہمیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ ایں یہاں تو

کوئی بھی نہیں۔ ضرور سب باغ میں ہیں۔

لوودو: ۔ مجھے حیرت ہے کہ تم مجھے گدھوں کے اس گھونسلے میں کیوں لائیں؟ یہ جگہ میرے اور تمہارے لئے نہیں ہے۔ ایمانداروں کو اس فضا سے الگ تھلگ رہنا چاہئے

اناپیٹروونا: ۔ سُنئے جناب ایماندار صاحب۔ یہ کوئی تہذیب نہیں ہے کہ آپ ایک خاتون کو اپنے ساتھ لائیں اور راستہ بھر ایمانداری کے علاوہ کوئی دوسری بات نہ کریں۔ ممکن ہے ایمانداری کا طریقہ بھی ہو لیکن کم از کم بہت اُکتا دینے والا ہے۔ عورتوں سے اپنی خوبیوں کا کبھی آپ کو تذکرہ نہ کرنا چاہئے۔ وہ خود دیکھ لیں گی جب میرا نکولائی تمہاری عمر کا تھا تو عورتوں کی صحبت میں سوائے گانے اور قصہ کہنے کے کوئی دوسرا کام نہ کرتا۔ پھر بھی سب جانتے تھے کہ وہ کن خوبیوں کا مالک ہے

لوودو: ۔ آہ مجھ سے اپنے نکولائی کا تذکرہ مت کرو۔ اس کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔

اناپیٹروونا: ۔ تم آدمی تو اچھے ہو لیکن سمجھتے خاک بھی نہیں۔ چلو باغ میں چلیں نکولائی نے کبھی ایسے جملے نہیں کہے کہ "میں ایماندار آدمی ہوں اس فضا میں میرا دم گھٹتا ہے۔ گدھ ۔ اُلو کا گھونسلا، مگرمچھ" وہ چڑیا خانہ کو ہمیشہ الگ ہی رکھتا۔ غصہ میں بھی میں نے اس کو یہی کہتے سُنا "آہ آج میں نے کتنی ناانصافی کی" یا "مجھے اس شخص پر افسوس آرہا ہے" وہ اس قسم کا آدمی تھا اور تم ...... (دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

(اودوتیا نذاروونا اور پہلا مہمان داخل ہوتے ہیں)

پہلا مہمان: ۔ (بائیں دروازے سے اندر آتے ہوئے) کھانے کے کمرے میں تو نہیں ہے گوشت والی الماری میں کہیں نہ کہیں تو ضرور ہوگا یگورشکا کو لانا چاہئے۔ چلو ملاقات کے کمرے میں ہو کر چلیں۔

اودوتیا: ۔ جی چاہتا ہے اسکے ٹکڑے اُڑا دوں (دائیں دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)۔

(مادام بیاکن اور بورکن باغ سے بھاگ آتے ہیں۔ شیبلسکی ان کے پیچھے پیچھے آتا ہے ہنستا اور ہاتھ ملتا ہوا)

مادام بیاکن: ۔ کتنی اُداس فضا ہے (ہنستی ہے) بہت اُداسی ہے۔ یہ اس طرح بیٹھتے اور چلتے پھرتے ہیں جیسے میخیں نگل لی ہیں۔ اکتاہٹ سے گھٹ گئی ہوں (ادھر اُدھر پھسلتی ہے) ذرا پیر پھیلاؤں

(بورکن اسکی کمر میں ہاتھ دیکر گالوں کو پیار کرتا ہے)

شیبلسکی: ۔ (ہنستا اور انگلی دکھاتا ہے) ستیاناس ہو۔ (کھکارتا ہے) آخر ......

مادام بیاکن: ۔ چھوڑو۔ بے شرم اپنے ہاتھ ہٹاؤ۔ خدا جانے کاؤنٹ کیا خیال کرے گا۔ ہٹ جاؤ ....

بورکن: ۔ میری روح کی حسرت، میرے دل کی راحت .... (پیار کرتا ہے) پیاری تین سو روپے مجھے قرض دیدو .....

مادام بیاکن: ۔ نہ نہ نہیں۔ نہ نہ نہیں .... جو جی چاہے کہو۔ لیکن روپیہ کا ذکر نہ کرو۔ نہیں شکریہ نہیں نہیں نہیں۔ وہ ہاتھ ہٹاؤ

شیبلسکی: ۔ (ان کے اردگرد ٹہلتا پھرتا ہے) چھوٹی سی بیڑو ...... اس میں ایک دلکشی ہے ......

۴۷ بورکن: ۔ (سنجیدگی سے) خیر بہت ہوا۔ آؤ مطلب کی بات کریں۔ ہمیں معاملات کو کاروباری آدمی کی طرح سیدھی سیدھی طرح طے کرنا چاہئے بغیر حیلہ حوالہ کئے مجھ کو ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ ہاں یا نہیں۔ سُنو (کاؤنٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے) اُن کو روپیوں کی ضرورت ہے کم سے کم تین ہزار روپے ہر سال۔ تم کو شوہر کی ضرورت ہے تم کاؤنٹس ہونا پسند کروگی ؟

شیبلسکی: ۔ عجیب سنکی آدمی ہے ......

بورکن: ۔ تم کاؤنٹس ہونا پسند کروگی۔ ہاں یا نہیں۔

مادام بیاکن: ۔ (اضطراب میں) سوچو تو تم کیا کہہ رہے ہو۔ میشا۔ واہ اور ایسے معاملے اس طرح ہنسی مذاق میں طے نہیں کئے جاتے... اگر کاؤنٹ کی خواہش ہے تو وہ خود .... اور میں واقعی نہیں سمجھتی کہ کیسے ایک لمحہ میں .....

بورکن: ۔ رہنے بھی دو بہت ہوا باندھ چکیں، یہ تو معاملہ کی بات ہے ... ہاں یا نہیں ۔

شیبلسکی: ۔ (ہنستے اور ہاتھ ملتے ہوئے) ہاں۔ واقعی کیوں؟ ستیاناس ہو

کیوں نہ ایک جرأت رندانہ کروں؟ کیوں! پٹرہ (مادام بیاکن کے
گال پر پیار کرتا ہے) موہنی۔ دل کی ملکہ

مادام بیاکن:۔ ذرا ٹھہرو ذرا ٹھہرو...... تم نے مجھے پریشان کردیا...
جاؤ چلے جاؤ۔ نہیں نہیں مت جاؤ......

بورکن:۔ جلدی کرو۔ ہاں یا نہیں۔ ہمارے پاس وقت ضائع کرنے کیلئے
نہیں......

مادام بیاکن:۔ کاؤنٹ میری ایک تجویز ہے۔ تم اگر دو تین دن میرے ساتھ
رہو۔ دلچسپی رہے گی۔ میرا گھر اس گھر کی طرح نہیں ہے۔ کل آؤ
...... (بورکن سے) نہیں تم مذاق کر رہے ہو۔ کیوں؟

بورکن:۔ (خفگی میں) گویا ایسے معاملہ میں بھی مذاق کیا جا سکتا ہے!

مادام بیاکن:۔ ایک منٹ ٹھہرو ایک منٹ..... آہ میں بیہوش ہو رہی
ہوں۔ میں بیہوش ہو رہی ہوں۔ کاؤنٹس..... میں بیہوش
ہو رہی ہوں۔ کاؤنٹس..... میں بیہوش ہو رہی ہوں....
میں گر پڑوں گی۔ (بورکن اور شیبلسکی ہنستے ہوئے اسکے بازو
پکڑ لیتے ہیں اور گال پر پیار کرتے ہوئے دائیں دروازے ۴
سے باہر لیجاتے ہیں)۔

(آیوانوف اور ساشا باغ سے دوڑتے ہوئے اندر آتے ہیں)

آیوانوف:۔ (اپنا سر گھبراہٹ میں پکڑتے ہوئے) یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں
ساشا یہ مت کرو..... اف مت کرو۔

ساشا:۔ (بے قابو ہو کر) میں تمہاری محبت میں پاگل ہو رہی ہوں....
تمہارے بغیر میری زندگی بےمعنی ہے۔ تمہارے بغیر میرے
لئے کوئی خوشی نہیں۔ کوئی مسرت نہیں۔ میرے لئے تم ہی
سب کچھ ہو......

آیوانوف:۔ کیا فائدہ۔ یا خدا.... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ساشا
ایسا مت کرو.......

ساشا:۔ بچپن میں میرے دل کی مسرت تم ہی تھے۔ میں تم سے تمہاری روح
سے اسی طرح محبت کرتی تھی جس طرح اپنے سے...... لیکن
اب..... مجھے تم سے عشق ہے نکولائی الیکزیوچ....
میں تمہارے ساتھ دوسری دنیا میں چلی چلوں گی۔ تم چاہو گے
تو قبر میں بھی ساتھ چلی چلوں گی لیکن خدا کے لئے جلدی طے کرو
نہیں تو میرا دم گھٹ جائیگا.....

آیوانوف:۔ (خوشی کا قہقہہ لگاتا ہے) یہ کیا ہوا! تو نئے سرے سے
زندگی شروع کروں ساشا۔ ہاں؟.... میرے دل کی راحت
(اسکو اپنی طرف کھینچتا ہے) میری جوانی... میری تازگی....
(اناپیٹروونا باغ کی طرف سے آتی ہے اور اپنے شوہر اور ساشا
کو دیکھ کر اسکے قدم زمین پر گڑ جاتے ہیں)

آیوانوف:۔ تو ابھی مجھے زندہ رہنا ہے۔ ہاں! پھر کام شروع کرنا ہے
(ایک بوسہ۔ بوسہ کے بعد آیوانوف اور ساشا ادگرد نظر
دوڑاتے ہیں اور انا کو دیکھتے ہیں)

آیوانوف:۔ (خوفزدہ ہو کر) سارہ!

پردہ گرتا ہے

اشاعت ۱۹۴۲ء

رام پرتاب بہادر ایم - اے

زرینہ

زرینہ! جس کا یہ نام ہو وہ سوائے خوبصورت ہونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ میرا یہ کامل یقین ہے، صرف نام یاد کرنے سے ایک آدھ کھلی کلی کی خوشبو اور حسن سنگیت بنکر میرے دماغ میں گونجنے لگتا ہے، زرینہ!! پھر مجھے گلے اور رخساروں سے کھیلتے ہوئے اسکے چمکتے ہوئے بُندے یاد آئے، کانوں اور گالوں کے اوپر سے گزرتا ہوا سفید ساڑی کا مخملی کالا چوڑی دار کنارہ اسکے چہرہ کی لامحدود خوبصورتی کو محدود کرتا ہوا میرے شاعرانہ دل و دماغ کو وجد میں لے آتا تھا۔ میں نے وہی ایک چہرہ دیکھا جس میں ناک اوپر سے دھری ہوئی چیز نہیں معلوم ہوئی فقط دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھوٹی ناک اسکے حسن کا ایک نازک تر حصّہ تھی اور اس میں وہ ننھی سی شربتی رنگ کی کیل! اب بھی جب میں سوچتا ہوں تو وہ شیشہ کا ٹکڑا میری آنکھوں میں چبھنے لگتا ہے اسکے لب ایسے ملے ہوئے تھے جیسے آپس میں مل جُل کر خاموش باتیں کر رہے ہوں ان ہونٹوں کو کبھی میں نے بناوٹی رنگ کا محتاج نہیں پایا۔ سیاہ چنچل آنکھوں کا اسکے گورے مکھڑے پر ازلی رقص میری سوتی جاگتی روح کو ابدی تماشائی بنائے رہتا تھا۔ زرینہ!!! ہمیشہ مجھے اس لفظ سے کسی کی پتلی نازک کمر کی یاد آتی ہے۔ اور پھر وہ کمر جس پر اس کی غیر محسوس جوانی اٹھکیلیاں کرتی چلتی تھی۔ اسکی لمبی سڈول بانہوں کو دیکھ کر میرے خود غرض دل نے کتنی بار نہیں چاہا کہ کپڑے کی طرح وہ مجھے لپیٹ لیں۔ زرینہ!!!! اس لفظ سے مجھے ہمیشہ ادھورے افسانے یا ادھورے شعر کا خیال آتا ہے۔

لیکن تھی وہ طوائف، میں اسے طوائف ہی کہونگا کیونکہ اس لفظ میں مجھے واجد علی شاہی شان کی جھلک ملتی ہے۔ قالین کا فرش، مسند، پاندان اور اُگالدان — بیسوا میں اُسے نہیں کہہ سکتا کیونکہ اسے بیسوا کہتے وقت میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میں اسکے ساتھ بے انصافی کر رہا ہوں، اس لفظ میں جو زہر ہے، جو آلودگی ہے، جو بدصورتی ہے جو مفلسی ہے وہ زرینہ میں نہیں تھی، زرینہ وکیل چھاپ کی کالی سلیپر پہنتی تھی، وہ بیسواؤں کی طرح چپلیں نہیں پہنتی تھی چپلوں کا خیال کر کے مجھے گاندھی جی کی یاد آتی ہے اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے بیسوائیں اس ملک کی غربت پیروں میں پہنکر چل رہی ہیں، کالی سلیپر کے ساتھ چلی ہوئی وکالت کا خیال آتا ہے، اس طرح کی سلیپر طوائفیں اور کامیاب وکیل پہنتے ہیں۔ زرینہ سر سے پاؤں تک سادگی اور خوبصورتی کا مجسمہ تھی، وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جسے ہر کوئی پڑھ سکتا تھا، زرینہ بکتی تھی اپنے کو بیچتی نہیں تھی۔ بیسوا کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے نفرت ہوتی ہے، زرینہ کو دیکھکر عزت کرنے کی خواہش ہوتی تھی، محبت بڑھتی تھی۔ کیا سُلجھی ہوئی پہیلی تھی وہ جس میں میں اُلجھ گیا!

(۲)

۴۹ میری اس کی جب پہلی بار ملاقات ہوئی وہ مجھ سے کچھ کم عمر کی تھی، میں بھی زندگی سے انجان تھا۔ یوں بھی طالب علمی کی زندگی میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ دُنیا کے غیر معمولی عیش و مسرّت کا حصّہ دار ہو سکے۔ لکھنے پڑھنے کی عمر میں جب کبھی ہلکے قسم کے جذبات و خواہشات سر اُٹھاتے ہیں تو انہیں خیالوں اور خوابوں سے سینچکر سُکھا دینا پڑتا ہے وہ ایسی عمر ہوتی ہے جبکہ خاص طور سے کچھ کرنے کو نہ ہوتے ہوئے بھی ہم ضرورت سے زیادہ مصروف رہتے ہیں دُنیا اس وقت تک زندگی کو کھیلنے کے لئے کوئی خاص کھلونے نہیں دیتی جس کے ساتھ ہم مصروف ہو کر کھیلیں، پھر بھی ہم اپنے بچپن کے کھیلوں میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ آغاز شباب چیزوں کے سمجھنے کا وقت ہوتا ہے ہر شخص جو مجھ سے ایک دن پہلے بھی اس دُنیا میں آیا ہو وہ مجھے راستہ بتانے کا حقدار بن جاتا ہے۔ ہر طرف سے ہم پر نصیحتوں کی بارش ہونے لگتی ہے، اگر بچہ سب نصیحتوں کو مان لے تو بوڑھا ہو جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ہر چیز کو اس طرح نہیں سمجھ لیتے جس طرح ہمیں بتایا جاتا ہے۔ مگر دُنیا میں آنکھ کھولتے ہی ہر شخص ہمارے سامنے ہمہ داں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے دُنیا کو ہم ایک عجائب خانہ یا نمائش کی شکل میں پاتے ہیں۔ ہماری پہچان کیلئے

ہر چیز پر کوئی نہ کوئی مہر لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہیں اس سے مطلب نہیں کہ عام طور سے کشمل کی مہر املی پر، مہوے کی آم پر ہے۔ دُنیا ہمیں نصیحتوں کی خُرد بین دیتی ہے جس کی مدد سے ہم ہر چیز دیکھ سکیں، ہر شخص میرے لئے زندگی کے راستے پر خطروں سے آگاہ کرنے والا راہنما بن جاتا ہے، اس چیز کو مت چھوؤ، اس سے مت بولو۔ اس سے مت اُلجھو اس سے مت ملو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دُنیا خرابیوں اور بُرائیوں کا ایک ڈھیر سا بنکر رہ جاتی ہے، راستے ہم کو کم ملتے ہیں اور رُکاوٹیں زیادہ، روڑوں اور رُکاوٹوں کے سامنے ہم سے سر جھکانے کو کہا جاتا ہے۔

اس طرح جوانی کی صبح کو میں نے دیکھا ہر چیز میرا راستہ روکے کھڑی ہے مگر میرے اندر ایک طاقت تھی جو مجھے آگے بڑھاتی تھی۔ میں خود کو روکنے لگا ایک زبردست کشمکش ہوئی، زندگی جسے میں ایک بہتے ہوئے چشمے کی طرح سادہ اور سہل سمجھتا تھا وہ میرے واسطے ہر قدم پر بندھن ثابت ہونے لگی، لیکن میں اندرونی طاقت سے مغلوب ہوگیا اور ساری رُکاوٹوں، بندھنوں کو توڑ کر زندگی میں گھس پڑا۔

(۳)

۵۰ اس سے پہلے میں نے سُرون کمار، اور شور داس، ایسے ڈرامے دیکھے تھے اور اسٹیج پر رنگ برنگ کے پردوں کے سامنے مختلف قسم کے مناظر قدرت کے درمیان سُنہری تتلیوں جیسی پریوں کو ناچتے تھرکتے دیکھا تھا اور اپنی عمر کے لحاظ سے اس سے لطف اندوز ہوا تھا، کبھی کبھی اسکول سے لوٹتے وقت تھیٹر کے شامیانے کے باہر کھڑا ہو کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ انگریزی بینڈ کو بجتے سُن کر اپنا جی بہلا لیا کرتا تھا، لیکن آج ناٹک دیکھتے وقت کچھ اور ہی قسم کا احساس اور تجربہ ہو رہا تھا۔ اسٹیج پر خوبصورت ہیروئن کو عشق کے طوفان میں گھر کر جو کچھ سہنا اور برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ اس سے میری پوری ہمدردی ہیروئن کے ساتھ تھی۔ ہمدردی ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی میرا نوجوان دل تو ایسا مست ہو جاتا کہ جی چاہتا تھا ہیروئن کی دُکھ درد کی کہانی ختم کرنے کیلئے خود اپنے کو نثار کردوں اور اس طرح ہیرو اور ہیروئن کی تمام مشکلات ختم کردوں۔

میں جس درجہ میں بیٹھا تھا اسی قطار میں دو بہنیں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ناٹک دیکھ رہی تھیں۔ دیکھنے سے وہ بنگالی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی بہن تو عورت زیادہ تھی اور لڑکی کم جس کی وجہ سے وہ میری جوانی کے سپنوں کے نزدیک بھی نہیں آسکتی تھی لیکن اس کے اور اس کی ماں کے درمیان وہ پندرہ سولہ سال کی لڑکی وہ لڑکی تھی جسے دیکھتے ہی میرے بدن میں ایک طرح کی سنسنی دوڑ گئی۔ اُسے ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنا ہی میرا کام رہ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس ہال میں میرے واسطے دو ناٹک ہونے لگے تھے۔ ایک اسٹیج پر اور دوسرا اس لڑکی کے ارد گرد۔ اسے دیکھتے ہی میرے دماغ میں بہت سے سوال اُٹھ کھڑے ہوئے اس کو جاننے اور سمجھنے کیلئے میرے جسم کا ایک ایک تار بے چین ہو گیا۔ اس چھوٹے سے شہر میں وہ کس بنگالی گھرانے کی ہوسکتی ہے؟ وہ میرے لئے اتنی بیش قیمت ہو گئی تھی کہ میری نظر میں اس شہر میں کوئی ایسا خوش قسمت نہیں ہوسکتا تھا جس کی وہ ہوسکتی تھی۔

یہ معلوم نہیں کہ شہد کی مکھی پہلے پھول پر بیٹھتی ہے یا کانٹے پر لیکن جب سے میں اس سے دلچسپی لینے لگا تھا اسی وقت سے میری آنکھیں اس سے تعلق رکھنے والوں کی جانچ پڑتال کرنے لگی تھیں۔ ہر شخص کو میں شبہے کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس تھوڑے وقت میں اس کے سادہ حُسن کے کنج میں میری معصوم محبت نے جو آشیانہ بنا لیا تھا اس میں میں ایک غریب پرند کی طرح بیٹھا چاروں طرف آنکھیں گھما گھما کر یہی دیکھ رہا تھا کہ خوبصورتی اور محبت کے دو تنکوں کے بنے ہوئے آشیانہ کے بگاڑنے والے وہاں کون کون تھے۔ جب پردہ گرتا تو اُسکے آس پاس مجھے دو غنڈے گلاس میں شربت یا ہاتھ میں پان لئے نظر آتے معلوم نہیں وہ غنڈے تھے یا کیا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میرا دل اس سے واسطہ رکھنے والوں کے بارے میں اچھا نہیں سوچ سکتا تھا۔ میرے واسطے زیادہ پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اُس بے چین فضا میں مجھے ہر کوئی اسی کی طرف دیکھتا ہوا نظر آتا تھا یہاں تک کہ بجلی کا "ٹیبل فین" بھی جو اس کی قطار کے سامنے ہوا دینے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے داہنے بائیں گھومتے ہوئے اس کے سامنے آکر رُکنے لگتا تھا اور مجبوراً وہاں سے ہٹتا تھا۔ جس چیز کی طرف میں اپنے سُکھ اور شانتی کیلئے کھنچ گیا تھا وہ میرے واسطے لامحدود تکلیف اور پریشانی کا سبب بن گئی تھی جسے میں اچھی طرح دیکھ یا جان بھی نہ پایا تھا، وہ یکلخت میری ہو گئی تھی۔ اپنا بنانے کیلئے تو میں کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن اسے دوسروں کے چنگل سے چھڑانے کیلئے میری ساری قوت اندر ہی اندر ختم ہوئی جا رہی تھی، اُس اتھاہ سمندر میں امید اور ناامیدی کے اُٹھتے ہوئے جوار بھاٹے میں میرا کمزور دل ڈوبتا اور اُبھرتا رہا۔

ناٹک ختم ہوتے ہی باہر نکلا، برآمدے میں کئی سو کینڈل پاور ( ) کی روشنی میں اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے۔ اسکی آنکھوں سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مجھے غیر ارادی طور پر اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ ادھر اُدھر دیکھ کر میں اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بھیڑ سے نکل کر سونی سڑک پر چلتا ہوا بھی میں اپنے چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا۔ جب بجلی کی روشنی کا کھمبا قریب آتا تو میں ذرا پیچھے رہ جاتا، روشنی میں پہنچکر وہ مُڑ کر میری طرف دیکھتی تھی، رات کو دو بجے ہونگے، ناٹک نہ دیکھنے والی شہری دُنیا سو گئی تھی، سڑک سونی پڑی تھی۔ وہ پیدل اپنے گھر والوں کے ساتھ چلی جا رہی تھی، اسکے ساتھ وہی پان شربت والے آدمی تھے، انہیں دیکھ کر کبھی کبھی میرے دل میں ڈر پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ ارادہ کر کے بھی کہ اگلی گلی سے مُڑ کر گھر چلا جاؤں گا۔ میں اسکے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرے اندھیرے راستے میں روشنی دکھا رہی ہے۔ اندھیری گلیوں میں پھر کیسے جاتا ——

چلتے چلتے میں اس محلّے میں پہنچ گیا جہاں دن میں جانے کا مجھے خیال تک نہ آسکتا تھا۔ اسکے گھر کے سامنے پہنچ کر میں نے اُسے پہچانا، اب میرے دل میں مطلق شبہ نہیں رہا، اُسے گھر تک پہنچا کر وہ شُہدے لوٹ پڑے انہیں آتے دیکھ کر میری جان نکل گئی، طے نہیں کر پایا کہ کس طرف جاؤں، پریشانی کی حالت میں پاؤں بڑھتے گئے، سیدھا اندھیری گلی میں میں چلتا گیا لیکن آگے جا کر وہ گلی بند ملی، مجبور ہو کر لوٹنا پڑا، اسکے مکان کے سامنے اندھیرا تھا وہ برآمدہ میں کھڑی تھی، مجھے دیکھ کر اندر چلی گئی۔

اب میں اکیلا تھا۔ اور سوائے ان اندھیری گلیوں کے اور کوئی میرا ساتھی نہیں تھا۔ جدھر سے گیا تھا اسی طرف سے لوٹ رہا تھا کبھی ڈر لگتا تو کبھی اپنے ڈرنے پر غصّہ آتا۔ اپنی زبوں حالی پر زبردست دماغی چبھن اور شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں کہاں چلا آیا تھا؟ یہ مجھے ہو کیا گیا تھا؟ مجھے اپنی ذات سے سخت نفرت ہو رہی تھی، ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بڑا بھاری گناہ کر کے لوٹ رہا ہوں، اتنی رات گئے سڑکوں پر صرف میلے کی گاڑیاں چل رہی تھیں۔ ان کے پہیوں کی آواز دور سے سیٹی ہوئی آتی تھی۔ میں چلتا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے میں ایسا محسوس کرنے لگا جیسے میں خود میلا گاڑی کی طرح سڑک پر ہر طرف بدبو پھیلاتا جا رہا ہوں، کسی طرح سے ایک کتّا دوڑا آیا اور مجھے گھیر گھیر کر بھونکنے لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ مجھے پھٹکار رہا ہے، میں اور شرمندہ ہوا، کتّے سے جان چھوٹی تو گھر کا خیال ستانے لگا۔ معلوم نہیں نوکر نے بھونا نکالا ہو گا یا نہیں، امّاں شاید بیٹھی انتظار کر رہی ہوں۔ پھر خیال آیا کہ محلّہ کے کسی آدمی نے مجھے دیکھا تو نہیں، انہیں خیالوں کی بھیڑ میں ڈرتا کانپتا اور افسوس کرتا میں گھر پہنچا، سب سو گئے تھے، دروازہ پر میری چارپائی بچھی تھی، کوٹ اُتار کر سرہانے رکھا۔ صُراحی سے ایک گلاس پانی اُنڈیل کر پیا۔ پھر چارپائی پر بیٹھ کر مُنہ ہاتھ پاؤں دھوئے۔ مسہری گرا کر میں نے اپنے دونوں کان پکڑ کر قسم کھائی، اب ایسی بھول کبھی نہ ہو گی اور گائتری منتر پڑھتا پڑھتا سو گیا۔

(۴)

مگر میری غریبی کا خیال نہ کرو، زرینہ! میں تمہیں پیار کرتا ہوں۔" میں نے اسکے ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا، اس نے مسکرا کر اپنی اُنگلیاں چھڑاتے ہوئے جواب دیا —— "لیکن تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟" اس کی بات کاٹتے ہوئے دُکھی آواز میں میں نے کہا —— "جانتا ہوں، لیکن مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہو؟ ..... تم میری سب کچھ ہو" یہ کہتے کہتے میرا گلا بھر آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے میں نے اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ایک لمحہ مجھے وہ چُپ چاپ اُداس آنکھوں سے دیکھتی رہی —— "تم مجھے بالکل نہیں جانتے، میں محبت کرنے کے لئے نہیں ہوں۔ یہ کہتے ہوئے ناک کی نتھ چھو کر وہ بولی —— اسے دیکھتے ہو اس کی قیمت ہے ۵ سو روپے، اب مجھے چھوڑ دو، مجھے جانا ہے۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کے نیچے سڑک چل رہی تھی، میں گھٹنوں کے بل زمین پر اسکے پاؤں کے پاس جُھکا ہوا تھا، اسکے دونوں ہاتھ پکڑے حسرت بھری آنکھوں سے دیکھتا ہوا کہنے لگا "میں دونگا ..... سب کچھ دونگا ..... میں سو ہزار روپے دونگا ......"

51

یہ کہتے کہتے میری زبان لڑکھڑائی، اسکے چکنے چکنے پاؤں میرے ہاتھوں میں آگئے تھے، وہ مُسکرانے لگی، اپنے پاؤں چھڑا کر کھمبے کے پاس کے پُل کی پتھریلی دیوار پر بیٹھ گئی، مجھے بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیا، تھوڑی دیر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہا۔ "تم کیا کرتے ہو؟" میں نے بتایا "میں پڑھتا ہوں" پھر اس نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور ہنسنے لگی،

ایک کتا اسکے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اُسے میں نے زور سے ایک لات مار کر بھگا دیا، اُس کی کمر میں میں نے اپنا بایاں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کا داہنا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں پاگل کی طرح بیٹھا سوچ رہا تھا — اس کی کمر زیادہ پتلی ہے یا اس کا ہاتھ زیادہ ملائم ہے، اتنے میں ایک یکّے والا کوئی غزل گاتا یکّہ تیز دوڑاتا ہوا گزرا، ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا، وہ مسرور ہوکر میٹھے راگ میں گنگنانے لگی ——

. . . .

پھر اس نے میرے گالوں کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپاتے ہوئے مجھے پیار سے چوم لیا، ہونٹ سے ہونٹ ملتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں اس نے مجھے اپنی لمبی لمبی باہوں میں کس لیا۔ میں نے اُس کی کمر زور سے پکڑ لی، معلوم نہیں ہم دونوں کب تک اس حالت میں چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اسے نیند آنے لگی، میں نے اسے اپنی گود میں اُٹھا کر پُل کی دیوار کے پاس زمین پر سُلا دیا، اسکی خوبصورتی کتنی سُبک تھی! ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر سڑک کے کنارے سو گئے۔

۵۲ زور سے مرغ نے میرے سرہانے بانگ دی، میری آنکھیں کھُل گئیں۔ گھبرا کر میں اُٹھ بیٹھا، میں کہاں ہوں! مسہری سے مُنہ نکالتے ہی دیکھا سُرخ مُرغا ایک مُرغی کو دوڑا رہا تھا۔ میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ کیا وہ خواب تھا! میں سوچنے لگا۔ جلدی سے چارپائی سے اُٹھ پڑا، سب لوگ جاگ گئے تھے نوکر برآمدہ میں جھاڑو دے رہا تھا، سرہانے اخبار رکھا تھا۔ اُٹھا کر پڑھنے لگا۔

(۵)

سوائے بڑھیا ماں کے دُنیا میں میرا اور کوئی نہیں تھا۔ پتاجی اپنی کمائی ہوئی دولت چھوڑ کر جوانی ہی میں اپنی حسرتوں کا بوجھ لئے اس دُنیا سے چل بسے تھے، میں ہی اپنی ماں کی بوڑھی آنکھوں کی روشنی تھا۔ ماں ہی کی وجہ سے بچپن میں میں نے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی۔ میری طرف سے بھی ماں کی کبھی دلشکنی نہیں ہوئی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی میں کبھی بُرا نہیں رہا امتحان میں پاس ہونا ہی ماں کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ میری کسی خواہش کو پورا کرنے میں انہوں نے کبھی کچھ اُٹھا نہیں رکھا، انہیں مجھ پر پورا یقین تھا۔ سوائے ان کی محبت کے میری زندگی میں اور کوئی رُکاوٹ یا بندش نہیں تھی۔

لیکن وہ دن کتنی پریشانی میں کٹ رہے تھے، پاگلوں کی سی میری حالت ہوگئی تھی، کھانا کھاتے وقت وہ مجھ سے اور کھانے کا اصرار کرتے کرتے اُداس ہوجاتیں۔ لیکن میں ان سے ہر طرح محبت کرتے ہوئے بھی انہیں خوش نہیں کرسکتا تھا۔ وجہ یہ تھی میں خود اپنی خوشی کھو بیٹھا تھا۔

دھیرے دھیرے میرا سب ملنا جلنا بھی چھوٹ گیا، گرمی کے دنوں میں زیادہ وقت کمرے میں بیٹھے ہی بیٹھے گزر جاتے۔ کبھی کمرہ کے گرم ماحول سے پریشان ہو اُٹھتا۔

شام ہوئی نہیں کہ میں ندی کی سمت چلا، ندی کے کنارے جی بہلانے کو جاتا اور زیادہ تر اس خیال سے کہ لوٹتے وقت اُس محلّے کی طرف سے آنے کا بہانہ مل جائیگا۔ عموماً سورج ڈوب جانے کے بعد میرا اس کے دروازہ کے سامنے سے گزر ہوتا۔ مکان کے سامنے ہمیشہ کوئی نہ کوئی سواری موٹر یا تانگہ کھڑا ہوتا، روشن کمرہ میں محفل جمی ہوتی جس کے بیچ میں وہ حُسن کی دیوی ہی صدارت کرتی ہوتی، مسند سے لگے ہوئے دو چار اور بڑے آدمی نظر آتے، پان سگریٹ کا دور چل رہا ہوتا۔ کبھی گانے بجانے کی محفل جمی ہوتی، میں نالے کے کنارے دیوار سے لگا دیر تک کھڑا رہتا۔ اتنے میں کسی کے مست قہقہے کی آواز آتی اور میں وہاں سے بےچین ہوکر چلنے لگتا۔ اور وہ مجھے اپنی خاموش نگاہوں سے اس طرف آتے دیکھتی۔ مجھے اپنے اوپر جھنجھلاہٹ ہوتی، غصّہ آتا اور نفرت ہوتی، میں تہیّہ کرتا قسم کھاتا کہ اب پھر یہاں نہیں آؤں گا۔

لیکن گھر پہنچنے کے بعد پھر اسکی یاد ستانے لگتی، میں سوچتا وہ مجھے ضرور چاہتی ہے، مجھے کن آنکھوں سے دیکھتی ہے! لیکن اپنی ماں سے مجبور ہے، وہ بُڑھیا چوکھٹ ہی پر پاندان لئے بیٹھی رہتی ہے۔ آخر وہ کرے تو کیا کرے! لیکن وہ مجھے ضرور چاہتی ہے، آخر میرے خواب میں آئی تھی! اسکی باہیں، اسکی کمر، اسکی اُنگلیاں، اسکے ہونٹ، اس کا گداز و ملائم جسم!! اس نے کس طرح مجھے چوم لیا تھا!!! اور میں طے کر لیتا —— وہ میری ہے۔ چاہے جو ہو میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اسکے جسم کے ہر حصّہ کو کتنے نزدیک سے میں نے دیکھا ہے، چھوا ہے، اُف کیسی پھول سی ہی ہے وہ، میں ان خیالوں سے پاگل ہو جاتا۔ اسے چھونے کیلئے میری

اُنگلیاں پھر ایک بار رینگنے لگتیں، کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ میرے بازو ٹوٹنے لگتے، جیسے میرے بدن کے کوئی ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہو۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتیں، بندکمرہ میں میری روح چیخ اُٹھتی ——— میں اسکے پاس جاؤں گا! ضرور جاؤں گا!!

(۶)

دوپہر کا وقت تھا۔ جیٹھ تپ رہا تھا۔ لو چل رہی تھی، ننگے سر میں اسکے مکان کے سامنے سے گزرا، دروازے بند ملے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن ذرا اور غور کرکے سُنا تو طبلے اور گانے کی آواز ساتھ ساتھ کہیں سے آرہی تھی۔ بے چین ہو کر جلدی جلدی چلنے لگا۔ اتنے میں میرے کندھے پر کسی نے زور سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں چونک گیا۔ مُڑ کر دیکھا۔ روشن لال! اس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے ہنسکر پوچھا "کہئے جناب! آپ یہاں کہاں؟ بڑے چھپے رستم نکلے" میرے تو ہوش اُڑ چکے تھے، گھبراہٹ میں معلوم نہیں کیا جواب دیا۔ پھر ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اُس چوڑی گلی سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف اونچے اونچے کوٹھے، دھول لئے ہوئے لُو زور سے چل رہی تھی۔ اتنے میں روشن لال ایک دم بے تحاشا بھاگا، ہوا کے ساتھ دھول کا بگولا اُڑتا دیکھ کر میں بھی اُسی طرف بھاگا، جتنا تیز میں بھاگ سکتا تھا بھاگ رہا تھا، اِدھر اُدھر کے مکانوں کی دیواروں کو دیکھتا جاتا۔ زمین مکانوں کو لئے ہوئے نیچے اوپر ہو رہی تھی، روشن ایک گلی میں گھُس گیا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ روشن کھڑا زور زور سے ہانپ رہا تھا، میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا ——— "بڑے اُلّو ہو جی! بھاگے کیوں؟" روشن لال نے دم لیکر ہنستے ہوئے جواب دیا ——— "ارے یار بال بال بچ گئے، ادھر کی گلی سے میرے خسر آرہے تھے۔" مجھے بھی ہنسی آگئی ——— "لیکن تم بھاگے کیوں؟" اس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا ——— "تمہارا دماغ پھر گیا ہے کیا۔ جانتے نہیں یہ کون محلہ ہے، اگر انہوں نے دیکھ لیا ہوتا تو بڑے جوتے پڑتے۔" اس کے ساتھ چلتے چلتے میں بھی زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے پوچھا ——— "اور تم کیوں بھاگے؟" میں نے جواب دیا ——— بھئی میں نے سمجھا زلزلہ آگیا۔" روشن تالیاں بجاکر زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں نے بیانِ صفائی دیتے ہوئے کہا "تمہیں ہنسی آرہی ہے۔ یاد نہیں جو زلزلہ میں نہیں بھاگ سکے وہ دیواروں کے نیچے پس گئے۔" پھر ہم دونوں خوب ہنسے ——— وہ میرے زلزلہ سے ڈر کر بھاگنے پر اور میں اس کے خسر کو اس محلے میں سوچکر۔

(۷)

میں اچھے یا بُرے راستہ پر چل رہا تھا۔ یہ میں نہیں سوچ سکتا تھا لیکن اپنے کو ہزاروں مرتبہ اس راستہ پر چلنے سے روکا، کس کس کا خیال میرے دماغ میں نہیں آیا۔ شرم نفرت اور ڈر مجھے چوکنے سپاہیوں کی طرح ہمیشہ گھیرے رہتے تھے۔ جس طرف بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھتا مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے ہر چیز مجھ پر ہنس رہی ہے ——— مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ راستہ میں جو بھی مجھے ملتا اور ہنسکر میرا خیر مقدم کرتا۔ اسپر مجھے شبہ ہوتا۔ ہو نہ ہو وہ نفرت سے مجھ پر ہنس رہا ہے۔ ہر شخص مجھے اپنا دشمن معلوم ہوتا۔ چنانچہ میں سب سے بچنے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی تو سڑک پر چلتا ہوا میں ایسا محسوس کرنے لگتا جیسے پولیس والا ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے میری گردن پکڑ لینا چاہتا ہے، اپنے کو ہمیشہ مجرم سمجھنے کی میری عادت ہو گئی تھی۔ کبھی یکایک میں اس خیال سے کانپ اُٹھتا۔ دھیرے دھیرے مجھے ہر چیز سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ ہر چیز پر غصہ آتا تھا۔ خیالی دُنیا میں کھویا ہوا میں ہمیشہ اپنے ہی کو خلا میں پاتا ——— پوری طاقت لگا کر پھاوڑے سے کسی بڑے ستون کو یا کبھی کسی بھاری دیوار کو توڑ توڑ کر گرا رہا ہوں۔ جب کبھی سوچنے کی کوشش کرتا تو اپنے کو ایک زبردست باغی اور دہشت انگیز کی شکل میں پاتا تھا۔ میری حالت بگڑتی گئی اور میری بوڑھی ماں کی حالت اور بھی پریشان کن ہوتی گئی۔ وہ میری وجہ سے بہت متفکر رہتی تھیں میں کسی حالت میں بھی اپنے بھلے کے واسطے ان کا بُرا نہیں سوچ سکتا تھا لیکن میں کرتا کیا! میں اُن کی خوشی کے لئے اپنا سُکھ اور اطمینان قربان کر سکتا تھا۔ لیکن زرینہ تو میری زندگی میں سُکھ نہیں بلکہ دُکھ کا پیغام لیکر آئی تھی ——— میں کتنا مجبور تھا! میں اکثر اسے تیاگ دینے کا تہیہ کر لیتا اور کبھی اس سے نجات حاصل کرنے کی قسم کھاتا۔ لیکن میں کیسے تیاگ دیتا اور کس طرح تیاگ دیتا؟ زرینہ میرے واسطے تھی ہی کیا یا اس کے لئے میں کیا تھا۔ میں ان خیالات سے پریشان ہو اُٹھتا، کبھی سوچنے لگتا ——— بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پڑ گیا، لیکن مکھی کی طرح گڑ میں پھنس گیا تھا۔ جتنا زور نکلنے کیلئے لگاتا اتنا ہی پھنستا جاتا۔ کنول کی طرح اس کا سادہ حُسن، اس کی پتلی کمر، اس کی سڈول ملائم بانہیں، پتلی نرم اُنگلیاں!!! اس نے کن آنکھوں سے مجھے دیکھ کر میرے ہونٹوں کو چوم لیا تھا!! یہ سب سوچتا ہوا، اسے ابھی

گود میں محسوس کرکے میں پاگل ہو جاتا، کیا یہ سب خواب تھا؟ کیا زرینہ صرف ایک خواب ہے میں پھر سوچنے لگتا۔ لیکن کتنا پُرمعنی خواب! پوری کوشش کرکے میں خواب کو خواب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ خواب نہیں جادو تھا۔ پھر میں سوچنے لگتا —— وہ میرے بارے میں ضرور سوچتی ہوگی، ورنہ میرے خواب میں کیوں آتی۔ یہ سوچتا ہوا میں اُٹھا اور اسکے مکان کی طرف اسی حالت میں چل دیا۔

(۸)

اندھیرے میں مکان کی منڈیر کے نیچے کھڑا ہوگیا، بجلی کے پنکھے سے اسکے کمرے کی روشنی کانپ رہی تھی۔ اُستاد کے مست ہاتھوں کے نیچے طبلے کھڑک رہے تھے۔ جوڑی کی کھن کھن کھن جیسے مجھے چڑھا رہی ہو، ایک سارنگی تھی جو میرے دل کے ساتھ رو رہی تھی۔ اور وہ گا رہی تھی،

نا برسو نا برسو،
نا برسو نا برسو،
ساون کے بادرا کارے

میری سوئی ہوئی آتما جاگ اُٹھی۔ جوڑ جوڑ پھڑکنے لگا، آنکھیں اُٹھاکر
54 میں نے آسمان کی سمت دیکھا —— کہیں بادل نہیں تھے۔ لیکن اسکی آوازیں
کتنی التجا ہے ان سروں کا التماس سن کر میگھ دوت مان ہی نہیں بلکہ وہ جائینگے۔ اتنے میں اس نے ذرا اونچی آواز میں انترا اُٹھایا،

آتے ہونگے آج ساجن ہمارے
پریت کے مارے تلوارے

سنتے سنتے میں بوکھلا اُٹھا۔ کیا تخت پر مسند لگاکر بیٹھے ہوئے موٹے موٹے بدمعاش اسکے ساجن ہیں! میرے دل نے کہا —— ہرگز نہیں ایک دم جی میں آیا کہ کمرہ میں داخل ہوں اور ان بدمعاشوں کو پیٹ کر وہاں سے نکال دوں اور زرینہ کو لیکر کہیں بھاگ جاؤں۔ میرے قدم بڑھے، برآمدہ کی سیڑھی کے پاس سے کتراتا ہوا میں صحیح راستہ پر پڑ گیا۔

لیکن میں نے طے کرلیا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہوکر رہے گی، گھر پہنچ کر سیدھا اپنے کمرہ میں گیا۔ پیچھے کمر پر ہاتھ باندھے کچھ دیر کمرہ میں ٹہلتا رہا نوکر کو تیز آواز سے پانی لانے کو کہا۔ پھر ٹہلنے لگا، گلاس میں پانی لئے ماں کمرہ میں داخل ہوئیں، پانی مجھے دیتے ہوئے ایک کرب انگیز نگاہ سے میری طرف دیکھا ماں کو دیکھ کر میں بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہیں خوش کرنے کے لئے میں نے ہنس کر کہا —— "اماں، کئی دنوں سے میں تم سے کہنے کو سوچ رہا تھا"

ماں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا "کہو بیٹا! کہو، کیا بات ہے؟ آخر کہو گے نہیں تو معلوم کیسے ہوگا" میں بالکل بچہ بن گیا۔ سر جھکائے ہوئے، رُک رُک کر میں نے کہا "ماں، میں ایک سونے کی گھڑی لوں گا۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے"

"اچھا بیٹا، اچھا۔ اچھا۔ اتنی ہی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں کہا؟ میں نے تمہیں کب روکا ہے؟" میں نے دوسری طرف منہ پھیر کر کہا —— میں نے ایک گھڑی دیکھی ہے —— وہ مجھے پسند ہے۔ گھڑی والا دو سو روپے اس کے مانگتا ہے"۔ ماں حیرت سے تکتی رہ گئیں —— "بیٹا اتنے دام کی گھڑی لیکر کیا کرو گے؟ کوئی ہلکے ——" مجھے چُپ دیکھ کر وہ اپنی بات پوری نہ کرسکیں۔ جب میں کچھ نہیں بولا تو انہوں نے اندر جاتے ہوئے کہا:۔ "اچھا اس میں کیا ہے، میں روپے دیتی ہوں، میں نے تمہاری کون سی بات نہیں رکھی" —— اور وہ نہیں معلوم کیا کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

(۹)

ہائے جوانی دِوانی، تو کیا کچھ نہ کرا لے۔ جیب میں دو سو روپے نقد لئے اور جیب کو ہاتھ سے دابے زرینہ کے مکان کے سامنے گندے نالے کے پُل پر میں اندھیرے میں کھڑا تھا، ہر آدمی کو دیکھ کر چور اُچکّے کا شک ہوتا تھا، کوئی جیب نہ کاٹ لے۔ میں جس کی جوانی خریدنے کے لئے وہاں کھڑا تھا اس کا دروازہ آج بند ملا۔ برآمدہ اور دروازہ پر خاموشی کا عالم تھا اور اس تاریکی میں سے مایوسی کی لہریں نکل رہی تھیں جو مجھے ٹکرا کر لوٹ جاتیں، لیکن سیلاب کی طرح ہر لہر میرے جسم کے زیادہ حصّہ کو ڈبو دیتی تھی، دھیرے دھیرے پانی میرے گلے تک پہنچ رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کی روح کی طرح میری روح پھڑپھڑانے لگی۔ اتنے میں سامنے کے دروازے کا ایک کواڑ کھلا اور میں امید کے خوف سے بھیگے ہوئے آدمی کی طرح کھڑا کھڑا کانپنے لگا۔ وہ آکر برآمدہ میں کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر ساکت کھڑی رہنے کے بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اندر جاتے ہوئے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ایک غیر ارادی سکوت سے جس طرح مجرم پھانسی کے تختہ کی طرف بڑھ رہا ہو میں اس کا اشارہ پاکر اسکی طرف جا رہا تھا۔

کمرہ میں داخل ہوتے ہی اس نے جھٹ سے چٹخنی چڑھا دی، پھر وہ بیچ کے کمرہ سے ہوکر بغل کے کمرہ میں گئی اور بڑے کمرہ میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی، سامنے

کی کرسی پر اُس کا اشارہ پا کر میں بیٹھ گیا۔ اسے سنجیدہ دیکھ کر میری زبان بند ہوگئی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آخر کار کمرہ کی دردناک خاموشی اسی نے توڑی آپ کیوں روز یہاں تشریف لاتے ہیں" یہ سوال سنتے ہی میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ ہچکچاتے اور ڈرتے ہوئے میں نے کچھ کہنا چاہا، میں نے کچھ کہنا چاہا، میں آپ کو ——" لیکن میری بات اس کی پھیکی ہنسی سے کٹ گئی۔ سر اُٹھا کر وہ سامنے دیوار پر آویزاں تصویر کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں تصویر پر جمی تھیں۔ سر جھکائے میں آنکھیں چُرا کر اُسکے گلے تک کا حصّہ دیکھ رہا تھا۔ اس سے کہنے کیلئے میں کتنے رومانی مضامین اپنے دل میں نہیں لکھ لایا تھا لیکن اس وقت زبان کھولے نہ کھلتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کمرہ کی خاموشی سے میں گھبرانے لگا۔ یہاں سے نکالا نہ جاؤں۔ آخر اس طرح وہ کب تک میری خاموشی برداشت کرے گی۔ میں یہی بیٹھا سوچ رہا تھا۔ جب مجھے کچھ کرتے نہ بنا تو میں نے جیب سے گٹھری نکال کر رکھ دی۔ اس نے پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں مجھ سے برابر سوال کر رہی تھیں، آخر یہ کیا ہے، میں نے اس کی ناک کی نتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا" اس کی قیمت دو سو روپے" یہ کہتے ہوئے میرا دل زور سے دھڑکنے لگا اور میں آگے کچھ اور نہ کہہ سکا۔ اس نے مسکراتے ہوئے گٹھری کھولی، روپے دیکھ کر اُس نے ہنستے ہوئے کہا ——

"آپ کو نوٹ نہیں ملے؟" میں بے حد شرمندہ ہوا اور اپنی اُس چھوٹی سمجھ کو کوسنے لگا جس نے زرینہ کو خریدنے کے لئے چاندی کے روپیوں کو کاغذ کے نوٹوں سے زیادہ کارگر سمجھا تھا۔ زرینہ نے شرارت سے میری جیب کی طرف اشارہ کرکے کہا" آپ کے پاس کچھ اور ہے؟" میں نے مجرمانہ انداز سے جیب میں ہاتھ ڈالے کچھ پیسے تھے۔ وہ بھی نکال کر میں نے اسکے سامنے رکھ دئے۔ زرینہ روپے اور پیسے سب ہاتھ میں لیکر بچوں کی طرح بجانے لگی۔ میں اُسکے سامنے اُلّو بنا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے ساری مایا میری جیب میں ڈالدی اور ریشمی رومال جس میں وہ کائنات بندھی تھی جھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا، اس رومال میں وہ اپنی اُنگلیاں ڈال کر کھیلنے لگی" رومال میرا ہے، روپے میں نے اپنی طرف سے آپ کو مٹھائی کھانے کے لئے دئے" اس نے کہا۔

میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے ہوا میں کرسی لگائے بیٹھا ہوں —— میں سوچ رہا تھا اب کیا کروں؟ لیکن کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ جی میں آیا اپنی پوری کہانی ایک دم کہہ ڈالوں ——" لیکن میں آپ سے محبت کرتا ہوں —— جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے اپنی خوشی کھو بیٹھا ہوں —— اگر آپ مجھے اپنا نہیں بنا لینگی تو میں کہیں کا نہیں رہونگا"

اسکے ہونٹوں کی سُرخی مسکراہٹ اور اسکے بچپن چہرہ پر ہنسی کی ایک لکیر ناچ گئی۔ وہ پھر ایک تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ میں اسکی اوپر اُٹھی پتلیوں کی سفیدی کو دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسکی آنکھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ میں بھی تصویروں کی طرف دیکھنے لگا۔ دیوار کی لٹکی ہوئی تصویر میں ہوائی جہاز اُڑ رہا تھا سامنے کی سیٹ پر زرینہ پائلٹ کی ٹوپی اور چشمہ لگائے بیٹھی تھی اسکی پیچھے کی سیٹ پر راجہ ٹھاٹھ کے کوئی راجا صاحب بیٹھے تھے، اور ان کے پیچھے دُبلے پتلے سے کوئی صاحب انگریزی لباس میں سجے ہوئے بیٹھے تھے۔

اس نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" راجہ صاحب اور انکم ٹیکس کے افسر۔ انہوں نے پچھلے تین سال میں مجھے کوئی دس ہزار روپے دئے ہیں۔ میں ان کی مہربانیوں کے ہاتھ بک چکی ہوں، انہیں لوگوں نے میری نتھ اُتاری تھی" اچنبھے میں اسکی نتھ کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے شبہ میں کہا" لیکن آپ
۵۵
تو اب بھی ——" زرینہ نے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" ماں کا حکم ہے" ماں کا حکم ہے اور ان لوگوں کو بھی یہ حسین فریب پسند ہے" کچھ لمحے ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر کار میری پریشانی دیکھ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اپنے حسن کا بوجھ ہتھیلی پر رکھے جانگھ پر جھکی ہوئی مجھے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ میں اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا، لیکن میں نے حوصلہ سے جواب دیا" میں آپ سے محبت کرتا ہوں" ناک پر اُنگلی لیجا کر اس نے ہنسکر کہا" تو آپ بھی اسے اُتارنا چاہتے ہیں؟" اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ میرے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی۔

میں چُپ چاپ بیٹھا کمرہ کی ہر چیز کو غور سے دیکھتا رہا کس قرینے سے ہر چیز اپنی جگہ سجی ہوئی تھی۔ کتنا ملائم بچھونا تھا اور کتنا بڑا پلنگ اور پلنگ کے سامنے دو گدّے دار کرسیاں رکھی تھیں۔ پھر اسکے بعد تخت تھا جس پر قالین بچھا تھا۔ تخت پر پڑے ہوئے دو مسند آپس میں کچھ مشورہ کر رہے تھے اسی قالین پر ایک طرف اُگالدان بھی رکھا تھا۔ دروازوں پر موتیوں کا جھلملی دار پردہ

پڑا تھا اور دیواروں پر چاروں طرف بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں ۔ پھر میری نظر اس مخصوص تصویر پر پڑی جس میں زرینہ ہوائی جہاز چلا رہی تھی ۔ زرینہ کے پیچھے ان دو شریف آدمیوں کو دیکھ کر پہلے مجھے ایک عجیب اُلجھن ہوئی اور پھر ترس آیا ۔ پلنگ میں سرہانے کی طرف ایک آئینہ جڑا ہوا تھا ۔ ذرا پیچھے کھسک کر آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھنا چاہا ۔ آئینہ میں میرا چہرہ چوروں کا سا لگا ۔ ایک دم میں نے مُنہ ہٹا لیا جیسے کوئی میرے کانوں میں گا رہا ہو "کھڑا کیا دیکھت درپن میں"

زرینہ واپس آ کر پھر میرے پہلو میں بیٹھ گئی ۔ اس کی طرف میں نے دیکھا ناک میں نتھ کی بجائے شربتی رنگ کی نگ جڑی ایک کیل تھی ۔ زرینہ کا حُسن اس کیل کے جڑاؤ سے کوئی مدھر راگنی الاپ رہا تھا ۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں پیوست کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "آپ یہی چاہتے تھے نا ! لیجئے اب آپ والی ہو گئی " یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ اپنی چھوٹی ہتھیلیوں میں لیکر سنجیدگی سے بولی "تو آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں ! لیکن میں محبت کے لئے نہیں بنی ہوں آپ پڑھنے لکھنے والے بھلے گھر کے لڑکے ہیں ——— آج تو خیر اماں نہیں ہیں ——— لیکن آپ میرا کہا مانیئے ———" میں ایک عجیب ہیجان
۵۷ میں یکبارگی بول اُٹھا "یہ ناممکن ہے ، زرینہ یہ مجھ سے نہ ہو گا " میرے مُنہ سے وہ اپنا نام اس بیباکی سے سُن کر مُسکرائی "یہ ناممکن ہے ! اور اگر میں آپ سے محبت کرتی ہوں ؟" میرا سر جھک گیا " اگر آپ کی اسی میں خوشی ہے تو میں آپ کو پیار کرتی ہوں لیکن میں پھر آپ سے کہتی ہوں کہ میں محبت کیلئے نہیں بنی ہوں میں یہاں بکتی ہوں " میری نظریں سیدھی اس جہاز پر گئیں ۔ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا " یہاں ہر چیز ایک فریب ہے ' ایک جھوٹ ہے ' وہ نقلی ہوائی جہاز کی تصویر ہے جس میں میری اور میرے چاہنے والوں کی تصویریں بعد میں شامل کر دی گئی ہیں ' ان لوگوں نے سب سے زیادہ میری قیمت دی ہے ' میں ان کی ملازم ہوں " اس کی باتیں سُنتے سُنتے میں ایک نامعلوم تشویش میں پڑ گیا میرا چہرہ کُمھلا گیا اور اندر زبان سوکھ جانے سے دم گھٹنے لگا ۔

"میں نے اُس دن آپ کو تھیٹر کے باہر دیکھا تھا اور اس دن سے لگاتار ادھر آتے جاتے دیکھ رہی ہوں ' آپ مجھے چاہتے ہیں لیکن یہاں کی ہر چیز دھوکا ہے ' فریب ہے ' ہر شخص جو یہاں آتا ہے وہ یہ جانتا ہوا آتا ہے لیکن تم کچھ نہیں جانتے" اسکے مُنہ سے "تم" سُن کر میرا دل کھل گیا ۔ اسکے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے "لیکن اگر اس طرح تم یہاں آتے ہو تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے برباد نہ ہونے دوں گی ۔ لیکن میری کامیابی بغیر تمہاری مدد کے نہیں ہو سکتی " اسکی طرف ایک ٹک دیکھتا ہوا میں اسکی باتیں سُنتا رہا " تم جانتے ہو تم نے میرے اندر ایک طوفان اُٹھا دیا ہے ۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے وہ نہ چاہو گے جس کے لئے دوسرے یہاں آتے ہیں ۔ اسکے بدلے میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں تم سے وہ سلوک نہ رکھوں گی جس کے لئے میں یہاں دروازہ کھولے بیٹھی ہوں ۔ میں تم سے امید کرتی ہوں کہ تم مجھے وہ نہ سمجھو گے جو سمجھ کر دوسرے یہاں آتے ہیں ۔ تم سے مجھے جو زندگی کی ایک نئی جھلک ملی ہے اسے قائم رکھنے میں تم میری مدد کرو اور مجھے امید ہے کہ تم مجھ میں وہی پاؤ گے جس کی تصویر دل میں لیکر تم یہاں آئے تھے " میرا دل خوشی سے ناچ رہا تھا ۔ پلنگ پر اسکے ساتھ لیٹا ہوا میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بادلوں کی سیج پر سوئے ہوئے ہم دونوں آسمان میں اُڑ رہے ہوں ۔ میں شروع سے آخر تک اسی کو دیکھ رہا تھا اور وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی ۔ اتنے میں کوئی باہر سے دروازہ پیٹنے لگا ۔ اس نے میری ہمت بندھائی وہ آگے چلی اور میں اسکے پیچھے ہو لیا ۔ ڈیوڑھی کی تاریکی میں پہنچ کر اس نے مجھے اپنی باہوں میں کس کر میرے ہونٹھ چوم لئے ۔ جس وقت وہ بڑے کمرے کا دروازہ کھول رہی تھی ڈیوڑھی کا ایک پٹ کھول کر میں باہر نکل گیا ۔ کوئی صاحب باہر انگریزی کپڑے پہنے سر پر نائٹ کیپ رکھے پتلون میں سے قمیص کا دامن کھینچ کر جلدی جلدی ہوا کر رہے تھے ۔ میں ان کے پیچھے سے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا اس بیچارے کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے وہ دن یاد آیا جب مجھ کو بھی ایک بار اس دروازہ پر پسینہ آنے لگا تھا ۔

گھر پہنچ کر میں نے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا ۔ روپیوں کو بکس کی تہ میں رکھا ۔ پھر ڈھیرے سے وہ پانچ روپے کی سونے کی گھڑی نکالی ۔ اس نقلی گھڑی میں مجھے وقت دیکھتے ہوئے ہنسی آئی ۔ گھڑی لیکر اندر گیا ۔ ماں کی ضعیف آنکھیں لالٹین کی روشنی میں اصلی سونا دیکھ کر چمکنے لگیں ۔ ماں نے کہا " بیٹا اب تو تم نے خرید ہی لی ۔ اگر کہو تو میں اسے اپنے پاس رکھ لوں ۔ شاید تم سے کھو جائے " میں نے اپنی رضامندی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ اور کوئی نہ جاننے پائے ہم نے سونے کی گھڑی خریدی ہے ۔ ماں کو میری بات پسند آئی ۔ اور ان کو خوش دیکھ کر میں اُداس ہو گیا ۔

(۱۰)

انگریزی کہاوت ہے "کسی خواہش کو دبانا نہیں چاہیئے " لیکن میرا

تجربہ یہ ہوا کہ اپنی خواہش کے سامنے ایک بار سر جھکا دینے سے معاملہ حل نہ ہوا۔ میری روح کی یہ پیاس بار بار بجھ کر بھی نہ بجھ سکی۔ زرینہ کی تنبیہ پر بھی اسکے یہاں بار بار جانے کو جی کرتا تھا جس طرح شرابی کو جب شراب نہیں میسر ہوتی تو وہ بھٹی کے دروازے پر جاکر وہاں کی ہوا پی کر مسرور ہو آتا ہے۔ اسی طرح میں زرینہ کے مکان کے گرد چکر لگا کر اپنا جی بہلا آتا تھا۔

لیکن اس دن پھر دل نے میرے اوپر قابو پالیا۔ شام کا وقت تھا بیچ کے بڑے کمرے میں روشنی نہیں جلی تھی۔ میں چپکے سے اندر جاکر کونے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بغل کے کمرہ میں، تخت پر کوئی آدمی ایک موٹے تکیہ پر منہ کے بل پڑا ہوا تھا۔ اسکے سامنے ایک گلاس میں شراب رکھی تھی جس میں سوڈے کے بلبلے اٹھ رہے تھے، شراب کی بوتل اور دو سوڈے کی بوتلیں سامنے تھیں۔ گلاس میں برف کا ٹکڑا گل کر چھوٹا ہو گیا تھا۔ اگالدان کے اوپر پان کی بھدی پیک پڑی تھی۔ اس آدمی کے بال ماتھے پر بکھرے تھے، منہ لال ہو گیا تھا اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ گلاس پر ہاتھ رکھے وہ منہ کے بل تکیے پر پڑا تھا۔ میں نے ذرا جھک کر دیکھا، موتیوں کی جھلملی کے پیچھے زرینہ پلنگ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ اسکے ہاتھ میں بھی گلاس تھا اور آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں وہ ٹکٹکی لگائے شرابی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں اپنی آنکھوں سے یہ کیا دیکھ رہا ہوں! زرینہ شرابی!! وہی زرینہ جو میری سیدھی سادی زندگی کی اکیلی رہبر ہے!!! میں بیٹھا سوچتا رہا اور جب سوچ نہ سکا تو صرف دیکھتا رہا۔ شرابی نے خمار سے جاگ کر آنکھیں اٹھا کر زرینہ کی طرف دیکھا، میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ نہ راجہ صاحب نہ انکم ٹیکس کے افسر۔ پھر آخر یہ تیسرا آدمی کون؟ کیا بہت سے ایسے بدمعاشوں کی گذر زرینہ کے یہاں ہے؟ میں نے پھر سوچنے کی کوشش کی۔ اتنے میں زرینہ اس کی آنکھوں کا اشارہ پاکر اٹھی اور بوتل سے شراب اس کے گلاس میں انڈیلنے لگی، اسکے ضد کرنے پر تھوڑی شراب اپنے گلاس میں بھی ڈال لی اور پھر اپنی جگہ جاکر بیٹھ گئی۔ شرابی پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ زرینہ کو اس نے اپنے پاس بیٹھنے کی دعوت دی اور پھر اپنے گلاس کی شراب زرینہ کے اوپر پھینکنے کے لئے گلاس اٹھایا، زرینہ ہنستی ہوئی اسکے سرہانے پاس جاکر بیٹھ گئی۔

اب میں صرف زرینہ کو دیکھ سکتا تھا۔ شرابی زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسکی انگلیاں توڑ رہا تھا۔ زرینہ ہنستی ہوئی انگلیاں چھڑا کر اسکے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی

اتنی ہمدردی شرابی کے ساتھ! اتنی مہربانی اسکے اوپر! میرا احساس زور زور سے میرے کانوں میں چیخ رہا تھا۔ پھٹے ہوئے موٹے گلے سے شرابی بڑبڑا رہا تھا۔

پیئے جا اور پیئے جا

زرینہ نے اس کو اپنے گلے سے گانا بنا دیا،

بوتل اٹھا، کاگ اڑا

شرابی نے گانے کو جاری رکھا،

جتنا پی سکتا ہے پی لے — ارے زندگی میں اور دو دن جی لے

زرینہ نے ایک گھونٹ میں اپنا گلاس خالی کر دیا اور جھوم جھوم کر گانے لگی

عاقبت کی باتیں جانے کوئی کیا — خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا

شرابی نے ٹٹول کر اپنا بایاں ہاتھ زرینہ کی جانگ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے گلاس خالی کر دیا۔ زرینہ نے جتنی شراب بچ رہی تھی شرابی کے گلاس میں انڈیل دی اور جھک کر خالی بوتلیں تخت کے نیچے رکھنے لگی۔ شرابی نے اسکی جانگھ میں انگلیاں گڑاتے ہوئے دوسرے گلاس کو بھی خالی کر کے اسے تخت پر الٹ دیا۔ میں نیم بیہوشی میں شرابی کو انگلیاں زرینہ کی جانگھ میں گڑاتے دیکھ رہا تھا۔ میری گرم آہ بول اٹھی۔ وہی جانگھیں!

۵۷

معلوم نہیں اس حالت میں کب تک پڑا رہا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور اس کا احساس نہیں میں سویا جاگ رہا تھا۔ یکایک کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے سامنے زرینہ کھڑی تھی۔ شرابی منہ کے بل تخت پر پڑا پڑا سو گیا تھا۔ اور اسکے منہ سے سرخ رال ٹپک کر تکیہ پر بہہ رہی تھی۔ زرینہ کے اشارہ پر میں اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ مجھے کوٹھے پر اپنے کمرہ میں لے گئی۔ وہ اپنی چارپائی پر پڑ گئی۔ تھکا اور اکسایا میں بھی اسکی بغل میں لیٹا رہا۔ کچھ دیر چپ چاپ ہم دونوں اسی حالت میں پڑے رہے۔ پھر کوئی کمرہ میں داخل ہوا۔ زرینہ چونک کر اٹھ بیٹھی، میں نے سر اٹھا کر دیکھا زرینہ کی بڑی بہن تھی۔ الٹے پاؤں کمرہ سے باہر جا رہی تھی۔ زرینہ کچھ سوچتی ہوئی پلنگ پر کچھ دیر پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی۔ میں اپنی جگہ پڑا رہا۔ اتنے میں زرینہ کی ماں کی آواز کمرہ کے باہر سنائی دی "کیوں زرینہ یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس سوال کے بعد اس کی آواز اور سخت ہو گئی "تیری جیسی کئی زرینہ میں پیدا کر کے بیٹھی ہوں — چلی ہے عشق کرنے! سارے شہر کے لونڈوں کا کیا یہ کوئی ٹھکانا ہے!" زرینہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور میں دھیرے دھیرے کھسک کر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرینہ کی ماں

کی آواز اندر کے برآمدہ میں غائب ہوگئی۔ میری خودی کو بڑی زبردست ٹھیس لگی تھی زرینہ کی آنکھوں کے آگے میری سخت بے عزّتی ہوئی۔ زرینہ کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرہ کے باہر نکلا، نیچے برآمدہ میں پہنچکر اس نے دھیرے سے کہا۔ "جاؤ میں لکھوں گی۔" اور میں چور کی طرح وہاں سے بھاگتا ہوا گھر آرہا تھا۔

(۱۱)

سکنڈ کلاس ڈبہ میں ہم بیٹھے تھے۔ ان کے اور میرے سوا ڈبے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میرے ہی برتھ پر وہ دوسری طرف بیٹھی تھیں لیکن داہنے رُخ پر ساری کا پلّہ اس طرح پڑ رہا تھا کہ میں انہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی چلنے پر میرے دل میں جو پہلی خواہش پیدا ہوئی وہ تھی ان کو دیکھنے کی۔ ویسے تو انکی خوبصورتی کی تعریف دوسروں کے مُنہ سے میں نے بہت کچھ سُنی تھی لیکن آج تو میں اپنی ہی آنکھوں کا اعتبار کرسکتا تھا۔ مجھے اس کا بھی خیال تھا کہ گھر سے جُدا ہونے کا انہیں بڑا رنج ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی ہیں اس لئے ان کا رنج دور کرنے اور اپنے دل کی پیاس بجھانے کی غرض سے میں نے ان کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ رکھنا چاہا۔ حالانکہ سماج نے قانون کی زنجیروں میں باندھ کر انہیں میرے حوالہ کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک انجان عورت پر جس کی صورت سے بھی میں آشنا نہ تھا ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے ڈر لگا۔ ایک مرتبہ ان کو چھونا چاہا لیکن ہاتھ کانپ کر رہ گیا۔ دوبارہ ہمّت کر کے میں نے مُسکراتے ہوئے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ ہی دیا۔ وہ ڈر اور لجّا سے میرے غیر مانوس ہاتھ کے بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا، میں نے انہیں اپنے پاس کھینچنا چاہا۔ لیکن جب کامیابی نہیں ہوئی تو میں نے جُھک کر ان کی ٹھوڑی پکڑ کر شرارت سے کہا۔ "مجھ سے بھی کیا شرم! تم تو اب میری ہو۔" یہ کہتے وقت میں نے اپنی بھوکی اور امیدوں سے بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا! زرینہ! وہی آنکھیں، وہی صورت وہی معصوم ادائیں لیکن زرینہ کی وہ مسکراہٹ نہ تھی! نہیں زرینہ نہیں، یہ میری دھرم پتنی ہیں۔ میرے ضمیر کی آواز آئی۔" میں اپنے شاعر دل کو کوسنے لگا۔ جو ہر پیکرِ حُسن میں زرینہ کو ڈھونڈھتا تھا۔ میں نے سوچا یہ تو میری بیوی ہے، ہندو گھر کی نئی دُلہن ہے۔ پتی کے سامنے کیسے مسکرا سکتی ہے۔ وہ نیچی نگاہوں سے کسی دوسری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ حسین چہرہ، وہ رنگ کا نکھار، ماتھے کا سیندور، کانوں اور گلے میں جھومتے جھلکتے سونے اور نگوں کے جڑاؤ گہنے! باریک ریشمی ساری میں سے ان کا حُسن جھانک رہا تھا۔ ایسی حسین معصومیت بھی میں نے کم دیکھی۔

میں پلنگ پر لیٹا ہوا خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے ہوا میں محل بنا رہا تھا اور اس محل میں اپنی نئی بیوی کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن ہر بار اس میں زرینہ ہی نظر آتی، اور میں جھنجھلا کر دھوئیں کے محل کو ہاتھ سے مار کر بار بار بگاڑ دیتا۔ اتنے میں میں نے محسوس کیا میرے سرہانے کوئی کھڑا ہے پلٹ کر میں نے دیکھا۔ میری بیوی چاندی کی طشتری میں پان الائچی لئے کھڑی ہیں میں نے اپنے تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اپنی بھابی کی تاکید کے مطابق گنّی نکالکر طشتری میں رکھ دی۔ زرینہ پھر مجھے یاد آئی۔ جب میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑی ہے تو میں نے دو گلوریاں خود لیکر کھالیں۔ اچانک مجھے اس مسافر کا خیال آیا جسے میں نے ایک بار تھک کر کہیں کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں دباتے دیکھا تھا لیکن میری بیوی کے چہرہ کا رنگ نہیں بدلا۔ انہوں نے طشتری اُٹھا کر میز پر رکھ دی۔ طشتری میں گنّی دیکھ کر کمبخت زرینہ کا خیال مجھے بُری طرح ستانے لگا۔

صبح کے آفتاب کی نرم اور رنگین کرنیں جنگلے سے گزر کر میرے پلنگ پر پڑ رہی تھیں۔ میں چُپکے سے اُٹھ کر بیٹھ گیا، سورج کی لمبی لمبی کرنوں کی روشنی میں میری بیوی کی کلائی، گلے اور کان کے گہنے دمک رہے تھے۔ وہ ابتک سوئی ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ گہنوں اور ساڑی سے لیکر ان کی پیشانی تک کی ہر چیز مجھے زرد دکھائی دے رہی تھی۔ میری آخری شاعرانہ اُمنگیں اصلیت کی دُنیا میں پیلے سونے اور رپلی صورت سے مس ہو کر خودکشی کر رہی تھیں۔ انکی سانس کی حرکت سے ہار کی کمانی دار تتلیاں کانپ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج کی کرنوں نے تتلیوں میں جان ڈال دی تھی اور وہ ابھی رنگین کرنوں کے بل کھاتی ہوئی اُڑ جائینگی۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کمرہ میں آرہی تھی جس سے میری بیوی کے رخسار پر بکھرے ہوئے بال ہلکے ہلکے اُڑ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا جس تتلی کے کمانی دار پنکھ رات ٹوٹ گئے تھے وہی تتلی بے حس پڑی تھی۔

لیکن میرے لئے شادی بھی اپنے ساتھ راحت نہ لائی۔ میرے دل میں زرینہ کی طرف سے نفرت، روز بروز بڑھتی جا رہی تھی مگر اس کا خیال دل سے نہ جاتا تھا۔ اسکی یاد آتے ہی میرا غصّہ بڑھ جاتا اور میری بیوی جو اب مجھ سے دھیرے دھیرے ہل مل گئی تھیں میرے منٹ منٹ پر احساس کے تغیرات سے ایک قدم آگے بڑھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔

اسی سلسلے میں ایک روز ڈاک کے ذریعہ ایک قیمتی ساری میری بیوی کے واسطے شادی کے تحفہ میں آئی۔ پارسل پر بھیجنے والے کا نام پتہ نہیں تھا۔ صرف یہی لکھا تھا "ایک دوست کی طرف سے" میں نے پیسے والوں کو گمنام خیرات کرتے سُنا تھا لیکن یہ گمنام تحفے بھیجنے کا طریقہ اپنی جگہ پر ایک ہی تھا اور مجھے بہت پسند آیا۔ اگر چڑھ ہوئی تو اس بات سے کہ وہ گمنام طریقہ سے میری زندگی میں پھر کیوں داخل ہوئی۔

باغوں میں جب پھول کھلنے لگتے ہیں تو بسنت کا چھُپ کر آنا بھی سب پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا راز اوروں کو بھی معلوم تھا میں اپنی لاعلمی میں اپنی شادی کو صرف ایک اتفاق یا سانحہ سمجھتا تھا۔ ایک دن صبح کو ٹہل کر واپس ہوا! تو دیکھا کہ میز کے پاس کپڑا جلا پڑا ہے، پوچھنے پر بیوی نے غصہ میں بتایا، خود انہوں نے وہ ساری جلا دی تھی۔ دو سو روپے کے تحفے کی جلی ہوئی سیاہی نے میری آنکھوں میں جلن پیدا کر دی، ولائتی کپڑے جلائے جانے کے دنوں کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میں سوچنے لگا یہ بھی بائیکاٹ کا کیا قیمتی طریقہ ہے۔ لیکن زرینہ کی بات ان سے کہی کس نے؟ اپنی بھابی کا خیال آیا، میرا دماغ چکرانے لگا۔ ایک دم جی چاہا کہ سامنے جو عورت کھڑی تھی اس کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن وہ میری بیوی تھیں۔

(۱۲)

شہر سے دو میل کی دوری پر اک پارک ہے۔ جب سے دُنیا کے جنجال سے دور جا کر وقت گزارنے کی میری عادت پڑی اسی وقت سے میں اس پارک سے مانوس ہوں، شہر کی بھیڑ بھاڑ اور گندگی سے بہت دور سول لائنس کی امیری کی بو سے ذرا بچکر، دریا سے تھوڑی دور یہ پارک کئی میل کی لمبائی چوڑائی میں پھیلا ہوا تھا۔ میں نے یہی ایک پارک پایا جس میں آدمی عام طور پر بہت کم ملتے تھے۔ اس سے پہلے میں یہاں صبح کے وقت آیا ہوں، شام کو آیا ہوں اور رات کو بھی۔ لیکن اس رات کو نو بجے وہاں ہونا مجھے عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ ہلکی چاندنی پارک کی ہری گھاس اور پھولوں پر سو گئی تھی۔ بڑے بڑے درخت اپنی مبہم خاموشی میں چپ چاپ کھڑے تھے۔

ہر طرف سنّاٹا چھایا ہوا تھا، میں راستہ کے کنارے بڑی بڑی گھاس میں جو لوہے کی کُرسی رکھی تھی اس پر قریب آدھ گھنٹہ سے چپ چاپ بیٹھا تھا میرے سر کے اوپر سیمر کا ایک بڑا پیڑ کھڑا تھا، ہر دم اسکے بڑے لال پھول زمین پر پٹ پٹ گرتے تھے۔ جب کوئی پھول گرتا تو میری نظر اسکی طرف جاتی تھی آسمان سے زمین پر گر کر وہ اپنے زوال کی شرح کہانی سُنا تا ہی ہوتا کہ اتنے میں دوسرا پھول پٹ سے زمین پر گر پڑتا۔ ہر پھول کے گرنے میں کم سے کم دو آوازیں ہوتیں۔ ایک کسی ڈال سے ٹکرانے کی اور دوسری زمین پر گرنے کی۔ سیمر کے بھاری پھولوں کے گرنے کی منحوس آوازسے میں گھرا ہوا کُرسی پر بیٹھا تھا۔

کُرسی پر بیٹھا بیٹھا جب میں اپنے خیالوں میں کھو جاتا تو کوئی سیمر کا پھول زمین پر گر کر مجھے جگا دیتا۔ میں سمجھتا زرینہ آگئی۔ کتنی ہی بار اسی جگہ زرینہ مجھ سے ملی تھی۔ جب سے میں نے اسکے گھر جانا چھوڑا تھا وہ مجھ سے یہیں ملتی تھی، آج مجھے اسکی آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اُداسی سے مسکرا کر مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس وقت میری شادی کی بات چیت گھر پر ہو رہی تھی۔ اس سے میرے اندر ایک نئی خواہش پیدا ہو گئی تھی، میں اسکے تصوّر سے ناچ اُٹھا۔

زرینہ میری ہو جائیگی۔ میں خوشی سے پھولا ہوا زرینہ سے یہاں ملنے آیا زرینہ کو شام کو کہیں گانے کیلئے جانا تھا۔ وہ اکثر ایسے موقعوں پر مجھ سے یہاں ملنے کا ارادہ کر لیتی تھی۔ زرینہ مجھ سے دور ہی تھی کہ اس کی زری کی ساری کا عکس میری آنکھوں کی پُتلیوں میں جھلکنے لگا۔ زرینہ آکر تھکی ہوئی میری بغل میں اسی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ مجھے باسی پھول جیسا لگا، شادی کی بات سُن کر وہ اُداس ہنسی ہنسنے لگی۔ میں اس بات کو لاکھ طرح سے اُٹھاتا اور ہر طرح سے التجا کرتا تھا لیکن وہ میری بات ٹالتی ہی گئی۔ جب مجھے غصہ آنے لگا تو اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میرا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا "شادی کر لو میں بھی بہو دیکھنے آؤں گی۔"

میرا غصہ بڑھنے لگا۔ کُرسی سے اُٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر ٹہلنے لگا۔ میں بار بار یہی سوچ رہا تھا۔ اسی نے میری شادی کرائی اور میری .... زندگی برباد کی۔ میرا ماتھا گرم ہو گیا تھا۔ اندر سے بغاوت کا ایک طوفان اُمڈا آ رہا تھا۔ ایک بھاری پھول پٹ سے زمین پر گرا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ پھول نہیں تھا۔ زرینہ آ رہی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے نزدیک آکر کہا "میں نے کہا آداب عرض"۔ میں نے جواب دیا "آداب عرض" کُرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا "کہئے خیریت تو ہے، بہت دنوں بعد ملے" "آپ کی مہربانی" کیوں خیریت تو ہے

کچھ روٹھے سے لگ رہے ہو بہو نے کچھ کہا تو نہیں ؟“ ——— ”سب آپ کی مہربانی ہے “ ——— ” کیوں کیا بات ہے کچھ کہو تو سہی ——— جب سے شادی ہوئی تم ملنے بھی نہیں، خود سوچا چلو آج مل آؤں“ ———

”اچھا سوچا میں بھی ملنے ہی والا تھا“ ——— ” لیکن کچھ کہو تو کیوں ایسی روکھی روکھی باتیں کر رہے ہو ؟ میرا جی گھبرا رہا ہے، میں تو خوشی خوشی ملنے آئی سوچا بہت دنوں بعد تم سے ملاقات ہوگی۔ تم سے باتیں کرکے جی بہلاؤں گی اور ایک تم ہو کہ روٹھے بیٹھے ہو“ ——— ” زرینہ ! جو کچھ تم نے کہا میں نے کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں کہیں کا نہ رہا۔ میں ناراض نہیں ہوں، میرا اپنا کون ہے جس سے میں ناراض ہونگا“ ——— ” کیا بہو سے“ ——— ؟

”بہو بہو مت کرو، اگر تم چاہتی ہو کہ میں یہاں بیٹھا رہوں۔ جب سے ساری جلائی گئی میں نے اس کی شکل . . . . “ ——— ” ساری جلائی گئی“ ——— ” جی ہاں۔ وہ ساری جو تم نے بھیجی تھی جل کر خاک ہو چکی۔ لیکن اسے چھوڑو، اس وقت میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے میں خود جلا جا رہا ہوں اور اگر تم مجھ کو اس آگ سے نکالنا چاہتی تو میری مدد کرو“

پریشانی کے عالم میں زرینہ کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے، سر اوپر اٹھائے میری طرف دیکھ رہی تھی“ ——— ” نہیں تو مجھے تم سے رخصت ہونا پڑیگا“ یہ کہکر میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ٹہلنے لگا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی اور کچھ عرصہ تک ہم لوگ خاموش رہے، صرف پھولوں کے گرنے کی آواز ہو رہی تھی۔

زرینہ نے سنجیدگی سے کہا ——— ” بیٹھ جاؤ۔ مجھ سے بھول ہوئی جو میں نے تم سے شادی کرنے کے لئے کہا ——— میری بھول تھی کہ اس رات کو تم کو اندھیری سڑک پر سے اپنے مکان میں بلایا اور بہو کی بھی بھول تھی کہ انہوں نے وہ ساری جلا دی۔ لیکن سب سے بڑی بھول ہے تمہاری جو ان کی شکایت لیکر تم میرے پاس آئے ہو۔ میں کیا کر سکتی ہوں، اگر میں معافی بھی مانگ لوں تو معاملہ حل نہ ہو جائیگا۔ میں نے تمہارے راستہ میں آکر غلطی کی“ ——— ” یہ مجھے سمجھنے کے لئے چھوڑ دو“ ——— ” نہیں مجھی کو سمجھنا چاہئے“ ——— ” مجھے کیا حق تھا کہ اپنی اچھی یا بُری زندگی سے نکل کر تمہاری زندگی کی ہریالی پر تفریح کرنے آئی۔ خوش تھی میں اپنی زندگی میں“ ——— ” زرینہ ! جھوٹ مت بولو۔ تم خوش نہیں تھیں“ ——— ” یہ تمہیں کیسے معلوم، میں آج سے زیادہ خوش تھی“ ——— ” اُن شرابیوں اور بدمعاشوں کے ساتھ“ ——— ” ہاں ! لیکن آج دو انسانوں کے رنج کی وجہ بنکر خوش نہیں ہوں، میں گندگی میں رہتی تھی اور وہی میری خوشی تھی۔ بگڑے ہوئے میرے پاس آتے تھے، میں اور بگاڑتی یا بناتی تھی، اسی لئے وہ میرے پاس آتے تھے۔ وہی میری زندگی کی تفریح تھی۔ اسی کیلئے سماج نے ہم کو شہر کے کنارے اس محلّے میں بٹھا دیا تھا۔ جن کو دنیا میں کوئی بھی خوش نہیں کر سکتا، وہ مجھ میں راحت ڈھونڈنے آتے تھے جنکا سنسار میں کوئی نہیں ہوتا وہ مجھے اپنا پاتے۔ میں اُس آتی جاتی اور بنتی بگڑتی دنیا میں رہ کر خوش تھی، سُکھی تھی“ ——— ” شراب پی کر ؟“ ——— ” ہاں شراب پی کر، وہی شراب جس سے تمہیں نفرت ہے، وہی شراب جو تم کو میں نے نہیں پلائی، شراب پینا اور اس زندگی میں رہنا مجھے پسند تھا۔ لیکن میرے دل میں ایک ایسا کونا تھا جس کو میں جیت نہ پائی۔ اپنے من کے اسی جھروکے سے میں نے تمہیں دیکھا۔ میں تم پر فریفتہ ہو گئی“ ——— ” اور میری شادی کرا دی“ ——— ” وہ میری ہار تھی اور تمہارا شادی کر لینا میری جیت ہے، اپنے آنسوؤں کا ہار تمہارے گلے میں ڈال کر میں نے کہا جاؤ شادی کر لو۔ میرے آنسو ہی میری محبت کی یادگار تھے اپنی خود غرضی پر میں نے تم کو قربان نہیں کیا۔ لیکن تم مجھ سے بہت امیدیں کرنے لگے جس کا نتیجہ ہے کہ آج تم اس طرح مجھے ملامت کر رہے ہو“۔

اس کی باتیں سُنتے سُنتے میں اُٹھ کر ٹہلنے لگا“ تم سے اپنی زندگی کو سُکھی بنانے کی کوشش کرنا میری بھول تھی۔ میں نہیں سوچ سکتی تھی کہ اس دُنیا میں کسی کا سُکھ کم کر کے ہی ہم سُکھی ہو سکتے ہیں۔ بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو“

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا“ یہ سوچ رہا تھا بہت دیر ہو رہی ہے“

زرینہ ایک دم رُک کر بولی“ ہاں چلو چلتی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی تھی اس لئے میں نے تمہارا بُرا نہیں چاہا (پارک کے کسی کونے سے لومڑی کے رونے کی آواز آنے لگی) مجھے امید ہے تم مجھے سمجھنے کی کوشش کروگے (لومڑی زور زور سے رو رہی تھی) ایک شخص دو انسانوں کو آج سُکھی نہیں بنا سکتا وہ چاہے میں ہوں یا تم۔ مجھے امید ہے تم مجھے غلط نہیں سمجھو گے“ (ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لومڑی روتی ہوئی میری طرف بڑھتی آ رہی تھی) میں چلتے چلتے رُک گیا اور مُڑ کر اس سے کہا“ زرینہ ! ——— (وہ لومڑی بالکل میرے پیچھے آکر رونے لگی) ——— اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ” بھول جاؤ جو کچھ ہوا“۔

سات سال بعد ـــــــــ

اب میں دو بچوں کا باپ ہوں، کھاتا پیتا آدمی ہوں، اپنے بچوں کو پیار اور بیوی کی عزت کرتا ہوں کسی چیز کی کمی نہیں محسوس کرتا۔ ویسے تو موجودہ زندگی ایسی ہے کہ آج کی دُنیا میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسکے پاس سب کچھ ہے۔

کسی چیز کے بارے میں اُسے الگ کر کے نہیں سوچا جا سکتا ہے۔ ہر چیز دوسری چیزوں کے مقابلہ میں ہم کو چھوٹی یا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ میں اپنے بارے میں بھی اپنے سے بڑوں اور چھوٹوں کو دماغ میں رکھے بغیر کیسے سوچ سکتا ہوں۔ اور اس زمانہ میں تو ہر آدمی کو یہ شکایت ہے کہ اسے زندگی سے اتنا نہیں ملا جتنا وہ سمجھتا ہے اسے ملنا چاہیئے تھا اور میں تو خود اسی اعتقاد کے بل پر جیتا ہوں اور مشقت کرتا ہوں کہ کل کی دُنیا میرا احسان مانے گی ؎

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

یہی میرا نظریہ ہے اور یہی میرا فلسفہ۔ یہ دوسری بات ہوئی کہ آئے دن ہماری خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ ہر ایک آج کو منوّر اور کل کی روشنی میں دیکھ کر خود کو تسکین دیتا ہوں۔ اگر دُنیا ہم کو ایسی نہیں ملتی جس طرح کہ ہم نے ایک خیالی تصویر بنا رکھی ہے تو اسکی یہ وجہ ہے کہ شروع ہی سے ہم دو دُنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک وہ دُنیا جس کو میں نے کتابوں میں پڑھا اور جس کی بنا پر دماغ میں ایک نئی دُنیا کے نقش بنائے۔ وہ دُنیا میرے دماغ کی ہے اور دوسری دُنیا میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، لیکن میں اس سے ہراساں نہیں ہوتا کیونکہ میں سوچتا ہوں کہ اسی فرق کی بنا پر انسان کی مسلسل ترقی کا مدار ہے۔

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ نسبتاً میں اپنے کو سُکھی سمجھتا ہوں۔ چھوٹے پیمانے پر میری ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، میری ازدواجی زندگی سُکھی ہے اپنے بال بچوں میں اپنے آپ کو خوش پاتا ہوں، اسکے علاوہ مجھ میں اوروں کے مقابلہ میں ایک طرح کی برتری کا احساس بھی ہے۔ مجھے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری جڑیں آم، املی، پیپل یا برگد کے درختوں کی طرح زندگی میں نیچے تک گئی ہیں۔ دوسرے مجھے گملوں میں لگے ہوئے پودوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس ایک دھکا لگا اور وہ اپنے گملوں سمیت زمین پر ڈھلک جائیں گے۔

میں شام کو اپنے برآمدہ میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ سامنے سڑک پر کوئی تانگہ رُکا۔ ایک ادھیڑ عمر کی تندرست بھرے بدن کی عورت سفید ساڑی پہنے تانگہ سے اُترنے لگی۔ اسکے ماتھے پر گھونگھریالے بالوں کے دو گُچھے دونوں طرف لٹکے ہوئے اس عورت کے بیتے ہوئے حُسن کی کہانی سُنا رہے تھے۔ اس نئے محلّے میں ہر آدمی راستہ بھولا ہوا آتا ہے۔ میں سوچنے لگا ضرور شریمتی جی کسی کا مکان پوچھنا چاہتی ہیں۔ وہ میرے برآمدہ میں آگئیں حالانکہ میں ان سے واقف نہیں تھا۔ لیکن ان کی نسوانیّت کے احترام میں مجھے کرسی چھوڑ کر اُٹھ جانا پڑا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کیا، میں نے بھی غیر ارادی طور پر جواب میں ہاتھ جوڑے۔ وہ مسکرا پڑیں۔ میرا دل چیخ اُٹھا، یہ کیا! زرینہ!! میں نے اسے پہچانا اور گھبرایا ہوا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے اُنکے ساتھ بڑے کمرے میں آیا۔ فوراً بیوی کا خیال ہوا۔ لیکن وہ ان دنوں اپنے گھر گئی ہوئی تھیں، وہاں بھی مجھے چین نہ ملا۔ ان کے ساتھ ساتھ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میں اتنی قیمتی چیز پا گیا تھا کہ اسے چھپانے کی کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی، جیسے کُتّا روٹی کا ٹکڑا پا کر کوئی کونا تاک کر بھاگتا ہے۔

اوپر کے کمرہ میں آکر میں نے ان سے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ ریڈیو ٦١
دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ میں نے پوچھا "آپ ہنسیں کیوں؟"۔ زرینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یوں ہی"۔ میں نے پوچھا۔ "کہیئے آپ مزے میں ہیں"۔ "آپ کی مہربانی"۔ "اِدھر کیسے آنا ہوا"۔ "بنارس تک ایک بیڑے کے سلسلے میں آئی تھی۔ سوچا آپ سے بھی مل لوں"۔ میں نے تعجّب سے پوچھا ــــ "لیکن میرا پتہ؟" انہوں نے ریڈیو کی طرف مُسکراتے ہوئے دیکھا اور بولیں۔ "میں نے ریڈیو سُنا تھا"۔ میں تعجب سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ذرا سوچنے پر خیال آیا۔ شرم سے میرا سر جُھک گیا۔ بہت دن ہوئے، ریڈیو والوں کو میں نے خط لکھا تھا۔ ریڈیو پروگرام کے بارے میں زرینہ کے گانے کی تعریف کرتے ہوئے میں نے صلاح دی تھی کہ انہیں اکثر گانے کے واسطے بُلایا جائے"ــــ "لیکن وہ چِٹھی آپ کو کیسے ملی؟"ــــ چِٹھی کا جواب میں نے سُنا تھا۔" اچھا میں نے نہیں سُنا"ــــ "جی ہاں، آپ نے بڑی مہربانی کی۔ میرا کئی بار لکھنؤ جانا ہوا، بڑی مدد آپ نے میری......" میں شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا ــــ "جی ہاں میں نے اپنے کچھ ساتھیوں سے ویسے خط لکھنے کو کہہ دیا تھا" زرینہ مُسکراتی ہوئی بولی۔ "مجھے آپ بھولے نہیں، یہی میرے لئے کیا کم ہے"۔

میں نے ہنستے ہوئے نوکر کو آواز دی اور اُسے چائے لانے کو کہا ــــ "جی نہیں تکلف نہ کیجئے! میں نے اسٹیشن پر چائے پی لی ہے۔" میں نے اس بات سے ذرا نامطمئن ہو کر کہا۔ "آپ میرے وہاں آ رہی تھیں تو ــــ" انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "جی نہیں یہ بات نہیں، میں نے سوچا آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "رہنے دیجئے بہت ہو چکا اب، پان میں تو اعتراض نہیں ہے" میں نے نوکر سے پان لانے کو کہا۔ . . . .

. . . . اس وقفہ میں ان کی نظر کمرہ کے کونہ کی میز پر رکھے ہوئے فوٹو اسٹینڈ پر پڑی، زرینہ نے مسکراتے ہوئے کہا "یہی ایک لڑکی ہے؟" میں نے تصویر میں دیکھا۔ میری دھرم پتنی میرے پہلو میں بیٹھی تھیں اور ہمارے سامنے ہماری لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے کہا "جی نہیں ایک بچہ گود میں ہے۔" تصویر پر آنکھ جمائے ہوئے انہوں نے پوچھا "آپ کی بیوی تو مزے میں ہیں۔" تصویر میں میں اپنی بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ شرماتے ہوئے میں نے کہا "جی ہاں مزے میں ہیں۔"

نوکر نے پان لاکر دیا۔ پان کھاتے ہوئے سنجیدگی سے زرینہ نے کہا

"میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔ میرے پاس وقت زیادہ ٦٢
نہیں ہے، اسی گاڑی سے لکھنؤ جانا ہے۔" میں نے بات کاٹ کر کہا "لیکن آپ نے تو کہا تھا بنارس۔" زرینہ بیچ میں بول اٹھی "جی نہیں۔ کل لکھنؤ سے پروگرام ہے۔" سامنے پڑا ہوا السنر ([illegible]) میں اُلٹنے لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی "میرا اس طرح آنا یہاں، معاف کیجئے گا۔ کچھ دنوں سے برابر آنے کو سوچ رہی تھی، آنا ضروری تھا؟" یہ کہتے ہوئے وہ اپنا منی بیگ کھولنے لگی، میں تعجب سے منی بیگ کی طرف دیکھ رہا تھا ــــ "آپ کو یاد ہوگا" یہ کہتے ہوئے اس نے سونے کی ایک چھوٹی سی دو موتیوں کی نتھ نکالی ــــ "آپ تو اسے پہچانتے ہوں گے ــــ یہ اس وقت اُتر چکی تھی، اسکے اُتارے جانے میں میری ماں کا ہاتھ تھا، وہ میری رسم نہ تھی لیکن میں ایسے آدمی کی تلاش میں تھی جسے میں اس کو نذر کر سکتی۔ جو عورت کو پہچانتا ہو اور اس کی قیمت سمجھتا ہو . . . . اس دن ریڈیو پر آپ کا خط سُنکر میں نے طے کیا کہ آپ عورت کی اس عزت کا بوجھ اُٹھا سکیں گے۔" نتھ میرے ہاتھ پر رکھ کر وہ کرسی سے اُٹھنے لگی، میں نے پریشان آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے شک کی حالت میں اُس سے پوچھا "لیکن میں اس کا کیا کروں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کی چیز ہے، اس میں عورت کی لاج اور عزت دونوں ہیں ــــ یہ امانت آپ کے پاس رہنی چاہئے۔" یہ کہکر وہ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ میں نے بیچین ہو کر کہا "لیکن اتنی جلدی کیا ہے، آج رہ جائیے۔ کل صبح بھی لکھنؤ جا سکتی ہیں۔" اس نے کمرہ کے چاروں طرف دیکھ کر پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "یہ میرے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھی سے اُترنے لگی۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "پھر کب ملاقات ہوگی؟" اس نے مُڑ کر میری آنکھوں میں دیکھا "زندگی کا کیا ٹھکانا" یہ کہتے کہتے وہ ساڑی کا کونہ اُٹھا کر اپنی آنکھوں تک لے گئی۔ میں دروازہ پر کھڑا تھا اس کا تانگہ چلا جا رہا تھا وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا زرینہ کتنی بدل گئی ہے۔ اسکی عمر کس تیزی سے ڈھلتی جا رہی ہے۔ اس کا کہنا یاد ہو آیا۔ "زندگی کا کیا ٹھکانا" اور میں یکبارگی کانپ گیا۔

خیالوں میں ڈوبا ہوا اپنے کمرہ میں واپس آیا۔ چھوٹی میز پر سونے کی امانت پڑی تھی، کہاں رکھوں اسے؟ یہی سوال بار بار میرے دل میں اُٹھتا تھا، وہ چھوٹی سی چیز مجھے کتنی بھاری معلوم ہو رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے میرے گلے میں پتھر کی بھاری چکی ڈال دی ہے۔ کچھ دیر اسے ہاتھ میں لئے اِدھر اُدھر گھومتے رہنے کے بعد اپنا بکس کھولا اور اسکی تہ میں نتھ رکھ دی۔ پھر کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد پھر بیچین ہو گیا، جا کر بکس کھولا نتھ کو ڈھونڈتے ہی سونے کی ایک گھڑی ملی۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ اتنی دیر میں اس نے اپنا ایک ساتھی بھی ڈھونڈھ لیا، اب میں دونوں چیزوں کو ہاتھ میں لئے کمرہ میں گھومنے لگا۔ پھر الماری کھولی، الماری کے اندر بیچ کے خانہ میں دیوار پر ایک تصویر دو کیلوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

تئیس سال ہوئے آسمان میں اُتر کی طرف ایک بڑا تارہ چمکا تھا جس کی سُرخ روشنی دُنیا کے پانچویں حصہ پر آج بھی چمک رہی ہے۔ یہ اُسی لال ستارہ کی تصویر ہے۔ چکنا سر، چمکتی ہوئی گہری آنکھیں، بھدی ناک، مضبوط جبڑے اور چھوٹی سی ڈاڑھی! ــــ دیکھنے میں وہ آدمی چوروں کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ دراصل چوروں اور نیچوں سے زندگی میں اس کا گہرا تعلق رہا۔ اس تصویر کو دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا، تصویر دو کیلوں پر ٹھہری تھی ایک کیل پر وہ نتھ اور دوسری پر وہ گھڑی ٹانگ دی۔ سونے کی نقلی گھڑی میں میرا ماضی چھپا ہوا تھا اور اصلی سونے کی نتھ میں میرے مستقبل کا بوجھ! ایک کے بغیر دوسرا ممکن نہیں، نتھ کا بوجھ میں اکیلے نہیں اُٹھا سکتا تھا، اس لئے اس تصویر کو ساتھی بنایا۔

بقیہ مضمون صفحہ ۲۶

اور وزیر بچاؤ کے اختیارات کے حدود کی صاف صاف وضاحت کردی جائے یہ تمام باتیں بہترین نیک نیتی سے کی گئیں، اور خاص مقصد یہ تھا کہ زور شور سے کام شروع ہو جائے۔ یہ ظاہر تھا کہ بغیر اسکے ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی۔

موجودہ حکومت یہ یقین کر سکتی ہے کہ وہ عوام کے جذبات واحساسات کا علم رکھتی ہے، لیکن خلیج بہت بڑی ہے اور عوام کے لیڈر ہی اسے پاٹ سکتے ہیں اور عوام کے لیڈر بھی اُسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ عوام کی امیدوں کے قدم بقدم رہیں۔ نظر بہ حالات کانگریس کی ورکنگ کمیٹی سمجھوتہ کی صادق اور پرُجوش خواہش کی وجہ سے اس انتہا تک پہنچ گئی کہ عوام کے جذبات انتہا درجہ تک جھیل چھال کر کم کردیے گئے، کمیٹی کو اس بات کا پوری طرح علم تھا کہ آسٹریلیا اور ہندوستان کی پوزیشن میں جو فرق ہے وہ ہندوستان کے بچاؤ کے کنٹرول اور رہنمائی کی نسبت سے عوام کو سمجھانا مشکل ہوگا۔ لیکن اس امید کا پورا بھروسہ تھا کہ ایک بار جہاں سمجھوتہ ہوا تمام پارٹیوں کی مشترکہ کوشش ایک دم سے فضا کو بدل دے گی، اور ہندوستان میں ہر شہر اور گاؤں میں پرُجوش والنٹیروں کی چہل پہل نظر آئے گی، صرف یہ کہنے کا موقع ملنا چاہئے تھا کہ ہندوستان عملاً آزاد ہے، اور برطانی اور امریکن آپ کے دوستوں اور ساتھیوں کی حیثیت سے یہاں ہیں، تاکہ آپ کو اپنی آزادی قائم کرنے اور بچانے میں مدد دیں، اس میں کسی ایک فرقہ کے دوسرے پر چھا جانے یا کسی اقلیت پر اکثریت کی جابرانہ حکومت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

سر اسٹیفورڈ کرپس کے آخری خط اور ان کی براڈکاسٹ تقریر نے تو اور بھی زیادہ گنجلک پیدا کردی اور بعد کو انہوں نے کراچی کے اخبار والوں کو جو انٹرویو دیا، اس سے تو اس انتشار میں جو رہی سہی کسر تھی وہ بھی پوری ہوگئی انہوں نے قدرتی طور پر یہ کوشش کی کہ حالات کے سیاسی جائزہ میں شخصی توازن داخل کرکے صریحی درشتیوں کو نرم کردیں، اس . . . . سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر منہ بد ذائقہ ہوگیا۔ ہندوستان ہکا بکا ہے اور پہلے سے زیادہ غیر یقینی حالت میں ہے اور یہ محسوس کیا جاتا ہے (جس کے لئے بہت کچھ جواز موجود ہے) کہ سر اسٹیفورڈ کرپس کی آخری اداکاری خاص اس مقصد سے تھی کہ وہ دہلی اور لندن میں اپنے آدمیوں میں اپنی ناکامی کو ایک قسم کی کامیابی ظاہر کریں، ایک ایسے رجعت پسند کی کامیابی جو وقتی طور پر سامراج کے محافظ ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہو۔

شاید مسٹر جناح سے آخری انٹرویو کے دوران میں مسٹر اسٹیفورڈ کرپس نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کانگریس مشترکہ ذمہ داری کے کونسل سے لیجسلیچر کے روبرو ذمہ داری چاہتی ہے۔ ورنہ مسٹر جناح اتنے تجربہ کار پالیمنٹیرین ہیں کہ وہ اپنے اخباری بیان میں وہ خیال نہ ظاہر کرتے جو انہوں نے سر اسٹیفورڈ کرپس کی روانگی کے بعد ظاہر کیا۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو سر اسٹیفورڈ کرپس نے مختلف آدمیوں سے مختلف مقصدوں سے مختلف باتیں کہیں، اس سے پہلے پنڈت جواہرلال نہرو اور کانگریس کے صدر سے انٹرویو کے دوران میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے ہی ہمت کرکے یہ کہا تھا کہ چونکہ اگزیکٹیو کے ممبر لیجسلیچر کے سامنے ذمہ دار نہیں ہو سکتے، وہ ایک طرح پر ان پارٹیوں کے سامنے ذمہ دار ہوں گے جن میں سے وہ آئے ہوں گے۔

بہرحال کیبنٹ کی تشکیل پر تو اس لئے بحث نہیں ہوئی کہ وہ منزل آئی ہی نہیں، لیکن یہ ظاہر تھا کہ اس مشترکہ کیبنٹ سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ مشترکہ ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ایک ٹیم کی سی اجتماعی اسپرٹ سے کام کریگی اگزیکٹیو اور گورنر جنرل کے رابطہ کا بھیانک سوال، اس کا تعلق کیبنٹ کی مشترکہ ذمہ داری اور گورنر جنرل سے تھا، کیبنٹ کے اندر فرقہ واری کی بنیاد پر پالیسی اور لائن پر اکثریت اور اقلیت کا سوال تو کبھی زیر بحث آیا ہی نہیں۔ اگر بحث کیلئے یہ مان بھی لیا جائے کہ مجوزہ کیبنٹ کی تشکیل ایسی ہوتی ہے کہ رائے دہی کے معاملہ میں اقلیتوں کے نمائندے گھاٹے میں رہتے، لیکن انتہائی دھندلی نظر والی اکثریت ہی خانہ برانداز ظالمانہ کھیل کھیل سکتی ہے۔ اپنے تجربہ کی بنا پر میں اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ پارٹی کیبنٹ میں بھی اقلیتیں اپنی تعداد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وزن رکھتی ہیں۔ وقتی مسئلے جن پر اہم نتیجوں کا انحصار ہوتا ہے ووٹوں سے نہیں بلکہ عام اتفاق رائے سے طے ہوتے ہیں لیکن اس مسئلہ کی زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

مجموعی حیثیت سے ہندوستان میں کرپس مشن کا نتیجہ یہ ہے کہ مصیبت کی گھٹائیں اور زیادہ گھر آئیں۔

حسرت ترمذی بی۔اے

محبّت کی وادیاں

یہ عہدِ محبت کی آبادیاں　　سلامت رہیں دل کی بربادیاں
نشیمن کی وہ آرزو کیا کرے　　سمجھتا ہو جو خانہ بربادیاں
محبّت کی رسمیں ہی اب اور ہیں　　نہ فریادیں اور نہ فریادیاں
کہاں فکر کی اُلجھنوں سے نجات　　کہاں زندگانی میں آزادیاں
کوئی کیا کسی کی شکایت کرے　　چمن میں لُٹیں خود چمن زادیاں ۶۱
نگاہوں میں شوخی لبوں پر ہنسی　　کوئی سیکھ لے تم سے صیّادیاں
تمہاری اداؤں کے سب کھیل ہیں　　نہ آبادیاں ہیں نہ بربادیاں
کہاں تک یہ ہم سے تری غفلتیں　　کہاں تک یہ ہر لحظہ بربادیاں
محبّت کے جلووں سے آباد ہیں　　یہ صحرا ، یہ گلزار ، یہ وادیاں

قفس کے لئے دل تڑپتا رہے
ملیں ہم کو حسرت جو آزادیاں

ایشیا۔ مئی ۱۹۴۲ء

نگار

ایشیا مئی ۱۹۴۳ء

عورت کی زندگی (تریاقِ نسواں)

اس حیثیت سے کہ عورت زندگی میں خلاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ دُنیا اور سماج کی تمام تر صحت کی ذمہ وار ہے، یہی نہیں، آنے والی نسلوں کی صحت کا دار و مدار خود آج کی عورت کی تندرستی پر ہے، مگر افسوس مرد غافل اور خود عورت دوررس نہیں۔ اس کی حیا، اور مرد کی غفلت دُنیا کو مریض مستقبل کی طرف لئے جارہی ہے۔

عورتوں کی معمولی بیماری ہی کو لیجئے، عام جسمانی کمزوری و نقاہت، بعض اوقات زچگی کے امراض اور کبھی رحم کے کمزور ہوجانے کی وجہ سے سفید رطوبات خارج ہونے لگتی ہیں، جس کی وجہ سے زندگی مضمحل نظر آنے لگتی ہے۔ قبل از وقت بُڑھاپا چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اولاد ہونا بھی بند ہوجاتا ہے۔ ان تمام شکایتوں کے لئے تریاقِ نسواں نہایت ذی تاثیر دوا ہے۔ پہلی ہی خوراک اثر کرتی ہے۔ اس دوا نے صنف نازک کے طبقے میں بڑی قبولیت حاصل کی ہے، اصل میں یہ اکسیر ہمارے دواخانے کی شہرت اور کامیابی کا باعث ہوئی ہے۔ تریاقِ نسواں ۳ ماشہ صبح اور ۳ ماشہ شام گائے کے تازہ دودھ کے ساتھ استعمال کیجئے۔ ترش اشیاء، اور گڑ وغیرہ سے پرہیز لازمی ہے۔ قیمت برائے ایک ماہ فی ڈبہ ۱۲؍ علاوہ محصولڈاک۔

نوٹ :- یہ تریاقِ حکیم نعیم اللہ صاحب سند یافتہ طبیہ کالج لاہور رجسٹرڈ انڈیجنیس میڈیکل پریکٹیشنر کلاس اے گورنمنٹ یوپی کی شہرۂ آفاق دوا ہے (ادارہ ایشیا میرٹھ)

منیجر مشہور عالم آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ

جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر یوپی)

ساغر نظامی

سماج

کھِل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا، جانِ بہار — اے مری جانِ بہار
خندہ، جُز شورشِ آغازِ بلا کچھ بھی نہیں
نغمہ، جُز ماتمِ تابوتِ صدا کچھ بھی نہیں
ہر روشِ صحنِ گلستاں کی مزارِ بُو ہے
گو دہیں موجِ تبسّم کے فقط آنسو ہے
جگنوؤں کا یہ چراغاں ہے شراروں کا فریب
لالہ و گُل کا تبسّم ہے بہاروں کا فریب
کھِل کھلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا، جانِ بہار — اے مری جانِ بہار
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا، جانِ سخن — اے مری جانِ سخن
جھوٹ نے مستیِ گفتار میں بدلا ہے لباس
غیبت و کذب کی رنگین و تراشیدہ اساس
بحرِ تکذیب کے ٹھہرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ
یا جہنم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
سچ کو اک آن میں الہام بنا دیتے ہیں
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا، جانِ سخن — اے مری جانِ سخن

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر، کیفِ نظر — اے مرے کیفِ نظر

یوں تو شیریں ہیں بظاہر یہ مئے زیست کے جام
لیکن احساس میں یہ جام ہیں زہرابِ تمام
تلخیاں جھانک رہی ہیں کوئی جیتا تو نہیں
بادۂ عیش جہاں میں کوئی پیتا تو نہیں
میٹھی میٹھی یہ نگاہیں، یہ تبسّم یہ نیاز
سب کے پردے میں ہے اک تلخ حقیقت غمّاز

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر، کیفِ نظر — اے مرے کیفِ نظر
گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا، سازِ خیال — اے مرے سازِ خیال

استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستون چاہیئے اس بیل کو زردوزی کا
حلقہ کرتی ہیں یہ زرّیں کمرو گردن کا
عکس پڑتا ہے بہاروں ہی پہ اس گلشن کا
فن ہو یا حُسن، جوانی ہو کہ پیغامبری
ہار پڑتا نہیں مفلس کے گلے میں یہ کبھی

گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا، سازِ خیال — اے مرے سازِ خیال
عطر آلود لباسوں پہ نہ جا، روحِ گلاب — اے مری روحِ گلاب

اُس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائیگا دنگ
عہدِ تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ دھڑنگ
ہے یہی مرکزِ بو، اور یہی مخزنِ رنگ
جسمِ عریاں پہ مگر جامۂ انفاس ہے تنگ
توشہ خانے سے غریبوں کے اُڑے ہیں یہ لباس
خونِ مزدور کی خوشبو میں بسے ہیں یہ لباس

عطر آلود لباسوں پہ نہ جا، روحِ گلاب — اے مری روحِ گلاب

ایشیا، مئی ۱۹۴۲ء

٦٩

اِن خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ، حسنِ نظر — اے مرے حسنِ نظر

چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جو تہذیب کے بُت
ترشے ترشائے ہوئے آذرِ تادیب کے بُت
ان کے دل سنگ ہیں، جان سرد ہے سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب، ان کے سفینے تاریک
کوئی در ان پہ سیہ کاریوں کا بند نہیں
جانِ ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں

اِن خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ، حسنِ نظر — اے مرے حسنِ نظر
ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا، کشتِ حیات — اے مری کشتِ حیات

کبھی مجبور پہ ہو بارشِ الطافِ امیر؟
ایک ہو جائے کبھی قسمتِ صیّاد و اسیر!
زہر خود شہد بنے، آب ہو خود موجۂ شیر
اپنی ہر کاٹ سے پیدا کرے امرت شمشیر
جذبۂ جبر کے ہونٹوں پہ تبسّم ہو، محال
ظلم کی روح کو احساسِ ترحّم ہو، محال

ریگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا، کشتِ حیات — اے مری کشتِ حیات
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا، حسنِ نظر — اے مرے حسنِ نظر

یہ کرم اور یہ اخلاق، یہ مجرے، یہ سلام
یہ تواضع، یہ تکلّف، یہ تبسّم، یہ کلام
ہر نفس گدگدے صوفوں پہ قعود اور قیام
ہر ادا قاتل و صیّاد، نظر دانہ و دام
پر یہ سب ذوقِ نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں
اس کی تہ میں صداقت بخدا کچھ بھی نہیں

مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ جا، حسنِ نظر — اے مرے حسنِ نظر

ساغر نظامی

انقلاب

کیوں لطف تم کو شام و سحر میں نہیں رہا
کیا میرا اعتبار نظر میں نہیں رہا

ساکت ہے کائنات تو جامد ہیں شش جہات
جیسے کہ دورِ شمس و قمر میں نہیں رہا

جس میں فروغِ لالۂ و گل دیکھتا تھا منہ
وہ آئینہ حریمِ سحر میں نہیں رہا

آئینہ ہی نہیں ہے تحیّر سے چور چور
جوہر مزاجِ آئینہ گر میں نہیں رہا

ہر شے کو دیکھتا ہوں، مگر دیکھتا نہیں
احساسِ دید چشم و نظر میں نہیں رہا

دل اختیار میں ہے نہ قابو ہے روح پر
میرا وجود میرے اثر میں نہیں رہا

تھی گردشِ حیات بھی جس عزم سے خجل
وہ عزم میرے ذوقِ سفر میں نہیں رہا

جو چومتا تھا اُڑ کے تخیّل کی چوٹیاں
وہ اشتیاق بازو و پر میں نہیں رہا

جو میرے آشیاں کو بناتا تھا آشیاں
وہ اضطراب برق و شرر میں نہیں رہا

کشتی مری امید کی اب کون لے چلے
طوفان کوئی دیدۂ تر میں نہیں رہا

جس نے تجھے تراش کے معبود کر دیا
وہ بُت تراش قلب و نظر میں نہیں رہا

جس میکدہ کا مست خرامی تھا ایک نام
وہ میکدہ بھی راہ گزر میں نہیں رہا

آتا تھا جس سے تیرے خرامِ حسیں میں لوچ
اب وہ ہجوم راہ گزر میں نہیں رہا

ملتا ہوں ہاتھ آہ کہ جب لگ رہی تھی آگ
کیوں اس گھڑی میں بھول کے گھر میں نہیں رہا

ہر دم نوازشیں ہیں نہ پیہم ستائشیں
اب کوئی لُطف عرضِ ہنر میں نہیں رہا

عکّاس تھا جو تیرے جمال و جلال کا
وہ سوزِ حُسن شام و سحر میں نہیں رہا

مبہم سا اک فریبِ اجابت تھا جس کا نام
وہ ربط بھی دُعا و اثر میں نہیں رہا

پرتو سے جس کے آرزوئے دل جوان تھی
وہ التفات تیری نظر میں نہیں رہا

شائد یہ کائنات بکھرتی نہ کچھ دنوں
کچھ اور کیوں میں تیری نظر میں نہیں رہا

ایشیا۔ مئی سنہ ۱۹۴۲ء

ساغر نظامی

آنکھیں

نسیم و نکہت و رنگ و شراب ہیں آنکھیں   شگفتگی ہیں، کنول ہیں، گلاب ہیں آنکھیں
جزیرہ ہائے مہ و آفتاب ہیں آنکھیں   پہیلیوں کی طلسمی کتاب ہیں آنکھیں

نظر اُٹھا کے خود اپنا جواب ہیں آنکھیں

سجودِ صبح کے پاکیزہ تر اثر کی قسم   شبِ گنہ کی دھڑکتی ہوئی سحر کی قسم
کسی عفیف کی بہکی ہوئی نظر کی قسم   تمام عالمِ اسرارِ خیر و شر کی قسم

پیامِ کفر و گناہ و ثواب ہیں آنکھیں

مچل رہی ہیں کبھی مُسکرا رہی ہیں کبھی   سنبھل رہی ہیں کبھی لڑکھڑا رہی ہیں کبھی
فریبِ کیف میں سب کچھ لُٹا رہی ہیں کبھی   چھلک رہی ہیں کبھی اور پلا رہی ہیں کبھی

شراب ہیں کبھی جامِ شراب ہیں آنکھیں

تڑپ رہی ہے غمِ گفتگو کی بیتابی   جھلک رہی ہے خفی جستجو کی بیتابی
شگفتگی کو ہے پرواز بو کی بیتابی   چھلک رہی ہے مئے آرزو کی بیتابی

لطیف دو قدحِ اضطراب ہیں آنکھیں

سلام ہوتے ہیں پیہم پیام آتے ہیں   کلام ہوتے ہیں باہم سلام آتے ہیں
ابدنشاط تمنّا کے جام آتے ہیں   عجیب ان کو طریقِ کلام آتے ہیں
کہ چُپ ہیں بزم میں اور کامیاب ہیں آنکھیں

تصدّق ان پہ ہیں، شام و پگاہ کے بھونرے   طواف کیلئے بیکل ہیں آہ کے بھونرے
تڑپ رہے ہیں مری تشنہ چاہ کے بھونرے   بنے ہیں نغمۂ رقصاں نگاہ کے بھونرے
کنول کی شاخ ہو تم اور گلاب ہیں آنکھیں

دلوں میں سوئے ہوئے کارواں جگاتی ہیں   عجیب خواہشوں کی مثنوی سُناتی ہیں
سپردگی کے عجب راگ گنگناتی ہیں   بغیر سازہی سازِ کرم بجاتی ہیں ۱۷
نگاہِ شوق ہے مطرب، رباب ہیں آنکھیں

بیان پھر ہوں فسانے حسین آنکھوں سے   بلند پھر ہوں ترانے حسین آنکھوں سے
کچھ اور مست نشانے حسین آنکھوں سے   بدل گئے ہیں زمانے حسین آنکھوں سے
نویدِ شورشِ صد انقلاب ہیں آنکھیں

جوش ملیح آبادی

"حرفِ آخر" کا ایک ورق

حوّا کا احساسِ شباب

(ایک کنج کے سبزہ زار پر حوّا بیٹھی ہوئی ہے، آدم اسکے زانو پر سر رکھے سو رہا ہے کہ دبے پاؤں اک سُرخ پوش چہرہ پر گہری سیاہ نقاب ڈالے حوّا کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے، اسکے احساسِ شباب کو بیدار کرنے کی خاطر آہستہ سے کہتا ہے)

اس آبِ تبسّم میں نہ آئے گی روانی　　اس حرف سے چھلکے ہیں نہ جھلکیں گے معانی
اس حسن سے ہو گی نہ کبھی شعلہ فشانی　　برسے گا نہ اک بوند بھی اس ابر سے پانی

نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس سلسلۂ شرم سے بل جائیگا جس وقت　　رگ رگ میں جوان خون اُبل جائیگا جس وقت
سانچے میں نئی آگ کے ڈھل جائیگا جس وقت　　کانٹا ترے سینہ کا نکل جائے گا جس وقت

کھل جائیں گے تخلیق کے اسرارِ نہانی

نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس شرم سے اس ضبط سے اس بیم و رجا سے　　اس جذبۂ ناموس سے اس خوفِ خدا سے
اس شدّتِ آداب سے اس فرطِ حیا سے　　اس خفّتِ مغرولیٔ انداز و ادا سے

شامیں ہی سلونی ہیں نہ صبحیں ہیں سہانی

نادان اگر تو نے مری بات نہ مانی

ہاں جھوم، کہ انگارہ جوانی کا دھک جائے　　کوندا سا لپکنے لگے بجلی سی چمک جائے
یوں پی مئے عشرت کہ ترا جسم چھلک جائے　　اور اتنی کہ انگڑائی جو لے جلد مسک جائے

اُٹھ رقص میں آ رقص میں بھرپور جوانی

ایشیا ۔ مئی ۱۹۴۰ء

(یہ کہتے ہی سُرخ پوش نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حوّا پر بیداریٔ شباب کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور وہ اپنی کلائی کو بلند کر کے دیکھتی ہے۔ ایک عجیب لذت و کرب کے عالم میں دل ہی دل میں کہنے لگتی ہے)

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں — یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں دواں
بیداریوں کو اپنے جلو میں لئے ہوئے — کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کئے ہوئے
آنکھوں سے ایک بھاپ سی اُٹھتی ہے گرم و سرد — پنڈے کے پھیکے پن میں ہے کیسے مزہ کا درد
تڑپا رہا ہے کون دلِ دردمند کو — اینٹھن سی کھائے جاتی ہے ہر جوڑ بند کو
رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں — رُخ سے سکون کے چھوتے ہی اُٹھتا ہے اک دھواں
کوئی ہمک رہا ہے بہ اندازِ دل نشیں — سینے میں ہے کہ گود میں مجھ کو خبر نہیں
کانوں سے لو نکلتی ہے اور آگ ہے جبیں — چھاتی اُبل رہی ہے نہ ہو جائے شق کہیں
زانو پہ سونے والے ہی سے کیوں نہ پوچھ لوں — یہ بیخودی سی مجھ میں پھٹی پڑ رہی ہے کیوں
دھومیں مچی ہوئی ہیں وہ دل میں کہ الاماں — اینٹھی سی جا رہی ہیں نگوڑی کلائیاں
اک لو سی پھٹ رہی ہے الجھتی نجوم سے — کیا صبح ہو رہی ہے رگ و پے میں دھوم سے ۱۷
ہوتی ہے کیوں لچک سی کمر میں یہ بار بار — کیسا یہ اُف ہے دھوم مچاتا ہوا اُبھار
پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بُری — پہلو سے زلف مس ہو تو آتی ہے جھرجھری
تیزی سے بن رہی ہوں میں اک زندہ پھول بن — ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے پھبکا ہوا بدن
ہر رونگٹے کی جاگ اُٹھی پیاس الاماں — احساس اور جسم کا احساس الاماں
شیریں و تلخ زہر رگ و پے میں بھر دیا — کس نے یہ مجھ کو جسم سے آگاہ کر دیا
لگتا ہے تیر بن کے جھکنا ہزار کا — در آیا ہے بدن میں زمانہ بہار کا
سیّال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن — معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن
اے کاش مجھ پہ رحم نہ کوئی ذرا کرے — مجھ کو نڈھال کر دے مجھے اَدھ مُوا کرے
دشمن کی طرح بھینچ کے رگ رگ کو توڑ دے — اور توڑنے کے بعد سسکتا ہی چھوڑ دے

(کہ حوّا کے جسم کی برقی لہروں سے آدم بیدار ہو جاتا ہے اور ایک سیاہ لکۂ ابر دونوں کو چھپا لیتا ہے)

ایشیا، مئی ۱۹۴۲ء

کسوٹی

اکسیر برص (سفید داغ)

حُسن، انسانی زندگی اور جدوجہد کا اعلیٰ ترین مقصود ہے، سوسائٹی اور زندگی میں خوبصورتی کبھی ناکام نہیں ہوئی، مگر سفید داغ (برص) انسان کی انتہائی بدقسمتی ہے، نفرت و حقارت کا موجب ہیں، سوسائٹی میں برص زدہ انسان سے کوئی حقارت کا اظہار نہ کرے، مگر اسکے منظر کا اثر انسانی دل و دماغ پر ضرور ہوتا ہے موذی ترین مرض ہے، اور انسانی حُسن کا شدید دشمن، مگر اس شدید دشمن کا علاج صرف اکسیر برص ہے جس کے استعمال سے یہ جلدی مرض جڑ سے جاتا رہتا ہے۔

صبح و شام، اکسیر برص ۶، ۶ ماشہ تیز گرم پانی میں بھگو رکھیں اور کچھ دیر بعد نتھار کر پی لیں، بچے ہوئے فضلہ کو پیس کر اور سرکہ میں ملا کر داغوں پر لیپ کر لیں۔ سوتے وقت ضماد برص نیم گرم داغوں پر لگائیں اور اسکے بعد دیکھیں کہ کس طرح یہ اپنا کام کرتا ہے۔ قیمت ایک ماہ کیلئے عہ علاوہ محصول۔

نوٹ:۔ یہ اکسیر حکیم نعیم اللہ صاحب سند یافتہ طبیہ کالج لاہور رجسٹرڈ انڈیجنس میڈیکل پریکٹیشنر گورنمنٹ یو۔پی کی مجرب اور کارگر ادویات میں سے ہے۔ (ادارۂ ایشیا میرٹھ)

منیجر مشہور عالم آیورویدک اینڈ یونانی دواخانہ
جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر۔ یو۔پی)

کسوٹی

نئی کتابیں اور رسالے

روح غالب :- مرتبۂ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور،

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ (۲۱)
قیمت عہ/ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

مرزا غالب کی نظم و نثر اور اُن کی زندگی کے متعلق کافی لٹریچر پیدا ہو چکا ہے مگر شکسپیر کے برابر نہیں۔ غلام، بدذوق اور جاہل قوم میں جو کچھ ہو سکا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ مایوس کن نہیں۔ روح غالب کے نام سے ڈاکٹر زور (حیدرآباد نے) مرزا غالب کے متعلق ایک نئی کتاب ترتیب دی ہے۔ اس تالیف و ترتیب کا مقصد یہ ہے کہ اُردو کے اس شاہکار سے صرف ایسے شہ پارے چُن لئے جائیں جو زبان اور اسلوب کے لحاظ سے دلچسپ ہوں اور اُن علمی و فنی بحثوں کو علیحدہ کر دیا جائے جو تحقیق و تفتیش کرنے والوں کے لئے کارآمد ہیں نہ کہ غالب کے اسلوب خاص سے لطف اندوز ہونے اور اردو نثر کے پاکیزہ نمونوں سے واقف ہونے کے لئے۔

جن ادب پاروں کو ڈاکٹر صاحب نے منتخب کیا ہے اُن کی حیثیت ادبی ہے۔ نثر کے جو انتخابات شامل کئے گئے ہیں وہ اُن کے اُردو مکاتیب کا نچوڑ ہیں ان خطوط سے غالب کی روحانی کیفیتیں پھوٹی پڑتی ہیں۔ غالب کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔

اصل میں یہ کتاب اک تالیفی نمونہ ہے، مغربی اصول ترتیب کا، دوسری کتابوں کے سقوط کے لئے اسے ترتیب نہیں دیا گیا۔ بلکہ جماعت کے لئے رنگارنگ مزاج و ذوق کے مطالبہ کی ضمنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس تالیف میں لاعلمی و فنی باتوں کے علاوہ اس مجموعہ کے خطوط سے ان عبارتوں کو بھی علیحدہ کر دیا گیا ہے جن میں غالب نے حوائج ضروری اور دیگر ایسے امور کا ذکر کیا ہے جو مطالعہ کے لطف میں بدمزگی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتے تھے۔

یہ ہیں وہ التزامات جن کی بنا پر اسے روح غالب کہا جا سکتا ہے۔

خطوط کے سمجھنے کے لیے مرزا غالب کے حالات زندگی، تصنیفات و تالیفات، خاص عزیزوں اور دوستوں کے متعلق معلومات بھی ایک باب میں درج ہیں۔

کتاب کے پہلے باب "غالب کے متعلق ادب" میں ابتدائی کوششوں کی داستان، سوانح عمریاں، اور غالب کے سوانح نگاروں اور ناقدوں حالی آزاد حیدر یار جنگ طباطبائی۔ دوسری نثر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف غلام رسول مہر شیخ محمد اکرام۔ سالک رام اور مہیش پرشاد کا ذکر ہے۔

تیسرے باب میں حیات غالب میں الف خاندان، تعلیم و تربیت، شادی اور سکونت دہلی، صحبت کا اثر، مالی پریشانیاں، کلکتہ میں، بدنامی، قید، قلعہ کی ملازمت عروج و زوال، رام پور سے تعلق، انگریزوں کی خفگی، رام پور کا دوسرا سفر، وفات ب آزادہ روی و رندمشربی، اسراف، خوشامد، مروّت و فراخ حوصلگی، مذہبی بےتعلقی و رواداری اور ظرافت کا ذکر کیا گیا ہے۔ *

* تیسرے باب "غالب کے ادبی کارنامے میں" فارسی نظم، فارسی نثر، اردو نظم، اردو نثر کا تذکرہ ہے۔
چوتھے باب "غالب کے اعزہ و احباب میں" اعزہ و احباب اور تلامذہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

۴ پانچویں باب "خطوط غالب کے دلچسپ ادبی حصے" میں غالب کے خطوں کی خصوصیت، خطوط غالب کی فہرست، اور غالب کے خطوط درج کر دیئے گئے ہیں۔

اس کا پیش لفظ آنریبل مولوی سید مہدی حسین صاحب بلگرامی نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے (کیمبرج) صدرالمہام تعلیمات ممالک محروسہ و معین میر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے تحریر فرمایا ہے۔ اس پیش لفظ کا یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ غالب کو مغربی معیار و نقطۂ نگاہ سے نہیں مشرقی زاویۂ نگاہ ہی سے دیکھنا چاہیے۔ یہ انتباہ ان حضرات کے لئے ہے جو مغربی اصول تنقید کی روشنی میں غالب کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ گو یہ پیش لفظ مختصر ہے مگر اپنی جامعیت کے لحاظ سے بہت ہی خوب ہے۔

دیباچہ مرتب نے لکھا ہے۔ غالب اور ڈاکٹر زور صاحب کے دو عکسی فوٹو ہیں۔ غالب کی کوئی نئی تصویر نہیں ہے۔

کتابت تنوع کے طور پر نہایت خوب ہی اور شعراء کے متعلق اس قسم کی نئی تالیفات اور بھی آئیں تو اُردو زبان کی یہ بہت بڑی خدمت ہے۔

ضرورت ہے کہ اب ڈاکٹر زور قبرستانوں سے رُخ پھیر کر زندگی کی طرف رجوع ہوں اور عصر حاضر کے زندہ جدید شعراء کی چھان بین کی طرف رجوع کریں اگر یہ پوری نسل کی نسل خود رو طور پر پروان چڑھنے کے لیے چھوڑ دی گئی تو اس کی ذمہ داری ان افراد پر ہوگی جو خود کو نقاد کہتے ہیں اور اس وقت تک زیرِ زمین دفن شدہ دنیا ہی سے تعلق رہا ہے۔

اُردو میں نیا سیاسی ادب

کسی زبان میں رومانی ادب کی زیادتی ذہنی انفعال پذیری کی دلیل ہے۔ اُردو میں صدیوں ایک خاص قسم کے ادب کی ترقی ہوتی رہی۔ سیاسی ادب نام کو بھی نہ تھا۔ آزاد نے تو تاریخ کا لہجہ بھی افسانوی کر دیا۔ آخر دوسری زبانوں نے اُردو ادب پر اپنا پرتو ڈالا۔ یہاں کی سیاسی جدوجہد نے بھی اُردو ادب کو کافی متاثر کیا۔ چنانچہ اب وقتی ضروریات سے ہم آہنگ سیاسی ادب پیدا ہو رہا ہے اور یہ مستقل افادی حیثیت رکھتا ہے۔ "الہلال" اور "نگار"
۷۸ نے بڑی حد تک عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ پڑھنے والوں کو کچھ عادت سی ہو گئی کہ نظم و افسانہ کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی سیاسی جدوجہد سے بھی واقف ہوں۔ اس باب میں مکتبۂ جامعہ دہلی کی کوششیں بھی کم اہم نہیں۔ مکتبہ نے سیاسیات کی مبادیات و تاریخ کے متعلق اس وقت تک متعدد سیاسی کتابیں شائع کی ہیں حال ہی میں اسی قسم کی کتابوں کا ایک سیٹ چھاپا ہے جو لڑائی کی جغرافیائی و سیاسی حیثیت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ اس سلسلے کی چار کتابوں بحرالکاہل کی سیاست اور بین الاقوامیت، ممالک اسلامیہ کی سیاسیات اور نازیت پیشِ نظر ہیں۔ اس وقت میں صرف "بحرالکاہل کی سیاست" پر اظہار رائے کر سکوں گا۔

بحرالکاہل کی سیاست —— محوریوں اور اتحادیوں کی موجودہ جنگ میں بحرالکاہل (پیسفک) کی ہستی ایک نئے باب کے انجام و آغاز کی کنجی ہے۔ پُرسکون پانی کی یہ وسیع دنیا کرۂ ارض کے کروڑوں انسانوں کے اقتصادی قومی اور ملکی مسئلوں کا مجموعہ ہے۔ اس سمندر کی اہمیت دُنیا کے باقی سمندروں کے مقابلے میں دوسرے درجہ پر ہے۔ بحرالکاہل کی موجوں نے مغرب کی ہوسِ ملک رانی اور سینکڑوں تاجرانہ آرزوؤں کے قافلے کو اپنے سینے سے گنار لیا ہے۔ جاپان کی بیداری کے بعد بحرالکاہل کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جاپان نے مغربی اثر سے آزاد کر کے ایشیا کو خود اپنے اثر میں لینے کا جو خواب دیکھا ہے وہ شرمندۂ تعبیر ہوگا یا نہیں، اس سے بحث نہیں لیکن بحرالکاہل کی موجوں میں اس وقت تک طوفان اٹھتا رہے گا جب تک ایشیائی اقوام کو اقتصادی اور سیاسی آزادی حاصل نہ ہو جائے۔

یہ چھوٹی سی کتاب بحرالکاہل کی سیاسیات پر جامع ترین کتاب ہے جغرافیائی حالات، ساحلی ممالک، بحرالکاہل کے جزیرے، خود جنگی اہمیت اور بحرالکاہل سے بحرِ اوقیانوس کا تقابل اُن تمام جغرافیائی حقیقتوں کو روشن کرتا ہے، جو اس سمندر سے تعلق رکھتی ہیں۔

بحرالکاہل کی سیاسی اہمیت کا رشتہ دنیا کے مستقبل سے نہایت گہرا ہے، دنیا کی تمام تر تجارت کا رُخ بھی بحرالکاہل ہی کی طرف ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ بحرالکاہل دنیا کی تجارت کا مرکز ہوگا۔ اس چھوٹی سی کتاب میں ان تمام سیاسی و اقتصادی حالات سے بحث کی گئی ہے جو بحرالکاہل کی اقتصادی اہمیت کو بڑھاتے ہیں جس قدر موجودہ سیاسی کشمکش ہے اس کے پس منظر میں بھی بڑھتی ہوئی اقتصادیات کارفرما ہیں جو بحرالکاہل کے ذریعہ ہونے والی تجارت کو دنیا میں ممتاز کر رہی ہیں۔

"چین اور دورِ حاضر" کے عنوان سے ۱۸۹۶ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک کے وہ تمام سیاسی انقلابات اور سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے جس کی آماجگاہ چین کی سرزمین اب تک بنی رہی۔ اِن انقلابات کے پیچھے جاپان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یورپی طاقتوں کے سیاسی و تجارتی مفادات کام کر رہے تھے۔ ٹیلپنگ کی بغاوت، باکسر کی جنگ، چین اور جنگ عظیم، چین کا دوسرا انقلاب، چین اور بیرونی ممالک اور اس کے بعد موجودہ دور تک کی تمام سیاسی جدوجہد آئینہ بن کر سامنے آجاتی ہے۔ چین اور جاپان کی سیاسیات کا ہر پہلو بھی اس کے اوراق میں روشن ہو جاتا ہے۔ جاپان مشرق میں اپنی طاقت کے قیام و استیلا کے لئے مغرب سے ٹکرا رہا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ "ایشیا، ایشیا والوں کے لیے ہے" بظاہر یہ نعرہ ایک طرح مشرقی تحریک کا اجتماعی نشان معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح مغربی طاقتیں اور امریکہ طلبِ منفعت کے جذبہ سے مغلوب رہا جاپان بھی ایشیا کی شکارگاہ پر بلا شرکتِ غیرے اپنا قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جاپان کا مفاد بحرالکاہل اور اس کے ممالک سے وابستہ ہے اس سمندر کی لہروں پر وہ اتنے ہی ہاتھ پیر مارنا چاہتا ہے جتنے دوسرے پیراک اس وقت اپنی غواصی کے کارنامے دکھلا رہے ہیں۔

لیلن مغربی امپیریلزم اور جاپانی امپیریلزم میں مفاد اور نظام کے لحاظ
سے کوئی فرق نہیں۔ اس کتاب میں نہایت وضاحت کے ساتھ ان مسائل
ور حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

برطانیہ اور بحرالکاہل کی سیاست ایک مکمل باب ہے جس میں برطانوی
مفاد کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی سیاسیات کے متعلق لکھا گیا ہے
سی طرح ایک باب ریاست ہائے متحدہ اور بحرالکاہل کے عنوان سے ہے
جس میں امریکہ کے مفاد، اصول غیر جانب داری .... جزائر فلپائن
ور جزائر ہوائی کے متعلق واضح معلومات درج ہیں۔ تیسرا باب روس اور بحر
لکاہل کی سیاست کے متعلق ہے۔ ان مخصوص ابواب کے بعد یہ ابواب ہیں:-

(۱) بحرالکاہل میں ہالینڈ کے مقبوضات اور اس کی سیاسی پالیسی۔
(۲) جاپان اور برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ۔
(۳) بحرالکاہل کے ممالک میں نقل وطن اور نسلی امتیاز۔
(۴) بحرالکاہل میں ہوائی راستے۔

ان ابواب میں بحرالکاہل کے متعلق سیاسی معلومات کا اک سمندر
بند ہے۔ آخر میں چند نقشے ہیں جو اپنی مباحث کے متعلق ہیں اور مسائل
سمجھنے میں بڑی امداد کرتے ہیں۔

میرے خیال میں جاپان، امریکہ اور برطانیہ کی جنگ کا پس منظر
سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

(باقی)

ساغر

مجبورِ معذرت

موجودہ خلفشار میں زندگی کے اہم ترین معمولات الٹ پلٹ ہو رہے ہیں۔ ایشیا کی اشاعت کا فریضہ تو عام حالات میں، جمود اور پریشانی سے آزاد نہیں رہ سکا۔ آجکل کاغذ کی گرانی و کمیابی اور دوسری پریشانیوں کا حملہ اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ ۶ ماہ کے لئے حکومت کی طرف سے کاغذ کی سپلائی کا انتظام ہوا تھا وہ میعاد ختم ہوئی۔ اب نئے انتظامات پیش نظر ہیں کچھ اس لئے کچھ دوسری وجوہ سے اس نمبر میں تاخیر واقع ہوئی۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے

منیجر

مفرّح یاقوتی محمّد شاہی

جواہرات گرانمایہ، ورق طلا و نقرہ، مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ طب کیمیاوی کا اعجاز نما کرشمہ بوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی بے ضرر شہنشاہی مفرح

خادم خلق اللہ

محمد عبد المغنی انصاری مع برادران نبیرہ لقمان الملک علامہ حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی منیجر انصاری دواخانہ زیر نگرانی حکیم محمد عبد الغنی انصاری خسرو شاہ نظامی

(واقع شاہ گنج حیدرآباد دکن)

یاقوتی محمّد شاہی

معروف و مشہور مغل شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمال کی دوا جس کا نسخہ قطعی راز میں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل ہمارے خاندان عالیہ انصاریہ میں (جو عہد سلطنت مغلیہ میں علاوہ منصب طبابت شہنشاہی کے عہدۂ جلیلہ ملکی ہفت ہزاری تک پر متقرر رہ چکا ہے) چلا آرہا ہے یہ نسخہ صرف والیان ملک و سادات و امراء کیلئے مخصوص طور سے بنایا جاتا رہا۔ اگر اس کو ہر اعتبار سے علاوہ قطعی بے ضرر ہونے کے سراج و شہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار مشاہدات کی بے لاگ کسوٹی پر ہرگز بیجا نہ ہوگا۔ یوں تو یاقوتی اور مفرحات سے طب یونانی کی قرابادینیں پٹی پڑی ہیں اور بعض تجارتی دواخانے مفرحات میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کرکے بدنام کنندۂ نکونامے چند کے مصداق ہو رہے ہیں مگر یہ شہنشاہ پسند مفرح یاقوتی جس کو ایک جماعت اطبا و حکماء و فضلاء عصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا۔ اسکے اجزاء ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گرانمایہ کا مجموعہ ہیں اس کو مجدد طب علامہ لقمان الملک حکیم نابینا صاحب نے اپنے جدید طب کیمیاوی کے طریقہ سے اب اس درجہ مکمل فرمادیا ہے کہ یہ مفرح بغایت معتدل ہوگئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں کرتی ورق طلا و نقرہ۔ مروارید ناسفتہ لعل بدخشانی۔ یاقوت رومانی و یاقوت اصفر و کہرباء زمرد تابناک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول اور بیحد الطف بنا کر اس میں شامل کیا جاتا ہے اسی وجہ سے قلب و دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو حد درجہ تقویت پہنچاتی ہے اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو ہمہ صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے تھے کہ تقویت باہ بھی ہو۔ جسم و روح اور اعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اس درجہ تفریح اور ایسی ہیجان فرحت کمال کا حال پیدا کرتی ہے کہ باید و شاید۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے عجیب و غریب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب و غریب صفت ہے کہ یہ مثل جوہر الجواہر یا جواہر مہرہ کے پرانی سے پرانی عادت منشیات کو ترک کرا دیتی ہے۔ اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شرابی شوقین نے شراب ترک کر دی افیونیوں نے افیون کو ترک کر دیا اور دوسرے منشیات کے استعمال کرنیوالوں نے اس یاقوتی کو حرز جاں بنالیا۔ یہ مفرح یاقوتی جسم کی تمام ارواح کو کمال درجہ تقویت بخشتی نشاط پیدا کرتی عمدہ اغذیہ کو جزو بدن بناتی ہے وہ لوگ جو گرم مقویات کھا کر پریشان ہو چکے ہیں اور جنکو سرد دوا موافق آتی ہو مگر ان کے لئے یہ مفرح یاقوتی واقعی آب حیات سے کم نہیں ہے۔ بلا کسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کیلئے بہترین مقوی ہے بہرحال یاقوتی ہر اعتبار سے ہمہ صفت موصوف ہے مگر صرف ایک صفت اس میں نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ صد درجہ بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اور روح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی ایک شاہی دوا ہے جو حضرات نمونۃً بھی اسکی چند خوراکیں نوش جاں فرما لیتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے اسکے والہ و شیفتہ ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گویا روح ادویہ ہے اس لئے اسکی مقدار خوراک حد درجہ قلیل ہے جو چاہے اس کا تجزیہ یعنی عمل انالائسس کے بعد اچھی طرح جانچ سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مضر ادویہ ہر قسم کی سمیات مکاسات کشتہ جات سے قطعی پاک ہے۔

مقدار خوراک ۲ رتی سے ۸ رتی تک ہے۔ ۸ رتی سے زیادہ شاید ہی کوئی قوی آدمی برداشت کر سکے۔ قیمت فی شیشی جس میں ۶ ماشہ یہ شہنشاہی یاقوتی ہے (۵ء) پانچ روپیہ۔

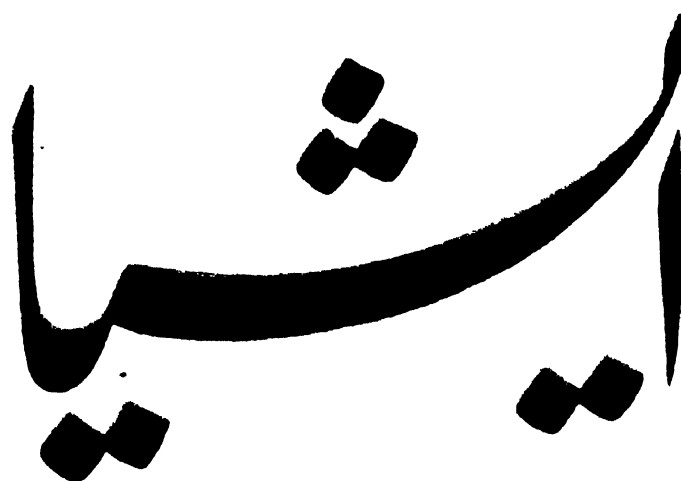
بدرقہ کچا دودھ ۱۰ تولہ۔ گرم پانی ۱۰ تولہ قدرے شیرینی ملاکر۔

المعلن:۔ عبد الغنی انصاری منیجر انصاری دواخانہ نبیرۂ علامہ لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی



Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT.


ایشیا

ثروت آرا بیگم

محترمہ حمیدہ سلطان کا شاہکار

حمیدہ سلطان صاحبہ نے جو ہندوستان کی ادیب خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں ۔ ادبی حلقوں کے پیہم اصرار اور تقاضوں سے متاثر ہو کر اپنی قدیم تصنیف "ثروت آرا بیگم" شائع فرمادی ہے۔ یہ اخلاقی و ادبی لحاظ سے ایک خاص مرتبہ کا ناول ہے جس میں زندگی اور سماج کی کامل و صحیح تصویر کھینچی گئی ہے۔ "ثروت آرا بیگم" میں قیاس سے بعید تصوریت اور گذری ہوئی شعریت کی جھلک نہیں ناول میں مقررہ ماحول اور کردار کی مطابقت سے واقعیت نگاری کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اور وہ واقعیت نگاری ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔

"ثروت آرا" کی زبان اُسے نمایاں طور پر دوسرے ناولوں سے اک امتیاز بخشتی ہے۔ اس کا ہر صفحہ منہ سے بول رہا ہے کہ ایک دہلوی خاتون کی تصنیف ہے۔ زبان کی بے ساختگی اور لطافت نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ یہ بڑی تسکین دہ بات ہے کہ اندازِ بیان اور اسلوب میں روایتی رومان نگاری اور افسانویت نہیں پائی جاتی۔ لفظی ترکیبیں اور لہجے کی بے ساختگی، سادگی، وقار اور مکالمہ میں زبان کا معیاری لوچ یہ تمام عناصر ایسے گھُلے ملے ہوئے ہیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد کوئی اسے ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی نہیں "ثروت آرا بیگم" اپنے انداز کا خاص کلچر، تہذیب اور تمدن رکھتی ہے۔ اُس کو پڑھکر دلی کی مٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے دسیوں محاورے جو دلی کے مردوں میں نہیں عورتوں میں بولے جاتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس ناول کو اپنے برادرِ محترم آنریبل مسٹر فخر الدین علی احمد سابق ریونیو منسٹر (آسام) کے نام معنون کیا ہے شروع میں فخر الدین صاحب کی تصویر بھی شریکِ کتاب ہے۔

منیجر

ملنے کا پتہ :- **مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ**

"رسالۂ ادیب"۔ دہلی

(۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

حکومت صوبۂ بہار اور حکومت صوبۂ سی۔ پی (برار)

زیر سرپرستی

ڈاکٹر سیّد محمود

اسسٹنٹ اڈیٹر
تقی محمد

ناشر
مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

اڈیٹر
ساغر

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۵ آنے

(جملہ حقوق محفوظ)
(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۰ فیصدی کمیشن

فہرست مضامین ایشیا اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

ایشیا

نمبر ۳	اپریل سنہ ۱۹۴۲ء	جلد ۷

دنیا کا حال اور مستقبل

ازل سے لیکر آج تک دنیا اتنے مہیب زلزلہ سے دوچار نہیں ہوئی جتنے خوفناک زلزلہ سے بیسویں صدی (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء) میں دوچار ہوئی ہے۔ شہنشاہیت، نازی ازم، فیسزم اور اشتراکیت، چار سیاسی اصولوں کے دیوانے آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے ہیں، اس ہولی میں انسانی تہذیب و تمدن ایندھن کی مانند اور انسانی خون پانی کی طرح صرف ہو رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نازی ازم اور فسیزم جنکی گردن پر انسانیت کا خونِ ناحق ہے جن کے ہاتھ انسانیت کے خون میں رنگے ہوئے ہیں، اپنی تازہ دم بربریت کے خون ریز شمشیروں کے سایہ میں دنیا کو دبوچ لینا چاہتے ہیں، درست، مگر شاید یہ شہنشاہیت کے تمام اگلے پچھلے اعمال کا شدید ردِ عمل ہے۔ یہ ردِ عمل بھی کبھی نام نہاد انسانی آزادی کو ختم کر کے ایک ابدی غلامی کا نیا دور دنیا میں لانا چاہتا ہے، دنیا کے وسیع دائرۂ ترقی و آزادی کو سمیٹنا چاہتا ہے، اور سمیٹ کر ایک محدود مرکز میں بند کر دینا چاہتا ہے یعنی انسان اور دنیا کی تمام تر تخلیقی قوتوں کو فنا کر کے رکھ دینا اسکا اولین ارادہ معلوم ہوتا ہے۔

"برطانوی امپیریلزم" اور مہاجن امریکہ جمہوریت اور آزادی کا دعویدار ہے! دعویدار ہی نہیں، موت اور زندگی کی لرزتی ہوئی چٹان پر کھڑا ہوا ہے۔ اُس نے آزادی اور انسانیت کے دشمنوں کے خلاف اپنی تمام تر طاقتوں کی بازی لگا دی ہے، لباط پر اس کی یہ کھُلی ہوئی پوزیشن ہے کہ یا حریفوں کو موت کے گھاٹ اتار دیگا یا دُنیا سے خود مٹ جائیگا۔

۳

"اشتراکیت" جو نسلِ انسانی کی آخری حمایت بن کر نمودار ہوئی تھی ایک ایسے دشمن سے شدید مقابلے کیلئے مجبور ہو گئی ہے جو اس کے تعقل اور جذبہ کے مقابلے میں جاہل اور بہیم ہے پھر بھی روس جس کی مدافعت کی بنیاد مقابلہ کے انتہائی پُرجوش اور مخلص جذبات ہیں اپنی استقامت میں ماضی کی ساری تاریخ کو خجل کر رہا ہے:

اسوقت تک اس نے جرمنی کو روک کر تاریخی استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ روس کی ہار اور جیت پر اتحادیوں کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔ دنیا کی کامل تباہی اور کامل آبادی کا انحصار ہے۔

اب یہ زلزلہ بحرِ ہند کے پانی کو اچھال رہا ہے۔ ہندوستانی بندرگاہوں کو لرزا دینا چاہتا ہے، ایسے نازک موقع پر ہندوستان کو خاموش نہیں رہنا چاہیئے۔ حکومت اور ہندوستان دونوں بڑھے اور اس حل کو تلاش کرنا چاہا جو عزت اور آزادی کا حل ہو سکتا ہے مگر یہ کم قیامت نہیں کہ برطانیہ اور ہندوستان میں کھلے دل کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہو سکا۔ ایسا معاہدہ جو زندگی کو بے قیمت بنا دیتا۔ ہم کروڑ انسانوں کی روحوں میں ایثار و قربانی

کی آگ بھڑکا دیتا۔

ہندوستان کے قوم پرست حلقے بیک وقت نازیت فسیزم اور سامراجیت تینوں کے خلاف ہیں، ہر پارٹی کی سوشلسٹ، محوریوں کے خلاف ہیں۔ روس جنگ کی آگ میں پھنسا ہوا ہے، ان کے نزدیک ایمانداری سے دنیا کا حال و مستقبل خطرہ میں ہے؛ ہر کمیونسٹ اور سوشلسٹ اتحادیوں کو غیر مشروط تعاون و امداد کی پیشکش کرنا چاہتا ہے؛ وہ لوگ جس فریق کی فتح چاہتے ہیں وہ فریق وہی ہیں جنمیں برطانیہ شریک ہے۔

مگر سب جانتے ہیں کہ باوجود اس اعتقاد کے یہ لوگ جھجک رہے ہیں اصلی وجہ یہ ہے کہ بہرحال یہ کسی پارٹی اور عقیدہ کو مانتے ہوں مگر سیاسی طور پر یہ کانگریس کی رہبری اور ہدایت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر وہ محوریوں کے ساتھی ہیں

اور کانگریس ہی نہیں، برطانیہ کے جمہوری نظام کے مقابلے میں شاید ایک ہندوستانی بھی محوریوں کے نظام ریاست اور جاپانی شہنشاہیت کے طریق کو پسند نہیں کرتا؛ ہر علمی انسان جانتا ہے، دنیا اشتراکیت کے درجہ تک ترقی کر چکی ہے، ہر دماغی انسان چاہتا ہے سرمایہ داروں اور امیروں کے دوش بدوش نظام ریاست میں مزدور اور کسان کے لئے بھی جگہ ہو، سماج، اور زندگی ۴
کی ہر راحت برابر برابر ہر انسان کی قسمت ہو تقریر و تحریر کی آزادی عام کی جائے شہری زندگی کے حقوق اور اس کی مسرتیں ہر فرد کا اجتماعی و سماجی حق ہوں یہ ہیں آج کے انسان کے ابھرتے ہوئے تصورات، اور ارتقائی احساسات ان کی موجودگی میں، دل و دماغ میں ان احساسات کے ہوتے ہوئے کوئی کیونکر گوارا کر سکتا ہے؛ دنیا میں اس تمام سیاسی اور سماجی ترقی کا جنازہ نکال دیا جائے۔

ہمارے ملک کی گود از شانہ کہ قاتل نازی ازم اور فسیزم ہی لُٹے اٹھائیں!؟

یہ ہے آج کے تصورات کی سچی تصویر مگر دماغ میں کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں ہر دل استفسار کرتا ہے، ہر روح میں سوال و جواب کی کشمکش ہو رہی ہے یہ غلط اور غیر نفسیاتی نہیں، اس کی گہری بنیادیں ہیں، سوال یہ ہے کہ وہ طاقتیں جو جمہوریت اور انسانی آزادی کیلئے بزعم خود ایک مقدس جنگ لڑ رہی ہیں، ان کے نزدیک ۴۰ کروڑ افراد کی آزادی کی کیا قیمت ہے!؟

نازی غلامی کی چکی میں پسنے سے ہندوستان بچ جائے، برطانیہ کا مقصد نہایت مقدس ہے، اس مقصد میں انسانیت کا اعلیٰ ترین جذبہ جھلک رہا ہے، پیغمبروں نے بھی اس اخلاقی فریضہ کو شاید اس تکمیل کے ساتھ ادا کرنے میں کامیابی حاصل نہ کی ہو، جو چرچل اور روزویلٹ دل سے اس فریضہ کو ادا کر رہے ہیں!؟

جمہوریت اور آزادی کے ان پیغامبروں کو ہندوستان کی اصلی حیثیت بتانا ان کے مکاشفاتی دل و دماغ کی توہین کرنا ہے۔ میرا خیال ہے امریکہ ہو یا برطانیہ، دونوں جانتے ہیں، ہندوستان کے دل میں کسی حملہ آور کی محبت نہیں ہے، ملک کے قوم پرست حلقے سینکڑوں مرتبہ محوری طاقتوں کے بارے میں اپنا دل چیر کر رکھ چکے ہیں، وطن سے محبت کرنیوالا قوم پرست ہندوستان کی آزادی اور برابر کی سیاسی پوزیشن چاہتا ہے نہ کہ غلامی!؟ کوئی غلامی کیلئے جان نہیں دیا کرتا، آزادی کا جذبہ ہی سرفروشی کا جذبہ پیدا کرتا اور گھر میں آگ لگا دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

افسوس یہ جذبہ ہندوستانیوں میں پیدا کرنیکی کوشش اس وقت تک نہیں کی گئی!؟

ہاں ایک موقع حکومت نے پیدا کیا، اسوقت کچھ لوگوں نے شور مچایا تھا کہ یہ قیمتی دونوں جماعتوں یعنی حکومت اور ہندوستانیوں کو ہاتھ سے نہ کھونا چاہیئے، یہ دونوں چاہتے تو دنیا کے حال و مستقبل کو خاک ہونے سے بچا سکتے تھے۔ کچھ دنوں ہندوستان کی فضا کرپس کے تبسم کی پرامید روشنی میں اک نئے مستقبل کا انتظار کرتی رہی، یکایک یہ انتظار ختم ہو گیا، روشنی خوفناک اور بے چین تاریکی میں تبدیل ہو گئی، سارا طلسم دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ گیا؛

ملک کے ہر سیاسی حلقے نے برٹش وار کیبنٹ کی پیشکش پر بے اطمینانی کا اظہار کیا، کانگریس کسی نہ کسی طرح ان تجویزوں کو قبول کر کے حکومت سے تعاون کرنا چاہتی تھی، تاکہ ملک کی اندرونی ترقی و محافظت کے فرض میں حصہ لے سکے؛ مگر ڈیفنس کے مسئلہ پر اختلاف ہوا، اور سمجھوتہ کی تمام عمارت دھڑام سے زمین پر آگری؛

کرپس کا وہی پرامید تبسم جو ان کے چشم و ابرو کو عارض جمال بخش رہا تھا۔ کبیدگی اور چڑچڑے پن میں تبدیل ہو گیا؛ لندن پہونچکر برٹش پارلیمنٹ میں ان کے تیور بدل گئے —!

بہرحال دنیا کی دو بڑی قوموں کے اس نیک اقدام کی ناکامی وقت کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔ یہی اقدام مشرق و مغرب کے اک نئے ربط

تعلق کی بنیاد ڈال سکتا تھا، مگر اس خواب کو تو شرمندۂ تعبیر ہونا تھا نہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، آنکھ کھلی تو ناراضگی اور اختلافات کی سینکڑوں کھاڑیاں ایک دوسرے کے درمیان حائل تھیں۔!؟

اب ایسی حالت میں کہ محوریوں کے نئے حملے اپنے پر تول رہے ہیں، اس مجہول فضا کو باقی رکھنا تدبر اور دانشمندی کے قطعی خلاف ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ برطانیہ جمہوریت اور قوموں کی آزادی کے برقرار رکھنے کی مدعی ہے۔ خود اپنی تمام روایات کو بچانا چاہتی ہے۔ اور مشرق کو اس کی تمام روایات کے ساتھ باقی رکھ کر اپنے مفاد کی حفاظت اس کا اولین مقصد ہے، اگر قول و فعل میں تضاد نہیں ہے تو اس مجہول فضا کو ختم کرنا بھی اسی کا فرض ہے۔

قوموں کی نمائندہ جماعتیں، قوموں کی جاکر ہیں، اسی طرح حکومتیں بھی انسانوں کے مفاد کی محض نمائندہ ہیں، ان دونوں کے مابین جو مشترک شے ہے وہ ایک جذبۂ تعمیر اور محض ایک اجتماعی یا فریضۂ خدمت ہے، کسی فریق کا یہ کہنا کہ اب پہل ہماری طرف سے نہیں ہوگی، اس جذبہ اور فریضے سے روگردانی کرنا ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں جو تصویر کے باریک ترین خد و خال پر گہری نظر رکھتے ہیں، آج بھی یہ ضرورت باقی ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان میں از سر نو جلد ہی سمجھوتہ کی گفتگو شروع ہو، اور گفتگو کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچا جائے، تاکہ ہندوستان کا بچاؤ ہر شخص کا قومی فرض ہو جائے۔

دنیا سے حال پکار کر یہ کہہ رہا ہے مجھے آگ سے بچاؤ، مستقبل حال سے اپنی حفاظت کی بھیک مانگ رہا ہے۔ زمین و آسمان ان مطالبوں سے گونجے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، دنیا کو ان نظاموں کے پھیلاؤ سے بچایا جائے جو انسانیت کیلئے رجعت، تباہی، غلامی اور طبقاتی وباؤ کا منحوس پیغام ہیں؛ مگر یہ تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب ہندوستان اور حکومت دونوں جذبات کے جال سے نکل کر کھلی فضا میں آکر یہ جان لیں کہ دنیا کا حال و مستقبل بنانا ان کے سچے جان فروشانہ ارادوں کے ہاتھ میں ہے۔

چند دن کی تاخیر

اپریل نمبر چند دن کی تاخیر سے آپ کے پاس آرہا ہے، خیر یہی کیا کم ہے کہ آرہا ہے، دنیا اور اس کے چلنے کے ذرائع کمزور اور محدود تر ہوتے چلے جارہے ہیں۔ کاغذ کا گو انتظام ہے، مگر یہ انتظام ہر وقت بے انتظامی کی گرفت میں ہے، اس مہینے میں بھی کچھ ایسی پریشانی ہوئی۔ بہرحال مئی نمبر جلد ہی آپ کو ملیگا۔ یہ مسرت میرے لئے کم نہیں، کہ نگار نامہ کے بعد ایشیا نے اپنے مقصود معیار کو حاصل کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اپریل نمبر بھی اپنے مضامین کے لحاظ سے اہم ترین مجموعہ ہے۔ مئی کی نظم و نثر اور تنقیدی مضامین کا معیار تمام گذشتہ مہینوں سے افضل ثابت ہوگا۔ چند عجیب چیزیں آپ کو اس نمبر میں ملیں گی۔ گو تہی دامن نہیں مگر اہل قلم دوستوں کی موت جیسی خاموشی، خوئے گدائی کو جگاتی ہے۔ ایسے دوستوں کو خود انکا ہی واسطہ کچھ تو لکھیں۔

حیدر آباد کا سفر

میں نے اپنے حیدر آبادی دوستوں سے مارچ ہی میں حیدر آباد حاضر ہونے کا وعدہ کیا تھا، مگر تمام اپریل کچھ اس قسم کی مصروفیتیں رہیں کہ اس وعدہ کو پورا نہ کرسکا اب یہ طے ہے کہ اپریل ۱۹۴۲ء کی اشاعت کے بعد ۱۵ مئی سے پہلے ہی حیدر آباد چلا جاؤں گا۔ اور مئی کے آخر تک وہیں مقیم رہوں گا۔ گذرے ہوئے چار مہینوں میں ہمت سے زیادہ کام کرتا رہا ہوں، اس مصروفیت کا صحت پر گہرا اثر پڑا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مرکز سے کچھ دور رہ کر چند دن کہولت اور خاموشی سے گذاروں؛ بشرطیکہ گزار سکوں، حیدر آباد میں میرا پتہ یہ ہوگا۔ تمام ضروری خطوط و تار اسی پتہ سے ارسال کئے جائیں تو بہتر ہے۔ میرٹھ بھیجنے کی صورت میں جواب میں تاخیر ہو جانیکا اندیشہ ہے؛

ساغر نظامی

بمعرفت کرنل نظیر الاسلام۔ اسلام ہاؤس حیدر آباد دکن
ٹیلیفون نمبر ۳۵۴۳

حکیم آزاد انصاری (مرحوم) کا آخری خط

از راممتا پور روڈ، ڈاکخانہ عنبر پیٹھ حیدرآباد دکن
۱۶ اگست ۱۹۴۱ء

مشفقی و محبی ساغر

مرسلہ روح مکاتیب وصول ہوئی۔ شکر گذار ہوں، معاف فرمائیے بھولا چوکی ہوئی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، کیونکہ دو یا پونے دو برس ہوئے کہ میں اس ناروا حرکت سے بذریعہ احکام امتناعی روک دیا گیا تھا۔ اور مجھ کو کچھ علم نہیں کہ یہ احکام ہنوز نافذ ہیں یا انھیں منسوخ کر دیا گیا ہے، اگر انھیں منسوخ کر دیا گیا ہے تو کچھ تشویش کی بات نہیں، ورنہ سخت بازپرس کا خوف ہے۔

لہذا شکر گذاری کا واپس لے لیا جانا ضروری ہے۔ تاکہ یہ واپسی (ندر ہے) اور عندالحاجت کام آوے۔

(اس خط کا وہ حصہ جو "روح مکاتیب" (مجموعہ خطوط مطبوعہ جولائی ۱۹۴۱ء) کے متعلق نگار نامہ مطبوعہ جنوری ۱۹۴۲ء میں شائع ہو چکا ہے اس لئے وہ حذف کر دیا گیا ہے)

اس سلسلے میں آپ نے اپنی مخصوص توجہات کو ارزانی فرما کر کچھ صحیح اور کچھ بالکل غلط میرے حال زار پر بھی کرم فرمایا ہے، خیر اپنی نسبت تو میں آئندہ سطور میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔ یہاں مجھے دیگر ارباب کمال کے نوٹوں اور حاشیوں کی نسبت کچھ التماس کرنا ہے۔ آپ کے یہ سب نوٹ اور حاشئے غیر معمولی طور سے بلیغ، دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ جن سے آپ کی غیر معمولی ادبی قابلیت کا ناقابل انکار ثبوت بھی بہم پہونچتا ہے، ان سب نوٹوں سے میں نے کافی فائدہ اور کافی لطف اٹھایا ہے، مگر مندرجہ ذیل دو عدد عجیب و غریب نوٹوں یا حاشیوں نے جو کیف بے پایاں مجھے بخشا ہے اس کا مزا نہیں بھولتا، نہیں بھولتا، اور بھولنا تو بڑی چیز ہے یہ مزا ہنوز کم پذیر ہوتا بھی نظر نہیں آتا، اور شاید ایک مدت تک کم پذیر نہ ہو سکے۔ ان نوٹوں اور حاشیوں کے چند ضروری اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

پہلے دو اقتباسات

(۱) "جوش خلقی طور پر اک مخلص افغان ہے، مگر افغان کا اخلاص بھی اس کی نسلی کیفیات کی طرح خوفناک ہوتا ہے۔"

(۲) جوش کا قدرتی اخلاص افراد سے توقعات قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے، مگر وہ خود کبھی اس حقیقت پر دھیان نہیں دیتا کہ سوسائٹی اور دوسرے بدبخت بھی جوش سے کچھ توقعات رکھتے ہیں۔ دوسروں کی توقعات" پوری ہوں تو محض ایک سرشار قہقہہ! اور اپنی ایک توقع بھی مجروح ہو جائے تو لگا تار دشنام، مگر یہ دشنام طرازیاں بھی بڑی قیمت رکھتی ہیں:

دوسرے دو اقتباسات

(۳) ہمارے دوست پوشیدہ کافر ہیں اور بظاہر ولی، اور سچ پوچھئے تو بظاہر بھی ولی نہیں، طویل القامت، موجودہ تمدن کی ممکن لذتوں سے بہرہ ور، بہرہ ور نہیں تو آرزومند، مگر عادتاً جب نظر آئیں گے وعظ فرماتے نظر آئیں گے، ایک طرف سخت قسم کی رومانی شاعری کے ناشر، لب پر ذکر شراب، دل میں تصور حور، مگر قلم جب متحرک ہوگا اسلامیات ضرور لکھیں گے۔ تاکہ کفار کے مقابلہ میں مومنین کی صف میں بٹھائے جائیں۔

(۴) اللہ اللہ، لوگوں کو کیا کیا شوق ہیں۔ انسان کبھی اپنی منفرد ہستی کی طرف نظر نہیں کرتا اور شاعر ہو کر کفر و اسلام کے لیبل اپنے لئے پسند کرتا ہے، کاش وہ حبیب الرحمن صدیقی کے ان الفاظ پر غور کریں کہ "ادب، دین، دھرم، وطن اور سیاست سب سے بلند ہے"۔ خیر ماہر اچھے شاعر، اچھے دوست، اچھے انسان اور اچھے .... ہیں اور قیام حیدرآباد اس نیکی

الشیا اپریل ۱۹۴۲ء

کا مظاہرہ ہے۔

(از روح مکاتیب)

ساغر! مرحبا! آپ نے اپنے تخیل کے موقلم سے ان ہر دو باکمال اصحاب کی بعض مخصوص ذہنیتوں اور افتاد ہائے طبائع کی چند جچے تلے الفاظ میں ایسی صحیح تصویر کشی کی ہے کہ اس سے زیادہ صحیح ممکن نہ تھی۔ میری رائے ہے کہ اگر فوٹوگراف کے کیمرے کی طرح کوئی سیرت نگاری کا آلہ موجود بھی ہوتا تو وہ بھی ان صحیح تصویروں پر شاید کوئی قابل لحاظ اضافہ نہ کر سکتا۔

اب مجھے اپنے متعلقہ نوٹ اور حاشئے کی نسبت کچھ عرض کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں آپنے دوسرے ارباب کمال کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔ وہاں میرا حلیۂ مبارک اپنی قدیم عادت کے مطابق بالکل غلط اور بالکل لگاٹ کے دکھایا ہے۔ یہ مجھ پر ظلم نہیں تو کیا ہے کہ آپنے مجھے اسّی بیاسّی سال کا بڈھا لکھ مارا، حالانکہ میں ابھی صرف کچھ دن کم بہتّر سال کا بچّہ ہوں، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بفضلہ تعالیٰ ۷۲ سالہ بہتّرا نوجوان ہوں، مگر آپ ہیں کہ آپ نے مجھے بڈھا ثابت کرنے کیلئے میری عمر میں دس بارہ سال اضافہ کر دیا۔ آخر یہ کیا اندھیر ہے۔ بار بار میری اس قدر توہین کیوں کی جاتی ہے۔ آپ کبھی مجھے بزرگ دیرینہ لکھ مارتے ہیں اور کبھی اسّی بیاسی برس کا بڈھا۔ اگر صحیح تصویر کشی اور صحیح کردار نگاری یہی ہے تو ہزار لعنت اس تصویر کشی اور کردار نگاری پر۔

آپنے بحث غزل کے متعلق جو حاشیہ دیا ہے اس کا اکثر حصّہ بالکل غلط ہے اور مجھ پر ایک اتّہام ناروا، اس حاشئے کے فرضی اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) رسالۂ کلیم دہلی میں نقّاد کے نام سے ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا، آزاد صاحب نے جوش صاحب سے ہر چند دریافت کیا، کہ مضمون نگار کا نام بتا دیجے، مگر کئی دن تک جوش نے نہ بتایا اور جب اصرار حد سے زیادہ گذر گیا تو میرا نام لے دیا۔"

(۲) میں جیسے ہی دہلی پہونچا آزاد صاحب میرے سر ہو گئے (وہ غزل و نظم کے معاملہ میں جگر مراد آبادی سے بھی زیادہ انتہا پسند واقع ہوئے ہیں) سچ مچ برہم تھے، میں نے انکار نہیں کیا، اقرار سے وہ اور بھی برہم ہو گئے۔

(۳) غزل کے استرداد میں جو مضمون کلیم میں شائع ہوا تھا وہ اتنا مسکت و مدلل تھا کہ آپ کو نہ صرف خاموش کر گیا بلکہ بیمار بھی ڈال گیا، اگر آپ اعتراف شکست کر لیں تو ہم آپ کو بتا سکتے ہیں کہ آپ کا قاتل آپکے دوستوں ہی میں سے ایک ہے۔ اور آپکی نگاہوں کے سامنے ہنستا بولتا اور آزاد چلتا پھرتا ہے۔"

(از روح مکاتیب)

پہلے اقتباس میں صرف اس قدر صحیح ہے کہ رسالۂ کلیم دہلی میں میرے خلاف ایک مضمون نکلا تھا، رہا یہ کہ وہ تنقیدی تھا، بالکل غلط، بیچارے اسرائیل احمد خاں نہ شاعر نہ شاعر کی دم، وہ نہ فن تنقید سے واقف اور نہ فن شعر و ادب کے متعلق علوم ضروریہ سے آگاہ، وہ کیا تنقید کرتے اور تنقید کے لئے مواد کہاں سے لاتے جبکہ وہ اس معاملہ میں سر سے پاؤں تک بالکل بدّھو واقع ہوئے ہیں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مجھے گالیاں خوب دیں اور پیٹ بھر کے دیں اور اس بارہ صفحات کو گالیوں سے سیاہ کر کے اپنی گندی فطرت کا مظاہرہ بہترین طریق پر کیا۔ میری خاموشی اس بارے میں کچھ اس وجہ سے نہ تھی کہ میں اُن کے مضمون کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں گالیوں کا جواب گالیوں سے نہیں دینا چاہتا تھا۔

بجز منقولہ بالا فقرے کے اقتباس اوّل کے باقی فقرات سب غلط ہیں، نہ کبھی میں نے جوش صاحب سے مضمون نگار کا نام دریافت کیا۔ نہ میرا اصرار اس بارے میں حد سے زیادہ بڑھا اور نہ کبھی انھوں نے اس بات میں آپ کا نام لیا، کیونکہ میں اس سے واقف تھا کہ یہ مغلّظات آگیں مضمون جوش صاحب کی سازش سے لکھا گیا ہے اور انھوں نے اپنے ایک "سرشار قہقہے" کی تمنّا پوری کرنے کیلئے اسکو اپنے رسالہ میں شائع فرمایا ہے۔ البتہ اوّل اوّل مجھکو کچھ عرصے تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مضمون نگار کون صاحب ہیں، اور کیوں کر معلوم ہو سکا اس کا اظہار آئندہ سطور میں کروں گا۔

دوسرے اقتباس کا ایک فقرہ، ایک لفظ کیا ایک حرف بھی صحیح نہیں، نہ کبھی میں آپکے دہلی آنے پر آپکے سر ہوا۔ نہ میں سچ مچ برہم تھا، نہ جھوٹ موٹ، نہ اس بارے میں میں نے آپ سے کچھ دریافت کیا، نہ آپنے اقرار کیا نہ انکار اور نہ میں آپکے اقرار پر آپ سے اور زیادہ برہم ہوا، معلوم نہیں کہ اپنی اس بہترین تالیف میں آپ کو ان غلط واقعات کے اندراج کی کیوں ضرورت پیش آئی، کیا صحیح واقعات کے اندراج سے اس نادر تالیف کی وقعت میں کوئی کمی پیدا ہو جانے کا اندیشہ

ایشیا اپریل ۱۹۳۲ء

تھا، یا ممکن ہے آپنے اس قسم کا کوئی خواب دیکھا ہو اور اس کو واقعہ باور کر کے اپنی اس نئی تالیف میں درج کرنے پر مجبور ہوئے ہوں، اگر میرا خیال صحیح ہے تو آپ بری الذمہ ہیں۔ مجھے آپسے شکایت کا کوئی حق نہیں، کیونکہ بعض اوقات اس قسم کے خواب مجسّم بن کر انسان کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان غلط اندراجات یا صحیح طور سے یوں کہنا چاہیئے کہ ان افترا پردازیوں سے کسی نامعلوم مصلحت کی بنا پر آپ کا منشا یہ ہو کہ میں آپسے ناراض ہو جاؤں، مگر باور کیجئے میں آپسے کسی حالت بھی ناراض نہیں ہو سکتا، خیال تو فرمایئے کہ آپ جیسی محبوب ترین ہستی سے کون ناراض ہونے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اور ہستی بھی وہ دلفریب ہستی جو صرف چاہے جانے ہی کیلئے پیدا کی گئی ہو۔

آپ کی یہ رائے بھی صحیح نہیں کہ میں نظم و غزل کے معاملے میں جگر سے زیادہ انتہا پسند واقع ہوا ہوں۔ وہ صرف غزل گو شاعر ہیں۔ میں غزل، نظم، قطعہ رباعی، مخمس، مسدس، مربّع اور مثنوی وغیرہ شعر کی ہر صنف لکھتا ہوں، البتہ میں اُن نادانوں کا ہم نوا نہیں جو غزل کو مٹا ڈالنا چاہتے ہیں، میں مروّجہ غزل کے نقائص اور اس کی پستی سے ناواقف نہیں، مگر اس کو ناقابلِ اصلاح نہیں سمجھتا۔ باوجود چند دیوانوں کی مخالفت کے غزل اب بھی ہماری اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مقبولِ عام صنف ہے، میری رائے ہے کہ ایسی مقبولِ عام صنف سے اس کی مناسب اصلاح کر کے کوئی مفید کام لینا چاہیئے، مٹا ڈالنے سے کیا فائدہ

تیسرے اقتباس کا بھی کوئی حصہ صحت کا حامل نہیں، جو مضمون میرے خلاف کلیم میں شائع ہوا تھا وہ نہ مسکت و مدلّل تھا، نہ اس نے مجھے خاموش کیا، نہ بیمار ڈالا، ایک ناواقف شعر اور بیگانۂ فن کا کوئی مضمون جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، مسکت و مدلل ہو ہی کس طرح سکتا تھا، ہاں سب و شتم اور مغلظات آگینی میں وہ سب سے بڑھ چڑھ کر تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جوش صاحب کو اور جوش صاحب کے بعد آپکو چند سرشار قہقہوں کے موقعے بہم پہنچا گیا اور آپ کو خوش کر گیا، اگر ایسے ہی سرتاپا مغلظات مضمون کا نام مسکت و مدلل مضمون ہے تو مجھے آپ کو خوش کرنے کو مان لینا چاہیئے کہ وہ بیحد مسکت و مدلّل تھا۔

اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھ کو یہ کیوں کر معلوم ہو سکا کہ اس گندگی کے اچھالنے والے کون صاحب ہیں، اس بارے میں سب سے پہلے میں آپ کا یا آپکے رسالۂ پیمانہ کا ممنون ہوں جس نے یہ بتایا کہ آپ کا قاتل آپکے دوستوں ہی میں ایک ہے۔ جو آپکے سامنے ہنستا بولتا اور چلتا پھرتا ہے، اس سے مجھے اسرائیل احمد خاں کی ذات پر ایک گونہ شبہ ہوا مگر وہ یقین کے مرتبے تک ابھی نہیں پہنچ سکا تھا کہ کلیم ہی میں کشّاف کے نام سے دو مرے اور مضمون شائع ہوئے ان میں سے پہلا سر اقبال مرحوم کے خلاف تھا اور دوسرا عطاء الرحمٰن صاحب کے خلاف، یہ دونوں مضمون بھی کم و بیش اسی طرح فحش نگاری سے معمور تھے، ان مضامین اور میرے متعلقہ مضمون کا صرف پیرایۂ بیان ہی ایک نہ تھا بلکہ اکثر فقرے اور جملے بھی مشترک تھے۔ ان کے باہم مقابلے سے میر الیقین کی طرف قدم بڑھا اور پھر اس یقین نے یقین کامل کی صورت اس طرح حاصل کی کہ ایک روز رات کو جوش صاحب کی محفل نائے نوش گرم تھی، وہ کافی مخمور تھے، اسی حالت میں رسالۂ کلیم اور اس کی پالیسی کے متعلق کچھ ذکر چھڑ گیا، میں نے اثنائے گفتگو میں جوش صاحب سے پوچھا کہ یہ آپنے کشّاف صاحب اور نقّاد صاحب وغیرہ کو (میرا متعلقہ مضمون نقاد کے نام سے شائع ہوا تھا) اپنے موقر رسالے کلیم میں اسقدر گندگی اچھالنے کی کیوں اجازت دے رکھی ہے۔ کیا مغلظات نگاری بھی آپکے رسالے کی پالیسی میں داخل ہے اور کیا اس سے اس رسالے کا معیار علم دوست اصحاب کی نظروں میں گر نہیں جائیگا، جوش صاحب پوری طرح عالمِ کیف و سرور میں تو تھے ہی، کہہ اٹھے کہ یہ ہمارے اسرائیل احمد خاں ہی تو ہیں جو کبھی نقّاد اور کبھی کشّاف کے نام سے کلیم کیلئے مضامین لکھتے ہیں، جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے، سُن لیا آپنے یہ ہے قصہ اُن مغلظات نگار صاحب کے نام مبارک کا صحت و یقین کیساتھ میرے علم میں آنیکا۔ اب فرمایئے اس واقعے کی نسبت آپکی حاشیہ آرائی کی میری نظر میں کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ اور کیوں نہ میں اسکو اپنی نسبت آپکا اک تمام محض سمجھوں، میں یہ نہیں کہتا کہ آپنے یہ بہتان تراشی کسی بدنیتی سے دانستہ کی ہے، واقعہ زیادہ عرصہ کا ہے اسلئے ممکن ہے کہ غلطی سے آپ کو اسی طرح سے یاد رہا ہو۔ بہرحال کچھ ہو میں آپکو معاف کرتا ہوں۔ چونکہ صحیح واقعات کا آپکے علم میں لانا ضروری تھا اس لئے اس بارۂ خاص میں اسقدر خامہ فرسائی کی ضرورت پیش آئی۔

اب صرف ایک رنگین سی شکایت اور باقی رہ گئی ہے، کیوں نہ لگے ہاتھ اسکو بھی خدمتِ والا میں پیش کر دوں، اور وہ یہ ہے کہ خدا جانے صرف ایک میں بدنصیب آپکے موقر رسالۂ ایشیا سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہوں جبکہ ایک زمانہ اس سے فیضیاب ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ یا تو "ایشیا" کو میرے قابل نہیں سمجھتے یا مجھکو ایشیا کے قابل خیال نہیں کرتے، وجہ کچھ ہو، میں ہر حال بہرحالت اس سے محروم۔

اپنے والد ماجد کی خدمت میں سلام بچوں کو دعا۔ نیاز کیش آزاد انصاری (حیدرآباد دکن)

ایشیا اپریل ۱۹۳۲ء

نئی صبح

قاضی عبدالغفار

سمندروں کی آزادی

قاضی صاحب کی سنہ ۱۹۴۲ء کی یہ تقریر "سمندروں کی آزادی" کی ایک جامع تاریخ ہے۔ بعض جگہ اس میں جرمنی، جاپان اور امریکہ کی گزشتہ سیاسیات کی طرف اشارے ہیں۔ ان اشاروں کو اب گزری ہوئی منزلوں کے جھلسے ہوئے نشانات سمجھئے، حالات کہیں سے کہیں پہنچ گئے مگر اس مضمون کی سیاسی و تاریخی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے اس لئے شائع کیا جاتا ہے۔ ساغر

۹

خشکی اور پانی اور ہوا یہ تین عناصر دُنیا میں جنگ و جدال کے تین تدریجی دور ہیں۔ سکندر۔ ہلاکو اور نادر شاہ کا دور گھوڑوں اور ہاتھیوں کا دور تھا۔ پھر امریکہ کی نئی دُنیا کے انکشاف کے بعد اور خصوصاً آٹھویں صدی کے وسط میں جنگ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور یہ پانی اور سمندر، دلّی بین الاقوامی جنگ و جدل کا دور تھا۔ اسکے بعد ہوا اور تحت البحر قوتوں کی زور آزمائیوں کا دور آیا اور اُس دور کا یہ خونریز نصف النہار ہے جس کی مہلک معراج سے ہم سب گزر رہے ہیں پانی پر قوتوں کے فوجی اقتدارات کو صدمہ پہنچانے والی تحت البحر کشتیاں اور آبدوز تھے جنھوں نے اُنیسویں صدی کے آخر میں پانی کے نیچے ایک خوفناک خطرہ پیدا کردیا اُن کے بعد بیسویں صدی کے شروع میں کھُلی ہوا میں طیّاروں اور ہوائی جہازوں کی تگ و دو کا آغاز ہوا اور صفحۂ ہستی پر لاکھوں میل پھیلا ہوا پانی ان دو طاقتوں کے درمیان ایک شکنجہ میں آگیا یعنی اوپر طیّارے اور نیچے آبدوز۔

—— گویا تباہی اور ہلاکت کی سائنس نے پانی پر تیرنے والوں اور خشکی پر بسنے والوں کیلئے زندگی کو ایک عذاب بنا دیا۔

ہمارا زمانہ انسانی زندگی کے اُس نقطہ پر آگیا ہے جہاں جینا مشکل ہے اور موت آسان ہے۔ آسمان سے بھی موت برستی ہے اور زمین کے پیٹ میں سے بھی اُس کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ گویا علوم اور سائنس کی ترقی کا یہ آخری اور سب سے اونچا نشان ہے۔ صدیوں تک متمدن انسان اپنے سماج کی ضروریات اور اپنے بین الاقوامی تعلقات کو منظم کرنے کی غرض سے بہت سے قانون اور ضابطے بناتا رہا لیکن اب وہ قاعدے اور ضابطے بھی ردّی کاغذ کے پُرزوں کی طرح اُڑتے پھر رہے ہیں ایک زمانہ ضرور ایسا تھا جب ہر مسئلہ اور ہر قضیہ میں قانون اور ضابطہ کا حوالہ دیا جاتا تھا — اُس وقت تک سب سے بڑا قانون بین الاقوامی قانون سمجھا جاتا تھا لیکن قانون اور ضابطہ کے وہ دن گزر گئے اور موجودہ انسانیت کے زمانہ میں اُن گزری ہوئی باتوں کا ذکر کرنا ایسا ہے جیسے خواب کی باتیں بیان کرنا قوانین کی شکست اور سیاست کے اخلاقی معیار کا انہدام "سمندروں کی آزادی" کے مسئلہ کو حل نہیں کرتا بلکہ پہلے سے زیادہ اُلجھا دیتا ہے۔ سکندر اور ہلاکو کے قدیم عہد میں سمندر کرۂ ارض کا ایک تاریک حصہ

تھے جس کی تجارتی یا سیاسی اہمیت اُس زمانہ کی سیاست میں اگر تھی بھی تو کچھ زیادہ نہ تھی۔ بلکہ عام طور پر اقوام اور ممالک کے درمیان سمندری اقتدار کا سوال بہت کم پیدا ہوا کرتا تھا۔

—— اگر ہوتا بھی تھا تو صرف اُن سمندروں کے متعلق جو کسی ملک کے ساحل سے ملحق ہوں۔ جدید اصطلاح میں پانی کی جس وسعت کو (High Seas) کہتے ہیں وہ بالکل آزاد تھی۔ اس آزادی کا سبب زیادہ تر جہازرانی اور تجارت کی کمی تھی لیکن پھر بھی یورپ کی بالادست اقوام "سمندروں کی شاہی" کا دعویٰ کرتی رہتی تھیں البتہ وہ دعویٰ ایسا ہی تھا جیسے آسمان پر حکومت کرنے کا دعویٰ۔ جرمنی کے ابتدائی دور میں جدید سیاست میں سمندروں کے قبضہ کی اہمیت پندرہویں صدی کے آخری چند سالوں سے شروع ہوتی ہے جبکہ ایک طرف واسکوڈی گاما نے جنوبی افریقہ کا چکر لگا کر ہندوستان پہنچنے کا راستہ معلوم کیا اور دوسری طرف کولمبس نے نئی دُنیا کا پتہ پایا اسکے بعد یورپین اقوام کے حوصلے بڑھنے شروع ہوئے اور استعماریت
10
و تجارت کے یورپین قافلے دور دور پہنچنے لگے۔ ان قافلوں میں ہالینڈ کے لوگ آگے اور اُن کے پیچھے اسپینی اور انگریز اور فرانسیسی ہر طرف پھیل گئے۔ اس طرح گویا سمندروں پر انسانی اقتدارات کی داستان کم وبیش سات صدیوں کی داستان ہے۔

سمندری مسافرت کا جس قدر پھیلاؤ بڑھتا گیا اُسی قدر زیادہ خُشکی کی طرح پانی پر بھی قوموں اور حکومتوں نے اپنے اپنے حصے بانٹنے شروع کر دئے۔ اس سمندری مسابقت کے ابتدائی زمانہ میں پرتگال والوں نے بحرِ ہند اور مراقش کے جنوب میں بحرِ اطلانتک کے ایک حصہ کو اپنا مملوکہ اور مقبوضہ قرار دیا۔ پھر اسپین نے دعویٰ کیا کہ تمام بحرِ الکاہل پر اُس کا اقتدار تسلیم کیا جائے۔ سویڈن اور ڈنمارک نے بحرِ اطلانتک تک اپنے اقتدارات محدود رکھے اور اُس وقت تک برطانیہ بھی صرف اُن ہی سمندروں پر مالکانہ دعویٰ کرتا تھا جو اُسکے جزائر کے گرد و پیش واقع تھے۔ لیکن اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں تجارت کا دامن سیاست کے دامن سے بندھ گیا اور مختلف اقوام میں ایک سمندری دوڑ شروع ہو گئی۔ اس مسابقت کے جھگڑوں کو رفع کرنے کیلئے "آزادیٔ سمندر" کا ایک نظریہ سیاست میں داخل کیا گیا۔ اس کی ابتدا تو ملکہ الیزبتھ کے زمانہ سے ہوئی لیکن بین الاقوامی قانون میں اس نظریہ کا استقرار سترہویں صدی سے شروع ہوا۔ اٹھارویں صدی میں خود برطانیہ نے جس کے سمندری اقتدارات بڑھتے جاتے تھے اس نظریہ کی تائید کرنی شروع کی مگر اس تجویز کی مخالفت کرنے والی اقوام بہت عرصہ تک اُس کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔ حتّٰی کہ ۱۸۲۱ء میں انگلستان اور امریکہ سے روس کا جھگڑا ہوا جو نہیں چاہتا تھا کہ الاسکا کے ساحل کے قریب سو میل کے فاصلہ تک کوئی غیر مُلکی جہاز بغیر اُس کی اجازت کے آنے پائے لیکن جب ۱۸۶۵ء میں روس نے الاسکا امریکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تو امریکہ نے اپنی ماہی گیری کو محفوظ کرنے کے لئے یہ دعویٰ کیا کہ الاسکا کے قریب کا کُھلا سمندر اُس کے قبضہ میں رہے۔ اب برطانیہ نے اس دعوے کے خلاف احتجاج کیا۔ آخر کار یہ جھگڑا پیرس کی ایک بین الاقوامی پنچایت کے سامنے پیش ہوا جس نے کُھلے ہوئے سمندروں کی آزادی کے اصول کو تسلیم کر لیا۔

سمندروں کی آزادی کے معاملہ میں ایک اہم سوال موتی نکالنے اور مچھلی پکڑنے کا سوال بھی ہے۔ اسکے متعلق مختلف اقوام میں ہمیشہ جھگڑے ہوتے رہے ہیں اور آج تک بھی سمندر کے بعض حصوں میں امریکہ۔ ناروے سویڈن وغیرہ اپنی ماہی گیری کے حقوق کو محفوظ رکھنے پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح خلیج فارس میں موتی نکالنے کے لئے اور سیلون میں مچھلیاں پکڑنے کے لئے سمندر کے بعض حصے محفوظ کر دئے گئے ہیں تاہم عام سیاسی نظریہ ابتک یہی تھا کہ کُھلے سمندر بالکل آزاد ہیں اور اُن کے پانی پر اور پانی کے نیچے بھی ہر قوم اور ملک کے جہازوں اور آبدوزوں کو گزرنے کی عام اجازت ہے۔ اس طرح دُنیا کے کُھلے اور آزاد سمندر اور اُن کے ملحقات کی آزادی کو بین الاقوامی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ پانچوں بڑے سمندر بحرِ شمالی۔ رود بار انگلستان۔ بحرِ آئرلینڈ۔ بحرِ روم۔ بحرِ اسود۔ بحرِ احمر۔ بحرِ عرب اور خلیج بنگال اور چھوٹے بڑے ایسے تمام سمندر آزاد کہے جاتے ہیں۔ سوائے چھوٹی چھوٹی خلیجوں اور آبناؤں کے جو کسی ملک کے ساحل سے ملی ہوئی ہوں باقی تمام پانی پر سمندروں کی آزادی کا نظریہ حاوی سمجھا جاتا تھا۔ "سمجھا جاتا تھا" میں نے اس لئے

کہا کہ یہ امن کی حالت کا قانون ہے جنگ کی حالت میں اب یہ سارے اصول اور قانون حرف غلط ہو جاتے ہیں اور اُن کو ایسا اخلاقی استحکام حاصل نہیں کہ ضرورت کے وقت کوئی فریق اُن کی پابندی کو گوارا کر سکے۔

(اب چونکہ بحرالکاہل میں جاپان کی طرف سے ایک نیا فتنہ سر اُٹھا رہا ہے تو یہ گمان ہے کہ غالباً بحر جاپان اور امریکہ کے سمندروں کی اس آزادی کا سوال پھر پیدا ہو گا۔ اور اگر جنگ چھڑ گئی تو ہر فریق زیادہ سے زیادہ سمندر پر اپنے زیادہ سے زیادہ حقوق محفوظ کرنے کی کوشش کریگا اور جہاز رانی کے وہ تمام قواعد و ضوابط شکست ہو جائینگے جو امن کے زمانہ میں سمندروں کو اور اُن سفر کرنے والے جہازوں کو ایک ضبط و نظم کی حالت میں رکھتے ہیں۔)

موجودہ بین الاقوامی قانون کے مطابق جنگ کی حالت میں اُن سمندروں کو جہاں سے جنگ قریب ہوتی ہے دو اقسام میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایک حصہ "میدانِ جنگ" میں شامل سمجھا جاتا ہے اور دوسرا "مضافاتِ جنگ" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہوتا ہے جہاں فریقین جنگی تیاریاں کرتے ہیں۔ ان دونوں حصوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ مضافاتِ جنگ میں میدانِ جنگ کی طرح جنگی اقدامات تو کئے جا سکتے ہیں مگر سمندری سرنگیں نہیں بچھائی جا سکتی ہیں۔ مگر گزشتہ جنگِ عظیم میں بھی اس ضابطہ کی پوری پابندی نہ ہو سکی تھی اور اس دفعہ تو اب کھلے سمندروں اور اُن کے ان حصوں میں کوئی امتیاز باقی ہی نہیں رہا ہے۔ فریقین کے آبدوز، طیارے ہر جگہ پہنچتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں حملے کرتے ہیں۔

بین الاقوامی کانفرنسوں میں بعض سمندروں کو "غیر جنبہ دار" قرار دیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہاں کوئی فریق بھی جنگی اقدامات نہ کر سکے۔ لیکن یہ شرط بھی چند روز سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں یہ فیصلہ مسترد ہو گیا۔

جو سمندر تمام ممالک سے دور اور کھلے سمندر کہلاتے ہیں وہ بھی اب کسی نہ کسی فریق کے اقتدارات کے تابع ہیں۔ ناکہ بندی اور جوابی ناکہ بندی کی ضرورتوں نے سمندروں کا ایک چلو بھر پانی بھی ایسا باقی نہیں رکھا جس کو "آزاد" یا کھلا ہوا کہا جا سکے۔ (آج کل سمندروں کی آزادی کے متعلق بڑا جھگڑا ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی کے درمیان پیدا ہو گیا ہے اور شاید جاپان اور امریکہ کے درمیان بھی پیدا ہونے والا ہے۔

اس جھگڑے کی نوعیت یہ ہے کہ امریکہ جرمنوں کی ناکہ بندی تسلیم نہیں کرتا اس لئے کہ وہ سوائے فوج بھیجنے کے باقی ہر قسم کی امداد جرمنی کے دشمنوں کو دے رہا ہے اس لئے جرمنی کو حق حاصل ہے کہ وہ جہاں بھی امریکی جہازوں کو پائے غرق کر دے۔ اس کا ردّعمل امریکہ کی طرف سے یہ ہو رہا ہے کہ اُس نے اپنی اور اپنے سمندروں کی حفاظت کے لئے آئس لینڈ سے برطانیہ کے سواحل اور شمالی افریقہ اور سیام اور سنگاپور تک اپنے دفاعات کا ایک سلسلہ قائم کر دیا ہے۔ بین الاقوامی قوانین کے تحت کھلے سمندروں پر جرمنوں نے امریکی جہازوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا تو اب امریکہ نے اپنے قانون غیر جنبہ داری میں ترمیم کر کے اپنے تجارتی جہازوں کو مسلح کر لینے کے بعد امریکہ کا دوسرا قدم صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں آجائے۔ یعنی ۱۹۴۱ء میں امریکہ نے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو تدابیر اختیار کیں اُن سے زیادہ اُس کو ۱۹۴۲ء میں اختیار کرنی پڑینگی اور ایسا ہر قدم اُس کو میدانِ جنگ کی طرف لا رہا ہے۔ حال ہی میں مسٹر کارڈل ہل نے اپنے ایک خط میں جو شائع ہو چکا ہے لکھا تھا کہ:۔

"آج جو حالات ہیں اُن کی وجہ سے ہم کو اس بات کی آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ ہم اپنے تجارتی جہازوں کو مسلح کر دیں تاکہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں اور ہم کو یہ آزادی بھی حاصل ہونی چاہئے کہ انتہائی ضرورت کے وقت ان جہازوں کو اُن اقوام کے لئے رسد لیجانے کے کام میں لائیں جو دُنیا کو فتح کرنے کی ایک ایسی عالمگیر تحریک کا مقابلہ کر رہے ہیں جسکا رُخ ہماری طرف بھی ہے۔")

سمندروں کی آزادی کے نظریّہ کو منہدم کرنے والی سب سے زیادہ مؤثر جو چیزیں اس جنگ میں ہیں وہ آبدوز اور طیارے ہیں جنہوں نے اس نظریہ کی بنیاد ہی کو توڑ دیا ہے۔ اس وقت خاص طور پر بحرِ اطلانتک میں جرمنوں کے سینکڑوں آبدوز پانی کے نیچے رہزنوں کی طرح پھر رہے ہیں اور کسی قوم اور ملک کا جہاز اُن کے حملوں سے محفوظ نہیں اسی طرح جرمن طیارے اپنے مرکزوں سے پرواز کر کے جہاں تک بھی پہنچ سکتے ہیں وہ سمندروں کی آزادی کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں

نو دولں نے آپس میں ایک معاہدہ کیا تھا جس میں اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ آبدوزوں کی دست برد ” ایسے اقدامات پر مشتمل ہے جو انسانیت کے ابتدائی اصولوں کی نفی ہیں اور اس لئے اُن کو ڈاکہ زنی کی ایک قسم قرار دیکر اُن کا ویسا ہی رد کیا جائے“۔ آج ۱۹۴۱ء پھر ان ہی الفاظ کو امریکی سینیٹر کو نیلے دُہرا رہا ہے کہ آبدوزوں کی دستبرد ” ایک پوشیدہ ظلم ہے خون ناحق ہے اور زبردستی اور قوّت کا ایک خفیہ اصول ہے جو خدائی۔ انسانی۔ قومی اور بین الاقوامی قانون کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے“۔ ان ہی جذبات کے تحت امریکہ نے غیر جنبہ داری کے قانون سے باز گشت شروع کی ہے اور یہ بازگشت ” سمندروں کی آزادی ،، کے بین الاقوامی اصول کا آخری سانس ہے ۔

جس عہد میں انسانوں کی آزادی کی کوئی قیمت باقی نہ رہی ہو اُس زمانہ میں سمندروں اور پہاڑوں اور دریاؤں کی آزادی کا سوال ہی فضول ہے۔ دُنیا کے قرونِ جہالت و وحشت کی روایات کو زندہ کرنے کا بیڑا اُٹھا کر ایک مردم آزار دیوانے کی طرح ہر طرف آگ لگا تا پھر رہا ہے اس ہنگامہ میں جبکہ انسانیت کے بڑے سے بڑے اصول برباد ہو چکے کسی عہد و میثاق کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ جب اخلاقیات کو حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا گیا تو پھر بین الاقوامی دستور و رواج کی کیا حقیقت ہے کہ وہ قوّت اور زبردستی کے جدید فلسفہ کا مقابلہ کر سکے۔ جہاں انسانیت کی ساری عمارت منہدم ہو رہی ہو وہاں کسی ایک طاقچہ یا محراب یا ستون کی شکستگی کا ماتم فضول ہے ۔

شیخ و برہمن

دیہاتی زندگی اور معاشرت کی نمائندگی کرنے والے مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کے سولہ (۱۶) افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے دیہات کے ہندو مُسلمانوں کی اُس یکجہتی کے آئینہ دار ہیں جو اب تک ”شیخ و برہمن“ کی آویزشوں سے آلودہ نہیں ہو سکی۔ ڈاکٹر اعظم کریوی کے افسانوں کی وہ ساری خصوصیات جنھوں نے موصوف کو موجودہ افسانہ نگاروں میں ممتاز کیا ہے اِن کہانیوں میں موجود ہیں۔ زبان کا لُطف اور اندازِ بیان کی جاذبیت قابلِ دید ہے۔ حجم ۲۱۸ صفحات۔ قیمت مجلّد دو روپئے (عـ)

ملنے کا پتہ :۔ کتب خانۂ دانش محل۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ

سیّد محمد تقی

اُردو شاعری کے دَور اور اُن کا پس منظر

اُردو ادب کی تاریخ بہت پُرانی ہے اتنی کہ جوں جوں ہم ماضی کے بعید گوشوں میں داخل ہوتے ہیں اُردو کے نشان مبہم طور پر دور تک نظر آتے ہیں - قدیم اُردو کے آثار امیر خسرو کے عہد (۱۳۲۴ء) سے بھی بہت پہلے پائے جاتے ہیں - احسن مارہروی نے اُردو کا ابتدائی زمانہ عہد غزنوی (شروع بارہویں صدی کو قرار دیا ہے - ممکن ہے محتاط محققین اس خیال کی تائید نہ کریں تاہم اتنا تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ اُردو کی عمر آزاد کے اندازہ سے زیادہ ہے - آزاد نے ولی دکنی کو اُردو شاعری کا باوا آدم مانا ہے لیکن علم الالسنہ کی اس فاش غلطی سے قطع نظر جو آزاد نے ایک شخص کو زبان کا موجد قرار دے کر کی ہے - نئی تحقیقات نے اُن کی رائے کے خلاف کافی ثبوت مہیا کر دئے ہیں -

اُردو کی اتنی عمر ہونے کے باوجود ـــ احسن مارہروی کے اندازہ سے اُردو زبان آٹھ سو سال پُرانی ہے ـــ اتنے طویل زمانے میں اُس نے جو ترقی کی ہے وہ کچھ زیادہ ہمت افزا نہیں - لیکن اس کا یہ سبب نہیں ہے کہ ترقی کی صلاحیت اُردو میں دوسری زبانوں کی نسبت کم ہے - جہانتک اُسکے بولی ہونے کا تعلق ہے کہا جاسکتا ہے وہ دوسری زبانوں سے اصلح ہے - اس کی ترقی کی سُست رفتاری کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اسے نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا - اپنی ابتدائے عمر سے آجتک اُسے دو سخت سامراجی زبانوں سے ٹکر لینا پڑی - فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے دورِ جدید تک وہ تن تنہا غزنویوں - غوریوں - تغلقوں اور لودھیوں کی سامراجی زبانوں - پشتو اور فارسی سے ٹکراتی رہی - اور ۱۸۵۷ء سے آج تک برطانی سامراج کی چہیتی زبان انگریزی سے ٹکر لے رہی ہے اس طرح بمشکل پون صدی اُسے حکومت کی امداد مل سکی - اور اس امداد کا دامن بھی بہت تنگ تھا تاہم اُردو ادب نے اس سے فائدہ اُٹھایا اس لئے اُردو کی تاریخ میں اسے نئے عہد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے -

اُردو ادب کی اس طویل زندگی کو نہایت آسانی سے پانچ دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے - گیارہویں صدی سے لیکر ۱۷۵۷ء تک - ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ـــ ۱۷۵۷ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک - ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک ـــ اور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک -

یہ تقسیم خالص ادبی تاریخ کی حیثیت سے صحیح نہیں ہے لیکن اُس پس منظری تصوّر کی حیثیت سے جو ادب کی تاریخ کے مختلف دوروں کو ممتاز کرتا ہے ہمیں اسی تقسیم پر اعتماد کرنا ہوگا -

تاریخ اُردو کا دور اوّل ہر چند کہ ہماری نظروں سے بہت کچھ اوجھل ہے مگر اس زمانہ میں اُس کے عوامی رجحان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا - اس عہد میں عام طور پر - دوہے - گیت - پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں کہی گئیں - یہ عوام کی چیزیں تھیں اور عوام اور ہندوستانیوں ہی سے ان کا تعلق تھا - اس زمانہ میں زبان شمالی اور جنوبی ہند کی تقسیم میں بٹی نہیں تھی - ملک کے مختلف حصّوں میں جہاں جہاں بھی وسط ایشیا کے باشندوں اور اہلِ ہند کی مختلف تہذیبوں کا گہرا میل ہوا - ان دونوں گروہوں کے تجارتی - معاشی اور سیاسی مقاصد کے مشترک ذریعہ اظہار کے طور پر اُردو نے جنم لیا - یہ ملاپ جتنا ہمہ گیر ہوتا چلا گیا اُردو کے دامن میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی - خیال تھا کہ وسط ایشیا - افغانستان اور ایران کے حکمراں قبائل کا گروہ جتنی زیادہ تعداد میں یہاں آبسے گا اُسی تناسب سے اُردو بھی پھیلتی جائیگی - مگر مُغل سامراج کی ایران نوازی نے اس امید کو پامال کر دیا چغتائیوں کا تصوّر حیات ایران کے مبہم اسلامی تخئیل زندگی سے بالکل متاثر تھا - بلکہ وہ امید کرتے تھے کہ فارسی تہذیب کو برقرار رکھنے والی اُن چھوٹی چھوٹی نو آبادیوں کو جو ملک کے مختلف حصّوں میں ماتحت مغل حاکموں نے بنادی ہیں اسی طرح باقی رکھیں گے - بابر - ہمایوں - جہانگیر - شاہجہاں اور عالمگیر کی یہ غیر منطقی خواہشیں تو ضرور ناکام ہوئیں مگر ان کا اتنا اثر لازمی

ہوا کہ اُردو کا مرکز شمالی ہند سے ہٹ کر ہندھیاچل کی وادیوں میں جا بسا۔

دربارِ دہلی کے ادھر اُدھر اصفہان۔ شیراز۔ کابل اور قندھار کے امرا اپنی اپنی تہذیبوں کی پوری پوری نمائندگی کرنے کے لئے موجود تھے یہ درست ہے کہ مغلوں نے ہندوستانی سماج کی دشمنی کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا جس کا واحد سبب یہ تھا کہ اُن کی حکومت کا اقتصادی جُوا ہندوستانی سماج کے کاندھوں پر رکھا ہوا تھا اور اسی سماج کے اعلیٰ طبقے اُسے اُٹھاتے تھے۔ کسی بدیسی سماج کی اقتصادی ذمہ داریاں دہلی کے محکمۂ مال پر نہیں ڈالی گئی تھیں نہ ہندوستان کے ایوانہائے تجارت کی پالیسی پر خارجی مفادوں کی نگرانی تھی۔ تاہم تاج شاہی کے نمائندے اپنی مادری تہذیب کی سختی کے ساتھ محافظت کرتے تھے۔ اُن کا مجلسی و سماجی تصوّر وہی تھا جو ان کے آباؤ اجداد نے بلخ۔ بخارا۔ تاشقند اور بغداد کی مخلوط تہذیب کے ورثہ کے طور پر دیا تھا۔ ہندوستانی تہذیب نے مغل تمدن پر گہرے اور زبردست اثرات ڈالے جسے فاتح مسلمانوں نے غیر محسوس طور پر قبول کر لیا۔ مغل شہنشاہیت اپنے اپنے حلقوں میں ملک کی مقامی زبانوں
کو ترقی کرنے کے مواقع دیتی تھی۔ تاریخ نے ہم تک اُن چند در چند مثالوں ۱۴
کو پہنچایا ہے جو درمیانی دور کے اس طاقتور امپیریلزم کی وسیع النظری کو ثابت کرتی ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اُردو شعر و ادب کی ترقی میں اس چیز نے بھی کافی امداد پہنچائی۔ ہر چند کہ اس طرح ۱۷۰۷ء تک سرکار دہلی کو بالواسطہ اُردو کے خدمتگزاروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک ثانوی چیز تھی۔ اس دور تک اُن کی اپنی زبان فارسی اور اُن کا اپنا تمدن ایرانی تھا اور وہ نسبتاً اُسی سے زیادہ محبت کرتے تھے۔

ان کوششوں کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ جنوبی ہند نے مرکزیت اختیار کر لی دوسرے دور میں عالمگیر کے انتقال کے بعد (۱۷۰۷ء) شمالی ہند کے حکمرانوں کی ذہنیت میں انقلابی تبدیلی ہوئی۔ سلطنت دہلی کے تعلقات بدیسی مسلمانوں سے کم ہونے لگے۔ اور ہندوستانی قومیت نے طاقت حاصل کرنی شروع کی۔ سماج کے ان مطالبات کا دباؤ اتنا پڑا کہ مغل دربار کو اس مطالبہ کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔ اسی عہد سے ہندوستانی بھاشا کا اثر تیزی سے بڑھنا شروع ہو گیا۔

اُردو ادب و شعر پر اس دور میں (۱۷۰۷ء تا ۱۸۵۷ء) بہت مہلک اثرات پڑے۔ مغل سامراج ہچکیاں لے رہا تھا۔ تین سو سال سے زیادہ کی تہذیب تباہ ہونے کو آمادہ تھی۔ وہ سماج جس کے کاندھوں پر ایک نئی زبان کے بڑھانے۔ پھیلانے اور ترقی دینے کی ذمہ داری تھی بربادی و نامرادی کے ڈیڑھ سو تاریک سال سے گزرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ مغل اور اُن کی تہذیب ہر ہر قدم پر منتشر ہوتی گئی۔ اس کا یقینی اثر جو ہونا تھا ہوا۔ اُردو شاعری اور اُردو ادب کی دُنیا سخت قسم کی مایوسی ناامیدی اور بے یقینی پر رکھی گئی۔ دوسرے دور — ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء — برطانی سامراج کا عہد تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حاکموں کے طرزِ عمل نے اس نازک حالت کے اضافہ میں مزید امداد دی۔ لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں بنگال میں ایک قانون کے ذریعہ ہندوستان میں بھی وہی طرز زمینداری قائم کر دیا جو انگلستان میں رائج تھا۔ کمپنی کے حکّام کی نیّت تو بخیر نہ تھی مگر تاریخی حیثیت سے اس کا فائدہ خاطر خواہ نکلا۔ پُرانے طرز کی بالکل دقیانوسی جاگیرداری ختم ہو گئی اور نئی زمینداری نے اُس کی جگہ لے لی اس حیثیت سے کارنوالس نے ہندوستانی سماج کی خدمت کی مگر چونکہ ہر قسم کی نئی کوششیں پُرانی تہذیب کو تباہ کرنے کا باعث تھیں اس لئے اس اقدام کا اثر بھی مضر ہوا۔ مایوسی کی وہ لہر جو پہلے ہی شدید تھی اب خوفناک ہو گئی۔ ادھر برطانی سرکار اپنی سامراجی لوٹ کی خاطر ہندوستان کو نئے طرز کی نوآبادی بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ یہاں کے اُن طبقوں کو ترقی دی جا رہی تھی جو پچھلی سماج کے شکار رہ چکے تھے۔ ان کوششوں کی اس حیثیت سے ضرور تعریف کی جا سکتی ہے کہ اس سے ہندوستانی سماج نے تاریخ کی ایک نئی منزل طے کی مگر چونکہ مقصد حد درجہ گھناؤنا تھا اس لئے نتائج بھی گھناؤنے نکلے۔ ہندوستان نے برطانی غلامی کی بھیانک قیمت ادا کی۔ نہ صرف یہ کہ پُرانے سماج کے تمام مقدس اصول ہی بھینٹ دینے پڑے بلکہ اقتصادی حیثیت سے بھی تمام ملک دیوالیہ ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء تک سامراج کی یہ پالیسی اپنے شباب کو پہنچ گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اُس برطانی سامراج کے خلاف نہیں تھی جو اپنے دلی مقاصد کیلئے ہندوستان کو تباہ کرنے پر تُلا ہوا تھا اور جونک کی مانند ہندوستانی اقتصادیات کا خون چوس رہا تھا۔ بلکہ یہ بغاوت تھی اُس برطانی حکومت کے خلاف جو نئی تہذیب کے نمائندہ کی حیثیت سے ہندوستان کی پُرانی سوسائٹی میں بُنیادی تبدیلی کی خواہشمند تھی۔ ممکن

ہے یہ تبدیلی خود ہوتی اور یقیناً ہوتی مگر کمپنی کے جوشیلے تہذیب پرستوں نے مجبراً انقلابی کوشش کی۔ وہ اس میں ایک حد تک کامیاب ضرور ہوئے مگر اسکے ردّ فعل میں ہندوستانی مفکّروں۔ ادیبوں اور شاعروں کی ذہنیت سختی کے ساتھ رجعت پسند ہوگئی۔ یہ لوگ پُرانے جاگیرداری سماج کی طرف تسلّی و سکون حاصل کرنے کے لئے تکتے تھے۔ نئی دُنیا سے انہیں اس لئے نفرت ہوگئی کہ آنے والے سماج (سرمایہ دارانہ سماج) کا نقیب ــــ برطانیہ۔ اُن کا سخت ترین دشمن تھا ــــ کوشش کی گئی کہ اکبری اور عالمگیری یادگاروں کو باقی رکھا جائے۔ تمام ادیبوں اور شاعروں نے اپنا نمونہ پُرانے دور کے بگڑے ہوئے شعر و ادب کو قرار دیا۔ کچھ دنوں یہ لوگ اطمینان سے چلتے رہے مگر یہ غیر منطقی اور بے ربط چیز زیادہ نہیں چل سکتی تھی۔ آخر تیسرے دور میں حالی نے ملک کی بیراہ روی کا احساس کرکے قدامت پرستوں کو ٹوکا اور بتایا کہ وہ خطرناک راستہ پر جا رہے ہیں۔

نیا رُخ

ادب اُردو کے دوسرے دور ۱۷۰۷ء تا ۱۷۵۷ء میں جس یاسیت نے جڑ پکڑی تھی تیسرے دور (۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء) میں بھی یہی یاسیت باقی رہی۔ حالی نے اسکے خلاف کوشش کی مگر اس عہد میں اُس کا کوئی بہتر نتیجہ نہیں نکلا۔ یہ قنوطیت من حیث المجموع تمام ہندوستانی سماج پر طاری تھی مگر برطانی سرکار کی اس پالیسی نے کہ ہندوستانی سماج کے دو اہم ٹکڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی اقتصادی ترقی میں اُس نے فرق ڈالنے کی کوشش کی۔ اُردو ادب پر خصوصاً بہت بُرا اثر ڈالا۔ برطانوی حکومت نے ۱۸۵۷ء کے بعد عمداً ہندوستانی مسلمانوں کو پیسنا شروع کیا جس کا نتیجہ جہاں یہ ہوا کہ ہندوستانی سماج دو ممتاز تہذیبی رجحانات کا مجموعہ ہو گیا۔ یہ بھی اثر ہوا کہ اُردو ادب کے زیادہ ادیب ــــ جو مسلمان تھے ــــ اُسے پیچھے ڈھکیلنے میں مشغول رہے عام ہندوستانی سماج میں اور اُسکے اثر سے ملک کی دوسری زبانوں میں ــــ گزشتہ عہد کی قنوطیت کے ردّ فعل کے طور پر۔ قومیت ــ نے ترقی کی ــ یہ قومی احساسات چوتھے عہد میں نمایاں نظر آتے لگے تھے مگر مسلمان اور اُنکے اثر سے اُردو ادب اس دور میں اس تحریک سے متاثر نہیں ہوا۔

پانچویں عہد ۱۹۱۸ء تا ۱۹۳۹ء میں قومی خیالات نے ادب اُردو کو تیزی کے ساتھ متاثر کرنا شروع کیا اس لئے کہ وہ تمام ہندوستانی ادبوں سے بچھڑ گیا تھا۔ بنگالی۔ مرہٹی اور جنوبی ہند کی دوسری زبانیں قومی نظمیں، گیتوں۔ افسانوں اور ناولوں کی کثیر تعداد رکھتی تھیں لیکن اُردو ادبیات پُرانی یاسیت کے پھندوں سے نکلنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ وہ کبھی اسلامی دور کے پُرانے عہد ترقی کے تصوّر سے اس یاسیت کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ کبھی اتحادِ اسلامی کے سراب آسا تخیّل میں پناہ لیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام وہ کوششیں تھیں جو مسلمان قوم   اپنے ماضی کی یاد کو دور کرنے کے لئے کر رہی تھی لیکن یہی کوششیں اُردو ادبیات کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں اس لئے کہ اُردو ادب اس عہد میں آئینہ دار تھا اسلامی سماج کا۔

خوش قسمتی سے حیاتیاتی اسباب مسلم سماج اور اُس کے واسطے سے اُردو ادب کی مخالفت میں نہیں تھے۔ چنانچہ اسی عہد میں مسلم تہذیب کو چند اچھے دماغ ملے۔ اگر ساتھ ہی اقتصادی محرکات بھی مسلمانوں اور بالواسطہ اُردو شعر و ادب کی تائید میں ہوتے تو یقیناً وہ اسی دور میں بہت آگے جاچکا ہوتا۔ ۱۵

پانچواں دور اُردو ادب میں ایک انقلابی دور ہے۔ اس کے نصف اوّل میں۔ قومیت اور آخر میں بین الاقوامیت نے ترقی کی ۱۹۳۰ء تک قومی خیالات ادب اُردو پر چھائے رہے لیکن ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے بین الاقوامی اقتصادی جمود نے جو تمام دُنیا کے سرمایہ داری سماج کی چولیں ہلا رہا تھا ہندوستان پر بھی اثر کیا۔ اُردو ادب کا بھی اس حالت سے متاثر ہونا لازمی تھا گو وہ ابھی اس کے لئے پوری طرح طیار نہ تھا لیکن تاریخ اپنی رفتار میں کسی ٹکڑے (   ) کی طیاری کا انتظار نہیں کیا کرتی۔ وہ تیزی سے آگے دوڑ رہی تھی۔ اگر اُردو ادب کو تاریخ کی ہمنوائی کرنا تھی تو اُسے اپنی رفتار میں سرعت پیدا کرنا لازمی تھی۔ آخر وہ متاثر ہوا اور نئی بین الاقوامیت کے لئے اُسے بھی طیار ہوتا پڑا۔ ۱۹۳۹ء کے بعد سے ادب اُردو کا وہ دور شروع ہوتا ہے جب اُس نے اپنا واسطہ عام عالمی ادب سے جوڑ لیا۔

اس طرح اُس نے مذکورہ عہدوں میں تین ممتاز پس منظری تصوّرات

سے اثر قبول کیا۔ ۱۷۰۰ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک یاسیت کا دور دورہ تھا۔ اور ۱۹۱۴ء سے لیکر ۱۹۳۹ء تک قومیت اور پھر بین الاقوامیت نے اُسے متاثر کیا۔

یاسیت

یہ عہد نہ صرف زبانی حیثیت سے ہی بہت طویل ہے بلکہ لسانی حیثیت سے بھی اسکی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اسی زمانہ میں اُردو شاعری و ادب کی بُنیادیں مضبوط ہوئیں۔ اُس نے طاقت حاصل کی۔ ترقی کی، بڑھی اور تمام ہندوستان پر چھا گئی۔ اسی دور میں اُردو کے مشہور اساطین

فضلی - حاتم - آبرو - میر تقی

سودا - نظیر - مصحفی - انشا

غالب - ذوق - آتش - ناسخ

انیس - دبیر - داغ - امیر

۱۶ وغیرہ نے ادب و شعر کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔

اس عہد میں تین رجحانات واضح طور پر نمایاں ہیں۔ پرولتاری۔ فارسی۔ اور جدید۔

پرولتاری رجحان

اس عہد کے پہلے حصہ میں اور دکنی عہد کے شعراء پر پرولتاریت کی جھلک ہے۔ اس زمانہ میں اُردو شاعری کے دو رُخ ہیں۔ ایک طرف وہ درباری ضروریات پوری کرتی ہے۔ دوسری طرف عوامی مطالبات کو پورا کرنے کی طرف مائل ہے۔ ولی دکنی۔ فضلی۔ حاتم۔ میر تقی مصحفی۔ انشاؔ اور نظیر کی شاعری اس رجحان کو پورے طور پر واضح کرتی ہے۔ ان میں پرولتاری شعراء کا سرگروہ نظیر اکبر آبادی ہے۔ اُس کی شاعری میں شروع سے آخر تک خارجیت نمایاں ہے۔ لیکن دوسرے شاعروں کے کلام میں داخلیت اتنی شدت اختیار کرلیتی ہے کہ یہ خالص درباری شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

عام طور پر مثنویاں۔ ادب و شعر کے عوام رجحان کو ظاہر کرنے کیلئے کہی جاتی تھیں۔ جیسے میر تقی۔ مصحفی اور انشا، وغیرہ کی مثنویاں۔ برسات مکان۔ مرغبازوں اور لشکر وغیرہ پر میر کی مثنویاں اس رجحان کو واضح کرنے کی بہترین مثال ہیں۔

میر کے چند شعر سُنئے۔ دیکھئے شاعر اُس عہد کے سماج کی بابت کیا خیال رکھتا تھا۔

میر دلی کی تباہ حال سوسائٹی پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے ؎

دلی میں بہت سخت کی اب کی گذران	دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شان	کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے	اُجڑے تھے گھر
تا حدِ نظر صاف پڑے تھے میدان	عرصہ تھا تنگ

اپنی افسوسناک مفلسی کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ ؎

تیرا اے دل یہ غم فردا بھی ہوگا	اندیشۂ رزق کم کبھو بھی ہوگا
کھانے کو دیا ہے آج حق نے تجھ کو	کل بھی دیویگا کل جو تو بھی ہوگا

مثنوی مرغ بازاں میں مرغوں کی لڑائی کا دلچسپ منظر کھینچا گیا ہے ؎

جیسے منگل کو بالی کی ہے دھوم	گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش	جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں۔ ایک دولاتیں	سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
اُن نے پر جھاڑے پر پھڑکنے لگے	اُن نے کی نوک پر کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو پر ہیں کج	ساتھ اسکے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے	اُن کی صد رنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ	ایک کہتا ہے کہ بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں	لاتیں گویا کہ یہی کھاتے ہیں
ایک کے مُنہ میں مُرغ کی منقار	ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
مُنہ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے	تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے	بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پہ بغل میں مارے مُرغ	لے گئے جیتے مارے سارے مرغ

اسی طرح دوسری مثنویوں میں اُس عہد کی سوسائٹی کی صحیح نمائندگی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر شعر کی لسانی حیثیت پر اتنی توجہ نہیں کرتا جس قدر

معانی و مقاصد کی اہمیت اُسکے پیش نظر رہتی ہے۔

اس عہد کے شعراء عصر کی عوامی ذہنیت کا اندازہ پوری طرح نظیر اکبرآبادی کے کلام سے لگایا جاسکتا ہے۔ نظیر اس زمانہ کے تمام شعراء کا سرخیل ہے اُسکے تمام کلام میں عوامی حالات پر روشنی ڈالی گئی۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی کے شروع میں ہندوستانی سماج کن مشکلات سے دوچار تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو برطانی سامراج کی ہندوستان میں نمائندگی کررہی تھی اُس کی اقتصادی لوٹ سے غربت و افلاس ملک میں کس شدت سے پھیل چکا تھا۔ اس حالت کی پوری وضاحت نظیر نے اپنے کلام میں کی ہے۔ شہرآشوب۔ آدمی نامہ۔ روٹی۔ مفلسی اور کوڑی کے عنوانات سے اُس نے جو نظمیں کہی ہیں اُن کے پڑھنے سے سماج کی تباہ حالی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ شہرآشوب کے دو بند ہیں ؎

بیرونگاری نے یہ دکھائی ہے مفلسی — کوٹھے کی چھت نہیں ہے یہ چھائی ہے مفلسی
دیوار و در کے بیچ سمائی ہے مفلسی — ہر گھر میں اس طرح سے بھرآئی ہے مفلسی
پانی کا ٹوٹ جاوے ہے جوں ایک بار بند

محنت سے ہاتھ پاؤں کے کوڑی نہ ہاتھ آئے — بیکار کب تلک کوئی قرض اُدھار کھائے
دیکھوں جسے وہ کرتا ہے رو رو کے ہائے ہائے — آتا ہے ایسے حال پہ رونا ہمیں تو ہائے
دشمن کا بھی خدا نکرے کاروبار بند

یہی نہیں اُس نے سماج کی چھوٹی چھوٹی حالتوں کی دلچسپ مرقع کشی کی ہے وہ پُرانی شاعری کے تخیلاتی آسمانوں سے اُتر کر سماج کی سچی اور سیدھی حقیقتوں پر بحث کرتا ہے۔ اور پوری وضاحت سے بتاتا ہے کہ اُس وقت سوسائٹی کا سانچہ کیا تھا؟

فارسی رجحان

اس عہد کے دوسرے حصہ میں تمام شعراء کے کلام پر فارسیت کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ ویسے یوں تو پہلے دور میں بھی سودا اس اسکول کا نمائندہ تھا۔ لیکن شاعری کا عام رجحان عوامی تھا یا عوامیت کی طرف ان کا میلان زیادہ تھا۔ فارسی پرست شعراء کے گروہ میں سودا۔ غالب ذوق۔ انیس۔ دبیر۔ آتش و ناسخ وغیرہ ہیں۔ اس جماعت نے فارسی سے بہت کچھ مستعار لیا۔ استعارے۔ تشبیہیں۔ طرز ادا۔ محاورے۔ خیالات اور قدریں۔ تمام فارسی شاعری سے لی گئیں۔ یہ گروہ شعر کے لسانی پہلو پر بھی کافی زور دیتا تھا۔ سودا۔ ذوق۔ ناسخ اور دبیر کے کلام کا ایک کثیر حصہ محض لسانی موشگافیوں کی نذر ہوگیا ہے۔

نیا رجحان

آخری عہد میں اُردو ادب نئے حالات سے متاثر ہونے لگا۔ یاسیت کا ردعمل تیزی سے ہوا اور اس ردعمل کے نتیجے میں قومی خیالات ترقی پکڑنے لگے۔ اس رجحان کی نمائندگی۔ حالی۔ اکبر۔ اقبال۔ چکبست شبلی جوش اور ساغر نے کی ہے۔ اس زمانہ میں قومی خیالات بہت مبہم تھے۔ چونکہ یاسیت کا ردعمل تھا اس لئے ادب کوئی نئی شعاع امید پیدا کرنے کی فکر میں تھا۔ کبھی اتحادِ اسلامی کا تصور اُس کی تسکین کرتا تھا اور کبھی ہندوستان کی متحدہ قومیت کا مبہم تصور۔ اس لئے حقیقتاً اس دور میں نئے رجحان سے اثباتی رجحان مراد نہیں اس لئے کہ اس وقت منفی رجحان ہی پیدا ہوا تھا۔ اثباتیت کا آغاز کہیں پانچویں دور (۱۹۱۸ء تا ۱۹۴۲ء) میں ہوتا ہے۔

یاسیت پر ایک نظر

۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک اُردو ادب پر یاسیت کا جو 17
خوفناک عہد گذرا اس کے تین ممتاز رجحانات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے پہلے حصہ میں سماج کے نقیبوں نے سوسائٹی کی تباہ حالی کا اندازہ لگایا اور اُس کی افتادگی و واماندگی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس عہد تک پُرانے معاشی رشتے اتنے ڈھیلے نہیں ہوئے تھے کہ سوسائٹی بالکل تھک کر نڈھال ہوجائے۔ اس لئے اس عہد تک ادب میں بھی جان تھی اور وہ اپنے زمانہ کی زندہ حقیقتوں کو محسوس کرتا تھا۔ لیکن ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء کی ایک صدی میں ہندوستانی سماج بالکل تباہ ہوگیا۔ قدیم اقتصادی بندھن ایک ایک کرکے بکھر گئے تھے۔ پُرانے جاگیرداری عہد کے معاشی سوتے خشک ہوچکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادب بھی تباہ ہوگیا۔ تمام شاعری مصنوعی خیالات سے پُر ہوگئی شعر و ادب نام ہوگیا چند استعارات۔ تشبیہات۔ خاص قسم کی دروبست اور ایک امتیازی بندش و ترکیب کا۔ اس کے علاوہ اس عہد میں کوئی ندرت نہیں ملتی۔ البتہ اس فارسی رجحان کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اُردو ادب لسانی حیثیت سے مالامال ہوگیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہندوستانی سماج میں نئے سرمایہ داری عہد کی اصلاحات پیدا ہونے لگی تھیں۔ اس کے اثر سے ادب میں پھر زندگی پیدا ہوئی اور یاسیت کے خلاف سخت ردِ عمل ہوا۔ ۱۹۱۴ء تک یہی منفی رجحان چلتا رہا۔

رجائیت

۱۹۱۰ء سے لیکر ۱۹۲۰ء تک اسلامی دنیا میں چند انقلابی بیچینیاں ہوئیں۔ ان کا ہلکا سا اثر ہندوستانی مسلمانوں کے توسّط سے اُردو ادب پر بھی پڑا۔ شاعری کا منفی رجحان دھندلا ہونے لگا اسی تصور نے اثباتیت کی شکل اختیار کرنی شروع کی۔ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۸ء کی جنگ۔ رولٹ ایکٹ اور تحریکِ خلافت نے قومیت کو ترقی دی۔ ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۹ء تک یہ دونوں اثرات دوش بدوش چلتے رہے لیکن ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء کے بین الاقوامی اقتصادی جمود اور کانگریس کی قومی تحریک نے مل کر اجتماعیت کو آگے بڑھایا۔ قومی تصور کے سایہ میں بین الاقوامی تخیل آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ ادھر اجتماعیت کی ترقی نے روسی انقلاب کے ہلکے ہلکے اثرات بھی ڈالنے شروع کئے۔ ان تمام مختلف عناصر سے ۱۸
نئی رجائیت کی تخلیق ہوئی۔

خودی

اس عہد کے شعراء و ادباء میں اقبال ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ اُس نے اُس منفعیت کے ساتھ جو اس عہد کی تمام شاعری میں بنیادی تصور کی حیثیت رکھتی ہے اور جو خود اُسکے اپنے کلام کا بھی ایک حصّہ ہے۔ اثباتی تصور بھی اُردو ادب کو دیا۔ اقبال نے خودی کی تبلیغ کی اور پرانی قنوطیت کے خلاف ایک جہادِ عظیم۔ یقیناً اقبال نئے رجائی عہد کا امام ہے۔

رومانی ادب کے بنیادی تصورات میں تبدیلی

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اُردو شاعری فارسی کی مقلد تھی۔ فارسی ادب تاجاریوں کے عہدِ انحطاط کی تقلید میں محبوب کو مرد تسلیم کرتا تھا۔ اُردو شاعری نے بھی اس غیر فطری تصور کو اپنا لیا۔ یہی تصور ان دونوں صدیوں میں یکساں مقبول رہا لیکن اٹھارویں صدی کے پہلے تہائی حصّہ میں عاشق و معشوق دو برابر کی چیز تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انحطاط ذہنی نے یہاں بھی اپنا اثر دکھایا۔ محبوب بڑھتے بڑھتے ایک جنگجو اور خونیں جرنیل بن گیا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بلکہ کچھ ۱۹۱۴ء تک محبوب اور محب کا واسطہ غلام اور آقا کے اصول پر تھا۔ اقبال کے نظریۂ خودی نے اس صد سالہ قدیم تصور کی بھی بنیادیں ہلا دیں۔ اب عاشق و معشوق کا تعلق جمہوری بنیادوں پر استوار ہوا۔ عاشق و معشوق کے تعلقات کی بنیادیں ابھی طے بھی نہ ہو پائی تھیں کہ داغ نے معشوق کی شخصیت کو ہی سوال کرنا شروع کیا۔ داغ نے جرأت کی اور کہا معشوق مرد نہیں عورت ہے۔ اس نئے تصور کی نمود ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے ہو جاتی ہے لیکن نئے اور جدید اسلوب پر داغ نے اسے ترتیب دیا۔ داغ کے انقلابی تصور شاعری پر قدامت نواز حلقوں نے کافی نکتہ چینیاں کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ نئے عہد کے شعراء میں اُس کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ صرف داغ ہی کی خصوصیت ہے کہ اُس نے پرانی رومانیات کو حقیقی تجرباتی رومانیات کے رنگ میں پیش کیا۔ اس کا اندازہ اس اثر سے لگایا جا سکتا ہے جو داغ کے کلام کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے رومانی احساسات میں پاتے ہیں۔

۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت تک محبوب عورت اور عاشق مرد رہا۔ لیکن اس تحریک میں اُردو کے شعراء جن کی اکثریت مسلمان تھی ہندوؤں سے قریب ہوئی۔ اس قرب کا یہ اثر ہوا کہ ہندی ادب کے نئے تصورات اُردو میں تیزی سے داخل ہونے شروع ہوئے۔ ہندوؤں کے رومانی تصور کی رو سے عاشق عورت ہوتی ہے اور معشوق مرد۔ اُردو شاعری نے بھی اس تصور کو جذب کیا۔ اس طرح ۱۹۲۰ء کے بعد رومانی ادب میں تین رجحان نمایاں ہوئے۔

(۱) عاشق اور معشوق دونوں مرد۔ یہ قدیم رجحان کی تقلید تھی۔
(۲) عاشق مرد معشوق عورت۔ یہ عرب کے رومانی تصور کی تقلید تھی۔
(۳) عاشق عورت معشوق مرد۔ یہ ہندی شاعری کے رجحان کا اقتدا تھا۔

لیکن بنیادی طور پر یہ تینوں رجحانات رجائیت کی بنیاد پر استوار تھے۔

نئے رجائی شعراء

۱۹۳۰ء تک حالی۔ اکبر۔ اقبال۔ چکبست وغیرہ کا اثر رہا۔

لیکن ۱۹۳۰ء تک اقبال کے علاوہ ان تمام شعراء کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ اقبال ۱۹۳۰ء تک اس لئے ہی رہنمانہ رہا کہ اُس کی شاعری کا عروج دور ہی یہ تھا بلکہ اس کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ اُس رجعت پسندانہ تصوّر کی تبلیغ کرتا تھا جو اس عہد کی یاسیت سے بھاگ کر پرانے اسلامی تمدّن کی برتری میں پناہ لیتا ہے اور اس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا سبب قدیم اسلامی اصول سے انحراف کو بتاتا ہے ۔ یہ اسکول اس زمانہ میں بہت مقبول تھا۔ اس کا اثر ۱۹۳۰ء سے آگے بڑھ کر ۱۹۳۹ء تک اپنے اثرات ڈالتا رہا ۔

اقبال کے دوش بدوش اور اسکے بعد حسرت، اصغر، فانی، جگر، جوش ساغر، حفیظ، اختر شیرانی کا دور شروع ہوتا ہے ۔

ان ہمعصر اور نئے شعراء نے اقبال کے عہد کے رجعت پسندانہ خیالات کو سامنے رکھ کر نئی شاعری کو آگے بڑھایا۔ مزدوروں کی تکلیف دہ حالت جو اقبال کا جزوی موضوع بھی رہ چکا تھا اکثر شعراء نے اپنا موضوع بنایا۔ اس عہد کے باغیانہ رجحان اور تصوّر الوہیت کے خلاف تلخ تنقیدوں نے اپنی تکمیلی شکل جوش کی شاعری میں اختیار کی۔ اقبال کے عہد ہی کی اسلامی بین الاقوامیت نے شعراء کے ایک نئے گروہ کی شاعری پر اثر کیا ۔

مومن و غالب اور داغ کے تغزّل کے انعکاسات نے حسرت، فانی اصغر اور جگر کی نئی غزل کی بنیاد ڈالی ۔

اپنے اپنے مخصوص حلقوں میں ساغر نظامی اور اختر شیرانی نے قطعی جدید رومانی شاعری کا آغاز قطعی جدید اسالیب کے ساتھ کیا ۔

ادب اور نئے معاشی رجحانات

۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد ہندوستانی سوسائٹی میں جو انقلابی تبدیلیاں ہوئیں اُن کا اثر اُردو ادب پر گہرا پڑا اس دور میں وہ بالکل نئے اور جدید رجحانات سے دوچار ہوا ۔ ۱۹۳۰ء تک مختلف رجحانات دوش بدوش چلتے رہے لیکن ۱۹۳۰ء کی انقلابی تحریکوں کے نتیجہ میں ممتاز رجحانات نمایاں ہوئے۔

ابتک اقبال نے حالات سے متاثر ہو کر جن نئے خطوط کی طرف رُخ کیا تھا اُن پر مبہم انداز میں تمام شعراء چلتے رہے تھے لیکن ۱۹۳۰ء تک ان رجحانات نے کوئی ممتاز شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اس عہد کے شعراء صرف پرانی دُنیا سے ناراض ہو کر نئے عناصر کے مؤید تھے اس لئے ان سب کو انقلابی شاعر کہا جاتا تھا۔ گویا یہ سب منفی عناصر کا ردِّ عمل تھے ۔ مگر ۱۹۳۰ء کے بعد کے حالات نے انہیں یہ بتادیا کہ نئے اقتصادی و حیاتیاتی اسباب کے نتیجہ میں اب ایک نئی دُنیا لازمی طور پر بن کر رہے گی ۔

اس نئے تصوّر نے ان انقلابی شعراء میں امتیاز پیدا کر دیا ۔ وہ طبقہ جو انقلابیت کے ساتھ ہی رجعت کے گہرے جراثیم رکھتا تھا گھبرا اُٹھا اُسے اپنی اُن مقدس قدروں کی فکر ہو گئی جن کی عزت اُس کے بطون کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھی اور جس کو اُس نے انقلاب کا پردہ ڈال کر عام نظروں سے چھپا رکھا تھا۔ اسی نئے خوف کے نتیجہ میں ان کی شاعری ۔ انقلاب و رجعت کا مجموعہ ہو گئی ۔ یہ سماج کی اقتصادی بناوٹ میں کوئی تقدس نہیں پاتے سوسائٹی کی مذہبی قدریں ان کے خیال میں اپنا اثر کھو چکی ہیں ۔ سرمایہ داری نظام تباہی و بربادی کا موجب ہے ۔ خدا ۔ روح اور دوسرے روحانی ادارے اپنے تخئیل میں کوئی منطق نہیں رکھتے ۔ مگر اسکے ساتھ ہی وہ سماجی و مجلسی حیثیت سے بالکل رجعت پسند ہیں ۔ ان کے مجلسی تخئیل میں عورت کیلئے کوئی جگہ نہیں ۔ اُن کے سماج کے اخلاقی نظریات جاگیرداری قانونِ اخلاق کی بُنیادوں پر طیار ہوتے ہیں ۔

19 ان نئے شعراء کی اس غیر منطقی ذہنیت اور پیغام کو اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ صحیح معنی میں فاشی شاعر نظر آئینگے ۔

انقلابی شعراء میں جوش ان فاشی ادیبوں میں ممتاز نظر آتا ہے وہ موجودہ سرمایہ دارانہ سوسائٹی سے ناراض ہے ۔ مذہبی اداروں پر حملے کرتا ہے ۔ مزدوروں کی افسوسناک حالت پر آنسو بہاتا ہے ۔ برطانی سامراج کی غلط حکمت عملیوں پر سخت اور ترش تنقیدیں کرتا ہے ۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوصف بھی عورت پر اس کے سماج میں صرف یہ ذمّہ داریاں ڈالی جائیں گی ۔

چاندنی ۔ قوسِ قزح ۔ عورت، شگوفہ ۔ لالہ زار　　علم کا کب انکے شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار
روشنائی میں کہیں کھلتی ہے موجِ آفتاب　　کیا کوئی اوراقِ گل پر طبع کرتا ہے کتاب
مہرِ عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا شعار　　کاکلِ افسانہ ہو دوشِ حقیقت سے دوچار
حسن کا آغوش رنگین، دلفریب و دلربا　　علم سے بجائے اقلیدس کا صرف ایک دائرہ
مصحفِ روئے کتابی روکشِ نازِ گلاب　　اور بجائے لغت یا دفترِ علم حساب
نغمۂ شیریں کے دامن میں ہو شورِ کائنات　　بزم کاوش میں جلے شمع شبستانِ حیات

وہ صرف عورت سے یہ توقع رکھتا ہے کہ مردوں کی تہذیب کو برقرار

رکھنے کیلئے وہ ایک آلہ کے طور پر کام کرے۔

اس فاشی رجحان کو پوری وضاحت سے سمجھنے کیلئے جرمنی و اطالیہ کے نئے ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ ڈاکٹر گوئرنگ جو جرمنی کی سیاسی تحریک کی اہم شخصیت ہونے کے علاوہ ایک کامیاب ادیب بھی ہے عورت کی بابت یہ خیالات رکھتا ہے۔

"عورت کی جگہ اُس کا گھر ہے۔ اُس کا فرض صرف یہ ہے کہ وہ تھکے ہوئے سپاہی کیلئے تفریح و راحت مہیا کرے۔

اطالیہ کے مشہور فاشی اخبار۔ پوپولی ڈی اٹیسلیہ میں ایک فاشی شاعر کے اس خیال کو تمام اطالوی دوشیزاؤں کیلئے بطور نصیحت پیش کیا گیا تھا۔

"عورت کا کام یہ ہے کہ وہ حسین ہو اور دُنیا میں لڑکے پیدا کرتی رہے . . . . نسواتی چڑیا مرد کے لئے خود کو آراستہ کرتی ہے اور اُس کے لئے انڈے دیتی ہے۔ مرد صرف ملک کا محافظ ہے . . . . علم کی ضرورت ملک کے تحفظ کے لئے ہے اس لئے
۲۰ مرد کو اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ یہ حسین تتلیوں کا فرض نہیں ہے"

فاشی ذہنیت رکھنے والے شعراء میں یہی نہیں کہ صرف جوش یا اُن کے ہمنوا نظم گو شعراء ہی آجاتے ہیں بلکہ یہ گروہ اُن تمام افراد پر مشتمل ہے جو قدیم جاگیرداری سماج کے مجلسی تصور کو ایک مقدس قدر تسلیم کرتے ہیں یہ ضرور ہے کہ اُنہیں خالص فاشیت نواز نہیں کہہ سکتے مگر نیم فاشی کہنے میں بھی تامل نہیں کیا جا سکتا۔

فاشی و نیم فاشی رجحان رکھنے والے شعراء کی تعداد بہت وسیع ہے قدیم یاسیت کے ردّعمل میں جتنے نئے شاعر آگے بڑھے ان کی فاشیت نیم فاشی رجحان رکھتی ہے۔ پُرانے شعراء کے مقابل ان کے " . . سیاسی سماجی اور اقتصادی نظریے یہ ہیں:۔

(۱) یہ رومانی شاعری میں پُرانے سماجی بندھنوں سے ناراض ہیں اور اس راہ میں سرمایہ دارانہ عہد کی تمام رعایتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن اجتماعی حیثیت سے سماج کی تعمیر کسی ایسے طرز پر پسند نہیں کرتے جو عورت کی موجودہ حالت میں تبدیلی پیدا کردے۔ اختر شیرانی اور دوسرے نوجوان شعراء اسی نقطۂ نظر پر قائم ہیں۔ بلاشک ان کے اس نظریاتی تضاد

یہاں کی اس نیم فاشیت کا بڑا سبب پُرانی جاگیرداری کی محبت۔ وقت کے نئے مطالبات کا احساس اور ساتھ ہی نئے سائنٹفک نظریوں کا ان تک نہ پہنچنا ہے۔

(۲) دوسرا گروہ جو سیاسی و اقتصادی مسائل سے بحث کرتا ہے عام طور پر قومیت سے متاثر ہے۔ بین الاقوامیت اس پر اثر نہیں ڈالتی یوں اکثر پُرانے شعراء کے طرز پر یہ بھی "انسانیت" کو اپنا موضوع بناتا ہے، لیکن اس گروہ کی انسانیت۔ رومانی اور خیالی چیز ہے جسے خارجی دُنیا کی زندہ حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا اقتصادی نقطۂ نظر بہت انقلابی ہے۔ سرمایہ داری کی تباہیوں کا اس طبقہ کو پوری طرح احساس ہے۔ یہ اُس کے خلاف بیرحمانہ تنقید کرتا ہے مگر ساتھ ہی قومیت میں پوری طرح اعتقاد رکھتا ہے اور سوسائٹی کا مجلسی ڈھانچہ بہت کچھ پُرانے اصول پہ بنانا چاہتا ہے۔ عورت جو آجتک رومانی شاعری کا مرکزی نقطہ رہی۔ اسکے خیال میں بھی محض ایک حسین تتلی ہے اور کچھ نہیں۔ اس طرح سرمایہ داری کے مخالف ہوکر تو منطقی طور پر بین الاقوامیت کی تائید کرنا مگر اپنے غیر منطقی جذبات سے مجبور ہو کر مستقل قوم پرست رہنا۔ اور موجودہ سماج کی معاشری قدروں سے ناراض ہونیکے باوجود عورت کو وہی درجہ دینا جو پُرانے جاگیرداری شعراء نے مقدر کردیا تھا۔ اتنے منطقی تضاد ہیں کہ ان کے مجموعہ کو صرف فاشیت ہی کہہ سکتے ہیں۔

ان شعراء تک نئے سائنٹفک نظریے اُردو ادب کے موجودہ انقلابی اور پرولتاری رجحان کی وجہ سے چھن چھن کر پہنچے ہیں ان نظریات کی برہانی اور دلائلی حیثیت کو چیلنج کرنے کی ان میں جرأت نہیں لیکن چونکہ ذہن لاشعوری . . . . دماغ جاگیرداری کے اثرات کو آجتک چھپائے ہوئے ہے اور انجان طور پر وہ اُن کی زندگیوں۔ ذہنیتوں اور ادبی سرگرمیوں پر اثر ڈالتا رہتا ہے اس لئے وہ مجبور ہوتے ہیں کہ پُرانے سماجی نظریوں کو صحیح تسلیم کرتے رہیں۔

(۳) ایک طبقہ ان انقلابی شعراء کا وہ ہے جو نئی دُنیا کے مطالبات نئی سائنس کے نتائج۔ آج کے سماج کے رجحانات۔ فکری ساخت۔ اقتصادی دباؤ۔ حیاتیاتی اثرات۔ پُرانے عناصر کی دن بدن ناپیدگی وغیرہ کے درمیان باہمی ربط اور اس ربط کے منطقی نتیجوں کو جانتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب بھی

اسی طرح نئے حالات کی پیداوار ہیں جیسے پہلے دونوں طبقوں کے شعراء مگر ان میں اور سابقہ رجحانات رکھنے والے ادیبوں میں یہ واضح فرق ہے کہ وہ پیداشدہ حالات کے منطقی ربط کو نہیں سمجھتے نہ ہی وہ اُن کمزوریوں کو محسوس کرتے ہیں جو ان کے دماغ کی گہرائیوں اور اندھیرے گوشوں میں جاگیرداری سماج اور جاگیرداری ادب نے چھوڑ رکھی ہیں۔ اوّل الذکر شعراء انقلابی خیالات کی پُر پیچ وادیوں میں ٹھوکریں کھاتے ہیں اور نہیں سمجھ سکتے وہ کیا چاہتے ہیں اور اُن کو کیا چاہنا چاہیئے۔ مگر ثانی الذکر واقعات کی علمی بُنیادوں پر تشریح کرتے ہیں وہ اسی طرح اپنی کمزوریوں پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں جیسے سوسائٹی پر اعتراضات کرنے کے عادی رہے ہیں۔ انہیں ماحول نے اپنی اچھائیوں اور بُرائیوں کی گود میں پالا تھا اور امید کی تھی کہ وہ دونوں کی برابر نمائندگی کرینگے۔ مگر یہ اس نمائندگی سے باغی ہو کر اُس کی بُرائیوں پر خود حملے کرنے لگے۔ لیکن فاشی شعراء اپنے ماحول کی بُرائیوں کی تنقید کرنے کی جرأت نہیں رکھتے اور صرف ملک کے موجودہ انقلابی و رجعت پسندانہ ماحول کے نقیب رہنا چاہتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ فاشی شعراء کا عام اثر سنہ ۱۹۳۶ء تک رہا جبکہ اسپین کی سول وار شروع ہوئی۔ اس شہری جنگ کا اثر ہندوستانی انقلابی حلقوں نے بھی محسوس کیا لیکن یہ فاشی شعراء جنہیں انقلابی کہا جاتا تھا اس بین الاقوامیت سے ذرا متاثر نہ ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۹ء کی جنگ میں بین الاقوامیت نے پھر اثر ڈالا لیکن یہاں بھی یہ واقعات کو محض قومی نقطۂ نظر سے دیکھتے رہے۔ روس پر جرمنی حملہ نے پرولتاری دُنیا میں ہلچل ڈالدی مگر ہندوستان کے انقلابی شعراء جو ذہناً فاشی تھے وہی اپنا قومی نظریہ پیش کرنے میں مشغول رہے کہ ان کی انقلابیت اس حد سے آگے جاتے ہوئے لرزتی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اس جنگ کے بعد یا انہیں خود پیچھے ہٹ جانا پڑے گا یا یہ کھُل کر رجعت پسندی کے نقیب ہوں گے۔



(بقیہ مضمون صفحہ ۲۴) مسولینی کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ شخصیاتی نظام اشتراکیت اور اقتصادی اعتدال پسندی پر فوقیت رکھتا ہے۔ اطالوی نظام میں ہر حلقہ کے لئے صرف ایک انجمن کی قانوناً اجازت ہے۔ اسکے فیصلے متعلقہ تجارت کے تمام مزدوروں ــ خواہ وہ اسکے رکن ہوں یا نہ ہوں پر عائد ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ تمام نظام مکمّل طور پر حکومت اور فسطائی جماعت کے ماتحت ہے۔ اس قسم کی انجمنیں غیر فسطائی ممالک میں بھی موجود ہیں۔ اور نہ یہ اقتصادی اعتدال پسندی کے متضاد ہیں۔

اشتراکی اس نظام کی مخالفت میں یہ کہتے ہیں کہ دو سو سال تک اعتدال پسندی اور جمہوری اداروں نے سرمایہ داروں کے مقاصد کے حصول میں مدد دی ہے اور مزدوروں کو صرف سیاسی مراعات پر قانع رکھا ہے اور انہیں اقتصادی مراعات کے قریب تک نہیں آنے دیا۔ لیکن جب مزدور سیاسی نظام پر قابض ہونے کے قابل ہو گئے تو سرمایہ داروں نے جمہوری اداروں کو ترک کر دیا اور فسطائی نظام اختیار کر لیا۔ مزدوروں کی توجہات کو قومیت اور وطنیت کی طرف منتقل کر کے اقتصادی مفادات پر سرمایہ دار بدستور قابض رہنا چاہتا ہے۔ فسطائی اس اعتراض کے جواب میں اپنا یہ نظریہ ریاست پیش کرتے ہیں کہ تمام افراد کے پیش نظر صرف ایک مقصد۔ قومی استحکام۔ ہونا چاہیئے۔ قومی ترقی کو وہ ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ موجودہ حالات میں وہ شخصی تجارت کو پیداوار کا بہترین نظام قرار دیتے ہیں۔ چونکہ اشتمالیت بین الاقوامیت کی علمبردار ہے یعنی قومیّت کے بالکل برعکس ہے اس لئے فسطائی اس کے خلاف ہیں۔

آراء کے اتنے اختلاف کی موجودگی میں حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اطالیہ کا شخصیاتی نظام قائم ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ نئے حالات کے مطابق اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم اس موقعہ پر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس نظام نے اطالیہ کی اقتصادی حالت کو بہت زیادہ بہتر اور مضبوط کر دیا ہے۔ اس نے معیارِ زندگی میں بھی کچھ ترقی پیدا کی ہے اور لکھوکھا مزدوروں کیلئے کام کے بعد تفریح کا سامان بھی بہم پہنچایا ہے۔ ہر قسم کی سٹرائکیں اور در بندیاں ختم ہو گئی ہیں۔ اطالیہ کی مالی حالت بہت سدھر گئی ہے اگرچہ قومی مفاد کو ہر امر پر فوقیت حاصل ہے تاہم مزدوروں کی آوازمیں بھی طاقت اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔

صرف مستقبل ہی ہمیں اس اطالوی تجربہ کے حقیقی محاسن و معائب سے آگاہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس نظام میں بعض تعمیری خوبیاں موجود ہیں اور پارلیمانی جمہوریت کو بدلتی ہوئی دُنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے ان تعمیری پہلوؤں سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

ایشیا۔ اپریل ۱۹۴۳ء

اکرام قمر۔ بی ۔ اے

اطالیہ کا شخصیاتی نظامِ حکومت

۲۲

موجودہ جنگ جو اصل میں مختلف نظاموں اور نظریوں کی جنگ ہے کچھ ایسے نتائج کی طرف ذہن کا رُخ پھیرتی ہے جن پر حیاتِ انسانی اور دنیا کے مستقبل کا دار و مدار ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ انگلستانی جمہوریت سماج کے دکھوں کا علاج ثابت نہیں ہو سکی۔ پھر بھی اس میں لچک ہے اور وہ تبدیلی و ترقی کے امکانات اپنے اندر رکھتی ہے لیکن انجمنی نظام حکومت ایک قہرمانہ نظام ہے جسکی باگ ڈور ایک جبّار مطلق کے ہاتھ میں ہے۔

فسطائیوں اور کارپوریشنوں کا اک ایوان ہے جس میں ۶۸۲ "نیشنل کونسلر" ہیں۔ دو تہائی سے زیادہ ارکان کارپوریشنوں کے نمائندے ہوتے ہیں، ان کے علاوہ عام طور پر سنڈیکیٹوں کے عہدہ دار ہوتے ہیں۔ عہدہ اور منصب کی حیثیت سے بھی بہت سے رکن اس ایوان میں شامل ہیں۔ مگر کسی کا شمول اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مسولینی منظور نہ کرے۔

اسی طرح ایوان کی تجاویز سینکڑوں مدارج طے کر کے قائد اعظم مسولینی تک پہونچتی ہیں جو یہ فیصلہ کرنیکا مجازِ قطعی ہے کہ بادشاہ اسے منظور کرے یا نہ کرے۔ !؟

شخصیاتی نظامِ حکومت میں مزدوروں کی دکھاوے کی شرکت ضرور ہے۔ امپیریلزم کے مقابلہ میں ان کے مسائل کا کچھ نامِ نہاد حل اسی نظام میں پایا جاتا ہے۔ مگر شخصیاتی نظامِ اشتراکیت اور اقتصادی اعتدال پسندی پر ہرگز فوقیت نہیں رکھتا۔

تمام نظام اور اس کے ضمنی اداروں پر کامل طور پر فسطائی جماعت کا اقتدار ہے، فرد کی آزادی، جماعت کی آزاد خیالی، ہر جوہر پامال کر دیا گیا ہے۔

بہرحال سیاسی معلومات اور مختلف نظاموں میں مقابلہ کرنے اور نتیجے نکالنے کے لئے اس سے واقف ہونا ایک علمی ضرورت ہے۔ (مناظر)

شخصیاتی (Corporate) نظامِ حکومت میں فرد کی حیثیت کچھ نہیں ہوتی بلکہ افراد کو ان کے پیشہ کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور حکومت ان گروہوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان انجمنوں یا کارپوریشنوں کے ذریعہ افراد امورِ مملکت میں حصّہ لیتے ہیں۔ فرد کی حیثیت و [illegible] کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ وہ ملک کیلئے کتنی پیداوار کرتا ہے۔

اس نظام حکومت میں اور کسی اشتراکیت (سنڈیکلزم) اور گلڈ اشتراکیت میں نمایاں فرق ہے۔ مؤخر الذکر دونوں نظاموں میں پیشہ وروں کی انجمنوں کو مساوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ پیشہ ور یہ انجمنیں خود رضا کارانہ طور پر بناتے ہیں اور یہ انجمنیں حکومت کے دائرۂ اقتدار سے آزاد ہوتی ہیں لیکن شخصیاتی نظام میں ایسا نہیں ہوتا یہاں یہ انجمنیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں قوم اور ملک کو ہر چیز پر فوقیت دی جاتی ہے مشترکہ مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح حاصل ہوتی ہے اور آزادی کی بجائے ضبط و نظم پر زور دیا جاتا ہے۔

اطالیہ میں اس نظام کا تجربہ کیا جا رہا ہے مسولینی نے جب اطالیہ میں اقتدار حاصل کر لیا تو اس کے سامنے سب سے پہلا سوال اپنے قوت و اختیار کو مضبوط کرنا تھا (جو اصحاب یہ جاننا چاہتے ہوں کہ مسولینی کس طرح برسرِ عروج آیا وہ میری کتاب "آمریت" کا مطالعہ کریں جو مکتبہ اردو لاہور کی طرف سے شائع ہو رہی ہے) کمیونسٹوں اور فسطائیت کے تمام مخالفوں کو کچلنے کے بعد اس نے اپنی توجہ اقتصادی ترقی کی طرف منعطف کی۔

مسولینی برسرِ حکومت آنے سے قبل ایک کٹر اشتراکی رہ چکا تھا اور ابھی تک اسے مزدوروں سے ہمدردی تھی لیکن اس کے جذبۂ قومیت اور اطالیہ کے استحکام کی خواہش نے اس کے اشتراکی جذبہ کو دبا دیا تھا۔ مگر وہ کبھی مزدوروں کے خلاف برسرِ پیکار نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنے اشتراکی

جذبہ کو وقتی حالات اور ملکی مفاد کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

مشہور "منشورِ مزدوران" میں اس نے شخصی ملکیت کو جائز قرار دیا ہے اور شخصی تجارت کو پیداوار کا بہترین نظام کہا ہے۔ مالک اور مزدور دونوں ہی قوم کے لئے لابدی اور باہم لازم و ملزوم ہیں۔ انہیں ایک ٹیم کی طرح کام کرنا چاہیئے۔ ان کے مدّنظر ذاتی منافع یا تنخواہ کی زیادتی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان کی نگاہ ہمیشہ قومی استحکام پر مرکوز رہنی چاہیئے۔ اس منشور میں مزدوروں کی اسٹرائک اور کارخانوں کی دربندی (Lock out) کو خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ ان سے قومی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے ان کو قابلِ سزا سمجھا گیا ہے۔

اطالیہ کے شخصیاتی نظام کی بُنیادیں اطالوی مزدور تحریک کی گزشتہ کسبی اشتراکی تاریخ پر مشتمل ہیں اور اس کا اصول مسولینی کا یہ نظریہ ہے کہ طبقاتی کشمکش ترقی پسند قوّتوں کے راستہ میں حائل ہے۔ لیکن مسولینی نے اس نظریہ کے ساتھ ہی مزدور اور سرمایہ دار مفادات کا تضاد و نزاع بھی تسلیم کیا ہے اس نظریہ کی عملی صورت دو متوازی ادارے ہیں۔ ایک مزدوروں کی سنڈیکیٹ ہے اور دوسری مالکوں کی۔ ان دونوں اداروں کے درمیان فسطائی جماعت ایک ثالث کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان اداروں کے قیام نے انجمنی نظام کے قیام میں مدد دی ہے۔

اس نظام کی اساس ۱۹۲۶و۲۷ء میں رکھی گئی اور تین قوانین رائج کئے گئے یعنی کسبی اشتراکی یا ٹریڈ یونین قانون ۱۹۲۶ء، یکم جولائی ۱۹۲۶ء کا اعلان، اور اپریل ۱۹۲۷ء کا منشور مزدوران۔ ان قوانین کی رو سے مالکوں اور مزدوروں کی انجمنوں یا سنڈیکیٹوں کی علیحدہ علیحدہ کانفڈریشنیں قائم کی گئیں۔ ایک جنرل کونسل بنائی گئی اور ایک وزارت ان کارپوریشنوں کے انتظام و نگرانی کے لئے بنائی گئی۔ لیکن دو تین سال تک ان کارپوریشنوں نے اطالیہ کی اقتصادی زندگی پر بہت کم اثر کیا۔ ۱۹۲۶ء میں کارپوریشنوں کی قومی مجلس قائم کی گئی تھی اور یہ کونسل مذکورہ وزارت کی صرف ایک جماعت شوریٰ تھی۔ اس مجلس کو ۲۰ر مارچ ۱۹۳۰ء کے قانون کی رو سے بالکل نئی بُنیادوں پر منظم کیا گیا۔ اب اس قومی مجلس کا دائرۂ عمل و اقتدار بہت وسیع ہے۔ منشور مزدوران کے اصولوں کو شخصیاتی نظام کے ارتقا اور پیداوار کی ضروریات کے مطابق عملی جامہ پہنانا اس مجلس کے فرائض میں داخل ہے۔ قومی پیداوار کے ہر مسئلہ پر یہ مجلس اپنی رائے دیتی ہے۔

۱۹۳۳ء میں مسولینی نے اعلان کیا کہ اب کسبی اشتراکی (سنڈیکلسٹ) پہلو مکمّل ہوگیا ہے اس لئے اب شخصیاتی نظام کی طرف توجہ کی جائے۔ چنانچہ ۱۳ر جنوری ۱۹۳۴ء کو ایوانِ اعلیٰ نے انجمنوں یا کارپوریشنوں کے قیام کیلئے ایک قانون منظور کیا۔ ۴ر فروری ۱۹۳۴ء کو ایک اور قانون بنایا گیا۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے مختلف احکام جاری کئے گئے۔ فروری کے قانون اور ان احکام کی رو سے مزدوروں اور مالکوں کی جماعتوں میں ارتباط پیدا کرنے کے لئے کارپوریشنیں بنائی گئیں۔ تجارتی پیشہ ور یا صنعتی انجمنوں کا ایک حلقہ ملکر ایک کارپوریشن بناتا ہے۔ یہ کارپوریشن ایک بورڈ۔ کونسل آف کارپوریشن۔ کے ماتحت ہوتی ہے۔ ان بورڈوں کے اراکین ملحقہ جماعتیں منتخب کرتی ہیں اور کارپوریشنوں کے شعبہ کے وزیر کی سفارش پر حکومت انہیں نامزد کرتی ہے۔ ہر بورڈ میں صنعتی تجربہ کار اور فسطائی جماعت اور حکومت کے نمائندے لئے جاتے ہیں اور مسولینی کے قول کے مطابق یہ اراکین خریداروں کے مفاد کی نگہداشت کرتے ہیں

۲۴ ۱۵ر نومبر ۱۹۳۴ء کو ۲۲ کارپوریشنوں کی کونسلیں قائم کی گئیں۔ اس وقت مسولینی کے پیشِ نظر ایک ایسی آئینی تنظیم تھی جو تجارتی اتحاد کے ہر قسم کے فائدہ پر منتج ہو لیکن ضرر رساں سیاسی جمہوریت کا باعث نہ ہو۔

یہ بائیس کارپوریشنیں تین حصّوں میں تقسیم کی گئی تھیں:۔

(۱) زراعتی، صنعتی اور تجارتی کارپوریشنیں۔ (۲) صنعتی اور تجارتی کارپوریشنیں۔ اور (۳) سرکاری ملازموں کی کارپوریشنیں۔

ان کارپوریشنوں کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے۔ اقتصادی تعلقات کی تنظیم اور پیداوار کا اتحادی نظم اسکے فرائض میں شامل ہے۔ شروع شروع میں تو ان کارپوریشنوں کے فیصلوں کے لئے کارپوریشنوں کی قومی مجلس کی منظوری لازمی ہوتی تھی اور یہ صرف سرکاری حکم ہی سے قوانین کی صورت اختیار کر سکتے تھے۔ ۱۸ر اپریل ۱۹۳۷ء قانون کی رو سے اس دستور کا پہلا حصّہ بدل دیا گیا۔ اور بجائے کارپوریشنوں کی قومی مجلس کے سنٹرل کارپوریشن کمیٹی کی منظوری لازمی قرار دی گئی۔ اوّل الذکر مجلس ایک بہت بڑی جماعت اور مؤخر الذکر کمیٹی ایک چھوٹی سی جماعت ہے۔ یہ کمیٹی اراکین کابینہ، فسطائی جماعت کے سکریٹری، بائیس کارپوریشنوں

ایشیا۔ اپریل ۱۹۴۲ء

کے نائب صدروں، مالکوں اور مزدوروں کی قومی کانفڈریشنوں کے صدروں اور دوسری جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے ۔

شخصیاتی نظام نے آخری شکل ۱۹۳۹ء میں حاصل کی۔ یعنی فسطائیوں اور کارپوریشنوں کا ایک ایوان بنایا گیا ۔ اس نئے ایوان کا افتتاح شاہِ اطالیہ نے ۲۳ مارچ ۱۹۳۹ء کو کیا ۔ اسکے ارکان کی تعداد ۶۸۲ تھی ۔ انہیں نیشنل کونسلر کہا جاتا ہے ۔ دو تہائی سے زیادہ ارکان کارپوریشنوں کے نمائندے ہوتے ہیں اور عموماً سنڈیکیٹوں کے عہدہ دار ہوتے ہیں ۔ بہت سے رکن اپنے عہدہ کی حیثیت سے اس ایوان میں شامل ہیں ۔ لیکن ان کے نام قائد اعظم مسولینی منظور کرتا ہے ۔ اس ایوان نے ایوان نمائندگان کی جگہ حاصل کرلی ہے ۔ ایوان نمائندگان کو ایوانِ اعلیٰ سے جو تعلق تھا وہی اس ایوان کو ہے ۔ ایوانِ اعلیٰ کو اگرچہ ابھی تک بادشاہ ہی نامزد کرتا ہے لیکن اس نئے ایوانِ اعلیٰ میں فسطائیوں کو ایک عظیم اکثریت دے رکھی ہے ۔

اس نئے ایوان کا کام خالصۃً مشاورتی ہے ۔ حکومت تجاویز پیش کرتی ہے ۔ دونوں ایوان ـــ یعنی نیا ایوان اور ایوان اعلیٰ ـ اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اپنا مشورہ دیتے ہیں ۔ نئے ایوان کے عام اجلاس بہت کم ہوتے ہیں اور تجاویز پر اس ایوان کی کمیٹیاں غور کرتی ہیں یہ کمیٹیاں ان میں ترامیم کرسکتی ہیں ۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ حکومت ان تبدیلیوں کو منظور کرلے ۔ ان کمیٹیوں کے غور کے بعد یہ تجاویز ایوانِ اعلیٰ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں ۔ ایوانِ اعلیٰ کے بعد تجاویز قائد اعظم کے پاس آتی ہیں جو یہ فیصلہ کرتا ہے کہ بادشاہ کو یہ منظور کرنی چاہئیں یا نہیں لیکن بعض تجاویز پر ـــ جو آئین، میزانیہ، عدالتی نظام، تعزیرات میں ترامیم کے متعلق ہوتی ہیں ـــ نئے ایوان کا عام اجلاس غور کرتا ہے ۔ مگر ضرورت کے وقت یہ تجاویز بھی کمیٹیوں میں پیش کی جاتی ہیں ۔

اشتمالیت کو اطالیہ میں ختم کرنے کے بعد مسولینی نے مزدوروں کی حمایت کرنی چاہی ۔ اسے یہ اعتراف تھا کہ ان کے تعاون کے بغیر اطالیہ ترقی نہیں کرسکتا ۔ کسی کارخانہ کے مزدوروں کی انجمن قائم کرنے کے لئے اس کارخانہ کے مزدوروں کے کم از کم دسویں حصّہ کو اس انجمن کا رکن ہونا چاہئیے اور اس انجمن کو اپنے حلقہ کا واحد نمائندہ سمجھا جاتا ہے ۔ انجمن کے عہدیداروں کو راسخ العقیدہ فسطائی ہونا چاہئے ۔ ان کے انتخاب کے لئے حکومت کی منظوری لازمی ہے ۔ کارخانہ کے تمام مزدوروں سے خواہ وہ اس کے ممبر ہوں یا نہ ہوں چندہ لیا جاتا ہے اور ہر موقعہ پر اسی انجمن کو ان سب کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے ۔ سالانہ چندہ ایک دن کی تنخواہ ہے اسی طرح مالکوں کی تنظیم کی گئی ہے ۔ مالکوں اور مزدوروں کو مساوی حیثیت حاصل ہے اور ان کی اہمیت اس امر پر مبنی ہے کہ وہ قومی بہبود و ترقی کے لئے کہاں تک ممد ثابت ہوتے ہیں ۔

مالکوں اور مزدوروں کی ان انجمنوں کا کام ان دونوں طبقات کے تعلقات کو سلجھانا اور مضبوط کرنا، تنخواہیں مقرر کرنا اور محنت کی شرائط کو بہتر بنانا ہے ۔ ان کے فرائض کار بہت وسیع ہیں ۔ جب کبھی مزدوروں اور مالکوں میں کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو ان دونوں کے نمائندے سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور اختلاف و نزاع کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہیں تو معاملہ لیبر کورٹ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ـــ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے ۔

ملک میں سب سے زیادہ مقتدر اور با اختیار ادارہ فسطائی مجلس کبیر ہے ۔ یہ کارپوریشنوں کی قومی مجلس کے نام ہدایات جاری کرتی ہے اور اس طرح ملک کی اقتصادی پالیسی کی رہنمائی کرتی ہے ۔ تمام فسطائی ادارے اسکے ماتحت ہیں ۔ قائد اعظم کا جانشین چننے کا اختیار اسے حاصل ہے یہ مجلس کبیر قائد اعظم، وزراء، کانفڈریشنوں اور کارپوریشنوں کے صدروں اور فسطائی جماعت کے سکرٹری پر مشتمل ہے ۔ اس کا مقصد ملک کے تمام مفادات کو متحد کرنا ہے ۔

اگرچہ فسطائی جماعت اور حکومت کو بہت زیادہ اختیارات حاصل ہیں تاہم یہ کارپوریشنیں صنعت اور پیداوار کی ترقی کے لئے بہت مفید ثابت ہوسکتی ہیں ۔

اگرچہ شخصی تجارت کو براہِ راست ختم نہیں کیا گیا تاہم جس طرح اقتصادی تنظیم کو حکومت اور فسطائی جماعت کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ تجارت پر حکومت کا اثر و اقتدار بڑھ گیا ہے اور اس سے بھی زیادہ حکومتی مداخلت کا امکان عملی طور پر بہت زیادہ اغلب ہوگیا ہے ۔

لیکن یہ نظام بہت زیادہ دفتری صورت اختیار کرگیا ہے اور تاجر طبقہ اس سے بہت نالاں ہے ۔ (باقی مضمون دیکھو صفحہ ۱۲ پر)

مرزا ارشاد بیگ

ادب میں ارتقائی احساسات

انسانی زندگی معرضِ انقلاب میں ہے، یہ انقلاب زندگی کی حقیقت ہے۔ ادب اس حقیقت سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ادب زندگی پر ترقی یافتہ تخلیقی قوتوں کے عمل اور ردِ عمل کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ یہ اندازہ کرتا ہے۔ پسِ پردہ کارفرما تغیر کی وجہ سے انسانی زندگی کیا صورت اختیار کر رہی ہے — ؟ کون سے تصورات مٹ رہے ہیں اور کون سے ذہنی افق پر ہویدا ہو رہے ہیں؟ ادب، انسانی علم و ادراک، عقائد اور خیالات پر قطع و بُرید کے عمل کو پسِ پشت نہیں ڈال سکتا۔

روایاتی تصورات، اور ارتقائی احساسات میں ایک تصادم جاری رہتا ہے، انسان اپنی احساساتی کیفیات، عملی حقیقتوں اور ماحول عمل کو اس تصادم سے مختلف پاتا ہے۔ اس کے شعور کو بھی روایاتی احساسات کچھ ایسا ہی یقین دلاتے ہیں۔ اصل میں تصورات کی نوعیت (Static) سکونیاتی ہے اور احساسات کی حرکتی (Dynamic)۔ اگر احساسات بھی سکونیاتی ہوتے زندگی میں روحِ ارتقاء مُردہ ہو جاتی۔

ادب کو (Scientific) اور (Accurate) بنانے کے لئے تخلیقی و ارتقائی احساسات کی روشنی سے خیالات و تصورات کو اخذ کرنا ضروری ہے۔ تصورات کو ارتقائی احساسات سے الگ کرنا درخت کو زمین سے اکھیڑ پھینکنے کے مترادف ہے۔ جس طرح درخت زمین سے جدا ہو کر نشو و نما سے رشتہ توڑ لیتا ہے اور سوکھ جاتا ہے اسی طرح تصورات، احساسات سے جُدا ہو کر زندگی سے (Alien) رہ جائینگے۔

وہ ادب جس کی بُنیاد روایاتی تصورات و شعور پر قائم کی جاتی ہے یا جو محض تصورات کی پرواز ہے تخلیقی زندگی کی باگ نہیں تھام سکتا ایسا ادب صحت و صداقت اور عملی حقیقتوں سے دور جا پڑتا ہے۔

اگر ثریا نے رجعت پسند ادب نے روایاتی شعور و تصورات کو ترک نہیں کیا تھا تو نئے ادب نے بھی اپنی بُنیاد۔۔ کو۔ غلط اور گمراہ شعور پر استوار کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ دونوں ارتقائی تخلیقی احساسات کے حقیقی مطالعہ اور جائزہ سے اپنے شعور و تصورات کی صحیح تشکیل نہ کر سکے۔

ایک اور نکتہ بھی ہے۔ تصورات اور شعور کو احساسات کا مترادف (Synonymous) نہیں بنانا چاہئے۔ ان کی تمنیں احساسات کے مطالعہ کے بعد مقرر کرنی ضروری ہیں، تصورات ہمارے کچھ ادا ہوتے ہیں۔ ہماری (Impulses) کچھ اور (Impulses) کو یا زندگی کو دبانا ہے۔ تصورات کا دبانا زندگی کے لئے اتنا مضر نہیں ہے اور چونکہ

۲۵ اور چونکہ Phenomena ارتقائی تخلیقی زندگی کا آئینہ ہیں۔ اس لئے خیالات اور تصورات کو بھی اُن سے ہم آہنگ کر لینا چاہئے ایسا نہیں ہوگا تو تصورات سکونیاتی رہ جائینگے۔ احساسات کا ارتقا نہ ہو سکے گا اور صحیح زندگی پیدا نہیں ہوگی۔ احساساتی مکتبِ خیال کا مقلدِ اولیں ادب کو زندگی کا حقیقی ترجمان بنانا ہے۔

جو ارتقائی ذہن اور احساسات کے مطالعہ پر قادر ہے آرٹ اور ادب کی شاہراہ اس کے لئے کھلی ہوئی ہے، وہ مظاہرِ فطرت کی صناعت کاریاں اور ماحول کے حالات کی تصویر انسانی ادب کے نام سے پیش کر سکتا ہے لیکن سوال ایک اور بھی ہے کہ کیا ادب محض نقوش اور اشکال کا نام ہے .... ادب کا نام دینے کے لئے ان نقوش اور اشکال میں اپنے احساسات کو داخل کرنا ہوگا۔ ماحول اور مشاہدات کو اپنے نفس کی کیفیتوں کے پیرایہ میں بیان کرنا ہوگا۔ احساسات سے الگ ادب کوئی چیز نہیں۔

جبتک ہمارے احساسات اور ذہن کی ارتقائی صلاحیتیں نشو و نما نہ پائیں ہم ماحول اور گرد و پیش کے مشاہدے میں نئے معنی

اور مفہوم نہیں ظاہر کر سکتے۔" وہ نفسی اور طبعی قواعد وضوابط دریافت کرتا جو افعال انسانی کے ذمہ دار ہیں۔" ادب کا مرکزی نکتہ ہے نفسی اُتار چڑھاؤ۔ میلانات و رجحانات کی کامل ترجمانی۔ غیر شعوری احساساتی کیفیتوں، رجحانات اور ذہنی تخلیقی قوتوں کی شعوری تشکیل ادب کا معراج ہے۔ زندگی کی کائنات غیر شعوری نفسی کیفیتوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس روشنی کو لیکر زندگی کو تلاش کرو۔ موجودہ ادب کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ مشاہدات۔ اشکال اور روایاتی مسائل کا ایک انبار اپنے گرد جمع کرلیتا ہے اور اس انبار میں زندگی کی حقیقی نمود و اضطراب اور تخلیقی صلاحیتوں کو دبا دیتا ہے۔ آرٹ اور ادب کا میدان ان وسیع حدود اور شعوری وسعتوں میں نہیں۔ ادب کی جولانگاہ وہ چھوٹی سی وسعت ہے جسے قلب کہا جاتا ہے۔ گرد و پیش کی زندگی اور مسائل اسی کے پرتو سے واضح نظر آنے لگتے ہیں۔ احساسات سے آنکھیں بند کرکے اگر زندگی کے مسائل اور کائنات کے ہر نقش پر غور کیا جائیگا تو کبھی صحیح مسائل، رجحانات اور حقیقتوں کا ایک شمہ آشکارا نہ ہوگا اصل خرابی یہ ہے کہ ہم اپنے روایاتی شعور کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ارتقائی و احساساتی اور غیر شعوری ذہنی حقیقتوں اور تخلیقی قوتوں کو روایاتی شعور پر قربان کردیتے ہیں۔ ہم ان ارتقائی احساسات اور غیر تخلیقی قوتوں کے مطالعہ سے اپنے شعور اور تصورات کو زیادہ صحیح اور ارتقائی انکشافات سے مالا مال نہیں کرنا چاہتے جو اصل میں ادب کی بنیاد ہیں۔

ادب برائے ادب

زندگی میں ارتقائی تخلیقی ذہنی قوتوں کی حقیقت مسلّم ہے چونکہ ہم روایاتی تصورات اور شعور کی وجہ سے ذہن کی اس کیفیت کو دبا دیتے ہیں۔ اس لئے ذہن کی ارتقائی قوتوں اور روایاتی یا اس وقت کے مروجہ ادب میں ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے۔

روایاتی یا سکونیاتی ادب ذہن کی ارتقائی صلاحیتوں سے پست ہوتا ہے۔ اور روایاتی شعور ذہن کی ارتقائی صلاحیتوں کو شعوری حیثیت میں قبول نہیں کرتا۔ اس لئے یہ دبی ہوئی بلند صلاحیتیں اپنی تسکین کے لئے ادب برائے ادب کی شکل میں نکاس ڈھونڈ لیتی ہیں۔ گویا ادب برائے ادب ارتقائی صلاحیتوں کا غیر فطری نکاس ہے۔ روایاتی شعور و تصورات اور ادب سے یہ صلاحیتیں مطمئن نہیں ہوتیں۔ آگے بڑھنا چاہتی ہیں لیکن انسان کی روایاتی عادت اور شعور ان غیر شعوری صلاحیتوں کی سدّ راہ بن جاتا ہے۔ یہ جوہر انسانی شعور میں اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کرپاتا۔ پرانا ادب ذہنی ارتقائی صلاحیتوں کے معیار سے پست ہوتا ہے اور نیا ادب ادب برائے زندگی کے نام سے مزدور۔ وطن اور جنسیات کے سطحی تصور پیش کرتا ہے جو ارتقائی رجحان اور میلان سے دور ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقی گہرائی نہیں پائی جاتی۔ ارتقائی تخلیقی قوتوں اور فطری تشنگی سے ہم آہنگی تو ہوتی ہی نہیں۔ زندگی جامع حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں روحانی۔ رومانی۔ جمالیاتی اور مادی حقیقتیں سموئی ہوئی ہیں۔ صرف رومانی یا مادی پہلو کو اختیار کرنا۔ یا صرف روحانی پہلو کو۔ ادب کو غیر فطری اور مصنوعی بناتا ہے۔ پرانے ادب نے بے بنیاد روحانیت۔ مذہب کا احیاء اور کھوکھلے اخلاق پر زور دیا۔ تو نئے ادب نے سطحی اقتصادیات اور مغربی مادیت کی نقل محض کی۔ مزدور کی کھوکھلی ہمدردی کے گرد انسانی ذہن کو گھمایا۔ جامع زندگی کی حقیقتوں کو کسی نے نہ چھوا۔ پیشرو ادب کو ارتقائی معیار کے مطابق ہمہ گیر۔ جامع اور بنیادی حقیقتوں پر مبنی ہونا چاہیئے۔ زندگی کے فطری قانون کو نظر انداز کرکے سطحی ترقی پسندی کا نعرہ گمراہ روی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ نئے ادب کا مقصد واضح کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔ دنیا بے بنیاد روحانیت میں کھو گئی درست، مگر اس دعوٰی کے ساتھ ہی نئے ادب کو صحیح بنیاد پر حقیقی روحانیت پیش کرنی چاہیئے تھی۔ اور ساتھ ساتھ صحیح مادی مسائل بھی۔ لیکن اس نے روحانیت کو یکسر خارج ہی کردیا۔ اس سے بے بنیاد روحانیت کا علاج تو نہیں ہوا بلکہ مسئلہ سے گریز کیا گیا۔ دوسرے جو مادی مسائل لئے گئے۔ ان کو سطحی اور کھوکھلے طور پر پیش کیا گیا۔ نئے ادب نے یہ تو محسوس کیا کہ پرانا ادب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سے عاجز ہے۔ لیکن جب وہ خود بڑھا تو ایک نیا نسخہ تو پیش کیا۔ لیکن غلط۔ نبض کو دیکھا لیکن مرض نہ سمجھ سکا۔

اقتصادی انقلاب زندگی کے انقلاب کا ایک جزو ہے کل نہیں ہم ابھی وطن۔ وطن پکار رہے ہیں، آج وطنیت اپنی ([illegible]) کا ارتقائی [illegible] کرچکی ہے۔ ہم آزادی کے نعرہ لگاتے ہیں لیکن اس مکدر ماحول میں۔ حالانکہ آج دنیا کے موجودہ ماحول میں آزادی کا مقصد

ہی زائل ہو رہا ہے اور دُنیا یہ محسوس کر رہی ہے کہ آزادی تو ہے لیکن ایک ایسے عالمگیر اور پُر امن ماحول میں جہاں آزادی کا مقصد غارت نہ ہو۔ اور آزادی محفوظ رہے۔ صرف یہ کہنا ہم منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جب تک منزل کا اتہ پتہ اور نشانات نہ بتائے جائیں پس اگر ارتقائی ضروریات اور تخلیقی قوتوں کی صلاحیت کا اندازہ کر کے صحیح مقاصد کا تعین نہ کیا جائے تو ادب برائے ادب کا سوال برابر پیدا ہوگا اگر انسان کی صلاحیتوں کو حقیقی ارتقائی میدان مل جائے تو ارتقائی ذہن بے بنیاد پرواز میں مشغول نہ ہوگا۔ اور ارتقائی صلاحیتوں کا حقیقی ارتقائی میدان میں نکاس ہوتا رہے گا۔ ادب کو کسی حالت میں بھی محدود نہیں کرنا چاہیئے۔ مثلاً اگر صرف آزادی اور اقتصادیت کے مسائل کو لیا جائیگا اور نظمیں کہی جائیں گی تو گویا شاعر کی روحانی حس کو کچلا جا رہا ہے۔ اس لئے وہ الگ اپنا نکاس ڈھونڈے گی۔ اور وہی زندگی سے فرار کا خدشہ پیدا ہو جائے گا۔ آرٹ اور ادب کو جامع ہونا چاہیئے۔ اور ارتقائی معیار کو Research کرنا چاہیئے۔ سطحی اور مصنوعی میلانات کی طرف ذہن کو موڑنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ زمانہ نے جب کبھی جامع، فطری، بنیادی اور ارتقائی معیار کے مطابق ادبی تخلیق پیش کرنے کے بجائے یک طرفہ محدود مصنوعی۔ سطحی اور سکونیاتی حدود میں ارتقائی صلاحیتوں کو استعمال کرنا چاہا۔ ذہن آرٹ برائے آرٹ کے ذریعہ اپنی تسکین پر مجبور ہوا۔ ادب برائے ادب، ادب برائے زندگی میں تصنّع اور سکونیاتی عنصر کا نتیجہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں آرٹ برائے زندگی کا فقدان ہی آرٹ برائے آرٹ کا محرک اور اس کے وجود کو قائم رکھنے والا ہے۔ ذہنی ارتقا انسان میں نئی تخلیقی ذہنی۔ زرخیزی۔ علاوہ پختگی پیدا کر دیتا ہے اور روایاتی آرٹ برائے زندگی پست اور سکونیاتی نکتہ پر ہی رہتا ہے یا نئے ادب کے نام سے مصنوعی اور سطحی تصوّرات میں کھو جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ذہن کی نئی صلاحیتیں، نئی حقیقت، نئے مذاق اور ارتقائی نفسیاتی کیفیتوں کی متلاشی ہوتی ہیں۔ روایاتی شعور اس تڑپ کو دبا دیتا ہے۔ اگر ادب برائے زندگی قدم قدم پر نئے تاثرات کو قبول کرنے کے لئے اور خود کو ارتقائی معیار کے مطابق بلند ہوتے رہنے کیلئے آزاد چھوڑ دے۔ اور روایاتی شعور کو فراہم نہ ہونے دے تو آرٹ برائے آرٹ کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ اور نئی صلاحیتیں خیالی اور زندگی سے الگ مرقعے بنا کر خود کو مصنوعی تسکین میں سرگرداں نہیں کریں گی کیونکہ ارتقائی صلاحیتوں کو جو تسکین اور رغبت فطری ارتقائی میدان میں حاصل ہو سکتی ہے وہ آرٹ برائے آرٹ کے خیالی میدان اور غیر فطری ماحول میں حاصل نہیں ہو سکتی۔

ادب کا غلط مفہوم

ادب میں آجکل یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اچھوتی طرز تحریر، حسین استعارے اور البیلی بندشیں ہیں یا نہیں گویا جو شخص صرف لکھنا جانتا ہے خواہ اس کے خیالات میں وزن اور اہمیت نہ ہو وہ ادیب اور آرٹسٹ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ادب صرف لکھنے کی مشق ہے۔ تحریر تو ایک ذریعہ ہے اصل چیز وہ تصوّرِ کائنات اور تاثرات و خیالات ہیں جو ادیب ان تحریروں کے ذریعہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ محض تجربہ۔ ٹیکنک۔ اصطلاحی فن ادب نہیں کہلا سکتا۔ یہ تو ادب کے اظہار کا آلہ ہیں۔ آجکل آرٹ اور ادب کتنا سستا ہے جو صرف چُست بندشوں، حسین الفاظ، اور دلکش تحریر کو یکجا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ آرٹ نہ صرف حسین تحریر ہے، نہ محض مصوّری۔ بلکہ وہ خیالات اور تاثرات، وہ ذہنیت جو ماحول کے ردِّ عمل، مشاہدہ اور تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور تحریر کے ذریعہ اپنا اظہار کرتی ہے۔ آرٹ طرزِ انشاء کو پیچھے چھوڑتا ہوا انسان کے دل و دماغ کو گرفت میں لے لیتا ہے، جیسے خوشبو پھول میں سے نکل کر ہمارے دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اس خوشبو کے ہلکے یا تیز ہونے یا لطیف یا کثیف ہونے پر آرٹ کے عروج و زوال کا دارومدار ہے۔ آجکل کے ادیب الفاظ کو بہترین طریقے سے ترتیب دے سکتے ہیں۔ لیکن ان تاثرات احساسات اور خیالات کی حقیقی اور قابلِ قدر خوشبو نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس افسانہ میں حقیقی تصویرِ کائنات یا نظریۂ زندگی کی طرف لیجانے کی صلاحیت نہ ہو۔ اس کی بندش خواہ کتنی ہی اچھی ہوا کرے وہ ایسی خوراک ہے جس میں جراثیمِ حیات نہ ہوں۔ ارتقائی تخلیقی فطری احساسات کی صحیح گرفت کا نام ہی آرٹ ہے

اب تک جو کچھ میں نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب میں

ذہن کی ارتقائی صلاحیتوں اور فطرتی احساسات کو نظر انداز کر کے روایاتی یا سطحی شعور اور تصوّرات کو ان پر غالب نہیں کرنا چاہیئے۔

ادب برائے ادب دراصل علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ادب برائے زندگی کے کھوکھلے پن سطحیّت اور تصنّع اور ارتقائی صلاحیتوں کو شعوری طور پر قبول کرنے میں ناکامی کا ردِّ عمل ہے، یعنی ادب برائے زندگی ہماری ارتقائی ([illegible]) کو مطمئن نہ کر سکا۔ اس لئے ان ([illegible]) کو آرٹ برائے آرٹ میں مصنوعی پناہ لینی پڑی۔

یہ نفسیاتی اصول ہے کہ اگر کسی فطری جذبہ اور تحریک کو دبا یا جائے تو وہ دوسری غیر فطری سمتوں میں نکلنے کی کوشش کریگا۔

اس کے علاوہ ہمیں فطری تخلیقی احساسات اور غیر شعوری ارتقائی ذہن کی مدد سے صحیح تصوّرات اور نظرّیات اخذ کر کے پیش کرنے چاہئیں۔ خود ساختہ نظرّیات گھڑنے نہیں چاہئیں نہ سطحی نظرّیات میں گم ہونا چاہیئے۔ اور اپنے دل کی فطری گہرائیاں ٹٹولنی چاہئیں۔ جو کچھ ہم دُنیا اور زندگی کے متعلق محسوس کرتے ہیں۔ نہ کہ جو کچھ تصوّر کرتے ہیں۔ اپنے تصوّر کو فطری احساسات کے تحت رکھنا چاہیئے۔

آج ہمارے ادب کو ایک کروٹ لینی ہے اور زندگی کی نبض پہچان کر اپنے اندر زندگی کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہے۔ آج وقت کی ضروریات اور صحیح رجحانات اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے ایک پیشرو ادب پیش کرنے کی ضرورت ہے آجتک کا پیش کیا ہوا نیا ادب پیشرو ادب کے درجہ سے بڑی حد تک بھٹکا ہوا ہے ———— ۔

دُکھ سُکھ

دیوندر ستیارتھی

سانپ اور آدمی

بڑ سے کتنی ہی ڈاڑھیاں لٹک رہی تھیں۔ بل کھاتے بھیانک سانپوں کی طرح !

گھنی چھاؤں والے اس درخت نے اس سُنسان جگہ کو سڑک سے چھپا رکھا تھا۔ کہیں کہیں گھاس اُگ رہی تھی جیسے کسی کی مسیں بھیگ رہی ہوں۔ ایک طرف یکساں ڈھلواں چلی گئی تھی دوسری طرف ایک ٹیکرا تھا۔ جیسے یہ دوشیزۂ ارض کا اُبھرا ہوا سینہ ہو!

ہرے کھیتوں میں دھوپ تھی۔ ہنسی تھی اور سرور کی لہریں بھی۔ فصل کے دانہ دانہ میں دھرتی کا دل دھڑکتا تھا۔ اور کھیتوں کی مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی۔ جیسے گائے کے سانس میں سے دودھ کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔

اور شرمیلی دُلہن کی طرح زندگی دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھی۔

دور تک جہاں تک نگاہ کی پہنچ تھی سبزہ بچھا ہوا تھا اوپر آسمان پر سیلانی پرندوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ اُن کی خانہ بدوش طبیعت اُن کے بازوؤں میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رو پیدا کرتی رہتی۔ آدمی اُنھیں دیکھتا اور اپنی زندگی کے لئے نئے تاثرات حاصل کرتا کس نے سکھائی یہ پرواز۔ ان آزاد بے فکر پرندوں کو ؟ سینکڑوں نہیں ہزاروں میلوں سے بلند برفانی پہاڑوں کی چوٹیاں پار کرتے ہوئے وہ میدانوں کی طرف نکل آتے ہیں! سال کے سال، مقررہ موسم میں۔ کس نے سکھایا آدمی کو ہل چلانا اور دھرتی سے اناج کے جواہر پیدا کرنا؟ سال بہ سال ہر فصل پر۔ ایک مسلسل طور پر کھیتوں کی کوکھ ہری ہوتی رہتی ہے۔

اور دُنیا کی وسیع گود میں زندگی کھیلتی رہتی ہے، متواتر اٹوٹ کھلنڈرے پن سے! کون جانے اس کا آغاز، کیسے ہوا اور کب؟ اور کیا یہ کبھی ختم بھی ہو جائے گی؟

اُس سُنسان ٹیکرے پر ایک اہیر بنسری بجا رہا تھا۔ گایوں نے چرنا چھوڑ دیا۔ بنسری کے جادو بھرے منموہن نغمہ نے اُن پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دی۔ ڈھلوان پر سے وہ اوپر چڑھ آئیں۔

جنگل کے ہرن اور مور بھی دوڑے آئے اور مست ہو کر بنسری کا نغمہ سُننے لگے۔

سنسار اور اس کی دلچسپیوں سے بے خبر ہو کر اہیر لگاتار اپنا نغمہ چھیڑ رہا تھا۔ بنسری میں اُس نے اپنا دل ڈال دیا تھا جیسے وہ بانس کا بنا آلۂ موسیقی نہ تھا بلکہ ایک لڑکی تھی جو اپنے محبوب کے سب سے گہرے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔ جب سے اُس نے اپنے گانے میں ایک حقیقی پناہ پالی تھی، اُسے اپنی بنسری سے ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا لگاؤ ہو گیا تھا۔ بار بار وہ سوچتا کہ بنسری اُس کی دُلہن ہے جو اُس کے ہونٹوں کے لمس کے لئے ترستی رہتی ہے۔

گائیں مست ہو رہی تھیں، مور بھی اور ہرن بھی، جیسے اُن کی کوئی

مدّت کی پیاس بجھ رہی ہو، کوئی مدّت کی بھوک مٹ رہی ہو۔ یہ کسی نئی زندگی کا نغمہ تھا۔ اس کی ایک ایک لچک پر وہ جھوم رہے تھے۔ یہ نغمہ شاید زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ زندگی ایک ہے۔ سدا اس کا دور جاری رہتا ہے۔ اور آدمی اور باقی سب جانداروں میں یہ ایک ہی زندگی، یہ ایک ہی راگنی الگ الگ رنگ اختیار کر اُٹھی ہے۔

اور پھر آسمان کے پرندے بھی اُس ٹیکرے پر اُتر آئے۔ یہ دوستی کا نغمہ تھا۔ اس کی تھرکن عشق، حسن اور شباب سے مل کر بنی تھی۔ بڑا میٹھا میٹھا رس تھا، بیچ بیچ میں ایک درد سا بھی۔ ایک ابدی درد۔

کھیتوں کا سارا سنگیت، درختوں کی تمام سرگوشیاں، جھرنوں اور دریاؤں کے بہتے پانی کے سارے بول، تیز ہوا کی آواز۔ گایوں کے دلوں کی دھڑکن، تیز سانس اور سَرَر سَرَر کی وہ آواز جو اُن کے دودھ دوہے جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ شاید اس نغمہ میں سما گیا تھا۔

اور پھر زہری ناگ بھی اُس ٹیکرے پر چڑھ آیا۔

سانپ کی خصلت ہے کاٹنا۔ مگر یہ تو پیار کا نغمہ تھا۔ سُنتے سُنتے وہ کئی بار چونک اُٹھا۔ اُس کے کھوپڑ سر میں زہر حرکت کرنے لگا۔ لیکن اُسے اپنے جسم میں ایک تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اور نغمہ نے اُس کے زہر پر فتح پالی۔

نغمہ کی تانیں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ چاروں طرف ایک پُرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ زندگی کی ساری نفرت کون جانے کن گہرائیوں میں گم ہو چکی تھی۔ پُروائی بھی تھم گئی۔ یہ شاید اُس کی اطاعت کا ثبوت تھا۔

ناگ کا برہنہ جسم چمک رہا تھا۔ پھن پھیلا کر وہ رقص کر رہا تھا۔ وہی ابدی رقص۔ اُس وقت وہ اپنے زہر سے بے خبر تھا۔ سانپ کا یہ رقص کوئی مصنوعی رقص نہ تھا۔ یہ تو پیار کے نغمہ سے پیدا ہوا تھا۔

ناگ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ گویا وہ بھی دل رکھتا تھا صرف زہر ہی نہیں۔ اور وہ دل کا درد سمجھتا تھا۔ زندگی کی رگ رگ میں حرکت کرنے والا لطیف درد!

دور اُفق پر کالی بدلی چھا رہی تھی۔ اور پرے کھیت سے ایک کسان دُلہن گا اُٹھی:

"اری او کالی بدلی! تم میری دھرم کی بہن ہو۔ دیکھو پیاری! پہلے میرے باپ کے کھیتوں پر برسیو۔ اور پھر سسرال کے کھیتوں پر۔ چوکیو مت، بہن! جیسے میں کہتی ہوں ویسے ہی کریو!"

اور اہیر نے اپنے لبوں سے بنسری ہٹالی۔ نغمہ بند ہو گیا۔ اُس کے کان کھیتوں سے آتے ہوئے گیت کی جانب متوجہ ہو گئے۔

گائیں ٹیکرے سے نیچے اُتر رہی تھیں۔ ہرن بھی جا رہے تھے اور مور بھی۔ پرندوں کو بھی آسمان کی بلندیاں یاد آ گئیں۔

لیکن زہری ناگ بدستور پھن پھیلائے رقص کر رہا تھا۔ اہیر ڈرا نہیں۔ وہ مُسکرایا۔ یہ اُس کے نغمہ کی دلکشی کا ثبوت تھا۔ وہ خوش تھا۔

اور کسان دلہن گا رہی تھی:

"نیم پر، ہرے ہرے نیم پر میری بہن جھولا جھول رہی تھی۔ ہائے! میری ماں رو پڑی۔ میں بھی رو پڑی۔ بہن کو کالے ناگ نے ڈس لیا!"

کس ناگ نے ڈس لیا تھا جھولا جھولتی لڑکی کو؟ کیا یہی سانپ تھا وہ ناگ، جو اہیر کے پاس پھن پھیلائے ناچ رہا تھا۔ اِسے تو رونا آتا تھا اب تک اِس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور جب کوئی روتا ہے اُس کا زہر مر جاتا ہے!

(۲)

زہری ناگ ٹیکرے سے نیچے اُتر رہا تھا۔

اُس کے بند بند میں ایک غیر معمولی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی جیسے لہو جم رہا ہو۔ جذبات کی رَو میں وہ بہت دیر تک رقص کرتا رہا تھا، ضرورت سے کہیں زیادہ۔

یہ نغمہ نہ تھا، ایک منتر تھا۔ ورنہ وہ وہاں کیوں جاتا؟

اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ لہو پہلی چال سے چلنے لگا وہ پھر وہی پہلا سانپ تھا جس کی خصلت ہے کاٹنا۔ اور اُس کے تاثرات کی خبر صرف اُسی کو ہی تھی۔

جب وہ کھیت کی مینڈ کے پاس پہنچا تو اُس نے ناگن کی لاش بدستور پڑی دیکھی۔ اَب وہ بدبودار ہو چلی تھی۔ ناگ کا دل بے چین ہو گیا لاش کے گرد اُس نے پانچ چکر کاٹے اور پھر وہ مُڑ کر ناگن کی طرف دیکھنے لگا۔

اُس کے سر میں زہر پھر جاگ اُٹھا۔

یہ ناگن محبوبہ بنی اُس کے پیچھے پیچھے چلا کرتی تھی۔ چاندنی راتوں کی کتنی ہی پُرسرور گھڑیاں دونوں نے بارہا ایک ساتھ گزاری تھیں۔ اُس کی صحبت میں زندگی کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی، کتنی ملائم اور چمک دار، ناگن کے جسم کی طرح اور خود اُس کے اپنے جسم کی طرح جبکہ کینچلی ابھی ابھی پھینکی گئی ہو۔ ناگن کی زبان پر زبان رکھ کر اُس نے اُسے اپنے دائمی پیار کا یقین دلایا تھا۔ تب وہ کیا جانتا تھا کہ اُسے یوں اپنی محبوبہ کے بے حس جسم پر آنسو گرانے ہوں گے۔

پھن پھیلا کر اُس نے ناگن کے جسم کو پھر سونگھا۔ اُس کی آنکھوں میں انتقام جاگ اُٹھا۔ اور اُس کا زہر اُبلنے لگا۔

فضا میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پُروائی کے لمس سے بھیانک زہری ناگ کا بند بند ایک بالکل نئی قوّت محسوس کرنے لگا۔

کسی شہزادے کی چاند رانی سے سانپ کی محبوبہ کیا کچھ کم وقعت رکھتی تھی؟ اُسے کوئی مار ڈالتا تو حکومت ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی۔ اور اگر سانپ بھی اپنی محبوبہ کے قاتل کا دشمن بن گیا تو کون سی بڑی بات ہو گئی؟

پہلے بھی ایک دن اہیر نے بنسری پر اپنا نغمہ چھیڑا تھا۔ اور ناگ اور ناگن نغمہ کی آواز سے مست ہو کر اُس ٹیکرے کی جانب چل دئے تھے جہاں اہیر اپنی لَے کی نرم نرم تھپکیوں سے گایوں کا من رجھا رہا تھا۔

ایک شریر راہی نے اپنی پُرانی عادت کے مطابق ناگن کو پتھر کا نشانہ بنا ڈالا۔ وہ تڑپی اور مر گئی۔ پگ ڈنڈی کے کنارے، جہاں بیٹھ کر اُس نے ان گنت دفعہ اپنے محبوب کی آنکھوں میں پیار کے گہرے راز دیکھ لئے تھے۔ ناگ آگے آگے جا رہا تھا۔ ورنہ اگر اُسے خبر ہو جاتی تو اُسی وقت اُس راہی کو بھی اِسی پگ ڈنڈی کے قریب ہی سُلا دیتا۔

اَب وہ راہی کہاں چلا گیا؟ بھیانک زہری ناگ انتقام ضرور لیگا۔ پہلے اُس نے سمجھا کہ ناگن کی موت کی ذمہ داری اہیر یا اُس کے نغمہ پر کسی طرح عاید نہیں ہوتی۔ جب سے اُس نے اُس کی سب سے زیادہ دودھ دینے والی گائے کی پچھلی ٹانگوں سے لپٹ کر اُس کا میٹھا میٹھا دودھ پینا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کو کچھ کچھ فراموش کر بیٹھا تھا۔ مگر اُس کی لاش دیکھ کر اُس کے لہو کی ایک ایک بوند نفرت کی آئینہ دار بن گئی۔ اور وہ سب شانتی جو اُسے پیار کے نغمہ سے حاصل ہوئی تھی، کون جانے کہاں غائب ہو گئی۔

وہ راہی اب نہیں ملتا تو نہ ملے وہ اُس اہیر کا خاتمہ کر ڈالیگا اور اُس کے نغمہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیگا۔ نہ اُس دن اُس نے نغمہ چھیڑا ہوتا، اور نہ وہ اپنی محبوبہ سمیت ٹیکرے کی جانب چل پڑتا۔ اور وہ راہی ضرور اُس اہیر کا بھائی بند ہی تو ہے۔ آدمی کا بیٹا، سانپوں کا ابدی دشمن۔

کسی دوسری ناگن سے وہ آسانی سے پیار کر سکتا تھا۔ اپنی نسل کو آگے بڑھانے میں اُسے کیا تکلیف ہو سکتی تھی؟ آدمی بھی تو ایک عورت کے مر جانے پر دوسری عورت کا دم بھرنے لگتا ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ انتقام سے مُنہ موڑے۔

آخر زہر کا مفہوم کیا ہے؟ مارنا، انتقام لینا۔ زہر بنا ہی ہے مارنے کے لئے؟ آدمی کو چاہیئے ڈرنا، سانپ سے، سانپ کے انتقام سے۔ زہر سانپ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، جب تک وہ زندہ رہتا ہے اُس کا زہر بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ جھوٹے امرت سے تو سانپ کا زہر ہی ہزار بار سچّا ہے۔ سانپ کی زبان ناپاک سہی، مگر کیا وہ امرت کی ڈینگیں مارنے والوں سے انتقام لینا کبھی چھوڑ سکتا ہے؟

سانپ کے سر میں زہر سوتا رہتا ہے جب تک کوئی اُسے جگا نہیں دیتا۔

بھیانک زہری ناگ اہیر کے ہاتھ سے بنسری گرا دینا چاہتا تھا، ہمیشہ کیلئے، تاکہ پھر کبھی اُس کا نغمہ ہوا میں نہ گونجے۔ اور اُسے اُس کے ارادے سے کون روک سکتا تھا؟

پچھّم کی طرف دھنک سانپ کی طرح لہرائی ہوئی تھی۔ اہیر اسے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ یہ کسی بڑھیا کا جھولا تھا، جیسا کہ اُس نے اپنی دادی سے سُن رکھا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جہاں سے یہ جھولا اوپر اُٹھتا دکھائی دیتا ہے وہاں افق کے قریب ہی زہری سانپ کی بامبی ہے۔ سانپ سے بچیو، بچّہ! — ماں کی یہ نصیحت اُسے بھولی نہ تھی۔ مگر وہ اپنے نغمہ کی پہنچ سے واقف تھا۔ وہ سانپ سے ڈرتا نہ تھا۔

نغمہ گونج رہا تھا۔ ناگ چاروں طرف دیکھتا تھا، حیران نگاہوں سے، حیران کانوں سے۔ بار بار اُس کا پھن اوپر اُٹھ جاتا۔ یہ نغمہ ضرور بند

ہونا چاہیئے۔ نغمہ چاروں طرف گونج رہا تھا۔ اور سانپ نے سمجھا کہ اہیر کے سب بھائی بند۔ آدمی کے بیٹے۔ بنسریاں بجا رہے ہیں۔

اُس کے کالے چمکدار جسم کا بند بند دُکھنے لگا۔ نہیں، وہ ڈریگا نہیں وہ اکیلا ہے اور آدمی کے بیٹے لاتعداد، مقابلہ سخت ہے۔ تو کیا ہوا؟ وہ ڈٹ کر لڑے گا۔ مر جائیگا یا سب کو مار ڈالیگا۔ پہلے اہیر کو اور پھر سب آدمیوں کو اور اگر سب کے ہاتھوں سے بنسریاں نہ گرا دیں، نغمہ نہ بند کر دیا تو اُس کا نام سانپ نہیں۔

وقت گزر رہا تھا۔ دن، ہفتے اور مہینے گزر رہے تھے نغمہ بدستور جاری رہا۔ ناگ کے ذہن میں وقت کے لمبے سائے اپنے عکس پھینکتے چلتے وہ دیکھتا کہ ایک لہر جاتی اور دوسری جھٹ دوڑی چلی آتی۔ وہ مقابلہ سے بھاگے گا نہیں۔ اُس کا زہر گاڑھا ہو رہا تھا۔ جیسے بسنت رُت میں شہد اور بھی خوشبودار بن جاتا ہے اور میٹھا بھی۔

کس نے پھونکی زندگی میں اتنی خودنمائی؟ شروع میں یہ آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہے، جیسے درختوں پر بُور آتا ہے۔ کیا امرت میں بھی اتنی ہی خودنمائی ہوتی ہے جتنی زہر میں؟ کیسے سوجھی اہیر کو یہ شرارت۔ اہیر ہی کو نہیں، آدمی کے سبھی بیٹوں کو؟ کیا یہ بنسریاں بجانے والے دیوانے یہ نہیں سمجھتے کہ سانپ کا ایک ہی بوسہ اُن کو موت کے مُنہ میں ڈھکیل سکتا ہے؟

اُس وقت خدا کا انصاف کہاں تھا جب ایک شریر راہی نے پگ ڈنڈی کے کنارے جاتی ہوئی ناگن کا سر پتھر مار کر توڑ دیا تھا؟ اب اگر خدا بھی اُسے انتقام لینے سے منع کرے گا تو وہ ایک نہ سُنے گا۔ خدا ہوگا اپنے گھر میں۔ وہ بھی بے انصاف ہو سکتا ہے! سانپ پر اب اس کا حکم نہیں چلے گا۔ وہ سانپ بھی ہے اور شیطان بھی۔ اگر خدا میں ذرا بھی طاقت ہے تو وہ اس نغمہ ہی کو کیوں نہیں بند کر دیتا؟ خدا بھی غریبوں کو ڈراتا ہے۔ غریبوں کو اور کمزوروں کو! شیطان سانپ کے سامنے اُس کی کچھ پیش نہ جائیگی بھیانک زہری ناگ ضرور کوئی ایسی ترکیب نکال لیگا جس سے وہ خدا اور آدمی کی مشترکہ طاقت کا بھی مقابلہ کر سکے۔ اور اکیلا آدمی تو ہرگز اُس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکے گا!

ایک دن ناگ سو کر اُٹھا تو وہ خوشی سے ناچنے لگا۔ دھرتی پر تو صرف وہی اتنا زہریلا ہے کہ آدمی کی زندگی اُس کے ایک ہی بوسہ سے فنا ہو جائے .... اور مقابلہ اکیلے اہیر سے نہیں بلکہ سبھی آدمیوں سے ہے۔ سبھی آدمیوں سے جو بنسریاں بجا رہے ہیں!...... اُس کی خوشی سنجیدگی بن گئی...... پھر اُس کی سنجیدگی چِنتا بن گئی......

پاتال کے سارے سانپ دھرتی پر آ گئے۔ بھیانک زہری ناگ یہ جانتا تھا کہ وہ اُن کو اپنا زہر دے سکتا ہے اور اُنھیں آدمی کے ایک ایک بیٹے کا بوسہ لینے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اُس کی دعوت پا کر وہ سب بھاگے چلے آئے تھے، یہ کچھ کم نہ تھا۔

بھیانک زہری ناگ نے کسی طرح اپنے زہر کا بیشتر حصہ کھانے میں ملا دیا۔ اور یہ کھانا کھانے کے بعد سبھی سانپ اُس کی طرح مہلک بن گئے۔

رو رو کر اُس نے اپنی بپتا سبھی سانپوں کو کہہ سُنائی۔ اب ہر ایک سانپ ہر ایک بنسری والے کا دشمن تھا...... مگر اُس اہیر کا بوسہ وہ خود لے گا۔

(۳)

دھرتی کا بھیانک ناگ اُس ٹیکرے کے اوپر چڑھ رہا تھا۔

اُس نے دیکھا کہ اہیر سو رہا ہے۔ بڑا اچھا موقعہ تھا۔ اوپر آسمان پر چاند نمودار ہو رہا تھا — چاند، اہیر کا ماموں! سانپ نے چاند کی جانب دیکھا اور اُس کا زہر خشمگیں ہو اُٹھا — اہیر تو اہیر موقعہ پڑنے پر وہ چاند کو بھی ڈس سکتا ہے!

ناگن کی یاد اُسے اب رُلاتی نہ تھی۔ وہ تو شہید ہو چکی تھی مگر انتقام ضروری ہے۔ وہ اب شیطان بن گیا ہے۔ نہیں، اہیر کے ہونٹ تو اُسے چومنے ہی ہوں گے! دھیرے دھیرے وہ اہیر کے پاس جا پہنچا۔ چھتری کی طرح اُس نے اپنا پھن پھیلا لیا۔ اور آگے بڑھ کر اُس نے اپنی زبان اہیر کے ہونٹوں پر رکھ دی۔ جہاں اُس کی بنسری اٹکی تھی۔ کاتک کے شہد جیسے رنگین اور رسیلے ہونٹ جو نغمہ پیدا کرنے میں سدا مدد پہنچاتے رہے تھے ایک بار ہلے اور پھر خاموش ہو گئے۔

اہیر پھر نہ جاگا۔ گائیں بدستور ٹیکرے کے قریب چر رہی تھیں، جہاں ہری ہری گھاس اُگ رہی تھی اور کسی خاموش موسیقی کی طرح جسے کوئی بند نہیں کر سکتا۔

ناگ نے اہیر کو ایسے غصہ سے کاٹا تھا کہ وہ درد کے ایک شدید

احساس سے تڑپا۔ اُس کے مُنہ سے جھاگ پیدا ہوئے۔ ناک سے خون بہنے لگا۔ اور وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

زہر کہتا ہے۔ "او زندگی! مجھ سے ڈر"۔ کون جانے زہر کا آغاز کیسے ہوا؟ اور کیا کبھی زہر ختم بھی ہو جائیگا؟ مگر زندگی کا سانس ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ زندگی تو امرت ہے۔

پُروائی چل رہی تھی اور وہ مردہ اہیر کے سینے کے نیچے پڑی ہوئی بنسری میں سے گزر کر نغمہ پیدا کر رہی تھی۔ مگر یہ ہوا اُداس تھی اور نغمہ کی غمگینی اور دلسوزی فضا کی وسعتوں میں بکھر رہی تھی۔ ناگ شاید اپنی بامبی کی طرف چلا گیا تھا، دور اُفق کے قریب، جہاں سے دھنک اُٹھا کرتی ہے۔ بڑ کی ڈاڑھیاں برابر لٹک رہی تھیں، بل کھاتے بھیانک سانپوں کی طرح۔ پُروائی کے جھونکے انہیں ہلا رہے تھے اور اُن کی سرگوشیاں بھی غمگین اور دلسوز ہو رہی تھیں۔

نغمہ بدستور جاری رہا۔ نغمہ تو امرت ہے۔ کوئی زہر اسے مٹا نہیں سکتا۔ اور کوئی سانپ اِسے ڈس نہیں سکتا۔

سانپ اور سپولئے اِنسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے کی سعی کرتے رہے۔ جیسے گھنے بادلوں میں بجلی چمکتی ہے، ہر سانپ کے سر میں زہر بار بار جاگ اُٹھتا اور پھر جلد کوئی بنسری والا سانپ کے بوسہ کی تاب نہ لا کر دم توڑ دیتا۔

گھنے سایہ دار بڑ نے اَب بھی اُس سُنسان جگہ کو سڑک سے چھپا رکھا تھا، جہاں گھاس اُگ رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی گھاس، جیسے کسی کی مسیں بھیگ رہی ہوں۔ اور وہ ٹیکرا، دوشیزۂ ارض کا وہ خوبصورت سینہ برابر اُبھرا ہوا تھا۔

کوئی اور اہیر اَب اُس ٹیکرے پر بنسری بجا رہا تھا گائیں مست ہو رہی تھیں۔ پھر وہ دھرتی کا بھیانک زہری ناگ بھی اوپر چڑھ آیا نغمہ نے اُس کے زہر پر پھر فتح پالی .... اور بنسری بجتی رہی۔

پرواز جعفری مچھلی شہری

حیات و ممات

سمجھ میں میری نہیں آئی آج تک یہ بات
کہ دل میں درد اُٹھے کانپ جائے ساری حیات

ابھی تلک مرے احساس میں اُبھرتی ہے
ابد نشاط ملاقات کی وہ پہلی رات

کلیدِ بابِ ابد ہے شعارِ بے باکی
ہے صرف جستِ تمنّا حیات ہو کہ ممات

حقیقتوں سے تہی ہیں یہ خوب رُو جلوے
ہیں حُسن و عشق فریبِ جمالیاتِ حیات

حدیثِ غم ہے یہ جذبات کی حسیں روداد
صحیفۂ دلِ نازک کے واہ رے آیات

فرانس کا سعدی۔ "لابرو ییر"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
ڈی لٹ (پیرس)

عورت کیا ہے؟

(LE BRUYERE) فرانس کا سعدی ہے۔ اپنی نظر بینی اور نکتہ رسی میں بے مثل اس کی تصنیف (LES CARACTERES) (کردار) کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو گلستاں بوستاں کو۔ تعجب ہے کہ فرانسیسی جاننے والے اس سے جتنے آشنا ہیں۔ فرانسیسی نہ جاننے والے اتنے ہی ناآشنا۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اس کے نکات کا انتخاب "ایشیا" کے توسط سے وقتاً فوقتاً اردو دنیا تک پہنچائیں۔ آج کی صحبت میں عورت کے متعلق اس کے دلچسپ مشاہدوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اختر حسین

ایسا کم ہوتا ہے کہ کسی عورت کی خوبیوں کے بارے میں زن و مرد متفق الرائے ہوں۔ دونوں کے زاویہ ہائے نگاہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے جن اداؤں سے عورتیں مردوں کو لبھاتی ہیں۔ ان کے چلتوں اُن میں آپس میں بگاڑ ہو جاتا ہے۔ جو ناؤ بھاؤ مردوں کو وجد میں لے آتے ہیں۔ وہ عورتوں میں حقارت و نفرت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔

یہ خیال بھی کس قدر دلچسپ ہے کہ کوئی ۱۳ سال سے لیکر ۲۲ سال کی عمر تک ایک حسین دوشیزہ ہونا اور اس کے بعد مرد بن جانا۔

عورت کو ایڑی سے لیکر چوٹی تک پرکھنا چاہئے ویسے ہی جیسے مچھلی دُم سے لیکر سر تک جانچی جاتی ہے۔

اگر عورتیں آپ اپنے لئے بناؤ سنگھار کرتی ہیں فبہا۔ وہ چاہے اپنے چہرہ پر کیسی ہی لیپا پوتی کریں۔ جیسی چاہیں نوک پلک نکالیں لیکن اگر وہ مردوں کو موہنا چاہتی ہیں اور اُن کی توجہ کے لئے سارے جتن کرتی ہیں تو مجھے مردوں کی طرف سے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ غازہ اور لاکھے سے وہ اکثر اپنی شکلیں بگاڑ لیتی ہیں۔ ہمیں اُن کے گالوں کی جھوٹی لالی۔ اکھڑی ہوئی ابرو اور نقلی دانتوں کو دیکھ کر اُبکائی آتی ہے۔ نسوانیت کو مسخ کرنے کی ان ساری کوششوں کے خلاف ہم احتجاج کرتے ہیں۔

عورتیں یہ نہیں جانتیں کہ اگر ان کا روپ در اصل اتنا ہی بھیانک ہوتا جتنا سنگار میز کے سامنے سے اُٹھ کر ہوتا ہے تو وہ مردوں کی جان کے لئے وبال ہو جاتیں۔

ایک حسین عورت جس میں کسی ایماندار مرد کی خوبیاں ہوں۔ خدائی کا معجزہ ہے۔ وہ دونوں جنسوں کی اچھائیوں کا نچوڑ ہے۔

قدرت نے حُسن کے زہر کو مارنے کے لئے عورت کو سیاہ پوش بنا دیا ہے۔ یوں نہ ہوتا تو مرد اس کے زہر کے اثر سے جاں بر کیونکر ہوتا۔

مرد کی عنایتیں عورت کو اس سے قریب لاتی ہیں لیکن عورت کی نوازشوں سے مرد دور ہی بھاگتا ہے۔

اگر میں کسی لالچی عورت سے شادی کر لوں تو وہ مجھے تباہ نہ کر سکے گی کسی سمجھدار سے۔ تو وہ مجھے راہ راست دکھلائے گی۔ کسی شوخ سے۔ تو وہ ہمیشہ آتش رشک کو پنکھا کیا کرے گی۔ کسی عشوہ گر سے۔ تو وہ میرا دل بہلائیگی اور کسی سدابہار معشوق سے۔ تو وہ شاید کبھی مجھ سے بھی محبت کریگی۔ لیکن خدانخواستہ اگر کوئی "ممکنا رکنا زن" میرے پلے پڑ گئی جو خود کو اور خدا کو بھلا دینا چاہتی ہے۔ تو اس سے بھلا مجھے کیا ملے گا۔؟

عورتیں بین بین نہیں رہ سکتیں یا تو وہ مردوں سے بہتر ہوتی ہیں یا بدتر۔

اکثر عورتوں کی رہبری اصول نہیں بلکہ جذبات کرتے ہیں۔ ان کے طور طریق کا تعیّن عاشقوں کی مرضی کرتی ہے۔

عورت عشق کر سکتی ہے مرد دوستی کر سکتا ہے۔

مرد دوسروں کے راز چھپانا تو خوب جانتا ہے مگر اپنے راز طشت از بام کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس عورت اپنے بھید چھپاتی اور دوسروں کے بھید کھول دیتی ہے۔

ایسی کتنی لڑکیاں تم نے دیکھی ہیں جو اپنے حُسن کے تناسب سے جاہ و ثروت کی آرزو نہیں رکھتیں۔

بدصورت، بوڑھے یا غریب شوہر سے ہر حسین عورت انتقام لینا چاہتی ہے۔

اگر کوئی مرد اپنی چڑھتی ہوئی عمر اور چہرہ کی جھریوں سے ناواقف ہے تو اسے کسی جوان عورت سے باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھوں اور اس کے لب و لہجہ پر غور کرنا چاہئے۔ جس حقیقت کو وہ نہیں جاننا چاہتا ہے اب جان جائے گا۔

عورت جو کچھ محسوس نہیں کرتی اس کا ذکر بھی بیدھڑک کر دیتی ہے

اُس سے بھی زیادہ نڈرپن سے مرد وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جو محسوس کرتا ہے۔

مرد کسی عورت کو جھوٹی محبت کے فریب میں اُسی صورت میں لا سکتا ہے جب وہ بیک وقت کسی سے سچی محبت نہ کرتا ہو۔

جب مرد دیکھتا ہے کہ عورت اب اُسے نہیں چاہتی تو غصّہ کا اظہار کر کے اُسے سکون مل جاتا ہے۔ لیکن جب مرد عورت کو چھوڑ جاتا ہے تو عورت کی زبان خاموش رہتی ہے اور دل مدتوں رویا کرتا ہے۔

اگر کسی عورت کے نامۂ محبت میں بڑی گرمی ہے تو یہ امر تو یقینی ہے کہ اس کا جسم متوالا ہو رہا ہے لیکن خبر نہیں کہ اس کا دل کس حد تک گرم ہے۔ کیونکہ جو عورت پریم سے پاگل ہو رہی ہے اُسے اپنی محبت جتانے کی ضرورت کہاں۔ وہ تو یہ جاننے کو بے صبر ہو گی کہ محبوب بھی اُسے چاہتا ہے یا نہیں۔

ایسے خوش نصیب شوہر کم ہیں جو دن میں کم از کم ایک بار اپنی بیوی کی جان کو نہ روئیں اور کنواروں پر رشک نہ کریں۔

وہ عورت بے جان ہے جس نے ہنوز اُسے نہیں دیکھا جس سے اُسے محبت کرنی چاہئے۔

زیب النّساء

شب ز گرمی ہائے اشکِ دشتِ پیما سوختیم
چوں چراغِ ناخدا بر رُوئے دریا سوختیم

ایشیا۔ اپریل ۱۹۴۲ء

علی اطہر اور چیخوف

آیوانف

(روس کے مشہور افسانہ نگار چیخوف کا ایک شاہکار اُردو میں)

(پہلا ایکٹ)

(آیوانف کی زمینداری میں ایک باغ بائیں طرف مکان کا اگلا حصّہ اور برآمدہ۔ ایک کھڑکی کھلی ہوئی۔ برآمدے کے سامنے نصف دائرہ کے شکل کی کھلی ہوئی جگہ جس سے زاویۂ قائمہ بناتا ہوا ایک راستہ مکان کی طرف گیا ہے اور دوسرا راستہ دائیں جانب باغ میں چلا گیا ہے۔ برآمدے کے دائیں جانب باغ میں بیٹھنے کی جگہیں اور میزیں ہیں۔ ایک میز پر لیمپ جل رہا ہے۔ شام ہو رہی ہے۔ پردہ اُٹھنے پر مکان کے اندرونی حصّہ سے پیانو کا نغمہ سُنائی دیتا ہے۔)

(آیوانف ایک میز پر بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ بورکن اونچے جوتے پہنے اور ایک بندوق لئے باغ کے دوسرے کنارے پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ کچھ نشہ میں ہے آیوانف کو دیکھ کر انگوٹھوں کے بل اس کی طرف آتا ہے اور قریب پہنچکر اُس کے چہرے پر بندوق کا نشانہ لگاتا ہے)

آیوانف (بورکن کو دیکھکر چونک پڑتا ہے اور کود جاتا ہے) مشا یہ تم کیا کر رہے ہو؟ ..... تم نے تو مجھے ڈرا دیا ..... میں خود پریشان ہوں اور تم آکر ایسے احمقانہ مذاق کرتے ہو ..... (بیٹھ جاتا ہے) آپ نے ایک تو مجھے ڈرا دیا اور اب خوش ہو رہے ہیں ....

بورکن۔ (ہنستا ہے) ارے رے .... مجھے بہت افسوس ہے۔ بہت افسوس (اس کی بغل میں بیٹھ جاتا ہے) اب پھر ایسا نہیں کروں گا۔ واقعی نہیں کروں گا ..... (اپنی ٹوپی اتار لیتا ہے) میں بہت گرم ہو رہا ہوں تم یقین نہیں کروگے دوست میں تین گھنٹہ میں بارہ میل چل کر آرہا ہوں۔ ..... ذرا دیکھو تو میرا دل کس طرح حرکت کر رہا ہے۔

آیوانف (پڑھتا ہے) بہت اچھا فوراً۔

بورکن۔ نہیں ابھی دیکھو (آیوانف کا ہاتھ لیکر اپنے سینہ پر رکھ لیتا ہے) کچھ سُن رہے ہو؟ دھک دھک دھک .... اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے دل کی کوئی بیماری ہے۔ ہے نہ؟ میں کسی وقت اچانک مر سکتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر میں اچانک مر جاؤں تو تمہیں افسوس ہوگا؟

آیوانف میں پڑھ رہا ہوں ...... فوراً ....

بورکن۔ مذاق نہیں بتاؤ۔ میرے مرنے پر تمہیں افسوس ہوگا؟ کیوں آیوانف اگر میں مر جاؤں تو تمہیں افسوس ہوگا؟

آیوانف۔ مجھے دق مت کرو۔

بورکن۔ ارے بھائی بتاؤ تو تمہیں افسوس ہوگا یا نہیں؟

آیوانف۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ تمہارے مُنہ سے شراب کی بو آرہی ہے مشا یہ نہایت تکلیف دہ بات ہے۔

بورکن۔ (ہنستا ہے) میرے مُنہ سے شراب کی بو آرہی ہے؟ کتنی حیرت انگیز بات ہے ..... اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ حیرت کی کوئی بات نہیں پلیسنیکی میں ایک مجسٹریٹ سے ملاقات ہو گئی ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ ہم دونوں نے آٹھ آٹھ گلاس پی ڈالے حقیقت یہ ہے کہ شراب خواری ہر شخص کے لئے بہت بُری ہے۔ میں کہتا ہوں ہر شخص کیلئے بُری ہے ہے نا؟ ضرور ہے۔ ہے نا؟

آیوانف اَب واقعی برداشت سے باہر ہے ...... تم کو سمجھنا چاہئے کہ یہ طریقہ پاگل بنا دینے والا ہے ....

بورکن۔ ارے رے رے۔ مجھے افسوس ہے۔ افسوس...... خدا تمہارا بھلا کرے۔ اچھا میٹھو...... (اُٹھ کر چلنے لگتا ہے) عجیب لوگ ہیں۔ ان سے بات تک نہیں کی جا سکتی (واپس آتا ہے) ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا...... مجھے وہ بیاسی روبل تو دیدو۔

آیوانف کیسے بیاسی روبل۔!؟

بورکن۔ کل مزدوروں کی اُجرت ادا کرنی ہے۔

آیوانف۔ میرے پاس نہیں ہیں۔

بورکن۔ بہت بہت شکریہ (نقل کرتے ہوئے) میرے پاس نہیں ہیں۔ ...... لیکن مزدوروں کو اُجرت تو دینی ہے۔ یا نہیں؟

آیوانف۔ مجھے نہیں معلوم۔ میرے پاس آج روپے نہیں ہیں۔ اگلے مہینہ کی پہلی تاریخ تک انتظار کرو۔ اُس وقت میری تنخواہ ملے گی۔

بورکن۔ ایسے لوگوں سے بات کرنی ہی بیکار ہے...... مزدور تو پہلی تاریخ تک روپیہ کا انتظار نہیں کریں گے وہ سب کل صبح ہی آئینگے۔

آیوانف۔ تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جی چاہے میرا گلا کاٹ دو۔ میرے ٹکڑے اُڑا دو...... اور یہ تمہاری کتنی پریشان کن عادت ہے کہ جہاں میں پڑھنے لکھنے بیٹھا تم نے مجھے دق کرنا شروع کر دیا۔ یا......

بورکن۔ میں پوچھتا ہوں مزدوروں کی اُجرت ادا کرنی ہے یا نہیں؟ لیکن تم سے باتیں کرنے کا فائدہ کیا (ہاتھ ہلاتا ہے) اور آپ گاؤں کے رئیس ہیں ـــــ ہونہہ زمیندار...... نئے طریقہ کی کاشتکاری ...... تین ہزار ایکڑ کے مالک اور جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں۔ ...... شراب بچیں اور کاگ کھولنے کا پیچ ہی ندارد...... میں جاتا ہوں کل تینوں گھوڑوں کو بیچے ڈالتا ہوں۔ اور کیا؟ جئی کی کھڑی فصل بیچ چکا ہوں۔ اب رائی بھی بیچ دوں گا (اسٹیج پر ٹہلتا ہے) تم سمجھتے ہو ایسا کرنے میں مجھے جھجک ہوگی؟ کیوں ذرا بھی نہیں۔ ایسا سمجھنے میں تم نے مجھے غلط سمجھا ہے......

(اندر سے شیبلسکی کی آواز آتی ہے "تمہارے ساتھ پیانو بجانا بالکل ناممکن ہے۔ تمہارے کان میں اتنی حس بھی نہیں جتنی ایک بھس بھری ہوئی مچھلی میں اور تمہاری انگلیوں کی ضرب تکلیف دہ ہے۔")

انا پٹرونا۔ (کھلی ہوئی کھڑکی پر نظر آتی ہے) ابھی ابھی یہاں کون باتیں کر رہا تھا؟ تم تھے مشا؟ تم اس طرح ٹہل کیوں رہے ہو؟

بورکن۔ تمہارے پیارے نکولائی کی حرکتیں جو کچھ کرائیں کم ہیں۔

انا پٹرونا۔ میں کہتی ہوں مشا ذرا نوکروں سے کہدو کہ "کروکے" لان پر تھوڑی سی سوکھی گھاس لاکر رکھ دیں۔

بورکن۔ (اشارے سے انا کو ہٹاتے ہوئے) مجھے خدا کیلئے بخشئے۔

انا۔ خدا کی پناہ۔ یہ گفتگو کا کوئی طریقہ ہے...... یہ لہجہ تمہیں بالکل زیب نہیں دیتا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ عورتیں تمہیں پسند کریں تو اُنھیں کوئی موقع نہ دو کہ تمہیں کشیدہ اور اینٹھے ہوئے دیکھیں۔ (اپنے شوہر سے) چلو نکولائی گھاس پر لوٹیں۔

آیوانف۔ کھلی کھڑکی پر کھڑے رہنا تمہارے لئے نقصان دہ ہے۔ انیونا خدا کے لئے اندر چلی جاؤ۔ (پکار کر کہتا ہے) ماموں کھڑکی بند کر دیجئے (کھڑکی بند ہو جاتی ہے)

بورکن۔ یہ نہ بھول جانا کہ دو دن کے اندر لیبیڈیو کا سود ادا کرنا ہے۔

47 آیوانف مجھے یاد ہے۔ میں آج لیبیڈیو کے یہاں جاؤں گا اور اُن سے کچھ مہلت لوں گا (کلائی کی گھڑی دیکھتا ہے)

بورکن۔ کب جاؤ گے؟

آیوانو۔ ابھی فوراً۔

بورکن۔ (اشتیاق کے ساتھ) ایک منٹ ٹھیرو۔ مجھے خیال آتا ہے آج ساشا کی سالگرہ ہے...... ٹٹ ٹٹ ٹٹ ٹٹ...... اور میں اسے بھول گیا تھا۔ میرا بھی کیا حافظہ ہے (جانے لگتا ہے) میں جا رہا ہوں۔ میں جا رہا ہوں (گاتا ہے) میں جا رہا ہوں...... جا کر پہلے غسل کروں گا۔ کوئی اخبار پڑھوں گا اور ایمونیا کے تین قطرہ پیکر پھر تر و تازہ ہو جاؤں گا۔ اور نئے سرے سے کام شروع کر سکوں گا ...... نکولائی الیکزیوچ۔ پیارے۔ میرے عزیز دوست۔ تم تو ہمیشہ ملول رہتے ہو۔ ہر وقت شکایت کرتے رہتے ہو۔ نہایت ہی پریشان اور گھبرائے ہوئے۔ ورنہ خدا جانتا ہے کہ ہم دونوں ملکر کیا کیا نہ کر سکتے ہیں۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ...... اچھا یہ بتاؤ اگر میں تمہاری خاطر مارفوشا بابکن سے شادی

کرلوں تو تم پسند کرو گے؟ آدھا جہیز تمہارا......... نہیں آدھا
کیوں سب تمہارا۔

آیوالف بند کرو اپنی مہمل بکواس۔

بورکن۔ نہیں مذاق نہیں۔ بتاؤ تو ماروشا سے میری شادی تم پسند کروگے
جہیز میں ہم دونوں کا آدھا آدھا...... مگر ہاں میں اس مسئلہ
کے متعلق تم سے بات ہی کیوں کر رہا ہوں؟ تمہاری سمجھ میں کیا خاک
آئے گا۔ (نقل کرتے ہوئے) "بند کرو اپنی مہمل بکواس۔" تم بہت
اچھے آدمی ہو اور ذہین بھی لیکن جانتے ہو تم میں وہ خاص بات
نہیں۔ وہ ولولہ...... ایسا کارنامہ کرنے کا کہ شیطان بھی رشک
سے جل جائے...... تمہارے اعصاب کمزور ہیں اور مزاج مائی۔
لیکن اگر تم عام لوگوں کی طرح ہوتے تو سال بھر میں لاکھوں حاصل
کر لیتے۔ مثلاً اگر میرے پاس تئیس سو روبل ہوں تو دو ہفتہ میں بیس ہزار
بنالوں۔ تمہیں اس پر یقین نہیں آتا؟ تم اسے بھی مہمل بکواس سمجھتے
ہو۔ لیکن نہیں یہ مہمل بکواس نہیں ہے...... لاؤ دو مجھے تئیس سو
روبل میں ایک ہفتہ میں بیس ہزار لا دیتا ہوں۔ دیکھو دریا کے
اوسیالوو کے دوسرے کنارے پر ایک ٹکڑا زمین ٹھیک ہم لوگوں
کی زمین کے مقابل تئیس سو روبل میں بک رہی ہے اگر ہم وہ ٹکڑا خرید
لیں تو دریا کے دونوں کنارے ہمارے ہو جائیں گے۔ اور جب دونوں
کنارے ہمارے ہو جائیں گے تو تم جانتے ہی ہو کہ ہمیں باندھ بنانے
کا حق ہو جائے گا۔ تب ہم لوگ ایک مل قائم کرنے کی تیاری شروع
کر دیں گے۔ جیسے ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہم باندھ بنانے والے ہیں
ایک شور مچ جائیگا اور تب ہم کہیں گے کہ دیکھو بھائیو اگر تم نہیں چاہتے
کہ باندھ بنائی جائے تو ہماری زمین خرید لو۔ سمجھتے ہو؟ زریوسکی
کی فیکٹری سے پانچ ہزار مل جائیں گے۔ کرولکوو سے تین ہزار
اور گرجا والوں سے پانچ ہزار......

آیوالف۔ مشا یہ سب مہمل اور بیہودہ باتیں ہیں۔ اگر تم مجھ سے جھگڑنا نہیں
چاہتے تو ایسی اسکیمیں اپنے ہی دماغ تک رکھو۔

بورکن (میز پر بیٹھ جاتا ہے) کیوں نہیں، بیشک...... میں جانتا تھا کہ
یہی ہوگا...... تم نہ خود کچھ کرو گے اور نہ مجھے کرنے دو گے۔

(شیبلسکی اور لوودو داخل ہوتے ہیں)

شیبلسکی۔ (لوودو کے ساتھ مکان سے باہر آتے ہوئے) ڈاکٹر اور وکیل
ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وکیل صرف
لوٹتے ہیں اور ڈاکٹر لوٹتے ہیں اور مار بھی ڈالتے ہیں...... یہاں
جو لوگ ہیں میں اُن کا ذکر نہیں کر رہا ہوں (باغ میں ایک جگہ بیٹھ
جاتا ہے) بدمعاش، لٹیرے، ممکن ہے آرکیڈیا میں کوئی استثناء
ہو۔ لیکن...... میں نے اپنی زندگی میں قریب قریب بیس ہزار
روپئے ڈاکٹروں پر صرف کئے ہیں اور ایک بھی ایسا ڈاکٹر نہ دیکھا جو
سند یافتہ اُچکا نہ ہو۔

بورکن۔ (آیوالف سے) ہاں ہاں تم نہ خود کچھ کرتے ہو نہ مجھے کرنے دیتے ہو
یہی وجہ ہے کہ تمہارے پاس روپئے نہیں ہیں۔

شیبلسکی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اس وقت جو لوگ یہاں موجود ہیں میں اُن
کا ذکر نہیں کر رہا ہوں...... ممکن ہے کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ
ہوں اگرچہ...... (جمائی لیتا ہے)

آیوالف (کتاب بند کرتے ہوئے) کیوں ڈاکٹر کیا کہتے ہو؟

لوودو۔ (مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) جو میں نے تم سے آج صبح کہا،
انہیں فوراً کریمیا جانا چاہئے (اسٹیج پر ٹہلتا ہے)

شیبلسکی۔ (منہ ہی منہ میں ہنستے ہوئے) کریمیا!...... مشا کیوں نہ ہم
اور تم ڈاکٹر بن جائیں؟ یہ تو بڑا آسان کام ہے...... جیسے ہی
کسی میڈم انگینوٹ یا میڈم اوفیلیا نے چھینکنا یا کھانسنا شروع
کیا۔ چونکہ اس سے بہتر کوئی کام وہ کر نہیں سکتیں۔ بس ایک کاغذ
کا ٹکڑا لیکر اپنے علم کے مطابق ایک نسخہ تجویز کر دو۔ ایک نوجوان
ڈاکٹر، پھر کریمیا کی سیر اور کریمیا میں ایک تاتاری گائیڈ۔

آیوالف۔ (شیبلسکی سے) اوہ ختم کیجئے یہ باتیں، آپ کس طرح بکے جاتے ہیں
(لوودو سے) کریمیا جانے کے لئے روپئے چاہئیں۔ روپیوں کا میں
انتظام کر بھی لوں تو انّا جانے سے قطعی انکار کرتی ہے۔

لوودو۔ ہاں وہ تو انکار کرتی ہیں (مختصر وقفہ)

بورکن۔ میں کہتا ہوں ڈاکٹر کیا انا پیٹرووناواقعی اتنی بیمار ہیں کہ کریمیا
جانے کی ضرورت ہے؟

لودو۔(مڑکر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) ہاں دق کی بیماری ہے۔

بورکن۔ سَن۔سَن۔سَن...... یہ تو بہت بُرا ہے۔ کچھ دنوں سے اناؔ کا چہرہ دیکھکر مجھے خیال ہو رہا تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہیں گی۔

لودو۔ لیکن......زور سے نہ بولئے.....مکان کے اندر آواز جائیگی۔

(مختصر وقفہ)

بورکن۔(ٹھنڈی سانس لیکر) زندگی کا حال ہی یہی ہے...... انسان کی زندگی اُس پھول کی مانند ہے جو چمن میں وقار کے ساتھ کھلتا ہے، ایک بکری آکر اُسے چبا جاتی ہے، پھول کا پتہ نشان بھی نہیں ملتا۔

شیبلسکی۔ یہ سب بیہودگی ہے سراسر بیہودگی (جمائی لیتا ہے) بیہودگی اور فریب۔ (مختصر وقفہ)

بورکن۔ اور دیکھو دوستو، میں ہمیشہ نکولائی الیکزیوچ کو روپئے کمانیکے طریقے بتاتا رہتا ہوں۔ ابھی ابھی میں نے ایک نہایت نفع بخش اسکیم بتائی لیکن جناب نے حسب معمول اُسے رد کر دیا۔ انھیں سمجھانے کی کوئی صورت ہی نہیں...... ذرا آپ کی شکل ملاحظہ کیجئے، غمگینی، غصہ، اضمحلال، اضطراب اور پست ہمتی کی تصویر ہیں......۔

شیبلسکی۔ بھئی تمہارے پاس ہر شخص کے لئے کوئی نہ کوئی اسکیم رہتی ہے بڑے جینیس ہو۔ ہر شخص کو زندگی بہتر بنانے کے طریقے سکھاتے ہو، ایک مرتبہ اپنا نسخہ مجھ پر بھی تو آزماؤ........ صاحب عقل ہو ایک سبق مجھے بھی پڑھاؤ، مصیبت سے نجات کا کوئی راستہ بتاؤ......

بورکن۔(اُٹھتے ہوئے) میں نہانے جا رہا ہوں...... خدا حافظ دوستو (کاؤنٹ سے) تمہارے کرنے کے بیسیوں کام ہیں..... اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو ایک ہفتہ میں بیس ہزار حاصل کر لیتا (جاتا ہے)

شیبلسکی۔(پیچھا کرتے ہوئے) کیسے بھئی کیسے؟ ٹھہرو تو۔ مجھے بتاؤ کس طرح حاصل کر سکتا ہوں۔

بورکن۔ اس میں بتانا کیا ہے، بہت آسان ہے (واپس آتے ہوئے) نکولائی الیکزیوچ مجھے ایک روبل تو دو۔

(آیوانف خاموشی سے روبل دیدیتا ہے)

بورکن۔ بڑی عنایت (کاؤنٹ سے) تمہارے ہاتھوں میں ابھی بہتیرے قیمتی مہرے ہیں۔

شیبلسکی۔(اس کا پیچھا کرتے ہوئے) وہ کیا؟

بورکن۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایک ہفتہ میں تو تیس ہزار ضرور حاصل کر لیتا۔

(کاؤنٹ کے ساتھ باہر چلا جاتا ہے)

آیوانف (تھوڑے وقفہ کے بعد) بیکار لوگ، بیکار باتیں، احمقانہ سوالات کا جواب دینے کی مجبوری — ان پریشانیوں نے مجھے اتنا تھکا دیا ہے کہ ڈاکٹر میں بیمار ہو گیا ہوں۔ چڑچڑا، جلد باز، سخت مزاج اور اتنا پست کہ اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ مسلسل کئی کئی دنوں تک سر میں درد رہتا ہے۔ نیند نہیں آتی۔ کانوں میں ایک گنگناہٹ سی رہتی ہے...... اور ان مصیبتوں سے نجات کی کوئی صورت نہیں ...... میں بالکل کچھ نہیں کر سکتا.......

لودو۔ نکولائی ایکزیوچ میں تم سے سنجیدگی کے ساتھ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں

آیوانف۔ کیا؟

لودو۔ انا پیٹرودنا کے متعلق (بیٹھ جاتا ہے) وہ اکیلے تو کریمیا جانے پر راضی نہ ہوں گی لیکن تمہارے ساتھ جانے پر راضی ہو جائیں گی۔

٣٩ آیوانف۔(سوچتے ہوئے) ساتھ جانے کے لئے روپئے بھی چاہئیں۔ اس کے علاوہ مجھے اب لمبی چھٹی بھی نہیں مل سکتی۔ اس سال کی پوری چھٹیاں میں پہلے ہی ختم کر چکا ہوں۔

لودو۔ خیر یہ تو ہوا، ایک دوسری بات بھی ہے۔ دق کے علاج کی سب سے اہم شرط یہ ہے کہ دماغ کو کامل سکون ہو۔ اور تمہاری بیوی کو ایک لمحہ کا بھی سکون حاصل نہیں ہے۔ تمہارے برتاؤ سے وہ ہر وقت مسلسل اضطراب میں رہتی ہیں۔ معاف کرنا اس وقت میرے دل میں ذرا ہیجان ہے اور میں تم سے صاف صاف باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ تمہارا برتاؤ انا کو مارے ڈال رہا ہے (مختصر وقفہ) نکولائی الیکزیوچ مجھے موقع دو کہ تمہارے متعلق اچھی رائے قائم کر سکوں!

آیوانف۔ یہ سب سچ ہے، بالکل سچ...... میں جانتا ہوں کہ اس حالت کی ذمہ داری سراسر میرے ہی سر ہے، لیکن میرے دماغ میں ایک الجھن ہے، میری روح پر ایک جمود طاری ہے اور مجھ میں خود اپنے کو سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رہی۔ نہ میں دوسروں کی حالت سمجھ سکتا ہوں نہ اپنی...... (کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے) ممکن ہے

ہماری باتیں کوئی سُن لے، چلو ٹہل کر باتیں کریں (وہ دونوں اُٹھ جاتے ہیں) میں تمہیں شروع سے اپنی رام کہانی سُناتا لیکن یہ داستان طویل ہے اور اتنی الجھی ہوئی کہ صبح تک بھی ختم نہ ہو سکے گی۔ (وہ دونوں ٹہلتے ہوئے جا رہے ہیں) آنّا ایک نمایاں اور غیر معمولی شخصیت کی عورت ہے...... میری خاطر اس نے اپنا مذہب چھوڑا۔ ماں باپ چھوڑے، دولت پر لات ماری۔ اور اگر میں اس سے ایسی سینکڑوں اور قربانیاں چاہتا تو وہ خوشی کے ساتھ پلک جھپکائے بغیر کرتی۔ اور مجھ میں کوئی بھی نمایاں خصوصیت نہیں، نہ میں نے کوئی قربانی کی ہے لیکن یہ ایک لمبی کہانی ہے...... اصل بات یہ ہے ڈاکٹر (ہچکچاتا ہے) یہ ہے کہ ...... مختصر یہ کہ شادی کے وقت میں اس سے والہانہ محبت کرتا تھا اور میں نے قسم کھائی تھی کہ ہمیشہ محبّت کرتا رہوں گا۔ لیکن...... پانچ سال بیت گئے وہ اب تک مجھ سے محبّت کرتی ہے اور میں (ایسی حرکت کرتا ہے جس سے مایوسی ٹپکتی ہے) یہی دیکھو کہ اس وقت تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ وہ عنقریب مرنے والی ہے اور میں نہ محبّت کی کسک محسوس کرتا ہوں نہ رحم، بلکہ ایک قسم کا خلا اور تھکن...... دوسرے لوگ یقیناً اسے نہایت مذموم حرکت سمجھتے ہوں گے۔ میں خود نہیں سمجھ سکتا کہ میری روح کے اندر کیا واقعہ ہو رہا ہے (وہ دونوں سڑک پر چلے جاتے ہیں)

(شیبلسکی داخل ہوتا ہے)

شیبلسکی۔ (ہنستے ہوئے) واللہ وہ کوئی ایسا ویسا بدمعاش نہیں ہے ایک جینیس ہے، ماہر فن، ہم لوگوں کو چاہیئے کہ اس کا مجسمہ نصب کرائیں۔ وہ اس زمانہ کی تمام حماقتوں کا مجموعہ ہے، وکیل، ڈاکٹر سوداگر سبز انچی سمبوں کی حماقتوں کا معجون (برآمدہ کی سب سے نچلی سیڑھی پر بیٹھ جاتا ہے) اور حالانکہ میرے خیال میں اس کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی ہے، تعجب اسی پر ہے...... مردود کتنا بڑا جینیس ہوتا اگر تھوڑا تمدّن اور علم حاصل کر لیتا! کہتا ہے "تم ایک ہفتہ میں بیس ہزار روپیہ حاصل کر سکتے ہو" اور کہتا ہے "تمہارے ہاتھ میں ابھی تک نہایت قیمتی مہرے ہیں، تمہارا خطاب" (ہنستا ہے) "کافی جہیز والی ہر لڑکی تم سے شادی کرنے پر تیار ہوگی......"

(انا پیٹرو ونا کھڑکی کھول کر نیچے دیکھتی ہے)

شیبلسکی۔ کہتا ہے "کیا تم پسند کرو گے کہ میں مارفوشا سے تمہاری نسبت لگا دوں؟" اور یہ سونے کی چڑیا مارفوشا کون ہے؟ اوہ وہی بلا بالکن...... بابا کالکن...... جو صورت سے دھوبن معلوم ہوتی ہے......

انا پیٹرو ونا۔ تم ہو کاؤنٹ؟

شیبلسکی۔ کیا بات ہے؟

(انا پیٹرو ونا ہنستی ہے)

شیبلسکی۔ (یہودی لہجہ میں) تم ہنس کیوں رہی ہو؟

انا پیٹرو ونا۔ مجھے تمہارا ایک قول یاد آگیا۔ یاد ہے ایک مرتبہ کھانے پر تم نے کہا تھا کہ "چور جسے معاف کر دیا گیا ہو، گھوڑا...... اس کے بعد کیا ہے؟

شیبلسکی۔ یہودی جو عیسائی ہو جائے، چور جسے معاف کر دیا گیا ہو، گھوڑا جس پر ڈاکٹری کی گئی ہو...... سب یکساں ہیں۔

انا پیٹرو ونا۔ تم ایک مذاق بھی ایسا نہیں کر سکتے جس میں کینہ نہ ہو۔ تم کینہ پرور آدمی ہو (سنجیدہ ہو کر) مذاق نہیں کاؤنٹ۔ تم بڑے ہی کینہ پرور ہو۔ تمہارے ساتھ زندگی بے کیف اور پریشان کن ہوتی ہے۔ ہمیشہ بدبداتے اور شکوے کرتے رہتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ تمام لوگ بدمعاش اور منافق ہیں۔ سچ بتاؤ تم نے کسی شخص کے متعلق کبھی کوئی اچھی بات بھی کہی ہے؟

شیبلسکی۔ یہ جرح کیوں ہو رہی ہے؟

انا پیٹرو ونا۔ ہم دونوں پانچ سال سے ایک ہی چھت تلے رہتے ہیں لیکن میں نے کبھی تم کو سکون کے ساتھ کینہ یا تمسخر کے بغیر کسی کا ذکر کرتے نہیں سُنا۔ لوگوں نے آخر تم کو کیا نقصان پہنچایا ہے؟ تم واقعی سمجھتے ہو کہ تم دوسروں سے کسی طرح بھی بہتر ہو؟

شیبلسکی۔ میں ایسا بالکل نہیں سمجھتا۔ میں خود اتنا ہی بڑا بدمعاش اور ٹوپی پہنے ہوئے سؤر ہوں جتنا دوسرے۔ بدخصال اور پرانا چیتھڑا۔ میں ہمیشہ اپنے آپ کو کوستا ہوں۔ میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ میں کبھی دولتمند تھا، آزاد اور مسرور، لیکن اب...... میں محتاج

ہوں اور مصاحبت کرنے والا ذلیل مسخرا۔ میں غصہ ور ہوں، میں لوگوں سے نفرت کرتا ہوں اور لوگ مجھ پر ہنستے ہیں۔ میں ہنستا ہوں تو لوگ افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ بڈھے کا دماغ خراب ہوگیا ہے .... اور زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ وہ میری بات بھی نہیں سنتے نہ ان پر کوئی توجہ دیتے ہیں ....

اناپیٹروونا۔ آج پھر بول رہا ہے۔

شیبلسکی۔ کون بول رہا ہے؟

اناپیٹروونا۔ الّو۔ روزانہ شام کو بولتا ہے۔

شیبلسکی۔ بولنے دو۔ اس وقت جو حالت ہے اس سے بدتر کوئی چیز نہیں ہوسکتی (پھیل کر بیٹھتا ہے) آہ عزیز سارہ۔ کہیں مجھے لاکھ دو لاکھ روپیہ ہاتھ لگ جائیں تو میں کچھ کر کے تمہیں دکھا دوں۔ پھر تم مجھے یہاں نہ دیکھو گی، میں اس کال کوٹھری سے نکل جاؤں گا۔ خیرات کے ٹکڑوں کو ٹھوکر مار دوں گا .... اور پھر قیامت تک یہاں قدم نہیں رکھوں گا ....

اناپیٹروونا۔ اور اگر واقعی تمہیں دولت مل جائے تو کیا کرو گے؟

شیبلسکی۔ (ایک لمحہ سوچنے کے بعد) پہلے تو میں جپسیوں کا گانا سننے ماسکو جاؤں گا، پھر .... پھر میں پیرس چلا جاؤں گا، وہاں ایک کمرہ لوں گا، روسی گرجا میں جایا کروں گا۔

اناپیٹروونا۔ اور کیا کرو گے؟

شیبلسکی۔ کئی کئی دن تک لگاتار اپنی بیوی کی قبر پر بیٹھوں گا اور سوچوں گا۔ وہیں بیٹھا رہوں گا یہاں تک موت آجائے۔ میری بیوی پیرس میں مدفون ہے .... (وقفہ)

اناپیٹروونا۔ کتنی بے کیف زندگی ہے۔ ایک مرتبہ اور مل کر گاؤ گے؟

شیبلسکی۔ اچھی بات ہے۔ باجہ شروع کرو۔

(اناپیٹروونا چلی جاتی ہے، آیوانف اور لووو داخل ہوتے ہیں)

آیوانف۔ (راستہ میں لووو کے ساتھ دکھائی دیتا ہے) میرے دوست تم نے اگلے ہی سال ڈگری لی ہے۔ ابھی تک جوان اور قوی ہو۔ اور میں ۳۵ سال کا ادھیڑ ہوں۔ مجھے تم کو مشورہ دینے کا حق ہے میرا مشورہ ہے کہ کبھی کسی یہودن سے شادی نہ کرو۔ نہ کمزور اعصاب کی عورت سے اور نہ ادیبہ سے، ایسی عورت چنو جو عام عورتوں کی طرح ہو، بھورا رنگ رکھتی ہو، نہ زیادہ سرخ و سپید، نہ بہت شوخ و شنگ اپنی زندگی رواجی نمونہ کے مطابق تعمیر کرو۔ میرے عزیز پس منظر جتنا زیادہ بے کیف اور بے رنگ و بو ہے بہتر ہے۔ تن تنہا ہزاروں سے جنگ مت کرو اور نہ ہوا سے لڑو، نہ دیوار سے سر ٹکراؤ ...... خدا تمہیں سائنٹفک کاشتکاری، شاندار اسکولوں اور پرجوش تقریروں کی بلاؤں سے محفوظ رکھے ...... ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں اپنے آپ کو بند کر لو، اور خدا نے جو ذمہ داریاں تم پر عائد کی ہیں انہیں پورا کرو ...... یہ زندگی زیادہ آرام دہ، زیادہ مسرت آگیں اور زیادہ ایماندارانہ ہے۔ لیکن جو زندگی میں نے گزاری ہے وہ بہت تھکا دینے والی ہے۔ اُف کتنا تھکا دینے والی! ...... مجھ سے زندگی میں کتنی غلطیاں سرزد ہوئیں، کتنی ناانصافیاں، اور کتنی حماقتیں .... (کاؤنٹ کو دیکھ کر چڑچڑے لہجہ میں) ماموں آپ ہمیشہ ساتھ لگے رہتے ہیں۔ کبھی اطمینان سے باتیں نہیں کرنے دیتے!

۴۱ شیبلسکی۔ (روتی آواز میں) خدا مجھے غارت کرے، میرے لئے کہیں پناہ نہیں ہے (کود کر مکان کے اندر چلا جاتا ہے)

آیوانف۔ (اس کو پکارتے ہوئے) اُف میں بہت نادم ہوں (لووو سے) کیوں میں نے ان کے جذبات کو ٹھیس لگائی۔ ضرور میرے دماغ کا کوئی پرزہ خراب ہوگیا ہے۔ مجھے اپنا علاج کرانا چاہئے۔ واقعی کرانا چاہئے ....

لووو۔ (جوش میں) نکولائی الیکزیوچ میں نے تمہاری باتیں سن لیں .... اور معاف کرنا میں صاف صاف بغیر کسی تمہید کے کہوں گا کہ نہ صرف تمہارے الفاظ، بلکہ تمہاری آواز، تمہارا لہجہ سخت بے روح انانیت اور انتہائی بیدردی سے بھرا ہوا ہے ...... ایک ہستی جو تمہاری قریب ترین عزیز ہے تمہاری محبت کی بدولت مر رہی ہے، اس کی زندگی کے دن گنے ہوئے ہیں اور تم ...... تم اس سے بے اعتنائی کرتے ہو، ٹہل ٹہل کر مشورہ دیتے پھرتے ہو اور بنتے ہو .... میں تم سے نہیں کہہ سکتا، الفاظ پر مجھے قدرت نہیں لیکن .... لیکن میرے لئے تم نہایت ہی مکروہ شخص ہو!

آیوالف۔ بہت ممکن ہے، بہت ممکن ہے........ باہر سے تم زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتے ہو........ بہت ممکن ہے کہ تم سمجھتے ہو........ میرا خیال ہے سارا الزام میرے ہی سر ہے........ (کچھ سُننے کی کوشش کرتا ہے) معلوم ہوتا ہے گاڑی آرہی ہے۔ میں جاکر تیار ہوتا ہوں........ (مکان کی طرف جاتے جاتے رُک جاتا ہے) ڈاکٹر تم مجھ سے نفرت کرتے ہو اور اپنی نفرت چھپاتے نہیں۔ یہ تمہارے دل کی صفائی ہے........ مکان کے اندر چلا جاتا ہے۔

لووو۔ (تنہائی میں) کمبخت کمزوری۔ پھر میں نے موقعہ کھودیا۔ جو کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا میں اس سے سکون کے ساتھ باتیں ہی نہیں کرسکتا۔ جیسے ہی زبان کھولی اور ایک لفظ کہا کہ حلق خشک ہوگیا اور یہاں (سینہ کی طرف اشارہ کرتا ہے) دم پھولنے لگا زبان تالو میں سٹ گئی۔ میں اس مردود سے، اس شریف بدمعاش سے نفرت کرتا ہوں، سخت نفرت........ ذرا دیکھئے باہر جارہا ہے........ بیچاری بیوی کو صرف اس سے مسرت ہوتی ہے کہ یہ شخص اس کے قریب رہے۔ وہی اس کی زندگی ہے۔ منّت کرتی ہے کہ ایک شام ساتھ گزارے اور وہ........ وہ اتنا بھی نہیں کرسکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں اس کا دم گھٹتا ہے، روح خشک ہوتی ہے۔ ایک شام بھی گھر پر گزارتا ہے تو اتنا مضمحل ہوجاتا ہے جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ بیچارہ........ اس کو تو آزادی چاہیئے کہ نئی نئی شرارتیں کرسکے........ آہ، میں خوب جانتا ہوں کہ آپ روزانہ شام کو لیبیڈیو کے یہاں کیوں تشریف لے جاتے ہیں، خوب جانتا ہوں۔

(آیوالف ہیٹ اور اوورکوٹ پہنے، انا پیٹرووناً اور شیبلسکی داخل ہوتے ہیں)

شیبلسکی۔ (انا پیٹروونا اور آیوالف کے ساتھ باہر آتے ہوئے) واقعی نکولائی، یہ بڑی خلاف انسانیت بات ہے۔ روزانہ شام کو تم باہر چلے جاتے ہو اور ہم لوگ اکیلے رہ جاتے ہیں، اتنے اُکتا جاتے ہیں کہ آٹھ ہی بجے نیند آنے لگتی ہے۔ یہ بڑا ظلم ہے، یہ کوئی زندگی نہیں۔ اور کیا وجہ ہے کہ تم جاسکتے ہو اور ہم لوگ نہیں جاسکتے؟ کیا وجہ ہے؟

انا پیٹرووناً۔ چھوڑیئے ان کو، جانے دیجئے۔

آیوالف (بیوی سے) بیماری میں تم کیسے جاسکتی ہو۔ تم علیل ہو، مغرب کے بعد تمہیں باہر نہیں رہنا چاہیئے........ پوچھ لو ڈاکٹر سے۔ تم بچّہ نہیں ہو اینوتا۔ تمہیں سمجھنا چاہیئے........ (کونٹ سے) اور آپ وہاں کس لئے جانا چاہتے ہیں

شیبلسکی۔ میں جہنّم میں بھی جاسکتا ہوں۔ گھڑیال کے مُنہ میں بھی، اگر مجھے یہاں نہ رہنا پڑے میں اُکتا گیا ہوں، اُکتا کے خبطی ہوگیا ہوں۔ تم مجھے گھر پر چھوڑ جاتے ہو کہ انا اکیلی گھبرا نہ جائے اور میں ان پر بگڑتا رہتا ہوں اور وہ اُٹھتا ہوں۔

انا پیٹرووناً۔ چھوڑ دو، کونٹ چھوڑ دو، جانے دو۔ اگر ان کو اسی میں لطف آتا ہے۔

آیوالف۔ اینوتا تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟ تمہارا خیال ہے کہ میں وہاں تفریح کے لئے جارہا ہوں۔ مجھے قرضہ کے متعلق کچھ باتیں کرنی ہیں۔

انا پیٹرووناً۔ میں نہیں سمجھتی کہ تم صفائی کیوں پیش کررہے ہو۔ جاؤ۔ تم کو کوئی روک نہیں رہا ہے۔

آیوالف۔ ارے رے، ہمیں جھگڑنا نہیں چاہیئے۔ یقینی اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

شیبلسکی۔ (رونی آواز میں) نکولائی، تم بڑے اچھے لڑکے ہو، میں منّت کرتا ہوں، مجھے اپنے ساتھ لے چلو، وہاں میں ذرا احمقوں اور بدمعاشوں کو دیکھوں گا، ممکن ہے اس سے جی بہل جائے۔ ایسٹر کے بعد میں ابھی تک کہیں نہیں گیا ہوں۔

آیوالف (چڑچڑے لہجہ میں) بہتر، تشریف لے چلئے۔ میں تم لوگوں سے تنگ آگیا۔

شیبلسکی۔ چلوں؟ اوہو خوش قسمتی، خوش قسمتی........ (خوش خوش آیوالف کا بازو پکڑ کر علیحدہ لیجاتا ہے) تمہاری پروں والی ٹوپی پہن لوں؟

آیوالف۔ پہن لیجئے، لیکن جلدی کیجئے۔

(کونٹ دوڑتا ہوا اندر چلا جاتا ہے)

آیوالف میں تم سب لوگوں سے کتنا تنگ آگیا ہوں، لیکن یا خدا، میں یہ کیا کہہ رہا ہوں؟ اینوتا، میں ایسے بُرے لہجہ میں بات کرتا ہوں جسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے تو میں کبھی ایسا نہ تھا، خیر خدا حافظ، اینوتا، میں ایک بجے تک واپس آجاؤں گا۔

انا پیٹرووناً۔ کولیا پیارے، مت جاؤ، گھر ہی پر ٹھیرو۔

۱۴۲

آیوالف (اضطراب میں) جانِ من، میری رنجیدہ ڈارلنگ، میں تم سے التجا کرتا ہوں، شام کو باہر جانے سے مجھے نہ روکو میں تم پر ظلم کر رہا ہوں اور ناانصافی لیکن مجھے کرنے دو۔ گھر پر میں بڑی کبیدگی محسوس کرتا ہوں، ہوں ہی سوچ ڈوبتا ہے مجھ پر مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے سخت مصیبت، اس کی وجہ نہ پوچھو، اسے میں خود نہیں جانتا۔ یہاں پریشانی ہوتی ہے تو لیبیڈو کے یہاں چلا جاتا ہوں، وہاں اس سے بھی بُرا حال رہتا ہے، واپس آتا ہوں، یہاں پھر وہی حال، رات بھر اسی طرح گزرتی ہے ...... اب تو بالکل جی چھوٹ گیا۔

اناپیٹرو ونا۔ کولیا ...... لیکن اگر تم یہاں ٹھیر جاؤ؟ ہم لوگ پہلے کی طرح باتیں کریں گے، ساتھ کھانا کھائیں گے، پڑھیں گے ...... میں نے اور بڈھے کونٹ نے تمہاری خاطر بہت سے گانے سیکھے ہیں (اپنے بازو اس کی کمر میں ڈالدیتی ہے) ٹھہر جاؤ (ذرا سا وقفہ) تمہاری حالت میری سمجھ میں نہیں آتی، سال بھر سے یہی حال ہے، آخر تم اس طرح بدل کیوں گئے؟

آیوالف میں خود نہیں جانتا، خود نہیں جانتا ......

اناپیٹرو ونا۔ اور تمہیں میرا ساتھ جانا کیوں ناپسند ہے؟

آیوالف تم جاننا چاہتی ہو تو سنو۔ تم سے کہنا، تم پر ظلم کرنا ہے، لیکن بہتر ہے کہ کہہ ہی ڈالوں ...... جب میں کبیدہ رہتا ہوں تو میں .... میں تم سے محبت نہ کرنا شروع کر دیتا ہوں۔ ایسے وقت میں میں تم سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ مختصر یہ کہ جی چاہتا ہے گھر سے بھاگ جاؤں۔

اناپیٹرو ونا۔ کبیدگی! میں خوب سمجھتی ہوں، خوب سمجھتی ہوں ...... تم سمجھتے ہو کولیا یہ کیا ہے؟ کوشش کرو گانے کی، ہنسنے کی، روٹھنے کی جیسے تم پہلے کیا کرتے تھے ...... یہاں ٹھہرو، ہم لوگ ہنسیں گے گھر کی بنی ہوئی شراب پئیں گے، اور تمہاری کبیدگی کو ایک لمحہ میں دور کر دیں گے۔ گا کر کچھ سناؤں؟ یا پھر ہم دونوں تمہارے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھیں گے، تاریکی میں، جیسا کہ ہم پہلے کیا کرتے تھے۔ اور تم مجھے اپنی کبیدگی کا قصہ سناؤ گے ...... تمہاری آنکھوں سے کتنی تکلیف جھلک رہی ہے۔ میں ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دوں گی اور ہم دونوں کی حالت بہتر ہو جائے گی ...... (انا ہنستی ہے اور پھر روتی ہے) کیوں کولیا، یہ کیا بات ہے کہ پھول تو ہر سال موسم بہار میں آجاتے ہیں لیکن خوشیاں نہیں آتیں؟ کیوں؟ اچھا تو جاؤ، جاؤ ......

آیوالف میرے لئے دُعا کرو انیوتا (آگے بڑھتا ہے، رکتا ہے اور سوچنے لگتا ہے) نہیں مجھ سے نہیں ہو سکتا (چلا جاتا ہے)

اناپیٹرو ونا۔ جاؤ ...... میز پر بیٹھ جاتی ہے۔

لوو و۔ (اسٹیج کے اوپر نیچے آتا جاتا رہتا ہے) اناپیٹرو ونا، تم کو معمول بنا لینا چاہئے کہ جیسے ہی چھ بجیں تم اندر آجاؤ۔ اور صبح تک یہیں ہو شام کی مرطوب ہوا تمہارے لئے نقصان دہ ہے۔

اناپیٹرو ونا۔ بہت اچھا جناب والا۔

لوو و۔ اس لہجہ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں

اناپیٹرو ونا۔ اور میں سنجیدہ رہنا ہی نہیں چاہتی (کھانسنے لگتی ہے)

لوو و۔ دیکھو تم نے کھانسنا شروع کر دیا۔

(شیبلسکی داخل ہوتا ہے)

شیبلسکی۔ (ہیٹ اور اوورکوٹ پہنے باہر آتا ہے) نکولائی کہاں ہے؟ وہاں گاڑی ہے؟ (جلدی سے جاکر انا کا ہاتھ چومتا ہے) شب بخیر میری موہنی (منہ بناتے ہوئے) معاف کرنا (جلدی سے چلا جاتا ہے)

لوو و۔ مسخرا۔

(وقفہ۔ دور سے گانے بجانے کی آواز آتی ہے)

اناپیٹرو ونا۔ کتنی اُداسی ہے! سائیس اور باورچی گا بجا رہے ہیں۔ اور میں ...... ایسا معلوم ہوتا ہے، مجھے سبھوں نے چھوڑ دیا۔ لووو، تم اوپر نیچے کیا آجا رہے ہو؟ بیٹھو آکے۔

لووف۔ میں چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ (ذرا سا وقفہ)

اناپیٹرو ونا۔ وہ سب باورچی خانہ میں گرین فنچ گا رہے ہیں (خود بھی گانے لگتی ہے) ...... (وقفہ) کیوں ڈاکٹر تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟

لوو و۔ باپ کا انتقال ہو گیا، ماں موجود ہیں۔

اناپیٹرو ونا۔ تم اپنی ماں کی عدم موجودگی محسوس نہیں کرتے؟

لوو و۔ مجھے اس احساس کی فرصت نہیں۔

انا پیٹروونا۔ (ہنسنے لگتی ہے) پھول ہر بہار میں آتے ہیں، لیکن خوشیاں نہیں آتیں۔ کس نے مجھے یہ جملہ سُنایا تھا؟ ذرا یاد کروں...... میرا خیال ہے خود نکولائی نے سُنایا تھا (کچھ سُننے کی کوشش کرتی ہے) پھر اُلّو بول رہا ہے۔

لووو۔ تو بولنے دو۔

انا پیٹروونا۔ میں کبھی کبھی سوچنے لگتی ہوں ڈاکٹر کہ تقدیر نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے، دُنیا میں ہزاروں آدمی ہیں، کسی لحاظ سے مجھ سے بہتر نہیں، لیکن خوش ہیں اور خوشی کی کوئی قیمت ادا نہیں کرتے میں نے ہر چیز کے دام دئے ہیں، ہر ہر چیز کے! دام بھی کتنے ہونگے! پھر مجھ سے اتنا سخت سود کیوں وصول کیا جا رہا ہے .... میرے اچھے دوست، تم میرے سامنے ہمیشہ چوکنے سے رہتے ہو۔ میرے جذبات کا بڑا خیال رکھتے ہو، مجھ سے سچ کہتے ڈرتے ہو لیکن کیا تم سمجھتے ہو میں اپنا مرض نہیں جانتی؟ اچھی طرح جانتی ہوں۔ لیکن اس کا ذکر تکلیف دہ ہے (یہودی لہجہ میں) معاف فرمائیے گا جناب کیا تم عجیب وغریب کہانیاں سُنا سکتے ہو؟

لووو۔ نہیں۔

انا پیٹروونا۔ نکولائی سُنا سکتا ہے۔ مجھے لوگوں کی ناانصافیوں پر تعجّب ہوتا ہے، کیوں یہ لوگ محبّت کا جواب محبّت سے نہیں دیتے؟ سچائی کا جواب جھوٹ سے کیوں دیتے ہیں؟ مجھے بتاؤ، میرے ماں باپ کب تک مجھ سے نفرت کرتے رہیں گے؟ مجھ سے چالیس میل کے فاصلہ پر رہتے ہیں۔ لیکن میں دن رات یہاں تک کہ نیند میں بھی اُن کی نفرت محسوس کرتی ہوں۔ اور تمہارے خیال میں نکولائی کی کبیدگی سے مجھے کیا نتیجہ نکالنا چاہئے؟ وہ کہتا ہے کہ صرف شام کے وقت جب کبیدگی کا غلبہ ہوتا ہے تو مجھ سے محبّت نہیں کرتا۔ اتنا پھر میں سمجھ سکتی ہوں اور جائز رکھ سکتی ہوں، لیکن فرض کرو وہ مجھ سے بالکل اکتا جائے! یقینی یہ ناممکن ہے، لیکن ـــ اگر ایسا ہو؟ نہیں، نہیں، مجھے ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہئے۔ (گانے لگتی ہے اور گاتے گاتے چونک پڑتی ہے) میرے دماغ میں کیسے خوفناک خیالات آرہے ہیں!

ڈاکٹر تمہاری شادی ابھی نہیں ہوئی، اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو تم نہیں سمجھ سکتے۔

لووو۔ تمہیں تعجب ہوتا ہے .... (انا کی بغل میں بیٹھ جاتا ہے) نہیں مجھے .... مجھے تعجب ہوتا ہے ـــ مجھے تم پر تعجب ہوتا ہے! آؤ ذرا بتاؤ، مجھے سمجھاؤ، کیا وجہ ہے کہ تمہاری جیسی ذہین، ایماندار، فرشتہ خصلت عورت، اس شرمناک طریقہ سے فریب کھانے اور اس اُلّو کے گھونسلے میں کھنچ لائے جانے پر تیّار ہوگئی؟ تم یہاں کیوں ہو؟ تم میں اور اُس بے رحم، بے روح شخص میں کیا بات مشترک ہے........ لیکن تمہارے شوہر کے ذکر کو چھوڑ ہی دینا چاہئے ـــ تم اس ذلیل، بے کیف فضا میں کیا بات پاتی ہو؟ خدا کی پناہ! .... وہ ہمیشہ شکایت کرتا رہنے والا دہقانی، پاگل کونٹ اور وہ بدمعاش مشا ـــ اگر دُنیا میں کوئی بدمعاش ہے تو وہ ضرور ہے ـــ اور اس کی کریہہ صورت .... مجھے بتاؤ، تم یہاں کس لئے ٹھہری ہو، تم کیسے یہاں آئیں؟

انا پیٹروونا۔ (ہنستی ہے) بالکل اسی طرح وہ بھی باتیں کرتا تھا، لفظ بہ لفظ....... لیکن اس کی آنکھیں بڑی ہیں۔ لیکن جب وہ جوش میں بولتا ہے تو انگارے کی طرح چمکنے لگتی ہیں........ بولے جاؤ، بولے جاؤ۔

لووو۔ (ہاتھ ہلاتے ہوئے اٹھتا ہے) کیا بولے جاؤں؟ تم اندر جاؤ۔

انا پیٹروونا۔ تم کہتے ہو نکولائی ایسا ہے، ویسا ہے، یہ ہے، وہ ہے، تم اس کو کیسے جانتے ہو؟ تم سمجھتے ہو کہ ایک آدمی کے پہچاننے کے لئے چھ مہینہ کافی ہیں۔ وہ ایک نمایاں شخصیت کا آدمی ہے ڈاکٹر اور مجھے افسوس ہے کہ تم اس سے تین چار سال پہلے نہیں ملے۔ آج کل وہ دل شکستہ اور ملول رہتا ہے، نہ ٹھیک سے باتیں کرتا ہے نہ کوئی کام۔ لیکن کچھ دنوں پہلے....... اس میں کتنی جاذبیت تھی! میں پہلی نظر میں اس سے محبّت کرنے لگی تھی (ہنستی ہے) ادھر میری نظر پڑی، اُدھر چوہے دان کا دروازہ بند ہوگیا۔ اس نے کہا "چلی آؤ"....... میں نے

ہر بندھن کاٹ دئے، جیسے تم سمجھو کہ کوئی سوکھی پتیوں کو قینچی سے کاٹ دے، اور اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ (وقفہ) لیکن اب حالت مختلف ہے۔ آج کل وہ لیبیڈیو کے یہاں جاتا ہے تاکہ دوسری عورتوں سے دل بہلائے اور میں...... باغ میں بیٹھی اُلّو کی آواز سُنا کرتی ہوں...... (چوکیدار دستک دیتا ہے) تمہارا کوئی بھائی ہے ڈاکٹر؟

لووو۔ نہیں۔

(انا پیٹروونارونے لگتی ہے)

لووو۔ ایں، یہ کیا؟ کیا بات ہے؟

انا پیٹرو ونا۔ (اٹھتی ہے) ڈاکٹر مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا...... میں جاتی ہوں......

لووو۔ کہاں؟

انا پیٹرو ونا۔ جہاں وہ ہے........ میں جاتی ہوں۔ تم آدمیوں سے کہدو کہ گھوڑے ٹھیک کریں۔ (مکان کے اندر چلی جاتی ہے)

لووو۔ نہیں۔ ایسے حالات میں مریض کا علاج کرنے سے مجھے قطعی انکار کر دینا چاہئے۔ نہ صرف یہ کہ یہ لوگ مجھے ایک پیسہ نہیں دیتے بلکہ میری روح تلے اوپر کر دیتے ہیں........ نہیں اب میں انکار کر دیتا ہوں، یہ انتہا ہے (مکان کے اندر چلا جاتا ہے)

(پردہ) (باقی)

(صفحہ ۵٦ کا بقیہ مضمون)

زندگی کے متعلق۔ کہیں اسے یہ خیال نہ آگیا ہو کہ وہ بھی کسی دور دراز جگہ پر نہ پھینک دی جائے۔ اور یہ مہیب سا طوفان جسے ریل کہتے ہیں اس جگہ سے اُٹھا کر کہیں بیگانوں میں نہ لے جا پٹکے۔

میرے پاؤں بھاری بھاری ہو گئے، ہاتھوں کی طاقت سُست پڑ گئی، سانس گھٹتی ہوئی معلوم ہوئی، اور میں نے ایک تیزی کے ساتھ اس کے شانوں پر سے جُھک کر اُس کے ہونٹ........ اُس نے ایک انگڑائی سی لی، ایک جُھرجُھری سی اس کے بدن میں پیدا ہوئی۔ وہ تیزی سے میری گرفت سے نکل گئی جیسے کوئی چنگاری ہوا سے بھڑک کر اُڑ جائے۔

دوسرے دن ماں میری طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہی تھی؛

"تونے رات یہ کیا حرکت کی رے، وہ سعیدہ کی نانی شکایت کرنے آئی تھی۔!"

میرے گلے میں ایک پھندا سا پڑ گیا، میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین پھٹ گئی ہے اور میں اُس میں دھنستا چلا جا رہا ہوں۔

ماں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں جوالامکھی کے دہانے پر کھڑا ہوں اور وہ مجھے پکڑنے کیلئے دوڑنا چاہتی ہیں۔!

سُدرشن

آوارہ دماغ

مذہب کی پیدایش

دُنیا میں مذہب نہیں تھا۔ مندر نہیں تھے۔ دیوتا نہیں تھے۔

لوگ امن پسند تھے، اور بہادر تھے، اور جو کچھ ان کے من میں آتا تھا وہ زبان سے کہہ دیتے تھے۔

مگر ان میں سے ایک آدمی چالاک تھا، اور ایک دوسرا آدمی سادہ لوح تھا، اور چالاک آدمی کاہل تھا اور سادہ لوح آدمی کے بازوؤں میں شکار مارنے کی اور زمین سے مٹی کھودنے کی بے پناہ قوت تھی۔

ایک بار قدرت نے آدمی رات کے اندھیرے میں دونوں کو ملا دیا۔

دوسرے دن شہر کے چوک میں مندر تھا، مندر میں دیوتا تھے، دیوتاؤں میں سزا اور جزا دینے کی طاقت تھی۔

اور وہ دونوں آدمی جو رات کے اندھیرے میں ملے تھے۔ اَب دن کی روشنی میں مندر پہنچے۔

ایک نے ڈرتے ڈرتے اپنی محنت و کوشش سے پیدا کیے ہوئے پھل اور اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹھائیاں دیوتاؤں کے سامنے پیش کیں اور نمسکار کرکے اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ دوسرے نے آگے بڑھ کر نذر بھینٹ کی یہ سب چیزیں اُٹھالیں اور کھا پی کر وہیں لیٹ گیا۔

میری بڑائی

جس دن میں نے موٹر کار خریدی اور اُس میں بیٹھ کر بازار سے گزرا۔ اُس دن میں نے اپنے من سے کہا۔ یہ پاؤں سے چلنے والے لوگ بہت چھوٹے ہیں اور میں بہت بڑا ہوں۔

اور اُس وقت میرے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

جب شام کو میں اور میری بڑائی گھر کو لوٹے تو دونوں خوش تھے اور ہمارے چہرے چمکتے تھے۔

اور جب ہم صوفے پر بیٹھ گئے؟ تو میری چھوٹی بیٹی ایک کرسی گھسیٹ کر ہمارے قریب لے آئی۔ اور اس پر کھڑی ہو کر بولی میں تم سے بڑی ہوں اور تم مجھ سے چھوٹے ہو۔

اُس وقت اس کے چہرہ پر مذاق کی ہنسی تھی۔

اور میرے مَن میں یہ بات چبھی۔ اور میں نے اپنی بڑائی کی طرف دیکھا۔ مگر میری بڑائی بجلی کی روشنی میں غائب ہو چکی تھی۔

پردے

سات سمندروں کے پار ایک آٹھواں سمندر ہے۔ اور اس میں ایک ٹاپو ہے جس کا نام آج تک کسی نے نہیں سُنا۔ اور اس ٹاپو میں ایک آدمی ہے جسے آج تک دُنیا کے کسی بیٹے نے نہیں دیکھا۔

جب خدا نے اسے پیدا کیا تو اس کے ساتھ کئی پردے بھی پیدا کئے اور اُن پر مہریں لگا دیں۔ اور آدمی سے کہا یہ پردے نہ پھاڑنا۔ یہ پردے تیری خوشیاں ہیں۔

اور جب اس ٹاپو پر رات کی تاریکی چھا جاتی تھی تو ان پردوں کے اندر سے روشنی نکلتی تھی۔ اور آدمی اس روشنی میں اپنے راستے ڈھونڈھ لیتا تھا۔

اور جب وہ دن کے وقت اُداس ہو جاتا تھا تو ان پردوں کے پیچھے کوئی گاتا تھا۔ اور ان گیتوں کی مٹھاس اس کی اداسیوں کو دور کر دیتی تھی۔

مگر آدمی کے من میں حیرانی پیدا ہوئی، اور اُس حیرانی نے کہا پتہ نہیں۔ ان پردوں کے اندر کیا ہے جو اندھیرے میں چمکتا ہے اور

اُداسیوں میں گاتا ہے۔

آدمی نے اپنی حیرانی کی بات سُنی اور پردے پھاڑ ڈالے، اور ان پردوں کے اندر سے زمینوں کا سونا۔ اور سمندروں کے موتی۔ اور آسمانوں کے تارے نکلے۔ اور آدمی اپنے دل میں خوش ہوا کہ مجھے یہ خوشی کی چیزیں مل گئی ہیں۔

مگر جب رات ہوئی تو ان میں ان کی چمک نہ تھی۔ اور جب دن ہوا تو ان میں ان کے گیت نہ تھے۔

اب وہ آدمی اپنا سر ٹاپو کے پتھروں پر پٹکتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح وہ پردے پھر سے سِل جائیں۔ اور مہریں پھر سے لگ جائیں۔ مگر پردے سلتے نہیں مہریں لگتی نہیں۔

حرماں خیر آبادی

آج کا انسان

جو شخص موجودہ نام نہاد سوسائٹی اور آج کے انسان کے رُخ سے پردے اٹھاتا ہے۔ جو شخص اس طلسم کو اپنے فکر و عمل کی ضربوں سے توڑتا ہے وہ انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد اور دوست ہے، وہ شخص وہی فریضہ ادا کرتا ہے جو اپنے اپنے دور میں دُنیا کے عظیم الشان مصلحین نے ادا کیا۔ ضمیر کا سکون صرف اس لگن میں پوشیدہ ہے کہ ایک نئی اجتماعی نیکی کے تصوّر کو زندہ اور باعمل بنانے میں زندگی صرف و تباہ کر دی جائے۔
جو افراد سوسائٹی کی تاریک و غلیظ دلدل سے روزانہ گزرتے اور دل پر چوٹیں کھا کر لوٹتے ہیں اُنھیں ان رباعیات سے یقیناً تسکین ہوگی۔ ساغر

ایماں کی جہاں میں کم عیاری! توبہ
سچ ہے، کہ طلسمِ شر سے بچنا ہے محال
انسان کی تمثیل نگاری! توبہ
اخلاص کی تہ میں ہرزہ کاری! توبہ

مانا کہ خراب ہے زمانہ یارب
چہرے سے تو آثارِ تبسّم ہیں عیاں
اس مکر کا بھی کچھ ہے ٹھکانا یارب
اور دِل ہے غموں کا اِک خزانہ یارب

ظاہر کہیں شانِ افترا بھی تو نہیں
اللہ رے مکر و فن کا گہرا پالش
کردار میں باطن کی ہوا بھی تو نہیں
چہروں پہ عقائد کا پتا بھی تو نہیں

باطل کا چمن رہیگا تازہ کب تک
ارباب کی نکتہ بیں نگاہوں میں حضور
اُٹھے گا صداقت کا جنازہ کب تک
چہرے پہ ملے رہینگے غازہ کب تک

رام پرتاپ بہادر۔ ایم، اے

گاؤں کی لڑکی

رام پرتاپ بہادر ہندی کے مشہور و عالی مرتبت افسانہ نگار ہیں، جہاں ہندی میں کوتاہی نہیں کہانی تک پر ایک مہمل سٹیسزم چھایا ہوا ہے وہاں رام پرتاپ جیسے ترقی یافتہ کہانی لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ جن کی کہانی میں انسانی نفسیات نگاری کے گہرے چھینٹے ہوتے ہیں اور ان کے افسانہ میں فن کاری کے اعلیٰ عناصر تکمیل کے ساتھ زندہ و تابندہ نظر آتے ہیں۔

روسی افسانہ نگاروں کی طرح وہ جزئیات نگاری میں ماہر ہیں، بے ساختگی، صداقت، ربط اور ہم آہنگی، یہ تمام جوہر ان کی کہانی کی جان ہوتے ہیں۔ ماحول کی ایک ایک چیز کی مناسب اور کامل تصویر کے ساتھ تجزیۂ نفس بہادر کی خصوصیت ہے۔

بہادر زندگی کا افسانہ نگار ہے، زندگی میں معیشت اور روایاتی اخلاق کے عناصر جس مقدار میں اور جس طرح کام کرتے ہیں وہ اس مقدار اور نوعیت سے ایک انچ آگے نہیں بڑھتا؛ سماج کے بندھن، قوی اور کمزور کی کشمکش، امیر و غریب کی دوری، چھوٹے اور بڑے کا عظیم بُعد، برائی اور بھلائی کی قدریں، زندگی کے معیاروں کا دل ہلا دینے والا تضاد، ان تمام طوفانوں کو وہ کہانی میں نامحسوس طور پر بند کر دیتا ہے، اخلاقی مآل اس کا مقصود ہوتا ہے، نہ اخلاقی نمائش، مقصود اس کا محض کہانی ہوتا ہے، مگر دل و دماغ گہرے استفہام و تفہیم کی آماجگاہ بنجاتے ہیں، اور نتائج وہی نکلتے ہیں جو بہادر کے آرٹ کا نامحسوس مقصود ہوتا ہے۔ ۴۸

اس کے کردار خود اُس سے اور وہ اپنے کرداروں سے اس درجہ قریب ہے، گویا ان ہی میں سے ایک ہے انسانی زندگی، اور فطرتِ انسانی کے تجربہ نے اُسے ماہر کی حیثیت دیدی ہے۔

اس کی کہانی کی ماحول نگاری بھی اس کی بڑی خصوصیت ہے؛ جیتے جاگتے ماحولوں سے ہمارے احساس و خیال گزرتے ہیں، اور ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ سارا واقعہ ہم ہی پر بیت گیا؛ اس کی کہانی سماج اور اس کے ماحول و اخلاق کے تضاد کا چمکتا ہوا آئینہ ہے؛

ہر شاعر مجھے کچھ نہ کچھ متاثر کر سکتا ہے مگر ہر افسانہ نگار نہیں؛

گاؤں کی لڑکی پڑھتا ہوں، ختم کرتا ہوں، اور پھر پڑھتا ہوں، سیدھے سادے الفاظ میں ہمارے نظامِ زندگی اور انسانی فطرت کے ظلم کی کیسی دُکھ بھری تصویر ہے! !؟ (ساغر)

سڑک سے ملا ہوا گاؤں تھا۔ سڑک سے دیکھنے پر دو بڑے بڑے مہوے کے درخت دکھائی دیتے تھے۔ درخت گاؤں کو جانیوالی پگڈنڈی کے پاس ہی تھے۔ کھیت میں ایک جگہ کھڑے کھڑے وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ مہوے کے یہ درخت بہت بڑے تھے لیکن ایک دوسرے سے چھوٹائی بڑائی انھوں نے قائم رکھی تھی۔ بائیں طرف مڑ کر دیکھنے پر آم کے دو اونچے اونچے درخت بھی نظر آتے تھے۔ عمر اور قد میں آم کے درخت مہوے کے درختوں کے ساتھی تھے اور یہ چاروں درخت ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے اس وقت کے گمراہ مسافر ہیں جب زمین پر آدم کی بود و باش نہ تھی۔

گاؤں کی زندگی میں ہر چھوٹی بڑی چیز کسی آسمانی طاقت کے بل ہی پر قائم معلوم ہوتی ہے۔ پگ ڈنڈی کے داہنی طرف دھتورے کی جھاڑیوں میں چھپا ہوا ڈیہہ بابا کا استھان تھا۔ مٹی کے بنے ہوئے ہاتھی کے سونڈ والے ڈیہہ بابا ان درختوں کے نگہبان تھے۔

اور آگے بڑھنے پر زمینداروں کے چار عالیشان مکان ملتے

تھے جو آم اور مہوئے کے قدآور درختوں کا اثر دماغ پر قائم رکھتے تھے زمینداروں کے مکانوں کے اوپر پیچھے کی طرف املی کے تین بڑے ہرے بھرے درخت نظر آتے۔ املی کے یہ درخت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان مکانوں کے لئے ایک سبز پس منظر بنا رہے ہوں۔

ان بلندیوں کی دُنیا میں پھوس کے جھونپڑوں کی پست آبادی پر شاید نظر بھی نہ جاتی۔ اگر وہیں گندے پانی کا ایک بڑا پوکھرا نظر نہ آجاتا پوکھرا چھوٹے مکانوں کی آبادی کو دو حصّوں میں بانٹ دیتا تھا۔ گاؤں کی دو مختلف دُنیاؤں کے درمیان جو بیچ بچاؤ کا مفید کام وہ پوکھرا کرتا تھا اُسے سرسری طور پر دیکھنے میں آسانی سے سمجھا بھی نہیں جاسکتا۔ اگر اس پچھّم کی آبادی کے نیچے گندے پوکھرے کی ہری کائی کھاتے ہوئے سوّروں کا ایک جھنڈ نظر نہ آجاتا؛

ہندوؤں کے پُرانے فن تعمیر کی رو سے گاؤں کی چمروٹی دکھّن اور پچھّم کے کونے پر ہوتی ہے۔ اس کونہ سے سال کے کسی بھی موسم میں ہوا چماروں کی زندگی کی بدبو گاؤں میں نہیں لاسکتی لیکن یہ چمروٹی گاؤں کے اتر پچھّم میں بسی ہوئی تھی۔ اس غلطی کی وجہ کوئی خاص خدائی یا انسانی مصلحت نہ تھی سوائے اس کے کہ زمین کی سطح کے لحاظ سے گاؤں کا پانی بہکر اُسی طرف سے دریا میں جاتا تھا جہاں وہ چمروٹی بسی ہوئی تھی۔

زمیندار کے مکان کے سامنے والے کنوئیں پر کہرام مچا ہوا تھا کچھ چمار عورتیں پھٹے پُرانے کپڑے پہنے چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ نوکر چاکر اِدھر اُدھر چھپے کھڑے تھے۔ کوئی بھینس کو انگوچھے سے جھاڑ رہا تھا۔ کوئی سلگتے ہوئے الاؤ سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کا رُخ مویشیوں کی طرف کر رہا تھا۔ بوڑھا ہلواہا گائے کی آڑ میں کھڑا تھا۔ روتی چیختی عورتوں کے درمیان ایک گورے رنگ کی نوجوان لڑکی بڑھیا کو اپنی گود میں سنبھالے آنسوؤں کے تار پرو رہی تھی۔ زمیندار کا لڑکا غصّہ اور ہیجان کی حالت میں برآمدے میں تیزی سے ٹہل رہا تھا۔ دروازہ پر ایک کالے رنگ کا جوان چھوکرا ننگے بدن سر جھکائے بیٹھا تھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ گائے کا دودھ چُرا کر کسی نے بھوسے کی کوٹھری میں رکھ دیا تھا۔ زمیندار کا لڑکا کارندے کے ہاتھ سے لاٹھی چھین کر چمار کے لونڈے پر ٹوٹ پڑا۔ اپنے بیٹے کی مار کی خبر سُنکر بڑھیا ماں روتی چلّاتی زمیندار کے دروازے پر چلی آئی۔ زمیندار کا لڑکا بھلا یہ کب برداشت کرسکتا تھا۔ اُس کے بوٹ جوتے کی ایک ہی ٹھوکر نے بڑھیا کو قریب قریب ٹھنڈا ہی کردیا۔ عورتیں اُسی کو گھیر کر رو رہی تھیں۔

ایک ہفتہ بڑھیا چارپائی پر پڑی رہی۔ تھانے کا سپاہی روز آتا زمیندار کے لڑکے سے بڑھیا کا حال کہتا اور دو روپیہ ٹینٹ میں رکھ کر اُسے اطمینان دلا جاتا کہ تھانہ میں رپٹ نہ ہونے پائے گی۔ زمیندار کے لڑکے نے دوا دوش کے لئے پانچ روپیہ چمار کے لڑکے کو دے دئے تھے۔ بڑھیا اپنی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے جی گئی۔ چمار کے لونڈے نے بطور دوا کے خوب شراب پی اور تھانہ کے سپاہی کے بال بچوّں نے بھی کچھ دنوں خوب کھایا پیا۔

زمیندار کا لڑکا کشادہ دل اور فیاض تھا۔ خاصکر گاؤں کے غریب اُس سے بہت خوش تھے۔ گاؤں کے اندھے اور اپاہجوں کی پرورش کیلئے اُس نے سالانہ اناج اور کپڑے باندھ دئے تھے۔ شہر میں پڑھنے والا زمیندار کا لڑکا صرف چھٹیوں ہی میں گاؤں آتا تھا۔ بڑے باپ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس لئے خوشامدی باتوں میں آکر پیسے خوب اُڑاتا تھا۔ غریبوں کو بغیر سود کے اناج قرض میں دینے کا دستور اُسی نے نکالا تھا۔ علم کا ایسا اثر پڑا تھا کہ نیچوں اور چماروں کے اوپر خاص طور سے مہربان رہتا اور چونکہ گھر کا مالک وہی تھا اس لئے اس کی آزادی پر کسی طرح کی بندش نہ تھی۔ نوکر چاکر اگر اسے کبھی فضول خرچی سے روکتے تو صرف ارادہ سے کہ ضد میں آکر سرکار اور زیادہ خرچ کر ڈالیں۔

اپنے قلعہ جیسے مکان کے اندر برآمدے میں چارپائی پر لیٹے ہوئے اُسے کئی سال کی باتیں آج یاد آرہی تھیں۔ جس دن وہ گاؤں آیا تھا اُسی دن گاؤں میں ایک عجیب حادثہ ہوگیا تھا۔ ایک چمار کے پورے خاندان نے زہریلی ہلدی دال میں کھالی تھی۔ شور مچنے پر زمیندار کا لڑکا اپنے چچیرے بھائی کے ساتھ چمروٹی میں گیا۔ چمار کے آنگن میں ایک دیوار کی چھاؤں میں بارہ تیرہ سال کی چمار کی لڑکی زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ ماں، بہنیں، بھائی، سب الگ سٹ پٹا رہے تھے اور قے کر رہے تھے۔ زمیندار کے نوجوان لڑکے نے بڑی ہمدردی سے بیماروں کو اپنی بیل گاڑی پر بٹھا کر تحصیل کے ہسپتال میں بھجوا دیا۔

وہی چمار کی گورے رنگ کی لڑکی تھی جو اس دن کنوئیں پر بڑھیا کو لئے رو رہی تھی۔ وہی گوری لڑکی تھی جس پر زمیندار کا لڑکا ایک سال پہلے فریفتہ ہو گیا تھا۔ آم کے باغ میں ڈالیاں آموں سے لدی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے لڑکے کھیلوں میں بھولے ہوئے تھے۔ کوئلیں شاخوں پر بسنت کے کیف میں جھک جھک کر کوک رہی تھیں۔ اُسی بیساکھ کی دوپہری میں زمیندار کا لڑکا چمار کی گوری لڑکی کی بڑی بڑی آنکھوں کا شکار ہو گیا۔ وہ اُسے اپنے پاس بار بار بلاتا تھا۔ لیکن چمار کی بیٹی گاؤں کے راجا کے پاس آنے سے ڈرتی تھی۔ وہ اسے اپنے جہاز جیسے مکان میں بلاتا تھا لیکن چمار کی بیٹی زمیندار کے مکان میں جانے سے خوف زدہ تھی۔ ایک دن دوسری عورتوں کے ساتھ وہ لڑکی زمیندار کے مکان میں کام کرنے گئی تھی۔ کارندے نے اسے ایک کمرہ میں کسی کام کے لئے بھیجا۔ کچھ منٹوں کے بعد وہ پسینہ میں ڈوبی میلے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی کوٹھری سے نکلی۔ دوسری عورتوں نے اُسے ایک اڑتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ پھر سب نے ایک ساتھ آنکھیں نیچی کر لیں۔ چمار کی لڑکی زمیندار کے لڑکے کی ہو کر بھی دو باتیں نہیں بھولی تھی — اُس کے کالے گھنگھریالے بال اور چمڑے کا 'منی بیگ'۔

زمیندار کا لڑکا چارپائی پر لیٹا ہوا اپنی ماضی کی یاد تازہ کر رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ چمار کی حسین لڑکی اُس کو کتنا پیار کرتی تھی۔ اور وہ خود اسے کتنا چاہتا تھا۔ وہ بے خطر کس طرح زمیندار کے قلعہ جیسے مکان میں اُس کے شہر سے آنے کی بات سُنکر چلی آتی تھی۔ وہ کس طرح جبکہ سارا گاؤں سویا ہوتا اور گاؤں کے چوکیدار کی "سونے والو جاگتے رہیو" کی ڈراؤنی آواز سونے والوں کو جگاتی اور جاگنے والوں کو ڈراتی ہوئی کھیتوں اور کانٹوں کو عبور کرتی مکان کے پیچھے کی چار دیواری پھاند کر اُس کے کمرے میں چلی آتی۔ جب زمیندار کا لڑکا شہر واپس چلا جاتا تو چمار کی لڑکی گاؤں کے باہر تالاب پر جا کر گھنٹوں بیٹھ کر روتی۔ زمیندار کے لڑکے کو وہ بات یاد تھی کہ وہ کس طرح اُسے اپنی تھالی میں کھلانے کے لئے گھسیٹ لایا تھا لیکن چمار کی لڑکی اس کی ضد اور قسموں کے باوجود نہ مانی تو اُس نے ایک روٹی اُس کے آنچل میں ڈالدی اور وہ ہنستی ہنستی روٹی کھا گئی۔ زمیندار کے لڑکے کو وہ دوپہر کی کڑی دھوپ بھی یاد آ رہی تھی جب اُس نے اپنے مکان سے آنکھوں میں آنسو بھر کر چمار کی لڑکی کو لال چندری اوڑھے روتے ہوئے اپنی سُسرال جاتے دیکھا تھا۔ اُس کے منی بیگ میں پیسے تھے لیکن چمار کی لڑکی اپنی سُسرال تک پیدل ہی گئی۔ موٹر لاری پر وہ سُسرال نہیں جا سکتی تھی نہیں تو چمروٹی کے چمار اُسے برادری باہر کر دیتے۔ زمیندار کا لڑکا جس وقت ان خیالات میں کھویا ہوا تھا کارندے نے آکر کہا — "سرکار دروازے پر کچھ آسامی آئے ہیں"۔ زمیندار کا لڑکا اپنے آنسو چھپاتا ہوا اٹھا۔ اپنی کمزوری پر اُسے غصہ آ رہا تھا۔ اپنے مرحوم والد کا حقہ جسے اُس نے اُس دن پہلی بار بھروا کر پیا تھا ایک طرف ہٹا کر تیزی میں باہر چلا گیا۔ کارندے نے گرتی ہوئی فرشی کو سنبھالا اور سوچتا رہ گیا کہ سرکار کا غصہ اُس دن سے ابھی تک اُترا نہیں۔

زمیندار کے لڑکے کی ابھرتی ہوئی خودی کے جذبات کو زبردست ٹھیس لگی تھی۔ اس کی سنورتی ہوئی شخصیت کے لئے زمینداری کے کام میں پہلی الجھن پیدا ہوئی تھی۔ اس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد وہ موٹر لاری کی اگلی نشست پر بیٹھا شہر جا رہا تھا۔ جیوں جیوں وہ گاؤں سے دُور ہوتا جاتا گرد اور لُو کے ساتھ ریتیلے کھیت آنکھوں کے سامنے سے اُڑتے جاتے تھے۔ اُس کا چہرہ دھوپ اور شدّت کی گرمی سے تپ رہا تھا۔ اُس وقت بھی وہی بات اُس کے ذہن میں تھی۔ اس موقعہ پر چمار کی بیٹی نے گاؤں کے چماروں کی طرف داری کیوں کی! اُس نے اُس کے چچا کے لڑکے کو ضرور مارا تھا اور خوب مارا لیکن اُس نے دودھ کی چوری کیوں کی۔ اور چمار کی لڑکی جب اُس کے مکان میں آتی تو وہ چمار کا چھوکرا اُسے دیکھ کر کیوں جلتا تھا! تو وہ اُسی بدمعاش لونڈے کے لئے رو رہی تھی! یہ سوچتے سوچتے اُس نے تہیّہ کیا۔ ان چماروں کو میں پیس کر رکھ دوں گا۔

بغل کی نشست پر گاؤں کا برہمن مکھیا بیٹھا ہوا تھا۔ زمیندار کے لڑکے کو وہ شہر پہنچانے جا رہا تھا۔ اُسے کوئی غرض ہی ہو گی۔ شاید کھیت ہی لینا چاہتا ہو گا۔ مکھیا چالاک اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ زمیندار کے چہرے سے جو باطنی ہیجان نمایاں ہو رہا تھا اُس سے اُس نے سمجھ لیا کہ گاؤں کا مالک ابھی اپنی بے عزتی بھولا نہیں ہے۔ اُس نے موقع دیکھ کر کہا۔ یہ نیچ ذات کسی کے نہیں ہوتے۔ آپ کے والد کہا کرتے تھے "ڈھول گنوار شودر پشو ناری یہ سب تاڑن کے ادھیکاری"۔ ان نیچوں کو جتنا ہی اپنے جوتوں کے نیچے

دبائے رکھئے اتنے ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ زمیندار کا لڑکا پہلے تو خاموشی سے سُنتا رہا پھر بولا "مہاراج آپ کا کہنا صحیح ہے میں نے ان چماروں کو منہ لگا کر غلطی کی"۔ یہ کہتے کہتے اپنی باطنی کمزوری سے اُس کا سر جھُک گیا۔

مکھیا نے بات جاری رکھی "بابو آپ لوگ تو بہت پڑھ لکھ لئے لیکن پڑھنا لکھنا اور چیز ہے اور راجنیت اور ہے"۔ زمیندار کے لڑکے کو اپنے علم اور قابلیت کا ثبوت دینے کا اچھا موقع ملا۔ کہنے لگا "نہیں مہاراج یہ تو میں جانتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے ہی ہیں اور بڑے بڑے ......"۔ اس وقت زمیندار کا لڑکا کسی حال میں پڑھے ہوئے ڈارون کے اصول کو سوچ رہا تھا لیکن دیہاتی زبان میں اسے واضح نہ کر سکا۔ لاری رک گئی۔ ڈرائیور نے کہا "اتریئے پُل آ گیا۔ جلد گاڑی خالی کر دیجئے"۔

ویسے تو سالگرہ ہر چیز کی ہوتی ہے کچھ منائی جاتی ہیں کچھ نہیں کچھ لوگ لاکھ مصیبتوں میں بھی ان موقعوں کو مناڈالتے ہیں اور کچھ موقعے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی سالگرہ منانے والوں کو ساری کائنات کی خوشی میسر ہوسکتی ہے لیکن نہیں منا سکتے۔ ایسی بے ترتیبی اور بے انصافی تو آج کے سماج کی خصوصیت ہے۔ لیکن دُکھ اور حسرت کا وہ موقع ہوتا ہے جب سالگرہ اس وجہ سے نہیں منائی جا سکتی جب سُنہرا موقع آتا ہے تو اُس کا موضوع ہی نہیں ہوتا۔

وہی آم کا باغ تھا۔ وہی چمار کی ——— گورے رنگ کی کنواری لڑکی۔ ویسے ہی ادھ پکے آم ڈالیوں پر لدے تھے حسب معمول ویسے ہی ڈالیوں پر اپنی مسرت کی دُنیا میں بھولی ہوئی کوئلیں کُہک کُہک کر رہی تھیں۔ قریب قریب وہی دن تھے جب ایک چت چور اُس بیچاری لڑکی کا دل چُرا لے گیا تھا۔ اُس آزاد انسانی پرندکو کوئی مکھتی شکاری گھائل کر گیا تھا۔ لڑکی کو شکاری کے پنجرے میں قید ہونے کا ملال نہ تھا لیکن آم کے باغ میں آج چھپّر کے نیچے بیٹھ کر اس بارش میں آنسو بہانا بجز تکلیف دہ تھا۔ اسی لئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جس کے بغیر آج محبت کا نیا سال نہیں منایا جا سکتا تھا۔ جیٹھ کے مہینہ میں پانی اکثر نہیں برستا لیکن اُس روز وقت سے پہلے جھڑی لگی ہوئی تھی اُس کی آنکھیں اس موقعہ پر آنسو نہ بہاتیں لیکن وقت سے پہلے محبت کی بہار اُجڑتے دیکھ کر وہ رو رہی تھی۔ آخر روتی نہ تو کیا کرتی۔!

رم جھم برستے ہوئے پانی کی خاموشی میں لڑکی چار ٹیڑھے ستونوں کی جھونپڑی میں بیٹھی باغ سے دور بہتی ہوئی ندی کی دھار کو دیکھ رہی تھی۔ یہی ندی کبھی اُسے شباب کی انگڑائیوں کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ زمیندار کے لڑکے کے گھونگریالے کالے گیسو اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے۔ اس کی کہی ہوئی ایک ایک پیاری بات اس کی آتما میں چبھ رہی تھی "میں تمہیں پیار کرتا ہوں...... بہت پیار کرتا ہوں.... ..... تم میرے جیتے جی کبھی اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھنا..... کوئی تمہیں کچھ نہ کہہ سکے گا!" لیکن آج کہنے والے کہہ رہے تھے۔ گاؤں کی لڑکیوں کا وہ قہقہہ اُس کے دل کو چھید جاتا تھا۔ سب کہتی تھیں "چلی تھی رانی بننے ...... راجہ سے محبت کر رہی تھی ..... جیسے یہ نہیں جانتی تھی کہ راجہ راجہ ہی ہوتا ہے اور پرجا پرجا......" وہ سوچتی کہ گاؤں والوں کا کہنا ٹھیک ہی ہے۔ لیکن وہ اپنے درد میں یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ کیوں اس کا محبوب بغیر ملے شہر چلا گیا۔ وہ سوچ رہی تھی اس نے کہا تھا کہ وہ اُسی کی ہو کر ساری زندگی رہیگی جس وقت وہ ندّی کے بہتے ہوئے دھارے کو دیکھ رہی تھی اُس کے دماغ میں ایک خیالی ناٹک ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ ناٹک کے اُس حصہ تک پہنچ چکی تھی جب چار چمار گندے کپڑے میں ایک نعش کو لپیٹے اپنے کندھوں پر لئے ہوئے ندی کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ جب اس کی دماغی دُنیا میں نعش جلنی شروع ہوئی غریب لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بے چاری اپنے غریب نصیب پر رو رہی تھی۔

زمینداری کی دولت میں پلا ہوا نوجوان مغرور بچہ اپنی عمر سے بھی متاثر تھا۔ اسے بار بار چمار کی گورے رنگ والی لڑکی یاد آتی۔ آخر یاد آتی کیسے نہیں! وہ اس کی پہلی محبت تھی جس کی یاد میں جذبات سے بھرا ہوا نوجوان باقی زندگی آنسوؤں سے سینچتا ہے۔ اُس لڑکی نے اپنی نادانی میں جو بھی کیا ہو لیکن اُسے یقین تھا کہ وہ اُس سے محبت کرتی تھی۔ گاؤں والوں سے اُسے ضرور نفرت ہو گئی تھی۔ وہ چماروں سے بھی نفرت کرنے لگا تھا لیکن جب وہ اپنے خیالوں اور خوابوں کی دُنیا میں کھو جاتا تو وہ خود کو ہمیشہ اُسی چمار کی لڑکی کی ابھرتی ہوئی جوانی کے ساتھ آم کے

۵۱

پیڑوں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلتا ہوا پاتا۔ دل اور دماغ میں عجیب کشمکش شروع ہو جاتی اور چہرے پر اُس آہنی کشمکش کے خطرے نمودار ہونے لگتے پھر اُسے اپنی کمزوری پر غصّہ آتا۔ اپنی بے عزتی کا خیال آتا۔ اور چمار کی لڑکی کو کسی چمار کے لڑکے کے ساتھ سوچکر اس کا غصّہ اور بڑھ جاتا غصّہ اور خودداری کے تکلیف دہ جذبات سے مغلوب ہو کر پھر وہ کوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا کبھی وہ شہرۂ آفاق جرمن مصنّف "گرٹے" کے "میفسٹوفیلیس" کے مشہور کردار کے بارے میں سوچنے لگتا جس کے تمام نیک ارادوں کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ نظام بھی بدلتا ہے نظام کے چلانے والے بھی بدل جاتے ہیں۔ زمیندار کے لڑکے نے گاؤں جانا چھوڑ دیا تھا۔ دسہرے کی کسواری تحصیل کے واسطے اُس کا چھوٹا بھائی گاؤں آیا ہوا تھا نئے مالک کی آمد میں کارندے بڑی سرگرمی سے "سگن" وصول رہے تھے آج کارندہ چماری کے دروازہ پر آدھمکا۔ اُسی مکان کے آنگن میں ایک دن جا کر اس کے مالکوں نے پورے خاندان کو موت کے مُنہ سے بچایا تھا۔ وہی گھر تھا جس میں کسی وقت اُس کے مالک کی ساری کائنات تھی۔ پچھلی فصل کا بھی لگان باقی تھا۔ چمار نے لاکھ دُہائیاں دیں لیکن جان نہ بچی۔ زمیندار کے دروازے پر طلوا بھی نہیں رہی تھی جو لگان تنخواہ میں کٹ جاتا۔ مجبور ہو کر چمار گھر میں جا کر سر سے ہاتھ دیکر بیٹھ گیا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو منڈلا رہے تھے۔ ماں بیٹھی بیٹی کا اُس کی ماضی کی یاد سے ستایا جانا دیکھ رہی تھی۔ بیٹی کی بیماری اور اس کے دن بدن گھلتے جلنے کا اسے الگ غم تھا۔ بیٹی کو تسکین دیتے ہوئے اُس نے اُس کی آنکھوں کے آنسو اپنے آنچل کے کونے سے پونچھ دئے۔ دوسروں کے آنسو پونچھنے میں اکثر اپنے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ بیٹی ماں کے آنسو دیکھ کر چاندی اور چاندی کے نئے کرن پھول لاکر ماں کے ہاتھ میں رکھ دئے۔ وہی زمیندار کے لڑکے کی محبت کی آخری یادگار تھی۔ کرن پھول بنئے کے گھر بک کر لگان کی شکل میں زمیندار کے گھر واپس آگئے۔

بہت دنوں کی بات ہے جاڑے کا موسم تھا صبح سے بدلی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان کی سرد اُداسی شہر کے اونچے اونچے مکانوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ بادل کے بڑے بڑے ٹکڑے سوگوار آسمان سے لٹکے ہوئے تھے اس موسم کے بدلی کے دن جوان دلوں کے لئے دوزخ کی ساری تکلیفوں اور بے بسی سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ جب سارے محلّہ میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک بڑے مکان کے نیچے کے کمرے میں ایک نوجوان آدمی اطمینان سے بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کمرہ میں ایسی خاموشی تھی جیسے گھر میں کوئی اور نہ ہو۔ نوجوان کی حالت یہ بتا رہی تھی کہ موسم کا اُس کے اوپر کوئی اثر نہیں ہے۔

گلی میں کسی طرف سے گانے کی آواز آنے لگی بگانے میں درد تھا بُمرِیلے گانے کی کڑیاں ہواؤں کے ساتھ کھیلتی ہوئی کمرہ میں داخل ہو رہی تھیں۔ کتاب پڑھنے والے نوجوان کا دل دھڑکنے لگا۔ کمرہ گیت سے گونج گیا۔ نوجوان چونک کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی پریشان آنکھیں لوہے کی سلاخوں میں سے ایک غریبی کی ماری سربھری جوان بھکارن کو دیکھ رہی تھیں وہ گاتے جا رہی تھی۔ میلے کچیلے کپڑے اور پھٹی جھولی والی بگی بھکارن گائے جا رہی تھی اور اُس کی وہ آنکھیں جو کبھی حسین رہی ہوں گی نوجوان کے اوپر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ گانے کی کڑیاں اُسی کو سُنانے کیلئے گائی جا رہی ہوں وہ خاموش غریبی کی ماری ہوئی دُبلی پتلی صورت کو ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اور گلی کی اونچی اونچی دیواروں سے گھبرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیا وہ کوچے اُسی کے تھے! سفید ساڑی پہنے ایک نوخیز لڑکی کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ دراز اپنے خیالوں کی پریشانی میں کھوئے ہوئے نوجوان نے اُس کا کمرہ میں داخل ہونا نہیں دیکھا۔ اُس سفید ساڑی والی لڑکی نے بڑھ کر کھڑکی کے راستہ بھکارن کو ایک پیسہ دیا۔ بھکارن گاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ سفید ساڑی والی حسین عورت کو نوجوان دیکھ رہا تھا لیکن اُس کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں لڑکی ساکت کھڑی رہی۔ آخرکار نوجوان نے کہا۔ "رانی نوکر کو بلاؤ" رانی اُس کی بی بی تھی اور اس کی شادی ابھی حال میں ہی ہوئی تھی۔ نوکر سے نوجوان نے پوچھا۔ "تم جانتے ہو چمار کی لڑکی اَب کہاں ہے؟" نوکر اُس کے گاؤں ہی کا تھا۔ اُس نے دبے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔ "بہت دن ہوئے سرکار جب آپ نے گاؤں جانا چھوڑ دیا تو آٹھ نو مہینہ بعد وہ مرگئی"۔ نئی دلھن نے پریشانی سے پوچھا۔ "کیسے مرگئی؟" نوکر باہر گلی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "اُسے بچّہ ہونے کو تھا"۔

تینوں چپ چاپ کھڑے تھے۔ سب کی آنکھیں نیچے جھکی ہوئی تھیں زمیندار کے لڑکے کی آنکھوں کے سامنے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے آم، مہوے اور املی کے درخت ناچ رہے تھے۔ وہ درخت جو اُس وقت گمراہ مسافر معلوم ہوتے تھے جیسے اس زمانے کے انسان اجنبی بن کر کھڑے ہوں۔

۵۲

اختر الایمان

تصویر کا تیسرا رُخ

ایک ڈر سا محسوس ہوتا ہے ایک خوف سا جس کے نیچے مسرت کی ایک ہلکی سی لہر پوشیدہ ہوتی ہے ایک ہلکی سی لہر، اور انسان کی روح کھنچکر اس کی آنکھوں میں آجاتی ہے جب کوئی نوجوان لڑکی اس کی طرف دیکھتی ہے، اس طرح کہ اس کی گردن میں ایک ہلکا سا خم پڑجاتا ہے، اس کے ہونٹوں پر ایک انوکھی سی مسکراہٹ کھیلتی ہے، اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سا جذبہ سمٹ کر اس طرح چمکتا ہے جیسے کسی خوبصورت جھیل کی سطح پر بلبلے بن بنکر ابھر رہے ہوں۔ آدمی ڈوبتا چلا جاتا ہے ان گہرائیوں میں ایک بھاری پتھر کی طرح، اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کئے بغیر، بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ میرا مقصد ہے میں نے ایسا ہی محسوس کیا، رباب کے تاروں کی طرح میرے بدن میں ایک تھرتھری سی پیدا ہوگئی، میرے جذبات الجھن میں پڑگئے، میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور سوچتا رہ گیا اس لطیف دلکش اور حسین مسکراہٹ کے معنی جو مجھے دیکھ کر ان اجنبی ہونٹوں پر کھیلنے لگی تھی۔

اگرچہ واقعات دہرانے سے کچھ حاصل نہیں لیکن بعض حالات کے ماتحت دہرانے پڑتے ہیں، انھیں یاد بھی رکھنا پڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کی ہر نئی تبدیلی ایک دلکش انداز لئے ہوتی ہے اور وقت گزرنے پر اسے سوچنے میں ایک گونہ لُطف آتا ہے۔ بعض دفعہ یہ احساس دل میں ایک ہلکی سی خلش پیدا کر دیتا ہے جن پر فرصت کے لمحات میں ہوائی قلعے بنائے جا سکتے ہیں۔

وہ ایک شام تھی، سہانی اور نظر فریب شام۔ دور شمال میں پہاڑ چمنے ہوئے تانبے کی مانند دکھائی دے رہے تھے، اور سورج ایک بڑے سے آہنی پہیئے کی طرح ایک دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ بستیاں ایک دھند لکے میں گم ہونے لگی تھیں اور چاند کی مدھم سی روشنی زمین پر جال سے پھیلا رہی تھی

بستی کے چھپّروں سے دھواں نکل نکل کر فضا میں منتشر ہو رہا تھا۔ شام کچھ بھیگ سی گئی تھی۔ مہینہ ٹھیک سے یاد نہیں ہاں دن ایسے تھے کہ نہ زیادہ سردی تھی نہ گرمی۔ ایک ہلکی ہلکی خنکی اور ایک اچھوتا اچھوتا سا کیف بکھرا ہوا تھا وہ آئی اور مسکرا کر چلی گئی۔ اس طرح کہ اس کی گردن میں ایک ہلکا سا خم پڑگیا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوگئی۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ——! دیکھئے ذہن سے نکل گئی۔ اس واقعہ کا خیال آتے ہی دماغ ایک ایسی الجھن میں پڑجاتا ہے کہ سوچنے کی قوت ایک منٹ کے لئے سلب ہو جاتی ہے۔ ہاں تو یہ اس وقت کی بات ہے جب میں گرمیوں کی چھٹی میں دوبارہ اس گاؤں میں آیا تھا،
۱۳۵ گاؤں کیا دراصل یہ میرا وطن ہے مگر معاش ایسی چیز ہے جس کے سلسلہ میں جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ مگر اب اس کا کیا علاج کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں۔ اور میرے والدین بھی اسی پیٹ بھرائی کے سلسلہ میں جانے کہاں کہاں پھرتے رہے مگر اب مستقل طور پر یہیں آرہے تھے اور میں یہاں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کی غرض سے آیا تھا۔

یہاں آکر میری دلچسپی اس جگہ سے روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اگر کسی نوجوان سے کوئی لڑکی میرا مطلب ہے نوجوان لڑکی دلچسپی لینے لگے تو اس کی دلچسپیاں پہلے سے دگنی ہو جاتی ہیں۔ دگنی ہو جاتی ہیں یا سہ گنی میرے پاس اس کے لئے کوئی پیمانہ نہیں لیکن ہاں اس کی دلچسپیاں کچھ ضرور بڑھ جاتی ہیں۔ اس کی زندگی میں ایک بے چینی سی داخل ہو جاتی ہے، اس کے خیالات کچھ بھٹکنے سے لگتے ہیں۔ وہ ہر وقت ایسا ظاہر کرتا ہے جیسے اسے کسی کی تلاش ہے نہیں بلکہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسے کسی کی تلاش ہے، وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔

ایک شام کا ذکر ہے، سورج کی آخری کرنیں دور تک پھیلے ہوئے

دھانوں کے کھیتوں میں سے ہوتی ہوئیں اُس تالاب سے بہت آگے نکل گئی تھیں جس میں سے گاؤں کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کنول توڑ کر لایا کرتی تھیں اور غریب عورتیں سردی سے بچنے کے لئے کسیر؛

سائے پھیل کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے، شیشموں کے زرد پتّوں پر شفق کی جھلک سے سونا سا پگھل کر جم گیا تھا اور گاؤں کے باہر بہتے ہوئے نالے کا پانی جو آگے جا کر ایک ندی میں مل جاتا تھا کچھ خاموش سا تھا، دور ایک کھیت سے دوسرے کھیت تک گونجتی ہوئی دیہاتیوں کی آوازیں ایک گہری خاموشی میں ڈوبتی جا رہی تھیں، کوّوں کے گروہ باغوں کے اوپر سے الوداع ..... الوداع کرتے، ہوا کی موجوں پر تیرتے ہوئے کہیں بہت دور کے ارادے سے چل کھڑے ہوئے تھے۔

میں کھیتوں کی مینڈ مینڈ چلتا ہوا ایک بڑی سی مالٹے کی جھاڑی کے پاس آکر رُک گیا جس کی سب سے اونچی چوٹی پر ایک پدّا بیٹھا ہوا پٹ پٹ..... پٹ پٹ کر کے اچھل اچھل کر شور مچا رہا تھا جیسے اس نے ایکہ میں کسی نوجوان لڑکی کو کسی سے باتیں کرتے دیکھ لیا ہو۔ میں نے قریب آکر اس کی طرف ہاتھ ہلایا اور اس نے اپنی آواز کو تھوڑا کھینچا اور اڑ کر ملوہ کی جھاڑی پر جا بیٹھا جیسے چھوٹے بچے کسی کی کوئی حرکت دیکھ کر چلّایا کرتے ہیں۔ "اچھا آ آ آ !" وہ برابر کے مکان سے نکل رہی تھی۔ میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا اور دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ اپنے مکان کے احاطہ میں داخل ہو گئی۔ میں کچھ دور چلا اور پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا، میں نے اندازہ لگایا کہ وہ نظریں جمائے ہوئے میری طرف دیکھ رہی ہے، احاطہ کی دیوار کا سہارا لئے ہوئے، اس طرح کہ اس کی گردن میں ایک ہلکا سا خم ہے اور اس کی اوڑھنی کا ایک پلّو مضبوطی سے اس کی مٹھی میں بند ہے۔ میرے دل میں ایک میٹھی سی خلش پیدا ہوئی اور میں ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

میں ایک الجھن میں پڑ گیا، ایک تذبذب میں، میں نے اسے بہت قریب سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اتنے قریب سے کہ بعض دفعہ میں نے محسوس کیا کہ اس کے رخساروں پر ایک عجیب سی رنگت پیدا ہو رہی ہے اور پیدا ہو کر اس طرح غائب ہو رہی ہے جیسے چکنی مٹّی کی منڈیر سے دھوپ آہستہ آہستہ اتر رہی ہو۔ وہ چلتے چلتے اوڑھنی کو اپنے گرد لپیٹ کر بدن کو اس طرح سمیٹ لیتی تھی کہ اس کی چوڑیوں کی آواز اس کے دامن میں گھٹ کر رہ جاتی تھی، مدھم پڑ جاتی تھی، اتنی مدھم کہ سنائی تک نہ دیتی تھی، میں اسے اس طرح دیکھتا رہ جاتا جیسے میرے ہاتھوں سے ابھی ابھی کچھ گر کر کھو گیا ہے۔ اور میں ایک بھاری پتھر کی طرح پانی کی تہ میں بیٹھتا چلا جاتا تھا۔

اس کی نگاہیں مجھے کچھ کہتی ہوئی معلوم دیتی تھیں اور ان میں جذبے سمٹ کر اس طرح چمک اٹھتے تھے جس طرح ندی کے صاف پانی میں چاندی کی کرنیں کروٹیں لیا کرتی ہیں۔ وہ یوں ہی اپنا دوپٹہ سنبھال کر میری طرف دیکھتی ہوئی اپنے سینہ پر اس طرح پھیلا لیتی تھی جیسے یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ یہاں بھی کوئی چیز ہے، وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ اب وہ اس منزل سے گزر چکی ہے جس میں انسان کی شعوری کیفیتیں معصومیتوں کے نیچے دبی رہتی ہیں، وہ اس حد سے گزر چکی ہے جب وہ بستی کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ مل کر کھیلا کرتی تھی۔ ایک انجان ساجن کو بلانے کے لئے گیت گایا کرتی تھی، لپک لپک، مٹک مٹک کر، اور کچے آم کی نرم نرم گٹھلیوں کو اپنی چٹکی میں پکڑ کر چھوڑ دیا کرتی تھی، یہ جاننے کے لئے کہ دیکھیں اس کے من مندر کا دیوتا کس طرف سے آئے گا اور جس سمت گٹھلی جایا کرتی تھی اُس طرف دیکھ کر مسکرا دیا کرتی تھی، ایک ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھ لیا کرتی تھی جیسے وہ سچ مچ ہی آگیا ہو مگر اس وقت تو وہ سب بچپن تھا، ایک کھیل تھا جو برسوں سے کھیلا جاتا رہا تھا۔ اس سے پہلے جانے والی لڑکیاں جو اب اس بستی سے بہت دور جا چکی تھیں اور ان کی گاڑی جس میں وہ دلہن بن کر گئی تھیں بیلوں کے پاؤں سے اُٹھنے والی گرد میں گم ہو کر رہ گئی تھی، اس سے بھی پہلے وہ لڑکیاں جو اب اپنے بچوں کو گھٹنوں پر بٹھا کر دودھ پلاتے پلاتے روٹی پکاتی جاتی ہیں اور ایک ایسے شخص کا انتظار کرتی جاتی ہیں جو اکھڑا اور جاہل ہوگا اور آتے ہی چارپائی پر گالیاں پھٹکارے گا وہ بھی یہی کھیل کھیل کر گئی ہیں یہ تو ایک سلسلہ ہے، زندگی اور محبّت کا ایک سلسلہ، بچیاں یہ کھیل کھیل کر جوان ہوتی ہیں اور پھر بوڑھی ہو جاتی ہیں، مگر یہ سب سلسلہ چلتا رہتا ہے، یہ کھیل جاری رہتا ہے، محبّت اور ساجن کا کھیل!

مگر اب تو وہ بچّہ نہ تھی، اب وہ جوان ہو گئی تھی، اور اسے اپنے سینہ میں ایک دھڑکتی ہوئی چیز کا احساس ہو چلا تھا، وہی کھیل جسے وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی اور اسے کوئی نہیں روکتا تھا، کوئی بھی نہیں،

اب چھپ چھپ کر کھیلنا چاہتی تھی۔ اب لوگ اس کے کھیلوں میں الجھ ہونا چاہتے تھے۔ اسے بے خبری کے عالم میں ایک عادت ڈلوا کر اس عادت کو چھڑوانا چاہتے تھے اب وہ اپنے اندر ایک ایسی کمی محسوس کرنے لگی تھی جس کی جگہ وہ مٹی یا چینی کی بے جان گڑیا نہ لے سکتی تھی۔ اب وہ سوچنے لگی تھی خیالات ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں، جذبات اسی طرح پیدا ہوتے ہیں، ایک نوجوان آدمی اور ایک نوجوان لڑکی کے احساسات ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ تنہائی کا احساس اور ایک خلا دونوں محسوس کرتے ہیں، دونوں نوجوان دل، یہ بالکل ایک فطری چیز ہے!

اب مجھے اس کا رہ رہ کر خیال آنے لگا تھا۔ میں بڑی شدّت کے ساتھ اپنے اندر ایک کمی محسوس کر رہا تھا، ایک کمی، ایک خلا اور میں ہر دفعہ ارادہ کرتا تھا، اس مرتبہ آہستہ سے، پیچھے سے جا کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دوں گا، وہ ٹھٹھک جائے گی۔ شرما جائیگی، اور میں کہوں گا، میں کہونگا سعیدہ مجھے تم سے ایک وابستگی ہو گئی ہے، ایک گہرا لگاؤ۔ جو شاید محبّت کی حد تک پہنچ جائے۔ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھتی ہو، کیوں دیکھتی ہو اس طرح مُسکرا کر، اس طرح پلٹ پلٹ کر، مگر یہ ابھی تک میرے قابو سے باہر تھا۔ میں ایک جھجک محسوس کرتا تھا، ایک خوف جس کے نیچے حسرت کی ایک ہلکی سی لہر پوشیدہ ہوتی تھی۔ اور بعض دفعہ تو میں اُسے نہایت قریب محسوس کرتا تھا مجھے اس کے سانس کی گرمی اور بدن کے لمس تک کا احساس ہونے لگتا تھا بڑی شدّت کے ساتھ میرے اندر ایک جذبہ پیدا ہو رہا تھا، اتنی شدّت کیساتھ کہ میں ہر نوجوان لڑکی کو اپنی آغوش میں بھینچ لینے کے لئے بیقرار تھا۔ . . .

.. ..

.. ..

.. ..

.. ..

.. ..

.. ..

.. ..

.. ..

دوپہر کا وقت تھا، ٹھیک دوپہر کا۔ میں نے اس کے گھر میں قدم رکھا۔ وہ سامنے چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس طرح کہ اس کے ایک ہاتھ میں گیہوں کی بالوں کا بنا ہوا پنکھا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ کے سہارے اس کا سر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی نظریں پنکھے کی سُرخ گوٹ پر جمی ہوئی تھیں، وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی بالیاں اس کے رخساروں پر لٹک رہی تھیں، چاندی کی دو بالیاں، اور اس کے بال اس کی پیشانی پر بکھر گئے تھے۔ وہ مجھے دیکھکر اُٹھ کھڑی ہوئی، ایک انگڑائی سی لی اور برابر کے کمرے میں چلی گئی، چلی نہیں گئی بلکہ کمرہ کے ستون کی آڑ میں کھڑی ہو گئی اور اس کے پیچھے سے جھانکنا شروع کر دیا، مُسکرا مُسکرا کر جھانکنا۔ پھر وہاں سے ہٹ کر آنگن میں کھڑے ہوئے نیم کی آڑ میں چارپائی بچھا کر بیٹھ گئی اور جُھک جُھک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر حمید کو آواز دیکر اپنے پاس بلا لیا، اسے باہوں میں بھینچ لیا، زور زور سے پیار کرنے لگی، زور زور سے یہاں تک کہ وہ چیخ اُٹھا، پھر وہ دبے دبے انداز میں ہنسنے لگی۔ ایک عجیب اور اچھوتے انداز میں!

۵۵ وہ چند منٹ خاموش رہی اور پھر حمیؔد سے باتیں کرنے لگی، اس انداز میں کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ گویا مجھ ہی سے باتیں کر رہی ہے، گویا اپنی گفتگو کا ایک ایک لفظ مجھے سُنانا چاہتی ہے، اس نے اُسے پھر اپنی باہوں میں بھینچ لیا، اس کے رخساروں پر ہونٹ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں، پنکھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا، سر قریب ہوتے ہوتے حمیؔد کے سر سے جا ملا، اس کی بالیاں حمید کے رخساروں سے مس کرنے لگیں۔ ایک کیف، ایک جذبۂ بے اختیار اس پر چھا گیا، اور میں دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور محسوس کرتا رہا، حمید اس کی آغوش میں بیٹھا ہوا تھا، اس کے بازوؤں کی گرفت میں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اس کے چہرے پر ایک سکون تھا، ایک اطمینان جیسے کسی کو اعتراف کرنے کے بعد ہوا کرتا ہے، جیسے اس نے سب کچھ کہہ دیا تھا، اس کے سینہ سے ایک بوجھ سا اُٹھ گیا تھا۔ اس کی مدہوشی کے ساتھ ساتھ میں بھی از خود رفتہ ہوتا چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے خیالات کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

جب وہ میری طرف دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ہوائیں رُک گئی ہیں، میرے ہاتھوں میں ایک رعشہ سا پڑ جاتا، بدن میں ایک سنسنی سی

دوڑ جاتی، ہلکے ہلکے بخار کی سی کیفیت محسوس ہونے لگتی اور ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے میرے کانوں کی لَو کے پاس چنگاریاں بھڑک رہی ہیں' بعض دفعہ تو ایک جنونی سی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی جس کا اس وقت میرے ذہن میں کوئی نام نہیں' میں سوچنے لگتا' وہ معصوم ہے' حسین ہے' دلکش ہے' اس کی آنکھیں دو چشمے' میٹھے پانی کے دو گہرے چشمے ہیں جنھیں دیکھ کر پیاس بھڑک اٹھتی ہے' اسے دیکھ کر آدمی اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں محسوس کرتا ہے' بھول کر ایک نئی بستی میں چلا آتا ہے جہاں ہر چیز مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، ہر چیز رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے' اس وقت اصول اور پابندیاں ایک ایک کر کے ختم ہو جاتی ہیں' جوانی اصولوں کی پابند نہیں ہوتی' چار دیواریاں اور موٹے موٹے پردے خود فریبی کا ایک سہل طریقہ ہیں۔ انسان سب کچھ سمجھتا ہے' اور پھر بھول کرتا ہے بھول کرتا ہے یا فطرت کے اصولوں کی پابندی۔ ایک ہی کام کو کتنے پھیرے کر کیا جاتا ہے ایک سادہ لوح شخص سیب اٹھا کر کھا لیتا ہے' اس لئے کہ وہ کھانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے' دوسرا اُسے کھانے کیلئے حیلے تراشتا ہے' "اُس کے اندر لوہے کے اجزا ہیں جو صحت کیلئے بہت مفید ہیں" گویا اسے اس کی رنگینی اور مٹھاس سے کوئی تعلق ہی نہیں، کوئی واسطہ ہی نہیں۔ پہلا بوالہوس' نفس پرست۔ اور دوسرا انسانی زندگی کا ماہر و نکتہ داں۔ اور پھر دونوں قدرت کا شاہکار' دونوں قدرت کا شاہکار اور ایک دوسرے کیلئے بیوقوف و حیلہ ساز!

ساری دُنیا قدرت کا شاہکار ہے' سڑکوں کے کنارے پڑے ہوئے ننگے فقیر' ہر وقت سوچنے والا بے مصرف فلسفی' خود نما امیر' لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے دین کے ٹھیکیدار' لومڑی کی سی صفت رکھنے والے سیاستداں گھٹنوں کے بل لیٹ کر موٹی موٹی کتابیں چاٹنے والا عالم' اور ہاتھ پر روٹی رکھ کر دن بھر تھر تھر کرنے والا دیہاتی سب قدرت کے شاہکار' اور ایک دوسرے کے آلۂ کار' سب تماشا اور سب تماشائی!

میرے دل میں ایک جذبہ سا پیدا ہوا' ایک شدید جذبہ سعیدہ کو اپنی آغوش میں بھینچ لینے کا۔ میں بالکل یہی چاہنے لگا' اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دوں اور اپنے آپ کو بھول جاؤں جس طرح اس نے حمید کے رخساروں پر ہونٹ رکھ دئے تھے اور ایک لمحہ کیلئے سب کچھ بھول گئی تھی' مجھے اس کی گردن کا ہلکا سا خم یاد آ گیا۔ آپ اسے دیوانگی کہہ سکتے ہیں نا عاقبت اندیشی کہہ سکتے ہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ یہ بھی آپ ہی کے تخلیق کئے ہوئے الفاظ ہیں' میں بھول گیا اُن بزرگوں کے تخلیق کئے ہوئے الفاظ ہیں جنھیں جوانی گزارنے کے بعد اخلاقیات کا خیال آیا تھا۔ انسان کے گناہوں پر رونا آیا تھا' اس کی گمراہی سے ایک دلی ہمدردی ہو گئی تھی اسی گمراہ کن راستہ سے گزرنے کے بعد چند اصول مرتب کئے تھے۔

آپ کو یاد ہو گی بوڑھوں کی وہ انجمن' وہ انجمن جس میں اخلاقیات کے چند اصول ترتیب دئے گئے تھے' آج سے کئی سو سال پہلے' آج سے کئی ہزار سال پہلے اور وہ اصول اب تک اصولوں ہی تک محدود ہیں!

چاند کی کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر ناچتی ہوئیں پتوں سے چھن چھن کر زمین پر ایک جال سا بُن رہی تھیں' شہر کو جانے والا راستہ دور دیو قد درختوں کے دھندلے سایوں میں گم ہو گیا تھا۔ ہوا میں لطیف سی کیفیتیں بکھری ہوئی تھیں۔ دیہاتی نوجوان حقہ کا گھیرا ڈالے ہوئے چوپال میں بیٹھے ہوئے ایک تجربہ کار بوڑھے کی باتیں سُن رہے تھے جو دور دور تک گھوم آیا تھا اور جس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ وہ کہانی کہتے کہتے حقہ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔

"ہاں چودھری پھر کیا ہوا باس ساجادی کا؟"

"بس بھیا ندی کی لہر بہا کے اُسے دوسرے کنارے پر لے گئی۔ ...."

سامنے ریل کی چوکی پر ایک سہ رنگی لالٹین لٹک رہی تھی' چوکیدار دونوں پھاٹک بند کئے ہوئے شاید اپنی ترقی کے خواب دیکھ رہا تھا اور بڑے صاحب سے اپنی گھریلو زندگی کی داستان سُناتے سُناتے اس کے دوبارہ پوچھنے پر فقرہ دہرا رہا تھا'

"ہاں سرکار ایک لڑکی ہے' جوان لڑکی"

میں گزرا چلا گیا۔ میری رگوں میں خون ایک آتشیں مادہ بن کر دوڑ رہا تھا۔ وہ اپنے احاطہ میں کھڑی ہو کر اس گاڑی کو دیکھ رہی تھی جو ابھی ابھی شور کرتی ہوئی لائن پر سے گزر گئی تھی' اور چوکیدار کے ہاتھ میں جھنڈی ہل کر اس طرح نیچے کو گر گئی تھی جیسے کوئی کمزور شاخ ہوا کے زور سے ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔ شاید اپنی شادی کے بعد کی

(بقیہ صفحہ ۱۲۵ پر)

نیا راگ

نہال سیوہاروی

آدم

کون و مکاں میں غایت کون و مکاں ہے آدمی
اصلِ جہاں سے بے خبر اصلِ جہاں ہے آدمی

روزِ ازل سے ہے لئے دوش پہ بارِ کائنات
ذرّۂ ناتواں نہیں کوہِ گراں ہے آدمی

اس کا خرامِ تند و تیز رونقِ عرصۂ وجود
عرصہ گہِ وجود میں سیلِ رواں ہے آدمی

جب یہ نہو تو گرمئ خمکدۂ حیات کیا
خمکدۂ حیات کا پیرِ مغاں ہے آدمی

عقل نہ جس کو پا سکی، ذہن میں جو نہ آسکا
وہ دلِ کائنات کا سرِّ نہاں ہے آدمی

ایک نفس کے ساتھ ہیں گرچہ ہزار انقلاب
ہمّت آدمی تو دیکھ پھر بھی جواں ہے آدمی

مالکِ ہمّتِ بلند مہرِ مبیں سے ارجمند
عرش نشاں ہے اور کون، عرش نشاں ہے آدمی

اُف رے یہ تابناکیاں ایک شرارِ عشق کی
عہدِ ازل سے آج تک شعلہ بجاں ہے آدمی

خم رہے کیوں سرِ غرور جلوۂ دہر کے حضور
اپنی تجلّیوں سے آپ ایک جہاں ہے آدمی

معرضِ گفتگو میں ہیں تازہ ترین مکاشفات
ارض و سما شنو شنو، گرم بیاں ہے آدمی

حیرت و اشتیاق سے دیکھ رہے ہیں برق و باد
کون سی منزلوں کی سمت تیز رواں ہے آدمی

کچھ نہ خزاں نہ کچھ بہار، ایک سرور اک خمار
وجہِ بہار آدمی - وجہِ خزاں ہے آدمی

جس کی بلندیوں سے ہوش اُڑتے ہیں جبرئیل کے
دیکھ تو کس مقام پہ زمزمہ خواں ہے آدمی

فطرتِ آدمی ہے یہ، ثمرۂ آگہی ہے یہ
کوئی ہو مبتلائے غم صرف فغاں ہے آدمی

رونقِ کاروبارِ دہر ہمّتِ آدمی سے ہے
جوش پہ یہ بہارِ دہر ہمّتِ آدمی سے ہے

ایشیا - اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

نواب جعفر علی خاں اثرؔ

تأثّرات

خیالِ عیشِ دو عالم بھلا دیا تو نے
وہ ابتدا میں غمِ انتہا دیا تو نے

اسیر اپنے ہی خود ساختہ طلسم میں تھی
جنوں کو عقل کا رہبر بنا دیا تو نے

متاعِ ہر دو جہاں تیری اس عطا پہ نثار
کہ مجکو اک دلِ درد آشنا دیا تو نے

تمام رندی و پاکی، تمام صدق و صفا
مذاقِ عشق وہ نکھرا ہوا دیا تو نے

مرے خیال کی دُنیا کو وسعتیں دیکر
ہر اک خیال کو دُنیا بنا دیا تو نے

تعیّنات کو دے کر جمالِ بے رنگی
تعیّنات کا پردا اُٹھا دیا تو نے

نگاہِ شوق کی دیکھی جو رخنہ اندازی
نگاہِ شوق کو پردا بنا دیا تو نے

ترا کرم، ترا احسان، تیری بخشش ہے
کہ بے طلب دلِ بے مدّعا دیا تو نے

وہ حُسن جو ہے تخیّل سے حُسن کے بالا
سنوار کر، دلِ عاشق بنا دیا تو نے

سرشکِ یاس کو جب مُسکرا کے دیکھ لیا
ہزار نغموں کو دل میں جگا دیا تو نے

مذاقِ دید کو آئینہ دے کے حیرت کا
نظر کو حُسن سراسر بنا دیا تو نے

تری نظر نہیں ہوتی حریفِ شوخی کی
نظر سے آج یہ کس کو گرا دیا تو نے

خطا معاف مری بیکسی پہ کر کے نظر
کچھ اور حوصلۂ غم بڑھا دیا تو نے

اگر ہے زیست کا مقصد عروجِ انساں کا
تو کیا ملا تھا اثرؔ اور کیا دیا تو نے!

ایشیا۔ اپریل ۱۹۴۲ء

احمد ندیم قاسمی

افسونِ رنگ و بُو

زرد سا پتہ شیشم کا اک روز فضا میں بل کھاتا
اُڑتا اُڑتا پھولوں کی کیاری میں چھپ کر بیٹھ گیا

بھونرے نے پھولوں سے جو بھی راز و نیاز کی باتیں کیں
اُس نے آنکھیں میچ کے اک لمحے میں سب کی سب رٹ لیں

رات کی تاریکی میں اُس نے پھولوں کو بیدار کیا
درد بھرے لہجے میں اُن سے رُکتے رُکتے کہنے لگا

"پیارے پھولو! اپنی نازک کلیاں چومنے دو
ہائے مجھے ان رنگ و بو کے گہواروں میں جھومنے دو"

"چوس کے رس ان مست گلابی غنچوں کا اُڑ جاؤں گا
اور نشہ جب ٹوٹ گیا پھر ہاتھ آ کر پھیلاؤں گا"

صبح ہوئی اتنے میں — اک بھونرا اُڑتا گاتا آیا
اپنے پروں کے گیت سُنائے اور ہوا میں رقص کیا

اک غنچے سے چُپکے چُپکے باتیں کیں پیاری پیاری
پی کر رس کے گھونٹ اُس نے جب کی اُڑنے کی تیاری

پتہ چلّایا "اے بھونرے - تیرے پریم کا راز ہے کیا
میں بھی ہوں اِن نازک پھولوں کی رعنائی پر شیدا"

بھونرا بولا "دیوانے - قدرت کے راز نرالے ہیں
تو نے کیوں یہ روگ اپنے بھولے سے دل میں پالے ہیں

"پریم کی پہلی شرط ہے یہ - اپنی غیرت کا خون کرو
چکنی چپڑی باتوں سے ان پھولوں کے دل بہلاؤ"

"ان کے آگے پیچھے گھومو - گانے گاؤ - رقص کرو
تب اک قطرہ رس کا چوسو - چوس کے فوراً اُڑ جاؤ"

"رنگ و بُو کے پردوں میں اک زہر چھپا ہے دیوانے!
تو لیکن جنگل کا باسی - تو یہ باتیں کیا جانے!"

اتنا سُن کر پتہ ایک بگولے کے ہمراہ - اُڑا
اپنے وطن کی خشک پتاور پہ جب جا کر لیٹ گیا

آہ بھری - کروٹ بدلی - اور بولا آنکھیں ملتے ہوئے
"بھونرے نے کیا بات بتائی - خوف آتا ہے دُنیا سے

"آگ ہے ان پیارے تاروں میں خاک ہے ان نازک پھولوں میں
جنت ہے آزاد دلوں کی پنہاں خشک بگولوں میں"

اسرار الحق مجاز بی-اے

شاعر کی بستی

یہ میری دُنیا یہ میری ہستی — نغمہ طرازی صہبا پرستی
سب سے گریزاں سب پر برستی — آنکھوں کی مستی مہنگی نہ سستی
شاعر کی دُنیا شاعر کی ہستی — یا نالۂ غم یا شورِ مستی
یا خلد و ساقی اے جذبِ مستی ! — یا ٹکڑے ٹکڑے دامانِ ہستی!
محوِ سفر ہوں گرمِ سفر ہوں — میری نظر میں رفعت نہ پستی
اُن انکھڑیوں کا عالم نہ پوچھو — صہبا ہی صہبا مستی ہی مستی
میری نظر میں جنّت سے بڑھکر — وہ تیری نگری وہ تیری بستی
وہ آبھی جاتے وہ ہو بھی جاتے — چشمِ تمنّا پھر بھی ترستی
اُن کا کرم ہے اُن کی محبّت — کیا میرے نغمے کیا میری ہستی

(۲)

وقت کی سعیِ مسلسل کارگر ہوتی گئی — زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی
سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا سازِ حیات — موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

خرمنِ دل جلا رہا ہوں میں — نقشِ ہستی مٹا رہا ہوں میں
تو نہ مغموم ہو مگر اے دوست — تیری ہی سمت آرہا ہوں میں

ایشیا۔ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

حسرت ترمذی بی-اے

نیم خوابی

یہ تیری نظریں، یہ نیم خوابی　　جیسے کوئی بدمست شرابی
دامِ تمنّا گیسوئے مشکیں　　جامِ تمنّا چشمِ شرابی
باغِ بہارِ حُسن و جوانی　　آنکھ نشیلی، رنگ شہابی
صبحِ بہاراں عارضِ تاباں　　لالۂ خنداں، حُسنِ گلابی
پیکرِ مستی، ساغرِ رنگیں　　پاؤں میں لغزش آنکھیں گلابی
شادابیوں پہ سارا گلستاں　　نکھرے ہوئے گلہائے شبابی
ہر ہر قدم پہ تازہ قیامت　　ہر ہر قدم پہ خانہ خرابی
برقِ نگاہی، برقِ ادائی　　دل کے لئے پیغامِ خرابی
حُسنِ مجسّم، کیف سراپا　　جانِ گلستاں روحِ شرابی
آنکھ چُرانا دل سے نہ جانا　　یہ تیرا پردہ، یہ بے حجابی
ذکر ترا حسرت کا فسانا　　بادۂ رنگیں، جامِ شرابی

ایشیا- اپریل ۱۹۴۲ء

ظفر تاباں دہلوی

زندگی سے فرار

یاد میں تیری دوعالم کو بھلانا ہے ہمیں
عمر بھر اب کہیں آنا ہے نہ جانا ہے ہمیں

اب ہر اک نقشِ تعیّن کو مٹانا ہے ہمیں
ذرّے کو مہرِ جہانتاب بنانا ہے ہمیں

ہائے وہ آگ جو مشکل سے جلی تھی دل میں
آج اُس آگ کے شعلوں کو بجھانا ہے ہمیں

کہتے ہیں عشق کا انجام بُرا ہوتا ہے
اب تو کچھ بھی ہو محبّت کو نبھانا ہے ہمیں

رخصتِ عرضِ تمنّا نہیں ملتی نہ ملے
قصّہ شوق نگاہوں سے سُنانا ہے ہمیں ٦٢

خلشِ عشق سے بیچین ہے دل ایک طرف
اُس پہ یارب غمِ ہستی بھی اُٹھانا ہے ہمیں

ایک تم ہو کہ فسانے کو حقیقت سمجھے
ایک ہم ہیں کہ حقیقت بھی فسانا ہے ہمیں

آپ کانٹوں سے جو بچتے ہوئے چلتے ہیں چلیں
دامنِ شوق کو پھولوں سے بچانا ہے ہمیں

کاش مل جائے تری اک نگہِ لطف کہیں
دل کی اُجڑی ہوئی دُنیا کو بسانا ہے ہمیں

ہائے اس شرمِ محبّت کا بُرا ہو تاباں
عشق کا راز خود اُن سے بھی چھپانا ہے ہمیں

علی اختر حیدرآبادی

انوار

حریمِ کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے — ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

یہ مجھ سے پوچھ کہ اجزائے رنگ و بو کیا ہیں — کئے ہیں چاک بہت جیب و آستیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب — وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

۶۳ نشاطِ ہستیٔ فانی مری نگاہ سے دیکھ — بہت اُٹھائے ہیں رنجِ گراں نشیں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوتِ جانفزا تو نہیں — سُنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

اسی جہان میں دیکھا کیا غمِ مسرور — یہیں مشاہدہ کی عشرتِ حزیں میں نے

رہینِ منزلِ وہم و گماں نہیں اختر
اسی میں ڈھونڈ لیا جادۂ یقیں میں نے

ایشیا - اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

نجم آفندی اکبر آبادی

انتظار

بدلا ہوا ہے دہر کا عنواں ترے بغیر
امکانِ زیست ہے غمِ اِمکاں ترے بغیر

تنظیمِ شش جہات میں آثارِ بے رُخی
تقویمِ کائنات پریشاں ترے بغیر

بالاتفاق رقصِ مہ و مہر بے محل
بے اعتبار گردشِ دوراں ترے بغیر

پژمردہ نے میں شورشِ نغماتِ مضمحل
افسردہ لے میں جوشِ بہاراں ترے بغیر

برہم سی ہے زمیں پہ ترتیبِ شمع و گل
دھندلا سا ہے فلک پہ چراغاں ترے بغیر

بے کیف دقّتِ نظر و زحمتِ خیال
بے لطف ارتعاشِ رگِ جاں ترے بغیر

بے آب چشمِ شوق کی گوہر فشانیاں
بے قدر حُسنِ چاک گریباں ترے بغیر

بے حسرنازِ حسرت و ارمان و آرزو
بیجا نوازشِ سر و ساماں ترے بغیر

سر پھوڑنے کا زعم تڑپنے کی بیکلی
عہدِ جنوں گناہ بداماں ترے بغیر

بیجاں توقعات کی تمکین بے خودی
باطل تصوّراتِ فروزاں ترے بغیر

ادراک بے ضرورت و احساس بے اصول
بے ربط امتزاجِ تن و جاں ترے بغیر

اُتری ہوئی نگاہ سے ہر موجِ دردِ دل
ایک ایک آہ تشنۂ طوفاں ترے بغیر

کھویا ہوا زباں پہ افسانہ فراق
سہما ہوا ملالِ فراواں ترے بغیر

معیار سے گرے ہوئے تسکین و اضطراب
درمان و درد دست و گریباں ترے بغیر

روٹھی ہوئی نگاہ کی جنبش ترے لئے
سمٹا ہوا سوال کا داماں ترے بغیر

ہر ہر قدم پہ عقل کی بدلی ہوئی روش
بگڑا ہوا مزاج نگہباں ترے بغیر

آزردۂ کشاکشِ عہدِ حیات ہوں
مشکل ترے بغیر نہ آساں ترے بغیر

امیدِ یک نظر میں ہر آئینۂ جمال
ایک ایک میری جان کا خواہاں ترے بغیر

ٹھہرا نہ ایک وضع پہ سو بار ہو چکا
کافر ترے بغیر مسلماں ترے بغیر

کچھ دن میں تیری یاد کی محفل اُداس ہے
اب چل بسے گا نجمِ غزل خواں ترے بغیر

ایشیا - اپریل ۱۹۴۳ء

کسوٹی

ساغر نظامی

نئی کتابیں اور نئے رسالے

باقیاتِ بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے نثر مضامین، خطوط اور نظموں کا مجموعہ۔ ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی، قیمت عہ مجلّد ساری کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اردو زبان میں جمالیاتی اور نفسیاتی تنقید نگاری کے موجد ہیں۔ غالب کے دیوان کا دیباچہ لکھ کر بجنوری نے ایک نئے اسلوبِ تنقید کا آغاز کیا۔ اُردو پڑھنے والوں میں غالب کے کلام کو سمجھنے کا ایک نیا ذوق انہیں کے دیباچہ کو پڑھ کر ہوا۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے ترقی پسند تھے۔ انہوں نے مغربی ادب کے مستند نمونوں کو اُردو میں پیش کیا، اس طرح گویا فکر و عمل کا رُخ ہی بدل دیا۔

باقیاتِ بجنوری کا دیباچہ رشید احمد صدیقی نے تحریر فرمایا ہے۔ بجنوری کے متعلق وہ اس طرح اظہار رائے فرماتے ہیں۔

"بجنوری مرحوم مفکر زیادہ اور آرٹسٹ کم تھے۔ ان کی نظموں کا آپ مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ وہ آرٹسٹ سے ابتدا کرتے تھے اور مفکر میں گم ہو جاتے تھے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مفکر کے بوجھ کو آرٹسٹ کی دل آویزیوں سے ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ مرحوم عظمت اللہ خاں بجنوری مرحوم ہی کی نظموں سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ عربی فارسی کی متداول بحور و عروض سے آزاد ہو کر اپنے خیالات کو کم، جذبات کو زیادہ مترنم بنانے میں دونوں کو لطف آتا تھا۔ لیکن دونوں میں جو بات مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ بجنوری روایتی ثقاہت و ثقافت اور مفکرانہ گرانمائگی سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہتے تھے کہ کبھی کبھی رنگین الفاظ اور رقصاں ترکیبوں سے کھیل لیا کرتے تھے یہی بات اور یہی رنگ ذوق کے ابتدائی قصیدوں میں ملتا ہے عظمت اللہ خاں جذبات کی نمائش یا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان سے ایک قسم کی لذت یابی کے درپے رہتے تھے؛ عظمت اللہ خاں میں اس "التذاذ"، یا "لذتیت"، کا ردِ عمل "حزن و افسردگی" ملےگی، بجنوری میں حُسن اندیشی اور فکر کاری اسطور پر دو جدید تحریکوں کا سرچشمہ بجنوری مرحوم ہی میں ملتا ہے"۔

ڈاکٹر بجنوری کی اعلیٰ ترین علمی قابلیت، ذہانت، مشرقی اطوار و سیرت کی پختگی اور تخلیقی و جمالیاتی، اہلیتوں کی تکمیل سب کی سب ایسی حقیقتیں ہیں کہ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ ایک کامل شاعر بھی تھے، اس سے مجھے اختلاف ہے، آخر میں جو نظمیں اس کتاب میں ہیں وہ بُری نہیں، بعض میں بے ساختگی بھی ہے، مثلاً تتلی، مگر اکثر ایسی ہیں جن سے محض نو مشقی ظاہر ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ موت نے سب سے زیادہ ناانصافی بجنوری کے ساتھ کی، چاند ابھی طلوع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ گہن میں آگیا۔ بجنوری کی روح میں ایک عظیم المرتبت آرٹسٹ پروان چڑھ رہا تھا، خود وہ بھی اپنے ([illegible]) کے منتظر تھے مگر موت نے تمام تمناؤں کو خاک میں ملا دیا، لیکن بہر حال بجنوری کے ان مضامین، خطوط، اور نظموں میں ان کی اک تصویر ملتی ہے۔ بجنوری اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جو ادب کے کارواں کا اولین نقیب تھا۔ اور اس لحاظ سے ادب کی تاریخ میں ان کا اہم مقام ہمیشہ تسلیم کیا جائیگا۔

محشرِ خیال

از سجاد علی انصاری مرحوم بی اے۔ ایل۔ ایل بی (علیگ)، ناشر خان الیاس احمد مجیبی قرول باغ نئی دہلی۔ قیمت قسم اوّل مجلد مع گرد پوش ۵ہے، قسم دوم عہ بے جلد ۸ (علاوہ محصول)

اس یادگار مجموعہ کو ہمارے دوست خواجہ منظور حسین ایم اے (علیگ)

بی اے آکسن نے ترتیب دیا ہے اور ایک دوست ہی نے شائع کیا ہے، الیاس صاحب نے اس کا پہلا ایڈیشن شرکتِ ادبیہ کیملرٹ ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا۔ یہ چھپتے ہی اتنا مقبول ہوا کہ بعض یونیورسٹیوں نے اسے اپنے نصاب میں داخل کر لیا؛

۱۹۲۶ء کے بعد ۱۹۴۲ء میں محشرِ خیال کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جسے پڑھ کر انسان میں ٹوٹنے بننے ابھرنے اور پھیلنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی اور اعمال و اخلاق کی قدر میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں کم از کم انسان کی وہ جبلی فطرت جو متعدد اخلاقی اور سیاسی نظاموں کے دباؤ کا نتیجہ ہے کچھ تبدیلی ہوتی اور سر اٹھاتی نظر آتی ہے۔

"شعلۂ مستعجل" کے عنوان سے آل احمد سرور نے اسکا دیباچہ لکھا ہے۔ دیباچہ برا نہیں۔ لیکن جہاں جہاں سرور سنجیدہ تنقید نگاری اور طنز کو ملانا چاہتے ہیں۔ اک سبکی سی پیدا ہو جاتی ہے، رشید کی طرح انھیں رنگ آمیزی پر قدرت نہیں ہے، ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کے دو مختلف نظریوں کے درمیان وہ ایک وسطی نظریہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور سجاد کے ادبیات کو اس وسطی نظریہ ادب کا حامل قرار دیتے ہیں، مگر اس کوشش کو حاضر ذہن تسلیم نہیں کر سکتا، ادب برائے ادب کے جمالیاتی عنصر، زندگی کی ایک غیر قیاسی مگر حسین تحلیل، پھر اسلوب کا دقیق و مبہم ہونا، زبان کا بھی عام بولی سے بلند ہونا، تعمیر و تخریب کے خیال سے آزاد ہو کر نتیجے نکالنا یہ ادب برائے ادب کے عاملین ہی کا طریق و اسلوب ہے۔ ترقی پسندوں کا نہیں۔ ۶۶

سجاد جس ماحول کی پیداوار ہیں، وہ ماحول اور اس کے تمام گوشے ادب برائے ادب کی تحریک ہی سے متاثر تھے، ان میں اور دوسروں میں محض کیف و کم کا فرق تھا۔ یلدرم، نیاز اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ عجوبہ فکر، بت شکن اور ساتھ ہی بت ساز بھی تھے۔ یہ کہنا کہ وہ چیزوں کو توڑنا ہی جانتے تھے، غلط ہے وہ چیزوں کو عجیب حسن کارانہ انداز سے پیدا بھی کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے صناع تھے جو دوسروں کے شاہکاروں پر اپنا برش پھیرنے کیلئے ہمیشہ بیتاب رہتا ہو۔

سجاد کے جن بلند آہنگ، الفاظ سے سرور نے اپنا دیباچہ شروع کیا ہے وہ زوردار بھی ہیں اور مرعوب کن بھی، سجاد کا قول ہے ؎

جماعت محض جاہل، کمزور اور بزدل افراد کا اتحاد ہے
جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ بلند نظر اور بلند حوصلہ
افراد کی قوتوں کو ابھرنے کا موقع دیا جائے۔ جماعت چاہتی
ہے کہ برگزیدہ شخصیتوں کی قوتِ ارادہ اور قوتِ عمل دونوں
ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائیں۔ نظامِ اخلاق جماعت کے
اسی بزدلانہ اتحاد کا دوسرا نام ہے۔ بلند نظر افراد کا فرض
اور اہم ترین فرض یہ ہے کہ جماعت کے اخلاقی قوانین کو پامال
کردیں ورنہ وہ ایک دن ان کی انفرادی عظمت کو پامال کردیگی"

سرور کے ان الفاظ میں نیٹشے کی روح، برنارڈ شا کی بت شکنی، آسکر وائلڈ کی (Paradoxes) بیدل کی انانیت، غالب کی انفرادیت سب کا عکس ملتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جماعت سے ہٹکر فرد کی پوزیشن کیا رہ جائیگی۔!؟

اصل میں اس بلند آہنگی کا اصلی مرکز وہ مٹا ہوا جاگیرداری ماحول تھا جسمیں سجاد نے آنکھ کھولی، جسمیں اُس نے دیکھا، انسان اور اس کے ابھرنے کی روح جکڑی ہوئی ہے؛ سماج پر اس سے زیادہ کاری ضرب لگانا سجاد کا فریضہ نہیں تھا کیونکہ اُسوقت نہ بیرونی محرکات ہی بیدار ہوئے تھے نہ انسانی تصورات، سجاد نے صرف محسوس کیا اور فردیت کے نام پر تخریب کا نعرہ بلند کیا۔ اب یہی نعرہ ایک اجتماعی سماج کے نام پر بلند کیا جا رہا ہے اور یہ نوعیت محض جذباتی نہیں منطقی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

"دوست پرستی"، یا "علیگ نوازی" دوسری چیز ہے مگر ادب میں اس قسم کی رعائتیں کوئی ذی ثبات نقش نہیں چھوڑ سکتیں، سجاد کا مخصوص فریضۂ ادب اشیاء اور مسائل کی حکیمانہ و شاعرانہ تشریح و تنقید کرنے کی کوشش تھا؛ اس کوشش میں ایک انفرادی جذبۂ انا کی نمائش تو خوب ہوئی مگر ان کی رائے اور تنقید میں سخت ٹکراؤ پایا جاتا ہے "علی گڑھ میگزین" کے اڈیٹر کو خط لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

صحیح شاعری تو وہ ہے جو حقائق کو رنگینیوں سے اس
طرح لبریز کر دے کہ ہر شعر اپنے علم کی لطافت میں قرآن کی ایک
آیت اور اپنے عمل کی وسعتوں میں حدیث کا ایک ٹکڑا بن جائے۔"

یہ انہوں نے اپنے نزدیک صحیح شاعری کی تعریف کی۔ اس تعریف کے ماتحت "صحیح شاعری" جتنی عظیم و ناممکن الوقوع شے ہو جاتی ہے ظاہر ہے، لیکن شاعری کی اس تعریف کے دوش بدوش سجاد مزید اظہار خیال کرتے ہیں۔

حقیقتیں مذہب و ملت کی پابند ہو کر نہیں رہتیں، ایک حقیقی
شاعر کا یہ فرض نہیں کہ کسی مذہب یا کسی نظامِ اخلاق کے ایک
ایک جزو کو صراحتاً (یعنی اجمالاً) بیان کرے اس کے لیے
راہِ نجات اور بہشتی زیور کافی ہیں۔

پہلے حقائق کو مطلق آزاد تصور کر کے ایک نیا نظریہ وضع کیا، اس کے بعد رسمی مذہب و اخلاق کو راہ نجات و بہشتی زیور تک محدود کر دیا گیا۔ پھر اسی

پیراگراف میں لکھتے ہیں۔

"صحیح مذہب وہ ہے جو ناقابلِ برداشت نہ ہو۔ اور صحیح اخلاق وہ جو حقائق کی مشکلات کو تخیل کی رنگینیوں اور عقود کی لطافتوں سے آسان کر دے، اسکا یہ منصب نہیں کہ یہ یتیم خانوں اور حاجیوں کی امداد پر اپنی صلاحیتوں کو قربان کر دے۔"

یہ چار سطریں انتقادی و طنزیاتی ادب کے ذیل میں دیکھی جائیں گی، مگر تنقید اور طنز دونوں میں سخت قسم کا ٹکراؤ پایا جاتا ہے۔ اظہارِ خیال میں مجذوبانہ و شاعرانہ کیفیت اس درجہ داخل ہو گئی ہے کہ کسی قسم کا ربط باقی نہیں رہا۔ اگر یہ نثر نہ ہوتی غزل کے اشعار ہوتے تو ظاہر ہے کہ کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ مگر یہ تو نثر ہے اور مسائل کے متعلق ذمہ دارانہ تنقید، صحیح شاعری، حقائق، صحیح مذہب، صحیح اخلاق سجاد نے ان چار باتوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہا مگر وہ خوبصورت الفاظ کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔ یہ سجاد کی خامی ہے اور ان کے ادب میں جا بجا پائی جاتی ہے۔

آل احمد سرور اپنے دیباچہ میں ذہنِ معترض کیلئے ایک بند باندھتے ہیں کہ:۔

"سجاد انصاری کے خیالات کو صحت یا غلطی کے معیار سے نہیں جانچا جا سکتا، وہ صحت اور غلطی دونوں سے بیزار ہیں، وہ صرف دلچسپی کے قائل ہیں"

یہی سجاد کی سچی تعریف ہے، ان کے یہاں تنقیدِ حیات ہے۔ مگر زبردست منطقی استدلال نہیں۔ ان کے یہاں طنز ہے مگر نہ کلیۃً تخریبی نہ امکانی طور پر تعمیری میں سرور سے قطعی متفق ہوں کہ "ان کے خیالات میں صحت اتنی نہیں ہوتی جتنی شدت مگر اسمیں کوئی شک نہیں کہ سجاد ذہین ترین انسان تھے، اگر وہ زندہ رہتے تو اردو ادب کی سب سے انوکھی اور عظیم شخصیت ہوتے۔"

سجاد کے ادب میں مجذوبہ کاری، جدت، جاذبیت، گہرائی اور ایک مخصوص ذہن و فکر کی صلاحیت و کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ اُن کی صحیح تعریف میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ فطری طور پر ایک صاحبِ طرز آرٹسٹ تھے اور خارجی طور پر آسکر وائلڈ سے کافی متاثر معلوم ہوتے تھے محشرِ خیال کے مطالعہ سے انسانی روح وہی مسرت حاصل کرتی ہے جو ارسطو کے نزدیک آرٹ کا حقیقی مقصود تھا۔ بہرحال باوجود اس واضح اور روشن افادی و جمہوری نظریۂ ادب کے جو زمانۂ حاضر کا اصول ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ جس نے "محشرِ خیال" کو نہیں پڑھا وہ بہت بڑی نعمت سے محروم ہے۔

فنِّ شاعری:۔ از ارسطو مترجمہ عزیز احمد بی اے آنرز (لندن)
بوطیقا (Poetics) شائع کردہ انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دہلی
سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو (ہند) قیمت ۱۲/
نمبر ۱۷ (۱۹۴۱ء)

انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دہلی نے اردو زبان کی ٹھوس خدمت کی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں شائع ہونیوالی علمی کتابوں میں ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ ایک اہم کتاب ہے۔ یہ مع تمہید و ضمیمہ کے ۱۰ حصوں پر مشتمل ہے۔ مترجم کی تمہید اس کتاب کا اہم ترین جزو ہے۔ اس تمہید میں ان تمام مدارجِ تاریخ کو وضاحت کیساتھ بیان کیا گیا ہے جن سے تنقیدی شعور کو گذرنا پڑا "ارسطو کی فنِّ شاعری یا بوطیقا دنیا بھر میں نہ سہی تو کم از کم یورپ بھر میں ادبی تنقید پر پہلی کتاب ہے۔ شاید ہی کسی اور کتاب نے دنیا بھر کی تنقید پر خصوصاً اور ادب پر عموماً اتنا اثر ڈالا ہو۔ جس جس زمانے میں جس جس قوم نے ارسطو کے فلسفے کی قدر کی، اس کتاب کو بھی صحیفۂ آسمانی کے قریب قریب سمجھا۔ جیسے صحائفِ آسمانی کی شرحیں لکھی جاتی ہیں اور آیات کی تاویلیں کی جاتی ہیں، ارسطو کی اس تصنیف کے مشکل جملوں یا مبہم الفاظ کی تاویلوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے گئے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شاید ہی کسی اور تنقیدی کتاب کو اس قدر غلط معنی پہنائے گئے ہوں اور اس سے اتنے غلط نتیجے نکالے گئے ہوں، جتنے ارسطو کی اس سیدھی سادھی تصنیف سے نکالے گئے جو کتاب ارسطو نے یونانی شاعری اور یونانی ڈرامہ کے متعلق لکھی تھی اُسے مغرب نے اور ایک حد تک مشرق نے نمونۂ ہدایت بنانا چاہا اور اس سلسلے میں بہت سی غلطیاں کیں لیکن باوجود اس تمام تاریخی پس منظر کے آج بھی ارسطو کی کتاب اپنی خوبیوں کے باعث یکتا ہے۔ تنقید اور خصوصاً نظری تنقید ایک ایسی چیز ہے جس کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھنا ارسطو ہی کا کام تھا۔ ارسطو کے بعد کے تمام نقاد اپنا اپنا نظریہ تو پیش کرتے رہے یا دوسروں کے نظریے دُہراتے رہے لیکن اس کی سی جامع بحث اس کے سے استدلال پر کسی کو قدرت نہ حاصل ہو سکی معلمِ اول آج بھی معلمِ اعلیٰ ہی ہے۔ ارسطو کی یہ تصنیف جہاں تک اس کی اپنی تصانیف اور اس کے اپنے فلسفے کا تعلق ہے اس کے فلسفیانہ افکار کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن جہاں تک ادب اور فنِ تنقید کا تعلق ہے۔ آج بھی کوئی کتاب ارسطو کی بوطیقا، کا مقابلہ

نہیں کرسکتی۔

کتاب کی تمہید میں بوطیقا، اور یورپ پر پڑنے والے اسکے شدید اثرات اس سے پیدا ہونیوالی غلط فہمیوں اور اس کی غلط تعبیرات کی ایک جامع تنقید و تاریخ ہے اس میں ہومر سے لیکر ارسطو تک یونانیوں کے تنقیدی شعور کی تاریخ دہرائی گئی ہے۔ اسی ذیل میں افلاطون کے مکالمات کا بھی ذکر ہے اور ان مکالمات کی تشریح بھی۔ اس تشریح سے شاعری اور تنقید کے متعلق افلاطون کے خیالات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

اس وقت تک شاعری اور شعراء کے متعلق افلاطون کی وہ رائے دہرائی جاتی رہی ہے جو اُس نے اپنی کتاب "ریاست" میں شاعروں کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اس رائے کا پرتو سماج پر شعراء کی مخالفت میں پڑتا رہا لیکن اصل میں "ریاست" میں افلاطون کے پیشِ نظر یونان کے وہ شعراء تھے جنکا کلام جھوٹ کا انبار تھا۔ اس کے خلاف اپنے مکالمات میں وہ اعلیٰ ترین شاعر کا تصور پیش کرتا ہے۔ اور اگر اس کا کلام حق پر مبنی ہو تو اسے حکیم کا مرتبہ دینے کو تیار ہے؛

بہرحال افلاطون نے تنقیدِ شعر کے نظریّہ کا بنیادی پتھر رکھا، اور ارسطو نے اس پر شاندار عمارت تعمیر کی، بوطیقا سب سے پہلی کتاب ہے جو صرف فنِ شاعری سے بحث کرتی ہے۔ ۴۸

اس کتاب میں اُس نے شاعری کو انسانی ذہن کا ایک آزاد و خود مختار عمل قرار دیکر اس کے متعلق بحث کی ہے۔ افلاطون نے شاعری کو مذہب اور سیاست کا پابند قرار دیا تھا، مگر ارسطو نے اسکو مذہب و سیاسیات سے وابستہ نہیں کیا اس کے نزدیک تو شاعری اخلاقیات کی بھی پابند نہیں۔

تمہید کے بعد پہلے حصہ میں ارسطو نے شاعری پر ایک عام اور بالموازنہ نظر ڈالی ہے اور شاعری کی خاص قسمیں بتائی ہیں۔ دوسرے حصہ میں ٹریجڈی کے متعلقات سے بحث کی ہے۔

تیسرے حصہ میں رزمیہ شاعری کے اصولوں کو بتایا گیا ہے۔ چوتھے حصہ میں نقادوں کے اعتراض اور ان کے جواب دینے کے اصول واضح کئے گئے ہیں۔ پانچویں حصہ میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ٹریجڈی رزمیہ شاعری سے افضل ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے جسمیں صرف اُن اشارات و تلمیحات کی تشریح کی گئی ہے جو ارسطو کی کتاب کے متن میں ہیں۔ یہ تشریح بھی اس کتاب کا اہم باب ہے۔ ساری کتاب میں بعض اشارے اور تلمیحات ارسطو نے عبارت میں لیکا یک استعمال کئے ہیں اور اسی وقت ذہن متبادر ہوتا ہے کہ کس طرح انھیں معلوم کریں، مگر ضمیمہ اس ضرورت کو پورا کردیتا ہے؛

یہ کتاب ۱۲۴ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے۔ مگر تنقیدِ شعر کے نظریّہ پر اپنا آپ ہی جواب ہے، میری رائے میں اُردو زبان کے ہر اس شاعر کو جو شعر و ادب کا روایتی نہیں حقیقی ذوق رکھتا ہے ارسطو کی بوطیقا، ضرور پڑھنی چاہیئے۔

کوئی شک نہیں کہ اس کے بعض تنقیدی اصول موجودہ ترقی یافتہ نظریۂ تنقید کے مقابلے میں فرسودہ معلوم ہوتے ہیں، مگر بنیادی طور پر قدیم و جدید اصولوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں، مثلاً افلاطون اور ارسطو کے نزدیک آرٹ کا مقصد سماج میں مسرّت پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں، ادب برائے ادب، کے نظریّہ کے ماننے والوں کی ساری عمارت اسی سنگِ بنیاد پر قائم تھی؛ مگر نیا خیال رکھنے والے زندگی سے آرٹ کا ایک نیا تعلق پیدا کرچکے ہیں؛ یعنی ہزار تصادم کے بعد سہی، مگر اس تعلق کا مقصد بھی انسانی راحت و مسرّت ہی ہے۔

پاپی ازاپندر ناتھ اشک ناشر مکتبۂ اردو لاہور، قیمت عہ مجلد ریڈر نائز

اپندر ناتھ اشک کرنپل میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت میں پیش ہوئے۔ مگر پاپی میں، وہ ایک کامیاب ڈراما نگار کی حیثیت میں ہیں۔ "پاپی" ایک ایکٹ کے سات ڈراموں کا مجموعہ ہے؛ ان ڈراموں کا موضوع، زندگی کا کوئی تخیّل نہیں خود زندگی ہے۔ یہی زندگی جو عمل و اخلاق کے تضادوں کی ایک بھیڑ ہے، قدرت کے جبر اور سماجی ظلم وستم کی ایک خون ریز داستان ہے؛ پاپی کے سب سے پہلے ڈرامے "دیوتاؤں کے سایہ تلے" میں محبّت کی نازک نفسیات، سرمایہ دارانہ نظام و طریقِ کار کی ہولناکی، غریب مزدوروں کی ایک محدود قسمت، لاچاری و بے بسی اور پھر ان کا دردناک انجام، اس انجام میں عورت کی نازک حسیّات کی نکمت آسا حیثیت! انسانی دل و دماغ پہلے تھرّاتے ہیں، اور پھر وہ تھرتھراہٹ ایک خوفناک بغاوت میں تبدیل ہوجاتی ہے؛

ٹریجڈی کے چھ عنصر ہیں، روئداد، اطوار، تاثرات، زبان، آرائش اور موسیقی، یہ ۶ عناصر مل کر ٹریجڈی کی خاص نوعیت اور ماہیت کا سبب ہوتے ہیں۔ ان عناصر میں سب سے نمایاں حیثیت روئداد یعنی پلاٹ کو ہے۔ ٹریجڈی زندگی کی راحت اور رنج کی نقل ہوتی ہے، راحت اور رنج، مطلق نیکی اور کامل برائی تمام تر انسانی اعمال میں مضمر ہیں۔ عمل اور روئداد ٹریجڈی کا مقصدِ خصوصی ہیں۔ ٹریجڈی میں واقعات اور روئداد کا اجتماع حقیقی اور درست ہونا چاہیئے۔ زبان، اطوار اور تاثرات کے لحاظ سے اگر کوئی نقص ہو تو قابلِ اعتراض

نہیں؛ تاثرات کو تو تیسرا درجہ حاصل ہے ۔ اس کا تعلق ان تمام حقیقی باتوں کے پُرزور بیان سے ہے جو مکالمے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج سے بہت پہلے، غیر ضروری خطابت ڈرامے کا لازمی جزو خیال کی جاتی تھی۔ مگر ظاہر ہے کہ آج اس کی قیمت ایک مصنوعی نقالی کے سوا کچھ نہیں ۔ تاثرات میں ہر کہی جانیوالی چیز شامل ہے ۔ خواہ وہ اثباتی ہو یا منفی، یا یونہی عام باتوں کے اظہار سے تعلق رکھتی ہو۔

ٹریجڈی میں زبان کو آخری درجہ حاصل ہے ۔ زبان محض تاثرات کو ظاہر کرنیکا ذریعہ ہے، یہ ذریعہ یقینی طور پر طاقتور ہونا چاہیئے۔ اسی کے ذریعہ ڈرامانگار اصلی مقصد میں کامیابی حاصل کرتا ہے ۔

ان عناصر کے علاوہ آرائشی عناصر موسیقی اور اداکاری ہے ۔سوان کا تعلق شاعر سے زیادہ اداکار سے ہے ۔

اُپندر ناتھ اشک کے یہ مختصر ڈرامے جو اصل میں چھوٹے چھوٹے المیہ ہیں اپنی فن کاری میں کامیابی اور تکمیل سے بہت قریب ہیں، بغیر کسی کوشش کے ہم ان ٹریجڈیوں کے افراد سے نفرت یا محبت کرنے لگتے ہیں؛ اشک کسی نئی دنیا سے کردار مانگ کر نہیں لاتا، اسی چلتی پھرتی روتی ہنستی دنیا میں سے اسی رنج اور مسرت گناہ اور ثواب، پیری اور جوانی، آنسو اور تبسّم کی بھیڑ سے کچھ کردار چن لیتا ہے ۔ ایسے کردار جن کو ہم اپنی اپنی جگہ جانتے پہچانتے ہیں؛ اس کے چھوٹے ڈراموں کو پڑھ کر کئی مسٹر سیٹھ کئی رام لکھن، کئی بابوجی کہتے ہوئے بچّہ، کئی مسز سیٹھ، اور اسی طرح اکثر کردار ہمارے ذہن وخیال میں چلتے پھرتے روتے ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔

اس قسم کے لکھنے والوں کا جوہر، غیر ضروری ذہانت اور ما فوق الفطرت تخلیقِ ادب میں صرف نہیں ہوسکتا، یہی وہ مرحلہ ہے، جہاں پہونچکر آسانی کے ساتھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ نظم ہو یا نثر، غیر ضروری بلندی بھی، زندگی سے فرار کے مترادف ہے؛ زندگی سے ہمکنار اور سماج سے ہم سطح رہنے کیلئے ہمیں نظر آنیوالی سطحی حقیقتوں کو بیان کرنا ہوگا۔ کیونکہ انھیں کے حل کیلئے خود انسان نے بڑے بڑے فلسفوں کو وضع کیا ۔ یہاں تک کہ فلسفۂ مذاہب بھی اسی ضرورت کی پیداوار تھا ۔ اور ادب بھی انھیں سطحی حقیقتوں کی گہری نمائندگی کیلئے ہے ۔

کوئی شک نہیں اپندر ناتھ اشک کو ایک بڑا سفر طے کرنا ہے؛ انھیں اپنے جوہر کو لافانی ثبات بخشنا ہے، اور زندگی سے ہمکنار رہتے ہوئے انھیں بھی بہت بلند ہونا ہے ۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان کی زبان میں وہ جوش وہ رس اور وہ زور نہیں پایا جاتا ۔ جو اعلیٰ درجہ کے فنکار کی خصوصیت ہوتا ہے۔ محاوروں کی غلطیاں جا بجا ہیں، مثلاً "پھاڑ میں جائے سونا جو کان ٹوٹے " " وہ میرے ساتھ تھوڑی سی آزادی لینا چاہتا تھا۔ وغیرہ نگران کی فکر کا سانچہ کہیں سے غلط نہیں ہے ۔میرے نزدیک ایک شخص کی یہ کم خوش قسمتی نہیں۔ یہ چند ڈرامے بجائے خود فرصت کے اوقات میں اپنے مطالعہ کی گہری ترغیب ہیں ۔

"شہاب" (باتصویر) فیض عام کالج میرٹھ کا میگزین، مدیر اقتدار حسین خاں نگراں منظور حسین خاں ومقصود نعمانی ایم اے ،

قیمت وسالانہ چندہ درج نہیں، ملنے کا پتہ فیض عام کالج میرٹھ

ہر گزرا ہوا زمانہ اپنے اندر اک کشش رکھتا ہے، میرٹھ کا بھی ماضی اسی لئے شاندار و دلکش معلوم ہوتا ہے ورنہ یہ شہر کبھی اپنی مرکزیت کے لحاظ سے کامیاب ونمایاں مقام ثابت نہیں ہوا۔ بیآن یزدانی اور حضرتِ شوکت میرٹھی کے زمانہ میں جو ادبی جدوجہد یہاں پائی جاتی تھی وہ جدوجہد ادبی نہیں تھی ۔ ہمارے بزرگوں کے تفریحی چونچلے تھے، طوطیٔ ہند، اور اسکے پیچھے شاعرانہ چشمکیں یا حریفانہ آویزشیں یہ گزرے ہوئے عہد اور مسلمانوں کے مٹتے ہوئے اخلاق ۶۹
کی ناگوار تصویریں پیش کرتی ہیں۔ کسی سنجیدہ جدوجہد اور ادبی ذوق وشوق کی نمائش نہیں کرتیں ۔

اس کے کچھ سال بعد مسجد کانپور کے قضیہ سے قبل یہاں ایک نیم اخلاقی ادبی ادارہ شروع ہوا؛ جس کے روحِ رواں بھیّا احسان الحق اور خواجہ حسن نظامی صاحب تھے ۔ اس ادارہ کا خاص رسالہ اسوہ حسنہ تھا۔ ادارہ اپنا مکتبہ، اپنا پریس، اور اپنا باقاعدہ ایک عملہ رکھتا تھا۔ لیکن کچھ سال بعد یہ ادارہ بھی ناکام ہوا، اور خواجہ حسن نظامی مع بھیّا احسان الحق کے دہلی منتقل ہونے پر مجبور ہوگئے۔

تاریخ دہرانا مقصود نہیں، لیکن لوگ ابھی "الخلیل" اخبار اور پریس کو نہیں بھولے ہیں، یہ ادارہ بھی کامل طور پر ناکام ہوا۔ حالانکہ اس کے مالک کمبوہ تھے، میرٹھ میں کمبوہ فرقے اور کمبوہ رؤسا کی کافی تعداد ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ "الخلیل" باوجود کمبوہ ہونے کے اپنے فرقہ کی ہمدردیاں حاصل نہ کرسکے؛

اس کے بعد جولائی ۱۹۳۲ء میں، گردشِ قسمت سے میں بھی اسی

معصاب، ناکامی وفنا میں آن پھنسا، برسوں کے بعد آج پہلی بار مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ کامل ۱۲ سال تک میں نے میرٹھ میں رہ کر ایک طویل حماقت کا ارتکاب کیا

جودت اور طاقت جو اگر کسی بڑے مرکزی شہر میں صرف ہوتی اور اپنی مادی و ادبی نتیجہ خیزی کے لحاظ سے یقینی طور پر بار آور ثابت ہوتی، میں نے اس جنگل میں ضائع کردی۔ اک سرسری اندازہ مگر کامل وثوق و یقین کیساتھ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان ۱۲ سال میں محض ادبی جد و جہد پر کم از کم ۸۹ ہزار یعنی تقریباً ایک لاکھ روپیہ صرف کیا گیا۔ اس ایک لاکھ روپیہ میں میرٹھ کی طرف سے صرف خندہ اور تبسم کی ملمع کاریاں شامل تھیں اور کچھ نہیں،

ہر چند کہ ہمارے ملک میں ادب کی مادی قدر نہیں اور جب مادی قدر نہیں تو نتیجے اتنے مہتم بالشان نہیں نکل سکتے جتنے کھاد کی تجارت اور "فوج کے کھونٹوں" کے ٹھیکوں سے نکل سکتے ہیں، لیکن باوجود اس حقیقت کے اگر میری ادبی جد و جہد کا میدان دہلی بمبئی یا کلکتہ ہوتا تو کامیابی کا معیار اور ہی کچھ ہوتا۔

میں نے میرٹھ میں یہ بارہ سال کامل خود مختاریت اور آزادی کیساتھ گذارے مادی اثر تھا یا رُوحانی پرتو، مگر میں یہاں کے لوگوں کے دلوں میں رس بس گیا، ہندو ہوں یا مسلمان، عوام ہوں یا خواص، سب نے مجھ سے محبت کی، مگر میرے کاز سے ۷۰
محبت نہیں کی، شاید اس لئے کہ مجھے لوگ محبت کرنیکے قابل جانتے تھے اور میرے اس اعلیٰ مقصد کو نہیں سمجھتے تھے۔ جو سوسائٹی کی راحت اور بھلائی یا زبان و ادب کی ترقی سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبت کرنا کوئی خاص ذمہ داری نہیں اور کسی کاز میں حصہ لینا بجائے خود ایک ذمہ داری ہے۔ کسی مرکز سے تعلق رکھنے والی کامیابی یہی نہیں ہے کہ ایک سانچے میں مقاصد اور ارادے ڈھلتے رہیں، میرے خیال سے حقیقی کامیابی پرانے سانچوں کے مٹنے اور نئے سانچے بنتے رہتے ہیں۔ میرٹھ کی مرکزیت میں سب سے بڑی خامی اسکی "قدامت" ہے۔ یہاں جو سانچہ ہے پھپھوندی لگا ہوا، ہر شخص کو اصرار ہے، ان سانچوں پر سے گرد نہ ہٹائی جائے، توڑنا تو درکنار انھیں چھوا بھی نہ جائے۔ یہ عالم ہو تو ترقی اور زندگی معلوم!؟

میرٹھ میں کوئی علمی و ادبی ماحول تو کجا، شاعرانہ فضا بھی نہیں ہے، یا جو نام نہاد فضا ہے وہ اپنے کلچر اور روایات کے لحاظ سے آج سے ۵۰ برس قبل کی شاعری کے نمونے اور ماحول پیش کرتی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ میرٹھ میں اسمٰعیل و ندرت کے بعد موجودہ عہد میں کوئی آل انڈیا شہرت کا شاعر بھی پیدا نہیں ہوا!؟

نہ یہاں ادبی مجالس اور مشاعروں کا ہی چرچا ہے جن سے ذہنوں پر خارجی اثرات اور بیرونی پرتو پڑ کر ان امکانات کو بیدار کریں جن سے نشو و نما کی اہلیتیں اور تخلیقی قوتیں تعلق رکھتی ہیں؛ یہاں محدود نمونے اور محدود سانچے ہیں، اگر آپ خود تراش تراشا کر ان میں اپنی ذات کو ڈھالنا چاہیں تو ڈھالدیں ورنہ ناتراشیدہ ہستی کی مانند اس طرح پھرتے پھرئے جیسے ریگستان میں شتر بے مہار گردن اٹھائے پھرتا رہتا ہے۔

زمانہ اور ادب کے تازہ ترین و شاداب تقاضوں سے میرٹھ محروم ہے، وہ انھیں نہ سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ میرے خیال سے اس کی قدامت اس بار کو برداشت بھی نہیں کر سکتی؛ وہ ابھی تک مٹی ہوئی جاگیرداری اور بزعم خود غلط زمینداری کے جان توڑتے ہوئے ماحول سے عقیدت رکھتا ہے دولت نہیں، دولت لٹانیوالا دل نہیں، دربار نہیں، درباروں کی شان شوکت نہیں، مسند نہیں، مسند نشین نہیں، عیش نہیں عیش کے جذبات نہیں، جذبات تو جذبات، عیش کو سوچنے کی سکت نہیں، مگر آج بھی سماج اپنی ذات سے اہل قلم کا وہی رابطہ تصور کرتا ہے، جو پہلے زمانوں میں تھا؛

میرٹھ کو جن خانہ بدوشوں نے مامن بنایا، انہیں میرٹھ نے اپنے استغنا بے حسی اور صبر آزما یکسوئی کا ہدف بنا کر فنا کے گھاٹ اتار دیا؛

ابھی کل ہی کی بات ہے سنہ ۱۹۳ء میں ایک انٹرنیشنل کمیونسٹ پارٹی کے افراد اپنا ادارہ لاہور سے منتقل کرکے میرٹھ لائے۔ کیرتی اخبار نکالا۔ آزاد پریس قائم کیا اور خود مختار ہو کر سال ڈیڑھ سال کام بھی کیا، مگر میرٹھ کے ایک ہندو مسلمان نے یہاں تک کہ کانگریس پارٹی تک نے ان سے اخلاقی تعاون نہیں کیا، کوئی شک نہیں کہ ان میں خود مٹنے کی شاندار صلاحیت موجود تھی۔ مگر اس صلاحیت کو میزبان میرٹھ نے اپنی خفتہ عملی سے اور بھی طاقت بخشی۔

صرف، میں ایک جانِ ناتواں ہوں، کہ ابھی تک زندہ ہوں، یہ زندگی یونہی نہیں، اس زندگی کی پشت پناہی تمام ہندوستان کی اخلاقی و مادی امداد اس زمانے کے جدید تقاضے اور وقت کے ارتقائی احساسات کرتے ہیں؛ اور خود میرا شعور خود میری قوتِ ارادی مجھے سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے سہارے میں سفر کی رفتار رفتار بڑھا کر اور منزل کی دوری و قرب کا اندازہ کرتا رہتا ہوں؛ یہی پیمانہ ہے جس پر نظر رکھتے ہوئے ادبی مرکز اور اسکی عظیم الشان جد و جہد کا سلسلہ جاری ہے اور جاری رہیگا۔ لیکن تاریخ میں یہ بات نوٹ کرلی جائے کہ اس جد و جہد کی کامیابی کا سہرا ہرگز ہرگز میرٹھ کے مسلمان و ہندو رؤسا یا عام باشندوں کے سر نہیں ہے؛

ایشیا اپریل ۱۹۴۲ء

اصل میں یہ شہر ادبی و صحافتی جدوجہد کے لئے نہیں کافی شباب کھولنے کے لئے اک موزوں مقام ہے۔

اسی میرٹھ سے جو کئی اداروں اور افراد کا مدفن ہے، فیض عام کالج کے طالب علموں نے "شہاب" رسالہ شائع کرکے جوانی کی سرشار پُرامیدی کا معجزنما ثبوت دیا ہے؛ شہاب کی زندگی کا مجھے یقین نہ ہوتا اگر اسکا چندہ طالب علموں کی فیس کا لازمی جزو نہ قرار دیدیا گیا ہوتا۔ ان حالات میں میں امید کرتا ہوں کہ یہ رسالہ جاری رہیگا اور ترقی کریگا؛

شہاب کی ترتیب میں وہی جھلکیاں ہیں جو کسی تعلیمی ادارہ کے میگزین میں لازمی طور پر ہوتی ہیں۔ اس نمبر میں ۷ ترجمہ، متعدد نظمیں، غزلیں اور مضامین ہیں۔ نظم کا معیار، نثر سے بلند ہے، اور نظم کا حصہ زیادہ بھی ہے، نثر کے مضامین اک متوسط معیار رکھتے ہیں، شروع میں شیخ الجامعہ سید عارف حسین ایم اے اور بشیر احمد ڈسٹرکٹ جج کے پیغامات ہیں؛ دونوں پیام سادہ، جامع اور وسیع المعنیٰ ہیں؛ خاص کر سارف حسین ایم اے کے یہ الفاظ کہ "اس میگزین کے اغراض و مقاصد میں قدیم شعر و شاعری کا وہ فرسودہ راگ نہ ہونا چاہیئے، جو "دنیا کی بے ثباتی" اور عالمِ فانی کی غم انگیزی کا سراسر حامی ہو۔ بلکہ شعروادب کے اس مرقع میں زندہ اور حوصلہ افزا افکار منعکس ہوں جو انسانی خودداری، تنازع للبقا، الوالعزمی اور جدوجہد کا نعرہ بلند کریں، وہ افکار جو اپنے وسیع دامن میں جیتی جاگتی علمی تحریکوں اور حوصلہ افزا خیالات کے درخشاں جواہر ریزوں کو لئے ہوئے ہوں اور ایک زندگی بخش ماحول پیدا کرسکیں۔ ہم موجودہ سیاسی دنیا کی تیز رفتار تبدیلی سے بہت جلد واقف ہوجائیں، خود بیدار ہوں اور اپنے سوئے ہوئے بھائیوں کو بیدار کرسکیں؛ "نظریۂ خودی اور تعلیم" کے عنوان سے مدیر کا افتتاحیہ خوب ہے۔ اپنے مضمون نگاروں کے متعلق انکی موافق اور مخالف رائے ذرا عجیب سی بات ہے۔ مدیر کے فرائض میں بنیادی پسندیدگی و ناپسندیدگی ایک لابدی امر ہے، وہ جس مضمون کے خلاف ہے یا اس کے معیار کو پست خیال کرتا ہے، اسکی اشاعت ہی کی ضرورت نہیں ہے۔

"آشاؤں کے دیپک" کے عنوان پر اعتراض کرتے ہوئے مدیر شہاب لکھتے ہیں۔

> البتہ ہندی الفاظ سے عنوان کو زینت بخشنا ایک ناپسندیدہ اُپج ہے اور اس روش سے اُردو ادب کو نقصان پہونچ جانیکا اندیشہ ہے؛

اُردو زبان و ادب کی اس ترقی کے بعد جبکہ "گیتوں" کی ایک منفرد صنف پیدا ہوکر اُردو شاعری کا خوبصورت اور اہم باب بن گئی ہے؛ کسی کا یہ کہنا کہ آشا اور دیپک کے الفاظ سے پرہیز کیا جائے عدم واقفیت ہی ہے اور کچھ نہیں، یہ الفاظ روزِ زبان و شاعری میں آج سے نہیں تقریباً ۲ صدی سے بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ اُردو زبان کے مصادر، پسِ منظر اور سینکڑوں برس کی متعلقہ روایات ہمیں ان الفاظ سے قریب کئے ہوئے ہیں؛ "ہندی" اور "اردو" کے مسئلہ کو اس درجہ شدت سے دیکھنا اور پیش کرنا صحیح جذبۂ ادب نہیں؛ میری صاف رائے ہے کہ اردو میں گزشتہ چوتھائی صدی میں بڑھتی ہوئی فارسیت خود اک ذہنی غلامی تھی اور ادبی انفرادیت کی سخت توہین؛ ہندی سے، تو ہم قومی اور ماحولی طور پر قریب ہیں، فارسی سے ہماری قربت محض رجعت پسندی اور مذہبی احساس کی کارفرمائی کی بنا پر ہے۔

پھر آپکو حق ہے کہ آپ کسی سے محبت نہ کریں، مگر نفرت کے اعلان کی کیا ضرورت ہے۔

بہت سے اردو شاعر اور افسانہ نگار ہیں، جو آزادانہ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں؛ بہ حیثیت آرٹسٹ انھیں ہندی الفاظ استعمال کرنیکا قطعی حق ہے۔ ہر شخص کو انگریزی سیکھنے اور بولنے کا حق ہے۔ (یہاں تک کہ شہاب میں تاریخ کے بجائے "ہسٹری" لکھنے کا بھی) مگر ہندی پڑھنے اور لکھنے کا نہیں، یہ ضد اور ناروائی نہیں تو اور کیا ہے؟

شہاب کارفرما نوجوانوں کا پرچہ ہے، نوجوانوں کو اس قسم کے جذبات سے بلند رہنا چاہیئے؛ ۷۱

اداریہ کے بعد "دل و جگر" کے عنوان سے اقتدار حسین خاں صاحب کا ایک تنقیدی مضمون ہے۔ اسمیں ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہانپوری اور حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کا موازنہ کیا گیا ہے؛ تمہید ہی میں اقتدار صاحب کے تیور معلوم ہوجاتے ہیں کہ وہ دل صاحب کی تائید میں جھوم کر اٹھنے والے ہیں؛ جگر سے ان کی دلی ناپسندیدگی ان سطور سے صاف ظاہر ہوتی ہے ؎

> "یہی سبب ہے کہ جہاں تک عام طور پر تمام اصنافِ سخن اور خصوصیت کیساتھ غزل کا تعلق ہے، تنقیدِ غلط اور بیجا طرفداری کے باعث وہ حضرت شہرت کے منتہائے عروج تک پہونچ گئے ہیں جن کے اندر اپنے دل کی ترجمانی کا تو ذکر ہی کیا، دوسروں کے وارداتِ قلب کو نظم کرنیکی صلاحیت بھی موجود نہیں"؛

"شعر تو ہوش ربا انداز میں پڑھے جانے سے پہلے بھی اس قدر پُرکیف اور لطیف ہوسکتا ہے جتنا اس کے بعد" "شہرت اور اصلیت دو جداگانہ چیزیں ہیں؛ کسی خاص فن میں شہرت حاصل کرلینا۔ اس بات کی ضمانت نہیں ہوسکتا کہ یہ شہرت

حق بجانب ہے؟ یا کسی کی اصلیت کو اسکی شہرت کے پیمانے میں ناپنا ایک مستقل غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا نہیں ہے؟ ہو سکتا ہے نہیں بلکہ اکثر ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی شہرت کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بجتا ہے ان کے اوصاف و کمال کو اگر امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت اس شہرتِ بے پایاں کے مستحق نہیں ہیں جو انھیں مختلف ذرائع سے حاصل ہو گئی ہے۔ بالکل یہی حال جگر مرادآبادی کا ہے۔"

اس کے بعد ظاہر ہے کہ دل صاحب کو اُن کے خلاف بالکل اصلیت اور صحیح شہرت کا حامل قرار دیا گیا ہے، مجھے اس سے بحث نہیں، کیونکہ جہاں تک دل صاحب کا تعلق ہے، بڑے پختہ کار پرانے انداز کے اساتذہ میں سے ہیں۔ مگر جگر سے ان کا مقابلہ بنیادی طور پر غلط ہے، جگر کے تغزل اور دل کے تغزل کو کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا۔ دل صاحب کی غزل قدیم روایتِ شعری کے ماتحت آتی ہے، اس روایتِ شعری میں قافیہ اور اس کے متعلقات کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی، جگر نے ان حدود سے کچھ زیادہ ترقی نہیں کی؛ مگر ان قیود و حدود کیساتھ ایک حقیقی نفسیاتی رنگ کا اضافہ کیا، جس نے اس کے شعر میں تاثیر و حلاوت پیدا کر دی، وہ محبت کے ان مسائل
42 کو جنھیں مرزا داغ اور ان کے متبعین زبان کے چٹخارہ اور زبان کے چوچلے کے ساتھ بیان کرتے ہیں، آنسو اور روح کی کامل لذت و رقت کیساتھ بیان کرتا ہے۔ اس کے شعر میں جدید عہد کی رومانیت کی آمیزش ہے یعنی اس کا ماحول داغ اور دل سے بالکل مختلف ہو کر اک نئی دنیا اور اس دنیا کے نئے طور طریق پیش کرتا ہے۔"

میں اس مضمون پر سرسری اظہارِ خیال محض اس لئے کر رہا ہوں، کہ اب اس قسم کی تنقید کی کوئی قیمت نہیں ہے، بے شک شہرت کمال کا پیمانہ نہیں ہوا کرتی مگر موازنہ کا کوئی نظریہ تو قائم کیجئےگا؟ یا صرف انفرادی پسندیدگی کو تنقید تسلیم کر لیا جائے۔ جگر اور دل کا موازنہ اس لئے نہیں ہو سکتا، کہ دونوں کے آرٹ کی تیکنک ایک ہوتے ہوئے بھی جدا ہے۔ جگر غزل کہتے ہوئے روایات اور رسمی اظہارِ بیان کو اور کمو کھلے طریقۂ بیان سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ الفاظ میں اپنے انفرادی تصورات کے پرتو سے روشنی پیدا کرتا ہے۔ یہ روشنی لذت و تاثیر کی داروئے بے ہوشی بن کر انسانی روح و دل پر طاری ہو جاتی ہے۔ وہ تراکیب اور الفاظ کو شعر میں اس طرح ترتیب دیتا ہے کہ روح پر ان کا اثر پڑنا لابدی ہو جائے۔ مگر دل صاحب کے پیشِ نظر مرزا داغ کے اسکول کے تتبع میں محاورات نگاری، متعلقاتِ شعری پر نظر، اور ان سب سے ایک شوخی آفرینی ہوتی ہے۔ جگر کے کلام میں مستی، غنودگی اور ایک مبہم اضطرابی کیفیت ہے۔ یعنی ایک عشقیہ شاعر کی جو خصوصیات ہیں، وہ ہیں؛ مگر دل صاحب کا منصب بالکل جدا ہے؛ ان کے کلام میں اک واضح جذبہ سطحی اثر، شوخی، اور مرزا داغ کا سا طنطنہ پایا جاتا ہے۔ دونوں کے مناصب اور مقاصد جدا ہیں، موازنہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

کوئی بتائے کہاں یہ اشعار!؟ ہے

جگر

(۱) نگہ یار کے مخصوص اشاروں کے سوا
مذہبِ عشق میں ہے کفر نہ ایماں کوئی

(۲) انجام سے بے پروا آغاز سے بیگانہ
پروانے کی دنیا ہے بے تابیٔ پروانہ

(۳) حسرت سے دیکھتا ہوں ہر اک شاخِ گل کی سمت
یہ ضعف اور ہائے یہ عالم بہار کا

(۴) تو محوِ بیخودی ہی رہا ورنہ بے خبر
پنہاں تھا نازِ حسن میں عالم نیاز کا

اور کہاں یہ اشعار!؟

دل

(۱) ہم کو ہنگامِ نظر آج خدا یاد آیا
دل سمجھتا تھا کہ ہے دشمنِ ایماں کوئی

(۲) ہر ذرہ میں در پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے
اے اہلِ نظر دیکھو خاکسترِ پروانہ

(۳) بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب
دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

(۴) ہم اور سنگِ درہی کسی مستِ ناز کا
اللہ رے عروج جبینِ نیاز کا

میں دوسروں کی طرح موازنہ میں جری نہیں، نہ میرا مقصود جگر صاحب کو دل صاحب سے بڑا شاعر ثابت کرنا ہے۔ رہی شہرت سو یوپی کے جتنے مشہور شعراء ہیں، اُن کے لئے اس صوبہ کے نقادوں نے کوئی کام نہیں کیا، ان کی شہرمیں خود ان کے جوہر کا معمولی سا پر تو نہیں۔

بہرحال موجودہ نامساعدت حالات میں "شہاب" کی اشاعت فیضِ عام کالج کے جواں ہمت طلباء اور صاحبِ عزم اساتذہ کا عظیم الشان کارنامہ ہے، ہمیں عارف صاحب کے پیام کی روشنی میں امید ہے کہ شہاب کے مدیر اور نگراں اساتذہ اسکو وقت سے ہم آہنگ کرینگے، اب تو ادب رسمیات سے آزاد ہو کر، زندگی کا آئینہ دار ہے، اور نئے ارتقائی احساسات سے ہم دوش ہو رہا ہے۔

شہاب کا یہ نمبر بھی کسی تعلیمی ادارہ کے مجلۂ ادب سے کم نہیں، اس سال میں ہندوستان کے مختلف تعلیمی مرکزوں سے جو سالنامے شائع ہوئے ہیں اُن کے مقابلے میں اپنے ترقی پسندانہ مضامین اور نظموں کے لحاظ سے شہاب کا یہ نمبر کسی طرح کم نہیں، گو مخاطب کوئی نہیں مگر مجھے خطاب کرنا ہے، میرٹھ کے اردو نواز طبقوں کو شہاب کی ہر ممکن امداد کرنی چاہیئے۔

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

مفرّح یاقوتی محمّد شاہی

جواہرات گرانمایہ ورقِ طلاو نقرہ، مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ طب کیمیاوی کا اعجاز نما کرشمہ بوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی بے ضرر شہنشاہی مفرّح

خادم خلق اللہ

محمد عبد المغنی انصاری مع برادران نبیرۂ لقمان الملک علامہ حکیم نابینا صاحب مدظلّہ العالی منیجر انصاری دواخانہ زیر نگرانی حکیم محمد عبد الغنی انصاری خسرو شاہ نظامی

(واقع شاہ گنج حیدر آباد دکن)

یاقوتی محمّد شاہی

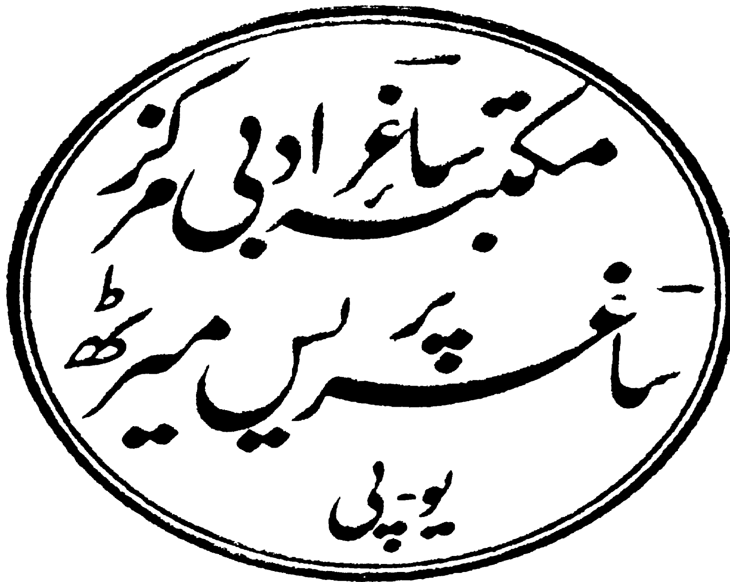
معروف و مشہور مغل شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمال کی دوا جس کا نسخہ قطعی راز میں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے خاندان عالیہ انصاریہ میں (جو عہدِ سلطنت مغلیہ میں علاوہ منصب طبابت شہنشاہی کے عہدۂ جلیلہ ملکی ہفت ہزاری تک بہ متفخرہ چکا ہے) چلا آرہا ہے یہ نسخہ صرف والیان ملک وسا رو امراء کیلئے مخصوص طور سے بنایا جاتا رہا۔ اگر اس کو ہر اعتبار سے علاوہ قطعی بے ضرر ہونیکے سرتاج و شہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار شاہدات کی بے لاگ کسوٹی پہ ہرگز بیجا نہوگا۔ یوں تو یاقوتی اور مفرحات سے طب یونانی کی قرابا دینیں پٹی پڑی ہیں اور بعض تجارتی دواخانے مفرحات میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کرکے بدنام کنندۂ نکو نامے چند کے مصداق ہورہے ہیں مگر یہ شہنشاہ پسند مفرح یاقوتی جس کو ایک جماعت اطبا و کملاء و فضلاء عصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا۔ اسکے اجزاء ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گراں مایہ کا مجموعہ ہیں اس کو مجدد طب علامہ لقمان الملک حکیم نابینا صاحب نے اپنے جدید طب کیمیاوی کے طریقہ سے اب اس درجہ مکمل فرمادیا ہے کہ یہ مفرح بغایت معتدل ہوگئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں کرتی ورق طلاو نقرہ۔ مروارید ناسفتہ لعل بدخشانی۔ یاقوت رومانی و یاقوت اصفر و کبود زمرد تابناک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول اور بعید اللطف بنا کر اس میں شامل کیا جاتا ہے اسی وجہ سے قلب و دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو حد درجہ تقویت پہنچاتی ہے اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو ہمہ صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے تھے کہ تقویت بھی ہو اور باہ بھی بڑھے جسم و روح اور اعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اس درجہ تفریح اور ایسی ہیجان فرحت کمال کا حال پیدا کرتی ہے کہ باید و شائد۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے عجیب و غریب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب و غریب صفت ہے کہ بمثل جوہر الجواہر یا جواہر مہرہ کے پرانی سے پرانی عادت منشیات کو ترک کرا دیتی ہے۔ اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شراب نوشوں نے شراب ترک کردی افیونیوں نے افیون کو ترک کر دیا اور دوسرے منشیات کے استعمال کرنیوالوں نے اس یاقوتی کو حرزِ جاں بنایا۔ یہ مفرح یاقوتی جسم کی تمام ارواح کو کمال درجہ تقویت بخشتی نشاط پیدا کرتی عمدہ اغذیہ کو جزو بدن بناتی ہے وہ لوگ جو گرم مقویات کھا کر پریشان ہوتے ہیں اور یہ جنکو سرد دوا موافق آتی ہو نہ گرم ان کے لئے یہ مفرح یاقوتی واقعی آبِ حیات سے کم نہیں ہے۔ بلا کسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کیلئے بہترین مقوی ہے بہرحال یہ یاقوتی ہر اعتبار سے ہمہ صفت موصوف ہے مگر صرف ایک صفت اس میں نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ حد درجہ بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اور روح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی ایک شاہی دوا ہے جو حضرات نمونتاً بھی اسکی چند خوراکیں نوش جاں فرمالیتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے اسکے والہ و شیفتہ ہوجاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گویا روح ادویہ ہے اس لئے اسکی مقدار خوراک حد درجہ قلیل ہے جو چاہے اس کا تجزیہ یعنی عمل نالائز کرکے بہت اچھی طرح جانچ سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مضر ادویہ ہر قسم کی سمیات مکاسات کشتہ جات سے قطعی پاک ہے۔

مقدار خوراک ۲ رتی سے ۸ رتی تک ۷۔۸ رتی سے زیادہ شاید ہی کوئی قوی آدمی برداشت کرسکے۔ قیمت فی شیشی جس میں ۶ ماشہ یہ شہنشاہی یاقوتی ہے (٥) پانچ روپیہ۔

بدرقہ۔ کچا دودھ ۱۰ تولہ۔ گرم پانی ۱۰ تولہ قدرے شیرینی ملاکر۔

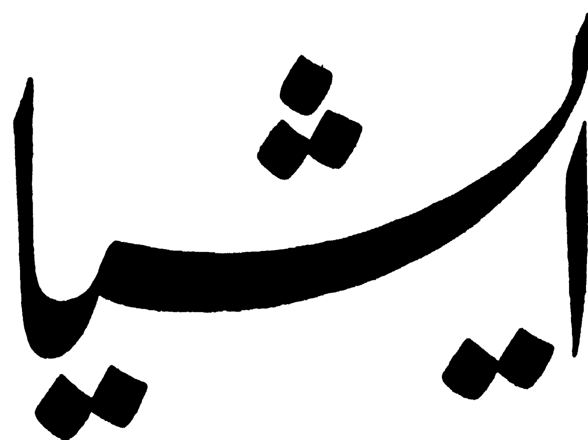
المعلن:۔ عبد المغنی انصاری منیجر انصاری دواخانہ نبیرۂ علامہ لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حکیم نابینا صاحب مدظلّہ العالی

Registered No A. 656



Published by

The Adbi Markaz Saghar Press, (India)
MEERUT


ایشیا

مفرّح یاقوتی محمد شاہی

جواہرات گرانمایہ، ورق طلا و نقرہ، مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ، طب کیمیاوی کا اعجاز نما کرشمہ، بوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی بے ضرر شہنشاہی مفرح

خادم خلق اللہ

محمد عبد المغنی الانصاری مع برادران نبیرۂ لقمان الملک علامہ حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی منیجر الانصاری دواخانہ زیر نگرانی حکیم محمد عبد الغنی الانصاری خسرو شاہ نظامی

(واقع شاہ گنج حیدرآباد دکن)

یاقوتی محمد شاہی

معروف و مشہور مغل شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمال دوا جس کا نسخہ قطعی راز میں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسلٍ ہمارے خاندان عالیہ انصاریہ میں زمانہ سلطنت مغلیہ میں علاوہ منصب طبابت شہنشاہی کے عہدۂ جلیلہ ملکی ہفت ہزاری تک پر متمکن رہ چکا ہے، چلا آ رہا ہے یہ نسخہ صرف والیان ملک رؤسا و امراء کیلئے مخصوص طور سے بنایا جاتا رہا۔ اگر اسکو ہر اعتبار سے علاوہ قطعی بے ضرر ہونیکے سرتاج و شہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار مشاہدات کی بے لاگ کسوٹی پر ہرگز بے جا نہوگا۔ یوں تو یاقوتی اور مفرحات سے طب یونانی کی قرابا دینیں پٹی پڑی ہیں اور بعض تجارتی دواخانے مفرحات میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کرکے بدنام کنندہ نکونامے چند کے مصداق ہو رہے ہیں۔ مگر یہ شہنشاہ پسند مفرح یاقوتی جسکو ایک جماعت اطبا و کملا و فضلاء عصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا اس کے اجزاء ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گراں مایہ کا مجموعہ ہیں اسکو مجدد طب علامہ لقمان الملک حکیم نابینا صاحب نے اپنے جدید طب کیمیاوی کے طریقہ سے اب اسدرجہ مکمل فرمادیا ہے کہ یہ مفرح بغایت معتدل ہوگئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں کرتی۔ ورق طلا و نقرہ مروارید ناسفتہ، لعل بدخشانی، یاقوت رممانی و یاقوت اصفر و کبود زمرد تا مناک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول اور بعید اللطف بناکر اسمیں شامل کیا جاتا ہے اسی وجہ سے قلب و دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو حد درجہ تقویت پہنچاتی ہے اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو بہمہ صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے ہیں کہ تقویت ہو اور باہ بھی بڑھے جسم و روح اور اعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اسدرجہ تفریح اور ایسی ہیجان و فرحت کمال کا حال پیدا کرتی ہے کہ بائد و شائد۔ دماغی کام کرنیوالوں کیلئے عجیب و غریب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب و غریب صفت ہے کہ یہ مثل جوہر الجواہر یا جواہر مہرہ کے پرانی سے پرانی عادت منشیات کو ترک کرا دیتی ہے۔ اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شراب نوشوں نے شراب ترک کردی افیونیوں نے افیون کو ترک کردیا۔ اور دوسرے منشیات کے استعمال کرنیوالوں نے اس یاقوتی کو حرز جان بنا یا۔ یہ مفرح یاقوتی جسم کی تمام ارواح کو کمال درجہ تقویت بخشتی، نشاط پیدا کرتی، عمدہ اغذیہ کو جزو بدن بناتی ہے وہ لوگ جو گرم مقویات کھاکر پریشان ہوتے ہیں اور جن کو سرد دوا موافق آتی ہو نہ گرم ان کے لئے یہ مفرح یاقوتی واقعی آب حیات سے کم نہیں ہے۔ بلا کسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کیلئے بہترین مقوی ہے بہرحال یہ یاقوتی ہر اعتبار سے بہمہ صفت موصوف ہے۔ مگر صرف ایک صفت اسمیں نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ حد درجہ بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اور روح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی ایک شاہی دوا ہے جو حضرات نمونتاً بھی اسکی چند خوراکیں نوش جان فرمالیتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے اسکے والہ و شیفتہ ہوجاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گویا رُوح ادویہ ہے اسلئے اسکی مقدار خوراک حد درجہ قلیل ہے جو چاہے اس کا تجزیہ یعنی عمل انالائز کرکے بہت اچھی طرح جانچ سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مفرد ادویہ ہر قسم کی سمیات مکاسات، کشتہ جات سے قطعی پاک ہے۔

مقدار خوراک۔ ۲ رتی سے ۸ رتی تک ہے۔ ۸ رتی سے زیادہ شائد ہی کوئی قوی آدمی برداشت کرسکے۔ قیمت فی شیشی جسمیں ۶ ماشہ یہ شہنشاہی یاقوتی ہے (عہ) پانچ روپیہ بدرقہ۔ کچا دودھ ۱۰ تولہ۔ گرم پانی قدرے شیرینی ملاکر ۱۰ تولہ

المعلن:۔ عبد الغنی الانصاری منیجر الانصاری دواخانہ نبیرۂ علامہ لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی

(۱۹۳۶ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبہ متحدہ

حکومت صوبۂ بہار اور حکومت صوبۂ سی پی (برار)

اسسٹنٹ اڈیٹر

محمد تقی

اڈیٹر

ساغر

ناشر

مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان)

قیمت فی نمبر ۸ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)

ایجنسیوں کو ۲۵ فیصدی کمیشن

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

فہرست مضامین ایشیا فروری ۱۹۴۲ء

ایشیا

جلد (۷) | سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر (۱)

چند دن حیدرآباد میں

عجیب معمّہ ہے انسانی فطرت بھی، ——— وہ دن مجھے خوب یاد ہیں جب ادبی اجتماعات، کانفرنسوں اور مشاعروں میں کشش ہی کشش اور مسرت ہی مسرت تھی۔ زندگی نے رُوح و دل کو چھوا تک نہ تھا، ایک فریبِ شوق تھا کہ حصار کئے ہوئے تھا: میں ہر بزم میں شمع کی طرح روشن اور چاند کی طرح چمکنا چاہتا تھا ——— اور نہ میں شمع تھا نہ چاند!؟

عجیب معمّہ ہے یہ انسانی فطرت، کامیابیوں اور ملک کی پذیرائیوں نے ان چیزوں کا ہجوم کردیا، مگر ادنیٰ سی دلکشی محسوس نہیں ہوتی، زندگی کا لمس احساسِ لذت کو یکسر زہر بنا گیا۔ جیسے کوئی شیمپین کے گلاس کو سم آلود کردے!!

انسانی فطرت کا تجربہ، زندگی کے مشاہدات، موجودہ سماج میں علم و ہنر کا درجہ، حاضر نظام کے عناصر شعر و ادب کا نام نہاد رابطہ!!!

اور اس تمام طوفان میں یکسا رئی ساحل کی تمنّا! ——— پھر غرقابی کا یقین،!؟ اک عالمِ حیرت ہے کہ حیرت فزا ہے

زندہ رہنا، زندگی کا اک بُت تراشنا، اک آئیڈل کو وضع و مکمل کرنا، اور ------——— اس آئیڈل کے ماتحت راحت کا تصور!؟ عملی دنیا میں تخیل اور حقیقت کا تمام کارخانہ بھک سے اُڑتا ہوا نظر آیا، یہ دنیا، یہ تضادوں کی بھیڑ، یہاں نہ تخیل کا پنپنا ممکن ہے نہ حقیقت کا، ——— یہ سب کچھ دیکھا اور مشاہدات کی تلخی رُوح کو زہریلے کیڑے کی طرح مس کرکے گذر گئی،

شمع روشن ہے، (اس لئے کہ ہر رنگ میں سحر تک اسکو جلنا ہے)

مگر اپنے لئے بجھی ہوئی، چاند ضوبار رہے مگر اپنے لئے تاریک؛ تلخی کا یہ زہریلا مَس، زندگی کی یہ خوفناک رونمائی، مشاہدات کی یہ ہیبتناکی اور تجربوں کی یہ واقعیاتی و مادّی روشناسی، انسانی فطرت کے توازن کو ہلا بھی سکتی ہے اور قوی بھی کرسکتی ہے؛ ——

یہ میں نے آج محسوس کیا زندگی میں جان نہ سہی مگر یہ دکھیا، انسان سے زیادہ قابلِ ۳۲
رحم ہے!!

اس نے کچھ نہیں دیا؛ مگر ہاں خود سے نباہ کی قوت، مقابلہ کی طاقت، انسانی خدمت کا جذبہ، گویا اپنا آخری سہارا، اپنا اچھوتا راز، اپنی ان چھوئی حقیقت، یعنی خود سے نباہ کی قوت، مقابلہ کی طاقت،۔

گذشتہ سال میں حیدرآباد نے کئی بار یاد کیا مگر میں نہ جاسکا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں کلیۂ ورنگل نے دعوت دی، یہ اک علمی ادارہ کی یاد تھی، اس یاد پر مہر تھی اختر کی (اختر حسین موہانی ایم اے، اردو لکچرار کلیۂ عثمانیہ ورنگل) کچھ کشش اختر کی کچھ سرزمینِ دکن کی، میں اس طرح کھنچا چلا گیا، گویا کھنچ جانا میرا فرض تھا؛

سر محمد یعقوب کی صدارت میں ایک مناظمہ ہوا۔ پسِ پردہ ایک بڑی تعداد خواتین کی موجود تھی، ہزاروں انسانوں کا مجمع، تہذیب و سکوت کیساتھ نئی اور پرانی شاعری کے اسالیب سے لطف لے رہا تھا، حفیظ جالندھری بھی شریک تھے۔ دکنی اور دکن میں مقیم شعراء بھی موجود تھے۔ مخدوم محی الدین، نظر حیدرآبادی، دہقانی حیدرآبادی صمد رضوی ساز، تسنیم مینائی، ماہر القادری، علامہ حیرت بدایونی، شاہد صدیقی

اوریس مینائی، حسرت ترمذی، سید فضل کریم فضلی (کلکتہ) اور دوسرے شعراء نے اپنا مخصوص کلام سنایا۔ خاص سامعین بڑی تعداد میں حیدرآباد سے آئے تھے اور تو اور قاضی عبدالغفار بھی، جن کی مصروفیت مسلّم ہے، اسی سے آپ اس باعظمت اجتماع کی اہمیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ بالکل یوپی، اور پنجاب کے کل ہند اجتماعات کی سی تکمیل اور افادیت کی شان پائی جاتی تھی؛

یہ سب کچھ احمد حسین خاں صاحب پرنسپل کلیہ ورنگل، اساتذہ، اور اُس کے باذوق طلبہ کے اخلاص، ادبی ذوق، بڑے وقار آرزوؤں اور سوزِ عمل کا پرتو تھا، کہ تھوڑی دیر کے لئے (سرسوتی) شاعری کی دیوی مسکرا اٹھی ورنہ آج مسکرانے کی ... کہاں۔!؟

ورنگل کے بعد ۲۰، ۲۲ دن حیدرآباد میں مقیم رہا۔ یہ قیام عشرتِ یک نفس معلوم ہوا۔ دن رات کی مسلسل مہمان نوازی سے دو اندازے ہوئے۔ (۱) حیدرآبادیوں اور دکن میں جابسنے والوں کی وسیع الاخلاقی غیر ضروری حد تک وسیع ہے۔ (۲) دوسرے اردو شعر و ادب کا ذوق عام ہے۔ یہ اندازے انسانی کردار اور ادبی ترقی کے امکانات سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۱) پہلا اجتماعی زندگی کے لئے فالِ نیک ہے؟ (۲) ممکن ہے اس جاگیردارانہ ماحول میں سرمایہ دارانہ عہد کی ادبیت ترقی کرکے نئے ادب کا لباس پہن سکے۔

حیدرآباد کی شاعری، تغزل اور نظم نگاری کے اُن تمام نئے اور پرانے تقاضوں سے متاثر ہو رہی ہے جو ماحول اور وقت نے پیدا کئے ہیں، ترقی پسند ادیبوں اور شعراء کی ایک تعلیم یافتہ جماعت حیدرآباد میں ابھر رہی ہے۔ فضا سازگار نہیں بعض خود اپنی راہ میں حائل ہیں، لیکن ابھرنے والی چیز ابھر کر رہیگی؛

قدیم و جدید میں کشمکش یہاں بھی ہے۔ زندگی اور اُس کے مسائل پر کھلی ہوئی تنقید ناپسند کرنیوالے یہاں بھی موجود ہیں؛ عوام و خواص میں شعر و ادب کا ذوق ترقی پر ہے؛ لیکن اس ترقی کیساتھ کسی خاص ثقافت اور افادیت کا تخیّل ابھی اس درجہ مکمل نہیں ہوا جتنا کہ اُسے ہونا چاہیئے۔

یہ اک سرسری نگاہ ہے، کھل کر لکھنے کا امکان نہیں، حیدرآباد سے واپسی پر ایشیا چھپ کر تیار ہو چکا تھا۔ بہرحال اس سفر میں مجھے خواص کے علاوہ حیدرآباد کے عوام سے بھی قریب ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اگر الفاظ میں یہ طاقت ہے کہ وہ دل کی نمائندگی کرسکیں تو میں کمالِ اعتراف و احترام کیساتھ اُن اداروں، احباب اور اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری قدر افزائی اور مسافر نوازی میں اپنی دلی فیاضی کا ثبوت دیا خاص کر

(۱) جنرل والاشان نواب معظم جاہ بہادر (شہزادۂ دکن)

(۲) محترمہ مسز سروجنی نائیڈو (۳) سید عبدالعزیز صاحب صدر عدالت و امورِ مذہبی (۴) یٰسین صاحب نوری سابق وزیر بمبئی گورنمنٹ (۵) کرنل نظیر الاسلام صاحب (۶) میجر خواجہ محمد سعید۔ (۷) سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی نائب معتمد فوج [redacted] (۹) مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی (۱۰) خواجہ نصیر الدین صاحب [redacted] سید احمد حسرت ترمذی (۱۲) علامہ حیرت بدایونی (۱۳) مخدوم محی الدین بی اے اور ان کے احباب (۱۴) ادارۂ شرقیہ حیدرآباد دکن (۱۵) تسنیم صاحب مینائی (۱۶) [redacted] حیدرآبادی (۱۷) اختر صدیقی (۱۸) مختر صاحب عابدی، پروفیسر شعبۂ حیاتیات عثمانیہ یونیورسٹی (۱۹) کپتان یحییٰ صاحب (۲۰) ماہر القادری صاحب (۲۱) محمد یونس سلیم بی اے وکیل لطیف الحسن برنی

اور ان تمام حیدرآبادی دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں؛ جنھوں نے میرا اس طرح خیر مقدم کیا۔ گویا میں انھیں میں سے ہوں؛

رہ گئے اختر سو ان تمام حضرات کو جن کا میں شکر گذار ہوں، اختر ہی کا ممنون ہونا چاہیئے۔ یہی وہ ذریعہ ہیں جس نے اس مرتبہ مجھے حیدرآباد اور حیدرآبادیوں سے قریب کیا۔

میرے لئے اتنا شکر گذار ہونا گویا آئینہ سامنے رکھ کر اپنا شکریہ ادا کرنا ہے؛ خلوص و انسانیت کی وہ چنگاری جو اختر کے سینے میں دہک رہی ہے، میرے شکریہ سے بے نیاز ہے؛

______ یکم مارچ کو ایجوکیشنل کانفرنس کی شرکت کے لئے حیدرآباد پھر جانا ہے؛ مجھے یقین ہے کہ مارچ میں حیدرآباد کی ادبی جدوجہد اور شاعرانہ زندگی و ترقی کے بارے میں اس طرح لکھ سکوں گا جس طرح میں لکھنا چاہتا ہوں؛ حیدرآباد کے اس سفر میں میری آرزو ہے کہ ہر مستحق تک ماہنامہ ایشیا کو پہنچا سکوں۔

اس مرتبہ حیدرآباد میں میرا پتہ یہ ہوگا۔

کرنل نظیر الاسلام صاحب
اسلام ہاؤس بنجارہ ہل
حیدرآباد (دکن)

ساغر

فانی بدایونی

احتشام حسین

۲۶ راگست ۱۹۴۱ء کو فانی بدایونی نے حیدرآباد میں انتقال کیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال کی تھی اور اُن کی شاعری کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۶۲ سال بھی ایک مرگِ مسلسل کی طرح گذرے، ہر لمحہ انھیں موت کا انتظار رہا زندگی کی تلخیاں جو ایک انفرادیت پسند حساس شاعر کے یہاں بیماری بن جاتی ہیں۔ فانی سے کسی لمحہ جدا نہیں ہوئیں۔ فانی ایک وارفتہ مزاج شاعر تھے۔ وکالت ان کے لئے ایسی تھی جیسے کسی گول خانے میں چوکھنٹی چیز بٹھانے کی کوشش کی جائے مگر ہمارا نظامِ تمدن اس کی کب فکر کرتا ہے، شخصیت فنا ہو جائے، ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ دماغ مسلسل احتجاج کرے لیکن یہ گرفت ڈھیلی نہیں پڑ سکتی۔ کون جانتا ہے کہ فانی کو انھیں تجربات نے جبر کا قائل بنا دیا ہو۔ اسی سے چھوٹنے کے لئے موت کا ہر وقت انتظار تھا۔

آج روزِ وصالِ فانی ہے　　　موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

چمن سے رخصت فانی قریب ہے، شاید　　　کچھ آج بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی　　　زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

اور اس طرح کے سیکڑوں شعر! فانی کا رنج و الم گہرا اور فلسفیانہ ہے غمِ دو چار دن کا ہوتا تو اس میں رقت پسندی، جذباتیت اور بھڑک کر بجھ جانے کی کیفیت ہوتی لیکن جب غم زندگی بن جائے، جسے جینا گناہ معلوم ہو اس کے یہاں موت "دلھن" بن کے آتی ہے۔ فانی کی موت ڈراؤنی اور خوفناک نہیں ہے۔ کیونکہ وہی زندگی کے معمّے کو حل کرتی ہے، وہی سکون لاتی ہے۔ قنوطیت جہاں زندگی کا مقصد بن جائے فانی وہاں کھڑے ہیں۔ اس لئے فانی کے یہاں مرگ کی تکرار فلسفۂ حیات کے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں۔ فانی جلنے ہی دُکھ درد کا راز نہیں پاتے ان پر اپنی ہی زندگی کا بھید نہیں کھلتا اس لئے کائنات ان کے پیشِ نظر نہیں۔ شدت کے ساتھ وہ اپنی زندگی کے تغیرات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ زندگی اُن کے لئے دیوانے کا خواب ہے جو بیان نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں بلکہ

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم　　　رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہاں پہونچ کے بہت سے سوچنے والے فانی کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اور بہت سے ان کا ساتھ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیں گے۔ فانی لکھنؤ، اٹاوہ، بدایوں، آگرہ، حیدرآباد تمام جگہ پھرتے رہے لیکن ان کو کہیں اس کا جواب نہ مل سکا کہ زندگی کسے کہتے ہیں، ہاں موت کے بارے میں البتہ انھوں نے ایک فلسفہ بنا لیا تھا کیونکہ اس کا راز تو زیادہ تر تخئیل پر مبنی ہے۔ اور تخئیل کے لئے ایک تصوراتی بات نکال لینا زیادہ مشکل نہیں۔

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر　　　موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

فانی کو موت کی تلاش تھی اور انھیں مل گئی۔ جو زندگی ڈھونڈ رہے ہیں شاید انھیں زندگی مل جائے!،

غزل گوئی فطری شاعری ہے یا نہیں؟ غزل گوئی فرسودگی کے سوا اور کچھ بھی ہے یا نہیں، غزل ہمارے بڑھتے ہوئے خیالات کا ساتھ دے سکتی ہے یا نہیں، مختصر یہ کہ اسے مٹنا چاہیئے یا رہنا چاہیئے۔ ان سوالوں کا جواب کسی تنقیدی بحث میں دیا جا سکتا ہے۔ یہاں تو ایک غزل گو شاعر کی یاد میں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں۔ اور انھیں حدود کے اندر سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ فانی کی غزل گوئی ذرا دوسرے شعراء کی غزل گوئی سے مختلف ہے بھی۔ اُس کا ایک فلسفہ ہے اس کا ایک انداز بیان ہے اور وہ اُسے غزل گو شعراء میں بہت بلند مرتبہ بناتی ہے۔ اگر کوئی غزل گو ہمارے سامنے زندگی کے مسائل، اُن کی پیچیدگیاں اور اُن کے حل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اُس کی شاعری موجودہ دور کے لوگوں کے لئے بھی اپنے دامن میں کچھ بجلیاں رکھتی ہیں۔ فانی کے دامن میں

ایسی بہت سی بجلیاں تھیں ۔ وہ عشق اور عشق کی کیفیات کو سمجھنا چاہتے ہیں ، انھیں زندگی اور موت کا بھید معلوم کرنے کی تمنا ہے ۔ وہ انسانی طاقت اور اختیار کے حدود دیکھنا چاہتے ہیں ۔ یہ مسائل کسے پریشان نہیں کرتے ، ایک اجتماعیت پسند انھیں پھیلا دیتا ہے ، جواب کہیں اور ڈھونڈتا اور کہتا ہے کہ ع

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں پھر مل کر تدبیریں سوچیں

لیکن انفرادیت پسند تنہا ہونے کی وجہ سے شکست کھا جاتا ہے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ؎

راس آتے ہیں اشک و آہ کسے — کر نہ آب و ہوائے غم سے ساز (فانی)

آب و ہوائے غم سے ساز کرلیتا ہے ۔ اور اس مصالحت کو عاشقانہ کیف کا رنگ دیتا ہے ۔

کیا کروں نازک بہت ہے اُنکی مرضی کا سوال — ورنہ فانی اس جیے جانے سے کچھ حاصل نہیں

فانی بہت اچھے غزل گو شاعر تھے ۔ اُن کی شاعری اتنی متحرک بھی ہوسکتی تھی ۔

ہاں شبِ ہجر آج صبح نہ ہو — ہاں چلی جائے یادِ زُلفِ دراز

کون باعزم ، عمل پسند اپنے نصب العین کے حاصل کرنے میں اس جوش کا

۶ پتہ نہ دے گا ؟

آیئے فانی کے کچھ شعر پڑھ کر فانی کو یاد کریں ۔

سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہوگیا

آخر کوئی امید اثر بھی دُعا کے بعد ! — کچھ آپ بھی کہیں گے مری التجا کے بعد ؟

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہونچی تری جوانی تک

رُوحِ اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے — تو پشیماں نہ ہوا پنی جفا یاد نہ کر

اک فسانہ سُن گئے اک کہہ گئے — میں جو رویا مُسکرا کر رہ گئے

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہوگئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہوگئے

نکل ہی جائیں گے نالے دہن سے خوں ہوکر — زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زبانِ صیّاد

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا — مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

لبریز تھو زح تھا اِک اِک خط پیمانہ — محفل سے جو وہ اُٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

محوِ تماشا ہوں میں یارب یا مدہوش تماشا ہوں — اُس نے کب کا پھیر لیا منہ اب کس کا منہ تکتا ہوں

غمِ عشق اور غمِ روزگار دونوں نے فانی کو وہ کچھ بنایا جو باقیاتِ فانی یا عرفانیاتِ فانی میں وہ نظر آتے ہیں ۔ ان کی شاعری اور زندگی میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہے جو تجربے کی شاعرانہ صداقت کہی جاسکتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ فانی میں میر اور غالب کا امتزاج ہے ۔ فانی میر اور غالب میں کسی سے قریب ہوں یا نہ ہوں اپنی ذات سے بہت قریب تھے ۔ اور اسی کی ترجمانی نے اُن کی شاعری میں اثر پیدا کردیا ہے ۔

فانی کا ایک شعر اور یاد آتا ہے ۔

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز — میں ہی تھا ایک دُکھ بھری آواز

فانی کی انفرادیت پسندی اور غزل کی انفرادیت پسندی دونوں کی منزل ختم ہے اور نئے سر سے پردۂ ساز چھیڑنے کا وقت آگیا ہے ۔ شاید کوئی نیا نغمہ نکلے ۔ کوئی نیا گیت سُنائی دے ۔ جو اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ زندگی کے معمّہ کو حل کرنے میں مدد دے ۔

(باقی مضمون صفحہ ۸)

وہ قدیم تھے ، اُن کی ہر ادا قدیم تھی ، انسان تھے ، ان میں کمزوریاں بھی تھیں ، مگر بنیادی اختلافات کے باوجود وہ نئے لوگوں کو سراہنے میں تنگدل نہ تھے ۔ میں انھیں اور وہ مجھے ۱۸ برس سے جانتے تھے ۔ اُن کے سامنے میں نے سب سے پہلی غزل مشاعرہ میں پڑھی ۔ کوئی پندرہ برس کے بعد (۳۸-۱۹۳۹ء) میں دہلی میں ملے اُن کی کسی بات میں کمی نہ تھی ، وہی ۱۹۱۹ء کے آزاد تھے ۔

جوش سے اُن کے گہرے دوستانہ روابط تھے ، بوڑھے آزاد کی معیت انھیں جوانوں سے زیادہ پسند تھی ۔ میرا خیال ہے جوش نرم دل انسان نہیں ، مگر مجھے یقین ہے کہ جس طرح وہ اقبال کے لئے روئے ، آزاد کے حصّے کے آنسو بھی ضبط نہ کرسکے ہونگے ۔

سیماب صاحب نے ان کی موت پر خوب تاریخ نکالی ہے ؎

بارِ غم سے ہوئے آزاد آزاد

۶۰ ھ ۱۳

زندگی بارِ غم نہیں تو اور ہے بھی کیا ۔ بہرحال آزاد نے قیدِ غم سے ۱۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو حیدرآباد دکن میں نجات پائی ، شاعری کی دنیا میں انکا کتنا ہی رسمی ماتم ہو ۔ مگر اُن کے دوستوں کو ان کی موت سے جو کاری زخم پہونچا وہ جلد نہیں بھرے گا ۔

ساغر

عظیم بیگ چغتائی

۲۰ راگست ۱۹۴۱ء کو عظیم بیگ چغتائی کی نا وقت موت، ایک مدت سے حیات و مرگ میں کشمکش، لاتعداد تصانیف، مزاح، اپنی تصانیف میں اپنے ذاتی غم کا اظہار نہ ہونے دینا۔ یہ سب ایک تشبیہ کی طرف ذہن کو منتقل کرتے ہیں۔ کسی شخص کے مکان میں آگ لگ گئی ہو اور وہ اپنے سامان کے بچانے کی جدوجہد کر رہا ہو۔ ایسی حالت میں کچھ سامان بچ جائیں گے، باہر وہ بکھرے ہوئے پڑے ہوں گے، اُن میں کوئی خاص ترتیب نہ ہوگی۔ چغتائی کا ذہن کہانیوں کے معاملے میں بیحد زرخیز تھا۔ وہ نہ جانے کتنی کہانیاں کہہ سکتے تھے۔ کہنا چاہتے تھے لیکن ادھر تھوڑے دنوں سے کہنے کی سکت بھی باقی نہ رہی تھی۔ انھیں کچھ نہ کچھ کہہ جانا تھا اس لئے زبان و محاورہ میں وہ تراش خراش نہ پیدا ہو سکی۔ جو ادب کے لئے ضروری ہے۔ کہانیوں کے پلاٹ اس طرح گٹھے ہوئے نہیں ہیں۔ اوّل درجہ کی کہانیوں میں جس کا ہونا ضروری ہے۔ موت سے مستقل مقابلہ کرتے ہوئے یہ سب کچھ چھوڑ جانا بھی بڑی باہمت روح کا پتہ دیتا ہے۔

عظیم بیگ کے یہاں علیگڑھ کی تعلیم اور مسلمانوں کے متوسط طبقے کے تمدّن کو اُن کے درمیان میں رہ کر دیکھنے کی وجہ سے ایک ایسی بصیرت پیدا ہوگئی تھی جو ہر حساس ادیب کے یہاں پیدا ہونا ضروری ہے۔ چغتائی نے جرأت کرکے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کوئی اور نہ کہہ سکتا تھا۔

یہ کہنے کیلئے کہ اسلامی تہذیب کی ہندوستانی روایتوں اور شرع کی من مانی تفسیر اور ترجمانی نے متوسط طبقے کے مسلمانوں کی خاندانی زندگی میں بہت سی ہولناک اور گھناؤنی صورتیں پیدا کر دی ہیں، چغتائی نے مزاحیہ افسانوں اور قصّوں کا پیرایہ اختیار کیا۔ "شریر بیوی" سے لیکر اپنی آخری کہانیوں تک ایک عظیم الشان مقصد اپنے سامنے رکھا۔ متوسط طبقے کے اخلاق میں رسم و رواج اور قدامت پسندی نے وہ جگہ حاصل کر لی تھی جو اصل مقاصد کو حاصل ہوتی ہے۔ چغتائی نے بڑی بے رحمی سے اُن کا پول کھولا۔ نکاح اور طلاق پردہ، رہنے سہنے کا معیار، خلع اور تفویض، جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی کا اُبھار، سچّی مسرت اور صحیح نشاط کی تلاش، پھر زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات جن کی تہ میں خوشی اور غم دونوں ہیں، انھیں سے اُن کی کہانیاں بھری پڑی ہیں۔ چغتائی نے عورتوں کے مسائل کو سمجھنے کی کافی کوشش کی تھی اور اس جنسی ہیجان کو جو متوسط طبقے کی لڑکیاں اپنی شرافت کے غرور میں ظاہر نہیں کر سکتیں بھیس بدل بدل کر چھوٹے چھوٹے ارادوں اور معمولی معمولی حرکتوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

چغتائی کا کام صرف ہنسنا ہنسانا نہ تھا، پلاٹ وہ ضرور ایسے بناتے تھے جو مزاح کا پہلو پیدا کریں، لیکن وہ کبھی اپنے مقصد کی تبلیغ سے غافل نہ رہے۔ بہت سی کہانیوں میں اسی وجہ سے مقصد بہت نمایاں ہوگیا ہے۔ یہی نہیں اُنھیں "قرآن اور پردہ"، "رقص و سرود" جیسی سنجیدہ کتابیں لکھ کر بھی اپنے خیال کو ظاہر کرنا پڑا۔ چغتائی نے عام طور پر مختصر افسانے لکھے لیکن انھیں بعد میں مربوط کر لیا۔ چنانچہ "شریر بیوی" خانم، کولتار، وغیرہ ایسی ہی کتابیں ہیں جن کو الگ الگ کہانیوں کی شکل میں لکھ کر چغتائی نے کتابیں بنا لیں۔ انھوں نے بعض ناول بھی لکھے اور کبھی سنجیدہ افسانوں اور ٹریجڈی کی بھی کوشش کی لیکن اُن کی اُفتادِ طبع حرکت تیزی اور تیز رفتاری چاہتی تھی۔ بیماری نے خود جو کمزوری پیدا کر دی تھی اس کی کمی اُن کی کہانی کے کرداروں میں پیدا ہوتی تھی۔ سب زندہ دوڑنے اور بھاگنے والے، لڑنے جھگڑنے والے اور کسی طرح شکست نہ ماننے والے چغتائی کے کردار ہار جانیکے بعد بھی اپنی ہار نہیں ملتے۔

چغتائی جودھپور میں وکالت کرتے تھے۔ وہاں کی سرزمین سے واقف تھے۔ راجپوتانہ میں رومانوں کی کیا کمی ہے۔ چغتائی نے اُن میں سے کچھ پیش کئے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں "شریر بیوی"، کی کہانیوں سے شروع کرکے تقریباً بارہ سال میں چغتائی نے تصانیف کا انبار لگا دیا۔ اُن کے موضوعات کی وسعت اور ہمہ گیری اور ان کی تیز نگاری نے لوگوں کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ رکھا۔ زبان کی وسعت اور لغات کے مسئلہ پر بھی اُن کی خاص رائے تھی۔ ابھی گذشتہ

سال وہ عندلیب شادانی سے غزل گوئی اور خاص طور سے فانی کی غزل گوئی کے معاملے میں الجھ پڑے تھے۔ کون جانتا تھا کہ فانی اور ان کے ہمدرد دونوں کو ایک ہی مہینے میں اور ایک ہی ہفتے کے وقفے سے یہ دنیا چھوڑ دینی پڑے گی۔ یورپ میں موت کی گرم بازاری نے موت کا خوف اور اس کا احساس ضرور سبک اور ارزاں کر دیا ہے لیکن پھر بھی ہندوستان کے ان دو ادیبوں کی موت نے اُردو زبان اور ادب کو افسردہ کر دیا ہے۔

چغتائی کی عمر طبعی طور پر مرنے کی نہ تھی لیکن ناموافق حالات نے انھیں جینے نہ دیا۔ اس کے باوجود انھوں نے ہندوستانی ادب میں اپنے لئے ایک باوقار جگہ بنالی ہے۔ اُردو کے تخلیقی ادب میں جو اضافہ چغتائی کے قلم نے کیا ہے وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ انھوں نے بہت لکھا اس لئے اچھی اور بری ہر طرح کی چیزیں اُن کے دماغ اور قلم سے نکلیں۔ الگ الگ دیکھنے سے اُن کی کہانیوں میں بہت گہرائی، بہت وسعت نظر اور بہت جدت نہیں معلوم ہوتی لیکن ان کا مجموعی اثر بڑا گہرا ہے۔

ان کی بعض کتابوں اور بعض افسانوں کے ترجمے ہندوستان کی صوبجاتی زبانوں میں ہوئے اور چغتائی صرف اُردو کے مصنف نہ رہے تھے بلکہ دوسری زبانوں کے پڑھنے والے بھی اُن سے واقف تھے۔ یقیناً اُن کی موت سے ہندوستانی ادب کو نقصان پہونچا۔ چغتائی کی ذکاوت اور اُن کے تصورات نے جو دنیا بنائی تھی اس کا جاننے والا اُردو مزاح نگاروں میں تو اب تک کوئی دکھائی نہیں دیتا یہ کمی کون پوری کرے گا!

احتشام حسین

حکیم آزاد انصاری

۸

قدیم روایات اور شعر و ادب کی وہ شمع بجھ گئی جس کی روشنی میں ہم مثالی دوستی کی روح ابھرتی دیکھتے تھے، پرانوں کی زندگی سے سبق لیتے تھے۔ اور قدیم آب و رنگ، طرز و اسلوب، شعور و وجدان اور مٹ جانیوالی دنیا کبھی کبھی اپنی جھلک دکھا جاتی تھی۔

فانی کے بعد آزاد کی موت اردو شاعری کیلئے قدامت کی موت ہے، ادبی تعلقات اک طرف، ہماری ذاتی محبتوں کے رشتے اتنے قوی تھے کہ اُن کی صبر آزما ابدی جدائی کو "حادثہ" سے تعبیر کرنا۔ اظہار غم کی بے مائگی ہے۔

زندگی میں ہم ایک دوسرے سے دور تھے، لیکن پھر بھی قریب تھے۔ مرنے کے بعد ایک مجہول ابدیت تاریک و عریض دیوار بن کر آکھڑی ہوئی۔ کل مرنیوالوں کے ماتم بھی دم توڑ دینگے۔ پانے اور کھونے کا یہ لامتناہی سلسلہ، مسکراہٹوں اور آنسوؤں کا یہ نہ ختم ہونیوالا دور نہ جانے کب شروع ہوا، اور نہ جانے کب تک جاری رہیگا۔!؟

آزاد کیا تھے کیا نہ تھے، !؟ مگر قدامت کی ہنستی ہوئی یادگار تھے۔ انھیں شعر و ادب کی نئی کسوٹی پر کسنا زیادتی ہے۔ وہ ایک وضعدار، زندہ دل اور بلند اخلاق انسان تھے، قدیم علمی و ادبی روایتوں کا نشان تھے۔ بہ حیثیت استاد شعر چند در چند خصوصیات کے مالک تھے اور غزل میں ایک مخصوص رنگ کے موجد تھے، کلام کی اصلی ترتیب (۲) زبان کی سلاست و صفائی (۳) ندرت بیان (۴) خوبصورت الفاظ کی تکرار (۵) صنعت ترصیع و تقابل (۶) صنعت ترصیع جدید کی ایجاد، ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔

ان کی زندگی ہی میں "معارف جمیل" کے نام سے اُن کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا تھا، یہ اُن کے تمام تر شاعرانہ محاسن اور مجددانہ تقاضوں سے روشناس کرا دیتا ہے،

آزاد بڑے دلچسپ اور بلند انسان تھے، دوست کی حیثیت میں اور بھی بلند، میں کبھی اس (مئی ۱۹۴۱ء) رابطی ہوئی شام کو نہیں بھول سکتا۔ جب جوش دہلی سے رخصت ہو رہے تھے، آزاد کے مکان پر جوش و مخمور لکھنوی بیٹھے تھے، زندگی اور اس کی ہر تلخی سے بالکل محفوظ، ——— اور اس کے بعد وہ جوش و آزاد کی جھڑپ!؟

پھر دہلی سے رخصت ہونے کے کچھ گھنٹے قبل آزاد اور جوش کی آخری صلح و صفائی ——— !؟ کل کی بات ہے، مگر آزاد کی موت نے اسکے آنسوؤں اور اخلاص کو اک دردناک تاریخ بنا دیا ہے۔

(باقی صفحہ ۴ پر)

نئی صبح

ایشیا

پہلا باب

ادبیات وسیاسیات

بابتہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء

نئے ادبی رجحانات[1]

احتشام حسین

افراد کی زندگی میں وہ لمحے آتے ہیں جب اصل شاہراہ اور مرکز سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کر لینا اُن کے لئے بالکل ضروری ہو جاتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی ؂

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

خاندانوں کی حالت دو تین پشتوں کے بعد بدل جاتی ہے، زندگی کے نئے نظامِ عمل میں، حیاتِ اجتماعی کے نئے فلسفہ پر گامزن ہونے کے بعد یقین ہے کہ ایسا ہو گا لیکن اب تک تو یہی رہا ہے کہ انیسؔ کو یہ کہنا پڑا ؂

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دو پہر دیکھا

قوموں کی تاریخ ایسے ناگزیر موڑ پر آجاتی ہے جہاں سے اس میں زندگی کی نئی قدریں پیدا ہوتی ہیں اور پرانی روایات کا جنازہ نکلتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو دُنیا کی تاریخ اتنی رنگین اور دلکش نہ ہوتی۔ ایک تصورِ حیات، تخیل کا ایک انداز، ذکر و فکر کا ایک طریقہ کچھ دنوں تک نیا رہنے کے بعد پُرانا ہو جاتا ہے اور نئی چیزیں زندگی کی مادّی کشمکش سے پیدا ہو کر انسانوں میں نئے تخئیل، نئے اندازِ فکر اور نئے زاویۂ نظر کی بُنیاد ڈالتی ہیں۔ ویسے تو یہ لمحے ہر وقت آیا کرتے ہیں جن کے بطن میں تغیرات اور تبدیلیوں کی بہت سی نسلیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ لیکن جب تبدیلی کا تقاضا شدید ہوتا ہے، جب کوئی نظام اپنے بڑھنے اور پھیلنے کی طاقت کھو دیتا ہے اور نئے پیدا ہونے والے اجزا کو سنبھال نہیں سکتا اس وقت انقلاب آتے ہیں جن کی رو میں انسانیت اپنے پورے تمدّنی آثار کے ساتھ کروٹ لیتی ہے

ادب اور موسیقی، رقص اور مصوری، تعمیر اور نقّاشی کے تصوّرات بدلتے ہیں بعض چیزوں میں یہ تبدیلیاں بہت واضح، بہت روشن اور بہت گہری ہوتی ہیں جو نظر آجاتی ہیں لیکن فنون لطیفہ کے بعض اقسام میں وہ اس طرح صورت اور معنی مادّہ اور خیال کو ساتھ لیکر پیدا ہوتی ہیں کہ صرف تاریخ کی پیچ در پیچ رفتار کے جاننے والے اور حیات کے تضادی ارتقا کو پوری طرح سے سمجھنے والے ہی ان تغیرات کی تحلیل اور اُن تبدیلیوں کا تجزیہ کر کے یہ بتا سکتے ہیں کہ تمدّن اور 11
تاریخ کی اس خاص منزل پر یہی ہونا ممکن تھا۔ ادبیات کے نقاد کے لئے سب سے بڑی چیز یہی ہے کہ وہ ادب میں صورت اور معنی کی ہم آہنگی، مادّہ اور خیال کے حسین امتزاج، اثر اور کیف کے بے پناہ جادو کے باوجود بھی اُن اصولوں کو تلاش کرے جنہوں نے تغیرات کی تشکیل کی ہے۔ ان تبدیلیوں کی رفتار خطِ مستقیم کی طرح سیدھی نہیں ہے بلکہ مادّی وجود کے پیہم تصادمات سے چیزیں نئی طرح صورت پذیر ہوتی ہیں اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن ان تمام باتوں میں اس عمل اور ردّ عمل میں یہ یاد رکھنا بیحد ضروری ہے کہ تمام تغیّرات مادّی ہوتے ہیں اور وہی تخیل پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لئے اگر ہم ادب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہیں تو سماجی نظام کی مادّی تبدیلیوں پر غور کئے بغیر ہم ایک فلسفۂ عینیت کے ماننے والے کی طرح صرف سطحی، مبہم اور نامعلوم جذبات کی رہنمائی میں آگے

---

[1] مشیرانِ بزمِ ادب کے جلسہ میں ۶ راپریل ۱۹۴۱ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں پڑھا گیا۔ عجلت میں لکھا گیا ہے اس لئے اسکے نامکمل ہونے کا احساس ہے اور نئے ادب کی اس ادھوری ترجمانی کا ذمہ دار تنہا میں ہوں نیا ادب نہیں۔ احتشام

بڑھیں گے۔ یہ تو ہم اس وقت بھی مان لیں گے کہ تغیرات ضروری ہیں لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے اس پر غور نہ کرینگے۔ یہ نیا نقطۂ نظر جس کا تذکرہ میں نے کیا ہے تبدیلیوں کے فلسفہ کو بھی واضح کرتا ہے، "کیوں" کا جواب بھی دیتا ہے اور ہمارے خارجی اور داخلی تصورات میں یکسانیت اور ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ زندگی اپنے ہر شعبہ میں ایک مخصوص نظام کے ماتحت بڑھتی اور پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور خیال و عمل کے درمیان کوئی ایسی خلیج حائل نہیں رہ جاتی کہ دونوں کا سمجھنا اور سمجھانا ناممکن ہو جائے۔ مادی وسائل کی مقدار اور خصوصیتیں تخیل کا ڈھانچہ بناتی ہیں اور فن کار انہیں کی عکاسی کرکے زندگی کی قدروں کی تخلیق اپنے طور پر کرتا ہے۔ یقیناً کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان تبدیلیوں میں کوئی ریاضیاتی تناسب نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ رفتار بہت تیز یا بہت آہستہ ہو جاتی ہے اور کبھی اچانک جست کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

تبدیلی کا یہ فلسفہ ادبیات کے تغیر پر بھی حاوی ہے دُنیا کے دوسرے ملکوں کے ادبیات کے مقابلہ میں اُردو ادب کی عمر یقیناً زیادہ نہیں ہے لیکن یہ زمانہ بھی کچھ ایسا کم نہیں رہا ہے کہ ہمیں ادب میں مختلف ادوار بنانے میں زیادہ
12 دقت پیش آئے۔ رجحانات اور میلانات جن تاریخی اور مادی حقیقتوں سے بنتے ہیں ان کی کمی ہندوستان میں نہیں رہی۔ اُردو ادب نے مغلوں کے زوال کے زمانہ میں ہاتھ پاؤں نکالے، اودھ کا عروج و زوال دونوں اپنی آنکھوں سے دیکھا، دکنی سلطنتیں اسی کی نگاہ کے سامنے مٹیں، ایسٹ انڈیا کمپنی کا استحصال، انگریزی حکومت کے قیام و بقا کی کوششیں سب اسکے دیکھتے دیکھتے ہوئیں اور پھر ۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعہ نے تو ہندوستان کو تاریخ عالم میں ایک ایسی جگہ دیدی جہاں سے کوئی ملک بھی تبدیلیوں اور اہم تغیرات کی زد میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ سب اُردو ادب نے دیکھا۔

غدر کا تذکرہ آگیا ہے تو اس سلسلہ میں ایک "سخن گسترانہ" بات کہہ دینے کو جی چاہتا ہے اور اس بات کا تعلق موضوع سے ہے بھی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی نے "تاریخ ہند کے ازمنۂ وسطیٰ میں معاشرتی اور اقتصادی حالات پر تقریر کرتے ہوئے عہدِ جدید کو ازمنۂ وسطیٰ سے جدا کرنے کی کوشش میں یہ کہا ہے کہ "زمانۂ جدید عہدِ مغلیہ اور عہدِ انگلشیہ ہر دو پر مشتمل ہوگا، جن کے درمیانی وقفے میں کوئی نیا انقلاب اچانک ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ بتدریج تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے"۱؎ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کہتے وقت موصوف کے پیش نظر تبدیلی اور انقلاب کا وہ تصور تھا جس کی جڑیں معاشی اور اقتصادی نظام میں دور تک نہیں پھیلتیں بلکہ بادشاہوں کے خاندان بدل جانے اور اچانک بدل جانے کا نام انقلاب ہے ورنہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے ہندوستان کے تمدنی عروج و زوال میں بالکل نئی خصوصیتیں پیدا ہوتی رہیں جنہوں نے آج کے ہندوستانی دماغ کی تعمیر کی ہے۔ علامہ موصوف نے غدر کی اہمیت کا تذکرہ اپنی ایک دوسری کتاب۲؎ میں بہت تفصیل سے کیا ہے۔ "ایک پورا باب اسکے لئے وقف کردیا ہے۔" "انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن" میں انہوں نے غدر کو نئے تصورات کا پیش خیمہ قرار دیتے ہوئے اس کی عمرانیاتی اہمیت کو بہت واضح طریقہ پر پیش کیا ہے لیکن ان کا انقلاب اور تغیر کا وہ تصور صحیح نہیں کہا جاسکتا جو انہوں نے اپنی اوّل الذکر تصنیف میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر فراق گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون میں ہندوستان کے دور بیداری کا تذکرہ کرتے ہوئے غدر کو نئے تصورات، نئے رجحانات، نئی زندگی اور نئے میلانات کا ہراول قرار دیا ہے اور صحیح تاریخی نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھ کر یہ الفاظ کہے ہیں "بدیشی حکومت قائم ہونے کا قدرتی نتیجہ ۱۸۵۷ء کا غدر تھا جو ہندوستانی تاریخ کے تضادی ارتقا میں ایک ناگزیر منزل تھا۔ اس کا انجام صرف تخریبی نتائج اور نفی پر مشتمل نہ تھا"۲؎ جبتک غدر کو اس طرح نہ دیکھا جائیگا اس وقت تک جدید ہندوستان کی تحریکات کا پورا تجزیہ نہ ہو سکے گا۔ پھر غدر ایک دن کی بات نہ تھی پوری اٹھارویں صدی اور آدھی اُنیسویں صدی کے انحطاطی دور کی کشمکش اور باہر سے آنیوالی نئی طاقتوں سے معرکہ آرا ہونے کی آخری مسلح جدوجہد کے نتیجہ کے طور پر یہ انقلاب ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس معرکہ میں بہت سی روایتوں نے دم توڑ دیا اور بہت سی نئی چیزوں نے جنم لیا۔ کشمکش کا یہ دور پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ ایک دفعہ اُبال آیا تھا پھر کچھ دنوں کے لئے خاموشی اور مجہولیت نے اصلاح پسندی کے حربے ہاتھ میں دے دئے لیکن ہندوستان

۱؎ تاریخ ہند کے ازمنۂ وسطیٰ میں معاشرتی اور اقتصادی حالات - مطبوعہ ہندوستانی اکاڈیمی ۱۹۲۹ء صفحہ ۲۸

۲؎ ہندوستان کا دور بیداری - فراق گورکھپوری - "زمانہ" جون ۱۹۲۹ء

اصلاح نہیں بلکہ تبدیلی چاہتا ہے اس لئے کشمکش اب تک جاری ہے۔ غدر کے انقلابات نے متوسط طبقہ والوں، جاگیر سے ہاتھ دھونے والے جاگیرداروں ان کے بہی خواہوں اور بیکار ہو جانے والے صناعوں کو بھی آسودہ اور مطمئن نہیں کیا اور طاقت نئے پیدا ہونے والے زمینداروں، جاگیرداروں اور اُبھرتے ہوئے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں پہنچ گئی جن کے لئے نئی روایتوں کی ضرورت تھی اگر یہ سب کچھ ہمیں اپنے ادب میں نہیں ملتا تو یا ہمارا تاریخ کا تجزیہ غلط ہے یا ادبی قدروں کی تحلیل صحیح بنیادوں پر نہیں ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے معمولی نظر ڈالنے پر بھی ادب اُردو اس دور کی خصوصیات، بے چینیوں، اصلاح پسندیوں اور جدید رجحانات کا پتہ دے دیتا ہے۔ سلطنت اور دربار داری کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا وظائف پر زندگی بسر کرنا آسان نہ تھا، قصائد لکھ کر خلعت اور گاؤں مل سکتے تھے اس لئے حالی، آزاد، نذیر احمد، سرسید سب نئی حقیقتوں سے دوچار ہوئے انہوں نے زندگی بسر کرنے کے دوسرے راستے نئے نظام میں تلاش کئے پرانے ادب سے بیزاری کا اظہار کیا اور نئے تصورات کا خیرمقدم۔ حالی مقدمۂ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں:۔

"دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے آج کل دنیا کا حال اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی ہیں اور نئی قومیں اُن کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے رہ جائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ . . .

. . . . ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہو سکتا ہے۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانہ میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا . . . .

. . . .

. . . . . عیش و عشرت کی رات گذر گئی اور صبح نمودار ہوئی اب کالنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔"[1]

دیکھئے اس میں ڈارون کی بہم کی ہوئی معلومات کا کتنا اثر ہے اور دور جدید کی تبدیلیوں کا کتنا شدید احساس! آزاد لکھتے ہیں:۔

"ملک ہمارا عنقریب آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا جا رہا ہے، نئے نئے علوم ہیں، نئے فنون ہیں، سب کے حال نئے ہیں، دل کے خیال نئے ہیں، عمارتیں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں۔ رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں۔ اس طلسمات کو دیکھ کر عقل حیران ہے مگر اسی عالم حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب کی سواری شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانہ کو جھاڑ بہار رہا ہے اور جس حال میں ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے۔"[2]

ڈاکٹر نذیر احمد پرانے ادبی سرمایہ پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میری مثال اس زمانہ کے شاعر کی سی ہے کہ بیچارہ کوئی مضمون سوچ رہا تھا، جس طرف ذہن کو دوڑاتا ہے دیکھتا ہے کہ وصل و ہجر اور انتظار اور واسوخت اور سراپا اور بہار اور خزاں اور استخفاف مذہب اور بزرگانِ دین کے ساتھ استہزاء وغیرہ وغیرہ کوئی خیال نہیں جس میں
over and over again
سیکڑوں ہزاروں نے طبع آزمائی نہیں کی ناچار ہار تھک کر بندر پر قناعت کرتا ہے وہ بھی ہر ایک کو نصیب نہیں۔"[3]

سرسید ان سب کے سرگروہ تھے۔ ان کی بات بھی سن لیجئے:۔

"زمانہ اور زمانہ کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج

---

[1] مقدمۂ شعر و شاعری۔ حالی۔ انوار المطابع لکھنؤ ص ۱۴۰

[2] نیرنگ خیال حصہ اول آزاد ص ۳

[3] لکچر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۸ء محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس لاہور

سب تبدیل ہوگئے ہیں ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرزِ بیان اور ان کے الفاظ مشتملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہنچانا ذرا بھی تسلیم نہیں کرتے بلکہ برخلاف اسکے دھوکہ میں ڈالنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو لون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلاف واقعہ الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا .... یہ تمام باتیں حال کے زمانہ اور حال کے زمانہ کی طبیعت کے مناسب نہیں ہیں۔[1]

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی کبھی اتفاق بھی انسانی زندگی میں تغیرات کا سبب بنتا ہے لیکن یہ محض اتفاق نہ تھا کہ اُنیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصہ میں ہر ایسے ادیب کی زبان پر جسے زندگی کی کشمکش سے دو چار ہونا پڑا تھا یہی بات آئی۔ اسی دور میں امیر اور داغ بھی تھے جن کا تعلق لکھنؤ، رامپور اور حیدرآباد دکن کے درباروں سے تھا اور انہوں نے اُنہیں قدروں کو عزیز رکھا جو اُن کے
درباری پیشروؤں کو عزیز تھیں۔ اُن کے یہاں تبدیلی کی خواہش نہیں معلوم ہوتی ۱۴
اندازِ شاعری میں جو فرق اگلے شعراء کے مقابلہ میں اُن کے یہاں پایا جاتا ہے وہ دورِ انحطاط کی دوسری نشانیوں کا پتہ دیتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی نقاد ان چیزوں کو نظر انداز کر جائے لیکن رجحانات کا تجزیہ کرنے والا اُن معاشی اور معاشرتی حالات پر ضرور نظر ڈالے گا جنہوں نے کہیں نئے تصورات پیدا کئے اور کہیں پرانے ہی تصورات کو برقرار رکھنے میں مدد دی۔

غدر کی وجہ سے ہندوستانی سماج میں جو اہم واقعات رونما ہوئے تھے اُن کے تفصیلی بیان کا موقع نہیں لیکن کچھ چیزیں تو ظاہر ہیں نئے سیاسی نظام نے نئے سماجی تصورات پیدا کر دئے، علم و تعلیم کا معیار بدلا، درس و تدریس کے طریقے بدلے، طرزِ معاشرت میں تبدیلی ہوئی، نئے آداب و قوانین آئے، پیشے اور پیشہ ور وہ نہ رہے، جاگیرداری نظامِ حکومت کے بل پر قائم رہا۔ صنعت و حرفت کی ترقی کچھ رُکی رُکی سی رہی۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت نکلی، ہندو تعلیم کی دوڑ میں آگے نکل گئے، نئے نظامِ حکومت میں بہت سی جگہوں پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ مسلمان چونکے تو انہیں دُنیا اندھیری دکھائی دی غدر نے اُنکو زیادہ مجرم ٹھہرایا تھا اس لئے انہیں اپنی حالت سنبھالنے کا ہوش ہوا۔ حالی، سر سید، نذیر احمد، آزاد سب گذشتہ عظمت کی واپسی پر غور کرنے لگے لیکن جس نظام نے انہیں جکڑ لیا تھا اس سے چھٹکارا حاصل کرنا اُن کے بس میں نہ تھا، مادی طور پر وہ شکست کھا گئے تھے، اجتماعی احساس کی کمی تھی اس لئے انہوں نے انفرادی ترقیوں کو صحیح ترقی سمجھ کر نئے نظام کی مخالفت نہیں کی اور اصلاح پسندی میں انہوں نے زندگی کے حقائق سے مقابلہ کی تاب نہیں پیدا کی بلکہ اسی محدود دائرہ میں اپنی حالت سنبھالنے کی دعوت دی، ہر شخص نے اُمید کو اپنا ہتھیار بنا لیا اور اپنے پیروں پر پھر اُٹھ کھڑے ہونے کی تعلیم دی۔ چونکہ تغیر سے ملک کو آگاہ بھی کرنا چاہتے تھے اس لئے ایک طرح کی حقیقت نگاری کی بُنیاد پڑی۔ نیچرل شاعری، سیدھی سادی زبان، پُر جوش اصلاحی تنقیدوں کا دور شروع ہوا۔ مذہب اور سائنس نے قدم قدم پر ایک دوسرے کو آنکھیں دکھائیں اور نئے قسم کے علم کلام اور نئی طرح کی تعقل پسندی کا رواج ہوا۔ ان لوگوں نے کشمکش میں حصہ لیا تھا۔ دین و دُنیا دونوں کو سامنے رکھ کر ترقی کی تھی اس لئے انہیں دین اور دُنیا دونوں عزیز تھے۔ اس وقت کے نظم و نثر کے تمام مجموعوں کا ماحصل یہی ہے کہ اپنی حالت سنبھالو، اخلاق درست کرو، کسی کے لہجہ میں ذرا زیادہ گرمی تھی، کوئی دبی ہوئی زبان سے کہتا تھا، لیکن یہی آواز تھی جو مختلف سازوں سے نکل رہی تھی۔ شرر، سرشار، اکبر ذرا پیچھے آئے لیکن اُن کے یہاں بھی انہیں تصورات کی صدائے بازگشت سُنائی دیتی ہے ایک طرح کی مجہولیت، انفعالیت اور انفرادی طور پر زندگی اور اخلاق کی درستگی کا سبق۔

آہستہ آہستہ اس میں بھی تبدیلی ہوئی۔ سیاسی نظام بدلتا چلا جاتا تھا سماجی نظام بھی بدلتا رہا۔ ایک طرف تو غدر کے بعد ہی سے وطن کے پوری طرح ہاتھ سے نکل جانے کی چوٹ کھا کر حب الوطنی کا ایک دُھندلا سا تصور پیدا ہو چکا تھا۔ دوسری جانب جب کونسلوں اور اسمبلیوں میں کھڑے ہو کر کچھ کہنے کا موقع ملا تو ایک معمولی اور محدود پیمانے پر متوسط طبقہ کے پڑھے لکھے لوگوں نے جماعتی ترقی کا خواب بھی دیکھنا شروع کیا۔ سیاسی جماعتیں بننے لگیں جنہوں نے اپنے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ ہندوستان کی تعلیمی اوسط چھ سات فی صدی سے زیادہ نہ تھی، وہی متوسط طبقہ بناتے تھے۔ انہیں میں سے کچھ لوگ اعلیٰ طبقہ

[1] تہذیب الاخلاق جلد ۳ صـ ۱۷۴

کے ساتھی تھے اور کچھ حکومت کے سنبھالنے والے اس لئے ان کے خیالات، محسوسات سب متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے مفاد ہی سے بنتے تھے۔ چکبست اور اقبال نے بھی اس کے باہر نہیں سوچا۔ چکبست نے تو کھل کر متوسط طبقہ کے جذبات کی ترجمانی کی لیکن اقبال نے مزدوروں اور غریبوں کو اُٹھنے اور جاگنے کی تلقین کرتے ہوئے بھی اپنے فلسفۂ خودی سے ہمیشہ سماج کی بنیادی حقیقتوں کو پردہ میں چھپا دیا جسمیں اجتماعی احساس ایک ثانوی چیز معلوم ہوتا ہے۔ ایک طبقاتی مفاد کا جادو ایسا ہے کہ وہی مہاجن جو رقت قلب کی وجہ سے چیونٹیوں کو خوراک بہم پہنچاتا ہوا چلتا ہے، سود دینے والے غریب پر ذرا بھی رحم کھانے پر راضی نہیں دکھائی دیتا۔ وہی امیر جس کے دروازے سے فقیروں کو روزانہ بھیک ملتی ہو اُسے افلاس کو جڑ سے مٹا دینے پر تیار نہیں کیا جاسکتا اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادیب اور فن کار کو بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر یا تو اپنے طبقہ کے مفاد کا ساتھ دینا پڑتا ہے یا باغی بن کر اپنے طبقہ سے الگ ہو جانا پڑتا ہے۔ اور وہ جو بے دلی سے کسی تحریک کا ساتھ دیتے ہیں یا کسی تبدیلی کے بارے میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتے۔ وہ کھل کر یا پوشیدہ دوسری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی نظام کو برقرار رکھنے کے حامی ہیں۔ ایک بات اس طرح ضرور نمایاں ہو جاتی ہے کہ ادب کو صرف تفریح اور دلچسپی کی چیز ماننے والوں کو بھی وقت کے تقاضے کے سامنے سر جھکا دینا پڑتا ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ادب کو تفریح سے آگے بھی قدم بڑھانا پڑتا ہے ....

ان باتوں کا دار مدار بہت سی خود پرستیوں اور نامعلوم خواہش پرستیوں پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ادب کے اندر بہت سے ادیب ایسے دکھائی دیتے ہیں جو سوچ سمجھ کر نئے ادبی رجحانات کو اپنے یہاں جگہ دے رہے ہیں لیکن ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو رسمی طور پر چند سطحی لفظوں کے استعمال پر خوش ہیں۔

غدر کے قریب جدید ادب کی بنیاد میں انگریزی ادب سے استفادہ اور نقالی کا بھی ہاتھ تھا۔ اب وہ بات نہیں رہی ہے۔ ہمارے سامنے خود نئی حقیقتیں، نئے مسائل، نئے دکھ درد، نئی خواہشات، نئی اُمنگیں، نئی پابندیاں اور نئے ادراک ادبی تجربوں کی حیثیت سے موجود ہیں اور اب ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں وہ بصیرت موجود ہے جو تخلیق کے لئے ضروری ہے چاہے وہ آرٹ یا سائنس کے کسی شعبہ میں ہو۔

ہندوستانی سیاسیات میں آزادی کا جو مبہم مفہوم سنہ ۱۹۳۰ء تک رہا اسکی جھلک ہمیں منشی پریم چند کے افسانوں اور ناولوں میں، ٹیگور کی نظموں اور کہانیوں میں، سروجنی نائیڈو کے گیتوں میں اور گاندھی جی کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہے لیکن سنہ ۱۹۳۰ء سے ہندوستان کی سیاست کا رخ بدلا، معاشی نظام میں تبدیلی کا احساس پیدا ہوا اور صرف آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد پر قناعت کرنا غلط تاریخی نظریہ معلوم ہوا کیونکہ جو ملک آزاد ہیں، جمہوریت پسندی کے مدعی ہیں۔ ان کے یہاں بھی آزادی کا مفہوم اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی آزادی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے آزادی کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کو معاشی اور اقتصادی آزادی کا خیال پیدا ہوا اور پھر ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ وسیع ہو کر تمام دُنیا میں آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد کا ایک حصہ بن گیا۔ اس وقت جو شاعر اور ادیب اپنے مضامین میں انسانی زندگی کی اس وسعت کا پتہ دے رہے ہیں وہی درحقیقت ادب کی تخلیقی طاقت کا ساتھ دے رہے ہیں وہی زندگی کی حقیقت سے آنکھیں چار کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں شاید یہ بات کہہ دینا بھی ضروری ہو گا کہ ہندوستانیوں کے ارادے اور خواہشیں ابھی یہاں کے سماجی حالات سے بے اطمینانی کی وجہ سے ظہور پذیر ہو رہی ہیں کوئی حقیقی تبدیلی جو تعمیری بھی ہو طاقت کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی ہے لیکن اسکے حصول کی جد و جہد، بے اطمینانی، تعمیر کا تصور یہ چیزیں ادب میں پوری طرح آگئی ہیں۔ کہیں کہیں تو لفظوں کے پیچھے پورے سماجی عمل کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

ادب اور آرٹ کے ہر شعبے میں چند اہم تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور ہوئی ہیں لیکن آرٹ کے بعض سانچے ان تبدیلیوں کو بہت جلد قبول کر کے ظاہر کر دیتے ہیں اور بعض پوری طرح نمایاں نہیں کرتے۔ مختصر افسانے، نظمیں، تنقیدی مضامین یہ چند اصناف ادب ایسے ہیں جو ہمارے ارادوں اور خواہشوں کی ترجمانی کر رہے ہیں لیکن غزلوں میں یا دوسرے علمی مضامین میں ابھی وہ صفائی نہیں آئی ہے جو انہیں اگلوں سے ممتاز کر سکے اگرچہ انکی روح بھی بدل چکی ہے۔ موجودہ دور کا افسانہ نویس اور نظم نگار انفرادی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور تکلیفوں، معمولی انسانی کمزوریوں اور مصنوعی اخلاقی تعلقات کو اوّل تو اپنی نظم اور افسانہ کا موضوع نہیں بناتا اور اگر کبھی

ایسا کرتا ہے تو اس انفرادی تصوّر کے پس منظر میں کوئی گہرا سماجی تصوّر ہوتا ہے یہ بات اتنی آسان نہیں ہے جتنی بادی النظر میں دکھائی دیتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ادیب یا شاعر کامیاب نہیں ہوتا اور فنی کمزوری کا اظہار کر دیتا ہے کبھی کبھی وہ خطیبانہ اور واعظانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے، کبھی کچھ لفظوں اور اصطلاحوں کے استعمال ہی کو کافی سمجھ لیتا ہے۔ کبھی اپنی بے مائگی کو نئی نئی اصطلاحوں کے پردہ میں چھپا دینا چاہتا ہے، کبھی معمولی اور بھدّی چیزوں پر زور دیکر اسے جدّت سے تعبیر کرتا ہے لیکن تجربہ کے دور میں یہ سب کچھ ممکن ہے اس لئے ہمیں اس مرکز، اس مستقل راہ پر نظر جمانی چاہیئے۔ نیا ادیب جس پر چلنے کا مدعی اور جہاں تک جانے کے لئے بے چین ہے۔

نئے علوم اور فنون نے، سائنس کی ترقّی نے، آزادی کے نئے تصوّرات نے، اخلاقی معیار کی تبدیلی نے بہت سے نئے اخلاقی، جنسی، نفسیاتی اور سیاسی مسائل عریاں طور پر موجودہ ادیب کے سامنے پیش کر دئے ہیں، وہ ہر قدم پر قدیم توہم پرستیوں سے ٹکر لیتا ہے اور جب پرانی آہنی دیواروں کو توڑ نہیں سکتا تو اسکے یہاں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہ جھنجھلاہٹ بھی بالکل وقتی چیز ہے

وہ ادیب جنہوں نے ۱۹۳۰ء کے بعد سے لکھنا شروع کیا ہے اور جنہیں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی تاریخ پڑھنے کا موقع ملا ہے اُن کے یہاں داخلیت، رومان پرستی، خواہش پرستی اور انفرادیت کی کمی دکھائی دیگی اگرچہ ظاہر ہے کہ ان سے پوری طرح چھٹکارا ابھی ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

ہندوستان جن حالات سے گزر رہا ہے اس کی تہ میں کتنا کرب و اضطراب ہے اس کا اندازہ اوپر کی چند تحریکوں سے اتنا نہیں ہو سکتا جتنا کہ موجودہ ادبی رجحانات سے ہو رہا ہے۔ ہمارے ادیبوں نے ادب کو زندگی سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے، وہ فرضی اور تخئیلی عشق و محبّت، گناہ و ثواب، علم اور تصوّف، روحانیت اور اخلاق کا تذکرہ نہیں کرتے بلکہ خود زندگی جن حقائق کو پیش کر رہی ہے انہیں سامنے لا رہے ہیں چاہے وہ حقائق کیسے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ ہمدردی اور رواداری کے کھوکھلے جذبے جو جد و جہد سے دور رہ کر پیدا ہوتے ہیں وہ ان کے موضوع نہیں لیکن جس بات کو بار بار دُہرا چکا ہوں اسے پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ابھی اس ادب کی ابتدا ہے، ابھی تو بہت کچھ سیکھنا ہے، بہت کچھ تبدیل کرنا ہے اور بہت سی گہری حقیقتوں کی نقاب کشائی کرنا ہے اور اس سلسلہ میں انہیں فن کی لطیف ترکیبوں سے مدد لینا پڑے گا جو چیزیں رجحانات کے طور پر ظاہر ہو رہی ہیں انہیں ادب کا جزو بن جانا ہے اور آج کی وسیع انسانیت، بین الاقوامیت کی کوشش ظلم و جور کا استیصال، عقل کی کارفرمائی، آزادی کی سچّی لگن اور ایسے ہی دوسرے پائدار اور بلند جذبات سے ادبی سرمایہ کی تشکیل ہوگی۔

یہ بات جس طرح تمام فنون لطیفہ کے لئے صحیح ہے اسی طرح ادب کیلئے بھی ہے کہ ادب کچھ لوگوں کیلئے تو کسی مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور کچھ لوگوں کے لئے خود مقصد۔

یہ دو قسم کے فلسفۂ حیات کے ماننے والوں کا پتہ دیتا ہے لیکن وہ لوگ جو ادب ... ہی کو مقصد سمجھتے ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ کام ادب سے لیتے رہتے ہیں۔ اس بحث کو آج کل تنقید میں خاص جگہ حاصل ہے کہ ادب میں افادیت اور مقصدیت یا پروپیگنڈے کا کیا مطلب ہے۔ جدید تنقید جب ادب کا تجزیہ کرتی ہے تو اُسے ہر ادب میں چاہے وہ کسی دور کا کیوں نہ ہو یہ بات صاف صاف دکھائی دیتی ہے کہ شاعر یا ادیب کے طبقاتی تعلّق کی وجہ سے ادب میں مخصوص اثرات اور تجربات کا بیان ہوگا اور اس طرح زہرِ عشق اور میر کی غزلیں بھی ادب برائے ادب کا بیان ہو کر نہیں رہ جاتیں بلکہ اُن میں بھی زندگی کی مخصوص قدروں کا پتہ ملتا ہے۔ بے اطمینانی اور تغیّرات، سکون اور تصوّف یا حالات نے جن باتوں کو پسندیدہ اور عزیز بنا دیا تھا انہیں کے بیان سے ادب کا دامن بھرا ہوا ملتا ہے۔

موجودہ ادب میں یوں تو ہر پہلو سے تغیّرات پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ لیکن ان سب کی تہ میں تنقیدی جائزہ کی وہ نئی طاقت ہے جس نے ادبیات کو نئے پر و بال عطا کر دئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب خود ادیب اپنے کارنامہ کا جائزہ لینے کے بعد اُسے پیش کرتا ہے۔ ہر کس و ناکس کا ذکر نہیں بلکہ ان کا ذکر ہے جن کی ادبی کاوشیں ادب کے سرمایہ میں کوئی اضافہ کرتی ہیں سائنٹفک اور غیر سائنٹفک طور پر لوگ اپنے دور کی ترجمانی، سماجی حقائق کے اظہار اور عقل پرستی کو رواج دینے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ توہمات کا پردہ علوم نے چاک کر دیا ہے اس لئے شاعر بھی نئے علوم کی مدد سے آگے بڑھ رہے ہیں، ادیب سائنس اور دوسرے علوم کی روشنی میں قدم اُٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ زندگی کی کشمکش دعوتِ مقابلہ دے رہی ہے اور ادیب اس سے

مقابلہ پر آمادہ دکھائی دے رہے ہیں اس میں یہ ہوتا ہے کہ ادیب کی زندگی حیاتِ اجتماعی کے اور دوسرے شعبوں سے وابستہ ہو جاتی ہے اور زندگی کے تجربے تخلیقی ادب کا موضوع بنتے ہیں۔ کچھ ادیب تو اس سلسلہ میں ایسے ملیں گے جن کا نقطۂ نظر جذباتی ہے جو بنیادی باتوں سے واقف نہیں ہیں لیکن موجودہ تمدّن کے تضاد سے پریشان ہیں، بھٹک بھٹک کر اندھیرے میں راستہ ڈھونڈھتے ہیں، کبھی راہ مل جاتی ہے کبھی قدم بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن ایک جماعت ایسے ادیبوں کی بھی ہے جنھوں نے راستہ پالیا ہے چاہے وہ تیز رو نہ ہوں، سبک خرام نہ ہوں لیکن انہیں اپنی منزل کا نشان معلوم ہے۔ وہ ان راہوں سے واقف ہیں جدھر سے انہیں جانا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین باقاعدہ طور پر ایسے ہی شاعروں اور ادیبوں کو اپنی جانب بلاتی ہے۔ یہ بات کسی قدر یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انفرادی کوششوں کے علاوہ اگر موجودہ دور کے صحیح اور منضبط رجحانات نے کوئی پیکر اختیار کیا ہے تو وہ اس انجمن کی شکل میں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا ہر ممبر کسی معیاری بصیرت اور علم کا حامل ہے۔ ممکن ہے کہ خود یہ انجمن منزل تک نہ پہنچ سکے لیکن اسکی نشان بردار ضرور ہے۔ اس نے ابتک چاہے زبان اور ادب کی کوئی اہم خدمت انجام نہ دی ہو لیکن کچھ نئے رجحانات کی تشکیل ضرور کردی ہے اور ادب کے بارے میں واضح تصوّرات پیش کئے ہیں اس کا ایک دوسرا نتیجہ اور ہوا، وہ یہ کہ ادب میں مستقل اور ناممکن التغیّر قدروں کے ماننے والے ترقی پسند ادب کے خلاف صف آرا ہو گئے اور اس طرح بہت سی ایسی باتیں جو کبھی کھل کر نہیں کہی گئی تھیں کہی جانے لگی ہیں اور نئے ادبی رجحانات سے اختلاف رکھنے والے اپنے طبقاتی مفاد کو پشت پناہ بنا کر نئے ادب سے بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔ بدلتی ہوئی قدروں نے زمانہ میں اس وقت کے سماجی نظام کے پُرانے اجارہ داروں کو چیخنے پر مجبور کر دیا ہے صرف ادب ہی نہیں ہے جس کی تبدیلیاں پراگندہ خاطر بنا رہی ہیں بلکہ سائنس کی بڑھتی ہوئی طاقت عمل کا جائزہ لے رہی ہے۔ انفرادیت کا علم اب بھی بلند کیا جاتا ہے لیکن اُسے اجتماعی احساس کے سامنے سرنگوں ہونا ہے، توہم پرستیاں اب بھی سر اُٹھا رہی ہیں اور ان کے اصولوں کو الہامی اور الٰہی ماننے والے سائنس کا مذاق اُڑانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ لیکن علم اور یقین کا مقابلہ جذبات اور ظنّیات زیادہ دنوں تک نہیں کر سکتے اس لئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ پُرانی قدروں کو آج نہیں تو کل محاذ سے ہٹنا ہے اور ان نئی قدروں کو جگہ دینا ہے جو وقت کے تقاضے سے پیدا ہو رہی ہیں، جن کی تخلیق میں تاریخی طاقتوں کا ہاتھ ہے اور جن کے زندہ رہنے کے لئے مخصوص حالات ۱۷ پیدا ہو چکے ہیں۔

”زندگی“ اور ”موت“

فضل حسین کیف

محفلِ استقرار سے کیوں پیکول ہے
جہانِ آرزو پُرجوش کیوں ہے
نصیبِ دل ہے خوابِ تمنّا
وہ نغمۂ زندگی خاموش کیوں ہے

نوا راہی ہے حیاتِ جاوداں کا
بھلا کیا تجھ کو ہے ڈر مرگِ ناگہاں کا
نہیں ہے تیرے سفر کی انتہا موت
شبستاں ہے فقط یہ کارواں کا

جاپان کی داخلی اور خارجی سیاسیات کا پس منظر

مشرق بعید۔ بحرالکاہل اور جاپان و روس کے باہمی جھمیلوں اور انکی سیاسیات کو سمجھنے کے لئے پہلے خود جاپان کی اندرونی سیاست اور اُس سیاست کے مختلف رخوں کا جاننا اور جاپانی حکومت کے اقتصادی ڈھانچہ پر نظر رکھنا ضروری ہے اس لئے کہ مشرق بعید کی سیاست میں پیچیدگیاں جاپانی سامراج کے اقتصادی مفادوں ہی کی بہت کچھ پیدا کردہ ہیں۔

آئندہ سطور میں جاپان کی اندرونی سیاست پر ایک چھچھلتی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس سے جاپان کی سیاسی حالت کا سرسری اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی۔

نئے جاپان کی تاریخ ۱۸۶۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ اسی سال جدید اصلاحات کے ذریعہ قدیم جاگیرداروں سے اُن کے بڑھے ہوئے حقوق چھین لئے گئے۔

اصلاحات کے اس انقلابی اثر کا جو نتیجہ ہونا تھا ہوا۔ جاگیرداروں کی وہ اولاد جو اپنی من مانی کارروائیوں کیلئے آزاد چھوڑ دی گئی تھی قانون کے آہنی شکنجہ میں جکڑ دی گئی۔ اس سیاسی اثر کے علاوہ ان اصلاحات کا اقتصادی اور معاشی اثر بھی پڑا جس کی وجہ سے امراء اور رؤسا کی اولاد صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف منہمک ہوگئی۔ ان لوگوں نے اس نئی دُنیا میں تیزی سے ترقی کی اور آج جاپان کی معاشی زندگی پر انہی قدیم امراء کی اولاد کا قبضہ ہے اور چونکہ یہ امراء و رؤسا اپنے خاندانی اثرات اور حکام سے تعلق کی بنا پر جاپانی سوسائٹی کا سب سے موثر عنصر تھے اس لئے انہوں نے تجارتی میدان میں بڑے بڑے ٹرسٹ قائم کرکے مشہور کاروباروں اور صنعتوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

ان سرمایہ دار خاندانوں میں دو مشہور خانوادے جاپان کی تاریخ میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ مٹسوئی (Mitsui) اور مٹسوبشی (Mitsubishi)۔

مٹسوئی خاندان کے قبضہ میں بینکنگ۔ اسلحہ سازی۔ طیار شدہ مال اور بڑی بڑی صنعتوں کا کاروبار ہے اور مٹسوبشی خاندان۔ جہازسازی انجنیرنگ اور دوسرے بحری سامان نیز گھریلو سامان کی تجارت پر اقتدار رکھتا ہے۔

سیاسی پارٹیاں

یہ دونوں خاندان جاپان کی سیاسی پارٹیوں پر بھی درون پردہ اقتدار رکھتے ہیں لیکن چونکہ دونوں اپنی تقابلی فطرت Competitive nature کی بنا پر باہم دست و گریباں رہتے ہیں اس لئے وہ سیاسی جماعتیں بھی جنکی یہ علی التواتر متحرک روح ہیں باہم متصادم رہتی ہیں۔

جاپان کی سیاسی پارٹیاں بھی دو ہیں۔ سی یوکائی Seiyukai اور منسیٹو (Minseito) پہلی جماعت انگلستان کی قدامت پسند پارٹی (Conservative Party) سے بہت میل کھاتی ہے لیکن مٹسوبشی کا رجحان اعتدالیت (Liberalism) کی طرف ہے۔

ان دو پارٹیوں کے علاوہ تیسری طاقتور جماعت جو مذکورہ سیاسی پارٹیوں سے متصادم رہتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سیاسی جماعتوں کو ملک کی فوجی ترقی سے دلچسپی نہیں بلکہ اس کے برعکس دونوں جماعتیں علی التواتر برّی و بحری بیڑہ کی زیادتی کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔

امن پسندانہ پالیسی

جاپان کے وزیراعظم وسکاؤنٹ کاٹو۔ کے دورانِ وزارت میں کچھ نئی اور دور رس اصلاحات کی گئیں اور ۱۹۲۳ء کے خوفناک زلزلہ سے جو ملک کی مالی حالت زبوں ہو چلی تھی اُس میں یک گونہ خوشحالی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس زمانہ میں حکومت کی پالیسی امن پسندانہ تھی حالانکہ امریکہ کی طرف سے متعدد بار اشتعال انگیز اقدامات کیے گئے چنانچہ ۱۹۲۴ء میں صوبہ جات متحدہ امریکہ میں قانون انتقال منظور کیا گیا جس سے جاپانیوں کو مستثنیٰ رکھا گیا۔ پھر امریکہ نے جاپان کا قانون۔ جنٹلمین اگریمنٹ ایکٹ جو ۱۹۰۷ء سے نافذ تھا ناپسند کیا اور جاپانیوں کے مکمل اخراج کا فیصلہ کر دیا اور اس طرح ایکٹ کی دھجیاں اُڑا دیں۔ ان تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود بھی جاپان کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا گیا گو کیمپ۔ نے حکومت کی اس پالیسی کو بزدلانہ خطرناک اور قابلِ ملامت بتایا۔ مگر بیرن شیڈیہارا۔ کی کابینۂ وزارت جو اُس وقت حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھی۔ خارجی ممالک کے مسائل میں عدم مداخلت کی پالیسی پر سختی کے ساتھ عامل تھی۔ اس لئے اُس نے اس راہ میں کوئی اقدام نہ کیا۔ وزارت کی اس پالیسی سے کیمپ۔ بہت نالاں تھی چنانچہ جب ۱۹۲۷ء میں بینکنگ میں اقتصادی جمود کے دباؤ سے۔ شیڈیہارا۔ کی وزارت کو استعفیٰ دینا پڑا تو کیمپ۔ نے شانٹنگ پر قبضہ کرنے کے لئے افواج بھیج دیں اور وزارت کی عدم مداخلت کی پالیسی کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد بیرن شیڈیہارا۔ کی وزارت پھر لوٹ آئی اور شانٹنگ کے انخلاء کا حکم پھر دیدیا گیا۔ کیمپ نے سختی کے ساتھ حکومت کی توجہ قومی چین کی بڑھتی ہوئی طاقت اور سوویٹ روس کی ترقی پذیر فوجی حالت کی طرف مبذول کرائی جو مستقبل قریب میں جاپان کے جارحانہ مقاصد کے لئے خطرہ بننے والی تھی مگر حکومت نے کوئی توجہ نہ دی اور فوجی جماعت کو مایوس ہونا پڑا لیکن ۱۹۳۰ء میں عدم مداخلت کی پالیسی کی اشاعت ہو گئی اور فوجی جماعت کو اقتدار حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ برطانی وزیراعظم مسٹر ریمزے مکڈانلڈ نے لندن میں بحری کانفرنس بلائی تھی تاکہ وہ واشنگٹن کانفرنس کی عائد کردہ پابندیوں پر غور کرے۔ . . . . واشنگٹن کانفرنس میں جاپان۔ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان بحری طاقت کا تناسب ۳ - ۵ - ۵ رکھا گیا تھا۔

اس کانفرنس میں جاپانی بحری بیڑہ کے نمائندوں نے اپنے بحری پروگرام میں ہر اک تحدیدی ترمیم کو نامنظور کر دیا۔ اسپر مسٹر میکڈانلڈ نے تمام سابقہ قواعد کے برخلاف براہِ راست ٹوکیو سے خط و کتابت شروع کر دی اور وزیراعظم کی تائید حاصل کر لی۔ چنانچہ معاہدۂ لندن کی اکتوبر ۱۹۳۰ء میں تصدیق کر دی گئی۔ وزیراعظم کے اس طرزِ عمل سے تمام فوجی حلقے بھڑک اُٹھے اور صرف دو ہی ہفتہ بعد وزیراعظم کو قتل کر دیا گیا۔

انقلابی نقطہ

۱۹۳۰ء کے عالمگیر اقتصادی جمود . . . . نے جاپان پر بُرا اثر ڈالا اُس کی خارجی تجارت ½ کم ہو گئی ظاہر ہے کہ یہ ایک تعجب انگیز حد تھی کہ جیسی دُنیا کے کسی بھی مقام پر دیکھنے میں نہیں آئی۔ اقتصادی جمود سے جاپانی کسان کو خاص نقصان پہنچا۔ کھانے کے تمام سامان کی قیمت خوفناک حد تک بڑھ چکی تھی۔ مچھلی کا حصول مشکل تھا چاول کے ملنے میں گو آسانی تھی لیکن وہ ناقابلِ فروخت ہونے کی بنا پر کسان کی مالی حالت میں کچھ مفید تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا تھا اور ریشم کے جراثیم کی پرورش جس سے جاپانی کسان کو عام حالات میں بہت کچھ اقتصادی منافع ہوتے تھے اس لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتی تھی کہ ریشم کی خارجی تجارت میں کمی کی وجہ سے اب وہ بھی کچھ فائدہ بخش نہیں رہی تھی اُس وقت کے جاپانی کسان کی بابت ایک ماہر اقتصادیات کا بیان ہے کہ: —

"اس جمود کے زمانہ میں جاپانی کسان کی صرف ¼ آبادی نسبتاً خوشحالی کی زندگی بسر کرتی تھی۔"

امریکہ کے ایک ماہر مالیات نے مشرق بعید کی اقتصادی حالت پر بحث کرتے ہوئے جاپانی کسان کی حالت بایں الفاظ میں روشنی ڈالی تھی:۔

"بین الاقوامی اقتصادی جمود کا قابل رحم شکار جاپانی کسان ہوا ہے۔ اُس کا ہر قسم کا غلہ بازار میں اچھی قیمت پر نہیں اُٹھتا۔ حکومت کی امداد اصل حالت میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ سرسری اندازہ کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ ۳۰ فی صدی کسان آبادی فاقہ کی حد تک پہنچ چکی ہے۔"

دیہات کے ساتھ شہر کی حالت بھی بے حد ناقص تھی اس لئے کہ جاپانی شہروں کی اقتصادی بہتری تین صنعتوں پر انحصار کرتی ہے۔ (۱) جہاز رانی۔

(۲) ریشم کی صنعت اور (۳) روئی کے سامان کے کارخانے لیکن اقتصادی بدحالی نے ان تینوں صنعتوں ہی کی کمر توڑ دی تھی اس لئے کہ نہ تو جہازوں میں سامان جانے کی وہ کثرت تھی اور نہ ہی ریشم اور کپڑے وغیرہ کی وہ مانگ جو ۱۹۳۰ء سے پہلے شہروں میں خوشحالی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ بدقسمتی بالائے بدقسمتی یہ ہوئی کہ چینیوں نے جاپانی مال کا بائیکاٹ کر دیا اور برطانی نو آبادیات نے بھاری ڈیوٹی لگانی شروع کر دی۔ غرض ان تمام حالات کے نتیجہ میں جاپان کی دس سالہ اقتصادی ترقی تباہی کے دروازہ پر آ لگی۔ ایسی حالت میں عوام یہ کہنے لگے کہ۔ کیمپ۔ نے جس پالیسی کو پیش کیا تھا صرف اُسی پر چل کر ملک کی مالی حالت بہتر ہو سکتی ہے اور آخرکار فوجی جماعت کا اثر و نفوذ حیرت انگیز تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا۔ یہ چیز افسوسناک تھی لیکن بہرحال اسکے علاوہ چارۂ کار ہی کیا تھا۔ آخرکار مجبوراً ملک کی قسمت کو فوجی گروپ کے سپرد کر دیا گیا جس نے اس بدحالی کو دور کرنے کے لئے چین کے ساتھ جنگ شروع کر دی اور ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو ایک تکلیف دہ حادثہ کے نتیجہ میں جاپان نے منچوریہ پر حملہ بول دیا اور ایک سال کے قلیل عرصہ میں چینی فوجوں کو پسپا کر دیا۔ آخر منچوریہ کا نام بدلکر مانچوکو کا نیا صوبہ شہنشاہیت کے ماتحت قائم ہو گیا۔

پچھلے دس سال

پچھلے دس سال میں جاپانی سیاست کا عام رجحان فیسزم کی طرف رہا جس کا بہت کچھ سبب سنہ ۲۹ء کے جمود کے تلخ اور گہرے اثرات اور پرانی وزارتوں کی ناکام پالیسیوں کا احساس تھا۔ اس دوران میں زیادہ تر حکومتیں جنگوں میں مبتلا رہیں جن سے اُن کی اقتصادی اور مالی حالت کو سخت چوٹیں لگیں۔ چنانچہ سنہ ۳۰ء اور سنہ ۴۰ء کے عشرۂ سابقہ .... کی سیاسی اور اقتصادی حالت پر بحث کرتے ہوئے ٹوکیو یونیورسٹی کے پولیٹکل ڈپارٹمنٹ کے صدر اعلیٰ نے اپنی کتاب "جاپان۔ آج اور کل" میں لکھا ہے کہ:۔

"پچھلے دس سال میں جاپان کی بیرونی سیاست اوسطاً ۸۰ فی صدی جنگی مسائل کو حل کرنے میں اُلجھی رہی۔ صرف اندازہ کی رو سے بجٹ کا ۴۷ فی صدی حصہ جنگ کی نذر ہوا اور ۵ لاکھ آدمی مارے گئے۔"

یاد رہے کہ ان اعداد و شمار میں اُن اخراجات کا شمول نہیں ہے جو روسی اور جاپانی سرحدی جھگڑوں یا شنگھائی میں جاپانی اور بین الاقوامی مفادوں کی باہمی ٹکر کے نتیجہ میں حکومت جاپان کو برداشت کرنے پڑے ان کی تعداد مشہور جاپانی اخبار "آشاہی شمبون" کے ایک مضمون نگار کے اندازہ کے مطابق سنہ ۳۳ء سے لیکر سنہ ۳۹ء تک ۔ ۴۹ ۔ سالانہ ہے۔ ان پر سالانہ ۳۴ لاکھ روپیہ تک خرچ ہوتے ہیں۔

اس جنگی حالت کا ملک کی سیاسیات میں جو اثر تھا ظاہر ہے اعتدال پسند اور قدامت نواز عنصر — جہاں تک ان اصطلاحات کے برطانی مفہوم کا تعلق ہے — نہایت تیزی کے ساتھ سیاسیات سے غائب ہونے لگا اور فوجی جماعت آہستہ آہستہ تمام حکومت پر چھا گئی۔ ہونے کو اب بھی اعتدال پسند پارٹیاں جاپانی پارلیمنٹ میں موجود ہیں اور کبھی کبھی حکومت کی ذمہ داریاں بھی سنبھالتی ہیں مگر ملک کے عام رجحان اور بیرونی سیاست کے خاص اُلجھاؤ کی وجہ سے ان کی اعتدال پسندی کوئی خاص فرق نہیں پیدا کرتی۔

جاپان اور بین الاقوامی جنگ

روس پر جرمن حملہ کے بعد ہی سے بین الاقوامی سیاسی حلقوں میں یہ پوچھا جا رہا ہے کہ جاپان اس سلسلہ میں کیا طریقہ اختیار کرے گا۔ اس لئے کہ وہ روس اور محوری طاقتوں کے ساتھ۔ غیر جانبداری اور۔ امداد۔ کے معاہدے کئے ہوئے ہے۔ اس سوال کا جواب یقیناً ان سطور کے شائع ہونے تک ناظرینِ ایشیا کو معلوم ہو جائیگا۔ لیکن یہ کہ اگر جاپان روس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ تو چونکہ اُسے امریکہ اور برطانیہ سے بھی مقابلہ کرنا پڑیگا اس لئے کہ امریکی اور برطانی ارکانِ حکومت نے کھُل کر اعلان کر دیا ہے کہ اگر مشرق بعید میں جاپان نے کوئی بھی ایسا اقدام کیا جو اُن کے مصالح کے لئے خطرناک ثابت ہوا یا مشرق بعید میں۔ مساوی طاقت۔ کی حیثیت میں کوئی تبدیلی ہوئی کھُل کر میدان میں آجائیں گے اور ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں روس پر حملہ ہونے کی صورت میں یہ تمام امکانات قوی ہو جائینگے اس لئے یہ سوال خاص اہمیت رکھتا ہے کہ امریکہ و برطانیہ اور جاپان کے درمیان جنگ کی صورت میں کیا حالات رونما ہونگے۔

فوجی نقطہ نظر سے جاپان اور امریکہ کی جنگ وہ صورت اختیار نہیں کر سکتی جو یورپی جنگوں میں نمایاں ہوئی اس لئے کہ دونوں ممالک کے

درمیان پانچ ہزار میل کا سمندر حائل ہے۔ اس لئے نہ طیارے ہی آپس میں گتھ سکتے ہیں اور نہ ٹینکوں ہی کا ٹکرانا ممکن ہے اور یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ بحری جنگی جہاز اس دور دراز کی مسافت کو طے کر کے مخالف ملک پر جا کر گولہ باری کریں۔ لہذا یہ جنگ صرف تجارتی ناکہ بندی تک محدود رہ جائے گی۔

انڈوچائنا کا معاملہ

جاپان نے وشی کی کمزور حکومت کو دبا کر انڈوچائنا کے جنوبی بندرگاہوں اور چند ہوائی مستقروں کے استعمال کا حق لے لیا ہے۔ یہ واقعہ فوجی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے اس لئے کہ اس سے پہلے ملایا۔ سنگاپور اور فلپائن کا ہر بحری مرکز جاپانی بحری مراکز سے ایک ہزار میل سے کم دور نہیں تھا۔ لیکن اب ان میں سے ہر مقام مسافت میں آٹھ سو میل کے اندر ہے۔

تجارتی ناکہ بندی

جہاں تک موجودہ اطلاعات کا تعلق ہے انڈوچائنا کے مسئلہ میں برطانی اور امریکی حکومت نے تجارتی ناکہ بندی کرنے کا ارادہ کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جاپان کے اس اقدام کا مناسب جواب یہی تھا اس لئے کہ۔ جاپان کی صنعتیں امریکہ اور برطانی نوآبادیات کی خام پیداوار پر چلتی ہیں۔ جاپان امریکہ سے تیل۔ پٹرول مشینیں۔ اور برطانی مقبوضات سے روئی۔ شکر اور دوسرا ضروری سامان منگاتا ہے۔ جاپان کا یہاں تک امریکہ پر انحصا

ہے کہ پروفیسر مارٹن کا اندازہ ہے کہ:-

"اگر امریکہ جاپان کیلئے اپنے سامان کی برآمد ممنوع
کر دے تو تمام جاپانی صنعتیں اور کارخانے فوراً
بند ہو جائیں"

یہی وجہ تھی کہ محور کے پیہم دباؤ کے باوجود بھی جاپان کو اعلان جنگ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ مستقبل کے ان امکانات کے پیش نظر جاپانی حکومت نے تیل اور پٹرول وغیرہ کی کثیر تعداد محفوظ کر لی ہو۔ چنانچہ گزشتہ کئی سال سے جاپان امریکہ سے ضروری اشیاء عام مانگ اور عام حاجت سے کہیں زیادہ خرید رہا ہے اور دوسرے ممالک سے اسکی درآمدی تجارت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ مگر تجارتی ناکہ بندی کے نتیجہ میں نقصان پہنچنا ضروری ہے اس لئے کہ بعض اشیاء کا ذخیرہ کرنا ممکن نہ ہو سکا اور ان ممالک نے پہلے ہی سے دست کشی اختیار کر لی۔

حالات بتا رہے ہیں کہ جاپانی سامراج عنقریب میدان میں آنیوالا ہے وہ جنگی محاذوں کو تک رہا ہے لیکن اصلاً اس کی پالیسی کا فیصلہ روس اور جرمنی کی جنگ کی بابت مستقبل کے امکانات کریں گے۔

۱۲۱

سید محمد تقی

دورِ عقلیّت کے سیاسی افکار

اکرام قمر۔ بی۔ اے

(۱) آئین پسند

۱۶۵۱ء میں ہوبز کی کتاب "عفریت" (Leviathan) شائع ہونے پر پیرس میں مقیم انگریزوں نے ہوبز کو وہ لعنت ملامت کی کہ وہ خوفزدہ ہوکر پیرس سے انگلستان واپس بھاگ آیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر کرامویل اور پیوریٹن (Puritan) فوج نے اسپر بہت تھوڑی مہربانی بھی کی تو بھی
۲۲ وہ گھاٹے میں نہیں رہے گا کیونکہ جلاوطن ساتھیوں کی لعنت ملامت زیادہ نقصان دہ تھی۔ شاہ پرست پادری اُس کی صرف اس بات پر مشتعل نہیں تھے کہ اُس نے بادشاہ کو نائبِ خدا ماننے سے انکار کردیا ہے بلکہ وہ اُس کی عمومی کلبیت، مادیت، اور اس کے اس گستاخانہ نظریہ کے خلاف تھے کہ کلیسائی طاقت دُنیوی طاقت کے ماتحت ہے۔ جو شاہ پرست مذہبی شغف نہ رکھتے تھے وہ بھی ریاستی حاکمیت کے نظریہ سے پریشان تھے کیونکہ یہ نظریہ جمہوریت اور ملوکیت دونوں کے موافق تھا۔ یہ نظریہ جس طرح سٹوئرٹ خاندان کی مخالفت کی مذمت کرتا تھا اسی طرح کرامویل کی مخالفت کو بنظرِ حقارت دیکھتا تھا۔ یہ نظریہ ہر اُس بادشاہ کی حمایت کرتا تھا جس کا سکہ رواں ہو خواہ قانونی طور پر اُسے حکومت کا حق پہنچتا ہو یا نہ پہنچتا ہو۔ جب ہوبز انگلستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی تصنیف انگلستان کے جمہوریت پسندوں میں فرانس کے شاہ پرستوں سے کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئی۔ سیاسین اس بات کے سخت خلاف تھے کہ اس نے ان کا معاہدۂ عمرانی کا پسندیدہ نظریہ مطلق العنانی کو ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ اُسکے حاکمیت اور قانون کے نظریات کی فقہا تردید کرتے تھے۔ مؤرخین اسکی بیان کردہ دورِ جاہلیت کی حالت کی صحت سے انکار کرتے تھے۔ فلسفی اسکی نفسیات کو جھٹلاتے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ ہر جگہ اس کی مذمت کی جاتی ہے — اور اس صورتِ حال نے اُسے متفکر و پریشان کردیا۔

ہوبز کی تردید کرنے کی نسبت اسکی مذمت کرنا آسان تھا۔ چند مفکر ہی اُس سے زیادہ منطقی قابلیت رکھتے تھے اگر اسکے نظریات کی اساس کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اسکے دلائل اتنے ہی بےعیب ہیں جتنا انسانی استدلال بےعیب دلائل پیش کرسکتا ہے۔ جن دو مصنفوں نے اسکے دلائل پر مبنی بحث کی ہے وہ دونوں صفِ اوّل کے فلسفیوں میں شمار کئے جاتے ہیں انکے نام بینیڈکٹ سپائینوزا (۷۷-۱۶۳۲ء) اور جان لوک (۱۷۰۴-۱۶۳۲ء) ہیں ان دونوں میں سے کوئی بھی اُس کے اخذ کردہ نتائج پر اعتراض نہیں کرتا۔ مگر ان نظریات کو قبول کرکے وہ ان میں چند ترمیمیں پیش کرتے ہیں تاکہ انہیں عملی سیاسیات کے موافق بنایا جاسکے۔

سپائینوزا کو خاص طور پر ہوبز کا شاگرد تصور کیا جاسکتا ہے اُس کی کتاب دینی سیاسی رسالہ (Tractatus Theologico Politicus. ۱۶۷۰ء) اور اسکی تصنیف سیاسی رسالہ (Tractatus Politicum ۱۶۷۷ء) جو اسکی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ ان دونوں میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ "عفریت" کے دلائل کی تقلید کرتے ہیں۔ آدمی اور آدمی کی فطرت کے متعلق وہ ہوبز سے کم قنوطی نظریہ رکھتا ہے۔ اس طرح سپائینوزا منطقی بحث کی ہر منزل پر شرائط پیش کرکے آخرکار ایک ایسی ریاست پیش کرنے کے قابل ہوگیا ہے جو آئینی اور جمہوری ہے، مذہبی رواداری کی پابند اور انفرادی آزادی کے لئے موزوں ہے۔

جان لوک ۱۶۸۸ء کے انقلاب انگلستان کا مؤید تھا۔ اس کے خیالات ہوبز کی نسبت سپائنوزا کے خیالات سے زیادہ مختلف تھے۔ اس نے مشروط بادشاہت کا نظریہ پیش کیا جو اٹھارویں صدی میں رائج تھا۔ اسکے سیاسی خیالات کا قدیم و جدید دُنیا پر بہت گہرا اثر ہوا۔ لوک کے نظریات مالینیو، مانٹسکیو، روسیو، بلیک سٹون اور امریکی وفاقیوں سے لے کر موجودہ زمانہ تک اثر انداز ہوئے ہیں۔ یہ امر نہ درست ہے اور نہ لوک نے اس کا دعویٰ کیا ہے کہ اسکے مختص خیالات اُسی کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ انگلستان میں اُس کے زمانہ سے قبل ہی آئینی نظریہ اور پارلیمانی نظام کی قدیم روایت موجود تھی اس نے معاملہ فہم ہوکر (۱۶۰۰-۱۵۵۴ء) اور غیر دانشمند سڈنی (۱۶۸۳-۱۶۲۲ء) سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ ہم ان ہر دو اشخاص کی تعلیم کا مطالعہ اس مضمون میں عدم گنجائش کی بنا پر کرنے سے قاصر ہیں۔ لوک نے یہ مختلف مواد آئینی اصول کے عظیم الشان نظریہ کی صورت میں پیش کیا ہے مدنی حکومت پر اس نے دو رسالے لکھے ہیں (۱۶۹۰ء) پہلے رسالے میں اس نے فلمر کے خیالات کی وضاحت کی ہے اور ضمنی طور پر بادشاہ کے نائبِ خدا ہونے کے متروک نظریہ کی بھی تشریح کی ہے۔ دوسرے رسالے میں اُس نے ہوبز اور اس کے نظریۂ حاکمیت پر بحث کر کے حقیقی و سنجیدہ کام کیا ہے۔ یہ بات عجیب ہے کہ اس نے اپنی ایک طول طویل دلیل کے دوران میں نہ ہوبز کا خاص ذکر کیا ہے اور نہ حاکمیت کا۔ مگر اُس نے مؤثر پیرایہ میں ہوبز کے نظریہ میں اعتدال پیدا کیا ہے اور حاکمیت کی سختیوں کو کم کیا ہے۔ اُس نے قدیم انسان کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ہوبز اور سپائنوزا کے نظریات سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ وہ دورِ جاہلیت کو محبت و مسرت کا دور قرار دیتا ہے۔ اگرچہ یہ دور اسکے نزدیک غیر ترقی یافتہ اور نامکمل ہے۔ اُس نے وہ وجوہات پیش کی ہیں جن کی بنا پر ادارۂ ریاست کا قیام پسندیدہ ہوگیا تھا اُس کا خیال ہے کہ ریاست کی حقیقی بنیاد دورِ جاہلیت کے افراد کے درمیان معاہدۂ عمرانی پر ہے اور اس معاہدہ کے بعد ایک قابلِ تنسیخ حکومتی معاہدہ ہوا ہے جس میں ایک فریق تو تمام قوم کی ہیئت اجتماعی ہے اور دوسرا فریق وہ حاکم ہے جسے قوم اپنا سردار چُنتی ہے۔ لوک کہتا ہے کہ قوم اپنے تمام قدرتی حقوق اپنی بنا کردہ حکومت کے سپرد نہیں کرتی بلکہ صرف وہ حقوق اسکے سپرد کرتی ہے جو قومی وجود کے لئے لازمی ہیں۔ اور ریاست کا واحد مقصد فرد کے بقیہ قدرتی حقوق بالخصوص زندگی، آزادی اور ملکیت کے قدرتی حقوق کا تحفظ ہے چونکہ اُس نے حکومت کا دائرہ محدود کردیا ہے اس لئے اُسے اپنے "رواداری پر مکتوبات" میں یہ ثابت کرنے کیلئے چنداں دقت پیش نہیں آئی کہ ریاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور اسے ہر اُس عقیدہ و عبادت کے ساتھ رواداری برتنی چاہیئے جو مدنی معاشرہ کے لئے نقصان دِہ نہیں۔

لوک اور اُسکے وہگ (Whigs) شاگردوں کے زیر اثر انگلستان میں اٹھارویں صدی کے اوائل میں جو آئینی رسوم رائج ہوگئی تھیں اُن کا اور لوک کی تعلیمات کا نتیجہ بیرن ڈی مانٹسکیو (۱۷۵۵-۱۶۸۹ء) کی مشہور کتاب "روحِ قانون" (L'Esprit des Lois) تھا۔

مانٹسکیو ۱۷۳۰ء میں انگلستان گیا اور وہاں اٹھارہ ماہ مقیم رہا۔ اس قیام کے دوران میں وہ لوئی پانزدہم شاہ فرانس کی ظلمت پسند شخصی حکومت اور جارج دوم کی آرام طلب آئینی حکومت کے اختلاف سے بہت متاثر ہوا۔ اُس نے برطانی طرزِ حکومت کا غائرانہ مطالعہ کیا۔ تاریخ کے مکمل و جامع مطالعہ سے اپنی معلومات کو وسیع کیا اور آخرکار اُس نے ۱۷۴۸ء میں "کتابِ عظیم" (Magnum Opus) لکھی۔ یہ کتاب اکتیس حصوں اور پانچ سو چھیانوے ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ سیاست و قانون کے ایک وسیع دائرے کو محیط ہے۔ اگرچہ اس نے یہ مقصد ظاہر کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے مگر اس کا بیّن مقصد یہی ہے کہ حکومتِ فرانس کے جبر میں کمی کرنے کے لئے چند ترامیم پیش کرے اور اس مقصد کیلئے حکومتِ فرانس کو کہے کہ وہ رومائے قدیم، ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ اور موجودہ برطانیہ کے چند ایک آئینی دساتیر کو اختیار کرلے۔ سیاسی خیالات میں اُس نے جو سب سے زیادہ قابلِ قدر اضافہ کیا ہے وہ (انفرادی آزادی کے مفاد کی خاطر) تین حکومتی اختیارات ۔ مقننہ، عاملہ اور عدالت ۔ کو علیحدہ علیحدہ کرنے کی اہمیّت پر اصرار ہے۔ اُس نے آئین میں ضبط و توازن کے پولی بیئن (Polybian) اصول کا احیاء کیا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے آئین کے بنتے وقت (۱۷۸۹-۱۷۸۳ء) مانٹسکیو کے نظریات امریکہ پر بہت اثر انداز ہوئے ہیں۔

(۲) انقلابی ۔ لوک کی تعلیمات نے مانٹسکیو کے

دل میں اعتدال پسند آئینی اصلاح کے خیالات پیدا کر دئیے لیکن روسو (۱۷۱۲ء – ۱۷۷۸ء) کا مستعد مگر غیر متوازن قلب ان تعلیمات کے زیرِ اثر معاشری و سیاسی انقلاب کے خواب دیکھنے لگا۔ روسو جنیوا میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک مخبوط الحواس گھڑی ساز تھا۔ سولہ سال کی عمر میں روسو نے سیر و سیاحت اور غریب الوطنی کی زندگی اختیار کر لی اور یہ سیر و سیاحت اور غریب الوطنی کی زندگی ختیار کر لی۔

.... تاحینِ حیات جاری رہی (صرف پیرس میں اقامت کے مسلسل بارہ برس ۱۷۴۴ – ۱۷۵۶ء اس سیر و سیاحت سے مستثنیٰ ہیں)۔ جب ۱۷۵۰ء میں اس نے "علم و ادب کے اخلاقی اثرات" پر ایک مضمون لکھ کر دیجون یونیورسٹی سے انعام حاصل کیا تو اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اچھا لکھ سکتا ہے۔ اس نے تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا جس سے اُس نے عام مقبولیت حاصل کر لی حتیٰ کہ ۱۷۶۲ء میں اس نے "معاہدۂ عمرانی" پر عدیم النظیر کتاب لکھ کر عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ روسو کے اس شاہکار میں وضاحتِ بیان، دلآویز پیرایہ اور معقول و قابلِ فہم دلائل کی خصوصیات موجود ہیں۔ یہ کتاب جذباتی ہے اور عوام کے جذبات کو متاثر کرتی ہے۔ اس میں دو نظریات پیش کئے گئے
۴۴ ہیں جو روسو کی اس تصنیف سے پہلے متضاد و متبائن خیال کئے جاتے تھے ایک طرف تو فلاطون کی طرح قومی احساس کو زبردست قرار دیا گیا اور دوسری طرف شخصی آزادی کا جذبہ لوک سے بھی زیادہ ظاہر کیا گیا۔ ریاستی حاکمیت اور آزادیٔ رعایا کو کس طرح اکٹھا کیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جسے حل کرنے کی روسو نے کوشش کی ہے۔ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یہ تصور کرتا ہے کہ دورِ جاہلیت کی آزادی کے مالک انسان رضا کارانہ طور پر ایک معاہدہ کرتے ہیں جس سے خود بخود ایک قوم وجود میں آجاتی ہے۔ جس میں فرد جو قوم کا ایک جزو ہے قوم کے بالکل مترادف ہے اور فرد کی شخصی رائے اور قوم کی مشیّت عامہ General Will میں اختلاف و تضاد نہیں۔ معاہدۂ عمرانی کی اس نے مندرجۂ ذیل شرائط بیان کی ہیں:-

"ہم میں سے ہر فرد اپنی ذات اور اپنی تمام مشترکہ طاقت کو مشیّت عامّہ کے سپرد کرتا ہے۔ اور ہم بحیثیت مجموعی ہر رکن کو ہیئتِ اجتماعی کا ایک غیر منفک جزو سمجھتے ہیں۔"

روسو کا "مشیّتِ عامّہ" کا نظریہ ہوبز کا سر بریدہ "عفریت" ہے روسو یہ سوال کرتا ہے کہ اگر انسانی فطرت کی خودسری کے ماتحت فرد "اپنی مخصوص رائے کا مظاہرہ کرتا ہے جو مشیّتِ عامّہ کے برعکس یا اس سے مختلف ہے" تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ روسو کہتا ہے کہ اس صورت میں اسے جبراً منایا جائیگا۔ مگر اس حالت میں فرد کی قدیم و غیر منفک آزادی کا کیا بنیگا؟ روسو لکھتا ہے کہ اس طرح آزادی میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔ انسان کی خودسری صرف یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی حقیقی رائے سے ناآشنا ہے۔ جبر اسکی حقیقی رائے کے مطابق ہے۔ قوم اُس پر صرف اس لئے جبر کرتی ہے تاکہ اُسے آزاد ہونے پر مجبور کر دے! اس طرح سے روسو کا سر بریدہ عفریت ہوبز کے صحیح و سالم دیو کی مانند خوفناک و مہیب ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کو آزاد ہونے پر مجبور کرنا اُسے اطاعت گزاری پر مجبور کرنا ہے۔ اس طرح سے روسو کا سوال لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔

اگرچہ روسو اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا ہے مگر اپنی بحث و نظر کے دوران میں اُس نے علم السیاست میں مستقل اور گرانقدر اضافہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ سیاسی طاقت کی بُنیاد عوام پر ہے مشترکہ مفاد حکومت کا اصلی مقصد ہے۔ اُسکے نزدیک ریاست ایک عمرانی تنظیم ہے اور ایک تنظیم ہونے کی حیثیت سے اس میں قومی احساس بھی ہے اور مشیّت عامہ کا وجود بھی۔ وہ اس جمہوری نظریّہ کا حامی ہے کہ سیاسی فریضہ کا حقیقی معیار رضامندی ہے۔ وہ آزادی اور حاکمیت کے اتحاد کو ممکن قرار دیتا ہے اگرچہ اپنی تحاریر میں وہ مہمل لفاظی بھی کرتا ہے مگر اُسکے معقول اصولوں کی اہمیت اس قدر ہے کہ اُس نے سیاسی مفکّروں میں ایک اعلیٰ حیثیت حاصل کر لی ہے۔

روسو کی فصاحت اور جوش کی وجہ سے اس کے بہت سے شاگرد ہوگئے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اسکے نظریات انقلابِ فرانس میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ جس طرح مانٹسکیو نے بوربونز کے سیاسی استبداد کی جڑوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا اور والٹیئر نے رجعت پسند و بد اطوار کلیسائے گال کی طاقت کو کمزور کر دیا تھا، ٹھیک اُسی طرح روسو نے فرانس کے غیر منصفانہ معاشرتی نظام کی اخلاقی و ذہنی بُنیادوں کو اُکھاڑ کر رکھ دیا جب ۱۷۸۹ء میں انقلاب ہوا تو سیاسی لسانی کے نشہ میں بے شمار رہنماؤں نے "معاہدۂ عمرانی" کے اصولوں کا اعلان کیا۔ یعنی مساوات، عوام کی حاکمیت اور مشیّت عامہ کی حقانیت کے نظریات پر گلی کوچوں میں بحثیں ہونے لگیں۔
روسو کے نظریات صرف فرانس ہی میں نہیں اپنائے گئے بلکہ

ایشیا فروری ۱۹۶۲ء

بہت سی اقوام نے انھیں اختیار کیا۔ یہاں ان میں سے صرف دو اہم قوموں کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں طامس پین (۱۸۰۹-۱۷۳۷ء) جنیوائی مسلک کا مبلغ اعظم بن گیا۔ وہ ایک کٹر انفرادی Individualist اور اپنی فطرت ہی سے ہنگامہ پسند تھا۔ انگلستان میں ہنگامہ خیز زندگی بسر کر کے وہ امریکہ چلا گیا۔ "عام فہم و فراست" (۱۷۷۶ء) اور دیگر تصانیف کے ذریعے اس نے امریکی آزادی پر باقی تمام انفرادیت پسند مصنفوں سے زیادہ زور دیا اور اسپر ان سب سے زیادہ اصرار کیا کہ امریکہ برطانیہ کا مقابلہ ضرور کرے۔ ۱۷۸۷ء میں اُس نے انگلستان واپس آکر ۱۷۸۹ء سے لیکر ۱۷۹۲ء تک کے فرانس کے انقلابی دور کا نہایت بیتابی و دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اُسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ جب ۱۷۹۰ء میں اڈمنڈ برک نے اپنے مشہور "الزامات" میں انقلاب فرانس کی مذمت کی تو طامس پین نے اس کے جواب میں ایک آتشیں رسالہ لکھا جو سیاسی علم ادب میں ایک اصولی و اہم اضافہ ہے۔ اس رسالہ کا نام "آدمی کے حقوق" (۱۷۹۲-۱۷۹۱ء) ہے۔ اسکی اشاعت کے فوراً بعد اسے بغاوت کے الزام میں گرفتاری کا خطرہ ہو گیا۔ اس لئے وہ فرانس چلا گیا اور اس کی "جمہوری مجلس" کا رُکن منتخب ہو گیا۔ وہ دس سال تک فرانس میں رہا۔ اس دوران میں قسمت کے ہاتھوں اُسے کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ بعدازاں وہ اپنی زندگی کے بقیہ دن نیویارک میں بسر کرنے کے لئے بحر اوقیانوس کو دوبارہ عبور کر کے وہاں چلا گیا۔ اُسے روسو سے کم قوی احساس تھا۔ اس لئے اپنے اُستاد کی تعلیم کے اشتراکی پہلو کی بجائے اُس نے اُسکے انفرادی پہلو پر بہت زور دیا۔ لیکن روسو کے ان نظریات کی اس نے بہت نشر و اشاعت کی جو انسان کے قدرتی حقوق، معاشرتی مساوات، عوام کی غیر منفک حاکمیت اور شخصی آزادی میں بیجا حکومتی مداخلت کی لغویت کے متعلق تھے۔

جرمنی میں شہرہ آفاق فلسفی عمانوئل کانت (۱۸۰۴-۱۷۲۴ء) نے اپنے غیر محدود صبر و استقلال، ذہانت و میانہ روی سے روسو کی فصاحت و بلاغت کی وضاحت کی اور اس کی کتاب "معاہدہ عمرانی" کے نظریات کو عام فہم اور مربوط پیرایہ میں پیش کیا۔ "روح قانون" میں مانٹسکیو نے جو اصول بیان کئے ہیں ان میں اور روسو کے نظریات میں تطابق و مماثلت پیدا کرنے کی اُس نے بہت کوشش کی۔ سیاسی نظریہ کے میدان میں اُس کی اہم ترین کتاب "فلسفۂ قانون" (۱۷۹۶ء) ہے۔ "قانون" اور "آزادی" کی طرح کی اصطلاحات کی اُس نے جو تعریفیں اور تجزیے کئے ہیں وہ بے بہا ہیں۔

(۴) مصلحین

عمانوئل کانت کو انقلابیوں میں شمار کرنا ایک تعجب انگیز امر ہے کوئی شخص اس سے زیادہ اعتدال پسند نہیں ہو سکتا اور نہ اسکے بلند فلسفہ یا پُرسکون زندگی سے زیادہ بے ضرر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے (اس نے اپنی تمام زندگی اپنے وطن کونیسبرگ میں بسر کر دی تھی) وہ قوائے حاضرہ کے خلاف جارحانہ اقدام کرنے سے گریزاں تھا۔ اس نے پروشیائی تعصبات کو کم کرنے کی خاطر یہاں تک کہہ دیا کہ حاکمیت عامہ تو ہنزولرن شہنشاہی کے متضاد نہیں ہے! لیکن انقلاب ہمیشہ تشدد ہی کی تعلیم نہیں دیتا۔ انقلابی خیالات غیر جذباتی الفاظ میں بھی بیان کئے جا سکتے ہیں (اگرچہ یہ شاذ ہے) اور یہ ناقابل تردید امر ہے کہ کانت کا اخلاقی قانون کو فوقیت دینا، اُسکی تخئیل پرستی، اُس کا صلح کل مشرب، اُس کی انسان دوستی
۲۵ اُس کی امن پسندی یہ سب امور اسکے زمانہ کی جنگی قوم پرستی کے قطعی متضاد تھے اس نے ایک بلند تر سماجی نظام کے اصول وضع کئے اور اس نظام کیلئے اخلاقی انقلاب لابدی ہے۔

اسکے ہمعصروں کے خیالات اس کی برابر انقلابی نہ تھے۔ وہ مصلحین تھے اور سیاسی اداروں اور معاشرتی حالات میں اصلاح کو ناگزیر سمجھتے تھے لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ موجودہ نظام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے یہ اصلاحات کی جا سکتی ہیں۔ وہ تقریباً تمام تر برطانی رعایا تھے اور برطانوی لوگ میانہ روی میں خاص طور پر ماہر ہیں اور اپنے اعتقادات کے منطقی نتائج سے بچنے کی اہلیت و قابلیت رکھتے ہیں۔ ان مصلحین میں سے تین کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ـــــ اڈمنڈ برک، ولیم گاڈون اور جیریمی بنتھم۔

اڈمنڈ برک (۱۷۹۷-۱۷۲۹ء) ایک آئرستانی پروٹسٹنٹ اور متبحر عالم تھا۔ اس نے شروع شروع میں قانون کی طرف توجہ دی مگر بعدازیں ادب و سیاست پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ وہ پارلیمان کا رکن منتخب ہو گیا اور وِہگ وزیر اعظم کا سکرٹری بن گیا۔ اس نے اپنی جماعت اور اپنے رہنما کی نہایت قابلیت و ذہانت کے ساتھ گرانقدر خدمات کیں۔ وہ سیاسی مفکر کی

بجائے ایک عملی سیاستداں تھا۔ جب کوئی اہم مسئلہ پیدا ہوتا وہ اُس پر خامہ فرسائی کرتا۔ وہ مسائل کا سطحی مطالعے کے بجائے عمیق مطالعہ کرتا اور سیاس کی عارضی مصلحتوں اور عیّارانہ دلائل کے نیچے چھپے ہوئے فلسفیانہ ابدی حقائق دیکھ لیتا۔ وہ اس وقت تک آرام نہ لیتا جب تک کہ وہ اُن بُنیادی اصولوں کو معلوم نہ کر لیتا جن کے ذریعہ اُس کی جماعت کی مخصوص تجاویز صحیح ثابت کی جاسکتی تھیں۔ چنانچہ اس کی تصانیف عملی انسانوں کی کسی دوسرے سیاسی مفکّر سے زیادہ عملی رہبری کرتی ہیں۔ جن مسائل کا اُسے سامنا کرنا پڑا اُن میں سے اہم ترین مسائل دو تھے۔ پہلا امریکی نو آبادیات کی بغاوت (۱۷۷۶ء) کا مسئلہ تھا۔ دوسرا مسئلہ انقلابِ فرانس (۹۶-۱۷۸۹ء) کا تھا اُس نے امریکی باغیوں کی حمایت اور فرانسیسی انقلابیوں کی مذمّت کی۔ اس واقعہ سے وہ لوگ بھی کچھ حیران و ششدر رہ گئے جو اسے اچھی طرح جانتے تھے مثلاً چارلس جیمز فاکس (جو اپنی فطرت ہی سے ہر قسم کی اور ہر جگہ کی بغاوت و انقلاب کا موّید تھا) لیکن برک ایک مشتعل مزاج انسان تھا۔ وہ اپنے اصول نہ بدلتا تھا۔ اُس نے ہمیشہ اس بات پر پختہ یقین رکھا ہے کہ ریاست ایک تنظیم اور ایک زندہ ہستی ہے جو ازمنۂ عتیق سے متواتر و مسلسل قائم چلی آتی ہے۔ یہ ترقی بھی کرتی ہے اور تنزّلی بھی یہاں تک کہ فنا بھی ہوسکتی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت ایک طرف تو مسلسل و محتاط اصلاح لازمی تھی تاکہ کہیں یہ تنظیم فنا نہ ہوجائے۔ چنانچہ جہاں ۱۷۷۶ء میں اُس نے اس بات پر زور دیا کہ امریکہ کے جائز مطالبات تسلیم کر لئے جائیں تاکہ برطانی سلطنت میں انتشار پیدا نہ ہو اور یہ آئینی طور پر ترقی کرتی جائے۔ وہاں ۱۷۹۱ء میں اُس نے فرانس کے خیال پرستوں کی شدید مذمّت کی۔ کیونکہ وہ روسو کے خیالی نظریات سے گمراہ ہو کر اپنی عظیم الشّان شہنشاہی کو تباہ کر رہے تھے۔ پُرانی یادگار امارات کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے۔ مقدّس کلیسا کی تخریب پر آمادہ تھے اور ہر اُس چیز کو تباہ و برباد کرنے پر تُلے ہوئے تھے جو اُن کا رشتہ ماضی سے باندھتی تھی۔

ولیم گاڈون (۱۸۳۶-۱۷۵۶ء) برک جتنا زیرک اور متوازن مصلح نہ تھا۔ اوائل زندگی میں وہ مختلف دلچسپ ادوار کے بعد ٹوری ازم اور کالوینیت سے انارکیت اور دہریت کی طرف مائل ہوگیا۔ اُس نے رجعت قہقری شروع کردی مگر وہ اعتدال پسندی اور لا ادریت (یہ اعتقاد کہ خدا اور دوسری غیر مادّی اشیاء کی ہستی کے متعلق ہمیں نہ تو کچھ علم ہے اور نہ غالباً کبھی ہوگا)

تک ہی پہنچا تھا کہ اسّی سال کی عمر میں موت نے قبل از وقت ہی اُسکی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اُس کی حقیقی اہم سیاسی تصنیف "سیاسی انصاف کے متعلق تحقیق" اُسکی زندگی کے انارکی دور (۱۷۹۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انفرادیت کی بُنیاد اس جامع نظریہ پر رکھی ہے کہ انسان اپنی فطرت سے اچھا ہے اور اگر بیرونی قیود اسکے معاملات میں دخل انداز نہ ہوں تو وہ کاملیّت کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس امر پر زور دیا کہ حکومت کو اپنی مداخلت ترک کرکے سماج کو اپنی دوبارہ تنظیم رضاکارانہ بُنیادوں پر کرنے کی اجازت دینی چاہئے۔ کلیسا کو ختم کر دینا چاہئے۔ تعلیم کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلّق نہیں ہونا چاہئے۔ سزا کی جگہ ترغیب سے کام لیا جائے۔ شادی کی جگہ آزادانہ ملاپ ہو۔ حلف اور ٹھیکے ختم کردئے جائیں۔ اور جائداد کی دوبارہ تنظیم اس انداز میں ہونی چاہئے کہ ہر شخص اپنی ضروریات مہیّا کر سکے۔ گاڈون نے انفرادیت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ سیاسی ادب میں سب سے زیادہ انتہائی ہے۔

جیرمی بنتھم (۱۸۳۲-۱۷۴۸ء) ایک دوسرا سیاسی مصلح تھا۔ اسکی انتہا درجہ کی بے ضرر زندگی پر یہ قدیمی کہاوت پوری اُترتی ہے کہ "خدا کے پیارے جوانی ہی میں مرجاتے ہیں"۔ وہ مسلسل ساٹھ سال تک تصنیف میں مشغول رہا۔ اسکی اسّی کے قریب کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور ایک سو پچپن کتابوں کے مسوّدے ابھی تک یونیورسٹی کالج لندن کے محرابی کمروں میں پڑے ہوئے اشاعت یا آتش کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کی دو اہم ترین سیاسی کتابیں "حکومت پر ایک اجمالی نظر" (۱۷۷۶ء) اور "نظریۂ اخلاق و قانون سازی" (۱۷۸۹ء) ہیں۔ اسکی شہرت کا پہلا سبب یہ ہے کہ اس نے متروک افادیت کو اخلاقیات میں جامع طور پر دوبارہ مرتب کیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نے اس افادیت کے نظریہ کو بالکل غیر منطقی طور پر سیاسیات میں استعمال کرتے ہوئے یہ اصول وضع کیا ہے کہ حکومت کا منتہائے مقصود کثیر ترین تعداد کے لئے کثیر ترین مسرّت کا حصول ہے۔ اگرچہ بنتھم کی انفرادی اخلاقیات کی "ہے" ([illegible]) اور اس کی قومی سیاست کی "چاہئے" ([illegible]) کے امتیاز کی خلیج کو کسی ٹھوس منطق سے پاٹا نہیں جاسکتا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ برطانی ترقی پسندوں کے لئے جو منطقی گہرائیوں کو اندھا دھند عبور کرسکتے ہیں بنتھم کا نظریہ اصلاح کا گراں بہا معیار ہے "کثیر ترین مسرّت" کے اصول کے تجزیہ نے اٹھارویں صدی کے اوّلین دور کے فلسفیانہ ([illegible]) انتہا پسندوں کو لازمی اصلاحات کی ایک بڑی تعداد — یعنی انتخابی، پارلیمانی، آئینی اور قانونی اصلاحات — کے حصول میں کامیاب کردیا۔ (پروفیسر مہیرن شا)

دُکھ سُکھ

ایشیا

دوسرا باب

فسانے و ڈرامے

بابتہ فروری ۱۹۴۲ء

تہذیب کا پہلا سبق

(از للتادیوی)

"ننھو! ننھو!! ارے او ننھو بولتا نہیں" لچھمی آپانے چلاکر کہا: ہائے ہائے!! ارے کتنا گذرا ہے تو"۔ "بابو جی بلا رہے ہیں سریش بابو کے ساتھ کھیلنے کیلئے ہاتھ منہ دھوکر جلدی سے آ"۔ ننھو کا منہ مسرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا، وہ خوشی میں نل کی طرف پلٹا، ہاتھ دھو رہا تھا اور دل میں سوچتا جاتا تھا "میں بابو جی کے ساتھ کھیلوں گا۔ اچھے اچھے کھلونے ہوں گے۔ گیند۔ بلا۔ لکڑی کا گھوڑا۔ بڑی سی ہولڑ، پھر بی بی جی ٹوٹے ہوئے سب کھلونے مجھے دیدیا کریں گی"۔...... وہ ایکدم چلا اٹھا: "اری چندرا دیکھ تو میں بابو جی کیساتھ کھیلنے جا رہا ہوں" چندرا کے جواب نہ دینے پر ننھو جھنجلا گیا" تو جل گئی ہوگی چڑیل نہیں توکہیں کی" یہ کہتا ہوا وہ کوٹھی کی طرف بھاگ گیا۔

ننھو پرکاش جی کو پرنام کرکے کھڑا ہوگیا۔ انھوں نے کہا "ننھو آج سے تو بابو کے ساتھ کھیلا کرے گا۔ اب جا اُن کے ساتھ گھاس میں جاکر کھیل"۔ آپا، سریش جس کی عمر تین سال تھی اور ننھو جو سریش بابو سے دو تین سال بڑا تھا ان کی طرف چلے گئے۔

پرکاش نے سرلا سے کہا "جب گھر میں ایک ہی بچہ ہوا ور کوئی دوسرا بچہ اُس کے ساتھ کھانے کھیلنے کو نہ ہو تو بچے کے مزاج میں خودغرضی آجاتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ کوئی بچہ اُس کے ساتھ ہر چیز اور ہر بات میں شریک رہے"۔ سرلا بولی "ہاں کہتے تو ٹھیک ہو اب میں بھی اس کا خیال رکھوں گی۔ سریش کو تو اب ایک دو سال میں اسکول بھی بھیجنا ہوگا۔ تم نے کوئی اچھا سا اسکول بھی اُس کے لئے تلاش کیا؟" پرکاش "ابھی تو ایک دو سال اسکو گھر پر ہی تھوڑا بہت پڑھائیں گے، بھئی میرا تو دل اسکو دہرہ دون بھیجنے کو چاہتا ہے۔ سرلا" ارے اتنی دور!!؟" پرکاش "بہت دور کہاں ہے اور اگر ہو بھی تو کیا؟ بچے کی بھلائی کی خاطر دل پر جبر تو کرنا ہی پڑتا ہے"۔

ننھو اور سریش دونوں بہت خوش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کی تلاش تھی اور اب ایک دوسرے کو پاکر پھولے نہیں سماتے۔ سریش کو دیکھ کر ننھو کی آنکھیں جوش مسرت سے چمک اٹھتیں اور ننھو کو دیکھ کر سریش کے معصوم چہرہ پر رونق آجاتی۔ گھنٹوں یہ دونوں اور لچھمی آپا گھاس پر درخت کے سایہ میں بیٹھے کھیلا کرتے۔ لچھمی کہانی کہتی دونوں بہت دل لگاکر سنتے کبھی کبھی شرارت سوجھتی تو کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ سوال کرکرکے لچھمی کو تنگ کرتے اور اپنی کامیابی پر دونوں مارے ہنسی کے لوٹ جاتے۔ کوئی چیز گھر میں آتی تو سریش ننھو کو ضرور دکھایا کرتا اور ننھو بھی اپنے گھر کی ساری داستان جب تک سریش سے نہ کہہ لیتا اس کا دل ہلکا نہ ہوتا

۲۹ وقت گذرتا گیا اور دیوالی آئی، ہولی آئی، کئی اور تہوار منائے گئے۔ سریش کی وجہ سے ننھو کا گھر بھی اب ان تہواروں پر بھر جاتا۔ وہ گودی بھر بھر کر کھیلیں اور کھانڈ کے کھلونے اور پھل لایا کرتا۔ ننھو کیلئے سریش بابو کسی دیوتا سے کم نہ تھے۔ لیکن دو محبت کرنیوالے دل ہمیشہ ایک جگہ کیسے رہ سکتے تھے؟ وہ زمانہ بھی قریب آگیا جب سریش الہ آباد سے ڈیرہ دون ایک نئے اور بہت ہی مہذب اسکول میں عمدہ تعلیم بہتر تربیت کیلئے بھیجے جانیوالے تھے۔

ننھو نے یہ خبر سنی اور اس کا دل بیٹھ گیا۔ سریش بابو کے ساتھ اُس کی خوشیوں کا خاتمہ ہونیوالا تھا۔ اس کے گھر میں بہار آنے بعد خزاں آنیوالی تھی اس کے دل کی کلی ابھی پوری طرح کھلی بھی نہ تھی کہ مرجھا گئی۔ وہ سوچا کرتا کہ سریش کے جانے کے بعد اسکو کوٹھی میں کون جانے دیگا۔؟ اور پھر یہ چیزیں اُس کو کہاں میسر آئیں گی۔ یہ سب وہ برداشت کرلیتا لیکن سارے دن وہ اکیلا کیا کرے گا؟ کس کے ساتھ کھیلے گا؟ اور کس سے اپنی دل کی باتیں کہے گا۔!؟ آخر ایک دن سریش کو پرکاش لیکر چلے گئے۔ ننھو بہت رویا۔ کئی دن اُس نے روٹی نہیں کھائی۔ اُس کا دل سریش کے بغیر کسی چیز میں نہیں لگتا تھا۔

کچھ دنوں وہ یونہی مغموم رہا پھر اسکو خیال آیا کہ سریش بابو چھٹی میں گھر

آئیں گے۔ ایک خوشی۔ ایک اُمید کی جھلک اُس کے دل میں پیدا ہوئی۔ ایک جھلک ہلکی سی پرچھائیوں کی طرح جو مدھم دھندلکے میں نمودار ہو کر کھو جائے۔

آخر وہ سریش کے آنے کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ ایک دن اُس نے باغ کے ایک کونے میں مٹی کا ایک گھر بنایا۔ گھروندے کے پاس گملے سجائے اور دل میں کہنے لگا "بابو اس کو دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے اور جب میں کہوں گا آپ کے لئے بنایا ہے تو وہ مجھ سے لپٹ جائیں گے"۔ اس کو پھر کچھ خیال آیا ایک مٹی کا پُتلا بنا کر اُس نے دروازے پہ لگا دیا۔ گویا نتھو سریش کے گھر کی دربانی کر رہا تھا۔ نتھو نے اپنے باپ سے کہہ کر کئی غلیلیں بنوائیں۔ بہت سی شیشے کی گولیاں جمع کیں۔ غرض جو چیز وہ اچھی سمجھتا سریش کیلئے رکھ دیتا۔ پڑوس کے بچوں سے کھلونے چھین لاتا اور کہیں کونے میں چھپا دیتا۔ جیسے جیسے سریش کے آنے کے دن قریب آتے گئے نتھو کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں اور اُس کے اضطراب میں ترقی ہوتی گئی۔

ایک دن اسکو خبر ہوئی کہ سریش بابو کل صبح کی گاڑی سے آ رہے ہیں۔ نتھو نے ایک بار ساری چیزوں کو صاف کیا اور اُن کے استقبال کیلئے تیار ہو گیا۔ موٹر کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔ نتھو ایک جھاڑی کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ اُس نے
۴۰ مالن سے پوچھا "اماں بابو جی آ گئے میں جاؤں نا!؟" "ارے ٹھہر ذرا، ٹھنڈے ہو لیں، بی بی جی کے پاس بیٹھیں تب جائیو" — "اری اماں دیکھ تو بابو جی کتنے سُندر لگ رہے ہیں — میں بھی اُن سے ایک جانگیہ لیکر پہنوں گا" اُس نے چلّا کر ماں سے کہا۔ نتھو کو وہ پانچ دس منٹ جو سریش کو آنے اور اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھنے میں لگے پہاڑ ہو گئے۔ آخر کو اُس سے نہ رہا گیا، وہ مسکراتا ہوا برآمدے کی طرف چلا ——

سریش نتھو کو بھولا تو نہ تھا لیکن اب وہ اپنے اسکول کے لڑکوں سے زیادہ مانوس تھا۔ وہ صاف تھے، انگریزی بولتے تھے اور سریش کو بابو جی کی جگہ "مسٹر پرکاش" کہہ کر پکارتے تھے۔ نتھو نہ جانے کتنے ارمان اور اُمیدیں اپنے دل میں لئے پر نام کر کے سریش کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سریش نے نتھو کو دیکھا اور نظریں نیچی کر لیں۔ وہ کتنا میلا تھا۔!؟ اُس کے ناخن، دانت، اور بال۔ سریش کو متلی محسوس ہوئی۔ ہائجین کے ماسٹر کے فقرے اُس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ نتھو کا چہرہ اسوقت ایک مصور کیلئے بہترین موڈل تھا۔ ارمان! امیدیں!! مسرت!!! اور حسرت۔ وہ منتظر تھا کہ سریش اس کا ہاتھ پکڑ کر باغ میں بھاگ جائیگا۔ اور نتھو اُس کو وہ سب چیزیں دکھائے جو اُس نے اتنی محبت اور محنت سے سریش کے لئے بنائیں یا جمع کی ہیں۔ لیکن سریش بہت سنجیدہ بنا اپنی ماں کے قریب بیٹھا رہا۔ اُس نے دوبارہ نتھو کی طرف دیکھا تک نہیں۔

سرلا نے ایک روپیہ نتھو کو دیتے ہوئے کہا "لے! بابو جی دے رہے ہیں مٹھائی کھانا۔" نتھو کھو سا گیا وہ کبھی پرکاش کو دیکھتا کبھی سرلا کو اور کبھی سریش کو۔ "لے نا!! بڑے دماغ ہو گئے ہیں تیرے تو۔" نتھو نے روپیہ لے لیا جیسے کسی نے ایک دہکتا انگارہ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا ہو۔ "چل ہٹ یہاں سے اب کیا سر پر کھڑا رہے گا۔!؟" لچھمی نے کہا۔ سریش نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اتنی دیر تک نتھو کے میلے کپڑوں کی بو نہ جانے کیسے برداشت کر رہا تھا۔ اور نتھو بدبخت نامراد نتھو۔ گردن جھکائے آنسو پونچھتا ہوا اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔

بے زبان

ڈاکٹر رشید جہاں

صدیقہ بیگم کی شادی میں بہت دقتیں پیش آرہی تھیں۔ اصل نسل کی سیدانی تھیں۔ باپ اچھے خاصے کھاتے پیتے خوشحال تھے۔ لیکن پھر بھی صدیقہ بیگم کی شادی ابھی تک نہ ہوسکی تھی تیئیس سال عمر ہوچکی تھی۔ ان کی اماں احمدی بیگم کی راتوں کی نیند تک اڑگئی تھی۔ صدیقہ بیگم اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ دو بڑی بہنوں کی شادی ہوچکی تھی۔ اُن کی شادیوں میں کوئی مشکل پیش نہ آئی تھی۔ بڑی لڑکی کی شادی سترہ سال میں ہوئی۔ اور منجھلی تو صرف چودہ ہی سال کی تھی۔ یہ منجھلی بہن سے بارہ سال چھوٹی تھی اور بھائی سے دس سال۔ اب سب بہن بھائی شادی شدہ بچوں والے تھے۔ اور یہ تیئیس ۲۳ سال کی عمر میں ابتک کنواری تھیں۔ پیغاموں کی بھی کمی نہ تھی۔ قریب کے رشتہ میں اول تو کوئی لڑکا ہی نہ تھا۔ اور جو تھے یا تو وہ اتنے غریب تھے کہ ان کا خیال ہی ناممکن تھا یا جو ایک آدھ کھاتے پیتے تھے تو ان لڑکوں کے چال چلن ٹھیک نہیں تھے غیروں کے جو پیغام آتے تھے۔ کہیں تو حسب نسب نہیں ملتا تھا۔ کہیں لڑکا عمر دار کہیں دوہا جوڑا، کہیں بیوی بچوں والا۔ اور جو دو ایک پسند بھی آئے تو وہاں شرطیں اور تھیں۔ کہیں تو لڑکے والے کہتے تھے کہ ہم پہلے لڑکی کو دیکھ لیں پھر بات پکی کرینگے۔ کہیں پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈتے تھے۔ غرضکہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بات نکل آتی تھی۔ ہر طرف لڑکے لڑکیاں بیاہے جارہے تھے۔ لیکن صدیقہ بیگم ابھی تک کنواری ہی بیٹھی تھیں۔

برسوں سے ایک نئی لہر دلّی کے کونے کونے میں گھوم رہی ہے۔ لیکن پھر بھی بہت گھر ایسے مل جائیں گے۔ جہاں نہ کسی آندھی کا گذر ہے اور نہ کسی زلزلہ کا اثر ہے۔ وہی وضعداری۔ وہی باہر کی بیٹھک وہی شام کا مجمع اور وہی پرانا اندرون خانہ چل رہا ہے۔ اسکول کی تعلیم تو خیر حامد حسن کے یہاں کیا ہوتی۔ اُن کے ہاں تو لڑکے تک نے خدا کے فضل سے صرف علم دین ہی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پہلے حامد حسن نے اس کو قرآن حفظ کردیا۔ پھر فارسی پڑھوائی اور پھر جب وہ بڑا ہوگیا تو دیوبند بھیجکر عالم بنوایا۔ اور اب وہی سارے گھر کی دیکھ بھال اور جائداد کا انتظام کرتا تھا۔ شادی بھی اُسکی شریف اور اچھے امیر گھرانے میں کردی تھی۔ اور اب اللہ رکھے چار بچوں کا باپ تھا۔ حامد حسن صاحب کا نام بہت بڑا تھا۔ خاندان بھی ہزاروں میں ایک تھا۔ لیکن پھر بھی صدیقہ بیگم کی شادی ابھی تک نہ ہوسکی تھی۔

لڑکیوں کی تعلیم کے حامد حسن بہت خلاف تھے۔ قرآن شریف۔ نماز اور دو ایک دینیات کی کتابیں ان کو پڑھادی گئی تھیں۔ اور حامد حسن اس سے زیادہ تعلیم کے حامی نہ تھے۔ باپ دادا کے نام پر جان دینے والے۔ اور اُن کے بنائے ہوئے رسم ورواج کی پابندی اسی طرح کرتے تھے جس طرح، ڈپٹی کمشنر بہادر کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ کہاں مذہب ختم تھا اور کہاں رسم ورواج شروع ہوتا تھا۔ اس کی چھان بین انھوں نے کبھی نہ کی تھی اور نہ کرنا چاہتے تھے۔ بس جو شرافت کا ایک معیار بزرگ بناگئے تھے وہی ان کا پیمانہ تھا۔ اُسی سے ہر چیز کی ناپ تول کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی دنیا الگ بنالی تھی۔ جسمیں انھیں کے ہم خیال دو چار آدمی اور شریک تھے۔ یہ لوگ آپس میں مل کر محفل جماتے۔ حقہ چلتا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے اور ساتھ ہی پُرانے زمانے کی چمک اور آجکل کے زمانے کے اندھیرے پر رائے زنی کرکے آنسو بہایا کرتے تھے۔ حامد حسن تھے بہت خوش قسمت۔ بیوی بھی بالکل ہم خیال ملی تھیں۔ وہ بھی اُنیسویں صدی کا ہو بہو نمونہ تھیں۔ ڈیوڑھی پر دربان بٹھاتی تھیں کہ کوئی غیر شخص اندر نہ گھس سکے۔ نو برس کا لڑکا اندر نہ جاسکتا تھا۔ اور تو اور ہر عورت کو بھی اندر گھر میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ پھر کسی کے یہاں آنا جانا بھی وہ بہت بُرا خیال کرتی تھیں۔

بھائی سے اس بات پر لڑائی ہوگئی تھی کہ لڑکیوں کو گھر پر بھی تعلیم نہ دو۔ ایک بھتیجی سے اپنے لڑکے کی منگنی کی تھی۔ لیکن اس بات پر کہ لڑکی نے انگریزی

بڑھنی شروع کروائی گئی تو منگنی توڑ دی اور کہا کہ میں گھر میں ٹھولانا چاہتی ہوں۔ میم صاحب نہیں۔ اپنی بات اور اُن کی ایسی پکی تھیں کہ پندرہ سال سے زیادہ ہو گئے تھے اکلوتے بھائی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔

صدیقہ بیگم کو اُن کی والدہ احمدی بیگم نے بالکل بھونرے میں پالا تھا قریب قریب رشتہ داروں نے لڑکی کی صورت ٹھیک سے نہ دیکھی تھی۔ ہر اپنی ملنے جُلنے والی سے صدیقہ کا پردہ کرواتی تھیں۔ جس طرح کہ خود اپنے کنوارپن میں رہی تھیں اُسی طرح صدیقہ کو بھی رکھتی تھیں۔ بے مانگ کی چوٹی کرواتی تھیں۔ عطر مہندی حتیٰ کہ پھول چھونے تک کا حکم نہ تھا۔ ہر ممکن کوشش اُسکو بچہ اور انجان بنا کر رکھنے کی کرتی تھیں۔ نہ کوئی اُس کی سہیلی تھی نہ کسی سے ملنا تھا، نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ سارا دن بیکاری میں گزر جاتا تھا۔ کبھی کچھ سی لیا تو سی لیا ورنہ لیٹ کر سو گئی۔ اٹھ کر نماز پڑھ لی۔ کبھی کبھار کچھ پکا لیا۔ بس یہی اُس کا مشغلہ تھا۔ بہنیں تھیں تو وہ اوّل عمر میں اتنی بڑی اور پھر اتنی دور کہ کبھی کبھار اُن سے ملنا جلنا ہو جاتا تھا۔ لیکن اب اُن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اور اب وہ عورتوں میں برابر کی ہو کر بیٹھتی تھیں۔ صدیقہ کے خیال میں وہ آزاد تھیں۔ اور اُن کو دیکھ دیکھ کر یہ رشک کھاتی تھی۔ یہ پنجرے میں بند ہوئی ہوئی گھبراتی تھی۔ اکثر گھبرا گھبرا کر دعائیں مانگتی کہ لے خدا میری بیڑیاں بھی کاٹ تک

اور جب کبھی رشتہ کی پھوپھی رضیہ بیگم آ جاتیں تو اُن کی طرف دیکھ کر وہ اور ڈر جاتی تھی کہ کہیں اُس کی بھی یہی حالت نہ ہو۔ رضیہ بیگم کوئی ساٹھ سال کی کنواری عورت تھیں۔ اب تک اُن میں ایک جھجک تھی۔ اکثر جگہ ان کو دیکھ کر لڑکیاں اور نوعمر شادی شدہ عورتیں آپس میں کانا پھونسی شروع کر دیتی تھیں کہ رضیہ بیگم کو اپنی اس کمی کا بہت احساس تھا۔ اور وہ بیچاری خود ہر جگہ کم آتی جاتی تھیں۔ اور جب کہیں جاتیں بھی تو کوشش کر کے ایسی جگہ بیٹھتیں کہ اُن پر لوگوں کی نگاہ کم پڑے۔ پھر وہ اپنی سگی پھوپھی ذکیہ خاتون کی طرف بھی دیکھتی تھی جو شادی کے مہینہ بھر بعد بیوہ ہو گئی تھیں۔ وہ نہایت دلیرانہ ہر جگہ آتی جاتیں۔ جو منہ میں آتا کہتیں بدقسمت ضرور تھیں لیکن کسی سے کم تر نہ تھیں۔ صادقہ اپنے دل میں ان دونوں عورتوں کو ملاتی تھی اور ہر دفعہ اپنی بیوہ پھوپھی کی زندگی کو ترجیح دیتی تھی۔

جب کبھی اماں یا ابا کو گُن گُن کرتے بات سُنتی یا اماں یا بھاوج کے کسی جملہ سے سمجھ جاتی کہ آجکل ایسا ویسا ذکر ہے تو امید کچھ بنتی اور پھر جب سب خاموش ہو جاتے تو یہ سمجھ جاتی کہ پھر انکار کر دیا گیا۔ دل ہی دل میں ماں پر جھنجلا پڑتی اور اس کی آنکھوں میں رضیہ پھوپھی کی مسکین اور شرمندہ صورت پھر جاتی اور وہ کہتی "آخر اماں اتنی شرطیں کیوں لگاتی ہیں۔ کہیں مہر کی شرط ہے تو کہیں خرچ پاندان پر جھگڑا ہے۔ کسی کے باپ دادا میں نقص ہے۔ تو کسی کی نانی میں۔" لیکن کہتی تو کس سے کہتی۔ ماں تو ماں تھی کوئی سہیلی نہ تھی۔ باپ سے تو اُس کی رُوح کانپتی تھی۔ بھائی سے بھی جھجک تھی۔ بھاوج غیر تھی۔ گھر میں جو مامائیں تھیں وہ بھی پُرانی نہ معلوم کس زمانے کی تھیں۔ عجیب مصیبت میں جان تھی!

آج صدیقہ بیگم پھر اپنے کمرے کا دروازہ بند کئے کواڑ سے کان لگائے اپنی اماں اور بی صغرا بیگم کی باتیں سُن رہی تھیں۔ صغرا بیگم ایک شریف گھرانے کی غریب بیوہ تھیں۔ غربت سے لاچار ہو کر رفتہ رفتہ مشاطہ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ چونکہ شریف عورت تھیں ہر گھر میں بے روک ٹوک آتی جاتی تھیں۔ تو رشتہ کروانے میں ان کو آسانی ہو جاتی تھی۔ صدیقہ بیگم جیسے جیسے ماں کی باتیں سُنتی جاتی تھیں تیوری چڑھتی جاتی تھی۔ احمدی بیگم جل بھن کر کہہ رہی تھیں: "اوئی بوی، یہ کہاں کا نیا طریقہ شریفوں میں نکلا ہے کہ لڑکی کو دیکھتے پھرو۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج نہیں۔ ہماری شادی ایسے ہی ہوئی۔ میری اللہ رکھے دونوں بڑی لڑکیاں بیاہی گئیں۔ بہو آئی۔ کیا سارے ملک کے شریف ہی اجڑ گئے جاکر لڑکے کی اماں سے کہنا کہ بوی کیا ساری شرافت اشرم دھو کر پی گئیں۔ اپنی لڑکیوں کی شوق سے نمائش لگائیں، سودا کریں، ہماری لڑکی کانی کھدری سب کچھ ہے لیکن ہے حامد حسن کی بیٹی اور مجید حسن کی پوتی۔ پر دو پشت ہمیں اسی شہر میں گذر گئیں کوئی ہم ایسے گرے پڑے نہیں ہیں کہ ہم کو نہیں جانتا۔ ہمارے ہاں کی لڑکیاں ملتی کہاں ہیں۔ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جو یہاں کی چوکھٹ چڑھتے ہیں۔ ہم تو اپنے نام پر مرتے ہیں۔ لے ہاں میں سب کچھ جانتی ہوں۔ لڑکے ہی کی طرف تو دیکھ رہی ہوں۔ اکیلا لڑکا ہے۔ چار سو کا گریڈ اُس کا ہے۔ ڈھائی سو کا نوکر۔ خاندانی ہے۔ نیک۔ میں سب کچھ ماننے کو تیار ہوں لیکن یہ شرط میں کیسے گوارہ کروں کہ وہ لڑکی کو دیکھ جائیں اور پھر پیغام دیں۔ جو وہ دیکھ کر گئیں اور کہہ دیا کہ ہمیں لڑکی نہیں پسند تو اُن کا تو لڑکا ہے۔ اُن کا کیا بگڑے گا۔ میں تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ مجھے عمر بھر کنوارا رکھنا منظور لیکن یہ مول تول تو مجھ سے نہ ہو گا۔"

"لے ہے بیگم تم تو بات بھی نہیں سُنتیں۔" "بات کہاں سنوں،" احمدی بیگم بات کاٹ کر بولیں۔ مجھ سے تو افسر جہاں جیسی بیٹے تیوری نہیں بھگتی

سکھے کو تو وہ میری عزیزہ بہن لیکن جو کوئی جھوٹے کیے تو وہ بیچوں لڑکیاں دکھا دیتی ہیں منجھلی لڑکی کو تو سُنتی ہوں کہ چار پانچ جگہ دکھایا۔ جب کہیں کسی نے جاکر قبولا۔ نا بُوا مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا نہ میں لڑکے کی ماں کو دکھاؤں نہ اس کی بہنوں کو

" اتنے میں ایک ماما خبر لائی کہ رنگ محل سے سواریاں آئی ہیں۔ اور برقعے مانگے ہیں۔ جلدی سے دو چادریں پلنگ پر سے اٹھا کر ڈیوڑھی کی طرف چلی اور ادھر احمدی بیگم بھی قرینے سے ہو کر بیٹھ گئیں۔ اور صغرا بیگم سے بولیں۔ اب ان کے سامنے ساری بات کھول دینا "

صغرا بیگم نے جواب دیا " اے بوا کیا میں نے چونڈا دھوپ میں سفید کیا ہے؟"

چار بیویاں دو ادھیڑ عمر کی جو بہنیں معلوم ہوتی تھیں اور دو جوان عورتیں صحن سے ہو کر قریب آئیں۔ سب ایک دوسرے سے گلے ملیں اور پھر فرش پر بیٹھ گئیں بیٹھتے بیٹھتے ایک بولیں " واہ بہن جمعہ کو خوب میلاد میں آئیں "

دُلہن کے چھوٹے بچے کا جی بہت ماندا تھا۔ اور پھر مُغلانی بھی آج کل نہیں ہیں۔ ایسا بیاہ بھتیجے کا کرنے گئیں ہیں کہ مہینہ بھر ہو گیا شکل ہی نہیں دکھائی۔ صدیقہ کی طبیعت الگ ماندی ہے۔ سر میں درد ہے اور لیٹی ہے۔ اے حشمت تم کیوں دُبلی ہو رہی ہو۔ ابھی تو شادی ہوئی ہے خوشی کے دن ہیں۔

کیوں آپا صغرا یہاں کیا کر رہی ہو۔ صدیقہ بیگم کا کہیں سے پیغام لیکر آئی ہو۔" حشمت کی بڑی بہن مسرت نے پوچھا

" اے بیوی جہاں بیری ہو گی وہاں پتھر بھی آئیں گے۔ صغرا بیگم نے تڑاق سے جواب دیا۔

" تو خالہ جان پھر کیا ارادہ ہے۔ صدیقہ کی شادی کا تو بہت ہی ارمان ہے"

مسرت بولیں

" لو بوا شادی کرنا مذاق ہے اور خاص کر آجکل۔ اول تو وہ گھرانے گھرانے ہی نہیں رہے۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ میل ہوتا جاتا ہے۔ نہیں بُوا کسی خاص کا ذکر نہیں کرتی ہوں۔ لیکن کیا بتاؤں دِلّی میں ایک نئی وبا اور نکلی ہے کہ لڑکی کو دکھاؤ۔ آخر ہماری بھی تو شادیاں ہوئی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں اور تو اور یہ بُوا صغرا کہتی ہیں کہ عورتوں کو دکھانے میں کیا ہرج ہے۔ میں کہتی ہوں کہ ہرج ہی نہیں۔ جو یہ صدیوں سے ہم خاندان شرافت بنا کر بیٹھتے ہیں تو وہ اسی دن کے لئے۔ آج کل تو نہ شرافت کی قدر نہ خاندان کی قدر بس نہ پیسہ ہو۔ اور موئی گِٹ پٹ ہو۔ اب ہماری بہن نے جو حشمت کو دکھا کر کیا تھا تو حشمت کون سی خوش ہیں۔

" کیا بُرائی ہے حشمت کے میاں میں۔ اب یہ نہ خوش ہوں تو ان کا اپنا قصور ہے۔ انھیں کس چیز کی کمی ہے۔ خاطر محبت کرنیوالا۔ پیسہ والا۔ اور کیا چاہیئے۔ اور یہ کہتی ہیں کہ اماں آپ میرا تو ذکر نہ کیا کیجئے۔ آپ کو جو کچھ کرنا تھا کر چکیں۔ آپ کیا جانیں سوکن کا ساتھ۔ میاں کہتا ہے کہ میں اس بیوی کا منہ نہ دیکھوں لیکن ان کو سوکن کا بڑا درد آتا ہے۔ کہیں سنیں ہیں بوا تم نے ایسی اُلٹی باتیں" مسرت کی اماں بولیں

" اماں تم میرا ذکر ہر جگہ کیوں لے بیٹھتی ہو۔ خالہ جان بتائیے صدیقہ کی بات کہاں لگ رہی ہے؟

" ابھی تو بیٹی کہیں ٹھیک نہیں ہوا۔ جہاں ایک آدھ لڑکا اچھا نظر آتا ہے تو وہی دکھانے دکھانے کا جھگڑا اور پھر مزہ یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ پہلے دیکھ لیں پھر بات پکی کریں گے۔

اے بُوا مجھے تو تم کہنے بیٹھ گئیں کہ حشمت کو دکھا دیا۔ میں نے تو عورتوں ہی کو چپکے سے دکھایا تھا۔ لیکن اُن کو تو کہو جو مردوں کو بھی دکھا دیتی ہیں۔

" اری وہ کون ہوتی ہیں؟ احمدی بیگم نے حیران ہو کر پوچھا " کون ہوتی ہیں۔ صفدر جہاں کو تم نہیں جانتیں۔ انھوں نے تو بیٹی کو لڑکوں تک کو دکھا دیا۔ سامنے کواڑوں میں سے جھکوا دیا۔

" ہے ہے!" کہہ کر احمدی بیگم نے سینہ پر زور سے ہاتھ مارا اور لہرا کر بولیں " اوئی زمین نہ پھٹ گئی! میں تو بوا صدیقہ کو دو پیسہ کی سنکھیا کھلا کر سُلا دوں لیکن یہ کام مجھ سے نہ ہو۔ اے کیا آمنے سامنے بٹھا دیا تھا۔ شاباش ہے اس بے شرمی کو! لڑکی کو کمرے میں بٹھا کر لڑکوں کو کواڑوں سے جھکوا دیا۔ وہ لڑکا تو خیر راضی ہو گیا۔ اور بوا جو وہ راضی نہ ہوتا تو پھر اسی طرح دوسرے کو تیسرے جھکواتی چلی جاتیں۔ میرا تو ایسی باتیں سُن کر رُواں رُواں کانپتا ہے۔ توبہ اللہ، توبہ خاک چاٹ کر کہتی ہوں"

" اے ہے بیگم تم رہتی کس دُنیا میں ہو۔ کس گھر میں لڑکیاں نہیں دکھائی جا رہیں۔ صفدر جہاں نے کیا جو ہزاروں کر رہے ہیں۔ آج کل تو وہ وہ طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں کہ سُن کر اوسان خطا ہوتے ہیں۔ محمود خاں کے لڑکے کا پیغام ایک جگہ گیا۔ لڑکا اڑ گیا کہ بغیر دیکھے نہ کروں گا۔ لڑکا اچھا تھا۔ گھر پر بُلا کر دکھانا مناسب نہ سمجھا۔ ایک انگریزی دوکان پر لڑکی کو لیجا کر دکھا دیا"

صغرا نشاط بولیں

" اور اُس نقندری نے طباق سا مُنہ کھول کر دکھا دیا! احمدی بیگم

جلکر بولیں " ہاں بوا ٹھیک ہے جب اماں ہی کو شرم نہ آئی اور بیٹی کو دکان پر لیکر پہونچ گئیں تو وہ تو پھر پڑھی لکھی تھیں - ہاں بوا تو پھر میموں میں کیا بُرائی ہے - وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈال لیتی ہیں - اب بوا یہاں بھی یہی ہو جائیگا "

" اے لو وہ تو خدا کے فضل سے آپ کی بھاوج نے سُنا ہے کہ شروع کر دیا ہے سنجھلی لڑکی کی شادی جس طرح کی ہے وہ تو بہت ہی شرمناک ہے -

" ہاں وہ تو جو نہ کریں کم ہے - کنواری لڑکیوں کو گھر سے دُور مدرسوں میں لڑکوں کی طرح بھیجنا - سائیکلوں پر چڑھوانا - بھلا اُن کا گذر میرے گھر میں کہاں ہوتا اسی لئے تو میں نے بھائی بھاوج سے بالکل قطع تعلق کر لیا - لیکن یہ تو بتاؤ کہ شادی ہوئی کیسے ؟"

" بالکل لڑکی کی پسند سے - لڑکی نے کہہ دیا کہ میں تو کروں گی تو اس سے اماں باوا بھی خوش ہو گئے - وہ گھر میں سُنا ہے آتا جاتا رہتا تھا - سال بھر بعد جا کر کہیں شادی ہوئی "

" اور مجھ سے جو کوئی پوچھے تو ہونا بھی چاہیئے " حشمت بولیں " اوئی لڑکی اللہ اللہ کر - شرم نہیں آتی - کہیں میری صدیقہ کے سامنے ایسی باتیں نہ کر بیٹھنا - جب ہی بیاہی تیاہی لڑکیوں سے میں اس کا ملنا پسند نہیں کرتی - اور بُوا میرا تو یہ سب سُن سُن کر دل دہل جاتا ہے - پوتی کے کرتوت دیکھ کر ہمارے ابا میاں کی رُوح کیا کہتی ہوگی - میں تو اپنی بھاوج کے ڈھنگ شروع ہی سے سمجھ گئی تھی - سولہا سال ہو گئے نہ میں نے اُن کی صورت دیکھی ہے - اور نہ خدا مجھ کو زندگی بھر دکھائے - اُن کی ذلیل باتیں سُن کر میں بس خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں - جو آج کہیں ابّا میاں زندہ ہوتے تو ان لوگوں کی مجال ہوتی کہ ایسی باتیں کرتے - اب سُنتی ہوں کہ میری بھتیجیاں

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

سڑکوں پر بے پردہ جُوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں - اولاد کا کیا قصور ہے - جیسا پالو گے ویسے ہی اٹھیں گے - اب ہمارے بچے ہیں مجال ہے کہ کوئی باپ کے سامنے ہُوں تو کر جائے - صدیقہ ہی کو لے لو - جہاں بٹھا دیا بیٹھ گئی - جیسا کھلا دیا کھا لیا احمدی بیگم نے کہا اور اب تو جدھر دیکھتی ہوں یہی دیکھتی ہوں کہ لڑکیوں کو اس طرح نکال کر پھینکتے ہیں جیسے کوئی گندی نکال کر پھینکدے - ہمارے وقتوں میں برسوں ناک رگڑواتے تھے - جب کہیں جا کر بیٹی دیتے تھے - اور بوا بیٹی دیں تو دیں ساتھ ہی روپیہ کا وعدہ بھی کرتے ہیں -

" ہاں بہن ٹھیک کہتی ہو اب ہمارے گھر کے قریب حافظ جلال الدین کی بیوہ آکر رہی ہیں کوئی بیس لڑکیاں تو دیکھ چکی ہیں - ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نکال دیتی ہیں -

" کون حافظ جلال الدین ؟" صدیقہ بیگم کی اماں نے گھبرا کر بات کاٹی -

" سیّد ہیں - خاندان اچھا ہے - لڑکا بھی بُرا نہیں - لیکن اماں غضب کی ہیں " مسرت جہاں نے کہا اور یہی آپا صغرا ہی اُن کو چھ سات ، لڑکیاں تو دکھا چکی ہیں " " اوئی بوا صغرا ! تم ایسا پیغام میرے گھر میں لاتی ہو - شاباش ہے تمہیں " صدیقہ بیگم کی اماں نے کلمہ کی انگلی کو اوپر کے ہونٹ پر رکھ کر کچھ غصّہ اور کچھ حسرت سے کہا " اے ہے بیگم تم بھی کن کی باتوں ——————

صدیقہ بیگم جو ابھی تک کان لگائے ایک ایک لفظ سُن رہی تھیں ماں کا لہجہ سُن کر سب سمجھ گئیں - وہاں سے اُٹھیں اور دھڑ سے جا کے اپنے پلنگ پر گر پڑیں اور سسکیوں سے رُونے لگیں -

بابوجی مزدور چاہیئے

(مالتی دیوی)

گھنے کہرے کی دھندلی چھایا کو چیرتی ہوئی سردیلی اور اندھیری راتوں میں بھی جبکہ ساری امیر دنیا گرم ریشمی لحافوں میں پڑی آلھڑ نیند کی گود میں مست سویا کرتی ہے۔ سونی فضا کو گونجاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی گلیوں اور سڑکوں میں گاڑیوں تانگوں اور یکوں وغیرہ سواریوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے سائے انتہائی درد بھری امید اور دکھ بھری آواز میں پکار اٹھتے ہیں۔ بابوجی مزدور چاہیئے؟ دوڑتے ہوئے رامو کے قدم یکایک دھیمے پڑ گئے۔ اس نے سنا۔ گاڑی کے اندر سے آواز آئی نہیں چاہیئے۔ قدم دھیمے پڑتے پڑتے بھی نہ جانے کس لالچ سے اک ساتھ نہ رکے۔ پھر ایک کرخت تیز آواز گونج اوٹھی۔" ایک بار کہہ دیا نہیں چاہیئے۔ الفاظ گونج اٹھے "نہیں چاہیئے" رامو لوٹ پڑا۔

اس کڑاکے کی سردی میں جبکہ سنسار کے عیش پرستوں نے ایک رضائی کے اوپر دوسری رضائی اوڑھ لی تب ہڈی اور گوشت کے بنے رامو نے لاپرواہی سے بدن پر لپٹا ہوا پھٹا سا انگوچھا بھی اتار کر رکھ دیا۔ اب وہ مستعدی سے دوسری گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

یہی رامو کی زندگی تھی۔ یہی اس کی لگاتار رٹ تھی۔" بابوجی مزدور چاہیئے" انھیں الفاظ کے دم پر وہ کماتا تھا۔ تھکا ہارا رامو جب ان الفاظ کو دہراتا تو اسکی کمزور آنکھوں کے آگے امید بن کر تانبے کے کچھ ٹکڑے چمک اٹھتے۔ کچھ پیسے ہی اسکی امید تھے۔ اور ممتحن کے منہ سے ہاں یا نہیں سننا ہی اسکے امتحان کا نتیجہ تھا۔ چند پیسوں کیلئے کتنی کٹھن تپسیا اور کتنا کڑا امتحان تھا۔

امید اور نا امیدی کے اس طوفان کے ساتھ لڑتے لڑتے اس کے کتنے ہی برس بیت چکے تھے۔ رات کو جب گھپ اندھیرا پھیل جاتا تھا تب وہ چونکتا اور بڑی تدبیر سے کچھ پیسے کھونسے دکھ اور امید کیساتھ گھر کی طرف قدم بڑھاتا۔ لمبا راستہ گھنے کالے درخت اور پتھریلی تنگ پگڈنڈی۔ وہ اور زیادہ لمبے قدم بڑھاتا آگے پیچھے چاروں طرف اندھیرا۔ پر دور اس گہرے اندھیرے میں اس کے آگے مضبوط ہنستی ہوئی بیوی رد ھیا آجاتی اور پیروں سے لپٹے ہوئے بچے پکار اٹھتے "کالا لائے ہوئے ککو" رامو کے تھکے جسم میں بجلی کی طاقت دوڑ جاتی۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا گھر کی طرف بھاگتا۔ اسے دور سے ہی دیکھ کر بچے دوڑتے۔ وہ انھیں گودی میں اٹھا کر پیار کرتا اور پھر ہنستی ہوئی ردھیا اسے حقہ بھر کر دیتی۔ اپنی تکلیفوں کو چھپاتا ہوا رامو اسے ادھر ادھر کے کچھ قصہ سناتا۔ ردھیا ہنستی اور دھیرے دھیرے اپنی بھی دن بھر کی بیتی سنا جاتی۔ اس طرح دو محنتیوں کا دل ہلکا ہوتا۔ رات کو ردھیا اسے باجرہ کی موٹی روٹی دیتی۔ وہ خوشی سے کھا کر چل دیتا اور پھر دوستوں میں بیٹھ کر زور زور سے برہا اور ہولی گا۔ اتنا مست ہو جاتا کہ گھر بار سب بھول جاتا۔

رات کو رامو اپنے پھوس کے بستر پر پڑا خواب دیکھتا۔ وہ گاڑیوں کے پیچھے پیچھے چلا رہا ہے۔" بابوجی مزدور چاہیئے" پھر ملتے ہیں چار پیسے۔ ایکدم چار۔ رامو دعائیں دیتے کو منہ کھولتا۔ اسکا خواب ٹوٹ جاتا اور وہ بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھتا۔ جس وقت شریف کہلانیوالی دنیا خواب کی خوبصورت بستی میں گھوما کرتی ہے۔ اسوقت رامو کے قدم اپنی جانی پہچانی جگہ کی طرف بڑھتے اور روز کی طرح سواریوں کے پیچھے آواز گونج اٹھتی۔ بابوجی مزدور چاہیئے" کیسی عجیب رٹ تھی۔

* * * * * *

" اُف بابو کیا دیکھ کر نہیں چلتے ہو" رامو درد سے کراہ اٹھا۔ گاڑی میں سے ایک شاندار آدمی نے نکل کر ایک روپیہ رامو کے جلتے ہاتھ پر رکھ دیا۔ رامو مارے خوشی کے اپنا درد بھول گیا۔" نہیں بابوجی زیادہ چوٹ نہیں لگی ہے بھگوان آپ کا بھلا کرے" رامو نے جلدی سے لوگوں کی نظر بچا کر وہ روپیہ کمر میں کس کر آٹھ آٹھ گانٹھیں دیکر باندھ لیا۔ خوشی سے پاگل رامو نے سوچا آج وہ خوب

تاڑی پئے گا۔ رودھیا کتنی خوش ہوگی۔ نہیں نہیں تاڑی نہیں پیوں گا: یہ روپیہ رودھیا کو لال لال ساڑی خریدنے کو دوں گا۔ خوب کھلے گی" انہیں خیالوں میں غرق وہ گھر پہونچا۔ چمکتا ہوا روپیہ اُس نے جھٹ سے رودھیا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ رودھیا کھل پڑی اور جھٹ سے پوچھ ہی تو بیٹھی کہاں سے لائے۔ بات بنا کر رامو بولا "ایک امیر بابو کا بوجھ لادا تھا انھوں نے مہربانی کرکے دیا ہے۔" رامو ہیر کے اوپر سے پہیہ نکل جانے کی بات بھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا ہیر میں درد بڑھتا گیا۔ آخر رات میں درد اتنا بڑھا کہ رامو کو رودھیا سے اصلی حال کہنا ہی پڑا۔ ہیر سُوجکر بھیانک ہو رہا تھا۔ اور جسم جلکر انگارہ کی طرح دہک رہا تھا۔ ساری بات جان لینے پر رودھیا نے اُس روپئے کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اٹھا کر الگ رکھ دیا اور اس رحمدل بابو کو جسے کچھ گھنٹے پہلے اُس نے ان گنت دُعائیں دی تھیں کوسنے لگی۔

رامو کی حالت بگڑتی ہی گئی۔ اُسے مزدوری پر گئے قریب ایک ہفتہ بیت گیا۔ بیماری میں گھر کا ایک ایک پیسہ لگ گیا۔ بڑا لڑکا بھوک سے گھبرایا سا رہنے لگا اور چھوٹا لڑکا دُودھ کیلئے تڑپ گیا۔ رودھیا بے جان سی سب کچھ بھولی گاؤں کے دیوی دیوتاؤں کی مانتا مناتی۔ اور پھر رامو کی کھاٹ کا سہارا لے بیٹھ رہتی۔ جب رامو کو ہوش آتا تب وہ کہتا "کاہے رودھیا تو کا ہمرے ساتھ مری ہو؟" رودھیا مُنہ پر ہاتھ رکھ دیتی " ناہیں ہمار کھاتر بچن کی کھاتر ایسی بات جبان سے کاہے نکالت ہو" کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے آنسو کی دو بڑی بڑی بوندیں ڈھلک پڑتیں۔ وہ کھائے کیا جب گھر میں کچھ ہو تبھی نہ۔ اڑوسی پڑوسی کچھ پیسوں سے رودھیا کی مدد کرتے پر وہ سب پیسے دوائیوں میں خرچ کر دیتی۔

× × × × × × ×

آج رامو کی حالت زیادہ خراب تھی۔ روتی روتی رودھیا دیوی کے مندر میں دوڑی "دیوی مائی تو ہے چندری بھینیون"

ادھر رودھیا ماتا کو منا رہی تھی ادھر بڑا لڑکا دوڑا آیا۔

"مائی گجب ہوئ گوا" رودھیا نے آگے کچھ بھی نہ سُنا اور سیدھی گھر کی طرف دوڑی۔ وہ اپنے سہاگ کے لئے گھبرا اٹھی۔

جونہی اُس نے گھر میں قدم رکھا دیکھا کہ اُس کے ننھے پھول سے بیٹے کو لوگ باندھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ تعجب سے کھڑی رہ گئی۔ آنسو ایک بھی نہ ٹپکا۔

کیا موت کا آنا اتنا آسان ہے؟ اس کی آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ مانو یقین ہی نہ ہوا کہ یہ کیا ہو گیا۔ کس کی۔ کیسی لاش؟ اس کے دل کی دیوار میں ایک ایسی کیل آکر گڑ گئی جس کے گڑنے کی اُسے کبھی بھی اُمید نہ تھی۔ وہ رُو اٹھی۔ لاش چلی گئی۔ پر وہ اسی طرح آنکھیں نکالے ٹک ٹک اسی طرف دیکھتی رہی۔ آخر یقین کی بھی حد ہوتی ہے۔

بیہوشی میں رامو بڑبڑایا: "رودھیا کاہے ٹھاڑی ہے" رودھیا رامو کی طرف بڑھی اور پتھر کی مورتی کی طرح اسکی کھاٹ پر آکر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

دو دن بیت گئے۔ تیسری رات کو رامو کا جسم بھٹی کی طرح دہکنے لگا وہ درد سے بیتاب ہو کر چیخ رہا تھا۔ رودھیا بھوکی پیاسی خاموش ایک ٹک رامو کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ تیز مشین کی طرح نکلنے لگے۔ "دیوی تو ہے چندری بھینیون"

موت کا سایہ رامو کے چہرے پر پڑنے لگا وہ ہنسا "کاہے رودھیا دیوی تو ہے چندری بھینیون" ایک ایک لفظ قہقہے کیساتھ گونج اُٹھا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا تو ہے چندری بھینیون" رودھیا ڈر کر چارپائی چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اُس نے اپنے ہونٹوں کو کس کر بند کر لیا۔

× × × × × ×

رودھیا نے دیکھا۔ اُسی آنگن میں جہاں چند دن پہلے ایک ننھی سی لاش باندھی جا رہی تھی وہیں۔ ٹھیک اُسی جگہ آج ایک بڑی لاش باندھی جا رہی ہے رودھیا نے لاش کو پکڑ لیا "ہمار کھاتر۔ بچن کی کھاتر" اس کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس دوسری نوکیلی کیل نے آکر اس کے دل کی دیوار کو ایک ساتھ چُور چُور کر دیا۔

× × × × × ×

مکان والا کرایہ کے تقاضے کرنے لگا۔ اُس کے کُل چار روپیہ آتے تھے۔ رودھیا نے سامان بیچکر کسی طرح اُس کے دو روپیہ چکا دئے۔ ایک رات گاؤں والوں اور پڑوسیوں کی نظر بچا کر وہ اپنے سات سالہ بچّہ کا ہاتھ پکڑے آنسوؤں کو پلکوں سے ڈھکے گاؤں چھوڑ کر چل دی۔

ادھر دور بہت دور اُسی جگہ پر سواریوں کے پیچھے اک خاموش آواز فضا میں گونج اٹھتی تھی۔ "بابو جی مزدور چاہیئے" کیسی ٹیس تھی اس آواز میں!؟

گھن گرج

گولے بارُود کی گھن گرج سے دور ، گاؤں نیچی نیچی پہاڑیوں کے اُوپر گھنے درختوں کی چھاؤں میں آباد تھا۔ گاؤں کے درمیان میں سے ایک سڑک گذرتی تھی۔ جس کے دونوں طرف سایہ دار درختوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ درختوں کے سفید چکنے تنے یوں معلوم ہوتے تھے گویا خانہ بدوش کنواریوں کی جوانیاں اُنکی ننگی پنڈلیوں میں رچی ہوئی دہک رہی ہوں۔ یہ جنوبی چین کی ایک بہت اچھی تفریح گاہ تھی۔ جہاں بوڑھے افیونی سرمایہ دار قناعت اور غفلت کے نشے میں مدہوش پڑے رہتے تھے۔

جب چیانگ کائی شیک جنوبِ بعید کی طرف بھاگا۔ جاپانی فوجیں بھی اُدھر مڑیں۔ اسوقت بمبار طیاروں اور فوجی ہلاکت سامانیوں نے گاؤں کے گاؤں کو تباہ کردیا۔ . . . . درختوں کی پتّیاں اس طرح جھڑیں جیسے بہار کی دیوی کا جوبن نوچ کھسوٹ ڈالا گیا ہو۔ سینہ تانے نازک کمر، خوبرو درخت اس طرح جھکے کھڑے تھے۔ جس طرح لیکا یک اُنسٹھ برس کی راتیں گذارنے کے بعد ساٹھویں سال کی صبح کو بوڑھا اپنے مستقل بڑھاپے کی ٹھنڈی بجلی محسوس کرتا ہو۔ خوبصورت ہلکے پھلکے مکانات زمین سے لگ گئے۔ گھاس پھوس کی ہری بھری جھونپڑیوں کا نشان تک بھی نہ رہا۔ ہر چیز پر مُردنی چھا گئی۔ تمام آبادی ٹوٹے پھوٹے گھروں میں دبک بیٹھی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک دو منزلہ مکان تھا۔ یہ صوبے کے گورنر کی اقامت گاہ تھی۔ اور اس وقت اس میں چینی سپاہیوں کا ایک دستہ ٹھیرا ہوا تھا۔

جاپانی طیاروں نے اسے اچھی طرح چھلنی کردیا تھا۔ اوپر کی منزل کا زیادہ حصہ نیچے آرہا تھا۔ سارے کمروں کی چھتوں میں بڑے بڑے سوراخ پڑ گئے تھے اور پتھر کی دیواریں اور فرش اچھی طرح مسمار ہوگئے تھے۔ میلی میلی دیواروں پر ہر جگہ خون کے چھینٹے پڑے تھے۔ ساری فضا تھرّائی ہوئی تھی۔ بھورے بھورے بادل آسمان پر اس طرح بپھرے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ جس طرح تازی کتے شکار کی دھن میں ہانپ رہے ہوں۔ تیز و تند ہوا رہی سہی خدائی کو تباہ کرنے لگی تھی۔

وانگ ایک سپاہی مکان کے دروازے پر کھڑا آسمان کیطرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی رائفل کاندھوں سے لٹکی ہوئی تھی۔ آہنی سرپوش نے اس کی پیشانی ڈھانپ رکھی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں آسمان کی جانب اٹھی تھیں۔ اور وہ قدرت کے تماشے کو محویت کے عالم میں دیکھ رہا تھا: بجلی چمکتی تھی اور نظروں کے سامنے سے کوند جاتی تھی۔ بادل گرجتا تھا۔ اور کان کے پردے ہل جاتے تھے۔ سُرخ سُرخ بجلی کے پیچھے کئی سیاہ طیارے گزر جاتے تھے۔ سنسناتی ہوئی ہوا بھی رُخ سے بے رُخ ہوجاتی تھی۔ پھر وہی مزدوروں کا فاقہ، کسانوں کی محنت، یتیمی، مظلومیت ——————

وانگ بلند آواز سے بڑبڑانے لگا۔

وطنِ مقدس کا بینک پھر خالی کیا جائیگا۔ مزدور پھر اسی طرح خون پسینہ ایک کردینگے۔ کسان پھر اسی طرح دھوپ میں جلے گا اور سردی میں کانپے گا۔ آہ! یہ لڑائی —— یہ کمبخت لڑائی، یہ جنگ و جدال، یہ چند نفوس کی بازیگری —— صرف دو آدمی شطرنج کی بساط لیکر بیٹھتے ہیں اور مہروں کو کھلاتے ہیں۔ اس طرح ان چند آدمیوں نے دنیا کو لڑائی جھگڑے میں مبتلا کر رکھا ہے —— آہ! بھوک —————— بھوک —— کتنی شدت کی بھوک، دیکھوں، کچھ ہے بھی . . . . !

بھوک محسوس کرکے اُس نے تھیلا دیوار سے اتارا۔ ایک نان پاؤ اُس میں سے نکالی اور بھوکے کتے کی طرح اُسے چبانے لگا۔

نان پاؤ باسی تیواسی تھی۔ کوشش سے بھی چبائی نہ گئی باوجودیکہ بھوک نے تلملا رکھا تھا۔ اور تازہ راشن کی بظاہر کوئی امید نہ تھی۔ پھر بھی اُس نے جھنجلا کر نان پاؤ کا باقی ٹکڑا دُور پھینک دیا۔ جو کیچڑ میں گر پڑا، وہ پھر بڑبڑانے لگا۔ . . . .

سپاہی کی زندگی ایک کھلونا ہے۔ وطن کی عزت اور وطن کی آزادی کے نام پر اس کی

عزت اور اُس کے پیدائشی حقوق پامال کر دئے ہیں۔ ان بیچاروں کے خرمنِ حیات کو اس لئے شعلوں کی نذر کر دیا جاتا ہے کہ چار یا پانچ انسانی تندوروں میں چاندی سونے کی آگ جلتی رہے۔ وطن اپنوں کے ہاتھ میں ہو یا غیروں کے ہاتھ میں، موجودہ معاشی نظام کے تحت خودی کو بلندی کہاں حاصل ہو سکتی ہے۔ جب تک یہ نظام نہ بدلے، ملک خواہ کسی کے ہاتھ میں ہو ہم تو غلام ہی رہیں گے۔ چاہے وہ غلامی جاپانیوں کی ہو یا اپنے مہاجن چیانگ چینگ کی۔ ہم ناحق لڑتے ہیں۔ آہ ہم کیوں لڑتے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے —— اپنا ایمان اور اپنی جان بیچتے ہیں —— پھر بھی بھوکے ہی رہتے ہیں۔ کمبختوں نے اپنے عیش و فراغت کیلئے یہ سارا جال بچھا رکھا ہے۔ اور ہماری جانوں کے معاوضہ میں ہمیں سوکھی روٹی دیتے ہیں۔ لذیذ و پُر لطف خوراک تو درکنار، سلونی گرم گرم نان پاؤ بھی ہمیں نہیں ملتی۔ جس طرح ہمارے سوکھے جسم خون کی ندیوں میں پھینکے جاتے ہیں اسی طرح یہ سوکھے نان پاؤ کیچڑوں ہی میں پھینکے جانے کے قابل ہیں۔"

اس نے قدموں کی آواز سُنی اور دیکھا کہ ایک سپاہی سامنے سے گذر رہا ہے وہ کیچڑ کے پاس پہنچ کر یکایک ٹھٹھک گیا، جھکا، نان پاؤ کا ٹکڑا کیچڑ سے نکالا۔ اسے اپنے کوٹ کی آستینوں سے پونچھا اور جلدی جلدی اُسے کھانے لگا۔ ۳۸

وانگ کو بڑی شرم آئی۔ اُسے نان پاؤ نہیں پھینکنی چاہیئے تھی۔ دنیا میں ہر شخص تو فلسفی نہیں ہوتا۔ اُس نے نووارد سپاہی کی طرف ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا سپاہی سوکھی ہوئی اکڑی نان پاؤ کو واقعی جھنجوڑ رہا تھا۔ جس طرح ایک بازاری کتا چربی سے لپٹی ہوئی پتلی سی ہڈی کو جھنجوڑتا ہے۔

وہ لانبا تھا۔ پتلا تھا۔ کاندھے جھکے ہوئے۔ چہرہ نہایت دُبلا: ناک چینیوں کے برعکس کسی قدر لانبی، آنکھیں وحشی اور روسیوں جیسی، بڑھی ہوئی ڈاڑھی۔

وانگ اس کی طرف بڑھا۔ اور نرم لہجے میں پوچھا: "تم بہت بھوکے معلوم ہوتے ہو۔ کامریڈ! مجھے معاف کردو۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا۔ کہ تم اس نان پاؤ کو کھا سکوگے۔ تو میں اسے کبھی نہ پھینکتا!"

"کوئی بات نہیں! مجھے تم لوگوں کی طرح ان باتوں کی پروا ہوتی تو آج اُسی کیچڑ کے نیچے میں بھی پڑا ہوتا:"

"مجھے افسوس ہے اور میں شرمندہ ہوں۔ تم میرے کامریڈ ہو۔ اور غالباً عالمگیر امن کی برادری سے تعلق رکھتے ہو —— آؤ چلو اس گرجتے ہوئے آسمان کے نیچے کہیں بیٹھ کر کچھ پئیں۔" وانگ نے اپنے جھولے سے بیئر (Beer) کی بوتل نکالی اور پینی شروع کردی۔

"میرا نام وانگ ہے، تمہارا کیا نام ہے؟"

"چارلی! میں ہسپتال سے بھاگ آیا ہوں۔ میں لے ہن کی لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا۔ ابھی مجھے پوری صحت تو نہیں ہوئی۔ پھر بھی ہسپتال میں رہتے رہتے گھبرا گیا تھا۔ اس لئے بھاگ آیا۔ میں ساری زندگی بھوکا رہا ہوں اور شاید بھوکا ہی مروں گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وقت مجھ پر اسقدر دحشت سوار رہتی ہے ....."

وانگ نے اسے عجیب و غریب آدمی پایا۔ اور اسکی گفتگو کا طریقہ عجیب تر۔

چارلی نے بات جاری رکھی: "مجھے اپنے متعلق زیادہ نہیں معلوم ہے جس طرح میں نے کیچڑ میں سے تمہاری پھینکی ہوئی نان پاؤ اٹھاکر کھالی ہے اسی طرح کسی نے مجھے بھی سڑک سے اٹھاکر پالا تھا۔ بچپن کی صرف ایک بات یاد آتی ہے۔ جب میں لاوارث بچّوں کے ہسپتال میں تھا، ایک نوجوان نرس تھی۔ وہ مجھے نہ معلوم کیوں بہت چاہتی تھی۔ مجھے بھی اس سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ میں اسکی انگلیاں پکڑے ادھر اُدھر دوڑا کرتا تھا۔ اس دوران میں ایک بوڑھا سپاہی کبھی کبھی مجھے دیکھنے آجایا کرتا تھا جب میں بارہ تیرہ برس کا ہوا۔ تو نحوست کے بادل میرے سر پر منڈلانے لگے۔ میں ایک عیسائی مشن کے سپرد کر دیا گیا۔ جہاں مجھے بید کی کرسیاں بنانے کے کارخانے میں لگا دیا گیا۔ پیسے تھوڑے ملتے تھے کیونکہ اس تجارت میں منافع بہت کم ہے۔ یہیں سب سے پہلی بار میں نے بھوک محسوس کی۔ کارخانہ ایک بوڑھے کے سپرد تھا۔ جس کی بیوی جتنی موٹی تھی۔ اتنی کنجوس بھی تھی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا کاٹتی تو سو طرح کے منہ بناتی۔ بھویں تن جاتیں، پیشانی پر شکنیں پڑ جاتیں اور جب تک کہ باحسرت و یاس ہم کام کرنیوالے معصوم لڑکے اپنے اپنے ٹکڑے کھانہ جاتے۔ وہ بڑبڑاتی ہی رہتی۔ کاش تم اسے اسوقت دیکھتے جب وہ ہمارے لئے شوربہ نکالتی تھی چمچہ دیگچی کے اندر گھومتا رہتا۔ جیسے کشتی سمندر میں ہو۔ کمبخت اس طریقے سے ذرا سا شوربا نکالتی۔ اور چھوٹے سے چمچے کو دیکھا کرتی —— نہ معلوم کتنی ٹھنڈی سانسیں بھرتی تب کہیں ذرا سا شوربا ملتا۔ کارخانے میں دو لڑکے اور بھی تھے۔ جو میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ دونوں اندھے تھے۔ ان کے ساتھ بھی میرے ہی جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مگر وہ خوش تھے اور بظاہر انھیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس لئے کہ وہ عورت کی اُن حریص آنکھوں کو تو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میں نے اس جگہ تین برس کام کیا اور تین برس مستقل بھوکا رہا۔ ایک دن بھی بھوک پوری طرح نہ مٹی۔ جس وقت میں نے روٹی کا ٹکڑا کیچڑ میں سے نکالا

تو تم حیران ہوئے ہوگے۔ کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں ـــــ میں اپنا گزارہ ہی اسی طرح کرتا ہوں۔ اور اسی طرح کرتا رہا ہوں۔ بعض دفعہ مجھے اس سے بھی سخت ٹکڑے ملے ہیں۔ اور ان کو مجھے رات بھر پانی میں ڈالنا پڑا ہے۔ بعض وقت اچھی چیزیں بھی ملیں۔ کیونکہ سکول جاتے ہوئے لڑکوں کی عادت ہوتی ہے۔ کہ کچھ نہ کچھ کھاتے جاتے ہیں۔ اور گراتے جاتے ہیں۔ میں نے مزدور ـــ قلی ـــ دوکاندار چوکیدار ہر حیثیت سے کام کیا ہے اور اب سپاہی ہوں۔ پہلے بھی دوسروں کے لئے کام کیا تھا۔ اور اب بھی دوسروں کیلئے لڑتا ہوں۔"

وانگ کے آنسو گر رہے تھے۔ اور وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا یہ کامریڈ سچ ہے۔ اس نظام کے تحت ہم جو کچھ کر رہے ہیں۔ وہ دوسروں ہی کے لئے ہے۔ اور یہ لڑائی بھی دوسروں ہی کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ تمہاری بھوک نہ آزاد چین مٹا سکے گا اور نہ غاصب جاپان ہی۔ تم پہلے بھی بھوکے رہے ہو اور آئندہ بھی بھوکے رہوگے۔ بھوک کے لئے دھرتی کے اس عالمگیر جاگیردارانہ نظام کو الٹ پلٹ کر دینا ہوگا۔ بغیر اس کے بھوک نہیں مٹ سکتی۔ اور لڑائی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

چارلی نے وانگ کا ہاتھ محبت سے بے اختیار ہو کر دبایا اور بولا میں بھوکا رہا ہوں اور بھوکا ہی مروں گا۔ زندگی کے تیس سال میں ایک دن کے لئے بھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔"

دونوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اور چارلی مکان کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب ڈیوٹی بدلی۔ اور دروازے کے سامنے پہرا دینے کے لئے دوسرا سپاہی آیا۔ تو وانگ بھی اندر گیا۔ اس نے چارلی کو بے خبر سوتے پایا۔ وہ بھی اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ اور ذرا سی دیر میں خراٹے بھرنے لگا۔

بارہ بجے رات کو چارلی جاگا۔ غالباً بھوک سے بے تاب ہو کر، بادلوں کو ہوا کے جھونکوں نے بھگا دیا تھا۔ اور چاند کی کرنیں سوئے ہوئے جوانوں پر چھت کے سوراخوں کے ذریعہ بچھی پڑتی تھیں۔ چندرماں کی ان کنواریوں کی زیادہ تر کشش اندازی وانگ ہی کے ٹکڑے پر تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دمک رہا تھا اتنے میں سارجنٹ نے دروازہ کھولا۔ اور ان پانچ سپاہیوں کے نام پکارے جن کو اسوقت گشت پر جانا تھا۔

وانگ کا نام بھی ان میں تھا۔ مگر وہ اسوقت نیند میں گم تھا۔ اور کسی طرح نہ جاگا۔ باقی چار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جن کی ڈیوٹی نہیں تھی وہ کروٹیں لینے لگے۔ مگر وانگ نہ اٹھا وہ سوتا رہا۔ چارلی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سارجنٹ کو فوجی سلام دیتے ہوئے کہا۔" وانگ صبح سے بہت بیمار ہے اسے بخار ہو رہا ہے وہ ابھی ابھی سویا ہے۔ میں شام ہی کو ہسپتال سے آیا ہوں۔ تازہ دم ہوں اور گشت پر جانے کیلئے تیار ہوں۔ میں بھی کامریڈ ہوتنگ کی کمیونسٹ فوج کا سپاہی ہوں۔"

سارجنٹ نے پوری چاندنی وانگ کے چہرہ پر چھٹکی ہوئی دیکھی پھر چارلی کی طرف دیکھا مسکرایا اور اجازت دیدی۔ پانچوں آدمی گشت پر چلے گئے۔

آدھ ہی گھنٹہ ہوا تھا۔ کہ کہیں قریب سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں آوازیں تیز اور کرخت تھیں سب جاگ اُٹھے اور تفتیش کیلئے باہر نکل آئے۔

"وقت کیا ہے؟" وانگ نے پوچھا۔ "مجھے آج رات گشت پر جانا تھا۔"

کسی نے جواب دیا تمہاری جگہ پر چارلی چلا گیا۔

اُسی وقت ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ ہر ایک نے اسے گھیر لیا اور گھبرا گھبرا کر اُس سے پوچھنے لگے کیا ہوا؟ "ہم پر جاپانیوں کے ایک بھاری دستے نے حملہ کر دیا ہے ہمیں جنوب کی طرف فوراً بھاگنا چاہیئے۔" باقی چار سپاہیوں کا کیا ہوا۔ جو تمہارے ساتھ گشت پر گئے تھے۔ کسی نے پوچھا

"چارلی کو کیا ہوا۔ وہ کہاں ہے؟" وانگ نے گھبرا کر پوچھا۔

"بیچارہ مر گیا۔ گولی سر میں لگی۔ ایک لفظ بھی نہ بولا۔"

سید فرید جعفری

ل۔ احمد اکبر آبادی

ایک فیشنیبل سوانگ

جولائی ۲۶ء کی چوتھی تاریخ ہے :۔ فلاڈلفیا کانگریس کے اجلاس کو آج پورے ڈیڑھ سو سال ہوئے ہیں! امریکائی کونسل خانے میں شنگھائی کی ساری یورپی آبادی کے تمام قابل ذکر لوگ اس لئے جمع ہیں کہ سرزمین ترقی اور آزادی کی جنم بھومی امریکا ——— امریکا نہیں بلکہ تنہا فاتح یعنے ڈالر کے سامنے اپنے احترام اور پرستش کے جذبات کا نذرانہ پیش کریں!

ہال کی دیواروں پر پسیجتی گرمی کی فضا میں واشنگٹن اور لنکن کی بڑی بڑی تصویریں سنہرے اور دمکتے ہوئے چوکھٹوں میں لٹک رہی ہیں۔ امریکائی نیلے پرچم کی آڑی ترچھی لکیریں اور ستارے لہرا رہے ہیں۔

یکایک بیتلی بینڈ باجے کے سُر بلند ہونے لگتے ہیں۔ امریکا کا چینی کونسل تیز قدمی سے بڑھتا اور بیچ ہال میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اعلان آزادی کا کاغذ کھولنے لگتا ہے۔ اسے کھانسی اٹھتی ہے ..... سب کے سب سانس روکے انتظار کی تصویر بن گئے ہیں۔ اس مجمع کے کانوں میں آج وہ لفظ پھر گونجنے والے ہیں۔ جو ڈیڑھ سو برس سے ہر سال بجلی اور گرج کی طرح گونجتے رہے ہیں! آج یہ سب لوگ پھر آزادی اور مساوات کا فخر انگیز نغمہ سننے والے ہیں!

میں بھی اس مجمع میں ہوں۔ میں اپنے دائیں بائیں نظر ڈالتا ہوں۔ امریکائی بیوپاری، انک سک سے درست، انگریزی اور فرانسیسی، سب کے سب سنجیدہ لباس پہنے، سروں کو جھکائے، اس طرح بیٹھے ہیں جیسے کہ گرجے کے اندر ہوں!

کونسل پھر کھانستا ہے، اور ارد گرد ایک نظر ڈالتا ہے۔ آدھا منٹ سخت قسم کے تعطل میں گذرتا ہے۔ اس آدھے منٹ کی فرصت میں محسوس ہوتا ہے کہ اس غیر مہذب ملک اور استبداد کی سرزمین یعنی چین، پر اس پر عظمت اعلان کی اہمیت کیا ہے!

فلاڈلفیا کانگریس کی روشنی میں اگر پچھلے چند سالوں کے واقعات یعنے واشنگٹن کانگریس کے بعد جو کچھ ہوا، اسے دیکھا جائے تو اس کا مطلب اور مفہوم دوسرا ہی ہو جاتا ہے! لیکن شاید میں تنگ نظر ہوں، اس لئے کہ آدھے منٹ کی اس مہلت میں میرے خیال کے اندر انقلاب امریکا کے ہیرو نہیں آتے۔ بلکہ ان کی جگہ شنگھائی کے رکشا قلی چھین لیتے ہیں!

شنگھائی کی یورپی آبادی میں ایک رکشا والا صبح سات بجے سے رات کے ایک بجے تک جبکہ تھیٹر اور سینما ختم ہوں، بھاگتا رہتا ہے، تب کہیں اس کے ہاتھ میں ایک ڈالر آتا ہے۔ اس ڈالر کا اسّی فیصدی حصہ تو رکشا کا مالک ہتھیا لیتا ہے اور دس فیصدی شہر کی میونسپلٹی ٹیکسوں میں لے لیتی ہے۔ رکشا والے کے پاس اسکی اٹھارہ گھنٹے کی محنت کا دسواں حصہ بچتا ہے، وہ اس قلیل حصے میں بھی گذر کر لیتا ہے۔ اس لئے کہ کپڑا اگر وہ پہنتا ہے تو نام کیلئے؛ اس کے سونے کیلئے سڑک اور رکشا کا سہارا بہت ہے؛ اور گھر کنبے کے نام سے تو وہ واقف بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ضرورت بس ابلے ہوئے چاولوں کی ایک رکابی ہے یا کبھی کبھار افیون کے دو کش!

اس رکشا والے کے ڈالر کی کہانی ابھی ختم نہ سمجھئے۔ اُسے ابھی ایک اور شخص سے معاملہ کرنا ہے، اور یہ شخص امریکہ کا مہاجن یعنی بنک کا مالک ہے۔ جو ہنڈی کے بٹے اور چاندی کے بھاؤ کا سٹہ کھیلتا رہتا ہے۔ امریکہ کے کسی بلند محل میں بیٹھا ہوا منٹ منٹ کے بازار بھاؤ مشین پر پڑھتا رہتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے اپنے شنگھائی کے ایجنٹ کو تار دیکر بھاؤ اونچا نیچا کر دیتا ہے۔ امریکائی دلال، چینی صرّاف، اور بمبئی کے یہودی، چین میں اس کے گرگے ہیں۔ پرچے بدلے جاتے ہیں، رجسٹروں میں اندراج ہوتا ہے۔ اور غریب رکشا والے کے بچے ہوئے دس فیصدی پانچ ہی فیصدی رہ جاتے ہیں! باقی پانچ امریکائی بنک اپنے حصہ داروں کو بانٹتا ہے، اور حصوں کا یہ نفع اسّی فیصدی ہوتا ہے ——— "نو آبادی" کے کسی بنک کیلئے اس سے کم نفع تقسیم کرنا ذلّت کی بات ہے! یہ بے زبان رکشا قلی اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کو اس طرح ہوا ہوتے

ایشیا فروری ۱۹۴۲ء

دیکھتا ہے تو ذرا سا اس کے پاؤں توڑ دیتی ہے۔ جو اس آدم گھوڑے کو پانچ چھے برس سے زیادہ نہیں چلنے دیتی۔ اس پانچ چھے برس کے اندر اسے ایک رکابی بھات تو ضرور ہی چاہیئے مگر جب اس کے پانچ فیصدی بھات کی رکابی نہیں خرید سکتے تو وہ ان کا ذرا ہتیلی پر جا پٹختا ہوا چانڈو خانے میں داخل ہو جاتا ہے۔

میں اس عظیم الشان ہال میں بیٹھا جب رکشا والے کے دھیان سے چونکتا ہوں تو اپنے سیدھے ہات والی کو دیکھتا ہوں۔ یہ ایک امریکائی بنک کا ڈائرکٹر ہے جو سر جھکائے اعلان آزادی کا منتظر ہے!

کونسل نے اپنا چشمہ لگا لیا ہے۔ اسے پھر کھانسی اٹھتی ہے۔ بہت ہلکی اور ضابطے کی کھانسی! چینیوں کے وہ لڑکے بھی کھانستے ہیں جو امریکا اور انگلستان کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ لڑکے میل اور گندگی کے اندھیرے میں گلا گھونٹنے والی گرمی کے اندر کپڑے کے بدیسی ملوں میں کام کرتے ہیں۔ اور روئی کے ریشے ان کے حلق اور ناک سے اندر پہونچتے رہتے ہیں۔ روئی کی یہ گرد اُن کے پھیپڑوں پر جم جاتی ہے! ہاں یہ لڑکے بھی کھانستے ہیں۔ اُن کے سینوں میں ہنڈیا سی پکتی رہتی ہے۔ کھدکتی ہوئی سُنائی دیتی ہے! اُن کے گالوں پر ایک پتی ہوئی سی دمک ہوتی ہے۔ ان کے دیدے باہر نکل پڑنا چاہتے ہیں۔ اور اُن کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ٹھیری رہتی ہیں۔ وہ جب کھانستے ہیں تو کھکاریں روئی کے ریشے نکلتے ہیں! اور بالآخر ان پر کھانسی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک دن بے حال ہو کر گر جاتے ہیں!

کپڑے کے مل میں کام کرنے والا یہ لڑکا شام کے چھ بجے سے صبح کے آٹھ بجے تک روئی صاف کرتا ہے اور اُس کے بدلے میں نو فیصدی گھر لیجاتا ہے۔ اس رقم سے پاؤ بھر چاول خریدے جا سکتے ہیں۔ یہ پاؤ بھر چاول تو اس کے چھوٹے بھائی بہن کے پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں!

مگر اس لڑکے کی کہانی بھی یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ نیویارک کے بہت اونچے دفتر میں بیٹھا ہوا ایک بیوپاری ایک تار بھیجکر چین کا سارا چاول خرید کر دساور لاد دیتا ہے۔ اور پھر سب گاؤں سے گھٹیا قسم کا چاول شنگھائی لاتا اور اچھے چاول سے چار فیصدی فی پونڈ مہنگا بیچتا ہے۔ سنیچر کی صبح کو جب ایک لڑکا چاول خریدنے جاتا ہے تو معمول سے آدھا پونڈ مال کم پاتا ہے۔ وہ بقال کی صورت دیکھتا اور سُنتا ہو کہ بھاؤ چڑھ گیا ہے! لڑکا یہ سُنتا اور صبر کر لیتا ہے کہ چھوٹے بھائی بہن بالکل ہی تو نہ فاقہ کرینگے۔

میں پھر اپنے بائیں ہاتھ والوں کو دیکھتا ہوں۔ ایک چکنی کھوپری والے مل مالک اور ایک دساور لادنے والی کمپنی کے ایجنٹ پر میری نظر پڑتی ہے! یہ دونوں یانکی (Yankee) فراکوٹ پہنے، سر جھکائے نہایت عقیدت سے آزادی کا اعلان سُن رہے ہیں! کونسل اونچی اور صاف آواز میں پڑھ رہا ہے:-

" انسانی معاملات کی دنیا میں ایک قوم کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اُن سیاسی بندھنوں کو توڑ کر جو اُسے دوسری قوم کا پابند بنائے ہوں، دنیا کی دوسری طاقتوں کی طرح برابر کا درجہ اور مرتبہ حاصل کرے۔ جو خدا اور فطرت کے قانون کے مطابق اس کا حق ہے!"

اس کے بعد وہ کونسل ان بنیادی حقوق کی فہرست پڑھتا ہے جسے سُنکر انسانی آزادی کے سپاہیوں کی کئی نسلوں کے دلوں کی حرکت تیز ہو ہو گئی ہے، مگر اس کونسل کے لہجے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی ہے جس سے معلوم ہو کہ اسکے جذبات بھی متاثر ہیں۔ یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ اسے کسی قسم کی غیرت کا احساس ہے۔ وہ بس اس طرح پڑھے جا رہا ہے۔ جیسے کھاؤں کی فہرست یا شیر بازار کا بلیٹن یا ریلوے ٹائم ٹیبل پڑھ رہا ہے! وہ آگے پڑھتا ہے:-

" ہم اس صداقت کو مانتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو برابر کا پیدا کیا ہے اور ان کو مساوی طور پر بعض حقوق دئے ہیں جو ان سے چھینے نہیں جا سکتے۔ کیونکہ یہ بنیادی حقوق ہی انسانی زندگی کے ہم معنیٰ ہیں! آزادی اور مسرت کی تلاش انسان کا حق ہے۔ اور انسانی جماعتوں میں ان حقوق کو ہی حاصل کرنے کیلئے حکومت قائم کی جاتی ہے، اور ایسی حکومت کے جائز اختیارات کا منبع یا سوتا اُن لوگوں کی رضامندی ہے جن پر کہ حکومت کی جائے! مگر جب کوئی حکومت ان حقوق کے حاصل کرنے میں سدِ راہ ہو یا ان حقوق کو پامال کرے تو اس ملک والوں کو حق حاصل ہوتا ہے کہ ایسی حکومت کو ختم کر کے دوسری حکومت قائم کرلیں، اور اس حکومت کی بنا، ایسے اصول پر رکھیں اور اس کے اختیارات کو اس صورت میں قرار دیں جن لوگوں کی حفاظت اور مسرّت کیلئے مناسب ترین معلوم ہوں!"

" جو لوگوں کی حفاظت اور مسرت کیلئے مناسب ترین معلوم ہوں!"

اس فقرے کو سُن کر میری نظر سامنے ایک شخص پر پڑتی ہے جو چست خاکی وردی پہنے اور براؤن چمڑے کی چوڑی پیٹی لگائے "اٹینشن" کھڑا ہے۔ اس کا نام کپتان رائٹ ہے۔ اور یہ شنگھائی کی یورپی قوموں کی والنٹیر کور کا کپتان ہے۔ وہ اسطرح

بے حس وحرکت کھڑا ہے۔ جیسے اعلان آزادی نے اس پر جادو کر دیا ہے! یہ کپتان انھیں لوگوں کی اولاد ہے ۔جنھوں نے ماسوشیٹ ملیشیا کے نام سے لکسنگٹن میں انگریزوں سے آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔

"اُس ملک کے رہنے والوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ ایسی حکومت کو ختم کر کے دوسری حکومت بنالیں!"

سنہ ۱۹۲۰ کی ۳۰ مئی کو انسپکٹر ایوانسن کے تھانے کے چاروں طرف اسی کپتان رائٹ نے ہزن بولا تھا - ایوانسن نے حکم دیا اور رائٹ نے تعمیل کی! نہتے مزدوروں کا قتل عام ہوا ـــــ نوجوان طلباء کو بے دریغ قتل کیا گیا! اور یہ اس لئے ہوا کہ امریکائی ڈالر چین میں داخلہ چاہتا تھا اور داخل ہونے کیلئے اسے سنگینوں کی مدد کی ضرورت تھی!

کپتان رائٹ ان لوگوں میں سے ہے جو چین میں "کھلا دروازہ" یعنے بے روک ٹوک داخلے کی پالیسی چاہتے ہیں۔ اور یقیناً کپتان رائٹ "خاص رعایتوں" کے بھی خلاف ہے۔ مگر ڈالر! ڈالر کا مطالبہ ہے کہ اس کا راستہ صاف رہے! اسی لئے کپتان رائٹ نے پہلے دن چھیالیس چینی مزدوروں کو شنگھائی کی ۴۲ سڑکوں پر سلایا اور دوسرے دن بینیٹھ کو کھیت رکھا اور ڈھائی سو کو زخمی کر کے ڈالر کا راستہ صاف کر دیا!

تحقیقاتی کمیٹی بیٹھی اور ایوانسن سے سوال کیا گیا:۔

"تمہارے خیال میں دو ہزار آدمیوں کی بھیڑ کو منتشر ہو جانے کے لئے دس سیکنڈ کا وقت کافی تھا؟

"نہیں ـــ میں سمجھتا ہوں یہ بات ناممکن تھی!"

"پھر بھی تم نے گولی چلانے کا حکم دیدیا؟"

"ہاں!"

اس تحقیقات کے بعد ایوانسن کو "بہادری" کا تمغہ دیئے جانے کی سفارش ہوئی اور ایک سو گیارہ بھاگتے ہوئے چینیوں کی پیٹھوں اور پہلوؤں نے اس "بہادری" پر ٹھٹھا مارا! کپتان رائٹ کو اچھے لفظوں میں ذکر کئے جانے پر قناعت کر لینا پڑی۔ کیونکہ اس سے زیادہ پرشہرت ہو جاتی اور محتاط امریکائی کو یہ بات بھاتی نہیں ہے!

میں حیرانی میں مبتلا ہوں کہ کپتان رائٹ جو اسوقت آزادی کا اعلان سُن رہا ہے۔ کیا اس کے خیال میں سنہ ۱۹۲۰ء کا یہ قتل عام بھی ہے؟ کونسل آ گئے پڑھتا ہے:۔

"اس لئے ہم متحدہ ریاستہائے امریکا کے نمائندے جو عام کانگریس میں یہاں جمع ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے جج سے اپنے نظام کی کامیابی کیلئے دعا کرتے ہیں اور نئی ریاستوں کے باشندوں کے نام پر اعلان کرتے ہیں کہ یہ متحدہ ریاستیں آزاد و خود مختار ریاستیں ہیں اور آزاد و خود مختار رہنا ان کا حق ہے! یہ ریاستیں آجکی تاریخ سے ان تمام معاہدوں سے بری ہیں جو تاج برطانیہ کیلئے گئے تھے۔ اور برطانیہ عظمیٰ سے اب ان ریاستوں کا کوئی سیاسی رشتہ باقی نہیں رہا!"

اعلان کے آخری الفاظ پیتلی بینڈ باجے کی بلند آوازوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ہر آدمی اطمینان کی سانس لیتا ہے اور سب برآمدے میں آجاتے ہیں۔ میں برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا منگولیا کے درختوں کی پتیوں کو ہوا سے اٹھکیلیاں کرتے دیکھنے لگتا ہوں۔ ان درختوں کے پرے خلیج کے زمردیں پانی کے کنارے، فرانسیسی کونسل خانے کی عمارت نظر آرہی ہے۔ عمارت کے اوپر فرانسیسی ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ جو اصل میں تو فرانسیسی نیشنل گارڈ کا پرچم تھا۔ مگر اب شیر بازار کے دلالوں کی جمہوریت کا نشان ہے!

جھنڈے کے سُرخ اور نیلے رنگ ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ شاید ان رنگوں میں کوئی کشش ہے کہ ایک چیل منڈلاتی اور پھر باڑے کی لکڑی کے سرے پر بیٹھ جاتی ہے ـــ خموش اور شاہانہ انداز سے بیٹھی ہوئی ہے!

میں اس تماشے میں کھویا ہوا ہوں کہ کوئی شخص میرے شانے کو تھپ تھپاتا ہے۔ یہ موسیو رینو ایک فرانسیسی اخبار نویس ہے۔ اس کا چہرہ تمتایا ہوا ہے۔ ہال کے سوانگ نے اسے متاثر کر دیا ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگتا ہے۔

"امریکا کا اعلان آزادی ہمارے اعلان حقوق کا باپ ہے! سب انسان برابر ہیں اور آزاد رہنے کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔ سماجی مرتبے کا فرق عام بہبود کے سوا کسی دوسری وجہ سے جائز نہیں ہو سکتا!"

موسیو رینو شاید تعطیل کی حرمت برقرار رکھنے کیلئے مجھ سے بے تکلفی کا برتاؤ اور خوش کن باتیں کرنا چاہتا ہے مگر میں اس حال میں نہیں ہوں۔ میں اسے انگلی کے اشارے سے فرانسیسی جھنڈا دکھاتا ہوں۔

"وہ دیکھو، موسیو رینو، تمہارے جھنڈے پر چیل نے کس طرح قبضہ جمالیا ہے"[1]

---

[1] اس شگون کا نتیجہ نکلنے میں چودہ سال لگے اور ۱۹۴۰ء میں جرمن عقاب نے [illegible]

ایشیا فروری ۱۹۴۶ء

وہ مجھے سگار پیش کرتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

"موسیو، آپ غلطی پر ہیں، آپ کو شاید معلوم نہیں، ——— فرانس کے پرچم کی علامت تو گالی (GALLIC) مرغ ہے!

میں سگار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پھر کہتا ہوں:۔

لیکن موسیو رینو گالی مرغ کا زمانہ تو بیت گیا۔ تاریخ میں ایک ایسا وقت ضرور آیا جب فرانس نے دنیا کو تخلیقی محنت کا سبق دیا، دنیا کو جدو جہد کیلئے بیدار کیا اور اُسے ڈراؤنے خوابوں سے نجات دلائی۔ مگر اب تو فرانس ایک شکار ہو جانیوالی چڑیا سے زیادہ نہیں ہے۔ اب وہ اس بیرحم جنگل اور ظالم..... کا شکار ہے جو غریبوں کو پکڑ کر چیر پھاڑ ڈالتا ہے!"

میرے اس کہنے سے موسیو رینو بہت سنجیدہ بنجاتا اور کہتا ہے:۔

"مساوات، موسیو برابر والوں ہی میں قائم ہو سکتی ہے۔ شاید آپ نے نوآبادیوں میں بڑی جمہوریتوں کے فرزندوں کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی ہے۔ مگر یہ نہ بھولئے موسیو کہ جمہوریتوں کے یہ فرزند دیسی وحشیوں کی نفرت کا موضوع ہوتے اور اپنے بچاؤ پر مجبور ہو کر یہ رویہ اختیار کرتے ہیں! امریکا یا فرانس میں رہ کر آپکی رائے دوسری ہوگی، موسیو!"

میں اس کے جواب میں اسے بتاتا ہوں۔

"موسیو، میں امریکا گیا تو نہیں مگر وہاں کے کاشتکاروں کا حال میں نے سُنا ہے۔ جلوس اور مظاہروں پر زہریلی گیس چھوڑی جانے کا بھی حال سُنا ہے ووٹوں کی خرید و فروخت کا بھی حال سُنا ہے، تیل کے معاملے میں جعل اور فریب کا حال بھی سُنا ہے۔ سرِ راہ حبشیوں کو درّے مارے جانے سے بھی واقف ہوں اور بجلی کی کرسی کا بھی علم ہے! اور موسیو "بندر کی عدالت" بھی جانتا ہوں۔ اور یہ بھی خبر ہے کہ اناج کا کباڑا (ایک شخص سارا غلّہ خرید لیتا ہے) ہوتا ہے! میں موسیو، (KU-KLU-KLAN) کا نام اور کام بھی جانتا ہوں اور میں نے یہ بھی پڑھا ہے۔ کہ رین بسیروں (Night Lodging) کے سامنے بیروزگاروں اور بےگھروں کی کتنی لمبی قطاریں کھڑی رہتی ہیں!

"میرا خیال تو موسیو یہ ہے کہ جتنا فاصلہ رشنگھائی کی مزدور آبادی) شاپئی اور ہوٹل کیتھنک میں ہے اتنا ہی ففتھ ایونیو (نیویارک کے کروڑ پتیوں کا محلہ) اور غریب کوارٹروں میں ہے! اسلئے موسیو، جو قوم کسی دوسری قوم پر ظلم ڈھاتی اور اسے غلام بناتی ہے وہ آزاد رہ ہی نہیں سکتی!"

یہ بتانے کے لئے کہ زیادہ گفتگو بیکار ہے، موسیو رینو میرے پاس سے چل دیتے ہیں۔ مگر سامنے، فرانسیسی باؤٹے پر وہ چیل اسی طرح قبضہ جمائے بیٹھی ہے۔ اس پر میرا خیال یونانی دیومالا کی اس کہانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جسمیں ۴۳
مینٹور کی زبان سے چڑیوں کے اڑ جانے کو اُڈی سس کی موت کا شگون بتایا گیا ہے!

(ماخوذ)

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

دل کا اندھیرا

تنقید حیات آرٹ، افسانویت اور یورپ کے موجودہ خون ریز و آتشیں ماحول کی کامل و موثر تصویر کشی "دل کے اندھیرے" کی روشنی میں ثبات و حرکت کیساتھ نظر آتی ہے۔

یہ کوئی ترجمہ نہیں ہے، اختر کا تخلیقی کارنامہ ہے، وہ دلّی اور رائے پور کے برابر نہ سہی مگر پیرس کو بہت کچھ جانتا ہے۔ سیاسی اور سماجی ارتقا کے گہوارہ میں اس کے شعور و وجدان، اور احساس و مشاہدہ نے کئی سال گذارے ہیں۔ وہ پیرس کے باشندوں، اسکے تہذیب و تمدن، اسکی گلیوں، سڑکوں ندیوں — کل ماحول سے اتنا ہی گہرا خلوص رکھتا ہے جتنا ایک نسل و رنگ، اور وطن و قوم کے بندھنوں سے آزاد مخلص آرٹسٹ کو انسانیت کیساتھ ہو سکتا ہے۔ خاص کر انسانی اور تمدنی جمال کے مرکز فرانس کے ساتھ۔

آپ دیکھیں گے، اس مختصر سی کہانی میں اخلاص و تاثر کی وہ روح پائی جاتی ہے جو فرانس سے تعلق رکھنے والے فرانسیسی ادیب ہی میں ہو سکتی ہے۔

کہانی کا مرکزی خیال، یورپ کی جنگ، اور اس کے بنیادی اقتصادی و سماجی اسباب ہیں، ان اسباب پر حکیمانہ تنقید کہانی کی جان ہے۔ اس کہانی میں ترقی پسند ادب کے تمام عناصر پورے توازن اور سلیقے کیساتھ اجاگر ہوئے ہیں، یہ گویا موجودہ ترقی پسند کہانی کا ایک آئیڈیل ہے جس میں خیالاً اور ان کے اظہار و بیان کا کھردرا پن نہیں پایا جاتا۔ ساغر

۴۴

جب ریل کی رفتار یک بیک سست پڑ گئی اور کسی نے ہوا میں ایک نیلی قندیل کو جنبش دے کر زور سے "گاؤلیت — باری" کی صدا لگائی — تو آندرے چونک پڑا۔ کھڑکی سے اُس نے سر نکال کر دیکھا کہ ہر طرف اندھیرا گھُپ ہے۔ اور اُجالے کے نام پر بس برف کے وہ گالے ہیں جو لگا تار آسمان سے ٹپک رہے ہیں۔

آندرے کو یقین نہ آیا کہ یہ اس نورستان کا اسٹیشن ہے جسے پیرس کہتے ہیں مانا کہ جنگ کا زمانہ ہے — اسے یہ یاد دلانیکی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ وہ خود لڑائی کے میدان سے ہفتہ بھر کی چھٹی پر آرہا تھا۔ لیکن یہ سدا روشن شہر مسلسل تاریکی میں کس طرح زندہ تھا پھر آپ ہی آپ آندرے کو اپنی اس پڑوسی کا خیال آیا جو محبت کی طرح حسین تھی لیکن کئی سال بعد جب وہ اس سے دو چار ہوا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی جوانی ڈھل چکی تھی حسن پامال ہو چکا تھا۔ جھرّیاں چہرے پر زوال کی جھنڈی لہلہا رہی تھی۔ اپنے شہر کی خاموشی اور تاریکی کو دیکھ کر آندرے کو ویسا ہی جھٹکا لگا۔ اور وہ دیر تک دم بخود کھڑکی کا سہارا لئے کھڑا رہا — مہینوں بندوق چھپائے دشمن کے مقابل کھڑے بھی جو حقیقت اس پر عیاں نہ ہوئی تھی وہ اس اندھے اور اندھیرے شہر پر نگاہ پڑتے ہی واضح ہو گئی۔

ہاں یہ دراصل لڑائی تھی — انسانوں کے دو قبیلوں کے درمیان جو ایک کھنچی ہوئی لکیر کے آر پار کھڑے اس گھڑی کے منتظر تھے جب انھیں ایک دوسرے کو قتل کرنیکا حکم ملیگا۔ اور ان میں سب سے زیادہ فرض شناس وہ ہوگا جو سب سے زیادہ آدمیوں کو مار ڈالے۔

آندرے کے ذہن میں پیرس کی تصویر کسی نفیس اور نازک یونانی مجسمہ کی صورت میں محفوظ تھی اور اب اسے محسوس ہوا کہ اس مجسمہ پر کسی نے سیاہ چادر ڈال دی ہے۔

ریل آہستہ آہستہ چلتی اور رکتی ہوئی دیر کے بعد پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہوئی۔ اسٹیشن میں اگر اندھیرا نہیں تو خاصا دھندلکا تھا۔ اِدھر اُدھر بجلی کے چند قمقمے گہرے نیلے سرپوشوں میں مُنہ لپیٹے پڑے تھے۔ آنے جانے والی گاڑیوں کا کوئی وقت معین نہ تھا۔ جسے جب فرصت ملتی آجاتی۔ پھر بھی بڑے دن آپہنچے تھے، اور تھوڑے سے خوش نصیب سپاہیوں کو اس موقع پر گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ اُن کے عزیز یہ تو نہ جانتے تھے کہ وہ کب آئیں گے۔ اور اگر آئے بھی تو اندھیرے میں کس طرح پہچانے جائیں گے۔ پھر بھی وہ آس باندھے ہر پھاٹک

پر کھڑے باہر جانیوالے مسافروں کو تاریخ کی روشنی میں نہلا رہے تھے۔

آندرے اس بھیڑ میں گھس بیٹھ کر بمشکل باہر نکلا۔ مخلوط درختوں اور سپاٹ چھتوں پر برف تہ بہ تہ جم گئی تھی۔ سڑکوں کو صاف کرنیکا اس سال کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے برف کے تودے ہر طرف جمع تھے اور آنکھ چوکتے ہی راہگیر پھسل کر منہ کے بل گر پڑتے تھے۔

برف باری کا سلسلہ جاری تھا اور اسٹیشن کے علاقہ سے ہٹ کر ہر سو سناٹا سا تھا۔ پہلے تو اُس کے جی میں آیا کہ کوئی سواری لے اور اپنے محلّہ کی راہ پکڑے لیکن قریب سے سین ندی کی سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ وہ زیر لب اس کے بچپن کا فسانہ گنگنا رہی تھی۔ جب وہ کنارِ دریا کے ایک گاؤں میں رہتا اور اسمیں بسر کرتا تھا۔ آندرے اپنا سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے اور کمبل کاندھے پر ڈالے ہوئے اس طرف چلا اور پل کی ایک بینچ پہ بیٹھ گیا۔

ندی کا پانی بے رنگ تھا اور اس پر برف کے قطعے تیر رہے تھے۔ صدیوں کی داستان اس کے جگر پر مرقوم تھی اور آس پاس کے اندھیرے کو دیکھ کر اس پر حیرانی اور اداسی کی کیفیت طاری تھی۔ ابھی کچھ مہینوں پہلے کی بات ہے جب سڑکوں اور عمارتوں سے رنگ برنگی کرنیں اسکی موجوں پہ تیرا کرتی تھیں۔

چاندنی راتوں میں بادبانی کشتیاں اسکی گود میں ناچتیں اور اس کے کنارے بے گھروں یا چاہنے والوں کا ہجوم سکون کی تلاش میں آتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوگیا۔ پھر بھی یہ لازوال دریا لیل و نہار سے واقف تھا۔ جس قوم کے قلب سے ہو کر اس کی راہ گذرتی تھی اُسے وہ روز اوّل سے جانتا تھا۔ اور بہتے بہتے جب اسکی تہ سے وہ خون کی بوندیں اوپر چھلک آتیں جو یہاں کے رہنے والوں کی تلواروں سے ٹپکی تھیں۔ تو دریا جوش میں آتا اور اس کا دھارا تیز ہو جاتا۔

آندرے بہتے ہوئے پانی کے تاثرات کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے لئے بیم کی مہک اسکی اپنی آواز کی لنک اسمیں سربستہ تھی۔ اور طبیعت کے بھاری پن کو جھٹک کر اس نے دل سے کہا۔ نہیں یہ شہر ابدالآباد تک قائم رہیگا۔ اسکی تعمیر چوب و سنگ سے ہوئی ہو لیکن اسکی بنیاد ایک خیال اور ایک خواب پر رکھی گئی۔ اور اگر وہ آج بگڑ گیا تو کل پھر بنے گا۔

جب اس کی آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوگئیں تو آس پاس کچھ اور لوگ نظر آئے جو اسی کی طرح ندی سے باتیں کرنے آئے تھے۔ وہ سب پُل کے ستونوں کو تھامے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اور اُن کی بے زبانی میں ایک جہانِ غم پنہاں تھا۔ دفعتاً آندرے کو اس مقدس وعدہ کی یاد آئی جس کی تکمیل کیلئے وہ یہاں آیا تھا۔ پیڑوں کے جھرمٹ میں اُس کے قدموں کے پاس ایک نیم جاں لاش پڑی ہے۔ اپنی ٹولی کے ساتھ وہ دشمن کی ٹوہ لینے نکلا تھا۔ ہوا برف میں گھلی ہوئی چاندنی کہر میں بسی ہوئی۔ بہت دور افق کے پاس دشمن تاک لگائے بیٹھا ہے۔ دونوں چاہتے ہیں کہ موقع ملتے ہی ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں اور زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو کم سے کم عرصہ میں مار ڈالیں۔ ان کی ساری صلاحیتیں ہلاکت کے حربوں کے استعمال میں صرف ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو یہ اپنے ناخنوں کو بڑھا لیں اپنے دانتوں کو تیز کرلیں اور درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں آندرے کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ بندوق پر اس کی انگلی جنبش کرتی ہے۔ ایک گولی فضا کو چیر کر کسی نامعلوم انسان کے جسم میں بیٹھ جاتی ہے۔ وہ مر جاتا ہے۔ اسکے عزیزوں کے نام جنگ کے دیوتا کی طرف سے شکریہ کا پروانہ آتا ہے اور محلہ والے ان ننگے بھوکوں کو دیکھ کر ہمدردی سے سر ہلاتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ ملک و قوم کے لئے مصائب برداشت کر رہے ہیں۔

یہ نیم جاں لاش جس کی ہے اُسے وہ جانتا پہچانتا نہیں۔ وہ ابھی نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ارمانوں اور آرزوؤں کی دنیا بسی ہوئی امید اسکی ہونٹوں پر مسکراتی ہوئی۔ جب رات کو وہ گشت لگانے نکلے تو وہ چپکے چپکے اپنی باتیں سنانے لگا۔ پیرس میں فلاں مقام پر اسکی دوکان ہے۔ اندر وہ گھر والوں کے ساتھ رہتا ہے۔ گھر میں بوڑھی ماں اور نئی دولہن کے سوا کوئی نہیں۔ بڑے دنوں میں اسے گھر جانیکی چھٹی ملے گی۔ کپتان نے اس کی درخواست پر سفارش کر دی ہے۔

اتنے میں ایک گولی اس کے سر پر لگتی ہے اور وہ گھڑی بھر تڑپ کر مر جاتا ہے اور مرتے مرتے وہ پُر حسرت نگاہوں سے اپنے نامعلوم ساتھی کو دیکھتا ہے اور وہ اُنکے پیغام کو سمجھ جاتا ہے۔ مرنے والے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے آندرے یہ سوچنے سے اپنے کو باز نہیں رکھ سکتا کہ موت جیسی قادر مطلق شے کیسی حقیر چیزوں میں رہتی ہے۔ لوہے کے ذرّوں میں، زہریلے جراثیم میں اور زندگی کہاں رہتی ہے ایک ہچکی میں، سانس کے ایک جھٹکے میں۔

رات بھیگ رہی تھی ہوا سرد تر ہوگئی تھی آندرے اٹھ کر آگے چلنے لگا۔ اب بھی کئی درماندہ ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے ماضی کی روشنی اور حال کی تاریکی کو گھور رہے تھے۔ جب صبح ہوگی تو ان میں سے کئی اس ندی کی تہ میں سوتے ہوں گے زندگی کے افکار و مصائب سے انھیں ہمیشہ کیلئے نجات مل جائیگی۔ ان کا گوشت مچھلیاں

کھا جائیں گی۔ اور پھر ان مچھلیوں کو انسان کھا جائیگا۔

گھروں اور دوکانوں کے دروازے بند —— صرف کھانے پینے اور ناچنے گانے کے ٹھکانے کھلے ہوئے۔ ان کے اندر سے ہنسنے بولنے کی آواز آتی ہوئی، لیکن آواز میں ہزیان کی سی کیفیت۔ لوگوں کی ہنسی میں وحشت کا انداز ہے۔ آندرے ایک کیفے میں داخل ہوا اور کونے کی ایک میز پر بیٹھ گیا۔

یہ عورتیں اور یہ مرد سرسام کے مریضوں کی طرح کہرام مچا رہے ہیں۔ گویا یہ سب ایک پُرآشوب سیلاب سے بچنے کیلئے نوح کی کشتی پر بیٹھیں گے۔ انھیں نہیں معلوم کہ اس کشتی کو کبھی کوئی ساحل ملے گا یا نہیں۔ اور وہ سوچتے ہیں کہ آؤ کچھ ایسا کریں کہ زندگی اور موت کی یاد بھول جائے ——

آندرے کو ہنگری کے اُس گاؤں کی یاد آئی جس کے چاروں طرف دشمنوں نے آگ لگا دی اور جب لوگوں کیلئے بچنے کا کوئی راستہ نہ رہا تو وہ سب ایک جگہ جمع ہوئے۔ شراب کے گیلن کھول دئے گئے

باجوں نے موت کے رقص کا نغمہ چھیڑا۔ سب مرد عورت متوالے ہوگئے۔ وہ دو دو ایک دوسرے سے لپٹ کر پڑ گئے اور جب آگ انھیں جلانے آئی تو کسی کو اُس کی پرواہ نہ ہوئی۔

۴۶ تہذیب و تمدن کے باوجود انسان وہی دوپایہ ہے۔ جو باغ عدن میں عورت اور چارے کی فراوانی سے خوش اور ان کی محرومی سے دکھی رہتا تھا۔ آدم اور آدمی میں زبان اور ہاتھوں کی چند جنبشوں کا امتیاز ہے اور بس۔

آندرے کے آگے لڑائی کے میدان کا نقشہ کھنچ گیا۔ سپاہی وہاں کیچڑ سے لت پت خندق میں جیتے مرتے ہیں۔ یہی ان کا گھر اور یہی ان کی قبر ہے۔ جب شہروں کے رہنے والے سردی میں کوئلے اور رضائیوں کیلئے واویلا مچاتے ہیں۔ چائے اور گوشت کی کمی کا رونا روتے ہیں تو یہ سپاہی کھلے ہوئے آسمان تلے برف کے بار سے دبے ہوئے اس تار پہ کھڑے رہتے ہیں جو زندگی اور موت کے مابین سرحد قائم کرتا ہے۔ وہ مذہب، ملک، قوم یا ملک کی خاطر لڑنے بھیجے جاتے ہیں اور ان بلند بانگ الفاظ کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ تھوڑے سے آدمیوں کے لئے شہنشاہیت تک بہت سی خوبصورت عورتوں اور طرح طرح کے کھانوں کے وسائل مہیا کئے جائیں۔

آندرے کے ہونٹوں پر ایک تلخ تبسم آیا۔ اور اُس نے بیئر (Beer) کے چوتھے گلاس کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ اور جب ان ملکوں کے پیشوا مر جاتے ہیں تو ان کا جسم سڑ کر کھاد بن جاتا ہے۔ اور اس کھاد سے اناج اگتا ہے جسے حیوان اور انسان سب ہی کھاتے ہیں۔

بیزاری اور تلخی کا طوفان لئے ہوئے وہ باہر نکلا۔ اُس کے بے گناہ دوست نے اس لئے اپنی جان دی تھی اور وہ آئندہ چل کر خود بھی ایسے مارا جائیگا کہ کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی خواہشوں کی تکمیل کی جائے۔ اور ان خواہشوں کا ماحصل اچھے کھانے کے بعد کی ایک پُرسکون ڈکار اور کسی عورت کے آغوش میں پُراطمینان خراٹوں کے سوا کیا ہے۔

(۲)

دن چڑھ چکا تھا جب آندرے کی آنکھ کھلی۔ مہینوں بعد وہ اپنی گہری نیند سویا تھا۔ کھڑکی کا پردہ کھینچ کر اس نے زمین و آسمان کو دیکھا۔ نیلے آکاش پر سورج جگمگا رہا تھا اور دھوپ جمی ہوئی برف پر چاندی لٹا رہی تھی۔

آندرے تیار ہو کر اس پتہ پر چلا جہاں ایک بوڑھی ماں اور ایک دولہن اپنے پیارے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اور اُن جیسی کتنی عورتیں اپنے عزیزوں کی راہ شب و روز تکا کرتی ہیں۔

آندرے اُس گھر سے جس قدر قریب ہوتا گیا اُس کے دل کی دھڑکن اتنی ہی تیز ہوتی گئی۔ لڑائی کے میدان میں کئی بار اُسے بکٹ سے بکٹ مہم پر جانا پڑا تھا۔ لیکن اب تک وہ کسی مہم میں اتنا ہراساں نہ ہوا تھا۔ شدید سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینہ آرہا تھا اور وہ اپنے رعشہ رعشہ میں کپکپی محسوس کرنے لگا۔ راستہ میں ایک جگہ ٹھہر کر اُس نے شراب پی اور سوچنے لگا کہ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ وہ خط یا تار کے ذریعہ یہ خبر بھیجکر اپنی گلوخلاصی کرے۔ لیکن اس کی جیب میں شادی کی وہ انگوٹھی ہے جو مرنے والے نے اپنی دولہن کو لوٹائی ہے۔ اور چاندی کے ننھے سے چوکھٹے میں جڑی ہوئی مریم کی تصویر جو ماں نے اپنے بیٹے کیساتھ کر دی تھی۔ ان یادگاروں کو بھی تو ان سوگوار عورتوں کے سپرد کرنا ہے۔ آندرے نے اپنے بٹوے کو کھول کر دیکھا اور یکبیک اُسکی نگاہ اس لوہے کی زنجیر پر پڑی جو ہر سپاہی کی کلائی سے بندھی ہوئی تھی۔ اس میں اس کا نام اور اس کی فوج کا نشان کھدا ہوا تھا۔ جب کوئی مر جاتا تو یہ زنجیر اُس کے گھر بھیجدی جاتی۔ آندرے کی جیب میں مرنے والے کی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ تینوں چیزوں کو رومال میں لپیٹے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اپنی موت سے زیادہ اندوہناک امر کسی دوسرے کی موت کی اطلاع

اُس کے عزیزوں کو پہنچاتا ہے۔ اور اُسے ان لوگوں کی بیاکی پر حیرت ہوئی جو لاشوں کے پاس بیٹھ کر اطمینان سے پُرسہ کرتے اور سیاپہ گاتے ہیں۔ اسوقت اپنی حالت دیکھ کر آندرے کو ایسے لوگوں پر ہنسی کا شبہ ہونے لگا۔ کیونکہ موت کا پُر وقار سکون صرف ناکلامی کا طلبگار رہے۔

اسے اپنی قسمت پر بھروسہ نہیں رہا۔ اسکی بیزاری اور تلخی دھوم بن کر گھل گئی۔ ان عورتوں نے تو زندگی سے کچھ زیادہ نہیں مانگا تھا۔ دونوں کا سہارا ایک مرد تھا۔ جس نے دانستہ کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ ایک چھوٹی سی دوکان میں وہ تینوں اخبار اور کتابیں بیچا کرتے تھے۔ اتنے میں ایک روز ان کے ملک پر ایک دوسرا ملک حملہ کر دیتا ہے۔ وہاں کا ایک ویسا ہی دوکاندار دور بیٹھ کر ہوا میں بندوق چلاتا ہے۔ اور اس کی گولی کسی کو مار ڈالتی ہے۔ اور اب یہ بوڑھی ماں کس کے برتے پہ جیئے گی۔ یہ پریم پیاسی عورت کس کا سہارا لے گی۔

آندرے اپنی قسمت کو سراہتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں وہ کسی کو نہیں چاہتا اور کوئی اسکی پرواہ نہیں کرتا۔ جب ہر طرف امن تھا تو یہ بے معنی زندگی اس کے لئے وبال تھی لیکن آج یہ سب سے بڑی برکت ہے۔ کوئی اسکا انتظار نہیں کرے گا۔ کوئی اس کے مرجانے پر آنسو نہیں بہائیگا۔ اور یہ صورتِ حال عین موت کے مطابق سکوں پرور ہے۔

وہ دوکان میں داخل ہوتا ہے۔ کونے میں کرسی پر ایک بوڑھی اونی مفلر بُن رہی ہے۔ اندر کے کمرے سے برتن دھلنے کی آواز آرہی ہے۔ وہاں شاید اُسکی بہو ہے۔ آندرے اندر جاکر ٹھٹک جاتا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے وہ الماری سے کتابیں نکال کر دیکھنے لگتا ہے۔

بوڑھی اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور گاہک کو سلام کرتی ہے۔ "کیسی سہانی صبح ہے لیکن عیسیٰ کی شہادت کے دن موسم بہت اداس تھا۔ ...... آپ کو کیسی کتابوں کی ضرورت ہے؟ ـــــ اگر میں غلطی نہیں کرتی ہوں تو آپ مورچے سے چھٹی پر آئے ہیں۔ جی؟ میرا قیاس ٹھیک ہے نا؟ تو پھر آپ ایسی کتابیں پڑھئے جن سے امید اور تسکین ملے۔ عیسیٰ کی زندگی؟ سان فرانسس کے بول؟

بُڑھیا خوش ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا بیٹا بھی آجکل میں آتا ہوگا وہ کتابیں نکال نکال کر میز پر رکھتی جاتی ہے۔ روزگار بہت مندا پڑ گیا ہے۔ شہر ویرانہ پڑا ہے۔ بکری ہو تو کس چیز کی۔ اخبار ضرور بک جاتے ہوں گے۔ لیکن ـــ اس

لیکن کیساتھ بوڑھی کا چہرہ فرط انبساط سے کھل اٹھتا ہے۔ "جب لڑائی ختم ہوجائے گی تو مورس سب کام سنبھال لے گا۔ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ کاش آپ جانتے ہوتے کہ وہ کتنا محنتی اور سعادت مند ہے۔ آپنے اُسے کہاں دیکھا ہوگا۔ اونچا قد۔ بھوری نیلی آنکھیں، سنہرے بال۔ وہ بھی آج کل میں دس دن کی چھٹی پر آنیوالا ہے۔ میں تو اُس کے لئے مفلر کے سوا کچھ نہ بُن سکی۔ لیکن اُس کی بہو نے اوہ، اگر آپ اُس کے بنائے ہوئے سوئٹر اور موزوں کو دیکھیں ـــ"

آندرے کا دل بھر آیا۔ مدت کے بعد اُس کی آنکھوں کو آنسوؤں کی تری محسوس ہوئی۔ وہ چپ یہ سب سُنتا رہا اور پھر پیٹھ پھیر کر کسی الماری سے کتابیں نکالنے لگا۔ بھرائے ہوئے گلے سے وہ صرف یہ کہہ سکا۔

"ان کی قیمت؟"

جب بُڑھیا نوٹ کا نامہ لینے کیلئے صندوقچہ کی طرف گئی۔ آندرے نے فوراً جیب سے وہ تینوں چیزیں نکالکر میز کے کونے پر رکھدیں۔ آنکھیں پھیر کر اُس نے "الوداع"۔ "خدا آپکا نگہبان ہو" کہا اور فوراً دوکان کے باہر نکل آیا۔ وہ یوں لپکتا ہوا پاس کی گلی میں گھس گیا۔ گویا کسی جرم کا خطاوار ہو۔ پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہوئے وہ اندھا دھند بھاگتا گیا۔ اور اس کا دل ڈرا کہ اگر وہ بے کس عورتیں اُس کا دامن تھام کر زندگی کی بھیک مانگ بیٹھیں تو وہ کیا دیگا۔

آسمان کا نیلاپن اور نکھر گیا تھا۔ سورج کی تابانی زیادہ کھل گئی تھی۔ لیکن دلوں میں اندھیرا تھا۔ اور اندھیرے میں مایوسی تھی۔ ہر مکان کے در و دالان سے ایک خاموش دُعا۔ ایک بے زبان التجا اٹھتی اور اُس طرف دیکھتی جہاں انسانوں کے غول زندگی کے حکم پر مرنے اور مارنے کیلئے جمع تھے۔

بچے آندرے کی طرف انگلی اٹھا کر آپس میں کچھ کہنے لگتے۔ شاید ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کے باپ یا بھائی اسی سپاہی کی طرح لڑ رہے ہیں۔ سپاہی اور لڑائی کے کھیل وہ آپس میں رچاتے ہیں اور حسرت سے سوچتے ہیں کہ کاش ہم بڑے ہوتے اور سپاہی بن کر لڑتے۔ اور آندرے یہ سوچ کر کانپ جاتا ہے کہ ایک نئی نسل وجود میں آرہی ہے جس کی سب سے بڑی تمنا قتل و غارت گری ہے۔ لیکن مائیں اسے دیکھ کر پسیج جاتی ہیں اور سہم کر آپس میں کہتی ہیں کہ بہت دور اسی جواں سال کی طرح ان کے بیٹے بھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ جوان عورتیں اسے للچائی ہوئی نظروں سے گھورتی ہیں۔ اور انہیں اپنی جوانی پر رونا آتا ہے جو سونی بیت رہی ہے ـــ گلیوں کا سلسلہ ایک پارک کے سامنے جاکر ختم ہوتا ہے۔

آندرے تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ چار دن میں وہ اپنی فوج کے ساتھ ہوگا۔ اور پھر اُسے شاید کبھی اتنی فرصت نہ ملے کہ یوں تنہا بیٹھ کر آسمان وزمین کو اس نگاہ سے دیکھ سکے۔

یہ کائنات کتنی عجیب ہے، اور کس قدر پُر اسرار۔ انسان اس طلسم کے دروازہ پر کھڑا ہو کر قیامت تک دستک دیتا رہیگا۔ اور قیامت کے دن جب یہ دروازہ ٹوٹے گا تو یہ نظر آئیگا کہ خون کا ایک دریا ہے جس کے بیچ و بیچ ہڈیوں کا محل بنا ہوا ہے اور اسمیں وہ معبود رہتا ہے جس کی پرستش فریب خوردہ انسانیت ہمیشہ سے کرتی آئی ہے۔

بھری دوپہر میں کلیسہ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ بس ایسے بج رہا ہے کہ ہمیشہ سے بجتا آیا ہے۔ بجانیوالوں اور سُننے والوں کو کچھ نہیں معلوم کہ اس آواز میں خوشی ہے یا غم امید ہے یا مایوسی۔

آندرے دیر کے بعد اپنی جگہ سے اٹھتا ہے۔ اسے کہیں نہیں جانا ہے۔ اُسے کچھ نہیں کرنا ہے۔ اُسے سب کچھ بھول جانا ہے۔ جب زندگی کا مقصد موت کے سوا کچھ نہیں تو اُس کے مرحلوں پر کیوں سر کھپایا جائے۔ چلتے چلتے وہ کلیسہ کے سامنے پہنچتا ہے۔ اور بلا ارادہ اُس کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ ہلکا ہلکا سا اندھیرا گہری گہری سی خاموشی۔ آرگن ایک متین لیکن دل سوز نغمہ بجا رہا ہے۔ یہاں وہاں سوگوار عبادت گذار گھٹنے ٹیکے اور ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ جگہ جگہ عیسیٰ اور مریم کی شبیہوں کے آگے موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ اگر اور عود کی خوشبو سے ہوا بوجھل تھی۔

تھوڑی دیر اس فضا میں بیٹھ کر آندرے کو محسوس ہوا کہ انسان کے میدان جنگ سے عبادت گاہ زیادہ مہلک ہے۔ کیونکہ یہاں آدمی اپنے مصائب کو بھول جانیکا درس لیتا ہے۔ ان سے لڑنے کا نہیں۔ عبادت کا کلوروفارم سنگھا کر ظلم انسانیت پر نشتر زنی کیا کرتا ہے۔

آندرے کو ان انسانوں پر رحم آیا۔ یہ پیاسے ہیں اور زندگی کے صحرا میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اگر سراب میں پانی کی جھلک دیکھ کر یہ فریب کھا جائیں تو کیا عجب۔

اتنے میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہی بوڑھی لاٹھی ٹیکتے ہوئے اندر آرہی ہے اسکی بہو سیاہ نقاب اور سیاہ لبادہ میں ملبوس اس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہے۔ دونوں کے سر جھکے ہوئے ہیں۔ دو کمزور درخت جنھیں پالا مار گیا ہے۔ دونوں کونہ کے ایک شہ نشیں کے مقابل جا کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

آندرے دم بخود ہے۔ وہ مجرم کی طرح اُن دکھیاریوں کو دیکھ رہا ہے۔ کیوں کہ وہ یہ منحوس خبر انھیں لایا۔ کون زیادہ قابلِ ملامت ہے — موت کا فرشتہ یا موت کی خبر دینے والا؟

یک بیک کئی لوگ چیخ پڑتے ہیں اور قبل اسکے کہ آندرے کی سمجھ میں کچھ آئے وہ اپنے کو اُس بوڑھی کے پاس پاتا ہے۔ بوڑھی نہ دُعا مانگ رہی ہے، نہ رو رہی ہے نہ اُس نے سجدہ کیا ہے، نہ فریاد کی ہے۔ اُس نے مریم کے بُت کے مُنہ پر تھوک دیا ہے اور یہ تھوک خدا کی ماں کے گالوں پر بہہ رہا ہے۔

آندرے بوڑھی کو ایک ہاتھ سے لپیٹ لیتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں رومال لیکر بُت کا مُنہ صاف کرنے لگتا ہے۔

نیا راگ

ایشیا

تیسرا باب

نظم و غزل

بابتہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء

انقلاب

ساقیا دور میں اب لاعوضِ جام کچھ اور		کہہ رہی ہے روشِ گردشِ ایّام کچھ اور
تابکے حظِّ دل و چشم کی سعی ناکام		تجھ سے لینا ہے محبّت مجھے اب کام کچھ اور
یاد پھر آئی ہیں آغازِ جنوں کی راتیں		اور پیچھے کو پلٹ گردشِ ایّام کچھ اور
حُسن کا مرتبہ حیرت نے سمجھنے نہ دیا		جتنا دیکھا انہیں بڑھتا گیا ابہام کچھ اور
حُسن پر قیدِ تعیّن سے اُدھر حرف آیا		اور ادھر حدِّ نظر نے کیا بدنام کچھ اور
جو نہ دیکھا نہ سُنا تھا وہ سُنا اور دیکھا		جو نہ ہونا تھا ہوا۔ اے دلِ ناکام کچھ اور

ان کے وعدے ہی بدلتے نہیں دن رات اثرؔ
حال عالم کا یہ ہے صبح کچھ اور شام کچھ اور

محمّد علی خاں اثرؔ رامپوری

زمزمے

زمین کانپ اُٹھی آسمان تھرّایا
غمِ جہاں کو غمِ عشق نے جب اپنایا

بتائیں کیا دلِ مضطر اُداس کتنا تھا
کہ آج تو نگہِ ناز نے بھی سمجھایا

نگاہِ شوق نے کچھ انجمن نے کچھ سمجھا
کوئی نہ جان سکا اس طرح وہ شرمایا

تو عشق ہی کی پشیمانیوں کے پھیر میں ہے
تجھے خبر بھی ہے کچھ حُسن بھی تو پچھتایا

پڑی تھی دولتِ کونین جلوہ گہ میں تری
کہاں سے عشق بھی یارب یہ دل اُٹھا لایا

مٹا دیا مرے دل نے نشانِ جورِ بُتاں
میں ڈر رہا تھا کہ پتھر سے شیشہ ٹکرایا

تری نگاہ ہوئی جب تو زندگی پائی
کہ آج تک تو مجھے موت نے بھی ترسایا

نہ ہجر ہجر ہے تیرا نہ وصل وصل ترا
اگر یہی ہے محبت تری تو باز آیا

نگاہِ ہوش رُبا تک تو ہوش قائم تھے
میں کھو گیا ہوں ان آنکھوں کا جب پتہ پایا

نگاہِ چشمِ سیہ کار سے کوئی پوچھے
یہ کس نے دہر کی تاریکیوں کو چمکایا

ابھی تو جور و کرم سے ترے گزرنا ہے
ابھی کہاں تجھے کھویا ابھی کہاں پایا

عجیب شے ہے یہ چونکی ہوئی سی بے خبری
نگاہِ یار تجھے آج کیا خیال آیا

ہمیں سے عشق کی گہرائیوں کی لاج رہی
ہر اک نے تیری محبت کا جام چھلکایا

رہیں گی یاد رسا کاریاں تری اے عشق
کہاں سے تو نے کہاں اہلِ دل کو پہنچایا

یہ زندگی کے کڑے کوس سے یاد آتا ہے
تری نگاہِ کرم کا گھنا گھنا سایا

تری نظر سے بھی جس کو چھپا کے رکھا تھا
وہی تو دردِ محبت میں آج کام آیا

کبھی سُنے نہ تقاضائے فطرتِ ازلی
اسی نے خُلد سے انسان کو نکلوایا

ہے آج خود مجھے حیرت سی اپنی وحشت پر
قسم ہے زلف کی ابتک تو میں نہ گھبرایا

نہ کر سکی تھی تری چاہ کس مپرسیٔ عشق
تری نگاہ نے پوچھا تو دل بھی للچایا

مناسبت بھی ہے کچھ غم سے مجھ کو۔ اور اے دوست
بہت دنوں سے تجھے مہرباں نہیں پایا

بیانِ غم میں بھی کچھ احتیاط لازم ہے
اُداس حسن کو کر کے فراق کیا پایا

فراق گورکھپوری ایم۔ اے

مراجعت

ہو چکا دامنِ دل تار، چلا آنے دے
اس قدر بھی نہ ہو بیزار، چلا آنے دے
اپنی محفل میں پھر اک بار چلا آنے دے

تیری محفل کی بہاروں کو نہیں چھیڑوں گا
اپنے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہیں چھیڑونگا

اک کلی بھی مری نظروں سے نہیں ہانپے گی
مری آہوں سے تری شمع نہیں کانپے گی

کوئی آنسو مری پلکوں سے نہیں ٹوٹے گا
تیرے پھولوں کا حسیں رنگ نہیں چھوٹے گا

آئینہ تک بھی تو حیران نہ ہوگا مجھ سے
کوئی جلوہ بھی پریشان نہ ہوگا مجھ سے

بے ارادہ بھی پریشاں کروں تو کہنا
چاک اب اپنا گریبان کروں تو کہنا

بے سکوں رہ کے بھی آرام نہ مانگوں گا کبھی
اب بہ اِصرار کوئی جام نہ مانگوں گا کبھی

جو گزر جائے شکایت نہ کروں گا تجھ سے
تو کہے گی تو محبّت نہ کروں گا تجھ سے

مدّتوں بے سروساماں پھرا ہوں انجم
آج لے کر یہی ارمان پھرا ہوں انجم

جاں نثار اختر ایم اے

ایشیا - فروری ۱۹۴۲ء

ساقی مجھے بھیک دے سکون کی!

اُٹھا وہ جھوم کے ابرِ بہار اے ساقی
بدل گئی روشِ روزگار اے ساقی

فضا میں دوڑ رہی ہیں شراب کی موجیں
برس رہی ہے مئے خوشگوار اے ساقی

ہر ایک چیز پہ مستی ہر ایک شے میں جمال
جہاں ہے جلوہ گہ حُسنِ یار اے ساقی

گلوں سے روئے زمیں پر شفق کی رنگینی
شفق سے رنگِ فضا لالہ کار اے ساقی

کہیں بنفشہ کہیں یاسمن کہیں سنبل
چمن ہے صفحۂ نقش و نگار اے ساقی

بنا ہوا ہے "خراباتِ نو بہار" چمن
ہر ایک شے ہے یہاں بادہ خوار اے ساقی

ہر اک کلی ہے صُراحی شرابِ رنگیں کی
ہر ایک گل قدحِ زرنگار اے ساقی

ہر ایک شاخ میں ہے پائے رند کی لغزش
ہر ایک برگ کفِ رعشہ دار اے ساقی

فضائے باغ جواہر فروش و گوہر ریز
ہوائے صحنِ چمن مشکبار اے ساقی

چمن ہے کانِ گہر اشکہائے شبنم سے
ان آنسوؤں پہ ستارے نثار اے ساقی

ترے حضور میں لایا ہوں کچھ تمنائیں
ترے کرم کا ہوں امیدوار اے ساقی

جہاں کو تو نے سکون و قرار بخشا ہے
مجھے بھی بخش سکون و قرار اے ساقی

ظفر تاباں دہلوی

شام کی ظلمت کو اندازِ سحر آتا نہیں
یہ وہ دُنیا ہے جسے کوئی ہُنر آتا نہیں

آدمی اس سرزمیں پر ہے ہلاکِ بندگی
یعنی فرضِ زندگی ہے انہماکِ زندگی

خواجگی کا تابعِ احکامِ انساں ہے یہاں
بندگی کہتے ہیں جس کو اصلِ ایماں ہے یہاں

جانتا ہے بندگی کو ننگ نامی الاماں
الاماں اے جہلِ دنیائے غلامی الاماں

واہ ذہنیت یہ دُنیائے جہالت خیز کی
برہمن کو فکر ہے خوشنودیِ پرویز کی

اس جہاں کے کاخ و کو میں شاہراہوں میں غلام
مسجدوں میں، مندروں میں، خانقاہوں میں غلام

لب پہ خواب آور ترانے ہیں ارادے پست ہیں
اس جہاں کے نغمہ پیرا و سخن ور مست ہیں

جن کے آبا فخر تھے اس عالمِ ایجاد کے
اُن کے بچّوں کی گردنوں پہ ہے صیّاد کے

ایک ہی عالم میں شیخ و برہمن پاتا ہوں میں
کوئی ملّت ہو غلامی کا چلن پاتا ہوں میں

وہ غلامی جس سے ہو بے نور ہستی کا چراغ
ہوش جس کے نام سے رخصت ہو مختل ہو دماغ

وہ غلامی خود شناسی سے جو بیگانہ کرے
آپ کو کھو کر طوافِ شمع پروانہ کرے

وہ غلامی ننگِ انساں کا عدو جس کو کہیں
دشمنِ ناموس، انساں کا عدو جس کو کہیں

وہ غلامی واہ ہو تبدیل جس سے آہ میں
فرق جو باقی نہ رکھے ضیغم نہ روباہ میں

وہ غلامی جس سے ہو ہر نشۂ ہستی ہرن
گل سے ہو نکہت گریزاں روح سے خالی ہو تن

وہ غلامی جو مٹا دے ہر نمایاں شان کو
قوم کا تکیہ بنا دے قوم کے ایوان کو

وہ غلامی جو نشاطِ زندگانی چھین لے
ملّتِ محکوم سے ہمّت، جوانی چھین لے

وہ غلامی جس سے بہرِ منزلت روکنا پڑے
حکمراں کے سامنے محکوم کو جُھکنا پڑے

شہر یارِ دہر کا اندازِ خواری ہائے ہائے
ابنِ آدم اور یہ خدمت شعاری ہائے ہائے

خاک میں غلطاں ہو فرقِ آدمیت کی کلاہ
اے زمیں تاریک ہو، اے آسماں ہو جا سیاہ

نہال سیوہاروی

بہار کی رات

آ مری جان جلد آ بس یہی رُت ہے پیار کی
دل میں کھِلی ہے چاندنی رات بھی ہے بہار کی

(۱)

چشمۂ عشق بھی اگر موج زناں رہے مدام
پہنچے نہ کچھ اسے ضرر از گذرِ صباح و شام
پھر تو ضرور ہر بشر بن کے رہے غلامِ عشق
اپنی حیات و جاہ و زر وقف کرے بہ نامِ عشق
ایک ہی رنگ پر مگر سوزشِ اندروں نہیں
تاب و تپِ غمِ جگر بے خبرِ سکوں نہیں

اس لئے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ بس یہی رُت ہے پیار کی

(۲)

جب ہوئے یار دو جدا نالہ کناں و اشکبار
سمجھے کہ زخم وہ لگا اب نہ بچے گی جانِ زار
جب گئے چند دن گزر آپ قرار آ گیا
جس پہ فدا تھی جاں۔ نظر گر وہی یار آ گیا
اب نہ وہ کیفِ جوش ہے اب نہ وہ لب پہ آہ ہے
آتشِ دل خموش ہے شوق بھی کم نگاہ ہے

اس لئے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ بس یہی رُت ہے پیار کی

(۳)

مل گئے دو حبیب جب پڑھنے لگے وہ بابِ عشق
صبح و مسا و روز و شب حفظ ہوئی کتابِ عشق
ہو گئی سیر جب ہوس کرنے لگے وہ خونِ عشق
بن گیا آشیاں قفس ختم ہوا جنونِ عشق
زیست کے سانحات میں رہ نہ سکا خمارِ عشق
کشمکشِ حیات میں خاک ہوئی بہارِ عشق

اس لئے اے مری حیات
مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات
ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ بس یہی رت ہے پیار کی

(۴)

بنتے ہیں جو وفا شعار کہتا ہوں اُن سے صاف صاف
قول کا اُن کے اعتبار مجھ کو نہیں خطا معاف
ایک سے تا بہ زندگی عشق بشر کی خو نہیں
ایک خدا کی بندگی مذہب آرزو نہیں
شوق ہیں جب ہوس نہیں پھر وہ نہیں عیارِ عشق
تاب کن قفس نہیں طائرِ بے قرارِ عشق

اس لئے اے مری حیات مجھ کو پسند ہے یہ بات
ساتھ رہیں بس ایک رات ہو وہ مگر بہار کی
آ مری جان جلد آ بس یہی رُت ہے پیار کی
دل میں کھِلی ہے چاندنی رات بھی ہے بہار کی

آنند نرائن مُلّا

ایشیا۔ فروری سنہ ۱۹۳۴ء

یادِ ماضی کا پیغام

وہ کہتے ہیں کہ میری لغزشوں کو بھول جاؤ تم   کتابِ عاشقی کا باب اک نیا سناؤ تم
بہار کی دھنوں میں دُکھ کا ایک نیا راگ گاؤ تم   سرشکِ درد بادلوں کے ساتھ پھر بہاؤ تم
غبارِ قلب دھو کے کیفِ عشق ساتھ لاؤ تم
وہ کہتے ہیں کہ میری لغزشوں کو بھول جاؤ تم

افق پہ تیرتی ہیں مست و مشکبار بدلیاں   بنی ہوئی ہیں موجِ نکہتِ بہار بدلیاں
شراب ریز بدلیاں، شباب کار بدلیاں   بُری طرح سے گر رہی ہیں بیقرار بدلیاں
سکونِ دل کی بدلیوں کو اپنے ساتھ لاؤ تم

پیام دے رہے ہیں گل مہک مہک کے عشق کا   سُنا رہی ہے نغمہ شاخِ گل مہک کے عشق کا
طیور گیت گا رہے ہیں پھر چہک کے عشق کا   بجا رہا ہے ساز میکدہ بہک کے عشق کا
شرابِ عیش ایک بار آکے پھر لنڈھاؤ تم

بہار کی لطافتوں میں کھو گئی ہیں ہستیاں   ہر اک طرف ہواؤں میں گھلی ہوئی ہیں مستیاں
مسرتوں میں جذب ہو گئی ہیں دل کی پستیاں   مصیبتوں کی محو ہو گئی ہیں چیرہ دستیاں
بُرے دنوں کی یاد دل میں بھول کر نہ لاؤ تم

جواں ہے نوبہار و لالہ زار و جوئے بار بھی   جواں ہے گلستاں بھی دشت اور کوہسار بھی
جواں ہیں پست ہمتیں جواں ہے قلبِ زار بھی   جواں ہیں حسرتیں جواں ہے عشقِ بیقرار بھی
جوانی ہنس رہی ہے اس سمے میں کیوں نہ آؤ تم

زمردیں چمن کی رنگتوں کے ساتھ آؤ تم   بہار کی لطیف نزہتوں کے ساتھ آؤ تم
شفق کی ارغوانی طلعتوں کے ساتھ آؤ تم   گھٹا کی مشکبو لطافتوں کے ساتھ آؤ تم
گلوں کی نشہ ریز نکہتوں کے ساتھ آؤ تم

پپیہے کی پکار پھر نہ قلب کو رجھائے گی   نہ کوئلوں کی کوک دل میں ہوک سی اٹھائیگی
سدا نہ دل کی ہوک پھر یہ لطف ساتھ لائیگی   دلوں کی چھیڑ چھاڑ پھر نہ یہ سماں دکھائے گی
بہار کی پری ہے محوِ رقص و نغمہ آؤ تم
نہ یہ سماں رہے گا پھر نہ یہ گھٹا رہے گی پھر   نہ مشک رنگ و مشکبار یہ فضا رہے گی پھر

حیاؔ

غلاموں کی دنیا

بے عمل، بے آب وتاب زندگی، بے ننگ و نام
آہ وہ دنیا جہاں کے رہنے والے ہوں غلام

جس کے انسانوں کو ننگِ عالمِ انساں کہیں
کہنے والے زندگی کا جس کو گورستاں کہیں

دیکھ ہے کیا صفحۂ عبرت غلاموں کا جہاں
سر بسر اک عالمِ ظلمت غلاموں کا جہاں

یہ وہ عالم ہے جہاں عشرت کی ارزانی نہ ڈھونڈ
عیش کوشی، عیش رانی، عیش سامانی نہ ڈھونڈ

رہنے والے اس زمیں کے مرکزِ آلام ہیں
یہ وہ صہبا نوش ہیں، جن کے شکستہ جام ہیں

کارگاہِ دہر میں تقدیر کے بیٹھے ہیں یہ
جن کی جنت چھن چلی آدم کے وہ بیٹے ہیں یہ

ان کو کیا معلوم کس صورت سے جینا چاہیئے
کس طرح بے منتِ اغیار جینا چاہیئے

ان کو کیا معلوم ہے ہستی کا نصب العین کیا
یہ جہاں کہتا ہے آزادی کسے، ہے چین کیا

ان کو کیا معلوم کیا ہے شیوۂ مردانِ کار
آدمی کیونکر بدل دیتے ہیں رنگِ روزگار

ان کو کیا معلوم کیا ہے عظمتِ خاکِ وطن
چاہتی ہے کیا فغانِ سینۂ چاکِ وطن

ان کو کیا معلوم کیا ہے منزلت انسان کی
یہ غلامی کو سمجھتے ہیں صفت انسان کی

ان کو کیا معلوم کیا ہوتا ہے احساسِ خودی
آدمیت کے لئے لازم ہے کیوں پاسِ خودی

ان کو کیا معلوم اس عالم کی آقائی ہے کیا
یہ سمجھتے ہی نہیں پربت ہے کیا رائی ہے کیا

ان کو کیا معلوم کیا ہیں پرچم و تخت و کلاہ
زندگانی ہے غلاموں کے تخیل میں گناہ

ان کو کیا معلوم یہ عالم بہارِ عیش ہے
ان کی دنیائے غلامی سوگوارِ عیش ہے

ان کو کیا معلوم کیا ہے رزم طوفانوں کے ساتھ
ان کو دیکھا ہی نہیں پُرجوش طوفانوں کے ساتھ

زندگی ہے جس کی شکلِ موت اُس عالم کو دیکھ
دیکھنے والے غلاموں کے جہانِ غم کو دیکھ

ہے بظاہر عالمِ زندہ مگر زندہ نہیں
اسکے سینے میں شرارِ زیست تابندہ نہیں

انتہائے خواب کے سانچے میں ہے ڈھالی ہوئی
ہے یہ دنیا موت کے آغوش میں پالی ہوئی

ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا نشانِ انقلاب
دور ہے اس سرزمیں سے کاروانِ انقلاب

گردشِ ایام کا کچھ زور چلتا ہی نہیں
حشر بھی آئے تو یہ عالم بدلتا ہی نہیں

خیر مقدم

ہر ایک حرفِ آرزو کو داستاں کئے ہوئے — زمانہ ہو گیا ہے اُن کو میہماں کئے ہوئے
سرودِ عیش تلخیٔ حیات نے بھلا دیا — دلِ حزیں ہے بےکسی کو حرزِ جاں کئے ہوئے
بہارِ حُسن و دلبری کا خواب پھر سے دیکھ لوں — خیالِ حُسن و دلبری کو جاوداں کئے ہوئے
کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے وہ آئیں گے — وہ آئیں گے کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے
سکونِ دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں — سکونِ دل کی راحتوں کو بیکراں کئے ہوئے
حدیثِ آہِ نیم شب سُناؤں گی سُناؤں گی — زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کئے ہوئے
وہ آرزوئے دل کی ہمتیں بڑھائیں شوق سے — غرورِ عشق بےنوا کو کامراں کئے ہوئے
وفورِ شوق و بےخودی ٹھہر ٹھہر دلِ حزیں! — نگاہِ شوق و بےخودی کا امتحاں کئے ہوئے
تجلّیاں لئے ہوئے وہ آرہے ہیں سوئے دل — نگاہ و دل کی وسعتوں کو لامکاں کئے ہوئے
وہ آئیں گے تو آئیں گے جنونِ شوق اُبھارنے — وہ جائیں گے تو جائیں گے تباہیاں کئے ہوئے
متاعِ صبر و ہوش کو لُٹاؤں ان کی راہ میں — وداعِ صبر و ہوش کو متاعِ جاں کئے ہوئے
میں اُن کی بھی نگاہ سے چھپا کے ان کو دیکھ لوں — کہ اُن سے بھی ہے آج رشک بدگماں کئے ہوئے
وقارِ عشق تو سہی کریں وہ اعترافِ غم — نظر کو دل کی دھڑکنوں کا رازداں کئے ہوئے
سرِ نیاز و پائے ناز ابتدا تھی عشق کی — اب انتہائے بےخودی ہے سرگراں کئے ہوئے

یہ کیفِ انتظار ہے کہ ساری عمر کاٹ دوں
نظر کو وقفِ انتظارِ دلستاں کئے ہوئے

ع جہاں بیگم آدا (بدایونی)

موت

اپنی سوئی ہوئی دُنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غمخانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جامِ مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں

ابھی چلتا ہوں، ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی، ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دُھندلا دُھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں، دُنیا ہوئی جاتی ہے غبار

آنکھ تو مل لوں، ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں

وہ مرا سحر وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا

اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گالوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا، اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین پُر اسرار خیالوں کے محل

ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانہ میں نہیں جس کا چلن!!
آنسوؤ!! تم نے تو بیکار بھگویا دامن

اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور

ایسے وہموں سے بھی اب خود کو نکالوں تو چلوں

معین احسن جذبی بی-اے

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

میری منزل

طاقتِ رفتارِ تاباںؔ آزمانا ہے مجھے   مشکلاتِ راہ کو آساں بنانا ہے مجھے
کچھ بھی ہو لیکن قدم آگے بڑھانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

میری منزل رفعتِ افلاک سے بھی دور ہے   میری منزل سرحدِ ادراک سے بھی دور ہے
ہر قدم لیکن سوئے منزل اُٹھانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

وسعتِ دوراں سے بھی آگے نکل جاؤں گا میں   عالمِ امکاں سے بھی آگے نکل جاؤں گا میں
ذرّۂ ثابت کو سیّارہ بنانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

گرمیِ رفتارِ عہدِ نو جوانی کی قسم   برق گامی کی قسم طوفاں خرامی کی قسم
امتیازِ دوری و قربت مٹانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

اُٹھ چکا ہے جو قدم پیچھے وہ ہٹ سکتا نہیں   چاہے کچھ ہو جائے لیکن میں پلٹ سکتا نہیں   ۶۱
اب تو بڑھنا ہے مجھے بڑھتے ہی جانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

لڑکھڑاتا - ڈگمگاتا - ٹھوکریں کھاتا ہوا   میں چلا جاؤں گا قربِ و دور پر چھاتا ہوا
ذہن سے قصدِ تمکّن اب بھلانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

راستہ میں خشمگیں طوفان حائل ہی سہی   ایک اک ذرّہ جفا کوشی پہ مائل ہی سہی
ہمنفس پھر بھی قدم آگے بڑھانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

خار کیا تلوار سدِّ راہ بن سکتی نہیں   آہنی دیوار سدِّ راہ بن سکتی نہیں
انقلابی عزمِ مستحکم دکھانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

راہ کی دشواریوں سے کھیلتا جاؤں گا میں   سخت ناہمواریوں سے کھیلتا جاؤں گا میں
آبلہ پائی پہ تاباںؔ مسکرانا ہے مجھے   دور جانا ہے مجھے ہاں دور جانا ہے مجھے

تاباں (فتح گڑھ)

ایشیا۔ فروری ۱۹۴۲ء

بادل

(۱)

ایک شاعر کے پراگندہ خیالوں کا ہجوم — اُجڑے اُجڑے سے گلستانوں میں ہے سیر کناں
اپنے ہی رنگ کی گہرائی میں اُڑتے اُڑتے — جیسے رُک جائے فضاؤں میں مرے پائپ کا دھواں

قصرِ ذی شان و پُر ہیبت کی سیہ دیواریں — جیسے ہر ایک جگہ چھوڑ دیں اپنی صیقل
یا سمندر کی اک الھڑ سی حسیں دوشیزہ — بس یوں ہی بھولے سے کپڑوں میں لگالے کاجل

سرد موسم میں سرِ چرخ کوئی دوشیزہ — رات کی سیر کو نیلی سی دُلائی میں آئے
آسماں والوں کی رنگیں شرارت کے سبب — جیسے ہر ایک جگہ نرم دُلائی پھٹ جائے

ایک آوارہ نے جنگل کی اُدھر بستی میں — ابھی کچھ دیر ہوئی جیسے لگائی تھی آگ
یا اُڑاتے ہیں بہر سمت ہزاروں مے خوار — ساغرِ چرخ میں صہبائے تر و تازہ کے جھاگ

سادے سادے سے حسیں پھول ہوائیں پاکر — گلشنِ بحر میں ہر چار طرف لہرائیں
اور سورج کی شعاعوں کے حسیں جھرمٹ میں — آسمانوں کے سمندر کے کنول کھل جائیں

آرٹسٹ اک نئی تصویر بنانے کے لئے — جائزہ جیسے ہر اک سمت نظاروں کا لے
اور پھر تختۂ تصویر کو برہم ہو کر — مختلف رنگ کو اک ساتھ ملا کر بھر دے

دور کے مغرور ارادوں سے مرے دور سلام — بکھرے بکھرے سے یہ موضوع یہ آوارہ خیال
جس طرح میری حسیں اور نئی نظم کے گرد — چاند تاروں نے کہیں چھپ کے لگائے ہیں جال

سلام (مچھلی شہری)

ایشیا۔ فروری ۱۹۴۲ء

ہدیۂ محبّت

(انجم کے نام)

سکوں ہو فضاؤں میں یا اضطراب
محبت تو چھیڑے گی اپنا رباب

اُٹھیں آندھیاں خاک و خاشاک کی
نہ کھوئے گیا یہ آئینہ آب و تاب

زمانہ میں ہو خشک سالی تو ہو
برستی رہے گی سدا یہ شراب

شریعت جہنّم سی آنکھیں دکھائے
یہ جنّت نہ ہوگی کسی کو عذاب

کھُلیں عقل و حکمت کے دفتر کھُلیں
جنوں کا نہ ہوگا کبھی سدِّ باب

محبت ہوس کی ہے بیٹی تو کیا!
وہ بدکار عورت یہ عصمت مآب

محبت ہے اک مریمِ پاک دل
ہوس اک زلیخائے رنگیں شباب

محبت کی دیوی کے آغوش میں
سکوں بن کے رہتا ہے ہر اضطراب

امیدوں کی ضو ریز قندیل سے
جھلکتا ہے قصرِ محبت کا باب

[illegible]
[illegible]

مگر وہ محل میری انجم نہیں
جہاں سینکڑوں عصمتیں ہوں خراب

جہاں حکمِ مستی ہو گلبانگ نے
جہاں اذنِ لغزش ہو دورِ شراب

ہوس مقصدِ مے پرستی نہیں
بہت دن سے پیتا ہوں میں بھی شراب

وہ ہر دم ترے ساتھ دُنیا کی سیر
وہ ہر لمحہ رنگیں ترا اک خواب

کبھی وہ فضائیں پہلگام کی
مچلتی ترے رُخ پہ موجِ شہاب

کبھی سیرِ رنگین گلمرگ کی
ترے سُرخ عارض سے ملتے گلاب

میہ نو کا سنگم پہ منظر کبھی
تری چشم و ابرو کا مبہم جواب

کبھی وہ شبِ ماہ میں سیرِ تاج
نظر میں محبت کی روشن کتاب

وہ گنگا کے دھارے کا منظر کبھی
کہ جیسے مچلتا ہو تیرا شباب

وہ راوی کے ساحل پہ تو سرو قد
کہ اُلٹی ہو نورِ جہاں نے نقاب

وہ میرے لئے تیرا ذوقِ وفا
کہ جس کی کوئی حد نہ کوئی حساب

رہے گرچہ محرومِ تعبیر آہ
مری جاگتی چشمِ حسرت کے خواب

مگر اس سے تو آہ یہ مت سمجھ
کہ ہے زندگی دل کی ناکامیاب

ہو کچھ، زندگی موت فرقت وصال!
محبّت بہر کیف ہے کامیاب

جاں نثار اختر (علیگ)

ایشیا۔ فروری ۱۹۴۲ء

اجتماعِ ضدّین

حُسن کی فطرت میں نرمی عشق کی فطرت میں خروش
اُس کی فطرت میں لطافت اس کی فطرت میں خروش

عشق کی آنکھیں درخشاں شعلۂ نمناک سے
حُسن کا چہرہ مزیّن نورِ ہفت افلاک سے

حُسن میں شانِ تغافل عشق میں آمادگی
اُس میں شانِ دلربائی اس میں رنگِ سادگی ٦۴

اُس کی خو میں لوچ ہے مثلِ خرامِ جوئبار
اس کے حصّے میں پڑا ہے کوہساروں کا وقار

چاند کی سی اُس میں خنکی شاخِ گل کی سی لچک
اس میں شعلوں کی حرارت بجلیوں کی سی لپک

وقف ہے وہ کجکلاہوں خوش جمالوں کے لئے
اور یہ وجداں پرست آشفتہ حالوں کے لئے

ذوقی

ایشیا۔ فروری ۱۹۴۲ء

طلسمات

(دو تازہ غزلیں)

ہجومِ خیالات ہے اور کیا ہے — وہی بارِ آفات ہے اور کیا ہے
وہی ہم ہیں اور آرزوئے تلاطم — وہی شورِ جذبات ہے اور کیا ہے
وہی ہم وہی تم وہی سوزِ قربت — ابھی تک ملاقات ہے اور کیا ہے
ابھی تک کھنچے جا رہے ہیں دل و جاں — یہ جذبِ مدارات ہے اور کیا ہے
وہی انتظارِ مسلسل کا عالم — جنونِ ملاقات ہے اور کیا ہے
کہاں ہم کہاں تم کہاں یہ ستارے — یہ دل کی کرامات ہے اور کیا ہے
فغانِ شبی نغمۂ صبحگاہی — فریبِ مناجات ہے اور کیا ہے
۶۵ جنونِ محبت، جنونِ محبت!! — فسونِ روایات ہے اور کیا ہے
نہ پوچھو مرے ذوقِ عصیاں کا حاصل — جوانی کی اک رات ہے اور کیا ہے
مرے من کی دُنیا ترے من کی دُنیا — جہانِ طلسمات ہے اور کیا ہے
مری اشک ریزی پہ اتنی نہ کانپو! — کہ یہ عیشِ جذبات ہے اور کیا ہے
دلوں میں بہ شکلِ شرارِ تمنا — مرا سوزِ نغمات ہے اور کیا ہے
ازل میرا سایہ ابد میرا پرتو — مری ذات ہی ذات ہے اور کیا ہے

ہے ساغر کو مٹنے کی خواہش ابھی تک
یہ سحرِ خرابات ہے اور کیا ہے

ساغر (نظامی)

(۲)

بلند از وفا و جفا ہو گئے ہم
محبت سے بھی ماورا ہو گئے ہم

اشاروں، اشاروں میں کیا کہہ گئے وہ
نگاہوں، نگاہوں میں کیا ہو گئے ہم

ترے دل میں رہ کر نظر میں سما کر
تمنائے ارض و سما ہو گئے ہم

نہ دیکھے گئے اُس نظر کے تقاضے
زسرتا بہ پا مدعا ہو گئے ہم

جسے دیکھئے تک رہا ہے ہمیں کو
تری بزم کا آئینا ہو گئے ہم

سمجھنا ترا کوئی آسان ہے ظالم
یہ کیا کم ہے خود آشنا ہو گئے ہم

محبت کی کچھ تلخیوں کی بدولت
سغنئ شیریں نوا ہو گئے ہم

حقیقت نہ تھی دل لگانے کے قابل
حقیقت سے کیوں آشنا ہو گئے ہم

پڑا رہ گیا سازِ ہستی اکیلا
برنگِ ترنم رہا ہو گئے ہم

تباہی بھی ہے اک نشانِ ہدایت
لٹے اس قدر رہنما ہو گئے ہم

جو اُبھرے تو طوفان و سیلاب بنکر
جو ڈوبے تو رازِ بقا ہو گئے ہم

مشیت کو خاموش دیکھا تو بڑھ کر
بنامِ خودی ناخدا ہو گئے ہم

صدا دو محبت کے تاریخ داں کو
کہ پھر سے اسیرِ بلا ہو گئے ہم

نہیں کم یہ ہستی کی معراج ساغر
کہ خاکسترِ میکدا ہو گئے ہم

ساغر (نظامی)

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

بابتہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء

کسوٹی

(نئی کتابیں)

ذکر و فکر ۔ مقصود زاہدی صاحب کے مضامین اور افسانوں کے اس مجموعہ پر ہندوستان کے تقریباً ہر رسالہ اور اخبار نے اپنی رائے کا اظہار کیا یعنی "ذکر و فکر" کی یہ حیثیت تو طے شدہ ثابت ہوئی کہ لوگ اس پر اظہار رائے کرنے کیلئے مجبور ہو گئے۔ یہ تمام رائیں میری نظر سے گذریں اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ لوگ مقصود صاحب کی نیم خوابیدہ قوتوں کے قائل ہیں۔ اور ہر شخص اس خیال سے متفق ہے کہ مقصود کی شخصیت میں ایک جدید مصنف بیدار ہو سکتا ہے۔ جہاں تک میری رائے ہے میں نے ذکر و فکر کے دیباچہ ہی میں ان بنیادی خیالات سے بحث کی تھی جو آج حاشیہ کی صورت میں ظاہر کئے گئے ہیں۔

ہر اس شخص کو جو نئے ادب کی راہ پر گامزن ہونا چاہتا ہے آج شدید طور پر خود انتقاد اور خود اعتماد ہونے کی ضرورت ہے۔ محض تقلیدی طور پر نچلے طبقہ کی نمائندگی اور طبقاتی خوش آئند انقلابی تصورات، آنیوالے ایک پرولتاری انقلاب کا خواب، چند نام نہاد اور گمراہ کن الفاظ، مزدور، انقلاب، خون، امیر، غریب اور ان سب کی نہایت بے جان اور رسمی نمائندگی کا نام نیا ادب ہرگز نہیں ہے۔ اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ادب محض ایک خاص اقتصادی نظریہ کے ماتحت پیدا ہونا چاہیے تب بھی مباحث اور مسائل میں جو لطیف ترین متضاد گوشے ہیں انھیں کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آج نئے ادیب کیلئے اعلیٰ درجہ کا مفکر ہونا لازم ہو گیا ہے۔ میرے خیال سے آج وہ گروہ رجعت پسندی کے قریب آ گیا ہے جس نے نام نہاد ...... حدود تک ترقی پسندی کو محدود کر دیا ہے۔

ترقی پسند ادب میں بہت سے عناصر ایسے ہیں جن کو ہم اس عبوری دور میں قطعیت کا درجہ نہیں دے سکتے لیکن سب سے پہلے "زندگی جیسی کہ آج ہے" اُسے صحیح ترین شکل میں پیش کرنا ایک کامیاب اور اعلیٰ درجہ کے آرٹسٹ کا اوّلین فریضہ ہے۔ اس کے بعد "زندگی جیسی کہ ہونی چاہیئے" کی منزل آتی ہے جہاں نظریاتی اور صحیح انقلابی بنیادوں پر تدریجی ترقی کے امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے ادب کے ناخداؤں کو آگے بڑھنا ہوگا۔

مقصود کو مشاہدہ کا شوق ہے۔ سوچنے کا ذوق ہے۔ وہ انسانی دکھ سکھ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان کا انداز تحریر شگفتہ، سادہ اور دلکش ہے۔ یہ تمام خصوصیتیں ایسی ہیں کہ مقصود کی ذات میں کچھ اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ بہرحال یہ شاندار کامیابی ہے کہ (شاندار پسپائی کے وزن پر) ذکر و فکر کو دیکھ کر لوگوں نے ان کی صحیح طاقتوں کا اندازہ کیا اور کھلے دل سے ان کی ذات سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ کیں۔ یہ کتاب ادبی مرکز میرٹھ سے مل سکتی ہے، قیمت علاوہ محصول آٹھ آنے ۸ر

The Life and Odes of Ghalib مولفہ و مترجمہ عبداللہ انور بیگ۔ ایم اے، ایم او ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ۔ لاہور

سوانح غالب اور اُس کی غزلیات ناشر اردو اکاڈمی لاہوری گیٹ لاہور قیمت ۸ر

اُردو اکاڈمی لاہور نے گذشتہ سال میں کئی کتابیں بہت اچھی شائع کیں، علاوہ تخلیقی ادب کے اس کی توجہ ترجمہ شائع کرنے کی طرف بھی مبذول ہوئی۔ ترجمہ بظاہر بہت آسان کام معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تخلیقی ادب سے زیادہ اہم اور مشکل کام ہے۔ ترجمہ کے ذریعہ خوفناک غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں اور بنیادی تعمیری صحت کا فرض بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔

انور صاحب نے اس سے پہلے اقبال کے کلام کو انگریزی میں پیش کیا تھا، اُن کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ مشرقی علوم کے علاوہ جرمن، فرانسیسی زبان و ادب سے بھی واقف ہیں؛ نہایت خاموش کام کرنیوالے ہیں۔ اُنکی صلاحیت و جرأت تو اسی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے غالب جیسے بلند مرتبہ شاعر کے کلام کو انگریزی زبان میں منتقل کرنیکی سعی کی۔

ایشیا فروری ۱۹۴۲ء

کسی زبان کی شاعری کو دوسری زبان میں منتقل کرنا نہایت امتحان و ذمہ داری کا کام ہے، اس فریضہ کو ادا کرنے کیلئے مترجم کیلئے لسانی نزاکتوں، اور شاعرانہ گہرائیوں کا ماہر ہونے کی ضرورت ہے۔ اول تو اُسے شاعر کی اصل رُوح سے کامل وقوف کی ضرورت ہے اور پھر ان زبانوں پر کامل درک کی بھی جن سے ترجمہ کیا اور جن میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، ترجمہ نہایت مایوس کُن ہے، یہ مایوسی کوئی انور صاحب کی عدم قابلیت کا نتیجہ نہیں۔ شعر کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا بجائے خود نہایت خطرناک فریضہ ہے۔ وہ لذت اور وہ رُوحانی وسعت جو کسی زبان کے الفاظ کے سواد سے تعلق رکھتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ میں منتقل ہی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً غالبؔ کے اس شعر کا ترجمہ میں کہ ؎

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
"موئے آتش دیدہ" ہے حلقہ مری زنجیر کا

انور صاحب نے موئے آتش دیدہ" کا ترجمہ (A hair that hath seen fire) وہ بال جس نے آگ کو دیکھا ہے کیا ہے۔ حالانکہ "آتش دیدہ" کا ترجمہ "آگ کو دیکھا" ہے نہیں ہے "آتش دیدہ" بال کی صفت ہے فعل نہیں ہے۔ اس لئے "موئے آتش دیدہ" کے معنی ہیں۔ وہ بال ۷۰
جسے آگ دکھائی گئی۔ لہٰذا اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیئے۔ (Fire - Shane hair) نہ کہ (That hath seen fire)

اسی طرح غالبؔ کے اس شعر کا ترجمہ کہ ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل   خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

"گم کیا ہوا پایا" کا ترجمہ (Having lost it found) کیا گیا ہے۔ گویا گم کیا ہوا پایا کا ترجمہ انور صاحب کے نزدیک " دل کو گم کر دیا اور پا لیا" ہے۔ مگر شعر کا صحیح ترجمہ یہ نہیں ہے۔ غالبؔ کے شعر کا نثری ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ " بہار کی آمد سے جو کلی کھلی ہے اور اُسمیں جو رنگ نمایاں ہوا ہے وہ میرے خون آلود دل کی تصویر ہے۔ (یہ حادثہ غالبؔ کے دل کے ساتھ ہو چکا ہے، وہ غنچہ و رنگیں سے دلِ خون آلودہ کا استعارہ کرتا ہے۔ غنچہ کے کھلنے کو خون ہونے سے تعبیر کرتا ہے اور پا یا کو مل جانے سے (Regained) اس مقام پر نظیری اور غالبؔ دونوں تناسخ کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ نظیری کہتا ہے کہ ؎   یادگارِ جگرِ سوختۂ مجنوں است   لالۂ چند کہ از دامنِ صحرا برخاست

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انور صاحب نے اردو شعر کو غور سے سمجھنے کی سعی نہیں کی، اور اپنی توجہ محض ترجمہ کر دینے کی طرف مبذول رکھی۔

اسی طرح الفاظ کے ترجموں میں بھی محض ڈکشنری کا سا فرض ادا کیا گیا ہے۔ "محبوب قاتل" کا ترجمہ (Assassin) یا گورِ غریباں کا ترجمہ (Strang ro' grave .) کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ غور کرتے تو اُن میں اس سے زیادہ صحیح اور موزوں ترجمہ کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ یہ اور اس قسم کی کمزوریاں غالبؔ کو انگریزی میں غلط متعارف کرا سکتی ہیں، اور یہ غالبؔ کیساتھ کافی ظلم ہے۔ کلامِ غالبؔ کے انتخاب میں بھی پوری توجہ صرف نہیں کی گئی۔ بعض دلدوز اشعار نظرانداز کر دیئے گئے ہیں، اکثر معمولی اشعار چُن لئے گئے ہیں، ممکن ہے انور صاحب کا ذاتی ذوق اس انتخاب میں کارفرما ہو۔

بہرحال، اقبالؔ کے بعد غالبؔ کو انگریزی میں لانا، ایک بہت اہم خدمت ہے، جو نقائص موجودہ ایڈیشن میں رہ گئے ہیں اُن نقائص کو انور صاحب دوسرے ایڈیشن میں نظرِ ثانی کے بعد نکال سکتے ہیں، اُردو اکیڈمی کی یہ خدمت یقیناً داد کی مستحق ہے۔ کتاب اپنے ظاہری حسن و جمال کے لحاظ سے کافی شاندار ہے۔

Expression and Communication مصنفہ ڈاکٹر دین محمد تاثیر ایم اے
پی ایچ ڈی (کینٹب)
قیمت ۸ آنے۔ ملنے کا پتہ مسٹر پی۔ سی۔ ٹائر۔ ٹائرہ ہاؤس امرتسر (پنجاب)

یہ مختصر لیکن جامع، اہم اور مفید رسالہ "فنونِ لطیفہ اور اُن کی ادائیگی" کے موضوع پر سوسائٹی فار دی پروموشن آف آرٹ اینڈ کلچر کی تحریک پر تاثیر صاحب نے مرتب کیا ہے۔ فنونِ لطیفہ اور سماج کی پیچیدگیوں اور ان سے تعلق رکھنے والے نئے پیدا شدہ مسئلوں پر بحث کی ہے، خاص کر آلاتِ ادائیگی کے متنازعہ مسئلہ پر۔

تاثیر صاحب نے فرانس کے مشہور مصور۔ گلیز اور کرسٹوفر کاڈول کے حوالوں سے موجودہ سرمایہ دار سماج پر تقریباً انھیں الفاظ میں روشنی ڈالی ہے جن الفاظ میں مارکس اور اینگلز گذشتہ صدی میں بحث کر چکے ہیں، تاثیر لکھتے ہیں۔

آرٹسٹ کے لئے اس دیوانی دنیا کو کیا بنانا ضروری ہے۔ اس بنیادی تضادوں والی دُنیا کو، اس دنیا کو جس میں اکثریت بھوک اور فاقہ کی آگ میں بھسم ہو رہی ہے۔ اس چیز کو چھوڑو، اور آرٹسٹ کر بھی کیا سکتا ہے۔ جبکہ اس کے دماغی سرمایہ کو بازاری چیزوں

کی طرح سمجھا جانے لگے اس کی وہی قیمت رکھنے لگے جو، جوتوں، ٹوپیوں اور کرسیوں کی ہوتی ہے۔ آرٹ اور دوسری چیزوں کے امتیازی فرق کیساتھ، یہ چیزیں تو زندگی کی ضروریات میں شامل ہیں۔ آرٹ ضروریاتِ زندگی میں لازماً شامل نہیں۔"

ان الفاظ میں اُس اسکول کی تقلید جھلکتی ہے جو سرمایہ داری کے پیدا کردہ جھمیلوں اور اس دور میں آرٹ کی مایوس کن حالت پر بے رحمانہ تنقید کرنے کا عادی رہا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر آگے چل کر کہتے ہیں :-

سپنگلر کا یہ کہنا کہ :-

" دن اور رات سے اک مسرت گم ہو گئی ہے "

اس کا ماتم نہیں ہے۔ یہ ذاتی گھٹن اور غصہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت اہم اور سنجیدہ چیز ہے، یہ ایک بنیادی چیز ہے جو غائب ہو گئی ہے" صفحہ ۱۴

سرمایہ دار سماج پر جو گروہ ترقی پسندانہ تنقید کرتا ہے تاثیر صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر آپ ولیم ہنڈلیٹ کے موید بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ :-

" یہ ممکن ہے کہ تمام قوم سے ترقی یافتہ طبقوں کی جدائی .... اور انسانی دماغوں کی دو جداگانہ طبقوں میں تقسیم (ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ) ایک تیاری ہو جسے میں آرٹ کی مختلف اصناف میں دیکھ رہا ہوں" ص۳۵ ولیم کے قول پر تاثیر صاحب کی رائے ہے کہ :-

" یہ ایک علم ہئیت کا سا اندازہ ہے لیکن ایک اُس دنیا میں جہاں وہ چیز جسے کبھی مستحکم اور حقیقی سمجھا جاتا تھا۔ غیر حقیقی اور .... معلوم ہوتی ہے، کس چیز پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ مستقبل پہلے کے مقابل اب کہیں زیادہ خداؤں کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے " ص۳۸

گویا آپ کے نزدیک سماج نامعلوم مدت تک دو تقسیم شدہ ٹکڑوں کے اُن جھگڑوں کو برداشت کرتا رہیگا جو انسانیت کی تمام تر تباہی کی اصل ہیں اور اگر آخر میں کوئی تبدیلی ہوئی تو وہ منطق کی راہ سے ہٹکر خدائی رہنمائی کی تلاش کریگا۔

دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں نہ سوسائٹی غیر معینہ مدت کیلئے موجودہ نظام پر قائم رہ سکتی ہے اور نہ تاریخی و سماجی طاقتوں کی رفتار غیر منطقی ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر تاثیر صاحب نے پھر اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے :-

سپنگلر کے ہم زبان ہو کر یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے کہ " دنیا میں بڑا عہد پھر سے شروع ہو رہا ہے" ص۳۹

لیکن بہر حال ان چند جزیات کو چھوڑ کر، ادب اور سماج، اور خاص کر سرمایہ داری ادب کے ساتھ سماج کے سلوک کا تعلق ہے تاثیر صاحب نئے اسکول ہی کے موید ہیں :-

عہدِ سرمایہ داری میں جب عام پیداوار (Mass Production) میں عجلت کیساتھ ترقی ہو رہی ہے۔ یہ اُمید کرنا حقیقتوں سے مذاق کرنا ہوگا۔ کہ سوسائٹی ان فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کو برداشت کر سکتی ہے جو غیر مادی قسم کے فلسفیانہ مسائل سے بحث کرتے ہیں اور جو اپنا مخاطب ایک محدود طبقۂ عقلاء (Intellectuals) کو فرض کئے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں اگر یہ ادیب سوسائٹی کو بُرا کہتے ہیں تو تعجب نہیں کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں سوسائٹی اسکو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اُن کے لئے صرف دو راستے ہیں یا تو وہ تاثیر صاحب کے الفاظ میں :- رمباڈ کا راستہ اختیار کریں اور بیسویں صدی کو اپنے پیچھے چھوڑ دیں ص۲۴ اور غیر ترقی یافتہ مقامات میں رہن سہن اختیار کریں جس طرح رمباڈ پیرس کو چھوڑ کر حبش چلا گیا تھا۔ اور یا ـــ ایکسل کی پیروی کریں، یعنی اپنے خیال میں مگن رہیں، ذاتی تصورات، جنون و خبط کی دُنیا میں گھومتے رہیں اور بالآخر حقیقتوں پر اپنے توہمات کو ترجیح دیں بلکہ خود اُنھیں کو حقائق سمجھنے لگیں ص۲۷

بلا شک سرمایہ دار ادیبوں کا انجام یہی ہے اور یہی ادب برائے ادب کے نظریہ کی حدِ آخر ہے۔

یہ رسالہ محض ۹۳ صفحات کا ہے لیکن اس مختصر سے رسالہ میں تاثیر صاحب نے موضوعات زیر بحث پر عالمانہ بحث کی ہے۔ ادب اور عوام کے موضوع پر یہ کتاب مفید اور بلند مسائل کے بلند اور مفید ترین حلوں پر مشتمل ہے۔ ادب اور اُس کے جدید تقاضوں سے روشناس ہونے کیلئے ہر اُس شخص پر اُس کا مطالعہ فرض ہے جو تنقیدِ ادب کے نئے پہلوؤں سے آگہی چاہتا ہے۔ یقیناً اس کا مطالعہ زاویہ ہائے فکر پیدا کرے گا۔

کلیاتِ میر تقی

مرتبہ و مصححہ مولوی عبدالباری آسی، مولوی سید جعفر علی
مطبوعہ نولکشور پریس و بکڈپو لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں

نولکشور پریس لکھنؤ نے اردو زبان کی جتنی عظیم خدمت کی ہے، تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی، ۳۰ سال قبل اس کی طباعت و اشاعت کا معیار قدیم طباعتی

کسی زبان کی شاعری کو دوسری زبان میں منتقل کرنا نہایت امتحان و ذمہ داری کا کام ہے؛ اس فریضہ کو ادا کرنے کیلئے مترجم کیلئے لسانی نزاکتوں، اور شاعرانہ گہرائیوں کا ماہر ہونے کی ضرورت ہے۔ اول تو اُسے شاعر کی اصل رُوح سے کامل وقوف کی ضرورت ہے اور پھر ان زبانوں پر کامل درک کی بھی جن سے ترجمہ کیا اور جن میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، ترجمہ نہایت مایوس کُن ہے؛ یہ مایوسی کوئی انور صاحب کی عدم قابلیت کا نتیجہ نہیں۔ شعر کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا بجائے خود نہایت خطرناک فریضہ ہے۔ وہ لذت اور وہ رُوحانی وسعت جو کسی زبان کے الفاظ کے سواد سے تعلق رکھتی ہے۔ غیر زبان کے الفاظ میں منتقل ہی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً غالب کے اس شعر کا ترجمہ میں کہ ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
"موئے آتش دیدہ" ہے حلقہ مری زنجیر کا

انور صاحب نے "موئے آتش دیدہ" کا ترجمہ (A hair That hath Seen fire) وہ بال جس نے آگ کو دیکھا ہے کیا ہے۔ حالانکہ "آتش دیدہ" کا ترجمہ "آگ کو دیکھا" ہے نہیں ہے "آتش دیدہ" بال کی صفت ہے فعل نہیں ہے۔ اس لئے "موئے آتش دیدہ" کے معنی ہیں۔ وہ بال ۷۰
جسے آگ دکھائی گئی۔ لہٰذا اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیئے۔ (Fire - Shane hair) نہ کہ (That hath seen fire)

اسی طرح غالب کے اس شعر کا ترجمہ کہ ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

"گم کیا ہوا پایا" کا ترجمہ (Having lost it found) کیا گیا ہے۔ گویا گم کیا ہوا پایا کا ترجمہ انور صاحب کے نزدیک "دل کو گم کر دیا اور پا لیا" ہے۔ مگر شعر کا صحیح ترجمہ یہ نہیں ہے۔ غالب کے شعر کا نثری ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ "بہار کی آمد سے جو کلی کھلی ہے اور اُس میں جو رنگ نمایاں ہوا ہے وہ میرے خون آلود دل کی تصویر ہے۔ ریہ حادثہ غالب کے دل کے ساتھ ہو چکا ہے، وہ غنچہ و رنگیں سے دلِ خون آلودہ کا استعارہ کرتا ہے۔ غنچہ کے کھلنے کو خون ہونے سے تعبیر کرتا ہے اور پا یا کو مل جانے سے (Regained) اس مقام پر نظیری اور غالب دونوں تناسخ کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ نظیری کہتا ہے کہ ؎

یادگارِ جگرِ سوختۂ مجنون است
لالہ چندکہ از دامنِ صحرا برخاست

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انور صاحب نے اردو شعر کو غور سے سمجھنے کی سعی نہیں کی، اور اپنی توجہ محض ترجمہ کر دینے کی طرف مبذول رکھی؛

اسی طرح الفاظ کے ترجموں میں بھی محض ڈکشنری کا سا فرض ادا کیا گیا ہے۔ "محبوب قاتل" کا ترجمہ (Assassin) یا "گورِ غریباں" کا ترجمہ (Strangers' grave) کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ غور کرتے تو اُن میں اس سے زیادہ صحیح اور موزوں ترجمہ کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ یہ اور اس قسم کی کمزوریاں غالب کو انگریزی میں غلط متعارف کرا سکتی ہیں، اور یہ غالب کیساتھ کافی ظلم ہے؛ کلام غالب کے انتخاب میں بھی پُوری توجہ صرف نہیں کی گئی۔ بعض دلدوز اشعار نظر انداز کر دیئے گئے ہیں، اکثر معمولی اشعار چُن لئے گئے ہیں؛ ممکن ہے انور صاحب کا ذاتی ذوق اس انتخاب میں کارفرما ہو؛

بہر حال، اقبال کے بعد غالب کو انگریزی میں لانا، ایک بہت اہم خدمت ہے؛ جو نقائص موجودہ ایڈیشن میں رہ گئے ہیں اُن نقائص کو انور صاحب دوسرے ایڈیشن میں نظر ثانی کے بعد نکال سکتے ہیں؛ اُردو اکیڈیمی کی یہ خدمت یقیناً داد کی مستحق ہے۔ کتاب اپنے ظاہری حسن و جمال کے لحاظ سے کافی شاندار ہے؛

Expression and Communication مصنفہ ڈاکٹر دین محمد تاثیر ایم اے پی ایچ ڈی (کینٹب)

قیمت ۸ آنے۔ ملنے کا پتہ بشر پی بی سی۔ ٹائر۔ تاثیر ہاؤس امرتسر (پنجاب)

یہ مختصر لیکن جامع، اہم اور مفید رسالہ "فنونِ لطیفہ اور اُن کی ادائیگی" کے موضوع پر سوسائٹی فار دی پروموشن آف آرٹ اینڈ کلچر کی تحریک پر تاثیر صاحب نے مرتب کیا ہے۔ فنونِ لطیفہ اور سماج کی پیچیدگیوں اور ان سے تعلق رکھنے والے نئے پیدا شدہ مسئلوں پر بحث کی ہے؛ خاص کر آلاتِ ادائیگی کے متنازعہ مسئلہ پر۔ تاثیر صاحب نے فرانس کے مشہور مصور۔ گلیئز اور کرسٹوفر کاڈول کے حوالوں سے موجودہ سرمایہ دار سماج پر تقریباً انہیں الفاظ میں روشنی ڈالی ہے جن الفاظ میں مارکس اور اینگلز گذشتہ صدی میں بحث کر چکے ہیں؛ تاثیر لکھتے ہیں۔

آرٹسٹ کے لئے اس دیوانی دنیا کو کیا بنانا ضروری ہے۔ اس بنیادی تضادوں والی دُنیا کو، اس دنیا کو جس میں اکثریت بھوک اور فاقہ کی آگ میں بھسم ہو رہی ہے۔ اس چیز کو چھوڑو، اور آرٹسٹ کر بھی کیا سکتا ہے۔ جبکہ اس کے دماغی سرمایہ کو بازاری چیزوں

ایشیا فروری ۱۹۴۲ء

کی طرح سمجھا جانے لگے اس کی وہی قیمت رکھنے لگے جو، جوتوں، ٹوپیوں اور کرسیوں کی ہوتی ہے۔ آرٹ اور دوسری چیزوں کے امتیازی فرق کیساتھ، یہ چیزیں تو زندگی کی ضروریات میں شامل ہیں، آرٹ ضروریاتِ زندگی میں لازماً شامل نہیں۔"

ان الفاظ میں اُس اسکول کی تقلید جھلکتی ہے جو سرمایہ داری کے پیدا کردہ جھمیلوں اور اس دور میں آرٹ کی مایوس کن حالت پر بے رحمانہ تنقید کرنے کا عادی رہا ہے۔ ڈاکٹر تاثیر آگے چل کر کہتے ہیں :-

سپنگلر کا یہ کہنا کہ:-

"دن اور رات سے اک مسرت گم ہو گئی ہے"

اس کا ماتم نہیں ہے۔ یہ ذاتی گھٹن اور غصہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت اہم اور سنجیدہ چیز ہے، یہ ایک بنیادی چیز ہے جو غائب ہو گئی ہے" صفحہ ۱۴

سرمایہ دار سماج پر جو گروہ ترقی پسندانہ تنقید کرتا ہے تاثیر صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن آگے چل کر آپ ولیم ہیڈلیٹ کے موید بھی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:-

"یہ ممکن ہے کہ تمام قوم سے ترقی یافتہ طبقوں کی جدائی .... اور انسانی دماغوں کی دو جداگانہ طبقوں میں تقسیم (ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ) ایک تیاری ہو جسے میں آرٹ کی مختلف اصناف میں دیکھ رہا ہوں" ص۳۵ ولیم کے قول پر تاثیر صاحب کی رائے ہے کہ:-

"یہ ایک علم ہیئت کا سا اندازہ ہے لیکن ایک اُس دنیا میں جہاں وہ چیز جسے کبھی مستحکم اور حقیقی سمجھا جاتا تھا۔ غیر حقیقی اور .... معلوم ہوتی ہے، کس چیز پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ مستقبل پہلے کے مقابل اب کہیں زیادہ خداؤں کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے" ص۳۸

گویا آپ کے نزدیک سماج نامعلوم مدت تک دو تقسیم شدہ ٹکڑوں کے اُن جھگڑوں کو برداشت کرتا رہیگا جو انسانیت کی تمام تر تباہی کی اصل ہیں اور اگر آخر میں کوئی تبدیلی ہوئی تو وہ منطق کی راہ سے ہٹکر خدائی رہنمائی کی تلاش کریگا۔ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں نہ سوسائٹی غیر معینہ مدت کیلئے موجودہ نظام پر قائم رہ سکتی ہے اور نہ تاریخی و سماجی طاقتوں کی رفتار غیر منطقی ہو سکتی ہے۔

آگے چل کر تاثیر صاحب نے پھر اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے:-

شپنگلر کے ہم زبان ہو کر یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے کہ "دنیا میں بڑا عہد پھر سے شروع ہو رہا ہے" ص۳۹

لیکن بہر حال ان چند جزیات کو چھوڑ کر، ادب اور سماج، اور خاص کر سرمایہ داری ادب کے ساتھ سماج کے سلوک کا تعلق ہے تاثیر صاحب نئے اسکول ہی کے موئد ہیں!

عہدِ سرمایہ داری میں جب عام پیداوار (Mass Production) میں عجلت کیساتھ ترقی ہو رہی ہے۔ یہ اُمید کرنا حقیقتوں سے مذاق کرنا ہوگا۔ کہ سوسائٹی ان فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں کو برداشت کر سکتی ہے جو غیر مادی قسم کے فلسفیانہ مسائل سے بحث کرتے ہیں اور جو اپنا مخاطب ایک محدود طبقۂ عقلاء (Intellectuals) کو فرض کئے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں اگر یہ ادیب سوسائٹی کو بُرا کہتے ہیں تو تعجب نہیں کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں سوسائٹی اسکو سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اُن کے لئے صرف دو راستے ہیں یا تو وہ تاثیر صاحب کے الفاظ میں "— ریمبانڈ کا راستہ اختیار کریں اور بیسویں صدی کو اپنے پیچھے چھوڑ دیں ص۲۴ اور غیر ترقی یافتہ مقامات میں رہن سہن اختیار کریں جس طرح ریمبانڈ پیرس کو چھوڑ کر حبش چلا گیا تھا۔ اور یا ـــ ایکسل کی پیروی کریں، یعنی اپنے خیال میں مگن رہیں، ذاتی تصورات، جنون و خبط کی دُنیا میں گھومتے رہیں اور بالآخر حقیقتوں پر اپنے توہمات کو ترجیح دیں بلکہ خود اُنھیں کو حقائق سمجھنے لگیں" ص۲۷ ۱۷

بلا شک سرمایہ دار ادیبوں کا انجام یہی ہے اور یہی ادب برائے ادب کے نظریہ کی حدِ آخر ہے۔

یہ رسالہ محض ۳۹ صفحات کا ہے لیکن اس مختصر سے رسالہ میں تاثیر صاحب نے موضوعات زیرِ بحث پر عالمانہ بحث کی ہے۔ ادب اور عوام کے موضوع پر یہ کتاب مفید اور بلند مسائل کے بلند اور مفید ترین حلوں پر مشتمل ہے۔ ادب اور اُس کے جدید تقاضوں سے روشناس ہونے کیلئے ہر اُس شخص پر اُس کا مطالعہ فرض ہے جو تنقیدِ ادب کے نئے پہلوؤں سے آگہی چاہتا ہے۔ یقیناً اس کا مطالعہ زاویہ ہائے مفکر پیدا کرے گا۔

کلیاتِ میر تقی

مرتبہ و مصححہ مولوی عبدالباری آسی، مولوی سید جعفر علی مطبوعہ نولکشور پریس و بکڈپو لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں

نولکشور پریس لکھنؤ نے اردو زبان کی جتنی عظیم خدمت کی ہے، تاریخ اس سے انکار نہیں کر سکتی، ۳۰ سال قبل اس کی طباعت و اشاعت کا معیار قدیم طباعتی

روایتوں کے مطابق تھا۔ لیکن نئی کتابوں کی اشاعت میں اس جمالیاتی ترقی وتہذیب کی جھلک پائی جاتی ہے جو ہمارے زمانے سے تعلق رکھتی ہے؛

کلیات میر تقی اس نئے تغیّر اور تبدیلی کا مظہر ہے؛ میر کے کلام کے مختلف مجموعہ شائع کئے جاچکے ہیں، لیکن ہر بار اُن کی تکمیل اور تصحیح کے سلسلہ میں شبہات ظاہر کئے جاتے رہے۔ نولکشور بکڈپو نے اس مطالبہ کو محسوس کرکے گیارہ سو صفحات کے اس ضخیم مجموعہ کو مولوی عبدالباری آسی اور سید جعفر علی صاحب کے زیرنگرانی ترتیب وجمع کرکے شائع کیا ہے۔

شروع میں آسی صاحب کا دیباچہ ہے جس میں، میر صاحب کے کلام، اُن کے حالات، قومیت، وطن، اور دوسرے متعلقہ حالات سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن ان تمام متعلقات کے بتانے میں صرف انھیں واقعات پر اکتفا کیا گیا ہے جو شعراء کے عام تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان حالات میں نہ میر کے عہد کے اس بحرانی دور کو بتایا گیا ہے جس سے میر کی شاعری کا پس منظر بن رہا تھا۔ نہ اُن سماجی، اقتصادی اور معاشی حقیقتوں کو زیربحث لایا گیا ہے۔ جو میر کی شاعری یا اس زمانے کے تمام تر شعروادب پر اثرانداز تھیں۔

کسی شاعر کے حالات بیان کرنے میں صرف اُس کی نسبیت، خاندان
۴۷ وطن اور اس کی شاعری کے مختلف اصناف، غزل قصیدہ، رباعی مثنوی وغیرہ اور کسب معاش کے لئے اُس کی کاوشوں کی تاریخ دہرا دینا ہی آج کافی نہیں ہے۔ آج یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ کس سماج کا نمائندہ تھا، اس کا ماحول کیا تھا۔ ماحول کے کیا تقاضے تھے؛ ماحول نے شاعر کی ذہنیت کا کیا سانچہ بنایا۔ اس کی شاعری کا وہ رُخ کیوں رہا جو ہم دیکھتے ہیں؛ غرض اس سلسلے میں ان تمام اقتصادی، معاشی، سیاسی، اور مجلسی عناصر کی تشریح لازمی ہے۔ جن سے کسی عہد کی شاعری اور شاعر پیدا ہوتا ہے۔

اس تذکرہ میں ان مسائل کیطرف کوئی اشارہ نہیں؛ پرانے طرز کی تذکرہ نویسی ہی کی اقتدا کی گئی ہے۔ لیکن بعض پہلوؤں سے اس تذکرہ کی بہت بڑی اہمیت ہے (۱) کوشش کی گئی ہے کہ اس مجموعہ میں میر کے تمام مجموعۂ کلام کو جمع کردیا جائے۔ قدیم نسخوں، پُرانی کتابوں اور دوسرے ذرائع سے جس قدر کلام مہیا ہوسکا۔ اس مجموعہ میں یکجا کردیا گیا ہے، جو حضرات میر کو کامل طور پر پڑھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس مجموعہ کو ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔

کلام میر کے علاوہ اس کلیات کا افادی پہلو بھی زبردست ہے، آخر میں ایک فرہنگ الفاظ بھی دی گئی ہے؛ اس فرہنگ کے ذریعہ غیرمروج اور غریب اردو وفارسی الفاظ اور محاورات کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، یہ دو کام بجائے خود نہایت مشکل اور اہم تھے؛ کلیات میر تقی کے مرتبین نے اس باب میں اپنے فرض کو کامل طور پر ادا کیا ہے۔ نولکشور پریس اردو داں طبقے کے شکریہ کا مستحق ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسی خدمت ہے جو تاریخی حیثیت رکھتی ہے

جہاں تک اس کے جمالیاتی رُخ کا تعلق ہے، یہ کلیات قدیم معیار طباعت سے بہت بلند ہے۔ مگر لمحۂ حاضر کا جمالیاتی احساس کچھ اور بلندی چاہتا ہے پھر بھی اس کی ضخامت اور تکمیل کو دیکھتے ہوئے موجودہ صورت کو کسی طرح کم تر درجہ کے حسن سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا؛

نغماتِ نور مجموعۂ کلام نور لودھیانوی قیمت مجلد ۳/ غیرمجلد ۲/ ملنے کا پتہ:۔ جعفریہ بک ایجنسی رجسٹرڈ نمبر ۲۲۶ ۲ فیض باغ لاہور

گذشتہ ۲۵، ۳۰ سال میں پنجاب کے شعراء پر دو اثر پڑتے رہے ہیں۔ ایک تو عام تغزّل کا عکس، دوسرے اقبال کی شاعری کا پرتو، غزل میں بعض، مرزا داغ اور بعض حسرت سے متاثر ہیں، عابد علی لے حسرت موہانی کے کامیاب مقلد ہیں، اور حفیظ جالندھری مرزا داغ کی شوخی کو شرما شرما کر اختیار کرتے ہیں۔ اقبال کے تمام تر کلام سے کوئی ایک پنجابی شاعر کامل طور پر اسقدر متاثر نہیں ہوا، کہ ہم اسے اقبال کی یادگار کہہ سکیں، امین حزیں بھی جن کے یہاں فلسفۂ خودی کا اعادہ، اقبال کے اسلوب کی پھیکی تقلید اور فارسی تراکیب کی بہتات ہے، نمونہ نہیں ہیں، وہ اقبال سے متاثر ضرور ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آتشکدہ کے محض پڑوسی ہیں، خود اُن کے خرمن میں وہ چنگاری براہ راست اُڑکر نہیں آئی جس سے اقبال کا دل روشن تھا؛

دوسروں کا کیا ذکر، لیکن اتنا ضرور ہے کہ پنجاب کے شعراء نے اقبال کے اسلوب اور خیالات کو عام طور پر اختیار کرنا چاہا۔ اور اُن خطوط پر دوڑے جو اقبال نے اپنے لئے پسند کی تھیں؛ یہ حضرات کافی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی شاعری کے پس منظر کیلئے سخت قسم کی تصوف نما مذہبیت، خودی اور بیخودی کی غیرمادی بحث اور ناممکن الحصول وحدتِ اسلامی کا تصور بنیاد کا کام کرے۔ یہ کوشش کرتے ہیں کہ طرزِ تفکر کا وہی سانچہ بنائیں جو علامہ اقبال کا تھا؛ اقبال چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو قدیم جاگیرداری اور شخصی حکومتوں کے برکات کی یاد دلاکر

قوی بنائے۔

نور صاحب بھی انھیں مقتدر شعراء میں سے ایک ہیں، جنھیں اقبال کا طرزِ تفکر، اسلوبِ بیان، اور طرزِ خطاب پسند ہے؛ کہیں کہیں اُن کے کلام میں اقبال کے علاوہ دوسرے شعراء کے اسالیبِ بیان کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

اس مجموعہ میں غزل، نظم، گیت، سلام، نعت، منقبت غرض تمام اصنافِ سخن کے نمونہ موجود ہیں، اور اُن کا ایک درجہ ہے کتاب کے آخر میں ادبِ لطیف کا ایک حصّہ ہے جس میں کچھ ٹیگوری نثر کے نمونے ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں ان تقلیدی عناصر کی کوئی قیمت نہیں؛ نور صاحب کو چاہیئے کہ وہ ایک راہ اپنے لئے طے کریں، اور اُسی کے مسافر بنیں۔ شاعری موجودہ زمانہ میں ایک منطقی پس منظر چاہتی ہے۔ اگر غور و فکر اور شعری عناصر کے میل سے شاعر کوئی تخلیق کر سکے تو واقعی اس تخلیق کو درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ ہر سعی لاحاصل ہے، شعر و ادب کو اب اپنی موجودہ منزلوں سے بھی آگے جانا ہے۔

پستک بھنڈار کا سلسلۂ کتب

ناشر پستک بھنڈار لہریا سرائے
دربھنگہ (صوبۂ بہار)

دنیا کے دس بڑے آدمی

یہ سلسلہ گیارہ چھوٹی چھوٹی کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ رسالے بچوّں کیلئے ہیں مگر ان میں سے چند عمر رسیدہ اور تعلیمیافتہ افراد کیلئے بھی مفید ہو سکتے ہیں۔

رسالوں کے نام یہ ہیں۔

دنیا کی کہانیاں، شیطانی بوتل، ننھوں کے دیس میں، ایجاد اور موجد خدا بخش، جادو کا راگ، تیر انداز، ہیرامن طوطا، گیدڑ پانڈے اور خالہ بلّی

دنیا کے دس بڑے آدمی

قیمت آٹھ آنے

بہار کے ذہین انشا پرداز اور قومی کارکن انیس الرحمٰن صاحب نے اسکو تالیف کیا ہے۔ اس رسالہ میں گوتم بدھ، ارسطو، جولیس سیزر، عیسٰی، محمدؐ، شکسپیر، والیٹر، نپولین، ڈارون اور کارل مارکس کے حالاتِ زندگی سہل اور پسندیدہ زبان میں بیان کئے گئے ہیں، حالات کیساتھ ان برگزیدہ اور عظیم شخصیتوں کے اصول اور نظریوں کو بھی وضاحت اور تشریح کیساتھ لکھا گیا ہے، ارسطو کے حال میں بہ سلسلۂ عمرانیات انیس صاحب نے انسان کی عمرانی ترقی پر بحث کرتے ہوئے کہ کس طرح انسان جنگلوں میں رہتا تھا، کس طرح اُس نے کھیتی باڑی کرنی شروع کی، مال جمع کیا اور اس کے بعد آپس میں لڑنے جھگڑنے لگا۔ لکھا ہے کہ:۔

"اب فکر یہ آن پڑی کہ مال اسباب کی حفاظت کی جائے رائے یہ ٹھہری کہ ایک سردار مقرر کیا جائے"

اس طرح انیس صاحب نے نظریۂ سرداریٔ قبیلیت کو خود اختیاری انتخاب کے نظریہ کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ جو عمرانیات کے ذمہ دار مصنفین کے نزدیک صحیح نہیں ہے!؟

اب رہی ترتیب و انتخاب، مشہور ہستیوں میں ڈارون، اور مارکس کے اسماء کی شرکت قابلِ تعریف ہے۔ مگر جولیس سیزر کی شمولیت کے وہ تاریخی اور واقعیاتی اسباب کیا ہیں، جو سیزر کو دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں کی صف میں کھڑے کر سکتے ہیں! ڈارون اور مارکس کو جو عہدِ نو کی علمی اور انقلابی شخصیتیں ہیں درس و تدریس کی کتابوں میں عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مگر ان کا جاننا اس نسل کے لئے ضروری ہے۔ جو اُن کے پیدا کردہ سائنٹفک ماحول میں آنکھ کھول رہی ہے۔ جولیس سیزر کا جاننا کوئی بات نہیں، اس بہادر جرنیل نے شخصی ترقی و تکمیل کا ضرور ثبوت دیا۔ لیکن تاریخ کے عام بہاؤ پر اس کا کوئی خاص احسان نہیں، سیزر کے بجائے روس کے مشہور انقلابی رہنما لینن کے حالات کا اضافہ بچوّں کیلئے نہایت ضروری چیز تھا!

یہ وہ نکات ہیں جنھیں نظر انداز کر دینے کے باوجود ان رسالوں کی افادیت اور اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا؛ یقیناً یہ اتنی مفید کتابیں ہیں کہ انھیں ابتدائی کلاسوں کے کورس میں داخل کر لینے کی سفارش کرنا ایک ضروری سفارش ہے۔

ناشر، پستک بھنڈار لہریا سرائے دربھنگہ۔ لکھائی چھپائی بہترین، قیمت ۱۰ آنے

پٹنہ کے مشہور ترقی پسند شاعر رضی نے ان کہانیوں کو مرتب کیا ہے، دُنیا کی مختلف دس زبانوں کی ۱۲ شاہکار کہانیاں ایک جگہ مرتب کر کے شائع کرنا پہلی کوشش ہے اور نہایت مستحسن ہے۔ واشنگٹن اروِن۔ ٹالسٹائے چیخوف، ٹیگور، ایچ جی ویلز، خالدہ ادیب خانم۔ لاہسان۔ انفانسے ڈووے، آلو کرنائے۔ اور مصطفیٰ لطفی کے دلچسپ اور شاہکار افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

ٹیگور کا کابلی والا، اور ٹالسٹائے کا مرغی کے انڈے کے برابر اناج اگانے شاہکار افسانے بھی اس میں شریک کر دئے گئے ہیں۔ ان میں بعض کہانیاں مافوق العقل حادثات اور پریوں کے ذکر پر مبنی ہیں، تاہم اُن کی افادی قدر ہے۔

بچوں کی نفسی کیفیت کے لحاظ سے یہ مناسب ترین انتخاب ہے، رومانوی افسانوں کے مطالعہ سے جو خراب نتائج طفلی کے دماغ پر پڑ سکتے ہیں، اُن نتائج سے کم از کم ایسے مجموعے بچوں کو محفوظ کر سکتے ہیں؛

مترجمین نے ترجمہ کی زبان ہلکی پھلکی اور دلچسپ رکھی ہے، زبان کی سادگی اور شیرینی نے کشش کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ ہاں اسالیب کی خصوصیات ترجموں میں نمایاں نہیں ہو سکیں، بعض جگہ ادبی خامیاں بھی ہیں، مثلاً ٹالسٹائی کے افسانے میں "اناج اگانے" کے بجائے "اناج ابجانے" استعمال کیا گیا ہے۔ یا مصطفیٰ لطفی کے افسانہ "گدہ" کے مترجم نے آہ کرنے کے بجائے، "آہ بہا کنا" استعمال کیا ہے، کئی جگہ اسی قسم کی مثالیں ملتی ہیں؛

کوئی شک نہیں کہ بعض محاورے مقامی ہوتے ہیں اور زبان کی وسعت کے خیال سے ان کا استعمال ہرگز نامناسب اور غلط نہیں۔ مگر لسانی اور صوتی حسن ضائع نہیں ہونا چاہیئے، ملی جلی زبان، کے لئے اُردو ہندی کے الفاظ اردو میں استعمال کرنے کیلئے صناعتی احتیاط و تناسب کی ضرورت ہے؛

شیطانی بوتل

قیمت ۱ر پستک بھنڈار لہریا سرائے دربھنگہ (صوبہ بہار)

اب لفظ "بھنڈار" ہی کو لیجئے، زبان سے نکلتے ہی اس کی "ڈ" دماغ پر لٹھ سا رسید کرتی ہے، مگر مرکز، مخزن، اور اسی قسم کے مترادف الفاظ میں ایک قسم کی نزاکتِ صوتی اور زبان کی خوبصورتی ہے، "بھنڈار" والے کہہ سکتے ہیں کہ بکڈپو، میں بھی "ڈ" ہے، بجا، مگر وہ نہیں جانتے کہ "پ" کے ترنم نے بکڈپو کے "ڈ" کی سختی بہت کم کر دی ہے؛

اگر اردو ہندی کے ادیب اور کوئی اپنا صحیح صناعتی فرض محسوس کریں تو وہ تعصبات پیدا ہی نہیں ہو سکتے جو اصل میں الفاظ اور اُن کے غلط استعمالات سے پیدا ہوتے ہیں۔

شیطانی بوتل آر۔ایل اسٹیونسن کی کہانی (The Bottle Imp) سے ماخوذ ہے، اسٹیونسن انگریزی ادب کا اعلیٰ ترین صاحبِ طرز ادیب و افسانہ نگار ہے؛ افسانہ کی جزئیات کو نمایاں کرنا اسکی خصوصیت ہے، شیطانی بوتل میں یہ خصوصیت زیادہ نمایاں نہ سہی مگر اس کا اسٹائل اس کہانی کی ہر سطر سے نمایاں ہے۔ اس کتاب کے مولف و مترجم انیس الرحمٰن صاحب نے نہایت کامیاب ترجمہ کیا ہے، ترجمہ میں اصل کی شان ہے، دونوں غیر متفاہم عناصر کامیابی کیساتھ ایک جا نظر آتے ہیں؛

یہ ایک خاص امتیاز و نوعیت کی طویل کہانی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے؛

ننھوں کے دیس میں

قیمت ۸ر آنے، مولف انیس الرحمٰن ناشر، پستک بھنڈار لہریا سرائے دربھنگہ۔

یہ جان سوفٹ کے سفر نامۂ گلیور سے ماخوذ ہے جسے اعجوبہ افسانے کی حیثیت سے خاص امتیاز حاصل ہے، قدیم عربی افسانہ نگاروں کی طرز کی تقلید کی جھلک پائی جاتی ہے۔ مگر اپنی انفرادیت بھی رکھتا ہے۔ انیس صاحب نے اس کمال و لطافت سے اُردو میں منتقل و اخذ کیا ہے کہ اصل کی اعجوبہ کاری اپنی کامل شان و دلنوازی سے جلوہ گر ہے۔ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو یہ ترجمہ بجائے ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے؛

ایجاد و موجد

قیمت ۶ر از شری رام برکش بینی پوری سائز ۱۷×۲۷/۸ ۵۵ صفحات باتصویر، آرٹ پیپر پر پوری کتاب چھپی ہے۔

بینی پوری بہار میں ہندی زبان کے مشہور اور مقبول ادیب ہیں، خاصکر ان کے مزاحی مضامین ہندی دنیا میں بہت پسند کئے جاتے ہیں؛ بینی نے میٹھی اور سادہ زبان میں ہمارے زمانے کی چند ایجادوں، ریل گاڑی، جہاز ڈوبکنی کشتی، ہوائی جہاز، بجلی تاربرقی، لاسلکی، ٹیلیفون، گراموفون، چھاپہ خانہ اور ان کے موجدوں کا حال بیان کیا ہے، بچوں کے لئے نہایت موزوں و مناسب کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی، تصویروں اور آرٹ پیپر کے لحاظ سے اس کی قیمت بہت ہی کم ہے؛

(باقی باقی)

نئی چرکھاری

مصنفہ آغا حیدر حسین صاحب حیدر ایم۔ آر۔ اے۔ ایس سول و اسسٹنٹ سشن جج چرکھاری۔ ملنے کا پتہ:- لال برادرس اور صدیقی بکڈپو لکھنؤ

چرکھاری سنٹرل انڈیا کی ایک چھوٹی ریاست ہے، لیکن اس کے مرحوم فرمانروا سے بہت بڑی خصوصیات تعلق رکھتی تھیں، ریاستوں کے دیسی دھرّے کے متعلق کوئی نیا نظریہ پیش نہیں کیا جاسکتا، سوائے اس کے کہ برطانوی

ہند میں جس قدر سیاسی ارتقا اور نظم و ضابطہ پایا جاتا ہے وہ ان ریاستوں میں جزوی طور پر بھی نہیں، اس کی پہلی وجہ نمائندہ حکومت نہ ہونا اور شخصِ واحد کی اجارہ داری ہے۔ برطانوی ہند میں جمہوریت کی نام نہاد صورت موجود ہے۔ مگر ریاستوں میں یہ بھی نہیں۔ یہ تمام دیسی ریاستیں حکومتِ ہند کی ایک سیاسی پالیسی کے تحت چل رہی ہیں، جب تک برطانوی ہند میں مرکزی حکومت کا قیام نہیں ہوتا اور اس سے ریاستی نظامِ حکومت کا رشتہ نہیں جڑتا، ریاستوں کے عوام کی بھلائی ممکن نہیں۔

یہ ریاستوں اور اُن کے عوام کی ترقی سے تعلق رکھنے والا بنیادی سوال ہے، اور اس کے کئی گوشے ہیں، (۱) مرکز میں ایک قومی حکومت کا قیام، (۲) ہندوستان کی ایک اجتماعی و سیاسی وحدت کا معاہدہ اور اس پر والیانِ ریاست کا ایمان (۳) ریاستوں میں عوام کی نمائندہ حکومتوں کا قیام (۴) مرکز میں دیسی ریاستوں کی نمائندگی اور ان کا تناسب۔

ان گوشوں کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے، جب ایک عظیم الشان اجتماعی وحدتِ سیاسی کو عالمِ شہود میں لایا جائے۔ یہ بڑی قومی حکومت یقیناً والیانِ ریاست کے ذاتی و خاندانی مفادات کے قطعی منافی ہوگی۔ اور بظاہر یہ امید نہیں کہ وہ اپنے اثرات اپنی موروثہ ریاستوں پر سے ہٹا لینا بہ آسانی قبول کرلیں گے۔ خود حکومتِ ہند برطانوی ہند میں کسی تغیر اور انقلاب کی قائل نہیں تو یہ..... والیانِ ریاست کیوں کر اس تبدیلی کے لئے تیار ہو سکتے ہیں؟ اگر کچھ کارگر ہو سکتے ہیں تو داخلی اثرات ہی کارگر ہو سکتے ہیں۔ بعض ریاستیں، اپنے فرماں رواؤں کی قدرتی اور حقیقی حاکمانہ دلچسپی حاصل کئے ہوئے ہیں، ان ریاستوں میں حیدرآباد، اور میسور نمایاں ریاستیں ہیں بعض ریاستیں اپنے فرمانرواؤں کی شدید لاپرواہی کا نشانہ بنی ہوئی تھیں، ان میں سے ریاست چرکھاری بھی ایک ریاست تھی۔ جس کے حالات آغا حیدر حسین صاحب نے ایک رسالہ کی صورت میں شائع کئے ہیں، اس کے مطالعہ سے ریاست کے حالات، جائے وقوع، آبادی، مختصر تاریخ، اور اس کی قدیم و جدید حیثیت سمجھ میں آجاتی ہے، خان بہادر سید عین الدین صاحب موجودہ دیوان ریاست سے قبل چرکھاری کے غریبوں اور تیسرے طبقے کی بڑی بری حالت تھی، خزانہ، عدالتوں اور عمارتوں میں مالی، عدلی، اور تعمیری کھوکھلا پن تھا۔ ریاست کے نظم و نسق پر غاصب اور ظالم عناصر چھائے ہوئے تھے، اور کوئی کسی کا فریاد رس نہ تھا، لیکن سید صاحب نے جنھیں قدرت نے ایڈمنسٹریٹر پیدا کیا ہے۔ ریاست کے تمام شعبوں میں نظم و عدل قائم کیا اور ریاست کے مردہ جسم میں ایک نئی زندگی دوڑا دی۔

یہ نئی زندگی کسی بنیادی حیات کی ضامن نہ سہی، مگر ایک چھوٹی ریاست میں اتنی ترقی قطعی ناممکن تھی۔ پھر معلوم ہوتا ہے کہ جن حالات میں اس ترقی کو ممکن بنایا گیا وہ نہایت شنیع اور خطرناک تھے۔

آغا صاحب کی تصنیف چرکھاری کے ارتقا اور ضابطہ و نظم کی ایک مختصر سی تاریخ ہے جو ذاتی مدح سرائی سے بلند ہو کر لکھی گئی ہے۔

آیات و نغمات

از جوش ملیح آبادی ناشر مکتبۂ اردو لاہور
قیمت تین روپیہ ۸ آنے۔

حجم ۲۴۸ صفحات، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ (ستمبر ۱۹۴۱ء)

حضرت جوش ملیح آبادی کی تازہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں مرتب یا ناشر نے یہ بھی بتانے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ یہ نظمیں کس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں!؟

بہر حال چند نظموں کو چھوڑ کر یہ تمام کلام (۱۹۳۵ء سے لیکر ۱۹۴۱ء) تک کا ہے۔ اس مجموعہ کی اعلیٰ ترین نظموں "باغی روحوں کا کورس" وغیرہ سے جوش ۷۵
کی تبدیلی و ارتقا، کے نئے اندازہ ہوتے ہیں۔

شاعر کا مشاہدہ تجربہ اور تفکر کے بلند و نازک مقام پر لیجا کر کس طرح اسے تنہا چھوڑ دیتا ہے؟ اس کتاب میں پھیکی رومانیت اور حسنِ فطرت کی پرفریب دلکشی و دلدوزی بھی اسکے مشاہدات و تجربات کی تلخی مٹانے میں کامیاب نہیں ہوتی

جیسے جیسے زندگی کے مشاہدات اور مطالعۂ فطرت نے جوش کو فکر و نظر کی قوتیں بخشی، اسکے حکیمانہ مزاج کو جلا ہوتی گئی، لیکن وہ زندگی کا مثبت نقطۂ نگاہ پیدا نہ کرسکا۔ اس کے فلسفہ کا نمایاں منفی پہلو، اُسے شوپنہار، جیسے قنوطی حکما کی صف میں بٹھا دیتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا اثباتی پہلو، اسے رومی و عطار اور برگساں کے پہلو میں جگہ دیتا ہے۔

یہاں سب سے بڑا سوال خود نفی و اثبات کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ یہ اثبات و یقین کوئی ظنی و اضافی چیزیں ہیں، یا محض اثبات و یقین ہی ہیں!؟

اثبات۔ جو رومانیین کے فکر کا ایک تخیلاتی عنصر ہے۔ کوئی منطقی پسِ منظر نہیں رکھتا؛ وہ انسان و قدرت کے درمیان ایک دھندلا اور نازک ترین رشتہ ہے جسے کمال احتیاط کے ساتھ ٹوٹنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ لیکن زندگی کا منفی پہلو رکھنے والے زندگی اور قدرت انکار میں روحانی کیفیت کو بالکل ہی مٹا دیتے ہیں۔ وہ توہم کا رشتہ بھی باقی نہیں رکھتے۔ جس طرح اقبال کی آخری تصنیفات میں "مردِ مومن" کے رُخ سے آخری نقاب اٹھ گیا تھا۔ جوش کی نئی تصنیف میں ان کے "حکیم" کے بت سے بھی حجابات اٹھ رہے ہیں، سہ

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا
کہ قلبِ آدمِ خاکی سدا فگار رہے

آخر میں کہتا ہے سہ

مگر حکیم وہی ہے جوان شدائد میں
ہمیشہ فارغِ غم ہائے روزگار رہے

اقبال "یقین" کے سہارے روحِ آدم کو زندگی اور حوادثِ زندگی کے مقابلے کیلئے تیار کرتا ہے۔

جوش بے یقینی اور تشکیک کے بل پر حیات و قدرت سے مقابلہ کیلئے کہتا ہے اور انسانی افضلیت و بلندی کی مبادیات وضع کرنے کی سعی کرتا ہے ۶۴
یہ نفی و اثبات کی رُوح ہے جو اُردو کے دو شاعروں میں رنگا رنگ طریقوں سے پائی جاتی ہے۔

جن تفکرات، اور حکیمانہ استفہام و تفہیم اور جذباتی کشمکش کے ناتمام خاکے آیات و نغمات میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی تکمیل "حرفِ آخر" میں ہو گئی ہے۔ یہ جوش کی نئی غیر مطبوعہ تصنیف ہے جس میں مسائلِ حیات انسان و خدا، دین و دنیا، مرگ و حیات اور فلسفۂ ارتقا پر شاعر نے ڈرامائی اسلوب میں بحث کی ہے۔

یہ سوال بالکل علیحدہ ہے کہ زندگی کے لئے توہم کی ضرورت ہے یا حقیقت کی، زہر کی ضرورت ہے یا سکر کی۔!؟

لیکن بہر حال یہاں دو فرد ہیں، ایک کے ہاتھ میں جامِ سکر ہے دوسرے کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ، دیکھیں انسانیت کے لئے کس کا نسخہ آبِ حیات ثابت ہوتا ہے۔

سلسلۂ مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اردو شمارہ (۶۳)

انوار

معنفہ علی اختر صاحب حیدر آبادی، ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد قیمت عہ

انوار۔ حیدر آباد (دکن) کے کہنہ مشق اور مشہور شاعر علی اختر صاحب حیدر آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں حمد بھی ہے نعت بھی ہے؛ غزلیں بھی ہیں .... روحانی نظمیں بھی مختصر نظمیں بھی اور رباعیات بھی۔ تمام اصنافِ کلام میں پختگی صحت مند خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔

سید علی اختر حیدر آبادی، جن کی زندگی دکن کے دور دراز گزشتہ گیرانہ ماحول میں گذری اور گذر رہی ہے۔ اپنے فکر و نظر اسلوب اور روایات کے لحاظ سے ا، جدید اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ جدید جو ادب قدیم ہو رہا ہے؛ ان کے کلام کی رنگینی، دل آویزی الفاظ کی تراش فارسی الفاظ کی بندش، در و بست اور شعریت کا پورا رچاؤ اپنے اندر رکھتی ہے، محاکات، منظر نگاری اور زندگی کے مسائل پر اپنے زاویہ نگاہ سے تنقید ان کے کلام کا نمایاں عنصر ہے۔

زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق انکا زاویۂ نگاہ روحانی اور رومانی ہے۔ ان کا طرزِ فکر، قدیم صوفیانہ طرزِ فکر ہے۔ فارسی غزل سے لے کر اُردو غزل تک جو "یاسیت" اب تک چھائی رہی، وہ اُن پر بھی چھائی ہوئی ہے۔ زندگی اور حیاتِ بعد الممات کی یہ بھی وہی تعبیر کرتے ہیں جو اگلوں نے کی۔ حیدر آباد میں ان کی ذات بلند اخلاق اور ارفع شاعری کا سرچشمہ ہے، چند شعر سنئے سہ

وہ خود بھی اس شوق، پر تھے حیران کیا ہے جب انتخاب میرا
ابھی زمانے کو یاد ہوگا سوال ان کا جواب میرا
خرد ہے آئینِ خامکاری، نہ آگہی ہے نہ ہوشیاری
یہ عالمِ ہوش بھی ہے شاید کوئی پریشان خواب میرا
اللہ مری مجبوریٔ دل اک وہم سا ہے آزادی کا
اک حسرت ہے آبادی کی اک عالم ہے بربادی کا

"ادارہ"

روغن تاج گیسو دراز

ـــــــ ایجاد ـــــــ

به نسخہ خاص علامہ لقمان الملک

حضرت والد ماجد حکیم نابینا صاحب سابق طبیب خاص اعلیٰحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ (از فقیر دعاگو حکیم خسرو شاہ نظامی)

روغن تاج گیسو دراز

آج کل حشرات الارض کی طرح روغن اور ہیر آئیل نکل آئے ہیں جو بڑے خوشنما رنگت کے نظر آتے ہیں، اگر جن میں سے (۹۵) فیصدی مٹی کے صاف شدہ تیل اور دوسرے مضر صحت اجزاء کی وجہ سے، تجربہ سے بجائے فائدے کے مضرت رساں ثابت ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بیشمار لوگوں کے بال اس قسم کے تیلوں کے استعمال کی وجہ سے قبل از وقت سفید ہو جاتے ہیں۔ روغن تاج کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ حضرت والد ماجد مجدد طب لقمان الملک حکیم نابینا صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے مجربات خاص میں سے ہے اور چونکہ حضرت والد ماجد اعلیٰحضرت غفران مکاں مرحوم کے طبیب خاص تھے اس لئے محلات مبارک میں بکثرت یہ روغن تاج استعمال ہوتا تھا۔ جو واقعی اپنے فوائد کے اعتبار سے روغنیات کا سرتاج ہے۔ اس کے اجزاء دماغ کیلئے اس حد تک تقویت بخش و مفید ہیں کہ اس کے کچھ دنوں استعمال سے دماغی چکر آنکھ کے سامنے اندھیرا آنا یہ سب کافور ہو جاتے ہیں۔ اس لئے دماغی کام کرنیوالوں کیلئے نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ بالوں کی جڑوں کو غذا بہم پہونچا کر اسقدر مضبوط کر دیتا ہے کہ اگر بال کمزوری کی وجہ سے گر رہے ہوں تو صرف چند روزہ استعمال سے اُن کا گرنا بند ہو جاتا ہے۔ بالوں کو نہ صرف بیحد دراز کرتا ہے بلکہ گھنے اور کالے بھی کر دیتا ہے۔ سیاہ کرنیکے یہ معنی نہیں ہیں کہ تیل خضاب کا کام دے بلکہ اگر نزلہ وغیرہ کی وجہ سے قبل از وقت بال پکنے لگے ہوں تو پہلا عمل تیل کا یہ ہوتا ہے کہ دوسرے بال سفیدی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور بتدریج تمام سفید شدہ بال خود بخود گر جاتے ہیں اور انکی بجائے سیاہ نکلتے ہیں۔ دماغی کام کرنیوالوں نفیس طبیعتوں اور بیگمات کیلئے نہایت اعلیٰ تحفہ ہے چونکہ ساٹھ ستر سے زیادہ ادویات اور بعض کیمیا جڑی بوٹی سے یہ شاہی تیل سخت محنت سے بنایا جاتا ہے اسلئے اسکی قیمت مروجہ خوشنما مضر تیلوں سے بظاہر زیادہ مگر از حد واجبی ہے۔ قیمت فی بوتل نیم پاؤ دیڑھ ایک روپیہ آٹھ آنے

بیت ۔۔ دواخانہ متعلقہ فقیر دعاگو حکیم خسرو شاہ نظامی خلف لقمان الملک حکیم نابینا صاحب شاہ گنج حیدرآباد دکن

رُوح الذہب

ایک حد درجہ جلیل القدر بکمال معتدل دوا جو تدریجی تیری کام کرتی ہے ہر موسم میں قابل استعمال، ہر امزجہ کے چاہے حار ہو یا بارد، بوجہ کمال اعتدال سازگار مطلب کیمیادی کے سالہا سال کے بیحد بیش بہا تجربات کا لب لباب، لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حضرت جد امجد علامہ حکیم نابینا صاحب قبلہ کے نصف صدی کے تجربات کا نچوڑ، وہ دوا جس کے متعلق علامہ مشرق لسان القوم حضرت اقبال اعلی اللہ مقامہ فرماگئے ہیں ۔

ہے دو روحوں کا نشیمن قالب خاکی میرا :. اک سراپا شورِ مستی اک سراپا تاب و تب

یک جو اللہ نے بخشی مجھے روز ازل :. دوسری ہے آپکی بخشی ہوئی روح الذہب

روح الذہب کے متعلق بغایت دلچسپ علمی رسالہ مع پانچ زر رسالہ سونے کے بطور دوا استعمال کی مجمل تاریخ کے آپکو انصاری دواخانہ زیر نگرانی والد ماجد قبلہ حکیم عبدالغنی صاحب انصاری خسرو شاہ نظامی واقع شاہ گنج سے بلاقیمت مفت مل سکتا ہے مگر اس استدعا کیساتھ کہ آپ ذوق علمی کی توہین اسکو کوئی سینمائی اشتہار سمجھ کر دو چار ورق ادھر اُدھر سے پلٹ کر رکھ دینے سے نہ فرمائیگا۔ اسلئے کہ یہ کارنامہ علمی آپکے ذوق بلند پائے ادبی کے عین مطابق ہے۔ آپکے خادم و بہی خواہ ۔ عبدالغنی عبدالودود مع برادران



Published By :—

The Adabi Markaz
Saghar Press,
Meerut (India)

ایشیا

مفرّح یاقوتی محمد شاہی

جواہرات گرانمایہ، ورق طلا و نقرہ، مروارید ناسفتہ اور جوہر نباتات کا از حد لطیف خلاصہ، طب کیمیاوی کا اعجاز نما کرشمہ، بوجہ کمال اعتدال ہر مزاج کے موافق قطعی بے ضرر شہنشاہی مفرح

خادم خلق اللہ

محمد عبد المغنی انصاری مع برادران نبیرۂ لقمان الملک علامہ حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی مینیجر انصاری دواخانہ زیر نگرانی حکیم محمد عبد النبی انصاری خسرو شاہ نظامی

(واقع شاہ گنج حیدرآباد دکن)

یاقوتی محمد شاہی

معروف و مشہور مغل شہنشاہ ہندوستان محمد شاہ رنگیلے کی خاص الخاص استعمال دوا جس کا نسخہ قطعی راز میں سینہ بسینہ نسلاً بعد نسل ہمارے خاندان عالیہ انصاریہ میں رہا جو عہد سلطنت مغلیہ میں علاوہ منصب طبابت شہنشاہی کے عہدہ جلیلہ ملکی ہفت ہزاری تک پر متفرز رہ چکا ہے۔ چلا آرہا ہے یہ نسخہ صرف والیان ملک رؤسا و امراء کیلئے مخصوص طور سے بنایا جاتا رہا۔ اگر اسکو ہر اعتبار سے علاوہ قطعی بے ضرر ہونیکے سرتاج و شہنشاہ مفرحات کہا جائے تو بے شمار مشاہدات کی بے لاگ کسوٹی پر ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ یوں تو یاقوتی اور مفرحات طب یونانی کی قرابادینیں بٹی پڑی ہیں اور بعض تجارتی دواخانے مفرحات میں منشیات مثل چرس بھنگ افیون عارضی تفریح اور دائمی گرفتاری کیلئے شامل کرکے بدنام کنندہ نکو نامے چند کے مصداق ہو رہے ہیں۔ مگر یہ شہنشاہ پسند مفرح یاقوتی جسکو ایک جماعت اطباء و کملاء و فضلاء عصر نے بادشاہ کیلئے مرتب کیا تھا اس کے اجزاء ترکیبی منشیات سے قطعی پاک اور جواہرات گراں مایہ کا مجموعہ ہیں اسکو مجدد طب علامہ لقمان الملک حکیم نابینا صاحب نے اپنے جدید طب کیمیاوی کے طریقہ سے اب اس درجہ مکمل فرمادیا ہے کہ یہ مفرح بغایت معتدل ہو گئی ہے کسی مزاج سے چاہے وہ حار ہو یا بارد مطلق ناموافقت نہیں کرتی۔ ورق طلا و نقرہ مروارید ناسفتہ لعل بدخشانی۔ یاقوت رمانی و یاقوت اصفر و کہرباء زمرد تاباک اور دوسرے جواہرات کو اپنے دریافت کردہ طریقہ سے محلول اور بحد اللطافت بناکر اسمیں شامل کیا جاتا ہے اسی وجہ سے قلب و دماغ اور تمام اعضاء رئیسہ کو حد درجہ تقویت پہنچاتی ہے اکثر لطیف المزاج اصحاب کو ایسی دوا کی تلاش رہتی ہے جو بہمہ صفت موصوف ہو بعض اصحاب چاہتے ہیں کہ تقویت ہو اور باہ بھی بڑھے جسم و روح اور اعضاء رئیسہ کو یکساں مفید ہو۔ ان کیلئے یہ مفرح یاقوتی بوجہ آمیزش جواہرات اس درجہ تفریح اور ایسی ہیجان و فرحت کمال کا حال پیدا کرتی ہے کہ بااندوشاندہ۔ دماغی کام کرنیوالوں کیلئے عجیب و غریب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس مفرح یاقوتی میں ایک عجیب و غریب صفت ہے کہ یہ مثل جوہر الجواہر یا جواہر مہرہ کے پرانی سے پرانی عادت منشیات کو ترک کرادیتی ہے۔ اس مفرح یاقوتی کے استعمال سے بیس بیس سالہ شراب نوشوں نے شراب ترک کردی افیونیوں نے افیون کو ترک کردیا۔ اور دوسرے منشیات کے استعمال کرنیوالوں نے اس یاقوتی کو حرز جاں بنایا۔ یہ مفرح یاقوتی جسم کی تمام ارواح کو کمال درجہ تقویت بخشتی، نشاط پیدا کرتی عمدہ اغذیہ کو جزو بدن بناتی ہے وہ لوگ جو گرم مقویات کھاکر پریشان ہوتے ہیں اور وہ جن کو سرد دوا موافق آتی ہو نہ گرم ان کے لئے یہ مفرح یاقوتی واقعی آب حیات سے کم نہیں ہے۔ بلا کسی قسم کے ہیجان یا جوش پیدا کرنے کیلئے بہترین مقوی ہے بہرحال یہ یاقوتی ہر اعتبار سے بہمہ صفت موصوف ہے۔ مگر صرف ایک صفت اسمیں نہیں ہے وہ یہ کہ کم قیمت نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ حد درجہ بیش بہا جواہرات اور عقاقیر کے جوہر اور روح کا مجموعہ طب کیمیاوی کا کرشمہ اور واقعی ایک شاہی دوا ہے جو حضرات نمونتاً بھی اسکی چند خوراکیں نوش جان فرمالیتے ہیں وہ ہمیشہ کیلئے اسکے والہ و شیفتہ ہوجاتے ہیں۔ چونکہ یہ یاقوتی گویا روح ادویہ ہے اسلئے اسکی مقدار خوراک حد درجہ قلیل ہو چاہے اس کا تجزیہ یعنی عمل انالائز کرکے بہت اچھی طرح جانچ سکتا ہے کہ یہ جسم انسانی کیلئے مفرد ادویہ ہر قسم کی سمیات مسکرات کشتہ جات سے قطعی پاک ہے۔

مقدار خوراک۔ ۲ رتی سے ۸ رتی تک ہے۔ ۸ رتی سے زیادہ شاذ ہی کوئی قوی آدمی برداشت کرسکے۔ قیمت فی شیشی جسمیں ۶ ماشہ یہ شہنشاہی یاقوتی ہے (عہ) پانچ روپیہ۔

بدرقہ۔ کچا دودھ۔ گرم پانی قدرے فیرنی ملائی وغیرہ۔ المعلن:۔ عبد الغنی انصاری منیجر انصاری دواخانہ نبیرۂ علامہ لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حکیم نابینا صاحب مدظلہ العالی۔

(۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات حکومت صوبۂ متحدہ

حکومت صوبۂ بہار اور حکومت صوبہ سی، پی (برار)

زیر سرپرستی۔ ڈاکٹر سیّد محمود

اسسٹنٹ اڈیٹر
محمد نقی

اڈیٹر
ساغر

ناشر
مکتبۂ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی پرچہ ۸ / آٹھ آنے

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۰ فیصدی کمیشن

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

فہرست مضامین ایشیا مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

ایشیا

جلد ۷ | مارچ سنہ ۱۹۴۲ء | نمبر ۲

رات اندھیری طوفاں سرپر!

محصور اور مظلوم دنیا کے لئے یہ وقت قیامت سے کم نہیں، قیامت بربادیٔ عالم کی اک لفظی تعبیر تھی مگر یہ وقت گرجتی اور دہکتی ہوئی حقیقت ہے۔ یہ حقیقت قوموں کی ناقابلِ معافی فروگذاشتوں، قیاسی تقاضوں اور قدرت کے معینہ جابر نظام کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ قیامت کی حقیقت! جس سے ہمارے ٹکرانے یا نہ ٹکرانے کا سوال نہیں، وہ خود ہم سے ٹکرانے کیلئے پوری خوفناکیوں کیساتھ بڑھی چلی آتی ہے۔

کوئی خود مختار اور آزادی پسند ہندوستانی، ملک کو غلامی کا نیا چولا بدلوانے کی تائید میں نہیں۔ ہر شخص کی آرزو ہے کہ دنیا میں جمہوریت اور انفرادی آزادی برقرار رہے، مگر اس کے لئے موجودہ نظام اور ذہن کی کامل تبدیلی کی ضرورت ہے اس تبدیلی کے بعد ہندوستان ترقی اور حرکت کے اس نقطۂ عروج پر نظر آسکتا ہے جہاں سے آنیوالی قیامت سے ٹکرا کر کم از کم مٹ جانے کی حسرت ہی سلیقے سے پوری ہوسکے۔

ہم تاریخ کے اہم ترین منازل سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ اس تاریخ کے منفی پہلو سے مجھے غرض نہیں، مگر شاید، تدبر اور عاقبت اندیشی کی مٹی ہوئی صلاحیت کچھ معجزہ دکھائے، شاید انتہا کو پہونچے ہوئے دنیا کے سیاسی حالات نے برطانیہ کی قلب ماہیت کردی ہو، شاید تاریخ کا سب سے بڑا سیاسی پیامبر کرپس ہندوستان کے دل کو جیت لے، شاید انگریز قوم اپنی روایات کے خلاف کوئی صالح اور مدبرانہ قدم اٹھائے۔ اگر ایسا ہوا تو دنیا کے مستقبل کا نیا باب ہندوستان، اور صرف ہندوستان کھولے گا؛

کامل اور واضح نتیجے قبل از وقت نکالنا، ممکن نہیں، ہندوستان جو سینکڑوں غلیظ اور ناقص، لاکھوں غلط و منافق عناصر کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے اسوقت تک ترقی و آزادی کے کئی موقع ضائع کرچکا ہے، اگر ہندوستانیوں اور خود حکومت نے پرانی راہوں ہی پر چل کر منزل پر پہونچنا چاہا تو میرے خیال میں سفر شروع کرنے ہی کی ضرورت نہیں؛

پچھلے سیاسی گناہوں کے بطن سے پھوٹنے والی آتشیں قیامت کا مقابلہ کرنے کیلئے حکومت کو اپنے مفاد کی خاطر تبدیل ہیئت کرلینا چاہیئے۔ اور ہندوستانیوں کو اگر ملک کی آزادی، انفرادی خود مختاریت، تقریر و تحریر کا اختیار۔ یہی نہیں تمام عالمِ انسانیت کا امن، کمزوروں اور غریبوں کی بقا منظور ہے تو ایک مرکز پر متحد ہوجانا لازمی ہے؛

یہ مرکز کیا ہوسکتا ہے ؟!؟ کل ہندوستان کی نمائندہ ترقی یافتہ قومی حکومت کا عارضی ڈھانچہ، اور اس کو جنگ کے بعد مستقل آزاد قومی حکومت کے نام پر قائم کرنیکا متحدہ مطالبہ!

یہ ڈھانچہ کیوں کر بنے!؟ اس ڈھانچہ کو ہندوستان کی مختلف سیاسی پارٹیاں، ہندوستان کی آزادی اور محبت کے نام پر تیار کرسکتی ہیں، اگر آج بھی ذاتی ضدیں، اور لیڈرشپ کی دلی خواہشات کو سدِ راہ بنایا گیا، تو یہ

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

نزدیک آزادی سے زیادہ مقدم فرض سیاسی لیڈروں کا زوال قرار دیا جانا چاہیئے۔

اور اگر برطانیہ کی بیشکش اتنی ترقی یافتہ ہی نہ ہو کہ اس کی طرف توجہ کی جاسکے۔ تو پھر سوال ہی کیا ہے۔ یہ طلسم خیال خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی کی یہ خواہش نہیں کہ یہ مرحلہ ناکام ہو مگر تاریخ اور دوڑتے ہوئے عناصر اس مرحلہ کا بھی انتظار نہیں کرینگے۔ اس کے بعد ناکامی کی صورت میں ملک کی ہر پارٹی کو تحفظ کے ذرائع پر غور کرنا لابدی ہے۔ حکومت کو بہت کام ہے، اس لئے ہر آنے والی مصیبت سے بچاؤ یا مقابلہ کی ذاتی قوت و حوصلہ ہم میں خود ہونا چاہیئے۔ اُس حوصلہ کو اک مرکزی قوت دینے کے لئے، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، تمام قوموں کو مذہبی اور سیاسی اختلافات مٹا کر ایک دوسرے کی امداد و ہمدردی کیلئے کوئی نظام بنانا چاہیئے۔ خواہ حکومت سے مل کر، خواہ علیحدہ، بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ ہم موقع کی نزاکت کو محسوس کریں۔ طوفان سر پر ہے، اور اندھیری رات گہری ہوتی چلی جارہی ہے۔

گرجتے ہوئے طوفان میں!

گرجتے ہوئے طوفان میں ادارۂ ایشیا جس رفتار سے کام کو جاری رکھے ہوئے ہے وہ اس کے لئے اعجاز ہے، یہ رفتار شاید بہت ہی دھیمی ہوجاتی اگر اس ادارہ کو قلمی امداد پہونچانے والے، اپنے اعلیٰ ثبات دماغی اور صادق ترین اخلاص کا ثبوت نہ دیتے۔ مجھے یہ عام رائے معلوم کرکے اطمینان ہے کہ مکاتیب نمبر کی دو جلدوں کے بعد جو معیارِ ادب ایشیا نے پیش کیا ہے، وہ اس کے گذشتہ معیار سے بہت بلند ہے۔ اور اس تمام پرواز میں رجعت کی سمتیں قطعی مفقود ہیں۔ کم از کم یہ وہ بلند مرکز ہے جہاں سے ہم ترقی کی عمودی چوٹی کی طرف آسانی سے اُڑ سکتے ہیں:

فروری سے ایشیا کے لکھنے والوں میں کچھ نئے رفقاء کا اضافہ ہوا ہے۔ طاہرہ دیوی، ہاجرہ بیگم، پنڈت سُندر لال، قاضی عبدالغفار، فضل قریشی دہلوی، شارق میرٹھی، محشر بدایونی، ڈاکٹر اختر امام (بنگال) اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈی، لٹ (پیرس)،

اختر حسین رائے پوری، ایشیا کے قدیم دوست اور سرپرست ہیں۔ اُن کی ذہانت اور اخلاص نے ایشیا کو ہمیشہ نوازا، مگر جب تک یہ سورج مغرب کی گود میں رہا ایشیا کو بھلاتے رہا۔ اور جب مشرق میں اپنی نئی تابانیوں کے ساتھ طلوع ہوا، ایشیا پر اُس نے وہ خاص پرتو ڈالا جو اُس کے اخلاص کی روشنی کی مضبوط گواہی ہے، ہم سب ایک مقصد کے لئے جیتے ہیں، وہ مقصد ہے۔ انسانی ذہن کی ترقی و پاکیزگی، مسرت اور بلندی، اسی مقصد میں ڈاکٹر اختر نے ایشیا کے حلقہ کو وسیع کرکے دل کی جو وسعت دکھائی، وہ اُن کے اعلیٰ ادیب ہی نہیں، بلند تر انسان ہونے کی دلیل ہے، اور اچھا انسان ہونا ادیب ہونے سے زیادہ ضروری ہے۔ گرجتے ہوئے طوفان میں ان ساتھیوں کی رفاقت ہمت افزا ہی نہیں، حیرت ناک ہے۔ مگر شاید یہ صحیح ہے، اعلیٰ درجہ کی مصیبت اعلیٰ کارناموں کا موجب ہوتی ہے۔

ساغر

نئی صبح

ایشیا

پہلا باب

ادبیات و سیاسیات

بابتہ مارچ ۱۹۴۲ء



سعید احمد رشید میرٹھہ

ڈاکٹر اختر امام (بنگال)

شلر کے شرارے

(یہ مختصر سا مقالہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۱ء کو انجمن ادب بنگالہ میں پڑھا گیا)

جس وقت المانیا کی حیات اجتماعی میں شعریت اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جلوہ فرما تھی۔ یہاں کی سرزمین سے ایک شاعر پیدا ہوا۔ وہ شاعر جس کی بے وقت موت خود ایک یاس آمیز شعر ہے، میری مراد فریڈرش شلر سے ہے جسکے اچھوتے تخیل، حسن بیان اور جوش محبت نے دُنیائے ادب میں ایک ہلچل ڈالدی یہ ایک حقیقت ہے بیحد شیریں اور مستحکم کہ دنیا کی تمام امیر زبانوں میں ایسے شاعر بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں۔ جنھوں نے خود اپنے جذبات سے مجبور ہو کر شاعری کی یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں ایک عالمگیر محبت اور کائناتی تخاطب ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس بے پناہ شاعر کے خیالات سے اُردو دنیا بہت کم واقف ہے۔ وہ تو خدا اقبال کا بھلا کرے کہ اُس نے گوئٹے کے مشرقی دیوان ......
کے جواب میں "پیام مشرق" لکھ کر المانوی ادب سے ہم لوگوں کو روشناس کرایا۔ ورنہ ہم ابتک ان سدابہار پھولوں سے ناواقف ہی رہتے۔ جہاں تک شلر کا تعلق ہے اور شلر ہی پر کیا موقوف ہے۔ انگریزی زبان کے علاوہ مغربی زبانوں کے شہپارے اب تک ہماری زبان میں منتقل نہیں ہوسکے۔ اس بے اعتنائی کے دو ہی اسباب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مغربی شاعری کا نگارخانہ بھونڈی اور بھیانک تصویروں سے بھرا پڑا ہے۔ اور ہمارے نقطۂ نگاہ سے ان میں کوئی کشش نہیں یا یہ کہ ہم اُردو بولنے والے اس سے کامل واقفیت کی بنا پر اس کا بار بار تذکرہ بیکار سمجھتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو اب وقت آگیا ہے کہ ہم تراجم کی اہمیت کو سمجھیں اور اس طرح اپنے ادب کو غیر اُردو افکار سے متعارف کریں۔
"زہے تازہ نو بہ نو!

فریڈرش شلر ۱۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو دریائے نیکر کے کنارے چھوٹے سے خوبصورت شہر مارباخ میں پیدا ہوا۔ چونکہ اس کا باپ پرتگان کا زہ پا ایک فوجی ڈاکٹر تھا اس لئے کسی ایک جگہ جم کر اسکا تعلیمی سلسلہ شروع نہیں ہوسکا۔ اس کا سیرت نگار لکھتا ہے کہ لورخ ([illegible]) اور لڈوِش بورش ([illegible]) میں اس کے والدین کافی عرصہ تک رہ گئے۔ اس لئے صحیح معنوں میں اس کے خیالات کی نشو ونما انہی دو قصبوں میں پڑی۔ کچھ دنوں بعد ویرٹم بورش ...... کے نواب صاحب کے حکم کے بموجب اس کو حربی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہ فطرت پرست نوجوان فوجی پابندیوں سے اُکتا سا گیا۔ اور فن حرب سے زیادہ شاعری کا دلدادہ ہوگیا۔ چنانچہ ۱۷۷۶ء میں جبکہ شلر کی عمر سترہ سال 11
کی تھی اس نے پہلی بار غنائی شعر کہے اور اس کے بعد اس مدرسہ کو چھوڑ کر آزادانہ پھر لگیا ۱۷۸۱ء میں جبکہ نوجوان شاعر کچھ کم بائیس برس کا تھا، اس نے اپنا پہلا ناٹک موسوم بہ "رہزن" ملک کے سامنے پیش کیا۔ گوئٹے کے ورتھر کی طرح "رہزن" میں شلر نے جس باغی کا ذکر کیا ہے۔ غالباً خود شاعر اپنی صورت آئینہ تخیل میں دیکھ رہا تھا۔ اسی زمانہ میں مانہائم (Mannheim) میں ناٹک کمپنی کے ڈائرکٹر دالبرگ (Dalberg) نے شلر سے درخواست کی کہ کچھ ترمیم کے بعد "رہزن" کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی جائے۔ شلر راضی ہوگیا۔ "رہزن" کھیلا گیا۔ تماشائیوں نے طوفانی استقبال کیا۔ اس طرح المانیا میں پہلی بار شلر کے شعلے بھڑک اٹھے۔

اس ڈرامے میں شلر کی ابتدائی خامیاں اور مستقبل کی ترقیاں صاف نظر آتی ہیں۔ جس وقت شاعر نے یہ ناٹک لکھا تو اسوقت اُس نے صحیح معنوں میں انسانی سیرت کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ مردوں کے کردار کہیں کہیں تو اپنے اصلی روپ میں جھلک بھی پڑتے ہیں۔ مگر جہاں تک نسوانی تحلیل نفسی کا تعلق ہے۔ شاعر کو ایک سطحی علم تھا۔ دنیا کے بسنے والوں کو اُس نے کتابوں کے ذریعہ تاک جھانک کر

دیکھا تھا۔ خود اپنے مشاہدات کا سرے سے فقدان ہے۔ باغیانہ فطرت کے تحت اس کے ناٹکی مکالموں میں ضرورت سے زیادہ پُرزور انداز بیان ہے۔ جیسے دو دیو گرج رہے ہوں۔ حالانکہ شاعر کا مقصد تو یہ تھا کہ گفتار میں جوش اور گرمی ہو۔ اس کے علاوہ افسانہ کے اہم واقعات میں باہمی ربط کی کمی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری کہانی گونگے کا خواب بن جاتی ہے۔ یہ تو تھا تصویر کا ایک رُخ۔ دوسری جانب اس ڈرامے میں ایک فطری تمثیل نگار کی پوری شان موجود ہے مثلاً ناٹکی فضائے بعید پیغام اور دنیا کے تمام المیۃ کی نمایاں خصوصیت یعنی خواہشات کا تصادم، حیرت، رحم اور خوف وغیرہ۔

۱۷۸۳ء کے لگ بھگ اُس نے دوسرا ڈرامہ "جینوا میں جیکو کی سازش" پیش کیا۔ یہ ڈرامہ کیا ہے ایک سماجی المیۃ! جسمیں ایک شریف النفس، بلند حوصلہ اور حریت پسند آدمی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ ایسا حریت پسند جو ملک کو ظالم حکمران سے نجات دلائے۔ اس ناٹک پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ شاعر سماج کی بے جوڑ بندشوں کو توڑ کر اُن کے تار و پود بکھیر دینا چاہتا ہے۔ ابسن (Ibsen) کی طرح اس باغیانہ فضا میں وہ کافی عمر تک سانس لیتا رہا۔

اس کے ناٹکوں کی تخلیق اسی طرح وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔ اس کے بعد اپریل ۱۷۸۵ء کا سکر آمیز وقفہ شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ اس کے پاس دو غیر متعارف پرستاروں کے خطوط لائپزش سے آئے۔ شلر ان دونوں کو جانتا بھی نہ تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ موسم بہار لائپزش کے مضافات میں گذاریئے اور ہمیں میزبانی کا شرف عطا کیجئے۔ شلر حیران تھا کہ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ آخر یہ پرستار ہے کون؟ اس کو شاید پہلی بار صحیح احساس ہوا کہ اب وہ گھریلو نہیں بلکہ المانیا کی قومی ملکیت ہے۔ شلر نے دعوت نامہ قبول کر لیا اور اپریل کے اواخر میں لائپزش روانہ ہو گیا۔ لائپزش سے اس کے پرستار اسکو گولیز (Gohlis) لے گئے اور وہاں ان دو ادب نوازوں نے اپنی اپنی محبوباؤں سے تعارف کرادیا۔ موسم بہار کی رنگینیاں، ہر طرف بالزم کراٹ، ہیل شلوسل، لالہ اور گلاب کے پھول، شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، سکون، شباب اور خوشبو نے اس جوشیلے شاعر کو موہ لیا۔ وہ اس فردوس بریں میں کھو سا گیا اور تمام ارضی مسرتوں سے لُطف اندوز ہوا۔ یہ سفر ادبی اعتبار سے بہت قیمتی ثابت ہوا۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے "نغمۂ مسرت" لکھا۔

نغمۂ مسرت میں، بہار، خوشبو اور حسین جوانیاں اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

جولائی ۱۷۸۷ء میں جب کہ نواب صاحب وائمر سے کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ شلر یہاں پہنچا۔ وہ اکثر یہ محسوس کرتا تھا کہ گوئٹے کے خیالات کا جواسا سی چشمہ بہہ رہا ہے اس کا مزہ اس سے زیادہ کسی نے نہیں لوٹا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ شلر کا بے پناہ ہمعصر گوئٹے اپنی بیتاب رُوح کو تسکین دینے کی خاطر اطالیہ چلا گیا تھا۔ وائمر میں صرف ہرڈر (Herder) اور ویلاند (Wieland) موجود تھے۔ ان دو ادیبوں نے شلر کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہرڈر اور ویلاند نے گوئٹے اور کانٹ کی طرح شاعر کے تصورِ حیات کو کافی متاثر کیا ہے۔ وائمر میں کچھ دنوں تک رہنے کے بعد شلر رُوڈول اشٹاٹ (Rudolstadt) چلا گیا۔ اور فون لینگفلڈ کے خاندان سے مراسم شروع ہو گئے۔

خود شاعر "روڈول اشٹاٹ" کے شہر کو کام دیوتا کا ذکر اشارتاً کر گیا ہے۔ اور غالباً یہیں اس کا محبت اور حُسن پرست دل تیر الفت سے زخمی ہوا۔ لانگفیلڈ کی چھوٹی لڑکی حُسن، صحت اور رُومانی سلجھی نظر کا مجموعہ تھی، شلر نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ اس واقعہ کے بعد وہ بدستور مطالعہ میں معروف رہا مگر اس کا رجحان تاریخ و فلسفہ کی طرف ہو گیا۔ تاریخی اور فلسفیانہ مقالے لکھتا رہا جو اس زمانہ کے گلدستوں میں شائع ہوئے اور آج تک سدا بہار ہیں۔ اس کے تاریخی اور فلسفیانہ مقالوں نے ملک الشعراء گوئٹے کو اس کی طرف متوجہ کیا اور شاعر اعظم کی سفارش سے شلر کو "یونا (Jena)" میں پروفیسری ملی۔

خارجی اثرات کا جہاں تک تعلق ہے، گوئٹے، کانٹ اور روسو کے بلند پایہ خیالات نے اس کی شاعری پر کافی اثر ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی تحریک کا پرتو بھی موجود ہے۔ ریوکرٹ (Rückert) اور پرگشٹال (Purgstall) نے مشرقی شہپاروں سے مغرب کو روشناس کیا اور یہ اثر گوئٹے کے کلام میں اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ خصوصاً مغرب کے مشرقی دیوان (West Östlicher Diwan) میں، جیسی گوئٹے نے خواجہ حافظ کے رنگ میں ردیف و قوافی کو مدنظر رکھتے ہوئے، رباعیاں غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں۔

کائنات کے مطالعہ سے "جمالیات" کا صحیح تصور شلر نے متعین کرلیا۔ یہی وجہ ہے اس کے اخیر زمانے کے ناٹکوں میں جمالیات کے لئے ایک مخصوص جگہ ہے۔ بہ حیثیت مجموعی جوش بیان اور فطری زندگی میں ایک معصومانہ رنگ دوڑتا ہے۔ شلر نے اپنے اشعار میں مرکزی خیالات کے اردگرد جو فطرتی مناظر پیش کئے ہیں اس سے وہ ایک قسم کی صدائے بازگشت کا کام لیتا ہے۔ جو شعر اور زمین شعر میں ہم آہنگی پیدا کردیتی ہے۔ وہی ہم آہنگی جو لیونارڈ ڈاونچی (Leonardo da Vinci) نے مونالزا کی شبیہ اتارتے وقت مدنظر رکھی۔

۱۷۹۹ء سے شلر مستقل طور پر وائمر میں رہنے لگا۔ یہ دور ہر اعتبار سے اہم ہے کیونکہ یہیں گوئٹے سے استفادہ کا براہ راست موقع ملا۔ شلر اپنی تمام جودت طبع دکھائے اور المانوی ادب کو حیات نو بخشنے کے بعد یہیں ۹ رمئی ۱۸۰۵ء میں اس دنیا سے چل بسا۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد اب میں اس کی مختلف نظموں کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ اہل نظر اس بات سے خوب واقف ہیں کہ ترجمہ ترجمہ ہی ہے۔ مجھ کو اس وقت کامیاب ترجمہ پر ایک المانوی ناقد کا یہ جملہ یاد آتا ہے۔

وہ کہتا ہے، "ترجمہ مشکل کام ہے۔ کامیاب ترجمہ ایسا ہے جیسے ایک حسین دوشیزہ کے رخ پر باریک ترین نقاب کا بوسہ لے لیا جائے۔" یہی حال ہر زبان کا حال ہے۔ فردوسی ہی کو لیجئے۔

بہ بالا یکے سرو شاداب بود — تو گوئی ہمہ تخت سہراب بود

یا امرالقیس کا یہ شعر

مکرٍ مفرٍ مقبلٍ مدبرٍ معاً — کجلمود صخرٍ حطہ السیل من علِ

اور غالب کے

چاک مت کر جیب بے ایام گل — کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

شاید ترجمہ سے لطافت کھو بیٹھیں گے۔ اب ملاحظہ ہو شاعر کا بہاریہ گیت کہتا ہے:۔

اے حسین دوشیزہ!
او فطرت کی خوشی، خوش آمدید!
تیرے رنگا رنگ پھولوں کو دیکھ کر سبزہ زار خوش آمدید کہہ رہے ہیں اے نوحسینہ آہی گئی۔
حسینہ! تو کتنی من موہنی معلوم ہوتی ہے۔
اب تو ہم لوگ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے ہیں اور تیرا استقبال کرتے ہیں۔
اور بہار! ذرا سن تو! کبھی تجھ کو میری محبوبۂ دلنواز کا بھی خیال آتا ہے
خدارا اسکا بھی دھیان رکھ!
میری پیاری معشوقہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔
اور وہ تو اب تک مجھ کو چاہتی ہے۔
بہار! سن میری محبوبہ کی زیبائش کیلئے کچھ چند کلیاں بھی پیش کرنا!
تجھ سے بس یہی التجا ہے۔
بہار تجھ سے دوبارہ التجا کرتا ہوں،
سچ بتا تو بیوفائی تو نہ کرے گی؟
اے حسین دوشیزہ!
او فطرت کی خوشی! خوش آمدید!

یہ نمونہ ہے اس کے ابتدائی کلام کا جس میں معنویت سے زیادہ ناپختگی جھلکتی ہے، ہاں ایک اعتبار سے اسکا مرتبہ بلند ہے وہ یہ کہ بہاریہ نغمے کی پوری شان موجود ہے۔ دوسرے دور کی ایک نظم ہے "ملاقات" ۱۲۳
اس میں کہتا ہے۔

"ہاں! تو پھر آج بہت دنوں بعد ہم لوگ رہائن کی دلکش سرزمین میں ملے ہیں!
تو سن! اسی مناسبت سے نغمہ کے گلے کا ہار
شاداب اور معطر پھولوں سے تیار کرنا چاہیئے۔
لیکن کس مقدس ہستی کی شان میں ان گیتوں کا نذرانہ پیش کریں؟
ہاں سن بھی! خوشی کی تمنا میں خوب ناچیں اور گائیں!
یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ عبادت گاہوں کو پھولوں سے مزین کیا ہے اور عیش و عشرت کا دیوتا انگوروں کو نچوڑ رہا ہے۔
پیاری! جس کا آتشکدہ بھڑک اٹھا ہو
اس کو آسمانی شراروں کی حاجت ہی کیا؟
جب دل میں محبت کی چنگاریاں سلگ رہی ہوں تو دماغ کوئی
آتشیں کی ضرورت ہی کیا؟

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

اے کاش کہیں بادلوں میں چھپ کر، دیوتا پھول برسا دے۔
اور سُن! دنیا کے تمام حکمرانوں سے زیادہ طاقتور محبت بھری آنکھیں ہیں۔
زمین و آسمان میں فطرت کا رنگ دوڑ رہا ہے۔
یہ تمام دیوتا اسی سے اکتساب نور کر رہے ہیں اور دنیا نے نئے جوڑے زیب تن کر لئے۔
جیسے آفتاب کی سُنہری کرنوں میں کوئی ہفت رنگ قالین بن رہا ہو۔
یا رنگا رنگ پل پرسے، ویرانہ میں کوئی دیوتا آسمان کی طرف اڑا جا رہا ہو۔
ہاں ایسی ہی برقی چمک کے ساتھ حسن جلوہ ریز ہوتا ہے۔
اور شباب پرور رات کہیں جا کر چھپ جاتی ہے۔

اس نظم میں راگ اور رنگ دونوں موجود ہیں۔ مسرت کا صحت بخش تصور موجود ہے۔ اور اس کی بیتاب فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔
تیسرے دور کی ایک نظم اب ملاحظہ ہو:-

جلوہ ریز خدا! غروب ہو جا

زمین اوس کی پیاسی ہے اور انسانوں کے ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ کرنوں کے شہسوار اپنے گھوڑوں کو دوڑائے لئے جا رہے ہیں۔ اس لئے اپنے محل میں آرام کر! ۱۴

ذرا دیکھ تو خدا! سمندر کی بلوریں موجوں سے تجھے محبتانہ تبسم کے ساتھ کون چشمک زنی کر رہا ہے؟
کیا تیرا دل اُس درد سے آشنا ہے؟
کرنوں کے شہسوار اپنے گھوڑوں کو بھگاتے لئے جا رہے ہیں اور خدائے سیر تبسم ہے۔
لے تو سردار لگام پھینک دیتا ہے جس کو کام دیوتا تھام لیتا ہے۔
یہ شہسوار ٹھیر گئے اور برفانی موجوں سے پیاس بجھاتے ہیں۔ آسمان میں دبے پاؤں معطرات چلی آ رہی ہے اور اُس کے پیچھے شیریں محبت ہے۔
سکون اور محبت!

دوسری جگہ ایک دوشیزہ رنج فراق سے بیتاب ہو کر کہتی ہے۔
اُدھر کے پتے تیز ہوا میں سرسرا رہے ہیں اور بدلیاں سرکتی چلی آ رہی ہیں۔ اور ایک دوشیزہ دریا کنارے شاداب زمین پر بیٹھی ہوئی ہے۔ سامنے بپھری موجوں کا جوش شباب پر ہے۔
یہ دوشیزہ، ایک آہ سرد کے ساتھ اپنی شراب ریز آنکھوں سے رات کی بھیانک تاریکی کو تک رہی ہے۔
"آج دنیا سونی پڑی ہے اور میرا جی اداس ہے۔ ایسے میں یہ ہماری امیدوں کا دامن بھری کیا سکتی ہے۔
خدائے مقدس! اپنی بچی کو اٹھا لے۔
کیونکہ یہ تیری عنایتوں کا مزا لوٹ چکی۔
میں کافی زندہ رہی اور محبت بھی کی
آنسو ہیں کہ تیزی سے رواں ہیں،
اور نالۂ فراق بھی جو مردوں کو جگا نہیں سکتے۔

اس المیہ میں ایک دوشیزہ کی درد بھری لے موجزن ہے۔
اب ایک اور نظم ملاحظہ ہو جس میں شاعر نے اپنی معشوقہ Emma کو بیتابانہ یاد کیا ہے۔

دور بہت دور کہر کے دھندلکے میں
میری محبتوں کے دن جا چھپے ہیں
اور اب صرف ایک جھلملاتے ہوئے تارے کو میری آنکھیں فرط شوق سے تک رہی ہیں۔
اندھی موت نے تجھ پر ایک طویل نیند طاری کر دی ہے اور تیری ذات سے میری تلخیاں وابستہ ہیں۔
ایما! آہ تو تو طوفان نور میں موجزن ہے
میری محبت اب کہاں؟
ایما! کیا اس سے بھی شیریں تمنا اور ہو سکتی ہے کہ ہمارے گذرے ہوئے رومانی دن پلٹ آئیں۔ میری پیاری ایما! بیتے ہوئے دنوں نے جو گلہائے رنگا رنگ جمع کر رکھے ہیں۔ کیا یہ واقعی محبت کے پھول تھے؟
اور یہ ساری چنگاریاں جنہیں آسمانی سوز پوشیدہ تھا بجھ کر راکھ ہو گئیں!

شلر اور گوئٹے اٹھارویں صدی کے دو مایۂ ناز المانوی شعرا گذرے ہیں ان میں سب کچھ موجود ہے خصوصاً المانوی زاویۂ نگاہ سے۔ یہ دونوں شعرا مضطرب روحوں کیلئے سامان تسکین بہم پہنچاتے ہیں جس طرح ہارون الرشید کا بغداد، شکستہ حال مسلمانوں کی دلی، ابو نواس اور مرزا غالب پر نازاں ہے اسی طرح فریڈرش اعظم کا وائمر

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

قاضی عبدالغفار

جرمن کلچر اور نئی تنظیم

خون اور فولاد کا دیوتا محبت اور رحم کی جگہ لیگا۔ ان چند لفظوں میں صدر روزویلٹ نے تقریر کرتے ہوئے دنیا کی اس مستقبل کا ذکر کیا تھا جسکو پیدا کرنے کیلئے جرمن "کلچر" کی ترقی کے مختلف طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ لفظ "کلچر" لاطینی زبان سے لیا گیا ہے۔ اس کے اصلی معنی خیالات کی شائستگی اور تربیت کا ایک اعلیٰ مقام ہے جو کسی قوم کے اجتماعی اور انفرادی زندگی کو حاصل ہو جائے یہ تہذیب انسانی ذہنی اور دماغی تکمیل ہے۔ لیکن جدید جرمن اور نازیت کے بانیوں نے اس لفظ میں جو معنیٰ پیدا کئے ہیں وہ ایک ایسی قومی ترقی کا عملی تخیل ہے جس کے تحت حیوانی قوت کی انتہائی شدت کیساتھ تہذیب کے تمام قدیم اخلاقی معیار کو برہم کر کے کمتر اور کمزور اقوام پر جرمن تسلط قائم کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس تسلط کی تکمیل کیلئے جرمن قوم کے افکار و عزائم کو انسانیت کے اس عہد قدیم سے ملا دینے کی کوشش کی گئی ہے جو حیوانیت سے زیادہ قریب ہے۔ بقول ایک جرمن مفکر کے "جرمن قومیت اُن اجنبی اثرات سے قطع تعلق کرتی جا رہی ہے جس کو یہود و نصاریٰ کی مذہبی روایات نے اس کی اجتماعی زندگی میں داخل کر دیا تھا" اب وحشت انسانیت کے ارتقا کا (اسکو آپ ارتقائے معکوس بھی کہہ سکتے ہیں) ایک اعلیٰ ترین منظر ہے اور اس کے اندر موجودہ تہذیب و تمدن سے ہزارہا سال پہلے کی وہ تمام خصوصیات تازہ کیجا رہی ہیں۔ جو صرف حیوانی قوت کو تفوق کا معیار بناتی تھیں۔ اسکی صرف ایک مثال میں آج آپکو سنانا چاہتا ہوں۔

عورت اور نازیت

جو لوگ مذاہب کے تعلیمات اور تہذیب انسانی کے مسلمہ اصولوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی تنظیم میں عورت کا درجہ اور مقام کیا ہے ماں بیوی اور بہن کی حیثیت سے تمام مذاہب اور تہذیبوں نے عورت کی ایک مخصوص حیثیت اور تمدن میں اس کا ایک خاص مقام مقرر کر دیا ہے اور متمدن اقوام کی زندگی میں اس کے جنسی فرائض کا ایک اخلاقی معیار بھی مقرر ہے۔ جس کے مطابق مرد اور عورت کے تعلقات کی تنظیم کی جاتی ہے۔ اُن جماعتوں میں بھی جو لا مذہب ہیں زن و شو کے تعلقات کا کوئی نہ کوئی معیار مقرر ہے۔ عورت کا وجود جس طرح کہ مرد کا وجود اپنے بعض فطرتی فرائض کا پابند ہے اور ان میں سب سے بڑا فرض نسل انسانی کی ترقی ہے لیکن جرمن "کلچر" نے فطرت کے اس تقاضے کو اپنی ضرورتوں کا اس درجہ پابند کر لیا ہے کہ اب جرمن اور محوری ممالک میں عورت کا وجود تمام انسانی حقوق سے محروم ہو کر صرف ایک ایسی مشین کے مماثل ہو گیا ہے جس کا کام سوائے بچے پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ نازیوں کے ایک اخبار نے حال ہی میں کہا تھا کہ جرمنوں کو سب زیادہ "انسانی سامان جنگ" درکار ہے اور ایک جرمن یونیورسٹی کی پروفیسر نے فرمایا تھا کہ وہ لڑکی اور عورت جو زیادہ سے زیادہ بچے پیدا نہ کرے اپنے ملک سے غداری کرتی ہے"۔ اگر بچوں کی یہ مانگ نسل انسانی کی ترقی کیلئے ضروری سمجھی جاتی تو اُس پر اعتراض کرنا ناروا ہوتا لیکن جرمن "کلچر" میدان جنگ میں توپوں کیلئے صرف ایندھن تیار کرنے کی غرض سے زیادہ سے زیادہ بچے ... اُگنے پر اصرار کرتا ہے اس کی نظر میں ہر نوجوان ایک ہیزم سوختنی ہے جو جنگ کے آتش خانوں کو گرم رکھنے کیلئے پیدا کیا جاتا ہے اور پالا جاتا ہے بقول ایک جرمن مصنف کے "ہر جرمن ماں کا ہر تندرست بچہ جرمن قوم کی زندگی میں میدان جنگ کا ایک سپاہی ہے۔ الفرڈ روزنبرگ

کہتا ہے کہ "جرمن ..... میں ہر ایسی عورت جو بچہ پیدا نہ کرے — خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ — قومی دولت مشترکہ کا ایک ناممکل جزو سمجھی جائیگی" ظاہر ہے کہ جرمن "کلچر" کے اس نقطۂ نظر نے مناکحت اور مرد و عورت کے جنسی تعلقات کی اس اخلاقی حیثیت کو بالکل ختم کر دیا ہے جس کی بنا پر گھروں کی خاندانی زندگی منظم ہوا کرتی ہے۔ اب تو آرنسٹ برگمان مناکحت کی تمام پابندیوں سے قطع نظر کر کے صرف یہ حساب لگاتا ہے کہ:۔

"ہر ایک تندرست جرمن نوجوان کو کم از کم (۲۰) لڑکیوں سے بچے پیدا کرنے کے قابل ہونا چاہیئے"

سنہ ۱۹۲۸ء میں نازیوں کی حکومت نے ایک قانون نافذ کر کے زن و شو کے ایسے تمام تعلقات کو ناجائز اور قابل تنسیخ قرار دیدیا جن سے بچے پیدا نہ ہوں۔ جرمن نوجوانوں کی تمام انجمنوں میں جو ملک میں پھیلی ہوئی ہیں لڑکیوں کو عام طور پر یہ تعلیم دی جانے لگی کہ ماں بننے کیلئے شادی کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ مملکت اور فیوہرر کی خدمت کرنے کیلئے بغیر شادی کئے بھی بچے پیدا کرنا ضروری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج جرمنی کے ہر ایک ہزار بچوں میں سے پندرہ بیس بچے غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے جنسی اتصال کا نتیجہ ہوتے ہیں ان بچوں کی پرورش اور نگہداشت اس توجہ اور اہتمام کیساتھ کی جاتی ہے جس توجہ اور اہتمام کیساتھ سامان جنگ کے ذخائر جمع کئے جاتے۔ توپیں ڈھالی جاتی ہیں۔ طیارے بنائے جاتے ہیں۔ پٹرول جمع کیا جاتا ہے۔ اور دبابے تیار کئے جاتے ہیں!

جرمن "کلچر" کی اس جد و جہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ سنہ ۳۸ء میں لاتعداد جرمن بچے پیدا ہونے لگے۔ کہ وہ جوان ہو کر میدان جنگ میں مرنے والے نوجوانوں کی جگہ پُر کر سکیں سنہ ۱۴ء کے جنگ میں جو لاکھوں جرمن نوجوان مارے گئے تھے اُن کی جگہ جلد سے جلد پُر کرنے کے لئے ہٹلر نے اپنی قوم کو جنسی تعلقات میں ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر دیا اور انسانی نسل توپوں کا ایندھن بنا دی گئی۔ جرمن "کلچر" کے اس اصول کو دوسرے محوری ممالک میں بھی اختیار کیا گیا۔ چنانچہ اٹلی اور جاپان میں تمام قوانین بدل دئے گئے حتیٰ کہ زنا اور اغوا کی سزاؤں میں بھی بہت تخفیف کر دی گئی۔ وہاں کچھ عرصہ پہلے (۲۱) سال کی عمر تک کی لڑکیوں کا اغوا جرم تھا لیکن مسولینی نے اس عمر کے معیار کو گھٹا کر (۱۴) سال کر دیا۔ یعنے اب چودہ برس کی عمر سے زیادہ کی لڑکی کا اغوا کوئی جرم نہیں رہا۔ جرمن "کلچر" نے "حیاتیات" سے قدیم اخلاقی اصولوں کو خارج کر کے ایسے اصولوں کو تمام محوری ممالک میں رائج کر دیا ہے جو انسانوں کے جنسی قوانین کو خالص حیوانی زندگی کیطرف واپس لے جا رہے ہیں۔ اب حیاتیات کے جرمن ماہرین صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ملکوں کی اجتماعی زندگی میں سے زیادہ سے زیادہ کتنے بچے پیدا کئے جا سکتے ہیں اور یہ بچے صرف اس طرح شمار کئے جاتے ہیں جیسے توپیں یا رائفل یا دبابے اس سے زیادہ جرمن "کلچر" کی نظر میں اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ گویا بھیڑیں یا بکرے ہیں جو قربانی کیلئے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں یعنے جرمن کلچر نے انسانیت کی تمام دوسری خصوصیات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔

"حیاتیات کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ایک جرمن مصنف نے لکھا ہے کہ تندرست مرد ستر برس کی عمر تک بھی بچے پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ جنگ میں نوجوانوں اور جوانوں کے مارے جانے کی وجہ سے شرح پیدائش کم ہو سکتی ہے البتہ عورتیں اکثر (۵۵) سال کی عمر کے بعد بچہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ اس لئے ان کا وجود اس عمر کے بعد بیکار ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کی رائے میں (۷۰) سالہ مردوں کی قیمت بھی (۵۰) سالہ عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ نازیوں کیلئے گھر کی زندگی میں عورت کا وجود بے قیمت ہے اگر وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا نہیں کرتی ہے۔ جرمن ماہرین فن نے "حیاتیات" کے تجربات کے بعد یہ حساب لگایا ہے کہ جس طرح ایک گھوڑا (۵) سال کی عمر میں (۸۰) یا (۹۰) گھوڑیوں سے بچے پیدا کر سکتا ہے اس طرح کوئی وجہ نہیں کہ ایک نازی سپاہی بھی بہت سی عورتوں سے بہت سے بچے پیدا نہ کرائے۔ وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ مناکحت اور ازدواجی تعلقات، مذہبی یا اخلاقی پابندیوں کو منسوخ کر کے صرف حیوانی فطرت کے مسلمہ اصولوں کو رہنما بنا کر جرمن نسل کی ترقی میں کوشش کرنی چاہیئے۔

— یہ جرمن "کلچر" ہے۔ یہ وہ "تنظیم نو" ہے جس کو دنیا پر مسلط کرنے کیلئے ہٹلر لاکھوں انسانوں کا خون بہا رہا ہے۔ اس کلچر میں انسانوں کی انسانیت کو گھوڑوں اور گدھوں کی طرح افزائش نسل کیلئے استعمال کرنا ایک قومی فرض قرار دیدیا گیا ہے۔ نازی کلچر کے ان حقائق پر گہری نظر

ڈالئے اور دیکھئے کہ یہ کیسا خوفناک انقلاب ہے جو آدم کی اولاد کو وحشت اور بربریت کے اُن ویرانوں کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے جہاں اُن کی قدیم تہذیب کا کوئی اخلاقی معیار اور اصول باقی نہ رہیگا۔ جہاں وہ جنگل کے بہائم کے ساتھ ساتھ شمار کئے جائیں گے جہاں وہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی طرح بچّے پیدا کرینگے۔ جہاں ان کی جنسی قوتیں صرف ایک مشین کی طرح استعمال کی جائے گی۔ جہاں مرد محض توپوں کا ایندھن سمجھے جائیں گے اور عورتیں کوئی جنسی آبرو نہ رکھیں گی۔ سوائے اس کے کہ وہ مردوں کی جنسی ضروریات کو پورا کریں اور ایسے بچّے پیدا کریں جن کی ہڈیوں سے ڈکٹیٹروں کی عظمت وجلال کے مینار ومحراب تعمیر ہو سکیں۔ نازیوں نے بچّوں کے پیدا کرانے کا جو حیوانی اصول اختیار کیا ہے اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہو سکتا کہ انسانی زندگی کے ہر ذہنی اور اخلاقی شعبہ میں پستی اور خواری پیدا ہو اور موجودہ سماج کی ساری تنظیم یکسر برباد ہو جائے۔ جنسی اخلاق اور صالحت اور خاندانی زندگی کی اس تباہی سے صرف ایک ایسی ہی "تنظیم جدید" پیدا ہو سکتی ہے جو انسانوں کو حیوان بنا دے اور اُن تمام حد بندیوں کو توڑ دے جن سے انسانیت اور حیوانیت کے درمیان ایک بیّن امتیاز قائم ہے۔

آج دو کروڑ سے زیادہ مرد اور عورتیں بھی ذہنی تربیت حاصل کر رہی ہیں کہ ان کا وجود صرف ایک لیڈر کے احکام کا پابند ہے اور اُن کا کام سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں میں جنگل کے درندوں کی سی قوت پیدا کریں۔ انسانی شعور اور عزت نفس۔ اس جرمن کلچر کی فرہنگ میں ایک بے معنے اصطلاح ہے۔ وہ صرف چند لیڈروں کا حصّہ ہے۔ اور باقی جتنے انسان ہیں وہ جانوروں کا ایک بڑا گلّہ ہیں۔ ذہنی اور اخلاقی غلاموں کا ایک بڑا گروہ جو صرف ایک فرعون کو سجدہ کرنے اور صرف ایک فرعون کی ٹھوکروں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے! ـــ ہٹلر کی تنظیم جدید کا یہ محض کوئی تصوّر نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جس کا خوفناک چہرہ اب بے نقاب ہو چکا ہے۔

نئی تنظیم

دنیا کی تنظیم کے نقشے ہر گوشہ میں بنائے جا رہے ہیں۔ تہذیب حاضر کی عظیم الشان عمارت مسمار کی جا رہی ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کی تعمیر ہی میں "مضمر تھی اک صورت خرابی کی" اور اہل فکر و نظر کے پُرسکون گوشوں میں اب یہ تلاش ہو رہی ہے کہ آمریت وجمہوریت کے اس ہنگامۂ دار وگیر کے ختم ہونے کے بعد انسانی تمدن کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ دنیا کے اس حال خراب پر متعجب ہونے میں کیوں وقت ضائع کیجئے۔ جو ہونا تھا وہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا۔ حیوانی "عالمگیریت" کی پُرخروش قوتیں آخر ایک دن دنیا کے اس ویرانہ میں کہیں نہ کہیں تھک کر گرنے والی ہیں۔ اسوقت آمریت کے وحشیانہ فلسفہ اور جمہوریت کے راہ گم کردہ تصورات دونوں نظر ثانی کے محتاج ہوں گے اور جس طرح ان میں سے ایک یعنے آمریت جواب انسانی تمدن کو ہزارہا سال پیچھے لیجانا چاہتی ہے اسی طرح دوسری ان میں سے جو بہت عرصہ تک انقلاب کی آواز کو سُننے سے انکار کرتی رہی۔ اپنی زندگی کے تمام نقوش پر نظر ثانی کرے گی اور قوموں کی آنیوالی نسلیں اپنے لئے ایک نئی زمین مانگیں گی اور ایک نیا آسمان۔

آمریت کا فلسفہ یا نازیت کا فلسفہ جو ہٹلر کی کتاب "میری سرگزشت" میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ اب اپنی ہی پیدا کی ہوئی آگ اور فولاد کی کشمکش میں اس قدر مصروف ہے کہ اُسے اب اس بات پر غور کرنیکی فرصت ہی نہیں کہ مستقبل کی گود میں جو نئی دنیا پرورش پا رہی ہے وہ کیا ہوگی۔ وہ تو اب صرف ہٹلر کے اس تصور میں لپٹا ہوا ہے کہ (۱۰) کروڑ نازیوں کی ایک مضبوط چٹان زندگی 17
کے سمندر میں قائم کی جائے جس پر یورپ اور شاید ایشیا کی بھی تمام اقوام غلامی کی زنجیروں میں باندھ کر ڈال دی جائینگی۔ محوری مدبّرین کی تقریروں اور تحریروں میں بار بار یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے خونخوار عزائم میں کامیاب ہو گئے تو اس خاک وخون کی دُنیا کا ٹوٹا ہوا ڈھانچہ ایک ایسی عالمگیر آمریت کی صورت اختیار کریگا جس کا محور ومرکز ایک غیر مشروط نازیت ہوگی۔ اور اس دُنیا کو اس طرح بسایا جائیگا جس میں انسانوں کی انفرادیت آمریت کے قوی بازو میں سلب کر لی جائے۔ لیکن اہل نظر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس جنگ میں دو چیزیں تو یقیناً ختم ہو رہی ہیں۔ ایک آمریت اور ایک سامراج۔ پھر ان دو کے بعد انسانیت کا جو اساس باقی رہتا ہے اس کی تشکیل وتنظیم کیا ہوگی۔ آمریت کو فی الوقت اس بات کی کچھ پروا نہیں اور نہ اُس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہے۔ جرمن اور اٹلی ایک "نئی تنظیم" کے تخیل کو اپنی جد وجہد کا اساس بتلاتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے اور شاید بتا ہی نہیں سکتے کہ آخر اس تخیل کے خد وخال کیا ہیں اور دائمی غلامی کا جو طوق وہ انسانوں کے گلے میں ڈالنا

ایشیا مارچ ۴۲ء

چاہتے ہیں وہ فطرت انسانی کے قوانین کو کس طرح ہمیشہ کیلئے ختم کر سکے گا۔
جاپان اس تخیل کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ وہ ایشیا میں اپنی ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جو اُس کو پھیلنے کا موقعہ دے اس کی قوم کو آباد ہونے کیلئے زمین کے وسیع علاقے دے۔ اور اُس کی معاشی ضروریات کو ضرورت سے زیادہ پورا کرے۔ وہ اپنی ایسی دنیا چاہتا ہے کہ جس کو علانیہ فاتح اور مغلوب تو نہ کہا جائے۔ مگر جس پر جاپانی "نوجیت" کی مستحکم سیادت قائم ہو ——— مستقبل کے متعلق یورپین اور ایشیائی محور کے یہ تصورات ہیں اور یہ ایسے تصورات نہیں ہیں جن سے دنیا واقف نہ ہو۔

اب ذرا دوسری طرف بھی دیکھئے۔ جمہوریت میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ بہت سے دھوکے اور فریب ہیں۔ بہت سی خامیاں ہیں مگر اس میں انقلابی لچک بھی اور انقلابوں کیلئے وسعت بھی ہے۔ وہی ایک ماں کی گود ہے جس میں انسانی زندگی کے انقلابات پرورش پاتے ہیں۔ جمہوریت ہی کی اولاد سے اشتراکیت بھی ہے اور کمیونزم بھی۔ اولاد اچھی بھی ہوتی ہے اور بُری بھی۔ مگر نہ تو وہ اپنی ماں کے وجود سے انکار کر سکتی ہے اور نہ ماں اُس کے وجود سے انکار کر سکتی ہے۔ اس کو اپنی خاندانی میراث بھی ملتی ہے اور وہ اپنی نسل کی روایات بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے موجودہ شور محشر میں بھی جمہوریت کے مختلف گوشوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے تصورات میں مستقبل کے خاکے تیار کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا انگلستان کے مفکر ایچ۔جی۔ویلز نے "حقوق انسانیت" کی ایک دستاویز مرتب کر کے شائع کرائی تھی۔ اُس کے بعد چند ہی روز ہوئے کہ مسٹر چرچل اور صدر روزویلٹ کے مشورہ کا نتیجہ ایک دستاویز اطلانتک شائع ہوئی جس کی تفصیلات سے ابھی ہم واقف نہیں ہو سکے ہیں لیکن جس کے بنیادی اصولوں کی ایک جھلک ہمیں دکھائی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اہل نظر اپنے تصورات کو پیش کرتے رہے ہیں اور بہت سے گوشوں میں سوچا جا رہا ہے کہ آخر بیسویں صدی عیسوی کے اس طوفان نوح کے بعد ہماری یہ دنیا اگر کوئی کروٹ لیگی تو وہ کیا بن جائیگی۔

ان خیالات کا مرکزی نقطہ جس پر ہر مکتب خیال متحد ہے یہ سوال ہے کہ جنگ کے ان حیوانی جذبات کو جنھوں نے انسانیت اور تہذیب کے بڑے بڑے گنبدوں اور میناروں اور محرابوں کو مسمار کر دیا ہے۔ کس طرح قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح دنیا میں انسانی زندگی کا ایک ایسا نقشہ بنایا جا سکتا ہے جس میں سیاسی رقابتوں اور نسل و قومیت کے امتیازات کی کشمکش کے امکانات باقی نہ رہیں۔ اس طلسم پیچ و تاب میں امن و امان کی بہت سی آرزوئیں مبتلا ہیں۔ اور اہل نظر ان حالات و اسباب کا گہرا مطالعہ کر رہے ہیں جن کی بنا پر مغربی تمدن اور مغربی علوم و سائنس کی ترقیوں کا خمیر اس طرح بگڑا ہے کہ بگڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔

تھیٹر کے اسٹیج پر اداکار خود اپنی اداکاری کے عیب و سقم کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے سامنے جو تماشائی ہوتے ہیں وہ اُن کی اداکاری کے معائب و نقائص پر زیادہ نظر کر سکتے ہیں۔ اس لئے جنگ کے فریقین کی طرف سے دنیا کے مستقبل کی تنظیم و تشکیل کے جو تصورات اور خاکے پیش کئے جا رہے ہیں اُن پر تنقید۔ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی جھونپڑیاں ابھی تک جنگ کے شعلوں سے محفوظ ہیں اور جو کسی قدر فاصلہ پر کھڑے ہوئے اُن عالیشان محلوں اور ایوانوں کو منہدم ہوتے دیکھ رہے ہیں۔

تفصیلات سے بحث کرنا تو اس وقت ناممکن ہے لیکن میرے خیال میں اس عالمگیر عہد ابتلا کا بڑا سبب مجلس اقوام کے تخیل کی ناکامی ہے اور اس ناکامی کا بڑا سبب اپنے مفادات کے متعلق اقوام کی خودغرضیاں ہیں اور جمہوریت کی وہ اخلاقی کمزوری ہے جس کی تین بڑی مثالیں ہماری نظر کے سامنے ہیں۔ یعنے چین۔ حبش اور اسپین۔ چین میں جاپانی آمریت کی پیشقدمی نہ روکی جا سکی۔ حبش میں اٹلی کی دست درازی کا کوئی انسداد نہ ہو سکا۔ اور اسپین میں اٹلی اور جرمن کی سازشوں کا سدباب نہ ہوا۔ پے درپے تین بڑے امتحانوں میں ناکام ہو کر مجلس اقوام کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا۔ اور تقلیل اسلحہ کی تجویز حرف غلط بنا دی گئی۔

اگر ان نتائج کے سرچشمہ کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دور عقلیت میں فکر و عقل کی بے قید آزادی اور مادی قوت پر انسانوں کے عزائم کا انحصار ہے جس نے انسانوں کے تمدن کا کوئی اخلاقی معیار باقی نہیں رکھا جس طرح اعمال و اقوال کے اس طرح فکر و نظر کے بھی کچھ راستے وہ ہیں جو سیدھے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ٹیڑھے ہیں۔ ٹیڑھے وہ ہیں جن پر خودغرضی اور افادیت پسندی تمام دوسرے انسانی امتیازات کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ دور حاضر کے ہم بظاہر تندرست بیماروں اور بظاہر دانشمند بے عقلوں کا حقیقی مرض یہی ہے۔ اور یہ ایک ایسا ابتلا ہے جس کا علاج

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۰ پر)

پنڈت سندرلال

ہندو مسلم تنازعہ

(پنڈت جی کے اصل مسودّہ کے مطابق)

کسی بھی اخلاقی مریض پر غصّہ کرنا یا اُس سے نفرت کرنا اُسی طرح بیجا اور غلط ہے۔ جس طرح کسی جسمانی مرض میں مُبتلا انسان پر غصّہ کرنا یا اس سے نفرت کرنا۔ خود بیماری سے بچنے کی کوشش ایک علیحدہ چیز ہے۔ جس طرح افراد پیدا ہوتے ہیں۔ تندرستی کا حصن اٹھاتے ہیں بیمار پڑتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ اُسی طرح قومیں پیدا ہوتی ہیں۔ تندرستی کا سُکھ بھوگتی ہیں۔ بیمار پڑتی ہیں اور مرتی ہیں۔ اور جو حالت جسمانی بیماریوں کی ہے وہی اخلاقی اور رُوحانی بیماریوں کی ہے۔ ہر مرض میں اگر مریض کے اندر جراثیم کے مُقابلہ کی طاقت باقی ہے اور مناسب علاج ہوگیا تو پھر سے تندرستی حاصل کرنیکا اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی کمی رہی تو مرجانیکا۔ دونوں کا امکان رہتا ہے۔ ہماری قوم اس وقت ایک گہرے مرض میں مبتلا ہے۔ غصّہ کرنے یا ایک دوسرے کو الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ صحیح علاج کی کوشش کی جائے اگر اس دیرینہ سال قوم میں دم یا وائیٹیلٹی (تو گمانا کما ہے تا نہ کما) باقی ہوگی ممکن ہے۔ اللہ پھر اس کے دن پھیر دے۔ ورنہ ہم سب کو اُسی کی رضا پر توکل کرنا چاہیئے۔ اور اگر اُس کی مشیت کو یہی منظور ہے تو دوسری زیادہ تندرست۔ زیادہ سمجھدار اور زیادہ جوان قوموں کے لئے میدان خالی کر کے صفحۂ ہستی سے مِٹ جانا چاہیئے۔ آخر ہوگا وہی جو اُسے منظور ہے۔

جسم کے اندر سودا۔ سفرا۔ بلغم اور خون وغیرہ اگر ایک مناسبت سے رہیں تو اُسی کا نام تندرستی ہے۔ اگر کوئی مُناسبت سے بڑھ جائے یا کم ہوجائے اس حالت کا نام مرض ہے۔ اسی طرح قوموں کے مختلف اوصاف ہیں۔ مثلاً خود پسندی جب تک خود داری کی حد تک رہے بڑی اچھی چیز ہے۔ اس سے بڑھ جائے بُرائی ہے۔ یہی حالت قدامت پسندی کی ہے۔ اپنے ملک اپنے مذہب بلکہ دُنیا کے متقدّمین کی دل میں عزت ہونا بڑی اچھی چیز ہے۔ قدیم زمانے کی اچھائیاں بھی ہمیں ہاتھ سے نہیں کھونی چاہئیں۔ ہر زندہ مہذّب اور ترقّی پذیر مُلک میں ہر فرد کے لئے کامل مذہبی آزادی بھی ایک ضروری چیز ہے۔ ہر شخص کو اپنے طریقہ پر اور جس زبان میں وہ چاہے اپنے معبود کو یاد کرنے اور اپنے مذہبی رسوم کو ادا کرنے کا پورا موقع اور حق ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر کسی قوم میں قدامت پسندی اس حد تک پہنچ جائے کہ اُس ملک کے رہنے والے باوجود مکمل مذہبی آزادی اور مذہبی اختلاف کے ایک عام اور مشترکہ سماجی زندگی۔ مشترکہ کلچر اور مشترکہ زبان بازار میں میلوں میں۔ کھیلوں میں۔ کچہریوں میں
19 تعلیم میں صنعت و حرفت میں۔ علم و فن میں۔ لباس میں۔ کھانے پینے میں۔ رہن سہن میں۔ اپنے اندر کم و بیش ایک مشترکہ اور متحدہ زندگی پیدا نہیں کرسکتے۔ اور قائم نہیں رکھ سکتے تو وہ مُلک بحیثیت ایک مہذب اور آزاد مُلک کے دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں یہ مُلک اُس شان اور خوبصورتی کے ساتھ اس طرح کی ایک مشترکہ اور متحدہ سماجی زندگی کو اپنے اندر پیدا کررہا تھا جسے دیکھ کر دنیا دنگ تھی۔ سب سے زیادہ رونا اس چیز کا ہے کہ اپنی تواریخ بھی ہمیں نہایت غلط پڑھائی جاتی ہے۔ اور ہمارے اسوقت کے بڑے بڑے مُلکی رہنما ایسی ہی غلط تاریخ کو پڑھ کر بڑے ہوئے ہیں۔

موجودہ جھگڑوں کا بیج اس وقت پڑا جب کہ پچھلی صدی کے آخیر اور موجودہ صدی کے شروع میں قدامت پرستی کی کچھ بے وقت لہریں اس مُلک کے اندر چلنی شروع ہوئیں۔ ہم نے اس صدیوں کی متحدہ زندگی سے پیچھے ہٹانا چاہا۔ سب سے زیادہ افسوس ناک صورت اس رجحان نے اس وقت اختیار کی جب کہ کچھ نیک دل لیکن ناعاقبت اندیش مُحبّان وطن نے ہندی کے نام سے ایک ایسی نئی زبان وجود میں لانے کی کوششیں شروع کیں جو آج تک بھی ہندوستان کے کسی ضلع یا حصّہ کی عام بول چال کی زبان نہیں ہے اور جس نے ہندو مُسلمانوں کے

دِلوں کو ایک دوسرے سے پھاڑنے میں سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے۔ جس وقت اُن لوگوں نے بھی جن کے ہاتھ میں ایک وقت تمام قوم نے اپنی قسمت کی باگ ڈور سونپ دی تھی۔ اپنا رجحان اس طرف ظاہر کیا۔ حالت اور زیادہ نازک ہوگئی۔ دوسرے فریق پر اس کا ردِّ عمل لازمی تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا اُسے محسوس ہونے لگا کہ برادرانِ وطن اُس متّحدہ اور مشترکہ زندگی سے پیچھے ہٹنا چاہتے ہیں۔ جسے سب نے ملکر صدیوں میں تعمیر کیا تھا۔ ردِّ عمل بڑھا۔ قدرتی تھا کہ مُلک کے دشمن اس حالت سے پورا فائدہ اٹھائیں طبیعتیں یہاں تک بہکیں کہ ایک قوم کی دو قومیں نظر آنے لگیں۔ آئندہ کے لئے متّحدہ قومیت ایک خواب معلوم ہونے لگی۔ یہ خیال کیسے کہ جو غلط کشمکش ایک کی جگہ دو قومیں دکھا رہی ہے۔ وہ اگر قائم رہ گئی تو اتنے ہی پر نہیں رُک سکتی۔ پھر خُدا نہ کرے۔ دو نہیں تین نہیں۔ کم از کم بیس آزاد قومیں اور آزاد سلطنتیں اس مُلک میں نظر آئیں گی جو علیحدہ علیحدہ دُنیا کی مختلف طاقتور قوموں کے ہاتھوں کے مُہرے ہوں گی۔ اور اس وقت جو "ہندوستان" اور "ہندوستانی" کہلاتے ہیں۔ اُن کا ہمیشہ کے لئے جنازہ نکل جائے گا۔ مرض فی الحال کافی زور پر ہے۔ نیتیں دونوں طرف کی درست ہیں۔ لیکن دونوں اپنے اپنے سے مجبور ہیں۔ جس دھرم اور جس مذہب کو عالمگیر ہونیکا دعویٰ ہے اُسے اندیشہ ہے کہ اگر اس ملک میں "نمائش" کی جگہ "پردرشنی" یا "پردرشنی" کی جگہ "نمائش" کہا جانے لگا تو اُس کی ہستی خطرہ میں ہے۔ جن لوگوں کو وہ زبردست روشنی ورثہ میں ملی ہے۔ جو ہزاروں رنگ کی رنگ برنگی

۲۰

چمنیوں میں سے بھی اپنا جلوہ دکھا سکتی ہے، اور دکھاتی رہی ہے۔ اُنہیں اب ڈر ہے کہ چمنی کا رنگ بدلا اور روشنی بجھی۔ عنقریب کیا ہوگا یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

لیکن مایوسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ ملک کے عام ہندو اور مُسلمانوں کے دل ابھی تک بالکل صاف ہیں۔ وہ گیتا اور قرآن۔ کبیر کی ساکھی اور مولانا روم کی مثنوی۔ نانک اور محب اللہ۔ دادو اور بُلّے شاہ کو ابھی تک بھولے نہیں ہیں۔ اُن کا دھرم۔ اُن کا مذہب ابھی تک باوجود توہّمات اور ضعیف الاعتقادیوں کے "پریم کا دھرم" اور "عشق کا مذہب" ہے جنھیں دونوں طرف غیریت نظر آرہی ہے۔ اُن میں سے زیادہ تر عملاً اور اعتقاداً نہ ہندو ہیں اور نہ مُسلمان۔ یورپ میں فرقہ دارانہ جھگڑے ایک ہزار سال سے اوپر تک اس سے ہزاروں گُنا زیادہ خوفناک شکل میں جاری رہے۔ جاپان میں بودھوں اور عیسائیوں میں صدیوں اس سے کہیں زیادہ بُری صورت رہی۔ یہ بادل چھٹینگے۔ فضا بدلے گی اگر وہ دن نہیں رہے تو یہ بھی ہمیشہ نہ رہیں گے۔ ایک خواب ہے نہایت بُرا خواب ہے جس سے یہ قدیم قوم کم از کم ایک مرتبہ اور بیدار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی مجھے کوئی شبہ نہیں۔ مریض کا اصلی قلب درست ہے۔ اسمیں غضب کی وائیٹیلیٹی (قوّتِ مدافعت) ہے۔

علاج صاف ہے۔ راستہ نظر آرہا ہے۔ غیروں کی آمد سے ٹھیک پہلے کی جس مشترکہ اور متحدہ زندگی سے ہم نے قدم پیچھے ہٹائے ہیں۔ اُسی طرف ہمیں پھر لوٹنا ہے اور لوٹنا ہے مضبوطی اور اعتقاد کیساتھ۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۸)

کسی دستاویز اور عہدنامے اور دستور اساسی سے نہیں ہوسکتا۔ یہ دلوں کا معاملہ ہے۔ دماغوں کا معاملہ نہیں ہے جمہوریت ہو یا قومیت ہو یا اشتراکیت ہو۔ یہ سب ایک ایسی اخلاقی بنیاد کے محتاج ہیں جس کو خواہشیں اور خود غرضیاں نقصان نہ پہونچا سکیں لیکن ہٹلر "میری سرگزشت" میں سیاست کی تمام اخلاقی بنیادوں کو یہ کہہ کر منہدم کرچکا ہے کہ "حق اور باطل کا معیار صرف کامیابی ہے"۔

نوح کے زمانہ میں دنیا غرق کی گئی تھی، تاکہ ایک نئی اور بہتر دنیا پیدا ہو۔ اس طوفان کی بربادیوں میں نئی آبادیاں مضمر تھیں۔ اس ابتلائے عظیم کی ہلاکتوں میں ایک بہتر زندگی کے وعدے پنہاں تھے۔ یہی داستان دنیا کے ہر دور میں دہرائی جاتی رہی ہے اور اب پھر دہرائی جارہی ہے۔ ان بربادیوں کے ہنگامہ ہی میں نئے قاید پیدا ہوا کرتے ہیں اور وہ نئی راہیں پیدا کیا کرتے ہیں۔ فطرت کے وعدے اور قانون جھوٹے یا نا استوار نہیں ہوا کرتے۔ اسلئے ہمیں یقین ہے کہ ہم آج ایک نئے انقلاب کے دروازہ پر کھڑے ہوئے ہیں اور عہد حاضر کا یہ فتنہ جس نے جرمن آمریت کے گہوارہ میں پرورش پائی ہے۔ دنیا کے ایک نئے دور۔ ایک نئی بیداری اور ایک نئے انقلاب کی تمہید ہے — ایک نوید ہے جو ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے اسلئے آنیوالے خطرات کے خیال سے پریشان ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ گویا ہماری نظر وسیع تر دائرہ میں کام نہیں کرتی یا ہم ادنیٰ اور ذاتی منافادات کے زاویۂ نظر سے عالمگیر مفادات کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ذاتی مفادات اور ذاتی خطرات ایک عالمگیر انقلاب کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ اور اکثر آندھیوں اور طوفانوں میں برباد ہوجایا کرتے ہیں لیکن اُن ہی کی مٹی سے جمہوریت کی نئی عمارتیں تیار ہوا کرتی ہیں۔ درحقیقت جمہور کے اجتماعی وجود میں شخصی زندگی کا سرمایہ اتنا بھی نہیں جتنا کہ سمندر میں "ایک قطرہ" ہم قوموں کے ارتقا کو اگر انسانوں کی زندگی کے مختصر زمانہ سے ناپا کریں تو وہ ایسا ہے جیسے کہ سمندر کے پانی کو آبخوروں میں بھر کر تولا جائے۔ افراد کا فنا ہوجانا انسانی نسل کی تاریخ میں ایک بہت ہی خفیف واقعہ ہے۔ لہٰذا جو لوگ انسانیت کے افق پر نظریں جمائے ہوئے ہیں وہ اپنی ذات اپنی جان یا اپنے ادنیٰ مفادات کے تحفظ کا خیال بھی نہیں کرسکتے وہ دنیا کی ایک نئی تنظیم،

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۴ پر)

قاضی عبدالغفار

سنگاپور

بحر پیسفک اور بحر ہند کے درمیان ملایا اسٹیٹس کی آخری نوک پر جو ایک طرف جزیرۂ بورنیو اور دوسری طرف جزیرۂ سماٹرا سے ملی ہوئی ہے مشرق بعید کا یہ ایک برطانوی چوکیدار تھا۔ جو جبل الطارق۔ نہر سویز اور مالٹا کی طرح ایشیا کی طرف برطانوی اقتدارات کے دشمنوں کا راستہ روکے ہوئے تھا۔

جس وقت فرانس یورپ کے میدان جنگ میں موجود تھا۔ ہند چین میں اس کی طاقت برطانیہ کے لئے بھی باعث اطمینان تھی۔ لیکن فرانس کے انہدام کے بعد اب برطانیہ کو بحر پیسفک کے طرف امریکہ اور بحر ہند کی جانب سنگاپور کے استحکامات پر بھروسہ کرنا تھا۔ اور اس لئے مشرق بعید کے اس برطانوی چوکیدار کی اہمیت اب اس قدر زیادہ ہو گئی تھی جس قدر کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ اس چوکیدار کی سیاسی عمر دوسرے برطانوی چوکیداروں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ لیکن اُس کی اہمیت کسی دوسرے دفاعی استحکام سے کم نہیں تھی۔

سنگاپور کی قدیم تاریخ بہت دھندلی ہے۔ تیرہویں اور چودہویں صدی میں سنگاپور ایک آزاد ریاست تھی۔ مگر سنہ ۱۳۶۰ء میں اہل جاوا نے اس کو برباد کر دیا اور اس کے بعد تقریباً (۵۰۰) سال تک وہ ویران رہا۔ اس زمانہ میں تاریخ کے صفحات پر اُس کا نام و نشان نہیں ملتا تاآنکہ سنہ ۱۸۲۲ء میں وہ برطانوی سیاست کی بساط پر نمودار ہوتا ہے۔ البتہ حال ہی میں آثارِ قدیمہ کے ایک ماہر ڈاکٹر کوارش نے اس جزیرہ نما کی قدیم تاریخ کے متعلق بعض انکشافات کئے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ وہاں چوتھی صدی سے تیرہویں صدی تک کے ایسے قدیم آثار برآمد ہوئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنہ ۴۰۰ء میں بھی ہندوستان کی قدیم تہذیب اس جزیرہ نما تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے ہندچینی میں ایک قدیم ہندی … کے آثار برآمد کئے ہیں جو پانچویں صدی عیسوی میں وہاں آباد تھا۔

جزیرہ نمائے ملایا میں برطانیہ کا سب سے پہلا مقبوضہ مشرق میں مغرب کا سب سے قدیم مقبوضہ پینانگ ہے جس کو سلطان کداح سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنہ ۱۷۸۶ء میں حاصل کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اہلِ پرتگال کے قبضہ میں تھا۔ اور اس کے بعد سنہ ۱۸۱۶ء میں اہل ہالینڈ کی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا تھا سنہ ۱۸۵۶ء کے بعد سے اس مقبوضہ کی وسعت میں کافی اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۲۳ء میں کمپنی نے سلطان جوہور سے ایک کارخانہ قائم کرنے کیلئے سنگاپور کے علاقہ میں ایک قطعہ زمین حاصل کیا جس کی قیمت (۱۲½) ہزار پونڈ دی گئی اور جس کا سالانہ کرایہ (۵) ہزار پونڈ تھا۔ چونکہ یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاروبار میں شامل تھا اس لئے سنہ ۱۸۲۶ء میں اس کو ہندوستان کی حکومت کیساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں اس علاقہ کا صدر مقام سنگاپور کو بنایا گیا۔ جو ایک نوآبادی تھی۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں اس علاقہ کا تعلق حکومت ہند سے دفتر نوآبادیات کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد برطانوی سلطنت کے رسل و رسائل کے وسیع سلسلہ میں رفتہ رفتہ یہ ایک دفاعی مورچہ بن گیا۔ اور اس کے استحکامات میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔

جغرافیائی لحاظ سے سنگاپور کا محلِ وقوع اس قسم کا ہے کہ حکومت برطانیہ اگر اس بندرگاہ کو سرتاسر قلعہ بندیوں سے مستحکم نہ کرتی تو فرانس کے انہدام کے بعد وہ ایک دن بھی اس پر قابض نہ رہ سکتی۔ چنانچہ سنگاپور کی حفاظت کے لئے جہازوں کا ایک جنگی بیڑہ اور متعدد تباہ کن کشتیاں اور ساحلی توپیں اور مشین گنیں اور بم پھینکنے والے زبردست طیارے مہیا کئے گئے تھے۔ یہاں بڑی بڑی طیارہ شکن توپوں کا انتظام کیا گیا تاکہ سنگاپور ہر طرح کے حملے اور ہر طرح کی مزاحمت سے محفوظ رہے۔ بحرِ اوقیانوس میں نیوزی لینڈ کی حفاظت کیلئے آسٹریلیا کی حفاظت کیلئے اور ہندوستان اور برما اور سیلون اور جزیرہ نمائے ملکا کے دفاعی انتظامات اور حفاظت کیلئے سنگاپور پر اس تمام فوجی ساز و سامان کا ہونا

ضروری تھا۔

جزیرہ نمائے ملکا پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا رقبہ پانچسو مربع میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اور وسعت کے لحاظ سے یہ جزیرہ گرد و نواح کے مقامات میں سب سے زیادہ زرخیز ہے۔ اس جگہ کی آبادی کے لحاظ سے یہاں کی درآمد بہت زیادہ ہے۔ صرف ۱۹۳۵ء میں اس جزیرہ کی ربڑ وغیرہ کی سالانہ برآمد بقدر ساٹھ لاکھ روپیہ کے تھی۔ سال بھر میں اس جزیرہ نما کی برآمد و درآمد کے مال کی کل میزان چالیس ملین روپیہ تک ہوتی ہے۔ اگر اس کا ہم ہندوستان اور ہانگ کانگ کی درآمد و برآمد کے ساتھ مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی (۸۰) ملین روپیہ کی اور ہانگ کانگ کی (۵۵) ملین روپیہ کی درآمد برآمد ہے۔ اس سے واضح ہو جائیگا کہ تجارتی حیثیت سے یہ مقام کتنا اہم ہے۔

اس مقبوضہ کی آبادی کا حال یہ ہے کہ سنہ ۱۸۲۰ء میں چین کے پانچسو آدمی سنگاپور میں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے یہاں آکر آباد ہو جانے سے ہر سمت کے لوگ اس آبادی کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اور اس کی رونق رفتہ رفتہ بڑھنے لگی یہاں تک کہ آج سنگاپور کی آبادی (۵) لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اور ان میں پنجابی چینی، جاپانی، عرب، فرانسیسی، روسی، جرمن، ہالینڈ کے رہنے والے اور ہندوستان کے سکھ سب ہی موجود ہیں۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں اس آبادی میں (۵۲) ہزار ہندوستانی موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر مزدور اور تجار ہیں۔ ان کے علاوہ یورپ کے دیگر مختلف ممالک کے دس ہزار آدمی بھی آباد ہیں۔ مختلف قوموں کی یہ ترنج میل بستی ہے۔ جسمیں مندروں کی کلغیوں کے ساتھ مسجدوں کے مینارے سر بفلک نظر آتے ہیں۔ اور کلیسا کے گھنٹوں کی آواز میں چینی عبادت گاہوں کی گھنٹیاں بیک وقت اپنی آواز ملایا کرتی ہیں۔ مشرق و مغرب اور کالے سفید اور زرد کا سنگم برطانوی سلطنت کی اس ہمہ گیری کا آئینہ دار ہے۔ جس کی وسعت میں ایشیا کے ڈانڈے یورپ سے مل گئے ہیں اور مشرقی سمندروں کا پانی مغربی سمندروں کے پانی سے ٹکرا رہا ہے۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہو کر سنہ ۱۹۲۱ء میں حکومت برطانیہ نے سنگاپور کو اپنا مشرقی نقطۂ دفاع قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ برطانیہ کی بحری فوج کا ایک حصہ سنگاپور کی حفاظت کیلئے وقف کر دیا گیا۔ اور کابینہ نے سنگاپور کے استحکامات کے متعلق ایک تجویز پیش کی اور یہ تجویز فوراً منظور ہو کر نافذ ہو گئی۔ اور سنگاپور میں ہوائی مستقر قائم کر دیا گیا۔

اس سال سنگاپور میں مختلف معدنیات کھودنے کیلئے کانیں دریافت ہوئیں اور ان کانوں کی وجہ سے باہر کے لوگوں کی آمد کا سلسلہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ سنگاپور کی شہرت نے بھی غیر معمولی ترقی کر لی۔ سنگاپور اور انگلستان کے مابین آٹھ ہزار میل کا فاصلہ ہے اور بحیرۂ روم کے مشرقی دہانے سے سنگاپور پانچہزار ایک سو بیاسی میل دور ہے۔ ہندوستان اور سنگاپور کے مابین ایک ہزار پانچسو میل کا فاصلہ ہے۔ سنگاپور اور شانگھائی میں یکہزار دو سو چالیس میل سے زیادہ اور سنگاپور اور آسٹریلیا میں دو ہزار میل سے زیادہ مسافت ہے۔

برطانیہ کا یہ مشرقی چوکیدار جس قدر زیادہ مستحکم ہوتا گیا اسی قدر زیادہ وہ جاپان کا مرکز نظر بنتا گیا۔ ایشیا میں جاپانی استعمار کے منصوبے برطانیہ یا امریکہ کی چوکیداری کو گوارا نہیں کر سکتے اور ایک دفعہ سے زیادہ ایسا نازک وقت آچکا ہے۔ جب کہ یہ اندیشہ تھا کہ جاپان اور برطانیہ کی رقابت جنگ وجدال کا رنگ اختیار کریگی۔ لیکن چند سال ہوئے برطانیہ اور جاپان کا ایک معاہدہ ہو جانے کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ اب کچھ عرصہ کیلئے مشرق و مغرب کی ان دو قوتوں کا تصادم نہ ہوگا۔ لیکن چین کے خلاف جاپان کی جارحانہ زبردستیوں نے برطانیہ سے اس کے تعلقات کو پھر خراب کر دیا اور جاپان کے بحری جہاز سنگاپور کے سامنے اپنی بحری طاقت کے مظاہرے کرتے ہوئے دیکھے جانے لگے۔ چنانچہ مشرق بعید کا یہ جبرالٹر پھر کسی دشمن کی ٹکر کیلئے تیار ہوتا رہا۔ یہ صورت حال اور بھی زیادہ نازک اس لئے ہو گئی کہ جاپان اور محوری دول کے تازہ معاہدہ نے بحر پیسفک کے ساحل پر امریکہ کو اور بحر ہند کے کنارے پر برطانیہ کو خطرہ کے قریب سے آگاہ کر دیا۔ جس طرح طارق کی چٹان سے بحر روم کی طوفانی موجیں ٹکرا رہی تھیں اسی طرح جاپان کی فوجی آمریت کے عزائم کا ایک طوفان سنگاپور کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ اور بالآخر اُسے لے ڈوبا۔

مرزا ارشاد بیگ

آج کا انسان اور ماحول کی جدوجہد

آج کا انسان دیکھتا ہے کہ دنیا کا نظام اس کی زندگی کو نظر انداز کرتا اور کچلتا ہوا چل رہا ہے -

—— حالات اس کی زندگی کی تمناؤں، خواہشوں اور خلقی بلندیوں (جو علم و اکتشاف و ترقی اور اقدار کیلئے بیچین ہیں) سے بغاوت کرتے ہیں۔ نام نہاد سیج جسکی وہ عزت اور احترام کرتا تھا۔ زندگی کی مشکلات میں رتی بھر کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ مصائب اور اذیتیں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ اپنے دور میں خود کو تنہا پاتا ہے۔ اور موجودہ نظام کا کھوکھلا پن اس پر پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔

—— اس کے پاس کوئی نصب العین نہیں ہے۔ اس کے لمحاتِ زندگی پر تعطل چھایا ہوا ہے۔ اس کے پرانے شعور اور ارتقائی ذہن و احساسات میں کشمکش ہے۔ آج کے حالات اور اس کے اپنے ارتقائی دل و دماغ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ خود گویا پرانا شعور ہے۔ اس طرح آج انسان کے دو (Ideas) ہیں ایک پرانے شعور پر مبنی۔ اور دوسرا ارتقائی محرکات کا حامل۔ انسان خود بھی اپنے حقیقی ارتقائی Ideas کا ہمنوا ہیں ——

آج تمام دنیا کے انسان یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ جہاں تک ان کی حقیقی آرزوؤں اور خواہشوں کا تعلق ہے۔ وہ یکساں قابلِ توجہ ہیں۔ محبت۔ خاندانی زندگی۔ کاروبار۔ علم و انکشافات اور ترقی کی نئی راہیں۔ غذا، سکون اور آرام۔ حفاظت اور امن و چین کی زندگی۔ جذبات اور احساسات اور اقدار سے متعلق حس یہ سب تشنہ اور گرسنہ ہیں۔ انسان کائنات کے اس شور و غوغا میں اس طرح جھلایا ہوا کھڑا ہے۔ جیسے موجودہ وحشی اور بربری نظامِ عالم نے اس کے عزیز ترین اور لطیف ترین جذبات کے منہ پر تھپڑ رسید کیا ہو۔ اور وہ غیرت و خودداری سے غیظ و غضب میں تڑپ کر یہ سوچ رہا ہو۔ کہ اس بے معنی وحشی نظام کی دھجیوں کو بھی آگ لگا دے۔ اور ان کی خاک تک کو نہ رہنے دے۔ آج کا انسان گویا کہہ رہا ہے۔ خدا کی قسم۔ اس نظام کے سایہ میں جتنی ناانصافیاں مجھ پر ہوئیں۔ اور جو ظلم اور دکھ میں نے سہے۔ وہ آدم کی اولاد نے کبھی نہ سہے ہوں گے۔ میرے دل و دماغ کی گہرائیاں آج وہ دہ چرکے اور ناسور اپنے اندر روپوش اور نہاں پاتی ہیں۔ جنھوں نے مجھ پر آشکارا کر دیا ہے کہ اس ماحول میں ایک حساس اور خوددار انسان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ اس دنیا کو سلام کرے۔ اور کہے۔ اے خدا میں تیری دنیا سے بھر پایا۔ تیری کائنات میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تیری دی ہوئی روح اس کائنات میں سسکتی ہوئی کس مپرسی کیساتھ بھٹک رہی ہے۔ آہ کیا طرفہ نیرنگی ہے۔ اس کے جذبات کا اس رنگ و بو کے عالم میں کوئی مول نہیں۔ اس کے درد کا کوئی شناسا نہیں۔ آہ کیسی رقت انگیز بے بسی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے۔ وہ جان رہا ہے۔ وہ محسوس کر رہا ہے۔ اس پر ظلم ہو رہا ہے۔ ناانصافی کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اُسے کچلا جا رہا ہے لیکن وہ خود کو بے دست و پا پاتا ہے۔ اے انسان آج تجھے کس نے مفلوج کر دیا۔ تیری قوت پرواز اور جرأت کس نے سلب کر لی...... یہ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ کہ انسان کے شعورِ کہنہ نے اسے مجروح اور بے بس کر کے پھینکدیا ہے۔ یہ ہار پرانے شعور کی ہار ہے۔ اور یہ بے بسی پرانے شعور کی بے بسی۔ اے انسانِ نو۔ مژدہ۔ کہ تو ازل سے اپنی سرشت میں بے بس نہیں ہے—— تاریخ کے اوراق میں تیرے شعورِ کہنہ کی شکست کے ذکر تو ہیں۔ لیکن انسان کی شکست سے قادرِ مطلق نے اپنی کائنات کو کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔

میرا دل زار زار رو رہا تھا۔ اے خدا تو نے اپنے سچے بندوں کو یوں کیوں کچل ڈالا ہے۔ کیا اُن کی بے بسی تیری بے بسی نہیں —— میں ناواقف تھا۔ کہ یہ

بے بسی روایاتی خدا کی بے بسی ہے ۔ اور یہ شکست دنیا کے بیکار اور تصوری خدا کی شکست ۔ دنیا کی جدوجہد بیکار خداؤں کے تصور کی شکست اور پائمالی سے خون آلود ہے ۔ لیکن لاریب حقیقی قادرِ مطلق دنیا اور انسان کی ہر حرکت اور عمل میں نئے انسان کے روپ میں بڑھتا آیا ہے ۔ عرب کے بُت پرستوں کے بُت بھی تو خدا ہی تھے ۔ کیا اُن کی ہار کو ہم نے خدا کی ہار کہا ۔ کیا ہے ۔ اگر دُنیا آج مذہب کے بیکار خدا کی شکست کو خدا کی شکست کہتی ہے ۔ کیا ہے ۔ اگر انسان آج اپنے تصوری خدا کو کوستا ہے ۔ قادرِ مطلق تو نئے انسان کے روپ میں اپنی جیت پر مسکرا رہا ہے ۔ اگر پہلے اس نے بت پرستوں کو شکست دی تھی ۔ تو آج وہ تصور اور وہم پرستوں کو شکست دے رہا تھا ۔ اگر کل اُس نے مٹی کے سینکڑوں یا ہزاروں خداؤں کو مٹا کر اپنا قدم بڑھایا تھا ۔ تو آج اپنے حریف بیکار روایاتی خدا کو مٹا کر اپنی برکتیں لئے نئے انسان کے واسطے منتظر ہے ۔

آج انسان اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں کا اطمینان چاہتا ہے ۔ آج انسان حیوانی زندگی ۔ مذہب کی رسمی زندگی ۔ خاموش اعتقاد ۔ اور وطن کے فرض کی تباہ کُن زندگی کے بجائے اپنے فطری حواس اور احساسات کی ۔ اپنی ارتقائی قوتوں اور حقیقی تمناؤں کی زندگی کے لئے یکساں مضطرب ہے ۔ آج ارتقائی ذہن اور [illegible] کی قوتیں اپنے بلند ترین مدارج پر منقسم ہیں ۔ آج انسان کا پہلا شعور بیحد کنگال ہے ۔ لیکن اس کا ارتقائی ذہن ہمارے تصور کی رسائی سے زیادہ مالا مال ...... آج انسان کا شعور بیحد نسلوں ۔ قوموں اور مذاہب میں بٹا ہوا ہے ۔ لیکن اس کی تحت الشعوری [illegible] یگانگت اور یک جہتی کے ناقابلِ تقسیم سلسلہ میں منسلک ہو چکی ہے ۔ آج ہمارا پہلا شعور تار تار اور تباہ حال ہے ۔ مایوس اور نا اُمید ۔ تاریکی میں لپٹا ہوا اور بے بس و بے کس ... ۔ نیا شعور اپنی [illegible] اور ناقابلِ تسخیر قوتیں لئے نئے انسان کی صورت میں ان گنت روشنیاں ۔ امیدیں اور آشائیں توتیں اور طاقتیں لئے کھڑا ہے ۔ اے تباہ حال اور حرماں نصیب انسان احساس کی قوت تجھ میں مردہ ہو چکی ہے ۔ اس لئے کہ بے شمار تباہیاں اور بربادیاں تیرے گرد منڈلا رہی ہیں ۔ اور اس طرح منڈلا رہی ہیں ۔ کہ تو ادھل ارتقائی قوتوں کا یقین تک کرنے کو تیار نہیں ۔ اس لئے کہ تیرے شعور کم ہونے بجھے تہی دامنی اور بربادی ہی دی ہے ۔ اور تو ایک بلند ترین زندگی کے خیال کو ایک خواب دل خوش کُن سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں ہے ۔

بقیہ مضمون صفحہ (۲۰)

وہ جمہوریت کی ایک نئی تشکیل کیلئے ہر گوشہ میں آمریت کے برباد کرنے کے ہر امکان کیلئے ہر قیمت ادا کرنے پر آمادہ ہیں ـــــ ان کی نظر میں یہ آنیوالا زمانہ کوئی ایسا زمانہ نہیں جن کو افراد کی عمروں سے ناپا جائے ۔ یہ قوموں کی اجتماعی عمروں ہی کے طول سے ناپا جا سکتا ہے ۔ پس اس عظیم الشان تصور میں اس آنیوالے زمانہ کا انتظار کیجئے ۔ جب انصاف اور مساوات اور امن کی سیاسی اصطلاحات کا ایک بہتر اور زیادہ استوار اخلاقی معیار پیدا ہوگا ۔ اور جنگ کے عالم سوز شعلوں میں جو دنیا برباد ہو گئی وہ بارہ دگر آباد ہو گی ۔ ـــــ یہ لوگ جن تصورات کا دامن پکڑے ہوئے ہیں اُن کی وسعت ۔ ارادہ اور آرزو کی اس حد پر ختم ہوتی ہے ۔ جہاں شاعر نے کہا تھا کہ :۔

گو مشت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد

سید محمد تقی

ادب اور اس کے نئے تقاضے

اس عہد میں جس سے ہم گذر رہے ہیں، ایک تہذیب شکست ہو رہی ہے۔ اور دوسری نئی دنیا اس کی جگہ حاصل کر رہی ہے۔ یہ چیز کس قدر تعجب انگیز ہے کہ جو کچھ گذرنا چاہتا ہے اور جو کچھ آرہا ہے۔ اُسے بجا طور پر نہیں سمجھا گیا۔ ہم جو کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں اس کی تنقید کر سکتے ہیں، ایک تھکا ہوا دماغ کسی طرح نہیں سمجھ سکتا کہ عہد جوانی میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔

فنِ مصوری کے نئے تقاضے ان لوگوں کے لئے پریشان کن ہیں جنھوں نے ان حیاتیاتی اسباب کی موجودگی پر کبھی شک نہیں کیا۔ جو بڑے بڑے سامراجوں کی تباہی اور نئی شہنشاہیتوں کے احیاء کا باعث ہوئے۔ جو لوگ اپنے اردگرد کی بدلتی ہوئی دنیا کو ایک ایسا وقتی حادثہ سمجھتے ہیں جو کسی بنیادی تبدیلی کو پیدا کئے بغیر گذر جائیگا، وہ ابدی تحفظ پر کامل یقین کئے ہوئے ہیں"

(البرٹ گلیزز)

فرانس کے مشہور فن کار اور عہدِ جدید کے قابل نقاد البرٹ گلیزز کی یہ رائے نئے ادب اور اس کے اسباب پر بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جو لوگ حیاتیاتی اسباب اور ان کے فعل و ردِ فعل کو تسلیم نہیں کرتے اور جو ہمارے سماج کو محض جامد گمان کرتے ہیں ان کے نزدیک جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ ہونیوالا ہے وہ محض ایک تخیلاتی چیز ہے جو سماج کی گہری بنیادوں پر اثر کئے بغیر گذر جائیگی مگر جن لوگوں کے نزدیک سماج نام ہے اقتصادی اسباب کے اس مجموعی اثر کا جو صدیوں کی پیہم کوششوں کے نتیجہ کے طور پر ظاہر ہوا ہے وہ نئے حالات کے ضروری تقاضات کا اندازہ لگاتے ہیں:

ادب کے متعلق قدیم نقطۂ نظر رکھنے والا گروہ یا وہ گروہ جو ادب برائے ادب کا قائل ہے، ادب اور سماج کو ایک ناقابلِ تغیّر وجود تسلیم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حیاتیاتی اسباب یا اقتصادی اقدار کوئی اہمیت نہیں رکھتیں وہ ان اسباب سے آنکھیں بند کئے ہوئے محدود ترین حلقہ میں غور کرنیکا عادی ہے۔ لیکن ادب کو بدلنے والے سماج کا نقیب سمجھنے والے "ادب برائے زندگی" کے نظریہ پر عقیدہ رکھتے ہیں:

ادب برائے زندگی

نئے مصنفین نے ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کے موضوع پر کافی بحثیں کی ہیں۔ لیکن چند مستثنیات کو چھوڑ کر اس واقعہ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ابھی تک ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی، کا مفہوم کامل طور پر واضح نہیں ہوا۔ بعض لوگ ادب برائے زندگی اس ادب کو سمجھتے ہیں، جو انقلاب، مزدور، سماج، سرمایہ داری، جاگیرداری کی نئی اصطلاحوں پر مشتمل ہے۔ اور ادب برائے ادب، ان حضرات نے اس ادب کا نام رکھا ہے جو حسن و عشق، رنگ، نغمہ، موسیقی شراب و کباب جیسے نشاطی موضوعات کو عنوانِ نثر و نظم بنائے ہوئے ہے لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ اگر ادب برائے زندگی صرف چند اشتراکی اصطلاحوں کا نام قرار دیدیا جائیگا تو میکسم گورکی، پشکن، کراپٹکین، ماداَم رولان، برنارڈ شا اور اسی قسم کے چند اور حقیقت پسند اہلِ قلم کو چھوڑ کر ہمیں تمام دوسرے ادیبوں کو صرف ادب برائے ادب، کا نقیب ماننا پڑے گا۔

ایشیا مارچ ۱۹۴۳ء

حقیقتاً ادب برائے ادب بذاتہ کوئی چیز نہیں ہے، ادب ہمیشہ انسانی سماج کے کسی نہ کسی پہلو کا پرتو رہا ہے۔ وہ کبھی ہماری سوسائٹی کے مابعد الطبیعاتی رجحانات کی تشریح کرتا تھا۔ لیکن اب ان انقلابی عناصر کی تعبیر کرنیکی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ جو نئے سماج کو متاثر کر رہے ہیں۔

یہ مابعد الطبیعاتی عناصر عہدِ جاگیرداری کی ممتاز خصوصیت تھے۔ اس عہد میں ادب چند فارغ البال انسانوں کی دماغی تفریح کا ایک ذریعہ تھا۔ ان لوگوں کو اپنے عجوبہ پسند روحانی اور غیر حقیقی تصوّرات کیلئے غذا کی ضرورت تھی۔ ادب اس ضرورت کو پورا کرتا تھا، تاہم اس دور میں بھی ادب کو کبھی کبھی زندہ حقیقتوں پر بحث کرنے کیلئے مجبور ہونا پڑا۔ ہرچند کہ ان حقائق کے اظہار کا کوئی منطقی پس منظر نہیں تھا۔ یعنی ماحولی اثرات اس قدر چھائے ہوئے تھے کہ ان اثرات کے جال سے ذہنِ انسانی کے لئے فرار ناممکن ہو گیا تھا۔

جاگیرداری عہد کا ادب، زندگی کے دبے ہوئے گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر یہ نہیں بتاتا تھا کہ وہ دبے ہوئے کیوں ہیں؟ اور ہر جبرِ زندگی کو مقدرات سے تعبیر کر کے آگے بڑھ جاتا تھا۔

۲۶

زندگی

بحث طلب امر یہ ہے کہ زندگی سے ہم کیا مراد لیتے ہیں، اگر زندگی ایک فرد اور اُس کی محدود اقتصادی ضروریات کا نام ہے تو بلاشبہ ادب برائے زندگی بھی اسی ادب کا نام ہو کر رہ جائیگی جو ہمیں یہ بتائے کہ معاش حاصل کرنے کے ذرائع کیا ہیں۔ اور اگر زندگی نام ہے سوسائٹی اور اس کی تمام تر ضروریات اور تمام رجحانات کا اور اگر معاشرہ و کائنات کے مختلف اثرات کے باہمی روابط، عمومی حیاتیاتی اسباب وغیرہ کا بھی اس سے تعلق ہے تو ادب برائے زندگی بھی اس ادب کا نام ہوگا جس کے دائرہ میں یہ تمام وسیع دنیا آجاتی ہے ؛

پرانی دنیا میں (جو جاگیرداری عہد کیساتھ ختم ہو گئی) اقتصادی اسباب مجموعی سوسائٹی نہ بنا سکے۔ گو مذاہب نے قبل از وقت اجتماعی تصوّر پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس ارادہ میں بُری طرح ناکامی ہوئی۔ سماج اور اس کے اقتصادی ذرائع اس قدر محدود تھے کہ وہ کسی عظیم مجموعی سماج کا بار برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے سوسائٹی مجبوراً چند بے تعلق ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ البتہ مذہب نے اتنا ضرور کیا کہ اُن کے مابعد الطبیعاتی تصوّرات کو اسلام، عیسائیت، یہودیت۔

ایشیا مارچ ۱۹۴۳ء

ہندوئیت اور بُدھ مت جیسے بڑے بڑے ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ لیکن جہاں ان روحانی تصوّرات کا مقابلہ سماج اور اُس کے اقتصادی حیاتیاتی اسباب سے ہوا۔ ان کو اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی۔

ایران نے اسلام کی وہ تشریح کی جو عرب سے بالکل مختلف تھی۔ بدھ مت چین میں جا کر کنفیوشس کے قومی تصوّرات سے اتنا متاثر ہوا کہ ہندوستانی بدھ ازم اس کے مقابلے میں ایک دوسری چیز نظر آنے لگا۔ ان خارجی تصوّرات نے سماج کی ساخت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ مختلف سوسائٹیوں اور مختلف ماحولات نے ان رومانوں کو اسی قدر قبول کیا جس قدر وہ ان کے اپنے تصورات سے مطابق ہوئے۔

ان مذاہب کی ناکامی کے بعد صرف اقتصادی اسباب ہی سماج کی بناوٹ کے ذمّہ دار تھے۔ لیکن یہ سخت غیر منظّم اور منتشر تھے۔ اُن کی بنیادوں پر انسانی اجتماعیت کسی بڑے حلقہ تک وسیع نہیں ہو سکتی تھی۔ اور سماج پر انفرادیت کا دباؤ تھا۔ انفرادیت ہی کا یہ اثر تھا کہ اس دور میں، رومانی شاعری جو خدا، فرشتوں، روحانی چیزوں اور حُسن و محبت جیسے مسئلوں پر بحث کرتی تھی، کافی اثر رکھتی تھی۔ تاہم اس عہد کے ادب کو بھی ادب برائے ادب کے ذیل شمار نہیں کیا جا سکتا، یہ چیزیں بھی ایک عہد کے انسانی احساسات کا پرتو ہیں۔ البتہ ہم اپنی ضروریات کے پیشِ نظر پرانے ادب پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اس نے ضروری و غیر ضروری میں فرق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہرچند کہ زندگی میں رومان کا ایک درجہ ہے۔ مگر سماج کی بنیادی ضرورت، اس کے اقتصادی اسباب کی اہمیت ہے۔ زندگی پہلے زندہ رہنے کیلئے مجبور ہے۔ سوچنا اور خواہش کرنا، بعد کی منزلیں ہیں۔ لیکن پرانے ادب نے محض سوچنے اور محض خواہش کرنے کو پہلا درجہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ داخلیت پُرانی شاعری کا خاص عنصر تھی۔

اگر سماج نام ہے افراد کی اس کثیر تعداد کا جو وسیع معاشی ذرائع کو چلا کر ہماری دنیا کو آگے بڑھا رہی ہے تو ادب جو حاضر سماج کا پرتو ہے اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان ضروریات کو واضح کرے۔ اگر آج کا ادب رومانی تصوّرات کی تسکین کرنے پر قناعت کر لیتا ہے تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آج سے کئی صدی پیچھے لوٹ کر جاگیرداری عہد کے ادب کی نقّالی کرتا ہے۔ وہ سماج کے اعلیٰ طبقے کے افراد کی رومانی خواہشوں کو پورا کرتا ہے۔ اور سماج کے نچلے طبقوں کی نمائندگی نہیں کرتا۔ حالانکہ آج ایک مجموعی سماج کی تعمیر و تشکیل کا آغاز ہو چکا ہے۔ اور وہ آنکھیں جنہیں دیکھنے کی قوت حاصل ہے، زندگی کے ان گوشوں کو نظر انداز نہیں

کرسکتیں۔ جن پر آج تک نظر نہیں پڑی تھی۔ یا جو کم نگہی کا دیدہ و دانستہ شکار رہے۔

بلاشبہ وہ وقت آئیگا جب موجودہ سماج ان اقتصادی مشکلات کا حل تلاش کرلیگا اور اُسے موقع ملے گا کہ وہ رومانی دنیا پر بحث کرے۔ وہ پرکھے کہ خدا، عشق، رہبانیت اور رُوحانی احساسات کیا قیمت رکھتے ہیں۔ اور منطقی دنیا میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ لیکن ابھی یہ وقت بہت دور ہے۔ آج ہم محض اُن موضوعات پر غور کرنے کیلئے وقت نہیں نکال سکتے۔ آج ادب میں رومانیت کا صرف اس قدر درجہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہمارے صنفی احساسات کا ترجمان ہے اور بس۔

عہدِ سرمایہ داری

سرمایہ داری عہد میں اوسط طبقے کو کافی اقتدار حاصل تھا۔ یہ نچلے طبقوں کے لاکھوں انسانوں پر حکومت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ادب کو صنفی احساسات ومطالبات کی تکمیل کا ذریعہ بنا دیا۔ انیسویں صدی کے شروع میں رومانی ادب کا بول بالا تھا۔ شیلی، بائرن، کیٹس، اور ورڈز ورتھ یورپ میں اور ہندوستان میں سنہ ۱۹ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۵ء تک کے تمام ادبا و شعرا اسی سماجی رجحان کو ظاہر کرتے تھے۔ ادب کا یہ دور بھی ادب برائے ادب کے تحت نہیں آتا۔ اسلئے کہ سرمایہ داری دور کی ابتدا میں اقتصادی و معاشی اسباب نے کوئی مستقل سانچہ اختیار نہیں کیا تھا۔ کہ نچلے طبقہ کے افراد سماج کی ساخت میں کوئی انقلاب لا سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب یہ تھا کہ سماج اسوقت نام تھا چند افراد کے مجموعہ کا، اسے نچلے طبقوں کے لاکھوں اور کروروں انسانوں کے تاثرات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ انسانوں کی یہ کثیر تعداد سماج پر اپنا حق جتانے کیلئے کوئی اقدام کرسکتی تھی۔ اور کبھی اس قسم کی کوئی کوشش کی بھی گئی تو وہ کوشش بُری طرح ناکام ہوگئی۔

پُرانی دنیا میں سماج کے اس انفرادی تخیّل کی وجہ سے ادب چند افراد کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا، اور یہ افراد اقتصادی طور پر قطعی مطمئن تھے، وہ اپنی غیر مادّی خواہشوں کی تکمیل چاہتے تھے۔ لیکن اب صورت حال قطعی مختلف ہے آج کا سماج اجتماعی بندھنوں میں اسیر ہے۔ ان حالات سے ادب کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے، یہ حالات معاشرتی و معاشی نظام کی تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔ جن کا پرتو اپنے پورے کمال کیساتھ زندگی پر پڑ رہا ہے؛

اُس دور کا ادب اوسط طبقے کا ادب ہے۔ اور وہ انھیں کے میلانات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس زمانہ میں شعروادب پر اعلیٰ اور اوسط طبقے کی اجارہ داری اس حد تک بڑھ گئی۔ کہ جین کاکیٹن نے یہاں تک کہہ دیا کہ:-

"عوامی شعروادب کا وجود ہی نہیں پایا جاتا"

کاکیٹن کا یہ خیال غلط نہیں ہے یہ واقعہ ہے کہ جاگیرداری عہد میں عوامی ادب ایک بے معنی اصطلاح تھی لیکن بیسویں صدی میں حالات نے ایک شاندار تبدیلی پیدا کی۔ اب انسانی شعور میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اور اجتماعیت کا احساس بیدار ہوگیا ہے۔ آج اگر سماج کا کوئی حصہ اقتصادی مشکلات کا شکار رہے تو سوسائٹی اطمینان کی زندگی بسر نہیں کرسکتی۔ چنانچہ آج سماج ہر گھڑی تباہی و بربادی کے کنارے لرز رہا ہے۔ اور وہ اتنے سخت ہچکولے کھا رہا ہے۔ کہ سوسائٹی کا کوئی بھی طبقہ واقعات سے بے توجہ ہوکر نہیں رہ سکتا، اب شاعری کو عوام کی شاعری ہوکر ترقی کرنی ہوگی۔ ورنہ وہ ختم ہوجائیگی۔ ٹالسٹائی نے اپنے مشہور نظریہ "حسن کاری" میں اس امر پر انقلابی حیثیت سے زور دیا ہے کہ ادب و شاعری کو عام فہم ہونا چاہیئے اور انسانیت کے کم سواد اور کثیر حصّہ کو فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اس زمانہ میں ادب کا محض رومانیت میں مبتلا رہنا قطعی غیر منطقی ہے۔

رومانیت تو آج تک صرف اوسط طبقات کے ذہنی رجحانات کو ظاہر کرتی
رہی ہے۔ نچلے طبقے تو سخت اقتصادی دباؤ، اور تعلیمی وجمالیاتی احساس کی کم شعوری ۲۷
کی وجہ سے رومان کو رومان کی طرح محسوس بھی نہیں کرسکتے؛ یا اگر کبھی رومانیت کا پرتو ان پر پڑتا بھی ہے تو ان کا رومان اقتصادی زنجیروں میں الجھ کر رہ جاتا ہے؛ اس لئے اگر آج کا سرمایۂ ادب فقط رومانیت کو قرار دیا جائیگا تو ادب تمام طبقات کی نمائندگی کرنے میں قطعی ناکام رہیگا؛

بلاشبہ، جب تک انسانی زندگی میں صنفی رجحانات موجود ہیں، رومان اک حقیقت ہے۔ اور ہم مسائل کے خشک عناصر کو محسوس کرنے کے باوجود اس کے اثر سے انکار نہیں کرسکتے۔ پھر غلط یا صحیح اوسط اور اعلیٰ طبقہ بہرحال ہمارے سماج کے حصّہ ہیں۔ اس لئے ادب کا فرض ہے کہ وہ اُن کے حسّیات و میلانات کی ترجمانی بھی کرے اور ہر ترجمان کے سچے دعویدار کو ان نفسیاتی رشتوں کو نہیں توڑنا چاہیئے۔ جو رومانی دنیا سے الگ ہوکر تخیّل اور حقیقت کو جوڑتے ہیں۔

جہاں تک زندگی کے کاہل عناصر کا تعلق ہے۔ وہ سماج سے رفتہ رفتہ مٹتے اور ہٹتے جائیں گے۔ اور ادب میں اُن کی نمائندگی خود بخود مدّہم پڑتی جائیگی، آگے چل کر وقت خود مطالبہ کریگا۔ کہ ادب کی حدود سے اُن طبقوں کے احساسات کو فنا کردیا جائے۔ اس وقت ادب ایک نئے اور شاندار راستہ میں قدم رکھیگا۔

ادب پر جب اس حیثیت سے غور کیا جائے۔ کہ وہ بہرحال سماج کے کسی نہ کسی طبقے کے ذہنی میلانات کی تشریح کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ سوسائٹی نے کسی مخصوص عہد میں سوچنے کی کتنی مخصوص لائنیں پیدا کی تھیں۔ تو ہمیں اسکو من حیث المجموع ادب برائے زندگی کی صنف میں لانا پڑے گا۔ مگر جاگیرداری عہد کا ادب عام طور پر خیالی حقیقتوں کو زیرِ بحث لاتا تھا۔ اس لئے اس کے اس مخصوص رجحان کو جو بلا شک محدود ہے۔ ادب برائے ادب کی صنف میں شمار کرنا لازمی ہے؛

یہ ادب، محاسنِ الفاظ، جدّتِ کلام، دروبست، بندشِ الفاظ کی ہم آہنگی اور موسیقی پر زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کی سچی حقیقتوں سے بحث کرنا کوئی ضروری فریضہ نہیں۔ وہ کبھی کبھی کائنات کے اُلجھنوں کی تشریح کرنا چاہتا ہے۔ مگر سبب اور اسباب کی پیچیدہ کڑیوں میں پھنس کر مجبوراً تخیلاتی دنیا میں بھٹکنے لگتا ہے۔ عبوری دوروں کا تمام ادب انھیں ناکام کوششوں کی ایک طویل داستان ہے۔

حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع

ہمارے عہد کی ادبی کشمکش سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی
ذریعوں نے پرانے سماج پر کتنے غیر متوازن اثرات ڈالے۔ کبھی حیاتیاتی اسباب افراد کو ۲۸
سماج کے معیار سے آگے لیجانے کا باعث ہوتے تھے۔ اور کبھی اقتصادی ذریعے سماج کو افراد کے معیّنہ ارتقائے ذہنی سے صدیوں دور لیجانیکی کوشش کرتے تھے!

حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع کے اسی عدم توازن یا افراد اور جماعت کی اسی غیر متناسب ذہنی ترقی، باہمی نعصیت اور انفعالیت نے غیر مادّی فلسفہ کو پیدا کیا۔ اور پروان چڑھایا۔ کبھی ایک شاعر و فلسفی اپنے عہد کے فکری خطوط سے کئی صدی آگے بڑھ کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن جہاں تک اس کے عہد کا سماج آچکا ہے۔ اسی قدر اُس کے خیالات میں حقیقت پسندی ہوتی تھی۔ لیکن اس عہد کے عام معیار سے جس قدر وہ آگے کی طرف پرواز کرتا تھا۔ اُس کے نظریوں میں خیال پسندی بڑھتی جاتی تھی؛

ارسطو، روسو اور مارکس نے مستقبل کیلئے چند حقیقی اور بنیادی خیالات پیش کئے لیکن یہ اپنے نظریوں میں اس قدر کامیاب نہیں۔ جس قدر اُن کے عہد کا عام ذہنی معیار اُن کا ساتھ دیتا ہے، جیسے ہی یہ مستقبل کی گہری اندھیاریوں میں زیادہ داخل ہونیکی کوشش کرتے ہیں۔ عقلیت اور منطق ان کا ساتھ چھوڑتی جاتی ہے۔

حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع کی بے آہنگی اتنی بڑھی ہوئی ہے

کہ اب سے ہزاروں سال پہلے ایسے بلند دماغ افراد کا وجود ملتا ہے جو اگر آج ہوتے تو ان کی ذہنی صلاحیتیں موجودہ ترقی یافتہ دماغ سے ہم آہنگ اور مسطّح ہوتیں۔ اس کے برعکس بیسویں صدی کے سماج کے کئی ٹکڑے اتنے غیر ترقی یافتہ ہیں کہ چار ہزار سال قبل کی سوسائٹی کے حصّے معلوم ہوتے ہیں!؟

درمیانی عہد کی اس ذہنی کیفیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عہدِ جاگیرداری کے مفکّر اور شاعر رجعت پسند نہیں تھے۔ ان کی نظر مستقبل پر تھی۔ مگر فکری تہیدستی کی بنا پر مجبور ہوتے تھے۔ اس مجبوری میں خیالی دنیا ہی ان کا مامن ہو سکتی تھی۔

پرانے ادب اور شاعری میں اخلاقی، صوفیانہ، اور مذہبی افکار کی کثرت بلاغت، فصاحت لفظی گورکھ دھندوں اور بندش کی چپستیوں کا وجود اسی غیر متناسب صورتِ حال کی چغلی کھاتا ہے؛

لیکن بہرحال پرانے سماج کے فکری معیاروں کا اندازہ حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع کی ہم آہنگی اور ناآہنگی کے بدلتے ہوئے تناسب کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے؛

سماج کے خالق اور نشوونما دینے والے عناصر

سماج کو اقتصادی ذرائع پیدا کرتے اور بڑھاتے ہیں یا حیاتیاتی اسباب اس کی ترقی اور نشوونما کا اصل سبب ہیں؟ یہ سوال اپنی جگہ ایک اہم سوال ہے اشتراکی ادبا کا دعویٰ ہے کہ سماج کے تمام تغیرات محض اقتصادی اسباب کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ غیر اشتراکی ادیب سماج کی تبدیلی اور تغیر کو حیاتیاتی اسباب کا نتیجہ خیال کرتے ہیں؛ بقائے اصلح کے اصول کے ماتحت سماج ارتقا حاصل کرتا ہے اور اقتصادی ذرائع سماج پر اثر کرنے میں بالکل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ سماجی ترقی کو محض انفرادی کوششوں کا مرہونِ وجود خیال کرتے ہیں؛

بلا شبہ اشتراکی ادبا کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، فقط اقتصادی ذرائع ہی سماج کی نشوونما اور ترقی کا ذریعہ نہیں، مگر اس کے ساتھ ہی غیر اشتراکی ادیبوں کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ سماج پر فقط حیاتیاتی اسباب ہی موثر ہوتے ہیں۔ بے شک یہ ایک واقعاتی چیز ہے۔ کہ حیاتیاتی اسباب سماج پر اثر ڈالنے میں اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اقتصادی ذرائع ثانوی، مگر جہاں تک سماج کو بنانے اور آگے بڑھانیکا تعلق ہے ان دونوں کی حیثیت برابر ہے۔

یہ دونوں اسباب جس قدر قریب ہوتے ہیں، اجتماعیت ترقی کرتی ہے۔

یا یوں کہیے کہ یہ جتنی تیزی سے اثر ڈالتے ہیں اسی تناسب سے یہ قریب ہوتے ہیں، عہدِ جاگیرداری میں اُن کی بے آہنگی جتنی وسیع تھی اسی قدر انفرادیت کا زور تھا، لیکن ان کی تیز تر اثر انگیزی کے نتیجے میں سرمایہ داری میں اجتماعیت پیدا ہوتی چلی گئی۔ اور آخر اجتماعی تصور انفرادیت پر غالب آگیا۔ گو یہ زمانہ اجتماعیت کے غلبہ کا زمانہ ہے تاہم اب بھی انفرادیت فیسزم اور نازی ازم کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اقتصادی اسباب نے اسے اتنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ انفرادیت کے محدود معنٰی میں اجتماعیت سے کچھ نہ کچھ مستعار کیفیت لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔ مستقبل میں انفرادیت قطعی طور پر ختم ہو جائیگی۔ اس کے فنا کے بعد حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع میں پوری ہم آہنگی پیدا ہو جائیگی۔

اقتصادی ذرائع سماج کے عقلی، فکری اور ذہنی اداروں کی ترقی کو بتاتے ہیں۔ یعنی افراد کی عقلی سطح کسی عہد کے اقتصادی ذرائع ہی ہوتے ہیں۔ لہذا ادب میں بھی واقعیت اور صداقت جو کسی عہد کے ذہنی و فکری ارتقاء کا پتہ دیتی ہے۔ اسی تناسب سے پیدا ہوتی ہے۔ جو حیاتیاتی اسباب اور اقتصادی ذرائع کی ہم آہنگی کے درمیان پایا جاتا ہے۔

جاگیرداری زمانہ میں یہ ہم آہنگی بہت کم تھی، اس لئے ادب میں واقعیت نسبتاً کم درجہ پر پائی جاتی تھی۔ مگر عہدِ سرمایہ داری میں یہ دونوں تاثیری عناصر قریب تر ہو گئے۔ اس لئے ادب میں واقعیت اور حقیقت نگاری بھی بڑھ گئی۔

ادب کی تقسیم

اگر ادب برائے زندگی کی روح واقعیت نگاری ہے تو فقط نئے ادب کو ادب برائے زندگی کی تفسیر ماننا صحیح نہ ہوگا۔ اس لئے کہ پُرانے ادب میں بھی واقعہ نگاری اور مرقع نگاری ایک اہم عنصر کی حیثیت سے تسلیم کی گئی ہے۔ قدیم ہندوستان، مصر، بابل اور عرب کی شاعری میں اس کی ان گنت مثالیں موجود ہیں۔ اسی خیال کے پیشِ نظر گارفیلڈ نئے اور پُرانے ادب کی تقسیم کو صحیح نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک قدیم و جدید ادب کی رُوح ایک ہی۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"جو شخص ادب کی حقیقی روح سمجھ سکتا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ کسی خاص دور کے ادیبوں کو نہ چنے بلکہ ادب کے سرچشمہ تک پہونچے اور اس ہلکی سی لہر کا اندازہ لگائے جو زمانے کے بہتے ہوئے دھارے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور خیال کے سمندر میں بتدریج وسیع اور گہری ہوتی جاتی ہے۔

جدید زمانے کے لوگ اسی قسم کی لہروں کی تلاش میں ہیں"

گارفیلڈ کے نزدیک ادب کی تقسیم قدیم و جدید کے لحاظ سے نہیں کی جاسکتی اس کے نزدیک ادب اک ہلکی سی لہر کا نام ہے۔ جو ہر دور میں یکساں پائی جاتی ہے یہاں سوال اٹھتا ہے کہ اگر ادب کی رُوح، واقعیت نگاری، یا ارسطو کے الفاظ میں فطرت کی نقّالی تسلیم کر لی جائے (آرٹ فطرت کی نقّالی کا نام ہے۔ آرسطو) یا افلاطون کے قول پر کہ "آرٹ چند سایوں کا نام ہے" سرِ تسلیم خم کر دیا جائے، تو اس خیالی، ذہنی، غیر حقیقی ادب کی تشریح کیا کی جائے گی، جو پُرانے زمانے کی اک ممتاز خصوصیت رہا ہے اور جس کا ہلکا سا پرتو ہم آج بھی اپنے ادب میں پاتے ہیں؟!

جہاں تک پُرانے ادب کی تخئیلت اور خالص تصوّریت کا تعلق ہے۔ اتنا ضرور صحیح ہے کہ قدیم ادب خیالی نتیجے نکالتا تھا لیکن اس کے تصورات کی کچھ استعاراتی بنیادیں تو بہرحال ضرور تھیں۔

"طلسم ہوش رُبا" کے جنوں اور بھوتوں کا پایا جانا ممکن نہ سہی۔ لیکن خوفناک انسانوں کا پایا جانا اور ان اجزار کا پایا جانا بالکل یقینی ہے۔ جن کے مجموعہ کو ایک خاص شکل میں پیش کرنے سے ان کے مجسّمہ کی تصویر ہمارے ذہن میں پھر جاتی ہے۔

حقیقتاً آرسطو کا یہ کہنا کہ آرٹ فطرت کی نقالی کا نام ہے۔ اس منطقی نظریّہ سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا سمجھتا، بولتا اور غور کرتا ہے وہ لازمی طور پر خارجی مادّی اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اور یہ کہ انسان غیر مادّی چیز کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا اور کوئی بھی خیالی چیز جہاں تک لفظ کے خیالی حقیقی معنی کا تعلق ہے۔ ذہن انسانی میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ لہذا آرٹ بھی لازماً فطرت اور اس کے تغیّرات کی ایسی نقل کا نام ہے جس سے ایک خاص جمالیاتی اثر پڑے، لیکن فطرت کی نقّالی کا یہی طرز نئے اور پُرانے آرٹ یا ادب میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس لئے یہ دو مختلف چیزیں ہو جاتی ہیں۔

نیا ادب

ادب برائے ادب۔ کی تقسیم میں اعتقاد رکھنے والے اور ادب برائے ادب کے نظریہ کو تسلیم کرنیوالوں کا بیان ہے۔ کہ ادب کی تقسیم۔ نئے اور پُرانے ادب کے دو ٹکڑوں میں نہیں کی جاسکتی۔ ادب ایک ہی ہے اور وہ ایک ہی رہنا چاہیئے۔ ان کے نزدیک گارفیلڈ کے بیان کے مطابق ادب ایک ہلکی سی لہر ہے۔

ایشیا مارچ ۱۹۴۳ء

جو زمانے کے بہتے ہوئے دریا کیساتھ بہہ رہی ہو۔

یہ سچ ہے کہ ادب ایک ہلکی سی لہر ہے۔ لیکن وہ گارفیلڈ ہی کے قول کے مطابق خیال کے سمندر میں بتدریج وسیع اور گہری بھی ہوتی جاتی ہے۔ فطرت کی نقالی یا۔ ایک ہلکی سی لہر۔ پرانے ادب کی بھی روح تھی اور نئے ادب کی بھی روح ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ نئے ادب نے فطرت کی نقالی میں زیادہ سے زیادہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ نیا ادب کوشش کرتا ہے کہ وہ نفسیات کی باریک اور نازک گہرائیوں میں اُتر جائے۔ اور فطرت کے رازاتنے اچھوتے طرز سے بیان کرے کہ ہر جذبہ، واقعہ اور واردات کی تصویر نگاہ و خیال کے سامنے کھینچ جائے۔ یہ کچھ آسان نہیں۔ فطرت کے پُرپیچ دقیق اور نازک جزئیات کا احاطہ اور انہیں اُن کے صحیح اور معینہ مقامات پر رکھ کر کامل درست اور فطری نتیجے نکالنا نہایت مشکل فریضہ ہے۔ لیکن یہی وہ فریضہ ہے جو آرٹسٹ کی امتیازی خصوصیت ہے۔

نئے اور پُرانے ادب کا ایک اہم امتیاز۔ فنکار اور غیر فن کار کے مابین ذہنی معاہدہ کی تنسیخ ہے۔ نئے ادب نے اس معاہدہ کو چاک کر دیا ہے۔

۳۰ معاہدۂ ذہنی

قدیم فنکار اپنے ادّعائے فن کاری کی بنا پر عوام سے چند مراعات کا متمنی تھا؛ وہ جانتا تھا کہ زندگی کے جن جمالیاتی گوشوں کو وہ نمایاں کر سکتا ہے عوام کی نگاہیں ان گوشوں میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ وہ امید کرتا تھا کہ اُسے اپنے آرٹ کی اساس کو ایک متصورہ اور ممکن واقعہ، شئے یا حادثہ پر قائم کرنیکی اجازت دی جائے گی؛ خواہ وہ واقعہ یا حادثہ حقیقتاً پیش نہ آیا ہو۔

ایک مصوّر کسی اُس بادشاہ۔ دیوی یا دیوتا کی تصویر بناتا تھا جس کا موجود ہونا قدیم زمانہ میں ممکن ہے۔ گو وہ حقیقتاً موجود نہ رہا ہو۔ عوام آرٹ کی اہمیت کے پیش نظر فنکار کو۔ ممکنات۔ کی یہ مراعات دیدیتے تھے۔ اس طرح فنکار اور غیر فنکار کے مابین یہ ذہنی معاہدہ قائم تھا کہ وہ فنکار کو چند مراعات دینگے اور کسی واقعہ کی بنیادی سچائی سے متعلق اپنے ذہن میں پیدا ہونیوالے منطقی سوالات کو دبا دیں گے۔ جس کے جواب میں۔ فنکار۔ اُن کے جمالیاتی اور رومانی حس کی تسکین کا سامان مہیا کرے گا۔

ایک یونانی مصوّر اس تصور کیساتھ کہ۔ ایک حسین دیوی کا وجود ممکن ہے اُس کی تصویر اس طرح تیار کرنیکا مجاز تھا۔ کہ اس میں حُسن سے متعلق ہر ممکن چیز کی رنگ آمیزی کر دے۔ اسی طرح انیسویں صدی میں یورپ کا ایک افسانہ نگار اس امکان کو فرض کر کے کہ ایک۔ نوجوان مرد اور نوجوان لڑکی کے درمیان محبت ہی ممکن ہو۔ اپنے پورے افسانہ کی بنیاد ڈالدیتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس معاہدۂ ذہنی کی رُو سے مذکورہ مراعات دی جاسکتی ہیں۔ لیکن پرانے ادب اور آرٹ نے اس معاہدہ کی آڑ میں اتنی غیر منطقی اور بے ربط چیزیں بیان کی ہیں کہ وہ تمام محض خیالی دنیا کی پرچھائیاں معلوم ہو رہی ہیں۔ لیکن عوام کے بڑھتے ہوئے منطقی مطالبوں کیوجہ سے یہ معاہدہ کمزور ہوتا چلا گیا اور فنکار سے وہ بہت سی مراعات چھین لی گئیں جو پُرانے ادب نے اسے دیدی تھیں۔ نیا ادب فنکار سے یہ جائز مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فرضیات سے نکل کر نفسیات کو اختیار کرے۔ آخر وہ کیوں کچھ ممکن الوقوع چیزیں فرض کرتا ہے۔ جبکہ ہماری زندگی میں اَن گنت یقین الوقوع چیزیں پائی جاتی ہیں۔

بلاشبہ اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ پُرانے ماہرین فن نے ان مراعات سے جائز فائدے اٹھائے۔ اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فن کے بہترین نمونہ پیش کئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر وہ اس معاہدہ سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے چند جاندار اور ٹھوس حقیقتوں پر اپنے آرٹ کی بنیاد رکھتے تو اس میں اتنی تیز تاثیر پیدا ہو جاتی جو مصنوعی حقیقتوں کی ملمع کاری سے ممکن نہیں۔ اس لئے نیا ادب ایک شاعر سے یہ اُمید کرتا ہو کہ اگر وہ شراب کے اثرات کا خود تجربہ نہیں اٹھا سکا تو صرف اس لئے کہ اس کی معلومات میں وہ اثرات آچکے ہیں۔ اُسے ان کو بیان کرنیکی اجازت نہیں ہے۔ یا تو وہ خود تجربہ حاصل کرے یا وہ اُن چیزوں کو بیان کرے جنکا تجربہ انہیں حاصل ہو۔

بالکل اسی طرح ایک بادہ کش شاعر سے نئے ادب کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ صرف اس لئے کہ عوام کی رومانی حس کو متحرک کرے کیوں شرابیات و خمریات میں خود کو محدود کئے لیتا ہے جبکہ عوام کے جمالیاتی احساسات کو مشتعل کرنے کے لئے زندگی کی ان چند در چند حقیقتوں کو بیان کرنا زیادہ بہتر ہے۔ جو آئے دن ہمارے تجربہ میں آتی ہیں۔ اور یہ بالکل مناسب نہیں کہ اس رعایت کو لیتے ہوئے کہ ایک مخمور شرابی کی کیفیات کچھ ایسی حقیقتیں ہیں جو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بہرحال ممتاز ہیں۔ اور اس لئے کہ وہ ممتاز ہیں ان کی نفسیات کا اظہار ہمارے عجوبہ پسند جذبہ کو بہت اپیل کرے گا۔ لہذا انہیں بہتر طور پر بیان کرنا شاعر کا ایک آرٹ ہے۔ (بقیہ مضمون صفحہ ۵۱ پر)

دُکھ سُکھ

ایشیا

دوسرا باب

فسانے و ڈرامے

بابتہ مارچ سنہ ۱۹۳۳ء

ہاجرہ بیگم

بچّے کی ذہنیت اور کہانی

بچّے کی زندگی میں کہانی کی بڑی اہمیّت ہے۔ سوائے ان مظلوم بچّوں کے جن کے پلنے کارخانے ہوتے ہیں اور جن کی مائیں مشین کے شکنجے میں خود مشین بن جاتی ہیں۔ کون ایسا بچّہ ہوگا جو کہانی کے نام سے واقف نہ ہو۔ کہانی کی دلچسپی سے تو انکار کسی کو نہیں لیکن کم لوگ ایسے ہیں جو اس بات پر غور کرتے ہیں کہانی کیوں ہر بچّے کو بھاتی ہے اور کس طرح ہم اُن کی اس دلچسپی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کہانی شروع ہوئی جب سے کہ انسان کی نسل شروع ہوئی۔ زبان بنی اور سماج کے قاعدے قانون مقرر ہوئے اور اسکا ثبوت خود ہمیں کہانی سے ملتا ہے۔ کیونکہ ادب کی اس شاخ سے شوق رکھنے والوں نے جب دنیا بھر کی کہانیاں اکٹھا کیں تو ان کو چند کہانیوں میں بعض باتیں عام معلوم ہوئیں۔ مثلاً اکثر قوموں کی کہانیوں میں اسی طرح کی باتیں عام تھیں جیسے کہ انسان کا جانور کی شکل میں تبدیل ہو جانا۔ کسی خوفناک چیز کا دوسروں کو نگل لینا اور پھر ان چیزوں کا جانور کے پیٹ سے برآمد ہونا۔ جان کا کسی چیز (ڈبیہ یا طوطے میں) بند ہونا۔ آسمان پر گھوڑے کھٹولے یا قالین کی مدد سے چڑھنا۔ کسی خاص ٹوٹکے کی مدد سے مرے انسان کا جی اٹھنا وغیرہ۔ اور زیادہ چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ان قوموں کی کہانیوں میں عام تھیں جو کہ ایک عام تمدنی دور سے گذر چکی ہوں۔ مثلاً وہ تمام قومیں جو کسی نہ کسی وقت قدرت کی طاقتوں کی پجاری رہ چکی ہیں (گو آج نہ ہوں) اپنی کہانیوں میں آندھی کیساتھ جنوں اور دیووں کا بیان کرینگے۔ اسی طرح جن جن قوموں میں یہ عقیدہ رائج تھا کہ سورج ایک لمبی مسافت طے کر کے شام کو جب مغرب میں پہنچتا ہے تو اندھیرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور پھر صبح کو نکل آتا ہے۔ ان سب قوموں میں آپ ایک سی کہانی پائیں گے کہ کسی خوبصورت لال چیز کو کوئی خوفناک جانور ہڑپ کر جاتا ہے اور پھر وہ پیٹ چاک کر کے باہر نکل آتی ہے۔ یورپ کے ملکوں انگلستان، سکینڈ نیویا، فرانس وغیرہ میں ایک سرخ پوش لڑکی کو بھیڑیا نگلتا ہے۔ (Red Riding Hood)، امریکہ کے سرخ انڈین میں ایک بہادر کو ریچھ کھا جاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں مور کو (جو سورج کی نہایت خوبصورت شبیہ ہے) گیدڑ نگل جاتا ہے۔

اسی طرح آپ تمام آریہ قوموں میں خواہ وہ یورپ کی ہوں یا ایشیا کی سات بھائیوں یا سات بہنوں کی کہانیاں عام پائیں گے۔ ان کہانیوں میں ہمیشہ سب سے چھوٹا بچّہ ہوشیار اور خوش قسمت ہوتا ہے۔ اور گو کئی طرح کی مشکلات کا سامنا اسے کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کوئی پہیلی بوجھنی، کبھی بیوی تلاش کرنی لیکن وہی فتحیاب ہوتا ہے۔ یہ کہانی اس لئے آریہ قوموں میں پائی جاتی ہے کہ آریہ ایک زمانہ میں چھوٹے بیٹے کو ہی ماں باپ کا وارث قرار دیتے تھے۔ اسلئے کہ بڑی اولاد جوان ۳۳
ہو کر خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ لیکن سب سے چھوٹا کمزور اور کم عمر رہ جاتا ہے لیکن جب بڑے بیٹے کو وارث بنایا جانے لگا تو ضرورت اس بات کی ہوئی کہ چھوٹے بچّے کی وراثت اسکو عقلمند کہہ کر مناسب ثابت کی جائے۔

جان کا کسی ڈبیہ یا جانور میں محفوظ ہو جانا غیر آریہ قوموں کا عقیدہ تھا۔ چنانچہ آج بھی افریقہ کی حبشی قومیں اس پر یقین رکھتی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا کوئی خاص ٹوٹم مقرر ہے اور اسی چیز کی حفاظت کرتے اور دشمن سے اس کو بچاتے ہیں اور اس کا اثر یہاں تک سُنا گیا ہے کہ اگر کوئی دشمن کسی کے ٹوٹم کو توڑ ڈالے تو وہ شخص واقعی دہشت سے مر جاتا ہے۔

غرضکہ کہانی کی ہر ایک بات گو شروع میں بے سر و پا معلوم ہو چھان بین کرنے پر صاف ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک نقشہ تیار کیا جائے تو کہانی کو خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصّے سے آئی ہو اُس کے مرکزی پلاٹ کی مناسبت سے ایک خاص خانہ میں درج کر سکتے ہیں۔ اور اُن کے ایسے گروپ بنا سکتے ہیں جیسے کہ جانوروں کی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں، سوتیلی ماں کی کہانیاں

ایشیا مارچ ۱۹۴۳ء

سات بھائیوں یا تین بھائیوں کی کہانیاں اور دہرانے والی کہانیاں ۔

یہ دہرانے والی کہانیاں نہایت دلچسپ ہیں۔ تقریباً سب قوموں میں عام ہیں اور مختلف ناموں کی عجیب فہرستیں ان میں ہوتی ہیں۔ جن کا آپس میں کچھ زیادہ رشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً ایک پرانی کہانی ہے ۔ ایک مکھی کی جو اپنا نام بھول گئی ۔ اُس نے گائے سے اپنا نام پوچھا ۔ گائے نے کہا مجھے نہیں معلوم ۔ بچھڑے سے پوچھ، مکھی نے کہا گائے ۔ گائے کا بچھڑا ۔ اپنا نام بتا ۔ بچھڑے نے کہا "گائے گائے کا بچھڑا ۔ بچھڑے کا چرواہا میرا نام بتا ۔ اسی طرح ہوتے ہوتے وہ مچھیرے کے پاس جاتی ہے اور کہتی ہے ۔ گائے گائے کا بچھڑا ۔ بچھڑے کا چرواہا ۔ چرواہے کا سونٹا سونٹے کا بٹیر ۔ بٹیر کی چڑیاں ۔ چڑیوں کی ندی ۔ ندی کی مچھلیاں ۔ مچھلیوں کے مچھیرے میرا نام بتا ۔ یا ایسی کہانیاں بھی ہوتی ہیں جن میں صرف چند فقرے بار بار دہرائے جاتے ہیں ۔

کہانی سُنانے کو تو ہر کوئی سناتا ہے لیکن سُنانے کا اصلی ڈھب کم کو آتا ہے ۔ پہلے زمانہ میں اس فن کے ماہر پیشہ ور داستاں گو ہوتے تھے ۔ لیکن وہ داستاں گو بڑے آدمیوں کو قصّہ سنانے کیلئے موزوں تھے ۔ کیونکہ اُن کی پیچیدہ اور رنگین داستانیں دراصل اس فن کی یادگار تھیں ۔ جس کی مدد سے تحریر کی ایجاد سے پہلے لوگ اپنی روایات مذہبی قاعدوں اور سماج کے قوانین کو یاد رکھتے تھے ۔ یہاں تو ہمارا مقصد بچّوں کی کہانیوں سے ہے ۔

۳۴

بچّہ کی پہلی کہانی وہی دُہرانے والی کہانی ہوتی ہے ۔ اس کی پلاٹ نہایت سادہ ہوتی ہے اور چند فقرہ بار بار دہرا کر نئے نام کے ساتھ جوڑ دئے جاتے ہیں ۔ مثلاً خالہ بلّی حج کو چلیں راستہ میں ملی مینا اس نے ساتھ چلنے کو کہا اور پوچھا خالہ بلّی تم ہمیں کھاؤ گی تو نہیں ۔ خالہ بلّی نے کہا " تیرے کھاتے کرتا کھاؤں، تیرے کھاتے عصا کھاؤں ۔ تیرے کھاتے تسبیح کھاؤں ۔ تجھے کیوں کھانے لگی تھی ۔ آگے ملا طوطا ۔ طوطے نے بھی وہی سوال کیا اور وہی جواب پایا اسی طرح کبوتر مرغا چوہا وغیرہ سب ملتے ہیں اور ایک جواب پاتے ہیں ۔ یہ کہانیاں اتنی سادہ ہوتی ہیں کہ دو سال کے بچّے بھی انھیں سمجھ لیتے ہیں ۔ اور بار بار دہرانے سے یاد کر لیتے ہیں ۔ ان کا خاص مقصد ہوتا ہے ۔ نئے نام سیکھنا اور حافظہ بڑھانا ساتھ ہی اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ بچّہ سنکر اچاٹ نہیں ہوتا ۔

تین چار سال کی عمر میں ذرا لمبی کہانی جسمیں کئی ایک واردات ہوں سمجھ میں آنے لگتی ہے ۔ جیسے ایک تھی چڑیا ۔ ایک تھا چڑا ۔ چڑیا لائی دال کا دانہ چڑا لایا چاول کا دانہ ۔ دونوں نے ملکر کھچڑی پکائی ... ' یا ایک کوا تھا ایک فاختہ تھی ۔ کوّے نے نمک کا گھر بنایا ۔ فاختہ نے موم کا ' وغیرہ ۔ ان سب کہانیوں میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور بیان کیا جاتا ہے ۔ مثلاً چڑے چڑیا کی کہانی میں چڑیا کا جھوٹ بولنا اور اُس کی سزا پانا ۔ کوّے اور فاختہ کی کہانی میں ہمسایہ کی مدد سے انکار اور اس کا بُرا نتیجہ ۔ اس طرح سے بچّہ آپس کے برتاؤ کے قاعدے سیکھتا ہے اور اس کی (Social Sense) کی بنیاد پڑتی ہے ۔ لیکن یہ سب اس خوبی سے بات میں بات کے طور پہ وہ سُنتا ہے کہ نصیحت کے طور پر اسکو بارِ خاطر نہیں معلوم ہوتا ۔

پانچ چھ سال کی عمر میں بچّہ کی سمجھ اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ جان جاتا ہے کہ انسان حیوان اور اُس کے گرد و نواح کی چیزوں کی عام طاقتیں محدود ہیں نہ گائے بات کرتی ہے نہ چڑیا ہنڈیا پکاتی ہے ۔ لہٰذا اُس کے تخیل کو اب ضرورت ہوتی ہے ۔ پریوں اور دوسری غیر انسانی طاقتوں کی ۔ اب اَن ہونی بات بھی جادو کے زور سے ہو جاتی ہے ۔ لڑکی ندی بن جاتی ہے ۔ شہزادہ پنکھا جھل کر ادجھل ہو جاتا ہے ۔ پتھر پانی چھڑکنے سے انسان ہو جاتا ہے ۔ وغیرہ

یہ غیر محدود فضا بچّے کے پہلے خیالات کیلئے ضروری ہے ۔ اور اس آزادی میں وہ بہت بلندیوں کو پہنچتا ہے ۔ "یوں ہو تو کیا ہو" شاید یوں بھی ہو جائے " مزہ ہو جو یوں ہو ۔ یہ اُس کے دماغی رجحانات ہوتے ہیں اور اُن کی تکمیل میں پریوں کی کہانیوں سے مدد ملتی ہے ۔ ان کہانیوں میں بھی جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ۔ کچھ قاعدہ قانون ضرور ہوتے ہیں ۔ مثلاً المیہ یعنی ٹریجڈی نہیں ہوتیں ۔ بچھڑے ملتے ہیں ۔ مشکلات حل ہوتی ہیں ۔ اور دُکھ کے بعد سُکھ ہوتا ہے اور ہونا بھی ایسا چاہیئے ۔ بچّہ قدرتی طور پر (Optimistic) ہوتا ہے ۔ اس کے حوصلے بلند اور فطرت بشاش ہوتی ہے ۔ ان کہانیوں سے بچّے کو دنیا کے بہت سے نئے اور پرانے قاعدوں قرینوں سے واقفیت ہو جاتی ہے ۔ غریبی امیری کا فرق ۔ راجہ کی مطلق العنانی ۔ ماں کی مامتا ۔ سوتیا ڈاہ ۔ مرد عورت کی محبّت ۔ شادی کا رواج ۔ موت کا تذکرہ ۔ غرضکہ کیا کچھ نہیں ہوتا ۔ اور سُننے والا کی دنیا اب بجائے گھر کی چار دیواری کے شہروں ۔ بیابانوں اور پرستاروں تک وسیع ہو جاتی ہے ۔

لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ نیا دور شروع ہوتا ہے ۔ یعنی وہ جبکہ بچّہ ہر چیز کو پرکھنا ۔ جانچنا ۔ اور آزمانا چاہتا ہے ۔ اب اس کے لئے اڑان کھٹولے

کا ذکر کافی نہیں۔ وہ اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر سمرقند جانا چاہتا ہے۔ جادو کی چھڑی کو ہاتھ سے چھونا چاہتا ہے اور جب یہ طلسماتی دنیا اس کے گرفت میں نہیں آتی تو اس کے وجود پر بھی اس کو کچھ شک ہونے لگتا ہے۔ اور اب اس کو اُس جیسے بچوّں کی اور انسانوں کی کہانیاں زیادہ پسند آتی ہیں۔ بہادری کے قصّہ۔ سیاحت نامہ رستم اور سہراب۔ سندباد جہازی۔ گلور صاحب کی سیاحت وغیرہ اس کو زیادہ بھاتے ہیں۔ اور دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے "وہ کہانی" کی اوّل منزل کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

یہ تو موٹے طور پر ایک عام بچےّ کی دماغی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن سب بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اور جو بچے کہ عام بچوّں سے ممتاز ہوتے ہیں اُن کے لئے خاص طور پر سوچنا پڑتا ہے کہ اُن کو کیسی کہانی سنائیں یا پڑھنے کو دیں۔ مثلاً ایک بچہ ہوتا ہے جس کو انگریز سائیکولیجسٹ (Considerable Type) کہتے ہیں۔ یہ بچہّ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں سست۔ ڈرپوک۔ بے وقوف اور کھویا ہوا رہتا ہے۔ لیکن اپنے خیالات کی دنیا میں وہ ایک نئی زندگی بسر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ دراصل شاہزادہ یا شاہزادی یا کوئی اور پوشیدہ شاندار ہستی ہے۔ ایسا بچہ کسی کھلونے یا گڑیا کو اپنا چاہتا ہے۔ کہانی خاص طور پر ایسی جس میں مظلوم بچہّ آخر میں شاہزادہ یا پری بن جاتا ہے۔ نہایت شوق سے سُنتا ہے۔ لیکن ایسے بچےّ کو بڑی عمر تک بھی کہانیاں سُنانا اُس کے حق میں ظلم کرنا ہے۔ ہم کہانی کے ذریعہ اسکی ذہنیت پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ اس کو اپنے آپ پر بھروسہ کرانے کیلئے ہم اُس کو اُس جیسے چھوٹے چھوٹے بچوّں کی بہادری کی داستانیں سُنا سکتے ہیں۔ اور بجائے جنوں اور پریوں کے قصّوں سے اُس کے دماغ کو بھر دینے کے سائنس کے سچے کرشمے سیر و سیاحت کے عجیب عجیب واقعات اُس کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اور اس طرح مادّی دُنیا میں دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک ٹائپ ہوتا ہے۔ نہایت ہی بے درد بچےّ کا! جو ہر چیز کو توڑتا پھوڑتا چھوٹے بچوّں کو مارتا اور جانوروں کو ستاتا ہے۔ ایسے بچوّں کو چوروں اور ڈاکوؤں کے قتل اور غارت گری کے قصےّ سنانا ان کو اور خونخوار بناتا ہے۔

بجائے اس کے اگر انھیں جانوروں کے قصّے جن میں اُن کی حیرت انگیز زندگی کی داستانیں ہوں۔ یا قربانی اور سچی بہادری کی روایات سُنائیں تو یقیناً اُن کی ذہنیت تبدیل ہونے میں مدد ملیگی۔

غرضکہ ہر بچہّ کی طبیعت کی مناسبت سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کونسی کہانی اس کے دل پر بُرا اثر ڈالے گی۔ علاوہ اس کے چند ایسی چیزیں ہیں جو کہ بچوّں کی کہانیوں میں کبھی بھی نہ آنا چاہئیں۔ مثلاً موت کا خوفناک تذکرہ۔ یا دہشت دلانے والی چیزوں کا ذکر۔ یا انسان کے کسی فرقہ یا گروہ سے نفرت اور حقارت کا سبق دہشت۔ نفرت اور حقارت یہ سب ایسے جذبات ہیں جن کا بچےّ کے دماغ پر بہت بُرا اور گہرا اثر پڑتا ہے۔



طاہرہ دیوی شیرازی

باز گشت

وہ مصوّر تھا۔ ایک باکمال مصوّر

مختلف رنگوں کے مناسب امتزاج سے جب وہ اپنے شاعرانہ دماغ کے تخلیق کردہ ذہنی پیکر صفحۂ قرطاس پر تکمیلِ فن کے ساتھ پیش کر چکتا۔ تو بسا اوقات خود اُسے مغالطہ ہو جاتا۔ کہ شاید وہ ذی حیات ہیں۔ اور اگر کوئی حسین دوشیزہ اُن سے گفتگو کرنے لگے، تو جواب دینے کی غرض سے لب کشائی کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن وہ اپنے اس وہمی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کی جرأت کبھی اپنے دل میں پیدا نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ امر اسے کبھی کسی عنوان گوارا نہیں تھا۔ کہ انھیں صحیح معنوں میں ذی حیات بنا کر سریع الزوال اور فانی بنا دیا جائے۔

زندگی اور موت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

مسلک کے اعتبار سے وہ اس عقیدے کا زبردست حامی تھا۔ کہ کوئی فنِ لطیف بغیر عریانی کے معراجِ کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بشرطیکہ عریانی صرف اس حد تک روا سمجھی جائے۔ کہ وہ برہنگی کے ضمن میں نہ آسکے۔ گویا جس طرح سنجیدہ فطرتیں اظہارِ مسرت کو محض تبسم تک محدود رکھتی ہیں نہ کہ قہقہہ تک وسیع۔ بالکل اسی طرح کبھی نور کے پردوں میں چھپ کر اور کبھی نکہت کے نقابوں میں ملفوف ہو کر اس کے تصورات کی مستور عریانیاں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ اور چونکہ اس کے خیال کے مطابق عریانی کا بہترین مظہر صرف عورت ذات سے ممکن ہے۔ —— اور عورت بھی وہ جو بارِ جوانی سے دب رہی ہو —— اس لئے اس کی ذہنی مخلوق میں زیادہ تر صرف صنفِ نازک ہی کو دخل حاصل ہوتا تھا۔ جن کے خصوصاً مینائے شباب کو نقش کرتے وقت وہ ہمیشہ پچھلے پہر کے تاروں کی ہلکی ضیاء، نسیم سحر کی خنک لطافتیں، اور شبنم کی مرطوب لذتیں چرا لیتا تھا۔ پھر اگر یہ نعمتیں اس کی صحیح ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر رہ جاتیں تو اسے مجبوراً سماوات کی لانہایت وسعتوں میں گم ہو کر سورج دیوتا اور چاند دیوی سے بھیک مانگنی پڑتی۔ یعنی جب آفتاب دن بھر کی مسافت طے کر چکنے کے بعد سیاہ پوش رات کے دامنِ ظلمت میں روپوش ہونے لگتا، تو وہ اُسے مخاطب کر کے کہتا۔

اے اندھیری دنیا میں اجالا کرنیوالے دیوتا! مجھے اپنی شفق افروز درخشاں پیشانی سے تھوڑا سا وہ رنگِ عقیدت دے دے جس کے پرتو کی ایک ہلکی سی جھلک نوعِ انسان کے اکثر افراد کو تیری بارگاہ میں آمادۂ پرستش کر دیتی ہے۔ میں اس رنگ سے اپنی تصویر کے آخری خطوط کی تکمیل کروں گا۔"

اسی طرح جب ماہتاب ایک عریاں مدّشی کی طرح تابوت فلک سے برآمد ہوتا۔ تو وہ اس سے التجا کرتا۔

"اے رات کی ملکہ! اے آسمان کی دیوی! مجھے تیرے جواں سال و گداز سینے کی وہ کشش و جاذبیت درکار ہے جس کا ادنیٰ کرشمہ خاموش سمندروں میں طوفان اور پُرسکون موجوں میں بے قراری پیدا کر دیتا ہے۔ مجھے اس کشش کی ساحرانہ قوتوں سے تصویر کے مینائے شباب میں وہ جادو بھرنا ہے، جو دیکھنے والوں کو ایک ہی نظر میں دلدادۂ تخیل بنا دے۔"

اور عموماً ایسا ہوتا کہ اس کی یہ آرزوئیں پوری ہو جاتیں۔

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک اس کے حقیقی ذوق اور تکمیلِ ذوق کی عملی سرگرمیوں کی

لیکن ایک وقت آیا، جب اس کی طبیعت کی افتادگی اس یک رنگی سے گھبرا گئی جس کا سب سے بڑا سبب اُسکی چڑھتی ہوئی عمر کا تقاضہ تھا۔ وہ شباب کی منزلوں سے گذر کر شیب کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ جہاں دل کی امنگیں مضمحل ہو کر بے حس ہو جاتی ہیں، اور انسان عموماً مذہب کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ مذہب جو جذباتِ لطیف کی دُنیا کو برباد کرنے کا سب سے زیادہ کارگر آلہ ہے۔ جو انسان کو اُس کی انسانیت فنا کر دینے کے بعد —— باطن میں اسی فرشتہ کا ہمسر بنا دیتا ہے۔ جو الوہیت کے تمام مدارج طے کر کے ابلیسِ لعین ہو گیا۔ ضرورت سے زیادہ تقدس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ فرشتے کی معراج یہی ہے۔ کہ وہ شیطان بن جائے۔ غرض یہ کہ وہ زندگی کے ہر جزو میں مذہب کی کارفرمائی

دیکھنے کا دلدادہ ہوگیا۔ حتیٰ کہ آرٹ میں بھی، حالانکہ آرٹ کو مذہب سے کیا سروکار ہوسکتا ہے۔

اس نے فیصلہ کرلیا۔ کہ آئندہ وہ کبھی عریاں تصاویر نہیں بنائیگا۔ کیونکہ عریانی آئینِ مذہب میں مذموم ہی نہیں بلکہ ہر اعتبار سے ممنوع بھی ہے۔ اس ضمن میں وہ گرجا کے پادریوں کا ہمنیاں ہوگیا۔ کہ عریانی ہیجانِ جذبات پیدا کردینے کے باعث ہمیشہ مخربِ الاخلاق ثابت ہوتی ہے۔ لہذا نسوانی حُسن کے وہ تمام دلکش مظاہر جو کبھی اس کے پندار میں لطیف ترین تھے، حددرجہ کریہہ المنظر سمجھے جانے لگے۔

پیکرِ نسائیت کے وہ مینائے شباب، جن کو ہمیشہ عریاں رکھنا وہ شانِ مصوّری تصوّر کرتا تھا۔ اس درجہ مستور رہنے لگے۔ کہ مختلف ملبوسات کی متعدد تہوں کو ناکافی سمجھ کر گردوپیش کے ماحول تک سے استفادہ کرنے لگا۔ مثلاً کبھی شاخِ گل اور کبھی طاؤس کی لمبی گردن اور کبھی دستِ بدُعا کے ذریعہ وہ سینے کو اس طرح چھپا دیتا کہ دیکھنے والے کی نظر اس کے نشیب و فراز تک مشکل سے پہونچ سکتی۔ اور ایسی صورت میں کہ اگر کوئی شئے درمیان نہ آسکتی، تو وہ خود پیکر کے یک رخی طرزِ نشست سے سینہ کا وجود ہی معدوم کردیتا۔

انجیلِ مقدّس کے اوراق اور اُن کی مندرجہ کہانیاں اس کے دل و دماغ پر حاوی ہوگئیں۔ وہ آدم سے لیکر یسوع ناصری تک تمام پیغمبروں اور آسمان و زمین کے جملہ فرشتوں کے نمایاں کارنامے اور مشہور روایات — جن کو تشکیلی اعتبار سے ذرا بھی اہمیت دی جاسکتی تھی۔ بڑی جانکاہی سے صفحۂ قرطاس پر نقش کرنے لگا۔ اسے سب سے زیادہ محنت حضرتِ عیسیٰ کے حالاتِ زندگی پیش کرتے وقت اٹھانی پڑتی تھی۔ کیونکہ اس ضمن میں وہ فنّی مہارت کے علاوہ اپنی عقیدت مندی کا ثبوت بھی دینا چاہتا تھا۔ اور چونکہ مسیح کے ساتھ مقدّس مریم کا وجود ایک خاص نسبت رکھتا ہے۔ اس لئے پیکرِ نسوانی کی وہ عمیق معصومیت جسے وہ اپنی تمام عمر میں کسی عنوان اور کسی رنگ میں پیش نہ کرسکا تھا۔ اب بڑی آسانی کے ساتھ اپنی جھلک دکھانے لگی۔ یہاں تک کہ بہت ہی قلیل مدّت میں اطالیہ کے وہ ماہرینِ فن جو مذہبی نقاشی کے باعث شہرۂ آفاق تھے۔ اس کے مقابلے میں محض طفلِ مکتب ہوکر رہ گئے۔

اس کے وہ تمام پچھلے شاہکار جن کی قدرومنزلت خود اُس کی نگاہ میں بھی تھی، اس کی نظر سے گر گئے۔ اور اسی لئے ان کو اپنے نگارخانے کی دیواروں سے اتار کر ایک ایسے تیرہ و تاریک کمرے میں ڈالدیا۔ جس کی وقعت طاقِ نسیاں سے کم نہیں تھی۔ اس کے برعکس نگارخانے کو اپنی نئی چترکاریوں سے اس طرح مزیّن کیا، کہ دیواریں بجائے خود کتابِ مقدس کے اوراق معلوم ہونے لگیں۔

یہ ہے ایک ہلکا سا خاکہ اُس کی طبیعت کے انقلاب اور انقلاب کے مابعد اثرات کا۔

بڑے دن سے کچھ عرصہ قبل جب اس کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ وہ سالانہ تہوار کے موقع پر بڑے گرجا کی تزئین کیلئے مقدّس مریم کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جس کے نقش و نگار میں انتہائی معصومیت کیساتھ شدید مظلومیت کی کیفیات کو سمو دیا گیا ہو۔ تو اُس نے اپنی تمام توجّہ صرف ایک غیرفانی شاہکار تخلیق کرنے کیلئے وقف کردی۔ اور ساتھ ہی تہیہ کرلیا۔ کہ اس کے بعد وہ مُوقلم کو ہاتھ بھی نہ لگائیگا۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا شبیہِ مریم پر سبقت لے جائے۔ وہ مغرور تو نہیں تھا۔ لیکن بالکل غیرشعوری طور پر یہ حقیقت اس کے دل و دماغ میں پنہاں تھی کہ اُس کا ہر نقشِ ثانی اپنے نقشِ اوّل سے بہتر رہتا ہے۔

ناقدین کی رائے اس سے بھی زیادہ بلند تھی۔

ایک ماہرِ فن کیلئے سب سے اولین کاوش "ماڈل" کا انتخاب ہے۔ کیونکہ جس طرح بھی زندگی میں منزلِ مقصود تک پہونچنے کیلئے ایک قبلہ نما کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح تاثراتِ قلبی کو کسی پیکرِ مجسم سے منسوب کئے بغیر متشکل کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

۳۷ اُن تمام مقاماتِ سیر و تفریح پر جہاں صنفِ نازک کا ہجوم خاص طور پر ہوتا ہے، اُس نے بے شمار چکر لگائے۔ اُس کی نظر ہزاروں صورتوں پر پڑی، مگر کسی کو بھی وہ معیاری رتبۂ قبول حاصل نہ ہوا۔ جو پہلے سے اُس نے اپنے ذہن میں قائم کر رکھا تھا۔ بیشتر میں معصومیت کا فقدان تھا۔ اور کہیں یہ جھلک بھی نظر آئی تو دوسری خصوصیات کی کمی نے اُس کو نظرِ انتخاب سے گرا دیا۔ پھر یہ بھی تو دقّت تھی کہ محض انتخاب سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ تاوقتیکہ اس کی پسندیدہ ہستی ماڈل بننے کیلئے آمادہ نہ ہو جائے۔ اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

دلی تجسّس سے کام لیا جائے۔ تو اس دارِ امکاں میں سب کچھ مل جاتا ہے۔

چنانچہ اس کی سعیِ پیہم ایک روز بارآور ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

آفتاب سرمگیں پہاڑیوں کے پیچھے روپوش ہوچکا تھا۔ لیکن اس کی آخری قرمزی شعاعیں دامنِ اُفق کو ہنوز زرنگار بنائے ہوئے تھیں۔ جس کے انعکاس سے پانی کی شفاف مگر بیتاب لہریں، جن کی بیتابی آبی جانوروں کی تڑپ کے علاوہ کسی اور اثر کی بھی رہینِ منّت تھی، آتشِ سیّال بنی ہوئی تھیں۔ دیوقامت ساحلی درختوں کے سائے تڑپتی ہوئی موجوں پر عفریتی پیکروں کی طرح آپس میں ایک دوسرے

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

سے دست وگریباں معلوم دیتے تھے۔

ٹھیک اسی وقت اس سنسان فضا میں وہ بند کے قریب ایک سنگین لوح پر کہنیاں جمائے مطالعۂ قدرت میں مصروف تھا۔ اور ساتھ ہی سوچ رہا تھا کہ ماڈل مل جانے پر وہ اپنی نئی تصویر میں اس قسم کا پس منظر پیش کرے گا۔ تاکہ اس کی ایمائی کیفیات کے ساتھ ماحول اچھی طرح ہم آہنگ ہو سکے۔

اچانک پاؤں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے مڑکر دیکھا۔ ایک پریشان حال عورت ڈگمگاتے قدموں سے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ یقیناً اُس کا چہرہ اُن معیاری خدوخال کا حامل تھا جو قدیم اطالوی مصوّروں نے حضرت مریم کیلئے مخصوص کردیئے تھے اور انہیں کے مطابق وہ اپنی تصاویر تیار کرتے تھے۔

ہر ایک ٹھنڈا سانس بتا رہا تھا۔ کہ وہ زمانے کے ہاتھوں بُری طرح ستائی ہوئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قمریوں کی اسیرانہ بیکسی اور سرو کا معصومانہ سکوت اس کے اعضا میں ایک افسردہ لوچ بن کر تحلیل ہو گیا ہے۔

چہرے کے مضمحل نقش و نگار اور رنگ و روپ کی پژمردگیاں یقین دلا رہی تھیں کہ وہ عہدِ جوانی میں حسن و جمال سے محروم نہیں رہی ہے۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی چمک ـــ عورت کی آنکھوں کی وہ چمک جو دل کا آئینہ سمجھی جاتی ہے ـــ شاہد بن رہی تھی کہ معصیت کی دنیا میں اُس نے کبھی قدم تک نہیں رکھا۔ اس کا دامن ہمیشہ گناہ کی آلودگیوں سے منزّہ رہا ہے۔ وہ پھولوں کے رخسار پر پڑے ہوئے قطراتِ شبنم کی طرح پاک ہے۔

حد درجہ محویت کے باعث ایک لمحے کیلئے اُسے ایسا محسوس ہوا۔ گویا وہ بھی وقت و مقام کے تعینات سے بے نیاز عالمِ خواب میں نظر آنے والے کسی پیکر کی مانند ہے جس کا عدم و وجود برابر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جب ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتی ہوئی وہ اسکے قریب سے ہو کر گذر گئی تو یہ یقین کر لینا اُس کے لئے آسان تھا۔ کہ دراصل وہ اسی عالمِ رنگ و بو کی رہنے والی ہے۔ اور اس کا مرتبہ ان دیویوں سے بھی زیادہ بلند ہو سکتا ہے۔ جو یونان و روما کی اساطیرُ الاوّلین میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔

جس طرح ایک محفلِ سرود میں کسی دوسرے کے گیت سُن کر ایک مغنّی کی خود اپنی رگِ موسیقی بھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اسی طرح اسکو اپنے دائیں ہاتھ کی ان تین انگلیوں کا بالائی سرے پر جو مصوّری کے وقت مُوقلم کو اپنی مضبوط گرفت میں لئے رکھتی ہیں خفیف ارتعاش سا محسوس ہونے لگا۔

وہ غیر ارادی طور پر ایک سایۂ متحرک کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

لیکن زیادہ دور تک نہیں۔ کیونکہ جلدی ہی وہ ایک دوسرے کے دوش بدوش ہو گئے عورت کی سبک خرامی کے مقابلے میں مرد کی آہستہ چال بھی تیز رفتار ہی ثابت ہوتی ہے۔

ایک اجنبی کو اس طرح اپنے ہمراہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکی، مڑی اور بہ نظرِ استفسار دیکھنے لگی۔ وہ کھوئی ہوئی حالت میں عرضِ مدعا کیلئے مناسب الفاظ ڈھونڈھنے لگا۔

روپیہ حصولِ مقصد کی کلید ہے۔ وہ غریب تھی، مفلس و نادار۔ اور یہ اپنی آرزو پوری کرنے کیلئے تمام مال و متاع قربان کردینے پر تُلا ہوا تھا۔ صرف سات یوم ماڈل بن کر نگارخانے میں بیٹھے رہنے کا معاوضہ ایک گراں قدر رقم! ۔ بھلا کون آتی ہوئی دولت کو ٹھکرا دیتا۔

معاہدے کی حدیں ختم ہوئیں۔ کام شروع ہو گیا۔ اور مقدّس مریم کی مظلوم معصومیت مُوقلم کے اعجاز سے صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہونے لگی۔

معاہدہ کا ساتواں دن تھا اور سالانہ تہوار میں ابھی دو ایک یوم باقی تھے۔ تصویر تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ وہ ماڈل کے انتظار میں خاموشی کے ساتھ کمرے کے اندر گھوم رہا تھا۔ اور دور و نزدیک کے مختلف مقامات پر کھڑے ہو کر مختلف زاویہ ہائے نظر سے خطوط کی کشش اور رنگوں کے امتزاج کا مطالعہ کر رہا تھا۔ کہ اگر کوئی نقص یا کمی باقی ہو تو آج اُسے پورا کرلے۔ حقیقتاً اُس نے فنِ لطیف کا وہ بے مثل نمونہ تیار کیا تھا جس کی قدر و منزلت خود صانع کی نظر میں بھی بہت بلند ہوتی ہے۔

یوں تو اُس کی شہرت اب بھی کچھ کم نہیں تھی۔ لیکن اس معجز نگار یوں کے سلسلے میں وہ بڑے فخر کیساتھ محسوس کر رہا تھا۔ کہ خراجِ تحسین تمام گذشتہ کارناموں کے مقابلے میں سبقت لے جائیگا۔

انتظار کی شدید گھڑیاں ابھی ختم نہ ہونے پائی تھیں۔ کہ بڑے گرجا کے پادری کی غیر متوقع آمد نے اس کے سلسلۂ خیال کو توڑ دیا۔ اُس نے آتے ہی تصویر پر ایک معنی خیز نظر ڈالی اور پھر مصوّر کی طرف متوجّہ ہو گیا۔ غیر معمولی رنگِ رُخ کسی خاص جذبے کا پتہ دے رہا تھا۔ تاہم اُس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے پہلے غیر متعلقہ گفتگو شروع کی۔ اور کچھ دیر بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کیا۔

اُس نے یہ تسلیم کرا لینے کے بعد کہ مذہبی نقاشی کو عقائد کی روشنی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور مقدّس مریم کی شبیہ بنانے کیلئے جو ماڈل منتخب کیا جائے۔ ضرورت ہے کہ وہ کردار کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ہو، مصوّر کو اس حقیقت سے باخبر کیا۔ کہ اس تصویر کیلئے جو عورت اُس نے انتخاب کی ہے۔ وہ سماج کی نظروں میں ذلیل ترین

سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا شمار بازاری عورتوں میں ہوتا ہے۔ جوانی کی راتیں اس نے اس طرح بسر کی ہیں۔ کہ ہر شب اس کا آغوش ایک نئے مرد کی ہوسناکیوں سے گرم رہا۔ اور سنسار کے ہر گناہ کے ارتکاب میں جو کسی عنوان عورت ذات سے متعلق ہوسکتا ہے۔ اسنے کبھی تامل سے کام نہیں لیا۔ اس کے چہرے کی وہ کیفیات جو معصومیت و مظلومیت کے ظاہری رنگ میں نمایاں ہیں۔ درحقیقت شباب کے بے جا تصرّف اور اس شکستِ پندار سے پیدا ہونیوالی افسردگی کا نتیجہ ہیں۔ اب اس کے لئے پرستیدۂ عالم بننے کا زمانہ گذر گیا۔ کشکولِ معصیت کی تمام جمع پونجی عیاشیوں کی نذر ہوگئی۔ اور اس لئے فاقہ مستی سے پیدا ہونیوالا اضمحلال مظلومیت کی حد تک پہنچ گیا ہے۔

سکوتِ مطلق میں مصوّر کو اپنے دل کی دھک دھک صاف سنائی دے رہی تھی اس کے بحرِ تصوّر میں زبردست طوفان برپا تھا۔ ایوانِ آرزو کی دیواریں جن کو لطیف رنگوں سے تعمیر کیا تھا منہدم ہوکر بنیادوں سے بھی نیچے گر پڑی تھیں۔ اُسے کمرے کی ہر شے گھومتی معلوم دے رہی تھی ——— وہ تصویر بھی، جس کو مریم سے منسوب کرنا تھا۔ مگر اب عنوان طلب تھی۔

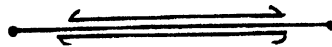
زندگی ایک فریب ہے۔ — وہ سوچ رہا تھا ——— اور زندگی کا ہر فعل ریاکاری کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ تقدّس خواہ کتنا ہی عمیق ہو معصیت کی لطیف چاشنی سے اسکو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ نیکیاں بدی سے الگ ہوکر قائم نہیں رہ سکتیں۔ اور حُسن کی رعنائیاں عیّاشیوں کے بغیر پھیکی ہیں۔ عورت، جس کے عناصرِ ترکیبی کا ابتدائی خمیر ہی گناہ سے تیار کیا گیا تھا۔ کسی طرح بھی گناہ سے خالی الذہن نہیں رہ سکتی۔ اس ضمن میں ایک حوّا اور ایک مریم، ایک دیوی اور ایک طوائف سب برابر ہیں۔ پھر آخر کب تک دنیا اس قسم کے مغالطوں اور اوہام خیالی میں مبتلا رہے، یسوع ناصری واقعی بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ عقل میں نہ آنیوالی باتوں کو بغیر سمجھے تسلیم کرلینے سے بہتر یہ ہے کہ ان کو اچھی طرح سمجھ کر تسلیم نہ کیا جائے۔

چنانچہ ماڈل کے آجانے پر خود اُس کی زبانی معلوم کرلینے کے بعد کہ گرجا کے پادری نے جو اطلاع دی تھی وہ واقعی درست تھی۔ اس کا سب سے پہلا حکم یہ تھا۔ کہ وہ عورت اپنا تمام لباس اتار کر پھینکدے۔ وہ مریم کی ایک فنّی تصویر بالکل عُریاں حالت میں تیار کرنیکا فیصلہ کرچکا تھا۔ اسے اپنا قدیم اصول یاد آگیا۔ کہ کوئی فنِ لطیف بغیر عریانی کے معراجِ کمال حاصل نہیں کرسکتا۔

نشے میں چور کرکے اُس نے عورت کو خوب متوالا بھی بنادیا۔ تاکہ وہ عہدِ پیری میں کچھ دیر کے لئے جوان معلوم ہونے لگے۔ وہ تصوّرات سے کام لیکر تصویر کے پردے میں مقدس مریم کے عہدِ شباب کی ایک ایسی تعیش گذار رات کا منظر پیش کرنا چاہتا تھا جس کی ایمائی کیفیتوں میں عہدِ دوشیزگی کے اندر ہی ماں بن جانیکا راز مضمر ہے۔

وہ جانتا تھا۔ کہ علم برداران مذہب اس کے آخری شاہکار کو قبول نہیں کرینگے۔ لیکن اُس کے نگارخانے کی زینت ——— کیا وہ بھی اس سے دوبالا نہ ہوسکے گی۔ اسکے جذبات میں زبردست انقلاب برپا تھا۔ اس لئے وہ ایک باغیانہ سرکشی کے ساتھ مذہب کے تمام عقیدوں، سماج کے جملہ اصولوں اور معلمانِ اخلاق کے زرّیں اقوال کو ٹھکرا دینا چاہتا تھا۔

انجام کار وہ اپنے مسلک کے اعتبار سے جہاں تھا وہیں آگیا۔



ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
ڈی لٹ (پیرس)

محفل رقص کی تصویر

(کالیداس، پیرلوتی اور میر حسن کے قلم سے)

یہاں نظارۂ رقص کی تین تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ جن کے صناع تین باکمال ادیب ہیں۔

کالیداس نے اپنے ڈرامے مالوکاگنی متر میں نہایت حسن و خوبصورتی سے محفل رقص و سرود منعقد کی ہے۔ راجا اگنی متر اپنی رانی دھارنی کی باندی مالوکا کی تصویر دیکھ کر اس پر ریجھ جاتا ہے۔ اور اُسے دیکھنے کا موقع تلاش کرتا ہے۔ مالوکا اور راجا کی ایک دوسری باندی گوتمی دو مختلف استادوں سے ناچ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ یہ دونوں استاد جوش رقابت میں ایک محفل سجاتے ہیں۔ تاکہ اپنی اپنی چیلی کے کرتب دکھلائیں۔ ایک جوگن جو محل میں رہتی ہے۔ اس مقابلے کی ثالث مقرر کی جاتی ہے۔ راجا کا مطلب بر آتا ہے۔ اور وہ اپنی محبوبہ کو دوبدو دیکھ لیتا ہے، سنسکرت ڈرامے میں ودوشک (مسخرہ) کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کلاسکل یورپین ڈرامے میں "فول" کو، وہ عموماً ہیرو کا لنگوٹیا یار ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ ڈرامے کے دوسرے ایکٹ سے براہ راست سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ حصۂ نظم وادین میں رکھا گیا ہے۔

فرانس کے نامور ادیب پیرلوتی (Pierre Loti) نے اپنے سفرنامۂ ہند میں کوچین کے ایک ناچ کا حال بڑے لطیف انداز میں لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ ہندوستانی رقاصہ کے عنوان سے کیا گیا ہے۔

میر حسن نے بھی اپنی مثنوی میں بدر منیر اور بے نظیر کی شادی کے بیان میں ناچ کی محفل بڑی دھوم سے سجائی ہے۔

ان ترجموں اور اقتباس سے ایک تو اُن ادیبوں کا کمال ظاہر ہوتا ہے اور پھر ادب کا تقابلی مطالعہ بھی کم دلچسپ نہیں۔ (مترجم)

(رقص و سرود کا انتظام ہو چکا ہے۔ اور راجا اپنے دوست کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ رانی، جوگن اور خدم و حشم حسب مراتب بیٹھے ہوئے ہیں)

راجا۔ دیوی ان دونوں اُستادوں میں سے پہلے کس کی تعلیم اداکاری کا امتحان لیا جائیگا؟

جوگن یوں تو دونوں اپنے فن کے چاند سورج ہیں، تاہم عمر کی بزرگی کے لحاظ سے گن داس کو ترجیح دینا چاہیئے۔

راجا۔ اچھا تو، مودگلیہ، ان صاحبوں کو یہ خبر پہنچا کر اپنی خدمت پر مستعد رہو۔

حاجب کرامات، جہاں پناہ۔ (رفت)

گن داس۔ حضور، شرمشٹھا[1] کا بنایا ہوا ایک گیت چوپائی میں ہے، جو مدھم سُر میں گایا جاتا ہے۔ اس کے ایک بند کو توجہ سے سننے کی زحمت فرمایئے۔

راجا۔ فرط احترام سے میں ہمہ تن گوش ہوں۔

(گن داس باہر جاتا ہے)

راجا (علیحدہ) یار: "وہ جو پس پردہ ہے، اس کے شوقِ دیدار میں یہ بیقرار نین گویا پردے کو اُلٹ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

مسخرہ (چپکے سے) بھئی لو، تمہاری آنکھوں کا رس تو آگیا، لیکن تمہاری رانی شہد کی مکھی بنی بیٹھی ہے۔ ذرا ہوشیاری سے درشن پیاس بجھانا۔

(مالوکا اپنے استاد کے ساتھ جو اس کے سڈول بدن کو غور سے نرکھ رہا ہے، اندر آتی ہے)

[1] جنوں کے راجا کی بیٹی اور راجا ییاتی کی بیوی تھی جس کا ذکر پرانوں میں کئی جگہ آیا ہے۔

مسخرہ۔ (کان میں) حضور دیکھئے تو سہی۔ تصویر اور اصل کے حسن میں جو سر مو فرق ہو۔

راجا (آہستہ سے) دوست میرا دل اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں جیب میں اس کا روپ نکھر آیا ہو۔ لیکن اب تو یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کا مصوّر نظارۂ حسن میں اتنا کھو گیا تھا کہ تصویر جیتی جاگتی نہ بن سکی۔"

گن داس۔ بیٹی لاج اور جھجک کو چھوڑ کر اپنے آپے میں آجا۔

راجا۔ (خود بخود) حقا کہ اس کا ہر عضو تن سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

آنکھیں غلافی ہیں۔ چہرہ زمستاں کے ماہتاب کی طرح روشن ہے اور کاندھوں سے دونوں ہاتھ کس بانکپن سے نیچے ڈھل گئے ہیں بھری ہوئی چھاتی میں گدرائے ہوئے جوبن تن کر ایک دوسرے سے بھڑ گئے ہیں۔ آغوش میں کیا کٹاؤ ہے۔ اور کمر اتنی پتلی کہ بازو حائل کرلے۔ ساق بلوریں گداز ہیں اور ان سب پر پاؤں کے انگوٹھے کی ہلکی سی کجی غضب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کالبد اپنے اُستاد کے تخیّل کی مناسبت سے تیار کیا گیا ہے"

(مالو کا تال سر ملا کر اس رباعی کو لحن سے گاتی ہے)

"پیتم پیارے کا ملنا ناممکن ہے۔ اس لئے لے دل اب آس چھوڑ دے لیکن میری بائیں آنکھ کی کور رہ رہ کر پھڑک کیوں رہی ہے۔ مدتِ دراز کے بعد آج جو محبوب نظارہ فروز ہے تو اُس کے پاس جاتے ہوئے میں شرما رہی ہوں۔ میرے مالک! گو میں باندی ہوں پھر بھی یقین جان کہ تیرے فراق کی ماری ہوئی ہوں۔"

(گیت میں مسطورمعنی کے اظہار کیلئے وہ ناچ کر بھاؤ بتلاتی ہے)

مسخرہ۔ (کان میں) دوست، یہ چوپدا سنا کر اس نے بھی اظہارِ الفت کر دیا۔

راجا۔ بھائی میرا دل بھی یہی شہادت دیتا ہے۔

"میرے مالک میں تیری مشتاق ہوں" یہ گا کر غمزہ و عشوہ سے اس نے ان الفاظ کو واضح کیا اور اشارے اشارے میں مخاطب کرکے اپنا دردِ دل سنا دیا۔ کیونکہ رانی متعرنی کی موجودگی کے سبب اظہارِ مدّعا کی کوئی دوسری صورت نہ ہو سکتی تھی۔"

(گانا ختم کرکے مالو کا محفل سے اٹھنا چاہتی ہے)

مسخرہ۔ ٹھہریے جناب آپ کی ایک آدھ بھول چوک کے متعلق مجھے دریافت کرنا ہے۔

گن داس۔ بیٹی ذرا ٹھہر جاؤ۔ کسی کو یہ کہنے کی جگہ نہ رہ جائے کہ تمہاری تعلیم میں کوئی نقص رہ گیا۔

(مالو کا پلٹ کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے)

راجا۔ (خود بخود) ہر ڈھب پر اس کا حسن نئی آن بان دکھلانے لگتا ہے۔

"لاریب کہ شانِ رقص سے یہ اندازِ استادگی کہیں زیادہ دلفریب ہے، یہ انداز کہ دھڑ چھڑی کی طرح سیدھا ہے۔ اور بایاں ہاتھ سرین پر اس انداز سے رکھا ہوا ہے کہ اس کی چوڑی جیب چاپ کلائی سے لپٹی ہوئی ہے۔ اور دوسرا ہاتھ یوں ڈھیلا لٹکا ہوا ہے گویا شیام بیل کی زلف ہے۔ اس کی آنکھیں روِش پر جمی ہوئی ہیں جس پر بکھرے ہوئے پھولوں کو وہ اپنے انگوٹھے سے آہستہ آہستہ مسل رہی ہے"

گن داس (مسخرے کو مخاطب کرکے) سُنیں تو سہی کہ جناب کا اعتراض کیا ہے؟"

مسخرہ۔ پہلے اپنی ثالثہ سے پوچھ لیں بعد ازاں میں اس نقص کا ذکر کروں گا جو دورانِ رقص میں مجھے نظر آیا۔

گن داس۔ دیوی! اپنے مشاہدہ کے مطابق فیصلہ کیجئے کہ یہ کرتب کامیاب رہا یا ناکام

جوگن۔ میری دانست میں تو وہ بالکل بے عیب تھا۔ کیونکہ:۔ ۴۱

"اس کے جسمِ نازنیں کا ہر بُنِ مُو جذبات کی بولتی ہوئی تصویر بن گیا تھا۔ خرام اور لے میں مناسبت تھی اور وہ خود جذبات کے اظہار میں محو ہو گئی تھی سیمیں بازوؤں کی ہر جنبش کمال نازک تھی اور رس کی لہریں یکے بعد دیگرے امنڈتی آتی تھیں لیکن از ابتدا تا آخر جذبۂ محبت میں جو قیام تھا۔ اس نے دلچپی میں اتار چڑھاؤ پیدا نہ ہونے دیا۔"

ہندوستانی رقّاصہ

وہ چہرہ قریب آتا جاتا ہے۔ جس کی آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں۔ جو شباب پرور ہے۔ جس پر غازہ ملا ہوا ہے۔ شہوانیت اور کلفت اس سے صاف عیاں ہیں۔ اور بڑی نزاکت و سرمستی سے وہ کبھی سامنے آتا اور پھر ہٹ جاتا ہے۔ اس کی ناچتی ہوئی نین پتلیوں کو دیکھ کر گمان مینا کاری کی زمین پر سیاہ سنگِ سلیمانی جڑے ہوئے ہو

ملیشیا مارچ ۱۹۳۲ء

جذبۂ شہوت کو ابھارتی ہوئی وہ آگے آکر پھر تاریکی کی طرف لوٹ جاتی ہے اور اس کی ہر پیش قدمی میں ایک نیا اشتعال انگیز اشارہ پنہاں ہوتا ہے۔ اور اس سارے وقفے میں اس کا تارِ نظر مجھ پر بندھا ہوا ہے۔ یہ سانولا سلونا مکھڑا جواہرات سے منڈھا ہوا ہے۔ ہیرے اور کندن کا ایک مکٹ پیشانی کا ہالہ بنا کر اور زلفوں کو اپنے آغوش میں چھپا کر کانوں کے اوپر ڈھلک گیا ہے۔ ناک میں اور کانوں میں کئی ہیرے جگمگا رہے ہیں۔

رات کا وقت ہے اور ہر طرف روشنی ہو رہی ہے لیکن اس انبوہ میں میں فقط اس تاجدار حسینہ کو دیکھ سکتا ہوں جس کے مکٹ کی انی مجھ پر جادو پھونک رہی ہے۔ بہتیرے تماشائی اس کے گرد حلقہ بنا کر یوں گھور رہے ہیں کہ اسے بمشکل تمام تاؤ بھاؤ بتانے کی جگہ ملتی ہے۔ ایک ذرا سی کھلی ہوئی جگہ رہ گئی ہے جس میں سے ہو کر وہ میرے قریب آتی اور پھر پلٹ جاتی ہے۔ لیکن اس کا ہونا نہ ہونا میرے لئے برابر ہے۔ اور میں صرف اس عورت کو، اس کے درخشاں مکٹ کو، اس کی چشمِ سرمہ سا کو اور کٹیلی ابرو کو دیکھ سکتا ہوں۔ اس کا جسم نازنیں سانپ کی طرح لچکیلا ہوتے ہوئے بھی گداز اور مضبوط ہے۔ کیسے سحر طراز بازو ہیں وہ جو گل بسیاں کرنے کو بیتاب معلوم ہوتے ہیں۔ جو سانپوں کی طرح بل کھا رہے ہیں اور جو کاندھوں تک گہر و زمرد سے زیر بار ہیں لیکن نہیں کشش تو ان آنکھوں میں ہے جن کا انداز ہر آن تغیر پذیر ہے۔ کبھی وہ ۴۲

شعلہ زن ہیں تو کبھی اُن میں عجب دلپذیر حلاوت ہے۔ جب وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے تو میں کانپنے لگتا ہوں۔ مکٹ کے رتن اور ناک کان کے جواہرات اس آب و تاب کے ساتھ جلوہ فگن ہیں۔ اور یہ طلائی فیتہ ایسا روشن حلقہ بنائے ہوئے ہے کہ اس وقت بھی جب وہ مجھ سے بالکل ہٹ جاتی ہے، اس کا چہرہ اپنے دل رُبا نک سک اور اٹے اٹے سے سانولے رنگ کے ساتھ ایک پُر اسرار ابہام میں ملبوس نظر آتا ہے۔ رقّاصہ آتی ہے اور جاتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مجھے ناچ دکھا رہی ہے کتنا نا محروم ہے یہ رقص! صرف ان بیش قیمت گھنگروؤں کی رم جھم سُنائی دیتی ہے! اس کے ننگے اور ننھے پاؤں کی چاپ کا زیر و بم قالین ہی میں سما جاتا ہے۔ ان پیروں کی کشیدہ اور سیماب وش اُنگلیوں میں چھلّے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ رقص جس جگہ ہو رہا ہے وہ پھولوں کی مہک اور عطروں کی لپٹ سے اس قدر بسی ہوئی ہے کہ دم گھٹ رہا ہے۔ فرانسیسی علاقے کے جو ہندوستانی یہاں رہتے ہیں انہوں نے میری خاطر یہ محفل سجائی ہے۔ میں اس کا مہمان ہوں جو ان میں سب سے زیادہ دولتمند ہے۔ میرے آتے ہی میزبان نے یاسمین کے پھولوں کے کئی لڑی کا ہار گلے میں ڈال دیا اور ایک نقرئی گلاب پاش سے مجھ پر چھڑکا ؤ کیا۔ گرمی کے مارے سانس رُک رہا ہے۔ تقریباً سب ہی مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ گویا کالے کالے سروں کی ایک قطار ہے جس پر مندری کی پگڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ نیم برہنہ دست بستہ نوکر تاڑ کے رنگین پتّوں کے بڑے بڑے پنکھوں کو ان کی کھوپڑیوں پر جھل رہے ہیں۔ اس خوش لباس مجمع میں جہاں مرد بھی جواہر جڑے ہیں، ان غریبوں کی برہنگی کمال درجہ موجب حیرت ہے۔

رقّاصہ سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ جشن میرے اعزاز میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جسے ذوق و اکتساب دونوں حاصل ہیں یوں مجھ پر توجہ کر رہی ہے۔

آج شام کو وہ دور دراز سے یہاں آئی ہے۔ دکن کے کسی مندر میں وہ شیو بھگوان کی داسی ہے۔ دور دور تک اس کا شہرہ ہے اور ایک ناچ کے لئے اسے بہت روپئے دینے ہوتے ہیں۔

وہ آگے پیچھے جھوم رہی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کے برہنہ سیمیں بازو مچل رہے ہیں اس کی انگلیاں طرح طرح سے مٹک رہی ہیں۔ انگشتِ پا جو بچپن سے اپنے کرتب کی مشق کرتے آئے ہیں اور بھی اچرج دکھا رہے ہیں۔ انگوٹھا برابر الگ اور ادھر کھڑا رہتا ہے۔

سنہرے کمر بند اور اس سینہ بند کے بیچ جس میں اس کے جوبن جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے چنپئی بدن اور گٹھے ہوئے سڈول جسم کی ذرا سی پھبن نظر آ رہی ہے۔ سینوں کے نچلے اُبھار کی تھرکن کو بھی ہم صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا رقص مختلف اداؤں کے اظہار کا ایک سلسلہ ہے۔ ایک قسم کی اداکارانہ یک شخصی تمثیل ہے۔ اس کا رہ رہ کر سامنے آنا اور جھک کر پیچھے لوٹ جانا۔ تماشائیوں کے جمگھٹ کو چیر کر مجھ پر ٹکٹکی باندھے ہوئے بہت قریب آ جانا اور پھر بجلی کی طرح اس تاریکی میں گھُل مل جانا جو دیوان خانوں کی پشت پر چھائی ہوئی ہے!

وہ شہوت اور ملامت کا ایک نظارہ پیش کر رہی ہے۔ پس منظر میں ساز ندے طنبوروں اور بانسریوں سے اس نظارہ کو سرودی لباس پہنا رہے ہیں۔

اداکاری کے ساتھ وہ زیرِ لب گاتی بھی جاتی ہے۔ اتنے دھیمے سُروں میں جنہیں اس کے سوا کوئی اور نہیں سُن سکتا۔ اس سے اس کی یادداشت تازہ ہوتی جاتی ہے۔ اور اپنے کرتب کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں اُسے مدد ملتی ہے۔

لو وہ دیوان خانے کے تاریک گوشے سے باہر نکلی، سونے روپے سے جگمگاتی ہوئی! گلہ و شکوہ کی پُر عتاب اداؤں کے ساتھ وہ میری طرف لپکتی ہے۔ اور اس

انداز سے مجھ پر ملامت کرتی ہے گویا فلک کو میرے گناہ کی ہولناکی کا تماشا دکھا رہی ہے۔

یک بیک رقاصہ طنز سے کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے۔ اپنی زہر آلود حقارت سے وہ مجھے عرق عرق کر دیتی ہے اور طعنہ زن مجمع کو انگلی اٹھا کر میری طرف متوجہ کرتی ہے یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی طعن و تشنیع بھی اسی طرح فرضی ہے جس طرح وہ پُرغضب بددعا لیکن اس اداکاری کے فطری ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔ اس کی کھلکھلاہٹ اور اس ہنسی کی صدائے بازگشت اس کے سرجوش سینہ میں گونج رہی ہے۔ اور جب وہ ہنستی ہے تو اس کا منہ، آنکھیں، ابرو، نیز ہانپتی اور کانپتی ہوئی چھاتیاں بھی ہنسنے لگتی ہیں۔

جب وہ اس طرح ہنستی ہوئی پیچھے بھاگتی ہے تو بلا کا اثر ہوتا ہے۔ اور تماشائی اس کے ساتھ ہنسنے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ پوری طاقت سے پیچھے پلٹتی ہے۔ اپنے سر کو اس طرح موڑ کر کہ مجھے دوبارہ نہ دیکھ سکے لیکن اب وہ ہولے ہولے بڑی شان کے ساتھ ادھر آ رہی ہے وہ طعن چھیڑنے کے لئے ہی تھا۔ اس کی محبت انتہا ہے۔ اتھاہ الفت نے اسے پرشکستہ کر کے اس صورت میں بھیجا ہے کہ کبھی تو وہ معافی کی التجا میں دونوں ہاتھ پھیلاتی ہے اور کبھی خود سپردگی کا یقین دلاتی ہے۔ اور اب جو وہ اپنے سر کو پیچھے پھینک کر اور نیم کشودہ لبوں میں گوہرِ دنداں کی آب دکھلا کر، جو ہیرے کی کیل کے نیچے جھلک رہے ہیں، بازگشت کرتی ہے تو وہ مجھے دعوتِ ہم رکابی دیتی ہے۔ بلکہ وہ مجھے حکم دے رہی ہے۔ اس کے بازو، اس کے جوبن، اس کے متوالے نین مجھے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔ اس کی زندگی کا ہر تار سراپا اذن بن گیا ہے۔ گویا وہ مجسم مقناطیس ہے۔ ذرا سی دیر میں بلا ارادہ کہیں میں اس کی دعوت پر لبیک نہ کہہ دوں۔

ان دلربائیوں نے مجھے گرفتارِ نظر کر لیا ہے۔ جھوٹے ہیں اس کی محبت کے دعوے! اس کی ہنسی کی طرح یہ بھی اس تماشے کے سیپارے ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا۔ اور پھر بھی اس احساس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ شاید اس عشوہ طرازی کا علم منظر میں ایک نئی اور شدید کشش پیدا کر دیتا ہے۔

جب وہ بھاؤ دکھاتی ہے تو دونوں سازندوں میں اور اس میں ایک مقناطیسی یا پُراسرار پوشیدہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بھی انسانوں کی قطار میں سے ہو کر آگے آتے اور پیچھے جاتے ہیں۔ آگے بڑھ کر پھر تین چار قدم پیچھے لوٹ جاتے ہیں۔ رقاصہ جب میرے پاس آتی ہے تو وہ بھی قریب آ جاتے ہیں لیکن اس کی واپسی کے پہلے ہی لوٹ جاتے ہیں۔ وہ کبھی نظروں سے اسے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور ان کی آتشیں نگاہیں اس پر جمی رہتی ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ منہ پھاڑ کر موذن کی سی فلک سیر آواز میں گاتے جاتے ہیں۔ یہ اونچے پورے سازندے سر جھکا کر اس کے ٹھینگے سے قد کا جائزہ لیا کرتے ہیں۔ ان کے وتیرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ استاد ہیں۔ جو اس رقاصہ کی روح میں سمائے ہوئے ہیں۔ گویا وہ اپنی آواز سے اس کی رہبری کر رہے ہیں اور وہ اپنے سانس کی گرمی سے اسے گرما رہے ہیں۔ یا یہ کہ وہ کوئی نازک اور فرخندہ تتلی ہے۔ جسے انھوں نے اپنی مرضی کا غلام بنا رکھا ہے اس پوری روش میں کوئی ایسی نامعلوم شے ہے جو غیر مرئی اور کنج فطرت معلوم ہوتی ہے۔

طائفہ جس جگہ بیٹھا تھا وہاں روشنی کچھ ہلکی ہلکی سی تھی۔ وہاں دو تین خوش لباس رقاصائیں بیٹھی ہوئی تھیں جن کا ناچ پہلے ہو چکا تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا کیونکہ وہ ایک زہریلے مگر حسین پھول سے ملتی جلتی تھی۔ دراز قامت اور چھریرا بدن جس کے اعضا بہت نازک معلوم ہوتے تھے اور آنکھیں کاجل کی لمبی لیک کے بغیر بھی بہت بڑی تھیں۔ گہرے کالے بال جن کے گچھے چوٹیوں میں گندھے ہوئے، گالوں پر لہرا رہے تھے۔ سیاہ لباس، سیاہ کمربند اور ہلکی سی روپہلی کور کی کالی نقاب۔ اس کے گہنوں میں زمرد کے سوا کچھ نہ تھا۔ کلائی اور ہاتھوں میں بیش بہا لعل اور ناک میں عقیق کا بلاق جو لبوں پر یوں لٹکا ہوا تھا گویا موٹے موٹے ہونٹوں

۴۳ پر خون کا ایک قطرہ ٹپک پڑا ہے۔

لیکن میں ان سب کو بھول گیا جب میں نے اس رانی کو، اس ستارہ جبیں کو دیکھا جو یکایک سازندوں کی قطار کو چیر کر نمودار ہو گئی۔ وہی جو سونے روپے میں لدی ہوئی سب کے بعد سامانِ نظارہ مہیا کرنے آئی تھی۔

یہ رقص طویل تھا۔ بہت طویل حتیٰ کہ تکان سی محسوس ہونے لگی۔ تاہم اس لمحے کے خوف سے میں ہراساں ہو رہا تھا جب وہ ختم ہو جائیگا اور میں پھر کبھی اسے نہ دیکھ سکوں گا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے ملامت اور مسکراہٹ کے نشتر لگائے۔ از سرِ نو اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کا تیز طنز میرے دل میں چبھ گیا اور لگاوٹ کے وہ اشارے میرے دل میں کھپ گئے۔

بالآخر وہ خاموش ہو گئی اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں ہوش میں آتا ہوں اور اس مجمع کو دیکھ کر یاد کرتا ہوں کہ یہ جشن اور اس کی حقیقت کیا تھی۔ اب برخاست ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور میں اپنا ہدیۂ تحسین پیش کرنے کی غرض سے رقاصہ کے پاس جاتا ہوں۔ وہ ایک جھینے بینے رومال سے منہ کا پسینہ پونچھ رہی ہے۔

ایشیا مارچ ۱۹۳۴ء

گرمی کے مارے اس کی پیشانی سے پسینہ کی بوندیں موتیوں سینے پر ڈھلک رہی ہیں اب بالکل بے نیازی، بے پروائی اور بے تکلفی کے ساتھ یہ تتلی باری بجا رہی تل تراساگر مجھے سلام کرتی ہے۔ اس ہندوستانی سلام کے بھولے پن میں بھی تیکھا طنز پنہاں ہے۔ ہر سلام کے ساتھ وہ اپنے رُخِ زیبا کا پردہ دار ہاتھوں کو بنالیتی ہے۔ جن کے پور پور میں ہیرے دمک رہے ہیں۔

کسی رقاصہ کی رُوح نسل اور نجابت کی کیا پرواکرتی ہے؟ وہ خاندانی نرتکیوں کی اولاد ہے جسے سینکڑوں اور ہزاروں سال سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ محض عیش و عشرت کی بندی ہو کر زندگی گذار دے۔

بینظیر اور بدرِ منیر کی شادی کا جلسہ

کروں راگ اور ناچ کا کیا بیاں ۔ قدیمی کسی وقت کا سا سماں
وہ اربابِ عشرت کا آپس میں مِل جمانا کھڑے راگ کا ٹے کے دل
وہ ایمن کی تانیں اِدھر اور اُدھر مِلے سُر طنبوروں کے با یک دگر
اور اس صف سے اک چھوکری کا نکل
اُلٹنا دوپٹے کا دے دے کے تال
کبھی پرملو، میں دکھاتی ادا
کبھی گت سری، ناچنا ذوق سے
اِدھر کی تو یہ گت اور اس کا یہ بھاؤ
کھڑی ہو کے دو گھونٹ حقّہ کے لے
انگوٹھی کی لے سامنے آرسی
اُلٹ آستیں اور مہری کا چاک
بنا کنگھی اور کر کے ابرو درست
دوپٹے کو سر پر اُلٹ اور سنبھل
پکڑ کان اور گنگھروؤں کو اُٹھا
اِدھر اور اُدھر رکھ کے کاندھے پہ ہاتھ
فتح چند کے ہاتھ کی مورت ایک
کبھی ناچنا اور گانا کبھی
جتانا ہُنر اپنا پہلے پہل
وہ بڑا سا قد اور گھنگرو کی چال
کہ جوں لوٹ کر ہو وے بجلی ہوا
کہ تیورا کے عاشق گرے شوق سے
اُدھر اوٹ میں نائیکہ کا بناؤ
چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے
وہ صورت کو دیکھ اپنی گلزار سی
نئے سر سے انگیا کو کر ٹھیک ٹھاک
جھٹک دامن اور ہو کے چالاک چُست
یکایک وہ صف چیر آ نکل
پہن پاؤں میں اور سر سے چھوا
چلے ناچتے آنا سنگت کے ساتھ
لجائی ہوئی چاند سی صورت ایک
رِجھانا کبھی اور بتانا کبھی

منظور حسین شورؔ ایم اے

نوائے وقت

سینۂ وقت میں پوشیدہ ہیں لاکھوں خورشید ہر شبِ تار سے اک تازہ سحر پیدا کر
خاک میں فطرتِ آدم کی جو مضمر ہیں ہنوز اُنہیں ذرّات سے خورشید و قمر پیدا کر
ذرّے ذرّے میں یہاں ایک دھڑکتا دل ہے جلوے محسوس ہیں پنہائے نظر پیدا کر
نکہت و نور کی ہر موج ہے طغیانِ نشاط نفسِ غم میں بھی نغموں کا اثر پیدا کر
شعلے درکار ہیں ترکیبِ نشیمن کے لئے اب گُل و لالہ سے طوفانِ شرر پیدا کر
ذوقِ تقلید ہے افکار و نظر کی توہین لغزشِ پا میں بھی اندازِ خضر پیدا کر
کارواں رختِ سفر کھول چکے منزل پر شام منزل ہی سے اب صبحِ سفر پیدا کر
داستانِ مے و مینا تو بہت عام ہوئی کوئی افسانہ بعنوانِ دگر پیدا کر

یوجین اونیل[1] اور فضل حق قریشی دہلوی

آرٹسٹ کی زندگی اور موت

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

افراد

(۱) مسز رولینڈ

(۲) الفریڈ رولینڈ (اسٹیج کے باہر)

منظر:- امریکہ کا شہر نیویارک ایک مختصر مکان کا چھوٹا سا کمرہ جو بیک وقت باورچی خانے اور کمرۂ طعام کا کام دیتا ہے۔ عقب میں دائیں جانب ایک دروازہ جو ایک بیرونی وسیع ہال میں کھلتا ہے۔ دروازے کے بائیں جانب ہاتھ دھونے کا نل اور گیس کا چولھا چولھے سے ذرا ہٹ کر لکڑی کا گنجینہ جس میں طشتریاں وغیرہ رکھی ہیں۔ بائیں طرف دو کھڑکیاں جن کی دہلیزوں میں چند گملے غفلت و لاپروائی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کھڑکیوں کے سامنے ایک میز جس پر روغنی کپڑا بچھا ہے بید لگی ہوئی دو کرسیاں میز کے قریب رکھی ہیں۔ ایک تیسری کرسی عقبی دروازے کے دائیں جانب دیوار کے پاس پڑی ہے۔ داہنی دیوار کا ایک دروازہ خواب گاہ میں کھلتا ہے۔ جہاں مختلف قسم کے کپڑے کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے ہیں۔ کمرے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک الگنی بھی بندھی ہوئی ہے

۴۵ صبح کے تقریباً ساڑھے دس بجے ہیں۔ موسم خوشگوار ہے۔ دھوپ کھلی ہوئی ہے۔ مسز رولینڈ خواب گاہ سے جماہی لیتی ہوئی نکلتی ہے۔ اس کے ہاتھ چہرے مہرے کو درست کرنے میں مصروف ہیں۔ خصوصاً انگلیاں بڑی سرعت کیساتھ بالوں میں پن لگا رہی ہیں۔ بال گلہری کے گھونسلے سے نکلے ہوئے گوڈر کی طرح ایک گچھے کی شکل میں چند یا پر جمے ہوئے ہیں۔ اس کا قد میانہ ہے۔ جسم بے ڈول اور غیر جاذب نظر نیلگوں لباس جس کی تراش بغیر کسی اصول کے وضع کی ہے جسم پر بے زیب معلوم ہوتا ہے ڈھیلا ڈھالا اور کہیں کہیں سے پھٹا چرا۔ خستہ حال۔ نقش و نگار میں وہ سیدھی سادی با قاعدگی ہے۔ جس میں کوئی حسن کاری نہ ہونے کے باعث جاذبیت نہیں ہوتی۔ عمر ۲۲ سال ہوگی۔ مگر چہرے سے بڑھاپن ظاہر ہونے لگا ہے۔

وہ کمرے کے وسط میں پہنچ کر پھر جماہی لیتی ہے۔ اور ایک طویل انگڑائی کے بعد ہاتھ ڈھیلے [illegible] تی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ دیر تک سونے کے باوجود اس کی نیند نہیں بھری۔ اس کی خوابناک آنکھیں کمرے میں کسی چیز کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ چند لمحے کے بعد وہ مریل بیل کی طرح آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گیس کے چولھے کے پاس پہنچتی ہے۔ اور دیا سلائی کھینچ کر اسے روشن کر دیتی ہے۔ پھر نل کے پانی سے کیتلی بھر کر شعلوں پر رکھ دیتی ہے۔ اس کام سے گویا تھک کر وہ میز کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر دراز ہو جاتی ہے۔ اور پیشانی پر اس طرح انگلیاں پھیرتی ہے گویا سر میں درد ہو رہا ہے۔ اچانک اس کے چہرے پر ایک تازگی دوڑ جاتی ہے۔ گویا کوئی بھولی بسری رات یاد آگئی ہے۔ گنجینے اور اس کے اندر رکھی ہوئی طشتریوں کا جائزہ لیتی ہوئی اس کی نظریں خواب گاہ کے دروازے کی طرف اٹھتی ہیں اور کان ایک ایسی آہٹ پر لگ جاتے ہیں جو خود اس کے اوہام خیالی نے پیدا کی ہیں۔

---

[1] یوجین اونیل امریکہ کا سب سے کامیاب تمثیل نگار ہے اور اسے نوبل پرائز مل چکا ہے

مسز رولینڈ (آہستہ لہجہ میں) الفریڈ ...... الفریڈ ...... دوسرے کمرے سے کوئی جواب سُنائی نہیں دیتا۔ مجبوراً وہ کسی قدر مشکوک مگر بآواز بلند کہتی ہے) یہ ظاہر مت کرو کہ تم سو رہے ہو۔ (اس کا بھی کوئی جواب خواب گاہ سے نہیں ملتا۔ اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ کوئی جواب نہیں ملیگا۔ وہ کرُسی سے اٹھتی ہے۔ اور پنجوں کے بل گنجینہ تک جاتی ہے۔ پھر پوری احتیاط کیساتھ کہ کہیں کوئی آواز نہ ہو جائے۔ وہ دروازہ کھول کر شراب کی بوتل اور گلاس نکالتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں دوسری اشیاء کے پیچھے اس طرح چھپی ہوئی ہیں کہ پہلی جھلک میں کسی کو نظر نہ آئیں۔ حد درجہ احتیاط کے باوجود گلاس کا کنارہ ایک طشتری سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس آواز سے وہ خود اس طرح چونک پڑتی ہے۔ گویا اس کا ضمیر مجرم ہے اور ملتجیانہ نظروں سے دروازہ کی طرف دیکھتی ہے گویا معافی کی خواستگار ہے)

(کپکپاتے ہوئے لہجہ میں) الفریڈ!

(ایک لمحہ وہ خاموش رہتی ہے۔ کہ شاید کوئی آواز سنائی دے۔ مگر مطمئن ہو کر شراب کے چند جرعے گلاس میں انڈیلتی ہے اور غٹ غٹ پی جاتی ہے۔ پھر انتہائی عجلت کیساتھ کہ کہیں آخر وقت میں راز فاش نہ ہو جائے وہ گلاس اور بوتل کو گنجینہ میں چھپا دیتی ہے۔ اور دروازہ کو اسی احتیاط کیساتھ جس طرح کھولا تھا آہستہ

۴۶ آہستہ بند کر دیتی ہے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر اور اطمینان کا سانس لینے کے بعد کرسی پر دوبارہ بیٹھ جاتی ہے۔ الکحل کے وہ نشہ آور گھونٹ اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو شراب بنا دیتے ہیں۔ جس کے باعث تمام چہرا تمتما اٹھتا ہے۔ رخساروں پر سُرخی دوڑ جاتی ہے اور معلوم ہونے لگتا ہے۔ کہ اس کے مردہ جسم میں زندگی کی تھوڑی سی رمق باقی ہے۔ تبسم کی ہلکی لہر اس کے لبوں پر نمودار ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر دروازہ کی طرف دیکھتی ہے لیکن وہاں زندگی کی کوئی لہر محسوس نہیں ہوتی۔ پھر پلٹ کر اس کی نظریں کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ اور صدری پر جم جاتی ہیں۔ وہ چوروں کی طرح کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور قریب پہنچ کر رُک جاتی ہے۔ نظر کے سامنے نہ سہی لیکن خواب گاہ میں کسی کی موجودگی کا اسے یقین ہے۔ وہ کان لگا کر سُننے کی کوشش کرتی ہے)

(خفیف متبسم لہجہ میں) الفریڈ!!

(اس دفعہ بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔ جھپٹ کر وہ کھونٹی کے اوپر سے کوٹ اور صدری اتار لیتی ہے۔ اور ان کو لیکر بدستور کرسی پر آن بیٹھتی ہے۔ جیب تلاشی کی تمام سرگرمیاں بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ کیونکہ مطلب کی کوئی چیز نہیں ملتی مگر اچانک صدری کی اندرونی جیب سے ایک خط برآمد ہوتا ہے)

(طرزِ تحریر کو دیکھتے ہوئے) ہاں ہاں یہ تحریر میں پہچانتی ہوں۔

(وہ خط کھول کر پڑھنا شروع کرتی ہے۔ شروع میں چہرے پر نفرت اور غصّے کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں تبدیلی ہوتی ہے حتیٰ کہ فاتحانہ سرکشی اپنا رنگ جما لیتی ہے۔ چند لمحے وہ کسی سوچ میں غرق رہتی ہے۔ اس طرح کہ ہاتھوں پر ٹیکے ہوئے خط پر نظریں جمی رہتی ہیں اور لبوں پر ایک ظالمانہ تبسم آجاتا ہے پھر وہ خط کو ملفوف کر کے صدری کی اسی جیب میں رکھ دیتی ہے اور اتنی احتیاط کیساتھ کہ سونیوالا بیدار نہ ہو جائے۔ دونوں چیزیں وہیں کھونٹی پر ٹانگ دیتی ہے۔ وہ خوابگاہ پر ٹھٹک کر ایک آخری نظر ڈالتی ہے)

(تند و تیز لہجہ میں)! الفریڈ — بلند تر لہجہ میں) الفریڈ

(گھٹی ہوئی کراہنے کی آواز جب کہ کوئی ساتھ ساتھ جماہی بھی لے رہا ہو۔ دوسرے کمرے سے سُنائی دیتی ہے)

تمہیں نہیں معلوم کہ اب اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے؟ کیا تم تمام دن پلنگ سوار رہنا چاہتے ہو؟ (پلٹ کر اپنی کرسی کی طرف آتے ہوئے) اس کا تو مجھے کامل یقین ہے کہ تم اس حد تک کاہل اور سُست ہو کہ تمام دن بستر پر پڑے رہو۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر بےچینی کے ساتھ کھڑکی کے باہر دیکھتی ہے۔ خدا جانے اس وقت کیا بجا ہو گا۔ جب سے تم نے اپنی اہمال پسندی کے باعث گھڑی رہن رکھی ہے۔ ہم وقت کا صحیح اندازہ لگانے کے لائق بھی نہیں رہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہمارے پاس بس وہی آخری قیمتی چیز تھی۔ جس کو رہن رکھ کر تم نے خاک میں ملا دیا۔ ہر چیز ہمارے قبضہ سے نکل گئی۔ اسی امید موہوم میں کہ شاید کوئی روزگار مل جائے (وہ فورِ جوش میں اپنا پاؤں فرش پر مارنے اور دانتوں سے لب چبانے لگتی ہے۔ ایک لمحہ خاموشی کے بعد) الفریڈ! اُٹھو۔ فوراً اٹھ جاؤ۔ تم نے سُنا یا نہیں۔ میں باہر جانے سے پہلے بستر طے کر دینا چاہتی ہوں۔ میں تمہارے ہاتھوں اس جگہ بدنظمی سے اکتا گئی ہوں۔ (بظاہر مطمئن انداز سے) یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ تم کو کسی قسم کا بھی روزگار مل جانے کے بعد ہم اسی جگہ نہیں پڑے رہیں گے۔ خدا جانتا ہے کہ میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں۔ اپنی ہمتوں سے زیادہ۔ صبح سے شام تک سینے پرونے میں مصروف رہتی ہوں۔ اور تم تمام دن دنیا کے چھٹے ہوئے اوباش یعنی مصوّروں شاعروں اور راویوں کے ساتھ تضیع اوقات کرتے ہو ہوٹلوں اور میخانوں میں۔

(ایک خفیف وقفہ۔ اس دوران میں وہ پہنچ پیالی کیساتھ اس طرح

کھیلتی ہے۔ گویا اس کے اعصاب میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے)

اور تم روپیہ لاؤ گے کہاں سے۔ آخر مجھے بھی تو معلوم ہو؟ اس ہفتہ مکان کا کرایہ نہیں دیا گیا۔ اور تم مالک مکان کی ذہنیت سے واقف ہو۔ وہ اس کے بعد لمحے ایک لمحہ قیام کا بھی روادار نہیں ہوگا۔ تم کہتے ہو کہ روزگار نہیں ملتا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔ تم نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ تمہارا تمام دن شاعری کی بھول بھلیاں میں بسر ہوتا ہے۔ بس لکھے جاؤ۔ بے معنی نظمیں جنھیں کوئی پھوٹی کوڑی کے عوض بھی نہیں خرید سکتا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان میں ہوتا ہی کیا ہے۔ ملک اور قوم کی خدمت تو کجا تم ان کے ذریعے اپنی خدمت بھی نہیں کر سکتے میرا تجربہ ہے کہ مجھے روزگار جلدی مل جاتا ہے۔ اور صرف اسی طرح ہم اب تک فاقہ کی موت مرنے سے بچے ہوئے ہیں۔

(اٹھ کر چولھے کے قریب جاتی ہے اور کیتلی میں نظر ڈال کر دیکھتی ہے۔ یہ معلوم کرنے کیلئے کہ پانی کھولا یا نہیں۔ پھر واپس آکر بدستور کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

خواہ کچھ بھی ہو آج تو تمہیں کچھ نہ کچھ رقم پیدا کرنی ہی پڑے گی۔ کیا ضروری ہے کہ میں ہی مصیبت میں پیٹوں۔ میں اس سے زیادہ اپنی جان نہیں کھپا سکتی۔ اب تمہیں اپنی آنکھیں کھولنی پڑیں گی۔ اپنے حواس درست کرنے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم۔ بھیک مانگو، قرض لو یا چوری کرو۔ لیکن روپیہ لاؤ۔ روپیہ (نفرت آمیز قہقہہ کے ساتھ) لیکن کہاں سے اور کس طرح؟ میں جاننا چاہتی ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ تم اس قدر مغرور ہو کہ بھیک نہیں مانگ سکتے۔ اور قرض اس قدر لے چکے ہو کہ اب دوست احباب اور عزیز و اقارب کو تم پر اعتماد نہیں رہا۔ چوری کرنے کیلئے اعلیٰ ہمت اور قوی دل کی ضرورت ہے۔ جس کی تمہارے پاس کمی ہے (ایک لمحہ کے بعد غصہ میں کھڑے ہو کر) کیا تم ابھی تک بیدار نہیں ہوئے؟ خدا کی پناہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک بار اٹھ کر پھر سو گئے ہو۔ یا پڑے اینڈ رہے ہو۔ (وہ خواب گاہ کے دروازے کے قریب جا کر اندر نظر ڈالتی ہے۔ غنیمت ہے تم اٹھ بیٹھے۔ وقت کا احساس تو ہوا۔ لیکن یہ کیا؟ میری طرف ان نظروں سے مت دیکھو۔ تمہارے یہ انداز مجھے زیادہ بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ میں تمہاری ذہنیت کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ اتنی اچھی طرح کہ تم میرے سمجھنے کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (دروازے کے پاس سے ایک معنی خیز انداز میں ہٹتے ہوئے) میرے عزیز شوہر! مجھے بہت کچھ معلوم ہے۔ اور حال میں جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کی خبر نہ کرنا۔ جانے سے قبل تم کو سب کچھ بتا دوں گی۔ فی الحال کیوں پریشان ہو۔

(وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہو کر تیوری پر بل ڈالتی ہے۔ پھر زیادہ برہمی کے ساتھ ہوں۔ شاید اب تک مجھے ناشتہ تیار کر لینا چاہیئے تھا۔ خواہ گھر میں کچھ موجود ہو بھی یا نہیں۔ تم کو روپے پیسے سے کیا غرض۔ ٹھیک ہے نا۔ (وہ منتظر رہتی ہے کہ شاید کوئی جواب ملے۔ مگر بے سود) میرا سوال ہی حماقت آمیز ہے۔ (مختصر مگر لرزہ خیز قہقہے کے بعد) اب ضرورت ہے کہ میں تمہیں اور زیادہ سمجھنے کی کوشش کروں۔ کل رات جب تم برہم ہو کر یہاں سے گئے تو میں جانتی تھی کہ اس کا نتیجہ کیا رہے گا۔ اب تم پر ایک لمحہ کیلئے بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تم کس قدر آن بان سے گھر واپس آئے۔ ہمارا باہمی جھگڑا گویا تمہارے لئے ایک معقول بہانا بن گیا۔ کہ تم گھر سے دور رہ کر اپنے آپ کو جانوروں سے بدتر کر لو۔ اور پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ گھڑی رہن رکھنے کی کیا خاص ضرورت تھی۔ سوائے اس کے کہ تھوڑی بہت شراب خرید کر تمام رقم برباد کر دی۔

(انگیٹھی کے قریب جا کر طشتریاں اور پیالیاں وغیرہ نکالتی ہے۔ لیکن سلسلۂ کلام جاری رہتا ہے)

جلدی کرو۔ آج کل ناشتہ تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ خدا تمہارا بھلا کرے تمہاری عنایتوں کے باعث ہمارے گھر میں معمولی روٹی مکھن اور کافی کے سوا
اور رکھا کیا ہے۔ پھر بھی اسے غنیمت سمجھو۔ میں نے سی پرو کر چار پیسے کمائے ورنہ 47
اس کے بھی لالے تھے۔

(وہ ایک دھماکے کیساتھ روٹی کو میز پر پٹکتی ہے)

روٹی باسی ہو کر سوکھ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اسے پسند کرو گے۔ تم کو اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ملنی چاہیئے۔ لیکن میں تمہارے ساتھ کیوں مصیبت پیٹوں۔ (چولھے کے قریب جاتے ہوئے) ایک منٹ میں کافی تیار ہو جائیگی اور تمہیں یہ توقع رکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ (یکایک بہت غصے کے ساتھ) کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر تم کیا کر رہے ہو؟ (دروازے کے قریب جا کر نظر ڈالتی ہے)

بہرحال لباس تو تم نے تقریباً پہن ہی لیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تم دوبارہ پلنگ پر تو نہیں لیٹ گئے۔ کیونکہ یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ آج تم کس قدر بھیانک معلوم ہو رہے ہو۔ خدا کے لئے ڈاڑھی صاف کرو۔ تمہیں دیکھ کر طبیعت ابکانے لگتی ہے۔ تم آوارہ گرد معلوم ہو رہے ہو۔ ایسی حالت میں تمہیں روزگار نہ ملے تو تعجب کی بات نہیں۔ دوسروں کو الزام کیوں دیا جائے کہ وہ

لازم نہیں رکھتے۔ نفاست سے تمکو درگا بھی واسطہ نہیں ہے۔ (چولہے کے قریب جاتے ہوئے) یہ دیکھو۔ گرم پانی کی کافی مقدار میں موجود ہے۔ اب کسی عذر کی گنجائش نہیں ہے۔ (ایک پیالی میں تھوڑا سا گرم پانی کیتلی کے اندر سے اُنڈیلتی ہے) لو یہ رہا پانی۔

ایک مردانہ ہاتھ خواب گاہ کے دروازے کے باہر نکلتا ہے۔ اس میں خفیف سا رتعاش ہے۔ انگلیاں بھی کپکپا رہی ہیں۔ پیالی کو سنبھالنے کی کشمکش میں تھوڑا پانی چھلک کر فرش پر گر پڑتا ہے۔

(ملامت کرتے ہوئے ذرا ہاتھ کی لغزش ملاحظہ ہو۔ کہتی ہوں کہ تم شراب پینی چھوڑ دو۔ تم اسے برداشت نہیں کر سکتے لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ فرش کی طرف دیکھ کر) فرش کی حالت بھی قابل دید ہے سگرٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے۔ دیا سلائیاں اور راکھ۔ کونے کونے میں چپّہ چپّہ پر کیا تم انہیں راکھہ دان میں نہیں ڈال سکتے۔ تمہاری بلا سے۔ تمہیں میری مصیبتوں کا احساس ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تمہیں کمرے کے اندر جھاڑو دینی پڑے تو حقیقت معلوم ہو۔

(جھاڑو اٹھا کر کسی قدر شرارت کیساتھ صفائی شروع کر دیتی ہے اس طرح کہ خوب خاک اڑنے لگتی ہے۔ دوسرے کمرے سے شترا تیز کرنیکی آواز سنائی دیتی ہے)

۴۱ (جھاڑو دیتے ہوئے) جلدی کرو میری روانگی کا وقت قریب آگیا ہے۔ اگر مجھے دیر ہو گئی تو اندیشہ ہے۔ کہ ملازمت سے جواب نہ مل جائے۔) اور پھر ظاہر ہے کہ گذارا کیوں کر ہو سکے گا۔ (طنزاً) اور ہاں تمہیں بھی تو کام کی تلاش میں جانا ہے ورنہ بیکاری تمہیں زیادہ تباہ کر دے گی۔ (میز کے نیچے سے کوڑا نکالتے ہوئے) میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم آج روزگار کی تلاش میں جاؤ گے یا نہیں تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ دوسرے عزیز و اقارب ہماری مدد کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ وہ بھی تمہارا رنگ اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ (ایک لمحہ تک خاموشی کیساتھ جھاڑو دینے کے بعد) میں اس قسم کی زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ میں سوچ رہی ہوں۔ کہ اپنے میکے چلی جاؤں لیکن مشکل یہ آپڑی کہ سب میرے گھر والوں کو میری زبوں حالی کا علم ہو جائے گا۔ ابھی تک وہ جانتے ہیں کہ میں لکھ پتی رولینڈ کے اکلوتے بیٹے کی شریک حیات ہوں۔ رولینڈ جو گریجویٹ ہونے کے علاوہ ایک کہنہ مشق شاعر اور بے مثل افسانہ نویس بھی ہے۔ جو اس وقت شہر کی ناک ہے۔ ہوں!۔ (حقارت آمیز لہجہ میں) لیکن دنیا کے بہت سے لوگ اس ممتاز ہستی سے حسد کرنا چھوڑ دیں گے۔ اگر حقیقت بے نقاب ہو جائے۔ تمہارے لکھ پتی باپ مرنے سے قبل ہزاروں کے زمیندار تھے۔ اور شادی کے بعد سے آج تک تم نے اپنی بیوی کیلئے کتنی رقم صرف کی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اور اس پر یہ غرور ہے کہ تمہاری شریک حیات بننا گویا میرے لئے باعث فخر ہے۔ کیا اس لئے کہ میں بے شمار مصیبتوں میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ تم اپنے دوستوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے شرم محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ میرا باپ بقّال ہے۔ اور خود تم کیا ہو؟ میرا باپ کم سے کم ایماندار سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ افتخار تمہارے باپ کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔ تمہارے لکھ پتی باپ کو جو مرنے کے وقت ہزاروں کا قرضدار تھا۔

(وہ بڑی سُرعت سے کوڑے کو دروازے کی طرف لے جا رہی ہے۔ ایک لمحہ کیلئے جھاڑو کا سہارا لیکر جھک جاتی ہے)

تم چاہتے تھے۔ ہر شخص یہ خیال کرلے کہ تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے مجبور کئے گئے ہو۔ تمہیں میری حالت زار پر رحم آگیا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ شادی سے قبل تم بڑی دلیری کے ساتھ میری محبت کا راگ الاپتے رہے اور تم نے کوشش کی کہ میں تمہارے ہر فریب کو ایک صداقت سمجھوں۔ لیکن اب میں اصلیت سے ناواقف نہیں رہی۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں نے بے حسی کی زندگی بسر نہیں کی ہے۔ (سنجیدگی سے) غنیمت ہے کہ ہمارا غریب بچّہ مر کر پیدا ہوا۔ اچھا ہوا کہ تم اس کے باپ نہ بن سکے۔

ایک لمحہ کیلئے خاموشی کیساتھ جھاڑو دیتی رہتی ہے۔ پھر ایک وحشیانہ مسرّت کے ساتھ سلسلۂ گفتگو کو جاری کرتی ہے) لیکن صرف میری ہی ذات اس امر کی شکر یہ ادا کرتی ہے کہ تمہاری عنایتوں سے میری زندگی وبال جان بنی ہوئی ہے بلکہ ایک ہستی اور بھی ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ اور اب وہ تم سے شادی کرنے کی امید بھی ترک کر چکی ہے۔ اس کا بھی مجھے علم ہے۔ (دوسرے کمرے میں سر ٹیڑھا کر) ہیلن کی بابت کیا رہا؟ وہ نیم خوفزدہ ہو کر اُلٹے قدموں ہٹ جاتی ہے) میری طرف اس طرح مت دیکھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے خط پڑھ لیا ہے۔ آخر اس میں کیا ہرج ہے؟ یہ میرا حق تھا میں تمہاری شریک حیات ہوں اور میں اس سلسلہ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ لہذا مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔ مجھے گھور کر مت دیکھو۔ تم اپنے جادو بھرے انداز سے میرے دل کو نہیں موہ سکتے۔ اگر میں چاہوں تو آج صبح بغیر ناشتے کے تم کو باہر بھیج سکتی ہوں۔ (وہ جھاڑو کو ایک کونے میں رکھ دیتی ہے) تم نے میری خدمات کے عوض شکریہ تک کبھی ادا نہیں کیا (وہ چولہے کے قریب آکر کیتلی میں کافی ڈال دیتی ہے) کافی تیار ہو گئی ہے۔ میں تمہارا انتظار نہیں کر سکتی وہ دوبارہ اسی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے، کچھ دیر بعد پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ترش لہجہ میں)

آج صبح ہی صبح میرے سر میں درد ہو رہا ہے ۔ کس قدر شرمناک امر ہے۔ کہ اس حالت کے باوجود مجھے ایک گندے کمرے میں دن بھر کام کرنے کیلئے جانا پڑے گا ۔ اور میں آج نہ جاتی ۔ اگر تمہارے اندر ذرا بھی انسانیت ہوتی ۔ میرا حق ہے ۔ کہ بجائے تمہارے میں تمام دن آرام سے پلنگ پر پڑی رہوں ۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں گذشتہ سال کس قدر بیمار رہی ہوں ۔ اور پھر بھی اگر میں ذاتی آسائش کے لئے کچھ خرچ کر کرا دوں تو تم اعتراض کرتے ہو ۔ تم اتنا بھی نہیں چاہتے کہ میں کوئی تقویت کی دوا استعمال کر لوں (بلند قہقہے کے ساتھ) میں جانتی ہوں کہ میری موت تمہارے لئے باعث مسرت ہوگی ۔ میں تمہارے راستے میں ایک کانٹا بنی ہوئی ہوں ۔ میرے بعد تم کو آزادی ہوگی ۔ تم اُن بیوقوف لڑکیوں پر آسانی سے ڈورے ڈال سکو گے ۔ جو تمہارے اور تمہاری قابلیت کے متعلق زبردست غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ جو تمہیں خدا جانے کیا سمجھتی ہیں ۔ یہ ہیلن اور اسی قماش کی دوسری نوجوان لڑکیاں ۔

(دوسرے کمرے سے ایک دردناک آہ سنائی دیتی ہے ۔)

(اطمینان کے ساتھ) ٹھیک بالکل ٹھیک ۔ میں جانتی تھی کہ تم استرے سے اپنے آپ کو زخمی کر لو گے ۔ اس طرح شاید تمہیں کچھ سبق مل جائے ۔ تم خود بھی جانتے ہو کہ تمہیں رات رات بھر آوارہ گردی کرتے ہوئے اور شراب پیتے ہوئے زندگی خراب نہیں کرنی چاہیئے ۔

(وہ دروازے کے قریب جا کر اندر کی طرف دیکھتی ہے ،)

تم اس قدر زرد کیوں نظر آ رہے ہو ؟ تم آئینہ میں اپنے ہی عکس کو اس قدر گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو ؟ خدا کے لئے اپنے چہرے سے اس خون کو پونچھ ڈالو ۔ (سہم کر) کس قدر خوفناک منظر ہے ۔ (پُرسکون لہجہ میں) تاہم مناسب یہی ہے ۔ میں خون کا نظارہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی (وہ جھجک کر پیچھے ہٹ جاتی ہے) میرا خیال ہے کہ تم کوشش نہ کرو اور کسی حجام کی دوکان پر چلے جاؤ ۔ تمہارے ہاتھ خوفناک طریقے پر کپکپا رہے ہیں ۔ لیکن تم مجھے گھور کیوں رہے ہو ؟ (وہ دروازے کے پاس پلٹ آتی ہے) کیا اس خط کی وجہ سے تم مجھ پر برہم ہو رہے ہو ! آخر وجہ ؟ اس کو پڑھ لینا میرا حق تھا میں تمہاری شریک حیات ہوں ۔

(واپس آ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ۔ ایک لمحہ خاموش رہتی ہے ،)

میں پہلے سے جانتی تھی کہ تم کسی نہ کسی پر ڈورے ڈال رہے ہو ۔ میں تمہارے اس چکمہ میں نہیں آ سکتی ۔ کہ تم اپنا قیمتی وقت دارالمطالعہ میں بسر کرتے ہو ۔ اچھا بتاؤ تو یہ ہیلن کون ہے ؟ کیا کوئی مصورہ ہے ؟ یا اسے بھی شعروشاعری کا شوق ہے اس کے خط سے کم سے کم یہی ظاہر ہوتا ہے ۔ میں شرط لگاتی ہوں کہ اس نے تمہارے کلام کو ایک نوشتۂ قدرت سے زیادہ قابل تحسین بتایا ۔ اور تم نے ایک بیوقوف کی طرح ان الفاظ کو صحیح سمجھا ۔ کیا وہ نوجوان اور خوبصورت ہے ؟ کبھی میں بھی جوان اور خوبصورت تھی ۔ اس وقت تم مجھے اپنی شاعرانہ رنگین بیانی سے بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے ۔ لیکن تمہارے ساتھ رہ کر ہر عورت اپنی زندگی سے اکتانے لگے گی ۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے ۔

(کھڑے ہو کر کافی کو چولھے کے اوپر سے اُتار لیتی ہے ،)

ناشتہ تیار ہے ۔ (نفرت سے نظر ڈال کر) ناشتہ ! (صرف اپنے لئے ایک پیالی میں کافی انڈیلتی ہے ۔ اور چائے دانی کو میز پر رکھ دیتی ہے ۔) تمہاری کافی ٹھنڈی ہو جائے گی ۔ تم کیا کر رہے ہو ؟ حجامت ختم نہیں ہوئی ؟ خدا کے لئے بس کرو ۔ ان دنوں کسی نہ کسی صبح کو تم کوئی گہرا زخم کھاؤ گے ۔

(روٹی میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر مکھن لگاتی ہے ۔ بعد کی گفتگو کے دوران میں وہ توس کھاتی اور کافی کا گھونٹ لیتی جاتی ہے ۔)

ناشتہ ختم کرتے ہی مجھے بھاگ جانا پڑے گا ۔ ہم دونوں میں سے بہرحال ایک کو کام کرنا ہی پڑے گا ۔ (ناراضگی کے ساتھ) بتاؤ ۔ تم روزگار کی تلاش میں جاؤ گے یا نہیں؟ ۴۹
مجھے یقین ہے کہ تمہارے مخلص دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی تمہاری مدد کرنے کے لئے تیار ہو جائیگا ۔ بشرطیکہ وہ تمہیں کسی لائق سمجھتا ہو ۔ لیکن میرا قیاس ہے کہ وہ سب تمہاری چرب زبانی کے شیدائی ہیں ۔

(ایک لمحہ کیلئے خاموش بیٹھ جاتی ہے ،)

وہ ہیلن خواہ کوئی بھی ہو ۔ مجھے اس پر ترس آتا ہے ۔ کیا تم دوسروں کے جذبات کو محسوس نہیں کرتے ؟ اُس کے خاندان کے لوگ کیا کہیں گے ؟ اپنے خط میں اس نے اس قسم کا ذکر کیا ہے ۔ آخر اس نے کیا فیصلہ کیا ہے ؟ ایک بچے کی ماں بنے گی ۔ یا کسی دائی وغیرہ کی مدد سے بدنامی کے داغ کو قبل از وقت مٹا دے گی ۔ یہ معاملہ ہے بہت پُرلطف ۔ لیکن اس غریب کے پاس روپیہ کہاں سے آئیگا ؟ کیا وہ کسی امیر گھرانے کی لڑکی ہے ؟

(وہ رُک جاتی ہے ۔ کہ شاید ان سوالات کے طومار میں سے کسی ایک کا جواب مل جائے ۔)

ہاں ! میں جانتی ہوں ۔ تم اس کی بابت مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے ۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے اس پر ضرورت سے زیادہ ترس آ رہا ہے ۔ اسے اپنے نیک و بد کا احساس ہونا چاہیئے تھا ۔

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مدرسہ میں پڑھنے والی کج فہم لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔ کیا اسے معلوم ہے کہ تم شادی شدہ ہو؟ یقیناً اُسے معلوم ہونا چاہئیے تمہارے سب دوستوں کو معلوم ہے کہ تم ایک دل سوز ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انہیں تمہاری حالت پر ترس آتا ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ اُن کی نگاہ کے سامنے نہیں ہے۔ اگر وہ مجھ سے گفتگو کریں تو اُن کے نظرئیے ہی بدل جائیں۔

(کھانے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اور گفتگو ذرا رُک رُک کر تی ہے)

اگر ہیلن کو یہ معلوم ہے کہ تم شادی شدہ ہو تو سمجھنا چاہئیے کہ وہ بہت ہی لائق لڑکی ہے۔ پھر وہ کس بات کی منتظر ہے؟ بس یہی نا کہ میں تمہیں طلاق دوں اور وہ تم سے شادی کر لے۔ کیا وہ سمجھتی ہے کہ میں اتنی بیوقوف ہوں؟ تم خود بھی جانتے ہو کہ مجھ سے طلاق لے کر چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ میں اس قسم کی غلطی نہیں کر سکتی۔

(کافی کی پیالی خالی کر دیتی ہے۔)

میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ وہ اس لائق ہے کہ اُسے جس قدر بھی روحانی صدمے پہنچیں کم ہیں۔ رہی میری رائے سو میرا خیال ہے۔ کہ تمہاری ہیلن ایک بازاری عورت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ۵۰

(دوسرے کمرے سے تکلیف کی ایک مبہم سی آواز سنائی دیتی ہے)

کیا پھر کہیں سے کاٹ لیا۔ خوب ہوا۔ تمہارا یہی علاج ہے۔ اچھا اب مجھے دوڑ جانا چاہئیے میرے لئے اس قسم کی زندگی بسر کرنا بہت دلچسپ ہے۔ میں تمہاری ستم رانیاں زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتی۔

(اسے ایک عجیب آواز سنائی دیتی ہے۔ اور وہ اس کی حقیقت سمجھنے کے لئے کان لگا کر کھڑی ہو جاتی ہے)

ہیں! یہ کیا! تم نے تمام پانی انڈیل دیا۔ تم انکار نہیں کر سکتے۔ فرش پر اس کے ٹپ ٹپ گرنے کی آواز مجھے صاف سُنائی دے رہی ہے۔ (ایک نا معلوم خوف کی مُبہم سی کیفیت اس کے چہرے پر نمودار ہوتی ہے۔) الفریڈ! تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ (وہ آہستہ آہستہ کمرے کی طرف بڑھتی ہے۔ کرسی سے لڑھک کر گرنے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ اور فرش سے کسی چیز کا تصادم ہوتا ہے۔ وہ خوف سے تھرتھراتی ہوئی کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے)

الفریڈ! — الفریڈ! میری بات کا جواب دو۔ تم کس چیز سے ٹکرا کر گرے ہو۔ کیا اس وقت بھی تم نشہ کی حالت میں ہو۔

الفریڈ!

(وہ دروازے کے قریب رُک جاتی ہے۔ اس کی نظریں اندرونی کمرے کے فرش پر جم جاتی ہیں۔ شدید خوف اس کے تمام جسم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بے تحاشا چیخنے لگتی ہے۔ اور بیرونی دروازے کی طرف دوڑ کر اسے کھولتی ہے۔ اور پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی بیرونی وسیع ہال کی طرف بھاگ جاتی ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

ہماری حقیقت

تن پر نہیں ہے چیتھڑا، چولہے پڑے ہیں گھر میں ٹھنڈے
رکھتے ہیں پھر بھی اونچے ہم دوسروں کے جھنڈے
مرغی کی خاصیت ہے ہم ہندوستانیوں میں
خود کھا رہے ہیں کوڑا اور دے رہے ہیں انڈے

ڈاکٹر ازہر قدوائی

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۰)

بلاشبہ وہ حقیقتیں ہیں۔ اور اُن کا اظہار ہمارے عجوبہ پسند جذبہ کو متحرک کرسکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہمارے رومانی جذبات اور عجوبہ پسند احساسات کو حرکت دینے کے لئے کیوں نہ اُن واقعات کی صحیح اور کامل تصویر کشی کی جائے۔ جو اس دنیا میں عام طور پر پیش آتے ہیں۔ اور جن سے زندگی کو ہر گھڑی دوچار ہونا پڑتا ہے۔

بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ، واقعات، واردات اور خیالات کا ٹھیک ٹھیک اظہار بیان فن کاری کا کمال ہے۔ لہٰذا یہ ماننا پڑیگا کہ کسی خیالی واقعہ کی تصویر کشی اس لئے فنکاری نہیں ہے کہ وہ اس خیالی واقعہ کی تصویر ہے۔ بلکہ اس کی فنیّت محض یہی ہے کہ فنکار نے واقعہ کو صحیح اور نفسیاتی جزئیات کے ساتھ بیان کردیا ہے۔ گویا فنکاری عبارت ہے۔ بہتر نادر اور فطری تصویر کشی ہے۔

اور جب یہ صحیح ہے تو بہتر فنکار اس کو قرار دیا جائیگا جو زندگی کی حقیقتوں پر بحث کرے جو عام تجربہ میں آتی ہیں۔ اُن کی تصویر کشی اس لئے زیادہ مشکل ہے کہ عوام اُن کی جزئیات سے بہ نسبت اس واقعہ سے زیادہ واقف ہیں جو عام طور پر کم پیش آتا ہے۔ ایسی مثال میں فنکار کیلئے یہ لازمی ہوتا ہے کہ وہ واقعہ کی جزئیات سے تعلق رکھنے والی تمام پیچیدگیوں کو بالکل اسی طرح بیان کرے جیسی کہ وہ ہیں ورنہ وہ اپنے فن میں ناکام رہے گا۔ لیکن اس کے برعکس ایک اُس واقعہ کی منظر کشی ضرور آسان ہے جسکی جزئیات عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

یہی بنا ہے کہ عام طور پر نئے ادیب اُن رومانی حادثات کی تشریح سے پرہیز کرتے ہیں۔ جو گو واقعہ تو ہو سکتے ہیں لیکن جن کا وقوع بسیط انسانی آبادی میں اس شکل میں نہیں ہے۔ جس شکل میں کہ وہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں میں محدود پایا جاتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے شعر و ادب کی بنیاد روزمرّہ کی زندگی کی واضح حقیقتوں ہی پر رکھتے ہیں۔

ادب اور اُس کی افادیت

زندگی جیسی کہ وہ ہے۔ اور زندگی جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے۔ کے دو متضاد نظریوں پر ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو متخالف نظریوں کو ماننے والوں کے تعفیہ کی بنیاد ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ادب کی یہ تقسیم جہاں تک ادب کے حقیقی مفہوم کا تعلق ہے۔ صحیح نہیں لیکن اگر ہم کسی اعتبار سے بھی اس تقسیم کو صحیح مان لیں۔ اور بہرحال اس حیثیت سے تو اُسے ضرور صحیح ماننا پڑیگا۔ کہ ادیبوں۔ شاعروں اور فنکاروں کے گروہ میں اس وقت دو ممتاز گروپ ہیں جن میں سے ایک ماضی کی طرف نظر جمائے کھڑا ہے۔ اور دوسرا مستقبل اور اسکی رنگینیوں اور آفت کوشیوں کو اپنا مقصد بناتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ادب کی تقسیم بھی ٹھیک مان لی جائے تو ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور رہیں گے کہ یہ دونوں گروہ۔ زندگی جیسی کہ وہ ہے اور زندگی جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے کے نظریوں پر جھگڑتے ہیں۔

"زندگی جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے" والے نظریہ کو ماننے والا طبقہ — جیسی کہ وہ ہے۔ کو اوّل تسلیم کرتا ہے۔ لیکن پہلا گروہ "جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے" کو بالکل تسلیم نہیں کرتا۔

ادب برائے ادب پر اعتقاد رکھنے والوں کا خیال ہے کہ۔ ادب۔ کو زندگی کی حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں اس لئے ادب میں افادیت کی تلاش بالکل بے معنی ہے۔ سوسائٹی اسی طرح چلی آرہی ہے جیسی کہ وہ ہے اور ہمیشہ اسی طرح جاری رہیگی۔ اسلئے ادب میں بھی افادیت اور انقلاب کی ضرورت نہیں۔ ادب ہمارے سماج سے اونچی دنیا کی کچھ اونچی حقیقتوں سے تعلق رکھتا ہے اور بس۔ اسی خیال کے ماتحت ادب برائے ادب۔ کے سب سے بڑے رہنما۔ آسکر وائلڈ نے کہا تھا کہ "میں نے اپنے آپ سے یہ معاہدہ کرلیا ہے کہ ادب کو میری شخصیت میں خود۔ اپنے ہی سے اور اپنے ہی لئے قائم رہنا چاہیئے"۔ اسی چیز کو دوسرے الفاظ میں۔ چارلس کیمبل نے کہا: "وہ ادب کو سماج کی عام سطح سے بلند رکھنا چاہتا ہے۔ اس بلند سطح کو ادب برائے ادب والے۔ ابدی حقیقتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیمب کہتا ہے کہ "میں اب ابدیت کے لئے شعر کہتا ہوں"۔

یہ لوگ اس خیال میں یہاں تک بڑھے ہیں کہ ان کے نزدیک جو ادب ابدیّت حاصل کرسکتا ہے محض ایک اتفاق ہے۔

یعنی ادب نام ہے اس تخیُّلی حادثہ کا جسے۔ الہام۔ کہا جاتا ہے۔

ظاہر ہے جب ادب ابدی حقیقتوں پر بحث کرتا ہے تو نہ نئے ادب اور پرانے ادب کی تقسیم صحیح ہے اور نہ افادی ادب کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ لوگ افادیّت سے اس قدر چڑھے ہیں کہ ان کے ایک نقّاد کے خیال میں ادب میں زبان اور مواد بے معنی الفاظ ہیں۔ جو کچھ ہے اسٹائل ہے۔ لیکن

شیکسپئر ان سب سے آگے بڑھ گیا ہے۔ اُس نے شاعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ شاعر g anitta Aniary y (بے حقیقت چیز کو) A looal habilation faraam (اُس کی اصلی جائے قیام اور حقیقی نام) تک عطا کر دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ پُرانے زمانہ کی طرح خیالی دنیا میں سرگرداں رہا جائے جسے وہ کبھی زندہ حقیقتیں کہتے ہیں۔ کبھی ادب کا اصلی مقصد بتاتے ہیں۔ انکا نقطۂ نظر ہے۔ زندگی جیسی کہ وہ ہے۔ لیکن ادب برائے زندگی۔ کا گروہ۔ زندگی جیسی کہ وہ ہونی چاہیئے۔ والے خیالات پر مضبوطی سے اعتقاد رکھتا ہے۔ ٹالسٹائے نے کہا ہے :۔

"ادب کا فرض ہے کہ وہ عوام کے زیادہ سے زیادہ حصّہ کو اپنا مخاطب بنائے۔"

اور میکسم گارکی کے خیال میں جو ادب عوام سے قریب نہیں اُسے ختم ہو جانا چاہیئے۔

" ادب برائے ادب کے علمبرداروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ۔ افادی ادب تشہیری ادب کا نام ہے۔

بظاہر اُن کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اور ادب بہرحال پڑھنے دیکھنے یا سُننے والے پر اثر کرتا ہے۔ سماج کی موجودہ حالت میں اس کے دو اثر ہو سکتے ہیں۔ یا وہ ان واقعات کو بیان کر کے اثر ڈالیں جو ہماری زندگی سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے۔ تاثیر کی یہ نوعیت۔ سماج کی موجودہ حالت میں تبدیلی کا باعث نہیں۔ اس لئے یہ تاثیر زندگی جیسی کہ وہ ہے کا نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس سماج کے ان امراض سے بحث کی جائے جو واقعتاً اُس میں پائی جاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے لازمی نہیں کہ اس طرح ادب پروپیگنڈہ کے فرائض انجام دے۔ بہرحال اُن کا بیان تاثیری اہمیت رکھتا ہے۔ اس صورت میں لازمی زندگی جیسی کہ وہ ہونا چاہیئے۔ کا نتیجہ پیدا ہوگا۔ یاد رہے کہ یہاں بھی آرٹ محض تاثیری مقصد کیلئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن نتیجہ میں وہ ایک انقلابی فرض بھی ادا کر رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس نے تبدیلی و تغیّر کی رُوح دوڑائی ہے۔ اسے تشہیری ادب کہدینا صحیح نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے احساسات کو حرکت میں لانے کیلئے اور فن کے دوسرے اہم اصولوں کے پیشِ نظر اس کا کیا درجہ ہے۔

ادب برائے زندگی کو تسلیم کرنیوالے ادب سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ کسی متعیّنہ اصول کے پروپیگنڈہ کے ایک آرگن کی حیثیت اختیار کرلے۔ البتّہ وہ یہ توقّع کرتے ہیں کہ ادب جو ہر عہد میں سماجی احساسات کی نمائندگی کا فرض انجام دیتا رہا ہے۔ آج بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوگا۔ آج کا سماج مختلف طبقوں سے ملکر بنا ہے۔ اس لئے ادب کا فرض ہے کہ ان سب کی مجموعی نمائندگی کا فرض ادا کرے۔ اُن کا مطالبہ صرف اسقدر ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی شخص اس مطالبہ کی سنجیدگی سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہ چیز قطعی مختلف ہے، کہ اگر ادب ان ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے گا تو اسمیں انقلابی خیالات تیزی سے آجائیں گے۔ ان خیالات کی نمود سماج کے مختلف طبقوں کے متضاد احساسات کے اظہار کی صورت میں لازمی ہے۔ لیکن یہ سماج کی اپنی بناوٹ کی خامی ہے۔ اس کی وجہ سے ادب اپنی ذمّہ داریوں کو فراموش نہیں کرسکتا۔

نئے ادب کے تقاضے

زندگی آج نہایت گہری پیچیدہ اور دقیق ہوگئی ہے۔ نئے نئے مسئلے ہیں۔ نئی نئی باتیں، نئے مسافر ہیں نئے راستے دل و دماغ تبدیل ہوگئے ہیں۔ سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کے پیمانے بدل رہے ہیں۔ پرانی قدریں پیچھے ہٹ چکی ہیں۔ نئے اصُول و قوانین اُن کی جگہ آگئے ہیں۔ انسانی خیالات کیلئے نئی نئی الجھنیں اور تصوّرات کیلئے انوکھی کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔ سائنٹفک ایجادات اور نفسیاتی انکشافات نے فکر و نظر کو پیچیدہ تر بنا دیا ہے۔ ان سب حالات کا تقاضہ تھا کہ ادب بھی زیادہ سے زیادہ سائنٹفک دقیق اور بعض حالات میں مُبہم ہو جائے۔ اور ایسا ہی ہوا بھی۔ آج کا ادب پُرانے ادب کے مقابلہ میں کہیں مُبہم اور دقیق ہوگیا ہے۔ اسلوبِ اظہار اور طرزِ نگارش اس قدر سائنٹفک ہو چکے ہیں کہ پُرانے ادبیات کے طالب علم کیلئے جدید ادب بہت کچھ چیستان بنکر رہ گیا ہے۔

ادب اور آرٹ میں اس عجیب تبدیلی نے انھیں عوام کی دسترس سے دور کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادب کی تقسیم عام فہم اور دقیق ادب میں کی جانے لگی ہے۔ اسی طرح کی تقسیم پہلے بھی تھی لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ پرانا ادب سوسائٹی کی بیڈھنگی بناوٹ کی وجہ سے ایک حلقہ میں محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ (بقیہ مضمون صفحہ ۵۹ پر)

نیا راگ

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

پجارن

حضرتِ ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انھوں نے خود اپنی درد بھری
مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے!

"ہز ماسٹرس وائس"

پجارن

ہمیں مسرت ہے کہ اس ماہ شائقین کرام کی خدمت میں ہمیں ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنیکا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جسمیں ایک شاعر کے دلپذیر جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون ؟ جناب ساغر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی مترنم جاذبیت کے باعث ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم - پجارن - کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں۔ سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سننے کے قابل ہے۔

پجارن - حصہ پہلا

اے مندر کا راز پجارن — اے فطرت کا ساز پجارن
پریم نگر کی رہنے والی — ہر کی بتیاں کہنے والی
گردن میں تلسی کی مالا — دل میں اک خاموش شوالہ
ہونٹوں پر پیمانے رقصاں — آنکھوں میں میخانے رقصاں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

بھینی بھینی بو ساری میں — ساری مدہ میں تو ساری میں
آنکھوں میں جمنا کی موجیں — بالوں میں گنگا کی لہریں
نور ترے رخسار حسیں پر — رنگیں ٹیکا پاک جبیں پر
جیسے فلک پر صبح کا تارا — روشن روشن پیارا پیارا
شرمیلی معصوم نگاہیں — گوری گوری نازک باہیں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

پھولوں کی اک ہاتھ میں تھالی — موہن مدہ ماتی متوالی
نیچی نظریں ترچھی چتون — مست پجارن ہر کی جوگن
چال ہے مستانہ متوالی — اور کمر پھولوں کی ڈالی
دل تیرا نیکی کی منزل — لاکھوں بتخانوں کا حاصل
ہستی تجھ میں جھوم رہی ہے — مستی آنکھیں چوم رہی ہے

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

حصہ دوسرا

آنکھ میں تیری ہے اک آنسو — جیسے ہو ندی میں جگنو
مالا میں کر اس کو شامل — یہ موتی ہے تیرے قابل
دھیان سے اپنے پران بسا کر — پاؤں سے تیرے آنکھ ملا کر
پریم کا اپنے نیر بہا دوں — سب کچھ تجھ پر بھینٹ چڑھا دوں
پاپی دل میرا سکھ پائے — میری پوجا کیوں رہ جائے
اے دیوی کا روپ پجارن — تیرا روپ انوپ پجارن
تجھکو دل کے گیت سناؤں — پھر چرنوں پر سیس نواؤں
ترلوک اور آکاش جھکا دوں — دھرتی کی شکتی لچکا دوں
تارے، چاند اور بھورے بادل — باغ، ندی، دریا اور جنگل!
پربت روکھ اور مسجد مندر — ساقی پیمانہ اور ساغر
دنیا ہو تیرے قدموں پر — قدموں کے نیچے میرا سر

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن

ایک پجارن ایک پجاری — پریت کی ریتیں کر دیں جاری
دیس میں پریت اور پیار کو بھر دیں — پریم سے کل سنسار کو بھر دیں
لالچ اور لوبھ کے بت کو توڑیں — پاپ اور کرودھ کا نام نہ چھوڑیں
پریم کا رس دوڑے رگ رگ میں — ہو اک پریم کی پوجا جگ میں
دونوں اس دھن میں مر جائیں — تیرتھ اک عجیب بنائیں

اے دیوی کا روپ پجارن
تیرا روپ انوپ پجارن (ہز ماسٹرس وائس)

مطلوب

ع جہاں بیگم ادا (بدایونی)

تیری حضور چاہیے، تیری جناب چاہیے
حوصلۂ نگہہ بھی ہو؟ کچھ تو جواب چاہیے

یہ وہ صدا نہیں جو ہو حرف و بیاں سے آشنا
نغمۂ عشق کے لئے دل کا رباب چاہیے

میری نگاہِ شوق نے اُن کو تلاش کر لیا
وعدۂ صبر آزما! اب تو حجاب چاہیے

رازِ طلب چھپا ہوا، راہ کی سختیوں میں ہے
رہروِ شوق کے لئے دشتِ سراب چاہیے

عشق کی بیخودی کو کیا بادۂ ناب سے غرض
کیف نگاہِ مست سے حالِ خراب چاہیے

سوزِ الم کے آبلے کس سے شمار ہو سکیں!
حالِ تباہ کی دید کو چشمِ پُر آب چاہیے

وعدہ کیا تھا آپ نے وعدہ وفا نہ کر سکے
مجھ سے حجاب کس لئے خود سے حجاب چاہیے

دیدۂ و دل کی ہو خطا دونوں گناہگار ہیں
کس پہ نگاہِ لطف ہو کس پہ عتاب چاہیے

زیست وہی ہے جو رہے درد سے لذت آشنا
جامِ حیات میں مجھے تلخ شراب چاہیے

میری نگاہِ شوق ہے اور نظارۂ جمال
جلوۂ ماہتاب اب زیرِ سحاب چاہیے

ٹوٹے جو ایک آہ میں چور ہوا اک نگاہ میں
ساغرِ زندگی ادا رشکِ حباب چاہیے

دُور ہے تیری منزل!

۱ "ابھی دور ہے تیری منزل مسافر"

سُناتا ہوا زندگی کا فسانہ
لگا ہوں میں منزل لبوں پر ترانہ
ترے ساتھ ہو جائے گا خود زمانہ
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

پیامِ محبت سُناتا چلا جا
کدورت کے شعلے بُجھاتا چلا جا
مسرّت کے موتی لُٹاتا چلا جا
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

یہ تاریک شب اور یہ زورِ باراں
یہ تیزی ہوا کی یہ اُمڈا سا طوفاں
کڑک بجلیوں کی ہے کیا حشر ساماں
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

برستے ہیں ہر لحظہ گولے فضا سے
بکھرتے ہیں شعلے سے موجِ ہوا سے
تمسخر کیا جا رہا ہے قضا سے
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

ترے جوش تک ہے یہ تزئینِ محفل
عمل ہے فقط زندگانی کا حاصل
سکوں سے بہت دور ہے تیری منزل
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

ترا راستہ سخت مشکل ہے لیکن
مصائب کی دیوار حائل ہے لیکن
بہت نرم و نازک ترا دل ہے لیکن
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

ہے بے نورِ شمعِ شبستاں ابھی تک
ہے تاریک صبحِ غریباں ابھی تک
بھکاری ہے انساں کا انساں ابھی تک
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

مدد لے مدد سوزِ قلب و نظر سے
گذرنا ہے تجھ کو یم خیر و شر سے
سبق لے گی دنیا تری رہگذر سے
اُٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

شفق کے نظارے ترے واسطے ہیں
گھٹا کے اشارے ترے واسطے ہیں
یہ چاند اور تارے ترے واسطے ہیں
اٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دور ہے تیری منزل مسافر!

ترا پائے سرگرم رکنے نہ پائے
خزانہ ارادوں کا لٹنے نہ پائے
دیا عزم راسخ کا بجھنے نہ پائے
اٹھائے چلا چل قدم والہانہ
ابھی دُور ہے تیری منزل مسافر!

شارق میرٹھی

تیرا تصور

مظہر حسین شمیم

پھر چاندنی راتوں میں سمندر کے کنارے — آتا ہے تصوّر ترا کرنوں کے سہارے
دامانِ تخیّل میں لئے چاند ستارے

یہ نور کے دریا میں نہائی ہوئی لہریں — یہ چاند کے غاروں سے بہائی ہوئی لہریں
مہتاب کی وادی میں بنائی ہوئی لہریں

یہ خواب کی دنیا سے جگائے ہوئے تارے — دامن میں فلک کے یہ لگائے ہوئے تارے
نیلم کی زمیں پہ یہ اگائے ہوئے تارے

پھر چاندنی راتوں میں سمندر کے کنارے
آتا ہے تصوّر ترا کرنوں کے سہارے

۱۵ مارچ ۱۹۴۲ء

منوّر ظلمتیں

دُھندلی شاموں میں لپکتے ہوئے آنچل کی قسم
زندگی تجھ پہ ہے اترائی ہوئی
رفعتِ کوہ پہ پھیلے ہوئے بادل کی قسم
خلوتِ دل پہ ہے تو چھائی ہوئی
میں تجھے چھوڑ کے، پردیس چلا آیا ہوں
بات گو قابلِ اظہار نہیں
تیری امید کے محلوں کو گرا آیا ہوں
اس حقیقت سے بھی انکار نہیں
لیکن اے جان! یہ عالم کے قوانینِ کُہن
عشق پر رحم نہیں کھا سکتے
یہ گھٹائیں، یہ صنوبر، یہ کھنڈر، یہ گلشن
قسمتوں سے نہیں ٹکرا سکتے
پیٹ بھرنے کے لئے حُسن سے رشتہ توڑا
بیچ کر پھول خریدے کانٹے
زر کے دھارے میں محبت کا سفینہ چھوڑا
ذرّوں کے شوق میں تارے بانٹے

ہاں مجھے یاد ہیں ساون کی وہ بھیگی راتیں
بھوری بدلی میں وہ ڈوبا ہوا ماہ
گنگناتی ہوئی کھیتوں میں حسیں برساتیں
اور وہ نیموں میں لپکتی ہوئی راہ
ہاں! مجھے یاد ہیں جنگل کے وہ مبہوت درخت
پر سمیٹے ہوئے پنچھی خاموش!
وہ درختوں میں نئی گھاس کے ترشے ہوئے تخت
یعنی فطرت کا وہ پیارا آغوش!
ہاں! مجھے یاد ہے وہ صبح کا بڑھتا ہوا نور
مسجدوں سے وہ اذانوں کی صدا
اور گجردم کی ہواؤں سے فضائیں مسحور
قصرِ مشرق کا وہ پٹ کھلتا ہوا
ہاں! مجھے یاد ہیں وہ زلف میں چھپتے ہوئے بال
پتلے ہونٹوں کا وہ حُسنِ لرزاں
وہ جھپکتی ہوئی آنکھیں وہ بہکتی ہوئی چال
وہ حیاؤں میں تقاضے سے نہاں

چار بھیگی ہوئی آنکھوں کا وہ پیمانِ وفا
ہاتھ پر ہاتھ۔ خموشی۔ مستی!
اُن دنوں روح میں ناپید تھا فکرِ فردا
اور آزاد تھی میری ہستی!
آہ لیکن یہ زمانہ تھا بس اک خوابِ حسیں
نیند کی ایک دلآویز اُڑان
بے خود و مست جوانی کا خیالِ شیریں،
بربطِ دل کی لرزتی ہوئی تان
مادہ روح پہ اک کوہِ گراں بن کے گرا
پنکھڑی عشق کی مرجھا سی گئی
نظر آنے لگا عالم میں غبار اُڑتا ہوا
روح مدہوش تھی گھبرا سی گئی
اور اب دھوپ سے تپتے ہوئے بازاروں میں
عشق دم توڑ رہا ہے کب کا
اہلِ ثروت کی اٹھائی ہوئی دیواروں میں
تیرا آزاد ندیم آ دبکا!

یہ بزرگوں کا بنایا ہوا بے کیف نظام
ایک لعنت ہے جوانوں کے لئے
اُف یہ مجرے یہ خوشامد۔ یہ تعصب۔ یہ سلام!
سب ہیں بار دو چٹانوں کے لئے
پھر بھی جب روح پہ کھویا ہوا رنگ آ جائے
دل کا سب میل اچانک دھل جائے
سطحِ احساس سے چھٹ جاتے ہیں گہرے سائے
عرش کا جیسے دریچہ کھل جائے
میرے پہلو میں تو چپ چاپ چلی آتی ہے،
زلف بر دوش۔ سمٹتی۔ ہنستی!
میرے دفتر پہ لپکتی ہوئی چھا جاتی ہے،
دامنِ کوہ کی ننھی بستی!
اس لئے اے مری جاں! عشق سے بیزار نہ ہو
ان اندھیروں میں اُجالا ہو گا،
دیکھ! پیمانِ وفا کشتۂ افکار نہ ہو
بول ہم دونوں کا بالا ہو گا،

احمد ندیم قاسمی

ماہ مارچ ۱۹۴۲ء

طلوع

آکہ خورشید کے چہرے سے الٹ دی ہے نقاب
ہیں نمائش کے لئے حسن کی جلوے بیتاب

آکہ اک نور کا سیلاب ہے آنے والا
آکہ طوفانِ تجلّی میں ہے دنیا غرقاب

آکہ پھولوں کے کٹوروں میں بھری ہے شبنم
آکہ آئی ہے نسیمِ سحری لے کے شراب

آکہ اٹھنے کو ہیں پھر حسنِ ازل کے پردے
نہ رہا جلوۂ فطرت کوئی پابندِ نقاب

آکہ پھر دامنِ گردوں ہے شفق سے رنگیں
آکہ اٹھّی ہے بڑی زور سے موجِ مئے ناب

آنکھ ملتی ہوئی آئی ہے چمن میں نرگس
ہے نگاہوں میں ابھی تک اثرِ مستیٔ خواب

آکہ لبریز ہے نغموں سے فضائے گلشن
وقفِ آہنگ ہے پھر مطربِ فطرت کا رباب

آکہ ہے قابلِ نظّارہ سحر کا منظر
لالہ ساماں ہیں فضائیں رُخِ گلشن شاداب

آکہ اک کعبۂ رنگیں کی بنا پڑتی ہے
سبزہ۔ سجّادہ لچکتی ہوئی شاخیں محراب

آکہ اے جانِ تمنّا ترے جلووں کے بغیر
ہائے میرا دلِ بیتاب ہے اب بھی بیتاب

چشمِ میگوں پہ تری مستیٔ میخانہ نثار
لبِ رنگیں پہ تصدّق تری پھولوں کا شباب

روح بیچین جگر خستہ ہے آنکھیں پُرنم
دل گرفتار خلش سینہ رہینِ تب وتاب

آکہ یہ دلکشیٔ ارض وسما کچھ بھی نہیں
زندگی تیری حضوری کے سوا کچھ بھی نہیں

ظفر تاباں

رُکے رُکے سے آنسو!

نگاہِ یار نہیں تیری سادگی کی سہی — کہ رنگ لائیں گی باتیں تری کبھی نہ کبھی
نشاطِ عشق نے گھٹ بڑھ کے کیا کیا آخر — کرے گی کیا ترے غم کی زیادتی و کمی
وہیں ہے مرکزِ ہنگامۂ وجودِ جہاں — جز ایک حیرتِ ساکت کوئی خدا نہ خودی
جو واقعاتِ جہاں کا سبب کھلا بھی تو کیا — سبب تو خود ہے سراسر طلسمِ بے سببی
وصال میں بھی نظر سے مجھے نہ چھیڑ اے دوست — رگِ نشاطِ محبّت مری بہت ہے دکھی
ترے جمال سے کیا شانِ عشق پیدا ہے — چمک ہے زُلف کی یا برقِ آہِ نیم شبی ۶۱.
ارے یہ کیسی ادائیں ہیں حسن کافر کی — یہ بے نیاز نگاہیں! یہ مدّعا طلبی
تمام بزم کہیں جس طرح اُتر آئے — کچھ اِس طرح سے سرِ بزم اُس کی آنکھ جھکی
مسرّتیں نہ سہی ہوش تو پلٹ آئے — غموں کی رات گئی بیخودی کی بات گئی
تمام شبنم و گُل ہے وہ سر سے تا بہ قدم — رُکے رُکے سے کچھ آنسو رُکی رُکی سی ہنسی

نکھار اُس کے بدن کا فراقؔ کیا کہیے!
ز فرق تا بہ قدم خندہ ہائے زیرِ لبی

فراقؔ گورکھپوری ایم۔اے

۱۰ مارچ سنہ۱۹۴۲ء

نئے ارادے

نہ وہ رقص ساغر نہ وہ دورِ بادہ
زمانے کا ہے اور ہی کچھ ارادہ

فریبِ نظر سے ہے نفرت ہے ممکن
محبت کا پھر کر رہے ہیں اعادہ

محبت نے آکر دلا کر نگیں بنایا
یہ پرکار دل میرا اب تک ہے سادہ

بڑی حسرت سے کھا کر دل نے
جو عشق سے کر لیا استفادہ

مسافر ہوں مجھ کو سفر سے غرض ہے
نہ کچھ پوچھ منزل نہ کچھ پوچھ جادہ

مرا دل بھی رخصت ہوا مجھ سے کہہ کر
سدا سب خانہ آباد و دولت زیادہ

تری بزم میں اس طرح آئے شوکت
لب بہ دعا بستہ و دل کشادہ

شوکت تھانوی

چار تصویریں

صومعہ نشیں

بیشتر صومعہ نشینوں کو — پا رہا ہوں حریصِ سطوتِ جاہ
بیشتر داڑھیوں کے سائے میں — دیکھتا ہوں ہوس کا روئے سیاہ
بیشتر خرقہ ہائے پیری سے — مجھ کو آتی ہے بوئے ذوقِ گناہ
کہیں پاتے نہیں جو تازہ شکار — کہیں ملتی نہیں جو حرص کو راہ
بھیڑیئے لے کے ہاتھ میں تسبیح
خانقاہوں میں ڈھونڈتے ہیں پناہ

ایک منزل

خواجگی کی ہوا کے یخ جھونکے — لوٹ لیتے ہیں جب وطن کا سہاگ
پست حالی کا برفِ زا طوفاں — موڑتا ہے جب اختیار کی باگ
آہیں بھرتی ہے روحِ بیداری — سر اٹھاتا ہے حرص و آز کا ناگ
کہیں ہوتا ہے رقصِ زہرہ وشاں — کہیں اُٹھتا ہے جوگ اور بہاگ
بیٹھ کر عیش کے الاؤ کے گرد
تاپتا ہے بشر گناہ کی آگ

٦٣

تہذیب

خود کلیساؤں کے درودیوار — خونِ نوعِ بشر سے ہیں پُر داغ
خود سکوں پروری سے چلتا ہے — انتہائی شقاوتوں کا سُراغ
آدمیت کا جن کو دعویٰ ہے — نہیں اُن کو درندگی سے فراغ
رہنماؤں کا جن کو سودا ہے — مرکزِ شیطنت ہے اُن کا دماغ
گویا تہذیب کے دریچے میں
بربریت کا جل رہا ہے چراغ

مدرسہ

رات اک مدرسے کے گوشے میں — بحث جاری تھی اک عریض و طویل
اک نیا مسئلہ تھا پیشِ نظر — اک نئے زاویئے کی تھی تشکیل
اُڑ رہے تھے شرارِ علم و ہنر — جل رہا تھا چراغِ رمز و دلیل
میری سرمستیوں نے کیا دیکھا — دل تھے بے ذوق، فکر سب کی علیل
نظر آتے تھے زیرِ پردۂ علم
جہل کے خدّ و خال باتفصیل

سراج الدین ظفر بی۔ اے

ہوش و مستی

نہ غرورِ دردمندی نہ ہوائے خود پرستی
میں ترے خیال میں ہوں، نہ یہ ہوش ہے نہ مستی

مرے دل میں تیرا غم ہے تو غمِ حیات کیوں ہو
یہ حرم کی سرزمیں پر، ہے بنائے بُت پرستی

ترا مبتلا سمجھ کر مجھے پوجتی ہے دنیا،
یہ گناہ کا تقدس یہ بلندیوں کی پستی

ترے عشق کا تصرّف، ترے درد کی کرامت
کہ ہوائے نیستی سے نہ بجھا چراغِ ہستی

غمِ عشق کھینچ لایا مجھے کیف بیخودی تک،
نہ یہاں ضیا نہ ظلمت، نہ بلندیاں، نہ پستی

بہت انقلاب آئے، مگر اب بھی دل وہی ہے
جسے تو بسا چکا تھا نہ اُجڑ سکی وہ بستی

وہ نظر اُٹھا رہے ہیں تو میں جان و ہوش دیدوں
کہیں پھر بدل نہ جائے یہ فضائے کیف و مستی

شاہد صدیقی

جنگل

کتنا مسرّت بخش تھا شاداب جنگل کا سماں
وہ صبح کی ٹھنڈی ہوائیں سنسناتی پتّیاں
وہ پیچ و خم کھاتا ہُوا دریا کا پانی جا بجا
سبزے میں چکر کاٹتی ترشی ہوئی پگڈنڈیاں
کتنا مسرّت بخش تھا ـــــ شاداب جنگل کا سماں

بہتے ہوئے تالاب میں موجوں کا پیہم جھُومنا
انگڑائیاں لے لے کے وہ ساحل کا دامن چوُمنا
دریا کے پُل سے آسماں اپنی کمر ٹیکے ہوئے
اُڑکر فضائے چرخ میں مرغابیوں کا گھُومنا
کتنا مسرّت بخش تھا ـــــ شاداب جنگل کا سماں

وہ فاصلے پر جا بجا اونچے درختوں کا ہجوم!
خاموش ساکت وادیوں میں ہر طرف چڑیوں کی دھوم
پانی میں غوطے مارتی وہ بادلوں کی آندھیاں
وہ پردۂ ظلمت میں مُنہ ڈھانپے ہوئے ماہ و نجوم
کتنا مسرّت بخش تھا ـــــ شاداب جنگل کا سماں

پانی میں بھینسیں جا بجا سر اپنا چمکاتی ہوئی!
کوّوں کو سر پر لیکے دریا کی ہوا کھاتی ہوئی!
پھیلے ہوئے تھے گھاس پر کپڑے کہیں دھوئے ہوئے
رکھے سروں پر گاگریں کچھ لڑکیاں آتی ہوئی!

دامانِ صحنِ دشت میں مہکی ہوئی بوُئے شمیم!
اشجار نورِ صبح سے مدہوش مانندِ کلیم
پتّوں پہ تھرّاتے ہوئے شبنم کے موتی جا بجا،
وہ گنگناتی کھیتیوں کو چوُمتی بادِ نسیم،
کتنا مسرّت بخش تھا ـــــ شاداب جنگل کا سماں

موجوں کے ہونٹوں پر وہ دھیمی گنگناہٹ بار بار
سوتے سے اُٹھ کر جس طرح کانوں میں گوُنج اُٹھے پکار
وہ گھنٹیاں سی بیل گاڑی کی کہیں بجتی ہوئی
پگڈنڈیوں سے دمبدم اُٹھتا ہُوا ہلکا غبار

٦٥

کتنا مسرّت بخش تھا ـــــ شاداب جنگل کا سماں

کاندھوں پہ ہَل رکھّے ہوئے آتا ہے کھیتوں میں کسان
بھیڑوں کے ریوڑ کو ہنکاتے لا رہے تھے گلہ بان
میدان پر سایہ کئے اونچے ببولوں کے درخت
کچھ دُور ٹیلوں سے لگے وہ پھوُس کے ٹوٹے مکان
کتنا مسرّت بخش تھا ـــــ شاداب جنگل کا سماں

کتنا مسرّت بخش تھا ـــــ شاداب جنگل کا سماں

دوسرا رُخ

اب تک نگاہوں میں سمائی ہیں وہ گاگر والیاں
وہ جامنوں کے پیڑ اور دُور تک ہریالیاں
وہ نیلے نیلے آنچلوں پر اُلجھی اُلجھی سی چھاؤں
وہ جھومتا سبزہ وہ پیڑوں کی لچکتی ڈالیاں
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

کچھ فاصلے پر ہل چلائے جا رہا تھا اک کسان
صورت کا بوڑھا دُھن کا پکّا اور ہمّت کا جوان
رہ رہ کے تک لیتا تھا اپنی فاقہ کش بیٹی کی سمت
گاگر لئے سر پر چلی جاتی تھی دُکھیا بے زبان
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

دہراتی جاتی تھی کوئی بے مائگی کی داستاں
کرتی تھی کوئی نازسے بیگانہ وار اٹھکھیلیاں
سنجیدگی نظروں سے چہروں سے متانت آشکار
مخمور بوجھل انکھڑیاں، جھجکی ہوئی پیشانیاں
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

ناگاہ رخصت ہوگئیں سب رہزنانِ عقل و ہوش!
آئی نظر مجھ کو پھر اک دوشیزۂ گیسو بدوش!
اُس سمت وہ معصوم و کمسن نو تراشیدہ صنم،
اور اِس طرف میں بھولا بھٹکا شاعرِ ایماں فروش
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

جس وقت آموں کے درختوں سے میں کچھ آگے بڑھا
نکلا گڈریا جھونپڑے سے اپنے غُل کرتا ہوا
باشور ہستی جاگ اُٹھا بھیڑیں چرانے کے لئے
اٹھکھیلیاں کرتا بہت مسرور ہنستا کھیلتا،
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

دامن میں بچّے بھر رہے تھے نیم کی نمکولیاں
بے انتہا روشن جبیں بے حد ضعیف و ناتواں
کچھ لوگ اکٹّھی کر رہے تھے ٹوکری میں جامنیں
نزدیک و دُور آئیں نظر پنگھٹ پہ جانے والیاں
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

تالاب کے نزدیک سے جس دم ہوا میرا گذر
چھپّر کی اک ٹوٹی ہوئی سی جھونپڑی آئی نظر
آنچل ہلاتی آ رہی تھیں گاؤں کی شہزادیاں
دہرا رہی تھیں اگلی پچھلی داستانیں بیٹھ کر
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

بھولا نہیں ہوں میں وہ جھیلوں کے کنارے آج تک
ہیں قلب میں پیوست موجوں کے اشارے آج تک
جی چاہتا ہے وہ سماں میں دیکھ لوں پھر ایک بار
محشرؔ نگاہوں میں ہیں میری وہ نظارے آج تک
اکثر وہ جنگل کے مناظر —— یاد آتے ہیں مجھے

محشر بدایونی

اتنی فرصت کہاں؟!

یہ ہنستی ہوئی رات، یہ مست دریا — یہ دریا، یہ انجم، یہ ساغر، یہ مینا
وہ اُمڈے شراروں کے طوفان دیکھو — وہ برسے جہنم کے سامان دیکھو
سنو تو مگر اے مرے دل کی ملکہ! — نہیں جاوداں یہ سنہری تماشا
سُلگتی ہوئی نسل انسان دیکھو — نہ روکو، نہ روکو، مری جان دیکھو

روا بھی ہیں مدہوشیاں یہ تو سوچو
قیام اب ہے یکسر زیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

گلوں سے مہکتا سفینہ بھی برحق — مے و ساغر و جام و مینا بھی برحق
لٹے زندگی پُر خطر ہے مسلسل — کہ یہ عالم خیر و شر ہے مسلسل
پلانا بھی برحق ہے پینا بھی برحق — محبت کی اک رات جینا بھی برحق
بظاہر حدوں میں مگر ہے مسلسل — مسافر مسلسل سفر ہے مسلسل ۶۷

مگر میں نہیں شادماں یہ تو سوچو
نہ منزل نہ کوئی نشاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

یہ منظر سُلگتے ہوئے بام و در کا — کلیجہ دہلتا ہے برق و شرر کا
تخیل میں ہیں لاکھ مبہم ارادے — مچلتے ہیں دل میں یہ تخیل زادے
دھڑکتا ہو دل وسعت بحر و بر کا — مجھے ہو تصور نسیم سحر کا!
ہے اک جسم کمزور لاکھوں لبادے — مسافر ہوں تنہا ہزاروں ہیں جادے

جوانی ہو جنت نشاں یہ تو سوچو
سجاؤں نیا کارواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

اُٹھائے نقاب اپنے رُخ سے جوانی نمایاں ہوں خال و خطِ زندگانی
مُبصّر ہوں میں فطرتِ زندگی کا میں نبّاض ہوں حکمتِ زندگی کا

فسانہ محبّت کا دل کی کہانی ادا ہوں یہ قصّے جنوں کی زبانی
مغنّی ہوں میں عشرتِ زندگی کا حُدی خواں ہوں میں عظمتِ زندگی کا

یہ دُکھڑے ہوں کھل کر بیاں یہ تو سوچو
خود اپنا بنوں نوحہ خواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

جو مردہ گویّوں کی گائی ہوئی ہے جو اک عمر کی گنگنائی ہوئی ہے
کبھی خود ہوں صیّاد اور خود ہوں گلشن کبھی خود ہوں بجلی کبھی خود ہوں خرمن

جو زہر و شکر میں بسائی ہوئی ہے جو گذرے ہوؤں کی سنائی ہوئی ہے
چُھڑاؤں علائق سے کس طرح دامن کریں خود ہی رہبر ہوں اور خود ہی رہزن

سنوں پھر وہی داستاں یہ تو سوچو
کبھی آپ ہوں کارواں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

۶۸ چمکنا ہے مجھ کو اُبھرنا ہے مجھ کو سنورنا ہے مجھ کو نکھرنا ہے مجھ کو
ہنسے میری بے رنگیوں پر زمانہ مجھے ناگوارا ہوا اپنا ترانہ

حقیقی محبّت پہ مرنا ہے مجھ کو محبّت کو جاوید کرنا ہے مجھ کو
مری مستیاں ہوں بشکلِ فسانہ پلا کر مجھے وقت خود ہو روانہ

محبّت میں ہوں رائیگاں یہ تو سوچو
ابد تک رہوں سرگراں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

اسی آشیاں کو بچانا ہے مجھ کو بچا کر گلستاں بنانا ہے مجھ کو
بنا کر یہ گلشن سجانا ہے مجھ کو سجا کر جہاں کو دکھانا ہے مجھ کو

بناؤں نیا آشیاں یہ تو سوچو
مجھے اتنی فرصت کہاں یہ تو سوچو

ساغر نظامی

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

۱۵ مارچ ۱۹۴۲ء

روحِ ایثار کا ترانہ

میں قرن وسال کے ایواں میں سوتوں کو جگاتی آئی ہوں
میں جبر و غلامی کے نقشِ باطل کو مٹاتی آئی ہوں
پستی کو دائم رفعت کے پیغام سُناتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

تسلیم و رضا کا جادہ ہوں "قربانی" مجھ کو کہتے ہیں
بے گنتی عزمِ براہیمی میرے سایہ میں رہتے ہیں

میں قرن وسال کے ایواں میں سوتوں کو جگاتی آئی ہوں
ہستی کو... اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

دائیدۂ خواب ہوں یا عکسِ احساسِ دلِ ابراہیمی
طوفان کا قاہر نغمہ ہوں، کہسار کی جابر خاموشی
میں نیستی کا سناٹا ہوں اور ہستی کی دائم مستی
سینے میں جو ابراہیم کے تھی ہوں میں وہ دہکتی چنگاری

اکسیر ہے میری چٹکی میں، تاریخ ہے میرے پہلو میں
گرتوں کو اُٹھانے کی قوت ہو آج ہے میرے بازو میں

سقراط و حسینؓ و مسلم کی میں یاد دلاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

میں عزمِ الٰہی کا سایہ، آدم کا پُرانا جذبہ ہوں
قوموں کے عروج و پستی کا اک نازک تر پیمانہ ہوں
تاریخ مری نیرنگی ہے، ہر رنگ سے لیکن پیدا ہوں
ہاں میں ہی ابد کے ماتھے پر عظمت کا چمکتا ٹیکا ہوں

جلووں سے مرے اس دنیا کی تقدیر منور ہوتی ہے
جو ذرّہ تھا وہ ہیرا ہے جو قطرہ تھا وہ موتی ہے

تاریخ پہ چھا جانے کے لئے تاریخ بناتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

ماہ مارچ ۱۹۴۳ء

میں قوت ہوں، میں دولت ہوں، میں عزت ہوں، میں عظمت ہوں
تاریک دریچہ میں غم کے میں عیشِ ابد کی بشارت ہوں
میں فطرتِ انساں کا جوہر آئینۂ بزمِ فطرت ہوں
میں پشت و پناہ قوم و وطن، میں روحِ حیاتِ ملت ہوں.

آزادی میرے قدموں میں آبادی میرے قدموں میں
خوش حالی میرے قدموں میں ہے شادی میرے قدموں میں

مجبوروں اور غلاموں کو یہ راز بتاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

ہاں ملتِ ابراہیم نہیں مدت سے مرے دیوانوں میں
وہ روح نہیں دیوانوں میں وہ جان نہیں فرزانوں میں
وہ کیف نہیں وہ ذوق نہیں، وہ جوش نہیں میخانوں میں
اور میں کہ چھلکتی ہوں اب بھی آدم کے نئے پیمانوں میں

سرشار ہوا ہے اک عالم ساغر وہ پلایا ہے میں نے
ہنس ہنس کے دہکتے سورج سے ذرّوں کو بھڑایا ہے میں نے

اور اپنے سفینے کو اب بھی طوفاں سے لڑاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

بے تاب فضائے عالم پر پھر ظلم کے بادل چھائے ہیں ۷۰
اکبار حیاتِ انساں پر پھر نازک لمحے آئے ہیں
مظلوم پھر انسانیت ہے، پھر امن و سکوں ٹھکرائے ہیں
آدم کی ٹوٹی کشتی سے پھر سو طوفاں ٹکرائے ہیں

آ میرے جلو میں آگے بڑھ گر تجھ کو جہاں میں جینا ہے
پی میرے ہاتھ سے ساغر پی گر جامِ تمنا پینا ہے

لاکھوں کو پلاتی آئی ہوں، لاکھوں کو جلاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

طوفانِ بلا اکڑتا ہے ساحل سے مرے ٹکرانے دو
سیلاب فنا بل کھاتا ہے وادی میں مری بل کھانے دو
جلتا ہے اگر گلشن میرا جل جانے دو پھنک جانے دو
آتی ہے تباہی میری طرف میں سینہ سپر ہوں آنے دو

ہنس ہنس کر میرے دیوانے ان طوفانوں کو روکیں گے
میدانِ عمل میں بڑھ بڑھ کر عفریتِ فنا کو ٹوکیں گے

یہ وار ہے کیا، میں ایسے لاکھوں وار بچاتی آئی ہوں
ہستی کو اپنے پرتو سے جاوید بناتی آئی ہوں

ساغر نظامی

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

۱۰ مارچ ۱۹۴۲ء

کسوٹی

ایشیا

چوتھا باب

تنقید و تبصرہ

بابتہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

کسوٹی

(نئی کتابیں اور رسالے)

زندہ چین

جدید چینی کہانیاں، مترجمہ "تمنائی"

ناشر۔ نیا سنسار۔ کتاب گھر، بانکی پور پٹنہ

زندہ چین جیسی مفید راہبر کتابیں اگر اردو زبان میں برابر منتقل ہوتی رہیں تو وہ دن دور نہیں، جب اردو کا تخلیقی ادب دوسری زبانوں کے ہم پایہ ہو جائے گا۔ ہمیں اپنی دنیا کی خصوصیتوں کا اندازہ نہیں، اپنے جوہر کی پرکھ نہیں۔ جس طرح سونے کو کسوٹی پہ آسانی سے کسا جا سکتا ہے۔ اگر ہمارے پاس یونیورسل نئے ادب کی کسوٹیاں جمع ہو گئیں۔ تو ہم اپنے سونے کی پرکھ کر سکیں گے۔ زندہ چین، جدید چینی کہانیوں کا مجموعہ ہے؛ محض دس کہانیاں ہیں۔ اکثر ان میں سے بہت ہی مختصر، مگر ان میں سے ایک کہانی ایسی نہیں جس کو فنکارانہ نقطۂ نگاہ سے معمولی کہا جا سکے؛

چین کے افسانہ نگاروں، لوہسون۔ شہ منگ۔ ٹنگ لنگ۔ چنگ تین یہ پاچن، ماؤتون کے بارے میں مترجم نے ضروری معلومات، سوانح حیات اور سماجی و سیاسی پس منظر مختصر نوٹوں کے ذریعہ بتا دیا ہے۔ آخر میں "چین کی جدید ادبی تحریک" کے عنوان سے نیم ویلز کا ایک تاریخی اور تنقیدی مضمون ہے۔ جس میں اختصار کیساتھ ان تمام ادبی تحریکات اور چینی انشاپردازوں کی تخلیق وارتقاء کی تاریخ درج ہے۔ جو چین کے ادبی تحریک کے ہیرو تھے۔ یا اس سے تعلق رکھتے تھے ساتھ ہی اُن عناصر کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ جو اس تحریک میں رجعت پسندی کا راگ گاتے رہے۔ نیم ویلز لکھتا ہے۔

"چین کی جدید ادبی تحریک دو الگ الگ دور میں نمایاں طور سے بٹی ہوئی ہے اور سیاسی انقلابی تحریک کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اٹھی۔ یہ تحریک ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۷ء تک کے ادبی نوجیون سے شروع ہوتی ہے۔ یہ پورا دور بیرونی ملکوں سے واپس آئے ہوئے طلباء کے ہاتھوں مغربی ادب کے ترجموں کے جوش کے ماتحت تخم ریزی اور اثر پذیری کا دور تھا جس کا مختصر ابھار ۱۹۱۹ء کی چوتھی مئی کی تحریک میں ہوا؛

یہ دس برس کا دور، جسے چینی "ادبی انقلاب سے انقلابی ادب کی طرف" کہتے ہیں، تمام کا تمام نئے چینی بورژوا کے آزادی، مساوات، اور اخوت کے مایوس اور پراگندہ خوابوں کے اظہار کے لئے وقف تھا۔ اور پرانے سماجی رواج کے خلاف اُن کی انقلابی لڑائی کو ظاہر کرتا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں کثومنٹینگ کے دائیں بازو کی پالیسی کے ناگہانی تغیر کے ساتھ جہاں سے ادھورے بورژوا انقلاب کی موت اور کمیونسٹوں کی قیادت میں مزدور اور کسان انقلاب کی آزاد ترقی شروع ہوتی ہے۔ اس کا یکایک خاتمہ ہو گیا کثومنٹگ کی اس فوجی اور جنگی پالیسی کے ساتھ ہی ساتھ ادبی تحریک کی مرکزی اور اہم جماعت تیزی سے مخالف سمت کو بائیں جانب مڑ گئی اور متوسط طبقہ کی کمزوری اور رجعت پسندی پر سخت مایوسی اور جنتا کے انقلاب پر جو اندر ہی اندر دبے دبے ابل رہا تھا۔ یقین ظاہر کرنے لگی ۱۹۲۸ء سے آج تک میدان بائیں انقلابی ادب کے ساتھ رہا ہے"

ایشیا مارچ ۱۹۳۲ء

نیم ویلز کا یہ اہم مقالہ، نہ صرف اُردو میں "چین کی جدید تحریک" کے متعلق ایک اہم ترین دستاویز ہے۔ بلکہ انگریزی زبان میں بھی یہ اپنی نوعیت کی سب سے پہلی چیز ہے؛ "زندہ چین" میں اگر یہ مقالہ نہ ہوتا، تو کتاب بے رُوح جسم بن کر رہ جاتی۔
آگے چل کر ویلز چین میں مختصر افسانہ کی کہانی اس طرح بیان کرتا ہے:

"جدید مختصر افسانہ چین کے لئے ایک نئی صنف ہے۔ جو موجودہ یورپ کے نمونہ کی طرح روس سے آیا۔ دوسرا اہم اثر فرانسیسی ادب کا ہے، انگریزی مصنف صرف دلچسپی کیلئے پڑھے جاتے ہیں، لیکن چینی نفسیات، طریقہ اور عام مادّی پس منظر کیلئے اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں، ان عظیم الشان رُکاوٹوں کے باوجود جو اس تہذیبی رجحان کے راستے میں سیاسی ضرورتوں کی وجہ سے ڈالی گئی ہیں۔ جاپان اور چین دونوں پر اس کا اثر وسیع اور گہرا ہے، روس کی طرف اس نئے رجحان کی کئی وجہیں ہیں۔ لیکن بنیادی اور اصلی سبب ایک ہی طرح کی انقلابی تحریکیں ہیں۔ جدید ادبی تحریک کے شروع ہی سے روسیوں نے چینیوں کے دلوں پر قبضہ کرلیا۔ ۴۷
چینی ادب پر روسی اثر زیادہ تر جاپانی ترجموں کے ذریعہ ہوا؛ بلکہ وہ راستہ جس سے چین میں جدید آرٹ کی تحریکیں اٹھیں اصل میں جاپان کا مغربی طرز و انداز اختیار کرلینا ہے۔"

چین میں کمیونسٹ تحریک نے کس درجہ کا انقلابی ادب پیدا کیا ہے۔ اس کی مثال شہ منگ ایک اشتراکی باعظمت خاتون کے "ایک کھوئی ہوئی ڈائری کے کچھ ورق" سے کیا جاسکتا ہے؛ یہ چند اوراق جس میں اس نے اپنی ڈائری پیش کی ہے۔
"زندہ چین" کی جان ہیں۔ یہ اوراق بتاتے ہیں کہ اصول اور مقصد، اخلاق سے بھی بلند مرتبہ رکھتے ہیں، یہ اوراق ہم میں سب کچھ پاکر سب کچھ کھو دینے کی دقیق ترین صلاحیتیں پیدا کرتے ہیں؛ شہ منگ اپنے احساسِ حمل کو اس طرح ایک جگہ بیان کرتی ہے۔

"چنگ اس کا ساتھی اُس کی پُرمعنی حالت کا اندازہ کرکے آرام کرنے کیلئے کہتا ہے۔ وہ جواب دیتی ہے:۔

"بے معنی الفاظ! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کتنی تکلیف میں ہوں، عورت کے بچہ دان (رحم) کو "تاریخی ضرورتوں" کا کتنا کم خیال ہے؛ یہ خود اپنی تاریخ اور اپنی ضرورت ہے۔
یہ آسان بیان کی صورت میں لائی ہوئی منطق ہے۔ فطرت کی کتنی فیاضی ہے کہ اس وقت مجھے "امیروں کی بیماری" کا تحفہ دیا گیا ہے"!

"میرے اندر جو جان بن رہی ہے اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہماری تمام تدبیریں اور منصوبے اس وقت بالکل یقینی اور درست ہوں" میرے ہی اندر یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور میری خواہش کے خلاف،

عورت کی رُوح میں تخلیق کی فطری خواہش اک ابدی کارفرمائی ہے، وہ اشتراکی ہو یا نازی، مجاہدہ یا محلہ نشین بیگم۔ جوبن ہو یا پدمنی مگر اس کارفرمائی سے گریز نہیں کرسکتی۔ شہ منگ اس کیفیت کو ذاتی تجربہ کے بعد لکھتی ہے:۔

"میں بہت بے چین ہو رہی ہوں گی، کیونکہ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے پیٹ کو نوچتی، دباتی اور پیٹتی بھی تھی، میں کتنا چاہ رہی تھی کہ وہ ننھی سی جان مرجائے۔ لیکن ساتھ ساتھ میرا دل اپنی بچی ہوئی قوت سے میری اس خواہش پر اعتراض کرتا ہے۔ ہر چوٹ جو میں اپنے پیٹ پر دیتی تھی اس کے جواب میں میرا دل دُکھ کے تکلیف دیتا، مجھ پر دو کیفیتیں تھیں ایک خود غرض تمنا، اپنے بچّے کو بچانے کی، دوسری بے غرض، دوسروں کے لئے اپنے کو بچانے کی، اور تھوڑی دیر کے لئے میں نے محسوس کیا کہ اس کا علاج دونوں ہی کی موت سے ہوسکتا ہے۔

دغاباز خیال! پھر بھی اس ننھی سی جان سے مجھے محبت ہے۔ باوجود اس کی تکلیفوں کے میں اس عجیب واقعہ کے ہونے کی تمنا کررہی ہوں؛ جب ایک ننھی سی ہستی میرے بدن میں سے نکل کر اس دنیا میں بہادری سے آئیگی مجھے اس کی ضرورت ہے۔ جیسے ایک سچے شاعر کو ایک نہ مٹنے والی نظم پیدا کرنیکی ضرورت ہوتی ہے"۔ نہیں اس سے بھی زیادہ کیونکہ میرا ننھا فطرت کو بدلنے کیلئے مادرِ فطرت کا آلہ ہوگا،

اس کا مجھے یقین ہے کہ ٹھیک اسی طرح جیسے اس وقت بھی مجھے یقین ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ایک مرد بنتا جارہا ہے'

یہ ننھا انسان جو پہلے مجبور اور میری دیکھ بھال کا محتاج ہوگا۔ جس کی ننھی آنکھیں دھیرے دھیرے حیران کر دینے والے انداز سے کھلیں گی، یہ ننھا آدمی تھوڑے دنوں بعد کھڑا ہوگا۔ اور اپنے بے انتہا حسن اور بے انتہا طاقت سے آدمیوں اور فطرت کے بارے میں ایسی اچھی اور سچی باتوں کا دعویٰ کریگا۔ کہ تمام حاکموں کو زمین اور آسمان کے کل راج کرنیوالوں کو اس کی خواہش کے آگے سر جھکا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا'

کس طرح ایک عورت ماں بننے سے پہلے سوچتی ہے۔ کس طرح غیر شعوری جنسی تقاضے اس کے فکر کو ایک لابدی شکل دیتے ہیں، اور عورت ہو یا مرد، اصول انسان کے تفکر کو کس طرح اپنے سانچے میں لامحدود کر کے محدود کر لیتا ہے: شتہ منگ کی زبان سے سنئیے:۔

میری پہلی ماہواری رکنے کے وقت سے، اس وقت سے جب میرے رحم میں پہلی دھڑکن ہوئی میرا دل اس عجیب چیز کے ہونے سے کچھ اس طرح دھڑک رہا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی، ساری دنیا میں یہ خبر پھیلا دینے کے لئے میری زبان پھڑک رہی ہے۔ باوجود اس کی پاکیزگی اور بڑائی کے یہ میں ہوں گی جس پر یہ نوجوان آدمی اپنی پہلی مسکراہٹ نچھاور کرے گا۔ یہ میں ہوں گی جسے وہ ماں کہہ کے پکاریگا۔

کہاں ہے کوئی اتنی مضبوط دل کی عورت جو ایسے خواب نہ دیکھتی ہو، نہیں کوئی بھی ایسی نہیں، اور کم از کم میں تو نہیں ہوں، ایک بھی نہیں، اور پھر بھی شاید بہت سی ہزاروں لاکھوں ہم لوگ ہیں، کیا ممتا کی اصلی روح بہت سی عورتوں کے اتحاد سے مضبوط ہو کے اپنے خود غرض چھوٹے ذاتی حقوق کو چھوڑ نہیں سکتی، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی بے بہا تخلیقی قوت کے ذریعہ مادر فطرت کے کسی زبردست تخلیقی فعل کو نشوونما ہونے دیں اور اپنے زمانے میں اس کے رحم میں ایک نئے قسم کے انسان کی پرورش کریں؟

مجھے یقین ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں، لیکن اس خیالی فلسفہ کو ایک زہریلی سوئی میں بدل کے اپنے پیٹ میں چبھو لینا دوسری بات ہے۔ یہ جذبات بلا رُکے ہوئے اُڑ رہے ہیں"

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتی ہے کہ:۔

"صرف اس وقت جب زندگی کی دھڑکن اس انتہا، اس تیزی اور اس خطرہ کو پہونچ جائے۔ جب تقدیر میرے ساتھ تو صرف ایک من موجی اندھا کیڑا ہے جو عجیب و غریب کیمیاوی خاصیت لئے میرے اندر داخل ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی تقدیر کی ایک شکل ہے، مخالف خواہشوں میں انتخاب کرنے کا سامنا کرا دے، جب فیصلہ کرنے میں آدمی کو ذاتی احساسات کو نظر انداز کرنا پڑے صرف اس وقت انقلابی بیداری کی بات آدمی کر سکتا ہے"

ہر کیف جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ لاکھوں مفلس انسانوں کا آج کل کے غیر منظم سماج میں بچے پیدا کرنا صرف دکھ اٹھانے والوں کی تعداد بڑھانا ہے۔ ہر بچہ جو بیمار بھوکی ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے ذلت اور مصیبت ساتھ لاتا ہے۔ غریبی میں جنم لئے ہوئے بچہ کے آگے بھوک، ذلت جہالت، گالی، تلخی کے سوا کچھ نہیں، اس روحانی بلندی کا تو کوئی سوال ہی نہیں، جو انسان کو جنگل کے جانوروں سے الگ کرتا ہے۔ ہم لوگوں کے لئے نئی زندگی کا مسئلہ اس زندگی کا مسئلہ ہے جسے ہم خود جانتے ہیں اور اسے ہم بلا سوچے سمجھے پیدا ہونیوالوں پر نہیں لاد دینگے۔

۷۵

ایک اپنی میزبان اور اس کے انقلابی شوہر کی مفلسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے:۔

اس کے پاس پیسے بھی اتنے کم ہوتے کہ اچھی طرح کھانے پینے کا سامان نہیں ہو سکتا، اس طرح سات بار اسے اپنے بچے سے ہاتھ دھونا پڑا سات بار! کیا عورت کے لئے یہ دہشتناک صدمہ سات بار اٹھانا ممکن ہے؟ عورتیں اور انقلاب! دنیا کی تاریخ میں بہادری کے کیسے درد بھرے بن گائے گیت چپ چاپ پڑے ہیں"

اس کا ساتھی چینگ گرفتار ہو جاتا ہے۔ آخر اس کی ڈائری دو گولیاں کھا لینے پر ختم ہوتی ہے۔

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

میرا سارا بدن چبھن، جلن، کھجلاہٹ سے پھٹا جا رہا ہے؛
میرا سارا بدن اس طرح پھڑک رہا ہے جیسے اندر بجلی بھر دی گئی ہے۔ میرے چاروں طرف ہر چیز مار ڈالنے والی ہے۔ زہر سے بھری ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔ کوئی دم میں ایک گرم پتھر میرے اندر سے پھٹ پڑنے کو تیار ہے۔ اور دوسرا میرے سر میں سے پھٹ پڑنے والا ہے"

(عورتیں اور انقلاب!؟)

سطحی سی بات ہے اگر مبارکباد دیجئے گر، نیا سنسار نے یہ مختصر سی کتاب شائع کر کے چین کی روحِ انقلاب، ہندوستان کے مُردہ پیکر میں منتقل کی ہے۔ تمنائی کو کیا داد دی جائے اور کیوں داد دی جائے"۔ اُن کا فرض تھا، یقیناً یہ ایک نشانِ نور ہے۔ جو روشنی اور سرفرازی کی نئی راہیں بتانے میں ہماری امداد کریگا؛

نیم ویلز نے ہندوستان کی دیسی زبانوں کے ادیب اور شعراء کے لئے گہرے سوچنے کی ایک گھڑی بھی دی ہے "چین کی جدید ادبی تحریک" کوئی دربار داری اور محفلِ رقص و سرود نہیں ہے، ہمارے وہ شاعر جو درباروں سے نکالے
۴۷ جانے کے بعد اب اپنی رجعت پسندیوں سے عوام کے کھلے جلسوں کو دربار بنانا چاہتے ہیں۔ جنھیں صرف گنگناہٹ سے مطلب ہے۔ آہوں سے نہیں، جو صرف تبسم کے پجاری ہیں۔ آنسوؤں کے نہیں، وہ ویلز کی یہ سطریں پڑھیں۔

"تاریخ میں پہلے کبھی شاید ہی کسی اور ملک کے ادبی عالموں نے چین کے آجکل کے انقلابی لکھنے والوں سے زیادہ سر فروشانہ جد و جہد کی ہوگی۔ بائیں تحریک کی سخت جانی حیرت خیز ہے ۱۹۳۰ء میں ماؤ توان کی تیار کی ہوئی فہرست کے مطابق بائیں مصنفوں کی لیگ کے مندرجہ ذیل ممبروں کا یہ حشر ہوا؛

۱۔ ۷ر فروری ۱۹۳۱ء کو ایک ساتھ قتل کئے گئے:۔ جاؤ شہہ، ہو یہ پنگ، مس فنگ، لی وئی ثنگ اور ین فو۔

۲۔ دی ہوئی تاریخوں میں گرفتار ہوئے۔ معلوم نہیں کیا حشر ہوا۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ ابھی تک جیل میں زندہ ہیں۔ لی چولی (۱۹۳۱ء) کوانگ چوان (۱۹۳۲ء) یان تزی نائن (۱۹۳۳ء)، لاؤشہ یی (۱۹۳۴ء) ہوا تی (۱۹۳۵ء)، پنگ شان (۱۹۳۵ء)، ہوکیئو ٹمین (۱۹۳۴ء)، اور پنگ کینگ، انتہائی ترقی پسند (۱۹۳۱ء)

(۳) قید ہوئے اور تقریباً ایک ہی سال میں چھوڑ دئے گئے آئی وو (فروری ۱۹۳۳-۳۴ء) مس تسامنگ (جون ۱۹۳۲ء رہائی کی تاریخ نامعلوم) اور مس تینگ لنگ (مئی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک)۔

یان ہسوان (یان ہنین) ۱۹۳۴ء میں گرفتار کیا گیا اور ۱۹۳۵ء میں تنتسین کے قیدخانہ میں لگاتار نو دنوں تک کھانا نہ دیکر بھوکوں مار ڈالا گیا۔

تنگ چینیو تسی ۱۹۳۳ء میں تینگ لنگ کے ساتھ گرفتاری سے بچنے میں مارا گیا۔

بعد میں دوسرے ذرائع سے پتہ چلا کہ یان تزوئن چپ چاپ قتل کر ڈالا گیا۔ تائی چنگ ننگ کی ۱۹۳۳ء میں پیکنگ میں قتل کردئے جانے کی خبر آئی ہنگ لنگ فئی تنسئین میں ۱۹۳۴ء میں قتل کیا گیا۔ اور (پاؤ) پنگ تزد تنسئین میں گرفتار کیا گیا اور کمیونسٹ کہہ کے فوراً قتل کردیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں چار ممتاز بائیں مصنف گرفتار ہوئے۔ تئن ہان، ہوا ہان، لنگ پائی شوئی اور ہسوتی ہنگ ان میں سے صرف تئن ہان رہا کیا گیا۔ آج کل وہ مس تینگ لنگ[1] کی طرح نینکنگ میں سخت نگرانی میں زندگی بسر کر رہا ہے"

یہ ایک مختصر اور سرسری رپورٹ ہے۔

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

تقریباً ۳۰ سال قبل اُردو ادب نے ایک ایسا گروپ پیدا کیا جس کا

---

[1] مس تینگ لنگ نینکنگ کی نگرانی سے بھاگ نکلی اور آج کل شمالی چین کے سوویٹ علاقہ میں ہے۔ تمنائی

اسلوب اور تخیل مغرب کے رومانی اندازِ نگارش اور جمالیاتی طرزِ تفکر سے متاثر ہوا۔ نیاز ہوں، ل۔ احمد، سجاد حیدر یلدرم ہوں یا سلطان حیدر جوش، سب مغربی افسانہ نگاروں سے متاثر ہوئے۔ خاص کر آسکر وائلڈ سے، اردو ادب پر مغرب کی یہ سحرکار شخصیت اس وقت اثر انداز ہوئی جب مغربی ادب میں اس کے اثرات کا سورج ڈوب چکا تھا، نیاز نے آسکر وائلڈ کے اسلوب اور طرزِ تفکر کو اپنانے کی کوششیں کیں، وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے، مگر ادب جو اصل میں غیر شعوری طور پر بھی، سماج سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔ ماحول کی مخلوق ہوتا ہے کبھی ایک ماحول پیدا بھی کرتا ہے۔ مگر ہندوستان میں اعلیٰ طبقہ کا سماجی شعور، غدر کے بعد مبہم اور مفلوج ہو گیا تھا، پھر مشرق اور مغرب کا کلچری امتیاز، جمالیاتی احساس ایک سہی، مگر معیار مختلف تھے، جوڑ کچھ صحیح نہ لگ سکا؛ پھر بھی ہر کوشش کے کچھ نہ کچھ اثرات ہوتے ہی ہیں، نوجوان اردو داں طبقہ اس کوشش سے بڑی حد تک متاثر ہوا؛ ناتمام سہی مگر ایک جمالیاتی زاویۂ نگاہ وضع ہوا، اور زندگی اس زاویے سے دیکھی جانے لگی؛

اس پرتو کے اثرات دیرپا نہیں رہے، کیونکر رہ سکتے تھے، اقتصادی وسیاسی نظریوں اور عام سائنٹفک ارتقا نے زندگی کا بند بند کھول دیا۔ زندگی کو قریب سے دیکھنے کی آرزوئیں دلوں میں مچلنے لگیں، نیاز اور ان کے معاصرین کے اسالیب میں پختگی تھی۔ وہ پختگی اور وسیع ہوتی، رومانی افسانہ نگاری کی ترقی اور تکمیل میں ابھی بڑی گنجائشیں تھیں، مگر ادب کے نئے تقاضوں اور ترقی کی پرواز نے اس کارواں کو یونہی چھوڑا۔ اور ایک ایسی چھلانگ لگائی جس نے ہمیں، تبدیلی کی نئی منزل پر پہونچا دیا۔ آسکر وائلڈ کے بعد ٹالسٹائی نے لی، پھر چیخوف نے پھر گورکی نے، اور اب اک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو تمام اردو ادب، روسی طرزِ تفکر اور اسلوبِ تحریر سے بڑی حد تک متاثر ہو رہا ہے؛

منفعل اور مفلوج قوم پرستی کی تحریک کے فروغ کیساتھ ساتھ (جسمیں روایاتی نیکیوں کی اقدار اجاگر ہو رہی تھیں) ٹالسٹائی کی کہانی کے اخلاقی عناصر روشن ہوئے؛ اہلِ نظر یہ بھی جانتے ہیں، کہ اپنے اعمال وکردار میں خود گاندھی جی، ٹالسٹائی سے کافی متاثر ہیں؛ تحریکِ عدم تعاون تو خیر، واضح طور پر ٹالسٹائی کی تحریک (   ) کا پرتو ہے۔

بہرحال روحِ ارتقا کا یہ کچھ عجیب کارنامہ نہیں، مگر کارنامہ ضرور ہے، کہ کسی چیز کو ہم نے مکمل نہیں کیا، اور نئی چیزوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اب کہانی میں دور دراز کار باتیں عیب خیال کی جاتی ہیں۔ زندگی کی دقیق اور واضح حقیقتوں پر ہماری نگاہ پڑنے لگی ہے۔ موتی ہاتھ نہیں لگے، مگر غوّاصی کا جذبہ تیزی سے کارفرما ہے؛

سید محمود مورخ بی اے نے جن کی حقیقی حیثیت ایک جرنلسٹ کی ہے، اپنے نئے بارہ افسانوں کو مجموعہ کی شکل میں شائع کیا ہے؛ اس سے پہلے بھی وہ ایک مجموعہ شائع کر چکے ہیں؛ جرنلزم اور افسانہ نگاری دو مختلف راہیں ہیں، جرنلزم اور پھر دیسی جرنلزم جس میں "ریاستی سیاست" پر رائے زنی بھی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ جداگانہ فریضہ ہے، رہا افسانہ یہ ادب کی ایک مستقل صنف ہے، جسمیں کمال حاصل کرنے کیلئے عمر بھی بیت جائے تو کم ہے؛

سید محمود مورخ کو پُرسکون اوقات میں یہ سوچنے کے لئے بھی وقت نکالنا چاہئے کہ انھیں افسانہ نگار بننا ہے یا جرنلسٹ، یہ بڑی خوفناک بات ہے کہ کہانیوں کی دنیا میں بھی ریاستوں کے بھوت گھس آئے ہیں، شاہی قیدی، میری محبت کا خوفناک انجام، یہ اور کئی افسانے والیانِ ریاست کی عیّاشیوں، رنگ رلیوں اور استبداد کی ہولناک تصویریں ہیں؛

۷۷ اس میں شک نہیں، ان کہانیوں کی ایک دنیا ہے؛ جسمیں پہونچکر ہمیں ریاستوں کی مظلوم اور بھولی پرجا کے دکھ معلوم ہوتے ہیں۔ ان اعمال کے رُخ سے حجابات اٹھتے ہیں۔ جو دیسی راجا مہاراجہ یورپ میں جاکر اختیار کرتے ہیں۔ غریب اور ان پڑھ پرجا کی گاڑھی کمائی ویسٹ اینڈ کے شریک مالکانِ ہوٹل اور یورپی کنواری کی عشوہ طرازیوں کی نذر کر دی جاتی ہے، اور یہ کہ حکومتِ ہند ان تمام شرارتوں اور آدم آزاریوں کو برداشت ہی نہیں کرتی کبھی کبھی برابر کی مجرم بھی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن کہانی کے آرٹ سے اور اس اسلوب کو کوئی تعلق نہیں۔

مورخ برسوں سے لکھتے ہیں، ان کی نثر میں بڑی جان ہے۔ حالات کی نامساعدت کہئے، یا معذوریاں، وہ اپنی اہلیتوں سے وہ کام نہیں لے سکے جو انھیں لینا چاہئے تھا؛ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیوں میں فنکاری کی وہ شان نہیں، جسے مورخ آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں؛

مورخ کے اکثر افسانے اپنی ترتیب کے لحاظ سے نادر ہوتے ہیں۔ "کیمیا" اچھا افسانہ ہے۔ مگر فنکاری اُس میں بھی مفقود ہے، پس منظر غیر حقیقی تصورات پر مبنی، یہ رجحان ترقی یافتہ زمانے میں افسوسناک ہے، موجودہ زمانہ اور رہبانیت! جب زندگی گریز و فرار کے باوجود مسلسل کشش کر رہی ہے۔

زندگی سے آنکھ بند کرلینے کی تعلیم؛ !! ترقی اور انسانیت کی بڑائی کی توہین نہیں تو کیا ہے؟

لیکن بہرحال، مورّخ کے افسانے ایسے ضرور ہیں کہ وہ سوسائٹی کے ایک مخصوص حلقہ میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کامیابی بھی ایک افسانہ نگار کیلئے کم نہیں؛

نثرہ

مُصنّفہ مولانا محمد عزیز اللہ شاہ عزیز عرف منشی (ر) ولایت علی خاں ولایت، مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ، قیمت ۸ر

نثرہ کی زبان کا اسلوب وہی ہے جو امام حریری کے بعد عام طور پر عربی اور فارسی ادب پر حاوی رہا۔ عربی ادب میں امام حریری کا ایک خاص مقام ہے۔ حریری نے اپنے عہد کے فنِ بلاغت اور صنائع بدائع کے انتہائی کمال کا ایک نادر نمونہ مقاماتِ حریری، کے نام سے پیش کیا، اور ثابت کردیا کہ عربی ادب موجودہ ترقی یافتہ ادبیات میں بھی ایک انفرادی شان رکھتاہے۔ ان مقامات نے یہ بھی ثابت کیا کہ عربی ادب مترادف المعنیٰ، مترادف الصوت، مترادف اللفظ، کثیر المعانی اور وسیع و دقیق مفاہیم ادا کرنیوالے الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ رکھتاہے۔ یہ مقامات ہی کا اثر تھا کہ ان کی اشاعت کے ایک صدی بعد عربی ۷۸
ادبا کی کثیر تعداد مقامات کا جواب دینے کی دُھن میں قافیہ بندی اور لغت پیرائی میں مبتلا ہوگئی۔ عربی کے شستہ و شگفتہ ادب میں بھدّے بے ڈول اور غریب الفاظ کے استعمال کی کثرت ہوگئی۔ یہ حماقت سامانیاں جاری رہیں مگر مقاماتِ حریری کا جواب نہ ہوسکا۔ اور وہ بلاغت کے آخری، مکمل اور کامیاب شاہکار کی حیثیت سے آج تک باقی ہے۔

پچھلی چند صدیوں میں ایران کے عربی نواز حکمرانوں نے فارسی ادب کی قسمت عربی ادب کے ساتھ وابستہ کررکھی تھی، اس عربی رجحان کا فارسی ادب پر بھی اثر پڑا، فارسی انشا پردازوں نے بھی قافیہ پیمائی اور صنعت پروری کو ادبیات کی جان سمجھ لیا۔ بعض کو کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ مقاماتِ بدیعی جیسی اچھی کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔ لیکن بہرحال مجموعی طور پر ادب کی آزاد ترقی کے لئے یہ رجحان تباہ کن تھا، اور بالآخر تباہ کن ثابت ہوا؛

عربی ادب میں حریری اسٹائل کا اثر تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں ختم ہوگیا تھا۔ مگر فارسی ادب میں اس اسکول کے مقلدین جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) سے قبل تک موجود تھے۔

نثرہ بھی حریری اسکول کا ایک دلچسپ، مختصر، اور لطیف نمونہ ہے، جس میں مولانا عزیز نے الفاظ کی در و بست اور بلاغتی نثر کی فنون کاریوں میں خود کو محدود رکھا ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"دہر بتیشی بہ لفظِ چیدہ و بمعنی پیچیدہ، بلفظ فریدہ و بمعنی جریدہ، بلفظ و بمعنی فکر و ذکر۔ بلفظ گوہر آبدار و بمعنی جوہر تابدار"

اسی طرح صہ۲۵ سطر ۱۳ سے لیکر صہ۲۶ سطر ۸ گویا ۴۶ سطروں میں یہ بتایا گیا ہے کہ "حدائق نعت" (جس کتاب کی تقریظ کے سلسلے میں مذکورہ عبارت لکھی گئی ہے) کے الفاظ و معانی کا کن کن چیزوں کیساتھ استعارہ کیا جاسکتا ہے۔

اس ایک نمونہ سے مولانا عزیز کے طرزِ نگارش کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

فارسی میں یہ اسلوبِ انشا اب متروک ہے، لیکن اس کے مطالعہ سے ادب کی ایک خاص صنف یعنی لغات پر دسترس ضرور ہوجاتی ہے۔ قدیم عربی آمیز فارسی لغت پر عبور حاصل کرنے کیلئے نثرہ یقیناً ایک مفید کتاب ہے۔

مصنف اس دُنیا میں نہیں، کتاب کے آخر میں ان کے حالات سید شرف علی بی اے (علیگ) صفی پوری ڈپٹی کلکٹر نے تحریر کئے ہیں؛

نگارشِ عاری

:- صوفی محمد عزیز اللہ شاہ عزیز
مطبوعہ ادبی پریس قیمت عہ/

نثرہ کے مصنف کی دوسری تصنیف، یہ مختلف رقعات ہیں۔ عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کے نام، کتاب کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ عبارت صنائع و بدائع کی پابندیوں سے آزاد ہوگی۔ نثرہ کے مقابلے میں کچھ آزاد ہے بھی پھر بھی بلاغت آمیز طرز نگارش کی جھلک کہیں کہیں نمودار ہو ہی گئی ہے۔ رقعات کے آداب و القاب کے سلسلے میں لفظِ شفیق (بمعنی ہمدرد مہربان) کے بجائے ہر جگہ مشفق استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ مشفق کے معنی ڈرانے والے کے ہیں؛ مجموعی طور پر یہ نثرہ کے مقابلہ میں واضح اور صاف اسلوبِ انشا رکھتی ہے؛

ساغر

ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد دکن

چند سال سے اُردو زبان و ادب کے متعلق ملک میں خاص بیداری پیدا ہوئی ہے۔ اس بیداری کا دوسرا نام مدافعت اور حفاظت ہے، وقت کے وہ تقاضے جو نئی تبدیلیوں کی گود میں پل کر جوان ہو رہے ہیں، نئی لسانی ترقی اور تعمیر کی نیو ڈال چکے ہیں، ان کا اندازہ کرنے کے بعد نہ جاگنا موت کی نیند سو جانا ہے، کوئی شک نہیں کہ انفرادی کوششیں بھی کم قیمت نہیں لیکن ہر کام میں مرکزیت، مقاصد کی جامع و کامل ترقی کے لئے لازمی ہے۔ مل جل کر جو قدم اٹھائے جاتے ہیں وہ کبھی پسپا اور مغلوب نہیں ہوتے، اردو زبان و ادب کے سلسلے میں کام کرنیوالوں نے اس اصول کو کچھ سمجھا ہے۔ اور انفرادی کوششوں کے بجائے جمہوری و اجتماعی کوششیں شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

ایسے ہی جمہوری اداروں میں سے ایک "ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد دکن بھی ہے۔ جس نے محض ادبی کتابوں کی اشاعت ہی کو اپنا مقصد نہیں بنایا بلکہ اُردو کتابوں کے پڑھنے کا ذوق پیدا کرنے کے ذرائع کو وسیع کرنے پر اپنے نظام میں زور دیا ہے؛ اس نے دوسرے شعبوں کے ساتھ ایک شعبۂ اردو امتحانات بھی قائم کیا ہے، جو مقررہ قواعد و ضوابط کے تحت امتحانات لیتا ہے اور کامیاب امیدواروں کو ادارے کی طرف سے صداقت نامے، سندیں اور امتیاز کے ساتھ کامیاب ہونیوالوں کو انعامات عطا کرتا ہے۔ دکن میں مختلف مدرسے قائم کرنے کی تجاویز بھی اس کے زیر غور ہیں۔ اس ادارہ میں مقررہ نصاب کے ماتحت عام فہم تقریروں کا بھی انتظام کیا جاتا ہے جس سے عوام و خواص امیدوار مساوی طور پر استفادہ حاصل کر سکتے ہیں؛

"ادبیاتِ اردو" مجلسِ امتحاناتِ اُردو کے صدر مولوی سید علی اکبر ایم اے (کنٹب)، نائب ناظم تعلیمات ممالکِ محروسہ ہیں؛ نائب صدر مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے (کنٹب)، پرنسپل ٹریننگ کالج حیدرآباد دکن اور معتمد مولوی عبدالقادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی اُردو لکچرار جامعہ عثمانیہ ہیں۔ اراکین میں حیدرآباد کی مختلف علمی و ادبی شخصیتوں کے علاوہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ بھی ہیں؛ ڈاکٹر زور نے اُردو زبان کی جتنی بنیادی خدمت کی ہے شاید اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے اپنے طریقِ کار سے محدود و لا محدود، مقاصد کو اپنے دائرہ میں شریک کیا ہے، مختلف موضوعات پر وہ علمی و ادبی تصنیفات شائع کر کے جملہ اُردو دنیا کی خدمت کریگا، اور جہاں تک دکن کے گوشہ گوشہ میں اُردو کو وسیع و مستحکم کرنے کا سوال ہے، وہ چاہتا ہے کہ ماہر سند یافتہ ادیب پیدا ہوں اور اُردو اسکولوں کا ایک گلشن تمام دکن میں کھلا دیا جائے جس سے اُردو ادب کی خوشبو پھوٹے اور بعید سے بعید علاقہ کو متاثر کرے۔ اردو دانی، اردو عالم، اردو فاضل، کی ڈگریوں کا جو نصاب ترتیب دیا گیا ہے، وہ بہت آسان ہے، اور تمام اردو ادب کے انتخاب پر حاوی نہیں۔ میری تجویز ہے کہ اُردو عالم اور اُردو فاضل کے نصاب میں، موجودہ نئے ادب کی کتابیں اور نثر و نظم کے مجموعوں کو بھی شامل کیا جائے، خاص کر وہ تنقیدی کتابیں، جن میں نئے زاویہ ہائے نگاہ پیش کئے گئے ہیں؛ موجودہ زمانے کی تمام اُردو شاعری کو اقبال کی کتابوں میں محدود سمجھ لینا، ذرا زیادتی ہے، اسی طرح صرف مرحوم نثر نگاروں کی کتابوں ہی تک نثر کو محدود کر دینا، کوئی انصاف نہیں؛

لیکن یہ ایسے مسائل ہیں کہ اگر ادارہ تبدیلی و ارتقا کو فطرت کا اٹل قانون تسلیم کرلے تو نصاب کی تبدیلی کے متعلق خود نصاب مقرر کرنیوالوں کے ذہن ہماری نمائندگی کر سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا شاندار اور یادگار کام ادارہ کا تازہ کارنامہ ایک اُردو انسائیکلوپیڈیا ترتیب دینے کا اہم [illegible] ہے؛ اس ذیل میں ادارہ کے خاص مقاصد یہ ہیں۔

۷۹ (۱) جملہ علوم و فنون کی اہم اور ضروری معلومات یک جا فراہم کرنا (۲) مستند مواد کو ماہرین کے نقطۂ نظر سے ایسی زبان اور ایسے اسلوب میں مرتب کرنا جس سے عوام و خواص ہر دو کما حقہ استفادہ کر سکیں (۳) حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں، ضرورتوں، اور رجحانوں کی تقسیم اور اس کی نسبت معلومات کو منظم طریقہ پر پیش کرنا؛ اس کے سلسلہ میں ادارہ نے ۶ کمیٹیاں بنائی ہیں (۱) مجلسِ انتظامی، مجلسِ ادارت، مجلسِ نظرِ ثانی زبان و بیان، مجلسِ ترجمہ مجلسِ اشاعت، مجلسِ فروخت و تشہیر، مجلسِ انتظامی کے صدر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے (پی ایچ ڈی لندن) صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ ہیں۔ معتمدین۔ ابو المکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ (عثمانیہ)، سید بادشاہ حسین، ارکین میں۔ تقریباً جامعہ عثمانیہ دکن کے تمام اساتذہ، خاص کر عبدالقادر سروری ایم اے لکچرار اُردو، مجلسِ ادارت کے ارکین کا ماحول محض دکن تک محدود نہیں، حیدرآباد کے علما و ادبا کے ساتھ ساتھ، ڈاکٹر تاثیر ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب، رام بابو سکسینہ، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریاآبادی، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال لاہور، مسعود حسن صاحب رضوی، مسعود عالم ندوی، نجیب اشرف ندوی، وغیرہ بھی اس مجلس میں شامل ہیں؛

اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب اردو زبان میں ایک نئے عہد کا آغاز ثابت ہو سکتی ہے، اس لحاظ سے ادارۂ ادبیاتِ اردو کا یہ با جرأت اقدام کافی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ نہایت ذمہ دارانہ قدم ہے؛

ایشیا [illegible] ١٩٣٢ء

[illegible] ڈاکٹر زور سے کامل ذمہ داری کی توقع ہے، اپریل [illegible] میں، اس سلسلے میں ادارہ کے مقررہ نظام کا خاکہ انسائیکلوپیڈیا کے ابتدائی نمونہ پر روشنی ڈالی جائیگی جو ادارہ نے [illegible] میں شائع کی ہے، وہ باقی باقی، ساغر

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۲)

وہ صرف اونچے درجہ کے افراد کو فائدہ پہونچا سکتا تھا۔ گویا اسوقت ادب کی رسائی عام ذہن تک نہ تھی لیکن آج عوام اُس تک پہونچنے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ یہ محض اس لئے کہ ادبی ارتقا، عوام کی ذہنی ترقی سے کچھ قبل ہو گیا ہے۔ بظاہر ہے کہ اس مشکل کے باوجود ادب کی سائنٹفک موشگافیوں کی ہمت شکنی نہیں کیجا سکتی بلاشبہ عوام کا ادب پر بہت بڑا حق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہیں اور فلسفیانہ خیالات کے بھی اس پر کچھ حقوق ہیں۔ اسلئے ادب یا آرٹ کو انقلابی جوش میں آکر کامل طور پر عوام کی خواہشوں کے تابع نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لینا چاہیئے کہ ادب میں بھی مختلف طبقات قائم کر کے کچھ اور نئی مقدس ادبی قدریں پیدا کرلی جائیں۔ ضرورت ہے کہ ادب کو رُوح و پیکر، زبان و خیال کے لحاظ سے قتنا سب اور لچکیلا بنایا جائے۔ خلاّق اور معجز نما فنکار کے لئے عوام کے ذہنوں سے قریب ہونا ناممکن نہیں، یہی تو وہ مرحلہ ہے جہاں عوام کی لسانی اور نفسیاتی ضرورتوں کا انکشاف ہوتا ہے اور فنکار و عوام کے نئے تعلق کی بنیاد پڑتی ہے!

عوام ذہناً روشن، زود فہم اور اپنی دنیا کی باتیں سننا پسند کرتے ہیں مگر انھیں دقیق و لطیف مسائل سے عدم دلچسپی اور بُعد کا اتہام نہیں دیا جاسکتا۔ اگر سماج کے دماغی اور مدمّغ طبقے ان کا حق تسلیم کر لیتے تو وہ ہر بلندی اور گہرائی سے قریب تھے۔ آج بھی اُن کا حق تسلیم کر لیا جائے تو وہ دقیق اور لطیف مسائلِ حیات کو اسی طرح سمجھ سکتے ہیں جس طرح اعلیٰ دماغی طبقے۔

ادب کو ان کی مانگوں اور ہنگامی تقاضوں کو بھی پورا کرنا چاہیئے اور اُن کے علاوہ بھی کچھ دینا چاہیئے۔ اس طرح وہ ان طبقات کے مطالبوں کو بھی پورا کر سکتا ہے۔ جو گہرے نکات اور اُن نکات کو عجوبہ اور جدید اسالیب سے سُننے کا ذوق رکھتے ہیں!

رومانیت اور ادب

بعض طبقوں خصوصاً اُن ادیبوں کا جو ذہناً تقشف زدہ ہیں۔ خیال ہے کہ رومانیت ادب کی اہم ذمہ داریوں کی راہ میں سدِراہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ اعتراض اُٹھانے والے چاہتے ہیں کہ ادب کو خشک۔ روکھی، تلخ، افادی اور منطقی بحثوں اور دعلوں میں محدود کر دیں۔ یہی نہیں اُن کی خواہش ہے کہ صنفی رومان کی تشریح نفسیاتی حقائق کی روشنی میں کی جائے۔ یعنی رومان کو فلسفۂ محض بنا دیا جائے۔

فنونِ لطیفہ سوسائٹی پر اپنا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس لئے غیر منطقی رجحانات اور مابعد الطبعیاتی خیالات کی ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیئے۔ جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے۔ اور اس خیال کو ماننے والوں کا اُن کا یہ اعتراض ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن محض رومان ہی کو انسانی ذہن کے غیر مادّی رجحان سے تعبیر کرنا ایک خطرناک غلطی ہے۔ بلاشبہ آپ رومان کو رجعت کا آلۂ کار نہ بننے دیجے۔ تاہم اسکی اپنی لطافت کو اگر وہ سماج کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ بہرحال برقرار رکھنا چاہیئے۔ اس ضمن میں خود رومان کی اپنی منطقی اہمیت کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ یقیناً یہ ممکن ہے کہ اگر ہم سائنٹفک نقطۂ نظر سے تشریح کریں تو وہ ہمارے ذہن کی کسی نہ کسی کمزوری کا نتیجہ ثابت ہوگا اور اس کا بنیادی سبب ہمارے سماج کی طبقاتی تقسیم میں مل سکتا ہے۔ لیکن یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ سماج۔ ماحول یا خارجی ذرائع رومان پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ یہ چیز اپنے مقام پر باقی رہتی ہے۔ انسانی ذہن کی صلاحیتیں ان خارجی اثرات سے متاثر ہو کر رومانی کیفیات پیدا کر دیتی ہیں۔ انسانی ذہن کی یہی وہ صلاحیتیں ہیں جو رومانی لٹریچر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ پھر یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ صنفی میلانات رومانیت کی بنیاد ہیں اور معلوم ہے کہ صنفی مطالبہ انسانی سیرت کا ایک فطری مطالبہ ہے۔ لہٰذا رومانیات کو ادب کے غیر منطقی رجحان سے تعبیر کرنا صحیح نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ادب ہماری سوسائٹی کی مختلف ذہنی تبدیلیوں کا پرتو ہے۔ وہ فقط کسی خاص طبقہ۔ جماعت یا گروہ کا نمائندہ نہیں۔ نہ سماج کے کسی خاص تقشف آمیز یا رومانیت نواز رجحان کی نمائندگی ہی تک اسکی ذمہ داریاں محدود ہیں اس لئے ہر وہ رُخ اور ہر وہ تبدیلی جو سوسائٹی میں نمودار ہوتی ہے۔ ادب میں اسکی جگہ ہونی چاہیئے۔ دقیق مضامین، افسانہ، ڈراما، شاعری، نظم، گیت تمام اسالیب اور طرائق ادب کی تکمیل میں اپنا اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ اسلئے ان میں کسی کو غیر ضروری غیر منطقی یا مضر نہیں بتایا جاسکتا۔

اب یہ نئے ادیب کا فرض ہے کہ وہ اس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب طرز میں پیش کرے وہ خیالات کی اُن اندرونی لہروں کا تجزیہ کرے جو ہماری تہذیب کو حرکت میں لا رہی ہیں اور جو ادیب جس قدر بہتر طور پر اس کام کو انجام دیگا۔ اسی قدر ۴

۴ وہ اپنے فن کو مکمل اور ابدی بنا سکے گا۔

ایشیا مارچ ۱۹۴۲ء

روغن تاج گیسو دراز

ایجاد

بہ نسخہ خاص علامہ لقمان الملک

حضرت والد ماجد حکیم نابینا صاحب سابق طبیب خاص اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ (از فقیر دعاگو حکیم خسرو شاہ نظامی)

روغن تاج گیسو دراز

آج کل حشرات الارض کی طرح روغن اور بہیر آئیل نکل آئے ہیں جو بڑے خوشنما رنگت کے نظر آتے ہیں، اگر جن میں سے (۹۰) فیصدی مٹی کے صاف شدہ تیل اور دوسرے مضر صحت اجزاء کی وجہ سے، بتجربہ سے بجائے فائدے کے مضرت رساں ثابت ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بیشمار لوگوں کے بال اس قسم کے تیلوں کے استعمال کی وجہ سے قبل از وقت سفید ہو جاتے ہیں۔ روغن تاج کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ حضرت والد ماجد مجدد طب لقمان الملک حکیم نابینا صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے مجربات خاص میں سے ہے اور چونکہ حضرت والد ماجد اعلیحضرت غفران مکاں مرحوم کے طبیب خاص تھے اس لئے محلات مبارک میں بکثرت یہ روغن تاج استعمال ہوتا تھا۔ جو واقعی اپنے فوائد کے اعتبار سے روغنیات کا سرتاج ہے۔ اس کے اجزاء دماغ کیلئے اس حد تک تقویت بخش و مفید ہیں کہ اس کے کچھ دنوں استعمال سے دماغی چکر آنکھ کے سامنے اندھیرا آنا یہ سب نافع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے دماغی کام کرنیوالوں کیلئے نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ بالوں کی جڑوں کو غذا بہم پہونچا کر اسقدر مضبوط کر دیتا ہے کہ اگر بال کمزوری کی وجہ سے گر رہے ہوں تو صرف چند روزہ استعمال سے اُن کا گرنا بند ہو جاتا ہے۔ بالوں کو نہ صرف بیحد دراز کرتا ہے بلکہ گھنے اور کالے بھی کر دیتا ہے۔ سیاہ کرنیکے یہ معنی نہیں ہیں کہ تیل خضاب کا کام دے بلکہ اگر نزلہ وغیرہ کی وجہ سے قبل از وقت بال پکنے لگے ہوں تو پہلا عمل تیل کا یہ ہوتا ہے کہ دوسرے بال سفیدی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور بتدریج تمام سفید شدہ بال خود بخود گر جاتے ہیں اور انکی بجائے سیاہ نکلتے ہیں۔ دماغی کام کرنیوالوں نفیس طبیعتوں اور بیگمات کیلئے نہایت اعلیٰ تحفہ ہے چونکہ ساٹھ ستر سے زیادہ ادویات اور بعض کیمیا جڑی بوٹی سے یہ شاہی تیل سخت محنت سے بنایا جاتا ہے اسلئے اسکی قیمت مروجہ خوشنما مضر تیلوں سے بظاہر زیادہ مگر از حد واجبی ہے۔ قیمت فی بوتل نیم پاؤ (سیر) ایک روپیہ آٹھ آنے

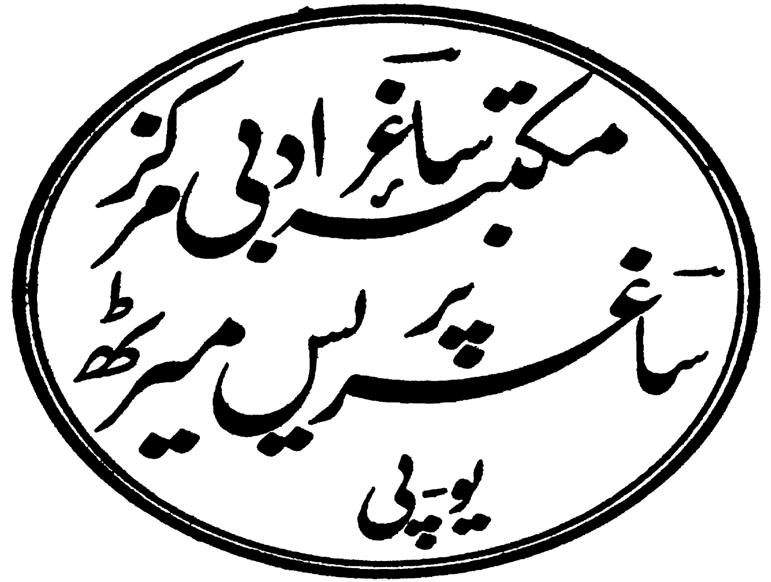
پتہ:۔ دواخانہ متعلقہ فقیر دعاگو حکیم خسرو شاہ نظامی خلف لقمان الملک حکیم نابینا صاحب شاہ گنج حیدر آباد دکن

رُوح الذہب

ایک صد درجہ جلیل القدر و کمال معتدل دوا جو تدریجی تیری کام کرتی ہے ہر موسم میں قابل استعمال، ہر امزجہ کے چاہے حار ہو یا بارد، بوجہ کمال اعتدال ساز گار مطلب کیمیا دی کے سالہا سال کے بیش بہا تجربات کا لب لباب، لقمان الملک شیخ الرئیس ثانی حضرت جد امجد علامہ حکیم نابینا صاحب قبلہ کے نصف صدی کے تجربات کا نچوڑ، وہ دوا جس کے متعلق علامہ مشرق لسان القوم حضرت اقبال اعلی اللہ مقامہ فرما گئے ہیں ۔ ہے دو روحوں کا نشیمن قالب خاکی میرا :. اک سراپا شور مستی اک سراپا تاب و تب

یک جو اللہ نے بخشی مجھے روز ازل :. دوسری ہے آپکی بخشی ہوئی روح الذہب

روح الذہب کے متعلق نہایت دلچسپ علمی رسالہ مع پانچ زر رسالہ سونے کے بطور دوا استعمال کی مجمل تاریخ کے آپکو انصاری دواخانہ زیر نگرانی والد ماجد قبلہ حکیم عبد الغنی صاحب انصاری خسرو شاہ نظامی عارف شاہ گنج سے بلا قیمت مفت مل سکتا ہے مگر اس استدعا کیساتھ کہ آپ ذوق علمی کی توہین اسکو کوئی سینمائی اشتہار سمجھ کر دو چار ورق ادھر اُدھر سے پلٹ کر رکھ دینے سے نہ فرمائینگا۔ اسلئے کہ یہ کارنامہ علمی آپکے ذوق بلند پایۂ ادبی کے عین مطابق ہے۔ آپکے خادم و بہی خواہ :۔ عبد الغنی عبد الودود مع برادران



Published By :—

The Adabi Markaz
Saghar Press,
Meerut (India)